ماہِ نو

اپریل ۱۹۵۸ء

ڈاکٹر میری شیمل   حجاب امتیاز علی   نظر حیدرآبادی

سید عبدالواحد   جمیل الدین عالی   اے۔ شمسی

اللہ بخش راجپوت   عنایت اللہ   جمیل نقوی

پاکستان میں

ماہِ نو

جلد ۱۱ ــــــ شمارہ ۱

اپریل ۱۹۵۸ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی ۸ آنے

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان

پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

اقبالؒ نے جس فکرِ نو کی بنیاد رکھی اس کا آفاقی ہونا لازم تھا، کیونکہ اس کی حیثیت شروع ہی سے بنیادی تھی۔ وہ جس زمانے میں پیدا ہوئے اس میں مشرق و مغرب کے تصورات اور تہذیبی دھارے آپس میں گھل مل رہے تھے۔ اقبال نے ان کا بھرپور جائزہ لیا اور اسی کی بناء پر ایک وسیع تر نظامِ فکر کی تشکیل کی۔ اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ وہ اپنے عہد سے بہت آگے تھے۔ اپنے ہی الفاظ میں وہ "——— بہ شہرِ خود غریب" کا مصداق تھے۔ اسی لئے ابتدا میں اپنے ملک میں بھی اُن کی نوائے راز کو نہ سمجھا سکا۔ وہ بھری انجمن میں تنہا تھے۔ مگر رفتہ رفتہ ان کے کتنے ہی ہمنوا پیدا ہو گئے۔ اور ہند و عراق و عرب و شام سے قطعِ نظر یورپ بھی ان کے حدی خوانوں سے خالی نہ رہا۔ اور آج مشرق کی طرح مغرب بھی ان کی فضیلت کے اعتراف میں پیش پیش ہے۔ بعض دانشورانِ مغرب کو اقبالیات سے خاص شغف ہے۔ انہی میں سے ایک نامور جرمن خاتون "ڈاکٹر میری این شیمل" ہیں جو پچھلے دنوں پاکستان تشریف لائی تھیں اور انہوں نے متعدد فاضلانہ مقالات پڑھ کر اقبال پر بسیط روشنی ڈالی تھی۔ ہم اُن کا ایک مقالہ اس شمارہ میں پیش کر رہے ہیں۔ جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ آج مغرب کی بہترین شخصیتیں اقبال کو کس نظر سے دیکھتی ہیں:

جس طرح مسیحیت اور اسلام میں کئی باتیں مشترک ہیں اسی طرح ان کے نمائندوں ملٹن اور اقبال میں بھی کئی باتیں مشابہ ہیں۔ اس موضوع پر جو مقالہ پیش کیا جا رہا ہے اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ مشرق و مغرب کے فکر کی راہیں کہاں کہاں ملتی اور کہاں کہاں جدا ہوتی ہیں۔ اور اقبال نے عالمی افکار کا سلسلہ کس حد تک آگے بڑھایا ہے:

مقامی شعراء میں اکبر کا نقطۂ نظر اقبال کے نقطۂ نظر سے بظاہر کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو در اصل اس کے ساتھ موافقت رکھتا ہے۔ یہ حقیقت اس شمارہ کے ایک اور مضمون "لسان العصر" سے بخوبی نمایاں ہو جاتی ہے:

★

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات سے عہدِ اکبر و اقبال کی ایک اور جید شخصیت نظروں سے پوشیدہ ہو جاتی ہے۔ ابوالکلام بحیثیت سیاستدان فوت ہو چکے ہیں مگر وہ مردِ مومن جس نے ۱۹ برس کی عمر میں اسلامیات اور اردو صحافت میں انقلاب برپا کر دیا تھا بدستور زندہ ہے۔ اور ہم ایک عظیم صحافی، نامور انشاء پرداز اور مفسّرِ قرآن کی حیثیت سے ہمیشہ اُن کی قدر و منزلت کرتے رہیں گے۔ اپنے ہمعصروں کی طرح ان کا مطمحِ نظر بھی اسلامی کی بازیافت یا احیاءِ دین ہی تھا۔ اور انہوں نے گیسوئے اردو اور گیسوئے ملت کی جو شانہ آرائی کی ہے، اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا:

★

پاکستان کے ہر شعبہ میں ترقی کے لئے جو سعیٔ بلیغ کی جا رہی ہے اس کی ایک عمدہ مثال آثارِ قدیمہ کی تحقیق و دریافت ہے جس کا آغاز قیامِ پاکستان کے جلد ہی بعد ہو گیا تھا چنانچہ مغربی و مشرقی پاکستان میں کئی مقامات پر بڑے اہم انکشافات ہوئے ہیں۔ اب کوٹ ڈیجی پر جو سابقہ سندھ میں واقع ہے ہڑپا و موئن جو ڈرو تہذیب کے آثار کے علاوہ ایک اور تمدن کے آثار بھی دستیاب ہوئے ہیں، جنہوں نے پاکستان کی قدیم تاریخ کم از کم پانچ چھ سو سال بڑھا دی ہے۔ یہ ایک عظیم الشان دریافت ہے جس سے عالمی تاریخ پر بھی نہایت وسیع اثرات کا امکان ہے۔ یہ تحقیق ہنوز ابتدائی منازل میں ہے۔ دیکھئے آگے چل کر کیا کیا حقائق بروئے کار آتے ہیں۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم اس شمارہ میں کوٹ ڈیجی کے متعلق آرلیس سیرِ حاصل مقالہ پیش کر رہے ہیں:

سرورق: مرقدِ اقبالؒ • رنگین عکس: احسان ملک

اقبال اور ملٹن

سید عبد الواحد

شعر و ادب کی تاریخ میں یہ اتفاق شاذ و نادر دکھائی دیتا ہے کہ دو بڑے شاعر جو مختلف زمانوں میں پیدا ہوئے ہوں، مختلف مذہبوں سے تعلق رکھتے ہوں، ان کا کلام مختلف زبانوں میں ہو اور وہ مختلف تمدنوں سے ابھرے ہوں، ان کے فکر و فن میں اس قدر مشابہت ہو جتنی اقبال اور ملٹن میں ہے۔ اور جو بات اس مشابہت کو اور بھی دلچسپ بنا دیتی ہے وہ یہ ہے کہ فکر و فن سے قطع نظر ان کی زندگیوں میں بھی کئی باتیں ملتی جلتی ہیں۔ اگرچہ زندگی کے یہ چھوٹے چھوٹے واقعات ان عظیم فن کاروں کے تخیلات اور کلام کے اعتبار سے کچھ ایسے اہم نہیں ہیں پھر بھی ان سے ان دونوں میں مشابہت کے جو گوناگوں پہلو ابھرتے ہیں، وہ بڑے ہی دلچسپ ہیں۔ مگر تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اقبال نے اپنی تحریرات میں کہیں بھی ملٹن کا ذکر نہیں کیا۔ سوائے ایک خط کے جو انہوں نے اپنی زندگی کے بالکل آغاز میں ۱۱ مارچ ۱۹۰۳ء کو لکھا تھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

"ایک عرصہ سے ملٹن کے انداز یعنی 'فردوس گم گشتہ' وغیرہ کے انداز میں لکھنے کا ارادہ کر رہا ہوں اور یہ وقت بڑی تیزی سے قریب آرہا ہے، کیونکہ کوئی لمحہ ایسا نہیں گذرتا جب میں اس معاملہ پر شدت سے غور نہیں کرتا۔ پچھلے پانچ چھ سال سے یہ تمنا میرے دل میں کروٹیں لے رہی ہے مگر ایسے تخلیقی کارنامے کے لئے جو شدید تڑپ اب پیدا ہو گئی ہے وہ کبھی پیدا نہیں ہوئی تھی۔"

ملٹن کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا جو تمام عمر اس کے دل و دماغ پر حاوی رہی، یہ تھی کہ وہ ایک مہتم بالشان نظم لکھے۔ ایسی نظم جو نفسِ موضوع، اسلوب اور تکنیک، ہر اعتبار سے مہتم بالشان ہو۔ چنانچہ ایک موضوع جس سے دونوں کو عظیم شاعری کا فیضان حاصل ہوا ہے وہ زوالِ آدم ہے۔ ملٹن کے لئے یہ اس کی زندگی کا عظیم ترین کارنامہ تھا۔ اور اقبال بھی اس کی طرف بار بار رجوع کرتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی ڈرامائی نظموں میں، فلسفیانہ خطبات میں اور ان حکمت و بصیرت میں ڈوبے ہوئے پُر مغز، بصیرت افروز اشارات میں جو معاملات کی تہہ تک کاٹ کرتے ہوئے حقائق و بصائر کو الم نشرح کرتے ہیں۔

ملٹن اور اقبال دونوں نے سیاسیات میں حصہ لیا اور مخالفت کا سامنا کیا۔ ملٹن انگلستان میں کرام ویل کے دورِ دینداری کا مبلغ اور فلسفی تھا اور اقبال وہ فلسفی جس نے پاکستان کی آزاد اسلامی مملکت کا خواب دیکھا۔ دونوں کے نزدیک سیاسیات اور مذہب میں چولی دامن کا ساتھ تھا۔ شاعری کو دیکھا جائے تو ملٹن اور اقبال دونوں نے ایک نہیں دو زبانوں میں شاعری کی اور اس کے وجوہ بھی ایک ہی تھے۔ یہ کہ اپنے اپنے ملک کی حدود سے باہر زیادہ وسیع حلقوں تک رسائی پیدا کریں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں ملٹن کی عظیم تخلیقات انگریزی میں ہیں اور اس کا لاطینی کلام محض طبع آزمائی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، وہاں اقبال کا بیشتر بہترین کلام فارسی میں ہے۔ ملٹن کو انگریزی اور اقبال کو اردو میں ایسی شاعرانہ زبان، ایسا پُر سطوت اسلوب برتنا پڑا جو ان کی سیاسی تصوریت کے تمام تر التہاب اور والہانہ شوریدگی کی ترجمانی کر سکے۔ ایڈیسن نے ملٹن کے متعلق جو الفاظ کہے "زبان اس کے افکار کے بارِ گراں کے نیچے دب گئی" اقبال پر بھی صادق آتے ہیں۔ دونوں کا اسلوب بیان عنایت درجہ مترنم ہے اور اس میں زبردست گھن گرج ہے دونوں عالمانہ، گرانڈیل الفاظ کے دلدادہ ہیں جن میں خاص پُر شکوہ ناموں کی رغبت شدت سے نمایاں ہے اور یہ وہ غلغلہ آفریں نام ہیں جو ملٹن کی حد تک بنی اسرائیل اور یونانی دیو مالا کی تلمیحات پر مشتمل ہیں۔ اور اقبال کے یہاں عبرانی و اسلامی تاریخ کی طرف اشارہ کناں ہیں۔

ملٹن اور اقبال دونوں کو شعر و ادب کے شائقین اور ناقدین نے "شاعرِ پیغمبر" قرار دیا ہے۔ ڈاکٹر گریرسن فرماتے ہیں "جناب! اخلاقی شر جو ہمارے تمام دکھوں کا سرچشمہ ہے، راستبازی اور توبہ و استغفار آئندہ فلاح و بہبود کی نوید لئے ہوئے پیغمبرانہ شاعری میں بار بار انہیں امور کا اعادہ ہوتا چلا آیا ہے۔"

ماہِ نو، کراچی۔ اپریل ۱۹۵۸ء

اقبال نے "شاعرِ پیغمبر" کی حیثیت سے جو کردار ادا کیا ہے اس کے متعلق اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اس کے متعلق کچھ اور کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ ماسوا اس لیے کہ ان کے استادِ گرامی کے اس مشہور شعر کو دہرا دیا جائے کہ "در دیدۂ معنی نگراں حضرتِ اقبال پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت" اور پھر یہ بات بھی کچھ کم قابلِ لحاظ نہیں کہ ملٹن کی عظیم الشان نظم کا مرکزی کردار آدم ہے۔ اس طرح اقبال کی شاعری کا مرکزی موضوع بھی انسان ہی ہے۔ وہ فرماتے ہیں :-

بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست　　تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست

پروفیسر سورت نے ملٹن کے بنیادی عقائد کا خلاصہ یوں کیا ہے :

۱۔ عقیدۂ الوہیت (جس میں باپ (خلّاقِ کائنات) ہے اور بیٹے میں مسیح (زبدۂ خالقِ کائنات) ہے۔

۲۔ عقیدۂ اختیار۔

۳۔ مادہ : نیک، غیر فانی اور الٰہی

۴۔ انسان کی دو رنگی : نفس و عقل

۵ عقیدۂ حریت

چونکہ دونوں شاعروں کے دینیات الگ الگ تھے۔ اس لیے لازماً ان کا تصورِ الٰہی بالکل یکساں نہیں ہو سکتا تھا لیکن دیگر عقائد میں ان کے یہاں غیر معمولی یکسانیت نظر آتی ہے۔ سوائے اس کے کہ جہاں تک ملٹن کے یہاں انسان پر دو قوتوں کا عمل ہے : نفس و عقل وہاں اقبال کے ہاں یہ قوتیں عقل اور عشق ہیں۔ اس میں کچھ اجنبیت تو ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے "عشق" اور ملٹن کی "عقل" کا مفہوم ان الفاظ کی اصطلاحی وضع سے بظاہر کتنا ہی مختلف معلوم ہو، لیکن درحقیقت ان میں کافی مشابہت ہے۔ اقبال کی 'عقل' کا مدعا و مقصود ملٹن کی 'عقل' سے یقیناً کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اور بعض اعتبارات سے اس کے بالکل برعکس۔ لہٰذا ان میں مغالطے کا بعید از امکان ہے۔ پھر بھی ملٹن کے 'نفس' اور 'عقل' کا مقابلہ اقبال کے عقل و عشق سے بڑا دلچسپ رہے گا۔

مگر سچ پوچھیے تو ملٹن اور اقبال جس طرح کائنات اور حیاتِ انسانی میں شر کے مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس سے ان کے افکار میں غیر معمولی مشابہت دکھائی دیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلۂ شر نے نوعِ انسان کو شروع ہی سے سرگرداں رکھا ہے۔ اور دنیا کے بڑے بڑے مفکروں نے کائنات میں شر کے عنصر کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔

اقبال کے نزدیک شر کی موجودگی فلسفۂ الٰہیات کا سب سے خاردار مسئلہ ہے۔ آخر کائنات کا الٰہی نظام کیسے برقرار رہ سکتا ہے جبکہ انسان کی زندگی میں خیر و شر یوں آمیختہ ہیں ؟

ملٹن نے اس مسئلہ کا وہی نصرانیت کا روایتی جواب دیا ہے یعنی شیطان یا ابلیس۔ اقبال نے بھی شر کو شیطان سے منسوب کیا ہے۔ مگر انہوں نے مسئلۂ شر کی جو توجیہ کی ہے وہ ان کے فلسفۂ خودی کے عین مطابق ہے۔ "جاوید نامہ" میں زندہ رود مشہور عارف، شاہ ہمداں سے پوچھتا ہے :

از تو خواہم سرِّ یزداں را کلید　　طاعت از ما جست و شیطاں آفرید

زشت و ناخوش را چناں آراستن　　در عمل از ما نکوئی خواستن

از تو پرسم ایں فسوں سازی کہ چہ　　با قمارِ بد نشیں بازی کہ چہ

شاہ ہمداں اس کا جواب دیتے ہیں :

بندۂ کز خویشتن دارد خبر　　آفریند منفعت را از ضرر

بزم با دیو است آدم را وبال　　رزم با دیو است آدم را جمال

خویش را بر اہرمن باید زدن　　تو ہمہ تیغ، آں ہمہ سنگِ فسن

در عشق غنچه ایم که لرزد ز باد صبح
در کار زندگی صفت سنگ خاره ایم

محمد اقبال لندن ۲۴ دسمبر ۳۲ء

اقبال رح (۱۸۷۳ء—۱۹۳۸ء)
اسلام کے عظیم مفکر جن کے تصورات مشرق و مغرب میں ایک نئے نظام فکر و حیات کی نشان دہی کرتے ہیں

جان ملٹن (۱۶۰۸ء—۱۶۷۴ء)
انگلستان کا نامور شاعر، جس کی تصنیف ''فردوس گم گشتہ'' دنیا کے عظیم ترین شعری شاہکاروں میں شمار کی جاتی ہے

And courage never to submit or yield,
And what is else not to be overcome,
That glory never shall his wrath or might
Extort from me. To bow and serve for peace
With suppliant knee, and deify his power
Who from the terror of this arm, so late
Doubted his empire— that were low indeed."
(*Paradise Lost*, I 105-114)

شاکر علی کی نقاشی

(مضمون صفحہ ۵۰)

اساس: (سٹل لائف)

بھس

سائے: (کینوس پر روغنی ...)

تنزل مضمر نہیں ہے بلکہ یہ تو معمولی شعور سے ابھر کر خودی کے شعوری احساس کا طلوع اولیں ہے۔ جیسے کوئی شخص فطرت کے خواب سے بیدار ہو کر اپنے وجود ہی میں ایک ذاتی حادثہ کی کسک، اس کی تڑپ سے چونک اٹھے۔ اور پھر قرآن کی رو سے زمین کوئی دار عذاب بھی نہیں جہاں انسان کو اس کی لغزشِ اولیں کی سزا میں قید کر دیا گیا ہو۔ انسان کا پہلا عملِ سرکشی اس کا ذاتی اختیار کے تحت اولیں اقدام تھا۔ اسی لئے قرآن کے مطابق آدم کی اولیں خطا معاف کر دی گئی۔ (تجدید فکر)

اس طرح جہاں دونوں شاعروں میں ہبوطِ آدم اور ابلیس کے کردار کے بعض اہم پہلوؤں کے بارہ میں اختلاف ہے وہاں ملٹن اور اقبال دونوں بنیادی حیثیت سے مسئلہ شر کے بارہ میں متفق بھی ہیں۔ ان کی منظومات خیر و شر کی ازلی کشمکش اور انسان کی سعی و کوشش سے آخر کار شر کی شکستِ فاش کی آئینہ دار ہیں۔ بلکہ اقبال تو اپنی فطری زندہ دلی سے کام لیتے ہوئے شیطان سے خدا کے حضور یہ شکایت بھی کرواتا ہے کہ وہ انسان کی ذات میں اپنا شایانِ شان حریف نہیں پاتا۔ وہ ایک بہتر حریف کا طلبگار ہے جو اس کے مقاصد کو پیغام شکست دے سکے اور اس قدر آسانی سے اس کے دامِ ابلیس کا شکار نہ ہو جائے۔ یہ احساس اقبال میں اپنے معاصر انسانوں ہی کے مشاہدہ سے پیدا ہوا ہو گا۔

ملٹن اور اقبال کے مطابق ابلیس کا المیہ اسی وجہ سے پیدا ہوا کہ وہ اپنی تقدیر کو بدل نہیں سکتا:

ہم کہاں اور خیر کے ساماں کہاں
شر ہی شر ہے قسمتِ ابلیسیاں
ہم خطا و معصیت سے شاد کام
ہے یہی شغلِ کہن کارِ دوام
جو بھی صادر ہو ز اندِج کبریا
ہم کریں تخریب اُس کی برملا

("فردوسِ گم گشتہ")

اس کے برعکس انسان اپنی قسمت کا مالک و مختار ہے۔ اور اس کے سامنے نشو و ارتقا کے لامحدود امکانات ہیں۔ ملٹن نے آدم اور ابلیس کی جو داستان "فردوسِ گم گشتہ اور بازیافتہ" کی بارہ فصلوں میں بیان کی، اقبال نے صرف چھوٹی چھوٹی متفرق نظموں میں بیان کی ہے جن میں سب سے نمایاں "تسخیرِ فطرت" (مطبوعہ "پیامِ مشرق")، "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ"، "ابلیس و جبریل" اور "جاوید نامہ" وغیرہ کی بعض منظومات ہیں۔ ان نظموں میں ملٹن اور اقبال نے بعض مواقع کی تصویر ایسے الفاظ میں پیش کی ہے جو ایک دوسرے سے نمایاں مشابہت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر جہنم میں ابلیس کی تقریر کا مقابلہ "تسخیرِ فطرت" میں ابلیس کی تقریر سے کیا جا سکتا ہے:

اگر رن میں ہم ہار جائیں تو کیا | ابھی کچھ نہیں اس سے کھویا گیا
سلامت ہے یہ عزمِ راسخ ابھی | یہ جباری اپنی یہ سرکشی
سلامت ہے یہ جذبۂ انتقام | سلامت ہے نفرت کا زورِ تمام
یہ جرأت کہ ہرگز نہ ہاریں گے ہم | سفینہ کبھی پار اتاریں گے ہم
بھلا ہار جانے کی ہے بات کیا | یہاں عزم یاراں ہے اس کے سوا
کبھی ہم پہ غالب نہ آئے کوئی | کبھی جیت ہم پر نہ پائے کوئی
یہ شوکت، یہ سطوت، یہ شانِ نمود | کہاں چھینا پائے گا ربِ ودود
سدا اپنے تن کو جھکائے ہوئے | مدام اپنے من کو دبائے ہوئے
گزارش کروں بہرِ امن و اماں! | ہوں تسبیح سے اس کی ذلت نشاں!
کہ جس کے لئے میری کمند آوری | کچھ اس درجہ سرمایۂ خوف تھی

کہ وہ تھرتھراتا تھا اب کوئی دم — گیا اس کا جاہ و جلال و حشم
نہ وہ بادشاہت نہ وہ احتشام — ہوا چند لمحوں میں قصہ تمام

اقبال فرماتے ہیں:

نوری نادان نیم سجدہ بہ آدم برم — او بہ نہاد است خاک، من بہ نژاد آذرم
می تپد از سوزِ من خون رگ کائنات — من بہ دو صرصرم، من بہ غو تندرم
پیکر انجم ز تو گردش انجم ز من — جاں بہ جہاں اندرم، زندگی مضمرم
من ز تنک مایگاں گدیہ نکردم سجود — قاہر بے دوزخم، داور بے محشرم

وہ الفاظ جن میں ایک اقتدار باختہ تاجدار کے دم خم، لاف زنی، آن بان، بر خود غلطی اور فخر و غرور کی تصویر کھینچی گئی ہے آپس میں کس قدر مشابہ ہیں۔ اگرچہ ابلیس نے یہ دونوں تقریریں بالکل مختلف حالات میں کی ہیں "مجلس شوریٰ" میں ابلیس کا ایک مشیر اسے یوں خطاب کرتا ہے:

ہے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالم استوار — تو نے جب چاہا کیا ہر پردگی کو آشکار
آب و گل تیری حرارت سے جہانِ سوز و ساز — ابلہِ جنت تری تعلیم سے دانائے کار
تجھ سے بڑھ کر فطرتِ آدم کا وہ محرم نہیں — سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار
کام تھا جن کا فقط تقدیس و تسبیح و طواف — تیری غیرت سے ابد تک سرنگون و شرمسار

یہ اشعار ہمیں "فردوس گم گشتہ" کے یہ الفاظ یاد دلاتے ہیں:

"اے تاجدار! اے اورنگ برادرنگ شاہ ذوالافتدار جس نے صف بصف ملائکہ کی معرکۂ کارزار میں قیادت کی اور ہیبت آفریں معرکوں میں بے خوف و خطر تلک الافلاک کے سلطان علی الدوام کو دارِ اعلیٰ سے گھسیٹ کر لے آیا اور اس کی بالادستی کو معرضِ امتحان میں ڈالا۔"

اور جب ابلیس جنت عدن سے باہر نکلتا ہے تو وہ اپنے احساسات کی ترجمانی ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"مسرت و حیرت سے سرشار وہ یوں گویا ہوا: اے خیرِ لا انتہا! اے خیرِ کثیر جو اس تمام شر سے خیر کو ابھارے گا اور شر کو بالآخر خیر سے موسوم کرے گا: اس کائنات سے کہیں زیادہ تابندہ اور حیرت آفریں جس کو تو نے ابتداً دمِ تخلیق قعرِ ظلمات سے ابھارا تھا، بروئے کار لائے گا۔"

"میں تذبذب و تشکک سے معمور کھڑا تھا کہ میں اس خطا و عصیان پر شرمندگی محسوس کروں جس کا میں مسبب اور مرتکب ہوا تھا یا اور بھی زیادہ مسرور رہوں کہ اس شر سے اور بھی زیادہ خیر جنم لے گا یعنی خدائے تعالیٰ کا جلال اور بھی بڑھے گا اور انسانوں کے لئے ذاتِ باری کی طرف سے اور بھی خیر خواہی اور غیظ و غضب پر بے انتہا فضل و کرم حاوی ہوگا۔"

اقبال کے یہاں انسان یہ اشعار گنگناتا ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا زوال ایک ایسا شر نہ تھا جس میں خیر کی آمیزش نہ ہو:

اے کہ ز خورشید تو کوکب جاں مستنیر
از دلم افروختی شمع جہانِ ضمیر
گرچہ فسونش مرا برد ز راہِ صواب
از غلطم درگذر، عذرِ گنہ ہم پذیر
رام نگردد جہاں تا نہ فسونش خوریم
جز بکمندِ نیاز ناز نگردد اسیر
عقل بدام آورد فطرتِ چالاک را
اہرمنِ شعلہ زاد سجدہ کند خاک را

منصور حلاج: اقبال کی نظر میں

ڈاکٹر میری۔ اینے شیمل

اقبالؒ کی تصنیف "جاوید نامہ" کا نقطۂ عروج بلا شبہ تین زندیقوں، حلاج، غالب اور قرۃ العین طاہرہ کی ارواح کی فلکِ مشتری پر آمد ہے، یہ وہ فلک ہے جو انتہائی سعادت سے منسوب ہونے کی بناء پر "السعد الاکبر" کے نام سے موسوم ہے۔ اور بانیان مذاہب اور عارفانِ حق کا ملجا و ماویٰ ہے۔ ان تین عاشقانِ جلیل کی پاکیزہ روحیں شاعر کو لوح و نبوت، تقدیر اور انبیاء و ابلیس کے مناصب کے عمیق ترین اسرار و رموز پر غور و فکر کی حرکت دلاتی ہیں۔ اگر طاہرہ کے دو نہایت پر ترنم آفریں گیتوں اور غالب کے چند اشعار سے قطع نظر کر لی جائے تو اس مقام کی ساری کی ساری گفتگو حلاج ہی کی زبانی ادا ہوتی ہے جس کے تصوف کا اقبال نے ۲۵ سال پہلے اپنے مقالہ میں بڑے حقارت آمیز پیرائے میں ذکر کیا تھا۔

سوال اٹھتا ہے کہ حلاج کی تعلیمات کیا ہیں اور اس نے تصوف کی تاریخ میں کیا حصہ لیا؟

حسین ابن منصور الحلاج، جس کا تذکرہ [illegible] کتب تصوف میں صرف منصور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی سال پیدا ہوا جب کہ اسلام کا [illegible] ذوالنون مصری پیدا ہوا تھا یعنی ۸۵۷ء میں۔ وہ اپنے وطن مالوف صوبۂ فارس سے بغداد آیا جو نویں اور ابتدائی دسویں صدی میں تصوف کا مرکز تھا۔ اس جگہ وہ تصوف جس سے ہم عام طور پر شناسا ہیں، نمو پذیر ہوا یعنی حسن البصری جیسے کڑے مزاج کے زاہد منش واعظ [illegible] مرحلہ عاشقِ حق سے شروع ہو کر محاسبی جیسے ثقہ انسان کے ضبط نفس سے گذرتے ہوئے ساری ارتقائی منازل تک پہنچا اور آخر میں ارتقائی کے نقطے جنید کی ارتقائی مدارج طے کئے۔ [illegible] یہ کہ صرف اکابر معلمین روحانی ہی پر اکتفا کیا جائے کیونکہ ان کے علاوہ اور بے شمار صوفیاء موجود تھے جو عرفانِ حق، عشق الٰہی، توحید، رب انواع معنی، اور فنا فی اللہ کے ساتھ اس کی مثبت صورت بقا باللہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حلاج بھی ان کے حلقہ میں شامل ہو گیا مگر اس کے اپنے مرشد جنید کے ساتھ مراسم کچھ اچھے نہ تھے کیونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے اس کے حق میں بد دعا کی تھی۔ کوئی ایک سال حلاج مکۂ معظمہ میں مقیم رہا اور کرامتیں دکھائیں۔ پھر وہ مشرقی ممالک کی طرف چل پڑا۔ سنتے ہیں وہ جوگیوں کے طور طریق جاننے کے لئے ہندوستان بھی گیا اور اس کے علاوہ ترکستان بھی پہنچا۔

۹۱۳ء میں بغداد واپس آنے پر اسے گرفتار کر لیا گیا کیونکہ حکومت اور اکثر فقہا، یہاں تک کہ صوفیا نے بھی اسے قرامطہ سے سازباز اور بے دینی کا ملزم گردانا [illegible] ۲۲ مارچ ۹۲۲ء کو [illegible] بڑی بے رحمی سے زندہ دار کر دیا گیا۔ صوفیاء کی رائے میں بارگاہِ حق کی طرف سے اس امر کی سزا تھی کہ حلاج نے عشق الٰہی کے ناقابل بیان رازوں کو افشا کر دیا تھا۔ یعنی "انا الحق" کہہ کر خود کو خالق اکبر قرار دیا۔ اور یہ کلمات گو اہل شریعت کے لئے بھی ناقابل برداشت ہیں اور [illegible] مزاج اہل طریقت کے لئے تھی۔ لہٰذا متقی و پرہیزگار شیخ ابن خفیف شیرازی [illegible] عارف بزرگ ابوعلی رودباری [illegible] نظریہ "ہمہ اوست" کو سمجھا جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان ہستی باری کا ذاتی اور زندہ ناظر و شاہد ہے اور نہ اس کے مشہور الفاظ "انا الحق" کے صحیح تر مفہوم کو ہی پا سکا جو ہرگز ایک ایسے عاشقِ از خود رفتہ کا نعرۂ مستانہ نہیں جسے اپنے آپ پر کوئی ضبط و اختیار نہ رہا ہو۔ بلکہ اس کے عارفانہ نظریات کی [illegible] دال ہے جن کی تشریح وحدت الوجود کی روشنی میں مناسب نہیں جیسا ابن عربی کے زمانہ کے بعد کیا گیا۔

حلاج کی [illegible] اسلامی [illegible] قصص و حکایات کے باعث بالکل بدل گئی یا شاید اہل نظر نے اس کی حقیقی نوعیت کو

بھانپ لیا۔ اب جیساکہ آر۔ اے۔ نکلسن نے بیان کیا ہے، اس کی حیثیت یہ قرار پائی کہ: "وہ تمام تر ایک ایسی ستم نصیب ہستی ہے جس نے جان و دل سے جدوجہد کرتے ہوئے فرمانِ باری کی تعمیل کی خواہ اس کی خاطر اسے کتنی ہی آفات و مصائب کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑا۔" اس نے اس عاشق صادق کا بن رہے یا جس نے بے پایاں محبت کے جذبۂ بے اختیار میں خون کی قربانی دی اور دار پر چڑھ کر منصور یعنی فاتح بن گیا۔ چنانچہ مولانا رومؔ نے شاخ پُر آگے ہوئے سرخ گلاب کو منصور سے تشبیہ دی ہے۔

حلاج کے عقائد کا اثر اور اس کی شخصیت سے جو احساس دوسروں کے دل میں پیدا ہوا، اس کا عکس خواجہ فریدالدین عطار کی تصانیف نظم و نثر میں بڑی وضاحت سے دکھائی دیتا ہے جو اُسے اپنا مرشد روحانی تصور کرتے تھے۔ باقی رہے مولانا جلال الدین رومی تو مثنوی معنوی اور دیوان شمس تبریز دونوں اس شہید عشق کی تلمیحات سے بھرپور ہیں؛ فرماتے ہیں:

ما مست الستیم بیک جرعہ چو منصور
اندیشۂ فتوائے سر دار نداریم

ترکی شاعری میں شروع ہی سے عشق منصور یعنی اس جادۂ پرخار عشق کا تذکرہ نظر آتا ہے جس میں خطرات ہی خطرات اور مصائب ہی مصائب ہیں۔ ترکی شعراء کے کلام میں حلاج کی زندگی کے واقعات پر واقعات بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً نسیمی کے یہاں جو اپنے مرشد ممدوح کی طرح ملحدانہ عقائد کے لئے مارا گیا یعنی اس نے نماز عشق ادا کرنے کے لئے اپنے خون سے وضو کیا۔ سولہویں صدی کا شاعر پیر سلطان ابدال بھی اپنی اسیری اور تحزیر کے دوران ان پتھروں کی شکایت نہیں کرتا جو اس پر پھینکے گئے بلکہ اس پھول کی شکایت کرتا ہے جو اس کے دوست نے پھینکا تھا۔ بالکل اس طرح جس طرح منصور نے اپنے شاگرد شبلی کے پھول کی شکایت کی تھی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس نے کیا کیا ہے۔ اور منصور کا نام بیان نہ بھی کیا جائے تو بھی اکثر مشرقی شعرا اس کی حکایت شمع و پروانہ ضرور برتتے ہیں۔ جو صدہا سال سے فنا کی تمثیل ہے۔ تصنیف معروف "کتاب الطواسین" میں بڑے مختصر مگر نغز و شیریں جملوں میں اس عاشق کا حال بیان کیا گیا ہے جو وصل کو پہنچ کر کبھی اپنے ساتھیوں کے پاس واپس نہ آئے گا۔ مگر یہ نہ سمجھو لئے کہ حلاج قرون وسطیٰ میں نہ صرف شعراء کے نزدیک دکھ سہنے والی محبت کا ہیرو بن گیا تھا بلکہ دور مابعد کے تصوف میں وحدت الوجود کا نمائندہ بھی بن چکا تھا۔ چونکہ ۱۲ویں صدی میں عقیدۂ وحدت الوجود ابن عربی کے فلسفہ کے باعث درجۂ کمال کو پہنچ چکا تھا، اس لئے مسلم عارفین ان نظریوں میں بہت گہرے کھو گئے اور کلاسی صوفیاء، جنید، حلاج، وغیرہ کے مقولوں اور عقیدوں کی اس فلسفہ کے مطابق ایسی تشریح کی گئی جو حقیقتہً ان کی تعلیم میں موجود نہ تھی۔ کلاسی تصوف یہاں تک کہ حلاج نے بھی ہمیشہ یا تقریباً ہمیشہ خدا کے ماوراء ہونے ہی پر زور دیا ہے۔ اور خدا و انسان کا رشتہ خالق و مخلوق اور بعد میں عاشق و معشوق کا رشتہ قرار دیا ہے لیکن ابن عربی کے بعد حلاج کے عقائد کو بالکل بدل ڈالا گیا اور اس کی تشریح اندلس کے شیخ اکبر کے تصورات کے مطابق کی گئی جو اقبال کو قطعاً پسند نہ تھے۔ کیونکہ انہوں نے وجودی فلسفہ کے خطرناک نتائج کو بڑی وضاحت سے محسوس کر لیا تھا اور یہ سمجھ لیا تھا کہ یہ دین اسلام کی الہامی روح کے مطابق نہیں۔ اسی لئے اپنے مقالہ دربارۂ "ارتقائے مابعد الطبیعیات ایران" (۱۹۰۸ء) میں لکھا تھا:۔

"اس ہماؤ نے حلاج میں بے انتہا وجودیت کی شکل اختیار کر لی تھی اور وہ اپنشدوں کی روح میں "انا الحق" یعنی "برہمسی" پکار اٹھا۔ اس سے ہمیں معاً "زبور عجم" کے یہ اشعار یاد آتے ہیں:

دگر از شنکر و منصور کم گوئے — خدارا ہم براہِ خویشتن جوئے
بخود گم بہر تحقیق خودی شو — انا الحق گوئے و صدیق خودی شو

پس اقبال پھر حلاج کو ویدی اُپنشدوں کے اس نہایت گنوان اور پراثر شارح، شنکر سے ملاتے ہیں جو غالباً خالص ترین لامحدودیت کا سب سے بڑا نمائندہ قرار دیا گیا" کا اہم ترین فلسفی ہے۔

اس اثنا میں یعنی مقالہ اور "زبور عجم" کے مذکورہ اشعار کی تصنیف کے دوران اقبال فرانسیسی عالم، ایل۔ میسی نان کے اہم مطالعوں سے

A PASSION d' al HUSAYN IBN-MANSUR- al- HALLAJ :
MARTYRE MYSTIQUE de l' ISLAM" واقف ہو چکے تھے جس نے ۱۹۲۲ء میں اپنی ضخیم کتاب :

——— "حسین ابن منصور حلاج شہید عارف اسلام کا اندوہ نامہ" اور اس موضوع پر متعدد اور بیش بہا کتابیں شا
کرنے سے پہلے ۱۹۱۴ء میں "کتاب الطواسین" کی تدوین کی تھی۔ اقبال نے یہ کتاب ۱۹۱۸ء - ۱۹۱۹ء میں ضرور پڑھی ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے م
اسلم جیراجپوری (مرحوم) کے نام ایک خط مرقومہ ۱۷ مئی ۱۹۱۹ء میں اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ منصور کے بنیادی عقائد اب واضح ہو گئے
بھی وہ اس مشہور و معروف شہید عشق سے زیادہ ہمدردی ظاہر نہیں کرتے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اقبال نے کب حلاج کی طرف اپنا رویہ بدل
کیا۔ ہمیں یہ تبدیلی پہلی بار "جاوید نامہ" میں دکھائی دیتی ہے جس میں "کتاب الطواسین" ان پر کچھ ایسا الہامی کیف طاری کرتی ہے کہ وہ فلا
میں اپنی دلفریب طواسین رسل اختراع کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ "طواسین" سورہ ۲۸ - ۲۶ کے حروف مقطعات کا مجموعہ ہے۔
جہاں تک مسینی نان کا تعلق ہے اس نے بڑی کامیابی سے یہ ثابت کر دیا تھا کہ حلاج کے دینی عقائد میں خدا کی ماورائیت کارفرما ہے
ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ خدا اپنے فضل سے مومن کے دل میں بھی جاگزیں ہوتا ہے جبکہ وہ تزکیۂ نفس سے مصفٰی و منزہ ہو جائے۔ انسان کو اس
خلق کیا گیا ہے کہ عشق الٰہی دنیا میں ظاہر ہو۔ وہ خدا ہی کی تمثیل ہے جس نے اسے ازل سے مشتاقانہ دیکھتے دیکھتے اس طرح الٰہی اوصاف سے
کر دیا ہے کہ وہ "ہُوَ ہُوَ"، یعنی وہی بن جائے۔
یہاں یہ نکتہ اور بھی اہم ہے کہ آدم نے خدا سے ظہور نہیں کیا بلکہ وہ عدم سے پیدا کیا گیا۔ حلاج کہتا ہے یہ بات اور بھی اہم ہے کہ "د
حق عارف کی خودی کو محو نہیں کر دیتی بلکہ اسے اور بھی زیادہ کامل، مقدس اور الوہی بنا کر ایک آزاد و زندہ عضو بنا دیتی ہے"۔ کیونکہ اس کی رائے
تخلیق کا راز جب ہی سمجھا جا سکتا ہے کہ الٰہی خصوصیت خاصہ عشق یعنی تخلیقی عشق ہے جو خدا کی سرشت میں داخل ہے۔ وہی جسے مسینی نان نے
نہایت وقیع مضمون میں "خلقی شوق" قرار دیا ہے۔ یہ حلاج کا خاص انداز ہے کہ وہ اس شوق الٰہی کو "عشق" قرار دیتا ہے جس سے متحرک شوق
ہے اور سب سے صوفی اُس وقت بھی شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہاں تک کہ لفظ 'محبت' کو بھی' جو ایک سکونی تصور ہے' ۹ ویں صدی سے تمام صد
خدا اور انسان کے باہمی ربط کو ظاہر کرنے کے لئے قبول نہیں کیا تھا۔ یہ خاصۂ الٰہی جسے حلاج عشق کہتا ہے، انسان کو خدا سے قریب لانے ک
کرتا ہے اور فضل ربی کا منتہائے مقصود یہی ہے کہ انسان اس جبلی عشق ربانی میں شریک ہو۔ مگر عشق میں بے شمار مصائب لازم ہیں یعنی لوگو
جدائی، آلام، آنسو، آہیں۔ اقبال نے حلاج کے منہ سے یہ بالکل صحیح الفاظ کہلوائے ہیں کہ:

بے خلش از یستن نا زیستن   باید آتش در تہ پا زیستن!

ایسے عشق کے معنی ہیں خدا کی راہ میں تسلیم جان یا اس کی بارگاہ میں نادان لوگوں کے ہاتھوں قربانی کے طور پر پیش کیا جانا۔ اسلئے حلاج کی نہایت
دعائیں اس فریاد سے لبریز ہیں :-

اقتلونی یا ثقاتی   ان فی قتلی حیاتی
ومماتی فی حیاتی   وحیاتی فی مماتی

یہ اس قصیدہ سے ماخوذ ہے جسے سہروردی حلبی، ابن عربی اور دیگر عارفین خصوصاً رومی نے پڑھا ہے۔ اور اپنی مثنوی میں اس کا بار با
کیا ہے ÷
عشق اور اذیت ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس بارے میں ایک نہایت رقت آمیز حکایت "تذکرۃ الاولیاء" میں مذکور ہے:-
"لوگوں نے حلاج سے پوچھا: "عشق کیا ہے؟" اس نے جواب دیا: "تم اسے آج، کل اور پرسوں دیکھ لوگے۔ ایک دن اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ
جائیں گے، دوسرے دن اسے مار دیا جائے گا اور تیسرے دن ہوا اس کی خاک اُڑاتی پھرے گی"۔
"جاوید نامہ" میں طاہرہ جو شعر گا کر سناتی ہے اس سے یہ حکایت بھی یاد آتی ہے اور اُس پروانہ کی تمثیل بھی جو اپنے محبوب سے ہمکنار ہو کر بھ

میں آتا ہے

گر نہ اُٹھا روسن گیر د نصیب ‌‌‌‌ ‌ بر نگرد د زندہ از کوئے حبیب

حلاج کے سلسلہ میں جو سب سے دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے وہ "انا الحق" کا سوال ہے۔ خبر نہیں حلاج نے اپنے مرشد جنید کے سامنے یہ الفاظ بولے یا نہیں مگر اب یہ "کتاب الطواسین" کے چھٹے باب میں محفوظ ہیں۔ اس کتاب میں حلاج کے نزدیک "حق" سے مراد ذات باری کا خاصۂ تخلیق ہے یعنی حق بحیثیت خالق۔ یہ اس شخص کی پکار ہے جو محسوس کرتا ہے کہ روح ناطقہ یعنی غیر مخلوق یزدانی روح نے اس میں قلب ماہیت پیدا کر دی ہے اور اب وہ اس کی زندہ مشاہد ہے کیونکہ اس کی غیر مخلوق روح اس کے فضل سے انسان کی مخلوق روح سے متحد ہو گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ بعد میں آنے والے صوفیائے عارف شہید کے اس خطرناک ارشاد کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور اُن میں سے اکثر اپنے اپنے طور پر اس کی ذہنی باتی اس کو بھول گئے ہیں۔ بعض کی رائے میں حلاج کی ہستی عالم مستی میں محو ہو گئی اور اس کی جگہ خدا نے اس کی زبانی کلام کیا۔ غزالی جو ہمیشہ شرعی پہلو کو ملحوظ رکھتا ہے اس کو ایک دھوکا قرار دیتا ہے جس کا برسرِ عام اعلان کیا جائے تو یہ ایک خطرناک مغالطہ ذہنی بن جاتا ہے۔ یعنی ایک ایسے عاشق کا غلو جو مستی عشق سے اس قدر سرشار ہو جائے کہ وہ اپنے آپ اور اپنے محبوب میں کوئی فرق محسوس نہ کرے۔ مگر یہ وہ جبلائے باطنی بھی تو ہو سکتا ہے جو اسم الٰہی "الحق" پر غور و فکر کرنے سے مومن کے دل میں پیدا ہوتی ہے ــــــ صرف "مشکوٰۃ الانوار" میں غزالی یہ تسلیم کرتا ہے کہ ممکن ہے جلوۂ حق نے حلاج کے منہ سے یہ الفاظ نکلوا لئے ہوں۔ مگر جب وہ اس کے مقولوں اور دعاؤں کا تذکرہ کرتا ہے تو بھی شاذ و نادر حلاج کا نام لیتا ہے۔

"انا الحق" کی سب سے دلآویز تشریح شاہ عبد القادر گیلانی نے کی ہے۔ کیونکہ اس عظیم عراقی عارف نے جو استعارے استعمال کئے ہیں۔ وہ اقبال کے استعاروں سے بہت قریب ہیں۔ گو اس نے حلاج کو ولی تسلیم نہیں کیا:

"ایک دن ایک عارف کا مرغِ ہوش اس کے پیکرِ ظاہری سے اڑ کر آسمان پر جا پہنچا جہاں وہ ملائکہ کی صفیں چیر کر آگے نکل گیا۔ وہ ایک شاہین تھا جس کی آنکھوں پر "وخلق الانسان ضعیفا" کا خول چڑھا تھا۔ اسے آسمان پر کوئی شکار نہ ملا۔ اور جب اس نے اپنا شکار "رایت ربی بعینہ" دیکھا تو وہ اس حیرانی میں مبتلا ہو گیا کہ کہیں شکار اسے یہ نہ کہہ بیٹھے کہ "انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض" ــــــ وہ پھر آسمان سے نیچے آیا تا کہ وہ چیز پائے جو محیا کی تہہ کے نیچے شعلہ زن آگ سے زیادہ بیش بہا ہو۔ جب اس نے اپنی چشمِ ہوش کھولی اور اس کے جلووں کے سوا اور کچھ نہ پایا تو واپس آ گیا اور اس دنیا اور دوسری دنیا میں اپنے محبوب مطلوب کے سوا کچھ نہ پایا۔ وہ بہت خوش ہوا اور مستی میں پکار اٹھا: "انا الحق"۔ وہ ایسی نوائیں گا رہا تھا جو انسان کو نصیب نہیں اور باغِ حیات میں اس طرح زمزمہ پیرا ہوا جو اولادِ آدم کو میسر نہیں۔ اور ایسی دھن میں نغمہ سرا ہوا کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔۔۔"

اس تشریح میں "طائر" کا تصور قابلِ توجہ ہے۔ اقبال نے بھی فلکِ مشتری پر حلاج کو ایک ایسی روح قرار دیا ہے جو طیور کی طرح ہمیشہ برسرِ پرواز رہتی ہے۔ یہ حلاج کے شارح روزبہان بقلی کے اُس نہایت دلپذیر مقولے کی طرف تلمیح ہے جس میں اُس نے اپنے مرشد کو "شاہِ طائرانِ عشق" قرار دیا ہے۔ اور بال کہ ملائکہ بلکہ حق تعالیٰ بھی ذوق و شوق و آرزو کا شکار ہے۔ اقبال کی شاعری میں بار بار دکھائی دیتا ہے۔

شاہ صاحب نے جو کچھ کہا ہے، وہ "وحدت الشہود" کے نقطۂ نظر سے ہے۔ طالب کا حقیقی مقصود جمالِ حقیقی ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے "افشائے سر" کے مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ چونکہ الٰہی محبت اور وصل کے عظیم اسرار کو فاش کرنا ممنوع ہے۔ اس لئے منصور جس نے اس ممانعت کی پروا نہ کی، سزایاب ہوا۔

ابن عربی نے "انا الحق" کی تشریح تمام تر وحدت الوجود کی روشنی میں کی ہے۔ رومی نے "انا الحق" کہنے والے کو اُس لوہے سے تشبیہ دی ہے جسے آگ میں ڈالا جائے، اس سے کا رنگ آگ کے رنگ میں محو ہو جائے۔ یہ مواصلت بہ اعتبار عرض نہیں بلکہ بہ اعتبار اوصاف ہے۔ رومی مزید کہتا ہے کہ مناسب وقت پر "من" کہنا مہر کا باعث ہے، اور بے وقت پر قہر کا باعث۔ منصور کی "من" مہر بن گئی اور فرعون کی "من" قہر۔

اس شعر میں اقبال کے مسئلہ خودی سے ایک دلچسپ مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ لہٰذا حلاج کے متعلق اقبال کی مزید آراء کا مطالعہ کرنے کے لئے ہمیں ان کے چھ لیکچروں کی طرف رجوع کرنا پڑیگا۔ یہ موضوع ایک الگ بحث کا متقاضی ہے اور ہم اس پر پھر کبھی کسی اور مضمون میں بحث کریں گے۔

عشق : دمِ جبرئیل

ریاض الدین قیصر زبیری

اقبال کا فلسفہ حرکت اور زندگی کا فلسفہ ہے۔ یہ اور خودی کا اثبات ہم معنی ہیں اور خودی کی پرورش عشق کے زیرِ سایہ ہوتی ہے۔ اس لئے اقبال کے پیغام کو سمجھنے کے لئے عشق کے معنی سمجھنا لازم ہے۔

اقبال کا تصورِ عشق، اردو اور فارسی شعراء کے روایتی تصورِ عشق سے یکسر مختلف ہے۔ وہ اس عشق کی تعلیم ہرگز نہیں دیتے جس میں پڑ کر عزتِ سادات گنوا بیٹھنے کا اندیشہ ہو۔ اقبال روایتی شاعر کی طرح نالہ و فریاد نہیں کرتے، وہ عشق کا رونا نہیں روتے، وہ عشق کا ترانہ گاتے ہیں۔ ان کے نزدیک عشق وہ دھیمی دھیمی آنچ نہیں ہے جس کی تپش سے زندگی شمع ساں فنا کی طرف بڑھتی ہے۔ بلکہ وہ دہکتی ہوئی آگ ہے جس میں پڑ کر زندگی کندن کی طرح جگمگاتا ہوا روپ اختیار کر لیتی ہے اور رمزِ بقا سے آگاہی حاصل کرتی ہے۔ عشق ان کے نزدیک ارتقائے حیات کا راہ نما ہے۔ اقبال صوفیا کے اس روایتی تصورِ عشق کے سخت خلاف ہیں جس کی رو سے وصالِ محبوب اور مکمل سپردگی یا فنا ہم معنی ہو کر رہ جائیں۔ اس طرح خودی کی نفی ہوتی ہے۔ یہی تو وہ گراں بہا قوت ہے جس کی پرورش و ارتقاء حیاتِ انسانی کا اہم مقصد ہے اور جس تک زندگی نہ جانے کتنی کٹھن منزلوں سے گزر کر پہونچی ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق انسان کی خفتہ اور عظیم تخلیقی قوتوں کا محرک ہے۔

عقل و عشق، منطق و وجدان کی بحث بہت پرانی ہے یعنی محض عقلی و خشک منطقی دلائل کے ذریعہ دنیا، زندگی اور ارتقاء کے اہم مسائل کو سمجھا جاسکتا ہے یا نہیں۔ اس ضمن میں عقلی وسائل زیادہ کارگر ہیں یا وجدانی۔ اقبال کے نزدیک زندگی کے ادق اور ٹھوس مسائل کو سمجھنے کے لئے وجدان ہی ایک کارگر ذریعہ ہے محض منطق بیکار ہے۔

وہ عشق کو رہبر گردانتے ہیں لیکن یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ انہوں نے عقل کی اہمیت سے سرے سے انکار کیا ہے۔ وہ عقل اور عشق کے مابین کسی تضاد کے قائل نہیں۔ یہ دونوں دریا کے دو کنارے نہیں جو کہیں مل ہی نہ سکیں۔

راہنمائی کا کام عقل صرف ایک خاص مقام تک ہی کر سکتی ہے۔ جن مقامات پر عقل کی رسائی ممکن نہیں عشق وہاں رہ نورد ہے۔ جہاں سے کائنات کی رہ مردِ مومن یا دانائے راز کی طرف مڑتی ہے، عقل کی سرحدیں وہیں ختم ہوجاتی ہیں۔

اہلِ دنیا جو مادی سود و زیاں ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں عقل سے راہبری کا کام لیتے ہیں۔ لیکن کیا مادی جاہ و حشم ہی تمام و کمال زندگی ہے؟ ایسی زندگی جو اعلیٰ مقاصد بھول جائیں انسانیت کی معراجِ کمال نہیں ہوسکتی۔ درخشندہ فلزات کی خدائی میں مغرب نے کیا پایا؟ مشینوں کی حکومت دل کی موت ہے۔ اقبال اس زندگی کا خواب دیکھتے ہیں جو کبھی جاں ہے تو کبھی تسلیمِ جاں اور اس راہ کے سفر میں راہنمائی کا جو طریقہ عشق اختیار کرتا ہے، وہ اقبال کے نزدیک زیادہ مفید اور زیادہ موثر ہے۔ عشق کے پاس حدی حس اور اس حس کی بدولت عرفانِ حقائق کا فقدان نہیں۔ نئے نئے مسائل سامنے آتے جاتے ہیں اور ان کا حل ملتا جاتا ہے۔ نئی نئی گتھیاں اور نئی نئی الجھنیں پیش آتی ہیں اور طے ہوتی جاتی ہیں اور کاروانِ حیات عشق کی سرکردگی میں جرس کی آواز پر کان دیئے آگے بڑھتا جاتا ہے۔

عقل کی بھی دو اقسام ہیں عقل خود بیں اور عقل جہاں بیں۔ یہاں عقل سے مراد عقل خود بیں ہے جس کا انجام حیرت ہی حیرت ہے، بہت پیچیدہ مسائل کو حل کرتا نہیں اور جو صرف خود غرضی کی بناء پر تسخیرِ فطرت کرتی ہے۔ عقلِ جہاں بیں جو کائنات کی گہرائیوں میں سرایت کر کے اسے اندر سے منقلب کرتی ہے، عقل خود بیں سے بہت بلند تر درجے پر ہے اور عشق سے بہت قریب۔

عقل بہت سے مسائل طے کر سکتی ہے، بہت سے رموز کی عقدہ کشائی کر سکتی ہے۔ زندگی کے کارواں کو آگے بڑھانے میں اس کا بھی ہاتھ ہے۔ وہ زندگی کی رہ گزر میں انسان کو دیکھنے، اشیاء کی جانچ پڑتال کرنے اور ان کی ماہیت دریافت کرنے والی آنکھ عطا کرتی ہے لیکن دل کے اندر حرارت پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں، یہ کام عشق کا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جتنے فلسفہ ہائے حیات، جتنے نظامِ فکر بھی دنیا میں پنپ کر اپنے اپنے زمانے میں لاکھوں کروڑوں دلوں دماغوں کو چلا دے گئے ہیں، وہ اسی جرأتِ رندانہ کی بدولت تھے جس کا بانی عشق ہے۔ عقل "مسائلِ حیات" کو سمجھ سکتی ہے لیکن "رمزِ حیات" کو سمجھنے سے قاصر ہے۔

لسان العصر

(اقبال کا ایک ہمعصر ، ایک ہمنوا)

ثروت یاسمین

لسان العصر اکبرؔ الہ آبادی کو اقبال کا معاصر کہا جائے یا ہمنوا ، بہرحال وہ زمانی حیثیت ہی سے نہیں ذہنی اعتبار سے بھی ان کے بہت قریب تھے۔ اس قدر کہ اگر ہم ان کے افکار کا امعانِ نظر سے جائزہ لیں تو ان میں اشتراک فکر کے کتنے ہی پہلو دکھائی دیں گے ۔ بلکہ بڑی حد تک مماثلت بھی دکھائی دے گی ۔ ان کا دور ، ان کے مسئلے ایک ہی تھے۔ اور دونوں کا دل و دماغ بھی اسلامی روایات ہی میں رسا بسا ہوا تھا۔ لہٰذا ان کا ردعمل بھی یکساں ہی ہو سکتا تھا۔ خواہ ہم انداز فکر پر نظر رکھیں یا شعری وضع و مطمح نظر پر دونوں میں کافی حد تک ہم آہنگی ہی دکھائی دے گی۔

انیسویں صدی برصغیر پاک و ہند میں نشاۃ الثانیہ کا نقطہ آغاز ہے۔ اس میں مغربی اثرات کے باعث نئے نئے رجحانات پیدا ہوئے اور وہی کیفیت پیدا ہوئی جس کی طرف غالبؔ نے اشارہ کیا ہے کہ " ع کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے "۔

تہذیب مغرب میں تمام تر مادی علوم اور مادی اقدار ہی پر زور تھا۔ یورپ کی غیر معمولی صنعتی ترقی اپنے جلو میں مادی ترقیات لائی ۔ عقلیت اور سائنس کے زور نے سیاسی ، سماجی ، معاشی اور تہذیبی بساط کو الٹ کر رکھ دیا ۔ مغربی تمدن کے عناصر ہمارے سماج میں پھیل گئے ۔ انیسویں صدی کے وسط تک سائنس اور مذہب کی کشمکش شروع ہو چکی تھی اور جو مسئلہ نشاۃ الثانیہ کے بعد یورپ کے سامنے تھا کہ آیا تو سائنس مذہب سے مطابقت پیدا کرے یا سائنس اور مذہب میں سے کسی کو برتری حاصل ہو ، مشرق میں بھی پیدا ہوا ۔ اور جو کیفیت دیگر ایشیائی ممالک میں پیدا ہوئی وہی اس برصغیر میں بھی پیدا ہوئی ۔ ایک طرف مشرق کی روحانیت تھی اور دوسری طرف مغرب کی مادیت ۔ کچھ دیر تک ان کی کشمکش بڑی تندی و تیزی سے جاری رہی ۔ آخر ۱۸۵۷ء سے پہلے ہماری دینی و اصلاحی تحریکات اس ردعمل ہی کا نتیجہ تو تھیں جو تہذیب مغرب کے نقیب انگریزوں کے سیاسی ، معاشری اور تمدنی غلبہ کے خلاف پیدا ہوا تھا اور ۱۸۵۷ء کی جنگ سیاسی سے کہیں زیادہ تمدنی محرکتی ۔ اور یہی اس قضیہ کا پہلا فیصلہ بھی ثابت ہوئی ۔ اس نے حالات کا پانسہ بالکل پلٹ دیا ۔ اور اب سوال مزید حربی کشمکش کا نہیں بلکہ مغلوب فریق کی طرف سے مفاہمت کا تھا ۔ یعنی یہ کہ اس عظیم قومی اُفتاد کے پیش نظر اپنی بگڑی کو بنایا جائے ۔ کس طرح ایک ایسا لائحۂ فکر و عمل پیدا کیا جائے جو اس ذہنی و حیاتیاتی کشمکش کے بحرانی دور میں ہماری صحیح رہنمائی کر سکے اور یا ہمد گر دست و گریباں دھاروں میں پھنسی ہوئی کشتی کو سلامتی کے کنارے پر لے جائے ۔ قومی پیمانہ پر " ہراکری " تو خارج از بحث تھی ۔ ہماری طبعی سلامت روی کا اس چیلنج کو ہر طرح منفی جواب دینا محال تھا ۔ زمانہ شناس نگاہوں نے اپنا صحیح راستہ بھانپ لیا اور اس چیلنج کا برجستہ جواب دیا ۔ سرسیدؒ جس نے ڈگمگاتی ہوئی ناؤ کو تمنت پر سنبھال لیا " درمع الدار اکیف دارا " یہ وہ روش تھی جو اس نازک دور میں ہر طرح کے خطرات سے بچا کر ہمیں قومی حفظ و بقا کے راستے پر ڈال سکتی تھی ۔ سرسیدؒ وہ خضر مبارک پے تھے جو عین وقت پر علم اصلاح لے کر اٹھے ۔ انھوں نے نہ صرف حکومت بلکہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور اس کے گوناگوں پیچیدہ تقاضوں سے مفاہمت کرنے کی تلقین کی ۔ اپنی روایات کو چھوڑ کر نہیں بلکہ ان سے اعتنا کرتے ہوئے ۔ یہ درحقیقت اس بات کا ردعمل تھا کہ جنگِ آزادی نے مادی طور پر مغرب کی برتری تسلیم کرلی تھی ۔ نظام حیات کے وہ نقوش واضح ہو گئے تھے جو سو سال سے برصغیر کے اُفق زندگی پر ابھر رہے تھے ۔ اپنے ہم مذہبوں کو قدیم و جدید کی آمیزش سے ایک نیا جادۂ حیات تراشنے اور ان کو بقائے ملی کی راہ پر ڈالنے کے سلسلے میں سرسیدؒ اور ان کے رفقا کی مشترکہ کوششیں بر وقت اور برمحل اقدام تھا۔

اپنے ہم قوموں کو مغرب سے روشناس کرانے اور نئی روشنی سے مطابقت پیدا کرنے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے ۔ اگرچہ ان کے رجحان کو اپنی روایات کے منافی سمجھا گیا مگر یہ حقیقت ہے کہ اس رجحان میں ایک نئی جوت جگانے ، ایک نئی روح پھونکنے کے محرکات بھی تھے ۔ حقیقی معنوں میں حیات افروز اور ناگزیر ۔ یہ بھی مسلم ہے کہ زندگی کے ساتھ احیاء و تجدید کی ان کوششوں نے ادب و فن میں بھی قلب ماہیت پیدا کی جس سے ہمیں نئے نئے تصورات ہاتھ آئے اور جدید ادب

کی وضع قدیم ادب سے بالکل علیحدہ و ممیز دکھائی دینے لگی۔

یہ بوقلموں تہذیبی اثرات جو اس تمام دور پر مرتب ہو رہے تھے۔ اکبر کا دل و دماغ بھی ان کی آماجگاہ تھا۔ اور وہ ان سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایک جیتا جاگتا حساس، بیدار مغز انسان ان سے غیر متاثر رہ بھی کیسے سکتا ہے؟ وہ اس اصلاحی و تجدیدی دور سے متعلق تو نہ تھے جس کی سربراہی سرسید اور ان کے رفقا نے کار نے کی تھی۔ وہ تو یوں سمجھئے ہوئے کی ایک جنبش تھی جو کلائی ادھر سے اُدھر ہو گئی اور ایک طلسمی رو کے تحت سب مغرب ہی کی طرف ہو لئے۔ جب اکبر نے آنکھ کھولی تو ہر طرف سرسید اور ان کی سرگرمیوں ہی کا غلغلہ تھا جس میں 'نیچریت' کے فتووں کی گرم بازاری تھی۔ اکبر کی پرورش خالصتاً مذہبی اور روایتی ماحول میں ہوئی تھی، اس لئے جو پاس ان کو قدیم اقدار کا ہو سکتا تھا وہ شاید ہی کسی اور کو ہو سکتا۔

چونکہ سرسید کے مسلک میں بظاہر مادی رجحان غالب تھا اس لئے اکبر اوّل اوّل اس سے بہت گھبرائے۔ جیسا کہ اور خالص مذہبی لوگ بھی گھبرائے تھے اور انھوں نے سرسید پر جی بھر کر طنز کئے، زہر میں بجھے تیر و نشتر برسائے تاہم بنیادی طور پر ان میں بھی وہی اصلاحی جذبہ، وہی قوم کی لگن، وہی مذہب سے وابستگی تھی جو سرسید میں تھی۔ دونوں کا مطمح نظر ایک ہی تھا۔ قوم کو دوبارہ بام عروج پر پہنچانا، اس کو صحیح معنوں میں زندہ بنانا۔ اکبر کی شاعری میں 'شیخ و سید' کی قابل احترام اصطلاحات اس امر کی طرف اشارہ کناں ہیں کہ وہ سرسید سے متاثر تھے چنانچہ انہوں نے اس کا اعتراف بھی کیا۔—— ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا، —— اتنا ضرور ہے کہ سرسید اصلاح و تجدید کی دھن میں اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ ان کی تحریک سے بعض تخریبی اثرات بھی پیدا ہونے کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔

اکبر نے ان اثرات کا اندازہ ابھی سے لگا لیا تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ گو مادی و دنیاوی سرگرمیاں لازمۂ حیات ہیں لیکن وہ مقصود بالذات نہیں ہیں مقدم حیثیت مذہب اور روحانی اقدار ہی کو حاصل ہے جو کچھ ہو ان ہی کے تحت ہو۔ ہمیں دنیا کے شوق میں دین اور حق کو فراموش نہیں کر دینا چاہئے۔ لہٰذا جب اقبال نے بھی "خودی" کا آوازہ بلند کیا تو اکبر نے اس سے جو کچھ سمجھا اس کے خلاف ردعمل بھی تمام تر اسی موقف ہی کے تحت تھا۔ بعد میں جب یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ 'دلیل و تجزیے رائے پرستند' اور اقبال کسی مطلق العنان خودی کے قائل نہیں بلکہ اسلامی عقائد اور احکام شرعی کی پابند "مسلمان خودی" کے قائل ہیں جو زیادہ واضح الفاظ میں روح یا ایمان ہی ہے، تو انہیں اقبال میں غیریت کی بجائے اپنائیت کا عکس نظر آیا۔ اسی لئے انہوں نے بعد میں اقبال کا زور شور سے خیر مقدم کیا۔ دونوں کی آواز، دونوں کا مسلک، دونوں کا پیغام ایک ہی تھا۔ گو اس کے پیرائے مختلف تھے۔

اور پھر ان میں طبائع کا بھی تو فرق تھا۔ اقبال کی افتادِ طبع انگریزی شعراء شیلے، ورڈز ورتھ وغیرہ سے قریب تھی۔ ان کا ذوق انہی رومانوی شعراء کا ہم رنگ تھا۔ اکبر طرح تو اختیار کرنے کے باوجود غزل گو ہی رہے۔ اور پھر قدرت نے انہیں طنز کا بادشاہ بنایا تھا۔ اس صنف کے لئے جو تیکھا پن جو ہنسانے کا سلیقہ چاہئے۔ ایسا کہ وہ ہنسانے کے ساتھ ہی ساتھ رلائے بھی، وہ اکبر کو مبدء فیاض سے بدرجۂ اتم میسر آیا تھا۔ انہوں نے پرسٹلے کے الفاظ میں خالص طنز ہی کو اپنایا جس کا مقصود تفریح یا خندہ آوری نہیں بلکہ تیز و تلخ تنبیہہ و اصلاح ہے۔ ان کے اشعار کی تہہ میں ایک شدید جذبہ و مقصد ہے۔ اسی لئے ان میں یکسوئی کی بھرپور شدت ہے۔ اس میں تفنن کی کوشش سے ذہن کسی اور طرف منحرف نہیں ہوتا۔ اسی لئے شدت میں بھی کوئی فرق نہیں آتا۔ یہی اکبر کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔

اکبر نے اپنی بے پناہ تنقید سے اہل وطن کو چونکا دیا کہ دیکھنا غیروں کی تقلید کے شوق میں اپنے آپ کو نہ بھول جانا۔ مغرب سے استفادہ ضرور کرو مگر اپنے ماضی کی میراث کو فراموش نہ کرو۔ اپنا توازن برقرار رکھو۔ اگر اس وقت یہ آواز بلند نہ کی جاتی جب کہ لوگ تقلید مغرب کے شوق میں دیوانے ہو رہے تھے تو یہ بہت بڑا اندیشہ تھا کہ مشرق تمام تر مغرب ہی نہ بن جائے۔ اکبر نے اس اندھا دھند میلان کو روکنے میں ایک زبردست کردار ادا کیا اور ان کے کام کو بلاشبہ ہماری ملت کی تاریخ میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اگر اکبر اور اقبال نہ پیدا ہوئے ہوتے تو آج جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان کا وجود بھی نہ ہوتا۔

جب اکبر نے آنکھ کھولی تو برطانیہ کی عظمت کا سکہ بیٹھ چکا تھا تعلیم، تہذیب، معاشرت، سیاست، اخلاق، عادات سب پر انگریزی تمدن کی چھاپ بہت گہری اور دیرپا نظر آتی تھی۔ اور مسلمانوں کی دم توڑتی ہوئی تہذیب تقریباً مغربی تہذیب میں ضم ہو کر رہ گئی تھی۔ برصغیر پر مغرب کا جادو چل چکا تھا۔ اور اس زہر کا تریاق ملنا مشکل تھا۔ دانشِ فرنگ، اقبالِ سرکار وغیرہ ہر کہ و مہ کے ذہن پر چھا گئے تھے۔ اور وہی اہلِ فرنگ جو اہلِ ہند و پاک کی نگاہوں میں ملعون تھے، اب باعثِ خیر و برکت تصور کئے جاتے تھے۔ اکبر نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور چونکہ وہ فطرت کے پیامی تھے، گہری نظر رکھتے تھے، لہٰذا حالات کا جائزہ بہت گہرائی سے لیا۔ قدرتِ تفکر قدرت کی طرف سے عطا ہوئی تھی، اس لئے انہوں نے مغربیت کا طلسم توڑنے کے لئے کھلم کھلا آواز نہیں اٹھائی مگر دبی دبی زبان

سے سب کچھ کہہ دیا اور سیاست پر اس طرح چوٹیں کیں کہ سننے والا بھی حیران اور کہنے والا بھی شرمندہ نہ ہوا اور نہ مدبرانِ فرنگ کی طرف سے دار و گیر ہو سکے اور نہ وہ دار و رسن کا شکار ہو۔ یہ حکمتِ عملی جو انگریز کی شہرۂ آفاق حکمتِ عملی کا برجستہ جواب تھی اور فن کی کامیابی کی دلیل، ان کی دربارِ دوام میں شہرت عام کا باعث ہوئی۔ انہوں نے بلاشبہ اپنے عہد کے حالات کی طرف اعتنا کیا، اس پر نہایت پُرمغز اور برمحل تبصرہ کیا۔ اس لئے وہ حقیقتاً "لسان العصر" تھے لیکن ان کی حیثیت اس سے بلند تر بھی تھی۔ اُن کا تبصرہ، ان کی تنقیح بنیادی تھی۔ اس کا براہِ راست قوم کی تمام زندگی، اس کے ماضی، اس کے حال، اس کے مستقبل سے تعلق تھا۔ انہوں نے دوامی اور آفاقی اقدار کو ملحوظ رکھا۔ وہ ایک طنز گو سے زیادہ سنجیدہ مفکر، بلند نظر حکیم، ایک محرمِ رازِ صوفی اور نباضِ فطرت تھے۔ وہ اپنے زمانہ کے لئے نہیں تمام زمانوں کے لئے تھے۔ اور یہ تمام باتیں انہیں اقبال کی طرح "غیرفانیوں" کے زمرہ میں شامل کرتی ہیں۔ اس لئے خواہ ان کے طنزیہ نشتر آج وہ کام نہ کرتے ہوں جو کسی زمانہ میں کیا کرتے تھے، خواہ ان کی شاعری میں ذاتی حیثیت سے وہ کیف نظر نہ آئے جس سے کبھی اربابِ شوق و آرزو پر وجد طاری ہوا کرتا تھا، پھر بھی ان کا شمار ہمیشہ ہمیشہ اُن برگزیدہ ہستیوں میں رہے گا جنھوں نے فکر و فن اور تاریخ و تہذیب کے سرمایہ میں معتدبہ اضافہ کیا۔ اور اس سے بھی بڑھکر توسنِ حیات کو مہمیز کیا ہے۔

★

فیضِ دوام

(اقبال کی خدمت میں)

شیدا گجراتی

تری نوا نے ہمیں اک نیا چمن بخشا
گلوں کو عظمتِ رفتہ کا پیرہن بخشا

چمن کو نکہتِ نسرین و یاسمن بخشی
غزالِ دشتِ محبت کو اک ختن بخشا

گلوں کو رنگ، بہاروں کو تازگی بخشی
دلوں کو شعلۂ احساسِ روح و تن بخشا

بھٹک رہا تھا دھندلکوں میں کاروانِ حیات
مسافرانِ محبت کو اک وطن بخشا

دلوں کو تو نے عطا کی یقین کی تابانی
مٹے ہوؤں کو جوانی کا بانکپن بخشا

شکوہ و سطوتِ پرویز سر پٹکتی رہی
دلوں کو ولولۂ عزم کوہکن بخشا

گدازِ عشق سے محروم ہو چلا تھا حرم
پھر اس کو عظمتِ اسلاف کا چلن بخشا

خیال و فکر سے عاری تھے انجمن والے
خیال و فکر کو احساسِ انجمن بخشا

بہائے دولتِ پرویز کے عوض تو نے
ہم اہلِ درد کو گنجینۂ سخن بخشا

رقیبِ سروساماں!

جمیل نقوی

یہ چمکتے ہوئے تارے یہ فلک سیر نجوم
رقص کرتے ہیں خلاؤں میں نہ جانے کب سے
آسمانوں کی گھنی وسعتیں تھک جاتی ہیں
مجھ کو محسوس یہ ہوتا ہے طلوعِ شب سے

رات ڈھلتی ہے تو احساسِ زیاں ہوتا ہے
غمِ فردا غمِ ماضی پہ گراں ہوتا ہے
صبحِ کاذب کے سحر خیز دھندلکوں کا طلسم
سر پہ چھایا ہوا آہوں کا دھواں ہوتا ہے
لب خاموش پہ ہو لاکھ تبسم رقصاں
شب کا افسانہ نگاہوں سے عیاں ہوتا ہے

راس آجائے اگر کام و دہن کی تلخی
یہ وفائیں، یہ جفائیں، بخدا کچھ نہ رہے
پختہ ہوجائے اگر ذوقِ نظر، ذوقِ جمال
حسن مغرور بجز حسنِ ادا کچھ نہ رہے
ہر طرف کچھ نہ نظر آئے بجز خیمۂ گل
ایک گلرنگ تخیل کے سوا کچھ نہ رہے

عشق گر خاصۂ فطرت انسانی ہے
تو بہر رنگ رقیبِ سروساماں کیوں ہو
"بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل"
جو تری بزم سے نکلے وہ پریشاں کیوں ہو

دلِ مجبور کہ ہے حسن کے جلووں کا امیں
حسنِ برہم کے تصور سے گریزاں کیوں ہو

لاکھ، جذبات کے ابرو پہ شکن ہو لیکن
عشقِ خوددار سنورتا ہی چلا جاتا ہے
گردشِ دہر کے گلخن میں جنوں کا کندن
جتنا تپتا ہے نکھرتا ہی چلا جاتا ہے
دل میں قائم ہے اگر ضبط تمنا کا نظام
غم کا طوفان اترتا ہی چلا جاتا ہے

زندگی صرف تمناؤں کا جھولا ہی نہیں
رقصِ پرویں بھی ہے اور گردشِ ایام بھی ہے
زندگی کارگہِ دہر کا آئینہ ہے
روزِ روشن بھی، سلگتی ہوئی اک شام بھی ہے
زندگی ایک حقیقت بھی ہے افسانہ بھی ہے
زندگی زہر بھی ہے بادۂ گلفام بھی ہے

میرے سینہ میں بھی پنہاں ہے دھڑکتا ہوا دل
قربِ محبوب کی دولت بھی ملی ہے مجھ کو
ستم و جور کے نشتر بھی چبھے ہیں دل میں
حسن سرکش سے محبت بھی ملی ہے مجھ کو
گلشنِ حسن سے کبھی پھول بھی چنے ہیں میں نے
غم کے کانٹوں سے اذیت بھی ملی ہے مجھ کو

میں کہ اک شاعرِ وارفتہ و آشفتہ مزاج
رسم و راہِ چمنِ دہر سے بیگانہ نہیں
لاکھ دل شدتِ احساس سے بیتاب سہی
رنگ و نیرنگِ تصور کا جلو خانہ نہیں
آپ کے حسنِ جنوں خیز کے جلووں کی قسم
آپ کہتے ہیں کہ دیوانہ ہوں، دیوانہ نہیں

★

طلسمِ خواب

شہاب رفعت

میں راوی کے کنارے دھیرے دھیرے
اکیلا ناؤ کھیتا جا رہا تھا
شفق کی دھیمی دھیمی جھلملاتی
سنہری ارغوانی روشنی گھولی ہوئی لالی
دیے کی بجھتی بجھتی لو!
خاریں ہلکا ہلکا سرخ پانی، سحر کا پھونکا ہوا سا
بہکی لہروں کے میٹھے میٹھے ہلکے کمناتے زمزمے
اک بہکی بہکی راگنی جیسے
کوئی سادھو جو پہنے ڈھیلا ڈھالا گیروا چولا
ہَون میں ہولے ہولے میٹھے میٹھے منتر گاتا ہو
"ہری ہرادم ادم" اس کے دہن سے اس طرح نکلیں
کہ ان سے داسیوں کی آتما پر کیف چھا جائے
وہ کشتی ڈولتی، اک بلبلہ سا- تیرتا جادو!
میں کھیتا جا رہا تھا ناؤ، کھیتا ہی گیا، جیسے
میں خود بھی ناؤ تھا، بہتی ہوئی کشتی
جو آپ ہی آپ کھنچتی جا رہی تھی!
لہروں لہروں، روح سیلانی
یونہی چلتی گئی چلتی گئی چلتی گئی کشتی
نظر آتے تھے پل کے بھاری بھرکم پیلتن پائے
کسی جادوگر مشاق کی بیگاریں جیسے
اٹھا رکھا ہو اک بارِ گراں جنات نے سر پر
چلی آتی تھیں یوں جنگل کی جانب دور سے کھنچ کر
قطاریں ہی قطاریں دم بخود خاموش کوّوں کی
کہ جیسے سوئے مقناطیس کھنچ کھنچ کر چلے آئیں
ہزاراں در ہزاراں ناتواں فولاد کے ذرّے
نہیں، جس طرح آدم خور پودوں کی طرف آئیں
سیہ قسمت پرندے، آدمی اُس برِاعظم میں
جسے ہیئت شناسانِ جہاں "تاریک" کہتے ہیں
چلی آتی تھی ایسے ریل بھی یوں اونگھتی جیسے
کوئی افیون کی پینک کا مارا جھومتا آئے
پڑے جنگل میں سوکھے سوکھے پیڑوں کے سڑے ٹہنے
ہوا میں جیسے بھوتوں نے ہوں اپنے ہاتھ پھیلائے
وہ لمبے لمبے کالے کالے بڑھتے رینگتے سائے!
دمادم پھیلتے چمکیلے ذرّے حلقہ در حلقہ
مٹکتے دیدے، جگنو کی طرح، جیسے خلاؤں کے
دریچے سے ہیولے ہی ہیولے جھانکتے جائیں
ہوا کے پنکھ کا سرّاٹا، سنّاٹوں کو تھرّاتا!
چھپک پانی کی، چپّو چھپچھپاتے، ہلکی پھلکی سرخ پتواریں
ٹپکتے، ڈوبتے سورج کی پتلی پھانک سی رنگیں
ہوا کا پنکھ! اس کی پھڑپھڑاہٹ، ہلکی ہلکی
کمناہٹ - ہشت! یہ سرگوشیاں پیہم!
مِرے گھڑیال کا پنجر- یہ ساحل ریتلا چپٹا
یہ ٹوٹا پھوٹا ڈھانچہ، ہو بہو بجلی کے کھمبوں کا
یہ رونق ریل پیل اور سیٹیاں- اور گیت ملّاحی
ارے یہ گھاٹ!
ابھی تو ناؤ بہتی جا رہی تھی دور اُس بن میں!

کوٹ ڈیجی

اللہ بخش راجپوت

گزشتہ پینتیس برس میں پاکستان کے زمانۂ ماقبل تاریخ کے سلسلہ میں ایسی دریافتیں ہوئی ہیں جو غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۲۴ء سے پہلے اس برصغیر کی تاریخ ایک دم یوں شروع ہو جاتی تھی کہ آریا لوگوں کا سیلاب ہوا، وہ مغربی پاکستان میں در آئے اور یہاں کے وحشی لوگوں کو جو نہ دین دھرم جانتے تھے نہ قاعدہ قانون، باہر نکال کر ان کی جگہ خود لے لی۔ یہ نظریہ کہ آریا ہی اس ملک بلکہ تمام برصغیر میں تہذیب و تمدن کی روشنی لے کر آئے، مدتوں رائج رہا۔ یہاں تک کہ موجودہ صدی کی دوسری دہائی کے اوائل میں مغربی پاکستان میں وادیٔ سندھ کی تہذیب کے معرکہ آرا انکشافات نے صورتِ حالات بدل ڈالی۔

سابقہ صوبۂ پنجاب کے ایک شہر منٹگمری کے نزدیک ہڑپا اور سابقہ سندھ کے ایک ضلع لاڑکانہ میں موہن جو دڑو کے اہم مقامات پر جو کھدائیاں ہوئیں، اُن سے ایک نہایت ترقی یافتہ تہذیب کا سراغ ملا جو کوئی ایک ہزار میل لمبے علاقہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے برصغیر پاک و ہند کے زمانۂ ماقبل تاریخ کا ایک اور ہی تصور پیدا کر دیا۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے یہ دو مرکز دریافت ہونے کے بعد جو زمانہ گزرا اس میں دریائے سندھ کے کنارے کتنے ہی اور مقامات مثلاً چنہو دڑو، شاہ جو دڑو، لوہم جو دڑو، علی مراد، غازی شاہ، گورندی، ڈھل، امری، کرچت، تھانہ بولا خان، اللہ دینو، کوٹاسر اور ڈیجی جی ٹکری دریافت ہوئے جو اسی عہد سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس کے بعد ہڑپا اور موہن جو دڑو میں وسیع پیمانہ پر کھدائیاں ہوئیں جن سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ ایک حد تک وادیٔ سندھ کی تہذیب عراق کی تہذیب کی معاصر ہے جس کا زمانۂ فروغ ۲۳۰۰ سے ۲۵۰۰ ق م تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر کے اردگرد دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کی اونچی اونچی دفاعی فصیلیں اور بھٹی میں پکی ہوئی اینٹوں سے بنے ہوئے رہائشی مکانات، پبلک ہال اور دیگر عمارات تھیں جو بڑی بڑی کشادہ سڑکوں کی دونوں طرف بنی ہوئی تھیں۔ اور یہ سڑکیں ایک بہت عمدہ منصوبے کے مطابق بنائی گئی تھیں۔ یہاں کی شہری زندگی کا ایک غیر معمولی پہلو بڑے بڑے پبلک تالاب یا حوض تھے جن کے اردگرد اینٹوں کی سیڑھیاں بنی تھیں اور ساتھ ہی غسل خانوں کی لمبی لمبی قطاریں تھیں جن کے بہت خوش اسلوبی سے بنے ہوئے چہ بچے تھے اور ڈھکی ہوئی بدروئیں تھیں۔

ان مقامات سے جو چیزیں ملی ہیں ان کی کیفیت یہ ہے: کانسی اور پیتل کے ہتھیار مثلاً کلہاڑیاں، خنجر اور نیزے۔ ہاتھی دانت، منکوں، گھونگوں اور ہڈی سے بنے ہوئے زیورات۔ سونے چاندی کے جڑاؤ گہنے بڑی کاریگری سے بنے ہوئے۔ پیتل کے برتن، سوت اور اون۔ ابرق اور مختلف رنگوں کی مٹی سے بنی ہوئی بے شمار طرح طرح کی مہریں جن پر مختلف جانوروں مثلاً بیل، ہاتھی، ہرن وغیرہ کے نقوش کندہ ہیں اور ساتھ ہی ایک ایسے خط میں کچھ لکھا ہوا ہے جسے ماہرین ابھی تک پڑھ نہیں سکے۔ اس تہذیب اور اُن تہذیبوں کی تاریخ میں جو مصر و عراق کے معاصر شہروں میں تھیں، بعض حیثیتوں سے نمایاں فرق ہے۔ چونکہ وادیٔ سندھ کی تہذیب جیسا کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے، اور ملکوں سے بہت دور بالکل الگ تھلگ نشوونما پاتی رہی۔ اس لئے اس کی تاریخ تمدن میں کوئی حادثہ یا اچانک انقلابات نظر نہیں آتے۔ کھدائی کرنے پر اس علاقہ سے جو ہتھیار، زیورات اور ظروف ملے ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وادیٔ سندھ کے باشندے صدہا سال پیتل کے پھل کی بڑی پرانی وضع کی چپٹی کلہاڑی استعمال کرتے رہے مگر ظروف سے معلوم ہوا ہے کہ اندازاً پانچ سو سال سے لے کر آٹھ سو سال کے عرصہ میں جب کہ یہ تہذیب قائم رہی، اس کی ثقافت میں یقیناً تدریجی نشوونما ہوئی۔ اس تہذیب کے ابتدائی نمائندوں نے جو ظروف بنائے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بنانے کا کوئی سکہ بند اسلوب نہ تھا۔ ان مقامات کی تمام سطحوں سے جو نمونے دستیاب ہوئے ہیں ان سے مٹکوں، ہنڈیوں، تھالیوں، طباقوں اور گلاسوں کے عام کھپت کے لئے وسیع پیمانہ پر بنائے جانے کی شہادت ملتی ہے۔ ان کی وضع بتدریج یکساں ہوتی گئی۔ نسبتاً بعد کے زمانہ میں بالائی سطحوں سے جو ظروف دستیاب ہوئے وہ گھٹیا، موٹے موٹے اور بھدے بھدے ہیں۔

جو تبدیلیاں موہن جو دڑو اور ہڑپا کی ظروف سازی کے سلسلہ میں نظر آتی ہیں وہی ان کے فن تعمیر اور شہری زندگی میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ فن تعمیر کا سب سے پہلا

کوٹ ڈیجی
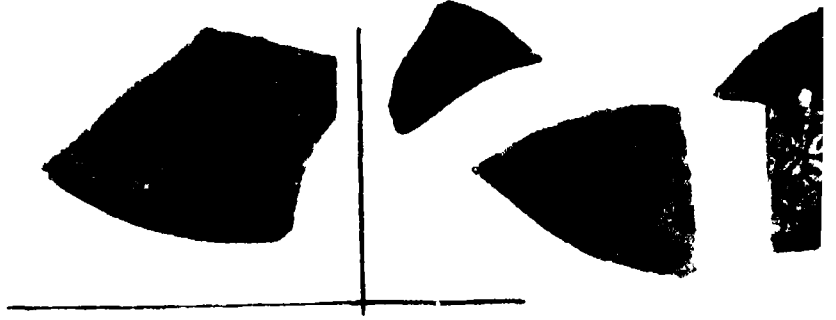
شکستہ ظروف کے ٹکڑے

منقش مٹکا

صنعت کاری کے مختلف نمونے (ہڑپا کے آباد کاروں کا دور)
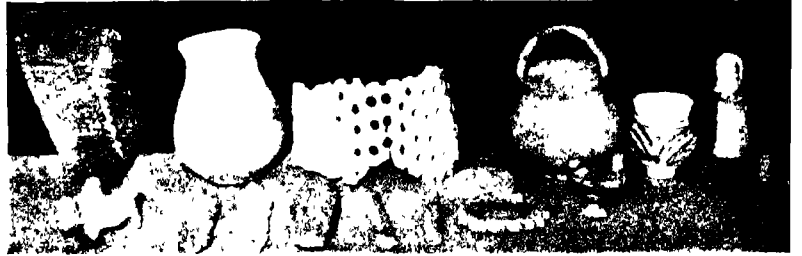
کوٹ ڈیجی کی مختلف سطحوں سے برآمد شدہ ظروف
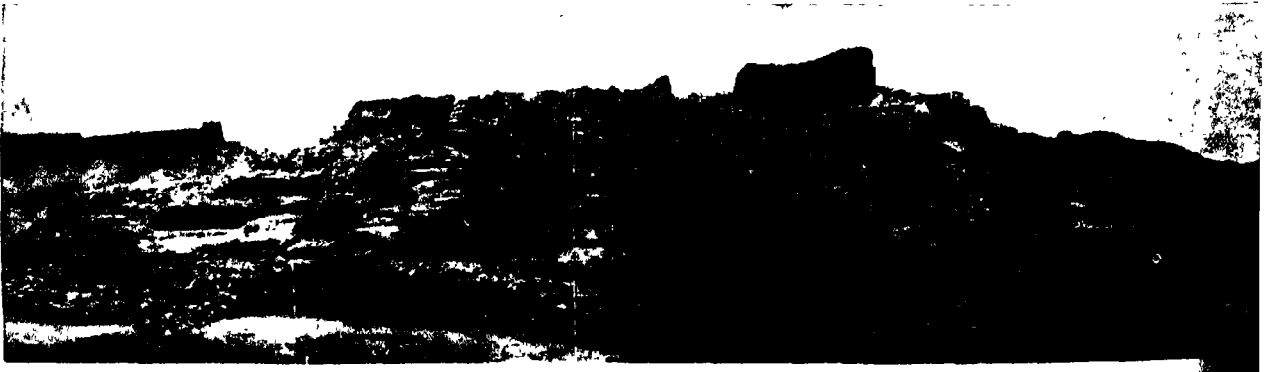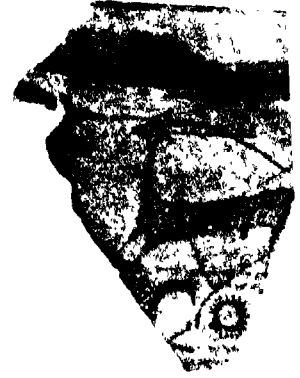
کھدائی کے بعد کا منظر

کوٹ ڈیجی کا منظر اور قلعہ

کوٹ ڈیجی۔ ۲

دھبوں [illegible]
خوبصورت [illegible] ہے

برتنوں کے نقش آرائشی نمونے

مٹی کی جالی

گھڑے پر نقش و نگار

کھدائیوں کی مختلف تہیں

نمونہ دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کی بنی ہوئی قلعہ کی فصیل ہے جس کے بعد زیادہ ترقی یافتہ فن کے نمونے دکھائی دیتے ہیں۔ یعنی خود قلعہ، پبلک عمارات اور شہر جس کی خاکہ بندی بڑے اہتمام و سلیقہ سے کی گئی ہے۔ یہ سب کام بھٹی میں پکی ہوئی اینٹوں ہی سے کئے گئے ہیں۔ آخر میں جس طرح ظروف سازی کا فن اور معیار گر گیا۔ اسی طرح عمارت سازی کی خوبی اور معیار میں بھی فرق آگیا۔ جیسا کہ اُن ادنیٰ عمارتوں سے ظاہر ہے جو قلعہ کے کھنڈرات پر بنائی گئی ہیں۔ غرض یہ ہے وادیٔ سندھ کی تہذیب کی مختصر کہانی جس کا پتہ موئن جودڑو اور ہڑپا کے مقامات پر مسلسل تیس سال کی پُرمشقت کھدائی اور تحقیق سے چلتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دریا کے کنارے پر واقع نہایت مطمئن اور بالکل الگ تھلگ آبادی کا فضائی، اقتصادی اور سیاسی انحطاط ایک قدرتی اضمحلال کا نتیجہ تھا جو بڑھتے بڑھتے آریاؤں کے حملے سے جا ملا۔ آریاؤں کے دل بادل آئے اور اُن کی بے دریغ تاخت و تاراج نے ۱۵۰۰ سے ۱۳۰۰ ق م کے درمیان کسی وقت اِس تہذیب کا خاتمہ کر دیا۔

یہ بے نظیر اور حیرت انگیز ماقبل آریائی تہذیب جس نے فنی مہارت اور صناعی میں اس قدر اعلیٰ درجہ پیدا کیا تھا اور جس کا ایک کافی ترقی یافتہ رسم الخط بھی تھا، ماہرین آثار قدیمہ اور اہل تاریخ میں ایک چوتھائی صدی سے زیادہ دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ ان لوگوں کی اصل اور ان کا رسم الخط بہت ہی بحث انگیز موضوع رہا ہے۔ یہاں کے رسم الخط کے بارہ میں کتنے ہی دلچسپ نظریئے پیش کئے گئے ہیں مگر زبان تو کیا اس کی ابجد کے بارہ میں بھی کوئی عالم کسی دوسرے عالم سے اتفاق نہیں کر سکا۔ اسی طرح اس کی تہذیب کا سراغ مختلف بیرونی اثرات میں لگایا گیا ہے یا مقامی اسباب کو اس کا ذمہ دار گردانا گیا ہے۔ گو اس سلسلہ میں کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔ چونکہ موئن جودڑو کی نچلی تہوں میں زمین سیلی ہے۔ اس لئے وہاں گہری کھدائی ممکن نہ تھی۔ اس وجہ سے اس تہذیب کے ارتقائی مدارج کا پتہ نہ چل سکا اور ان کے متعلق قیاس آرائی کا میدان کھلا رہا۔ مگر حال ہی میں سندھ کے اس پار موئن جودڑو کے مشرق میں کوئی ۳۰ میل دُور ڈیجی جی ٹکری یا کوٹ ڈیجی کے مقام پر جو سرسری کھدائی ہوئی ہے اس سے تاریخ میں پہلی بار اس عظیم الشان تہذیب کے ابتدائی مرحلوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ہڑپا کے ظروف پر جو گہری سرخ چکنی مٹی کی پتلی تہہ پائی جاتی ہے، یہاں کے ظروف میں ابھی ٹھیک طرح ترقی پذیر نہیں ہوئی تاہم سرخ زمین پر سیاہ آرائشی نقوش بالکل واضح ہیں۔ اس قسم کے پیچیدہ مگر دلچسپ نقوش جیسے ہڑپا اور موئن جودڑو کے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے دائرے اور پیپل کا پتہ بالائی سطحوں میں موجود نہیں۔ ان کی بجائے ہرن اور مور کے نقوش ہیں۔ یہ دلکش طرحوں اور شکلوں کے بڑی گھٹی ہوئی لیسی کے ظروف جو چرخ سے بنائے جاتے تھے۔ رنگ میں گلابی سے لیکر سرخ تک ہیں۔ آرائش زیادہ تر ظروف کے گلوں پر چوڑی چوڑی سرخ بادامی اور خاکی رنگ کی پٹیوں پر مشتمل ہے۔ اور باقی حصہ پر پھلی کے چھلکوں کے سیاہ رنگ میں طرح طرح کے پیچیدہ لچھے دار ڈیزائن اور لہریا دھاریاں ہیں۔ نیز کچھ سیاہ و سفید پیچیدہ نقوش بھی جن میں ایک سینگوں والی دیوی کی مورت پیش کی گئی ہے۔ یہ دوسری قسم کے نقوش برصغیر کی قدیم ظروف سازی میں اور کہیں نظر نہیں آتے۔ اور خاصے ترقی یافتہ معلوم ہوتے ہیں۔ مختلف رنگوں کی چوڑی چوڑی پٹیوں کے علاوہ دیگر آرائشی نقوش باریک اُفقی خطوط پر مشتمل ہیں جو کبھی ایک کبھی زیادہ پھول اور لہروں سے ملے جلے نظر آتے ہیں۔

کوٹ ڈیجی اور ہڑپا و موئن جودڑو کے ظروف میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ کوٹ ڈیجی کے ظروف زیادہ ہلکے پھلکے اور پتلے پتلے ہیں اور دوسرے زیادہ دَل دار اور بھاری بھرکم۔ آرائشی اشکال میں بھی فرق اس قدر نمایاں ہے کہ دونوں کا بنیادی فرق بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ دونوں میں رنگوں کی ترتیب کا الگ الگ انداز، نرالی وضع اور منفرد آرائشی اسلوب۔ ان ساری باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کوٹ ڈیجی کے ظروف ایک ایسے تمدن کی نشانی ہیں جو ہڑپا اور موئن جودڑو کے تمدن سے پہلے کا تمدن بھی ہے اور اس سے الگ بھی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کوٹ ڈیجی، موئن جودڑو کے تقریباً بالمقابل دریا کی دوسری طرف واقع ہے۔ اس لئے یہ بہر طور اس وادی ہی کی پیداوار ہے مگر اس جگہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں گہری کھدائی کرنے سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہڑپا اور موئن جودڑو تمدن کے ابتدائی نمائندے تقریباً فی الفور ہی کوٹ ڈیجی کے ان کھنڈرات پر آباد ہو گئے تھے۔ جو یہاں کی زیریں سطح پر آباد اصلی باشندوں نے اپنے پیچھے چھوڑے تھے۔ اس سے پہلے یہ بات وادیٔ سندھ میں موئن جودڑو، ہڑپا یا کسی اور جگہ پر زمین کی نچلی سطحیں سیلی ہونے کے باعث ثابت نہیں کیا جا سکا تھا۔

ڈاکٹر ایف۔ اے خان، جنھوں نے وادیٔ سندھ کی تہذیب کے شہرۂ آفاق ماہرین آثار قدیمہ، سرجان مارشل، وی گارڈن چائیلڈ اور سر مارٹیمر وہیلر سے آثار کاری میں تربیت حاصل کی تھی، کے زیر نگرانی کوٹ ڈیجی پر جو خفیف سی کھدائی ہوئی ہے اس سے اس امر کی کافی شہادت بہم پہنچی ہے کہ یہاں کے اصلی باشندوں

کا ایک اپنا بہت ترقی یافتہ تمدن تھا جس سے ہڑپا اور موئن جودڑو والوں نے بعض فنی اور دیگر تصورات حاصل کئے۔ ان میں شہر کی خاکہ بندی، قلعہ بندی اور غالباً مذہبی شعائر اور عقائد بھی شامل تھے۔

موئن جودڑو کی طرح کوٹ ڈیجی میں بھی شہر کے دو نمایاں حصے ہیں : بالائی اور زیریں۔ جن میں سے دوسرے حصے میں ایک بھاری بھرکم قلعہ تعمیر کیا گیا ہے۔ کوٹ ڈیجی کے بھی دو واضح حصے ہیں : ایک ۵۰۰ فٹ لمبا، ۳۰۰ فٹ چوڑا اور ۴۵ فٹ اونچا قلعہ ہے اور دوسرا خود شہر۔ قلعہ کی فصیل کافی اونچی اور چوڑی ہے۔ یہ ایک دریا برآمد زمین کے نیچے کی چٹان پر بنایا گیا ہے۔ نیچے بنیاد میں بغیر مسالے کے پتھر جڑے ہیں، اور اوپر کی عمارت میں کچی اینٹ اور گارے کی چنائی ہے۔ ہڑپا اور موئن جودڑو کی فصیلوں کے حفاظتی پشتے بھی کچی اینٹوں اور گارے سے بنے ہیں۔ اور ان کے باہر کی طرف بھٹی میں پکی ہوئی اینٹوں کی تہہ جمی ہے۔

کوٹ ڈیجی میں بھی فصیل کو مضبوط کرنے کے لئے باقاعدہ وقفوں کے بعد برج بنائے گئے ہیں۔ ویسے ہی جیسے بعد میں ہڑپا میں بنائے گئے۔ قلعہ کا استعمال جیسا کہ ہم ہڑپا اور موئن جودڑو میں دیکھ چکے ہیں، کوٹ ڈیجی سے ملتا جلتا ہے۔ یہ حکمراں طبقہ کا دفتر بھی تھا اور اس کی رہائش گاہ بھی۔ پھر کوٹ ڈیجی میں بھی ترقی یافتہ اور خوشحال معاشرہ کے باعث وہی جما جمایا نقشہ نظر آتا ہے۔ قلعہ کے بالائی درجوں میں بڑے کھلے کھلے کمرے دکھائی دیتے ہیں۔ جن کی بنیادیں پتھر کی ہیں اور بالائی عمارت کچی اینٹوں کی۔ کبھی اینٹوں کے فرش، دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں کی دیواریں اور چٹائی کی چھتیں جن پر مٹی گارے سے پلستر کیا گیا ہے۔ یہ ہیں شہری عمارات کی نمایاں خصوصیات۔

مٹی کے برتنوں اور طباقوں کے علاوہ غلہ جمع کرنے کی بڑی بڑی کوٹھیاں، ماں دیویوں اور جانوروں کی پختہ مٹی کی مورتیوں کے علاوہ کھیلنے کی گولیاں اور گیند، اور پختہ مٹی و پتھر کی بنی ہوئی چوڑیاں اور منکے بھی ملے ہیں۔ اسی طرح پختہ مٹی کی بنی ہوئی ایک بیل کی مورتی بھی ملی ہے۔ بیل کا ڈیل ڈول خوب ہے۔ اور سینگ چھوٹے نوکدار۔ اس کا انداز ان مورتیوں سے بہت مختلف ہے جو موئن جودڑو، ہڑپا اور بلوچستان سے ملے ہیں۔ اس کے برعکس یہ اس بیل سے ملتا ہے جس کا نقش جنوب مغربی ایران کے قدیم شہر شوش کے سرخ رنگ کے ظروف (۲۸۰۰ - ۲۷۰۰ ق م) پر دکھائی دیتا ہے۔ چوڑیاں سادہ بھی ہیں اور مٹی اور گھونگوں پر کاڑھی ہوئی بھی۔ لیکن منکوں میں کڑھے ہوئے نقوش ہیں اور گولیاں پختہ مٹی سے بنی ہوئی اور سڈول ہیں۔ کوٹ ڈیجی سے پنڈول کی نمونے کی روٹیاں اور تکلوں سے ملتی جلتی سویاں بھی کافی تعداد میں ملی ہیں۔

ان کے علاوہ پتھروں کا اندرونی حصہ اور پرت بھی ملے ہیں۔ ان سے مختلف چیزوں کے پھل، کھرچنے کے آلات، تیروں کی انیاں اور درانتیاں کاٹ کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ یہیں پتے کی شکل کے بڑی صفائی سے بنے ہوئے تیروں کے نگین پھل بھی ملے ہیں جو قبل ازیں بلوچستان اور سندھ سے ملے تھے لیکن وادئ سندھ سے باہر برصغیر میں اور کہیں نہیں ملے تھے۔ پتھر کے ان اوزاروں اور تبروں کے پھلوں کے ساتھ کانسی کے پھل بھی ملے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوٹ ڈیجی کا تمدن حجری انقلاب کے فوراً ہی بعد نمو پذیر ہوا۔ اور اس کا ظروف سازی سے ماقبل، نیز ابتدائی حجری دور کہیں اور بسر ہوا۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے کوٹ ڈیجی کے لوگ یہاں اس وقت آباد ہوئے جب ان کا فن ظروف سازی اعلیٰ پیمانہ پر ترقی کر چکا تھا اور وہ اس جگہ کافی عرصہ مقیم رہے جیسا کہ اوپر تلے آبادی کی گیارہ تہوں سے نظر آتا ہے۔ اُن متواتر گیارہ آبادیوں کو کم از کم ۵-۶ سو سال لگے ہوں گے جیسا کہ ہڑپا اور موئن جودڑو (جس کی تاریخ اب تقریباً ۲۵۰۰ ق-م مقرر کی گئی ہے)، کی تہوں کا اندازہ ۵-۶ سو سال کیا گیا ہے۔ اس اندازے کے مطابق ہم کہہ سکتے ہیں کہ کوٹ ڈیجی کے اصلی باشندے یہاں ۳۰۰ ق-م کے لگ بھگ آئے ہونگے اور چھ سات سو سال رہے ہوں گے۔ یہاں تک کہ ہڑپا، موئن جودڑو والوں نے ان کی جگہ لے لی۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مذکورہ بالا گیارہ متواتر تہوں کے سب سے اوپر جلی ہوئی چیزوں کی ایک دبیز تہہ جمی ہوئی ہے اور یہ تہہ اس تمام علاقے میں موجود ہے جس میں کھدائی کی گئی ہے۔ راکھ کی یہ دبیز تہہ کسی اتفاقی آگ کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ کسی دشمن کی خوفناک آتش زدگی کا نتیجہ ہے جس نے کوٹ ڈیجی کی ساری آبادی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا اور ہڑپا اور موئن جودڑو کے نوآبادکاروں کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

اس طرح جہاں کوٹ ڈیجی کی کھدائی سے تاریخ کا سلسلہ موئن جودڑو کی تہذیب کے ابتدائی سلسلوں سے براہ راست مل جاتا ہے۔ وہاں پاکستان کی قدیم تاریخ میں، جس حد تک ہم اسے جانتے تھے، ۷۰۰ سال کا اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کی قدامت ۲۳۰۰ ق-م سے ۳۰۰۰ ق۔م تک پہنچ جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ اس سے ایک اور بڑا ترقی یافتہ تمدن بھی آشکار ہوا ہے جو پاکستان کی اس قدیم ترین تہذیب سے جس کا ہمیں تا حال علم تھا، پہلے موجود تھا۔ بہر صورت حال

(باقی صفحہ ۵۵ پر)
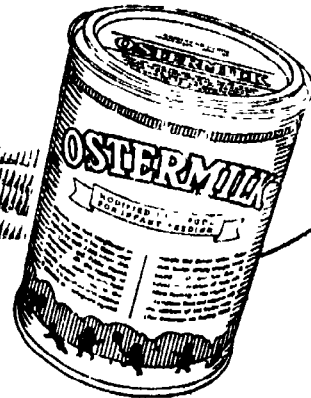
سیدھی پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے ننھے بچہ کو
یہ خالص دودھ دیجئے
OSTERMILK
جو مائیں اپنے شیر خوار بچوں کو ضرورت بھر یا بالکل ہی چھاتی کا دودھ نہ پلا سکتی ہوں وہ آسٹر ملک پر پورا بھروسہ کر سکتی ہیں۔ یہ بالکل خالص، قوت بخش اور نہایت عمدہ دودھ ہے جسکو اس طرح سے بنایا جاتا ہے کہ بچوں کے ہاضمہ کے موافق ہو۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ آپ اپنے بچے کی نشوونما سیدھی پیٹھ اور بازوؤں کی مضبوطی کے لئے آسٹر ملک پر پورا اعتماد کر سکتی ہیں۔ یہ خاص کر پاکستان میں شیر خوار بچوں کے لئے بیحد موزوں ہے۔
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
بچہ کی دودھ پینے والی بوتل کو صاف اور جراثیم سے پاک رکھنے کے لئے ایک برتن میں ٹھنڈا پانی لیجئے اسمیں خالی بوتل ڈال کر اتنا گرم کیجئے کہ اُبلنے لگے۔ پھر بوتل نکال لیجئے لیکن اُس کے اندرونی حصہ کو صاف کرتے وقت خشک نہ کیجئے۔
آسٹر ملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ
R 60
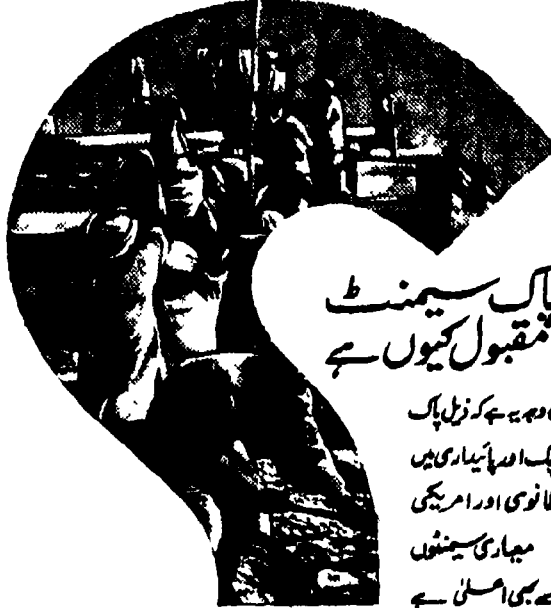
ذیل پاک سیمنٹ
اتنا مقبول کیوں ہے
اس کی وجہ یہ ہے کہ ذیل پاک
سیمنٹ لچک اور پائیداری میں
برطانوی اور امریکی
معیاری سیمنٹوں
سے بھی اعلیٰ ہے
شروع ہی سے
ذیل پاک کی کھپت سب
سے زیادہ رہی ہے
اور اسکی مانگ روز بروز
بڑھتی جا رہی ہے
ZEALPAK

افسانہ:

وہ گر پڑا

حجاب امتیاز علی

اسے سٹیچر پر ڈال کر آپریشن تھیٹر میں پہنچا دیا گیا۔ وہ آج صبح اپنی بالائی منزل کے شہ نشین میں کھڑا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ صبح بے حد روشن اور نہایت حسین تھی کہ اچانک وہ کئی سو فیٹ نیچے زمین پر آ رہا۔ اسے بظاہر کسی نے دھکا نہیں دیا تھا۔ نہ شہ نشین کا فرش ہی اتنا کمزور تھا کہ اس کے بوجھ کو نہ سہار سکتا پھر وہ اچانک نیچے کیسے آ رہا؟ ـــــ اور بھلا اس میں سوچنے کی بات ہی کیا ہے؟ یہ بالکل ایک ویسا ہی حادثہ تھا جیسے ہر روز وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ خود گرنے والے میں بھی اتنی خود آگاہی نہ تھی کہ اپنے گر پڑنے کی وجہ پر غور کرتا۔ ویسے اسے بچنے ادھیڑنے کی عادت بھی نہ تھی۔ ظاہر ہے یہ اس کے پاؤں کی لغزش تھی کہ وہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور کئی سو فیٹ کی بلندی سے نیچے آ رہا۔ جہاں تک الفاظ کا تعلق ہے یہ وجہ بالکل صحیح ہے کہ وہ **توازن قائم نہ رکھ سکنے** کی وجہ سے نیچے گر پڑا۔ اور ہر حادثے یوں ہی ہوتے ہیں!

جب وہ آپریشن تھیٹر میں لایا گیا تو ہر چند اس کا جسم لاش کی طرح بے حس و حرکت تھا مگر اس کے دماغ میں سمندر کا سا تلاطم بپا تھا۔ وہی مدوجزر۔ وہی طوفانی لہریں ..... انسانی ذہن لمحہ بھر کے لئے بھی تفکرات و کشمکش سے معرا نہیں ہوتا!

وہ اپنے ماحول سے یکسر بے نیاز تھا۔ اسے نہ تو نرسوں کی سفید ٹوپیاں نظر آ رہی تھیں نہ ڈاکٹروں کے نقاب پوش چہرے۔ آپریشن تھیٹر کی تیز روشنیوں کے لئے اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔ اور قینچیوں اور چھریوں کی آوازوں کے لئے اس کے کان بہرے۔ کیونکہ جب ہم ماضی کی کسی چیونٹی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں حال کا سامنے کھڑا ہوا پہاڑ بھی نظر نہیں آتا۔ اسے یہ بھی یاد نہ تھا کہ وہ یہاں کیوں لایا گیا ہے! البتہ اس کے حافظے کے کان اور ذہن کی آنکھیں بہت دور کچھ دیکھ رہی تھیں۔

"منّو! منوا" ـــــ اس کے کان میں آواز آئی۔ وہ سوچنے لگا یہ کس کا نام تھا جو ماضی کی گہری وادیوں میں اب تک گونج رہا ہے؟ ـــــ پھر اسے اچانک یاد آیا منّو کتّے کا ایک پلّا تھا جسے اس نے اپنے کسی دوست سے مانگ کر بڑے چاؤ سے پالا تھا۔ مگر منّو اتنا چھوٹا تھا کہ وہ نہ دودھ پی سکتا تھا نہ اپنے آپ کو سنبھال سکتا تھا۔ چنانچہ وہ ساری ساری رات اپنی دردانگیز آواز میں آہ و زاری کیا کرتا۔ جسے سن کر محلّے کے لوگ بیزار ہو گئے تھے۔ محلّے کے لوگ ایک طرف۔ خود اس کی ماں کو اس پلّے سے خدا واسطہ کا بیر ہو گیا تھا۔

کئی دفعہ اس کی ماں نے جل کر کہا تھا "اسے واپس کر دو ورنہ میں اسے زہر دے دوں گی۔ کمبخت ساری ساری رات چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا رکھتا ہے ـــــ"

مگر آج اتنے سالوں بعد اسے منّو کیوں یاد آ رہا ہے؟!

پھر یوں ہوا کہ منّو کو زہر تو نہیں دیا گیا مگر قدرت خود اس کے درپئے آزار ہو گئی۔ سڑک پر کھیل رہا تھا کہ ایک بائسکل کے نیچے آ گیا۔ اس حادثے کے بعد منوا اس کی ماں کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ منّو کے زخم کے لئے بازار سے فوراً دوا منگوائی گئی۔ اس کی مرہم پٹی ہوئی۔ اس کے لئے نیا بستر آ گیا۔ اب منّو کی بے وقت کی راگنی بھی اس کی ماں کو بری نہیں لگتی۔ بچارہ کتّا! زخمی ہو گیا تھا!

پھر منّو کے بھونکنے کی آواز اس کے ذہن سے رفتہ رفتہ معدوم ہونے لگی۔ اور چند ہی سال پہلے کا ایک واقعہ ذہن کے پردوں پر ابھر آیا۔

اس دن جمعہ ہونے کی وجہ سے اسے دفتر سے جلدی چھٹی مل گئی تھی۔ اس لئے اس نے رستے ہی میں ارادہ کر لیا کہ آج فیروزہ کے ساتھ کشتی رانی کے لئے چلنا چاہئے۔ اور چائے بھی وہیں پینی چاہئے۔ راستہ میں ایک بے تکلف دوست کا گھر پڑتا تھا۔ وہاں جا کر اسے بھی ساتھ چلنے پر رضا مند کر لیا۔ لمحہ بھر کو خیال

آیا۔ جس دوست کو اس نے ابھی ابھی مدعو کیا ہے بیوی اسے ناپسند کرتی ہے شاید وہ ناراض ہو جائے۔ پھر دل کو سمجھا لیا کہ بیوی کو منا لیا جائے گا آخر احمد اتنا برا آدمی تو نہیں جتنا وہ سمجھتی ہے۔ جھوٹ تا ضرور ہے۔ مگر جھوٹ کون نہیں بولتا؟ پھر پاس کے رسٹوراں سے چکن سینڈوچ اور چیز فنگرز خریدے اور جلد جلد گھر کی طرف چلا۔

جب ناشتے کی پڑیاں ہاتھ میں لیے گھر پہنچا تو اس کا جی چاہتا تھا کہ فرطِ انبساط سے چیخیں مارتا ہوا ننھے بچے کی طرح فیروزہ سے چمٹ جائے اور کہے کہ آج جلدی تعطیل ہو گئی۔ چنانچہ وہ بچوں کی طرح چیخ پڑا۔ "فیروزہ۔ فیروزہ ۔۔۔ ادیکھو میں کیا لایا ۔۔۔ آج دفتر سے جلدی چھٹی ہو گئی۔"

اس کی بیوی کام کرتے کرتے کمرے میں آگئی۔ "کیا لے آئے ؟"

وہ ہنس پڑا۔ "چکن سینڈوچ اور چیز فنگرز۔ چلو کشتی رانی کو چلیں۔"

فیروزہ مسکرا کر بولی۔ "تم تو دفتر سے چھٹی ملتے ہی ایسے خوش ہو جاتے ہو جیسے کوئی بچہ سکول سے نجات پاکر پھولا نہیں سماتا۔"

وہ کسی قدر پلان کر بولا۔ "تم ہر روز دفتر جاتیں تو جانتیں کہ انسانوں کے لئے دفتر اور اس کی پابندیاں وہی معنی رکھتی ہیں جو بچے کے لئے مدرسہ اور اس کی قیود۔ اچھا یہ پڑیاں تم جلد جلد ٹفن باسکٹ میں رکھ دو۔ تھرماس میں گرم گرم چاء بھرو۔ دس منٹ کے اندر اندر سمندر پر پہنچ جانا چاہئے۔ احمد سے میں نے کشتی کے بندوبست کے لئے کہہ دیا ہے۔ وہ وہیں ساحل پر ہمارا انتظار کرے گا۔"

"احمد کی کیا ضرورت تھی ۔۔۔" اس کی بیوی نے کسی قدر ناراض لہجے میں کہا "کشتی بڑی آسانی سے کرائے پر مل جاتی ہے ہم خود وہاں پہونچ کر لے لیتے۔ دراصل مجھے احمد کی شورش پسند طبیعت اچھی نہیں لگتی۔"

وہ ٹالنے کے لئے بولا۔ "خواہ مخواہ تم بچارے کے پیچھے پڑی رہتی ہو بھلا آدمی ہے۔"

"ٹفن باسکٹ میں پڑیاں رکھتے ہوئے بولی۔ "بھلا آدمی ہی تو نہیں۔"

"مگر اس میں برائی بھی کیا ہے ؟"

"چغلخور ہے۔ ادہر کی ادُہر لگاتا رہتا ہے۔ یہ تھوڑی برائی ہے؟ ایسے خطرناک لوگوں سے مجھے نفرت ہے۔"

وہ ہنس پڑا "ایسے ہی لوگ تو سیر و تفریح کی جان ہوتے ہیں۔ خیر اس دفعہ معاف کر دو۔ اور آج اس سے ناراض ناراض سی نہ رہو۔ گذشتہ دفعہ بھی وہ تمہاری ناراضی کو بھانپ گیا تھا ۔۔۔"

"اور پھر بھی آج آنے پر رضامند ہو گیا۔ ایسی بے غیرتی کس کو پسند آسکتی ہے۔" فیروزہ نے ابرو چڑھا کر کہا۔

"صرف آج ایک دن تو اسے برداشت کرلو۔ آئندہ کبھی نہ بلاؤں گا۔ وہ اس وقت کشتی کے ساحل پر ہماری راہ دیکھ رہا ہوگا۔"

اور وہ ساحلِ سمندر پر پہونچ گئے۔

اتفاق کی بات کہ اس مختصر سی پارٹی کو سمندر کی لہروں پر گئے آدھا گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ اچانک سیاہ خوفناک گھٹا اٹھی اور اس زور کی آندھی شروع ہوئی اور ہوا کے جھکڑ چلنے لگے کہ کشتی قابو میں نہ رہی اور الٹ گئی۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ اور اس کی بیوی تو صحیح سالم ساحل پر پہونچ گئے مگر معلوم ہوا کہ احمد موجود نہیں۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ایسا ڈوبا کہ پھر ابھر ہی نہ سکا کسی نے کہا سمندری مچھلیوں کی خوراک بن گیا۔ کسی نے سمجھا کہ دم گھٹنے کی وجہ سے بے ہوش ہو کر رہ گیا اور لہریں اسے بہالے گئیں۔

اس نے محسوس کیا اس المیہ حادثے کا فیروزہ پر بہت زیادہ اثر ہوا ہے۔ وہ نہایت غمگین اور رقت بھری آواز میں کہنے لگی: "آہ! کیا معلوم تھا کہ احمد اس طرح اچانک ہم سے چھوٹ جائے گا !"

"تم کو تو خوش ہونا چاہئے" اس نے طنزیہ کہا تھا۔

"میں اس کی دشمن نہیں تھی۔"

اور پھر دوسرے ہی دن ماہی گیروں نے بے ہوش احمد کو پا لیا تھا۔

وہ علاج کے لئے اپنے گھر لانے سے پہلے بیوی سے مخاطب ہوا: "اگر تم ناراض نہ ہو تو میں احمد کو اپنے ہاں لے آؤں۔ اچھا ہو جائیگا تو اپنے گھر چلا جائے گا"
فیروزہ نے نہایت جوش سے جواب دیا: "ہاں ہاں ضرور لے آؤ۔ بانی کے اس حادثے کے بعد تو جیسے میری نفرت دُھل گئی!"
اور احمد اس کے گھر لایا گیا۔

پھر اس نے دیکھا کہ اس حادثہ نے اس کی بیوی کا نقطۂ نظر بدل دیا ہے۔ وہ یا تو اس کی موجودگی برداشت نہ کرتی تھی یا اب وہی فیروزہ ہے کہ اس کی تیمارداری کس چاؤ سے کر رہی ہے!

اس نے سوچا اس خطرناک حادثے نے فیروزہ کی نظروں میں احمد کو قابل رحم بنا دیا ہے۔

پھر اسے اپنی ماں اور اپنی بیوی کے مزاج میں ایک مطابقت سی محسوس ہونے لگی۔ منو کا واقعہ۔ اور اب یہ احمد کا حادثہ! ماں اور بیوی میں کئی چیزوں کی مطابقت کے باوجود اسے دونوں میں زمین و آسمان کا تفاوت بھی نظر آتا تھا۔ بھلا مرد ایسی عورت کو کیونکر برداشت کرے جس میں اس کی ماں جیسی خوبیاں نہ ہوں؟ —— ہاں اگر یوں ہوتا کہ فیروزہ —— اس کی ماں سے بالکل مختلف ایک اور عورت ہوتی —— اتنی مختلف —— جتنی دن سے رات ہوتی ہے —— تب بھی اسے قبول کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کی الجھن یہ تھی کہ اسے کئی باتوں میں دونوں ایک سی معلوم معلوم ہوتے ہوئے بھی مختلف تھیں! آہ، اسی سے تو کشمکش پیدا ہوگئی تھی۔ اضطراب قلب بڑھ گیا تھا! حادثے سے چند دن پہلے ہی وہ اپنی بیوی کے سلسلے میں مغموم سا رہنے لگا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے بے حد محبت تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں بیوی کے خلاف شکایات کا ایک دفتر کھلا رہتا تھا۔ وہ کبھی اپنے گلے شکووں کو عملی شکل میں نہ دیکھ سکا۔ اور دیکھے بھی کیونکر؟ وہ خود اس بات سے لاعلم تھا کہ اس کے ان شکوہ شکایات کی بنیادی اور اصلی وجہ کیا ہے۔ پھر وہ کیونکر اپنی بیوی سے کسی بات پر لڑ سکتا یا شکایت کر سکتا تھا؟

اسے یاد آیا ایک رات وہ بیوی سے کسی معمولی سی بات پر الجھ گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ فیروزہ اس کی اس تکلیف سے پریشان ہو کر اس کے پاس آئے گی اور شاید اس کا سر بھی دبائے گی۔

مگر یوں نہیں ہوا —— بلکہ فیروزہ نے اس پر ایک درشت سی نظر ڈالی اور بولی: "دفتر کا وقت ہوگیا ہے۔ اٹھو۔ ناشتہ کرو اور جاؤ"
اور جانے اس کا بخار کیسے اتر گیا۔ اس کا درد سر کہاں چلا گیا۔

منٹوں میں وہ تیار ہو کر دفتر تو چلا گیا مگر افسردگی و اضمحلال نے اسے وہاں نکما بنائے رکھا۔

دوپہر کے بعد اس کا ایک بے تکلف دوست آگیا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ شام تک وہ تاش کھیلتا رہا۔ اور طبیعت کی کدورت بظاہر رفع ہوگئی۔ مگر جب شام کو وہ اپنے گھر کے زینے پر چڑھ رہا تھا تو بے اختیار اس کا منہ غصہ سے پھول گیا اور آنکھوں میں یاس کا دریا لہریں لینے لگا۔ اور وہ مغموم انداز سے اپنی بیوی کے آگے سے گذرتا ہوا اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"تمہیں کیا ہوگیا ہے مری جان؟ ادھر تو آؤ ——" اس کے منتظر کانوں میں اس کی بیوی کے محبت بھرے الفاظ گونجے۔ وہ بے قابو ہو کر بیوی کی طرف بھاگنے ہی کو تھا کہ اسے معلوم ہوا وہ اس کی بیوی کے الفاظ نہیں تھے۔ اوپر کی منزل میں ریڈیو کھلا ہوا تھا اور اس میں، ایک ڈراما ہو رہا تھا —— یا شاید اس کے کانوں نے تمنائی الفاظ سنے تھے۔ جو کچھ بھی تھا۔ وہ اس کی بیوی کے الفاظ نہ تھے۔ اس کے قدم وہیں جامد ہوگئے۔ اور اس پر ایک یاس انگیز اداسی چھا گئی۔

دوسرے دن وہ اپنی بالائی منزل کی شہ نشین میں کھڑا ادہر اُدہر دیکھ رہا تھا۔ صبح بے حد روشن اور نہایت حسین تھی کہ دفعتاً —— بالکل اچانک جانے کس طرح کئی سو فیٹ نیچے زمین پر آ رہا —— !! اور حادثے یوں ہوتے ہیں!!

★

چمن میں آگ لگی!

محمد احمد حامی

یوں تو بہار کے لفظ کے ساتھ ہی ذہن میں ایک انقلاب کا تصور آ جاتا ہے۔ خزاں دیدہ اشجار کی بیداری، گل و لالہ کی تاجپوشی، زمستاں کے زمانہ کے شفاف چشموں میں برف کے گلنے سے گدگداہٹ، اداس پرندوں کی ایک دم زمزمہ خوانی، غرضیکہ ساری کائنات انگڑائی لے اٹھتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ جہاں پتھر بھی متاثر ہو کر گنگنانے لگتے ہیں۔ لیکن جو بہار میرے سابق وطن کے مسکن سے ملحق عیدگاہ میں آتی تھی وہ ان سب سے الگ تھی۔ یوں کہنے کو تو یہ جگہ عیدگاہ تھی لیکن دراصل یہ مجموعہ تھا ایک دیہاتی سڑک کے کنارے واقع قبرستان، ایک سدا بہار جوہڑ، ایک شیریں کنوئیں، ہندوؤں کے ایک مندر، جس کے گرد ایک خوبصورت باغیچہ تھا، جس میں انار اور امرود لگے تھے، اور ایک چٹیل میدان کا جہاں مسلمانانِ شہر سال میں دو بار جمع ہو کر نماز عید پڑھتے تھے۔

یہ بستی کسی زمانہ میں ایک مغل رئیس کا ٹھکانہ بنی تھی جس کے خاندان کے افراد کو یکے بعد دیگرے ایک جگہ دفن کرتے جانے سے ایک ننھا سا خاندانی قبرستان بن گیا تھا جو بعد میں ایک باقاعدہ وسیع قبرستان کے لئے بطور مرکز کے کام آیا اور رفتہ رفتہ یہاں سکہ بند قبرستانوں کے تمام لوازمات، مثلاً ایک لمبی قبر، چار دیواری، برج، دیئے، کنواں، جوہڑ اور بڑ کے بڑے بڑے درخت، مہیا ہو گئے تھے۔ جس زمانہ میں ہم نے اسے دیکھا ہے، اس میں کیسو (ڈھاک) کے درختوں کا ایک جنگل اگ رہا تھا۔ بڑے بوڑھوں کی روایت تھی کہ نواح میں پھیلی ہوئی زرعی زمین کے زیر کاشت آنے سے قبل یہ سارا علاقہ ہی ڈھاک کے جنگل سے آباد تھا، اور جوں جوں زمین ہل کے نیچے آتی گئی، جنگل کے نیچے سے نکلتی گئی۔ یہاں تک کہ اُس لق و دق جنگل کا مابقی صرف قبرستان میں رہ گیا کیونکہ تب تک وہاں ہل نہیں پہنچ سکا تھا۔

اس قبرستان کے ساتھ ہی مغل خاندان نے اپنی زمین کا کچھ حصہ عیدگاہ کے لئے وقف کر دیا تھا اور اس میں قبلہ کی سمت معین کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی محرابوں والی ایک دیوار بھی بنوا دی تھی۔ اس دیوار کے عین عقب میں سکھوں کی زمین شروع ہوتی تھی۔ اس زمین میں ایک نہایت خوبصورت مندر بنا ہوا تھا جس کے ارد گرد حاشیہ بنا تھا۔ بیرونی سیمنٹ سے لپے ہوئے چبوترے تھے جن پر دھریکوں (بکائن)، اور نیموں کا مشترکہ سایہ ٹھنڈک پہنچاتا تھا۔ اس مندر کا دروازہ ہم نے ہمیشہ کھلا پایا۔ اس میں مورتیاں یا مورتیاں وغیرہ کچھ نہ تھیں، بس دیواروں پر کچھ تصاویر بنی ہوئی تھیں جن کے کہیں چار ہاتھ تھے تو کہیں ہاتھی کی طرح سونڈ تھی اور کہیں یہ عجیب مخلوق ہیولا جیسے کان پھیلائے خلا میں گھورا کرتی۔ اس مندر کے برابر کچے راستے کے متوازی سکھوں نے زمین کے ایک ٹکڑے کو باغیچہ میں تبدیل کر رکھا تھا جس میں پھلدار پودے اس قدر گھنے لگائے گئے تھے کہ دور سے یہ جگہ جنگلات والوں کی 'رکھ' نظر آتی تھی۔ اس کے گرد اس قدر موٹی اور مضبوط کانٹے دار باڑ تھی کہ باغیچہ میں گھسنے کا تصور ایک لمحہ کے لئے بھی نہ ہو سکتا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ پڑوس والے سکھوں کا ایک بوڑھا ہر تین ماہ بعد پرانی باڑ میں نئی کانٹے دار شاخیں گاڑ دیتا تھا اور یوں یہ باڑ ہوتے ہوتے چھ فٹ موٹی ہو گئی تھی۔ اس کے باہر چاروں طرف مٹی سے اونچی منڈیر بنا کر اس پر جنگلی کیوڑہ اتنی مقدار میں لگا دیا گیا تھا کہ اگر جھاڑیوں کی اندرونی باڑھ نہ ہوتی تو اس منڈیر کو پھلانگنا آسان کام نہ تھا۔ قبرستان کی رکھوالی کرنے والے فقیروں کو قبرستان سے ملحق کچھ زمین بھی ملی ہوئی تھی جو عرصہ سے اُن کے قبضہ میں رہنے کی وجہ سے موروثی ہو گئی تھی اور اب وہ لوگ وہاں پکے مکان بنا کر بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے، اور زرعی زمین میں سبزیاں اگا کر گویا اپنے بڑوں کی خدمت گزاریوں کا معاوضہ وصول کر رہے تھے۔ اپنی زمین کو سیراب کرنے کے لئے ان فقیروں نے، جو اب 'شاہ' کہلاتے تھے، پرانے کنوئیں پر ایک رہٹ بھی لگا رکھا تھا جو بڑ کے ایک بوڑھے درخت کے نیچے روں روں کیا کرتا اور جس کے چبچہ میں بیٹھ کر کالے کالے پنڈوں والے فقیر 'تاریاں' (غوطہ) لگاتے وقت ڈکارا کرتے تھے۔

یہ سب کچھ جیسے ہم نے ہوش میں آتے ہی 'عیدگاہ' کے نام سے سنا اور اسے ہمیشہ یوں ہی پکارا، بستی کی اصل آبادی سے آدھ پون میل شمال مغرب میں تھا

اور یہاں پہنچنے کے لئے کھیتوں کے کنارے کنارے سبز گھاس سے پٹی بنی ہوئی منڈیروں پر سے گزرنا پڑتا تھا اور راستہ میں رہٹ لگے ایک دو کنوئیں اور بھی پڑتے تھے جن کی زمین سکھوں، نومسلم چوہڑوں اور کچھ غریب مسلمان گھرانوں کی موروثی ہوچکی تھی۔ یہ لوگ شہر کی منڈی میں آسانی سے بک جانے والی سبزیاں، پونڈے اور چارہ بوتے تھے اور زمین کے اِن خورد بینی قطعوں سے اپنا رزق حاصل کیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ عیدگاہ میں میرا سب سے پہلا گزر کہیں والد مرحوم کی انگلی پکڑے عید کی نماز ادا کرنے کے لئے ہی ہوا ہوگا، لیکن اس بارہ زمانہ کا تعین مشکل ہے۔ وہاں باقاعدہ آمد و رفت اس وقت شروع ہوئی جب میرا ایک چھوٹا بھائی فوت ہوکر عیدگاہ کے قبرستان میں دفن ہوا۔ والدین کے لئے اولاد کی جانب سے یہ پہلا صدمہ تھا۔ اس کے چھ ماہ بعد ایک شیرخوار بہن بھی وہیں جا سوئی! سو ہم سب لوگ مہینہ میں ایک آدھ بار اکٹھے ہوکر ان قبروں کی زیارت کے لئے عیدگاہ جایا کرتے ——

ہم بچوں کے لئے تو یہ محض سیر ہوتی تھی بلکہ میں تو کبھی کبھی اپنی گول چھرّے والی ڈیزی بندوق ساتھ لے لیتا اور فاختاؤں کو پریشان کیا کرتا تھا لیکن جب ان قبروں میں سے ایک کے سرہانے کلف لگی ہوئی ڈاڑھی والا میرا بوڑھا باپ' اور دوسری کے سرہانے آنکھوں میں دکھ بسائے ہوئے میری ماں' بیٹھ کر ٹپ ٹپ آنسو گراتے تو مجھے احساس ہوتا کہ معاملہ کچھ سنجیدہ سا ہے اور میں بندوق سے کھیلنا چھوڑ کر ڈھاک کے سوکھے پتوں پر بھاگتے ہوئے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو "شی شی" کہہ کر چپ کرانے لگتا اور ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر دونوں جڑواں قبروں کے پائنتی کھڑے نصف دائرہ بنا لیتے۔ اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے جب میری ماں ذرا اوپر دیکھتی اور ہمیں ٹکٹکی باندھے مصروف پاتی تو یوں لگتا جیسے اس کے کلیجے میں ایک ٹیس اٹھتی ہے جو نکلنے کا راستہ نہ پاکر گرم سلائی کی طرح اس کے کلیجہ کو داغ رہی ہے اور اس کرب کو دبانے کے لئے وہ ہم کو باری باری بھینچنا شروع کر دیتی۔ اس کی محبت کی حدت سے ہمارے کان سرخ ہوجاتے اور ہم بے وجہ ہانپتے ہوئے بے وقوفوں کی طرح کبھی اس کے چہرہ اور کبھی اپنے باپ کی آنسوؤں سے تر ڈاڑھی کی طرف دیکھا کیے۔ ہمیں پریشان پاکر ہمارا باپ رومال سے ناک صاف کرتے ہوئے اٹھ بیٹھتا اور ہمیں ساتھ لیکر 'شاہوں' کے کنوئیں کی طرف لے جاتا جہاں پہلے اپنا منہ دھوتا، خود پانی پیتا اور پھر ہمیں اوک سے بھر بھر کر پانی پلاتا۔ اس کی ہتھیلی سے ہونٹ لگا کر پانی سُڑکتے ہوئے بہت سا پانی باچھوں کے پاس سے بہہ کر گردن کو بھگوتا ہوا گریبان کے نیچے تک بہہ جاتا۔ ہوا کا ٹھنڈا فراٹا لگنے سے ایسا احساس ہوتا گویا کوئی برف میں لگی ہوئی قلفی جسم سے چھو رہی ہے! پھر وہ 'شاہوں' کی اجازت سے ہمیں اُن کے شہتوتوں کے پیڑوں سے لمبے لمبے ارغوانی شہتوت توڑ کر دیا کرتا اور واپسی پر ہماری انگلیاں پکڑے قبروں کے درمیان لیٹی ہوئی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈی سے گزرتے ہوئے ہمیں قبر پر پاؤں رکھنے سے منع کرتا ہوا چلتا۔ اتنی دیر میں ہماری ماں اپنے ہاتھوں سے تھوڑی سی مٹی اکٹھی کر کے اِن قبروں پر چڑھا چکی ہوتی اور ہم ڈھاک کے درختوں کے نیچے گرے ہوئے سرخ سرخ پھول اٹھا کر قبروں پر چننے لگتے، اس پر ہمارا باپ لپک کر ان پھولوں کو اٹھا کے دور پھینک دیتا اور ڈھاک کے پتوں سے لدی ہوئی دو گچھے دار ٹہنیاں کڑک کڑک کر کے توڑتا اور دونوں قبروں پر رکھ دیتا اور ہماری اماں سے مخاطب ہوکر کہتا: "میں نے تم سے پہلے بھی کہا ہے یہ آگ ایسے سرخ پھول' اِن پھول ایسے بچوں کو نہ دیا کرو، رسولِ پاکؐ نے فرمایا ہے کہ قبروں پر سبزہ رکھو۔"

میری ماں بے بسی سے اس کی طرف دیکھتی اور اپنا برقع سنبھالتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوتی اور ابا رسولِ پاکؐ کے اس ارشاد کا حوالہ دینے کے بعد عربی کی کوئی دعا زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے چل دیتے۔ پیچھے پیچھے اماں ہو لیتیں اور ہم بچھیروں کی طرح کبھی آگے کبھی پیچھے بھاگنے لگتے۔ راستہ میں کانٹا چبھتا تو خود ہی چیخ مار کر بیٹھ جاتے۔ ڈیڑھ انچ لمبے کانٹے کو مکھن کی طرح نرم گوشت سے ایک "سی" کے ساتھ کھینچتے جس کے ساتھ ہی لہو کی ایک ننھی سی بوند بھی ابھر آتی۔ انگلی پر ذرا سا تھوک لگا کر اس جگہ رگڑ دینے سے گویا علاج مکمل ہوجاتا اور ہم اُسی پہلی سی رفتار سے ساتھ کھیتوں میں بھتنوں کی طرح ناچتے ہوئے پھر چل پڑتے۔

عیدگاہ سے اس تعارف کے بعد جب وہاں تک پہنچنے والے تمام منڈیری راستے مجھے حفظ ہوگئے تو پھر اپنے اسکولی ہمجولیوں کے ساتھ بندوق لئے شکار کے بہانے وہاں تک پہنچنے کی جرأت ہونے لگی۔ گو اس شکار میں پرندہ تو شاید ہی کوئی ہاتھ آیا ہو لیکن اس سے کولمبسانہ ذوقِ تجسس کو کماحقہٗ آسودگی ضرور پہنچی۔ اگر کبھی کسی پرندہ کو چھرّہ لگ بھی جاتا اور وہ ہماری کھلونے جیسی بندوق کی چوٹ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے دوسرے پیڑ پر جا بیٹھتا تو ہم اس کے رنگین گرے ہوئے پروں سے 'وار کاری' لگا کا نتیجہ نکالتے ہوئے اس کا پیچھا کرتے۔ دوسرے پیڑ پر وہ پھر دوسری چوٹ کھاتا اور اُڑ جاتا اور ہم اسی طرح کاری اور ناکاری 'فائروں' سے اس کا تعاقب جاری رکھتے۔ یہاں تک کہ وہ بے چارہ نڈھال ہوکر خود سپردگی پر مجبور ہو جاتا اور ہم بڑے اہتمام سے اُسے چھلے ہوئے سرکنڈے یا آم کی تیز چھال سے اُلٹا سیدھا ذبح کرتے اور فاتحانہ جلوس کی صورت میں اپنے محلے کو چل پڑتے۔

انہی دنوں جب جاڑے ماند پڑتے اور لحاف کی آنچ احساس دلاتی کہ اب چھتوں پر سونے کے دن آنے والے ہیں تو یکایک انکشاف ہوتا کہ امتحان سر پر ہیں۔ اور ساتھ ہی

قدِ آدم گیہوں اور ساحر چاندنی راتیں آنکھ مچولی کی دعوت دے رہی ہوتیں۔ بہرحال امتحان اور آنکھ مچولی خود بخود سمجھوتہ کر لیتے اور آنکھ جھپکتے میں ہم نئی کلاس میں پہنچ جاتے۔ یوں تو امتحان کا آخری پرچہ کرنے کے بعد ہی سے ہم اپنی کاپیوں اور گھر کی دیواروں سے اپنے نام کے سامنے سے 'جماعت ہفتم فرقِ سی' مٹا کر 'جماعت ہشتم اے' موٹا کر کے لکھ دیتے تھے، گو اپنے غول میں سے ایک آدھ کو ڈسیبٹ بن کر اپنی روایات کو نبھانا پڑتا۔ امتحان کے بعد کی چھٹیاں گزارنے کے لئے پروگرام بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہی سکہ بند مصروفیات جو ہمیں اپنے پیشرو لڑکوں سے وراثت میں ملتی آئی تھیں خود بخود ہماری رہنمائی کیا کرتیں۔ صبح سویرے ناشتہ کے بعد گھر سے نکلتے اور گلی کے نکڑ پر کھڑے ہو کر انگلیاں منہ میں ڈال کے بڑی تیز سیٹیاں بجائی جاتیں، دو عدد ایسے اپیل... سے کم نہ ہوتیں اور آن کی آن میں گلی محلّے کے تمام لڑکے نکل پڑتے۔ کسی دیوار کے سائے میں کانفرنس ہوتی کہ آج شکار ہوگا، کبڈی ہوگی، کھیتوں میں آنکھ مچولی ہوگی یا عیدگاہ چل کر محض سیر و تفریح اور مہم جوئی ہوگی۔ اکثر قبل دوپہر کے عرصہ کے لئے آنکھ مچولی کی قرارداد منظور ہوتی تو سوال پیدا ہوتا کہ ٹیمیں بنیں گی یا ہاتھ جھٹک کر، ہاتھ پر ہاتھ مار کر باری دینے والے کا فیصلہ ہوگا۔ اگر لڑکے زیادہ تعداد میں موجود ہوتے اور عموماً یہی ہوتا تو کھلاڑی دو ٹیموں میں بٹ جاتے۔

ٹیمیں بن چکنے کے بعد ٹاس ہوتا۔ ٹاس جیتنے والی ٹیم کو چھپنے کا موقع دینے کے لئے ضروری ہوتا تھا کہ دوسری کو کچھ وقت کے لئے مصروف رکھا جائے۔ اس کے لئے کبھی تو باری دینے والی ٹیم کو دُور کسی "دائی" کو ہاتھ لگا آنے کے لئے کہا جاتا اور اس دوران میں باری لینے والے گلیوں کو طے کرتے ہوئے کھیتوں کی طرف بھاگ جاتے۔ لیکن اکثر یوں ہوتا کہ پدنے والی ٹیم مقررہ جگہ تک پہنچنے سے پہلے ہی تعاقب میں دوڑ پڑتی یا ان میں سے ایک آدھ چھپ چھپا کر چھپنے والوں کے پیچھے ہو لیتا اور ان کی پناہ گاہ کو دیکھتا رہتا۔ اتنے میں اس کے ساتھی آملتے اور سب جمع ہو کر یا بکھر کر محاصرہ کر کے چھپنے والوں کو ڈھونڈ نکالتے۔

اسی زمانہ میں عیدگاہ پر بہار ہولے ہولے اترنے لگتی اور چند ہی دنوں میں ڈھاک کے درخت ہلکے سبز رنگ کے شگوفوں سے لد جاتے۔ دندانے دار پتیوں میں لپٹے ہوئے شگوفے سوئیوں کی طرح باریک ڈنٹھلوں کے سہارے بندوں کی طرح جھولا کرتے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان بندوں میں سے سرخ سرخ زبانیں جھانکنے لگتیں اور بہار کے ضابطہ طور پر آ جانے کا اعلان ہو جاتا۔ تیز سرخ رنگ کی یہ پتیاں (زبانیں) جب پوری طرح باہر لٹک پڑتیں تو یوں معلوم ہوتا جیسے سبز طوطوں نے چونچیں ڈھلکا رکھی ہوں۔ شاید اسی لئے چھوٹے چھوٹے بچے ان پھولوں کو طوطے کہا کرتے تھے گو قبریں کھودنے والے ممدے گھمار (کمہار) سے ہم نے یہ سنا تھا کہ بعض دیہاتی عورتیں انہیں کیسو کہتی ہیں اور عیدگاہ سے لپٹے ہوئے بیل گاڑیوں کے کچے راستے سے گزرتے ہوئے ان کی جھولیاں بھر بھر کر لے جاتی ہیں اور ان سے اپنے کیسری رنگ کے دوپٹے رنگتی ہیں۔ ہم نے کبھی ان عورتوں کو یہ پھول چنتے ہوئے نہیں دیکھا تھا بلکہ ہمیشہ یہی دیکھا کہ دو تین جاٹ اور ایک دو جاٹنیاں بڑے مزے سے جوتیاں ہاتھوں میں اٹھائے پنجابی میں "ہا ہو۔ ہاہو" کرتے چلے آ رہے ہیں، قبرستان کے قریب آتے ہی وہ خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے پر نظر ڈالتے اور کسی لاشعوری تحریک سے سمٹ کر پاس پاس ہو جاتے اور رفتار یکدم تیز کر دیتے جیسے انہیں ڈر ہو کہ کسی پرانی قبر سے ابھی کوئی بھتنا نکل کر ان کے سامنے آ جائیگا اور قلابازیاں کھانے لگے گا۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ ہم اپریل کی پسینہ لانے والی دوپہر میں آنکھ مچولی، چھون چھوائی یا جٹ پا من کھیلتے وقت ڈھاک کے درختوں میں چھپے ہوتے، اتنے میں چار پانچ جاٹ جاٹنیاں قبرستان میں داخل ہوتے۔ دُور سے ان کی باتیں کرنے کی آواز یکدم دوپہر کے قبرستانی سناٹے میں تحلیل ہو جاتی اور وہ اپنے ننگے پیروں کو احتیاط سے اٹھاتے ہوئے چھپا چھپ گزرنے لگتے۔ ایسے میں انہیں کیسو جمع کرنے کا خیال کب آتا ہوگا! یا پھر ممکن ہے وہ 'طوطے' جو ہم ڈھیروں کے حساب سے توڑتے تھے اور ان کی گردن مروڑ کر شہد چوس کے راستوں میں بکھیرتے جاتے تھے، انہی سے وہ بھی چلتے چلتے کچھ چن لیا کرتی ہوں۔

ڈھاک کے کیسو چننے کے لئے ہمارے محلّے کا بوڑھا حکیم اپنی جوانی کی پہلوانی کے زور پر صبح سویرے دُڑکی دُڑکی چال سے قبرستان میں جایا کرتا تھا اور دن چڑھے پھولوں کی پوٹلی ہاتھ میں اور ہاتھ بھر لمبی مسواک منہ میں لئے جھومتا ہوا واپس آتا تھا۔ الشیر سنگھ کمبوہ کے رہٹ کے پاس آ کر وہ نہانے کے لئے رُکتا، کھدر کا موٹا کرتا اور کھجور کے پتوں کی ٹوپی اتار کر 'لائن کلیئر' کا منتظر رہتا اور جب گاڑی پر بیٹھا ہوا کمبوہ رہٹ کے چکر میں دوسری طرف منہ پھیرتا تو بجلی کی تیزی سے تہمد اتار کر اَولو (حوض) میں گھس جاتا اور ایک دوبار پانی کی چھ انچ موٹی دھار کو کندھوں پر بکھرا کر اپنی لٹکے ہوئے گوشت والی باہوں کو رگڑتا اور پھر غوطہ لگا جاتا، سر اُبھار کر اِدھر اُدھر دیکھتا، میدان صاف پاتا تو آگے پیچھے ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوتا اور ایک آدھ بار جسم کو جھٹک کر تہمد پہن لیتا اور سی سی کرتا "اللہ تو، اللہ تو" کہتا ہوا محلّہ کی غربی جانب سے داخل ہونے والی پگڈنڈی پر ہو لیتا۔ اگر نہانے کے دوران ہماری ٹولی کا گزر وہاں سے ہوتا تو لڑکے رہٹ کے اردگرد اگنے والے توت کے تین تین فٹ قطر کے درختوں کی آڑ میں ہو جاتے اور جب حکیم ایک لمبی "سی" کرنے کے بعد نچلا ہونٹ دانتوں میں داب کر دھار کے نیچے سر دیتا تو کوئی لڑکا ایک بڑا سا مٹی کا ڈھیلا شڑاپ سے پانی میں پھینکتا اور حکیم گھبرا کر جلدی سے سر باہر نکالتا، آنکھیں جھپکتا اور چاروں طرف دیکھتا۔ کچھ نہ پا سکنے پر سمجھتا ممکن ہے یہ اس کا وہم ہو لیکن کچی مٹی کا ڈھیلا پانی میں گھل گھل کر باریک مٹی کی لہر

سی بنتا ہوا نظر آتا تو وہ چونک کر پھر ماحول کا جائزہ لیتا اور سخت سست کہتا جس کے ردِّ عمل میں ہمارا قہقہہ بلند ہوتا اور ہم لپک کر سامنے آجاتے۔ وہ اپنی دیہاتی پنجابی میں اول فول بکتا اور ہم اسے یونہی چھوڑ کر چہکتے ہوئے عیدگاہ کا رُخ کرتے۔

اس وقت تک گرمی کافی بڑھ چکی ہوتی۔ دوپہر کو نیم گرم لُو بھی چلنا شروع ہو جاتی جس سے پکتی ہوئی گیہوں کی سنہری ناڑیں (رئیں) سوکھ کر اپنی لچک کھو بیٹھتیں اور کسان درانتیوں کے دندانے تیز کرانے لگتے۔ تُوتوں (شہتوت) میں لگی ہوئی گولیں (ٹینٹیں) گدرانے لگتیں اور عیدگاہ میں کیسوؤں کا الاؤ دہک اٹھتا۔ گہرے سبز رنگ کے ڈھاک کے درخت شعلے ایسے سُرخ پھولوں سے ڈھک جاتے اور دُور سے یوں دکھائی دیتا جیسے زمرد کی ننھی ننھی پہاڑیوں کو بے شمار دیوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے جن کی لویں لٹ لٹ کرتی دہک رہی ہیں۔ جب دوپہر کو لو چلتی تو اس چھوٹے سے خطّے سے ترمرے اُٹھ کر فضا میں اس طرح تحلیل ہوتے جیسے جنگل کی یہ آگ شعلوں کی زبان سے بارش کی بھیک مانگ رہی ہے۔ سردیوں میں آنے والے تیترے (ملے جلے رنگ کا) اور چتکبرے تلیروں کی ڈاریں کوچ کر چکی ہوتیں اور ان کی جگہ دودھیا چھاتی اور براؤن بوٹ پالش کے رنگ کے پروں والے گرمائی تلیروں کے جُھنڈ دوپہر کی جھلس دینے والی لُو سے بچنے کے لئے اس آگ کے جنگل میں پناہ گزیں ہوا کرتے۔

آنکھ مچولی سے اُکتا کر بھوک سے نڈھال سب ہم گھروں کو لوٹتے اور ہوائیاں اُڑتے ہوئے چہروں کو لیکر کھانا مانگتے تو صبح سویرے سے گھر سے غائب رہنے کی فہمائش کے طور پر اماں کی ایک گھُرکی برداشت کرنے کے بعد منہ ہاتھ دھونے کا ناخوشگوار فریضہ ادا ہوتا اور پھر سیر ہو کر کھانا کھایا جاتا۔ کھانے کے بعد یونہی کونوں کھدروں میں منڈلا کر موقع تلاش کیا جاتا کہ نظر بچا کر پھر بھاگا جائے۔ یکدم مجید کالو کی دُور سے آتی ہوئی سیٹی کانوں میں لہراجاتی اور دل بے اختیار لوٹنے لگتا۔ اب ہر قیمت پر گھر سے نکلنا ضروری ہوتا اور ہر روز کسی نہ کسی بہانے یہ موقع مل جاتا۔ ایک آدھ بار تو بیٹھک کے راستہ دروازہ کھُلا چھوڑ کر بھی کھسکنا پڑا۔ مجید کالو محلّہ کے لڑکوں کا سردار تھا۔ گو نہ تو وہ عمر میں سب سے بڑا تھا اور نہ قد کاٹھ ہی کے لحاظ سے اس قابل تھا کہ لیڈر بن سکتا۔ لیکن اس کی غیر معمولی ذہانت، جرأت اور تجربہ ہم سب کو گرویدہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ وہ گلی کے نکڑ پر راجہ صاحب کی بیٹھک کے سایہ میں کھڑا زبان کو انگلیوں سے دُہرا کر کے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بھیانک، تیز اور نوکیلی سیٹیاں گلی کے دونوں طرف پھینکتا۔ اس کے کالے رنگ اور کھڑے کانوں کے پس منظر میں پارہ کی طرح چمکتی ہوئی متحرک آنکھیں اور گوشت کی لسی سُرخ جیبھ لئے وہ خواہ مخواہ شیطان سا نظر آیا کرتا تھا اور اس کی ہیئت کذائی سے دہشت برستی! آستینیں پھٹی ہوئی گلے میں ربڑوں والی غلیل کا ہار، شلوار کا پائنچہ جو کسی جگہ اٹک کر قریباً آٹھ دس انچ تک اُدھڑ گیا تھا اور اس نے نیفے کو ذرا اُڑس کر اُونچا کیا ہوتا، یہ ننگے پیر اور خشک بال!!

جب اُس کی 'قوم' کے اتنے افراد جمع ہو جاتے جن سے وہ اُس روز کی مہم شروع کر سکتا تو وہ مطمئن ہو کر ایک بازو دیوار پر ٹیک کے خطیبانہ رنگ میں کہتا:

"بولو بھئی" اور پھر خود ہی تجویز کرتا۔ "نمبر ایک شکار تلیراں، نمبر دو ناس پورہ کے بیر، نمبر تین نہر میں تاری۔ بولو منظور ا!" اور جواباً کورس میں ہچکچاتی سی آواز آتی: "منظور ہے"۔ ہچکچاہٹ میں راز یہ تھا کہ تلیروں کے شکار کے لئے ہمیں اپنی غلیلیں لینے کے لئے پھر سے گھر جانا ضروری ہوتا اور یہ مرحلہ خاصا حوصلہ شکن ہوتا، تاہم کالو کی ہمت بندھانے والی نظریں اور حشر برپا کرنے والی آواز ہمیں گھر لوٹنے پر مجبور کرتی اور ہم جیبیں بھر کر مٹی کے غلّے لئے غلیل کو نیفے میں چھپائے پھر گاؤں کے 'جامع المتفرقین' رہٹ کے پاس اکٹھے ہو جاتے۔ مجید کالو جوان مہموں کا ہیرو تھا بہت اچھا نشانہ باز تھا۔ اس کو مٹی کے بٹے ہوئے گول غلّوں کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ بس رہٹ کے کچے چوبچہ میں سے ٹھیکری اٹھا کر یا ریل کی پٹڑی سے نوکیلے پتھر چن کر دے مارتا تھا۔ پرندے کو ٹہنی پر بیٹھے پا کر اس انداز میں قریب جایا کرتا تھا جیسے اسے پرندے سے کوئی سروکار نہ ہو اور جب وہ اس کی زد میں آجاتا تو غلیل سر کے پاس سے چلا دیتا اور تیکھی ٹھیکری زن سے چھوٹ کر پرندے کو زخمی کرتی ہوئی فضا میں قوس بنا جاتی۔ ایک بار تو میں نے یہ بھی دیکھا کہ تازہ ہل چلے ہوئے کھیت سے مٹی کا کچا ڈھیلا اٹھا کر کالو نے غلیل میں رکھا اور ایک شارق پر داغ دیا اور وہ پکے آم کی طرح دھپ سے زمین پر آگری۔ اُٹھا کر دیکھا تو اس کا سر بھٹّے کی طرح ڈھیلے سے صاف اُڑ گیا تھا۔ شکار کے یوں حرام جانے پر کالو نے تلملا کر مری ہوئی شارق کو پاس کے کنوئیں میں پھینک دیا تھا۔ شکار پر روانہ ہونے سے قبل کبھی کبھی کالو کبوتر کے رہٹ کے چاروں طرف فوجی جرنیلوں کی طرح ریکی کرنے والی نظروں سے دیکھتا اور جب اسے دُور دُور تک کوئی آدمی نظر نہ آتا تو بند رہٹ کی گاڑی پر اُلٹا ہو کر چھپکلی کی طرح لیٹ جاتا اور ہم میں سے کسی کو کہتا: "رہٹ کا کتّا رکھٹکا، چھوڑ دو" کھٹکے کے ہٹتے ہی پانی کی بھری ہوئی ٹینڈوں (کوزوں) کے وزن سے رہٹ اُلٹا چلنا شروع ہو جاتا اور کالو مزے سے لیٹا ہوا پانچ چھ چکر پورے کرتا اور رہٹ کے ٹھہر جانے پر حکم دیتا: "کتّا لگا دو اور اس کو پھر سیدھا چلاؤ" ہم سب مل کر ایڑی چوٹی کا زور لگا کر پھر سے رہٹ کو چلاتے۔ کالو مزے سے لیٹا رہتا۔ جب پانی سے بھری ہوئی ٹینڈیں پھر اُوپر آجاتیں اور زمین کی نالی میں پانی گرنے کی آواز اسے پہنچتی تو چلاتا۔ "باقی سب پرے ہٹ جاؤ اور نِبکے اتم کتّا کھول کر بھاگ جاؤ"۔ نِبکا بڑی فرمانبرداری سے

کھٹکا کھول کر پیچھے ہٹ جاتا اور رہٹ کا الٹا چکر کالو کو جھلانے لگتا اور لٹنے میں رہٹ کے اس ناجائز استعمال کی آواز کمبوہ کو پہنچ جاتی جو دُور کہیں کماد (گنے) کے کھیت میں بیٹھا خربوزوں کی ننھی ننھی بیلوں میں گوڈی (نلائی) کر رہا ہوتا اور وہ وہیں سے کھرپا ہاتھ میں لئے اپنے پوپلے منہ سے گالیاں بکتا، دوڑنے کی رفتار پر ڈگمگاتا رہٹ کی طرف بڑھتا۔ اس کی گالیوں کا کوئی لفظ بھی سمجھ میں نہ آتا۔ کالو اطمینان سے اترتا اور حکم دیتا: "قوم کوچ کرے" اور ہم سب کٹی ہوئی گیہوں کے کھتوں کی آڑ لیکر عیدگاہ کی طرف بھاگ اٹھتے۔

دن بھر کے شکار، بیر کھانے اور آوارہ گردی کے پرگراموں کے سلسلہ میں جب ہمارا قافلہ کالو کی قیادت میں عیدگاہ پہنچتا تھا تو ہم اور دبے پاؤں درختوں کے جھنڈ میں داخل ہوتے تو ذرا سی دیر کے لئے تمام پرندے اپنے پیچھے چھوڑ کر خوفزدہ ہوجاتے۔ کالو بڑے اطمینان سے کسی پختہ قبر کے کتبہ سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا اور پھٹا ہوا پائیچہ اوپر گھسیٹ کر اپنی کالی ران کو کھرچنے لگتا جس پر سے مدتوں کی سوکھی ہوئی بھوسی سفید لکیریں بنا کر اُترنے لگتی۔ یکدم سرخ پھولوں اور سبز پتوں کے درمیان سے کالو کو کسی تلیر کی مرمراتی چھاتی نظر آتی، وہ اسی انداز سے لیٹے لیٹے غلہ رسید کر دیتا اور ایک کراہتی ہوئی چہچہپ کے ساتھ تلیر پھڑ پھڑاتا ہوا نیچے آ رہتا۔ کالو دہاڑتے ہوئے حکم دیتا: "ابے او پکڑ کے لا اسے" اور رشید اتیلی بھاگ کر تلیر کو پکڑ لاتا اور کالو کے دربار میں پیش کرتا۔ کالو اس کے مخملیں پروں میں پھونکیں مار کر چوٹ کا نشان تلاش کرتا اور پھر پالتو کبوتروں کی طرح اس کا بازو پھیلا کر اس کی سرپیں گننے لگتا۔ تلیر اس معائنہ کے احتجاج کے طور پر چونچ سے انگلی یا ہاتھ پر کاٹتا یا کالو کی کلائی پر پنے نوکیلے پنجے سے سرخ لکیریں کھینچ دیتا تو اس کے منہ میں کف بھر آتا۔

عیدگاہ کے شکار سے اُکتا کر تجویز ہوتی کہ ناتش پورہ کی بیروں پر حملہ کیا جائے۔ جھٹ سب اُدھر چل پڑتے کچے پکے بیروں کو ڈھیلوں سے گراتے، کھاتے، کھاتے چلے جاتے کہ یکایک کسی احساس ہوتا پیاس لگ رہی ہے۔ وہیں سے رُخ کسی رہٹ کی طرف ہوجاتا۔ چلچلاتی دوپہر میں کوئی جاٹ مزے سے گاڑی میں لیٹا سو رہا ہوتا۔ درختوں کے جھنڈ میں سے کالو جب اپنی تجسس آمیز نظروں سے منظر کا جائزہ لیتا تو اسے پانی پینا بھول کر شرارت سوجھتی، اور کھٹاک سے رہٹ میں جتے ہوئے بیل کے پیٹ میں کالو کا غلہ آ بیٹھا۔ بیل ڈر کر بھاگتے۔ جاٹ اپنے الجھے ہوئے بالوں کو سنبھالتا، سر اٹھاتا اور بیلوں کے بدکنے کی وجہ پر غور کرتا لیکن پھر نیند سے مغلوب ہو کر گاڑی کی لکڑی پر سر کو ٹکا دیتا۔ اب کی بار غلہ گاڑی کی لکڑی پر لگتا، جاٹ کو مجبوراً اٹھنا پڑتا اور باوجود چھپنے کی ہر ممکن کوشش کے وہ ہم میں سے کسی نہ کسی کو دیکھ لیتا اور نیند کے خمار سے بوجھل اعضا میں تاب تعاقب نہ پاتے ہوئے وہیں سے دھمکیاں دیتا: "چلو نہیں تو......" اور کالو جان بوجھ کر لنگڑی چال چلتا لڑکوں کو نعبگا کر دور لے جاتا۔ کھیتوں میں ناگن کی طرح گزرتی پانی کی باریک نالی پر جھک کر سب پانی پیتے اور پھر گیہوں کے ڈھیر (ٹھنٹھ) میں سے نہر کی طرف روانہ ہوجاتے۔

ایک ایسی ہی مہم میں کالو نے ناتش پورہ کے کبوتر باز دستن سنگھ کے رہٹ پر اُس کے پالتو کبوتر کو جانشانہ بنایا اور جب وہ کبوتر کو مرکنڈے کے چھلکے سے ذبح کرنے کی کوشش کر رہا تھا تو دستن نے اسے موقع پر گردن سے آ دبوچا۔ کالو کا رنگ فق ہو کر مٹیالا زرد ہوگیا اور وہ کچھ بے الفاظ گھگیایا۔ دستن نے اس کی غلیل چھین لی، چانٹے مار مار کر اور کان اینیٹھ اینٹھ کر اس کے چہرہ کو رکھ کی تہ سے ڈھنپا ہوا انگارا بنا دیا اور اُسے رسّی میں باندھنے کے لئے لے چلا۔ راستہ میں اتفاقاً اس کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو کالو ایک جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑا کر نو دو گیارہ ہوگیا۔ دستن نے اس کے پیچھے دو چار الانگیں بھری مگر کہاں کالو کی بجلی کی سی رفتار اور کہاں دستن کا بھدا جسم۔ ذرا پرے جا کر کالو نے تازہ جتی ہوئی زمین سے مٹی کا ڈھیلا اٹھا کر اس کی طرف پھینکا اور ساتھ ہی ایک گالی بک دی، اور اس گالی کا ردعمل دیکھے بغیر عیدگاہ میں لوٹ آیا۔

یہ اُسی روز کا واقعہ ہے جب ہم سب دن کے گیارہ بجے دوپہر گزارنے اور شہتوت کھانے کے لئے عیدگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں ارائیوں کے رہٹ پر ہم نے دیکھا کہ کالو حوبچہ میں بیٹھا نہا رہا ہے۔ کان سُرخ اور منہ پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ مری ہوئی آواز میں منمنایا: "قوم کو موت کدھر لے چلی ہے" قوم نے بیک آواز کہا: "چلو جیئے تمہیں توت کھلائیں" اور رجید کالو کے چہرے پر یکدم وَالدوں جیسی سنجیدگی لوٹ آئی اور پُر درد لہجہ میں کہنے لگا: "خدا کے لئے عیدگاہ نہ جانا، آج وہاں جنوں کا قبضہ ہے" اور پھر نہانا بھول کر ہاتھ ہلا ہلا کر داستان سنانے لگا: "وہ پیرجی کی چاردیواری کے پاس تھڑے پر جو آم کا پیڑ ہے نا، میں آج اس پر ڈھیلے پھینک پھینک کر کیریاں گرا رہا تھا۔ یکدم درخت کی ڈال سے ایک بونا لٹکتا نظر آیا جس کی تین ہاتھ لمبی ڈاڑھی تھی۔ ڈال سے ایک ہاتھ سے لٹک کر وہ نیچے کود پڑا اور میرے چٹکیاں بھرنے لگا۔ ساتھ ہی یہ کہتا جاتا تھا: "تم کبھی چین سے سونے بھی دوگے کہ نہیں؟ آج میں تمہارا علاج کر کے چھوڑوں گا"۔ تب سے یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی لوہے کی سوئیاں آگ میں سُرخ کر کے جسم میں چبھو رہا ہے۔ بھاگم بھاگ یہاں پہنچا ہوں اور تب سے پانی میں بیٹھا ہوں۔ ذرا سر باہر نکالتا ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے تنور میں جھانک رہا ہوں۔ اب بتاؤ کیا کروں؟"

یہ کہتے کہتے وہ حوض سے باہر نکل پڑا اور کپڑے پہن کر محلے کی طرف ہولیا۔ ہم بھی اپنا دوپہر کا پروگرام ملتوی کرنے پر مجبور ہوگئے۔ محلّہ میں داخل ہونے سے قبل

مرزا اظہار بیگ کے مکان کے سائے میں ذرا رُک کر کہنے لگا: "یار آج بہت بری ہوئی ہے"۔ اور اس کے بعد دتن کے پنجہ میں قابو آنے اور کان مروڑے جانے کا قصہ سنا کر کہا: "اس کی تو کوئی بات نہیں۔ دتن کے بچے کو غلے مار مار کر یوں کر دوں گا جیسے بینگن کا بھرتہ، مگر افسوس یہ ہے کہ اس کمبخت نے میری غلیل چھین لی ہے"۔ اس کے بعد تجویز طلب نظروں سے سب کی آنکھوں میں ایک بار جھانکا۔ ذرا سے وقفہ کے بعد لطیف لمبا بولا "وہ موٹا تھانیدار ہمارے پڑوس میں رہتا ہے، چلو اُس سے کہیں۔" سب لوگ پوری سنجیدگی سے تھانے پہنچ گئے۔ لطیف کو دیکھتے ہی تھانیدار ڈکرایا: "اوئے جمورے! ایدھر کِدھر؟" اور لطیف لمبے نے رُندھی ہوئی آواز میں تمام کہانی سنائی۔ تھانیدار نے اسی وقت ایک پیادے کو ناس پورہ دوڑایا کہ وہ دتن کو بلا لائے اور ہمیں کہا: "دن ڈھلے آنا"۔

ہم سب جمع ہو کر جب شام سے ذرا پہلے تھانے پہنچے تو دتن کو کان پکڑ کر مرغا بنے ہوئے پایا۔ ہمیں دیکھ کر تھانیدار بولا: "لو بھئی کاکو (لڑکو)! تمہارا مجرم حاضر ہے"۔ یہ کہہ کر دتن کو ایک لات رسید کی اور کہا بھاگ جاؤ اور صبح دن چڑھے سے قبل غلیل یہاں پہنچا دو۔ صبح ہم غلیل وصول کرنے کے لئے جب چوکی گئے تو دتن کو منتظر پایا۔ تھانیدار ابھی گھر سے نہیں آیا تھا۔ دتن نے ہاتھ باندھ کر ایک بھدّی سی غلیل جس کو سوت کی کچّی ڈور سے باندھا گیا تھا۔ ہمارے سامنے پیش کیا اور منتیں کرنے لگا: "واہگرو کے لئے یہ لے لو"۔ ہم نے اس سے پوچھا: "جیدے کی غلیل کیا ہوئی؟" تو قریباً رو کر کہنے لگا: "میں نے وہ گلول لے کر کھوہ (کنوئیں) میں پھینک دی تھی۔ پانی میں بھیگ کر اس کی دوشاخی لکڑی پھٹ گئی اور ٹیوب سے کٹی ہوئی ربڑ کی باریک کترنیں کھل گئیں۔ اس لئے راتوں رات گاؤں کے ترکھان سے یہی کچھ گھڑوا کر دال دلیا کر کے لے آیا ہوں۔ اب کے ماف کر دو، پھر کبھی ایسی گلتی نہیں ہوگی"۔ اور ہم نے سچ مچ اسے معاف کر دیا اور تھانیدار کے آنے سے قبل ہی اپنی بگڑی ہوئی ہئیت کی گلول لے کر چلے آئے۔

کل مجھے اپنے روزمرّہ کے کام کے سلسلہ میں خاکی پتلون اور سولا ہیٹ پہنے ہوئے اپریل کی ایک تپتی ہوئی دوپہر کو درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہوا اور میں سستانے کے لئے وہاں ذرا رکا۔ ہیٹ اتار اس سے پنکھا کرنے لگا کہ دور سے روں روں کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ درختوں کے جھنڈ کو چیر کر میں رہٹ پر پہنچا۔ پانی پیا، منہ دھویا، سر پر گیلا ہاتھ پھیرا اور جب ذرا دم میں دم آیا تو بے اختیار عیدگاہ یاد آگئی اور اس کے ساتھ ہی اُونٹوں کی قطاریں دُم اور نکیل کی طرح بات سے بات مربوط ہو کر سامنے آنے لگی۔ مجید کالو یاد آیا جو اب کسی کپڑے کی مل میں کھڈی بنتا ہے، رشید اتیلی سوٹ پہنتا ہے، لطیف لمبا کسی کالج میں لیکچرر ہے۔ تابی ٹیٹ کا اب مونچھیں لگائے خانصاحب آفتاب احمد خاں بن گیا ہے اور کسی دفتر میں کلرک ہے۔ یوسی نے کھیوڑہ میں نمک کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور میں گاؤں گاؤں پیدل پھر کر اپنے رزق کے دانے مہیّا کرتا پھرتا ہوں۔ عیدگاہ کسی دور 'پرانے' دیس میں رہ گئی ہے! وہاں مدفون میرے بہن بھائی کی قبروں پر ماتا کی گھٹاؤں سے ٹپکے ہوئے آنسو اب پھول بن کر نہیں گرتے۔ اب وہاں ڈھور چرتے ہیں۔ اب 'شاہوں' کے کنوئیں پر کوئی اور ہی براجمان ہے۔ عیدگاہ کی چونے گچ دیوار پر کالی پھپھوندی نے روغن کر دیا ہوگا۔ عیدگاہ کے چٹیل میدان میں جہاں عید کے روز بار بار "اللہ اکبر — اللہ اکبر" سنائی دیتا تھا۔ اب اور لڑکے گلی ڈنڈا کھیلتے ہوں گے۔ پیر جی کی چوکھنڈی کی اینٹیں اُکھڑ چکی ہوں گی۔ ان کے مزار پر ہر جمعرات کو جلنے والے دیئے اب ٹھیکریوں کی صورت میں بکھرے ہوں گے۔ آم کی چوٹی پر لہرانے والا فیروزی رنگ کا جھنڈا کبھی کا تار تار ہو کر ہوا میں تحلیل ہو چکا ہوگا۔ عیدگاہ کے چاروں کونوں پر بڑ کے درخت ذرا اور بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ گہرے سبز رنگ کے جالے سے ڈھکے ہوئے جوہڑ میں بھینسوں کے لوٹنے سے اب یہ سبز قالین چیتھڑے ہو چکا ہوگا۔ مندر کے ساتھ والے باغیچہ کی باڑ اب چھ فٹ سے بڑھ کر بارہ فٹ موٹی ہو چکی ہوگی اور اب اس میں سے ہاتھی کا گزرنا بھی محال ہوگا۔ باغیچہ کے امرودوں، آڑوؤں اور شہتوتوں کے پودے جن کے تنوں کے درمیان سے گزرنا اب اور بھی مشکل ہوگا۔ ایک لق و دق چھتری کی صورت میں پہلے سے اونچے ہو گئے ہوں گے۔ لیکن ڈھاک کا وہ پُراسرار جنگل اب پہلے سے بھی گنجان ہو گیا ہوگا۔ اس کی ٹھنڈی بسیلی چھاؤں میں میٹھی ہوئی قبروں کے گڑھوں میں کھٹی بوٹی زور شور سے اُگ آئی ہوگی اور درختوں کی چوٹیاں شعلہ رد کیسوؤں سے ڈھک گئی ہوں گی۔ پگڈنڈی پر سے گزرنے والے راہی یقیناً یہاں سے جھولیاں بھر بھر کر پھول لئے جاتے ہوں گے اور میری بستی میں بسنے والے بچے گروہ در گروہ 'طوطے' چننے کے لئے وہاں پہنچتے ہوں گے۔ تلیروں کے پچھے اور بیباک ہو گئے ہوں گے۔ پیلے منہ والا بابا کبوتو یقیناً مر کر راکھ ہو چکا ہوگا۔ اور اب اس کے بیٹے باری باری گاڑی پر لیٹ کر سوتے ہوں گے۔ لیکن آہ! اس کے تصور سے ہی میرے دل کے کسی گوشے میں محفوظ کیسو کھلا کر جمے ہوئے خون کا رنگ پکڑنے لگتے ہیں، پھر ان کی پتیاں سلگ اٹھتی ہیں اور ان کے گاڑھے دھوئیں کی تلخی جب میری آنکھوں میں پہنچتی ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے باریک سوئیوں کی تپی ہوئی لال سرخ نوکیں میری آنکھوں کو چھید رہی ہیں اور ان لال بھبوکا سوئیوں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے میری آنکھوں کا نور پانی کی بوندوں میں ڈھلنے لگتا ہے!

افسانہ:

عنایت اللہ

مختار بائیس برس کی عمر میں ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ ایک برس پرانی کھانسی شدید دمہ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ وہ جوان تو جیسے ہوا ہی نہیں تھا۔ لڑکپن سے ایک ہی جست میں بڑھاپے تک پہنچ گیا تھا۔ چہرہ مرجھایا ہوا، بے نور۔ دور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھوں کے گرد سیاہ گھیرے، اور سر کے بال سفید ہونے لگ گئے تھے۔ اس کی ماں، مائی مریم، اس کے لئے دن بھر دوا دارو، تعویذ ٹوٹکوں اور خانقاہوں کے چکر میں گذار دیتی تھی یا ہر آئے گئے کو اپنے اکلوتے بیٹے، مختار کا دکھڑا سناتی رہتی تھی۔ ماں بیٹے کی زندگی مسلسل روگ بن گئی تھی۔ محلے کے ہر چھوٹے بڑے کو، قصبے اور مضافات کے حکیموں، سیانوں اور ڈاکٹروں کو، پیروں، فقیروں اور مولویوں کو اور سولہ کوس دور ایک جھگی میں دھرنا مارے بیٹھے سائیں عمرو کو بھی مائی مریم کے بیٹے کے روگ کی تفصیلات زبانی یاد ہو گئی تھیں۔ ماتا کی ماری نے دمے کی گرفت میں کراہتے ہنکارتے اور تڑپتے ہوئے بیٹے کے گرد توتلوں، پڑیوں، پھنکیوں، جڑی بوٹیوں، تعویذوں، اور کئی خانقاہوں کی خاک اور چھوٹے چھوٹے پتھروں کے ڈھیر لگا دئے تھے۔ وہ بھی یوں جیسے محاذ پر سپاہی ریت کی بوریوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا کر موت کے خلاف سینہ سپر ہو جاتا ہے +

مائی مریم نے قصبے کا کوئی حکیم، ڈاکٹر اور سیانا نہ چھوڑا۔ سب کو باری باری بارہ بارہ، چودہ چودہ روز آزما دیکھا۔ ڈاکٹروں وغیرہ نے مائی مریم کی بساط سے بڑھ کر پیسے وصول کئے اور علاج اپنی بساط کے مطابق کیا۔ مریض کو اس قدر انجکشن لگ چکے تھے کہ دمہ پسلیاں توڑ رہا تھا اور ڈاکٹروں نے بازو چھلنی کر کے ایک اور روگ پیدا کر دیا تھا۔ اس کے بعد حکیموں کے نسخوں نے شربتوں نے باقی بے زنبیل کا کام کیا +

مجبوراً ماں اپنی محنت کی کمائی کلوتے بیٹے کی اکھڑی ہوئی سانسوں کا تسلسل قائم کرنے میں صرف کرتی رہی۔ زیور بک گیا۔ گھر کے کئی اچھے اچھے برتن جن میں زیادہ تر جہیز کے تھے اور جن میں مائی مریم کا ماضی مسکرا رہا تھا، کوڑیوں کے داموں نکل گئے۔ بودھیلا ٹکا بچا تھا وہ پیر فقیر، مولوی اور خانقاہوں کے مجاور لے گئے تھے۔ بیٹے کے اس جان لیوا مرض کے ساتھ ساتھ ایک اور بے چینی کھائے جا رہی تھی۔ سائیں عمرو نے اسے کہا تھا "ایک دنبہ زندہ جس کی گردن میں سوا چھ روپے اور سات چھٹانک نمک کی ڈلی بندھی ہوئی ہو لے آؤ۔ ہم چالیس روز اس پر دم کریں گے اور چالیسویں رات کے بارہ بجے مریض کو اس دنبے کی کلیجی کھلائیں گے ..... اس کے سوا مریض کا کوئی علاج نہیں" لیکن مائی مریم تیس پینتیس کا دنبہ اور سوا چھ روپے کہاں سے لاتی؟ آمدنی پہلے ہی کم ہو گئی تھی اور ساتھ کے ساتھ جو آمدنی ہوتی تھی وہ مختار کا دمہ چوستا جا رہا تھا۔ دو ایک جگہوں سے، ادھار، سا تو وہ رستے میں ہی کسی ڈاکٹر، حکیم یا سیانے نے دھروا لیا +

مائی مریم کا اس دنیا میں اپنا عزیز رشتہ دار کوئی نہ تھا، سوائے اس اکلوتے بیٹے کے۔ وہ قصبے کی تجربہ کار دائی تھی اور قصبے کے گلی گلی، کوچے کوچے میں اس کے ہاتھ کے سینچے ہوئے منیخے مسکرا رہے تھے۔ جانے کتنے بچوں نے اس کے ہاتھوں میں جنم پایا تھا اور جانے کتنی ہی عورتوں کو اس نے زچگی کے جانکاہ مرحلے سے بخیر و خوبی گذار دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں خدا نے ایسا ا ہر دیا تھا کہ بچہ خواہ الٹا ہو، ٹیڑھا ہو یا مرا ہوا ہی کیوں نہ ہو، کیا مجال کہ زچہ کو زیادہ تکلیف ہو جائے۔ ہونے والی ماں اگر اس تا ر ک ..... ایسی باتوں میں لگا لیتی تھی کہ ماں فخر سے پیٹ میں چبھتی ہوئی چھریاں اور بچھوؤں کے ڈنک برداشت کر لیتی تھی۔ مائی مریم دائی کی زندگی ..... یہ ایک داستان ہے۔ مختصر یہ کہ پیشہ اس کا آبائی نہ تھا۔ چوبیس برس پہلے کا حادثہ ہے کہ مریم کا خاوند شادی کے دو سال بعد اور مختار کی پیدائش سے دو ماہ پہلے، دور پردیس صوبہ بنگال، میں مر گیا تھا۔ مریم اس کے ساتھ تھی۔ روزی نے میاں بیوی کو اپنے دیس پنجاب سے بہت دور پھینکا ہوا تھا۔ مریم شادی کے تیسرے ہی روز اپنے خاوند کے ساتھ بنگال چلی گئی تھی۔ اسی دوران میں اس کے ماں باپ بھی مر گئے۔ اتنے دور پردیس میں تنہا رہ جانا اور وہ بھی اس حالت میں کہ پیٹ میں بچہ ..... صرف دو مہینے باقی تھے۔ مریم نے اس سمپرسی میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ زچگی کے بعد ہی آئے

وطن پنجاب کا رُخ کیا جائے۔ پنجاب میں بھی اس کے لئے اب کیا کشش تھی۔ اپنے جو تھے وہ اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ گئے تھے۔ اگر کچھ باقی تھا تو ڈھولک کے اُن گیتوں کی گونج باقی تھی جو اس کی سہیلیوں نے اس کی شادی پر گائے تھے۔ یہ گونج ابھی تک اس کے ماں باپ کے اجڑے ہوئے گھر میں سو رہی تھی۔ اور سہیلیاں؟ مریم جانتی تھی کہ وہ بھی ایک ایک کرکے اپنے اپنے آشیانے جانے کہاں کہاں بنا چکی ہیں۔

مریم کے پیٹ میں یہ بچہ پہلا بچہ تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ مرحلہ کہاں سے اور کس طرح شروع ہوتا ہے اور کسی کو مدد امداد کے لئے بلانے کا صحیح وقت کونسا ہوتا ہے۔ وہ رات تاریک تھی اور سرد جب مریم کے پیٹ میں کرخت درد اٹھا تھا۔ یہ درد لہروں کے زیر و بم کی طرح آتا اور جاتا رہا۔ بڑھتا اور گھٹتا رہا تھا۔ تنہائی، آدھی رات کا وقت، پردیس، اڑوس پڑوس والوں کے ساتھ راہ و رسم تو ابھی تھی لیکن اس نے آدھی رات کو کسی کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں گر پڑی ہے اور مگرمچھوں کے لمبے لمبے دانت اس کے پیٹ میں اُترتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لالٹین کی ٹمٹماتی ہوئی لَو دھندلی ہو گئی تھی۔ پھر اندھیرا گھُپ اندھیرا۔ جب وہ اپنے آپ آئی تھی تو محلے کی دو ادھیڑ عمر عورتیں اور ایک معمر عورت اس کے اردگرد افراتفری کے عالم میں گھوم پھر رہی تھیں پیشتر اس کے کہ وہ پوچھتی "یہ کیا ہوا تھا؟ . . . . میں کہاں تھی؟ . . . . اب کہاں ہوں؟" کہ اس کے کانوں میں بچے کی "آغوں۔ آغوں" کی انتہائی پیاری آواز پڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک بھاری بھرکم گرسریلی آواز اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ سنائی دی تھی جس نے مریم کا سارا درد چوس کر اس کے رگ و ریشے میں ایک مقدس سا سکون بھر دیا تھا ——— دُنیا میں مختار کی یہ پہلی صبح تھی۔

معمر عورت دائی تھی جسے یہ دو عورتیں پڑوس سے مریم کی چیخ و پکار اور واویلا سن کر بلا لائی تھیں۔ یہ سب کچھ اس کی غشی کی حالت میں ہوا تھا۔ اس روز کے بعد اس بوڑھی دائی نے مریم کی کسمپرسی پر ترس کھاتے ہوئے زیادہ تر وقت اسی کے پاس گذارنا شروع کر دیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ مریم پردیسن ہے اور بیوہ۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ مریم کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ مریم نے اسے بتایا تھا کہ پنجاب کے ایک قصبے میں اس کے آبا و اجداد کا مکان ہے۔ بوڑھی دائی نے ایک نیک ارادہ دل میں لے کر مریم کو اپنے ساتھ لگا لیا تھا اور اسے دائیوں کا کام سکھا دیا تھا مریم کو بھی چند مہینوں میں اچھی خاصی دائی جیسی مہارت حاصل ہو گئی تھی۔ بوڑھی دائی کا ایثار تھا کہ اس نے مریم کو قصبے کا آدھا حصہ دے دیا تھا اور اس طرح اس کی آمدنی شروع ہو گئی جو بڑھتے بڑھتے اس کے مرحوم خاوند کی ماہانہ تنخواہ سے تین بعض دفعہ چار گنا ہو جاتی تھی۔ مریم نے مختار کو لاڈ و پیار اور چاندی میں پالنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے سال کے آخر میں اس کے پاس ڈیڑھ پونے دو ہزار روپے جمع ہو گئے تھے اور اس نے بوڑھی دائی کے پاؤں چھو کر الوداع کہی اور پنجاب چلی آئی تھی۔ یہاں آکر اس نے اسی پیشے کو ذریعہ معاش بنایا۔ ہر طرف مشہور ہو گئی اور آمدنی بھی اچھی ہوتی رہی۔

کمایا تو اس نے خوب لیکن دماغ میں اتنی وسعت اور بلندی نہیں تھی کہ اس قدر کمائی کا کوئی بہتر مصرف سوچ سکتی۔ ہوا یہ کہ اس نے ضرورت سے زیادہ آمدنی سے مختار کو بگاڑنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی تمام تر توجہ کی طرح اس نے روپے پیسے اور اخراجات کا بھی مرکز مختار کو بنا لیا تھا۔ لاڈ پیار کی بھی یہ حد کہ بچہ آدھی رات کے وقت پیشاب کے لئے اٹھا اور کسی ایسی چیز کی فرمائش کر دی جو گھر میں نہیں ہے تو مریم نے اسے سلا دینے کی بجائے خواہ دس دروازے کھٹکھٹانے پڑے بچے کی فرمائش اور ضد ضرور پوری کی۔ چھٹے برس سکول بٹھایا تو بچہ سکول سے بھاگ کر ماں کی گود میں آ چھپتا تھا۔ ماں نے سختی کی تو مختار نے صحن کی مٹی ایڑیوں سے کھود کر آسمان تک پہنچا دی۔ مریم کے پاس دوسرا علاج پیسہ تھا۔ اس نے مختار کو دو چار پیسوں کی جگہ دو چار آنے دے کر سکول بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ اس رشوت ستانی نے مریم کی آنکھوں میں یہ دھول جھونکی تھی کہ "بچے کا دل سکول میں لگ گیا ہے" لیکن پہلی کے ماسٹر سے پتہ چلا تھا کہ "بچہ سکول سے بھاگ جاتا ہے"۔ مریم کو اور تو کوئی علاج نہ سوجھا، اس نے ماسٹر کو پانچ سات روپے ماہانہ دینے شروع کر دیئے تھے کہ مختار کو کسی نہ کسی طریقے سے پڑھائی میں لگا لے۔ اس رشوت یا اجرت نے یہ کام کیا تھا کہ مختار دوسری جماعت تک پہنچ گیا پھر دوسری جماعت کے ماسٹر کی بالائی آمدنی شروع ہو گئی تھی اور یہ آمدنی چھٹی جماعت کے ماسٹر پر جا ختم ہوئی تھی کیونکہ مختار اب سکول سے بھی اور گھر سے بھی غائب رہنے لگ گیا تھا۔ اس کے علاوہ چھٹی جماعت کا ماسٹر بھلا آدمی تھا۔ اس نے مریم کو دیانتداری سے خبردار کر دیا تھا کہ "لڑکا آوارہ ہو چلا ہے اس پر یوں پیسے برباد نہ کرو۔ گھر میں ماسٹر بٹھالو اور لڑکے کو نظر میں رکھو۔"

مریم کو دکھ ہوا تھا۔ اس نے اس بچے کی خاطر جوانی کی اُمنگیں سینے میں دبالی تھیں اور زندگی کا سارا سوز اس اکلوتے بچے پر مرکوز کر دیا تھا۔ اس نے شادی کے کئی پیغام ٹھکرا دیئے تھے لیکن بچہ اس کی تمناؤں کا خون کر رہا تھا۔ "کاش! میں دوسری شادی کر لیتی۔ شاید مرد اس لڑکے کو راہ پر چلا لیتا۔" لیکن مریم نے اس خیال کو جھٹک دیا اور اپنے اندر مردانہ خود اعتمادی اور استقلال پیدا کر لیا۔ اس نے مختار کو تعلیم کی طرف ڈالنے کے لئے نئی راہیں تلاش کرنی شروع کر دیں لیکن

ہر راہ لاڈ و پیار سے شروع ہوتی تھی اور لاڈ و پیار میں ہی جا ختم ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ مختار بہت دور پہنچ چکا تھا۔ مریم کو اس فاصلے کا اندازہ اس روز ہوا تھا جس روز اس نے بارہ سالہ مختار کو گود میں لے کر پیار کیا تو اسے لڑکے کے منہ سے تمباکو کی تیز بدبو آئی تھی۔ مریم کا تو کلیجہ ہی ہل گیا تھا۔ اس نے اسے لاڈ پیار سے سمجھایا۔ پیسوں کا لالچ دیا لیکن مختار نے اب اپنی قیمت بڑھا دی تھی۔ اب وہ دو چار آنے پہ تو راضی ہی نہ ہوتا تھا۔ مانگتا تھا تو پورا روپیہ مانگتا تھا۔ اگر نہ ملے تو گھر کے کسی نہ کسی برتن کی خیر نہیں۔ اس طرح کئی برتن ٹوٹ گئے تھے لیکن مریم کا دل ابھی ثابت و سالم تھا۔ محلے کی عورتوں نے اسے کئی بار کہا تھا "مریم بہن! مختار ماشاء اللہ جوان ہو گیا ہے ذرا ڈانٹ ڈپٹ رکھا کرو۔ سنا ہے لوفر لفنگوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔" اور مریم نے پیار بھری ہنسی ہنس کر ٹال دیا تھا "اری بہن! بیوہ کا بیٹا بادشاہ کا بیٹا۔ بچہ ہی تو ہے۔ خود سنبھل جائیگا۔ دو چار برس بعد شادی کرا دوں گی اور بہو خود ہی سنبھال لے گی۔ ابھی تو کھیلنے کے دن ہیں لے چارے کے۔"

یہ دو چار برسوں بعد کا تصور مریم کو جانے کونسے سہانے سبزہ زاروں میں لے گیا تھا۔ اس نے دو چار برس کا عرصہ خیالوں کی ایک چھلانگ میں طے کر لیا تھا لیکن مختار ماں کے ذہن میں بسے ہوئے ان سبزہ زاروں کی طرف جانے والی پگڈنڈی سے ہٹتا گیا، ہٹتا گیا، ہٹتا ہی گیا تھا اور بھٹک کر ایسی کھائی میں جا گرا تھا کہ ماں پورا پورا دن اور بعض دفعہ پوری پوری رات بیٹے کو دیکھنے کو بھی ترسنے لگی تھی:

مختار کی عمر سولہ برس ہو چکی تھی اور مریم اب مائی مریم بن گئی تھی۔ بعضوں کا بچپن پیچھے رہ جاتا ہے بعض جھٹک دیتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو بچپن کو بڑھاپے تک اپنے اوپر آسیب کی طرح سوار پاتے ہیں یہ حال مختار کا تھا۔ مختار بڑا ہو گیا تھا لیکن ماں نے اس کے کردار میں "بچے" کو بڑا نہ ہونے دیا تھا۔ ماں کے اس پیار بھرے تعاون نے اور بچپن کے زندہ جاوید اثرات نے مختار کو گمراہ کر کے رکھ دیا تھا۔ اب تو وہ بہت ہی دور نکل گیا تھا۔ اس دوری کا احساس مائی مریم کو اس روز ہوا تھا جس روز اس نے جانے کیوں ٹرنک کھولا تو اس کے کونے میں سے پڑوسن کی امانت کا سو روپیہ غائب پایا۔ جو اسے اپنے پیسوں میں سے پورا کرنا پڑا تھا۔ سو کے اس نوٹ کے ساتھ مختار بھی غائب تھا۔ مریم نے اپنا سر پیٹ لیا اور چوتھے روز مختار سامنے آیا تو اس کا سر چوم لیا:

مختار جھومتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا تھا۔ آنکھیں چڑھی ہوئیں جیسے کئی راتوں سے سویا نہ ہو۔ بال بکھرے ہوئے۔ ہونٹ خشک اور چہرہ اترا ہوا تھا چہرے کے ایک ایک نقش اور چال ڈھال سے آوارگی اور گناہ کی بو اٹھ رہی تھی اور یہ بو اس کے گرد اس طرح منڈلا رہی تھی جس طرح خارش زدہ کتیا کے گرد مکھیاں بھنبھنا رہی ہوتی ہیں۔ مختار کا اس وقت کا حال حلیہ اس منظر سے کم نہ تھا۔ مریم نے لپک کر چھوٹے ہوئے بیٹے کو بازوؤں میں دبوچ لیا تھا اور وارفتگی کا یہ عالم کہ مریم کو بہت دیر بعد یہ خیال آیا تھا کہ مختار کے منہ اور بدن سے انوکھی سی بدبو آ رہی تھی جو تمباکو سے زیادہ مکروہ اور گلی سڑی تھی۔ اگر وہ ماں نہ ہوتی تو شاید قے کر دیتی لیکن اس بدبو میں ماں کو اپنے بیٹے کی بھینی بھینی آ رہی تھی۔ مائی مریم نے اسے نہلایا دھلایا۔ کپڑے تبدیل کرائے پاس بیٹھ کر کھانا کھلایا۔ وہ سولہ برس کا نہ ہوتا تو مریم اسے گود میں بٹھا لیتی۔ اس نے آہستہ سے مختار سے پوچھا کہ وہ کہاں رہا ہے اور "کیا سو روپیہ تم ہی لے گئے تھے میرے لال؟" مختار نے قہر آلود نگاہوں سے ماں کو دیکھا تھا اور رندانہ نگل کر بم کی طرح پھٹتے ہوئے کہا تھا "ہاں! میں لے گیا تھا" ماں تو دب گئی تھی لیکن ممتا تڑپ اٹھی تھی۔

اس روز کے بعد مختار گم رہنے لگا تھا۔ کبھی رات کو گھر آتا تھا تو ماں کے قریب ہو کر بھی وہ گم رہتا تھا۔ کھویا ہوا۔ آنکھیں بے چین۔ ہاتھوں کی حرکتوں سے کسی بے قراری کا پتہ ملتا تھا۔ بات بات پر وہ بلنے کو آ جاتا تھا۔ چڑچڑا پن بھی ایسا کہ مریم ڈر اور پیار کے مارے کچھ نہ کہتی تھی اور تنہائی میں خونِ جگر پی کر آنسو بہا لیتی تھی۔ دن گزر رہے تھے۔ پھر مہینے گزرنے لگے اور مختار دن بدن زرد پیلا ہوتا جا رہا تھا آنکھیں اندر کو دھنستی جا رہی تھیں کئی کئی روز کپڑے نہ بدلتا تھا کنگھی بھی کبھی ماں نے کر دی تو بال سنور گئے ورنہ وہاں تو جوؤں کا بسیرا تھا۔ مریم کے پاس آنسوؤں کے سوا علاج ہی کیا تھا۔ بیٹے کی زبوں حالی کے غم سے وہ قبل از وقت مائی مریم بن گئی تھی ورنہ چھتیس پینتیس برس بھی کوئی عمر ہوتی ہے! اس نے روپے پیسے سے بیٹے کو واپس لانا چاہا تھا لیکن بیٹا گھر میں روپیہ پیسہ چھوڑتا ہی کہاں تھا۔ جہاں اس نے ذرا مزاحمت کی بیٹا مرنے مارنے پر تل گیا۔

اس وقت بھی مریم نے خانقاہوں پر نذر نیاز مانی تھی۔ دی بھی تھی اور اونچی مسجد کے مولوی صاحب سے کتاب بھی نکلوائی تھی۔ مولوی صاحب اس روز موڈ میں نہیں تھے۔ ان کی بہو اُن کے اچھے بھلے بیٹے کو دھتکار کر میکے جا بیٹھی تھی۔ بیٹا روتا تھا اور بہو، سنا تھا، کہ ہنستی کھیلتی سرسوں کے پھولوں کے ہار بنائی رہتی تاہم مولوی صاحب نے بند کتاب پر مائی مریم سے سوا روپیہ رکھوا فال نکالی تھی اور اسے بتایا تھا "تیرے بیٹے پر ایک عورت کا سایہ ہے۔ ہر شام پانچ پیسے کا تیل مسجد میں ڈالا کرو۔ اور جمعرات سوا سیر چاول باسمتی کا زردہ پکا کر مسجد میں لے آیا کرو جسے ہم دم کر کے دو نوالے مختار کے لئے دیا کریں گے" مولوی صاحب

نے ایک تعویذ بھی دیا تھا جسے ان کی ہدایت کے مطابق مریم نے مختار کی چارپائی کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ اس چارپائی کے ساتھ کہ جس پر مختار سویا بیٹھا ہو یا نہ ہو۔ چرس گانجے اور افیون کی بو دہیں بستی تھی ـــــــ اور تعویذ پر خدا اور رسولؐ کا نام لکھا ہوا تھا!

مائی مریم تعویذ کے اثر کی آس سے دکھی ہوئی زندگی کے شب و روز کو فریب دینے لگی تھی اور وہ اونچی مسجد میں رکھا ہوا کنستر تیل سے اور مولوی صاحب کا پیٹ باسمتی چاولوں سے باقاعدگی سے بھرتی رہی تھی۔ مختار پر جانے کس عورت کا سایہ تھا جو نہ ہٹا۔ مریم اس احساس سے بے بہرہ تھی کہ وہ عورت وہ خود ہی ہے اور اس کے بے جا لاڈ پیار کا آسیب اس کے بیٹے کو کھائے جا رہا ہے۔ پھر مریم کی زندگی نے وہ دن بھی دیکھا جب حاجی کرم دین نے اس سے پوچھا تھا: "مریم! مختار کا کچھ پتہ ہے کہاں ہے؟" "نہیں حاجی جی!" مریم کے آنسو بہہ نکلے تھے۔ ایک دکھ نے اس کی آواز حلق میں ہی دبوچ لی تھی اور بصد مشکل اسی قدر کہہ سکی تھی۔ "آج پانچ روز سے وہ لاپتہ ہے۔ گھر میں جو پیسہ دھیلا ہے وہ بھی لے گیا ہے۔"

"خدا کی بندی! خدا کو یاد کر۔ نماز روزہ کر اور بیٹے کی سلامتی کی دعا کر۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ جا قبرستان والے تکئے میں۔ مختار وہاں بے ہوش پڑا ہے۔ کمبخت نے چرس پی پی کر بُرا حال کیا ہوا ہے۔" "چرس!" مریم کی جیسے چیخ نکل گئی تھی۔

"آج سے نہیں۔ وہ دو برس سے چرس اور گانجا پی رہا ہے۔ جُوا بھی کھیلتا ہے۔ تمہیں ابھی پتہ ہی نہیں!" حاجی کرم دین نے کہا تھا: "ادھر آ میرے ساتھ۔ دو آدمی تیرے ساتھ بھیج دوں گا۔"

بے ہوش مختار کو دو آدمی تکئے سے اٹھا کر لائے تھے اور اس دن کے بعد اس کی کھانسی نہ تھمی جو کرتے کرتے دمہ بن گئی۔ علاج معالجہ شروع ہوا لیکن اسے ذرا سی فرصت اور افاقہ مل جاتا تو جا کے چرس کا کش لگا آتا تھا۔ پھر رات بھر اس کا سانس رکا رکا رہتا جیسے ابھی مرا کہ مرا۔ وہ تو نہ مرا لیکن مریم رات کو سو سو بار مرتی تھی۔ اور اب بگڑا ہوا دمہ اس کے انگ انگ کو چلا رہا تھا۔ ایسی ہی ایک رات جبکہ مختار کی سانس کتنی کتنی دیر رکی رہتی تھی۔ آنکھوں کے ڈھیلے باہر آ جاتے تھے اور وہ ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا تو مریم کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔

"یا مولا! میں نے تو دعا کی تھی کہ میرا بچہ صحیح و سالم پیدا ہو اس کا کوئی عضو مارا ہوا نہ ہو۔ پیدائشی اندھا نہ ہو۔ اچھے کی طرح لنگڑا ٹنڈا نہ ہو۔ اے خدا اس اچھے بھلے لڑکے سے تو مجھے پیدائشی اندھا یا لنگڑا بچہ دے دیتا تو مجھ سے یوں تو نہ بھاگتا۔"

مریم کی یہ دعا بظاہر انوکھی سی لگتی تھی لیکن اس کے پس منظر میں چند تجربے چھپے ہوئے تھے جن کا مریم کی زندگی میں بڑا دخل تھا۔ گذشتہ چوبیس برسوں میں مریم کے ہاتھوں میں ہزاروں بچوں نے جنم لیا تھا۔ ان میں بے شمار ایسے تھے جو قبل از وقت پیدا ہوئے تھے اور جنہیں زندہ رکھنے کے لئے مریم نے خون پسینہ ایک کر دیا تھا۔ اُلٹے اور ٹیڑھے بچوں کو بھی وہ بڑی احتیاط اور محنت سے اس دُنیا میں بخیر و عافیت لے آئی تھی۔ کسی بچے کا زچگی میں ضائع ہو جاتا تو وہ اپنی موت سمجھتی تھی۔ بعض بچے جو ہڈیوں کا ڈھانچہ بنے ہوئے پیدا ہوتے تھے مریم کے ہاتھوں میں یوں لگتے تھے جیسے وہ انہیں اپنی زندگی دے رہی ہے۔ بچے کے منہ میں منہ ڈال کر پھیپھڑوں کو ہوا دے کر سانس رواں کرنے میں تو اسے خداداد قابلیت اور تجربہ حاصل تھا۔ گو وہ پیشہ ور دائی تھی لیکن اس کے انداز میں کاروبار کو ذرہ بھر دخل نہ تھا۔

اُسے چڑ تھی تو ان بچوں کے ساتھ کہ جو پیدائشی نقص دار پیدا ہوتے تھے۔ اندھے۔ ایک ہاتھ ٹیڑھا یا ٹانگ ٹیڑھی یا اس قسم کا اور کوئی نقص جو بڑے ہو کر انسان کو اپاہج اور لوگوں کے لئے تماشہ بنا دیتا ہے۔ یہ چڑ اس کے چھوٹے بھائی کی یاد سے وابستہ تھی جو تیرہ سال کی عمر میں مر گیا تھا۔ یہ بھائی مریم سے چار سال چھوٹا تھا اور اس کے بائیں بازو اور بائیں ٹانگ میں یہ پیدائشی نقص تھا کہ بازو کہنی سے نوّے درجے کے زاویے پر اکڑا ہوا تھا۔ بازو کندھے سے آگے پیچھے کو ہلتا تھا لیکن کہنی سے نیچے بالکل بے جان تھا۔ اس کا ہاتھ جو پیٹ پر رکھا رہتا تھا بے ڈھب طریقے سے مڑا ہوا تھا اور بائیں ٹانگ دائیں سے ذرا سی چھوٹی۔ ایڑی اوپر کو اٹھی ہوئی اور پاؤں باہر کو مڑا ہوا تھا۔ مریم کی ماں نے بہت جتن کئے تھے۔ ہر طرح کی مالشیں بھی کرائی تھیں لیکن بچے کا یہ نقص دور نہ ہو سکا تھا۔ جب بچہ بڑا ہوا تو اس کی چال دیکھ کر دیکھنے والوں کو ترس آتا تھا لیکن بچے اسے لنگڑا تیتہ کہہ کر پکارنے لگے تھے۔ جب وہ سکول میں داخل ہوا تو سکول میں بھی لنگڑا تیتر مشہور ہو گیا تھا۔ اور اس معذور بچے کا یہ حال کہ دن بھر لڑکوں سے لڑتا رہتا تھا۔ جہاں کسی نے لنگڑا تیتر کہہ دیا اس نے پتھر اٹھا کر پھینکنے شروع کر دیئے اور ایک بار ایسے ہی ایک موقعہ پر جبکہ وہ لڑکوں سے تنگ آ کر انہیں پتھر مار رہا تھا تو ایک پتھر پاس سے گزرتے ہوئے ماسٹر کے قریب جا پڑا۔ ماسٹر رک گیا اور

قہر آلود لہجے میں کہا "لنگڑے کے بجے پتھر لگ جاتا تو......؟"

جس ماسٹر سے وہ اپنی مظلومیت کی شکایت کیا کرتا تھا اسی نے اسے اس کی محرومی کا طعنہ دے دیا تھا۔ بچے کا چڑچڑا پن اور غصہ اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ اس نے گھر والوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا جس کی بظاہر کوئی وجہ نہ ہوتی تھی لیکن اس کے کردار میں اس محرومی نے اور اس محرومی پر ہنسنے والوں نے جو زہر بھر دیا تھا وہ بچے کے دل و دماغ کو جلانے لگ گیا تھا۔ ایک تلخی تھی کہ اسے کسی پل چین نہ لینے دیتی تھی۔ اس تلخ تشنگی کو وہ گھر میں دنگا فساد، لڑائی مار کٹائی اور برتن توڑنے میں بجھانے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ ماں باپ اس کی اندرونی کیفیت سمجھے بغیر اس سے اکتانے لگ گئے تھے اور دو تین بار ماں نے بھی غصے میں آ کر اسے لنگڑا تک کہہ دیا تھا۔ صرف مریم تھی جو اس کے دل کا حال سمجھتی تھی اور وہ اسے گود میں لے کر پیار کیا کرتی تھی۔ وہ کئی بار رو بھی دی تھی کہ ایک بھائی ملا اور وہ بھی اس حالت میں۔ مریم نے بھی کئی بار محلے کے بچوں کو ڈانٹا تھا اور ایک بار پڑوس والوں سے لڑائی بھی ہو گئی تھی۔

اس ماحول و فضا اور محرومی کی الجھن میں بچہ تیرہ برس کا ہو گیا تھا۔ اس بے بسی اور دنیا کے ہر انسان کے ہنسی ٹھٹھے نے اس کے اعصاب کچل کے رکھ دیئے تھے اور اس پر دورے پڑنے لگے تھے۔ کسی نے مرگی کی تشخیص کی تھی۔ کسی نے شر شرارت بتایا اور بعض نے آسیب کہہ کر یہ حقیقت پس پردہ ڈال دی تھی کہ بچے کا شعور اس کے لاشعور کے پے بہ پے ڈنکوں کے زہر سے کبھی کا مر چکا ہے۔ پیشتر اس کے کہ اس کے ماں باپ اور گرد و پیش کے لوگ یہ حقیقت سمجھتے کہ بچے نے ایک دن دورے کی حالت میں آخری ہچکی لی اور چل بسا۔ مریم اس وقت سترہ برس کی تھی۔ روتی تھی اور روتی ہی رہی۔ پھر اس کی شادی ہوئی۔ پھر ماں باپ یکے بعد دیگرے مر گئے۔ خاوند مر گیا اور مختار پیدا ہوا لیکن وہ اپنے لنگڑے بھائی کو فراموش نہ کر سکی۔ وہ ہمیشہ دعا کیا کرتی تھی "خدایا! مجھے بچہ دینا ہے تو بھلا چنگا دینا ورنہ بے اولاد اچھی۔ اسی میں تیرا شکر ادا کرتی رہوں گی"

اس رات جب اس نے تڑپتے ہوئے مختار کے سرہانے بیٹھ کر دعا کی تو اسے معاً اپنے مرحوم بھائی کا لنگڑا پن یاد آ گیا تھا اور اس کا ذہن گزرے ہوئے چوبیس برسوں کی مسافت طے کر رہا تھا۔ ذہن پیچھے کو چل پڑا۔ اسے ایک بچہ یاد آ گیا۔ جو پیدا ہوا تو مریم نے دیکھا کہ اس کا ایک بازو اور ٹانگ اس کے بھائی کی طرح تھیں۔ اس مولود کو دیکھ کر اسے اپنا بھائی، اس کی تیرہ سالہ تلخ زندگی اور اس کا انجام یاد آ گیا۔ اتفاق سے اس بچے کے سانسوں کا تسلسل درست نہ تھا جیسے مریم منہ میں منہ ڈال کر یا بچے کو الٹا سیدھا کر کے درست کر سکتی تھی لیکن مریم نے چشم زدن میں تصور میں دیکھ لیا تھا کہ بچہ بڑا ہو گیا ہے۔ سکول داخل ہو گیا ہے اور لنگڑا [illegible] آوازیں اور بلند قہقہے اس پر گدھوں اور چیلوں کی طرح ٹوٹ پڑ رہے ہیں۔ اور وہ بچہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگی کے دورے سے مر گیا ہے۔ [illegible] دماغ پر تو مریم کا زور نہ چلتا تھا۔ اس کا جہاں تک زور چلا چلا یا ـــ اس نے بچے کی ماں کی نظر بچا کر بچے کی ناک اور منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بچے کی سانسوں کا تسلسل تو پہلے ہی بے قاعدہ تھا۔ سانس جو رکا تو دو ہی سیکنڈ بعد بچہ ذرا سا تڑپا اور بن کھلے مرجھا گیا۔ مریم نے ماں کو کہہ دیا کہ "بی بی! بچہ مرا ہوا پیدا ہوا ہے"

ازاں بعد اس کی گذری ہوئی زندگی کے چوبیس برسوں میں دو اور بچے ایسے آئے جنہیں مریم نے اپنے بھائی کے بھیانک انجام تک پہنچنے کی خار دار راہوں سے بچا لیا تھا۔ ان تین ہی جانوں کی متوقع تلخیوں اور صعوبتوں سے بچانے کے لئے مریم نے انہیں خدا کے سپرد کر کے نیکی کی تھی جس سے اسے سکون ملا تھا لیکن اس سکون کے ساتھ احساسِ گناہ بھی تھا جس سے مریم اکثر گھبرا جاتی تھی۔ "شاید میں قاتل ہوں!" چنانچہ وہ یہ راز اپنے آپ سے بھی چھپانے لگ گئی تھی۔

اس رات تڑپتے ہوئے مختار کے سرہانے بیٹھے ہوئے اسے اچانک اپنا بھائی یاد آ گیا اور یہ بچے بھی یاد آ گئے اور اس نے اپنے بیٹے کو چارپائی پر کراہتے ہوئے دیکھ کر اپنے آپ سے کہا "میرا مختار تو میری دعاؤں کے مطابق اچھا بھلا تندرست اعضاء لے کر پیدا ہوا تھا لیکن کس کام کا! یہ اچھا بھلا دماغ اور چھ تلے متناسب اعضا! کاش! یہ لنگڑا ہی پیدا ہوتا، چرسی بھنگی نہ ہوتا......" مریم یک لخت ساکت و جامد ہو گئی۔ ایک جانی پہچانی تلخی اس کے رگ و ریشے میں سرایت کر گئی۔ وہ لرز گئی اور اس نے مختار کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر اپنے آپ سے کہا "اللہ میرے مختار کو صحت دے گا۔ لنگڑے ہوں اس کے دشمن" اسے ایک گونہ قرار سا محسوس ہوا کہ "میرا مختار لنگڑا نہیں" اور اس کے دل میں ایک نفرت نے انگڑائی لی۔ ایک چڑ جو ہر لنگڑے بچے کو دیکھ کر اس میں پیدا ہو جایا کرتی تھی "لنگڑوں کی بھی بھلا کوئی زندگی ہوتی ہے؟ مصیبت! اپنے لئے بھی دوسروں کے لئے بھی۔ تف!" اس نے ان تینوں بچوں کی یاد کو ذہن سے نکالنے کے لئے ذہن کے پٹ کھول دیئے۔ ان یادوں کو اب وہ بالکل ہی بھول جانا چاہتی تھی۔ ذہن کے پٹ جو کھلے تو ایک اور بچے کی یاد اس طرح

گھس آئی جس طرح کھلے ہوئے منہ میں مکھی داخل ہو جاتی ہے دراصل یہ تھا وہ پہلا بچہ جسے اس نے مار دینا چاہا تھا لیکن ...

جب یہ بچہ پیدا ہوا تھا تو مریم کی نگاہ سب سے پہلے اس کی پیشانی پر پڑی تھی۔ پیشانی غیر معمولی طور پر چوڑی تھی اور پیشانی کے بائیں طرف ایک ننھا سا نشان تھا جیسے کسی پرانے زخم کا نشان ہوتا ہے۔ ایسا نشان مریم کے لئے عجوبہ تھا۔ اگر تازہ زخم ہوتا تو قابل فہم تھا لیکن نشان بہت پرانا معلوم ہوتا تھا۔ مریم نے قدرت کا کھیل سمجھ کر سوچنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بچے کی آنکھیں خاص طور پر بڑی اور دلنشیں تھیں اور اسی طرح چہرے کا ایک ایک نقش جاذبِ نگاہ تھا۔ یہ پہلا بچہ تھا جو اس کے دل کو بھا گیا تھا۔ قدرت نے پھولوں کی رعنائیاں نوزائیدہ کے چہرے مہرے میں سمو دی تھیں لیکن مریم کا دل دھک دھک کرنے لگ گیا تھا جب اس کی صد آفریں! صد آفریں! کہتی ہوئی نگاہیں بچے کی بائیں ٹانگ پر جم گئیں بچے کی بائیں ٹانگ دائیں سے اس قدر چھوٹی تھی کہ اس کا پاؤں دائیں ٹخنے کی بلندی سے بھی اوپر تھا۔ مریم نے سوچا تھا کہ یہ بچہ جب جوان ہو جائے گا تو اس کی بائیں ٹانگ دائیں سے کم و بیش چھ انچ چھوٹی رہ جائے گی۔ اسے اپنا بھائی یاد آ گیا تھا اور وہ اپنے آپ میں ایک سوچ میں گم ہو گئی تھی۔ پھر اس کے دل و دماغ میں ایک کشمکش پیدا ہو گئی تھی۔ اس کا کردار دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ ایک حصہ کہہ رہا تھا "ہاں" اور دوسرا چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا "نہیں نہیں"؟

"مائی مریم!" زچہ کی نحیف آواز آئی "چپ کیوں ہو گئی ہو۔ اگر لڑکی ہے تو کہہ دو کہ لڑکی ہے۔ تم جانتی ہو کہ ہمارا پہلا بچہ ہے اور ہم کس طرح آس لگائے بیٹھے ہیں۔ بچہ زندہ تو ہے؟" "مبارک ہو بی بی!" مریم کے منہ سے بے ساختگی سے نکل گیا تھا "اللہ زندگی دے۔ لڑکا ہے" اور ایک لنگڑا بچہ مریم کے ہاتھ سے بچ گیا تھا لیکن مریم ایک تاسف سے نہ بچ سکی تھی اور یہ تاسف اسے اکثر پریشان کرتا رہا تھا کہ اس بچے کو اس نے زندہ رکھ کر محلے اور سکول کے بچوں کے لئے تماشہ پیدا کر دیا ہے۔ ایسے میں اسے اپنا بھائی پھر یاد آ جاتا تھا لیکن وہ بچہ بنگال رہ گیا تھا "معلوم نہیں زندہ ہوگا یا مرگی کے دورے سے مر گیا ہوگا..." مریم نے مختار کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے دل میں کہا "خدا کرے مر گیا ہو بے چارہ! زندہ رہ کر وہ کس کام آئے گا۔ لنگڑے پن کی بھی حد ہوتی ہے۔ ایک ٹانگ دوسری سے اس قدر چھوٹی ......"

"ماں! ماں! پانی! ہائے۔ ہائے۔" مختار کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں نکلیں تو مریم کو سب کچھ بھول گیا اور وہ تڑپ اٹھی۔ ایک کٹورہ پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی جست میں مختار کو بازو کے گھیرے میں لے کر اٹھایا اور اس کا سر اپنے سینے کے ساتھ لگا گلاس اس کے منہ کے ساتھ لگا دیا۔ چرس تو اس نے مہینوں سے نہ پی تھی۔ چارپائی سے اٹھنا محال تھا لیکن چرس کی بو ابھی تک اس کے پھیپھڑوں میں باقی تھی۔ مریم نے زندگی کی ایک اور رات جاگنے اور رونے گذار دی۔

صبح مختار کی حالت زیادہ خراب ہو رہی تھی اور اب تو یوں لگتا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر، حکیم یا سیانا اسے بچا نہ سکے گا۔ کسی کی دوائی ذرہ بھر اثر نہ کر رہی تھی۔ تعویذ اور نذر نیاز بھی بے اثر تھیں۔ مرض میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ بعض اوقات تو نزع کی حالت طاری ہو جاتی تھی اور مریم نے آج پہلی بار اپنے آپ کو اس جان لیوا حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار کیا کہ مختار بچ نہ سکے گا۔

"مائی مریم! ایک حیلہ اور کر دیکھو" چھٹی آئے ہوئے ایک حوالدار نے اسے کہا۔ "شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے انسان تو حیلہ کرتا ہے۔"

"تم کسی خانقاہ کا نام لو بیٹا! میں سر کے بل چل کے جاؤں گی۔"

"خانقاہ نہیں مائی مریم!" حوالدار نے جواب دیا۔ "مختار کو راولپنڈی لے جاؤ۔ جامع مسجد کے عین سامنے ایک بنگالی ڈاکٹر نے نئی نئی دوکان کھولی ہے۔ جانے آج تک دمے کے کتنے ہی مایوس مریض اس نے ٹھیک کر دیئے ہیں۔ دمے کے علاج کا وہ ماہر ہے۔ کہتے ہیں کہ چار پڑیاں دیتا ہے اور ایک انجکشن لگاتا ہے اور مریض اٹھ کے چل پڑتا ہے۔ پنڈی کونسی دور ہے یہ دو سٹیشن تو ہے۔"

مائی مریم تو ڈاکٹروں کے نام سن سن کر اکتا گئی تھی۔ جو بیمار پرسی کے لئے آتا تھا کسی نہ کسی ڈاکٹر حکیم کا نام یا اپنا کوئی نسخہ بتا جاتا تھا۔ لوگوں کو نسخے بتانے کا تو خبط ہوتا ہے۔ مریم نے اسے بھی ٹال دینا چاہا لیکن بنگال کا نام سن کر سوتے ہوئے نغمے تھرک اٹھے اور جوانی کی کچھ یادیں امڈ آئیں۔ شادی کے آغاز کی بہاریں اس نے بنگال میں منائی تھیں۔ اسے بنگال کا ذرہ ذرہ اور بچہ بچہ خوبصورت دکھائی دیتا تھا اور یوں بنگال اس کے رگ و ریشے میں سما گیا تھا۔ آج بیس بائیس برس بعد اس نے کسی بنگالی کا نام سنا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ خود تو بوڑھی ہو گئی ہے لیکن یادیں ابھی جوان ہیں۔ اس نے

بنگالی کے لفظ میں کچھ ایسی کشش پائی کہ جانے کو تیار ہو گئی ورنہ یہ تو اسے یقین تھا کہ مختار اب ہاتھ سے گیا۔

مائی مریم نے قصبے کے گھر گھر کی خدمت کی تھی، کون انکار کرتا۔ ایک آدمی ساتھ ہو لیا اور مختار کو راولپنڈی لے آئے۔ مریم ساتھ تھی۔

"ڈاکٹر صاحب! میں کیمبل پور سے آئی ہوں۔ میرے اکلوتے اور جوان بیٹے کی زندگی آپ کے ہاتھ میں ہے.... " اور اس نے رو رو کر مختار کا سارا حال کہہ سنایا لیکن اس کے کہنے کے انداز میں کچھ ایسی جھلک تھی جیسے ڈاکٹر کو کہنا چاہتی ہو۔ "ڈاکٹر صاحب! میں اپنی جوانی بنگال میں چھوڑ آئی تھی۔ آپ نے ذہن ہو گی کہیں! اور میرے دکھیارے بچے کا باپ بھی وہیں رہ گیا تھا۔ بنگال کی سرزمین سے مجھے بہت پیار ہے ڈاکٹر صاحب!" لیکن وہ مختار کا حال سناتی رہی اور مختار ڈاکٹر کے قریب کرسی پر بیٹھا بڑی مشکل سے سانس لے رہا تھا۔ "ڈاکٹر صاحب! سخت نادار ہوں...." مائی مریم کہہ رہی تھی "........

ڈاکٹروں اور حکیموں نے میرا خون بھی چوس لیا ہے۔ یہ پیسے بھی ادھار لے کر آپ تک پہنچی ہوں۔ بیٹے کی بیماری کی وجہ سے آمدنی......"

"مائی! ہم جب پیسہ مانگے گا تو پیسہ کا بولو۔ ہم پہلے دوا دے گا...." ڈاکٹر نے اس کا فقرہ کاٹتے ہوئے کہا۔ "پہلے تمہارا بیٹا کو ٹھیک کرے گا تو پیسہ کا بات بولے گا۔ ہم ڈاکٹروں کا بات نہیں بولے گا مائی۔ آدمی والا بات بولے گا۔ تم غریب ہے تو ہم پیسہ کا واسطے تم کو واپس نہیں جانے دیگا۔ علاج ضرور ضرور کرے گا...." ڈاکٹر بولتا جا رہا تھا اور مریم جہانِ دگر میں پہنچ چکی تھی۔ ڈاکٹر نے نسخہ لکھا اور پرچی مریم کو دیتے ہوئے کہا "....

ادھر سے میرے کمپونڈر کو یہ پرچی دکھاؤ اور دوائی لے جاؤ۔ دن میں تین دفعہ دیو۔ ابھی ہم ایک انجکشن کرے گا۔ آٹھ روز کا بعد دوسرا انجکشن کرے گا۔ تمہارا آنے کا ضرورت نہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! پیسے کتنے دوں؟"

"تم پھر پیسے کا بات بولا...." ڈاکٹر نے کہا "تم جو بولا ہے ہم دائی کا کام کرتا ہوں تو تم بھی ڈاکٹر ہم بھی ڈاکٹر۔ پیسے بعد میں لے گا مائی پہلے علاج پورا کرو۔ ایک مہینے بعد یہ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور تم دیکھو مسٹر!" ڈاکٹر نے مختار کو کہا۔ "پہلے یہ بتاؤ جب تم چرس پیئے گا تو ہم علاج نہیں کرے گا۔ ایسا ہی تم مر جائے گا۔ ایسا ہی جور جور سے سانس لیتا لیتا مرے گا...."

"مجھے اللہ کی قسم ڈاکٹر صاحب! میں سخت دکھی ہوں...." مختار نے کہا "اب چرس نہیں پیوں گا اور سگریٹ تک نہیں پیوں گا۔"

"پھر قسم پھر بولو۔"

"اللہ کی قسم ڈاکٹر صاحب!"

جب آٹھویں روز مائی مریم مختار کو پنڈی لانے کی تیاری کرنے لگی تو مختار نے کہا "ماں! تمہارے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو میں خود ہی چلا جاؤں گا۔ دیکھو تو میں تندرست۔ اچھا بھلا ہوں۔ دمے کا دورہ تو اٹھا ہی نہیں۔" مریم نے تو پہلے ہی محسوس کیا تھا کہ مختار بہتر ہو رہا ہے اور راتیں بھی اچھی طرح سوتا بھی رہا ہے لیکن وہ اسے اکیلا بھیجنا نہ چاہتی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ پیسے کہیں ہوا نہ ہو جائے لیکن مختار بضد تھا کہ وہ اکیلا ہی جائے گا۔

وہ اکیلا پنڈی گیا۔ اور ایک اور انجکشن لگوا آیا اور آٹھ روز کی دوائی بھی لے آیا۔ اس میں صحت کے علاوہ یہ تبدیلی آئی کہ بچے ہوئے پیسے ماں کو لوٹا دیئے اور کہا "ماں! میں نے صرف یہ فضول خرچی کی ہے کہ روٹی ہوٹل میں کھائی تھی اور بعد میں چائے پی تھی۔" اور مریم نے اسے سینے سے لگا کر زور سے بھینچا اور زار و قطار رونے لگ گئی۔ خوشی کے رونے میں کسقدر لذت ہوتی ہے۔ مریم کے تو جیسے دن پھر آئے تھے۔

ایک اور ہفتہ گذر گیا اور مختار نے یہ ہفتہ نہایت اچھی عالت میں گذارا۔ ہفتے بعد راولپنڈی گیا اور حسبِ معمول انجکشن بھی کرا آیا اور دوائی بھی لے آیا۔ اب اس میں یہ تبدیلی ظاہر ہوئی کہ "ماں! اب میں نے روٹی ہوٹل میں کھائی تھی لیکن چائے نہیں پی۔"

"کیوں میرے لال!" مریم نے پوچھا "پی لینی تھی نا!"

"فضول خرچی ہے نا ماں!" اس نے کہا "ہماری حالت پہلے ہی خراب ہے۔"

دمے کے شکنجے نے مختار کے سب بل نکال دیئے تھے۔

ایک مہینہ گذرا تو مختار نے خود بھی اور ڈاکٹر نے بھی کہہ دیا کہ اب آنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے خون کا دباؤ اور نبض وغیرہ دیکھ کر اطمینان

(باقی صفحہ [illegible] پر)

اوّلیں افسانہ:

"سُورج مکھی"!

عذرا حسنین

ہماری معاشرت میں پھولوں کو وہ مقام حاصل نہیں ہے جو مغربی ممالک میں ہے۔ اچھے شاعروں کی طرح بلیک (BLAKE) کا بھی ایک علیحدہ فلسفۂ زندگی ہے۔ اس کے یہاں "سن فلاور" (SUN FLOWER) کو زندگی کی علامت مانا گیا ہے۔ اس فلسفہ سے قطع نظر سورج مکھی کا پیلا پیلا پھول کسی پژمردہ مریض کے چہرے کی یاد دلاتا ہے۔ کم از کم میرا خیال یہی ہے۔ یہی خیال اس افسانے کا محرک ہوا ہے۔ (عذرا حسنین)

ہمارے گھر کے سامنے والے کئی گھر خالی پڑے تھے۔ ہم لوگ بھی اس علاقے میں ابھی نئے نئے آئے تھے، نہ کوئی دوست نہ عزیز۔ دل بہت گھبراتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس خاموشی کے عادی ہو ہی گئے پھر بھی کبھی کبھی دل یہی چاہتا کہ اور کچھ نہ ہو تو سامنے والے گھر ہی میں کچھ آبادی ہو جائے، کچھ چہل پہل تو ہوگی

آخر ہماری دعائیں جلد ہی پوری ہو گئیں۔ ایک دن سہ پہر کے وقت میں اور یوسف وقت گزارنے کے لئے بیڈمنٹن کھیلنے لگے۔ کچھ دیر تک تو کھیل اچھا ہوتا رہا لیکن تھوڑا کھیلنے کے بعد یوسف کا دل گھبرا گیا۔ وہ جان بوجھ کر چڑیا کو ادھر اُدھر پھینک دیتا۔ ایک مرتبہ تو چڑیا سڑک کے بھی پار جا پڑی۔ اس کو لینے دوڑے تو دیکھا کہ سامنے والے مکان میں لوگ آگئے ہیں۔ ایک بے ہنگم سی اونٹ گاڑی کھڑی ہے جس میں سے نوکر سامان اتار اتار کر مکان میں رکھ رہے ہیں۔ ایک دبلی پتلی لڑکی ستون کا سہارا لئے کھڑی ہے۔ ہرے رنگ کا ماربل جیسی کا ستون، اس کے سہارے ایک کمزور پیلی لڑکی ساکت کھڑی تھی۔ اس کے چہرے کا پیلا پن تو بس دیکھنے کے قابل تھا۔ یوں لگتا تھا کہ رنگ اوپر سے چھڑکا ہوا ہے۔ چہرے کے پیلے پن سے بالکل مختلف اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تھیں۔ ایک لمحہ کے لئے تو میں ان میں کھو ہی گئی۔ یوسف نے جو مجھے اس طرح منہمک دیکھا تو میرا کندھا پکڑ کر مجھے جھنجھوڑ ڈالا۔ "سُورج مکھی!" بے اختیار میرے منہ سے نکل گیا اور ہم دونوں واپس گھر آگئے۔ پھر بھی کھیل میں دل نہ لگا۔ ہم لوگوں نے نئے ہمسایوں کو دیکھنے کی کوشش کی، لیکن وہاں تو مکمل خاموشی چھا چکی تھی۔

دن گزرتے گئے لیکن سامنے والوں سے ہماری کوئی دوستی نہ ہو سکی۔ اتنے بڑے گھر میں صرف ایک بڑے میاں اور بڑی بی کے ہمراہ ایک لڑکی تھی۔ وہ بھی کچھ بیمار، اس لئے انہوں نے ہمیں ان کے یہاں آمد و رفت کی اجازت نہیں دی۔ وہ لڑکی کبھی کبھی کھڑکی میں آکر بیٹھ جاتی اور ہمارے کمپاؤنڈ میں لگے ہوئے پھولوں کو بڑی حسرت سے دیکھا کرتی۔ ہمارے یہاں سے وہ فریم میں جڑی ہوئی تصویر کی طرح نظر آتی۔ کھیلتے کھیلتے جب ہماری نظر اس پر پڑ جاتی تو یکایک منہ کا مزہ بگڑ جاتا۔ میں منہ پھیر کر کہتی: "سورج مکھی!" یوسف باغ میں دوڑا دوڑا پھرتا۔ "سُورج مکھی" ہم دونوں کو کھیلتے دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہتی۔ پھر بھی دوستی ہونے کی کوئی امید نہ تھی۔ ایک دن مجھے کیا سوجھا کہ ہمارے کمپاؤنڈ کا وہ حصہ جو اس کے مکان سے نظر آتا تھا وہاں ایک کیاری بنا ڈالی اور کھاد وغیرہ ڈال کر سُورج مکھی کے بیج بو دیئے۔ صبح شام میں اور یوسف اپنے اپنے فواروں سے پانی ڈالتے۔ "سُورج مکھی" اپنے گھر سے بیٹھی دیکھتی رہتی۔ کبھی کبھی جب میں اور یوسف لڑ پڑتے تو وہ ہنستی۔ یوسف غصّے کی نظر سے مجھے دیکھتا اور میں "سورج مکھی" کی طرف دبی ہوئی نظروں سے دیکھ کر ہنس دیتی۔ دن اسی طرح گزرتے رہے۔ مہینے بھر میں وہ کالے کالے بیج ہرے بھرے پودوں میں تبدیل ہو گئے۔ میں اور یوسف انہیں دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔ ایک روز ہم دونوں خوشی سے اچھل پڑے۔ "آپا جی! ہمارے پودوں میں کلیاں آگئی ہیں!" کلیاں بڑھتے بڑھتے پھول بن گئیں۔ میں نے اور یوسف نے مل جل کر ایک گلدستہ بنایا۔ اس میں سُورج مکھی کے بڑے بڑے پھول سجائے اور نوکر کے ہاتھ "سورج مکھی" کو بھجوا دیا۔ وہ اپنی کھڑکی سے ہماری ساری تیاریاں دیکھ چکی تھی۔ اس نے بغیر کسی پس و پیش کے یا حیرت ظاہر کئے وہ گلدستہ لے لیا۔ دن بھر کی دلچسپیوں میں ہم لوگ اپنی صبح والی کارگذاری بھول ہی گئے۔ لیکن شام کو جب ہم اپنے پودوں کو پانی دینے آئے تو "سُورج مکھی" کو سیاہ سوگوار ساڑھی میں ملبوس دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ ہمارے بھیجے ہوئے پھولوں میں سے ایک بڑا سا پھول اپنے سیاہ لمبے بالوں میں لگائے ہوئے تھی۔ اس کی شکل پر نقاہت اور خاموشی برس رہی تھی۔ میں اور یوسف اس غیر متوقع کامیابی پر پھولے نہیں سمائے۔

لیکن وہ آج مسکرا نہیں رہی تھی۔ صرف اپنی سیاہ آنکھوں کو خلا میں سمائے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

قسمت ہماری خوشیوں پر ہنس رہی تھی کیونکہ وہ آخری دن تھا جب کہ وہ اس جگہ مجھے نظر آئی۔ ایک ایک دن ہم دونوں نے بے چینی سے گزارا۔ بات کرتے ہماری نگاہیں اس کی کھڑکی پر جا پڑتیں لیکن ان کو مایوس لوٹنا پڑتا۔ دن میں کئی کئی بار ڈاکٹر کی آمد و رفت دیکھ کر یہ اندازہ لگانا تو کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ ٹھیک نہیں ہے۔ لیکن اس کو دیکھنے کیسے جائیں، اسی سوچ میں ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ نئے گھر جانے میں ایک قسم کی جھجک مانع تھی۔ اسی لئے باوجود شدید خواہش کے ہم لوگ اسے دیکھنے نہ جاسکے۔ اس پریشانی اور بے چینی کے زمانے میں ہم اپنے سورج مکھی کے پودوں کو بھی بھول گئے۔ ان میں پھول نکلتے اور لگے لگے مرجھا بھی جاتے۔ ان کو کوئی ہاتھ توڑنے والا نہ ہوتا۔ اس میں کلیاں نکلتی لیکن ان کو خوشی سے گننے والا کوئی نہ ہوتا۔ اس میں پتے مرجھا جاتے لیکن ان کو جھاڑنے والا کوئی نہ ہوتا۔ کئی دن اسی طرح گزر گئے۔ سامنے والوں کے یہاں کچھ تو خاموشی چھائی رہتی تھی، اور اب تو ادھر بھی ہُو کا عالم رہتا تھا۔ ان ہی دنوں برسات کا موسم آ گیا۔ رات کو بڑی زور کی آندھی آئی۔ شاید کچھ بوندا باندی بھی ہوئی کیونکہ صبح کو زمین نم تھی۔ آندھی کے زور سے معلوم ہوتا تھا کہ بڑے بڑے تناور درخت جڑ سے اکھڑ جائیں گے۔ ساری رات میں اس خوف سے کانپتی رہی کہ کہیں گھر کی چھت نہ گر پڑے۔ صبح اٹھ کر دیکھا کہ باغ میں ان گنت پیڑ گرے پڑے ہیں، پودے ٹیڑھے ہوئے پڑے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ افسوس جس بات کا ہوا وہ یہ تھا کہ ہمارے سورج مکھی کے پودے بری طرح گرے ہوئے تھے۔ کئی ادھ کھلے پھول کچلے پڑے تھے اور کئی خوبصورت پھولوں کی پنکھڑیاں ہوا میں اُڑ رہی تھیں۔ شور کی آواز سُن کر میری توجہ سامنے والے مکان کی طرف گئی جہاں سے رونے والوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان کے گھر میں آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔

یوسف نے پیچھے سے آ کر کہا: "آپا! 'سورج مکھی' اب اس دنیا میں نہیں!!"

مجھے بے ساختہ بلیک کی 'سن فلاور' (SUN FLOWER) کے متعلق وہ پُر درد اشعار یاد آگئے:

سُورج مکھی! سُورج مکھی!

اے رات دن کے پھیر سے	گھبرائے، اکتائے ہوئے
جو گن رہا ہے دم بہ دم	اس ڈھلتے سُورج کے قدم
اور ڈھونڈتا ہے وہ جہاں	پیارا، سنہرا، بیکراں
جس تک پہنچ کر کارواں	قرنوں تلک آسودہ ہوں
سرگشتہ پائے رہرواں	تا حشر خواب آلودہ ہوں
وہ خطۂ جنت نشاں	جس میں کئی رنگیں جواں
رومانیت کے راز داں	ہو جائیں گھل کر بے نشاں
ان کے مزاروں پر رہے	حسرت ہی حسرت پرفشاں
جس میں ہزاروں نازنیں	البیلی، پیلی کنواریاں
اُجلا کفن پہنے ہوئے	جیسے ڈھکی ہوں برف سے
کھوئی ہوں خواب نازمیں	حیرت سرائے راز میں!
اور اٹھ کے سارے یک بیک	یہ چاہتے ہیں بے دھڑک
ہوں اس ہی منزل کو رواں	وہ منزلِ جادو نشاں

جس جا گیا سُورج مکھی!

سُورج مکھی! سُورج مکھی!!

★

غزل

جمیل الدین عالی

عالی جی اب آپ چلو تم اپنے بوجھ اٹھائے
ساتھ بھی دے تو آخر پیارے کوئی کہاں تک جائے

جس سورج کی آس لگی ہے شاید وہ بھی آئے
یہ تو کہو خود تم نے اب تک کتنے دیئے جلائے

اپنا کام ہے صرف محبت باقی اس کا کام
جب چاہے وہ روٹھے ہم سے جب چاہے من جائے

ایک اسی امید پہ ہیں سب دشمن دوست قبول
کیا جانے اس سادہ روی میں کون کہاں مل جائے

دل کے دکھ بھی جھوٹ ہیں سارے ان کے سکھ بھی جھوٹ
بات چلی تو صاف کہیں گے اب جو بھی شرمائے

کیا کیا روگ لگے ہیں ہم کو کیا کیا ان کے بھید
ہم سب کو سمجھانے والے کون ہمیں سمجھائے

اور تو اس مجبوری میں ہو تجھ سے کیا اظہار
او عالی پر ہنسنے والے، تو عالی بن جائے

غزل

اختر ہوشیارپوری

ہماری آنکھ میں جب اشک بھرنے لگتے ہیں
تمہارا تذکرہ کیوں لوگ کرنے لگتے ہیں

جنونِ عشق پہ الزام پھر بھی آتا ہے
اگر کبھی ترے گیسو سنورنے لگتے ہیں

پکارتا ہے پسِ پردۂ افق کوئی
جو بام و در سے وہ جلوے اترنے لگتے ہیں

خود اس کی آگ میں جلتی ہے جب بہار کی شام
خود اپنے سائے سے دیوانے ڈرنے لگتے ہیں

اندھیری رات سلگتی ہے جب فضاؤں میں
نہ جانے کیوں ترے گیسو بکھرنے لگتے ہیں

جب اُن کی یاد سے جلتے ہیں آرزو کے چراغ
ستارے اور بھی اختر نکھرنے لگتے ہیں

غزل

ضمیر اظہر

محرمِ عشق ہیں، ہونٹوں کو سیئے بیٹھے ہیں
شیشۂ دل میں کئی داغ لئے بیٹھے ہیں

ماہ و انجم پہ پہنچ کر بھی نہیں رکتی نظر
رُخ کسی اور ہی منزل کا کئے بیٹھے ہیں

اب تو کچھ اور ہی عالم ہے فروغِ غم سے
صورتِ جاں ترے ہر غم کو لئے بیٹھے ہیں

بھولتا ہی نہیں اس نرگسِ شہلا کا کرم
ایک مے ہے کہ شب و روز پئے بیٹھے ہیں

ایک ہی شکل ہے سو رنگ سے دل میں آباد
ایک ہی عکس کے سو عکس لئے بیٹھے ہیں

جب سے چھوڑی ہے تمنائے سکوں اے اظہر
ہر کٹھن راہ کو ہموار کئے بیٹھے ہیں

★

نظر حیدرآبادی

ہماری بزم میں اب چھیڑ کائنات کی بات
یہ ہجر و وصل کا قصہ ہے ایک رات کی بات

دلِ اجل میں کھٹکتی رہی ہے صدیوں سے
بگڑ بگڑ کے سنورتی ہوئی حیات کی بات

چمن میں آگ لگا دی ہے شعلۂ گل نے
زبانِ برق پہ آئی تھی حادثات کی بات

حقیقتوں پہ چڑھا رنگ استعاروں کا
فسانہ بننے لگی جب سے واقعات کی بات

نظر کو دیکھ کے کچھ کچھ یقین آتا ہے
سُنی تھی ہم نے بھی اکثر تغیرات کی بات

غزل

مشتاق مبارک

کوئی ارماں دلِ آتش بجاں باقی نہ رہ جائے
وہ آسکتے ہیں تو غم کی داستاں باقی نہ رہ جائے

ہم اہلِ عشق کو جس طرح چاہو آزما دیکھو
کسی پہلو سے کوئی امتحاں باقی نہ رہ جائے

جو سچ پوچھو یہی ہے رازِ تکمیلِ محبت کا
مزاجِ حسن میں وہم و گماں باقی نہ رہ جائے

کچھ اس انداز سے رسمِ محبت کی بنا ڈالیں
کوئی اندیشۂ سود و زیاں باقی نہ رہ جائے

کٹھن ہے راہِ غم یوں بھی تمہاری سمت سے لیکن
کسر کوئی نصیبِ دشمناں باقی نہ رہ جائے

پلانا ہے اگر خونابِ غم ہی جامِ رنگیں میں
تو یہ حسرت بھی اے پیرِ مغاں باقی نہ رہ جائے

خردمندانِ عالم ہیں اسی کوشش میں مدت سے
کہیں انصاف کا نام و نشاں باقی نہ رہ جائے

چلو دنیا کو ہم مفہومِ غم اس طرح سمجھا دیں
کوئی گنجائشِ شرح و بیاں باقی نہ رہ جائے

غزل کو آپ سے کوئی توقع ہے تو بس یہ ہے
مبارکؔ شرحِ سرِّ دلبراں باقی نہ رہ جائے

★

غزل

طلعت اشارت

اداس روح، نظر مضمحل، تن افسردہ
یہ کس کی یاد میں حیراں ہے میری تنہائی

وہ چند اشک جو پلکوں پہ کانپ کانپ گئے
دیئے جلا کے جھروکوں میں آنکھ بھر آئی

رہا شرابِ تخیل سے جامِ دل لبریز
وہ میکدے کی فضا میں تری شناسائی

مرا سکوں ترے خوابوں کی تاب لا نہ سکا
خبر نہیں کہ سحر ڈھل گئی کہ رات آئی

قدم اٹھے تو نگاہیں جھجک کے لوٹ گئیں
ہمیں تھپکنے لگی راہ کی فسوں زائی

تصورات کی دنیا میں آپ مل تو گئے
یہی بہت ہے جہاں تک ملے پذیرائی

فلک کے نیلگوں ساحر نے پھر نقاب الٹا
طلسمِ شب تری خوگر رہی نگوں سائی

جو بے نیازیٔ گردوں پہ خوابناک نہیں
انہیں کی روح کے نغمے سکوت برنائی

ہوا ہی کیا جو نسیمِ حیات بوجھل ہے
کبھی تو بادِ صبا لے ہی لے گی انگڑائی

یہ کس لئے روشِ گلستاں ہوئی نادم
یہ کس کے غم میں شگوفوں کی آنکھ بھر آئی

شاکر علی

اے۔ شمسی

شاکر علی کا شمار پاکستان کے ممتاز ترین فنکاروں میں ہے۔ نقاشی کا ذوق انہیں دیس بدیس لئے پھرا ہے۔ برصغیر میں وہ دہلی، بنگال، بمبئی، جنوبی ہند سب ہی جگہ رہے۔ انہیں جہاں بھی اپنے شوق کی تکمیل و تہذیب کی امید نظر آئی، وہاں پیاسے کی طرح پہنچے اور ہنر کا جو بھی سرچشمہ راہ میں آیا اس سے سیراب ہوئے۔ اس نے ان کی نظر میں وسعت پیدا کر دی ہے اور ان کا فن نئی، پرانی قدروں کا بڑا ہی خوش آئند آمیزہ بن گیا ہے۔ مگر آج ہم انہیں جس منزل پر پاتے ہیں وہاں وہ اچانک نہیں پہنچ گئے۔ انہیں کئی راہیں بدلنی پڑی ہیں۔ کئی منزلیں ایسی ملیں جہاں پہنچ کر وہ پلٹ آئے، مگر ان کی مراجعت اپنے سفر کے مرکزی نقطے پر ہی ہوئی۔ آج بھی وہ فن کے چوراستے پر کھڑے ہیں اور سامنے وہ سب شاہراہیں کھلی پڑی ہیں جن پر وہ کبھی چلے تھے اور کچھ پہلی ہی جگہ واپس آگئے تھے۔

فن کی پہلی راہ انہیں ۱۹۳۰ء میں ملی۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۱ سال تھی۔ دہلی میں مشہور بنگالی مصور شاردا اچندر اکیل کے اسٹوڈیو کا بڑا چرچا تھا۔ وہ ماڈرن ہائی اسکول دہلی میں مصوری کا استاد تھا۔ اس کے ہاں کام کا اسلوب وہی تھا جو دادا آبندر ناتھ ٹیگور کے مکتبِ فن نے اس برصغیر میں اختیار کیا تھا، یعنی دھیمی دھیمی جذباتیت، ایک شباب کا کام۔ ۱۹ویں صدی میں وکٹوریائی عہد کا تصورِ جمالیات فن پر چھایا ہوا تھا اور اس جکڑبند سے سانس لینا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ آزادہ رو فنکار کے لئے اس سے آگے پرواز کرنا ممکن نہ تھا۔ آبندر ناتھ ٹیگور کے فن نے کم از کم یہ تو ضرور کیا کہ اس روایتی پھندے کو فنکاروں کے گلے سے دور کر دیا۔ مگر یہ دوسرا پھندا پہلے سے بھی زیادہ کسا ہوا نکلا۔ فنکاروں میں اب اپنائیت کا احساس تو ہوا مگر ان کی نگاہیں اجنتا کے غاروں اور مختصر مغل تصاویر کو دیکھتے دیکھتے پتھرا گئی تھیں۔ لے دے کر یہی دو پھیرے رہ گئے تھے۔ ہاں ایک فائدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ برصغیر کے فنکاروں نے مغربی انداز کی روغنی نقاشی کی تکنیک سے چھٹکارا پا لیا۔

برصغیر میں فن کی نشاۃ الثانیہ اس صدی کی پہلی دہائی میں شروع ہوئی اور اس کی ابتدا بنگال سے ہوئی۔ صرف ہنروری کی نظر سے دیکھا جائے تو اسے ایک آمیزہ سمجھئے چینی خطاطی، جاپانی رنگ کاری اور مغل نقوش کی آبداری کا۔ شاردا اکیل کے نگارخانے میں شاکر علی نے ایک کام یہ سیکھا کہ اپنے ہاتھ کو خط کشی کے لئے خوب سدھایا۔ اظہارِ موضوع کے لئے مسلسل لہراتے ہوئے خط کھینچنا انہوں نے یہیں سیکھا۔ گیلے کاغذ پر ہلکے آب رنگی لمسوں سے رومانی روپ جھلک کا احساس منتقل کرنا بھی انہوں نے یہیں سیکھا۔ مگر اس نگارخانے میں نقاشی کے موضوعات بڑے گھٹے گھٹے تھے اور وہ ان کو متاثر نہ کر سکے۔ ماضی کی طرف مراجعت کی جو تحریک چل پڑی تھی بنگال اسکول والوں نے اس میں غلو سے کام لیا اور فن محدود ہو کر رہ گیا۔ وہی بندھے ٹکے موضوع جیسے مہاتما بدھ کے جیون چکر کی کہانی۔ ہر چند کہ بدھ مت اب ہندوستان میں تقریباً معدوم ہے مگر ہمارے یہ آرٹسٹ بدھ کے بچپن سے نروان پانے تک کے چکر کو دکھائے جا رہے تھے۔ اگر اور آگے تصور پرواز کرتا تھا تو ان کی اپنی تاریخ تھی اور اپنے اصنامیات۔ ادھر سے نگاہ ہٹی تو دیہات کی سادہ رومانی فضاؤں میں آ ٹھہرے۔ ان چیزوں نے موقلم کی گردش کو مقید کر دیا تھا۔ حد یہ کہ جدید موضوع بھی اس چکر میں پھنس کر اپنی صحتِ تصور سے محروم ہو جاتے تھے۔ ویسے یہ ٹھیک ہے کہ ماضی پر نگاہِ بازگشت ڈالنے کی جہاں تک بات ہے وہاں تک یہ کوششیں بیشک بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔

تو شاکر علی اس راہ پر چلے مگر پھر واپس آگئے۔ اب ہم انہیں بمبئی میں دوسری شاہراہ پر دیکھتے ہیں۔ یہ ۱۹۳۸ء کا زمانہ ہے۔ جہاں پہنچ کر انہوں

نے جے۔ جے اسکول آف آرٹ میں باقاعدہ داخلہ لے لیا۔ اس ادارۂ نقاشی میں اُس وقت جس ہُنر کا چرچا تھا اسے "ہندوستان کی آرائشی نقاشی" کا نام دیا جاتا ہے۔ سولومن اسلوبِ نقش گری کو اب یہاں سے ہٹا کر اس نئی تکنیک کا چلن پیدا کیا گیا تھا۔

یہ اسلوب کیا تھا ؛ جے جے اسکول آف آرٹ، بمبئی کے سابق ڈائریکٹر گلیڈ سٹن سولومن نے اسے جنم دیا تھا ——— موضوع ہندوستانی مگر چولا مغربی۔

شاکر علی نے یہ نئی تکنیک سیکھی جس میں ہر رنگ اور اس کی ہر جھلک اپنی اپنی جگہ جھلا مارتی ہے۔ یہاں طرح پر بڑا زور دیا جاتا تھا اور پھر پھر کرا سے آرائشی نقاشی کے روپ میں گھیر لیا کرتے تھے۔ گویا وہی تجدیدِ ماضی کا جذبہ یہاں بھی چھایا ہوا تھا۔ یہی تکنیک کا کچھ فرق تھا اور بس۔

یہاں لوگوں کو محرّک اجنتا سے ورثے نہیں ملتا تھا، یا پھر جینی وراجپوتی نقوش ان کے رہنما تھے۔ کبھی کبھی ان کے موضوعات کی نظر موجودہ گرد و پیش پر بھی پڑ ہی جاتی تھی۔ یہاں پہنچ کر شاکر علی کو دو شخصیتوں کے کام نے متاثر کیا۔ ایک بنگالی مصور، جیمنی رائے اور دوسری پنجاب کی مشہور مصورہ امرتا شیر گل۔ جیمنی رائے نے بنگال کے عوامی فن اور جین نقاشی (۱۱ ویں تا ۱۵ ویں صدی) سے سہارا لیا۔ امرتا شیر گل نے ہیئت اور رنگ کے باب میں یورپی فنکار سیزانے (CEZANNE) اور گاگن (GAUGIN) سے تاثر لیا تھا۔ مگر ہندوستان واپس آنے کے بعد اس مصورہ نے بھی اجنتائی نقاشی اور مغل تصاویر کو اپنا رہنما بنا لیا تھا۔ مگر شاکر علی کی دُھن اور ہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ محرکات کے اصل سرچشموں سے فیض حاصل کیا جائے۔ تجدیدِ ماضی کی راہوں میں بھٹکنے کے لیے وہ کچھ آمادہ نہ تھے۔ شکر ہے کہ یہ مراجعت بڑی جلدی ہو گئی۔

۴۶-۱۹۴۵ء میں وہ جنوبی ہند کے سفر پر چل پڑے۔ یہاں کی تعمیرات، مجسمے، اور دیواری نقاشی کو جا جا کر دیکھا اور ان کی روح تک پہنچنے کی کوشش کی۔ ان کا اصل میدان تھا زندگی کی دلتی ہوئی حقیقتیں اور ان تک رسائی۔ ان کی متجسس نگاہیں ایسے ہی موضوعات ڈھونڈتی تھیں۔ ۴۶-۱۹۴۵ء کے سفر نے ان کی نگاہوں کو وسعت و آسودگی سے آشنا کر دیا تھا مگر ابھی ان کی منزل نہیں آئی تھی۔

اب ہم انہیں ایک بالکل ہی مخالف سمت میں چلتے ہوئے پاتے ہیں۔ اس برصغیر کے فن کی روایت تھی، عمومیت اور اشاریت، مثلاً یہی دیکھیے کہ مغلیہ مرقعوں کی شبیہوں تک میں، باوجود اختصاصی کیفیت کے، وہی عمومیت اور آفاق گیر پھیلاؤ ہے، مگر شاکر علی کو اور تلاش تھی۔

۱۹۴۶ء میں ہم انہیں لندن میں دیکھتے ہیں۔ اب وہ ایک ایسی راہ پر پڑ گئے جو سب راہوں سے بالکل مختلف تھی۔ وہ "سلیڈ سکول آف آرٹ" سے منسلک ہو گئے۔ یہاں فن کی نوعیت خالصتاً معین، محدود اور موضوعاتی تھی، یا پھر صرف علامتی۔ گو یہ مغرب کی دنیا تھی پھر بھی یہاں روایت پرستی موجود سی تھی۔

۱۴ ویں صدی کے اواخر سے ۱۹ ویں صدی کے خاتمہ تک نشاۃ الثانیہ کی تحریک نے ذہنوں کو جکڑے رکھا۔ اس کا اثر فن پر اب تک موجود تھا۔ حقیقت پسندی پر زور تھا اور اس حقیقت پسندی میں لوگ خرافات کی حد تک پہنچ چکے تھے۔ مثلاً یہ قصہ کہ انگور کا خوشہ ایسا ہو بہو بنایا جاتا تھا کہ چڑیاں ان کو اصل جان کر ٹھونگیں مارا کرتی تھیں!

خیر، شاکر علی نے اس دنیا کو بھی دیکھا گو اب روایت پرستی کا زور کم پڑ چکا تھا مگر شاکر کو کلاسی فن کی روایات سمجھنی تھیں۔ اس لئے وہ اس کام میں لگ گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ مثلاً:-

تناظر (PERSPECTIVE) دھوپ چھاؤں (CHIAROSCURO) اور کلاسی کام کا یہ مبالغہ کہ نقش "دیوار میں بنے ہوئے دریچے" کی مانند ہو۔ یا پھر وہ سہ طرفی فریبِ نظارہ یا ان سب کا ملا ملا کر فطری روپ دھار لینا، کہ "حقیقت کو آئینہ دکھانا" کہیں جسے۔

اس اسلوب سے شاکر علی کو کچھ دلچسپی پیدا ہوئی۔ ویسے یہ دلچسپی تو بمبئی کے قیام کے زمانے سے ہی تھی مگر دبی دبی سی تھی۔ وہاں بمبئی میں تو یہ مصیبت بھی درپیش تھی کہ سولومن صاحب نے اپنے زمانے میں اسکول کے نصاب سے زندگی (LIFE) اور قدیم نقاشی کی نقول کا کام سرے سے بند ہی کر دیا تھا۔ بہر کیف، تین سال تک شاکر علی سلیڈ اسکول لندن میں کام سیکھتے رہے اور کلاسی روایاتِ فن کو اچھی طرح سمجھنے میں محو رہے۔ تین سال پورے کر کے انہوں نے لندن یونیورسٹی سے فنونِ لطیفہ کا ڈپلوما بھی چپتے چلتے لے لیا۔

اب یاد کیجئے کہ شاکر علی نے اپنا سفرِ فن کہاں سے اور کب شروع کیا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں دہلی (شاردا آکیل سٹوڈیو) سے۔ انہوں نے اپنے طویل، گھومتے ہوئے سفر میں برصغیر اور یورپ دونوں کے کلاسی کام کا بخوبی مطالعہ کیا۔ اس برصغیر کے کلاسی فن کے اصل شاہکاروں کا خصوصی مطالعہ کرنے سے قبل انہوں نے "جدیدیت" کے پہلوؤں پر بھی خوب غور کیا۔ اُدھر جب وہ انگلستان پہنچے تو سب سے پہلے کلاسی روایاتِ فن کو سمجھنے میں لگ گئے۔ جب دونوں کلاسی فنون سے خوب آگاہ ہو گئے تب انہوں نے ہیئت اور رنگ کے آزاد تجربوں کی راہ پر چلنا شروع کیا۔

۱۹۴۴ء میں وہ فرانس پہنچ گئے۔ نئے میدانوں کی تلاش میں۔ فرانس میں "آندرے۔ لا۔ ہوتے" (ANDRE L' HOTE) کے ساتھ کام کرنے لگے۔ اس صدی کی دوسری دہائی میں "مکعبیت" کی جو تحریک چلی تھی یہ صاحب ان کے داعیوں میں تھے۔ ان کے ہمراہ کام کرنے کی وجہ سے شاکر علی کو ڈیزائن سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ پہلے یہ دلچسپی ذرا کھچی کھچی سی تھی۔

۱۹۵۰ء میں شاکر علی زیکوسلاواکیہ پہنچ گئے اور پراگ یونیورسٹی کے "ادارۂ صنعتی فنکاری" میں داخلہ لے لیا۔ یہاں رہ کر انہوں نے پارچہ بافی کے لئے ڈیزائن تیار کرنے کا کام بھی نہیں سیکھا۔ دو سال تک اسی شغل میں لگے رہے اور ۱۹۵۱ء میں پراگ کی "ٹیکسٹائل کارپوریشن" کے ساتھ ایک بیرونی نقاش کی حیثیت سے منسلک بھی ہو گئے۔

۱۹۵۲ء میں شاکر علی کے قدم پھر اپنے وطن کی سرزمین پر واپس آ گئے۔ مگر فن کی راہ پر اب بھی ان کے قدم اسی سمت رواں تھے جو آندرے۔ لا۔ ہوتے کے ساتھ رہ کر انہوں نے دیکھی تھی۔ اصل میں ہیئت سے دلچسپی ان میں کافی پہلے ہی پیدا ہو چکی تھی۔

۱۹۴۴ء میں وہ بمبئی میں تھے۔ اس وقت جے جے اسکول آف آرٹ کے ڈائرکٹر چارلس جیرارڈ تھے۔ اور وہ "مابعد تاثراتی" (POST — IMPRESSIONI: T) اسلوب میں چیزیں بنایا کرتے تھے۔ اب یہ دیکھئے کہ واقعات کا تانا بانا وقت کے کارگاہ پر کس طرح ایک نیا جامہ تیار کرتا ہے۔ شاکر علی پہلے تو کراچی میں مقیم رہے۔ پھر لاہور چلے گئے اور اپنے کام میں منہمک ہو گئے۔ اب ان کی دقیق نظریں ہیئت کی تحلیل اور تجزیے پر زیادہ لگی ہوئی تھیں۔ چنانچہ ان کی بعض تصویریں جیسے "بیل" (THE BULL) ان کے کام کے اسی پہلو کی آئینہ دار ہیں۔

گزشتہ دو سال سے شاکر علی کی فنی زندگی کچھ ٹھیری ہوئی سی ہے۔ ۱۹۵۵ء میں ان کی تصویر "اناس میں ساکن زندگی" (STILL LIFE WITH PINE - APPLE) تیار ہوئی۔ یہ نقش ان کے عبوری دور کے کام کا نمونہ ہے۔ آجکل وہ اپنے آپ کو جمود کے اس خول سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاکہ ان کا شخصی تصورِ نقش پوری طرح نمو دیا سکے۔ وہ اس جستجو میں ہیں کہ فن کار کے اصل منصب کو معلوم کر سکیں۔ انہیں اس سوال کا جواب مل چکا ہے۔

اس سلسلے میں پال کلی (PAUL KLEE) نے جو تشبیہہ برتی تھی وہ واقعی بڑی خوب تھی۔ اس نے کہا تھا کہ فنکار درخت کے تنے کی مانند ہوتا ہے۔ یعنی عضویاتی دنیا کی جڑوں تک پہنچنے کے لئے وہ اس کے رگ و ریشے میں پیوست ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس تشبیہہ میں جو بات ہے وہ سطحی نہیں ہے۔ درخت کی جڑ اور پھننگ میں ایک ربط و سلسلہ ہوتا ہے۔ کسی فنی کام کی تخلیق۔ (درخت کی پھننگ پیدا ہونا)۔ لازماً کئی تقاضے کرتی ہے۔ عکاسانہ نقاشی کی معین حدود میں جاگزین ہونے کے نتیجہ میں فطری شکل کی تنسیخ ضرور عمل میں آئے گی کیونکہ فطری ٹوٹ پھوٹ اور کتر چھانٹ ہی میں سے فطرت اپنا نیا روپ، پھر جنم دے کر نکالتی ہے۔

یہاں تک تو شاکر علی کے کام کی باتیں ہوئیں۔ اب آپ شاید ان کے شخصی تعارف کے بھی خواہاں ہوں گے۔ لیجئے۔ شاکر علی ۱۹۱۶ء میں بمقام رامپور پیدا ہوئے۔ ابھی بچے ہی تھے کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اور آغوشِ مادر سے محرومی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے وجود میں گھر گئے۔ تعلیم رامپور سے دور، دلی کے جامعہ ملیہ میں ہوئی۔ پھر وہاں سے نینی تال گئے جہاں انگریزی وضع کے اسکول، فلانڈرز میں پڑھتے رہے۔ ان فاصلوں اور دوریوں نے ان میں احساسِ تنہائی کو بہت بڑھا دیا اور وہ اپنے آپ میں بہت ہی گم ہوتے چلے گئے۔

شاکر طبعاً بہت حساس آدمی ہیں۔ اور سات سال تک بمبئی جیسے شہر میں رہنے کے باوجود ان کے جذباتی توازن میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی

پھر وہ رہے غیر ملکوں میں۔ وہاں احساس تنہائی اور بھی زیادہ رہا۔ وہاں کے پانچ سال بھی ایسے ہی گزرے۔ بات یہ ہے کہ احساس تنہائی میں اضافہ کرنے کے لئے کئی سماجی عناصر بھی کارفرما رہتے ہیں۔ آجکل کا معاشرہ جس قدر پیچیدہ ہو چکا ہے، سب جانتے ہیں۔ فنکار اس کی برق رفتار، سیماب وش کیفیتوں اور ادل بدل کو پا نہیں سکتا، اس لئے اِنپ کر رہ جاتا ہے! اس میں اقتصادی و اخلاقی تاروپود کا انقلابی عمل بھی شامل ہے۔ اس کے مقابلے فن ایک خود نمو عمل ہے، دونوں باتوں کا سمجھوتہ کیسے ہو؟!

روحِ عصر کی شعوری و منطقیانہ تعبیر کر سکنا ویسے بھی کوئی آسان کام نہیں ہے، اس لئے فنکار کی یہ مشکل ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ فنکار نے اب اس مشکل سے یوں سمجھوتہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے شخصی تصورات کو اظہار کا جامہ پہناتا چلا جاتا ہے۔ یہ اور اتفاق ہے کہ اس کے ذاتی تصورات کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی اندرونی روح بھی جلوہ پیرا ہوتی چلی جاتی ہے÷

خود شاکر علی کے باب میں بھی یہی چیز ہے کہ ان کا فن ان کے وجود کا ذریعہ اظہار ہے۔ ان کے نکھرے ستھرے خواب، "تنہائی کے تصورات" کی ایک دُنیا۔ اُن کے تجربات ان کے شعور میں گہرے پہنچ جاتے ہیں اور فکر و فن کے ڈانڈے آن ملتے ہیں۔ انفرادیت آفاقیت کا رُوپ لے لیتی ہے اور یہ انجذابی عمل قطعی بے ساختہ ہوتا ہے۔

شاکر کے کام میں جو جمالیاتی حسن ہے وہ فطرت سے الگ ہی کوئی چیز ہے۔ عالمِ محویت سے اس کی تخلیق اُبھرتی ہے۔ اس عالم میں زندگی دوسرے ہی قوانین کی تابع نظر آتی ہے یعنی فطری جکڑ بند سے آزاد، اُس سے باہر۔ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اس فنکار کو زندگی ایک طلسم ہمہ نظر آتی ہے جو اس کے حیطۂ اختیار سے باہر ہو، تو وہ اس سے گریز کر کے اپنی تخلیق کو سامنے لے آتا ہے۔ مگر کچھ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اُس کے کام پر نشاطِ زندگی کے بجائے اُداسی کی پرچھائیاں پڑی ہوئی ہیں۔

بیانیہ نقاشی شاکر کے موضوعات سے باہر ہے۔ اگر وہ فطرت کی کوئی شے برتتے بھی ہیں تو اس طرح کہ وہ اپنی مرغوب خطوط، الوانی کیف وکم اور رنگ داری کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ دُنیائے محسوسات کی نقش گری میں وہ خاص اہتمام کرتے ہیں اور ان کے مُوقلم بہت سے سنگلاخ خارجی مشاہدات سے چل کر تصاویر تک پہنچتے ہیں۔ انہیں بہت ہی صبر آزما کاوشوں کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا انداز تمام تر ایک صناع کا انداز ہے۔ وہ خط کو محض پیمائش ہی تصور کرتے ہیں، یعنی یہی لمبائی، چھوٹی یا بڑی زاویئے حادّہ یا منفرجہ۔ الوان کے درجۂ شدت کو وہ وزن اور رنگ کو خاصیت تصور کرتے ہیں۔ وہ ان تینوں صُوری لوازمات کو ایک نئی تنظیم و ترتیب کی تخلیق کے لئے استعمال کرتے ہیں اور یہیں سے فنکار کی مشکل شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب ان کی تصاویر میں جانی پہچانی چیز آ جاتی ہے تو دیکھنے والے الجھن میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالمِ محسوسات میں جو اشیاء ہم دیکھتے ہیں ان کے کچھ التزامی خصائص ہوتے ہیں، وہ ناظر کے ذہن میں رسے بسے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے وہ فنکار کے تصور سے خارج ہوں۔ ~~اس کو یوں~~ سمجھیئے کہ جو کام موسیقار اپنی تخلیق میں موضوع او رعندیہ سے لیتا ہے وہی شاکر علی اپنی تصاویر میں اشیاء سے لیتا ہے۔

شاکر علی اپنے خطوط، رنگوں کے درجۂ شدت اور رنگ داری کے ذریعے تمام درمیانی زوائد کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں تاکہ احساس فوراً جاگ اٹھے۔ پہلا عمل نظر کا ہے دوسرا خبر کا۔ "نظر" (تعارف) اور "خبر" (جذبہ) کے درمیان کے سارے حجابات شاکر علی کے ہاں ایک دم اُٹھ جاتے ہیں۔ یہ ایک طلسم اور سحر ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا وہ موسیقار کا پیدا کیا ہوا آہنگ۔ اگر موسیقار یہ عمل کر سکتا ہے تو نقاش کو بھی یہ چھوٹ ملنی چاہیئے۔

شاکر علی اسکیچ بنانے میں تیز، تیکھے خطوط اور زاویے برتتے ہیں۔ جگہیں پُر کرنے کے لئے ملے جلے رنگوں کی استرکاری کرتے ہیں۔ خاکہ بندی میں تمام جزئیات خارج کر دیتے ہیں۔ بلکہ جاندار اشیاء میں تو وہ آنکھیں تک نہیں بناتے۔ بس ہیئت یا سراپا کا محض خیال ناظر کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے کام میں ہیئت متضاد پہلوؤں کا آمیزہ ہے۔ پلاسٹکی ٹھوس پن جو اُبھر داں کام (RELIEF) میں ملتے ہیں۔ اور دوسری طرف تناظر، عمق کا فریبِ نظر اور بُعدِ سوم، تینوں چیزیں غائب۔ وہ ہماری نظروں کو جو چیز دیتے ہیں وہ ایسی سطحیں ہیں جو مجسمہ سازی میں برتی جاتی ہیں...

حال ہی میں جو نقش انہوں نے بنائے ہیں ان میں رنگوں کی شدت اور دمک کا شائبہ خارج ہے۔ یہ ایک ایسی جھلک داری ہے جو آفتاب کی تیز کرنیں "رنگین شفافوں" (COLOUR TRANSPARENCIES) پر پڑ کر کرتی ہیں۔ یورپ کی نشاۃ الثانیہ کے زمانہ میں بھورے رنگوں کا

رواج چلا تھا۔ جدیدی لوگ "بنیادی رنگوں" PRIMARIES کے گرویدہ ہوگئے۔ مگر شاکر علی ان دونوں سمتوں سے الگ، ہلکے ہلکے، دھیمے دھیمے رنگ برتتے ہیں، زور صرف کالی لکیروں پر ہوتا ہے۔ رنگ بھرنے کے لئے وہ موقلم اور (PALLETT-KNIFE) استعمال کرتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا زور اور ضرب الگ دکھائی پڑتی ہے۔ گویا نقش میں سے یہ چیزیں ہماری طرف گھور کر دیکھ رہی ہوں۔ اس کی مثال پہلے پہلے ہمیں ططیان (TITIAN) کے ہاں ملتی ہے جو اس کے بعد کے نقوش میں ہے۔ یعنی موقلم کی نمایاں نمایاں گردشیں۔ شاکر کے ہاں بھی یہ چیز ہے اور بڑے زور و قوت کے مظاہر۔ ویسے تو ان کے نقوش میں ایک طرح کا ضبط اور ٹھہراؤ ہے مگر رنگوں کی چھینٹیں، لکیریں اور دھبے" باہمی قطع کاری" (CRISS-CROSSING) اور گھلاوٹ، حرکت کا عنصر پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کے ہاں آرائشی زیب اگر کسی چیز سے آتی ہے تو وہ یہی عمل ہے۔ ان کے ہاں رنگین لکیریں اور دھبے (DABS) دراصل وہی کام کرتے ہیں جو موسیقی میں "درت"۔ اس سے "سم" کبھی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ مگر ان کے ہاں رنگوں کا تاثر دبا دبا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قدیم یونان کے ان برنجی مجسموں میں جو عہد نشاۃ الثانیہ میں کھود کر نکالے گئے اور جن پر ہرے رنگ کی جمی ہوئی پیڑی نے بجائے خود ایک فنی طرحداری کا روپ دھار لیا ہے۔

بہرحال شاکر علی جو بھی کام کر رہا ہے اس میں زور ہے۔ وہ سپاٹ سطح کے عمل میں آذری ہیئیتوں کا تصور سمو رہا ہے۔ یہ ضدین کو مجتمع کرنا ہے ـــــ وقت سے دوری کا عنصر بھی ان کے ہاں جذب ہوتا دکھائی دیتا ہے ؛

پیچ و خم .... بقیہ صفحہ ۴۴

کرلیا تھا۔ اس نے احتیاطاً ایک ہفتے کی دوائی دے دی اور کہا "اپنی ماں کو ہمارا سلام بولو، ہاں ؟"

جب مائی مریم کو ڈاکٹر کا سلام پہنچا تو وہ اسے ملنے کو تیار ہوگئی۔ پیسے دینے کے علاوہ وہ اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی تھی۔ وہ جب مختار کے چہرے پر گئی گذری جوانی کے واپس آنے ہوئے آثار دیکھتی تھی تو خیالوں میں سجدہ ریز ہو جاتی تھی قصبے کے بچے بچے نے اسے مبارک باد کہی تھی۔ اور رتو لو کتاب نکال کر تعویذ دینے والے مولوی نے بھی مختار کو ٹھہرا ٹھہرا کو دیکھا ہوں سے دیکھتے ہوئے اور ڈاکٹر کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے کھسیانی ہنسی کے ساتھ مریم کو مبارک باد کہی۔ تین روز بعد مریم ایک سو روپیہ پلے باندھا اور مختار کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے ہاں پہنچی اور آنسوؤں کی روانی میں اسے دعائیں دیں پھر ایک سو روپیہ اس کی میز پر رکھ دیا اور کہا:

C4592

"یہ ایک سو روپیہ لائی ہوں ڈاکٹر صاحب! خدا کے لئے قبول کر لیجئے۔ بڑی غریب ہوں"

"غریب ہے تو اتنا روپیہ کدھر سے لایا تم ؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تیس روپے اپنے ہیں ڈاکٹر صاحب! اور باقی ادھار لئے ہیں"

ڈاکٹر نے مسکرا کر تیس روپے اٹھا کر دراز میں رکھ لئے اور ستر روپے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "قرض مت لیو مائی با خدا نا راج ہوتا ہے۔ ناؤ۔ اب تمہارا بیٹا چرس کا نشہ نہیں کرے گا۔ کیوں رے ؟"

اور مختار نے ندامت سے گردن جھکا لی۔

"ڈاکٹر صاحب!" ایک ادھیڑ عمر عورت ساتھ والے کمرے سے آئی اور ملتجی لہجے میں کہا "مریضہ کی حالت بگڑ رہی ہے۔ ذرا جلدی کیجئے۔"

ڈاکٹر اٹھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک عورت لیٹی ہوئی کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے دایاں قدم تو ٹھیک اٹھایا جب بایاں پاؤں آگے رکھا تو یوں لگا جیسے اس کا پاؤں گہرے گڑھے میں جا پڑا ہے اور وہ بائیں طرف گرنے والا ہے لیکن اس نے پھر دایاں قدم اٹھایا اور بائیں قدم پر پھر بائیں طرف گرنے کے انداز میں نیچے جھک گیا۔ اسی طرح جب وہ میز کی اوٹ سے مریم کے سامنے آیا تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر کی بائیں ٹانگ دائیں سے چھ سات انگل چھوٹی تھی۔ مریم کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں وقت و زمانہ کا ایک چکر چل پڑا۔ تیز بہت تیز۔ اور تیز۔ کمرے کی ہر ایک چیز گھوم رہی تھی اور اس کا ذہن جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ جب ڈاکٹر مریضہ کو دیکھ کر کمرے سے نکلا تو مریم نے گہری نگاہ سے ڈاکٹر کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی کے بائیں طرف منحنی سا ایک نشان تھا۔ پرانے زخم کا نشان ؛

کوٹ ڈیجی : ———— بقیہ صفحہ ۲۶

نے ماہرینِ آثار قدیمہ اور ماقبل تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے وادیٔ سندھ کے پہلے ہی لاینحل مسئلوں یعنی اس کی اصل اور رسم الخط میں ایک اور پیچیدہ مسئلے کا اضافہ کر دیا ہے۔

چونکہ کوٹ ڈیجی میں کھدائی چٹان کی آخری قدرتی تہہ تک کی گئی ہے، اس لئے اس تمدن کی اصل بھی متنازعہ فیہ رہے گی۔ کیا یہ سمندر کے راستے عراق سے آیا یا خشکی کے راستے وادیٔ ژوب سے جہاں زمانۂ ماقبل تاریخ اور ماقبل موئن جو دڑو سے متعلق اہم مقامات دریافت ہوئے ہیں یا یہ پاکستان کی سرزمین ہی سے کہیں مغربی پاکستان میں خود بخود پیدا ہوا ہے؟ یہ تمام معاملات ابھی دریافت طلب ہیں اور ان کے متعلق محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔ تاہم جو معلومات اب تک بہم پہنچی ہیں اُن سے یہ بات قطعی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ پاکستان ۵۰۰۰ ق۔م ہی میں تمدن کے کس قدر اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا تھا اور اس کے باشندوں میں شہریت کا شعور کس قدر ترقی پذیر ہو چکا تھا۔

تندرست لوگ باقاعدہ
لائف بوائے صابن سے نہاتے ہیں
LIFEBUOY
SOAP
یہ ۲۴ گھنٹے دن کی گندگی اور اس کے جراثیم دھو ڈالتا ہے!
کسے دن میں گندگی سے واسطہ پڑتا ہے جس میں جراثیم ہوتے ہیں
اور جن سے ہمیں بیماریوں کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لئے تو بے شمار
لوگ اپنی صحت کی حفاظت لائف بوائے صابن کے باقاعدہ غسل کر
کرتے ہیں جو گندگی اور اس کے جراثیم بھی دھو ڈالتا ہے۔
اور تازگی اور شگفتگی کا صحت مندانہ احساس دلاتا ہے
L2—193UO

پھر وہ رہے غیر ملکوں میں۔ وہاں احساس تنہائی اور بھی زیادہ رہا۔ وہاں کے پانچ سال بھی ایسے ہی گزرے۔ بات یہ ہے کہ احساس تنہائی میں اضافہ کرنے کے لئے کئی سماجی عناصر بھی کارفرما رہتے ہیں۔ آجکل کا معاشرہ جس قدر پیچیدہ ہو چکا ہے، سب جانتے ہیں۔ فنکار اس کی برق رفتار، سیماب وش کیفیتوں اور ادل بدل کو پا نہیں سکتا، اس لئے ہانپ کر رہ جاتا ہے! اس میں اقتصادی و اخلاقی تار و پود کا انقلابی عمل بھی شامل ہے۔ اس کے مقابلے فن ایک خود نمو عمل ہے، دونوں باتوں کا سمجھوتہ کیسے ہو؟!

روحِ عصر کی شعوری و منطقیانہ تعبیر کر سکنا ویسے بھی کوئی آسان کام نہیں ہے، اس لئے فنکار کی یہ مشکل ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیئے۔ فنکار نے اب اس مشکل سے یوں سمجھوتہ کر لیا ہے کہ وہ اپنے شخصی تصورات کو اظہار کا جامہ پہناتا چلا جاتا ہے۔ یہ اور اتفاق ہے کہ اس کے ذاتی تصورات کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی اندرونی روح بھی جلوہ پیرا ہوتی چلی جاتی ہے۔

خود شاکر علی کے باب میں بھی یہی چیز ہے کہ ان کا فن ان کے وجود کا ذریعہ اظہار ہے۔ ان کے نکھرے ستھرے خواب، "تنہائی کے تصورات" کی ایک دُنیا۔ اُن کے تجربات ان کے شعور میں گہرے پہنچ جاتے ہیں اور فکر و فن کے ڈانڈے آن ملتے ہیں۔ انفرادیت آفاقیت کا رُوپ لے لیتی ہے اور یہ انجذابی عمل قطعی بے ساختہ ہوتا ہے۔

شاکر کے کام میں جو جمالیاتی حسن ہے وہ فطرت سے الگ ہی کوئی چیز ہے۔ عالمِ محویت سے اس کی تخلیق اُبھرتی ہے۔ اس عالم میں زندگی دوسرے ہی قوانین کی تابع نظر آتی ہے یعنی فطری جکڑ بند سے آزاد، اُس سے باہر۔ جب کبھی اور جہاں کہیں بھی اس فنکار کو زندگی ایک طلسم دمدمہ نظر آتی ہے جو اس کے حیطۂ اختیار سے باہر ہو، تو وہ اس سے گریز کر کے اپنی تخلیق کو سامنے لے آتا ہے۔ مگر کچھ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے اُس کے کام پر نشاطِ زندگی کے بجائے اُداسی کی پرچھائیاں پڑی ہوئی ہیں۔

بیانیہ نقاشی شاکر کے موضوعات سے باہر ہے۔ اگرچہ فطرت کی کوئی شے برتتے بھی ہیں تو اس طرح کہ وہ اپنی مرغوب خطوط، الوانی کیف و کم اور رنگ داری کی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ دُنیائے محسوسات کی نقش گری میں وہ خاص اہتمام کرتے ہیں اور ان کے مُوقلم بہت سے سنگلاخ خارجی مشاہدات سے چل کر تصاویر تک پہنچتے ہیں۔ انہیں بہت ہی صبر آزما کاوشوں کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کا انداز تمام تر ایک صنّاع کا انداز ہے۔ وہ خط کو محض پیمائش ہی تصور کرتے ہیں، یعنی یہی لمبائی، چھوٹی یا بڑی، زاویے حادّہ یا منفرجہ۔ الوان کے درجۂ شدت کو وہ وزن اور رنگ کو خاصیت تصور کرتے ہیں۔ وہ ان تینوں صُوری لوازمات کو ایک نئی تنظیم و ترتیب کی تخلیق کے لئے استعمال کرتے ہیں اور یہیں سے فنکار کی مشکل شروع ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جب ان کی تصاویر میں جانی پہچانی چیز آ جاتی ہے تو دیکھنے والے الجھن میں پڑ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس عالمِ محسوسات میں جو اشیاء ہم دیکھتے ہیں ان کے کچھ التزامی خصائص ہوتے ہیں، وہ ناظر کے ذہن میں رسے بسے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے وہ فنکار کے تصور سے خارج ہوں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ جو کام موسیقار اپنی تخلیق میں موضوع اور رعندیہ سے لیتا ہے وہی شاکر علی اپنی تصاویر میں اشیاء سے لیتا ہے۔

شاکر علی اپنے خطوط، رنگوں کے درجۂ شدّت اور رنگ داری کے ذریعے تمام درمیانی زوائد کو چھوڑتے چلے جاتے ہیں تاکہ احساس فوراً جاگ اٹھے۔ پہلا عمل نظر کا ہے دوسرا خبر کا۔ "نظر" (تعارف) اور "خبر" (جذبہ) کے درمیان کے سارے حجابات شاکر علی کے ہاں ایک دم اُٹھ جاتے ہیں۔ یہ ایک طلسم اور سحر ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا وہ موسیقار کا پیدا کیا ہوا آہنگ۔ اگر موسیقار یہ عمل کر سکتا ہے تو نقاش کو بھی یہ چھوٹ ملنی چاہیئے۔

شاکر علی اسکیچ بنانے میں تیز تیکھے خطوط اور زاویے برتتے ہیں۔ جگہیں پُر کرنے کے لئے ملے جلے رنگوں کی استرکاری کرتے ہیں۔ خاکہ بندی میں تمام جزئیات خارج کر دیتے ہیں۔ بلکہ جاندار اشیاء میں تو وہ آنکھیں تک نہیں بناتے۔ بس ہیئت یا سراپا کا محض خیال ناظر کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ ان کے کام میں ہیئت متضاد پہلوؤں کا آمیزہ ہے۔ پلاسٹکی ٹھوس پن جو اُبھرواں کام (RELIEF) میں ملتے ہیں۔ اور دوسری طرف تناظر، عمق کا فریب نظر اور بُعدِ سوم، تینوں چیزیں غائب۔ وہ ہماری نظروں کو جو چیز دیتے ہیں وہ ایسی سطحیں ہیں جو مجسمہ سازی میں برتی جاتی ہیں۔۔۔

حال ہی میں جو نقش انہوں نے بنائے ہیں ان میں رنگوں کی شدت اور دمک کا شائبہ خارج ہے۔ یہ ایک ایسی جھلک داری ہے جو آفتاب کی تیز کرنیں "رنگین شفافوں" (COLOUR TRANSPARENCIES) پر پڑ کر کرتی ہیں۔ یورپ کی نشاۃ الثانیہ کے زمانہ میں بھورے رنگوں کا

رواج چلا تھا۔ جدیدی لوگ "بنیادی رنگوں" PRIMARIES کے گرویدہ ہو گئے۔ مگر شاکر علی ان دونوں سمتوں سے الگ، ہلکے ہلکے، دھیمے دھیمے، رنگ برتتے ہیں، زور صرف کالی لکیروں پر ہوتا ہے۔ رنگ بھرنے کے لئے وہ موقلم اور (PALLETT--KNIFE) استعمال کرتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں کا زور اور ضرب الگ دکھائی پڑتی ہے، گویا نقش میں سے یہ چیزیں ہماری طرف گھور کر دیکھ رہی ہوں۔ اس کی مثال پہلے پہلے ہمیں ططیان (TITIAN) کے ہاں ملتی ہے جو اس کے بعد کے نقوش میں ہے۔ یعنی موقلم کی نمایاں نمایاں گردشیں۔ شاکر کے ہاں بھی یہ چیز ہے اور بڑے زور و قوت کے مظاہر۔ ویسے تو ان کے نقوش میں ایک طرح کا ضبط اور ٹھہراؤ ہے مگر رنگوں کی چھینٹیں، لکیریں اور دھبے "باہمی قطع کاری" (CRISS-CROSSING) اور گھلاوٹ، حرکت کا عنصر پیدا کرتی چلی جاتی ہے۔ ان کے ہاں آرائشی زیب اگر کسی چیز سے آتی ہے تو وہ یہی عمل ہے۔ ان کے ہاں رنگین لکیریں اور دھبے (DABS) دراصل وہی کام کرتے ہیں جو موسیقی میں "درت"۔ اس سے "سم" بھی پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ مگر ان کے ہاں رنگوں کا تاثر دبا دبا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قدیم یونان کے ان برنجی مجسموں میں جو عہد نشاۃ الثانیہ میں کھود کر نکالے گئے اور جن پہ ہرے رنگ کی جمی ہوئی پپڑی نے بجائے خود ایک فنی طرحداری کا روپ دھار لیا ہے۔

بہرحال شاکر علی جو بھی کام کر رہا ہے اس میں زور ہے۔ وہ سپاٹ سطح کے عمل میں آذری ہیئتوں کا تصور سمو رہا ہے۔ یہ ضدین کو مجتمع کرنا ہے ـــــ وقت سے دوری کا عنصر بھی ان کے ہاں جذب ہوتا دکھائی دیتا ہے ؎

ہیچ و خم ـــــــــــــ بقیہ صفحہ: ۴۴

کر لیا تھا۔ اس نے احتیاطاً ایک ہفتے کی دوائی دے دی اور کہا "اپنی مائی کو ہمارا اسلام بولو، ہاں؟"

جب مائی مریم کو ڈاکٹر کا سلام پہنچا تو وہ اسے ملنے کو تیار ہو گئی۔ پیسے دینے کے علاوہ وہ اس کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہتی تھی۔ وہ جب مختار کے چہرے پر گئی گذری جوانی کے واپس آنے ہوئے آثار دیکھتی تھی تو نیالوں میں سجدہ ریز ہو جاتی تھی قصبے کے بچے بچے نے اسے مبارک باد کہی تھی۔ اور نواز کتاب نکال کر تعویذ دینے والے مولوی نے بھی مختار کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اور ڈاکٹر کو دل ہی دل میں کوستے ہوئے کھسیانی ہنسی کے ساتھ مریم کو مبارک باد کہی۔ تین روز بعد مریم ایک سو روپیہ پلے باندھ اور مختار کو ساتھ لے کر ڈاکٹر کے ہاں پہنچی اور آنسوؤں کی روانی میں اسے دعائیں دیں پھر ایک سو روپیہ اس کی میز پر رکھ دیا اور کہا:

"یہ ایک سو روپیہ لائی ہوں ڈاکٹر صاحب! خدا کے لئے قبول کر لیجئے۔ بڑی غریب ہوں۔"

"گر یب ہے تو اتنا روپیہ کدھر سے لایا تم؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تیس روپے اپنے ہیں ڈاکٹر صاحب! اور باقی ادھار لئے ہیں۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر تیس روپے اٹھا کر دراز میں رکھ لئے اور ستر روپے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "قرج مت لیو مائی! خدا ناراج ہوتا ہے۔ جاؤ۔ اب تمہارا بیٹا چرس کا نشہ نہیں کرے گا۔ کیوں رے؟"

اور مختار نے ندامت سے گردن جھکا لی۔

"ڈاکٹر صاحب!" ایک ادھیڑ عمر عورت ساتھ والے کمرے سے آئی اور ملتجی لہجے میں کہا۔ "مریضہ کی حالت بگڑ رہی ہے۔ ذرا جلدی کیجئے۔"

ڈاکٹر اٹھا۔ ساتھ والے کمرے میں ایک عورت لیٹی ہوئی کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے دایاں قدم تو ٹھیک اٹھایا جب بایاں پاؤں آگے رکھا تو یوں لگا جیسے اس کا پاؤں گہرے گڑھے میں جا پڑا ہے اور بائیں طرف گرنے والا ہے لیکن اس نے پھر دایاں قدم اٹھایا اور بائیں قدم پر پھر بائیں طرف گرنے کے انداز میں نیچے جھک گیا۔ اسی طرح جب وہ میز کی اوٹ سے مریم کے سامنے آیا تو اس نے دیکھا کہ ڈاکٹر کی بائیں ٹانگ دائیں سے چھ سات انچ چھوٹی تھی۔ مریم کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے ذہن میں وقت و زمانہ کا ایک چکر چل پڑا۔ تیز بہت تیز۔ اور تیز۔ کمرے کی ہر ایک چیز گھوم رہی تھی اور اس کا ذہن جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔ جب ڈاکٹر مریضہ کو دیکھ کر کمرے سے نکلا تو مریم نے گہری نگاہ سے ڈاکٹر کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی پیشانی کے بائیں طرف ننھی سا ایک نشان تھا۔ پرانے زخم کا نشان ؎

کوٹ ڈیجی :—— بقیہ صفحہ ۲۶

نے ماہرین آثار قدیمہ اور ماقبل تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے وادیٔ سندھ کے پہلے ہی لاینحل مسئلوں یعنی اس کی اصل اور رسم الخط میں ایک اور پیچیدہ مسئلے کا اضافہ کر دیا ہے۔

چونکہ کوٹ ڈیجی میں کھدائی چٹان کی آخری قدرتی تہہ تک کی گئی ہے، اس لئے اس تمدن کی اصل بھی متنازعہ فیہ رہے گی۔ کیا یہ سمندر کے راستے عراق سے آیا یا خشکی کے راستے وادیٔ ژوب سے جہاں زمانۂ ماقبل تاریخ اور ماقبل موئن جو دڑو سے متعلق اہم مقامات دریافت ہوئے ہیں یا یہ پاکستان کی سرزمین ہی سے کہیں مغربی پاکستان میں خود بخود پیدا ہوا ہے؟ یہ تمام معاملات ابھی دریافت طلب ہیں اور ان کے متعلق محض قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔ تاہم جو معلومات اب تک بہم پہنچی ہیں ان سے یہ بات قطعی طور پر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ پاکستان ۵۰۰۰ ق۔م ہی میں تمدن کے کس قدر اعلیٰ مقام پر پہنچ چکا تھا اور اس کے باشندوں میں شہریت کا شعور کس قدر ترقی پذیر ہو چکا تھا۔

تندرست لوگ باقاعدہ
لائف بوائے صابن سے نہاتے ہیں
LIFEBUOY SOAP
LIFEBUOY SOAP
یہ آئے دن کی گندگی اور اس کے جراثیم دھو ڈالتا ہے!
آئے دن ہمیں گندگی سے واسطہ پڑتا ہے، جس میں جراثیم ہوتے ہیں
اور جن سے ہمیں بیماریوں کا خطرہ رہتا ہے۔ اسی لئے تو بے شمار
لوگ اپنی صحت کی حفاظت لائف بوائے صابن کے باقاعدہ غسل کر
کرتے ہیں جو گندگی اور اس کے جراثیم بھی دھو ڈالتا ہے۔
اور تازگی اور شگفتگی کا صحت مندانہ احساس دلاتا ہے

اسلم - تو آپ کی رائے میں افراط زر کی روک تھام سے ہمارے ملک کی اقتصادی پریشانیاں دور ہوسکتی ہیں - ہم غریبوں کی پریشانیوں کا کیا ہے - ہم غریبوں کا تو اللہ ہی حافظ ہے مگر یہ پریشانیاں افراط زر کو روکنے سے کیونکر دور ہوسکتی ہیں ؟

اعجاز - قطعی طور پر - کیونکہ یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جب ملک میں زر کا پھیلاؤ بڑھتا ہے تو روپے کی قیمت خرید میں کمی واقع ہو جاتی ہے - اسے روکنے کے بہت سے طریقے ہیں -

اسلم - مثلاً کیا کیا ؟

اعجاز - ایک تو یہی کہ لوگ بچت کی طرف آمادہ ہوں - بچت ویسے بھی اچھی چیز ہے لیکن جب ملک میں افراط زر ہوتو بچت ہر شہری کے لئے لازمی ہو جاتی ہے اور آخرکار ان کو فائدہ پہنچاتی ہے -

اسلم - تو پھر بچت کی کوئی صورت تو بتائیے - یہاں آمدنی اتنی قلیل ہے کہ بچت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا -

اعجاز - یہ خیال سطحی ہے - بچت میں بڑی برکت ہوتی ہے اور یہ کسی صورت میں بھی پریشان کن نہیں ہوسکتی - قلیل آمدنی میں بھی بہت کچھ کیا جاسکتا ہے - صرف مستحکم ارادہ کی بات ہے - یہ ایسے ہی ہے جیسے سگرٹ نوشی کو کم کرنے کے لئے مستحکم قوت ارادی کی ضرورت ہے - ویسے بڑا کٹھن مرحلہ معلوم ہوتا ہے مگر آدمی اس پر آمادہ ہو ہی جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ کیسے سر ہوتا چلا گیا - یہی کیفیت بچت کی بھی ہے بس بچت کو ایک طرح کی ورزش سمجھو -

اسلم - بھئی ورزش کیسے ؟

بچت میں برکت

اعجاز - جیسے ورزش میں کچھ جسمانی مشقت ہوتی ہے لیکن اگر روز تھوڑی تھوڑی عادت ڈالی جائے تو یہ چیز راحت بن جاتی ہے - تازہ خون میں اضافہ ہوتا رہتا ہے بس پابندی اور ذراسی ہمت چاہیئے - بےقاعدگی اور بے دلی سے کام نہیں چلتا - آپ ایک بار بچت کرنا شروع کردیں تو یہ آسان ہوجائے گی - اور آپ اس کے پھل پائیں گے - تازہ خون کے سرخ ذروں کی طرح آپ کی آمدنی میں بھی زر کے ذرے بڑھنے شروع ہو جائیں گے "

اسلم - تو بچا بچا کے ڈھیر لگاتے جائیں اور بس ؟

اعجاز - نہیں نہیں بچانے کے ساتھ بڑھانے بھی یعنی سیدھی سی ایک بات جو میں خود بھی کرتا ہوں اور کافی عرصے سے -

اسلم - یعنی کیا صورت ؟

اعجاز - جتنا بچاؤ اس کے سرکاری سرٹیفکیٹ خرید لو، اور اگر ایک دم نہیں خرید سکتے تو ڈاکخانہ سے بچت کے کارڈ لےآؤ اور اس پر چار آنے

''بچت کارڈ'' پر چسپاں کرنے کے لئے ٹکٹ

آٹھ آنے روز کے حساب سے ٹکٹ، جو اسی مقصد کے لئے چھاپے گئے ہیں، لے لے کر جمع کیا کرو۔

اسلم۔ پھر کیا ہوگا؟

ایاز۔ جب پانچ یا دس روپے کے ٹکٹ اس کارڈ پر چسپاں ہو جائیں تو اسے لے کر ڈاکخانے پہنچ جاؤ۔ وہ یہ کارڈ لے کر آپ کو اصل سرٹیفکیٹ دے دیں گے۔

اسلم۔ ان سرٹیفکیٹوں کا فائدہ کیا ہے؟

ایاز۔ لو یہی تو سب سے فائدے کی بات ہے۔ یہاں ہم خرما و ہم ثواب۔ تمہاری بچت پر حکومت منافع دیتی ہے اور حکومت کے پاس جو روپیہ جمع ہوتا ہے اس سے ملک کے ترقیاتی منصوبوں کو مدد پہنچتی ہے، اور آخرکار تم بھی ان منصوبوں سے فائدہ اٹھاؤ گے ہی۔

اسلم۔ اچھا یہ بات ہے۔ تو پھر یہ سرٹیفکیٹ کون کون خرید سکتا ہے؟

ایاز۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ کوئی بھی چھوٹا، بڑا، بالغ یا نابالغ، مرد، عورت، انجمن، ادارے، غرض سب ہی۔

اسلم۔ کیوں ضرورت پر بھنا بھی سکتے ہیں؟ پھر [illegible] روپیہ [illegible] جب ضرورت ہو کام میں لے آؤ۔

ایاز۔ ہاں کیوں نہیں بھنا سکتے۔ خریداری کے بارہ مہینے بعد [illegible] بھنا سکتے ہیں۔ بڑی آسانی سے ڈاکخانہ جاؤ اور روپیہ لے آئے۔

اسلم۔ اگر میں یہ سرٹیفکیٹ اپنی بہن کی طرف سے خریدوں؟

ایاز۔ ہاں وہ ابھی چھوٹی ہے۔ اس کی طرف سے تم یا تمہارے والد یا والدہ یا کوئی سرپرست خرید سکتا ہے۔ وہی لوگ اسے جب چاہیں بھنا بھی سکتے ہیں۔

اسلم۔ مثلاً ہم مہینے میں ایک پانچ روپیہ کا سرٹیفکیٹ خرید لیا کریں تو اس کی عمر کے بڑھنے پڑھنے تعلیم، شادی بیاہ، وغیرہ کے موقع پر یہ روپیہ کام آسکتا ہے۔

ایاز۔ اور کیا، یہی تو اوسط درجے کے لوگوں کو سوچنا چاہئیے۔

اسلم۔ لیکن اگر کسی مالک کا، خدا نہ کرے انتقال ہوجائے تو؟

ایاز۔ اس کے وارث کو پوری رقم مع منافع مل جائے گی۔

اسلم۔ اور اگر کوئی اعتراض کرے کہ منافع نہیں لوں گا؟

ایاز۔ تو کیا ہے۔ اس کے سرٹیفکیٹ پر لکھ دیا جائے گا "غیر منافع"۔

اسلم۔ یہ ملتے کس ڈاکخانے سے ہیں؟

ایاز۔ کسی بھی ڈاکخانے سے مل سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہت سے ایجنٹ حکومت نے مقرر کئے ہیں، ان کی معرفت بھی خرید سکتے ہیں۔ کوئی کمیشن بھی نہیں دینی پڑتی۔

اسلم۔ یہ تو بڑی سہولت ہے۔ مگر ایک بات اور پوچھتا ہوں۔ فرض کرو میرا تبادلہ ہو جائے تو میں جہاں جاؤں گا وہاں سے اپنے سرٹیفکیٹ کو بھنا سکوں گا؟

ایاز۔ ہاں کیوں نہیں۔ پرچۂ شناخت ایک چیز ہوتی ہے۔ خریدتے وقت اسے ڈاکخانہ سے لے لیں۔ پھر آپ اپنا سرٹیفکیٹ جہاں بھی پیش کریں گے یہ پرچۂ شناخت آپ کی ملکیت کی تصدیق کردیگا۔ یعنی کوئی دقت ہی نہیں ہے۔

اسلم۔ اگر کوئی سرٹیفکیٹ گم ہوجائے تو کیا کریں؟

خاندان کے مستقبل کا خیال رکھیں

بچت کے سرٹیفکٹ

ز - حواس باختہ ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ درخواست دیجئے - ڈاکخانہ تحقیق کریگا - پھٹے پرانے، خراب ہوجانے والے سرٹیفکٹوں کو بھی ڈاکخانہ بدل دیتا ہے - یعنی ایک دستاویز لکھکر دے دیتا ہے جو اصل سرٹیفکٹ کا نعم‌البدل ہوتی ہے - مطلب یہ ہے کہ آپ کا روپیہ کبھی خطرہ میں پڑتا ہی نہیں -

لم - یہ تو رہی ذاتی منافع کی بات - اس کے علاوہ اور کیا صورت ہے جو آدمی کسی کو فائدہ پہنچانے کے لئے اس سلسلے میں کرسکتا ہے ؟

از - اگر آپ کو خدا کسی بڑے کاروبار یا کارخانے وغیرہ کا مالک بنادے، یا پھر ویسے ہی اگر آپ چاہیں تو اپنے عملے یا نوکروں کی طرف سے یہ سرٹیفکٹ خرید سکتے ہیں -

لم - اس کی کیا صورت ہوتی ہے ؟

از - بہت معمولی - اپنے عملے یا نوکروں کو پیشگی روپئے دے دیجئے - وہ اس سے سرٹیفکٹ خرید لیں گے - یہ سرٹیفکٹ آپ کے پاس محفوظ رہینگے - جب آدمی سارا روپیہ اتاردے تو اس کے سرٹیفکٹ اس کے حوالے کردیں - آپ کی اس مدد سے اس کی کچھ بچت بھی ہوجائے گی اور منافع بھی ملیگا - آپ کی پیشگی رقم اسکی تنخواہ میں مجرا ہوتی رہیگی - ہاں، بہت معمولی جھنجھٹ ہیں -

سلم - مگر ہم لوگ جانتے ہی نہیں ؟

یاز - ہاں یہ کبھو جان بوجھ کر عمل نہیں کرتے۔ اور بھائی صاحب یہ دنیا جائے عمل ہے !

سلم - بھئی وہ بچوں والی بات پھر ذرا سمجھا دو کہ بچوں کی طرف سے کس طرح خریدیں ؟

یاز - ہاں بہت معمولی سی ترکیب ہے - بچوں کو روزانہ جو جیب خرچ ملتا ہے وہ اکثر فضول چیزوں میں اڑا دیتے ہیں - آپ ان کو اگر بچت کا کارڈ لاکر دیدیں تو وہ جسطرح ڈاک کے پرانے ٹکٹ جمع کرتے ہیں اسی طرح بچت کے ٹکٹ روز یا دوسرے چوتھے بڑے شوق سے جمع کرنے لگینگے اور فخر سے دکھایا کریں گے کہ اب اتنے پیسے جمع ہو گئے اور اب اتنے جمع ہوگئے - جونہی پانچ یا دس روپے کے مکمل ٹکٹ جمع ہو جائیں، انہیں سرٹیفکٹ خرید دیں -

اسلم - اچھا ایک اور بات بتا دیجئے - منافع کیا ملتا ہے ؟

ایاز - ہاں تمہاری بھی عجب حالت ہے - ابھی انڈوں میں سے بچے نکلے نہیں کہ جوڑے گننے شروع کردئے !

اسلم - (ہنس کر) : شیخ چلی اور کسے کہتے ہیں -

ایاز - نہیں شیخ چلی والی بات نہیں ہے - اصل میں سارے بڑے خیال شیخ چلی ہی کے دن سے ہی پیدا ہوئے ہیں مگر فرق صرف یہ ہے کہ لوگ جو کوئی کام کی بات کرجاتے ہیں وہ شیخ چلی سے ذرا آگے بڑھ جاتے ہیں — یعنی عمل میں لانے کا تہیہ کر لیتے ہیں اور پھر کرتے ہی چلے جاتے ہیں—اچھا خیر سنو، منافع کتنا ملتا ہے ابھی حکومت نے نیشنل ڈویلپمنٹ سیونگز سرٹیفکٹ کے نام سے بچت کے نئے سرٹیفکٹ جاری کئے ہیں جن پر ۵ فیصدی منافع ملتا ہے - اگر آپ دس سال تک کسی سرٹیفکٹ کو نہ بھنائیں تو آپ کے ہر روپے کا ڈیڑھ روپیہ ہوجائیگا - اور کیا چاہتے ہو ؟

ڈاکخانہ کے سیونگز بینک کی کھڑکی

اسلم—ذرا اطمینان کے لئے پوچھ رہا تھا— مطلب یہ ہے کہ منافع بھی کافی ہے—حفاظت و امانت کے لئے حکومت کی ضمانت موجود ہی ہے -

ایاز—اس میں شک بھی کیا ہے - مگر ایک خیال رہے—اور وہ یہ ہے کہ صرف پانچ دس روپے کے ہی سرٹیفکٹ نہیں ہیں - زیادہ مالیت کے بھی سرٹیفکٹ ملتے ہیں—جیسے پچاس روپے، سو روپے، پانچسو روپے، ہزار، پانچ ہزار والے بھی ہیں -اگر کسی وقت کوئی شخص فضول قسم کے، غیر پیسی، منافع اور نقصان ہوجانے والے کاروبار کے حصے بیچنا چاہے اور اس کے پاس کوئی معقول سی رقم ہے تو سیدھا ڈاکخانہ کا رخ کرے—کیوں میاں ٹھیک ہے یا نہیں؟ اصل میں یہ خبر لینا بات کی عادت پیدا کرنے کے لئے ہے—دس سالہ سرٹیفکٹ پر حکومت کا مقصدی منافع دینی ہے ایک بات اور سناؤں -

اسلم— ہاں وہ بھی سنیں -

ایاز—اس منافع پر انکم ٹیکس معاف ہے-

اسلم—اچھا - پھر تو چھوٹے بڑے سبھی بچانے ہونگے- مگر حکومت اس روپے کا کرتی کیا ہے اور اس پر منافع دیتی کہاں سے ہے؟

ایاز—لو سارا قصہ سنکر کہتے ہیں زلیخا عورت تھی کہ مرد ! بھائی، آخر ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لئے روپیہ کہاں سے آئے؟ یہ سب کے فائدے کے کام ہیں اور ان میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کا سرمایہ لگنا چاہئے—یوں تو حکومت صرف بڑے بڑے لوگوں سے بھی روپیہ لیکر لگا سکتی ہے، مگر مقصد اس چھوٹی بچت کی اسکیم کا یہ ہے کہ سب کو ان سرمایہ منصوبوں میں روپیہ لگانے اور منافع کمانے کا موقع دیا جائے -

اسلم—تو یوں سمجھو کہ ہم بھی تھوڑا سا روپیہ لگا کر بڑے بڑے کاموں میں شریک ہو گئے- اچھا بھئی . تو ہم چلے ایک سرٹیفکٹ لینے آج تو اتنی میں ہیں بھی روپے—

ایاز—آخر ہو نہ سمجھدار ! ہاں اگر کوئی اور بات پوچھنی ہو تو وہیں ڈاکخانے سے معلوم کرلیں—ورنہ ایک ٹھکانا اور بھی ہے—ذرا دم تولو- تم تو ایک دم شیخ چلی سے واقعی عمل یار خاں بن گئے !— میاں ،، اگر اور کچھ معلومات حاصل کرنی ہوں تو حکومت پاکستان کے سونگز بورو یا نیشنل سونگز کراچی کے دفتر سے حاصل کرلینا - ٹھیک ہے نہ ؟ *

مسلم بنگالی ادب

قاضی نذر الاسلام

علی اختر مرحوم

روشؔ صدیقی

شیر افضل جعفری

ابو اللیث صدیقی

یونس احمر

ماہر القادری

کمال احمد رضوی
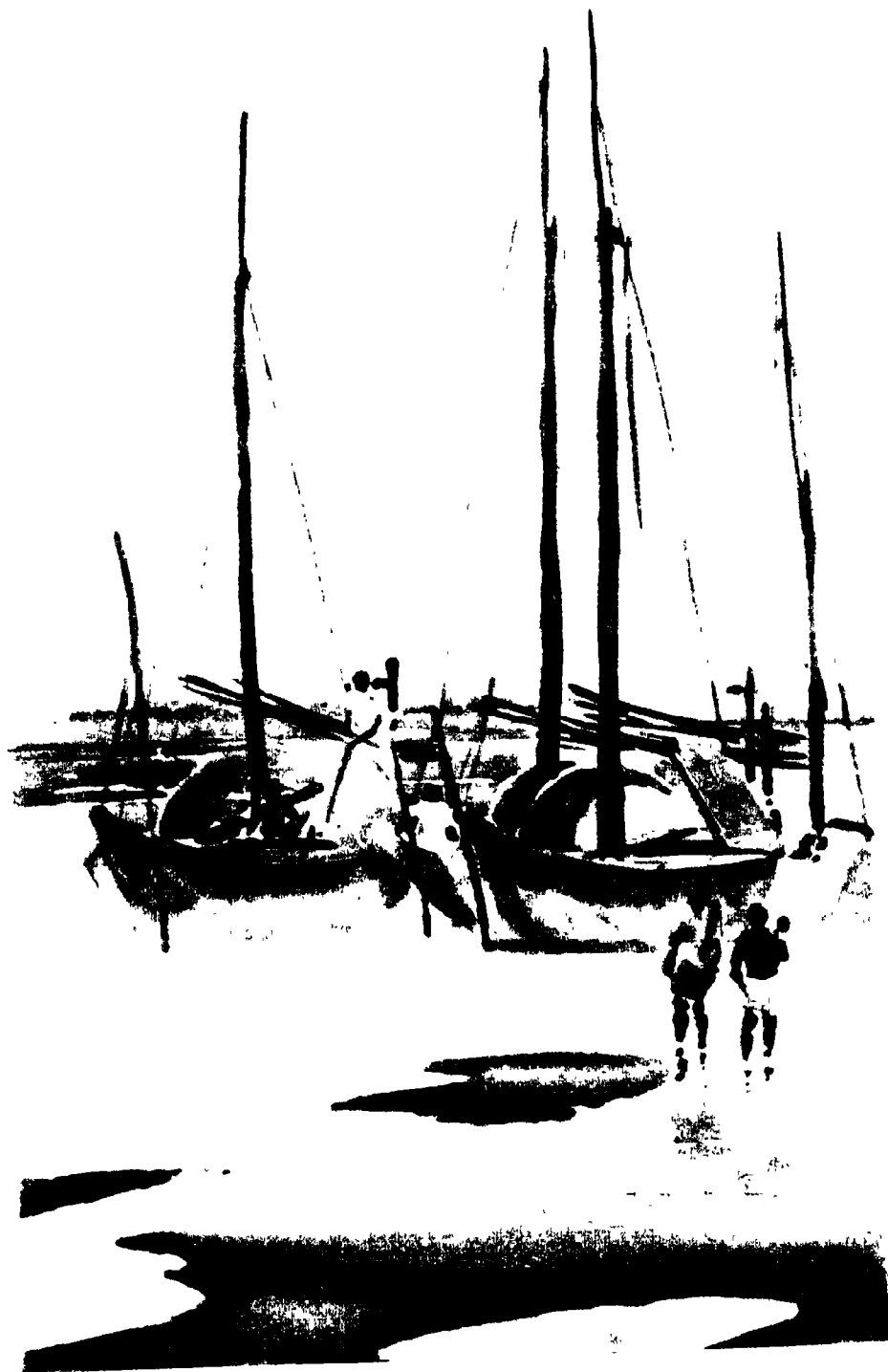
اشفاق احمد

قیوم نظر

عاصمہ حسین

عارف حجازی

مئی ۱۹۵۸ء
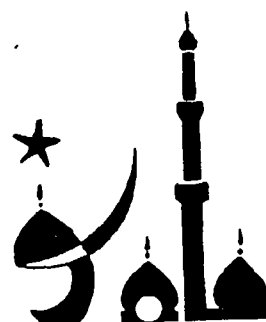
قیمت ۸ر

ماہِ نو

جلد ۱۱ — شمارہ ۲
مئی ۱۹۵۸ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے
فی کاپی ۸ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

اپس کی باتیں

بنگال کے "دھوم کیتو" قاضی نذرالاسلام ایک شاعر کی حیثیت سے منفرد و ممتاز ہیں۔ وہ ایک سپاہی شاعر ہیں۔ انقلاب پسند، انقلاب مست اُس دور میں جب "رخِ سحر کی لگن" کچھ زیادہ نمایاں نہ تھی۔ اس دیوانہ آتش نوا نے اپنی "اگنی وینا" اُٹھائی اور اسے ایک دم شعلۂ جوالہ بنا دیا۔ ایک ایسا صور پھونکا جس نے ہر دل میں حصول آزادی کے لئے ایک نئی روح، ایک نئی تڑپ، ایک نئی ہلچل پیدا کر دی۔ وہ ایک ہر دلعزیز شاعر ہیں۔ صحیح معنوں میں عوامی شاعر جن کا کلام فکر و خیال کی اتھاہ گہرائیوں سے نہیں اُبھرتا بلکہ جذبات کی بےچین روشن سطح پر کھیلتا رہتا اور اپنے ہلکے پھلکے مگر ساتھ ہی گرجدار جوار بھاٹے کے آثار چڑھاؤ دکھلاتا ہے۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے براہ راست، بے محابا کہا ہے اور بہت ہی صاف سیدھے سبھے تلے۔ خالص سپاہیانہ انداز میں آج ہمارے نذرل۔ چہیتے نذرل کی حیثیت ایک خاموش کوہ آتش فشاں کی سی ہے۔ مگر اس سے اُن کے چہیتے پن اُن کی جاذبیت اور دلکشی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ہم ان کے قرب میں وہی دل بستگی، وہی حرارت پاتے ہیں جو زندہ دل شاعروں اور انقلاب کے علمبرداروں سے مخصوص ہے۔ قارئین اس شمارہ کے ابتدائی صفحات میں اسی قرب کی کوشش نمایاں پائیں گے۔

★

منصور حلاج کے متعلق ڈاکٹر میری۔ این۔ شمل کے بصیرت افروز تحقیقی مقالہ کا باقی ماندہ حصہ اس شمارہ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سے تصویر کے تمام پہلو نظر کے سامنے آ جاتے ہیں اور نہ صرف حلاج کے متعلق اقبال کی تبدیلیٔ تصور کا پتہ چلتا ہے بلکہ خود اقبال کے فکری ارتقا پر بھی خاصی روشنی پڑتی ہے۔ ضمناً صوفیائے کرام کے نفیٔ خودی و اثباتِ خودی کے بارہ میں حقیقی موقف پر بھی روشنی پڑتی ہے اور بہت سے مغالطے دور ہو جاتے ہیں۔ اس قدر کہ ہمیں اُن کے فکر کے ڈانڈے اقبال کے فکر سے بڑی حد تک ملتے بلکہ اُن کے ساتھ منطبق نظر آتے ہیں۔

★

سرورق: — "کشتیاں" — نقاش: انوارالحق

لہ شہاب ثاقب

شاعرِ آتش نوا

یونس احمر

فروری ۱۹۵۸ء کی بات ہے۔ میں نذرالاسلام سے ملنے گیا۔ یہ میری ان سے پانچویں ملاقات تھی۔ چار منزلہ عمارت کی سب سے آخری منزل پر اُن کا قیام تھا۔ سیڑھیاں طے کرکے جونہی اُن کے فلیٹ میں داخل ہوا۔ ایک کھاٹ پر پرمیلا نذرل لیٹی ہوئی نظر آئیں۔ سفید ساڑی میں ملبوس گوری چٹی پرمیلا نذرل نے مجھے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ جانے کو کہا۔ میں ابھی بیٹھا بھی نہ تھا کہ سامنے نذرالاسلام نظر آگئے۔ وہ تہمد باندھے ہوئے تھے اور جسم پر ڈھیلا ڈھالا کرتا تھا۔ ان کی لمبی زلفیں جو کبھی اُن کی شاعرانہ عظمت کی نشاندہی کرتی تھیں اب چھوٹی ہو چکی تھیں اور بڑی بڑی سحر خیز آنکھوں کا جادو تو جیسے ڈھل گیا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھے ہوئے تھے اور سامنے کاغذ کا انبار لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر تک وہ کاغذ سے کھیلتے رہے، پھر اٹھے اور ٹہلنے لگے ــــــ جیسے وہ کوئی گیت، کوئی غزل یا کوئی نظم موزوں کر رہے ہوں۔ پھر بیٹھ گئے اور کاغذ کے انبار کے ساتھ اُن کا کھیل شروع ہو گیا۔ ایک بار انہوں نے میری طرف تاکا ـــــ آنکھوں میں وہی شعلہ فشانیاں تھیں، مگر گرمی نہ تھی۔ پرمیلا نذرل نے مجھے بتایا کہ کبھی کبھی جب اُن پر جنونی کیفیت طاری ہوتی ہے تو آنکھوں سے واقعی انگارے چھوٹنے لگتے ہیں اور گھر بھر سہم جاتا ہے۔ جب میں نذرل کے بارے میں سوالات کر رہا تھا کہ ایکا ایکی پرمیلا نذرل کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ بولیں: "ہم دونوں زبردستی زندگی کو گھسیٹ رہے ہیں، نہ جانے زندگی ہم سے کیسا امتحان لے رہی ہے۔" اور یہ سچ بھی ہے کہ ایک گھر میں دو مفلوج اور اپاہج انسان۔ پرمیلا نذرل کی طاقت گفتار سلامت ہے مگر وہ ہل نہیں سکتیں اور نذرل کی طاقتِ گویائی جواب دے چکی ہے مگر وہ چل پھر سکتے ہیں، اور بیک وقت کئی تصویریں میرے ذہن میں ابھر آئیں:۔

نذرل کی آتش نوائی نے نہ صرف بنگالی مسلمانوں کو بلکہ پورے بنگال کو جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

انہوں نے بنگلہ زبان کو ایک نیا آہنگ دیا، نیا اسلوب دیا، نئی طرز فکر دی۔

انہوں نے زندگی کو گلے لگایا، زندگی کے نغمے گائے اور پرانی روایتوں سے انحراف کرتے ہوئے اجتہاد کیا۔

نذرل کی آتش نوائی کے بارے میں ہم بہت کچھ سن چکے ہیں اور پڑھ بھی چکے ہیں۔ ان کی نظم بدروہی دنیا کی زندہ زبانوں میں ترجمہ ہو کر مقبول ہو چکی ہے۔ آیئے آج ہم اُن کے آہنگ، اُن کے اسلوب اور ان کی طرز فکر پر نئے زاویۂ نظر سے سوچیں۔

نذرل نے جب تک بندی شروع کی تھی اس وقت بنگال کے سب سے بڑے شاعر ٹیگور کو نوبل پرائز ملا ـــــ یعنی یہ انعام اس بات کا ثبوت تھا کہ ٹیگور اس عہد کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ اُن کے آفتاب شاعری کے سامنے دوسرے شاعروں کا آفتاب روشن نہیں ہو سکتا۔ لیکن نذرل نے بنگلہ ادب کو ٹیگور کے فکری رجحانات سے ہٹ کر ایک نیا آہنگ دیا۔ اس آہنگ میں زندگی کے اسرار و رموز نہیں بتائے گئے تھے اور نہ حسن و عشق کی گرمیاں سموئی گئی تھیں بلکہ یہ آہنگ تھا پورے بنگال کا جس میں لاکھوں درماندہ اور دریوزہ گر عوام کے دلوں کی تیز دھڑکنیں تھیں۔ اس میں اُن کی سانسوں کا وہ آتش فشاں تھا جس پر برف کے تودے رکھ دیئے گئے تھے۔ نذرل نے اپنے دل کی بلکہ لاکھوں انسانوں کے دلوں کی بات کہنے کے لئے اشاروں اور کنایوں سے کام نہیں لیا کیونکہ اُن کی طبیعت کی ہیجانی کیفیت اور اُن کے خیالات کی برجستگی و بے ساختگی تمثیلوں اور اشاروں سے بہت آگے تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اشارے اور کنائے تخیل کی بلند پروازی میں معاون ثابت ہوتے ہیں اور زبان و بیان میں اُن کی وجہ سے نکھار آجاتا ہے لیکن نذرل تو ہر بات کو واضح انداز میں بتانا چاہتے تھے کیونکہ ان کا عہد اشاروں کنایوں کے لئے نہ تھا۔ اور پھر دوسری بات یہ کہ وہ میدانِ جنگ سے لوٹے تھے۔ اُن کے خون میں گرمی تھی اور اُمنگوں میں بلا کا جوش تھا۔ وہ اپنے ملک کو غیر ملکیوں کے پنجۂ استبداد سے آزاد کرانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں میں، اُن کے اندازِ فکر میں جارحانہ پن آگیا ہے اور ایک مخصوص مدت تک یہ جارحانہ پن اُن کے فکر و نظر میں اس حد تک رچ بس گیا تھا کہ وہ سراپا انقلابی بن گئے تھے اور جو بات بھی کہتے براہِ راست کہہ دیتے تھے۔ ان کی ہنگامہ پسندی کی بہترین مثال اُن کی مشہور ترین نظم بدروہی (باغی) ہے۔ اس نظم میں وہ سراپا طوفان ہیں، برق ہیں، ہیجان ہیں۔ مگر ساتھ ہی موضوع کی وسعت اور ہمہ گیری نے ان کے

خلوص اور ان کی شدتِ جذبات کو کہیں سے بھی مجروح نہیں کیا ہے۔ انقلاب کے بارے میں ان کا اپنا جو نظریہ ہے اس میں وہ بہت مخلص اور باعمل نظر آتے ہیں۔ اس طویل نظم میں اگرچہ جوش، واضطراب اور نعرۂ اجتہاد کی فضا چھائی ہوئی ہے لیکن کہیں کہیں ایسی دلآویزی اور دلکشی آگئی ہے کہ جذباتیت کا عنصر مدھم پڑ جاتا ہے اور ہم نذرل کو ایک نئے انداز میں دیکھتے ہیں —— ایک نئی دنیا میں جہاں حسن و عشق کی رنگینیاں اور رعنائیاں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً :

بندھا جوڑا کنواری کے بالوں کا ہوں

جو ترچھی نظر سے چلے وہ خدنگ

حسینہ کا وہ بوسۂ اولیں

کہ جس کی حلاوت کی حد ہی نہیں

یا پھر ——

کبھی چشمِ دوشیزہ کی سنسنی	محبت کے بوسے نے دے کر چرالی
نظر بازیاں شاہدِ شوخ کی	جو پردے سے جھانکے پھر آنکھیں چرائے
نہ دیکھا کہ دیکھا یہ الجھن سی ہے	کبھی کچھ کہے دل کبھی کچھ کہے

یہ نذرل کا اپنا آہنگ ہے۔ یہ اُس بنگال کا آہنگ ہے جو فطرت کی نعمتوں سے مالامال ہونے کے باوجود غیر ملکی استبداد و جبروت سے آزاد ہونے کی لگن میں انقلاب و دہشت پسندی کی طرف مائل ہو رہا تھا۔ اس آہنگ کو سارے بنگال نے قبول کیا۔ البتہ ان کے اس جرأت مندانہ اقدام پر بعض گوشوں سے مخالفت بھی ہوئی اور انہیں طرح طرح کے القاب سے نوازا گیا مگر وہ اپنی راہ پر گامزن رہے۔

نذرل کی شاعری کو ہم تین خانوں میں بانٹ سکتے ہیں۔ نظم۔ گیت اور غزل۔ اور ہر صنف میں اُن کا آہنگ جدا جدا ہے۔ بیشتر طویل نظمیں انقلابی اور باغیانہ ہیں جن میں غلامی سے نفرت اور جھنجھلاہٹ پائی جاتی ہے۔ جن میں ایک سپاہی کی گرج ہے، ایک شاعر کا تخیل ہے اور ایک غلام کی تڑپ ہے۔ ابتدا ہی سے جس کی طبیعت سرفروشانہ اور مجتہدانہ ہو وہ کہاں تک کھری باتیں کہنے سے رکتا۔ "اگنی بینا" اُن کے کلام کا پہلا مجموعہ ہے جس میں بیشتر نظمیں ایک غلام قوم کو کچھ کر گزرنے کی تلقین کرتی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس مجموعہ کی ہر نظم میں جذبے کا خلوص اور جذبات کی شدت ہے لیکن فکری گہرائی نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان میں انسان کے دل کی دھڑکنیں سنائی نہیں دیتیں۔ نہیں ان میں انسان کے دل کی دھڑکنیں صاف اور واضح طور پر سنائی دیتی ہیں کیونکہ ان نظموں میں یہی چیز تو عیاں ہے۔ ان میں ایک بے لوث اور مخلص سپاہی کی آواز ہے۔ یہ نیا آہنگ ہی تو تھا جسے سن کر ٹیگور اور ان کے ہمنواؤں کے کان کھڑے ہو گئے اور ٹیگور نے فرطِ محبت میں آکر کہا تھا :

"آئے چولے تئے رے دھوم کیتو ——	"اے شہابِ ثاقب تو آبھی جا
آندھارے باندھ اگنی سیتو" ——	اور اندھیرے میں آگ کا پل بنا"

بدروہی کے علاوہ ان کی ایک اور طویل نظم "جھڑ" (طوفان) ہے جس میں جذبات کی شدت اور خیالات کی جولانی اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے۔ یہاں نذرل طوفان کے روپ میں آتے ہیں۔ اس میں بدروہی سے کہیں زیادہ گھن گرج اور حشر خیزی ہے۔ وہ غلامی کی ساری آلائشوں اور گندگیوں کو طوفان بن کر خس و خاشاک کی طرح صاف کر دینا چاہتے ہیں۔ وہ زندگی کو در اصل زندگی کے اصلی روپ میں دیکھنے کے متمنی ہیں۔ وہ اس کے سندرتا اور حُسن کو مسخ صورت میں دیکھنا نہیں چاہتے۔ کیونکہ ان کے اندر زندگی کو بنانے اور سنوارنے کا نیا جذبہ ہے، نئی لگن ہے، تڑپ اور احساس ہے۔ وہ فرسودہ نظام کی جگہ نیا نظام لانے کی آرزو میں، کبھی باغی بنتے ہیں، کبھی طوفان اور کبھی سمندر۔ ان نظموں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں قنوطیت نہیں ہے۔ شروع سے آخر تک رجائیت کارفرما ہے۔ وہ کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ ان کے جذبے کی شدت کبھی برف نہیں بنتی۔ وہ زندگی کا دامن نہیں چھوڑتے۔ وہ تو طوفانوں میں گھر جانے کے باوجود پیش روی کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

"جھڑ" (طوفان) میں نذرل کا یہ آہنگ سنیے :

قاضی نذرالاسلام

قومی اعزاز

اس سال نمایاں ، علمی ادبی اور فنی خدمات کے صلے میں جن اصحاب کو قومی اعزازات سے سرفراز کیا گیا ہے ان میں سے چند کی تصاویر یہاں پیش کی جاتی ہیں

ابوالاثر حفیظ :
قومی ترانے کے خالق

عبدالرحمان چغتائی — (نامور نقاش)

ڈاکٹر شہیداللہ
(صدر شعبہ بنگالی
راجشاہی یونیورسٹی)

زین العابدین — (باکمال مصور)

جسیم الدین (بنگالی عوامی گیتوں کے مرتب)

طوفان کہاں ؟ کدھر؟
وہ تو انقلاب کا لال گھوڑا ہنہنا رہا ہے ——— وہ دیکھو،
وہ دیکھو اس کے کھُر بادل کو چیر رہے ہیں
نہیں، نہیں، آج میں چلا
میرے باغی ہمدم میں پھر آؤں گا ——— تم جاگتے رہو جاگتے رہو!

آٹھ صفحے کی یہ نظم نذرل نے تین گھنٹے میں لکھ ڈالی اور ایسی حالت میں جب وہ بخار میں پھُنک رہے تھے۔ اس نظم میں بیباکی کے ساتھ ساتھ صاف گوئی بھی ہے۔ سحرکاری کے ساتھ خونِ جگر کی گرمی بھی شامل ہے۔ انھوں نے واقعی جگر کا خون دیکر ان نظموں کی تخلیق کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں اجتماعی شعور ہے، شعریت ہے، حُسن اور پُرکاری ہے۔ ان میں ہمیں اپنی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان میں ہمارے دلوں کی دھڑکنیں شامل ہیں۔ ہمارے آنسو، ہماری خوشیاں اور ہمارے دُکھ درد ہیں۔

بدرو ہی اور جھڑ کا اسلوب بھی بالکل اچھوتا ہے۔ اس سے پہلے بنگلہ زبان میں ایسا اسلوب کبھی استعمال نہیں کیا گیا۔ خیالات کی جولانی اور برق رفتاری کے ساتھ ساتھ اسلوب کا بھی خیال رکھا گیا ہے۔ درصل نذرل آہنگ کے ساتھ ساتھ اسلوب کا بھی خیال رکھتے تھے۔ ان کی نظموں کے آہنگ اور اسلوب نے تو درحقیقت بنگلہ زبان کی پوری ہیئت بدل ڈالی۔ بہتوں نے ان کے اچھوتے اسلوب کو اپنانا چاہا۔ مگر آج تک کسی کو کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

نذرل نے بنگلہ زبان کو نئے آہنگ اور اسلوب کی طرح نئی طرزِ فکر دی۔ انہوں نے پورے بنگال کو جو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ان کی طرزِ فکر ٹیگور کی طرزِ فکر سے بالکل مختلف تھی۔ ٹیگور کے آہنگ اور ساز میں سحر آفرینی اور فنی دلکشی تھی لیکن انھوں نے چونکہ اپنا رشتہ براہِ راست عوام سے جوڑا تھا اس لئے ان کی طرزِ فکر میں کوئی فلسفہ نہ تھا، کوئی نفسیاتی کھتی نہ تھی۔

طبقاتی سیاست اور طبقاتی نظامِ زندگی کے خلاف سب سے پہلے بھرپور وار نذرل ہی نے کیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہ طبقاتی نظام ان کی سماجی زندگی کا سارا خون نچوڑ لیگا۔ چنانچہ وہ بآوازِ بلند اعلان کرتے ہیں:

گاہی شامیہ رگان ——— میں مساوات کے گیت گاتا ہوں
جے کھانے آشیا ایک ہوئے گیچھے سب بادھا بیودھان ——— جہاں آکر سارے بھید بھاؤ مٹ جاتے ہیں۔

اس بھید بھاؤ کو دُور کرنے کے لئے نذرل نے نہ صرف سب سے پہلے قدم اٹھایا بلکہ وہ اپنے اس اصول پر برابر سختی سے کاربند رہے۔ کیونکہ ان پر یہ واضح طور پر روشن ہو چکا تھا کہ جب تک طبقاتی نظام کا قصر بلند ہے۔ اس وقت تک زندگی کے رُخِ روشن کے اُوپر بے انصافیوں اور ظلم وجَور کا غلاف چڑھا رہے گا۔ انہوں نے اس حقیقت کو شدت سے محسوس کیا ہے۔ وہ انسان کو یعنی عوام کو اس دنیائے آب وگِل میں سب سے بڑا مرتبہ دیتے ہیں۔ اسی لئے تو انہوں نے بارہا کہا ہے:

مانو شیر چیئے بڑو کیچھو نائی، نا ہے کیچھو مہیان ——— انسان سے افضل کوئی مخلوق نہیں اور نہ کوئی اعلیٰ ہے۔

اور یہ حقیقت ہے کہ نذرل اپنے نئے آہنگ، نئے اسلوب اور نئی طرزِ فکر سے ایک ایسے جہانِ رنگ و بو کی بنا ڈالنا چاہتے تھے، جہاں انسان، انسان کا دشمن نہ ہو، چھوٹے بڑے کی تفریق اور دولت کی غلط تقسیم نہ ہو ——— جہاں مساوات کے گیت گائے جاتے ہوں، جہاں ہر فرد کو یکساں مراعات حاصل ہوں۔ عوام کو برسرِاقتدار طبقہ کی آہنی گرفت سے نجات دلانے کا جذبہ ان پر اتنا غالب آجاتا ہے کہ اکثر اوقات ان کے شعروں کی نغمگی مجروح ہو جاتی ہے مثلاً:

تو می شوئے رَو بے تالیرا و پرلے، آمرا رو ہی بو نیچے ——— تم سہ منزلہ عمارت پر آرام کروگے اور ہم خاک نشیں رہیں گے
اٹھو جو تو مارا دیوتا بولی بو، سے بھورو سا آج میچھے ——— یا ہم تمہیں اپنا آقا سمجھتے رہیں گے ——— آج یہ خیال حرفِ غلط کی طرح غلط ہو چکا ہے

لیکن نذرل شعروں کی سحر آفرینی اور نغمگی کو دیدہ و دانستہ مجروح نہیں کرتے وہ تو طبقاتی نظام کی آہنی دیوار کو گرانے کے لئے ایسا کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایک چیز جو نذرل کی شاعری میں ابتدا سے نظر آتی ہے۔ وہ ہے ان کی رجائیت پسندی۔ ان کی کسی ایک نظم میں بھی قنوطیت اور مایوسی کی جھلک نہیں ملتی۔ وہ درازئ شب سے مایوس ضرور ہو جاتے ہیں مگر صبحِ اُمید کے شفق چہرے کو ہمیشہ اپنی آنکھوں کے سامنے پاتے ہیں۔ اور وہ قنوطیت پسند بنتے بھی کیسے

ان کے دل میں توحوصلوں اور ولولوں کا چراغ روشن رہا ہے، ان کے سینے میں آرزوؤں کے ستارے فروزاں ہوتے ہیں :

یہ سچ ہے خورشیدِ اوج اپنا ہوا ہے کب کا غروب لیکن وہ جگمگاتا طلوع ہوگا، ہمارے ہی خون میں نہاکر

ان کی نظموں میں جو گھن گرج، جو للکار، جو شوریدگی اور شوریدہ سری ہے وہ اس لئے نہیں ہے کہ وہ نعرہ باز ہیں اور تخریبی کارروائی کرکے غلامی کی زنجیریں کاٹنا چاہتے ہیں بلکہ یہ سب کچھ منزلِ مقصود تک پہنچنے کی لگن ہے اور اپنی کائنات کو کلہائے بامراد سے سجانے کی آرزو ہے۔ اگر ان کے کلام میں ان کے خیالات و احساسات میں تلخی آگئی ہے تو اس کی وجہ برسوں کا وہ غلط نظامِ حیات ہے جس نے زندگی اور زندگی کی روشن قدروں کو پائمال کرکے رکھدیا ہے، اور پھر وہ غلط سیاست گری ہے جو عوام کو بار بار اپنا کھلونا بناتی رہے۔ ایک اور چیز جو نذرل کی شاعری میں رچی بسی ہے وہ ہے انکا عزم اور نصب العین :

بولو بیر ۔ ۔۔۔۔ جواں مرد کہدے

بولو انتو مم شیر ــــــــ کہ میرا سر ہمیشہ بلند رہے گا

اور واقعی ان کا سر ہمیشہ بلند رہا۔ اسی سربلندی کے لئے ہی تو وہ جیل گئے۔ اُن پر کفر کا فتویٰ صادر کیا گیا۔ ایک ضلع سے دوسرے ضلع اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں میں روپوش ہوئے۔ دل و دماغ کو کبھی سکون نہ ملا۔ برابر جنونی کیفیتوں میں مبتلا رہے۔ سرفروشانہ جذبے کی آنچ ٹھنڈی پڑتی تو گیتوں اور غزلوں کے رنگا رنگ گل بوٹوں سے اپنی کائنات کو زینت بخشتے لیکن یہاں بھی غمِ عشق چین نہیں لینے دیتا۔ یہاں بھی نرم و نازک پھولوں اور کلیوں کے پیراہن میں انگارے ملتے۔ یہاں بھی انہیں ہجر کا کالا ناگ پھن پھنکارے نظر آتا اور وہ ہمیشہ بیکل اور مضطرب سمندر کو اپنا مونس و ہمدم بنالتے۔ اپنی مشہور نظم "سمندر سے خطاب" میں وہ کہتے ہیں:

مرے پیارے ساتھی، مرے پیارے ہمدم
ملے ہیں بہت دن کے بچھڑے ہوئے ہم
ہیں باتیں بہت سی، ہیں نغمے سنانے کو بیتاب دل میں
سنوں گا تمہارے بھی دکھ کی کہانی، تمہاری زبانی!
مرے دوست آؤ، مرے سامنے
ہو ممکن تو اپنے گداز اور سجل بازوؤں میں مجھے بھی
اُٹھالو سنبھالو

چلو مجھ کو لیکر
نہ موجیں جہاں ہوں!
اندھیرے سے کہدو کہ اب پٹ نہ کھولے
وہیں اپنے دل کا میں چھیڑونگا نغمہ
جہاں لعل و گوہر ہوں آنکھوں سے اوجھل
جہاں صرف تم، دردِ دل اور میں ہوں!
وہاں خود خموشی تکلم بنے گی
کھلے گر وہاں تم
تو اتنا کہوں گا
تمہاری طرح میں بھی فرقت زدہ ہوں!

نذرل کے گیتوں میں ان کی نظموں کی طرح جذباتیت نہیں ہے۔ وہ گیتوں اور غزلوں کی دنیا میں بڑے پر وقار اور سنبھلے سنبھلے نظر آتے ہیں۔ اگرچہ ان کی آتش نوائی یہاں بھی موجود ہے کیونکہ عشق میں گداختگی گرمی کے بغیر ممکن کہاں۔ وہ اپنے مشہور گیت " اس دن مجھ کو یاد کروگی" میں کہتے ہیں:

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

"رمضانیر اوئی روزار شیشے"

"رمضانیر اوئی روزار شیشے" : "ماہِ صیام ختم ہوا"

قاضی نذرالاسلام

مترجمہ: عاصمہ حسین

اے دل، رمضاں کا
گذرا ہے مہینہ
اب عید سہانی
لے آئی جلو میں
خوشیوں کا سندیسہ
ہاں توڑ دے اس دن
بندھن یہ خودی کے
فرمانِ خدا پر
گردن کو جھکا دے

○

سب تن من تیرا
سارا دھن تیرا
یہ اونچے ایوان
یہ جاہ کے سامان
یہ عظمتیں یہ شان
سب حق کے لئے ہیں
ہاں بخش زکوٰۃ آج
کر خیر کی بات آج
مسلم کہ ہیں بے جان
بیدار ہوں پیارے
پھر زندہ ہوں سارے

○

ہاں فرضِ عبادت
کرنا ہے ادا یوں
سب جسم ہو پُرخوں
ہو عید کا میداں
جب عرصۂ پیکار
وہ عرصہ گہہ کیں
جب با ہمہ تمکیں
اسلام کے غازی
پُرجوش نمازی
مردانِ مجاہد
اللہ کے شاہد
میدان میں نکلے
بے باکی سے لڑتے
دیں شوق سے جانیں
میدانِ وغا میں
تھا عید کا میداں
اک گنجِ شہیداں

○

ہاں بھول بھی جا آج
کون اپنا ہے ساجن
اور کون ہے دشمن
ہاتھوں کو ملا آج

اور عشق کی لَو سے
دنیا کو اُجالے
اسلام کی رہ پر
سب جگ کو لگالے
اللہ کے بندے
جو ہوش کے بن سے
رکھتے رہے روزے
اس طرح کہ گا ہے
تار اُن کا نہ ٹوٹے
ناداروں کو بخشیں
جی بھر کے زکاتیں
ہاں ساغرِ دل میں
بھر شربتِ توحید
ہو نذرِ پیمبر
یہ پیشکشِ عید
یہ ختمِ رسل کی
خوشنودی کی تمہید

○

تجھ پر رہی تازیست
اینٹوں ہی کی بھرمار
اب عشق کی مسجد
ہو اِن ہی سے تیار

منصور حلاّج : اقبال کی نظر میں

(۲)

میری۔ این۔ شیمل

اقبال کے فکر کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ مسلسل نمو پذیر رہا۔ چنانچہ منصور حلاج کے سلسلے میں بھی یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتدا میں منصور حلاج کے متعلق ان کی رائے کیا تھی اور بعد میں یہ کس قدر تبدیل ہو گئی۔ اس سلسلے میں ان کے "چھ لیکچروں" سے ایک اہم اقتباس دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ اس میں وہ حلاج کی اُن کے اپنی پہلو کا بالخصوص اعتراف کرتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں کہ اس عظیم عارف کی طرف ان کا رویّہ کس طرح بدل گیا ہے:-

" یہ صرف عبا داتی تصوّف ہی تھا جس نے اس باطنی تجربہ کی وحدت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جسے قرآن نے تین ذرائع میں سے ایک قرار دیا ہے۔ دوسرے دو ذریعے تاریخ و فطرت ہیں۔ اسلام کی مذہبی زندگی میں اس تجربہ کی ترقی حلاج کے اُن مشہور الفاظ میں درجۂ کمال کو پہنچی کہ میں خالقِ حق ہوں۔ حلاج کے ہمعصروں اور بعد کے لوگوں نے ان کی وحدت الوجودی تشریح کی لیکن فرانسیسی مستشرق موسیو میسی نان نے حلاج کے جو منتشر اقوال جمع کر کے شائع کئے ہیں۔ ان سے ذرا شبہ باقی نہیں رہتا کہ اس ولی شہید کا مدعا ہرگز حق کے ماوراء ہونے سے انکار نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس تجربہ کی صحیح تشریح قطرہ کا دریا میں فنا ہونا نہیں بلکہ غیر فانی پیرایہ میں انسانی خودی کے ایک عمیق تر ہستی میں حقیقی و باقی ہونے کا ادراک اور اس کی تائید ہے۔ یہ اعلان تو متکلمین کے خلاف ایک اچھا خاصا چیلنج معلوم ہوتا ہے۔ مذہب کے جدید طالبعلموں کی دشواری یہ ہے کہ گو اس قسم کا تجربہ ابتدائی عوالم میں بالکل معمول کے مطابق ہوتا ہے لیکن ترقی یافتہ مدارج میں کیف و احساس کی نامعلوم حدود تک پہنچ جاتا ہے ......"

ایک اور جگہ "ایمان" اور اس کے "نادر واردات سے زندہ استشہاد پانے" کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:-

" یہ ایک طریقہ ہے جس میں وصالی تجربہ ظاہر ہوتا ہے۔ اسلام میں مذہبی تجربہ (جسے حضرت پیغمبر علیہ السلام نے انسان میں الٰہی اوصاف پیدا کرنا قرار دیا ہے) کی تاریخ میں یہ تجربہ اس قسم کے مقولوں میں ظاہر ہوا ہے: انا الحق (حلاج)، انا الدہر (محمد)، انا قرآن ناطق (علی)، جلال انا (بایزید)۔ اعلیٰ اسلامی تصوّف میں وصالی تجربہ کے معنی محدود خودی کا اپنے تشخص کو لامحدود خودی میں محو کر دینا نہیں بلکہ لامحدود کا محدود کے آغوش میں سما جانا ہے۔"

یہاں اقبال نے حلاج میں زندہ ایمان کا ایک عظیم مظہر پالیا ہے۔ اس لئے یہ امر تعجب خیز نہیں کہ "جاوید نامہ" میں یہ مشہور صوفی حرکیت کا نمائندہ نظر آتا ہے یا خود شاعر کا اپنا پیشرو۔ اقبال نے فلکِ مشتری پر اس کی زبانی اپنی وہ غزل بھی پیش کی ہے جو بیس سال پہلے "پیامِ مشرق" میں شائع ہوئی تھی۔ اور جس میں حلاج کو آرزو اور اختیار کا ایک پُرجوش مبلغ قرار دیا گیا ہے۔ بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر کہا گیا ہے۔

" فلکِ مشتری پر دو موضوع خصوصاً دلچسپ ہیں اور ان پر حلاج کے سلسلہ میں گفتگو ان قارئین کو پہلے پہل کچھ عجیب معلوم ہوگی جو فلسفۂ حلاج سے واقف نہیں۔ مگر یہاں ہمیں اقبال کے تجربۂ علمی اور فن کی داد دینی چاہئے کہ انھوں نے اس عارف شہید کے سلسلہ میں نعرۂ انا الحق کا ذکر کیا جس کی اس قدر تشہیر ہو چکی ہے اور جو شاید خطرناک بھی ہے بلکہ اس کے نظریات کے دو اور موضوع منتخب کئے ہیں جن کا ذکر "کتاب الطواسین" میں کیا گیا ہے۔ یہ موضوع ہیں۔ مقامِ نبوّت اور شیطان بحیثیت واحد حقیقی پرستارِ حق۔

"جاوید نامہ" کے وہ دلنشیں حصّے جہاں حلاج نہایت لطیف اور مشتاقانہ اشعار میں نبی کریمؐ کی تعریف کرتا ہے اور "عبدہٗ" کے معنی کا انکشاف کرتا ہے۔ بلاشبہ "کتاب الطواسین" کے زیرِ اثر لکھے گئے ہیں اور ان میں ایک طرح کی "سرّیتِ محمدیہ" کی تعلیم دی گئی ہے۔ مذکورہ کتاب کے ابواب بہ عنوان "طاسین الفہم"

اور "طاسین النقوطہ" میں واقعۂ معراج اور سورۂ نجم کے پُراسرار الفاظ کی طرف تلمیح کرتے ہوئے پیغمبر کے اعلیٰ اوصاف کی ستائش کی گئی ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں "طاسین السراج" میں حلاّج اُس ہستی کے اوصافِ جمیلہ کے گیت گاتا ہے جس کا نور تمام موجودات سے پہلے تخلیق کیا گیا۔ "حتی انہ سبقت الھمم ووجوده سبق العدم واسمهٔ سبق القلم وانهٔ کان قبل الامم ماکان فی الافاق ودراء الافاق ودون الافاق اظرف واشرف واعرف وانصف وارأف وأخوف واعطف ـــ محمد صاحب هذه القضیه وهو سید البریه"

ایک قدیم ہرتری روایت کے مطابق جو قطانی سے منسوب ہے 'عبدہٗ' اعلیٰ ترین مقام ہے جہاں تک انسان پہنچ سکتا ہے کیونکہ سورۂ "اسریٰ" میں معراج شریف کے عمیق ترین معارف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: سبحان الذی أسریٰ بعبدہٖ اس لئے 'عبدہٗ' سے بہتر درجہ کا تصور محال ہے۔

جس طرح اقبال نے 'عبدہٗ' سے متعلق اشعار میں حلاّج کے نکریات کو واشگاف کیا ہے، اسی طرح انہوں نے حلاّج کے ابلیس سے متعلق تصورات پر زور دیا ہے۔ اگرچہ سرّیت سے متعلق بعض اشعار بالخصوص 'فنا' کے سلسلہ میں اقبال تاریخی حلاّج کا ساتھ نہیں دیتے پھر بھی انہوں نے حلاّج کے الفاظ میں جنّت کے متعلق اسلامی تصوف کے نقطۂ نظر کا خلاصہ ضرور کردیا ہے۔ کیونکہ عاشقِ صادق تو خدا کے سوا اور کسی کا طالب نہیں۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر اربابِ تصوف نے اکثر بحث کی ہے۔ اور رابعہ اور اس کے ہم طریق صوفیا سے لیکر اقبال تک اس کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ جنّت تو محض ایک نقاب ہے جو عاشق کو معشوق سے جُدا کرتا ہے۔ جو لوگ خدا کی عبادت جنّت کی امید میں کرتے ہیں، اُن مزدوروں کی طرح ہیں جو کام کرنے کے بعد خدا سے کوئی اچھا انعام طلب کرتے ہیں۔ زاہد بھی اس دنیا کو چھوڑ کر نعیمِ جنت کی آرزو کرتا ہے اور جس عیش و عشرت سے وہ اس دنیا میں پرہیز کرتا ہے، اس کو جنّت میں پانے کی امید رکھتا ہے۔ لیکن حقیقی عاشق جنّت سے روگرداں ہوکر رویتِ حق کی طرف رجوع ہوتا ہے اور حیاتِ اُخروی کی آفریدہ مسرتوں سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔[1]

اب رہا "فلکِ مشتری" کے خاتمہ پر ابلیس کی روح کا نمودار ہونا، یہ کیا ہے؟ شاعر کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حلاّج غائب ہونے سے پہلے کہتا ہے ؎

ماجہول او عارفِ بود و نبود   کفر او ایں راز را برما کشود

یہ راز کیا ہے؟ ـــ سورہ ۲ آیت ۳۲ کی تفسیر کرتے ہوئے روزبہان بقلی لکھتا ہے: "حلاّج کے الفاظ میں جب ابلیس کو آدم کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے حق تعالیٰ سے کہا "کیا کسی اور نے میرے دل سے اعزازِ سجود چھین لیا ہے کہ میں آدم کے سامنے سجدہ کروں؟" خدا نے کہا "میں تجھے دائمی عذاب کی سزا دوں گا"۔ اس نے پوچھا "کیا سزا دیتے وقت تم میری طرف دیکھو گے؟" خدا نے کہا "ہاں"۔ ابلیس نے کہا "تیرا میری طرف نظر بھر کر دیکھ لینا عذاب کو میرے لئے گوارا بنا دے گا۔ چاہے تو کچھ بھی کرے"۔ خدا نے کہا "میں تجھے رجیم بنا دوں گا"۔ ابلیس نے جواب دیا "جو جی چاہے کردے"۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ حلاّج کے مطابق ابلیس خوش تھا کہ خدا نے اسے "طوقِ لعنت" عطا کیا۔ جیسا کہ بعد کے ایک صوفی نے کہا ہے۔ یہ کہ ایک سچا عاشق اپنے محبوب سے بخوشی سزا قبول کرے گا بشرطیکہ وہ سزا دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھتا رہے۔ اس شکل میں عطاّر اور بعض اور صوفیا نے ابلیس کو ایک ایسے عاشق کے طور پر قبول کیا ہے جو کسی اور خدا کی پرستش نہیں کرے گا۔ اگرچہ اس نے بظاہر خدا کی نافرمانی کی لیکن اس نے خدا کی اُس مشیت پنہاں

---

[1] متعلقہ اشعار یہ ہیں:-

جنّتِ ملا مے و حور و غلام   جنّتِ آزادگاں سیرِ دوام!
جنّتِ ملا خور و خواب و سرود   جنّتِ عاشق تماشائے وجود
حشرِ ملا شقِ قبر و بانگِ صور   عشق شور انگیز خود صبحِ نشور
عشقِ ما از شکوہ ہا بیگانہ نیست   گرچہ او را گریۂ مستانہ نیست

(جاوید نامہ)

کی پیروی کی جس نے اپنے سوا اور کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اس طرح ابلیس واحد سچا پرستار قرار پاتا ہے۔

مگر حق یہ ہے کہ یہ سب کچھ ابلیس اور اس کی نذریانی کے عظیم مسئلوں کا بیان ہے' انہیں حلاج نے پیش کیا ہے' ایک مختصر سا حصہ ہے۔ طاسین عزل والالتباس (نمبرہ) میں یہی مسئلہ زیادہ وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں حلاج صاف صاف لکھتا ہے کہ اس دنیا میں ابلیس اور محمد کے سوا کوئی حقیقی موحد نہیں۔ اگر محمد کو فضل ربی کا خازن کہا جائے تو ابلیس کو عذاب ایزدی کا خازن کہنا مناسب ہوگا۔ وہ اپنے آپ ہی میں رہا مگر پیغمبر اپنے سے دور ہوگیا۔ اس باب میں تو ابلیس یہاں تک کہہ دیتا ہے کہ؟ اس کا انکار تقدیس حق کا اعلان بن جاتا ہے۔ دیکھئے مشہور رباعیات (جحودی لک تقدیس) مگر اس نے آدم کا صرف خارجی پہلو دیکھا۔ محض پیکر آب وگل۔ اس میں جلوۂ حق کا پرتو نہ دیکھا۔ ہاں وہ واحد حقیقی موحد تھا اس لئے اس نے صرف حق ہی کو دیکھا، اس کے سوا اور کچھ نہ دیکھا۔ حلاج کے مطابق ابلیس خدا کی میلاد آدم سے قبل طاعت پر ناز کرتا ہے۔ اور اسی نازکی بنا پر اس نے دائمی جدائی کو ایک پُرمحبت سجدہ پر ترجیح دی "کتاب الطواسین" کے تتمہ میں ابلیس کا موسیٰ سے سامنا ہوتا ہے اور وہ ان سے کہتا ہے کہ وہ محض اپنے محبوب کو یاد ہی نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ہمیشہ یاد بھی کیا جاتا ہے کسی آیت قرآن مثلاً سورۃ ۳۸ میں) وان علیک لعنتی الیٰ یوم الدین یا قرآن مجید کی تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم اور بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اور وہ موسیٰ کو شرک کا الزام دیتا ہے کہ اس نے جلتی ہوئی جھاڑی کے سامنے سر جھکایا اور پہاڑ یعنی خدا کے سوا دیگر موجودات عالم پر نظر ڈالی۔

اس باب کے آخر میں حلاج اپنا موازنہ ابلیس اور فرعون سے کرتا ہے۔ یہ سب کوئی نہ کوئی ادّعا کرتے ہیں اور پھر اس پر اڑ جاتے ہیں۔ مثلاً ابلیس کی یہ ضد کہ "میں سجدہ نہیں کروں گا"' فرعون کا یہ دعویٰ کہ "میں خدا ہوں" اور حلاج کا "انا الحق"۔ یہ اپنے دعووں سے باز آنے کی بجائے مرنے یا سزا پانے کو تیار ہیں۔ اس باب سے ہمیں مثنوی کے محولہ بالا اشعار کا مفہوم بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے کہ حلاج اور فرعون کی انا دونوں مختلف چیزیں ہیں۔

حلاج کے یہ افکار ہمیں "فلک مشتری" کے خاتمہ پر روح ابلیس اور شکوۂ ابلیس کے شاندار منظر کا مفہوم سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ کئی مشہور صوفی بھی منصور کے ان عقائد کے قائل تھے اور انہوں نے ان کی اپنے اپنے انداز میں تشریح کی ہے۔ احمد غزالی نے تو ابلیس و موسیٰ کی حکایت کو مکمل کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جو شخص توحید کو ابلیس سے نہیں سیکھتا وہ زندیق ہے۔

اقبال نے ابلیس کے کردار کے اس مثبت پہلو کو جو "کتاب الطواسین" میں واضح کیا گیا ہے نہایت خوش آیند الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ آخری ہدایت ہے جو حلاج ابدی طلب وشوق میں پرواز کو جاری رکھنے سے قبل شاعر کو کرتا ہے۔

اس عارف شہید کا ذکر ایک بار اور بھی "جاوید نامہ" میں آتا ہے۔ اور وہاں بھی ایک ایسی روح کے طور پر جو افلاک اور بہشت کے درمیان ایک حلقہ پر مسلسل چکر لگاتی رہتی ہے۔ نیٹشے جسے اقبال "منصور بے دار" کہتے ہیں بشرقی عارف کی طرح جاہل عوام کے ہاتھ سے، جو خدا کے زندہ مشاہدہ سے خائف تھے نہیں مارا گیا بلکہ اطبائے مغرب کے ہاتھوں مارا گیا جو ستی خودی سے واقف نہ تھے اور اس کے تصوریت کی صداقت کی داد نہ دے سکے۔ لہٰذا وہ اس کو منزل مقصود یعنی خدا تک پہنچانے میں ناکام رہے۔

اقبال اپنی زندگی کے ابتدائی زمانہ ہی میں نیٹشے سے واقف ہو چکے تھے۔ مگر اس کے افکار تو صرف ایک نشان راہ تھے۔ اس لئے کہ اس کے یک رخہ نظریۂ انسان کو کبھی "عبدہٗ" کے مقام تک نہیں پہنچا سکتے۔ اقبال کو بعد میں حلاج کے پُراسرار اقوال کی گہری مضمر حقیقت معلوم ہوئی جو ان کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ انہیں اپنے اور حلاج کے افکار میں کافی مشابہت نظر آئی۔ جب حلاج "فلک مشتری" پر طویل تقریر میں شاعر کو بتاتا ہے کہ اس کے سینے میں غوغائے صور اسرافیل پنہاں تھا مگر اس کی ملت نے قبر کی طرف رجوع کیا ہے

بود اندر سینۂ من بانگِ صور
ملتے دیدم کہ دارد قصدِ گور

ہ کم مگو زاں خواجۂ اہل فراق — تشنہ کام و از ازل خونیں ایاق — (جاوید نامہ)

اور جب شاعر شکایت کرتا ہے کہ اس کے معاصر فقہا "روح اللہ" کو "امر اللہ" کی جانب سے خیال نہیں کرتے تو ہمیں بے اختیار دیوان حلاج کے یہ دلنشیں اشعار یاد آتے ہیں کہ ؎

بالله ينفع الروح في جلدي　　　بحالہ نفخ اسرافيل في الصور

اس کے لئے عشقِ حقیقی یومِ محشر ہے۔ جو اس عشق کا محرم نہیں وہ مردہ ہے جس کسی نے حلاج کا کلام پڑھا ہے وہ کبھی اُس کی اس شاندار غزل کو فراموش نہیں کرسکتا جو اِن الفاظ سے شروع ہوتی ہے ؎

انعى اليك نفوساً طاح شاهدها

یہ ان تمام لوگوں کے لئے جو روحانی حیثیت سے مردہ ہیں ایک زبردست نوحہ ہے۔ وہ جنھوں نے کبھی عشق کا والہانہ ولولہ محسوس نہیں کیا، جو شدید ترین مصائب کو بلا شکوہ و شکایت برداشت کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ اقبال اس عظیم عارف کے عشقِ بے باک، اس پیغام "آرزو" (تمنائے پُرشوق خود خاصۂ ذاتِ باری ہے)، اس زندہ مذہبی احساس کے بے حد مدّاح ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اقبال کیوں اپنے آپ کو حلاج سے تشبیہ دیتے ہیں، جس کو "فلکِ مشتری" میں وہ ان الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں ؎　کم نگاہاں فتنہ ہا انگیختند　　بندۂ حق را بدار آویختند

★

زندہ رود:

کم نگاہاں فتنہ ہا انگیختند　　بندۂ حق را بدار آویختند
آشکارا بر تو پنہانِ وجود　　باز گو آخر گناہ تو چہ بود؟

حلاج:

بود در اندیشۂ من بانگِ صور　　ملتے دیدم کہ دارد قصدِ گور!
مومناں با خوئے و بوئے کافراں　　لا الٰہ گویاں و از خود منکراں!

★

من بخود افروختم نارِ حیات[1]　　مردہ را گفتم ز اسرارِ حیات!
من ز نورو نار او دارم خبر　　بندۂ محرم! گناہ من نگر!
آنچہ من کردم تو ہم کردی بترس
محشرے بر مردہ آوردی بترس!

قرۃ العین طاہرہ:

از گناہِ بندۂ صاحب جنوں
کائناتِ تازۂ آید بروں

(جاوید نامہ)

---

[1] 'امرِ حق' گفتند نقشِ باطل است　　زانکہ او دوا سۂ آب و گل است
من بخود افروختم نارِ حیات　　مردہ را گفتم ز اسرارِ حیات!
امرِ حق۔ روحِ انسانی کی طرف اشارہ ہے قل الرّوح من امرِ ربّی۔　(اقبال۔ "جاوید نامہ")

اردو ناول پر مغربی اثرات

ابواللیث صدیقی

اردو زبان کی طرح، اردو ادب کا مزاج بھی بڑا ہی ملنسار واقع ہوا ہے۔ اس کا دامن بڑا وسیع ہے۔ یہ ہر زبان کے لفظ اور محاورے کو خوش آمدید کہتی ہے اور اسے اپنے دل میں جگہ دیتی ہے اور پھر آہستہ آہستہ یہ مہمان بھی اس کے کنبہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اس کی اصلی شکل وصورت پہچانی بھی نہیں جاتی۔ یہی حال اس کی اصناف ادب کا ہے۔ اس نے مشرقی ومغربی ادبیات سے خوشہ چینی کی ہے اور جس چیز کو اپنے مزاج کے مطابق اور مناسب پایا ہے اسے اپنا لیا ہے۔ یوں تو مغربی اثرات اردو زبان کے سرمایۂ الفاظ، اس کے اسالیب بیان اور محاورہ پر بھی پڑے ہیں لیکن اس سے بڑھ کر بعض اصناف ادب میں، بالخصوص افسانوی ادب اور ڈرامے میں بہت نمایاں ہیں۔ ان ہی میں ناول بھی شامل ہے جس کے خدوخال اور ارتقا میں مغربی اثرات بدرجۂ اتم کار فرما ہیں۔ دنیا کی ہر زبان کا ایک افسانوی ادب ہوتا ہے جس کا رشتہ ملکی وقومی تاریخ میں بہت دور ماضی کے دھندلکوں تک پھیلتا چلا جاتا ہے۔ یہ مدتوں محض زبانی روایات کے وسیلے سے منتقل ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ادبی تخلیقات کا آغاز ہوتا ہے تو نثر ونظم میں یہی کہانیاں، روداستانیں ادب کا سب سے پہلا موضوع بنتی ہیں۔ اردو کا بھی یہی حال ہے۔ مذہبی تصانیف سے قطع نظر جن کی اہمیت تاریخی وافادی، مقصدی واصلاحی زیادہ اور خالص ادبی کم ہے۔ اردو کے ابتدائی دور میں بھی نثری اور منظوم داستانوں، کہانیوں اور قصوں کا سراغ مل جاتا ہے۔ یہاں میں منظوم کہانیوں یعنی مثنویوں کا ذکر چھوڑتا ہوں کیونکہ ان کا نثری قصے کہانیوں سے الگ، ایک مستقل موضوع ہے۔ نثر میں پہلی مستقل کہانی یا قصہ دکن کے مشہور مصنف ملا وجہی کا قصہ "حسن ودل" ہے جو "سب رس" کے نام سے ۱۰۴۵ھ میں لکھا گیا اور پھر یہ سلسلہ دکھنی کہانیوں سے گذرتا فورٹ ولیم کالج کے دور تک پہنچتا ہے جہاں میر امن کی "باغ وبہار"، حیدری کی "آرائش محفل"۔ اور نہال چند لاہوری کی "مذہب عشق" یعنی "قصہ تاج الملوک اور بکاؤلی" کی تخلیق ہوئی۔ اسی سلسلہ کی کڑی وہ طویل داستانیں ہیں جن کا سلسلۂ دراز "بوستانِ خیال"، "داستانِ امیر حمزہ" اور "طلسم ہوشربا" تک پہنچتا ہے۔ ناول کی طرح یہ سب نثری قصے ہیں۔ ہم ان کو ناول نہیں کہتے۔ ناول ایک نئے قسم کا قصہ ہے جس کا اپنا انداز، اپنا تکنیک الگ ہے۔ اردو میں یہ براہِ راست مغرب سے آیا۔ اس کا ایک ثبوت تو خود لفظ 'ناول' ہے جو ہے تو دراصل اطالوی زبان کا ایک لفظ لیکن ہمیں انگریزی کے وسیلہ سے ملا اور ۶۵ء کے بعد نذیر احمد، شرر اور سرشار کے دور میں پہلی مرتبہ ان معنوں میں استعمال ہوا۔

خود مغرب میں ناول کا ارتقاء ایک نہایت اہم اور دلچسپ موضوع ہے۔ پرانے نثری اور منظوم قصوں کو چھوڑ دیں تو مغربی ادب کا پہلا قصہ جو ناول کہلانے کا مستحق اور اس کی تعریف میں داخل ہے سروانٹس (CERVANTES) کا "ڈان کوئکزوٹ" (DON QUIXOTE) ہے جو اسپین میں ۱۶۰۵ء میں لکھا گیا۔ اس ناول کا مقصد پرانے انداز کے قصوں اور کہانیوں کا مذاق اڑانا تھا، چنانچہ ناول کا ہیرو ڈان کوئکزوٹ قدیم ناولوں اور کہانیوں کو پڑھتے پڑھتے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم شخصیت اور جلیل القدر انسان ہے جسے خلق خدا کی رہبری ورہنمائی اور اصلاح وامداد کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کو بھی افسانوی ادب کے سورماؤں کی طرح زرہ بکتر پہن کر، سارے اسلحہ سے لیس ہو کر گھوڑے پر سوار ہو کر گھر سے نکلنا چاہئے تاکہ وہ بھی مہماتِ عظیم سر کر سکے۔ چنانچہ وہ اس پر عمل کرتے ہوئے گھر سے باہر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ افسانوی ادب اس کے دل ودماغ میں ایسا بسا ہوتا ہے کہ جب وہ ایک ویران سی سرائے میں پہنچتا ہے تو سمجھتا ہے کہ کسی بڑے امیر کے قلعہ میں پہنچ گیا۔ اس وقت سرائے کا بھٹیارہ اس کے لئے بادشاہ بن جاتا ہے اور بھٹیارنیں عالی نسب خواتین کے روپ میں نظر آتی ہیں۔ وہ ہوا سے چلنے والی پن چکیوں کو دیو بھوت سمجھ کر لڑنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ پتہ کھڑکتا ہے تو وہ اپنی تلوار سنبھال لیتا ہے لیکن افسوس کہ ہر مہم میں اس کی غلط فہمی رفع ہوتی جاتی ہے۔

یہ قصہ "خدائی فوجدار" کے نام سے روپ بدل کر اردو میں آ چکا ہے۔ یوں تو یہ ایک تفریحی کہانی ہے جس کا مقصد قدیم کہانیوں کا مذاق اڑانا ہے لیکن خدائی

فوجدار اپنے سفر میں جن منزلوں سے گذرتا ہے ان میں وہ اسپین کی بودی سوسائٹی سے ہمارا تعارف کرا دیتا ہے۔ ڈان کوئکزوٹ کی حماقت دراصل اس عہد پر بڑا گہرا طنز ہے۔
اردو ناول کے ابتدائی دور میں بھی ایک ایسا ہی قصہ لکھا گیا۔ یہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا "فسانۂ آزاد" ہے جس کے مرکزی کردار میاں آزاد ہیں۔ یہ سیلانی طبع ہیں۔ اور ان کے واسطے سے ہمیں لکھنؤ کے چنڈو خانوں، افیمیوں کی محفلوں، نوابوں اور رئیسوں کی مجلسوں، درسگاہوں، عدالتوں، جلوسوں، کمیٹیوں، مشاعروں، کچہریوں اور عدالتوں کی سیر کا موقع ملتا ہے۔ اور پھر یہ روم کی لڑائی میں شریک ہوتے ہیں تاکہ یورپ کے قرونِ وسطیٰ کے افسانوی سورماؤں کی طرح اپنی محبوبہ حسن آرا کی شرط پوری کرنے اور ترکی جا کر روسیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوں۔ یہ اسی طرح کا ناول ہے جسے انگریزی میں (PICARESQUE) ناول کہتے ہیں۔ اس میں کسی منظم پلاٹ کی ضرورت نہیں ہوتی اور "فسانۂ آزاد" میں تو منظم پلاٹ کا التزام ممکن ہی نہ تھا کیونکہ اس کے اجزا اخبار میں شائع ہونے کے لئے لکھے جاتے۔ انگریزی میں جن لوگوں نے ڈکنس کے ناول پڑھے ہیں، خاص طور پر (PICKWICK PAPERS) وہ "فسانۂ آزاد" کی تکنیک کو مغربی ناول کے اس انداز سے بڑی آسانی سے ہم آہنگ کر سکتے ہیں۔ اس کی جھلک سرشار کے دوسرے ناول "سیرِ کہسار" میں بھی ملتی ہے۔

ناول کا تکنیکی مفہوم انگریزی میں ایک ایسے سادہ نثری قصے سے ہے جس میں حقیقی زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہو۔ اس اعتبار سے بھی اردو ناول کا باقاعدہ آغاز ۵۷ء کے بعد ہی ہوا اور نذیر احمد کے ناول اردو میں اپنی قسم کے پہلے مقصدی و معاشرتی ناول ہیں۔ دراصل کردار کے ناول ہیں۔ ان میں اصغری اکبری کے کردار بھی ہیں اور نصوح کا کردار بھی۔ مبتلا کا کردار بھی ہے اور ابن الوقت کا بھی۔ اور ان میں ہی اُن کا زندۂ جاوید کردار مرزا ظاہر دار بیگ بھی ہے۔ نذیر احمد انگریزی کچھ واجبی ہی جانتے تھے اور انگریزی ناول شاید ان کی نظر سے نہ گزرے ہوں گے تاہم ان کے ناول اس عہد کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہمارے قدیم افسانوی ادب کے مقابلہ میں مغربی ناول سے قریب تر آتے چلتے ہیں۔

اس گروہ کے تیسرے ناول نگار شرر ہیں جنہیں اردو کا سروالٹر اسکاٹ کہا گیا ہے۔ مغربی تاریخی ناول نگاروں میں اسکاٹ کے علاوہ اور بھی ناول نگار مشہور ہوئے ہیں مثلاً ڈوماز (DUMAS) ہیوگو (HUGO) وغیرہ۔ شرر کے ناول تاریخی برائے نام ہیں۔ وہ دلچسپ ضرور ہیں لیکن اسکاٹ کی فنی پختگی بالکل ان میں نہیں پائی جاتی۔ پھر تاریخی ناولوں کا یہ سلسلہ ہمارے زمانے تک پہنچا ہے اور اسلامی تاریخی ناولوں کے نام سے بڑی بڑی ضخیم داستانیں مکمل کی جا رہی ہیں۔ جو بہت کم تاریخی اور اسلامی ہیں بلکہ ان میں اسلامی جذبات کو ایک نعرے کے طور پر اختیار کیا گیا ہے جس کا مقصد فنی تخلیق نہیں محض تجارت ہے۔

مغربی ناولوں کی ایک اور قسم گھریلو ناولوں کی ہے جن میں صرف گھریلو زندگی پیش کی جاتی ہے اور وہ بھی چند خاندانوں یا خاندان کے صرف چند افراد کی کہانی پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس طرح کے ناولوں میں رچرڈسن کے پمیلا (PAMELA) اور جین آسٹن (JANE AUSTIN) کے ناولوں کا نام لیا جا سکتا ہے۔ نذیر احمد کے ناول اسی کے تحت آتے ہیں اور آج کے دور میں اس کی ترجمانی اے۔ آر۔ خاتون کے ناولوں میں ہوتی ہے۔ راشد الخیری کے ناول، نذر سجاد ساحبہ کا "شوکت آرا" وغیرہ بھی اسی ... کے ناول ہیں۔

مغربی ناول کا ایک اور انداز طبقاتی ناولوں کا ہے جس میں مختلف طبقات کی زندگی اور ان کے مسائل کا بیان ہوتا ہے۔ پریم چند کے ناول پڑھنے والوں کے سامنے ہمارے سماج کے مختلف طبقات آتے ہیں اور بحیثیت ناول نگار پریم چند نے ہی پہلی مرتبہ اردو ناول کے فن کو یہ معراج بخشی کہ اسے مغربی ناول کے مقابلہ میں فنی حیثیت سے بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح انگریزی کے جاسوسی ناولوں نے بھی اردو کے ناول نویسوں کو راہ دکھائی "مسٹریز آف لندن" اور شرلک ہومز کے کارنامے مختلف ناولوں کا موضوع بنے ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک اور کامیاب ناول ظفر عمر کی "نیلی چھتری" ہے۔

مرزا محمد ہادی رسوا اردو میں نفسیاتی ناول کے پہلے علمبردار اور نمائندہ ہیں اور بڑی حد تک نفسیاتی ناول مغربی اثرات کا ہی مرہونِ منت ہے۔ ایک نقاد کا خیال ہے کہ امراؤ جان ادا کے کردار کو پڑھ کر تھیکرے کی بیکی شارپ، فلابیر کی ایما بوری اور ہارڈی کی ٹیس کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ جدید مغربی علوم میں نفسیات کے مطالعہ اور تحقیق کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور اس رجحان نے شاعری، افسانے، ڈرامے اور تنقید سب ہی کو متاثر کیا ہے اور ناول اور افسانہ دونوں اس رجحان کے ترجمان ہیں۔ اس سلسلے میں فرائڈ کی جنسیات کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہئے۔ خاص طور پر ہماری نئی نسل کے ناول نگاروں کو بڑا متاثر کیا ہے۔ کرشن چندر کی "شکست"، عصمت کی "ٹیڑھی لکیر" اور عزیز احمد کا ناول "گریز" ایسے ناول ہیں جن میں جنسیات کا پہلو نمایاں ہے۔ اچھے نفسیاتی ناول کی ابتدا میں آج (باقی صفحہ ۶۴ پر)

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

لہ اس سلسلہ میں ڈاکٹر محمد صادق کا مضمون "توبۃ النصوح" مطبوعہ "ماہ نو" بابت نومبر و دسمبر ۱۹۵۴ء ملاحظہ ہو جس میں واضح کیا گیا ہے کہ یہ ڈینیل ڈفو کی تصنیف "دی فیملی انسٹرکٹر" سے ماخوذ ہے (مدیر)

(ایک نیا ناول)

رفیق خاور

غزل اور ناول میں اصنافِ ادب کی حیثیت سے شاید ہی کوئی قدرِ مشترک ہو پھر بھی ممکن ہے فن کار کے تصوّر کی حد تک یا کسی حکمتِ عملی سے ان دونوں کی جولاں گاہیں آپس میں مل جائیں۔ بادی النظر میں یہ امکان اس حد تک امرِ واقعہ ہے کہ فضل احمد کریم فضلی صاحب کے اوّلیں ناول کا عنوان ایک غزل ہی سے ماخوذ ہے۔ اور فضلی صاحب نے، جو غزل کے خاص طور پر رسیا ہیں، تھوڑی دیر کے لئے اس تنگنائے سے باہر نکل کر اپنی جولانیٔ طبع کے لئے ناول کا میدان اختیار کیا ہے۔ فنی یا معنوی اعتبار سے مشابہت کی بات اور ہے۔ اگر غزل کے کوئی ایسے تیور یا تکنیکی خصوصیات ہیں جنھیں ناول کے لئے برتا جا سکتا ہے۔ اور مصنف کے ذہن میں ان کا کوئی ایسا تصوّر تھا جس کا کسی واضح شکل میں تعین کیا جا سکے تو یہ ناول کے عناصرِ ترکیبی میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور خاصا اہم ہے۔ اگرچہ یہ اہمیت نفسِ موضوع، مواد، نوعیت اور مقصد کی زیادہ بنیادی اہمیت نہیں۔ بلکہ محض ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے آلۂ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔

سب سے اہم سوال، نوعیت کا ہے۔ اس معاملہ میں لیبل چسپاں کرنے والی ذہنیت کو بڑی مایوسی ہوگی۔ کیونکہ نہ اس میں کوئی طلسمی یا رومانوی رنگ محل یا برجِ عاج تعمیر کیا گیا ہے، نہ کسی مارکسی، ریاستی، مذہبی، اخلاقی، اصلاحی، فلسفیانہ یا نفسیاتی نظریہ کے تحت کوئی ہیولیٰ تراشا گیا ہے۔ جس میں پہلے ہی سے طے شدہ انجام تک پہنچنے کی دیوانہ وار کوشش کی جائے اور اس کے لئے واقعات، اور کرداروں کو جی بھر کر توڑا مروڑا جائے تاکہ وہ ایک خاص سانچے میں ٹھیک بیٹھ جائیں اور آخر میں وہ نظریہ ہی سب سے نمایاں اور پیش پیش رہے اور زندگی کی ایک بولتی چالتی تصویر سامنے نہ آئے۔ جو اپنے نتائج کا خود بخود انکشاف کرے۔ اس ناول میں، نہ تو محض تفریح و تفنن پر زور ہے نہ مقصدیت و افادیت اور پرچار پر۔ اس میں ماحول اور معاشرہ کے مطالعہ کا بھی کوئی ڈھونگ نہیں۔ نہ کوئی بُرائیاں کھول کھول کر بیان کی گئی ہیں نہ اچھائیاں۔ نہ کسی کے پول کھولے گئے ہیں اور نہ طنز و مزاح یا تمسخر کا کھیل کھیلا گیا ہے۔ جو بسا اوقات کھلنے لگتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ناول ہمارے ناولوں میں ایک نہایت خوشگوار تبدیلی اور رسم و رہِ عام سے ایک خوش آیند اور تندرست انحراف ظاہر کرتا ہے۔ جو کچھ اس میں پیش کیا گیا ہے۔ ہم اسے زندگی ہی کی حیثیت سے دیکھتے اور قبول کرتے ہیں۔ اور اس میں کوئی خلافِ معمول من گھڑت یا ناقابلِ یقین بات نہیں پاتے۔ اگر ہم اس کی کسی اصطلاحی لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں تو وہ "کردار" ہے۔ یہ ایک کرداری ناول ہے۔ اس میں اوّل تا آخر ایک مرکزی کردار اور اس کے ساتھ ساتھ کتنے ہی ذیلی کرداروں کا جھرمٹ پیش کیا گیا ہے اور سب اپنے اپنے رنگ میں، یہ سب اپنے اپنے کردار میں سچے ہیں۔ یہ کوئی ٹائپ نہیں ہیں نہ کوئی علامت یہ محض کٹھ پتلیاں بھی نہیں بلکہ گوشت پوست کے جیتے جاگتے پتلے ہیں اور پھر کردار محض کہنے کو کردار یعنی افراد کا قصّہ نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں کردار ہیں۔ ان میں کرداریت ہے یعنی واضح اور منفرد تشخص۔ یہ جاندار ہیں۔ یہ اُگتے ہیں، بڑھتے ہیں، پھلتے پھولتے ہیں، بدلتے ہیں، نمو پاتے ہیں، یہ سکونی نہیں، پوری طرح نامیاتی ہیں۔ چنانچہ جیسے جیسے حالات کروٹ لیتے ہیں اور زندگی اپنے نت نئے تقاضوں اور گمبھیرتا کے ساتھ آگے بڑھتی ہے یہ بھی حالات سے اثر لیتے، بدلتے اور کچھ کے کچھ بن جاتے ہیں۔ کردار اور زندگی بحالتِ نمو۔ یہ ہے اس ناول کا مابہ الامتیاز۔ جیسے ایک خالق اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی مخلوق اور اس کی دنیا کو پنپتے دیکھ رہا ہو۔ یہ وہی خالقانہ شعور ہے جو اپنی مخلوق دنیا اور اس کے باسیوں کی نس نس اور رگ رگ کو پہچانتا ہو، ان کے ساتھ ساتھ چل کر ان کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھتا ہو اور ان کے بننے بگڑنے کا پورا پورا احساس دیکھتا ہو، قدرت کی ایک بڑی ہی نادر دین ہے۔ جو بہت کم لوگوں کو میسّر آتی ہے اور یہ اس ناول کے خالق میں بڑی شدّت سے نمایاں ہے۔ وہ اپنے جیتے جاگتے مہرے ایک ایسی بساط پر چُن دیتا ہے جو ہر آن بدلتی جاتی ہے لیکن ان مہروں کی چالوں اور بساط کی تبدیلی کے پس پردہ خالق کا اپنا ہاتھ کہیں آشوب نظر نہیں ہوتا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ان کرداروں کو خود بولنے، خود سوچنے اور خود چلنے پھرنے کی اجازت دیتا

ہے۔ اور پھر حالات سے جو نتائج پیدا ہوں ان کو کرداروں اور واقعات کے قدرتی تال میل پر چھوڑ دیتا ہے تاکہ وہ جو روپ دھارنا چاہیں دھاریں۔ ابتدا ہو یا انتہا اس میں کوئی کاوش نہیں جھلکتی۔

اسی سے اس ناول کی ایک اور نمایاں خصوصیت بھی ابھرتی ہے۔ اس میں قصہ آرائی نہیں۔ اس میں کہانی تو ہے مگر کہانی گھڑنے، بنانے یا بیان کرنے کی کوشش دکھائی نہیں دیتی۔ واقعات کا ایک سلسلہ ہے جسے راوی یوں پیش کئے جاتا ہے جیسے وہ ایک قدرتی، بے ساختہ سلسلہ ہو۔ اس نے اسے جوں کا توں پیش کر دیا ہے، پھیلا دیا ہے۔ اگرچہ وہ نفس الواقع ایسا نہ تھا جیسا کہ اس نے خود ہی واضح کر دیا ہے۔ واقعات کو اس طرح ترتیب دیا گیا ہے کہ ان میں ایک بے ساختہ بہاؤ ہے، ڈھلاؤ ہے اور لہریں، موجیں خود بخود بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں یہاں تک کہ وہ اپنے قدرتی پڑاؤ تک پہنچ جاتی ہیں۔ بالفاظ دیگر اس ناول میں پلاٹ بافی کا ہیر پھیر اور گورکھ دھندا نہیں، اس لحاظ سے کہ واقعات کا جوڑ لیں، بٹھا بٹھا کر در و بست ہو، یا صاف نظر آئے کہ کہاں کا سلسلہ کہاں ملایا گیا ہے۔ اور تانے بانے کا گٹھ جوڑ صاف صاف دکھائی دے۔ اس طرح سارا زور قصے پر ہوتا ہے۔ ناول ہو یا افسانہ اس میں کہانی کی دلچسپی اور سب باتوں پر غالب رہتی ہے، اور یہ سب سے ادنیٰ قسم کی دلچسپی ہے۔ بالخصوص ایسی کہانی جس میں افسانہ تراشی ہی کا پہلو غالب ہو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ناول میں سرے سے کوئی پلاٹ ہی نہیں بلکہ جو جو واقعات چنے گئے ہیں اس طرح عین موقع و محل پر ہیں کہ ان پر 'واقع' ہونے یا 'لائے جانے' کا گمان نہیں ہوتا۔ بہت ممکن تھا کہ کسی فلم کے پلاٹ کی طرح واقعات کو ذرا بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرنے سے بناوٹ کا احساس ہوتا اور اس طرح بات میلوڈراما تک جا پہنچتی۔ خوشی ہو تو وارفتگی ہو، رقت ہو تو حد سے زیادہ۔ رونے رلانے کی حد تک! اور اس طرح ایک غیر تندرست درد آفرینی کے خلاف نفرت کا ردِ عمل پیدا ہو۔ جیسا کہ ہماری فلموں میں اکثر ہوتا ہے۔ ہم نے فلموں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ یہ ناول اپنی واقعیت میں فلم نما ہے۔ مگر اچھے معنوں میں۔ اگرچہ اسے بڑا اندیشہ تھا کہ یہ کسی سستی فلم کا چربہ نہ بن جائے۔ اس اندیشے کے خلاف کئی باتوں کی ضمانت تھی: مصنف کی سنجیدگی، سلیم الفطرتی، رچا ہوا ذوق، وسعت نظر اور علمی و ثقافتی پس منظر۔ ہم اس ناول کو بجا طور پر ایک عمدہ، بھرپور فلم کہہ سکتے ہیں۔ قرطاس کی شکل میں سیلولائڈ کا مظاہرہ۔ سلسلہ در سلسلہ چپنی تصاویر کی طرح اس میں فن کی پختگی سے عناصر پر غالب ہے۔ اسی حقیقت کو اس پیرایہ میں بھی ادا کیا جا سکتا ہے کہ یہ ناول تحریری شکل میں فلم ہے اور سینمائی پیشکش کے لئے نہایت موزوں۔ بشرطیکہ اس کے رچاؤ اور اس کی ثقاہت کو برقرار رکھا جائے۔ بنگالی مصور زین العابدین نے تو بنگال کے ہولناک قحط کی مسلسل تصاویر ہی پیش کی ہیں لیکن اس کتاب میں افسانہ نویسی کی کڑی شرائط کے تحت اس کی کیفیت پیش کی گئی ہے اور اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ۔ کیونکہ یہ قحط تو محض ناول کے وسیع کینوس کا ایک حصہ ہے اور کہانی اس پر مستزاد۔ در اصل اس کی دلچسپیاں کہانی کے علاوہ ہیں۔ گوناگوں دلچسپیاں جو ایک پختہ ذوق کے لئے موزوں ہیں اور یہی اس کی حقیقی اہمیت کا باعث ہیں۔

پلاٹ کے سلسلہ میں یہ مزید بیان کر دینا لازم ہے کہ واقعات اور جزئیات کی بے ساختگی اور سیدھا، سرتیز بہاؤ ایسا ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا اور ہم انجام تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور اس خفیف تبدیلی سے جو دہرائے ہوئے ابتدائی سین کے ساتھ ناول میں کی جاتی ہے۔ ابتدا و انتہا کی کڑیاں مل جاتی ہیں۔ جیسے ان کڑیوں میں کوئی فصل ہی نہ تھا اور یہ ناول ہونے کے باوجود افسانہ یا ناولٹ معلوم ہوتا ہے۔ اس تاثر کی وجہ ظاہر ہے۔ افسانہ یا تو نقطہ بہ نقطہ آگے بڑھتا ہوا ایک خط کی صورت پیدا کرتا ہے یا دائرہ کی۔ اگر یہ نہیں تو پھر ایک نقطہ ہی میں سکونی قسم کی حرکت ہوتی ہے یعنی افسانہ نویس کسی نکتہ کی توضیح کرتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اور ہم اس سے ایک ذہنی تشفی پاتے ہیں۔ گویا افسانہ کی کڑیاں ایک جگہ مل جاتی ہیں۔ وہ اس نکتے ہی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں جو بجائے خود ایک خط یا دائرہ بن جاتا ہے اور ناول نویس کو کسی ایکشن کے پھیلانے یا کسی الجھن کو سلجھانے اور کسی پلاٹ بافی یا قصہ طرازی کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اس ناول میں نکتہ یا گلٹی ہی کیا ہے۔ ایک فرد کا تغیرِ نفس۔ ہم نے اسے اصلاح، قصداً نہیں کہا۔ کیونکہ اس سے فن کے اٹھان میں فرق آ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ تبدیلی کا عمل فی نفسہٖ اصلاح ہی کا عمل ہے۔ ناول نویس نے اپنے مقصد کا تصور نذیر احمد کی طرح نہیں کیا بلکہ واقعاتی و نفسیاتی حیثیت سے کیا ہے جس میں عمل قدرتی طور پر بے ساختہ ہے اور یہی سارا فرق پیدا کرتا ہے۔ دکھانا صرف یہ ہے کہ کس طرح ایک بڑھ بڑھ کر ڈینگیں مارنے والے یا ہوائی باتیں کرنے والے، ان گھڑ، بے حس، نیم جاہل، صرف اپنی ہی سوچنے والے نمبردار صاحب جو خیر نہیں لام پر جا کر حاجی بابا کی طرح کیا کیا بہادرانہ کارنامے سرانجام دے آئے ہیں، اور پھر وہ بھی زبانی اپنی۔ حالات و ظروف کی ناگزیر منطق کے ماتحت ایک پرلے درجے کے حساس ہمدرد، اور فی الجملہ بہتر انسان بن جاتے ہیں۔

وہ اچھے برے کے مجموعے کی ایک عام مثال ہیں اور ان میں کچھ کمزوریوں کے باوجود سنورنے کی صلاحیت ہے جس تجربہ سے وہ دوچار ہوئے اس سے ان میں تطہیر کا عمل ہوتا ہے جو اعلیٰ درجہ کی تعمیری سرگرمی کے لئے ناگزیر ہے۔ وہی جو ہمارے مصلحین اور مذہبی و روحانی بزرگ ہمیشہ کہتے چلے آئے ہیں۔ روحانی مدارج طے کرنے کے لئے تزکیۂ نفس ضروری ہے، اور ہم چاہیں تو روحانی مدارج کی جگہ اعلیٰ درجے کے کارناموں کو دے سکتے ہیں۔ لہٰذا ہم ابھی سے ان امور کا تصور کر سکتے ہیں جو دوسرے حصے میں آنے والے ہیں۔ "خونِ جگر ہونے تک" محض شوخیٔ عنوان ہی نہیں اور نہ مصنف کی محبوب صنفِ سخن غزل کی چٹخارے دار زبان کے ترچھے تیکھے تیور، بلکہ اس میں واقعی "خونِ جگر" ہونے کی کچھ بات ہے، اور ساتھ ہی "دل کا کیا رنگ" ہونے کا معاملہ بھی ہے۔ آخر میں دل کا رنگ یہی ہوتا ہے کہ کچھ غمِ جاناں کچھ غمِ دوراں سے یہ کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ جمعدار صاحب کے دل یعنی فطرت کا رنگ اس قدر بدل جاتا ہے کہ ہم اسے پہچان نہیں پاتے جیسے وہ تھامس ہارڈی کے ناول "میئر آف کاسٹر برج" کا ہیرو ہنچرڈ ہو۔ پہلے جمعدار اور دوسرے جمعدار میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک اور ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ والی بات کچھ ایسی ہی بنتی ہے جیسی کہ مثال کے طور پر کولرج کی نظم "اینشینٹ میرینر" میں یعنی ہیرو میں ابتداءً جو خامی ہے سنگدلی، محبت کا فقدان، اس پر کوئی افتاد آن پڑتی ہے جو آہستہ آہستہ اس کے ضمیر کو بیدار کرتی ہے اور اسے احساس دلاتی ہے کہ حقیقی قدریں کچھ اور ہیں اور وہ انسان، وحش و طیر سب کی محبت سے سرشار ہو کر ایک کائناتی احساس پیدا کرتا ہے۔

دانتے کی طرح "خونِ جگر ہونے تک" کے ہیرو کو بھی بہشت (آسودگیٔ نفس و عروجِ ذات) تک پہنچنے کے لئے دوزخ سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور یہ دوزخ بنگال کا وہ خوفناک قحط ہے جس نے ہزاروں جانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اسی لئے ناول پر قحط ہی قحط چھایا ہوا ہے، اور قاری ہر بیں نظروں کو یہ دھوکا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ بنگال کے قحط کی داستان ہے اور بس۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ناول کا پس منظر بنگال ہے۔ اپنی زندگی، اپنی فضا اور نسبتاً حالیہ تاریخ کے ساتھ چونکہ سارا ماجرا ہی بنگال کا ہے۔ اس لئے افراد سے لے کر ماحول اور واقعات تک سب کچھ بنگال ہی کا ہے۔ ناول کا پس منظر کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ نہ کہ اس کو علاماتی ضرورت کے ماتحت ارادۃً منتخب کیا گیا۔ کہانی کو بنگال کی کہانی سمجھنا غلط ہے۔ یہ محض اتفاق ہے۔ جو کچھ مصنف کہنا چاہتا تھا اس کے لئے اسے بنگال کے واقعات میں مناسب مواد یا ایلیٹ کے الفاظ میں معروضی مترادف (OBJECTIVE CORRELATIVE) مل گیا۔ لہٰذا اس سلسلہ میں ان کے ذاتی تجربوں کا تذکرہ خاص بے محل ہے۔ یہی کہانی دنیا کی کسی اور جگہ کے ضمن میں بھی بیان کی جا سکتی تھی۔ مثلاً: جمعدار صاحب کو میدانِ جنگ ہی میں رکھ کر دوسری قسم کا جمعدار بنایا جا سکتا تھا۔ کیونکہ جنگ کے ہنگامی حالات انہیں انسانیت کا درس دیتے۔ جیسا کہ کئی اور ناول نویسوں نے کیا بھی ہے۔ بنگال کو منتخب کرنے کے بعد مصنف نے اس پس منظر کو پوری طرح اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ ناول اردو میں بنگال کے متعلق ہے جس سے ہم بلکہ ہر انسان کو جو عالم اور اقوامِ عالم سے دلچسپی رکھتا ہے، پہلا ناول ہے۔ تاہم یہ محض ایک ضمنی بات ہے اور ہمیں اس ہی میں الجھ کر نہیں رہ جانا چاہئے۔ کیونکہ ناول کا اصلی مقصد بنگال اور اس کے بعض واقعات اور افراد کو پیش کرنا نہیں بلکہ آفاق کے بجائے انفس کا مطالعہ ہے۔ اور اس کے لئے دنیا کی کوئی جگہ، کوئی انسان بھی منتخب کئے جا سکتے تھے۔ بنگال کے واقعات یا افراد کو کوئی علاماتی حیثیت حاصل نہیں۔ افراد ویسے ہی انسان ہیں جیسے اور مقامات کے انسان۔ ان سے زندگی کا وہی نقشہ ابھرتا ہے جو کسی اور جگہ ابھر سکتا ہے۔ اور وہی نتائج پیدا ہوتے ہیں جو کہیں اور ہو سکتے تھے جب مصنف نے بوجوہ بنگال کو منتخب کر ہی لیا تو اس نے اس کی زندگی اور ماحول کی عکاسی اسی طرح کی ہے جس طرح ایک ماہر دیدہ ور اور باریک بیں ناظر کر سکتا تھا۔ یہ خداداد قوتِ مشاہدہ ہے جو ہر کسی کو میسر نہیں آتی اور فضلی صاحب کو ایک شاعر و ناول نگار دونوں کی قوتِ مشاہدہ ہاتھ آئی ہے جو عام کشید کو بھی دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ شروع سے آخر تک ناول میں بنگال کی زندگی اور فضا کے ہر پہلو کا بڑا ہی بھرپور، کشادہ اور رنگین نقشہ ہے جس میں واقعیت ہی واقعیت رچی بسی ہوئی ہے۔ بلکہ اس ناول کی ممتاز خصوصیت ہی یہ ہے کہ یہ واقعاتی ہے۔ تمثیلی، خیالی یا نظریاتی نہیں۔ اگر ہم نے بنگال کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تو بھی جس طرح ناول میں کشتی رانی کے مقابلہ یا طوفان کے مناظر پیش کئے گئے ہیں۔ ہم ان کا پورا پورا تصور کر سکتے ہیں۔ طوفان کے منظر میں طوفان کی طبعی کیفیت سے زیادہ ناول نویس کی قدرتِ بیان، قوتِ مشاہدہ اور تخلیقی دسترس کو دخل ہے۔ انشا پردازی میں یہ بلا کی آمد اور آبیج شروع سے لے کر آخر تک حاوی ہے۔ جیسے خود بنگال کی باغ و بہار فضا اس کے تمام ماحول پہ۔ اور صرف اسی پر ہی اکتفا کی جائے تو یہ اس ناول کو ہمارے بہترین ناولوں میں جگہ دینے کے لئے کافی ہے۔ یہ ہمارے دوسرے ناولوں سے ایک جداگانہ اور کافی نمایاں نوعیت کا حامل ہے۔ اس میں متداول موضوعات سے ایک صحت مندانہ انحراف کیا گیا ہے

جو ممکن ہے آگے چل کر انقلاب آفریں ثابت ہو۔ اس میں کسی کو ہیرو بنا کر ہالہ سازی نہیں کی گئی ۔ تاوقتیکہ جمعدار صاحب اپنے ذوقِ نمود میں خود بخود ہیرو بن کر برات کے دولھا نہ بن جائیں مصنف کے لئے سارے لوگ ہیرو ہی ہیں ۔ کیا جلو دھر، مخلص ، خان صاحب مولوی نیہ الاسلام اور مونید شاب کچھ کم ہیرو ہیں؟ درحقیقت جس وضع کا یہ ناول ہے اس میں ہیرو کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ممکن ہے فن کار نے اس میں غزل ہی کا رنگ روپ جھالا ہو۔ مگر اس میں حسن و عشق یا رومان کی کوئی " لیمن چوس " جیسی جانی پہچانی ، مرغوب چاشنی نہیں اور نہ کوئی اور سادہ فریب رنگینی ہے ۔ لہٰذا اس کی وضع اس کا لب و لہجہ ، اس کا تصور ، اس کا موضوع عہد آفریں قسم کے انحراف ہیں ۔ جو ایک اور ہی طرح کی جوت جگاتے ہیں اور نئی نئی منزلوں کی نشان دہی کرتے ہیں ۔

فضلی آنسوؤں اور مسکراہٹوں کو ملانے کے کھیل میں ماہر ہیں ۔ ناول کا موضوع بہت سنجیدہ ، بہت بھیانک تھا اور اندیشہ تھا کہ کہیں یہ خونچکاں روداد اُن کو " مصورِ غم " نہ بنا دے ۔ مگر نہیں ، ان کی فطری زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی نے ان کو بھی بچا لیا اور ناول کو بھی ۔ جس پر بہر کہیں ان کی ثقافتی تہہ داری ، ان کی پُرمعنی ہنسی اور مسکراہٹ کی چھوٹ پڑتی ہے ۔ اور گھٹا ٹوپ بادلوں میں ایک روپہلی لکیر کی طرح مچل کر تمام اندھیری فضا میں اُجالا پیدا کر دیتی ہے ۔ یہ نادر خصوصیت صرف بہترین دماغوں ہی کا حصہ ہے ۔ جیسا کہ ایک حقیقی بذلہ سنج کے متعلق کہا گیا ہے ۔ اس کی ایک آنکھ مسکراتی اور دوسری روتی ہے ۔ سروانٹس ، شیکسپیئر ، ڈکنس میں ان انتہاؤں کا اجتماع بڑے وسیع و بلند پیمانہ پر ہے ۔ فضلی کے یہاں بھی کچھ یہی کیفیت ہے ۔ ان کے یہاں بڑے بڑے گہرے گھاؤ اور ان کے ساتھ ہنسی ، گدگدیاں اور چٹکیاں بھی ہیں ۔ بقول غالب : ع دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

اس میں شک نہیں کہ ناول ایک اونچی سطح پر سوچا گیا ہے ۔ اور اسی سطح پر پیش بھی کیا گیا ہے ۔ اس پیش کش میں کمال انشا پردازی کو خاص دخل ہے ۔ جس تک اردو کے بہت کم ناول پہنچتے ہیں ۔ اس میں ایک وقار ہے جو صرف بلندیٔ نظر اور بلندیٔ ذوق ہی سے پیدا ہو سکتا ہے ۔ مگر یہ لطیف انشا پردازی تغزل اور اس کی روایتی زبان کی کرشمہ آفرینیوں سے بے نیاز ہے ۔ مصنف نے ایک آزاد زبان برتی ہے ۔ جو اصنافِ سخن میں نظم کی زبان سے ملتی ہے ۔ اس میں غزل ان کی محبوب صنف یا اس کی زبان کا شائبہ تک نہیں ، دراصل ناول کا سارا اسلوب بیان نظم ہی کی زبان کی پرزور تائید ہے ۔

اس ناول کا موضوع داستانی نہیں ۔ یہ جدید دور کا موضوع ہے ۔ اس کا زمانہ بڑی حد تک ہمارا اپنا زمانہ ہے ۔ اس کے معاملات اور مسئلے ہمارے ہی ہیں لیکن ان محدود معنوں میں نہیں کہ ناول نگار قصداً مسئلے تلاش کرتا اور ان کے حل پیش کرتا ہے ۔ واقعات کم و بیش ہمارے ہی عہد کے واقعات ہیں ، زندگی لگ بھگ ہمارے ہی عہد کی زندگی ہے ۔ لہٰذا اس میں ایک خوشگوار قسم کی واقعیت ہے ۔ ہمارے پاؤں اپنی ہی دھرتی پر ہیں ، آکاش پر نہیں ۔ اور پھر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس میں افراد کی آپ بیتی کے ساتھ ساتھ قوم بیتی بھی ہے ۔ یہ باتیں ناول میں تہہ پر تہہ اور دل پر دل بنا دیتی ہیں ۔ اگرچہ کہانی کی رفتار بہت سیدھی ہے اور یہ تہیں اور دل اس میں کسی کرشمۂ فن سے نہیں بلکہ آپ ہی آپ پیدا ہو جاتے ہیں ۔

فضلی فطرت پرست بلکہ فطرت نگار ہیں ۔ وہ کسی سرّی یا حکیمانہ گہرائی کی طرف نہیں جاتے جس سے ہمیں ان کے ہم ذوق و ہم وضع ہارڈی کی یاد آئے جو BLACK HEATH اور تمام WESSEX کے علاقہ میں ایک علاماتی سی بات ، پیدا کر دیتا ہے فضلی اس قسم کے اشاری ابہام کی بجائے نکھار کے قائل ہیں ۔ وہ نکھار جو واقعیت ، ہی میں کھلتا ہے ۔ لہٰذا بنگال کی جو منظر نگاری انھوں نے کی ہے وہ کوئی علامتی حیثیت نہیں رکھتی ۔ تاہم ان لوگوں کے لئے جنھوں نے بنگال کو نہیں دیکھا اور جو اس کا تصور کرنا چاہتے ہیں ، ان کے لئے یہ رنگ برنگے نقشے ایک طرح کی علامتی یعنی نمائندہ حیثیت ضرور رکھتے ہیں ۔

ایسی تخلیقات جن کو دیکھتے ہی اہلِ نظر بالاتفاق کہہ دیں کہ یہ امر ہیں ، شاذ و نادر وجود میں آتی ہیں ۔ اور پھر ایسی تخلیقات جن کے عہد آفریں ہونے کی تائید میں داخلی شواہد کثرت سے پیش کئے جا سکیں ۔ اور ہمیں لامحالہ ان کے غیر معمولی حد تک قد آور ہونے کا اقرار کرنا پڑے " خونِ جگر ہونے تک " کا شمار انہی مستثنیات میں ہے ۔

★

نواحِ غرناطہ میں

قیوم نظر

کس قدر سست ہے دن ۔۔۔ ریت کے جلتے ہوئے ٹکڑے سے پرے
رینگتے رینگتے جا پہنچے گا ۔۔۔ تنہائی میں مٹ جانے کو
خشک ہے گھاس، رگِ تاک میں اک بوند لہو کی بھی نہیں
مضمحل لیٹے ہوئے وقت کے پہلو میں نمو پانے کو

★

دم بخود جھنڈ کھجوروں کے، ستم دیدوں کے، جانے کب سے
راہ تکتے ہیں کسی جھونکے کی، بے ساختہ ٹھہرانے کو
جو اچانک کسی گوشے سے بگولے کی طرح اُٹھتا ہے
خاک اُڑانے کو، تہی کھیت میں سناٹے سے در آنے کو

★

زندگانی کی تب و تاب سے خالی ہے دلِ ہر ذرّہ
کوئی نغمہ ہے نہ ٹکڑا کسی آواز کا، ٹکرانے کو
اُس خموشی سے جو ہر شے پہ مسلط ہے ۔۔۔ سنی جاتی ہے
دامِ تزویر میں لانے کو، نگوں ساری کے بہلانے کو

★

ریگ آلود سڑک ۔۔۔ اُجلے مکانوں میں سفیدی جیسے
داغِ محرومیٔ نقشِ کفِ پا کھانے کو، شرمانے کو
سنگ ریزوں کی اُدھڑتی ہوئی زنجیر سی تا حدِ نگاہ
کوئی ندی یہاں بہتی تھی بہاراں میں، یہ جتلانے کو

★

★ ★

روپ رانی

شبیر افضل جعفری

گوری، لاج کٹوری — متوالی، "مستوری"[1]
نین کنول شکارے — اور بھنویں بھنبوری
ململ کے گھونگھٹ سے — دیکھے چوری چوری
چاند اس کا کنکوا — نظریں ریشم ڈوری
زلفیں پھاگن راتیں — پلکیں چیت کی پوری
چڑھتی بیل جوانی — قامت نازک توری
سوہا لال تبسم — دل میں پان گلوری
چہرہ خار نگ رنگیلا — باہیں گوری گوری
چاندی کی پازیبیں — چھم چھم ٹورے[2] چکوری
تاروں کو شرمائے — جھلمل جھلمل گوری
وارے وارے جائیں — نانگے، چیپے، تھوری[3]

ہرنوں کو تڑپائے
ساندل بار کی چھوری

---

[1] مستی بھری [2] گھبرا [3] چال [4] بار کے تین راجپوت قبیلے۔

آخرِ شب

تمہید الاسلام سید

یہ سُبک گام ہوائیں یہ زمستاں کی رُت
یہ لہکتی ہوئی پھلواری، یہ البیلے پھول
آہ یہ جھومتے پتّے، یہ لچکتی شاخیں
سرِ دیوار چنبیلی کی مہکتی بیلیں،
دامنِ کوہ میں کھلتے ہوئے نورس غنچے
یہ سپیدے کے درختوں کے گھنیرے سائے
یہ تراشیدہ چٹانیں، یہ چٹختے پتھر
کہکشاں جھیل کے دامن میں اُتر آئی ہے
چاندنی ریت کے تودوں پہ کھڑی ہے گُم سُم
مجھ سے سرگوشیاں کرتی ہیں سلونی یادیں
دل کسی دھیان کی آہٹ میں مگن ہو جیسے
کسی دلبر کسی گلرخ کی لگن ہو جیسے

★

یہ گھنے کہرے میں لپٹے ہوئے اونچے ٹیلے
دمبدم جھیل کی لہروں کا اُمڈتا سرگم
یہ سرِ چرخ ستاروں کا طلائی جھومر
بیدِ مجنوں کی گھنی شاخوں میں اٹکا ہوا چاند
یہ چمکتے ہوئے جگنوؤں کی آوارہ قطار
یہ سجل رات یہ سیجیں، یہ مہکتی ہوئی گھاس
رچ رہی ہے مری نس نس میں کسی پھول کی باس

★

رات کی رانی مہکتی ہے کسی گوشے میں
جھاڑیوں میں کہیں دبکے ہوئے جھینگر بولے
اوس میں بھیگے ہوئے مست ہوا کے جھونکے
ڈولتی پھرتی ہے ویرانے میں سوندھی خوشبو
جاگ اٹھی ہیں مرے دھیان کی سونی راہیں
نہ گرانباریٔ احساس نہ آشفتہ سری
دلنشیں یادیں کہ آ آ کے لپٹ جاتی ہیں
آج پھر ذہن کو خوشبوؤں سے مہکاتی ہیں

★

دشت و کہسار میں گونجی ہے رہٹ کی آواز
کوئی چرواہا دبے پاؤں چلا آتا ہے
اس طرح گونجتی ہے اس کی کھنکتی آواز
گھنٹیاں جیسے بج اٹھیں کسی ویرانے میں
کتنی پُرسوز ہے چرواہے کے نغمے کی الاپ
کتنی دلدوز ہیں سناٹے میں شب کی چیخیں
ہر نفس شہرِ سمن پوش سلگ اُٹھتا ہے

★

دُور اِک بستی میں جلتے ہوئے دیپک کی لَو
ٹمٹماتی ہے کبھی اور کبھی بجھتی ہے
یہ پُراسرار دُھندلکوں میں سمٹتی ہوئی رات
نیلگوں عرش کسی سوچ میں گم ہو جیسے
اک نئی صبحِ دل آویز اُبھرنے کو ہے
کوئی مدمست مہک دل میں اُترنے کو ہے

★

توڑ دے حسرتِ ناکام کے بندھن کوئی
کاش سُن لے دلِ بیمار کی دھڑکن کوئی

افسانہ:

حادثہ

اشفاق احمد

ساری گلی پر دہشت چھائی ہوئی تھی اور عورتیں کوٹھوں پر سے نیچے جھانک رہی تھیں۔ لوگ ایک ایک کر کے بیٹھک کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ اور دبی دبی زبان میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کئے جاتے تھے۔ تھانیدار کرسی پر بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا اور میر محلہ اپنے یہاں سے اور کرسیاں منگوا رہا تھا۔ زنگریز کے تخت پوش پہ بیٹھک کے ساتھ بسنے والے لوگ بیٹھے تھے اور معنی خیز نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ چھوٹا تھانیدار، ایک حوالدار اور دو سپاہی بیٹھک کا نقشہ تیار کرنے میں مصروف تھے اور ایک فوٹو گرافر مختلف زاویوں سے بیٹھک کے اندر اور باہر کے فوٹو کھینچ رہا تھا۔ میر محلہ ان لوگوں کو جائے وقوعہ سے رخصت کر رہے تھے جن کا گلی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ گھروں کے کواڑ بند تھے اور گلی میں کھیلنے والے بچے ماؤں نے اندر قید کر رکھے تھے۔

چھ مہینے پہلے اسی گلی کے دہانے پر کسی نے غفور جلد ساز کو چھرا مار کر زخمی کر دیا تھا لیکن اس حملے کی نوعیت کچھ اور تھی۔ ہر ایک کو معلوم تھا کہ چونکہ غفور معاملے کا کھرا نہیں، اس لئے کسی دل جلے قرضخواہ نے اس کو سبق سکھانے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ لیکن غفور اچھی طرح سے جانتا تھا کہ اصل بات کیا تھی۔ اس نے نہ تو تھانے میں رپٹ درج کرائی اور نہ یہ خبر اپنی گلی سے باہر پھیلنے دی۔ بابو خیر الدین کو کچھ شک گزرا۔ انہوں نے اشارۃً غفور سے پوچھا بھی مگر وہ مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

اس گلی میں پڑھے لکھے مردوں کی تعداد دو سے زیادہ نہ تھی اور دونوں میٹرک سے اوپر نہ پہنچے تھے۔ بابو خیر الدین ایف۔ اے کی تعلیم بیچ ہی میں چھوڑ کر سرکاری دفتر میں ملازم ہو گئے تھے اور علی نواز دسویں پاس کرنے کے بعد کپڑے کا کاروبار کرنے لگا تھا لیکن جب سے اُستانی سکینہ کی لڑکی بی۔ اے میں ہوئی تھی ان دونوں کو اس سے اللہ واسطے کا بیر ہو گیا تھا اور ان کے ذہن میں طرح طرح کی کہانیاں جنم لینے لگی تھیں۔ ایسی کہانیاں جب ایک بار کوئی واضح شکل اختیار کر لیتی ہیں تو ہونٹوں پر آئے بغیر آپ سے آپ دوسروں کے ذہن میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ پھر زہت کی شکل و صورت بھی ایسی تھی کہ ہر ایک کا خواہ مخواہ کہانی کہنے کو جی چاہتا تھا۔

اسی گلی میں بھاری بھرکم جسم کی دائی نوراں رہتی تھی جس کی ٹھوڑی پر ایک بڑا سا سیاہ مسّا تھا۔ وہ جب ہنستی تھی تو یہ مسّا اس سے پہلے ہنسنے لگتا تھا۔ غفور جلد ساز کا آماں نوراں سے بڑا پیار تھا۔ اس نے یہی مشہور کر رکھا تھا کہ آماں نوراں ایک رشتے سے اس کی نانی لگتی ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ دائی نوراں کے رشتے کے سارے نواسے نواسیاں شکر گڑھ میں رہتے تھے۔

زنگریز پڑھا لکھا نہ تھا لیکن اُسے تھیٹر کے زمانے کی بہت سی غزلیں یاد تھیں اور اس نے کبھی کوئی شعر غلط نہ پڑھا تھا۔ وہ جب بھی علی نواز سے اپنے کسی یار دوست کو خط لکھواتا تو شعروں کا طومار باندھ دیتا۔ اس طرح علی نواز کو املا کی بہت سی مشکلات پیش آتیں۔ زنگریز کے خطوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی پری مکھی لڑکی کے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہے اور اس کو اپنے دل کے اسٹیج پہ بٹھا کر اس کی پوجا کر رہا ہے لیکن اس کا رول ہیرو کا سا نہ تھا ولن کا سا تھا، مار کٹائی اور جنگ و جدل سے بھرپور۔

زہت کالج سے آتے جاتے گلی میں برقعے کا نقاب اُٹھا دیتی اور گھروں کے آگے کھیلنے والے لڑکوں کے سروں پر اپنی لال کاپی کی دھولیں جماتی ہوئی ٹھپ ٹھپ گھر کی سیڑھیاں چڑھ جاتی۔ اس میں اور گلی کی دوسری لڑکیوں میں ایک بڑا فرق یہ بھی تھا کہ وہ دیواروں کے ساتھ ساتھ نہیں چلتی تھی، گلی کے بیچوں بیچ چلتی تھی اور ہر دروازے پر کچھ اس طرح سے رُکتی سی تھی جیسے مکینوں کا حال پوچھنے لگی ہو۔ اس کی ماں نے کئی مرتبہ منع کیا کہ وہ گلی میں چلتے ہوئے اپنی رفتار ہموار رکھا کرے لیکن اس کا زہت پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آج صبح جب وہ کالج جانے لگی تو گلی میں یہ حادثہ ہو گیا۔

چوکیدار کا بیان تھا کہ جب آدھی رات کو وہ گلی میں لاٹھی کھڑکاتا ہوا داخل ہوا تو منظور صاحب کی بیٹھک میں بتّی جل رہی تھی۔ اُس نے تخت پوش پر سوئے ہوئے ایک کتے کو دھتکارا تو بیٹھک سے ایک موٹی سی کتاب بند ہونے کی آواز آئی۔ دوبارہ جب وہ دو ڈھائی بجے کے قریب گلی میں داخل ہوا تو بیٹھک

یوم جمہوریۂ اسلامیہ پاکستان

(تقریبات)

صدر اسکندر مرزا عساکر پاکستان کی سلامی لے رہے ہیں

عساکر پاکستان کی سلامی لینے کے لئے صدر کی روانگی

یوم جمہوریہ کی دوسری سالگرہ کے موقع پر
یہ یادگاری ٹکٹ جاری کیا گیا

(یوم جمہوریہ کی تقریبات
(۲)

عراق کا فوجی دستہ

فضائیہ پاکستان کے مظاہرے
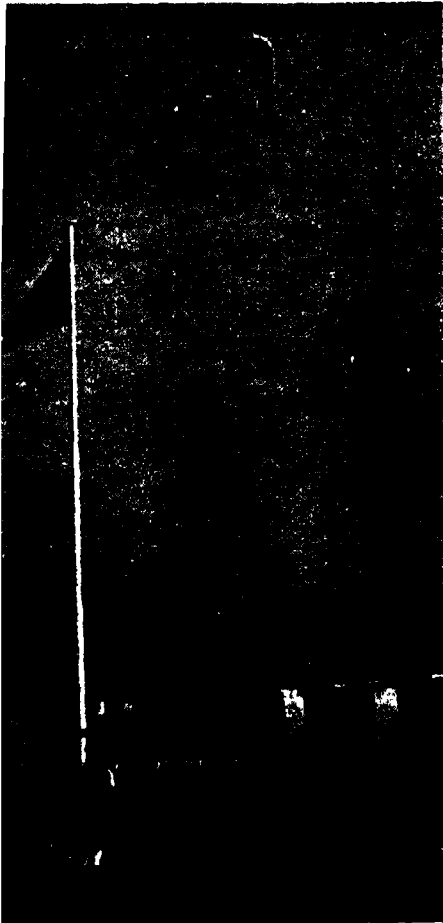
ترکی فوجی دستہ ، جس نے یوم جمہوریہ کی تقریب میں حصہ لیا

ایران کا فوجی دستہ

کی بتی بجھی ہوئی تھی اور کتا پھر تخت پوش پر سویا ہوا تھا۔

غفور جلد ساز نے کہا کہ جب وہ گیارہ بجے کے قریب گھر واپس آیا تو منظور صاحب کی بیٹھک کا بلب بجھا ہوا تھا اور اندر سے مدھم مدھم روشنی آ رہی تھی۔ شاید انہوں نے موم بتی روشن کی ہوئی تھی۔ دور دور کے محلوں سے اکا دکا پٹاخے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن اس گلی کے سارے بچے شب برات منا کر سو چکے تھے۔

اس حادثے سے ایک روز پیشتر منظور صاحب کتنی دیر تک رنگریز سے باتیں کرتے رہے تھے۔ وہ قریشیوں کے گھر سے آیا ہوا الہریا دوپٹہ رنگ رہا تھا اور منظور صاحب کو ترنم کے ساتھ آغا حشر کی ایک غزل سنا رہا تھا۔ منظور صاحب نے تین چار مرتبہ گھڑی پر وقت دیکھا تھا اور وہ پریشانی کے عالم میں گلی کے دہانے کی طرف دیکھ رہے تھے۔" پھر" رنگریز نے کہا۔" میں جامنی رنگ لینے اندر کوٹھڑی میں گیا اور جب باہر نکلا تو منظور صاحب جا چکے تھے۔ ان کی بیٹھک کے دروازے چوپٹ کھلے تھے اور ان کا کوئی پتہ نہ تھا۔"

اماں نوراں نے بتایا کہ کل شام وہ تنبا کو والے کی دکان کے پاس اُستانی سکینہ کے لڑکے کو پھلجھڑیاں اور پٹاخے خرید کر دے رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک اور نوجوان تھا جسے اماں نوراں نے پہلے نہ دیکھا تھا۔

میر محلہ نے کہا۔" تین دن پیشتر، دفتر سے لوٹتے ہوئے، منظور صاحب میرے احاطے میں آئے تھے اور ہم دیر تک الجزائر اور تیونس کی باتیں کرتے رہے تھے۔ انھوں نے مجھے بھورے رنگ کا ایک عجیب سا سگرٹ بھی پلایا تھا جس سے تنباکو کے بجائے عطر پھلیل کی خوشبو آ رہی تھی۔ میں نے باتوں باتوں میں ان سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنے بیوی بچے یہاں کیوں نہیں بلو الیتے لیکن انہوں نے اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا تھا اور اخبار پڑھتے رہے تھے۔ پھر مجھے مہر قادر بلانے آ گیا۔ ہمیں رمضان کی لڑکی کے نکاح پر جانا تھا اور ہم منظور صاحب کو ویسے ہی اخبار پڑھتے چھوڑ کر احاطے سے باہر نکل گئے۔ نکاح پر ایجاب و قبول کے وقت لڑکی نے انکار کر دیا اور لڑکے والے کچھ کہے سنے بغیر واپس چلے گئے۔ جب میں اور مہر قادر احاطے میں لوٹے تو منظور صاحب جا چکے تھے اور ان کا بھورے رنگ کا ایک سگرٹ مونڈھے کے پاس گرا ہوا تھا۔

غفور جلد ساز نے کہا میں نے کئی مرتبہ اُستانی سکینہ کے لڑکے کو ان کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے میرے سرخ رومال کی بات بھی پوچھا تھا کہ میں نے کہاں سے خریدا ہے۔ میں نے دکان کا پتہ بتا دیا لیکن میرے ذہن میں کھلبلی سی مچی رہی کہ انہوں نے اس خاص دکان کا پتہ کیوں پوچھا۔ ایسا رومال تو کہیں سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ اس کے دو تین روز بعد میں نے اسی طرح کا رومال بیٹھک کی کھڑکی سے بندھا ہوا دیکھا۔ انہوں نے اس کے دونوں سرے کھڑکی کی سلاخوں سے باندھے ہوئے تھے اور نچلا حصہ کھلا تھا۔ جب تک بیٹھک کھلی رہتی وہ رومال اسی طرح بندھا رہتا اور جب وہ بیٹھک بند کر کے باہر جاتے، رومال کھول کر لے جاتے۔

رنگریز نے بتایا کہ چار پانچ روز پیشتر ان کی بیٹھک سے کسی کے جھگڑنے کی آواز آ رہی تھی۔ جھگڑا کرنے والا بڑا گرم تھا لیکن وہ اس قدر آہستہ بول رہا تھا کہ اس کے الفاظ ٹھیک سے سنائی نہ دیتے تھے۔ میں تخت پوش پر پھونس کا چولہا جلا کر کلف تیار کر رہا تھا۔ دو تین مرتبہ میرا جی چاہا بھی کہ بیٹھک کے پاس جا کر ان کی باتیں سنوں لیکن کلف میں گٹھلیاں پڑنے کا اندیشہ تھا اور میں چولہا چھوڑ کر جا نہ سکتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ناٹے قد کا آدمی ان کی بیٹھک سے نکلا۔ جانے سے پیشتر اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے کہا" اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ میں آسانی سے چھوڑنے والا نہیں۔"

بابو خیر الدین نے بتایا کہ میری منظور صاحب سے کوئی خاص بول چال نہ تھی۔ ہم ایک دوسرے کو سلام بھی کم ہی کرتے تھے۔ پرسوں جب میں دفتر جانے کے لئے گھر سے نکلا تو مجھ سے پندرہ بیس قدم آگے نزہت بی بی منظور صاحب کے پیچھے پیچھے جا رہی تھی۔ جب وہ ان کے برابر پہنچی تو اس نے آہستہ سے منظور صاحب سے کچھ پوچھا۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر کلائی پر گھڑی دیکھی۔ کچھ کہا اور پھر وہ دونوں اپنی اپنی راہوں پر مڑ گئے۔ شاید اس نے وقت پوچھا تھا۔

علی نواز نے کہا۔" گزشتہ رات کوئی بارہ ساڑھے بارہ کا عمل ہوگا۔ میں انگریزی کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا جب میں نے گلی میں پٹاخہ چلنے کی آواز سنی۔ میں ایک دم بدک کر اٹھ بیٹھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ آج شب برات ہے کسی شریر بچے کے پاس کوئی پٹاخہ باقی رہ گیا ہوگا۔ لیکن اس پٹاخے کی آواز دوسرے پٹاخوں سے مختلف تھی۔

نزہت کی طبیعت کچھ عجیب طرح کی تھی۔ بات بات پر بگڑ جاتی، چھوٹی چھوٹی چیزوں کا برا مان جاتی۔ کئی کئی دن ماں سے روٹھی رہتی اور جب ترنگ میں

ا تو ہر ایک کو غلط فہمی میں مبتلا کر جاتی۔ باپ کی بے وقت موت اور ماں کے بے جا لاڈ پیار نے اسے ضدی بنا دیا تھا۔ اس پر ستم یہ ہوا کہ اپنی تعلیمی قابلیت کی
پر پروفیسروں کی آنکھ کا تارا بھی ہو گئی اور گلی کے بچے باجی سے کہانی سننے کو اس کے اشاروں پر ناچنے لگے ـــــ جب اتنی ساری محبوبیت ایک ہی شخص کے
میں آ جائے تو وہ اپنی ذات کے علاوہ کسی اور چیز کو اہمیت دے ہی نہیں سکتا۔ ایک دو جگہ سے بڑے اچھے پیام آئے لیکن نزہت نے دور ہی سے اپنی
کو ٹھینگا دکھا دیا اور پیام لانے والیاں اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔ ریاض جو دو تین سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد اس کے دل کے سنگھاسن کا پایہ پکڑ کر
ا تھا، سی ایس پی ہوتے ہی ایک بار پھر اردلیوں کی طرح دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ اس کے کراچی جانے سے ایک روز پیشتر باغ میں دونوں کی خوب
ب لڑائی ہوئی تھی اور اسے اس بات کا پختہ یقین ہو گیا تھا کہ نزہت اس سے کبھی بھی محبت نہ کر سکے گی۔ اتنا کچھ سوچ لینے کے باوجود ریاض نے کراچی جا کر
ہت کو کئی خط لکھے تھے اور ایک کا بھی جواب نہ پایا تھا۔ آخر وہ ان طول و طویل پرزوں کا جواب کیوں دیتی جب ساری عاجزی اور انکساری کے مجسمے
، سینوں پر ہاتھ باندھے، اس کے آگے پیچھے گھوم رہے تھے۔ وہ چاہتی تھی ریاض چھٹی لے کر خود آئے اور زبانی اس سے معافی مانگے پھر وہ اس کی درخواست
ر کر سکتی تھی۔

اس گلی میں منظور کی آمد سے جہاں بابو خیرالدین اور علی نواز کے ذہنوں میں کہانیاں جنم لینے لگی تھیں وہاں گلی کی عورتوں نے کئی داستانیں ایک
سری کو سنا بھی دی تھیں۔ یہ قصے اڑتے اڑتے نزہت کی والدہ تک بھی پہنچے تھے اور وہ اپنی طبیعت کے مطابق یونہی فکر مند ہو گئی تھیں۔ ایک دو مرتبہ
انہوں نے نزہت کو منظور کی بیٹھک کے سامنے رکتے دیکھا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کو بلانے کے لئے رکی تھی جو منظور صاحب سے
یاں سن رہا تھا۔

نقشہ تیار ہو چکا تھا اور تھانیدار صاحب لوگوں کے بیان لے رہے تھے۔ عام خیال یہی تھا کہ منظور صاحب نے خودکشی کی ہے لیکن ادھ کھلی کھڑکی
آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے لگی ہوئی گولی اس بات کی صاف ترجمانی کرتی تھی کہ قاتل کوئی اور ہے جس نے کھڑکی
ہاتھ ڈال کر پستول چلایا ہے اور جب اپنا ہاتھ باہر نکالنے لگا ہے تو پستول کو تھامے ہوئے اس کی مٹھی سلاخوں سے باہر نہیں نکل سکی اور اس نے گھبراہٹ میں
ول وہیں پھینک دیا۔ موقع واردات پر منظور صاحب کے گلے میں وہی سرخ رومال بندھا ہوا تھا اور وہ کل کا اخبار پڑھ رہے تھے۔ لیکن چوکیدار کے بیان
اندازہ ہوتا تھا کہ جب گولی چلی تو کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ علی نواز کا اندازہ تھا کہ اس وقت بارہ ساڑھے بارہ سے زیادہ کا عمل نہ ہوگا۔ حاجی صاحب
یان تھا کہ جب وہ تہجد کے لئے جاگے تو انہیں بھاگتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے بھاگنے والے نے فلیٹ بوٹ
ن رکھے ہوں۔

اتنا کچھ سننے اور دیکھنے کے باوجود گلی بھر میں کسی کو شک تک نہ گذرا کہ اتنا بڑا حادثہ ہو چکا ہے۔ صبح جب اخبار والے نے منظور صاحب کی
ٹھک کا دروازہ کھول کر اخبار اندر پھینکا تو اس نے دیکھا کہ منظور صاحب مرے پڑے ہیں اور ان کا خون بہہ کر دہلیز تک پھیل گیا ہے۔ اخبار والے نے شور
یا۔ گلی کے سب لوگ وہاں اکٹھے ہو گئے۔ میر محلہ تھانے اطلاع دینے چلے گئے اور گلی کی عورتیں کوٹھوں پر آ کر ایک دوسری سے باتیں کرنے لگیں۔
ی اماں نوراں یہ خبر لے کر استانی سکینہ کے گھر پہنچی نزہت کی زبان کو جیسے تالا لگ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسے ہو سکتا ہے۔ دونوں
وں نے معنی خیز نظروں سے نزہت کی طرف دیکھا اور استانی جی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اماں نوراں کہہ رہی تھی "دشمنی بیر کیا ہوتا ہے یہ تو خودکشی ہے خودکشی
بے وفائی کرتا ہے تو بیوی یہ بیوی لے آتا ہے، اور وفاداری کرنے پہ آتا ہے تو جان دے دیتا ہے۔" نزہت آہستہ سے اٹھی اور اپنے کمرے میں جا کر تیار ہونے
۔ اماں نوراں استانی سکینہ کو صحن ہی میں چھوڑ کر نیچے اتر آئی اور نزہت کی ماں کو یوں محسوس ہوا کہ آج ضرور کچھ ہو جائیگا۔ وہ نزہت کے پیچھے پیچھے اسکے
ے میں گئی اور دروازے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ ایک ہی فکر اس کا کلیجہ نوچے جا رہی تھی کہ جونہی نزہت گلی میں اترے گی کہرام مچ جائیگا۔ اس نے
ـ دو مرتبہ نزہت کو بلانے کی کوشش بھی کی مگر اس کا حلق بند ہو گیا۔ نزہت کالج جانے کے لئے اپنی کتابیں ترتیب دے رہی تھی اور اس کی آنکھوں
ں ایسے موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے جو کبھی نہ گرنے کے لئے پلکوں سے لپٹے رہتے ہیں۔ اس نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی اس کے دروازے پر کھڑا ہے
ن اس نے سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ استانی سکینہ نے دونوں ہاتھوں سے دروازوں پر ایک ساتھ جھپٹا مارا اور کھٹاک سے پٹ بھیڑ کر

باہر سے کنڈی لگا دی۔ اندر نزہت کی کرب ناک آواز گونجی "اماں اماں" لیکن اس کی ماں نے کوئی جواب نہ دیا۔ کنڈی میں بڑا سا قفل پڑا۔ قفل میں چابی گھومی تو اندر سے سسکیاں بھری آواز آئی "مجھے کالج جانے دو اماں۔ خدا کے لئے جانے دو۔ ساڑھے سات ہوگئے"۔ نزہت رو رہی تھی، دروازہ پیٹ رہی تھی اور اس کی ماں گونگی بہری بنی صحن سے بالا خانے کو جانے والی سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

نزہت کے کمرے میں جاپانی ٹائم پیس کی سوئی آگے ہی آگے بڑھ رہی تھی اور میز پر پڑے ہوئے نیلے رنگ کے ایک چھوٹے سے خط پر ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے:۔

مری جان نزہت!

میں کراچی سے پنڈی جاتے ہوئے کل صبح سوا آٹھ لاہور سے گذر رہا ہوں۔ پرسوں پنڈی میں میرے نکاح کی رسم ادا کی جا رہی ہے۔ اگر تو لاہور سٹیشن پہ پہنچ گئی تو میں اگلا سفر بیچ ہی میں چھوڑ کر گاڑی سے اتر پڑوں گا اور اگر یوں نہ ہوا تو یہ میری اور تمہاری زندگی کا سب سے بڑا حادثہ ہوگا۔ باقی باتیں ملاقات پر (شاید)۔

تمہارا

ریاض

★

الیاس: نہیں، جو مل جائے اس کے ساتھ کھیل لیتے ہیں۔ ابھی حال میں ایک فلم پروڈیوسر آئے تھے۔ آدھ ہی گھنٹہ میں بیچارے کی پائی پائی جھاڑ لی ایک اور ٹھیکیدار تھا، ہزار لاکھ کا آدمی، دوسری صبح غریب کو اپنی گھڑی فروخت کر کے ہوٹل کا بل ادا کرنا پڑا۔

سرفراز: اچھا ایک بات تو بتاؤ الیاس۔ ان لوگوں کو تاش تم خرید کر لا دیتے ہو؟

الیاس: نہیں، وہ خود ہی خریدتے ہیں۔

سرفراز: کہاں سے؟

الیاس: دکانوں سے۔

سرفراز: دیکھو، یہ باتیں کسی احمق سے کرنا۔ مجھ سے جھوٹ نہ بولو۔

الیاس: سچ عرض کر رہا ہوں حضور، قسم کھاتا ہوں (بڑے میاں آسیجی کیس اٹھائے ہوئے اندر آتے ہیں)۔

سرفراز: اچھا ہم اس کے متعلق پھر باتیں کریں گے۔ (ملازم سے) باہر سے سگریٹ کی ڈبیہ لے آؤ۔

(سرفراز بکس کھولتا ہے جو تاش کے پتوں سے بھرا ہے۔ ایک گڈی باہر نکالتا ہے)

سرفراز: یہ تاش کے پتے نہیں، یہ میری خوبصورت جل پریاں ہیں، میری ننھی اڑتی خوش رنگ تتلیاں! (پتہ کی پشت پہ بنے ہوئے ڈیزائن دیکھ کر) ان میں بیک وقت کتنی یکسانیت، کتنا اختلاف ہے؟ ان سبھوں پر مجھے کتنا وقت صرف کرنا پڑا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔ (ایک پتہ کو چٹاخ سے چومتا ہے) میری معجزہ دکھانے والی تتلی! میری پیاری گوہر جان! پھر اسی طرح تین لاکھ کی چوتھائی لا کر دکھا دو جس طرح تم نے اس احمق کرنل سے دلوا دیے تھے۔ پھر میں تمہارا کانسی کا مجسمہ بنا کر چوک میں کھڑا نہ کرا دوں تو میرا نام سرفراز بیرزا نہیں۔ (باہر سے کچھ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ سرفراز جلدی سے سوٹ کیس کو بند کر دیتا ہے۔ بڑے میاں اور الیاس صابن، تولیہ، اور تسلہ لئے ہوئے اندر آتے ہیں)

سرفراز: کیوں الیاس، تمام لوگ اپنے کمروں میں ہیں یا باہر گئے ہوئے ہیں؟

الیاس: وہ لوگ ڈائننگ ہال میں بیٹھے ہیں۔

سرفراز: اچھا میں پھر ایک نظر دیکھ آؤں

(اٹھ کر باہر چلا جاتا ہے)

الیاس: بڑے میاں، معلوم ہوتا ہے تمہارے صاحب بہت دور سے آ رہے ہیں

بڑے میاں: ہاں صاحب اپنی ریاست سے آ رہے ہیں۔

الیاس: ان کی کوئی بہت بڑی ریاست ہے؟

بڑے میاں: ہاں کھاتے پیتے آدمی ہیں۔ کپڑے پہنانے کے لئے الگ نوکر ہے۔ کھانا کھلانے کے لئے الگ۔ برتن اٹھانے کے لئے الگ۔ ہاتھ دھلانے کے لئے الگ۔

(دروازہ میں سے مظفر بیگ اور امتیاز علی بڑی احتیاط سے اندر جھانکتے ہیں)

امتیاز: (الیاس سے) الیاس، منیجر صاحب تمہیں نیچے بلا رہے ہیں۔

الیاس: اچھا صاحب (الیاس چلا جاتا ہے۔ امتیاز اور مظفر سرگوشی کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں)

امتیاز علی: کیوں بڑے میاں، تمہارے صاحب کہاں سے آئے ہیں؟

بڑے میاں: اپنی ریاست سے تشریف لائے ہیں جناب!

امتیاز: ان کی کوئی بہت بڑی ریاست ہے؟

بڑے میاں: جی ہاں۔

مظفر: تاش واش سے بھی شوق رکھتے ہیں؟

بڑے میاں: جی ہاں، کبھی کبھار کھیل لیتے ہیں۔

امتیاز: پانچ روپیہ کا نوٹ نکال کر۔ یہ لو اپنا انعام، اچھا اب بتاؤ کہ—

مظفر: پہلے وعدہ کرو کہ اس کا ذکر اپنے صاحب سے نہ کرو گے۔

بڑے میاں: آپ بے فکر رہیں۔

امتیاز: ہاں تو یہ بتاؤ کہ تاش کے کھیل میں وہ کچے ہیں یا گھاگ قسم کے کھلاڑی۔

بڑے میاں: وہ تو بڑے ماہر ہیں اس میں۔ کچھ روز ہوئے ایک کرنل صاحب سے ایک ہی نشست میں ۷۵ ہزار جیت لئے!

امتیاز: ہوں، پچھتر ہزار، بڑے میاں، تمہارے صاحب تنہا ہوتے ہیں تو کیا کیا کرتے ہیں؟

بڑے میاں: (سر کھجا کر) کیا کرتے ہیں؟ صاحب وہ بڑے آدمی ہیں۔ بڑے آدمی کیا کریں گے۔

مظفر: میرا تو خیال ہے یہ بڑے میاں غلط بیانی کر رہے ہیں۔

امتیاز: دیکھو بڑے میاں ہم سے چار سو بیس نہ کرو۔ وہ تنہائی میں یقیناً تاش کی گڈیوں سے کھیلتے ہیں۔

بڑے میاں: جی.... یہ تو نہیں جانتا.... حال ہی میں ان کے ہاں ملازم ہوا ہوں۔

مظفر: (امتیاز سے) بہر حال آسامی بڑی معلوم ہوتی ہے (دونوں دروازہ کی طرف واپس جاتے ہیں) (باہر جاتے ہوئے) کوشش کر دیکھتے ہیں کوئی ہرج نہیں۔ (بڑے میاں کڑکتے ہوئے نوٹ کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیتے ہیں اور مسکراتے ہیں۔ اتنے میں سرفراز واپس آتا ہے)

سرفراز: لگتے تو سب پھکڑ ہیں، مگر کیا پتہ اسی گودڑ میں کوئی لعل چھپا ہو۔

(آئینے کے سامنے بیٹھ کر شیو بنانے لگتا ہے اور بیچ بیچ میں مسکراتا بھی جاتا ہے)

الیاس: (اندر آ کر) صاحب آپ کا کھانا لاؤں؟

سرفراز: ہاں بیرا، اور دیکھو ہمارے بڑے میاں کو بھی ذرا پر تکلف قسم کا کھانا کھلاؤ۔

الیاس: بڑے میاں آپ چل کر نیچے ہی کھا لیں۔

سرفراز: ہاں بڑے میاں تم نیچے ہی چلے جاؤ۔ الیاس ابھی جاتا ہے (بڑے میاں چلے جاتے ہیں) اچھا یہ بتاؤ انہوں نے تمہیں کتنا ٹپ کیا ہے؟

الیاس: (مسکرا کر) بس یہی کوئی پانچ روپے دئے ہوں گے۔

سرفراز: میں تمہیں اس کا چار گنا دیتا ہوں۔ یہ لو پانچ پانچ کے پانچ نوٹ۔ تم نے کہا تھا وہ لوگ تاش دکان سے منگواتے ہیں۔ یہ لو تاش کی ایک درجن گڈیاں۔ لو یہ خاص قسم کے تاش ہیں۔

الیاس: جی ہاں، مجھ پر بھروسہ رکھئے! (چلا جاتا ہے، تھوڑی دیر بعد امتیاز مظفر، اور عباس اندر داخل ہوتے ہیں)

سرفراز: آئیے آئیے تشریف لائیے۔ یہ کرم اور آپ جیسے بزرگ!

امتیاز: آپ تکلف میں نہ پڑیں۔ ہمیں تو آپ سے ملنے کا شوق کھینچ لایا۔

سرفراز: دل را بہ دل رہے است۔

عباس: بھئی ان لوگوں سے پوچھئے ہم نے تو ایک بار کسی کی رفاقت کا دم بھر لیا تو بھر لیا۔

امتیاز: بھئی، دوستی کے متعلق آپ کا یہ نظریہ یگانہ ہے۔

سرفراز: اپنے دماغ کا قیمتی جوہر فن رفاقت پر صرف کرنے کے بجائے اسے تاش جیسے اعلیٰ فن پر لگایا جائے تو کیسا رہے؟ الیاس جاؤ، بھاگ کر کسی دکان سے تاش لے آؤ۔ اور ہاں لیجئے، اتنے کچھ شوق فرمائیے۔ (اٹیچی کیس سے بوتل اور چار گلاس نکال کر میز پر رکھتا ہے)۔

امتیاز: واہ! ہم تو ایسی صحبت کے لئے ترس گئے تھے۔

سرفراز: عمدہ شراب اور عمدہ تاش میری دو بڑی کمزوریاں ہیں۔

عباس: تاش تو خیر آپ کی بھی کمزوری ہے مظفر صاحب!

مظفر: ہاں بھئی۔ ہوتی تھی کبھی (سانس بھر کر) مگر اب وہ لوگ کہاں رہے جو میدان میں اتر آتے تھے تو جائداد، زمین، مکان کسی چیز کی پروا نہ کرتے۔

سرفراز: لو، الیاس آ گیا، آئیے پھر ہو جائیں دو دو ہاتھ!

مظفر: ہو جائیں۔ (میز پر سے گڈی اٹھا کر پھینٹنا شروع کر دیتا ہے) لیجئے مرزا صاحب کاٹئے! (پتے تقسیم ہوتے ہیں اور سرفراز ایک ہی بازی میں پانچ سو روپے بٹور لیتا ہے)

امتیاز: مرزا صاحب کے ہاتھوں میں تو کوئی موہنی معلوم ہوتی ہے۔ ہم انہیں استاد مان گئے۔ میری ایک تجویز ہے۔ آپ ہم تینوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں اس لئے ہم آپ کو حصہ دار بنانے کو تیار ہیں۔

عباس: ہماری ایک جماعت ہے جو بھولے بھالے رئیسوں سے جنہیں روپیہ خرچ کرنے کی کوئی تدبیر نہیں سوجھتی، ان کی جیبوں پر ہاتھ صاف کرتی ہے۔

امتیاز: آپ اس جماعت کے امیر بن جائیں تو مہینوں کا کام ہفتہ عشرہ میں ہو جائے۔

سرفراز: میرا حصہ کیا ہوا کرے گا؟

عباس: پچاس فی صدی۔ اور بزنس لانا ہمارا ذمہ۔

سرفراز: تو پھر مجھے منظور ہے۔ لائیے میں آپ کو چند کرتب بتاؤں۔ (بغیر دیکھے کئی پتے شناخت کر کے دکھاتا ہے) یہ گڈی دیکھئے۔ میں نے اس کا نام گوہر جان رکھا ہے۔ لیجئے میں ان سے آپ کا تعارف کرا دوں (پتے کو منہ سے چوم کر) میری پیاری گوہر جان۔ یہ میرے نئے دوست ہیں۔

مظفر: گوہر جان، آپ سے مل کر خوشی ہوئی (سب لوگ ہنستے ہیں)۔

امتیاز: کیا بات ہے!

عباس: اس کی پشت پر کوئی خفیہ نشان نہیں آپ پھر بھی پتے کو شناخت کر لیتے ہیں۔ کمال ہے مرزا صاحب۔ خوب سدھا رکھا ہے آپ نے گوہر جان کو۔

امتیاز: مرزا صاحب کی اس کار خیر میں شمولیت پر کیوں نہ ہم منہ میٹھا کریں؟ الیاس!

سرفراز: نہیں آپ کو آرڈر نہیں دینے دوں گا۔ آپ مہمان ہیں (الیاس داخل ہوتا ہے) الیاس جا کر بازار سے کچھ مٹھائی اور پھولوں کے ہار لے آؤ۔

امتیاز: افسوس ہے اس وقت ہم چار اول درجہ کے ماہر بیٹھے ہیں اور کوئی نہیں! اپنا فن آزمائیں۔

عباس: کیوں بیگ صاحب، آپ کی نگاہ میں ہے کوئی آسامی؟

مظفر: میں کچھ ٹھیک کہہ نہیں سکتا ——

امتیاز: میں سمجھ گیا بیگ صاحب کی نظر کس پر ہو سکتی ہے۔

سرفراز: (اشتیاق سے) مجھے بھی تو بتلائیے، ایسا کون نیک بخت ہے۔

امتیاز: اس ہوٹل میں ایک نواب صاحب قیام فرما ہیں۔ لیکن بد قسمتی سے تاش کھیلنا تو کجا پتوں کو ہاتھ لگانا بھی حرام سمجھتے ہیں۔

سرفراز: (آگے بڑھ کر) ایسے کو تو ضرور پھانسنا چاہئے۔

امتیاز: بیگ صاحب، آپ اس کو کسی طرح کھینچ لائیے۔ شاید مرزا صاحب کی کوئی تکڑم لڑ جائے۔

سرفراز: دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ ویسے میرا ہاتھ آج کھجلا رہا ہے۔

امتیاز:۔ معلوم ہوتا ہے عرصہ سے خالی رہا ہے۔

سرفراز: توبہ کیجئے ابھی ہفتہ ہوا پورے خزانہ پر ہاتھ مار بیٹھا۔ پچھتر ہزار روپے۔

عباس: ہیں! ایسا کون آ پھنسا؟

سرفراز: ایک کرنل تھا۔ میری گوہر کے سامنے پالتو کتے کی طرح لیٹ گیا۔ یہی ان حضرت کو بھی رام کرلے گی۔ جب وہ یہاں تشریف لائیں تو ہم کھیل میں مصروف ہوں۔ اس کا ان پر کچھ نفسیاتی اثر پڑے گا۔ (تھوڑی دیر بعد مظفر نواب صاحب کے ساتھ اندر داخل ہوتا ہے جو شکل سے ہی گھسے ہوئے آدمی معلوم ہوتے ہیں)۔

مظفر: مرزا صاحب! قبلہ نواب صاحب سے ملئے۔ بڑے باغ و بہار آدمی ہیں۔

سرفراز: (اٹھ کر میزبان کی حیثیت سے) تشریف لائیے قبلہ۔ آپ نے اس ناچیز کو بے حد عزت بخشی۔

نواب: عزت تو آپ نے مجھے بخشی۔ البتہ مجھے افسوس ہے کہ عین روانگی کے وقت آپ سے ملاقات ہوئی۔

سرفراز: (کرسی بڑھاتے ہوئے) تشریف تو رکھئے (دوسرے لوگ آہستہ لہجہ میں باتیں کر رہے ہیں)

نواب: اُف! میں تو اس شہر میں رہ رہ کر اکتا گیا۔

سرفراز: کسی کاروباری سلسلے میں یہاں آنا ہوا؟

نواب: جی نہیں۔ بچی کے جہیز کے سلسلے میں خرید و فروخت کرنے آگیا تھا۔

سرفراز: کچھ فروخت کا سلسلہ بھی تھا!

نواب: جی ہاں اپنی زمین کے کچھ حصے فروخت کرنے تھے۔

سرفراز: صاحب یہ تو بڑا کٹھن کام ہے۔ بڑی بڑی قباحتیں پیش آتی ہیں۔

نواب: جی ہاں سارا مہینہ صرف ہو گیا۔ رجسٹری ہو چکی ہے، اب روپئے ملنے باقی ہیں۔

سرفراز: شوق سے کوئی کب اپنی چیز بیچتا ہے نواب صاحب۔ ویسے کیا قیمت ملی؟

نواب: یہی کوئی ڈیڑھ لاکھ۔ افسوس ہے اتنی معمولی سی رقم کے انتظار میں پورا مہینہ گذر گیا۔ اب تو یہاں نہیں ٹھہرنے کا، اسی گاڑی سے واپس گھر جا رہا ہوں۔

سرفراز: لیکن روپیہ وصول کئے بغیر ہی آپ چلے جائیں گے؟

نواب: بھئی مرزا صاحب، بھلا محلوں کا عادی انسان جس کے اندگرد بیسیوں نوکر چاکر ہوں، مصاحبوں کی پُر لطف گفتگو اور شطرنج کی بساط — اس چھوٹے سے کمرے میں کیسے بند رہ سکتا ہے؛ ویسے میں اپنے پیچھے اپنے لڑکے کو چھوڑے جا رہا ہوں۔

سرفراز: ہاں۔ ہاں پھر تو دوسری بات ہے۔

نواب: یہ روز روز کچہری کی قدمبوسیاں مجھ سے نہیں ہوتیں (دوسروں سے) آپ حضرات کیا تاش کھیل رہے ہیں؟

عباس: جی نہیں بس یونہی وقت گذارنے کے لئے ذرا ——

نواب: کوئی بازی کا کھیل تو نہیں ——

امتیاز: بس تفریحاً چار آٹھ آنے لگا دیتے ہیں — اس سے بازی مراد نہیں کیوں نواب صاحب اس میں تو کوئی عیب نہیں؟

نواب: بھئی میں اس کا کیا جواب دوں؟ آپ ٹھہرئیے نوجوان لوگ، میری باتوں کو آپ دقیانوسی سمجھیں گے۔ شروع شروع میں لوگ محض تفریح کی خاطر ہی کھیلتے ہیں مگر یہ کافر آگے چل کر ملت بن کر چپک جاتی ہے۔

(الیاس مٹھائیاں اور تحفے لاکر میز پر رکھ دیتا ہے)

الیاس: نواب صاحب گاڑی کا وقت ہو گیا ٹیکسی نیچے کھڑی ہے۔

نواب: ٹیکسی آگئی! اچھا مرزا صاحب! میں ایک لمحہ کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ (لپک کر باہر نکل جاتا ہے)

امتیاز: دیکھا مرزا جی؛ میں نہ کہتا تھا یہ نواب پٹھے پر ہاتھ نہیں دھرنے دیتا۔

سرفراز: بڑا کائیاں معلوم ہوتا ہے۔ افسوس کہ مجھے زیادہ وقت نہ ملا ورنہ ایسا شیشے میں اتارتا کہ ——

عباس: گھبرائیے نہیں۔ ابھی موقع ہاتھ سے نہیں گیا۔ (نواب پھر لپک کر اندر آتا ہے)

نواب: — اچھا بھئی مرزا صاحب، آپ سے بڑی مختصر ملاقات رہی۔ آپ کی صحبت سے محروم ہونے کا بڑا قلق ہوگا۔ (بیگ سے) اچھا مظفر صاحب آپ نے میرے دورانِ قیام میں میری بڑی دلجوئی فرمائی ہے۔ میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟

مظفر: کیوں شرمندہ کرتے ہیں قبلہ؟ ممنون تو میں ہوں آپ کا کس مروت سے پیش آئے ہیں آپ؟

نواب: معاف کیجئے گا بیگ صاحب میں چلتے چلتے ایک درخواست کرنے حاضر ہوا تھا۔

مظفر: ارشاد کیجئے، میں خادم ہوں۔

نواب: میں اپنے لڑکے افتخار احمد کو یہاں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ویسے تو مجھے

اس بچہ پر ہر طرح سے بھروسہ ہے مگر ـــ

مظفر: آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کا خیال رکھوں۔ یہی نا؟ اس سے بڑی سعادت میرے لئے اور کیا ہوگی۔ آپ مطمئن رہئے، مجھے بھائی کے برابر ـ

نواب: ابھی بچہ ہے اور یہ شہر خطرناک ہے۔ آپ اسے اپنی نگرانی میں رکھیں گے تو مجھے پوری طرح اطمینان رہے گا۔

مظفر: آپ بالکل تردد نہ کیجئے قبلہ۔

نواب: شکریہ شکریہ خدا حافظ!

مظفر: آیئے ٹیکسی تک تو آپ کو چھوڑ آؤں (دونوں چلے جاتے ہیں)

سرفراز: (سانس بھر کر) سونے کی چڑیا تھی جو اڑ گئی!

امتیاز: کاش ہمارا تیر نشانہ پر بیٹھ جاتا!

سرفراز: ڈیڑھ لاکھ روپئے! یہ رقم سن کر تو میرے کلیجے پر چھری چل گئی۔

عباس: اگر ہم یہ رقم اینٹھ سکیں تو ۵۰ ہزار آپکے اور باقی پچیس پچیس ہزار ہمارے ہو جائیں۔

مظفر: (بھاگا ہوا آتا ہے) یارو! اب تو پو بارہ ہے۔ نواب گیا اب رہ گیا اس کا لونڈا اور اس کی پاور آف اٹرنی۔ اور پھر لونڈا بھی کیسا؟ جسے فلم ایکٹر بننے کی دھن ہے۔

سرفراز: وہ لونڈا سونے کی چڑیا ہے بھائی۔

امتیاز: اور پھر تمہارے فلمی تجربے میں یہی تو لطف ہے ڈھانا آیا ہوں کہ تمہیں تو گیتا بالی کے ساتھ پردہ سیمیں پر ڈوئٹ گاتے ہوئے نظر آنا چاہئے۔ اسے لے کر ابھی آتا ہوں۔

سرفراز: پردہ سیمیں پر تو بعد میں نظر آئے گا، پہلے اسے اپنے سیلولائڈ پر اتاروں۔

امتیاز: لیجئے مرزا صاحب، بزنس تو ہم نے لا دیا، اب جب جھاڑنا آپ کا کام۔

مظفر: (شاداں و فرحاں) یہی مرزا صاحب ہیں ہمارے چھوٹے نواب صاحب!

(تمام لوگ بیک وقت خوش آمدید کہتے ہیں)

اب آپ ہی انصاف سے بتلایئے کہ یہ نوجوان جو عہد حاضر کا سب سے بڑا ہیرو بن سکتا ہے۔ اس کے والد کس بے دردی سے اس کی صلاحیت کو تباہ کر رہے ہیں؟

سرفراز: نواب صاحب کیا پئیں گے؟

امتیاز: خاندانی نواب ہیں۔ شامپین سے کم کیا بات کریں گے۔

چھوٹے نواب: جی ــــ شام ــ پین؟ ــ میں ــ میں.....

سرفراز: تکلف نہ فرمایئے۔ یہ آپ کا گھر ہے۔ ہاں تو آپ نے فلمی کیریر اختیار کرنے میں اتنی دیر کیوں کر دی؟ اس وقت ملک میں کوئی خاص ہیرو نظر نہیں آتا۔ آپ کو تو ہالی وڈ میں ہونا چاہئے تھا۔

چھوٹے نواب: میرا بھی یہی خیال تھا مگر شاید قبلہ والد صاحب ـــ

عباس: یہ تو فلمی صنعت پر سب سے بڑا ظلم ہوگا۔

سرفراز: (تمام گلاسوں میں شامپین انڈیل کر) چھوٹے نواب صاحب کا جام صحت!

عباس: پردہ سیمیں پر عنقریب طوفان برپا کرنے والے ہیرو کے نام!

(سب چسکیاں لگاتے ہیں مگر چھوٹا نواب ایک ہی سانس میں گلاس ختم کر دیتا ہے)

سرفراز: شامپین کے معاملے میں تو نواب صاحب بڑے تیز معلوم ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تاش میں کتنی مہارت رکھتے ہیں۔ کیوں نواب صاحب اس فن لطیف کے متعلق کیا خیال ہے؟

نواب: خیال تو نیک ہے مگر اس وقت میرے پاس روپے نہیں ہیں۔

امتیاز: لیجئے اتنی معمولی سی بات۔ آپ پہلے تھوڑا سا لگا کر دیکھئے جیتنے کے بعد پھر آگے کھیلئے۔

نواب: میرے پاس تو بالکل کچھ نہیں، ابا جان جیب خرچ بھی تو بہت کم دیتے ہیں۔

عباس: آپ ناحق تردد فرماتے ہیں۔ جتنی رقم درکار ہو مجھ سے لیجئے۔ آپکے پاس والد کی پاور آف اٹرنی جو ہے، وہی بہت بڑی ضمانت ہے۔ خدانخواستہ ہار بھی جائیں تو یہی دے دیجئے گا۔ اور پھر آپ ہارنے کیوں لگے؟

نواب: (مشکوک انداز میں سوچتے ہوئے) اگر ہار گیا تو؟

سرفراز: گلاس تو ختم کیجئے حضور، (نواب گلاس اٹھا کر خالی کر دیتا ہے) اگر جی کھول کر کھیلیں گے تو ضرور جیتیں گے۔

نواب: (گلاس میں خود ہی شراب انڈیل کر چڑھا لیتا ہے) چلئے تو پھر شروع کیجئے۔

عباس: چلئے مرزا صاحب آپ کی چال ہے۔

سرفراز: (پتہ پھینکتا ہے) یہ لیجئے۔

نواب: بس؟ تو یہ لیجئے!

عباس: شاباش! میں نہ کہتا تھا تم جیتو گے۔ اور پانچ ہزار لگا دو (سرفراز پانچ ہزار کے نوٹ اس کی طرف بڑھاتا ہے۔ نواب نوٹوں کو بے نیازی سے ایک طرف کر کے سرفراز کے ہاتھ سے پتہ کاٹتا ہے۔ اور کھیل شروع ہوتا ہے)

نواب: (جوش میں) دس ہزار کی بازی ـــ (پتہ پھینکتا ہے)

امتیاز: نواب کو اب آیا ہے تاؤ۔ مگر ذرا بچ کے میری جان۔

سرفراز: (پتہ پھینک کر) لائیے دس ہزار ادھر۔

عباس: دس ہزار تو نواب کے پاس ہیں نہیں۔ پانچ ہزار لے لو۔ اور پانچ ہزار کی رسید لکھوا لو۔

نواب: لائیے کاغذ پنسل دیجئے۔ یہ لیجئے بیس ہزار کی رسید (پندرہ ہزار ادا کردیجئے)

سرفراز: (بکس میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر لاتا ہے اور اس کے حوالے کرتا ہے) چلئے نواب صاحب، ابکے کتنے کی بازی؟

نواب: پندرہ ہزار کی۔

امتیاز: خدا کی قسم مرزا صاحب، آپ لُٹ جائیں گے۔ نواب نے بڑی ظالم قسمت پائی ہے۔

سرفراز: آپ غم نہ کریں۔ (پتہ بڑھا کر) کاٹئے نواب صاحب (نواب کاٹتا ہے) پتے چلے جاتے ہیں اور نواب یہ بازی بھی ہار جاتا ہے)۔

عباس: اماں کس کا منہ دیکھا تھا نواب؟

مظفر: ظاہر ہے ابا جان کا ہی منہ دیکھا ہوگا۔

نواب: (طیش میں) مجھے بیس ہزار اور دیجئے۔

سرفراز: ضرور لیجئے — مگر — رسید!

نواب: (جلدی سے رسید لکھ کر) ابکے پھر بیس ہزار کی بازی ہو (پتے تقسیم ہوتے ہیں اور پھر تھوڑی دیر میں نواب کے بیس ہزار، سرفراز ہتھیا لیتا ہے)

عباس: نواب کی قسمت روٹھی ہوئی معلوم ہوتی ہے، نصیب دشمناں!

نواب: (تھوڑی سی شراب اور انڈیل کر غٹ غٹ پی جاتا ہے) چالیس ہزار کی ایک بازی اور — (سرفراز پھر اسی طرح رسید لکھواتا ہے اور رقم حوالہ کرتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ رقم بھی نواب ہار جاتا ہے) (اچھل کر) اسّی ہزار روپے! خدایا، تم لٹیرے ہو، تم — (اٹھ کر کمرے سے باہر بھاگتا ہے)

مظفر: (اس کے پیچھے بھاگتا ہوا) اماں سنو تو، افتخار — ! (باہر چلا جاتا ہے)

سرفراز: اگر یہ قابو سے باہر ہوا تو بڑی خرابی ہوگی۔ پاور آف اٹرنی بھی اسی کے پاس ہے۔ کہیں غائب . . . . .

امتیاز: غائب کیسے ہو جائے گا۔ مظفر کوئی کچی گولیاں کھیلے ہوئے تھوڑی ہے۔

(مظفر بیگ نواب کو پکڑے ہوئے آتے ہیں)

مظفر: اگر یہی حال رہا تو بن چکے تم فلم ایکٹر۔

نواب: میں آپ سب لوگوں سے معافی چاہتا ہوں۔

امتیاز: ابھی سے ہمت ہارنے لگے تو آگے بڑھنے میں سخت دشواری ہوگی۔

مظفر: خیر اب جو ہوا سو ہوا۔ نواب صاحب اب طریقہ سے کھیلیں گے۔

نواب: ہاں۔ اب کے میں دستاویز کی باقی رقم بھی لگا دیتا ہوں۔

سرفراز: یعنی باقی ستر ہزار بھی؟

نواب: ہاں —

امتیاز: مرزا صاحب، بچے کے لب خشک ہو رہے ہیں۔ شامپین تو دیں۔

سرفراز: لیجئے لیجئے۔ تو اب بازی پھر شروع ہوتی ہے مگر — ایک منٹ نواب صاحب وہ پاور آف اٹرنی تو دیجئے ادھر!

نواب: معلوم ہوتا ہے آپ کو اعتبار نہیں۔ (غصّہ سے دستاویز کو جیب سے نکال کر میز پر پھینک دیتا ہے)۔

سرفراز: عباس صاحب اسے آپ رکھ لیجئے (کھیل پھر سے شروع ہوتا ہے اور کچھ دیر بعد پھر نواب ہار جاتا ہے)

نواب: شاید یہ سب میں خواب میں کر رہا ہوں۔ ڈیڑھ لاکھ روپے!

سرفراز: (روپوں کو سمیٹ کر واپس بکس میں رکھ دیتا ہے) میرا خیال ہے اب نواب صاحب کو جا کر آرام کرنا چاہئے۔ کافی تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

نواب: میں نشہ میں نہیں ہوں۔ میں صرف خواب دیکھ رہا ہوں۔

سرفراز: تو پھر جا کر آپ سو رہیں نواب صاحب۔

عباس: فی الحال آپ دو سو روپے اپنے خرچ کے لئے رکھیں (روپے بڑھاتا ہے) آیئے میں آپ کو کمرے میں لے چلتا ہوں۔ (لوگ اسے سہارا دے کر اٹھاتے ہیں اور عباس بیگ اسے باہر لے جاتا ہے)۔

مظفر: دراصل پے درپے ہارنے سے لڑکے کا دماغی توازن قائم نہ رہا۔ سونے سے طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔

سرفراز: ہمیں اس لونڈے کو اس وقت تک اپنے قابو میں رکھنا چاہئے جب تک ساری رقم وصول نہیں ہو جاتی۔

امتیاز: مجھے ڈر ہے کہ رجسٹری آفس والے پیسے دینے میں کوئی بیچ نہ لگا دیں۔

مظفر: اماں کیا باتیں کرتے ہو، ذرا ان کی مٹھی گرم کیجئے اور منٹوں میں کام ختم۔

(دروازہ کھلتا ہے اور رجسٹری آفس کا ایک کلرک اندر داخل ہوتا ہے)

کلرک: نواب وجاہت مرزا تو یہاں نہیں؟

سرفراز: کیوں؟ کیا بات ہے؟

کلرک: میں رجسٹری آفس سے آیا ہوں، ان کے روپے کے متعلق کچھ بات کرنی ہے۔

مظفر: اب وہ باتیں آپ ہم سے کر سکتے ہیں کیونکہ ان کی پاور آف اٹرنی ہمارے

پاس ہے۔

کلرک: بہت بہتر۔ تو آپ ستائیس تاریخ کو دفتر سے رقم وصول کر سکتے ہیں۔

سرفراز: یعنی آج سے ایک ہفتہ بعد؟ آج سات تاریخ ہے نا؟

کلرک: جی ہاں۔

سرفراز: آپ پہلے نہیں دلوا سکتے؟

کلرک: جی مشکل ہے

سرفراز: ہم آپ کی خدمت کر دیں گے۔ یہ کام ذرا جلدی کرا دیجئے۔

کلرک: کتنی جلدی؟

سرفراز: اگر کل صبح ہو جائے۔

کلرک: لیکن اس کے لئے مجھے اپنے افسروں سے درخواست کرنی ہوگی اور وہ پہلے ہی نواب صاحب سے چڑے ہوئے ہیں۔

سرفراز: نواب تو کنجوس آدمی تھا۔ (سو کا ایک نوٹ اس کے حوالہ کرتا ہے) فی الحال آپ یہ رکھئے اور باقی آپ جو فرمائیں گے وہ میں کل افسروں کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ مگر یہ کام کل ہی ہونا چاہیئے

کلرک: آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کے اخلاق نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں آپ کو کل ہی رقم ادا کرا دوں۔ مگر....

عباس: فکر نہ کیجئے، دو سو آپ کو مزید کل دے دوں گا۔

کلرک: بس ٹھیک ہے (اٹھتا ہوا) تو پھر مجھے اجازت ہے؟

سرفراز: (اٹھ کر) کچھ نوش نہیں فرمائیں گے۔

کلرک: جی نہیں شکریہ۔ میں ڈیوٹی پر ہوں۔ اچھا خدا حافظ (چلا جاتا ہے)

مظفر: شکریہ!

امتیاز: جیسے بے سدھ ہو کر کرسی پر گر پڑتا ہے) ہمارا پروگرام چوپٹ ہو کر رہ گیا۔ اب کل تک کون انتظار کرے گا؟

سرفراز: اور صورت بھی کیا ہے۔ لیکن پروگرام کون سا چوپٹ ہو کر رہ گیا؟

مظفر: میرے ایک ایجنٹ نے کراچی میں کوئی تین لاکھ کا بزنس ٹھیک کیا ہے۔ کوئی سیٹھ ہے، اسے اس نے پھانسا ہے۔ آج اس کا تار آیا ہے کہ میں سب لوگوں کے ہمراہ آج شام کی گاڑی سے پہنچ جاؤں پرسوں وہ امریکہ جا رہا ہے۔ اگر ہم وقت پر نہ پہنچے تو سارے کئے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔

سرفراز: آپ کو یقین ہے یہ بزنس ہاتھ سے نہیں جائے گا؟

مظفر: ہم کوئی اناڑی ہیں جو ایسے موقع کو ہاتھ سے جانے دیں گے۔ اب چونکہ آپ ہماری جماعت میں شامل ہو چکے ہیں اسی لئے میں نے آپ کے سامنے یہ راز اگل دیا ہے۔ آپ کا پچاس فیصد حصہ اس میں ہر طرح رہیگا۔

سرفراز: یعنی خواہ میں آپ کے ساتھ ہوں یا نہ ہوں آپ مجھے میرا حصہ دیدیں گے؟

مظفر: غالباً یہ بات تو ہم نے شروع میں ہی واضح کر دی تھی۔

امتیاز: میرے خیال میں بہتر یہ ہوگا کہ ہم یہ دستاویز آپ کے پاس چھوڑ جائیں آپ ہمارا آدھا حصہ چاہیں تو ادا کر دیجئے اور کل ساری رقم رجسٹری آفس سے نکلوا لیجئے۔ اگر کل ۲ بجے تک رقم نکل آئی تو آپ ہوائی جہاز کے ذریعہ کل شام ہمارے پاس پہنچ سکتے ہیں۔ ہم وہاں، مائی ڈارلنگ ہوٹل، کمرہ ۵ میں ہوں گے۔

سرفراز: تو گویا میں ۵۰ ہزار کاٹ کے باقی ۵۰ ہزار آپ کو ادا کر دوں۔

امتیاز: جی ہاں ہم فی کس ۲۵ ہزار بانٹ لیں گے۔

سرفراز: تو پھر دستاویز میرے حوالہ کیجئے۔

امتیاز: (دستاویز بڑھا کر) یہ لیجئے۔

سرفراز: (دستاویز کو غور سے دیکھتا ہے) پھر تھوڑی دیر بعد اٹھ کر بکس سے نوٹوں کی گڈیاں اٹھا لاتا ہے۔ یہ لیجئے۔ پورے پچاس ہزار ہیں، گن لیجئے!

مظفر: ہمیں آپ پر بھروسہ ہے۔ اب لائیے میں اس رقم کی آپ کو رسید دے دوں۔ خدا کا ہزار ہزار احسان ہے کہ ہماری آج کی روانگی کا انتظام ہو ہی گیا۔

سرفراز: اچھا تو پھر دیر نہ کیجئے۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہیئے۔

مظفر: آپ کل ہوائی جہاز سے ضرور پہنچ جائیے۔ اچھا خدا حافظ!

سرفراز: (اٹھ کر سب سے باری باری مصافحہ کرتا ہے) فی امان اللہ!

سرفراز: (آواز دے کر) بڑے میاں!

بڑے میاں: (اندر داخل ہوتے ہیں) جی صاحب!

سرفراز: بہت تھک گیا ہوں۔ چند گھنٹوں میں پچاس ہزار بنا لئے۔ اپنی بہترین دماغی قابلیت کے سبب وہ لفنگے جو ابھی چند گھنٹہ قبل میری کھال اتارنے آئے تھے میری بے پناہ قابلیت کے سامنے انہوں نے گھٹنے ٹیک دئے۔ وہ اب بھیڑ بکریوں کی طرح میرے آگے پیچھے پھرا کرینگے

(چھوٹے نواب لپک کر داخل ہوتے ہیں)

چھوٹے نواب: کہاں گئے سب؟

سرفراز: وہ لوگ اپنے کمرے میں سامان باندھ رہے ہیں۔

چھوٹے نواب: وہاں تو کوئی نہیں، کمرہ خالی پڑا ہوا ہے۔

سرفراز: یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ وہ تو ابھی یہاں سے نکلے ہیں۔

نواب: آپ نے انہیں اپنا روپیہ تو نہیں دے دیا؟

سرفراز: میں نے روپیہ تو انہیں ضرور دیا ہے مگر اس کے بدلے یہ ——

الیاس: کیوں صاحب، آپ مجھے ڈھونڈ رہے تھے؟

نواب: ہاں، وہ لوگ کہاں گئے؟

الیاس: وہ سب تو یہاں سے جا چکے۔

نواب: کہاں جا چکے۔

الیاس: انہوں نے کوئی چار گھنٹہ قبل ایک ٹیکسی منگوائی تھی۔ اسی میں ابھی ابھی سوار ہو کر چلے گئے۔

نواب: (متردد) ان کمبختوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا۔ اور ان میں آپ بھی شامل ہیں۔

سرفراز: تاہم دستاویز کی رقم مجھے ملے گی۔ یہ میرے قبضہ میں ہے۔ اب سب حقوق میرے ہیں۔

نواب: کون سے حقوق؟ کیسے حقوق! مجھے ان کو کچھ نہیں دینا۔ آپ کو اتنی عقل نہیں کہ وہ آپ کو احمق بنا کر یہاں سے غائب ہو گئے۔

سرفراز: آپ اپنے کمرہ میں جا کر آرام کریں، آپ ابھی تک نشہ میں ہیں۔

نواب: نشہ میں آپ ہیں میں نہیں ہوں۔

سرفراز: نواب صاحب عقل سے کام لیجئے۔

نواب: میں نواب کوئی نہیں۔ میرا نام عبدالصمد ہے اور میں اس ہوٹل کے سامنے سگریٹ پان بیچتا ہوں۔

سرفراز: یہ کیا بکواس ہے؟ تو وہ آپکے والد صاحب قبلہ یعنی بڑے نواب صاحب۔

نواب: وہ بُڈھا! ہونہہ، وہ مریل آدمی میرا باپ ہو سکتا ہے۔ کہاں کا نواب وہ تو انہی کا آدمی تھا۔

سرفراز: دیکھئے میاں صاحبزادے۔ اب مذاق ہو لیا میں اس طبیعت کا آدمی نہیں۔

نواب: مذاق؟ مجھے خود ان کم بختوں سے یہ لالچ دے کر اپنے ساتھ ملایا تھا۔ ۵ ہزار مجھے دیں گے، اور دیئے کل سو!

سرفراز: (طیش میں کھڑا ہو کر) یہ لایعنی بکواس بند کرو۔ تم یوں اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ یہ ہے تمہاری دستاویز۔ ابھی آدھ گھنٹہ پہلے رجسٹری آفس کا ایک کلرک آیا تھا اور اس سے میں کل صبح روپے لے رہا ہوں۔ ہونہہ! تم سمجھتے ہو میں بدھو ہوں؟

نواب: مولانا، وہ کلرک نہیں، ان کا ہی آدمی تھا۔ انہوں نے خود اُسے سکھا پڑھا کر بھیجا تھا۔

سرفراز: (دیوانگی میں اس کا گریبان پکڑ کر) چور، بدمعاش، میں تجھے ابھی تھانے لے جاتا ہوں (پکڑ کر دروازے کی طرف گھسیٹتا ہوا لے جاتا ہے) چل میرے ساتھ ابھی مزا چکھاتا ہوں۔ ایک ایک کو جیل کی ہوا کھلواتا ہوں۔

نواب: دیکھئے حضرت، آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ آپ کے پاس اول تو میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں۔ اور نہ آپ کو مجھے پکڑنے کا حق ہے۔

سرفراز: کوئی حق نہیں؟ تم اور تمہارے ساتھی میری ساری پونجی لوٹ کر لے گئے اور مجھے پکڑنے کا حق نہیں؟ چل میں تجھے شریف آدمیوں کو بیوقوف بنانے کا مزا چکھاتا ہوں۔

نواب: مرزا صاحب غالباً آپ بھول گئے کہ آپ ان بدمعاشوں کے ساتھ مل کر مجھے بیوقوف بنا رہے تھے۔ کیا آپ گرفت میں نہیں آتے؟ آپ بھی تو لوگوں کو لوٹتے ہیں۔ اگر اس کے بعد بھی آپ تھانہ چلنے پر مُصر ہیں تو بسم اللہ!

سرفراز: (سوچ کر) ٹھیک کہتے ہو۔

نواب: جب میں پولیس کے سامنے بیان دوں گا تو آپ کی پوزیشن کیا ہو گی؟

سرفراز: (کرسی پر گر پڑتا ہے) مجھ سے کچھ نہ کہو۔ میں تباہ ہو گیا۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔

نواب: (جاتے ہوئے تاش کے بکھرے ہوئے پتوں کی طرف دیکھ کر) گورنمنٹ سلامت رہے!

سرفراز: (غصے سے گڈیوں کو اس کی طرف پھینکتا ہوا) اپنی اس نادار کو بھی ساتھ لیتے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ! ——

(پردہ)

★

ماہِ نو، کراچی۔ مئی ۱۹۵۸ء

اوّلیں افسانہ:

"راہرو ہوگا...!"

فلاحت شریف

فائزہ جب اپنے مخصوص الطرز انداز میں قہقہے لگاتی تو سننے والے محسوس کرتے کہ کسی پہاڑ کے تمام جھرنے اٹھلاتے اٹھلاتے نغمہ ریز ہو گئے۔ اور کتنی نوجوان نظریں اس کی التفاتِ نگاہ کی متمنی ہو جاتیں۔ جوانی تو خیر سب پر ہی آتی ہے۔ لیکن اس کے ننھے سے نحیف جسم نے چند ہی دنوں میں کس بلا کا روپ دھارا تھا۔ شباب ومستی نے آنکھوں کے سرخ ڈوروں میں شراب علیں سمو دی تھی۔ نقشے کوئی ایسے بہت سبک بھی نہ تھے۔ در اصل اس کے حسین مچلتے اور کلبلاتے قہقہے زندگی وشباب کی اضطرابی کیفیتوں کو اپنے میں سموئے ہوئے تھے۔ اس طرح آغازِ شباب کی تمام رنگینیاں و رعنائیاں اس نازنین کے کمزور سے ڈھانچے میں ڈھلتی چلی گئیں۔ جوانی کا بھرپور ساغر ادائے غمزہ ناز سے چھلکنے کے لئے بیتاب رہتا!

لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنے افتاں وخیزاں حالات سے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ قدرت نے جتنی بھی نعمتیں اسے عطا کی تھیں وہ اس کے جذبۂ شوق کے لئے ناکافی تھیں۔ اس کے دل میں بھی تمنائیں بیدار ہوتیں اور تکمیلِ آرزو کے لئے مچلا کرتیں لیکن نصیبے کے تلخ جام اسے غٹاغٹ پی جانے پڑتے۔ کبھی بات بات پر مسکرا کر رہ جاتی۔ کبھی بُری طرح پھوٹ پڑتی اور کبھی ہنسی کے دوروں سے لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ بیحد عجیب وغریب اور بیک وقت گوناگوں متضاد کیفیتوں کے شکنجے میں جکڑی سی رہتی۔ بعض اوقات گھبرا کر اپنی بیزاریوں کو نازلی کے دل کے گہرے غاروں میں مدفون کرنے کی جابجا کوشش کرتی یا پھر وہ اکثر تنہائی میں اپنے خواب کے دھندلکوں کو میلے کچیلے آئینے کی طرح صاف کرنے کے لاکھ جتن کرتی اور اپنی آنکھیں زمین میں گاڑ کر تصورات میں غرق، تخیلات میں غلطاں و پیچاں حسن و ناز کے لاتعداد پیکر تشکیل کیا کرتی۔ اور پھر جب منزل کا اتا پتہ نہ ملتا تو وہیں پریشانی کے عالم میں کھڑی ہو جاتی۔ "اونھ! کیا مصیبت ہے۔ جب دیکھو کمبخت دماغ پر سوار خیالات کے ہنڈولوں میں خود بخود جھولتا رہتا ہے۔ بھلا میں کیوں اس کی پرواہ کرنے لگی۔" لیکن ہلکی سی سرگوشی میں عاصم کا نام لیتے ہی اس کی روح میں سنسنی سی پھیل جاتی۔ دل و دماغ پر کوئی چیز رینگتی ہوئی سی محسوس ہوتی۔ عاصم کا نام رگ وپے میں سرایت کرتا جارہا تھا۔ دل دھک دھک کرنے کے باوجود ایک کیفِ بیخودی میں کھو جاتا۔ وہ ہاتھ جھٹکتی، پاؤں پٹکتی کسی نہ کسی کام میں لگ جاتی اور یوں تھوڑا بہت دھیان بٹ جاتا۔

بستر پر دراز ایک شب، فائزہ بھولی بسری یادوں کے بکھرے ہوئے کھلونے چن چن کر سجا رہی تھی۔ ایک نامعلوم سی خلش رات کے سناٹے میں کروٹوں پہ کروٹیں بدلوا رہی تھی۔ فائزہ کی اس کرب واندوہ میں گھٹی گھٹی سسکیوں سے نازلی جو اس وقت اپنی کتابوں میں کھوئی ہوئی تھی یکدم چونک پڑی:

"ارے فزو! رو رہی ہو؟ کیوں خیر تو ہے؟ یہ بیٹھے بٹھائے کیا افتاد آن پڑی؟" نازلی نے اسے شفقت کے ساتھ سینے سے بھینچ کر کہا۔ فائزہ مسلسل ہچکیوں سے روتی رہی اور نازلی حیرت واستعجاب کی تصویر بنی اسے ٹک ٹک دیکھتی رہی۔ "یا اللہ! روئے ہی جاؤ گی؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔ اب ہم سے تمہارے اتنے نخرے نہیں سہے جاتے۔ جب دیکھو ٹسوے بہا رہی ہیں۔ بھلا اس طرح رونے سے کیا ہو سکتا ہے؟ ہنسنے پہ آتی ہو تو کھلکھلاتے چلی جاتی ہو۔ دیکھنے والے یقین نہیں کر سکتے کہ یہ کبھی روتی بھی ہوں گی؟"

"کچھ نہیں نازلی، ایسے ہی خیال آگیا تھا" اور آنسوؤں کی لڑیاں اس کے گندمی رخساروں پر بہہ نکلیں۔ دل کے کسی گوشے سے عاصم، جس نے کچھ ہی عرصہ پہلے اپنا بیاہ رچالیا تھا، جھانک جھانک کر جیسے فائزہ کا منہ چڑا رہا ہو۔ نازلی سوچتی رہ گئی، کیا عاصم کو فزو کی دلچسپی کا وہم وگمان بھی نہ ہو سکا!؟ ——— کتنی پگلی تھی اس کی چھوٹی سی بہن!!

نازلی اور فائزہ میں صرف سال بھر کا فرق تھا۔ اس معمولی فرق کی وجہ سے دونوں بہنوں میں بیحد محبت تھی۔ نازلی کا دولہا آیا اور اس کو بیاہ لے گیا۔ دولہا دلہن دونوں ملنے آتے اور ہنسی مذاق کے بعد اپنے گھر لوٹ جاتے لیکن نازلی کو فزو کی مایوسی سے بیحد دکھ ہوتا۔ اور وہ اسے ہر طرح سمجھانے کی کوشش کرتی ——— ایک دن اسی ارادے سے وہ فائزہ کے پاس پہنچی:

"میں کہتی ہوں چھوڑ دو یہ سب نخرے۔ شادی کرو۔ گھر بساؤ۔ یہ کیا کہ بیگم ہنستی ہیں تو ہنستی ہی چلی جاتی ہیں۔ رونے پر آتی ہیں تو چپ ہی نہیں ہوتیں۔ میں پوچھتی ہوں یہ ڈھنگ کہاں سے سیکھ لیا آپ نے؟ اور آخر یوں کب تک مجھے اور امی کو تنگ کرتی رہو گی؟"

نازلی ایک سانس میں سب کچھ کہتے کہتے ہانپ گئی اور مجسم سوال بن کر اس کو دیکھنے لگی۔ فرزو اس کے اس بے تکے پن پر صرف زیر لب مسکرا دی: "واللہ کیا کہنے آپ کی شانِ استغنا کے۔ دل چاہتا ہے کہ تمہیں جھنجھوڑ کر رکھ دوں۔" وہ لپک کر سامنے آکھڑی ہوئی اور سچ مچ اس نے فائزہ کو جھنجھوڑ ہی ڈالا: "آخر جواب تو دو۔ میں کیا باؤلی ہوں کہ بھونکے چلی جا رہی ہوں اور تمہارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی!" لہجہ درشت ضرور تھا مگر نگاہیں والہانہ محبت کی غمازی کر رہی تھیں۔ "کیوں کیا شادی میں بہت راحت ملتی ہے؟" فائزہ نے ارمان کی سلگتی ہوئی چنگاریوں کو گفتگو کی ملائمت سے دبانا چاہا۔ "سچ فرزو! بس تمہاری تنہا زندگی سے تھک گئی ہوں۔ میرا دل کتنا چاہتا ہے کہ تمہارا اپنا گھر ہو، جہاں تم خوش و خرم رہ سکو۔ تمہاری خوشی سے ہمیں قلبی و ذہنی سکون مل جائیگا۔"

نازلی نے سنجیدگی سے کہا۔ "تو یوں کہو میری شادی میں اپنا فائدہ مدنظر ہے۔" وہ بھی بظاہر سنجیدہ ہو کر بولی۔ "بیوقوف نہ بنو۔ جب زبان کھولتی ہو تو الٹی سیدھی نہیں کرتی ہو۔ میں تو تمہیں دلہن بنی ہوئی دیکھنا چاہتی ہوں۔" نازلی کے محبت بھرے احساسات جیسے زخمی ہو گئے۔ "جی تو میرا بھی چاہتا ہے نازلی! لیکن۔!" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ نگاہیں دلی اذیت کی چغلی کھا رہی تھیں۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ اس کی آنکھوں میں دو تڑپتے ہوئے آنسو ابھر کر پھیل گئے۔ یونہی اس کے ارمان بھی واقعات کی بیدرد وسعتوں میں نہ جانے کتنی بار کھو چکے تھے۔

اس سے پہلے فرزو کے بہت رشتے آئے۔ اچھے اچھے رشتے! لیکن وہ تعلیم کے جنجال میں پھنسی ہوئی تھی۔ اس لئے سب کے سب رد کر دیئے گئے۔ اب کیفیت تھی کہ رشتے تو بہت آتے مگر پسند نہ آتے یا جہاں کوئی پسند آتا وہاں سرے سے کوئی سلسلہ ہی نہ اٹھایا جاتا یعنی بس التوا ہی التوا۔ "لیکن لیا؟" نازلی نے بےچین ہو کر پوچھا۔ "لیکن ویکن کچھ بھی نہیں۔ چھوڑو اس فرسودہ موضوع کو، تم بتاؤ تمہارے میاں کیسے ہیں؟ حضرت نے آج تمہیں کیونکر اکیلے بھیج دیا؟" فائزہ نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "لو میرے میاں کا قصہ لے بیٹھیں۔ یہ تم بات کہتے کہتے ٹال کیوں گئیں؟" اس نے مزید اصرار کیا۔ "تم تو ایک بات کے پیچھے پڑ جاتی ہو، بڑی ہی ضدن ہو۔" فائزہ نے ہنستے ہوئے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ "نہیں فرزو! مجھے یوں بہلانے کی کوئی کوشش نہ کرو میں ایسے ہتھکنڈوں میں آنے سے رہی!" یہ کہتے ہوئے نازلی علیحدہ ہو گئی۔ "ارے خفا کیوں ہوئے جاتی ہو؟ بھلا کونسا جوان دل گھر بسانے کے لئے نہیں تڑپتا۔ تم بھی تو عجب عجب سوال کر کے خواہ مخواہ پریشان کرتی ہو۔ ایسے سوالوں کا جواب دیتے دیتے آنکھوں کی حیا ڈھل گئی تو کہیں کی بھی نہ رہوں گی۔ منہ پکا ہو جانے کا، بگلی!" فائزہ منانے کے سو سو ڈھنگ کرنے لگی۔ "مذاق ایک طرف، اصل واقعہ بیان کرو۔" نازلی بھی اڑیل ٹٹو کی طرح اڑ گئی۔

"اچھا سنو، وہ خالہ اماں ہیں نا! ان کے دیور کے سالے آجکل یہاں ٹریننگ کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ یونہی دو چار مرتبہ ان کی میری سرسری سی ملاقات ہوئی۔ اکبر نام ہے۔ اچھے خاصے ہیں۔ مجھے پسند بھی ہیں۔" اس نے کہنا شروع کیا۔ "تو پھر دیر کاہے کی۔ کوئی تعویذ گنڈہ کروں اس پر؟" نازلی خوشی سے سرشار ہو کر بولی۔ "تم بھی بڑی سیمابِ رفتار ہو۔" فائزہ نے ہنسی میں دبے ہوئے جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر بات کہاں تک بڑھی؟ جلدی جلدی بتاؤ۔" وہ بے صبری میں ہکلانے سی لگی۔ "پھر وہی، تم اطمینان سے سنتی تو جاؤ۔ خیر صاحب، پرسوں ہمیں خالہ اماں نے پکنک کو بلا بھیجا۔ ہم نے بھی سوچا لڑکا پسند ہے، بات بن جائے تو اچھا ہے۔" نازلی کے لہجے میں ایک غم آگیں سکون و اطمینان تھا: "پھر کچھ بنا بنایا بھی۔۔۔؟" فائزہ نتیجہ سننے کے لئے سخت بےچین تھی۔ "تم تو بات منہ سے چھینے لیتی ہو۔۔۔ مہلت دو تو بتاؤں۔" اس نے فائزہ کی مداخلت کی آڑ لیتے ہوئے بات کو طول دینا چاہا۔ "اچھا بھئی توبہ ہے! تم بات چبا چبا کر ہی تو کر رہی ہو۔ مجھ سے صبر نہیں ہوتا۔" فائزہ چڑ گئی۔ "خیر ہم بھی سوچنے لگے۔ گھر ہو جائیگا۔ زندگی کا ایک ساتھی مل جائے گا۔ چند لمحات خوشی کے نصیب ہو جائیں گے۔ میرے کھوئے ہوئے قہقہے لوٹ آئیں گے۔ میری سوئی ہوئی امیدیں اور تمنائیں بیدار ہو جائیں گی اور۔۔۔" نازلی آہستہ آہستہ ٹھیر ٹھیر کر کہہ رہی تھی۔۔۔ "اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور۔۔۔ اور میری فرزو دلہن بن کر ایک گھر کی رانی بن جائے گی۔" نازلی سوچتے سوچتے دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔۔۔ "اور۔۔۔ میری آغوش کسی ننھی معصوم جان کی مہکتی باہوں سے پر ہو جائے گی۔۔۔ اور اس کے ننھے ننھے بھولے بھولے بوسوں سے محبت مہک اٹھے گی۔۔۔ اور۔۔۔" اس کی سنجیدگی پر غم و اندوہ بلبلا اٹھا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے خاموش ہو گئی۔۔۔ "اور۔۔۔ اور کیا۔۔۔ جلدی سے کہہ ڈالو میں اسی سوچ میں معاملہ التوا میں نہ پڑ جائے۔" فرزو کی اس بے تابی سے متاثر ہوئے بغیر نازلی نے پھر کہا۔ "اور میں لٹی ہوئی محبت بنی بیٹھی رہوں گی۔ میری ہنسی کی جھنکار

(باقی صـ۴۷ پر)

ماہِ نو، کراچی۔ مئی ۱۹۵۸ء

اسلامی فنون کی نمائش

قاضی شبّیر حسین

کراچی کے لیل و نہار تو ادب و فن اور علوم و معارف ہی کے لیل و نہار ہو چکے۔ زندگی کے سینے سے جو موجیں ابھرتی ہیں، اپنے دامن میں علوم وفنون کے انمول موتی لئے ہوئے ابھرتی ہیں اور ہم اس بین الاقوامی سنگم پر رہنے والے جہاں چاروں کھونٹ سے تہذیبی دھارے آآکر گلے ملتے ہیں، آئے دن اس ملاپ کا سماں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور ان کے لائے ہوئے انمول موتیوں کو سمیٹنے میں سرگرم رہتے ہیں۔

اور پچھلے دنوں تو ان دھاروں کی آمد میں ایسی تیزی پیدا ہوگئی کہ ہر طرف زندگی کے سیل سبک تاز و ہمہ گیر کے ساتھ ہی ساتھ تہذیب و ثقافت کے بھی سیلاب … یہ دل … تمنا تھی کہ کہیں پر لگ جائیں تو اڑ کر لاہور پہنچوں اور اپنی آنکھوں سے بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ کی بہار دیکھوں بالخصوص اسلامی فنون کے ان بیش بہا نوادر کی جو دنیا کے گوشے گوشے سے تاریخ لاہور کے آغوش میں سمٹ آئے تھے اور میرے جیسے شیدائیانِ فن کے لئے جنت نگاہ بنے ہوئے تھے۔ یہ میری حسرت زدہ نگاہوں کو محرومی کا شکار نہیں ہونا پڑا۔ نہ پر لگانے کی ضرورت ہی پیش آئی اور نہ ہماری طلسمی داستانوں کے دیو … قالین کی بجائے … وادیوں میں اڑائے جاتا کیونکہ قصہ لاہور کی جمی جمائی مجلس خود ہی اٹھ کر فریئر ہال کراچی کے پُرفضا ماحول میں آن جمی اور ہم تشنہ کامانِ شوق کی آرزوئیں آپ ہی آپ پوری ہوگئیں۔ اسلامی فنون کے جن نوادر کو دیکھنے کی تمنا دل میں تھی وہ آپ ہی سامنے آ گئے۔ اور پھر وہی سعدی والی بات ہوئی کہ۔

دریغ آمدم زاں ہمہ بوستاں ۔۔۔ تہی دست رفتن سوئے دوستاں

جی چاہا یہ سوغاتیں اُن اربابِ ذوق تک بھی پہنچ جائیں جن کو میری ہی طرح ان کو دیکھنے کی تمنا تھی لیکن خوبیٔ قسمت اُن کا ساتھ نہ دے سکی یعنی خود جو دیکھا ہے وہ اوروں کو بھی دکھا دیا جائے۔

انتظار کی گھڑیاں گننے زیادہ دیر نہیں لگی۔ پہلے لاہور میں اور بعد ازاں کراچی میں جو نوادر آئے تھے، وہ تقریباً ایک درجن دور دراز ممالک گویا دنیا کے کتنے ہی گوشوں سے لائے گئے۔ ان میں ہر قسم کے پارہ ہائے دلنواز تھے: مختصر تصاویر، سکّہ جات، مخطوطات، خطاطی کے نمونے، اسلحہ، زیورات، خود نوشت خطوط، ظروف، قالین، ملبوسات، فرنیچر اور کسی تعداد۔ غرض ایک ایسی بہار در بہار کیفیت تھی کہ در گفتن نمی آید۔ جس پُرفضا ماحول میں یہ بوقلموں اور گوناگوں نوادر سجائے گئے تھے وہ تختۂ گلزار معلوم ہوتا تھا۔ ان کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ ان میں سے بعض فن پارے عجائب گھروں کی زینت تھے یا درویشوں کی، اور بعض خاص افراد کی ذاتی ملکیت۔ ظاہر ہے کہ ایک عام شائق فن کے لئے ان تمام نوادر تک رسائی کس قدر مشکل تھی اور ان کا کسی نمائش کے لئے بہم پہنچانا کس قدر دشوار … یہ تو بین الاقوامی اسلامی مذاکرہ کی کرامات ہی کہیئے کہ عام نگاہوں کو ان کی زیارت میسّر آگئی۔ اور وہ دشواریاں جو ان کی طلب و رسد کے سلسلے میں حائل تھیں اس یادگار اجتماع کی چشمِ فسوں ساز سے ایک پل میں دور ہو گئیں۔

اس معاملے میں موجودہ زمانہ کے برق رفتار ذرائع آمد و رفت بھی مدد و معاون ثابت ہوئے اور برسوں کے مرحلے چند دن ہی میں طے ہو گئے۔ اور کچھ نہیں تو ایک ٹن وزنی نوادر دنیا کے مختلف گوشوں سے موہوم طلسمی پرندوں یا طیلسانوں کی بجائے سچ مچ کے گھومتے طیاروں کے دوش پر اُڑ اُڑ کر پاکستان پہنچ گئے۔ خود پاکستان نے بھی اس نمائش کو ایک مثالی نمائش بنانے میں نمایاں حصہ لیا اور اجتماعاً و فرداً فرداً کتنی ہی غیر معمولی کوششیں بروئے کار آئیں۔

غرض یہ امر واقعہ ہے کہ فنونِ لطیفہ اور صناعی کے اس یادگار مظاہرے میں برس ہا برس کی خوابیدہ تاریخ نے پھر سے انگڑائی لی اور خوابِ ناز سے بیدار ہوگئی یعنی ایک طرف تو مقامی حیثیت سے ہزارہا میل کی مسافت میں زندگی کی روح دوڑ گئی اور دوسری طرف تاریخ کی صدہا سال کی خوابیدہ شہزادی نیندوں کی دنیا سے جاگ اٹھی۔ اور حق یہ ہے کہ دیکھنے والی نگاہوں کے لئے ہر ہر گوشے میں بہت کچھ تھا بلکہ یہ پوچھئے کیا نہیں تھا۔ آیئے ذرا جھلکی، مگر ساتھ

ہی ساتھ چشم زدن میں تاریخ و ثقافت کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی نگاہوں سے، ان نوادر کا جائزہ لیں اور ان کے خدوخال کی رعنائیوں اور پُرکاریوں، لطافتوں اور رنگینیوں کی داد دیں۔

سب سے پہلے تبرکاً اس مقدس پارے پر نظر ڈالئے: قرآن مجید، سرچشمۂ حکمت و الہام کا ایک ہی ورق سہی، جان و دل سے چوم لینے کے لائق ہے خواہ ہونٹوں سے نہ سہی نظروں ہی سے سہی۔ دفترِ علم و عرفان کا یہ ورق مغربی پاکستان کے ایک نجی کتب گھر کا غیر فانی جگر پارہ ہے۔ اور تیسری صدی ہجری کی غیر فانی یادگار! کوفی خط کی دلآویزی الہام میں سحر کا انداز پیدا کر رہی ہے۔ اِس پارہ کو نورٌ علےٰ نور کا مصداق بنا دیتی ہے۔ یہ لوحِ طلسم کشا تو محض بسم اللہ ہے۔ اس کے بعد کتنے ہی زندۂ جاوید فن پارے اور بھی دل و نگاہ کی داد تحسین کے حقدار ہیں۔

خطاطی ایک خالص اسلامی فن ہے۔ اور سب سے پہلے ہماری نظر اسی پر پڑتی ہے۔ بیش بہا نوادر کے اس خوانِ نعمت میں مخطوطات، طغرے، خود نوشت خطوط، توقیعات اور مجلدات خاص طور پر نمایاں اور جاذب نظر تھیں۔ مجلّٰی، مزیّن، مصوّر اور تاریخی، ہر قسم کے مخطوطات اس مجلس فن میں شامل تھے۔ قرآن کے مجلّٰی و مذہّب نسخوں کے کتنے ہی شاندار نمونے تھے، ایک سے ایک بڑھ کر۔ ایسے کہ ان کی رنگینی و پُرکاری، دیکھتے ہی نظروں میں کھب جائے۔

قرآن مجید کے بعد سلطان شہیدؒ کی طرف آئیے جو اس کی تعلیم جہاد کی زندۂ جاوید علامت تھے۔ یہ ہے اُن کا "خواب نامہ" اور یہ روزنامچہ۔ کیسے شجاع اور جیّد انسان کی یادگاریں، جو تمام تر پیکرِ حریت تھا۔ رزم و بزم اور سیف و قلم دونوں کا بادشاہ۔ اور اُن کے پہلو ہی میں ان کے خنجر کا دستہ! تاریخ کی یادیں یکلخت اُمڈ اُمڈ کر دل و دماغ کی پہنائیوں پر چھا گئیں! داراشکوہ کے دیوان کا یہ واحد نسخہ۔ کون صاحب ذوق ہے جو اس کے لئے آغوش کشا نہ ہو۔ نسخ، غبار، ثلث اور بہاری جیسے نادر خطوں میں قلمکاری بڑی پُربہار تھی۔ اور اس میں میر پنجہ کش، عبدالرشید دیلمی وغیرہ کے شاہکار ہر اعتبار سے فردوس نگاہ تھے۔ جہاں خطاطی کے حسن و رعنائی کا یہ عالم ہو وہاں سجاوٹ کا اہتمام کیا کم ہوگا۔ چنانچہ جلد سازی کے شاندار متفرق نمونے گویا حسین و جمیل پیکروں پر نفیس و بدیع کسوتیں اور پیراہن تھے۔

خطاطی کی طرح مصوری کا بھی مسلمانوں کو خاص ذوق رہا ہے۔ ان دونوں فنون میں فرق صرف یہ ہے کہ خطاطی کی روح سادگی ہے اور مصوری کی پُرکاری و رنگینی۔ پاکستان کے کتنے ہی مقامات سے مختصر تصاویر کا ایک عظیم الشّان ذخیرہ فراہم ہوا تھا۔ پشاور سے مغل مصوّر شریف کی تصاویر، متعدد مغلیہ تصاویر کا ایک شاندار البم، جسے میر عثمان علی خان، نظام حیدرآباد دکن نے لارڈ ہارڈنگ کو تحفتہً دیا تھا۔ جانسن کا مشہور ذخیرۂ نوادر دیگر ذخائر کے ساتھ مل کر حقیقتہً عالمِ تصویر پیدا کر رہا تھا۔

یہ تو تھیں عالمِ تصوّر کی باتیں یعنی فن کے ایسے نمونے جن سے صرف تخیل ہی میں حظ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن مسلمانوں کے نادرہ کار فنی شعور نے افادی اشیا اور مصنوعات میں بھی ان کے حیرت انگیز مظاہرے کئے ہیں۔ ان میں قالین اور غالیچے خاص طور پر نمایاں ہیں جیسے گلزار کے ٹکڑے گھر کی چار دیواری میں لاکر رکھ دیئے ہوں اور اس انداز سے کہ:

گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

نمائش میں اس جنسِ گراں مایہ کا بہت عمدہ اور سیر حاصل مظاہرہ کیا گیا تھا۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے مسٹر جوزف ڈی میکلن کی ہمت، قابلِ داد ہے کہ وہ قالینوں کا سب سے بڑا ذخیرہ ہوا کے دوش پر لے کر یہاں پہنچے، اور اس طرح "گنج باد آورد" کے امر واقعہ ہونے کا عملی ثبوت بہم پہنچا دیا۔ پچاس[۵۵] قالینوں کا یہ ذخیرہ گلہائے رنگ رنگ کی حدیث تازہ کر رہا تھا، اور اس میں ترکی، ایرانی، مغل، کاکیشیائی، شام کی صنّاعی کے نمونے فردوس نگاہ تھے۔ ان میں سے مغل قالین حقیقتہً النادر کالمعدوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ان میں مغلوں کی مناظرِ فطرت سے دلبستگی پوری طرح جھلکتی تھی۔

یہی سلیقہ، یہی منجھا ہوا ذوق، یہی دبی فنی شعور، یہی افادیت پر فن کی یورش ایک اور میدان میں اثر آفریں ہوئی یعنی مسلمانوں کا امڈتا ہوا ذوق عام مظاہر سے ابھر کر عام استعمال کی چیزوں پر بھی چھا گیا۔ یہاں تک کہ اس نے آلاتِ جنگ کو بھی بداعت فن کی کرشمہ آرائیوں سے محروم نہ رہنے دیا۔ آئیے ان تلواروں، تبروں، خنجروں، گرزوں، پیش قبضوں، بندوقوں، ان کے توڑوں، زرہ بکتروں، ڈھالوں، چار آئینوں کو دیکھئے۔ رزم پر بزم کے نقشے کس خوش اسلوبی سے اُجاگر کئے گئے ہیں، بلکہ سجائے گئے ہیں۔ خنجر کے دستے پر مذہّب کندہ کاری جسے اصطلاحاً "کوفت کاری" کہتے ہیں، کیسی دیدہ زیب فن کاری ہے

جنگ وجدل کی چیز پر جنگ وجدل یعنی شکار کا نقشہ ۔ یہ طبعی مناسبت، یہ سجل پن! نادر شاہ جیسے جری سورما کی شمشیر فولادی ۔ اور اس کا شیر ماہی کا دستہ اور پھر اس پر گھوڑے کا طلائی سر دبدبۂ سلطانی و قہاری کی زندگی نما تجسیم ہے ۔ اس تلوار کا نام "غنیم کشا" یقیناً اسم بامسمیٰ ہے ۔ اس پر یہ طلاکار عبارت اس فاتح عظیم و بطلِ جلیل کی شجاعت و بسالت کی کیسی بولتی ہوئی تصویر بلکہ زبردست شہادت ہے :

یا اللہ یا محمد یا علی علیہ الصلوٰۃ والسلام

د	ب
٨	د

سرکار نادر شاہ

عمل محمد زماں صفہانی

غنیم کشا

میر مراد علی خاں تالپور

سرکار میر محمد نصیر خاں تالپور

المالک ھو اللہ سرکار عبد الرسول محمد بہادل خاں بہادر ثالث بالخیر ۔

لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ ۔ سرکار میاں غلام شاہ عباسی

ان جنگی آلاتِ جنگ کے دوش بدوش روزمرہ کی زندگی کی جھلک وہی لطف و کیف پیدا کر رہی تھی جو دو انتہاؤں کی یکجائی سے پیدا ہوتا ہے ۔ یہ جھلک مختلف ملکوں کے ظروف میں نظر آتی تھی ۔ برطانیہ کے سر الڈر ڈ بیج کاک کے ذوق و شوق نے ایسی ایسی چیزیں فراہم کردی تھیں جو منفرد ہوتے ہوئے نایاب بھی ہیں اور دیکھنے کے علاوہ خصوصی مطالعہ کی مستحق ہیں ۔ وہ خوش وضع صراحیاں سنہری سنہری زنگار رنگ کیسی بہار دیتی تھیں جیسے لمبی لمبی گردنوں والی ملیح لیلاؤں کا ایک حشر آفریں جھرمٹ!

صنفِ نازک روزمرہ کی زندگی کی روحِ رواں ہے ۔ اس کے پرتو کے بغیر کوئی بھی نمائش صحیح معنوں میں کامیاب نہیں ہو سکتی ۔ اس میں شمشیر و سناں ہی کی جھنکار یعنی مردوں کا شور و شرہی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ عورتوں کے ہار سنگار کی نرمی و دلآویزی بھی لازم ہے ۔ چنانچہ یہ دلکش لوازمات بھی نمائش کی زینت تھے ۔ نسوانی ملبوسات اور پارچہ جات کی شان طرحداری واقعی دیدنی تھی جنھیں شوقین حضرات نے بڑی محنت سے جمع کیا تھا اور اس سے زیادہ سلیقے کے ساتھ سینت سینت کر رکھا بھی تھا ۔

سکوں کو آپ روزمرہ کی چیز سمجھئے یا کچھ اور ۔ بہرکیف یہ بھی فن کی اس بساطِ زنگار رنگ کے اسبابِ آرائش میں شامل تھے ۔ خلیفہ عبد الملک (۲۴۳) کا ایک بے نظیر طلائی سکہ، اکبر کا ۳ تولہ وزنی طلائی سکہ، جہانگیر کے تمام سکوں کا مکمل ذخیرہ اور اورنگ زیب عالمگیر کا ۲½ سیر وزنی نقرئی سکہ ۔ یہ سب اسلام کے دورِ عروج و اقبال کی کتنی عمدہ نشانیاں تھیں ۔

ہاتھی دانت پر نقاشی کا کام اسلامی فن کاری کا ایک اور نہایت نفیس نمونہ ہے ۔ ڈھاکہ سے تو ہاتھی دانت کی ایک پوری کی پوری چٹائی لائی گئی تھی ۔ اور اس پر جس دیدہ ریزی سے محنت کی گئی تھی ۔ وہ اسے لاجواب بنانے کے لئے کافی تھی ۔ انہی نوادر میں جرمنی سے بھیجا ہوا ایک اصطرلاب بھی تھا ۔ جو یوں لگتا تھا جیسے ماہر ہیئت شناس اسے ابھی ابھی برت کر اٹھے ہوں ۔

ایک الوداعی نظر ۔۔۔ اُس عظیم شخصیت کی یادگاروں پر جو اس دورِ آخری میں اسلامی فکر و فن کا لاثانی مظہر تھا ۔۔۔ علامہ اقبالؒ ۔۔۔ یہ ایک بہت چھوٹا خیال تھا کہ اسلامی فن و ثقافت کی دونوں نمائشوں میں جو یکے بعد دیگرے لاہور اور کراچی میں منعقد ہوئیں، اس صاحبِ دل درویش کے سامانِ فقیرانہ : بستر، حقہ، تپائی، کرسی اور قالین کو جو اُن کی حیات میں ان کے کمرے کی زینت ہوا کرتے تھے، ان تاریخی مواقع پر تمام دنیا کے سامنے

(باقی صفحہ ۔۔)

ہمارا تھیٹر

ضیاء محی الدین

سیاسیات حاضرہ، جدید ترین فلم اور افسانے کے مستقبل پر گفتگو کرتے کرتے جب یار لوگ تھک جاتے ہیں تو میری طرف رجوع ہو کر پوچھتے ہیں "ہاں بھئی! پاکستان میں تھیٹر کا مستقبل کیا ہے؟" پوچھنے والوں کے چہروں سے بڑی سنجیدگی اور گہرے فکر و تجسس کا پتہ چلتا ہے مگر فوراً ہی مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ تو مجھے بنا رہے تھے۔ مجھے بھی اس قسم کی دانستہ سنجیدگی پیدا کرنے کا سالہا سال کا تجربہ ہے۔ دل خواہ اندر سے کتنا ہی کھوکھلا کیوں نہ ہو مگر میں چہرے پر بے کیف سی مسکراہٹ پھیلا دیتا ہوں جیسے اس معاملہ پر بڑی ہی سنجیدہ رائے ظاہر کرنے والا ہوں!

مگر یہ ضرور ہے کہ تھیٹر کے سلسلے میں میرے خیالات ذرا تکلیف دہ ہیں۔ جب ان کا اظہار دوستوں کے سامنے کرتا ہوں تو وہ ہنسی ان سنی کر دیتے ہیں اور کوئی اور ہی بات چھیڑ دیتے ہیں۔ اور میں اپنے خیالوں میں پھر گم ہو جاتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تھیٹر کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ یوں ہونے کو کیا کچھ نہیں ہوتا۔ سال کے سال بڑے جوش و خروش اور طمطراق مگر بڑی بدسلیقگی کے ساتھ کہیں کوئی چیز اسٹیج پر آ جاتی ہے اور بس۔ یعنی ہمارے ہاں ناٹک کا ادارہ اب اسقدر ختم ہو چکا ہے کہ دس منٹ سے زیادہ کوئی سنجیدہ گفتگو اس پر جاری نہیں رکھی جا سکتی اگر کوئی معجزہ ہی ہو جائے تو اور بات ہے ورنہ اردو تھیٹر کو پرانی یادوں اور تصوروں کے دودھ پر پرورش کئے جائیے۔

ایک زمانہ تھا جب تھیٹر کا مطلب تھا بڑی بڑی پیشہ ور کمپنیاں جو زیادہ تر پارسیوں کی تھیں۔ یہ اپنے "زرق برق لباس اور نئی سین سینریوں" کے ساتھ میلو ڈرامے پیش کرتی رہتی تھیں۔ سال میں ایک آدھ پھیرا سارے برصغیر کا لگا لیا کرتی تھیں۔ بڑے بڑے شہروں کا کیا ذکر، چھوٹے چھوٹے شہروں تک میں پہنچ جاتی تھیں۔ مگر ۱۹۲۰ء کے بعد سے اردو تھیٹر کو زوال آ گیا کیونکہ سیاسی تحریکوں نے لوگوں کی توجہ اور مذاق بدل دیئے۔ ادھر اقتصادی حالات نے دنیا کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔

یوں تھیٹر کا چرچا ہمارے ہاں کوئی پچاس سال تک رہا۔ ہمارا ناٹکی ادب جسے ہم اپنا ڈرامائی سرمایہ سمجھ رہے ہیں "منیجر کمپنی ہذا" اور ایکٹر منیجر قسم کے لوگوں کی پیداوار تھا۔ یہ لوگ تماشائیوں کی ذہنیت سے بخوبی واقف تھے اور ایسے کھیل بناتے تھے کہ دھن برسنے لگے۔ نوعیت کے اعتبار سے وہ حزنیہ، غنائیہ یا غنائیہ طربیہ ہوتے تھے۔ یہ آزمودہ نسخہ تھا اور کبھی ناکام نہیں رہا۔ بلکہ اب تک جو ڈرامے ہو رہے ہیں ان میں سے بھی گیتوں کا عنصر خارج نہیں ہوا ہے۔ یہ سراسر کاروباری بات ہے اور جب اس میں غلو ہو تو زوال لازمی ہے جیسے انگریزی اور امریکی ڈرامہ کا حشر ہوا۔ ادھر ہمارا تماشائی پانچ گھنٹے کا کھیل چاہتا تھا اور "گداز قلب" دور کرنے کے لئے موسیقی سے "تالیف قلب" کا کام لیتا تھا۔ اور یہ گانے اکثر قطعی بے محل اور بیشتر مہمل ہوتے تھے۔

سہراب جی یا نیو الفریڈ تھیٹریکل کمپنی نے جو ڈرامے اپنے وقت میں پیدا کئے ان کا ذکر جب لوگ کرتے ہیں تو حد درجہ رطب اللساں ہو جاتے ہیں۔ ان کے تصور میں جو دنیا بسی ہوئی ہے اس میں بلند ترین لمحہ وہی سمجھا جاتا ہے جب وہ سوچتے ہیں کہ فلاں ایکٹر لڑکے نے کس خوش گلوئی اور سوز کے ساتھ کیا "چیز" گائی تھی یا فلاں "سیٹھ" کا پارٹ کیا غضب کا تھا!

آغا حشر کے چند غنائیہ ڈراموں کو چھوڑ کر ہمارے ہاں جو بھی ڈرامائی ادب ملتا ہے وہ بالکل غلط چھپا ہوا ملتا ہے۔ منیجروں کے کہنے پر گانوں کی بھرمار سے تو ان کا اور بھی حلیہ بگڑا ہوا ہے۔

یہ بات کہ اردو ڈرامہ کا آغاز "اندر سبھا" سے ہوا یا نہیں ایک نزاعی مسئلہ ہے۔ مگر یہ یاد رکھنے میں کوئی غلطی نہ ہوگی کہ اردو ڈرامے یا کم از کم

اسٹیج پر آنے والے کھیل) ۱۸۰۰ء سے شروع ہوتے ہیں اور پارسی کمپنیاں اس کی شروعات کرنے والی تھیں۔ پارسیوں نے اپنی زبان میں ڈرامے کیوں نہیں لکھے، اس کا جواب یہ ہے کہ کاروباری نقطۂ نظر سے اردو زیادہ مقبول اور وسیع تر زبان تھی۔ پارسی تھیٹریکل کمپنیوں کے مالکوں اور منیجروں نے اردو لکھنی پڑھنی شروع کی اور اس میں خوب مہارت پیدا کرلی۔ شروع شروع میں انہوں نے ڈرامے لکھنے کے لئے جو لوگ نوکر رکھے "وہ "منشی" کہلاتے تھے۔ منشی کچھ اپنی مرضی سے لکھتے تھے اور کچھ سیٹھ " کے کہنے پر گھسا پٹا سا دیتے تھے۔ جہاں منیجر کا نا یا خاص لفظ جو پہلے مقبول ہو چکا ہو دیتا مثلاً "دلبرا دلبرا دلبرا" یا ہم قافیہ اسماء و افعال جا بجا بھرتی کر دیتا تھا۔

اس دور کے بعد کچھ سمجھدار قسم کے ڈرامہ نویس بھی ان پارسی کمپنیوں نے نوکر رکھنے شروع کر دیئے۔ اور ڈرامہ نویسی کچھ بہتر ہونے لگی۔

"اوریجنل تھیٹریکل کمپنی آف بمبئی" کے مالک پیلو جی فرامجی کے ہاں رونق اور ظریف ملازم تھے۔ وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی کے منشی ونائک پرشاد طالب بنارسی تھے جنہوں نے سب سے پہلے اردو اسٹیج پر نثر کا آغاز کیا۔ دوسرے نامور لکھنے والوں میں احسن لکھنوی اور پنڈت نرائن پرشاد بیتاب کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔

ہمارا ڈرامائی ورثہ وکٹوریائی عہد کے میلوڈرامے کا چربہ نظر آتا ہے۔ ہئیت کے اعتبار سے اطالوی اوپرا کا رنگ غالب ہے۔ رونق اور ظریف سے کر آغا حشر تک جتنے بھی ڈرامہ نویس گذرے انہوں نے اپنے موضوعات کے لئے پرانی دیومالا اور پرانی داستانوں سے کام لیا۔ یا پھر رشک و حسد کا لگا بندھا واقعہ۔ طربیہ کے پلاٹ زیادہ تر یہی ہوتے تھے کہ بڈھا جوان لڑکی سے شادی کر لیتا ہے یا کرنے کا ارمان رکھتا ہے یا پھر ایک کنجوس باپ ہوتا ہے جو اپنی اولاد کی نا شائستہ حرکات پر ہر وقت دل پکڑے پکڑے پھرتا ہے اور غش پہ غش کھا رہا ہے۔

تھیٹر کی دنیا یہ تھی کہ جو چیز قبول عام سے خارج سمجھی جاتی اسے فوراً مسترد کر دیا کرتے تھے۔ کشش اور عام مقبولیت کے لئے اسٹیج پر مصنوعی خوبصورتیاں اور فریب نظارہ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ بعض چالاکیاں بہت مقبول ثابت ہوتی تھیں اور انہیں بار بار دکھایا جاتا تھا۔

بعض کمپنیوں کے منیجر یورپ جا چکے تھے۔ انہوں نے ولایت میں وکٹوریائی عہد کے ڈراموں کی نقالی بھی ضرور دیکھی ہوگی۔ انگریزی داں طبقہ کیلئے بمبئی میں جو انگریزی کھیل کھیلے جاتے تھے ان کا کام بھی ان منیجروں کی نظر سے گذرا ہوگا۔ اس لئے بہت سی باتیں ان سے مستعار لی گئیں مثلاً کردار کا گلا پھاڑ کر چیخنا خاص کر جب کسی اتفاق سے وہ بادشاہ بھی بنا ہوا ہو اور جب کسی کے پیٹ کا بھید کھل جائے یا واضح ہو جائے تو جھٹ گانے کا سہارا لیا جاتا تھا۔ یا "سینریز" کے زرق برق لباس اور خوش شکل ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی گائیکی یا سرت بھاؤ سے منیجر کی آبرو رکھ لی جاتی تھی!

★

جب بڑی بڑی کمپنیاں قائم ہونے لگیں اور ان کا فنی دور دست بھی بہتر ہوا تو ایک تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ بس یہی ایک تبدیلی ہوئی اور کوئی نہیں وہ یہ کہ نظم کی جگہ مقفیٰ نثر نے لے لی۔ یہ نثر بڑی مصنوعی اور سراسر آورد کا نمونہ ہوتی تھی۔ اسے سوائے "منشیوں" کی "کاریگری" کے اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ فقرہ کسی نہ کسی التزام کے ساتھ بولا جاتا تھا "توفیق کس حال میں ہے" — اس کا جواب بھی بڑے مرصع انداز میں یوں دیا جاتا تھا — "شیر لوہے کے جال میں ہے"۔ ایک خفیف سی تبدیلی یہ بھی ہوئی کہ گانے اب ذرا موزوں جگہوں پر فٹ کئے جاتے تھے۔ پلاٹ پر بھی کچھ توجہ کی گئی۔ اور وہ یہ کہ "کامک" کے قصے کو اصل قصے سے الگ الگ رکھنے کے بجائے مربوط کر دیا گیا، ورنہ اپنا "کامک" کا قصہ الگ چلتا تھا اور کھیل کی کہانی الگ رہتی تھی۔ مگر پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ڈرامہ نویسوں کے تاجدار آغا حشر بھی اچھی خاصی میلوڈرامائی ٹریجڈی میں "کامک" کا حصہ خواہ مخواہ گھسیڑ دیتے ہیں اور وہ بھی الگ چلتا رہتا ہے۔

کچھ سماجی اور سیاسی موضوعات بھی پلاٹوں میں در آئے مگر "ناصح مشفق" کی گرانباری کے سے انداز میں وعظ و نصیحت کا دامن اسقدر تھاما جاتا تھا کہ فن و ادب کا جامہ تار تار ہو جاتا تھا۔

بہرکیف ہمارے تھیٹر کی دنیا اسی طرح بنتی اور بگڑتی رہی۔ ۱۹۲۰ء کے بعد آغا حشر اور چند دیگر ڈرامہ نگاروں نے ان لوگوں کو اگر ڈرامہ نگار کے بجائے رومان نگار کہا جائے تو کیا حرج ہے!) کچھ کام کیا۔ محمد عمر اور نور الٰہی صاحبان نے ایک بڑا کام سرانجام دیا۔ "ناٹک ساگر" کی تالیف انہوں نے کچھ کھیل بھی لکھے جن میں سماجی برائیوں پر انگلی اٹھائی گئی تھی اور اصلاح قوم کا کام لیا گیا تھا مگر کیفیت اب بھی وہی تھی کہ "شاعرانہ انصاف" کا دامن ہاتھ سے

نہیں جانے دیتے تھے۔ یعنی "کالا" ایک دم کالا اور "سفید" ایک دم سفید ہوتا تھا۔ کردار کی نیک نیتی فرشتوں کو سبق سکھاتی تھی اور جو برائی کا مجسمہ ہوتا اس میں کوئی انسانی خوبی کسی وقت بھی پیدا نہیں ہونے دی جاتی تھی یعنی زندگی کا اوسط تصور سرے سے خارج تھا۔ مثلاً ان ڈرامہ نویسوں کے ہاں ایک محبوب کردار ظالم عیاش شرابی ہوتا تھا اور اس کی نہایت معصوم، خدمت گزار، صبر کی بندی بیوی۔ شرابی قدرتی طور پر رنڈی کے پھندے میں پھنس کر بالکل برباد ہو جاتا تھا اور اس کی بیوی اسے آغوشِ پناہ میں لے لیتی تھی۔ شراب نوشی خاص طور پر ہدفِ موضوع تھا (مثلاً آغا کے "ترکی حور" میں "ان گلاسوں میں جو ڈوبے پھر نہ ابھرے زندگانی میں!") بدی کرنے والے کو "کیفرِ کردار" تک پہنچائے بغیر کوئی ڈرامہ نویس مطمئن نہیں ہوتا تھا۔

آغا کو قدرت نے بہت سی صلاحیتیں دی تھیں۔ وہ اپنے وقت کے تھیٹری تقاضوں کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ فنی ضرورتوں پر بھی ان کی گرفت تھی، مکالمے بڑے شائستہ، رواں اور چست لکھتے تھے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی "منیجر کمپنی ہذا" کے دیو کے سامنے بونے بن جاتے تھے اور کچھ نہ کر سکتے تھے (غالباً اس کی وجہ ان کی اپنی نجی زندگی بھی تھی!)

اس میں شک نہیں کہ ہمارے تھیٹر نے کوئی فالسٹاف یا چارلس سرفیس نہیں دیا مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ ہمارے ہاں یہ فن بہت قلیل عمر میں پیدا ہوا اور مر گیا۔ اسے ویسے بھی شرفا نے در خورِ اعتنا نہ سمجھا اور اب کسی بلند روایت کا ذکر کرنا فضول بات ہے۔

پلاٹ کا جہاں تک تعلق ہے تشخص نگاری کی جہاں تک بات ہے وہ کبھی سرے سے پیدا نہیں ہوئی۔ سپاٹ، بے رنگ کھیلوں میں جان، گونج اور شوکت لفظوں کے الٹ پھیر اور منصب العینی نیکی کے کردار تراش کر پیدا کی جاتی تھی۔ اس وقت کے کرداروں کے بعض نمونے اب بھی بقیدِ حیات ہیں (مثلاً عبدالرحمٰن کابلی) لوگ ان کرداروں کو خوب جان پہچان گئے تھے اور ان سے جو بھی کھیل منسوب ہوتا لوگ داد دینے کے لئے موجود رہتے تھے۔ اسٹیج پر مدھم رنگین روشنیوں اور اسٹیج پر مُردہ کے بار بار "ونس مور" کے تقاضوں پر اٹھ کر مر کر دکھانا" ایک عام ناٹکی مظاہرہ تھا۔ ان حالات میں کسی فالسٹاف کا تقاضہ کرنا کہاں تک درست ہے؟

★

رہی سہی کسر سینما نے پوری کر دی۔ سینما نے اپنے کام کا آغاز تھیٹر کے کام کے خاتمے سے کیا۔ چنانچہ پہلی گویا تصویر عام آئی۔ اس کی مثال ہے یوں تھیٹر تو سارے برصغیر میں ختم ہو گیا مگر بنگال میں اس کا سراغ ملتا رہا۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ قلیل سے قلیل وقت میں اچھی سے اچھی تفریح کا تقاضہ نہایت کم پیسوں میں سینما نے پورا کر دیا۔ پھر سینما کے پاس جاذبِ نظر تکنیکی خوبیوں کے پیش کرنے کا بھی سامان تھا۔

تھیٹر دیکھنے والے بیشتر ان پڑھ ہوتے تھے اور ان پڑھ شائقین ناقد اور نہیں بن سکتے اس لئے ان کی بے حسی کا رونا فضول ہے۔ سیاست کے چکر اور معیشت کی پریشانیوں نے تعلیم یافتہ طبقے کو ویسے بھی ناٹک سے بددل کر دیا تھا۔

اردو تھیٹر والے ادب و ثقافت کے دوسرے تقاضوں کی طرح اس کے تقاضوں سے بھی بے خبر اور بے حس رہے۔

یوم آزادی تک کا کوئی تیس سال کا زمانہ ایسا گزرا ہے کہ تھیٹر کی دنیا بالکل سونی رہی۔ شوقیہ ڈرامیٹک کلبوں نے زیادہ تر کالجوں میں تھیں' اس شمع کو اپنے ہاتھ میں تھامے رکھا۔ پھر "گروپ تھیٹر" کی تحریک آئی۔ مغربی اثر نے "ایک بابی ڈرامے" کو بھی جنم دیا مگر ایک بابی ڈرامے لکھنے والے اس سے بڑھ کر پرواز نہ کر سکے۔ ایک بابی ڈراموں کی نسبت ریڈیائی کھیل زیادہ مقبول ہوئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ریڈیو والے لکھنے والوں کی کچھ "دامے درمے" بھی خدمت کرتے ہیں اور ایک بابی ڈرامہ نگار کو یہ تسلی بھی میسر نہیں۔ سوائے اس کے کہ اس کی کوئی چیز کبھی کبھار کسی رسالے میں بس چھپ گئی یا کسی ادبی اجتماع میں لوگوں نے اسے کافی کے کڑوے گھونٹوں کے ساتھ گوارا کر لیا!

پیشہ ورانہ اسٹیج کے نہ ہونے کا ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ اس پچھلے تیس چالیس سال میں ڈرامائی ادب پر اوس پڑی رہی پھر جو کچھ لکھا بھی گیا وہ اسٹیج پر لانے کے لحاظ سے صفر ہے۔ بس، ہاں پڑھنے کے مطلب کا ہے۔ زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ لکھنے والے اسٹیج کے مضمرات سے واقف نہیں تھے (یا کم از کم ایک بار تو ضرور اپنی عملی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں) لکھنے والوں پر "کلاسیت" کا غلبہ رہا ہے۔ بول بات کی دنیا کے لئے کچھ لکھنا بہت مشکل نہیں تو دشوار اور محنت طلب کام ضرور ہے۔ اب ان کے ڈراموں کو مکالمہ نگاری کا نمونہ سمجھ لیجئے جس میں دو کردار آمنے سامنے کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر

خوبصورت لفظوں کی گیندیں اچھالتے رہتے ہیں!

اس میں ڈرامہ نویس کا بھی اس قدر قصور نہیں ہے کیونکہ لوگوں کی بے توجہی اور سرد مہری بھی اس کا بڑا سبب ہے۔ اب لکھنے والا لکھنے سے پہلے ان باتوں سے نمٹے یا کوئی انگلی دکھائے۔ دُور کیوں جائیے اپنے سب سے بڑے ڈرامے 'انارکلی' کو ہی لے لیجئے۔ اس میں بھی یہ نقص موجود ہے کہ مکالمے طوالت کا شکار ہیں اور مناظر کی تیاری ناقابل عمل حد تک کارے دارد!

آزادی کے بعد تھیٹر میں کچھ جان پڑی اور پاکستان میں کئی جگہ کھیل تیار ہوئے۔ مگر لکھنے والے کی یہ مشکل اب بھی موجود ہے کہ ڈرامہ نویس کیوں لکھے، کس کے لئے لکھے اور لکھے بھی کہ نہیں! پھر کھیل پیش کرنے والوں کا مسئلہ الگ ہے۔ جب تک کوئی پیسے خرچ کرنے والا "سیٹھ" دستیاب نہ ہو ڈرامے کی بات آگے چلتی ہی نہیں۔

مگر یہ بات بھی نہیں کہ ڈرامہ بالکل ہی گھاٹے کا سودا ہے، نہیں۔ سلیقے سے اگر کوئی کام کیا جائے تو مقبول ہوتا ہے۔ چنانچہ کراچی ہی میں کئی کھیل کامیابی کے ساتھ کھیلے گئے (مثلاً "لال قلعہ سے لولوکھیت تک" اور "زوال حیدرآباد") بلکہ کراچی تو اب تھیٹر کا مرکز بنتا جا رہا ہے کیونکہ لکھنے والے، کام کرنے والے اور شائقین سب ہی موجود ہیں۔ لاہور اس معاملہ میں ابھی ذرا پیچھے ہے۔ وہاں ایسی متنوع آبادی کم ہے، گو لکھنے والوں کا روائتی گڑھ رہا ہے۔ مگر وہاں بھی ابھی کسی نے اوریجنل لکھنے کا کام شروع نہیں کیا۔ یوں کالجوں میں سالانہ عرس کی طرح ڈرامیٹک کلبیں سال کے سال ایک انگریزی ڈرامہ پیش کر دیتی ہیں! انگریزی کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ذریعہ تعلیم ابھی تک یہی زبان ہے۔

میرا خیال ہے کہ آئندہ چند سال میں لاہور یا کراچی میں ضرور کچھ ایسے لوگ قدم اٹھائیں گے کہ اسٹیج کے نقطۂ نظر سے کوئی چیز لکھی جائے۔ اصل بات یہ ہے کہ ڈرامہ اوّلاً کھیلنے کے لئے ہی لکھا جانا چاہیئے۔ اب اس وقت کوئی پیشہ ور کمپنی موجود نہیں ہے جو ایکٹروں ایکٹریسوں کو اسی امید پر اپنے ہاں لگائے رکھے کہ کوئی مائی کا لال اٹھے گا اور ان کے لئے ڈرامہ لکھ کر لائے گا! ڈرامہ کا موضوع کیا ہو یہ دوسرا دردِ سر ہے۔ اچھے تراجم ویسے ہی ناپید ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ تھیٹر کے بطن سے ڈرامہ نویس پیدا ہوا کرتا ہے، برعکس نہیں!

غزل

علی اختر مرحوم

کیا لطافتِ غم کو نہ رائگاں میں نے
لبوں کو دی نہ کبھی رخصتِ فغاں میں نے

غمِ فنا سے لیا عیشِ جاوداں میں نے
متاعِ عشق کو اتنا کیا گراں میں نے

بنا دیا جو محبت کا راز داں میں نے
زمیں کو بخش دیا اوجِ آسماں میں نے

نصیبِ دل ہیں ازل سے تصوّراتِ جمال
فضائے برق میں رکھا ہے آشیاں میں نے

بقدرِ شوق نہ تھا اہتمامِ سوز و گداز
ضمیرِ خاک میں بھر دی ہیں بجلیاں میں نے

بساطِ ہوش سے تا جلوہ گاہِ مستی و کیف
تجھے تلاش کیا ہے کہاں کہاں میں نے

اجل کا راز بس اتنا ہے کچھ دنوں کے لئے
بجھا کے رکھ دی ہے شمعِ غمِ نہاں میں نے

ملا کہیں نہ دلِ آشنائے دردِ اختر
یہ جنس دہر میں پائی بہت گراں میں نے

غزل

روش صدیقی

★

عمرِ ابد سے خضر کو بیزار دیکھکر
خوش ہوں فسونِ نرگسِ بیمار دیکھکر

کیا جلوہ گاہِ حسرتِ نظارہ ہی بہشت؟
حیراں ہوں صورتِ در و دیوار دیکھکر

بادہ بقدرِ ظرف سہی، رسمِ میکدہ
ساقی! نزاکتِ دلِ میخوار دیکھکر

اب جستجوئے دوست کی منزل کہیں بھی ہو
ہم چل پڑے ہیں راہ کو دشوار دیکھکر

شایانِ جرمِ عشق نہ تھی قیدِ زندگی
جی شاد ہو گیا رسن و دار دیکھکر

اب اس سے کیا غرض، یہ حرم ہو کہ دیر ہو
بیٹھے ہیں ہم تو سایۂ دیوار دیکھکر

رازِ فروغِ آخرِ شب کچھ نہ کھل سکا
کیوں خوش ہے شمعِ صبح کے آثار دیکھکر

سازِ غزل اٹھا ہی لیا ہم نے اے روش
اُس چشمِ نیم باز کا اصرار دیکھکر

★

غزل

ماہر القادری

اُن کی چینِ جبیں بن گیا ہے
عرضِ غم، کیا حسیں بن گیا ہے

آپ اور یہ کرم، یہ تواضع
آسماں کیوں زمیں بن گیا ہے

حُسن خلوت سے محفل میں آکر
کس قدر شرمگیں بن گیا ہے

شکریہ زحمتِ چارہ گر کا
غم مگر، دل نشیں بن گیا ہے

اُن کا چہرہ مرا نام سُن کر
اور کبھی کچھ حسیں بن گیا ہے

عشق پاکیزگی و ہوس میں
اصلِ دُنیا و دیں بن گیا ہے

وہ جو تھا ایک وہمِ تصور
رفتہ رفتہ یقیں بن گیا ہے

میرے حُسنِ نظر کی بدولت
کوئی زہرہ جبیں بن گیا ہے

اس ہجومِ ہوا و ہوس میں
عشق، تنہا نشیں بن گیا ہے

آپ ماہرؔ کو جو چاہیں کہہ لیں
غیر کیوں نکتہ چیں بن گیا ہے

غزل

تابش دہلوی

عُمر کٹی ہے بے چینی میں بارے اب آرام سے ہیں
عشرتِ محرومی تو ملی ہر چند کہ ہم ناکام سے ہیں

اب وُہ سکوں ہو یا بے تابی جب تم بخشو جب ہی ملے
اس کی رکھنا لاج کہ ہم منسوب تمہارے نام سے ہیں

کوئی تمنا ساتھ نہیں ہے کوئی تصور پاس نہیں
کیسے کٹے گی یہ شبِ ہجراں آج اکیلے شام سے ہیں

کیوں نہ کریں اربابِ محبت جان و دل سے اُنکو قبول
درد کے کچھ پیغام ملے ہیں اور تمہارے نام سے ہیں

غم سے میسر عشرتِ ہستی، دل کو سکوں بیتابی سے
ہم کو نصیب آرام نہیں ہے یعنی ہم آرام سے ہیں

اہلِ وفا کی خاطر تم فریاد سمجھ کر ہی سُن لو
آہوں میں کچھ مژدے سے ہیں، نالوں میں پیغام سے ہیں

نُور سے تابشؔ جسکے ہو اک دائمی روزِ وصل طلوع
ایسی سحر کے ہم مُتمنّی اپنی اک اک شام سے ہیں

★

غزل

عبداللہ خاور

شفق کا رنگ، گلوں کی پھبن بھی کہتے ہیں
رُخِ حسیں کو سحر کی کرن بھی کہتے ہیں

ہوا ہوں پرسشِ احوالِ دل پہ آزردہ
کچھ اہلِ دل اسے بیگانہ پن بھی کہتے ہیں

شبِ فراق کی ویرانیوں سے قطعِ نظر
ہم ان کی ذات کو اک انجمن بھی کہتے ہیں

دیارِ گل میں کوئی مائلِ کلام نہیں
بدل گئی ہے ہوائے چمن بھی، کہتے ہیں

جبینِ ناز ہے جس بات پر شفق آلود
اسی کو آپ مرا حسنِ ظن بھی کہتے ہیں؟

طلب کی موج گھٹن بن کے رہ گئی دل میں
اسی کو منزلِ دار و رسن بھی کہتے ہیں

مژہ کی اوٹ میں یہ پُرسکوں حسیں آنکھیں
ہم ان کو پاس میں پیماں شکن بھی کہتے ہیں

کوئی بھی سن نہ سکا مرتعش لبوں کی صدا
کنائے تھے جنھیں اعجازِ فن بھی کہتے ہیں

حضورِ دوست ہوں بیگانۂ نوا خاور
سکوتِ یاس کو طرزِ سخن بھی کہتے ہیں

"راہرو ہوگا" (بقیہ صفحہ ۳۷)

فضا معمور ہو جائے گی۔ میرے دل کی مرجھائی ہوئی کلیاں پھر ایک بار مسکرا دیں گی لیکن.........؟" فرطِ غم سے اس کی آواز بھرا گئی اور سکوت غالب آگیا۔

"لیکن کیا؟، پھر تم نے گفتگو کا سلسلہ لیکن پر ختم کر دیا؟" نازلی اس کے پُر اطمینان لہجے سے ٹھٹک سی گئی "نازلی!" فائزہ ایک کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے پھر خاموش ہو گئی۔ "پھر——؟" نازلی کا پیمانۂ صبر اب تو واقعی لبریز ہو چکا تھا۔ "بس پھر۔ کچھ بھی نہیں!" فائزہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ "بس یہی تو تمہاری بری عادت ہے۔ یوں ستا ستا کر بتانے سے کیا فائدہ؟" نازلی نے بگڑ کر کہا۔ "تم بگڑو گی تو نہیں بتاؤنگی۔" فرزو نے نازلی پر ایک بار ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے مزید طول دیا۔ "توبہ ہے ظالم تجھے بھی دق دینے کا ڈھنگ خوب آتا ہے!" نازلی مغلوب سی ہو گئی۔ "پھر یہ کہ دورانِ گفتگو میں پتہ چلا! وہ پرسوں چھٹی لیکر بیوی کو لینے جا رہا ہے۔" فائزہ نے ایک اندازِ بے اعتنائی سے کہا اور وہ اپنی گمنام منزل کے راہرو کا انتظار اسی صبر و ضبط سے کرنے لگی۔ لیکن نازلی کے تخیل اور ارمانوں کی دلہن ایک بار پھر بیوہ ہو گئی، اور وہ سوچتی رہ گئی کہ کیا اس کی فرزانے لئے زندگی ایک مسلسل عذاب انتظار ہی رہے گی!

منچھر کے صبح و شام

عارف حجازی

منچھر جھیل کے ٹھہرے صاف و شفاف پانی کو دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے 'موہان' دوشیزاؤں کی سرشار جوانی پانی کے سینے میں اتر آئی ہے اور حسن و عشق کی ایک وسیع کائنات محبت کے مہکتے ہوئے لالہ زاروں سے آباد ہے۔ تا حد نگاہ آفاقی جلوے بکھرے پڑے ہیں۔ شاداب مرغزار، مسکراتے ہوئے کھیت، درختوں کے پراسرار گہرے سائے اور آبی پرندوں کے چہچہے۔ زندگی کے ابدی نغموں کا احساس ہو رہا تھا۔ غرضیکہ مناظرِ فطرت کے گلکار ہاتھوں نے رنگا رنگ جنت کا سماں پیدا کر دیا تھا۔ لیکن یکبارگی پھر میرے تخیل کے افق پر 'موہان' لڑکی کا ایمان جمال طلوع ہوتا۔ تھوڑی دیر کے لئے میری نگاہیں حسن و رعنائی کے ایک پیکر جمیل کے گرد طواف کرنے لگیں۔ پھر منچھر جھیل کے فسوں آفریں مناظر نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ میں عشق و محبت کے دوراہے پر سوچتا اپنی پچھلی زندگی کا محاسبہ کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میری دنیائے محبت تمام پراگندہ تصورات اور خیالات سے پاک ہے اور میرے جذبات، میری خواہشات، میری تمنائیں ان تمام آلودگیوں سے دور، بہت دور ہیں جہاں جوانیوں کا خون جورِ فرعونِ ہوس کے دیوتا کو پلا دیا جاتا ہے۔ یہ سن کر جھیل میں ایک ہلچل سی پیدا ہوگئی اور اسکی لہریں جیسے گنگنانے لگیں:

اے مسافر! سن، زمانے کی چکی میں پس جانے کے بعد بھی میری زندہ دلی کبھی نہیں جھٹلایا جاسکتا۔ میرے حسین تصورات پامال نہیں ہوسکتے۔ میری امنگوں اور میرے شباب پر کوئی آنچ نہیں آسکتی۔

پھر جھیل کے سینے پر پانی کے چھوٹے چھوٹے گول گول دائرے نمودار ہوئے جو زندگی کے دائروں کی طرح پھیلتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ نظروں سے غائب ہوگئے۔ میں سوچنے لگا زندگی کی ان لامحدود وسعتوں پر زندہ دلی ہی کا جادو طاری ہے ورنہ اسکے بغیر یہ حسن اور یہ خوبصورتیاں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ زندہ دلی ایک مقدس روح اور سحر و سخاوت کا نام ہے، جسے اس سے کئی روگوں کا علاج ہو جاتا ہے'

میں نے سوچا شاید اسی اطمینان، اسی سحر و سخاوت، اسی روحانی سکون نے وادیٔ سندھ کو حسن و جمال سے مالا مال کردیا ہے۔ ایک زبردست آب و گیاہ وادی، ایک عظیم ریگستان کو۔

''موہان مچھیرے - جھیلوں میں کشتی پر زندگی بسر کرتے''

سے بن سو برس پہلے درختوں کے پتوں سے اپنے جسم کی بردہ‌بوسی کرتے تھے -

منچھر ان لوگوں کی زندہ تاریخ ہے - اسکی دلفریبیاں اس بات کا ثبوت ہیں کہ موہان اس سے کس قدر مسحور ہوئے ہیں کہ انہوں نے اس خوبصورت جھیل سے آگے بڑھنے کا ارادہ ہی نہیں کیا اور سیر و سیاحت کے قدرتی جذبات کو اس کی مسکراتی ہوئی، ہر دم متلاطم لہروں کے سپرد کر دیا - ہزاروں سال گزر چکے مگر کوئی انقلاب انہیں منچھر سے اور منچھر کو ان سے جدا نہ کر سکا - اور آج بھی یہ ہزاروں موہان دنیا کے مکر و فریب سے کوسوں دور عالم فطرت کے دامن میں اپنے ماہ و سال یونہی مچھلیاں پکڑنے، گانے بجانے اور ہنسی خوشی بسر کرنے کے عادی ہیں - ان میں سے ہر ایک ''میر بحر'' کہلاتا ہے - یہ خطاب ''شاہ سمندر'' سے کسی طرح کم وزن کا نہیں - یہی ان کی عظمت اور قدامت کا ضامن ہے - انہی دو لفظوں میں اس قدیم‌النسل قبیلے کی تاریخ کی جھلک صاف نظر آتی ہے - پھر اس کے رہن سہن، اس کے علاقے کا نظم و نسق ہزاروں سال قدیم جمہوری طرز کا ہے جس سے اس کی قدامت اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے - ہر ڈوں کا ایک مکھیا گویا اس کی چھوٹی سی سلطنت کا صدر ہے -

میں انہی انہی خیالات میں محو تھا کہ ماہی گیر نے لپکتے ہوئے اپنا جال پانی میں بچھا دیا - اسکی للچائی ہوئی نگاہوں میں جیسے سینکڑوں رنگین مچھلیاں سمٹ آتی تھیں - اس وقت اس کے چہرے پر ایسی ہی کیفیت طاری تھی جیسے کسی فوج کے سالار کے چہرے پر دشمن کے مورچہ پر حملہ کرتے وقت پیدا ہو جاتی ہے - اس وقت مجھے محسوس ہوا جیسے دور دراز ماضی بھی زمانہ حال میں تبدیل ہو گیا ہے اور محمد بن قاسم کا حملہ اسی صدی کا واقعہ ہے - یہ سوچ کر میں پھر خیالات کی رو میں بہ گیا - میں نے آسمان کی طرف دیکھا - سہ‌پہر کا آفتاب سر سے بہت دور تھا، شمال کی جانب بادلوں کے سفید ٹکڑے منڈلا رہے تھے، نیلگوں آسمان پر سپید سفید بادل، کیسے بھلے معلوم ہو رہے تھے! میں نے اپنے دل سے کہا: اوپر یہ برف جیسے سفید بادل، نیچے چاندی جیسی بیس میل کے رقبہ میں پھیلی ہوئی منچھر جھیل، جسے قدرتی نہروں نے دریائے سندھ سے وابستہ کر رکھا ہے، موتی کے آئینہ سے کس طرح کم ہے؟ جب برکھا رات میں وادی کے مست‌الست دریا، سندھ میں سیلاب آتا ہے تو جھیل بھی سینکڑوں میل کے علاقے پر محیط ہو جاتی ہے اور جب دریا اتر جاتا ہے تو منچھر بھی اپنی اصلی صورت پر لوٹ آتی ہے - سارا علاقہ چشم زدن میں سرسبز و شاداب مرغزاروں اور کھیتوں میں تبدیل ہو جاتا ہے - جبھی تو منچھر ایک نہایت شاندار تفریح گاہ کے ساتھ ساتھ نہایت عمدہ شکارگاہ بھی ہے - اس کا مقابلہ تو دنیا کی خوبصورت جھیلوں سے کیا جا سکتا ہے - لیکن صدیوں کی گمنامی نے اسے اب تک حضرات کے دیوانوں اور دنیا کے سیاحوں کی نگاہوں سے محروم رکھا ہے - پاکستان کی یہ سب سے بڑی جھیل آج کروڑوں انسانوں کے خواب و خیال سے کوسوں دور ہے -

جھیل کے خاموش سینے پر زندگی کی ہلچل

افق تا افق :

جدید تنقید کا پیشرو

سید ذاکر اعجاز

تنقید کی ابتدا افلاطون کے چند فقروں سے ہوئی، ارسطو نے بوطیقا لکھ کر اسے ایک باقاعدہ فن بنا دیا۔ اور یہ بدیوانہ کہ اس کی یہ کتاب فن تنقید کی بائبل بن گئی۔ اس کے ایک ایک فقرے کی تاویل میں سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں اور دو ہزار سال تک شعراء اور مصنفین اس کے اصول پر عمل پیرا رہے۔ لیکن ارسطو نے اپنی توجہ زیادہ تر نظم اور ڈرامہ کی ہیئت پر مرکوز رکھی۔ اس نے سوائے چند فقروں کے اور ٹریجڈی کے منصب سے متعلق اپنے اس تصور کے جو نظریہ تنقیع المیہ کے نام سے موسوم ہے۔ شعر و ادب کے تاثیری پہلو پر زیادہ زور نہیں دیا۔ اس کے بعد ایک نقاد کیسیس لان جائی نس اٹھا جو ارسطو کی طرح یونانی الاصل تھا اور جس نے شعر و ادب میں رفعت عظمت کے متعلق ایک رسالہ لکھ کر تاریخ تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا، نئی تنقید کی طرح ڈالی اور اس فن کا پیشرو ثابت ہوا جس کا مطالعہ علم الانتقاد کی نشوونما کے سلسلہ میں لازم ہے۔

لان جائی نس کون تھا؟ یہ سوال سالہا سال سے بحث کا موضوع رہا ہے، اس نام کے دو یونانی عالم گزرے ہیں۔ ایک تیسری صدی عیسوی کا جو تھا تو یونانی الاصل، مگر رہنے والا غالباً ملک شام کا تھا۔ یہ شخص افلاطونی فلسفہ کا بہت بڑا عالم تھا اور خطابت، لسانیات، اور ادب میں بھی اسے ید طولیٰ حاصل تھا۔ ان علوم پر اُس کی متعدد تصنیفات موجود ہیں جن سے اس کے علمی مرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ سیاسی حیثیت سے بھی اس کی شخصیت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ وہ شام کی ملکہ زینوبیا کا مشیر خاص تھا اور آزادی پسند اسے بڑی محبت تھی۔ ملکہ زینوبیا نے اسی کے مشورے سے آرلین نامی شہنشاہ کے خلاف اپنی سلطنت کی آزادی کا اعلان کیا اور اس سے جنگ کی جس کے نتیجہ میں ملکہ کو شکست ہوئی اور لان جائی نس کی زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

اسی کے ہم نام ایک اور شخص کا بھی پتہ چلتا ہے جو سنہ ۳۰ء یا سنہ ۴۰ء کے لگ بھگ روم میں رہتا تھا، اس کے متعلق ہماری معلومات نہایت محدود ہیں، تاہم اتنا ضرور معلوم ہے کہ وہ بھی افلاطون کا پرستار تھا اور فن خطابت میں بھی اسے بڑی مہارت تھی۔

یہ مسئلہ ابھی تک متنازعہ فیہ ہے کہ زیر بحث رسالہ کا اصل مصنف کون سا لان جائی نس ہے۔ پرانے محقق اسے ملکہ زینوبیا کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر آر ڈبلیو رابرٹ اور دوسرے جدید ماہرین فن اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ یہ رومی لان جائی نس کی تصنیف ہے۔ خود رسالہ سے کئی ایسی داخلی شہادتیں ملتی ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پہلی صدی ہی کی تصنیف ہے۔ مثلاً لوگوں کے ناموں یا واقعات کا حوالہ، اسلوب، مصنف کا عام نقطہ نظر وغیرہ۔

رسالہ کا عنوان بھی بڑا دقت آفریں ہے۔ کیونکہ لفظ (SUBLIMITY) کا مفہوم متعین نہیں۔ اس کے لفظی معنے انگریزی میں بلندی (HEIGHT) کے ہیں، لیکن لان جائی نس نے اسے جگہ جگہ "عظمت" (GREATNESS) کے مفہوم میں استعمال کیا ہے اور ساتھ ہی یہ صراحت بھی کر دی گئی ہے کہ عظمت رفعت کے بغیر بھی ممکن ہے۔ بعض انگریز مصنفین "سب لمٹی" یا "سبلائم" کو موثر اسلوب سے تعبیر کرتے ہیں اور اس رسالہ کو محض اسٹائل سے متعلق سمجھتے ہیں، ہماری رائے میں یہ تعبیر جامع نہیں، کیونکہ اس سے مصنف کے نظریہ تنقید کے صرف ایک پہلو کی اہمیت نمایاں ہوتی ہے۔ اس لئے بہتر لفظ کی غیر موجودگی میں ہم "سب لمٹی" کے لفظی ترجمہ "رفعت" کو قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔

لان جائی نس کو "پہلا جدید نقاد" اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے پڑھنے یا سننے والے کے رد عمل اور تاثر کو ادبی تخلیق کی "رفعت" کا معیار قرار دیا ہے اور اُس کے خیالات میں انیسویں صدی کی رومانوی تحریک کی جھلک نظر آتی ہے۔ رسالہ کے پہلے ہی بند میں اس نے لکھا ہے :-

"رفعت ہمیشہ زبان کے حسن و امتیاز میں ہوتی ہے یہی اور صرف یہی خوبی تھی جس کی وجہ سے دنیا کے عظیم شعراء اور مصنفین کو اعلیٰ مرتبہ اور بقائے دوام نصیب ہوا۔ کیونکہ سننے والے پر عظیم عبارت یا اشعار کا اثر ترغیب نہیں بلکہ وجدان ہے۔ ادبی تحریر بالقریہ جوش شدید کر دے لازمی

اور ہمیشہ اس سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے جس میں ترغیب دینے یا خوش کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔"
سننے والے پر عظیم عبارتوں یا اشعار کا اثر ترغیب نہیں بلکہ وجدان ہے۔" اس ایک فقرے سے لالن جائی نس جدید نقادوں کی صف میں آجاتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک ترغیب، اخلاقی تعلیم اور حظ پہنچانا سب ہی شاعری کے فرائض و مقاصد میں شامل ہیں۔ اس کے برعکس لالن جائی نس اہتزاز (ECSTACY) اور سننے والے کی از خود رفتگی ([illegible]) سے کم کسی چیز کو نہیں مانتا۔ اس کے نزدیک ادبی رفعت کی پہچان یہ ہے کہ ناظر ادراک اور حظ کی منزل سے گزر کر ایسے عالم میں پہنچ جائے جہاں نہ عقل کی کچھ پیش جاتی ہے نہ اخلاق کا کوئی معیار کام آتا ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت یوں کرتا ہے کہ رفعتِ کلام کا اثر "ایک کیف بے پناہ ہے جو اسی کا حصہ ہے جو شاعر یا مصنف پر جو تخلیقی لمحات میں طاری ہوتا ہے وہ صحیح مطالعہ سے ناظر میں منتقل ہو جاتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اس کا اپنا کلام یا تصنیف ہے۔

"یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ شعر میں حقیقی رفعت سے (پڑھنے والے) کی روح کو بلندی میسر آتی ہے ..... اس پر کیف و سرور طاری ہو جاتا ہے اور اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا جو کچھ اس نے سنا وہ اسی کی تخلیق ہے۔"

اردو کے سب سے بڑے شاعر مرزا غالب اس نکتہ سے بخوبی واقف تھے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گویا لالن جائی نس کے نظریہ کی رو سے اہتزاز اور کیف و سرور اعلیٰ قسم کے ادب کا سرچشمہ بھی ہیں اور نصب العین بھی۔ اس کے نظریے کے دو پہلو ہیں: ایک کا تعلق فطرت سے ہے اور دوسرے کا فن سے۔ فطری صلاحیتوں کے بغیر لالن جائی نس کے نزدیک رفعت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی رائے میں بڑا شاعر یا مصنف وہی ہے جو بلند خیالات پر گرفت کی صلاحیت رکھتا ہو اور جس میں طاقتور جذبات کی فراوانی ہو۔ کیونکہ بلند خیالات رفعت کا جزوِ لاینفک ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں جذبات کی شدت بھی ضروری ہے۔ یہ دونوں باتیں اکتسابی یا حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ عطیۂ فطرت ہیں۔

تاہم اگر کسی میں دونوں صلاحیتیں موجود ہیں تو اسے اعلیٰ قسم کا ادب پیدا کرنے کی غرض سے فن کا حاصل کرنا بھی انتہا درجہ ضروری ہے۔ اس ضمن میں وہ فطرت کی مثال پیش کر کے کہتا ہے کہ فطرت بجائے خود ایک قانون ہے اور اس میں کہیں بھی بے ترتیبی نہیں ملتی۔ اس کے خیال میں "عظمت کو ایڑ کی اکثر ضرورت پڑتی ہے لیکن اسے لگام بھی ضرور چاہیے۔" لگام سے لالن جائی نس کی مراد نظم و ضبط اور قاعدہ کی پابندی ہے۔ اس کے رسالہ کا معتد بہ حصہ فن سے متعلق ہے بلکہ اس کی تصنیف کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ ادب میں رفعت پیدا کرنے کے طریقے بتائے جائیں۔ اسی وجہ سے وہ اٹھارویں صدی کے یورپ میں کلاسیکی شعرا اور مصنفین کا بھی بڑا مقبول نقاد تھا۔

لیکن لالن جائی نس اپنے رسالہ میں فن یا تکنیک کو کہیں بھی مقصود بالذات قرار نہیں دیتا بلکہ اس کے نظریہ کی ایک جدید خصوصیت یہ ہے کہ اس کی رو سے رفعت کے لئے کسی تحریر کا تمام جزئیات میں فنی معیار پر پورا اترنا ضروری نہیں۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ تکنیک میں کمال بے مائگی کی دلیل ہے جہاں رفعت ہوتی ہے وہاں کچھ غلطیاں بھی ضرور ہوتی ہیں۔ لالن جائی نس کی رائے میں فن اپنی تمام اہمیت کے باوجود فطری صلاحیتوں کو نکھارنے اور ادب میں ان کی موجودگی یا فقدان کے اندازہ لگانے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ فطری صلاحیتوں اور تکنیک کی اہمیت کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے:-

"فطرت خوش قسمتی کے مترادف ہے اور فن بمنزلہ صائب رائے ہے۔ فن ہی سے ہم کو اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ادب کے بعض اثرات کا سرچشمہ فطرت ہی ہے۔"

گویا حصولِ فن صرف عظیم مصنف ہی کے لئے ناگزیر نہیں بلکہ پڑھنے والے کے لئے بھی تمام فنی متضمنات سے واقفیت لازمی ہے۔ شعر و ادب کا پرکھنا آسان کام نہیں، تاوقتیکہ ناظر فنی اصول سے کماحقہٗ واقف نہ ہو اور ادبی تخلیق کا محنت سے مطالعہ نہ کرے، عظیم فن کار کی کاوشوں کی صحیح داد نہیں دے سکتا اور نہ اس وجدانی ارتعاش کو محسوس کر سکتا ہے جو عظیم ادب کی تہ میں کارفرما ہوتا ہے۔

اگر ناظر کے لئے فنی علم لازمی ہے تو شاعر یا ادیب کے فن کی کامیابی بھی اس بات پر موقوف ہے کہ ناظر کے ذہن تک فنکار کی بات پہنچے اور وہ بھی وہی لذت، وہی کیف و سرور محسوس کرے جس کے ماتحت اس کی نظم یا ادبی تخلیق معرضِ وجود میں آئی ہو۔ تاثیر کی اسی کسوٹی پر لالن جائی نس ادب کے تمام فنی عن

کو جانچنا ہے اور بڑی حد تک اُسی کی روشنی میں اُن خامیوں کا تجزیہ کرتا ہے جو ادب کی عظمت کے راستہ میں حائل ہوتی ہیں۔ مثلاً اُس کی رائے میں تشبیہہ و استعارہ کے حسن و قبح کا اندازہ اس کی کامیابی یا ناکامی ہی سے ہو سکتا ہے۔ اگر کسی تشبیہہ کا ناظر پہ خاطر خواہ اثر ہوتا ہے تو فنی لحاظ سے اس کا استعمال جائز ہے ورنہ نہیں۔ اسی طرح ان اسقام کا سبب جو رفعت کے نقیض ہیں یا تو خلوص کا فقدان ہے یا ناظر سے پورا رابطہ قائم کرنے میں مصنف کی ناکامی۔ خلوص کی کمی کا پتہ چلانے کے لئے بھی لان جائی نس کے خیال میں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ناظر متاثر ہوا ہے یا نہیں۔

لان جائی نس نے تکنیک پر سیر حاصل بحث کی ہے لیکن اُس نے اپنے رسالہ میں کہیں بھی رفعت کو کسی خاص ہیئت یا صنف ادب تک محدود نہیں کیا۔ رفعت کی وضاحت کے لئے اس نے تحریر و تقریر، نظم و نثر، رزمیہ، ڈراما، تاریخی کتابیں سبھی سے مثالیں پیش کی ہیں۔ البتہ رفعت کے متعلق اُس کا اہم فقرہ ہماری غزل کے خلاف جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایجاد و اختراع میں شاعر یا مصنف کی مہارت اور ربط و ترتیب کے سلیقہ کا اندازہ محض ایک آدھ عبارت یا شعر سے نہیں ہو سکتا، اس کے لئے کسی ادبی تخلیق کے سارے سیاق و سباق پر حاوی ہونا ضروری ہے۔ نیز لان جائی نس کے نزدیک وجدانی سرمستی سے جو رفعت کی اساس ہے، عظیم ادب کی مقدار بھی معین ہوتی ہے۔ ہماری بہترین شاعری غزلیات پر مشتمل ہے، جن کے مختلف اشعار میں نہ کوئی ترتیب ہوتی ہے نہ ربط۔ اور جن کا ہر شعر ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ البتہ مرزا غالب کی اکثر غزلیں لان جائی نس کے معیار رفعت پر پوری اترتی ہیں۔ کیونکہ ان کے اشعار میں 'موڈ' کی وحدت اور مرزا کی شخصی عظمت کا رشتہ ہر جگہ نمایاں ہوتا ہے۔

لان جائی نس کا انداز تنقید بھی نہایت جدید ہے۔ اس نے اپنے نظریہ کی وضاحت کے لئے قدیم یونانی شعر و ادب سے سینکڑوں اقتباسات پیش کئے ہیں۔ انہی میں یونانی شاعرہ سیفو کی ایک بے نظیر 'اوڈ' بھی ہے جو محض لان جائی نس کے رسالہ کی وجہ سے فنا ہونے سے بچ گئی، لیکن اقتباسات کو اس نے اپنے پیشروؤں یا بعد کے کلاسکی نقادوں کی طرح صرف اصول یا قواعد کی تشریح کے لئے نہیں پیش کیا، بلکہ انہیں پیش کرنے کے لئے اس کا زیادہ تر مقصد یہ ہے کہ اُس کیف و سرور اور لذت کے اسباب بتائے جائیں جو عظیم ادب کا جوہر ہے۔

لان جائی نس کا رسالہ تاریخ تنقید میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے اہتزاز کو ادب کی غایت قرار دے کر اس فن کا وہ خالص جمالیاتی نظریہ پیش کیا جو جدید رومانوی تنقید کی اساس ہے۔ اس لحاظ سے کوئینے کے عہد تک تاریخ تنقید میں ہمیں اس کا کوئی ہمسر نظر نہیں آتا ؎

عمرا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات!
تا ز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

★

"شاعر آتش نوا" ——— بقیہ صفحہ ۱۰

بیت چکے گی رات جب آدمی اور ٹوٹے گا تمہارا سپنا،
جیسے شیشہ ٹھیس سے ٹوٹے اور تھاموگی تم دل اپنا
اور احساس یہ تم کو ہوگا
پاس ہی تھا میں دور نہ تھا
آنکھوں سے دیکھوگی مجھ کو
لیکن چھو نہ سکوگی مجھ کو

یہ ہے ندرالاسلام کا آہنگ جو آج بھی نیا ہے اور ہمیشہ نیا رہے گا۔

★ ★
★

"اسلامی فنون کی نمائش" ——— بقیہ صفحہ ۴۰

پیش کیا جائے۔ یہ نوادر بلاشبہ اس نمائش کے سامانِ تجمل کا ایک نہایت ہی اہم اور بنیادی جزو تھے جس نے اس کو ہر اعتبار سے جامع بنادیا۔

افسوس ہے کہ اس نمائش میں ترکی وایرانی نوادر شامل نہ ہوسکے۔ کیونکہ انہیں دوسری بین الاقوامی نمائشوں میں پیش کرنے کے لئے لے جانا پڑا۔ اس کے باوجود فن و ثقافت کے جو زندۂ جاوید مظاہر اس نمائش میں موجود تھے، وہ اس میں بھرپور کیف پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔

'ناقابلِ فراموش': یہی بلیغ ترین الفاظ ہیں جن سے ہم اس نمائش کو یاد کرسکتے ہیں' اور ہم انہی پر اس مختصر روداد کو ختم کرتے ہیں ؎

نمی گردید کوتہ رشتۂ معنی رہا کردم!
حکایت بود بے پایاں بہ خاموشی ادا کردم

ہماری ڈاک

مدیرِ مکرم۔ آداب

جنوری ۱۹۵۸ء کے "ماہِ نو" میں ڈاکٹر محمد صادق صاحب اپنے مقالہ بعنوان "آزاد کا سفرِ ایران" میں بتاتے ہیں کہ ڈاکٹر لائٹنر "پنجاب کے پہلے انگریزی اخبار" انڈین پبلک اوپینین "کے ایڈیٹر اور مالک تھے۔ اس کام میں پرنسپل کرفن ان کے شریکِ کار تھے۔ یہ وہی اخبار ہے جسے بعد میں "سول ملٹری گزٹ" کا نام دیا گیا۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل گذارشات پیشِ خدمت ہیں۔

(۱) انڈین پبلک یونین کے نام سے پنجاب سے کوئی اخبار جاری نہیں ہوا۔ غالباً مقالہ نگار کی مراد "انڈین پبلک اوپینین" سے ہے۔

(۲) "انڈین پبلک اوپینین" پنجاب میں انگریزی کا پہلا نہیں تیسرا اخبار تھا۔ پہلا اخبار "لاہور کرانیکل" تھا جو ۱۸۵۰ء میں نکلا۔ دوسرا انگریزی اخبار "دی پنجابی" تھا جو ۱۸۵۷ء میں جاری ہوا جس کے مالک منشی محمد عظیم تھے۔ تیسرا انگریزی اخبار "انڈین پبلک اوپینین" تھا جو ۱۸۶۶ء میں شروع ہوا اور ایک سال بعد "لاہور کرانیکل" اس میں مدغم ہو گیا۔

(۳) "انڈین پبلک اوپینین" کے بارے میں یہ کہنا غلط تو نہیں لیکن نادرست ضرور ہے کہ "یہ وہی اخبار ہے جسے بعد میں سول ملٹری گزٹ کا نام دیا گیا" حقیقت یہ ہے کہ سول ملٹری گزٹ کا "وارث اعلیٰ" "مفصل" جو تھا۔ جو پہلے آگرہ سے جاری ہوا پھر انبالہ سے نکلنے لگا۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ پہلے شملہ سے نکلا۔ اور "مفصل" اخبار کچھ عرصہ بعد اس میں مدغم ہو گیا۔ ۱۹ دسمبر ۱۸۷۶ء کو لاہور سے روزنامہ کی حیثیت سے جاری ہوا۔ ۲۹ فروری ۱۸۷۷ء کو اس اخبار نے "انڈین پبلک اوپینین" خرید کر اسے اپنے آپ میں مدغم کر لیا۔

(عبدالسلام خورشید)

★

مکرمی۔ اپریل کے شمارہ میں "طلسمِ خواب" سے کچھ عجیب احساس ہوا۔ جیسے اس کو پڑھتے پڑھتے میں خود کسی خواب میں کھو گیا ہوں۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس سے پہلے ایسی ہی ایک اور چیز کہیں، غالباً نہ ہو جائے، ابھی آپ کے یہاں شائع ہوئی تھی۔ دونوں میں واقعیت اور طلسم کو ملا کر ایک عجیب کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے کولرج نے اپنی بعض نظموں مثلاً (CHRISTABEL) اور (ANCIENT MARINER) میں پیدا کی ہے۔ اردو میں ایک نئی چیز ہے۔ "طلسمِ خواب" میں دار زیادہ بھرپور معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ ہم واقعی سمجھنے لگتے ہیں کہ کشتی چلتی جا رہی ہے۔ بہتی جا رہی ہے۔ لیکن آخر میں یہ کھلتا ہے کہ — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سُنا افسانہ تھا! یعنی جانے والا کہیں بھی نہیں گیا۔ وہ گھاٹ ہی پر شاید سوتے جاگتے میں ایک خواب دیکھتا رہا ہے۔ نظم ایک کھلا فریب یا شعبدہ ہے۔ شاعر یا راوی پڑھنے والے کو اسی خیال میں مبتلا رکھتا ہے کہ وہ کوئی سچ مچ کا واقعہ بیان کر رہا ہے۔ مگر وہ برابر دو رخی یعنی بیک وقت حقیقی و طلسمی بات کر رہا ہے، اور کائیاں ناظر شاید اسے اس کے اشاروں کنایوں سے اس کو بھانپ بھی سکتا ہے، اور فن کار کی یہ بڑی استادی ہے کہ وہ اس کو آخر تک یہ نہیں ہونے دیتا۔ مسمریزم کا عمل شفق کی جھلملاتی روشنی ہی سے شروع ہو جاتا ہے کیونکہ جھٹپٹے کا سماں اس کے لئے بالکل موزوں ہے۔ خمار میں ہلکا ہلکا سرخ پانی، سحر کا پھونکا ہوا سا۔ چینکی لہریں۔ بہکی بہکی راگنی — بدن میں ہولے ہولے، میٹھے میٹھے منتر گاتا ہوا۔ جادوگر مشاق — جنات — مٹکتے دیدے .... تمام بہت ہی عمدہ قسم کے ... ہیں۔ آخر میں حاضرات کی موجودگی، بڑے واضح اور ساتھ ہی ڈھکے چھپے ایمائی پیرائے میں ظاہر کی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ نظم تفصیلی مطالعہ کے لئے ایک بہت عمدہ موضوع مہیا کرتی ہے۔ اور ہماری تخلیقی کوششوں خصوصاً تکنیک اور محاکات میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ کیا اچھا ہو اگر آپ ایسی نظموں پر، خواہ وہ کہیں بھی شائع ہوں، اس قسم کے خیال افروز تبصرے شائع کیا کریں، اس سے شاعری کے "راہ و مقام" کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے، اور ہم ادب و فن کو نئی نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں۔ دیکھیں یہ "التجائے مسافر" قبول ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کی ضرورت تو ہے لیکن — رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند۔ والسلام

گدائے گوشہ نشیں ؛ مشکور حسین

★

جناب ایڈیٹر صاحب۔ ایک افسانہ روانہ خدمت کر رہا ہوں۔ میری مادری زبان بنگلہ ہے لیکن اردو پڑھ رہا ہوں اور فی الحال ڈھاکہ گورنمنٹ کالج میں زیرِ تعلیم ہوں۔ اگر میری ہمت افزائی کی گئی تو انشاء اللہ اور بنگالی افسانے بھی اردو میں ترجمہ کر کے بھیجوں گا۔ جمہوریت نمبر پڑھا، ہر لحاظ سے کامیاب اور قابلِ تحسین ہے۔ میری مبارکباد قبول فرمائیے۔ مخلص :- اے۔ ایچ۔ کبیر
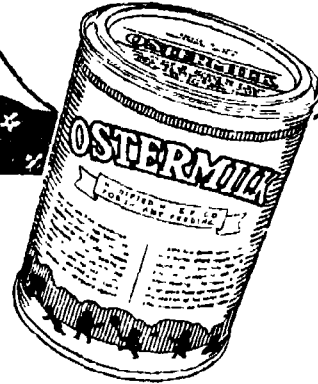
سیدھی
پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچّے کو یہ
خالص دودھ
دیجئے
OSTERMILK
آسٹر ملک ایک خالص قوّت بخش اور غذائیت والا دودھ ہے جو کہ اُن
بچّوں کے لئے بیحد ضروری ہے جنکو کہ مائیں چھاتی کا دودھ کامیابی سے نہیں پلا سکتی
ہیں۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور
لوہا اس لئے ملایا جاتا ہے کہ بچّے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ بچّوں کو
سیدھی پیٹھ اور مضبوط بازوؤں کیلئے اچھی و قوت بخش غذا کی سخت ضرورت ہے۔
اسی لئے آج ہی آپ آسٹر ملک خریدیئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ آپ کا بچّہ بہترین
دودھ پا رہا ہے۔ بہ خاص کر پاکستان میں بچّوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔
آسٹر ملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
سنگترہ کا رس پہلے مہینہ کے بعد سے ہر بچّے کو دینا چاہئے۔ اسمیں وٹامن "سی"
ہوتا ہے جو کہ صحت کے لئے ضروری اور ہاضمہ کے لئے مفید ہے۔ ایک چھوٹے چمچے کے
برابر رس اُسی قدر پانی کے ساتھ ابتدا میں دینا شروع کیجئے۔ ضرورت ہو تو
تھوڑی شکر یا گلوکوز کا تھوڑا گلوکوز ڈی بھی ملا دیا کیجئے۔
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ
P 61

"اردو ناول پر مغربی اثرات" ۔۔۔۔ بقیہ صفحہ ۵۱

بھی کمی ہے اور اس کی خامیوں کے باوجود بہت کم ناول امراؤ جان کی فنی نزاکت اور کمال کو چھو سکتے ہیں

مغرب کے اثرات کا ذکر اشتراکیت اور اشتمالیت کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ ہمارے ناول نگاروں میں پریم چند نے طبقاتی کشمکش اور صنعتی نظام میں مزدور اور سرمایہ داری کے تصادم کو اپنے بعض ناولوں میں بڑی خوبی سے پیش کیا ہے لیکن اکثر ناول نگاروں نے محض بھوک، سرمایہ داری، کسان، مزدور وغیرہ کو سستے نعروں کے طور پر اختیار کر کے ادبی سودے بازی کی ہے مگر ان میں سے کوئی ترگینیو (TURGENEV) یا دستو وسکی نہیں بن سکا۔

مغربی اثرات قبول کرنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہونا چاہئے کہ اردو میں اچھے مغربی ناولوں کا ترجمہ ہوتا۔ افسوس کہ ہماری یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ چند اچھے ناولوں کے ترجمے ضرور ہوئے ہیں لیکن اکثر اوسط درجے کے، اور کبھی کبھی تو تیسرے درجے کے ناولوں کے سستے ترجمے ہوئے ہیں۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری نے بے شمار ناول ترجمہ کئے یا سرقہ کیا۔ رام سروپ کوشل نے وکٹر ہیوگو کے لامزرایبل کا ترجمہ "بدنصیب" کے نام سے کیا۔ محمد علی طبیب نے، جن کا ناول "گورا" بہت مشہور ہے "نیل کا سانپ" کے نام سے "کلوپٹرا" کا ترجمہ کیا۔ ملٹن کے ناول کا ترجمہ "لیلیٰ" کے نام سے ہوا اور عبدالمجید حیرت نے رائیڈر ہیگرڈ کے ایک ناول کا ترجمہ "بنی اسرائیل کے چاند" کے نام سے کیا۔ برٹس کوتم کے ناول کا ترجمہ "بلیک شرٹ" کے نام سے ایسٹ لین کا ترجمہ "سیل حوادث" کے نام سے کانن ڈائل کے شرلک ہومز کا ترجمہ "وادیٔ خوف" کے نام سے ہوا ہے۔ یہ فہرست خاصی طویل ہے اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے لیکن ان ترجموں کا اثر اردو ناول کے فن پر بہت کم پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں ایسے ناولوں کی آج بھی کمی ہے جو دنیا کے مشہور ناول نگاروں کے شہ پاروں کے مقابلے میں لائے جا سکتے ہیں۔

ناول کا فن سخت ریاض چاہتا ہے۔ ہمارے فن کار اس ریاض سے جی چراتے ہیں اور کم سے کم مزاحمت کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اسلئے ناول کو بھی افسانہ بنا دیتے ہیں۔ اچھے ناول کے لئے اتنی ہی ضبط و تحمل کی ضرورت ہے جتنی ایک طویل اعلیٰ رزمیہ کی تخلیق کے لئے، اور افسوس کہ اردو اب تک ان دونوں سے محروم ہے۔

(بہ شکریہ: ریڈیو پاکستان کراچی)

ماہِ نو

جلد ۱۱ ـــــ شمارہ ۳

جون ۱۹۵۸ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے
فی کاپی ۸ آنے

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

اپنی باتیں

کسی قوم کی عزیز ترین متاع اس کے مشاہیر کی یادگاریں ہیں، خصوصاً وہ مشاہیر جنہوں نے اپنے افکار و خیالات سے قوم کی تعمیر کی ہو۔ اسی بنا پر ہم علامہ اقبالؒ کی ہر برسی پر مشرق و مغرب کے ارباب فکر و نظر کے شہ پاروں کے ساتھ ساتھ ایسے نوادر بھی پیش کرتے رہے ہیں، جن سے ہمارے قومی ورثہ میں اضافہ ہو۔ پچھلے برس ہم نے شرف النساء کے مزار کی تصاویر شائع کی تھیں جو اتفاق سے اس وقت تک پردۂ گمنامی میں مستور تھا۔ اب کی ہم علامہ مرحوم کی بعض ایسی یادگاروں کو منظر عام پر لا رہے ہیں جو ان کی ذات گرامی سے منسوب ہونے کی بنا پر قابل قدر ہیں ع

اے گل بہ تو خورسندم تو بوئے کسے داری

ان یادگاروں میں سے بعض کو تبرکات کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ پہلے اسلامی نوادر کی اس نمائش میں پیش کی گئی تھیں جو مذاکرۂ اسلامیہ کے سلسلہ میں منعقد ہوئی تھی۔ اور بقیہ نوادر اقبالؒ کی اس نمائش میں پیش کی گئیں جو پچھلے دنوں "اقبال اکاڈمی" کے زیر اہتمام فریئر ہال کراچی میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ تبرکات وہ ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں جن کو ارباب ذوق نے بہ صد خلوص و عقیدت محفوظ کر لیا ہے اور وہ اب ہمارا قومی سرمایہ ہیں۔ انہی کے ساتھ ہم چند اور اہم پیشکشوں کا عکس بھی پیش کر رہے ہیں جو اس نمائش کی زینت تھے۔ معنوی اعتبار سے اقبال کی فقہ اسلامی سے متعلق مجوزہ کتاب کا خاکہ سب سے اہم ہے جس کی تفصیلات "ڈاکٹر مولوی محمد شفیع نے حضرت علامہ کی زبانی سن کر انہی کے حسب ایماء حوالۂ قرطاس کی تھیں۔ امید ہے کہ ہمارے محبوب شاعر و فلسفی کی یادگاروں کا یہ نادر مجموعہ ارباب نظر کے لئے غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اردو کے دو اہل چشم و چراغ ڈاکٹر تاثیر اور مولانا چراغ حسن حسرت ہیں جن کے فیضان پر روشنی ڈالنے کی عرصہ سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ ان دونوں نے زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دیں جن کی یاد ان کی ذاتی یادوں کی طرح بدستور تازہ ہے۔ اس شمارہ کے ایک مضمون نگار نے ان کو محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ معروف ادیبوں کے فیضان کو نمایاں کرنے کی کوششیں آئندہ بھی جاری رہیں گی۔

★

زبان و ادب کی نشو و نما تازہ بہ تازہ نو بہ نو یعنی زندہ مسائل کی تلاش اور ان کا حل پیش کرنے ہی پر موقوف ہے۔ ان مسائل سے مراد ایسے اہم بنیادی اور نتیجہ خیز مسائل ہیں جن سے فکر و نیال میں حرکت پیدا ہو اور تجربہ و کوشش کا سلسلہ آگے بڑھے۔ اس شمارہ میں ڈاکٹر محمد باقر نے ایک ایسا ہی مسئلہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ ان کا مبحث درحقیقت کچھ ایسا نیا نہیں اور اس پر دور جدید سے کہیں پہلے انشا جیسا ماہر لسانیات اپنی تصنیف "دریائے فصاحت" میں کافی روشنی ڈال چکا ہے۔ مضمون نگار نے جو کچھ کہا ہے ہم نے اسے جوں کا توں پیش کر دیا ہے۔ تاکہ قارئین اس کے متعلق خود رائے قائم کر لیں۔ ادارہ کا موقف اس بارہ میں غیر جانبدارانہ ہے۔ مذاکرہ کے بندھے ٹکے پیرایے میں تنوع اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ہم نے یہ مقالہ چند اور ارباب نظر کو دکھایا اور ان کی رائیں حاصل کر لیں۔ جو اصل مضمون کے ساتھ ہی پیش کر دی گئی ہیں۔ اس سے بحث کے موافق و مخالف دونوں پہلو واضح ہو جائیں گے۔ تاہم یہ صرف ابتدا ہے۔ امید ہے کہ دیگر اہل الرائے اس کو اور بھی آگے بڑھائیں گے۔

پچھلے شمارہ میں ایک نئے ناول پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا تھا۔ اب کی ایک نئی شعری تصنیف "ایران میں اجنبی" پر نظر ڈالی جا رہی ہے۔ ایسے مضامین سے نہ صرف نئی اور اہم تصانیف کا تعارف مقصود ہے بلکہ یہ امر بھی پیش نظر ہے کہ شعر و ادب کی رفتار اور ادبی رجحانات نمایاں ہوں ؎

سرورق۔ کنول کے پھول	(رنگین عکس)	احسان، ملک
تصاویر: "اردو کے دو چشم و چراغ"		(بہ توسط سید ضمیر جعفری)

یادِ رفتگاں :

ڈاکٹر محمد دین تاثیر (مرحوم) ★ مولانا چراغ حسن حسرت (مرحوم)

★

یوسف حسن صدیقی

آج سے کچھ عرصہ پہلے دو ممتاز ہستیاں ہم میں گرمِ نوا تھیں جن کو بجا طور پر اُردو کے چشم و چراغ کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر اور مولانا چراغ حسن حسرت۔ یہ دونوں اپنے ساتھ غیر معمولی صلاحیتیں لے کر آئے تھے اور انہوں نے اپنے زورِ قلم سے تمام برصغیر میں نام پیدا کیا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہے ادبی حلقوں میں خاصی رونق اور گہما گہمی محسوس کی جاتی رہی۔ دونوں کو ادب و صحافت کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا اور اس کا نتیجہ رنگا رنگ بزم آرائیاں، جو افسوس ہے! آج گلدستۂ طاقِ نسیاں ہو گئی ہیں۔ تاہم ان کے نام آج بھی کتنی ہی یادوں کی سلسلہ جنبانی کرتے ہیں۔

جن لوگوں کی ان کے ساتھ رسم و راہ رہی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ ہم نوالہ و ہم پیالہ رہے تو "من تو شدم تو من شدی" کی حد تک جو رندوں کا شیوہ ہے۔ اور لڑنے پر آئے تو اس طرح کہ انشاء و مصحفی کی یاد تازہ ہو گئی۔ یعنی بات صرف استادوں ہی تک نہیں رہی بلکہ ان کے دوست، ہم نشیں، شاگرد، سب کے سب میدان میں کود پڑے۔ اہلِ قلم نے اہلِ سیف کا رُوپ دھار لیا اور کوئی "مردِ مجاہد" ایسا نہ رہا جو ایک طرف یا دوسری طرف سے شریکِ کارزار نہ ہوا ہو۔ آخر کار اس رَن میں نہ یہ ہارا نہ وہ جیتا۔ بلکہ دونوں میں صلح ہو گئی اور وہ پھر اسی طرح شیر و شکر ہو گئے جس طرح ہم نوالہ و ہم پیالہ لوگ ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ آج ان کا تذکرہ بھی یکجا ہی ہو رہا ہے۔

یوں بھی ہم ان دونوں کو ایک ہی دَور میں ابھرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ ان کی عمریں، ان کی زندگیاں اسی کی متقاضی تھیں اور پھر یہ بھی کہ انکی سرگرمیوں کا مرکز بھی ایک ہی تھا۔ لاہور۔ اپنے تعلیمی ماحول، اپنی بھرپور علمی و ادبی فضا، اپنی صحافتی تیز رفتاری و گرم بازاری، روزافزوں ثقافتی ذوق و شوق، دیرینہ سنگلاخ رسوم و قیود سے آزادی، تازہ بتازہ نو بنو تحریکات اور غیر معمولی بحث و نزاع، قدیم و جدید، مشرق و مغرب کے اختلاط وغیرہ وغیرہ کے ساتھ جو دل و دماغ میں نئی نئی جنبشیں اور ادب و فن میں نئی نئی کروٹیں پیدا کر رہے تھے۔ دورِ اوّل کے صدر نشیں حالی، شبلی، آزاد، نذیر احمد اور ان کے ساتھی ایک نیا آہنگ پیدا کر کے رخصت ہو چکے تھے لیکن ان کی آواز برابر گونج رہی تھی۔ ان کے جانشینوں، اقبال، ابوالکلام آزاد، اکبر الہ آبادی، آغا حشر اور ظفر علی خاں نے اس آہنگ کو دوبالا کر کے اور بھی غلغلہ پیدا کر دیا تھا۔ خصوصاً علامہ اقبال کی تخلیقی سرگرمیاں اپنے پورے عروج پر تھیں اور یکے بعد دیگرے متعدد تصانیف کی مسلسل اشاعت ایک مستقل اور بہت ہی بھرپور قسم کے اثر کا باعث ہو رہی تھی۔ اُدھر مغربی ثقافت نے لاہور کے تعلیمی اداروں اور "زندہ دلانِ پنجاب" کے حساس دل و دماغ میں ایک بہت ہی زرخیز میدان پا لیا تھا۔ یہ اثرات ان آفاقی رجحانات کا پیش خیمہ تھے جو اس فضا میں بڑی تیزی سے ترقی کر رہے تھے۔

ادھر "زمیندار" کی ہمہ گیر مقبولیت نے صحافت کا نقش پوری طرح راسخ کر دیا تھا اور اس میں ایسا پھیلاؤ، ایسی گہرائی پیدا کر دی تھی کہ پنجاب میں صحافت کا عروج و اقتدار بالکل یقینی ہو گیا۔ چنانچہ "انقلاب"، "احسان"، "شہباز"، "آزاد" اور دیگر اخبارات کا ایک بے پایاں اور گرانقدر سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ "مخزن" کی تیار کی ہوئی زمین سے رسائل و جرائد بھی کثرت سے اُبھرنے لگے اور صحافت کی اس نوع نے بھی ایک نہایت موقر و معتبر حیثیت پیدا کر لی۔ اس کے ساتھ ہی زبان نے بھی خوب بال و پر پیدا کئے۔ مشاعروں نے رفتہ رفتہ ایسی دھوم دھام پیدا کر لی کہ اپنے

ساتھ زبان و ادب کو بھی لے اُڑے۔ یہاں تک کہ خود "اہلِ زبان" کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ع

"مرکزِ زبانِ اُردو کا لاہور ہو گیا"

یہ فضا تھی جس میں نئے نئے جوہروں کو اُبھارنے اور چمکانے کی گوناگوں صلاحیتیں تھیں۔ اس میں ایک مستقل تحریک، ایک ترغیب مضمر تھی جس نے نو قلموں امکانات کے لئے ایک وسیع میدان پیدا کر دیا تھا اور جوہرِ قابل ان کی طرف رجوع کر کے غیر معمولی آب و تاب پیدا کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر اور چراغ حسن حسرت کا شمار انہی اربابِ کمال میں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک طرف عام جدید رُجحانات اور دوسری طرف مغربی علوم و فنون کی ترویج نے جلد ہی ایسے ذہین افراد پیدا کر دئے تھے جن میں فکر و ادب کو نئی طرح عطا کرنے کا مادّہ بھی تھا اور اس کی لگن بھی۔ چنانچہ صحافت کو جو طرح مولانا ظفر علی خاں نے عطا کی تھی وہ اس کا نمونہ قرار پائی۔ خود مولانا ظفر علی خاں صحافت کے استاد تھے۔ اور اُن کا اخبار "زمیندار" نئے صحافیوں کی تربیت گاہ، اُن کا وسیلۂ معاش اور صحافت کا معیاری نمونہ — لہٰذا جب یہ لوگ تربیت پا کر نکلے تو انھوں نے "زمیندار" ہی کا اسلوب اختیار کیا۔ اور سنجیدہ پہلو کے ساتھ ساتھ اس کے تفریحی کالم کو بھی نئے نئے عنوانات کے ساتھ اپنایا۔ غرض اندازِ صحافت، تبحرِ علمی، زباں دانی، ہنگامی شاعری اور طنز و مزاح کا جو نقش "زمیندار" نے قائم کیا تھا وہ اس کے دبستان کا مستقل و مشترکہ سرمایہ قرار پایا۔ اور نئے صحافیوں — مولانا غلام رسول مہر، مولانا عبدالمجید سالک وغیرہم نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس کو اپنایا، چمکایا، بدلا، بڑھایا۔

چراغ حسن حسرت ادب و صحافت کے اس مخلوط دبستان کا ایک نمایاں مظہر تھے۔ انہیں محض مولانا ظفر علی خاں کے خرمنِ فیض کا خوشہ چیں یا ان کا مقلد و متبع قرار دینا شاید صحیح نہ ہو۔ گو ان کی شہرت "زمیندار" کا وابستۂ دامن ہونے ہی کی حیثیت سے ہوئی۔ ان کی انشا پردازی یا فکاہیہ نگاری کو ظفر علی خاں کی دین قرار دینے کی بجائے ایک ہم ذوق و ہم رنگ صحافی و ادیب کا نتیجۂ فکر قرار دینا مناسب ہوگا۔ کیونکہ وہ "عصرِ جدید" (کلکتہ) کے "کوچہ گرد" کی حیثیت سے پہلے بھی ایک طرزِ خاص کے مالک تھے جس میں ان کے خداداد علمی ذوق اور بذلہ سنجی کو نمایاں دخل ہے۔ ذوقِ سلیم اور شستہ و رفتہ بامحاورہ زبان کے شوق نے ان کے علمی تبحر کو گراں بار ہونے سے باز رکھا۔ وہ صحافت و ادب کے نفیس امتزاج سے ایک ہلکا پھلکا، سجل مگر ساتھ ہی باوقار انداز پیدا کرتے ہیں جس سے ایک فرحت انگیز سادگی اور تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جوہر سب سے زیادہ ایک لطیف و شگفتہ قسم کے مزاح میں کھلے جو بے ساختہ بھی ہے اور عالمانہ بھی۔ اور جس کا نمونہ "حرف و حکایت" کے بے شمار کالم اور ایک مستقل تصنیف "پنجاب کا جغرافیہ" ہیں۔ حسرت میں الفاظ اور ناموں سے مزاحیہ نکات پیدا کرنے کا خاص سلیقہ ہے اور وہ اپنے جوہرِ تفکر کو واقعات میں اس طرح سمو دیتے ہیں کہ سارا سلسلہ اٹکھیلیوں کا دریائے رواں معلوم ہوتا ہے۔ مگر درحقیقت یہ دریا ننھی ننھی کرچوں کا دریا ہے۔ ہم اس کو پانی کی چادر سمجھتے ہیں لیکن اس کی تہہ میں طنز و تعریض کے ایسے ان گنت چبھنے والے پارے چھپے ہوتے ہیں جن سے پاؤں یہاں تک کہ پورا نظام بھی لہولہان ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کشمیر کے متعلق ان نوکیلی کرچوں کی خونچکانی کی داد کون نہ دے گا۔ —

> "کشمیر کے سلسلے میں حکومتِ ہند کا وائٹ پیپر بھی اصل میں ... زیادہ موزوں ہوگا۔ بڑی دلچسپ چیز ہے۔ کہنے کو تو یہ وائٹ پیپر ہے لیکن مہاراجہ گلاب سنگھ اور [illegible] کے اقتدار کی وجہ سے ذرا کالا ہو گیا ہے۔ تعجب ہے کہ ہندوستان کی حکومت کو اس بات کا احساس نہیں ہوا۔ کیا اچھا ہو کہ حکومتِ ہند اس وائٹ پیپر [illegible] کہ ڈوگروں کے عہد میں کشمیر کے اندر کتنی مرتبہ قحط کی آفت آئی۔ سیلاب اور آتش زدگی سے کتنی جانیں ضائع ہوئیں ... کو ترکِ وطن پر مجبور ہونا پڑا۔ وائٹ پیپر کو کالا ہی کرنا تھا تو پوری طرح کالا کر دیا ہوتا۔ اب تو یہ وائٹ پیپر کو دیکھ کے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکومتِ ہند نے سرکار کے باورچی خانے میں سفیدی کروانے کی کوشش کی ہے۔"

اے کاش! مولانا آج زندہ ہوتے۔ وہ جو سفید یا سیاہ پیپر اب تک ہوئی ہیں ان کو اسی طرح چبھتی چبھتی کرچیں بچھا بچھا کر پیش کرتے تاکہ جو پاؤں مظلوموں کے "استخوانِ شکستہ" پر چل چل کر بالکل بے حس ہو چکے ہیں، ان کو بھی ان کی چبھن رلائے بغیر نہ چھوڑتی۔ اے کاش! کشمیر کی یہ بپتا ایک اور "جغرافیہ" کی شکل اختیار کرتی کیونکہ جس طرح مولانا نے اس قدر وسیع پیمانہ پر "جغرافیہ پنجاب" لکھ کر سیاسیات کو نازک خیالی کا لطیف مگر خاردار اور
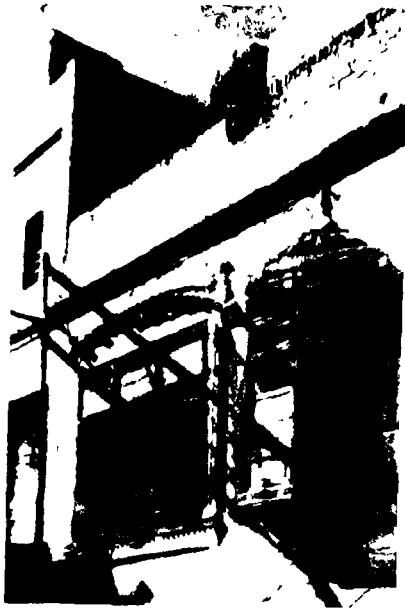
مولانا چراغ حسن حسرت (مرحوم)
(اوائل عمر میں)

اردو کے دو چشم و چراغ

فیض ہمارے ملک کے ان شاعروں میں ہے۔ جنہوں نے
اپنے ہم عصر شعرا کو بہت متاثر کیا ہے۔ یہ
ناممکن ہے۔ کہ کوئی شخص اردو شاعری
کی تاریخ لکھے۔ اور فیض کو نظر انداز
کر جائے۔ ان کی شاعری میں ترنم کا احساس
بڑا اونچا اور گداز ہے۔ مجھے یقین ہے۔ کہ ان کی
آواز اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہے گی

چراغ حسن حسرت

زہر میں بسا ہوا جامہ پہنا دیا ہے اور اس طرح ایک نہایت اچھوتا استعارہ وضع کیا ہے۔ اسی طرح وہ "وادیٔ مظلوم" اور "خطۂ بسمل" کا بھی ایک دردناک سا گا تیار کر دیتے۔

ایک بڑی بات یہ ہے کہ حسرت کا مزاج محض لطائف و ظرائف کا مجموعہ نہیں بلکہ اس کا دامن معلومات کے انمول جواہر پاروں سے بھرا پڑا ہے جس سے اس کا سلسلہ ادب سے جا ملتا ہے۔ اگر کوئی کسر ہے تو یہ کہ صحافت پوری طرح ادب کے سانچے میں ڈھلنے نہیں پاتی یعنی اس میں وہ ذاتی لہجہ، وہ تیور، وہ تخلیقی جوہر پیدا نہیں ہوتے جس سے کسی نقش میں رنگِ دوام پیدا ہوتا ہے۔

حسرت کے برعکس ان کے دوست و ہمعصر ڈاکٹر تاثیر کی وضع مغربی ہے حسرت کی تعلیم بڑی حد تک مشرقی ہی رہی۔ اس لئے ان کی محبوب دنیا "فسانۂ عجائب" ہی کی دنیا رہی جو اُن کے نزدیک ذخیرۂ معلومات ہوتے ہوئے شستہ و رفتہ بامحاورہ زبان کا سرچشمہ بھی ہے۔ ڈاکٹر تاثیر کا رُخ مغرب کی طرف ہے۔ ان دونوں کا فرق بیک وقت علامت بھی ہے اور حقیقت بھی۔ کیونکہ "مولانا" سے "ڈاکٹر" تک تبدیلی معاشرہ میں اس تبدیلی کی آئینہ دار ہے کہ اس کا رُخ قدیم سے جدید اور مشرق سے مغرب کی طرف ہوتا جا رہا ہے۔ "سندباد جہازی" کی زندگی اخبارات کے دشتِ سیاحی میں ہی گزری۔ اس کے برعکس تاثیر ایک جدید ادیب کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ اخبارات کے کالم نویس کی بجائے رسائل و جرائد کے مضمون نگار اور کتابوں کے مقدمہ نویس کی حیثیت سے۔ اس کام کے لئے ان کا ہرسو خرام اور زود نویس قلم بہت موزوں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریریں بڑی متفرق اور ساتھ ہی منتشر قسم کی ہیں۔ ان کی واحد مستقل تصنیف "آتشکدہ" ان کی وفات کے بعد ہی مرتب ہوئی۔

ڈاکٹر تاثیر کی حیثیت ایک بوقلموں نویس صحافی ادیب کی ہے۔ وہ نقاد بھی ہیں اور شاعر بھی۔ اور شاعری میں مختلف کوچوں کے سیّاح۔ چنانچہ غزل، قطعہ اور رباعی کی روایتی اصناف ہوں یا جدید نظم (پابند، آزاد، اور گیت) سب ان کی دلچسپیوں کے دائرہ میں شامل ہیں اور وہ ان سے یکساں طور پر مانوس۔ یہی صحافتی مسلک قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے سلسلہ میں بھی نمایاں ہے۔ کیونکہ ایک کامیاب صحافی کی علامت یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں جولانیٔ طبع دکھا سکے۔ اس کے لئے فکر میں غیر معمولی تیزی و تازگی لازم نہیں۔ بلکہ یہ اس عمل میں سدِّ راہ ہے تاثیر اپنی وسعتِ مطالعہ کے باوجود، جو مشرقی و مغربی علوم و ادب پر حاوی تھی اندازِ فکر میں اعتدال کی طرف مائل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی ہو یا ادب، ان کے متعلق اُن کا کوئی مخصوص تصور، نظریہ یا آدرش نہیں۔ جو کچھ ہے وہ ہنگامی تاثر ہے۔ ایسے افکار کی جھلک کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی جن کو ان کے نظامِ فکر میں نمایاں حیثیت حاصل ہو۔ وہ زیادہ تر معروف افکار ہی ہیں۔ شاید یہ کمی انہوں نے خود بھی محسوس کی اور پاسنگ کے طور پر اشتراکیت کو اپنا لیا۔ وہ بھی بظاہر مشغلے یا رُت کی مقبول چیز کے طور پر۔ اس میں کسی گہرے تاثر کی جھلک نظر نہیں آتی۔ یوں بھی علی العموم تاثیر کی شاعری گزراں لمحوں کے رواں دواں تاثرات اور نقوش ہی کی شاعری ہے۔ اس سے کوئی عمیق احساس نہیں اُبھرتا جو قاری کے دل و دماغ پر چھا جائے۔ ہاں ایک گونہ احساس ضرور ہے جو تاثیر کی ایک ہلکی سی لہر پیدا کر کے محو ہو جاتا ہے۔ الفاظ، تمثیلات اور اسالیب میں بھی وہ اسی قسم کے تفنن اور ہرسو خرامی کے قائل ہیں۔ فکر و احساس کے دبتے ہوئے پہلوؤں کو وہ ایک گونج دار آواز سے اُبھارتے ہیں اور یہ حکمتِ عملی بعض اوقات مشاعروں کی طرح تحریر میں بھی کامیاب ثابت ہوتی ہے تخلیق کی [illegible] کیفیت [illegible] بہترین اور طویل ترین نظم "ید بیضا" [illegible] بھی نمایاں ہے۔ یعنی اس میں بیان زیادہ ہے ایمائیت [illegible]

نثر میں بعض اوقات [illegible] ہے اور اُردو کو ایک نئی توانائی عطا کرتا ہے [illegible] زیادہ توجہ [illegible] اور اس کا حق [illegible] گیا الفت نہیں بلاشبہ تاثیر کے بعض [illegible] نظم [illegible] رباعی کا بہ پُر کیف ترجمہ بھی ہے جو خیام [illegible] زیادہ تاثیر کے حسنِ طبع کا [illegible]

اور [illegible] وہ بھر رہا ہے
[illegible] ہے جو جام [illegible] ہے
[illegible] کا شکاری اُٹھا ہے [illegible]
اک [illegible] میں قصر [illegible] پیچ میں قصر دارا ہے

★

ماہِ نو، کراچی۔ جون ۱۹۵۸ء

مذاکرہ:

اُردو زبان کی توسیع

ڈاکٹر محمد باقر
شان الحق حقی
جمیل نقوی

ڈاکٹر محمد باقر

اُردو میں ایسے کتنے کلمات ہیں جن کو صرف اُردو کے الفاظ کہا جا سکے اور جن کا مادہ یا اصلی شکل کسی اور زبان میں موجود نہیں؟ یہ ایک دلچسپ سوال ہے۔ غالباً سید احمد دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ" نے ایسے الفاظ کی فہرست تیار کرنے کی کوشش کی تھی جو خالصتہً اُردو کے ہیں۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو ان میں سے کتنے ہی الفاظ خالص اُردو کے نہیں بلکہ ان کا ماخذ پنجابی اور متعدد ہندوستان کی دوسری بولیاں ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں اُردو کا سرمایۂ الفاظ بہت ہی قلیل تھا۔ بعد میں وقت کے تقاضوں اور روز افزوں ضروریات کے باعث اس میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوا۔ یہ الفاظ زیادہ تر عربی و فارسی سے ماخوذ ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا جب اُردو میں یہ الفاظ بڑی کثرت سے استعمال ہونے لگے اور انگریزوں نے اُردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور انگریزی سے اس کا تصادم ہوتے دیکھ کر مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اُردو جیسی سیدھی سادی زبان کو عربی و فارسی کے سنگین الفاظ سے گراں بار نہ کریں۔ ساتھ ہی اُردو نواز ہندوؤں کو بھی ترغیب دلائی کہ وہ بھی مسلمانوں کو یہی کہیں کہ اُردو کی سادہ وضع برقرار رہنی چاہیئے ورنہ وہ ہندی کا رُخ کر لیں گے۔ مسلمان اس بھتّرے میں آگئے اور انہوں نے اُردو کو سادہ بنا کر عربی و فارسی سے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج سے تقریباً پچاس سال پہلے مسلمانوں نے ذہنی طور پر یہ خاموش اور خطرناک تحریک قبول کر لی کہ اُردو میں انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کے کلمات تو داخل ہوتے رہیں لیکن عربی و فارسی پر اس کا دروازہ بند ہو جائے۔

یہ طرزِ عمل اُردو کی نشو و نما اور توسیع میں بہت حد تک حارج ہوا۔ بیشک زبان ایسی بولنی اور لکھنی چاہیئے جسے اکثر لوگ سمجھ سکیں، نہ کہ لکھنے والے کے چند حواری ہی اس کی داد دے سکیں۔ افادی اعتبار سے زبان وہی اچھی ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔ ادق بنا کر اس کا حلقۂ اثر محدود کر دینا کوئی خوبی نہیں۔ مگر جس زبان کا سرمایہ مستعار کلمات اور تراکیب پر مشتمل ہو اس کے حق میں یہ بات بھی مسلّم قائل ہے کہ اس میں بالخصوص اُن زبانوں کے الفاظ کو راہ نہ دی جائے جن سے اس کا ہیولیٰ تیار ہوا ہے اور جو اس کے عناصر ترکیبی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اُردو نے بالعموم عربی و فارسی کلمات مستعار لینے بند کر دیے ہیں۔ اس کی توسیع رک گئی ہے۔ یہاں تک کہ اب وہ وقت آپہنچا ہے جب توسیع زبان کے سلسلہ میں اردو داں طبقہ غیر شعوری طور پر خود کو عربی و فارسی کی ضرورت سے بے نیاز سمجھنے لگا ہے اور ان کے ادب اور علوم و معارف کے مطالعہ سے دُور ہٹ گیا ہے۔ اس بے نیازی، اس بُعد اور اس ناساز الفاق نے اردو کو اس سرمایۂ الفاظ تک محدود کر دیا ہے جو ہمارے بزرگوں نے جمع کیا تھا۔ ہماری نسل چونکہ عصرِ حاضر کے عربی و فارسی ادب سے بیگانہ ہے اس لئے یہ اُن کلمات سے بھی بے خبر ہے جو ان زبانوں میں عصری تقاضوں کے باعث ایجاد یا وضع ہوئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس عام بے خبری و لاعلمی کی فضا میں اردو کے لئے ان زبانوں کے الفاظ اپنانا بہت دشوار تھا۔ مانا کہ کچھ اردو دانوں نے ان زبانوں اور ان کے ادب سے اپنا تعلق قائم رکھا لیکن یہ تو گنتی کے آدمی ہیں۔ اور ان میں سے بھی ادیب یا شاعر اور بھی کم ہیں۔ اس لئے نہ تو یہ موثر طور پر زبان کی توسیع کر سکتے ہیں۔ نہ اردو کے سرمایۂ الفاظ میں معتدبہ اضافہ ہی کر سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر اس صدی کے آغاز میں ایرانیوں نے لاؤڈ اسپیکر کے لئے "بلندگو" کا ایک سادہ اور دلکش کلمہ ایجاد کیا۔ اسی طرح PAVEMENT کے لئے "پیادہ رو" کا کلمہ وضع کیا۔ اگر گذشتہ صدی کی طرح معاصر ایرانی ادب بھی ہمارے پیش نظر رہتا تو ہم بڑی آسانی سے ان الفاظ کو اپنا سکتے۔ لیکن چونکہ ہم میں سے اکثر لوگ اس ادب سے بے خبر ہیں اس لئے اردو میں یا تو "لاؤڈ اسپیکر" کا بھونڈا لفظ لکھتے ہیں یا عربی کی ایک خود ساختہ سنگین ترکیب

"آلۂ جہیر الصوت" یا "آلۂ مکبّر الصوت" استعمال کرتے ہیں ۔ اور PAVEMENT کا صحیح بدل تو اُردو میں شاید ایجاد ہی نہیں ہوا ۔ البتہ کبھی پٹری اور کبھی پا تری سے، یہ کام لیا گیا ہے ۔

اِسی طرح سے REFRIGERATOR کے لئے اُردو میں ابھی تک کوئی لفظ وضع نہیں ہوا ۔ اہلِ ایران نے اس کے لئے یخچال (یخ + چال = برف + گڑھا) کا لفظ بنا لیا ہے ۔ AUTOMATIC کے لئے ایرانیوں نے ایک سادہ و دلکش ترکیب "خودکار" ایجاد کی ہے ۔ اسی طرح علوم و فنون کی بیشمار سادہ، موزوں اور پُر معنی اصطلاحیں فارسی اور عربی بولنے والوں نے وضع کی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی میں اُردو کے اُونچے درجے کے امتحانوں میں بھی اب فارسی و عربی کا کوئی دخل نہیں ۔ کبھی کبھی انگریزی اصطلاحوں کے تراجم کی ضرورت پیش آئی تو اُردو دانوں نے فارسی و عربی کی طرف رجوع کیا ہے لیکن بالعموم ایک ایسی فضا پیدا ہو گئی ہے جس میں اُردو داں حضرات عربی فارسی کی ضرورت سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھنے لگے ہیں ۔

اس بے نیازی کا ایک اور نتیجہ کلمات کا غلط تلفظ ہے ۔ عربی کے تلفظ کے بندھے ٹکے اُصول ہیں ۔ فارسی لغت نویسوں نے بھی اپنی زبان کے کلمات کا تلفظ مقرر کر دیا ہے لیکن اگر ان منابع تک اُردو بولنے والوں کی رسائی ہی نہ ہو یا وہ اس کی ضرورت ہی نہ سمجھیں تو صحیح اور معیاری تلفظ کیسے رواج پا سکتا ہے ؟ اِس موضوع پر ان لوگوں سے جن کی مادری زبان اُردو ہے، کبھی کبھار گفتگو کا موقع ملا ہے تو ان میں سے بعض نے اس امر پر اصرار کیا ہے کہ عربی فارسی کے کلمات کا اصلی تلفظ کچھ ہی کیوں نہ ہو ہم تو ان کا وہی تلفّظ کریں گے جو ہماری زبان میں رائج ہو گیا ہے یعنی باقِر کو باقَر اور وقَار کو وِقار ہی کہیں گے ۔ یہ نقطۂ نظر نہ صرف غلط بلکہ علمی لحاظ سے گمراہ کُن ہے ۔ اُردو کا تار و پود فارسی او رعربی سے بنا ہے اور نفاستِ ذوق کا تقاضا یہی ہے کہ اِن زبانوں سے جو الفاظ مستعار لئے گئے ہیں یا اپنا لئے گئے ہیں اُن کا صحیح تلفظ رائج کریں کہ علم کا تقاضا بھی یہی ہے ۔

اُردو کے لئے فارسی و عربی جیسے اہم سرچشموں سے استفادہ بدیہی طور پر ناگزیر ہے لیکن اب جبکہ اردو کے دلدادہ یہ خواہش رکھتے ہیں کہ کم از کم مغربی پاکستان میں یہ زبان قومی زبان قرار دی جائے تو انہیں اس فراخدلی کا ثبوت بھی دینا پڑے گا کہ جس طرح اس میں انگریزی کے الفاظ قبول کئے جا رہے ہیں اسی طرح اُن علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی قبول کئے جائیں جن کے بدل اُردو میں موجود نہیں ۔ مثلاً پنجابی کا ایک لفظ "لشکارا" ہے جس کے مفہوم کو اُردو کا کوئی ایک لفظ ادا نہیں کر سکتا ۔ یہ اُس قسم کی آنی اور تیز چمک ہے جو آنکھوں میں چکا چوند پیدا کرتی ہے ۔ میرے خیال میں اگر اُردو اسے اپنا لے تو کوئی مضائقہ نہیں ۔ اسی طرح سندھی، ملتانی اور پشتو میں ایسے خوبصورت اور صوتی اعتبار سے نفیس کلمات ملیں گے جن کے بدل اُردو میں موجود نہیں ۔ اگر ان الفاظ کو اُردو کے ذخیرہ میں شامل کر لیا جائے تو ہماری زبان بہت متمول ہو جائے گی بلکہ اگر ہمیں اس زبان سے محبت ہے تو کیا یہ مناسب نہ ہو گا کہ اس کو "پاکستانی" کے نام سے یاد کیا جائے ؟ آخر 'اُردو' کا لفظ کچھ ایسا پُرانا نہیں ۔ اِس کے معنی بھی زبان کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے ۔ اس کا نام ایسا ہی ہونا چاہیئے جس سے اِس کا تعلق اُس ملک سے ظاہر ہو جہاں یہ بولی لکھی اور پڑھی جاتی ہے ۔

شان الحق حقی ۔

ڈاکٹر باقر نے اپنے مختصر مضمون میں کئی دلچسپ باتیں چھیڑی ہیں، جن پر غور کرنا ضرور مفید ہو گا ۔ البتہ یہ سوال کہ اُردو میں کتنے الفاظ ایسے ہیں جن کو خالصتاً اُردو کا کہا جا سکے ۔ میرے خیال میں کچھ ایسا ضروری سوال نہیں ۔ زبانوں کے وسیع شجرۂ نسب میں اُردو کا مقام ہم کو معلوم ہے اور اس کی ترقی کے مدارج بھی پیشِ نظر ہیں ۔ یہ آریائی پراکرتوں کے کنبے میں سے ہے ۔ اس کی اصل برج بھاشا تھی ۔ اس نے مسلمانوں کے عہد میں ترقی کر کے ایک شائستہ زبان کی صورت اختیار کی، لیکن اس کی بنیاد شاید ان کے عہد سے پہلے ہی پڑ چکی تھی، اور غالباً اس کو "اپ بھرنش" کی ترقی یافتہ شکل کہا جا سکتا ہے جو اسی طرح کی ایک مخلوط بولی تھی ۔ خیر اگر اِن نظریات میں کچھ گنجائشِ کلام بھی ہو تو موجودہ بحث کے سلسلے میں اتنی ہی بات کافی ہے کہ زبانوں کی اصل محض ایک نقطۂ آغاز کی حیثیت رکھتی ہے ۔ پھر وہ مختلف وسائل سے نشو و نما پاتی ہیں ۔ ان میں پورے معاشرے کی تاریخ اور اس کی ذہنی نشو و نما کا ریکارڈ ہوتا ہے اور اُن کی ترقی معاشرے کی ذہنی ترقی سے عبارت ہوتی ہے ۔ اُردو کی بہت سی لغت لازماً مستعار ہے لیکن یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں ۔ انگریزی زبان بھی ایسی ہی مخلوط اور بیرایہ پوش رہی ہے ۔ یہ آریائی زبانوں کی 'جرمینک' شاخ سے تعلق رکھتی ہے ۔ اغلباً اس کا نقطۂ آغاز قدیم 'کیلٹک' بولی تھی جس کی بضاعت بہت ہی محدود ہو گی ۔ پھر اس میں 'نارمن' حملے کے ساتھ

نارمن الفاظ، فرانسیسی دورِ اقتدار میں گیلک، عیسائیت کے ساتھ لاطینی، علمی ترقی کے ساتھ یونانی اور پھر برطانوی نو آبادیات اور بین الاقوامی روابط کے ذریعے دنیا بھر کے الفاظ شامل ہوتے چلے گئے۔ اسی طرح اُردو کے ابتدائی دور میں بھی یہ تاریخی اثرات کام کرتے رہے ہیں۔ اس میں کیا شک ہے کہ اس نے عربی و فارسی سے بہت فیض پایا ہے۔ ہر زبان کے لئے اپنے ابتدائی اور وسطی دور میں کسی شائستہ زبان سے لین دین رکھنا مفید ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر مہذب زبان کے سرمائے میں صحائفِ مذہبی، اساطیر اور دیومالا بھی شامل ہوتے ہیں۔ عربی و فارسی سے ہمارا زندہ تعلق اس نوعیت سے بھی ہماری زبان اور ادب کے لئے مفید رہا۔ یہ بھی ایک دلچسپ نکتہ ہے کہ غلامی کے دور میں زبان میں شکست خوردگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں بیرونی اثرات داخل ہونے لگتے ہیں۔ جو چاہے ابتداءً ناگوار ہی گزریں، رفتہ رفتہ زبان کا جزو بن جاتے ہیں۔ البتہ غلامی کے دور میں معاشرے کی ذہنی اور روحانی ترقی میں ضرور بل پڑ جاتا ہے اور اس کا اثر زبان پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔

اُردو کی رائج تحریر و تقریر میں بھی ہماری ذہنی و اخلاقی کیفیت نمایاں ہے۔ ہم عربی و فارسی تعلیم سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں، لہٰذا بہت سے وہ الفاظ جو ہماری دسترس میں تھے اب اجنبی ہو گئے ہیں۔ نئے لکھنے والوں کی پہنچ صرف انگریزی تک ہے، چنانچہ جو انگریزی کلمات پہلے بدمذاقی کی دلیل سمجھے جاتے تھے اب خاصے رواں ہو گئے ہیں۔ بول چال میں اور بھی ابتر حال ہے یعنی کسی پڑھے لکھے آدمی کے لئے چار جملے بلا انگریزی کی آمیزش کے بولنا مشکل ہو گیا ہے۔ جہاں تک انگریزی کے اُردو میں دخیل ہونے کا تعلق ہے، یہ بالکل قابلِ فہم بات ہے۔ اُردو جتنا ذخیرہ انگریزی الفاظ کا اپنے دامن میں سمیٹ رہی ہے، وہ اس وقت ہمارے ذوق کو چاہے گراں ہی گزرے، ہو سکتا ہے آگے چل کر معیاری زبان میں داخل ہو جائے۔ افسوسناک بات صرف اتنی ہے کہ اس اضافے کے ساتھ ساتھ اُردو نے اپنے الفاظ کا ایک گرانقدر ذخیرہ ہاتھ سے کھو دیا۔ ہم کو انگریزی سے جدید دنیا کے بہت سے الفاظ اور اصطلاحیں تو یقینی ہی تھیں اُن کے ساتھ جو ایک سیلاب انگریزی الفاظ کا امڈ آیا ہے، وہ تعمیر سے زیادہ تخریب کا پہلو رکھتا ہے۔ ہم نے اپنے سبک، خوبصورت، پرمعنی الفاظ کو بے موت مار کر انگریزی کی لغت پر زبان کو تیار بھی تو کیا کیا۔ یہ بے ضرورت وضعداری اور انگریزی دانی، یہ ذہنی دیوالیہ پن کی علامت بن گئی ہے۔ ریڈیو اور تار تو تسلیم لیکن تعمیر جیسے قومی فن کی ساری دلآویز اصطلاحیں بھلا کر کرسی کی بلڈ نشین، محراب کی جگہ آرچ، اسارا مستری کی جگہ "ایسٹمیٹ" بولنا کوئی تعمیری کام نہیں۔

اب یہ رجحان روز افزوں ہے اور صحت مند ادبی اظہار سلیقے تک میں آ گیا ہے جو بڑے سخت خطرے کی علامت ہے۔ اور زبان کا آخری مورچہ کہے جا سکتے ہیں۔ یہ اس بات کی کھلی علامتیں ہیں کہ زبان کا وصل زندگی سے اٹھ رہا ہے اور یہ محض تبرک ہوتی جا رہی ہے۔ اسی لئے ہمارا ادب بھی مصنوعی اب نظر آنے لگا ہے۔ اب سچے جذبات انگریزی میں ہونی چاہئیں۔ جو انہار جذبات کا وسیلہ بن گئی ہے۔ سویٹ، فائن، ڈارلنگ، ایکسیلنٹ وغیرہ۔ "ڈمف گرل" کے "بٹ" کا ذکر اب ہمارے ادب میں آنے لگا ہے جس کے آگے شاعروں کا سارا زورِ تغزل بے آبرو ہو کر رہ گیا ہے۔

اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کے ساتھ مخلوط الفاظ کا بھی بہت بڑا ذخیرہ تھا۔ زندگی میں جہاں جہاں اس کا دخل تھا، اور دربار و مجلس سے لیکر ہاٹ بازار اور حکمت کاروبار تک، اس کی ضرورت کے لئے برابر الفاظ وضع کرتی رہی۔ مولوی ظفر الرحمن دہلوی کی مرتبہ "اصطلاحات پیشہ وراں" اگرچہ ایک تشنہ و نامکمل کتاب ہے لیکن اس کی ہر جلد میں ہر پیشے اور فن کی کیسی سبک اور رواں اصطلاحیں موجود ہیں، جو اب ہمارے ناخواندہ کاریگروں ہی کے تصرف میں رہ گئی ہیں۔ مثلاً کاغذ سازی کوئی بہت قدیم پیشہ نہیں لیکن اس میں بال کمانی، پھول چکر، بن سال، لونگ، لاٹ، چال، باج، گرد، چہرہ، ہول، بھرا، ٹکڑا، گھوڑی، کی طرح کی کتنی ہی اصطلاحیں بن گئیں جو کاریگروں کی اپنی ایجاد تھیں۔ جب تک زبان زندہ ہے نئی اصطلاحات کے لئے کسی خاص ادارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ویسے "اصطلاحاتِ بینکاری" زاہد حسین صاحب مرحوم نے مرتب کروا کے اسٹیٹ بینک کی طرف سے شائع بھی کی مگر کس کام آئی؟ یہ مطالبہ کہ پہلے اُردو انگریزی کے ہم قدم آ جائے پھر اس کی بیڑیاں کاٹی جائیں گی، "گاڑی کے پیچھے گھوڑا باندھنا" ہے۔

اُردو کی لغت میں انگریزی سے بھی زیادہ توجہ اس پر دی جائے کہ ہر وہ لفظ جو اس نے اپنا لیا ہے اُردو ہی کہلائے گا، لیکن اگر خالص اُردو کے کچھ معنی ہیں تو اس کا اطلاق ایسے ہی الفاظ پر ہوتا ہے۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو اُردو نے خود وضع کئے اور اپنی نوعیت سے اکثر مخلوط واقع ہوئے ہیں۔ مطبع والوں کی رائج اصطلاح "برنی" جو ہر جلد ساز بولتا ہے، غالباً برش سے مشتق ہے۔ ایسے مرکبات بھی بہت ہیں جیسے کھٹکے دار، چٹخارے دار، دیگچی دان، کباڑ خانہ، دھڑے بندی، میز پوش کو دیکھئے، کہاں کی میز ہے اور کہاں کا پوش۔ بعض الفاظ میں عجیب تصرف

ہولے ہے جیسے میل خورا، جوتے خور، اور پھر دھینگا مشتی، منہ در منہ، ہو بہو، دن بہ دن، غوط، علین غلین، خدائی فوجدار، غل غپاڑہ اور فوق البھڑک بھی ہیں۔ نقصائی، حلوائی، ہمسایہ سے ہو اہمسائی، حشراتی، قل اعوذی، اسی قبیل کے الفاظ ہیں۔ ان کا سلسلہ بہت دراز ہے۔ بعض نقوابِ صوت بھی دلچسپ ہیں اور یہ بھی خالص اُردو کی تعریف میں آتی ہیں، جیسے غوں غاں، غٹ غٹ، غرفش، تڑاقہ، زناٹہ، غراٹہ، غڑاپ غٹرغوں، وغیرہ۔ عربی کا غین ہندی کے "ٹ" وغیرہ کے ساتھ بہت آمیز ہوا ہے۔ محاورے تو اُردو نے کثرت سے ایجاد کئے ہیں بغلیں جھانکنا، خون خرابے، دیدے دکھانا، فضیحتے اڑانا، رسی دراز ہونا — ان کی تعداد ہزاروں سے گزر جاتی ہے۔ یہ محاورات و ضرب الامثال معاشرے کی بے پناہ تخلیقی قوت اور تخئیلی ذہن کی دلیل ہیں۔ ان میں ہماری نفسیات مذاق تخلیقی صلاحیت کے علاوہ تجربات و فلسفۂ زندگی کا بھی ریکارڈ ہے جو ہرگز ضائع ہونے کے لائق نہیں۔ فی الحال ہمارا کاروبار صرف ترجمہ واسم پر رہ گیا ہے۔

ڈاکٹر باقر کی یہ اصلاح کہ اُردو پر عربی و فارسی کے دریچے باز کئے جائیں بہت مناسب ہے لیکن در اصل سب سے پہلے زبان کو معاشرے میں نئے سرے سے رواں اور آباد کرنے کی ضرورت ہے، جہاں سے انگریزی نے اسے دیس نکالا دے دیا ہے۔ اس کی ترقی میں جو غیر طبعی رکاوٹیں حائل ہیں وہ دور ہو جائیں، پھر زبان کا زور نمو اور ہماری ذہنی صلاحیتیں خود بخود کام کریں گی۔ ہم عربی و فارسی سے بھی استفادہ کریں گے اور انگریزی سے بھی۔

مقامی زبانوں سے بھی اُردو نے کچھ نہ کچھ حاصل کیا ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی۔ "لشکارا" جوت اٹھنا یا چوٹ پڑنے کے معنوں میں بیشک بھلا لفظ ہے، عجب نہیں کہ ایسے بہت سے الفاظ آپ سے آپ اُردو میں رائج ہو جائیں۔

*

جمیل نقوی

زبان کا مسئلہ لسانی سے زیادہ اجتماعی اور ثقافتی ہے۔ ہر زبان بولنے والوں کے عادات و اطوار کا مظہر ہوتی ہے، اور صوت کے اعتبار سے افراد کے مابین ایک دوسرے کے مافی الضمیر کو سمجھنے کا واحد ذریعہ تسلیم کی گئی ہے۔ الفاظ جنہیں زبان کے عناصر ترکیبی کہنا چاہیئے، اپنی ساخت کے لحاظ سے خواہ کسی قسم کے بھی کیوں نہ ہوں اصل چیز ان کے معانی ہوتے ہیں جو ایک مخصوص معاشرہ کی کردار سازی کا فرض ادا کرتے ہیں، اور انہیں سماج کے نفسِ ناطقہ کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔

اردو سے ہمیں جس قدر محبت ہو کم ہے۔ لیکن یہ محبت جذباتی قسم کی نہیں ہے منطقی طور پر بھی اس کا جواز موجود ہے کئی سو سال کی مجموعی اجتماعی کاوشوں کے بعد ہماری زبان کی تشکیل عمل میں آئی ہے۔ صدیوں کے لگاتار ریاض کے بعد اردو زبان و ادب کی اقدار مرتب ہوئی ہیں۔ کسی ادب و زبان کی اپنی کوئی اقدار نہیں ہوتیں۔ یہ قدریں معاشرہ کی قدروں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی رہتی ہیں اور قومی عظمت کا معیار متعین کرتی ہیں۔ زبان ہی ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعہ معاشرہ کے دل کی دھڑکنیں سنی جاسکتی ہیں۔

اردو ایک معیاری زبان ہے۔ اور اُسے وہ تمام ذرائع بیان و اظہار حاصل ہیں جو متمدن دُنیا کی دوسری بلند پایہ زبانوں کا طرۂ امتیاز ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے نام میں کیا رکھا ہے۔ مقصد اور عمل درد عمل کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ بادی النظر میں یہ بات معقول معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا اطلاق ہر چیز پر نہیں ہوسکتا خصوصاً زبان کے معاملہ میں یہ نظریہ بالکل بے معنی ہے۔ زبان کو کسی طور پر جغرافیائی حدود میں قید نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً انگریزی زبان دراصل برطانیہ (انگریزوں) کی زبان ہے۔ کناڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ وغیرہ میں جہاں کلیتاً انگریز آباد ہیں۔ بدستور اسی زبان کے بولی جاتی ہے لیکن اس کا نام انگریزی ہی ہے۔ کناڈین آسٹریلین وغیرہ نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اسلئے کہ ان تمام ممالک کی معاشرتی اور ثقافتی قدریں وہی ہیں جو انگریزوں کی ہیں — عربی زبان کا بھی یہی حال ہے۔ شام، عراق، عرب اور مصر وغیرہ میں عربی زبان یکساں طور پر مستعمل ہے۔ ان ممالک کے ادب میں مقامی رنگ کی جھلک ہو تو ہو لیکن بحیثیت مجموعی ان تمام ممالک کے ادب پر عربی زبان کی ہی چھاپ ہے۔

اسی طرح اگر ہم "اردو زبان" کا نام بدل کر "پاکستانی زبان" رکھ لیں تو اس کا سب سے پہلا ردعمل تو یہ ہوگا کہ گزشتہ سات صدیوں کے لسانی اور ادبی سرمایہ سے چشم زدن میں ہمارا رشتہ ٹوٹ جائے گا۔ اور ہمارے اسلاف کی تمام ادبی و لسانی کاوشیں صدا بصحرا اور ہمارے معاشرہ کی بنیاد برباد ہو کر رہ جائیں گی۔ یہ سب کچھ ہم کس لئے گوارا کریں گے؟ محض ایک نیم سیاسی مصلحت کے لئے! اور وہ بھی حقیقتاً کوئی مصلحت نہیں۔

جن ممالک میں سیاسی انقلابات رونما ہوتے ہیں وہاں اجداد کی ذہنیتیں بڑی تیزی سے بر روئے کار آتی ہیں جس کا مقصد عظمتِ رفتہ کو واپس

افسانہ و افسوں

سید جعفر طاہر

زشرحِ قصۂ ما رفتہ خواب از چشمِ خاصاں را
شبِ آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد

شہنشاہ نے جو اکی شب، انہیں شمعوں کی روشن لویں کپکپائیں
در و بام پر طلائیں ... ، سونی سیجوں پہ شہزادیاں تلملائیں
نشوں میں لہکتی بہکتی ہوئی پرفشاں خوشبوؤں کے علم لڑکھڑائے
زمرد کی زرکار مہتابیوں، شعلہ رنگ فانوسوں کے دل ڈگمگائے

نہ اب زرنگارِ سپہر کے تشتِ دُربارِ شب میں ستاروں کے موتی درخشاں
نہ وہ طمطراقِ زرکارانِ گردوں، نہ وہ کاروبارِ نجیبِ سبا برگرداں
نہ زہرہ نگاہوں کے نغمے، نہ وہ دیدبانانِ عالم کی حیرت نگاہی
نہ وہ یک نشستانِ بزمِ مسرت، نہ وہ ازدواراں اسرارِ شاہی

وہ بکھرے ہوئے ڈھیر ہر سمت کمخواب و ابریشم و اطلس و پرنیاں کے
وہ خوابوں کے جھولوں میں سمٹے ہوئے جھلملاتے بدن بانوانِ جواں کے
گماں ہو جو ایسے میں دیکھے کوئی ان حسینانِ نوخیز و نوخاستہ کو
کوئی دل شکستہ صنم گر جو اپنے سٹیچو سجا کر کہیں چل دیا ہو

نہ وہ نقرئی بانہوں کے پھیلتے دائروں کی لپکتی لچکتی کمانیں
نہ وہ انگلیوں کے سنہری تیرے، نہ وہ تلملاتے ابروؤں کی سنانیں
وہ کافورِ ناساختہ رنگ سینوں پہ لہراتی زلفوں کے سیلاب تھے
وہ شنگرف رو زانوؤں کی حنائی فصیلوں کے دامن میں مہتاب تھے

نہ وہ ناچتی تتلیوں کے سنہری پروں سے مزین حریری قبائیں
نہ وہ چاند کی اُجلی کرنوں کی مانند شانوں سے ڈھلتی پھسلتی ردائیں
نہ عشقِ ابد ماجرا کے فسانے نہ حسنِ برشتہ کی جادو نوائی
فقط اب سراسیمہ لہروں کے نوحے، دھوئیں کی لکیروں کی ریزہ سرائی

وہ تیروں کے بستر پہ تابوت تیاگے، بچھڑ نکلے سر بریدہ جنازے
کراں تا کراں گوش تا گوش گونجے گزشتہ دلوں کے پرانے تقاضے
پُر اسرار نعرے، عفونت بھری خندقوں نے اُگل دیں شہیدوں کی آنتیں
وہ نورانی جسموں پہ طوق و سلاسل کے ناپاک پنجوں کی نیلی خراشیں

وہ لہرائے محشر صفت زلزلوں کے علم، دندناتے دھندلکوں کے طوفاں
سمندر، زمیں، آسماں، عرش، گہوارہ گردبادِ قیامت میں گرداں
گرانڈیل دیووں کے لانبے لبادوں میں لپٹی ہوئی مرمریں بارگاہیں
ستارہ سفیدار و سرو و صنوبر، سیہ سوختہ سہم تن سٹپٹائیں

گدا جانے کس جا نے کہاں سے بھٹکتے ہوئے اس طرف چار درویش آئے
جو دیکھا تو مانند ... لطف سے پیش آئے، شہنشاہ کے پاس لائے
گلے میں سیہ کفنیاں، چاک داماں، گھنی داڑھیاں، لانبی لانبی جٹائیں
وہ ماتھوں کی ریکھیں کہ جیسے کسی دشت میں ندیاں پھیل کر سوکھ جائیں

وہ سینوں کے سنسان ساحل پہ کتنی سیہ سیپیوں کے شکستہ نگینے
تمناؤں کے ان شکستہ سفینوں کی تمثیل، ہائے نہ پوچھی کسی نے
یہ ہیئت گدائی جو دیکھی، زباں لڑکھڑائی، کہا، آبِ خاصہ پلائیں
گھڑی دو گھڑی بعد ظلِ الٰہی نے فرمایا، سب آپ بیتی سنائیں

وہ صحرا نوردانِ وحشت قدم باری باری لگے اپنا قصہ سنانے
دل آشوبیوں، دشت پیمائیوں، ہول انگیز ناکامیوں کے فسانے
کہیں ایک نوشابۂ کج ادا و گل اندام سرمایۂ داستاں بھی
کسی ایک نقشِ گذارش میں جلوہ نما کوئی بانوئے کشورستاں بھی

سحرگاہ شہنائیوں کی سہانی سُریں نَو بہ نَو دمدموں پر اذانیں
سرِ شام شیوا زباں مغبچوں، شعلہ آواز آتش پرستوں کی تانیں

مَندل باجت دُھم کٹ دُھم کٹ دھلانگ تکیٹ دھا دھک ترٹ تا
پائل باجت چھچھی چھوم چھچھی چھوم جھا تجن بولت: دھر دھر دھا

چَم چَم چَم چَم چندرا چمکے، تھرتھرا امبر ناچے ـــــ
گوری گوری پی کی انگری، تھام تھام کرناچے ـــــ
دھرت دھرت دھرمنگ دھرت دھرنگ۔ دھرت تھرتھا

ڈھگ تگ ڈھگ تگ دھرتی ڈولے، چھم چھم ناچیں ناریں
ہری بھجن کی لَے میں جانے کس کا نام پکاریں ـــــ
ڈھمک ڈھمک گتی ڈامرد باجے دیے تگ ترکٹ تا

ٹھمک ٹھمک کر راج نچنیاں نرت کرت کی ٹھانیں
باندھی لیک پہ چلنے والے مورکھ یہ کیا جانیں
گھونگھٹ پٹ کی اوٹ میں ہنس ہنس نین پکاریں
تھرک تھرک کر سانوریاں سو جگڑے کاج سنواریں

تک جھنک تکت جھناک۔ اسکرپٹ برکٹ، کٹ کا
دھرت دھرت دھرمنگ دھرت دھرنگ دھرت تھرتھا

نَی ابلا رس بھید نہ جانے بات سنے لجیائے
جلتے دیپک ڈھانپ لے کنٹھ سے بانہہ پھڑائے
گر گر گر گر جانے چنریا، نابھ سے ابھر چھوٹے
آشا یون کا ایک جھکورا۔ ڈار تڑپ کر ٹوٹے

وہ بھاؤ کہ جیسے کسی بتکدے کے در و بام پر مشعلیں جل رہی ہوں
وہ رس جیسے چَل بچل چھلکنے پیالوں میں جھل جھل جھمکتی لویں ڈھل رہی ہوں
وہ گت جیسے اِک سرمدی خواب سے جاگ اٹھی ہو خود راگنی کی جوانی
نرت جیسے دریا کی لہروں میں انگڑائیاں لے رہی ہو کوئی رج رانی

وہ سُر جیسے فطرت کے ذیشان معبد کی جانب جنوں کا قدم بڑھ رہا ہو
خداوندِ عالم کے ارشاد پر اِک جواں سال شاعر غزل پڑھ رہا ہو
سماں جیسے بوسوں کی حدت سے اِک نازنیں کا سنہرا بدن تمتمائے
کسی لاجونتی کی آنکھوں میں جیسے محبت کی پہلی کرن تیر جائے

✣ ✣ ✣

★ ★ ★

تعاقب

وزیر آغا

تری یاد
اِک زخم خوردہ سے آہو کی مانند تھک ہار کر گر پڑی ہے!
کسی کانپتے، لڑکھڑاتے ہوئے پاؤں کی چاپ جیسے
بہت ہولے ہولے

کسی سرد پتھر پہ جا کر رُکے، پھر نہ ابھرے
وہ پتھر جو اِک گہرے پُرہول کھڈ کے دہانے پہ گردن جھکائے
ازل سے کھڑا ہو!

نہ جانے میں اس کالے بے جان پتھر پہ کب سے کھڑا ہوں؟
مرے سامنے اِک بھیانک خلا ہے
خلا جو تری یاد کو کھا گیا ہے!!

وجدان

عبدالرؤف عروج

تھا جو اک فاصلہ فکر و احساس سے
اپنے آدرش سے وہ بھی طے کر دیا
شعلۂ حسن پیدا ۔۔۔ افق گیر ہے
یہ خوشی میرے خوابوں کی تعبیر ہے
یہ خوشی میرے جذبوں کی تعمیر ہے

تراشیدم ۔۔۔

میرے وجدان کی مرمریں مورتو!
کہکشاں، چاند، تارے، شگوفے، کنول
میرے گیتوں پہ سازوں پہ گاتے رہے
قدرت اپنے صحیفے الٹتی رہی!
پھول کھلتے رہے، مسکراتے رہے
ابرِ بہاراں کے خراماں قدم
بادۂ رنگیں سے لڑکھڑاتے رہے
وقت کی کم نگاہی نے دیکھا نہیں
تم شفق میں، ستاروں میں مستور ہو
یہ تمنا صدا دے رہی ہے تمہیں
تم گریزاں بہاروں میں مستور ہو
تم کو اس خاکداں کا ستارا کروں
سوزِ جاں بخش دوں، آشکارا کروں

شکستم ۔۔۔

میرے وجدان کی مرمریں مورتو!
آج تم نے کہاں کھو دیا ہے مجھے
میرے دامن میں گردِ سفر بھی نہیں
اس تمناکدے میں کڑی تا کڑی
اعتبارِ خیال و نظر بھی نہیں
کہکشاں، چاند، تارے، شگوفے، کنول
کوئی آنسوں میں اک چارہ گر بھی نہیں
روح کے زخم، خوابوں سے تازہ ہوئے
مجھ کو تنہائیوں کے سوا کیا ملا
خود فریبی کے شعلوں میں جلتا ہے دل
دل کو رسوائیوں کے سوا کیا ملا
میرے وجدان کی مرمریں مورتیں
میرے خلّاق ہاتھوں سے ڈھ جائیں گی
سیلِ امروز و فردا میں بہہ جائیں گی
ہر تحیر کدے سے گذر جاؤں گا
یہ نہ ہوگا تو گھبرا کے مر جاؤں گا

٭

پرستیدم ۔۔۔

میرے وجدان کی مرمریں مورتو!
میں ازل سے تمہارا پرستار تھا
تم ابد تک مجھے مسکراتی ملیں
خواہشیں، حسرتیں، آرزوئیں، جنوں
تم ہر اک موڑ پر گنگناتی ملیں
کہکشاں، چاند، تارے، شگوفے، کنول
تم ہر اک بزم میں جگمگاتی ملیں
درد کی طرح دل میں بسا کر تمہیں
میں نے ہر زہر کو قند سا کر دیا

اُڑان کے بعد

جلیل حشمی

دھرتی کے سب بندھن توڑے چھوڑے ڈیرے [illegible]
اُونچا اُونچا اُڑنے والے! تجھ کو ایسے پنکھ لگے
اے ناداں! اے مورکھ لیکن یہ بھی ہے معلوم تجھے
کھینچے گی تجھے خوشبو اس کی چاندنگر کی گلیوں سے
جس نے تیرے پھول کھلائے، جس نے تجھ کو رنگ دیئے
جس نے تجھ کو ماں کا پیار، دلہن کا سنگ دیا پگلے
تجھ کو سجھائے جس کے ذرّوں نے جھلمل کرتے تارے
تیرے سہانے بچپن کے دن جس کے پہلو میں گزرے
جس کی دھڑکتی کوکھ سے تیری آنکھوں کے تارے چمکے
جس نے تری رومانی راتوں میں ہنستے ہوئے چاند جنے
جس کے پیڑوں نے دھوپوں میں ڈالے تجھ پر سائے گھنے
جس نے دکھائے آئینے تجھے نیلی نیلی جھیلوں کے
جس نے تری شاموں کو سنائے بہتی موجوں کے نغمے
— اُونچا اُونچا اُڑنے والے! جس سے تجھ کو پنکھ ملے
جس نے ترے بچپن کے کھلونے تک سینے سے لگائے رکھے
جس کے دم سے پائندہ ہیں تیری کہانی کے ٹکڑے
جس نے زمانے کی نظروں سے رکھے چُھپا کر ریزے تیرے
تُو اس دھرتی اس مٹی سے توڑ کے سب رشتے ناتے
کہاں چلا ہے کہاں چلا ہے اے اُونچا اُڑنے والے؟

گھات

ضمیر اظہر

یہ اعتراف ہے مجھ کو بہارِ آئینہ کار
ترے جمال میں ہے انتہائے رنگینی
تری جبیں پہ منقّش گلوں کے نقش و نگار
ترے لبوں میں نہاں کوزہ کوزہ شیرینی

★

ترے کنار کی راحت فریبِ جنّت ہیں
شمیم و رنگ کے خاموش زمزمے آباد
تری ردائے شفق رنگ کے تہِ سایہ
گلاب و سوسن و سنبل کے سلسلے آباد

★

مذاقِ اہلِ نظر کے لئے ہے وجہِ سکوں
ترا وجود، ترا پیکرِ شباب آمود
ترے قیام سے ہے زینتِ ریاضِ جہاں
ترے کرم سے زمیں میں ہر آرزوئے بہار

★

بہار! مجھ کو ہے لیکن یہ بات وجہِ ملال
پنپ رہی ہے تری اوٹ میں خزاں اب بھی
نجات دے کے تجھے دستِ ہائے سنگیں سے
ہیں تیری گھات میں گلچین و باغباں اب بھی

نوی کراچی، جون ۱۹۵۸ء

افسانہ

پورب پچھم، اُتر دکن!

ابو سعید قریشی

جوں جوں وقت گذر رہا تھا اس کی بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اور نہ جانے وہ کے بار پوچھ چکا تھا: "چھورے نا ہیں آئے اب تک؟ جانے کہاں ٹیر گئے ۔۔ انکا ۔۔ داپس کے ۔۔۔ پچھم کا بھی تو پتہ ناہیں چلے میں ایہاں ..... "

اس کے سامنے کوئی انسان ایسا نہیں تھا جسے بتا کر وہ کہہ سکتا کہ سورج اس رہٹ کی اوٹ سے نکلتا ہے اور اس چوپال کے پیچھے چھپتا ہے ۔ لوئی جو بٹ کوئی ۔۔۔ پھیلا ہوا ایک مدا تھا۔ آنکھ کھلتی تو سورج سوا نیزے پر ہوتا ۔

ان کے جھونپڑے ریلوے لائن کے کنارے، اس مختصر سے سٹیشن کی عمارت کے پاس پڑے تھے جہاں ایک گاڑی نہیں ڈھور ڈنگروں کی طرح الاد کرلاتی تھی اور دھوئیں اور بھاپ کے بادل چھوڑتی ہوئی چلی گئی تھی۔ اس کو تو یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ آئی کہ سے تھی اور گئی کدھر کو۔ وہ خود کو رہٹ کا بیل سمجھ رہا تھا جس کی آنکھیں ہوتے ہوئے بھی نہیں تھیں اور کوئی نامعلوم ہاتھ اسے ہانکے جا رہا تھا۔

"شام پڑے تو اس کو بھی کھونٹا مل جاوے ہے۔ اور سوہرا مزے سے بیٹھا سانی کھاوے ہے اور جگالی کرے ہے۔ جانے کیا چکر ہے پانوؤں میں"۔

"پانوؤں کا ناہیں بھاگوں کا" پاس کی کھٹیا سے اس کی بڑھیا نے اپنی پیشانی پیٹتے ہوئے کہا "دیکھ سے اپنا اپنا! سات پیڑھیوں کا بنا بنایا گھر یوں چھینکنے میں چھٹ کیا اور یہ ۔۔ کو اب بھی چین ناہیں پڑے سے ۔۔ گھروں کو اور ساتھ کھینچے پھرے ہوا پنے۔ سندھ تک تو ہو ہی آئے۔"

"بدھو بڑھیا! بڈھے نے فلسفیانہ اور رحم آلود لہجے میں کہا "تیری کھوپڑی میں ناہیں آنے کی یہ باتیں۔ تیرے کو تو بیری کا جھنڈ بھی امریاں بن کے دکھے ہے کہ جھولا ڈالے ہوں ایہاں۔ اری پگلی جد تک ماٹی سے ماٹی ناہیں ملے گی اس کھیت کی اس کھیت سے ۔۔"

"تو کھیت ہی ۔۔۔ اپنے سر" بڑھیا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"چپ ہو جا بس" بڈھے کے گلے میں جیسے کھٹیا کے بان کی طرح، جس پر وہ لیٹا ہوا تھا، کانٹے نکل آئے "کتے کا بھیجا ہو جس کی کھوپڑی میں وہ سر کھپاوے تیرے ساتھ۔ جد تک ماٹی سے ماٹی ناہیں ملے گی۔ میں کہوے ہوں، رمضانی چودھری تو بالو کے بگولے کی طریوں گھومتا رہوے گا۔ ہاں!"

بڈھے کا بدن ریلوے لائن کے پاس تیز ہوا میں تھر تھر کرتے ہوئے سرکنڈے کی طرح کانپنے لگا۔ اس نے اپنی کھٹیا کے پاؤں سے لٹکتی ہوئی تھیلی اتاری اور کالے ڈبے ۔۔۔ ایک لوٹے تو ۔۔۔ بائیں ہتھیلی پر رکھی۔ حقے کے نیچے سے پانی کے چند قطرے اس پر ٹپکائے اور ہتھیلیوں کو آپس میں ملنے لگا۔ ۔۔۔ کی مستی گئی اور اس کے دماغ کی طرح اس کی ہتھیلیوں سے اٹھی ہوئی گڑ دی خوشبو سے بڈھے رمضانی کے نتھنے پھڑک اٹھے اور چہرہ چمک اٹھا جیسے سلگنے سے پہلے ہی ۔۔۔ میں سوئی ہوئی کوئی چنگاری مل پڑی تھی ۔۔۔ اپنے مویشیوں کے بدن سے بھی کبھی اس کو ایسی ہی مہک آیا کرتی تھی لیکن کہاں تھے وہ جنا دھن کو دیکھ کے آنکھوں میں جوت جگتی تھی۔ اور دھن کے سینگوں سے چاندی میں منڈھے ہوئے تعویذوں کے جھومر لٹکا کرتے تھے؟؟؟ ایک ایک کر کے سب اپنے سے زیادہ بھوکے آدمیوں کا شکار ہو گئے تھے ۔۔۔ حتیٰ کہ کیمپ میں پڑے پڑے وہ جوڑی بھی چھری تلے آ گئی جو انہیں موت اور لے آ کر ۔۔۔ لائی تھی۔

۔۔۔ وہ سوچنے لگا۔ رمضانی چودھری قافلے والوں کو فاقوں مرتے تو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آدمی کی جان کے سامنے ڈھور ڈنگر کی جان ۔۔۔ اور رمضانی کا تو عقیدہ تھا کہ جو زیادہ جاندار ہے اسی کو جینے کا حق ہے۔ کیا جنا ور کیا آدمی جنگل میں بھی یہی کچھ ہو رہے ہے۔

اور جنگل سے، باہر بھی۔ جھوٹ ہووے تو چور کی سزا...." اس کا فلسفہ تھا کہ آدمیوں میں بھی وہی آدمی زندہ رہے گا جس کی بانہہ میں کس بل ہے۔ جو سانڈ کے سینگوں کو مروڑ سکتا ہے۔ جس کا پنجہ مضبوط ہے، جس کا ہاتھ ہل کی ہتھی پر نہیں کانپتا، جو زمین کا سینہ چیر کر اس میں بیج ڈال سکتا ہے، اور جس کی رگوں میں اتنا لہو ہے کہ اس کا پسینہ بن سکے۔

لیکن بڑھاپے کے آگے اس کی ایک نہیں چلی تھی۔ اب تو اگر اس سے کہا جاتا کہ رمضانی چاچا ذرا بکری کو تو باندھ دینا، کان سے پکڑ کے، تو وہ سینگوں سے ڈر کے ایک طرف ہٹ جاتا۔ ہاں اسے اپنی جوانی کے قصے ضرور یاد رہ گئے تھے۔ انہیں قصوں کے سہارے وہ ایک مدت سے اپنی آل اولاد پر حکومت کر رہا تھا۔ جاگیردار بہادر نے بیل خریدا تھا ہل کے لئے نوچندی کے میلے سے۔ پر کسی نہیں ڈالنے دے رہا تھا۔ چاندی چڑھی تھی سینگوں پہ، ہٹ ہی تو بیٹھا، ڈالا کاٹی کا۔ رمضانی چاچا نے قابو کیا آخر۔

مگر رمضانی چاچا کے ہاتھ اب سوکھے جوتوں کی طرح بے کار ہو چکے تھے۔ دیسی تمباکو کی گرہیں کھولنا بھی مونج کا رسا بٹنے سے کم کام نہیں تھا۔ یہ تو دھوئیں کے اس ایک کش کی طلب کا جادو تھا جو وہ اتنا کام بھی کر لیتا تھا۔ ورنہ اس کا ہاتھ تو حقے کی نے تھامتے وقت بھی کانپتا تھا۔ اور ایک زمانہ وہ تھا.... وہ۔ جب رمضانی لٹھیا لے کر کھیت میں کھڑا ہو جاتا تو کٹاروں کی دھاریں کند ہو جاتیں، بھالوں کے منہ مڑ جاتے اور برچھوں کی زبانیں خاک چاٹتی نظر آتیں۔ "بڑا اترا اتر آیا تھا۔ کھوے تھے ہم آلہ اودل کی اولاد ہیں۔ پر رمضانی نے بھی گیہوں کا آٹا کھایا ہوا تھا۔ دیکھی جاوے گی میں بولا! رہٹ کے پاس لال مرچوں کا ڈھیر لگا تھا۔ وس کے پاس کھٹیا سے لکیر کھینچ دی میں نے کہ جس نے سات دھاریں بخشوائی ہوں وہی آوے گا، ادھر۔ یا پھر رمضانی کے مردے کو پھاندو گے! چھکے چھوٹ گئے سورماؤں کے۔ پگڑی رکھی پانوؤں پہ کہ چاچا بھول ہوئی......" اور پھر ایک وہ زمانہ بھی آیا تھا کہ چار چار برس کے چھوکرے چاچا رمضانی کو چڑا چڑا کر ہرے بوٹ توڑ لیتے۔ اور آنکھوں کے آگے بکری دودھ کر بے جاتے۔

اور پھر وہ دن بھی آیا تھا۔ وہ دن جس کی یاد بھارت سے آنے والے پناہ گزینوں کے تھکا دینے والے، ایک سے، اداس اور ویران چہروں، تباہی اور بربادی کی بارات بن کر رمضانی چاچا کی آنکھوں پر چھائی ہوئی تھی۔ ایک پوری قوم دکھ درد کا راج لئے چلی آ رہی تھی۔ بڈھا رمضانی اس منظر کو بھول جانا چاہتا تھا۔ اس نے کھٹیا تلے ہاتھ پھیرا۔ چند دمچیوں اور تنکوں سے آگ سلگائی اور چلم میں رکھ کے ایک لمبا کش لگایا۔ سارا منظر دھوئیں کے پیچھے چھپ گیا۔ ایک کش اور! اور پھر دم زدہ کھانسی کا دورہ۔ اس کی آنکھیں ابل آئیں، رنگ سیاہ پڑ گیا۔ پوپلے منہ میں گال اندر کو دھنس گئے۔ نرخرہ کسی بوڑھے ذبیحہ کی طرح کھڑ کھڑ کرنے لگا۔ اور اس کی گنجی کھوپڑی اور کنپٹیوں میں نیلی رگیں جونکوں کی طرح پھول گئیں۔

"یو تمباکو تیری جان لے کے رہوے گا ایک دن!" بڑھیا نے شکایت آمیز لہجے میں کہا "اور ابھی تو گور گڈھے کا بھی کوئی ٹھیک ناہیں۔ ایک دم اس پہ کڑوا تمباکو، کالا۔"

"لوہے کو لوہا کاٹے ہے پگلی" بڈھے نے ٹوٹتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس جیون سے تو کڑوا ناہیں ہے یو تمباکو جس سے تو اتنی ڈرے ہے۔ جد اس میں مٹھیا ناہیں رہا تو تمباکو میں راب ملا کے کیا کرے گا رمضانی! اور تو ہی تو کہوے ہے کہ مردہ گاڑنے کو گڈھے کا تو ٹھیک نہیں۔ ایسے ہیں، میں پوچھے ہوں گڑھا کا کرو ہا۔ کہاں گڑے گا! میں تو بس یہ جانے ہوں کہ اپنے لئے تو اللہ ہی مر گیا جیسے"

"اللہ اللہ کر" بڑھیا نے کہا "پھر مت کہیو ایسی بات۔ تیری تو وہی بات ہوئی کہ آپ موئے سو جگ مویا۔ گھر گھاٹ تو چھوٹا۔ اس کا ناؤں تو نہ چھوٹے۔ دو جگہ کی آگ تیری اس چلم کی آگ سے تو ٹھنڈی نہ ہووے گی جو پھر کے ہے۔"

بڈھے کے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔ اس نے سہمی ہوئی نظروں سے بڑھیا کو دیکھا۔ نیچے کی نے کو اپنی چمٹے جیسی انگلیوں میں دبایا۔ اور منہال کے گرد اس کے ہونٹ کسی سوکھا مارے بچے کے ہونٹوں کی طرح بھنچ گئے جو چھیچھڑے سی چھاتیوں سے دودھ حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ دمچیوں کی آگ بجھ چکی تھی اور ویرانی مراد آبادی گڑگڑی میں بڈھے کا سانس کسی دور دراز کھیت کے رہٹ کی طرح ٹک ٹک کر رہا تھا جس کی گادی خالی پڑی ہو اور عادت سے مجبور تھکا ہوا بیل چلنے کی ناکام کوشش کر رہا ہو۔ کڑک کڑک... ٹک ٹک۔ کٹ

خاموشی کے وقفے بڑھتے گئے اور آخر کار جھونپڑوں کی بھنبھناہٹ کے سوا اور کوئی آواز باقی نہ رہی۔ بوڑھے کے ہونٹ منہال سے الگ ہو گئے۔

اور اس کا منہ کسی اندھے کنوئیں کی طرح کھلا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں بیہوشی کی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کا ہاتھ اپنے سینے پر کسی اَن دیکھے گھاؤ کو سہلانے لگا۔ اس کا تصور اسے وہاں لے گیا جہاں خدا کے بعد رمضانی چودھری کا حکم چلتا تھا۔ یہ بستی اس کے بزرگوں نے بسائی تھی۔ اور یہاں کی چودھراہٹ اسی کے گھرانے کی وراثت سمجھی جاتی تھی۔ اس کا گھرانہ! بڈھے نے ایک ٹوٹا ہوا سانس لیا۔ اس کا گھرانہ جس کی لڑکیاں اپنی ذات سے باہر بیاہی جانے کی بجائے بوڑھی ہو جاتی تھیں، لیکن جب کوئی بیاہ رچتا تھا تو دنیا دیکھتی تھی۔ اور جس کے لڑکے چاندنی راتوں میں گاؤں کے میراثیوں سے اپنے بزرگوں کی بہادری کے قصے سنتے سنتے سو جایا کرتے تھے۔ اور ان کا گاؤں جس کے میلے ٹھیلوں میں ایسے ایسے گانے گائے جاتے تھے کہ بڈھے بزرگی کا چولا اتار پھینکتے اور کم سن قبل از وقت بالغ ہو جاتے اور جہاں پیرگی کے رس بھرے نوں مجرے ہوتے..... وہ گاؤں، وہ گاؤں۔ وہ گاؤں جس میں نوجوانوں کے ہاتھوں سے بٹیر کا پنجرہ کبھی نہیں چھوٹتا تھا لیکن نہ جانے کسی نے کیا جادو کیا تھا کہ ایک مدت سے چودھری کے گھرانے میں بس لڑکیاں ہی پیدا ہوتی تھیں۔ خود رمضانی کے اپنے ہاں بھی چھ بیٹے اللہ نے دے کر چھین لئے تھے۔ اور آخر کار ایک لڑکا آخری عمر میں بڑھاپے کا سہارا ملا تھا لیکن اس کو بھی لوگ بدھو کہتے تھے۔

ان کے ہاں سولہ سال کی عمر میں جوان ہونا جوا بیچارے کی گردن میں ضرور ڈال دیا جاتا تھا لیکن وہ اٹھارہ برس کا ہونے کو آیا تھا مگر اب تک کوئی اس کو نیا نہیں ڈال سکا تھا۔ اپنے ہم عمر نوجوانوں کی دلچسپیوں سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں اس پہ آوازے کسا کرتیں۔ لیکن وہ سر جھکا کر نکل جاتا۔ ہوتے ہوتے نچوں میں کھسر پھسر ہونے لگی تھی کہ تو جو بدھوا کالا رنگ ہی ناہیں ہم کہوے ہیں.... بدھو سالا بڑھاپے کا بیج۔"

اور اب وہ خاندان کے چند نوجوانوں کے ساتھ جانے کہاں گیا ہوا تھا۔

"گاؤں تک کے تاؤں تو ایسے ہیں اس دیس کے۔ اور جنے یہاں کا کوس کتنے کوس کا ہووے ہے" بڈھے رمضانی نے آنکھیں کھولتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ "اور سادھو یہ چھورے۔ دو دن دم بھی تو نہیں لیا۔ بولے ابھی جاوے ہیں۔ کوئی پوچھے زمین ہے گھوڑی تو ہے نہیں جو رسا تڑا کر بھاگ جاوے گی۔ وہ لونڈے تو خیر ہشیار ہیں، اگر کما گئے تو لوٹ آویں گے۔ پر اپنا یہ بدھو سر اٹھا کے سامنے تو دیکھنا ہی نا آوے ہے۔ سو جا بھی ایک سے دو نہ ہو جاوے وہ بھی تو اس بدھو کی کھوپڑی میں ناہیں پڑے ہے۔ پنچ ٹھیک ہی کہوے ہیں شاید"

اس نے ایک حسرت آلود سانس لیا اور اس کا ہاتھ پھر تمباکو کی تھیلی کی طرف بڑھا "تازہ ہووے اور حسرمیں ہووے تو باتیں کرے ہے حقہ ۔۔ چور چکار بھی تو پاس نہیں پھٹکے ہے کہ ہونہ ہو دو ہیں۔ اور بڑھیا کہوے ہے کہ تینے اپنا کالجہ پھونک لیا۔ سٹھیا گئی ہے میں جانوں ۔۔۔ اری او بھاگوان! میں کہوے ہوں چھورا اب تک ناہیں آیا تیرا۔ ذری دیکھ تو جا کے۔ پر تو کیا دیکھے گی اتر دکن کا بھی تو پتہ نہیں چلے ہے یہاں۔ مالو رستہ بھول گئے لونڈے"

بڑھیا کو جواب دینے کی ضرورت نہ پڑی۔ باہر جھونپڑوں میں جھنجھلاہٹ کی آواز بلند ہوئی چند مردانہ آوازیں سنائی دیں۔ اور چھورے بوڑھے بچوں کے ساتھ رمضانی چودھری کے جھونپڑے میں داخل ہوئے۔

نوجوانوں کے چہروں پر مٹی کے لیپ چڑھے ہوئے تھے۔ اور پسینہ تیز بارش میں کچے مکانوں کے پرنالوں کی طرح بہہ رہا تھا۔ ان کے کندھوں پر چادروں کے پلوؤں سے کچھ بندھا ہوا تھا۔ کچھ کہے سنے بغیر انہوں نے اپنی پوٹلیاں کھول کر بڈھے چودھری کے سامنے بچھا دیں۔

بڈھے کا تنفس تیز ہو گیا۔

اس نے اپنے تکئے کے نیچے سے ایک اور پوٹلی نکالی۔ اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے اس کی گرہ کھولتے ہوئے کہا:

"ذری چلم میں آگ تو ڈالیو کوئی"

"یہ تمباکو تیری جان کے رہوے گا میں کہوے ہوں"

لیکن بڑھیا کی کسی نے نہ سنی۔ پوٹلی کی گرہ کھل چکی تھی۔ اور بیماری کے سودے کی طرح بڈھے کے سامنے کھیت کھیت کی مٹی پڑی تھی۔ اس کے خاندان کو کئی علاقوں میں زمین الاٹ ہوئی تھی لیکن اس کے آبائی کھیت کی مٹی سے جسے وہ اپنی پوٹلی میں ساتھ لئے پھر رہا تھا کسی کھیت کی مٹی نہیں ملی تھی چنانچہ وہ ہر بار بڑے کیمپ میں لوٹ گئے تھے کہ مانی سی مائی ملے اور منڈیر سے منڈیر ملے تب بووے ہیں۔ اب انہیں تھل میں زمین ملی تھی۔

بڈھے نے نئی زمین کی مٹی اپنی ہتھیلی پر اٹھائی۔ اس کے ذروں کو انگلیوں میں مسلا اور کسی عطار کی طرح، جو عنبر یا نافے کو سونگھ کر اس کی پہچان کر رہا ہو، اپنی ہتھیلی کو ناک کے قریب لے آیا۔

"رہٹ کہ رجبہا؟" اس نے پوچھا۔

جواب ملا "نہر"

"ہوں! — تو ہو گئی نا یاری کی بات۔ رہٹ میں تو جب چاہو اور جتنا چاہو پانی دے لو۔ خیر! یہ بتا دو کہ ہووے کیا کچھ ہے اس ماٹی میں؟"

اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے ان تمام چیزوں کے نام گنوا دیئے جو اس کے اپنے گاؤں اور آس پاس کے علاقوں میں پیدا ہوتی تھیں! گنا، گیہوں، دھان، سرسوں، آم......؟

"آپ سے۔ آپ تو تھوڑی آگے سے ہیں کہو دے ہوں!" بڑھیا کو پھر پانوؤں کا چکر نظر آ رہا تھا۔

"تو چپ ہو جا بڑھیا!" بڈھے کا سانس اس بیل کے سانس کی طرح چلنے لگا جس کی پیٹھ پر دفعتاً اس کی برداشت سے زیادہ بوجھ لد گیا ہو — اس نے اپنے سر کو زور کا جھٹکا دیا اور نئی زمین کی مٹی کو واپس پوٹلی میں پھینک دیا " ماٹی سے ماٹی نہیں ملے ہے ہیں کہوے ہوں!"

چھوروں کے چہرے اتر گئے۔ جھونپڑا مایوسی کے سانس سے سائیں سائیں کر اٹھا لیکن بڈھے پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے اپنے پرانے کھیت کی مٹی ہتھیلی پر اٹھائی اور آنکھیں بند کئے کسی اور دنیا میں کھو گیا۔ اس نے خالی ہاتھ سے حقے کی نے اپنی طرف کھینچی اور منہال منہ میں دبا کر ایک لمبا کش کھینچا۔ چلم میں آگ کا ایک شعلہ لپک کر ریشوں کی راکھ میں چھپ گیا۔

"ماٹی سے ماٹی نہیں ملے ہے۔ اور رمضانی چودھری کہوے ہے —" لیکن وہ اپنی بات پوری نہ کر سکا۔ اسے غوطہ آ گیا۔ سانس لینے کی کوشش میں اس کا ہاتھ اپنے گریبان سے الجھ گیا۔ گاڑھے کی بوسیدہ صدری سے جھاڑے کی آواز بلند ہوئی لیکن رمضانی چودھری کا سانس نہ لوٹا۔

تھل کی وسعتوں میں بڑھیا کے بین سستی کی چیخوں کی طرح بھٹکنے لگے جس کا پنگل اس کی جھوک اجاڑ کر غائب ہو گیا تھا۔

"تیرے کو کبھی مرنے کے لئے کوئی اور جا کہ نا ہیں رہ گئی تھی۔ گور نہ گدھا گھر نہ گھاٹ"۔

"گور نہ گدھا۔ گھر نہ گھاٹ ......!"

بڑھیا کی رہٹ کی طرح چیخ رہی تھی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ جھونپڑے کے باہر صحرا کا سورج سراب کی طرح چھپ گیا۔

"پورب پچھم کا بھی تو پتہ نہیں چلے ہے یہاں ...." بڑھیا، رمضانی چودھری کے ہزار بار دہرائے ہوئے الفاظ دہرا رہی تھی۔

پنچوں کے سر گھومنے لگے۔

".... بجانے دلیں کے کالے کوسوں ....."

اس آواز کے پس منظر میں اور آوازیں آ رہی تھیں۔

"اب کیا بنے گا؟ گاڑیں گے کہاں میں پوچھے ہوں؟ کھو دیں گڑھا اور ڈالیں ماٹی؟ کہاں؟ کدھر؟ بیٹے سے پوچھو اس کے!

بدھو بیٹا بھی نہ ہوئے کسی کا! عورت کے تو لائق ہی ناہیں! چودھریوں کے چھوہرے .... خاک! دیکھیں کرے کیا ہے...... اپنی بھی تو سوچ پنچو۔ کتے کی طرح یوں چلے آئے دم ہلاتے اس کے پیچھے! ماٹی سے ماٹی ملادے تھا موترا۔ بات ہے۔ بات اور بیچ جنگل کے لائے چھوڑ گیا! اتر دکن کا بھی تو پتہ ناہیں چلے ہے"۔

"پنچو!" پنچ چپ ہو گئے۔ انہیں یوں محسوس ہوا جیسے یہ آواز ہم نے کہیں سنی ہے۔ "کیا سوچ رہے ہو پنچو؟"

اور پنچوں کو یاد آ گیا کہ یہ رمضانی چودھری کی آواز تھی۔ پنچوں میں جب کسی بات پہ اختلاف ہوتا تو — لیکن رمضانی چودھری تو مر چکا تھا۔ تو یہ ابھی ابھی کون بولا تھا۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ مرنے والے کی روح یہ دیکھنے کے لئے ضرور آتی ہے کہ میرے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔ اس تصور سے ان کے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی۔

"چودھری کی میت یہیں پڑی رہے گی پنچو؟"

"اسے بدھو؟"

کمرہ حقارت آمیز کھانسی سے گونج اٹھا۔ اور کئی ہاتھ بہ یک وقت چودھری کی چارپائی کی طرف بڑھے۔

رمضانی کی میت کو نہلانے کفنانے کے بعد پنچوں میں پھر وہی کھسر پھسر شروع ہوئی ـــ پر گاڑیں گے کہاں جس کے پس منظر میں بڑھیا کا رٹا ہوا بدستور "گور نہ گڑھا۔ گھر نہ گھاٹ" کی تکرار کر رہا تھا۔

"پر گاڑیں گے کہاں؟" پنچوں نے بہ یک آواز پوچھا۔

"میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ بھائیو!" رمضانی چودھری کے بیٹے نے اپنے باپ کی میت کو کندھا دینے کے لئے جھکتے ہوئے کہا۔

انہوں نے چپکے سے جنازہ اٹھایا اور چل پڑے۔

ان کے قدم آپ سے آپ منزل کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے وہ راستے پر صدیوں آتے گئے تھے۔

پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو اور صحرا کی سرد ہوا سے ان کے بدن میں ایک نئی طاقت بھر گئی جس کا انہیں وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ چودھویں کا چاند ان کے سروں پہ چاندی کے چھتر کی طرح چھایا ہوا تھا۔ اور ان کے پاؤں تلے ریت کے ذرے آسمان کے ستاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ ایسا حسین منظر انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

دفعتاً ایک ٹیلے کی اوٹ سے جو چاندی کا بنا ہوا معلوم ہو رہا تھا ایک بستی کے آثار ابھرے۔

چودھری کا بیٹا بستی کے داہنے ہاتھ کھجوروں کے ایک جھنڈ کے قریب رک گیا۔

"آج صبح ہم یہیں آئے تھے پنچو ـــ یہ کھجوریں تجھے یاد ہے عثمان؟"

اس نے اپنے ایک ہم عمر سے پوچھا "یہیں سے ماٹی لی تھی نا ہم نے؟"

جواب ملا "ہاں بھیا بھیا"

صحرا کا سینہ لوٹ کے لمس سے لرز اٹھا۔ قبر تیار ہوئی اور گڑھا پٹ گیا۔ چودھری کے بیٹے نے اپنے باپ کی بوسیدہ چادر اٹھائی، جسے وہ جھونپڑے کے اندھیرے میں اپنے کندھے پر ڈال لایا تھا۔ اس نے چادر کو قبر کے پاس پھیلا دیا اور پوٹلی کھولتے ہوئے کہا: "یہ اس کھیت کی ماٹی ہے جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے مٹی کی ایک مٹھی بھری اور اسے پھولوں کی طرح قبر پہ چھڑک دیا۔ پھر اس نے چادر اٹھائی اور اسے جھٹکتے ہوئے باقی مٹی کو تیز ہوا میں اڑا دیا۔

"اس کھیت اور اس کھیت کی ماٹی اب مل گئی ہے پنچو۔ اس کھیت کا دھیان اب من سے نکال دو ـــ یہ زمین تمہاری ہے۔"

انہوں نے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ صحرا کی ایک جانب، زمین کے کنارے کنارے بنفشئی روشنی کا آنچل پھیل رہا تھا۔ ان کا سمت کا احساس دفعتاً زندہ ہو گیا۔ اور انہوں نے کہا کہ یہ پورب ہے اور وہ پچھم!

ان کے سروں پر، اوپر کہیں پروں کی سرسراہٹ سنائی دی۔ آسمان کی سیمگوں نیلاہٹوں میں کونجوں کی ایک قطار اڑتی ہوئی جا رہی تھی۔ نیلگوں پہنائیوں سے نکلا ہوا ایک تیر تھا جس کی سب شاخیں سمٹ سمٹا کر ایک نقطے پر مرکوز ہو گئی تھیں۔

"تلیروں کی ڈاریں ڈھلتے ہیں مرغابیاں"

"برفوں کو بھاگے جا رہے ہیں بیچاری"

برلیں ـــ "اتّہ!" اور راستے کی دوسری جانب، دکن مگر یہ پوچھاڑ کی سی آواز کیا تھی؟

ٹیلے کی اوٹ سے ہرنوں کی ایک ڈار چوکڑیاں بھرتی ہوئی ابھری۔ سحر کے پُراسرار اجالے میں ان کی کمر کی قوسیں کمانوں کی طرح لہرا رہی تھیں جن سے سینگوں کے سنہری تیر نکل رہے تھے۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

بنگلا افسانہ:

انجان!

شاہیرہ احسان
مترجمہ: او۔ ایچ۔ کبیر

ابھی صبح کے دس بھی نہ بجنے پائے تھے کہ دھوپ سخت تیز ہوگئی۔ باہر نکلنا تو دور کی بات ٹھیری، دھوپ کی طرف نظر تک بھی نہ اٹھتی تھی۔ سارے کا سارا آسمان جیسے تیز دھار والے خنجر کی طرح دہک رہا تھا اور بادل کا نشان تک کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ اگر ہوا کا ایک آدھ جھونکا بھی چل جاتا تو اس قدر گرمی محسوس نہ ہوتی۔ لیکن نہ جانے کیوں دو دن سے ہوا نے بھی سازش کر رکھی تھی۔

صبور اپنی پھٹی قمیص سیتے سیتے کھڑکی سے سڑک کی جانب دیکھنے لگا۔ دو کتے زبان نکالے ہانپتے ہانپتے سامنے سے بھاگ گئے۔ ایک گڈریا چند گائیں چرانے لئے جا رہا تھا۔ چار پانچ کوے ایک مردہ چوہے کو نوچ رہے تھے۔ باہر کا منظر دیکھتے دیکھتے صبور کا ہاتھ کام سے رک گیا۔ اچانک وہ موٹر کی آواز سے چونک پڑا اور نہ جانے اس کو کس بات کا خیال آگیا۔ اس نے اپنے سر کو ایک ہلکی سی جنبش دی اور پھر پھٹی قمیص سینے میں مشغول ہوگیا۔ ایک آدھ گھنٹے کے بعد اس کی بیوی محجوبہ وہاں پہنچی، اپنی ٹوٹی پھوٹی چپل ایک طرف پھینکی اور پھر اپنے کمزور جسم سمیت دھپ سے اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اس کو بڑی مشکل سے حاصل کیا تھا۔ اور خاندان والوں کی ناراضگی کے باوجود دونوں نے شادی کرلی تھی۔

کمرہ میں داخل ہوتے ہی محجوبہ کے دل میں اضطراب برپا ہوگیا۔ صبور اس کے چہرہ کی طرف دیکھے بغیر اور کوئی سوال پوچھے بنا سمجھ گیا کہ بات کیا تھی۔ وہ خاموش رہا، اس نے اسے کوئی تسلی نہ دی اور نہ کوئی امید افزا لفظ ہی بولا۔ آخر محجوبہ ہی نے مہر خاموشی کو توڑا اور مایوس لہجہ میں بولی "کچھ بھی نہ بنا، ساری محنت بیکار گئی"، اور پھر تھکے ماندے لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ پانی کی صراحی کے پاس جاکر کھڑی ہوگئی۔ "میں تو جانتا ہی تھا" صبور نے بے پروائی سے جواب دیا۔ محجوبہ اس وقت غٹ غٹ پانی پی رہی تھی، اس لئے فوراً جواب نہ دے سکی، پیاس کے مارے اس کا حلق خشک ہوگیا تھا۔ اس نے ٹھنڈا پانی ایک ہی سانس میں چڑھا لیا، اور آنکھیں موند لیں۔ اس کے منہ سے نکل گیا "خیر، جان بچ گئی"۔ پھر پسینہ میں تر ابو ربلاؤز اتارتے اتارتے کہنے لگی "تمہیں کیا معلوم تھا؟ اگر تم نجومی ہو تو پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا؟ اس شدید گرمی میں اس قدر پریشانی نہ اٹھانی پڑتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کرایہ بچتا۔ اسی کی سخت کوفت ہے، اور کچھ نہیں تو ایک دن کا خرچ تو چل جاتا"۔ اس بار صبور نے محجوبہ کی طرف بغور دیکھا۔ گرمی سے اس کا چہرہ بالکل سوکھ گیا تھا اور اکیس سال کی عمر میں وہ بڑھیا معلوم ہونے لگی تھی!

ایک لمبی سانس لے کر صبور نے کہا "جوتش سے بھی بڑھ کر ایک علم ہے اور وہ ہے تجربہ ..... نہ پہننے کو تمہارے پاس کوئی اچھا کپڑا ہے اور نہ زیور گہنا۔ چپل بھی پھٹا پرانا اور پیوند لگا، پھر کسی بڑے آدمی کا زور دار سارٹیفکٹ بھی نہیں، تمہارے پاس کس چیز کے سہارے پر نوکری تلاش کرنے گئی تھیں؟ محجوبہ آج اگر تم کسی مشہور آدمی کی بیوی ہوتیں اور تمہارے پاس اتنی ڈگریاں بھی نہیں ہوتیں تو بھی نوکریاں تمہارے پاؤں چومنے کو دوڑتی پھرتیں۔ تمہارا چہرہ صاف بتا رہا ہے کہ تم بے انتہا ضرورتمند ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی قابلیت رکھتے ہوئے بھی تمہاری درخواست نامنظور کر دی گئی۔ اچھا چھوڑو اس کو۔ یہ تو بتاؤ انہوں نے کہا کیا؟ کہیں نوکر سے یہ تو نہیں کہلوا دیا کہ صاحب گھر پر نہیں۔ انٹرویو نہیں ہو سکتا؟

مصیبت میں ہمدردی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ اس وقت اندرونی دکھ پر قابو نہیں رہتا اور آواز تک میں تکلیف کی موجیں بے تحاشا ابل پڑتی ہیں۔ محجوبہ نے گھٹی گھٹی آواز میں جواب دیا "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ان لوگوں نے صرف اتنا کہہ دیا کہ فی الحال کوئی جگہ خالی نہیں اور انہیں اس کا بہت افسوس ہے۔ جگہ خالی ہونے پر اطلاع دی جائے گی ... ہر جگہ بدقسمتی ہی سے سابقہ رہتا ہے جس چیز کا سہارا لیتی ہوں وہی

بے کار ثابت ہوتی ہے۔ پھر جو میں تمہاری مصیبت میں کوئی کام نہ آ رہی ہوں، اس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ اچھا ہٹاؤ ان باتوں کو۔ اگر تم یہ کیا کرنے بیٹھ گئے؟
یہ کام کوئی تمہارے کرنے کا ہے؟" یہ کہتے کہتے محبوبہ نے صبور سے قمیص چھین لی۔ "کیوں، جب تم میرا گھر چلانے کی ذمہ داری اپنے کندھوں پہ لے سکتی
ہو تو کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا؟" صبور ہنسنے لگا۔ "میں اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتا؟" صبور ہنسنے لگا۔ "میں اندھا نہیں، اپاہج نہیں۔ پھر تم کو اوروں کے
دروازے پہ نوکری کے لئے بھیجنا کیا معنی؟" محبوبہ نے جلدی سے دونوں ہاتھ صبور کے منہ پر رکھ دئے۔ "توبہ! تم یہ کیا کہنے لگے؟ کیا ہم میں یہ عہد نہیں ہوا
تھا کہ ہم ہمیشہ ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے رہیں گے؟ ورنہ ازدواج کے اور معنی ہی کیا ہیں؟ آج بھی میں اس بات پر ایمان رکھتی ہوں کہ اگر کوئی پڑھی لکھی بیوی
ملازمت کر کے تھوڑی سی آمدنی سے شوہر کی مدد کرے تو سارے خاندان میں اس کی عزت بڑھ جاتی ہے۔ ایسی عزت جو دولت یا زیورات نہیں دے سکتے
جدید تعلیم بھی تو اسی پر زور دیتی ہے۔" "سوال یہ ہے کہ عورت کی اپنی بھی خودداری ہے جو مردوں کے غرور کو بھی توڑ سکتی ہے۔"

"غرور نہیں، اصل کہو۔ مرد یہی سوچ کر شادی کرتے ہیں کہ لڑکی گھر کے کام کاج میں مرد کا ہاتھ بٹائے گی اور لڑکی بھی انہی ذمہ داریوں کا احساس لئے
ہوئے اس کے گھر رخصت ہوتی ہے۔ لیکن جب بیوی کو اپنے فرائض تو کیسو رہے شوہر کی ذمہ داریاں بھی سنبھالنی پڑیں تو مرد کو لازماً بڑا صدمہ ہوتا ہے۔
پہلے مجھے اس کا تجربہ نہیں تھا اس لئے تمہیں بار بار کہتا تھا۔ لیکن اب محسوس کر لیا۔" "آخر تم میری بات کیوں نہیں مانتیں؟ مجھے غیر کیوں سمجھتی ہو؟"

"نعوذ باللہ! میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا۔ تم نے مجھے غلط سمجھا ہے یقین کرو......" "تم نے ضرور کہا ہے، نہ کہہ دینے سے کیا ہوتا ہے؟ شادی
کے بعد شوہر کو ہر بات بیوی کی رضامندی کے مطابق کرنا پڑتی ہے۔ آخر ایسا کیوں نہ ہو؟ گھر کا سکون، خوشی، راحت سب کچھ تو بیوی ہی کے ہاتھوں میں
ہوتا ہے اگر وہ کہیں خفا ہو گئیں تو بس سمجھو قیامت ہی آ گئی۔ میاں بیوی کے حقوق ان کی ذمہ داریوں کی بنا پر مختلف نہیں؟ مگر کیا کریں، آج کل عورتیں
ان باتوں کو سمجھتی ہی نہیں۔"

اب تک تو محبوبہ ان باتوں کو دھیان دئے بغیر سن رہی تھی۔ اب وہ بھڑک اٹھی۔ "تمہیں یقین کرنے پر کوئی مجبور نہیں کرتا۔ کیا تم نے عورت کو
ایک ننھی بچی سمجھ لیا ہے۔ اگر وہ حصول معاش کے لئے جد و جہد کرنے کی غرض سے باہر نکلتی ہے تو تمہارے وقار پر ایک بدنما داغ پڑ جاتا ہے۔ کیوں؟ یہ تو
آزادی کا زمانہ ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جس طرح بے چون و چرا جو کچھ تسلیم کر لیا تھا وہ ہم کس طرح مان سکتے ہیں؟ آج کل بھی مرد عورتوں کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتے
ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ عورتیں اقتصادی حیثیت سے مردوں کی دست نگر ہیں۔ اگر ایک غلط سماجی نظام رائج ہے۔ تو اس لئے مردوں کو اپنا وقار
ضائع ہونے کا خوف لگا رہتا ہے وہ خود غرضی کی بنا پر یہ نہیں چاہتے کہ عورتیں اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔"

"اگر بیوی باہر جا کر نوکری کرے تو گھر بار کا دھیان کون کرے؟" "گھر بار تو میاں بیوی دونوں ہی کا ہوا کرتا ہے۔ اس لئے تمام باتوں میں دونوں کی ذمہ داریاں
برابر ہیں۔ اچھا اب ہٹاؤ ان بحثوں کو، چلو کھانا کھائیں۔"

"جب بات چھڑ ہی گئی تو اسے پورا کیوں نہ کیا جائے؟"

"بس، خفا ہو گئے کیا؟"

محبوبہ بہت دیر تک ٹکٹکی باندھے صبور کے غصہ بھرے چہرے کو دیکھتی رہی۔ اس نے صبور کا چہرہ اتنا لال پیلا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کا بدلا ہوا
روپ دیکھ کر وہ سخت خائف ہوئی۔ اس کی آزادی کی وسعتیں جیسے سکڑ کر رہ گئیں۔ کہیں صبور اس کی باتوں کو اپنے آپ سے تو منسوب نہیں کرنے لگا؟
یونہی باتوں باتوں میں بحث اتنی طول پکڑ گئی۔ میرے خدا! کہیں وہ غلط نہ سمجھ بیٹھے۔" وہ دل ہی دل میں دعا مانگنے لگی۔

"وہ شاید اس لئے خفا ہے کہ میں اس کی اجازت کے بغیر ملازمت کی تلاش میں چلی گئی تھی۔ مگر کیوں؟ کچھ اور بھی؟ اگر مجھے اپنی دنیا کو خوشحال بنانے کا
ذرا بھی حق نہیں تو پھر کام کیسے چلے گا؟ صبور یہ بات کیوں نہیں سمجھتا؟ وہ تو صرف باتوں کو پیچیدہ بنا کر خود بھی پریشان ہو رہا ہے اور مجھے بھی پریشان
کر رہا ہے۔ میں عورت ہوں۔ اس لئے مجھے کام کرنا منع ہے!" محبوبہ کو یہی بات بار بار پریشان کرتی رہی۔ اس کا دل مضطرب ہو گیا۔ احساس خودی سے اس کا چہرہ
بھڑک اٹھا اور کمرے سے جاتے وقت وہ یہ چٹکی لئے بغیر نہ رہ سکی کہ "اے مرد! تو سراپا نخوت ہے۔"

صبور خاموش بیٹھا سوچتا رہا۔ طرح طرح کے خیالات اس کے ذہن میں آتے رہے۔ آج تین مہینہ سے وہ بیکار بیٹھا تھا۔ تخفیف میں اس کی عارضی

نوکری جاتی رہی تھی۔ دو مہینہ سے گھر کا کرایہ، دودھ والے کا پیسہ، نوکروں کی تنخواہ سب دینا باقی تھے۔ ادھر اُدھر سے جو رقم ادھاری تھی اس کا حساب ہی نہ تھا۔ تقاضوں کے مارے راستہ چلنا مشکل تھا۔ اس لئے وہ گھر ہی میں پڑا رہتا۔ زیورات گروی رکھ کر کام چل رہا تھا۔ قرضہ بھی لوگ کہاں "تک" دے سکتے تھے، اور زیور بھی کتنا تھا؟ مستقبل کی لامحدود تاریکی کے تصور ہی سے اس کا دم گھٹنے لگتا تھا۔ کاش وہ شرافت اور اعلیٰ تعلیم کے احساس کو توڑ مروڑ کر پھینک سکتا! تب زندگی بتانا کس قدر آسان ہوتا۔ وہ قلی مزدور ہو سکتا تھا، کندھے پر کپڑوں کی گٹھری لادے لادے پھیری کر سکتا تھا، اپنے ہاتھ پیروں سے محنت کر کے پیسہ کمانے کی صورت میں اس طرح سسک سسک کر بھوکوں مرنا نہ پڑتا۔ مرد ہو کر گھر میں عورتوں کی طرح بے کار بیٹھے رہنا۔ اس سے زیادہ شرم کی اور کیا بات ہو سکتی تھی؟"

وہ انہی خیالات میں غرق تھا کہ اچانک دروازہ پر کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی اور وہ چونک پڑا، دروازہ کھولتے ہی مایوسیوں کے اندھیرے میں امید کی کرن چمک اٹھی۔ اس نے بڑی ہی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا "ادہو حلیمہ بہن! تم اچانک کیسے آگئیں؟ آؤ آؤ، اندر آؤ!"۔

زیورات سے لدی جھلمل کرتی ساڑھی پہنے حلیمہ کھلی جا رہی تھی۔ وہ بڑی شان سے بولی "تم لوگ تو بھول کر بھی خیر خبر نہیں لیتے۔ آخر بات کیا ہے؟ دیکھو، میں خود ہی تم لوگوں کو دیکھنے چلی آئی۔ بھابی کہاں ہیں؟"

صبور اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ صرف ان کی خیریت پوچھنے ہی نہیں آئی۔ حلیمہ اس کی چھوٹی بہن تھی اور بہت ہی پیاری بہن۔ بہت خوش حال۔ اس کا شوہران لوگوں میں سے تھا جن کی تقدیر محض ہواؤں کے تغیر سے بن جایا کرتی ہے۔ صبور نے کہا "بہت اچھا کیا تم آگئیں۔ مجھے ایک بہت بڑی ضرورت تھی"

"کہو تو ایسی بات کیا ہے؟"

تم تو اپنے بھیا کو بہت چاہتی ہو نا؟ اس پر اعتماد کرتی ہو"

"واہ! کام نکلنے کا کتنا اچھا ڈھنگ نکالا ہے" حلیمہ زور زور سے ہنسنے لگی۔

"اچھا فرض کرو میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں اور مجھے بہت سے روپیوں کی ضرورت آن پڑے۔ تمہارے میاں تو کچھ دینے پر راضی نہیں۔ اس وقت تم کیا کرو گی، کیسے مدد کرو گی میری؟"

حلیمہ نے جواب دیا "روپیہ نہیں تو میرے زیورات تو ہیں ہی، انہیں تو کوئی چھین نہیں سکتا"

"سچ؟ اچھا تم کس کام سے آئی ہو؟ تم نے بتایا ہی نہیں"۔ صبور نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

"یہ کیا دیوانوں کی طرح باتیں کر رہے ہو؟ بھابھی کہاں ہیں؟ ان سے جھگڑا کر کے مجھے خوف کیوں دلا رہے ہو؟ اف کیسی گڑبڑ پیدا کر دی تم نے۔ اچھا جس کام سے آئی تھی وہ کہتی جاؤں۔ اور ابھی چار پانچ جگہ جانا ہے، ذرا بھی تو فرصت نہیں۔ ۔ اوہو، ڈیڑھ بج گئے! اتوار کو تم سب ہمارے یہاں آ کر کھانا کھانا۔ تمہاری جنگی کی بات پکی ہو رہی ہے۔ اسی دن شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گی۔ یہ ہے پانچسو روپیہ۔ دعوت کا انتظام تم ہی کو کرنا ہو گا۔ تمہارے سوا اور کوئی بھروسہ کا آدمی دکھائی نہیں دیتا"

صبور نے ہاتھ بڑھا کر روپیہ لے لیا، پھر ایک دم بول اٹھا "حلیمہ تم کو اس وقت کی باتیں بھی کچھ یاد ہیں۔ جب تم لوگ پریشان تھے۔ اور دولہا میاں کی جتنی آمدنی ہوتی تھی اس سے تمہاری گزر بسر ٹھیک سے نہیں ہو پاتی تھی؟ اس وقت میں نے تم کو کچھ روپے دئے تھے۔ یاد ہے، یہی کوئی تین ہزار کے لگ بھگ ہوں گے۔ اس وقت حساب ٹھیک سے یاد نہیں پڑ رہا ....."

یہ باتیں سن کر حلیمہ یکبارگی سہم سی گئی، گزرے ہوئے دنوں کے کھنڈر نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔ اس نے روکھے لہجہ میں جواب دیا "کیا جانوں بھیا! اتنا حساب کتاب تو رکھتی نہیں، لیکن اتنی پرانی باتیں آج یکایک کیسے یاد آ گئیں؟"

"مجھے آجکل روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ ایک ہزار روپیہ قرض ہی سمجھ کر دے دو، آہستہ آہستہ چکا دوں گا۔ تمہارے علاوہ تو اور کوئی دکھائی نہیں دیتا جس سے روپیہ ملے"

اتنا سنتے ہی حلیمہ سن سی ہو گئی۔ کہنے لگی "تمہیں مذاق کرنے کا اور کوئی وقت نہیں ملا صبور بھیا؟ تم کو تو خود اس وقت میری مدد کرنی چاہئے۔ اگلے

(باقی صفحہ ۳۰ پر)

اندھیرے

طاہرہ رشی

آج پھر ناہید کا خط مری کے سینی ٹوریم سے آیا ہے ۔ بادامی لفافے میں کتنے ہی بیتابانہ سوالات میری جنبشِ قلم کے منتظر ہیں ۔ اپنے مخصوص طرزِ نگارش میں میرے اتنے عرصے کے پُر معنی سکوت پر اظہار کرتے ہوئے ناہید نے لکھا ہے :-

"سلمیٰ، تم پر بے مہری کا الزام لگاتے ہوئے گو میرے اپنے وقار کو ٹھیس سی لگتی ہے لیکن میں تمہاری اس طویل خاموشی سے یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوں کہ وقت اور فاصلے کے علاوہ میری ہستی کے بیکار ہونے کے خیال نے ضرور تمہارے پردۂ دل سے میرے تصور کو دھندلا دیا ہوگا۔ مجھے اسکی کوئی شکایت نہیں، جب میرا وجود ہی بیکار چیزوں میں شامل ہوا تو پھر کیسا شکوہ؟ اپنی حیثیت کا اندازہ ہونے کے باوجود تم یہ الزام تو میری ان نگاہوں کو دو جو روز چڑھتے سورج کو دیکھ کر پارینہ یادوں کی کہر میں لپٹی ہوئی صبحوں کو ڈھونڈنے لگ جاتی ہیں ۔ اور کبھی بیتی ہوئی سالونی شاموں کا جاوید کو گوئٹے کی تصنیف نما ئے زندگی کے حقائق پر غور و فکر میں محو پاتی ہیں ۔ اور پھر تم سلمیٰ — بارہا کائنات کے اجلے اجلے رنگ کینوس پر پھیلانے میں مصروف نظر آتی ہو ۔ اور کبھی روشن خالہ کی شفقت میرے قلبِ حزیں کو اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ سلمیٰ یہی ہیں وہ کردار جو میرے افسانۂ زندگی کا جزو ہیں"

ناہید نے کتنی سادگی سے ان کرداروں کو اپنے افسانۂ زندگی کا جزو قرار دیا ہے جس طرح دھیمے لہجے میں وہ گفتگو کرنے کی عادی تھی اسی طرح اس کا قلم بھی خاموشی سے ہر خیال کو بڑی نزاکت سے صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا تھا ۔

میرے ذہن پر کائنات کے ہزار ہا جاذبِ نظر رنگوں پر حاوی ناہید کا چہرہ پریدہ رنگ، خزاں کی طرح رافیل کے شاہکار "میڈونا" کی بصیرت لئے چھا جاتا ہے ۔ ناہید بڑی پیاری لڑکی ہے کبھی اسے زندگی کی تزئین کا بڑا شوق تھا جس کی وجہ سے اس کی فطرت میں تبسم اور شگفتگی رس بس گئی تھی ۔ جب کبھی وہ اپنی سیاہ زلفوں کو سنوار کر، آنکھوں میں کاجل لگا کے جاوید کے سامنے جاتی تو اور بھی پیاری لگتی۔ اتنی کہ دل چاہتا اسے روح میں چھپا لے ۔ ان دونوں نے اپنی وابستگی کو ہم سے کبھی نہیں چھپایا ۔ ان کا نظریہ تھا کہ نفسانی آلائشوں سے مبرا، مریم کے خیال کی طرح مقدس جذبات کو دلوں میں دفن رکھنا ان کی توہین ہے ۔ بلکہ ان کو تو منظرِ عام پر لانا چاہیئے تاکہ ہر ایک دل ان کی میٹھی میٹھی نرم آنچ سے آشنا ہو سکے ۔ اسی جذبہ کی تسکین کے لئے ناہید نے مجھ ۔ بیسی بار جاوید کی تصویریں بنوائیں اور ذاتی خواہشوں پر جاوید کی خواہشوں کو ہمیشہ مقدم سمجھا بلکہ خود کو فراموش کر کے اسے اپنا مرکزِ تمنا بنا لیا ۔

اس کے مرکزِ تمنا کو میں اس وقت سے جانتی ہوں جب روشن خالہ بیوگی کا داغ اٹھا کر مستقل طور پر اپنے اکلوتے نورِ نظر جاوید کو لئے ہمارے ہاں آن بسی تھیں ۔ عین شباب میں اجڑی مانگ اور ناموس کی حفاظت کے علاوہ اپنے شوہر کی آخری نشانی کی پرورش کی ذمہ داری نے انہیں لوہے کا دل گردہ بخش دیا تھا ۔ انہوں نے اپنے لختِ جگر کا مثالی کردار بنانے کے لئے اس کی تعلیم و تربیت میں کسی قسم کی کسر نہ اٹھا رکھی ۔ جاوید کو اپنے بڑھاپے کی لاٹھی اور مرحوم شوہر کی محبت کا نعم البدل سمجھ کر روشن خالہ نے اس پر اتنی توجہ کی کہ ماں اور محبوبہ کی بے پایاں محبت پا کر اس کی پروازِ خیال بہت بلند ہو گئی ۔ اس کی ذہنی جودت کی نوعیت اس نفسیاتی اثر سے کچھ اس قسم کی ہو گئی تھی کہ ان کے التفات کی ذرا سی کمی اس کے جذبات میں ایک بحران پیدا کر سکتی تھی ۔ جہاں تک میرا مشاہدہ تھا جاوید نے ہمیشہ عام انسانوں سے خود کو بلند سطح پر محسوس کیا ۔ وہ ہمیشہ ایسی آزاد زندگی کے خواب دیکھا کرتا تھا جہاں کائنات کی وسیع ذہنی فضاؤں میں زندگی اڑتے ہوئے طیور کی طرح پرواز کرے اور کوئی

صیاد رخنہ انداز نہ ہوسکے۔

میں جب بھی برش اور کینوس سنبھال کر پائیں باغ میں آن بیٹھتی وہ بھی ضرور آکر شریک ہو جاتا اور حسبِ عادت مسکراتے ہوئے مجھے نئے نئے زاویوں سے تصویرکشی کا مشورہ دیتے ہوئے کہتا "سلمیٰ آپا، یہ تو ٹھیک ہے کہ کلاسیکی آرٹ میں لیونارڈو اور جدید آرٹ میں چغتائی کے شاہکاروں نے آپ کو مسحور کر رکھا ہے، لیکن اپنی رفعتِ نظر کا ثبوت ان شاہکاروں کی نقل کی بجائے قدرت کے جیتے جاگتے شاہکار کی تصویر بنا کر دیجئے نا۔ مثلاً مونالیزا کی مسکراہٹ کی بجائے، ناہید کی مسکراہٹ......"

اور جب کبھی ناہید بھی میرے ہمراہ جاوید کے نیلے پردوں سے آراستہ کمرے میں ہوتی تو پھر گویا جاوید کے ذہن میں بسے ہوئے رنگین خیالات کو مہمیز سی لگ جاتی۔ وہ دیر تک اپنے بلند بام ارادوں حسین و درخشاں مستقبل اور پھر رومانی شاعروں کا تذکرہ کرتا رہتا جو بزم گاہِ وجود میں رہنے کے باوجود اپنی بیشتر زندگی ارضِ تصور کے رومان پرور جزیروں میں بسر کرتے ہیں۔ کیمسٹری میں ریسرچ کرنے کے لئے اس نے اگلے سال ہی یورپ جانے کا پروگرام بھی بنالیا تھا اور اپنے ساتھ ناہید کو اپنی جیون ساتھی کی حیثیت سے لے جانے کا ارادہ تھا لیکن اچانک ہی ان ہی دنوں ناہید پر ٹی بی کا خفیف حملہ ہوا جس کے باعث اسے مری کے سینی ٹوریم تبدیلِ آب و ہوا کے لئے بھیجنا پڑا۔

اپنے خط میں ایسی ہی رنگین ساعتوں کے متعلق ناہید نے تذکرہ کیا ہے۔ "سلمیٰ! سب کہتے ہیں بہار آگئی۔ یہاں ہر صبح ہر مریض کے کمرے میں تر و تازہ پھول رکھے جاتے ہیں۔ ایامِ گذشتہ کی طرح شعریت سے لبریز ماحول ہے اور نشاط آفریں مناظر۔ ایسا معلوم ہوتا ہے زمین آسمان ملکر ایک شعر بن گئے ہیں۔ پوری کائنات بقعۂ نور بنی ہوئی ہے، چرخِ نیلوفری پر ستاروں کی کانپتی ہوئی روشنی ہے، اور دنیا کسی بت گر کے خواب کی تعبیر۔ پھولوں سے لدی ڈالیوں پر بادری کوئل اکثر خوش آہنگ آواز میں ملہار گاتی ہے۔ لیکن میری سماعت اس نغمگی کو سننے سے محروم ہے، میری بے چین نظریں عہدِ پارینہ کی جانب مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں، جہاں میرا گمشدہ ماضی ہے جسے میں بلبل کے نغموں اور بادِ سحر کے جھونکوں میں بار بار تلاش کرتی ہوں۔ مگر آہ! یہ سب محض سعیٔ ناکام ہے۔ تم میرے خیالات کی قنوطیت کی وجہ دریافت کرو گی۔ وہ ہے تمہارا پرمعنی سکوت...... جاوید کی خاموشی اور میری متوحش تنہائی!"

"سلمیٰ، تم تو میری اس عادت سے اچھی طرح واقف ہو کہ میں بہت جلد افسردہ ہو جاتی ہوں۔ میں بے انتہا حساس ہوں۔ سب سے زیادہ غم مجھے اس مسلسل بیماری نے لگا دیا ہے جس کے باعث مجھے ڈری ہوئی بیگناہ روح کی طرح مری کے اونچے اونچے پہاڑوں کے حصار میں قیدِ تنہائی کاٹنی پڑ رہی ہے جس کی میں قطعاً عادی نہیں۔ کہاں جاوید کے طویل قہقہے، روشن خالہ کی مسکراہٹیں اور تمہاری کھلکھلاتی ہنسی اور کہاں اس بیمار ماحول کے لبوں پر کھنڈروں جیسا سکوت! بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ اپنی اور مریضوں کی گریہ و زاری اور ہائے وائے کے درمیان رہ کر شگفتگی قائم رکھنا پل صراط پر توازن قائم رکھنے کی بات ہے اور...."

میں تصور کی نگاہوں سے دھندلی روشنی میں ناہید کی شمع نما انگلیوں کی کپکپاہٹ کو دیکھتی ہوں۔ اور پھر شبنمی پلکوں پر لرزاں موتیوں کو جنہوں نے ڈھلک کر اگلی سطور کو دھندلا دیا ہے۔ اگر ناہید کو اس تلخ حقیقت کا پتہ چل جاتا جس نے میری زبان پر تالے لگا دیئے ہیں۔ تو شاید میں اس سے صرف اتنا ہی کہہ سکتی: "ننھی معصوم گڑیا! ماضی کے افسانے دہرانا لاحاصل ہے۔ رفتہ و گزشتہ، ماضی اور اس کی چند گھڑیوں کا ذکر ہی کیا...... آہ! وہ سراب آسا لمحات، جن کو گزرتے اتنا عرصہ بھی نہ لگا جتنے عرصہ میں کنول کی پنکھڑی پر بارش کی بوند گر کر منتشر ہو جاتی ہے، پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ ان کو ثبات عطا کرنا ہے تو بس انہیں ذہن کی کٹھالی میں ڈھال لو، یا لوحِ دل پر گزشتہ زندگی کی جنتوں کے نقوش مرتسم کر لو۔ اور جب جی چاہے تحت الشعور کی تہوں کو عریاں کر کے ان جنتوں میں جھانک لو! خلوت کو جلوت میں لانے کی یہی وہ صورت ہے جو بیہم گریزپا لمحوں کو واپس موڑ لاتی ہے۔

اور افکار کے علاوہ مجھے ناہید کی بیماری کی بھی بہت فکر ہے۔ خود میری روح جو کبھی کوہِ وقار تھی، اور چٹان کی طرح خوددار، اب احساس کے تند رو نالوں سے پاش پاش ہو رہی ہے۔ میں ناہید کے خزاں رسیدہ پتے کی طرح مرتعش لبوں کی پکار سنتی ہوں: "سلمیٰ! تم کتنی بے وفا ہو۔

تم میرے حزنیہ خطوط کا جواب دینے سے گریز کیوں کرتی ہو؟"
لیکن میں اسے کیا بتاؤں! نہیں، میں اس کے نازک خوابوں کے آبگینوں کو نہیں توڑ سکتی! سب کی رائے ہے کہ میرا برش فطرت کے تمام شوخ پہلو کینوس پر بڑی چابکدستی سے ظاہر کر دیتا ہے۔ مگر یہ قلم فطرت کے تاریک پہلو کیوں نہیں ظاہر کر پاتا؟ ان کا مطلب یہی ہوا نا کہ میری شخصیت کی نشوونما ہنوز نامکمل ہے۔ میں عموماً خوابِ خود فراموشی میں غرق رہتی ہوں۔ خیالات امواجِ تخیل میں ڈوبے ہوئے! میرے قلبِ حزیں کو اتنی مہلت نہیں ملتی کہ شعلے کی طرح اپنے ان احساسات کے درد کو بھڑکا کر لا سکوں جو ناہید کے خط کے آخری حصے نے پیدا کر دیئے ہیں!

اوہ! میں بھی کتنی پگلی ہوں، کہ اپنے سوزِ دروں کو ظاہر کر دیا۔ حالانکہ یہ اسی سوزِ دروں کا اعجاز ہے کہ اتنے فاصلوں کے باوجود تمہیں کینوس پر جھکے ہوئے نیلے کاہی رنگوں کی دنیا میں گم دیکھتی ہوں، پھر دفعتاً ذہن میں ہلکی ہلکی چاپ ابھرتی ہے۔ میں کہتی ہوں اب جانے بھی دو۔ بھلا اب یادوں کے بجھے دیپ جلانے کون آئے گا! لیکن میری پلکوں کی جنبش ہوتے ہی جاوید کا چہرہ سامنے آ جاتا ہے۔ جس کی عقابی آنکھوں میں اپنے زریں مستقبل کی چمک اور ہونٹوں پر زندگی کی مسکراہٹ ہوتی ہے۔ مجھے بے اختیار ایک حسین جذبے، ایک افلاطونی قسم کے معصوم عشق کی یاد آ جاتی ہے۔ سلمیٰ، تم ذرا اس سے پوچھنا تو سہی کہ چمکیلے خوابوں کو دیکھنے والے انسان کیا تیرے دل سے اس محبت کے چراغ کی لو بجھ گئی جو تونے راہِ منزل کی حائل کردہ تاریکیوں کو چھپانے کے لئے جلا رکھی تھی؟ اور ہاں اسے میرا سلام کہہ دینا!"

خط کے آخری الفاظ نے میرے ضبط کا بند توڑ دیا ہے۔ میری آنکھوں پر آنسوؤں کے دھندلکے چھا گئے ہیں، ہر جانب شبِ یلدا کی سی تاریکی ہے۔ یہی تاریکی جاوید کے چمکیلے خوابوں پر، میرے دل پر اور گرد و پیش کے سکون و اطمینان پر بھی چھائی ہوئی ہے۔ کائنات کا ہر رنگ اس تاریکی میں سیاہ پڑ گیا ہے۔ میں ان اندھیروں کی ماہیت کیسے بتاؤں؟ میں کیسے ناہید کو زندگی کی تلخ حقیقتوں سے روشناس کراؤں کہ کئی روز پیشتر جیپ کے حادثے میں جاوید ہلاک ہو چکا ہے!

انجان! ——— افسر صبور

صبنہ لڑکی کی شادی ہے، کم از کم دس ہزار کا تو دھکا ہی ہے بجائے میری مدد کے تم بنا دکھڑا لے بیٹھے۔ دیکھو بھیا وقت پر ضروری چیزیں خریدنے کا بندوبست کرنا نہ بھول جانا تم تو اتنے بھلکڑ ہو" اور وہ دل ہی دل میں سوچنے لگی: "آٹھ روپیہ ہے، آجکل آسانی سے کس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے، چاہے وہ اپنا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔
جو کچھ وہ سوچ رہی تھی وہ صبور سمجھ رہا تھا۔ اس نے زور سے قہقہہ لگا کر کہا "ڈرنے لگیں کیا؟ ارے ابھی یہاں تک نوبت نہیں پہنچی کہ تمہارا روپیہ ہضم کر جاؤں۔ نوکری چھوٹ گئی تو جانے دو۔ انسانیت تو ابھی نہیں گئی!"
خلیمہ ہو گئیں۔ "ارے تمہاری نوکری چھوٹ گئی، کب؟ اُف کیسی مصیبت ہے! اچھا بھیا اب چلتی ہوں، پھر کسی دن یہ سب کچھ سنوں گی"
وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتی چلی گئی!
دروازہ بند کر کے جب صبور پھر اپنی جگہ آن کر بیٹھا تو اس کے چہرہ پر ہنسی کی ذرا سی جھلک بھی نہ تھی!

★

تصوّری غنائیہ :

رفیق خاور

(ہر قسم کی ملی جلی قدرتی آوازیں جن سے چلبلا پن اور گہما گہمی ظاہر ہو)
ایک غلغلہ - شہنائی پر بلند آوازیں "بہار" کی دھن - بول :-
"آئی رُتوا پھولن کی"

راوی :- بہار — پھلنے پھولنے کی رت - آتے ہے دل کے اندر باہر خوشی کی ایک لہر اٹھتی ہے - کون ہے جس نے اس قدرتی جشن کے سُہانے منظر دیکھے ہوں اور ان سے اس کے دل کے کنول نہ کھلے ہوں؟ بالکل اسی طرح جس طرح خود قدرت کے دل کے کنول کھل جاتے ہیں - یہ ایک ڈرامہ ہے جسے قدرت ہر سال ایک نئی شان، نئی دھوم دھام سے پیش کرتی ہے - اور اس میں حصّہ لینے والے اس سے بھی زیادہ دلفریب ہیں - آئیے پہلے ان سے ملئے -

یہ ہے "مورپنکھ" قدرت کا خود بخود دیکھنے والا ساز (شاخوں کی سرسراہٹ) -

یہ کون؟ "مورپنکھ" کی ہیجولی ہنسی کی روح "کھل سم سم" (قہقہے، کلیوں کی چٹک) -

اور یہ — دل میں دھڑکن - آنکھ میں آنسو" رم جھم" (شبنم کے قطرے بوندوں کا ٹپکنا - ٹپ ٹپ ٹپ) -

سراپا رنگ شوخی، البیلا پن - کیا نام؟ "نوک پلک" (تیتری کی اڑان) -

اتنی لمبی تان کیوں نہ ہو یہ دربار قدرت کے نورتن تان سین تان پردھان" ہی تو ہیں پپیہے کی لمبی تان)

یہ لیجئے عشق کے ہنگاموں کی اڑتی ہوئی تصویر "خندہ لب" (بلبل کے بلند قہقہے اور چہک)

دیپک راگ کی اوتار - تن من جلا دینے والی آگ میں پھنکی ہوئی کالی "اڑتی رین"

بنسری کی پرسوز دُھن: "کوئلیا بولے" (کوئل کی آواز)
چمن کی پارسا، رات دن خدا کی یاد میں محو — "مست ذات" (فاختہ کی آواز) -

یہ ہے چاروں کھونٹ کی رانی "رواں دواں یا سارنگ" (سیٹیاں مینڈیں، گمگیں، تانیں - ہوا کی گوناگوں آوازیں) -

کیا لوچ ہے! انگ انگ نرت اور یہ گیت کبھی مدھم کبھی تیز - کیا نام؟ — "من کی موج" (پانی کے بہنے اور غرغرانے کی آواز) -

سب سے آخر اور سب سے بڑھ کر - نوجوان "سائرہ" شوخیوں کی روح جس کے سینے میں آغاز شباب کی ترنگیں رہ رہ کر اٹھتی ہیں اور یہ نچال البیلی لہریں جن کے تحت وہ دوسری چیزوں میں کشش محسوس کرنے لگی ہے - سچ پوچھئے تو بہار کا ڈرامہ اس کے دل ہی کا ڈرامہ ہے - (قہقہے اور اٹھکھیلیاں)

گھنگھرؤوں کی چھن چھن اور اَن گنت کلیوں کی مسلسل سریلی چٹکن جو گھنٹی کی لگاتار ٹن ٹن ٹن ٹن سے ملتی جلتی ہے جیسے کوئی کھیل شروع ہونے والا ہو - کلیوں کی آواز تار سپتک کے پاگانی سے پیدا کی جائے -

سائرہ : یہ زمزمہ عجیب جیسے آ رہی ہو دور
ایک سپنوں کے جہان سے طلسمی طنطنوں کی سنسنی بکھیرتی ہوئی ہواؤں میں انوکھی راگنی ....

(وقفہ)

نظر سے ایک پردہ اٹھ گیا ہے ناگہاں ——
روشنی کی رو —— یہ زمزمے —— یہ قہقہے
مجھ کو ڈر ہے اور نہیں —— کہ ان سے تیرا سینہ شق نہ ہو کہیں!
یہ کیا؟ یہ کھلکھلاتے نغمے، یہ چہکتے بول!
اور! اور! اور! — یہ گنگری سی رس بھری نوا.

جیسے اک پری نے جاتے جاتے جل ترنگ کی پیالیوں کو مس کیا ہو؟
تھرتھراتے پنکھ سے ——

(جل ترنگ کی ایک ہلکی سی چوٹ)

یہ کون ہیں؟ یہ کون ہیں!! — پری جمال شاہزادیاں!
میں ان سے پوچھوں تو — دل کھنچا ہی جا رہا ہے۔ جیسے کوئی سیمیائی
تاروں کے فسوں سے دل کو کھینچے جائے۔ کھینچتا ہی جائے: لو میں
ان کے پاس آن پہنچی۔ یا خود لپک کے میرے پاس آگئیں خبر نہیں!

کھل سم سم: مجھے بلا رہی ہیں آپ؟

سائرہ: تمہارا نام کیا ہے ننھی منی حور؟ ایسا کھلتا کھلتا نکھرا نکھرا رنگ
نازنین تہیر کو بج اجلی، چندنی کنواریوں کی رانی —سوہنی!

کھل سم سم: میں کھل سم سم ہوں: "کھل سم سم"
میرا نام گانا گانا صبح و شام گانا
تارا رم تارا رم تارا رم
پاپا گا پاپا پانی نی نی پا گا پا گا
میری بانی کا سرگم

سائرہ: کھل سم سم! ہاں ذرا سنوں تو تیرا گیت

کھل سم سم: گیت کیا ہے۔ ہلکا ہلکا دھیما دھیما میٹھا میٹھا کتنا تا کتنا تا زمزمہ
ہے اہمہ —— لو سنو! (ہر کلی ایک ایک لفظ بولے پھر سارا مصرع
سنگت میں)۔ گیت

سار ی دنیا بہار ہی بہار ہے
کتنا سندر یہ سب سنسار ہے
ہر طرف جوت کی ایک دھار ہے
جگمگاتی ہوئی اک پھوار ہے
باجے — باجے ڈمرو

★

میں ہوں کم سن سی نار البیلی
ہر کلی ڈار ڈار اک سہیلی
کروں پون سے نت اٹکھیلی
عمر بھر شاخ کی گود کھیلی
چھن چھن چھلکے گھنگھرو

★

اپنی دنیا ہے کتنی سہانی
ہائے یہ رت، یہ کیف جوانی
یہ ہواؤں کی بے خود روانی
ہر طرف نشۂ شادمانی
گونجیں بھونروں کے بھونپو

★

ناچنا رات دن ہے مرا شعار
میرے سائے کی دیکھے کوئی بہار
میرے چہرے کا دیکھے کوئی نکھار
میری پائیل کی جادو بھری ستار
تھیا تھئی دھمال[1] ہر سو

سائرہ: یہ نغمہ ختم ہو گیا! نہیں نہیں۔ یہ گونجتا ہے گونجتا، جہاں تہاں
عیاں نہاں، ڈگر ڈگر، نگر نگر۔
یہ ہے چمن نگر کہ من نگر میں گونج؟
میں جانوں من ترنگ ہی مچل کے گل ترنگ بن گئی!
کوئی فسوں، نہ جانے کون، کیسا۔ اس کی موج رنگ رنگ بن گئی
کس قدر رسیلا، من رجھانے والا نغمہ تھا!
یہ شوخ گیت گانے والی ساحرہ کہاں گئی؟
کاش! اس کی میٹھی میٹھی پیاری پیاری راگنی ہمیشہ گونجتی رہے!

راوی: "کھل سم سم" کے گیت سے "مورپنکھ" بے اختیار جھومنے لگا۔
اس کے پروں کی سرسراہٹ جھنکار کی صورت میں بلند ہوئی۔
سائرہ اس کو سن کر چونک اٹھی۔

سائرہ: یہ جھنجھناہٹ، اُف میرے خدا! یہ چھنا کا چھن چھنا چھن!
دل میں؟ دل کے آر پار؟ — یہ قلندرانہ ساز
بے شمار پاروں[2] سے مڑھا ہوا
ہوا کے گھٹتے بڑھتے چلتے رکتے، رمتے جمتے جھونکوں کی

---

[1] سرمستی کے اعتبار سے۔ رومانوی حیثیت سے جھومر یا بھنگڑا زیادہ موزوں ہونگے خصوصاً بھنگڑا جس میں ایکانت کے ساتھ ساتھ سنگت بھی ہے اور گھومنے کے بجائے اچھلنے، شوق دستی کا اظہار زیادہ نمایاں ہے۔

[2] بعض قلندروں کے سازوں پر پتوں سے ملتے جلتے گول گول پترے جڑے ہوتے ہیں

یہ چھیڑ چھیڑ کر

یہ صدائیں ——— سائیں! سائیں! سائیں!

یہ نوائیں ——— سن سن! سن سن! سن سن!

یہ زمزمہ

سب سنسار سہانا

ہر شے چھیل چھبیلی

سندر سندر سارے

شوخ اور شنگ، شریر

گرتے پڑتے پتے

چھن چھن چھن چھن — چھن چھن

گاتی باد بہاری

"آؤ لوٹ لو — لوٹ لو

دھن لٹتا ہے دھن!

(آخری بول تیزی سے ادا ہوں۔ ساتھ درت لے میں طبلہ اور چلبلی دھن۔ "دھن" اور طبلے کے "دھا" ایک ساتھ)

(آہیں، سسکیاں، پرسوز دھن)

سائرہ:- یہ ہارنی، یہ ہچکیاں، یہ سسکیاں — ہائیں!

جیسے میرے دل کی تہ سے کوئی — جانے کون؟

رونی رونی لے میں بھیرویں سی گائے! ———

روتی کیوں ہو ننھی منی پیاری پیاری گڑیا؟ ——— تیرا نام؟

رم جھم:- "رم جھم" — "رم جھم" (ہر لفظ پر سسکی)

سائرہ:- کتنا پیارا نام! اتنی ننھی جان اور رونا!

رم جھم:- میں ساری ساری رات روتی رہتی ہوں

انکھڑیوں سے بوندلیوں کی اک جھڑی!

(پہلے کی طرح ہر لفظ پر سسکیاں)

سائرہ:- ہوں وہ کون؟

رم جھم:- خبر نہیں۔ رات دن یہ بول طبلاتی رہتی ہوں ———

رس — رس — رس

ٹپ — ٹپ — ٹپ

آنسو — ہردم — آنسو

پگھلے — پگھلے — موتی

جھلمل — جھلمل — جھلمل

رونا — شب بھر — رونا

روؤں — کیوں نہ — روؤں

کل سے — دل کو — لگایا

پل بھر — چین نہ — آیا

پھر — سورج — اُف ظالم!

میرا — جنم کا — بیری

دم — گھٹ گھٹ — گیا

اُلٹ گیا — دم — ہائے!

اُف! — اُف! — اُف!

ٹپ — ٹپ — ٹپ!

(پانی کی بوندوں کی ٹپ ٹپ۔ درد بھری دھن۔ تمام بول الگ الگ اور رک رک کر)

سائرہ:- ہائے پیاری گڑیا! مت رو۔ تیری آپ بیتی کتنی دلگداز ہے

لے یہ پھول کی نشیلی پتی کا حریری پلو —

اس سے اپنی بھیگی بھیگی پلکیں پونچھ لے!

راوی:- جہاں سادگی ہے وہاں پرکاری بھی ہے۔ ابھی سائرہ ہوشیار بےخودی میں سوتی جاگتی سی "کھل سم سم" اور "رم جھم" کے جلووں کی طرف وجدانی طور پر مائل اور ان کی راگنی سے دم بخود تھی کہ یکایک گویا اس کی اپنی ہی چنچل روح کا پروانہ جیسے نئے نئے پر لگے ہوں۔ "نوک پلک" ایک شوخ شریر ننھی سی جان اپنے چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پر پھیلائے دوش ہوا پر تیرتی ہوئی چمن میں آنکلی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی سفیر رنگین خلعت پہنے کسی ملک کے دربار میں آنکلا ہے۔ جیسے اس کا اپنا دل کسی انجانی گھٹن سے گھبرا کر یا کسی ان بوجھی لہر میں مچل کر باہر کی کھلی فضا میں آگیا ہو۔ سائرہ اسے دیکھ کر والہانہ سرمستی کے عالم میں چہک اٹھی۔

سائرہ:- یہ شوخ رنگ کی پری، بلا کی شوخ لاڈلی۔ نہ جانے کس سبھا کی یادگار ہے۔ یہ اس کے نیلے پیلے اور سجیلے رنگ جیسے بادلوں پہ چھوٹ پینگ[1] کی!

ذرا ٹھہر تو تیرا نام پوچھوں۔

---

[1] پنجابی۔ قوس قزح۔

نوک پلک ۔ آؤ آؤ۔ میں تو اپنے دوارے "مور پنکھ" پھدکوں گی۔

کھل سم سم ۔ میرے دوارے آؤ۔ مرا چھپا ہوا خزانہ سب تمہارا ہے۔

نوک پلک ۔ یہ لو میں آگئی۔ اب بتاؤ۔ میرا نام کس نے پوچھا تھا؟

سائرہ ۔ میں نے۔

نوک پلک : شوخیوں کو پر لگا دو۔ رنگ روپ سے سنوار دو۔ وہ میں

ہوں — میں ہوں — میں!

سائرہ ۔ مگر بہار — میرے دل کی چلبلی چہیتی نازنین تیرا نام؟

نوک پلک ۔ نوک پلک۔ نوک پلک۔ نوک پلک۔

سائرہ ۔ شوخ تو بہت ہو تم۔ مگر خموش بھی بہت ہو۔

نوک پلک ۔ میں خموش؟ کملی لڑکی! میری گائیکی بہت ہی دھیمی اور

لطیف ہے۔ ذرا سی تھرتھری جو دل کی تہہ سے اٹھ کے رہ گئی

ہے۔ اب آؤ اپنے کان۔ دل کو میرے پاس لا کے غور سے سنو۔

گیت

جھوم جھام کر — گھوم گھام کر

اک اڑان میں

سو سو پلٹے کھاتی

میں آتی ہوں اس دوارے

کود پھاند کر — باڑھیں باغ کی

لا رہی ہوں میں

پریم دیس سے — رنگ رنگ کے

تحفے خوش نما

اپنے پنکھ پر

میٹھے گیت گاتی

میں آتی ہوں پریم کے مارے

میری شوخیاں — ترکتازیاں

گلعذاروں سے — عشقبازیاں

میں یہاں بھی ہوں — میں وہاں بھی ہوں

میں کہاں نہیں؟

ایک چلبلی ناچتی پری

جو ہوا میں اپنے پر ہلاتی

آتی ہے گیت کنارے

اور بستی ہے دل کے دوارے

(ہلکی ہلکی دھن — ساتھ پروں کی آواز)

سائرہ ۔ اتنی تیز — اتنی چلبلی — بلا کی نرتکی!

کہاں چلی گئی؟ بجلی کوندتی جھلک کے چھپتی

جس طرح کوئی اٹھائی گیر لوٹ کر چھپے خزانے کو۔

میں اس کو دیکھوں تو — وہ بھاگی جا رہی ہے تیز

وہ — وہ — وہ!

مگر کہاں — نظر میں اتنی تیزی، اتنا لاابالیانہ پن کہاں؟

راوی : شوخ چنچل "نوک پلک" جیسے آئی تھی ویسے ہی تیزی سے پر پھیلا کر چلی بھی گئی۔ نادیدہ خلاؤں میں! اور سائرہ اسے دیکھتی ہی دیکھتی رہ گئی۔ یکایک سبھا کا رنگ بدلا۔ اور قسم قسم کے تان رس خان، رُتوں کی ملکہ کے نو رتن، اس کے بے پایاں دیوان خاص میں جس کا گنبد آسمان کے گنبد زبرجد کی طرح آفاق گیر ہے۔ اپنا اپنا کمال دکھانے لگے۔ سب سے پہلے "تان پردھان" نے چھوٹتے ہی ایک لمبی تان اڑائی —

(پپیہے کی تان)

سائرہ : ارے یہ اتنی لمبی تان! ختم ہوتی ہی نہیں

ازل ابد کا سلسلۂ خیال، کا — میں دیکھوں تو

یہ اتنی لمبی تان بھرنے والا تان سین کون ہے؟

تان پردھان : پی کہاں — کیسے بولوں؟.... میرا دم نہ ٹوٹ جائے۔ پی کہاں

سائرہ : یہ تیکھے بول! اس کی "پی کہاں" جگر میں چبھ کے رہ گئی!

کسی نے سچ کہا ہے "پی کہاں" کی تان گونج اٹھے

تو پھر کسی کے بس میں جی کہاں؟

نوائے درد آ — مرے دل و جگر میں سوز بن کے تیر جا؛

کہ میرے دل کو جانے کیسی کیسی آنچیں لگ رہی ہیں۔

کیسی کیسی اگنی لہریں سی سلگ رہی ہیں۔

راوی : "تان پردھان" تھے تو بڑے کلاونت۔ اور ان کی تان کا

ؔ پپیہے کی تان کبھی اور کہیں نہیں ٹوٹتی بلکہ لامتناہی ہوتی ہے — — — وہ جواب کے لئے رکے تو کیسے؟ اس لئے وہ جلدی جلدی کچھ لفظ بول کر پھر "پی کہاں" پر آ رہتا ہے۔ لہٰذا آواز کے تسلسل کو لمبی توس سے ظاہر کیا گیا ہے۔

کوئی جواب نہ تھا۔ پھر بھی یہ اگلے وقتوں کے استاد تھے۔
اس لئے ان کی تان کچھ سپاٹ اور بے سری سی ہوتی جا رہی
تھی۔۔ یہ دیکھ کر عشق کے خوش باش مغنی "خندہ لب" کو
جوش آیا اور اس نے اپنے مستانہ گیت سے چمن میں ایک ہنگامہ
برپا کر دیا۔ اور اس کے ساتھ سائرہ کے دل میں بھی

خندہ لب:۔ قہ قہ قہ قہ ۔ چہ چہ چہ چہ
بخ بخ بخ بخ ۔ بہ بہ بہ بہ

سائرہ :۔ ہیں! یہ کیا؟ یہ نہ رکنے والے چہچہے، یہ قہقہے۔

خندہ لب:۔ قاہ قاہ قاہ قاہ ۔۔۔

سائرہ :۔ کچھ کہو گے بھی کہ ایسے ہی فضول ہنستے جاؤ گے؟

خندہ لب:۔ میرا ہنسنا بولنا ہے اور بولنا ہنسی
اس میں شک ہی کیا ہے، شک ہی کیلئے،
میں خندہ لب ہوں، خندہ لب ہوں، خندہ لب
سفوف زرد رنگ کا مجھے پھلی پڑیوں میں پڑا ہوا ملا
اسی نے مجھ کو اس کو اس قدر منہ پھٹ، منچلا بنا دیا
مرے دل و دماغ پر نشہ سا بن کے چھا گیا

سائرہ :۔ معاف کرنا! کچھ بہک گئے ہو تم

خندہ لب:۔ آج؟ آج؟ آج؟ ۔ ازل ازل سے میں
تو اک نشے میں گم ہوں، میرا دل ہے ایک موج بیخودی!
مرے گلے میں چہچہے ہی چہچہے ہیں۔ قہقہے ہی قہقہے۔

سائرہ :۔ یہ بیقراریاں کبھی ادھر کبھی ادھر جنوں کے طور
اچھل اچھل کے شاخ شاخ ناچتے ہو، کودتے ہو جیسے
برق بے قرار ابر میں کبھی یہاں کبھی وہاں

خندہ لب:۔ بھولی۔ اتنی بھولی! میں تو باغ کا فدائی قدیم ہوں
یہ میرے دل کی آگ ہے جو مجھ کو صبح و شام برق وار
نچا رہی ہے شاخ شاخ۔ یہ تجھی سے گل رخوں
کا فیض ہے کہ میں ازل سے بے قرار ہوں!

سائرہ :۔ بجا کہا۔ ایسی ہیئت کذائی اتم پہ عشق کا جنوں سوار ہے۔

خندہ لب:۔ چہ خوش! چہ خوش! چہ خوش! چہ خوش!
میں چمن کا بادشہ ہوں، بادشہ ہوں، بادشہ!
چہ چہ چہ (کو کو کو کو) قہ قہ قہ قہ

(حق سرہ ۔ حق سرہ)

(دور کوئل کی آواز جو آہستہ آہستہ نزدیک آتی ہوئی معلوم
ہوتی ہے اور بلبل کے چہچہوں سے مل جاتی ہے۔ شروع میں
فاختہ کی آواز زیادہ بلند ہے)

میرے سر پہ عشق کا جنوں سوار ہے! بجا بجا بجا مگر ذرا خبر تو لو
جنوں میں امتیاز حسن و عشق بے محل! یہ ذوق و شوق میرے رنگ
و بو فقط فسانۂ جنوں! یہ اک بہانہ ہی نہ ہو۔ ہمہ فریب آگہی

مست ذات:۔ یہ رند ہے یہ رند رند رند رند رند
اس کی باتوں میں نہ آؤ، اس کے بول مت سنو!

(فاختہ کی آواز)

سائرہ :۔ تم تمہارا گیت؟

مست ذات:۔ میں وہ ہوں ۔ وہ ۔ وہ جانتی ہو نا؟
میں کیا بتاؤں، خود ہی بوجھ لو!

سائرہ :۔ خود ہی بوجھ لوں؟ وہ کیسے؟

مست ذات:۔ یہ دیکھو میرا صوفیانہ چولا۔ یہ گلے کا ۔

سائرہ :۔ بوا سمجھ گئی میں۔ تم کو کتنی بار محفل بہار میں ترانہ سنج دیکھا ہے

مست ذات:۔ نوج! میں ترانہ سنج؟ توبہ! توبہ!
آج کل کی لڑکیاں بھی کتنی شوخ ہیں
میں کوئی ہزار داستاں نہیں

سائرہ :۔ معاف کیجئے! مجھ سے بھول ہوگئی!

مست ذات:۔ بیٹی خوش رہو! اور سویرے شام اسی کا نام لو

(کوئل کی آواز قریب آتی جاتی ہے۔ کوکو۔ کوکو۔ کوکو۔ کوکو)

وہ ذات پاک ذوالجلال۔ اور زبان پر سدا
یہ ورد ہو:۔
ظاہر بھی تو باطن بھی تو۔ ہر گل میں ہے تیری ہی بو
جلوے ترے ہیں کو بکو۔ تو جا بجا تو سو بسو

(فاختہ اور کوئل کی ملی جلی آوازیں۔ فاختہ کی آواز زیادہ
بلند ہے۔ لیکن رکتی رکتی گویا وہ کچھ سوچ رہی ہے) حق سرہ
حق سرہ ۔ کوکو ۔ کوکو ۔ کوکو،
فاختہ کی آواز قدرے فیڈ آؤٹ۔ اور کوئل کی آواز خوب
بلند)

سائرہ :۔ اف یہ تیر سنسناتا کس طرف سے آگیا یہ دن کو کھول کر!!

اڑتی رین:۔ کو کو کو کو — کو کو کو کو
میں ہوں برہ دگن برہ کی ماری۔ غم کی ستائی اک دکھیاری
باوری بن کر۔ پھروں ہر سو — کو کو کو کو۔ کو کو کو کو
(فاختہ کی آواز ابھرا بھرتی ہے)

مستِ ذات:۔ یہ وادیاں یہ مرغزار — یہ دشت و در یہ کوہسار
یہ پھول پھل یہ رنگ و بار — یہ جھیل تال — یہ آبشار
ہر شے میں ہے تو رو برو — حق سرہ، حق سرہ
(کوئل کی آواز زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے)

اڑتی رین:۔ میرا جیون دکھ کی کہانی۔ میرا فسانہ غم کی نشانی
نت آنکھوں سے بہے لہو
کو کو کو کو — کو کو کو کو
میری سہیلی کالی چڑیا۔ موت نے چھینا ساجن اس کا
چبھ گیا دل میں غم کا کانٹا۔ سوگ میں رہتی چپ چپ تنہا
غم بڑھتا بڑھتا ہی گیا — آخر یہ اس نے دوہا
کہاں ہے ان میں غم کا دارو
کو کو کو کو۔ کو کو کو کو

سوگ میں اوڑھے کالا چادر۔ رہتی ہوں پتوں میں چھپ کر
ٹیس اٹھتی ہے دل میں برابر ایسا چبا ہے غم کا نشتر
بہتے رہتے ہیں آنکھوں میں آنسو
کو کو کو کو — کو کو کو کو

مستِ ذات :۔ قاری ہوں میں گلزار کی — میرا نعرہ سرمدی
میرا سر و نہ دیکھے کوئی — شام و سحر اک بے خودی
اللہ ہو اللہ ہو
حق سرہ حق سرہ
(پانی کی بھانت بھانت آوازیں)

من کی موج :۔ وہی پرانی پھیکی سیٹھی گیان گن کی باتیں
ان کو چھوڑو بھی۔ مری کتھا سنو تو سب جہان کی کتھائیں
بھول جاؤ!

راوی :۔ لیجئے۔ چمن کی قصے کہانیاں بیان کرنے والی شہزادی شہلا
بھی آ پہنچی۔ یہ کون! ایک اور پریم کی مدھ کی متوالی کالے
کوسوں کا سفر طے کر کے چمن میں آنے والی، سبزے سے
کھیلتی، ہر طرف گھومتی، ہر دل میں بستی مستِ ناز جو ایک قدرتی
شراب سے دیارِ لالہ و گل کو ایک عجیب آب و رنگ عطا کرتی
ہے۔ سائرہ کہانیوں کی رسیا فوراً اس کی آپ بیتی سننے کیلئے
آمادہ ہو گئی۔

من کی موج :۔ مرے من میں یہ چپکے ہی چپکے سمایا کون سکھی؟ سدھ بدھ نہ رہی
تن من کی

مرے دل میں یہ کس کی پریت بسی
یہ کس کی لگن میں کھوئی گئی۔ سوجھ نہیں گھر آنگن کی۔
مرے من میں....

نس نس میں بسا چت چور مرا
سب بن گیا تن من مور مرا۔ مستی ہے ہر آن نئی۔
مرے من میں....

سائرہ :۔ ایسا انترا میگھ جیسے کھل کے برسے اور رہ کہیں
جل ہی جل ہو۔ یہ کسی کے گہرے پیار ہی کا جادو، چاہ کا کرشمہ ہے۔
اے گنی! ذرا اپنی تیرے نوڑے تو سنوں

من کی موج :۔ میں ہوں اتم نگر کی رانی
ہے مری اک انوکھی کہانی
دور اک جنگل نئے پہاڑ ہیں
نور کی ہیں تمام جس کی وادیاں
اور چاندی کی ہیں سب حویلیاں
میرے بابل کا مرمریں دیس ہے
یک بیک لے چلی میرے من کی موج
ایک ان دیکھے پریتم کے دیس کو
پھر بھی ہر دم رواں ہوں اسکے شوق میں
پل پل ہے مری ہستی ہی نئی۔ مرے من میں سمایا کون سکھی....

سائرہ :۔ وہ تیرے من کا راجہ کون ہے؟ ذرا کچھ اور نئے بڑھاؤ تو

من کی موج :۔ کیا حال بتاؤں جیون کا
قصہ ہی اور ہے اس من کا
جنبش سے جیسے چھنا کا ہوں پاؤں کی سوئی جھانجن کا
یا حال ہو بانکے سجیلے پیا کے سندر مکھ سے درپن۔ من کے درپن کا

اب فکر ہے دشت اور بن کی۔ مرے من میں بہ چکے ہی چکے ....

سائرہ :۔ میری نظر میں اب تو تیرا موج موج پھیلتا ہوا سبھاؤ ہی سبھاؤ ہے۔ بڑھاؤ ہی بڑھاؤ!

من کی موج،

چلی پنگھٹ سے اک پنہاری

سر پہ رکھے چھلکتی گگریا

لہر کی باہوں سے سر کو تھام کر

نیر کے پاؤں، بالی عمریا

ہر قدم اس کی مستانہ چال سے

سو سو بل کھائے نازک کمریا

پہنے ساری سفید نرم جھاگ کی۔ جو سرکتی ہے بار بار

جیسے پگ دھرتے چندرماں سے بدلیاں ــــ

گیت گاتی پہاڑوں کے رس بھرے۔ دور تک جاتے ہیں جن کے سلسلے

جن میں دکھ کی ہے میٹھی کسک نہاں۔ ٹوٹتی جن سے دل پر ہیں بجلیاں

جھوم جھوم اٹھتی ہیں سبز شاداب۔ سرشار وادیاں

سائرہ :۔ ہاں مگر وہ تیرے دل کا میت کون ہے؟ اس کی بات تو سنا وہ جس میں سارے رنگ روپ مل کے ایک روپ سپنے جیسا روپ دھارتے ہیں۔

سارے سرگموں کا ایک راگ۔ جو آپ ہی آپ

جان و دل، جگر میں، روح میں سمائے جاتا ہے۔

من کی موج :۔ میرا من ہے اسی سے بھرا ہوا۔ میرا ماہی محبت کا دیوتا۔ پہنے اک نیلمی ریشمی قبا

کوہ و صحرا میں شوق اس کا لے چلا۔ خواب میں تھی کہ وہ مجھ سے کھو گیا۔ کچھ کی نگری کا شاہزادہ خوش جمال و خوش ادا۔ راستے میں اچک کے سر کو بار رہا۔ دیکھتی جاؤں میں اس کا نقش پا۔ دلربا، جانفزا۔ تاکہ سجدوں پہ سجدے کروں ادا اور پھیلا کے باہیں کروں وار۔ اپنے پیارے سے ہو باؤلی ہمکنار کوئی مجھ کو بتا دے کہاں ہے وہ۔ پہنچوں اس تک یہ دشت در پھلانگ کر

میرے دل میں بسی ہے اک یہی لگن۔ کروں گردشیں بن بن کی

میرے من میں چپکے ہی چپکے سما گیا کون سکھی۔ کہاں سدھ رہی تن من کی

گوئیاں :۔ تو چلی جا یونہی من کی اور ری یہیں ہو گئے ترے چت چور ری

من کی موج :۔ کھول کر اپنی آنکھوں کو دیکھ لے۔ روپ رنگ اس کا ہر چیز میں بسے

اب چلی جاؤں گی آنکھ موند کر

اپنے من بھاتے پریتم کے دیس کو

جس کا سیال لوہے کا جسم ہے

سپنے بن سپنے سے آن دیکھتی

مرمریں غسل من میں لئے ہوئے

یہ چلی جاؤں گی دور دیس کو

اپنے پیتم سے جا ملوں گی میں گلے

اس سے گھل مل کے من کا چین پاؤں گی

ایک ہو جاؤں گی اپنے میت سے

پھر نہ بھولے سے مجھ کو یاد آئیں گے

اپنے بچھڑے ہوئے دیس کے سمے

سائرہ :۔ یہ دلپذیر نغمہ میرے جان و دل کے گوشے گوشے میں سما گیا اک ہجوم بیخودی۔ یہ سفید ڈال کی طرح لچکتی جھومتی پری بادل میں پارے کا سا لوچ، گیت گاتی، جھاڑیوں میں چھپتی، ان کی کھلتی بند ہوتی کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی چلی گئی!

دور سے ہوا کی آواز جو آہستہ آہستہ زیادہ بلند ہوتی چلی جاتی ہے

راوی :۔ چمن کی زندگی بھی نت نئے ہنگاموں سے خالی نہیں۔ چنانچہ اچانک ایک لمبا چوڑا جلوس بڑے دھوم دھڑکے سے باجوں تاشوں کے سنگ، اور رنگ برنگے شاخ ہائے گل اور گلبنوں کے آراستہ و پیراستہ زرق برق تدرتی دہناتروں سے گونا گوں گیتوں اور نغموں کے ساتھ گزرنے لگا۔ سائرہ نے اتنا لمبا جلوس کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس میں قسم قسم کے لوگ تھے۔ کوئی پورب سے آیا تھا تو کوئی پچھم سے۔ کوئی اتر سے آیا تھا تو کوئی دکن سے۔ اس میں خشکی تری بلندی پستی ہر جگہ کے نمائندے تھے۔ یہ بھی مل کر گاتے اور کبھی اکیلے۔ اس جلوس کی لیڈر "رواں دواں" یا "سارنگ" تھی۔

سائرہ :۔ اخاہ! یہ جلوس۔ ذرا لپک کے پاؤں۔ باغ کی روش پہ آ کر دیکھوں۔ رتیوں کی سرسراہٹ، شاخوں کا جھومنا اور لچکنا جھولوں کی آوازیں،

کورس:۔ چلو گجیا چلیں رل مل کر
سب سکھیاں چڑھائیں پینگیں
ہم جھولا جھلائیں دن بھر
گیت گائیں خوشی سے ناچیں

اے خوشی!
یہ عشق کی سبھا

پورب:۔ میں چلوں گی ادھر مرغزار میں
پچھم:۔ اور میں اس طرف سوئے جوئبار
اتر دکن:۔ ہم ادھر پاؤں سے پاؤں کو ملائے
اونچے اونچے پہاڑوں کو جائیں گی
اینڈتی کھیلتی کودتی پھاندتی
دکن اتر:۔ اور ہم ہاتھ کو ہاتھ میں دئے
جائیں گی سبز وادیوں کو ناچتی
سوئیں گی ان کی نرم نرم سیج پہ
پورب پچھم:۔ اور ہم دل جہاں جائے دور پار!
کورس:۔—— چار دن کی ہیں یہ نوجوانیاں
کھیل لیں، ناچ لیں، کود لیں
بیت جائیں گی یہ سب کہانیاں
یہ سماں
پھر کہاں
کھیل لیں کم سنی کے یہ کھیل ہم
ہم بنالیں گلوں کے بلند ڈھیر
مست دلھنیں
ہولے ہولے پگ دھریں

(آندھی کا شور۔ سیٹیاں۔ غل غپاڑہ)

سائرہ:۔ گزر گیا۔ صدائیں دھیمی پڑتی جارہی ہیں! رفتہ رفتہ محو ہوتی جا رہی ہیں! کتنا حیرت آفریں جلوس تھا! مگر یہ رنگ روپ کے سہانے سپنے کیسے ماند پڑنے لگ گئے! افق پہ یہ دھندلا دھندلا ہلکا ہلکا تیرتا غبار چھاتا جارہا ہے جیسے کوئی آندھی آرہی ہو! روشنی کی لہر اب کدھر گئی! اور وہ دور دھوپ سیل! اندھیرا اپنے گہرے خاکی رنگ بادباں اٹھا رہا ہے دائیں بائیں بھورے بھورے بھاری بھاری شہپر دل کو پھڑپھڑا تا ہے۔ اب نظر کے سامنے بس ایک ہلکا ملگجا سا پردہ ہے!

(پردہ)

★

★

ماہِ نو

میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

(۱) ماہ نو میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

وادیٔ سندھ کا فنِ تعمیر

کے۔ اے۔ جیرازبھائی

اسلام کی فتوحات نے نہ صرف دین کا دائرہ وسیع کیا بلکہ بادیہ نشین عربوں نے علم و حکمت کے فنون و حرفہ کے میدانوں میں بھی اپنے گھوڑے دوڑا دئیے۔ علم کو مومن کی کھوئی ہوئی میراث بتایا گیا تھا۔ اس لئے یہ خزانہ اسے جہاں بھی ملے اپنے سینے سے لگا لئے۔ ادب، شاعری، ہندسہ، ریاضی، تعمیر، فن، غرض ہر شعبے میں دوسری تہذیبوں کے آثار و باقیات سے فائدہ اٹھایا۔ ان کو سمجھا، سمجھایا، اپنایا، ترقی دی اور مٹتے ہوئے نقوش کو اجاگر کیا۔ فنون و حکمت کے جسد مردہ میں نئی روح پھونکی۔ تہذیب انسانی پر ساڑھے تین ہزار سال گذر چکے تھے کہ آفتاب اسلام طلوع ہوا اور جو دنیا سو رہی تھی ایک دم جاگ پڑی۔ مشرق میں تہذیبیں دریاؤں کے کنارے پیدا ہوتی رہی تھیں، اور وہیں دفن بھی ہوتی رہیں۔ مسلمانوں نے ان تہذیبی گہواروں میں پہنچ کر علم و حکمت کے خزانے حاصل کرنے شروع کر دئے اور ان کے ایسے امین ثابت ہوئے کہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ اور نشاۃ الثانیہ کے دور کو چھوڑ کر موجودہ تہذیب کے مورث و مؤسس اگر مسلمان ہی سمجھے جائیں تو بے جا نہ ہوگا۔

فنونِ لطیفہ کا ورثہ بالخصوص مسلمانوں کو بہت عزیز رہا اور یہ دعویٰ بھی بلا دلیل نہیں ہے۔ مختصر رقع نگاری ہی کو دیکھئے۔ اس فن میں مسلمانوں نے قبل اسلام کی بھدی صورت گری اور فضائی تناؤ کے عیب کو کس خوبصورتی سے دور کیا۔ اُدھر ایران و پاکستان کے مسلمانوں نے اپنی تعمیرات پر روغنی ٹائلوں، کاشی کاری اور منبت کاری کے جوہر دکھا کر رنگ و حسن سے اپنی طبعی مناسبت کو اجاگر کیا جسے کچھ اشوریا اور بابل والے شروع کر گئے تھے۔ ان کے کمال تعمیر کے نمونے دیکھنے ہوں تو ان کے بنائے ہوئے گنبدوں، روضوں اور محرابوں کو دیکھئے۔ خاص کردہ تعمیرات جو فرات و دجلہ کی وادی میں اُبھریں۔ ایک بات ضرور ہے کہ اسلام کی تہذیب ایکدم نہیں ابھر پڑی۔ ابن آدم صدیوں سے میدانِ عمل میں سرگرم رہا تھا۔ ان ابتدائی یکہ تازوں کے کام کو نہ تو کم کیا جا سکتا ہے نہ نظر انداز۔ مسلمانوں کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ان علوم و فنون کو مرنے سے بچا لیا، انہوں نے ان کی اصلاح کی۔ اپنے گرد و پیش کو فتح کر کے اپنے ذوق و ظرف کا ایک ایسا نقش تاریخ و تہذیب میں چھوڑا کہ اس کی مثال نہیں ہے۔

سطحوں پر استر کاری کرنے کے لئے ماضی کے ابتدا کاروں نے جن تعمیری آرائشوں کو جنم دیا تھا وہ تھیں روغنی چیزیں، جن کی آب و تاب، شوکت اور کم خرچی و پائداری ان کی مقبولیت کا سبب بنی۔ ان میں رنگین ٹائل بھی شامل ہیں۔ مگر ان چیزوں کے بنانے والے یہ راز اپنے ساتھ لیکر مر گئے تھے۔ مسلمانوں نے ان رازوں کا کھوج لگایا اور ترتیب دیا اور گرد و پیش میں وہاں کے تقاضوں کے مطابق ترمیم و اصلاح کی۔ اس لئے اگر یہ کہا جاتا ہے کہ ٹائل مسلمانوں کی ایجاد ہیں تو وہ غیر معمولی موشگافی کے خیال سے تو شاید درست نہیں مگر فی الحقیقت وہ اس کے موجد نہ بھی ہوں تو مسیحا ضرور تھے —— نہ صرف مسیحا بلکہ سنوارنے والے بھی۔ تہذیب کے گیسو سنوارنے میں مسلمانوں کی مشاطگی اب ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہے۔

اب مثلاً روغنی ٹائلوں کا کام یوں تو فراعنہ کے زمانے میں بھی ہم دیکھتے ہیں۔ اوّل خاندان فراعنہ (۳۱۸۸ ق م) کا عہد۔ اس وقت ہرے اور فیروزی کو فروغ تھا۔ سقارہ (مصر) کے مقام پر ایک ہرم کی دیواروں پر چمکدار نیلے محدب ٹائل نظر آتے ہیں (۲۸۱۵ ق م) (سائز = ۲ x ۱ x ½)۔ ان میں چینی کے برتنوں والا مسالہ اور زنگار مسی سے نیلاہٹ پیدا کی گئی ہے۔ پرندوں کی شبیہیں اور ہیروغلافی تحریروں کی ابتدا (۱۳۷۰ ق م) سے ہوتی ہے۔ وتل العمرنہ کے مقبرہ میں دیواروں پر کی گئی پچی کاری کے ذریعے گلکاری اور تصویر سازی بھی نظر آتی ہے۔ پھر رئیمس دوم (۱۱۷۰ ق م) کے مندر (مقام ہیلی اوپولس) میں دیواری ٹائل دستیاب ہوئے ہیں) پس منظر نیلا اور تحریریں ہیروغلافی "خط" میں ہیں۔ سانچے میں نکلی ہوئی ابھرواں تصویری آرائشیں

بادشاہ کی فتوحات اور دلیری کے واقعات کی ترجمان ہیں۔ یہ سب روغنی کام ہے۔ یہی حال تکوریا کے مختلف ادوار میں نظر آتا ہے۔

اب ذرا آگے بڑھ کر ایران تک آیئے۔ یہاں بھی روغنی کام کی ابتدا ظہورِ اسلام سے قبل ہو چکی تھی مگر جب اسلام یہاں پہنچا تو یہ فن اور فنکار ایران کی سرزمین پر کبھی ختم ہو چکے تھے۔ مسلمانوں نے ماضی کے ورثہ کو اپنے سینے سے لگایا اور ان سے عمل و فکر کی شمعیں جلائیں۔ چراغ سے چراغ نہیں جلا بلکہ اس چراغ کو جس میں تیل باقی رہا تھا انہوں نے ازسرِنو بھی جلا دیا اور اس کی روشنی چہار دانگِ عالم میں پھیلائی۔ تاریخی شواہد خاموش ہیں یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ایران کی تعمیرات سے مسلمانوں نے براہِ راست فائدہ اٹھایا یا انہوں نے ان فنون کو مسلمانوں نے جنم دیا۔ بہرکیف۔ سلاطینِ سلجوق (۱۲ویں صدی) کے زمانہ میں ہی اس ہنر کی نمود نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ عام طور پر مشرقی ملکوں میں اس کام کو "چینی" کا کام کہا جاتا ہے اور اس سے ملکِ ختن کو اصل گردانا جاتا ہے۔ مگر تاریخی طور پر یہ غلط ہے۔ مسلمانوں نے جو کام کیا اس کا چین سے چل کر ایران تک پہنچنا ثابت نہیں ہے۔ اس دعوے کے سلسلے میں "سفید زمین پر گلکاری کی روایات" کو چینی اثر کی دلیل بنایا جاتا ہے۔ مگر یہ دعویٰ بھی محلِ نظر ہے۔ کیونکہ اسلامی تعمیرات کے ابتدائی نمونوں میں ہم گلکار ٹائل نہیں دیکھتے۔ بلکہ اقلیدسی اشکال اور خطاطی کے کمالات ہی نظر آتے ہیں ــــ گلکاری کی نمود ۱۴ویں صدی کے دوسرے ربع سے قبل دکھائی ہی نہیں دیتی۔ ہاں مسلمانوں کی ابتدائی سفال گری میں چینی اثر بہت جھلک مارتا ہے، لیکن بڑے مرتبانوں اور قرابوں کی سطح پر نیلے اور ہرے رنگ کی روغنی تہوں کی تکنیک برتنا خود ایران کی قدیم مقامی روایات کا تسلسل ہے۔ عباسی عہد کی قابوں پر ابھرواں کام بھی مقامی اثر کی دلیل ہے۔ ایک اور غلط فہمی یہ ہے کہ کاشی کا کام ایران کے شہر کاشان سے متعلق ہے یعنی وہ اس کام کا مولد ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ کام کاشان میں بہت بعد کو پہنچا اور وہاں تکمیل کے درجہ طے کئے اور یہ بارہویں صدی میں جا کر اس کام کا مرکز مشہور ہوا۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی اثرات کے بہت سے مراکز تھے جہاں اپنی اپنی جگہ تعمیرات کا ذوق نمو پاتا رہا اور مقامی اثرات و روایات سے بغلگیر ہو کر نئے راستے پر گامزن رہا۔ یہ مرکز ایک دوسرے سے اس قدر دُور دُور تھے کہ ایک نے دوسرے پر براہِ راست کوئی اثر نہ ڈالا مگر عمومی روح یہاں سے وہاں تک سرایت رہی۔ مثلاً ایران سے چل کر روغنی کام کی تکنیک اناطولیہ پہنچی اور سلجوقی ترکوں کے دارالخلافہ، قونیہ (مولانا رومؒ کا شہر) میں اس نے فروغ پایا۔ مثلاً یہاں کے مدرسہ قراطائی (۱۲۵۲ء) میں سب سے پہلی بار پورا کا پورا کام کاشی کا ہے جس میں پس منظر بھی شامل ہے۔ اس سے پہلے پس منظر کو منقش کر کے ابھارا جاتا تھا گو پوری سطح کو ان ٹائلوں سے لبریز کر دینا ایک بڑا جراتمندانہ اقدام تھا مگر اس سے ایک نقص بھی پیدا ہوا اور وہ یہ کہ عمارت کی پائیداری اور بناوٹ کو کسی حد تک ضرر ضرور پہنچا۔ ایک بڑی خوبی یہ پیدا ہوئی کہ اس کام کی وجہ سے دو بُعدی آئینہ کا سطح پیدا ہو جاتی تھی چینی کی پچی کاری میں اس قدر بال برابر صحیح پیوستگی پیدا کرنی پڑتی تھی کہ یہ ہر ایک کے بس کا کام نہ تھا چنانچہ ایرانی اس کام کی دیدہ ریزی اور کاوش سے گھبرا کر طرح دے جانے کے عادی تھے مشہد اور تبریز میں (۱۵ویں صدی) ہم غیر روغنی سادہ چھلی ہوئی اینٹوں ہی کا کام دیکھتے ہیں۔ ۱۴ویں صدی میں بیشک اصفہان کی "مسجد شاہ" میں جو کور روغنی ٹائل برتے گئے ہیں۔ مگر یہاں بھی پچی کاری سے گریز کیا گیا ہے اور اسے صرف بیرونی بابِ داخلہ پر کر کے چھوڑ دیا گیا ہے۔

اسلامی تعمیرات اور قدیم تہذیبوں کی روشِ تعمیر کے سلسلے میں اس گفتگو کے بعد ہم سرزمین سندھ کی طرف نظر ڈالتے ہیں۔

یہاں کے ۱۷ویں صدی کے کام کو دیکھیئے ــــ سادہ اینٹوں کا کام ہے اور انہیں روغنی اینٹوں کے ساتھ پیوست کیا گیا ہے۔ روغنی کام کے رنگ انگ مہکتے ہیں اور جھلک داری کا اپنا ہی روپ رکھتے ہیں۔ آنکھ سے نہ دکھائی دینے والی پچی کاری کے لئے پہلے ننھے ننھے ٹائل بنائے جاتے تھے مگر یہاں کے لوگوں نے چینی مٹی کی خوبصورت اینٹیں گھڑیں اور ان کی پیوستگی و آراستگی کو کمال تک پہنچا دیا۔ اس سے عمارات کے شکوہ میں بڑا اضافہ ہوا اور ان کا یادگاری پایہ بلند ہو گیا۔ مگر مرورِ ایام کی یہ ستم ظریفی بھی قابلِ دید ہے کہ اس نفیس کام کی سب سے بڑی یادگار اب ایک خرابہ بن چکی ہے۔ اگر ۱۹۰۶ء میں مشہور مفتش (COUSINS) اس کے نقوش نہ چھاپ دیتا تو یہ عمارت بالکل ہی معدوم ہو چکی تھی۔ اس عمارت کے کام پر اس نے کچھ تعارفی روشنی بھی ڈالی ہے۔ بہ ظاہر یہ مسجد معلوم ہوتی ہے اور سکھر میں "حضرت ابو باقی پورانی" کے مقبرہ کے پاس واقع ہے۔ حضرت کا یہ مقبرہ ۱۶۱۰ء کی یادگار ہے۔ اس میں محراب کی دیواروں کی آراستگی خوبیاں اس قسم کی ہیں کہ لفظی بیان اکتفا نہیں کر سکتا۔ بہرکیف یہ واقعہ ہے کہ مربع حجرہ اور گول گنبد کے مابین رقبہ میں جو کام بنایا گیا ہے وہ اس قدر نفیس ہے کہ غیر معمولی حد تک پہنچا ہے۔ یہ اپنی جگہ اس قدر رنگارنگ، صناعانہ اور بھرپور ہے کہ ساری دنیا کے اسلامی تعمیری کارناموں میں ممتاز جگہ پا سکتا ہے۔ مربع عمارتوں میں پشتی کی دیوار، ڈاٹ دار محراب، اور گنبدوں میں کروی مثلث نکالنا اسلام سے پہلے

بھی تجربتاً موجود تھا مگر مسلمان فنکاروں نے اپنے کام کی ابتدا ہی میں اس پرانے مسئلے کا حل سوچنا شروع کر دیا تھا کہ مستطیل ایوان کے اوپر گول چکر دار گنبد کی کرسی کس طرح قائم کی جائے۔ سکھر میں جو عمارت بنی ہوئی ہے وہ ان عمارتوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کی ابتدا ایران کے شمال مغربی گوشے کے شہر سلطانیہ، میں منگولوں نے کی تھی۔ چھتری کی تیلیوں کی طرح اینٹوں کی چنائی کا سلسلہ چھتر نما جال کی طرح پھیلتا ہوا نیچے سے لے کر گنبد کے اوپر تک پہنچایا جاتا تھا۔ تمام زاویوں کو باہمی پیوستگی سے متناظرہ زاویوں کے سلسلے سے متوازن کیا جاتا تھا۔ اینٹوں کی یہ چھڑیں ایک دوسرے کو قطع کرتی ہوئی گزرتی تھیں اور راہ میں آنے والی قوسوں اور محرابوں کو بھی عبور کرتی چلی جاتی تھیں۔ محراب و گنبد کی تعمیر میں مسلمانوں کا یہ تصور بالکل نیا تھا۔

قرطبہ (اسپین) میں الحکم کے مقبرہ سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور اس عمارت کے ڈھانچے نے عہدِ وسطیٰ کے عیسوی فن تعمیر پر بعد کو بڑا اثر ڈالا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرطبہ کے "مقصورہ" کا نمونہ بعد میں اٹلی کے جنوبی ساحل پر کلیسائے املفی کی تعمیر میں مستعار لیا گیا۔ نیز محرابوں میں نیم رنگین پچر یں پیوست کرنے کا کام بھی اسی اسلامی تعمیر کا خوشہ چیں ہے۔

ترکانِ عثمانی نے بازنطینی معماروں کے تتبع میں کردی مثانوں میں جو لبی قوسیں برتی ہیں وہ سپاٹ تھیں مگر "مغرب" (اندلس) کے معماروں نے اس میں اضلاع بھی نکالے، جو اقلیدسی کمال ہے۔ پنکھیوں کی کڑیوں کی طرح کھلنے والی خشتی چھڑیں نیچے سے جھرمٹ دیکر گنبد کی پھننگ تک کھلتی چلی گئی ہیں۔ ٹھٹھہ کے حکمران، مرزا باقی بیگ (۱۶۴۰ء) کے مقبرہ میں یہ خوبی برتی گئی ہے اور گنبد کی چوکور کرسی سے جو چھڑیں پھیلائی گئی ہیں وہ چھتری نما بننے کے بجائے پتنگ کے "کانپ" اور "ٹھڈوں" کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ہر ٹھڈے کے حوالی کو دھنسے ہوئے قاب کی وضع میں لایا گیا ہے اور چھتری کی ہر کڑی میں اینٹیں کسی مسطح کرسی پر رکھ کر نہیں چنی گئی ہیں بلکہ "چور سائی" قائم کر کے ان کو ایک مرکزی نقطہ پر سر جوڑ بٹھایا گیا ہے تاکہ پیوستگی و پائیداری اس قدر ہو جائے کہ ان کا اندر کی طرف کسی وقت گر پڑنا ناممکن بنا دیا جائے۔ ہر زاویہ اور قطاعِ نصف دائرہ پر تین تین چھڑیں آکر مرکوز ہوتی ہیں اور اسی طرح محرابیں خود بخود نکلتی چلی گئی ہیں۔ ان چھڑوں کی تعداد ۳۲ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اندر کی جانب سے گنبد کا دائرہ نہیں دکھائی دیتا بلکہ ۳۲ طرفی بیضوی کرہ بن جاتا ہے۔ کیکری کا کٹاؤ زیادہ تر آرائشی خوبی پیدا کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔

ٹھٹھہ کی عمارت میں آنکھ ایسا دیکھتی ہے جیسے مرکز نگاہ اوج پر چمکتا ہوا ایک ستارہ ہے جس کی کرنیں دمک جھلک کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی اشعاع تنویر کی شکل اختیار کرتی ہیں۔ گنبد کے ڈھانچے میں تنویری لکیروں کا برتنا بالکل اسلامی تصور ہے۔ اس کی ابتدا ایران کی مسجد جامع (۱۱۲۱ء) میں ہم دیکھتے ہیں۔ ٹھٹھہ کے مقبرہ باقی بیگ میں جو مسالہ لگایا گیا ہے اس نے اینٹوں کو جوڑنے کے علاوہ تزئین کا کام بھی کیا ہے کیونکہ جوڑنے والے مسالے کو (جس میں پھکا ہوا چونا اور گندھک شامل ہے) طول میں پھیلایا گیا ہے۔ اور سفید دھاریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جوڑوں کو سٹھانے کے لئے یہ پچی کار دھاریاں بڑی خوبصورت نظر آتی ہیں۔ مرزا جانی بیگ کے مقبرہ (۱۶۰۰-۱۵۲۹) میں یہ بالخصوص نمایاں ہیں۔ خاص کر فیروزی اور بسنتی رنگ کی اینٹوں کی پچی کاری۔ دریچے میں زنگار رنگ کام بنایا گیا ہے۔ یہ دریچہ باب داخلہ کی عین پیشانی پر ہے۔ پھر مستطیل پٹڑی میں ایک کتبہ نصب کیا گیا ہے جس کے حروف سفید اور زمین گہری نیلی ہے۔

سکھر کی عمارت میں جو کور شکلوں میں غیر روغنی اینٹیں ہیں مگر چھڑیں فیروزی رنگ کی ہیں یا لاجوردی جس میں ستارے سفید ہیں مگر رنگ زیادہ نہیں ہیں۔ حیدر آباد کے تالپوری مقبروں (۱۸۴۳-۱۷۸۳ء) میں سبز، سنہرا، جامنی، زرد، زیادہ لگائے گئے ہیں۔

پاکستان میں اسلامی فن تعمیر کی معراج جامع مسجد ٹھٹھہ میں نظر آتی ہے، اس کی بنا (۱۶۴۲ء) میں شاہ جہاں کے حکم سے ڈالی گئی اور ۵۹-۱۶۵۸ء میں تکمیل کو پہنچی)، اس کا ذکر باب داخلہ کے کتبہ میں بھی موجود ہے۔

دوسری بڑی بات یہ ہے کہ اس میں ۹۳ گنبد ہیں جن میں سے بیشتر سامنے سے نظر نہ آنے والے بنائے گئے ہیں۔ بڑی محراب پر جو عظیم قبہ بنایا گیا ہے وہ بھی اپنی شوکت اور کرسی کے اعتبار سے بڑی شاندار چیز ہے۔ گنبد کی اندرونی ٹکڑیوں اور حاشیوں میں جو ٹائل برتے گئے ہیں ان کی چند خوبیاں یہ ہیں۔

(۱) ٹائلوں کو اقلیدسی اشکال میں تراشا گیا ہے جیسے نوزاتوں کی سر جوڑ بیٹھک۔ پھر جوڑوں پر سفید دھاری داری پیدا کی گئی ہے۔

(۲) چوکور ٹائلوں میں پنکھڑیوں کا جال ہے۔ گلکاری کے نمونے لاجوردی زمین پر ہیں۔ سفید رنگ سے گلاب اور کنول کی نمود دی گئی ہے اور

(باقی صفحہ ۴۶ پر)

غزل

شان الحق حقی

پھر مرے ہاتھ میں لبریز ہے مینائے غزل
یک سرِ جوئے شیر نہیں لرزشِ صہبا کا بدل

آئینۂ شدتِ احساس سے بنتا ہے پگھل
تب کہیں گوشۂ تخئیل میں کھلتے ہیں کنول

تشنہ جانوں نے دیا نظمِ خرابات بدل
حکمِ امروز سے بڑھ کر نہیں قانونِ ازل

پائے ہمت کو ہوا زورِ سلاسل سے نصیب
پہلے کب عزمِ سفر میں تھے یہ طوفان کے سے بل

تیری باتوں کے اُجالے تری یادوں کے چراغ
میری دنیا میں نہیں چاند ستاروں کا عمل

خود مری چشمِ طلب گار کو بھی کیا معلوم
کن مکینوں کے مکاں ہیں یہ خیالوں کے محل

کس نے اس بت کو سکھا دیں یہ دو رنگی چالیں
بزمِ ساقی میں سکوں خلوتِ زاہد میں خلل

ان کو یہ ضد ہے کہ ہاتھوں سے نہ جائے گلِ راز
دل وہ کافر ہے کہ آنکھوں کا اڑا لے کاجل

آپ ہی آپ ہے پہلو مرا خالی خالی
آپ ہی دل ہے کئی روز سے بے کل بے کل

شاطرِ دہر یہ ٹھہری ہوئی بازی کب تک؟
چال ممکن ہو تو چل، ورنہ نہیں ممکن تو بدل

فیض ہے حسنِ عمل حسنِ نظر کا حقی!!
لو کسی بت سے لگا لے کہ ہوں سب کام سپھل

عبدالعزیز فطرت

خزاں نے لطف فرمائی نہ چھوڑی
جہاں جو دلکشی پائی نہ چھوڑی

ہواؤں کی روش ظاہر تھی پھر بھی
گلوں نے شانِ رعنائی نہ چھوڑی

بہت کچھ دام پھیلائے خرد نے
جنوں نے دشت پیمائی نہ چھوڑی

اسی میں تھی وفا کی نیک نامی
کوئی تدبیر رسوائی نہ چھوڑی

حجابوں پر حجاب، اللہ اکبر
غرض تم نے خود آرائی نہ چھوڑی

کہاں جاتے تمہاری جستجو میں
فضائے دل کی پہنائی نہ چھوڑی

خیالوں پر تجلّی کا تصرف،
کسی نے محفل آرائی نہ چھوڑی

مرے اشکوں نے فطرت بھید کھولے
خموشی تک نے گویائی نہ چھوڑی

غزل

سید ضمیر جعفری

زنداں تک آئے ہم کہ گلستاں تک آئے ہیں
مشکل سے سرگزشت کے عنواں تک آئے ہیں

رعنائی حیات وہمیں لوگ ہیں کہ ہم
پھولوں کی جستجو میں بیاباں تک آئے ہیں

جب بھی، جہاں بھی، کوئی ہوا قتلِ تیغِ ظلم
چھینٹے لہو کے میرے گریباں تک آئے ہیں

وحشت نہیں، جنوں نہیں، آوارگی نہیں
رستے ہی گلستاں کے بیاباں تک آئے ہیں

اے موت دیکھ جادۂ ہستی کے رہ نورد
کن مشکلوں سے منزلِ آساں تک آئے ہیں

سنگِ گرانِ راہ فقط حادثے نہ تھے
انساں کے راستے میں خود انساں تک آئے ہیں

یہ کائنات عکس ہے میرے ضمیر کا
خود میرے پھول ہی مرے داماں تک آئے ہیں

جو گیت روح میں تھے کبھی چاندنی کا درد!
وہ گیت کب ضمیر کے دیواں تک آئے ہیں

نظر حیدرآبادی

نظر کو دید تری، عید ہو تو کیونکر ہو
یہ عید عشرتِ جاوید ہو تو کیونکر ہو

خود اپنے آپ سے ممکن نہیں رہی ہے وفا
وفا کی آپ سے اُمید ہو تو کیونکر ہو

جہاں کو چھوڑ کے آخر کہاں نکل جائیں
نگاہِ دوست کی تائید ہو تو کیونکر ہو

فضائیں تلخ، جہاں ناسپاس، دل بیتاب
نیازِ عشق کی تجدید ہو تو کیونکر ہو

خطائے زیست کی تہمت اٹھائے جاتے ہیں
اب ایسے جرم کی تردید ہو تو کیونکر ہو

یہ تیرہ بختِ محبت یہ شب پرست جنوں
چراغِ محفلِ خورشید ہو تو کیونکر ہو

ہمارے جام سفالیں کا دَور ہے ساقی!
حریفِ ساغرِ جمشید ہو تو کیونکر ہو

* * * * *

هزارہ کا سبزہ زار

۱- ایبٹ آباد (ہزارہ) کے خوبصورت مکانات
۲- دامن کوہ میں
۳- شہر کا منظر
۴- اونٹوں کے قافلوں کا پڑاؤ

۲

۱

۳

۴
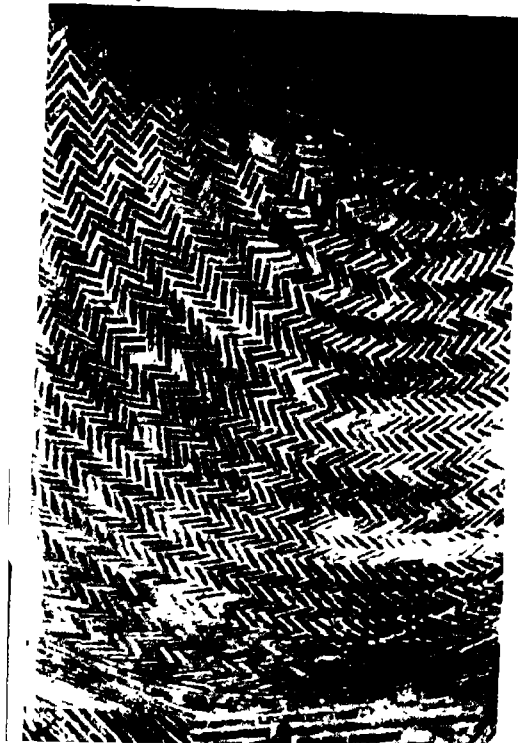
نظر آتے ہیں۔ برما، چین، بورنیو، افریقہ اور آسٹریلیا تک ان کی تگ و تاز ہے۔ گاؤوں میں دُور دُور سے جو خط آتے ہیں وہ اس کا سب سے بڑا ثبوت ہیں پچھلی جنگ عظیم میں ہزارہ کے اکثر کڑیل جوان فوج میں بھرتی ہو کر چلے گئے تھے۔ اب ان میں سے اکثر اپنے حجروں میں بیٹھے چلم کا کش سلگا کر دیس دیس کے قصے سناتے رہتے ہیں اور بے تابی سے اُس دن کا انتظار کرتے ہیں جب وہ اپنے وطن پاکستان کے لئے کوئی بہت بڑا بہادرانہ بلکہ مجاہدانہ کارنامہ سرانجام دیں گے اور آنے والی نسلوں کے لئے ایک غیر فانی یادگار چھوڑ جائیں گے۔ مشہور ہے کہ ؎

ہر کجا چشمۂ بود شیریں
مردم و مرغ و مور گرد آیند

چنانچہ ہزارہ کی سراپا بہار سرزمین میں بھی طرح طرح کے قبیلے آباد ہیں اور ان کی بولیاں گوناگوں ہیں۔ ان میں ہندکو سب سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اگرچہ پشتو اور گوجری کا بھی کچھ کم زور نہیں۔ ہندکو میں یوں سمجھئے پشتو، پوٹھواری، پنجابی، سب ہی کا رنگ رُوپ جھلکتا ہے۔ اور اس کے گیتوں کا رس کیا کہنے۔ یہاں کے گیت اور ٹپے وغیرہ شاعری بلکہ زندگی کی جان ہیں۔ اور دُور دُور تک لوگ ان کو سُن سُن کر تڑپ جاتے ہیں۔ یہ گیت کیا ہیں عورتوں کی زبانی اپنے بچھڑے ہوئے جیون ساتھیوں یا عزیزوں کی دکھ درد کی کہانی جو لام پر جا کر پردیس ہی کے ہو رہتے ہیں اور ان کی بیویاں، مائیں، بہنیں، بیٹیاں ان کی یاد میں پڑی تڑپا کرتی ہیں۔ ان کے گیتوں، ماہیوں اور ٹپوں میں ایک عجیب واقعیت رسی بسی ہوئی ہے جو شاید ہی کسی اور زبان یا بولی میں دکھائی دے۔ سنئیے: پنڈیوں آئی لاری ہشوہ بمبا لگا چکوال (راولپنڈی سے لاری آئی۔ ریل کا انجن چکوال میں آ کر لگا) یہاں راولپنڈی، چکوال، لاری اور ریل گاڑی کا ذکر کس بے تکلفی سے کیا گیا ہے۔ ایسی باتیں کچھ مقامی بولیوں پوٹھواری پنجابی، ملتانی ہی میں نبھ اور کھپ سکتی ہیں۔ جوں جوں زبان زیادہ مہذّب ہوتی چلی جائے گی وہ ان عام دلچسپی کی چیزوں سے دامن بچانے کی کوشش کرے گی، اور اس طرح بے ساختگی اور واقعیت سے دُور ہوتی جائے گی۔ اس سے بھی زیادہ عوامی اور واقعاتی باتیں سنئیے:

پھُلاں اُتاں ٹرمینڈا ماہی
گرگابی چیکدی آ

(میرے محبوب تو چل پھولوں پر
تیری گرگابی کی آواز آئے)

شیشی عطرے دی ماہی اُتے وٹی آ
(عطر کی شیشی لُنڈھادی میں نے کس پر بھلا؟ ماہی پہ!)

مگر سچ پوچھئے تو جوبات "گرگابی" کے "چیخنے" یعنی چُرمر چُرمر کرنے میں ہے وہ "آواز" میں کہاں؟ یہ اسی علاقے کے اَن جانے، اَن بوجھے شاعر ہی ہیں جو گرگابی جیسی چیز کو شاعری میں لا کر اس سے ایک رومانوی دلکشی پیدا کر سکتے ہیں۔ پھولوں پر چلنے کا تصور کتنا نفیس ہے؛ آخر اس طرح چلنے سے تو کمبخت "گرگابی چیخے گی نہیں" اور سنئیے:

ڈیوڑھی دیاں سنگلاں کِنیں لائیاں
ماہی سُنار رہیا، میں کھُسیں آئیاں

(ڈیوڑھی کے دروازے کی زنجیر کس نے کھولی؟ میرا محبوب سونار!، میں ہی پہنچ گئی)

اور دُور، جنگ پر گئے ہوئے ماہیوں کے فراق میں تو ہزاروں بول اور ٹپے ہیں جو سنتے ہی دل پر ایک چوٹ لگاتے ہیں۔ اور ان میں ایک عجیب اچھوتا پن، ایک عجیب کیف ہے۔ مٹیاروں اور جوانوں، بزم اور رزم کا یہ تال میل ہزارہ کی بہت بڑی سوغات ہے۔ رومان کی اس حسین و جمیل وادی میں پھرنے والے جوان کبھی اس میں کھو کر نہیں رہ جاتے۔ وہ اب بھی بزم میں رزم کا تصور کرتے رہتے ہیں مگر ان کے پرانے اور نئے خوابوں میں بہت فرق ہے۔ پہلے ان کے خواب دوسروں کی جنگیں لڑنے کے لئے وقف تھے۔ اب ان کی رزم آرائیاں اپنے ہی دیس کے لئے ہیں۔ اب یہی جوان اپنے محبوب وطن پاکستان کی حفاظت اور اس کے لئے جان و دل کی قربانیاں کرنے میں پیش پیش ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے علاقے میں جہاں پر کہیں بہادر قبائل آباد ہیں مردانہ کھیل کس قدر مقبول ہوں گے۔ چنانچہ نیزہ بازی یہاں کا بہت ہی چہیتا کھیل ہے۔ پرانے کھیلوں میں "تُنی" مشہور ہے۔

ہزارہ کا علاقہ کھیتی باڑی اور پھلوں کی جنت ہے مگر یہاں کے جنگلات اس کو جو اہمیت بخشتے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ہزارہ کے جنوب میں خانپور

کے کاؤ، پھلاہ اور سنتھا کے جنگلات ہماری بہت بڑی دولت ہیں۔ مانسہرہ تحصیل میں چیل کے ہرے درختوں سے پہاڑوں کی چوٹیاں زمرد کے ڈھیر معلوم ہوتے ہیں۔ ٹھنڈیانی اور ڈونگا گلی کے جنگلات میں بیاڑ اور پلاہ دو اہم درخت ہوتے ہیں۔ کاغان اور سرن کے اوپر کے علاقہ میں دیودار جیسا کارآمد درخت بھی موجود ہے۔ اگر در کے چیل کے درخت بھی قابل ذکر ہیں۔ ان جنگلات نے نہ صرف ہزارہ کو سرسبز اور پُربہار فضاؤں سے لبریز کر دیا ہے بلکہ پاکستان کی معاشی ترقی میں بھی ان کا بڑا حصہ ہے۔

پاکستان بننے کے بعد سے ترقی کی شاہراہ پر دوڑتا نظر آتا ہے۔ اب تقریباً ہر بڑے گاؤں کی طرف بسیں رینگتی نظر آئیں گی۔ متمدن دنیا کی دوسری آسائشیں بھی عام دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً بجلی جس سے ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں برقی قمقمے جگمگ جگمگ کرتے نظر آتے ہیں اور سچ مچ چپے چپے پر کوہ طور کا عالم دکھائی دیتا ہے مگر مادی باتیں ہی سب کچھ نہیں۔ ثقافتی و ذہنی کمالات کا درجہ ان سے کہیں بلند ہے۔ یوں تو ہزارہ کی مٹی سونا اور لعل و جواہر اُگلتی اور رنگا رنگ کے پھل پھول پیدا کرتی ہے لیکن اب یہ علاقہ علم و ہنر کی دولت سے بھی اس قدر مالا مال ہو رہا ہے اور اس تیزی کے ساتھ کہ باید و شاید۔ ایبٹ آباد میں ایک ڈگری کالج کی نئی عمارت تعمیر ہو چکی ہے، عورتوں کے لئے ایک انٹرمیڈیٹ کالج کھل چکا ہے اور ریلوے ملازمین کے بچوں کے لئے ایک اسکول بھی ہزارہ میں ہے۔

صنعتی ترقی بھی تیزی سے بال و پر پیدا کر رہی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاقہ دنوں میں اس اعتبار سے بھی نہایت اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے گا۔ ہری پور میں ایک ٹیکسٹائل مل اور ٹیلیفون فیکٹری تو پہلے ہی اس کو چار چاند لگا رہی تھی۔ اب ایک ریزن فیکٹری بھی زیر تعمیر ہے۔ یہ تمام باتیں مغربی پاکستان کے اس گوشے کو اور بھی بہشت آثار اور ترقی یافتہ بنانے کے لئے کافی ہیں اور اس کے روشن مستقبل کی نوید ہیں ٭

★

وادیٔ سندھ کا فنِ تعمیر: ________ بقیہ صفحہ (۴)

(۳) سفید اقلیدسی حاشیوں میں جو لاجوردی رنگ کے ہیں، ستاروں کا جھرمٹ ہے اور بڑا خوش الوان نمونہ۔

(۴) چوکور خانوں سے معلّے نہایت دیدہ زیب کام کے بنائے گئے ہیں۔ (وغیرہ)

ان چیزوں کی تفصیل کتنی ہی دی جائے اس جنت نگاہ کو دیکھے بغیر خوبیوں کی صحیح جانچ آسان نہیں۔ بہرکیف ان عمارات کی خوبیوں کو جانچنے کے لئے دو چار باتیں خاص طور پر ذہن میں رکھنی چاہئیں، مثلاً یہ کہ ایران میں تو عموماً باب داخلہ اس طرح بنایا جاتا ہے کہ ایوان کو نیم گندی شکل کے جھرمٹ میں لے لیتے ہیں یا ڈھول نما خلا کے اوپر سپاٹ مسقف دیا جاتا ہے۔ مگر ٹھٹھہ میں کیفیت دوسری ہے۔ ایوان پر سپاٹ مسقف ہے مگر اندرونی نصف حصہ میں ڈھول نما ترکیب نہیں رکھی گئی ہے بلکہ اس پر ایک چھوٹا سا گنبد بنا دیا گیا ہے اور دائیں بائیں طرف ایک چھوٹے سے گنبد سے گوگٹ نکالا گیا ہے۔ عین محراب داخلہ کے اوپر کھڑکی ہے جسے سنبھالنے کے لئے جالیدار کٹہرا چلایا گیا ہے۔ روزن دار جھلملیاں روشنی کی جھلکاری کیلئے ہیں۔

غرض سندھ کی اسلامی تعمیرات میں سے بعض اپنی نادر الوجود خوبیوں، اور فن کی نزاکتوں اور انوکھے پن کی مثال آپ ہیں۔ جن کے زیادہ گہرے مطالعہ کی ضرورت ہے ٭ (تلخیص)
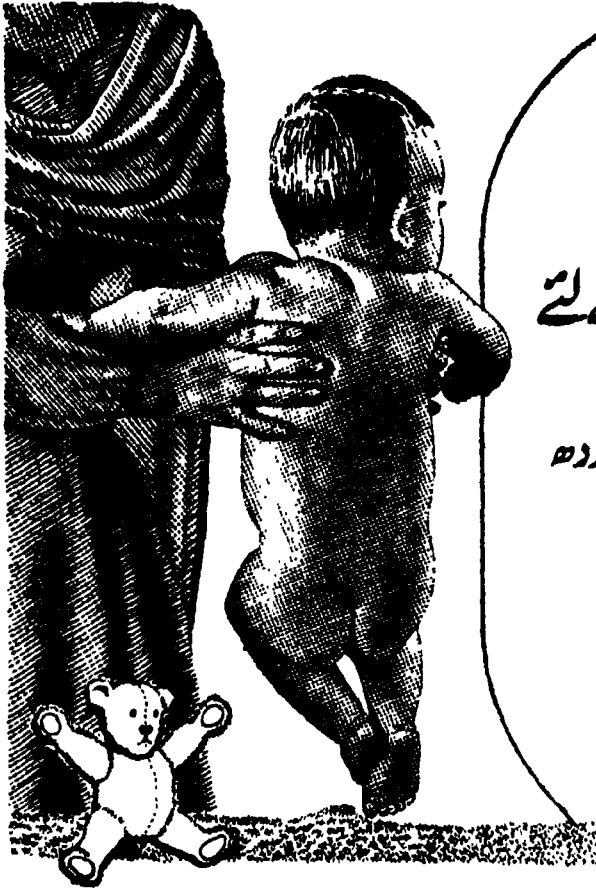
سیدھی پیٹھ
اور
مضبوط اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچّہ کو یہ خالص دودھ
دیجئے
OSTERMILK
اگر آپ کا بچّہ بوتل سے دودھ پارہا ہے تو اُس کے لئے آسٹر ملک بہترین ہے۔ یہ ایک خالص قوّت بخش اور غذائیت والا دودھ ہے جس کے استعمال سے بچّوں کی پیٹھ سیدھی اور اعضاء مضبوط ہوجاتے ہیں۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور لوہا شامل کیا جاتا ہے تاکہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ اس لئے آسٹر ملک فوراً خریدیئے۔ یہ خاص کر پاکستان میں بچّوں کے لئے بیحد موزوں ہے۔
آسٹر ملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
تین مہینے کی عمر تک بچّہ کو ۲۴ گھنٹہ میں ۲۰ گھنٹہ سونا چاہئے اس عمر کے بعد نیند کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ نو مہینے کی عمر میں بچّہ کو دن کے وقت صرف ۴ گھنٹہ اور ۲۴ گھنٹہ میں کُل ۱۶ گھنٹہ سونا چاہیئے۔
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ

ملک کی ترقی
وہ خواب جو بچت سے حقیقت بن جاتے ہیں
کچھ ہیں خواب انسان کی دلی خواہشات کے آئینہ دار ہوتے ہیں
انسان جس چیز کی خواہش رکھتا ہے وہی اُسے خواب میں نظر آتی ہے
لیکن بعض خوابوں کو حقیقت بنانے کی تدابیر بھی
ہو سکتی ہیں۔ مثلاً خوش آئند مستقبل، خوشحال خاندان،
صحت مند اور تعلیم یافتہ بچے، ترقی یافتہ ملک۔
ان خوابوں کو حقیقت بنانے کا ذریعہ بچت ہے
آج کی ضرورتوں سے ہر پیسہ جو آپ بچائیں وہ آپ کی
آئندہ مسرتوں کا ضامن ہوگا۔ ہر حیثیت کے
لوگوں کیلئے بچت کی مفید صورتیں موجود ہیں۔
پوسٹ آفس سیونگز بینک
پوسٹل لائف انشورنس
اپنے مستقبل کی حفاظت کے لئے بچت کیجئے

آئیے بہتر زندگی تعمیر کریں

کسی نے ایک لطیفہ بیان کیا ہے - :
کچھ عجب نہیں درست بھی ہو - کوئی صاحب جو پان کھانے کے بہت شوقین تھے کہیں جیسے پھرتے ولایت جا نکلے - ایسی صاف ستھری جگہ - گھربار، سڑکیں، گلی کوچے سب شیشے کی طرح صاف - عورتیں دن بھر گھر کو مانجھ مانجھ کر صاف کرنے میں لگی رہتیں--ذرا دھبہ پڑا اور انھوں نے فرش کو رگڑ رگڑ کر صاف کرنا شروع کردیا - مگر یہ حضرت تو اور ہی ادا لیکر آئے تھے - دل، دماغ میں پان ہی پان رسا بسا ہوا--گویا پان انہیں تہذیب و ترقی کی ہری بھری سند ہے - پردیس میں بھی وہی دن رات، سوتے جاگتے پان کھانے کی لت اور در و دیوار کو سرخ سرخ پیک کے روغن سے رنگنے کا سودا - جلدی لگے یہ پھٹکری، رنگ چوکھا آئے ! اوروں کا دیس ہوا کیا دیس--ابرار نے نکلے ہوئے میں مضائقہ ہی کیا تھا--ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست - آتے ہی بسم اللہ کر کے "طبع آزمائی" شروع کردی یعنی مغرب کو مشرق کی سوغات پیش کرنے کے لئے فرش کو پھوک پھوک کر لال گلال لعاب سے گلزار بنا دیا - حضور برابر "میں بھی" کے لئے "گرہ در گرہ" لگا رہے تھے اور "مصرعوں" پر "مصرعے" جڑ رہے تھے کہ یکبارگی چیخ چلی پھرتی آنکلی - یہ منظر دیکھا کہ ہوش اڑگئے - سمجھی کوئی ٹی - بی کا مریض ہے اور "خون خون" پکارتی ہوئی دوڑی - محکمۂ صحت کو فون کیا - صفائی کا عملہ ایکدم لباس کے ساتھ لیس آن پہنچا اور اندھادھند گھر کی صفائی شروع کردی - وہ حضرت ہکا بکا ہوکر دیکھ رہے تھے کہ--یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے !

وہ اسطرح بھونچکا سے کھڑے تھے کہ امبولنس

ایک نظر ادھر بھی !

کار آئی اور انہیں آناً فاناً دھکیل کر اسپتال میں جاپٹکا--ایسا ایک پھر تو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا - کہاں اپنے یہاں کی آزادی--جہاں جاتا اور جب جاتا وہیں کو لال لال کلولوں سے بےتاسر کردیتا نہ کوئی کچھ ٹوکتا نہ محکمۂ صفائی کا اندیشہ اور نہ کچھ انہیں پر منحصر نہ تھا ' وہ تو دیس بھر میں کا ایک چاول تھے--بس دیس کے وہ باسی تھے وہاں کے تو آدم کے بیٹے اور حوا کی بیٹیاں سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے تھے - آخر گندگی پھیلانا بھی تو ایک فن لطیف ہے - اس میں کیوں نہ مہارت پیدا کی جائے '

وہ دیکھئے، ایک صاحب سڑک پر کس شان سے چل رہے ہیں اور ایک ہی بیچ کو کھچ--چلتے چلتے کیلا بھی کھاتے جا رہے ہیں - اس بےتکلفی کے قربان جائیے--کس صفائی سے چھلکا راستے میں پھینک دیا اور کچھ دیر میں مکھیوں نے اس کے گرد طرح طرح کے سُریلے گیت گا کر لوک ناچ دکھایا اور لوٹ کھسوٹ شروع کردیا - کیا یوں سمجھئے بھنبھنا بھنبھنا کر اپنے اس انجانے مہربان

کے گن گانے لگیں—وہ کھچنے—ڈرامہ کا ایک اور سین! ایک صاحب اس پر چلتے چلتے پھسل گئے اور ایسے پھسلے کہ پھسلتے ہی چلے گئے— اگر ان کے بہت بری چوٹ آئی یا کوئی ہڈی پسلی ٹوٹ گئی تو کیا بات ہے: "سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی" ۔ یار زندہ ہے تو ایسی ہزاروں افتادیں دیکھی ہیں اور کچھ عجب نہیں کہ وہ حضرت خود بھی کسی دن اپنی یا کسی اور کی ایسی ہی ادائے جانانہ کا شکار ہوجائیں اور لوگ ان کے پھسلنے کا تماشہ دیکھیں دیکھنے کو دور ہی دور کھڑے ہنسیں اور قہقہے لگائیں ۔ تاروں کی بلا سے ۔ آخر گندگی پھیلانا ایک دلچسپی کی چیز ہے اور باتیں ہاتھ نہ لگیں ۔ جہاں جائیں آنکھیں بچھیں، چلیے پھیلائیں گے! اور جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ اس حسابی بات، (اربع متناسب)، کی پوری پوری تائید کرتا ہے— نہروں کے ارد گرد اور گلی کوچوں میں کوڑا کرکٹ، بول و براز، ردی کاغذ، کیا کچھ نہیں ہوتا۔ کوئی بلی کتا مرگیا ہے تو:

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادۂ ہوائے سر رہگذار تھا

کا ورد کرتا رہے اور ہفتوں پڑا گلے سڑے۔ کھانا خراب ہوتا ہے تو اس کا صحیح ٹھکانہ ایک اور صرف ایک ہے۔ اسے باہر گلی میں پھینک دیں جائے یا گندی نالی میں تاکہ وہ اور گندی ہوجائے اور سونگھنے اور دیکھنے کی قوتیں اس سے دن رات خوب لطف اندوز ہوں۔ باقی رہی

صاف ستھرے، تندرست
ہشاش بشاش

پھرتے ہوتا، نہ جھڑکا، اور طرح طرح سے گندگی پھیلانا ان کا من چاہا معاملہ ہے۔

ذاتی صفائی تو خیر اپنا اپنا معاملہ ہے۔ انسان صاف ستھرا رہے نہ رہے کسی کو کیا؟ گرمیوں کے دنوں میں بھی آٹھ آٹھ دس دس دن تک نہ نہائیں تو کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یا اثر تو صریحاً مقامی ہے۔ مگر یہ خیر، یہ بلی نوچے۔ یہاں تو بات ایک ذات ہی تک نہیں رہ جاتی۔ بلکہ ایک اور ایک مل کر گیارہ ہو جانے کی بات ہے! وہی حساب کی بات۔ یعنی ایک آدمی اتنی گندگی پھیلاتا ہے تو گیارہ یا اس سے زیادہ آدمی، جتنی بھی ان کی تعداد بڑھتی جائے، اتنی گندگی

بیماری تو اس کی کیا بات ہے۔ پھیلتی ہے تو پھیلے۔ ہماری بلا سے۔ کیڑے، جراثیم پروان چڑھتے رہیں۔ آخر یہی ہے نا کہ چند فالتو لوگ ہی مرجائیں گے۔ مرنے دیں۔ چاہے یہ ہم خود ہی کیوں نہ ہوں—یا ہمارے بیوی بچے، خویش و اقارب۔ تپ دق، ہیضہ، تپ محرقہ، خناق، ملیریا، طاعون، چیچک جو بھی آتا ہے آئے۔ ہمارے دیدہ و دل ہمیشہ فرش راہ ہیں۔ ایسی ہی باتوں کے کارن شہروں کا چپہ چپہ بیماریوں کا اڈہ بن جاتا ہے بلکہ ساری فضاء جراثیم سے اٹ جاتی ہے۔ اس قدر کہ ماہرین کی رائے میں معیادی بخار، ٹی، بی اور دوسری مہلک

بیماریوں کے جراثیم جو عام طور پر گلے یا پھیپھڑوں وغیرہ میں شاذ و نادر پائے جاتے ہیں ، ان میں ہمیشہ کے لئے بس جاتے ہیں ، بڑی بڑی کالونیاں بنا لیتے ہیں اور یہ صحت کے گھر بیماری کے گھر بنجاتے ہیں—ایسے میں کوئی بھی کسی وقت ان کا شکار ہوسکتا ہے— ان حالات میں دواؤں سے کیا بن پڑیگا ! ٹیکے ہوں یا علاج معالجہ وہ ایک بیماری کو دور کریں گے تو دوسری اسکی جگہ لے لے گی— سوال تو اس بس بھری فضا کا ہے جو ہمارے گرد و پیش ہر کہیں موجود ہے۔ ہم چاہے خودی کو کتنا ہی بلند کریں ، اس کا مقابلہ کیسے کرسکتے ہیں۔ اس کا تو صرف ایک ہی علاج ہے کہ انسان اپنی خودی ہی کو سدھار لے

ایک شاعر صاحب کی سنئے—جن کا ہر قول و فعل ہمارے لئے عموماً مثالی حیثیت رکھتا ہے— ایک دفعہ ہم ان کے گھر جا نکلے — وہ ایک کونے میں پرلے درجہ کی غلیظ پھٹی پرانی دھوتی باندھے یوں بیٹھے تھے جیسے کوئی جوگی دھونی رمائے بیٹھا ہو ۔ ناخنوں میں بری طرح میل بھرا ہوا، جس کو دیکھ کر آدمی ساری شاعری بھول جائے ۔ اور میرے خدا ! جہاں وہ بیٹھے تھے وہاں چاروں طرف دور دور تک فرش اور در و دیوار پر بلغم کی چاند ماری ، کچھ نئی کچھ پرانی—اور وہ اللہ کا بندہ ! اس فضا میں یوں بیٹھا تھا جیسے :

اگر فردوس بر روئے زمین است
همین است و همین است و همین است

غلیظ ، بیمار ، نڈھال ، دواؤں ، ڈاکٹروں کے محتاج

چاہے یہ ذاتی خودی ہو یا جماعتی—یہی حال اس زہریلے مادے کا بھی ہے جو خراب ماحول سے ہماری رگ رگ میں جاگزیں ہو جاتا ہے ۔ اس کو ایک طرف سے ہٹایا جائے تو یہ دوسری طرف جا نکلے گا ۔ اور بری طرح ڈیرہ جما لے گا— صحیح علاج ایک ہے اور وہ اپنے اندر اور باہر صفائی کی مہم پر زور ہے ۔ اور ہم اس کو ایک اخلاقی ، ایک مذہبی فرض سمجھ کر انجام دیں—

یہ جو کچھ اوپر کہا گیا ہے شاید آپ اسے مذاق سمجھیں—مگر یہ کوئی مذاق نہیں—طنز بھی تو آخر حقیقت ہی کی نقاب کشائی کرتی ہے ، اور ہمیں چونکا کر اس واقعہ کی طرف متوجہ کرتی ہے ۔

ایسا ہی فردوس گلی گلی اور کوچے کوچے دکھائی دے تو پھر کیا ہوگا !

یہ باتیں ایسی ہیں جو ہمیں بار بار سوچنے کی دعوت دیتی ہیں ۔ سچ پوچھئے تو یہ ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے ۔ لفظاً و معناً ، چاہے ہم غفلت کے باعث اس پر غور کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ صفائی کا مسئلہ ہماری زندگی کا مسئلہ ہے— اس کا تعلق براہ راست ہماری صحت و تندرستی سے ہے ۔ جو اور سب باتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے ۔ آخر یہ جینا اور اچھی طرح جینا ہی تو ہے ۔ جس کے لئے ہم سب کچھ کرتے ہیں ۔ محنت ،

ادبی جائزہ:

(ن - م - راشد)

ضیاء جالندھری

"ماورا" کا جوشیلا، رسیلا، سرپھرا، باغی، موجد، باخبر، تند اور تیز شاعر اب دوسرے مجموعۂ کلام میں ایک نئے روپ میں نظر آتا ہے۔ ٹھہری طبیعت سنبھلی کیفیت، ڈھلتی عمر، خون کی حدت کی جگہ فہم و فراست۔ یہ ہے "ایران میں اجنبی" کا شاعر۔ مگر ابھی تک آرزوئیں وہی ہیں، ارادے وہی۔ پہلے بھی جنسِ لطیف کے جسم سے رغبت تھی۔ اور اس کے لئے نت نئی ترغیب کی تلاش۔ کبھی روح کا بوجھ سبکبار کرنے کی تمنا۔ کبھی سیاسی انتقام کی خواہش، کبھی کہنہ اخلاقیات کے خلاف اجتہاد — مگر سب میں قربِ چشم و گوش کی طلب۔ اور اب بھی تلاش وہی مگر ساتھ ساتھ یہ احساس بھی کہ ان کے تبسم کے حسابی زاویوں سے کونسی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم اور یہ کہ "کہاں سے کس سبو سے کاسۂ پیری میں مے آئے"۔ پہلے بھی فرنگی کے خلاف فریاد تھی مگر ایک محکوم ہندی کی حیثیت سے۔ اب بھی مغرب سے شکایت ہے، ایشیا بھر کی مظلومی اور غلامی کی وجہ سے۔ "ماورا" میں بھی راشد نے اردو نظم میں انقلاب پیدا کیا تھا۔ آزاد نظم کو متعارف کرانے کا سہرا اسی کے سر ہے۔ گو میراجی اور ڈاکٹر خالد بھی اس کے ساتھ ساتھ ہی آزاد نظم کہہ رہے تھے لیکن نہ صرف راشد کا کلام کتابی صورت میں پہلے شائع ہوا بلکہ زیادہ مقبولیت بھی اسی کو حاصل ہوئی۔ اور آج بھی راشد طویل نظم "ایران میں اجنبی" کے تجربے کے علاوہ اندازِ بیان کے مختلف دوسرے تجربے کرتا نظر آتا ہے — مگر اس ہم آہنگی، اس شخصیت کی اکائی کے باوجود عمر کا، پختگی کا ٹھہراؤ کا جو احساس "ایران میں اجنبی" میں ہوتا ہے وہ اس راشد کو بڑی حد تک ماورا کے راشد سے مختلف بنا دیتا ہے۔

اس مجموعے کی پہلی نظم "ایران میں اجنبی" ہے۔ اس میں راشد نے جنگ اور سیاسی بدحالی میں مبتلا ایران کے کچھ خاکے پیش کئے ہیں۔ ان خاکوں میں ولیس دلیس کے کردار ہیں۔ ہندوستانی سپاہی ہیں جنہیں ایران سے ہمدردی ہے۔ ایرانی مردوں اور عورتوں کے قرب کی خواہش ہے۔ دوسرے ملکوں کی لڑکیوں سے تعلقات بڑھانے کی خواہش ہے۔ اس میں ایرانی مرد اور عورتیں ہیں جو اپنے گھروں میں، تماشہ گاہوں میں ان اجنبی سپاہیوں کو نظر آتے ہیں، وہ ان سے ملتے ہیں۔ ان کے قریب آجاتے ہیں۔ اور جہاں تفریح اور سیاست عجیب طرح سے آپس میں الجھی ہوئی ہیں۔ ایران کی تہذیب پر جنگ کے جو اثرات ہوئے ہیں اس کے ہلکے سے کچھ نقش ہیں۔ لیکن ان نظموں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اجنبی کی نظر ایران کا مکمل اور گہرا مطالعہ بھی نہیں کر پائی۔ شاید اس کی وجہ ایک یہ بھی ہو کہ راشد نے اس نظم کو تیس قطعات میں لکھنے کا فیصلہ کیا تھا مگر تیرہ قطعات لکھ چکنے کے بعد یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ہندوستانی اور ایرانی کرداروں کے علاوہ پردے پر اور پس پردہ کچھ لبستانی (دیو بینڈ کے باسی)، ارمنی، امریکی، فرنگی اور روسی کردار بھی ہیں۔ لبستانی پناہ گزیں لڑکی ایک امریکی کی پناہ ڈھونڈتی ہے — روسی لڑکیوں سے زبان سیکھنے کے بہانے سپاہی گفتگو کی سبیل نکالتے ہیں۔ ایک آدھ پرانی ایرانی کہانی کو نظم کیا ہے۔ یہ نظم نت نئی راہ ڈھونڈنے والے راشد کا نیا تجربہ ہے۔

اس نظم سے پہلے اردو میں قطعات پر مشتمل طویل آزاد نظمیں کہی جا چکی تھیں۔ مگر اتنے بڑے کینوس پر یہ پہلی نظم ہے۔ اپنی نامکمل صورت میں بھی یہ طویل ترین آزاد نظم ہے جس کے قطعات میں ایک بہت نازک سا رشتہ ہے اور جو وسیع پیمانے پر ایک ملک کی زندگی کا احاطہ کرنے کی ایک اہم کوشش ہے۔ اردو شاعری میں گذشتہ بیس سال میں بہت سے تجربے ہوئے۔ نظم آزاد اور نظم معرا ایک مستقل حیثیت اختیار کر گئی۔ اور اس سے پیشتر حفیظ جالندھری اپنے گیتوں اور مختلف قسم کے سٹینزوں میں نظموں کو رواج دے چکے تھے۔ ہیئت کے ان تجربوں کے علاوہ موضوع کے تجربے بھی کم اہم نہ تھے۔ نفسیاتی گہرائیوں اور الجھنوں پر نظمیں لکھی گئیں، اشاریت اور ایمائیت کو بہت حد تک جدید اردو نظموں میں کامیابی سے برتا گیا۔ اور محبوب اور عورت کا تصور پہلے سے بہت تبدیل ہو گیا۔ ان کے علاوہ مختلف سیاسی سکولوں نے اپنے اپنے مکتبۂ فکر کے مطابق شاعروں اور دوسرے لکھنے والوں پر ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے لیبل لگائے۔ مگر ان تمام باتوں کے

ماہِ نو، کراچی، جون ۱۹۵۸ء

باوجود ابھی تک جدید نظم نے ہمیں ایسی شاعری نہیں دی جسے عظیم کہنے میں باک نہ ہو۔ ہماری جدید شاعری ہنوز مختصر غنائی نظموں سے آگے نہیں گئی۔ ابھی اس میں ڈرامے کو فروغ نہیں ہوا، ابھی اس میں ایپک کا شکوہ پیدا نہیں ہوا۔ ابھی اس میں وہ آفاقیت اور گہرائی پیدا نہیں ہوئی جو عظیم شاعری کا خاصہ ہے۔ کچھ سیاسی شاعری ہوئی بھی تو عموماً نسائی انداز میں یا پھر سیاست اور محبوب آپس میں یوں گڈمڈ ہو گئے کہ ایک سے الگ نہیں ہو سکتا۔

ان حالات میں "ایران میں اجنبی" ایک ایسی نظم ہے جو ایک نئی منزل کا پتہ دیتی ہے۔ اس نظم میں ایک وسیع پیمانے پر زندگی کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس میں سیاسی طور پر راشد ایشیا کی بیداری کا علم اٹھائے نظر آتا ہے۔ مگر اس کے باوجود کسی گہرے سیاسی شعور کا اس نظم سے احساس نہیں ہوتا اور اس نظم کے لئے شاید اس کی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ مگر اس میں اس نے ایران اور ہندوستان میں یہ قدر مشترک تلاش کی ہے کہ یہ دونوں ملک، بلکہ تمام ایشیا فرنگ کی آہنی زنجیر میں بندھے تڑپ رہے ہیں۔ اور یہ رشتہ دونوں کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیتا ہے یہیں سے راشد کی تمام ایشیا کے لئے آزادی کی خواہش تیز ہوتی ہے:

"بس ایک زنجیر
ایک ہی آہنی کمندِ عظیم
پھیلی ہوئی ہے۔
مشرق کے اک کنارے سے دوسرے تک
مرے وطن سے ترے وطن تک
بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں"

اس نظم کا دوسرا بہت اہم پہلو اس کا ڈرامائی اور بیانیہ انداز ہے۔ راشد نے اس نظم میں طرزِ بیان بہت کٹھن تلاش کیا ہے۔ وہ نظم کو نثر سے اس قدر قریب لے آیا ہے کہ کئی جگہ یہ خدشہ ہوتا ہے کہ اس میں سے کہیں شعریت نہ جاتی رہے۔ مگر راشد اس کو بڑی کامیابی سے نباہ گیا ہے۔ اور جو ڈرامائی تاثر وہ پیدا کرنا چاہتا تھا اس میں اسے کامیابی ہوئی ہے:

کہا میں نے خالدہ سے
بہر دو پنے!
اس ولایت میں ضرب المثل ہے
گر او نٹوں کی سوداگری کی لگن ہو
تو گھر ان کے قابل بناؤ۔
اور اس شہر میں یوں تو استانیاں ان گنت ہیں
مگر اس کی اجرت بھلا تم کہاں دے سکو گے"
وہ پھر مضطرب ہو کے بے اختیاری سے ہنسنے لگی تھی۔
وہ بولی!
یہ سچ ہے کہ اجرت تو اک شمہ بھر کم نہ ہوگی
مگر فوجیوں کا بھروسہ ہی کیا ہے
بھلا تم کیا باز آؤ گے
آخر زباں سیکھنے کے بہانے
خیانت کرو گے"
وہ ہنستی ہوئی
اک نئے مشتری کی طرف ملتفت ہو گئی تھی۔

مگر نظم کے اس ڈرامائی اندازِ بیان کے باوجود راشد کے یہاں جو صولتِ آہنگ اور شکوہ الفاظ ماورا میں نظر آتا ہے۔ وہ اس کتاب میں بھی عام ملتا ہے۔ راشد بھاری بھرکم فارسی الفاظ اکثر استعمال کرتا ہے۔ اور اکثر وہ ان کو نہایت چابکدستی سے سمو دیتا ہے اور ان سے ایک تازگی اور کیفیت پیدا کرنے میں مدد لیتا ہے:

عجوزۂ سومنات کے اس جلوس میں ہیں
عقیم صدیوں کا علم لادے ہوئے برہمن
جو اک نئے سامراج کا خواب دیکھتے ہیں
اور اپنی توندوں کے بل پہ چلتے ہوئے مہاجن
حصولِ دولت کی آرزو میں بہ جبر عریاں
جو سامری کے فسوں کی قاتل حشیش پی کر
ہیں رہگذاروں میں آج پاکوب و مست و غلطاں
دف و دہل کی صدائے دلدوز پر خروشاں

لیکن نئے اور عجیب الفاظ کی یہ تلاش کبھی کبھی پڑھنے والوں پر گراں بھی گذرتی ہے۔ "ایران میں اجنبی" کے ایک قطعے کے چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

"وہ اپنے لباس حریری میں
پاؤں میں گلہائے نسریں کے زنگولے باندھے" اور۔۔
"خیاباں کے دورویہ سرو و صنوبر کی شاخوں پہ
یخ کے گلولے پرندے سے بنکر لٹکنے لگے ہیں"

یہاں زنگولے اور گلولے نہ صرف کانوں کو اجنبی معلوم ہوتے بلکہ اکھڑے اکھڑے بھی لگتے ہیں۔ گلہائے نسریں کے لئے زنگولے کا لفظ اگر گراں ہے تو ذہن میں یخ کے گلولے کی تصویر مشکل ہی سے بن پاتی ہے۔

ان قطعات میں "درویش" شاید سب سے بہتر قطعہ ہے۔

اس نظم کے علاوہ اس کتاب میں کچھ مختصر نظمیں بھی ہیں اور چند غزلیں بھی۔ اسی کے دوسرے حصے "خواب سحرگہی" میں سے چند ایک نظمیں تو آزادی سے پہلے کی ہیں۔ "زنجیر" اور "سومنات" میں وہی انگریزی راج اور اس کے بعد ہندو راج کے خلاف پکار کی ترغیب ہے۔ ان کے علاوہ دوسرے حصے کی باقی نظمیں بھی اس تفکر سے تعلق رکھتی ہیں جسے آجکل عام طور پر غم دوراں کہا جاتا ہے۔ ان میں مایوسیاں بھی ہیں، کوشش رائیگاں کا بھی احساس ہے۔ اور اب ان نظموں میں شاعر ہندوستان اور ایران سے نکل کر ان مغربی ممالک میں جا پہنچا ہے جن کے خلاف عمر بھر وہ آواز اٹھاتا رہا۔ اور وہاں جاکر جہاں اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ رنگ کی دیوار ان ممالک کے باشندوں میں اور مشرقیوں میں حائل ہے وہاں یہ بھی احساس ہے کہ:

"یہاں زندگی ہے اک آہنگ تازہ
مسلسل مگر پھر بھی تازہ
یہاں زندگی لحظہ لحظہ نئے دمبدم تیز تر
جوش سے گامزن ہے
یہاں وہ سکوں جس کے گہوارۂ نرم و نازک
میں پلتے ہیں ہم ایشیائی
فقط دور ہی دور سے خندہ زن ہے"

مگر اس سلسلے کی آخری نظم میں ایک تھکن کی سی کیفیت پائی جاتی ہے:۔

سبا ویراں کہ اب تک اس زمیں پر ہیں
کسی عیار کے غارت گروں کے نقش پا باقی
سبا باقی نہ مہرروئے سبا باقی
سلیماں سر بزانو
اب کہاں سے قاصد فرخندہ پے آئے
کہاں سے کس سبو سے کاسۂ پیری میں مے آئے

اور یہ احساس ہمیں ان نظموں میں بھی نظر آتا ہے جو اس کتاب کے تیسرے حصہ میں ہیں جنہیں "شباب گریزاں" کا عنوان دیا گیا ہے:۔ ان نظموں میں وہی جنسی آسودگی کی تمنا ہے، کبھی شب بھر کے ساتھی سے کبھی سرِ راہگذار۔ اور کبھی کسی ڈھلتی عمر کی عورت کے رس کا بھونرا بننے کا جوانہے تو کہیں "تازہ افق" ڈھونڈ کر اپنے غم بھلانے کی کوشش مگر ان نظموں میں اس قسم کی لگاوٹوں کا ایک ردعمل بھی پیدا ہو چکا ہے:

"رقص کی رات کسی غمزۂ عریاں کی کرن
اس لئے بن نہ سکی راہِ تمنا کی دلیل
کہ ابھی دور کسی دیس میں اک ننھا چراغ
جس سے تنویر مرے سینۂ غمناک میں ہے
ٹمٹماتا ہے اس اندیشے میں شاید کہ سحر ہو جائے
اور کوئی لوٹ کے آ ہی نہ سکے،

مگر راہِ تمنا کی دلیل نہ بننے کی محض یہی ایک وجہ نہیں بلکہ اس تجزیہ کی ابتدا ہے جس کی تکمیل "کونسی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم" میں ہوتی ہے۔ اس نظم کا ایک حصہ ملاحظہ ہو:

مطلب آساں، حرف بے معنی
تبسم کے حسابی زاویے

متن کے سب حاشیے
جن سے میش خام کے نقشِ ریا بنتے رہے
اور آخر جسم میں بعدِ سپہر بھی نہ تھا
کونسی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم
نام کو جب اپنی غم گاہوں سے دزدانہ نکل آتے ہیں ہم
زندگی کو تنگنائے تازہ تر کی آرزو

جب دلوں کے درمیاں حائل تھے سنگین فاصلے
قربِ چشم و گوش سے ہم کونسی الجھن کو سلجھاتے رہے

یا زوالِ عمر کا دیو سبک پا روبرو
یا نا کے دست و پا کو وسعتوں کی آرزو
کونسی الجھن کو سلجھاتے ہیں ہم"

کتاب کے آخر میں کچھ غزلیں ہیں جن کے متعلق راشد کی اپنی رائے یہ ہے کہ "میں نے غزلیں بہت کم کہی ہیں۔ غزل کی صناعی آزاد نظم کی صناعی سے مختلف ہے اور جہاں تک میں جانتا ہوں میں نے اسے اپنے لئے کبھی موزوں ذریعۂ اظہار نہیں پایا۔ جب بھی غزل کہی ہے بیشتر تقلیداً کہی ہے اور اس میں نسبتاً روایتی انداز بیان غالب رہا ہے" اس میں صرف اتنا اضافہ مجھے کرنا ہے کہ ان غزلوں کے کئی اشعار میں بھی راشد کی شخصیت جھلکتی ہے ٭

اردو زبان کی توسیع : بقیہ صفحہ ۱۴

جس اختراع و تصرف کے ساتھ کچھ دنوں سے اردو کے اوپر ہاتھ ڈالا جارہا ہے وہ سخت قابلِ اعتراض ہے اور یہ ہرگز گوارا نہیں کیا جاسکتا کہ جس زبان کو صدیوں کی کوششوں کے بعد ہم نے اس مقام پر پہنچایا ہے اسے بعض اہلِ غرض محض تفریحِ طبع کے لئے مختلف تخریبی تجاویز کا نشانہ بنائیں۔ ملک میں سیاسی اختلافات ہوتے ہی رہیں گے۔ یہ اختلافات قوموں کی زندگی اور ترقی کے ضامن ہیں۔ لیکن زبان کا مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اسے "کانا اور بے دوڑی" کا مصداق بنایا جائے۔ کیا اس سے انکار کیا جاسکتا ہے کہ علاقائی زبانوں کے دوش بدوش اردو تمام پاکستانی صوبوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے! یہ کہاں تک مناسب ہے کہ ہم بعض بے بنیاد وجوہ کی بنا پر اپنے تمام ادبی اثاثہ سے دست بردار ہو جائیں اور سب کچھ کھو دینے کے بعد اردو کو "پاکستانی" بھی کہیں؛ رہا علاقائی زبانوں سے الفاظ کا استعارہ تو اس سلسلہ میں بابائے اردو کے اس ارشاد کی طرف توجہ دلانا بے جا نہ ہوگا:

"زبان کسی کی ایجاد ہوتی ہے اور نہ اسے کوئی ایجاد کرسکتا ہے۔ جس اصول پر بیج سے کونپل پھوٹتی، پتے نکلتے، شاخیں پھیلتی، پھل پھول لگتے ہیں اور ایک دن وہی ننھا سا پودا ایک تناور درخت ہو جاتا ہے، اسی اصول کے مطابق زبان پیدا ہوتی، بڑھتی اور پھیلتی پھولتی ہے۔ اردو اس زمانہ کی یادگار ہے جب مسلمان فاتح ہندوستان میں داخل ہوئے اور اہل ہند سے ان کا میل جول بڑھتا گیا۔ اس وقت ملک کی زبان میں خفیف سا تغیر پیدا ہوتا چلا جس نے آخر ایک نئی صورت اختیار کی جس کا ان میں سے کسی کو سان گمان بھی نہ تھا"

پورب پچھم اتر دکن :- بقیہ صفحہ ۲۴

بچوں نے اپنے سانس روک لئے!
اور پھر کہیں سے تیتروں کے ایک دوسرے کو پکارنے کی آوازیں سنائی دیں،
"سبحان تیری قدرت!" ایک بڈھے نے کہا
"یہ سب تمہارا ہے —" یہ چودھری کے بیٹے کی آواز تھی۔
"پورب پچھم، اتر دکن!"
بچوں کو یوں محسوس ہوا جیسے سحر ٹوٹ پڑا تھا ٭

تصحیح: اپریل ۱۹۵۸ء کے شمارہ میں سرورق پر علامہ اقبالؒ کے مزار کا جو رنگین عکس شائع ہوا ہے اس پر سہواً عکاس کا نام احسان ملک شائع ہو گیا ہے جبکہ ضیاء الحسن موسوی صاحب کا تیار کردہ ہے۔ قارئین تصحیح فرمالیں۔ (ادارہ)

"ماہ نو" کی اشاعت مارچ ۱۹۵۸ء میں صفحات ۴۹، ۵۰ پر جو دو کارٹون بعنوان "مغربی پاکستان کے عوامی رقص" چھپے ہیں وہ ریحان صاحب کارٹونسٹ کے بنائے ہوئے ہیں۔ قارئین نوٹ فرمالیں۔ (ادارہ)
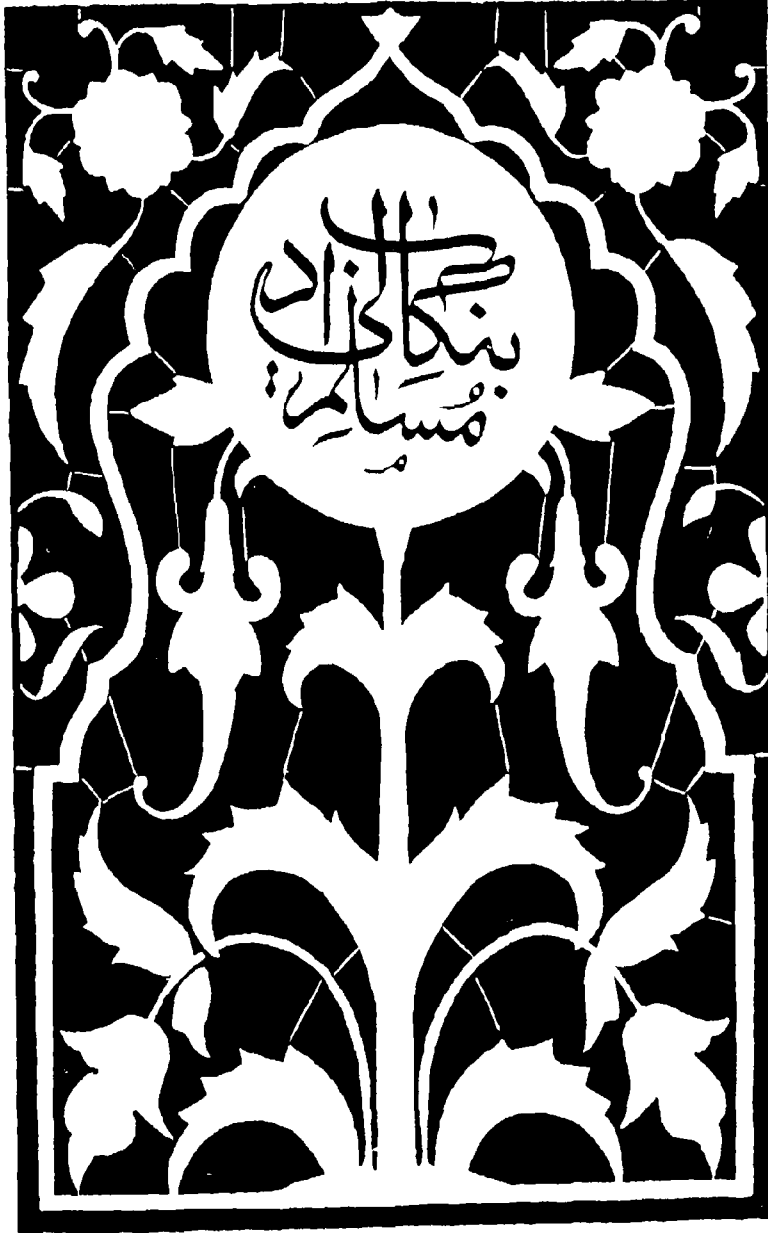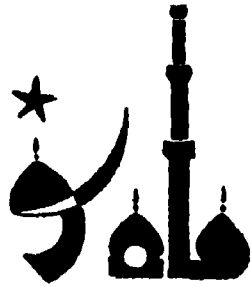
ابن انشاء　تابش دہلوی　جمیل الدین عالی　شان الحق حقی

جولائی ۱۹۵۸

۸/-

ماہ نو

جلد ۱۱ شمارہ ۴

جولائی ۱۹۵۸ء

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

★

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی ۸ آنے

★

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

پچھلے دنوں پاکستان بھر میں اشاعت پذیر اخباروں اور رسالوں کے متعلق اعداد و شمار شائع ہوئے ہیں۔ ان سے بعض اہم حقائق آشکار ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ اردو میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد کی تعداد اور سب زبانوں سے زیادہ ہے۔ اس کی یہ فوقیت ہمہ گیر ہے۔ کیونکہ اس کے رسائل و جرائد میں روزنامے، ماہنامے، سہ ماہی، ہفتہ وار صحافتی مطبوعات شامل ہیں۔ جہاں تک مغربی پاکستان کا تعلق ہے یہاں صحافت پہلے ہی کافی عروج پر تھی اور اس نے اپنا یہ امتیاز برقرار رکھا ہے۔ وفاقی پایۂ تخت کراچی میں صحافت نے اس تیزی سے ترقی کے مراحل طے کئے ہیں کہ یہ ادب و صحافت کے اہم مرکزوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ اور وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ اس کی رفتارِ ترقی اور بھی تیز ہو جائے گی۔ اگر موجودہ حالات کا موازنہ ان حالات سے کیا جائے جب پاکستان وجود میں آیا تھا تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہاں کی تمام زبانوں اور علاقوں میں صحافت نے فی الحقیقت غیر معمولی ترقی کی ہے جس سے اس کا مستقبل اور بھی تابناک نظر آتا ہے۔

★

ہمارا دور سائنس کی بعض حیرت انگیز دریافتوں کا دور ہے اور اس پس منظر میں ایک بار پھر زندگی اور ادب و فن کے بنیادی مسئلے زیرِ بحث آ رہے ہیں۔ چنانچہ بعض حلقوں میں ان کے متعلق بحث دوبارہ شروع ہو چکی ہے اور شعر و ادب کی افادیت کے بارہ میں شکوک ظاہر کئے گئے ہیں۔ ایسے میں ایک بار پھر موضوع کے موافق و مخالف پہلوؤں کا محتاط جائزہ لازم ہے۔ اس شمارہ کے ایک مضمون میں اسی موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان میں توضیح کا مسئلہ بھی توجہ طلب ہے اور ہمیں توقع ہے کہ یہ بحث اور بھی آگے بڑھے گی اور اپنے جلو میں اہم انکشافات لائے گی۔

ادب و زبان کے علاوہ فنونِ لطیفہ کا بھی نئے سرے سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ زیرِ نظر شمارہ میں ہماری موسیقی کے بعض مسائل پر تنقیدی تمہید اٹھائی گئی ہے جو امید ہے باشعور طبقوں کو فکر و نظر کی تحریک دلائے گی۔

★

دورِ جدید میں کتنی ہی نئی تحریکیں، شخصیتیں، ادبی اصناف اور مظاہر بروئے کار آئے ہیں جن سے روشناسی ہماری ذہنی تربیت کا لازمی جزو ہے۔ ہم ان موضوعات پر ایک سلسلہ مضامین کا اہتمام کر رہے ہیں جس کی پہلی کڑی اس شمارہ میں نظر آئے گی۔ یعنی منظوم ڈراما کا تاریخی و ناقدانہ جائزہ۔ ارادہ ہے کہ پورا سلسلہ ادب کی تمام اہم اصناف کو محیط ہو۔

★

آخر میں ایک نظر کھیلوں پر۔ اب کی تیسری کل ایشیائی کھیلوں میں ہمارے کھلاڑیوں نے جو امتیاز حاصل کیا ہے، خصوصاً ہاکی کے کھیل میں، وہ ہم سب کے لئے باعثِ فخر ہے۔ ان مظاہروں نے قوم کی مضمر صلاحیتوں کو نمایاں کر کے زندگی کے تفریحی شعبے میں بھی ہمارا عالمی وقار بلند کر دیا ہے۔

★

اگلا مہینہ قومی آزادی کی یادوں سے وابستہ ہے۔ اسلئے ہماری کوشش ہو گی کہ ماہِ نو کا اگلا شمارہ حتی الامکان ان یادوں کی عکاسی کرے۔

سرورق: — گلگت ⋆ عکس: — اے۔ بی۔ نذیر

ادب کا مستقبل

سلیم احمد

مصنوعی سیاروں کے آسمانی فضاؤں میں پرواز کرتے ہی ہمارے حلقہ ہائے فکر میں بھی ایک عجیب مصنوعی پادر ہوا کاوش کا آغاز ہو گیا ہے ۔۔۔۔۔۔ اگر دیا کافران اصنام خیالی نے مجھے' چنانچہ یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا یہ نئی دنیا جو سائنس کے نو بنو انکشافات اور معاشیات و سیاست کے جدید نظریات سے مل کر تعمیر ہو رہی ہے، ادب کی اسی طرح والد و شیدا رہے گی جیسے آج سے نصف صدی قبل تھی۔ یا یوں سمجھئے کہ اس دنیا کی تشکیل و تعمیر میں ادب کا اتنا ہی اہم حصہ ہو گا جتنا پہلے ہوا کرتا تھا؛ اس انداز سوال ہی سے ظاہر ہے کہ اب تہذیب کا مظہر ادب نہیں، سائنس ہے۔ اب اس کا کردار کچھ تفریحی اور کچھ دوسرے علوم کی منہاجت رہ گیا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ ہماری محدود جذباتی زندگی کو تسکین دے سکتا ہے۔ کم از کم فی الحال تو اس سے زیادہ کے لئے معذور نظر آتا ہے۔

کیا یہ تمام اندیشے درست ہیں؟ اس کا جواب کسی زبان کا ادب بھی مہیا کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر اپنے ہی ادب کو لے لیجئے۔ امیر خسرو اردو کا پہلا شاعر مانا جاتا ہے۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب برعظیم میں ایک نئی قوم، نئی تہذیب، نئی زندگی کا خمیر گوندھا جا رہا تھا۔ کئی بڑی بڑی سیاسی، معاشی اور تہذیبی [illegible] ایک دوسرے سے متصادم تھیں۔ مسلمان ملک میں نئے نئے آئے تھے اور اپنے ساتھ ایک نیا طرز فکر و احساس اور نیا طرز زندگی لائے تھے۔ دوسری [illegible] اپنی بکھری ہوئی قوتوں کو سمیٹ رہا تھا۔ اور ان دونوں کے تصادم میں ایک نئی رنگا رنگ اور ہمہ گیر زندگی کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ اس وقت ادب [illegible] تشکیل و تعمیر میں کیا حصہ لیا؛ امیر خسرو کے یہاں کچھ ایک آدھ غزل ہے، کچھ پہیلیاں ہیں، دو سخنے ہیں، کچھ ٹھمریاں ہیں۔ یہ ہے زندگی کی تشکیل و تعمیر میں ادب کا حصہ۔

سلطنت مغلیہ کے زوال کی ابتدا ہے۔ اورنگ زیب اپنی طوفانی قوتوں کے ساتھ اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کر رہا ہے جو سکھوں، مرہٹوں، ایرانیوں، ترکوں، شمالی و جنوبی ہند کے صوبوں اور ریاستوں کی باہمی آویزش کی صورت میں امڈ رہا ہے۔ اس وقت جعفر زٹلی کی شاعری ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس وقت جب ایک طرف عالمگیر کی شمشیر خارا شگاف ہے، مرہٹوں کا نیا نظم و نسق، نیا طرز جنگ اور ولولۂ انقلاب ہے اور سکھوں کا نیا مذہب ہے جس سے وہ ایک نئی قوم بننے کے لئے کوشاں ہیں۔ ان سب کے مقابلہ پر ادب کی حیثیت یہ تھی

اور آگے چلئے۔ انگریزوں کے قدم ملک میں جم چکے ہیں۔ بنگال میں پلاسی اور بکسر جیسی فیصلہ کن جنگیں لڑی جا چکی ہیں۔ دکن میں حیدر علی اور سلطان شہید ملک کی سیاسی، معاشی اور تہذیبی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے آخری جد و جہد کر چکے ہیں۔ اتنے بڑے انقلاب کے مقابلہ پر ہمارا ادب ہے ۔۔۔ "الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا"۔ آپ کہیں گے میر، سودا اور درد کی شاعری کی ایک سیاسی تاویل بھی ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے میر کی یہ غزل اجتماعی شکست و ریخت ہی کا مرثیہ ہو۔ ممکن ہے یہ درست ہو مگر سوال تو زندگی کی "تشکیل و تعمیر" کا ہے۔ اگر مبالغہ آمیزی اور جذباتیت سے کام نہ لیا جائے تو بھی یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ مصحفی و انشا کے معرکے، ناسخ و آتش کی چشمکیں، ذوق و غالب کی رقابت سب کچھ اس دور میں ہوا جب ادب سے کئی بڑی قوتیں زندگی کی تشکیل و تعمیر کر رہی تھیں۔ غالب کے خطوط، حالی کا مرثیۂ دہلی اور داغ کا "شہر آشوب" [illegible] عہد کی ایک جھلک پیش کر دیں یہ اور بات ہے مگر بڑی زیادتی ہو گی اگر اسے تعمیر یا تشکیل کے خوش نما الفاظ سے تعبیر کیا جائے۔

ہمارے اہل فکر نئی دنیا کی تعمیر میں شاعری کی حد تک تو بالکل مایوس ہیں۔ لیکن نثر سے ان کی کچھ توقعات وابستہ ہیں۔ کیونکہ اس میں منطقی مزاج کے اعتبار سے سنجیدگی پائی جاتی ہے اور سنجیدہ چیزوں کو سمیٹنے کی اہلیت۔ اس پہلو سے بھی مذکورہ بالا ادوار میں کوئی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دیتی۔ "دہ مجلس" "نو طرز مرصع" "باغ و بہار" "آرائش محفل" "طوطا کہانی" "رانی کیتکی کی کہانی" یہ ہیں اس عہد کی اختراعات فائقہ۔ اور جب انگریزوں کی فتوحات اودھ کی سرحدیں چھونے

تھیں اس وقت فسانۂ عجائب تھی۔ اس سے قطع نظر کم از کم سرشار نے تو باقاعدہ قدیم وجدید کے تصادم کی عکاسی کی ہے۔ اور قدیم کے مقابلہ پر جدید کی حمایت میں قلم اٹھایا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ "اودھ اخبار" کا ذکر کریں گے۔ ادھر سرسید احمد خاں، منشی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد خاں بھی ہیں۔ مگر کیا ان سب مشاہیرِ ادب کی ساری زندگی کا سرمایہ بھی (کیا الگ الگ اور کیا بحیثیت مجموعی) زندگی کی تعمیر و تشکیل میں اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ اسے انگریزوں کے لائے ہوئے مشینی نظام، ان کی صنعت و حرفت اور ان کے ہمہ گیر اثرات، ان کے نئے طرزِ حکومت اور نئی سیاست کے دور رس نتائج کے مقابلہ پر پیش کیا جا سکے؟ اگر ہم اس کا جواب اثبات میں دیں تو یہ ہماری خوش فہمی ہوگی۔ کیونکہ ہمارا موجودہ احساسِ شکست دراصل اسی خوش فہمی کا نتیجہ ہے۔ ہم نے ادب سے لامحدود توقعات وابستہ کیں اور ہر اس تصور کو ادب سے وابستہ کر دیا جس میں ہمیں تھوڑی بہت عظمت نظر آئی۔ اس کے دو نتیجے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہت سے لوگ ادب کی عظمت کے اس فرضی معیار کو سامنے رکھ کر ادب کی اہمیت سے قطعی طور پر منکر ہو گئے اور انہیں ماضی کا ادب صرف خرافات نظر آنے لگا، اور دوسرا ماضی کے ادب کے بارے میں ایک خوش فہمانہ تصور اور مستقبل کے ادب سے مایوسی۔ ادب کے بارے میں یہ دونوں نظریے زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ پہلے نظریہ کا نتیجہ آپ موجودہ ادب کی سطحیت، بے تہی، بے رنگی اور پستی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے نظریہ کو ذرا عام ہونے دیجئے، پھر دیکھئے گا کہ ادب کہاں جاتا ہے۔ سائنس کے نو بنو انکشافات اور معاشیات و سیاست کے جدید نظریات کی فتح کے احساس سے داب کھا کر ادیب جب قلم اٹھائے گا تو تخلیق کیا خاک کرے گا، تخلیق کا تو جذبہ ہی کمبخت ایسی چیز ہے کہ یا تو وہ اپنے آگے کسی کو گردانتا ہی نہیں اور اگر کبھی مار کھا جائے تو ساری زندگی کے لئے ناکارہ کر دیتا ہے۔ ادب کو زندہ رہنا ہے تو ادیب کو انتشار والا رویہ اختیار کرنا پڑے گا۔ ع

اک ملغل دبستاں ہے خلاؤں سے آگے

سائنس نے اگر زندگی کی تشکیل و تعمیر کے عظیم کام انجام دئے ہیں تو چشم ما روشن دل ما شاد۔ مگر ادب کا ان سے الگ ایک کام ہے اور اس کی عظمت منوانے کے لئے یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ ہم بہ تسمیہ کے الم غلم تصورات ادب سے وابستہ کر دیں بلکہ ہمیں اس کی عظمت کا سچا اور حقیقی احساس اس وقت ہو سکے گا جب ہم تمام انسانی اور تہذیبی عوامل میں ادب کے مقام کا تعین صحت کے ساتھ کر سکیں۔ افسوس ہے کہ پچھلے دو برس میں ادب کے متعلق خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں زیادہ پھیلائی گئی ہیں۔ اور اس سے بھی زیادہ بدقسمتی یہ کہ ادیب تنقید نگاروں کی انگلی پکڑ کر چلنے لگے۔ ادیبوں کا معاملہ تو بس کچھ نہ کچھ پیدا کرنے کا ہے۔ خواہ اس کے لئے انہیں کتنا ہی درد و کرب کیوں نہ سہنا پڑے۔

اب دوسرے مفروضے کی طرف آیئے کہ نصف صدی پہلے دنیا ادب کی دلدادہ و شیدا تھی۔ تمام ممالک کا دعویٰ ہے کہ ادبی کتابوں کی اشاعت اور پڑھنے والوں کی تعداد میں عہد قدیم کا کوئی دور اس زمانہ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ گذشتہ نصف صدی کے اندر اندر ہمارے ہاں پڑھنے والوں کی تعداد اور تناسب میں بہت بڑا اضافہ ہوا ہے، ظاہر ہے کہ ادب پڑھنے والوں کا تناسب بھی اسی حساب سے بڑھا ہوگا۔ اور یہ صرف قیاس ہی نہیں ان گنت ادبی رسالے اور ادب کی جملہ اصناف پر چھپنے والی بے شمار کتابیں تناسب کے اسی اضافہ کی شاہد ہیں۔

سائنس اور جدید نظریاتِ سیاست کے معتقد یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی جمالیاتی حس اب تعمیر کی طرف رجوع ہوگی۔ اس نے اسکائی اسکریپر زمیں دوز ریلوے، حسین پارک، بڑے بڑے بند اور شاندار سڑکیں بنانی شروع کر دیں۔ انسانی شعور کی ساری شعریت ایک نئی دنیا کی تعمیر و تشکیل میں منتقل ہو گئی۔ مگر کیا اربابِ فکر و نظر کی رائے میں یہ ترقی معکوس نہیں؟ سائنس اور اس کی ایجادات نے انسانی آلام کو گھٹانے کے بجائے کچھ اور بڑھا دیا ہے۔ ایٹم کی تعمیری قوت سے جو کام لیا جائے گا وہ تو ابھی مستقبل کی چیز ہے لیکن ایٹمی قوت کی تباہ کاری کا تجربہ ہم ابھی حال میں کر چکے ہیں۔ اور تجربہ کی تلخی خوش آئند خیالات سے رفع نہیں ہو سکتی۔

اب سے کچھ عرصہ پہلے اقبال نے جب "ڈھونڈھنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا، اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا" والی نظم کہی تھی۔ اس وقت زندگی کے ارتقا کے تمام مبلغوں نے ایک زبان ہو کر اس خیال کو رجعت پسندی کا مظہر قرار دیا تھا مگر کوئی ہے جو روزمرہ زندگی کے سنگین اور تلخ حقائق سے لے کر بڑے بڑے تاریخی واقعات تک کی صداقت کو جھٹلا سکے جو اس خیال کی تائید میں پیش کئے جا سکتے ہیں؟ پھر بھی جب ہم زندگی کے ارتقا کا نام لیتے ہیں تو روشن امکانات کی ایک کائنات چہرہ سے نقاب الٹ کر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ بے شک اگر آسمان پھاڑنے والے آدمی کو زمین پر بھی سیدھے سبھاؤ سے

چلنا آجائے تو اس دُنیا کے جنّت بن جانے میں کوئی شبہ نہیں۔ آج فطرت کی منہ زور قوتوں کی باگ ہمارے ہاتھوں میں ہے، زمین اپنے پوشیدہ خزانے اُگل رہی ہے اور تہ بہ تہ سمندروں اور پیچ در پیچ فضاؤں کے سربستہ راز ہمارے سامنے کھل رہے ہیں۔ ہم جب زندگی کو ترقی پذیر کہتے ہیں تو ان روشن امکانات کو سامنے رکھ کر۔ پھر ادب سے مایوسی کیوں؟ ممکن ہے ادب کا معیار پہلے سے گر گیا ہو، ممکن ہے ذہنی کاہلی اور سہل پسندی نے ادب کو سطحی بنا دیا ہو، لیکن سوال تو روشن امکانات کا ہے۔ طبعیات، حیاتیات، نفسیات، سیاسیات، معاشیات وغیرہ علوم سے لے کر روزمرہ زندگی کے ہمہ گیر تجربات تک ایک زبردست مواد کسی ایسے ادیب کے قلم کا منتظر ہے جو اس دور کو خارجی حقیقت سے داخلی حقیقت میں بدل دے، جو اس عہد کو اس کی حقیقی معنویت سے روشناس کرا دے اور پھر اس عہد کو اصولوں، کلیوں اور واقعات کو بے رنگ کھتونی کی صورت میں نہیں بلکہ جیتی جاگتی متحرک تصویروں میں منتقل کر کے عام انسانی شعور و ادراک کے حوالے کر دے تاکہ ہم اس کی مدد سے اپنے عہد کی انفرادیت کو سمجھ سکیں اور عہدِ قدیم کی پُر عظمت تہذیبوں اور تمدنوں کے مقابلہ میں رکھ کر اس کی اہمیت اور عظمت کو متعین کر سکیں۔

سائنس کے تجربات بجائے خود کوئی معنویت نہیں رکھتے۔ ان میں معنویت پیدا کرنے کے لئے سائنسداں کے معمل سے نکل کر زندگی کے معمل میں آنا پڑتا ہے۔ ایٹمی قوت کی دریافت اگر سائنس کا معجزہ ہے تو اس سے زبردست معجزہ وہ ہوگا جب انسان اس قوت کو انسانی فلاح و بہبود کے لئے استعمال کرنا سیکھ جائیگا۔ بات جب تک آلات تک رہتی ہے سائنس کی برتری کو تسلیم نہ کرنا جہالت ہے۔ لیکن گفتگو جب آلات سے گذر کر آلات کو استعمال کرنے والے انسانوں تک پہنچ جائے تو اس وقت سائنس صرف دور کی تماشائی ہے۔ سائنس نے ٹریکٹر اور زراعت کے جدید ترین آلات ایجاد کئے جن سے بنجر زمینوں کو ہرے بھرے کھیتوں میں بدل دیا گیا۔ غلّہ کی پیداوار تمام دنیا کی غذائی ضروریات کو نہ صرف پورا کرنے کے قابل ہو گئی بلکہ بڑھ گئی۔ سائنس نے طب اور جراحی میں وہ حیرت انگیز معجزات دکھلائے جن کے آگے "دمِ عیسیٰ" ایک قصّہ کہانی ہے۔ سائنس "قم باذن اللہ" کی جگہ "قم باذنی" کہہ کر مردوں کو جِلانے کے قابل ہو گئی اور ضروریاتِ زندگی کی ہزاروں چیزیں ہیں، لباس سے کفن تک، گھر کے برتن چولھے سے لے کر ہوائی جہاز کے انجن تک، جنہیں سائنس نے اس تعداد میں پیدا کیا کہ وہ انسان کے عام استعمال میں آئیں تو زمین پر جنّت کا نقشہ نظر آئے۔ اور اولادِ آدم کی تیرہ شبی چمکتے دمکتے دن میں بدل جائے۔ مگر کیا سائنس کی ان سب فتوحات کے باوجود دنیا کی تین چوتھائی مخلوق اسی طرح بھوکی اور ننگی نہیں ہے .... پھر سائنس کی فتوحات کا کیا حاصل؟!

زندگی کی تشکیل و تعمیر میں ادب نے اس طرح کبھی حصّہ نہیں لیا جس طرح سائنس کے نو بنو انکشافات اور معاشیات و سیاست کے جدید نظریات لیتے ہیں اگر ارباب فکر و نظر ادب سے یہی توقع رکھتے تھے اور اس نے یہ توقع پوری نہیں کی تو اس کا ماحصل ایک احساسِ شکست کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اس نظریہ کی تعمیر ہی میں اس کی خرابی کی صورت مضمر ہے۔ اس کا ماحصل ادب کے متعلق ایک غیر متوازن رویہ کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس کے معنی یہی ہیں کہ ادب کے سر پہ بو علی سینا کی پگڑی پہنائی جائے اور پھر قلم کی ایک جنبش سے ادب کی پگڑی اچھال دی جائے۔ تاکہ یہ نئی دنیا میں برہنہ پا اور برہنہ سر گلی کوچوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا پھرے۔ تاریخ کے کسی دور میں بھی ادب نے پگڑی پہننے سے کوئی شوق نہیں رکھا۔ ادب کو تو ازل سے اپنی برہنہ پائی اور برہنگی پر ہی فخر رہا ہے۔ اس نے کبھی دنیا کو بدلنے کا دعویٰ نہیں کیا، دنیا کو جنّت بنانے کے خواب نہیں دکھائے۔ وہ کبھی مسندِ درس پر نہیں بیٹھا، کبھی انسانیت کے نام نہاد، خود ساختہ خادموں کے روپ میں ہمارے سامنے نہیں آیا۔ ارباب سائنس، فلسفہ، ارباب معاشیات و سیاست سب سے الگ تھلگ، بھیڑ بھڑکے سے دور، شوقِ امارت اور دعویٔ قیادت سے نفور وہ اپنے گوشۂ تنہائی میں اپنے دل کی دھڑکنوں کو سنتا رہا کیونکہ اس کا دل کائنات کے دل کی دھڑکنوں سے ہم آہنگ تھا۔ اس نے معمل میں بیٹھ کر اجرامِ فلکی کا مشاہدہ نہیں کیا، لیکن انسان خود کتنی بڑی کائنات ہے اس کا حقیقی زندہ اور جیتا جاگتا شعور ادب اور ادیبوں کو رہا ہے، اور کون ہے جو اس کا دعویٰ کر سکے؟ ادب کو مستقبل میں بھی یہی کام انجام دینا ہے۔ اسے قیادت اور رہنمائی کی دستار پہننا ضروری نہیں، وہ برہنہ پا اور برہنہ سر بھی کر یہ انجام دے سکتا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ انسان نے جب تک آگہی حاصل نہیں کی تھی۔ اس وقت تک ادب انسان کو آگاہی کا دھوکا سا دیتا رہا اور اس دھوکے میں آ کر لوگ ادب کی باتیں کان دھر کر سنتے رہے لیکن طبعیات، حیاتیات، نفسیات، معاشیات اور سیاسیات وغیرہ علوم کی تحقیق سے جب زندگی کے رازہائے سربستہ کھل گئے تو ادب کا طریقۂ کار بڑی حد تک غیر مؤثر اور بچکانہ معلوم ہونے لگا۔ بالفاظ دیگر زندگی کی تشریح، تفسیر، تعبیر، ترجمانی، تنقید اور اس قسم کی جتنی چیزیں ادب کرتا آیا تھا اب دوسرے علوم و فنون یہی کام زیادہ باوثوق اور مکمل طور پر کرنے لگے ہیں۔ دنیا کو خوب صورت اور آرام دہ

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

ماہِ نو کراچی، جولائی ۱۹۵۸ء

مذاکرہ:

اُردو زبان کی توسیع

جمیل الدین عالی
ابن انشاء

جمیل الدین عالی:

ڈاکٹر باقر کی یہ تجویز کوئی نئی نہیں مگر بے حد اہم ضرور ہے کہ اردو پر عربی فارسی زبانوں کے دروازے پھر کھولے جائیں۔ ویسے یہ دروازے کچھ بند بھی نہیں ہیں۔ جہاں پچھلے پچاس ساٹھ برس میں اردو نے انگریزی الفاظ اور اصطلاحات قبول کیں وہیں عربی اور فارسی الفاظ کے مرکبات بناکر لاکھوں اصطلاحات بھی وضع کی گئیں۔ اب اگر ہم خود ہی انہیں استعمال نہ کریں اور انہیں دفتری طور پر بھی نہ برتا جائے تو اور بات ہے جیسا شان الحق صاحب نے بتایا ہے پاکستان میں بھی جناب ناصر حسین مرحوم نے بینک کاری کی اصطلاحات اور ضروری ترجموں کا انتظام کیا تھا۔ ۱۹۵۱ء میں حکومت پنجاب کے محکمہ مالیات میں احمد دین اظہر صاحب نے تو دفتری نوٹ وغیرہ بھی اردو میں شروع کرا دیئے تھے۔ عدالتوں میں آج بھی عام فہم اور کثیر الاستعمال اصطلاحات جاری ہیں۔

مگر اس رویّے میں سختی کرنا کوئی مفید بات نہیں۔ زبان تو ایک تغیر پذیر چیز ہے اور جیسے جیسے مختلف علاقائی اور غیر ملکی قوموں کا میل جول بڑھتا جاتا ہے زبان میں اسی تناسب سے وسعت پیدا ہونی لازمی ہے۔ یہ وسعت ابتدا میں ناگوار تبدیلی کی شکل میں پیدا ہوتی ہے جسے روایت پرست مزاج شک اور تحقیر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر کچھ عرصے میں اس تبدیلی کے صحت مند اور طاقتور عناصر ان رکاوٹوں کو توڑ کر سب پر چھا جاتے ہیں۔ اسی لئے میں باقر صاحب سے زیادہ جوش کے ساتھ اردو میں علاقائی زبانوں کی زیادہ سے زیادہ آمیزش کا حامی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم اردو میں بڑی بے تکلفی سے بادشاہو' اور سائیں' جیسے احترامیہ اور خطابیہ الفاظ استعمال کر سکتے ہیں جن کے نعم البدل پہلے ہی سے اردو میں موجود ہیں مگر جو یہاں کے مزاجوں کے لئے قابل قبول نہیں۔ اور ان الفاظ کو تو بالکل بے کھٹکے قبول کر لینا چاہئے جن کے مترادفات ہمارے پاس پہلے سے موجود نہیں جیسے 'لشکارا' جس کا ذکر باقر صاحب نے کیا ہے۔

رہا معاملہ تلفظ کا تو تلفظ قطعاً قومی مزاجوں کا پابند ہے اور گو اپنی ابتدا میں کتنا ہی جامد اور محکم ہو مگر اسے بھی تبدل پذیر ہونا پڑتا ہے۔ ڈاکٹر باقر کو اس امر پر اصرار ہے کہ باقر کو باقَر نہ کہا جائے۔ یہ تو انہوں نے ایک دو لفظ بتائے، اردو میں تو لاکھوں الفاظ کے تلفظات کچھ معنی ہی بدلے پڑے ہیں اور اس طرح مستعمل ہیں کہ ان کی اصلی صورت پہچانی نہیں جاتی۔ اس میں شک نہیں کہ یوں نراجیت پیدا ہو جانے کا امکان ہے کیونکہ اس طرح فصیح اور غیر فصیح اور درست و نادرست کی تمیز نہ رہے گی مگر اب تک یہ ہوا نہیں ہے کہ محبت کو محبت یا وقار کو وقار کہنے والے آدم کو آدِم، تقدیر کو تقدیر، عشق کو عشق کہنے لگے ہوں۔ تلفظات کی نادرستی کا جواب یہی ہے کہ بولنے والوں نے ایسا کیا اور یہ کہ بولنے والے اس قسم کے سوالات سے بہت بلند اور بڑی طاقت ہیں۔ (بولنے والوں سے میری مراد "اہل زبان" طبقہ نہیں جس پر باقر صاحب نے الزام دھرا ہے بلکہ سب ہی ہیں)

اس کے علاوہ اگر بات صحت کی ہو تو پھر مکمل صحت لازمی ہے۔ زیر زبر درست ادا کرنے سے کام نہیں چلے گا بلکہ اگر درست بولنا ہی ہو تو وہی لہجہ اور وہی مخارج بروئے کار آئیں جو ایک ایک حرف کے لئے بنائے گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو عربی سے شغف ہے، انہوں نے فن تجوید پر ضرور پڑھا ہوگا، وہ خود غور کریں کہ گذشتہ تیس برس میں دو چار بزرگوں سے قطع نظر انہوں نے کتنے پڑھے لکھے آدمیوں کو ع۔ ح۔ ص۔ ث۔ ط۔ کو طور پر ادا کرتے سنا ہے۔ میں کہ خود "اہل زبان" ہوں اور بڑے بڑے مستند دلّی اور لکھنو والوں کو دیکھ چکا ہوں میں اس بات کی شہادت

دیتا ہوں کہ سوائے چند طالبعلمان مکاتیب عربیہ کے میں نے کسی کو عربی کے صحیح مخارج اور درست اصوات کا پابند نہیں پایا۔ بات یہ ہے کہ ہم لوگ کئی ملی جلی نسلوں کی کڑی ہیں، ہمارے تمدنی اور جغرافیائی حالات ایران اور عرب سے قدرے مماثل ہوتے ہوئے بھی مختلف ہیں۔ ہم لوگ عام کو آم ہی بول سکتے ہیں ورنہ ہمارے گلے رندھ جائیں اور ہماری زبانوں میں ناسور پڑ جائیں۔ ہماری زبان میں ٹ ٹھ ڑ جیسے خطرناک حد تک ثقیل اور ٹھوس الفاظ ہیں اور ہم لوگ برہمن کو برہمنڑ بولنے والوں سے بہت دنوں متعلق رہے ہیں۔ بے چاری عربی تو گ اور پ جیسے حروف کی بھی متحمل نہیں ہو سکتی تھی اور یہ صرف آج کی بات ہے کہ وہاں جمال کو گمال کہنا شروع کیا ہے۔

چنانچہ میری رائے تو یہی ہے کہ اردو کی آرائش اور تزئین کی بجائے اس کی صحت و سلامتی کو زیادہ ملحوظِ خاطر رکھا جائے، زیادہ بناؤ سنگار اور گھونگھٹ بازی سے دلہن گھٹ جاتی ہے۔

ایک بات باقر صاحب نے بڑی بے خوفی سے کہی ہے اور وہ یہ کہ اردو کا نام بدل کر "پاکستانی" رکھ دیا جائے۔ سبب اس کا یہ بتاتے ہیں کہ اس ملک سے محبت کا اظہار یہی ہے کہ اس کی زبان کا نام ہی بدل دیا جائے۔ اس کا جواب جمیل نقوی صاحب نے تاریخی شواہد اور عالیہ مثالوں سے ضرور دیا ہے مگر ذرا تلخی سے۔ میں صرف یہ عرض کروں گا کہ ابھی بھارت میں ایک تحریک شد و مد سے چل رہی ہے جس کا مقصد اردو کو ایک علاقائی زبان تسلیم کرانا ہے۔ ہماری یہ تجویز دیکھ کر ان لوگوں کو بہت رنج ہوگا جو اس نام کو اب تک ایک نمائندہ بولی کا نام سمجھتے ہیں۔

ویسے یہ بات درست ہے کہ اردو کا لفظ کچھ ایسا پرانا نہیں۔ یہ لفظ ترکی ہے اور ترکی زبان کی تاریخ دو ڈھائی ہزار برس کی بھی نہیں۔ ادھر ہمارے ہاں یہ لفظ اس زبان کے اسم معرفہ کے طور پر صرف تین سو برس سے استعمال ہو رہا ہے۔ چنانچہ اگر زبانوں کے نام قبول کرنے میں ناموں کی قدامت ملحوظ خاطر رکھی جاتی ہے تو یقیناً یہ نام پرانا نہیں مگر اسی طرح بہت سی باتیں، بہت سے تصورات، بہت سے ادارے پرانے نہیں لیکن انہیں اس بنا پر بدل دینا یا ترک کر دینا زندہ قوموں میں بڑے بڑے ہنگامے کرا دیتا ہے۔ رہا یہ کہ اس کے معنی بھی زبان کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے تو یوں چلیں تو بہت سے اسمائے معرفہ معرضِ گفتگو میں آ جائیں گے۔ مجھے بڑی خوشی ہوتی اگر ڈاکٹر باقر اپنے عقیدے کی سچائی کے ساتھ ساتھ اس میں دل آزاری کے پہلو پر غور کرتے ہوئے اس سے گریز کرتے۔

ہمارا موضوع سیدھا سادا ہے۔ اردو زبان کی توسیع۔ اس کے دو پہلو ہیں علمی گفتگو (جیسی کہ ڈاکٹر صاحب نے کی) اور عملی تجویزیں۔ گفتگو کی بات تو یہ ہے کہ یہ زبان اپنے حریفوں کے وار پچاس برس جھیلتی رہی اور اب بھی اپنے خلاف واضح اور جاری دشمنی کے باوجود زندہ اور جوان ہے۔

پاکستان میں کہ پورا پنجاب سندھ اور سرحد کا علاقہ اردو بولتا اور پڑھتا ہے۔ اس کے زندہ رہنے اور ترقی پذیر ہونے میں کس بات کا خوف ہے؟ دو چار "اہل زبان" لوگ جو محاورے وغیرہ کے تعصبات لے کر آدھمکے ہیں، مر کھپ جائیں گے بلکہ خود یہ زبان انہیں کھا جائے گی! پھر میدان صاف ہے۔ اس میں ہمارے آپ کے لئے کچھ تردد فکر یا کوشش کی بات نہیں ہے۔ یہ زبان عوام کی ہے اور عوام کی طاقت بے پناہ ہے۔ اس پر جو زبان حملہ کرتی ہے اس میں مدغم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی مختلف النوع اور لاانتہا بحریں ہر مزاج کے شعری اظہار کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔ اس کے "ہر صوتی" حروف ہر لب و لہجے کو آسانیاں پہنچاتے ہیں، اس کی نحو کی آغوش بہت وسیع ہے۔ چنانچہ مجھے یقین ہے کہ بحیثیت عوامی زبان اردو وسیع وسیع تر ہوتی جا رہی ہے۔

ہاں، موضوع کا دوسرا پہلو عملی کوششوں کا محتاج ہے۔ اردو کو علمی اور کاروباری زبان بنانے کی گنجائشیں ابھی بہت ہیں۔ اور اس باب میں ایک لائحہ عمل بنانا پڑے گا۔ مثلاً تعلیمی اداروں کو علمی اصطلاحات وضع کرنی ہوں گی اور پرائیویٹ اداروں کو کاروباری معاملات میں اردو کو زیادہ سے زیادہ داخل کرنا ہوگا۔ اس قسم کے تجربے بہت ہو چکے ہیں اور کامیاب ہوئے ہیں۔ ابھی اسی "انگریزی زمانے" میں پوری حکومت عثمانیہ اردو میں ہی چلتی تھی اور ہندوستان کی ہزارہا عدالتیں اسی زبان میں کارروائی کرتی تھیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے ادارے اور تعلیمی درسگاہیں خلوص اور محنت سے کام کریں تو اردو کے ایک مکمل ترین زبان بننے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو اور اصل میں یہی کام ہے جس کی طرف متعلقہ حضرات کی توجہ دلانی ہے عوام اپنا کام خود کر لیں گے۔

ابنِ انشاء:

ہمارے محترم ڈاکٹر محمد باقر صاحب نے اردو کی توسیع کی بحث تو اچھی چھیڑی لیکن اس کا مالہ و ماعلیہ کچھ اس طرح مرتب کیا ہے کہ اردو ادب کا طالب علم الجھن میں پڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ "اردو کا تار و پود فارسی اور عربی سے بنا ہے"۔ تار و پود سے ڈاکٹر صاحب کا مطلب معلوم نہیں کیا ہے۔ اصل چیز کسی زبان کی نحوی اساس ہوتی ہے یعنی افعال و ضمائر اور ان کی تصریف کے قاعدے، حروف جار، حروف عطف اور حروف ربط وغیرہ۔ اردو کی نحوی اساس کھڑی بولی ہے۔ آپ بہ تکلف ہی سہی، اردو کے صفحے کے صفحے ایسے لکھ سکتے ہیں کہ عربی اور فارسی کے بل پر ایک سطر بھی ایسی نہ لکھ سکیں گے جسے اردو کہا جا سکے۔ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ عرض کیا ہے اور جوہر کیا۔ اردو میں عربی اور فارسی لفظیات کا تناسب کچھ بھی ہو، اسے ہم تار و پود نہیں کہہ سکتے۔ پھر اس تناسب میں بھی ہندی الاصل الفاظ کا پلہ بمقابلہ عربی اور فارسی لغات کے ہمیشہ بھاری رہتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اردو زبان میں سادگی پسندی کے رجحان کو انگریزوں کی سازش قرار دیا ہے اور بڑی خوفناک قسم کی سازش۔ یہ نظریہ دلچسپ اور سنسنی خیز ہے لیکن ثبوت کی محتاج ہے۔ بات کہنے کا سیدھا اور صاف پیرایہ نئے جمہوری اور سائنسی دور کے لوازم میں سے ہے۔ جب زبان سرکاروں دربار وں، قصوں اور داستانوں کے دور سے نکل کر سائنسی علوم کی ترجمان اور عوام میں ابلاغ کا ذریعہ بنتی ہے تو اسے سلاست اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اردو کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ غالبؔ کی تقریظوں کی زبان دیکھیے اور خطوط کو دیکھیے۔ "آثار الصنادید" کا پہلا ایڈیشن دیکھیے اور دوسرا دیکھیے۔ جب تک اخبار نکلنے بھی شروع ہو گئے تھے اور مسلمانوں کو احساس ہونے لگا تھا کہ انہیں اب حکمرانی اور برگزیدگی کے چکر سے نکل کر نئی تعلیم حاصل کرنا ہے اور کھلے میدان میں دوسروں سے مقابلہ کرنا ہے ورنہ پھسڈی رہ جائیں گے اور من حیث القوم خاکستی اور سفلہ گیری کی نوبت کو پہنچ جائیں گے۔ یہ تاریخی محرکات تھے اور اچھا ہوا کہ مسلمانوں کو اس کا احساس ہو گیا۔ اس سے انہی کی بجائی کی صورت نکلی۔ انگریزوں کی سازش کا یہاں کیا سوال ہے۔ جو لوگ عربی اور فارسی کے تکلفات بارد کے اسیر رہے ان سے نقصان البتہ ہوا۔ تفصیل یاد نہیں لیکن بہار کے کسی مولوی صاحب نے اپنی مولویانہ اردو میں سپاسنامہ پیش کر کے صوبجات متحدہ کے ایک انگریز لفٹیننٹ گورنر کو اردو سے ایسا برگشتہ کیا کہ وہ اسے سراسر مصنوعی زبان سمجھنے لگا اور اس کی بیخ کنی پر کمربستہ ہو گیا۔ ان صاحب بہادر کی جہالت تو ظاہر ہے لیکن مولوی عبدالحق جنہوں نے یہ قصہ اپنے بعض خطبات اور مضامین میں لکھا ہے، ان مولوی صاحب اور ان کے سپاسنامے کو غیر اردو کی شامت اعمال قرار دیتے ہیں۔

اس سلاست کے رجحان کے باوجود، جو تاریخی عوامل کی روشنی میں ناگزیر ٹھہرتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے "عربی فارسی سے بالکل قطع تعلق کر لیا ہو۔ جدید اصطلاحات علمیہ کا نوے پچانوے فیصدی حصہ انہی دونوں زبانوں سے مستعار رہے۔ دو چار شاعروں اور نثر نگاروں کو چھوڑ کر کسی کے ہاں ہندی کی طرف عود کرنے کا رجحان نہیں ملتا۔ ابوالکلام، ظفر علی خاں اور اقبالؔ اسی دور میں ہوئے ہیں بلکہ عربی اور فارسی الفاظ کی گرانباری اکثر وجہ شکایت بنتی رہی ہے۔ ڈاکٹر صاحب جو فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے ذہنی طور پر یہ خاموش اور خطرناک تحریک قبول کر لی کہ اردو میں انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کے کلمات تو داخل ہوتے رہیں لیکن عربی فارسی پر اس کا دروازہ بند ہو جائے" یہ بھی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اردو میں انگریزی اور یورپی دخیل کلمات آخر کتنے ہیں؟ بلکہ سرسید حالیؔ اور آزادؔ نے جو انگریزی مصطلحات خواہ مخواہ اختیار کر لی تھیں پچھلے پچاس سال میں ان کے بھی عربی اور فارسی بدل اختیار کر لئے گئے اور اب انگریزی الفاظ جوں کے توں لینے کا رجحان نہیں ملتا۔ جو چند یا چند در چند الفاظ آئے ہیں وہ بہرحال ناگزیر تھے۔ ایرانی اور عربی قوموں سے ہمارا واسطہ مدت سے ختم ہو گیا تھا۔ ان کی زبانوں میں نئے مقتضیات کے تحت جو رد و بدل ہوا تھا اس سے ہم کیسے باخبر رہ سکتے تھے؟ ترکوں اور پرتگالیوں سے تعلق تھا تو ان کے الفاظ بھی اردو میں آتے رہے۔ اب ڈیڑھ دو صدی سے ایک بھی نہیں آیا۔ ایرانیوں اور عربوں سے قطع تعلق کیا تو ان کی جدید زبانوں خصوصاً فارسی پر انگریزی اور

فرانسیسی الفاظ کا استعمال غیر ضروری اور ناگوار حد تک نظر آتا ہے۔ او خویشتن گم است کرا رہبری کند۔ انگریزی کی جن اصطلاحات کے ہمارے ہاں فارسی ترجمے رائج ہیں، ایرانیوں کے ہاں وہ بجنسہٖ یا معرّب صورت میں ملتی ہیں۔ ایران والے تلغراف کہتے ہیں ہم تار برقی۔ اگر ہم ان سے چند الفاظ لے سکتے ہیں تو وہ بھی ہم سے لے سکتے ہیں۔ نئی عربی یا نئی فارسی کو کوئی تقدس کا مرتبہ حاصل نہیں۔ اردو والوں کو اپنی زبان کا مزاج دیکھنا پڑے گا جس میں انگریزی کے بعض کلمات نسبتاً زیادہ آسانی سے کھپ سکتے ہیں۔ یہ قدرتی عمل جاری رہے گا۔

اسی مسئلے کو ڈاکٹر محمد باقر جو اس طور پر محسوس کرتے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فارسی کے استاد ہیں اور جدید فارسی سے کام نہیں بہرہ بھی ہے اور شغف بھی۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ جدید فارسی اور جدید عربی کی تعلیم کا ہمارے ہاں معقول انتظام ہونا چاہیئے۔ ان دونوں کو ہمارے نصاب میں لازمی کی حد تک بہتر جگہ ملنی چاہیئے۔ یہ ہو جائے تو ان زبانوں سے استفادے کی راہیں بھی خود بخود کھل جائیں گی۔ جب تک یہ نہیں ہوتا تب تک ڈاکٹر صاحب کے مخاطب محض واضعین اصطلاحات رہ جاتے ہیں۔ وہ بھی چند یا چند سو الفاظ لے لیں گے۔ زبان کے دھارے کا رخ نہیں بدل سکیں گے۔ اس کی ہیئت ترکیبی اور مزاج دیسی ہی رہے گا اور دیسی سے مطلب ہے اس سرزمین کا یعنی ہندی الاصل۔ ڈاکٹر صاحب کا موقف ہے کہ اردو میں فارسی اور عربی سے جو الفاظ مستعار لئے گئے ہیں ان کا تلفظ وہی رکھنا چاہیئے جو ان زبانوں میں ہے۔ وہ نہیں جو ہماری زبان میں رائج ہو گیا ہے۔" اسے وہ علم اور نفاستِ ذوق کا تقاضا بتاتے ہیں۔ اس خصوص میں سید انشا کا قول مشہور ہے اور بالاتفاق مسلّمات میں شمار ہوتا ہے کہ کسی لفظ کا اصل تلفظ کچھ بھی ہو، ہم اس کا وہی تلفظ کریں گے جو ہماری زبان میں رائج ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "یہ نقطۂ نظر نہ صرف غلط ہے بلکہ علمی لحاظ سے گمراہ کن ہے"۔ یہ ان کی ذاتی رائے ہے اور انہیں اپنا مؤید شاید ہی کوئی مل سکے۔ سید انشاء کا یہ اصول اردو کے لئے ہی نہیں، سب زبانوں کے لئے درست مانا گیا ہے جدید فارسی نے بھی یہی کیا اور جدید عربی نے بھی۔ افراتفری بے شک افراط تفریط سے ماخوذ ہے۔ اسی کی خرابی کہہ لیجئے۔ لیکن اب یہ اردو کا لفظ ہے۔ ایک اخبار میں آج یہ فقرہ نظر آیا کہ "پنڈال چھوٹتے ہی ہجوم میں افراط تفریط پھیل گئی"۔ کیا ڈاکٹر صاحب اس رجوع الی الاصل کو پسند کریں گے؟

اب رہا پاکستان کی مقامی بولیوں سے استفادے کا سوال۔ یہ اپنے طور پر ہوتا رہے گا۔ اسے تحریک بنانے کی ضرورت نہیں۔ آپ جب انگریزی کو خالص رکھے ہوئے ہیں اور اس میں غیر ضروری طور پر وہ الفاظ جن کے بدل انگریزی میں موجود ہیں، لانا مباح نہیں سمجھتے اور انگریزی کا روزمرہ اور محاورہ قائم رکھنے کو انسب سمجھتے ہیں تو اردو کے متعلق یہ اصول تسلیم کرنے میں کیا ہرج ہے۔ آپ گلابی انگریزی اور لالہ شاہی فارسی کا مذاق اڑاتے ہیں۔ کیا خود اردو کی یہ گت نہ ہو جائے گی؟ اسے حتی الوسع اپنے مرکزِ ثقل پر قائم رہنے دیجئے۔ یہ ہماری قومی یعنی بین الصوبائی زبان ہے۔ یہ قدرتی عمل کے طور پر مقامی اثرات اور لغتیات کو جذب کرے گی ورنہ پنجابی اردو، سندھی اردو، سرحدی اردو اور بنگالی اردو مختلف بولیاں ہو جائیں گی۔ کوئی معیاری اور مشترکہ زبان نہ رہے گی۔ زبان کا نام اردو سے بدل کر پاکستانی رکھنے کی علت بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ زبان ہندوستان کے مسلمانوں میں ضرور باقی رہے گی، اور ایسی تجویز لانے سے پیشتر تو ہمیں یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ ہم نے اردو کے فروغ کے لئے تعلیم و تدریس، نظم و نسق اور عام کاروباری و مجلسی ضروریات کے سلسلے میں کیا عملی کام کیا ہے۔ محض اسم بدلنا محبت کا ثبوت نہیں ہو سکتا۔ عمل کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں "اس کا نام ایسا ہونا چاہیئے جس سے اس کا تعلق اس ملک سے ظاہر ہو جہاں یہ بولی لکھی اور پڑھی جاتی ہے"۔ اس سے قطع نظر کہ تنہا پاکستان کو یہ شرف حاصل نہیں، عربی کی مثال دینا بے جا نہ ہو گا۔ مصری۔ شامی۔ لبنانی اور یمنی کوئی زبانیں نہیں؟ بس عربی ہے۔ اور پھر نام میں کیا دھرا ہے؟

منظوم ڈراما

شہاب رفعت

ڈراما نت نئی آوازوں کی صدائے بازگشت ہے۔ اور یہ آوازیں ہمارے یہاں پچھلی صدی کے وسط ہی سے بلند ہونا شروع ہوئی ہیں۔ دکھنی یا گوجری میں کوئی چھوٹا سا ڈرامائی پارہ دستیاب ہو جائے تو ہو جائے ورنہ اس صنف کا ہمارے ادب میں شروع ہی سے فقدان رہا ہے۔ سنسکرت اور ہندی کی روایت بالکل الگ ہے اور جہاں تک ڈرامہ کا تعلق ہے اس کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اُردو سے کوئی ربط نہیں رہا۔ جس کی بنا پر وثوق سے کہا جا سکے کہ ہمارے ڈرامائی ادب کے ابتدائی نقوش رہس یا رامائن مہابھارت وغیرہ کی نقلوں کے شرمندۂ احسان ہیں۔ اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ قیاس آرائی ہی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اور وہ کوئی ایسا معتبر یا محفوظ بہنا نہیں ہے۔ البتہ انگریزی تسلط کے قیام پر مغربی اثرات کے ماتحت جو فضا پیدا ہوئی اس کا زندگی، تہذیب، تمدن اور فکر و عمل کو متحرک کرنا لازم تھا۔ اور اس نے معاشرہ کے ساتھ ہی ساتھ دل و دماغ کو بھی کئی طرح اُکسایا اور زندگی و ادب کے نئے نئے مظاہر کو جنم دیا۔ اگر ہم اس دور میں ریختی، داستان گوئی، مرثیہ، واسوخت، نیچرل شاعری (جس کو نظیر اکبرآبادی نے فروغ دیا) خارجی طرز غزل گوئی، قصیدہ نگاری (جس میں خارجی طور وطریق اور رسم و رواج کی مصوری کی جاتی ہے) اور مرزا غالب کے انداز مکتوب نگاری کو اُبھرتے اور فروغ پاتے دیکھتے ہیں جس میں خارجیت کے ساتھ ساتھ ڈرامائی نیور بھی نمایاں ہیں تو یہ اسی تبدیلی کا نتیجہ ہو سکتا ہے جس نے وسیع پیمانہ پر نقل و حرکت اور میل جول کے امکانات پیدا کر کے زندگی، ابنائے جنس اور اوضاع و اطوار کے مشاہدہ و مطالعہ کے لئے میدان کھول دیا تھا۔ اور اس طرح وہ شدت و واقعیت پیدا کر دی تھی جو افسانہ اور ڈراما کا روپ دھارتی ہے، خصوصاً یوپی اور دہلی میں جہاں کی زندگی نت نئے ہنگاموں، تغیر و تبدل اور چہل پہل ہی سے عبارت ہے۔ دیکھئے انشا اور مصحفی کے معرکوں میں تو سوانگ تک نوبت پہنچ گئی۔ اور ہم زندگی کو ڈرامہ کا روپ ہی نہیں، لہجہ اور ترنگ بھی اختیار کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ شاید یہی روز بروز بڑھتے ہوئے رجحانات تھے جنھوں نے آخر کار امانت کی "اندر سبھا" میں ڈرامہ کا پورا پورا روپ دھار لیا۔ اور ایک باقاعدہ صنفِ ادب کی شکل اختیار کر لی۔ اُردو کے اولین ڈرامہ کی حیثیت سے "اندر سبھا" میں غیر معمولی دلچسپی لازم ہے اور اس کے متعلق اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اب اس کا مزید تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔ امانت نے اس کا تصور تمام تر ایک تفریحی کھیل کی حیثیت سے کیا تھا جس میں کلاسیکل شاعری اور موسیقی ہی کے حربے اور طور طریقے برتے گئے تھے تاکہ سامعین شعر و نغمہ کے دوگونہ کیف سے مسحور ہوں۔ آواز کو دُور دُور تک پہنچانے کے تقاضے نے دونوں کو میکانکی جھنکار کا راستہ دکھایا جس طرح تال سر بندھے ٹکے ہیں اسی طرح شاعری بھی ہے۔ اشعار میں پابند شاعری اپنے تمام کرے پن کے ساتھ براجمان ہے۔ تمام تر ادبِ بری کی وضع۔ لہٰذا اثرات بھی اوپری قسم کے ہیں۔ ڈرامہ نگار نے نہ کسی گمبھیرتا یا رچاؤ کا التزام کیا ہے اور نہ کوئی باریکیاں اور لطافتیں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈرامہ کا پلاٹ، اس کی ترتیب، اس کے کردار سب کے سب راگ رنگ کا بہانہ ہیں اور بس۔

یہ ڈرامہ جس طرح منظر عام پر آتے ہی چھا گیا اس نے نہ صرف اس اچھوتی مگر مقبول عام صنف شعر کے لئے ایک مستقل جگہ پیدا کر دی بلکہ خاص و عام میں اس کا شوق پیدا کر دیا اور ساتھ ہی وہ لگن بھی جو کسی چیز کو فروغ دینے کی ضامن ہے اور اس جیسی اور چیزیں پیدا کرنے کی ریس بھی پیدا کرتی ہے۔ چنانچہ "اندر سبھا" کے بعد مدت تک نظم و نثر کے جو ڈرامے وجود میں آتے رہے ان میں موسیقی ہی کا بول بالا ہے۔ اور ریڈیو اور سینما میں تو برابر اسی کا طوطی بولتا ہے! اور ان کی حد تک یہ میلان ایک مستقل روایت کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ "اندر سبھا" کے رنگ میں جو منظوم ڈرامے لکھے گئے ہوں گے وہ بڑی حد تک اسی کا چربہ ہوں گے۔ یا کچھ اِس سے کچھ تھوڑے بہت بدلے ہوئے مرقعے۔ ان میں سے بعض، بقول شخصے، فی الحقیقت "مرقعات" ہی کے نام سے موسوم ہیں

اور اسی فضا کی پیداوار ہیں۔ خود واجد علی شاہ نے اس وضع کا ایک ڈرامہ "پری خانہ" لکھا تھا۔ اس سلسلہ کا ٹیپ کا مصرع فدا علی خنجر کی "نیلم پری" بیان کیا جاتا ہے۔

یہ سلسلہ کافی دیر تک جاری رہا۔ گو اس کی بعض کڑیاں اتنی گمنام اور کمیاب ہیں کہ ان کی بہم رسی اور مطالعہ ——— تقدیر سے ہے اور اتفاقات سے ہے۔ ظاہر ہے کہ نظم میں ایسی کوششیں رفتہ رفتہ خود بخود ماند پڑتی گئی ہوں گی۔ یہاں تک کہ اوپرا کی اس مخصوص صورت کا چرچا بالکل محو ہو گیا۔ اب اگر منظوم ڈرامہ کی کوششیں جاری رہ سکتی تھیں تو کسی اور صورت میں یعنی جستہ جستہ کوششیں کی جائیں یا کوئی نیا سلسلہ یا تحریک جاری ہو۔ پہلی قسم کی کوششوں کا امکان زیادہ تھا۔ چنانچہ ہمیں ڈراما ایک نئی، انوکھی اور غیر متوقع شکل میں اُبھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہیں مولانا عبدالحلیم شرر کے متفرق ڈرامائی پارے۔ یہ مکمل ڈرامے نہیں ہیں۔ صرف چند افراد کے مکالمے یا گفتگوئیں ہیں جو نثر کی بجائے نظم میں ادا کی گئی ہیں۔ مصنف کی کوشش یہ تھی کہ وہ اردو میں "بلینک ورس" کی جھلک دکھائے جس کا ہمیں انگریزی زبان میں اس قدر چرچا سنائی دیتا ہے۔ اس کی بجائے وہ "فری ورس" ہی کی جھلک پیش کر سکے ہیں۔ اس صنف کی حد تک اُن کی کوشش کافی کامیاب بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ اس لئے کہ اس کی عبارت کافی منجھی ہوئی، صاف اور رواں ہے۔ مصرعے الگ الگ اور اکھڑے اکھڑے نہیں بلکہ کافی گھلے ملے اور رواں دواں ہیں۔ یہی اس صنف کی کامیابی کی شرطِ خاص ہے۔ عبارت میں وہی صفائی ہے جو شرر کی نثر میں ہے لیکن وہ بھرپور شعریت، وہ تموج جو نظمِ آزاد کا درجہ بلند تر کر دیتا ہے اس کا بڑی حد تک فقدان نظر آتا ہے۔ شرر کی نظم کی خاصیت بھی وہی ہے جو نثر کی ہے۔ مگر جو صفائی، روانی اور گھلاوٹ نثر کے لئے موزوں ہو ضروری نہیں کہ شاعری کے لئے بھی وجہ امتیاز ہو۔ شاعر اپنی نظم سے وہ تموّج نہیں پیدا کر سکا جو غالباً اس کا مقصود تھا۔ انگریزی "بلینک ورس" کا تصور۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شرر کا ڈرامائی انداز بھی اُن کے تاریخی ناولوں کے مماثل ہے۔ اُن کا نظمِ آزاد کا تصوّر کئی جدید شاعروں کی بہ نسبت، جنھوں نے اسی صنف کو خاص اہتمام سے فروغ دینے کی کوشش کی ہے، نظمِ آزاد کے حقیقی تصوّر سے زیادہ قریب ہے۔

ایک اور غیر متوقع کوشش نواب سرور الملک مرحوم نے کی ہے۔ انہوں نے اپنی تصنیف "کارنامۂ سروری" میں بیان کیا ہے کہ کس طرح ان کے ایک انگریز پروفیسر ہمیشہ شیکسپیئر کے ڈراموں اور بلینک ورس کا تذکرہ کرتے رہتے اور یہ دعویٰ کرتے کہ اُردو میں اس قبیل کی کوئی چیز موجود نہیں۔ نواب موصوف نے بزمانۂ طالب العلمی اس کی عملی تردید کے لئے ایک ڈرامہ لکھ ڈالا جس کے اشعار بے قافیہ تھے۔ یہ ڈرامہ حوادثِ روزگار میں ضائع ہو گیا اور مصنف نے اس کے تین درج ذیل مصرعے نمونتہً اپنی کتاب میں درج کر دیئے ہیں:-

کل ہم پانی بھرنے گئے تھے ، باغ میں ہم کو ترک ملا
وہ آگے بڑھے ہم پیچھے ہٹے ۔ کچھ اس نے کہا ہم چپکے رہے
جب سنّد نے مکہ گھونگھٹ کا رُخ ۔ ترک نے اپنے دل کو سنبھالا
روتا رہا وہ گھر کو پھرے ہم

اگر یہ سارا ڈرامہ موجود ہوتا تو بھی مصنف کی سعی و کاوش رائگاں ثابت ہوتی کیونکہ وہ سرے سے بلینک ورس کی نوعیت اور مقصود ہی کو نہیں سمجھ سکے۔ بلینک ورس یکساں وزن کی وہ نظم ہے جو بالعموم ڈراما، رزمیہ اور بیانیہ شاعری میں اس لئے برتی جاتی ہے کہ اس میں وقار کے ساتھ لچک بھی پیدا ہو خصوصاً ڈرامہ میں تقریر کی جا سکے کہ اس میں انتہائی شعریت کے ساتھ ساتھ نثر کا لوچ، بے تکلفی اور مناسب مقامات پر توقف بھی ہو اور عبارت و معنی مصرع بہ مصرع نہایت بے ساختگی سے ڈھلتے جائیں۔ وزن کی بجائے آہنگ کا احساس نمایاں ہو اور وہ جھنکار پیدا ہو جس سے ذہن تقریر یا واقعہ کی بجائے شاعری کی طرف متوجہ ہو جائے۔ اس کے لئے بحر کا باوقار اور لوچدار ہونا لازم ہے تاکہ اس میں ہر قسم کی آزادی برتی جا سکے۔ ظاہر ہے کہ جیسی مختصر بحر اوپر کے اشعار میں اختیار کی گئی ہے وہ کیسے ان مقاصد کو پورا کر سکتی ہے۔ ایسی بحر اور صنف کی دریافت آج بھی ایک مسئلہ ہے، جو بہت ہی غور و خوض، کد و کاوش اور تجربہ و تحقیق ہی سے حل ہو سکتا ہے۔

مولوی عظمت اللہ کا نام اُردو میں ایسی اجتہادی کوششوں سے وابستہ ہے جو بار آور نہیں ہو سکیں۔ کچھ اس لئے کہ پنگل کی مدد سے جو اپچ انہوں نے کی اس کی بنیاد دوسروں پر پوری طرح واضح نہیں ہو سکی۔ اور وہ معنی فی البطنِ شاعر ہو کر رہ گئی ہیں۔ ان کو پوری طرح اجاگر کرنے کے لئے ایسے

مرد نکتہ داں کی ضرورت ہے جو انہیں خود بھی سمجھ سکے اور دوسروں کو بھی سمجھا سکے۔ دوسرے ان میں شروع ہی سے ایک صورت خرابی کی مضمر تھی۔ انہوں نے بہتیری کوشش کی مگر انگریزی عروض کا پوری طرح درک نہ پیدا کر سکے اور نہ انہیں اردو میں داخل ہی کر سکے۔ نتیجۃً وہ اُردو کو انگریزی نظم کے چند نقوش ہی دے سکے مگر بہت درہم برہم۔ اور چند ڈرامائی پارے بھی جو کہیں کافی دلچسپ اور ندرت آمیز ہیں اور کہیں اچنبھے سے خالی نہیں۔ عظمت اللہ کی شاعری قدرت اور زندگی دونوں میں خالص واقعیت ہی سے ابھرتی ہے۔ اس لئے اس سے دھرتی کی سگندھ آتی ہے۔ وہ قدرت کے خارجی مظاہر دھوپ سایوں، سمندروں اور گھٹاؤں کے شاعر ہیں اور زندگی میں گھریلوپن کے رسیا۔ ان کی دلچسپی عورتوں اور مردوں کے ازلی و ابدی رشتوں سے ہے۔ اسی لئے وہ اکثر سیدھی سادی قسم کی ڈرامائی نظمیں لکھتے ہیں جن میں گفتگو عموماً عورت کی طرف سے ہوتی ہے مثلاً "مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا" "مرے حسن کے لئے کیوں مرے؟" ان کی عروضی پابندیوں کو ہم سمجھیں نہ سمجھیں لیکن ان میں کوئی بات، کوئی گُر ضرور ہے۔ جس کو پانا ہمارے عروض اور شاعری کا قدم آگے بڑھانے کے لئے ضروری ہے۔ عظمت اللہ نے براؤننگ کے بعض ڈرامائی مانولاگ بھی ترجمہ کئے ہیں۔ اچنبھے والی نظموں میں "مونچھ اور چوٹی" پہلا اور دوسرا دور ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

مونچھ: نہیں نہیں یہ کیا کہا مجھے
نہیں تمہاری چاہ جانِ من
یہ بات کاش ہو سکے تجھے
دکھا سکوں میں سینہ چیر تن

چوٹی: یہ ضد نہیں یہ دل کی ہے خوشی

مونچھ: کہاں ہیں ہوش! دیکھ ہوشیار
مرا نہ ہاتھ اٹھے

چوٹی: خدا کی مار
مجھے جو چھو سکے بھلا مجال
کس کی ہے؟—

مونچھ: مگر یہ ضد نہیں تو اور کیا؟

اس میں ایک اور دلچسپی کی بات یہ ہے کہ گفتگو مرتب شاعری میں ہے جس کا نقشہ ل ب ل ب ہے۔

آغا حشر نے زیادہ تر نثر ہی میں ڈرامے لکھے ہیں اور جس طرح اس نے اس صنف کی دھاک قائم کر دی، اسی سے منظوم ڈرامہ کے لئے خود بخود رستہ صاف ہو گیا۔ اس کے علاوہ آغا حشر نے نثر کی طرح نظم میں بھی ایک خاص انداز اختیار کیا جو آپ ہی آپ اس کی روایت بن گیا۔ اس کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔ اول، موسیقی کے نمونے پر بول جن میں آہنگ ہے، وزن کچھ ایسا واضح اور باقاعدہ نہیں۔ لے زیادہ تر سنسکرت اور ہندی آمیز ہے۔ دوم، مثنوی یا پابند نظم کی اور صورتوں میں مکالمے اور تقریریں اور سوم "اندر سبھا" کی طرح مختلف قسم کے بند جن میں بندش اور قافیہ کچھ ایسے چست نہیں ہوتے۔ مجموعی طور پر ایک عوامی اور میلوڈرامائی قسم کا کیف پایا جاتا ہے لیکن زیادہ بھرپور نہیں۔ ہمارے اسٹیج پر جو کلام بنتا جاتا ہے اس کی روایت آج بھی یہی ہے۔

اقبال ایک غنائی شاعر ہیں۔ پھر بھی ان کے یہاں کہیں کہیں مختصر مکالموں اور پاروں کی حد تک ڈرامائی عنصر پیدا ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں کوئی نکتہ ہی سلجھایا جاتا ہے اور زندگی یا کرداروں پر زور نہیں ہوتا۔ آوازیں دو یا زیادہ سے زیادہ تین چار ہی ہوتی ہیں۔ اور ان کی باہمی گفتگو سے ڈرامائی مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ شعری حیثیت سے یہ ڈرامائی پارے وہی اہمیت رکھتے ہیں جو اقبال کا دوسرا کلام۔ ان متفرق پاروں کا باقاعدہ منظوم ڈرامہ میں شمار زیادہ تر ہیئت کی بنا پر ہے۔ ڈرامائی نوعیت کی بنا پر نہیں۔

تقریباً اسی زمانہ میں جو قدما کا زمانہ تھا، نواب عابد نواز جنگ بہادر نے شیکسپیئر کے ڈرامہ "ہیملٹ" کا نظم عاری میں ترجمہ کیا اور اس میں اصل کی عبارت اور وزن سے قریب رہنے کی کوشش کی جس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ وہ اپنے تراجم میں نہ اصل کا آہنگ پیدا کر سکے نہ شعریت۔

ادھر جوش ملیح آبادی نے "حرفِ آخر" میں جس کے کچھ کچھ حصے شائع ہو چکے ہیں متفرق گیتوں سے مکالماتی اور ڈرامائی وضع پیدا کی۔

بہزاد لکھنوی نے پابند نظم میں ریڈیائی ڈرامے لکھے جن کی پرواز نغمہ بردار فضاؤں ہی تک محدود رہی۔ منور لکھنوی نے کالیداس کی "کمار سمبھو" کا پابند نظم میں ترجمہ کیا۔ سلام مچھلی شہری نے اسی سنسکرت ناٹک نویس کی "میگھ دوت" کو پابند نظم کا جامہ پہنایا۔ انہی نے انارکلی کی داستان کو بھی منظوم ڈرامہ کا بہروپ عطا کیا ہے۔ اور ایک اور ڈرامہ میں موسیقی کی پوری تاریخ کرداروں کے ذریعہ سے پیش کی۔ اسی طرح جعفر علی خاں اثر نے بھی

مشرقی پاکستان—ایک دلکش نظارہ

اردو کو بعض ڈراموں کے منظوم تراجم دیئے۔

اب تک سلسلہ کار بزرگوں ہی کے ہاتھ رہا تھا۔ اب شعر و ادب کو پروان چڑھانے کی کوششیں نئی پود کے ہاتھ آئیں اور اس نے دیگر اصناف کی طرف منظوم ڈرامہ میں بھی دلچسپی لینی شروع کی۔ کچھ اس لئے کہ یہ صنف شعری جولانیوں کے لئے ایک وسیع اور نہایت عمدہ میدان مہیا کرتی ہے۔ اور کچھ اس کی قدرتی دلکشی کے باعث کئی شاعروں نے اس سے گہری کشش محسوس کی۔ اور اپنے اپنے طور پر اس دلآویز خاکے میں رنگ بھرنے لگے۔ ان کی یہ کوشش ان کے ذوق اور اُپج ہی کے مطابق ثابت ہوئیں۔ در اصل یہ دور ہی نئے شعور، نئے احساس اور نئے تجربوں کا دور تھا جس میں مغربی ادبیات کی بڑھتی ہوئی لَو اور بھی جوت جگا رہی تھی۔ اکثر شعراء جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ مغربی ادبیات اور تخیلات ہی کے آغوش میں پروان چڑھے تھے۔ اس لئے انہیں مغربی ادب و فکریات سے زیادہ گہری واقفیت تھی۔ اس کے تمدنی و تہذیبی چشمہ ہائے فیض سے زیادہ مَس تھا۔ لہٰذا وہ زیادہ ذوق و شوق، وسعت نگاہ اور تبحرِ علمی کے ساتھ نئی کوششوں کا اہتمام کر سکتے تھے۔ چنانچہ منظوم ڈراما کو فروغ دینے والوں کی صف میں کتنے ہی شاعر شامل ہیں، کئی تازہ نوادر کئی مدتوں سے پرورشِ لوح و قلم کرنے والے۔ اسی لئے منظوم ڈراموں کے جدید تر مظاہر دلچسپ بھی ہیں اور متنوع بھی۔ ان میں پنج بابی، یک بابی، اوپرا، ڈرامائی خود کلامیاں، ملے جلے غنائی تمثیلی تراجم وغیرہ سبھی شامل ہیں اور ان سب میں وہ جدید وضع، لہجہ، ذوق، تکنیک اور تصور بھی نمایاں ہے۔ جو ادبیاتِ جدیدہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ پھر ان میں نئے نئے تجربوں کا قوس قزحی تلوّن بھی ہے چنانچہ یہ تاریخی، رومانوی، واقعاتی، نفسیاتی، رمزی، غنائی، عوامی، ریڈیائی ہر طرح کے ڈراموں پر مشتمل ہیں۔ اس طرح یہ بذاتِ خود جدید شاعری کی وسعت اور تنوع کا ایک اچھا خاصہ آئینہ ہیں جس سے اس کی بو قلمونی و وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ یکجائی تصور اس صنف کی مختلف اقسام اور اس کے نمونوں یعنی قوس قزح کے مختلف رنگوں اور تہوں سے اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اس ابتدائی دور میں جب شیکسپیئر، براؤننگ اور دیگر شعرائے مغرب کا اثر لاہور کی علمی و ادبی فضا میں چھایا ہوا تھا اور تمام جواں سال شعراء ڈاکٹر خالد، راشد، تاثیر، فیض، رفیق خاور وغیرہم تمام ایک ہی نشے سے سرشار تھے۔ نظم آزاد اور دیگر اقسام نظم میں تجربوں پر تجربے کر رہے تھے، منظوم ڈرامے کے لئے ایک خاص کشش پیدا ہوئی۔ چنانچہ راشد نے براؤننگ کے "ڈرامیٹک مانولاگ" پڑھ کر انہیں کالج ہی کے زمانہ سے اپنانا شروع کر دیا تھا۔ اور ان کا نام "ڈرامائی خود کلامیاں" رکھا تھا۔ یہ صنف خاصی مقبول ثابت ہوئی ہے اور کئی دوسرے شاعروں ـــ عبد المجید بھٹی، ساحر لدھیانوی، سلام مچھلی شہری وغیرہ نے بھی بطورِ خود اس کے اچھے خاصے نمونے پیش کئے ہیں۔ یہ باقاعدہ کھیل یا ناٹک نہیں ہوتا اور نہ اسٹیج پر پیش کیا جا سکتا ہے، پھر بھی یہ دل کے اسٹیج پر کھیلا جانے والا کھیل ضرور ہے۔ تقریباً اسی زمانہ میں احمد ندیم قاسمی نے "فرخندہ" کے عنوان سے ایک طویل ڈرامہ پابند نظم میں لکھا۔ "بلینک ورس" ہمارے یہاں ہر قسم کی نظم عاری کے لئے رائج ہے۔ انگریزی میں اس سے مراد وہ نظم عاری ہے جس کے تمام مصرعوں کا وزن یکساں ہو۔ یہ ایک نہایت ہی بنیادی بات ہے۔ اردو میں پہلی تصنیف گاندھی کی ایک منظوم سوانحِ عمری ہے (مطبوعہ ۱۹۳۳ء) جس میں اس کی بالارادہ کوشش کی گئی۔ اسی کے ایک پورے باب میں ڈرامائی پیرایہ اختیار کیا گیا ہے۔

تقریباً اسی زمانہ (۳۳-۱۹۳۴ء) میں خاور نے حلقۂ اربابِ ذوق لاہور میں "جہانِ نو" کے عنوان سے ایک مختصر منظوم ڈرامہ پڑھا جس کی نمایاں خصوصیت "بلینک ورس" کا استعمال تھا۔ ڈرامے کا ہیرو ایک مابعد الطبعیاتی قسم کا شخص تھا جو بالآخر حالات کے ناگزیر تقاضوں کے ماتحت آسمان سے زمین کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ یہ کوششیں بعد میں بھی جاری رہیں۔ ابتدائی منظوم ڈرامے لکھنے والوں میں اختر الایمان، علی سردار جعفری، اور عزیز احمد کا شمار بھی ہے۔ یوسف ظفر نے متعدد منظوم ڈرامے لکھے ہیں۔ سیف الدین سیف کا "ساربان" ایک غنائی ڈرامہ ہے۔ اس نے چند مکمل ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ قتیل شفائی اور باقی صدیقی نے بھی پابند نظم میں ہلکے پھلکے ڈرامے لکھے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد جمیل الدین عالی نے تاریخی ارتقا کے تصور کے تحت ایک طویل ڈرامہ "انسان" لکھا ہے۔

ان کوششوں کا مدوّن شکل میں نقطۂ عروج "زر داغِ دل" ہے جس کے مصنف عبد العزیز خالد نے چیدہ چیدہ مغربی ڈراموں کو اردو میں ڈھالنے کی کافی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کے مطالعہ سے ظاہر ہے کہ ڈرامائی اور بیانیہ ضروریات کے لئے مناسب صنف و بحر اور عروضی تجربات کا مسئلہ برابر اس کے زیرِ توجہ رہا ہے۔ "تسکینِ اوسط" کی اُپج اس لئے قابلِ لحاظ ہے کہ اس سے سنگلاخ عروض کو کسی قدر گداز بنانے کی ایک ترکیب

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

ماہِ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۸ء

ادبی جائزہ:

"آشفتہ بیانی میری"

(رشید احمد صدیقی)

شان الحق حقی

اہل نقد اکثر ادبی مقالات میں اسی قسم کا نظم و ضابطہ یا ہیئتِ ترکیبی تلاش کرتے ہیں جیسا کہ علمی تالیفات میں ہوتا ہے یا ہونا چاہیئے لیکن خیال اپنی جہت آپ نکالتا ہے اور اقلیدسی خاکوں کا پابند نہیں رہتا۔ خیال کی آمیزش اکثر منطقی ربط کو بدل دیتی ہے۔ [1] زیرِ نظر کتاب جو رشید احمد صدیقی صاحب کی نسبتاً تازہ تصنیف یا تازہ رس تحفہ ہے ایک محدود و معین موضوع کے باوجود اس قسم کا کوئی بندھا ہوا خاکہ ڈول یا ڈیزائن نہیں رکھتی جو درسی کتابوں سے بھی زیادہ ان کے "خلاصوں" میں پایا جاتا ہے۔ قلم کی یہی آزاد روش اس کتاب کی وجہ تسمیہ بھی ہے اور اس کا ایک سرسری تعارف بھی۔ ویسے تو اس کے آخر میں ایک گوشوارہ بھی لگا ہوا ہے لیکن وہ اتفاق سے مصنف کا مرتب کردہ نہیں بلکہ ان کے بقول ناقص و ناتمام ہے۔ رشید صاحب کا موضوع علی گڑھ ہے مگر یہ موضوع ان کی ذات سے جو نسبت رکھتا ہے وہ ظاہر ہے نہ صرف ان کے بلکہ بہت سے لوگوں کے لئے ایک کا تصور دوسرے کے بغیر محال ہوگا۔ اس مدغم سے موضوع پر ان کا قلم اسی آزادی سے بے اختیار رواں ہے جو خلوص جذبات کا تقاضا بھی تھی اور خلوصِ اظہار کا بھی ع

"آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست!" یہاں رشید صاحب کے قلم کی بے تکلف روانی نے جو لطف دیا ہے وہ کسی مدون تذکرے سے مل سکتا تھا نہ مربوط کہانی سے۔ اس کو خوابِ سحر کی لذت آفرینی سے نسبت دے سکتے ہیں جو "خمارِ شب نشیناں" کا علاج بھی ہوتی ہے اور دیدۂ بیدار کے لئے سامانِ خلش بھی۔

ویسے تو یہ ایک داستانِ دل ہے جس میں جذبات کے لئے کھل کھیلنے کا بہت موقع تھا۔ اس میں علی گڑھ کے دورِ گذشتہ کے ایک نہیں کئی ورق پلٹ جاتے ہیں اور خود رشید صاحب کی ابتدائی زندگی کے بھی کچھ نقوش، خصوصاً مکتبی و مجلسی تذکرے موجود ہیں۔ لیکن رشید صاحب مرثیہ گو کب تھے؟ اگرچہ بگڑا شاعر ہونے پر شاید انہیں چنداں اعتراض نہ ہو! اچھا طنز نگار کسی حد تک شاعر تو ہوتا ہی ہے لیکن بنا بنایا شاعر ہو تو محض شاعر ہی کہلائے اور شعری کہتارہ جائے۔ چنانچہ جذبات کی ایک زیریں لہر تو برابر محسوس ہوتی ہے مگر دریا کی پیشانی پر بل دکھائی نہیں دیتے۔ ہاں تبسم کی لہریں کہیں کہیں اٹھتی ہیں اور یاد دلا جاتی ہیں کہ یہ رشید صاحب ہیں۔

رشید صاحب کا طنز و مزاح مسلم سی باتیں ہیں۔ ان کی تحریر اس چاشنی کے بغیر ان کی تحریر تو ہو ہی نہیں سکتی۔ پختہ کار اہلِ طرز کی تحریر کا انداز اکثر موضوع پر حاوی ہی رہتا ہے۔ لیکن پختہ تر تحریر وہ ہے جو موضوع اور مصنف کے مزاج میں سمجھوتہ کرا سکے۔ موجودہ تحریر کو اسی کی مثال کہا جا سکتا ہے۔ اس بیان میں طنز و ظرافت کے گل بہت کھلائے جا سکتے تھے۔ رشید صاحب صرف بدیع گو ہوتے تو بہت کچھ سماں باندھتے۔ شاعرانہ نظر بندی سے کام لیکر بہت کچھ ہنساتے، لٹاتے اور جی خوش کرتے۔ لیکن 'جیسا کہ اوپر کہا گیا' انہوں نے اپنی تحریر کو جذباتیت سے بچا لیا تو یہ سمجھئے کہ بڑا کمال کیا اور اس میں مسلسل شگفتگی کو قائم رکھا تو اور بھی بڑا کمال کیا۔ معلوم ہوا کہ رشید صاحب ابھی بوڑھے نہیں ہوئے ورنہ لڑکپن کے ذکر پر خدا جانے کتنا ہنستے اور کتنا روتے۔

ہمارے ہاں طنز اور ظرافت کے دو لفظ دراصل طنزیات و مضحکات کے بہت وسیع میدان اور متنوع اقسام پر حاوی ہیں جن کے درمیان خاصے نازک مگر حقیقی امتیازات موجود ہیں۔ ایک طنز وہ ہے جس کی اساس کلبیت پر ہوتی ہے، ایک وہ جو زندگی سے گہرے لگاؤ مگر کسی قدر بے اطمینانی کا پتہ دیتا ہے۔ پھر

---

[1] بقول رشید صاحب: "منطق مجھے پسند نہیں کیونکہ میری منطق اکثر دوسروں کی منطق سے جدا ہوتی ہے!"

ماہ نو، کراچی، جولائی ۱۹۵۸ء

طنزیہ نگارش کے مدنظر یا مخاطب مختلف طبقات ہوتے ہیں۔ مثلاً فاؤلر کے نزدیک (جس کا ہربرٹ ریڈ نے اپنے ایک مضمون میں حوالہ دیا ہے) طنز کی غایت سماجی اصلاح، موضوع اخلاق و آداب، طریق کار مبالغہ اور روئے سخن بے حس یا خود غلط طبقہ کی طرف ہوتا ہے۔ وعلیٰ ہذا القیاس اس نے (IRONY) خاکہ، تضحیک، مزاح، کی بھی وضاحت کی ہے۔ رشید صاحب کی طنز نگاری تو مشہور و مسلّم ہے لیکن وہ ان معنوں میں طنز نگار نہیں کہے جا سکتے جو اوپر مذکور ہوا۔ وہ مبالغہ آرائی کے شوقین ہیں نہ مذمت کے، نہ سماج کی اصلاح و تادیب پر اپنے آپ کو رشد و ہدیٰ سے مامور سمجھتے ہیں۔ ان کو اپنی روزمرہ زندگی میں یہ حوصلہ پورا کرنے کے کافی مواقع حاصل ہیں لہٰذا ادبی شخصیت میں اس جذبے کو کوئی گہرا دخل معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ طبعاً حقائق سے سمجھوتہ کر لینے کی عادت بھی رکھتے ہیں۔ انہیں اپنے نزدیکی ماحول کی کمزوریوں کے بارے میں بھی شک ہے کہ یہ "قابل اعتنا" ہوں گی۔ مردم بیزار تو وہ ہو ہی نہیں سکتے۔ استادوں کو جیسے بھی "بور" ہونے کی کافی مشق اور بڑا ظرف پیدا کرنا پڑتا ہے۔ موصوف تو یہاں تک کہتے ہیں کہ "میں کچھ مقامی سا آدمی واقع ہوا ہوں۔ آفاقی یا ماورائی قسم کا بننے کی نہ صلاحیت رکھتا ہوں نہ حوصلہ۔" ان جیسے ذی مرتبہ ادیب کے لئے یہ انکسار ہی کی ایک صورت کہلائے گی۔ بہرحال ان کی نظر سوسائٹی کے اکھڑ، بیڈھنگے، بے ڈول گوشوں سے کیونکر چوک سکتی ہے۔ ذی حس، صحیح النظر، خوش ذوق اور خوش طبع انسان ہیں۔ لہٰذا بڑے شائستہ و لطیف پیرائے میں بڑے خلوص اور بے واسطگی کے ساتھ کبھی کبھی چھیڑ دیتے ہیں۔

طنز کی طرح ظرافت کے بھی کئی مدارج اور کئی کیفیتیں ہیں۔ رشید صاحب جتنے طناز ہیں مضحک تو اتنے بھی نہیں۔ یعنی ان کی تحریر میں کہیں بھی آپ کے وقت کو "خوش کرنے" کا شوق نہیں ملتا۔ وہ ہنسانے کے لئے قلم نہیں اٹھاتے، نہ حُسنِ طبیعت کے اظہار کے لئے۔ آپ مسکرا دیتے ہیں تو اس میں اُن کے کسی منصوبے کو دخل نہیں ہوتا۔ لوگ تو بعض اوقات ویسے بھی ہنس دیتے ہیں کہ رشید صاحب نے کہی ہے تو کوئی مزے ہی کی بات ہوگی۔ ان کے ہاں شوخ و پُرمعنی فقرے کافی ملتے ہیں لیکن ان میں نہ خندہ خیزی کا شوق جھلکتا ہے، نہ کلبیت نہ جارحیت نہ کوئی شدید مثبت یا منفی جذبہ۔

پھر آخر وہ لکھتے ہی کیا ہیں؟ جواب یہ ہے کہ اوّل تو لکھتے ہی کہاں ہیں! ان کا کم لکھنا اور بغیر لاگ لپیٹ یا مقصد کے لکھنا، ہنسانے، چڑانے، اور رلانے سے پرہیز کرنا، یہ سب باتیں ایک دوسرے سے بڑا تعلق رکھتی ہیں۔ یہی تو رشید صاحب ہیں۔ یہ وہ خوش طبعی ہے جسے رشید صاحب نے علیگڑھ والوں کی خصوصیت بتایا ہے اور ان کے وہ استاد ٹھہرے۔ ان جیسی ہوئی ظرافت کا مقصد کچھ نہیں ہوتا اور یہ آپ ہی اپنا مقصد ہو تو بے تاثیر رہ جائے۔ البتہ اس کی تہ میں ایک ذہین، فطین، حساس اور سلجھی ہوئی شخصیت ہوتی ہے۔ بے لاگ بے پرواہی میں سماجی لگاؤ کے ساتھ آزاد منشی اس طرح ملی جلی ہوتی ہے کہ اسے کسی خاص رجحان سے تعبیر کرنا درست یا کافی نہیں ہوتا۔ ان کی تحریر کا موضوع اور محرک ان کی یادیں ہیں اور وہ شخصیتیں جو ان کو عزیز رہیں۔ اُن کے تذکرے وہ ایسے شگفتہ و بے ساختہ پیرائے میں کرتے ہیں جو انکے قلم کا جوہر اور طبیعت کا خاصہ ہے۔ جہاں محرک محبت و ارادت ہو، وہاں طنز کی گنجائش کم ہوتی ہے بس ایسی ہی صباحت اور شگفتگی نبھ سکتی ہے جیسی کہ رشید صاحب کی تحریروں میں ہے۔

زیر نظر کتاب میں رشید صاحب کے مخصوص بے ضرر، نشتر کافی ہیں، لیکن علی العموم یہ ایک سنجیدہ سی تصنیف نظر آتی ہے۔ بعض دلچسپ شخصیات کا ذکر خیر، جستہ جستہ دلچسپ واقعات، ہنگامی مسائل پر سرسری محاکمے، آخر میں علیگڑھ کے چند اکابرین کے کردار اور کارگذاریوں پر حاشیے، یہ اس کتاب کے نمایاں خدوخال ہیں جو اسے دلچسپ بھی بناتے ہیں اور مفید بھی۔

اپنے موضوع کی وقعت اور اپنی ذات پر رشید صاحب کو کافی اعتماد ہے لیکن کہیں کہیں لہجہ معتذرانہ ہو گیا ہے جو ان کی شرافتِ نفس کا تقاضا معلوم ہوتا ہے۔

اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ "پھر دل میں یہ وسوسہ پیدا ہوا کہ شاید مجھ پر یہ الزام رکھا جائے کہ میں اپنا پروپیگنڈا کرتا ہوں... میرا پروپیگنڈا دوسرے کیا کم کرتے ہیں کہ میں خود کرنے لگوں۔ پھر عمر کی جس منزل میں ہوں وہاں پروپیگنڈا نہیں کرتے توبہ استغفار کرتے ہیں یا عقد ثانی و ثالث۔ مجھے اب تک ان میں سے ایک کی بھی توفیق نہ ہوئی۔ ممکن ہے آئندہ بھی نہ ہو اس لئے کہ مجھے کچھ اس طرح کا اندیشہ لاحق ہے کہ کہیں توبہ استغفار اور عقدِ ثانی و ثالث لازم و ملزوم تو نہیں۔"

علی گڑھ کے ایک دور کی جھلک، رشید صاحب کی شخصیت اور لطیف تحریر کی بنا پر یہ کتاب اردو کی انشا، سرگزشت اور سیرت نگاری میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔

بیتے لمحے

عبداللہ خاور

قمرِ شب کے صحرا میں تنہا رواں تھا
اٹھا دل میں وہ درد جو بیکراں تھا
فضاؤں میں تھی میر کی سوگواری
غبارِ الم چاندنی کا دھواں تھا
روانی تھی شب میں، مگر اتنی ہلکی
کہ عمرِ رواں پر وفا کا گماں تھا
چھلک آئے آنکھوں میں بے وجہ آنسو
نگاہوں کا رخ جانب کہکشاں تھا

★

کہیں دامنِ شب سے شعلہ سا الجھا
میں سمجھا تھا دل میں ترا غم نہاں تھا
جو مہتاب ڈوبا تو ابھرے ستارے
ترا غم نہ ہوتا، غمِ دو جہاں تھا!

★

گھٹن سی ہوئی ایسی ظلمت میں پیدا
کہ جیسے خلوصِ وفا رائیگاں تھا
مکمل تھا تنہائیِ شب کا عالم...
فریبِ نظر تا حدِ لامکاں تھا۔
ہر اک لمحہ، اک طائرِ پر شکستہ
اڑانوں کی گذری ہوئی داستاں تھا
ہواؤں کی لرزش میں تھے طنز پنہاں
نہ جانے ترا لمسِ گیسو کہاں تھا!

★

ستارہ کوئی ڈوب کر پھر نہ ابھرا
کہ جیسے مرا جذبۂ نیم جاں تھا!

★

تری طرح یادیں بھی پیماں شکن تھیں
مری طرح ماضی بھی شعلہ بجاں تھا
حیاتِ الم، رائیگاں رائیگاں تھی
ثباتِ الم، جاوداں جاوداں تھا!
بہت تند تھا سیلِ احساس، خاموش
نہیں ہوش، دل پر سبک یا گراں تھا
زباں ہمکنارِ سکوتِ ابد تھی...!
نہاں خانۂ ذہن "محوِ بیاں" تھا!

★

ماہیا

(فراق)

منیر عشرت

پھر یاد تری آئی
اک ہوک سی اٹھی دل میں
ڈسنے لگی تنہائی

— لو چاند نکل آیا
ہم راہ تکیں جس کی
وہ آج نہ نکل آیا

— سونی ہے گلی دل کی
ایسے میں جو آ جاؤ
کھل جائے کلی دل کی

— چندا اتراتا ہے
کیا جانوں بات ہے کیا
کیوں جی بھر آتا ہے

— ہیں چار طرف میلے
پھر بھی ترا دیوانہ
تنہائی کا غم جھیلے

— یہ پوچھے ہے یہ دل تم سے
کیا بات ہوئی آخر
کیوں روٹھ گئے ہم سے

کچھ پا کر کھو بیٹھے
تر آنکھ ہے نرگس کی
کیا باغ بھی [illegible]

افسانہ:

رات کے آخر ہوتے ہوتے

آغا ناصر

رات جیسے منجمد ہو گئی تھی۔ وقت ٹھہر گیا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ستاروں کی گردش سے وقت کا اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کی، اور مایوس ہو کر پھر ٹہلنے لگا۔ سناٹے میں اس کے قدموں کی بھاری اور ہموار چاپ پھر اسی طرح گونجنے لگی۔ سامنے ویران قبرستان دور تک پھیلا ہوا تھا۔ شکستہ قبروں کا ایک سلسلہ تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ پتھریلی زمین پر اس کے فوجی جوتوں کی آواز ایک عجیب سی گونج پیدا کر رہی تھی۔ آوازیں ابھرتیں اور ڈوب جاتیں۔ کئی دفعہ اس کا جی چاہا کہ دو گھڑی بیٹھ جائے لیکن پھر سامنے درخت پر لٹکی ہوئی چار لاشیں اسے اپنی طرف متوجہ کر لیتیں اور وہ بندوق کو اپنے ایک کاندھے سے اٹھا کر دوسرے پر رکھ لیتا اور پھر اسی طرح پہرہ دینے لگتا۔ لمبا ڈراؤنا منظر تھا۔ تاریک اور سرد رات، اتنا ور درختوں کے سیاہ گھنے سائے جو رات کے اندھیرے میں بھوتوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ سنسان اور ویران قبرستان اور... اس کے سامنے درخت پر لٹکے ہوئے چار انسانوں کے مردہ جسم! اس کا جی لرز اٹھا لیکن پھر اسے اپنے کمانڈر کا وہ فقرہ یاد آ جاتا جو اس نے یہاں سے رخصت ہوتے وقت کہا تھا: "دیکھو۔ ان اسمگلروں کے ساتھی ان کی لاشیں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں رات بھر نہایت ہوشیاری کے ساتھ پہرہ دینا ہوگا۔ اگر تم نے ذرا بھی غیر ذمہ داری سے کام لیا تو کوئی لاش غائب ہو سکتی ہے اور تم جانتے ہو اس کی سزا کیا ہوگی؟ تمہیں اس مردہ آدمی کی جگہ پر کرنی ہوگی!"

اس کے بعد سب چلے گئے۔ اور وہ تنہا اس ویرانے میں ان چار لاشوں کی حفاظت کے لئے رہ گیا۔ ملکی مفاد سے دغا کرنے والے اسمگلروں کے مردہ جسم جن کے ساتھی ان کی تلاش میں تھے۔ اور انہیں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ اکیلا زندہ آدمی ان چار لاشوں کی حفاظت کر رہا تھا یہ جانتے ہوئے کہ اگر ان چاروں میں سے کوئی لاش بھی غائب ہو گئی تو اسے جان سے ہاتھ دھو کر اس کی جگہ پر کرنی ہوگی۔ رات کے سناٹے میں دور کسی درخت پر الّو کی کرخت اور منحوس آواز گونجی۔ اور پھر پتھریلی چٹانوں اور گھنے تنے والے درختوں کے درمیان سے گذرتی ہوئی قبرستان کے سناٹوں میں چلی گئی۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔ کسی نامعلوم خوف سے اس کا دل کانپ اٹھا۔ "مجبوری، ہاں مجبوری" وہ مجبور تھا کہ پہرہ دے اور ان کی حفاظت کرے

لیکن پھر اسے وہ تمام واقعات یاد آئے، اپنے بیتے ہوئے دن۔ "ٹھیک ہی تو ہے"۔ اس نے سوچا "میری زندگی سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں۔ زندہ رہوں یا مر جاؤں، کوئی میری موت پر آنسو بہانے والا بھی نہیں ہے۔ پھر کس کا خوف؟ محبت، ہاں محبت زندگی کے چراغ میں تیل کا کام کرتی ہے۔ جب کوئی محبت کرنے والا ہی نہ ہو تو پھر زندگی سے کیا حاصل؟ ہاں میں صرف انسان ہوں۔ زندگی کو مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں، پھر مجھے زندگی سے دلچسپی کیوں ہو؟" وہ ہنس دیا اور۔ اس کے دل کو آپ ہی آپ تسکین سی ہو گئی۔ زندگی میں ایسے اس قدر مایوسیاں ہوئیں کہ اب اسے کسی شے کی آرزو ہی نہیں رہی تھی۔ نہ غم کی تمنا نہ خوشی کی آرزو۔ وہ اس دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اس پتھر کی طرح جو کسی وسیع ریگستان میں سالہا سال سے پڑا ہو، بے مصرف، بے فائدہ۔ وہ سوچتے سوچتے آگے نکل گیا۔ اس درخت سے خاصی دور جہاں وہ لاشیں لٹکی ہوئی تھیں۔ اس کے بھاری جوتوں کی چاپ گونجتی رہی اور جب ان کے نیچے پتھریلی زمین کی بجائے مٹی کے ڈھیر محسوس ہونے لگے تو اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ قبرستان میں داخل ہو گیا ہے اور قبروں پر چل رہا ہے۔ اسے کچھ برا سا لگا۔ وہ قبروں پہ

اپنے بھاری بھاری جوتوں سمیت کیوں چڑھ آیا۔" کہیں مردے جاگ نہ اٹھیں!۔ اونہہ ؟" وہ ہنس دیا۔ عین اس وقت اس نے سسکیوں کی آواز سنی۔ ایک عورت کی سسکیاں! وہ سچ مچ پریشان سا ہو گیا۔ کہیں واقعی کوئی مردہ تو نہیں جاگ اٹھا! اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ دھڑکن خوف کی وجہ سے تھی یا تعجب کی وجہ سے، اسے خود بھی علم نہیں تھا۔ اسے عورت کی سسکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ سہمے سہمے قدموں سے اس طرف بڑھا جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ ایک شکستہ دیوار کے عقب سے آواز آ رہی تھی۔ ایک نوجوان عورت کی آواز جو دھیرے دھیرے رو رہی تھی۔ وہ ٹوٹے ہوئے دروازہ سے مقبرہ میں داخل ہو گیا۔ "اف میرے خدا!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے بچپن میں سنی ہوئی وہ لاتعداد کہانیاں یاد آ گئیں جن میں یہ بتایا جاتا تھا کہ مردے رات کو جاگ جاتے ہیں اور مقبروں سے باہر نکل آتے ہیں۔ اس نے دیکھا اس شکستہ دیوار سے ٹیک لگائے ایک خوبصورت عورت بیٹھی ہے۔ اس کے سیاہ بال کھلے ہیں۔ موٹی موٹی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے ہیں۔ رخساروں پر آنسو بہنے کے نشان۔ اور ساتھ ہی ایک نوعمر سانولی سی لڑکی چپ چاپ بیٹھی اسے تک رہی ہے۔ وہ دیر تک حیرت میں ڈوبا ہوا کھڑا رہا۔ عورت اسی طرح روتی رہی — اندھیری رات، ویران قبرستان، سناٹا اور اس شکستہ مقبرے میں ایک خوبصورت نوجوان عورت جو سسکیاں لے رہی ہے۔ اسے سب کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا جیسے وہ عالم تصورات کی کسی بستی میں آ گیا ہے۔ سہمے سہمے قدموں سے وہ آگے بڑھا۔ اس کے فوجی جوتوں کی آہٹ سے نوجوان عورت چونک سی پڑی۔ اپنی موٹی موٹی سیاہ آنکھیں گھما کر اس نے دیکھا اور پھر ایک سہمی سی چیخ اس کے منہ سے نکل گئی۔ ساتھ بیٹھی ہوئی لڑکی گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ان کے قریب آ گیا۔

"تم کون ہو؟" اس نے دھیرے سے پوچھا۔ لیکن اس عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اسی طرح اس کا چہرہ تکتی رہی۔ "بتاؤ، مجھے بتاؤ۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"کیا میں مر چکی ہوں؟ کیا ہم عالم بالا میں ہیں؟" اس کے ہونٹ کانپے اور اس نے اتنے دھیرے سے یہ فقرہ کہا کہ کوئی سن بھی نہ سکے۔ وہ صرف سانس میں بول رہی تھی۔ تب اچانک وہ دیوار سے ڈھلک گئی۔ اور بے سہارا سی ہو کر زمین پر گر پڑی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں ہونٹ بالکل خشک ہونٹ ایک دوسرے سے چپک گئے۔ اس نے گھبرا کر اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ اس کی نبض دیکھی جو بہت ہی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اور پھر اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے خشک سوکھے ہونٹوں کو چھو کر دیکھنے لگا۔ "کیا وہ — کیا یہ بھی —" قریب کھڑی ہوئی لڑکی نے رو کر پوچھا۔

"نہیں ابھی زندگی کی رمق باقی ہے، تمہارے پاس پانی ہے؟"

"نہیں۔ پانی۔ پانی کہاں! ہم تین روز سے بھوکے پیاسے ہیں۔ کاش پانی کے چند قطرے مل سکتے! مالکن کے سوکھے ہونٹوں کو تر کرنے کے لئے صرف چند قطرے!" "پانی!" اس کی آنکھوں میں امید کی روشنی چمک اٹھی "پانی —" وہ بولا "میرے پاس بوتل میں تھوڑا سا پانی ہے۔ شاید پیاس ہی کی وجہ سے یہ بے ہوش ہو گئی ہیں" اس نے جلدی سے اپنی کمر میں بندھی ہوئی پانی کی بوتل کھولی۔ اور اس کے ہونٹوں میں پانی کے چند قطرے ٹپکا دئے۔ لڑکی نے حسرت سے پانی کی طرف دیکھا۔ "لو ایک گھونٹ تم بھی پی لو" اس نے پانی کی بوتل لڑکی کی طرف بڑھا دی۔

"یہ کون ہیں۔ تم کون ہو یہاں اتنی رات گئے؟ اس ویران قبرستان میں اس طرح بھوکی پیاسی؟ یہ سب کیا ہے؟" اس نے ایک سانس میں اس لڑکی سے سوالات پوچھ ڈالے۔

"مالکن۔ میری مالکن!" پانی کا ایک گھونٹ پی لینے کے بعد نوعمر کنیز نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا۔ "میرے مالک فوت ہو گئے۔ اور میری مالکن بیوہ ہو گئیں۔ وہ ان کی موت پر آنسو بہاتی رہیں۔ اپنی محبت کے خاتمہ کے بعد انہیں بھی زندگی سے نفرت ہو گئی اور آج تین دن تین راتوں سے یہ اسی طرح بھوکی پیاسی یہاں پڑی رہی ہیں۔ یہ میرے مالک کی قبر ہے، ان کے محبوب کی قبر!"

"تمہارے مالک کو مرے تین دن ہوئے" اس نے پوچھا۔

"ہاں آج تیسرا دن ہے۔ آہ میری مالکن!" لڑکی رونے لگی۔
اس کی گود میں لیٹی ہوئی عورت نے اپنا سر ہلایا۔ ہونٹوں کو جنبش سی ہوئی۔
"ذرا سا پانی اور دو۔" لڑکی نے کہا۔
اور اس نے اپنی بوتل سے پانی کے چند اور قطرے اپنی گود میں لیٹی ہوئی عورت کے منہ میں ٹپکا دیئے۔ عورت نے آنکھیں کھولیں اور پھر گھبرا کر بند کر لیں۔ وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ "جاگ جاؤ، آنکھیں کھول دو" اس نے بڑی میٹھی آواز میں کہا۔ عورت نے آہستہ آہستہ اپنی پلکیں اوپر اٹھائیں۔ اور کنول کے پھولوں کی طرح اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ "تم کون ہو؟" اس نے بڑی پژمردہ آواز میں پوچھا۔
"تمہارا ایک ہمدرد"
"کیا میں مر چکی ہوں؟ کیا ہم عالم بالا میں ہیں؟ بتاؤ اجنبی۔ وہ کہاں ہیں۔ مجھے بتاؤ" اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو پھر سے ڈبڈبا آئے۔
"تم اپنی ہی دنیا میں ہو۔ آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھو۔ تم اپنی دنیا میں ہو۔ یہ تمہاری کنیز ہے، یہ مقبرہ ہے جہاں تمہارے شوہر کی لاش دفن ہے۔ وہ مر چکا ہے نا۔"
"اور میں؟"
"تم زندہ ہو۔ اسی طرح جیسے میں زندہ ہوں۔ جیسے تمہاری کنیز زندہ ہے، جیسے دنیا میں اور بلا تعداد لوگ زندہ ہیں۔"
"پھر تم کون ہو؟" عورت تڑپ کر اٹھ بیٹھی۔ "تم یہاں کیوں آئے؟ تم نے میرے جسم کو کیوں چھوا؟"
"مالکن" کنیز قریب آگئی "آپ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ انہوں نے آپ کے حلق میں پانی ٹپکا کر آپ کو ہوش میں لایا۔ پانی مالکن"
"اوہ، خاموش رہ! مجھے تیرے لہجے سے زندگی کی بو آ رہی ہے۔" عورت نے بگڑ کر کہا اور پھر اس شخص کی طرف متوجہ ہوئی تم نے یہ کیوں کیا؟ تم سے کس نے کہا تھا کہ مجھے ہوش میں لاؤ؟ مجھے مرنے کیوں نہ دیا تم نے؟"
"خاتون! یہ جرم ہے، اخلاقی جرم! مذہبی جرم! محبت کا جرم! بیٹھ جاؤ۔" اس نے پھر عورت کو اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر اٹھایا اور اپنے کاندھے سے ٹیک لگا کر بٹھا لیا۔ "میرے پاس کچھ خشک گوشت ہے۔ لو تھوڑا سا کھا لو۔"
"نہیں نہیں، مجھے زندگی سے نفرت ہے" عورت نے کہا۔
"پہلے کچھ کھا لو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا خودکشی کیسے کی جاتی ہے۔ لو، میرے کہنے سے۔ میری بات مان لو۔" اس نے عورت کا منہ کھول کر سوکھے گوشت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا اس کے منہ میں ڈال دیا۔ وہ دھیرے دھیرے چبانے لگی۔ کنیز گوشت کے چند سوکھے ٹکڑے لے کر مقبرے کے دروازہ کی طرف چلی گئی۔ تھوڑا سا کھا لینے کے بعد عورت نے پانی مانگا۔ تب سپاہی نے محسوس کیا کہ اس کی بیمار آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی چمک آگئی ہے۔
"تم کیوں آئے تھے یہاں؟" عورت نے پہلی بار اس کی طرف دیکھا۔
"یونہی"
"کون ہو تم؟"
"ایک سپاہی"
"لیکن تم نے مجھے مرنے کیوں نہ دیا؟"
یہ خودکشی ہوتی۔ جو جرم ہے، بزدلی ہے۔ محبت سے بے وفائی ہے۔"

"تمہیں اس سے کیا؟ اگر میں مرجاتی۔"
"یہ میرا اخلاقی اور انسانی فرض تھا۔ اور پھر یہ تمہاری محبت کی شکست ہوتی۔ محبت زندگی سے جنگ کرنا سکھاتی ہے، فرار نہیں سکھاتی۔"
"کیسی عجیب باتیں کرتے ہو تم؟" عورت نے اس انداز سے کہا جیسے اس کے پاس کوئی اور جواب نہ رہا ہو۔
"مگر تم اتنی رات گئے اس مقبرے میں کیوں آئے تھے؟"
"پہرہ دینے"
"کس کا؟"
"اسمگلروں کی چار لاشوں کا جنہیں آج صبح اس مقبرے کے عین سامنے والے درخت کے نیچے گولی ماردی گئی کیونکہ وہ تشدد پر آمادہ تھے۔"
"مگر مردہ انسانوں پر پہرہ کیوں؟"
"اس لئے کہ کہیں ان کے ساتھی ان کی لاشوں کو لے نہ جائیں۔"
"تو انہیں دفن کیوں نہیں کر دیا؟"
"ان کی لاشیں درختوں سے لٹکا دی گئی ہیں تاکہ ملاکت پسند اسمگلروں کو عبرت ہو۔"
"تو تم تمام رات پہرہ دیتے رہے؟"
"ہاں، چونکہ کوئی لاش چوری ہو جائے تو اس کی جگہ مجھے اپنی لاش سے پُر کرنا ہو گی، اس لئے مجھے ایک پل بھی ان سے غافل نہ رہنا چاہیے"
"تو پھر تم یہاں کیوں آ گئے؟"
"تمہاری سسکیوں کی آواز سن کر۔"
"اب جاؤ، کہیں اسمگلروں کے ساتھی کوئی لاش نہ لے جائیں۔ تمہیں تو ان کی حفاظت کرنا چاہیئے۔ یہاں وقت کیوں ضائع کر رہے ہو؟"
"مردہ انسانوں کی حفاظت سے زیادہ ضروری ان زندہ انسانوں کی حفاظت ہے جو مرنا چاہتے ہیں۔"
"تمہارا اشارہ میری طرف ہے۔"
"شاید۔ میں اس وقت تک کیسے جا سکتا ہوں جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ تم نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔"
"لیکن کوئی لاش غائب ہو گئی تو؟"
"تو میں اس کی جگہ پُر کر دوں گا"
"اوہ،" عورت نے حیرت سے سپاہی کی طرف دیکھا۔ "اجنبی! تم میرے لئے اتنی بڑی قربانی دے سکتے ہو؟"
"تمہارے لئے نہیں، انسانیت کے لئے، محبت کی جیت کے لئے!"
"تم اب جاؤ، پہرہ دو۔"
"تو تم وعدہ کرتی ہو کہ اب مرنے کا خیال نہ کرو گی، بولو؟"
"ضروری تو نہیں"
"تو پھر میں نہیں جاؤں گا۔ میں اس وقت ہرگز نہیں جا سکتا۔"
"تو پھر یونہی سہی،" عورت نے مجبور ہو کر کہا اور اپنی گردن جھکا لی۔ "وعدہ کرتی ہوں"
"ہاں،" عورت نے دھیرے سے کہا۔ سپاہی اٹھ کھڑا ہوا اور اپنے کپڑوں کی گرد جھاڑ کر باہر نکل گیا۔
"ٹھہرو" مقبرے کے دروازہ پر وہ رک گیا۔ "تم واپس آؤ گے نا؟"
"کیوں؟" اس نے پوچھا۔ "میں تمہارا انتظار کروں گی۔ تم واپس آؤ گے نا؟" عورت کی شیریں آواز دور تک اس کے ساتھ گئی۔
باہر رات ویسی ہی وحشت ناک اور ڈراؤنی تھی۔ منحوس پرندوں کی آوازیں رات کے بولنے والے کیڑوں کی بھنبھناہٹیں اور سپاہی کے

چرمی جوتوں کی چاپ۔ مقبرے میں بیٹھی ہوئی دونوں عورتیں اب خاموش تھیں۔ اور چپ چاپ ایک دوسری کی صورت تک رہی تھیں۔ قبر پر جلتے ہوئے چراغ کا تیل ختم ہو چکا تھا اور اس کی لو ڈوبتی جا رہی تھی۔ پھر چراغ بجھ گیا۔ عورت کے منہ سے ایک لمبی سی آہ نکل گئی۔ کنیز گھبرا کر اس کے قریب آ گئی۔ اور اندھیرا، گہرا اندھیرا! اور مقبرے کے دروازہ پر چرمی جوتوں کی گونج سنائی دی۔

"اجنبی!" عورت نے چونک کر پوچھا "تم آ گئے۔ قریب آ جاؤ، یہاں آ جاؤ۔ ہمیں اندھیرے میں ڈر لگ رہا تھا۔ اور اس ویران قبرستان سے دہشت ہو رہی تھی، اچھا ہوا تم آ گئے" سپاہی نے محسوس کیا عورت کی آواز میں زندگی کی آرزو تھی، موت کا خوف تھا "میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ اچھا ہوا تم آ گئے، میں انتظار ہی کر رہی تھی۔ مگر۔ مگر۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ سپاہی قریب آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"مگر اجنبی تم تو صبح تک پہرہ دینے گئے تھے۔ ابھی تو رات ختم بھی نہیں ہوئی۔"

"ہاں" سپاہی کی آواز میں کوئی جذبہ نہ تھا، کوئی احساس نہ تھا۔

"پھر تم کیوں آ گئے؟"

"میں۔ میں نے سوچا۔ اب پہرہ دینے سے کیا حاصل؟" ـــــــ "کیوں؟"

"ایک لاش غائب ہو چکی ہے" اس نے بہت ہی مدھم آواز میں کہا۔

"غائب ہو چکی ہے؟۔ تو پھر۔ پھر اب کیا ہوگا؟"

"مجھے اس کی جگہ پر کرنی ہوگی۔"

"اوہ!" عورت رونے لگی "یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا۔"

"تم رو کیوں رہی ہو؟"

"تمہیں مرنا نہیں چاہئے۔ تمہیں مرنا نہیں چاہئے اجنبی!"

"ہونہہ!" سپاہی نے مایوس سا ہو کر کہا "میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ کسی کو میری موت کا دکھ نہیں ہوگا۔"

"میں تمہیں نہیں مرنے دوں گی، جاؤ کہیں بھاگ جاؤ۔ رات کی تاریکی میں کہیں دور نکل جاؤ تاکہ حکومت کے سپاہی تمہیں تلاش نہ کر سکیں۔"

"نہیں نہیں" اس نے بڑی نفرت کے ساتھ کہا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ ہم کہیں دور نکل جائیں گے۔"

"تم!" سپاہی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "مگر تم۔"

"ہاں ہم بھاگ چلیں گے۔"

"لیکن وہ ضرور مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔ ہم بچ نہیں سکتے۔"

"تو پھر اب۔ وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

"اب صبح ہوتے ہی وہ یہاں آ جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مجھے پکڑ کر لے جائیں۔ اس لئے ان کے آنے سے پہلے مجھے مر جانا چاہئے۔ لو میری رائفل سیدھی کر کے پکڑ لو، اور اس سنگین کو میری کمر سے لگا دو۔"

"نہیں نہیں!" عورت چیخ اٹھی۔

"یہی ہوگا، یہی ہونا چاہئے" اس نے کہا۔

"میں کسی قیمت پر بھی تمہیں نہ مرنے دوں گی!" وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی "میں نہیں جانتی کس طرح کہوں لیکن میں تمہاری موت کو برداشت نہیں کر سکوں گی۔ ایسا نہیں ہوگا۔"

"یہی ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی ایک طرح ملکی مفاد سے دغا کی ہے۔ میں نے فرض سے غفلت برتی ہے۔ اب جیل خانے میں ایڑیاں رگڑنے کی بجائے خود مر جانا بہتر ہے۔" اس نے یوں کہا جیسے اس کے سوا کوئی اور بات سن ہی نہیں سکتا۔

"تم تو خود کہتے تھے۔ کہ خود کشی جرم ہے اخلاقی جرم۔" محبت سے بے وفائی!

"محبت!" اس نے ٹھنڈی سانس لی "مگر مجھ سے کوئی محبت بھی تو نہیں کرتا۔"

"اور اگر کوئی ہو؟ ایسا ہو جو تم سے محبت کرتا ہو تو پھر؟" عورت نے بڑے پیار سے کہا اور سپاہی چند لمحوں کے لئے سب کچھ بھول کر اس کے لہجہ کی شیرینی میں کھو گیا۔ اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ اپنی زندگی کے سارے دکھ، اپنا بے کیف و بے رنگ ماضی۔ وہ سوچنے لگا۔ جانے کیا۔ عورت خاموشی سے اسے تکتی رہی، باہر صبح کا اجالا دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ دور شہر میں گھڑیال نے چار بجائے اور سپاہی جیسے کسی میٹھے خواب سے چونک پڑا۔

"نہیں نہیں۔ کچھ نہیں ہو سکتا، کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ رات گذر گئی۔ اجالا پھیل گیا۔ ہم کہیں نہیں جا سکتے۔ میں کسی طرح بھی نہیں بچ سکتا!"

"تو۔ تم۔" صبح کے پھیلتے ہوئے دھندھلے اجالے میں عورت کا چہرہ صاف چمک رہا تھا، اس کے کنول کے پھولوں جیسی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ سپاہی نے بڑے غور سے ان آنکھوں میں جھانکا اور اپنے چہرے کا عکس دیکھ کر سہم سا گیا، اس نے کبھی کسی عورت کی آنکھوں میں اپنا عکس نہیں دیکھا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے محسوس کیا جیسے کوئی کوشش ہے جو اسے اپنی طرف کھینچ رہی ہے اور وہ مسحور سا ہو کر اس نے کنول کے ان پھولوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔" کاش کچھ ہو سکتا، کاش!" مگر اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ کاش تم مجھے نہ ملتیں! تم نے مجھ سے یہ باتیں کیوں کہیں؟ اب۔ اس وقت۔ جب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ دونوں دیر تک ایک دوسرے کو چپ چاپ تکتے رہے۔ باہر صبح کے پرندے چہکار نے لگے تھے، روشنی بڑھتی جا رہی تھی، دھندلکے ڈوب رہے تھے اور اس دھیرے دھیرے بڑھتے ہوئے سویرے میں وہ ایک دوسرے کو تک رہے تھے، افسردہ، مایوس، مجبور! اچانک عورت کے چہرے پر ایک چمک سی آئی، اس کی آنکھیں مسکرا پڑیں۔ اس نے سپاہی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "تمہیں ایک لاش کی جگہ۔ پر کرنے کے لئے ایک انسان کا جسم چاہیئے نا؟"

"ہاں"

"خواہ وہ کسی کا جسم بھی ہو؟"

"ہاں۔"

"تو تمہیں ایک لاش چاہیئے؟"

"ہاں۔ مگر۔ تم۔"

"ایک لاش۔ جو گم شدہ لاش کی جگہ پر کر سکے؟"

"لیکن۔"

"تمہیں لاش چاہیئے نا؟" عورت بڑے عزم کے ساتھ آگے بڑھی۔

"لیکن تم۔"

"ادھر آؤ۔ اس قبر کو کھود ڈالو۔ اور میرے شوہر کی لاش نکال کر اس لاش کی جگہ لٹکا دو۔"

اس نے قبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا جس کی منڈیر پر رکھے ہوئے چراغ کی بتی جل کر سیاہ ہو چکی تھی۔

"تم۔" سپاہی جیسے چیخ پڑا۔ "تم۔ مگر۔ مگر۔"

"جاؤ، جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہی کرو۔ اور سنو، اس بجھے ہوئے چراغ کو باہر پھینک دو۔ اب سورج نکل آیا ہے۔ اس بجھے ہوئے چراغ سے کیا حاصل؟"

اور اجنبی سپاہی نے عورت کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ اس کے جملے کا مطلب سمجھ گیا ہے۔ (ماخوذ)

"یہ خلش کہاں سے ہوتی ..."

عنایت اللہ

میں نے جب میجر شہزادہ شہباز کو خبردار کیا کہ مسز شہباز کے لئے آب و ہوا اور جگہ کی تبدیلی بے حد ضروری ہو گئی ہے۔ اگر مری پسند نہیں تو انہیں ایبٹ آباد لے جایئے تو اس نے سر جھکا لیا۔ میں اسے تین چار بار مری جانے کا مشورہ دے چکا تھا لیکن اس نے ہر بار انکار کر دیا۔ اب میں نے مری کی جگہ ایبٹ آباد کا نام لیا تو اس نے جھکے ہوئے سر کو ذرا سا اٹھا کر جواب دیا "ہاں! ایبٹ آباد لے جایا جا سکتا ہے۔ میں تین ماہ کی چھٹی کا بندوبست کر لیتا ہوں"

"آپ مری کیوں نہیں جاتے مسٹر شہباز؟"

"مری؟" میجر شہباز کا چہرہ اتر گیا اور آنکھیں بے چین سی نظر آنے لگیں۔ ہونٹوں کے کونوں میں ذرا سی حرکت ہوئی جیسے مسکرانے کی کوشش کی ہو۔ وہ غم سے بوجھل لہجے میں بولا "ڈاکٹر صاحب! میں روبینہ کو دنیا کے کسی بھی کونے میں لے جاؤں گا، مری نہیں لے جاؤں گا ۔" وہ پھر خاموش ہو گیا۔ اس پر شاید رقت طاری ہو گئی تھی۔ تلخ سا گھونٹ نگل کر بولا۔ "مجھ پر ایک کرم کیجئے، میرے سامنے مری کا نام نہ لیا کریں۔ آپ جانتے ہیں میں ایک بار ایک ہی بار مری گیا تھا۔ بیگم اور اس کی چھوٹی بہن کو ساتھ لیکر ......"

میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ میجر کو مری کے نام سے چڑ ہو گئی ہے۔ میجر، اس کی بیگم روبینہ، اور روبینہ کی چھوٹی بہن سمینہ کے متعلق میں کیا کچھ نہیں جانتا۔ میجر کی پہلی محبت، تمام آرزوئیں اور امنگیں سمینہ کے روپ میں مری کی ایک گہری کھائی میں گر کر چکنا چور ہو گئی تھیں۔ کسے معلوم تھا کہ رنگ برنگے پھولوں کی خودرو جھاڑی کی اوٹ میں یہ گہری کھائی سمینہ ہی کو ہڑپ کرنے کے لئے چھپی بیٹھی تھی۔ اگر سمینہ پھول توڑنے نہ جاتی .. میجر نے ٹھیک کہا تھا میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میں ان کا محض فیملی ڈاکٹر ہی نہ تھا۔ وہ مجھے ہمراز بھی سمجھتے تھے۔ دوست بھی اور باپ بھی۔

میں لاہور کی ان دس کوٹھیوں پر مشتمل کالونی کا فیملی ڈاکٹر ہوں۔ ان کی ایک ایک انٹ، ایک ایک بچے اور ہر فرد کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ بن دیکھے ہر ایک کے قدموں کی آہٹ اور ہر ایک کی آواز پہچان لیتا ہوں ایسے ہی جیسے باپ اپنے بچوں سے واقف ہوتا ہے۔ میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ یہ دس گھرانے میرا اپنا کنبہ ہیں جن کا ہر دکھ اور سکھ میرا اپنا دکھ سکھ ہے۔ میری کوٹھی ان کوٹھیوں سے الگ ہے۔ میرا اپنا کوئی بچہ ہے نہ بیوی لیکن میرا آنگن ویران نہیں رہتا۔ دس کوٹھیوں کے بچے میرے گھر میں دن بھر ہنگامہ برپا کئے رکھتے ہیں۔ کئی دن مجھے نئی سٹیتھوسکوپ خریدنی پڑتی ہے۔ میں نے انہیں بہت سے کھیل سکھائے ہیں، خود بھی ان کے ساتھ کھیلا ہوں لیکن "ڈاکٹر، ڈاکٹر" کے کھیل کو وہ زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہر روز ڈاکٹر اور مریض بننے پر جھگڑتے ہیں اور میری سٹیتھوسکوپ اس جھگڑے کی نذر ہو جاتی ہے۔ ٹوٹے ہوئے اس آلہ کو دیکھ کر جانے میں کیوں قہقہہ لگا کر ہنس دیتا ہوں؟ جانے مجھے بچوں پر غصہ کیوں نہیں آتا؟ میں نے انہیں کبھی نہیں کہا کہ تم نے اتنا نقصان کر دیا؟ غالباً اس لئے کہ ٹوٹی ہوئی سٹیتھوسکوپ کو دیکھ کر میرے ٹوٹے ہوئے دل کے ٹکڑے جڑ جاتے ہیں۔ یا پھر یہ بات ہے کہ میرا بڑھاپا سنبھلا ہوا ہے۔ سنبھلا ہوا بڑھاپا الہڑ جوانی سے کسی قدر بہتر اور صحت مند ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ چھیاسٹھ برس کی عمر میں ہی آ کے ہوتا ہے لیکن اُسے، صرف اُسے، جو صحن میں کھیلتے بچوں کے نقرئی قہقہوں اور لڑائی جھگڑے سے اکتا نہ جائے، ان میں جذب ہو کے رہ جائے۔ میں نے اس مسلسل نقصان کی شکایت کبھی ان کے ماں باپ کے سامنے نہیں کی۔ سنجیدگی تو کیا، مذاق میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ مبادا ان کے والدین انہیں ڈانٹ دیں یا میرے گھر آنے سے روک دیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس معصوم ہنگامے کو میری زندگی میں سے نکال لیا جائے۔ اگر ایسا ہوا تو میری چھیاسٹھ سالہ زندگی ایک لق و دق صحرا بن کے رہ جائے گی۔ میں جی نہ سکوں گا۔ میری ایک ایک سانس میں ان بچوں کے قہقہے رچے ہوئے ہیں۔ یہ سالہا سال سے میرے برآمدوں، کمروں اور لان میں کھیل رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے دو چار روز کی ہی تو بات ہے کہ ان کے ماں باپ اسی عمر میں ایسے ہی آ کر کھیلا کرتے تھے۔ پرسوں اپنے خان بہادر کے لڑکے کی شادی ہوئی ہے۔ میں نے جب دلہن کو دیکھا تو

مجھے اشرف کی ماں یاد آگئی جیسے کل کا ذکر ہے کہ اشرف اس کے بطن میں تھا اور میں نے اسے آٹھ انجکشن لور ایکسٹریکٹ اور پندرہ کیلسیم گلوکینیٹ کے دیئے تھے۔ اشرف کی پیدائش کے وقت مجھے تمام رات جاگنا پڑا تھا۔ آج چوبیس برس بعد جب میں نے اسے دولہا بنا دیکھا تو مجھے اس قدر مسرت ہوئی جیسے میری عمر میں چوبیس برس کا اضافہ ہوگیا ہو!

سمینہ مرحومہ نے تو میری انجکشن والی سوئی ہی توڑ ڈالی تھی۔ اس کو مرحومہ کہتے ہوئے مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔ میرے دل کا یہ ٹکڑا ایسے بھونڈے طریقے سے ٹوٹا ہے کہ جڑتا نظر نہیں آتا۔ سال بھر ہوا کہ وہ سترہ برس کی عمر میں مری جا کر فوت ہوگئی ہے۔ اس کا بچپن مجھے ابھی تک اپنی کوٹھی کے سامنے رابیل کی الجھی ہوئی ملی ہوئی ڈالیوں کے ساتھ کھڑا مسکراتا نظر آرہا ہے ٹوٹی ہوئی سوئی ہاتھ میں اٹھائے۔۔ سمینہ مرگئی ہے لیکن اس کے بچپن کی معصوم اور شرارت آمیز ہنسی میری ہستی میں زندہ ہے۔ اور اب اس کی بڑی بہن روبینہ۔ مسز شہباز۔۔ زرد پتے کی طرح شاخ سے رشتہ توڑ رہی ہے۔ اعصاب زدگی بڑا نامراد مرض ہے۔ اگر اسے دق یا سل ہوتا تو میں اسے بچا لیتا لیکن اعصاب زدگی اور وہ بھی فوبیا کی صورت میں! وٹامن ای اور سلبے پلیکس کے بی کامپلیکس کے انجکشن کوئی کام نہیں کرتے کوئی افاقہ نہیں۔ روبینہ کی ذہنی حالت بگڑتی جارہی ہے۔ میری میز پر بکھری ہوئی، الماریوں میں قرینے سے رکھی ہوئی شیشیاں مجھے کانچ کے ٹکڑوں کی طرح دکھائی دے رہی ہیں اور میں جیسے ان ٹکڑوں پر ننگے پاؤں چل رہا ہوں! ہر ایک شیشی کا لیبل پڑھ کے دیکھ لیا ہے۔ تمام کتابوں کو از سر نو پڑھ لیا ہے۔ روبینہ کی زندگی کا پتہ نہیں مل رہا۔ میں اپنی شکست پر آنسو نہیں خون بہانا چاہتا ہوں۔ میں تو شکست کی بُو سے بھی بیگانہ رہا ہوں۔ اس بڑھاپے میں بھی جسم نے ابھی رعشہ قبول نہیں کیا لیکن روبینہ کی کیفیت دیکھتا ہوں تو لرز جاتا ہوں۔ ایسے میں تلخ سا ایک احساس بیدار ہوتا ہے۔ شاید میں بہت بڈھا ہوگیا ہوں۔ مگر روبینہ مجھے بہت چاہتی ہے۔ بہت پیاری بچی ہے۔ بائیس تئیس برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے؟ یہی تو ہنسنے کھیلنے کی عمر ہے۔ لیکن مرض کے اثر سے وہ اصلی عمر سے دس دس برس آگے نکل گئی ہے۔ وہ چہرہ جو کبھی شگفتہ تھا آج بنجر زمین کی طرح دکھائی دیتا ہے جس پر دراڑیں پڑتی جارہی ہوں۔ باریک بچے تلے ہونٹوں سے مسکراہٹ جل گئی ہے اور ہونٹ یوں پژمردہ رہ گئے ہیں جیسے سیلاب کے بعد دریا کے کنارے۔ ڈھے ہوئے، گھلے ہوئے، کٹے پھٹے، بے رونق! روبینہ اب بھی مسکراتی ہے لیکن یہ ایک جانی بوجھی کوشش ہوتی ہے۔ مسکرانے کی ناکام کوشش۔ جب وہ مسکراتی ہے تو مجھے ایک منظر یاد آجاتا ہے۔ عرصے کی بات ہے، میں ایک شام ٹہلتے ٹہلتے قبرستان تک چلا گیا تھا۔ اس کے درمیان میں سے گذرتے ہوئے راستے پر ایک برات جارہی تھی۔ باجے والوں نے ڈھول باجے پیٹھ کے پیچھے کرلئے تھے۔ براتیوں کے ہنستے مسکراتے چہرے اداس ہوگئے تھے۔ سب کے سر جھکے ہوئے اور ہونٹ فاتحہ خواں تھے۔ میں دیکھتا رہا۔ مسرت، اداسیوں کی خاموش بستی سے گزر رہی تھی۔ خاموشی سے، دبے پاؤں، چپ چاپ۔! اور مسرت گذر گئی۔ روبینہ کے علیل ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی ہے تو یوں ہی دبے پاؤں، چپ چاپ، سر جھکائے! اس مسکراہٹ کو دیکھ کر دُکھ ہوتا ہے۔ طنز، بے بسی اور زہر خند سے بوجھل یہ مسکراہٹ، بلکہ مسکراہٹ کا دھوکہ، جیسے نحیف آواز میں کہہ رہا ہو:

”ڈاکٹر چچا! چھوڑو ان انجکشنوں کو۔ کیوں سوئیوں سے میرے بازو چھلنی کررہے ہو۔ میرا روگ تم نہیں سمجھ سکتے۔ بہت بڈھے ہوگئے ہو۔“

کاش! میں روبینہ کے روگ کو سمجھ سکتا۔ میں اسی قدر سمجھ سکا ہوں کہ روبینہ کو سمینہ کے مرنے کا دکھ لے بیٹھا ہے۔ پہلے یہ شک تھا کہ چونکہ میجر شادی سے پہلے سمینہ کو چاہتا تھا، وہ مرگئی تو اس نے روبینہ سے شادی کرلی۔ اس لئے ہوسکتا ہے میجر کے دل و دماغ پر ابھی تک سمینہ سوار ہو اور وہ روبینہ کو وہ پیار نہ دے سکا ہو جو ایک بیوی کا جائز حق ہے۔ میں نے اپنے طور پر جائزہ لے کر یقین کرلیا ہے کہ میجر، روبینہ کو اسی قدر چاہتا ہے جس قدر سمینہ کو چاہتا تھا۔ اس نے روبینہ کو سمینہ کا صحیح نعم البدل سمجھ کر اسے روح کی تہوں میں محفوظ کرلیا ہے۔ میجر سمینہ کو یاد کرکے آہیں بھرتا ہے لیکن روبینہ کی علالت کا ذکر آتا ہے تو اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔ میرے ذہن میں اب لے دے کے ایک ہی بات رہ گئی ہے کہ روبینہ کو چھوٹی بہن کا غم کھا رہا ہے۔ میں نے منطق اور نفسیات کے تمام داؤں پیچ برت کر دیکھ لئے ہیں۔ مرض کسی پہلو گرفت میں نہیں آرہا۔ اب تو میں بھی جذبات میں الجھتا جارہا ہوں۔ بعض اوقات جی میں آتی ہے کہ روبینہ سے کہہ دوں: ۔۔۔ ”روبینہ! سمینہ کے لئے جس قدر رو سکتی ہو، رو لو، خوب رو لو اور روتے روتے ابدی نیند سو جاؤ! سمینہ بہت ہی پیاری لڑکی تھی۔ دُبلی پتلی رابیل کی ڈالی کی طرح بل کھاتی ہوئی سترہ برس کی ننھی سی گڑیا سی لڑکی، مرگئی تو کس قدر عظیم المیہ بن گئی ہے۔ روبینہ! اس قدر رو دو کہ عرش کے تختے ہل جائیں۔ سمینہ کو ابھی مرنا نہیں چاہیئے تھا۔“

لیکن میں یوں کہتا نہیں۔ میں روبینہ کے اعصاب سے سمینہ کی موت کا دکھ، جو اب ایک خوف کی صورت اختیار کرگیا ہے، دھونے کی کوشش

کرتا رہتا ہوں۔ ایسے میں مجھے بعض اوقات یوں لگتا ہے جیسے میں روبینہ کو فریب دے رہا ہوں' جھوٹ بول رہا ہوں۔ میرا اپنا دل ہمیشہ کے غم میں اچھل رہا ہوتا ہے۔ میں اس بے تاب دل پر ہاتھ رکھ لیتا ہوں۔ یہ جانتے ہوئے کہ دل پسلیوں کے عقب میں ہوتا ہے' باہر سے ہاتھ رکھ کر دبانے سے کوئی فائدہ نہیں لیکن میں ایسی حرکت کیا کرتا ہوں۔ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی میں ایسی حرکت کرتا ہوں۔ شاید میں بڈھا ہو گیا ہوں۔ میرے سینے میں بیٹھا ہوا ڈاکٹر شاید آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔ شاید اس میں باپ جاگ اٹھا ہے۔

روبینہ کی ذہنی حالت مخدوش ہوتی جا رہی ہے۔ یوں تو وہ چلتی پھرتی ہے، مریضوں کی طرح صاحبِ فراش نہیں رہتی لیکن نفسیاتی حالت تشویشناک حد تک پہنچ چکی ہے۔ نیند اور بھوک سے بے پروا ہوتی جا رہی ہے۔ خلاؤں میں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہتی ہے یا پھر روتی رہتی ہے۔ بعض اوقات یوں ڈر کر سکڑ جاتی ہے جیسے خلاؤں میں کوئی ڈراؤنی چیز دیکھ لی ہے۔ مجھے شہباز پر ترس آتا ہے۔ بے چارہ کئی کئی راتیں سوتا نہیں۔ روبینہ کا دل بہلانے میں لگا رہتا ہے۔ پہینہ پیشتر کی بات ہے، روبینہ نے مجھے کہا تھا: "بعض اوقات جی چاہتا ہے کمرہ بند کر لوں۔ دروازے بھی، کھڑکیاں بھی، روشندان بھی۔ اپنے آپ کو اس طرح قید کر لوں کہ باہر کی دنیا کی آواز تو آواز' ہوا بھی مجھ تک نہ پہنچے۔ اور بعض اوقات بے اختیار جی چاہتا ہے کہ در و دیوار توڑ دوں، یہ حدیں مسمار کر دوں۔ دُور بہت دُور تک سبزہ زار ہو۔ ریگزار ہی ہو لیکن اس میں کوئی دیوار نہ ہو، رکاوٹ کوئی نہ ہو اور میں آزاد، ہر بندھن سے آزاد بھاگتی ہی چلی جاؤں۔"

یہ کیفیت اعصاب زندگی کی ایک اسٹیج ہے۔ پندرہ بیس روز ہوئے روبینہ اس اسٹیج سے گزر آئی ہے۔ مرض کی خطرناک شدت کا اندازہ مجھے اُس روز ہوا۔ چند روز گزرے روبینہ میرے پاس آئی۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ کہنے لگی: "چچا جان! گاڑی نکالئے۔ سیر کو چلیں۔" میری چھوٹی سی آسٹن کار دس سال سے گیرج میں پڑی ہے۔ گاہے گاہے صاف کروا لیتا ہوں لیکن دس سال سے استعمال نہیں کی۔ اب پیدل چلتا ہوں۔ غالباً اس لئے کہ اب میں زندگی کی رفتار سست کر دینا چاہتا ہوں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میں کار کی تیز رفتاری کی وجہ سے اتنی جلدی زیست کے اتنے سال طے کر آیا ہوں۔ اب میں باقی عمر پیدل طے کر رہا ہوں تاکہ آخری منزل پہ ذرا دیر سے پہنچوں۔ روبینہ کی خواہش کو ٹھکرایا نہ جا سکا۔ میں نے گاڑی نکالی اور وہ میرے ساتھ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"نہر کے کنارے کنارے چلئے۔"

"کس طرف؟"

"جس طرف سڑک بالکل ویران ہو۔"

"میں چالیس میل کی رفتار پر جا رہا تھا۔"

"تیز، چچا جان!"

"میں نے ایکسلریٹر کو ذرا سا دبایا تو رفتار کی سوئی پچاس پر آ گئی۔

"چچا جان! اور تیز"۔۔۔ سوئی ساٹھ کے ہندسے کو چھونے لگی۔

"بہت تیز!"

میں نے روبینہ کی طرف دیکھا تو میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے علیل چہرے پر غیر معمولی سُرخی آ گئی تھی۔ آنکھوں کا تاثر بھی غیر معمولی تھا اور ہونٹ لرز لرز کر کسی اندرونی خلفشار کا اظہار کر رہے تھے۔ میں نے اس کے ہونٹوں کے کونوں میں جھاگ کی ہلکی سی سفیدی بھی دیکھی۔ وہ سامنے دیکھ رہی تھی، ہاتھوں کی انگلیاں بے چینی سے ایک دوسری سے اُلجھ رہی تھیں۔ اُس نے ہاتھ اٹھایا اور بغیر اس طرف دیکھے سٹیئرنگ پر رکھ دیا۔ میں نے سٹیئرنگ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ایکسیلریٹر سے پاؤں اٹھانا شروع کر دیا اور دوسرا پاؤں بریک پر رکھ کر بریک لگانے کو تیار ہو گیا۔ گاڑی کی رفتار سست ہو رہی تھی اور روبینہ اور بھی بے چین' حتیٰ کہ گاڑی رُک گئی۔ روبینہ نے سر کو زور سے جھٹکا اور میرے کندھے پہ ڈال کر' دونوں بازو میری گردن کے گرد لپیٹ کر بے تحاشا رونے لگ گئی۔ اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ میں نے اسے رونے ہی دیا۔ جب آنسوؤں نے سینے کا غبار ہلکا کر دیا تو اس نے نڈھال ہو کر سر میرے کندھے سے ہٹا کر سیٹ کی پشت پر ڈال دیا۔ وہ تھک گئی تھی۔ میں نے دو باتیں کیں تو وہ بولی۔ "ڈاکٹر چچا! جی میں آئی تھی کہ آپ موٹر کو اور تیز چلاتے بہت ہی تیز!

سامنے ایک کھائی آجاتی اور آپ موٹر کو نہ روک سکتے۔ جی چاہتا تھا کہ میں تیز رفتار موٹر کے سٹیرنگ کو یک لخت گھمادوں اور موٹر آندھی میں پھینکی ہوئی دیاسلائی کی خالی ڈبیا کی طرح لڑھکتی ہوئی، اُلٹی سیدھی اُلٹی سیدھی ہوتی نہر میں جاگرتی!" اُس نے بے بسی کے عالم میں میری طرف دیکھا اور بولی: "سمینہ کھائی میں گر گر گئی ہے، میں اسے گرنے سے نہ روک سکی!" اور روبینہ کی آواز رقت نے حلق میں ہی دبوچ لی۔

یہ کیفیت اعصاب زدگی کا عروج ہے۔ جذبۂ خودکشی مرض کی آخری اسٹیج ہے۔ میں اُسی روز سے روبینہ کے متعلق چوکنا ہو گیا ہوں۔ میجر کو بھی خبردار کردیا ہے۔ ایک روز اپنے ایک دوست سے جو نفسیاتی معالج ہے، ذکر کیا تو وہ جھٹ بولے "مینٹل ہاسپٹل میں داخل کرادو۔" میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میرے سامنے پاگل خانے کی تصویر آگئی۔ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی میں مینٹل ہاسپٹل کے نام سے گھبرا گیا۔ میں روبینہ کے معاملے میں جذباتی ہوتا جارہا ہوں۔ ڈاکٹر مر رہا ہے، باپ جاگ اٹھا ہے۔

مجھے روبینہ اور سمینہ کے والدین ابھی تک جیتے جاگتے، ہنسی مذاق کرتے دکھائی دے رہے ہیں۔ بڈھوں کا یہ جوڑا بڑا زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھا۔ وہ مجھ سے بہت مانوس تھے۔ اِدھر میں اُن کے گھر میں داخل ہوا، اُدھر روبینہ کی ماں میری مخصوص کافی کا پیالہ اٹھائے پہنچ گئی۔ دونوں میاں بیوی ذرا ذرا سی باتوں اور ہلکے پھلکے مذاق میں مجھے ایسا الجھالیتے کہ میں کبھی محسوس ہی نہ کرتا تھا کہ میں اس دنیا میں تنہا ہوں۔ دو سال ہوئے دونوں یکے بعد دیگرے فوت ہوگئے۔ روبینہ کا باپ حرکتِ قلب بند ہونے سے اور اس کی ماں اس کے غم میں۔ اب سوچتا ہوں کہ انہوں نے مجھ پر کونسا اتنا بڑا احسان کیا تھا کہ جب انہیں یاد کرتا ہوں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ یہی ذرا ذرا سی باتیں ہی تھیں جو وہ میرے ساتھ کیا کرتے تھے لیکن ان کے مرجانے کے بعد یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میری زندگی سے نکل گئی ہیں تو ان کی جگہ ایک بہت بڑا خلا رہ گیا ہے۔ ایک عظیم حادثہ!

ماں باپ کی وفات کے بعد روبینہ اور سمینہ تنہا رہ گئی تھیں، نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ سمینہ کی عمر سترہ برس تھی اور روبینہ کی تئیس برس۔ خدا نے بھائی بھی تو کوئی نہیں دیا تھا انہیں۔ میجر شہباز کی ان سے دُور کی رشتہ داری تھی۔ اس کے والدین نے دونوں لڑکیوں کے سر پہ شفقت کا ہاتھ رکھ دیا۔ ویسے وہ کسی کی محتاج نہ تھیں۔ زمینوں کی بے اندازہ آمدنی تھی جس میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا جارہا تھا۔ شہباز، سمینہ اور روبینہ بچپن سے اکٹھے کھیلتے چلے آرہے تھے۔ میری کوٹھی کے در و دیوار میں ان کے بچپنے کے قہقہے ابھی تک محفوظ ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دیوار کے پلستر کو ذرا سا چھیلوں تو ان کی ہنسی سنائی دے گی! میں انہیں بچپن اور لڑکپن میں اکٹھے کھیلتے دوڑتے دیکھتا رہا۔ جوان ہوتے دیکھتا رہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کی شوخ ہنسی شرمیلی مسکراہٹ بن گئی۔ ایک وہ وقت تھا کہ وہ آپس میں گتھم گتھا ہو کر لڑتے تھے، روٹھتے تھے، ہنستے تھے اور اب یہ وقت کہ ان کی آنکھیں نظروں کے ہلکے سے تصادم سے بھی جھک جاتی تھیں اور ہونٹوں پر شرم و حجاب کی مسکراہٹ کھیل جاتی تھی۔ جب وہ جوان ہوئے تو میں نے ان کو اکٹھے گھومتے ٹہلتے دیکھا تھا۔ شہباز اور سمینہ رہ رہ کر روبینہ کو ایسی نظروں سے دیکھا کرتے جیسے التجا کر رہے ہوں: "روبینہ! ذرا کی ذرا ہمیں تنہا چھوڑ دو، مان جاؤ آپا! ایک ثانیے کے لئے ہی سہی۔ دیکھو، ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب تر ہونے کو تڑپ رہے ہیں، ایک دوسرے کے لمس کو محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ تم عشق پیچاں کی اوٹ میں ہوجاؤ، بس ذرا کی ذرا۔ دیکھو تو! میرا ہاتھ کس طرح شہباز کے ہاتھ کی طرف کھنچا جارہا ہے۔ تمہاری موجودگی سے رُک رہا ہے۔ مجھے شہباز کو چھو کر تو دیکھ لینے دو۔ وہ ایک ہفتہ بعد چلا جائے گا۔ پھر ہم اکٹھی بیٹھا کریں گی۔ شہباز کی باتیں کریں گی۔"

لیکن روبینہ اس خاموش التجا کو نہ سمجھ سکی یا نظر انداز کرتی رہی۔ وہ بھی آخر جوان تھی۔ شاید اس کی نظریں بھی سمینہ سے یہی درخواست کر رہی ہوتی تھیں۔ وہ بھی شاید اس کوشش میں ہوتی تھی کہ اس کا ہاتھ سمینہ سے پہلے شہباز کی انگلیوں سے اُلجھ جائے۔ ایسے میں مجھے اکثر خدشہ ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو ان دونوں بہنوں کے درمیان آیا ہوا یہ مرد وجۂ پیکار بن جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دو حسین جوانیاں جذبۂ رقابت سے ٹکرا کر بھونڈا سا حزنیہ بن جائیں۔ حادثے ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ زندگی چوری چھپے، انجانے میں آرزوؤں اور اُمنگوں کے مہکتے پودوں کو سینچتی رہتی ہے اور باد و باراں کا پہلا ہی جھونکا ان کی کمر توڑ کر انہیں زمیں بوس کردیتا ہے۔ مرجھانے کے لئے، گلنے سڑنے کی خاطر!

میں نے یہ حسین کھیل اکثر دیکھا ہے۔ شہباز اور سمینہ کی بے قراری اور بے کلی کو میں بہاں پیار کی نظروں سے دیکھ دیکھ کر مسکرا اٹھتا تھا وہاں یہ رنج بھی ہوتا تھا کہ یہ کھیل حزنیہ نہ بن جائے لیکن ایسا نہ ہوا۔ لڑکیوں کے ماں باپ ایک ایک کر کے مرگئے۔ ان کے مرنے کی دیر تھی کہ روبینہ کے رویّے میں عجیب و غریب

تبدیلی آگئی۔ وہ سمینہ کی ماں بھی بن گئی باپ بھی۔ کیا مجال سمینہ کو یکے بعد دیگرے دو چھینکیں آجائیں اور روبینہ ملازم کو میری طرف نہ بھگا دے کہ اسے نزلہ ہو رہا ہے، دوائی بھیج دیجئے۔ وہ رات تو میری زندگی کی یادگار رات بن گئی۔ جب روبینہ رات دس بجے میرے ہاں بھاگی ہوئی آئی، گھبرائی ہوئی، ہانپتی کانپتی۔ کہنے لگی "چچا جان! سمینہ کو بہت تیز بخار آ رہا ہے۔ ٹمریچر سو تک پہنچ گیا ہے"۔ مجھے اس کی گھبراہٹ پہ پیار بھی آیا اور ہنسی بھی کہ سو درجے کا بخار بھی بھلا اتنی گھبراہٹ کی بات ہوتی ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ سمینہ کے ہنسنے کھیلنے کے دن ہیں۔ ناچتی کودتی رہتی ہے۔ بد پرہیزی کر لی ہوگی یا کوئی گرم سرد چیز کھالی ہوگی۔ میں روبینہ کے ساتھ گیا تو سمینہ کو اچھی بھلی حالت میں پلنگ پر لیٹے ہوئے پایا۔

"معاف رکھنا ڈاکٹر چچا!" سمینہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "آپا تو یوں گھبرا جاتی ہیں جیسے میرا دم نکل رہا ہے۔ بلاوجہ آپ کو تکلیف دی"۔

"نہیں ڈاکٹر چچا!" روبینہ ذمہ دارانہ سنجیدگی سے بولی۔ "اس کی نہ سنئے، اتنی بے پروا لڑکی ہے کہ صحت کا ذرّہ بھر خیال نہیں۔ دیکھو تو ذرا چہرہ کس طرح دہک رہا ہے۔ کہتی ہے میں اچھی ہوں۔ آپ دیکھئے اور انجکشن لگا دیجئے۔ ان دنوں ملیریا کا بھی خطرہ ہے"۔

میں کیس کو جانتا تھا۔ اس کے مطابق دوائی دی تو روبینہ بری طرح پیچھے پڑ گئی کہ میں انجکشن لگا دوں۔ بصد مشکل اسے سمجھایا کہ ابھی انجکشن کی نوبت نہیں آئی اور نہ آئے گی ہی۔ یہ دو گولیاں صبح تک اسے ٹھیک کر دیں گی۔

"چچا جان!" سمینہ ہنستے ہوئے بولی۔ "آپا کا تو دل گردہ جیسے ہے ہی نہیں۔ اتنے کمزور اعصاب بھی کیا"۔

"تم چپ چاپ لیٹی رہو"۔ روبینہ نے اسے کندھوں سے دھکیل کر لٹاتے ہوئے کہا۔ "اور باتیں کم کرو ورنہ ٹمریچر اور تیز ہو جائے گا"۔ اور اس نے سمینہ پر چادر ڈال دی۔ "اتنی بڑی ہو گئی بچوں کی سی حرکتیں نہ چھوڑیں"۔

باتوں باتوں میں خاصی دیر ہو گئی۔ سمینہ سو گئی تھی لیکن روبینہ اس طرح بے چین تھی جیسے خطرے کا الارم سن لیا ہو۔ میں اس کی گھبراہٹ کو دیکھتے ہوئے اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ روبینہ کو اس کیفیت میں دیکھ کر مجھے رنج ہوا کہ بے چاری ماں باپ کے بغیر ذرا ذرا سی اونچ نیچ سے بے چین ہونے لگتی ہے۔ چھوٹی بہن کی محبت تو اپنی جگہ ہے لیکن یہ خوفزدگی؟ میں نے اسے تسلی دی اور یہ بھی کہا۔ "روبینہ! شہباز کے والدین اور میں تم دونوں بہنوں سے بے خبر نہیں۔ یوں گھبرا نہ جایا کرو۔ تمہارے ابا اور امی نہیں رہے تو کیا ہوا، میں جو ہوں!"

"چچا جان!" روبینہ کے آنسو نکل آئے۔ "یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میں محسوس کرتی ہوں کہ سمینہ کی دیکھ بھال کی ذمہ دار صرف میں ہوں"۔ اس کے بعد روبینہ نے کچھ ایسے انداز سے باتیں کیں جیسے وہ بائیس تئیس برس کی کم عمر لڑکی نہیں جیسے وہ ایک ہی جست میں عمر کے پچیس تیس سال پھلانگ کر بوڑھی ماں بن گئی تھی جو اپنے اکلوتے بیٹے پر جان نثار کر رہی ہو۔ اس کے اس روپ نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے سر پر رکھ دیا لیکن کچھ کہہ نہ سکا۔ مجھ پر رقت طاری ہو گئی تھی۔ روبینہ بہت ساری باتیں کر کے ذرا خاموش ہوئی اور بولی۔ "شہباز جون کے آخر میں چھٹی پر آ رہے ہیں۔ میں نے ان کے والدین سے بات کر لی ہے۔ شہباز سے بھی پوچھ لوں تو اچھا ہے۔ میں یہ رشتہ انہی گرمیوں میں طے کر لینا چاہتی ہوں"۔

"کس کا رشتہ؟"

"سمینہ اور شہباز کا"۔

میں نے روبینہ کو گہری متجسس نظروں سے دیکھا۔ میں اس کے خدوخال میں اس عورت کو تلاش کر رہا تھا جو جذبۂ رقابت سے رقیبہ کا منہ نوچ لیتی ہے، مرنے مارنے پہ تل جاتی ہے۔ ایک محبت کی خاطر سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ میں نے روبینہ کو اس کی سفید مانگ سے لے کر ٹھوڑی سے نیچے تک یا پھر ایک کان سے دوسرے کان تک دیکھا۔ مجھے نہ وہ عورت نظر آئی نہ اس کا ہلکا سا تاثر ہی ملا۔ میرے سامنے روبینہ بیٹھی تھی۔ اپنے اصلی روپ، بڑی بہن کے روپ، ماں کے روپ اور باپ کے روپ میں۔

جون کے آخر میں شہباز چھٹی پر آیا۔ سمینہ کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ میں نے دیکھا اب روبینہ ان دونوں کے ساتھ کم نظر آتی تھی۔ اگر وہ اس کے پاس آکر بیٹھیں بھی تو روبینہ انہیں دھکیل دھکیل کر باہر سیر کو یا لان میں ٹہلنے کو بھیج دیتی تھی۔ ایک دن میں دونوں بہنوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ شہباز آ گیا۔ ذرا سی گپ شپ ہوئی تو روبینہ بول اٹھی: "شہباز! ہم نے لان کے اس طرف یوکلپٹس کے نئے درختوں کی پوری قطار لگا دی ہے۔ پودے

جڑیں پکڑ گئے ہیں۔ دو تین سال بعد دیکھنا کیا منظر بن جائے گا۔ سمینہ، جاؤ شہباز کو لے جاؤ۔ دیکھو تو ذرا شہباز کی کیاریاں ہیں۔" وہ اٹھنے پر آمادہ نہ تھے لیکن روبینہ کے اصرار نے انہیں باغیچے میں بھیج ہی دیا۔ سمینہ اور شہباز تو شاید یہی کچھ چاہتے تھے لیکن میری موجودگی اور روبینہ کی وجہ سے شرما رہے تھے۔ جب وہ چلے گئے تو روبینہ کی نظریں نیم وا دروازے پر جم گئیں اور وہ چند ثانیے وہیں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی جیسے اس کی نگاہیں شہباز اور سمینہ کو ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغیچے میں ٹہلتے اور سرگوشیوں میں باتیں کرتے دیکھ رہی تھیں۔

روبینہ بہت پیاری بچی ہے۔ یہ اسے اعصاب زدگی سے نکال کر دم لونگا۔ گزشتہ رات میں نے نماز کے بعد دعا کی۔ "یا خدا! میرے بوڑھے، مرجھائے ہوئے دماغ میں ذرا سی دیر کے لئے جوانی کی رمق پیدا کر دے تاکہ میں کوئی بہتر نسخہ، کوئی موثر دوائی سوچ سکوں۔ روبینہ بہت دکھی ہے۔ سمینہ کی موت کے غم نے اسے جلا دیا ہے۔"

ایک دن شہباز پچھلے پہر چائے کے وقت روبینہ کے ہاں آگیا مجھے معلوم ہوا کہ روبینہ نے لان میں صرف دو کرسیاں بچھوائیں اور چائے بھی صرف دو کے لئے بھجوائی۔ شہباز کو یہ منظر دیکھ کر غصہ آگیا۔ اندر آیا۔ دیکھا روبینہ باورچی خانے میں خانساماں کا ہاتھ بٹا رہی ہے۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے روبینہ؟" شہباز نے قدرے غصے میں کہا۔ "تم ہمارے ساتھ چائے نہیں پیوگی؟ یا میں یہ سمجھ لوں کہ یہ دو کرسیاں اور دو پیالیاں اشارہ ہے کہ میں یہاں نہ آیا کروں! میں تو یہی کچھ سمجھ سکا ہوں کہ دو پیالیاں صرف دونوں بہنوں کے لئے ہیں اور میری یہاں کوئی جگہ نہیں۔"

روبینہ کو صدمہ ہوا۔ وہ بوکھلا سی گئی، بولی: "نہیں شہباز! اس کا یہ مطلب ہے کہ تم اور سمینہ تنہائی میں اطمینان سے چائے پیو۔ میں نے تمہیں موقع دیا ہے۔" روبینہ کسی خیال سے ہنس پڑی اور شگفتہ لہجے میں بولی۔ "جاؤ، بھاگ جاؤ، سمینہ انتظار کر رہی ہوگی۔"

"چلو میرے ساتھ!" شہباز اسے بازو سے پکڑ کر لان کی طرف لے گیا۔ راستے میں اسے کہا۔ "روبینہ! مجھے شک ہوتا ہے کہ تم مجھ پر طنز کر رہی ہو۔ یا اشاروں اشاروں میں کسی شکایت اور ناراضگی کا اظہار کر رہی ہو۔ ایسی حرکتیں اچھی نہیں ہوتیں۔"

روبینہ اسے کچھ اور نہ کہہ سکی۔ شہباز نے بتایا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پہ کچھ ایسی کیفیت تھی جیسے وہ خود بھی اس حرکت کا مطلب سمجھنے میں غلطی کر رہی تھی۔

روبینہ اور شہباز کے والدین نے شہباز اور سمینہ کے رشتے کی بات طے کر لی لیکن شادی نہ ہو سکی۔ شہباز کی خواہش تھی کہ وہ دسمبر میں چھٹی پر آئے گا اور شادی کر کے ہنی مون مری پر برفباری کے دنوں میں منائے گا۔ روبینہ نے اسے کہا بھی کہ یہ محض فوجی بے تکا پن ہے لیکن وہ قائل نہ ہوا۔ سمینہ سے بات ہوئی تو اس نے بھی شہباز کی ہاں میں ہاں ملا دی، محض اس لئے کہ یہ شہباز کی خواہش تھی، یہ جانتے ہوئے کہ وہ دبلی پتلی نازک سی لڑکی ہے، بعید نہیں کہ وہ مری کی برفباری میں اکڑ ہی جائے لیکن اسے شہباز کی ہر بات اور ہر خیال سے پیار تھا۔ چنانچہ شادی دسمبر تک ملتوی کر دی گئی۔

جون کا مہینہ تھا۔ لاہور تنور کی طرح تپ رہا تھا۔ شہباز نے ایک دن روبینہ اور سمینہ سے پوچھا کہ وہ چاہیں تو چند دن مری میں گزار آئیں۔ روبینہ نے کہا۔ وہ دونوں چلے جائیں۔ وہ خود جانے کو تیار نہ ہوئی لیکن دونوں نے اسے رضامند کر لیا اور مری کے لئے تیار ہو گئے۔ ان کی رخصت کا منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ پچھلی گرمیوں ہی کا تو ذکر ہے جیسے کل پرسوں کی بات ہے کہ ان کی کیڈیلیک میری کوٹھی کے سامنے آرکی تھی اور میں نے بھاگ کر ان کا استقبال کر کے انہیں وہیں سے الوداع کہی تھی۔ روبینہ اور سمینہ، شہباز کے ساتھ کس قدر بھلی لگ رہی تھیں۔ میں نے ان کی کار کو کوٹھی میں سے نکلتے دیکھا۔ پھاٹک تک چلا گیا۔ دیکھا کہ کار گرد کی اوٹ میں چھپی چلی جا رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ پندرہ بیس روز تک واپس آجائیں گے پھر بھی مجھے ان بچوں کے جانے کا افسوس سا ہوا۔ مجھے گرد کے اس بادل پر غصہ سا آنے لگا جس نے ان کی کار کو چھپا لیا تھا۔ میں اسے ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ میں کچھ جذباتی سا ہو گیا تھا، شاید بڑھاپے کی وجہ سے، تنہائی کے احساس سے یا شاید اس لئے کہ تینوں میرے ساتھ بہت مانوس تھے۔

اس گرد نے سمینہ کو نگل لیا۔

ان کے جانے کے ایک ہفتہ بعد شہباز کے والد بھاگتے ہوئے میرے ہاں آئے۔ ان کے ہاتھ میں تار تھا جو شہباز نے مری سے دیا تھا۔ انگریزی کے ادھورے سے فقرے نے مجھے ہلا کے رکھ دیا، لکھا تھا: "سمینہ مر گئی ہے، میت لا رہے ہیں!" دوسرے دن سمینہ کی میت لاہور لائی گئی اور شام کو دفنا دی گئی۔ معلوم

ن مری سے چند میل دُور سیر کو گئے۔ ایک تنگ سے پہاڑی رستے پر جا رہے تھے کہ سمینہ کو ایک گھنی جھاڑی کے پھول بہت پسند آئے اور وہ پھول
لپکی۔ اُس نے پاؤں ایک پتھر پر رکھا تو پھسل گیا۔ ایک چیخ سنائی دی، پھر خاموشی! جھاڑی کے پیچھے دیوار نما ڈھلان تھا جو ایک کھڈ میں جا کر
نا۔ اُونچے اور گھنے درخت نے اس کھائی کو چھپا رکھا تھا جو خاصی گہری تھی۔ سمینہ سر کے بل گری تھی۔

دس کوٹھیوں کی اس کالونی پر موت کی افسردگی چھا گئی۔ ہر آنکھ پُرنم، ہر چہرہ مرثیہ خواں تھا۔ روبینہ کا تو یہ حال تھا کہ بے چاری کو چپ لگ گئی تھی جیرا
، ہم سب نے اسے تسلی دے کر سنبھالا۔ چھ ماہ بعد شہباز نے مجھ سے ذکر کیا کہ وہ روبینہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ تجویز خوب تھی۔ دونوں کو
محبت تھی اور دونوں کے دکھوں کا مداوا شادی ہی ہو سکتا تھا۔ ہم نے ان کا بیاہ کر دیا۔ شادی کے ایک ہی ماہ بعد شہباز نے میرے ساتھ
مزاج کا ذکر کیا۔ میں نے اسے دیکھا، چند باتیں کیں۔ پھر میں اس کے متعلق روزانہ رپورٹ لینے لگا۔ وہ کھوئی کھوئی اور چپ چاپ سی رہنے لگی تھی۔
بات بلاوجہ غصے میں آجاتی تھی۔ خدا کا شکر ہے شہباز ذہین آدمی ہے۔ بات کو سمجھ لیتا ہے۔ ورنہ وہ روبینہ کی نفسیاتی حالت کو سمجھے بغیر نہ جانے
تنی بار اُس سے الجھ پڑتا۔ ہوتے ہوتے آج روبینہ کی یہ حالت ہو گئی ہے کہ میں ایک خطرہ محسوس کرنے لگا ہوں۔ اس کی بیماری کا یہ چھٹا مہینہ ہے
ے شہباز تبدیل ہو کر لاہور آگیا ہے۔

میں نے آج میجر شہباز سے کہہ دیا ہے بلکہ اسے خبردار کر دیا ہے کہ وہ روبینہ کو مری نہیں تو ایبٹ آباد ہی لے جائے لیکن وہ مری پہ رضامند نہیں
ج اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ ایبٹ آباد چلا جائے گا۔ امید ہے روبینہ آب و ہوا اور جگہ کی تبدیلی سے سنبھل جائے گی۔

—— دو دن گذر گئے ہیں۔ خدا کرے شہباز کو چھٹی مل جائے اور یہ دونوں جلدی ایبٹ آباد چلے جائیں۔

میجر شہباز کو چھٹی نہیں ملی۔ کہتے ہیں کہ انتظامی حالات ٹھیک نہیں۔ ہو سکتا ہے ان کے عملے کو یہاں سے کسی دوسری جگہ بھیج دیا جائے۔
"ڈاکٹر صاحب!" میجر شہباز نے آج ہی مجھے پھر مجھے کہا ہے۔ "کیا یہ ممکن ہے آپ روبینہ کو مری لے جائیں کم از کم تین ماہ کے لئے؟ آپ کے جانے
ہ ہو گا کہ وہ آپ کے زیرِ مشاہدہ اور زیرِ علاج رہے گی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ آپ کے تمام اخراجات میرے ذمے ہوں گے۔"
میں روبینہ کی خاطر کیا کچھ کرنے کو تیار نہیں۔ میجر شہباز نے غالباً میرے دل کی آواز سُن لی ہے۔ میں نے اسے راضی کر لیا ہے کہ میں روبینہ کو مری
ے گا لیکن اپنے خرچ پر۔ صرف دوائیوں کی قیمت لوں گا۔

●

مری آئے ہوئے ہمیں تیسرا دن ہے۔ میری امیدیں ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ مری کی عطر بیز اور روح افزا ہواؤں میں جیسے وہ بات ہی نہیں رہی
نزع کی حالت میں پہنچا ہوا مریض بھی ایک بار انگڑائی لے اٹھتا تھا۔ چیل کے جھنڈوں میں، وادیوں کے اُوپر نیچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے بادلوں
سپید بوجھل ٹکڑوں میں جیسے وہ زندگی ہی نہیں رہی۔ مری پہنچتے ہی روبینہ کے ردِ عمل نے مجھے احساس دلا دیا تھا کہ اسے یہاں لا کر میں نے غلطی
اس کی طبیعت اسی شام بگڑنا شروع ہو گئی تھی۔ اب بات بات میں سمینہ کا ذکر لے آتی ہے۔ مری کی جانفزا ہریالی میں اسے ہر سُو سمینہ نظر آنے لگ گئی ہے۔
ذکر یوں کرتی ہے جیسے وہ اس کا خاوند نہیں، بس خدا سی جان پہچان ہے۔ پرسوں سے ضد کر رہی ہے کہ وہیں چلے جہاں سمینہ گری تھی۔ میں اسے دانستہ
ٹالے جا رہا ہوں۔ روبینہ کے زخم تو ہرے ہیں ہی، خدشہ ہے کہ اُس بھیانک جگہ کو دیکھ کر کھل نہ جائیں۔ یہ خدشہ بھی ہے کہ وہ رات کو اکیلی ہی نہ نکل
سی رات بارہ بجے کے بعد میری آنکھ کھلی۔ دیکھا روبینہ کا بستر خالی تھا۔ میں باہر نکلا تو اسے لان میں بیٹھے ہوئے پایا۔ ذہنی حالت دگرگوں تھی۔ بڑی مشکل سے
لایا۔ مرض کی اس اسٹیج پر نہ سختی کام کرتی ہے نہ چاپلوسی۔ دونوں صورتوں میں مریض کا ردِعمل تکلیف دہ ہوتا ہے۔
کل رات روبینہ نصف شب تک روتی رہی۔ کئی راتیں گذر گئی ہیں، لاہور بھی اور یہاں بھی، وہ سوئی نہیں۔ رات بھر لیٹے لیٹے اپنے آپ سے باتیں
ہے۔ گذشتہ رات وہ روتی رہی اور اس نے بعض باتیں ایسی کی ہیں جو دیوانگی کی بیّن علامت ہیں اور مجھے ایک عظیم خطرے سے آگاہ کر رہی ہیں۔ کل
اپنے معالج دوست کو خط لکھ کر ہدایات لوں گا۔ میرا علم جواب دے رہا ہے۔ میں نے وعدہ کر لیا ہے کہ کل صبح روبینہ کو ساتھ لے کر اُس مقام تک جاؤں گا،
نہ گری تھی۔ روبینہ کے آنسوؤں اور غیر معمولی مزاج نے مجھے یہ وعدہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کل صبح صبح اسی طرف جانے کا پروگرام طے ہو گیا ہے۔

روبینہ سو گئی ہے۔ آج بہت دنوں بعد سوئی ہے۔

مجھ سے بہت سخت لغزش ہوئی ہے جس کا خمیازہ میں ہی نہیں میجر شہباز بھی بھگت رہا ہے۔ میں نے ایک داؤ کھیلا تھا لیکن یہ نہ جان سکا۔ ڈاکٹر ہوتے ہوئے نہ جان سکا، کہ میں روبینہ کی جان کی بازی لگا رہا ہوں۔ موت نے بازی جیت لی ہے۔ میں ہارے ہوئے جواری کی طرح لاہور اپنی کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھا ہوا ہوں۔ میرے سامنے سرسبز لان بچھا ہے۔ شام کا وقت ہے۔ لان میں بچے کھیل رہے ہیں، کود رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، ہنگامہ برپا کر رہے ہیں لیکن اس ہنگامے میں اب وہ موسیقیت نہیں رہی وہ چاشنی نہیں رہی کیونکہ اس میں سے روبینہ اور سمینہ کی آوازیں نکال لی گئی ہیں۔ دونو بہنیں اُس قبرستان میں پہلو بہ پہلو سو رہی ہیں جس میں سے، برسوں گذرے، میں نے برات گذرتی دیکھی تھی۔ میری زندگی میں سے دو براتیں گذر گئی ہیں دبے پاؤں، آہستہ آہستہ، سر جھکائے ہوئے ——— سمینہ اور روبینہ!

میں نے میجر شہباز کو ساری بات سنا دی ہے۔ اس کا پُر شباب چہرہ جو ایک سال پہلے رستے بستے آنگن کی طرح بارونق اور شگفتہ تھا اب مری مری، مٹی مٹی یادوں کی آماجگاہ بن گیا ہے۔ میں نے اسے بتایا ہے کہ:

"مری پہنچنے کے چوتھے روز روبینہ کے اصرار پر میں صبح صبح اس کے ساتھ اس تنگ پہاڑی راستے پر گیا جہاں سے سمینہ گری تھی۔ جب ہم دونوں وہاں پہنچے تو جس پتھر سے سمینہ پھسلی تھی روبینہ اس سے چھ سات گز دُور رک گئی اور کہنے لگی: "چچا جان! سمینہ وہاں سے گری تھی۔ اس وقت بھی یہ درخت ویسا ہی تھا، یہی پھول تھے، یہی رنگ تھا؟" روبینہ کہہ رہی تھی، میں سُن رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ایک عرصہ بعد اس کے چہرے پر سکون کی جھلک نظر آئی۔ وہ نارمل حالت میں باتیں کر رہی تھی۔ مری امیدوں نے انگڑائی لی۔ مجھے اپنی فتح قریب محسوس ہوئی۔ میں نے روبینہ کو وہیں بٹھا دیا اور جو کچھ اس کے دل میں تھا کہہ ڈالنے پر آمادہ کرنے لگا۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں تھی، اُس روز وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔ وہ میرے پاس ہی بیٹھ گئی۔ وہ جوں جوں باتیں کرتی جا رہی تھی اس کے لب و لہجہ اور چہرے کے ایک ایک نقش میں مسرت اور سکون کا رنگ نکھرتا آ رہا تھا۔ مجھے اس کی یہ نارمل کیفیت غیر معمولی معلوم ہوئی۔ اس کا یوں اچانک ایک سال پہلے کی حالت کی طرف عود کر آنا مجھے معجزہ معلوم ہوا۔ اُس نے بہت سی باتیں کیں۔ میں نے اسے اپنی باتوں سے سہارا دیا تو وہ جذبات کی رَو میں بہنے لگی لیکن نہایت سکون سے۔ میں آخر پوچھ ہی بیٹھا۔ "روبینہ! آج تو تم بالکل تندرست ہو؟ اگر تم اسی حالت میں رہو تو میں چند دنوں میں ہی میجر شہباز کو مبارکباد کا تار بھیج دوں گا۔" وہ ہنس پڑی۔ یہ ہنسی بلاشبہ بڑی انوکھی تھی۔ میں نے ایسی ہنسی اس کے ہونٹوں پر کبھی نہ دیکھی تھی۔ میں چونک اٹھا۔ وہ کہنے لگی۔ "چچا جان! جب سے سمینہ مری ہے، میرا دل ایک انجانے خوف، ایک جلنے پہچانے جرم کی گرفت میں آگیا ہے۔ سمینہ کی موت کا خیال یا یوں کہیئے مرحومہ کی روح مجھ پر آسیب کی طرح سوار ہو گئی ہے۔ میرا ضمیر ایک احساسِ جرم کے بوجھ تلے کراہ رہا ہے ——— سمینہ کو میں نے دھکا دے کر کھائی میں گرایا تھا۔"

"کیا کہا؟" میں نے جیسے نیند سے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"میری باتیں سنتے جائیے چچا جان!" وہ اسی لہجے میں بولے جا رہی تھی۔ میرے استعجاب کو نظر انداز کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "آج مجھے جی بھر کے باتیں کر لینے دیجئے۔ ہو سکتا ہے مجھ پر ایسا پردہ پڑ جائے کہ باتیں تو باتیں آپ شاید اس پردے کے پیچھے میری ہستی کو بھی محسوس نہ کر سکیں۔ جس روز سمینہ یہاں گری تھی، اس سے دو روز پہلے میں سمینہ اور شہباز کو گھر چھوڑ کر اکیلی ہی گھوڑے پر سوار اس طرف آئی تھی، اسی راستے پر۔ میرے آگے آگے ایک انگریز مرد اور عورت جا رہے تھے۔ ان کا کتّا ان کے ساتھ بھاگتا دوڑتا جا رہا تھا۔ وہ ایک گلہری کے تعاقب میں بھاگا تو گلہری اس جھاڑی میں چھپ گئی۔ کتّا اس جھاڑی میں گھسنے لگا تو دوسرے لمحے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ انگریز نے بہت سیٹیاں بجائیں لیکن میں نے کتے کے نیچے گرنے کی آواز سن لی تھی۔ میں آگے بڑھ کر اور بلندی پر چلی گئی۔ پیچھے گھوم کر دیکھا تو مجھے یہ کھائی نظر آئی۔ خاصی گہری ہے۔ پھر دو روز بعد شہباز، سمینہ اور میں اس طرف آئے تو اسی مقام پر سمینہ پھول توڑنے کو جھاڑی پہ جھک گئی . ."

روبینہ کے لہجے میں ایک انوکھا اور بالکل ہی اجنبی رنگ اور انداز پیدا ہو گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پہ گہری سرخی چھا گئی تھی۔ آنکھیں جھاڑی میں الجھی ہوئی تھیں اور وہ تیزی سے سانس لے رہی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ میرا ذہن خالی تھا اور کسی خیال کو دبوچ لینے کا منتظر۔ روبینہ انجانے سے لہجے میں بولی۔ "میں شہباز کے ساتھ باتوں میں مصروف تھی۔ میں جانتی تھی کہ سمینہ کھائی کے منہ پر کھڑی پھول توڑ رہی تھی مجھے خیال ہی نہ آیا

کہ اسے کہہ دوں آگے نہ بڑھنا، گر جاؤ گی۔ میں نے اسے کیوں نہ روکا چچا جان؟ میں کیوں شہباز کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی تھی؟ کیوں؟ بتائیے نا ڈاکٹر چچا کیوں؟"

"کیونکہ تمہیں خیال نہیں رہا تھا کہ دو روز پہلے تم اس کھائی کو دیکھ گئی تھیں"۔ میں نے بات کو ذرا سمجھتے ہوئے کہا۔

"نہیں، نہیں۔ نہیں!" وہ سر کو زور زور سے ہلا کر کہنے لگی۔ "میں محسوس کرتی ہوں کہ میں نے دانستہ اُدھر سے منہ پھیر لیا تھا۔ شاید میرے اندر ایک عورت بیدار ہو گئی تھی۔ وہ عورت جو سمینہ کی رقیبہ تھی۔ وہ عورت جو شہباز کو چاہتی تھی۔ مجھے اس خوفناک کھڈ کا خیال کیوں نہ رہا تھا؟ میری سگی بہن میرے جگر کا ٹکڑا' موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ میں نے لپک کر اسے پیچھے کیوں نہ گھسیٹ لیا؟ میں نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ سمینہ خطرناک جگہ پر کھڑی آگے جھک رہی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ اس وقت میرے ذہن میں کسی قسم کی کش مکش نہیں تھی' کوئی خیال نہ تھا۔ دل میں کوئی ارادہ نہ تھا، کوئی جذبہ نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ میں شہباز کے ساتھ باتوں میں اس قدر محو ہو گئی تھی کہ سمینہ کو بھیانک غار کے منہ میں کھڑے دیکھ کر بھی اسے روک نہ سکی۔ میں شہباز میں کیوں مگن ہو گئی تھی؟ آپ کے علم نفسیات کے پاس اس کا جواب ہو گا۔ چچا جان! اگر نہیں تو اس کا جواب میرے رگ و ریشہ میں لکھا ہوا دیکھ لیجئے۔ یہ جواب میرے سینے میں پھیلا ہوا ہے اور اس نے ڈنک مار مار کر میرا وجود زہر سے بھر دیا ہے۔ میں نے ایک جرم کیا انجانے میں جس کی مجھے خبر نہیں تھی۔ پھر سمینہ کی آخری چیخ سنائی دی اور اس کے گرنے کی ہلکی سی آواز جو وادی میں مریل سی گونج بن کر ذرا کی ذرا کھنکی اور خاموش ہو گئی۔ ڈاکٹر چچا! مجھے یوں لگتا ہے کہ میں نے سمینہ کو خود گرایا ہے۔ شاید اس لئے کہ میں شہباز کو تمام عمر چاہتی رہی ہوں۔ میرا رواں رواں سمینہ کی رقابت میں جلتا رہا ہے۔ میرا دل بے خبری میں چوری چھپے، شہباز کی پوجا کرتا رہا ہے۔ جب سے سمینہ مری ہے، میں ایک جرم کے خیال کی گرفت میں آ گئی ہوں جو دن بدن تنگ تر اور سخت تر ہوتی گئی۔ میں اب اپنے آپ کو سزا دینا چاہتی ہوں۔ میں نے اپنی چھوٹی بہن کو موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے!"

میں قہقہہ مار کر ہنسا۔ یہ فتح کا قہقہہ تھا۔ میں روبینہ کی نفسیاتی حالت کو سمجھنا چاہتا تھا لیکن اس نے دل کی بات کو کبھی ظاہر نہ ہونے دیا تھا۔ اب اس نے کھل کر بات کی تو مجھے یوں لگا جیسے میں ایک ہفتے میں ہی اس کے دل و دماغ سے اس تلخ احساس کو نکال دوں گا۔ اور اسے بھلا چنگا کر دوں گا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کے یہ خیالات و جذبات سمینہ کی موت کے غم کی انتہا ہیں۔ اس کے لاشعور نے اسے غم کی انتہا تک پہنچانے کے لئے ایک وجہ پیدا کر لی ہے۔ میں خوش ہو کر روبینہ کا نفسیاتی تجزیہ کر ہی رہا تھا کہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور تیز قدموں کے ساتھ جھاڑی کے قریب پہنچ گئی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا ہوا اسے دیکھتا رہا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کہا: "آپ میرے جس خیال پہ ہنس پڑے ہیں وہ ایک سال سے مجھے خون رلا رہا ہے۔ میرا ضمیر میرے لئے ہر روز سزائیں تجویز کرتا ہے اور میں ہر روز بھاگ جاتی ہوں۔ میں دو تین بار اس کی گرفت میں آ گئی ہوں لیکن پھر بھاگ اٹھی ہوں۔ اب تاب نہیں رہی۔ میں شہباز کو سمینہ کی زندگی میں چاہتی رہی ہوں' لاشعوری طور پر ہی سہی اور سمینہ کا گر کر مرنا اسی کا نتیجہ ہے؟

روبینہ نے اسی پتھر پہ پاؤں رکھ دیا جہاں سے سمینہ پھسلی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "مجھے کیا حق حاصل تھا کہ میں سمینہ کے شہباز کے ساتھ باتوں میں محو ہو جاتی؟ ...... اور چچا جان! میں اعتراف کرتی ہوں کہ سمینہ کی زندگی میں جب میں اس کا رشتہ شہباز کے ساتھ طے کر رہی تھی، ایک رات میرے ذہن میں خیال آیا تھا، کاش! شہباز میرا ہوتا۔ بھٹکا ہوا یہ خیال جانے کہاں سے آیا تھا اور کہاں چلا گیا۔ شاید میری ذات میں ہی کہیں گھات لگا کر بیٹھ گیا تھا"۔ روبینہ یک لخت خاموش ہو گئی اور جھاڑی کی طرف دیکھنے لگی۔

میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ روبینہ پتھر پر رکھا ہوا پاؤں آگے سرکا رہی تھی' آگے کو جھک رہی تھی۔ جھاڑی اس کے بوجھ سے جھک گئی تھی۔ میں گھبرا کر اٹھا۔ صرف ایک سیکنڈ گذرا ہو گا۔ میں لڑکھڑایا۔ قدم چلا ہی تھا کہ جھاڑی جھک کر پھر اپنی جگہ پہ آ گئی۔ نیلے نیلے پھول لرز رہے تھے اور روبینہ ان کی اوٹ میں چھپ چکی تھی۔ ہمیشہ کے لئے!"

میں کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھا ہوا ہوں بچے لان میں کھیل رہے ہیں۔ آج وہ میری سٹیتھوسکوپ پر نہیں لڑ رہے۔ میں انہیں بلا کر کہنا چاہتا ہوں کہ آؤ بچو! میری سٹیتھوسکوپ توڑ دو۔ تینوں سیر بخیں توڑ دو۔ ان الماریوں میں سجی ہوئی بوتلوں اور شیشیوں کو توڑ دو اور ان کانچ کے ٹکڑوں کو میری راہ میں بکھیر دو۔ لیکن وہ میری ایک نہیں سن رہے۔ بچے ہیں کھیل رہے ہیں اور میں انہیں دیکھ رہا ہوں۔ کاش! یہ بچے کبھی جوان نہ ہوں!!

★

گولہ اندازی کا ایشیائی ریکارڈ توڑنے والے محمد اقبال
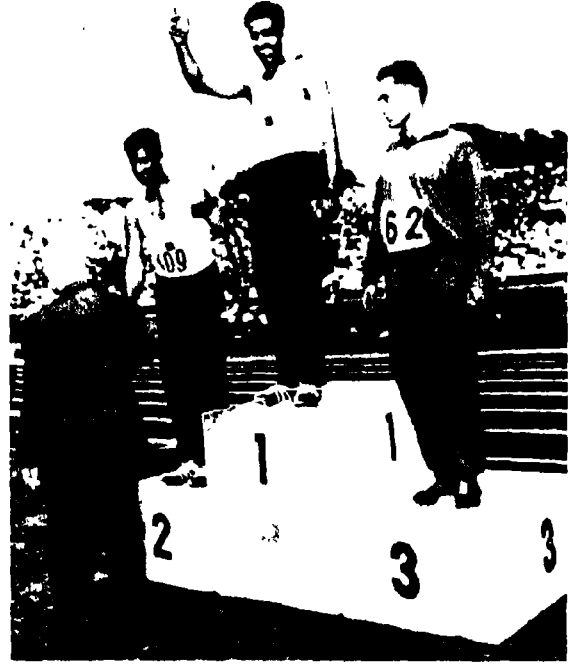
نیزہ اندازی کے مقابلہ میں حوالدار محمد نواز نے
پہلا انعام جیتا (طلائی تمغہ)

جاپان میں تیسرے ایشیائی اولمپک کھیل

۱۰۰ میٹر کی دوڑ میں اول آنے والے عبدالخالق
(طلائی تمغہ)
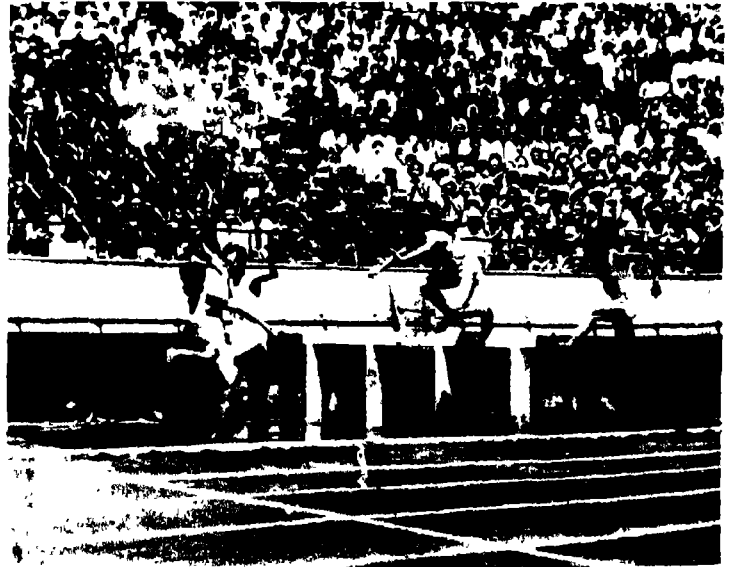
رکاوٹ والی لمبی دوڑ

(۳۰۰۰) میٹر کی رکاوٹ والی دوڑ جیتنے والے مبارک شاہ

نئے ریکارڈ:
(اوپر) نیزہ اندازی
(سامنے) گولہ اندازی

عبدالخالق
(بائیں طرف سے پہلے)
نے ۱۱۰۰ میٹر کی تیز دوڑ
۱۰۶۹ سیکنڈ میں جیتی !

اوّلین افسانہ:

صوما

آر۔ سیٹھی

رات کی تاریکی میں المناک اداسیاں رچ گئیں۔ ایک نامعلوم اور خاموش خاموش سا دباؤ چاروں طرف پھیل گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ اور چپ چاپ کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ چہرے کو کھڑکی کے نم شیشے سے لگا کر نگاہیں باہر پھیلا دیں۔ اسے مری آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہونے آیا تھا۔ اور وہ روز سینی ٹوریم کے اس چھوٹے سے کمرے سے رات کے وقت یہاں کھڑی ہو کر تاریکی میں دیکھنے کی عادی سی ہو گئی تھی۔ درختوں سے گھری ہوئی کوٹھیوں کی قطار کے پیچھے ہلکی ہلکی روشنی اسے بہت بھلی لگی، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے مسلسل آ رہے تھے۔ اس نے سیاہ شال کو اپنے کندھوں پر اچھی طرح ڈال لیا اور تاریکی میں جیسے کچھ تلاش کرتے کرتے کھو سی گئی اس کے دل نے ایک جھٹکا محسوس کیا اور پھر جیسے ڈوبنے لگا۔ اس سے بیاہ ہوئے اسے تین سال ہو گئے تھے۔ یہی بہار کے دن تھے جب وہ ایک سونی سی شام کو اس سے جدا ہو گئی تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود آخر اس کے [illegible] آ گئی تھی۔

سانولے سے رنگ پر معمولی سے نقش و نگار والی صوما بچپن ہی سے شدید احساسِ کمتری میں مبتلا تھی۔ وہ [illegible] مجبور ہو گئی تھی کہ کوئی [illegible] کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اسے بچپن سے ہی سمجھا دیا گیا تھا۔ کہ وہ اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے مقابلے میں بہت بدصورت ہے اسی لئے وہ ان سے [illegible] رہتی۔ وہ ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی اس کا باپ بڑا سنگدل تھا۔ وہ اکثر بات بات پر اس کی ماں پر ہاتھ چھوڑ دیتا تھا۔ وہ ہمیشہ اس کی [illegible] نگاہوں سے خوفزدہ رہتی اور اسے یقین تھا کہ اگر اس نے کبھی اسے کھڑکی کے پاس دیکھ لیا تو اپنے کہنے کے مطابق [illegible] کا گھونٹ دے گا۔

عمر کے ساتھ ساتھ احساسِ کمتری بھی بڑھتا گیا وہ گھنٹوں سوچتی رہتی جب بچپن میں اسے کسی نے منہ نہ لگایا تو جوانی [illegible] کچھ زیادہ ہی بدصورت ہو گئی تھی۔ پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسے چاہے جو اس کے لئے بیقرار ہو جو اس کی بدصورتی سے گھبرائے نہیں بلکہ [illegible] سے محبت کرے اس کے پرخلوص دل کی گہرائیوں تک پہنچ سکے۔ اسے یقین تھا کہ اس کا دل اس کے چہرے کی طرح نہیں ہے۔ بظاہر اس کی [illegible] خاموش خاموش، دھیمی دھیمی، آگ میں سلگ رہی تھی۔ لیکن حقیقت یہ نہ تھی۔ وہ بھی مسکرانا چاہتی تھی۔ اس کے قہقہے بھی فضا میں بکھرنے کے لئے بیتاب [illegible] مگر وہ بدصورت تھی اور مجبور۔

اپنے بھائی کی شادی پر اس نے نجمی کو دیکھا۔ وہ اس کے بھائی کا دوست تھا۔ ہنگامۂ شادی کے دوران پردہ کا کچھ ایسا خیال نہ [illegible] یوں لگا جیسے کوئی اسے گھور رہا ہو۔ وہ گھبرا کے آگے بڑھ جاتی۔ پھر کئی بار ایسا ہوا جیسے وہ رفتہ رفتہ ذہنی طور پر اس کے قریب آنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کے سارے جسم میں سب سے زیادہ متاثر کرنے والی اس کی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں میں سنجیدگی نہ جھلکتی تھی مسکراتی اور شریر آنکھیں شوخی اور چنچل پن سے [illegible] ابھی کوئی نیا شگوفہ چھوڑیں گی اور وہ حیرانی سے اسے دیکھتی آگے بڑھ جاتی۔ وہ ان نظروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی اصل میں احساسِ کمتری اس [illegible] تھا۔ ہر لمحہ اسے یہی گمان رہتا کہ نجمی کی مسکراتی آنکھیں اور مسکرا پڑیں گی۔ اور وہ قہقہہ لگا کر کہے گا۔ "او بدصورت لڑکی تو کون ہے؟ کیوں مجھے [illegible] مگر نجمی نے کچھ بھی تو نہ کہا۔۔۔۔ شادی کے ہنگاموں میں کسی کو ہوش نہ تھا اور وہ قریب ہوتے گئے اتنے قریب کہ اسے یوں لگا کہ جیسے وہ ہمیشہ سے نجمی کو جانتی [illegible] اسے اس کی ایک ایک ادا پسند تھی اور وہ اس میں کھو سی گئی۔ اچانک اسے احساس ہوا! کہیں نجمی اس سے کھیل تو نہیں رہا! وہ اس کو بہلا تو نہیں رہا؟ اور وہ اداس سی ہو گئی۔ بھلا اس جیسی بدصورت لڑکی کو کون پسند کر سکتا ہے؟ مگر نجمی تو ایسا نہ تھا۔ اس کی اپنے لئے اتنی چاہت دیکھ کر وہ سب کچھ بھول گئی۔

شادی ختم ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اتنی دور جا چکی ہے جہاں سے واپس آنا بہت مشکل ہے۔ اسے اپنے باپ کی سرخ آنکھیں دکھائی دیں اور مظلوم ماں کی صورت دکھائی دی جو کہہ رہی تھی "تم نے اچھا نہیں کیا صوما" اور وہ کانپ سی گئی۔ بھلا وہ یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ کوئی اس کی طرف انگلی اٹھائے۔ اس نے نجمی سے ملنا چھوڑ دیا اب شادی کی تقریب ختم ہو جانے کے بعد وہ اس سے مل بھی کیسے سکتی تھی۔ کیا بہانہ پیدا کیا جا سکتا تھا۔ اسے یوں لگا جیسے اس نے

خواب دیکھا ہو جس کی کوئی تعبیر نہ ہو۔

نجمی آزاد سا انسان تھا۔ وہ چاہتا تھا صوما کسی نہ کسی طرح اس سے مل لیا کرے۔ مگر وہ تو کبھی ایسا کرنے پر تیار نہ تھی۔ محبت تو محبت خاندانی عزت کی خاطر وہ اپنی جان تک دے سکتی تھی۔ اور اس نے اپنی محبت کا گلا یونہی گھونٹ دیا۔ اس نے نجمی سے کوئی بھی رابطہ رکھنا گوارا نہ کیا اور کھنچی کھنچی سے رہنے لگی۔ اسے اپنے جذبات پر پورا قابو تھا۔ اس نے فیصلہ کیا اب وہ اسے بھلا دے گی۔ یا کبھی کبھی بس دیکھ کر اس کے خیال کو دل سے بھلا کر یہ پہاڑ سی زندگی گذار دے گی۔ وہ ایسا کر سکتی تھی۔

نجمی طرح طرح سے اس سے ملنے کی کوشش کرتا۔ آخر اس نے مجبور ہو کر اسے ایک خط لکھا۔ ایسا خط جسے پڑھ کر وہ برہم ہو گئی اور جواب میں اسے بے حجاب قرار دیا۔

اس روز وہ ساری رات روتی رہی تھی۔ اگر اس نے نجمی کو اپنے سے دور رکھنے کے لئے یوں لکھا تھا تو اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ ۔ مگر نجمی بھی یہ لے سکتا ہے، یہ اس نے کبھی نہ سوچا تھا ۔۔۔

اس نے سوچا نجمی کتنا جھوٹا ہے۔ بھلا وہ اس قابل ہی کب تھی۔ کہ خود اس کی طرف مائل ہوتی۔ یہ تو وہی تھا جس نے اسے اپنی طرف مائل کرنے کے لئے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ گو کہ وہ اسے بے حد پسند کرنے لگی تھی۔

اور وہ پہلے والی خاموش صوما بن گئی تھی۔ اور نجمی نیلو کے بعد صفیہ سے رومان لڑانے کے بعد نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

دو سال گذر گئے دل میں سلگتی ہوئی آگ نے اسے بھسم کر دیا۔ اور جب اسے نجمی کی شادی کی اطلاع ملی تو سوزِ جاں جو وہ ایک عرصے سے محسوس کر رہی تھی اب برداشت سے باہر ہو گیا ۔۔۔۔ وہ بیمار رہنے لگی۔ مگر شمعِ حیات کا یہ گھلنا اسے دل سے پسند تھا جبھی تو اس نے دوا پینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ اس راز میں اس کی چچا زاد بہن طلعت ہی اس کی شریک تھی اور بس۔

مرنے کی سنسان وادی میں وہ اپنے دکھی دل کو لئے نجمی کو آخری دفعہ دیکھنے کی تمنا میں موت کا انتظار کر رہی تھی۔ حالانکہ اسے یقین تھا کہ وہ کبھی نہ آئیگا۔ ڈاکٹروں کی لاکھ کوشش کے باوجود اس کی صحت گرتی ہی گئی۔ اسی رات وہ سب اس کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس کا چراغِ زیست ٹمٹما رہا تھا اور ہر لمحے یہی گمان ہوتا تھا کہ اب گل ہو جائے گا۔ تمام عزیزوں کو تار دے گئے اور اکثر آ بھی گئے۔ جب بھی کوئی آتا تو وہ قدموں کی آہٹ پاکر تکئے سے سر اٹھا کر آنے والے کو ایک نظر دیکھتی اور پھر آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتی۔ اس کی نظروں میں ایک جستجو تھی۔ ۔ جب سب آ گئے تو اس نے ایک نظر طلعت کی طرف ڈالی۔ اور انتہائی بے بسی سے کہا: "کیا نجمی کبھی نہ آئیگا، طلعی"؟ ۔

طلعت کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر اس کے بالوں میں جذب ہو گیا اور اس نے بغیر کچھ کہے اپنا منہ پھیر لیا۔

پھر اس کی صحت اچھی ہونی گئی۔ سب مطمئن ہو گئے لیکن ڈاکٹر جانتے تھے کہ یہ اس کا آخری سنبھالا ہے اور وہ خود بھی جانتی تھی۔

پھر ایک سلگتی شام کو جب مشرق سے کالی گھٹائیں اٹھ آئی تھیں فضا میں ایک سکوت تھا۔ ایک بھیانک خاموشی، جیسے کسی بڑے طوفان کی آمد ہو۔ وہ خاموش لیٹی داستانِ ماضی کے اوراق اپنے ذہن میں الٹ رہی تھی۔ اس کے پرسکون چہرے پر دردِ دروں کے آثار تھے اس کی نظریں دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں اور آنسو ڈھلک ڈھلک کر اس کے گریبان کو تر کر رہے تھے۔

اسی شب ایک زبردست طوفان آیا۔ اور جب صبح ہوئی تو طلعت ایک دلدوز چیخ کے ساتھ صوما سے ہٹ گئی۔ اس کی بے نور مگر کھلی ہوئی آنکھیں دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اب بھی کسی کی آمد کی منتظر ہوں۔ شاید کوئی آ جائے، شاید!

★

ثقافت:

ہماری موسیقی کے مسائل

امین الرحمن

آزادی سے بہت پہلے برعظیم کی موسیقی کے مستقبل سے متعلق بہت سے ایسے مسائل ماہرینِ فن کے سامنے تھے جن کا موزوں حل تلاش کرنا ملک کی آئندہ تہذیبی زندگی کے لئے ضروری تھا۔ اور پاکستان بننے کے بعد تو اس نئے سیاسی خطے میں موسیقی کا مستقبل ایک خاصا پیچیدہ مسئلہ بن گیا ہے اور اس ضمن میں اتنے سوال پیدا ہو گئے ہیں جن کا موزوں حل اس وقت تلاش کرنا پاکستان کی آئندہ تہذیبی زندگی کے لئے بہت ضروری ہے۔ کیونکہ اگر مستقبل قریب میں پاکستان کی کوئی مشترکہ نئی تہذیب پیدا ہونے والی ہے، جو عمرانی لحاظ سے ناممکن نہیں، تو اس میں موسیقی کا مقام متعین کرنا موجودہ اہل الرائے طبقے کا ایک ناگزیر فرض ہے۔

خصوصاً اس لئے کہ دورِ جدید میں موسیقی کو ایک بین الاقوامی فن کی حیثیت حاصل ہو چکی ہے اور فونوگراف اور ریڈیو کی ایجاد کے بعد تو کسی بھی خطے کی موسیقی اس تک محدود نہیں رہی بلکہ زبان و مکان کی قیود سے نکل کر ایک عالمگیر فن کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ موسیقی قدیم اور جدید تہذیب کی تمام مسلّمہ قدروں میں ایک خاص اہمیت کی حامل ہے۔ اکثر ملکوں میں کسی پڑھے لکھے آدمی کا موسیقی سے نابلد ہونا اس کی تہذیبی زندگی میں ایک خاص کمی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کو تو عام طور پر موسیقی کا اچھا خاصا اصطلاحی علم ہوتا ہے چنانچہ وہاں کے ادیب، شاعر اور نقاد اپنی تحریروں میں موسیقی کی مصطلحات کو عام طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ادب یا آرٹ کی تنقید میں تو اکثر اوقات مغربی موسیقی کی بعض نہایت دقیق اصطلاحوں کا استعمال دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ کسی قوم کا دانشور طبقہ اپنی تہذیب کے مختلف پہلوؤں سے اچھی طرح واقف ہو اور قوم میں وہ کیفیت موجود ہو جسے تہذیبی رچاؤ کہا جاتا ہے۔ یہ تہذیبی رچاؤ مغربی قوموں میں بہت زیادہ ہے۔ ہم ابھی آغازِ سفر ہی کے مرحلے میں ہیں۔ اسلئے ہمارے یہاں ابھی وہ کیفیت پیدا نہیں ہوئی جو تہذیبی رچاؤ کے لئے ضروری ہوتی ہے پھر اس اعلیٰ شعور کو بھی ہنوز بروئے کار آنا ہے جو آرٹ کی ترقی کے لئے ناگزیر ہے۔

موسیقی ایک نہایت لطیف اور نازک فن ہے۔ اس کی تقریظ و تنقید اسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے کہ معاشرہ اس اعلیٰ شعور کی نفی نہ کرے جو تمام فنونِ لطیفہ کی ترقی کے لئے لازمی ہے۔ اسی طرح موسیقی کی لطیف ترین اور اعلیٰ ترین تخلیقات صرف اسی معاشرے میں ممکن ہو سکتی ہیں جہاں تہذیبی رچاؤ بدرجہ اتم ہو۔ اور اسی قسم کے معاشرے میں وہ دانشور طبقہ موجود ہوتا ہے جو اعلیٰ فن اور اس کی نمود کے تہذیبی اجزاء کا صحیح تجزیہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

پاکستان میں موسیقی کے جو مسائل درپیش ہیں ان کی نوعیت بڑی پیچیدہ ہے۔ مسائل کا تجزیہ کرنے کے لئے موسیقی کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت ہے، کیونکہ تقابلی مطالعے ہی کے ذریعے سے ہمیں یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہماری موسیقی کا نظام دنیا کی موسیقی کے دیگر نظاموں سے کس حد تک ترقی یافتہ یا پسماندہ ہے۔ اس ہی کے ذریعے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ہماری موسیقی جدید زمانے کے تقاضوں کو جو دراصل ایک صنعتی دور کے تقاضے ہیں، پورا کرنے میں کس حد تک کامیاب ہے یا ہماری موسیقی میں وہ کونسی کمیاں ہیں جن کی وجہ سے یہ ترقی کی ایک خاص حد پر پہنچ کر رک گئی ہے۔ اور اب اس میں وہ لچک موجود نہیں جو اپج اور اختراع کے لئے ضروری ہے۔

ان مسائل کی نوعیت دو گونہ ہے ایک تو تیکنکی جو سُروں، سُرتیوں، لے، تال اور ہئیت وغیرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ دوسرے
غیر تیکنکی، مثلاً برعظیم کی موسیقی کی تاریخ کا مطالعہ عمرانی پس منظر کے حوالے سے، اسلامی تہذیب و تمدن میں موسیقی کی حیثیت، یا نصاب تعلیم
میں موسیقی کی شمولیت وغیرہ۔ تیکنکی مسائل کا حل تو صرف ماہرین موسیقی ہی کر سکتے ہیں لیکن غیر تیکنکی مسائل کے حل میں وہ لوگ بھی حصہ
لے سکتے ہیں جو موسیقی کا تو کوئی خصوصی علم نہیں رکھتے لیکن ان علوم میں ضرور دخل رکھتے ہیں جن سے موسیقی کو الگ نہیں کیا جا سکتا مثلاً
طبیعیات، عمرانیات، جمالیات، نفسیات وغیرہ۔ موسیقی بیک وقت ایک علم اور فن ہے اور چونکہ اس کا تعلق طبعی دنیا کے اس مظہر سے ہے
جسے طبیعیات کی اصطلاح میں آواز یا صوت کہتے ہیں اس لئے موسیقی کا علم آواز کے جن اصولوں پر مبنی ہے ان کی صحیح صحیح توجیہ صرف ایک
ماہر طبیعیات ہی کر سکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ مغربی موسیقی کا موجودہ ارتقاء علم الاصوات کی ان گنت نئی دریافتوں کا مرہون منت ہے
جو یونانی حکیم فیثا غورث کے وقت سے لے کر جرمن ماہر طبیعیات ہیلم ہولٹس کے زمانے تک ہوئی ہیں۔ عمرانیات کا موسیقی سے بلاواسطہ
تعلق ہے۔ موسیقی دیگر فنون کے مانند معاشرے کی پیداوار ہے۔ اس کی ابتداء اور اس کی تاریخ کو قوم اور معاشرے سے علیحدہ نہیں
کیا جا سکتا۔ چنانچہ موسیقی کی ابتداء، اس کی نشو و نما، اور ارتقاء سے متعلق جتنے مسائل ہیں ان کا حل ماہرین عمرانیات ہی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح
موسیقی ایک فن ہے اور تقریباً سبھی فنون قرون وسطیٰ کی درسگاہوں سے لے کر موجودہ زمانے کی جدید ترین یونیورسٹیوں میں نہ صرف
پڑھائے جاتے رہے ہیں بلکہ پڑھائے جاتے ہیں۔ اس لئے کسی نظام تعلیم میں موسیقی کو ایک اہم فن کی حیثیت سے شامل کرنا ماہرین تعلیم
کے دائرہ اختیار میں ہے۔ اسی طرح موسیقی اور تعلیم کے تعلق کی وضاحت ایک ماہر تعلیم ہی کر سکتا ہے۔ گویا پاکستان میں موسیقی کے جو
مسائل اس وقت درپیش ہیں ان کے حل کے لئے نہ صرف ماہرین موسیقی ہی کی مہارت فن اور جودت طبع درکار ہے بلکہ ان علوم کے
خصوصی ماہرین کی بھی ضرورت ہے جن کا کم و بیش موسیقی سے بلاواسطہ تعلق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم کے دانشوروں اور اہل فکر
طبقہ نے موسیقی کی ترویج و ترقی میں ہمیشہ ایک خاص دلچسپی لی ہے اور اس کے مسائل حل کرنے میں خاص کوشش کی ہے۔ اس زمانے میں جو
علوم و فنون کی ترقی اور ترویج کے معاملے میں بین الاقوامی تعاون کا زمانہ ہے جن مغربی ملکوں میں موسیقی کو ایک بین الاقوامی سطح پر سمجھنے
اور پرکھنے کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ وہاں آپ کو بہت سے ایسے لوگ نظر آئیں گے جو اپنے ملک کی موسیقی کے ساتھ ساتھ کسی دوسرے
غیر ملک کی موسیقی میں بھی ماہرانہ دسترس رکھتے ہیں۔

موسیقی کو بین الاقوامی طور پر سمجھنے اور اس کی ترقی اور ترویج کے لئے "یونسکو" جیسا بین الاقوامی ادارہ بھی ایک خاص دلچسپی لے رہا ہے۔
یونسکو کی سرپرستی میں ایک بین الاقوامی مجلس موسیقی کا قیام بھی عمل میں آ چکا ہے۔ یہ بین الاقوامی مجلس موسیقی ۲۸ جنوری ۱۹۴۹ء کو "یونسکو ہاؤس"
پیرس میں قائم کی گئی تھی۔ اس مجلس موسیقی کے لائحہ عمل میں دنیا بھر کی ان انجمنوں، تنظیموں اور مجلسوں کے درمیان تعاون و اشتراک پیدا کرنا شامل ہے
جن کا مقصد موسیقی کی ترویج و ترقی ہے۔ اس مجلس موسیقی کو یونسکو کی تہذیبی سرگرمیوں کی وہ شاخ سمجھنا چاہیئے جس کا مقصد براہ راست موسیقی کو
بین الاقوامی طور پر ایک فن لطیف کی حیثیت سے ترقی دینا ہے۔ چنانچہ موسیقی کے نظریہ و عمل کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کے بارے میں اس بین الاقوامی
مجلس موسیقی کے سامنے کوئی واضح پروگرام نہیں۔ اس بین الاقوامی مجلس موسیقی کی پہلی عمومی اسمبلی ۳۰ جنوری ۱۹۵۰ء کو "یونسکو ہاؤس" پیرس میں
منعقد ہوئی تھی۔ اس پہلی عمومی اسمبلی میں بیس ملکوں کے مندوب شامل ہوئے تھے جن میں بعض اسلامی ملکوں (مثلاً ترکی، مصر اور ایران) کے
نمائندے بھی شامل تھے۔

اس عمومی اسمبلی کا خیر مقدم کرتے ہوئے یونسکو کے اس وقت کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر ٹوریس بودیٹ نے جو خطبہ پڑھا تھا اس کے کئی
اقتباسات ایسے ہیں جن کا مطالعہ کرنے سے ہمارے اہل الرائے اور دانشور طبقے کو موسیقی کے بارے میں ایک مغربی دانشور کے خیالات معلوم
کرنے، اپنے ہاں موسیقی کی تہذیبی قدر و قیمت کا احصار کرنے میں مدد ملے گی۔ اس خطبے کا آغاز یوں ہوتا ہے:

"موسیقی جو الفاظ یا تصورات کی مرہون منت ہوئے بغیر اظہار کی ایک شکل ہے، نمایاں طور پر ایک بین الاقوامی فن ہے۔ سیاسی

حد بندیوں اور زبانوں کی حدود سے الگ ہو کر موسیقی بیک وقت انسانی حساسیت کی ایک خاص وحدت کا نہ صرف ایک ثبوت ہے بلکہ اس کی ایک مجسم صورت بھی ہے۔ وہ لوگ، جو ایک دوسرے کی زبانیں نہیں سمجھ سکتے، بلکہ بعض اوقات اپنے درمیان ایک اس سے بھی بڑی خلیج حائل پاتے ہیں، وہ خلیج جو خیالات، اعتقادات، عادات اور تعصبات پیدا کرتے ہیں، اور جو اپنے اظہار کے لئے لفظوں سے کام لیتے ہیں، ہم آہنگ نغموں سے لطف اندوز ہونے کی ایک مشترک صلاحیت کی وجہ سے موسیقی کے ذریعے اپنے درمیان ایک بڑا قریبی تعلق محسوس کرتے ہیں اور ان ہم آہنگ نغموں کی کشش محض سے متاثر ہو کر ان گہرے پالیکن گہرے جذبات کا از سرِ نو تجربہ کرتے ہیں جن کی لفظوں کے ذریعے کبھی ترجمانی ہو ہی نہیں سکتی۔ مثال کے طور پہ اس بات میں کسے شک ہو سکتا ہے کہ اس سال تمام دنیا میں یوہن سبسطین باخ کی برسی کی جو تقریب منائی جا رہی ہے وہ ایک ایسے اجتماعی تجربے، اجتماعی ادراک اور اجتماعی احساس کے مترادف ہے جو صدیوں سے دنیا بھر کے لاکھوں کروڑوں مردوں اور عورتوں کی زندگیوں کا ایک اہم جزو رہا ہے"

اس اقتباس سے ہمیں موسیقی کے متعلق مندرجہ ذیل تین اہم نکات پر غور کرنے کا موقع ملتا ہے:

۱۔ موسیقی کو موسیقی سے یہاں موسیقی محض مراد ہے، اپنے اظہار کے لئے الفاظ یا دیگر قسم کے ذہنی تصورات کی ضرورت نہیں پڑتی۔

۲۔ موسیقی ایک بین الاقوامی فن ہے بلکہ ایک عالمگیر فن ہے۔

۳۔ موسیقی سے ایک خاص قسم کا اجتماعی تجربہ، اجتماعی ادراک اور اجتماعی احساس حاصل ہوتا ہے۔

یہ خیالات یقیناً طبعزاد نہیں اور نہ انہیں ایسے خیالات کے طور پر پیش ہی کیا گیا ہے لیکن وہ موسیقی کے متعلق مغربی دانشوروں کے اندازِ فکر کی غمازی ضرور کرتے ہیں۔ جس کا ہمارے یہاں فی الحال فقدان ہے۔

پاکستان میں موسیقی کے مستقبل کو امید افزا بنانے کے لئے لازم ہے کہ موسیقی کے ان پہلوؤں پر سنجیدگی سے اظہار خیال کیا جائے جو ایک طرف جمالیات سے تعلق رکھتے ہیں تو دوسری طرف نفسیات اور عمرانیات کے دائرے میں آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمارے معاشرے میں موسیقی کے بارے میں جو مختلف قسم کے تعصبات پھیلے ہوئے ہیں، انہیں دلائل و براہین سے دور کرنا بھی لازم ہے۔ سب سے اہم اور مقدم مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کے موجودہ معاشرے میں موسیقی کو وہ اہمیت کیوں حاصل نہیں جو اس فن لطیف کو دنیا کے دیگر مہذب ملکوں میں حاصل ہے۔ مقامی موسیقی کے بیرونی، خصوصاً مغربی، اثرات قبول کرنے کے علاوہ ایک بڑا اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہمارا رائج الوقت نظام کس حد تک موسیقی کے دیگر نظاموں پر اثر انداز ہو سکتا ہے یا ان سے اثر قبول کر سکتا ہے اور اگر موسیقی کو ایک بین الاقوامی فن تسلیم کیا جائے تو کیا اس میں پاکستان کے لئے کوئی اضافہ کرنا ممکن ہے؟

۱۹۴۷ء میں آزاد مملکت کا قیام محض ایک سیاسی اور جغرافیائی معنی نہیں رکھتا تھا بلکہ اس نام نہاد "مشترکہ تہذیب" کے بعض عناصر میں بھی اسی دو گونہ امتیاز کا مظہر تھا۔ جس کی ایک مثال برعظیم کی کلاسیکی موسیقی ہے۔ اس موسیقی کی نشوونما برعظیم کی تاریخ کے آغاز سے ہوئی ہے چنانچہ اس کے ابتدائی باشندوں کے ساتھ ساتھ بعد کی قوموں کو بھی اس میں دخل رہا اس کے باوجود اس فکر و خیال اور اصناف و اقسام نے وہ رنگ روپ اور آن بان نہیں پیدا کی تھی جو اسے بعد میں میسر آئی۔

مسلمانوں نے اپنے عہد حکومت میں اس موسیقی کی سرپرستی کی اور مسلمان موسیقاروں نے اس کی ہیئت اور روح میں ایسی ایسی تبدیلیاں پیدا کیں جن سے ان کے مخصوص احساس کے تقاضے پورے ہو سکیں۔ مشہور لورے کا یہ کہنا کہ "سیاسی حد بندیوں اور زبانوں کی حدود سے الگ ہو کر موسیقی بیک وقت انسانی احساس کی ایک خاص وحدت کا نہ صرف ثبوت ہے بلکہ اس کی ایک مجسم صورت بھی ہے" فلسفۂ موسیقی کی ایک ایسی حقیقت ہے جس کا مفہوم برعظیم میں آزادی سے پہلے کچھ اور تھا اور آزادی کے بعد اس کی کچھ اور ہی صورت ہو گئی۔ آزادی کے بعد برعظیم کے دونوں حصوں میں موسیقی کی وہ حیثیت نہ رہی جو اس سے پہلے تھی۔ مثلاً برعظیم کی تقسیم سے پہلے راگوں اور خاص کر دھرپدوں، خیالوں اور ٹھمریوں کے وہ بول جو ہندو دیومالا یا ہندوؤں کی تہذیبی روایات سے مستعار لئے گئے تھے ایک خاص عمرانی وجہ سے مسلمانوں کے لئے اجنبی نہ رہے تھے۔ تاہم اس کی ایک اجنبی

نظامِ تہذیب اور اندازِ فکر کے ساتھ وابستگی ضرور موجود تھی۔

آزادی کے بعد پاکستان کے نئے معاشری اور مخصوص تہذیبی حالات کی وجہ سے اس قسم کے بول پاکستانی مجالسِ موسیقی میں اوپرے اوپرے سے محسوس ہونے لگے اور اس میں کسی قسم کا تعصب کارفرما نہیں تھا بلکہ یہ بدلتے ہوئے حالات کا نتیجہ تھا۔ نئے ماحول اور اس کے تقاضوں کی وجہ سے پاکستان میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آرہا ہے جو سابقہ معاشرے سے بالکل مختلف ہے۔

گو پاکستان ایک نیا ملک ہے لیکن اس کی تہذیب و تمدن کا سلسلہ صدہا سال کو محیط ہے۔ اور ہمیں اس کی روشنی میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنا اور پوری شدت کے ساتھ بروئے کار لانا ہے۔ ہمارا راستہ ان روایات کی مزید جلا اور توسیع و ترقی ہے جو ہمارے پاس پہلے ہی سے موجود رہیں۔ ہم نے قرونِ وسطیٰ میں دورِ کہن کی بالکل ابتدائی موسیقی کی بنیاد پر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کی تھی۔ بلاشبہ برعظیم کی کلاسیکی موسیقی کی ترویج و ترقی میں مسلمان موسیقاروں کا بہت نمایاں حصہ ہے چنانچہ پاکستان میں اس کلاسیکی موسیقی کے ان پہلوؤں کو جن سے مسلمان موسیقاروں کا براہِ راست تعلق تھا نسبتہً زیادہ سراہا جانے لگا اور اس سے ایک خاص وابستگی کا اظہار کیا جانے لگا۔ مثال کے طور پر امیر خسرو کے "اختراع کردہ" راگ راگنیوں سے زیادہ دلچسپی لی جانے لگی۔ ریڈیو پر اور عوام کی مجالسِ موسیقی میں خیالوں کے وہ بول زیادہ گائے جانے لگے جن کا نفسِ مضمون کسی مسلمان بادشاہ یا کسی ولی اللہ کی تعریف ہو بعض حلقوں نے تو راگوں اور راگنیوں کے ناموں کو بھی بدل دینے کی تجویزیں پیش کیں اور ان کی جگہ ایرانی موسیقی کے "راگوں" یا "دھنوں" کے نام پیش کئے گئے مثلاً نوا، اصفہان، نوروز وغیرہ گرنتھوں کے راگ گکیہ بلاول کو تو اب پاکستان میں کوکب بلاول ہی کہا جاتا ہے۔ اور یہ کسی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ پاکستان کے نئے معاشرے کا جس کی بڑی سرعت سے تکمیل ہو رہی ہے، ایک جائز تقاضا ہے۔ یہ سب کچھ موسیقی ہی تک محدود نہیں بلکہ خود اردو زبان کے باشعور ادیب بھی اب ایسے الفاظ استعمال کرتے ہوئے گھبراتے ہیں جو خالص ہندو تہذیب اور معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً سماج، معاشرے کے معنوں میں یا جنتا عوام کے معنوں میں یا پرجا رعایا کے معنوں میں۔ چنانچہ پاکستان میں موسیقی کا تیسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ "کیا برعظیم کی کلاسیکی موسیقی میں ہیئت اور روح کے اعتبار سے ایسی تبدیلیاں کی جانی لازمی ہیں جن سے ہم اپنی کلاسیکی موسیقی کو اور بھی ممیز و منفرد بنا سکیں؟

یہ مسئلہ تیکنکی بھی ہے اور غیر تیکنکی بھی۔ ہماری کلاسیکی موسیقی جن اصولوں پر مبنی ہے ان کی وضاحت ان کتابوں میں ہے جو موسیقی کی تصانیف میں "گرنتھ" کہلاتے ہیں۔ یہ گرنتھ موسیقی کے ماہر پنڈتوں کی تصنیف ہیں اور ان میں سُروں، شرتیوں، راگوں، راگنیوں، تان پلٹوں، تالوں اور موسیقی کی تکنیک کے دیگر مسائل کی وضاحت ملتی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے بالعموم کلاسیکی موسیقی کے اصولوں پر پورا پورا اور ماہرانہ عبور رکھنا تقریباً ناممکن ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ امتدادِ زمانہ سے عملی رائج الوقت موسیقی اور گرنتھوں کی نظریاتی موسیقی میں ایک نمایاں فرق پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ چنانچہ مسلمان موسیقار، جو سنسکرت زبان سے نابلد تھے لیکن موسیقی کی مشق و عمل میں ماہرانہ دسترس رکھتے تھے، گرنتھوں کے اصولوں سے روگرداں ہوتے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان موسیقار راگوں اور راگنیوں کے صرف انہی اصولوں کو صحیح سمجھنے لگے جو انہوں نے اپنے استادوں اور بزرگوں سے زبانی سیکھے تھے یا جو ان کے خاندان یا گھرانے میں سینہ بسینہ چلے آتے تھے۔ ان کی روایت ایک زندہ روایت تھی اور ان کے اصول زندہ اصول۔ اب پاکستان میں جو مسلمان موسیقار گھرانے ہیں وہ کلاسیکی موسیقی کی مشق و عمل میں ماہرانہ دسترس تو ضرور رکھتے ہیں لیکن جہاں تک گرنتھوں کی موسیقی کو سمجھنے کا سوال ہے ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسے گرنتھوں کی نظریاتی موسیقی پر بھی پورا پورا عبور حاصل ہے یا وہ اس فرق کی ماہرانہ انداز میں تشریح کر سکتا ہے جو گرنتھوں کی موسیقی اور عملی موسیقی میں دکھائی دیتا ہے۔ اگر موسیقی کا کوئی ماہر نقاد اس باب میں تحقیقات کرے کہ مسلمان موسیقاروں نے گرنتھوں کے اصولوں سے کس حد تک روگردانی کی ہے اور اس کی وجہ کیا تھی تو اس سے ہمیں پاکستان میں کلاسیکی موسیقی کا ایک ایسا نظریہ وضع کرنے میں مدد مل سکتی ہے جس پر پاکستان کی آئندہ موسیقی کی بنیاد رکھنے میں آسانی ہوگی۔

پاکستان میں موسیقی کا ایک اور اہم مسئلہ وہ ہے جسے مسٹر تورے بودے نے اپنے محولہ بالا خطبے میں "اجتماعی تجربے، اجتماعی ادراک اور

اجتماعی احساس" کا نام دیا ہے۔ انہوں نے اس خطبے میں مشہور یورپی نغمہ نگار باخ کی برسی کا ذکر کرتے ہوئے بڑی اہم بات کہی ہے کہ "اس سال تمام دنیا میں یوہن سبسٹین باخ کی برسی کی جو تقریب منائی جارہی ہے وہ ایک ایسے اجتماعی تجربے، اجتماعی ادراک اور اجتماعی احساس کے مترادف ہے جو صدیوں سے دنیا بھر کے لاکھوں کروڑوں مردوں اور عورتوں کی زندگیوں کا ایک اہم جزو رہا ہے۔" اگرچہ ہم مشرق کے رہنے والوں کا اس تجربے سے براہ راست کوئی تعلق نہیں اور نہ وہ ہمارے مخصوص مشرقی احساس کے عمومی تقاضوں کو پورا کرتا ہے پھر بھی یہ بات اپنی جگہ بڑی اہم ہے کیونکہ جب بھی کسی معاشرے میں موسیقی کو مجموعی حیثیت سے اہمیت دی جائے گی تو اس کا لازمی طور پر یہ اثر ہوگا کہ موسیقی اس معاشرے میں تہذیبی طور پر ایک اجتماعی تجربے، اجتماعی ادراک اور اجتماعی احساس کی حامل بن جائے گی۔ باخ کی موسیقی مغربی لوگوں کے لئے جن میں عامی اور ماہر، نغمہ پسند یا غیر نغمہ پسند دونوں قسم ہی کے لوگ شامل ہیں ایک اجتماعی تجربے، اجتماعی ادراک اور اجتماعی احساس کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی طرح ہندو معاشرے میں مثال کے طور پر مالکونس، جے جے ونتی یا پوربی راگ میں موزوں کیا ہوا کوئی خیال جس کے بول ہندو دیو مالا، یا ہندو تاریخ پر مبنی ہوں، ایک اجتماعی تجربے، اجتماعی ادراک اجتماعی احساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف یہی راگ مالکونس، جے جے ونتی یا پوربی پاکستان میں نہ تو ایک اجتماعی تجربے کی حیثیت رکھتے ہیں اور نہ ایک اجتماعی احساس کی۔ ہمارے ہاں انہیں صرف وہی لوگ پسند کرسکتے ہیں جنہوں نے برعظیم کی کلاسیکی موسیقی کا ذوق اکتساب کیا ہو۔

موسیقی کے "اجتماعی تجربہ" ادراک یا احساس ہونے سے قطع نظر ہمارے یہاں موسیقی کی چند ایسی شکلیں ضرور ملتی ہیں جنہیں ہم انہیں معنوں میں ایک اجتماعی تجربے یا اجتماعی ادراک اور احساس کے مترادف سمجھ سکتے ہیں جن میں کلیسائی موسیقی کو مغرب میں سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ہر شخص قرآن مجید کی قرأت کو سن کر جس تجربے، ادراک یا احساس سے دوچار ہوتا ہے اُسے ہم ایک اجتماعی ادراک یا اجتماعی احساس کا نام دے سکتے ہیں، قرآن مجید کی قرأت جو فنِ تجوید کے اصولوں کے مطابق کی جاتی ہے دراصل نغمے ہی کی ایک شکل ہے جس میں ایقاع یا تال کا فقدان ہوتا ہے لیکن سُروں کا اتار چڑھاؤ موسیقی کے کسی نہ کسی اسکیل کے تابع ضرور ہوتا ہے۔ مثلاً قرأت کی بعض شکلیں راگ شدھ بلاول سے مستعار ہوتی ہیں، بعض میں بھیروں راگ کی شکل صاف صاف نظر آتی ہے اور بعض اوقات ان میں بلاول اور بھیروں کا ایک خوش آئند امتزاج نظر آتا ہے۔ اسی طرح ہمارے معاشرے میں غزل کو ترنم سے پڑھنا بھی ایک قسم کا اجتماعی احساس ہے۔ ترنم کو ہم موسیقی کی ایک نہایت ہی ہلکی پھلکی ابتدائی صنف سمجھ سکتے ہیں جس میں تال کی پابندی تو نہیں کی جاتی البتہ لفظوں کی مناسبت سے آہنگ اور سر پر زور دیا جاتا ہے۔ اسی طرح مرثیہ خوانی کا ترنم بھی اجتماعی احساس کی ایک مثال ہے۔ البتہ اگر صحیح معنوں میں ہمارے معاشرے میں موسیقی کا کسی قسم کا اجتماعی تجربہ، اجتماعی ادراک یا اجتماعی احساس ملتا ہے تو وہ ہمارے لوک گیت ہیں۔ ان لوک گیتوں کی سیدھی سادی موسیقی میں، جن میں کلاسیکی موسیقی کی ثقالت اور ردقت نہیں ہوتی، ہمیں ایک ایسا اجتماعی تجربہ، اجتماعی ادراک اور اجتماعی احساس ملتا ہے جو تورخم سے لے کر مکران کے ساحلوں تک ایک ہی ہے۔ ان لوک گیتوں کی موسیقی میں ہمیں اپنی روح کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ یہ موسیقی ہمیں اپنے دل کے زیادہ قریب محسوس ہوتی ہے!

غزل

جلیل قدوائی

کوئی بھی اب تو ہوش کا ساماں نہیں رہا
دامن تو جا چکا تھا گریباں نہیں رہا

غم یہ نہیں کہ درد کا درماں نہیں رہا
غم یہ ہے درد کا کوئی پرساں نہیں رہا

کیا قہر ہے کہ عشق سی دولت کا دہر میں
اب قدرداں تو کیا کوئی پرساں نہیں رہا

اللہ جانتا ہے کہ تیرے [illegible] ہوئے
صدمے اٹھائے [illegible] ہراساں نہیں رہا

کتنا ہوں تنگ کہ تیری مسرت کے واسطے
سب کچھ لٹا کے بھی میں پریشاں نہیں رہا

اب تک ہے دل میں داغِ محبت اسی طرح
ہاں یہ ضرور ہے کہ نمایاں نہیں رہا

دھیمی سی ایک لو ہے منور ہے شمعِ جاں
اب عشق کا وہ شعلہ فروزاں نہیں رہا

[illegible] رہی امید [illegible]
لیکن میں زندگی سے ہراساں نہیں رہا

کب وہ نہ میرے فن میں نمایاں ہوا جلیل
کب وہ مرے سخن میں غزل خواں نہیں رہا!

تابش دہلوی

تازہ تھی کچھ تو ہر افتاد اب کے
آپ بھی آئے بہت یاد اب کے

اپنی ویرانیِ خاطر معلوم
خلوتِ غم بھی ہے آباد اب کے

سازِ دل ٹوٹ گیا ہے شاید
لب پہ آئی نہیں فریاد اب کے

چارہ سازی پہ نہ الزام آجائے
زخم تو ہے دلِ ناشاد اب کے

بڑھ گئی دامِ بہاراں کی گرفت
خود اسیروں میں ہیں صیاد اب کے

مٹ نہ جائے یہ تصور بھی ترا
یاد ہے سلسلۂ یاد اب کے

زخم کر لیں کوئی ہم بھی پیدا
فصلِ گل سے ہے چمن ایجاد اب کے

سر اٹھانے کی بھی مہلت نہ ملے
رہ نہ جائے کوئی افتاد اب کے

خیر ہو خاطرِ غم کی تابش
ہم ہوئے تو ہیں بہت شاد اب کے

غزل

سراج الدین ظفر

وہ رند ہوں کہ فنا ہے مری بقا کی طرح
ابد کے دوش پہ ہوں پیرِ تسمہ پا کی طرح

غزالِ شہر کو دعوئے رَم تو تھا لیکن
کھڑے تھے ہم بھی سرِ رہگزر قضا کی طرح

حریم شوق میں ہے تیزیٔ نفس بھی گراں
معاملہ کسی گُل رُخ سے ہے صبا کی طرح

نہ جانے رات ہمارے سبُو میں کیا شے تھی
سحر کو روح سُبک سیر ہے ہوا کی طرح

صفائے سیم تناں سے اگر ہو شوقِ رجوع
اٹھو جماعتِ یارانِ با صفا کی طرح

شعورِ ذات کہاں تک کہ ہر زماں ہوں دگر
سیاستِ نگہِ چشمِ سرمہ سا کی طرح

مری طریقتِ رندی سمجھ سکا نہ کوئی
طریقِ زہد یہاں عام تھا وبا کی طرح

یہ نورِ عالمِ اسرار تو نہیں ہے کہیں
ہمارے جام میں کچھ شے ہے سیمیا کی طرح

دراز دست کہاں ہیں کہ راہِ عمر میں بھی
ہزار خم ہیں خمِ گیسوئے دوتا کی طرح

ہماری خلوتِ بادہ میں بر سرِ گل و مل
سکوت بھی ہے لبِ زمزمہ سرا کی طرح

نظر جو چہرۂ تحقیق پر کریں میخوار
نقابِ راز بھی اترے تری قبا کی طرح

میانِ بُعدِ ثلاثہ تھا عشق کا خطِ رقص
خطوطِ زاویۂ وقتِ برق پا کی طرح

نہ رند کوئی ظفرؔ کی طرح تھا رند خراب
نہ پارسا کوئی اس مردِ پارسا کی طرح

شفقتؔ کاظمی

بڑھا کچھ اور بھی احساسِ رنجِ تنہائی
ترے جمالِ دل آرا کی یاد کیا آئی

ترے کرم سے تھیں وابستہ جنکی امیدیں
نہ آئے یاد کسی دن تجھے وہ سودائی

شریکِ حال بجز بیکسی نہیں کوئی
مرے نصیب کی گردش مجھے کہاں لائی

حضورِ دوست رہی پھر بھی ناشنیدہ سی
وہ دل کی بات جو سو بار ہم نے دہرائی

نہ تھی کمی تری دنیا میں راحتوں کی مگر
مرا نصیب کہ میں نے متاعِ غم پائی

وہ تیرے قرب کی راہیں تلاش کیا کرتے
ازل سے جن کو مقدر تھا داغِ تنہائی

ہمیں خود اپنی وفا سے نہ شرمسار کرے
بحالِ غیر تری التفات فرمائی

چھٹی ہے تجھ سے رہ و رسمِ شوق یوں اے دوست
کہ مدتوں سے تری یاد بھی نہیں آئی

غمِ حیات سے ہرچند فرصتیں نہ ملیں
مگر بھلا نہ سکے تجھ کو تیرے سودائی

مٹا کے آج ترے التفات کی امید
تری گلی سے چلے ہیں ترے تمنائی

مری وفا کا صلہ اور کوئی دے نہ سکا
جفائے دوست ہمیشہ بروئے کار آئی

کریں گے عرض گزرتی ہے زندگی جیسے
ترے حضور میں قسمت اگر کبھی لائی

بڑے مزے میں گزرتی تھی زندگی شفقتؔ
خوشا وہ عہد کہ اُن سے نہ تھی شناسائی

ڈھاکہ ــــ میرے خوابوں کا شہر

عارف حجازی

دستور کے مطابق اسلام خاں نے نئے دار الحکومت کا نام مغل شہنشاہ کے نام پر جہانگیر نگر رکھا لیکن مقامی لوگ اسے ڈھاکہ ہی کہتے تھے۔ نام کی اصلیت کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی جا سکتی۔ ایک خیال یہ ہے کہ یہ نام "ڈھاکا سوری" سے نکلا ہے جو ایک دیوی کا نام تھا اور جس کا مندر بلال سین نے تعمیر کرایا تھا بعض کہتے ہیں کہ پہلے یہ شہر ڈھاک کے درختوں سے پٹا پڑا تھا اس لئے اس کا یہ نام رکھا گیا۔ ایک اور توجیہہ یہ ہے کہ یہ نام ڈھاک یا ڈھول کا مرہونِ احسان ہے۔ بات بڑی دلچسپ ہے جیسے یہ حقیقت نہیں افسانہ ہو۔ کہتے ہیں اسلام خاں نے شہر کی حدود مقرر کرنے کے لئے کچھ انوکھے طریقے اختیار کئے تھے۔ جب وہ اور اس کا عملہ یہاں وارد ہوا تو انہوں نے ڈھول بجنے کی آواز سنی۔ اس نے ڈھول بجانے والوں کو اور زیادہ زور سے ڈھول بجانے کا حکم دے کر تین سپاہی تین مختلف سمتوں میں روانہ کئے۔ جہاں ان تینوں کو ڈھول کی آواز سنائی دینی بند ہو گئی وہیں رک گئے۔ اور حد بندی کے لئے ستون نصب کر دیئے۔ بیشک یہ کہانی من گھڑت معلوم ہوتی ہے لیکن یہ ہندوستانی حکمرانوں کے ان طریقوں سے ضرور مطابقت رکھتی ہے جو وہ شہروں کی بنیاد رکھنے میں اختیار کیا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک مثال "بانیانِ شہر" (THE FOUNDERS) مصنفہ وڈرف میں ملتی ہے۔ وہ لکھتا ہے "قلعے سے ایک بہت بڑی توپ داغی جاتی تھی اور جہاں گولہ گرتا تھا۔ وہیں حد قرار پاتی تھی۔ سنہ ۱۶۹۰ء میں مرہٹوں نے انگریزوں کے ہاتھ اسی طریقہ سے زمین فروخت کی تھی۔ جتنی دُور گولہ جا کر گرتا اتنے فاصلہ کی زمین فروخت کر دی جاتی چنانچہ ایک بہت بڑی توپ لائی گئی اور سینٹ ڈیوڈ کا قلعہ قائم کیا گیا۔"

اسلام خاں نے ڈھاکہ کی ترقی میں کیا کچھ کیا، اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن اس شہر کو دار الحکومت بنا کر بنگال پر مغلوں کو قدم جمانے میں بڑی آسانی ہو گئی اور ان کا تسلط قائم ہو گیا۔ اس مہم کا آغاز ۱۵۷۵ء اور ۱۵۷۶ء میں داؤد قرانی پر منعم خاں کی فتوحات سے شروع ہوا اور ۱۶۲۷ء میں جہانگیر کے انتقال تک مغلوں نے یہاں بڑی مضبوطی سے قدم جمائے۔ اس وقت تک بنگال نے اپنی خود مختاری کھو دی تھی۔ مقامی زمینداروں کی طاقت ختم ہو گئی تھی اور وہ رفتہ رفتہ محکوم ہوتے جا رہے تھے۔ جاگیرداروں اور حاکموں کی قوت اکبر کے جرنیل مان سنگھ نے ختم کر دی تھی۔ لیکن یہ اسلام خاں ہی تھا جس نے شہنشاہ سے جاگیریں مستقل کروا کے امن و استحکام کی بنیادیں استوار کر دیں۔ پھر بھی قیامِ امن کی رفتار بہت دھیمی رہی۔ ۱۶۱۳ء میں اپنی وفات تک اسلام خاں کو ان جھنجٹوں سے اتنی فرصت نہیں ملی تھی کہ وہ شہری انتظام اور معاملات کی طرف پوری تندہی سے توجہ دے سکتا۔ پھر بھی اس نے اتنا ضرور کیا کہ قدیم افغان قلعہ دوبارہ تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ مغلیہ عہد میں شہر کے مغرب کی طرف اس جگہ واقع تھا جہاں اب مرکزی جیل ہے۔ یہاں اس نے ٹکسال بھی قائم کی اور انتظامی امور سے متعلق بعض محکمے بھی کھولے۔ اپنے صدر مقام کو ناگہانی حملوں کی زد سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے "دُلائی کھال"[1] کی مغربی شاخ اور بوڑھی گنگا کے درمیان ایک مصنوعی نہر کھدائی جو موجودہ "مٹ فورڈ ہسپتال" کے قریب دریا سے جا ملتی تھی۔ ان اہم اقدامات سے قطع نظر یہ خیال صحیح ہے کہ اس علاقہ کی منصوبہ بندی کی جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ بازاروں اور گلیوں کے گھماؤ پھراؤ سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیا دار الحکومت اپنے آپ ہی ترتیب پاتا گیا۔

قلعے میں چونکہ منتظمین افسروں کی رہائش بھی تھی اس لئے شہری محکموں کی عمارتوں کو قریب ہی تعمیر کرنا یقینی تھا۔ حاکم کے صدر مقام کے نزدیک ہی کسی جگہ ایک بازار بھی ضروری تھا (اب اس مقام پر سول لائنز اور حکومت مشرقی پاکستان کے صدر دفتر کی عمارت ہے) اس لئے بادشاہی بازار کے نام سے، جو آج کل "چوک" کہلاتا ہے، ایک بازار قلعہ اور دریا کے درمیان بنوایا گیا۔ دریا کے کنارے سوداگروں اور تاجروں نے اناج کے گودام اور دوسرے سامان کے ذخیروں کے لئے حویلیاں تعمیر کرائیں۔ شہر کے اس علاقہ میں "خوش باش" لوگ بھی اٹھ آئے جو مغربی حصہ کی طرف سے امراء کی دیکھا دیکھی چلے آئے تھے۔ انہی کے لئے

---

[1] قدرتی نہر

اس علاقہ میں زیادہ تر فارسی بولی جاتی تھی اور مغربی ایشیا کے طرز کے لباس اور رسم و رواج دیکھنے میں آتے تھے۔ چوک بازار میں تو عام آبادی کے لئے اشیائے ضرورت فروخت ہوتی تھیں اور بخشی بازار اور دیوان بازار وزراء، دیوان اور دوسرے اعلیٰ افسران کے لئے مخصوص تھے۔

اسلام خاں نے کوئی محل تعمیر نہیں کرایا۔ اس نے ایک "بجرے" کو ترجیح دی جو قلعہ کے مغرب میں چاندنی گھاٹ کے آخری سرے پر لنگر انداز رہتا تھا۔ یہ جگہ اس لئے منتخب کی گئی تھی کہ یہ قلعہ کے قریب تھی۔ یہ حصہ نسبتاً صاف ستھرا تھا۔ بنگلہ بازار سے ہوکر دریا بھی یہاں سے گزرتا تھا۔ یہ جگہ نہروں میں کھڑی ہوئی کشتیوں اور ان کے ہنگاموں سے الگ تھلگ تھی۔ حاکم نے مغربی سمت میں قیام کرنا اس لئے بھی پسند کیا تھا کہ عام طور پر بحری قزاقوں کا حملہ مشرق کی طرف سے ہوا کرتا تھا لہٰذا فوجی پڑاؤ بھی وہیں ہوتے اور امرا نے بھی دریا کے کنارے ہی نواب گنج کی طرف اپنے محلات تعمیر کرائے۔

یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ حاکم اپنے لاتعداد ہاتھیوں اور اونٹوں کی فوج کہاں رکھتا تھا لیکن "مہاوت ٹولی" نام کے مقام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ہاتھیوں کے محافظ اقامت گزیں تھے اور کچھ علاقے ان کے رہنے کے لئے مخصوص تھے۔ فوج کا بڑا حصہ کھل گاؤں، کاکریل، کاروان اور میرپور کے پڑاؤ میں رہتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ برطانوی حکومت سے لیکر اب تک جو پلاسی بیرکس ہیں وہ فوجوں ہی کے لئے استعمال ہوتی رہی ہیں۔ حاکم کے قلعے اور صدر دفتر محکمہ جاتِ انتظامیہ کی بنا پر یہ مرکزی چھاؤنی کی حیثیت سے بھی استعمال ہوتی رہی ہیں۔ جہاں حفاظتی دستے تعینات تھے۔

اگرچہ شہری و فوجی دستوں کی آمد ہی سے نئے دارالحکومت کا احساس پیدا ہو گیا تھا لیکن تیسرے حاکم "ابراہیم خاں" سے پہلے یہاں کی تجارت اور صنعت و حرفت کو کوئی خاص فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ پھر ڈھاکہ کے صنعتی اور تجارتی عروج کا دور شروع ہوا۔ پارچہ بافی کی صنعت کو شاہی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ ململ کی بہترین قسمیں آگرہ بھیجی جانے لگیں۔ ۱۶۱۶ء میں پرتگالیوں کی آمد سے ململ کی تجارت دنیا کے تمام ملکوں میں پھیل گئی۔ زمینداروں کو حاکم کے صلح پسندانہ طریقے کا سے بہت فائدہ ہوا اور ان کی جائدادیں بحال کر دی گئیں۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں سے بھی تجارت پیشہ لوگوں نے بے انتہا فائدہ اٹھایا اور عہدِ مغلیہ کے ڈھاکہ میں اپنی صنعتیں قائم کرلیں جو جنوب مشرقی ایشیا کے سب سے بڑے تجارتی مرکزوں میں سے ایک تھا۔ پھر اس شہر نے اتنی ترقی کرلی کہ بہت سی عالیشان عمارتیں بن گئیں جن میں حاکم کا محل بھی شامل تھا۔ یہ محل دریا کے مقابل کنارے پر بنایا گیا تھا۔

چوہدری کی تصنیف "بنگال بعہد اکبر و جہانگیر" میں ۱۶۲۷ء کے زمانہ تک کے رہن سہن کے طریقوں، عام زندگی اور مکانوں کی وضع کے متعلق مفصل معلومات درج ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت زندگی کا معیار اور طریقوں میں بہت تفاوت تھا۔ غریب لوگ گھاس پھوس کے مکانوں میں رہتے تھے جن میں معمولی بارش سے بھی بچاؤ نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹریونیر نے بڑھیوں کے گھروں کو بہت زیادہ تکلیف دہ بتایا ہے۔ یہ گھر بانس اور گوبر سے بنائے جاتے تھے۔ مینرک گل کہتا ہے کہ یہ بہت صاف ستھرے تھے اور تنکوں کی چٹائیاں اور چاراونس کے مٹی کے برتن ان کا آرائشی سرمایہ ہوا کرتے تھے۔ صحت و صفائی کا معیار بہت خراب تھا۔ عام طور پر لوگ خطرناک اور گھناؤنی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے تھے۔ متوسط طبقے کے لوگ جن میں بعض افسر بھی شامل تھے نسبتاً بہتر حالت میں رہتے تھے لیکن تعداد کے اعتبار سے متوسط طبقے کے لوگ قطعی طور پر غیر اہم تھے۔ بانس گوبر اور گھاس پھوس کے خستہ حال گندے جھونپڑوں اور مسلمان افسروں اور زمینداروں کے پرتکلف مکانوں کے درمیان جو فصل تھا اس کا پاٹنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ غریب اور مفلوک الحال طبقہ جس طرح رہتا تھا اس کا انداز الگ نظر آتا تھا۔ ڈھاکہ کی اصطلاح میں انہوں نے بانس اور ناریل کے بنگلے اور کوٹھیاں تعمیر کر رکھی تھیں جن میں سے بعض سہ منزلہ تھیں۔ مسلمانوں کے مکان عام طور پر بڑے کشادہ اور خوبصورت تھے۔ ان میں سے بہت سے چپٹی چھتوں کے تھے جن کے اردگرد باغات، سرسبز کنج اور روشیں ہوتی تھیں۔ بعض مکانوں میں نہانے اور مچھلیوں کے تالاب بھی ہوتے تھے۔ تمام گھروں میں حمام بھی لازمی تھے جو بنگال میں تعیش اور آسودگی کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ بعض مکانوں میں بڑے بڑے ہال بھی ہوتے تھے جنہیں خوبصورت، لچکدار جھولداریوں سے آراستہ کیا جاتا تھا اور ایرانی قالینوں سے فرش سجایا جاتا تھا۔

ان کے مقابلے میں ہندوؤں کے مکانات اتنے پرتکلف اور شاندار نہیں ہوتے تھے۔ چوہدری نے اپنی کتاب میں ایک امیر ہندو کے مکان کے کمرہ استقبالیہ کا نقشہ یوں کھینچا ہے:-

" مکان کا مالک ایک خوبصورت چھپر کھٹ پر براجمان تھا جو پیتل کی سلاخوں سے گھرا ہوا تھا اور ان کے سہارے ایک حسین شامیانہ

---

[1] ہاتھیوں کے محافظوں کے رہنے کا مقام

لگا ہوا تھا۔ چھپر کھٹ پر شاندار کپڑے کا بستر لگا ہوا تھا اور حریری گاؤ تکیے رکھے تھے۔ پانی کے کئی چھوٹے بڑے جگ اور پیتل کے برتن قریب دھرے تھے۔ اور دو غلام سرہانے کھڑے طاؤس کے پروں کا پنکھا جھل رہے تھے۔"

اسی طرح باقی کمروں کی بھی آرائش ہوتی تھی مگر آرائش کے سامان میں سب سے اہم اور بڑا حصہ یہی چھپر کھٹ ہوا کرتا تھا جس کو مچھر دانی اور دوسرے مختلف طریقوں سے آراستہ کیا جاتا تھا لیکن حقیقت میں آرائشی سامان کی چیزیں بہت کم ہوا کرتی تھیں۔ چھپر کھٹ اور بستر کے علاوہ برتن، جگ، آئینہ، سنگار کا سامان اور کھلونے ہی وہ چیزیں تھیں جو ہر رئیس کے مکان میں عام طور پر پائی جاتی تھیں مگر ان چیزوں کی سادہ دستکاری کو دیکھ کر بھی فنی خوبصورتیوں کا اظہار دل پر ایک گہرا اثر چھوڑتا تھا۔ اس زمانہ میں جبکہ گلے کی قیمت پانچ روپے سے لیکر دس روپے تک ہوا کرتی تھی، آرائشی سامان پانچ پانچ ہزار کا ہوا کرتا تھا اور بہت عرصے تک کام دیتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار روپے کے تو وہ بنگلے ہوتے تھے جہاں شاہی افسر قیام کرتے تھے۔ ایسے بنگلے کھاگر گھاٹ میں نظر آتے تھے۔

مستقل مکانوں کی طرزِ تعمیر ان سب سے علیحدہ تھی۔ چودھری کا کہنا ہے کہ بنگالی ادب میں پتھروں کے پکے مکانوں کا جو ذکر ملتا ہے ان کی حقیقت خیالی ہے پھر بھی اینٹیں نظر آجاتی تھیں۔ ان اینٹوں پر گوبر ملی سفیدی کی جاتی تھی اور بعد میں گوند۔ شکر اور دوسرا مرکب اوپر پھیر دیا جاتا تھا جس کی چکناہٹ سے چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ ان میں بعض پکے مکانوں کی چھتیں بھی پکی ہوتی تھیں لیکن زیادہ تر چھتیں گھاس پھوس ہی کی ہوا کرتی تھیں۔

باغ بڑے بڑے مکانوں کے لیے ایک لازمی چیز تھا۔ گویا باغ کے اندر مکان بنا ہوتا تھا۔ بہت سے باغوں میں نہانے کے تالاب بھی تھے اور بعض سوداگروں نے نو بڑے بڑے تالابوں کے بیچ میں ایک بلند سطح پر اپنے مکان بنا رکھے تھے۔ ان کا منظر لاہور کے قریب واقع جہانگیر کی شکار گاہ کا سا ہوتا تھا۔

سنہ ۱۶۲۴ء میں ابراہیم خاں کی شاہجہاں سے جنگ ہوئی۔ اس میں ابراہیم خاں مارا گیا۔ اس سے شہر کی خوشحالی اور عروج پر کافی برا اثر پڑا۔ ان غیر تسلی بخش حالات سے بحری قزاقوں کو لوٹ مار کرنے کا پھر موقع ہاتھ آگیا اور انہوں نے اپنے حملے شروع کر دیے۔ سنہ ۱۶۲۰ء میں وہ ڈھاکہ کے اندر گھس آئے اور قریب کے دیہاتوں میں خوب لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ سنہ ۱۶۲۴ء میں صرف شہر پر حملے جاری رہے۔ تین دن تک انہوں نے جی بھر کے لوٹا اور جگہ جگہ آگ لگا دی۔ نواب کے محل کو بھی تباہ کر دیا اور بہت سے لوگوں کو قیدی بنا کر اپنے ساتھ لے گئے۔

سنہ ۱۶۳۹ء میں جب شاہ شجاع کو یہاں کا حاکم مقرر کیا گیا تو شہر میں امن و خوشحالی کا پھر دور دورہ ہوا۔ بعد کی صدی میں فنِ تعمیر کے لحاظ سے ڈھاکہ میں بہت اضافے ہوئے۔ بڑا کٹرہ، چوک بازار کے قریب حسینی دالان اور عیدگاہ ان تعمیرات میں سے چند ہیں۔ عیدگاہ میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، عید کی نماز ہوتی تھی۔ یہ عمارت اس مقام پر تعمیر کی گئی جہاں کبھی شمال مغرب کی طرف دریا کا کنارا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ترقی کے عہد میں شہر عیدگاہ سے بھی آگے بڑھ گیا تھا جو پہلے تعمیر شدہ علاقہ کے مرکز سے نزدیک تھا لیکن جب سلطان نے اپنے سرکاری دفاتر راج شاہی منتقل کر لئے تو ڈھاکہ کی ترقی کی رفتار سست پڑ گئی۔

★ ★ ★

"ماہِ نو" میں اشاعتِ مضامین سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر ضروری حوالہ جات دینا ضروری ہے۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

(ایڈیٹر)

آئیے بہتر زندگی اختیار کریں

برسوں گذرے بچپن میں ایک نظم پڑھی تھی - جس کو سارے لوگ مل مل کے خوب زور شور سے لہک لہک کر پڑھا کرتے تھے - اس کا ایک مصرع اب بھی کبھی کبھی یاد آ جاتا ہے :

''لڑیں دو بلبلیں تو نالت بالخیر تو ہووے،،

اس '' ہووے،، کو جانے دیجئے —— آخر یہ اگلے وقتوں کی چیز ٹھہری—اور اس زمانہ میں لوگ زبان کے ایسے تیوروں ہی پر لوٹ پوٹ ہوتے تھے - دیکھنا تو یہ ہے کہ بات کیا کہی گئی ہے اور کس پتے کی بات — بلبلوں کو تو خیر ہم نے کبھی لڑتے نہیں دیکھا اور نہ آپ نے ہی کبھی دیکھا ہوگا - یہ شرف تو ہم انسانوں ہی کو حاصل ہے - جو اشرف المخلوقات کہلاتے ہیں اور لڑائی بھڑائی کی نت نئی صورتیں اور طریقے پیدا کرتے رہتے ہیں—ذرا سی بات ہوئی اور لگے چھری کٹاری ہونے بلکہ اب تو چھری کٹاری بھی بہت ہی دقیانوسی ہتیار بن کر رہ گئے ہیں — ہم توپ تفنگ بلکہ ایٹمی بم سے ادھر نہیں ٹھہرتے - میاں خوجی کی قرولی اور اس کا بات بے بات پر بھونک دیا جانا تو آپ جانیں خوجی مرحوم ہی کے ساتھ رخصت ہو گیا ہے :

''وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں،،

''ابنِ مریم ہوا کرے کوئی''

اب تو آستینوں میں خنجر چھپانے کی بجائے عام چھری بھی ہتیلیوں پر بے جھجک لئے پھرتے ہیں - یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے ، شاعری نہیں روزمرہ کا مشاہدہ اور تجربہ ہے ، انشاء پردازی نہیں امر واقعہ ہے — خبر نہیں دنیا کی آب و ہوا کی طرح انسانی طبائع بھی ایٹمی تجربوں سے متاثر ہونے لگی ہیں کہ ہم نئے دور کے لوگ بے حد سڑی اور چڑچڑے بنتے جا رہے ہیں اور بات بات پر دنگے فساد پر آمادہ ہو جاتے ہیں - لہذا ضرورت یہ ہے کہ انسانی مزاجوں کو جیسے بھی بن پڑے اعتدال پر لانے کی کوشش کی جائے - اور لڑائی جھگڑوں کو کم کیا جائے -

اسکے یہ معنی نہیں کہ ہم '' تو کون؟،، ''میں خواہ مخواہ،،—کا کردار ادا کریں اور آپ ہی آپ خدائی فوجدار بن کر کہنی سے ہر اکھاڑے میں کود پڑیں اور لگیں رعب گانٹھنے — بات تو سولہ آنے وہی ٹھیک ہے جو اوپر کہی گئی ہے — یعنی انسان بنے تو ''نالت بالخیر،، بنے اور جلتی پر تیل بننے کی بجائے، جو اکثر لوگ بنتے ہیں ، آگ پر پانی کا کام کریں - یعنی جو چیزیں بھڑک رہی ہوں انہیں ٹھنڈا کیا جائے - جب ہر طرف دکھ ہی دکھ نظر آئیں تو یہی اچھا ہے کہ کوئی سکھ کا

مفت کا جھگڑا — ''کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟،،

پیامی بن کر آئے - اور دکھتی رگوں اور جلے ہوئے دلوں پر مرہم رکھے - یعنی وہ سب دکھ درد کے ماروں کے لئے مسیحا بن کر آئے - اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ انسان سچ مچ مصیبت، بھوک ننگ، بیماری کے ستائے ہوئے ناچاروں کی دستگیری کرے لیکن ایک اور صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جہاں گڑبڑ، دنگے فساد، غنڈہ گردی وغیرہ کی کوئی صورت نظر آئے اور کوئی جھگڑالو آدمی نظر آئے جو پرامن شہریوں بلکہ یوں کہئے ہمارے جیسے دوسرے انسانوں، ہمارے بھائی بندوں کے امن و آرام کو جس طرح خاکستر کی طرح جلا کر خاک کردے، تو ہم اسکا مصالحانہ رویہ لے کر سامنے

یہ جو ہم کہ رہے ہیں محض خالی خولی باتیں نہیں جنہیں زبانی جمع خرچ کہا جا سکے - یہ تو بہت ہی ٹھوس اور اہم سے اہم باتیں ہیں - جن سے ہم اپنی زندگی کو سچ مچ بہشت کی طرح پرامن اور خوشگوار بنا سکتے ہیں - اپنے خاندانوں اور قبیلوں سے لیکر تمام قوم، اور گلی کوچوں، محلوں، شہروں سے لیکر تمام ملک تک اپنے خلوص اور محبت سے بغض، عناد اور شر و فساد کی وبا دور کرسکتے ہیں جس سے ہمارا تمام معاشرہ تندرستی و توانائی پیدا کر سکتا ہے -

ہم لوگ بیٹھے بٹھائے اور چلتے پھرتے لڑائی مول لینے کے عادی ہو چکے ہیں - ذرا سی بات

آئیں اور اس چنگاری کو بجھا ڈالیں قبل اسکے کہ وہ واقعی کسی عظیم نقصان کا باعث ہو -

اچھا شہری صرف وہی نہیں جو خود پرنجاں مرنج اور صلح کل کی پالیسی پر گامزن ہو - جو کسی کو دکھ نہ دے بلکہ وہ ہے جو اپنے ہم جنسوں میں صلح و آشتی پیدا کرے - ان کو واقعی بھائی بھائی بنانے کی کوشش کرے - سچ پوچھئے تو حقیقی معنوں میں انسان اور بہترین شہری وہ ہے جو رسم محبت کو عام کرنے کی پوری پوری جد و جہد کرے - ہمارے شاعر نے کیا خوب کہا ہے:-

"خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا"

ہوئی اور بھڑک اٹھے یا پھر دوسروں کے کہنے میں آ کر جوتم پیزار پر آمادہ ہوگئے - بعض میں تیل ڈال کر جلتی پر جمالو دور کھڑی تماشہ دیکھے - مگر ہم بی جمالو کے ہتھکنڈے جانتے ہوئے اسے بیچ میں جھگڑا ڈالنے ہی کیوں دیں ؟ کیوں نہ ہم خود ہی اسکو دفع بتادیں ؟ - اور ہاں، خود بھی کیا ضرور ہے کہ بی جمالو سے بنیں - اچھی بات تو یہ ہے کہ ہم نہ خود کوئی ایسا کھیل کھیلیں نہ دوسروں کو اس کا موقع دیں - اور تب کر سب خرابیوں کی جڑ کاٹ ڈالیں -

بات یہ ہے کہ بعض لوگ ہوتے ہی بلا کے جھگڑالو ہیں - یہ دیکھئے گلی میں کیسا جمگھٹا ہے -

یہ ہلڑ کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے۔ یہ زبانوں کے ساتھ ایٹمی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ چیختے چیختے محلے کو سر پر اٹھائے پہروں گذر چکے ہیں مگر کیا مجال جو یہ جنگ ایک پل کو بھی تھم جائے اور یہ خدا کی بندیاں ذرا دم لے لیں۔ نہیں یہ نو 'نان اسٹاپ، لکچر دے رہی ہیں۔ اور ایسا زوردار ڈرامہ دکھانے میں ماہر ہیں کہ کوئی فلم کمپنی بھی کیا دکھائے گی۔ کبھی کبھی تو یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ سارا دن کھائے پئے بغیر، کوسنے کاٹنے کے بعد دونوں نے ہتھیار نہیں ڈالے بلکہ یہ ترکیب کی کہ اپنی اپنی ٹوکریاں اوندھا دیں، گویا دونوں طرف سے "سیز فائیر،، ہوگیا — اور جنگ دوسرے دن پر ملتوی ہوگئی۔ دوسرے دن جونہی مرغے نے اذان دی یہ نیک بخنیں بھی اللہ کا نام لیکر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر کیا ہے، اللہ دے اور بندہ لے۔ واہی تباہی بکتے بکتے صبح سے شام ہوئی شام سے پچھلا پہرا۔ اسطرح یہ جنگ عرب کے " حرب داحس،، کی طرح مہینوں بلکہ برسوں جاری رہتی ہے۔ ان بھلی مانسوں سے کوئی پوچھے ایسی کٹاچھنی سے کیا فائدہ ؟ اور پھر یہی نہیں، بات بڑھتے بڑھتے تیغ و تفنگ تک جا پہنچتی ہے۔ اور باتوں کا معاملہ جانوں پر جا پہنچتا ہے۔ آخر اس فضول لذت پیکار سے کیا حاصل ؟ اگر یہی قوت کسی گھریلو کام دھندے، مجلسی خدمت یا قومی بھلائی پر صرف کی جائے تو کیا کچھ نہیں ہوسکتا ؟ اس طرح جانیں ضائع نہیں جائیں گی بلکہ بچیں گی، نشو و نما پائیں گی، ترقی کریں گی۔ ساری قوم خوش و خرم نظر آئے گی۔ اور اس کا نام دنیا بھر میں روشن ہوگا۔

تو بات یہ ہے کہ ہم سب کو خیر کا عنصر بننا چاہئے نہ کہ شر کا، فرشتوں کے دوست نہ کہ شیطان کے حلیف۔ یہ دیکھئے دو ہمسائے ہیں: دیکھنے میں بڑے شریف، بڑے با اخلاق مگر یہ کیا ؟ آئے دن زور شور سے وہ قیامت کا رن برپا رہتا ہے کہ ساری گلی محلہ دیکھے اور یہ سب کس لئے؟ ذرا ذرا سی معمولی باتوں اور سکر رنجیوں کے باعث — بچوں کی لڑائی بھڑائی، ردی کاغذ کا ذرا سا پرزہ ادھر سے ادھر پہنچ گیا یا دھول اڑکر ادھر سے ادھر جا پہنچی۔ بیٹرے تو پہلے ہی سے بیٹھے ہیں۔ بس ایکدم جھڑ گئی۔ اور دونوں طرف سے دھڑا دھڑ اور دھما دھم گولے پٹاخے چھوٹنے لگے۔ اب اچھے لوگوں کا کام یہ ہے کہ ان کو سمجھا بجھا کر راضی کردیں اور دو بھڑکتے شعلوں کے لئے شبنم ثابت ہوں۔ بس ایسی حکمت عملی اختیار کی جائے کہ جانبین میں صلح صفائی ہو جائے اور وہ غصہ تھوک کر آپس میں بھائی بھائی بن جائیں۔ نہ مار کٹائی تک نوبت پہنچے نہ مقدمے چلیں اور نہ روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہے۔

گلی کوچوں میں تو ایسی مصالحانہ پالیسی کی ضرورت ہے ہی مگر بازاروں میں اس کی اور بھی ضرورت ہے۔ یہاں تو ایسے لوگ جن کی نہ آپس میں جان پہچان ہے نہ لڑائی جھگڑے کی کوئی وجہ، آپس میں یونہی بھڑ جاتے ہیں۔ وہی کہ:

یہ بات کیا دم رفتار ہوتی جاتی ہے
کہ اپنے سائے سے تکرار ہوتی جاتی ہے

سائے سے تکرار !

شاداب جیسے گلاب
موسم گرما میں چلچلاتی دھوپ کی تپش اور لُو کے
مسلسل جھکڑ چہروں کی شادابی لے اُڑتے ہیں اور ہر ایک
پژمردہ و نڈھال نظر آتا ہے۔
حیاتین سے بھرپور شربت نورس کے استعمال
سے آپ موسم گرما میں بھی شگفتہ و بشاش رہ سکتے ہیں۔
احمد فروٹ پروڈکٹس
کراچی
(پاکستان)

"ادب کا مستقبل": ——— بقیہ صفحہ: (۹)

بناتا انسان کو مادی اشیاء سے لطف اندوز کرانا، جذبات اور فکر کو نئے راستوں پر لگانا اب ادب اور شعر کے بس کا نہیں رہا۔ لہٰذا ادب اب زندگی کے ان حقائق و غوامض کو پیش کر کے اپنا اور دوسروں کا وقت برباد کرے گا۔ اس کے لئے دوسری کتابیں موجود ہیں اب اس کا کچھ تفریحی اور کچھ دوسرے علوم کی مصاحبت کا کردار رہ گیا ہے۔

کیا یہ صحیح ہے کہ ادب کی اہمیت صرف اس وجہ سے تھی کہ وہ آگاہی کا دعوٰی کا دیتا تھا اور اب اس کا مستقبل اس لئے تاریک ہے کہ آگاہی بخشنے کا کام دوسرے علوم زیادہ باوثوق اور مکمل طور پر کرنے لگے ہیں اور ادب کے عقلی گڈے غیر معتبر اور اس کا طریق کار بچکانہ معلوم ہونے لگا ہے؟ یہ ایک پرانے خیال کی بازگشت ہے۔ حالی نے اپنے مقدمہ میں اس کو تفصیلاً بیان کیا ہے اور اس پر تنقید بھی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شعر کی ترقی صرف غیر متمدن قوموں میں ہوتی ہے۔ ان کا حال "میجک لنٹرن" جیسا ہے جس کی تصویریں رات کے اندھیرے میں چمکتی ہیں اور دن کے اجالے میں معدوم ہو جاتی ہیں۔ عقل اور علوم کی ترقی کے ساتھ لازم ہے کہ شاعری کا جادو بھی جھوٹا پڑ جائے۔ ادب کے زوال کو انسانی شعور اور آگاہی کا نتیجہ قرار دینے کے سلسلہ میں دو چار باتوں کی وضاحت لازم ہے:-

(۱) آگاہی اور شعور کا دور کب سے شروع ہوا؟ (۲) آگاہی و شعور کی کوئی تاریخ ہے یا نہیں؟

(۳) انیسویں اور بیسویں صدی کی ادبی و شعری تخلیقات کس مرتبہ کی ہیں؟

(۴) کیا ادب کی زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ بیس سال کے بعد کسی شیکسپیئر، حافظ یا غالب کو پیدا کرتا رہے؟

ان سوالات کا جواب نہ دینے سے خیالات میں بری طرح پراگندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہم انیسویں بیسویں صدی کے بیشتر مشاہیر ادب کا تذکرہ بھی کریں اور ادب کے زوال پذیر ہونے کا دعوٰی بھی تو یہ صریح تضاد بیانی ہوگی اور اگر شکایت صرف اتنی ہو کہ ادب نے گذشتہ گیارہ سال میں ایک بھی بڑا نام اور بڑی شخصیت نہیں پیدا کی، تو معاملہ کی نوعیت بالکل مختلف ہو جائے گی۔ اگر بات صرف دس گیارہ سال ہی کی ہے تو بڑے نام اور شخصیتیں نو لیاں تو نہیں ہوتیں کہ ہر فصل پر گئے اور ٹوکری بھر کر ٹو، لائے۔ ادب کی تاریخ کئی ہزار برس پرانی ہے۔ ادب کو بھی چھوڑیئے، انسانیت کی تاریخ دیکھئے۔

جس قسم کے ذہنی عدم توازن میں ہمارے ترقی پسند دوست مبتلا ہیں، اس کا اثر فکر کے کسی ایک گوشہ پر نہیں، پوری فکری زندگی پر پڑتا ہے۔ ان کا استدلال ہے کہ نیا فکری انقلاب بیسویں صدی کے تقریباً نصف تک ادب کے لئے بڑا دلکش اور باعث فیضان تھا لیکن تقریباً نصف کے بعد اس کا اثر بالکل بدل گیا ہے۔۔ اس مدت میں وہ ادب کے لئے سایۂ ہما ثابت ہوا، مگر تقریباً نصف کے بعد یہی سایۂ بوم بن گیا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اسلئے کہ "جب جاگیرداری سے سرمایہ داری میں تبدیلی کا زمانہ ختم ہو گیا اور تصادم کی اولیں لذت مٹ گئی یا کم ہونے لگی اور حالات ایک ڈھرے پر آنے لگے تو ادب کا قدم سست پڑنے لگا" اور پھر یہی لوگ اس کی توجیہ یوں بھی کرتے ہیں کہ "آواز کی رفتار سائنس کی تیز رفتاری کے سامنے بیل گاڑی کی رفتار بن گئی۔ راڈر نے دور کی چیز کو پاس کی چیز اور پنہاں کو عیاں بنا دیا۔ یہ عظیم اور حیرتناک تغیر اتنے وسیع پیمانے پر ہوا کہ ادب اسے انگیز نہیں کر پایا، وہ سراسیمہ ہو گیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان متضاد باتوں میں سے کس کو صحیح تسلیم کیا جائے؟

ادب کے مستقبل سے مایوسی کے اسباب دو وجوہ پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ بھی کہا گیا ہے کہ "ادب غریب تو معاشرہ کو ذہن دیتا یا دیا کرتا تھا۔ یہ بھی یک غلط مفروضہ ہے۔ یہ اسلئے کہا جاتا ہے کہ بعد میں یہ دکھایا جائے کہ اب معاشرہ کو ذہن دینے کا کام سائنس اور دوسرے علوم نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔

فلسفہ اور سائنس کی تجریدی سطح کے علاوہ ذہنی عمل کی ایک اور سطح بھی ہے جس پر انسانی ذہن اپنے محسوساتی اور جذباتی تجربوں کی قدر و قیمت متعین رتا ہے، ان کی لذت یا کرب کو سمجھتا ہے، ان کے خیر یا شر ہونے پر محاکمہ کرتا ہے۔ زندگی کے غم و نشاط، درد و داغ، سوز و ساز کا ادراک کرتا ہے۔۔۔۔
رف یہی نہیں ذاتی زندگی کے تجربوں کو پوری انسانیت کے بالمقابل رکھ کر ان پر غور کرنا، ان کی قدر و قیمت پرکھنا، ان کی معنویت کو دریافت کرنا اور پھر اسکے ربعہ ایک بھرپور زندگی کی صورت گری کرنا، یہ سب کام اسی ذہنی عمل کے ذریعہ انجام دئے جاتے ہیں اور اس عمل کا نتیجہ ہے ادب۔ انسانی ذہن کا یہ عمل ہم ہے یا غیر اہم، آپ اس کے نتیجہ کو سائنس یا فلسفہ سے چھوٹا قرار دیتے ہیں یا بڑا، یا برابر کا۔ اس کا فیصلہ آپ کریں۔ مذکورہ بالا بیان میں سائنس اور فلسفہ کو ادب ں شمار نہیں کیا گیا۔ پھر اس میں 'ذہن' جیسے وسیع المفہوم لفظ کا محل ہی کیا ہے؟ ادب کے متعلق متعصبانہ نظریہ رکھنے والوں کا مدعا یہ ہے کہ ادب کا کام سائنس نے نبھال دیا ہے۔ لہٰذا کبھی ادب کو زندگی کی تشکیل کا ذمہ دار ٹھیرایا جاتا ہے، کبھی انسان کو آگاہی کا شرف عطا کیا جاتا ہے۔ معاشرہ کو 'ذہن' دینے کا خیال اسی لئے ہر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ استدلال کس حد تک منطقی، حکیمانہ یا منصفانہ ہے۔ صحیح نتائج تک پہنچنے کے لئے ہمیں کہیں زیادہ وسیع النظری کی ضرورت ہے ں کے لئے پھر ایک ادب کا وجود ناگزیر ہے

بچوں کی کہانیاں

رفعت جاوید

پچھلے دنوں کچھ کہانیوں کی کتابیں دیکھیں۔ لال پیلے، نیلے سرورق اور اچھی اچھی رنگین تصویریں۔ امی سے پڑھوا کر سب کہانیاں سنیں۔ بہت پسند آئیں۔ جی چاہا اور بچے بھی پڑھیں۔ خود نہیں لکھ سکتا بھئی۔ ابھی میری عمر صرف چھ سال کی ہے۔ اس لئے جو کچھ مجھے ان کہانیوں کے بارہ میں کہنا ہے۔ اپنی امی سے لکھوا رہا ہوں۔

ایک کہانی کا نام ہے "بہادر لڑکا" یہ بہت ہی دلچسپ ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح ایک جادوگر نے ساتوں کے سات بھائیوں کو جو شہزادے تھے ایک خطرناک جنگل میں چودہ سال پتھر بنا کر رکھا۔ یہی جادوگر سب سے چھوٹی شہزادی کو بھی خوبصورت سی بلی بنا کر محل سے لے اڑا۔ آخر بھی شہزادی کا بیٹا جوان ہو کر سب کی تلاش میں نکلا۔ بڑی بہادری سے سارے بھید کا پتہ چلایا اور اپنے دوست عقاب کے پروں پر بیٹھ کر اس طوطے کو پکڑ لایا، جس میں جادوگر کی جان تھی۔ اس وقت بہت ہی مزا آتا ہے جب بہادر شہزادہ پہلے طوطے کے پر اکھیڑتا ہے تو ایک ایک کرکے جادوگر کے دونوں بازو جھڑ کر گر پڑتے ہیں۔ پھر طوطے کی ٹانگیں توڑنے پر جادوگر کی ٹانگیں بھی ٹوٹ جاتی ہیں اور وہ لوٹ پوٹ ہو کر شہزادہ کی طرف آتا ہے اور وہ تلوار کے ایک ہی ہاتھ سے اس کا سر بیچ سے اڑا دیتا ہے۔ اس طرح بہادر شہزادہ اپنی ماں اور چچوں، تایوں سب کو چھڑا لاتا ہے۔ بڑی مزے دار کہانی ہے اور مسلم ضیائی نے اسے خوب چٹخارے لے کر بیان کیا ہے۔ ایڈیٹر صاحب آپ بھی ضرور پڑھیئے۔

ایک اور کہانی ـــــ دو بھائیوں کی۔ بڑا بھائی سفر میں چھوٹے سے ایسا جدا ہوا کہ لاکھ ڈھونڈا اس کا کوئی پتہ نہ چلا۔ چھوٹے کو بڑی ہوشیاری سے چھپا دینے والی پگڑی اور جادو کا قالین ہاتھ آ گیا۔ شہزادی کو ایک دیو اڑا لے جاتا تھا۔ چھوٹے بھائی نے پراسرار پگڑی اور قالین سے اس بات کا پتہ چلا لیا۔ بادشاہ نے پوچھا تو اس نے بڑی استادی سے کہا کہ وہ تب بتائے گا کہ سارے ملک کے لوگ دربار میں حاضر ہوں۔ اس طرح اس کا بڑا بھائی بھی وہاں پہنچ گیا۔ چھوٹے نے شہزادی کی شادی اس سے کروادی اور خود گم کر دینے والی پگڑی اور جادو کا قالین لئے پڑا اڑتا پھرتا۔ شادی پر چالیس دن رات دعوت ہوئی۔ اور کمال کی بات یہ ہوئی کہ مولوی ٹماٹا بھی اس دعوت میں شریک تھے۔ انہوں نے اتنا پلاؤ کھایا، اتنا پلاؤ کھایا جتنا آج تک کسی نے نہ کھایا ہوگا۔ کیا اچھا ہوتا اگر سب بچے بھی اس دعوت میں شریک ہوتے! چلو کتاب ہی میں اس کا حال پڑھ کر خوش ہو لیں۔ چھ آنے میں یہ دعوت مہنگی نہیں!

اس ننھی سی کتاب کے شروع میں ایک بڑا پرلطف مشاعرہ بھی ہے۔ اہا! کیا اچھا شعر کہا ہے۔ بالکل دل کی بات ؎

آج کی چھٹی بھی رخصت ہو گئی　　　کل ہے پھر اسکول جانا ہائے ہائے!

یہ بھی خوب ہے :-

الف بے کس طرح پڑھتے ہیں ہم بچپن میں سن لیجئے　　　آ آ آ آ ــ با با با ــ تا تا تا ــ جا جا جا

یہ بھی ٹھیک رہا ع "تمہیں مرغا بنانا ہے آہا ہاہا ہا ہو ہو ہو" ـــــ اس پر ایک منچلے نے "ککڑوں کوں" کہہ کر کیا مرغانہ داد دی ہے۔

رہا آخری شعر تو اس کے کیا ہی کہنے ؎

بڑی اچھی کھنچے گی آپ کی تصویر مرزا جی!
ذرا سا مسکرانا ہے اہا ہا ہو ہو ہو

یہ بالکل سچ ہے۔ کچھ دن ہوئے ہمارے یہاں بھی بے بی کے برتھ ڈے پر فوٹوگرافر آیا تھا۔ وہ بھی فوٹو کھینچتے وقت یہی کہتا تھا۔

مگر کہانیوں کی کہانی تو ہے "نرالا آئینہ" بالکل جادو کی کہانی۔ ایک لکڑہارے نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ وہ جنگل کے سب درخت کاٹے، صرف ایک بڑا خوبصورت سرو کا درخت نہ کاٹے۔ لڑکے کا جی چاہا اس کو کاٹ ڈالے۔ خدا کی قدرت وہ اس کی طرف چلنے لگا تو درخت بھی آگے چلنے لگ پڑا،

لڑکے نے دیکھا ایک ہاتھی اور اژدھا لڑ رہے ہیں۔ دونوں نے اس سے مدد چاہی۔ لڑکے نے کلہاڑی مار کر ہاتھی کے دانت توڑ دیئے۔ دراصل یہ دونوں دیو تھے اب اژدھا اسے اپنے گھر لے گیا اور اپنی ماں سے ایک جادو کا آئینہ انعام میں دلوایا جس سے جب چاہو الٰہ دین کے چراغ کی طرح ایک جن خدمت کو حاضر ہوجائے۔ لڑکا جھٹ ہی امیر بن گیا اور جن سے ننھی شہزادی اڑا کر منگوالی۔ ایسے ہی کہانی آگے چلتی ہے۔ بادشاہ کو پتہ چلتا ہے تو وہ ایک کٹنی کے ذریعہ آئینہ ہتھیا لیتا ہے۔ اور لڑکے سے شہزادی چھن جاتی ہے۔ اب جس طرح چوہوں کے ذریعہ آئینہ لڑکے کو واپس ملتا ہے وہ بڑی مزے دار بات ہے پہلے ایک چوہا پھر دوسرا اپنی دم کٹنی کی ناک میں گھسیڑ دیتا ہے اور وہ "آچھیں - آچھیں" کرتی موئی سر تکیئے سے پرے ہٹا لیتی ہے اور ایک ہوشیار چوہا آئینہ کو لے بھاگتا ہے۔ اور لڑکے کو شہزادی پھر مل جاتی ہے۔ شروع میں تو کہانی ویسے ہی جادو بھری ہے لیکن بعد میں بیچ بیچ جادو کی کہانی بن جاتی ہے۔

"بندر اور نائی" "چل مرے مٹکے ٹمک ٹم" اور "روٹی کس نے پکائی" - یہ تین اور کہانیاں ہیں۔ اور سب اپنی جگہ بڑی دلچسپ۔
"بندر اور نائی" کو پڑھ کر تو انسان ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتا ہے۔ بندر کے سر میں تھا سونے کا لمبا چمکیلا بال -- نائی کو جو شرارت سوجھی تو اس نے اس کا آدھا سر مونڈ دیا جس سے سونے کا بال بھی کٹ گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ نٹ کھٹ بندر لگا خوخو کرنے۔ اس نے نائی کا استرا چھین لیا اور یہ جا وہ جا گھسیارے کو استرا دیا کہ گھاس کاٹ لے۔ استرا ٹوٹ گیا۔ بندر اس کا کمبل چھین کر بھاگ نکلا۔ مزا تب آتا ہے جب بندر بنیئے کا گھی کا مٹکا سر پر رکھ کر بھاگ جاتا ہے اور بنیا ہاتھ ملتا رہ جاتا ہے۔ بنیا خیر نہیں کیسا ہوتا ہے مگر اس کی تصویر انوکھی سی ہے۔ بندر نے گھی کا مٹکا براتیوں کو دے دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ وہ لال دلہن کی ڈولی ہی لے کر چمپت ہوجانے گا۔ آخر بندر لال دلہن کو سادھو (بنیئے کی طرح سادھو بھی عجیب ہے) کے پاس ٹیک کر اس کا طبلہ سارنگی لے بھاگا۔ اور لگا دونوں کو بجانے۔ طبلے سے بڑی مزے کی آواز نکلی۔

"اک دنادن تلک کے سے ... مرے چھنار فاقے سے"

آخر چڑیا کی نصیحت پر بندر نے سب کی چیزیں سب کو واپس دے دیں۔ نائی نے استرا پاکر آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ بندر کا بڑا سر مونڈ دیا۔ اور طبلے کی طرح اس کو خوب بجایا اور یہ کہہ کر تو کمال ہی کر دیا کہ۔

"لال چقندر شاباش! شاباش!!"

یہ کہانی روز امی سے پڑھوا کر سنتا ہوں اور لکھنے والے مولانا عبدالواحد سندھی کو داد دیتا ہوں۔

"چل مرے مٹکے ٹمک ٹم" بھی بڑی اچھی کہانی ہے۔ بڑھیا مٹکے میں بند ہو کر لڑھکتی لڑھکتی دعوت میں پہنچتی ہے اور صحیح سلامت اسی گاڑی میں واپس آجاتی ہے۔ "ٹمک ٹم" واقعی غضب کی چیز ہے۔ آپ کے رسالے میں ایسی ہی کہانی پڑھی تھی[1]۔ اس میں مٹکے کی جگہ کدو تھا۔ مگر سچ پوچھئے تو کدو میں وہ بات کہاں جو مٹکے میں ہے۔

"آٹا کس نے گوندھا" یونہی گپ شپ ہے۔ کہانی نہیں۔ بار بار ایک ہی بات دہرائے چلے جاتے ہیں۔ کہانی رک رک جاتی ہے۔ مگر ہاں چڑیا کا اتنی بھاری چکی پروں پر اٹھا کر اڑنا بڑی مزے دار تصویر ہے۔ خبر نہیں اس نے اتنی بھاری چیز کیسے اٹھائی۔ دب نہیں گئی؟ یہ تو جھوٹ موٹ لگتا ہے۔

کیا اچھا ہو اگر ایسی لاکھوں کروڑوں کہانیاں لکھی جائیں تاکہ ہم بچے ان کو پڑھ پڑھ کر خوش ہوں۔
کہئے ایڈیٹر صاحب! لطف آیا کہ نہیں؟ کیا اب بھی آپ یہ کہانیاں نہیں پڑھنی چاہیں گے اور دوسرے بچوں کو بھی نہیں پڑھوائیں گے؟
امی نے میرا نام پنسل سے لکھ دیا ہے۔ میں نے اس پر قلم سے سیاہی پھیر دی ہے:

(رفعت جاوید)

[1] "ماہ نو" بابت مارچ ۱۹۵۷ء "مشرقی پاکستان کی کہانیاں"۔ (ادارہ)

تصحیح:- ہمیں افسوس ہے کہ "پی لے اے" کے اشتہار مطبوعہ "ماہ نو" مئی ۱۹۵۸ء صفحہ ۴ پر نیویارک کا کرایہ سہواً درج ہونے سے رہ گیا۔ اور لندن کا کرایہ غلط چھپ گیا۔ اب ناظرین اس کی تصحیح اس طرح کرلیں:- نیویارک --- ۳۲۲۱ روپے؛ لندن --- ۱۷۲۰ روپے۔ (ادارہ)

منظوم ڈرامہ: ـــــ بقیہ صفحہ: (۱۷)

سمجھائی گئی ہے۔ بعض فروگزاشتوں سے قطع نظر یہ مجموعہ شعری و فنی حیثیت سے خاصا جدت آمیز ہے۔ ڈراموں میں اصل تصانیف سے زیادہ مترجم کے اپنے حسنِ طبع کا پرتو ہے۔

رضی ترمذی نے بھی مختلف تصوّرات کے تحت کئی خیال افروز منظوم ڈرامے لکھے ہیں۔ ناصر کاظمی نے نوٹنکی کو برت کر اوپرا کا ایک نیا نمونہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح قیوم نظر نے پابند شاعری میں ایک مختصر ڈرامہ لکھا ہے۔

جعفر طاہر نے بھی اپنے ڈراموں میں پابند شاعری ہی سے کام لیا ہے۔ ساز سنگیت کی کوششوں سے کہیں کہیں محفل رنگ پہ آجاتی ہے۔

مہبا اختر نے بعض اجنبی موضوعات کے لئے غیر اجنبی اور دلکش پیرائے اختیار کئے ہیں۔

ان علمی قسم کے ڈراموں کے ساتھ ساتھ بعض عوامی ڈرامے بھی ترتیب دیئے گئے ہیں مثلاً احمد فراز کی تمثیل "شمروز غزالہ" میں ڈرامہ کے ساتھ لوک گیتوں اور لوک کہانیوں کی چاشنی بھی ہے۔ عبدالرؤف عروج نے گیتوں اور منظوم تقریروں سے بعض ڈرامائی پارے ترتیب دئے ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد علاقائی شاعریوں سے غیر معمولی شغف نے ہمیں ان کی ڈرامائی دولت سے بھی مالامال کیا ہے۔ ان میں شاہ عبداللطیف کی مرکب نظمیں جو بیک وقت تمثیل بھی ہیں اور غنائیہ شاعری کا نمونہ بھی، خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "سُرماروی" مترجمہ ابن انشا میں شاعر کے سوزِ دروں، اس کی ہیروئن، ماروی کی نسوانی دردمندی وزاری اور مترجم کے اپنے رقّت آفریں لہجہ نے مل کر سوز و گداز کا ایک عجیب عالم پیدا کر دیا ہے۔ اسی طرح شاہ صاحب کی اور بھی کئی ایسی ہی مرکب نظمیں ـــــ سوہنی مہار، سسّی، مومل رانو اور لیلاں چنیسر بھی ترجمہ کی راہ سے اردو میں آچکی ہیں۔

پنجابی ڈرامے نسبتاً کم ہیں۔ "زردا غِ دل" کی تمثیلات کے علاوہ اردو کو دو مکمل ڈراموں پر بھی ناز ہے۔ ایک "انٹونی کلوپٹرا" مترجمہ شان الحق حقی اور دوسرا ضیاؔ جالندھری کا طبع زاد ڈرامہ۔ حقی کے ترجمہ میں ان کے اپنے تیور نمایاں ہیں۔

مکمل طبع زاد ڈرامہ کی مہم ضیاؔ جالندھری نے سر کی ہے جس سے اس صنف کے مستقبل میں نئی نئی تابانیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے شاعر اور ان کی یہ نئی محبوب صنف آج بلند تر اور روشن تر افقوں کے لئے آغوش کشا ہے۔ اور خبر نہیں ان کا ذوقِ طلب انہیں اور کن کن ارفع و اعلیٰ مقامات تک لے جائے۔

سیدھی
پیٹھ اور مضبوط
اعضاء کے لئے
اپنے
ننھے بچّے کو یہ
خالص دودھ
دیجئے
OSTERMILK
آسٹرملک ایک خالص قوت بخش اور غذائیت والا دودھ ہے جو کہ اُن
بچوں کے لئے بیحد ضروری ہے جنکو کہ مائیں چھاتی کا دودھ کامیابی سے نہیں پلا سکتی
ہیں۔ ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے اسمیں وٹامن "ڈی" ملایا جاتا ہے اور
لوہا اس لئے ملایا جاتا ہے کہ بچے خون کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکیں۔ بچوں کو
سیدھی پیٹھ اور مضبوط بازوؤں کیلئے اچھی و قوت بخش غذا کی سخت ضرورت ہے۔
اسی لئے آج ہی آپ آسٹرملک خریدیئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ آپ کا بچہ بہترین
دودھ پا رہا ہے۔ یہ خاص کر پاکستان میں بچوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔
ہر ماں کے لئے مفید مشورہ
آسٹرملک
ماں کے دودھ سے قریب تر
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ
کراچی لاہور چٹاگانگ ڈھاکہ

وارسک ، مغربی پاکستان: بجلی کی فراہمی کے لئے بند

لکھنے والے :

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ماہِ نو

جلد ۱۱ ——— شمارہ ۵

اگست ۱۹۵۸ء

★

مدیر: رفیق خاور

نائب مدیر: ظفر قریشی

★

سالانہ چندہ

ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی ۸ر آنے

★

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

اپس کی باتیں

آج سے گیارہ سال پہلے یارانِ تیز گام نے اپنے والہانہ ذوق و شوق اور جِدّ و جہد سے اس محمل کو جالیا تھا جس محمل میں لیلائے آزادی جلوہ افروز تھی اور ہماری دیرینہ تمناؤں کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا تھا۔ لیکن یہ انتہا در حقیقت ہماری آزاد قومی زندگی کی ابتدا تھی۔ اس کے ساتھ ہمارا کاروانِ ملت پھر جادہ پیما ہوا۔ اور یہ لگن لئے ہوئے کہ ہم ستاروں کی آخری منزل کو پالیں گے۔ چنانچہ صبح آزادی کے طلوع سے لے کر اب تک ہماری زندگی اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وقف رہی ہے جس کے نشانات جابجا دکھائی دیتے ہیں اور آغاز کے باوجود ان میں انجام کی واضح جھلک نظر آتی ہے۔ ہماری نوزائیدہ مملکت نے اس گیارہ سال کی مختصر مدت میں اندرونی نظم و نسق، خارجی روابط، صنعتی ترقی، تہذیب و ثقافت اور ادب و تحقیق وغیرہ کے میدان میں ایسے مدارج طے کر لئے ہیں جو ایک روشن مستقبل کی خبر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آزادی کی ہر سالگرہ ہمارے لئے ایک ولولۂ تازہ کا پیغام لاتی ہے اور شوق و آرزو کی حرارت آفرینی سے دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اس شمارہ میں بھی یہ دھڑکنیں صاف سنائی دیں گی۔

★

جون کے شمارہ میں اردو زبان کی توسیع و ترقی کے بارے میں ایک مذاکرہ کی طرح ڈالی گئی تھی۔ کچھ تو دلچسپ اور کچھ زبان کا مسئلہ اہم خصوصاً اس نئے ماحول میں جو قیامِ پاکستان کے بعد پیدا ہوا ہے۔ بہت سے قارئین نے اس کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ اور اپنے تاثرات پیش کئے ہیں چنانچہ اب کی ایک اور ناقد، جناب ممتاز حسین شریکِ محفل ہیں اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ اور بھی آگے بڑھے گا اور اپنے ساتھ بعض اہم حقائق و بصائر لائے گا۔ ممکن ہے اس سے مسئلہ پھر بھی نہ سلجھ سکے لیکن گیسوئے اردو کی شانہ آرائی کا مزید اہتمام ضرور ہو جائے گا اور امید ہے کہ ایک ایسی فضا ابھرے گی جس میں زبان و ادب کے مسائل کی گرہ کشائی کی طرف میلان پیدا ہو سکے گا۔ اس قسم کا صحت مندانہ تبادلۂ خیالات فکر و نظر اور علم و ادب دونوں۔ کے لئے مفید ہے اور اگر اس سلسلے کے بارِ خاطر ہونے کا احتمال نہ ہوا تو ہم حتی الامکان اسے جاری رکھنے کی کوشش کریں گے۔

★

اس ہی کے ساتھ غزل کا پرانا مسئلہ بھی چھڑ گیا ہے۔ جو اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود اس ہی طرح نیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک اس صنف سے متعلق زیادہ بنیادی اور خاردار سوالات نہیں چھیڑے گئے۔ محض سرسری نکات کے موافق یا مخالف رائے زنی کرنے سے یہ عقدہ جس میں قومی احساسات اور بھی پیچ پیدا کر دیتے ہیں، اچھی طرح حل نہیں ہو سکتا۔ امید ہے جوش صاحب کے اس موضوع کو متعدد نشری تقریروں میں زیرِ بحث لانے سے زیادہ بلند پیمانے پر نقد و نظر اور تحقیق و انکشاف کا دروازہ پھر وا ہو جائے گا اور ہم اب کی زیادہ دقیق اور فیصلہ کن نتائج پر پہنچ سکیں گے۔

★

سرورق: "ایرانی قلم" کا نمونہ (۱۴۲۰ - ۱۴۱۰ء)
(ایک ایرانی شہزادہ کے دربار میں "کلیلہ و دمنہ" کے مسودہ کی پیشی

شہیدانِ آلِ محمدؐ

روشن صدیقی

زہے عظمت و شانِ آلِ محمدؐ — مشیت ہے فرمانِ آلِ محمدؐ

ہوئی دینِ قیّم کی بنیاد محکم — ابد تک ہے احسانِ آلِ محمدؐ

شہادت نے اعزازِ معراج پایا — بہ فیضِ شہیدانِ آلِ محمدؐ

ادا، سجدۂ حق ہوا زیرِ خنجر — عبادت ہے شایانِ آلِ محمدؐ

شمائل میں اوصافِ خُلقِ نبیؐ سے — مشرف ہیں خاصانِ آلِ محمدؐ

اُبلتے ہیں قدموں سے تسنیم و کوثر — زہے تشنہ کامانِ آلِ محمدؐ

★

تصور میں پھر مشہدِ کربلا ہے — بیادِ شہیدانِ آلِ محمدؐ

اُدھر فسق و بدعت کے تاریک بادل — اِدھر مہرِ تابانِ آلِ محمدؐ

اُدھر بد نہادانِ کوفی و شامی — اِدھر نونہالانِ آلِ محمدؐ

نثارِ رُخِ آفتابِ امامت — نجومِ درخشانِ آلِ محمدؐ

وہ عباسؓ پرچم کشائے شہادت — شجاعِ شجاعانِ آلِ محمدؐ

علی اکبرؓ صف شکن، جلوہ فرما — وقارِ جوانانِ آلِ محمدؐ

وہ قاسمؓ جگر گوشۂ سبطِ اولؓ — چراغِ شبستانِ آلِ محمدؐ

ریاضِ امامت کی معصوم کلیاں — متاعِ گلستانِ آلِ محمدؐ

وہ اصحابِ حضرتؓ فدایانِ حضرتؓ — دل و جاں سے قربانِ آلِ محمدؐ

وہ تصویرِ اخلاص ابنِ مظاہرؓ — جلالِ فدایانِ آلِ محمدؐ

وہ حُرؓ، حق پرستی کی قندیلِ روشن — رُخِ افروزِ برہانِ آلِ محمدؐ

★

اٹھا فوجِ اعدا سے نیزوں کا طوفاں — بڑھے شہسوارانِ آلِ محمدؐ

حمیّت، شجاعت، صداقت نے بڑھ کر — پڑھا خطبۂ شانِ آلِ محمدؐ

اُدھر بارشِ نیزہ و تیر و خنجر — اِدھر ابرِ نیسانِ آلِ محمدؐ

اُدھر آندھیاں ظلم و بغض و حسد کی — اِدھر شمعِ ایمانِ آلِ محمدؐ

میسّر ہوئی امرِ حق کو بلندی — بنامِ شہیدانِ آلِ محمدؐ

وہ خوشنودیٔ ربِ اعلیٰ کا مژدہ — وہ تکمیلِ پیمانِ آلِ محمدؐ

درخشاں ہے آئینۂ کربلا میں — جمالِ جوانانِ آلِ محمدؐ

★

مقاماتِ تسلیم و صبر و رضا میں — قدم بوسیٔ خاصانِ آلِ محمدؐ

جیسے کشتیٔ نوح کہتا ہے قرآں — ہے تمثیلِ پاکانِ آلِ محمدؐ

سوادِ تسلّی کہاں روزِ محشر — مگر ظلِ دامانِ آلِ محمدؐ

نگہبانِ تقدیسِ بیت الحرم ہیں — غزالانِ بستانِ آلِ محمدؐ

الٰہی درود و سلام و تحیت — بروحِ شہیدانؓ آلِ محمدؐ

بہ حُسنِ ادب ہے روشؔن مثلِ جامیؔ

غلامِ غلامانِ آلِ محمدؐ

"سُرحسینی"

(شاہ بھٹائیؒ کے کلام میں تذکرۂ شہداءؑ)

ضیاء الحسن موسوی

سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں جب مغل سلطنت کا سورج ڈھل چلا تھا، دکن میں قطب شاہی دور کا چراغ بجھ رہا تھا اور بقول قائم ریختہ ابھی "غزل طور" نہیں ہوا تھا اور نہ میر و سودا منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئے تھے، اس وقت برصغیر کے شمال مغرب اور محمد بن قاسم کی سرزمین میں ایک "شعلۂ جوالہ" پیدا ہوا جسے دنیا شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے نام سے جانتی ہے اور اس کے ارادت مند اُسے "لال لطیف" کہتے ہیں۔

ہرات سے آئے ہوئے ہاشمی خاندان کا یہ چشم و چراغ عرب و عجم دونوں کی شاعرانہ خصوصیات کا وارث تھا، اس کی شاعری سوز و ساز رنگ و آہنگ کے ساتھ نور و سرور سے بھی آشنا تھی اور عشق مجازی کے ساتھ عشق حقیقی کے سرچشمے سے بھی اس کو فیض پہنچا تھا۔

ظاہر ہے کہ چشتی سلسلے کے تصوف اور انتساب سیادت دونوں کی بدولت شاہ صاحب محمدؐ و آلِ محمدؐ سے والہانہ محبت رکھتے تھے اور محبت و فدویت، قربانی و جانسپاری کی داستانوں کی گونج ان کے ذہن و خیال میں بسی ہوئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہو کہ انہوں نے المیہ شاعری کے لئے جو سُر اختیار کیا اس کا نام "سُرحسینی" رکھا ہے۔

شاہ عبداللطیف کا ایک مرثیہ "شہداءؑ" ان کے مشہور رسالہ میں موجود ہے۔ یہ "سُرکیدارو" میں ہے جس کا طرز اُس وقت کے سندھی مراثی کی طرح دوہوں کا طرز ہے۔ سندھی میں مسدس کے طرز کے مراثی کا آغاز بعد کے ایک شاعر ثابت علی شاہ سے ہوا۔

بعض سندھی مؤرخین ادب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ شاہ کے اس مرثیے میں ان کے ساتھیوں، احسان لانگی اور فتح فقیر وغیرہ نے بھی کچھ اضافے کئے ہیں مگر جو لوگ شاہ کے لہجے سے آگاہ ہیں ان کی رائے میں اس کا ہر ہر مصرع ان کے مخصوص رنگ میں ڈوبا ہوا ہے۔

کہتے ہیں کہ آخر عمر کے قریب شاہ حج و زیارات کے لئے جانا چاہتے تھے مگر ضعیفی اور ارادت مندوں کے منع کرنے سے انہوں نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا مگر جو سیاہ ماتمی لباس انہوں نے زیارت کربلا کے ارادے سے پہنا تھا آخر عمر تک اسے ترک نہیں کیا۔ عمر کے اس حصے میں انہوں نے لوگوں سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا تھا۔ اور یہ مرثیہ اسی زمانہ کا کلام ہے جب وہ گویا اپنے سفر کے لئے روانہ ہو چکے تھے اور سیاہ پوشی کے ساتھ گوشہ گیری بھی اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ شاہ کے جانشین آج بھی کالی پگڑی اور سیاہ کرتا پہنتے ہیں۔

شاہ کے اس مرثیے میں فقط مصائب و واقعات کربلا کا تذکرہ ہی نہیں ہے جو اس وقت کا عام رنگ تھا بلکہ اس میں ان کا فن کارانہ مشاہدہ بھی ہے اور وہ پرسوز احساس بھی جس نے اردو میں انیس و دبیر پیدا کئے۔ شاہ نے اس مرثیے میں شہدائے کربلا میں سے حضرت "حُر" کا خاص طور سے ذکر کیا ہے جو لشکر یزید کو چھوڑ کر امام حسینؑ کی مختصر سی فوج سے آملے تھے اور یقینی موت کے باوجود دنیاوی منفعت کی راہ پر حق و حقیقت کی راہ کو ترجیح دی تھی۔ اس کردار کے انتخاب سے شاہ کی عارفانہ بصیرت اور انداز فکر پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

ترجمہ خواہ کسی زبان سے کسی زبان میں ہو بہرحال ترجمہ ہے اور پھر نظم کا ترجمہ تو گونگے کے اشارات سے بہت کم آگے بڑھتا ہے، اسلئے شاہ کے مرثیے کا ترجمہ بھی آسان نہیں لیکن قادر الکلام شعراء نے شاہ کے بہت سے کلام کا خاصا اچھا ترجمہ کیا ہے۔ اس کے بعض منظوم ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں اور مجھے توقع ہے کہ شاہ کے مترجمین ان کی اس شاہکار نظم کو بھی اردو نظم کا لباس پہنائیں گے مگر فی الوقت میں اس مرثیے کا مفہوم نثر میں پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔
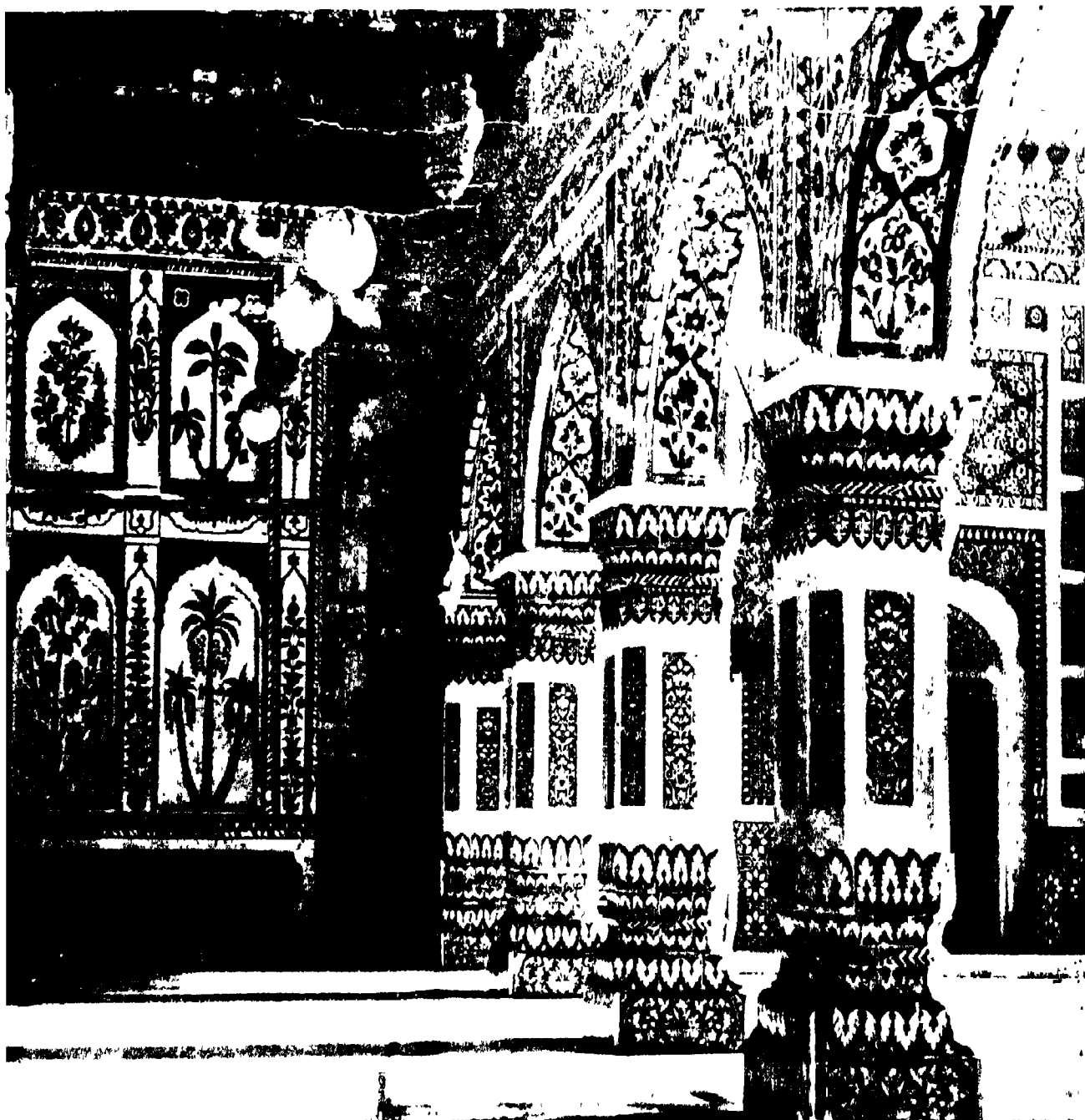
شاہ عبداللطیف بھٹائی رح کا روضہ
مغربی پاکستان کے اس عارف کامل نے آج سے دو سو سال پہلے
انسانیت و محبت کا جو پیغام دیا تھا وہ آج بھی مشعل راہ ہے

وسک در دریا کا بند

شہیدانِ کربلا

محرم کا متبرک مہینہ آگیا! "شہزادہ" کی مصیبت کا دن۔ اللہ کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہو کے رہتا ہے اور وہی ہر چیز اور مصلحت کا جاننے والا ہے۔

ماہ محرم پھر آگیا مگر ہمارے امام کہاں ہیں؟ خدایا مجھے "شاہ مدینہ" کے دربار میں پہنچا دے۔ شہزادگان مدینہ، مدینہ سے گئے تو پھر واپس نہیں آئے۔

او میرے رنگریز بھائی! میرے کپڑے سیاہ اور باوقار ماتمی رنگ میں رنگ دے۔

جب ان شہزادوں کے خون بہانے کا وقت آگیا تو وہ آوارہ وطن ہو کر اپنی قربان گاہ تک پہنچے۔ ان کی بے وقت موت پر مجھے شرم آرہی ہے۔

ان کی شہادت کا رنج گرمیوں کے ایک معتدل دن کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ آہ یزید کا دل خدا کے خوف اور اس کی محبت سے یکسر خالی تھا!

اماموں نے اپنی خوشی سے موت کا سودا کیا۔ ان کی شہادت کی درد انگیزی میں تابانی اور شکوہ ہے۔ خدا والے غم انگیز حادثۂ کربلا کی یاد مناتے ہیں۔

★

او یزید! علی کے گھرانے اور حسنؑ و حسینؑ کی عداوت کو فراموش کر دے۔ اس سے تجھے کیا حاصل ہوگا؟ تو کبھی خوشی اور مسرت کا منہ نہ دیکھ سکے گا!

یزید کے ساتھی کس قدر بدبخت اور بدانجام تھے جنہوں نے علیؑ کی کل اولاد کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کئے۔

کاش اس معرکہ کی صفوں میں امام حسنؑ بھی موجود ہوتے۔ اگر وہ ہوتے تو حسینؑ کی طرف اس طرح جاتے جیسے شمع کی تلاش میں پروانہ جاتا ہے۔

کیا حسینؑ کو نصرت اور انصار کی ضرورت تھی؟ وہ تو خود زندگی سے بے پروا تھے! مگر جب جنگ کا وقت آیا تو ان کی تلوار کی چمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی اور وہ بے پناہ بہادری دکھا رہے تھے۔ وہ میدان کی طرف یکہ و تنہا جا رہے تھے اور حسنؑ بھی ان کے پہلو میں نہ تھے جو ان کی نصرت اور دیکھ بھال کرتے۔

شہزادوں کی سرزمین دور ہے اور یزیدیوں کا ہجوم ضرب پر ضرب لگا رہا ہے حسنؑ حسینؑ اور ان کی جنگ سے کون آگاہ نہیں؟

سیاہ تیروں کی بارش میں میرے سید و آقا نے ثابت کر دیا کہ وہ جوانمرد اور حق پرست تھا۔

لوگ اپنے گھروں میں، درندے جنگلوں میں اور فرشتے آسمانوں پر امام حسینؑ اور اہلبیت کے غم میں اشک بہا رہے تھے، ان کے مددگار شہید ہو چکے تھے اور پرندے ان کے خون میں لوٹ رہے تھے۔ خدایا میرا ہدیۂ سلام میرے شہزادے کی بارگاہ میں پہنچا دے۔ اگر کچھ ایسے لوگ ہوں جن کی روح اس غم سے اندوہناک نہ ہو تو ان کو اپنی رحمت سے محروم رکھ!

★

بہادر جہاد سے محبت کرتے ہیں اور میدان سے گریز نہیں کرتے۔ جو پاک طینت تھے انہوں نے اپنی جانیں اماموں پر نثار کر دیں۔ جب وہ جہاد کر رہے تھے تو اللہ کا نام ان کے وردِ زبان تھا۔ یہ ان کی دانائی تھی۔ حورانِ بہشت نے ان کا استقبال کیا اور ہار پہنائے۔

خدا کے سچے بندے کربلا میں شیروں کی طرح آئے، چمکتی ہوئی مصری تلواریں لہراتے وہ جدھر گئے وہاں لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اور جب حسینؑ نے میان سے ذوالفقار نکالی تو بہادرانِ عرب کا زہرہ آب ہو گیا۔

حق پرست شہزادے آج کربلا میں جمع ہیں۔ انہوں نے تیروں کی بارش میں بھی میدان سے مُنہ نہیں موڑے ۔ خوش نصیب تھے وہ جو اس گھڑی امام کے ساتھ تھے ۔

خدا جس سے محبت کرتا ہے اس کی جان کا نذرانہ قبول کرتا ہے ۔ یہی مرغوب سنت الہٰی ہے ۔ جو اللہ سے لَو لگاتے ہیں ان کا دل خوف سے کبھی نہیں دھڑکتا ۔

ان باتوں کا راز میری سمجھ سے بالاتر ہے ۔ کچھ نہ کچھ پس پردہ ضرور ہے اور وہ عمیق بھی ہے اور پُراسرار بھی ۔۔۔۔

★

شہوار اور شہسوار چند دن زندہ رہتے ہیں ۔ وہ کبھی قلعوں میں فروکش ہوتے ہیں اور کبھی ان کو عرصۂ قتال کی چاہ ہوتی ہے ۔
ان کے گھر جنت میں ہیں ۔ لو ، وہ دیکھو مجاہد جنت میں پہنچ گئے ۔ وہ خدا کی جانب سے آتے ہیں اور وہیں لوٹ جاتے ہیں ۔ خدایا! ان کے طور طریقے اور ان کی عقل و دانش انوکھی ہے ۔

کتنا خوش نصیب تھا وہ حُر جو اندھیرے سے نکل کے روشنی میں آگیا اور امام کی صفوں میں شامل ہوگیا! اس نے عرض کیا کہ میں گو دیر سے آیا ہوں مگر میری زندگی میری نہیں ، آپ کی ہے اور میں موت کے لئے تیار ہو کے آیا ہوں!

خدا والے اپنی طاقت بھر غم کا بوجھ اٹھاتے ہیں ۔ حُر بھی اپنی سکت کے مطابق بوجھ اٹھانے پر آمادہ تھا ۔ یہ کہہ کے وہ بہادر بھی میدان جنگ میں گیا اور شہید ہوگیا ۔ زخموں سے چُور ، اپنی جان نثار کر کے وہ شہداء میں داخل ہوگیا ۔

اُس نے اپنی جوانمردی ، اور ہمت کی رُوح کا مظاہرہ کیا ۔ وہ شعلۂ عشق کا سچا پروانہ تھا پیغمبرِ خدا اس سے خوشنود و راضی ہوئے ۔
اُس نے ان کی حرمت کے لئے جان دی ۔ اس کی داڑھی اور اس کے ہونٹ پھولوں کی طرح خون سے رنگین تھے ۔

اس کا عمامہ یوں چمک رہا تھا جیسے چودھویں کا چاند ۔ خوش نصیب ماں کا فرزند جو سُرخ رو ہو کے محمدؐ کی بارگاہ میں گیا ۔ صحرا میں جان دینے والے کا نام زندۂ جاوید رہے گا جس کا جسم پارہ پارہ ہوا اور زخموں سے چُور چُور!

★

اہلِ کوفہ نے امام عالی مقام کو خدا کا واسطہ دے کے لکھا کہ آئیے ، ہم آپ کی رعایا ہیں اور آپ ہمارے امیر ۔ آئیے اور اپنا خیمہ نصب فرمائیے ۔ تخت آپ کا ہے ۔ یہ اُن کے جھوٹے دعوے تھے اسلئے کہ انہوں نے یزید کا ساتھ دیا ۔

اور بہادر امام ان دعدوں اور واسطوں پر یقین کرکے آیا اور گرفتارِ بلا ہوا ۔ اہلِ کوفہ نے نفع کی خاطر اپنا ایمان اور عہد بیچ ڈالا ۔
شہادت کی فہرست میں صرف بہتّر بہادر آدمیوں کا نام آتا ہے ۔ کوفیوں نے کربلا میں اپنے مہمان کو پانی تک نہ دیا!
علی کے شہزادے کربلا میں حق پر اپنی جان نثار کر کے سو گئے !

اور ایک فاختہ یہ کہتی ہوئی کربلا سے مدینے کی طرف اڑی کہ " اے شاہِ لولاک جلدی کربلا آئیے "
اور گنبدِ خضراء کا طواف کرتے ہوئے اس نے صدا دی :
"خدارا اٹھئے ، جلدی کیجئے ۔ میں چمکتے ہوئے خنجر اپنی ان آنکھوں سے دیکھ آئی ہوں!"

★

بتقریب استقلال:

"گردشِ بے مقامِ ما"

عبدالرؤف عروج

بہار آئی در و بام پر چراغ جلے
ارم نژاد، صبا دوست، نازنیں لمحے
ہوا کے دوش پہ اڑتے ہوئے حسیں لمحے
کسے خبر کہ کہاں رنگ و نور برسائیں
عجب نہیں جو اندھیرے، چراغ بن جائیں!

★

طرارے بھرتے ہوئے وقت کی دمکتی لویں
ستارہ وار، فضاؤں میں پھیل جاتی ہیں
شہاب رنگ افق کے حسیں دریچوں کو
نمود تازہ بہ تازہ سے جگمگاتی ہیں

★

ستارہ کار و ستارہ فشاں نگاہوں تک
عروسِ عصر کی آئینہ کارباہوں تک
کوئی غبار حجابِ رخِ جمال نہیں
ہے عین بانگِ جرس، صوت نے رفیقوں کو
پیامِ صُورِ سرافیل ہے رفیقوں کو
فراقِ جادہ و پا شوق کا مآل نہیں،
اسی کو ڈھونڈھ رہا تھا خرامِ اہلِ جنوں
وہی دلوں کی تمنا کا اوّلیں افسوں
وہ ایک دشت کہ ناواقفِ غزال نہیں

★

یقیں کے نور سے نکھرے ہوئے حسین خیال
صبا خرام زمانوں کے ہم عناں ہوں گے
طلسم کار بہاروں کے اطلسی پرچم
دمیدہ رنگ فضاؤں میں زرفشاں ہونگے
یہ شاہراہِ تمنا بڑی طویل سہی
اسی پہ قافلے اپنے رواں دواں ہوں گے

★

فضا تبسم گلنار ہے بہاروں کا
گلال رنگ بنامِ شفق اڑائے چلیں
ہزار گردِ گماں تہہ بہ تہہ سہی لیکن
حجاب، ظلمتِ تقدیر کے اٹھائے چلیں

★

فسونِ شورشِ دیروز مٹتا جاتا ہے
یقیں کے ساز پہ ہر عزم نغمہ خواں نکلا
جنوں کو فرصتِ آسائشِ جمال ملی
تضادِ فکر کو یک رنگئ خیال ملی

★

یقین و عزم میں محفوظ ہے جہانِ عظیم
دل و نگاہ میں ڈھلنے کو ہے جمالِ وطن
قدم قدم پہ مہکتی ہے زندگی کی شمیم
پھر اہتمام سے یاروں کا کارواں نکلا

ساقی نامہ:

"ساقیا برخیز و در دہ جام را"

رئیس امروہوی

ساقی! مئے تازہ دے بہر طور — محفل میں چلا ہے بارہواں دور
آزاد وطن کا گیارہواں سال — یہ بارہواں جشنِ جاہ و اجلال
سن لے مرا مدعا دوبارہ — عظمت کا یہ بارہواں نظارہ

محتاج ہے کب کسی صفت کی
تقریبِ جمیل حریت کی

اس جشن سے جان و دل ہیں خورسند — دہ چند نہیں، دوازدہ چند
اللہ رے جشنِ کامرانی — ہر شخص پہ چھا گئی جوانی
میں رندِ ازل، ہزار سالہ — ساقی! مجھے بارہواں پیالہ

دل کو مرے سرخوشی سے بھر دے
آلام کو بارہ باٹ کر دے

آزادیٔ قوم کی یہ تقریب — ترتیب ہوئی بہ حسنِ ترتیب
کب جشنِ جدیدِ حریت ہے — یہ بارھویں عیدِ حریت ہے
تھا جس کی ضیا سے اک جہاں [illegible] — اب بارھویں برج میں ہے وہ چاند

تکمیل کا عزم ہر نفس ہے
یہ قوم کا بارہواں برس ہے

ہے سال گرہ، نہیں گرہ دے — اس رشتے میں بارھویں گرہ دے
ملت ہے جواں تو نوجواں سال — آزادی کا سال، بارہواں سال
ہر چند کہ رہبر کہن ہے — اک منزلِ نو میں گامزن ہے
یہ رہبرِ یکہ تاز و سادہ — اس قوم کا نوجواں ارادہ

شامل ہے جو رحمتِ الٰہی
بھٹکے گا نہ راہ سے راہی

ملت کو پیامِ ضبط و تادیب — آزادیٔ قوم کی یہ تقریب
ہم وقت کو فتح کر چکے ہیں — دس بارہ برس گزر چکے ہیں
اُف بارھویں سال کا یہ جلوہ — مبہوت ہیں خود عقولِ عشرہ

یہ روزِ سعید اے جواں مرد!
بارہ میں نہیں ہزار میں فرد

اس ساعتِ دل کشا میں ہر دم — پھرتا ہے نگاہ میں وہ عالم
جب قوم کا ہر بشر حزیں تھا — آزادی کا سال اولیں تھا
وہ عیسوی سال چہل و ہفت — چمکا تھا فلک پہ اخترِ بخت

جب امن کا چاند گہہ رہا تھا
اس خاک پہ خون بہہ رہا تھا

جب روحِ خلوص تھی نہ زندہ — انسان تھا اک شقی درندہ
اے دل! یہ کہاں کا ذکر چھیڑا — چھوڑ اس کو غم کا ہے بکھیڑا
آ جشنِ حیات تو منائیں — آزادی کے گیت مل کے گائیں

دس سال کی خدمتوں کا انعام
رندوں کو عطا ہو بارہواں جام"
ساقی! مئے تازہ دے بہر طور
محفل میں چلا ہے بارہواں دور

ماہِ نو، کراچی۔ اگست ۱۹۵۸ء

غزل

کم نہیں ظلمت بھی کچھ اہلِ نظر کے لئے
کون رہے شب نشیں، نورِ سحر کے لئے

لاکھ چمن زارِ حُسن پیشِ نظر ہوں تو کیا
ہاتھ یہ اُٹھتے نہیں ہر گُلِ تر کے لئے

جوشِ طلب چاہیئے، ہوشِ ادب چاہیئے
بند نہیں کوئی راہ، پائے بشر کے لئے

جس پہ بہت ناز ہے، آہ تجھے بوالہوس
ننگ ہے وہ زندگی، اہلِ نظر کے لئے

رقص میں ہے زندگی، ایک ترے واسطے
وجد میں ہے کائنات اہلِ نظر کے لئے

کم نہ ہوئیں ظلمتیں، اُف رے شبستانِ غم
بجھ گئے لاکھوں چراغ ایک سحر کے لئے

جگر

تنگنائے غزل

جوش ملیح آبادی

نارمل حالات میں نفسِ انسانی پر وقتِ واحد میں جذبۂ واحد ہی طاری ہو سکتا ہے اور چونکہ غزل میں جذبۂ واحد کے عوض متعدد و متضاد جذبات کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ اور چونکہ غزل، جہاں تک کہ مشّاق غزل بافوں کا تعلق ہے، وقتِ واحد میں بنائی اور بُنی جاتی ہے، اسلئے بلاخوفِ ابطال یہ کہا جاسکتا ہے کہ غزل ایک غلط اور غیر فطری چیز کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی ہے۔ اس کے علاوہ دیگر نقطہ ہائے نظر کے لحاظ سے بھی یہی بات پایۂ ثبوت تک پہنچتی ہے کہ غزل کو فطری صنفِ کلام نہیں کہا جاسکتا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اگر یہ قول صحیح ہے کہ شاعری میں اکثر و بیشتر آپ بیتی اور گاہ گاہ جگ بیتی کا کوئی عنصر پایا جاتا ہے کہ نہیں۔ اس بات کا سراغ لگانے کے لئے ہمیں غزل گو کی سیرت و شخصیت اور اس کی غزل کے مضامین کے متعلق یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کے کردار اور اُس کے کلام میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے یا تضاد یا بالفاظ دیگر ہمیں یہ جانچنا ہوگا کہ غزل گو خود اپنی ذات سے مخلصانہ برتاؤ کرتا ہے یا نہیں۔ مثال کے طور پر ریاض خیرآبادی کو لے لیجئے۔

ریاض کی شہرت کا مدار اُن کے خمریات پر ہے لیکن تمام دنیا جانتی ہے کہ ریاض نے تمام عمر میں شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی نہیں چکھا تھا جسکے یہ معنی ہیں اور اس کے سوا کوئی دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے، کہ ریاض کا کلام ان کی سیرت کا آئینہ دار نہیں۔ بلکہ ان کی سیرت کے قطعی برعکس واقع ہوا تھا اس لئے انہوں نے خمریات کے باب میں جو کچھ کہا ہے۔ وہ آپ بیتی میں شمار نہیں کیا جاسکتا جس کے یہ معنی ہیں کہ ریاض خود اپنی ذات سے خلوص نہیں برت سکے اور ظاہر ہے کہ وہ کلام جو سراسر اظہار میں غیر مخلصانہ اور حقائق سے دور ہو وہ فطری کلام نہیں ہو سکتا۔ اگر اس موقعہ پر یہ کہا جائے کہ ریاض کے خمریات آپ بیتی نہیں نہ سہی، جگ بیتی تو ضرور ہی اور کوئی شاعر اگر جگ بیتی کہتا ہے تو اس میں کیا اعتراض کی بات ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا جائیگا کہ فطری شاعر کے کلام میں جگ بیتی آٹے میں نمک کے برابر ہوتی ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ وہ نمک میں آٹے کے برابر ہو کے رہ جائے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی بات ہے کہ مشروبات و ماکولات بالعموم اور شراب بالخصوص ایسی چیز ہے جو جگ بیتی کے ذیل میں نہیں آسکتی۔ اسی لئے کہ اگر آپ کسی کو شہد کھاتے دیکھتے ہیں تو مجرد دیکھ لینے کی بنا پر آپ شہد کے ذائقے سے واقف نہیں ہو جاتے۔ شہد کا ذائقہ تو وہی سمجھ سکتا ہے جس نے اسے چکھا ہو۔ اس طرح وہ شخص جو کسی کو شراب پیتے دیکھتا ہے۔ اس دیکھنے سے اُس پر شراب کا نشہ نہیں چڑھ سکتا اور جو شخص کسی کو شہد کھاتے یا شراب پیتے دیکھتا ہے وہ اُس کی شیرینی، اور اس کے نشے کو اگر شعر میں بیان کرتا ہے تو اس کا شعر حقیقت سے کوئی تعلق نہیں رکھ سکتا اور جو شعر یا جو صنف سخن اس قسم کے غیر حقیقی اشعار کا مجموعہ ہو اُسے حقیقی صنف نہیں کہا جاسکتا۔

اسی طرح امیر احمد صاحب مینائی لکھنوی کی غزلوں کو لے لیجئے۔ منشی صاحب ایک مولوی بلکہ متقی قسم کے بزرگ اور خانوادۂ حضرت شاہ ضیا کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا تقدس و تقشف اس قدر بلند و مستحکم تھا کہ اُن کے باب میں ان کا کوئی بدترین دشمن بھی یہ نہیں سکتا کہ زندگی میں انہوں نے کبھی ایک بار بھی زبانِ بازاری کا کوٹھا دیکھنا تو بڑی بات ہے، کسی نامحرم عورت یا کسی امرد کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا ہو۔ لیکن ان کی غزلیں دیکھئے تو ان کا تمام کلام بازاری عورتوں کے چونچلوں، بداطوار لڑکوں کے لچھنوں، بھنگڑخانوں کے نعروں اور شاہد پرستی کے غلغلوں سے گونجتا ہوا نظر آتا ہے۔ سر پیٹنے کی بات ہے کہ منشی امیر احمد مینائی اور یہ شعر فرمائیں ؎

حیا بولی اُبھرا ہو جوبن کسی کا
مٹا دوں گی میں چلبلا پن کسی کا

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب　　وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

اور یہ ریاض خیرآبادی یا امیر احمد مینائی ہی نہیں۔ ہمارے تمام غزل گو یہی اندھیر کرتے رہے ہیں، اور وہ راہِ راست پر نہیں آئے تو ہمیشہ یہی کرتے رہیں گے۔ کتنی غضب کی بات ہے کہ ایک شخص کبھی شراب نہیں پیتا۔ کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوتا۔ لیکن وہ جب غزل لکھنے بیٹھتا ہے تو شرابی اور عشق پیشہ بن جاتا ہے اس طرح ایک شخص حقیقتاً رند پیشہ اور عشق مشرب ہے لیکن غزل میں وہ مسائل تصوف و ایمان کے دریا بہاتا نظر آتا ہے، کیا ہم اس قسم کے کلام کو شاعری کا لقب دے سکتے ہیں؟ اب کیا یہ طرزِ کلام نفسِ شاعری اور دنیا کی تمام زبانوں کے تمام شعراء کے منہ پر ایک طمانچے کے سوا اور بھی کچھ ہو سکتا ہے؟

اس سلسلے میں ایک اور بات بھی نوٹ کر لینے کے قابل ہے یعنی ہماری غزلوں کے کم سے کم اسّی فیصدی اشعار عاشقانہ ہیں۔ جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ہمارے تمام غزل گو حضرات ماشاء اللہ عشق پیشہ تھے اور ظاہر ہے کہ ہر عاشق کی داستانِ عشق دوسرے عاشق کی داستانِ عشق سے مختلف ہوا کرتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر شخص کی داستانِ عشق سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ عاشق کے عشق میں کہاں تک شدت تھی۔ معشوق کا مزاج کیسا تھا۔ عاشق و معشوق کے ماحول کی نوعیت کیا تھی۔ عشق کی ابتدا کیونکر ہوئی، عشق پروان کیونکر چڑھا اور عشق کامیاب رہا یا ناکام۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس داستانِ عشق سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عاشق و معشوق کس دور اور کس خاندان کے لوگ تھے۔ اور اُس دور میں معاشرے کی مخصوص وضع کیا تھی لیکن جب ہم اپنے اساتذہ کی غزلیں پڑھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُن سب کی داستانِ عشق یکساں تھی۔ تمام عاشق اور تمام معشوق ایک ہی مزاج و ماحول اور ایک ہی خاندان کے افراد تھے۔ اُن سب کے عشق کی شدت بھی مساوی تھی۔ اُن سب کا دورِ حیات بھی ایک ہی تھا۔ ان سب کے عشق کی ابتدا و انتہا بھی ایک ہی طرز پر ہوئی تھی۔ وہ سب کے سب ایک ہی دن پیدا ہوئے تھے۔ ایک ہی دور کے باشندے تھے اور ایک ہی تاریخ اور ایک ہی وقت سب کا انتقال ہوا تھا۔ اُن میں سے ایک غزل گو کی صورت بھی ایسی نہ تھی کہ معشوق اُس پر ریجھتا یا کم سے کم اس کی طرف مائل ہو جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس ہر غزل گو بدقسمتی سے اس قدر بدصورت واقع ہوا تھا کہ معشوق نے اسے منہ نہیں لگایا اور جب وہ سامنے آیا تو اسے دھتکار دیا ؎

دیکھتے ہی مجھے محفل میں انہیں تاب کہاں
خود کھڑے ہو گئے آتے ہوئے باہر باہر

اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں انہی غزلوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غزل گو کے معشوق کا کم سے کم ایک عاشق اور بھی ہوا کرتا تھا اور وہ خدا کے فضل و کرم سے اس قدر حسین و جمیل ہوتا تھا کہ معشوق اُس پر جان دیا کرتا تھا اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہر غزل گو بزدل اور نحیف و لاغر بھی ہوا کرتا تھا۔ اس لئے کہ ہمارا ہر غزل گو اس کی شکایت کرتا پایا جاتا ہے کہ رقیبِ دیو پیکر نے مجھے محفلِ جاناں سے پیٹ کر نکال دیا۔

الغرض ان تمام حیرت ناک یکرنگیوں اور یکسانیوں کے دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان غزل گوؤں کے عشق کی لاکھوں داستانیں دراصل کاربن پیپر کی اتاری ہوئی نقلیں ہیں اس داستانِ عشق کی جو سب سے پہلے غزل گو نے قلمبند فرمائی تھی۔ آپ ضرور ملاحظہ فرمائیں:۔

نمبر۱:۔ پہلا غزل گو قنوطی تھا۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے تمام غزل گو قنوطی ہیں۔

نمبر۲:۔ پہلا غزل گو بازاری عورتوں اور بد اطوار لڑکوں کا عاشق تھا۔ ابتدا سے لیکر آج تک تمام غزل گو بازاری عورتوں اور بدقماش نوخیزوں کے عاشق رہے۔

نمبر۳:۔ پہلے غزل گو نے مجازی عشق کی شراب میں کوثرِ تصوف کی چند بوندیں ملادی تھیں۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے تمام غزل گو شرابِ عشقِ مجازی میں کوثرِ تصوف کی چند بوندیں ٹپکا رہے ہیں۔

نمبر۴:۔ پہلا غزل گو بقولِ خود شرابی تھا۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے تمام غزل گو بقولِ خود شرابی ہیں۔

نمبر۵:۔ پہلے غزل گو پر سیاسی، معاشری بحرانوں اور مناظرِ قدرت کا ذرہ برابر بھی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ابتدا سے لیکر آج تک کے غزل گویوں پر بھی ان چیزوں کا اثر بھی پڑ رہا ہے۔ اور آج کل جو چند سیاسی یا مناظری غزلیں نظر آ رہی ہیں۔ دراصل انہیں غزل کا خطاب دیا ہی نہیں جا سکتا۔

نمبر۶:۔ پہلے غزل گو کا معشوق (عورت اور امرد) اکثر جھوٹا، بدزبان، اشقی القلب، ہرجائی، بدچلن اور عاشق کش و رقیب نواز تھا۔

ابتدا سے لیکر آج تک کے غزل گویوں کے معشوقوں کے یہی لچھن رہے اور ہیں۔

۷ :۔ پہلا غزل گو بزدل، بدصورت اور نحیف البحثہ تھا اور اس کا رقیب بہادر، خوبصورت اور قوی الجثہ تھا۔

ابتدا سے لیکر آج تک تمام غزل گو اور ان کے رقیب ویسے ہی چلے آرہے ہیں۔

۸ :۔ پہلا غزل گو جذبۂ حیا و خودداری سے محروم تھا اور رقیبوں اور دربانوں کے دھکے کھانے اور خود معشوق کے بار بار دھتکارنے کے باوجود بزم جاناں تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دربان کی خوشامدیں کیا کرتا تھا۔

ابتدا سے لیکر آج تک کے غزل گو ماشاء اللہ اس قسم کی مشقیں فرما رہے ہیں۔

۹ :۔ اور پہلا غزل گو زاہدوں سے نفرت کرتا، دنیا کو فانی سمجھکر نا قابل اعتنا سمجھتا، اپنے جسم کی لاغری کا رونا روتا، اپنی مفلسی پر آنسو بہاتا، قسمت کو کوستا اور ابتدا سے لیکر آج تک کے تمام غزل گو ان تمام معتقدات کا اعادہ فرماتے رہتے ہیں۔ اس غیر فطری یکسانی اور اس غیر نفسیاتی ہم آہنگی پر غور کر کے کوئی اللہ کا بندہ اب تک یہ سمجھنے کی جسارت نہیں کر رہا ہے کہ اس قسم کا کلام شاعری نہیں، بلکہ شاعری کی نقالی ہے اور نقالی بھی شرمناک قسم کی نقالی ہے۔ اور اس حیرت ناک صورت حال کو دیکھ کر اب تک کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ہزاروں لاکھوں آدمی، شخص واحد نہیں بن سکتے ہیں۔ اور کوئی ایسا جید ذہن اب تک پیدا نہیں ہوا ہے کہ اس کا مزاج اور اس کی زندگی کے تمام حالات، لاکھوں افراد کی زندگی اور ان کے مزاج کا مکمل آئینہ دار ہو۔ اگر یہ قول صحیح ہے کہ شاعری اپنے زمانے کی موزوں اور شیریں تاریخ اور شاعر کی شخصیت کا ایک کھنکتا ہوا افسانہ اور خود نوشت حیات نامہ ہوتی ہے تو اس قول کی روشنی میں جب ہم اپنے دواوین کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ایک زبردست شرمندگی اور ایک عظیم مایوسی ہمارا احاطہ کر لیتی ہے اور ہمیں یہ جرأت نہیں ہوتی ہے کہ ہم دنیا کی عظیم شاعری اور دنیا کے عظیم شاعروں کے روبرو اپنی غزل کی ادھی پونجی کو پیش کریں جو خورده اندیشی و خورده فروشی کے سوا اور کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے۔

اگر ہماری غزلوں کو سنکر دنیا کا کوئی نقاد جلیل ہم سے یہ پوچھ بیٹھے کہ آخر آپ لوگ اس کلام کی معرفت ہم سے کہنا کیا چاہتے ہیں۔ اور آپ کی غزل انسان کے دماغ میں فکر کا کونسا دریچہ کھولنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری قومی غیرت اس کا کیا جواب دے گی اور اس کو ہم یہ کیوں کر باور کرا سکیں گے کہ اگر ہمارے غزل گو جوانی سے لے کر بڑھاپے تک ایک ایسے معشوق کا دم بھرتے رہتے ہیں جس کا نام کسی مردم شماری کے رجسٹر میں موجود نہیں ہے تو اس میں حرج ہی کیا ہے اور ایک مصنوعی قسم کا قلب گداختہ بھی ایک بڑا دوست پیدا کر سکتا ہے۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

★

مذاکرہ:

اُردُو زبان کی توسیع

ممتاز حسین

اس مذاکرے کا آغاز کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد باقر نے جو انکشافات کئے ہیں وہ یہ ہیں :-

(۱) خالص اردو ایک بے معنی سا فقرہ ہے :

اوّل تو یہ کہ اس زبان کا "ہیولیٰ عربی فارسی سے تیار ہوا ہے" اور یہی دونوں زبانیں اس کے عناصر ترکیبی میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ الفاظ جنہیں اردو کے لوگ خالصتاً اردو کا بتلاتے ہیں اگر انہیں "غور سے دیکھا جائے تو ان میں سے کتنے ہی الفاظ خالص اردو کے نہیں بلکہ پنجابی اور متحدہ ہندوستان کی دوسری بولیوں کے ہیں"۔

پنجابی کو یوں علیحدہ کرنے سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ متحدہ ہندوستان کی کوئی بولی نہیں ہے۔ بہرحال اطلاعاً عرض ہے کہ متحدہ ہندوستان کی انہی بولیوں میں سے ایک کھڑی بولی یا گریرسن کے الفاظ میں مغربی ہندی بھی تھی جو کہ قدیم سے ہندوستان کے دارالخلافہ دلّی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی۔ اردو اسی کھڑی بولی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اردو کا بنیادی ذخیرۂ الفاظ (BASIC VOCABULARY)۔۔ افعال، اشیاء کے نام، صفات، ضمیر، اور حروف ربط۔۔ اسی کھڑی بولی کے ذخیرۂ الفاظ پر مشتمل ہیں، لیکن جس طرح کہ کوئی بھی بولی (DIALECT) اپنے بنیادی ذخیرۂ الفاظ پر قائم رہ کر اس وقت تک زبان (LANGUAGE) کی صورت اختیار نہیں کرتی ہے حتیٰ کہ اس کے بنیادی ذخیرۂ الفاظ میں قابلِ قدر اور معتدبہ اضافہ نہ ہو۔ اس طرح اس بولی نے بھی اردو کے پیکر میں، کہ وہ ایک طویل تاریخی عمل سے وجود میں آیا ہے، وہ توسیعِ لغت اختیار کی جسے (EXTENDED VOCABULARY) کہا جاتا ہے۔ ماہرینِ لسانیات کسی بھی زبان کو اس کے بنیادی ذخیرہ الفاظ، افعال کی صورت اور حروف ربط سے پہچانتے ہیں نہ کہ اس بات سے کہ اس کی توسیع یافتہ لغت میں کتنے سو، ہزار یا لاکھ الفاظ عربی فارسی یا دوسری زبانوں سے آئے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ فارسی کا اثر اردو پر غیر معمولی رہا ہے۔ اللہ غریقِ رحمت کرے ریختہ گویوں کو اس سے انہوں نے نہ صرف الفاظ، مسلّم ترکیبیں، اضافتیں لی ہیں، بلکہ کہیں کہیں نحوی ترکیب کا قلم بھی لگایا ہے، اور استفادہ ترجمے کی صورت میں تو خیر بے انتہا کیا ہی ہے، لیکن اس سے اس کی اصل حقیقت کو پہچاننے میں دشواری نہیں ہوتی ہے، (ہمارے ریختہ گویوں کے بقولِ میر وہی اشعار مستند ہیں جن میں افعال اور حروف ہندی کے ہیں نہ کہ فارسی کے) بشرطیکہ ہمارا ذہن لسانیات کے اصولوں پر چلے، ورنہ یوں تو یوپی کے پنڈت سمپورنانند بھی یہی سمجھتے ہیں کہ اردو زبان عرب اور ایران سے آئی ہے نہ کہ ہندوستان کی کوئی ترقی یافتہ بولی ہے۔

رہ گیا کھڑی بولی اور متحدہ ہندوستان کی دوسری بولیوں مثلاً لہندا، ملتانی، سندھی، راجستھانی، برج اور اودھی وغیرہ کے الفاظ کے درمیان مشابہت کا معاملہ تو وہ اس وجہ سے ہے کہ یہ ساری بولیاں جس میں پنجابی بھی شامل ہے، ایک ہی پراکرت یعنی شورسینی (اتری ہندوستان) پراکرت اپبھرنش (مسخ شدہ) کی مختلف بیٹیاں ہیں۔ ان کے الفاظ اور قواعد کے درمیان مشابہت کا پایا جانا لازمی ہے۔ یہ تو خیر ایک ہی بطن سے پیدا ہو کر ایک ہی دیس میں رہ گئیں۔ مشابہت تو جرمنی اور سنسکرت کے ایسے دور افتادہ خاندانوں کے الفاظ میں بھی پائی جاتی ہے، لیکن جس طرح کہ اس مشابہت کے باعث جرمنی یا سنسکرت کے آزاد وجود کی اہمیت ختم نہیں ہو جاتی اسی طرح کھڑی بولی جس نے اردو زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے محض اتنی سی بات کی وجہ سے بے معنی نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے خاندان (شورسینی پراکرت اپبھرنش) کی دوسری بولیوں کے الفاظ اور قواعد سے مشابہت رکھتی ہے۔ جب ایک ہی خاندان کی مختلف بولیوں کے درمیان کسی ایک کو پہچاننے کی کوشش کی جاتی ہے، تو اس وقت مشابہت سے زیادہ، کہ وہ وجہ امتیاز نہیں ہے، اس کی مغائرت یا انفرادیت کو دیکھا جاتا ہے، اُن بولیوں کے درمیان وجہ امتیاز ان کا لہجہ ہی ہوا کرتا ہے۔ اسی لہجے کے اختلاف کے باعث ایک ہی پراکرت دس بیس کوس کے فاصلے پر مختلف بھاکاؤں میں بٹ جایا کرتی۔ کھڑی بولی اور پنجابی میں بڑا

فرق اسی لہجے کا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کے بہت سے الفاظ اور افعال کا ماخذ ایک ہی ہے، لیکن چونکہ ان کے لہجے کا چھند اجدا جدا ہے اس لئے ایک کھڑی اور دوسری پنجابی ہے۔ پنجابی میں کھاندا ہے تو کھڑی میں کھاتا ہے۔ پنجابی میں ہو رہے تو کھڑی میں آ در ہے۔ چونکہ اردو کا لہجہ کھڑی بولی کا ہے۔ اور وہ اپنی کھڑی کے بنیادی ذخیرۂ الفاظ اور قواعد کو ساتھ لئے ہوئے ہے اسلئے وہ کھڑی کہلاتی ہے۔ اردو کی پاکیزگی اس کھڑی بولی کے قواعد روزمرے اور محاورے، اور لہجے سے متعین ہوتی رہی ہے اور آج بھی اس کی پاکیزگی کا وہی معیار ہے "اردو زبان ایک لہجہ بھی ہے" یہ بات جو انشاء اللہ خاں نے دریائے لطافت میں لکھی ہے سوا سی بھر دسے پرکہی ہے۔ یہاں اس امر کا اظہار کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کھڑی بولی کا بھی لہجہ شروع شروع میں آتنا شستہ اور رفتہ نہ تھا جتنا کہ آج ہے اسے اس رُتبے تک پہونچانے میں ہمارے ریختہ گو شعراء اور اردو کے لوگ خواص و عوام کو بڑا دخل رہا ہے۔ کیسے ماتی سی متی، جاگہ سے جگہ، تو ہو سے آہو، کیدھر جیدھر سے کدھر جدھر اور کبھو کسو سے کبھی کسی، بنا ہے اس کی منطق کو آج ہم بتلانے سے قاصر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالبًا فارسی زبان اور فارسی ادب کی ذہنی تربیت سے ان میں اپنے الفاظ کی صوتی پرکھ کا بھی ایک مذاق پیدا ہو گیا تھا۔ دلی والے گھڑنا بولتے تھے، لکھنؤ والوں نے اسے گڑھنا کر دیا اور یہ جواز پیش کیا کہ گھڑ کی آواز ثقیل تھی۔ گویا یہ ان کی اپنی ہٹ تھی۔ لیکن اس حسن سماعت کی ہٹ دھرمی کے علاوہ، الفاظ کے تلفظ کو بدلنے میں پراکرت کا یہ اصول بھی کارفرما رہا ہے کہ جہاں کہیں سنسکرت یا کسی غیر زبان کا سہ حرفی لفظ تسکین اوسط کے ساتھ داخل ہوا اسے متحرک کر لیا، مثلاً دَھرم سے دَھَرَم۔ قلق سے قلق۔ کا۔ ڈ سے کارڈ۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ اردو کے شعراء سنسکرت کے تمام الفاظ کے ساتھ تو اسی قاعدے کی پیروی کرتے ہیں، لیکن عربی کے چند الفاظ کو اس سے مستثنیٰ بھی کئے ہیں۔ مثلاً وہ رَاج کو طَرح باندھتے ہیں مگر گرم کو گرم ہی باندھتے ہیں۔ میں نے اس کا اظہار اس لئے کیا کہ باوجود اس بات کے کہ اردو کے شعراء نے لہجے کے بارے میں کسی خاص اصول کی سختی سے پیروی نہیں کی ہے، تاہم اس کے اصول ہماری زبان میں پائے جاتے ہیں۔ اردو کے حروف تہجی میں عربی اور فارسی کے الفاظ کی صورت پہچاننے کی خاطر عربی اور فارسی کے کتنے ہی حروف داخل کئے گئے، لیکن ان میں سے صرف چند حروف کی صوتی اہمیت ہماری زبان میں ہے، مثلاً فارسی کا ژ اور ف اور عربی کا ق اور غ، کہ ان کی آواز کو بھی ہم ان کے مخرج سے ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں (تلفظ کو شش ملحوظ خاطر رہے) لیکن عربی کے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ وغیرہ کی آواز نہ تو ہم سے ادا ہو پاتی ہے اور نہ ہم اس کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ وہ تو صرف اس لئے ہیں کہ ہم ان کی مدد سے عربی کے الفاظ کی صورت پہچان سکیں، اور انہیں ہندی کے ہم آواز الفاظ کے ساتھ خلط ملط نہ کر سکیں۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ہم تسبیح کو تسبی، صحیح کو سہی، اور قاضی نکاح کو نکاہ پڑھتا ہے (ایک صاحب کا کہنا ہے۔ چلئے قاضی ہی سہی کہ اگر نکاح پڑھتے وقت نکاح کی 'ح' اپنے صحیح مخرج سے ادا نہ ہو تو وہ نکاح صحیح نہیں ہوتا ہے) اب ہمارا نکاح صحیح ہو یا نہ ہو، یہ ایسا اس لئے ہے کہ جس زبان کو کہ ہم بچپن سے بولتے ہیں اس کے صوتی نظام میں ان حروف کی آواز کی ادائیگی اور ان کی پہچان کا کوئی انتظام نہیں ہے، اور گوشت والی زبان یعنی جیبھ کا یہ معاملہ ہے کہ وہ بچپن ہی میں الٹنا پلٹنا اور توڑ مروڑ سیکھتی ہے، بعد میں سیکھنے سے انکار کر دیتی ہے، اور کیا عجب کہ اس کا تعلق گلے کی ساخت سے بھی ہو کہ آدمی، صحرا، جنگل، وادی، پہاڑ، مرغزار اور ریگستان کا جدا جدا ہوتا ہے جس طرح کہ ہندوستان اور پاکستان کے بہت سی دوسری بولیاں بولنے والے حضرات ش، ق، ادا نہیں کر پاتے ہیں اسی طرح ہم لوگ بھی ح، ص، ع، ض، ط، ظ وغیرہ کو ادا نہیں کر پاتے ہیں۔ پھر ہر زبان کے لہجے کے مخصوص اتار چڑھاؤ، تال، سم، مرکیاں اور گورکھ دھندے ہوتے ہیں۔ ہماری زبان آریائی خاندان کی ہے نہ کہ سامی خاندان کی کہ آخر الذکر کے لہجے کے بھاؤ تاؤ سے ہم زیادہ واقف ہو سکیں۔ ڈیڑھ سو سال سے ہند و پاک کے بابو لوگ انگریزی سیکھ رہے ہیں، لیکن (ACCENT) ان کی زبان پر چڑھ کر ہی نہیں دیتا ہے۔ یہی حال ہمارا عربی الفاظ کے ساتھ ہے اور ہمارا ہی کیا عربوں کا بھی ایرانی اور یونانی الفاظ کے ساتھ رہا ہے (مثالوں کی فہرست بڑی طویل ہے) ۔ عربی کے وہ الفاظ جو کہ ہماری زبان میں دخیل ہیں، اور ان کا استعمال ہر چھوٹا بڑا خاص و عام کرتا ہے ان پر اعراب ہم نے اپنے چڑھائے ہیں، ہم محبّت کو مُحبّت، جنازہ کو جَنازہ، میّت کو میَّت بولتے ہیں، اور اسے درست نہ کرنے پر مُصر ہیں، کیونکہ جیسا کہ حالی نے بھی سمجھایا ہے "تلفظ کا منشاء صرف اعراب کے درست کرنے ہی کا نہیں ہے، بلکہ ہر حرف کی آواز کو اس کے مخرج سے ادا کرنے کا بھی ہے۔ جن آوازوں کے ادا کرنے پر کہ ہم قادر نہیں ہیں اگر انہیں ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے، تو پھر تو ہماری وہی صورت بنے گی ع۔ زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا۔

دوسرے یہ کہ جب کسی دوسری زبان کا لفظ ہم اپنی زبان میں قبول کر لیتے ہیں تو اس کی آواز پر اپنے لب و لہجے کا خراد چڑھا دیتے ہیں۔ ہم مُلزَم کو مُلزِم بولتے ہیں اور اسی کو فصیح جانتے ہیں، ہمارا یہی طور طریقہ دوسری غیر زبانوں کے الفاظ کے ساتھ بھی رہا ہے۔ اگر ہم بوتل، کاگ، کارتوس، میز، بخشی، تنکشی کچھ ایسا ہی ہے (ترکی)

وغیرہ کو ان کے ماخذ کے مطابق درست کر دیں تو وہ پھر ہماری زبان کے الفاظ نہ رہ جائیں گے۔ میں نے لہجے کے معاملے پر جو اتنا وقت صرف کیا تو اس کا سبب یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس مضمون میں ایک سوال تلفظ کا بھی اٹھایا ہے۔ وہ اس بات کے مدعی ہیں کہ اردو والوں کا یہ نقطۂ نظر صحیح نہیں کہ عربی فارسی کے دخیل الفاظ کا وہی تلفظ ہماری زبان میں صحیح ہے جو کہ رائج ہے۔ اس کے برعکس وہ انہیں عربی فارسی کی لغات کی مدد سے درست کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو کو عربی فارسی کے ہیولے سے نکالا ہے، اور اس کی خالصیت سے جو انکار کیا ہے اس میں یہی لم شامل تھا کہ وہ اردو کے الفاظ کا لہجہ عربی فارسی کی لغت سے درست کرنا چاہتے تھے ؎

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

آج دنیا میں خالص زبان کوئی بھی نہیں ہے، اگر ہو گی تو افریقہ کے جنگلوں میں۔ ایسی صورت میں اس صفت کا اضافہ اردو کے ساتھ کیوں کیا جائے۔ کیوں نہ یوں کہا جائے کہ اردو اپنا ایک آزاد وجود رکھتی ہے، اس کی اپنی ایک گریمر اور اپنا ایک مخصوص صوتی نظام ہے، وہ اسی گریمر اور صوتی نظام کے تحت غیر زبانوں کے الفاظ کو رگڑ رگڑ کر اپنی زبان میں داخل کرتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور بتلاؤں اردو کی اردویت اس کے اپنے روزمرے اور محاورے میں بھی ہے، اور ان نئے الفاظ اور ترکیبوں کی ایجادات میں بھی ہے جہاں اس نے ہندی کے ساتھ فارسی یا عربی کو پیوند کیا ہے۔

انگریزوں کی سازش ؟ یا اردو میں وضع اصطلاحات کا سکہ ؟ :

اب تک ہم یہ سنتے آئے تھے کہ اردو ہندی کا جھگڑا انگریزوں کا پیدا کیا ہوا ہے، انہیں نے اردو کے بالمقابل فورٹ ولیم کالج میں جدید ہندی کو کھڑا کیا۔ اور ایک ہی زبان کے دو ایسے اسلوبوں کو پروان چڑھایا جن سے کہ ان کے دو نام پڑ گئے۔ ایک ہندی دوسرا اردو۔ لیکن اب ڈاکٹر محمد باقر کے توسط سے اس کا علم ہوا کہ انگریزوں کی سازش ہماری زبان کو دو اسلوبوں میں تقسیم کر کے کمزور کرنے کی نہ تھی بلکہ اردو کو سہل اور سادہ رکھنے کی تھی تاکہ وہ عوام میں زیادہ سے زیادہ مقبول ہو سکے۔ معلوم نہیں انگریزوں کی اس نیک کوشش کو وہ سازش کا نام کیوں کر دیتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ کیوں نہیں اردو کے لوگ ڈاکٹر صاحب کے حسب منشا اپنی زبان کے قواعد و ضوابط اور وضع اصطلاحات کے مختص اصولوں کو بھلا کر، جدید فارسی کی اصطلاحات کو قبول کر رہے ہیں۔ بہرحال ان کی اس خواہش پر تبصرہ تو بعد میں کروں گا۔ پہلے اس انکشافِ سازش کی وہ حکایتِ دلچسپ تو سنئے، جو کہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہے :-

"ابتدا میں اردو کا سرمایہ بہت قلیل تھا" (ابتدا میں تو دنیا کی ہر زبان کا سرمایہ قلیل تھا۔ حیرت تو اس بات پہ ہے کہ جس زبان کا ہیولیٰ عربی اور فارسی جیسی دو بڑی زبانوں سے تیار ہوا ہو، اس کا سرمایہ اس قدر قلیل کیوں تھا؟) "بعد میں وقت کے تقاضوں اور روز افزوں ضروریات کے باعث اس میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ ہوا۔ یہ الفاظ زیادہ تر عربی فارسی سے ماخوذ ہیں۔ ایک وقت ایسا آیا جبکہ اردو میں یہ الفاظ بڑی کثرت سے استعمال ہونے لگے۔" (ڈاکٹر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ اردو پر یہ وقت کب آیا؟)۔ "اس وقت انگریزوں نے اردو کی بڑھتی ہوئی مقبولیت اور انگریزی سے اس کا تصادم دیکھ کر مسلمانوں کو تلقین کی کہ وہ اردو جیسی سیدھی سادی (اردو تو ایک ٹیڑھی زبان ہے ع کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے) زبان کو عربی فارسی کے سنگین الفاظ سے گرانبار نہ کریں۔ ساتھ ہی اردو نواز ہندوؤں کو بھی ترغیب دی کہ وہ بھی مسلمانوں سے یہی کہیں کہ اردو کی سادہ وضع برقرار رہنی چاہئے ورنہ وہ ہندی کا رخ کر لیں گے۔ مسلمان اس بھرے میں آ گئے۔" (پھر کیوں اردو نواز ہندو ہندی کی طرف چلے گئے؟) "اردو کو سادہ بنا کر عربی فارسی سے قطع تعلق کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج سے تقریباً پچاس سال" (ڈاکٹر صاحب نے بھی کیا وقت تجویز کیا ہے، یہی زمانہ تو علامہ اقبال اور ابوالکلام آزاد کے اردو ادب پر چھانے کا ہے) "مسلمانوں نے ذہنی طور پر یہ خاموش اور خطرناک تحریک قبول کر لی کہ اردو میں انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں کے کلمات تو اس میں داخل ہوتے رہیں لیکن عربی فارسی کا دروازہ اس پر بند ہو جائے۔ یہ طرزِ عمل اردو کی نشو و نما اور توسیع میں بہت حد تک حارج ہوا۔" (متحدہ ہندوستان میں یا کہ پاکستان میں؟) "اردو نے بالعموم عربی فارسی کے کلمات مستعار لینے بند کر دئے ہیں؟" (گذشتہ دس سال میں عربی فارسی کے جتنے کلمات اردو صحافت میں آئے ہیں، کیا ان کی کوئی فہرست دی جائے؟) "اردو داں طبقہ عربی فارسی سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اس بے نیازی اس بُعد اور ناساز اتفاق (انگریزوں کی سازش) نے اردو کو اس سرمایۂ الفاظ تک محدود کر دیا ہے جو ہمارے پیش رووں نے جمع کیا تھا۔

(اور ان کلمات کا کیا بنا جو کہ انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں سے لئے جا رہے ہیں) اور اب اردو کے لوگ عصرِ حاضر کے عربی فارسی ادب سے بیگانہ ہونے کے باعث اُن کے ان کلمات سے بے خبر ہیں جو کہ عصری تقاضوں کے باعث وہاں ایجاد ہوئے ہیں۔ مثلاً ایران میں لاؤڈ اسپیکر کے لئے "بلندگو" اور (PAVEMENT) کے لئے "پیادہ رو" اور ریفریجریٹر کے لئے "یخچال" ایجاد کئے گئے ہیں۔ لیکن ہم اپنی بدقسمتی سے ایرانیوں کے ان بیش بہا ایجادات سے مستفید نہیں ہو پاتے ہیں، اس کے برعکس یا تو لاؤڈ اسپیکر کو لاؤڈ اسپیکر کہتے ہیں یا پھر (غالباً انگریزوں کی سازش کی وجہ سے) اس کے لئے آلۂ جہیر الصوت یا آلۂ مکبر الصوت کے ایسے سنگین لفظ استعمال کرتے ہیں۔ (فارسی کے حق میں عربی سے یہ تعصب کیسا؟)۔

ڈاکٹر صاحب کو بات تو صرف اتنی ہی کہنی تھی کہ اردو کے وضعِ اصطلاحات کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر براہ راست جدید ایرانی ادب سے استفادہ کرو، لیکن چونکہ وہ اپنی بات گھما پھیر کر کہتے ہیں، اور اس کے لئے ایک نظریہ بھی لاتے ہیں اس لئے انہوں نے اردو کی "سادہ وضع" یعنی اپنے اصولوں پر قایم رہنے کی وضع کو انگریزوں کی سازش قرار دیا۔ اور جو انگریزوں کا اصل سازش تھی انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی، اس کا کوئی ذکر فسانے میں آیا ہی نہیں، اور نہ اس حکایت دردآمیز میں نیا سجھائیوں کی اسی سازش کا ذکر ہے کہ اردو کا منبع ہندوستان نہیں بلکہ ایران اور عرب ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس کا ذکر ہی کیوں کریں جبکہ وہ خود بھی اس کا ہیولیٰ عربی فارسی ہی سے تیار کرتے ہیں۔

بہرحال قبل اس کے کہ وضعِ اصطلاحات کی بات اٹھائی جائے اور ایرانیوں کی جدید اصطلاحات کو اپنی زبان کے مزاج کے آئینے میں پرکھا جائے، اس نکتہ پر کچھ روشنی ڈالنا ضروری سا معلوم ہوتا ہے کہ کیوں آج نہ صرف اردو کے لوگ بلکہ پاکستان کے سبھی لوگ عربی فارسی سے دور ہیں، اور مغربی زبانوں کی طرف کھنچے چلے جا رہے ہیں۔ پہلے تو یہ جانئے کہ اب علوم و فنون کے نقطۂ نظر سے عربی فارسی کی وہ اہمیت نہ رہی جو کہ قرونِ وسطیٰ میں تھی۔ دوسرے یہ کہ گذشتہ دو تین سو سالوں میں یورپ اور انگلستان کی زبانوں نے اتنی ترقی کی ہے کہ اگر ہم ان زبانوں سے استفادہ نہیں کرتے ہیں تو پھر اپنی زبان کو ترقی نہیں دے سکتے ہیں۔ یہ کہنا کہ یہ سب محکوم ذہنیت کا نتیجہ ہے، احساس کمتری کا کرشمہ ہے بہت آسان ہے، اور اس پر ٹھنڈے دل سے سوچنا کہ ہم ہی کیوں پورا ایشیا مغرب کا غلام کیوں بنا، ذرا مشکل ہے، اور اس سے زیادہ مشکل یہ سوچنا ہے کہ اب وہ کونسا راستہ ہے کہ ہم اُن سے گوئے سبقت لیجائیں۔ اور اگر بہت نہیں تو اس کے ہمدوش ہی ہو سکیں۔ بہرحال اس سلسلے میں جو شعور کہ عام طور پر ایشیا کے لوگوں میں اپنی پسماندگی کے بارے میں پیدا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ ہم صنعت و حرفت، معقولات، سائنس، اور ٹکنالوجی میں یورپ سے پیچھے رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ جب بھی کوئی ملک ان چیزوں میں پیچھے رہ جاتا ہے تو اسکی زبان بھی پیچھے رہ جاتی ہے۔ کیونکہ زبان زندگی کے نئے رشتوں، نئے علوم کی ترویج و اشاعت اور زندگی کے مادی وسائل کو فروغ دینے ہی سے ترقی کرتی ہے۔ اسی وقت ہم اپنی نفسیات کو بروئے کار لاتے ہیں، نئے سے نئے خیالات اور نئے سے نئے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں تاوقتیکہ ایشیا کے ممالک بالخصوص عرب اور ایران اپنے کو ترقی کی اس راہ پر نہ ڈالیں۔ کس کی توقع رکھنی کہ ہماری زبان ان کی زبانوں سے اسی طرح استشراق کا رشتہ قایم کرے گی جیسا کہ اس نے قرونِ وسطیٰ میں کیا تھا۔ تاریخ کے تیور کو نہ پہچاننے کے مترادف ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہم ان سے قریب تر آئیں گے، اور اپنے یار و مددگار کی غنا جو کے علی الرغم آئیں گے لیکن یہ ناممکن ہے کہ ہم وضعِ اصطلاحات کے معاملے میں اپنے اصولوں کو فراموش کر کے، ان کی تقلید کرنے لگیں یا ان کی اصطلاحوں کو براہ راست قبول کرنے لگیں۔ عرب اور ایران آج ان دونوں ممالک کے لوگ اپنی زبانوں کا سررشتۂ استفادہ یورپ کی زبانوں سے باندھے ہوئے ہیں۔ اور ہمیں یہ سکھایا جاتا ہے کہ تم قرونِ وسطیٰ کی روایات کے پابند ہو کر ان کی زبانوں سے استشراق کرو، اور انگریزی اور یورپ کی دوسری زبانوں کو بھلا دو۔ بھلا یہ کیونکر ممکن ہے۔ ہم نے مانا کہ ان کا اب سورج گہنا رہا ہے، لیکن ابھی ہمارے انجم میں وہ تابانی کہاں آئی ہے، کہ ہم ان کی زبانوں سے بے نیاز ہو جائیں۔ آج انگریزی اور دوسری یورپی زبانوں کا سیکھنا اور ان سے استفادہ کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کسی زمانے میں عربی فارسی کا سیکھنا اور اس سے استفادہ کرنا ضروری تھا۔ یہ ایک غیر ضروری بات جو کہ فوری طور پر اس بحث سے قدرے خارج ہے۔ اس لئے درمیان میں لایا ہوں کہ ہم وضعِ اصطلاحات کے موقعے پر اسے لازم قرار نہیں دے سکتے ہیں کہ جو نئی اصطلاح بنے وہ عربی اور فارسی کے الفاظ سے بنے۔ اگر انگریزی کا کوئی لفظ ہماری زبان پر رواں ہے اور اسے عوام و خواص سبھی سمجھتے ہیں تو ہم اسی لفظ کو استعمال کریں گے نہ کہ اس کا ترجمہ عربی اور فارسی کی لغات میں ڈھونڈیں گے۔ مثال کے طور پر سائنس اور کیمسٹری کے الفاظ کو لیجئے۔ ہم سائنس کو سائنس ہی کہیں گے نہ کہ علم اور کیمسٹری کو کیمسٹری ہی کہیں گے نہ کہ الکیمیا یا کیمیاگری۔ کیمسٹری کا مفہوم الکیمیا سے مختلف ہے حالانکہ ماخذ ایک ہی ہے۔

اسی طرح جو سائنس کا مفہوم ہے وہ علم کے لفظ سے ادا نہیں ہو پاتا، تاوقتیکہ ہم اس کے ساتھ کسی اور لفظ کا اضافہ نہ کریں، پھر یہ کہ اس قسم کے الفاظ اس قدر عام ہیں کہ اگر ان کا ترجمہ مشکل الفاظ میں کیا جائے تو وہ اپنا مقصد ضائع کر دیں گے۔

بعض حضرات جو ان دنوں ایٹم کے لئے "جوہر" اور اٹامک کے لئے "جوہری" کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو وہ بھی درست نہیں ہے کیونکہ ہمارے ادب میں جوہر کا لفظ عرض کے بالمقابل استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ (اور جوہری اسے کہتے تھے جو کہ جواہرات کا کاروبار کرتا تھا) آج جو ایٹم کا تصور ہے اس کا اظہار اس لفظ سے نہیں ہوتا ہے، مزید یہ کہ یہ لفظ نہ صرف ہماری زبان پر رواں ہو چکا ہے بلکہ دنیا کی ساری ترقی یافتہ زبانوں میں یکساں طور پر اسی یونانی لفظ کو استعمال کیا جاتا ہے حالانکہ اس کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں اپنے یہاں بھی اسی کو رواج دینا چاہئے۔ سائنس کی ساری اصطلاحات کو بین الاقوامی ہونا چاہئے کہ اس سے تبادلۂ خیال میں آسانی ہوتی ہے۔ اگر عرب ہیولیٰ (یونانی لفظ)، مادہ (لاطینی)، اور اصطرلاب (یونانی) غیر زبانوں سے لے کر اپنے لہجے میں ڈھال لیا کرتے تھے اور آج بھی ایسا ہی کر رہے ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہم کیوں نہ اپنے اصول کے مطابق اصطلاحات وضع کریں، اور جہاں ضرورت ہو غیر زبانوں کے الفاظ کو اپنے لہجے میں ڈھال لیں۔

لیکن اگر غیر زبان کا کوئی ایسا لفظ ہے جو کہ ہماری زبان پر رواں نہیں ہو پاتا تو بے شک اس کے ترجمے یا بدل کو ہم عربی فارسی میں بھی دیکھیں گے۔ چنانچہ ادبی اور علمی اصطلاحات کے لئے ہم نے زیادہ تر عربی اور فارسی ہی سے استفادہ کیا ہے اور ابھی تک وہی طریق کار رائج بھی ہے۔ لیکن یہ طریق کار اشیاء کے ناموں کے ترجموں کے سلسلے میں جائز نہیں ہے۔ جو چیزیں کہ بازار میں بکتی ہیں وہ اپنے ساتھ اپنا نام بھی لاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شے کہ ولایتی ہوگی اس کا نام بھی ولایتی ہوگا۔ بلیڈ زیادہ مقبول ہے بہ نسبت پتی کے، اسی طرح منجن اور "ٹوتھ پیسٹ" کا بھی اب فرق پیدا ہو گیا ہے۔ "ٹوتھ پیسٹ" کے لئے منجن کا لفظ استعمال کیجئے تو کوئی نہیں سمجھے گا۔ اور نئے کپڑوں کے تو سارے نام ولایتی ہی ہیں۔ پھر بھی اس کی گنجائش ہے کہ جس طرح ہم ایروپلین کو ہوائی جہاز اور ایروڈروم کو ہوائی اڈہ کہتے ہیں۔ اسی طرح بہت سی دوسری ولایتی چیزوں کو بھی ہم اپنے زبان کے مزاج، آواز کا تنفر، ذوق کا پہلو، ثقالت۔ اور اپنے لہجے کے خراد اور تراش کو فراموش نہیں کر سکتے ہیں۔ ہم کوئی ایسی ترکیب یا اصطلاح قبول نہ کریں گے۔ جو کہ مضحکہ انگیز ہو۔ مثلاً ڈاکٹر صاحب نے جو دو تین نام مختلف اشیاء کے ایرانیوں کی لغت سے پیش کئے ہیں وہ ہمارے لئے سخت مضحکہ انگیز ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہم ریفری جریٹر کو ایرانیوں کی طرح "یخ چال" کہیں تو اس کا بڑا مضحکہ ہوگا۔ کیونکہ ہمارے یہاں چالیں مختلف ہیں۔ اگر ایک طرف یہ مشہور ہے کو اچلا ہنس کی چال گیا اپنی چال بھی بھول، تو دوسری طرف ایک بھونچال بھی ہے، قطع نظر اس بات کے کہ "یخ چال" کے سننے سے غالب کے اس مصرع کی تندی جاتی رہے گی: ع۔ لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر۔ اسی طرح اگر ہم PAVEMENT کے لئے جس کے لئے فرش کا لفظ بھی استعمال ہو سکتا ہے اور پٹری بھی)، ایرانیوں کی طرح "پیادہ رو" کہنے لگیں تو ہمارے اپنے لوگ پٹری دیکھنے کے بجائے پیادے کو دیکھنے لگیں گے۔ اور ہم جو موٹر کار "موٹر" یا "کار" یا "موٹر کار" ہی کہتے ہیں اور ایرانیوں کی طرح "خودکار" نہیں کہہ سکتے ہیں تو اس کا بھی یہی سبب ہے کہ ہمارے یہاں کار موٹر سے چلتی ہے نہ کہ خود سے۔ اب جبکہ ہم صنعت ابہام سے دور ہو چکے ہیں، ایسی ترکیب کیوں استعمال کریں جس میں ابہام ہو۔ ویسے SELF-PROPELLED کوئی ایک کار ہی تو نہیں ہوتی ہے، آجکل تو سبھی انجن خود ہی سے چلتے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ، کلاسیکی فارسی سے استفادہ کر چکنے کے بعد اب جدید ایرانی زبان سے ہمیں اتنا ہی لینا ہے جتنا کہ انہیں ہماری زبان سے سیکھنا ہے۔ ہمارا جدید ادب ان کے جدید ادب سے اگر آگے نہیں تو کچھ پیچھے بھی نہیں ہے۔ اور یہی بات ماڈرن عربی داں حضرات جدید عربی ادب کے بارے میں بھی کہتے ہیں۔ پھر ہم اپنے اوپر خواہ مخواہ عربیت اور فارسیت کا جنون کیوں طاری کریں کیوں نہ اپنی ٹھیٹھ زبان اور دوسری علاقائی زبانوں کی مدد سے ایسی اصطلاحات بنائیں جنہیں ہزاری بزاری دونوں سمجھ سکیں۔ ڈاکخانہ، پوسٹ آفس کے لئے اور تارگھر، ٹیلیگراف ہاؤس کے لئے اور بجلی گھر، پاور ہاؤس کے لئے کیا برا ہے، کہ ہم ایرانیوں اور عربوں سے انہیں انگریزی الفاظ کے مفرس اور معرب الفاظ لیں۔ اردو کی یہ سادہ وضع میں دانشمندی پر مبنی ہے کہ اس نے ترقی اپنی اسی سادہ وضع سے کی ہے، ورنہ جدید ہندی کی طرح یہ بھی نامقبول ہو چکی، اور اس کا وہ بول بالا نہ ہوتا جو کہ آج اردو کی فلموں کی مقبولیت سے ظاہر ہو رہا ہے۔

اردو کے ہیولے کی بات تو بہت ہوئی، لیکن اس سلسلے میں جو ایک ضروری بات کہنی تھی وہ تو میں بھول ہی گیا۔ اردو، لشکر کے بازار سے چل چلا کر شہر کے بازار میں پہونچی تھی، اس نے بیشتر الفاظ غیر زبانوں اور اپنی ہم کنبہ بولیوں سے انہیں بازاروں میں لئے ہیں، جہاں مختلف زبانوں اور بولیوں کے لوگ آپس میں

لین دین اور سودا سلف کرتے۔ یہ بازاریت اس کی گھٹی میں کچھ ایسی پڑی ہے کہ وہ کسی بھی نئے لفظ کو قبول کرنے سے پہلے، اس کے چالو ہونے کا سوال اٹھاتی ہے۔ آج جبکہ مغربی پاکستان ایک بازار میں تبدیل ہو رہا ہے، مغربی پاکستان کی علاقائی زبانوں کے بہت سے الفاظ آپس کے لین دین اور سودا سلف کرنے سے اس میں راہ پانے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن وہ مقبول اسی وقت ہوں گے جبکہ وہ چالو ہو جائیں گے۔ پنجابی کے نئے الفاظ بھی اردو زبان میں اسی فطری طریق کار سے آئیں گے اور اردو کا لہجہ پاکر ایسا گھل مل جائیں گے کہ عین اردو زبان کے الفاظ معلوم ہوں گے کسی بھی زبان میں نئے الفاظ اسی طرح کے مختلف لیکن فطری طریق کار سے داخل ہوتے ہیں، اور وہ بھی ایک طویل زمانے میں، نہ کہ کسی سمجھوتے کے تحت کہ "اگر تم یہ چاہتے ہو تو ایسا کرو" اگر اس قسم کا کوئی سمجھوتہ زبان کے معاملہ میں چلتا ہو تو یہ ہندی کو جیت کر کے کب کی وہاں براجمان ہو چکتی، زبان کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ جہاں ساری عصبیتیں ختم ہو چکتی ہیں، وہاں ایک عصبیت زبان کی باقی رہ جاتی ہے، کیونکہ خیالات کے اظہار کے لئے تو کسی اور کی زبان سے بھی کام چل سکتا ہے۔ لیکن جذبات کا اظہار صرف اپنی ہی زبان میں ہو پاتا ہے۔ اسی لئے اس کی پاکیزگی بھی عزیز ہوتی ہے ایسی صورت میں کسی ایک یا دس بیس الفاظ کے قبول کرنے یا نہ کرنے کی صورت میں فراخدلی کا سوال اٹھانا نہ چاہئے، کیونکہ آدمی کسی چیز کے دینے میں فراخدل ہوتا ہے نہ کہ لینے میں۔ فراخدلی سے دوسروں کی چیزیں لئے جانے کو کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا ہے۔ وہ زبان کیا جو اپنا لوہا تخت و تاج کی مدد سے منوالے، اردو تو درویشی میں پلی ہے، اور اسی انکسار و عاجزی کے ساتھ اب تک ترقی کرتی رہی ہے۔ وہ تو بر خود غلط چند سر پھرے تھے جو یہ سوچتے تھے کہ وہ اردو پڑھا کر اپنے ان پاکستانی بھائیوں کو مسلمان بنا رہے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے، ویسے سر پھرے اب ذرا خال ہی خال ہوں گے۔ ایک ڈاکٹر لوکے بعد دوسرا ڈاکٹر لو نہیں ہوا کرتا۔ ورنہ عام طور پر اردو کے لوگ اسی نقطہ نظر کے ہیں کہ وہ اپنی زبان کو پاکستان کی دوسری زبانوں اور بولیوں کی مسابقت میں ترقی کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں، نہ کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی مغلوب کر کے اس کی ترقی چاہتے ہیں۔ لیکن اگر مغربی پاکستان کی مختلف بولیوں اور زبانوں کے لوگ از خود یہ بات محسوس کرتے ہیں کہ یہاں کے مختلف قوم قبیلوں کے درمیان اردو زبان ہی کے ذریعہ اتحاد قائم کیا جا سکتا ہے یا یہ کہ اردو ہی اس علاقے کی لنگوا فرینکا ہے اور اسے مغربی پاکستان کی قومی زبان بنانی چاہئے، تو چشم ما روشن، دل ما شاد، اس میں کسی اینچ پینچ کی کیا بات ہے۔ نیکی کر کنوئیں میں ڈال۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا ہے خواہ اس کا سبب انگریزی زبان کا تسلط ہے، یا کوئی اور سبب ہو تو اردو کے لوگوں کو کیا شکایت ہو سکتی ہے اگر ان کے جائز حقوق کی پامالی نہیں ہوتی ہے۔

اردو یا پاکستانی ؟

گر اس وحدتی اور صلح جوئی کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو پھر ڈاکٹر محمد باقر کی اس تجویز پر رائے دینا کچھ مشکل نہیں ہے کہ کیوں نہ اردو کو پاکستانی کے نام سے بدل دیا جائے۔ عرض یہ ہے کہ جس طرح پاکستان کی نسبت سے ہر وہ شخص پاکستانی ہے جو کہ پاکستان میں رہتا ہے اسی طرح پاکستان کی ہر وہ زبان اور بولی پاکستانی ہے جو کہ پاکستان میں بولی جاتی ہے۔ چنانچہ اردو اس نسبت سے بغیر کسی کے کہے سنے پاکستانی ہے، ہر چند کہ وہ اور ملکوں میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے، پھر اسے بغیر کسی مقابلے میں اول آئے ہوئے سٹر پاکستانی کا لقب کیوں دیا جائے اس سے دوسری زبانوں اور بولیوں کے لوگوں کی دل آزاری ہوگی۔ بالخصوص مشرقی پاکستان کے بنگالی بولنے والے حضرات تو اس پر بڑا ہی ہنگامہ کریں گے۔ اور اگر اس کے جواب میں برائے بحث یہ کہا جائے کہ چلو اس کا نام پاکستانی نہ سہی مغربی پاکستانی رکھتے ہیں تو اس وقت ہم سے بیعت لینے سے پہلے سندھی، پنجابی، ملتانی، پشتو، براہوی، بلوچی، گجراتی، کچھی بولنے والوں سے مخاطب ہونا چاہئے، کہ انہیں کی اکثریت ہے اور کسی بھی جمہوری ملک میں اکثریت کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہ کرنا چاہئے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے لئے اس کے نام بدلنے کی تجویز سے یہ کام زیادہ اہم ہے کہ اردو کی سادہ وضع یعنی اس کے بنیادی ذخیرۂ الفاظ، اس کے روزمرے اور محاورے اور اس کے قواعد اور لہجے کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی ترقی میں کوشش کی جائے، ہر چند کہ یہ انگریزوں کی سازش ہی کیوں نہ ہو ؎

مرتا ہوں اس آواز پہ ہر چند سر اڑ جائے
جلاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"

اس سے کم از کم یہ تو فائدہ ہوگا کہ ہم پاکستان کے عوام سے تو قریب رہیں گے ؛

★

غزل

یہ غزل سو تیا چھند کے مطابق کہی گئی ہے۔ اس چھند یا بحر میں میرؔ کی متعدد غزلیں ہیں
جیسے ع "اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا"

فراق گورکھپوری

پوچھ پوچھ کے نام پتہ کچھ سمجھ سمجھ رہ جاتے ہو
ہم بھی فراق نگر جاتے ہیں بولو تم کبھی آتے ہو

نین پٹوں میں رہ رہ کر تم چنچل روپ دکھاتے ہو
آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھوں تو تم چھپ چھپ جاتے ہو

کالے بادلو اُمڑ گھمڑ دھرتی کی پیاس بجھاتے ہو
راگ ملھار سناتے ہو یا جیون گھن برساتے ہو

ہنس ہنس کے گلرنگ ادا سے ناز سے دیکھ دیکھ کے دھڑ
کھڑ پھیر پھیر لیتے ہو کیوں دل کو دھڑکاتے ہو

تم نے دل لینا سیکھا ہے دل رکھنا سیکھا ہی نہیں
تم اور مجھ پر کرم کرو گے کیوں مجھ کو جھٹکاتے ہو

آنکھوں سے اوجھل ہو لیکن جھمک جھمک یہ کیسی ہے
میرے من مندر میں اپنی پینجنیا جھنکاتے ہو

بزم طرب کے نام بڑے اور درشن چھوٹے یاد رہے
یار دور کے ڈھول سہانے کس محفل میں جاتے ہو

اُڑتی پھرتی تھی گلیوں گلیوں جدھر کدھر ماری ماری
روندرہے ہو خاک ہماری جیون مان بڑھاتے ہو

یہ شب مستی بھرتے ہو جس میں مذہب و ملت کے بہروپ
ایک رات میں دنیا والو کیا کیا سوانگ رچاتے ہو

دُنیا روشن کرنے والو۔ کچھ دُنیا کا حال بتاؤ
دیپ سمان بھری محفل میں جل جل کے بجھ جاتے ہو

اچّھا اچّھا اے دل والو تم کو کسی سے عشق نہیں
دُبدھے پیدا ہوتے ہیں اتنی قسمیں کیوں کھاتے ہو

میں بھی اسی دُنیا میں ہوں یارو لاکھ بار اس دُنیا کی
سمجھ چکا ہوں رام کہانی تم کس کو سمجھاتے ہو

تم نے چھپ کے چھیڑ دیا ہے کس جھرمٹ سے یہ سنگیت
گونج اٹھی ہے گھاٹی گھاٹی پریم کی بین بجاتے ہو

سُکھ کا بھید سمجھنے والا دکھ کا دھوکا کیا کھائے
میرے آنسو دیکھ دیکھ کے من ہی میں مسکاتے ہو

پریم نگر میں کہتے ہیں کل اک ماتم سا برپا تھا
اس ہمسائے میں کچھ تو بتاؤ تم بھی آتے جاتے ہو

دُنیا والو کن جتنوں سے دُنیا تم کو جگاتی ہے
تم ہو ایسے نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہو

چُپ رہتے ہو میرے آگے یہ تو مانتا ہوں لیکن
بے شبدوں کے جانے کیا کیا تم مجھ سے کہہ جاتے ہو

اس اُجڑی دُنیا کو سجاؤ تب تو کوئی بات بنے
اے من کے رسند رسینہ تاروں کے دیس بساتے ہو

نرجن بن اور رین اندھیری کب سے ہو اس عالم میں فراق
آنکھیں بند کئے بیٹھے ہو من کی جوت جگاتے ہو

★

سرڈول[1]

متبر انصاری جعفری

جواں سال، چونچال، سندر، چھورا

مدھ سر دیس کا بھاما لاتا جوڑا

دلوں کا حسیں چور، گبھرو، کنہیا

بھری بار کامت و مخمور تورا[2]

غزل مند کندھوں پہ نیلی خوشابن[3]

خوشابن میں جھلکے ارم گورا گورا

جوانی پہ اٹھتی امنگوں کے بادل

سجل عمر میں بجلیوں کا نہورا[4]

رسیلی ہنسی میں فروزاں چنبیلی

چناں تاب چہرہ، سنہری کٹورا

سحر رنگ ماتھے پہ زلفوں کے لچھے

کنول روپ نینوں میں سرمے کا ڈورا

خنک سوز چن ماہیوں کا تپنگا

جہاں گیر مہرانیوں کا چکورا

---

[1] ادھر کا ایک پیارا نام [2] پنجاب کا مشہور رومانی ڈاکو
[3] ریشمی کنارہ دار لنگی [4] نخرہ۔

فریبِ ازل

شاد امرتسری

ہم تھکے ہاروں کو دامن میں سمیٹے چپ چاپ
تیرگی شب کی نگل جاتی ہے دن کو ہر شام
سوچتی ہے کہ ہو خوابیدہ کھلے بستر پر
اور ہم اپنا سفر چھوڑ کے بے خود ہو جائیں
اور ہر وادیٔ شاداب کا تیکھا منظر
شب کے ارمانوں کی تکمیل کا ساماں بن جائے

تیرگی شب کی نگلتی ہے ہر اک نقش حسیں
خواب گاہوں کے دریچوں کے نشاں مٹتے ہیں
اور ایوانوں کے گوشوں پہ فسوں چھاتا ہے
بام و در تھے ہوئے دستِ سیہ دیکھتے ہیں
راستے خوف سے چپ چاپ سمٹ جاتے ہیں
شب ہر اک نقشِ حسیں خواب بنا دیتی ہے

تیرگی شب کی نگلتی ہے ہر اک شے کو یونہی
بام و در، وادیٔ شاداب، ہر اک نقشِ حسیں
دہنِ تیرہ کی وسعت پہ نظر گاڑے ہوئے
تند و تاریک خلاؤں میں اٹک جاتے ہیں
خواب گاہوں کے دریچوں کی جھپکتی آنکھیں
برق پاروں کی تمازت کو فرد کرتی ہیں

زندگی دن کو سفر کرتی ہے منزل کی طرف
ایک دو گام ازل پیچھے سرک جاتا ہے
خواہشِ منزلِ مقصود جواں ہوتے ہی
شب کے بے رحم سیہ ہاتھ میں آجاتی ہے
اور پھر نقطۂ آغاز کا ملتا ہے سراغ
گویا طے کردہ مسافت بھی کوئی شے ہی نہ تھی

آگ اور پیاس ★

شہاب اختر

ہر اک بدن سے سمندر گرے پسینے کے

دہکتی ریت کے جلتے ہوئے سرابوں میں
سلگتی آگ کا اک دجلۂ رواں بن کر
وہی تپاں وہی شعلہ بجاں اُداس خزاں
گذر رہی ہے کڑی دھوپ کا دھواں بن کر

★

چمن کی راہگذاروں میں آگ پھیل گئی!
وہ آگ جن سے بہاروں کے سائے ڈرتے ہیں
یہ پیلے بھوت خزاں کے یہ زرد روپتے!
دلوں میں خاک تو آنکھوں میں راکھ بھرتے ہیں

★

نہ سبز پتّوں کے آنچل نہ رنگ پھولوں کے!
ہر ایک شاخ برہنہ لباس ڈھونڈتی ہے
اُجاڑ، خاک اڑاتی ہوئی اُداسی میں!
شگفتِ گل کو نگاہوں کی پیاس ڈھونڈتی ہے

★

مرے اداس کراچی ترے مقدّر میں
کسی حسین کی زلفِ سمن فشاں بھی نہیں
زمیں پہ سایۂ ابرِ بہار تو کیسا
زمیں پہ سایۂ دیوارِ گلستاں بھی نہیں

خزاں نصیب کہاں دن بتائیں پینے کے!

★ کراچی پر ان دنوں برستی ہوئی آگ سے متاثر ہو کر۔

جھیل

بلراج کومل

رنگوں روشنیوں کا میلہ
میں نے کل شب جھیل میں دیکھا
تاریکی میں کھوئے پربت
کھمبوں کی خاموش قطاریں
کشتی بانوں کی آوازیں
نکھرے پانی کے درپن میں جھانک رہی تھیں

میرے جام سے ٹکرا کر خاموشی گونجی
آنکھیں پُرنم
میں خوش تھا یا جھیل میں اپنے دکھ کا سایہ دیکھ رہا تھا!؟
میں کیا جانوں!؟

مہمان

کل شب ایک سہانا سپنا
میرا مہماں بن کر آیا
لیکن میں تو جاگ رہا تھا
تنہائی کی راہ گذر پہ
تاریکی سے بھاگ رہا تھا
سواگت اس کا میں کیا کرتا
اس کے پیار کا دم کیا بھرتا

میرا مہماں لوٹ گیا ہے
اس کو واپس کون بلائے؟
کون اس پردیسی کو منائے!؟

غزل

طاہرہ کاظمی

نہ غمخوار ہے ذوق بادہ پرستی، نہ یاد کرم حاصل زندگی ہے
تلاش سکوں، شورش قلب مضطر، نگاہوں کا نم حاصل زندگی ہے
ترے غم نے بخشی امیدوں کی دولت، نظر کی بلندی تخیل کی عظمت
نہ لوں جس کے بدلے زمانے کی راحت، وہ معراج غم حاصل زندگی ہے
سلامت رہیں شدتیں آرزو کی مجھے اس تغافل کا شکوہ نہیں ہے
ہے دورِ وفا جس کے محور پہ قائم، وہ قول و قسم حاصل زندگی ہے
شبوں کے اندھیرے میں بھٹکی ہیں برسوں نگاہیں تری رہگزر پر رکی ہیں
جہاں پر جھکے چاند تاروں کی رفعت، وہ نقش قدم حاصل زندگی ہے
جفائے مسلسل کا شائق ہے یہ دل، اب اس کے لئے آرزوئے کرم کیا
جو خاروں کی سوزش گلوں میں بدل دے، وہ مشق ستم حاصل زندگی ہے
کہیں نالش آرزو و نوازے کہیں ہیں تصور میں جلوے فروزاں
یہ ہستی ہے جس سے چراغاں چراغاں، وہ درد و الم حاصل زندگی ہے

غزل

ضمیر اظہر

شہاب اُبھرے ہیں، مہتاب مسکرائے ہیں
ترے خیال میں کیا کیا خیال آئے ہیں
جبھی تو جاذبِ قلب و نظر ہے رنگ شفق
کہ اس میں تیرے لبوں کے حسین سائے ہیں
بہار تیرے خد و خال سے مزین ہے
گل و سمن نے ترے رنگ و بو چرائے ہیں
تری جبیں میں کئی رفعتیں جھلکتی ہیں

تری نظر نے کئی آسماں بنائے ہیں
ہوا ہے یوں بھی کبھی وسعتِ تمنا سے
ترے فراق میں تیرے پیام آئے ہیں
مہک اٹھی ہے مری شام، میری تنہائی
کچھ ایسے پھول تری یاد نے کھلائے ہیں
عجیب شے ہے تصور کا بتکدہ اظہر
ہر ایک روپ کے اس میں ہزار سائے ہیں

ماہِ نو، کراچی۔ اگست ۱۹۵۸ء

افسانہ:

زیرِ دام آ ہی گیا!

ابو الفضل صدیقی

مہینوں تاریک راتوں کے سناٹوں میں نیچوں کے بل جمع ہو ہو کر جس پودے کی ہم نے گویا اپنے خونِ دل سے آبیاری کی تھی، اور جسے گویا سر دھڑ کی بازی لگا کر پروان چڑھایا تھا آج اس کے بار آور ہونے کا دن تھا۔ مدتوں کی بنی ہوئی اسکیم آج عملی جامہ پہن رہی تھی۔ دھڑکنیں تیز تھیں، حواسِ خمسہ جس کی اخیر منزل پر تھے، دل سے ہراس غائب تھا، اعصاب میں کہربائی سرعت کار فرما تھی۔ سرشام سے ہماری پارٹی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں شہر بھر میں محلوں محلوں، گھر گھر گشت لگانے کے بعد کہیں بارہ ایک بجے ٹھکانے لگی تھی۔ ایک خفیہ جگہ پر جمع ہو کر پھر مختصر سی میٹنگ ہوئی، مجملاً اپنی اپنی کارگذاری کی روئداد بیان کی، اور اخیر رات سب اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہو گئے۔ نیند تو کس سخرے کو آنی۔ صبح نکلتے ذرا آنکھ جھپکی تو کیا دیکھتا ہوں کہ ہیڈ ماسٹر میرے نیچے دبا پڑا ہے مضبوط پُر گوشت گردن میرے پنجہ میں ہے اور گھٹنا اس کی پیٹھ پر جما ہوا ہے۔

"بہت خون پیا تھا، زندگی اجیرن کر دی تھی، آج زندہ بچ کر نکل جاؤ گے تو میں نے جانا" میں نے کہا اور دبے ہی دبے ہیڈ ماسٹر نے پورا زور لگا کر گردن موڑی اور رہا یک جوں ہی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں میری گرفت جیسے شدید خوف کے احساس سے ڈھیلی ہو گئی اور ہیڈ ماسٹر اچھل کر آزاد ہو گیا .... میری آنکھ کھل گئی اور میں غیظ و غضب میں زیر و زبر ہو کر جاگا۔ میرا ضمیر ایسا خواب دیکھنے پر مجھے نفرین کر رہا تھا۔ گویا خواب میں بھی ہیڈ ماسٹر سے خائف ہونے پر نادم تھا۔

اور میں اپنے ادب سکھانے والے کی تادیب کے لئے گھر سے چلا ہم سب ننگ لیڈر دن کو آج سورج نکلنے سے پیشتر اپنی انبیسی مجلس شوریٰ منعقد کرنی تھی۔ معینہ وقت پر تو آنکھ ہی کھلی تھی۔ جلدی جلدی بستر سے جوں کا توں اٹھ کر کوٹ کندھے پر لٹکائے، انگلیوں سے بال درست کرتا ہوا ایک ہاتھ میں سائیکل پکڑے گھر سے چل پڑا۔ بمشکل دو سو قدم نکل پایا ہوں گا کہ پچھلے پہیے میں پنکچر ہو گیا اور مجھے مجبوراً اپنی لنگڑی سائیکل رکھنے کے لئے گھر واپس آنا پڑا اور پھر بھاگنے اور لپکنے کے درمیان میں اسکول کی جانب چلا۔

آج اسکول میں قیامت صغریٰ بپا کرنے کا موعودہ دن تھا اور اس کم بخت پنکچر کے چکر میں مجھے دیر ہو گئی تھی، شعلہ ابھی نوزائیدہ تھا مجلس شوریٰ کا اجلاس ختم ہو چکا تھا اور مجھ پر غدار، بزدل وغیرہ قسم کا ریزولیشن پاس ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی فیصلہ میں آگ لگنے کی دیر تھی۔

"خوب آئے صبح تڑکے! سبحان اللہ!"

"اجی اب نکلی ہے آپ کی صبح!؟"

"ناشتہ میں دیر ہو گئی ہو گی، ایں، رات کا بھوکا تھا بچارہ"

"اجی دیکھ لی بہادری! ۔ مکار کہیں کا ۔ بزدل"

"ارے صاحب ان حضرت کو تو میں بھی کچھ پہچانتا ہوں بس سمجھ لو، گولی سو قدم بندہ پانسو قدم"

"چلتی رقم ہیں، ایسے سہل ہاتھ آنے والے نہیں، سو کر رہ گئے ہیں!؟"

"اور سوتا اور مرا برابر ہوتا ہے، کیا کریں بیچارے مجبوری ہو گئی مکار کہیں کا۔"

اور میں نے ساتھیوں کی ان بوچھاڑوں میں ذرا سانس درست کی اور اک ذرا بار سا پاکر جواب دیا "وہ تو اب دیر ہو ہی گئی، خواہ کچھ کہو، غدار بتاؤ یا بزدل کہو۔ اب تو بھائی سبھی کچھ ہیں۔ اگر آنکھ ذرا سویرے کھل جاتی تو آج ہم بھی تم سے کم بہادر نہ ہوتے"

ہماری کلاس کے تینوں سیکشنوں نے تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے درجے کے بچوں کو براہ راست اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ ساتویں اور آٹھویں جماعت کے طلباء ہمارا دست راست تھے۔ اور آٹھ سالہ کموان جیرکی ابوں کے تھا۔ میرے ہاتھ میں ایک تیلا سا جزدان سلور کی شام والا بید تھا۔ ظہیر، سعید، حسنین اور کاظم کے ہاتھوں میں ہاکی اسٹکس تھیں۔ میرے پہنچتے ہی ادھم مچ گیا۔ پھاٹک پر، میدان میں، برآمدوں اور کلاسوں میں بھاگڑ مچ گئی اور اسٹرائک کا سماں بندھ گیا۔ غرّاتے ہوئے صحرائی کتوں کے غولوں کی طرح چھوٹے بڑے طلباء دوڑ رہے تھے، چنگھاڑ رہے تھے۔ زمین آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ بنچیں اور اسٹول اٹھا اٹھا کر پٹخ رہے تھے۔ انقلاب اور دشمنوں کی چنگھاڑوں سے تمام فضا بھری ہوئی تھی۔ مجمع ہال کی جانب رجوع ہونے لگا۔ چوکیدار سے کنجی لے کر ہال کھول ڈالا، اور ہر طرف دروازوں سے ہال کے اندر کو طالب علموں کا طوفان پھٹ پڑا۔ اور میں ابھی فضا ہموار کرنے کے لیے ڈائس پر پہنچ گیا اور اپنی تمام تر لسانی قوتیں جمع کر کے اپنی بساط سے کہیں زیادہ زور کے ساتھ نو سو طلباء کے مجمع میں دھواں دھار تقریر کی اور جس ہیڈ ماسٹر نے گھنٹوں کھڑے ہو ہو کر اسکول ڈیبیٹ کی تعلیم دی تھی اور انگلش اور اردو سمجھا سمجھا کر تقریر کی مشق کرائی تھی اسی کو آج "کس نیاموخت علم تیر از من کہ مرا عاقبت نشانہ نکرد" کا مصداق بنا ڈالا۔

پہلے سناٹا ہوا اور پھر رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ جوش طاری ہوا اور پھر خشونت اور غیظ و غضب۔ جاہلانہ لیڈران کرام نے نوجوانوں کے جذبات کو بھڑکایا۔ اور یہ میٹنگ تو نظم و ضبط کی شکل دی شکیل نے دو تین ریزولیشن پیش کئے جن کے ذریعہ ایک باضابطہ الٹی میٹم سامنے آگیا۔ اور جب میٹنگ ختم کر کے مجمع ہال سے باہر نکلا تو سامنے سے ایک کار میں ہیڈ ماسٹر، سکریٹری اور چیئرمین آتے دکھائی دیے۔ کار نے پورٹیکو تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ہارن کی آواز "ہیڈ ماسٹر برباد"، "ظالم"، "موذی"، "جلاد"، "کافر" کے نعروں میں گم ہو گئی۔ اور پھر غدار ملت برباد، توڑ دو، مار دو، پکڑ لو، بے ایمان— پھر دھم دھم دھما دھم، چٹاچٹ، چھن چھن کار کے شیشے چکنا چور ہو گئے اور وہ بڑی مشکل سے مڑ کر فرار ہو سکی۔ ہم سب نے ایسا محسوس کیا کہ جیسے دشمن ہمارے مقابلہ سے شکست فاش کھا کر میدان سے فرار ہو گیا، دل بڑھ گئے۔ ہمارے کھولتے خون میں بڑے زور سے ہیجان پیدا ہو گیا طوفان تھا تھمتے تھمتے ہی کہیں پہنچ گیا۔ اور میٹنگ کے پاس شدہ ریزولیشنوں کے مطابق عملی اقدام شروع کر دیا۔ قرارداد کے مطابق تقریباً ایک ہزار طلباء کا جلوس چیختا چلاتا سیدھا مجسٹریٹ کی طرف چلا گیا جو کہ پہنچا تو اتنے بڑے شیطانی لشکر کو بڑھتے دیکھ کر مجسٹریٹ اپنی کوٹھی کی بالائی منزل پر چڑھ گیا۔ ہم نے نہایت منفعلانہ لہجے میں شکایات کے متعلق استفسار کیا اور ایک ہزار کے مجمع میں سے میں ہی بڑھ کر اس سے ہم کلام ہوا۔ میری خفت تو خیر ہال کے اندر تقریر کے بعد ہی ختم ہو گئی تھی اور اس وقت تو سارے مجمع اور مجسٹریٹ پر بھی رعب طاری ہو گیا کیسی خوبصورتی اور زور کے ساتھ میں نے اپنے مطالبات پیش کئے۔ مجسٹریٹ نے ایک پرچہ پر ہمارے مطالبات نوٹ کئے اور کہا چونکہ آپ کے مطالبات میں ہیڈ ماسٹر کی برطرفی اور اسکول اسٹاف اور ورکنگ کمیٹی میں تبدیلی وغیرہ کا مطالبہ ہے، لہذا آپ لوگ انسپکٹر آف اسکولس کے پاس جائیں۔ مجمع یہاں سے ہٹ کر انسپکٹر آف اسکولس کے بنگلہ پر پہنچا۔ یہاں باری باری سے ہم سب نے اپنی حسرتیں نکالیں۔ ہیڈ ماسٹر پر بدنظمی، بے ایمانی وغیرہ سب الزامات لگائے۔ سکریٹری کو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بتایا، بیشتر طلباء کے ساتھ درشتی اور بدکلامی سے پیش آنے، دوران امتحانوں میں بے ضابطگی برتنے کی شکایت کی اور برطرفی کا مطالبہ کیا۔ مطالبے کے اختتام پر فریادوں کے نعرے بلند کئے اور اپنے مطالبات کے پورے ہونے تک کے لئے اسٹرائک کا اعلان کر دیا۔ اسکول نامعلوم مدت کے لئے بند ہو گیا۔

چڑھی ہوئی اتر گئی تھی، اور سر پر خمار طاری تھا۔ ہم میں کے بیر بجر قسم کے لطیفے سرخرو بن کر صاف علیحدہ ہو گئے تھے۔ ابتدائی جماعتوں کے بچوں کو بید کی سزا دی جا چکی تھی۔ ساتویں اور آٹھویں جماعت کے نیم لیڈر طلباء کو پبلک کیننگ اور بھاری بھاری جرمانوں سے دبا دیا گیا تھا۔ غرض بغاوت فرو کرنے کے بعد فاتح حکومت جو کچھ کیا کرتی ہے وہ سب کچھ ہو چکا تھا۔ مگر ہم سات کے متعلق ابھی تک کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا اور معاملہ زیر غور تھا اور جیسے ہم موت و زیست کے درمیان ٹنگے ہوئے تھے۔ گھر پر تقریباً روزانہ لعنتیں پھٹکاریں پڑا کرتی تھیں اور کبھی کبھی گوشمالی تک نوبت پہنچ جاتی۔ ہم پنج وقتہ نمازیں پڑھ پڑھ کر خضوع و خشوع کے ساتھ دعائیں مانگتے، ہمہ وقت توبہ استغفار کا ورد رکھتے۔ اور وہ سب وظائف پڑھا کرتے جو امتحان کے زمانہ اور نتیجہ کی آمد تک کورس سے زیادہ شدت کے ساتھ پڑھے جایا کرتے ہیں۔ جب اسکول کو اسٹرائک کے بعد کھلے ہوئے دو ہفتے گزر گئے اور ہیڈ ماسٹر ہمارے معاملہ کو زیر غور ہی کہتا رہا تو ایک روز والد صاحب قبلہ مجھ کو ساتھ لے کر ہیڈ ماسٹر کے گھر پہنچے، سب ساتھیوں کے سرپرستوں اور والدوں کو بھی ساتھ لے لیا اور ہم ساتوں نے

فرداً فرداً بچشمِ نم دست بستہ معافی مانگی۔ خشک تیوروں اور سرد انداز سے ہیڈ ماسٹر نے معاف کرنے کا وعدہ کیا اور ہفتہ بھر کے اندر مطلع کرنے کو کہا۔ اور تیسرے چوتھے روز اسکول کا بوڑھا چپراسی ہمارے دروازہ پر رسٹی کیشن کا نوٹس لے کر پہنچا۔ ہمارے باپ کے نام کارگذاریوں کے انعام! یوں ہی کاغذ ہاتھ میں پہنچا ابا جان پہلے تو حسبِ عادت ہم پر برس پڑے، اپنی موت کی دعائیں مانگیں، بار بار پیشانی ٹھونک ٹھونک کر مجھ کو بد دعا دی، خاندان کی عزت خاک میں ملانے والا۔ اور پشتوں کا نام ڈبونے والا خطاب دیا۔ اور پھر دونوں مٹھیوں میں میرے دونوں کان کھینچ کر بڑے زور سے میرا سر جھنجھنا کر پھینک دیا۔ گھر سے نکل جا مردود، منحوس شکل دنیا کو سامنے سے بے ایمان! ۔ خدا غارت کرے شیطان صورت! ۔ اب ساری عمر ڈنڈے بجاتے پھرنا نالائق! اسہ پہر تک غصہ فرو ہوا۔ سعید کے باپ ملنے آئے، معلوم ہوا کہ ان سب کے ہاں بھی ایسے ہی نوٹس پہنچے ہیں سعید کے باپ سے گفتگو ہوئی تو میری جان میں جان آئی۔ والد قبلہ فرما رہے تھے "دیکھئے اس ہیڈ ماسٹر کے دماغ کو واقعی لونڈوں نے چگ لیا ہے یعنی اس روز ہم خود گئے اور لڑکوں سے معافی بھی منگوا دی اور وعدہ بھی کر دیا پھر آج رسٹی کیشن کا نوٹس بھجوا دیا! اچھا معافی نامہ بھجایا ہے!"

"ہوں" سعید کے باپ نے کہا "ہم نے اسٹرائک میں تو یہ سمجھ کر دخل نہ دیا تھا کہ یہ لڑکوں اور ہیڈ ماسٹر کے درمیان معاملہ ہے مگر اب سب معاملے ختم ہو گئے اور یہ ہمارے ناک کے بال نوچ رہا ہے؟"

"اب ایسے کام نہیں چلے گا۔ لڑکوں کے بجائے خود ہمیں میدان میں اترنا پڑے گا۔ اب یہ چیز اسکول کی مجلس عاملہ نہیں عدالت دیوانی اور فوجداری طے کرے گی"

چوبیس گھنٹے کے اندر سازش پھیل گئی۔ سعید، شکیل، کاظم، یوسف حسین اور ظہیر کے باپ تو گویا ایک ہی ناؤ میں سوار تھے کیونکہ سب کا رسٹی کیشن ہوا تھا۔ والد صاحب اور ان سب نے مل کر شہر کے اندر کہیں بغضِ معاویہ اور کہیں حبِ علی کے سہارے ایک اچھی خاصی پارٹی عمائدین ہیڈ ماسٹر، سکریٹری اور چیرمین کے خلاف صف آرا ہو گئی۔ بات پہلے لوکل اخبارات سے چل کر صوبہ کے مشہور انگریزی اور اردو روزناموں تک پہنچی۔ ان لوگوں نے بیانات اور آرٹیکلوں کے ذریعہ منیجنگ کمیٹی کو خوب خوب عریاں کیا، سکریٹری اور چیرمین کی اچھی طرح خبر لی اور ہیڈ ماسٹر کی بدعنوانیوں اور کج اخلاقیوں اور نالائقیوں کی تو ایک نئی فہرست ہر اینوع میں نکلتی۔ پھر بھی جب نوٹس واپس نہ لئے تو براہ راست ڈائریکٹر آف ایجوکیشن اور گورنر تک وفد بنا کر پہنچے اور جب وہاں سے بھی کچھ نہ بن آیا تو اسکول کے آئین کی رو سے ہر مسلمان کو حساب دیکھنے کا حق تھا لہٰذا ایک بہشتی سے ہیڈ ماسٹر کے خلاف غبن اور خیانت مجرمانہ کا دعویٰ عدالت فوجداری میں کرایا اور عدالت دیوانی میں اپنی جانب سے استقرار یہ دعویٰ کیا کہ رسٹی کیشن خلاف قانون و انصاف قرار دیا جائے۔ ان دعوؤں کے بعد ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ حکام ضلع اور عمائدین شہر بیچ میں پڑے، ہیڈ ماسٹر کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ہمارے سرپرست اتنا شدید اقدام کر جائیں گے۔ معاملات نہایت تلخ صورت اختیار کرنے لگے۔ بہشتی کا استغاثہ نہایت سنگین تھا اور ہیڈ ماسٹر پر نہایت کھردری قسم کی ضرب۔ پولیس کی بدنامی اپنی جگہ پر علیحدہ تھی۔ ہیڈ ماسٹر کی حمایت میں سکریٹری اور چیرمین تھے اور ہاتھی کی ہاتھی سے ٹکر تھی۔ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم کے یہاں سے نت نئی جواب طلبیاں ہو رہی تھیں۔ عمائدین شہر اور حکام ضلع نے مل کر معاملہ پنچایت میں ڈالا۔ سررشتہ تعلیم کی جانب سے ایک کمیشن کا تقرر ہوا جو اسٹرائک اور اس کے بعد کے تمام واقعات کی تفتیش کر کے رپورٹ دے۔ کمیشن کے روبرو لمبی لمبی شہادتیں اور بیانات ہوئے۔ مقدمات عدالتوں سے واپس لے لئے گئے اور کمیشن نے گول مول رپورٹ دی۔ ہیڈ ماسٹر برقرار رہا اور ہم کو بھی اسکول میں داخلہ دے دیا گیا۔ رسٹی کیشن کے نوٹس واپس لے لئے گئے۔ ہم ساتوں کا اسکول میں آخیر سال تھا۔ سب کے باپوں نے نصیحت کر دی کہ ہیڈ ماسٹر سے کھٹ پٹ نہ ہونے پائے۔ ادھر ہیڈ ماسٹر بھی ہمارا لوہا مان گیا تھا۔ اور اسی طرح ڈیڑھ سال تک ہم لوگ اسکول میں کاٹ کر میٹرک پاس کر کے اسکول اور ہیڈ ماسٹر دونوں کو چھوڑ آئے۔

پچھلی مجلس درہم برہم ہو گئی تھی اور آٹھ سال بعد یونیورسٹیوں کی بھٹیوں سے نیا فولاد بن کر نکل آیا تھا۔ ظہیر پی سی ایس ہو گیا تھا اور ڈپٹی کلکٹر تھا۔ کاظم محکمہ زراعت کا اعلیٰ افسر تھا، سعید ایسٹ انڈیا ریلوے میں ٹریفک سپرنٹنڈنٹ ہو گیا تھا، یوسف بڑا منہ زور اور کامیاب وکیل تھا، حسین اپنی شاندار آبائی دکان پر بیٹھ کر سامان اور سکوں کی الٹ پلٹ کرتا تھا اور میاں شکیل مسلم لیگ، خاکسار، اور احرار وغیرہ سب تحریکوں کے سرگرم رکن رہ کر ہر ایک کے

سلسلے میں ایک ایک دو دو مرتبہ قید کاٹ چکے تھے اور اب سفید کھدر کا پاجامہ اور کالے کھدر کی اچکن پہنے کھوپڑی پر گاندھی کیپ منڈھے جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے اور ہم بارہ برس دلی میں رہے بھاڑ ہی جھونکا جتنا ہیڈ ماسٹر نے اسلامیہ اسکول سے پڑھا کر بھیجا تھا بس اتنا ہی پڑھے پڑھائے مسلم یونیورسٹی میں آٹھ برس پڑھ کر پلٹ آئے تھے البتہ بغاوت کے جو جراثیم اسلامیہ کالج سے لیکر گئے تھے وہ اچھی طرح کلچر ہو گئے تھے۔ اور گھر پہنچکر شہر کے نیم سرکاری نیم قومی لیڈر بن بیٹھے تھے کیونکہ ادھر مسلم لیگ کے سکریٹری بھی تھے اور ادھر آنریری مجسٹریٹ بھی۔

ہم سات میں سے چار پھر جمع تھے، میں، حسنین، یوسف، اور شکیل۔ مگر چاروں کے راستے چار تھے، حسنین سے کبھی مہینہ دو مہینہ پیچھے بازار میں ملاقات ہو جایا کرتی، یوسف سے کبھی عدالت دیوانی کی جانب جانا ہوتا تو ملاقات ہو جاتی۔ چلتے ہی چلتے علیک سلیک اور ایک دو جملہ ہو جاتا۔ بھائی شکیل کا سال میں چھ مہینہ جیل خانے کے اندر اوسطاً رہنا اور باقی چھ مہینے باہر جیل خانے جانے کی ترکیبوں میں گذرتے۔ جب کبھی ملاقات ہوتی تو میں تو مذاق کے موڈ میں آجاتا، اس کی سیاسی سرگرمیوں پر چوٹیں کرتا "وزیر اعظم بننے میں کتنے تاؤوں کی کسر ہے" دریافت کرتا۔ مگر وہ سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیتا اور رمیں کہتا "یار مولوی تو تو بے حد نان سنس گفتگو کرتا ہے"

اور اس کی گفتگو خشک ہو جاتی۔ ایک بڑے دن کی تعطیل میں ظہیر، سعید اور کاظم جمع ہوئے اتفاق سے بھائی شکیل بھی ان دنوں باہر ہی تھے۔ میرے یہاں ایک دعوت میں سب مدعو تھے، کھانے کے بعد بریانی تورمے کھا کر جب یاران طریقت کی طبیعت ذرا موزوں ہوئی تو ظہیر صاحب کے نطق کے سُر کھلنے لگے۔ اور فرمایا "ارے یارو، یہ ہیڈ ماسٹر جہاں کا تہاں آج تک شاہ آباد کا سا کم گشتا ہوا ہے اور تم چاروں دنیا بھر کی فرصتوں اور فراغتوں میں اتنے مصروف ہو کہ ادھر نظر نہیں اٹھتی۔ اور پھر کاظم اور سعید کی بابت اشارہ کر کے کہا "بھائی ہم لوگ کیا کریں، اول تو اس پوزیشن میں نہیں۔ بندگی بیچارگی، نوکر پیشے، پھر تمہارے شہر سے دور، تمہاری پالیٹکس سے علیحدہ۔ مگر میں کبھی کبھی یہ سوچتا ہوں کہ تم چاروں کیا کرتے ہو اور یہ مولوی، یہ شکیل، بڑا سوشلسٹ، کمیونسٹ، جانے بنا پھرتا ہے۔ دنیا بھر کی لن ترانیاں ہانکتا پھرتا ہے اور یہ ایک اپنی قومی درسگاہ ہے، یہ نہیں کہ خدا اس کی حالت سدھارے۔ اور یہ یوسف جنگی وکیل بنا پھرتا ہے۔ بھئی قسمیہ وکیلوں کو دیکھ کر تو رشک آتا ہے جیبیں بھری ہوتی ہیں، زبان آزاد ہے، ضمیر بے لگام ہے۔ ذرا دیر میں سیاہ کو سپید، سپید کو سیاہ کر دکھائیں، مگر یہ نہیں کہ اپنی ایک اسلامی درسگاہ ہے اس کی بابت توجہ کریں۔ اور میاں حسنین، آپ، آپ شاید ننانوے کے پھیر میں رہتے ہیں پھر میری بابت اشارہ کیا اور آپ، آپ بے فیت کے حولدار ٹھہرے، آنریری مجسٹریٹ، اور مسلم لیگ کے سکریٹری، آپ شاید اونچی پالیٹکس کے قائل ہیں؟" اور اس کے مونہہ سے کاظم نے بات لے کر کہا "بھئی چیئرمین کے تو مجھ کو زندہ ہوتے ہیں شبہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہیڈ ماسٹر نے اس کی ممی بنا کر رکھدی ہے، اور سکریٹری، بھئی اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔ بھلا یاد تو کرو جب ہم سب نویں کلاس میں تھے اس وقت ہم اسی ہیڈ ماسٹر اور اسی ورکنگ کمیٹی کے خلاف اسٹرائک کرائی تھی، اور آج تک اسکول کا وہی نظام چل رہا ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے دو ممبر مرے تو ان کے بیٹے ہو گئے۔ جیسے باپ کی میراث ہے سعید نے میری جانب اشارہ کیا اور کہا "خیر وہ حسنین، وہ تو تجارت کرتا ہے اور یوسف وکیل ہے، مصروفیت بھی ہے۔ اور کام بھی اسی قسم کے ہیں مگر یار تم کیا کرتے رہتے ہو؟"

شکیل نے بات کاٹ کر کہا "میں بتاؤں، آپ، آپ حضرات کے میکش دن کے ناتری۔ اب آپ کی مصروفیتیں سنئے۔ صبح سے دوپہر تک آنا ڑی مجسٹریٹی فرماتے ہیں یعنی وکیلوں اور اہل معاملہ کی چاپلوسیاں سنتے رہتے ہیں اور شام کو مجسٹریٹ ضلع اینڈ کمپنی کی چاپلوسی کرنے تشریف لے جاتے ہیں، یعنی خوشامدیں لادلاد کر اتارنا۔ جھوٹی سچی تجویزیں لکھ لکھ کر توشۂ آخرت سمیٹتے ہیں، اور اتوار کے اتوار شکار کھیلنے جایا کرتے ہیں"

اور ظہیر نے کہا "یہی تو میں کہتا ہوں کہ یا تو یہ عالم تھا کہ اسکول کی بیخ و بن اکھیڑ دینے پر تلے ہوئے تھے کسی زمانے میں یا آج یہ حالت ہے کہ تم چاروں ماشاءاللہ سب کچھ کر سکتے ہو اور کان میں تیل ڈالے بیٹھے ہو۔ اور بھائی ہم کیا کریں کسی قابل نہیں۔ اگر تمہاری پوزیشن میں ہوتے تو آج ایسا انقلاب برپا کرتے کہ یا تو اسکول کالج ہی بن کر رہتا ورنہ پھر۔"

"ابی جب یہ چاروں اسکول کے لونڈے تھے تو جذبۂ انتقام اور مادۂ غیرت زیادہ تھا" کاظم نے کہا۔

سعید نے کہا "یہی تو میں کہتا ہوں، ان چاروں کی غیرتیں نہ معلوم کہاں اڑ گئی ہیں، ہم تو کبھی چھٹے چھمائے جب یہاں آنکلتے ہیں تو اسکول

کے اس ازلی نظام کو دیکھ کر ہمارے خون میں جھاگ اٹھنے لگتے ہیں۔ اور بھئی شاباش ہے تمہاری غیرتوں کو۔ اسکول کی چکی جوں کی توں چل رہی ہے اور تم چھاتی پہ مونگ دلوا رہے ہو۔"

اب ظہیر شکیل کی جانب متوجہ ہوا "نہیں جی، مجھے تو اس شکیل پر آتا ہے۔ بھلا آپ سے پوچھئے کہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ بکرے کی سی یہ لمبی داڑھی رکھ لی ہے، سر سے پاؤں تک کھدر منڈھ لیا ہے، اور یہ موٹا سونٹھا ہاتھ میں لے لیا ہے اور ساری عمر جیل کی روٹیاں کھانے کا تہیہ کر لیا ہے۔ تم جیسے بہت سے خادم ملک کے لئے موجود ہیں۔ کبھی یہ بھی سوچتے ہو کہ اسکول کے ٹرسٹی بورڈ میں مناسب نوجوان داخل ہوں اور ورکنگ کمیٹی کی تشکیل ایسی ہو جو موجودہ تعلیم کے رجحان کو سمجھ سکے، روایاتی بوڑھے اسکول کے قیام پر جو داخل ہوئے ہیں تو آج تک نہ مرنے کا نام لیتے ہیں نہ نکلنے کا۔"

"ہاں سنا ہے کہ ہیڈ ماسٹر اتوار کے اتوار سکریٹری اور ورکنگ کمیٹی کے کچھ ممبروں کو گھر بلا کر ربڑی کباب کھلا دیتا ہے اور چیرمین اور کچھ ممبروں کو جی حضوری سے احمق بناتا ہے۔ اپنے آپ نہ انتظام کر سکتا ہے۔ نہ پڑھانے لکھانے کی کوئی ایسی خاص قابلیت ہے اور سات سو روپے ماہوار تنخواہ پاتا ہے۔ چار چپراسی اور بنگلہ ہے اور کیا کیا لوازمات"۔ سعید نے کہا اور پھر شکیل کی جانب متوجہ ہوا "اور آپ لیڈری فرماتے ہیں، ملک کی اصلاح کی فکر میں گھلتے ہیں۔ لیڈر ہیں قومی لیڈر" اور ظہیر نے لقمہ دیا "جی ہاں آپ لیڈر واقع ہوئے ہیں۔ یقین مانئے دس نمبریوں سے زیادہ پولیس کو پریشان کرتے ہیں۔ اور آجکل لیڈری بھی کیا کہئے کیا ہے۔ ہم کو تو دن رات انہیں سے پالا ہے"۔ ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

شکیل نے جواب دیا "بے ایمان گدھو، تم مجبور ہو ایسی باتیں کرتے ہو۔ ذلیل روٹیوں سے پل رہے ہو نا، کہیں یہ بھی معلوم ہے کہ معلوم ہیں کیسے اس شہر میں پڑا ہوا ہوں یہ حسنین اور یوسف، یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ پچھلے لیگ اور کانگریس کے الکشنوں کے مقابلوں میں میری پوزیشن کتنی خراب کر دی ہے، آج تک آوارہ کتے میری شکل دیکھ کر بھونک پڑتے ہیں گلیوں میں لونڈے تالیاں پیٹتے ہیں۔ بھلا میں اور اسلامیہ کالج کے متعلق کوئی بات! مجھ پر تو بھائی کفر کے سینکڑوں فتوے لگ چکے ہیں۔ ان تینوں سے کہو"۔ میری جانب اشارہ کیا "یہ صاحب آنریری مجسٹریٹ، مسلم لیگ کے سکریٹری، خاندانی رئیس اور پشتینی خان بہادر"۔ اور پھر یوسف کی جانب اشارہ کیا "آپ ماشاءاللہ وکیل، ابن وکیل۔ عدالتوں پر حاوی قانون کے پتلے، پبلک پر چھائے ہوئے۔ کیا نہیں ہیں" اور پھر حسنین کی جانب اشارہ کیا "اور حسنین میاں، ملک التجار، بازار کی ساکھ کے شیر، اور، اور تو کچھ نہیں، جاؤ یہ تینوں کھڑے ہو جائیں کمربستہ ہو کر اور میں ایسی اسکیم بنا کر دوں جو ٹرسٹی بورڈ، سکریٹری شپ اور چیرمین تک ہی پہ چھا کر نہ رہ جائیں۔ جنوری میں سہ سالہ انتخاب ہو رہے ہیں۔ اگر اس وقت بھی کان میں تیل ڈالے بیٹھے رہے تو سمجھ لو کہ ان مردوں میں تین سال کے لئے اور جان پڑ گئی۔ اور شاید پھر اس کے بعد تیسری کمیٹی میں ہیڈ ماسٹر کی پانچ سالہ توسیع کی مدت بھی ختم ہو رہی ہے۔ اس کا سوال اٹھے۔ بس ورکنگ کمیٹی میں ٹھکانے کے آدمی جو پہنچ جائیں اور اپریل تک سب مشینری بدل ڈالو"

ظہیر نے کہا "یار مولوی۔ تو بات بڑے پتہ کی کہتا ہے۔ تم تینوں پہ پڑ رہے جھاڑ کر اٹھ بیٹھو اب کی مرتبہ"

بھئی مجھ سے کہا بیکار ہے، میں میدان میں تو آ نہیں سکتا البتہ اندر ہی اندر جوڑ توڑ ایسے لگا دوں گا کہ تم ہی تم دکھائی پڑو گے ٹرسٹی بورڈ سے لیکر چیرمین تک۔ لو اب اپنی پارٹی ترتیب دو"۔ شکیل نے کہا۔

آئین کے مطابق جو مسلمان یک مشت دو سو روپیہ کی رقم اسکول فنڈ میں دیتا وہ تین سال کے لئے ٹرسٹی منتخب ہو جاتا ہے۔ "تھوڑا بہت خرچ کر و جیب سے اور اپنے اثر کے ٹرسٹی بن جاؤ بورڈ آف ٹرسٹیز پر قبضہ ہوتے ہی سمجھ لو کہ آگیا اسکول ہاتھ میں"۔ وحید نے کہا اور شکیل نے لقمہ دیا "اماں میں تو نہ معلوم کب سے بھونک رہا ہوں، پچھلا الکشن ہاتھ سے نکال دیا، خواہ مخواہ کا جمود ہے بس"۔

نئے انتخاب کا وقت آیا ہماری پارٹی بڑے زور شور کے ساتھ اٹھی۔ شکیل نے اپنی ناکام سیاست کے پورے پورے ہتھکنڈے ہماری پشت پر آ کر استعمال کئے۔ خوب خوب جوڑ پھوڑ کے، پرانوں اور نئیوں کا ایسا اکھاڑہ پہلے کا ہے کو ہی دیکھنے میں آیا ہوگا، خود شکیل اب تک پس پردہ تھا، مگر جب وہ سامنے آیا تو پچھلے آدھی درجن کفر کے فتوے پھر سے چمک اٹھے۔ مگر ہم نے بجائے رائے عامہ کے ڈھائی سو روپیہ اسکول فنڈ میں دے کر

بورڈ آف ٹرسٹیز میں شامل کر ہی لیا۔

بورڈ آف ٹرسٹیز میں شامل ہو کر مجلس عاملہ کے انتخاب کے وقت شکیل نئے روپ میں آیا۔ کل ورکنگ کمیٹی بیس افراد پر مشتمل تھی، جس میں گیارہ محض شکیل کی سیاسی قابلیت کے زور سے ہماری پارٹی میں آ پہنچے۔ میں چیئرمین منتخب ہوا۔ تمام اسلامیہ اسکول کے نظم و نسق میں انقلاب رونما ہو گیا، جن جگہوں پر لمبی سفید اور سرخ داڑھیوں والے بزرگ بیٹھا کرتے تھے ان پر داڑھی مونچھ صفاچٹ کوٹ پتلون والے نظر آنے لگے اور تقریباً نصف درجن تو ایسے قدیم بت ٹوٹ گئے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔

تین ماہانہ اجلاس ہو چکے تھے اور اپریل کے پہلے ہفتہ میں چوتھا اجلاس تھا جس میں ہیڈ ماسٹر کی خدمات کی توسیع کا ریزولیشن یقینی پیش ہوتا تھا۔ اس خصوص میں ہماری اپنی پارٹی کے گیارہ ممبروں میں سے تین ممبر اختلاف کر رہے تھے۔ شکیل انہیں مدتوں سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسٹر کی تعطیل کے ساتھ چند چھٹیاں اور مل گئی تھیں اور تعطیل کے آخیر دن مجلس عاملہ کا اجلاس تھا۔ ظہیر، سعید اور کاظم تعطیل میں گھر آئے تھے۔ پوری پکڑی جمع تھی اور تمام چھٹیاں ہم ساتوں کو اسی تگ و دو میں گذری تھیں اور شکیل کا تو یہ عالم تھا کہ دن رات برابر تھے، خواب و خور حرام تھا، رات کے کسی بھی حصہ میں کہیں کنویسنگ کرنا پڑ جا سکتا تھا، اپنے اپنے دائرہ اثر میں ظہیر، سعید اور کاظم بھی چپکے چپکے کام کر رہے تھے۔ حسنین، یوسف اور میری تو کچھ پوچھئے ہی نہیں۔ رات کو میٹنگ ہونے والی تھی، اس رات کو حسنین کے یہاں ہم سب ایک مخصوص دعوت میں جمع تھے۔ شکیل کی طبیعت آج ذرا جولانی پر تھی — ہیڈ ماسٹر کے خلاف وہ ان تمام ممبروں کو ہموار کر چکا تھا۔ کھانے کی میز پر باتوں کی جھڑی لگائے پڑا تھا۔ امپیریلزم، کمیونزم، اور نہ معلوم کون کون اِزم۔ خود ہی سوال خود ہی جواب، بولنے کا انتہائی سلسلہ جاری تھا۔ اور آخیر پر اخلاقی فلسفے پر بڑی پر زور تقریر سی کرنے لگ گیا۔

ظہیر نے بیچ ہی میں اُکتا کر بات کاٹی "یار شکیل تو نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا، یہ کھدر، یہ منڈی کرا اور داڑھی چھوڑ کر" "اگر مسلم لیگ میں ہوتا تو بڑے کام کا آدمی تھا مسلمانوں کے لئے۔" شکیل نے طنزیہ سنجیدگی سے برجستہ جواب دیا "اور اگر تمہاری طرح ڈپٹی کلکٹر ہوتا یا ان کی طرح آنریری مجسٹریٹ اور مسلم لیگ کا سکریٹری دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہوں، تو گورنمنٹ اور مسلمانوں دونوں کے بڑے کام کی چیز ہوتا۔ ایں؟" ایک قہقہہ پڑا، ظہیر نے جھینپ اتارتے ہوئے شکیل کی پیٹھ ٹھونک کر کہا "خیر کچھ بھی ہو ہے یار بھائی پکا لیڈر۔ بس کاٹنے کا منتر نہیں۔ دیکھو جی کاظم، وہ بڑے میاں نہ میرے ہاتھ آئے اور نہ یوسف کے اور اس نے نہ معلوم کان میں کیا منتر پھونک دیا کہ بس چٹکیوں میں رام ہو گئے۔"

یوسف نے لقمہ دیا "ہاں بھائی۔ وہ تو کچھ انہیں کا کام تھا، ایسا شیشہ میں اتارا کہ حیرت ہو گئی۔ آج شام کو پرانے چیئرمین اور نہ معلوم اور کون کون انہیں کے گریڈ کے بابا دادا قسم کے بوڑھے جمع ہو کر پہنچے، خدا رسول قرآن حدیث سب ہی واسطے دئے مگر انہوں نے صاف جواب دے دیا۔"

میں نے کہا "ارے میاں ایک وہی کیا، شروع سے ظہیر ہم لوگ تو یہاں پر تھے نہیں کیا کیا تفاصیل بیان کروں؟ شکیل نے بورڈ آف ٹرسٹیز بنا کر پھر جو مجلس عاملہ کی تشکیل میں کام کیا ہے۔ واہ! طبیعت خوش ہو گئی۔ کہ اب سائنٹیفک انداز اگر سیاسیات میں اختیار کیا جائے تو ملک جنت ہو جائے اور قوم فرشتہ۔"

"ہوں ہم سمجھ گئے۔ چپ کر گیا مولوی شکیل، ہیڈ ماسٹر کو" حسنین نے کہا

ظہیر نے کہا "ارے یار جب تک تیری وائی چلتی ہے تو کھد پڑی کلاتی ہے۔ یاد کرو تیسری سے آٹھویں تک سب ہی کی روزانہ مرمت ہوا کرتی تھی۔"

"مگر ہم ساتوں تھے بھی تو نہایت شریف النفس اور نیک بخت" شکیل نے کہا

"ارے یار تجھ ہماری ہی جکڑی سترہ سری تھی۔ اسکول میں ہم سے پیچھے، رشید، رضی حیدر اور زاہد جیسے نیک اور سیدھے حضرات تھے جن کے آگے شیطان زانوئے ادب تہ کرتا۔ اور ہم سے آگے صفدر، شبیر، نصیر اور ظریف جیسے شریف اور اللہ والے بزرگ تھے، جن سے ابلیس سبق لیتا۔ مگر یار وہ تو اسکول بھر کی شرارتوں کا ہم ہی ساتوں کو ذمہ دار ٹھہراتا تھا۔ جیسے کہا جاتا ہے کہ ہر قتل کا ایک گناہ قاتل پر اور دوسرا قابیل کی گردن پر رکھا جاتا ہے، اسکول بھر میں کہیں بھی کوئی شرارت ہو، ہمیں خواہ دور کا بھی واسطہ نہ ہو مگر ہم پر ہو رہی ہے۔ اور کچھ نہیں اُدھر اُدھر تے کہیں اک ذرا جھلک نظر پڑ جائے اور مالوذ: چار بیت انتظاماً پڑ گئے خواہ مخواہ۔"

"اور وہ یاد نہیں اس سال اور کچھ بن نہ آئی تو ہم ساتوں کے ششماہی امتحان کے ریزلٹ شیٹ پر چال چلن کے خانہ میں (FAIR) لکھ دیا"

"ہاں یار اور دیکھو کتنے اچھے نمبر تھے ہمارے، کسی کی ہمت ریزلٹ شیٹ گھر دکھانے کی نہ ہوئی۔"

"اور وہ بھول گئے۔ اسکول بھر کے نوسو طلباء میں سے کوئی شرارت کرے، کسی کا پبلک کیننگ ہو مگر ہم پر ملاحیاں ضرور پڑتیں خواہ معاملہ ہمارا دور کا بھی واسطہ نہ ہوتا۔"

"اور انگریزی کے جواب مضمون والا قصہ یاد ہے نویں جماعت میں؟ میرا مضمون شکیل تمہیں یاد ہو گا کتنا اونچا تھا؟ اور انعام دلوایا اس نالائق عرفان کو جس کے مضمون میں تین چار تو گرامر کی غلطیاں تھیں۔" "جی ہاں خوب یاد ہے۔ ویسے یہ بات نہیں ہے کہ وہ ہمیں اسکول کے زمانے میں مارا کرتا تھا، ہماری تذلیل کیا کرتا تھا، چھٹیاں کاٹ لیا کرتا تھا۔ خواہ مخواہ ہمارے چال چلن خراب لکھ دیتا تھا، یہ تو خیر بچکانی باتیں ہیں۔ اور ہمیں ان کے ضمن میں نہیں سوچنا چاہیئے، اب ہماری پوزیشن لیڈر والی ہے اور ہم قوم کے امین ہیں۔ یہ اتنا بڑا قومی ادارہ ہمارے ہاتھ میں ہے اور پچھلی مجلس عاملہ اور چیئرمین سیکریٹری کے زمانہ سے عادتیں بگڑی ہوئی ہیں، اور میاں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہماری مخالف پارٹی کا پروردہ آوردہ ہے لہذا ہم نہیں رکھتے۔"

میں نے کہا "مگر یار شکیل جب سے میں چیئرمین ہوا ہوں کام بہت قاعدہ میں کر رہا ہے۔ اور مجھے جھک کر سلام کرتا ہے ایک حرکت پر مجھے بعد کو افسوس بھی ہوا۔ اس عید پر مجھ سے ملنے گھر آیا، میں نے گھنٹہ بھر تو منتظر رکھا، دیوان خانہ میں مونڈھے کے اوپر بیٹھا سوکھتا رہا۔ گھنٹہ بھر بعد نکلا تو بجائے گلے ملنے کے ہاتھ ملایا، اور کھڑے ہی کھڑے دو تین منٹ انگریزی میں بات کی اور رخصت کر کے اندر چلا آیا۔" سب نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا اور حسنین نے کہا "یار یہ تم نے برا کیا، جو کوئی گھر ملنے آئے اس سے اخلاق کے ساتھ ملنا چاہیئے۔"

"سب بیکار ہے۔ تری منافقت" شکیل نے جواب دیا "میں پوچھتا ہوں عید تو ہر سال ہوتی ہے۔ اب تک کسی عید کو ہیڈ ماسٹر صاحب ان سے ملنے کیوں نہیں آئے۔ ظاہر بات ہے کہ وہ ان سے نہیں بلکہ چیئرمین سے ملنے آئے۔ لہذا جو برتاؤ ایک ماتحت کے ساتھ ذرا بوس (BOSS) قسم کے کو کرنا چاہیئے انہوں نے کیا۔"

"نہیں جی میرا مطلب یہ تھا کہ عید کے دن سبھی آتے ہیں چھوٹے بڑے۔ اور مسلمان سے مسلمان برابر ہے۔"

"میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ یہ امسال چیئرمین ہونے کے بعد مسلمان ہوئے، اس سے پہلے مسلمان نہ تھے یا ہیڈ ماسٹر ان کے چیئرمین ہونے کے بعد مسلمان ہوئے؟ ظاہر بات ہے کہ وہ ماتحت افسر والا سوال رہ جاتا ہے اور تم نے ٹھیک کیا جو اس طرح برتاؤ کیا۔"

"اجی وہ اب خواہ عید ملنے آئیں یا بقر عید، یاروں پر رنگ چڑھنے والا نہیں، چھوڑ نہیں سکتے ہم انہیں۔"

"کل ہی کمیٹی میں ریزولیشن پاس ہوتے ہی سیکنڈ ماسٹر کو چارج دلواؤں گا" میں نے کہا اور شکیل نے یوسف سے مخاطب ہو کر میری بات کی مزید تصدیق چاہی۔

"ارے یوسف تم نے قواعد و ضوابط دیکھ لئے ہیں کچھ اپیل وپیل یا پہلے سے نوٹس وغیرہ کی تو صورت نہیں پیدا ہوتی؟"

"بھئی وہ تو کھلی بات ہے۔ اپیل کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کمیٹی کی کثرت رائے کے فیصلہ پر چیئرمین کے دستخط ہوں گے اور بس یہی چیز آخری اور قطعی ہے۔"

"مگر ایک قانونی نکتہ رہ جاتا ہے، ایجوکیشنل کوڈ کے تحت بغیر ایک مخصوص مدت کے نوٹس کے علیحدگی عمل میں نہیں آ سکتی۔"

"مگر علیحدگی یا برخاستگی کب ہے؟" یوسف نے بات کاٹ کر کہا "دیکھئے اسکول کے کانسٹی ٹیوشن میں یہ چیز ہے کہ ہر پانچ سال بعد ہیڈ ماسٹر کو مجلس عاملہ کی کثرت رائے سے توسیع ملنا چاہیئے۔ اگر کمیٹی توسیع نہیں دیتی تو اس میں اپیل یا مرافعہ کی کیا گنجائش ہے؟ البتہ اگر بغیر کسی معقول وجہ کے برطرف کیا جائے گا تو ڈائریکٹر تعلیمات یا وزیر تعلیم تک معروضہ پیش کیا جا سکتا ہے۔"

"ہوں، میں سمجھ گیا۔ اور یہ تو گویا ہر پانچ سال بعد کمیٹی ان کا نئے سرے سے تقرر کر دیتی ہے۔" میں نے کہا "ویسے میں نے پچھلے دو تین ماہ سے اکاؤنٹ بھی بہت کھنگالے، کیونکہ شہر میں تو ہر قسم کی افواہیں تھیں کہ غبن ہے، مگر اکاؤنٹ بالکل صاف ہے۔" شکیل نے کہا "یار یہ شہر تمہیں بھی

ہم ہی لوگوں کی پھیلائی ہوئی تھیں۔ سب الکشن اسٹنٹ۔ آج اسکول پر ہم قابض کیسے ہو جاتے؟" ظہیر نے کھانے سے ہاتھ کھینچ کر کہا "دیکھو یار، باتوں ہی باتوں میں پیٹ سے اوپر کھا گئے۔ اور مولوی یار تو تو ہضم کر جائے گا یہاں۔۔۔۔"

"ہاں یار اب میں چلوں گا۔ یہ تو مرغا تھا، تو کل ہیڈ ماسٹر کو ہضم کر جاؤں گا۔" شکیل نے کہا اور فرمائشی قہقہہ پڑا۔ ظہیر نے کہا "تو اب اس وقت رات میں کہاں جا رہے ہو؟"

شکیل نے جواب دیا "یہاں پہلی چیز تو ایک اصولی کام ہے یعنی جس صبح کو الکشن ہو اس سے قبل رات میں فرداً فرداً ہر ووٹر سے ملنا چاہیے۔ دوسری چیز وہ دونوں ممبر ہیں، ہمارے ساختہ پرداختہ اور ہم زبان، لیکن ذرا ہیڈ ماسٹر کو علیحدہ کرنے کے معاملہ میں پس و پیش کر رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی مسلمان کو روزی سے اتارنا۔۔۔ ہوں۔ اور کوئی بات نہیں ہے، ابھی جا کر ٹھیک کئے دیتا ہوں، و لیسے خلاف نہیں جا سکتے۔"

میں آج بہت صبح بیدار ہوا۔ آج سے بارہ سال پہلے بھی آج کی سی ایک صبح طلوع ہوئی تھی، اور اس صبح کا جو خواب شرمندۂ تعبیر ہونے ہوتے رہ گیا تھا آج اس کی تعبیر سامنے تھی۔۔۔۔۔۔ مجھے اسٹرائک کا دن یاد آ گیا۔ بارہ سال پیشتر دالاقیامتِ صغرائے کر طلوع ہونے والا دن کسے معلوم تھا کہ اس کام کی تکمیل کے لیے آج کی ساعت قدرت کی جانب سے مقرر تھی۔ میں اشتیاق نگاہوں سے آج کی ورکنگ کمیٹی کا ایجنڈا دیکھنے لگا۔ اور یہ ایجنڈے کی پہلی مد ہیڈ ماسٹر کی توسیع سے متعلق تھی۔ خوشی اور جوش کے مارے میرا دل اچھل رہا تھا کمیٹی کا وقت ٹھیک گیارہ بجے تھا مگر میں دس بجے تک طیار ہو گیا بہترین ٹراپیکل سوٹ پہنا، بار بار آئینہ کے سامنے تن تن کر اور پہلو بدل بدل کر رعب دار پوز دیکھے، جیسے کوئی نوجوان فوجی کپتان کسی مہم پر جاتے ہوئے دیکھتا ہوگا۔ کپڑے بدل کر ناشتہ کیا اور گیرج سے کار نکلوا کر خود اسٹیرنگ پر جا بیٹھا۔ اسکول کے پورٹیکو میں ہیڈ کلرک اور چپراسی استقبال کو کھڑے تھے۔ بڑی شان کے ساتھ ان کے جلو میں جھومتا اینڈتا ہال میں داخل ہوا۔ ورکنگ کمیٹی کے تمام اراکین اپنی نشستوں میں تھے۔ اور بہت سے پبلک کے لوگ پچھلی نشستوں پر۔ اور میں نے ڈائس پر پہنچکر غائر نگاہ سے جائزہ لیا تو ظہیر، سعید اور کاظم کے چہرے پبلک کی نشستوں میں سب سے پچھلی سیٹوں پر سے جھانکتے نظر آئے۔ اب میں نے اپنے ہاؤس کو پرتالا۔ اور اپنے دائیں بائیں کی سیٹوں کا جائزہ لیا تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ کل اٹھارہ ممبران حاضر تھے، نو میرے داہنے بازو پر اور نو ہی بائیں بازو پر۔ اور وہ بڑے میاں جو ہیڈ ماسٹر کو نکالنے کے خلاف تھے غائب ہیں اور شکیل بھی نہیں ہے۔ کارروائی شروع ہونے میں آٹھ منٹ رہ گئے اور شکیل اور ان کے وہ بڑے میاں غائب رہے تو مجھے یک گونہ خلفشار سا ہوا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پھر بھی سناٹے کی حد تک سکون تھا۔ سامنے بلندی پر لگے ہوئے کلاک کی ٹک ٹک بڑی واضح سنائی پڑ رہی تھی۔ ہیڈ ماسٹر کی توسیع کے مؤید اراکین میرے بائیں ہاتھ کی نشستوں پر خاموش بیٹھے تھے، ذرا سہمے سہمے سے، آج بیس سال پرانا چھ سات سو روپیہ ماہوار کا تنخواہ دار میری ایک جنبشِ قلم پر درہم برہم ہونے والا تھا۔ "بھلا اتنی تنخواہ کی جگہ یکدم گورنر بھی نہیں دے سکتا" میرے دل میں خیال آیا اور میں نے فخر کے ساتھ جیسے اپنے مضبوط بازوؤں پر ہاتھ پھیر کر سینہ پھیلایا، گردن آپ ہی آپ خم کھا گئی اور میں پہلو بدل کر اپنی بلند و بالا کرسی پر ذرا ترچھا ترچھا سا ہو گیا۔ کمیٹی کی کارروائی شروع ہونے میں اب تین منٹ رہ گئے تھے۔ اور مجھے شکیل پر غصہ آ رہا تھا، اس بوڑھے کھوسٹ کے چکر میں خود بھی ہاتھ سے گیا۔ ایجنڈے کی پہلی مد بھی یہی ہے اور آج اس میٹنگ کا ہر کام بہت باضابطہ اور آئین کے بالکل مطابق ہونا چاہیے۔ پھر اپنے ان نو میں بھی دو اراکین ایسے تھے جنہیں بڑی کوشش اور اتار چڑھاؤ کے بعد شکیل ہیڈ ماسٹر کے خلاف استعمال کرنے کے طیار کر سکا تھا۔ ڈر لگتا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں نہ معلوم ان کے منہ سے کیا نکلے اور مجھے ان دونوں پر شکیل کی موجودگی کے بغیر ذرا بھی بھروسہ نہ تھا، ورنہ بظاہر نو اور نو کے توازن میں میرا کاسٹنگ ووٹ کافی تھا گھڑی نے ٹن ٹن گیارہ بجائے اور سکریٹری نے بہ آوازِ بلند ایجنڈا پڑھا۔ ساتھ ہی ایک کلرک دوڑتا ہوا آیا اور اس نے مخل ہو کر آہستہ سے مجھ سے کہا "سرکار، شکیل صاحب گرفتار ہو گئے، راستہ میں ایک تقریر کے سلسلہ میں ان کا وارنٹ تھا، دو تین دن سے پولیس تلاش میں تھی۔"

"اچھا، گرفتار۔ ایں!!" میں نے مخصوص انداز میں کہا اور اس نے پھر کہا "ہاں سرکار، آپ کے یہاں آنے کے بعد سعید صاحب اور کاظم صاحب نے چپکے سے مجھے ان کی تلاش میں دوڑایا تھا اور وہ مجھے مع ان بڑے میاں حاجی صاحب کے راستہ میں آتے مل گئے۔ تانگے پر میں بھی اگلی سیٹ پر ٹنگ گیا۔

بازار سے تانگا نکل کر جوں ہی ہسپتال کے قریب پہنچا راستہ میں ایک تھانہ دار اور چار سپاہیوں نے روک لیا، مجھکو اور حاجی صاحب کو تانگے سے اتار دیا، اور شکیل صاحب کو وارنٹ دکھا کر اسی تانگے پر واپس لے گئے کوتوالی۔"

"پھر تم حاجی صاحب کو کیوں نہ ساتھ لے آئے۔"

"سرکار میں نے ان سے بہت کہا مگر وہ بغیر شکیل صاحب کے طیار نہ ہوئے اور پلٹ گئے۔" کلرک نے کہا۔ میں نے اپنے چہرہ پر بڑھتے ہوئے انتشار کو روکا۔ حالات کا جائزہ لیا تو آئین کی رو سے التوا اور گریز فرار کی بھی گنجائش نہ تھی کیونکہ کورم پورا تھا اور جلسہ کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ پھر یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ تین اراکین جو ذرا تذبذب میں تھے کہیں پھر نہ جائیں یا اٹھ کر ہی چل نہ دیں۔ یہ اندازہ کر کے کہ تمام مجمع میں یہ خبر گشت کر رہی اور چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں، میں یکدم اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور ہاؤس اور پبلک کے سامنے اپنی پوری لسانی قوتیں مجتمع کر کے ہیڈ ماسٹر کے خلاف نہایت پُر جوش اور پر زور تقریر کی اور اسی ڈائس پر اسی ہال کے اندر بارہ سال پچھلی تاریخ دہرا دی۔ تمام ہاؤس مرعوب ہو گیا۔ سب حاضرین حتٰی کہ ہیڈ ماسٹر کے ہمدرد پارٹی والے بھی ایک مرتبہ کو ہل گئے۔ حالانکہ اسکول اسٹاف کے کسی ممبر کو میٹنگ میں آنے کی اجازت نہ تھی، مگر جس طرح اپنے زمانہ میں ہیڈ ماسٹر کی آہٹ پا کر ہم لوگ کسی الماری، پکھے، یا کورِیڈر کی آڑ لیکر دبک جایا کرتے تھے، اسی طرح ہیڈ ماسٹر گیلری کے اندر ایک گھونگھٹ کی آڑ لیئے اپنی بوڑھی تقدیر کا فیصلہ سننے کو چھپا کھڑا تھا، اور یہ گھونگھٹ ڈائس کے عین سامنے تھی۔ یوسف آج اسکول کمیٹی کے آئین پر خوب طیار ہو کر آیا تھا۔ اسی نے ریزولیشن کی تحریک کی اور توسیع نہ دینے کی رائے دی حسنین نے برجستہ تائید کی اب معاملہ رائے شماری کی کسوٹی پر آ گیا۔ نو ہاتھ ہیڈ ماسٹر کے توسیع دینے اور نو ہی توسیع نہ دینے کے لئے اٹھے۔ مجھے اطمینان ہوا، یوسف اور حسنین کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں، شکیل کی عدم موجودگی کے باوجود ان دونوں ممبران نے ہمارے ساتھ ہاتھ اٹھائے تھے جو ہیڈ ماسٹر کو نکالنے کے خلاف تھے۔

اور پھر سناٹا ہو گیا موت کا سا سناٹا! ہیڈ کلرک نے شمار کر کے منٹ بک پر روئداد لکھی نو کے مقابلہ پر نو۔ معاملہ میرے ووٹ پر تل گیا۔ روئداد کہنے کے بعد ہیڈ کلرک نے کاسٹنگ ووٹ لکھنے کیلئے میری جانب منٹ بک بڑھائی۔ اور میں نے قلم اٹھا کر محاکمہ کے لئے بڑھایا۔ ایک گہرا سانس لے کر اک ذرا ٹھہرا۔ نگاہ سامنے اٹھ گئی تو گیلری میں ہیڈ ماسٹر کھڑا تھا۔ ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں اس وقت بھی مریل بوڑھا بدن ضابطہ کا اسٹیچو بنا ہوا تھا۔ گردن کا خم، اور رابرو کا چڑھا چڑھا انداز جوں کا توں آنکھوں میں سے بیک وقت صحرا و دا عجاز کے شرارے اور پھول سے چنخ رہے تھے، جھریوں دار پیلا شیالا چہرہ بدستور جلال و جمال کا آئینہ دار تھا۔ سفید چاندی سے دمکتے بالوں والا سر جیسے کا تیسا نہ جھک سکنے والی گردن پر بلند تھا اور تمام وجود پر ویسا ہی شاہانہ اطمینان کا لبادہ تھا۔

میرا قلم کاغذ کے اوپر کچھ دیر ہوا میں ٹنگا ڈولتا رہا۔ مخالفین کے خانہ کی جانب گیا اور بغیر کاغذ پر ٹکتے ہوئے جیسے پلٹ آیا۔ اور ذہنی رستخیز میں نگاہ کاغذ سے ہٹ کر پھر سامنے گئی اور ہیڈ ماسٹر جوں کا توں سامنے آ گیا۔ نگاہ جھک گئی اور قلم جیسے مقناطیسی قوت سے مؤیدین کے خانہ پر جا کر ٹک گیا!

غزل*

مشتاق مبارک

حسن و جوانی کے جب قصے چھڑ جاتے ہیں یاروں میں
نغمے سے نغمے جاگ اٹھتے ہیں بربطِ دل کے تاروں میں

کہنے والے جو بھی کہیں اب عشق ہمارا کام نہیں
ہم نے سنا ہے ذکر ہمارا ہوتا ہے مہ پاروں میں

•

کس کو سنائیں کون سنے گا جو کچھ ہم پر بیت گئی
دل میں تھا ارمان گلوں کا دامن الجھا خاروں میں

کیف افزا نظاروں کا حاصل ہیں تمہارے ہی جلوے
تم جو نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے کیف حسیں نظاروں میں

•

لالہ رخوں کی یاد کبھی جب آتی ہے تنہائی میں
ہوتی ہے محسوس اچھوتی ٹھنڈک سی انگاروں میں

نظروں کو جب کوئی جھکا کر پرسشِ غم فرماتا ہے
آ جاتی ہے جان مبارک سچ مچ غم کے ماروں میں

ماہ نو، کراچی، اگست ۱۹۵۸ء

(ناول کا ایک باب)

روشنیوں کا شہر

ابن سعید

"سی۔ اے۔ ٹی! کیٹ، کیٹ معنی بلی!" ـــــ "آر۔ اے۔ ٹی! ریٹ، ریٹ معنی چوہا!"

"۔ ۔ ۔ ابے آواز اونچی کرکے۔ بلی کے بچے! ـــــ"

ایک، لامتناہی گونج جو گرد سے اَٹے ہوئے اس ہال میں پھیلی ہوئی تھی: ملی جلی بے سری آوازوں کا ایک پیہم کورس جو کبھی کبھی ایک بلند گونج بن کے رہ جاتا اور پھر کبھی کبھی مکھیوں کی سی بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو کے رہ جاتا! ـــــ

اس ہال میں گرد و غبار سے اَٹے ہوئے لاتعداد نیچے نیچے ڈیسک رکھے ہوئے تھے۔ ان کی سطح نیلی روشنائی کے دھبّوں اور چاقوؤں سے کھردے ہوئے حروف اور نقش و نگار کی بدولت بالکل بدرنگ اور کھردری ہو کے رہ گئی تھی، اور ان ڈیسکوں کے اردگرد پھٹے ہوئے کناروں والی میلی، داغ دار دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ جب کبھی گرمی کے موسم میں چھت میں آویزاں جھالردار پنکھے چوں چوں کا ورد شروع کر دیتے اور پنکھوں کی ہوا گرم لُو سے جھکولوں کی طرح تمام ہال میں گردش کرنی شروع کر دیتی، تو ان بدرنگ، میلی، داغ دار دریوں کے یہ کنارے پھڑپھڑانے لگتے جیسے وہ یوں ایک بے وجہ احتجاجی شور بلند کرنے پر تلے ہوں، اور ان دریوں پر آلتی پالتی مارے، بے تنظیم قطاروں میں، کم عمر لڑکے بیٹھے ہوئے مسلسل کسی نہ کسی سبق کا ورد کرتے رہتے :۔

"سی۔ اے۔ ٹی! کیٹ معنی بلی!"

"۔ ۔ ۔ آر۔ اے۔ ٹی! ۔ ۔ ۔"

ان لڑکوں کی صورتیں کم عمری میں ہی مسخ ہو گئی تھیں اور ان کے چہروں کی رنگتیں گدلی گدلی زرد زرد تھیں۔ اور ان کے کپڑوں میں ہمہ وقت ایک بوسیدہ بوسیدہ بدبو سی رہتی، جو دریوں کے تعفن کے ساتھ مل کر ہال کی فضا کو اور بھی بوجھل بنا دیتی۔ ان لڑکوں کی آنکھیں بے نور اور بجھی بجھی سی تھیں جو غالباً اس بے سروسامانی کا پتہ دیتیں جو ان لڑکوں کو اپنے ورثے میں ملی تھی۔ اور جس سے ان لڑکوں کے گھرانوں کی کئی پشتیں بخوبی واقف تھیں ـــ وہ بے سروسامانی ہی ان لڑکوں کا اصل منبع اور مسکن تھی، اسی بے سروسامانی میں ہی وہ جنم لیتے، پلتے، بڑھتے۔ میونسپل کمیٹی کے قائم کردہ سکولوں میں گرد اور غلاظت سے اَٹی ہوئی دریوں پر آلتی پالتی بیٹھ کر "سی۔ اے۔ ٹی، کیٹ! اور آر۔ اے۔ ٹی!" کا سبق سینکڑوں بار دہراتے، اور پھر اُس اندھا دھند، بے تحاشہ ریلے میں گم ہو کے رہ جاتے جس کا نام دلی تھا، جس کا نام ہندوستان تھا، جس کا نام ایشیا تھا۔

کبھی کبھی کوئی لڑکا اپنے چہرے کے معصوم خدوخال اور بھولی بھولی آنکھوں کی بدولت باقی تمام جمِ غفیر سے جداگانہ نظر آتا اور اپنے تن کے کپڑوں کی بوسیدگی کے باوجود، اپنے چہرے کی رنگت کے پھیکے پن کے باوجود، ایک طرح کی جاذبیت لئے ہوتا اور سکول ماسٹر اس لڑکے کو اپنے ڈیسک کے سب سے قریب حصہ میں بچھی ہوئی دری پر جگہ دیتے، وہ کہتے "دیکھو۔ زید۔ بکر۔ عمرو! تم یہاں بیٹھا کرو۔ ہاں پڑھو تو بیٹا۔ "سی۔ اے۔ ٹی!" ـــــ اور وہ بھولی بھولی سہمی ہوئی نظروں والا کچھ خوف زدہ ہو جاتا، وہ سوچتا کہ نہ جانے اس کو اپنے ساتھیوں سے ممتاز جگہ پر کیوں بٹھایا گیا ہے اور نہ جانے سکول کا ہاف ٹائم ہوتے ہی اس کے ہم جماعت لڑکے اس کے گھٹے ہوئے سر پہ دھولیں کیوں جمانے لگتے ہیں۔ اور نہ جانے یہ ماسٹر صاحب، جو سب کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے ہیں، اس سے کبھی کبھی مسکرا کے بات کیوں کرتے ہیں۔ اور ماسٹر صاحب کہتے: ـــ بیٹا۔ تم سکول کی چھٹی ہو جانے کے بعد جماعت میں ٹھہرے رہنا، میں تم کو آج کا سبق پھر پڑھاؤں گا، محنت کرو، ورنہ فیل ہو جاؤ گے! ـــ اور اگر وہ زید، بکر یا عمرو (جو کوئی بھی وہ ہوتا!) اس بات پر کچھ خائف ہو جاتا تو ماسٹر صاحب اور حربے استعمال کرتے، وہ اپنی بید کی لمبی چھڑی کو لچکا لچکا کر اس کی آنکھوں کے سامنے نچاتے۔

"سنی تھی نا وہ بات، جو تیرا باپ کہہ گیا تھا کہ ہڈی پسلی ہماری اور گوشت پوست تمہارا، کھال ادھیڑ کے رکھ دیتا ہے یہ میرا مولا بخش!"

مولا بخش ماسٹر صاحب کا سب سے لمبا، سب سے مضبوط، سب سے ظالم بید تھا اور وہ اس قسم کے لڑکوں پر کئی پشتوں سے استعمال ہو رہا تھا۔ ثناء اللہ، زید، بکر یا عمرو کا باپ بھی اس بید کی چوٹ سے واقف تھا، اور اگر پرائمری سکول کے زمانے میں کوئی لڑکا دو ایک مرتبہ بھی مولا بخش کی مار سے واقف ہو جاتا تو وہ تمام عمر کے لئے اس تجربہ کو یاد رکھتا۔

"۔۔۔۔تو ا۔۔۔" ماہل نے اپنے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے گلاس کو اپنی انگلیوں سے نچاتے ہوئے کہا۔ "تو میری دوست آئیلین! میں تو لڑکوں کی اس پود میں سے ہوں جنھوں نے انگریزی کا پہلا سبق پھٹی ہوئی ٹاٹ، پھڑپھڑاتے ہوئے کناروں والی دریوں پر بیٹھ کر، مولا بخش کی لچک کے سائے میں پڑھا تھا۔ اور اسی لئے، میری عزیز دوست آئیلین، میرا تمہارا ساتھ آج شام میوزیم میں کوونٹری (COVENTARY) کے نئے گرجا کی جدید طرز کی کھڑکیاں دیکھتے وقت نہیں ہوا تھا بلکہ اب سے بہت پہلے، ہوا تھا، جب کہ میں کنگ ریڈر کی مدد سے انگریزی پڑھنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا اور تم غالباً دو چوٹیاں لٹکائے معصومیت کے ساتھ اپنی اماں کے ایپرن سے لگی پھرتی ہو گی!"

آئیلین، جو بار کے قریب ایک اونچے سے سٹول پر بیٹھی اپنے ٹانگیں ہلا رہی تھی، جیسے وہ اس سانولی رنگت والے اجنبی کی کہی ہوئی اتنی بہت سی باتیں ایک ملاقات میں پورے طور پر سمجھنے سے معذور رہو، مسکرا مسکرا کر ماہل کی آنکھوں میں گھورنے لگی۔ اس نے کہا، "تم شاید اتنی بہت سی بیئر پینے کے عادی نہیں ہو!"

ماہل نے جھنجھلا کر کہا: "یہی تو تم مغربیوں کی بدقسمتی ہے، تم لوگ ہر بات کا، ہر مسئلہ کا جواز تلاش کرنے لگتے ہو، اور یوں اس چیز کی اصل ماہیت اور قرب کو فراموش کر دیتے ہو، اور اسی لئے تم شاید آواگون کے اس دقیق مسئلے کو سمجھنے سے معذور ہو، اور تمہاری منطق یہ سمجھنے سے انکار کرتی ہے کہ جبکہ میری اور تمہاری ملاقات محض آج شام میوزیم میں ہوئی تھی تو آخر میں نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ میں برسوں سے تم سے واقف ہوں!"

آئیلین نے کہا: "اسی لئے تو کپلنگ کا خیال تھا کہ مشرق مشرق ہے، اور مغرب مغرب!"

"میری دوست آئیلین! ممکن ہے کہ کپلنگ اخبار نویس اور شاعر اچھا خاصہ رہا ہو لیکن مشرق کو سمجھنے میں جس قدر اندھے پن کا ثبوت اس نے دیا تھا، اس کا مقابلہ شاید ہالی وڈ کے فلم ڈائرکٹروں سے تو ہو سکے، اور تو کسی سے ہو نہیں سکتا!"

آئیلین چلا اٹھی، ماہل کی بے جوڑ، بے تکی باتیں اس کو ایک حد تک دلچسپ ضرور معلوم ہوئی تھیں، لیکن اس کی گفتگو زیادہ تر بے ربط تھی، اور وہ بار بار کوشش کر کے اپنے ذہن کو اس کی باتوں کے تسلسل پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتی، لیکن یہ ان دیکھا تسلسل تو جیسے ریشمیں دھاگے کی مانند تھا، جو بار بار انگلیوں کی گرفت سے آزاد ہو جاتا، اور اسی لئے اب اس کی طبیعت واقعی جھنجھلا اٹھی، اور اس نے بے تعلقی کے ساتھ پب (شراب خانے) میں مجمع لوگوں کو گھورنا شروع کر دیا۔

پب کی فضا، شراب اور سگرٹوں کی بو سے معمور تھی، ایک ہلکی ہلکی دھند چھت سے لیکر لوگوں کے سروں تک چھائی ہوئی تھی، اور جب آئیلین نے اپنے اونچے سٹول پر بیٹھے بیٹھے ان سب لوگوں کا جائزہ لیا تو اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ ایک اونچائی سے کسی وادی کو دیکھ رہی ہو، اور اس وادی میں دھند میں نیم پوشیدہ، نیم نہاں، وہ سب لوگ تھے ۔۔۔ اور اس کو ان سب پر یوں طائرانہ نگاہ ڈالنے میں ایک خاص لذت محسوس ہوئی۔

دو گھنٹے پہلے، آئیلین اس سانولی رنگت والے نوجوان کے وجود تک سے بے خبر تھی، دو گھنٹے پہلے وہ میوزیم میں کوونٹری کی جدید طرز کی کھڑکیاں دیکھنے کی غرض سے گئی، وہ کھڑکیاں جن میں مجرد آرٹ کی مدد سے عجب رنگ برنگے نقوش بنائے گئے تھے، یہ نقوش منتشر بھی تھے اور ایک دوسرے سے ہم آہنگ بھی، ان کے اقلیدسی نقوش میں، ان گنت رنگوں کے امتزاج میں، انسانی زندگی کے جسمانی اور روحانی تجربوں کی ایک کتھا کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی، مجرد آرٹ کے اشاروں اور کنایوں کی مدد سے، ایک عظیم داستان کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور یوں گرجا جیسے قدامت پرست ادارے نے عصرِ نو کے جدید مجرد آرٹ کے دامن کو سنبھال لیا تھا۔ جیسے وقت اور رسوم اور رواج کے بُعد کے باوجود قدیم اور جدید میں در اصل کوئی خاص فرق نہ ہو، کل اور آج، اور آنے والی کل، یہ سب در اصل ایک ہی چیز ہیں۔ ایک ہی تصور کے مختلف نام ہیں، ایک ہی تسلسل میں سموئے ہوئے ہیں، وقت

پانی کے ایک چشمے کی طرح ہے، جس کے شفاف پانی کی سطح کو جس مقام پر بھی چاہو چھو لو! اس سب گورکھ دھندے سے آواگون کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے' اس مشرقی نوجوان کا شعور بنتا ہے جو اس وقت ساؤتھ کنسنگٹن (SOUTH KENSINGTON) کے ایک پب میں آئیلین سے ایک مسلسل طولانی، بے ربط گفتگو میں مصروف تھا۔ دو گھنٹے پہلے جب وہ میوزیم میں ایک جگہ کھڑی ان کھڑکیوں کے دیکھنے میں محو تھی تو اس نے کنکھیوں سے' اس نوجوان کے قرب کو محسوس کیا تھا۔

آئیلین نے ایک تجسس کے جذبے کے ماتحت' اس اجنبی نوجوان سے خود کو متعارف کرایا: "میرا نام ہے، آئیلین!۔ آئیلین جونسر!۔ اور تمہارا؟"

"میرا نام ماہل ہے!۔۔۔ تم کو یہ جدید آرٹ پسند ہے؟"

"ہاں۔۔ غالباً!۔۔۔ مطلب یہ ہے کہ بعض وقت میں سوچتی ہوں کہ یہ سب کچھ ڈھکوسلہ تو نہیں!"

"یوں تو سب آرٹ ہی ڈھکوسلہ ہے، جب تک آرٹ کو کسی صحیح موضوع کی ترویج کے لئے استعمال نہ کیا جائے وہ کچھ ڈھکوسلہ ہی نظر آتا ہے!"

"تمہارے خیال میں ایک گرجا گھر کی کھڑکیاں آرٹ کے لئے صحیح موضوع ہے!"

"ہے بھی، اور نہیں بھی ہے!۔۔۔ واقعہ تو یہ ہے کہ کوونٹری کا گرجا محض عیسائی عبادت گاہ تو نہیں ہے، وہ اس جدوجہد کا بھی تو ایک حصہ ہے جو آج سے سات دس بارہ برس پہلے فاشیت اور جمہوریت کے درمیان ہوئی تھی، اور جس میں کوونٹری کا پرانا گرجا تباہ ہو گیا تھا، اور پھر کوونٹری کا نیا گرجا گھر بن گیا! کوونٹری کے باشندوں کی زندہ رہنے کی خواہش کی ایک زبردست علامت بن گیا اور اسی لئے اب اس گرجا گھر کی مدد کو آرٹ آن موجود ہوا ہے!"

میوزیم میں کوونٹری کی کھڑکیوں کو دیکھنے کے لئے تماش بینوں کا ایک لمبا سا کیو (QUEUE) ہال کے باہر تک پھیلا ہوا تھا۔ اس کیو میں کچھ لوگ جو آئیلین اور ماہل کے قریب تھے، اس بات کے منتظر تھے کہ یہ دونوں حائل تھے، اور باقی تماش بین ان کو گھور گھور کے دیکھنے لگے، اور آئیلین کو ان کے یوں بدمزگی کے ساتھ گھورنے' کا احساس ایک دم سے ہو گیا۔ اس نے ماہل سے کہا: "چلو آگے بڑھیں، ہم کیو کے راستے میں حائل ہیں!" اور ماہل بھی چونک پڑا، اور وہ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے' میوزیم سے باہر نکل آئے!

"اب۔۔۔؟۔۔۔" ماہل نے متوقع انداز میں' میوزیم سے باہر چلے آنے کے بعد' پوچھا۔

"یہاں قریب ہی ایک پب ہے، جس سے میں تھوڑی بہت واقف ہوں!"۔۔۔ آئیلین نے کہا۔

"چلو وہاں چلیں!"

"ہاں چلو!۔۔۔"

اور پھر وہ دو گھنٹے تک مسلسل پب میں بیٹھے رہے!

شام خاصی ڈھل چکی تھی لیکن ایک دھندلی دھندلی روشنی اب بھی لندن پر مسلط تھی جیسے سورج کی آخری کرنیں اس شہر کو خیرباد کہنے سے ہچکچا رہی ہوں۔ گرمیوں کے موسم میں بہت رات گئے تک یہ ہلکی ہلکی روشنی لندن کی سڑکوں پر، مکانوں پر، زیرزمین ریلوں کے ان گنت اسٹیشنوں پر، کئی کئی منزلوں والی دکانوں پر منڈلاتی رہتی، اور خواہ مخواہ لندن ایک پراسرار سا مقام بن کے رہ جاتا، لندن کے وجود کی اس پراسرار کیفیت کو ماہل نے پہلی شام ہی بھانپ لیا تھا' اور اب جب کہ وہ اس اجنبی لڑکی آئیلین کے ساتھ ایک پب میں بیٹھا تھا، لندن کے وجود کی پراسرار کیفیت' اس کو اور بھی شدید طور پر محسوس ہو رہی تھی۔۔۔ اور اسی اجنبی آئرش لڑکی کے وجود کو بھی ضرورت سے زیادہ دلکش بنائے دے رہی تھی۔

"آئیلین!۔۔ تم آئرش ہو نا!" ماہل نے پوچھا۔

"ہاں، میں آئرلینڈ کی رہنے والی ہوں، باغی آئرلینڈ کی!"

"باغی آئرلینڈ!"

ماہل کی آئرلینڈ سے واقفیت سرسری تھی۔۔ ایک طویل تنازعہ جو تاریخ کے بےگنتی صفحات پر پھیلا ہوا تھا' اور جو کبھی کبھی تشدد کی شکل اختیار

کرجاتا، ایک آزادی کی خواہش جس نے ان دونوں جزیروں کے درمیان، جن کو وہ بچپن سے جغرافیہ کی کتابوں میں ایک ہلکے گلابی رنگ میں ڈوبے ہوئے دیکھتا چلا آیا تھا، ایک گہری اور ناقابلِ عبور خلیج حائل کر دی تھی' ـــــ اور ایک بھولے بسرے فلمی گانے کی یاد :

[IRISH EYES ARE SMILING AT ME] ـــــ "آئرش آنکھیں مجھے دیکھ کے مسکرا رہی ہیں! ـــــ"

ـــــ نہ جانے یہ آئرش آنکھیں کیسی ہوتی ہیں؟ بڑی بڑی، گہری، شفاف، بھورے رنگ کی پتلیاں، جن میں ایک حسن ہے، دلکشی ہے، ایک محویت اور حیرت کا ملا جلا جذبہ ہے، لیکن بغاوت نام کو بھی نہیں ہے۔ بغاوت کے جذبے میں تو ایک طرح کی نفرت اور سخت دلی کی کیفیت ہوتی ہے' اور یہ بڑی بڑی آنکھیں تو محض مسکراتی رہتی ہیں۔

"آئیلین! تم آئرش لوگ انگلستان کے خلاف ہی تو بغاوت کرتے ہو، پھر تم یہاں لندن میں کیوں ہو؟ ـــــ" ماہل نے اپنے بیئر کے گلاس سے کھیلتے ہوئے پوچھا۔ گلاس میں بیئر کے جھاگ بے تابی کے ساتھ اُبل رہے تھے جیسے ان میں کئی سمندروں کی تندی مرکوز ہو کے رہ گئی ہو، اور آئیلین کے گلاس میں سوڈے کے ننھے ننھے بلبلے ایک دوسرے کے ساتھ مسکرا مسکرا کر، آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، جیسے وہ سمندروں کی تندی کے وجود سے قطعی بے خبر ہوں۔

آئیلین ذرا سوچ میں پڑ گئی؛ پھر اس نے رک رک کے جواب دیا: "ہاں یہی تو عجیب بات ہے، ہم آئرش لوگ ہوش سنبھالتے ہی ایک بغاوت کا نفرت کا، دشمنی کا سبق سیکھنا شروع کر دیتے ہیں، لیکن جب ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ اس بغاوت کے جذبے کو عملی جامہ پہنائیں تو ہم موقعہ ملتے ہی چینل کو عبور کر لیتے ہیں اور لندن اور مانچسٹر اور لورپول اور نیوکاسل میں تلاش معاش شروع کر دیتے ہیں' ـــــ عجب غیر منطقی سی بات ہے لیکن ہوتا یونہی ہے!"

ماہل نے بھی سوچا کہ واقعی اصلیت یوں ہی ہے، کیونکہ چند برس پہلے اس کے اپنے وطن میں یہی ہوتا تھا، چند برس پہلے اس کے اپنے وطن میں بھی لوگوں کے دلوں میں انگلستان کی طرف سے ایک نفرت اور بغاوت کا جذبہ بھرا ہوا تھا، لیکن پھر انگریزوں نے ہی مغربی طرز کی آزادی، مغربی طرز کی قومیت' مغربی طرز کی جمہوریت کا ان لوگوں کو سبق پڑھایا، اور ان کی پرانی روایات کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے موئن جودڑو، تیکشیلا اور اجنتا اور ایلورا کے کھنڈروں کو آثار الصنادید کے محکمے کے سپرد کر دیا' اور تاج محل کے سنگ مرمر کو رئیسوں کی بیٹھکوں کے فرش کی زینت بننے سے محفوظ رکھا' ان کو ایک زبردست پوسٹل سسٹم عطا کیا اور کنگ ریڈر عطا کی! ـــــ اور پھر یہی لوگ ایک بغاوت کی آگ سینے میں دبائے پھرتے تھے۔ مگر پھر اس آگ کی تپش کو محسوس کرنے کے باوجود جب موقع ملتا پی اینڈ او کے جہازوں میں بیٹھ کر یا بی، او، اے سی کے طیاروں میں پرواز کر کے، انگریزوں کی اپنی سرزمین پر پہونچ جاتے' اور یہاں لندن کے عجائب گھروں، لائبریریوں اور دریائے ٹیمز کے پلوں اور ہائڈ پارک میں طوائفوں اور ویسٹ منسٹر ایبی میں مدفون ادیبوں اور شاعروں اور مؤرخوں اور سٹیفورڈ آن ایون" (STAFFORD - ON - AVON) کے شہرۂ آفاق سپوت کے سلسلے میں خواہ مخواہ ایک شدید جذباتیت کا مظاہرہ کرتے پھرتے ـــــ اور آئیلین ماہل کے دوڑتے ہوئے خیالات سے بے خبر بولتی رہی :

"میں نے سکول چھوڑنے کے بعد ایک بہت بڑی کپڑے کی مل میں پیکنگ کا کام سیکھا، مانچسٹر کی اس فیکٹری میں زندگی بہت کٹھن تھی' اور ہماری شفٹ پر جو عورت سپروائزر تھی اس میں ضرور کسی فاشستی ڈکٹیٹر کی روح تھی۔ خیر، پھر بھی میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی ٹریننگ کا زمانہ گزار ہی لیا، اور یہاں چلی آئی اور اب میں اس زبردست سمندر میں قطرہ بن کے رہ گئی ہوں جس کا نام لندن ہے! آکسفورڈ سرکس کے قریب ایک سہ منزلہ اسٹور ہے، اس کے پیکنگ کے شعبے میں میں کام کرتی ہوں، وہ اسٹور واقعی بہت زبردست ہے۔ تم ضرور کسی روز دیکھنے کے لئے آنا' ـــــ ویسے میں رہتی یہاں قریب ہی ایک فلیٹ میں ہوں' ـــــ!" اور پھر وہ بولتے بولتے رک گئی۔ شاید اس نے ماہل کی آنکھوں کے کھوئے کھوئے انداز کو بھانپ لیا، اور اس نے سوچا کہ غالباً اس سانولی رنگت والے اجنبی نوجوان کا ذہن بیئر کی تندی کی بنا پر، یا پب کی بوجھل فضا کی بنا پر بہت دور بھٹک گیا ہے۔ اور وہ خالی الذہن ہو کر بیٹھ گئی'۔ ماہل آئیلین کے یوں ایکا ایکی خاموش ہو جانے پر چونک اٹھا' اور ایک کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے معافی مانگنے لگا، آئیلین اس وقت ماہل سے مصروفِ گفتگو رہنے پر مصر تھی۔ شاید اس کو اپنے اکیلے فلیٹ میں واپس جانے کے خیال سے ہی دہشت ہو رہی تھی، اس لئے وہ مسکرا اٹھی، اور اس کی بڑی بڑی آئرش آنکھوں میں چمک عود کر آئی۔ اس نے کہا: "دراصل ہم آئرش لوگ اپنے بارے میں باتیں کرنے کے بہت شوقین ہیں"

ماہل نے کہا: "اپنے بارے میں باتیں کرنے کا تو ہم لوگوں کو بھی بے حد شوق ہے!"

آیلین نے کہا: "بہرحال میں تو اتنی ڈھیر باتیں اپنے بارے میں بتا چکی ہوں۔ اب تمہاری باری ہے!"
ہال نے چاروں طرف نظر دوڑا کے دیکھا تو اس کو پب کی فضا پہلے سے بھی زیادہ، شراب اور سگرٹوں کی بُو سے لبریز معلوم ہوئی۔ ایک کونے میں تین ادھیڑ عمر کی عورتیں بیٹھی مسلسل آپس میں کھُسر پھُسر کئے جا رہی تھیں، شراب کی تیزی سے ان کے چہرے پر ایک مصنوعی سرخی جھلک آئی تھی اور باتیں کرتے وقت ان کی ناک کے نتھنے بے وجہ طور پر پھڑکنے لگتے۔ بار کے کاؤنٹر کے ایک سرے پر دو نوجوان مرد ایک کم عمر سی لڑکی کو گھیرے کھڑے تھے اور بارٹینڈر اُن کی طرف کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا! ۔ اور تمام پب میں ایک لامتناہی گونج مسلط تھی! ۔۔ انسانی آوازوں کی ملی جلی مبہم گونج، جیسے بہت سے نوعمر لڑکوں کو ایک ہال میں اکٹھا کر دیا گیا ہو اور جیسے وہ سب لڑکے ماسٹر صاحب کی غیرموجودگی سے فائدہ اٹھا کر آپس میں باتیں کرنے اور شور مچانے میں مشغول ہوں!
ہال نے سوچا کہ اس کا اپنا ذہن کسی بھی بات پر مرکوز ہونے سے قاصر تھا، وہ تو بار بار نہ جانے کہاں بھٹک جاتا۔ اس نے کہا: "میری دوست آیلین اگر میں بھی تمہاری طرح ایک سانس میں بہت سی باتیں کہہ ڈالوں تو شاید تمہاری سمجھ میں کچھ بھی نہ آئے! درصل اِس گرد آلود ہال' اور اس انگریزی پب کے درمیان پوری ایک کائنات حائل ہے' اور ویسے میں تو اس کائنات کو ایک جست میں عبور کرنے کو تیار ہوں لیکن شاید تمہارا اینگلوسیکسن (ANGLO - SAXON) ذہن اس قدر لمبی مسافت طے کرنے پر آمادہ نہ ہو! ۔۔۔ کیونکہ تم مجھ سے ابھی تھوڑی دیر پہلے میوزیم میں کوٹھڑی کی طرح کیاں دیکھتے وقت ملی تھیں لیکن میں تو ایک صدی سے تم سے واقف ہوں، صدی میں نے اس لئے کہا کہ میرے اجداد میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے علی گڑھ کالج کی بنیاد ڈالی تھی اور اپنے بچوں کے ایک ہاتھ میں بغدادی قاعدہ اور دوسرے میں کنگ ریڈر تھما دی تھی! ۔۔۔ اب تم یہ پوچھو گی کہ بغدادی قاعدہ کیا ہوتا ہے، پھر میں کہتا ہوں کہ تم ذرا اس واقعی تضاد پر تو غور کرو' تم جو ایک صدی سے میرے لاشعور میں سمائی ہوئی ہو! ۔۔۔۔۔"
شاید گرٹروڈ سچ ہی کہتی تھی کہ یہ کالی رنگت والے لوگ شراب کی شدت کو نہیں برداشت کر پاتے ہیں! ۔۔۔ پُور تھنگ!!"

"ماہِ نو" میں اشاعتِ مضامین سے متعلق شرائط:۔

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیرمطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالے یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر ضروری حوالہ جات دینا ضروری ہے۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

فن :

مغلیہ مصوّری میں فطرت کی عکّاسی

ایرک۔ سی۔ ڈکنسن

ہمارے گردوپیش کی محسوس و مرئی دنیا کی جیسی عکّاسی مغربی نقّاشی میں کی جاتی ہے اور جسے ہم "واقعیت نگاری" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اس کا پہلے پہل مغلیہ مصوّروں کو قطعی کوئی علم نہ تھا اور یہ بات کچھ ایسی تعجب انگیز بھی نہیں کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب ہمایوں اپنی جلاوطنی کا زمانہ ایران میں گزارنے کے بعد ۱۵۵۵ء میں واپس آیا تو وہ کچھ ایرانی نقّاشوں کو بھی اپنے ساتھ لایا۔ یہ نقّاش ہاتوں سے دو طرفی نقّاشی کی روایات ہی کے پابند تھے جو ایران میں صفوی عہد کے فنکاروں کی عام روش تھی۔

کچھ عرصہ بعد اکبر کے عہد میں اصلیت نگاری کی طرف رجحان شروع ہوا۔ جو مغل مصوّری میں ایک اہم تبدیلی تھی۔ اس کی پوری کیفیت سمجھنے سے پہلے اس بات پر نظر ڈالنے کی ضرورت ہوگی کہ ایرانی قلم، جو عہدِ صفوی کے اُستادانِ فن کے یہاں مروّج تھا، اس کی علّت غائی اور کیفیت کیا تھی۔

ان استادوں کے عمل میں تمام تر تزئین و آرائش پر زور تھا۔ اس لئے اس قسم کے فطری لوازم مثلاً سایہ کاری (SHADING) یا تناظر کے لئے ان میں کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی تھی۔ وہ اپنی مختصر تصاویر کی سطح کو محض خانہ دار روغنی تختے تصوّر کرتے تھے جن کے خانوں میں رنگ بھر دیئے جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سرخ، سبز، لاجوردی یا زرد کی شوخ رنگارنگی جھل جھل کرتی رہتی تھی اور یہ ساری جھلکاری ایک بوقلموں مرصّع کاری کا روپ اختیار کرلیتی تھی۔ تصویر کا ہر حصّہ ایک خاص رنگ سے بھرپور دکھائی دیتا تھا جس پر سائے کا شائبہ نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ لیکن اس میں تعمیراتی نقشہ گری اور دوسری نازک جزئیات خوب بھردی جاتی تھیں۔ اوپر مرغولوں کی طرح بل کھاتے بادلوں کا چھتر، نیچے زمین کا فرش زمردیں۔ ہو بہو پرستان کا عالم جس کی بہارِ شباب ہمیشہ نصف النہار پر رہتی اور شنگرف، لاجورد اور سنہرے کی ڈلک آنکھوں کو خیرہ کرتی رہتی۔ اس عالم طلسمات میں شہزادے الھڑ کھلے چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ مغرب کے عہدِ وسطیٰ کا ایک پرستار گاتھک انداز میں تیار کی ہوئی "کتاب نماز" کی تزئین کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ کہتا ہے : "اس لوچ لچک کے نہ ہونے سے ہی تقریباً سحر آمیز توانائی پیدا ہوجاتی ہے۔ جب تناظر اپنے سہ طرفی فریب نظارہ کے ساتھ فن پر چھا گیا اور معجز نما صداقت کا عنصر ناپید ہوگیا، تو نقّاشی کو کچھ ایسا نقصان پہنچا جو احاطۂ بیان سے باہر ہے"۔ یہی رائے من و عن صفوی عہد کی مختصر مصوّری پر بھی صادق آتی ہے، جس کے ناپید ہوجانے پر ہم افسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، اس گم گشتہ اعجاز کی جگہ مغل مصوّروں نے ایک اور معجزہ کاری کو فروغ دیا۔

تبریز سے ہمایوں، میر سیّد علی اور خواجہ عبد الصمد جیسے استادوں کو اپنے ساتھ لے کر آیا۔ یہ دونوں بہزاد کے شاگرد تھے جسے صفوی دربار کا جوہر یکتا کہنا چاہیئے۔ ہمایوں نے ان نقّاشوں کو ایک کام سپرد کیا۔ ایران کے ادب عالیہ کی سب سے وقیع اور پرکشش کتاب "داستانِ امیر حمزہ" کو مصوّر بنانا۔ چونکہ یہ داستان بارہ جلدوں پر مشتمل اور کئی ہزار صفحات کو محیط ہے، اور ہر جلد کو مصوّر کرنا تھا، اس لئے کام کی وسعت کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے ان اُستادوں نے اپنے ساتھ کوئی پچاس ایرانی و ہندوستانی مصوّروں کو بھی ملالیا اور اس کا آغاز ہوگیا۔

"داستانِ امیر حمزہ" دراصل مغل نقّاشی کی اساس ہے۔ اس ہی عہد میں ایران کی مختصر تصویر کشی کو سامنے رکھا جائے تو یہاں کے کام کا فرق نمایاں ہوجاتا ہے۔ "ایرانی قلم" میں تزئین برقرار رہتی ہے مگر یہاں خوب کاری کا تناسب غیر واضح بلکہ گڈمڈ ہوکر رہ جاتا ہے گویا کہ اس کا بالعموم نستعلیق موضوع، نقّاش کی قوتِ اظہار سے باہر ہے اور اس کا نتیجہ ایک درہم برہم سی کیفیت۔ پھر ان نقوش میں بے عیب رنگ داری کا جو ذوق دکھائی دیتا تھا، وہ بھی کچھ مرامر اسا دکھائی دیتا ہے۔ مگر جو چیز ہمارے لئے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان میں اشجار اور دیگر اشیاء میں فطرت و واقعیت پسندی کی لہر آگئی ہے

واضح رہے کہ اس وقت ہم الگ الگ بنائی ہوئی مختصر تصاویر کا ذکر نہیں کر رہے ہیں، بلکہ ہمارا موضوع وہ تصاویر ہیں جو مستقل کتابوں کی آرائش کے لئے سوتی پارچہ پر بنائی گئی ہیں۔ جس کی تقطیع ۲۲ × ۲۸ کے قریب ہوتی تھی۔ مثلاً "داستان امیر حمزہ" کی تصویر "کرامت حضرت علی رض" کو ہی لیجئے۔ اس کی تصویری اٹھان ترچھی (/) ہے۔ عہد اکبری کے مُصوّروں کو یہ اسلوب بڑا سہل اور بہ کار آمد نظر آیا کیونکہ ان کے موضوعات یا تو "بابر نامہ"، "تیمور نامہ" "اکبر نامہ" کے ولولہ انگیز واقعات تھے یا رومانوی داستانوں کے محیر العقول کارنامے۔ موجودہ مثال میں یہ انداز کچھ دھیما ہے مگر ایسا کہ منہ سے بول رہا ہو۔

اشجار اور پانی کا جو عمل ان تصویروں میں دکھائی دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک چونکا دینے والی اپچ نے آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولنی شروع کر دی ہیں۔ ایرانی قلم میں اشجار کو بس ایک انبوہ کی صورت میں دکھاتے تھے۔ مگر اب ان تصویروں میں اشجار نے ایک نئی وضع اختیار کر لی۔ پتّوں کی اشکال اگرچہ چپٹی اور چپکی چپکی سی ہیں (اور وہ بھی سطح تصویر کے چند حصّوں تک محدود ہیں، کو وہ پوری طرح بھرے ہوئے ہوتے ہیں) لیکن ناظر صاف پہچان سکتا ہے کہ یہ کونسا درخت ہے۔ مگر سب سے زیادہ نظری کیفیت درختوں کے تنوں میں پیدا کی گئی ہے۔ پھر جہاں تک پہاڑوں کا تعلق ہے، مصوّروں نے ایرانی و چینی روایات کے مطابق محض چٹانیں پیش کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا، بلکہ کم از کم سایہ کاری کے ساتھ ان کو ایسا ٹھوس پن عطا کیا ہے جو صفوی عہد کی مختصر تصاویر میں بالکل ناپید ہے۔ تزئین کا عنصر بدستور موجود ہے لیکن نقوش میں ایسے تصورات کار فرما ہیں جن کا تبریزی مصوّروں کو علم ہی نہ تھا۔ پانی کو سابقہ مشرقی روایات کے برعکس آڑے ترچھے کٹواں خطوط سے ظاہر نہیں کیا گیا بلکہ بالکل قدرتی طور پر بلبلے اور جھاگ پیدا کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ صفوی تصورات بتدریج محو ہوتے جا رہے ہیں۔ کس حد تک؟ اس کا اندازہ زیر بحث تصویر اور میر سید علی کی بنائی ہوئی تصویر "لیلیٰ مجنوں" کے موازنہ سے کیا جا سکتا ہے۔ اس تصویر میں دو طرفی تصویر کشی کے لوازمات کو بڑی حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے۔

۱۵۷۵ء میں مغل دبستان مصوّری میں ایک اور اہم دور کا آغاز ہوا جبکہ اکبر کو ایک ایسا ادارۂ فن قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا جس میں ہندو، مسلمان مصوروں کی یکساں پرورش اور حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ صفوی طرز کا غلبہ جو پہلے ہی روبہ انحطاط تھا اب تیزی سے معدوم ہونے لگا۔ چنانچہ کسی تیمور نامہ کی ایک تصویر "تزک غلام تیمور کے حضور میں" ــــ (جس کو دھرم داس کا عمل خیال کیا جاتا ہے) ــــ ہمیں نئے مغل اسلوب کی خصوصیات جھلکتی نظر آتی ہیں یعنی ایرانی، ہندی اور مغربی تصویر کشی کا امتزاج۔ اشکال اب لگے بندھے نمونے پر نہیں ہیں جیسا کہ "لیلیٰ مجنوں" میں ہے۔ بلکہ یہ دکھائی دیتا ہے کہ مصوّر کو اپنے موضوع سے نفسیاتی دلچسپی ہو گئی ہے اور ساتھ ہی ڈرامائی احساس بھی آچلا ہے۔ زائد قسم کی چیزیں مثلاً عمارتیں اور ملبوسات کو اس خوش اسلوبی سے دکھایا گیا ہے گویا مصوّروں نے انہیں ابھی ابھی دیکھا ہے۔ البتہ حاشیہ کی بیلوں سے، جو اُکتا دینے کی حد تک بڑی بڑی ہیں، تصویر کا سارا وقار مارا جاتا ہے۔ جہاں بہت سے لوگوں کو دکھایا گیا ہے اور وہ پتھر کی بے جان مورتیاں معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اس کا اثر زائل کرنے کے لئے پیش منظر میں غیر معمولی عمل و حرکت کا کوئی نہ کوئی مظاہرہ دکھایا گیا ہے۔ چنانچہ ہمیں دو مصاحب ایک چیتے کو، جو سدھایا ہوا اور پالتو ہے۔ اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے دکھتے ہیں۔ چیتا کچھ اس طرح چپ سادھے، بے حس و حرکت نہیں بیٹھا ہوا ہے گویا وہ واقعی رام ہو۔

تصاویر میں عمارتی ٹیپ ٹاپ سے بڑھتا ہوا شوق ایک اور تصویر سے نمایاں ہے، اور کافی مبالغہ کی حد تک۔ یہ تصویر بھی جس کا عنوان "بانگِ اذان" ہے کسی تیمور نامہ کی زینت ہے۔ اس کو دو مصوّروں نے تیار کیا۔ لیکن غضب یہ کیا ہے کہ تصویر کے چپّے چپّے پر جہاں بھی جگہ ملی ہے، کچھ نہ کچھ ضرور بنا دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک ایسی تصویر جو "الف لیلوی" وضع کا واقعی نہایت شاندار نقش بن سکتی تھی، ایک شاہکار بنتے بنتے رہ گئی ہے، خصوصاً عجب کہ اس میں طنز کی نشتریت بھی پوری طرح کام کر رہی ہے۔ کیونکہ مؤذن تو زور شور سے اذان دے دے کر لوگوں کو نماز اور فلاح کے لئے بلا رہا ہے مگر سننے والوں کی غفلت میں کوئی فرق نہیں آتا! ایرانی مختصر تصاویر کی بعض خصوصیات تو اس میں موجود ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اور بھی بہت کچھ ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فن کار اس جیتی جاگتی دنیا پر، جو اس کے ارد گرد ہے، کس طرح نظر ڈالتا ہے۔ عمارت کا نقشہ پورا دکھایا گیا ہے جیسے وہ جامد ہونے کی بجائے دُور تک کھلتی جا رہی ہو۔ یعنی تناظر کو بخوبی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جس سے عمارت کو دیکھ کر محض ظاہری ٹیپ ٹاپ کا سطحی احساس نہیں ہوتا۔

اکبر کا زمانہ ختم ہونے سے پہلے مغربی نقاشوں کے فن نے بھی مغل مصوّری تک راہ پائی۔ جو قدرت کی عکاسی کے شوق کو تیز تر کرنے کے لئے زبردست

تازیانہ ثابت ہوا۔ مغلیہ مصوّروں کی فطانت سے بعید تھا کہ وہ یورپی نمونوں کی دو خصوصیات کو فوراً نہ بھانپ لیتے: متوازن وحدت اور کُل تصویر پر حاوی ایک آہنگ جس کو رنگوں کی انتہائی احتیاط سے اختیار کی ہوئی ترکیب و ترتیب سے اُبھارا جاتا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مغربی تصاویر سے منظر نگاری کی اہمیت کا احساس بھی ہوا۔ مصوروں کو پہلی بار یہ پتہ چلا کہ مصوّری کے تمام لوازمات میں منظر نگاری سب سے اہم اور گراں قدر ہے۔

بساون کی ایک مختصر تصویر میں نہ شکلیں ٹھوس لگتی ہیں بلکہ منظر سے فضا جھلکتی ہے اور ساتھ ہی تناظر بھی۔ منظر نگاری، یوں سمجھ لیجئے، ذیلی ہونے کی بجائے مقدم چیز بن گئی ہے یعنی نقش کی علّتِ غائی۔ اس تصویر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نقّاش نے واقعیت نگاری کے میدان میں بڑا جرأت مندانہ اقدام کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں ہو سکتا ہے کہ یہ فن کار استاد عبد الصمد کا شاگرد تھا۔ اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ شاگرد نے خود کو اُن ایرانی روایات سے کسی قدر آزاد کر لیا تھا جو اس کے استاد کو اس قدر عزیز تھیں۔

مغلیہ مرقع نگار اس نئی دعوت کو قبول کرنے میں پیش پیش رہے۔ انہوں نے اپنے موضوعِ نقش کو دلآویز منظر کے روبرو دکھانا شروع کیا اور اکثر فطرت کی بڑی صحیح عکاسی کے ساتھ۔ فطری تمثال نگاری کا سب سے بڑا کارنامہ "رات کو ہرن کا شکار" ہے۔ جس میں تصوّر کی رعنائی واقعی بے نظیر ہے۔ یہ تصویر آج بھی "بوڈلیئین لائبریری" (آکسفورڈ) کی زینت ہے۔ اگرچہ اس کے محاسن کی جی بھر کے داد دینے کو جی چاہتا ہے، پھر بھی بخوفِ طوالت اس سے قطع نظر کرتا ہوں۔

●

جہانگیر کی نگرانی میں "مختصر مرقع نگاروں" کا ایک حلقہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان مصوروں نے پیڑوں اور پرندوں کی تصویریں بنانی شروع کیں اور بڑی نفاست و چابکدستی سے۔ ان میں سب سے باکمال استاد منصوّر تھا، جہانگیر کے چہیتے پھولوں میں سے ایک گُلِ لالہ تھا۔ جیسا کہ اس کی توزک کے ان بہت ہی تحسین آمیز الفاظ سے ظاہر ہے: "شمع ہائے لالہ محفل طرازند"

اس قسم کے شہ پاروں کا بہترین نمونہ استاد منصّور کی تصویر لالۂ احمر ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس بھی اس پھول کا زبردست شیدائی تھا۔ ایک جگہ اس نے کیا خوب کہا ہے: گُلِ لالہ کی گاڑھی سرخی میں دھڑتی ہی کی دبیز سرخی جھلکتی ہے۔ یعنی یہ اتنی گاڑھی سرخی ہے کہ نظر اس سے پار نہیں جا سکتی۔ یہی گاڑھی سرخی ہے جسے استاد منصّور نے بڑی کامیابی سے لالہ کے نقوش میں سمو دیا ہے۔

پرندوں کی تصاویر میں "پیلو" (نیل مرغ)، کمال درجہ کی صناعی کا مظہر ہے۔ پیلو اپنی دم پھیلائے کھڑا ہے۔ پیچھے یونہی ایک منظر کی جھلک سی ہے۔ محض اشارہ جس سے خشک بے آب و گیاہ صحرا کا بنجر پن نمایاں ہے۔ اس کے محاذی پیلو کی رنگینی اپنے تضاد میں عجیب کیف پیدا کرتی ہے۔ وہ رنگینی جس میں ایک طرف کلغی میں رنگوں کا درجہ بدرجہ اتار چڑھاؤ اور دوسری طرف سر اور گردن پر بڑی جسارت سے برتا ہوا شنگرفی سرخ رنگ ہے۔ استاد منصّور کو مختصر تصویر کشی کے ایک ایسے شعبہ میں یدِطولیٰ حاصل تھا جس میں کامیابی کے لئے خاص الخاص کمال کی ضرورت ہے۔ یہی امتیازی خصوصیت تھی جس کی بنا پر جہانگیر نے اس یگانۂ روزگار مصوّر کو "نادر العصر" کے خطاب سے سرفراز کیا تھا۔

عام امور سے تعلق رکھنے والی تصاویر، فطری عکاسی کے سلسلے میں مزید ترقی کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں بھی بے حد تنوع نظر آتا ہے اور ایک ایسی انسانی دلچسپی بھی جس میں سرکار دربار اور شاہانہ جلسوں جلوسوں کے نقشوں کی سج دھج اور رکھ رکھاؤ کا شائبہ تک نہیں۔ یہ سب نقوش مل کر سوسائٹی کے نسبتہً کم درجہ افراد کا ایک سماجی دستاویز پیش کرتے ہیں۔ ہم گوشِ توجہ سے سنیں تو ان مرقعات سے عوام کی اٹھتی آوازیں بخوبی سن سکتے ہیں۔ ان کی فہرست خاصی طویل ہے۔ مثلاً جواں سال شہزادہ کسی پیر فقیر کی بارگاہ میں۔ ننگ دھڑنگ سادھو دوپہر کی چلچلاتی دھوپ سے پناہ لینے کے لئے پیڑ کی چھاؤں میں آلکسی سے پاؤں پسارے لیٹا ہوا۔ رات کے وقت مُلّا بحث مباحثہ کرتے ہوئے یا ایک گویا اور اس کی مجلسِ سامعین (یہ ہندو مصوّر بچترؔ کا عمل ہے)۔

نت نئی نیرنگیٔ حالات نے مصوروں کو، جو درحقیقت فن کار بھی تھے اور شاعر بھی، بظاہر جانے پہچانے معمولی حالات سے اہم و بنیادی امور کو اخذ کرنے میں مدد دی۔ اس متناقض صورتِ حال (یعنی ادنیٰ و اعلیٰ کا بظاہر عجیب و غریب ربط) کا لطیف ترین جوہر تھا جو مشرق

ضی کے اس معجز نما عوامی فن میں آشکار ہوا جو جاپان کے دبستان یوکی واو (UKIYOYE) کے نام سے مشہور ہے اور جس کے معنی ہیں "آئینۂ ان گزراں"۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ شروع میں مغل مصوری تمام تر تیموری اور صفوی دبستانوں کے زیر سایہ تھی۔ اس سے آزاد ہو کر اس نے ایک نیا نقش پیدا کیا جس میں مقامی اور مغربی عناصر نے باہم مل کر آمیز ہو کر ایک مرکب وضع اختیار کی مگر مقامی عنصر کا استیلا، جو اس کی تشکیل پر حاکمانہ رت رکھتا ہو، کبھی بھی زائل نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود فطرت کی اسی وضع سے استخلاص اچانک یا جھٹ پٹ نہیں ہوا بلکہ اس کے رسوم و قیود سے ات اس وقت وقوع پذیر ہوئی جب کہ فن کاروں کو اپنے آپ پر اعتماد پیدا ہوا اور وہ نئی سہ طرفی دنیا میں بڑی آسانی و بے تکلفی سے کام رنے کے اہل ہوئے۔ یہ اعتماد جہانگیر اور شاہ جہاں کے عہد میں نقطۂ عروج کو پہنچا جبکہ غیر درباری عوامی موضوعات کی نقاشی میں، خصوصاً طری عکاسی اور خوش طبعی کا خوب حق ادا کیا گیا ہے۔ یہاں بھی "سایہ کاری" میں نفیس سے کام لیا گیا ہے اور پرچھائیں تو بالکل ہی مفقود ہے۔ لاوہ بریں جو مصور چرند و پرند اور پھولوں کی عکاسی کرتے ہیں وہ نہ صرف نہایت کڑی اور احتیاط و دیدہ ریزی کی متقاضی تکنیک میں ید طولیٰ لیتے ہیں بلکہ ہر چیز کو شاعرانہ نظر سے بھی دیکھتے ہیں۔

بالآخر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مغل مصوروں نے اس امتزاج سے ایک نہایت اعلیٰ ذریعۂ اظہار پیدا کر لیا تھا جس کی ولت وہ اپنے عظیم الشان مربیوں کے فرمان کی تعمیل کر سکے۔ اور یہ وہ مربی تھے جن کی انتہائی خوشی اس میں تھی کہ ان کے بہت ہی دلآویز در زندگی کی دھڑکنوں سے معمور ماحول کی روح لطیف مصوری میں کھینچ کر آ جائے، اور وہ اس کی تشریح و توضیح کا پورا پورا حق ادا کرے۔

ایک فن شناس موسیو فاورے (FAURE) نے ارتقائے فن کی جو نہایت ہی تاثراتی قسم کی تاریخ قلمبند کی ہے اس میں وہ بیان کرتا ہے کہ "تاریخ عالم میں بعض اوقات نہایت ہی نادر قسم کے لطائف غیبی رونما ہو جاتے ہیں"۔ اس پر مغز قول کا اطلاق جیسے جمال کی جستجو پر ہوتا ہے شاید ہی اور کسی بات پر۔ انسان کے لئے ہر اعتبار سے مایۂ ناز ہے۔ تلاش جمال سے مراد فن اور فطرت دونوں میں ہر لطیف عنصر کی سراغرسانی کا خداداد ملکہ ہے۔ مع لگن، جستجو اور تڑپ کے، فن کار کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ وہ رازہائے فطرت کا محرم بن جاتا ہے اور جب اس کا دل مائل ہو تو ن کا پردہ کشا بھی ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر پھر لطیفۂ غیبی بھی اپنا کام کر جاتا ہے۔ فرمان صادر کرنے والوں نے تو بس فرمان صادر کر دیا ر فنکاروں نے اس زبردست خوبیٔ اتفاق کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے تابناک تخلیقی مرقعے پیش کر دئے۔ ان مرقعوں کی آب و تاب ج بھی ایسی ہی تازہ ہے اور اگر ذوق جستجو کے ساتھ ذہن بیدار اور چشم بینا بھی واہو تو ان کو بخوبی مشاہدہ کر سکتی ہے۔ خواہ یہ شہ پارے ظروں سے دور کسی سرکاری یا نجی نگار خانے میں ہمیں روحانی کیف و مسرت بہم پہنچانے کے لئے محفوظ ہوں۔ (ترجمہ)

مغلیہ مصوری

۱ : سار (عمل : استاد منصور)
۲ : اونٹوں کی لڑائی (عمل ''ھوبہار'')
۳ : چوگان بازی
۴ : ہاتھیوں کی لڑائی
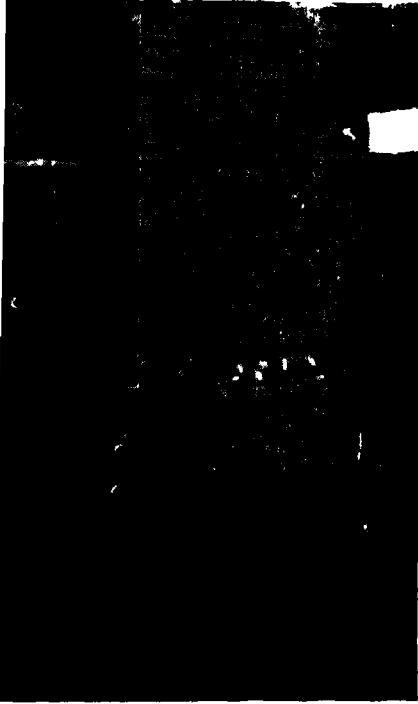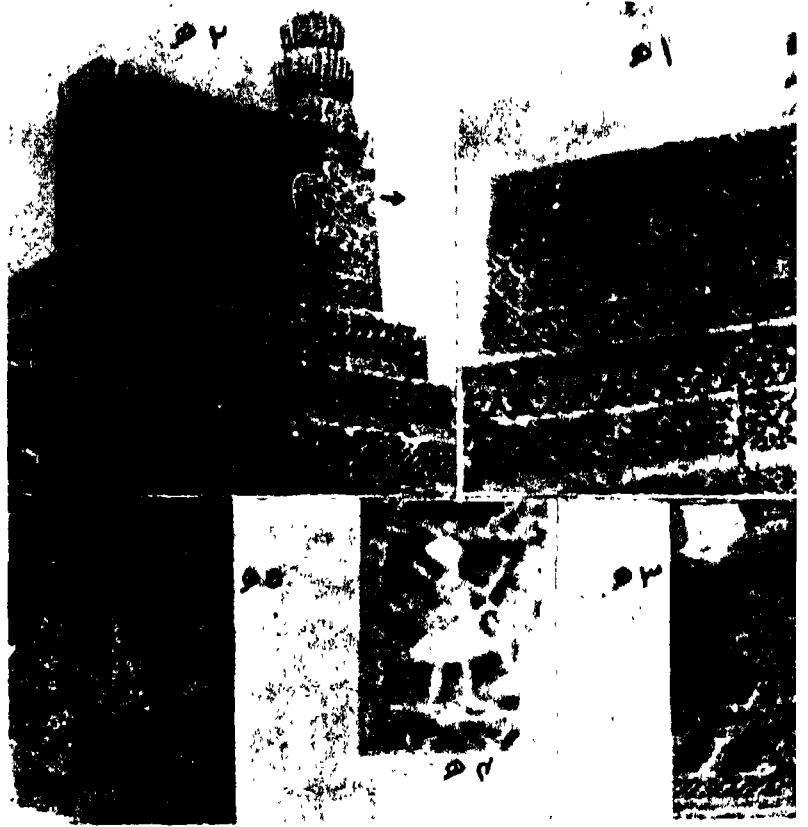
منجابری یا منگاپیر

ڈاکٹر محمد شفیع

کراچی سے دس میل شمال مشرق کی طرف منگا پیر نامی ایک موضع ہے۔ یہ ڈامر کی اس پکی سڑک پر واقع ہے جو کراچی کو بند مراد خاں کے راستہ سے لس بیلہ کے ساتھ ملاتی ہے اور جس پر موٹر گاڑیاں آجاسکتی ہیں۔ شہر سے کوئی چھ میل باہر نکل کر ہم "سندھ انڈسٹریل اسٹیٹ" سے آگے بڑھ جائیں تو دونوں طرف ٹیلوں کے بے آب و گیا چٹیل سلسلے نظر آتے ہیں جن پر کوئی جھاڑ ہے نہ پیڑ۔ لیکن بعض جگہ ٹینٹ (انجیر کی قسم کا خار دار جنگلی بیر) اور دوسری جھاڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ کوئی ۹ میل کے فاصلے پر منگا پیر کی آبادی کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ اور جب ہم اس گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ چند گھروں، سڑک کے کنارے واقع دکانوں، ایک مقبرہ اور اس کے ساتھ ہی واقع ایک مسجد پر مشتمل ہے۔ یہ مقبرہ اور مسجد دونوں ایک ٹیلے پر واقع ہیں۔ جو بیلی[1] (صفحہ ۱۸۰) کے اندازہ کے مطابق سطح سمندر سے تقریباً ۶۰۰ فٹ اونچا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس مقبرہ میں منگھ پیر یا حاجی منگھ سلطان نام کے ایک بزرگ کا مزار ہے۔ اس ٹیلے کے دامن میں سڑک کے دائیں بائیں قبروں کے آثار ہیں۔ اسی ٹیلے کے بائیں جانب دو پختہ حوض ہیں جن میں پانی بھرا رہتا ہے۔ ان میں سے ایک حوض مردوں کے لئے ہے اور دوسرا عورتوں کے لئے۔ یہاں کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ان حوضوں کا پانی کتنے ہی امراض سے شفا بخشتا ہے۔ ان سے چند گز کے فاصلے پر ایک بڑا حوض ہے جس کے گرد چار دیواری کھنچی ہے اور دیوار قد آدم اونچی ہے۔ اس حوض کی تہہ میں غلیظ، سبز رنگ کا بدبودار پانی ہے جس میں کتنے ہی چھوٹے بڑے مگرمچھ ہیں۔ جب میں ۸ مارچ ۵۸ء کو اس جگہ سیر کے لئے گیا تو گننے پر معلوم ہوا کہ اس میں کل ۲۰ مگرمچھ ہیں۔ اس حوض کے آس پاس باغات ہیں جن میں کھجور اور دوسرے خوشنما اور سرسبز درختوں کے جھنڈ ہیں۔ ان باغوں کے پچھواڑے ایک وسیع میدان ہے جو مغربی پہاڑ تک پھیلا ہے۔ یہ پہاڑ سڑک کے متوازی شمالاً جنوباً واقع ہے۔ اسی طرح دوسری جانب ایک اور پہاڑ مشرق میں ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ موضع منگا پیر ان دونوں پہاڑوں کے مابین جو لفٹننٹ کارس کے اندازہ کے مطابق سات آٹھ فٹ اونچے ہیں، ایک وادی ہے۔ (گزیٹیر: ۱۰۱) مغربی میدان میں چند قبریں ہیں جن کی طرف ہم بعد میں رجوع کریں گے۔

سڑک کے مشرق کی طرف تھوڑے ہی فاصلہ پر ہندوؤں کے خالی مکانات اور عبادت گاہیں نظر آتی ہیں۔ قیام پاکستان سے پہلے منگھ پیر کا مقبرہ ہندوؤں مسلمانوں دونوں کا مرجع تھا۔ شمال کی طرف کم و بیش ایک میدان کے فاصلے پر نئی پرانی عمارتیں نظر آتی ہیں۔ انہی میں سے ایک کوڑھیوں کا ہسپتال ہے جسے ابھی ابھی تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کے پاس ایسے حوض ہیں جن میں قدرتی طور پر گرم گندھک والا، بودار پانی پایا جاتا ہے۔ یہ حوض ان حوضوں سے زیادہ بڑے ہیں جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں اس مقام پر بسنے والے کتنے ہی مکرانی دکھائی دئے اور بے شمار ایسے لوگ بھی جو ہر طرف سے ان حوضوں میں نہانے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

اب تک ہم نے منگا پیر کے چیدہ چیدہ مناظر پر روشنی ڈالی ہے یعنی اس مقام کے آس پاس، دائیں بائیں، دو پہاڑ، گندھک ملا پانی جو ان پہاڑوں سے بہہ کر آتا ہے، کھجوروں کے درخت، مگرمچھ، منگا پیر کا مقبرہ اور دوسری قبریں۔

اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ تمام چیزیں جو لوگوں کے لئے اس قدر جاذب توجہ ثابت ہوئی ہیں نئی ہیں یا پرانے زمانے کے سیاحوں اور مصنفوں نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ سب سے پہلے ہم سندھی مورخ میر علی شیر قانع کی تصنیف "تحفۃ الکرام" کے خود نوشت نسخہ کی طرف رجوع کرتے ہیں جو

---

[1] A. F. BAILLIE; KURRACHEE: PAST, PRESENT AND FUTURE, LONDON 1890.

۴ جمادی الاول ۱۱۸۲ھ مطابق ۱۶ ستمبر ۱۷۶۸ء کو مکمل ہوا تھا۔ اس کتاب کے آخری حصہ میں ایک فصل بہ عنوان "طوق منگہ" ہے جس کے تحت قانع لکھتا ہے :-

"طوق منگہ ایک مشہور پہاڑ ہے۔ ایک بزرگ ولی اللہ حاجی منگہ جو شیخ بہاؤالدین ملتانی کے معاصر تھے، کا مدفن با صفا و صفا اس مقام پر نیک نہاد لوگوں اور برگزیدہ ارباب ہدایت کی دعاؤں کا محل اجابت ہے۔ اس پہاڑ سے جو طوق منگہ کے نام سے مشہور ہے، اس کے دامن میں گرم پانی بہہ کر آتا ہے جو دو ٹیلوں کی لمبائی کے برابر پہاڑ کے درمیان سے ایک کھائی میں گرتا ہے۔ اس کھائی میں مگرمچھ رہتے ہیں جنہیں "مور" کہتے ہیں۔ ایک مگرمچھ کے مرنے پر دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ اور وہی طاؤس یعنی مور کا لقب پاتا ہے۔ عقیدت مند لوگ یہاں بھیڑ بکریوں کی نذرانے کرتے ہیں اور اس کو حلال کرتے ہیں۔ گوشت کا پہلا ٹکڑا ان "موروں" ہی کو پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ کھالیں تو سمجھو نذر قبول ہوئی ورنہ نہیں۔ نیز اس کھائی کے پاس ایک اور چشمہ ہے۔ ان دونوں چشموں کے مابین ایک پتھر ہے۔ اگر گرم چشمے کا پانی اس پتھر پر ڈال کر نیچے سے پیالے یا کٹورے میں جمع کریں تو وہ بالکل ٹھنڈا نظر آئے گا۔ ان چشموں کا پانی زیادہ تر ڈھلان میں بہہ جاتا ہے۔ اس پانی میں بے شمار مگرمچھ جمع ہیں۔ اور خوش آیند باغات پانی کے دونوں طرف واقع ہیں۔ پھر ان دونوں چشموں کے قریب ایک پختہ کنواں ہے۔ جس میں ان دونوں چشموں کے پانی کے علاوہ ٹھنڈا اور میٹھا پانی ہے۔ جس میں "صحیح" نام ایک مگرمچھ ہے۔ اس کنوئیں کو کوزہ حاجی منگہ کہتے ہیں۔ نیز حاجی منگہ کی پہاڑی میں ایک نہر ہے جس کا نام "کندری مخدوم شہباز" ہے۔ اس کا پانی گرم ہے اور اس کے دونوں کناروں پر خوش آیند باغات اور فقراء کے منزل نشین ہیں۔"

قانع کے اس بیان سے ظاہر ہے کہ اس موضع کی کوئی کیفیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ جو کچھ اہم ہے کچھ غیر اہم، بارھویں صدی ہجری کے آخری ربع میں یعنی آج سے دو سو سال پہلے آج کل کے مطابق تھا۔ قانع کے قول کے مطابق حاجی منگہ حضرت بہاء الدین ملتانی (۶۶۱ھ / ۱۲۶۲ء) کے معاصر تھے یعنی حاجی مذکور کا عہد ساتویں صدی ہجری یا سترھویں صدی عیسوی تک پہنچتا ہے۔ ایک انگریز لفٹننٹ کارلس جو ہندوستان کی بحریہ میں ملازم تھا اور اس کو ساحلِ ہند کی مساحت کا کام تفویض کیا گیا تھا، ۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۳۸ء میں منگہ پر پہنچا اور اس نے اس مقام کے متعلق ایک مفصل بیان لکھا جس کے بعض اقتباسات "گزیٹر آف انڈیا" میں صفحہ ۱۰۱ اور اس کے بعد درج ہیں۔ اس کے بیان کے مطابق مگرمچھ ایک جھیل میں ___ جس کی لمبائی گو ۱۵۰ گز سے زائد نہ تھی لیکن چوڑائی ۸۰ گز سے زیادہ نہ تھی اس میں ۸ فٹ سے ۱۵ فٹ لمبے بڑے بڑے مگرمچھ تھے جن کی تعداد ۲۰۰ سے زیادہ نہ تھی۔ اور چھوٹے مگرمچھوں کا تو کوئی شمار ہی نہ تھا۔ اسی بیان کے مطابق لوگوں نے روایت کی کہ چونے کا وہ ٹیلہ جس پر حاجی منگہ کی قبر واقع ہے، دو ہزار سال سے موجود ہے! اس ٹیلہ کی مغربی جانب ڈھلان ہے۔ اور اس کے نیچے گرم پانی کا چشمہ جاری ہے۔ جو دو حوضوں سے ہو کر ایک "کھال" میں گرتا ہے۔ ان دو حوضوں میں سے ایک میں ایک بڑا اور تقریباً ۱۲ چھوٹے اور ننھے مگرمچھ ہیں۔ بڑے مگرمچھ کو "مور" کہتے ہیں یعنی طاؤس۔ جو یہاں کے باشندوں کے عقیدہ میں مگرمچھوں کی نسل کا مورثِ اعلیٰ ہے۔ اس حوض کا پانی بالکل صاف اور نیم گرم ہے لیکن دوسرے حوض کا پانی جو اس سے چند ہی گز کے فاصلہ پر ہے، بالکل ہی ٹھنڈا ہے۔

سید لطف اللہ شکر اللہی شیرازی تتوی نے جو سید جمال الدین محدث، سید غیاث الدین منصور دشتکی اور میر صدر الدین محمد شیرازی کی اولاد میں

---

۵۱ ایک پیر کہن سال نے راقم الحروف کو یہ بتایا تھا کہ چار یار یعنی مخدوم جلال جہانیاں و شیخ عثمان مروندی، شیخ فرید اور شیخ بہاء الدین زکریا نے یہاں پہنچ کر منگہ پیر کو دیکھا تھا۔ اور ایک پہاڑ میں، جو اس موضع کے مغرب میں واقع ہے، ایک جگہ ان کے سجدوں کے نشان پتھر پر برقرار ہیں۔ اسی طرح سہوان کے قریب پہاڑ میں ایک ہی ستون کا بڑا چبوترا ہے کہتے ہیں کہ چاروں دوست یہاں مکاشفہ کے لئے بیٹھے تھے اور یہ ایک بڑا مشہور اور برگزیدہ مقام ہے۔" (تحفۃ الکرام)

۵۲ عوام الناس کے عقیدہ کے مطابق حاجی منگہ کی آمد سے پہلے اس جگہ ایک بزرگ کی قبر تھی جس کی شہرت کی بناء پر لوگ یہاں نذریں پیش کرنے آتے تھے جب حاجی منگو یہاں پہنچے تو یہاں کے درویشوں نے ان کا مضحکہ اڑایا۔ اور شدید سردی کے باوجود گھاس پھونس جمع کر کے اپنے لئے آگ جلانے کی اجازت نہ دی۔ حاجی نے ان کے حق میں بددعا کی اور ان کی شکلیں ایسی مسخ ہوئیں کہ وہ سب مگرمچھ بن گئے!

سے تھا، تقریباً سو سال قبل اس موضع کا ذکر کیا ہے۔ وہ دسمبر ۱۷۵۵ء میں ٹھٹھہ سے سفرِ حج پر روانہ ہوا تھا اور اس نے اپنا سفرنامہ موسوم بہ تحفۃ الحرمین کراچی میں چھپوایا تھا۔ اس کتاب کے صفحہ ۶ پر وہ لکھتا ہے کہ وہ ۱۳ ربیع الثانی ۱۲۷۲ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۷۵۵ء میں شاہ منگھ علیہ الرحمۃ کی زیارت سے مشرف ہوا۔ اس کے بعد بیان کرتا ہے کہ:۔

"پہاڑ سے عجیب قدرتی پانی نکلتا ہے جو ایک جگہ تو گرم ہوتا ہے مگر نہر میں جاری ہو کر سرد ہو جاتا ہے۔ یہ سب اللہ کی قدرت اور اولیاء کی نظر کی برکت ہی ہے جو یہاں مشاہدہ کی گئی ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ وہاں پہاڑ کے بائیں ایک تالاب میں مگرمچھ ہیں جن میں سے ایک 'مور' کہلاتا ہے۔ یہ مگرمچھ دوسروں کے ساتھ جمع ہو کر اکٹھے رہتے ہیں اور وہاں کے زائرین کا دستور یہ ہے کہ وہ بکرا ذبح کر کے اس کا گوشت ان جانوروں کو کھلاتے ہیں۔ اگر 'مور' کسی کا بکرا کھالے تو وہ شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کی مراد بر آئی۔ ورنہ معاملہ مشکوک ہے۔ خبر نہیں یہ اس ملک کا رواج ہے یا مجاوروں نے ذاتی لالچ کے لئے مکر و فریب کا جال پھیلا رکھا ہے۔ کیونکہ کسی کتاب میں اس کا ذکر یا سند نہیں پائی گئی۔ مگر یہ سب اسی بزرگ کی کرامات ہے کہ یہ جانور رات دن انسانوں میں رہتے ہیں اور کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے۔"

یہ تھی اس موضع کی داستان بارھویں صدی سے لیکر چودھویں صدی ہجری کے مصنفین کی تصانیف میں جن سے اس موضع کے بزرگ کا تذکرہ ساتویں صدی ہجری تک پہنچتا ہے لیکن ہم اس موضع کی قدامت کو اس سے بھی پہلے تک پہنچا سکتے ہیں۔

ابن حوقل۔ (۳۶۷ھ کے لگ بھگ) اور ادریسی (متوفی ۵۶۰ھ ۱۱۶۶ء) اس مقام کا ذکر کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ سندھ کے مقامات میں 'منجابری' نام ایک موضع ہے جو دیبل[1] سے دو پڑاؤ کے فاصلے پر ہے اور ارمائیل کے راستے پر واقع ہے ارمائیل میں جو ادریسی کے بیان کے مطابق نشیب میں واقع تھا، پانی کا تالاب اور چشمے تھے۔ اور آس پاس باغات۔ یہ تمام تفصیلات منگاپیر کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں۔ اس سے یہ بات پایۂ یقین تک پہنچ جاتی ہے کہ 'بری' اور 'پیر' سے قطع نظر جو لفظ 'منجا' پر اضافے ہیں، منجا اور منگا ایک ہی چیز ہے۔ اور پیر کا اضافہ مرورِ وقت کے ساتھ ہوا۔ جو علاقہ بیلہ کے قصبات کے ناموں میں بہت عام ہے۔ بعینہ 'بری' کی طرح جو اصل نام پر اضافہ ہے۔ کننگھم[2] (۳۳۲) کی رائے میں احتمال یہ ہے کہ 'منجابری' منڈابری یا منڈاوری ہو یعنی شہرِ منڈ۔ اور یہ لوگ وہی ہیں جن کا فتوح البلدان بلاذری (مطبوعہ لیدن ص ۴۳۵ مع حاشیہ قرأت مند بجائے مید) میں مند کے نام سے ذکر کیا گیا ہے: "قوم من مید الدیبل" یعنی دیبل کے میدوں کی اقوام میں سے۔ چونکہ منجابری کا کلمہ غیر معروف سا تھا اس لئے اس میں تصحیف ہوتی رہی۔ لہٰذا عرب جغرافیہ دانوں کی تصانیف میں یہ مجابری، مخابری، مناتری، منابری وغیرہ کی شکل میں مسطور ہے۔

ہولڈچ (ص ۳۰۹) جس نے سید لطف اللہ شیرازی (۱۷۵۶ء) کی طرح منگہ پیر کو "مگر پیر" کہا ہے اپنے بیان کے آخر میں اس موضع کے متعلق یوں لکھتا ہے کہ:

"مگر پیر کا محلِ وقوع ان پہاڑی دیواروں کے ساتھ جو اس کا احاطہ کئے ہوئے ہیں گرم پانی کے چشموں کے ساتھ جو اس سے متصل ہیں اور ان باغات کے ساتھ (جو اس نواح میں اس قدر نادر الوقوع ہیں کہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی یہاں پر موجودگی عدیم النظیر ہے) نیز ساحلِ دریا

---

[1] ارمائیل "لس بیلہ" ملاحظہ ہو تصنیف:

THE GATES OF INDIA, LONDON 1910: COL SIR THOMAS HOLDICH.

"جنرل ہیگ نے دیبل کے کھنڈرات کراچی کے جنوب کی مشرقی جانب ۴۵ میل اور ٹھٹھہ کے جنوب مغرب میں ۲۰ میل دور قرار دیئے ہیں۔" (ہولڈچ ص ۲۱۰)

[2] 'باڑی۔ واڑی' کے معنی ہندی میں ہیں باغ، احاطہ، یا گرٹ تعلقہ میرپور ساکرو کے جنوب میں ایک جگہ گھوڑا باری جس میں باری کا لاحقہ موجود ہے:

CUNNINGHAM: ANCIENT GEOGRAPHY OF INDIA, CALCUTTA. 1924.

سے نزدیکی اور سب سے بڑھ کر وہ آثارِ قدیمہ جو فنِ تعمیر کے سلسلہ میں اس قدر جاذبِ توجہ ہیں، بلاشبہ و بلاخوفِ تردید اس امر کو متعین کرتے ہیں کہ یہ موضع وہی منجابری ہے جس کا ذکر ابن حوقل اور ادریسی نے کیا ہے اور جو دیبل سے دو پڑاؤ دُور ہے"۔

ہولڈرِچ کی یہ تحریر یہاں اس موضع کے فنِ تعمیر سے متعلق جاذبِ نظر آثار کی طرف ملتفت کرتی ہے۔

اس موضع کے سب سے جاذبِ توجہ آثار قبریں[1] ہیں جیسا کہ ہم پیچھے بیان کر آئے ہیں، باغات کے مغرب میں اور سڑک کے دائیں بائیں ریتیلے پتھر سے قبریں بنائی گئی ہیں جو سرتاسر خوبصورت نقوش سے آراستہ ہیں۔ ان قبروں کی وضع بہت ہی عجیب اور غیر متعارف ہے۔ ایک یہ کہ مدفن پر پتھر کا مستطیل خالی تعویذ، اس تعویذ کے اوپر اتنی ہی بلندی پر پتھر کی سلیں ہرم کی شکل میں ترتیب دی گئی ہیں یعنی اوپر کی ہر سل نیچے کی سل سے چھوٹی اور کم طول عرض کی ہے اور آخر میں ایک بڑے تختۂ سنگ کو عموداً ایک کونے میں نصب کیا گیا ہے۔ مردانہ قبروں پر یہ پتھر ایسا نظر آتا ہے جیسے اس کے شمالی کونے میں اونچا سا طرہ ہو۔ عورتوں کی قبروں میں اس سے کچھ مختلف چیز پتھر کے جنوبی کونے میں پائی جاتی ہے بحیثیت مجموعی ان قبروں کی بلندی انسانی قد سے زیادہ نہیں ہوتی۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، ان سب پتھروں پر اقلیدسی اشکال میں خوب کام کیا گیا ہے۔ اور بہت عمدہ نقش و نگار اور جالیاں بنائی گئی ہیں۔ عورتوں کی بعض قبروں پر نیچے کی طرف زیورات کے اُبھرواں نقوش بنائے گئے ہیں اور بعض مردانہ قبروں پر اسی طرح جنگی ہتھیاروں —— تلوار، ڈھال، بندوق اور دوسرے درانتی سے ملتے جلتے ہتھیار، چاقو وغیرہ —— کی تصاویر بنائی گئی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک قبر کے بالائی پتھر پر ایک سوار کی تصویر بنائی گئی ہے جس کے گھوڑے نے گویا زرہ بکتر پہن رکھی ہے۔ اور اس سے کچھ نیچے اسی قبر پر ایک شخص کی تصویر کھینچی گئی ہے جس نے مغلیہ دور سے ملتی جلتی قبا پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں ایک پھوان کی منہال لئے ہوئے ہے۔ جو زمین پر دھرا ہے۔ مسلمانوں کی قبروں پر راقم الحروف نے ایسی تصویریں اور کہیں نہیں دیکھیں اور واقعی بہت ہی نادر ہیں۔

ان میں سے بعض قبروں کے پتھروں پر کچھ عبارت بھی تحریر ہے لیکن چونکہ یہ زیادہ اُبھری ہوئی نہیں تھی، نیز دھوپ اور دوسرے اثرات کی وجہ سے اکثر حروف تقریباً مٹ گئے ہیں۔ دو تین جگہوں پر شمالی جانب بعض قبروں کے بالائی پتھر پر کلمۂ طیبہ خطِ نسخ میں مرقوم ہے۔ مگر چونکہ پتھر کم چوڑا ہے۔ اس لئے کلمہ ٹکڑے ٹکڑے کر کے چار سطروں میں لکھا گیا ہے۔ اس طرح :

لا الہ ا

لا اللہ

محمد رسو

ل اللہ

اس مقام پر یعنی ان قبروں میں جو کہ منگا پیر کے ٹیلے کی مشرق کی طرف ہیں۔ صرف ایک قبر کے نچلے پتھر پر نام بھی نظر آتا ہے۔ یعنی ؛

کاتو (؟) ابن حسین (؟)

اُس میدان میں جو اس ٹیلے کے جنوب مغرب میں باغات کے پیچھے ہے۔ چند قبریں ہیں جو نسبتاً زیادہ اہم ہیں۔ ان سب پر بہت عمدہ، لطیف، نازک اور متنوع نقوش ہیں۔ ان میں سے کم از کم چار قبروں پر عبارتیں تحریر ہیں۔ جن سے اس زمانہ کی قبروں کا زمانہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ اسی جگہ ایک مقبرے کا کھنڈر بھی ہے جو ایک چبوترے پر واقع ہے۔ اس کا گنبد موجود نہیں لیکن تمام اطراف کے سنگین ستون جن پر یہ قائم تھا، برقرار ہیں۔ اور ان دونوں قبروں سے متصل دو اور قبریں ہیں جو چبوترے پر بنی تھیں لیکن حسبِ معمول گنبد اور ستونوں کے بغیر۔ ان دو قبروں پر جو بالائی پتھر تھے وہ ٹوٹ گئے ہیں۔ مذکورہ مقبرہ کے ایک ستون پر خطِ نستعلیق میں ایک فارسی عبارت تحریر ہے جو صرف آدھی پڑھی جا سکتی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے :-

---

[1] اس قسم کی قبریں جن پر اشکال مرتسم ہیں سندھ کے بعض اور مقامات میں بھی موجود ہیں۔ وہاں بھی عورتوں کی قبروں پر زیورات کے نقوش ہیں اور ان لوگوں کی قبروں پر جو لڑائی میں فوت ہوئے ہوں، ہتھیاروں کے نقوش بنائے گئے ہیں۔ جو لوگ طبعی موت مرے ہوں، ان کی قبروں پر سوار وغیرہ کا نقش بنایا جاتا ہے۔

(ایک دو الفاظ جو پڑھے نہیں جا سکتے)
مبلغ پانچ ہزار پانچ سو روپیہ جبر (قبر) صندل ملک وحیدر (؟) ولد ملک ہارون ددھا ولد ملک ہارون پر خرچ آئے۔
مقبرہ کے اندر ایک پتھر پر یہ کتبہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم
لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ
رب لا تذرنی فردا و انت خیر الوارثین
این تربت سلنی (؟ تلہتی ؟) ولد حسن
بتاریخ عاشر جماد (کذا) الاول ۱۱۵۶

دوسرا کتبہ جو اسی جگہ ہے، اس طرح ہے:

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ
این قبر (ناخوانا) بولا خاں [1]
برائیں (؟) صد وصد پنجاہ روپیہ خرچ شدہ (دو سطر ناخوانا)

تیسرا کتبہ بھی جس پر تاریخ بھی درج ہے، یہیں ہے:

بتاریخ ...... عاشر جمادی الاول (؟) ۱۱۸۶

"امپیریل گزیٹیر" کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۹ء کے لگ بھگ اس مقبرہ کا گنبد برقرار تو تھا لیکن ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ قبروں کی تعداد بظاہر چار تھی۔ ان کے پتھر اس وقت اپنی جگہ سے نیچے گر پڑے تھے۔ غالباً اس لئے کہ ان کو کسی مسالہ سے جوڑا نہیں گیا تھا بلکہ ان کو ایک دوسرے پر ٹکا دیا گیا تھا۔

مرتب "گزیٹیر" کے بیان کے مطابق زیادہ مشہور روایت یہ تھی کہ شکستہ مقبرہ ایک شخص سردار خاں کا مدفن تھا جو قبیلہ نمریہ یا نہمرد جس کا شمار اس علاقہ اور اس کے شہروں کے بزرگ ترین قبائل میں ہے اور سمہ (یعنی راجپوت) قوم سے متعلق ہے کی ایک شاخ برفاتی (یا بلفاتی) کا سربراہ تھا۔ یہ شخص ایک موضع اللہ لونا، جو منگھو پیر سے دس میل دور واقع ہے، کی لڑائی میں جوکھیوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ لیکن یہی روایت اس نواح کے جوکھیوں میں مالیر کی ان قبروں کے بارہ میں بھی رائج ہے جو اس وضع و ہئیت کے ساتھ وہاں بھی پائی جاتی ہیں۔ اس روایت سے بلاشبہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ جوکھیا جو بالآخر مالیر اور سندھ کے ڈیلٹائی خطے پر مسلط ہو گئے تھے برفتیوں کے ساتھ بکثرت برسر آویزش و پیکار رہے [2] مؤلف مذکور یہ بھی بیان کرتا ہے کہ اس مقبرہ میں ۹۱۲ھ - ۱۵۰۶ء یعنی سموں کے عہد کا ایک پتھر بھی ہے۔ لیکن یہ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اگر یہ ان پتھروں کے نیچے دب گیا ہے جو دوسرے پتھروں کے نیچے چھپ گئے ہیں، تو یہ ممکن ہے۔ ورنہ جتنی تاریخیں یہاں نظر آئی ہیں وہ ۱۲ ویں صدی ہجری یعنی عہد کلہوڑہ ہی سے متعلق ہیں۔ (ترجمہ)

---

[1] گویا یہ وہی بولا خاں نہمرد ہے جس کا ذکر مرزا قلیچ بیگ نے اپنی انگریزی میں لکھی ہوئی "تاریخ سندھ" میں کیا ہے۔ "مظہر شاہجہانی" (جو شاہجہاں کی تخت نشینی کے ساتویں سال مرتب ہوئی) مصنفہ یوسف میرک بن ابوالقاسم نمکین کے قلمی نسخے کا کاتب بھی 'نہمرد' کا ہجا یونہی کرتا ہے یعنی ہائے ہوز سے لیکن مرزا قلیچ بیگ کی "تاریخ سندھ" اور امپریل گزٹیئر میں اس کو نومبردی لکھا ہے یعنی واؤ سے۔

[2] امپیریل گزیٹیر ص ۱۰۴

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

ابھی ٹوٹی نہیں دیوارِ زنداں، آؤ دیوانو
کوئی مشکل نہیں جو ہو نہ آساں، آؤ دیوانو

گریباں چاک دیوانوں پہ ہنستے ہیں خرد والے
خرد والوں سے ہوں دست و گریباں، آؤ دیوانو

خرد کی گتھیاں سلجھائیں فرزانوں کے کام آئیں
جنوں کب تک رہے گا ہم پہ بہتاں، آؤ دیوانو

یہاں صحرا سے بڑھ کر وحشیوں کی قدر ہوتی ہے
یہ بزمِ عشق ہے، با ساز و ساماں، آؤ دیوانو

دکانِ شیشہ گر سمجھے تھے میخانہ نکل آیا
مکدّر ہو نہ جائے عیشِ مستاں، آؤ دیوانو

یہ فرزانوں کی بستی میں صدائے آشنا کیسی
کوئی دیوانہ ہے شاید غزلخواں، آؤ دیوانو

بھری محفل، وہی اپنا حفیظ اور اس کی تنہائی!
کہیں سے ڈھونڈ لائیں کوئی انساں آؤ دیوانو

جمیل نقوی

ترا حسنِ عشق پیکر اگر آشکار ہوتا
نہ خرد فریب کھاتی نہ جنوں شکار ہوتا

تری بزمِ کن فکاں میں عجب انتشار ہوتا
اگر عشقِ سادہ فطرت نہ حریفِ دار ہوتا

نہ چمن میں آشیانہ سرِ شاخسار ہوتا
نہ خزاں کا خوف ہوتا نہ غمِ بہار ہوتا

کبھی یوں بھی کاش ہم پر اثرِ بہار ہوتا
کہ شرارِ آتشِ گل بھی نظر پہ بار ہوتا

یہی سوچ کر نگاہوں سے اٹھا دیئے ہیں پردے
مرا طرزِ کم نگاہی تجھے ناگوار ہوتا

یہ افق افق نظارے یہ چمن چمن بہاریں
جو مری نظر نہ ہوتی یہ جہاں غبار ہوتا

تری ملتفت نگاہیں جو فسانہ کہہ رہی ہیں
میں فریب کھا گیا تھا اگر اعتبار ہوتا

میں یہ سوچتا ہوں اکثر مری آگہی کا حاصل
غمِ عاشقی نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا

جو خزاں کا غم نہ ہوتا تو خدائے رنگ و خوشبو
یہ جہانِ رنگ و خوشبو ترا شاہکار ہوتا

تری آرزو نہ کرتے، تری جستجو نہ کرتے
ہمیں اپنے دل پہ ظالم اگر اختیار ہوتا

مرے دل میں ہے یہ حسرت کہ جمیل میرے غم میں
کوئی اشکبار ہوتا کوئی بیقرار ہوتا

غزل

ادیب سہارنپوری

مری زندگی میں شامل جو نہ تیرا پیار ہوتا
تو نشاطِ دو جہاں بھی مجھے ناگوار ہوتا

مرے شوقِ جستجو کا کسے اعتبار ہوتا
سرِ راہ منزلوں تک نہ اگر غبار ہوتا

میں تجھے خدا سمجھ کر نہ گناہگار ہوتا
اگر ایک بے نیازی ہی ترا شعار ہوتا

اثر ان کی گفتگو میں، تو دلوں میں پیار ہوتا
مرے ناصحوں کا جانا - جو بکوئے یار ہوتا

جو ستم زدوں کا یارب کوئی غمگسار ہوتا
تو غمِ حیات اتنا نہ دلوں پہ بار ہوتا

خرد اعتراف کرتی نہ جنوں کے معجزوں کا
گل و یاسمن کا دامن جو نہ تار تار ہوتا

ترے مہر و ماہ و انجم کو گلہ ہے مجھ سے یارب
کہ ہمیں بھی چین ملتا، جو تجھے قرار ہوتا

جو بغیر رونمائی کے یہ رنگ ہے تو یارب
دل و جاں پہ کیا گذرتی جو غم آشکار ہوتا

نہ سکونِ دل کی چاہت ہمیں آپ ادیب اتنا
کسی اور کو تو ملتا - جو کہیں قرار ہوتا

★

شیدا گجراتی

ہدفِ برقِ بے اماں ہیں ہم
زندگی کے مزاج داں ہیں ہم

کشتۂ سعیِ رائیگاں ہیں ہم
دکھ بھرے دل کی داستاں ہیں ہم

بے نیازانہ سوئے منزلِ دوست
بیخودی میں رواں دواں ہیں ہم

نغمۂ بے صدا سہی لیکن
لالہ و گل کے ترجماں ہیں ہم

عشق کا دور مختصر ہی سہی
حاصلِ عمرِ جاوداں ہیں ہم

آج بھی عام ہے حدیثِ جنوں
آج بھی روحِ داستاں ہیں ہم

ہم سے پوچھو مزاجِ رنگِ چمن
شاہدِ گل کے رازداں ہیں ہم

جادہ پیما ہے کاروانِ خیال
کیا خبر ان دنوں کہاں ہیں ہم

دل کی بے ربط دھڑکنوں کی قسم
محرمِ سرِ دلبراں ہیں ہم

لاکھ معتوبِ بارگاہ سہی
پھر بھی عنوانِ داستاں ہیں ہم

سینۂ کائنات میں شیدا
خلشِ دردِ بے کراں ہیں ہم

★

۱۹۵۸ء سائنس کی پوری تاریخ میں اس لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہیگا کہ اس سال انسان مصنوعی چاند بنانے میں کامیاب ہوگیا جو ماہ نخشب سے قطعی مختلف ہے - پہلے امریکہ اور پھر روس نے یکے بعد دیگرے کئی مصنوعی سیارچے فضا میں چھوڑے - قوت کے استعمال کے بغیر مادی اجسام کو زمین کے چاروں طرف گرداں رکھنا ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جسے بجا طور پر دوسرے جہانوں کے سفر کی ابتدا کہا جا سکتا ہے - انسان نے جب سے اس خاکدان پر ہوش سنبھالا ہے، وہ چاند اور دوسرے سیاروں کے حسن سے مسحور ہوتا رہا ہے اور اس کی یہ آرزو رہی ہے کہ وہ کسی بھی طور ان تک پہنچ جائے -

نظام شمسی: کائنات بے شمار ستاروں سے بھری ہوئی ہے - سورج بھی ایک معمولی ستارہ ہے - نو سیارے اسکے تابع فرمان رہتے ہوئے اسکے چاروں طرف گردش کرتے ہیں - اسی طرح دوسرے ستاروں کے بھی اپنے اپنے سیارے ہونگے لیکن ہماری سب سے بڑی دوربین بھی ہمیں ان کی جھلک دکھانے سے قاصر ہے، اسلئے جب ہم دوسرے جہانوں تک پہنچنے کا کوئی منصوبہ تیار کرتے ہیں تو اسکا تعلق صرف نظام شمسی کے سیاروں ہی سے ہو سکتا ہے -

نظام شمسی میں اب تک نو سیارے دیکھے جا چکے ہیں - سورج کی طرف سے مختلف فاصلوں پر ان کی ترتیب یہ ہے: عطارد، زہرہ، زمین، مریخ، مشتری، زحل، یورینس، نپتون اور پلوٹو - یہ سب مختلف رفتاروں کے ساتھ سورج کے گرد گھومتے ہیں - چاند آفتاب کا سیارہ نہیں، وہ ہماری زمین کا سیارہ ہے کیونکہ وہ زمین سے پیدا ہوا تھا اور اس کے چاروں طرف گھومتا ہے - اس لئے اسے سیارچہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا -

دوسرے سیاروں کے کئی کئی چاند ہیں—مریخ کے دو اور مشتری کے بارہ — لیکن ہمیں صرف اپنے چاند اور اپنے ان دو پڑوسی سیاروں سے سروکار ہے جو ہماری زمین کے ادھر ادھر واقع ہیں یعنی مریخ اور زہرہ—زہرہ سورج سے ہماری زمین کی بہ نسبت قریب اور مریخ دور ہے-اس وقت راکٹ اور مصنوعی سیارچوں کے ماہرین کی نظر ان تین جہانوں پر ہے - دیکھئیے ان میں سے کون انسان کی پہلی خلائی منزل بنتا ہے- البتہ یہاں بیٹھے بیٹھے بھی ان کی سیر دلچسپی سے خالی نہ ہوگی -

چاند: چاند کا قطر ۲۱۵۸ میل ہے اور وہ تقریباً دو ارب سال قبل ہماری زمین سے الگ ہوا تھا - شروع میں وہ قریب تھا لیکن رفتہ رفتہ دور ہوتا چلا گیا - یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے - اس وقت وہ ہم سے تقریباً دو لاکھ انتالیس ہزار میل کے فاصلہ پر ہے - اور زمین کے گرد تقریباً ۲۸ دن میں ایک گردش پوری کرلیتا ہے - اسکے

ساتھ ساتھ وہ اپنے محور پر بھی گھومتا ہے یعنی وہاں بھی دن اور رات کا وہی سلسلہ جاری ہے جو ہم زمین پر دیکھتے ہیں-لیکن اب اسے اتفاق کہئے یا کچھ اور، چاند جتنے عرصے میں ہماری زمین کے چاروں طرف ایک بار گھومتا ہے، اتنے ہی عرصے میں اپنے محور پر بھی ایک گردش پوری کر لیتا ہے - یہ مدت ۲۸ دن ہے - گویا اس کا دن اور رات ہمارے چودہ چودہ دن کے برابر ہوتے ہیں - اس کا ایک ہی رخ ہماری طرف رہتا ہے - کسی نے آج تک چاند کا دوسرا رخ نہیں دیکھا !

ہوا کی غیر موجودگی: چاند کے جس حصے پر دن رہتا ہے اس کا درجۂ حرارت ۲۰۰ درجے فارن ہیٹ تک پہنچتا ہے یعنی پانی کے نقطۂ جوش کے قریب، اور رات کو اتنی سردی ہوتی ہے کہ پارہ صفر سے ڈھائی سو درجے نیچے گرجائے- درجۂ حرارت کے اس زبردست فرق کی اصلی وجہ یہ ہے کہ چاند پر ہوا موجود نہیں جو ہر سیارے کیلئے بڑے اچھے غلاف کا کام کرتی ہے- یہ سردی کو حد سے تجاوز کرنے دیتی ہے اور نہ گرمی کو - ہوا نہ ہونے کی وجہ سے چاند پر کوئی آواز بھی نہیں سنائی دیگی - وہ تو ایک مردہ دنیا ہے - ویران، خوفناک اور سنسان - جو لوگ وہاں جائینگے انہیں آپس میں گفتگو کرنے کیلئے وائرلیس سیٹ استعمال کرنے پڑینگے کیونکہ ریڈیائی لہروں کو ہوا کی ضرورت نہیں - ہم زمین پر طلوع و غروب آفتاب کے جو خوبصورت مناظر دیکھتے ہیں وہ بھی ہوا نہ ہونے کی وجہ سے چاند پر مفقود ہونگے -

کشش ثقل: چاند پر پانی بھی موجود نہیں، اس لئے وہاں کسی قسم کی نباتات یا حیات کے موجود ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا - چونکہ وہ ایک چھوٹا سیارہ ہے اسلئے اسکی کشش بھی ہماری زمین سے کم ہے، تقریباً چھٹا حصہ - اسلئے وہاں ہر چیز کا وزن کم محسوس ہوگا - چلنے پھرنے میں بڑا ہلکاپن محسوس ہوگا - توازن برقرار رکھنے کے لئے بھاری جوتے پہننے پڑینگے -

قمری سطح: چاند کی سطح بھی بڑی بے ترتیب سی ہے - ہم جن علاقوں کو پہلے سمندر سمجھتے تھے، وہ سب ریگستان ہیں - اگر ایک طرف اٹھارہ ہزار فٹ بلند پہاڑ کھڑے ہیں، تو دوسری طرف اتنے ہی گہرے غار منہ پھیلائے نظر آتے ہیں - چاند پر شروع میں آتش فشاں پہاڑ عام تھے لیکن اب سب سرد ہو چکے ہیں - ان کے چھوڑے ہوئے دہانے اسقدر فراخ ہیں کہ ہمیں یہاں سے بھی آسانی سے نظر آ جاتے ہیں - چاند کے چہرے کے دھبے بھی سیاہ دہانے ہیں- کچھ دہانے اس زمانے کی یادگار ہیں جب چاند پگھلی ہوئی حالت میں تھا اور بڑے بڑے شہاب بلا روک ٹوک اسکی سطح پر گرتے تھے -
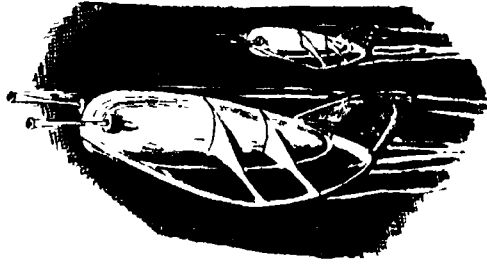
چاند کی ویرانی کے پیش نظر بعض امریکی سائنسدانوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ ہمارے لئے زہرہ اور مریخ کا رخ کرنا زیادہ مناسب رہیگا جہاں حیات کی کوئی نوع ہو سکتی ہے -

زہرہ: زہرا نظام شمسی کا دوسرا سیارہ ہے - سورج سے اس کا اوسط فاصلہ ۶۷،۲۰۰،۰۰۰ میل رہتا ہے - یہ چمکدار سیارہ بہت سی باتوں میں ہماری زمین سے مشابہ ہے، اسلئے اسے اکثر زمین کی بہن کہا جاتا ہے - جسامت میں وہ اس سے ذرا چھوٹا ہے - اس کا ایک سال ہمارے ۲۲۵ دن کے برابر ہوتا ہے- قیاس ہے کہ اسکا دن ہمارے دن سے بہت لمبا ہوتا ہے - شاید ہمارے تیس دن کے برابر-

کثیف بادل: زمین سے زہرہ کا فاصلہ کم زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ کم سے کم ۲۶،۰۰۰،۰۰۰ میل اور زیادہ سے زیادہ ۱۶۰،۰۰۰،۰۰۰ میل رہتا ہے۔ بہترین دوربینوں کی مدد سے بھی آج تک ہم اس کی سطح نہیں دیکھ سکے۔ اسکے چاروں طرف کثیف بادل چھائے رہتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زہرہ پر فضا موجود ہے لیکن دونوں فضاؤں کی بناوٹ میں بڑا فرق ہے اور اس فرق کی مدد سے ہی ہم نے زہرہ کے کچھ حالات معلوم کئے ہیں۔ کرہ ارض کی ہوا میں دو گیسیں ممتاز حیثیت رکھتی ہیں: آکسیجن اور نائٹروجن۔ ان کے علاوہ کچھ ابخرات، کاربن ڈائکسائڈ اور چند ہلکی گیسیں بھی شامل رہتی ہیں۔ ان سب پر آکسیجن حاوی ہے۔ حیات اسی گیس کی مرہون منت ہے۔ یہ گیس تیزی سے خرچ ہو رہی ہے اور کچھ مدت بعد یہاں زندگی دوبھر ہو جائیگی۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ جب سے دنیا بنی ہے تب سے اب تک آکسیجن کی موجودہ مقدار کا دوگنا حصہ مختلف عوامل پر صرف ہو چکا ہے۔

آکسیجن کا فقدان: جب ہم جدید سائنسی آلات کے ذریعہ زہرہ سے آنیوالی روشنی کا تجزیہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہاں کاربن ڈائکسائڈ میں زہریلی گیس تو افراط سے موجود ہے لیکن آکسیجن مفقود ہے۔ گویا اس وقت وہاں وہ حالات ہیں جو زمین پر شروع میں تھے جبکہ حیات کی کوئی شکل یہاں نہیں تھی۔ امید کی جا سکتی ہے کہ چند لاکھ سال بعد زہرہ پر بھی آبادی اور حیات کے آثار رونما ہو جائیں گے۔

درجۂ حرارت: چونکہ زہرہ ہماری بہ‌نسبت سورج سے ذرا قریب واقع ہے اس لئے اس کا درجۂ حرارت بھی کچھ زیادہ رہتا ہے۔ کثیف بادلوں کا غلاف اسکی سطح کو ہر وقت گرم رکھتا ہے۔ اوسطاً وہاں کا ٹمپریچر تقریباً اتنا رہتا ہوگا جتنا

یہاں کھولتے ہوئے پانی کا ہوتا ہے۔ خیال ہے کہ اسکی سطح پر بہت بڑے بڑے سمندر اور دلدلی علاقے پھیلے ہوئے ہیں۔ جیسے ابتدائی دور میں ہماری زمین پر تھے۔

چاند کی طرح زہرہ بھی گھٹتا بڑھتا نظر آتا ہے۔ وہ ایک صدی میں دو مرتبہ سورج کے سامنے سے بھی گذرتا ہے۔ اسوقت وہ دوربین کے بغیر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے ان مشاہدات نے ہی سورج کا فاصلہ معلوم کرنے میں ہماری مدد کی تھی۔ زہرہ کو آئندہ ایسے دو اتفاقات جون ۲۰۰۴ء اور جون ۲۰۱۲ء میں پھر پیش آئینگے۔

مریخ: مریخ یہ نظام شمسی کا چوتھا سیارہ ہے۔ سورج سے اس کا فاصلہ تقریباً ۱۴۲،۰۰۰،۰۰۰ میل رہتا ہے اور ہم سے کم از کم ۳۵،۰۰۰،۰۰۰ میل۔ اس کا ایک سال ہمارے ۶۸۷ دن کے برابر ہوتا ہے۔ یہ ہماری زمین سے کچھ چھوٹا ہے۔ اس کا دن ہمارے دن سے صرف چالیس منٹ زیادہ لمبا ہوتا ہے۔

مریخ بڑی مدت سے تمام ہیئت دانوں کے درمیان بحث کا موضوع بنا ہوا ہے، البتہ سب کے سب اس بات پر ضرور متفق ہیں کہ اگر نظام شمسی کے کسی سیارے پر حیات کی کوئی شکل موجود ہے تو وہ مریخ ہے۔ زمین کی طرح اسکے

بھی شمالی و جنوبی قطبین ہیں جو کبھی برف سے ڈھکے نظر آتے ہیں اور کبھی خالی یعنی وہاں بھی موسم اسی طرح بدلتے ہیں جیسے زمین پر۔

زمین سے مشابہت: ہیئت‌داں کہتے ہیں کہ مریخ چاند کی طرح بے آب و گیاہ نہیں ہے۔ اسمیں کچھ نہ کچھ فضا ضرور موجود ہے اور یہ بھی یقین کیا جاتا ہے کہ اسمیں کچھ پودے بھی اگتے ہیں۔ اسپر نارنجی رنگ کے بڑے بڑے قطعات بھی دیکھے گئے ہیں جنہیں ہیئت‌داں بھی چالیس پچاس سال پہلے سمندر سمجھتے تھے لیکن اب یہ یقین کیا جاتا ہے کہ وہاں وسیع سمندر نہیں ہیں اور پانی بھی اس برف کی شکل میں ہے جو قطبین پر چھائی ہوئی نظر آتی ہے اور پگھل پگھل کر میدانی علاقوں کو سیراب کرتی ہے۔ باقی علاقے پر ریگستان ہیں، جو نارنجی نظر آتے ہیں۔ نباتات کا بدلتا ہوا رنگ میدانوں کو مختلف رنگتیں بخشتا ہے۔ بعض ہیئت دانوں اور سائنس‌دانوں کے خیال میں مریخ پر زندگی کے آثار موجود ہیں۔ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں ایسی ذہین مخلوق بھی موجود ہے جو نہایت ترقی یافتہ طیاروں یعنی ,,اڑن طشتریوں،، میں بیٹھکر ہماری زمین کی سیر کرنے آتی ہے۔ خیال ہے کہ وہاں کے وسیع ریگستان ایسے پہلے ہی کہا چکے ہیں اسی لئے وہ نارنجی نظر آتے ہیں۔ لوہے کا زنگ ایسے نارنجی بنا دیتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر وہاں پودے کس طرح اگتے ہیں ؟

ایسے سوالات ابھی تک تشنۂ جواب ہیں۔ البتہ وہاں ایسے حالات کا یقین ہے جن میں حیات پروان چڑھ سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ حیات کی شکل ویسی ہو جو زمین پر ہے کیونکہ جغرافیائی حالات ہر جگہ اپنا اثر دکھاتے ہیں۔

مریخ میں فضائی کی فضا بلندی تقریباً پچاس میل ہے۔ یہ فضا بحد لطیف اور ہلکی ہے اور اسکی کل مقدار اس ہوا سے بھی کم ہے جو دنیا کی بلندترین چوٹی ,ایوریسٹ، پر چھائی ہوئی ہے۔ اسمیں ابخرات تو ہیں لیکن آکسیجن نہیں۔

چونکہ مریخ ہماری بہ نسبت سورج سے کافی دور ہے اسلئے وہاں سردی زیادہ پڑتی ہے۔ اندازہ ہے کہ دوپہر کے وقت وہاں کا درجۂ حرارت ۵۰ ڈگری فارن ہیٹ تک پہنچ جاتا ہے لیکن سہ پہر سے ہی سردی شروع ہوجاتی ہے جو غروب آفتاب کے بعد بڑھ جاتی ہے۔ رات کا درجۂ حرارت صفر سے غالباً ۱۰۰ درجے نیچے گر جاتا ہے۔ اگر وہاں کسی قسم کی حیات موجود ہے تو وہ گرمی سردی کے اس زبردست فرق کی عادی ہو چکی ہوگی لیکن ہمارے لئے یہ فرق سخت تکلیف‌دہ ثابت ہوگا اور ہمیں اپنے ساتھ ایسا لباس، اقامت گاہیں، غذا اور دوسری اشیاء لے جانی ہوں‌گی جو وہاں ہمارے قیام کو آرام‌دہ نہیں تو کم از کم ممکن ضرور بنا سکیں *

* * *

چاٹگام ، مشرقی پاکستان: یہاں کے پہاڑی قبائل خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں
(''سوگھا'' میلہ کی ایک لڑکی)
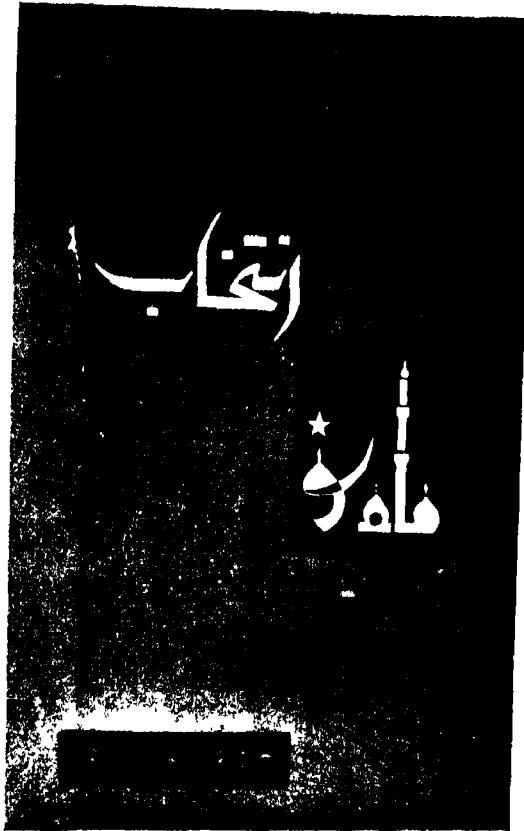
۱۹۵۳ — ۱۹۵۸ء

کے چیدہ مضامین نظم و نثر کا انتخاب

علم　ادب　ثقافت

فن　افسانہ

ڈرامہ

غزل　نظم

تبصرہ

چند لکھنے والے:

* ڈاکٹر سید عبداللہ
* ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
* ڈاکٹر عبادت بریلوی
* نذر سجاد حیدر
* محمد حسن عسکری
* الطاف گوہر
* عزیز احمد
* ممتاز مفتی
* غلام عباس
* ابوالفضل صدیقی
* حجاب امتیاز علی
* آغا بابر
* شوکت تھانوی
* اشرف صبوحی
* شاہد احمد دہلوی
* رفیق خاور
* جگر مرادآبادی
* جوش ملیح آبادی
* حفیظ جالندھری
* حفیظ ہوشیارپوری
* فراق گورکھپوری
* عدم
* شان الحق حقی
* ابن انشا
* فضل احمد کریم فضلی
* جعفر طاہر
* تابش دہلوی
* یوسف ظفر
* قیوم نظر
* جمیل نقوی
* عاصمہ حسن
* ناصر کاظمی
* ضمیر جعفری
* زہرہ نگاہ　وغیرہم

قیمت پانچ روپے　　　　رنگین خوبصورت گردپوش

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ۔ کراچی

ماہِ نو

جلد ۱۱ ـــــ شمارہ ٦

ستمبر ۱۹۵۸ء

مدیر: ـــــ رفیق خاور

نائب مدیر ـــــ ظفر قریشی

سالانہ چندہ:
ساڑھے پانچ روپے
فی کاپی ـــــ آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

اس مہینے ہم پھر بابائے ملت محمد علی جناح رح کی وفات کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ یہ اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ قائدِ اعظم ہمارے لئے اب بھی زندہ ہیں، ہمارے لئے مشعلِ راہ ہیں۔ ایک مسیح، ایک کلیم جس نے عین وقت پر برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو از سرِ نو زندگی بخشی اور ان کی رہنمائی کر کے آزادی کی نعمت سے بہرہ ور کیا۔ یہ کامیابی انہیں اُس بلند شخصیت سے حاصل ہوئی جس نے کسی قیمت پر اپنے موقف سے ہٹنا گوارا نہ کیا۔ اب ہم ہی نہیں دوسروں نے بھی یہ حقیقت محسوس کر لی ہے کہ ان کے کردار کی روحِ رواں ایک اور صرف ایک ہی چیز تھی۔ ان کی غیر معمولی راستبازی اور صداقت شعاری۔ چنانچہ حال ہی میں نامور سوانح نگار ہیکٹر بولائیتھو نے قائدِ اعظم پر جو کتاب لکھی ہے اس میں شروع سے آخر تک اسی بات پر زور دیا گیا ہے۔ بابائے ملت کی امسالہ برسی پر اس کتاب کے چیدہ چیدہ اقتباسات سے بہتر پیشکش اور کیا ہوگی؟ امید ہے یہ سرِ دلبراں در حدیثِ دیگراں قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

•

بزرگانِ سلف میں شاہ عبد اللطیف بھٹائی رح کا عارفانہ کلام ایک چشمۂ جاری ہے۔ "ماہِ نو" کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس نے آج سے گیارہ سال پہلے اپنے پہلے ہی شمارہ سے اس چشمہ کی سرمست لہروں کو اُردو کی جوئے رواں میں منتقل کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی اور یہ کوشش اب تک جاری ہے۔ اب ہم شاہ صاحب کے چند در کلہائے معانی سے دامانِ سخن بھر رہے ہیں اور انہیں قارئین کی خدمت میں اس طرح پیش کر رہے ہیں کہ ع گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماند

•

حال ہی میں ترقیاتی بورڈ کا قیام اردو زبان کی توسیع و ترقی کے حق میں ایک نیک فال ہے۔ اس کا پہلا کام یہ ہوگا کہ اُردو کی ایک مبسوط اور محققانہ لُغت مرتب کرے۔ اگر یہ کام بطرزِ احسن انجام پا گیا تو ایک کارنامۂ عظیم ہوگا اور اردو زبان کی تاریخ میں ایک سنگِ میل۔

بورڈ کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر مشیرِ تعلیمات ڈاکٹر عترت حسین زبیری نے اردو کی لسانی توسیع و ترقی اور آغوش کشائی کے بارہ میں جو کچھ کہا ہے وہ اس زبان کی قدیم روایت طبعی ملنساری اور موجودہ ظروف و حالات کے گوناگوں تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ اور اگر اسی روح سے سرشار ہو کر کام کیا جائے تو اُردو کا مستقبل یقیناً نہایت تابناک ہے۔ بورڈ کی ہیئتِ ترکیبی، منصوبہ بندی اور لائحۂ عمل میں جس اہتمام سے کام لیا گیا ہے، جن بلند و متنوع مقاصد کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے اور بہترین صلاحیتوں کو مجتمع کیا گیا ہے اس سے بہترین نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ہم بورڈ کی کامیابی کے لئے دست بدعا ہیں۔

•

معلوم ہوتا ہے ہم نے اُردو زبان کی توسیع کا مسئلہ بھلے وقت چھیڑا تھا۔ یہ نے بڑی مقبول ثابت ہوئی ہے۔ کیونکہ نہ صرف اہلِ قلم بلکہ قارئین نے بھی اس میں بےحد دلچسپی ظاہر کی ہے، پچھلے تین شماروں میں بعض ممتاز اہل الرائے کے نتائجِ فکر پیش کئے جا چکے ہیں۔ اور مصلحت یہی تھی کہ سلسلۂ کلام انہی تک ختم ہو جائے۔ مگر تازہ بتازہ نو بنو نقوش کا تانتا برابر جاری ہے۔ ادھر ہم نے دو اور ایسے ہی موضوع چھیڑ دیئے ہیں جن میں اور بھی قیل و قال کی گنجائش ہے۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ کہیں گفتگو بحث و مباحثہ کی حد سے باہر نہ نکل جائے اور یہ کیفیت نہ ہو کہ ؎

میانۂ من و غالب نزاع افتاد است
بیا بہ لابہ کہ ہیجانِ قوتِ غضبی است

جہاں تک غزل کا تعلق ہے مطلع ابھی سے دھواں دھار ہے اور ایک تند و تیز طوفان کے آثار نمایاں ہو رہے ہیں۔ رہا یہ کہ "طرز" سے کیا مراد ہے اور صاحبِ طرز ادیب کس کو کہا جا سکتا ہے تو یہ بھی بڑا ٹیڑھا سوال ہے اور اس کو بھی اسی طرح سلجھایا جا سکتا ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں پر ٹھنڈے دل سے بحث کی جائے۔ مذاکرہ اس کا بہت ہی دلچسپ و خوش آیند پیرایہ ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ اربابِ فکر و نظر ان مسائل کو بھی سنجیدہ بحث و مباحثہ سے سلجھانے کی کوشش کریں گے۔ "ماہِ نو" کے اوراق تمام سنجیدہ لکھنے والوں کے لئے کھلے ہیں۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ وہ اس کے ذریعہ تمام مسائل کی کماحقہ چھان بین کر کے قومی ادب کو چار چاند لگانے کی پوری پوری کوشش کریں گے۔

سرِ ورق: قائدِ اعظم ——— رنگین نقش: پروفیسر عسکری

بہ یادِ قائدِ اعظم :

رہبرِ نیکو نہاد

اسد ملتانی

یہ تو سوچیں، مُلکِ پاکستان کی
کیا خصوصیّت ہے وجہِ اعتماد

ہیں بہت سے مُلک رقبے میں فزوں
ہے بہت مُلکوں کی آبادی زیاد

کتنے مُلک افضل ہیں پیداوار میں
کتنے ہیں بہتر بروئے اقتصاد

مال میں فائق ہیں کتنی دولتیں
عام ہے جن کی دہش اور جن کی داد

علم و حکمت سے ہیں کتنے بہرہ ور
صنعت و حرفت سے کتنے مُستفاد

فوج ہے کتنوں کی بیروں از شمار
اسلحہ کتنوں کے ہیں حد سے زیاد

پاس کتنوں کے ہے وہ سامانِ جنگ
جوہری آلات جس پر مُستزاد

اس سے بڑھ کر اور کتنے مُلک ہیں
جن سے ہے وابستہ دُنیا کا مفاد

کم ہے پاکستان ہر اُس چیز میں
اہلِ دُنیا کو ہے جس پر اعتماد

ہے مگر اک بات پاکستان کی
جس میں ہے اس کو بھی حاصل انفراد

ہے اساس اس مُلک کی اسلام پر
ہے اسی قوت سے یہ محکم عماد

ہے فقط اسلام، کر سکتا ہے جو
ہر بُرائی کا جہاں میں انسداد

ہے فقط اسلام جو اقوام سے
دُور کر دے کینہ و بغض و عناد

ہے فقط اسلام جس کے فیض سے
رفع ہو سکتا ہے دُنیا کا فساد

ہے فقط اسلام، رکھے سامنے
جس نے حق اللہ اور حق العباد

ہے فقط اسلام کی تعلیم پر
منحصر نوعِ بشر کا اتحاد

روشنی پھیلی اسی کی ہر طرف
نُور کا مرکز ہے کعبے کا سواد

اصل میں اسلام ہی وہ لفظ ہے
جس سے صلح و امنِ عالم ہے مُراد

جس جگہ موجود ہو خیر و صلاح
سر اٹھا سکتا نہیں شر و فساد

دیں پہ لادینی کا غلبہ ہے محال
حق ہو کیوں باطل کے زیرِ انقیاد

حق سے دب جانا ہے باطل کی سرشت
نُور سے مٹنا ہے ظلمت کی نہاد

حق کی خدمت ہے عبادت سر بسر
حق کی جدّ و جہد ہے عینِ جہاد

غلبہ سب اقوام پر آسان ہے
پختہ جب اسلام پر ہو اعتقاد

ہم کو سیدھا راستہ دکھلا گیا
حال میں اک رہبرِ نیکو نہاد

یاد رکھیں اس کے زرّیں قول کو
جب منائیں قائدِ اعظمؒ کی یاد

راز پاکستان کی عظمت کا ہے
اعتقاد و انضباط و اتحاد

قائدِ اعظم بھی، پاکستان بھی
زندہ و تابندہ و پائندہ باد

"عہدِ حاضر را کلیم"

ہیکٹر بولائیتھو

بانیٔ پاکستان محمد علی جناح کے متعلق قلم اٹھاتے ہوئے جو سب سے بڑا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ وہ گوناگوں من گھڑت لطیفے اور قصے کہانیاں ہیں جو نہ معلوم کیسے رائج ہوگئے ہیں اور انہوں نے ابھی سے ان کی داستان حیات میں الجھنیں پیدا کرنی شروع کر دی ہیں۔ اگرچہ یہ سلسلہ ابھی کچھ ایسا آگے نہیں بڑھا پھر بھی امر واقعہ ہے کہ ان کی زندگی کے تحقیقی واقعات کو ان افسانوں سے الگ کرنا کچھ ایسا آسان نہیں۔ ایک افسانہ جو ان کے متعلق پہلے ہی رائج ہو گیا تھا، دلچسپی سے خالی نہیں ہے خصوصاً اس لئے کہ اس کا سرچشمہ مسز نائیڈو ہیں۔ جو جناح کی بے حد مداح تھیں۔ ۱۹۱۷ء میں ان کا اعتراف آمیز پیرایہ میں ذکر کرتے ہوئے مسز نائیڈو نے بیان کیا تھا کہ "وہ ایک امیر سوداگر کے سب سے بڑے فرزند تھے۔ اور ناز و نعمت کے آغوش میں بڑے ہوئے اور ہتھیلیوں پہ پروان چڑھے تھے"۔ یہ تصویر بالکل غلط ہے۔ جیسا کہ قائداعظم کی ایک رشتہ کی بھاوج فاطمہ بائی نے بیان کیا ہے۔ ان کا سارا کنبہ ایک کھوکھے دو کمروں میں گزارا کرتا تھا جو چاروں طرف ٹوٹے ہوئے رکشاؤں اور ماؤنٹ گاڑیوں سے گھرا رہتا تھا۔ جناح کے والد پونجا نامی ایک دھان پان آدمی معمولی سوداگر چرم تھے اور ہیں۔ ان کے سات اولادیں ہوئیں۔ جن میں سے شہرت صرف جناح اور ان کی ہمشیرہ مسز فاطمہ جناح ہی کو حاصل ہوئی۔ ان سات بچوں اور سب سے بڑھ کر اس ہونہار سپوت کی ماں ایک پرچھائیں سے زیادہ نہیں جو اس کہانی میں یوں ہی لہرا کر لندھ جاتی ہے۔

جناح کی نسبت نہ معلوم کتنے ہی افسانے بنے جا چکے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔ کئی پاکستانی رسالوں میں یہ حکایت دوہرا دوہرا کر پیش کی گئی ہے کہ جب جناح اسکول میں پڑھتے تھے تو وہ ایک دن سڑک پہ چلے جا رہے تھے کہ ایک نجومی نے ان کو روک کر کچھ حساب کتاب لگایا۔ جفر، نجوم اور رمل کا علم کھنگالا اور کہا۔ "بیٹا! علامات تو یہی بتا رہی ہیں کہ ہو نہ ہو تم بڑے ہو کر ضرور بادشاہ بنو گے"۔

مگر معمولی باتوں کے علاماتی اعتبار سے جو بات زیادہ اہم ہے۔ وہ ایک اور بزرگ نانجی جعفر نے بتائی۔ جس کی سفید براق لبیں صاف بتا رہی تھیں کہ اس نے بڑے بڑے زمانے دیکھے ہیں۔ وہ آئے اور اس کمرے سے جھولے میں بیٹھ گئے جو پرانے سندھی گھرانوں میں عام دکھائی دیتا ہے۔ بات سے بات نکل پڑی۔ وہ بولے اس وقت میری عمر ۸۰-۹۰ کے درمیان ہے۔ وہ اور جناح ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ اب تو سب کچھ بھول بسر گیا ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ ہم دونوں اکثر اکٹھے مل کر گولیاں کھیلا کرتے تھے۔

میں نے پوچھا "آپ کو کوئی بات تو یاد ہو گی جو جناح نے کہی ہو"۔ اس پر انہوں نے اپنی بھری بھری سفید بھوؤں کے نیچے سے جھانک کر کہا "ہاں! ہم دونوں گلی میں گولیاں کھیلا کرتے تھے"۔

میں نے کہا "ذرا اپنی آنکھیں پھر میچ لیں اور ایک بار پھر ان کانچ کی رنگ برنگی گولیوں کا تصور کریں جو مٹی میں رل مل..."

نانجی نے آنکھیں میچ لیں اور اپنے حافظہ کو خوب کریدا۔ اسے جناح کے لڑکپن کا ایک واقعہ یاد آ ہی گیا۔ ایک دن جب نانجی گلی میں پڑا کھیل رہا تھا، جناح جس کی عمر اس وقت ۱۴ سال کی تھی، وہاں آن پہنچا اور کہا "جھک کر دھول میں کانچ کی گولیوں سے کیا کھیل رہے ہو۔ اس سے کپڑے میلے اور ہاتھ گندے ہو جاتے ہیں۔ اٹھو، چل کے کرکٹ کھیلیں"۔

معلوم ہوتا ہے نیوں تمام دوسرے لڑکے بات مان لیتے تھے۔ انہوں نے واقعی گرد آلود زمین پہ گولیاں کھیلنا بند کر دیں اور جناح کی صلاح پر ایک اجلے اجلے میدان میں گیند بلا کھیلنے لگ گئے جہاں جناح اپنے ساتھ کھیلنے کے لئے بیٹ اور وکٹیں لے آئے تھے۔ جب وہ ۱۶ سال کی عمر میں ولایت چلے گئے تو انہوں نے نانجی جعفر کو اپنا گیند بلا دے دیا اور کہا "بھیا! دیکھو جب تک میں سمندر پار رہوں تم لڑکوں کو

ماہ نو، کراچی ستمبر ۱۹۵۰ء

کرکٹ کھیلنا سکھلاتے رہنا۔"

سچ پوچھئے تو جناح کی ساری داستانِ حیات لڑکپن کے اس مقولے ہی میں مرکوز ہے کہ "اٹھو! اس مٹی دھول سے اٹھ کر کھڑے ہو تاکہ تمہارے کپڑے بالکل صاف ستھرے رہیں اور تمہارے ہاتھ ان کاموں سے بالکل بے داغ جو تمہیں سرانجام دینے پڑیں۔"

لندن میں ایسے ہی ایک اور بات بھی علامانی حیثیت رکھتی ہے۔ مسٹر جناح نے قیام ولایت کے دوران ایک دن ایک عینک فروش کی دکان پر جا کر اپنا پہلا "مانوکل" خریدا۔ یہ ان کی جرأت اور شخصیت کے ارتقاء کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ وہ اگلے پچاس برس بلکہ آخری وقت تک جب انہیں کراچی کے صدر مقام میں اسٹریچر پر لٹا کر لے جایا گیا استعمال کرتے رہے۔ ایک جاں بلب سوار جس نے اپنی صاف شفاف انگلیوں میں مانوکل کا ویسا ہی صاف شفاف گول گول شیشہ پکڑا ہوا تھا۔ ان کا دل بھی تو اسی طرح شفاف اور بے داغ تھا۔

ہاں جناح کا دل بھی اسی طرح صاف و شفاف تھا۔ چنانچہ ان کے کردار کی صفائی کے بارہ میں کتنی ہی کہانیاں مشہور ہو گئی ہیں۔ جب وہ کراچی کی حوصلہ شکن ریتلی سرزمین کو چھوڑ کر بمبئی چلے گئے جہاں ہائی کورٹ بھی تھا، قانونی سرگرمیوں کی ایک روایت بھی قائم ہو چکی تھی اور ایک نوجوان کے لئے جو زندگی کے میدان میں آگے بڑھنا چاہتا ہو، عمدہ مواقع کی بہت خوش آیند جھلکیاں دکھائی دیتی تھیں اور اس کے دل کو انہی طرف کشاں کشاں لئے جاتی تھیں۔ راقم الحروف کو بمبئی کے بعض پرانے وکلاء سے بات چیت کا موقع ملا۔ سب نے کوئی نہ کوئی واقعہ بیان کیا جس سے جواں سال جناح کے کردار پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ مسٹر جناح کو اس وقت سے جانتا تھا جب کہ وہ "کچھ ایسے خوش اوقات" نہ تھے۔ مگر اس وکیل کا بیان ہے کہ "ان کا لباس ہمیشہ نمایاں رہتا تھا۔ وہ اس تنگدستی کے زمانہ میں اس سے بھی زیادہ آزاد مزاج تھے جتنے کہ وہ بعد میں ہوئے۔ مگر وہ بے حد دیانت دار تھے۔ بڑی ہی دشوار بات! ہاں ہے تو سہی۔ مگر میں نے انہیں کوئی غیر منصفانہ یا نامناسب بات کرتے نہیں دیکھا۔ یہ اُن کی فطرت ہی میں نہ تھا۔"

مسٹر جناح کی زندگی میں جو غیر معمولی جرأت نظر آتی ہے اس کی وجہ ان کا عجیب و غریب کردار ہے۔ اور پھر ان کے رویہ میں جو ظاہرا تنک مزاجی یا سختی دکھائی دیتی ہے، اس کا راز اُن کی انتہائی دیانت داری ہی میں مضمر ہے۔ اس کا یقین کرنا مشکل ہے مگر ہمیں مسٹر جناح کی ذاتی وجاہت اور بلندیٔ کردار کو اُس بالکل مختلف اخلاقی رویہ کی روشنی میں دیکھنا ہوگا جو اُن کے اردگرد ہر کہیں پھیلا ہوا تھا۔ ایک اور علامت کا ذکر کروں، مسٹر جناح کے ہاتھ۔ لانبے، پیلے پیلے جنہیں وہ تقریباً ہر ساعت دھوتے رہتے۔ اور آنکھیں جو انسانوں کے ضمیر کو ٹٹولتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اگر ان کے ہونٹوں سے قطع نظر کر لی جائے تو ان کا چہرہ ایک گرمجوش انسان کا تھا۔ ایک مرد نیکو نہاد۔ جو دوسروں کے لئے کوئی ایسا قاعدہ قانون نہیں بناتا جس کی وہ خود پابندی نہ کرے۔

مسٹر جناح کا "راست کردار، راست گفتار، راست رفتار" قسم کا طرز عمل ان کی وصیت سے ظاہر ہے۔ جو انہوں نے قیام پاکستان سے آٹھ سال پہلے مرتب کی تھی اور اس میں کچھ رقم علی گڈھ یونیورسٹی کے لئے بھی مقرر کی تھی۔ جناح نے اس وصیت میں قیام پاکستان کے بعد بھی کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں کی۔ حالانکہ علی گڈھ اب غیر کی سرزمین میں متاعِ غیر بن چکا تھا۔ جناح نے کبھی اس کی طرف بھولے سے اشارہ بھی نہیں کیا۔ یہاں تک کہ شدید علالت کے زمانہ میں بھی جب وہ بالکل لبِ مرگ تھے انہوں نے اپنی نیت نہیں بدلی۔

محمد علی جناح کی دیانت داری پر شک کرنا اُن کے تمام اصولِ زندگی پر شک و شبہہ کے مترادف ہے۔ مسٹر جناح نے اس صداقت شعاری کا مظاہرہ نجی معاملات میں بھی اسی طرح کیا جس طرح قومی اور بین الاقوامی معاملات میں۔ وہ طبیعت کے کھرے اور صاف باطن تھے۔ ان کی آدرشی شخصیت، کہاں آنا تزک دگر بے تکلف! ان دونوں میں بنیادی فرق رند اور پاکبازی کا فرق ہے۔

قائد اعظم نے برملا اعلان کیا کہ پاکستان کی پالیسی ہرگز فرقہ وارانہ امور پر مبنی نہیں ہوگی۔ اور وہ اس پر برابر قائم رہے۔ اسی طرح انہوں نے ریڈکلف کے ایوارڈ کو صرف اس لئے قبول کر لیا کہ وہ انہیں ثالث تسلیم کر چکے تھے یہی وجہ ہے کہ جناح کی صداقت شعاری سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ

"زہر پیاک"

"سُر کلیان" کی دوسری داستان میں شاہ بھٹائیؒ نے عشاق کی خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ یہ نظم اسی داستان کی چند ابیات کا ترجمہ ہے۔ "عاشق زہر پیاک" (عاشق زہر پیتے ہیں) اصل بیت کا ایک ٹکڑا ہے۔

دل میں اس کی یاد
تلخیٔ غم میں شاد

ہو نہ سکے غمناک
"عاشق زہر پیاک"

مہلک دردِ فراق
اور دلِ مشتاق

گردِ الم سے پاک
"عاشق زہر پیاک"

خوش ہیں یہ مہجور
گرچہ بنے ناسور

رِس رِس دل کے چاک
"عاشق زہر پیاک"

ایک لگن دن رات
دل میں دل کی بات

آخر ہو گئے خاک
"عاشق زہر پیاک"

کر گئے خوب لطیف
ان کا کون حریف؟

سخت نڈر، بے باک
"عاشق زہر پیاک"

سات دشمن

(ترجمہ)

حفیظ ہوشیارپوری

پنوں کی تلاش میں سسّی ماری ماری پھرتی ہے یہاں تک کہ سورج غروب ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر شاہ بھٹائیؒ نے "سُر دیسی" کی پہلی داستان میں سسّی کی زبان سے چند ابیات کہلائی ہیں۔ جن میں وہ اپنے ان سات دشمنوں کا ذکر کرتی ہے:

(۱) اونٹ (۲) ساربان (۳) پنوں کے بھائی (۴) سورج (۵) چاند (۶) ہوا (۷) پہاڑ۔

ناقہ بے مہر، ساربان دشمن
سربسر اہلِ کارواں دشمن

وقت سے پہلے ہو گیا روپوش
آفتابِ مسافراں دشمن

جانے کس انتظار میں ہے ابھی
نورِ مہتابِ عاشقاں دشمن

قافلے کے نقوشِ پا معدوم!
صرصرِ تُند، بے گماں، دشمن

سختیٔ راہ و خم بہ خم جانکاہ
ہیبتِ کوہِ سرگراں دشمن

آج شاید کہیں اماں نہ ملے
سفرِ عشق ہے اماں دشمن

سُرمُومل رانوؔ

شاہ عبداللطیفؒ بھٹائی
مترجمہ: لُطف اللہ بدوی

شاہ بھٹائی ؒ کے "رسالو" میں "سُرمومل رانو" کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ اس میں "اَلدُّنیا سِجنُ المُومِنِین" کی تشریح کی گئی ہے۔ اور وصال و فراق کا نقشہ بہت ہی پُرکیف اور پُرسوز پیرایہ میں کھینچا گیا ہے۔ شاہ کی دیگر منظومات کی طرح اس میں بھی قصے کہانی کی بجائے سارا زور حقیقت نگاری پر ہے۔

وائی

فکرِ بیاری کی کر ساتھی سدا　　رہ ہمیشہ رہ بیدار
کاک چلنا ہے کبھی
راہبر کتنے لڈونے کو گئے　　ہو نہیں سکتا شمار
کاک چلنا ہے کبھی
جو گیا ہے لوٹ کر آیا نہیں　　موت پر کیا اختیار
کاک چلنا ہے کبھی
ایک دن آئیگا پیغامِ رحیل　　یہ حیاتِ مستعار!
کاک چلنا ہے کبھی
موت لیجائیگی تجھ کو ایک دن　　کوچ کا کر انتظار
کاک چلنا ہے کبھی
سوئے دلبر اب چلا عبداللطیف　　چھوڑ کر سب انتشار
کاک چلنا ہے کبھی

داستانِ چہارم

شمع ساری رات جلتی ہی رہی
صبح کی آخر کرن آئی نظر
لوٹ آ رانا[2] خدا کے واسطے!
یہ جدائی موت سے ہے سخت تر
یاد میں تیرے اڑاتی ہی رہی
کاک کے کوّے بنا کر نامہ بر

چھائے تارے دیکھتے ہی دیکھتے
چھُپ گئی آخر یہ شب کی رہگذر
یاد میں کرتی رہی تا صبحدم
مینڈھرہ[1] نافہ کو روتے رات بھر

میں نے روشن کر رکھا ہے تا سحر
یہ معطر تیل سے جلتا دِیا
پڑ گیا شاید کچھ ایسا اتفاق
ڈھٹ نے روکا مگر میرا پیا
چڑھ کے نلقے پہ تو آجا لال پھر
کاک کے کوّے اڑاؤں تا کجا؟

---

[1] آج سے چھ سو سال قبل، میرپور ماتھیلہ کے نزدیک ماتھیلہ کے مقام پر ایک ہندو راجا نند نامی حکومت کرتا تھا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں، بہت حسین اور عقلمند۔ ایک کا نام مومل اور دوسری کا نام سومل تھا۔ مومل اپنے حسنِ خداداد میں سومل سے بڑھ چڑھ کر تھی۔ راجا نند نے ایک نہر میں اپنا خزانہ چھپا رکھا تھا۔ اتفاقاً ایک فقیر نے فریب سے اس خزانہ کا راز مومل سے پا لیا اور اسکو اڑا لے گیا۔ جب راجا نند کو یہ خبر ہوئی تو وہ مومل پر بہت خفا ہوا۔ لیکن مومل اور سومل نے ملکر اس کھوئے ہوئے خزانہ کی تلافی کے لئے کاک کے کنارے پر جو تھر میں ایک چھوٹی سی ندی ہے، ایک محل تعمیر کرکے، اس میں ایک طلسم بنایا۔ جس سے مومل کے ہزاروں شیدائی تباہ ہو گئے۔ بالآخر رانا نے جو ذات کا سوڈھا راجپوت تھا اپنی دانشمندی اور حکمتِ عملی سے طلسم کا راز پا لیا اور کامیاب ثابت ہوا۔

[2] رانا کا اصلی نام

لَو کو آگے کرتے روغن جل گیا
ہاں مسافر دوست آجا ناقہ پر
غمکدہ میں تیرا کرتے انتظار
رات روتے ہو گئی میری بسر

جھلملا کر مات تارے ہو گئے
مُرغابی پردیس، ثریا کی قطار
آہ! پر جانا نہ آیا وقت پر
کٹ گئی یہ رات کرتے انتظار
نحس شب جا دور ہو بانصیب!
تو فراقِ یار سے ہے داغدار
مطمئن ہو کر وہ بیٹھے ڈھٹ میں
اور میں تنہا ہوں خوار و اشکبار!

اُڑ رہی ہے خاک دیواروں پہ آب
دوست بن ہر چیز لگتی ہے اُداس
خانۂ دل ہو گیا ویران ندیم
چھا گیا دل پر جدائی کا ہراس
تجھ سے دل کا ہے تعلق اسلئے
قاصدوں کی اب لگی رہتی ہے آس

تو ہی ہے بیتاب دل کا آسرا
تجھکو ہیں معلوم میرے سب گناہ
مجھسے راحت چھٹ گئی سڈھے بغیر
قاصدوں پر اب تو رہتی ہے نگاہ

ڈھٹ سے ڈھٹائی[1] تو آتے ہیں ہزار
ایک سوڈھے بن نہیں آتا قرار
چھٹ گئی آرام و راحت کی امید
میندھرے نے کر دیا دل کو فگار
میں بھلائی ہوں نگاہ دل سے لے
پر بھلا سکتی نہیں ہوں اس کا پیار

رات کہہ دیں اس نے باتیں راز کی
ہو گئی ہے تلخ جن سے زندگی
آس رکھتی ہوں کہ شاید لوٹ کر
دل کے ویرانے کو بخشے تازگی

وائی

رات روتے ہو گئی میری بسر	پھیر کر ناقہ کو لا
ہاں خدا کے واسطے	پھیر کر ناقہ کو لا
چھوڑ کر جانا نہ تجھکو چاہئے	کاک سے یوں رُٹھ کر
ہاں خدا کے واسطے	تو پھیر کر ناقہ کو لا
یہ پلنگ اور یہ معطر بستر سے	بن گئے اژدہا کا گھر
ہاں خدا کے واسطے	تو پھیر کر ناقہ کو لا
مجھکو طعنے دیتے ہیں سب ہمنشیں	پھیر لی تو نے نظر
ہاں خدا کے واسطے	تو پھیر کر ناقہ کو لا
آس رکھتی ہوں میں یہ عبداللطیف	ہو وصالِ یار پھر
ہاں خدا کے واسطے	تو پھیر کر ناقہ کو لا

★

---

[1] ڈھٹ یا ڈہاٹ کے رہنے والے۔

ماہِ نو، کراچی۔ ستمبر ۱۹۵۸ء

فکر و ادب، اجتماعی نظام میں

قاضی یوسف حسین صدیقی

فن برائے فن، فن برائے زندگی، فن برائے مقصد، فن برائے افادیت ——— یہ آوازیں ہیں جو ہمیں فکر و نظر اور ادب و فن کی دنیا میں داخل ہوتے ہی گوش زد ہوتی ہیں اور بالعموم نعروں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ ان گوناگوں تعبیروں سے ہمارا خواب واقعی پریشان ہو جائے۔ اور ہم کسی واضح نتیجہ پر نہ پہنچ سکیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے حقیقی مضمرات ہماری نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ اور پھر یہ بات ان الجھیڑوں کو اور بھی پیچیدہ بنا دیتی ہے کہ فن برائے زندگی، مقصد، افادیت نے اور بھی کتنی ہی شکلیں اختیار کر لی ہیں جو ان سے دیکھنے میں مختلف لیکن درحقیقت اسی کے شاخسانے ہیں۔ مثلاً فن برائے عمل فن برائے اصلاح، فن برائے نظام، فن برائے نظریات اور فن برائے جماعت یا اجتماعیت۔ چونکہ آخرکار یہ سب تصوّر ایک ہی منزل تک پہنچتے ہیں۔ زندگی کی وہ اخلاقی، مذہبی، معاشرتی، روحانی تعبیر جو ہم اپنے ذہن میں متعین کر لیتے ہیں اور یہ درحقیقت "افادیت" ہی کے بدلے ہوئے روپ ہیں۔ کیونکہ ان سب میں فن کا مقصود یہ ہے کہ وہ کسی خاص قسم کی زندگی کے لئے فائدہ مند ثابت ہوں۔ لہٰذا جہاں کہیں اس قسم کے الفاظ یا اصطلاحیں نظر آئیں ہمیں یہی سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی حقیقی مراد کوئی نظریۂ نظام یا طرزِ حیات ہی ہے جس سے جماعت کی ایک خاص وضع یا تنظیم لازم ہوتی ہے اور ہمیں فلسفوں یا نظریوں کی بھول بھلیاں میں بھٹکنے کی بجائے براہِ راست اس جماعت ہی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ مثال کے طور پر اگر وہ فن برائے زندگی کے قائل ہیں تو زندگی سے ان کی مراد روحانیت ہے۔ اگر اقبالؒ فن برائے حیات کے علمبردار ہیں تو حیات سے ان کا مدعا اسلامی نظامِ فکر و عمل کے سوا اور کچھ نہیں۔ اسی طرح جو لوگ کسی مادی مسلک کی بنا پر زندگی یا معاشرہ کی تنظیم چاہتے ہیں اور اس طرح ایک خاص مقصد کے قائل ہیں وہ درحقیقت فن برائے جماعت ہی کے حامی ہیں۔ جوں جوں ہم ان پردوں کو چاک کرتے چلے جائیں، فن برائے ہیئتِ اجتماعیہ کی حقیقت نمایاں ہوتی جاتی ہے۔ یہ تمام تصور دراصل کسی کلیاتی ہیئت ہی کا نتیجہ ہوتے ہیں اور ان کے مؤید فکر و فن کو زبردستی ان کا پابند بنا دیتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ فکر و فن کو جو ایک آزاد، عمومی حیثیت رکھتے ہیں، ایک معین طریقِ فکر اور مخصوص نوعِ فن کا لبادہ پہنا کر اس کو فکر و فن کی واحد امکانی صورت قرار دیتے ہیں جس سے ایک تحدید، ایک گھٹن، ایک مصنوعی جبر بند لازم آتی ہے۔ یہ ایک عجیب ذہنی فریب ہے۔ مگر چونکہ ہم اس کو واحد حقیقت تصور کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس لئے یہ جزو ہماری نظر میں کُل کا مترادف بن جاتا ہے۔ بہرحال ہم کسی سوفسطائی بنیاد پر صغریٰ، کبریٰ قائم کر کے کوئی منطقی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں تو پھر فکر و فن کو خواہی نخواہی اس ہی کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔ تعبیر میں ایک ایسی خرابی کی صورت پیدا ہو جاتی ہے جو اس کے کُل کو محیط ہو کر فکر، فن اور حیات سب کو مسخ کر دیتی ہے۔ نظم و ضبط ہوتے ہوتے قید و بند اور دار و گیر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خصوصاً ان نظاموں میں جن کا دار و مدار ہی کسی کلیاتی اجتماعی نظام کو رائج کرنا ہو۔ خواہ وہ پیغام رسانی سے ہو یا اصلاح و تلقین سے۔ اور اگر یہ بھی کارگر ثابت نہ ہوں تو انقلاب ہی کو کامیابی کا آلۂ کار بنایا جائے۔

اسے فکر و فن کی روداد کہئے یا افتاد۔ بہرحال اس کا مطالعہ ان کلیاتی نظاموں ہی کی روشنی میں مناسب معلوم ہوتا ہے جن میں ان کا تجربہ کیا گیا ہے اور ان کی ایک مثال قائم ہو گئی ہے۔ ان نظاموں کے تحت فکر و فن میں جو اتار چڑھاؤ پیدا ہوتے ہیں، وہ بجائے خود ایک دعوتِ فکر و نظر اور سرمایۂ بصیرت ہیں اور ان کا مطالعہ بھی سے خالی نہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہماری نظر سوویت روس ہی پر پڑتی ہے جہاں فکر و فن کو ہیئتِ اجتماعیہ کا ہم رنگ بنانے کا سب سے وسیع پیمانہ پر سب سے منظم اور معرکہ آرا تجربہ کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس داستان کا آغاز جمہوریۂ روس کے سابق پیشوائے اعظم اسٹالین سے ہوتا ہے جس نے "پارٹی" اور اس کے نظام کو پوری شدت سے مسلط کرنے کے لئے فکر و فن پر کڑی سی کڑی پابندیاں عائد کی تھیں۔ کیونکہ کلیاتی نظام میں ایک اور صرف ایک بات ہو سکتی ہے یا تو صاف انکار ہو یا صاف اقرار۔ اس میں منافقت

تقیہ، گریز یا تذبذب کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ جب سوال ہی تمام تر سیاسی ہیئت یا قانون کا ہے تو اس سے اختلاف یا سرتابی کیا معنی؟ لہٰذا انسان جو بھی سوچے جو بھی کرے، وہ من وعن پارٹی کے حکم ومنشا کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اقرارٌ باللسان وتصدیقٌ بالقلب جیسا مذہب میں ضروری ہے۔ ویسے ہی سیاسی نظام میں بھی۔ کسی فرد یا گروہ کو اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد علیحدہ بنانے کے لئے چھوڑ دینے کے معنی ہیں بدنظمی یا انتشار کو دعوت دینا۔ لہٰذا ریاست اور اس کے سربراہ کے لئے ضروری ہے کہ ہر بات پر کڑی نگرانی کرے اور سب کو ایک مقررہ سانچے میں ڈھالنے پر مجبور کرے۔ سوویت وضع کے کلیاتی نظام میں اس قسم کا سنگین کڑاپن اور بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اسٹالین، جسے اپنے صاحب ذوق ونظر ہونے کا بہت غرہ تھا، فکر، ادب اور فنون پر کڑے سے کڑے پہرے لگائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی رائے میں ناول کیا تھا؟ ایک لمبا چوڑا پھیلا ہوا 'لغو'۔ تصاویر کیا تھیں؟ واہیات قسم کے اشتہارات۔ اور موسیقی؟ بینڈ کی فضول گتوں پر باوقار روندگشت یا بے ہنگم ترانے۔ بات یہ ہے کہ اسٹالین تھا بھی کیا؟ عہد وکٹوریا کا ایک اکھڑ اور انگھڑ شخص جس نے تہذیب وتمدن سے دور اضلاع میں پرورش پائی تھی۔ لیکن وہ خود کو بڑا صاحب ذوق سمجھتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے عہد کا حکیم افلاطون بن کر فکر وادب اور فن پر تعزیرات خاص کا نفاذ کر دیا۔ چنانچہ پچھلے چالیس سال سے تنقید ادب بھی پیچ در پیچ بھول بھلیوں میں سے گزرتی رہی ہے اور سب سے شدید کشمکش یہ رہی ہے کہ تنقید بھی کلیاتی نظریہ کے تابع رہ کر افادیت کے ضمن میں سوچے یا آزادی سے فنی محاسن ومعائب کی نقاب کشائی کرے۔ اس دوران میں تنقید بھی مارکس کے اقتصادی جبر اور لینن کی اندھا دھند سیاسی مقصدیت کا شکار رہی ہے یعنی ادب محض معاشری قدروں کا عکس یا مرادف ہو اور بس۔

اس کا لازمی نتیجہ ردعمل تھا۔ کیونکہ زندگی کا خاصہ ہے کہ وہ کسی شکنجے میں جکڑا رہنا قبول نہیں کرتی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس ردعمل کو بروئے کار آنے میں دیر لگے۔ چنانچہ روس میں بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تک سوویت نظام کو مسلط ہوئے اتنا عرصہ گذر چکا تھا کہ اس کے مثبت ومنفی پہلو پوری طرح نمایاں ہو جائیں اور رائے عامہ کو جو ظاہر ہے سوچنے سمجھنے اور لکھنے والے ذہین طبقہ ہی میں ابھر سکتی تھی' ابھرنے کا موقع ملا۔ یہ صورت حال اس وقت رونما ہوئی جب عنانِ اقتدار "خروشیف" کے ہاتھ میں آئی۔ اور "ادبی مخالفت" نے ایک مضبوط محاذ کی شکل پیدا کر لی۔ ان ادبی مجاہدین کی صف میں ایسے لوگ شامل تھے جو اسٹالین کی دار وگیر کو درہم برہم کر دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا خروشیف کو پارٹی سے پارٹی کے مخالف "اسٹالین گروہ" کو خارج کرنے کے علاوہ "ادبی مجاہدین" سے بھی نبٹنا پڑ رہا ہے۔

سننے والوں نے یہ بات بڑے مزے سے سنی ہوگی کہ "مخالف پارٹی" نے معاملات پر "نظرثانی" کے مطالعہ اور نظریاتی اختلاف کو ہوا دینے کی سعیٔ بلیغ کی۔ دراصل سوویت ادب میں نئی 'دلیرانہ' واقعاتی اور انسان دوست رجحانات کے نمودار ہونے کی علامت ہے۔ جن کا ظہور اس صدی کی بیسویں دہائی میں سی پی ایس یو کانگرس کے انعقاد سے ہوا۔ اگرچہ اب اس کو دبا دیا گیا ہے، روایتی قید وضبط کو پھر سے مسلط کر دیا گیا ہے اور ارباب قلم وفن کے متعلق خروشیف کے عقائد ایک مقالہ کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں جو اس کی تین تقریروں پر مشتمل ہے۔

یہ سب ہنگامہ جس کو "ادبی مخالفت" قرار دیا گیا ہے' دراصل سوویت روس کے ادبا کے اجلاس منعقدہ مارچ ومئی ۵۷ء سے شروع ہوا جس میں بعض ادبا نے اس مطالبہ کی شدت سے مخالفت کی کہ وہ اپنے کفریات وشطحیات سے تائب ہو جائیں اور ایسا کرنے کی بجائے انہوں نے "جرأتِ سکوت" سے کام لیا۔ یہ مطالبہ ظاہر ہے "پارٹی" ہی کے حسب ایما وحکم کیا گیا تھا۔ بعض لوگ تو اس "ادبی مخالفت" کو "سیاسی مخالفت" تعبیر کرتے ہیں۔

غور سے دیکھا جائے تو بنائے مخالفت ایک تو اسٹالین کی قائم کی ہوئی 'غلط قدریں' ہیں اور دوسرے وہ مذبوحی قسم کے طریقے جو ان قدروں کو برقرار رکھنے کے لئے اختیار کئے گئے ہیں۔ انسانی فطرت میں جو آزادانہ تخلیق کا جذبہ بے اختیار ہے وہ خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ چنانچہ یہ مذکورہ اجلاس سے کافی پہلے نمو پا چکا تھا۔ اس اجلاس میں آخرکار یہ یقین دلا ہی دیا گیا کہ اگر لکھنے والے پارٹی سے سرتابی نہ کریں تو ان کی دلیرانہ تحریروں سے بڑی رواداری برتی جائے گی۔ اور پھر اسٹالین کے دور کے انداز بھی تو کھس پٹ چکے تھے۔ ادبا نے کہا یہ دار وگیر، یہ بے کار طمانیت تا بکے؟ وہ چاہتے تھے کہ وہ جو کچھ لکھیں بڑی آزادی اور خلوص سے لکھیں۔ یہ محض اتفاق تھا کہ مخالفت نے ان کو ایک دفاعی محاذ قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس اجتماع کے بعد خروشیف نے جو تقریر کی اس نے مایوسی، برگشتگی اور برافروختگی سے لے کر بغاوت تک کے ردعمل پیدا کئے۔ ادبا کے دلوں میں پارٹی اور اس کے کاموں سے نفرت پیدا ہو گئی۔ ظاہر تھا کہ یہ بیدار مغز طبقہ میں ایسے سیاسی رجحانات پیدا کر دے گی جو پارٹی کے لئے مضرت رساں ہوں۔

لطف یہ ہے کہ یہ سوال خود پارٹی ہی نے چھیڑا تھا کہ سوویت معاشرہ میں کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے؟ اور اس کا جواب تھا "وہی انفرادیت کی دکھتی رگ اور کچھ بھی نہیں"۔ مگر یہ تو محض ڈھکوسلہ تھا۔ اصلی رگ تو کچھ اور ہے۔ ادیبوں نے تو صرف اس کی ٹھیک ٹھیک علامات بتا دیں اور اس کے ساتھ علاج بھی۔ انہوں نے

بتایا کہ ہمارے معاشرہ کی رگیں ماؤف ہو چکی ہیں۔ ہم میں شہری شعور اور معاشری جرأت نہیں رہی اور ہم ٹیڑھے میڑھے مسئلوں سے بزدلی، جھوٹے اطمینان، یا غفلت کے مارے کنی کتراتے ہیں۔ ہمیں ایک تغیرِ نفس، ایک بیداری کی ضرورت ہے۔ یہ ہے نئے ادیبوں کا چہیتا موضوع۔ وہ اپنے معاشرہ میں ایک شدید کمی پاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اپنے ضمیر کی آواز کو کچل کر اور عام سوجھ بوجھ کو خیرباد کہہ کر موجودہ روسی معاشرہ سے بزدلانہ سمجھوتہ کر لیا ہے۔ ہم ایک بے حس دفترشاہی، تنظیمی فروگذاشتوں اور معاشری کوتاہیوں کو نظرانداز کرتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ بے حسی ہے، جمود ہے، سنگدلی ہے، بزدلی ہے۔ ایک قہرمانی معاشرہ نے شہریوں کو گھن لگا دیا ہے جو لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں، کامیاب ہیں، ان میں اخلاقی تنزّل سب سے زیادہ ہے۔ ان عیار لوگوں کے لئے ایسے نظام کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرنا بہت آسان ہے۔ "پارٹی" نے تو "دفتری نظم و نسق" کا گناہ "انفرادیت" کے سر تھوپ دیا۔ ادبا نے دفترگردی کا پردہ چاک کر کے بتایا کہ قصور تو تمام تر نظام کا اپنا ہے اور اس کا علاج محض اسٹالین کی زیادتیوں سے ظاہرا طور پر تائب ہونے سے ہرگز ممکن نہیں۔ ڈوڈن سٹوف کے معرکہ آرا ناول ——— "NOT BY BREAD ALONE" میں دفتری راج، عمال کی رعونت، جی حضوری، طاقت کے بےجا استعمال، سازش اور سب سے بڑھ کر رسمی آدرش سے اس بُعد کی خوب قلعی کھولی ہے۔ آخر ان میں اور زارِ حکومت کے اشراف میں کیا فرق ہے؟ بلکہ نئے اور پرانے نظام میں کیا فرق ہے؟ پرانے عہدیداروں میں جو اوصاف تھے وہ بھی ان کے ادنیٰ، مزدور طبقہ سے ابھرے ہوئے، ناتراشیدہ جانشینوں میں موجود نہیں ہیں۔ وہ تو بس ایک معمولی سے گھٹیا کام کے تنگ نظر کارندے اور ایک بے تکے نظام کی مشینری کے اینڈے بینڈے پرزے بن کر رہ گئے ہیں، وہ کٹھ پتلیاں ہیں جو "نظام نظام" کی رٹ لگائے جاتی ہیں اور اس سے وہ کوتاہ نظری نمایاں ہوتی ہے جو محض منصوبوں، نظاموں اور قواعد و ضوابط کا ڈھول پیٹتی ہے اور جیتے جاگتے انسانوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی نظام کو چلایا کس طرح جائے۔ جب دفترگردی کا زور ہوگا تو تازہ خیالات اور خلّاق افراد سے بےپروائی نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگا؟ ادبا کی رائے میں سوویت آدرش پر زور دینے والوں نے تو فقط اپنی اور اپنے حلوے مانڈے کی خیر منانے کے لئے چند ڈھکوسلے گھڑ لئے ہیں اور وہ اپنے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہنے اور ٹھاٹ باٹ قائم رکھنے کے لئے محض بہانے ہی تراشتے ہیں۔ عام شہری اجارہ دار دفترشاہی کے مقابلہ میں کس قدر بے بس ہیں ——— سوویت نظام کا سب بڑا المیہ یہی ہے۔

ابتداءً "پارٹی" نے خود ہی خداوندانِ لوح و قلم کو دعوت دی تھی کہ "سوویت حکومت سے متعلق گزارش احوال واقعی کریں"۔ چنانچہ پہلے پہل تمام باضابطہ تبصروں میں اس کو بالشویک ادبی روایت کے صحیح نمائندہ کی حیثیت سے خوب سراہا گیا۔ مگر جب اس نئے جرأت آمیز ادب کے عمیق تر مضمرات، بیدار مغز طبقہ کے تاثرات سے ظاہر ہوئے تو ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انہوں نے سوویت لوگوں کے تمام کئے کرائے پر سیاہی پھیر دی ہے۔ اس سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہے کہ تصویر فی نفسہٖ صحیح ہے، اور بہت گھناؤنی۔ ادبی جہاد کے دیگر صف آراؤں نے جو کچھ کیا ہے اسے تمام نظام پرستوں کو پلّے باندھ لینا چاہیئے کہ معاشرہ کی صحت کسی اجتماعی آدرش کی غیر مشروط بیعت یا سیاسی فقروں مثلاً "ریاست کا مفاد" پر نہیں بلکہ عام شہریوں کی جرأت و ہمت اور نت نئے اقدامات اور اختراعات پر مبنی ہے۔ فضائل جو بھی ہیں افراد میں ہیں نہ کہ نظاموں اور اداروں میں۔

جہاد کے مشعل برداروں نے جو جوت جگائی تھی اس نے ذی شعور طبقہ کے بعض حصوں خصوصاً ماسکو اور دوسرے مقامات کے یونیورسٹی طلبہ کو چند مطالبات پر آمادہ کیا۔ مثلاً زیادہ آزادیٔ رائے، نقد و نظر کا حق، سوویت حکومت کے حلیف رہتے ہوئے اس کے ماضی و حال پر انتقاد وغیرہ۔ خیال تھا کہ "پارٹی" ان امور کو جائز سمجھتے ہوئے مناسب کارروائی کرے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ بلکہ الٹا چوٹی کے ادبا سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے قول و فعل سے تائب ہو جائیں۔ جس کا انہوں نے قدرتی طور پر برا مانا۔ اہلِ اقتدار کو ہرگز یہ گوارا نہ تھا کہ ان کے مطمحِ ہائے نظر کو پورا کرنے کا حق ادیب ادا کریں۔ چہ جائیکہ وہ ان کی نشاندہی کی جرأت کریں۔ یہ لاابالیانہ پن تو جمہور میں بھی لاابالیانہ پن پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ رویہ تو "پارٹی" کو برملا دعوتِ مقابلہ دینے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادیبوں کو خواہی نخواہی نہ صرف اپنے ہم پیشہ عمائد بلکہ "پارٹی" لیڈروں کی "حزبِ مخالف" ٹھہرایا گیا۔ اگر اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ اس گناہ کے ضرور مرتکب ہوئے کہ انہوں نے سوویت قائدین اور ان کی حکومت کا بھانڈا چوراہے میں پھوڑ دیا۔ اور باہر کے لوگ ان کے ان رازہائے درون پردہ ——— پردۂ آہنی ——— کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ انہوں نے "پارٹی" کے اس حق پر چھاپہ مار دیا کہ وہ سوویت معاشرہ کی بیماریوں کی تشخیص اور علاج معالجہ کرے اور سب سے بڑھ کر معاملات پر نظرِ ثانی کی تلقین کرے۔ چنانچہ خروشیف نے ۱۹ مئی ۵۷ء کو پارٹی لیڈروں، ادیبوں اور فن کاروں کے ایک اجتماع میں ان ادبی مخالفین

اور ہنگری کے اُن اربابِ قلم میں ایک چونکا دینے والا موازنہ کیا جنھوں نے اکتوبر کے آشوبِ عظیم میں اس قدر نمایاں حصہ لیا تھا۔ ڈوڈ منٹوف اور اس کے ساتھیوں کی سرگرمیوں کا ایک پریشان کن شاخسانہ یہ تھا کہ ان کی لگائی ہوئی آگ سوویت یونین میں دور دور پھیل گئی۔ چنانچہ قازقستان اور بالٹک ریاستوں میں بھی ادب و فکر کی دبی ہوئی چنگاریاں اُبل پڑیں۔

خروشچیف نے بھی اب آخر کار یہ واضح کر دیا ہے کہ ادب کو کس طرح حکومت کی پالیسی میں ممد و معاون ہونا چاہیئے۔ اس نے پھر وہی نسخے دوہرا دیئے ہیں جو قبل ازیں تجویز کئے جاتے رہے ہیں۔ پارٹی کی اطاعت، پارٹی اور جمہور کا ایک جان دو قالب ہونا، اور اصلیت کی پر امید، ابھارنے والی، بکار آمد خاکہ کشی۔ غالباً وہ فکر و ادب کی اس طرح جکڑبندی نہیں چاہتا جس طرح اس کا پیشرو اسٹالین۔ اسے فنون سے کم دلچسپی ہے اس لئے وہ اتنا کٹر نہیں۔ تاہم اس کی مداخلت کا سوویت ادب پر مضرت رساں اثر ڈالنا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ادب کے موضوعات اور اندازِ پیشکش پھر بندھا ٹکا ہو جائے گا۔ خروشچیف نے اسٹالین کی ہاں میں ہاں ملانے والوں کے ہاتھ مضبوط کر دیئے ہیں۔ اور ان کو ادیبوں، مفکروں اور فن کاروں کا داروغہ بنا دیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس نے ماسکو کے پریشان کن ادبی ادارہ پر ایک اور ادارۂ اربابِ قلم کو مسلط کر دیا ہے جس میں صوبجات کے بے تکے مگر قابلِ اعتماد اناڑی لکھک بھرتی کر دیئے گئے ہیں جنھیں کم از کم نظری طور پر وہی درجہ اور حقیقتہً وہی مشاہرہ اور کتابیں شائع کرنے کے مواقع حاصل ہوں گے جو ان سے کہیں نامور اور قومی شہرت کے مالک ادبا کو حاصل ہوں گے۔ کرسنوف نے خوب کہا ہے: "ہر قسم کے جھوٹ اس طرح بیچے گئے جیسے وہ دل ہوں"۔ ممکن ہے یہ الفاظ سوویت ادب کے مستقبل کے لئے پیشینگوئی ثابت ہوں۔ مگر اس کے بعد جو الفاظ آتے ہیں شاید ہی ان کا اطلاق بھی ہو سکے۔ یہ کہ "عوام نے ان جھوٹوں کو بڑی خوشی سے منہ میں ڈال لیا"۔

حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے سربراہ کا اس معاملہ میں دخل دینا ہی اس کی غیر معمولی اہمیت کا آئینہ دار ہے اور صرف سوویت روس ہی نہیں۔ اجتماعی نظام کے اس گہوارہ سے دور جہاں کہیں کلیاتی نظام قائم ہیں، وہاں بھی ایسی ہی متوازی تحریکیں جاری ہوئی ہیں اور طوفانی ہوائیں بڑی تیزی سے چلنا شروع ہو گئی ہیں۔ ہنگری کا آشوبِ عظیم جس کو برپا کرنے میں ادیب و مفکر ہی پیش پیش رہے، اس کی بیّن مثال ہے اور چین کی دیواروں میں بھی ایسی ہی شکست و ریخت نظر آتی ہے مگر جو کچھ "دل" میں گذرا ہے اس کی اعضا میں تشریح تحصیل حاصل ہے۔ ہم قلب کی روداد کو نظیر ٹھہرا کر اجتماعی نظام میں فکر و ادب کی اینٹھن اور کرب و اضطراب بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مشاہدہ نے ہمارے قیاسات کی تائید کر دی، لیکن غور سے دیکھا جائے تو محض قیاس ہی سے یہ کسمساہٹیں سامنے آ سکتی ہیں۔ کیونکہ بنیادی سوال ایک شکنجے کا ہے۔ اگر ادب و فکر کو کسی شکنجے ہی میں قید رہنا ہے تو ان کو لامحالہ اس کی گرفت قبول کرنی پڑے گی، اپنے آپ کو اس کی ٹیڑھی میڑھی طرفوں اور گوشوں میں سمٹنا پڑے گا۔ خواہ اس کوشش میں ان پر کچھ ہی گذر جائے خواہ وہ ہمیشہ کے لئے ماؤف، مفلوج اور بے کار ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ ان کی حیثیت ایک خادمہ ہی کی ہے جو صرف خدمت کر سکتی ہے، آقائی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ اسی لئے ان کی کارگذاری بھی محدود ہو گی۔ ادب ایک پرچارک ہو گا جو اپنے موضوع، مقاصد، طریقے خود اختیار نہیں کر سکتا بلکہ یہ اسے سمجھائے جاتے ہیں، اس کے سامنے پیش کر دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ ایک مشین کی طرح اسے مطلوبہ سانچے میں ڈھال دیں۔ اگر وہ ناقد بننا چاہتا ہے، اپنے دل کی بات کرنا چاہتا ہے تو اجتماعی نظام میں ع —— ایں خیال است و محال است و جنوں۔ اور اگر وہ آزاد اور خالق ہونے پر بضد ہو تو اسے وہ حلقۂ آہنی توڑ دینا پڑے گا جس نے اسے پیرِ تسمہ پا کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے ؎

بیضہ آسا تنگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس
از سرِ نو زندگی ہو گر رہا ہو جائیے!

خیالی مذاکرہ:

صاحبِ طرز ادیب

ابن انشاء

انور : کیا خوب! اُردو میں کوئی صاحبِ طرز نثر نگار نہیں۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مراد دورِ حاضر کے ادیبوں یعنی زندہ ادیبوں سے ہے یا سبھی زمانوں کے ادیبوں سے۔

معراج : یہ شبہ تو میرے ذہن میں بھی ہے۔

ابن انشا : کیوں نہ سارے ادب ہی کو بالموضوع لیا جائے؟

شفیق : انشا صاحب! کیا آپ واقعی سمجھتے ہیں کہ ابتک اُردو ادب میں کوئی صاحبِ طرز نثر نگار نہیں ہوا؟

ابن انشا : یہ آپ سے کس نے کہا؟ اگر آپ کو نتیجے پر پہنچنے کی جلدی ہو تو ہم ووٹ لیکر بھی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ یہ دعویٰ صحیح ہے یا غلط ہے لیکن اس سے بحث کا لطف جاتا رہے گا۔

طالب : بے شک۔ میرے خیال میں سب سے پہلے یہ طے ہو جانا چاہیئے کہ طرز یا اسلوب کہتے کسے ہیں؟

ابن انشا : یہ بات خود سمجھنا آسان ہے، بتانا ذرا مشکل ہے۔ اس موضوع پر مڈلٹن مرے کی مشہور تصنیف آپ کی نظر سے گذری ہوگی اور شاید آپ کو یاد بھی ہو کہ اس نے اسٹائل کی کیا تعریف کی ہے۔

انور : اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں: "STYLE IS THAT PERSONAL IDIOSYNCRASY OF EXPRESSION BY WHICH WE RECOGNISE A WRITER."

ابن انشا : اس کی تشریح میری زبانی سنیئے۔ آپ کوئی تحریر پڑھتے یا عبارت سنتے ہیں تو بعض اوقات کہہ اٹھتے ہیں: "یہ تو صاف غالب بول رہا ہے۔ یہ تو محمد حسین آزاد کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ یہ خواجہ حسن نظامی کی تحریر ہے۔" تو وہ انفرادی خصوصیت، مصنف کی شخصیت کی وہ چھاپ جو چھپائے نہیں چھپتی، ادب میں اسلوب یا طرز کہلاتی ہے۔ لیجئے، میں ایک تحریر پڑھتا ہوں۔ دیکھوں آپ لوگ پہچانتے ہیں کہ نہیں۔

" بادشاہ نے حکم دیا کہ جو نمک حراموں کے سر کاٹ کر لائے، انعام پائے۔ ولایتی کے سر کے لئے اشرفی۔ ہندوستانی کے سر کے لئے روپیہ۔ ہائے کم بخت ہندوستانیو! تمہارے سر کٹ کر بھی سستے ہی رہے۔ لوگ گودیں بھر بھر کر سر لاتے اور مٹھیاں بھر بھر کر روپے اشرفیاں لیتے۔"

انور : یہ تو محمد حسین آزاد کی "قصص ہند" کا کوئی حصہ معلوم ہوتا ہے۔

ابن انشا : "قصص ہند" تو نہیں "دربارِ اکبری" کا اقتباس ہے لیکن ہیں مولوی محمد حسین آزاد ہی۔ جس خصوصیت کی بنا پر آپ نے پہچانا ہے وہ ہے بیانیہ کے بیچ بیچ خطابیہ انداز۔ تاریخ اور تنقید لکھتے ہوئے کبھی وہ اپنے سے خطاب کرنے لگتے ہیں یا غائبانہ ذکر کرتے ہیں مثلاً "آزاد ہندی نہاد کہتا ہے" کبھی دوسروں کو مخاطب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "قصص ہند" اور "دربارِ اکبری" تاریخ ہوتے ہوئے بھی ادب یعنی انشا پردازی کے شاہکار ہیں اور تو "آبِ حیات" اور "سخندانِ پارس" میں بھی تذکرے اور تاریخ زبان کے ساتھ ساتھ داستان کا لطف ہے۔ یہی انفرادیت اسلوب ہے اگر میں "آبحیات" یا "نیرنگِ خیال" سے اقتباس لیتا تو آپ اور زیادہ آسانی سے پہچان لیتے۔

طالب : میرے خیال میں تو کوئی بھی شخص جو ایک خاص طرح کی لفظیات کا التزام رکھے۔ صاحبِ طرز کہلا سکے گا۔

ابنِ انشاؔ : بظاہر یہی معلوم ہوگا لیکن فی الاصل یہ بات نہیں۔ محض لفظیات کے طومار کا نام اسٹائل نہیں۔ پیرایۂ بیان، بات کرنے کا انداز اور چیز ہے۔

شفیق : مڈلٹن مرے نے لکھا ہے کہ بعض لوگ ایک عجیب سا طرزِ اظہار خودنمائی یا لوگوں کو حیران کرنے کے لئے اختیار کر لیتے ہیں۔

ابنِ انشاؔ : بےشک۔ یہ بات سچ ہے اور طرز میں مصنوعی اور حقیقی کا فرق کھل جاتا ہے۔ میں مولوی محمد حسین آزاد کا بہت قائل ہوں لیکن وہ بھی کاوش سے انشا پردازی کرتے معلوم ہوتے ہیں کیونکہ ان کے خطوط اور ان کی ذاتی تحریروں میں اس رنگ کا پتہ نہیں ملتا جو ان سے خاص ہے۔ الطاف گوہر صاحب نے اپنے ایک مضمون "طرز اور صاحبِ طرز" میں مولانا ابوالکلام آزاد کے اندازِ نگارش کو بھی فسانۂ عجائب کے اسلوب کی طرف مراجعت قرار دیا ہے۔ انہیں اس پر بھی اعتراض ہے کہ وہ ذرا سی بات بیان کرنے کے لئے مثلاً چائے کی پیالی سے ایک گھونٹ بھرنے کی تفصیل کے لئے بھی لفظوں کا اتنا لمبا چوڑا کھڑاگ پھیلاتے ہیں۔ گوہر صاحب کا نقطۂ نظر مجھے کچھ زیادہ ہی افادی معلوم ہوتا ہے۔

احمد : اس نقطۂ نظر سے تو انشا صاحب سوئفٹ کے جھاڑو کے تنکے اور خواجہ حسن نظامی کے دیاسلائی پر لکھنے کو بھی فضول کہہ سکتے ہیں۔

ابنِ انشاؔ : الطاف گوہر صاحب کو الفاظ پرستی کی طرف مراجعت پر اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ وہ نذیر احمد کی "توبۃ النصوح" کی زبان سے "طلسم ہوشربا" کی طرف واپس جانا نہیں چاہتے۔ بہرحال اپنی اپنی رائے ہے۔ بعض لوگوں کو عبارت آرائی خالی از لطف نہیں معلوم ہوتی۔

شفیق : کیا کوئی شخص صاحبِ طرز ہوئے بغیر اچھا ادیب نہیں ہو سکتا؟

ابنِ انشاؔ : معلوم نہیں اچھے ادیب سے آپ کی کیا مراد ہے۔ اگر کوئی شخص پلاٹ اچھا بناتا ہے، کردار نگاری یا نفسیات نگاری میں خصوصیت پیدا کرتا ہے تو عام بیانیہ یا داستانی رنگ میں بھی اچھا افسانہ لکھ سکتا ہے۔ لیکن وہ محض اچھا اور کامیاب ادیب ہوگا۔ بڑا ادیب ہمیشہ کسی انفرادی طرز کا مالک ہوتا ہے۔

سراج : کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہر ادیب جو ڈکشن کی کوئی ندرت رکھتا ہو یقیناً اچھا ادیب ہوگا؟

ابنِ انشاؔ : یہ ضروری نہیں۔ ایسے اصول بنانے سے مغالطہ ہو سکتا ہے۔ ڈکشن میں ندرت تو شاہ عبدالقادر کے ترجمہ قرآن مجید میں بھی ہے۔ لیکن وہ کوئی محمود یا قابلِ تقلید خصوصیت نہیں۔ انگریزی میں ہنری جیمس کے مطالعہ کا آپ کو اتفاق ہوا ہوگا۔

احمد : جی ہاں، میلوں تک کامے اور سیمی کولن ہی چلے جاتے ہیں' اور فقرے کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے ہم اس کا آغاز بھی بھول جاتے ہیں۔

ابنِ انشاؔ : بہرحال ایک ندرت تو ہے اور آپ بھی عامے کی موافقت ہی میں میں یہ کہنے والا تھا کہ اس ندرت میں ضروری نہیں کوئی خوبی یا دلکشی ہو۔ آپ کو غالباً یاد ہوگا خود مڈلٹن مرے نے ہنری جیمس کے متعلق کسی مشہور مصنف کا یہ طنزیہ جملہ نقل کیا ہے کہ ہنری جیمس کی تحریر یوں ہے جیسے کوئی دریائی گھوڑا مٹر کا دانہ چن رہا ہو۔

سراج : انشا صاحب! پرانی داستانوں کی زبان آپ کو معلوم ہے عجیب طرز کی ہوتی تھی۔ مثلاً: "آتشِ رخسارِ گل شبنم نے بجھائی تھی۔ باغ میں بھی جاڑے کی دہائی تھی۔" اس کی بنا پر ہم رجب علی بیگ سرور کو صاحبِ طرز کہہ سکتے ہیں۔

ابنِ انشاؔ : میری ناقص رائے میں تو سرور کو صاحبِ طرز نہیں کہہ سکتے۔ اس زمانے میں تحریر کا یہ عام انداز تھا۔ اس میں سرور کی کوئی خصوصیت نہیں۔ قصۂ گل بصنوبر کے نیم چند کا بھی یہی انداز ہے۔ البتہ میر امن صاحبِ طرز ہیں۔ ان کے یہاں زمانے کی روش سے الگ ایک سلاست اور دلآویزی ملتی ہے۔

طالب : کیا غالبؔ، سرسید اور حالیؔ کو ہم صاحبِ طرز کہہ سکتے ہیں؟

ابنِ انشاؔ : آپ یک لخت بہت سے نام لے گئے۔ کوزے میں دریا بند کرنے کی کوشش میں میں خود بھی پریشان ہوں گا اور آپ کو بھی پریشان کروں گا۔ غالب یقیناً صاحبِ طرز تھے لیکن میری دانست میں وہ شاعری سے زیادہ نثر میں خطوط کے اعتبار سے بہت بڑے صاحبِ طرز کہلانے کے مستحق ہیں۔ ان کے انتقال کو ایک صدی ہونے کو آئی۔ بہت لوگوں نے خطوط لکھے۔ بعضوں نے لکھنے اور چھپوانے کی خاطر تکلفاً بھی لکھے لیکن غالب کا وہ انداز کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سامنے بیٹھے بات کر رہے ہوں، کوئی پیدا نہ کر سکا۔

احمد : مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے متعلق کیا ارشاد ہے؟ چودھری محمد علی ردولوی نے تو لکھا ہے کہ وہ اپنے خطوط میں ادب کے منشی، علوم کے مولوی، انگریزی پالیٹکس کے ادھ کچرے نقال نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے الفاظ اور عربی ترکیبوں کا اردو کی اونچی نیچی زمین پر ٹینک چلانے والے۔

ابن انشا : ہاں میں نے چودھری صاحب کی یہ رائے دیکھی ہے۔ چودھری صاحب سلاست اور بے تکلفی میں غالب کی نثر کے پیرو ہیں اور خود صاحب اسلوب لیکن آزاد کے متعلق ان کی اور الطاف گوہر کی رائے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں متشددانہ معلوم ہوتی ہے۔ آزاد کے یہاں پرستانہیں دکشی ہے جو انکی طبیعت کا آہنگ ہے۔

شفیق : سرسید اور حالی کے متعلق بھی فرمائیے۔

ابن انشا : یہ دونوں بڑے ادیب تھے۔ سرسید بھی ایک منفرد پیرایہ رکھتے ہیں۔ لطیفوں اور سانحوں سے بات شروع کرتے ہیں۔ اور بذلہ سنجی کی آمیزش بھی ہے لیکن حالی کی غزل کی بات چھوڑیئے۔ نثر میں نقط عالی الافادی الاقتصادی لگتے ہیں۔

احمد : مہدی الافادی الاقتصادی سے ان کی کونسی خصوصیت آپ کو مشترک نظر آئی؟

ابن انشا : کوئی بھی نہیں۔ مہدی افادی کے ہاں رنگینی پائی جاتی ہے۔ اس لئے ان کا رجحان شبلی کی طرف زیادہ تھا۔ میں تو یہ کہنا ہوں کہ ان کے نام کا توصیفی جز "افادی الاقتصادی" ان پر کم اور مولانا حالی پر زیادہ بھبتا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں نام نہاد اسٹائل نہ ہوتے ہوئے بھی وہ بہت بڑے مصنف تھے۔

شفیق : شبلی جیسے مورخ اسلام پر آپ نے رنگینی کی تہمت لگادی معلوم نہیں تعریفاً یا تعریضاً۔ حالانکہ مہدی افادی کے نزدیک وہ پہلے یونانی تھے جو مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔

ابن انشا : میں نے شبلی کی رنگینی کا ذکر تعریفاً کیا ہے۔ میں شبلی کو "بوئے گل" ، "دستہ گل" اور "خطوط شبلی" کے مصنف کی حیثیت سے بھی دیکھتا ہوں۔ پھر مہدی الافادی نے یونانیت سے محض اس کی ٹھوس علمیت مراد نہیں لی۔ حسن دوستی اور ہیلن ازم کے لوازم بھی ملحوظ رکھے ہیں۔

سراج : آخر نذیر احمد بھی تو صاحب طرز تھے۔

ابن انشا : بے شک۔ ان کی طبیعت کا چلبلا پن بھی علاوہ ان کی مخصوص لغت کے جھلکی کھا جاتا ہے۔ اس چلبلے پن نے تو "امہات الامہ" کے معاملے میں CRISIS پیدا کر دیا تھا۔ دراصل طرز ادا کی ندرت کے بھی درجے ہیں۔ بعض کی تحریر سے آپ چار سطریں پڑھیں تو پہچان لیں گے۔ بعضوں کے ہاں صفحہ دو صفحے پڑھنے پڑیں گے۔ ایسے بزرگوار بھی ہیں کہ پوری کتاب پڑھ جاؤ تو کچھ پتہ نہ چلے کہ کس نے لکھی ہے۔

احمد : کوئی مثال؟

ابن انشا : مثال دینا سوء ادب ہوگا۔ رتن ناتھ سرشار کو فراموش کرنا زیادتی ہوگی۔ اُن کا "فسانہ آزاد" کہیں سے پڑھئے، چند سطروں میں کھل جاتا ہے کہ مصنف کون ہے۔ بیسویں صدی کے صاحب طرز لکھنے والوں کی فہرست طویل ہے۔ ان میں مولوی عبدالحق بھی ہیں، مولانا ظفر علی خاں بھی، خواجہ حسن نظامی بھی اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی۔ ان کے علاوہ فرحت اللہ بیگ، عبدالرزاق ملیح آبادی، فلک پیما، پطرس، چراغ حسن حسرت۔

معراج : ملّا رموزی کو آپ بھول رہے ہیں جو گلابی اُردو کے موجد تھے۔

ابن انشا : ایسے ہم طرز نہیں کہیں گے۔ ہنسانے کی ایک مصنوعی کوشش تھی۔ اور گلابی اُردو وہ کاوش سے پیدا کرتے تھے۔ یوں بھی ادب میں اُن کا اور اُن کی تحریروں کا مقام مشتبہ ہے۔

احمد : لیکن مولانا ظفر علی خاں بھی تو کاوش کر کے لکھتے تھے۔

ابن انشا : ممکن ہے ان کے یہاں کاوش ہو لیکن میں ایسا نہیں سمجھتا۔ ان کی نثر ان کی طبیعت کی جودت اور بہاؤ سے ہم آہنگ تھی۔ مولانا سالک نے ان کی مشکل گوئی کے ذکر میں یہ لطیفہ بھی دیا ہے کہ ایک رئیس کو اپنے گھوڑے کے لئے گھاس چاہیئے تھی۔ اپنے ہمسایہ کے ہاں نوکر کو بھیجا جو بہت عالم فاضل واقع ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ جواب دے کر نوکر کو لوٹا دیا کہ:

"ہمارے متبن میں تو اتنا تبن بھی نہیں کہ عصافیر اپنی مناقیر میں لے کر سقف خانہ میں آشیانہ بنا سکیں۔ چہ جائیکہ اخیال و افیال اخاء و اغلا کے لئے قدر قلیل مہیا ہوسکے۔"

شفیق : ذرا اس کا مطلب بتا دیجئے۔

ابن انشاء: مطلب یہی کہ اتنی گھاس بھی نہیں کہ چڑیاں گھونسلا بنا سکیں ــــــــــ ہاں میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولانا ظفر علی خاں بھی سیدھی سادی بات کو اس مرغن پیرائے میں بیان کرتے تھے لیکن یہ نثر ان کی علمیت کا عکس بھی، غیر ارادی عکس اور جیسا کہ اسٹائل کی تعریف میں عرض کیا جا چکا ہے:

"STYLE IS THAT PERS. ΛΟL ICIOSYNCRASY OF EXPRESSION BY WHICH WE RECOGNISE A WRITER"

طارق: مولوی عبدالحق صاحب کا اسٹائل کیا ہے؟

ابن انشاء: مولانا ابوالکلام آزاد اور ظفر علی خاں کے برعکس اُن کا جو ہر آسان گوئی ہے۔ ان کے ہاں کہیں جھول اور تکلف نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ مخاطبت (خطابت نہیں۔ مخاطبت) اور بذلہ سنجی کی آمیزش جو غالب اور سرسید کے ہاں پائی جاتی ہے۔ مولوی صاحب کی خصوصیت ہے۔ یہ ان کی تنقیدوں میں بھی جھلکتی ہے لیکن زیادہ نمایاں طور پر ان کی بے تکلف تحریروں، خصوصاً خطوں اور خاکوں میں۔

معراج: کیا آپ نیاز کو صاحب طرز کہیں گے؟ ان کے مکتوبات کے متعلق کہا جاتا ہے کہ چھپنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔

ابن انشاء: بے شک اُن کے خطوط کا خواہ وہ کسی طور سے لکھے گئے ہیں ایک الگ پیرایہ ہے جو لطف بھی دیتا ہے لیکن ان پر بھی وہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے جو گوہر صاحب نے ابوالکلام کی نثر پر کیا ہے ادب لطیف کے مضحکہ خیز اسلوب کی ترویج میں بھی ان کا بڑا حصہ تھا۔

انور: انشا صاحب میرے خیال میں اب ہمارے ہاں سے انشا پردازی کی روایت اُٹھتی جاتی ہے اور ہم آسان اور بے رنگ زبان لکھنے لگے ہیں۔

ابن انشاء: مجھے آپ کی دونوں باتوں سے اختلاف ہے۔ ابھی پچھلے دنوں میں نے وصی احمد بلگرامی کی کچھ تحریریں دیکھی ہیں جو انشا پردازی کا لطف رکھتی ہیں۔ مولانا صلاح الدین احمد کے ہاں اور کہیں کہیں ڈاکٹر سید عبداللہ کے ہاں بھی یہ مزا ہے۔ جوش اور حفیظ کی نثر بھی انشا پردازی سمجھنی چاہیئے۔ ہاں عام رجحان سادگی کی طرف ہے۔ لیکن سادہ زبان لازماً بے رنگ نہیں ہوتی مشکل اور مکلف زبان ازناً لذیذ ہوتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی اور مولوی عبدالحق کا جوہر ہی ان کی سادگی ہے دراصل محض زبان یا ذخیرۂ الفاظ سے اسٹائل نہیں بنتا بلکہ کسی موضوع کو ایک خاص طریقے پر پیش کرنے کا نام اسٹائل ہے۔

شفیق: میں پھر یہ عرض کروں گا کہ آپ مُردوں سے زندوں کی دنیا میں کب آئیں گے؟

ابن انشاء: میرے خیال میں ہم زندوں کی دنیا میں آ بھی چکے۔ آپ ہی کو خبر نہیں ہوئی اور جن لوگوں کو آپ مردہ سمجھتے ہیں۔ وہ بھی تو ادب میں زندہ ہی ہیں بلکہ زندۂ جاوید۔

شفیق: میری مراد آج کل کے لکھنے والوں سے ہے۔ مثلاً بعض لوگ دلّی کی زبان بہت عمدہ لکھتے ہیں۔

ابن انشاء: خواجہ حسن نظامی کی زبان بھی دلی کی زبان تھی ان کے علاوہ اشرف صبوحی اور شاہد احمد دہلوی صاحب نے خصوصیت سے اس زبان میں ادب پاروں کی تخلیق کی ہے لیکن ان کی خوبی محض زبان نہیں۔ ان کی خلاق طبیعت کسی بھی پیرائے میں، ادب میں اضافے کا موجب ہو سکتی تھی تاہم ان کی زبان ان کے اسٹائل کا جزو اعظم ہے۔

احمد: کیا اسٹائل صرف خاکے یا ہلکی پھلکی چیزوں ہی میں نمایاں ہوتا ہے یا تنقید و تاریخ نگاری وغیرہ میں بھی؟

ابن انشاء: ہر چیز میں۔ تنقید میں بھی، تاریخ میں بھی، ناول میں بھی، شاعری میں بھی کسی ادیب کی شخصیت کا جوہر کسی صورت میں بھی جھلک سکتا ہے۔ تنقید و تبصرہ میں مولوی عبدالحق یا محمد حسن عسکری کو لیجیے۔ تاریخ میں مولوی محمد حسین آزاد کی مثال میں دے چکا ہوں۔ افسانہ نگاری میں منٹو ہیں۔ قرۃ العین ہیں۔ انگریزی میں پیش کش کا پیرایہ ہی اسٹائل ہے حسن نظامی کے لئے دیا سلائی مچھر مکھی سبھی عمدہ موضوع ہیں۔

انور: اس گفتگو سے یہ تو معلوم ہوا کہ موضوع میں جو دعویٰ کیا گیا ہے یکسر غلط ہے۔ اُردو ادب میں صاحب طرز نثر نگاروں کی کمی نہیں۔

ابن انشاء: بے شک۔ اب البتہ آپ چاہیں تو وہ قرار داد پاس کر سکتے ہیں جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا تھا کہ یہ موضوع غلط ہے۔ یہ دعویٰ قابل مذمت ہے۔ وغیرہ وغیرہ میرا ووٹ آپ کے ساتھ ہوگا۔

معراج: آپ کا تو کاسٹنگ ووٹ ہے۔

ابن انشاء: جی نہیں، اور جب ہم سب متفق ہیں تو کاسٹنگ ووٹ کی کیا ضرورت ہے؟ صاحب طرز ادیب آج بھی ہیں جن لوگوں نے چار چھ برس پہلے لکھنا شروع کیا ہے، ان میں بھی ہیں۔ وہ انتظار حسین ہوں یا لے جمیدہ۔ اور ہر زندہ ادب میں ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہیں گے ۔ (بشکریہ ریڈیو پاکستان، کراچی)

دیسی گڑیاں

پاکستانی ملبوسات میں رقص

کراچی میں گڑیوں کی نمائش

ولایتی گڑیا

جاٹ اور جٹی

غزل

عبداللہ خاور

ایسی تو کبھی گردشِ حالات نہیں تھی
یوں ملتے ہو جیسے کہ ملاقات نہیں تھی

اب ذہن پہ یادوں کے بھی سائے نہیں پڑتے
اس درجہ سیہ شامِ حجابات نہیں تھی

ایسی تو سبک رم نہ تھی ہر صبح کم آغوش
اتنی تو گراں سیر کوئی رات نہیں تھی

جو دل پہ گذرتی تھی سو آتی تھی زباں پر
لرزاں کبھی طرزِ مقالات نہیں تھی

گہہ ہوش تھا، گہہ بے خودئ شوق کا عالم
یہ گھٹتی ہوئی شورشِ جذبات نہیں تھی

یہ سچ ہے، زمانے میں کسے کون ملا ہے
خود میری طلب واقفِ حالات نہیں تھی!

★

غزل

شہاب الدین شہاب (ڈھاکہ)

ابرِ سیاہ برق بہ داماں نہ پوچھئے
زیرِ نقاب جلوۂ تاباں نہ پوچھئے

ان کی تجلیات کا طوفاں نہ پوچھئے
بربادئ حیات کا ساماں نہ پوچھئے

ہر اشک میں تبسمِ رقصاں نہ پوچھئے
وہ لذتِ ندامتِ عصیاں نہ پوچھئے

فرقت میں ان کی آج گلستاں ہے سوگوار
ہر پھول سے جراحتِ پنہاں نہ پوچھئے

وہ جوش وہ خروش، وہ لطفِ نشاط و عیش
جلووں سے بزم میں وہ چراغاں نہ پوچھئے

تیرادا، خدنگِ نظر سب سہی مگر
کیا ہیں وہ التفاتِ گریزاں نہ پوچھئے

گلہائے رنگ رنگ سے آرائشِ چمن
لیکن کسی کا گوشۂ داماں نہ پوچھئے

پھولوں کو ناز حسن مگر ہے قسم بعشق
کانٹوں سے جو فروغِ گلستاں نہ پوچھئے

مخبر ہے آپ چاک گریبانِ گل شہاب
گلچیں سے داستانِ گلستاں نہ پوچھئے

رازجُو

انورعلی انور

یہ نگاہیں مری
ہیں شب و روز آوارہ و بے سکوں
خستہ و ماندہ و مضمحل جانے کیوں
راز کی جستجو ہے انہیں
راز کھلتا نہیں

راز کی جستجو ہے انہیں جانے کیوں
زندگی عقدۂ پیچ در پیچ ہے
عالمِ نکہت و رنگ ہے
قلزمِ بے کراں
جس کی سطحِ درخشاں پہ ہیں
رنگ و بو کے سفینے رواں
اور باطن ہیں گہرائیاں
کرب انگیز و ہول آفریں
جن کے اسرار کی خلوتِ تنگ و تاریک میں
ناوکِ جستجو کی رسائی نہیں
یہ نگاہیں مگر
پھر بھی ہیں مبتلائے جنوں
راز کی جستجو ہے انہیں جانے کیوں

راز کی جستجو میں نگاہیں مری
ہیں شب و روز سرگشتۂ دشتِ آوارگی
الجھی راہوں میں بھٹکی ہوئی
پیکرِ ماندگی، نقشِ بے چارگی
حسنِ بیرونِ در
یہ دلآرام جلوے، خوش آہنگ شام و سحر
یہ خجستہ مناظر، یہ تابندہ شمس و قمر
جنت دیدہ و گوش ہیں بالیقیں
کوئی جلوہ مگر
ان نگاہوں کو جامِ مسرت پلاتا نہیں
پیاس ان کی بجھاتا نہیں
یہ نگاہیں مری
کب سے ہیں تشنۂ رازہائے دروں
راز کی جستجو ہے انہیں جانے کیوں

رازہائے دروں
بے کراں وسعتیں، ہول انگیز پہنائیاں
منزلیں جن کا نام و نشاں تک نہیں
راستے جن میں گم ہیں زمان و زمیں
ظلمتیں پیش و پس ہیں بعید و قریں
کوئی مشعل فروزاں نہیں
کتنی اندوہگیں ہیں نگاہیں مری
خوار و زار و زبوں
راز کی جستجو ہے انہیں جانے کیوں

بہارِ نَو

قیّوم نظر

کنہیا سی راتیں، یہ رادھا سے دن
بہت مطمئن جسم — شعلوں کی صورت جھلکتے دمکتے،
عجب نازِ صد ساز ساماں کے انداز رکھتے، بہکتے، چہکتے،
بہت مطمئن جسم نا مطمئن

یہ نغمے — مَے ناب کے گھونٹ نایاب وقفوں میں رقصاں
معطر تبسّم کے زرکار چھینٹے، دبی گفتگو کے ترنم سے تاباں
ہر اک سمت، ہر اٹھتی دیوار کے سائے، ہر موڑ پر خواہشیں گویا اِندر کی پریاں
انوکھی نئی ناچشیدہ سی لذت کو حیلوں بہانوں سے بیدار کرنے ہوس کارِ حزیں
یہ رادھا سے دن

یہ نوبر ہوا — اُس کے نوخیز جھونکے
خنک، خشک، آزاد، بے آب، گُل ریز جھونکے
اُفق — کندنی بادلوں کے سمندر میں — رادھا کو ڈھانپے کنہیا
جواں گوپیاں گرمیِ جستجو رنگ و بو سے بھبھوکا
غزل خواں، پرافشاں،
بہت مطمئن پھر بھی نا مطمئن

چکا چوند آنکھوں کو، چہرے کو وارفتگی، دل کو دھڑکن
عطا کرنے والی یہ شاداب و آباد راہیں ہیں سونی
کہ رادھا کنہیا کے آغوشِ بے خواب میں بھی ہے نا مطمئن
یہ پیرس کی راتیں، یہ پیرس کے دن*

---

* شانزے لیزے۔ پیرس میں لکھی گئی۔

سادگی ہائے جنوں

ظہور نظر

یادوں کی حسین سرزمیں پر
بستا ہے تمہارا گاؤں اب بھی
ہنستی ہے کنارِ آبِ رقصاں
شیشم کی گھنیری چھاؤں اب بھی

بالوں میں سجا کے جنگلی پھول — تم ذہن میں اب بھی گھومتی ہو
رک رک کے قدم قدم پہ، میری — باہوں میں لچکتی جھومتی ہو
اڑتی ہوئی زلفِ عنبریں کو — ہونٹوں میں دبا کے چومتی ہو

کہتی ہو، کوئی غزل سناؤ!
ایسی، کہ بہار اور مچلے
آنکھوں میں خمار اور آئے
پہلو میں قرار اور مچلے
جیون کا چراغ اور بھڑکے
چاہت کا شرار اور مچلے

میں سُن کے تمہاری بات، دل میں — ہنستا ہوں جنوں کی سادگی پر
صحرائے خیال کی حدیں کب — سمٹی ہیں بساطِ زندگی پر
اک طنز ہے وقت کا سمندر — انساں کی دوامی تشنگی پر

یادوں کی حسین سرزمیں پر
بستا ہے تمہارا گاؤں اب بھی
ہنستی ہے کنارِ آبِ رقصاں
شیشم کی گھنیری چھاؤں اب بھی

افسانہ :

کمی؟

ابو سعید قریشی

نرم کُشن کی تہوں میں دھنسا ہوا وہ ایک ضخیم کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس کے گرد اخروٹ کی الماریوں میں سینکڑوں کتابوں کے رنگین گرد پوش چمک رہے تھے۔ قلمی نسخوں اور نایاب مطبوعات کے لئے الگ الماریاں رکھی تھیں۔ ان کتابوں کا ایک ایک لفظ اس کا پڑھا ہوا تھا۔ اس کا نام ہر پبلشر کی میلنگ لسٹ پر موجود تھا۔ ہر روز اسے ڈاک میں نئی مطبوعات کی اطلاع ملتی اور ہر آٹھویں دسویں ایک نہ ایک پیکٹ وصول ہوجاتا۔ ملازم کو ہدایت تھی کہ کتابوں کا کوئی وی پی نہ لوٹایا جائے: کتاب لوٹانا کفرانِ نعمت ہے۔

جب بھی کوئی پارسل آتا وہ اسے لیکر سیدھا اپنی سٹڈی میں پہنچ جاتا۔ بیاہ کے لئے اس نے پینتالیس سال انتظار کیا تھا لیکن کتابوں کے معاملے میں وہ سخت بے صبرا واقع ہوا تھا۔ وہ پارسل کی رسی اور کاغذ کو چاقو یا قینچی سے کاٹنے تک کا انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ کتابوں کے لمس سے اس کی زرد لانبی انگلیوں میں اتنی طاقت بھر جاتی کہ رسی کو ایک سے دوسرا جھٹکا دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔

اکیڈمی سے لوٹتے ہی اس کا پہلا سوال یہ ہوتا: کوئی پارسل؟ اس روز جب پارسل آیا تو وہ گھر پہ نہیں تھا۔ اپنی شادی کی دوسری سالگرہ پر اس نے پکنک کا انتظام کیا تھا۔ مہمانوں سے استدعا کی گئی تھی کہ سویرے ہی چلے آئیں، ناشتہ بھی باہر ہوگا۔ سردی کی بنا پر کچھ احباب نے اس پر اعتراض بھی کیا تھا۔ اس کی آواز میں کچھ ایسی ترغیب تھی کہ مخالف کو ہمیشہ ہتھیار ڈال دینے پڑتے اور قائل ہوئے بغیر بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانا پڑتی۔

"آدمی نہیں جادوگر ہے" حریف کہا کرتے۔

"ارے اور کیا۔ جادوگر نہ ہوتا تو لاہور کا اجالا کیسے چرا لاتا۔ سلمیٰ ہی کے سبب تو لاہور کو روشنیوں کا شہر کہا ہے شاعر نے۔ ربع صدی کا تفاوت ہوگا دونوں کی عمر میں لیکن نہ جانے کیا سحر پھونکا کہ کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی۔ اور اس پہ خوش ہے، اب دوسری سالگرہ منا رہے ہیں"

سالگرہ کے روز وہ قریب قریب مُنہ اندھیرے ہی گھر سے نکل گئے تھے۔ لوٹے تو سندر دامن میں ایبٹ آباد کی روشنیاں چھٹے ہوئے دودھ کی طرح دکھائی دی تھیں۔ بنگلے کی پورچ سے مہمانوں کو رخصت کر کے جب وہ ہال میں پہنچا تو میز پر تحائف کے انبار میں کتابوں کا ایک پیکٹ بھی پڑا تھا۔

"جانے کس نے کہا تھا کہ کتاب سے بہتر تحفہ ......"

وہ مسکرایا۔ "لو بھئی سلمیٰ! میرا تحفہ تو مجھے مل گیا"۔ اس نے بائیفوکل چشموں کی اوٹ سے اپنی جواں سال بیوی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں ذرا آنکھیں میچو!"

اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے سیپ کی ایک ڈبیہ نکالی اور موتیوں کی ایک نازک مالا سلمیٰ کی گردن میں پہنا دی....

سلمیٰ کا سینہ متلاطم ہوگیا۔

"آپ کتنے اچھے ہیں!" سلمیٰ نے اس کی جانب مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "شکریہ"

وہ مسکرایا اور سلمیٰ کے گال پر ایک ہلکا سا طمانچہ لگاتے ہوئے بولا: "اچھا میں ابھی آتا ہوں۔ ذرا دیکھیں وحید نے کیا بھیجا ہے۔ مزا آجائے جو گکری کی کتاب نکل آئے۔ آخاخاخا"

لائبریری کا تالا کلک آواز سے کھلا اور بند ہوگیا۔ لیونڈر پالش اور کتابوں کی مانوس خوشبو سے اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ اور آتشدان میں چٹختی ہوئی چیڑ کی گرمی سے اس کی تھکان سٹڈی میں قدم رکھتے ہی دور ہوگئی۔

"یونان کے چند غیر معروف فلسفی!" کتاب کا عنوان دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کتاب کی دصلی میں وحید کی دعائیں تھیں۔ "خدا کرے تم کبھی ایک دوسرے سے بیزار نہ ہو! اور تمہاری زندگی کا آہنگ اوروں کے لئے باعثِ رشک مثال بنا رہے!"

وحید نے یہ کتاب لندن سے بھیجی تھی۔ جہاں وہ پاکستانی سفارت خانے میں ثقافتی نمائندہ تھا۔

"دوست ہو تو ایسا ہو" عرفان نے سوچا۔ "میری شادی کی تاریخ بھی یاد ہے۔ حالانکہ اگر سلمیٰ یاد نہ دلاتی تو شاید کام کی مصروفیات میں خود مجھے بھی بھول جاتی۔

تازہ روشنائی اور نئے کاغذ کی مخصوص خوشبو نے اسے سرشار کر دیا اور پھر وہ فلسفے کی دنیا میں کھو گیا۔

اس وقت سے وہ وہیں بیٹھا تھا۔ لیکن یونان کے خردمندوں کی محفل میں یہ شور کیسا تھا؟ اوہ بجری!

دریچے کا شیشہ جس سے شہر کا کشور اکلیوں بھری ادک کی طرح نظر آیا کرتا تھا، اب کسی سنگین سلیٹ کی طرح دکھائی دے رہا تھا جس پر پانی سے لکھنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ دن تو خیریت سے گذر گیا ورنہ سلمیٰ کا دل برا ہوتا۔ اور سلمیٰ کی دلجوئی کا اسے ہر وقت دھیان رہتا تھا۔

ایک ذرا تھک گئی۔ ویسے سب کام ٹھیک ہو گیا۔ کوئی سُر غلط نہیں تھا۔ اس کی انگلی برائر کے پرانے پائپ کی خمیدہ کمر سے کھیلتی رہی۔ لیکن وہ سفے کی لذتوں میں گم اس حقیقت سے بھی ناآشنا تھا کہ آگ کب سے بجھ چکی ہے۔ انگوٹھا چوستے ہوئے بچے کی طرح وہ اسے ویسے ہی منہ میں دبائے بیٹھا تھا۔ اس بات کا احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ آگ سرد ہو چکی ہے۔ ٹھنڈے پائپ کے کش سے نکوٹین کا ایک قطرہ اس کی زبان سے چھوا۔ اور خیالات کی زنجیر پھر جھنجھنا اٹھی۔ کافی کتنی عمدہ تھی۔ اور سینڈوچز۔ نیلے پنیر، روسٹ چکورا، اور آئس کریم! سٹرابیریز کے سرخ شربتی ترش ذائقے کی خاطر وہ سردیوں میں بھی آئس کریم کا قائل تھا۔ مگر صرف دو چمچے۔

۔ شکم پُری جانوروں کا کام ہے! اور پھر پھلوں کا وہ انبار، اناس۔ شفتالو..... ان کی تو خوشبو ہی سے اِشتہا مٹ جاتی ہے۔ سنا ہے جنت میں بھی ایسا ہی ہو گا۔ یہاں بھی ہو سکتا ہے۔ ارتقا کی آخری منزل محض لطافت۔ بوئے گل و مئے نغمہ۔

ٹیپ ریکارڈر سے ابھرتی ہوئی لہروں کے دوش پر سلمیٰ کرنوں سے بنے ہوئے کسی پرندے کی طرح نظر آئی تھی۔ آبشار کی پھوار دھنک قزح کا جھالا۔

۔ تصویر ہو اللہ قسم! مسز رضا نے کہا۔ غیر مرئی رنگوں سے بنی ہوئی تصویر۔

۔ اور شوہر بھی کیسا تصویر شناس ملا ہے........

اپنی تعریف سُن کر وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا۔

۔ ارے ہاں بھئی۔ ایسا عالم فاضل شائستہ متمدن.......

۔ اتنا لکھ پڑھ کے بھی آدمی کو شوہر بننا بھی نہ آئے۔

۔ اور لکھا پڑھا سا لکھا پڑھا۔ نورِ ختم سے راس کماری تک دوسرا آدمی نہیں ملے گا اس پائے کا۔

۔ اور اس پر طرہ یہ کہ علم سر کو نہیں چڑھا۔ ورنہ ہما شما تو دو کتابوں پہ ریویو پڑھ کر ہی ہنکارنے لگتا ہے۔

۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ وقت کیسے ملجاتا ہے اتنا پڑھنے کے لئے۔ حمیدہ نے پوچھا۔ فنکشنز اٹینڈ کرتے ہیں۔ لیکچر، صدارتیں، عصرانے عشائیے:

۔ ہاں صاحب۔ معاملہ قابلِ غور ہے اس بارے میں تو سلمیٰ ہی کچھ بتا سکتی ہیں۔

۔ وہ بھی تو لیکچر روم کو چھوڑ کر ساتھ ہی ہوتی ہیں۔

۔ لیکن عشائیے کے بارے میں تو۔

اُن کے قہقہوں سے جھینگر خاموش ہوئے۔

۔ مگر دولہا میاں ہیں کہاں؟ ۔ اے دولہا بھائی یہاں آئیے دلہن انتظار کر رہی ہیں۔

۔ ارے ہاں یہ نیچر سٹڈی چھوڑیئے ذرا۔ قدرت کا شاہکار آپ کو بلا رہا ہے۔ آخر کب تک شرمایئے گا! اب تو دو سال ہو گئے شادی کو۔ ہمارے رضا صاحب تو پہلے دن ہی یوں ملے تھے جیسے جنم سے جانتے ہوں۔ جی ہاں میں آپ ہی سے کہہ رہی ہوں۔ سخت غیر مہذب واقع

ہوئے ہیں آپ -

— یہ اکھڑ ایسے ہی ہوتے ہیں - مسز شہریار نے کہا -

جھوڑے قہقہے لگاتے پیڑوں کی ہوا کھانے جنگل کے سایوں میں غائب ہو گئے -

— کتنے مخلص لوگ ہیں - سلمٰی نے کہا - زندہ دل! اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور آنکھوں میں کسی گہرے چشمے کی سی چمک تھی -

— سورج نے آج پھر موسم کے کاہنوں کو جھٹلا دیا - اس کے شوہر نے کہا - دھوپ تمہارے ہاتھوں کی طرح گرم اور راحت بخش ہے - تمہارے وجود کی طرح جس نے میری زندگی کے خلا کو پر کر دیا ہے - ارے یہ مہندی تو میں نے دیکھی ہی نہیں تھی!

— ماما نے زبردستی لگا دی کہ آج شادی کی سالگرہ ہے - پسند ہے نا آپ کو؟

— ہاں ہاں! کیوں نہیں - کیونکہ اب تو اتنی عام ہو گئی ہے کہ ہماری خواتین کو اپنی انفرادیت قائم رکھنے کے لئے پھر مشرقی سنگار کی ضرورت ہے - سپینگلر نے مغرب کا زوال لکھ کر ہمیں سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ مشرق کو پھر اپنا مقام حاصل کرنا ہوگا لیکن ہم ہیں کہ ابھی فیصلہ ہی نہیں کر سکے کہ ادھر جانا ہے یا اُدھر - شاید ہمارے معاشرے کی تمام قباحتیں اسی بے یقینی اور تذبذب کا نتیجہ ہیں - ہماری ترقی بلکہ ارتقا میں مارچ ٹائم کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے - چلتے ہوئے بھی ہم وہیں کھڑے ہیں - اور ہاں اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ اسلامک سمپوزیم کے لئے اسی موضوع پر مقالہ لکھنا چاہیئے - THE STATIC MOVEMENT — میں سے تمہارے نام معنون کروں گا - اس کا آغاز ہی چنار سے کروں گا - خوب کھلتی ہے تمہارے ہاتھوں میں - چنار کے ان پتوں کو چومنے کو جی چاہتا ہے - اُدھ کھلا پھول رکھا ہو جیسے ہتھیلی پر - مجھے نہیں معلوم تھا کہ ماما اتنی ماہر مشاطہ ہے -

سلمٰی کی باہوں میں انگڑائی کی سی کیفیت پیدا ہوئی -

— جی ہاں پاکستان آنے سے پہلے کسی پرانے خاندانی نواب کے ہاں ملازم تھی -

— جبھی میں بھی کہوں یہ سلیقہ کچھ وہیں کا سا ہے -

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گئے جو جھولے کی طرح گہری تھی اور جہاں چیڑ کے پتوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا -

— نوم کشن اس نے ہنستے ہوئے کہا - ستانے کو جی چاہتا ہے اسے دیکھ کر -

سلمٰی نے اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگی -

— تمہارے ہاتھوں سے خوابوں کی سی خوشبو آتی ہے - مجھے تو نیند آنے لگی -

— تو سو جائیے نا! سلمٰی کے ہونٹ لرز رہے تھے - سینہ متلاطم تھا -

— کاش ایسا ممکن ہوتا - لیکن انسان کی نصف سے زیادہ زندگی تو پہلے ہی نیند کی نذر ہو جاتی ہے - اگر آدمی سوتا کم اور جاگتا زیادہ تو جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوتا -

— اس دھوپ، ان چیڑوں اور اس خوشبو کے سوا اسے اور کیا چاہیئے - سلمٰی نے اپنے آپ سے کہا اور جیسے اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے اس کی نگاہیں جنگل کی گہرائیوں میں گم ہو گئیں جدھر ان کے ساتھی گئے تھے -

یکایک کہیں سے مسز رضا کے قہقہے کی آواز آئی -

ہاں وہی تھی - جیسے سلمٰی کے سوال کا جواب لے کر آتی ہو - رضا کا ہاتھ جھلائے چلی آ رہی تھی ڈولتی ہوئی - اپنے شوہر کا سہارا لیتی -

— ارے آپ لوگ ابھی یہیں ہیں - ہمارا تو خیال تھا کہ، میرا مطلب ہے - میں کہہ رہی تھی کہ ہم تو اس چوٹی کو ہی چھو آئے - ان کے بالوں اور کپڑوں سے چیڑ کی سوئیاں چمٹی ہوئی تھیں -

اللہ قسم میرا تو دل دھک دھک کر رہا ہے اب تک - میں کہہ رہی تھی اتنے گھنے جنگل میں ریچھ ضرور ہو گا - لیکن دیکھا تو بیر سا پڑا تھا -

— تو یہ کتنی شریر ہے - پروفیسر عرفان نے سوچا - زندگی سے بھرپور - ایک ذرا آزاد جا رہی ہے اور مذاق قدرے وہ — لیکن سلمٰی

ماہِ نو، کراچی - ستمبر ۱۹۵۸ء

سلمیٰ! مسز احسن کہہ رہی تھیں - جی چاہتا ہے تمہیں لاکٹ بنا کر گردن میں پہن لوں -

ٹن . . . . . . !!! آتشدان پر چائمنگ کلاک ایک بجا رہا تھا - سیاہ ڈائل پر سفید سوئیاں گوری باہنوں کی طرح انگڑائی لے رہی تھیں -

- ایک بج گیا اور مجھے احساس ہی نہیں ہوا - اور سلمیٰ سے کہہ کے آیا تھا کہ ابھی آتا ہوں -

اس نے کتاب بند کی اور سٹینڈرڈ لیمپ بجھا دیا - کمرے میں اندھیرا چھا گیا - آتشدان میں آگ کے اوپر سفید راکھ کے پردے پڑے تھے - اور دریچے کے شیشے پر شبنم کے منجمد قطرے چاندی کے پھولوں کی طرح چمک رہے تھے -

وہ دبے پاؤں خوابگاہ کی طرف بڑھا - سلمیٰ آتشدان کے سامنے آرام کرسی میں سو رہی تھی - اس کی گود میں کہانیوں کی ایک کتاب پڑی تھی جیسے پڑھتے پڑھتے نیند آ گئی ہو - ایک ہاتھ کرسی کے بازو پر تھا اور دوسرے کی ہتھیلی میں مہندی کا ادھ کھلا پھول سلگ رہا تھا - اس نے عروسی کا سرخ جوڑا پہن رکھا تھا - "مینک" کے کوٹ میں، جیسے اس نے سردی سے بچنے کے لئے ایسے ہی اپنے کندھوں پر ڈال لیا تھا - وہ کسی خوبصورت تتلی کی طرح نظر آئی جو آتشدان کے سامنے سو رہی تھی - عرفان کے جی میں آئی کہ اسے تھپکے جس طرح وہ اپنی سیامی بلی کو تھپکا کرتا تھا - لیکن اس کا ہاتھ رک گیا -

- نہیں! جاگ جائے گی - میری مالو! دن بھر کی تھکی ہوئی ہے - سونے دو - لیکن سردی! -

کونے میں پڑا ہوا پنکھے والا ہیٹر کمرے میں گرم ہوائی لہریں پھینک رہا تھا - مگر ہیٹر کی گرمی کو وہ ٹھنڈی آگ کہا کرتا تھا -

- آگ لکڑی کی! کتاب ہو اور آتشدان میں لکڑیاں چٹخ رہی ہوں -

اس نے آتشدان کے پاس رکھی ہوئی بید کی پٹاری کا ڈھکنا اٹھایا - پٹاری میں پرانے دستور کے مطابق تکّے بھرے رہتے تھے - آگ جلانے کے لئے تکّوں سے بہتر اور کوئی چیز نہیں - ان کا پہاڑی چوکیدار کہا کرتا، جی ہاں کھنگلے بھی اتنی جلدی آگ نہیں پکڑتے -!

- اور کبھی اس پر دانے چمک رہے ہوں گے - عرفان کو خیال آیا - ہری تھی من بھری تھی . . . . . . جانے کس تنور میں پکی ہو گی؟ کس فاقہ مست نے اپنے پیٹ کی آگ بجھائی ہو گی؟ - مگر آگ، آگ سلمیٰ کو سردی نہیں لگنی چاہیے -

اس نے تکّے کی نوک سے راکھ کو چھیڑا جس کی ایک بے جان تہہ انگارے سے الگ ہو کر آتشدان کی جالی میں گر گئی - اور وہ سوچنے لگا کہ یہ کیا ہوا؟ ابھی ابھی یہ راکھ، انگارے کو لباس کی طرح ڈھانپے ہوئے تھی - اور ابھی؟ - مگر کیا یہ اس سے الگ تھی یا اس کا حصہ تھی . . . . وہ حرف و معنی اور جان و تن کے رشتے پر غور کرنے لگا - مگر دو لکڑیوں کے درمیان رکھا ہوا تنکا یکایک بھڑک اٹھا - لکڑیاں روشن ہو گئیں اور تنکا بھسم ہو گیا -

آگ روشن کر کے اسے ایک گونہ تسلی ہوئی - اب سلمیٰ اطمینان سے سو سکتی ہے - آنکھ کھلی تو خود ہی بستر پر چلی آئے گی - البتہ کمبل ضرور اوڑھا دینا چاہیے -

سلمیٰ کے بستر سے اس نے ڈھنکے ہوئے پروں اور اون کا ایک سبک کشمیری کمبل اٹھایا اور آہستہ سے اس کی ٹانگوں پر ڈال دیا - کمبل کے کنارے دبانے کے لئے جب وہ اس پر جھکا تو معاً سلمیٰ نے ایک یاس آلود اچٹتا ہوا سانس لیا - گرم ہوا کا ایک معطر جھونکا عرفان کے گال سے ٹکرایا - اس نے اپنا سانس روک لیا - اس کا چہرہ متفکر ہو گیا -

جانے کیا تکلیف ہے اس کو کس چیز کی کمی محسوس کر رہی ہے؛ مجھ سے کوتاہی ہو گئی کوئی - انتظام تو ٹھیک ہی تھا میں سمجھتا ہوں - فہرست کے مطابق ایک ایک چیز - مسز رضا تو کہہ رہی تھی کہ ایسی پک نک تو پرنسس مارگریٹ کو بھی نصیب نہیں ہو سکتی - اور ہار پہن کے . . . . کتنی خوش تھی - جیسے کسی بچی کو عید کا تحفہ مل گیا ہو - کتنے اچھے ہیں آپ! ایک ذرا آواز میں تھکان کا شائبہ البتہ - مگر پہاڑی سفر جا ہے مرسیڈیز بینز میں ہو پھر سفر ہے - موڑ اور چکر - نہیں ویسی کوئی بات نہیں - کوئی خواب دیکھ رہی ہے شاید - فرائیڈ کہتا ہے . . . . خیر صبح اٹھ کر پوچھوں گا -

ماہ نو، کراچی۔ستمبر ۱۹۵۸ء

بنگلہ افسانہ:

جب درد جاگے

مصنف: ظہور ریحان
مترجم: احمد سعدی

یہاں سے یہ راستہ بل کھاتا ہوا دیوداروں کے جنگل کے قریب سے پتلا ہو کر بڑی خوبصورتی سے نشیب کی طرف چلا گیا ہے، جہاں پر شام کے وقت جھیل کے پانی میں ہرن کے بچے کی کانپتی ہوئی پرچھائیں سیاہ آسمان کی گود میں کھو جاتی ہے۔

جب شام آتی ہے تو دور وادیوں سے ہوتی ہوئی یخ بستہ ہوائیں دیوداروں کی شاخوں میں لرزش پیدا کرتی ہوئی گذر جاتی ہیں، پتے کانپنے لگتے ہیں، دل بھی لرز اٹھتا ہے۔ اس کے دل میں بھی سویا ہوا درد جاگ اٹھتا ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اس کے پاس کوئی چیز تھی۔ لیکن اب نہیں رہی۔ پھر بھی تاریکی میں، اس جنگلاتی شہر میں ماضی کی یادوں کو سمیٹ کر جب وہ پوچھتا ہے "تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟" تو میں چونک کر جواب دیتا ہوں "نہیں تو؟"

وہ پھر سوال کرتا ہے "کبھی بھی نہیں؟" میں جواب دیتا ہوں "نہیں ایسے لمحے میری زندگی میں کبھی نہیں آئے۔"

میری بات سن کر وہ زور سے ہنس دیتا۔ دھیرے دھیرے اس کی نازک انگلیاں تان پورہ پر حرکت کرنے لگتی ہیں۔ موسیقی پھوٹ بہتی ہے۔ وہ ٹھہر ٹھہر کر کہتا ہے "یہی اچھا ہے، محبت گناہ ہے، بھالو باشا پاپ؟" اس کی دونوں آنکھیں اشک آلود ہو جاتی ہیں۔ تاروں کی جھنکار رک گئی۔ میں پوچھتا ہوں۔ "تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

اشکوں کے دو قطرے اس کی آنکھوں سے ڈھلک کر اس کی گود میں گر پڑتے ہیں، دھیمے لہجے میں وہ کہتا ہے "ہاں، بہت دنوں پہلے۔"

"کو تو دن؟" (کتنے دن ہوئے؟)

"مونے نئی، خیال نہیں۔"

"نام؟"

"نام معلوم کر کے تم کیا کرو گے؟"

دیوداروں کے سائے میں مخملیں گھاس پر وہ تان پورہ رکھ دیتا ہے، اس کے بعد آہستہ آہستہ کہتا ہے "وہ لڑکی میرے ایک دوست کی بہن تھی" کہتے کہتے وہ یکایک رک جاتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے۔

میں اسے دونوں کندھوں سے جھنجھوڑ کر کہتا ہوں "رک کیوں گئے۔ میں نے زندگی میں کبھی محبت نہیں کی تو کیا ہوا، اتنا ضرور جانتا ہوں کہ سردیوں کی شام میں یہ قصے بہت بھلے لگتے ہیں، کہو، میں سنوں گا۔"

کشن چھوڑ کر وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے، ٹہلنے لگتا ہے، اس کے بعد کہتا ہے "ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے تھے، ایک ہی کلاس میں، وہ لڑکی بھی اور میں بھی، میں بھی ان دنوں کنوارا تھا اور وہ بھی ناکتخدا تھی۔"

ایک روز رات کے وقت کسی ریستوران میں چائے کی میز پر بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر کے تھک چکے تھے کہ میرے دوست نے کہا "فلاں تاریخ کو میری بہن کی شادی ہے، موقع ملے تو ضرور آنا۔"

میں نے کہا "آؤں گا۔ خیال رہا تو کیوں نہ آؤں گا۔"

مجھے بھول جانے کی پرانی عادت ہے، تان پورہ کے سُروں میں ایسا محو ہوا کہ وہاں نہ جا سکا۔ اس کے بعد وہ لڑکی مجھے برابر نظر آتی رہی، میں اسے دیکھتا رہا، جیسے راہ چلتے کاریں، گھوڑا، گاڑی بان اور اخبار کے ہاکر کو دیکھتا ہوں، اسی طرح میں اسے کبھی کلاس میں دیکھتا، کبھی کوریڈور میں۔ زرد زمین پر نیلی دھاریوں والی ساڑی یا کوئی اور معمولی قسم کی ساڑی پہنے رہتی۔ پانی برس جانے کے بعد جس طرح آسمان کا رنگ نکھر آتا ہے، اس کی آنکھیں ویسی ہی تھیں۔ وہ چاروں طرف

متجسس نگاہوں سے دیکھتی، آہستہ آہستہ چلتی جیسے اس کی چال سے زمین کو تکلیف پہنچتی ہو۔

ایک شام بہت دور تک پیدل چلنے کے بعد کسی بات کے خاتمہ پر میں نے اپنے دوست سے پوچھا "تمہاری بہن کے شوہر کو میں نے آج تک نہیں دیکھا؟"

میرے دوست نے میری آنکھوں میں خاموشی سے جھانکتے ہوئے جواب دیا "اس کی شادی ابھی تو نہیں ہوئی"

میں نے پوچھا "یہ کیا؟" میرے دوست نے نہ جانے کیا خیال کیا۔ کچھ سوچ کر آہستہ سے بولا "لڑکی کو دیکھنے کے بعد لڑکے نے ناپسند کر دیا"

بڑی عجیب تھی وہ شام کسی انجانے درد سے میرا دل چاک ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ ایسا لگا جیسے میں وحشی انسانوں کے بازار میں بیٹھا ہوا ہوں جہاں چند سکوں کے عوض عورتیں نیلام ہو رہی ہیں، جہاں وحشی مرد بکاؤ عورتوں کے بدن کو اپنی انگلیوں سے دبا دبا کر دیکھ رہے ہوں اور کہہ رہے ہوں —— بالکل بیکار ہے، مجھے پسند نہیں، کوئی اور —— اس لڑکی کی بابت سوچتے ہوئے میری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

گھاس پر رکھا ہوا تان پورہ وہ پھر اپنے ہاتھوں میں اٹھالیتا ہے۔ انگلیوں اور تاروں کے مابین جانے کیا باتیں ہوتی ہیں، تھوڑی دیر کے بعد وہ آہستہ آہستہ کہتا ہے!" دو دن کے بعد کوئیڈور میں اس لڑکی سے پھر میری ملاقات ہوئی۔ پہلی بار میں نے اسے جی بھر کر دیکھا، میں بڑی دیر تک اسے دیکھتا رہا۔ نہ جانے میں اس چہرہ اور اس کی آنکھوں میں کیا تلاش کر رہا تھا۔ اس کے بعد میں نے غیر واضح آواز میں، دل ہی دل میں کہا "کیا میں اس لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا" دل کے حضور جذبات کی یہ ایک قابل رحم درخواست تھی۔

ایک دن، دو دن، اسی طرح کتنے دن گذر گئے۔ اور کچھ یاد نہیں، صرف اتنا یاد ہے کہ رفتہ رفتہ وہ لڑکی میری نظروں کو بھلی معلوم ہونے لگی اس کی بدصورتی میں بھی میں نے بہت ساری خوبصورتی تلاش کر لی تھی، جذبات نے اتنے دنوں بعد دل پر فتح حاصل کر لی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے سچ مچ میں اس لڑکی سے محبت کرنے لگا ہوں۔

وہ پھر رُک جاتا ہے تان پورہ گھاس کے فرش پر رکھ دیتا ہے۔ دیوداروں کی شاخ پر بیٹھا ہوا ایک پرندہ ہوا میں لہریں پیدا کرتا ہوا دور افق کی طرف اڑ جاتا ہے، جہاں پرستاروں کی انجمن جھیل کے پانی میں نہا رہی ہے۔ بڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ پھر دھیمے لہجے میں کہتا ہے "سمجھو اس درمیان دو سال کا طویل عرصہ گذر گیا۔ میں نے سوچا، اب زیادہ دن خاموش رہنا ٹھیک نہیں، تمام باتیں اس سے کھل کر کہہ دینا چاہئیں۔ پھر بھی آسانی سے تمام باتیں میں اس سے نہ کہہ سکا دل و دماغ میں کشمکش جاری رہی۔

آخر ایک رات جب رِم جھم بارش ہو رہی تھی، کسی خیال کے زیر اثر میں دوست کے گھر جا پہنچا، معلوم ہوا میرا دوست گھر پر موجود نہیں۔ اس دن بھی میں اور دنوں کی طرح واپس آسکتا تھا، لیکن نہیں آیا، میں نے اس لڑکی کا نام لے کر کہا "اُسے بُلا دو"

سرخ قالین بچھائے ہوئے ایک خوبصورت ڈرائنگ روم میں آہستہ خرامی کے ساتھ آ کر وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ میں سب کچھ بھول گیا پھر کچھ میں نے کہا "بیٹھو، کوتھا آپ چھے، بیٹھو، تم سے باتیں کرنی ہیں" تھوڑی دیر تک وہ حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر خاموشی سے کُشن پر بیٹھ گئی، آہستگی سے بولی "فرمائیے"

میں نے کہا "ٹھہرو، کہتا ہوں" میری نگاہیں اس کے پیروں پر گڑی ہوئی تھیں اور وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ پھر بولی "کچھ کہنا چاہتے ہیں"

میں نے کہا "ہاں بتاتا ہوں"

یاد نہیں، اس کے بعد بھی میں کتنی دیر خاموش رہا۔ اس کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سن کر مجھے ہوش آیا۔ نظریں اوپر اٹھائیں تو نگاہیں چار ہوئیں، ایسا محسوس ہوا جیسے سارے بدن سے پسینے چھوٹ رہے ہیں۔ اپنی نگاہیں گھڑیال کی طرف پھیر کر میں نے بڑے عجیب لہجہ میں کہا "میں تم سے محبت کرتا ہوں تمیلی"

اتنی سخت اور مشکل گھڑی میری زندگی میں پھر کبھی نہیں آئی۔ گھڑیال سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر اس کی طرف دیکھوں، اس وقت مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ تھی، کمرے پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف گھڑیال کی ٹک ٹک ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی، میں کتنی دیر تک اس پر نظریں جمائے رہا۔

یکایک وہ نرم لہجہ میں بولی "اس بارے میں مجھے کچھ بھی نہیں کہنا" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "کچھ بھی نہیں" وہ اپنی نظریں نیچی کر کے بولی:

"نہیں"

میں نے پھر پوچھا: "تم بھی تو کچھ کہہ سکتی ہو؟" اس نے نہ جانے کیا خیال کیا۔ کچھ سوچ کر بولی: "جو بات میں کہوں گی وہ آپ کو اچھی معلوم نہ ہوگی۔" اتنا کہہ کر ساڑی کے آنچل سے کھیلنے لگی، اس کے بعد دھیرے سے بولی: "اچھا اب میں جاتی ہوں۔" اور جس دروازے سے وہ کمرے میں آئی تھی، آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اسی دروازے سے واپس چلی گئی۔

میں بڑی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ اٹھنے لگا تو ایسا معلوم ہوا جیسے مجھے لقوہ مار گیا ہو۔ میرے دونوں پاؤں چلنے کے قابل نہ رہے ہوں۔

وہ پھر رک جاتا ہے۔ تان پورہ اٹھا لیتا ہے۔ چند لمحوں تک بجاتا رہتا ہے، یکایک تان پورہ کا ایک تار ٹوٹ جاتا ہے اور جیسے ایک دھیمی چیخ ابھر کر خاموش ہو جاتی ہے۔ وہ پوچھتا ہے "اور بھی سننا چاہتے ہو؟"

میں کہتا ہوں: "سناؤ۔"

وہ دروازوں کی طرف ٹکٹکی لگا کر دیکھتا ہے۔ پھر کہنے لگتا ہے۔ "اس کے بعد کئی دنوں تک مجھے ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے میری طاقتِ گویائی چھن گئی ہو، سارے بدن میں ناقابلِ برداشت اضطراب سما گیا ہو، سر میں ہر وقت درد رہنے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے میرے دماغ میں وحشیوں کا ناچ ہو رہا ہو۔ رات کے وقت بستر سے اٹھ کر بیٹھ رہتا، جنگلے کے پاس کتنی ہی دیر کھڑا رہتا، ٹہلتا، اس کے بعد بستر پر جا کر سونے کی کوشش کرتا، لیکن کہیں سکون نہ ملتا۔ ہر وقت ایسا محسوس ہوتا جیسے ہر چہار طرف ویرانی چھائی ہوئی ہو، جیسے میرے پاس کوئی چیز تھی، وہ گم ہو گئی ہے۔ میں نے محسوس کیا میرے پاس وہ لڑکی نہیں تھی، جس سے میں محبت کرتا تھا۔ جب کبھی مجھے اس کی یاد آتی۔ ایسا لگتا جیسے میرے سینے میں کسی نے موم بتی جلا کر چھوڑ دی ہو، آہستہ آہستہ میرا لہو جل رہا ہو، قطرہ قطرہ ٹپک رہا ہو اور جلے ہوئے خون کی بدبو سے میرا دماغ پھٹا جا رہا ہو۔ یہ آگ سینے سے تمام جسم میں پھیل گئی، میرا تمام جسم اس آگ میں جل کر خاک ہونے لگا۔"

وہ پھر رک جاتا ہے۔ آسمان پر سفید بادلوں کے ٹکڑے جنوب سے پرواز کرتے ہوئے دیواروں کی پھنگیوں کو چھوتے ہوئے شمال کی طرف چلے جاتے ہیں، ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا نہ جانے کہاں سے آ کر ہم دونوں کے چہرے اور جسموں سے لپٹ کر گذر جاتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں: "اس کے بعد کیا ہوا؟"

"اس کے بعد؟" وہ نظریں اوپر اٹھا کر میری طرف دیکھتا ہے، تان پورہ کا ٹوٹا ہوا تار جوڑتے ہوئے کہنے لگتا ہے: "اس کے بعد؟ اس کے بعد میرے دن کس طرح گذرنے لگے، یہ بتانے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ یوں سمجھ لو، تمام جسم کا اضطراب سمٹ کر دل کے ایک گوشے میں چلا آیا، کسی روز اگر رات کے وقت نیند ٹوٹ جاتی، یا ہر رم جھم پانی برس رہا ہوتا، تو یہ درد، یہ اضطراب دل میں جاگ اٹھتا اور سارے بدن میں ایک تناؤ پیدا کر کے پھر اپنی جگہ پر لوٹ جاتا، محسوس ہوتا جیسے سینے میں کوئی شے جل رہی ہے۔ تمام رات اسی حالت میں گذرتی۔ رات کو اٹھ کر تان پورہ کے سروں کی ہم آہنگی سے موسیقی کی تخلیق کرتا، رات کب ختم ہوتی مجھے پتہ بھی نہ چلتا۔ اس کے بعد کئی سال گذر گئے، کتنی ہی تبدیلیاں ہوئیں، نقشے بدل گئے، تاریخیں بدل گئیں، تہذیبیں بدل گئیں انسانی زندگی میں کتنے ہی انقلابات رونما ہوئے، لیکن یہ درد جیسے میری زندگی میں سما کر رہ گیا تھا!"

وہ پھر رک جاتا ہے۔ میں دریافت کرتا ہوں: "کیا تمہاری کہانی یہاں پر آ کر ختم ہو جاتی ہے؟" وہ ٹھنڈی سانس لے کر کہتا ہے: "نہیں، یہاں سے شروع ہوتی ہے۔" میں سرسری طور سے پوچھتا ہوں: "وہ کیسے؟"

وہ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے: "بہت ممکن تھا، میں پاگل ہو جاتا کیونکہ میں اس کے متعلق جتنا زیادہ سوچنے لگا، اس سے اور بھی شدت سے محبت کرنے لگا۔ اس دوران ایک روز شام کے وقت میرے دوست نے کہا: "ایک بات میں کئی دنوں سے تم سے کہنے کے لئے سوچ رہا تھا، لیکن شرم سے اب تک نہ کہہ سکا۔" میں نے پوچھا: "کون سی بات؟" بڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے جواب دیا: "میلی سے تم محبت کرتے ہو، ٹھیک ہے نا؟" ہم دونوں کے چہرے سرخ ہو گئے۔

میں نے کہا: "محبت کرتا ہوں، اور آج بھی محبت کرتا ہوں۔" وہ دھیرے سے مسکرا کر اس نے سگریٹ سلگایا، اس کے بعد بولا: "وہ بھی تم سے محبت کرتی ہے۔" ایک لمحہ کے لئے میرے سارے بدن میں مسرت کی برقی رو دوڑ گئی، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے دو پر لگ گئے ہوں اور میں ہواؤں میں پرواز کر رہا ہوں۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سینے سے لگا لیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا: "سچ کہتے ہو؟"

میرا دوست ہنسا: "میں نے اس کے ساتھ بات کی ہے، بڑی گھنی لڑکی ہے، اتنے دنوں خاموش تھی، لیکن اب جب اس سے برداشت نہ ہو سکا تو

تو خود اپنی زبان سے اس نے سب کچھ بتا دیا۔"

اس کے بعد وہ طویل وقفے کے لئے خاموش ہوگیا۔ دیواروں کی شاخوں پر رات بڑھ رہی تھی، درختوں کے پتوں سے شبنم کے قطرے زمین پر گر رہے تھے۔ دور وادیوں میں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ وہ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا "کئی دن میں گم سم، خاموش خاموش رہا، دل میں ہر وقت اداسی کا نغمہ گونجتا رہا۔ اک روز آدھی رات کے وقت میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت میرا دل بُری طرح کانپ رہا تھا۔ تان پورہ کے تار کی طرح لرز رہا تھا، مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری کوئی چیز گم ہوگئی ہے، کوئی چیز میرے پاس تھی، اب وہ نہیں ہے۔ میں بستر سے اُٹھ کر بیٹھ گیا، پھر گھنٹوں جنگلے کے پاس کھڑا رہا، کمرے میں چکر کاٹنے لگا، اور جب دوبارہ بستر پر گیا تو محسوس ہوا جیسے میرا دل خالی ہوگیا، ویران ہوگیا ہو جیسے کوئی چیز میرے پاس تھی، وہ گم ہوگئی ہے۔ اور پھر میں نے محسوس کیا، میرے دل میں وہ درد نہیں تھا، جو رفتہ رفتہ بڑھتا رہا تھا، جوان ہوتا رہا تھا۔ تمام رات مجھے نیند نہیں آئی۔ بڑی بے چینی کے عالم میں رات گذر گئی۔ ایک دن میرے دوست نے آکر کہا: "اس نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے۔ بابا نے اس کی شادی کسی دوسری جگہ طے کردی ہے۔ کیا اب بھی تم خاموش بیٹھے رہو گے؟" میں نے کہا "مجھے چند دنوں کی مہلت دو، اسے اپنے گھر لانے کے لئے مجھے تھوڑی بہت تیاری کرنی پڑے گی۔" میرا دوست چلا گیا۔

اسی رات، سبھی، اسی رات ہاتھ میں تان پورہ لے کر میں شہر چھوڑ کر دور گاؤں کی طرف چل پڑا۔ اُس کے بعد مختلف شہروں اور بندرگاہوں میں گھومتا رہا۔ کتنی ہی برسات کی بھیگی راتیں بیت گئیں، لیکن میرے دل میں اب وہ پہلے جیسا اضطراب نہیں رہا تھا، درد کی وہ کسک نہیں رہی تھی، ہر وقت دل سونا سونا معلوم ہوتا، طبیعت بڑی بدمزہ رہنے لگی، وہ لڑکی مجھے یاد آتی رہی، ہمیشہ یاد آتی رہی: وہ جب بھی یاد آتی، ماضی کی بہت ساری بھولی بسری باتیں یاد آجاتیں، بچپن کے دن، جوانی کے ایام، بہت سارے جانے پہچانے اپنے پرائے لوگ، سبھی یاد آتے، لیکن اس کی یاد میں اب پہلے جیسی جلن نہیں تھی، جذبات میں وہ گرمی نہیں تھی، بعض اوقات اس کے متعلق سوچتے ہوئے کبھی مجھے بُرا معلوم ہوتا۔ طبیعت بیزار سی ہو جاتی۔"

"اسی طرح میری سیاحی کے دن گذر رہے تھے۔ اسی دوران ایک واقعہ رونما ہوا۔ ایک شام ریل کے ڈبے میں بیٹھا ہوا تان پورہ کے تاروں سے کھیل رہا تھا، ٹرین بھاگی جا رہی تھی، مجھے یاد نہیں، کسی غیر معلوم اسٹیشن پر ایک نوجوان اور اس کے ساتھ ایک دوشیزہ ڈبے میں داخل ہوئے۔ میں خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ یکایک ان پر نظر پڑ گئی۔ دیکھا وہ دونوں بھی کسی خیال میں کھوئے ہوئے تھے۔ ان کی بے خبری کا یہ عالم تھا کہ میرے وجود سے قطع نظر لڑکی نوجوان کی گود میں سر رکھ کر نیچے کی برتھ پر سو گئی۔ نوجوان آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے اس کے بالوں میں کنگھی کرنے لگا۔ دونوں سرگوشیوں میں جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔"

"میری متحرک انگلیاں غیر ارادی طور پر رک گئیں۔ میں بڑی دیر تک غور سے ان دونوں کو دیکھتا رہا، اس کے بعد اگلے اسٹیشن پر اتر گیا۔ دوسرے دن صبح کے وقت ڈھاکہ پہنچا اور سیدھا دوست کے گھر گیا، میرا دوست گھر پر موجود نہیں تھا، لڑکی کا نام لے کر میں نے کہا: "اسے بلا دو، چند باتیں کرنی ہیں۔" گھڑیال اس وقت بھی ٹک ٹک کر رہا تھا۔

چند لمحوں کے بعد آہستہ قدموں سے چل کر وہ میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی "آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا "ہاں، تم سے چند باتیں کرنی ہیں، بیٹھو۔" میری آواز میں پہلے دن کی طرح کپکپی نہیں تھی۔

وہ سامنے کشن پر بیٹھ گئی۔ بولی "بولو، فرمائیے" تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔۔۔ "میں نے تمام انتظام مکمل کرلیا ہے بیلی: اب جتنی جلدی ممکن ہو سکے ہم دونوں کو شادی کرلینا چاہئے۔"

میں اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کر رہا تھا، وہ بھی مجھ سے نظریں ملائے ہوئے تھی، وہ بڑی دیر تک خاموش نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی اس کے بعد اس کے چہرے پر خفگی عود کر آئی "آپ کا دماغ خراب ہوگیا ہے کیا؟" میں نے حسرت سے پوچھا "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

وہ یکایک کشن چھوڑ کر کھڑی ہوگئی اور ترش لہجے میں بولی "آپ ایسے آدمی ہیں، مجھے معلوم نہ تھا۔ آپ بیمار لوجاہوا اچھت" اتنا کہہ کر تیزی سے کمرے کے باہر چلی گئی۔ میں ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے میں مفلوج ہوگیا ہوں، میرے دل میں برسوں کا سویا ہوا درد ایک بار پھر انگڑائی لے کر جاگ اٹھا سینے میں پھر موم بتی کی جلتی ہوئی لو کی طرح سوزش ہونے لگی، اور مجھے ایک بار پھر یہ احساس ہونے لگا کہ میرے پاس کوئی چیز تھی، لیکن اب وہ نہیں ہے!

★

دِیا

غلام الثقلین نقوی

خالد کا مکان بھی اتنا بڑا نہ تھا۔ یہی دو کمرے۔ ایک بیٹھک اور ایک صحن جس کے گرد چار دیواری تھی۔ لیکن ننھے خالد کو اپنا گھر ہمیشہ اس کٹیا کے مقابلے میں محل نظر آیا جس میں بڑھا نبی بخش اور اس کی چھوٹی بیٹی نیماں رہا کرتے تھے اور جس کے کھلے آنگن میں شیشم کا ایک بڑا درخت تھا۔

خالد کا گاؤں شہر سے چار میل کے فاصلے پر تھا۔ خالد کا باپ کچہری میں ملازم تھا۔ پہلے وہ گاؤں کے اندر اپنے آبائی کچے مکان میں رہا کرتے تھے پھر خالد کے باپ نے گاؤں سے باہر یہ پختہ مکان تعمیر کروا لیا اور وہ اس گھر میں اُٹھ آئے۔ خالد کو پہلے دن ہی سے اس مکان سے اُنس پیدا ہو گیا۔ اس کے ارد گرد دور دور تک کھلے کھیت تھے، اور درختوں کے جھنڈ جہاں سارا دن پرندے چہچہاتے اور اڑتے رہتے تھے اور اس کی دیواروں کا رنگ لال تھا۔ گاؤں کے اندر کچی گلیاں تھیں اور گندے پانی کی نالیاں۔ خاص طور پر برسات کے دنوں میں تو گاؤں کے اندر کا حصہ لبلبا کیچڑ بن جاتا۔ خالد کو کیچڑ سے بہت نفرت تھی دو قدم چلو اور کپڑوں کا ستیاناس۔ جوتوں کا تو برا حال ہو جاتا۔ بدبودار کیچڑ میں سن کر وہ مردہ چوہے معلوم ہونے لگتے۔

نبی بخش کی کٹیا ان کے مکان کی تعمیر سے پہلے کی بنی ہوئی تھی۔ یہ مٹی کا بنا ہوا چھوٹا سا گھروندہ دو کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا۔ اس کے دالان کے گرد چار دیواری بھی نہ تھی۔ نبی بخش کی زمین بہت کم تھی۔ اسلئے وہ شہر میں محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتا تھا۔ وہ صبح منہ اندھیرے شہر چلا جاتا اور رات گئے واپس آتا لیکن خالد کا باپ دن چڑھے گھر سے نکلتا اور شام کو سورج چھپنے سے پہلے گھر لوٹ آتا کیونکہ اس کے پاس سائیکل تھا۔

پہلی رات خالد نے بڑے چاؤ سے نئے مکان کی صاف ستھری بیٹھک میں چارپائی بچھائی وہ لالٹین روشن کرنے والا ہی تھا کہ نبی بخش کی کٹیا میں دیا جلا۔ اس نے نہ جانے کیوں دیا سلائی کی ڈبیا پائی پر رکھدی اور کھڑکی کے راستے اُس دیئے پر نظر جما دی جس کی ننھی سی لَو گہرے بادلوں میں لپٹے ہوئے تارے کی مانند کپکپا رہی تھی۔ خالد کو یہ منظر عجیب سا لگا۔ اماں کی سنائی ہوئی داستانوں کا طلسماتی منظر جیسے وہ الف لیلیٰ کے کسی مسافر شہزادے کی طرح لق و دق بیابانوں میں رستہ بھول گیا ہو اور یہ ننھی سی لَو کانپ کانپ کر اس سے کہہ رہی ہو "بھٹکے ہوئے ننھے مسافر شہزادے ادھر آ، میں تجھے راستہ دکھاؤں"۔ خالد دیر تک کھڑکی کے سامنے کھڑا رہا۔ اس کی نگاہیں باہر کے اندھیرے کو جو شیشم کے سائے کے ساتھ مل کر اور زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ ایک پل تصور کر کے دیئے تک پہنچ رہی تھیں بانس ایک نیلا جو دئیے کی لَو اور اس کی مسحور نگاہوں کے درمیان حائل ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ کہاں کھڑا ہے اور وہ دیا کہاں جل رہا ہے۔ اُسے صرف اندھیرے کے تو بر تو پردوں میں ٹمٹماتی ہوئی لَو کا احساس تھا جو اب آسمان اور زمین کے درمیان لٹکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یکایک لَو جھلملائی اور بجھ گئی اور خالد کو دھچکا سا لگا۔ چند لمحوں کے لئے وہ اندھیروں میں گم رہا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ اپنی دُنیا میں لوٹ آیا۔ اس نے دیا سلائی رگڑی۔ لالٹین جلائی کھڑکی بند کی اور چارپائی پر بیٹھ کر سکول کا کام کرنے لگا۔ کام ختم کر کے اس نے لالٹین گل کی اور گہری نیند سو گیا صبح تک رات کی پراسرار روشنی اسے یاد تک نہ رہی لیکن اس کے تخیل میں اتنا سا احساس ضرور باقی رہا کہ وہ لال محل کا رہنے والا شہزادہ ہے اور اس کے محل کی بلند دیواروں کے سائے میں نیماں کی کٹیا ہے۔ جہاں کل رات اس کی صحرا نوردی اُسے لے گئی تھی۔ شاید یہ بھی الف لیلوی خوابوں کا ایک کرشمہ تھا۔

اس دن مدرسے سے واپسی کے وقت راستے میں وہ نذیر اور بشیر کے ساتھ گینڈ بلا کھیلنے کے لئے بھی نہ رکا۔ وہ سیدھا بیٹھک میں پہنچا اور بستہ الماری میں رکھ کر کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ باہر کا نظارہ بے حد دلفریب تھا۔ فروری کے مہینے کی سہ پہر تھی۔ سنہری دھوپ۔ گندم کے سرسبز کھیت۔ درختوں پر پھوٹنے والی ہری ہری کونپلیں۔ نیلا آسمان اڑتے ہوئے پرندے۔ کھڑکی میں سے یہ منظر کتنا بھلا لگ رہا تھا حالانکہ وہ سکول سے واپسی کے وقت انہیں کھیتوں میں سے گزر کر آیا تھا۔ وہی سنہری نرم دھوپ تھی۔ یہی دھلا دھلا سا نیلا آسمان تھا لیکن اس کمرے میں آکر یہ منظر اگرچہ بدلا تو نہیں تھا لیکن اس میں عجیب معنی پیدا

ہو گئے تھے۔ اور پھر..... اس منظر میں نبی بخش کا گھر وندا بھی تو کچھ عجیب سا لگ رہا تھا...... وہ دیر تک اس منظر میں کھویا رہا۔ پھر باہر نکل آیا۔ نبی بخش کی کوٹھا اُسے پہلے خالی نظر آئی۔ پھر اس نے غور سے دیکھا تو دالان کے ایک کونے میں شیماں نظر آئی جو چولھے کی آگ بھڑکانے کے لئے پھونکیں مار رہی تھی۔ اس نے شیماں کو پہلے بھی کئی بار دیکھا تھا لیکن وہ شیماں کے پاس سے یوں گزر جاتا تھا جیسے وہ کوئی کراڑ پڑا پتا ہو اور آج بھی شیماں اس کی توجہ اپنی طرف نہ کھینچ سکی۔ حالانکہ اس نے دھوئیں سے بھری ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور دیکھ کر مسکرائی۔ ننھے خالد کو یہ مسکراہٹ بھی کچھ بھلی معلوم نہ ہوئی۔ میلے چیکٹ کپڑوں کی گٹھڑی بنی ہوئی مریل سی شیماں کی اس بیماری سی مسکراہٹ میں کوئی کشش نہ تھی۔ "ہوں" اس نے قدم بڑھاتے ہوئے سوچا۔ "میں شیماں کے ساتھ کیوں کھیلوں، مجھے شیماں سے کیا غرض؟" اور واقعی شیماں اس قابل کہاں تھی کہ خالد اسے منہ لگاتا۔ وہ خالد جو ہمیشہ دُھلے ہوئے صاف کپڑے پہنتا اور جس کے بالوں میں صبح سویرے اس کی امی کنگھی کرتیں اور جو لال محل کا رہنے والا شہزادہ تھا۔ وہ شیماں کی کٹیا میں کیسے آتا بھلا شیماں سے کھیلنے کے لئے؟ خالد بڑی بے نیازی کے ساتھ جھونپڑے کے پاس سے گزر گیا۔ شیماں پھر چولھے کے دھوئیں میں الجھ گئی اور اس کی آنکھیں دھوئیں سے بھر گئیں اور ان سے گدلا سا پانی بہنے لگا۔

نذیر اور بشیر کے ساتھ خالد دیر تک گیند بلا کھیلتا رہا حتیٰ کہ شام پڑ گئی اور مغربی افق پر لٹکے ہوئے بادل لال لال پرندے بن گئے اور پرندے بیتاب ہو ہو کر اپنے آشیانوں کی طرف اڑنے لگے۔ اور خالد کے دل میں بے قراری کی ایک تند لہر اٹھی اس نے آخری گیند پھینکی اور کہا "میں اب جاتا ہوں"۔

"کیوں ابھی سے؟" نذیر نے ہٹ لگا کر کہا "اب میری باری ہے"۔

"دیکھتے نہیں ہو شام پڑ گئی ہے"۔ خالد نے تیز تیز کہا۔

"لیکن تم ہمیشہ دوسرے کی باری پر بھاگ جایا کرتے ہو۔ نہ بھائی ہم تو نہ جانے دیں گے"۔ نذیر نے چمک کر کہا۔

بشیر نے بھی نذیر کی حمایت میں ٹھنک کر کہا ——— "خالد بھائی اپنی باری دے کر جاؤ"۔ خالد نے مجبور ہو کر دو تین گیندیں پھینکیں۔ نذیر نے بڑھ بڑھ کر ہٹیں لگائیں۔ گیند پاس ہی گندم کے کھیت میں گر گئی۔ خالد نے گھبرا کر کہا:

"اب کیا ہوگا؟" نذیر نے فاتحانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا "گیند تلاش کرو۔ کون سی دیر لگے گی؟" خالد نے مغرب کی طرف دیکھا۔ اب تو لال لال بادل بھی کالے پڑتے جا رہے تھے اور اس کے سینے کا طوفان لحظہ بہ لحظہ پُرشور بنتا چلا گیا اور رات تیزی سے بڑھنے اور تاریکیاں چھانے لگیں۔ خالد کو محسوس ہو رہا تھا کہ گزرنے والا ایک ایک لمحہ اُسے ایک انجانی مسرت سے دُور لئے چلا جا رہا ہے۔ اُس نے گھبرا کر گندم کے پودوں کو اُلٹ پلٹ کیا۔ کچھ پودے اُس کے پاؤں تلے مسلے گئے۔ گھبراہٹ کے مارے وہ یکسوئی کے ساتھ تلاش بھی نہ کر سکتا تھا۔ آخر اس نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا "نذیر بھائی! بشیر بھائی! تم بھی تو میری کچھ مدد کرو"۔

"نہیں خالد! ہم نہیں آئیں گے۔ تم اپنی باری کا کام خود کرو"۔ خالد نے مغرب کی طرف ایک بار پھر دیکھا۔ بادل کا آخری ٹکڑا بھی بڑھتی ہوئی تاریکیوں میں جذب ہو چکا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا اور اُس کے آنسو آتے آتے رک گئے۔ اس نے گیند اٹھائی اور نذیر کی طرف پھینک دی۔

"یہ لو، اب مجھے جانے دو"۔ نذیر نے اپنی گیند لی اور خالد کو بلا دیتے ہوئے کہا "اب جاؤ لیکن یاد رکھو خالد بھائی کل تمہاری باری ہے گیند پھینکنے کی"۔

"اچھا"۔ خالد نے بلا ہاتھ میں لے کر کہا اور وہ اپنے گھر کی طرف اس تیزی سے بھاگا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہو۔ اس نے شمال کی ٹیا کی طرف کھلنے والی کھڑکی کے پٹ کھولے اور خالد اور شیماں کے گھر کے درمیان تاریکیوں کے پل اور اندھیروں کے پُراسرار خلا معلق ہو گئے۔ صحرا نورد مسافر راستہ بھول گیا۔ پھر شیماں کے گھر دیا ٹمٹمایا۔ ننھی سی لو تھرتھرائی، کانپی اور اندھیروں میں مدھم روشنی کے کپکپاتے ہوئے اشارے رقص کرنے لگے جیسے کہہ رہے ہوں "آؤ۔ آؤ ننھے مسافر ہم تمہاری راہنمائی کے لئے حاضر ہیں"۔ خالد تخیل کی وادیوں میں آوارہ ہو کر اس ننھی سی لو تک جا پہنچا اور دیر تک کہانیوں کے طلسماتی ویرانوں میں گم رہا... اور دیا پھر بجھ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ تاریکیوں کا پل اُس کے اور شیماں کے گھر کے درمیان حائل ہو گیا۔

اس کی اماں نے باورچی خانے سے پکار کر کہا "خالد بیٹا! آؤ کھانا کھا لو"۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے لالٹین روشن کر کے تپائی پر رکھی اور سکول کا کام کرنے لگا۔ کام کر کے وہ سو گیا اور آج رات بھی اس کی نیند اتنی ہی گہری تھی جتنی کل رات تھی۔

اگلی سہ پہر کو اس نے کھلی کھڑکی میں سے سنہری دھوپ، نیلے آسمان اور کھلے کھیتوں کا نظارہ کیا۔ تب گیند بلا کھیلنے کے لئے شیماں کی کٹیا کے پاس سے

گزرتے ہوئے پھر اُس نے ننھیاں کو چولھے میں پھونکیں مارتے دیکھا۔ پھر شیماں اُسے دیکھ کر مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو "آؤ خالد! میں سارا دن اکیلی رہتی ہوں۔ میرے ساتھ کوئی بھی آکر نہیں کھیلتا۔ تم ایک دو گھڑی کے لئے میرے پاس آجاؤ تو کیا ہرج ہے؟" لیکن خالد بے نیازی سے اُس کے پاس سے گزر گیا۔ محلوں میں رہنے والے شہزادے بھونپڑوں میں جا کر میلی کچیلی لڑکیوں سے نہیں کھیلتے۔ ہاں اگر لق و دق جنگلوں میں شکار کرتے وقت راستہ بھول جائیں تو دئے کی ننھی سی لو سے راہ نمائی حاصل کرنے کے لئے وہ فقیر کی کٹیا کو بھی اپنے قدوم میمنت لزوم سے مشرف کر لیتے ہیں۔ ورا س وقت تو نکھری ہوئی دھوپ تھی اور راستہ بھولنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا لیکن شام کے بعد جب بے چاند کی رات کے اندھیاروں کو سیلاب ڈھڈا تو خالد بھی تخیل کی وادیوں میں کھو گیا اور دئے کی مدھم لو کا سہارا لے کر شیماں کی کٹیا میں جا پہنچا اور دیر تک الف لیلوی داستانوں کا ہیرو شہزادہ بنا رہا!

آہستہ آہستہ بے چاند کی اندھیری راتیں ختم ہو گئیں۔ مہینے کی پہلی رات کا چاند سرِ شام نکل کر ڈوب گیا۔ دیا جلنے سے پہلے پہلے اس کی مدھم روشنی تاریکیوں کے پردے میں جذب ہو گئی اور خالد کو دئے کی کپکپاتی لو کے ساتھ چند لمحے کی محویت کا موقع مل ہی گیا لیکن دوسری رات چاند دیر تک زرد روشنی کے ساتھ آسمان کی بلندیوں پر مسکراتا رہا اور اس رات تاریکیوں کے خانہ بنے اور تخیل کے طلسماتی ہیولے نہ ابھرے اور دئے کی لو کی مدھم روشنی چاند کی زرد روشنیوں میں گویا گم ہو کر رہ گئی۔ خالد کو بے انتہا افسوس ہوا جیسے اس کے لبوں تک شہد کا بھرا ہوا پیالہ پہنچا لیکن چھین لیا گیا۔ خالد دیر تک چاند کے ڈوبنے کا انتظار کرتا رہا اور آخر چاند ڈوب گیا اور اس کے ساتھ ہی دیا بھی گل ہو گیا۔ خالد کے دل پر کھٹ سے ایک بوجھ آن گرا۔ آہ! آج وہ مسرت کہاں گئی جو ہر رات اُس کے تخیل کو لرزتی ہوئی روشنیوں سے آباد کیا کرتی تھی۔

تیسری رات یہ ناز او شور خ ہو گیا۔ اب چاند سورج کے ڈوبنے کا بھی انتظار نہ کرتا۔ مغرب میں سورج کا لال گولا ابھی تیروں سا ہوتا کہ مشرق کا دامن گلنار ہو جاتا اور چاند کا طلائی قرص ابھر آتا۔ اور رات زرد نقرئی روشنیوں سے منور ہو جاتی۔ شیماں کی کٹیا میں ہر رات دئے کی مدھم لو ابھرتی لیکن شیشم کے سایوں سے آگے نہ بڑھ سکتی اور خالد پہلی سی رنگین اُداس ہوتا رہا۔ پھر اُس کی کھلنڈری یادوں کے ہیولے مٹ گئے اور اس کی زندگی کا یہ نیا روان پرانے معمول کے چکر میں پس کر رہ گیا۔ اب وہ رات گئے تک گیند بلا کھیلتا رہتا۔ موسم بہار کی خنکیاں اور خوشبوؤں میں تیکتی ہوئی چاندنی میں گھل مل جاتیں اور خالد کو گیند بلا کھیلنے میں بے انتہا لطف محسوس ہوتا لیکن لیل و نہار کی گردش پھر چاندنیوں کے سیلاب سے گھپ اندھیروں کے اُمڈتے ہوئے گہرے بادلوں کی طرف لوٹ آئی۔ خالد کی یادوں کے خلا میں پھر مدھم لو کے کپکپاتے ہوئے جادو بھرے اشارے ناچے اور وہ تیرہ چودہ دنوں کے بعد پھر کھڑکی کھول کر دئے کے جلنے کا انتظار کرنے لگا اور لق و دق ویرانوں کی بے کراں پہنائیوں میں کھو جانے کے لئے بیتاب ہو گیا لیکن دیر تک اندھیروں کے خلا میں وہ ننھی سی روشنی نہ ابھری اور خالد کا انتظار برف کے گالوں کی طرح اس کے سینے پر گرنے اور پھر جل بننے لگا۔ ایک ایک لمحہ صدیوں کی طولانی وسعت میں بدل گیا۔ یہ لمحہ جو گزر کر پھر زندہ ہو جاتا اور وہ لمحہ دور چلا جاتا جس کو پکڑنے کے لئے اس کی تخیل کی ہر قوت برق رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔

آخر اُس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ اٹھا اور بے خیالی کے عالم میں شیماں کے گھر گھپ اندھیرا تھا۔ اس نے دروازے کے قریب پہنچ کر کہا۔

"شیماں ..... آ ..... آج دیا کیوں نہیں جلا؟"

"کون ہے؟" نبی بخش نے پوچھا

"میں ہوں ..... خالد ..... میں دیر سے دئے کے روشن ہونے کا انتظار کر رہا تھا"

"کیوں؟" اندھیرے میں شیماں کی آواز ابھری" ...

"بیٹی شیماں! دیا جلا دو ..... تیل ختم ہے خالد میاں ..... دیا کیسے جلے؟ ..... لیکن دیا جلنے کا انتظار کیوں کرتے ہو؟" نبی بخش نے پوچھا۔ خالد نے سوچا وہ دیا جلنے کا انتظار کیوں کرتا ہے۔ اُسے دیر تک کوئی جواب نہ سوجھا۔ پھر اُس نے دھیمے سے بڑبڑا کر کہا "میں مسافر شہزادہ ہوں۔ جو ہر اندھیری رات کو راستہ بھول جاتا ہے۔ تمہارا دیا ہر رات مجھے راستے پہ لگاتا ہے" نبی بخش کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے اندھیرے میں خالد کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پھر اس نے کہا "خالد میاں ..... شیماں کو بخار ہے ..... وہ آج دئے میں ڈالنے کے لئے تیل نہ لا سکی۔ تم جاؤ میں ابھی تیل ڈلوائے لا تا ہوں۔ شام کے وقت دیا ضرور جلنا چاہئے"

نبی بخش دیا ہاتھ میں لے کر گاؤں کی طرف چل دیا۔ خالد دوڑ کر واپس آیا۔ وہ کھلی کھڑکی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ اندھیروں میں تخیل کے ویرانے ابھرے۔ بے آب و گیاہ ریگستانوں کے ہیولے ابھرے۔ شیماں کے گھر تک اندھیروں کے پل بنے اور خالد ننھے شہزادے کی گم کردہ موہوم ہستی میں گم ہو گیا۔ دیر بعد دیا جلا۔

سرخ روشنی کا نقطہ کانپا اور ننھے مسافر کو اپنا راستہ مل گیا۔

ہر شام دیا جلتا رہا اور خالد ہر سہ پہر کو بلا ہاتھ میں لیکر شیماں کے گھر کے پاس سے گزرتا رہا۔ وہ شیماں کے صحن کی طرف محض ایک نگاہِ غلط انداز ڈال لینا ہی کافی سمجھتا رہا۔ اُسے شیماں کی ہستی سے کیا مطلب؟ اُسے تو محض شیماں کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی روشنی سے پیار تھا اگرچہ دو تین دن سے اسے شیماں چولہے کے دھوئیں میں اُلجھی ہوئی نظر بھی نہ آئی لیکن ہر شام دیا جلتا رہا۔ اس لئے اس نے شیماں کی عدم موجودگی کو قابلِ اعتنا بھی نہ سمجھا لیکن ایک شام جب دیر تک شیماں کا دیا روشن نہ ہوا تو رنگ محل کا شہزادہ پھر بے قرار ہو کر شیماں کی کٹیا میں پہنچ گیا۔ اس نے دروازے کے قریب کھڑے ہو کر کہا۔ "بابا! آج پھر دیا نہیں جلا؟"

اندر سے نبی بخش نہ بولا البتہ ایک کمزور کانپتی ہوئی آواز نے کہا "خالد بابو! آج پھر دیئے میں تیل ختم ہے۔" خالد ایک دو لمحے خاموش رہا۔ پھر اُس نے کہا "بابا کہاں ہے؟"

"نجانے کہاں ہے۔" شیماں نے کہا "وہ تو ابھی لوٹ کر بھی نہیں آیا۔"

"دیا کہاں ہے؟" خالد نے بے قرار ہو کر کہا۔

"سامنے کی دیوار کے طاقچے ہیں۔"

"دیا مجھے دو شیماں۔ میں تیل ڈالدوں۔"

"خالد بابو! میں تو بہت بیمار ہوں۔ میں اُٹھ نہیں سکتی۔ تم خود لے لو۔"

خالد اندھیرے میں آگے بڑھا۔ اس نے ٹٹول ٹٹول کر طاقچہ تلاش کیا۔ دیا ہاتھ میں لے کر وہ بھاگا اور دکان سے تیل ڈلوا کر بھاگتا ہوا واپس آیا۔

"یہ لو شیماں۔"

"اسے جلا دو خالد بابو۔"

"نہیں۔ نہیں۔" خالد نے گھبرا کر کہا "ابھی نہیں۔ میں دیا تمہارے سرہانے فرش پر رکھ دیتا ہوں۔ میرے گھر پہنچنے سے پہلے پہلے دیا نہ جلے۔"

"ڈبیا بھی تو دیتے جاؤ۔ اسی طاقچے میں پڑی ہے۔"

خالد نے طاقچے سے ڈبیا تلاش کر کے شیماں کے ہاتھ میں تھمائی اور دوڑ کر بیٹھک میں پہنچ گیا۔ اس نے کھٹ سے کھڑکی کھولی۔ شیماں نے دیا سلائی رگڑی۔ دیا سلائی کا ننھا سا شعلہ اُبھر کر دیئے کی لَو کے ساتھ مل گیا۔ لَو آہستہ آہستہ بلند ہوئی اور اندھیروں کو چیرتی ہوئی اس تک پہنچ گئی اور خالد نے طلسماتی مسرت کا خزانہ پالیا۔

لیکن اس سے اگلے دن جب پھر وقتِ مقررہ پر دیئے میں بتی نہ پڑی تو خالد کچھ مایوس اور کچھ ناراض ہو کر شیماں کی کٹیا میں جا پہنچا۔ وہ پھر دروازے سے باہر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ابھی 'نبی بخش کو، بابا' کہہ کر پکارا بھی نہ تھا کہ شیماں کی مریل سی آواز آئی "بابا! خالد بابو دیئے کے جلنے کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ تم دیا کیوں نہیں جلاتے؟"

"دیئے میں تیل کل کا ختم ہے بیٹی۔"

"میں تیل ڈلوا لاؤں بابا؟" خالد نے پکار کر کہا۔

"بابا! خالد بابو آگئے۔" شیماں کی دھیمی آواز خوشی سے کپکپا رہی تھی "خالد بابو کل ہی تو تیل ڈلوا کر لائے تھے بابا! کل تم دیر سے آئے۔ میں نے خود ہی دیا جلایا اور بجھا دیا۔"

"خالد میاں!" نبی بخش نے کہا۔ "تم جاؤ۔ میں ابھی دیا جلاتا ہوں۔"

پراسرار وادیوں میں ہر رات راہ گم کر دینے والا شہزادہ دوڑ کر اپنے کمرے میں پہنچا۔ دیا جلا۔ خوابوں کا قافلہ روانہ ہوا۔ دیا ٹمٹمایا اور چند لمحوں بعد نہ جانے کیوں کپکپا کر بجھ گیا۔ خالد کا پراسرار خواب پریشان ہو گیا۔ مسرت کا خزانہ ایک جھلک دکھا کر غائب ہو گیا۔ وہ چند لمحوں تک تاریکیوں کے خلا میں الجھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اپنی دنیا میں لوٹ آیا۔ دوسرا دن مسکراتا ہوا بیدار ہوا۔ بے داغ نیلا آسمان سارا دن نقرئی دھوپ میں نہاتا رہا۔ سہ پہر کو سنہری دھول بکھری اور گندم کے ہرے ہرے کھیتوں پر سونے کی بارش ہوتی رہی۔ پھر شام ہوئی۔ مغرب کے دامن میں گلاب کے پھول کھلے اور اندھیروں کے بے پناہ سیلاب میں راکھ بن کر

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

غزل

جعفر طاہر

سینہ جو تنگ ہو بفضائے چمن تو ہو
دل وہ کہ اپنی ذات سے اک انجمن تو ہو

ہم بھی سنائیں اس قد و گیسو کی داستاں
یارو کہیں پہ سایۂ سرو و سمن تو ہو

ہم بھی دکھائیں طنطنۂ و فرِّ خسروی
پہلو میں کوئی شاہدِ شیریں سخن تو ہو

رخشائی ستارہ و شبنم کا دوں جواب
ہائے لفِ نگاہ میں کوئی کرن تو ہو

ہم بھی حریمِ لالہ و گل پر کریں خرام
ہمراہ تم سا کوئی بہاریں بدن تو ہو

کوئے بتاں ہی منزلِ اہلِ نظر سہی
ذوقِ نظر کو حوصلۂ برہمن تو ہو

انکار کب ہے لطفِ بہاراں سے دوستو
لیکن غزل سرا کوئی مرغِ چمن تو ہو

وہ جلوہ کر کہ تیرا سراپا بھی جل اٹھے
ہر عضو اک شرارۂ آذر شکن تو ہو

رو کے گا تم کو جور و ستم سے نہ کوئی ہاتھ
یہ بات کم نہیں ہے کہ اہل وطن تو ہو

صحرائے بے نشاں میں یہ آوارگی بھی کیا
کوئی رفیقِ راہ نہ ہو، راہزن تو ہو

صحرا کی سمت جائیں نہ اہلِ نظر کبھی
شہروں کی زندگی میں کوئی بانکپن تو ہو

کوئی تو ان بتوں میں سلیمی نظر پڑے
ان مہوشوں میں کوئی غزالِ ختن تو ہو

طاہرؔ اسے بھی ذوقِ دعا کا پتا چلے
ہم سا وطن میں کوئی غریب الوطن تو ہو

انشاؔ جی ہاں کہو تو یہ کیسی ہوئی غزل
گو ہم زباں نہیں ہو مگر اہلِ فن تو ہو

تابش دہلوی

مایوس نہیں اب تک شاید ترے سودائی
آئی جو خزاں سمجھے اب کوئی بہار آئی

آغوشِ تصور میں تُو ہے ترے جلوے ہیں
ہے جشنِ ہم آغوشی، اک اک شبِ تنہائی

تشہیرِ محبت بھی تیری ہی بدولت ہے
ملتی ہے کہاں ورنہ یہ عزتِ رُسوائی

ہاں اے غمِ جانانہ پھر اپنا بھرم رکھنا
پھر عشق نے باندھا ہے پیمانِ شکیبائی

انوارِ تجلّی سے، نظریں بھی تجلی ہیں
ہے آپ تماشا بھی اللہ رے تماشائی

اک صورتِ زیبا سے ہیں لاکھ تمنّائیں
اک نقشِ تصور ہے اور انجمن آرائی

حُسنِ مُتلوّن سے ہر دم مجھے حاصل ہے
اک لطفِ کم آمیزی اک رنجِ پذیرائی

کیوں عام نہیں ہوتا احساس محبت کا
کیوں اب مری وحشت کی ہوتی نہیں رُسوائی

دنیائے خرابی میں کثرت ہے غمِ دل کی
تنہا ہے ترا تابشؔ اے جلوۂ یکتائی!

* * *

غزل

مشفق خواجہ

ینتِ راہ طلب لالہ رخاں تھے کیا کیا
رازِ بے تابیٔ دل مجھ پہ عیاں تھے کیا کیا

، گئے حیرتیٔ جلوۂ فردوس خیال
جن پہ لمحے تری فرقت کے گراں تھے کیا کیا

ئے وہ لوگ، جو بچھڑے تو ملے پھر نہ کبھی
ہائے وہ لوگ سکونِ دل وجاں تھے کیا کیا

ی گردشِ حالات ذرا سوچنے دے!
نگہِ شوق کے دامن میں جہاں تھے کیا کیا

، قسمت کہ "سرِ کوئے مسیحا نفساں"
ہم خود آمادۂ بربادیٔ جاں تھے کیا کیا

، گئی "شعبدۂ حسنِ تغافل" بن کر
ہم کو جس "چشمِ توجہ" پہ گماں تھے کیا کیا

ترے شہر کی قربت سے ہے بہت کچھ۔ ورنہ
قافلے درد کے بے نام ونشاں تھے کیا کیا

ہتِ گل ہی نہیں "رہروِ بے راہ نما"
ہم بھی آوارہ سرِ کوئے بتاں تھے کیا کیا

رفعت سلطانہ

کون ممنونِ کرم ہو کل کا
ساقیا آج ہی ساغر چھلکا

اپنے احساسِ وفا کیش سے پوچھ
کیوں مری آنکھ سے آنسو ڈھلکا

کہہ رہی ہیں وہ فسوں گر آنکھیں
حُسن پابند نہیں کاجل کا

زندگی وادیٔ پُر خار ہے دوست
زندگی فرش نہیں مخمل کا

شبِ رفتہ کا پتہ دیتا ہے
رنگ اُن آنکھوں میں ہلکا ہلکا

کل تھا آبادیہ دل صورتِ شہر
آج ہے جس پہ گماں جنگل کا

سادگی پوچھ نہ اس عارض کی
جس طرح پھول کوئی جنگل کا

ذہن میں قوسِ قزح لہرائی
دیکھ کر رنگ ترے آنچل کا

کس نے پھر یاد کیا ہے رفعت
دل میں پھر درد ہے ہلکا ہلکا

فن :

اجمل کی مصوّری

بلقیس ذکی

اجمل کی فنی زندگی پر اگر نظر ڈالیں تو اسے کئی پہلوؤں سے منفرد پائیں گے۔ ابھی وہ نوعمر ہے۔ یہی کوئی تیس پینتیس سال کے لگ بھگ۔ مگر اب بھی اسے ایک معروف پاکستانی فنکار کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ یورپ کے کئی دارالحکومتوں میں اس کی تصاویر کی نمائشیں بھی ہو چکی ہیں۔ وہاں اس کے کام کو سراہا گیا ہے۔ گو پاکستان میں اس کی "یک شخصی" نمائشِ تصاویر کا اہتمام نہیں ہوا ہے۔

اجمل مشرقی پاکستان سے تعلق رکھتا ہے مگر اس کی نقش کاری کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہم جسے "ڈھاکہ اسکول" کی نقاشی سے تعبیر کرتے ہیں، اس چیز کا اس کے کام میں مطلق شائبہ نہیں ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اجمل کی عمر اور فنی تربیت کا زمانہ زیادہ تر کراچی میں گذرا ہے۔ ایک چیز اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ کارٹون نگاری اس نے بطور پیشہ اختیار کی ہے اور کوئی پندرہ سال سے ایک انگریزی روزنامہ میں باقاعدہ اس کام پر مامور بھی ہے۔ مگر اس کی کارٹون نگاری کو اس کی نقاشی سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ ہاں اسے مصوّری و نقاشی سے جو شغف رہا ہے وہ برابر موجود ہے۔ پیشہ کے جھنجٹوں کو نبٹانے کے ساتھ ساتھ وہ نقش بھی بناتا رہتا ہے بشرطیکہ طبیعت حاضر ہو۔ نقاشی کے منہ زور گھوڑے کو رام کر کے اور اسے تیز رفتاری سے آگے بڑھا کر وہ فنکار کی حیثیت سے ایک اونچے مقام پر فائز نظر آتا ہے۔

اجمل کی کامیابی کا راز کیا ہے؟ صلاحیت؟ غالباً۔ مگر صلاحیت سے زیادہ ایک اور چیز نے اپنا اثر مرتب کیا ہے اور وہ ہے انتھک مسلسل کام اور کاوش کا عمل۔ اجمل کے معمولات میں داخل ہے کہ وہ اپنے سٹوڈیو میں آٹھ آٹھ دس دس گھنٹے کینوس پر کام کرتا رہتا ہے۔ اور کرتا ہی رہتا ہے تا آنکہ نقش مکمل ہو جائے۔ مگر یہ تب ہی ہوتا ہے جب طبیعت حاضر ہو۔ قدرتی بات ہے کہ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ کوئی نقش اس نے شروع کیا مگر طبیعت اس سے مطمئن نہ ہوئی اور اس نے نقش ناتمام ہی چھوڑ دیا۔ امکان یہی ہوتا ہے کہ اب یہ نامکمل نقش شاید کبھی مکمل نہ ہو پائے گا۔

اجمل کے نزدیک نقش کاری کا عمل ایک تکمیلی عمل ہے اور جب تک طبیعت میں میلان اور اکساہٹ نہ ہو نقش کی داغ بیل نہیں ڈالتا۔ مگر جب شروع ہو گیا تو اسے اکثر پایۂ تکمیل تک پہنچا کر سانس لیتا ہے۔ حال ہی میں اس نے ایک نقش بڑے چاؤ سے بنایا۔ مکمل ہونے پر دورانِ گفتگو میں کہنے لگا "نقش تو میرے وجود کا ایک جزو بن چکا ہے۔"

★

اجمل کے موضوعاتِ نقش کیا ہیں؟ اس کا اسلوبِ نقش گری کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ ان باتوں کا جواب صرف ایک لفظ میں بھی سما سکتا ہے ——— تنوع۔

یوں۔ اجمل کو بعض موضوعات سے بڑی دلچسپی ہے۔ ایسے موضوعات جن میں زندگی ہمک رہی ہو۔ گلی کوچوں میں پھرنے والے گویّے۔ عام کوچہ نورد، کشتی بان، گاؤں کی چھوریاں، گھڑے والیاں، لڑکی اور گلدستہ وغیرہ وغیرہ۔

صرف یہی نہیں۔ اجمل کے کام میں "اسٹل لائف" کی نقش گری کے روپ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ ان میں روشنی اور سائے کی طرفہ کاری، خطوط کی ترتیب و تہذیب اور متوازن دل آویزی ایک ایسا خوش جمال آمیزہ بن جاتا ہے کہ وجدان سرشار ہوتا اور نگاہیں آسودگی کا احساس کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔

★

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا اجمل کے کام میں بڑا تنوع ہے اور اسی اعتبار سے اسلوبوں کی گوناگونی اور تکنیک کی فراوانی بھی نظر آئے گی۔

یکسر مردضی موضوعات سے لے کر خالصاً تجریدی فن تک اجمل کا موقلم اپنا جوہر دکھا چکا ہے۔ تکنیکی نکتہ چینیوں کا شور بے ہنگام تو یہی کہتا سنائی دیگا کہ اجمل ابھی "حالتِ سفر" میں ہے۔ "منزل" پر نہیں پہنچا! خیر وہ تو زمانے کی بات ہے مگر یہ تو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے کہ اجمل کو نئی تکنیکوں پر حیرت انگیز گرفت حاصل ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ کسی "ازم" کے دم چھلے سے لٹکنا بھی پسند نہیں کرتا۔ ایک آزاد روش کا خود اعتماد صناع ہے۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں پہلے سے کسی تکنیک کو طے کر کے کام شروع کرنے کا قائل نہیں۔ میرا موضوع خود میرا ہاتھ بٹاتا ہے۔ صحیح تکنیک پر وہ خود میرے ہاتھوں، میری نگاہوں اور ذہن کو راجع کر دیتا ہے۔ جب ناظر اجمل کے کام کے تنوع اور ہمہ گیری کو دیکھے تو یہ ادعا اسے ماننا ہی پڑتا ہے۔ اور دل کچھ ایسا محسوس کرتا ہے کہ اس کے سوا دوسری تکنیک برتی ہی نہ جا سکتی تھی!

★

اجمل کو لہراتے ہوئے خطوط لگانے اور پاکیزہ رنگوں کے روشن روشن دھبے پیدا کرنے سے شغف ہے۔ اس کے لئے وہ پیلٹ چھری سے کام کرنے کے عادی ہیں۔ اس چھری سے رنگوں کا کام کرنے میں انہیں کچھ لطف آتا ہے۔ بڑے بڑے کشادہ گمبھیر اور خالص رنگ کے کھلے کھلے قطعے جن کو وہ چوڑی سی پیلٹ چھری سے چونکا دینے والے ضبط اور جسارت کے ساتھ نقش کئے جاتا ہے۔ رنگوں کو لینوس پر لگانے کے لئے وہ واقعتاً لیپ دیتے ہیں۔ پھر پیلٹ چھری سے بڑی شدید جنبشوں کے ساتھ ان رنگوں کو پھیلانا شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح نقش کی نادر بافتیں، ایک جچا تُلے کے ساتھ اپنی نمود اختیار کر لیتی ہیں۔

ابھی نیویارک میں اجمل کے نقوش کی نمائش ہوئی تھی۔ ان کے کام پر تبصرہ کرتے ہوئے وہاں کے مشہور مجلے ARTS DIGEST نے بڑے توصیفی کلمات استعمال کئے تھے اور اس خصوص میں اجمل کے نقوش کے اس پہلو کو سراہا تھا جس میں طرحدار اشکال مخصوص الوانی فضا میں رچ کر مرصع کاری کا سا روپ دھارتی ہیں۔ یا پھر اس کے کام کی خصوصیت میں پیلٹ چھری کا مشاقانہ استعمال اور رنگدار حصّوں کا دھیما پن ہے۔ عمارتی وغیرہ اور سایوں کے آمیزہ کو وہ بڑی بیساختگی سے لاتے ہیں اور حواس پر اس عمل کی تندی کا موڈ چھا جاتا ہے۔

بعض نقادوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اجمل کو حرکت و عمل کے مختلف روپوں کو اسیر کرنے میں یدِ طولیٰ حاصل ہے۔ کچھ مبصرین نے اس کے آب رنگی اسکیچوں میں مشق و جسارت کے تصوّر کی داد دی ہے۔

بہر نوع، اجمل کے کام کی رفتار کو دیکھ کر یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ کارٹون نگاری کی اس نے جو ٹریننگ حاصل کی اس نے اس کے کام میں بڑی مدد دی اور وہ یہ کہ شکل و وضع یا ہیئت کے ترکیبی عناصر میں جو "لوازم" ہوتے ہیں وہ اس کے ہاں بڑے نمایاں طور پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ پھر وہ شکست و ریخت کرتے کرتے انہیں اپنے مقصود ذہنی کے سانچے میں سمو لیتا ہے، تا نتر تجسیم اختیار کر لیتا ہے اور چہل پہل کر ڈرامائی کیفیت کو نمو دلتی ہے۔ اس بات نے اجمل کے نقوش میں وہ جوہر پیدا کر دیا ہے جسے خطوط کاری کا جمال اور جامد لمحات میں شدتِ تاثر کا شائبہ کہہ سکتے ہیں۔ اجمل کے روشن الوان ایک جیتی جاگتی فضا اور چونچلے کا اظہار ہیں اور ناظر پر از خود زندگی کا عالم طاری کرنے کے لئے کافی۔

★

اجمل ابھی نوعمر ہے، اس لئے نمو کا عمل برابر جاری ہے۔ فن کے باب میں پیشینگوئیاں کرنا کوئی معقول اظہار رائے نہیں کہا جا سکتا اور یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ اس کی فطانت آگے چل کر کیا معین و محسوس شکل اختیار کرے، بالخصوص جب اس پر دنیا کی معاصر تحریکاتِ فن کا اثر بھی پڑتا ہوا، مگر اب تک کے کئے ہوئے کاموں کو دیکھ کر اگر مستقبل کی نشان دہی کی جا سکتی ہے تو یہ کہنے میں کوئی باک نہ ہونا چاہیئے کہ مستقبل میں اجمل پاکستانی فنکاروں کی صفِ اول میں ضرور نظر آئے گا:

★

ثقافت:

برِّصغیر میں خطّاطی

یوسف بخاری

عام طور پر کہا جاتا ہے اور بالکل بجا کہ اگر کوئی ایسا فن ہے جو خصوصیت کے ساتھ تمام تر اسلامی ہے تو وہ خطاطی ہے۔ چنانچہ اس کے پیچھے ارتقاء کی ایک طول طویل داستان ہے جس کے مختلف اجزا مجموعی طور پر بھی دلچسپ ہیں اور فرداً فرداً بھی۔ اگر ایک طرف اس کا دنیائے اسلام میں علی العموم فروغ نظر آتا ہے، خصوصاً عرب و ایران میں تو دوسری طرف ہمارے برصغیر نے بھی اس کی نشو و نما میں کچھ کم حصہ نہیں لیا۔ جہاں تک دورِ قدیم اور عرب و ایران کا تعلق ہے۔ ہم اس سے قبل خطاطی کے ارتقائی مدارج پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ اب ہم برصغیر میں اس دلچسپ و دلآویز فن کے ارتقاء اور گوناگوں مظاہر پر نظر ڈالتے ہیں، اور دیکھتے ہیں کہ یہاں کے اربابِ ہنر نے اس میں کیا کچھ نوک پلک پیدا کی اور اس کو کس طرح درجۂ کمال تک پہنچایا۔

امیر تیمور: (۷۷۱-۸۰۷ھ) امیر تیمور کے عہد کا بیشتر حصہ قتل و غارت گری میں گذرا پھر بھی فارسی علم و ادب کو کافی عروج حاصل ہوا۔ میر علی تبریزی نے اسی کے زمانہ میں شہرت پائی۔ امیر کے چاروں فرزند جہانگیر سلطان، عمر شیخ سلطان، میران شاہ گورگانی اور مرزا شاہ رخ شاعر ہونے کے علاوہ بہترین خطاط تھے۔ یہ جوہر ان کی اولاد در اولاد برابر منتقل ہوتا رہا چنانچہ شہزادہ بایسنقر بن شاہ رخ مرزا شش قلم ہوئے۔ ان کے کتب خانہ میں جعفر تبریزی تلمیذ میر علی تبریزی کے ماتحت چالیس خطاط کلام مجید اور قلمی کتب لکھنے پر مامور تھے

بابر: خطِ بابری کا موجد تھا۔ اس خط کے مشہور استاد میر عبدالحئی مشہدی اکبر آبادی بعہد ہمایوں تھے۔ بابر کا سلسلۂ تلمذ میر علی تبریزی سے ملتا ہے۔

ہمایوں: (۹۶۳-۹۳۷ھ) بابر نے اپنے عہد میں فنِ خطاطی کی جو داغ بیل ڈالی تھی ہمایوں نے اس کی معقول نشو و نما کی لیکن عمر اور زمانے نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ عبدالحئی کے علاوہ عہدِ ہمایوں کے مشہور خطاط خواجہ سلطان علی تھے جن کو اکبر نے اپنے زمانہ میں افضل خاں کے خطاب سے سرفراز کیا۔ خواجہ عبدالصمد بھی عہدِ ہمایوں کے خطاط تھے لیکن دورِ اکبری میں چمکے۔ بزم خطاطاں میں اب تک صرف بادشاہوں اور شہزادوں نے شہرت اور مرتبہ پایا تھا لیکن مخدراتِ تیموریہ نے جو علم و ادب کا بلند ذوق رکھتی تھیں، ابھی تک اس فنِ لطیف میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا۔ یہ بھی عہدِ ہمایونی کی برکت تھی کہ ملکۂ گلبدن نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ہمایوں نامہ کے ساتھ ساتھ خطاطی کی طرف توجہ کی اور اس میں کمال حاصل کیا۔ گلبدن کی تقلید میں نورجہاں، جہاں آرا اور زیب النسا مخفی نے بھی اپنی تخلیقات سے ادب کو اور خطاطی سے علم خط کو زینت اور فروغ بخشا۔

اکبر: (۹۶۳-۱۰۱۴ھ) اکبر کا عہدِ حکومت بلحاظ سلطنت اور باعتبار علوم و فنون ایک زرّیں عہد تصور ہوتا ہے۔ ابوالفضل کی بیش بہا تصانیف بالخصوص آئینِ اکبری میں اس عہد کی تمام جزئیات کی تفصیل نہایت شرح و بسط کے ساتھ موجود ہے۔

خواجہ عبدالصمد شیریں قلم: خواجہ نظام وزیر شاہ شجاع شیرازی کے فرزند تھے۔ خطاط ہونے کے علاوہ مصور اور شاعر بھی تھے۔ اوّل ہمایوں کے درباری ہوئے۔ اکبری عہد میں منصب چہار صدی ملا اور فتح پور سیکری کی ٹکسال کے ناظم مقرر ہوئے۔ خشخاش کے ایک دانہ پر سورۂ اخلاص لکھ کر اکبر کو پیش کی۔

محمد حسین کشمیری زرّیں رقم: کامل نستعلیق تھے۔ اکبر کی فرمائش پر آئینِ اکبری کا پورا نسخہ تحریر کیا، تصاویر دوسرے مصوروں نے بنائیں۔

راجہ ٹوڈرمل کھتری: اکبر کے مشہور رتن اور دیوانِ اعلیٰ، نہایت ہی زود نگار اور خوش نویس تھے۔

مرزا عبدالرحیم خان خاناں: بیرم خاں کے فرزند رشید تھے۔ ہندی کے مشہور و معروف شاعر۔ نستعلیق اور ہندی خوشخطی میں کمال حاصل تھا۔

میرزا ایرج اور مرزا داراب: دونوں خان خاناں کے فرزند تھے۔ مرزا ایرج نسخ اور تعلیق اور مرزا داراب محض نستعلیق لکھا کرتے تھے۔
مرزا عزیز کوکلتاش: جلال الدین اکبر کے رضاعی بھائی، کامل خوش نویس اور باکمال مصور تھے۔
ملا عبدالقادر اخوند: فنِ خطاطی میں ان کو اکبر بادشاہ کی اُستادی کا فخر حاصل تھا اور مختلف خطوط کے ماہر تھے۔
عبدالرحیم عنبریں رقم: ہرات سے ہندوستان آکر خان خاناں کے منظورِ نظر ہوئے، کتب خانۂ خان خاناں میں کتب نویسی پر مامور ہوئے۔ اکبر کو نسخۂ نظامی لکھ کر پیش کیا۔ جو اس وقت لندن میں ہے۔
میر معصوم قندھاری: والد کا نام سید صفائی تھا۔ آبائی وصفِ صفائی اُن کے اُن کتبات سے ظاہر ہوتا ہے جو قلعۂ آگرہ اور فتح پور سیکری کی اکثر عمارات پر کندہ ہیں۔
حسین بن احمد چشتی: بلند دروازہ فتح پور سیکری کے پیش طاق کا عربی کتبہ انہی کے کمال کی یادگار ہے۔
پنڈت جگن ناتھ: اکبری عہد کے پہلے کاتب ہیں جنہوں نے ہندی قلموں کو شان اور عروج بخشا۔
ملا علی احمد مہرکن: خط کی جملہ اقسام بالخصوص تعلیق اور نستعلیق کے بہترین خطاط اور حکاک تھے۔ فولاد پر مہریں کندہ کرنے میں خاص ملکہ حاصل تھا۔

مذکورہ بالا خطاطوں کے علاوہ محمد اصغر عرف اشرف خاں ہفت قلم، علامہ میر فتح اللہ شیرازی، مظفر علی، خنجر بیگ چغتائی، رائے منوہر، محمد یوسف کابلی اور خواجہ ابراہیم حسین وغیرہ خطاط بھی دربارِ اکبری سے منسلک تھے۔

جہانگیر (۱۰۳۶ - ۱۰۱۴ھ): جہانگیر شعر و شراب اور نغمہ و رباب کا دلدادہ ہونے کے ساتھ ساتھ مصوری اور خطاطی سے بھی عشق رکھتا تھا۔ اس کے دربار میں بھی متعدد درباری خطاط موجود تھے۔
مرزا محمد حسین ابن مرزا شکر اللہ: ثلث، تعلیق اور نستعلیق کے استاد اور خطِ شکستہ کے موجد تھے۔
شہزادہ خسرو اور شہزادہ سلطان پرویز: دونوں جہانگیر کے چشم و چراغ تھے۔ اوّل الذکر خطاط ہونے کے علاوہ فن انشاء کے بھی ماہر تھے۔ شہزادہ پرویز کلام اللہ بکثرت لکھا کرتے تھے۔
محمود بن اسحاق سہائق الہروی: نستعلیق کے استاد تھے۔ دیوان کامران لکھا جو پٹنہ کی لائبریری میں موجود ہے۔
احمد علی ارشد: عہد جہانگیری کے مشہور طغرا نویس تھے۔ بلند دروازہ فتح پور سیکری کے ایک طغرے میں پنج تن پاک اور خلفائے راشدین کے اسمائے گرامی کندہ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی خطاطوں نے اس عہد کو زینت بخشی۔
خواجہ محمد شریف ابن خواجہ عبدالصمد شیریں قلم: عربی فارسی کے جید عالم اور نستعلیق کے کامل استاد تھے۔ دربارِ اکبری سے رخصت ہو کر شہزادہ جہانگیر کی خدمت میں آئے اور امیر الامراء کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔
شاہ جہاں (۱۰۷۶ - ۱۰۳۶ھ): یہ نامور بادشاہ جو سلاطینِ مغلیہ میں علوم و فنون کا سب سے زیادہ قدر دان اور سرپرست تھا، بزمِ خطاطاں میں خود بھی ایک اعلیٰ مقام رکھتا تھا۔ خطِ نستعلیق کا ماہر تھا۔ خطِ شکستہ بھی عہدِ شاہجہانی کی یادگار ہے جس کی توسیع اور اشاعت کا سہرا شاہ جہاں کے لائق وزیر سعد اللہ خاں کے سر ہے۔ شہزادہ دارا شکوہ بھی نہایت خوش رقم خطاط تھا۔ دربار خطاطوں سے بھرا پڑا تھا۔
عبدالحق عرف امانت خان شیرازی: علامی افضل خاں وزیر شاہ جہاں کے بھائی تھے۔ روضۂ تاج محل کے تمام طغرے اور دیگر کتبات اسی ماہرِ فن کے کمالات کا نمونہ ہیں، بالخصوص شاہ جہاں اور ممتاز محل کے مزارات کے طغرے اپنی نظیر آپ ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی باکمال خوشنویسوں نے تاج کے کتبات لکھنے میں حصہ لیا۔
عبدالباقی حداد: عبداللہ کے نام سے مشہور تھے۔ شاہ جہاں نے ان کو عالمگیر کا استاد مقرر کیا تھا۔ نسخ کے ماہر تھے۔ اس ماہرِ فن نے دو قرآن مجید لکھے، ایک تیس ورقی اور دوسرا چوب قلم، دونوں شاہ جہاں کی نذر کئے اور یاقوت رقم کا خطاب پایا۔ حداد کو غالباً اپنا وطن زیادہ عزیز تھا، اس لئے ہندوستان میں نہیں رہے لیکن ہندوستان میں اپنے کئی نامور شاگرد چھوڑ گئے جو یاقوت رقمی اور یاقوت خانی کے خطابات سے ممتاز

ہوئے۔ ان میں سے دو بہت مشہور ہوئے ؛

محمد عارف یاقوت رقم خاں: شاگرد رشید حداد۔ نسخ و ثلث کے استاد، اُن کے ایک قلمی قرآن مجید کا عکس بھوپال سے شائع ہو چکا ہے، ان کا انتقال محمد معظم بہادر شاہ اوّل کے عہد میں ہوا۔ ان کے بھانجے نے بھی یاقوت رقم خاں کا خطاب پایا۔ دونوں حدّاد کے شاگرد تھے۔ انکے علاوہ بیشمار خطاط اور بھی تھے۔

اورنگ زیب عالمگیر: (۱۱۱۸ - ۱۰۶۹ھ) عالمگیر بھی ماہر فن خطاط تھے۔ حداد کے بعد سید علی خان حسینی بن آقا مقیم تبریزی کے شاگرد ہوئے خطِ نسخ اور تعلیق میں متعدد کلام مجید لکھے جو ان کی یادگار ہیں۔ مرحوم خواجہ حسن نظامی دہلوی نے بھی ان کا ایک عکسی قرآن شائع کیا تھا جو شاید اب بھی ملتا ہے ؛

سید علی خاں حسینی جواہر رقم: میر عماد اور آقا رشید دیلمی کے ندیم خاص اور مقلد تھے۔ ہمہ اوقات عالمگیر کی خدمت میں حاضر رہتے۔ قیام دہلی کے زمانہ میں شاہی کتب خانہ میں کام کیا۔ آخر عمر میں دیوانہ ہوگئے ۱۰۹۴ھ میں دکن میں انتقال ہوا لیکن مدفن دہلی میں بنا ان کے صاحبزادے شمس الدین علی خاں بھی جواہر رقم ہوئے ؛

سید محمد باقر: بادشاہ کو ان کا خط بہت پسند تھا، خطوط عالمگیری میں جابجا ان کے خط کی تعریف موجود ہے بعض شہزادے بھی ان کے شاگرد ہوئے ؛

مرزا جعفر: خط شکستہ کے استاد تھے۔ عالمگیر نے کفایت خان کا خطاب عنایت کیا تھا ؛

ان کے علاوہ اور بھی نامور خطاط تھے جنہوں نے فن کو اوج کمال تک پہنچایا۔

محمد فرخ سیر کے عہد میں عہد عالمگیری کے خطاطوں کے علاوہ حاجی نامدار خاں (استاد شہزادگان) آقا رشید دیلمی کے مقلد اور استاد مرزا حاتم بیگ، معظم شاہ کے میر منشی تھے۔ مرزا صاحب نے فن انشا پر بھی ایک کتاب لکھی ہے۔

ابو الفتح ناصر الدین محمد شاہ (۱۱۶۱ - ۱۱۳۰ھ) کے پُر آشوب زمانہ میں یہ مشہور خطاط ہوئے۔ (۱) محمد افضل لاہوری قادری جس نے عبدالرشید دیلمی ثانی کا لقب پایا۔ (۲) سید محمد موسیٰ سرہندی جو میر عماد کے پیرو اور بادشاہ کے درباری تھے۔ (۳) نواب مظہر خاں ابن نواب روشن الدولہ، خط شکستہ کے استاد تھے۔ (۴) نواب مرید خاں، محمد صادق طباطبائی، رائے پریم ناتھ کھتری، مولوی حیات علی اور محمد حفیظ خاں۔

جلال الدین محمد علی گوہر شاہ عالم (۱۲۰۱ - ۱۱۷۳ھ) کے عہد میں مشہور ماہر نسخ قاضی عصمت اللہ خان ہوئے جن کے متعدد شاگرد تھے اُن میں میر مہدی زیادہ مشہور ہوئے۔ محمد میر جو میر سوز کے نام سے مشہور ہوئے۔ شاعری کے علاوہ خطِ شفیعہ اور نستعلیق کے استاد تھے۔

اکبر شاہ ثانی: مولانا غلام محمد دہلوی ہفت قلم حکیم قدرت اللہ خاں کے شاگرد، ثلث، ریحان اور تعلیق کے استاد کامل نیز نستعلیق، شفیعہ اور شکستہ میں فرد تھے۔ فارسی میں برصغیر کے مشہور خطاطوں کا ایک قابل قدر تذکرہ لکھا جسے سر ولیم جونس اور مولوی ہدایت حسین نے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے ۱۹۲۰ء میں شائع کیا تھا۔ ان کے علاوہ مولائی عبدالرشید دیلمی کے مقلد اور ہم پلہ تھے جنہیں آقائے ثانی کا خطاب ملا۔ حافظ ابراہیم، نسخ و نستعلیق کے استاد اور میر محمد حسین، غلام علی خاں، میر ابوالحسن عرف میر کلن، میر زین العابدین (طغرا نویس)، شاہ وارث علی میر مہدی بن میر مقصود اور خواجہ غلام نقش بند خاں۔

عماد الملک غازی الدین خاں فیروز جنگ آصف جاہی متخلص بہ نظام، ہفت زبان شاعر اور ہفت قلم استاد تھے نستعلیق، مرزا احمد علی اور نسخ یاقوت رقم کے انداز پر لکھتے تھے۔ عام مراسلت میں شفیعہ سے کام لیتے تھے۔ ان کے میر منشی مرزا ارجمند شاعر، خوش نویس اور باکمال مصور تھے۔

ابوظفر بہادر شاہ ثانی کا اعجاز شاہانہ تھا کہ اُن کے جیتے جی علوم و فنون پامال اور برباد نہ ہوئے۔ وہ ایک ماہر خطاط تھے۔ دلی میں ان کا شاہی زینت محل، حکیم احسن اللہ شاہی طبیب کی حویلی اور درگاہ حضرت صابر صاحب چشتیؒ کے مزارات کے کتبات ان کی خطاطی کی منہ بولتی تصاویر ہیں۔

سید محمد امیر رضوی (میر پنجہ کش) اس عہد کے اور خطاطانِ دہلوی میں آخری استاد تھے۔ پنجہ کشی کی وجہ سے میر پنجہ کش مشہور ہوئے۔ مصوّری، نقاشی، لوح، جدول نگاری، صحافی، علاقہ بندی اور سنگ تراشی ان تمام فنون میں یکتائے روزگار تھے۔ ابتدا میں قدما کے انداز پر نستعلیق رقم کرتے تھے۔ غلام محمد دہلوی کے مشورہ پر عبدالرشید دیلمی کے مقلد ہوئے اور ایسی لاجواب نقل کی کہ نقل کو اصل بنا دیا۔ بعض اوقات اپنی لکھی ہوئی وصلیوں پر آقا رشید کا نام لکھ دیتے تو کوئی ذرہ تمیز نہ کرتا، اس طرح خود آقا رشید بن گئے اور اپنے آقا کو زندہ کر دیا۔ مہاراجہ الور کی فرمائش پر سترہ سال میں "گلستاں" لکھی۔ آغا مرزا

دہلوی، مرزا عباد اللہ بیگ "زمرد رقم" اور حافظ سید امیر الدین ماہر نسخ و نستعلیق چند اور نامور خطاط ہیں۔

سید حامد بخاری ابن حافظ سید محمد امام شاہی جامع مسجد دہلی: راقم الحروف کے والد ماجد، امیر الدین کے شاگرد ہوئے اور خط نسخ میں کمال حاصل کیا۔

منشی ممتاز علی صاحب، (شاگرد حضرت بہادر شاہ ظفر) دورِ جدید میں اردو بازار دلی کے مایۂ ناز استاد نسخ و نستعلیق تھے۔ جب آپ حجاز میں تھے تو خانۂ کعبہ کے پردے پر آپکو خطاطی کی دعوت دی گئی۔ قرآن مجید، دیگر کتبات اور طغرے آج بھی آپ کی یادگار ہیں۔ آپ نے متعدد شاگرد چھوڑے۔ ان کے صاحبزادے منشی مشتاق علی اور منشی عبدالغنی ان کے شاگرد رشید تھے۔

بدر الدین علیخاں مرصع رقم: اپنے نانا شیخ محمد یار کے شاگرد اور آقا عبدالرشید دیلمی کے مقلد تھے۔ نسخ اور نستعلیق کے استاد مسلّم ہوئے۔ بہادر شاہ سے مرصع رقم کا خطاب پایا۔ دہلی میں ان سے بڑھ کر کوئی دوسرا حکاک نہ تھا۔ شاہی مہروں کے علاوہ تمام وزراء و امراء انہی سے اپنی مہریں تیار کراتے تھے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی نے بھی مہر اسی یگانہ روزگار سے بنوائی تھی۔ بدر الدین مرحوم نے اپنی وصلیوں اور شاہی مہروں کے نقوش کا ایک البم مرتب کیا تھا۔ لیکن ان کی اولاد ان کی اس یادگار کو محفوظ نہ رکھ سکی۔ ہمارے پاس ان کی ایک عقیق کی انگوٹھی ہے جس پر سید محمد شاہی امام جامع مسجد دہلی کا نام اور سنِ مہر کندہ ہے۔

جب سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ گل ہو گیا تو بچے کھچے اہلِ کمال فیض آباد اور لکھنؤ وغیرہ میں جا بسے۔ اور شاہانِ اودھ کی سرپرستی سے اس فن کو ناصافروغ حاصل ہوا۔ اس کا آغاز نواب شجاع الدولہ (۱۷۵۴-۱۷۷۴ء) سے ہوا۔ اس وقت لکھنؤ میں آقا عبدالرشید دیلمی کے دو شاگرد ماہرِ نستعلیق و شکستہ استادِ وقت تھے منشی چندر بھان عہدِ شاہجہانی کے مشہور شاعر و انشا پرداز اور منشی سبح بھان اسی دور کے تیسرے استاد سید محمد عطا حسین مرصع رقم تھے۔ یہ محمد باقر طغرا نویس (بادشاہ عالمگیر کے درباری) کے فرزند تھے مشہور قصہ چہار درویش، جو نواب شجاع الدولہ نے لکھوایا تھا ان ہی کی تصنیف ہے۔

شرر مرحوم کی رائے ہے کہ علم خط کی ترقی کا آغاز نواب آصف الدولہ کے عہد سے ہوا۔ اُن کے عہد (۱۷۷۴-۹۸ء) میں عبدالرشید دیلمی کے دو شاگرد، جو لاہوری تھے، لکھنؤ میں وارد ہوئے۔ ان میں سے ایک حافظ نور اللہ اور دوسرے قاضی نعمت اللہ تھے۔ آصف الدولہ نے ازراہِ قدردانی دونوں کو اپنے دربار میں جگہ دی۔ اور ان کی بدولت لکھنؤ میں فنِ خطاطی کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ حافظ صاحب کے کئی نامور شاگرد ہوئے۔

حافظ نور اللہ کی مقبولیت اور شہرت کا تو یہ عالم تھا کہ لوگ اُن کی وصلیوں کو موتیوں کے عوض خریدتے تھے، حافظ صاحب کے کئی نامور شاگرد ہوئے اُن میں سے چار بہت مشہور ہیں۔

(۱) سب سے ممتاز ان کے فرزند حافظ محمد ابراہیم تھے جنہوں نے اپنے خط میں ایک مجتہدانہ شان پیدا کی۔ (۲) منشی سرب سنگھ دیوانہ (۳) میاں وجیہ اللہ (۴) محمد عباس۔

حافظ ابراہیم کے یہ شاگرد مشہور ہوئے، ان کے فرزند حافظ سعید الدین، منشی عبدالمجید (شاہی فرمان نویس) اور منشی ہادی علی، جو نستعلیق اور نسخ کے علاوہ طغرا نگاری میں ماہر تھے۔ آخر الذکر کے شاگرد رشید منشی شمس الدین اعجاز رقم ہوئے، انہوں نے خطاطی پر کئی رسالے لکھے۔ لکھنؤ کے آخری دور میں جس قدر خطاط ہوئے وہ سب اعجاز رقم ہی کے تلمیذ تھے۔

قاضی نعمت اللہ کے شاگرد رشید ان کے صاحبزادے مولوی محمد اشرف اور مولوی فضل احمد ہوئے۔ ان کے کئی شاگرد تھے۔

دورِ حاضر کے مشہور خطاط محمد یوسف خلف منشی محمد دین مرحوم ہیں۔ جن کے نقوش سے پارلیمنٹ اور سیکریٹریٹ نئی دہلی کے در و دیوار آراستہ ہو چکے ہیں۔ اب مملکت پاکستان ان کی خطاطی سے فیض یاب ہو رہی ہے۔ موجودہ نوٹوں میں انہیں کا خط جلوہ گر ہے۔ ان کے نامور شاگرد عبدالمجید خطاط ہیں۔ اسی طرح تاج الدین زریں رقم مرحوم بھی ایک نہایت ممتاز خطاط تھے۔ الماس لاہوری ابھی حیات ہیں۔ اُن کا الماسی خط اس فن کو حیاتِ نو بخش رہا ہے۔ بنگال، لکھنؤ، سرحد اور سندھ میں بھی نامی گرامی خطاط موجود ہیں۔

قومی ضرورت کا تقاضا ہے کہ اردو کی بقا اور فروغ کے لئے اردو ٹائپ کو جلد از جلد بروئے کار لایا جائے۔ گو اس اقدام سے دورِ حاضر میں مرصع اور مہذب خطوط نسخ و نستعلیق کے کالعدم ہونے کا اندیشہ ہے مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ اردو ٹائپ کو مرصع و مزیّن کرنے کے لئے بھی ہمیں ہمیشہ خوش نویسوں کا مرہونِ منت ہونا پڑے گا اور یہ قدیم فن نئے ٹائپ کے رائج ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ قائم رہے گا۔

ماو نو، کراچی۔ ستمبر ۱۹۵۰ء

رپورتاژ :

چناری کے اُس پار

عارف حجازی

جون کی جھلسا دینے والی دھوپ سے بچکر چرند، پرند، حیوان، انسان سب مخلوق چیل کے لمبے لمبے بے ہنگم درختوں کی گہری چھاؤں، خودرو جھاڑیوں اور پہاڑ کی جنگل میں دبکی پڑی تھی۔ محمد جو ابھی تک تار کے پل کے قریب ایک درخت کے نیچے بیٹھا دریائے جہلم کے موجیں مارتے ہوئے دھارے کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا میں نے کہا۔ "محمد جو! یہاں تو جہلم، دریا نہیں ایک چھوٹا سا نالہ معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی سپوٗلا عمیق اور تنگ دڑدوں کے درمیان تیزی سے بھاگتا چلا جا رہا ہو شہر جہلم میں تو اس کی کچھ اور ہی شان ہے۔"

محمد جو میری بات سن کر مسکرا دیا اور اپنی متوالی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "قدرت کے نظام میں انسان کو کیا دخل ہو سکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو سمندر کو کوزے میں بند کر دے اور نالہ کو سمندر بنا دے۔"

"ٹھیک کہتے ہو محمد جو۔" میں نے جواب دیا۔

تمازتِ آفتاب سے ہر شئے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ اس کے باوجود قدرتی جلوے اپنے شعبدے دکھا رہے تھے۔ چناری کے مسافر بنگلے کی پشت پر سر بفلک پہاڑ کی مخروطی چوٹیاں سبزہ زار سے ڈھکی ہوئی تھیں اور اکثر آزاد پرندوں کی ٹولیاں چہکتی ہوئی ہمارے سروں پر گزر جاتیں۔ سامنے جہلم دریا اور اس کے ناہموار کنارے سے لپٹی ہوئی شاہراہ جہلم ویلی روڈ نجانے تھوڑی دور جاکر پہاڑوں کی سلوٹوں میں کہاں کھو گئی تھی۔ دریا کے دوسرے کنارے سے آگے جہاں تک نگاہ کام کر رہی تھی دھواں دار پہاڑوں کے لامتناہی سلسلے ہی نظر آ رہے تھے۔ جیسے دنیا کے سارے پہاڑوں کی حدیں یہیں آکر ختم ہو گئی تھیں۔ میں نے بیٹھے بیٹھے پھر باتیں چھیڑ دیں۔ میں نے محمد جو سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "ان پُر اسرار پہاڑوں میں کونسی ایسی دلفریبی ہے جس میں تم کھوئے ہوئے ہو؟ کوئی قصہ ہی سناؤ تاکہ وقت کٹے۔"

"قصے کہانیوں میں کیا رکھا ہے۔ نگاہوں کے سامنے جب جیتی جاگتی دنیا کی خوبصورتیاں ایسی ہیں کہ ان کے سامنے افسانے اور قصے ہیچ ہیں۔ یہ پہاڑ، یہ دریا، یہ سبزہ زار، یہ گلبار زمین اور وادیاں خود ایک حقیقت افروز افسانے سے کم نہیں۔ جب میں قدرت کے ان مظاہر کو دیکھتا ہوں تو مجھے اپنا دیس یاد آجاتا ہے۔"

"تو پھر صبر سے کام لو۔ تاریخ تو ہمیشہ ایسے واقعات دہراتی چلی آ رہی ہے۔"

محمد جو میرا جواب سن کر خاموش ہو رہا مگر اس کے گورے چٹے یونانی چہرے پر فکر و سنجیدگی کے گہرے آثار چھا گئے جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ آخر لمحہ بھر کے بعد وہ خود ہی بول اٹھا۔ "دریا کی دوسری طرف، چناری کے اُس پار قدرت کی حسین و جمیل وادیاں ہیں جہاں لاکھوں انسان ایک خوفناک چکی میں پسے جا رہے ہیں۔ جب تک میرا وطن آزاد نہ ہو جائے گا، میرے دل کو قرار نہیں آسکتا۔ کشمیر کا اڑسٹھ ہزار مربع میل طویل و عریض علاقہ بہشت سے کم نہیں۔ جہاں گوشے گوشے میں ہماری تہذیب و تمدن، معاشرت اور ثقافت کے بے شمار خزانے ہیں۔ جہاں بزرگوں اور دانشوروں کی یادگاریں آج ویران پڑی ہیں اور وہاں کا ذرہ ذرہ پکار پکار کے کہہ رہا ہے کہ جب تک تم سر سے کفن باندھ کر نہیں اٹھو گے یہ حسین دنیا تمہاری نہیں ہو سکتی۔"

یہ سن کر میں نے محمد جو سے کہا۔ "وقت کبھی یکساں نہیں رہتا۔ قدرت خود ہی سب کچھ کر لیتی ہے اور ایسے ذرائع پیدا ہو جاتے ہیں کہ تہرمانی دیوتا خود میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ میرے دوست! سچائی کو دنیا کی نگاہوں سے لاکھ چھپایا جائے وہ چھپ نہیں سکتی۔"

"مگر جد و جہد کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

پھر ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

دریا کی پُر جوش اور متلاطم موجوں کو دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے انھیں بھی محمد جو سے بیحد ہمدردی ہے اور وہ پکار پکار کر کہہ رہی ہیں۔ "ہمیں تمہارے

ابھاد کی تاریخ خوب یاد ہے۔ ساتویں صدی عیسوی سے بہت پہلے وادیٔ کشمیر پر بت پرستی کا دور دورہ تھا لیکن تقریباً چھ سو صدی پہلے کی بات ہے کہ یہاں اسلام کا آفتاب نمودار ہوا ــــــــ"

میں نے یہ سن کر دل میں کہا "جب تک جہلم اسی طرح بہتا رہے گا یہ ماضی اور حال کی تاریخ دہراتا رہے گا" یہ سوچ کر میں نے محمد جو کا شانہ ہلا کر کہا "تمہیں وادیٔ کشمیر کی تاریخ بھی یاد ہے؟"

وہ مسکرا دیا۔ پھر لمحہ بھر سوچ کر بولا "کشمیر کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ ۱۳۲۵ء میں حضرت بلال شاہ جو بڑے عالم و عامل تھے، سری نگر آئے۔ اس زمانے میں تبت کے راجہ کا بیٹا رتن جیو، جو بدھ مت کا پیرو تھا، حکمراں تھا۔ راجہ کو جب شاہ صاحب کی آمد کی خبر ملی تو انہیں اپنے دربار میں مذہبی مناظرے کے لئے بلا بھیجا۔ بڑے بڑے پنڈت اور رشی ایک طرف اور حضرت بلال شاہ کی تنہا ذات دوسری طرف۔ خدا کی شان! شاہ صاحب نے اپنے علم و عمل کا ایسا مظاہرہ کیا کہ راجہ کے تمام بڑے بڑے مذہبی پیشوا لاجواب ہو گئے۔ اس پر رتن جیو بڑا متاثر ہوا۔ شاہ صاحب کے ہاتھ مشرف بہ اسلام ہوا اور اپنا نام صدر الدین رکھا۔ اس کے ساتھ سینکڑوں پنڈت، درباری اور رعایا بھی مسلمان ہو گئی۔ صدر الدین لاولد مرا چنانچہ شاہ میرزا نامی ایک شخص نے جس کا بڑا اثر رسوخ تھا، عنانِ حکومت سنبھالی اور اپنا لقب شمس الدین رکھا۔ ۱۳۴۰ء سے لیکر ۱۵۵۵ء تک اسی شخص کا خاندان کشمیر پر حکمراں رہا ہے۔ اس خاندان کے بڑے مشہور سلاطین شہاب الدین، قطب الدین، سلطان سکندر بت شکن اور زین العابدین (المعروف بہ بڈشاہ۔ یا بڑا شاہ) بڑے جلیل القدر اور اولوالعزم حکمراں گزرے ہیں جن کی بدولت شمعِ اسلام کی منور شعاعیں ساری وادی میں جگمگانے لگیں۔ زین العابدین نے علم، ہنر، تعمیر سب ہی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مسجدیں بنوائیں اور ہنود کے لئے مندر بھی۔ اس کے عہدِ حکومت میں کشمیر نے بڑی ترقی کی۔ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن آج بھی ہر فرقہ اور مذہب کے لوگ "بڑا شاہ" کے نام کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ افسوس! اس خاندان کا آخری حکمراں حبیب شاہ نااہل ثابت ہوا۔ اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر خاندانِ چک کے سردار غازی خاں نے حکومت کی باگ ڈور پکڑی لیکن اس خاندان کے چوتھے حکمراں کے عہد میں بدنظمی کا دور دورہ شروع ہو گیا۔ آپس کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر مغل شہنشاہ اکبر نے کشمیر پر چڑھائی کی اور وہاں اپنا حاکم مقرر کیا۔ ہری پربت پر قلعہ بنوایا اور نسیم باغ لگوایا۔

عہدِ جہانگیری میں تو کشمیر نے دن دونی، رات چوگنی ترقی کی۔ بے شمار باغات، عمارتیں، مسجدیں اور پر فضا مقامات پر حوض اور حمام بنائے گئے۔ یہاں تک کہ جہانگیر کو کشمیر سے ایسا عشق ہو گیا کہ اس نے دارالسلطنت آگرہ سے لاہور منتقل کر لیا تھا تاکہ کشمیر سے قربت حاصل رہے۔ موسمِ گرما میں ملکہ نورجہاں اور جہانگیر یہیں رہا کرتے تھے۔ جہانگیر کے ساتھ اور اس کے بعد شاہجہاں بھی کئی دفعہ کشمیر آیا اور اس نے بھی کئی خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کو کشمیر آنے کا ایک یا دو ہی دفعہ اتفاق ہوا۔ اسے دکن کی مہم سے اتنی مہلت نہ ملی کہ وہ کشمیر کے نظم و نسق پر کڑی نظر رکھ سکتا، چنانچہ موقع پا کر احمد شاہ درانی نے وادی کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ اس طرح وادیٔ کشمیر پر مسلمانوں کی پانچسو برس حکومت رہی۔ مسلمانوں کے زوال کے بعد سکھوں کے ۲۷ برس دورِ حکومت میں کشمیر کی ترقی کی رفتار سست پڑ گئی۔ جب انگریزوں نے سکھوں کو شکست دیکر کشمیر پر قبضہ کیا تو اس وقت وہاں کی بری حالت تھی۔ خود انہیں مالی مشکلات ایسی درپیش تھیں کہ انہوں نے کشمیر کو ایک رئیس زادے گلاب سنگھ نامی ڈوگرے کے ہاتھ پچھتر لاکھ روپے میں فروخت کر دیا اور اسے مہاراجہ کا خطاب دیا۔ اس وقت سے لیکر تقسیمِ برصغیر تک کشمیر ڈوگروں کے پنجے میں جکڑا رہا...... اور اس کے بعد کی تاریخ ہمارے سامنے ہے...." محمد جو نے نیم وا آنکھوں سے دریا کی دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور خاموش ہو گیا۔

میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "تاریخ کا یہ دور بھی جلد ہی گزر جائے گا"

محمد جو نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے پھر وادی کے بارے میں ذکر چھیڑ دیا۔ اس نے دریا کے دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کشمیر ہمارے تمدنی ارتقاء کا گہوارہ ہے۔ اور اس کے باشندے ہی اس کے سچے وارث ہیں۔ کشمیر میں صانعِ حقیقی نے مرغزاروں اور کہساروں کو اس ترکیب سے پیدا کیا ہے کہ ان کی دل فریبی کی تعریف ناممکن ہے۔ اس کی عکاسی تو بڑے بڑے مصور بھی نہ کر سکے۔ اگر کچھ دلی تاثرات کی تصویر ملتی ہے تو وہ ہے عاشقِ کشمیر شہنشاہ جہانگیر کی صدائے دل نواز میں ؎

از شاہِ جہانگیر دمِ نزع چو پرسید
با حسرتِ دل گفت کہ کشمیر دگر ہیچ

ذرا چناری کے اس پار کا منظر دیکھئے ـــــ یہاں سے اٹھارہ میل پہ اوڑی ایک نہایت پر فضا مقام ہے جس کے ایک طرف یہی جہلم سائیں سائیں کرتا بہہ رہا ہے تو دوسری جانب شاداب سبزہ زار نظر آتے ہیں۔ تھوڑی ہی دور 'باب الکشمیر' ہے۔ ہاں ـــ ـــ بارہ مولا کو باب الکشمیر ہی کہنا درست ہوگا۔ یہاں سے سڑک سیدھی سپاٹ میدانوں اور کھیتوں کے درمیان سے گزرتی ہے جس کے دونوں کناروں پر سایہ دار درختوں کی قطاریں کھڑی ہیں۔ سڑک کے آگے پیچھے نظر دوڑانے سے ایسا لگتا ہے جیسے کسی مہ پارہ کی سیاہ چمکیلی زلفوں کے بیچوں بیچ سیدھی مانگ نکلی ہوئی ہے۔ دریا، سڑک سے کافی دور ہونے کی وجہ سے نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے لیکن میدان پار اس کا پاٹ بہت وسیع ہوگیا ہے۔ لوگ بارہ مولا سے لیکر سری نگر، اسلام آباد اور گاندربل کا سفر کرتے ہیں۔ سیاح عموماً شہر میں ٹھہرنے کی بجائے نہایت خوبصورت متحرک چوبی مکانوں (HOUSE BOATS) میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ ان اعلیٰ درجے کے چوبی مکانوں میں آرائش و آسائش کے تقریباً تمام سامان مہیا ہوتے ہیں۔

سری نگر صدیوں پرانا شہر ہو ابھی کشمیر ہوتے ہوئے بھی کشمیر نہیں ہے' کا تخت سلیمان نامی پہاڑ' جو شہر کے وسط میں ہے' دیکھنے کے لائق ہے۔ اس کے نیچے دریائے جہلم سانپ کی مانند لہریا بناتا ہوا بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے۔

اچھابل سری نگر کے بالکل قریب ہی ہے۔ یہ مقام بڑا قدیم ہے۔ انگریز جرنیل جارج مارشل نے یہاں پر قدیم زمانے کے آثار دریافت کئے تھے جن میں چند خستہ عمارتیں نکلی اور پرانی چیزیں دستیاب ہوئی تھیں جو سری نگر کے عجائب گھر میں رکھی ہوئی ہیں۔ اچھابل جاتے ہوئے راستے میں دشنو ندی' ہندو اور جہلم دریا کے ملاپ سے دل پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے۔ یہاں سے تھوڑی دور اسلام آباد آتا ہے جہاں ایک خوبصورت باغ ہے اور چھ حوض جن میں پندرہ فوارے لگے ہوئے ہیں۔ پہاڑ سے پانی بہہ کر حوض میں گرتا ہے اور پانی کی چادر، مرمریں ڈھلان سے گرتی ہوئی چھٹے آخری حوض میں پہنچتی ہے۔ ایک حوض کے درمیان ایک عمارت بھی ہے جس کے چاروں طرف کمان دار دالان ہیں جو کافی پرانے معلوم ہوتے ہیں۔

یہاں علی الصبح چوبی مکانوں سے دریائے جہلم کا نظارہ بڑا روح افزا ہوتا ہے۔ آفتاب افق مشرق سے طلوع ہوتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے دریا کی رو پہلی سطح آب سے کوئی بڑا سا سنہرا گیند ابھر رہا ہے۔ اس کی منور بنفشی کرنیں پانی کی سطح پر پھلجھڑی کی مانند دمکتی ہیں۔ دریا کے کنارے باغ ہی باغ ہیں۔ نشتی باغ جو عہد جہانگیر کا اعلیٰ نمونہ تھا آج بھی اس کے والہانہ عشق کے افسانے سنا رہا ہے۔ جہاں چنار کے گھنے درختوں کے کنج کچھ اور ہی نظارہ پیش کرتے ہیں۔ یہ درخت بڑے مدور اور گھنے ہوتے ہیں۔ انگور کی بیل جیسے پتے، برگد جیسی جسامت اور ڈیل ڈول جن کے گہری چھاؤں میں ابدی سکون و مسرت کا گمان ہوتا ہے۔ جون، جولائی، اگست اور ستمبر میں ان کے سبز پتوں کو دیکھکر یہ خیال ہی پیدا نہیں ہوسکتا کہ وہ اپنا رنگ بدل سکتے ہوں لیکن جہاں اکتوبر شروع ہوا' ان کی رنگت زرد ہونے لگتی ہے اور نومبر میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چنار کے درختوں میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھے ہیں۔ اور سارے باغ میں آگ ہی آگ روشن ہے۔ وہی پتے جو انتہائی سبز ہوتے ہیں نومبر میں خون کی مانند سرخ ہوجاتے ہیں۔ پھر برفباری کا زمانہ آتا ہے تو یہ پتے بھی باقی نہیں رہتے بلکہ یہ بلند و بالا درخت برف کے گالوں میں اس طرح چھپ جاتے ہیں جیسے برف کے نیچے دبے ہوئے عہد رفتہ کے کھنڈر!

چنار کی لکڑی جلانے سے ایک عجیب بھینی بھینی خوشبو دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ اس کے کوئلہ کی آگ بڑی دیرپا ہوتی ہے۔ صدیاں گزر چکی ہیں لیکن وہ آج بھی عہد ماضی کی تاریخ دہراتے ہیں۔ ان کی عمر خضر کی عمر سے کم نہیں ہوتی۔ جہانگیر نے یہ درخت ایران[1] سے منگوا کر لگوائے تھے۔ جو آج بھی اپنی بہار دکھا رہے ہیں۔

یوں تو کشمیر کے گوشے گوشے میں باغ ہی باغ تھے۔ مگر شالامار باغ، باغ اچھابل، ملا شاہی باغ، نشاط باغ کو چھوڑ کر سب تاراج ہو چکے ہیں۔"

محمد جو نے بڑی دیر کے بعد ایک گہری سانس لیکر اپنی متوالی روشن آنکھیں بند کرلیں۔ اس وقت اس کی صورت پر ایک عجیب کیفیت چھا گئی تھی۔ اس کے یونانی خدوخال بڑے دلکش اور حسین معلوم ہو رہے تھے لمحہ بھر کے بعد اس نے نیم وا آنکھوں سے دریا کی جانب دیکھکر کہا:

"کشمیر میں چار بڑی جھیلیں ہیں مانس بل، ولر، ہرکمہ گنگا اور سب سے بڑھ کر ڈل جس کے کنارے عہد رفتہ کی یادگاریں ہماری قدرتی روایات کی منہ بولتی

---

[1] ایران اور کشمیر کے علاوہ چنار دنیا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔

تصویر پیش کرتی ہیں۔ اسی کے کنارے پر حضرت بل ہے جہاں مسلمانوں کے عہد کی عمارتیں آج بھی کھڑی ہوئی ہماری زبوں حالی کا مضحکہ اڑا رہی ہیں۔ نسیم باغ، نشاط باغ، تختِ شاہی لوہیا لا حصار، چشمہ شاہی اور پری محل!

ڈل میں جو لمبی گھاس پیدا ہوتی ہے اس کی نہایت عمدہ چٹائیاں بنائی جاتی ہیں۔ کاشتکار اس کی لمبی چٹائیاں بنا کر پانی پر بچھا دیتے ہیں۔ پھر مٹی ڈال کر تخم ریزی کرتے ہیں اور کثرت سے ہر قسم کی ترکاریاں پیدا ہوتی ہیں۔ کاشتکاروں کا جب جی چاہتا ہے اپنے چٹائی کے کھیت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے رہتے ہیں۔"

"خوب! بعینہٖ ایسا منظر مشرقی پاکستان میں بھی تو پایا جاتا ہے اور عجیب بہار دیتا ہے۔"

محمد جُو نے پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "دنیا میں یوں تو ہزاروں خوبصورت اور دلکش باغ ہوں گے لیکن جو دلکشی اور خوبصورتی اور نظارہ شالامار باغ کا ہے وہ شاید ہی کہیں اور ہو...... اس کا ذکر کروں تو کیسے جب اس کا نام لیتے ہی دل سے ہوک سی اٹھتی ہے۔"

محمد جُو خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ چاروں طرف وہی سناٹا تھا اور ابھی تک دھوپ کی تپش کم نہ ہوئی تھی۔ کبھی کبھار ہوا کی ہلکی سی لہر سے درختوں کے پتے بجنے لگتے۔ اتنے میں محمد جُو بولا۔ "پہلگام کا نام تو سنا ہوگا!"

"سنا تو ہے، مگر دیکھنے کی تمنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

محمد جُو مسکرایا۔ کہنے لگا "خدا تمہیں وہ دن نصیب کرے! پہلگام سری نگر سے باسٹھ میل دور ہے اور چھ سو فٹ بلندی پر واقع ہے۔ یوں تو راستے میں کئی پر فضا مقامات ملتے ہیں لیکن پام پور جو میرا وطن ہے، قدرت نے اسے ایسا معطر اور پر فضا بنایا ہے کہ انسان جنم جنم کا دکھ بھول جاتا ہے۔ پام پور! ——— زعفران کے سدا بہار کھیتوں کی دنیا ——— ماہ اکتوبر میں جب زعفران کے پھول کھلتے ہیں تو مت پوچھو اس وقت کتنا بھلا منظر ہوتا ہے۔ زعفران کے بالشت بالشت بھر کے پودے، ان پر کاسنی رنگ کے پھولوں کے گچھے، پتے پیاز کے پتوں کی مانند، زرد زیرے اور تین تین سرخ لمبی لمبی کاڑیاں[1]، کمانیں بنائے لٹکا کرتی ہیں جیسے کوئی پھولوں کا فانوس فرشِ زمین پر رکھا ہوا ہے۔ یہی لمبی لمبی کاڑیاں زعفران ہوتا ہے۔ نومبر میں زعفران کے کھیت کاٹے جاتے اور پھول چنے جاتے ہیں۔ سینکڑوں مرد، عورتیں اور لڑکے، لڑکیاں کھیتوں میں تتلیوں کی مانند کام کرتی ہیں۔ پھولوں اور زعفران کے معطر شگوفوں اور کاڑیوں کو اپنی جھولیوں میں بھرتے ہیں۔ فضا میلوں معطر ہو جاتی ہے۔ انہیں زعفران کے ایک کھیت میں، میں اور جگری بچپن میں کھیلتے کھیلتے نکل آئے تھے۔ جگری، رحتی کی بڑی بہن نھی، بڑی خوبصورت جیسے زعفران کا پھول۔ زلفیں کالی بھونرا، آنکھیں جیسے ڈل جھیل ——— ہمارا بچپن بڑی سرعت سے بیت گیا۔ جب جوانی کی شادابیوں نے انگڑائیاں لیں تو ہماری شادی ہو گئی . . . ." اتنا کہہ کر محمد جُو کی آواز بھر آگئی۔

میں نے کہا "جگری بے چاری تو ملکِ عدم کو سدھاری مگر اس کی یاد تمہارے عزائم کی رہبری کر رہی ہے.... بڑھے چلو..... محمد جُو ابھی ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔"

محمد جُو جیسے جھرجھرا کے پھر مسکرانے لگا۔ وہ بڑا جذباتی آدمی تھا اور اس کے جذبات مد و جزر کی مانند ابھرتے اور مٹ جاتے تھے۔ اس نے مجھے بڑی شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا اور کہنے لگا "تمہاری باتیں بڑی حوصلہ افزا ہوتی ہیں.... باتوں باتوں میں بجانے کیوں مجھے جگری یاد آگئی... میری جگری زعفران کا پھول تھی.... اور جس طرح پھول کی زندگی چند دن بہار دکھانے کے بعد ختم ہو جاتی ہیں اور اپنی خوشبو اور تازگی کا اثر اتنا گہرا چھوڑ دیتی ہے کہ کئی دنوں تک انسان اس کے احساس سے طمانیت محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح مجھے اس کی یاد میرے اعصاب میں زندگی اور عزم کی لہریں پیدا کر دیتی ہے۔"

محمد جُو نے پھر دریا کی جانب اشارہ کر کے کہا "چناری کے اس پار میرے خوابوں کے شبستان آج بھی روشن ہیں۔ میرے وطن پام پور میں خواہ جو بھی حشر ہوا ہو لیکن ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ میں وہاں پہنچ کر اپنی سوئی ہوئی یادوں کو جگاؤں گا۔" پھر توقف کے بعد بولا "ایک دفعہ میں گاندربل میلے کے دنوں میں گیا تھا۔ دریائے جہلم میں چوبی مکان، کشتیاں، ڈونگے، مسافروں سے بھرے گاندربل کی طرف رواں دواں تھے۔ مانجھی طرح طرح کی بولیاں "یا کھدا" یا "جہانگیر یا چھا" (بادشاہ) یا "مولا" یا "پنج تن" وغیرہ بولتے ہوئے اپنی کشتیاں، چوبی مکان کھے رہے تھے اور اپنے لمبے لمبے بانسوں کو بار بار دریا کی تہہ میں گاڑ دیتے۔ ان کی ایک

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

[1] تیلیاں (کاڑی کشمیری زبان میں کہتے ہیں چونکہ تیلی سے میرا مفہوم پورا نہیں ہوتا اس لئے میں نے کاڑی کو اپنایا ہے)

دیہی ترقی کا منصوبہ

زندگی کا ازل سے وطن گاؤں میں

(احسان ملک)

یہ کچے کچے، ملگجے، چھوٹے چھوٹے بے ہنگم گھر۔ چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا۔ گھٹن ہی گھٹن۔ آپ کہیں گے ان دیہات کے کیا کہنے۔ چھوڑیئے بھی انہیں۔ یہاں کوئی دو دن بھی رہے تو زندگی اجیرن ہوجائے!

بے شک دیکھنے میں تو دیہات ایسے ہی ہیں۔ ان کا شہروں سے کیا مقابلہ۔ مگر ذرا غور کیجئے۔ اگر یہ دیہات نہ رہیں تو شہروں کا کیا حال ہو۔ ان کی ساری رونق، چہل پہل، آن بان، دھوم دھام، ٹھاٹ باٹ دھرے کا دھرا رہ جائے۔ ان شہروں کے پاس اپنا کیا ہے؟ جو کچھ ہے مانگے تانگے کا۔ آٹا دال، سوت کپاس، دھن دولت جو کچھ آتا ہے دیہات ہی سے آتا ہے ان کی تو زندگی کی دھڑکنیں بھی دیہات ہی سے مستعار ہیں۔ اگر شہر جسم ہیں تو دیہات جان اور ہمارے ملک میں تو جہاں جائیں دیہات ہی دیہات ہیں۔ شہر تو یوں ہی برائے نام ہیں جیسے آٹے میں نمک — ساری آبادی دیہات ہی کے بل بوتے پر پروان چڑھتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ اس کا دار و مدار کھیتی باڑی ہی پر ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے۔ اتم کھیتی مدھم بیوپار۔ اگر کھیتی نہ ہو تو بیوپار کہاں سے ہوگا اور شہر کیسے بسینگے؟ ہمارا ملک زیادہ تر زراعتی ہے نہ کہ صنعتی۔ صنعتی ہلچل تو اب تھوڑی بہت پیدا ہوئی ہے۔ اور اسکو بھی ایسا ہونا چاہئے کہ یہ ہماری زراعتی پیداوار کو زیادہ سے زیادہ ترقی دے۔ جس پر ہماری گذر اوقات اور خوشحالی کا دارومدار ہے۔ یا پھر واجبی حد تک ہماری روز مرہ کی ضرورتیں پوری کرے۔ بڑی بات تو یہ ہے کہ ہماری زندگی اور معیشت میں دیہات کا درجہ پہلے ہے، شہروں کا بعد میں۔ لہذا ہمیں زیادہ توجہ دیہات اور ان کے باسیوں کی ترقی و خوشحالی اور علم و دانش کو بڑھانے پر مرکوز کرنی چاہئے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم کیوں دن دونی رات چوگنی ترقی نہ کریں۔

خوادن دیہی درزی (مغربی پاکستان)

ہماری ڈاک

مکرمی

"ماہِ نو" کی اشاعت بابت مئی ۱۹۵۸ء میں عبدالسلام خورشید صاحب نے میرے مقالہ بعنوان "آزاد کا سفرِ ایران" کی چند فروگذاشتوں کی طرف میری توجہ دلائی ہے۔ جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں۔

(۱) انڈین پبلک یومین۔ واقعی اخبار کا نام "انڈین پبلک اوپنین" ہے۔ میں نے بھی یہی لکھا تھا۔ اسے سہوِ کاتب خیال کیا جائے۔

(۲) "واقعی پنجاب میں انگریزی کا پہلا اخبار "لاہور کرانیکل" تھا۔ لیکن اس کا اجرا (بقول عبدالسلام خورشید، ۱۸۵۰ء میں نہیں ہوا تھا۔ اس کی نسبت کرنل گولڈنگ نے اپنی تصنیف "اولڈ لاہور" (پرانا لاہور) میں صفحہ ۱۵ پر وضاحت سے درج کیا ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کی تاریخ مقرر نہیں کر سکتا۔ لیکن سرکاری ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ اخبار ہماری صدی کی چوتھی دہائی کے اواخر میں نکل رہا تھا اور اس کا ایڈیٹر ہنری کوپ تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جب پریس ایکٹ کا اجرا ہوا تو "لاہور کرانیکل" کو "اجازت نامہ" کے لئے درخواست دینی پڑی اور اسے ۱۳ دسمبر ۱۸۵۷ء کو اجازت نامہ مل گیا۔

(۳) خورشید صاحب لکھتے ہیں "انڈین پبلک اوپینن" کے بارے میں یہ کہنا غلط تو نہیں لیکن نادرست ضرور ہے کہ یہ وہی اخبار ہے جسے بعد میں "سول" کا نام دیا گیا....."

میں نے یہ اطلاع گولڈنگ کی کتاب سے حاصل کی تھی۔ جس میں درج ہے:

"جب اس اخبار "سول" کا نام ابھی "انڈین پبلک اوپنین" تھا....." اگر یہ اطلاع نادرست ہے تو یہ میرے ماخذ کی غلطی ہے۔

اس کے علاوہ مضمون میں ایک غلطی اور بھی ہے جس کی اطلاع مجھے ابن انشا صاحب نے دی۔ میرے مضمون میں رجب علی ارسطو جاہ "دہلوی" لکھا ہے جو غلط ہے۔ مجھے اس بات کا مدت سے علم تھا کہ مولوی رجب علی جگراؤں میں بودوباش رکھتے تھے لیکن مضمون لکھتے وقت مجھے یاد آ رہا تھا کہ آپ نے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی تھی اور دورانِ تعلیم سید احمد خاں کے والد کے ہاں قیام کیا تھا۔ روا روی میں "دہلوی" لکھ دیا۔

ابن انشا صاحب نے اپنے عنایت نامہ میں لکھا تھا کہ اگر مولوی رجب علی کے احوالِ زندگی معلوم ہوں تو انہیں "ماہِ نو" میں چھپوا دیا جائے۔ مجھے ان کی بابت ذیل کی اطلاعات حاصل ہیں:

سید رجب علی ۱۸۰۶ء میں بمقام تلونڈی پیدا ہوئے۔ جہاں ان کا خاندان مدت سے مقیم تھا لیکن سکھوں کے مظالم سے تنگ آ کر ان کے والد نے وطنِ مالوف سے ہجرت کر کے بمقام جگراؤں بودوباش اختیار کر لی۔ بارہ برس کی عمر میں آپ اکتسابِ ادب کے مطالعہ کے لئے لاہور تشریف لائے اور ۱۸۲۵ء میں جب دہلی کالج جاری ہوا تو آپ وہاں اعلیٰ جماعت میں داخل ہوئے۔ یہاں ان کی مولانا آزاد کے والد مولوی محمد باقر سے ملاقات ہوئی اور مذہبی یگانگت کی وجہ سے ان کے مراسم استوار ہو گئے۔ فتح پنجاب کے وقت آپ میر منشی ریذیڈنسی تھے۔ ۱۸۵۷ء میں آپ میر منشی کمانڈر ان چیف تھے اور غدر کے بعد آپ کو لارڈ کیننگ نے خلعت، پانچ ہزار روپیہ، جاگیر اور ارسطو جاہ کے خطاب سے عزت بخشی۔ اس سے پہلے انہیں خان بہادر کا خطاب مل چکا تھا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کچھ عرصہ کے لئے دہلی کالج میں ریاضی کے استاد تھے لیکن ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تصنیف "مرحوم دہلی کالج" میں اس کا ذکر نہیں کیا۔

موصوف نے ایک اخبار بنام "مجمع البحرین" بھی جاری کیا تھا۔ غدر کے کچھ عرصہ بعد مولانا آزاد اسی اخبار سے منسلک رہے۔ مولوی صاحب کو علم و ادب کا بہت شوق تھا۔ ان کا بڑا کارنامہ ایک کتب خانہ بمقام جگراؤں تھا۔ سنا ہے کہ تقسیم برصغیر کے وقت اس کی بہت سی بیش قیمت کتابیں تلف ہو گئیں۔ اس کتب خانہ کو اب گورنمنٹ کالج لدھیانہ میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میرے مضمون کا عنوان "آزاد کا سفرِ وسطِ ایشیا و ایران" زیادہ مناسب ہوگا۔

والسلام

(ڈاکٹر) محمد صادق، دیال سنگھ کالج لاہور

ر۔خ

نقد و نظر

نظیر اکبرآبادی اور ان کا عہد شاعری

از: ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
ناشر: اردو اکیڈمی سندھ، کراچی
صفحات ۲۲۰۔ قیمت ۵ روپے
مجلد مع گرد پوش، (نسخ ٹائپ)

اردو تنقید کا تازہ ترین حادثہ یہ ہے کہ ہم فن کو فن کے پیمانے سے نہیں بلکہ عوامی، اشرافی اور نفسیاتی پیمانے سے ناپنے لگے ہیں چونکہ نظیر اکبرآبادی کے موضوعات عوامی ہیں اس لئے اس کے عظیم شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں۔ خواہ اس کا فن کتنا ہی ناقص یا پست کیوں نہ ہو۔ سوال نفس موضوع کا نہیں بلکہ پیشکش کا ہے کیونکہ مضمون یا مواد کتنا ہی اعلیٰ کیوں نہ ہو، جب تک اسے بطریق احسن پیش نہ کیا جائے وہ فنی حیثیت سے قابلِ اعتنا نہیں ہو سکتا۔ یہ فن برائے زندگی اور فن برائے فن کی گمراہ کن توجیہہ ہے جس نے ایک شدید الجھن پیدا کر رکھی ہے ایسی تخلیقات جو بظاہر فن برائے زندگی کے تحت آتی ہیں وہ بھی اسی صورت میں 'فن' قرار دی جا سکتی ہیں جب کہ وہ فن کے معیار پر پوری اتریں۔ اور یہی فن برائے فن کا صحیح مفہوم ہے جس چیز پر ہم بالعموم اعتراض کرتے ہیں وہ فن برائے تفنن ہے (یعنی ہنسی کھیل، تفریح) اگرچہ وہ بھی فن کے دائرہ سے خارج نہیں۔

فاضل نقاد نے نظیر اکبرآبادی کے ماحول اور شاعری پر بہت زور دیا ہے لیکن یہ طول طویل بحثیں ہمیں ان کے مرتبۂ شاعری کو سمجھنے میں کوئی مدد نہیں دیتیں۔ محض 'روٹی' اور 'آٹا دال' پر نظمیں لکھ دی جائیں تو نہ یہ صحیح معنوں میں شاعری ہیں نہ ان کا فنی حیثیت سے کوئی بلند مقام ہے۔ خواہ ان سے ماحول یا معاشرہ پر کتنی ہی روشنی کیوں نہ پڑے۔ اس روشنی کی اہمیت تمام تر معنوی ہے، فنی نہیں یعنی کو فن کا درجہ جبھی حاصل ہوتا ہے کہ یہ فنی لوازمات میں تحلیل ہو جائے۔ آپ ہی کہئے ذیل کے اشعار کو فن کیسے قرار دیا جائے؟ -

سب چھوڑ و بات طوطی و بدڑی و لال کی
یارو کچھ اپنی فکر کرو آٹے دال کی

روٹی سے جس کا ناک تلک پیٹ ہے بھرا
کرتا پھرے ہے کیا وہ اچھل کود جابجا

اسی طرح "شہرآشوب"، "آدمی نامہ" اور "خوشامد" میں ایسی کونسی بات ہے جو انہیں فنی حیثیت سے وقیع بناتی ہے؟ واقعہ نگاری ہو یا منظر نگاری، ان میں مشاہدہ اور فن دونوں مل کر ہی کیف پیدا کرتے ہیں۔ "شب برات" میں اس تقریب کے معمولی واقعات کے سوا اور ہے کیا؟ "معولی" پر دو نظمیں انتخاب میں شامل کی گئی ہیں۔ ان میں سے دوسری کے وہی حصے کامیاب ہیں جن کو تخیل اور شوخیٔ بیان نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اور پہلا انداز اس کا بھی محض بیانیہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مقامات پر نظم نے شاعری کا زرکار لباس زیب تن کر لیا ہے اور وہیں نظیر حقیقی معنوں میں کامیاب ہے۔ نقاد کا حقیقی فرض یہ ہے کہ وہ عام داد و تحسین کی رو میں نہ بہ جائے بلکہ ہر چیز کو فن کے کڑے معیار سے جانچے۔ آج اس تنقیدی خودی کو بلند کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ ورنہ نظم و شعر، فن و غیر فن، ادنیٰ و اعلیٰ، فرسودہ و تازہ میں کوئی امتیاز نہیں رہے گا اور وہی افراتفری رونما ہوگی جس کا ہم فی زمانہ شکار ہیں اور جس کی بنا پر جمود کی شکایت عام ہو رہی ہے۔ جہاں تک ماحول یا معاشرہ کے تجزیہ کا تعلق ہے، اس کتاب کی اہمیت میں شبہ نہیں۔

داغ داغ اجالا

از: احمد سعید
ناشر: بک لینڈ لاہور
صفحات ۴۸۶

یہ ضخیم ناول اپنے مصنف کی اولیں کاوش فکر کا نتیجہ ہے اور اپنے انداز بیان و تصور کے لحاظ سے کافی امید افزا بھی ہے۔ اگرچہ ابتدا میں اس کی بنیاد رومان کی گل رنگ زمین پر استوار معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جوں جوں ہم دوسری جنگِ عظیم اور قیام پاکستان سے قبل برصغیر کے مقصدی، مادی، جنس زدہ ماحول میں سے گذرتے اور زندگی کی بوقلمون وسعتوں میں چاروں اور گھومتے پھرتے ہیں، حالات کچھ اور ہی رنگ اختیار کر لیتے ہیں۔ مصنف کا حقیقی مقصد اُس وقت کے معاشرہ پر طنز ہے۔ وہ اس کی دکھتی رگوں پر نشتر زنی کرنا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں داغ تو کچھ کچھ اجاگر ہو جاتے ہیں مگر زیادہ نہیں۔ اور اجالا بالکل دبا دبا رہتا ہے۔ قاری پر یہ واضح

نہیں ہوتا کہ یہ اجالا ہے کیا کیونکہ اس میں سدھرے ہوئے معاشرہ کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ اجالے کی واحد صورت یہ ہے کہ مہردمن انتہائی خون خرابے کے بعد لال بہادر کے ساتھ رہ جاتی ہے اور اس ملاپ کو کسی طرح پریمیوں کا ملاپ اور عشق کی آخرکار جیت نہیں کہا جا سکتا۔ یہ احساس پیدا کرنے کے لئے دونوں میں کچھ نہ کچھ باہمی میلان ظاہر کرنا ضروری تھا۔ مصنف کا جو بھی مقصد تھا وہ پوری شدت سے ظاہر نہیں ہو سکا۔ ویسے واقعات کا ارتقا فطری اور پیشکش معقول ہے۔ کردار کافی جیتے جاگتے ہیں تصویر کشی کے بھی کافی عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ جنسی تجزیہ صحیح مگر کہیں کہیں زیادہ بے محابا ہے۔ نقشِ ثانی سے لازماً بہتر توقعات کی جا سکتی ہیں۔

مرزا نوشہ

از عشرت رحمانی

ناشر: مکتبۂ خاور، چوک مینار، لاہور

صفحات ۲۹۵ قیمت پانچ روپے آٹھ آنے

مرزا غالب ان مستثنیٰ ادبی شخصیتوں میں سے ہیں جن کی زندگی میں داستان کا لطف ہے اور واقعات خود بخود کہانی کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں۔ چنانچہ "غالب نامہ" میں ان کی روداد ایک دلچسپ افسانہ ہی کی چاشنی لئے ہوئے ہے۔ اس ہی وجہ سے اس کو فلمایا بھی جا سکا۔ اور اب یہ ایک ادبی تاریخی ناول کا روپ دھار کر ہمارے سامنے آ رہی ہے۔ ایک ایسے وارفتۂ ذوقِ بیاں کے قلم سے جس کیلئے غالب اور محمد جمیل (بوٹا سنگھ) یکساں طور پر دلچسپی کا باعث ہیں۔ پیش لفظ "تکلف برطرف..." کے بعض غیر محتاط الفاظ "تاریخ ادب اردو کو تاریخی ناول کے انداز میں پیش کرنے کا تجربہ کیا گیا ہے"، "وقائع نگاری" سے قطع نظر جن سے تنقید کی گنجائش پیدا ہوتی ہے، ناول کافی دلچسپ ہے اور واقعات کا بہاؤ جس میں شاعر کے واقعات زندگی بڑی بے تکلفی سے سمو دئے گئے ہیں، بہت ہی بے ساختہ ہے۔ ناول کو بہرکیف ناول ہی کی حیثیت سے جانچنا مناسب ہے نہ کہ مصنف کے اپنے تعارفی الفاظ کی روشنی میں جن سے غلط فہمی کا امکان ہے۔ "تاریخ ادب اردو" سے بظاہر اس کا وہ حصہ مراد ہے جو غالب سے متعلق ہے۔ ایسی پیشکش میں روداد کی طرف رجوع لازم تھا جیسے "وقائع نگاری" کہنا مناسب نہیں۔ البتہ اگر یہ کہا جائے کہ ناول حقیقی واقعات اور حوالوں پر مبنی ہے تو اس میں کوئی ہرج نہیں۔ آخر میں وقائع کا پلہ کچھ کچھ بھاری ہو جانے سے لطف داستان میں کچھ فرق آ گیا ہے۔ ایسے موقعوں پر افسانوی صداقت تاریخی صداقت پر مقدم ہوتی ہے۔ بعض شعر کچھ غلط درج ہو گئے ہیں۔ مثلاً "بہ ایں عقل و دانش"... "زیں پس اسد بہشت (درسد بہشت) "یہ اپنی ترم ہے با وصفِ شوخی" (بہ رہنِ ترم ہے با وصفِ شوخی) وغیرہ وغیرہ

ڈھل گئی رات

از شفیع عقیل

ناشر: مکتبۂ ماحول کراچی

صفحات ۲۰۰، قیمت چار روپے

عام رومانوی رو میں بہنے کی بجائے اس ناول کا مصنف زندگی کی سنگین گہرائیوں میں غوطہ زن ہوا ہے کہیں کہیں ایسا لگتا ہے کہ ناول رومانوی دھارے کی طرف رخ کرنے والا ہے مگر مصنف کی سخت گیری اسے اس سستی خواہش کا شکار نہیں ہونے دیتی۔ اور ایک بگڑے ہوئے ماحول کے بگڑے ہوئے افراد اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ جاتے ہیں۔ سارا سلسلۂ واقعات صرف ۲۴ گھنٹے میں رات کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے عنوان کی مناسبت ظاہر ہے۔ ناول اپنے موضوع، پیشکش اور بیان کے اعتبار سے کافی بلند اٹھان لئے ہوئے ہے۔

ہندوستانی سماجیات

از ڈاکٹر جعفر حسن

ناشر: انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ

صفحات ۲۶۴

مصنف نے اپنے یہاں کے حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے موضوع کے مختلف پہلو اجاگر کئے ہیں۔ جو گہرے مطالعہ اور حقیقی مشاہدہ پر مبنی ہونے کے باعث کافی اہم ہیں۔ حالات کے ساتھ وہاں کی زبان کو بھی ضرورت سے زیادہ سمو دیا گیا ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ کتاب پاکستانی قارئین کے لئے بھی مفید ہو سکتی ہے۔

خاتونِ پاکستان

مدیر شفیق بریلوی

ملنے کا پتہ: پوسٹ بکس ۷۹۹۔

صدر کراچی۔ صفحات ۸۸، قیمت ۸/

قیام پاکستان کے ساتھ ہی یہ نسائی رسالہ منظر عام پر آیا تھا، اور اپنی غیر معمولی اٹھان کے باعث مقبول عام ہوا تھا۔ اب اس کا اجرائے ثانی غیر معمولی اہتمام سے عمل میں آیا ہے۔ پاک و ہند کے کتنے ہی مسلم الثبوت شعرا و ادبا کے نقوش اس مشترک شمارہ اگست و ستمبر کی زینت ہیں۔ یہ مصور رسالہ ہمارے افق صحافت پر ایسی بوقلموں تابانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے جن سے ایک نئے دور تابناک کی توقع کی جا سکتی ہے۔

"دیا" ——————— بقیہ صفحہ :۔(۳۵)

تخلیں ہو گئے اور ننھا خالد کھڑکی کھول کر ننھی سی اس دئے کے روشن ہونے کے انتظار میں محو ہو گیا جو چند لمحوں کے لئے الف لیلوی داستانوں کا ازلی اور ابدی حُسن بن گیا تھا!

شیماں کا دیا روشن نہ ہوا۔ ایک ایک لمحہ پہاڑ بن گیا۔ آخر خالد اٹھا اور شیماں کی کٹیا کی طرف بڑھا۔ وہ دروازے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ چاروں کھونٹ گہری خاموشیوں کا راج تھا۔ کٹیا کے اندر بھی گہرا سکوت تھا۔ خالد خاموشیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب کر رہ گیا اور اس کی زبان پر جیسے تالے پڑ گئے۔ نجانے کب اور کتنے عرصے کے بعد اس نے دھیمی سی آواز میں کہا "شیماں!" اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ خاموشیوں کا اتھاہ سمندر اس کے دل میں اتر آیا۔ اس کا دل اس بوجھ تلے دب کر رہ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی عفریتی ہاتھ اس کے دل کا گلا گھونٹ رہا ہے۔ اس نے چیخ کر کہا "شیماں!" لیکن شیماں نہ بولی۔ اس کی پشت کی طرف سے کسی نے اپنائیت سے کہا "خالد میاں! آج بھی شیماں نے دیا روشن نہیں کیا؟" خالد ڈر کر چونک گیا۔ پھر اس نے کہا "ہاں بابا!"

"شیماں بٹیا! خالد میاں دئے کے جلنے کا انتظار کر رہے ہیں۔" لیکن شیماں کا کوئی جواب نہ آیا۔ نبی بخش نے کہا "خالد میاں جاؤ۔ میں ابھی دیا جلاتا ہوں۔" خالد لپکا۔ اس نے ایک قدم اٹھایا لیکن دوسرا نہ اٹھ سکا۔ نبی بخش نے چیخ کر کہا "یہ دیا تو ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا۔ خالد میاں" نبی بخش کی چیخ اس کے جسم کو چیر کر گزر گئی۔ اس کے حواس کا دیا گل ہو گیا۔ وہ اندھیروں میں جذب ہوا اور پھر دیر تک ابھر نہ سکا۔ نہ اندھیرے چھٹے۔ نہ خالد کے دل و دماغ کو روشنی ملی لیکن وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ پہلے اس نے بیٹھک کا رخ کیا پھر وہ یکایک پلٹا اور باورچی خانہ میں چلا گیا۔ اماں نے کہا "کھانا کھا لو خالد! اب تم بہت دیر تک کھیلتے رہتے ہو۔ اچھے بچے شام ہونے سے پہلے گھر آجایا کرتے ہیں۔" خالد نے ایک لقمہ توڑا لیکن وہ اس کے حلق سے نہ اتر سکا۔ اس نے پانی کا ایک گھونٹ پیا۔ اماں نے کہا "خالد تمہارا رنگ کیوں اڑا ہوا ہے؟ اندھیرے میں ڈر گئے تھے کیا؟" خالد نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کے کسے ہوئے چہرے کا ایک ایک نقش پھیکا پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اماں نے حیران ہو کر پوچھا "تم رو کیوں رہے ہو خالد؟"

"اماں!" خالد نے سسکیوں میں الجھی ہوئی آواز میں کہا "آج شیماں کا دیا گل ہو گیا۔۔!"

* * *

ماہِ نو میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

(۱) ماہ نو میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

"چناری کے اُس پار" —— بقیہ صفحہ : (۴۸)

ساتھ آواز کی گونج سے ایسا معلوم ہوتا کہ سینکڑوں آدمی کسی گنبد میں بیٹھے ہوئے زور زور سے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ بالکل مشرقی پاکستان کا منظر۔۔۔۔ گاندربل کے میلے کی رونق اور چاندنی رات کا منظر عمر بھر نہیں بھول سکتا۔

کشمیر کی سب سے بڑی 'پرشکوہ' دلکش اور پرفضا جھیل مانس بل' گاندربل سے کوئی ۹ میل دور ہے' اس کی تہہ کا آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ اس سے تھوڑی دور نور جہاں کا لگوایا ہوا جھروکہ باغ تھا لیکن اب چاروں طرف دھان کے کھیت ہی کھیت نظر آتے ہیں۔

جھیل مانس بل قدرت کا شاہکار ہی نہیں بلکہ اس کے سینے میں عشق حقیقی کے سربستہ راز بھی پوشیدہ ہیں۔ ایک "لالہ رخ" ہی کیا' بجانے کتنی شگفتہ اور نوخیز حسن و محبت کے مسکراتے ہوئے کنول اس کی ہر دم انگڑائیاں لیتی ہوئی لہروں کے سپرد ہو چکے ہوں گے۔ روایت ہے کہ "لالہ رخ" کو ایک فرانسیسی سے عشق ہو گیا تھا جو کسی زمانے میں جہانگیر کے دربار میں سفیر کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس عشق کی دیوانگی نے لالہ رخ اور اس بدیسی عاشق کو جھیل مانس بل نے اپنے آغوش میں لے لیا۔ دونوں نے اسی جھیل کے ایک مختصر جزیرے میں پناہ لی تھی لیکن اب نہ تو وہ لالہ رخ ہی رہی اور نہ اس کا عاشق اور نہ وہ جزیرہ ہی باقی ہے جو مانس بل کے کسی حصے میں تھا تاہم آج بھی لالہ رخ کا نام سن کر جھیل کے مسکراتے ہوئے کنول یاد آجاتے ہیں جو شاید اسی کی خون آشام محبت کا مظہر ہیں"

محمد جو پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اس ذوق شوق کے عالم میں کشمیر کے متعلق سب کچھ کہہ دینا چاہتا ہے۔ "لالہ رخ" کے معاشقہ کی داستان چھیڑ کر اس نے مجھے ایسا متوجہ کیا جیسے ہم دونوں جھیل مانس بل کے کنارے بیٹھے ہوئے لالہ رخ کی فرضی خوبصورتی کا نظارہ کر رہے ہیں لیکن جب اس نے اس دلچسپ داستان کو یکایک ختم کر دیا تو میرے دل پر ایک دھچکا سا لگا۔ اور میں نے بڑے مضطرب انداز سے دریافت کیا "یہ لالہ رخ تھی کون۔۔۔ اور اس کا انجام کیا ہوا؟۔۔۔ کہانی تو نام ہی سے شروع ہو گئی تھی لیکن۔۔۔۔ بات ادھوری کیا۔۔۔۔ ابھی شروع ہوئی تھی کہ تم نے آنے والے واقعات پر بجائے خاموشی کا پردہ ڈال کر اس کی دلچسپی کو ختم کر دیا؟"

محمد جو میری بات سن کر بہت زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا پھر یکایک اس کے چہرے پر سنجیدگی چھا گئی۔ لمحہ بھر توقف کے بعد بولا "بہتر ہے کہ اس قصے کو یہیں رہنے دو۔ چناری کے اس پار' ان حسین و گلپوش وادیوں میں ایک لالہ رخ کیا لاکھوں لالہ رخیں نہ جانے کیسی کیسی آنچوں سے جھلس رہی ہیں۔ ان کی افسوسناک حالت ہمارے لئے ذلت اور رسوائی کا طوق ہے۔ ہمارے لئے بہتر ہے کہ ان مقید شہزادیوں کے لئے جو مدتوں سے ہماری راہ دیکھ رہی ہیں' ذریعۂ نجات ثابت ہوں۔ ان لالہ رخوں کو ان کی فطرتی آزادی سے بہرہ ور کرائیں جن کی آرزو زندگی بھر میرے دل میں قائم و دائم رہے گی۔ اور اگر میری تمنائیں یونہی ادھوری رہ گئیں تو میرے لئے اس زندگی سے بہتر پہاڑوں سے ٹکرا کے مر جانا ہوگا" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

محمد جو کے پرجوش عزم اور ارادوں کی جولانی کا حال دیکھ کر جیسے میرے ذہن کے گنبد میں روایتی لالہ رخ کی بجائے جیتی جاگتی لالہ رخوں کی درد و کرب سے بھرپور صدائیں گونجنے لگیں۔ دل میں جیسے زبردست آگ بھڑک اٹھی تھی اور جی چاہ رہا تھا کہ ایک ہی جست لگا کر جہلم کے اس پار لانگ جاؤں اور ان افسانوی شہزادیوں کو موج ہوا کی طرح آزاد کر دوں جو دیووں کے پنجۂ استبداد میں کراہ رہی ہیں یا ہوش و حواس سے بیگانہ ہیں' بے بس ہیں!

ابھی میں جوش و وحشت میں گم نہ جانے کیا سوچ رہا تھا کہ محمد جو بولا!

"بس اب تیار ہو جاؤ۔۔۔۔۔۔ چار بج چکے ہیں' ہمارے ساتھی ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔" یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

میں بھی بغیر کچھ کہے اس کے ساتھ ہو لیا۔ مگر ابھی تک مجھ پر وہی مجنونانہ کیفیت طاری تھی اور ہم دونوں خاموش ادھر ادھر دیکھتے بڑھے جا رہے تھے کہ اتنے میں ایک دستے نے ہمیں آگے بڑھ کر گھیر لیا۔

★

یہ گلیکسو بے بی ہے
یہ گلیکسو بے بی اتنا ہی طاقتور تندرست اور مُطمئن
ہے جتنا کہ وہ بچّہ جسے ماں کا دُودھ میسّر آتا ہے
اگر آپ کے بچّے کو ماں کا دُودھ خاطرخواہ نہیں
ملتا تو آپ اُسے گلیکسو دیجئے جو کہ خالص
اور غذائیت کے لحاظ سے مکمل بے بی فوڈ ہے
اس میں وٹامن ڈی اور فولاد شامل ہیں
تاکہ ہڈیاں اور دانت مضبوط ہوں اور وہ خون
کی کمی والی بیماری سے محفوظ رہ سکے۔ گلیکسو
وہ تمام عناصر مہیا کرتا ہے جن کی
بچے کو نشوونما اور توانائی کے لئے
ضرورت ہوتی ہے۔
SUNSHINE
Glaxo
گلیکسو
بچّوں کے لئے مکمل دُودھ والی غذا
گلیکسو لیبوریٹریز (پاکستان) لمیٹڈ کراچی • لاہور • چٹاگانگ • ڈھاکہ
STRONACHS
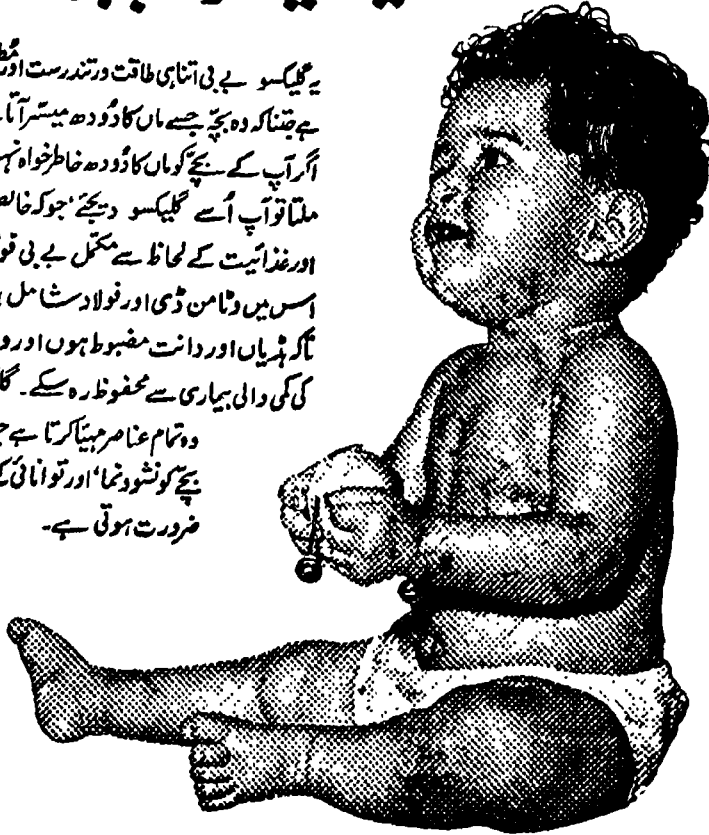
۱۹۵۳ - ۱۹۵۸

حمد لکھنے والے :

رنگین خوبصورت

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

اکتوبر ۱۹۵۸ء

۸ر

ماہِ نو

جلد ۱۱ —— شمارہ ۷

اکتوبر ۱۹۵۸ء

مدیر: —— رفیق خاور
نائب مدیر: —— ظفر قریشی

سالانہ چندہ
ساڑھے پانچ روپے
فی کاپی —— آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعات پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

آپس کی باتیں

معمارِ پاکستان، شہیدِ ملت لیاقت علی خاں مرحوم کی یاد ماہ و سال کے گزرنے سے کم نہیں ہو سکتی۔ یوں انہیں ہم سے جدا ہوئے آج سات سال ہو چکے ہیں مگر اولیں وزیرِ اعظم پاکستان اور ایک عظیم بطلِ ملت کی حیثیت سے وہ ہمیں ہمیشہ یاد آتے اور ہمارے دلوں کو گرماتے رہیں گے۔ کوئی عظیم شخصیت ہو، یا قومی یادگار، ایک علامتی حیثیت رکھتی ہے، اور جب اس کا نقش صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے تو وہ ہمارے دلوں پر ایک الم آفریں اثر چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مدائن کے کھنڈرات نے خاقانی کو "آئینۂ عبرت" اور "اشکے دو سہ ہم افشاں" کی جو انگیخت کی تھی، وہ ہمیں شہیدِ ملت جیسے محسنِ قوم کی یاد میں بھی اشک فشاں ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اس شمارے کے ابتدائی چند صفحات شہیدِ ملت کی یاد میں ہمارا خراجِ عقیدت ہیں۔

★

مولانا محمد حسین آزاد کی شخصیت بوجوہ غیر معمولی دلچسپی کا باعث رہی ہے اور کتنے ہی قلم کاروں نے اس کے مختلف پہلوؤں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی دیوانگی بھی ان کی زندگی کا ایک انوکھا پہلو ہے جو کچھ عجیب عالم رکھتا ہے۔ چند سال ہوئے "ماہِ نو" بابت اکتوبر ۱۹۵۴ء میں شاہد احمد دہلوی صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ان کی بہت ہی پُرلطف تصویر کھینچی تھی۔ اب ہمارے ایک اور مضمون نگار، ڈاکٹر محمد صادق، نے اپنی ذاتی تحقیق اور خصوصی معلومات کی بنا پر کچھ اپنی اور کچھ اوروں کی زبانی اس کی کیفیت بیان کی ہے۔ حق مغفرت کرے "آزاد" "بہتے دریا" تھے ہی۔ یہ دیوانگی اُن کی طبیعت کی ایک عجیب لہر تھی اور اگر ان کی بعض تصانیف "سپک و نمک"، "فلسفۂ الٰہیات" اور "جانورستان" وغیرہ کو سامنے رکھ کر آزاد کے تحت الشعور تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو اس سے اور بھی دلچسپ انکشافات کی امید کی جا سکتی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اعصابی کوفت اور دلی صدمات کے ساتھ ساتھ کوئی زیرِ نفسی کیفیت بھی کار فرما ہو جو ظاہری اسباب و علائم کی پردہ پوش ہو۔ اس کا فیصلہ مزید چھان بین پر ہی موقوف ہے۔

★

پچھلے شمارہ میں حضرت جوش ملیح آبادی نے غزل کا ایک رخ پیش کیا تھا۔ اس کا دوسرا رخ جناب فضل احمد کریم فضلی اور جمیل الدین عالی نے اس شمارہ میں پیش کیا ہے۔ یہ دونوں رخ لازماً جامع و مانع نہیں اور ہمیں امید ہے کہ دیگر اہل الرائے ان میں بحث و نظر کی مزید گنجائش پیدا کریں گے۔

★

مولانا ابوالجلال ندوی صاحب، جو قدیم تہذیب و ثقافت کے نقش کو اجاگر کرنے کے کام میں منہمک ہیں، ایک عرصہ کے بعد "ماہِ نو" کی محفلِ ادب میں شریک ہو رہے ہیں۔ "نقوشِ صحرا" کی مدد سے انہوں نے حروفِ مقطعات پر جو روشنی ڈالی ہے، وہ ہمیں ان پُراسرار حروف یا نقوش کو اور ہی نظروں سے دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگر اس عقدہ کشائی کا سلسلہ اور آگے بڑھایا جائے تو فہمِ قرآن کی اور راہیں وا ہونے کا قوی امکان ہے۔

★

حالی نے جس "پت جھڑ" کا ذکر اپنے زمانہ میں کیا تھا، اس کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنی ہی "کونپلیں پیرہنِ برگ سے عریاں" ہو گئیں۔ اس پت جھڑ میں مولوی محمد امین زبیری بھی شاخِ نشیمن سے جدا ہو گئے! مرحوم اُس دَور کی نشانی تھے جس میں سرسیّد اور حالی نے ایک نئی جوت جگائی تھی اور قوم کے مردہ جسم میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ افسوس ہے کہ تاراجِ زمانہ نے فصلِ بہار کی اس آخری پتّی کو بھی باقی نہ چھوڑا ؎

تا سحر تو نے نہ چھوڑی وہ بھی اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک!

سوانح نگاری کے باب میں زبیری مرحوم کے نقوش ہمیشہ تر و تازہ اور خاص اہمیت کے حامل رہیں گے اور اب تو ان کی وفات نے خود یہ ضرورت پیدا کر دی ہے کہ کوئی صاحبِ دل ان کے سوانحِ حیات پر قلم اٹھائے۔

سرورق: رنگین تصویر: "انتظار" —— عمل: اجمل حسین

ماہِ نو، کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء

"اشکے دو سہ ہم افشاں"

(شہیدِ ملت کی یاد میں)

محمد علی نیّر

تنِ آساں زندگی تھی اور عمل اک حرفِ مبہم تھا
دلِ جمہورِ ملت میں خلش تھی، دردِ پیہم تھا
نہ اندازِ تحمّل سے شناسا سبز پرچم تھا
نظامِ حکمت و تدبیر کا شیرازہ برہم تھا
شرارِ آرزو کی روشنی کم ہوتی جاتی تھی
تجلّی شوق کی سینوں میں مدھم ہوتی جاتی تھی

قیادت کی صفوں میں مکر و سازش کی حمایت تھی
رفاہِ قوم کے پردہ میں تخریبی سیاست تھی
اندھیروں میں ریاکاری کے گُم شانِ مروّت تھی
علی الاعلان ذاتی جاہ و منصب کی تجارت تھی
بچھایا دام جس نے آخرش وہ زیرِ دام آیا
عمل کا رُوحِ ملت کو حیات افزا پیام آیا

مجاہد کی نوا سے زندگی کروٹ بدلتی ہے
تمنّا حق پرستی کی نئے سانچے میں ڈھلتی ہے
فضائے یاس میں پھر عزم کی بجلی مچلتی ہے
تہِ دامانِ ظلمت نور کی ندی اُبلتی ہے
قیادت کے لئے اک پیکرِ آشفتہ جاں اٹھا
قیامت کا حدی خواں لالۂ آتش فشاں اٹھا

وہ ہستی گراں مایہ جو شایانِ سیاست تھی
متاعِ حرّیت کی جس کے سینے میں امانت تھی
خلوص و سادگی سے زندگی جس کی عبارت تھی
سراپا حکمت و تدبیر تھی، عینِ لیاقت تھی
اسی کی ضرب سے پھر آہنی زنجیرِ غم ٹوٹی
دلِ خونیں سے اس کے زندگانی کی کرن پھوٹی

شہیدِ ملّت

("صورت گرِ تقدیرِ ملت")

رئیس احمد جعفری

زعیم اور قائد کا کام صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ عوام کی رہنمائی کرے، رائے عامہ کی تشکیل کرے۔ منتشر اور پراگندہ گروہوں کو ایک مرکز پر مجتمع کر دے، قوم میں خودی، خودنگری، اور خود شناسی کا جذبہ پیدا کردے، ملت کو ایک نئی آرزو، ایک نئی امنگ سے آشنا کر دے، بلکہ اس کا کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ چند مخصوص لوگوں کی تربیت کرے، اور ان میں وہی رنگ اور وہی شان پیدا کر دے، جو خود اس کی خصوصیت تھی۔

متحدہ ہندوستان میں جتنی انقلابی تحریکیں عالم وجود میں آئیں، ان کے بانیوں اور کارفرماؤں کے حالات و سوانح پر اگر ایک نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا، ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ "آدمی گر" بھی تھے۔ مثلاً سر سیّد نہ ہوتے تو حالیؔ، محسن الملک، وقار الملک اور شبلیؔ وغیرہم وہ نہ ہوتے جو وہ بن گئے۔ اسی طرح اگر محمد علی شوکت علی نہ ہوتے تو ہماری ملّت کے بہت سے اکابر کی صلاحیتیں اور خوبیاں سربمہر رہ جاتیں۔

بعینہٖ اگر قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے ملّت کی قیادت نہ کی ہوتی اور اپنی خداداد مردم شناسی اور ذہانت سے ملت کی رہنمائی کے لئے کچھ لوگوں کو اپنا دست و بازو بنا کر تربیت نہ کی ہوتی تو ہماری ملت بہت سے قابل جوہروں سے شاید یا تو محروم ہی رہتی، یا اغیار کے پلّے پڑ جاتی اور ملک ان کی صلاحیتوں سے اب جس طرح بہرہ مند ہوا، نہ ہو سکتا۔ یہ دوربینی، مردم آگاہی، اور فیضِ تربیت ہماری تاریخِ ملت کی ایک ایسی خوشگوار روایت بن گیا ہے کہ ہم اسے بڑے فخر کی نگاہ سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس خصوص میں قائد اعظم کی نظرِ انتخاب خاص طور پر جس جوہرِ قابل پر پڑی، اس کا ذکر آج یہاں مقصود ہے۔

لیاقت علی خاں ایک دولت مند گھرانے کے فرد تھے۔ علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ بیرسٹر بھی تھے۔ لیکن نہ انہوں نے پریکٹس کی، نہ مسلمانوں کی ملّی اور تعمیری تحریکوں میں کوئی بڑا حصہ لیا۔ تحریکِ خلافت کا عالم آشوب دور آیا اور گزر گیا۔ مگر لیاقت علی خاں کا سر دامن بھی تر نہ ہوا، لوگ جیل جاتے تھے، لاٹھیاں کھاتے تھے، پھانسی پر لٹکتے تھے لیکن لیاقت علی خاں اپنے شبستانِ طرب میں محوِ راحت تھے، وہ یوپی کونسل کے ممبر تھے۔ خلافت سے بیزار کانگرس سے الگ، نوابوں، تعلقداروں، جاگیرداروں اور رئیسوں کے طبقہ کے ایک فرد۔ عالم اسلام کن مصائب میں مبتلا ہے، اس سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے دوش بدوش فرنگی استعمار کے خلاف کس طرح برسرِ پیکار تھے، لیاقت علی خاں نے اس طرف بھی کبھی توجہ نہیں کی۔ وہ سیاست میں تفریحاً حصہ لیتے تھے، سنجیدگی سے ملکی اور ملّی مسائل اور ان کی نوعیت پر ابتک انہوں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔

۱۹۳۵ء میں قائد اعظم نے مسلم لیگ کا احیا کیا، خود صدر منتخب ہوئے۔ لیاقت علی خاں کو سکریٹری منتخب کرایا۔ ملک کے آزمودہ کار سیاست داں اس انتخاب پر ششدر رہ گئے۔ یہ کیسا عجیب انتخاب تھا، ملّتِ اسلامیہ کی تنظیم و دفاع کا کام اسے سونپا جا رہا تھا جس نے عملی سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا تھا۔ دبی زبان سے بعض لوگوں نے کہا قائد اعظم نے مردم شناسی کا ثبوت نہیں دیا۔ بعض نے علانیہ کہا۔ بھلا لیاقت علی خاں مسلم لیگ میں نئی روح کیا پھونک سکیں گے؟

لیکن بہت جلد لیاقت علی خاں نے ثابت کر دیا کہ قائد اعظم کی مردم شناسی شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ انہوں نے اپنی بے پناہ صلاحیتوں اور کارگزاریوں کا جھنڈا گاڑ دیا۔ حریف تک ان کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گئے۔

سی پی کے مسلمانوں نے "ودیا مندر" کی مسلم آزار تحریک کے خلاف مورچہ قائم کیا۔ نوبت سول نافرمانی تک پہونچ گئی۔ کانگریسی حکومت، مسلمانوں کو کچلنے اور پامال کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ غدار مسلمان راؤ ڈی شنکر شکلا کی تائید اور حمایت کے لئے وقف تھے، اور کانگرس ہائی کمان نے

لیاقت علی خاں مرحوم

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد مرحوم

مولانا ابوالجلال ندوی

ڈاکٹر محمد صادق

اعلان کر دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے سامنے "نہیں جھک سکتی"! لیکن لیاقت علی خاں کی للکار نے فضا بدل دی، وادی لنکر تکلانے مجبور ہو کر دست مصالحت بڑھایا اندرونا باندروں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے لئے "مدینۃ العلم" کا مطالبہ منظور کر لیا۔ یہ لیاقت علی خاں کی فتح مبین تھی ۔۔۔ تدبر، سیاست دانی، معاملہ فہمی، اور سحر طراز شخصیت کی فتح!

حالات بدلتے رہے، تلخی بیدار ہوتی رہی، مسلمانوں کے جوش اور ولولہ میں اضافہ ہوتا رہا۔ ہندو سامراج، مسلمان اقلیت پر یلغار کرتا رہا، مسلمان قلیت ایک نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ اپنی حیات نو کے پروگرام بناتی رہی، یہاں تک کہ لارڈ ویول نے انٹرم حکومت قائم کی۔ کانگریس کی طرف سے جو لوگ اس کابینہ میں شریک ہوئے وہ قابلیت وصلاحیت اور ذہن و دماغ کے اعتبار سے چوٹی کے لوگ تھے۔ مسلم لیگ کو زک دینے کے لئے محکمۂ فینانس لیاقت علی خاں کے سپرد کیا گیا۔ عام خیال تھا کہ مسلمان اس معاملے میں کچے ہیں، لیاقت علی خاں کا بنایا ہوا بجٹ نقائص کا مجموعہ ہوگا۔ اس پہ خوب لے دے ہوگی اور دنیا پر ثابت کر دیا جائے گا کہ ؎

یہ وہ منزل ہے جس میں تیغ کا شوہ نہیں چلتا

لیکن لیاقت علی خاں نے "عوامی بجٹ" پیش کر کے دنیا کو وقف حیرت کر دیا، دوست رطب اللسان تھے اور دشمن انگشت بدنداں! اس بجٹ نے متحدہ ہندوستان کے عوام سے خراج تحسین حاصل کیا۔ یہ خراج تحسین پیش کرنے والے عوام ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی، عیسائی بھی اور پارسی بھی، سکھ بھی اور اچھوت بھی۔

پھر پاکستان بن گیا، اور لیاقت علی خاں کے دوش ناتواں پہ قدرت نے وہ بوجھ رکھ دیا کہ:

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید

قائداعظم بستر علالت پر تھے، پاکستان کی فوجیں پاکستان سے باہر مقیم تھیں، پاکستان کے حصہ کا روپیہ بھارت نے روک رکھا تھا۔ بٹوارہ میں جو سامان پاکستان کے حصہ میں آیا تھا، وہ اسے نہیں مل رہا تھا جس اسپیشل پر سرکاری فائلیں اور دوسری دفتری چیزیں آرہی تھیں، وہ نذر آتش کر دی گئی ۔ تباہ حال، آشفتہ روزگار، خانماں برباد، اور زندگی سے بیزار مسلمانوں کے قافلے گرتے پڑتے پاکستان کا رخ کر رہے تھے۔ پاکستان قائم ہو چکا تھا۔ نہ اس کے پاس سکریٹریٹ تھا، نہ دفاتر، نہ مکانات، نہ اسٹاف، نہ قلم نہ دوات، نہ میز، نہ کرسی، لیکن لیاقت علی خاں نے اپنی ہمت بلند سے ثابت کر دیا کہ پاکستان قائم رہنے کے لئے بنا ہے۔ انہوں نے بہت مختصر مدت میں ہر طرح کی مشکلات و موانع کے باوجود، پاکستان کی بکھری ہوئی فوجوں کو مجتمع کیا، ابتر حالات کو سدھارا، اور پاکستان کو ایک عظیم و جلیل مملکت بنا دیا۔ انہوں نے اپنے آپ کو فراموش کر دیا، اور صرف پاکستان کو یاد رکھا۔

قائداعظم کا انتقال ہو گیا اور قائداعظم کی وفات کے ساتھ ہی ریاست حیدرآباد پر "پولیس ایکشن" ہوا۔ اس حکمت عملی نے جہاں ریاست حیدرآباد کا خاتمہ کر دیا۔ وہاں پاکستان کے مسلمانوں پر بھی اضمحلال، مایوسی اور افسردگی کی کیفیت طاری کر دی۔ قائداعظم کے اچانک انتقال نے دفعتہً مسلمانوں کے سامنے یہ سوال لا کھڑا کیا تھا کہ اب ان کی رہنمائی کون کرے گا؟ ناسازگار اور ناساعد حالات میں کون ان کی حوصلہ افزائی کرے گا؟ آنکھیں ہر طرف کا جائزہ لیتی تھیں اور مایوس پلٹ آتی تھیں۔ یکایک لیاقت علی خاں کی گرجدار اور حیات آفریں آواز فضا میں گونجی۔ ان کے تیور، ان کے لب ولہجہ، ایقان کی استقامت نے آن کی آن میں کایا پلٹ دی۔ وہی مسلمان جو ہراساں اور سراسیمہ نظر آرہے تھے، اب خودنگر، خودشناس، اور خوددار نظر آنے لگے۔ کیونکہ لیاقت علی خاں نے ان کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی ؎

دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو، حاصل بھی تو

دیکھتے ہی دیکھتے لیاقت علی خاں "قائد ملت" بن گئے۔ قوم نے انہیں اپنی آنکھوں کا تارا بنا لیا، مخالف اور نکتہ چیں بھی پکار اٹھے:

آج تو آپ نے گرتا ہوا گھر تھام لیا ۔۔۔۔ اور واقعہ بھی یہی تھا۔

پھر مخصوص داعیات و مقاصد کے ماتحت، نہایت وسیع اور ہمہ گیر پیمانہ پر مشرقی پاکستان سے ہندوؤں کا انخلا شروع ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ مغربی بنگال میں مسلمانوں پر ظلم و تعدی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کے لئے "علیحدہ زمین" کا مطالبہ کیا جانے لگا، جنگ کی دھمکیاں دی جانے لگیں، بھارت اور پاکستان کے تعلقات قریب قریب ٹوٹ گئے، ہر آن اور ہر لحظہ یہ اندیشہ تھا کہ اب جنگ شروع ہوئی

اب لڑائی کا بگل بجا۔ ان حالات میں جواہر لال نہرو نے "وزرائے اعظم کی کانفرنس" کی تجویز پیش کی۔ پاکستان میں جذبات بہت مشتعل تھے۔ لوگوں نے اس تجویز کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اور اس پر تو گویا ساری قوم کا اتفاق تھا کہ اگر کانفرنس ہونی ہی ہے تو کراچی میں ہو، لیاقت علی خاں کو دلی جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ لیکن لیاقت علی خاں نے اعلان کیا میں دلی جاؤں گا۔ قومی اور ملکی مصالح کے تحت ہر جگہ جانے اور ہر شخص سے ملنے کو تیار ہوں، کوئی اندیشہ سد راہ نہ ہوا۔ لیاقت علی خاں دلی پہونچے، راجندر پرشاد، پٹیل اور نہرو سے ملے، وہ کسی معاملے میں نہیں جھکے کسی معاملے میں انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ چھوٹے بن کر نہیں برابر کے ساتھی بن کر ملے، ان کی فراست، تدبر، معاملہ فہمی، خوش گفتاری اور خلوص نے ساری مشکلیں آسان کر دیں۔" لیاقت نہرو معاہدہ عالم وجود میں آیا جو مایوسی کے اندھیرے میں امید کی کرن ثابت ہوا، بگڑتے ہوئے حالات سدھر گئے، اور بڑی حد تک طرفین کی اقلیتوں میں اعتماد بحال ہو گیا۔

مشرقی پنجاب سے جب مسلمانوں کا جبری انخلا ہو رہا تھا، وہاں سے مسلمانوں کے پٹے ہوئے اور لٹے ہوئے قافلے سرزمین پاک کا رخ کر رہے تھے، افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا، لیاقت علی خاں کا سارا خاندان، ماں، بھائی، بیوی، بیٹا، سب وہیں تھے، اور ہولناک خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ لیاقت علی خاں اس وقت لاہور میں مقیم تھے۔ اور مہاجرین کے حال زار کا بچشم خود مشاہدہ کر رہے تھے کہ ایک رکن خاندان کی طرف سے ہوائی جہاز کا مطالبہ پیش کیا گیا تاکہ کرنال سے سارا خاندان بہ حفاظت لاہور پہونچ جائے۔ یہ سنکر لیاقت علی خاں کی تیوریاں چڑھ گئیں، انہوں نے جواب دیا، سارے مشرقی پنجاب کے مسلمان میرے خاندان کی حیثیت رکھتے ہیں، اگر ہوائی جہاز کا انتظام سب کے لئے ہو سکتا ہے تو میرے خاندان کے لئے بھی ہو سکتا ہے۔ ورنہ کسی کے لئے نہیں۔

لیاقت علی خاں، بھارت میں اپنا سب کچھ چھوڑ آئے تھے، جائداد، جاگیر، کوٹھی، مکانات، حویلی، ساز و سامان، سب کچھ لیکن پاکستان آکر انہوں نے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا، کوئی تبادلہ نہیں کیا، صرف اُسی تنخواہ پر گزارا کیا، جو ایک وزیر کی حیثیت سے انہیں مل رہی تھی۔ جب مرتبہ شہادت پر فائز ہو کر اس دنیا سے رخصت ہوئے، تو ان کا دل نور ایمان سے معمور تھا لیکن جیب خالی تھی، ان کا بینک بیلنس اتنا بھی نہیں تھا، جتنا ایک معمولی آدمی کا ہو سکتا ہے۔ لیاقت علی خاں کے خلوص، ایثار، فداکاری، اور جذبۂ صادق نے اُس قوم کو سنبھال لیا تھا، جس نے نئی نئی آزادی حاصل کی تھی۔ اس ملک کو محکم اور مستحکم کر دیا جو ابھی ابھی عالم وجود میں آیا تھا، جس کے دوستوں کی فہرست بہت محدود تھی اور دشمنوں کی تعداد روز افزوں۔ یہ ایک نیا ملک تھا، ایک بڑا ملک تھا، اس کے پاس وسائل تھے، ذرائع تھے، اس کے عوام، اپنے کردار، اور ایثار کے لحاظ سے دنیا کی ہر قوم کے مقابلہ میں سربلند تھے۔ ضرورت تھی ایک زعیم کی، ایک قائد کی۔ اور قدرت نے یہ ضرورت قائد اعظم اور شہید ملت کی صورت میں پوری کر دی تھی! ؟

★

"ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنی مختصر زندگی میں ہمیں اپنے گرد و پیش کی دنیا اور اپنے زمانہ کی نسبت، نیز خود اپنے متعلق بہت کچھ معلوم ہو گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ آزادی، خواہ فرد کی ہو یا ملکوں کی، ہر جگہ اور ہر وقت محفوظ نہیں ہوتی اور ہمارے اپنے وطن کی سالمیت، جو ہمیں جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، ہم سے مسلسل خبردار رہنے کا مطالبہ کرتی ہے۔۔۔۔

اگرچہ آزادی نے بہت جنم لئے ہیں، لیکن افسوس، حرص و آز، ظلم و تشدد اور عدم رواداری اب بھی اپنا منحوس سر اٹھا رہے ہیں۔

یہ صدی دنیا کے تمام حصوں میں عظیم الشان بیداری کی صدی ہے اور یہ تمام تر دنیا کے رہنماؤں پر موقوف ہے کہ وہ انسانیت کو دہشت ناک تاریکی کی طرف لے جاتے ہیں یا اس کی رہنمائی ایک نورانی صبح کی طرف کرتے ہیں!"

(لیاقت علی خاں ——— ۴ مئی ۱۹۵۰ء: امریکی سینیٹ)

"تنگنائے غزل"

جمیل الدین عالی

مدتوں بعد گذشتہ اگست کے 'ماہِ نو' میں غزل پر پھر بحث چھڑی ہے۔

ویسے جناب جوش ملیح آبادی کی تحریک بہت پرانی ہے۔ اب سے پچیس برس پہلے جب وہ "کلیم" نکالتے تھے۔ انہوں نے غزل کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ قائم کیا تھا اور مضامین کے علاوہ نظمیں بھی لکھی تھیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اس وقت بھی غزل کی بجائے چند غزل گو شعراء کا کلام سامنے رکھکر غزل کے پورے ادارے کو ہی ہدفِ ملامت قرار دے دیا تھا اور آج بھی "ہمارے تمام غزل گو شعرا یہی اندھیر کرتے رہے ہیں" فرماکر گذشتہ تیس برس میں، خاص طور پر دورانِ جنگ اور بعد از جنگ، غزل میں جو نئی تحریکیں چلی ہیں اور جو صوتی اور آہنگی تجربے ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں، ان سے قطعی بے تعلقی کا ثبوت دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے جوش صاحب کو غزل سے اتنی کد نہیں جتنی اُن چند غزل گو شعرا سے ہے جن کا کلام انہیں ناپسند تھا۔ اس سلسلے میں انہوں نے از خود کچھ مقدمات قائم کئے ہیں اور پھر خود ہی کچھ فیصلے فرمائے ہیں۔ انہوں نے 'غزل باف' جیسی لطیف ترکیب بھی اختراع کی ہے اور بلا خوفِ ابطال فرمایا ہے کہ: "غزل ایک غلط اور غیر فطری چیز کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی ہے۔" ایک اہم مقدمہ جس پر ان کی رائے کا انحصار ہے، یہ ہے کہ غزل گو شعرا کی سیرت و شخصیت اور ان کے کلام میں ہم آہنگی نہیں پائی جاتی۔ اس سلسلے میں انہوں نے غزل جیسی صنفِ سخن کے متعلق بحث کی صرف دو ڈھائی سو برس کی تاریخ میں کوئی تیرہ ہزار کہنے والے گزرے ہیں، صرف ریاض خیرآبادی اور امیر مینائی کا حوالہ دیا ہے اور غالباً سہواً خود اس شخص کو نظر انداز کر گئے جس کا نام غالب تھا، اور جس کی وضع کردہ ترکیب "تنگنائے غزل" پر انہوں نے اپنے مضمون کی بنیاد رکھی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ہر بڑے آدمی کی ہر بات توجہ کے قابل نہیں ہوتی مگر کم از کم غزل کو اس تحریک کے احیا سے کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچنے کا امکان ہے اس لئے کہ مدتوں سے اس مسئلہ پر بحث بند ہے اور اب چھڑی ہے تو اچھے اچھے لوگ غزل کی تاریخ، غزل کی ہیئت، امکانات، افادیت اور اس کے مستقبل پر پرانی گفتگوؤں میں قابلِ قدر اضافے کریں گے۔

وہ نظم گو ہوا جو غزل خواں نہ ہو سکا

فضلی

یہ تو نہیں کہ جشنِ بہاراں نہ ہو سکا
لیکن بقدرِ شوق فراواں نہ ہو سکا

وہ وقت آپڑا ہے کہ اہلِ دل کو کیا کہیں
ہم سے بھی چاک اپنا گریباں نہ ہو سکا

ہم نے شبِ فراق جلائے بہت چراغ
ان کے بغیر گھر میں چراغاں نہ ہو سکا

ہر اک کی دسترس میں کہاں تیرِ دلبراں
وہ نظم گو ہوا جو غزل خواں نہ ہو سکا

ان کی وابستوں کا نہ حق کر سکے ادا
ہم سے کوئی بھی کارِ نمایاں نہ ہو سکا

فضلی کا حال اسکے سوا ہم سے کیا کہیں
وہ اک چراغ تھا جو فروزاں نہ ہو سکا

☆

اتفاق سے پوری شاعری کے عوامل اور پھر غزل کی ہیئت ترکیبی پر جوش صاحب نے اس بار کچھ نہیں فرمایا، نہ اس کی محدودات یا وسعتوں پر روشنی ڈالی۔ اس لئے فی الحال انہی کی پیروی مناسب ہے، اور شاید اس بار ان صفحات میں کسی سیر حاصل گفتگو کی گنجائش بھی نہ نکلے۔ پھر بہتر بھی یہی ہے کہ موضوع کے مختلف حصوں پر الگ الگ آراء کا اظہار کیا جائے چنانچہ جو کچھ عرض کیا جائے گا وہ جوش صاحب کے مضمون سے ہی متعلق ہو گا۔

جوش صاحب نے آپ بیتی کا مسئلہ اٹھایا ہے۔ ان کا مطلب غالباً یہ ہے کہ ادیب (یا شاعر کہہ لیجئے) جو کچھ لکھے وہ سو فیصدی اس کے "عملی" کردار

کا ظہور ہونا چاہیئے۔ یہاں انہوں نے خیال، جذبات، انسان کی اندرونی صلاحیتوں، ذہنی اور روحانی کشمکشوں سب کی طرف سے آنکھ بند کرلی ہے۔ وہ کسی باشعور آدمی کو حق نہیں دیتے کہ وہ کسی وقت اپنی صوری محرومی کو بھول کر اپنی کسی الجھن، کسی آرزو، کسی اندرونی تضاد کو کسی عنوان آراستہ کرے۔ وہ امیر مینائیؒ سے اس بات پر خفا ہیں کہ وہ ایک متقی انسان تھے اور پھکڑ قسم کی غزل کہتے تھے۔ یہاں انہوں نے "ہست قرآں در زبانِ پہلوی" والے مولوی معنوی کے ساتوں دفاتر فراموش کر دیئے ہیں جن کا ع

ہر ورقے دفتریست۔ —

اور دور کیوں جایئے انہوں نے حضرات خواجہ میر درد و خواجہ میر اثر کا جملہ اُردو کلام بھی مطلقاً نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس امر پر بھی غور نہیں کیا کہ ایک لکھنے والا اپنے معاشرے کی اقدار سے بالکل ہی بے نیاز ہو کر نہیں رہ سکتا، اور امیر مینائی مسلمانوں کے انتہائی زوال پرست معاشرے کے ایک رکن تھے۔ اسی طرح انہوں نے ریاض خیر آبادی کی خمریات کا حوالہ دیا ہے جو اُن کی زندگی سے مطابقت نہیں کرتیں مگر انہوں نے خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ نہیں کیا جن کے بارے میں آج تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک "عملی" شرابی اور شاہد باز آدمی تھے ——— اتفاق سے حافظ آج بھی غزل کے امام کہے جاتے ہیں ———

ایک اعتراض جوش صاحب کا یہ ہے کہ غزلوں کے اسّی فیصدی اشعار عاشقانہ ہیں اور سب غزلیں ایک ہی سے لچر پوچ عشق کی آئینہ دار ہیں اور ہر زمانے میں ہر غزل میں ان کے مرتب کردہ "نو نکات" منعکس ہیں۔ ان میں اہم نکتے یہ ہیں کہ سب غزل گو قنوطی ہیں، سب غزل گو بازاری عورتوں اور بدقماش نوخیزوں کے عاشق ہیں۔ سب غزل گو بقول خود شرابی ہیں، سب کے معشوق ہرجائی ہیں، سب غزل گو بزدل، بدصورت اور ان کے رقیب بہادر اور خوبصورت ہیں اور سب غزل گو خودداری سے محروم ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ غزل کا عام موضوع عشق رہا ہے مگر اب یا تو عشق پر ایک الگ مقالہ لکھا جائے یا مختصراً یہ کہا جائے، گو شاید جوش صاحب نہ مانیں کہ عشق تو اصل میں دنیا کی ہر ہر مبنی شاعری کا موضوع ہے اور سیفو سے لیکر جوش صاحب تک دنیا کی بیشتر اچھی شاعری عشق کے سہارے ہی ہوئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جوش صاحب سے بہت پہلے گزرنے والے دو آدمی یہ غیر عشقیہ شعر کہہ گئے کہ ؎

آخر الامر آہ کیا ہوگا! — کچھ تمہارے بھی دھیان پڑتی ہے

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش سے ادھر ہوتا کاشکے مکاں اپنا

بلکہ ایک اور کہنے والا کہہ گیا ؎

کہیں تو قافلۂ نو بہار ٹھہریگا

ان تو اسی عشقیہ شاعری میں، یعنی اسی اردو غزل کی عشقیہ شاعری میں عشق کی واردات نے بدلتے ہوئے سماجی حالات کے ساتھ ساتھ "انفرادی" و "ملی" تجربوں کی آنچ میں تپتے ہوئے کیا کیا رنگ بدلے، یہ جاننے کے لئے کوئی بڑا ساکھ نہیں کرنا پڑتا۔ صرف میر، غالب، حالی، اقبال، حسرت، اصغر، یگانہ، فانی اور فراق کے دیوان پڑھنے پڑتے ہیں جن کے سستے نسخے اُس وقت بھی ملتے تھے جب "کلیم" نیا نیا جلوہ گر ہوا تھا (یہاں جگر مرادآبادی کا ذکر دانستہ نہیں کیا گیا کیونکہ وہ جوش صاحب کے خاص ہم عصر ہیں) آگے چلئے تو فیض اور جذبی بھی نظم کہنے کے باوجود خاصے غزل گو ہی مانے جاتے ہیں۔ اور آگے تو اب پاکستان میں حفیظ ہوشیارپوری، ناصر کاظمی، سیف اور ضمی بھی اسی غزل کے نام لیوا ہیں۔ اسی لئے ہمیں ایک طرف تو یقین نہیں آتا کہ جوش صاحب نے ان حضرات کا کلام دیکھا ہی نہیں مگر دوسری طرف ہمیں ان جملہ حضرات کے کلام میں وہ بازاری لڑکے اور وہ طوائفیں نہیں ملتیں جو بقول جوش صاحب سب غزل گویوں کا کعبۂ مقصود ہیں۔ نہ یہ سب حضرات شرابی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، نہ اپنی بزدلی و بدصورتی اور رقیب کی بہادری اور خوبصورتی کے مداح معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں ان حضرات کے کلام سے اقتباس کا موقع نہیں ہے۔ جو غزل میں عشق سے متعلق مختلف النوع موڈوں اور جذباتی تجربوں کی تھوڑی سی رنگا رنگی دکھائی جائے۔ دور کیوں جایئے خود "ماہ نو" کے اگست والے شمارے میں دس غزلیں شامل ہیں جو شاید بڑی اور عظیم غزلیں نہ ہوں مگر سب الگ الگ ہیں۔ اور خاص طور پر جوش صاحب والا شرابی، قنوطی، بے غیرت شاعر تو ان میں سے کوئی نظر نہیں آتا۔ اور ان سب کا محبوب بھی کچھ اور مختلف ہی نظر آتا ہے بلکہ فراق صاحب کی غزل کا محبوب تو خود ان کا نام پتہ پوچھ رہا ہے ———

کون فراق جواب سے تیس چالیس برس پہلے کے غزل گو ہیں۔

اپنی تقریر کے اواخر میں جوش صاحب نے چند بے حد تکلیف دہ باتیں کہہ دی ہیں۔ انہوں نے فرمایا ہے کہ "اس قسم کا کلام شاعری نہیں بلکہ نقالی ہے اور نقالی بھی شرمناک قسم کی:

اس ذیل میں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ "کلیم" کے زمانے سے اب تک یہاں پڑھے لکھے لوگوں کی شرح اوسط بہت بڑھ گئی ہے اور نوجوانوں میں سوچنے سمجھنے اور پرکھنے جانے کی صلاحیتیں بھی کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہیں۔ ایسے زمانے میں جب کئی کئی اسپوتنک ادھر اڑ رہے ہوں، مشرق سے مغرب تک کا فاصلہ چھتیس گھنٹے میں طے ہو رہا ہو، دنیا کے ہر اچھے ادب کا ترجمہ ہر زبان میں ہو رہا ہو۔ لوگ اس قسم کے فیصلوں اور اس قسم کے لہجوں کو پسند نہیں کرتے خواہ وہ کوئی اختیار کرے۔

آخر میں جوش صاحب نے دھمکی دی ہے کہ اگر "دنیا کا کوئی نقاد جلیل" ہم سے پوچھ بیٹھے کہ آخر آپ لوگ اس کلام کی معرفت ہم سے کیا کہنا چاہتے ہیں تو۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری قومی غیرت اس کا کیا جواب دے گی؟"

خیر اگر قومی غیرت پر آنچ آنے لگی تو ہم جوش صاحب کے کلام کو سپر بنالیں گے مگر یہ تو اس وقت ہو گا جب وہ نقاد جلیل پیدا ہو گا اور ہم سے یہ بات "پوچھ بیٹھے گا" فی الحال تو ہماری تسلی کے لئے یہی عالمگیر خوش فہمی کافی ہے کہ اردو غزل نے اب تک جو ادب پیدا کیا ہے وہ کسی بھی ملک کی بڑی سے بڑی عشقیہ شاعری کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔

★

غزل

ضمیر اظہر

سکوتِ شب میں ہے ہلکی سی چاندنی تحلیل
ہے زیبِ دیدہ و دل ماہ کا خرامِ جمیل

یہ دیکھ کر کہ ہے تو ہر مقام سے آگے
ہر اک مقام سے آگے نکل گئی تخئیل

تو وہ ترانہ کہ قائم ہے جس سے سوزِ حیات
میں وہ فسانہ کہ جس کی نہ ہو سکی تکمیل

حسین خواب سے لہرا گئے ہیں آنکھوں میں
عجیب رنگ سے آئی ہے تیری یادِ جمیل

چمک چمک کے ستاروں کا ماند پڑ جانا
فنائے حُسن کی ہے ایک مختصر سی دلیل

اگرچہ اس میں کئی بار میں نے رنگ بھرے
شبیہ زیست رہی پھر بھی تشنۂ تکمیل

اُلجھ کے کانٹوں کے جھرمٹ میں رہ گئی اظہر
نظر کہ تھی کبھی حُسنِ گل و سمن کی قتیل

آزاد عالمِ دیوانگی میں

ڈاکٹر محمد صادق

اس مضمون کے ماخذ دو ہیں۔ اول وہ اطلاعات جو مجھے براہ راست آزاد کی تصانیف یا دوسرے طبع شدہ مواد سے حاصل ہوئیں، اور دوسرے وہ گرانقدر معلومات عنایت نامہ جو مولوی خلیل الرحمٰن نے میرے سوال نامہ کے جواب میں ۱۱ دسمبر ۱۹۳۷ء کو مرحمت فرمایا۔ چونکہ یہ خط سراسر ذاتی معلومات اور عینی مشاہدات پر مبنی ہے اور اس کے مضامین کو اپنے الفاظ میں ادا کرنے سے تغیر و تبدل کا احتمال تھا اس لئے میں نے متعلقہ اقتباسات کو جوں کا توں نقل کر دیا ہے۔ اس طریق کار میں مصنف کو دخل در معقولات کا موقع نہیں ملتا۔ دوسرے الفاظ میں وہ اپنی ذاتی اطلاعات کو مضمون میں سمو نہیں سکتا۔ اس قید کے پیش نظر ایسی اطلاعات یا معلومات فٹ نوٹ کی صورت میں دی گئی ہیں۔

مذکورہ بالا خط میں مولوی خلیل الرحمٰن نے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے :۔

> میں چیف کورٹ (ملتونی) میں نوکر ہوا۔ اور یکم فروری ۱۸۹۵ء کو لاہور پہنچا اور اگست ۱۹۲۷ء میں ریٹائر ہوا۔ مگر چیف کورٹ سے نہیں بلکہ ایجنٹ ریلوے کے دفتر سے ..... چیف کورٹ میں آغا ابراہیم مرحوم کے ماتحت کیا گیا۔ یہ کہنا چاہیئے کہ یکم فروری ۱۸۹۵ء ہی سے میرا تعلق مولوی آزاد صاحب مرحوم سے پیدا ہوا..... مجھے بچہ سا دیکھ کر آغا صاحب کی والدہ محترمہ نے مجھ سے مادرانہ سلوک کیا ......
>
> مولوی صاحب ذرا دیر آشنا تھے۔ ان کی شفقتیں ہونے میں دیر لگی۔ مگر شروع ہوئیں تو دیوانہ ہونے تک قائم رہیں۔

مولانا آزاد دماغی عارضہ میں دو دفعہ مبتلا ہوئے۔ پہلی مرتبہ سیر ایران سے چند سال پہلے جب ان کی صاحب زادی، امۃ السکینہ[1]، عین عالم جوانی میں انہیں داغ مفارقت دے گئیں۔ لیکن یہ دیوانگی دیرپا ثابت نہ ہوئی۔ دوسری دیوانگی، جس پر اس مضمون میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی، سفر آخرت تک ان کی رفیق رہی۔

مولانا آزاد کی دیوانگی کا کھوج لگانا کوئی مشکل کام نہیں۔ مولانا کی صحت، باوجود ان مصائب اور حرماں نصیبیوں[2] کے جن سے انہیں دو چار ہونا پڑا بہت اچھی تھی۔ وہ قوی ہیکل اور تنو مند تھے۔ لیکن تقریباً پچیس سال کی پیہم محنت شاقہ سے ان کے دماغی قویٰ مضمحل ہو گئے تھے۔ سفر ایران کے بعد ان کی ادبی سرگرمیوں نے ایک مستقل اعصابی تناؤ کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ان کے دل و دماغ پر ہر وقت یہ خیال مسلط رہتا تھا کہ جیسے بھی بن پڑے مجھے اپنی نا تمام تصانیف کو پورا کرنا چاہیئے۔ یہاں وہ چیز جو سب سے زیادہ ان کے لئے سوہان روح بن رہی تھی، دیوان ذوق کی ترتیب و اشاعت تھی۔

مولانا آزاد کے ادبی انہماک کا پتہ ان کی خط و کتابت سے چلتا ہے۔ یہاں میں صرف دو تین اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ آب حیات کی

---

[1] آزاد کی صاحب زادی میرے لاہور پہنچنے سے پہلے انتقال کر چکی تھیں۔ ان کا اکثر آزاد، آغا اور ان کی والدہ مرحومہ سے تذکرہ آیا۔ ماں باپ دونوں آہ بھرتے تھے۔ وہ واقعی بڑی قابل بی بی تھیں۔ خود آزاد نے مجھ سے کہا کہ ان ہی کے سودوں کو بعد از اصلاح میں کام میں لایا ہوں۔ ریویو کے لئے آزاد کے پاس بہت کتابیں آتی تھیں وہ سب ان صاحبزادی کو دے دی جاتی تھیں اور ان ہی کے ریویو آزاد کے نام سے چھپتے تھے۔ ان کی شادی ٹپیالہ کے خلیفوں کے خاندان میں ہوئی تھی (خلیل الرحمٰن)

[2] تمام زندگی میں ان کے ہاں سولہ بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے صرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی باقی رہے۔ باقی سب چند سال کے ہو ہو کے رخصت ہو گئے۔ (آغا محمد باقر)

اشاعت کے بعد وہ ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

اکثر ذوق و شوق کا وقت تھا کہ سوسائٹیوں اور کمیٹیوں کے مضامین لکھنے میں اڑ گیا۔ بڑا حصہ عمر گراں بہا کا سر رشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں۔ مگر انہوں نے مجھ سے انتہا سے بڑھ کر محنت لی.... پھر انہیں بار بار کاٹنا، بنانا، گھٹانا۔ ٹانا... پھرتے چلتے۔ جاگتے سوتے۔ بچوں کے خیالات میں رہا۔ مہینوں نہیں بلکہ برسوں صرف ہوئے جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے.... جو وقت نوکری سے خالی پاتا تھا اس میں آرام نہ کرتا تھا۔ بہت کم سوتا تھا..... اسی میں سے یہ اوراق پریشان کاٹے اور آبِ حیات کا جام بنا کر تمہاری ضیافت طبع کے لئے حاضر کیا۔ اب افسوس ہے۔ اور افسوس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ میں تھک گیا اور ہاتھ پاؤں میں سکت نہ رہی۔ دل و دماغ فرسودہ ہو گئے۔ اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ آخر انسان ہوں۔ محنت کی بھی حد ہوتی ہے۔ کئی مسودے دھرے ہیں کئی ناتمام پڑے ہیں۔ بہت سے خیالات دل ہی دل میں گرہ ہیں۔ اتنی طاقت نہیں کہ نکل سکیں....

اور:

پرسوں اتوار کو یہاں ایک بڑا جلسہ تھا..... وہاں کوئی بولا کہ آزاد کہاں ہے؟ اس سے بھی پوچھو۔ وہیں سے کوئی بولا، اس نے کمیٹیوں کو بالکل استعفا دے دیا ہے۔ وہ تو اب تصانیف میں غرق رہتا ہے۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ آجکل وہ دربارِ اکبری لکھ رہا ہے مگر اکیلا ہے کوئی رفیق و مددگار نہیں۔ کئی شخصوں نے کہا۔ پھر وہ کس طرح کی مدد چاہتا ہے؟ جو ہم سے ہو سکتی ہے ہم بھی کریں۔ میں دم بخود تھا۔ تائید و تدبیر کیا کہوں کہ میرا کام سوائے خدا و مولا کے مدد پذیر نہیں یا علی مدد! چار بجے ہیں صبح قریب ہے۔ وقت قبول کا ہے اگر سائل کی آواز حضور تک پہنچ جائے۔ ۲۰ مارچ ۱۸۸۳ء

اور:

عجب ہجوم محنت میں مبتلا ہوں..... سو امہینے سے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوں۔ میری حالت ایسی ہو گئی ہے کہ ہر شخص پوچھتا ہے کہ تم کچھ بیمار تھے..... میری کتابیں ناتمام پڑی ہیں اور میری جان انہیں میں لگی ہے۔ (میں اپنی) تصانیف کو پورا کر دوں گا۔ اور اپنے لختِ جگر بچوں کو نیم جان تڑپتا نہیں چھوڑ دوں گا۔ آبِ حیات نے مجھے ہلاک کر دیا۔ مجھ سے بے وقوفی ہوئی ہے۔ ا مہینے کا کام تھا جو ڈیڑھ مہینے میں کیا ہے.....

جب مولانا آزاد اپنے سفرِ ایران سے واپس آئے تو ان کی صحت بگڑ چکی تھی لیکن اپنی ناتمام تصانیف کا خیال انہیں چین نہیں لینے دیتا تھا۔ خصوصاً دیوانِ ذوق کی اشاعت نے ایک نیم مجنونانہ کیفیت پیدا کر دی تھی، وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

میں نے سخندانِ فارس کو نظر ثانی کر کے رکھ دیا ہے۔ چاہا کہ اب دربارِ اکبری کو سنبھالوں۔ مگر مروت اور حمیت نے اجازت نہ دی۔ کیونکہ استاد مرحوم شیخ ابراہیم ذوق کی بہت سی غزلیں قصیدے بے ترتیب پڑے ہیں۔ اور میں خوب جانتا ہوں کہ ان کا ترتیب دینے والا میرے سوا دنیا میں کوئی نہیں۔ اگر میں اس کے باب میں بے پروائی کروں گا تو یہ ان کی محنت کا نتیجہ جو دریا میں سے قطرہ رہ گیا ہے بے موت مر جائے گا۔ اور اس سے زیادہ افسوس موت کا مقام کیا ہو گا۔ ان کے حال پر افسوس نہیں۔ یہ میری غیرت اور حمیت پر افسوس ہے...

دیوانِ ذوق کی ترتیب پر جو محنت آزاد کو صرف کرنی پڑی اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوتا ہے:

ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے دیوان مروجہ میں کچھ چھپے۔ اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے کبھی کچھ۔

---

[1] یہ دوسرے ایڈیشن کا ذکر ہے۔ مولوی خلیل الرحمٰن نے آزاد کو دیوانِ ذوق کی ترتیب میں مشغول دیکھا تھا۔ ان کی منظر کشی ملاحظہ ہو: "سخت گرمی، جون کا مہینہ، دیوانِ ذوق کی ترتیب میں دن رات کی (بلا مبالغہ) مصروفیت۔ کتب خانہ گیا تو ہر طرف دروازے بند۔ دستک دیکر دروازہ کھلوایا اور فوراً بند کر دیا گیا۔ اندر گھپ اندھیرا۔ منت سماجت کر کے دروازہ کھلوایا۔ دیکھا کہ رقعۂ متذکرہ بالا کے پانچ چھ (یا زیادہ ٹھیک یاد نہیں ہے) مختلف الٹ پھیر کے ساتھ مسودے میز پر پڑے ہیں"

پھٹے پرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت سی تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں ...... کٹے پھٹے اشعار کا پڑھنا۔ مٹے حروف کا اجالنا اُس زمانے کے حالات کو سمیٹنا۔ حالتوں کا تصور باندھنا۔ بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا کہ راتیں صبح ہو گئیں اور دن اندھیرے ہو گئے جب یہ مہم سرانجام ہوئی۔

مندرجہ بالا اقتباس میں مولانا آزاد نے اپنی ان دشواریوں کو جن سے انہیں دیوانِ ذوق کو ترتیب دیتے ہوئے دوچار ہونا پڑا، نہایت مؤثر انداز میں بیان کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں انہوں نے اپنی دشواریوں کا پورا انکشاف نہیں کیا۔ اصل یہ ہے کہ ذوق کی بیسیوں غزلیں اور چند قصائد یا تو آزاد کے پاس سرے سے موجود ہی نہ تھے۔ یا ایسی خستہ حالت میں تھے کہ پڑھے نہیں جاتے تھے۔ لیکن ان سب کا انہیں علم تھا۔ ایک زمانہ تھا جب ان میں سے اکثر ان کے حافظہ میں موجود تھے۔ لیکن اب پیرانہ سالی میں یا وہ انہیں بھول چکے تھے۔ یا ان کے نہایت دھندلے سے نقوش ان کے حافظہ پر مرتسم تھے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ انہیں ان کی قسمت پر چھوڑ دیا جاتا۔ لیکن استاد کی محبت انہیں مجبور کرتی تھی کہ جیسے بھی ہو انہیں نیست و نابود ہونے سے بچایا جائے۔ میرے پاس ان غزلوں اور قصائد کے مسودے ہیں جنہیں میں ایک مبسوط مطالعہ کی صورت میں پیش کرنے والا ہوں۔ ان مسودوں میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جنہیں بلا مبالغہ بیسیوں بار کاٹا گیا ہے۔ اور تسیخ در تصحیح کی گئی ہے۔ جو لوگ شاعرانہ کاوشوں سے واقف ہیں وہ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ کام کس قدر صبر آزما ہوتا ہے۔ آزاد کے لئے ان بھولے بسرے نقوش کو از سر نو ابھارنا اور انہیں شاعرانہ زبان کے سانچے میں ڈھالنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور گرتے پڑتے اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ ہی گئے۔ اس محنت کی انہیں خوفناک قیمت ادا کرنی پڑی۔ آزاد کی دیوانگی کا راز دیوان ذوق کی ترتیب میں مضمر ہے۔ یہ امر کہ اس وقت آزاد کے دماغ میں فتور آچکا تھا دو اور باتوں سے بھی پایۂ ثبوت کو پہنچتا ہے۔ اول ان کی درویش پرستی اور دوسرے دربارِ اکبری کی اشاعت کی مجنونانہ مخالفت۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ آزاد کو درویشوں سے قطعاً کوئی مناسبت نہ تھی۔ اپنی تصانیف میں وہ کھلم کھلا ان کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ لیکن دماغی اختلاط کے اس دور میں جو سفر ایران کے بعد شروع ہوتا ہے انہیں ان سے نمایاں عقیدت ہو گئی تھی۔" ان دنوں ایک مجذوب سائیں دھیان شاہ میاں سلطان کی سرائے کے نزدیک رہتے تھے۔ آزاد ان کے بہت معتقد تھے۔ تقریباً روزانہ ان کے پاس جاتے تھے۔ اور آغا اور مجھے بھی تاکید کرتے تھے۔ دو تین دفعہ مجھے بہ جبر ساتھ لے گئے" (مولوی خلیل الرحمٰن)۔ اسی طرح آغا محمد باقر اپنے مضمون "شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد" میں لکھتے ہیں کہ نوٹیں کوٹ کے قریب ایک مجذوب سید بدھن شاہ چشتی رہتے تھے۔ آزاد کو ان سے بہت عقیدت تھی۔

دربارِ اکبری والا معاملہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ اس تصنیف کو آزاد نے سالہا سال کی محنت سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا تھا۔ اور تمام وقت وہ اس کی اشاعت کے حسین خواب دیکھا کئے۔ لیکن جب یہ تصنیف پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے تو آزاد اس کی اشاعت کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ اور مخالفت کی بنا بھی عجیب تھی، وہ کہتے تھے، میں ہرگز یہ پسند نہیں کرتا کہ اکبر جیسے اولوالعزم شہنشاہ کی زندگی ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں جائے اور چند سکوں کے عوض بازاروں میں بکتی پھرے۔ اس معاملے میں وہ کسی کی نہیں سنتے تھے اور مسودے کو دیکھنا تو درکنار کسی کو اپنے کتب خانے کے نزدیک نہیں آنے دیتے تھے۔ اور جب آخر کار ان کی تمام نگہداشت کے باوجود مسودہ ان کے کتب خانے سے نکال لیا گیا تو ان پر دیوانوں کی سی حالت طاری ہو گئی۔ اکثر سننے میں آتا ہے کہ بدیں خوف کہ کہیں اسے چھاپ نہ دیا جائے آزاد نے مسودے کو دریائے راوی میں ڈال دیا تھا۔ یہ بات سراسر غلط ہے۔ لیکن یہ عین ممکن ہے کہ آزاد نے اسے دریا برد کرنے کی دھمکی دی ہو یا خیال ظاہر کیا ہو۔ بہرحال یہ دونوں باتیں ایک واضح حقیقت کا پتہ دیتی ہیں۔ اگر آزاد کی درویش پرستی سے ان کی دماغی کمزوری کا ثبوت ملتا ہے تو دربارِ اکبری والے معاملہ سے ہم ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اس وقت ان کا دماغی توازن مکمل طور پر بگڑ چکا تھا۔

"اب آزاد کی دیوانگی کی کہانی مولوی خلیل الرحمٰن کی زبانی سنئے:

دیوانگی کا قصہ اور شروعات گورنمنٹ کالج کے ایک طالب علم نے یہ بیان کیا کہ ہم نے بی اے میں عربی لی تھی۔ مولانا کے پاس عربی بھی تھی۔ ہم نے ان کو بہت تنگ کیا۔ اس لئے وہ دیوانے بن بیٹھے۔ مگر یہ بالکل لغو ہے ...... صورت میرے نزدیک یہ ہے کہ ان میں دیوانگی کا مادہ

پہلے ہی تھا۔ غدر کے مصائب کی یاد۔ طبیعت کی بدگمانی نہتوں سے شکایت وغیرہ وغیرہ۔ رفتہ رفتہ کام کرتے رہے۔ اس پر قیامت یہ ہوئی کہ دیوانِ ذوق کی ترتیب شروع کر دی۔ اس میں دن رات کا انہماک و استغراق رہا۔ راتوں اسی ادھیڑبن میں لگے رہتے۔ استاد کی غزلیں پوری کرتے۔ گرمیوں میں اس پر محنت زیادہ ہوئی۔ نیند میں کمی آگئی۔ دیوان تو جوں توں کر کے چھپ گیا۔ مگر مراق کی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اور یہ حالت ہوئی کہ ایک دفعہ میں اور مولوی ممتاز علی مرحوم ملنے گئے۔ ان دنوں وہ امام باڑے میں رہتے تھے۔ میں مولانا سے ڈرنے لگا تھا کیونکہ سخت سست کہہ بیٹھتے تھے۔ اب ایک لطیفہ یہ ہوا کہ صحن میں دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ ایک پر آزاد بیٹھے تھے۔ مولوی صاحب ازراہ ادب پائینتی بیٹھ گئے۔ میں بھی دوسری خالی چار پائی پر پائینتی پر بیٹھ گیا۔ مجھ سے مولانا نے کہا کہ "میاں! کس کے لئے وہاں بیٹھے ہو۔ سرہانے ہو بیٹھو" میں نے فوراً تعمیل کی۔ مولوی صاحب سے انہوں نے دو تین مرتبہ کہا کہ "آگے ہو بیٹھو" انہوں نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ "اچھا بیٹھا ہوں"۔ آخر مولانا کو غصہ آگیا۔ کہنے لگے "بے وقوف۔ گدھا۔ احمق! میری ادھوائن ٹوٹی جا رہی ہے اور یہ کہتا ہے کہ اچھا بیٹھا ہوں" مولوی صاحب جھٹ اوپر ہو بیٹھے مگر بہت شرمندہ۔ یہ لطیفہ تو ہو چکا۔ اسی وقت چوڑھی آئی اور وہ جھاڑو دینے لگی۔ اس سے بڑی گرد اڑی۔ اب کیا تھا۔ آزاد چیخ اٹھے اور بہ آواز بلند فرمانے لگے کہ "ابرو کی ماں[1]! کتنی دفعہ تم سے کہا کہ چوڑھی کے آنے سے پہلے یہاں چھڑکاؤ کر دیا کرو" انہوں نے کہا "ابھی بہشتی نہیں آیا۔ چوڑھی سے کہہ دو کہ جھاڑو نہ دے"۔ اس کا جواب مولانا نے دیا کہ "بہشتی نہیں آیا تھا۔ تو تم ہی نے ذرا کھڑے ہو کر...... دیا ہوتا۔ کہ گرد تو بیٹھ جاتی۔ آغا صاحب کی والدہ ماجدہ پر جو اثر ہوا اس کا اندازہ آپ کر لیجیے۔ انہوں نے پان دینے کے لئے مجھے بلایا تو وہ آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ مجھ سے صرف اتنا کہا کہ "بوڑھے ہو کر ان کی عقل بالکل خراب ہوگئی۔ جو کچھ منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔ میرا سفید چونڈا[2] خاک کر گیا"۔ غرض جب ہم وہاں سے اٹھے تو گھر پہنچنے تک ہم دونوں کے درمیان یہی تذکرہ رہا۔ میرے منہ سے نکلا کہ کہیں پھر یہ پاگل نہ ہو جائیں۔ مولوی ممتاز علی صاحب نے فرمایا کہ ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔

غرض بے خوابی اور بدخوابی اور مراق بڑھتا گیا۔ ایک روز قیامت یہ ہوئی کہ انہیں دنوں پلان شیٹ (PLANCHETE) نکلی تھی۔ آغا کہیں سے خرید لائے اور باپ سے اس کا ذکر کیا۔ باپ نے دیکھنے کو مانگی اور اس کا تجربہ کیا۔ ہوتے ہوتے کہیں میر تقی کی روح کو بلاتے ہیں کہیں سودا کی۔ اور ہر ایک کو جھک جھک کر سلام کرتے ہیں۔ اب گھر والوں کو بھی شبہ ہوا اور چند ہی روز میں یقین ہوگیا۔ دوا کھانے کو جو کہتے ہیں تو کسی طرح نہیں مانتے۔ گالیاں دیتے ہیں۔ چپکے چپکے حکیم بزرگ شاہ سے رجوع کیا گیا۔ انہوں نے خاص طور پر توجہ کی۔ مگر دوائی کون کھاتا پیتا۔ علاج یہ تجویز ہوا کہ نیند آنی چاہیے۔ میں نے مشورہ دیا کہ ڈاکٹری دوائیں مقدار میں بہت کم ہوتی ہیں۔ ڈاکٹری علاج کیجیے۔ ڈاکٹر رحیم خاں مرحوم نے بھی نیند ہی علاج تجویز کیا۔ انہوں نے دوا بتلائی اور کہا کہ کسی کھانے میں ملا دیا کرو۔ مولانا کو دہی مرغوب تھی۔ اسی میں ملا دی گئی۔ پھر کچھ شبہ ہوگیا تو وہ بھی چھوڑ دی۔ مگر نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ رات رات بھر ٹہلتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے۔ بڑے استادوں کو پکار کر عرض معروض کرتے تھے۔ ان کی آواز سنتے تھے۔ جواب دیتے تھے۔ اب تو کوئی شبہ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ آغا نے درخواست دے کر برس روز کی رخصت دلوائی۔ اتفاق سے حافظ کریم بخش اپنے مقدمے میں آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے تجویز کیا کہ دہلی لے چلو حکیم محمود خاں کا علاج کراؤ۔ انتظار یہ ہوا کہ نیند آئے تو دہلی لے چلیں۔ ایک دن ایسے سوئے کہ دہلی پہنچ کر خبر ہوئی۔ محمود خاں اور عبدالمجید خاں نے بھی اپنی بہت سی کی۔ آزاد تھے کہ حافظ کریم بخش کے بدترین دشمن کہ میرے بال بچوں سے چھڑا کر مجھے یہاں لے آیا[3]۔ ایک دن منشی ذکاء اللہ کو بہت گالیاں دیں اور ان کو ہی ملزم ٹھہرایا۔ غرض وہاں سے بھی مایوسی ہوئی۔ پھر واپس لاہور لے آئے۔ اکبری منڈی والا مکان بن چکا تھا اسی میں نیچے کی منزل میں رہتے اور وہیں ختم ہو گئے۔ اناللہ!

دیوانگی عجیب تھی۔ پانچ دس منٹ۔ بعض اوقات آدھا پونا گھنٹہ۔ بہت اچھی طرح باتیں کر رہے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ دماغ پر کوئی اثر نہیں۔ حافظہ اور دل اچھا ہے۔ یکایک دیوانگی شروع ہوگئی۔ لوگ دھوکے میں رہ جاتے تھے اور حیران ہوتے تھے۔ یہی زمانہ تھا کہ دربار اکبری کا مسودہ نکالا گیا۔ ایک روز ایک خاص کام کے لئے میں مولانا کے پاس گیا۔ آغا ڈیوڑھی میں رہے۔ مجھے دیکھتے ہی چور چور کا شور مچایا اور مسودے کی چوری لگائی۔ میں واپس ہوا تو میرے پیچھے

---

[1] آغا ابراہیم کی اہلیہ۔
[2] دہلی میں آزاد اپنے ایک عزیز کے ہاں سوئی والوں میں اترے۔ جب وہاں سے جی گھبرایا تو ذکاء اللہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ منشی ذکاء اللہ آزاد کے بچپن کے دوست تھے۔ انہوں نے آزاد کی دل کھول کر خدمت کی اور دوستی کا حق خوب ادا کیا۔
[3] آزاد کچھ دیر لاہور کے پاگل خانہ میں بھی رہے۔ لیکن ابراہیم مرحوم سے ان کی حالت دیکھی نہ گئی اور جلد ہی انہیں واپس گھر لے آئے۔

مولانا آزاد کہیں چھپ رہے۔ مولانا پولیس کی تلاش میں رہے۔ میں بھاگ گیا، تیسرے چوتھے روز اسی حیثیت سے پھر گیا۔ آغا پیچھے رہے۔ مجھے دیکھ کر بہت اخلاق سے پیش آئے، بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے اور اچھی طرح ہوش میں کچھ بگڑنے لگے تھے کہ ایک بڑھیا آئی۔ مولانا نے پوچھا "مائی کی کہندیں ایں"(مائی کیا کہتی ہو؟) اس نے کہا "تھوڑی جئی مستی چاہی دی اے۔ سر دھون لئی۔" او صبون والا کدھر گیا (تھوڑی سی مستی چاہیے سر دھونے کے لئے۔ وہ صابن والا کدھر گیا؟) (ڈیوڑھی میں ایک شخص صابن بنایا کرتا تھا۔ اور "مستی" اس چیز کو کہتے ہیں جو صابن کے اوپر آ جاتی ہے) مولانا از رہ شفقت اٹھ کر بڑھیا کے پاس پہنچے اور کہنے لگے کہ "مائی اب تو ہم بڈھے ہو گئے۔ اب مستی کہاں"؟ وہ غریب شرمندہ ہو کر چلی گئی۔ اور میں بھی موقع پا کر بھاگ گیا۔ ایک اور واقعہ سن لیجئے۔۔۔ مولوی صاحب کی صبح کی ہوا خوری ایسی حالت میں بھی بند نہیں ہوئی۔ ایک روز میں دفتر کو جا رہا تھا۔ ہائی کورٹ کے سامنے جو لمبا سڑک پر ہے وہاں دور سے مولانا آتے نظر آئے۔ میں سخت پریشان ہوا کہ برسوں سے نہیں ملا ہوں دیکھئے کیسی بنتی ہے۔ مولانا نے مجھے دیکھ لیا اور کھڑے ہو گئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ "تم بہت عرصے سے نہیں ملے۔ کہیں باہر گئے تھے کہ نہیں۔" ہو میں نے عذر کیا۔ کچھ اور باتیں بالکل ہوش کی کرتے رہے۔ میرے ایک ایک لڑکے کی نام بنام خیریت پوچھی۔ پڑھنے لکھنے کو پوچھا۔ میں نے کہا کہ فلاں فلاں نے ایم اے کیا ہے۔ ایک بی اے میں ہے، وغیرہ۔ سنکر بہت خوش ہوئے۔ بہت مبارکباد دی۔ عربی پڑھوانے پر زور دیا۔ آدھ گھنٹہ گرفتار رکھا۔ مجھے دفتر کی جلدی۔ شامت جو آئی تو پوچھ بیٹھا کہ آپ کی بھی بہت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی۔ بس پھر کیا تھا کہنے لگے کہ تو ایسا بے ایمان۔ پاجی ہے۔ تو نے میری کب خبر لی۔ میرے اوپر کیا کیا بن گیا تو نے کروٹ نہیں لی۔ پاجی پوچھتا ہے بہت دن سے زیارت نہیں ہوئی۔ ارے تجھے خبر بھی ہے میرے ساتھ کیا دغا ہوئی؟ میں نے پوچھا کہ "خیریت"؟ کہنے لگے کہ میرے ساتھ ذکاء اللہ نے پھر دغا کی۔ اس کی۔۔۔۔ میں ایک روز ہوا خوری میں دلی پہنچ گیا۔ ذکاء اللہ نے بڑی خاطر سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے مکان میں ٹھہرایا۔ مجھے کیا معلوم کہ اس کے دل میں دغا ہے۔ اس کے مکان کے نزدیک ایک برات آکر ٹھہری۔ مجھ سے کہنے لگا کہ آزاد تو بھی برات دیکھ آ۔ میں گیا برات والوں نے جو مجھے دیکھا تو شور مچایا کہ آزاد آیا آزاد آیا! مجھے بڑی خاطر سے دولہا کے پاس بٹھا دیا۔ مجھے کیا خبر کہ ذکاء اللہ نے اس کی۔۔۔ کیا فریب کیا ہے۔ اب جو نکاح بندھنے لگا تو نکاح اور مہر کے ساتھ مجھے بھی باندھ دیا اور ایسا جکڑا کہ رسّوں کے بندھنوں سے اب تک میرے بدن میں درد ہو رہا ہے۔ جس طرح ہو سکا میں رسّوں کو توڑ کر ابھی چلا آ رہا ہوں۔ نہ پوچھئے کہ مجھے کتنی ہنسی آئی۔ یقین جانئے کہ ریل کے دفتر تک میں ہنستا ہی چلا گیا۔ بار بار خیال ہوتا تھا کہ دیکھنے والے کیا کہتے ہوں گے۔"

مولانا آزاد کے آخری ایام کی حسرتناک روئیداد سید ناصر نذیر فراق دہلوی کی ایک نوشت میں ملتی ہے۔ یہ ملاقات ۱۳ مارچ ۱۹۱۰ء کو ہوئی تھی۔

"استاد مرحوم امام باڑہ کے برآمدہ میں بیٹھے تھے۔ اور جس ہیئت سے بیٹھے تھے اسے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ ایک میلی سی اچکن گلے میں تھی جس کی چولی میں پورے بٹن بھی نہ تھے۔ ایسا ہی میلا کچیلا ڈبل زین کا پیجامہ تھا۔ سر پر علی وضع کی چکٹ ٹوپی اور پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ جوتی تھی۔ ایک بوریہ پر بیٹھے تھے۔ ایک مٹی کی رکابی میں شوربا تھا۔ اور ایک چنگیر میں چپاتیاں تھیں۔ چپاتی کا نوالہ بنا کر شوربے میں ڈبوتے تھے اور منہ میں رکھ لیتے تھے اور دیر تک چبا کر مشکل سے نگل جاتے تھے۔ بوریہ کے ادھر ادھر کچھ راکھ کچھ کوئلے کچھ کوڑا پڑا تھا۔ میں نے کہا سبحان اللہ یہ وہی منظر ہے جو حضرت نے آب حیات میں انشاء اللہ کے آخری دور میں لکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر فرمایا تم کون ہو؟ میں نے کہا حضرت میرا نام ناصر نذیر فراق ہے۔ دلی سے محض آپ کی زیارت کے واسطے لاہور آیا ہوں۔ فرمایا بھئی میں تمہیں نہیں پہچانتا۔ میں نے پھر عرض کیا میں آپ کا شاگرد ہوں۔ کہا ہو گے۔ پھر فرمایا۔ اچھا اگر تم میرے شاگرد ہو تو گرما گرم جلیبیاں تول لے آؤ۔ میں نے اسے بڑی سعادت سمجھا۔ دوڑا دوڑ گیا۔ گرم جلیبیاں تو نہ ملیں ٹھنڈی لایا، اور لا کر سامنے رکھ دیں۔ ایک جلیبی ہاتھ میں اٹھائی اور فرمایا۔ بھلا میرے ہلتے ہوئے دانتوں سے ٹھنڈی جلیبیاں کب کھائی جائیں گی۔ اچھا اٹھاؤ۔ میں نے اصرار کیا تو بگڑنے لگے۔ آغا یوسف مرحوم نے کہا زیادہ نہ کہئے نہیں بھلا برا کہنے لگیں گے۔ پھر کہا اچھا جاؤ یہاں سے۔ میں اور آغا یوسف مرحوم امام باڑہ کے صدر دروازہ میں آکر ایک تخت پر بیٹھ گئے۔ آغا محمد یوسف مرحوم خاصدان میں پان میرے لئے لائے۔ میں نے کہا آغا صاحب مجھے مولانا کو اس ابتر حالت میں دیکھ کر سخت افسوس ہو رہا ہے۔ آغا محمد یوسف نے فرمایا۔ حضرت گور کا عذاب مردہ ہی خوب جانتا ہے۔ اگر دستر خوان میں روٹی لائی جاتی ہے تو دسترخوان جلا دیتے ہیں۔ چینی کی رکابیوں میں دال سالن دیا جاتا ہے انہیں توڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ تانبے کی رکابیاں، غوریاں دیجئے تو بازار جا کر بیچ آتے ہیں۔ یا کسی راہ چلتے کو دے دیتے ہیں۔ سینکڑوں برتن غارت ہو چکے ہیں۔ اچھے اور ستھرے کپڑوں سے بیر ہے۔ ادھر پہنائے ادھر پھاڑے چیتھڑے لگائے پھینک دئے۔ اس عذر کو سنکر میں نے آغا یوسف صاحب سے معافی مانگی۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ خلال کرتے ہوئے امام باڑہ میں سے چلے آتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا بھئی تم کب دلی سے آئے۔ واللہ میں نے تمہیں اس وقت نہیں پہچانا تھا۔ یہ کہکر تخت کے تکیہ کا سہارا لیکر بیٹھ گئے اور مسکرانے لگے۔ میں نے کہا آپ نے

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

افسانہ:

"۔۔۔۔ کچھ دیر پہلے نیند سے"

یونس احمر

اس کی جوانی میں سچ مچ گھن لگ گیا تھا۔ اب نہ اس کے خزاں آلودہ ہونٹوں پر تبسم کے شگوفے کھلتے اور نہ آنکھوں میں زندگی کا فسوں پر درد رقص ہوتا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے کی اداسی درحقیقت اُس کی بوجھل زندگی کی کھُلی ہوئی کتاب تھی —— اور پھر وہ اپنے ہزاروں رِستے ہوئے زخموں کو کس کس سے چھپاتی پھرتی۔ اب دوسری بار اس کا سہاگ چھن گیا تھا اور چوڑیاں توڑ دی گئی تھیں۔ اس کا یہ شوہر بھی بڈھا تھا تو کیا ہوا —— اس کا سہاگ تو قائم تھا۔ وہ کبھی کھل کر اپنی سہیلیوں، اپنی نندوں میں ہنس تو لیتی تھی۔ کوئی یہ تو نہیں کہتا تھا کہ یہ تقدیر کی کتنی کھوٹی ہے —— جوانی ہی میں دوبارہ بیوہ ہوگئی۔ وہ آٹھوں پہر روتی رہتی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اُس کی آنکھوں کے سوتے خشک ہوگئے اور بینائی کمزور ہوگئی۔ اس کے چہرے کی ہڈیاں بھی ابھرنے لگیں۔

جب اُس کی پہلی شادی ہوئی تھی تو اس کا چھوٹا بھائی شکیل صرف دس سال کا تھا۔ جونہی اسے معلوم ہوا برات رات کے نو بجے آئے گی تو اس نے اپنی امّی جان سے پوچھا تھا: "امّی جان برات تو دن کو آنی چاہیئے۔ دن ہی کو آیا کرتی ہے برات۔" اور امّی جان نے اسے لاجواب کرتے ہوئے کہا تھا: "ان دنوں کیسی شدید گرمی پڑ رہی ہے بیٹے۔ براتیوں کو تکلیف ہوگی۔ اس لئے رات کو انتظام کیا گیا ہے۔" شکیل کو یہ بات معقول معلوم ہوئی۔ وہ خاموش ہوگیا۔

برات آئی مگر وہ دھوم دھڑکا نہ تھا جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ حتّٰی کہ باجے گاجے کا بھی انتظام نہ تھا اور نہ نوشاہ میاں گاڑی ہی پر آئے تھے۔ شکیل کو شرم محسوس ہوئی۔ اس کے دوستوں نے چڑانا شروع کیا۔ "ارے تمہارے دولھا بھائی تو پیدل ہی آگئے۔" اور شکیل رسوائی سے بچنے کے لئے ہجوم میں گم ہوگیا۔ اس کے ننھے سے دل کو چوٹ لگی اور جب عورتوں میں اس نے یہ سنا۔ "ہائے ہے، دولھا تو پچاس ساٹھ سال کا بڈھا ہے —— لڑکی کی قسمت پھوٹ گئی۔" تو اس نے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کیا۔ سچ مچ اس کے دولھا بھائی بڑھاپے کی حدود میں داخل ہوگئے تھے کیونکہ سر کے بال سفید ہونے کے علاوہ سامنے کے کئی دانت بھی غائب تھے۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا۔

شادی ہوگئی۔ براتی ایک ایک کرکے رخصت ہونے لگے۔ دولھا میاں کو رسم کے مطابق گھر میں لایا گیا۔ لیکن دیگر رسوم کی پابندیاں کرنے کی بجائے شکیل کی نانی نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا:

"گوہر میاں! یہ لڑکی بہت نیک ہے۔ سیدھی سادی رس گائے سمجھو۔ جہاں چاہو باندھ دو۔ زبان پر حرفِ شکایت نہیں لائے گی۔ تم تقدیر کے دھنی ہو گوہر میاں کہ ایسی نیک لڑکی تمہیں مل گئی۔"

اور دوسری طرف سے شکیل کی بیوہ ماں کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ شکیل کا دل بھی پھٹ پڑا۔ وہ بھی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ نانی جان اُسے اپنے پاس لے آئیں اور گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگیں مگر اس کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ وہ کسی قیمت پر چپ نہ ہوا یہاں تک کہ رشیدہ رخصت ہوگئی۔

اور جب رشیدہ پہلی بار سسرال سے میکے آئی اور اس نے شکیل کو ایک روپیہ دیا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس سے پہلے کسی نے آج تک اسے ایک روپیہ نہیں دیا تھا۔ عید، بقرعید میں بھی آٹھ، دس آنے سے کبھی زیادہ پیسے نہیں ملے۔ اس نے سوچا۔ آپا ایک دم سے اتنی مالدار کیسے ہوگئیں۔ اتنے پیسے کہاں سے آگئے ان کے پاس۔ چنانچہ اس نے بڑے رازدارانہ انداز میں آپا سے پوچھ ہی لیا: "آپا، تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آگئے؟" اور رشیدہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "تمہارے دولھا بھائی بہت پیسے والے ہیں۔ ان کی اپنی کوٹھی ہے، اپنا کاروبار ہے، نوکر چاکر ہیں۔"

"سچ آپا سچ!" شکیل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں رے پگلے ۔ تجھے یقین نہیں آ آ گیا ۔۔۔۔۔ دیکھ نا کتنے گہنے ملے ہیں مجھے ۔"

"تو اب مجھے اسکول میں داخل کرادو گی نا ؟"

"ہاں ۔۔۔ ہاں ضرور ۔ اب فیس کی فکر کیسی ۔ گھر پر ایک ماسٹر بھی رکھ دوں گی تیرے لئے ۔"

"اوہ میری اچھی آپا ۔" شکیل بہت خوش تھا ۔

"اور یہ لے مٹھائی ۔" اس نے پرس سے مٹھائی نکالتے ہوئے کہا ۔

شکیل نے مٹھائی چباتے ہوئے کہا ۔ "آج اس روپیہ کی ملائی کی برف کھاؤں گا آپا ۔ اور ہاں تم کو بھی دوں گا ۔"

ابھی شادی کو ایک سال ہی مشکل سے گذرا تھا کہ رشیدہ کا سہاگ اجڑ گیا ۔ اس کے تپتے اور جھلستے ہوئے ریگزارِ حیات میں بہار کے جو دو چار جھونکے آئے تھے وہ بھی بند ہو گئے اور اس کی آرزوؤں کے جو چند ستاروں نے جھلملانا سیکھا تھا وہ اس تیزی سے ٹوٹ کر گر پڑے جیسے وہ کبھی وجود میں آئے ہی نہ تھے ۔ رشیدہ میکے سے واپس آگئی ۔ اس کی گود میں ایک ننھی سی بچی تھی ۔ کمزور اور مریل سی لیکن اس بار میکے آ کر اس نے شکیل کو روپیہ دیا اور نہ مٹھائی ہی دی ۔ وہ تو اپنی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک سمندر چھپا کر لائی تھی ۔ سارے گھر میں کہرام مچ گیا ۔ بیوہ ماں نے اپنے سر سے جو بوجھ اتارا تھا وہ پھر اس کے سر پر آ گیا ۔ لیکن اس بار بوجھ اور بھاری تھا ۔ اس کے چاروں طرف جو اندھیرا چھایا ہوا تھا وہ اور گہرا ہو گیا ۔ اپنی بیوگی کا ماتم کرتا تو اس کی قسمت میں بہت پہلے لکھا جا چکا تھا ، اب جوان بیٹی کی بیوگی اس کے لئے سوہانِ روح بن گئی ۔ اس کے مزاج میں چڑچڑا پن آ گیا ۔ وہ کبھی کبھی جھنجھلا جاتی اور رشیدہ کو برا بھلا کہنے لگتی ۔

"نہ جانے کیسی قسمت لیکر آئی ہے دنیا میں بالکل کوئلے کی طرح سیاہ ۔ موت بھی نہیں آتی ہے چڑیل کو ۔ جی چاہتا ہے خود ہی زہر کھالوں اور ان جھمیلوں سے چھٹکارا حاصل کرلوں "

رشیدہ اپنی ماں کی سلی کٹی سنتی اور آنسو بہا کر خاموش رہ جاتی ۔ البتہ جب کبھی کبھی پانی سر سے اونچا ہو جاتا تو وہ پھٹ پڑتی ۔۔۔ " میری قسمت کے بگاڑنے میں تو تمہارا ہاتھ ہے ۔ نہ بڈھے سے شادی ہوتی نہ یہ دن دیکھنے نصیب ہوتے ۔" ۔۔۔ اس پر ماں کا پارہ اور چڑھ جاتا ۔

"اری اب تو زبان بھی چلنے لگی قینچی کی طرح ۔ ایسی ہی بات ہے تو نکل جاؤ یہاں سے ۔"

مگر رشیدہ نکل کر جاتی کہاں ؟ ماں کے گھر کے علاوہ اس کا دنیا میں اور تھا کون ۔ وہ آنسو پی کر خاموش رہ جاتی اور اپنے کام کاج سے لگ جاتی ۔

اس طرح دس سال گذر گئے ۔

اس عرصے میں رشیدہ کی ایک آنکھ کا آپریشن بھی ہوا ۔ اس کی بصارت رفتہ رفتہ کمزور ہوتی گئی ۔ اب اس کی بچی بھی روکھا سوکھا کھا کر بڑی ہو گئی تھی ۔ اس کے لکھنے پڑھنے کا کوئی انتظام نہ کیا گیا ۔ سسرال والوں نے اسے کوہرمیاں کی جائیداد سے بھی محروم کر دیا تھا ۔ اس کا کوئی اتنا بھی تو نہیں تھا جو نالش مقدمہ کر کے تھوڑی بہت جائیداد حاصل کرتا ۔ شکیل نے میٹرک پاس کر لیا تھا اور وظیفہ کے پیسے سے سکنڈ ایر آرٹس میں پڑھ رہا تھا ۔ اب اسے عقل آگئی تھی اور زندگی کے نشیب و فراز پر اس کی اچھی نظر تھی ۔ اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا :

"امّی میرا خیال ہے آپا کی دوسری شادی کر دی جائے ۔"

"مگر تیار کون ہوگا اس سے شادی کرنے کے لئے ۔ میں خود اس فکر میں ہوں ۔"

اس وقت رات کے نو بجے ہوں گے ۔ شکیل لالٹین کی روشنی میں کچھ پڑھ رہا تھا ۔ اس نے ماں کا یہ جواب سن کر پھر کہا ۔ "کوشش کی جائے ۔"

"کوشش !" ماں نے سرد آہ کھینچتے ہوئے کہا ۔ "اس عرصے میں نہ جانے کہاں کہاں کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی ۔ رشیدہ بھی تو تیار نہیں ہے دوبارہ شادی کرنے کے لئے ۔"

لالٹین کی روشنی میں ماں کا چہرہ غم آلود نظر آ رہا تھا ۔ شکیل خاموش ہو گیا ۔ کتاب کھلی ہوئی تھی ۔ مگر اس کا ذہن کہیں اور تھا ۔ وہ سوچ رہا تھا ۔ زندگی

کی ساری مسرتیں چھین لی گئیں ہیں ان لوگوں سے۔ کوئی پہلو بھی آرام نہیں۔ اپنے پرائے ہیں مگر برائے نام۔ ایسے موقعوں پر اپنا سایہ بھی جدا ہو جاتا ہے۔ اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ماں اور رشیدہ دن دن بھر اور رات گئے تک کپڑے سلائی کر کے جتنے پیسے پیدا کرتیں وہ کافی نہ تھے کہ اتنا بڑا کنبہ پل سکے۔ وہ بھی دو چار ٹیوشن کر رہا تھا۔ یکایک ماں نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

"نور محمد بھائی کو تو جانتے ہو گے؟"

"کون نور محمد بھائی؟" شکیل نے کتاب بند کرتے ہوئے پوچھا۔

"ابراہیم کے ابا ــــــ"

"ہاں ہاں۔ ٹھیک۔ وہی جو کل آئے تھے۔"

"ہاں وہی۔ ان کے ایک بہنوئی ہیں جلال میاں۔ بیچارے نے اب تک دوسری شادی نہیں کی۔ کل نور محمد کہہ رہے تھے کہ رشیدہ کی شادی ان سے کر دی جائے تو کیسا رہے گا۔"

"مگر ماں ان کی عمر بھی تو کافی ہو چکی ہے۔"

"ہاں' اور اپنی رشیدہ بھی تو بچی نہیں۔ آدمی بہت نیک اور کماؤ ہے۔ محنت مزدوری کر کے اطمینان کی زندگی بسر کر رہا ہے۔"

"تو پھر بات پکی کر لو لیکن ــــ؟ شکیل نے لالٹین کی روشنی کو تیز کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن کیا؟"

"رشیدہ آپا تیار ہوں گی؟"

"تیار کیوں نہ ہوں گی۔ آخر اس بوجھ کو اپنے سر سے اتارنا ہی پڑے گا۔ کب تک اس گھر میں پڑی رہے گی۔"

"ماں ایسا نہ کہو۔" شکیل نے چوٹ سی محسوس کی ــــ "آپا کو بوجھ نہ کہو۔ ان کی حالت پر غور تو کرو۔ اندر ہی اندر جیسے گھن لگتا جا رہا ہے ان کی زندگی میں' میں نے ان کے چہرے پر کبھی خوشی کے آثار نہیں پائے۔ ہر وقت جیسے وہ کچھ سوچتی رہتی ہیں۔ وہ خود اپنی زندگی سے بیزار ہیں ماں۔" اور یہ کہہ کر شکیل اٹھ کھڑا ہوا۔ ماں بیٹھی رہی۔

رشیدہ کی دوسری شادی بھی ہو گئی مگر اس کی بچی نانی ہی کے پاس رہی۔ اس شادی میں معمولی سی خوشی بھی نہیں منائی گئی۔ لین دین کی بات نہیں ہوئی تھی اس لئے ضروری رسم ادا کر کے جلال میاں رشیدہ کو اپنے ساتھ لے گئے۔ اس بار شکیل سے کسی نے مذاق تو نہیں کیا کہ اس کا بہنوئی بڈھا ہے مگر اس کے دل نے اندر ہی اندر کسک سی محسوس کی۔ رشیدہ کی رخصتی کے بعد وہ بہت دیر تک روتا رہا۔ ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔

صبح ہوئی تو گھر میں خوشی کی بجائے اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے رات دلہن کی رخصتی نہیں ہوئی بلکہ کسی کی نعش یہاں سے اُٹھائی گئی ہو۔ ماں نے چاروں طرف دیکھ کر خلا سا محسوس کیا ــــ اپنے گرد و پیش زبردست کمی کا احساس ہوا انہیں۔ وہ ایک دم سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ شکیل کی آنکھوں کا سمندر بھی اُبل پڑا۔ مکان کی دیواریں جیسے سبھوں کو کاٹ رہی تھیں۔ فضا میں غم و اندوہ چھائے ہوئے تھے۔ آج انگیٹھی بھی سرد پڑی تھی۔

دو سال بیت گئے!

شکیل اب بی۔ اے میں پہنچ گیا تھا۔ رشیدہ کی زندگی میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ جلال میاں اکثر و بیشتر بیمار رہنے لگے۔ اس کا اثر ان کی آمدنی پر بھی پڑا۔ کبھی کبھی تو فاقہ تک کی نوبت آجاتی۔ رشیدہ اپنی کٹھن زندگی سے اب بالکل عاجز آچکی تھی۔ اس کا بس چلتا تو خودکشی کر لیتی مگر خاندان کی عزت اسے عزیز تھی۔ ایک دن تو رشیدہ صبح سویرے روتے دھوتے اس طرح میکے پہنچی جیسے جلال میاں سے سخت جنگ ہو گئی ہو اور انہوں نے گھر سے نکال دیا ہو۔

شکیل اس وقت منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوا تھا اور ماں ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ بیٹی کو اس حالت میں دیکھ کر ان کا دل دھڑکنے لگا۔ شکیل بھی بدحواس ہو رہا تھا۔ رشیدہ کہہ رہی تھی۔ "آدھی رات سے یکایک ان کی حالت غیر ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے بھی کوئی آس نہیں بندھائی۔ ماں' چلو جلدی۔"

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

بجھتے چراغ!

رفعت شفیع

اس نے بھیگی بھیگی سی پلکیں جھپک کر اپنی نٹنگ اٹھالی۔ برآمدے میں نائلون کی نیلی قمیض پر آئیل پینٹ کرتے ہوئے عُصمہ اب پنجابی ٹپے گانے لگ گئی تھی:

زُلفاں دے وَل کُھل گئے

جِن نال دل لاکے۔ اَسی ہَسنے داوَل بُھل گئے

(زلفوں کے پیچ کھلے۔ تو چاند سے ایسی لگی، ہنسنا تک بھول گئے!)

عُصمہ کی آواز میں کوئی سوز کوئی تاثیر نہ تھی؛ مگر عظمیٰ نے پہلو بدل کر اٹھتے ہوئے بادامی پردے کی اوٹ سے اسے دیکھا۔ وہ نیلی قمیض پر گیہوں کے بڑے پیارے پیارے سنہری خوشے پینٹ کر رہی تھی۔ ہاتھ جس صفائی سے جتنی پیاری اور نفیس چیز بنا رہے تھے۔ پیازی ہونٹ اتنی ہی بے ڈھنگی آواز اگل رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے میں بھابی ننھے عثمان کو فیرکس (FERRIX) کے آخری چمچے کھا لینے کے لئے طرح طرح سے مجبور کر رہی تھی۔

"دیکھو عثمی نہیں کھاؤ گے تو عُصمہ آنٹی تمہارے رامپر پر پھول نہیں بنا کر دیں گی۔ تو جلدی سے کھالو۔ پھر مکھڑا مجھ سے دھلواؤ گے یا آیا سے؟ اچھا اچھا میں ہی دھوؤں گی مگر جلدی کرو۔ ابھی بِتنا آنٹی آگئی تو وہ ہمیشہ کی طرح 'گندہ بچہ' کہہ دے گی۔ پھر شاور کے نیچے دھوؤ گے؟" برآمدے میں ہلکی سی کھٹ کھٹ ہوئی!

"چاند سے دل لگا کر ہنسنا بھول نہیں جاتے بلکہ جینے کا سلیقہ آجاتا ہے!"

—— "وہ دیکھا بِتنا آنٹی آگئی" بھابی نے ننھے کا ایپرن اتارتے ہوئے کہا۔ اور عظمیٰ کی انگلیاں سلائیوں پر اور بھی تیز ہوگئیں۔

"ہائیں! تم کیسے ٹپک پڑیں؟" عُصمہ نے ہاتھ ذرا کی ذرا روک کر کہا۔ "تو میرے خیال میں تم ضرور دل دے کر سلیقہ سیکھ آئی ہو۔ کیوں؟"

عُصمہ نے بکھری ہوئی چیزیں سمیٹ کر بیٹھنے کی جگہ بناتے ہوئے کہا۔ "نہیں، میں تو ابھی سلیقہ سیکھوں گی اور شاید اسی لئے ——" اور پھر دونوں کی ہنسی ایک ساتھ عظمیٰ کے کانوں سے ٹکرائی ——

"شاید تم سچ کہتی ہو بِتنا" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہ محبت ہے کیا بلا؟ ہر شخص، ہر افسانہ، ہر آرٹ محبت محبت الاپتا ہے۔ محبت کتنی وسیع چیز ہے بِتنا؟"

"اگر وہ وسیع ہوتی تو ضرور تم تک آجاتی اور محبت بلا بھی نہیں ہے عظمیٰ! اگر وہ بلا ہوتی تو دنیا اس سے بھاگتی مگر تمہیں حیرت ہوگی کہ محبت کے لئے نہ تو ڈھنڈورچی تلاش کرنے کی ضرورت ہے نہ اشتہار دینے کی۔ صرف سینے میں ایک مدھم مدھم سی آنچ کی ضرورت ہے اور حساس دل کی جس پر یہ دھیمی دھیمی آنچ پیہم اثر کرتی رہے۔ محبت کتنی خاموش موسیقی کا خزانہ ہے! کبھی موسیقی اور آگ کو اکٹھا دیکھا ہے۔ یا وہ آگ جو موسیقی کی تال پر بھڑکے؟ وہ محبت ہے عظمیٰ! اس آگ میں سلگتی ہوئی روح کتنی مطمئن رہتی ہے! اور پھر تم جانتی ہو محبت کی آگ یقیناً دنیا کی اس ٹھنڈی چاندنی سے زیادہ خوبصورت ہوگی۔ میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس میں چناروں کی سہانی ٹھنڈی چھاؤں سے زیادہ لطافت ہے، اس میں، نرمی چٹانوں سے پھوٹنے والے اچھلتے سوتوں کا ترنم ہے۔ یہ آگ زندگی ہے، روح ہے اور جینے کا سلیقہ بھی!"

"ابھی ابھی تو تم کہہ رہی تھیں بِتنا کہ ——"

"ہاں، کہ مجھے اس کا کوئی تجربہ نہیں۔ ویسے یہ میرا ایک خیال ہے عُصمی!"

"تو میں تمہارے خیالوں کی قدر کرتی ہوں بِتنا!"

"سچ عظمیٰ، محبت نہ جانوں کیوں میری نظر میں بڑی سہانی چھاؤں ہے۔ جس کے سائے تلے وقتی طور پر ہی جا کر ہم کشمکشِ حیات سے پایا ہوا اضطراب دور کر سکتے ہیں محبت ہماری جھولی میں پڑے ہوئے اقتصادی فکر اور دکھ کو چھین کر زیست کی گہرائی سی دھڑکنوں کو ترنم سکھا سکتی ہے تو بتاؤ وہ جینے کا سلیقہ نہیں سکھا سکتی؟"

"واللہ بینا! تمہارے خیال زندگی کے کتنے نزدیک اور کتنا آگے آگے چلتے ہیں۔ تمہاری تنہائی کتنے پیارے تصورات کی دنیا ہے۔ تمہارے کمرے کی دھندلاہٹوں میں کتنے رنگین نقوش ہیں! تم کتنی اچھی ہو!" عظمیٰ نے متاثر ہو کر برش نیچے ڈال کے، دو ایک بار اپنی ستاروں ایسی چمکیلی آنکھوں سے بینا کے چہرے کو دیکھا اور نٹنگ کا پمفلٹ دیکھتے ہوئے عظمیٰ نے سوچا۔ یہ آجکل کی لڑکیاں محبت کرنے سے زیادہ محبت کے بارے میں باتیں زیادہ بنا سکتی ہیں!"

"تو کیا تم مترنم دھڑکنوں کو اپنانے کی سوچ رہی ہو؟ عظمیٰ، ہم اقتصادیات میں اتنے اُلجھ چکے ہیں کہ تم قمیض پر پھول بنانے کی بجائے گیہوں کے خوشے بنا رہی ہو۔ بھول کر بھی محبت نہ کرنا۔ اس سلگتی ہوئی آگ کو سینے میں مت جگہ دو۔ محبت کی منزل پا لینے کے لئے کتنی ٹیڑھی بانکی راہوں سے گزرنا ہوگا۔ اور محبت"

"یہ تم آئی کب ہو؟"

ہنستی ہنستی پیاری باتوں کو ایک دم اقتصادیات میں بدلتے پا کر عظمیٰ جیسے چیخ سی پڑی۔ وہ اسی چناروں کی ٹھنڈی سہانی چھاؤں میں اُبلتی ندی کو صحرا کی تپتی ریت میں جذب ہوتا نہ دیکھ سکتی تھی۔

"ارے تو آپ اندر ہیں دیدی؟" بینا چلائی اور عظمیٰ اپنی نٹنگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔ ابھی آپ کا WRAP مکمل نہیں ہوا، دیدی؟"

"نہیں یہ آخری حصہ ہے آخری سلائیاں۔"

"دیکھا بینا! انٹی اب گندہ بچہ نہیں کہے گی ناں!" بھابی ننھے کو انگلی سے سہارا دیکر باہر لائیں۔ اور رسالوں کا پلندہ پھینک کر بولیں۔ "میرے چاند کے لئے کوئی اچھا سا فینسی ڈریس تو دیکھ دو اور پھر ـــــــ"

"اوہو! تو اسی اتنے ضروری کام کے لئے بلایا گیا تھا؟ خوب!" بینا نے لپک کر دو تین "WOMAN'S WEEKLY" اٹھا کر کہا۔ "اور شاید اسی لئے ناہید آپا بھی دو چار بار بلا چکی ہیں۔" ناہید کا نام سن کر عظمیٰ اور بھی رسالوں میں کھو گئی۔ "میرا خیال ہے انہی رسالوں میں اس کی بچی کے لئے بھی اچھا سا ڈریس پسند کر لیں جو بھی ڈریس پسند کرے دو تین کے لئے اکٹھا چنے۔ اچھا!" اور سب خاموشی سے ورق الٹنے لگیں۔ یہ کوئین آف ہارٹس، یہ ٹاؤن لوائے، یہ ریڈ انڈین چائلڈ، ننھی ٹام دی لٹل نیو مون۔ اور عظمیٰ نہ جانے کدھر کدھر گھومتی رہی، شاید چناروں کی چھاؤں میں، شاید سلگتی ہوئی آنچ کے قریب، ننھے ننھے چراغوں کو تھامے!

اور عظمیٰ نے پھر سے پنجابی ٹپہ الاپنا شروع کر دیا:

ہو کے ہئی بھرنی آں۔ دیوے دی لاٹ وانگوں۔ دنے راتی سڑنی آں۔ دیوے دی لاٹ وانگوں.....

(میں آہیں بھروں پیارے۔ تو دئے کی جیسے جلے۔ دن رات جلوں پیارے)

"تو کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ سحر سے پہلے ہی دیا خود بخود بجھ جائے گا۔ دئے بجھا ہی کرتے ہیں!" بینا نے تین رسالے ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔

"مگر محبت کے دیپ نہیں بجھا کرتے!" عظمیٰ نے کہا۔

"ہاں، اگر محبت کرنے والے اس میں اپنے سینے کا خون ٹپکانا بند کر دیں۔" بھابی نے نظروں کو تیکھا سا بنا کر کہا اور اپنے ننھے کو آیا کے سپرد کرنے چلی گئیں۔ جو برآمدے کے پرلے سرے پر چار اکس کے لٹکے ہوئے سبز پیالوں تلے کھڑی اپنے میلے میلے سے دانت نکالے خواہ مخواہ ہنسے جا رہی تھی۔ بینا نے اسے دیکھ کر پھر وہی پرانی بات سوچی کہ اگر اس کے دانتوں کی سکیلنگ کرائی جائے......

اور گل برگ کی خاموش سی آبادی سڑک پر تینوں ہر نئے مکان اور مکین پر تبصرہ کرتے ہوئے ناہید کے سبزے بھرے لان میں داخل ہوئیں جہاں یوکلپٹس کے اونچے درخت تلے بید کی فیروزی فیروزی کرسیاں ڈالے ناہید اور امتیاز بیٹھے تھے۔

ناہید عظمیٰ کو دیکھ کر کھلی جا رہی تھی۔ "کوئی فینسی ڈریس پسند آیا میری بچی کے لئے؟"

"ہاں یہ "چاندنی پریاں" یا یہ "لٹل نیو مون"۔ اس کے لئے آپ کو چند چاند بنانے کی محنت کرنا پڑے گی، دیدی!"

"مگر فیری ہے کہاں ؟" عظمیٰ نے پوچھ ہی لیا۔

"آیا باہر لے گئی ہے۔"

"اور آپ آج گھر ہی ہیں امتیاز بھائی ؟" بینا نے سکوت چھاجانے سے پہلے پہلے ہی پوچھ ڈالا۔

"چند شعر موزوں ہوئے تھے۔"

"نظم، غزل یا آزاد شاعری ؟"

"تمہیں پتہ ہے میں نئی قدروں کا حامی ہوں، بینا۔"

"تو ہمیں بھی سنائیں۔"

"سنو گی ——— 'سکوت کے بعد' ؟"

"سکوت کے بعد ؟" عصمہ اور بینا نے ایک ساتھ دہرایا۔ اور آنکھیں جھپک کر سننے کے لئے تیار ہوگئیں۔

"وہ آہٹیں تھم گئیں
اچانک سکوت ٹوٹا !
فضا میں یہ شور کیا اٹھا ہے ؟
یہ گڑگڑاہٹ، یہ کیا ہوا ہے ؟
فضائیں بوجھل، ہوائیں بوجھل
وہ آہٹیں، وہ خموش نغمے، یہ کیسے طوفاں میں ڈھل گئے ہیں ؟ ..."

"خوب ! خوب !" عصمی جھوم سی اٹھی۔

"تو پریشان ہونے کی بات کیا تھی امتیاز بھائی ؟ شاید آپ نہیں جانتے کہ اب سکوت کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب تو اس گڑگڑاہٹ کو بھی نغمہ ہی سمجھنا چاہیئے۔ کیوں ؟"

بینا نے کافی کا گھونٹ نگل کر کچھ اس انداز سے داد دی کہ ناہید نے کافی کا گھونٹ ایک دم گھاس پر اگل دیا اور فضا میں قہقہوں کا ترنم گونجنے لگا۔

"شریر ! میں حیران ہوں ابھی کل کے دن یہ بینی اور عصمہ اتنی اتنی سی تھیں۔ مجھے اب بھی کئی بار احساس ہوتا ہے کہ بینی بڑی نہیں بلکہ اب بھی تتلیوں کے پیچھے بھاگنے والی بینی ہے، مگر دیکھو اب یہ ہمارا مذاق اڑانے لگی۔" یوکلپٹس پر ابابیل چیخ رہے تھے، کائنات میں شفق کے سرسراتے پیازی آنچل پھیلنے لگے، اور امتیاز کا غذ سمیٹ کر رسمی سی اجازت لیکر سگرٹ رول میں کاغذ اور تمباکو ڈال کر سگرٹ بنا کر سلگانے لگا۔

اور عظمیٰ سوچ رہی تھی : بینا محبت اور زندگی پر اتنا کچھ کہہ چکنے کے باوجود سکوت اور شور کو کیوں نہیں سمجھ سکتی ؟ اور بینا اور عصمی اب بھی ہنسے جا رہی تھیں۔

"میں کہتا ہوں یہ بینا اور عصمہ میں اتنا پیار کیوں ہے ؟" امتیاز نے سگرٹ کی راکھ کافی کی خالی پیالی میں جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

"عظمیٰ اور میں بھی تو اسی طرح تھیں۔ توبہ ! اسکول اور کالج میں ہماری دوستی ضرب المثل تھی۔ کپڑے اکٹھے سلواتے، ایک ہی چیز کھاتے پھولوں سے فلموں تک ہماری پسند ایک تھی۔ اور پھر کسی کی ہمت ہے عظمیٰ نے تو اپنی سلائی کی تمام نفیس نفیس چیزیں میرے جہیز میں رکھ دی تھیں۔ میری عظمیٰ سی تو اور کوئی دوست نہیں اس دنیا میں۔"

"مگر دیدی ! آپ دونوں کی عادات میں تو فرق ہے۔ بینا اور مجھ میں تو نہیں اتنا۔ ویسے ہم دونوں میں بینا خاموش ہے۔" عصمی نے رومال کے کونے سے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔

مگر عظمیٰ شروع زندگی سے بینا کی طرح چپ نہ تھی۔ اب تو یہ اپنے خود ساختہ خول کے اندر اتنی سمٹتی جا رہی ہے، نہ جانوں کیوں ؟ پہلے یہ اس کی بالکل عادت نہ تھی۔ وہی کمرہ، وہی دریچے، وہی چیزیں ہیں۔ بلکہ کمرے میں سجاوٹ کی چیزیں بڑھ گئی ہیں۔ اب اگر میں وہاں جاؤں تو جانے کیوں میرا دم گھٹنے لگتا ہے مجھے

یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے یہ عُظمیٰ کی سب دلچسپیوں، روح کی تمام لطافتوں، زیست کی سب قدروں کا مزار ہے۔ جس پر عظمیٰ سانپ کی طرح پہرہ دیا کرتی ہے، اب.........."

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔ مگر ہمیں اب زیادہ دیر اس مدفن پر چراغ نہیں بنائے رکھنا عُظمیٰ کو.........."

ناہید اپنی بچّی کی طرف لپکی اور عُظمیٰ کے ہونٹوں کا رنگ اور بھی گہرا گہرا نظر آنے لگا۔

گل برگ کی خاموش خاموش آبادسڑک پر فیروزی مورس تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی اور کار کی رفتار سے تیز عُظمٰہ کے خیالات ماضی کی طرف گھوم رہے تھے، مستقبل کو تلاش کر رہے تھے۔

"پہلے بتیا کو گھر چھوڑا جائے یا نہیں؟" امتیاز نے پوچھا۔

"بھیا مجھے" بتیلا نے رائے دی۔

"تو چلو ہم تمہیں چھوڑ آئیں۔ وہاں تک ساتھ رہے گا۔" عُصمہ بولی۔

کار جھٹکے سے رُکی، اور عُصمیٰ ننھے عثمان کی سالگرہ کا ٹھیک دن بتا کر کہہ رہی تھی۔ "دیکھئے دیدی! آپ فیری کو فینسی ڈریس کے بغیر نہیں لائیں گی۔ بھابی بہت زور دے رہی ہیں سب کو۔ اور سچ پوچھو تو کتنا اچھا لگے گا۔" امتیاز سکوت کی تلاش میں پھر کار کو اسٹارٹ کرنے لگا۔

عُظمیٰ رات بھر سو نہ سکی۔ اُس نے اوائل زندگی کے سارے نقوش ترتیب دیئے جب وہ اور ناہید اکٹھی گڑیوں کے گھروندے سجایا کرتی تھیں، تتلیاں پکڑتی تھیں، پریوں کی ننھی ننھی کہانیاں پڑھ کر یوکلپٹس کے اونچے اونچے درختوں تلے گری ہوئی ننھی منی مرکیاں چنتے اور چلاتے ہوئے دور دیس سے آنے والے شہزادوں کے متعلق سوچا کرتی تھیں۔ اکٹھی اسکول جایا کرتیں اور امتیاز سے ڈرائنگ بنوایا کرتیں.......... بالکل ایسے ہی دن تھے، گُڑھل کے درخت تلے جب ناہید نے اس سے کہا تھا:۔

"عُظمیٰ ڈیر! تم امتیاز کے شعروں کا عکس پہچان سکتی ہو؟ میرا جی چاہتا ہے کاش میں اس عکس کا رنگین اور جیتا جاگتا خاکہ بن جاؤں! اُس کی آنکھوں میں کتنی شفاف روشنی ہے جیسے برسات کے ستارے، جیسے سورج کی اولین کرنوں میں نہاتے ہوئے شبنم کے قطرے۔ اس کے کنیر کی کلیوں ایسے ہونٹوں پر مسکراہٹ کس غضب کی ہے! کاش میں اس مسکراہٹ کو اپنا سکوں، کاش!"

تو اس دن عُظمیٰ نے ناہید کے بالوں میں کتنے سارے سرخ سرخ پھول سجاتے ہوئے کہا تھا۔ اگر تم خود اس مسکراہٹ کو حاصل نہ کر سکیں تو میں کوشش کروں گی۔ میں وثوق سے کہہ رہی ہوں کہ امتیاز تمہارا ہی جیون ساتھی ہوگا۔" ناہید یہ سُن کر خوشی کے مارے اسے لپٹ کر رو دی۔

"کبھی ایسا ہوگا؟ ایسا ہو سکتا ہے عُظمیٰ ڈیر؟ تم کتنی پیاری ہو میری دوست!"

اور پھر جب دوسرے دن امتیاز اسے نئے اشعار سنانے کے لئے لایا تو وہ جھکی بیٹھی ریڈیو کے گانے سنتی اور شنیل کے پیلے میز پوش پر سیاہ موتیوں سے حاشیہ بناتی رہی۔ امتیاز شعروں کا کاغذ اس کے نزدیک رکھ کر سیٹی بجاتا باہر نکل گیا۔ اور ہوا کا جھونکا کاغذ کو نہ جانے کدھر اڑانے گیا مگر جیسے اُس کے سینے میں موسیقی کی تال پر آگ بھڑکنے لگی۔ کتنی میٹھی آنچ تھی! مگر.......... جیسے اسے امتیاز کو جھنجھلا پاکر کوئی حیرت نہ ہوئی۔ وہ بولتا رہا۔ "تم لڑکیاں اپنے نظریئے کتنی جلدی بدل ڈالتی ہو۔ میں نے تمہیں کتنا مختلف سمجھا تھا مگر تم کتنی ہی اور قسم کی ہو۔"

اور وہ بیٹھی خاموشی سے اپنی کوٹی بنتی رہی۔ پیازی رنگ کی اُون اس کے ہاتھوں میں لرزتی رہی۔

اور پھر اُس نے کہا تھا امتیاز! محبت کوئی زبردستی کی چیز نہیں کہ اُٹھا کر جب جی چاہا کسی کے گلے میں ڈال دی۔ تم نے مجھے پہچاننے میں کتنی غلطی کی ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا! کاش مجھے پہلے پتہ لگ جاتا! مگر مجھے اُمید ہے ناہید میری ہی دوسری تصویر ہے۔"

اور بھابی چیختی رہی۔ "عُظمٰہ تمہیں ہوا کیا ہے؟" امی رودیں۔ "اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" بھیا نے صرف یہی کہا۔ اور اس نے چپکے چپکے سب اچھی اچھی چیزیں ناہید کو دے ڈالیں۔ شادی سے لوٹ کر اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ نفیس چیزیں ہی نہیں بلکہ زندگی کی سب سے قیمتی چیز بھی ناہید کے بیاہ میں سما آئی ہے۔ اور پھر اُسی کی کالج میں درخواست منظور ہو گئی۔ ناہید کراچی چلی گئی تھی امتیاز کے ساتھ جہاں سے ہر روز اُس کے خط عُظمٰہ کے نام آیا کرتے اور عُظمٰہ کالج سے واپسی پر بیٹھ کر اسے خط لکھتے ہوئے نہ جانے کیا کیا سوچا کرتی اور پھر نئے لیکچر تیار کرنے لگتی۔ زندگی کتنی دھیمی آہٹوں مگر کس تیزی سے آگے بڑھ گئی؟

ماہِ نو، کراچی۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء

صبح صبح عُصمی کالج جانے کے لئے تیار ہو چکی تھی اور عُظمی کی لپ اسٹک اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ کالج سے واپسی پر بھابی نئی مسکراہٹ سے سنبر ساری میں اس کے کمرہ میں آگئی۔ "عُظمی! آج ناہید اور امتیاز آئے تھے۔ منوّر کے لئے آخری فیصلہ لینے، امّی کو منظور ہے۔ راشد کو بھی پسند ہے۔ ناہید ایک لفافہ تمہاری شیلف پر رکھ گئی تھی......"

اس نے لپک کر ہلکا نیلا لفافہ کھول ڈالا اور بھابی یہ نئی خبر سنانے عُصمہ کی طرف بڑھ گئی۔

"عُظمہ پیاری!

تمہیں چھوڑ کر آئے تو رات منوّر کو منتظر پایا۔ دیکھو 'جان' ترس کھاؤ اس پر۔ اگر تمہیں مجھ سے پیار ہے تو میری اس پسند کو قبول کرو گی...... میں تم سے "نہیں" کا لفظ سننے کے لئے تیار نہیں اور اس میں تمہاری خیر بھی ہے!

تمہاری اپنی : ناہید"

امتیاز نے لکھا تھا،

"عُظمی!

تمہیں اتنا قریب پا کر بھی تمہیں آج تک نہ سمجھ پایا۔ میں جانتا ہوں کہ تم میری پیشکش کو ٹھکرا کر کتنی خوشی محسوس کرتی ہو۔ مگر یہ نئی پیشکش میرے لئے نہیں تمہارے لئے ہے۔ دیکھو عُظمی کم از کم تم میرے لئے تو ایک معمہ بن چکی ہو، میں کبھی نہیں جان سکا کہ تم کس کے سہارے زندہ ہو، زندگی کے دامن میں یا تو پھول ہوتے ہیں یا شعلے، پھول تازگی دیتے ہیں اور شعلے گرمی۔ مگر میں حیران ہوں تمہارا دامن خالی ہے۔ تم کس طرح یہ سرد اور بے رونق زندگی گزار رہی ہو۔ یہاں بجھے ہوئے چراغ بھی تو نہیں۔ جن سے یہ سمجھ لیا جائے کہ تم زندہ رہنا چاہتی ہو۔ تم نے کبھی اس زندگی کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔ اب اس خالی زندگی کو جھٹک دو۔ اس خاموش مدفن سے نکل آؤ۔ سبزے بھرے لان تمہارے منتظر ہیں۔ زندگی سے پیار کرنا سیکھو۔

تمہیں یاد ہی ہو گا تم نے ایک بار میرے بڑھے ہوئے کشکول کو اپنی خود پسندی کی سخت سِل پر پھینک کر توڑ دیا تھا' اور مجھے ناہید کی طرف پھیر دیا تھا۔ آج بڑی دیر کے بعد میں اسی کشکول کی ٹوٹی کرچیاں چن کر لایا ہوں مگر اب اس میں منوّر کی درخواست ہے۔

تم میرے کشکول کو توڑ دینے کے عوض اب اسے ضرور قبول کر لو۔ اگر تمہیں ماضی سے کوئی دلچسپی ہے، اگر تمہارے دل میں ماضی کی کوئی یاد باقی ہے تو اسی کی قسم! اپنا مستقبل بنا کر اپنے عزیزوں کو اطمینان بخشو، میری یہ بات مان لوگی ناں' پروفیسر عُظمہ انصاری؟!

تمہارے ماضی کی ایک یاد : امتیاز"

اور عُظمہ بالکل نہ چیخ سکی۔ وہ دریچے سے لگ کر باہر دیکھنے لگی جہاں عقیق کے تازے تازے سبز چکنے پودوں کے قریب اس کی امّی اور بھابی مصروفِ گفتگو تھیں۔ اور گیلری کے آخری سرے پر عُصمہ فون کا نمبر ملا کر کہہ رہی تھی:۔

"روبینہ' روبینہ کو بھیج دو' مہربانی۔ ہاں بِنیا میں ہوں، تمہیں خوشخبری سناؤں، ہم نے دیدی عُظمہ کی بات طے کر لی ہے۔ بس ننھے عثمان کی سالگرہ پر شگون کر دیں گے،' امّی کہہ رہی ہیں:

"سچ کتنی خوشی ہے۔ تم آؤ گی؟.....کل......اچھا......ہاں.....!"

اور وہ رات بھر سو نہ سکی۔ اس کا جی چاہا وہ بِنیا سے کہہ دے۔ تم عُصمی سے اتنی دوستی نہ کرو، کہیں ایسا نہ ہو تم اپنی خاموشی کو خود پسندی کی بھاری سِل کہلوا دو' تمہارا کمرہ بھی روح کا مدفن کہلائے۔ اور تمہاری تنہائی تمہارے لئے خود ساختہ خول بن جائے۔ تم محبت کے متعلق بہت کچھ جانتی ہو۔ تم خاموشی سے عُصمی کے لئے یہ ایثار کرو گی۔ تو پھر ان بجھتے چراغوں کو لئے کب تک دنیا کو دھوکا دو گی؟ تم ہٹ جاؤ، بِنیا باز آ جاؤ...... یا پہلے تم...... مگر تم بالکل خاموش ہو اور گفتگو میں جیت جایا کرتی ہو۔ مگر وہ کسی سے کچھ نہ کہہ سکی۔ یوکلپٹس کی لمبی ٹہنیوں میں اُلجھا ہوا پہلے ہفتہ کا چاند نیچے ہی نیچے جا رہا تھا۔ اس کی چاندنی بجھی بجھی سی تھی، اور وہ امتیاز کو کچھ بھی نہ کہہ سکی کہ میرے پہلو میں بھی بجھے ہوئے چراغ ہیں جنہیں تم کبھی نہ دیکھ سکو گی۔ اور چاند نیچے ہی نیچے جا رہا تھا۔ ٹہنیاں اُلجھتی جا رہی تھیں۔ اور وہ بجھتے چراغوں کو ہمیشہ کی طرح چھپا کر بستر پر گر پڑی! •

نکاہیہ:

شکست کی آواز

(غزل کی ایک تعبیر)

عبدالرزاق رشیدہ

لق و دق صحرا کی نرم اور چمکیلی ریت پر میں بڑی سرعت سے بھاگا جا رہا تھا مگر بیاباں کی تیز رفتاری میرے بھاگنے سے کہیں زیادہ تیز تھی، اور ہر قدم کے بعد دوری منزل اور بھی نمایاں ہوئی جا رہی تھی۔ میرا سانس پھول گیا۔ میں نے رکتے ہوئے دم لیا اور اپنے گرد و پیش دیکھا۔ ہر طرف جاں گسل تنہائی اور سکوت چھا رہا تھا۔ آس پاس زندگی کا کوئی نشان نہ تھا کہیں کہیں بگولوں کے وحشیانہ رقص کی وجہ سے خود رو جھاڑیاں ان کی لپیٹ میں کانپ رہی تھیں۔

اس عالم ویرانی اور تنہائی میں کہیں دور سے یکلخت مجھے گانے کی آواز سنائی دی۔ آواز میں بلا کا درد و کرب اور بیکسی تھی۔ میں آہستہ آہستہ اس آواز کی طرف بڑھنے لگا۔ آواز بلند ہو رہی تھی۔ اب مجھے صاف سنائی دینے لگا ؎

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گذر
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار

گانے والا ریت کے ایک ٹیلے کے عقب میں روکھے سوکھے درخت کے نیچے نیم دراز تھا۔ اس نے مجھے ابھی تک نہیں دیکھ پایا تھا۔ وہ ایک تپلا دبلا انسان تھا۔ پھٹے ہوئے کپڑوں میں اس کے جسم کی ہڈیاں یوں نمایاں تھیں جیسے اس کی جنبشِ خفیف سے ابھی علیحدہ ہوا چاہتی ہیں۔ مذرد رنگ، سر اور چہرہ پر ریت سے اٹے ہوئے بال، لمبے لمبے ناخن، گریباں چاک، آنکھوں کے نیچے اس کی پچکے ہوئے زرد گالوں پر خون کی دو دھاریں جمی ہوئیں۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہوئے میری طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا۔ میں ٹھٹک گیا۔ اس کے ویران اور رنا اس چہرہ میں گڑی ہوئی پژمردہ آنکھوں سے افسردگی ہویدا تھی۔ میں مبہوت سا سراسیمگی کے عالم میں اسے تکتا رہا۔

"تم کون؟" درخت سے کمر لگاتے ہوئے اس نے اچانک مجھ سے پوچھا۔

"ایک اجنبی مسافر!"

"اس ویرانہ میں تمہارا کیا کام؟" اس نے پھر پوچھا۔

"تم کون ہو بھائی؟" میں نے اس کے سوال کا جواب نہ دیتے ہوئے دریافت کیا۔

وہ مسکرایا۔ اس کے غلیظ، بڑے بڑے دانت نمایاں ہوگئے۔

"بھائی۔ اونہہ!" وہ زیرِ لب بڑبڑایا ——"میں؟"

"ہاں، تم!" میں نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا اور کہا —— "یہ ویرانہ اور تمہاری ابتر حالت مجھے مجبور کر رہی ہے کہ تمہارے حالات جانوں اور کچھ بن پڑے تو تمہارے دکھ درد کا مداوا کروں۔"

"میرے چارہ گر" اس نے مسکراتے ہوئے طنزاً کہا۔ "تم میرے لئے کچھ نہ کر سکو گے۔ میرے لئے، جو غمِ عشق میں اپنی رہی سہی زندگی کے سانس ورے کر رہا ہاں، ہمدردی میں سموئے ہوئے الفاظ بے معنی ہیں۔ مجھے اس صحرا کی تنہائی و یکسوئی راس آچکی ہے۔ یہ میری مونس و غمخوار ہے۔"

"آخر تم ہو کون؟"

"اپنی شکست کی آواز!"

"کیا تمہارے کوئی عزیز و اقارب نہیں جو تمہارے پرسانِ حال ہوں؟ اس لق و دق صحرا میں تم اکیلے جیتے کیسے ہو؟"

"کون کہتا ہے میں یہاں اکیلا ہوں۔ یادِ یار میری زندگی کا اثاثہ ہے۔ یہی ایک سہارا ہے جس کی بدولت مجھے اس صحرا کی تنہائی اور ویرانی میں جنت کی چہل پہل دکھائی دیتی ہے۔"

"یادِ یار!" میں بڑبڑایا "عشق!"

"ہاں صاحب ہاں۔ عشق نے مجھ کو نکما کر دیا، ورنہ میں بھی آدمی تھا کام کا۔"

"کس کے عاشق ہو تم؟"

"آہ!" اس نے ایک لمبی آہ کھینچی جس کا گرم بھبکا میرے چہرہ سے مس کرتا ہوا فضا میں تحلیل ہو گیا۔ اس کے رخ پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں۔ "پوچھ کر کیا کرو گے۔ تم مسافر ہو۔ اپنی راہ لو۔ ہم دیوانوں کو ہمارے حال پہ چھوڑ دو۔"

"آخر بتانے میں تکلف کیا ہے؟" میں نے اس کے ذرا نزدیک ہوتے ہوئے کہا۔

"اس کے کئی نام ہیں، مگر وہ مشہور "جاناں" کے نام سے ہے۔"

"اپنے عشق کا ماجرا سنا سکتے ہو؟" میں نے قدرے بے تکلف ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بھئی ماجرا کیا، بس یہ سمجھ لو کہ راہِ عشق پہ چلے، کچھ فاصلہ طے کیا ہجر و وصل کی منزلوں کے درمیان دل گم کر بیٹھے، جو آج تک ہزار منتوں اور جستجو کے باوجود ہمیں نہیں ملا۔"

"عجیب اتفاق ہے۔ دل گم ہو جانے کی بھی ایک ہی کہی۔ دل کیسے گم ہو سکتا ہے؟" میں نے تشویش ناک لہجہ میں دریافت کیا۔

"جس تن لاگے وہی تن جانے اور نہ جانے کو — یہ مسائل تمہارے فہم و شعور کی دسترس سے باہر ہیں۔" اس نے بوکھلاتے ہوئے جواب دیا

"اس میں آخر الجھن کونسی ہے۔ بھلے آدمی بغیر دل کے انسان زندہ کیسے رہ سکتا ہے؟"

"میں جو زندہ ہوں! جہاں پہلے دل تھا وہاں اب میٹھا میٹھا درد رہتا ہے۔ اسی درد کی کسک مجھے زندہ رہنے پہ مجبور کر رہی ہے۔"

"تعجب! ۔ مگر یہ تو بتاؤ تمہارے عشق کی ابتدا کیسے ہوئی۔"

"کچھ برس اُدھر کی بات ہے، جب میں جوان تھا "جاناں" کے حسن و جمال کے چرچے زبان زدِ عام تھے۔ لوگ اس کے ناز و ادا کی باتیں کچھ اس طرح لطف لے لے کر بیان کرتے کہ سننے والے کا دل ڈول جاتا۔ یہ باتیں میں نے بھی سنیں۔ جہاں اس کے نام کی بھنک ذرا بھی میرے کان میں پڑ جاتی حالت یہ ہو جاتی کہ دنیا و مافیہا کی سب باتیں بھول کر اس ہی کے حسن و جمال کی خوبیاں سننے میں محو ہو جاتا۔ جوانی دیوانی ہوا ہی کرتی ہے؛ اسے ایک نظر دیکھنے کا شوق چرّایا۔ ہر وقت موقع کی تلاش میں رہتا کہ کسی نہ کسی طرح اس پری وش کو دیکھ پاؤں۔ چنانچہ ایسے لوگوں سے راہ و رسم پیدا کی جن کی رسائی ان تک تھی۔ بھلا لوگ خود غرض، مجھ غریب، بے یار و مددگار کو کون اڈّے لگنے دیتا تھا۔ بیسیوں ترکیبیں اور تدبیریں بنائیں اور بگاڑیں مگر ناکام رہا۔ قہرِ درویش برجانِ درویش! آخر کار میں نے ارادہ کیا کہ صبح گھر سے کان پہ قلم رکھ کر نکل جایا کروں گا اور بہ آوازِ بلند ہر ایک سے پوچھوں گا کہ اگر کسی نے جاناں کو خط لکھوانا ہو تو بندہ بے دام حاضر ہے۔"

"قطعِ کلام معاف۔ کیا تمام شہر اس سے عشق فرماتا تھا؟" میں نے اسے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔

"اجی حضرت کیا پوچھتے ہو۔ شہر کا ہر شخص اسی فکر میں مبتلا رہتا کہ کسی نہ کسی طرح اس کے عشاق کے زمرۂ خاص میں داخل ہو جائے۔ بہت سے لوگ، خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے! یہ آواز اپنے سینوں میں لئے اس دنیائے فانی سے کوچ فرما گئے!!"

"خوب! جس کے اس قدر چاہنے والے ہوں وہ وفا تو کسی سے کیا کرتا ہوگا۔ اتنے چاہنے والے تو کسی کے بھی نہیں ہوتے۔"

"دیکھئے صاحب! ایسے بیہودہ کلمات میں اس جانِ جہاں کی شان کے خلاف نہیں سن سکتا۔"

"معاف فرمایئے، مجھ سے غلطی ہوئی۔"

"جی ہاں!" اس نے فاتحانہ انداز میں زیرِ لب کہا۔

"اچھا حضرت جب آپ نے خط لکھنے کی مہم شروع کی تو پھر کیا ہوا؟"

"خوش قسمتی سے میری یہ ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ ایک دن میں اسی کارِ خیر میں سرگرداں تھا کہ مجھے ایک شخص نے بلایا اور پوچھا کیا تم ہی ہو جو اس آفتِ جاں کے لئے لوگوں کے خط لکھتے ہو؟ — میں نے بغیر کوئی جواب دیئے حسبِ معمول اپنا کان سے اُڑسا ہوا قلم اتارا اور کاغذ سنبھالتے ہوئے اس سے کہا "فرمایئے کیا لکھوں؟"

"مجھے کوئی خط نہیں لکھوانا"

"تو پھر راستہ ناپو۔"

"تم میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"وہیں"

"کیا فرمایا! کون ہیں آپ؟" میں نے ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے

اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے اس رشکِ حور نے تمہاری تلاش کے لئے بھیجا ہے۔
وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ ہولیا۔ میرے دل میں ہجومِ شوق نے ایک ہلچل مچا دی۔ خوشی سے میرے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ مجھے اپنی قسمت پہ خود ہی رشک آ رہا تھا۔ مدت کے بعد میری آرزوؤں اور امیدوں کے بر آنے کا موقع نصیب ہونے والا تھا۔ تمام راستہ امنگوں اور آرزوؤں کے ایک طوفانِ بلاخیز میں ڈوبتا ابھرتا آخر اپنے رہبر کے ہمراہ اس سراپا ناز کے دروازے پہ جا دم لیا۔ دربان نے مجھے ایک عجیب قہرمانی انداز سے گھورا۔ ہم دونوں اندر داخل ہو گئے۔ صحن کی بغل میں ایک خوبصورت باغیچہ تھا۔ مجھے اس شخص نے وہاں سنگِ مرمر کی ایک دلپذیر نشست پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا اور خود چلا گیا۔ میں وہیں اپنے دھڑکتے دل کو سنبھال کر بیٹھ گیا۔ اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد وہی شخص آیا اور مجھے اپنے ساتھ ایک آراستہ پیراستہ کمرے میں لے گیا۔ یہ کمرہ عجوبۂ روزگار تھا۔ ہر چیز سے حسن و جمال چھلک رہا تھا۔ میری نظرِ شوق ہر چیز کو انتہائی فریفتگی اور مرعوبیت سے تک رہی تھی۔ میں بہت سرشار ہوتا جا رہا تھا۔ مدہوشی کا یہ عالم کہ مجھے اتنی خبر نہ تھی کہ میں ہوں کہاں۔ اچانک اس شخص نے مجھے جھنجھوڑا۔ میں اس عالمِ بے خودی سے سنبھلا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ۔۔۔

ترے سرو قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

کا عالم تھا۔ وہ سراپا فتنۂ محشر بصد ناز و انداز اپنی تمام شوخیوں اور رعنائیوں کے ساتھ تشریف لا رہے تھے ۔۔ میرے خدا! کیا نظارا تھا!! اس کے پیکرِ نازکی رعنائی اور دزدیدہ نگاہی دل و جگر کے پار اتر گئی اور نظارگی سراپا نظارہ بن کے رہ گیا!

"گھبراؤ نہیں۔"

میں اس بتِ شیریں ادا کے مترنم الفاظ سے چونک اٹھا۔

میں نے پھر کوشش کی کہ نظریں اٹھاؤں اور جس حور شمائل کے لئے برسوں دربدر کی خاک چھانتا پھرا۔ اسے جی بھر کر دیکھ تو لوں مگر رعبِ حسن آڑے آ گیا۔ اس کے باوجود خدا کی قدرت کا جو مظاہرہ کنکھیوں سے دیکھا، کبھی نہیں بھول سکتا۔ سرو قد۔ دراز زلفیں ۔۔ سر پہ تاجِ کجکلاہی ۔۔ مگر اس قدر نازک کہ ذرا سی جنبش سے کسی پودے کی نیم و نازک شاخ کی طرح ہوا میں جھک جائے۔ سرخ و سفید چھوٹے سے کتابی چہرہ پر تہہ در تہہ سبزۂ خط، دو سرگیں آنکھیں جیسے دنبالہ دار نرگسِ فتاں۔ دیکھتے ہی برسوں سرگرداں رہنے کی کوفت دور ہو گئی۔"

"سبزۂ خط! یہ کیا کہا! وہ مرد تھا یا ۔۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کیا کہوں۔ ابھی تک اس عقدۂ پنہاں کو سلجھانے کی توفیق نہیں ہوئی۔"

اس نے جلدی جلدی فقرہ مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"خط تو خوب لکھتے ہو" ایک سحر آفریں آواز ہوا میں پھیل گئی۔

"آپ کا حسنِ ظن ہے ورنہ ۔۔"

میں ابھی اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ وہ بولے: "ہم تمہاری محبت اور سعی و کوشش کی داد دیتے ہیں۔ تم ہماری محفل میں شریک ہو سکتے ہو"
میں منہ سے کچھ نہ بولا لیکن نگاہوں ہی نگاہوں میں ان کے اس مربیانہ رویہ اور سلوک کے لئے فریضۂ تشکر ادا کیا۔

اب میں اس آفتِ دوراں کی محفل میں شریک ہونے لگا ۔۔ خلوت اور جلوت میں ان کا قرب حاصل کرنے کی خاطر میں نے اپنے عشق اور خلوص کی بدولت کیا کچھ نہ کر ڈالا۔ ان کی نظرِ کرم اور احسانات بڑھتے گئے۔ مگر یہ دلِ نامراد نہ پہلے خوش تھا اور نہ اب۔ یہ کسی اور کو ان کی محفلِ ناز میں نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اور وہاں یہ حالت تھی کہ رقیبوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ میری منزلِ عشق میں رقیب ایک سنگِ گراں ثابت ہو رہا تھا۔ طبیعت اس قدر حساس ہو گئی تھی کہ بس ہر کس و ناکس کا وجود شاہ خوباں کے نزدیک از حد شاق گذرتا۔ وہ آشنا ہوتے ہوئے بھی مجھے ناآشنا دکھائی دیتے۔ یہ تلخی بڑھتی گئی، بڑھتی ہی گئی۔ ایک دن آرائشِ خم کاکل سے فراغت پانے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا۔

"دیکھو تو ہم کیسے ہیں؟"

"قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو۔ کاش کہ تم مرے لئے ہوتے!"
میں نے برجستہ جواب دیا۔

"مطلب؟"

میں نے موقع کو غنیمت جانا اور اپنے رقیبوں کا ذکر چھیڑتے

ہوئے کہا یہ لوگ سب بوالہوس ہیں ۔ ان کی محبت ناپائیدار اور خلوص عارضی ہے ۔ آپ کا ان لوگوں سے یوں بے باکی سے ملنا بیٹھنا مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا"

"ہم ان رازہائے عشق بازی کو تم سے بہتر سمجھتے ہیں ۔ ہمارے معاملات میں دخل دینے والے تم کون ؟" حضور نے چیں بہ جبیں ہوتے ہوئے فرمایا ۔

"درست ارشاد ، مگر یہ کمبخت رشک مجھے آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا ۔"

"ہمارے ہاں رشک اور حسد کوئی وقعت نہیں رکھتے ۔ اگر تمہیں اپنی محبت اور اپنے عشق پہ بہت زعم ہے تو ہم تمہیں آزمائیں گے ۔"

"آزمائش کی بھڑکتی ہوئی بھٹی کے شعلے مجھے میرے منظور نظر سے دور نہیں کر سکتے ۔ جس آزمائش میں آپ چاہیں دھکیل دیں ، میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل چل کر دکھا دوں گا " میں نے دلیرانہ کہا ۔

"بہ دم خم ! خوب ، بہت خوب !! ہم تمہیں کل قتل کر ڈالیں گے ۔ کہو تیار ہو ؟"

"میرا یہ جسم ناتواں تو آپ کی عطا کردہ زندگی کو امانت سمجھ کر اٹھائے پھرتا ہے ۔ میری زندگی آپ کے قبضہ و اختیار میں ہے ۔"

"کل علی الصبح شہر کے باہر وسیع و عریض میدان میں ہم اپنے دست مبارک سے تمہیں قتل کریں گے ۔ دیکھنا تیغ و کفن اپنے ساتھ لیتے آنا ۔"

میں اپنے گھر واپس آگیا ۔ دوسرے دن میں نے اپنے آبا و اجداد کی پرانی تلوار نکالی ، کفن باندھا اور حسب وعدہ علی الصبح شہر کے وسیع و عریض میدان کا رخ کیا ۔

میدان میں لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے ۔ انہوں نے تحسین و آفریں کے فلک شگاف نعروں سے میرا خیر مقدم کیا ۔ میرا ولولۂ شوق اور بھی بلند ہوا ۔ بیچ میدان کے میرے لئے ایک مقتل بنوایا گیا تھا ۔ میں لوگوں سے ذرا ہٹ کر اپنی متعینہ جگہ پہ بیٹھ گیا ۔ لوگ میرے متعلق آپس میں باتیں کرنے لگے ۔ آخر وہ جن کی ہر ادا تیغ جانستاں اور ہر انداز پیغام مرگ ناگہاں ہے تشریف لائے ۔ ہر طرف سکوت چھا گیا ۔ ایک شخص نے مقتل کے چبوترے پر کھڑے ہو کر بہ آواز بلند میرا نام پکارا ۔ میں اٹھا اور مقتل کی طرف چلنے لگا ۔ ہر طرف سے "عاشق دلگیر زندہ باد !" "کشتۂ عشق پائندہ باد !!" کے نعرے گونجنے لگے ۔ میں نے چبوترے پر کھڑے نظر دوڑائی ۔ تمام شہر اس میدان کی طرف امڈا چلا آ رہا تھا ۔ اتنے میں مقتل کے چبوترے پہ تشریف لائے ۔ میں نے انہیں اپنی تلوار پیش کرنی چاہی مگر وہ اسے دیکھتے ہی برانگیختہ ہوگئے اور فرمانے لگے :-

" اے نادان ! اتنی بھاری تلوار ہم سے کیسے اٹھائی جائیگی ؟"

میں نے ندامت محسوس کرتے ہوئے عرض کیا ۔ "حضور ! جو تیغ بھی ہاتھ آئی لے کر حاضر ہوگیا قبول فرمائیے اور اپنے دستِ نازک سے بندہ کا سر قلم فرما دیجئے ۔"

"اس بھونڈی بھاری بھرکم تلوار کو پھینک دو ۔"

میں دم بخود ہوگیا ۔ انہوں نے اپنی تلوار ، جو میری تلوار سے بیس گنا ہلکی تھی ، اپنی نازک کمر سے اتاری اور کہنے لگے ۔ "دل میں کوئی آرزو ہو تو کہہ دو"

میں نے کہا ۔ " میں ناچیز تو مجسم آرزو ہوں ۔ اگر ممکن ہوسکے تو ۔

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن بعدِ قتل
میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے ؟"

"پھر وہی رشک کی بات ۔ نہ جانے تم لوگوں کا خمیر کس چیز سے اٹھایا گیا ہے " ۔ یہ کہتے ہوئے وہ میری طرف تلوار لے کر لپکے مگر میرا دل ، خدا اس نامراد کو کہیں چین نصیب نہ کرے ! پھر رشک سے پھڑک اٹھا ۔ ان کے دست حنائی میں تلوار دیکھ کر تلملانے لگا ۔ خیال آیا کہ ان کے دستِ نگاریں میں جو تلوار ہے اس کی جگہ میرا ہاتھ کیوں نہ ہو ؟ چنانچہ میں نے کہا ۔

للہ اس تلوار کو پھینک دو اور اس کی بجائے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لو ۔"

یہ سنتے ہی ان کی جبینِ ناز پر قہر و غضب کی شکنیں نمودار ہوگئیں ۔ اور انہوں نے اپنی تلوار میری گردن مارنے کے لئے یکدم فضا میں بلند کی ۔ ہر طرف سے "چشم بد دور ! نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو" کے آوازے آنے لگے ۔ میں ان کی شمشیر عریاں کو فضا میں دیکھ کر خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا ۔ نہ جانے کب تک

انہوں نے اپنی نازک کلائی اوپر اٹھائے رکھی اور میں اچھلتا رہا۔ آخر وہ مخاطب ہوئے۔

"سنبھلوگے یا نہیں؟ اس طرح ناچتے کیوں ہو؟"

میں یہ سنتے ہی ہوش میں آگیا اور کہا "واللہ! تمہاری شمشیر کا عریاں ہونا میرے لئے عید نظارہ ہے۔ اپنی شمشیر کو فضا میں ٹھہرائے رکھو کیونکہ مجھے بے انتہا خوشی اور سکونِ قلب میسر آرہا ہے۔"

وہ یہ سنتے ہی آگ بگولا ہوگئے اور چبوترے سے اترتے ہی یہ جا وہ جا۔ میں حواس باختہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لوگ منتشر ہونے شروع ہوگئے۔ اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے میدان بالکل خالی ہوگیا۔ بس وہاں میں تھا، مقتل کا چبوترہ اور ماتمِ یک شہرِ آرزو!

دوسرے روز جب پھر ملاقات ہوئی تو انہیں نہایت بدگمان پایا۔ وہ پہلے ہی وفا میں سست اور جفا میں چست تھے۔ اس حادثہ کے بعد ان کی جفائیں اور بھی بروئے کار آنے لگیں۔ میرے لئے یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔ جب میں نے اس کا ذکر کیا تو برہم ہوکر بولے "تم نے اس دن سارے شہر کے سامنے ہماری ہتک کی۔ ہم تم سے ناراض ہیں۔"

"مجھے معاف کر دیجئے۔" میں نے نہایت عاجزی سے گذارش کی۔

"معافی کا کوئی امکان نہیں!"

"حضور! اس قدر سنگ دل بننا اچھا نہیں۔ مجھے ایک اور موقع دیجئے۔ ورنہ میں گھل گھل کر جاں بحق ہو جاؤں گا۔"

"پھر وہی کج بحثی۔ کہہ تو دیا ہمارا کام ادا کمال ہی ہے۔ قدرت نے ہمیں اسی لئے پیدا کیا ہے کہ دنیا ہمارے عشق میں گھل گھل کر جاں بحق ہو۔ کیا آفتاب کا کام تمازت پھیلانا نہیں۔ اب اگر شبنم کہے کہ شرر فشاں نہ ہو، میں فنا ہو جاؤں گی تو یہ اس کی نادانی ہے۔" انہوں نے بڑے فلسفیانہ انداز سے کہا اور چلے گئے۔

اس پری پیکر کو میرے جذبۂ عشق پر شبہ ہونے لگا — اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی ملاحظہ ہو کہ اگر اس کی محفل میں کسی نے آہ بھی کھینچی تو وہ ستم ظریف خفا مجھ ہی پر ہوتا۔ اسے گمان گذرتا کہ میں ہی ہوں جو اس کی محفل کی رنگینیوں کو اپنی آہِ سرد سے درہم برہم کر دینا چاہتا ہوں۔

ایک دن ان کی محفلِ عشاق گرم تھی۔ میں بھی حاضر تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا "کہو کیسا رنگ ہے ہماری محفل کا؟"

شومئی قسمت سے میں نے کہدیا "آپ کی بزم تو غیر سے تہی ہونا چاہیئے۔ بس آپ ہوں اور میں!"

میرا یہ کہنا تھا کہ پیار بھری چتون جلال کی تیوریوں میں مبدل ہوگئی۔ مسرت وانبساط کے پھول برسانے والی آنکھیں قہر وغضب کے شعلہ ہائے آتش برسانے لگیں۔ اور پھول ایسی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ جن سے ترنم کی ندیاں پھوٹتی تھیں، یوں گویا ہوئے: "تم ہی اس بزم میں غیر ہو۔" اور مجھے بھری محفل سے اٹھا دیا گیا۔

آہ! اس کی بارگاہِ ناز سے ہم ایسے اٹھا دئے گئے جیسے کسی کا جنازہ اٹھتا ہے۔ رقیبوں نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مجھے اپنا کوئی ہوش نہ رہا۔ اب جنوں تھا اور میں۔ دیوانہ وار سینہ کوبی کرنے لگا۔ برابر پیٹتا اور چلاتا۔ میری حالت تشویش ناک ہوتی چلی گئی۔ چارہ گر آئے اور اپنی تدابیر آزما کر چلتے بنے۔ ناصح گروہ اندر گروہ تشریف لائے اور اپنی طویل تقاریر فرماکر جس راستہ سے آئے تھے اسی راستے لوٹ گئے۔ یار دوست اور عزیز واقارب نے مجنوں اور فرہاد کی خونچکاں داستانیں گوش گذار کیں مگر صاحب! یہاں تو عالم عالمِ عشق و جنوں تھا اور بس۔

گلیوں اور شاہراہوں پر طفلِ آوارہ مل جاتے تو وہ دیوانہ سمجھ کر مجھ پر سنگ وخشت کی بوچھاڑ کرتے۔ اس سنگ باری سے مجھے بے حد لطف اور مسرت محسوس ہوتی۔ میں یہی آرزو کرتا کہ اے کاش! ان اینٹ پتھروں میں نمک ہوتا تو میرے زخموں پہ لگتے ہی مجھے اور بے قرار کر ڈالتے۔ آخر مجھے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا۔ میں خون کے آنسو بہانے لگا۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ میری حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ اور ایک دن مجھے اس وسیع صحرا کی لامحدود تنہائیوں میں اکیلا چھوڑ دیا گیا۔ اب میں ہوں اور میرے الم ہائے جانگداز، صحرا کی تنہائی اور یادِ یار! فاعتبروا یا اولی الابصار!!

وہ یہ کہتے کہتے بے ہوش ہوگیا۔ اس کا منہ آہوں کے شرارے چھوڑنے لگا۔ فضا میں ہر طرف آگ ہی آگ بکھر گئی۔ صحرا میں بگولوں کا وحشیانہ رقص اور بھی تیز ہوگیا۔ اس کا ڈراؤنا اور بھیانک چہرہ

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

فن:

مُسلمانوں کی مصوّری

سیّد امجد علی

مسلمانوں میں فنی تخلیق محض چند خود میں نفاست پسندوں کا مشغلہ نہیں تھا بلکہ کاروبارِ زندگی کا ایک لازمی جزو۔ دنیا کی تاریخ میں فنی تخلیق کے جو بھی ممتاز دور گزرے ہیں ان سب میں یہی حال رہا ہے۔ تاآنکہ موجودہ زمانے میں ایک تمدنی تخریب رونما ہوئی۔ اب زندگی کچھ اس طرح پارہ پارہ ہوگئی ہے کہ کام اور تفریح کو ہم ملاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ دینی اور دنیوی امور الگ۔ زیبائشی اور کارآمد اشیا الگ۔

لیکن مسلمانوں کی روایات ہمیشہ یہ رہی ہیں کہ ذوقِ جمال اور فنی کمال کو روزمرہ زندگی کے معاملات میں برسرِکار لایا جائے۔ پارچہ اور لباس کے بنانے میں۔ زیورات اور ہتھیار۔ مٹی اور دھات کے برتن۔ مکان اور باغات۔ دریاں اور قالین۔ اور سب سے بڑھ کر کتابیں اور ان کی جلدیں۔ چنانچہ مسلمانوں کی مصوری اور نقاشی کا مطالعہ کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ یہ کچھ فنی اظہار کا صرف ایک ذریعہ تھا۔ اور اس قسم کے اور کئی ذرائع تھے۔ جن میں اسی قسم کے نفیس ذوق اور جمالیاتی ذوق نمایاں تھے۔ خود مصوری کئی طرح کام میں لائی جاتی تھی۔ کاغذ پر اور چمڑے اور لکڑی پر بھی۔ سینیوں اور صندوقوں پر۔ دیواروں اور چھتوں پر۔

اسلام کی آمد دنیائے فن میں ایک عظیم الشان واقعہ تھا۔ تخلیقی اور تعمیری کام کے لئے اس نے زبردست قوتوں کو بیدار کر دیا جس طرح اور بڑی بڑی تحریکوں نے دنیا کی تاریخ میں کیا ہے۔ ایران اور شط العرب، شام اور مصر جیسے مفتوح ممالک کے مصوروں کو نہ صرف کارگزاری کے مواقع اور مساعد حالات ملے۔ بلکہ خاص سرپرستی اور ہمت افزائی۔ البتہ ان کے کام کو ایک ایسے نہج پر ڈالا گیا۔ اور ایک ایسی نئی روح پھونکی گئی کہ تمام دور دراز ملکوں میں جہاں بھی اسلام پھیلا وہاں فنون لطیفہ میں ایک خاص نیا… اور رواج پیدا ہوگیا جو صرف اسلامی فنون ہی کا امتیازی رنگ تھا۔

فنِ تعمیر اور اس کے تمام معاون فنون جیسے سنگ تراشی۔ چوبی نقاشی۔ منبت کاری۔ کاشی کاری اور سب سے بڑھ کر مصوری، کو ایک دعوتِ عمل تھی کہ نئی مساجد اور محلات کی تعمیر میں مدد کریں اور کمالات دکھائیں۔ نئی عمارات، نجی اور سلطنتی تعمیر کریں اور یہاں تک کہ نئے شہر تک بنا ڈالیں جیسے کوفہ اور بغداد قاہرہ اور سامرّہ وغیرہ۔

تعمیرِ عمارات نو بڑے زور شور سے شروع ہوگئی۔ چنانچہ اب پہلی صدی ہجری کے تعمیری کارنامے دیکھنے کو موجود ہیں۔ مثلاً بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ، قاہرہ میں مسجد عمر۔ ان میں بہت کچھ اینٹ پتھر بلکہ طرز اور طرح بھی مقامی عمارات سے لی گئی ہے لیکن مسلمانوں کے مخصوص انداز کی جھلک ان میں بھی نظر آتی ہے۔ خاص کر ان کے محراب اور ستونوں میں تقسیمِ قطعات میں اور اندرونی آرائش میں۔

دیواروں کو منقور کرنے کا عربوں کو خاص شوق تھا چونکہ وسیع خالی سطحیں انہیں سخت ناپسند تھیں۔ اگر اور کچھ نہیں تو وہ دیوار کی یکسانیت اور پھیکے پن کو دور کرنے کے لئے رنگین پتھر ہی استعمال کر لیتے تھے۔ دراصل جداری یا دیواروں پر بنی ہوئی مصوری، خواہ روغنی رنگوں سے یا خود گیلے مصالحہ میں آبی رنگوں سے کی ہوئی، بہت جلد ہی اسلامی دور میں رائج ہوگئی تھی اور اس کی مثالیں شام کے قصیر عامرہ میں پائی جاتی ہیں۔ جو دوسری صدی ہجری کی یادگار ہیں۔ ایران میں نیشاپور اور عراق میں سامرّہ کے مقام پر بھی تیسری صدی ہجری کے اور قاہرہ میں چوتھی صدی ہجری کے آثار موجود ہیں جن میں دیواروں پر مصوری کے نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ پہلے میں قدیم یونانی اثرات نمایاں ہیں اور دوسرے میں ساسانی اور وسطی ایشیائی۔ اسی طرح تیسرے میں عیسائی عربوں کا ہاتھ نظر آتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ قصیر عامرہ میں بھی یونانی اثرات کے ساتھ ساتھ مشرقی عناصر موجود ہیں۔ اور نیشاپور کے نمونوں میں تو اسلامی فنِ تعمیر کے خاص خاص رکن بنے بنائے پائے جاتے ہیں جیسے طاق۔ اسی طرح وہ آرائشی نقوش بھی ملتے ہیں۔ جو دورِ اُمیّہ سے ہی مسلمانوں کے ہاں رائج ہو چکے تھے۔ اور صدیوں رائج رہے۔ جیسے

''یونس اندر دہان ماہی شد'' (دور عباسیہ)

رستم اور اس کا وحشی گھوڑا
(ایرانی مصوری ، دور مغول)

مسلمانوں کی مصوری
(عہد بہ عہد)

شاہ اسماعیل صفوی ایک باغ میں (دور صفوی ، ایران)

درویش اور شہزادہ (نقش : رضا عباسی ، ایران)

گلدان اور کھجور کے پتے اور آدھے پتے۔ یہ نقوش اتنی اتنی دُور یکساں حالت میں ملتے ہیں۔ جیسے شام کے مقام رقہ میں جہاں سنگِ مرمر کے ستون ملے ہیں۔ اور ان کے اُوپر کے حصے میں ایسے نقوش پائے گئے ہیں۔ دوسری طرف تیونس میں قیروان کے مقام پر مسجد کا چوبی منبر ملا ہے۔ جس پر ایسا ہی کام ہوا ہوا ہے سامرہ میں تو مسلمان مصوروں کا دستخط شدہ کام ملا ہے اور ان کے کام میں اس اسلامی طرزِ مصوری کی داغ بیل نظر آتی ہے جو بعد میں اسلامی ممالک میں پھیلنے والی تھی۔

جداری مصوری کے یہ چند نمونے جو دستیاب ہوتے ہیں۔ ان میں سے چند ہوں گے۔ جو اول زمانے میں بنائے گئے۔ ان کے ذکر سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ فن مصوری کو بہت جلد ہی مسلمانوں نے فروغ دینا شروع کر دیا۔ اور گو ہر قسم کے اثرات قبول کرنے میں یہ کشادہ دل رہے، تاہم ان کا اپنا ایک فنی مسلک تھا جو خاص اسلام کا پیدا کیا ہوا تھا۔

یہ اثر محض نفی کی حد تک نہ تھا۔ کہ انسانی شکل مصوری میں نہ آئے۔ گو یہ بھی ایک اثر تھا جس کے نتیجہ میں فنی جدت کو یہ راہ اختیار کرنی پڑی کہ خارجی اشکال کو استعمال کئے بغیر مجرد نقوش ایجاد کرے۔ لیکن کہنا تو یہ ہے کہ اسلام کا اثر مصوری پر مثبت انداز میں بھی پڑا۔ یہ اثر تھا خارجی دنیا کی حقیقت اور معنویت کا اقرار - اور دیکھا جائے تو یہ اعتقاد ہی مصوری کی جڑ بنیاد ہے۔ کیونکہ مصور کی نظر میں اشکال نہ کہ مادہ اور اجسام، اشیاء کا جوہر ہیں اور یہی حقیقت کی آیات اور علامات ہیں لیکن اشکال اور ظواہر کو بعض مذاہب نے اور مفکروں نے بے اعتبار اور بے حقیقت بتایا ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید بار بار ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ظاہری دنیا پر غور کریں اور اس میں معنی تلاش کریں۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ریگستان کے سیدھے سادے باشندے رنگ، اور خطوط کے حسن کی بے ساختہ داد دینے پر مجبور تھے۔ ان کے نا ملوث شدہ دلوں پر جب فنونِ لطیفہ اور مناظرِ قدرت کے نئے نئے جلوے آشکار ہوئے تو گہرے نقوش ڈالتے چلے گئے۔ ان کی حیرت و مسرت متعدی تھی۔ چنانچہ مفتوح ممالک کی پرانی آبادیاں جن کی نظریں اور احساسات ان جلووں کے عادی اور بڑی حد تک ان کی طرف سے بے حس ہو چکے تھے۔ نو واردوں کا تاثر دیکھ کر خود چونک سے گئے اور ان کے دل اور ان کی نظر سے گرد و پیش کا نئے سرے سے جائزہ لینے لگے۔ گویا ہر چیز "اجنبی" ہو گئی ہے۔

سب سے بڑھ کر اسلام نے فن کی یہ خدمت کی کہ اسے ایک پائداری اور وقار عطا کیا۔ جو دلی اطمینان اور قلبی طمانیت کے بغیر نہیں آتا۔ ایسے اعتقادات اور ایمان کی بدولت ہی فنکار کے نظریات میں وہ پختگی اور سنجیدگی آتی ہے جس کے بغیر فنونِ لطیفہ ایک کھیل بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہی بنیادی کمی ہے۔ جس کے باعث اس تشکیک اور شبہات کے دَور میں فنکار اس تمام کارخانۂ حیات کو بے معنی اور بے کار سمجھنے پر مجبور ہیں اور بجائے کوئی عظیم اور بسیط شاہکار پیدا کرنے کے جو ایک فکری نظام پر مبنی ہو، صرف سطحی اور اضطراری نظمیں اور فن پارے پیدا کر رہے ہیں جو ان کی بے اطمینانی کا نتیجہ ہیں۔

اسلام کے قرونِ اولیٰ کے فن کاروں کی بات اور تھی۔ ان کی قدریں یقین پر مبنی تھیں۔ خواہ ان کا عمل کچھ ہی ہو حسن کو بڑا درجہ حاصل تھا بحیثیت ایک روحانی نصب العین کے جسے صوفیا و فلاسفہ اور شعراء نے تسلیم کیا تھا۔ حدیث میں بھی منقول ہے: "اللہ جمیلٌ و یُحب الجمال" اور شبستری کا قول ہے: "خدا نے حُسن کو ہمارے بیچ میں ایسا رکھا ہے جیسے کسی شہر میں جھنڈا گاڑا ہوا ہو۔" امام غزالیؒ نے فرمایا ہے: "قلبِ انسانی اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ چقماق کی طرح اس میں چنگاریاں بھری ہوئی ہیں جو نغمہ و آہنگ سے بیدار ہوتی ہیں۔ اور انسان کو بےخود کر دیتی ہیں۔ یہ نغمہ و آہنگ ایک بلند تر حسن و ہم آہنگی کا عکس ہیں۔ جسے ہم عالمِ روحانی کہتے ہیں۔ یہ نغمات انسان کو اس رشتہ کی یاد دلاتے ہیں جو وہ اس عالم بالا سے رکھتا ہے اور ایسی کیفیات پیدا کرتے ہیں جو رمز و اسرار کے اعتبار سے ناقابلِ بیان ہیں۔" (اے۔ یو۔ پوپ کی کتاب "پرشین آرٹ" سے منقول)

مسلمانوں کے فن مصوری کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ابتدا اور ارتقا کا کچھ نہ کچھ ذکر کیا جائے۔ اسلامی دور کی پہلی چند صدیوں کے بہت کم مصوّر اوراق زمانہ کی دست برد سے بچے ہیں۔ لیکن اتنے ضرور موجود ہیں۔ جن سے پتہ چلتا ہے کہ آٹھویں۔ نویں اور دسویں صدی عیسوی میں کاغذ کے صفحات پر باریک مصوّری یا خورد نگاری (MINIATURE PAINTING) کا ایک پورا دبستان مصر میں موجود تھا۔ یہ ثبوت ان تصویروں کے ٹکڑوں سے ملتا ہے جو ایک خاص قسم کے مصری کاغذ پر بنی ہوئی ملتی ہیں یہ کاغذ PAPYRUS یا سرکنڈے کے گودے سے وہاں قدیم الایام سے بنتا رہا تھا۔ یہ نادر مرقعے، مجموعۂ آرچ ڈیوک رائنر کے نام سے ویانا کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔ اس مجموعہ میں ایک تصویر گھوڑے سوار کی ہے۔ جس پر ابوطمین حیدرہ نامی مصور کے دستخط ہیں۔ تاریخی شواہد سے بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانہ میں مصوری کا چرچا تھا۔ چونکہ مقریزی نے اپنی کتاب "خِطَط" میں ذکر کیا ہے کہ خلیفہ مستنصر باللہ کو مصوری سے خاص شغف تھا اور ایک مقابلہ کا

بھی بیان ہے جو اس بادشاہ نے دو مصوروں کے درمیان کیا تھا۔ بنام القصیر اور ابن عزیز ——— پہلا مصری اور دوسرا بغدادی۔ مقریزی نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ اس نے مصوروں کی ایک پوری تاریخ لکھی ہے۔ جو بدقسمتی سے نابود ہو گئی ہے۔

اس مختصر معلومات سے اس بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جا سکتی کہ مصوری کا معیار کیا تھا اور کیا کیا اسالیب رائج تھے۔ غالباً جو اسالیب بعد میں اسلامی ممالک میں رائج ہوئے ان کی ابتدا بغداد میں عباسی دور میں ہوئی لیکن افسوس ہے کہ اس دور کی بھی صرف وہ تصویریں بچ سکیں جو آخر زمانے کی ہیں یعنی تیرھویں صدی کے وسط میں جو منگول حملے بغداد پر ہوتے۔ ان سے ذرا ہی پہلے کی۔ ۱۲۵۸ء میں بغداد منگولوں کے ہاتھوں برباد ہوا۔ اور اس کے ساتھ ہی ایک پوری تہذیب کی عمارت منہدم ہو گئی۔ جو بڑی محنتوں سے کھڑی کی گئی تھی جو تصویریں عباسی دور کے آخر کی ہم تک پہنچی ہیں۔ وہ ان قلمی نسخوں میں پائی جاتی ہیں جو طب اور ہندسہ میں لکھے گئے لیکن خاص طور پر اہم اور دلچسپ وہ تصاویر ہیں جو "کلیلہ و دمنہ" اور "مقامات حریری" کے مختلف نسخوں میں پائی جاتی ہیں۔ آخرالذکر کا ایک اعلیٰ درجہ کا نسخہ فرانس کے قومی کتب خانے میں ہے جو شیفر کا نسخۂ حریری کہلاتا ہے۔ اس پر درج ہے کہ یہ یحییٰ ابن محمود واسطی کا عمل ہے اور ۱۲۳۷ء میں بنایا گیا۔ اس میں اس زمانے کی عرب زندگی کا ہو بہو نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اور بہت سے عام کردار پیش کئے گئے ہیں۔ اور جانوروں کی بھی تصویریں پیش کی گئی ہیں جو بہت صداقت اور محنت سے بنائی ہوئی ہیں۔ ان میں ناقابلِ تردید یونانی اثرات پائے جاتے ہیں جو قسطنطنیہ سے بغداد پہنچے تھے۔ یہ اثرات چہرے کی بناوٹ اور بعض فنی تراکیب اور اسالیب سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کام میں کچھ کچا پن ضرور ہے لیکن ایک جانداری اور صلابت ہے جس سے مصور کا جذبہ عیاں ہوتا ہے اور تصویر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے۔ اثرات کے علی الرغم تصویری تراکیب یعنی تصویر کی وضع مرتب کرنے میں وہ صنعت کاری اور کاوش ہے جو حقیقت نگاری کے برعکس آرائشی رجحانات کی حامل ہے۔ اور جس نے آگے بڑھ کر بہت ترقی کی۔ ترتیب اور تنظیم کی خواہش لباس کی سلوٹیں مرتسم کرنے میں نظر آتی ہے۔ رنگوں میں تنوع تو کافی ہے لیکن زیادہ تر گھٹے گھٹے رنگ ہیں۔ سیاہی یا خاکستری اثر لئے ہوئے۔ یہ عراقی مصور ہماری مصوری کے ارتقا میں قریب قریب وہی مقام رکھتے ہیں جو اٹلی کے متقدمین (PRIMITIVES) یورپ کی مصوری میں لیکن ہمارے یہ مصور یورپ کے مصوروں کے پیشرو تھے۔ دو صدی پہلے۔

منگول غارتگری نے عارضی طور پر تہذیب و تمدن کی ترقی کو اسلامی دنیا میں روک دیا۔ لیکن جب جنگ وجدل کی شورش ختم ہوئی اور فاتح خود مفتوح کے طور طریقوں کے گرویدہ ہو گئے تو فن مصوری کو ایک نئی زندگی نصیب ہوئی لیکن اب کے یہ شمالی ایران میں جلوہ گر ہوا۔ جہاں منگول بادشاہوں نے اپنا پایۂ تخت مقرر کیا۔ چنانچہ ایرانی مصوری تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر میں شروع ہوتی ہے اور اس سے پہلے کے کوئی نمونے اگر تھے تو اب موجود نہیں۔

جب تک بغداد اسلامی دنیا کا مرکز تھا تو ہمارے فنون لطیفہ پر غالب اثرات مغرب سے یعنی قسطنطنیہ سے آتے رہے۔ اور ان اثرات کی تہہ میں یونانی روایات تھیں اب جو رُو بدلی تو تمام اثرات مشرق سے آنے شروع ہوئے یعنی وسط ایشیا اور چین سے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ چین سے لیکر بغداد تک تمام علاقے پر ایک ہی خاندان حاکم تھا ——— یعنی ہلاکو خاں بغداد اور ادھر کے اسلامی ممالک میں اور کبلائی خاں چین میں۔ اب ان خانہ بدوشوں کی وحشی قوموں نے تہذیب کی روشنی پہلے پہل چین میں دیکھی۔ جہاں انہوں نے اول تسلط حاصل کیا اور وہاں کے تہذیب اور تمدن نے ان کے دلوں پر گہرا اثر ڈالا۔ یوں چین اور عرب ممالک میں پہلے ہی سے روابط اور تعلقات موجود تھے۔ چونکہ عرب جہاز تجارت کی غرض سے ساتویں۔ آٹھویں اور نویں صدی میں چین برابر جاتے رہتے تھے۔ پھر عرب پہلے سے ہی چینیوں کے مرہونِ منت تھے کہ اُن سے کاغذ بنانے کا فن انہوں نے سیکھا تھا۔ اور بعد میں بہت فروغ دیا تھا بقول سر ٹامس آرنلڈ کے "لطائف المعارف" میں ثعلبی نے لکھا ہے کہ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں سمرقند کے حاکم نے ایک قید شدہ چینی سے یہ کام دریافت کیا تھا اور یوں یہ مسلمانوں میں رائج ہوا۔

منگولوں کے دور میں ایران اور عرب میں چینی فنون لطیفہ کو کلاسیکی درجہ حاصل تھا۔ چنانچہ ہلاکو خاں نے ایک سو ہنرمندوں اور مصوروں کو مع خاندانوں کے چین سے ایران بلوایا تھا تاکہ نئے دارالخلافہ کی تزئین اور آرائش کریں۔ اس کے علاوہ صنعتی اور فنی نوادر مسلسل قافلوں پر چین سے ایران آتے رہتے تھے۔ چونکہ بادشاہ اور امرا ان کے قدردان اور منعمی تھے۔

پس یہ ایک قدرتی امر تھا کہ اس زمانہ کی چینی مصوری کا گہرا اثر ایران کے نئے دبستانِ مصوری پر پڑے۔ چین میں اس زمانے میں یوآن خاندان حاکم تھا۔ اور مناظر کشی کا بہت رواج تھا۔ چنانچہ یہ اثرات ایران کے قدیم ترین مرقعوں میں نمایاں نظر آتے ہیں جیسے ابن بختی شوس کی "منافع الحیوان" جو قریب ۱۲۹۷ء میں بمقام مراغہ تیار ہوئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ ان اثرات کے ایسے گہرے نقوش مسلمانوں کی مصوری پر پڑے بلکہ بعد میں بھی متعدد روایات چینی مصوری کی ہماری مصوری میں رائج رہیں۔

مثلاً تیرتے ہوئے بادل یا "تائی"۔ پرندوں کی تصویر کا رواج۔ خصوصاً اڑتی ہوئی مرغابیاں، مرد عورتوں کی تصویروں کے خطوط میں ایک تموّج اور لہراؤ، منظر کشی میں دلچسپی خاص کر ویسے دھیمے رنگوں میں جیسے چین میں رائج تھی اور سب سے بڑھ کر خطوط میں پیچ و خم، موٹے پتلے ہونے کا وہ انداز جو خطاطی میں پایا جاتا ہے۔ اور جو چین کے اثر سے پہلے خود ہماری خطاطی کے زیر اثر، ایک حد تک موجود تھا۔ دراصل چین اور اسلامی ممالک میں مصوری اور خطاطی کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔ اس کی وجہ سے یہ رجحان دونوں جگہ مماثل اور مترادف پایا جاتا ہے۔

اس زمانے کا سب سے ممتاز کارنامہ غالباً فردوسی کے شاہنامے کی وہ تصویریں ہیں جو ۱۳۲۰ء کے قریب تبریز میں بنائی گئیں اور جو "شاہنامہ دی موت" کے نام سے مشہور ہے یعنی اس نسخے کے تیئیس صفحے جو موسیو دی موت کے مجموعہ میں ہیں اور باقی صفحات دنیا کے مختلف کتب خانوں میں۔ خاص کر امریکہ کے شہروں بوسٹن اور واشنگٹن میں۔ گو اس سے پہلے کی بھی بعض ایرانی تصاویر موجود ہیں (مثلاً چند مصور اوراق چھوٹی تقطیع کے شاہنامہ کے جو اب انڈیا آفس میں جسٹر بیٹی مجموعہ کے نام سے محفوظ ہیں) لیکن اس نسخہ کو یہ امتیازی شان حاصل ہے کہ اس میں پہلی بار ایرانی مصوری پختگی کی منزل پر ایک ترقی یافتہ شکل میں نظر آتی ہے۔
اس نسخہ کی تصاویر گو ایک گمنام مصور کا کام ہیں لیکن دنیا کے شاہکاروں میں گنی جاتی ہیں۔ ان کا انداز پرشکوہ ہے، اور ان کا موضوع بڑے بڑے جشن اور جلوس اور رزمیہ کارنامے اور ڈرامائی واقعات ہیں۔ پرزور قلم اور انوکھی پر اثر ترتیب اور گہرے رنگ' اس کا طرۂ امتیاز ہیں جس کے نتیجہ کے طور پر ان میں جوش و جذبہ کی کیفیت بہت شدید محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ موضوع کے لحاظ سے بھی یہ انداز شاہنامہ کے لئے عین مناسب ہے۔
اس زمانے کے دوسرے شاہکاروں میں وہ متعدد نسخے جامع التواریخ کے ہیں۔ جو اس علم دوست اور امیر مصنف نے خود اپنی کتاب کے تیار کروائے تھے۔ اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے موصوف نے دو چینی عالموں کو بھی بلایا تھا جو اپنے ساتھ بہت سی کتابیں اور تصویریں وغیرہ لائے تھے۔ جن کا اثر ضرور کتاب کی تدوین اور تیاری پر پڑا ہوگا ضمناً لائق ذکر ہے کہ اس کتاب کے ایک نسخہ میں جو آدھا رائل ایشیاٹک سوسائٹی اور آدھا ایڈنبرا یونیورسٹی کی ملکیت ہے پیغمبر اسلام کی پہلی معلوم تصاویر درج ہیں جو تعداد میں آٹھ ہیں۔

تیمور اور اس کے بعد :

اسلامی دنیا پر اس کے بعد جو انقلاب رونما ہوا وہ تیمور لنگ کے حملوں کا نتیجہ تھا۔ حالانکہ اس سے ناقابل بیان تباہی اور بربادی ہوئی۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ علوم و فنون کی فیاضانہ سرپرستی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ نہ صرف خود تیمور نے سمرقند میں اپنے زرق برق دربار میں منفرد شعرا، مصور اور علماء کا ایک گروہ جمع کر رکھا تھا۔ بلکہ اس کے اسلاف نے بھی ایران۔ ہندوستان اور ماوراء النہر میں اسی قسم کی سرپرستی روا رکھی۔ اور علوم و فنون کو فروغ دیا۔
سمرقند کے زمانے کے کوئی نسخے ہم تک نہیں پہنچے۔ لیکن شیراز کی صناعی کے نمونے موجود ہیں۔ جو دارالخلافہ سے دور ایک اور تمدنی مرکز تھا۔ ان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ایرانی مصوری کے بہت سے امتیازی خصائص یہاں کے مصوروں کی صنعت اور ایجاد کا نتیجہ ہیں۔ اور یہ گرانقدر روایات بن کر بعد میں تمام تیموری مصوری حتیٰ کہ مغل مصوری کا تار و پود بنے۔ تیمور کے چوتھے لڑکے شاہ رخ نے اپنا دارالخلافہ ہرات کو بنایا۔ اور اپنے گرد ستارگان ہنر و فن کو جمع کیا۔ جن میں خلیل مرزا تھا۔ اس استاد کا کام جب جہانگیر کے سامنے پیش کیا گیا۔ تو وہ اتنا متاثر ہوا کہ اپنی کتاب "تزک جہانگیری" میں اس پر بہزاد کا استاد ہونے کا گمان کیا ہے۔
منگول دبستان مصوری کے دلپسند موضوع اگر رزم اور پرشکوہ مناظر اور ڈرامائی کیفیات تھیں۔ تو تیموری دلستان کا موضوع بزم اور محفل عیش و نشاط یا حسن و عشق کی خلوتیں تھا۔ جن کتابوں کو مصور کیا جاتا تھا۔ وہ زیادہ تر مثنویات یا تصوف کی شاعری پر مشتمل تھیں۔ خاص کر نظامی۔ اور حافظ اور جامی۔ اس دور کے بڑے بڑے شاہکار یہ ہیں :-
خمسہ نظامی کا وہ مصور نسخہ جو موسیو لوئی کارٹیر کی ملک ہے گلستان سعدی کا وہ نسخہ جو انڈیا آفس لائبریری میں اور جسٹر بیٹی مجموعہ کا حصہ ہے۔
اس دبستان کی فنی خصوصیات میں آدمیوں کی تصویروں کا چھوٹا پن اور نقوش کی نفاست ہے۔ مناظر میں روائتی عناصر کا غلبہ مثلاً گول مول پہاڑ اور پانی کو دکھلانے کے لئے لکیروں کا ایک جال اور افق کا تصویر کے بالکل اوپر کے حصہ میں رکھنا وغیرہ۔ رنگوں میں زیادہ تنوع اور شوخی، لیکن پھر بھی پوری طرح ہم آہنگ اور آپس میں گھلے ہوئے ہیں۔ تصویروں کی فضا عموماً پرسکون ہے، برعکس منگول دور کی تصویروں کے۔ جن میں

ایک طرح کا ہیجان اور حرکت کا احساس ہوتا ہے۔

بہزاد کا انقلابی اسلوب :

تیموری مصوری کے دور میں ایک خاص جگہ اس دبستان کو حاصل ہے جو سلطان حسین بایقرہ اور اس کے عالم فاضل وزیر میر علی شیر نوائی نے ہرات میں قائم کیا۔ ان کے دربار سے منسلک سینکڑوں اہلِ فن اور ادیب ہنر تھے۔ جن میں کمال الدین بہزاد جیسا یگانۂ روزگار باکمال بھی شامل تھا۔ ہماری جوہرِ نگار مصوری میں بہزاد کو وہی درجہ حاصل ہے جو اٹلی کے مشہور مصور رافیئیل کو اپنے یہاں بلکہ اس سے بھی ارفع۔ دونوں ہمعصر تھے اور سولہویں صدی کے ربع اول میں دونوں نے انتقال کیا۔ لیکن بہزاد نے رافیئیل سے دوچند عمر پائی۔ اور رافیئیل سے کہیں زیادہ گہرا اثر اسلامی ممالک کی مصوری پر ڈالا۔ نہ صرف اس نے ان مصوروں کی نشوونما میں بڑا حصہ لیا۔ جو اس کی ہدایت کے مطابق ہرات کے شاہی کارخانہ میں کام کرتے تھے۔ اور بہت سے اس کے شاگرد تھے۔ بلکہ دیگر اسلامی ممالک کی مصوری پر بھی یوں اثر انداز ہوا کہ یہ باکمال شاگرد باہر جاکر استاد بنے۔ اور الگ الگ دبستانوں کے موجد ہوئے۔ جیسے میرک اور میر سید علی۔ اور مظفر علی۔ خود بہزاد کو انقلابِ زمانہ کے ساتھ ساتھ ہرات چھوڑنا پڑا۔ اور شاہان صفویہ کے دربار میں تبریز جانا پڑا۔ شاہ اسمٰعیل صفوی نے ۱۵۱۰ء میں ایران فتح کیا۔ اور آلِ تیمور کا دور ختم ہوا۔ اس عالم دوست بادشاہ نے تبریز کو اپنا دارالخلافہ بنایا اور بوڑھے بہزاد کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ وہاں کے بالکل مختلف حالات اور بدلے ہوئے مزاج اور نئے تقاضوں کی بنا پر خود بہزاد نے ایک نئے دبستانِ مصوری کی داغ بیل ڈالی۔ جو صفوی دبستانِ مصوری کے نام سے مشہور ہوا۔

سینکڑوں نسخہ جات اور مرقعات، بہزاد کے نام نامی سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں زیادہ تر اس کے بنائے ہوئے نہیں۔ ان چند میں سے جو قطعی طور پر اس کا عمل ہیں۔ ایک خاص چیز وہ نسخہ سعدی کی بوستان کا ہے۔ جو مصر کے شاہی کتب خانے میں محفوظ ہے اور وہ نسخہ خمسۂ نظامی کا جو برٹش میوزیم میں ہے۔ رنگوں میں زیادہ شوخ اور رنگوں کے باہمی امتزاج کے نئے حیران کن طریقے، بہزاد کے کام کا خاصہ ہیں لیکن فن کی ناقابل فراموش خدمت جو بہزاد نے کی۔ وہ یہ تھی۔ کہ انسانی تصاویر کی رقم طرازی میں نمایاں ترقی کی۔ اس کی تصویروں میں جسم کی حرکات و سکنات واضح طور پر نظر آتی ہیں۔ اور پہلے کی طرح ساکت و جامد نہیں۔ اسی طرح چہروں پر بھی الگ شخصیت کا اداکرنا اسی کا حصہ تھا۔ اور پہلے ہمارے مصوروں کو نہ آتا تھا۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہمارے مصوروں میں وہ پہلا شخص تھا جس نے تصویر کشی کو بڑھا کر کر دارکشی کا رتبہ دیا اور شبیہہ سازی کو ایک الگ فن بنایا۔ انسانی شبیہہ بنانے کا رواج پہلے بھی تھا لیکن، بہزاد پہلا مصور تھا جس نے پوری شباہت بنانی سکھائی۔ اور ساتھ ساتھ شخصیت اور کردار کو تصویر میں ادا کیا۔

رضا عباسی اور صفوی دبستان کا خاتمہ :

دبستان صفوی سولہویں صدی عیسوی میں پروان چڑھا۔ صدی کے اخیر میں روبہ تنزل ہوا ـــــ سترھویں صدی کے شروع میں پھر ترقی پذیر ہوا۔ اور اٹھارویں صدی کے شروع میں رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔ اس اسکول کا رکنِ اعظم میرک تھا۔ جو بہزاد کا شاگرد تھا۔ نیز سلطان محمد، جو شاہی کارخانۂ مصوری کا ناظم اور مہتمم تھا۔ شاہ طہماسپ کے زمانے میں بہزاد کے بعد انہیں دو استادوں نے صفوی دبستان کو فروغ دیا۔ اور طرح طرح کے نئے کمالات سے مزین کیا چنانچہ صفوی مصوری کی جو خصوصیات ہیں وہ انہیں کے موقلم کی رہینِ منت ہیں۔ فنی اسلوب میں صد درجہ لطافت اور نوک پلک کی درستی اور کیفیتِ تصویر میں تمام تر متمدن ذوق کی تسلی کا سامان، ایک گونہ تصنع لئے ہوئے ایک طرف تصوف کی طبیعت اور سرمست شاعری دوسری طرف اہلِ طریقت کے ذوقِ جمال اور آزادہ روی، کا اثر اس دبستان میں نمایاں ہے۔ چنانچہ ان تصویروں میں جو منظر دکھائی دیتے ہیں وہ ایسے ہیں جیسے خواب و خیال کی دنیا کہیں گل و بل، سبزہ و باغات کے ساتھ بزم نشاط ہے۔ کہیں آراستہ و پیراستہ امیر زادے اور نازک اندام شہزادیاں شیرینی کی زیادتی سے طبیعت مکدر ہونے لگتی ہے۔ اور آرائش اور صنعت کاری گراں گزرنے لگتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصور کی تخلیقی قوت اور حقیقت پر گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے۔ اور اختتام قریب ہے۔ اس دوران میں ایک عظیم مصور

پیدا ہوا یعنی رضا عباسی جس نے مصوری کی ڈوبتی ہوئی نبض میں نئی جان ڈالنے کی بڑی ہمت اور لیاقت سے کوشش کی۔ کچھ حد تک اس کی سعی مشکور ہوئی۔ لیکن انحطاط کی رو کو وہ نہ تھام سکا اور ۱۶۴۵ء میں اس کے انتقال کے ساتھ ایرانی مصوری کا ایک شاندار باب ختم ہو گیا۔ بعد کیا جو کچھ صفحے سیاہ ہوتے یا ہاتھ رنگے گئے، وہ تفریح یا تفنن تھا۔

مسلمانوں کی مصوری کی ماہیت

مسلمانوں کی مصوری کا بنیادی اسلوب، انداز ایران میں پختہ ہو چکا تھا۔ اس سے پیشتر کہ یہ دیگر بلادِ اسلامیہ میں پھیلتا۔ جیسے بخارا، قسطنطنیہ، لاہور اور دہلی۔ ان میں سے ہر ایک دبستان کا ارتقا اپنی جگہ ایک داستان ہے۔ لیکن جو کچھ اوپر بیان کیا ہے۔ وہ چند نتائج اخذ کرنے کے لئے کافی ہے اس مصوری کی ماہیت کے بارے میں۔

حقیقت نگاری یونان اور روما کے فن میں کمال کو پہنچی حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ یونانی مجسموں کے رگ پٹھے اتنے صحیح ہوتے ہیں کہ ان سے طب کی تعلیم میں مدد لی جا سکتی ہے۔ برعکس اس کے تجریدی فن (ABSTRACT ART) مسلمانوں کے ہاتھوں کمال کو پہنچا۔ یہ خصوصیت اس کی روح کا نتیجہ ہے۔ جس کے زیر اثر مسلمانوں نے اپنی توجہ زیادہ تر ایسے فن کو دی جو اصناف فن میں سب سے مجرد (ABSTRACT) ہے یعنی فن تعمیر۔ کہ اس میں خارجی دنیا کی اشکال کی مطلق نقل نہیں کی جاتی۔ اور فنکار کو آزادی ہے کہ جو شکل چاہے ایجاد کرے بشرطیکہ وہ زمین پر قائم ہو سکے۔ اس کے بعد موسیقی سے بھی مسلمانوں کو خاص شغف رہا ہے اور یہ بھی تجریدی فن ہے۔ کیونکہ اس میں ان آوازوں کی نقل بالکل نہیں کی جاتی۔ جو قدرت میں پائی جاتی ہیں۔ بلکہ قوتِ ایجاد کو مطلق آزادی ہوتی ہے بشرطیکہ تال اور سُر میں رہے۔ چنانچہ ہماری مصوری اور نقاشی میں بھی بڑی حد تک اشکال اوضاع لوطاً اقلیدسی ہیں۔ یا پھول پتیوں کو آزادانہ موڑ توڑ کر بنائی ہیں۔ یا شاذ و نادر انسان اور جانوروں کی شکلیں ہیں لیکن ضرور ہے۔ فنی بنا پر اس قدر مسخ شدہ کہ انہیں بارہا پہچاننا بھی دشوار ہوتا ہے قالین اور پارچہ جات، ظروف اور عمارتی آرائش جیسے منبت کاری اور کاشی کاری۔ ان سب میں وہی اقلیدسی شکلیں اور بیل بوٹے پائے جاتے ہیں۔ جو خارجی اشکال کے تجزیہ اور تصرف یا خالص تجرید کی انتہائی صورتیں ہیں۔ ہماری مصوری میں بھی یہی رجحان ذرا کم شدت سے موجود ہے۔ بمقابلہ ہمارے آرائشی فنون کے۔ بہرحال ہماری تصویروں میں بھی جو سب سے قابل توجہ خصوصیت ہے وہ تصویر کے خطوط کا باہمی ربط ضبط ہے۔ نہ کہ نفس مضمون۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ تصویر کے قطعات کی تقسیم اور الگ الگ رنگ کے قطعات کی باہمی وضع یا (PATTERN) خطوط اور قطعات کی تمام تر شکل بحیثیت مجرد بعض جگہ جدید نقاد نگاروں کی زبان میں (ARABESQUE) کہلاتی ہے۔ اور اس لفظ کا استعمال ہی غمازی کر رہا ہے۔ کہ حسن کی خصوصیت کی طرف اشارہ ہے۔ وہ مبصرین کی نظر میں عربوں یعنی مسلمانوں کے فن کا مابہ الامتیاز ہو گا۔ چنانچہ فرانس کا ایک مشہور نقاد ڈی تسبن لیزارڈ اپنی کتاب "فرانس کی مصوری ۱۹۰۵ تا ۱۹۵۰" میں اس "عربیسک" عنصر کے متعلق رقمطراز ہے:

"آج گیشیا (GISCHIA) جو خالص مصورانہ انداز کو پیش نظر رکھتا ہے۔ گو وہ تجریدی مصور نہیں ہے۔ اسی مسئلے کے حل میں لگا ہوا ہے جو میگنیلی (MAGNELLI) جیسے تجریدی مصور کو در پیش ہے۔ اس مسئلہ کو ڈی لاکرائے (DELACROIX) نے خوب سمجھا تھا۔ جب اس نے یادداشت (... ... HAN) کو لکھا تھا۔

"آہ وہ عجیب و غریب رنگ و خط کے تاثرات جو صرف چند صاحب نظر افراد ہی محسوس کرتے ہیں۔ تصویر کا وہ خالص نغماتی اور عربیسک عنصر جو تصویر کا حاصل ہے اور بعض کے لئے کچھ بھی نہیں۔"

گیشیا پچھلی کی تصویریں کھینچتے وقت اس کا چربہ اتارنے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس نے دلبستان فاو (FAUVES) اور دبستان مکعب (CUBISTS) سے اتنا تو سیکھ لیا ہے۔ چنانچہ اس کا کام ہر چند کہ تجریدی نہیں ہے۔ پھر بھی منظم قطعات میں منقسم ہے۔ کاغذ یا کپڑے کی حدود میں منضبط وہ خارجی اشیا کا عکس نہیں ہے بلکہ خود ایک شے ہے۔ ایسی ہی نادر اور قابلِ قدر جیسی منگینلی کی مجرد تصویر۔"

ہماری مصوری کا حسن بھی تب آشکار ہو گا۔ جب ان اشکال میں بذاتِ خود حسن تلاش کیا جائے۔ نہ کہ خارجی اشکال کی حسین تصویریں۔

گویہ بھی ہے۔ ان کی مصوری کا بنیادی نظریہ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تصویر ایک دو جہتی شے ہے۔ اور اس میں خارجی دنیا کی سہ جہتی اشیا کو از سر نو ڈھالنے اور ترتیب کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ فاصلہ، حجم اور وزن وغیرہ قابلِ اعتنا نہیں۔ جب قدرت کی اشکال کو خود ساختہ قاعدوں کے مطابق دوبارہ بنایا جاتا ہے تو دو جہتی صورت میں تبدیل کر دیا۔ تو دوسرا فنی مسئلہ یہ تھا کہ ان اشکال کو کس طرح تصویر کے مستطیل میں قائم کیا جائے کہ ایک مستحکم ہم آہنگی پیدا ہو۔ یہ اشکال کا جمالیاتی نظم و ضبط ہی وہ مسئلہ ہے جو جدید مصوروں کے پیش نظر تھا۔ اور جسے انہوں نے طرح طرح سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہماری مصوری میں اگر تصویر کے قطعات کی تقسیم پر نظر کی جائے۔ اور اس کے مضمون کو ایک طرف رکھ کر صرف ہموار بنایا جائے۔ تو معلوم ہوگا کہ خالص اور مجرد حسن کو کس خوبی سے انہوں نے اپنایا ہے۔ اور کیا کیا قطعاتی ترکیب وضع کی ہیں۔

پھر رنگ کے استعمال میں بھی یہ خوبی مطلوب ہے۔ نہ رنگوں کا اتار چڑھاؤ نہیں ہے نہ وہ تصویر کا ایک یکساں رنگ یا ماحول [illegible] جو مغربی مصوری میں پہلے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ بلکہ شوخ یا صاف ہموار رنگوں کے الگ الگ قطعات جو برابر [illegible] رکھے جاتے ہیں۔ کہ ایک رنگ دوسرے کو اجاگر کرے اور سب مل کر ایک مختلف الالوان مرقع حسن بنائیں۔ نہ دھوپ چھاؤں دکھائی جاتی ہے۔ نہ مناظر یا اشیا کی وہ تدریج تصغیر جو فاصلہ بڑھنے کے ساتھ مغربی تصویروں میں دکھائی جاتی ہے۔ ہر شے برابر روشنی میں ہے اور اپنی جگہ نمایاں اور اجاگر۔ یہ مصوری کا ایک نغماتی تصور ہے۔ بقول روسی نژاد جرمن مصور کین ڈنسکی (KANDINSKY) کے اس کی رو سے تصویر کے طول و عرض، رنگ و روغن کا سُر اور تال کی طرح امتزاج کیا جاتا ہے۔ ہر رنگ اور ہر خط اپنی اپنی جگہ نگ یا جواہرات کی طرح بٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

خطوط کا استعمال خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اگر تصویر کی قدر و قیمت اس تاثر اور کیفیت پر مبنی ہے۔ جو وہ پیدا کرتا ہے تو اس تاثر کے مرتب کرنے میں خاص مدد طرح طرح کے خطوط سے ملتی ہے جنہیں قدرت نے الگ الگ جزئیات ودیعت کئے ہیں۔ سیدھی لکیروں میں پائیداری۔ مدوّر خطوط میں آرام و سکون۔ دندانے دار لکیروں میں ہیجان و حرکت، وغیرہ وغیرہ اسی طرح رنگوں میں بھی قلب انسانی کے لئے الگ معنی پوشیدہ ہیں۔ اس کی وجہ خارجی اشیا کے رنگوں سے وہ رشتہ ہے۔ جو قرنوں کے مشاہدے نے ہمارے دل و دماغ میں بسا دیا ہے۔ اب مشرقی اقوام کی مصوری میں خطوط کا استعمال زیادہ ہے۔ اور مغربی میں رنگ کا اور نتیجہ کے طور پر اشیا کی سطح کی طرف توجہ۔ مشرقی مصوری میں خطوط کی وہ خاص جاذبیت جو اس کے موڑ توڑ، موٹا پتلا ہونے میں ہے۔ پوری طرح بروئے کار لائی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی مصوری میں البتہ چینی مصوری سے یہ فرق بتایا جاتا ہے۔ کہ آخر الذکر میں تمام تر زور خطوط پر ہے۔ لیکن مسلمانوں کی مصوری میں خطوط اور رنگ۔ دونوں کو پوری طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ آگے چلکر ضرور مغل مصوری میں خطوط کی ذاتی جاذبیت کی طرف کم توجہی ہونے لگی۔ جیسے جیسے حقیقت نگاری کا غلبہ ہوا۔ لیکن خالص رنگ کے حسن کو خوب خوب نکھارا۔ اور اس کے نادر مجموعے اور مرقعے ایجاد کئے۔

مسلمانوں کی مصوری میں خطوط کے حسن کی طرف توجہ ایک بدیہی امر تھا۔ کیونکہ ہمارے یہاں مصوری خطاطی کی ایک شاخ ہے۔ فن کتابت کو خاص احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ چونکہ وہ کلامِ الٰہی کو محفوظ رکھنے کا ایک ذریعہ تھا۔ چنانچہ کوئی فن جس میں خطاطی کا دخل ہو۔ وہ بھی اس نسبت سے لائق احترام ہو گیا۔ کتابوں کے نسخوں کی تیاری میں جب حاشیہ اور جدول کا رواج ہوا۔ تو پہلے تو بیل بوٹے اور پھر جانوروں اور انسانوں کی تصویریں بنائی جانے لگیں۔ حاشیہ سے آہستہ آہستہ یہ بیچ صفحہ پر آنے لگے۔ کبھی عبارت کے بیچ میں ایک آرائشی ٹکڑے کی شکل میں کبھی فقرے کے اختتام پر نقطے کی جگہ۔ یوں مصوری نے پہلے خطاطی کا ہاتھ بٹایا اور معاون سے رفتہ رفتہ مختار بن گئی۔ پورے پورے صفحے تصویروں کے لئے موقف ہونے لگے۔ اور بعد میں پوری کتابیں سرتاسر تصویر ہونے لگیں یعنی ایک طرح کی البم۔ اس ابتدائی رشتہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری مصوری میں خطاطی کا انداز باقی رہا۔ اور بیچ تصویر میں عبارت کا بے تکلف استعمال بتاتا ہے کہ دونوں کا رشتہ کتنا قریب ہے۔

پھر یہ رواج بھی خطوط کی اہمیت بڑھانے کے لئے کافی تھا۔ کہ ہمارے یہاں پہلے تصویر کا خاکہ تیار کیا جاتا تھا۔ اور بعد میں رنگ بھرے جاتے تھے۔ چنانچہ بعض نقادوں نے ان تصویروں کو رنگ کردہ ڈرائینگ سے موسوم کیا ہے۔ لیکن اگر اس سے غرض تحقیر ہے۔ تو بیجا ہے۔ اس لئے کہ اس نام رکھنے سے تو صرف یہ پتہ چلتا ہے۔ کہ ان تصویروں میں خطوط اور خاکہ کو بھی خاص طور پر مورد توجہ بنایا گیا ہے۔ اسی طرح ماتیس (MATISSE) کے کام کو روجر فرائی (ROGER FRY) نے (TAPESTRY) سے مشابہ بتایا۔ یعنی ایسے دیواروں پر لٹکانے کے پردے جن میں تصویریں بنی ہوئی ہوں۔ لیکن اس موازنہ سے (MATISSE) کے کام پر حرف نہیں آتا۔ بلکہ الٹا یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تصویروں میں نہایت واضح اور متین قطعاتی تقسیم اور DESIGN ہوتا ہے۔ اور دوسری طرف نہایت شوخ رنگ۔

پھر سر ٹامس آرنلڈ نے سچ کہا ہے کہ مسلمان مصوروں کی کردارکشی اور شبیہہ سازی میں جزئیات کا اظہار مطلق نہیں ہوتا۔ بلکہ چہرے نہایت سنجیدہ اور بے حس معلوم ہوتے ہیں حتیٰ کہ بڑے بڑے معرکوں کی تصویروں میں بھی۔ یا شدید رنج والم یا خوف و ہراس کے واقعات کی ادائیگی میں بھی چہرے بالکل خالی اور پر سکون ہوتے ہیں۔ یہ یقیناً ایک فنی کمزوری کہلائیگی۔ اگر اسے موجودہ مصوری کے معیار سے جانچا جائے۔ جو انسانی شبیہہ کو نفسیاتی تحلیل کی غرض سے پیش کرتی ہے۔ نہ کہ بہ حیثیت رنگ و خطوط کے ایک حسین مرقع کے۔ لیکن کیا ہم اس بنا پر سیزآن (CEZANNE) کی کسی شبیہہ کو برا کہتے ہیں۔ حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ ان میں کردارکشی بہت کمزور بلکہ مفقود رہے۔ خواہ اور کوئی خوبی سیزآن (CEZANNE) میں ہو یا نہ ہو۔ اس اعتبار سے تو اس کی تصویروں میں انسانی شکلیں اتنی ہی خالی خالی اور بے حس و حرکت ہیں جتنی ہماری خورد نگار مصوروں کی۔ لیکن اس سلسلہ میں یونانی مصوروں (مجسمہ سازوں) کا لائحہ عمل قابل غور ہے۔ پہلے تو وہ حرکت کی حالت میں جسم کو دکھاتے ہی کم تھے۔ اور اگر دکھاتے تھے تو ایسے لمحے میں جبکہ مکمل توازن ہو۔ جیسے مشہور مجسمہ (DISCUS THROWER) میں۔ دوسرے سکون اور توازن کو فنی موضوعات میں ضروری سمجھنے کے ساتھ ساتھ وہ جزئیات کے اظہار کو بھی تصویر یا مجسمے میں مناسب سمجھتے تھے۔ جیساکہ ورڈزورتھ (WORDSWORTH) نے ایک یونانی کی زبان سے کہلوایا ہے:

"دیوتا روح کی گہرائی کی قدر کرتے ہیں۔ نہ کہ اس کے ہیجان کی۔"

مختصر یہ کہ جو رومانیہ کے مشہور جدید مجسمہ ساز برنکوسی (BRANCUSI) نے اپنے کام کے لئے کہا ہے وہ مسلمان خود نگار مصور بھی اپنے کام کے لئے کہہ سکتے ہیں:

"ہمارے کام میں چھپے ہوئے معنی تلاش نہ کرو۔ ہم تو خالص سرور پیش کرتے ہیں۔ ان کو نظر جما کر دیکھو۔ حتیٰ کہ کچھ دکھائی نہ دے۔ انہوں نے جلوۂ الٰہی کی جھلک دیکھ لی ہے۔ جنہوں نے انہیں دیکھا ہے۔"

یوں تو شیشے کے باسنوں کی وجہ سے مشہور رہے مگر مجھے یہاں مٹی کے ظروف بھی بڑے اچھے اچھے دکھائی دیئے۔ ڈنمارک تو خیر نفیس گلی ظروف کے لئے دور دور مشہور ہے مگر یہ شہرت کچھ یہیں کے حساب سے ہے۔ ہمارے ہاں کی چیزیں اس سے کہیں زیادہ اتم ہیں، کیا بناوٹ میں اور کیا رنگ روپ اور جھلک داری میں مثلاً میں اپنے بچپن کے زمانہ کا ذکر کرتی ہوں کلکتہ کے پاس مادھوپور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے میں وہاں سے کھلونے لیا کرتی تھی۔ ڈنمارک کے کھلونے اس گاؤں تک کے کھلونوں کی آب کو نہیں پہنچتے۔

اس وقت بھی پاکستان میں بہاول پور اور ہالا ظروف سازی کے مرکز ہیں۔ اور ہندوستان سے ہزاروں ہی کاریگر اب پاکستان آ چکے ہیں۔ ان سب کی مشترکہ کوشش سے ان ہنروں کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔ بہاول پور کے برتنوں کی نفاست و نزاکت اور خوش وضعی کو تو خیر دنیا کی کوئی سفال گری بھی نہیں پہنچ سکتی۔ ہالا کے برتنوں کی بناوٹ اور رنگ کاری اپنی جگہ ایک علیحدہ ہی خوبصورتی ہے اور بنانے والوں کی نفاست طبع کا نمونہ۔ فنلینڈ کے برتن بھی میں نے دیکھے جہاں کاریگروں کو بڑی سہولتیں میسر ہیں۔ وہ بھی بس ہالا کے برتنوں کے معیار تک ہیں۔ اس سے بڑھے ہوئے بالکل نہیں ہیں۔

ان باتوں پر جب نظر ڈالی جائے تو یہ دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے کہ ان پرانے اور کارآمد ہنروں کو غارت ہونے دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ ہمیں ان سے محبت ہونی چاہیئے اور ان کی قدر ہونی چاہیئے۔ ہم تو صرف وہ لوگ ہیں کہ ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کی اپنی ایک قدر و قیمت ہوتی ہے۔ ہاتھ کا عمل ایک تخلیقی عمل ہے۔ صناعی ہے، مشین نہیں۔ ہاتھ کے عمل سے جو نمونہ، یا بقول کاریگروں کے "پرزہ" نکلتا ہے وہ ہماری نگاہوں کے لئے آسودگی کا باعث ہوتا ہے۔ مشین چونکہ بے روح ہے اس لئے اس کی بنائی ہوئی چیزوں کی اقتصادی اہمیت بیشک ہے مگر جمالیاتی ذوق کی تسکین کا سامان اس سے میسر نہیں آتا اور یہ کہنا بڑا مشکل ہے کہ انسانی حیات میں جمالیاتی ذوق و آراستگی کا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔

ہمارے ہاں کاریگر نسلوں سے ۔۔ صدیوں سے ۔۔ یہ کام کرتے چلے آتے ہیں ان کے ہنر ضائع نہیں ہونے چاہئیں۔ ہمارا ملک ویسے بھی بہت وسیع ہے۔ آبادیاں طرح طرح سے پھیلی ہوئی ہیں۔ بہت ہی گھنی آبادیاں۔ ہمارے ہاں کبھی بھی نئے کارخانوں کی ریل پیل نہیں ہو سکے گی۔ یوں ملک بنیادی طور پر زرعی بھی ہے۔ اس لئے بڑی ضرورت ہے کہ دیہات اور عوام کی بہبود کا نقطۂ نظر زیادہ سامنے رکھا جائے اور ان گھریلو دستکاریوں کو فروغ دیا جائے۔ میرا مدعا صرف سفال گری سے ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی کئی ہنر ہیں۔ کشیدہ کاری ہیں "کار چوب"، "کامدانی" اور "چکن" کے کام خاص طور پر ہمت افزائی کے مستحق نظر آتے ہیں۔

چونکہ ان میں سے بعض ہنر اپنی نفاست کاری اور دیدہ ریزی کے کارن بڑے مہنگے پڑتے ہیں اس لئے لوگ یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ یہ سامان تو امیروں کے چونچلے ہیں۔ مگر غور کیجئے یہ ہنر تو عوامی ہیں ان چیزوں کو بنانے والے عوام ہیں۔ ان کے کتنے کنبے پلتے ہیں، ان چیزوں کے سہارے کتنے ہی ذیلی کام پرورش پاتے ہیں، اور اگر چلن عام ہو جائے۔ جیسے کبھی تھا، تو پھر مہنگے بھی نہیں رہتے، عوام اور خواص دونوں ہی اپنے مقدور بھر ان کو برتتے تھے اور اپنا چاؤ پورا کرتے تھے۔ مگر ہم نے ان کاریگروں کو تباہی کے دروازے پر پہنچا دیا۔ انہیں اب کاموں کی صرف معمولی مزدوری ملتی ہے، قدر دان ختم ہو گئے۔ اگر قبول عام بڑھے تو ان کا خرچ کاٹ چھانٹ کر گوارا حد تک کم ہو سکتا ہے اور غیر ملکی گراں قیمت چیزوں کو خریدتے وقت تو ہمیں یہ احساس تعیش کا آتا ہی نہیں! ایک چیز اور بھی ہے۔ ان چیزوں کی غیر ملکوں میں کافی مانگ ہے۔ ان سے ہم کافی زرِ مبادلہ بھی کما سکتے ہیں۔

بعض ادارے مثلاً اپوا اس سلسلے میں واقعی بڑا اچھا کام کر رہے ہیں۔ اپوا نے خواتین کے بنائے ہوئے ہاتھ کے کام کے نمونے جمع کئے ہیں، انہیں اپنی نمائش گاہوں پر لا کر بکری کے لئے رکھا ہے۔ اس طرح کم استطاعت ہنرمند خواتین کی ہمت افزائی ہو رہی ہے اور یہ ہنر بھی ختم ہونے سے بچ گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اپوا نے "بیدری" کا کام بنانے والے کاریگروں کی خدمات حاصل کر لی ہیں اور اب ان کی نمائش گاہ کے بیدری کام کی چیزیں بھی دستیاب ہو سکتی ہیں۔ ہالا کے برتن بھی ملتے ہیں۔

مگر میرا خاص روئے سخن زیادہ تر اس طرف ہے کہ ان مٹی کے برتنوں کو بھی پوچھئے۔ مٹی کے عام برتن، کورے کورے سوندھے سوندھے۔ یہ بھلے بھلے کھلونے۔ ان کی اپنی ایک قدر ہے۔ انہیں غیر ملکی بھی شوق سے خریدیں گے اور ہم پھر ان کی قدر پہچاننے لگیں گے۔ یہ بچارے مٹی کے برتن، ہماری اپنی دھرتی کے سینے کی مہک کے یہ معصوم معصوم نمونے شاید پھر ان گھروں تک بار پا لیں جنہیں عرف عام میں "فیشن ایبل" کہہ دیا جاتا ہے۔ شاید کوئی باذوق اس کام کا بیڑا اٹھائے کہ نئے وضع کے کمہاروں سے مٹی کے عام سادہ برتنوں کو بنوائے اور ہمارے شہروں میں پھر یہ چیزیں دیکھنے میں آنے لگیں۔ مگر شرط یہی ہے کہ یہ چیزیں واقعی دیکھنے دکھانے کے قابل ہوں:

نقوش صحرا

ابوالجلال ندوی

عرب کے صحرائی : عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ عرب کے صحرائی اسلام سے پیشتر محض صحرائی تھے۔ ان میں کسی حد تک بھی شائستگی نہ تھی۔ نرے "زبدھ" تھے، علوم و فنون تو خیر لکھنے پڑھنے سے بھی عاجز تھے۔ جہاں تک صحرائی علوم کا تعلق ہے، اس پر عربی لغت کا غایر مطالعہ روشنی ڈال سکتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ فن تحریر سے عرب کے صحرائی کس قدر شغف رکھتے تھے۔

صحرائے عرب کے خیمہ بر دوشوں کا کسی اور ملک کے خانہ بدوشوں پر قیاس نہیں کرنا چاہیئے۔ اس صحرا کے پورب دوآبہ دجلہ و فرات میں نامعلوم زمانے سے خورس کے زمانے تک سومیریوں، پھر سامیوں نے ایک عالیشان تمدن قائم کر رکھا تھا، شمال میں فنیقیوں اور دیگر فلسطینی اقوام نے یونان و روما کے برسر عروج آنے تک عالیشان تہذیبیں قائم کر رکھی تھیں، مغرب میں مصر واقع تھا۔ جس کی قدیم تہذیب کی بابت کافی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ پاکستان اور بھارت کی قدیم سمجھنا (تہذیب) ابھی حال تک محض "داستان امیر حمزہ" تھی لیکن وادیٔ سندھ نے اپنا سینہ چیر کر ایک نہایت قدیم اور نہایت قابل فخر شائستگی کی شہادتیں دکھادی ہیں اور ابھی مزید شہادتوں کی توقع کی جاسکتی ہے کیونکہ القت ما فیہا وتخلت کا زمانہ ابھی نہیں آیا ہے۔ جب زمین اپنے اندر کی چیزیں نکال کر خالی ہو جائے گی۔ ایک ایسا ملک جو ان ممالک کے درمیان ہو اور جہاں کے باشندے جہاں گردی پر قدرۃً مجبور ہوں، وہاں کے لوگ محض بے تمدن صحرائی نہیں ہو سکتے۔ ملک عرب میں آثار کاوی کی جائے تو ہماری معلومات میں بڑا اضافہ ہوگا۔ ہم اگر عرب کے صحراؤں میں سیر کریں تو شاید آج بھی ان آثار قدیمہ کے سراغ مل جائیں گے جن کی طرف قرآن مجید نے بار بار توجہ دلائی ہے اور یہ آثار ثابت کردیں گے کہ یہ صحرا کسی زمانے میں ایک ہرا بھرا دیس تھا، پے در پے قدرتی انقلابات نے اس کو ریگزار بنا دیا ہے۔ یہ ریگزار آپ کے سامنے ایسی شہادتیں بھی پیش کردے گا جو ثابت کردیں گی کہ ان صحرازادوں کے اسلاف کو فن تحریر سے اتنا شغف تھا جس کا تصور بھی سردست محال نظر آتا ہے۔

صحرائی خیمے : فن تحریر سے متعلق عربی الفاظ کو لغت کی کتابوں اور ایام جاہلیت کے اشعار میں تلاش کرکے جمع کیا جائے تو آپ کو حیرت ہوگی کہ بقول فردوسی "شیر شتر اور سوسمار" کھانے والے، ریتوں پر چلنے والے یہ کیڑے، ایک زمانے میں کس قدر شائستہ اور صاحب علم رہے ہوں گے۔ غالباً دنیا کے ہر گوشے میں آپ دیکھیں گے کہ چھوٹے چھوٹے لڑکے خاک پر بیٹھے طرح طرح کے گھروندے بنایا کرتے ہیں۔ عرب کے بچے بھی ایسا کرتے تھے۔ ریتوں میں گھروں کے خاکے کھینچا کرتے تھے۔ ایسا کھیل کھیلنے والے کو مفائل کہا جاتا تھا۔ ہمارے اپنے دیس کے لڑکے اپنے گھروں جیسے نقش بناتے ہیں۔ عرب کا مفائل اپنے گھروں یا خیموں جیسے نقوش بناتا تھا۔ عرب کے خیمے یا گھر جیسے ہوتے تھے اس کا اندازہ ایک عربی شعر سے ہوتا ہے۔ شاعر کا نام یاد نہیں، شعر غالباً "لسان العرب" میں دیکھا ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎

کان منہ الارسم الرواسما　　　کافاً و میمین و سینا طاسما

اس کے خیموں کے نشان گویا ایک کاف دو میم اور ایک مٹی ہوئی سین تھے

اس شعر سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب کا مفائل اپنی ریتوں پر کس طرح کے گھروندے بناتا ہوگا۔ سبائی رسم خط کے مطابق اس کا گھروندا ایسا ᑎ B B ᕱ ہوتا ہوگا معلوم ہوتا ہے کہ عرب کے خیمے بذات خود ایک طرح کی تحریر ہوتے تھے۔ بنو لوط میں سے ایک گروہ کا نام مواب تھا۔ جس کو "کموس کی قوم" بھی کہا جاتا تھا۔ (بائبل: عدد ۲۱ : ۲۹) کیونکہ اس کے دیوتا کا نام کموس تھا۔ مقول بالا شعر کے مطابق جو تحریر پیش کی گئی ہے اسے کمّس پڑھا جا سکتا ہے۔ ان خیموں والا قبیلہ بنو مواب جیسی کسی قوم کی نسل سے ہوگا۔ اس لئے اس کے خیمے اس شکل کے ہوتے تھے۔ خیمے کیا تھے، خود اس قبیلہ یا اس کے قدیم مورثوں کے معبود کا نام تھے۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے ؎

وَدِمْنَةَ هَيَّجَتْ شَوْقِي مَعَالِمُهَا　　　كَأَنَّهَا بِالْهِدَ مَلَاتِ الرَّوَاسِيم

اُجڑے پڑاؤ کے نشانوں نے میرے شوق کو اُبھارا، وہ نشانات گویا ھدملات کے رواسیم تھے

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عربی صحرانوردوں کے خیمے ایک طرح کی تحریریں ہوتے تھے۔ کوفہ اور بصرہ کے پچھم جو مستطیل ریگزار ہے اور جو نفود کو ربع خالی سے ملاتا ہے۔

ان نقوش کو BENT نے سنقوطرہ وغیرہ مقامات کے اونٹوں سے نقل کیا ہے :۔

ꙅ ||| || Y ⊃ ∩))) U ㅠ ⋀ ⋉ ዩ ዩ ዩ ዩ

ꓘ J T m Y

ان کو CHARLES M. DAUGHTY نے شمالی عرب خصوصاً جبل شمر کے اونٹوں پر منقوش دیکھا۔ ان نقوش پر ہم ابرہیم رفعت پاشا کی مرآۃ الحرمین سے حسب ذیل نقوش کا اضافہ کرسکتے ہیں :۔

⌓ ⫛ ⊓ |H ≏

مسز بنٹ نے اپنے شوہر کے سفرنامہ میں لکھا ہے " سنقوطرہ وغیرہ کے اونٹوں سے ان سمات کو نقل کرتے وقت ایسا جان پڑتا ہے جیسے کوئی شخص سبائی ابجد مشق کر رہا ہے " یہ نقوش جن کو یہاں نقل کیا گیا ہے سب کے سب مغربی ایشیا کی کسی نہ کسی ابجدی نوشتے میں ملیں گے مگر یکجا نہیں بلکہ منتشر طور پر۔

چند سماتی نوشتے : عربی سمات محض لایعنی نقوش نہیں ہیں بعض بعض اونٹ تو ایام قدیم کے چلتے پھرتے مواعظ حسنہ کی نوعیت رکھتے ہیں۔ عربی قبائل ان کو مطلب سمجھے بغیر اپنے روایتی نقوش اپنے اونٹوں پر داغتے رہتے ہیں۔ CHARLES M. DAUGHTY نے جبل شمر یعنی ہمارے روایتی اجا و سلمیٰ کے پاس یا بالفاظ دیگر مشہور حاتم طائی کے علاقے میں چار اونٹوں پر حسب ذیل نقوش دیکھے :۔

۱۔ ((||

۲۔ ∩| ||| ⊃|

۳۔ Y ዩ' ||ዩ ዩ ሦ | ዩ

۴۔ m () ||| T ꓘ|| J ى ⫛

ان نقوش کو دیکھکر ہر ایک یہ بیان کرسکتا ہے کہ یہ چاروں نقش چار عبارتیں ہیں۔ پہلے اور دوسرے نوشتے کی تشریح زیادہ سود مند نہ ہوگی۔ تیسرے اور چوتھے نوشتے کو سمجھنا ضروری معلوم ہوتا ہے، امید ہے کہ اگر یہ تحریر کسی پڑھے لکھے عرب تک پہنچ جائے تو اسے اپنے سمات کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ روز بروز ادسنے خطوط منقوم اونٹ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے نابود ہونے سے پیشتر اگر سمات نقل کر لئے جائیں تو بہتر ہوگا۔ چونکہ مسز بنٹ نے ٹھیک لکھا ہے کہ سمات ایک نقوش ایسے دیتے ہیں سبائی ابجد مشق کرنے کا گمان ہوتا ہے۔ اس لئے ان نوشتوں کو سبائی رسم خط کی مدد سے پڑھئے :۔

Y ዩ' || ዩ ዩ ሦ | ዩ

ی ع ی ا ء ؟ ح ء ی

قرآن پاک میں ہے کہ عزیز مصر کی بی بی نے حضرت یوسف پر ڈورے ڈالنے کی غرض سے کہا تھا : ھَیْتَ لَکَ۔ مفسرین اور ائمہ لغت نے اس فقرہ کی تشریح میں عجیب عجیب باتیں لکھی ہیں۔ یہ فقرہ عبرانی فقرہ : ھَیْتی لَکْ کا عربی روپ ہے۔ اس کے معنی ہیں " میں تیری ہوں " ھَیَہ یھی عبرانی میں وہی مطلب دیتا ہے جو عربی میں کان یکون کا مطلب ہے۔ توراۃ میں ہے کہ :

وَیُّومِرْ اِلُوھِیم یِھِی اَوْرْ وَیِھِی اُوْرْ خدا نے کہا اجالا ہو، اجالا ہو گیا۔

عربی اور عبرانی خصوصاً عدنانی عربی اور اسرائیلی عبرانی ہم نسل زبانیں ہیں۔ کبھی عربی میں ھَیَہ یِھی کا استعمال ہوتا تھا۔ ھَیَ کے وہی معنی ہیں جس کو ہم اردو میں " ہے " بول کر ادا کرتے ہیں۔

آیٔ جمع ہے آیۃ کی۔ قرآن میں ہے : ان فی ذلک لاٰیٰت لاولی الالباب یعنی اس میں خردمندوں کے لئے سوچنے کی باتیں ہیں۔ آیٔ کے معنے = غور طلب امور۔

ዩ کو ہم اِقلید، مقلاد۔ یا مفتاح پڑھ سکتے ہیں۔ یہ ایک تشکیلی لفظ ہے۔

"حیّ" کا لفظ اب متروک ہے لیکن ایک عربی مقولہ مروج ہے: فلان لا یعرف الحیّ من اللیّ۔ یعنی فلاں شخص کو حق و باطل کی تمیز نہیں۔ "حیّ" کا مطلب ہے حق۔ اس ساتویں نوشتے کا ترجمہ ہوگا:-

غور علامت امورِ حق شناسی کی کلید ہیں۔

جس قبیلے کے اونٹ پر یہ نصیحت منقوش ہے اس کا موجودہ نام شرارۃ ہے۔ یہ نام تو قوم کی آتش مزاجی بتاتا ہے مگر اس کے مورث کی نصیحت یہ تھی کہ انسان [illegible] غور و ذہانت سے کام لیا کرے جس سے حق لیا جاتا ہے اور باطل لیا جاتا ہے، پھر حق کو پہنچے۔

ṃ ς T II)-(T III ı) m

ت ر ۂ ی ا ۂ ذ ا ع ت خ س

سری بالإرۃ ذا بُیْنٍ الحُسْنِ

لانی ہے ذہانت جانچنا ٹھیک کو پانے والا فکر کے

ان دونوں نوشتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عربوں کے اونٹ زمانہ قدیم کی چلتی پھرتی تختیاں تھیں۔ بہت ممکن ہے کہ ہم کو عرب کے اونٹوں پر چلتی پھرتی قدیم تاریخ عرب کی [illegible] دستیاب ہوجائے۔

اس موقع پر ایک اہم بات عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عراق میں ایک بادشاہ گذرا ہے سرجون الاکادی۔ اس کا زمانہ ۲۸ ویں صدی قبل مسیح تھا۔ ایک میخی نوشتہ (CUNEIFORM WRITING) کے مطابق اس نے سنہ ۲۵۰۰ ق م کے آس پاس ماتن عرب شمسی (سرزمین مغرب الشمس) کو جو تمام سیت شمسی [illegible] اور تمام عرب شمسی (مغرب الشمس) کے درمیان واقع ہے یعنی جنوبی عرب کو فتح کیا تھا۔ اس نوشتے کے ایک فقرہ کا ترجمہ یورپ والوں نے یوں کیا ہے [illegible] اور اس نے اسے ایک [illegible] لیکن یہ ترجمہ غلط ہے۔ پرانے زمانے والے مولانا روم کے بیان کے مطابق جب حقیقت نہیں سمجھتے تھے تو افسانے گھڑ لیتے تھے۔ ہمارے زمانے کے اہل علم، خصوصاً مغربی علماء جب بات نہیں سمجھتے تو بات بنایا کرتے ہیں۔ وہ فقرہ حسب ذیل ہے:-

پی دُو عل اسطین اُدکن

منہ اس کا اوپر اونٹ کے اوکن کے

منہ سے مراد منہ کی بات۔ سرجون نے اوکن نام کے مقام یا مدینہ کے اونٹوں پر اپنے فرامین منقوش کئے تھے۔ اگر ہم عربی اونٹوں کے سمات کو پوری تن دہی اور توجہ سے جمع کریں تو ممکن ہے کہ ایام قدیم کے بینے ہوئے شاہی فرامین اور دستاویزیں بھی مل جائیں۔

قرآن کے مقطعات: قرآن مجید کی ۲۹ سورتوں کا آغاز چند اکیلے حروف سے ہوتا ہے۔ بعض لوگ ان کو ایسے اسرار و رموز قرار دیتے ہیں جن کے مطالب خدا ہی کو معلوم ہیں لیکن یہ اکیلے حروف جن کو مقطعات کہا جاتا ہے قرآن کی آیتیں ہیں۔ اگر یہ نقوش ناقابل فہم ہوتے یا ان کا سمجھنا دشوار ہوتا تو مومن حضور صلعم سے ان کے مطلب پوچھتے اور کفار قرآن پر مہمل گوئی کا الزام لگاتے۔ لیکن نہ تو کسی مومن نے ان مقطعات کے مطلب پوچھے اور نہ کافروں نے ان پر کوئی اعتراض کیا۔ مقطعات درحقیقت معانی رکھتے تھے جن کے مطالب اس زمانے کے عرب اسی طرح سمجھتے تھے جس طرح ہم معمولی عربی جملوں کے مطلب سمجھتے ہیں۔ ایک مقدمہ طلب مسئلہ ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر اس کی توضیح کردی جائے۔ قبل اس کے ایک آیت کا ترجمہ غور سے پڑھ لیجئے:-

حا میم ۔ عین سین قاف ۔ ۔ ــــــــ یوں ہی وحی فرماتا ہے تیری طرف نیز ان کی
طرف جو تجھ سے پہلے گذرے۔ وہ اللہ جو غلبہ رکھنے والا حکیم ہے (شوریٰ ۱:۱، ۳)

اس سے معلوم ہوا کہ مقطعات کے ذریعہ بعض حقائق کا الہام دوسرے پیغمبروں پر بھی ہوا ہے۔ اسی سورت کی آخری آیتوں میں خدا نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

اور کسی بھی انسان کا یہ رتبہ نہیں کہ اللہ اس سے باتیں کرے مگر (۱) وحی کے طور پر (۲) یا پس پردہ
سے (۳) یا کسی فرشتہ کو بھیجے اور وہ (فرستادہ) اس (خدا) کے حکم سے جو بھی اس (خدا) نے چاہا
اس (انسان) کو بتا دے۔ بیشک وہ بلند رتبہ ہے حکیم ہے (شوریٰ ۵:۸)

اس سے وحی کے تین طریقے ظاہر ہوئے : پس پردہ سے کلام کی صورت حضرت موسیٰ کلیم اللہ سے متعلق آیتوں سے ظاہر ہے۔ موسیٰ نے خدا کو نہیں دیکھا لیکن کلام سنا اور ان سے باتیں کیں۔ فرستادہ بھیجنے کی صورت سورۂ علق کی ابتدائی شان نزول سے واضح ہے۔ ایک فرشتہ سامنے آیا اور اس نے قرآن کی آیتیں سنائیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ وہ تیسرا طریقہ کیا ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے۔ حضرت موسیٰ کے متعلق خدا نے فرمایا۔ کتبنا لہٗ فی الالواح ۔ ہم نے اس کے لئے تختیوں پر لکھ دیا۔ حضرت داؤد کے متعلق فرمایا۔ وآتینا داؤد زبورا ۔ ہم نے داود کو ایک زبور (نوشتہ) عطا کیا۔ بائبل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض انبیاء کو الہامی نوشتے دکھائی دیئے۔ رسول اللہ صلعم کو بھی اللہ نے اس طریقۂ وحی سے نوازا۔ آپ ان دنوں رائج رسم خط سے واقف نہیں تھے لیکن ان نقوش کو تو آپ نے بھی پڑھا ہوگا۔ عربی سماتی اہل سے آپ بخوبی واقف تھے۔ اس قدر تمہید کے بعد اب ہم طٰسٓمٓ پر غور کریں گے۔

عربی سماتی میں سے ایک کا نام تو ثاء ہے۔ او ثاء اللہ کا مطلب ہے خدا اسے ہلاک کرے۔ اس سمت کی صورت کانٹے دار ہوتی لاٹھیوں یا تلواروں کی سی ہوتی تھی X۔ عبرانی زبان میں اس نقش کا نام تاو ہے کیونکہ سامی اسکرپٹوں کی یہ شکل ہے۔ یہی نقش انگریزی کا T اور X ہے۔ یہ حرف عربی حرف (ت) کی بدلی صورت ہے۔ براہمی رسم خط میں یہ ت کے حروف آواز ہے۔ سامی مطلب اس نقش کا قتل کرنا یا ہلاک کرنا اور لڑائی ہے۔ ایک سامی نقش ○ ایسا ہے۔ اس کے سامی معنوں میں تحجیر ہے جس کے معنی ہیں حجر تو پھر دینا۔ ھذا الخائر وحر ۔ حجر ۔ یہ چوپا یہ پر کھیت رام ہیں۔ ایک تیسرا سامی نقش ⊗ ایسا ہے۔ اس کے معنی ہیں الاتواء حجر یعنی ہلاک کرنا حرام ہے۔ توراۃ میں مذکور ہے قابیل نے جب اپنے بھائی ھابیل کو قتل کیا تو خدا نے اسے جلا وطنی کی سزا دی اور اس کے بدن پر ایک علامت (نشان) لگا دیا "تاکہ جو کوئی اسے دیکھے ہلاک نہ کر دے" (بائبل: تکوین ۴ : ۱۵) اس نقش کا مطلب جس کا ذکر توراۃ نے کیا ہے بعینہ وہ تھا جو ⊗ کا مطلب ہے۔ یہ نقش فنیقی یعنی عبرانی رسم خط میں حطی کا حرف دوم ہے جس کا عربی نام طا ہے۔ سین جنوبی عرب کی عربی میں چاند کو کہتے ہیں۔ یہی لفظ سابین کر قرآنی عربی میں چمک اور روشنی کے معنی دیتا ہے۔ سین کی سبائی شکلوں میں سے ایک ہلال (جیسی ہے۔ اس نقش کا سامی مطلب چاند اور روشنی ہے۔ میم کی مختلف شکلوں میں سے ایک برستے ہوئے پانی کی دھار ﻌ جیسی ہے۔ اس کے معنی ہیں پانی اور برسنا۔ اب اس طٰا سین میم کے معنی سمجھئے ۔

ﻌ	(	⊗
میم	سین	طا
برسنے کو ہے	روشنی	گلا گھونٹنا حرام ہے

اب اس مطلب کو سمجھنے کے بعد سورۂ شعراء کی ابتدائی آیتوں کا ترجمہ پڑھیئے :-

> طا۔ سین۔ میم ۔۔ یہ ہیں واضح نوشتے کی آیتیں (مگر) تم تو شاید اپنا گلا گھونٹ لیں گے اسلئے کہ لوگ ایمان نہیں لا رہے ہیں۔ ہم چاہیں گے تو آسمان سے ان پر ایسی آیت اتار دیں گے جس کے لئے ان کی گردنیں جھک جائیں گی۔ اور یہ تو ہمیشہ ہوا ہے کہ لوگوں کے پاس جب بھی کوئی نئی نصیحت آئی تو لوگ اس سے منہ موڑنے لگے۔ چنانچہ ان لوگوں نے بھی جھٹلایا۔ سو اب اُن کے پاس اس کی خبریں آنے ہی کو ہیں جس کا یہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں۔

دیکھئے اس مقطعہ کے سامی مطلب کو اس کے بعد کی آیتوں سے کس قدر مناسبت ہے۔ اسی طرح اور مقطعات کی بھی تشریح کی جا سکتی ہے لیکن ہمارا مقصد اس وقت تفسیر قرآن نہیں ہے۔ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ عربی اونٹوں پر نشانات لایعنی نہیں۔ ابجدی یا غیر ابجدی طرز تحریر میں عہد قدیم کی صحیفیں خبریں اور علمیں نقوش ہیں۔ یہ نقوش صحرا اب تو شاید عملی طور پر لایعنی بن گئے ہیں لیکن اگر ان کو جمع کیا جائے تو شاید ہم عرب قبل اسلام کی بھولی بسری تاریخ کے بعض اہم حقائق معلوم کر سکیں گے۔ عرب کے لوگ بتوں، اونٹوں، مکانوں، پہاڑوں، چٹانوں اور مختلف اشیاء پر طرح طرح کی تحریریں لکھنے کے عادی تھے۔ یورپین سیاحوں نے ہمارے لئے متعدد عربی نوشتے عہد قدیم کے حاصل کر دیئے ہیں۔ دیار عرب میں ابھی بہت سے قدیم نوشتے دبے پڑے ہیں جن کو حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ قدما میں سے

ما دخلوا قریۃ الا رقوا لتبوا ۔۔۔ بھا لتا با قلم یدرس ولم یبد

جس بستی میں بھی داخل ہوئے وہاں انہوں نے یک نہ ایک نوشتہ لکھا جو مٹ نہیں گیا، نابود نہیں ہو گیا ۔۔۔ یہ ہے ہارون و مامون کے معاصر شاعر دعبل خزاعی کا اعلان جس کی صداقت کو آزمانا ابھی باقی ہے ۔

الف لیلیٰ کا آخری ورق

صہبا اختر

بہ موجِ رقص دھنک کی طرح ابھرتے ہوئے
وہ مرمریں بدن سے نکلتی ہوئی شعاعوں کے
وہ پیچ ریشمیں زلفوں کے جال بنتے ہوئے
وہ خم لچکتی ہوئی شعلہ کار باہوں کے
وہ چنگ و دف کے چھناکے، وہ پائلوں کی گونج
خطوطِ جسم پہ وہ نازاٹھتے شعاعوں کے

★

وہ کوئی لیلیِ محمل نشیں غزل بر لب
وہ ساربان کوئی تھامے ہوئے سنہری مہار
وہ آبجو کے کنارے تنے ہوئے خیمے
زمیں تھکے ہوئے اونٹوں کی دلفریب قطار
کبھی کھجوروں سے کھینچی ہوئی شراب کا دور
کبھی کھجوروں کے سائے میں عشرتِ بیدار
کبھی سجودِ محبت بہ چشم و لب تو کبھی
وہ نیم خواب فضاؤں میں سر بہ زانوئے یار

★

وہ صاحبانِ زر و مال صف بہ صف موجود
وہ شاہراہوں پہ ہر صبح حسن کا نیلام
وہ اپسرائیں خیالوں کی چاند رتھ پہ رواں
وہ سیم و زر کے ترازو میں پھول سے اجسام
وہ بجلیوں کی طرح سامنے گذرتے ہوئے
کبھی شہاب قدم اور کبھی ستارہ خرام
لباس جن سے نمایاں ہر ایک تارِ بدن
ہے کچھ نیام میں شمشیر کچھ برونِ نیام
وہ اک بہشتِ تصور وہ ایک جنتِ خواب
وہ چلتے پھرتے ہوئے بولتے ہوئے اصنام

★

غبار اڑنے لگے ظلمتِ خزاں بن کر!
"طلسمِ ہوشربا" کے حسین باغوں کے
فسانے خواب ہوئے مے بہ لب کنیزوں کے
فسوں تمام ہوئے احمریں ایاغوں کے
غروب ہوگئے رنگ آشنا فضاؤں میں
سنہرے سورج الف لیلوی چراغوں کے

★

خلشِ جبر

جمیل نقوی

یوں تو روشن ہوئے تہذیب کے کتنے مینار
ذہنِ انسان اندھیروں میں بھٹکتا ہی رہا
ارتقا منزلِ آخر سے پلٹ بھی آیا
عشق تاریخ کے اوراق اُلٹتا ہی رہا

★

یہ بھی ہوتا ہے کہ ماحول کی بے کیفی سے
التزامِ پرِ پرواز بدل جاتا ہے
امن اور جنگ میں کچھ فرق نہیں ہے ایسا
کش مکش رہتی ہے انداز بدل جاتا ہے

★

چشمِ خود بیں کا تقاضا ہے کہ ہر تارِ نظر
پرتوِ آئینۂ ذات سے آگے نہ بڑھے
عینِ فطرت ہے اگر چاہتا ہے شپرہ چشم
وقت کا طرزِ عمل رات سے آگے نہ بڑھے

★

ایک وقت ایسا بھی انسان پہ آجاتا ہے
دل محبت بھری نظروں سے بھی گھبراتا ہے
وقت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس کا احساس
پیکرِ آہن و فولاد میں ڈھل جاتا ہے

چند افسانوں پہ قائم ہے حقیقت کی اساس
چند بیتے ہوئے لمحوں سے عبارت ہے حیات
اُنہی بیتے ہوئے لمحوں سے درخشاں ہے شعور
جس کے پرتو سے میسّر ہے غمِ دل کو ثبات

★

اتنی تیزی سے بدلتی رہیں غم کی قدریں
دل کی فطرت کا تعین نہ ہوا پر نہ ہوا
وائے بر عشق کہ تکمیلِ جنوں کر نہ سکا
عشرتِ درد کا اک لمحہ میسر نہ ہوا

★

ایک موہوم تمنّا کے سہارے لیکن
تلخیٔ گردشِ ایام گوارا نہ ہوئی
باوجودیکہ مقابل تھا جمالِ فطرت
دل جو مغموم تھا تسکینِ نظارا نہ ہوئی

★

لذتِ شورشِ جذبات بھی اک افسوں ہے
اسی افسوں کو کئی نام دیئے جاتے ہیں
حُسنِ سرکش سے کوئی پوچھنے والا بھی نہیں
دلِ بیتاب کو دشنام دیئے جاتے ہیں

★

دلِ دیوانہ کہ بیخود بھی ہے ہشیار بھی ہے
سرکش و راہنمائے رسن و دار بھی ہے
مگر اے اہلِ خرد تم نے یہ سوچا بھی کبھی
اس میں کچھ شائبۂ جذبۂ ایثار بھی ہے

غزل

حفیظ ہوشیارپوری

کیف ہی کیف تھا صبح سے شام تک
ایک عالم تھا میرے پیغام تک

کتنی بے کیف صدیوں کا تھا فاصلہ
دورِ ایام سے گردشِ جام تک

دیر تک اک فسانہ سناتے رہے
دفعتہً رک گئے آ کے اک نام تک

بزمِ ویراں کا نادار ساقی ہوں میں
کتنے پروانے تھے شمع بدنام تک

تیرے دل میں نہ اترے وہ میری طرح
لوگ پہنچے تری ہو کے بدنام تک

مجھ کو یہ سوچنے کی بھی فرصت نہیں
عشق محدود ہے کب سے الزام تک

خود فراموشیٔ عشق حد سے بڑھی
ورنہ میں بھول جاؤں ترا نام تک

میرے شوقِ سفر کی نہیں انتہا
مجھ کو اذنِ سفر ایک دو گام تک

شاد عارفی

گریۂ غم کا محبت پہ اثر پڑتا ہے
کچھ دکھائی بھی تجھے اے دیدۂ تر پڑتا ہے

صرف کعبے پہ نہ دوران نظر پڑتا ہے
میں جدھر جاؤں اُدھر آپ کا گھر پڑتا ہے

[illegible] جو [illegible] اثر پڑتا ہے
سچ کہا ہے کہ تخلص کا اثر پڑتا ہے

بے کلی کے علاوہ نہیں چارہ اس کا
دل پہ دورہ سا جو ہنگامِ سحر پڑتا ہے

غالباً موسمِ سود و زیاں باقی ہے
جام پیتا ہوں تو انجام نظر پڑتا ہے

حسنِ کافر کا بھرم کھلتا ہے پاس آنے پر
وہ نہیں ہوتا ہے منظر جو نظر پڑتا ہے

ان گھٹاؤں سے اجالے کی توقع لیکن
کوئی جگنو کوئی تارہ بھی نظر پڑتا ہے

پاسبانانِ چمن جس کو ہوا دیتے ہیں
وہ غمِ "نظمِ چمن" بھی مرے سر پڑتا ہے

طے کیے جائیں شبِ ہجر جدائی کیونکر
بیچ میں مرحلۂ شمس و قمر پڑتا ہے

دلنوازی جو کبھی گھر میں نہیں بن پڑتی
رخِ محبوب پہ گیسو سی بکھر پڑتا ہے

★
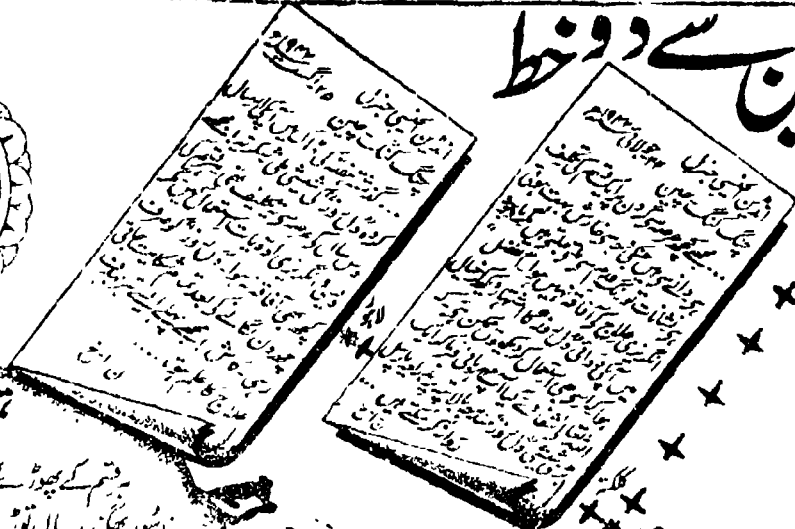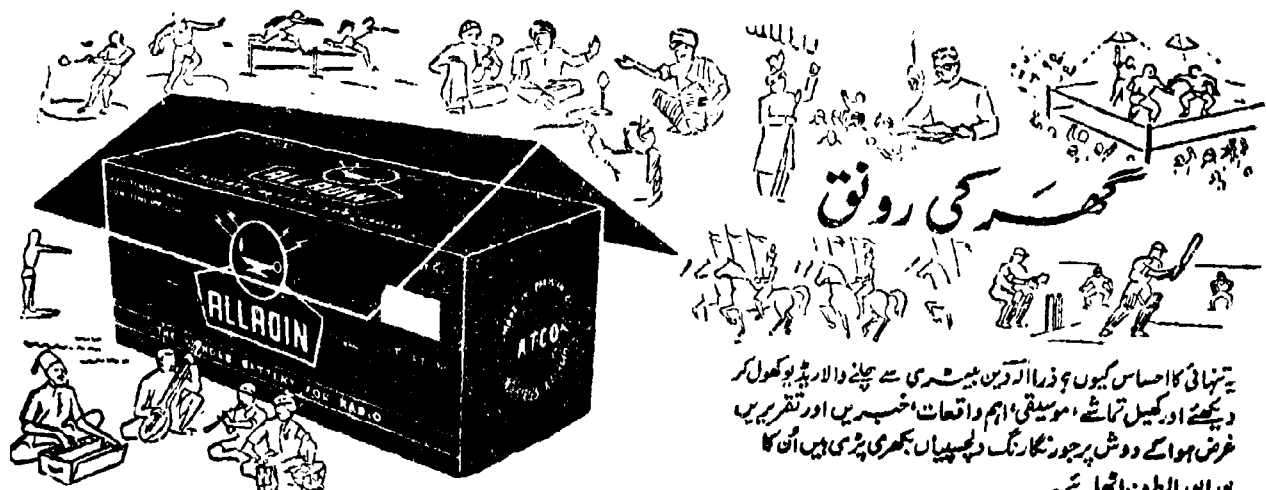
ALLADIN
ATCO
گھر کی رونق
یہ تنہائی کا احساس کیوں؟ ذرا الٰہ دین بیٹری سے چلنے والا ریڈیو کھول کر دیکھئے اور کھیل تماشے، موسیقی، اہم واقعات، خبریں اور تقریریں غرض ہوا کے دوش پر جو رنگا رنگ دلچسپیاں بکھری پڑی ہیں اُن کا پورا پورا لطف اٹھایئے۔
الٰہ دین بیٹری زیادہ عرصے تک کام دیتی ہے اور چونکہ طاقت ور ہے اس لئے اس کی بدولت ریڈیو کی آواز صاف اور شیریں سنائی دیتی ہے۔
الٰہ دین ریڈیو بیٹری
نارمل ڈیوٹی اور ہیوی ڈیوٹی
ATCO ایٹکو انڈسٹریز کراچی
STRONACHS

"آزاد عالمِ دیوانگی میں" ـــــ بقیہ صفحہ: ۱۸

مجھے پہچان لیا۔ فرمایا۔ ہاں میاں تمہارا نام نذیر ہے۔ اس بات کو سن کر میں نہایت خوش ہوا اور آغا یوسف حیران ہو گئے۔ میں نے حضرت کے مزاج کو راہ پر دیکھ کر کہا۔ میں نے ایک تازہ سلام کہا ہے وہ سنانا چاہتا ہوں۔ فرمایا پڑھو۔۔۔ جو شعر پسند آتا تھا اس پر خوش ہو کر فرماتے تھے یہ خوب کہا ہے۔ اور جو پسند نہ آتا تو فرماتے یہ کچھ نہیں۔ جب میں نے سلام کا مطلع بھی پڑھ دیا تو فرمایا تمہارا سلام تو سب ہی اچھا ہے۔ مگر کہیں کہیں جو میں نے یہ کہہ دیا کہ یہ کچھ نہیں تو یہ شعر کی بندش کے لحاظ سے کہا ہے۔ میں نے کہا درست ہے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے مگر کبھی کبھی بے ڈھنگے پن کی بھی لے جاتے تھے۔ پھر ایک دم سے اٹھ کر بازار کی طرف چلے گئے۔۔۔ اس کے بعد پھر زندگی میں مولانا کو دیکھنا نصیب نہ ہوا۔۔۔۔۔"

مولانا کی علالت کم و بیش بیس سال تک جاری رہی۔ اس دوران میں جب تک ان میں سکت رہی۔ وہ باتیں قائم رہیں۔ اول وہ باقاعدہ ہوا خوری کے لئے جاتے تھے۔ دوسرے ان کی تحریر کی عادت اتنی راسخ ہو چکی تھی کہ وہ تقریباً آخر تک قائم رہی۔ میں نے مولانا کی ان تحریروں کو دیکھا ہے۔ نہایت خوبصورت خط میں لکھی ہوئی ہیں۔ لیکن محض الفاظ کا ڈھیر ہیں نہ ربط ہے نہ معنی ☆

"۔۔۔ کچھ دیر پہلے نیند سے" ـــــ بقیہ صفحہ:۔ ۲۱

"آخر ڈاکٹر نے کیا کہا؟" شکیل نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

"کہتا ہے ان کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہیں۔" وہ روتے روتے بے حال ہو رہی تھی۔

دوسری بار رشیدہ کی چوڑیاں توڑ دی گئیں۔ ہلکے سبز رنگ کی چوڑیاں۔ ان چوڑیوں کو توڑتے وقت کانچ رشیدہ کی کلائی میں چبھ گئی اور خون بہنے لگا چند قطرے ٹپکے۔ مگر مٹی میں فوراً جذب نہیں ہوئے۔ وہ ان قطروں کو بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ نہ جانے ان قطروں کو دیکھ کر وہ کیا سوچ رہی تھی اور پھر اس کے بعد آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ آنسوؤں کے قطرے گر گر کر مٹی میں جذب ہوتے گئے اور فضا کہر آلود بنتی گئی۔

اب نوماں کے علاوہ اڑوس پڑوس کی عورتوں نے بھی اُسے بدقسمت اور نہ جانے کیا کیا کہنا شروع کیا۔ کوئی بھی اس سے خوش نہ تھا۔ البتہ شکیل کبھی کبھی اس کی دلجوئی کرتا اور اس کے بجھے ہوئے دل میں اُمیدوں کے چراغ جلانے کی کوشش کرتا لیکن رشیدہ مایوسانہ لہجہ میں شکیل سے کہتی:

"میری قسمت سچ مچ کوئلہ کی طرح سیاہ ہے بھائی۔ ماں ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ زندگی میرا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتی۔ اب تو مرنا چاہتی ہوں مجھے زہر پلا دو یا پھر میرا گلا دبا دو۔" شکیل کا دل پھٹ پڑتا ان باتوں کو سن کر۔ وہ سمجھانے کی کوشش کرتا ـــ

"ہمت نہ ہارو آپا۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔"

مگر شکیل کے یہ الفاظ اس کے زخموں پر مرہم کا کام نہ کر سکے۔ وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہی تڑپتی رہی۔ اب تو اس کے کرم خوردہ دل میں نہ کوئی آرزو تھی نہ تڑپ۔ اُسے یہ بھی نہیں معلوم کہ کب اُس کی جوانی کی بہاریں آئی تھیں اور اس کے چمن میں پھول کھلے تھے۔ اس نے کبھی پھول کھلتے ہوئے دیکھے ہی نہیں۔ اور ایک دن سچ مچ زندگی خود تھک تھکا کر اُس سے رخصت ہو گئی۔ شکیل ساکت و جامد بن گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ ٹپکا۔ ماں نعش سے لپٹ لپٹ کر روتی رہی اور ہمسایہ کی عورتوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا ـــ "بڑی سخت زندگی تھی اس کی۔ اب چین ملے گا اسے۔" ☆

"شکست کی آواز" ـــــ بقیہ صفحہ: ۳۱

اور بھی خوفناک ہو گیا۔ اور اس کی پژمردہ آنکھوں میں موت ناچنے لگی۔ ایک وحشت میرے چاروں طرف منڈلانے لگی!

یکلخت میری آنکھ کھل گئی۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ منہ لحاف میں بند ہونے کی وجہ سے سانس لینے میں ایک دشواری اور بے قراری سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے لحاف چہرہ سے ہٹا دیا۔ اور کمرہ میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ وہی کمرہ وہی ماحول۔ سرہانے پڑی ہوئی تپائی پر کچھ کلیات اور دیوان پڑے تھے۔ اور ایک دیوان جو پڑھتے پڑھتے میں اپنے سینہ پر لحاف کے اوپر رکھ کر سو گیا تھا، چارپائی کے نیچے گرا پڑا تھا ☆

اعلیٰ درجہ کے ان جٹ طیاروں کی پرواز اسقدر رواں اور خاموش ہے ... ہوابازی کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان انجنوں میں اسقدر طا... ہے کہ یہ ایک چھوٹے سے شہر کے لئے بھی بجلی پیدا کرسکتے ہیں۔

بحرِ اوقیانوس کے اِس پہلے جٹ طیارے پر جس کا تا ... عقبی حصہ تقریباً چار منزلہ عمارت کے برابر بلند ہے' پین امریکن ایرویز کا نشان " اسکائی مارک" لگا ہوا ہے۔

بحرِ اوقیانوس پر جٹ طیّاروں کے ذریعہ سفر - ایک تبصرہ

(از جیں - اے - ھِل)

بحرِ اوقیانوس کے اوپر ایک جٹ طیارے میں سفر کیا جائے تو کیا محسوس ہوگا؟ اس کا جواب صرف اِن لفظوں میں دیا جاسکتا ہے "حیرت انگیز"!

پین امریکن اِس موسم خزاں میں اوقیانوس کے اس کنارے سے اُس کنارے تک ایک نئے سفر کا آغاز مشہور بوئنگ ۷۰۷ جٹ طیارے سے کر رہا ہے۔ جٹ طیارے کے متعلق اندازہ قائم کرنے کے لئے میرے خیال میں سب سے زیادہ معقول لوگ ہواباز ہی ہوسکتے تھے۔ لیکن جب میں نے اُن سے گفتگو کی تو اُن کے تاثرات کا انداز وہی تھا جو عام طور پر جادو کے کرشمے دیکھنے کے بعد لوگوں کا ہوتا ہے۔ ایک پُرانے تجربہ کار اور ماہرِ فن ہواباز نے' جس کا بیشتر وقت فضائی پرواز کے دوران گزرا ہے' کہا "جب میں نے بوئنگ ۷۰۷ میں پرواز کی تو مجھے یہ محسوس ہوا گویا میں نے اس سے پہلے فضا میں پرواز ہی نہیں کی تھی۔ پرواز تو حقیقت میں اسی کو کہتے ہیں"۔

ایک کلپر طیارے کے کپتان نے جٹ طیارے میں سفر کرنے کے بعد اس پرواز کو روحانی مسرت کا ایک انوکھا وقعہ محسوس کیا۔ "۳۵ ہزار فیٹ کی بلندی پر پرواز کرتے ہوئے افق کے قریب صاف نیلا آسمان تدریج گہرا ہوتا ہوا ہمارے سروں پر بالکل نیلا دکھائی دیتا ہے۔ جب سورج افق کے قریب ڈوبنے لگتا ہے تو رات نہیں ہوجاتی بلکہ اس کی کرنیں آسمان کے پورے طاس پر پھیل جاتی ہیں۔ شفق کا وہ دلفریب منظر میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا"۔

بحرِ اوقیانوس پر پہلا جٹ طیارہ، جس میں آپ سفر کریں گے، مشہور بوئنگ ۷۰۷ ہے۔

بحرِ اوقیانوس پر جٹ طیاروں کے ذریعہ سفر - ایک تبصرہ

رفتار کی تیزی کوئی خاص محسوس نہ ہوگی اور نہ ہی بلندی کا کوئی احساس ہوگا۔ جہاز سے باہر آپ کی نگاہ ۲۰۰ میل کا احاطہ کرے گی۔ کیبن کا اگلا حصہ اتنا ہی خاموش ہے جتنا آپکے گھر کا مہمان خانہ ہو سکتا ہے۔ عقبی حصہ سے نہایت خفیف اور خوشگوار گنگناہٹ کی آواز آتی ہے اور بس! اِن چار انجنوں کی عظیم طاقت سے جو شور پیدا ہوتا ہے وہ بہت پیچھے آسمان کی خلاؤں میں گم ہو جاتا ہے۔ اور آپ کے کیبن کے قریب تک نہیں آتا۔ اِس خاموش پرواز کی روانی سے آپ پر مکمل آرام اور سکون کی کیفیت طاری ہو جائے گی۔

آپ اِدھر اُدھر گھومیں گے تو دیکھیں گے کہ جہاز کے اندرونی حصہ کو بہت سلیقے سے آراستہ کیا گیا ہے اور رنگوں کے استعمال میں نگاہ کی راحت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کشادہ اور اعلیٰ درجہ کی لاؤنج میں آپ اپنے ہمسفروں کو تاش اور شطرنج کھیلتے ہوئے یا بین الاقوامی معاملات پر بات چیت کرتے ہوئے یا مشروبات سے لطف اُٹھاتے ہوئے پائیں گے۔ چار فلائنگ کچن بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

وقت کی رفتار اِس سے پہلے کبھی اِسقدر تیز نہیں ہوئی جس قدر اب ہے کہ چند گھنٹوں کے اندر آپ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک پہنچ جاتے ہیں۔ ابھی آپ جٹ طیارے میں سفر کے تمام عجائبات سے پوری طرح واقف بھی نہ ہوئے ہوں گے کہ کپتان منزلِ مقصود کے قریب ہونے کا اعلان کر دے گا اور میزبان خاتون آپ کو گھڑی کا وقت درست کرنے کی یاد دہانی کرے گی۔ اِس کے بعد آپ کا عظیم جٹ طیارہ زمین کی طرف اس وقار سے اُترے گا جیسے کوئی حسینہ کسی محل کے زینہ سے بصد انداز اُتر رہی ہو۔ اُس وقت آپ کا دل چاہے گا کہ آپ بحرِ اوقیانوس پر جٹ طیارے کے ذریعہ دوبارہ پرواز کریں۔

پین امریکن اوقیانوس کے اِس کنارے سے اُس کنارے تک جٹ طیاروں کی پرواز کا سلسلہ قائم کر رہی ہے۔ اور کرایہ میں معمولی سا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ پین امریکن کی یہ قدیم ترین روایت ہے کہ اپنے نئے ساز و سامان کا وہاں استعمال کرتی ہے جہاں زیادہ سے زیادہ مسافر مستفید ہو سکیں۔ آج پین امریکن کا یہ بنیادی فلسفہ اپنے معانی میں پہلے سے بھی زیادہ راسخ ہے کہ "سفر چند مخصوص لوگوں کی اجارہ داری نہیں ہونا چاہیئے بلکہ تعلیم کی طرح اِس سے بھی ہر ایک کو فائدہ پہنچنا چاہیئے"۔

آپ ۲۰۰ میل تک پھیلے ہوئے مناظر سے اُکتا کر اِدھر اُدھر دیکھیں گے تو آپ کو چند اور دلچسپیاں نظر آئیں گی جو آپ کے چند گھنٹوں کے سفر کو اور مختصر کر دیں گی۔

PAN AMERICAN

دُنیا کی سب سے زیادہ تجربہ کار ایئر لائن۔

پین امریکن ورلڈ ایئرویز - اِنکارپوریٹڈ
(اِنکارپوریٹڈ اِن دی یو۔ ایس۔ اے۔ کمپنی کے ممبروں کی ذمہ داری محدود ہے)

بیش بہا
پیداوار
"غلہ زیادہ پیدا کیجئے اور غیر ملکی زرمبادلہ بچائیے"
دنیا کی آبادی روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور آج
سے دس سال بعد حکومت پاکستان کو بھی
۵۰،۰۰۰،۰۰۰ مزید انسانوں کے لئے غلہ فراہم
کرنا پڑے گا۔ چنانچہ اب یہ مسئلہ ایک اہم قومی
مسئلہ کی صورت اختیار کرچکا ہے۔
حکومت پاکستان نے غذائی مسئلہ کو حل کرنے
کے لئے بعض عملی قدم اٹھائے ہیں مثلاً زمین کو
قابل کاشت بنانا، کسانوں کو بہتر بیج
اور کھاد فراہم کرنا، تحفظ نباتات کے منصوبوں
کو عملی جامہ پہنانا اور مزارعین کو جدید
آلات زراعت نیز موزوں ترین طریقۂ کاشت
سے روشناس کرنا۔
"غلہ زیادہ اگاؤ" کی مہم مستقبل کے
اس چیلنج کا صحیح جواب ہے۔
برما شیل
ترقی پاکستان کا حصہ ہے
BSP—410

چند نفیس دستکاریاں

[illegible]

مٹی کے کھلونے

برتن اور نفیس ظروف
(بہاولپور)

مٹی کا مجسمہ

لکڑی کا کام

لکھنے والے:

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

ماہ نو
نومبر ۱۹۵۸ء
۸ر

"فن و ثقافت میں خواتین کا حصہ"

ماہِ نو
جلد ۱۱
شمارہ ۸
نومبر
۱۹۵۸ء
مدیر
نائب مدیر
رفیق خاور
ظفر قریشی
سالانہ چندہ: ساڑھے پانچ روپے
فی کاپی: آٹھ آنے
ادارۂ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

اپس کی باتیں

۷ اکتوبر کا خاموش انقلاب ملک و ملت کے لئے ہمہ گیر ترقی و خوشحالی کا ایک نیا پیام لایا ہے۔ یہ انقلاب جس نے ہمیں از سرِ نو آزادی کی نعمت عظمیٰ کے احساس سے بہرہ ور کیا ہے، ہماری تاریخ ملت کے ایک زریں باب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے ہمارے لئے صحت مندانہ نشو و نما اور ترقی کے نئے نئے افق، نئی نئی راہیں آشکار کر دی ہیں۔ ہمارے ملی ارتقا کی رفتار جو نامساعد حالات کی وجہ سے کچھ مدھم ہو گئی تھی، آج از سر نو جولاں ہوئی ہے۔ اب حریت کے صحیح مفہوم کو سمجھنے اور اپنانے کے بدرجہا زیادہ امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ حکیم فرزانہ، اقبال نے کبھی خیابانِ ملت کی تباہی و بربادی کا نقشہ دیکھکر بارگاہِ حقیقی میں دعا کی تھی: ع

یا شبر بفرست یا بادِ سحر

حالیہ انقلاب نے ہمیں ان دونوں سے بہرہ ور کیا ہے "شبر" سے اس لئے کہ اس نے آناً فاناً گوناگوں سماجی خرابیوں ـــــــــ ناجائز در آمد برآمد، نفع اندوزی، چور بازاری، نا اہلی، وغیرہ اور اخلاقی برائیوں کی فاسد جڑیں کاٹ کر رکھ دیں اور "بادِ سحر" سے اس لئے کہ اب ہمارا معاشرہ ایک خوشگوار فضا میں نشو و نما پا سکے گا۔ اب ہمارا کاروانِ ملت اپنے تابناک مستقبل کے افق پر نظریں جمائے نہایت اعتماد سے پھر جادہ پیما ہوتا ہے۔ اس امید کے ساتھ کہ ہمارا پائے شوق اب یقیناً اس "رنگینیوں کے شہر" تک رسا ہو جائے گا جس کی تمنا ہمارے دلوں میں جاگزیں ہے۔

اس عہدِ نو کے خوشگوار اور دور رس اثرات کا زندگی کے تمام شعبوں پر مترتب ہونا تو ویسے خوش آیند ہے ہی لیکن زبان و ادب اور ثقافت کی فضا میں ایک نئی امنگ کا پیدا ہونا بھی بالکل قدرتی ہوگا۔ ہمارے لئے یہ امر بالخصوص موجب طمانیت ہے کہ اس طرح ملک کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی بھی زیادہ آزاد اور کشادہ فضا میں ملک کی ہمہ جہتی ترقی میں بیش از بیش حصہ لے گی اور یہ تخلیقی و تعمیری صلاحیتوں کو پیغام نمو دینے کے اعتبار سے دوستانہ کا زیادہ پائیدار پہلو ہے کیونکہ اس میں فرد اور جماعت کو گرد و پیش کے ناسازگار، پریشان کن سیاسی، معاشرتی، اقتصادی حالات، بے اطمینانی اور انتشار سے نجات حاصل ہوگی اور ان کی گوناگوں فطری و عملی سرگرمیوں کے دھاروں کو پوری آزادی و شدت سے ہم آہنگ ہو کر موجزن ہونے کا موقع ملے گا۔

●

پچھلے مہینے انجمن خواتین پاکستان کے زیر اہتمام یونیسکو کے تعاون اور امداد کے ساتھ کراچی میں ایک سیمینار یعنی علمی مذاکرہ منعقد ہوا جو در حقیقت اقوام متحدہ کے مذکورہ شعبے کے جنوب مشرقی ایشیا سے متعلق ایک ثقافتی منصوبے کے مطالعوں اور مباحثوں کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ کیونکہ اس سے پہلے بھی یونیسکو نے ڈھاکہ، لاہور اور کراچی یونیورسٹیوں کو ایسے مذاکرات کے سلسلے میں مالی اور فنی امداد بہم پہنچائی تھی۔ منصوبے کا مقصدِ اولیٰ یہ دریافت کرنا ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا کی پرانی تہذیبوں اور تمدنوں پر صنعتی ترقی اور شہریت کا کیا اثر ہوا اور تمدن و ثقافت کے تحفظ اور نشو و نما میں خواتین کیا کردار ادا کرتی ہیں۔

اس اجتماع میں پاکستان، ایران، انڈونیشیا، ملایا، برما اور سیلون کے مندوبین اور افغانستان، تھائی لینڈ اور بھارت کے ناظر شامل ہوئے۔ ایسی تقریبات ان معاشرتی و اقتصادی مسائل اور اس تغیر و تبدل پر غور و فکر کا موقع بہم پہنچاتی ہیں جن سے جنوب مشرقی ایشیا کے ممالک آج کل دوچار ہیں۔ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانے میں جو قدیم و جدید اور مشرق و مغرب کے اختلاط کا زمانہ ہے خواتین کی سعی و کوشش کو ثقافت کی تشکیل نو میں کس قدر دخل ہے۔ مقام مسرت ہے کہ ہماری خواتین اپوا کے زیر قیادت اس سلسلے میں ایک اہم کردار ادا کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اس تقریب کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس میں پاکستانی دستکاریوں اور ثقافتی نوادر یعنی شاہکار ادب و فن اور علاقائی زندگی سے متعلق نقوش کی نمائش کا اہتمام بھی کیا گیا۔

●

اس شمارہ میں محترمہ حجاب امتیاز علی صاحبہ کا ایک طویل مختصر افسانہ پیش کیا جا رہا ہے جو ان کے نفسیاتی ذوق اور مخصوص انداز نگارش کے علاوہ اس افسانوی صنف کی امتیازی خصوصیات کی عکاسی بھی کرتا ہے۔ امید ہے یہ منفرد پیشکش قارئین کے لئے گہری دلچسپی کا باعث ہوگی۔

سرورق: "محو خیال" (مرونگ قبیلے کی ایک لڑکی، مشرقی پاکستان) عمل: زین العابدین

تنقید کا لائحہ عمل

ایچ - ٹی سورلے

"رومان"، "مذہب" اور اسی قسم کی دیگر اصطلاحوں کی طرح شاعری بھی نہایت وسیع مگر غیر واضح مفہوم کی حامل ہے۔ شعری تصنیف کی حیثیت سے اس کا مطالعہ دو بالکل مختلف زاویہ ہائے نگاہ سے کیا جاسکتا ہے: خارجی اور داخلی۔ اوّل الذکر کا تعلق صرف اس صناعانہ کامیابی سے ہے جو لسانی نظم و ترتیب، وضع و بیان کی صورت گری کرتی ہے، اور موخر الذکر میں شاعری کا مطالعہ فکر و معنی کی تبلیغ کے آلۂ کار کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اس ہی میں شاعری کی جمالیاتی یا تفکری خصوصیات بھی شامل ہیں۔ چونکہ انتقاد اور جمالیات سے متعلق اکثر تصانیف میں اس داخلی جائزہ کی دوگونہ نوعیت کے بارہ میں بہت کچھ ذہنی الجھاؤ پایا جاتا ہے، اسلئے ہمیں پہلے ہی سے ایک بہت ہی عام مغالطہ سے بچنا لازم ہے۔ یہ مغالطہ نفس مضمون اور اس پر غور کرنے والے انسان کے ذہنی عالم میں امتیاز نہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ بعینہٖ یہی مسئلہ جمالیات میں حسن کے معنی و منشا کے سلسلہ میں رونما ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی طرف رجوع کرنے سے یہ نکتہ اور بھی واضح ہو جائے گا۔

مسٹر اسٹرج مور پوچھتے ہیں: "ہم کسی چیز کو خوبصورت کیوں کہتے ہیں؟ اہل الرائے نے اس کے مختلف جواب دئے ہیں۔ کولرج کی رائے میں وہ اسلئے خوبصورت ہے کہ اس کے اجزائے ترکیبی ان کے درجۂ صداقت کے تابع ہوتے ہیں۔ رچرڈز کی رائے میں کیونکہ وہ کسی نفسی الجھن کو سلجھاتی ہے وہ اسلئے خوبصورت ہے۔ اور کروچے کی رائے میں، جس کا اس نے اطالیہ میں بڑے زور شور سے اعلان کیا ہے، یہ اسلئے حسین ہے کہ یہ وجدانی ہے۔ مگر نہیں، یہ تمام نہایت بدیع مقولے کسی اور ہی سوال کا جواب دیتے ہیں۔ ہمارا سوال یہ نہ تھا کہ حُسن کی تہ میں کیا حقیقت پوشیدہ ہے بلکہ یہ کس طرح اجاگر ہوتا ہے۔ کیونکہ حسن کی داد تو صرف ذوق تحسین ہی سے دی جاسکتی ہے، شعور اس کے ادراک سے قاصر ہے۔"

کیا یہ استدلال درست ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس ساری بحث میں سلسلۂ فکر برابر اُلجھا ہوا نظر آتا ہے۔ کیونکہ اس میں ان دو باتوں کے مابین قطعاً امتیاز نہیں کیا گیا کہ وہ کون سے اوصاف ہیں جو کسی چیز کو خوبصورت بناتے ہیں۔ اور خوبصورت چیز سے متاثر ہونے والے ناظر کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ زیادہ بسیط تجزیہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ حسن کا کماحقہٗ ادراک اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حظ کے ساتھ ہی ساتھ ذہنی جانچ پرکھ بھی شامل نہ ہو۔ یہ جانچ پرکھ یقیناً ایک شعوری عمل ہے۔ جس کے برعکس اہتزاز، کیفیات کا ایک خاص سمت میں بہاؤ ہے۔ ان دونوں کو ذہن میں مبہم طور پر ملا جلا کر کوئی توجیہہ پیش کرنا دراصل ان کو گڈمڈ کر کے فکر و خیال میں ژولیدگی پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں۔

اس قسم کا استدلال شاعری کے سلسلہ میں بالعموم برتا جاتا ہے۔ اس میں بھی اگر ایک طرف ذہنی جانچ پرکھ ہوتی ہے تو دوسری طرف حظ۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کس طرح پتہ چلاتے ہیں کہ کوئی تحریر شاعری ہے اور پھر اچھی بری شاعری میں فرق کیا ہے؟ اس کا جواب بہت آسان ہو جاتا ہے اگر ہم یہ یاد رکھیں کہ شاعری کی پرکھ میں تین علیحدہ چیزوں کو دخل ہے: اوّل، خارجی ہیئت، الفاظ، زبان، آہنگ، نفس موضوع اور ترنم عبارت۔ دوم، مواد کے معنی و منشا کا ادراک بذریعہ شعور۔ سوم، دل پر شاعری کے جمالیاتی اثر سے پیدا شدہ جذباتی کیف۔ پہلی چیز سراسر خارجی ہے۔ دوسری اور تیسری چیزیں داخلی ہیں۔ ہم پہلے عنصر کو الگ کر کے اس کا بعض بڑی حد تک مسلمہ معیاروں سے معروضی طور پر تجزیہ کر سکتے ہیں۔ دوسرے میں شعور کا عنصر شامل ہے اور تیسرا تمام تر نفسیاتی عمل ہے۔ یہ بڑی حد تک ذوقی یا جمالیاتی تاثر ہی کی تلون کاریاں ہیں جن سے کسی شعری تخلیق کے بارہ میں اتنی قدر اختلاف رائے پیدا ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کسی شعری پارہ کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ہمیں نہ صرف زبان و آہنگ کی شکل میں اس کے مادی پہلو کا مطالعہ کرنا چاہئیے بلکہ اس حظ کو بھی محسوس کرنا چاہیے جس کا ابلاغ اس کا مقصود ہے۔ چنانچہ جس قدر کوئی شعری پارہ، انشا پردازی میں اعلیٰ درجے کی ہنرمندی، خیالات میں صفائی، عظمت و صداقت اور ذوق میں نفاست کے معیاروں کی تشفی کرتا ہے، اسی قدر اس کو برگزیدہ شاعری کا وقیع نمونہ خیال کیا جائے گا۔ شاعری کی قدر و قیمت

اندازہ لگانے کے یہی تین معیار ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا تعلق کسی واضح ذہنی عمل سے ہے جس تنقید را دبہ میں اس بنیادی حقیقت کو نظر انداز کیا جائے گا اس سے ژولیدگی فکر کے سوا اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔

اس نکتہ کی مزید توضیح و تشریح کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر جدید تنقید کا ایک پارہ ملاحظہ فرمائیے۔ ڈاکٹر آئی اے رچرڈز نے اپنی تصنیف 'PRINCIPLES OF LITERARY CRITICISM.' میں لکھتے ہیں: "شاعری کا بیشتر حصہ ایسے بیانات پر مشتمل ہوتا ہے جن کی کوئی بڑا احمق ہی تصدیق کرنے کی کوشش کریگا۔ یہ ایسی چیزیں نہیں جن کی تصدیق کی جا سکے۔ شاعری رجحان[1] کو لفظی تلازم[2] کے تابع کرنے کی واضح ترین علامت اور جذباتی زبان کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ یہاں شاعری کے متعلق کتنی باتوں کی تعبیر کی گئی ہے۔ جو نہ صرف صحیح نہیں ہیں بلکہ جس پیرائے میں ان کو بیان کیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شعور اور جمالیاتی تاثر کو جن سے شاعری پرکھی جاتی ہے۔ آپس میں غلط ملط کر دیا گیا ہے۔ یہ کہنا کہ شاعری جذبات کی اعلیٰ ترین شکل ہے، ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ جذباتی زبان کی اور بھی کئی صورتیں ہیں۔ خطابت اور دعا، اس کی بہت ہی معروف اقسام ہیں۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا کہ ان میں سے اعلیٰ ترین کون ہے؟ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ نقاد موصوف کا بیان محض ایک رائے ہے اور وہ بھی کچھ ایسی ہی مشکوک سی، لیکن شاید نقاد کو جو کہنا مقصود ہے وہ صرف اس قدر ہے کہ شاعری بہت خوبصورتی سے ادا کی ہوئی اور بڑی استادی سے آراستہ و پیراستہ زبان میں پیش کی ہوئی تحریر ہے جس سے شدید جذباتی اثر طاری ہوتا ہے۔

رہے یہ الفاظ کہ کوئی بڑا احمق ہی ایسی باتوں کی تصدیق کرنے کی کوشش کرے گا جو شاعری میں پیش کی جاتی ہیں جس طریقے سے بات ادا کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر یہ ماصرف اتنا ہے کہ رمزیت، تمثال اور بیان کے وہ طریقے جو شاعری برتتی ہے ان سے من و عن لفظی اور عام بول چال کے معنی مراد لینا صحیح نہیں، تو معلوم ہوگا کہ دو اہم حقائق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اول، زبان مجازی بھی ہے اور حقیقی یعنی لغوی بھی۔ دوسرے خیالات کو قرین قیاس یا صداقت و حقیقت کے نظام سے ہم آہنگ ہونے کی بنا پر جانچا جا سکتا ہے۔ کسی آخری تجزیہ میں سائنس کے بیانات شاعری کے بیانات سے کچھ زیادہ استوار نہیں ہوتے۔ لہٰذا ڈاکٹر رچرڈز کو غالباً یہ تسلیم کرنے سے انکار نہیں ہوگا کہ ان کا مدعا صرف یہ ہے کہ شاعری کے بیانات کچھ اس قسم کے سیدھے نہیں ہوتے جیسے "دو مع دو چار" اور "سبزہ ہرا ہے"۔ پھر یہ کہنا کہ 'رجحان' شاعری میں لفظی تلازم کے تابع ہوتا ہے۔ یہ معنی رکھتا ہے کہ شاعری کا جذباتی مبلغ خیال کی اہمیت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ درحقیقت اس سے ایسا کوئی اثر مترتب نہیں ہوتا۔ جس چیز پر یہ اثر انداز ہوتا ہے وہ وہ تصور ہے جو سامع خیال کے بارہ میں پیدا کرتا ہے۔ اور جو بالکل اور ہی چیز ہے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ جذباتی مبلغ نفسِ مضمون کی اہمیت پر اثر ڈالتا ہے تو صریحاً ہم اسی مغالطہ کا شکار ہو جائیں گے جس سے ہم بچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یعنی مضمونِ شعر کا سامع کے ردِ عمل سے التباس۔

مضمون شعر میں کوئی اچنبہ یا اشکال نہیں ہوتا خواہ اس کے الفاظ کا ٹھیک ٹھیک منشا متعین کرنا کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو۔ شاعری میں بالکل موسیقی سے ملتی جلتی حکمتیں اور تدبیریں برتی جاتی ہیں تاکہ سامع کے جذبات پر اثر مقصود پیدا کیا جائے۔ مگر اس کا اس جذباتی مبلغ سے کوئی تعلق نہیں جو براہ راست الفاظ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس جذباتی مبلغ کا اندازہ سامع کی طبیعت پر مسمریزم سے مشابہ کسی ساحرانہ اثر پر موقوف نہیں بلکہ اس بات پر موقوف ہے کہ یہ سامع کی فکری قوتوں کو کام میں لا کر اس کے ذہن میں حقیقت اور گوناگوں پہلوؤں (وحدت و کثرت) کا ایک واضح تصور پیدا کر دے۔ محض یہ بات کہ شاعری کا طریق اظہار ایسے بیانات یا استنباط کام میں لاتا ہے جو من و عن فکری تجربہ کا عمومی اظہار نہیں ہوتے شاعری ہی سے مخصوص نہیں۔ انسان کی تمام گفتگو کچھ مجازی ہوتی ہے کچھ حقیقی۔ شاعری اپنی مخصوص نوعیت کی بنا پر بالعموم اس ابتدائی انداز فکر میں سوچنے کی عادی ہے جس کو تلازمۂ فکر کہتے ہیں یعنی تشبیہ، استعارہ تمثیل اور رمزیت کو جنم دیتی ہے۔ لیکن اس انداز فکر کا استعمال ان تمام افکار میں لازم ہے جو کسی معمولی سے معمولی، بالکل سطحی اور ادنیٰ مشاہدہ کی صلاحیت رکھنے والا ذہن اپنی کسی بڑی ہی ادنیٰ قسم کی بات میں اختیار کر سکتا ہے۔ چنانچہ ولیم بیک پوچھتا ہے:-

---

[1] "رجحان" ATTITUDE کسی داعیۂ عمل سے پہلے ذہنی جانچ اور سوچ بچار جس سے انسان بالآخر کوئی فیصلہ اور تہیہ کرتا ہے۔

[2] "لفظی تلازم" REFERENCE خیال کا وہ پیچ در پیچ سلسلہ جس سے ذہن علائق پیدا کرتا ہوا اشیاء یا مشاہدات کی ابتدائی کڑیوں کی طرف رجوع ہوتا ہے۔

جنرل محمد ایوب خان ، صدر پاکستان

ہاں ہاں تم یہ کیسے جانو
ہر پنچھی جو پر پھیلائے
پنکھ ہلاتا اڑے ہوا میں
اک دنیائے بے پایاں ہے
بے اندازہ خوشی کی دنیا
جس کو نگاہیں دیکھ نہ پائیں

یہاں شاعر ایک ایسی زبان بول رہا ہے جس میں انسانی گفتگو سے ایسا بھرپور اور اعلیٰ قسم کا کام لیا گیا ہے جو محض "ابجد سیکھنے یا" درجع دو جائنے سے منزلوں آگے ہے۔ الفاظ میں ایک ایمائی انداز ہے جو بے شک ابتدائی قسم کے مشاہدہ پر مبنی کوائف سے تیار شدہ فکری رجحان کی طرف اشارہ کناں ہے۔ لیکن اس سے کہیں آگے نکل جاتا ہے۔ شاعر یہ نہیں کہتا کہ پرندوں میں وہ انوکھی خصوصیت پائی جاتی ہے جس کے متعلق اس نے قیاس ظاہر کیا ہے اور نہ وہ توقع کرتا ہے کہ کوئی سائنسدان تجربہ واستقرا سے اس کی تصدیق کرے۔ وہ تو محض زبان کو ایک ترقی یافتہ پیرایہ میں استعمال کر کے ایک خاص نقطۂ نظر کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کا دامن کسی نہ کسی طرح حقیقت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور جس کا ادراک فہم و شعور کے ذریعہ ایک عمیق جذباتی مبلغ سے گزرنے ہی پر موقوف ہے۔ شاعری کی ہیئت کا اس کے معنی یا منشاء کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بعض اوقات بہت ہی عمیق اور مشکل قسم کی شاعری بہت ہی آسان زبان میں ادا کی جاتی ہے۔ اور شاعری میں ہیئت اور مواد کا امتیاز ایک بنیادی بات ہے، اور معقول تنقیدِ ادب میں نفسِ مضمون اور اندازِ بیان کی تفریق لازم ہے۔

شاعری نہ تو نثر ہے نہ جھنکار پیدا کرتی ہوئی تُک بندی اور نہ معمولی قسم کی اینڈی بینڈی باتیں جنہیں بہت ہی استادانہ کاریگری کے ساتھ نظم کے چوکھٹے میں جڑ دیا گیا ہو۔ مگر ان تمام صورتوں میں شاعری کا معیاری رسا نہ ہونا بالکل مختلف وجوہ کے باعث ہوتا ہے۔ ان وجوہ کو آپس میں خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ یہ تنبیہہ عارفانہ اور حکیمانہ شاعریوں کے سلسلہ میں اور بھی ضروری ہے۔ کیونکہ رمزیت اور معانی بین السطور ان کی نمایاں خصوصیات ہیں اور زبان ان میں ماورائی حیثیت اختیار کر لیتی ہے ÷

---

* اقتباس از دیباچہ:- H. T. SORLEY. "SHAH ABDUL LATIF OF BHIT."

اُردو ادب اور ملّی زندگی

حسن مثنیٰ ندوی

کچھ عرصہ ہوا "ماہِ نو" (جمہوریہ نمبر ۱۹۵۸ء) میں ڈاکٹر محمد باقر کا ایک مضمون اس عنوان سے شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون اس لحاظ سے تو بیشک بہت مفید ہے کہ اس میں انھوں نے اُردو ادب، اُردو اور کتابوں کی بے بسی و بیکسی کے سلسلے میں اپنا دردِ دل پیش کیا ہے اور اپنے انداز میں توجہ دلائی ہے کہ زندہ قومیں اپنی زبان و ادب کو زندہ رکھنے کی طرف سے غافل نہیں رہتیں۔ لیکن جو بحث انہوں نے اس مضمون میں کی ہے اور جو باتیں پیش کی ہیں وہ ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ ان کا زاویۂ نظر کس حد تک صحیح ہے۔

مضمون نگار نے جنوری ۱۹۵۸ء کے چار رسالوں کو سامنے رکھ کر ان کے مضامین کی فہرست نقل کی اور پھر اعتراض کیا کہ "یہ درباری ادب ہے عوامی ادب نہیں ہے"۔ پہلے وہ فہرست دیکھئے :۔

مجلّہ ۱ : یحییٰ منیری کے اردو خطوط، روڑی کے دو درویش

مجلّہ ۲ : نبی کریم کی تعلیم کے بنیادی عناصر، قائد اعظم محمد علی جناح، نقدِ جدید کی ضرورت، اسلام اور فطرت سے مطابقت پذیری، بھگوت گیتا اور اس کا فلسفۂ اخلاق، ریاستہائے متحدہ کی تحریکِ آزادی، مریض کا اکرام، اسلام اور موسیقی ــــ

مجلّہ ۳ : اُردو کی دو مقبول مثنویاں، ہمارے صحرائی نغمے (مغربی پاکستان کے دیہاتی گیتوں پر مقالہ) اسمال، خوشبو۔

مجلّہ ۴ : قرآن حکیم اور حسن، ایڈن، معرکۂ سویز اور اقوامِ متحدہ، دنیا کی سب سے کمسن جمہوریت، امریکن امداد، گوتم بدھ کی کہانی، سائنس کی بے سروسامانی، اولمپک کے تاریخی کھیل۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ "ان مجلات میں بیشتر مضامین کے عنوان پکار پکار کے کہہ رہے ہیں کہ ہمارا تعلق سرزمینِ پاکستان سے نہیں اور اس ملت سے نہیں جس کے لکھنے والوں نے ان موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے، ان مضامین میں ملت کے عوامانہ رجحانات، ان کے جذبات مسرت و غم، ان کی آرزوئیں، ان کی حسرتیں ان کے احساسات، ان کے افکار، غرض کسی چیز کو بھی ان مضامین میں نمائندگی نہیں ملی، مختصر یہ کہ یہ تمام مواد یا اس کا بیشتر حصہ اس شے سے عاری ہے، جو ان کی زندگی کی صحیح عکاسی یا ترجمانی کرتی ہے"۔

"درباری ادب، عوامی ادب" کے علاوہ اس ٹکڑے میں "نمائندگی، صحیح عکاسی یا ترجمانی" خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ "ملّی" کی تشریح صاحبِ مضمون نے یہ کی ہے کہ "میرے نزدیک ملّی زندگی بود و باش کی وہ نہج ہے جو کسی ملت کے عوام کے ہاں مقبول ہو۔ یہ صحیح ہے کہ خواص کے طرزِ حیات کو ملّی زندگی سے جدا نہیں کیا جاسکتا، اور اس میں بندہ و آقا کی تمیز روا نہیں رکھی جاسکتی، لیکن کسی ملک کی ملّی زندگی کے نمونے کی بات کریں تو ذہن میں انہیں افراد کی تصویر ابھرے گی جن کا تعلق عوام سے ہے، اور ملّی زندگی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے ہم بیشتر ان عناصر کو گنوائیں گے جن سے عوام کے معاشرے کا تار و پود بنا جاتا ہے"۔

ملت، قوم، زندہ قوم، ادبِ ملّی وغیرہ کی اصطلاحیں اس ٹکڑے میں اور پورے مضمون میں بار بار استعمال کی گئی ہیں جو قارئین کی خصوصی توجہ کی طلبگار ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "ملت" کے معنے مضمون نگار کے ذہن میں کچھ صاف نہیں ہیں، نہ قوم ہی کا مفہوم واضح ہے، اور نہ زندہ قوم کا کوئی معیار ان کے سامنے رہا ہے۔ اس لئے ادبِ ملّی بھی ان کے نزدیک نہ کوئی خاص مفہوم رکھتا ہے نہ اس کی حدود متعین ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اس کی تشریح کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اور چونکہ حدود متعین نہیں ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ اس کی تعریف بھی نہیں ہوسکتی۔

صاحبِ مضمون نے اس حقیقت کو یکسر فراموش کردیا ہے کہ یہ سرزمین کم از کم سو سال سے ایسی قوم کی محکوم و مقہور اور غلام رہی ہے، جس نے اپنی حکمرانی کے تحفظ کے لئے اس سرزمین کی قوم و ملت کا شیرازہ ارادةً بکھیرا۔ اس کے ذہنی سانچوں کو توڑا مروڑا، ان کو جاہل بنا کے رکھا، اس کے معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کیں، اصولِ معاشرہ

کو ہر ممکن طریقے سے تباہ و برباد کیا، علوم و فنون کو غارت کیا، معاشیات، حرفت و تجارت، سب کو ملیامیٹ کیا' اور یہ ملت کئی پشتوں سے اسی عالم جانکنی میں مبتلا رہی۔ اب جا کر کہیں ۱۹۴۷ء میں اک ذرا کھل کر صرف سانس لینے کے قابل ہوئی ہے' اور یہ سوچنے کے قابل کہ وہ کیا تھی، کس حال کو پہنچا دی گئی اور اب اسے کیا ہونا چاہیئے۔

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ آج اس قوم و ملت کے ڈھانچے میں جو کچھ نظر آ رہا ہے یا یہ قوم و ملت جن احوال و کوائف میں دکھائی دے رہی ہے۔ ان میں بیشتر وہی کچھ ہے جو انگریزوں نے اپنی حکومت کے زور سے اس پر تھوپا تھا، اس کے گلے میں انڈیلا تھا، اس کے دل و دماغ میں بہ لطائف الحیل اتارا تھا؟ اور باقی وہ ہے جو اس محکومی و غلامی کی بیکسانہ مجبورانہ زندگی کی پستی و بدحالی نے اس کے ارد گرد ماحول کی صورت میں کھڑا کر دیا تھا؟ اگر یہ واقعہ ہے تو پھر کوئی شخص یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ یہ قوم و ملت جو لفظاً "اہل پاکستان" کے نام سے دنیا کے سامنے آئی وہ درحقیقت وہی قوم و ملت تھی جو واقعۃً کبھی تھی یا اسے ہونا چاہیئے۔ تب تو جو قوم و ملت ہمارے سامنے آئی وہ دراصل ایک گروہ تھا 'انگریزوں کا تباہ کردہ' پراگندہ حال و پراگندہ خیال، لٹا پٹا تہس نہس جس کی نہ کوئی قومیت باقی تھی نہ ملیت، نہ معاشرہ" ملی زندگی کے بود و باش کی یہ نہج" جو بظاہر نظر آتی تھی' وہ اوپر کی تھوپی ہوئی ہے، اس قوم و ملت کی اپنی حقیقی اور فطری نہج ہرگز نہیں ہے۔ اس کی مثال تو اس لشکر کی سی تھی جسے کسی میدان میں شکست ہوئی ہو اور اسے تتر بتر کر کے گھیرے میں لے لیا گیا ہو، ظاہر ہے کہ کسی ایسے پراگندہ حال لشکر کے افراد جب تک مر نہ جائیں، چلتے پھرتے بھی رہیں گے، کھاتے پیتے بھی رہیں گے، ہنستے بولتے بھی رہیں گے، روتے بسورتے بھی رہیں گے، اور کسی نہ کسی طرح بحالت مجبوری اپنے دن گزارتے بھی رہیں گے۔ دن گزارنے کی اس حالت کو دیکھ کر کوئی شخص یہ حکم تو ہرگز نہیں لگا سکتا کہ یہ بھیڑ واقعی "لشکر" ہے اور اس کے یہی حالات جو اب نظر آ رہے ہیں اس کی اصلی خصوصیات ہیں، یہی اس کی روایات اور قومی اوصاف ہیں جو ہونے چاہئیں۔

یہی سبب تھا کہ پاکستان بنتے ہی قوم و ملت کے کچھ لوگوں نے اپنی استطاعت بھر کوشش کی کہ اس پراگندہ لشکر کو جو تازہ تازہ قید سے چھوٹا ہے' ایک بڑے گھیرے سے نکلا ہے، اس کے اصل اوصاف و خصوصیات و روایات کی طرف واپس لایا جائے' اسے ازسرِ نو منظم کیا جائے، اس میں تازہ روح دوڑائی جائے' اسے پھر کسی کام کے قابل بنایا جائے۔ خود پاکستان بھی تو حقیقتہً اسی مقصد کے حصول کے لئے معرض وجود میں آیا ورنہ کیا پیدائش کا سلسلہ بند ہو گیا تھا یا لوگ جو پیدا ہو چکے تھے وہ جی نہ رہے تھے؟ بچے پیدا ابھی ہو رہے تھے، اور پڑھ بھی رہے تھے، انہیں نوکریاں بھی ملتی تھیں اور خاصی بڑی نوکریاں' وہ کما بھی رہے تھے، لیکن واقعی وہ کیا منظم قوم تھے؟ اس قوم کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا اختیار تھا؟ کیا یہ قوم آزاد تھی؟ نہیں' آزادی و حریت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آپ کے مشکیں کسی ہوئی نہ ہوں، بلکہ یہ ہیں کہ آپ کے اعضاء و جوارح کے ساتھ آپ کے دل و دماغ' ذہن و فکر' ارادے اور عزائم بھی آزاد ہوں۔ اس حیثیت میں جب کسی قوم کو سامنے لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس میں "حال" کے کوائف و احوال بنیاد ہرگز قرار نہیں پاتے۔ "ماضی" ہی کی روایات اس کی اساس ٹھہرتی ہیں۔ وہ ماضی جو اس کا طرۂ امتیاز ہو۔

پاکستان جغرافی طور پر متعین حدود کا نام تو ہو سکتا ہے لیکن قومی اور ملی طور پر ان حدود کے اندر بسنے والے کا نام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک بقول اقبال وہ اپنی خودی کو نہ پہچانیں، خود آگاہی نہ حاصل کریں اور اپنی روشن روایات پھر سے تازہ نہ کریں۔ یہ کوئی خیالی فلسفہ نہیں بلکہ عملی دنیا کی بات ہے متعین حدود کے بلکہ یوں کہیئے کہ تصور تک میں آنے سے پہلے 'اقبال جو باتیں اپنی قوم و ملت کو یاد دلا رہے تھے' جو خصوصیات ملی گنوا رہے تھے' رازِ حیات سمجھا رہے تھے، وہ نری شاعری نہ تھی۔ یہ تو صرف ڈاکٹر صاحب ہی کہہ سکتے ہیں کہ چالیس سال تک انہوں نے صرف مذاق کیا۔ کیونکہ ہم پہلے ہی سے وہ سب کچھ تھے جو انہیں ہونا چاہیئے۔ مگر یہ بہت بڑی خود فریبی ہوگی۔ ایک اقبال ہی کیا قوم کے تمام اہل فکر و نظر اس بات پر متفق تھے کہ ہمارا سب کچھ لٹ چکا ہے۔ ہم اب ہم نہیں رہے۔ ہمیں ازسرِ نو سنبھلنا ہے' بننا ہے سنورنا ہے۔ پھر آپ اچانک' راتوں رات سنبھل کیسے گئے؟ بن سنور کیسے گئے کہ آج آپ کے پاس عریاں نویش معاشرہ بھی موجود ہے' صحیح معنوں میں آپ ایک قوم بھی ہیں، ملت بھی ہیں، اور ملت کے سے رجحانات بھی رکھتے ہیں اور افکار بھی اور آپ "ملی زندگی" کے دعویدار بھی ہیں؟

دنیا میں کوئی قوم اچانک آسمانی واقعہ یا قانون کے نفاذ سے نہیں پیدا ہوتی۔ قوم تو وہی ہے جو اپنے ماضی' اپنی روایات' اساسی افکار و تصورات' اور ان کے پیدا کردہ معاشرے کی گود میں پلتی اور پنپتی ہے۔

۱۹۴۷ء کا قانون آزادی ایک قضیہ کو چکانے کا وقتی اور کاغذی حل تھا۔ اس کو کسی قومیت اور ملیت کی اساس و بنیاد سمجھ لینا ایک غلط زاویۂ نظر ہے۔ قوم و ملت کے اسی نوّے فیصد عوام کی موجودہ پریشان حال زندگی کو "عوام کی مقبول نہج" قرار دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ جیسے ہیں ویسے ہی رہیں۔ آج کی زندگی کو' خواہ وہ عوام کی ہو یا خواص کی' طبعی قرار دینا صحیح نہیں۔

پاکستان یعنی سرحد، بلوچستان، پنجاب، سندھ، بنگال اور سلہٹ اور ان کے ساتھ کشمیر کو انگریزوں نے ملک کا سرحدی علاقہ ہونے کی وجہ سے خاص طور پر

تباہ و برباد کیا۔ اور مملکت کی ترقی کے ناگزیر کام ہوئے بھی تو ان علاقوں کو دانستہ پہنچنے نہ دیا گیا۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ آج ہم اپنے اسی حال کو اپنی قومی و ملی خصوصیات تسلیم کر لیں؟ نظر بریں کیا یہ ضروری نہیں کہ اس حالِ بد سے نکلنے کے لئے ہم اپنے روشن ماضی کی طرف رجوع کریں۔ اپنی ان روایات و خصوصیات کا دامن پھر سے تھامیں جن کی بدولت ہمارا تشخص قائم ہوتا ہے اور ہم 'ہم' قرار پاتے ہیں؟

ماضی سے مراد یقیناً محمد شاہی یا واجد علی شاہی دور نہیں۔ اس حال سے تو ہم اتنا عرصہ نجات پانے کے لئے کوشاں رہے ہیں اور بدستور خوب سے خوب تر کی طرف اقدام کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ ہمیں اس حقیقت پر غور کرنا ہے کہ "مقبول عوام نہجِ زندگی" عوام کے احساسات و جذبات، ان کی آرزوئیں، ان کی حسرتیں، ان کے افکار؟ ہیں کیا؟ اگر عوام سے مراد کوئی خاص گروہ نہیں تو وہ آبادی جو اسّی نوّے فیصدی ملک کی ہے اور زیادہ تر دیہاتوں میں آباد ہے، اس کے احساسات و جذبات، اس کی آرزوئیں، اس کی حسرتیں، اس کے افکار، تو صرف یہ ہیں کہ ایسی زندگی بسر کی جائے جو انسان کے شایانِ شان ہو، اس میں معاشرے کی رسوا کن خرابیاں نہ ہوں۔ سب خوش ہوں، خوشحال ہوں اور سب کو اطمینان میسر ہو۔ یہی "مقبول عوام نہجِ زندگی" ہے۔ جن پہلوؤں کا تذکرہ فاضل مضمون نگار نے ان کے مضامین کی فہرست پیش کر کے کیا ہے۔ ان کا سرسری جائزہ لیجئے :۔

مسلمان بلکہ انسان ہونے کی حیثیت سے : نبی کریمؐ کی تعلیم کے بنیادی عناصر کو از سرِ نو یاد دلانا۔

نئی مملکت پاکستان کے باشندے ہونے کی حیثیت سے : قائدِ اعظم محمد علی جناح بانئ پاکستان کی انتھک جدوجہد اور عزم و حوصلہ کی یاد تازہ رکھنا۔

زندہ قوم و ملت کی حیثیت سے : نئی مملکت کی اصلی تعمیر کے لئے فقہ جدید (قانونِ حیات) کی ضرورت کو محسوس کرنا اور اس کی تشکیل و تدوین۔

صاحبِ فکر امت کی حیثیت سے : اسلام اور فطرت سے مطابقت پذیری کے نکات کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی۔

فلسفۂ اخلاق کے حامل کی حیثیت سے : بھگوت گیتا اور اس کے فلسفۂ اخلاق (بلکہ دنیا کے دوسرے تمام فلسفوں) کا جائزہ۔

تحریکِ آزادی سے تازہ تازہ گذرنے والی قوم کی حیثیت سے : عہدِ حاضر کی ایک طاقتور مملکت امریکہ کی تحریکِ آزادی اور اس کے نشیب و فراز پر نظر رکھنا۔

اخلاقیات اور معاشرۂ انسانی کا ایک نظام رکھنے والی قوم کی حیثیت سے : صرف مریض ہی نہیں، ہر فرد کے "اکرام" کے متعلق مسائل و امور سے باخبری۔

جمال پسندی کے ایک خصوصی نقطۂ نظر رکھنے والے کی حیثیت سے : اسلام اور موسیقی یا قرآن حکیم اور حُسن جیسے مباحث کا صحیح فہم پیدا کرنا۔

اقوامِ عالم اور سیاسیاتِ عالم سے مربوط ہونے کی حیثیت سے : ایڈن، معرکۂ سویز اور اقوامِ متحدہ جیسے مسائل سے آگاہ رہنا اور ان پر غور کرنا۔

پاکستان ایک جمہوریہ ہے اس لئے : دنیا میں کسی نئے ملک یا نئی مملکت یا جمہوریت کے وجود میں آنے کی تفصیلی اور ضروری اطلاع رکھنا۔

پاکستان امریکی امداد لیتا ہے اس لئے : امریکن امداد کے تمام اچھے برے پہلوؤں کو سوچنا سمجھنا۔

زمانہ سائنس کا ہے اور ہم سائنس سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اس لئے : سائنس کے سرو سامان یا بے سرو سامانی کا علم رکھنا۔

کھیل ایک فطری جذبہ ہے اس لئے : اولمپک یا دوسرے تاریخی مقامی یا غیر مقامی کھیلوں کا تذکرہ، اُن کے احوال سننا، ان سے دلچسپی لینا۔

ان میں سے کونسا موضوع ایسا ہے جو سرزمین پاکستان کی قوم و ملت سے بے تعلق ہو اور وہ بھی اس قدر کہ ان پر تعجب دامنگیر ہو گیا؟ بلکہ قوم و ملک کے ذہن و فکر کی از سر نو تعمیر کرنے والوں کے نزدیک تو انتہائی تعجب خیز بات یہ ہو گی کہ ان باتوں پر کوئی شخص چونک بھی پڑا۔ حالانکہ ویسے بھی بے خبری سے خبر، اور بے علمی سے علم بہر صورت بہتر اور سود مند ہے، چہ جائیکہ وہ علوم اور مباحث و مسائل جن سے بالواسطہ یا بلاواسطہ واقعی ہمارا تعلق ہو۔

ہو سکتا ہے کہ "یحییٰ منیری نے اُردو فالنامے"، "روزی کے دو درویش"، "اردو کی دو مقبول مثنویاں"، "ہمارے صحرائی نغمے" (مغربی پاکستان کے دیہاتی گیت)، "اور خوشبو" وغیرہ کسی کے نزدیک غیر ضروری چیزیں ہوں لیکن یہ بھی ضروری نہیں کہ وہ واقعۃً ایسی ہوں۔ یہ کسی فرد کی رائے ہو سکتی ہے، اور اس رائے کے علی الرغم کہ "عوامانہ رجحانات" سے ان کو کیا تعلق؟ ـــــ ان مسائل کا تعلق بھی عوام ہی سے ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ مضمون کے ذہن میں "عوام اور عوام کے رجحانات" ان کے جذبات مسرت و غم، احساسات، ان کی آرزوؤں، ان کی حسرتوں، ان کے افکار وغیرہ کا کوئی واضح تصور موجود نہیں۔ علاوہ بریں جن لوگوں کے ہاتھوں میں یہ مجلات پہنچتے ہیں (یعنی ماہنامہ 'ثقافت' لاہور۔ ہفتہ وار 'لیل و نہار' لاہور، 'نئی قدریں' حیدرآباد اور 'ماہِ نو' کراچی) وہ پڑھے لکھے لوگ ہیں، جو کسی نہ کسی حد تک دنیا کے مسائل، مختلف فلسفوں اور نظریات سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے لئے یہ مضامین کسی لحاظ سے بھی بے محل نہیں۔ اپنی قوم کے تمام طبقوں کو علم شناس کرنا ہمارا فرض ہے۔ خالص ثقافتی مجلّوں سے قطع نظر "پاک سرزمین" جیسے مقصدی رسائل بھی طرح طرح کی تصویروں اور کہانیوں سے اہلِ دیہات میں ذوقِ علم پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اگرچہ کروڑوں افراد کو دولتِ علم سے مالا مال کرنے کے لئے تو قوم کی پوری مشینری کو کسی غیر معمولی پروگرام کے ساتھ حرکت میں آنا چاہیئے لیکن جو تھوڑے بہت علم شناس موجود ہوں۔ ان کے سامنے بھی علم کے چھوٹے بڑے مسائل کو علمی انداز پر نہ رکھا جائے، یہ بہت خطرناک تجویز ہے۔

کسی قوم میں تعمیری کام کرنے والے کم ہی ہوتے ہیں اور ان کے لئے بھی الگ الگ شعبے ہیں۔ ہر شعبہ اپنا علیحدہ ایک دائرہ رکھتا ہے، انہیں دائروں میں سے ایک اخبارات اور رسائل کا ہے۔ پھر ان میں بھی اخبارات کی زبان و بیان الگ اور رسائل میں علمی تحقیقی اور ادبی و فنی رسالوں کی زبان و بیان کا انداز جداگانہ ہوا کرتا ہے، یہ سچ ہے کہ ادب زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں لیکن اسی بنیاد پر سائنس بھی ادب میں داخل ہے، لہٰذا سائنس کے رسالہ میں اپنی اصطلاحات اور اپنے خصوصی تیور ہوں گے لیکن اگر کوئی یہ کہہ اٹھے کہ "عوامانہ رجحانات" سے اس کو کیا تعلق؟ تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ تحقیق زندہ قوموں کے اہم کارناموں میں سے ایک ہے اور زندگی و ادب کے حلقے سے یہ بھی الگ نہیں ہے، لیکن کیا خبر اس کو بھی تضیعِ اوقات قرار دیدیا جائے، یہ کہہ دیا جائے کہ عوام سے اس کا کیا واسطہ؟ " ان مضامین کو دیکھو تو معلوم نہیں ہوتا کہ سرزمین پاکستان سے ہمارا تعلق ہے:" اس لئے کہ ان میں سرزمین پاکستان سے باہر کے تذکرے ہیں۔ تو پھر کل کو صرف اس بنیاد پر کہ ہم کرۂ ارضی کے باشندے ہیں، آسمانوں کی باتیں، ہیئت، افلاک کی باتیں بھی نہیں ہونی چاہئیں۔ آئن اسٹائن اگر اس قسم کی باتیں کرتا تھا تو اس کی بات سمجھ میں بھی آتی ہے کہ وہ یہودی تھا، صدیوں سے بے وطن تھا۔ اس کی زبان سے اِدھر اُدھر یا آسمان و زمین کی باتیں جو ایک حد تک ٹھیک بھی تھیں کہ گردش نصیب تھا اور اس لئے آوارہ خیال بھی۔ مگر ہماری جڑیں تو زمین میں گڑی ہوئی ہیں۔ درختوں کی طرح اُگے، بڑھے، لہلہائے، جھومے اور پھر مرجھا کے اسی زمین میں گم ہو گئے۔ اس لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں کہ ہم اسی دنیا اور اس کے معاملات کا ذکر کریں جس کے ساتھ ہمارا دامن وابستہ ہے۔

ماہِ نو، کراچی۔ نومبر ۱۹۵۸ء

مذاکرہ:

تنگنائے غزل

* ڈاکٹر تاثیر مرحوم
* حجاب امتیاز علی
* مقبول نقش

ڈاکٹر تاثیر مرحوم:

صرف ایک لفظ، ایک فقرہ، زیادہ سے زیادہ ایک مصرع بجائے خود پوری نظم ہو۔ یہ تھی ہمارے معاصر علامتی مشرب (SYMBOLISM) کے حامی فرانسیسی شاعروں کی دلی تمنا جو شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکی۔ وہ ایک ایسی صنفِ سخن نہ پیدا کرسکے جو فیضان کی جستہ جستہ، پارہ پارہ، آنی جانی اڑانوں یا یوں کہیئے ایکا ایکی لپک لپک اٹھنے والی جھلکیوں کی متحمل ہوسکے اور شعور و احساس کی لہروں کو ایک بہتی ندی کے روپ میں ڈھال دے۔ ان کی زبان کی صلاحیتیں غزل سے بالکل بے خبر تھیں جو فارسی اور اُردو کی مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔

غزل کیا ہے؟ ایک ایسی ترتیب جو ہم قافیہ ابیات پر مشتمل ہو، اور جس کا ہر شعر مستقل بالذات اکائی ہو۔ اس میں اشعار کا باہمی ربط صوتی ہے معنوی نہیں۔ ہر شعر ایک ہی تاثر کا آئینہ دار ہوتا ہے جس کو گوناگوں پریشاں اور درہم برہم احساسات و ارتسامات کے طومار میں سے منتخب کرلیا جاتا ہے اس میں جمالیاتی تجربے کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے جس سے "شدت" پیدا ہونا لازم ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تازہ بہ تازہ، نو بہ نو خیالات کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے، جو ہر ہر شعر میں بدلتا رہتا ہے۔ خیالات کی نیرنگی کے ساتھ ہی ساتھ غزل ہر ہر قدم پر بدلتی ہوئی ترتیب قوافی کی متقاضی بھی ہوتی ہے۔ مگر یہ تبدیلی بالکل اجنبی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ نفسیات کی ایک کتاب میں تحریر ہے: "اگر ننانوے ۹۹ انوکھی چیزوں کے ہجوم میں کوئی انوکھی چیز رکھ دی جائے تو وہ اپنی طرف توجہ نہیں کھینچتی۔ کیونکہ کوئی وجہ نہیں ہم ایک کی جگہ دوسری چیز کو چنیں۔ اس کے برعکس ننانوے انوکھی چیزوں میں ایک مانوس چیز ضرور ممیز اور جاذب نظر معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر بات کچھ الٹی سی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہاں مانوس ہونا کچھ انوکھا یا کم از کم نادر معلوم ہوتا ہے۔" اس طرح نئے الفاظ کی سنگت میں صرف قافیہ کا لفظ ہی نمایاں ہوتا ہے۔ اگرچہ شعر کی طرح ہر قافیہ مانوس نظر آتا ہے لیکن ہر جگہ ایک ہی لفظ نہیں دہرایا جاتا۔ اس لئے "اب کیا ہوگا؟ اب کیا ہوگا؟" کا انتظار ڈرامائی اشتیاق کے اس احساس کو خوب بڑھا دیتا ہے جو بدل بدل کر آنے والے قافیے اپنے جلو میں لاتے ہیں۔

گو خیالات اور قافیے بدلتے رہتے ہیں لیکن غزل کی مجموعی صوتی وضع تکرار ہی پر مبنی ہے۔ یہ تینوں عنصر ——— شدت، ندرت اور تکرار جنھیں علم النفس کی ابتدائی کتابوں میں بھی "توجہ کے اصول" قرار دیا گیا ہے یعنی وہ اوصاف جو انجذابِ توجہ کا باعث ہوتے ہیں۔ غزل کو ایک ایسی صنف بنا دیتے ہیں جس سے اس کا نقش ذہن پر پوری طرح جم جاتا ہے۔ صورت کی طرح معنی میں بھی یہ صنف تجربے کی لمحہ بہ لمحہ دم بہ دم بدلتی، اچانک نت نئے روپ دھارتی افتادوں کی نمائندگی کرتی ہے۔

غزل کی ان منفرد خصوصیات کے ثبوت میں حافظ شیراز کا کلام پیش کیا جاسکتا ہے جن کو قرون وسطیٰ میں اس کی بہترین نمائندگی کا شرف حاصل ہے، اور جن کی غزلیات نے گوئٹے کو ۱۸۱۴ء میں "دیوان شرق و غرب" ترتیب دینے کی تحریک دلائی۔ ہائنا اس دیوان کو "مغرب کی طرف سے مشرق کو گلدستۂ عقیدت قرار دیتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مغرب اپنی سطحی اور خنک روحانیت سے تنگ آکر مشرق کے توانا و تندرست سینے سے حرارت کا متلاشی ہے"۔ گوئٹے نے چند غزلیں اس صنف کی مخصوص ہیئت اور ردیف و قافیہ کے التزام سے لکھیں، اور اس کے بعد کئی اور جرمن شاعروں نے اس "تحریکِ مشرق" میں بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیا۔ روکرٹ (۱۷۸۶–۱۸۲۲ء) اور پلےٹن (۱۷۹۶ – ۱۸۳۵ء) نے مشرقی اوزان میں غزلیں لکھیں اور ویسے ہی استعارے اور نازک خیالیاں بھی برتیں جیسی کہ ہم آجکل برتتے ہیں۔ دورِ جدید میں غزل کی صلاحیتوں کی نمائندگی اقبالؔ کرتے ہیں جنھوں نے "دیوان مغرب" کے جواب میں "پیامِ مشرق" تحریر کیا۔ یہ مشرق کی طرف سے مغرب کو

ایک رنگین گلدستہ ہے اور اس مجموعہ میں غزل جو ہائنا کو محلسراؤں اور حرم کی یاد دلاتی تھی، ایک نئی روح کے ساتھ جلوہ گر ہوئی، اور یہ بدستور ایک گلدستہ ہی رہی۔ ہر پھول اپنا ہی جداگانہ رنگ، روپ اور وضع قطع رکھتا ہے اور جو دھاگا ان سب کو یکجا باندھتا ہے وہ کچھ اور ہی قسم کا ہے۔ آہنگ اب بھی تاثر اور طبعی میلان ہی کا ہے منطق کا نہیں جیسے حافظ اور عہد سلف کے دوسرے ممتاز غزل گوؤں کے کلام میں حواس مدہوش ہو جاتے ہیں اور قاری کا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ وہاں اقبال کی غزلیں انسان کو خواب غفلت سے جگا کر عمل پر آمادہ کرتی ہیں۔ شاعر نے نئے موضوعات، مضامین اور تصورات سے 'جو ایک نئی قوم یعنی ملت پاکستان کی خواہشوں، تمناؤں اور مقاصد کی عکاسی کرتے ہیں' غزل کی قدیم صنف میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ یہاں تک کہ گھسے پٹے استعارات میں بھی نئی توانائی پیدا کر دی ہے۔ گل و بلبل، ساقی و مے خانہ، صیاد و غزال دیکھنے میں تو وہی ہیں لیکن ان میں ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی ہے۔ اس طرح اقبال نے ہماری ساری شاعری کا نظام اقدار ہی بدل ڈالا ہے۔ انہوں نے اس میں نئی معنویت کی جوت جگائی ہے۔ کیا خوب فرماتے ہیں ؎

دگرگوں ہے جہاں تاروں کی گردش تیز ہے ساقی
دل ہر ذرہ میں غوغائے رستاخیز ہے ساقی

یہاں مجرد قافیہ —— "تیز، رستاخیز، تبریز" پر مبنی ہیئت غزل کی مخصوص وضع کی آئینہ دار ہے۔ شعر کی ردیف یعنی مکرر آنے والے معین الفاظ "ہے ساقی" کا آہنگ نازک اور قافیہ کے مقابلہ میں نسبتۂ مدھم ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہے، جامع ہے۔ لیکن ساری غزل کا تاثر ایک ہی ہے۔ شدت، ندرت اور تکرار —— سحر کلام کے سبھی عناصر موجود ہیں۔ جو دل پر ایک گہرا، پائدار نقش چھوڑتے ہیں۔ ساقی کا فرسودہ استعارہ کسی اور ہی مقصد کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ شاعر اس مے کا متلاشی نہیں جس سے دل و دماغ نشے میں ڈوب کر رہ جائیں۔ وہ اشرافی دور کی غفلت و غلامی کے ان جانکاہ امراض کو نیست و نابود کرنے کا خواہاں ہے جو صدہا سال سے مسلمانان مشرق کے زوال و انحطاط کا باعث رہے ہیں۔ اب ہم ایک دور انقلاب میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہمارے سامنے عظیم الشان امکانات کا ایک وسیع سلسلہ ہے۔ آیئے ہم قرون وسطیٰ کے اسلام سے ایمان و ہیجان کا بادۂ سرجوش نوش کریں۔ یہ ہے اقبال کا حیات افروز پیغام۔

ایک اور غزل سے اقبال کی روش اور بھی واضح ہو جائے گی؛

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر

یوں تو اس غزل کا ہر شعر الگ ہے لیکن درحقیقت یہ ایک ہی سلسلۂ فکر کی کڑی ہے یعنی یہ اقبال کے فلسفۂ حیات کے مختلف پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہے۔ بجلی، جلوت، سینا، ملائیں، رباب، نے خانہ تمام ایسی علامات ہیں یا استعارات ہیں جو ہمارے یہاں برسوں سے مروج ہیں۔ قدیم غزلیہ شاعری کی طرح وہ محض ذاتی اور عشقیہ قدریں کی نمائندگی نہیں کرتے۔ یہ سب ایک ملت کے رنج و غم، آفات و مصائب، شادمانی و کامرانی کے آئینہ دار ہیں۔ ان کی فضا حرم کی فضا نہیں۔ یہ ایک بھرپور زندگی کی "جلوت" ہے۔ قافیہ کے ساتھ ساتھ ہر شعر میں خیالات بھی بدلتے جاتے ہیں، اور ردیف برابر اپنی وضع برقرار رکھتی ہے۔

اقبال کے افکار کی فلسفیانہ ہم آہنگی ان کی غزلیات کو، جو متفرق اشعار ہی سے مرتب ہوتی ہیں، ایک مربوط غنائیہ بنا دیتی ہیں۔ اس سے پہلے غزل کو اس انداز سے کسی نے نہیں برتا۔ اقبال نے پاکستان کی شاعری کا زمین آسمان ہی بدل ڈالا ہے، اس میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ چنانچہ غزل جس کو کبھی باہم دگر مربوط کیفیات و افکار کی ترجمانی کے لئے ناکافی سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے شعراء اس کو حیات تازہ عطا کرنے کی سعی بلیغ کر رہے ہیں ◦ (ترجمہ)

حجاب امتیاز علی:

اگست ۵۸ء کے "ماہ نو" میں جناب جوش ملیح آبادی کا ایک مضمون "تنگنائے غزل" میری نظر سے گذرا۔ مجھے اس مضمون میں چند باتیں ایسی نظر آئیں جو گہری نظر ڈالنے کے بعد صحیح معلوم نہیں ہوئیں۔ چنانچہ یہ چند سطور لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

جوش صاحب نے غزل اور غزل گو پر چند اعتراضات کئے ہیں:۔

"غزل گو خود اپنی ذات سے مخلصانہ برتاؤ کرتا ہے یا نہیں کرتا؟ مثال کے طور پر ریاض خیرآبادی کو لے لیجئے۔ تمام دنیا جانتی ہے کہ ریاض نے عمر میں شراب کا ایک قطرہ بھی کبھی نہیں چکھا تھا جس کے یہ معنی ہیں اور اس کے سوا دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ ریاض کا کلام ان کی سیرت کا آئینہ دار نہیں بلکہ ان کی سیرت کے قطعی برعکس واقع ہوا ہے۔"

ماہِ نو، کراچی۔ نومبر ۱۹۵۵ء

جوش صاحب کو یہاں غلط فہمی ہوئی ہے۔ جس کردار کو وہ ریاض خیرآبادی کی سیرت کا قطعی برعکس قرار دے رہے ہیں وہ فی الحقیقت شاعر کا مخفی کردار ہے۔ جسے اس نے روزمرہ کی محفلی زندگی میں ثقافت و تہذیب کے دبیز پردوں میں چھپا رکھا تھا۔ اندر وہ وہی کچھ تھے جس کا ذکر بار بار انہوں نے اپنی غزلوں میں تمنائی طور پر کیا۔ یہ شاعر کی وہ مدفون خواہشیں اور تمنائیں ہیں جن کا اظہار اگر وہ اپنے فن میں نہ کرتا تو جذبات کی شدت کو برداشت نہ کرسکتے ہوئے کسی دن یا تو خودکشی کرلیتا یا کم از کم بیمار پڑ جاتا، یا پھر وہ سوسائٹی کے لئے خطرناک مجرم ثابت ہوتا۔

یہ زمانہ سطحیت کا نہیں بلکہ گہرائیوں کا زمانہ ہے۔ ہر چیز اور ہر انسانی جذبہ ان دنوں منطق اور علم کے ترازو میں تلتا ہے۔ آج کا نقاد کسی فنکار یا مصنف کے ظاہری کردار کو نہیں دیکھتا بلکہ تنقید سے پہلے اس کی پوشیدہ شخصیت کو اس کے فن یا اس کے ادب میں سے ڈھونڈھ نکالتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید سوانح نگاری بھی اب بالکل بدل چکی ہے۔ اس میں مصنف یا شاعر یا مصور کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات اور تاریخ شادی یا اس کی اولاد کی تعداد کو اہمیت نہیں دی جاتی جیسا پہلے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ آج کا سوانح نگار یا نقاد مصنف یا شاعر یا مصور کے ادب یا اس کے فن کو پرکھتا اور اس پر اظہار خیال کرتا ہے۔ اسی لئے اگر امیر مینائی بقول حضرت جوش ایک متقی و پرہیزگار بزرگ تھے اور ان کی شاعری ان کے اس تقویٰ کی چغلی کھاتی ہے اور ان کی ظاہری سیرت کے بالکل برعکس بے حیائی اور جذباتیت سے معمور ہے تو یہ کوئی خلافِ فطرت یا تعجب انگیز بات نہیں بلکہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہے۔ آدمی اپنی اصلیت سے ہمیشہ گھبراتا اور اس سے فرار چاہتا ہے۔ اس کی مثال انسانی جذبات کے عظیم کھوجی فرائڈ نے اس طرح دی ہے کہ اندھیرے کمرے کے ایک گوشے میں اگر بلی بیٹھی ہو اور بچہ اس سے ڈرتا ہو تو جس گوشے میں بلی کا خطرہ ہوگا بچہ اس طرف سے منہ موڑ کر مقابل کے گوشے کو تکنا شروع کردے گا۔ بالکل اسی طرح ہم ساری عمر اپنے جذباتی ردعمل میں لگے رہتے ہیں۔ یہ انسانی فطرت کی بہت پرانی ٹکنیک ہے۔

اگر جوش صاحب کو غزل پر صرف یہی سب سے بڑا اعتراض ہے کہ وہ شاعر کی ظاہری سیرت کی آئینہ داری نہیں کرتی تو یہ تو اور بھی مزے کی بات ہے کہ وہ شاعر کی پوشیدہ اور چھپی ڈھکی شخصیت کو اپنی لاابالیت کے بہانے باہر لے آتی اور طشت از بام کرتی ہے۔ اور ہمیں اس کی مدفون آرزوؤں سے روشناس کردیتی ہے۔ یہ کیا کچھ کم بات ہے؟ جی چاہتا ہے کہوں غزل زندہ باد!!

دوسرا اعتراض غزل پر یہ کیا گیا ہے کہ اس کے ہر شعر میں ایک نیا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے غزل کی دلکشی بہت کچھ اپنی اسی خصوصیت پر موقوف ہے۔ دلکشی کے علاوہ وہ شاعر کے جذبات کو بغیر کسی حجاب یا تصنع یا رکاوٹ کے بےتکلفی اور روانی کے ساتھ ظاہر کردیتی ہے۔ اس بےنظم اندازِ گفتگو کی ٹکنیک کو تجزیۂ نفس کے علما "فری ایسوسی ایشن" کہتے ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ انسان بغیر کسی جذباتی دباؤ یا مصنوعی اندیشے اور تکلف کے جو کچھ بھی ذہن میں آئے بلا تامل خلوصِ دل سے بولتا چلا جائے۔ سننے والا معالج یا نقاد اس کے جذبات کے اس بہتے دریا سے اس کی چھپی ہوئی اصلی شخصیت کے موتی کھینچ کر باہر نکال لاتا ہے۔

میں جو کچھ کہنا چاہتی تھی وہ کہہ چکی اور میرا مضمون ختم ہوگیا مگر اس کے اختتام پر مجھے غالب کی وہ جادو بھری لاجواب غزل بے اختیار یاد آرہی ہے جو اپنے حسن، دلکشی اور رعنائی کی مثال نہیں رکھتی ؎

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا — دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی — کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ — سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

اس غزل کا ایک ایک شعر اور شعر کا ایک ایک مصرع اس قابل ہے کہ اگر آپ کے پاس سچے موتی ہوں تو ان کے ساتھ تولا جائے۔ دیوانِ حافظ یا دیوانِ غالب پڑھنے کے بعد کون حسن پرست غزل کی مخالفت کرسکتا ہے! بجز اُن کے جو آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں!

ماہ نو، کراچی۔ نومبر ۱۹۷۰ء

مقبول نقش:

جوش صاحب کا اردو ادب میں جو مقام ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اُن سے یہ توقع غلط نہیں کہ وہ اردو شاعری یا اس کے کسی حصے سے متعلق جب بھی کوئی بات کہیں گے، تو وہ سوچی سمجھی، ٹھوس اور وزنی ہوگی۔ کیونکہ اردو شاعری سے ان کی وابستگی اور اس سے متعلق ان کا علم، ان کا مطالعہ و مشاہدہ کچھ ایک دو دن کی بات نہیں ہے نصف صدی کا قصہ ہے!

لیکن مضمون پڑھ چکنے کے بعد اندازہ ہوا کہ یہ رائے قطعی خوش فہمی پر مبنی تھی۔ کیونکہ صاحبِ مضمون نے صنفِ غزل کی تنگ دامانی پر گفتگو کرنے یا اس کی وسعت پر غور فرمانے کی بجائے صرف امیر مینائی اور ریاض خیر آبادی کے رندانہ اور عشقیہ مضامین کے ذکر ہی کو کافی سمجھا اور بیک جنبشِ قلم غزل کو غیر ضروری صنفِ کلام اور غزل گو کو غزلباف بنا کر رکھ دیا۔

اصولاً چاہئے تو یہ کہ جب بھی ہم کسی ایسے مسئلے پر غور کرنے لگیں، جس کا تعلق کسی رخ سے بھی ہماری تہذیب و تمدن اور معاشرت سے ہو، تو اسوا اور باتوں کے سنجیدگی اور خلوص کو بھی شرطِ اولین سمجھیں اور تخریبی پہلوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے تعمیری امکانات پر زیادہ سے زیادہ زور دیں۔ مگر نہ جانے کیوں جوش صاحب کو شروع سے لیکر آج تک تمام غزل گو شعراء کے یہاں صرف قنوطیت، زنانِ بازاری کے عشق اور عشقِ مجازی کی شراب میں کوثرِ تصوف کی آمیزش کے سوا کچھ نہ ملا، اور نہ کسی کے یہاں سیاسی، معاشری بحرانوں اور مناظرِ قدرت کا اثر ہی نظر آیا، اور اگر آج کل چند سیاسی یا مناظری غزلیں، نظر بھی آ رہی ہیں تو انھیں وہ سرے سے غزل ماننے ہی کو تیار نہیں۔ وجہ شاید یہ ہو کہ قدمار نے غزل کی جو تعریف (عورت سے بات چیت) بتائی ہے، اس کے پیش نظر غزل کسی بھی نئے زاویۂ فکر و نظر کی متحمل نہیں۔ اگر یہی وجہ ہے تو یہ غزل کے ساتھ صریحاً ظلم ہے۔ جب بیشتر اصنافِ سخن میں رد و بدل سے کام لیا جا رہا ہے اور نئے نئے تجربے ہو رہے ہیں تو کیوں نہ غزل بھی اپنی قدیم تعریف کے زندانِ تنگ و تاریک سے باہر نکل کر کھلی ہواؤں میں سانس لے؟ نئے موضوعات کو جذب کرنے، بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دینے اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے غزل بھی اتنی ہی موزوں ہے جتنی کہ نظم، رباعی یا دوسری صنفیں ——— غزل کو زندگی اور وقت سے ہم آہنگ کرنے کے لئے جو کوششیں کی گئیں اور کی جا رہی ہیں، جوش صاحب کی نظر میں شاید ان کی کوئی اہمیت نہیں۔

قطع نظر اس سے کہ اب تک غزل میں کس قسم کے مضامین نظم ہوتے رہے، ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ صنفِ غزل ہماری شاعری کے لئے ضروری ہے یا غیر ضروری، سودمند ہے یا نقصان دہ۔ میری نظر میں تو غزل کی صنف بذاتِ خود نہ اچھی ہے نہ بُری۔ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے ایک خطۂ زمین۔ اب اس میں کوئی پھول اگائے یا کانٹے بوئے۔ یہ تو اپنی اپنی حیثیت اور توفیق کی بات ہے۔ اگر مکیں بُرے ہیں تو مکان ہی ڈھا دیا جائے، یہ منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں تو صنفِ غزل کو بھی اتنا ہی اہم سمجھتا ہوں جتنا کہ اور اصنافِ سخن کو۔

ہر زمانے کا فنکار اپنے ماحول، معاشرے اور رجحانات کی نمائندگی کرتا رہا۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ نقال بھی پائے جاتے ہیں جنھیں ہم مستثنیٰ قرار دے سکتے ہیں۔ فنکار بھی آخر ایک جیتا جاگتا انسان ہی ہوتا ہے اور تمام انسانی خصوصیات کا حامل۔ وہی حواسِ خمسہ کی بھق آسا لہریں، وہی داخلی و خارجی اثرات، وہی شعور و لاشعور کی دھوپ چھاؤں اور وہی ان سب کا ردِ عمل ——— اور آج بھی یہی ہو رہا ہے۔ کیا عہدِ حاضر کا فنکار، وقت کا ساتھ نہیں دے رہا ہے؟ قدم بہ قدم، شانہ بہ شانہ نہ سہی وقت کے پیچھے پیچھے ہی سہی، منزل کی طرف بڑھ تو رہا ہے۔

ہمیں گزشتہ ادوار کے شعراء کے کلام کا جائزہ لیتے وقت اُن کے زمانے، ماحول، معاشرے، ذہنی ارتقا، اور محدود موضوعات کو بھی مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ اس کے بغیر کوئی بھی ناقد دیانتداری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ صنفِ غزل اگر واقعی اتنی ہی ناکارہ اور مہمل ہوتی تو مخالفت کی تند و تیز ہوائیں، آج سے بہت پہلے اس کی دھجیاں اڑا چکی ہوتیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ غزل اسی طرح سینہ تانے بلکہ اور زیادہ سربلندی کے ساتھ آج بھی میدان میں کھڑی ہے۔ اس کے ثبوت میں غزل کے ہزاروں اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مگر طوالت کے خیال سے چند شعروں پر اکتفا کرنا ہی مناسب ہے:۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا ——— حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

اے موجِ بلا ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے ——— کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

وہ بات، سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا ——— وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

کیسی خوشی ہے لالہ و سرو و سمن میں ہے ——— غارت گرِ چمن تو ابھی تک چمن میں ہے

ان اشعار کا جس صنفِ سخن سے تعلق ہو، کیا وہ صنفِ سخن کسی طرح بھی غیر فطری کہی جاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہر وہ ناقد جس کا انصاف پسندی سے ذرا سا بھی تعلق ہو، میرے اس خیال کی تائید کر سکتا ہے۔ جوشؔ صاحب اپنے مزاج اور افتادِ طبع سے کسی حد تک مجبور بھی ہیں۔ توڑ، پھوڑ، گھن گرج اور لہجے کی کرختگی اگر ان کی شخصیت کوئی چیز ہے تو یہی اور صرف یہی "افتادِ طبع اور مخصوص مزاج"۔ زیرِ بحث مضمون میں بھی ان کی شخصیت اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہی لہجے کی کرختگی، وہی دوسروں کی تذلیل و تضحیک اور وہی توڑ پھوڑ۔

اہلِ فکر و نظر اچھی طرح جانتے ہیں کہ علم و حلم، تدبر و تحمل اور مکمل تعمیری پروگرام کے بغیر کوئی فنکار صرف ایسی ہی خصوصیات کے سہارے کوئی عظیم اور آفاقی تخلیق پیش کر ہی نہیں سکتا۔

"تنگنائے غزل" میں جو چیز زیادہ وضاحت کے ساتھ پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ غزل گو شعرائے کے وہ خیالات و جذبات، جن کا تعلق ان کے ذاتی تجربات سے نہیں ہے، جوشؔ صاحب کی نظر میں قطعی لغو، مہمل اور نقالی پر مبنی ہیں۔ اور حقیقتاً یہ درست بھی ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ موصوف بجائے ان خیالات و جذبات کو غیر فطری کہنے کے صنفِ غزل کو غیر فطری قرار دیتے ہیں۔

اگر مذکورۂ بالا اسباب کے پیشِ نظر صنفِ غزل غیر فطری کہی جاسکتی ہے تو دوسری اصنافِ سخن کو کیا کہئے گا۔ جوشؔ صاحب فرماتے ہیں: "نارمل حالات میں نفسِ انسانی پر وقتِ واحد میں جذبۂ واحد ہی طاری ہو سکتا ہے"۔ اس جملے کا فلسفیانہ اندازِ بیان مسلّم، مگر "وقتِ واحد" سے ان کی مراد، کتنا وقفہ، کتنی مدت ہے۔ جب تک یہ نہ بتایا جائے، بات صاف نہیں ہوتی اور نہ یہی چیز سمجھ میں آتی ہے کہ وقتِ واحد میں غزل کا اپنے مختلف و متضاد مضامین کے ساتھ نظم ہو جانا ہی اس کے غیر فطری ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

غزل چند گھنٹوں میں بھی مکمل ہو سکتی ہے اور کئی دنوں میں بھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ غزل کے تمام اشعار ایک ہی مسلسل خیال کے تحت کبھی نظم نہیں ہوتے۔ بلکہ ہر شعر کے بعد سلسلۂ خیال منقطع ہو جاتا ہے، اور دوسرے شعر کے لئے شاعر کو از سرِ نو ایک اور خیال کی بنیاد رکھ کر غور کرنا پڑتا ہے، اور یہی عمل غزل کے ختم ہونے تک جاری رہتا ہے۔ اب آپ وقتِ واحد کا اطلاق شعر پر کریں یا غزل پر، بہرحال غزل میں مختلف و متضاد جذبات و خیالات کا نظم ہونا کوئی ایسی بات نہیں جس کے پیشِ نظر ہم صنفِ غزل کو غیر فطری کہہ دیں، اور یہ "نارمل حالات" والی بات بھی برائے بیت ہی ہے، ورنہ حقیقت کچھ بھی نہیں۔ سالنامہ "ہمایوں" ۱۹۵۸ء میں جناب جاوید اقبال کا ایک مضمون "اقبال باپ کی حیثیت سے" شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"گرمیوں میں وہ (علامہ اقبال) باہر ہوتے اور میری چارپائی ان کے قریب ہوا کرتی۔ رات گئے تک وہ جاگتے رہتے، کیونکہ انہیں عموماً رات کو تکلیف ہوتی تھی، اور جب شعر کی آمد ہوتی تو ان کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو جایا کرتی، چہرے پر تغیر رونما ہو جاتا، بستر پر کروٹیں بدلتے، کبھی اٹھ کر بیٹھ جاتے، اور کبھی گھٹنوں میں سر دے دیتے۔ اکثر اوقات وہ رات کے دو یا تین بجے علی بخش کو تالی بجا کر بلاتے اور اسے اپنی بیاض اور قلم دوات لانے کو کہتے۔ جب وہ لے آتا تو اس پر اشعار لکھ دیتے، اشعار لکھ چکنے کے بعد ان کے چہرے پر آہستہ آہستہ سکون کے آثار نمودار ہو جاتے، اور وہ آرام سے لیٹ جایا کرتے"۔

اس اقتباس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شاعر پر فکرِ سخن کے وقت، غیر نارمل حالت بھی طاری ہو سکتی ہے۔ اور یوں بھی شعر کہتے وقت شاعر کا استغراق و انہماک اور ماحول سے بے خبری خاصی مشہور اور رسوائے زمانہ چیزیں ہیں۔ کیا نارمل حالات کی یہی علامتیں ہوتی ہیں؟

بات دراصل یہ ہے کہ جوشؔ صاحب شروع ہی سے غزل سے منحرف رہے ہیں؟ کچھ غزلیں کہی بھی ہیں تو محض خانہ پُری کے لئے، ورنہ اس صنف سے کبھی بھی کوئی خاص تعلق نہیں رہا۔ غیر مجرد تعلق۔ ویسے غزل کو ضرور دلچسپی سے پڑھا اور سنا ہوگا۔ دریافت طلب بات یہ ہے کہ باوجود اس مجرد تعلق غزل کے صنفِ غزل سے متعلق مضمون لکھ کر، موصوف نے خود اپنی ذات سے کس حد تک مخلصانہ برتاؤ کیا ہے؟ اور کیا اسی نوع کا سوال "شاہنامہ" کے پیشِ نظر فردوسی کے متعلق نہیں کیا جاسکتا؟ صاحبِ مضمون کے اس مجرد تعلق والے دلچسپ فارمولے کا اطلاق نہ صرف غزل گوؤں پر، بلکہ دوسری اصنافِ سخن سے تعلق رکھنے والے شعراء اور ان کے ساتھ نثر نگار حضرات پر بھی ہو سکتا ہے۔

لہٰذا اس روشنی میں نظم و نثر کی تمام تصنیفات و تخلیقات کا جائزہ لیں اور ایک "نقادِ جلیل" کی حیثیت سے دریافت کریں۔ "آپ حضرات اپنی ان تمام تصنیفات و تخلیقات کی معرفت ہم سے کیا کہنا چاہتے ہیں اور آپ کے شاہکار، انسان کے دماغ میں، فکر کا کون سا دریچہ کھولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں"۔ اور پھر بتائیں کہ ہماری قومی غیرت اس کا کیا جواب دے سکتی ہے؟

ادبی جائزہ:

"تارِ پیراہن"

(شان الحق حقی)

جمیل نقوی

عنوان بالاجازی طور پر جواں سال و جواں فکر شاعر شان الحق حقی کے مجموعۂ کلام کا نام ہے اور بہت شگفتہ نام، لیکن معنوی حیثیت سے ایک علامت ہے جس میں کتنے ہی تار جھلکتے ہیں سنہری، روپہلی، رنگین، سادہ، حقیقی، رومانوی، فکری، جذباتی، انشائی، لسانی، تو بہ تو، خم بہ خم جنہیں شاعر نے ایسے شوخ و تازہ کار پیرائے میں گوناں گوں ناموں سے تعبیر کیا ہے جو بجائے خود ایک مجموعۂ ذوق و نشاط ہیں: نوآہنگ، نغمۂ جولاں، بازیافت، غم جاوداں، جوش مینا، ہم ریختہ ہم رنگین اور ان سب سے زیادہ پرکار ابتدائیہ کا عنوان "نامنظوم"۔ حقی کی شاعری جانی پہچانی ہے مگر اس مجموعہ کی اشاعت سے اس کے مختلف عناصر کو یکجا دیکھنے کا موقع ملا۔ ابواب کے ان زنگارنگ عنوانات سے گذر کر ہماری نگاہیں نفس شاعری کے ایسے خدوخال سے دوچار ہوتی ہیں جو ایک اچھوتی کیفیت کے حامل ہیں اور ہر نظر کا پیمانہ بقدر ظرف ان سے اثر قبول کرتا ہے۔

اس تاثر میں ایک بات یکساں طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ تصور، ذوق، فکر اور زبان کے تاروں کی ایک مخصوص وضع جس پر تندرست و شگفتہ روایت کی گہری چھاپ ہے۔ نئے شعور، نئے ماحول، نئے موضوعات کے باوجود ان میں یہ کیفیت نمایاں رہتی ہے کہ ع "رنگ تابانی میں انداز کہن بھی نو بھی ہے"۔ ابتداءً اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں قاری کا ذوقِ نگاہ "پیراہن" یعنی کلام موزوں تک پہنچتے پہنچتے سرِ دامن یعنی مقدمہ "نامنظوم" ہی کی جاذبیتوں میں الجھ کر نہ رہ جائے۔ کیونکہ اس میں نثری کیف و لذت کے ساتھ ساتھ خیالات و تصورات کا سلسلہ دراز ہے جو ایک ممیز نوعیت لئے ہوئے ہے۔ ہمارے شعرا شعر و فن اور خود اپنے متعلق اس بے تکلفی سے گفتگو کرنے کے عادی نہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اس پیش لفظ میں کئی ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو فکر و خیال کو رہ رہ کر ٹھوکے دیتی اور ذہنی افق کو برق وار اُجالتی ہیں۔

حقی نے جن مختلف تاروں کو جزو پیراہن بنایا ہے ان میں ایک تو خاص طور پر نمایاں ہے: لطف زبان۔ اور یہ وہ ورثہ ہے جو انہوں نے اپنے بڑوں سے بطور خاص پایا ہے۔ میر کی طرح وہ بھی "دلی کے روڑے ہیں" اور ان کی زبان دہلی کی مستند محاورے میں رچی ہوئی، چٹخارے دار زبان ہے۔ شاعر کے زبان سے طبعی لگاؤ نے اس کے اشعار کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔ اس نے اپنے ترکش میں ایسے تیکھے تیکھے تیر جمع کر لئے ہیں جو دل کی گہرائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں ؎

تم سے اُلفت کے تقاضے نہ نباہے جاتے — ورنہ ہم کو بھی تمنا تھی کہ چاہے جاتے
دل کے ماروں کا نہ کر غم کہ یہ اندوہ نصیب — زخم بھی دل میں نہ ہوتا تو کراہے جاتے

آج تک کشتِ غم ہے ہریالی — سو ہجوم بہار ایک لگن
مرے بچھڑے تو پھر نہ ملنے پائے — اے سکھی سانئے؟ نا سکھی ساجن!

یہ بھی تھی حسرتو مٹو کی جلی — بجھ رہی ہے سلگ سلگ کے کلی
دیکھئے دیکھئے بہار آئی — لیجئے لیجئے، وہ بیت چلی!

بھلا دو رنج کی باتوں میں کیا ہے — ادھر دیکھو مری آنکھوں میں کیا ہے

ہمیں سے اس قدر رغبت ہمیں سے سرگراں ایسے
کبھی تم مہرباں ایسے کبھی نامہرباں ایسے

آ ہم تجھے محراب تمنا میں سجائیں
اے شمعِ وفا دور نہ رہے سر کی بلائیں

آئینے سے ہوتی ہیں صلاحیں کہ کسی کو
جب خوب مٹانا ہو تو کس طرح مٹائیں

غزل میں تو تیکھے تیکھے تیور ہیں ہی لیکن ان کو "انٹونی اینڈ کلوپیٹرا" کے ترجمے میں ڈرامائی بات چیت کے باعث اور بھی ابھرنے کا موقع ملا ہے اور دوسری ڈرامائی نظم "بیتی برسات" (ہم ریختہ ہم ریختی) میں تو خالص بیگماتی زبان ہو گئی ہے۔ جو اس نظم کے لئے واقعی موزوں بھی ہے اور اسی حد تک محدود ہے۔ ڈرامائی کیفیت، المیہ و نشاطیہ کا ملا جلا اثر اس پر مستزاد ہے۔

غزل میں زبان کی نوک پلک ابتدا ہی زیادہ نمایاں ہے اور غزل کا مخصوص جوہر، تغزل بھی اپنے امتیازی تیوروں کے ساتھ آشکارا اور خصوصاً بہادر شاہ ظفر کے رنگ کی جھلک لئے ہوئے ہے جس کے ساتھ حقی کو روحانی ربط رہا ہے اور جس پر انہوں نے بہت کچھ کام بھی کیا ہے۔ زمینوں کا انداز دیکھئے ؎

خدا رکھے چراغِ محفلِ رندانہ روشن ہے
ابھی ہم دل جلوں کے ہاتھ میں پیمانہ روشن ہے

محبت خار دامن بن کے رسوا ہو گئی آخر
یہ اقلیمِ عزیزاں بے زلیخا ہو گئی آخر

بُرے دوستی میں خسارے ہیں یارو
مگر کیا کریں دل کے مارے ہیں یارو

شب کی تنہائی میں مانے کہ نہ مانے کوئی شخص
بھید کیا کیا مجھے آتا ہے بتانے کوئی شخص

ہم نے سینے میں رکھا غم کو دل و جاں کی طرح
پاسِ دشمن بھی کیا خاطرِ خوباں کی طرح

لیکن یہ بات نہیں کہ حقی کی غزل میں منجھی ہوئی روایت ہی کا نکھار ہو وہ ایک جدید باذوق شاعر ہیں جن کے یہاں بڑا تنوع ہے اور نمایاں جدت طرازیاں بھی موجود ہیں۔ بیان کی بعض رعنائیاں شاعر کی خود پیدا کردہ ہیں ؎

دے گیا ہے نظر کو تیرا غم
یک سحر نور یک چمن شبنم

کاہش نے کو نغمگی کہہ لو
زندگی بھر رہا لبوں پر دم

چمن چمن سے اکھڑ کر رہ گیا پائے خزاں
روش روش کو جتا دے شجر شجر سے کہہ

یہ شب مہ یہ بزمِ ماہ وشاں
اے مرے شاہدِ خیال کہاں!

خرمنِ دل پہ میرے ٹوٹ پڑے
بجلیوں کے بنے ہوئے انساں

یہ فسانے ہیں میری روح کے راز
یہ ترنم ہے میرے دل کی زباں

نظر کو ہے اسی صورت کدے کی جستجو یعنی
کہیں پنہاں تھی وہ صورت جو پیدا ہو گئی آخر

فقط ایماں ہی کیا پابند ہیں ایماں شکن لاکھوں
دلوں کی وہ متاعِ کافری کیا ہو گئی آخر

تغزل کا انداز دیکھئے ؎

اے رہگزرد اس کو دلانا تو مری یاد
وہ مجھ کو یونہی بھول کے بسرا کے نہ رہ جائے

آ جاؤں کسی بات پہ گر یاد بھی اس کو
جی اور کسی بات سے بہلا کے نہ رہ جائے

بس اک خط پر یہ کیفیت ہے دل کی
کوئی جیسے گلے آ کر لگا لے

نگاہوں کو نہ کرتے کاش ویراں
خیالوں کو گلستاں کرنے والے

اک جھک سی دمِ تحریر کہاں سے آئی
نام میں تیرے یہ تاثیر کہاں سے آئی

اور یہ میر کی سی نشتریت اور پُرسوز لہجہ بھی ہے ؎

کیا سناتی ہے یہ سازوں کی صدائے دل سوز
کچھ ہمیں درد نصیبوں کا بیاں ہو جیسے

کہیں کہیں مسلسل غزلوں کا انداز بھی ملتا ہے اور بعض غزلیں ایک مسلسل کیفیت کی حامل ہیں۔ اس کے علاوہ حقّی نے ریختہ کے دوسرے استاد غالب کا دامن بھی نہیں چھوڑا جو بعض پوری غزلوں کے علاوہ خوش آئند تراکیب سے بھی ظاہر ہے۔ مثلاً نوائے سازِ شکن، شبِ ہنگامہ آرا، ظلمتِ نیرنگ، سازِ خوش نفس، کاہشِ نے، شعلۂ خاطر، محرابِ تمنا، نو دبے نمود، صحبت نا ساز، سحرِ جلوہ ساز، ابر بہار پرور، روزنِ بینۂ رنجش، سازِ برگِ نظر، یک سحر نور یک چمن شبنم، راہشِ سیف و سپر، حیاتِ نیم نفس، شعاعِ بے زنہار، کاروانِ نفس، جہانِ دیرپسند، جبینِ سنگ، صحرائے طلب، روش ہائے چمن، نقشِ جاں آفریں، ضربِ نو آہنگ۔ اِن کا سلسلہ دراز ہے اور یہ ترکیبیں اکثر بڑی بے ساختگی سے نظم ہوئی ہیں ؎

کبھی یہ لرزشیں سازِ آشنا ہونگی تو دیکھو گے
دلوں کی بے کلی آشوب دریا ہو گئی آخر

ہمیں کو یہ چمنِ دلکشا نہ راس آیا
ہمیں نے اک گلِ نا آشنا کو پیار کیا

اے مسکنِ خوبانِ زماں شہرِ عزیزاں
ہم بھی کبھی بکنے ترے بازار میں آئیں

ہاتھ میں رشتۂ صد عقدۂ مشکل رکھئے
ہاں کسی سروِ خوش اندام کا داماں بھی رہے

کہ نہیں منبر و محراب و مصلّیٰ سے ہمیں
طاق و تصویر و چراغ و گلِ داماں بھی رہے

مجھے کیا کیا چراغِ خانماں افروز کیا کیجئے
کہ جنکی یاد سے دل میں اک آتش خانہ روشن ہے

نہ حرف دلسوز کوئی لب پر نہ نغمۂ جاں فروز پیدا
گئی ہے آنچل نسیم گلشن بچا کے بیگانہ وار ہم سے

اے رہرو نو یافتہ مہمیز قدم تیز
اے مایۂ صد حسرتِ نو خیز قدم تیز!

"ہیئت و آہنگ کے چند تجربے" تین ہی نظموں پر مشتمل ہیں: تازہ بستیاں، نغمۂ نو روز اور بیتی برسات۔ اول دو کو منظوم فیچر کی ترقی یافتہ شکل کہنا چاہیئے کیونکہ ان کے دروبست میں کوئی مربوط خاکہ نہیں۔ یہی بے تکلف و بے ساختہ نیرنگی اس صنف کی روح رواں ہے اور شاعر نے یہ لوچدار پیرایہ اختیار کرنے میں خاصی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ غنائیہ کی نوایجاد صنف کو رواج دینے میں حقّی کا بہت حصہ ہے۔ اور انہیں اس سلسلہ میں ایک پیشرو کی حیثیت حاصل ہے۔ انکی ہر سو خرامی انہیں کتنی ہی کہنہ و نو اصناف کی طرف لے گئی ہے۔ ہر جگہ طبیعت اور جودت کی روانی کا انداز ایک سا ہے اور ہر صنف اور ہر باب کی سطح ہموار و مجلّی لطافت کی حامل ہے۔ اور ابھی ان میں اضافے کی گنجائشیں موجود ہیں۔

مختصر نظموں میں سب سے اچھی نظم شاید وہی ہے جسے کوئی عنوان میسر نہ آ سکا ؎

وہاں ملی ہے مجھے اک حیاتِ نیم نفس
جہاں فضاؤں میں پھیلے ہیں روشنی کے برس

اس نظم میں جدید تصورات اور جدید استعارات، مشاہدات اور حوالوں کی آمیزش اور بیان کی رفعت نہ صرف جمال بلکہ جلال کا بھی ایک عالم پیدا کر دیتی ہے۔

شاعر میں کچھ تو اپنی لَو ہوتی ہے کچھ وہ دوسروں کی لَو سے مستفید ہوتا اور دوسروں کو مستفید ہونے کا موقع دیتا ہے۔ حقّی نے قدیم و جدید کے اعلیٰ عناصر کی آمیزش سے ایک لَو پیدا کی ہے جو کافی تیز اور جاذب نظر ہے۔ مگر اس کو ابھی زمانے کی ہوا سے نبٹنا ہے اور اس کی آزمائش اسی کے ہاتھ ہے۔

یہ کتاب اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے نہایت اہتمام سے شائع کی ہے جسے خود شاعر نے اپنے نقوش سے آراستہ کیا ہے۔ سرورق بھی ان ہی کی فنکاری کا نتیجہ ہے ؂

★

غزل

روشن صدیقی

جبیں پہ نورِ مسرت ہے آنکھ پُرنم ہے
خرابِ عشق کا عالم عجیب عالم ہے

ہزار پردہ حائل ہے اک تحیّتِ شوق
جمالِ یار تجھے یہ نقاب کیا کم ہے

نہیں یہ شیوۂ تقریبِ لے تغافل ناز
کہ مدتوں سے وہی اجتنابِ پیہم ہے

ترا جمالِ فروزاں ہے زندگی دل کی
اس آفتاب کا پرتو حیاتِ شبنم ہے

مآلِ تلخیٔ عشرت سے بے خبر ہے حیات
ابھی تو شکوۂ آغازِ تلخیٔ غم ہے

خفا ہیں سب ترے مستوں کی بے نیازی سے
کہ ان کو فرصتِ ترکِ طلب ذرا کم ہے

سکوتِ ناز ہے ہم رنگِ نالۂ خاموش
اُدھر بھی ہے وہی عالم اِدھر جو عالم ہے

یہی ہے وقت روشؔ نذر کر متاعِ سکوں
خوشا وہ زلفِ پریشاں کچھ اور برہم ہے

طاہرہ کاظمی

پھر کسی کی آنکھ اشکبار ہو نہ جائے
وعدۂ کرم پہ اعتبار ہو نہ جائے

موسمِ خزاں کے سارے داغ جل اٹھے
موسمِ حیات خوشگوار ہو نہ جائے

اے گھٹا خزانہ ہائے چشمِ نم نہ لوٹ
آنکھ بے وفا کی شرمسار ہو نہ جائے

اِس قدر عزیز ہے نشاطِ غم مجھے
ڈر ہے تیرا عہد استوار ہو نہ جائے

آج اُدھر نہ جا ملول، اے صبا، کہ وہ
سُن کے میرا حال سوگوار ہو نہ جائے

شب کو خواب میں بہار موت بن کے آئی
زندگی پہ سایۂ بہار ہو نہ جائے

* * *

انگریزی افسانہ:

ناؤ

از ولی اللہ

ترجمہ: قرۃ العین حیدر

افق اور ندی اور دھان کے کھیتوں پر سے بہتی ہوئی رات بڑے نرالے انداز میں سروں پر آن پہنچی۔ وہ ناؤ میں بیٹھے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ رات ہو گئی مگر انہیں پتہ نہ چلا کہ اندھیرا کس طرح چھایا، جیسے پانی کا سیلاب تیزی سے لیکن خاموشی سے امڈتا ہے اور انہیں پتہ نہ چلا کہ زمین کیسے آہستہ آہستہ آہستہ نیچے دھنسی اور انہیں پتہ نہ چلا کہ کس طرح رات کی گہرائی پانی کی گہرائی میں تبدیل ہوئی۔ — ستارے ایک کے بعد ایک جھلملائے اور وہ اس تاریکی کی تہہ میں بیٹھے رہے۔

رات، خاموش اندھیرے پانی کے ریلے کی طرح کئی کئی بار ان تک آئی۔ وہ اسے بار بار آتے دیکھا کئے جیسے بہت سی راتیں اکٹھی ہو کر چھائی جاتی ہوں اور جس طرح پانی کی لہریں کنارے سے ٹکراتی ہیں۔ تب جا کر انہیں اندازہ ہوا کہ یہ وہی رات ہے اور دن ختم ہو چکا ہے اور ان کے ہاتھ خالی ہیں اور ان کے دل خالی ہیں اور محض ان کی کشتی بازار کے اس پار ڈھلوان سے بندھی ہے۔

وہ گھنٹوں سے آس لگائے بیٹھے تھے مگر موٹا آدمی آن کر نہ دیتا تھا۔ وہ آج اور کل اور پرسوں برابر متواتر مسلسل اس موٹے آدمی اور اس کے کھانڈ کے بوروں کا انتظار کرتے رہے تھے۔ دونوں کناروں پر دوسری کشتیاں آئیں اور چلی گئیں۔ پار کے ہاٹ میں لوگوں کی بھیڑ لگی اور چھٹی، اور جھٹپٹے کے وقت ہاٹ سنسان پڑا رہ گیا اور اس میں بہت سے گنجے منڈے بیمار خارش زدہ آوارہ کتوں نے منہ اٹھا کر چلانا شروع کیا اور آدمی سے ایک دوسرے سے لڑے اور ہاٹ کے سپاٹ میدان میں ہوا کے جھونکوں سے بہت سی مٹی اڑی اور ہوا کے جھونکوں نے بڑے درخت کے پتوں کو کھڑکھڑایا۔

ان کی کشتی بہت مضبوط کشتی تھی اور اس کے تختوں کو سرش اور کھردری کیلوں سے جوڑا گیا تھا اور اس کی چٹائی کی چھت کے نیچے دونوں سروں پر فالتو پانی باہر نکالنے کے لئے دو چوکور شگاف تھے اور پانی مستقل بہہ بہہ کر نیچے ٹپکتا تھا اور چاول ابلنے کے بعد اس کی پیچ باہر گرتی تھی اور یہی شگاف ایک قسم کے اگالدان کا کام دیتا تھا۔ اندر برتن تھے اور تمباکو اور پتواریں جو ہوا بند ہو جاتی تھی تو استعمال میں آتی تھیں اور ڈنڈے جن کے ذریعے اتھلے پانیوں میں ناؤ آگے بڑھتی تھی اور ایک بادبان جس پر ان گنت پیوند تھے اور جو اچھے موسم کے لئے بہت بھاری تھا اور دو مضبوط جسموں والے نوجوان مانجھی جو اس ناؤ کو کھیتے تھے اور ایک اداس چہرے والا یتیم لڑکا جو ان دونوں کا میٹ تھا۔

موٹا آدمی دو ٹانگوں کا مالک تھا لیکن اس کا تجارتی مال چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ ناؤ چل سکتی تھی مگر اس کے پاس بار برداری کے لئے سامان نہیں تھا۔ دونوں تنومند نوجوانوں اور اداس چہرے والے بچے کے پاس کھانے کو نہیں تھا اور گاؤں میں ان کے گھر والوں کے پاس کھانے کو نہیں تھا۔ بار برداری کی اس خالی کشتی کے اندر ایک بوڑھا پڑا مر رہا تھا۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مچھلیاں ناکوں یا بڑی مچھلیوں سے دہشت زدہ ہو کر اپنی جان بچانے کے لئے خود مچھیروں کی کشتی میں کود آتی ہیں۔ ان مچھلیوں کی طرح آج صبح یہ بوڑھا گرتا پڑتا ناؤ میں آن گرا تھا۔ اس کا نوجوانوں سے کوئی رشتہ یا کوئی دوستی نہ تھی لیکن انسان کی تیز فہمی نے ساتھ جس کے پاس بہت تھوڑے سے الفاظ باقی رہ گئے ہوں۔ اس بوڑھے نے ان لڑکوں کے سامنے اپنی آخری آرزو کا اظہار کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ یہ لوگ اسے اپنی کشتی میں بٹھا کر اس کے گاؤں تک پہنچا دیں۔ غالباً موت ہی ایک ایسا قابل ذکر واقعہ تھا جو اس کی زندگی میں پیش آنے والا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ اس کے گھر والے اچھی طرح سے اس کا نظارہ کر لیں اور اس نے بلا تامل ان دونوں سے فرمائش کی تھی کہ اسے گھر لے جائیں کیونکہ وہ مرنے والا تھا اور مرنے والا آخری لمحوں میں عزیزوں اور اجنبیوں اور دوستوں اور دشمنوں میں تفریق نہیں کرتا۔ اس نے کشتی کے کرائے کا بھی ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ مرتے وقت انسان کو ایسی دنیاوی باتوں کی فکر نہیں ہوتی۔

لیکن دونوں نوجوان موٹے آدمی کے کھانڈ کے بوروں کی فکر میں بیٹھے تھے اور موٹا آدمی تین روز قبل گھاٹ پر اتر کر دکانوں کے چھپروں کی دوسری طرف غائب ہو چکا تھا۔ چنانچہ مرتا ہوا بوڑھا گھسکتا گھسکتا ناؤ کے اندر آ گیا اور انہوں نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ انہوں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ بوڑھا دن بھر کراہا کیا۔ کبھی کبھی

اپنے بوجھل پپوٹے چیر کر وہ دونوں ماہجیوں پر نظر ڈالتا لیکن وہ دونوں اسی طرح ساکت وصامت اور بے نیاز بیٹھے رہے۔

جب ایک چھوٹی مچھلی مگرمچھ سے پناہ لینے کی خاطر عین ماہی گیر کی گود میں آن گرتی ہے ماہی گیر اسے اٹھا کر ان مچھلیوں کے ڈھیر پر ڈال دیا کرتا ہے جو پہلے سے زیر دام آچکی ہیں بحیثیت ایک ماہی گیر کے اسے یہ خیال کبھی نہیں آتا کہ وہ اس بے چاری مچھلی کی اس غیر معمولی حرکت کی وجہ جاننے کی کوشش کرے۔

لیکن یہ دونوں لڑکے باربرداری کرتے تھے اور قریب المرگ انسانوں کو اپنی کشتی میں ڈھونا ان کا کام نہ تھا۔ اگر کھانڈ کے بورے گھاٹ پر پہنچ گئے ہوتے تو وہ جلد از جلد روانہ ہو جاتے۔ مرتا ہوا آدمی اور باربرداری کا سامان ان کے لئے دو مختلف چیزیں تھیں۔ کھانڈ کے بورے سنبھال کر وہ کشتی وہاں سے آگے بڑھا لیتے اور بوڑھے کا بھی اپنے گھر پہنچ کر دم نکلتا کیونکہ اس کا گاؤں ان کے راستے میں پڑتا تھا۔ لیکن کھانڈ ابھی تک نہیں پہنچی تھی اور ان کو کل صبح سویرے روانہ ہو جانا چاہیئے تھا۔ بوڑھا مرتے وقت بہرحال اب بھی گھر پہنچ جائے گا۔ لہٰذا جب رات کا کفن سارے میں پھیلا اس سمے وہ خود بھی کالی رات کے ساتھ ساتھ اس گھپ اندھیرے میں ڈوب گئے اور جب بڑھے کے کراہنے کی آواز سیلاب کی ایسی امڈتی گمڈتی آگے بڑھی اور زخمی چڑیا کی طرح ان کے سروں پر چکر کاٹنے لگی، تب بھی ایک مرتبہ پانی میں تھوکنے کے بعد وہ اسی طرح گم سم بیٹھے رہے کہ ایسا سکوت زندگی کے لئے لرزہ خیز تھا۔

رات نے غم وغصہ کو جنم دیا۔ ان کے دلوں میں جو ان کے مضبوط جسموں میں چھپے تھے، اور ان کے جسموں میں جو تاریکی میں حفاظت سے ملفوف تھے، موٹے کاروباری کے لئے نفرت کی تیز آگ دہکتی رہی۔ مچھلیاں خنک اندھیرے پانی کی آرام دہ تہہ میں جا کر سکون سے سو رہیں۔

مانجھی غصے میں اندر ہی اندر کھولا کئے۔ کیونکہ کل صبح وہ خالی ہاتھ واپس جا رہے تھے۔ بادبانوں اور پتواروں اور بانسوں اور دو طاقتور ملاحوں اور ایک محنتی یتیم بچے کو اپنی گود میں سمیٹے یہ ناؤ گھاٹ پر خالی آ تو سکتی تھی مگر اسے مال اٹھائے بغیر خالی واپس لوٹنا نہ چاہیئے تھا۔ ناؤ کو اپنے دریائی راستے کے دونوں سروں پر ہمیشہ مسافر موجود ملتے تھے۔ خصوصاً ایسے مسافر جو انتظار کا دکھ بھوگنا جانتے تھے اور جنھیں ایسے مضبوط انسانوں پر بھروسہ تھا جو اپنی کشتیاں نکال کر دُور دراز کی منزلوں کی سمت چل کھڑے ہوتے ہیں۔ منتظر رہنے والی چھوٹی چھوٹی چڑیوں کی مانند، جو اپنے گھونسلوں میں گھُسی بڑی چڑیوں کی راہ دیکھا کرتی ہیں جو ان کے لئے دانہ دنکا لائیں گی، یہ مسافر طاقتور ملاحوں کی راہ دیکھتے تھے۔ بہت سی چڑیوں کے پر مضبوط ہوتے ہیں اور انہیں اڑنا آتا ہے۔ کمزور چڑیاں اُڑ نہیں پاتیں اور محض گھونسلے میں لیٹی لیٹی آسمان کو تکتی ہیں۔ انہیں بھوک لگتی ہے مگر انہیں بڑی چڑیوں پر بھروسہ ہے کیونکہ وہ ہمیشہ ہی اپنی چونچ میں چارہ چوگا لئے ان کے پاس واپس آن پہنچتی ہیں۔ اور ان کی گردنوں کے پر محبت اور دوسروں کو آرام پہنچانے کے احساس سے پھول جاتے ہیں۔

لیکن جو تنومند لوگ اعتماد کے ساتھ ناؤ لیکر آسمان کے کناروں پر نظریں جمائے باہر گئے تھے۔ بڑی چڑیوں کی طرح ہمیشہ ہی چارہ چوگا لیکر واپس نہ لوٹتے تھے۔

دونوں لڑکے اندر ہی اندر لرزے۔ انھوں نے محسوس کیا جیسے اپنے کمزور متعلقین کی طرح وہ خود بھی بے بال وپر اور لاچار ہیں اور گھونسلے میں ننھی چڑیوں کے ایسے ایک دوسرے سے چپٹے بیٹھے ہیں اور گھونسلے سے باہر سوا کوری، الفاظ سے عاری خلا کے اور کچھ نہیں ہے۔

ایسا کیوں تھا؟

ان دونوں کو اس کا جواب معلوم نہ تھا۔ اور جب رات گہری ہوئی۔ ان کا غصہ رفتہ رفتہ دھیما ہو کر بالکل ختم ہو گیا۔ کیونکہ ہر آگ کبھی نہ کبھی ضرور بجھتی ہے۔ اس کے باوجود وہ اندر سے خالی خالی محسوس کرتے تھے۔ وہ اچھی طرح سُلگ چکے تھے اور اب اپنے غم وغصہ کی راکھ کو موٹے کاروباری کے لئے طرح طرح کی بُری بُری باتیں سوچ سوچ کر چپکے چپکے کریدا کئے، جیسے وہ جاڑوں میں مٹی کی انگیٹھی کے انگاروں کو لکڑی سے کرید کرید کر جلتا رکھنے کی کوشش میں جُٹے رہتے تھے۔ لیکن انگیٹھی جو ان کے دلوں میں دہک رہی تھی، کب کی ٹھنڈی پڑ چکی تھی۔

کنارے پر کسی کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے مڑ کر دیکھا، وقت ابھی باقی تھا، اور بہت دفعہ ایسا ہوا تھا کہ اندھیرے اور خلا میں سے مسافر نمودار ہو کر ان کی ناؤ میں آن بیٹھے تھے۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ اس آخری رات اور اس ہیبتناک خلا میں کچھ نہیں تھا۔ غصہ تک نہیں تھا۔ رات کی خشک ہواؤں نے وادی کی کیچڑ کو سکھا دیا۔ سامنے میدان میں بڑے بڑے چوہوں نے تھکے ہوئے بیمار آزردہ کتوں کی جگہ لے لی تھی اور یہ موٹے موٹے چوہے چاروں طرف دوڑتے اور اودھم مچاتے پھر رہے تھے۔ دوسرے کتے انسانوں کے گھروں کی رکھوالی میں مصروف تھے اور انسان ان گھروں میں اس طرح آرام سے سوتے تھے جیسے مچھلیاں پانی کے اندر رہتی ہیں۔

رات کی تنہائی میں سے ایک اُلّو نکل کر آیا، اور کشتی کے اوپر منڈلانے لگا۔ اسے دیکھ کر مانجھیوں کو زندگی کا خیال آیا جس کے متعلق بڑے بوڑھے باتیں کرتے تھے، اور

ان کو اس گیان کا خیال آیا جو غیب میں پوشیدہ تھا اور موت اور زندگی کے متعلق سوچتے سوچتے انہوں نے تصور کیا کہ وہ خود دو پرکٹے اُلو ہیں۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ اپنے گیان کی لہروں میں گھرے بیٹھے رہے۔ یہاں تک کہ اپنے پراسرار خیالوں کے بوجھ تلے دبے دبے انہیں نیند آگئی۔

آدھی رات کو بوڑھا اچانک جاگ گیا کہ جیت ہمیشہ موت کی ہی ہوتی ہے لیکن وہ اکثر زندگی سے اس طرح کھیلتی ہے جیسے وہ خود ایک بلّی ہے اور زندگی ایک چھوٹا سا چوہا ـــــ غالباً بوڑھے کی موت ایک ایسی غیر مرئی ہستی تھی جو چوہے بلّی کا کھیل کھیلتے کھیلتے اُوب کر اب ذرا تازہ ہوا کھانے کی خاطر کشتی کے سرے پر جا بیٹھی تھی۔ کشتی کے اندر بوڑھے نے دیئے کی اندھی اندھی روشنی میں اپنی پتلیاں گھما کر یتیم بچے کو اپنے قدموں میں سوتا دیکھا۔ وہ اسے دیر تک ٹکٹکی باندھے تکتا رہا اور اسے اپنے بچے یاد آئے۔ اسے اپنا وہ لڑکا یاد آیا جو اس بچے کا ہم عمر تھا اور جو سانپ کے کاٹے سے مر گیا تھا۔ بوڑھے نے ایک بار پھر چاروں اور نظر ڈالی کہ کہیں موت کا فرشتہ اندھیرے کی پرچھائیوں میں چھپا تو نہیں بیٹھا۔ موت کے فرشتے کو موجود نہ پا کر اس نے آہستہ سے اپنی داہنی ٹانگ بڑھائی اور اپنے تقریباً بے جان اور ٹھنڈے انگوٹھے سے بچے کی پسلیوں میں ٹہوکا دیا۔ لڑکا سوتا ہی رہا۔ بوڑھے نے دوبارہ اسے چھوا مگر وہ بے خبر سو رہا تھا۔

بوڑھے کو بہت حیرت ہوئی۔ اسے لگا جیسے ہر شے موت ہے۔ رات اور لکڑی کے تختے جن پر وہ لیٹا تھا اور یہ بچہ۔ یہ سب موت میں شامل تھے۔ یہ لڑکا لہٰذا اس کا بیٹا تھا جو سانپ کے کاٹے سے مرا تھا، اور سوتا تھا کیونکہ موت نیند تھی۔ لیکن چونکہ موت زندگی کی طرح حساس اور اکل کھری نہ تھی اس لئے یہ خیال کئے بغیر کہ وہ خفا ہو جائے گی۔ انسان اسے ادھر اُدھر سے ٹہوکے دے سکتا تھا۔ اب کے سے لڑکے نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور ملامت سے بوڑھے کو دیکھنے لگا۔ بوڑھا جواباً اسکو گھورتا رہا۔

درختوں کا گہرا سبز جھرمٹ بارش میں بھیگ چکا تھا اور اس جھرمٹ کے ایک کونے میں اس کے لڑکے نے اپنی جان دی تھی۔ جاڑے ابھی بہت دُور تھے اور بوڑھے نے طے کیا تھا کہ اب کے سے وہ اسے سرخ دھاریوں والی قمیص بنوا کر دے گا۔ لڑکا جاڑوں سے بہت پہلے ختم ہو چکا تھا۔

بوڑھے نے لڑکے کو دیکھ کر اپنی طرف بلانے کے لئے ہلکے سے سر ہلایا۔ لڑکا اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ بوڑھے نے اسے پھر ٹہوکا لگایا۔ آواز دی۔ اس کی طرف منہ کر کے مسکرانے کی کوشش کی۔ آخرکار جب لڑکے نے اپنی جگہ سے حرکت کی تو معاً بوڑھے کو کوندے کی لپک کی طرح یہ احساس ہوا کہ یہ لڑکا نہ مردہ تھا اور نہ اس کا بیٹا۔ یہ ایک جنبی لڑکا تھا۔ تھکن کے احساس سے نڈھال ہونے کے باوجود وہ لڑکے کو ذرا دیر تک اور دیکھتا رہا کیونکہ انسان زندگی کو نظر انداز نہیں کر سکتا اور اس نے لڑکے کے نیند سے بوجھل پپوٹوں اور اس کے ننھے سے انتہائی مغموم چہرے پر پھر نگاہ ڈالی۔

لڑکے، میرے قریب آؤ۔

جب لڑکا ذرا آگے کو کھسکا، بوڑھے نے بڑی مشکل سے اپنا ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا۔ مگر اسے یہ بھی یاد رہا کہ یہ لڑکا اس کا مرا ہوا بیٹا نہیں تھا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ وہ دھاڑیں مار مار کے رونے کا متمنی ہے لیکن چونکہ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ بچہ اسے روتا دیکھے اس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔

باہر دونوں مانجھی جو اب گیانی اُلّو نہ رہے تھے اب دو ننھے پرندوں کی طرح سوتے تھے جو عمیق اندھیرے جنگلوں میں اکیلے رہ گئے ہوں۔ اور موت ایسے آدمی کی طرح جو کسی کو نظر نہ آسکتا ہو ناؤ کے سرے پر چڑھی بیٹھی تھی اور غالباً بے دھیانی سے چاروں اور دیکھتی تھی کیونکہ اسے کسی چیز میں کوئی معنی نظر نہ آتے تھے۔ جب بوڑھے نے دوبارہ آنکھیں کھولیں لڑکا کب کا سو چکا تھا۔

دفعتاً بوڑھے نے بڑی وحشت کے ساتھ پکارا: بیٹے۔ بیٹے۔

کوئی جواب نہ ملا۔ تب بوڑھے نے سوچا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ یا شاید وہ مر چکا ہے۔ لہٰذا اس نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ اور اس مرتبہ اس نے اپنی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند کر لیں۔

صبح ایک اندھی بلّی کی طرح احتیاط اور خاموشی سے دبے پاؤں چلتی چپکے سے آن پہنچی۔ ندی کے کنارے سوتی ہوئی کشتیوں اور کشتیوں میں سوتے ہوئے انسانوں اور بڑے درختوں کے نیچے بکھرے ہوئے گرد آلود پیلے پتّوں اور بنجر میدانوں اور بیکراں آسمان پر سے گندی کیلی کیلی چلتی ہوئی صبح بھی بے حد اچانک آ نازل ہوئی۔

باہر دونوں مانجھی جاگ اٹھے۔ اور ذرا بھونچکے سے بیٹھے رہے۔ انہیں معلوم تھا کہ اس روز کا سورج اپنے سفر پر روانہ ہو چکا ہے اور اب انسان اور جانور اپنے اپنے کولھوں میں جُت جائیں گے۔ ایک مانجھی نے اندر جھانک کر دیکھا کہ بوڑھا مرا پڑا ہے۔ اس نے ایک جماہی لی اور اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس بے جان جسم کا کیا کرے۔ جس طرح اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس خالی بیکار دن کا کیا کرے۔ چنانچہ وہ اور اس کا ساتھی کرب اور ذہن کے کسی احساس سے معرّا اسی طرح بیٹھے صبح کے دھندلکے میں تیرا کئے کسی

شکایت کی اور کسی سوالوں کے جواب حاصل کرنے کی انہیں ضرورت نہ تھی۔

پھر انہوں نے ناؤ کھینا شروع کی۔ ندی کے بل کھاتے کنارے کے ساتھ ساتھ ان گنت کشتیاں اس طرح سے چپٹی تھیں جیسے ان گنت چیونٹیاں کسی کینچوے کی لاش سے چپٹ جاتی ہیں۔ ایک چیونٹی کینچوے کی لاش سے علیحدہ ہو گئی۔ رسولؐ کے خدا اور انسانوں کے خدا نے افق کے اوپر سے جھانک کر دیکھا کہ ایک چھوٹی سی چیونٹی بلا وجہ بالکل بے معنی انداز میں لاش سے علیحدہ ہو گئی۔

ناؤ دھارے پر بہنے لگی جس کے دھندلکے میں اور بہت سی کشتیاں تھیں اور شب رنگ مچھلیاں اور زمرد کے ایسے پتوں والے کنول۔ لڑکے نے حقہ بھرا اور وہ دونوں باری باری کش لینے لگے۔ اور سورج نکلا اور اس کی کرنوں کی تپش بڑھی اور دریا کی چکیلی سطح کی جگمگاہٹ سے آنکھیں چندھیا گئیں۔

لڑکے نے دوبارہ حقہ تازہ کیا اور چٹائی کی چھت پر احتیاط سے قدم رکھتا اپنی جگہ پر لوٹ گیا اور اپنے کونے میں بیٹھ کر اپنی بھوک پر سے دھیان ہٹانے کے جس کی وجہ سے اسے چکر آ رہا تھا' وہ دوسری کشتیوں کا نظارہ کرنے میں مصروف ہو گیا۔ دونوں ملاح جن میں سے ایک پتوار چلا رہا تھا: نہ کچھ بولے نہ انہوں نے کچھ سوچا۔ ان کی ناؤ گھر کی اور جا رہی تھی مگر ان کا دھیان گھر یا گھر والوں کی طرف نہیں تھا۔

دھارے پر ڈولتی ہوئی ناؤ کے ڈولنے کے ساتھ ساتھ چھت کے نیچے پڑے ہوئے مردہ بوڑھے کی ہڈیاں ادھر اُدھر ہلتی رہیں اور ایسا لگا جیسے وہ مرنے کے باوجود بھی کہیں سفر پہ جا رہا ہے۔ مانجھیوں نے ناؤ دریا کے بہاؤ پر چھوڑ دی اور انہیں لگا جیسے وہ کہیں بھی نہیں جا رہے تھے۔ اور سورج اُونچا ہوتا گیا اور گذرے ہوئے دنوں کی بھوک اور ان کی ساری زندگی کی بھوک نے دفعتاً انہیں اپنے شکنجے میں کس لیا اور چنانچہ وہ باری باری کشتی کے اندر جا کر لاش کے برابر ہی لیٹ کے سو گئے۔ اور جس ابھی کی باری کشتی کھینے کی تھی وہ باہر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ کشتی کے اندر دو لاشیں پڑی ہیں۔ اور سامنے یتیم بچہ سوتا تھا اور اس کا گرم تپتا ہوا چہرہ سورج کے عین مقابل میں تھا۔ ایک مکھی جو عارضی طور پہ بچے کی ناک اور سوئے ہوئے مانجھی کی ناک پر بھنبھناتی تھی۔ اب لاش کی ناک میں جا گھسی اور وہاں آرام سے بیٹھ گئی۔

دریا خیرہ کن اور چمکدار سانپ کی مانند روشن آسمان کے نیچے رینگتا گیا یہاں تک کہ سورج پر سرخی آ گئی اور سلونی اور نرم زمین پر واپس لوٹی اور سانپ پھر دریا میں تبدیل ہو گیا۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جسموں میں چین سا پڑ گیا۔ بالآخر کشتی دریا کے آخری موڑ پر مڑی جہاں سے گاؤں نظر آتا تھا۔ گاؤں کے گھاٹ کی سرخ سیڑھیاں پانی میں اُترتی تھیں۔ یہ بوڑھے کا گاؤں تھا۔ بوڑھا جوان کا عجیب و غریب' بے معنی 'مال' تھا جس کی باربرداری انہوں نے یہاں تلک کی تھی۔

جھٹ پٹے کی روشنی میں انہوں نے ناؤ کو گھاٹ سے باندھا۔ دو آدمی کاہلی سے پانی میں نہاتے تھے۔ مانجھیوں نے انہیں بوڑھے کی موت کی اطلاع دی۔ وہ یہ سناؤنی لیکر تیز تیز قدم اٹھاتے گاؤں کی سمت روانہ ہو گئے۔ مانجھی خاموشی سے ساحل پر بیٹھے رہے۔

تھوڑی دیر بعد چند مرد اور عورتیں لالٹینیں لئے چپ چاپ اور جلدی جلدی کشتی کی طرف آتے دکھلائی پڑے۔ اب وہ سارے میں بکھرے تھے۔ ناؤ میں گھاٹ پر ناؤ کے چاروں طرف' کچھ اتھلے پانی میں کھڑے ہو گئے۔ عورتوں نے لرز لرز کر مگر آہستہ آہستہ رونا شروع کیا۔

دونوں مانجھی ساحل پر سائے میں کھڑے رہے۔ کسی نے اُن پر دھیان نہ دیا۔ مردوں نے لاش کو ناؤ میں سے نکالا اور گھاٹ کی سیڑھیوں پر چڑھے اور روتی ہوئی عورتوں کو ساتھ لیکر آہستہ خرام جلوس کی شکل میں گاؤں کی سمت واپس چلے گئے۔

جھونپڑوں اور درختوں اور اماوس کی کالی رات کے اندھیرے نے انہیں اپنی اوٹ میں چھپا لیا۔ اور رونے کی آواز مدھم ہوتی گئی لیکن رونے کی آواز لوٹ لوٹ کر پھر ان کے پاس واپس آئی جس طرح روتی ہوئی رات دن کے اختتام پر لوٹ آتی ہے' جس طرح تنہائی روز دن میں چلا چلا کر روتی ہے۔

بچے نے مٹی کا دیا روشن کیا۔ ایک مانجھی ناؤ کے دوسرے سرے تک جانے کے لئے چھت کے اندر گیا۔ بوڑھے کی لاش کی جگہ پر لکڑی کا فرش خالی پڑا تھا۔ دوسرے مانجھی نے ناؤ کی رسی کھولی اور سے پانی میں دھکیل کر سامنے جا بیٹھا۔ اب کے سے ناؤ جب تاریک پانی پر چلی تو دو سائے اس کے دونوں سروں پر بیٹھے تھے۔ بچہ اسی جگہ جا کر سو رہا جہاں وہ کل رات سویا تھا۔

اور ایک مانجھی اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے دفعتاً ایک گمنام بچے میں تبدیل ہو گیا۔ اب وہ ایک یتیم بچہ تھا جس کا کوئی ٹھور ٹھکانہ نہ تھا۔ پھر وہ ایک ننھا سا پرندہ بنا جس کی ماں کسی شوقین مزاج شکاری کی بندوق سے ماری جا چکی تھی۔ وہ چپکے چپکے رو دیا کیا اور اس کی ہمت نہ پڑی کہ وہ نظر اٹھا کر آسمان کو دیکھے یا ندی کو دیکھے اور اسے معلوم نہ تھا کہ اس کا دوسرا ساتھی جو ناؤ کھے رہا تھا کیا سوچتا ہے۔ وہ یہ نہ چاہتا تھا کہ اس کے ساتھی کو پتہ چلے کہ وہ خود کس دھیان میں ہے۔

ناؤ اندھیرے میں دھارے پر آہستہ آہستہ بہتی رہی۔

بہار آفریں

شبیر افضل جعفری

ہائے وہ زرنگارِ شہرِ ازل
آسماں کا سدا بہار کنول
اس کی داسی عروسِ لالہ و گل
اس کا پنکھا نسیم کا آنچل
کوئلیں اس کی چاہ میں بھکشو
بلبلیں اس کے عشق میں رانول[1]
جگنو اس کے فراق میں سوزاں
بجلیاں اس کے ہجر میں بے کل
اس کی چھاؤں میں ساون بھادوں
اس کے دم سے گلابیاں جل تھل
اس پہ قرباں سرور کی رم جھم
اس پہ صدقے خمار کے بادل
منتیٔ جامِ کوثر و تسنیم
نشہ سلسبیل و گنگا جل
روحِ دیوانِ حافظِ شیراز
رونقِ بزمِ شعر و جانِ غزل
دلبرِ خوش گوار و یارِ حسیں
سرمدِ جاں نثار کا سانول[2]
اس کا جلوہ گلاب اور چراغ
اس کی مسکان رنگ و نور کی چھل[3]
نرگسِ قدسیاں کا نورِ نظر
چشمِ انساں کا حسیں کاجل
اس کے آبِ حیات سے جاوید
دل کے لیل و نہار کا پل پل
ملگجے جھونپڑے فقیروں کے
اس بہار آفریں کے رنگ محل
وہ تبسم کی چودھویں کا چاند
اور اس کا چکور شبیر افضل

[1] جوگی [2] یار حسین [3] سیل

کافی:

وچ روہی[1] دے رہندیاں نازک نازو جٹیاں

خواجہ غلام فریدؒ — مترجمہ: ظہور نظر

خواجہ غلام فریدؒ کی یہ کافی بڑی مقبول ہے۔ خاص طور پر ملتانی زبان بولنے والے دیہی علاقوں میں۔ گذشتہ دس سالوں میں جب کبھی بھی مجھے بہاولپور کی کسی محفلِ موسیقی میں شرکت کا موقع ملا۔ یہ کافی ضرور سننے میں آئی۔ مقبولیت کی وجہ اس کی سادگی، شعریت اور مقامی ماحول کا حسین امتزاج ہے۔ عوام اور خواص دونوں طبقوں میں اسے بڑی محبت کے ساتھ گایا اور سنا جاتا ہے۔ (ظ۔ ن۔)

صحرا میں رہتی ہیں نازک، نرمل، چنچل دوشیزائیں
شب بھر کھیلیں پھاگ دلوں سے دن کو کسی کے ہاتھ نہ آئیں
جھوم جھوم کر دہی بلوئیں۔ چھان چھان کر چھاچھ بنائیں
ایک ساتھ سو دل ہوں زخمی ایسے کاری تیر چلائیں
زخمی کر کے دکھیاروں کو زخموں پر مرہم نہ لگائیں
ناز و ادا سے بن میں گھومیں، بھیڑیں بکریاں گائیں چرائیں
کئی مسافر بھولے بھالے ان کے سندر دام میں آئیں
گھر در بھولیں، جیون اجاڑیں، نیند گنوائیں، سدھ بسرائیں
فخر بڑائی چھوڑ کے ہم بھی جوگی بن صحرا میں جائیں
کتنے بن کر اس کے در کے آشا کی زنجیر ہلائیں
چوکھٹ چومیں، ماتھا رگڑیں سیس نوائیں نین بچھائیں
پاس فرید بڑھے پگ پگ پر خوشیاں پل پل گھٹتی جائیں

★

[1] صحرا

ماہِ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۰ء

ایک طویل مختصر افسانہ:

ڈھلتی شامیں

حجاب امتیاز علی

شام ڈھل چکی ہے۔ اور میں مغموم ہوں! میں نے سوچا۔ شاید ایک ہزار سال گذر جائیں، جب بھی شامیں یونہی ڈھلتی رہیں گی اور انسان کا غم یونہی تازہ رہے گا۔ اور ان دو چیزوں کے علاوہ دنیا کی ہر چیز بدلتی جائے گی۔ ہر شے پر تغیر مسلط ہوگا۔ آبادیاں ویرانیاں بنجائیں گی، اور ویرانیاں آبادیوں کی شکل اختیار کر جائیں گی۔ دوست دوست نہ رہیں گے۔ نہ دشمن دشمن۔ بلکہ بعض وقت تو جب سرِ شام ٹھنڈا اور نیلا چاند سبز آسمانوں کے کناروں کو ہلکے ہلکے چومنے لگتا ہے تو اسے دیکھ کر میں یہاں تک سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہوں کہ کیا یہ وہی پرانا چاند ہے جو صدیوں پہلے انسان کی محبت پر متبسم ہوا کرتا تھا، یا یہ وہی بوڑھا سورج ہے جو سینکڑوں سال پہلے بھی انسان کے غصے اور نفرت پر خشمگیں ہوا کرتا تھا؟ یہ وہی شوخ و زرد تارے ہیں جو کائنات کی پہلی اختراع فائقہ پر فرطِ حیرت سے آنکھیں جھپکا چکے ہیں؟

میرے پاس ان سوالوں کا کوئی یقینی جواب نہیں اس لئے نہیں کہ میرے دماغ میں خلل یا فتور ہے یا میں کسی کی کوئی دلیل سننا نہیں چاہتی، بلکہ اس لئے کہ مرا اندازِ فکر بھی دنیا کی اور چیزوں کی طرح ذاتی تجربات و عینی مشاہدات کی بنا پر اب بدل چکا ہے۔

ہر چیز بدل جاتی ہے، اس کا غم نہیں کہ کیوں بدلتی ہے۔ مرے خفقان کی وجہ کچھ اور ہے۔ عرصۂ دراز سے میں زندگی کے دریچے میں بیٹھی تیز رو مسافروں کا دامن تھامنے کی کوشش کرتی رہ جاتی ہوں۔ مگر وہ ہوا کے جھونکے کی سی پھرتی سے نکل جاتے ہیں۔ کوئی چیز ہاتھ نہیں آتی۔ سرما کی حیران صبحیں، بہار کی گہری گلابی دوپہریں، خزاں کی اُداس زرد شامیں۔ اور برسات کی مدہوش کالی راتیں۔ کوئی چیز بھی ہاتھ نہیں آتی۔ ہر چیز گذر جاتی ہے۔ اور تو اور ..... یہ انسان کی محبت اور اس کی نفرت دونوں گذر جاتی ہیں۔ ہاں گویا یہ بہاریں اور خزائیں بھی گذر جاتی ہیں!!

زندگی ایک مستول پر کھڑی ہو، چاند اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہٹے۔ بادل کا جو رنگین کاسنی ٹکڑا مشرق کے آسمان پر رقصاں ہے۔ یونہی تڑپتا رہے۔ دھان کے کھیتوں سے ہوائے جنوب ہمیشہ مصروف سرگوشی رہے اور انسان کی محبت مسکراتی یا اس کی نفرت کی آگ دھڑ دھڑ جلتی رہے، یہ نہیں ہوتا۔ ہر چیز گذر جاتی اور بدل جاتی ہے۔ لیکن اس نظام کائنات میں صرف ایک چیز قائم رہتی ہے، انسان کا غم۔

غم! بہت پرانی چیز ہے۔ اتنی پرانی اور اتنی معمر کہ جب خدا نے انسان کو تخلیق کیا تو اس کے بعد کائنات میں سب سے پہلے غم مسکرانے لگا۔ اور اسی غم نے انسان کو محبت کرنے کے ڈھنگ سکھائے اور مسکراہٹیں بخشیں۔ اور آخر اسی غم کے تحت ایک دن لیونارڈو ڈاونچی نے مونا لیزا کی زندۂ جاوید مسکراہٹ تخلیق کی۔ اور وینس ڈی میلو کا حسین ترین بت تراشا گیا مگر پھر بھی شامیں مسلسل ڈھلتی رہیں۔ اور یوں غمِ حیات تازہ رہا!

★

کیا وہ تم ہی تھیں جو گذشتہ سالوں میں مجھ سے کرخت لہجے میں پوچھ رہی تھیں کہ مجھے کسی چیز کے ختم ہونے کا غم کیوں ہوتا ہے؟ میں نے تمہارے سوال کے جواب میں دردناک لہجے میں تمہاری غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی اور سمجھایا تھا کہ "مجھے کسی چیز کے ختم ہونے کا غم نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے بدل جانے کا!"

اس پر تم نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی تھی اور چپ ہو گئی تھیں۔ ہاں غالباً وہ تم ہی تھیں۔ سنو۔ آج ڈاک میں میرے نام ایک ایسا لفافہ

آیا جس کے اندر نہ کوئی خط تھا اور نہ کوئی تحریر۔ صرف ایک سادہ کاغذ تہہ کیا ہوا رکھا تھا اور اس کی ایک شکن کے اندر پھول کی دو پنکھڑیاں تھیں۔ خشک مگر معطر! میں نے سمجھا اس کا بھیجنے والا سوائے تمہارے کون ہو سکتا ہے! یہ سادہ خط اور یہ دو پنکھڑیاں دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے خواب میں کسی بھولے بسرے شعر کا کوئی دلکش مصرع از سرِ نو یاد آ گیا ہو۔ اس سادہ کاغذ پر تم نے ماضی کی وہ تمام لمبی داستان لکھ دی ہے جسے مری آنکھیں بظاہر نہیں پڑھ سکتیں۔ مگر دل کی ہر دھڑکن کو اس میں حدیثِ آرزو کی ایک لمبی تفسیر مل سکتی ہے۔

مالیخولیا کی سی کیفیت میں میں نے تمہارا خط پڑھا۔ یعنی وہ بے تحریر کا سادہ کاغذ دیکھا جس پر تم نے نجانے کیوں کوئی لفظ نہیں لکھا تھا۔ اس کی تہہ میں ایک مرحوم پھول کی دو مردہ اور معطر پنکھڑیاں رکھی تھیں۔ اسے دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا خیال آنے لگا۔ سوچنے لگی۔ کہ وہ آتش فشاں پر بھی پھول اُگ سکتا اور تھوڑی دیر کے لئے لہرا سکتا ہے!!!

ہر چند تم نے اس کاغذ پر ایک لکیر کھینچنے کی بھی تکلیف گوارا نہیں کی مگر اس کے باوجود مجھے یہ بڑا جواب طلب خط معلوم ہوتا ہے۔ اس سادہ کاغذ نے اپنے اندر ہزاروں سوال چھپا رکھے ہیں جن کا اگر میں جواب لکھنے بیٹھوں تو شاید کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دینا پڑے۔ مرے سامنے یہ سفید کاغذ رکھا ہوا ہے اور اب بڑی تیزی سے اس پر حروف اُبھرے آ رہے ہیں۔ ماضی کی تصویریں یعنی وہ بہاریں۔ وہ خزائیں۔

یاد کرو۔ میں ان تصویروں میں وہ رنگ نہیں بھر رہی جس میں مرے اپنے جذبات رنگے ہوئے ہیں۔ میں ان نقوش کو ان کے اپنے رنگ میں تمہارے آگے پیش کرنے کی خواہشمند ہوں۔

کبھی ماضی میں تمہیں مجھ سے یہ شکایت ہوئی کہ میں مردم بیزار واقع ہوئی ہوں اور جذباتی نقطۂ نظر سے اپنے دوستوں پر کتابوں اور اپنی پالتو بلیوں کو ترجیح دیتی ہوں۔ میں تمہارے خیال کی تردید کرنا نہیں چاہتی۔ مجھ میں انسان کے خلاف بغاوت و غصہ موجود ہے یا میں خود مردم گزیدہ ہوں اس کے تجزیہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ تمہیں بس اتنا یاد رکھنا چاہیئے کہ میں ایک افسانہ نویس عورت ہوں۔ چلو تمہاری تسلی کے لئے مانے لیتی ہوں کہ میں اول درجے کی اعصابی ہوں اور جذباتی ہیجان میں گرفتار۔ لیکن یاد رکھو۔ آدم نے جب سانپ بن کر مجھے ڈسا ہوگا اس وقت میں شعور کی دنیا سے بہت دور ہونگی۔ یہ اس زمانے کی بات ہوگی، جب مرے جذبات کی زبان الفاظ سے نا آشنا ہوگی۔ اور صرف احساسات پر اظہاریت کا دار و مدار ہوگا۔ لیکن مری شخصیت کی اس تشکیل کی ذمہ داری بھی تو کسی انسان ہی پر عائد ہوگی؛ خیر یہاں یہ سب تذکرے بے معنی اور فضول ہیں۔ میں تم سے صرف یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کئی سال سے اب مجھے بلیوں اور کتابوں کے علاوہ کسی کی رفاقت پر اعتماد نہیں رہا۔ اب مرا مرکزِ توجہ ہٹ چکا ہے۔ لیکن آج میں تمہارے خط کو لیکر ماضی کی وادیوں میں جا نکلی! خواہ ماضی سے یہ گہری وابستگی کا رجحان اور یوں عمر کی پچھلی وادیوں میں آسانی سے پھسل جانے کی خواہش ہزار فرسودہ جذبات کی علامت ہو، مگر کیا کروں۔ آج تمہارے خط کو دیکھ کر اور باسی پنکھڑیوں کی خوشبو کو سونگھ کر مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا کہ یہ آج سے سالہا سال پہلے کی دنیا ہے۔ وہی زندگی ہے۔ وہی چاند تارے۔ وہی صبح شام ہے۔ وہی تم اور وہی میں!! لیکن! اچانک مری اک بلی نے زور کا قہقہہ لگایا اور سامنے پڑی ہوئی مری ایک موٹی کتاب نے اپنے ورق الٹ دیئے۔ اس وقت مجھے ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ یہ محض مرا جنون تھا۔ نہ تم وہ تم ہو۔ نہ میں ہی وہ میں رہی۔ ہر چیز بدل چکی ہے۔ صرف غم ہم کو مشترک رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ غم میں پاکیزگی بھی ہے اور استقلال بھی!!

تم کو یاد ہوگا۔ مجھے خواب کبھی کتنے پسند تھے۔ مجھے شدید حقیقت پسندی سے ہمیشہ محض اس لئے توحش رہا کہ یہ ہمارے خوابوں کی دشمن تھی۔ تم سب جب مجھے خواب کار کہتے تھے تو میں یہ دلیل پیش کیا کرتی تھی کہ دنیا میں کسی عظیم عمل سے پہلے آدمی خواب دیکھتا ہے پھر جب اس خواب کو عظمت بخشتا ہے تو وہ دنیا کے آگے ایک عظیم حقیقت بنکر جلوہ گر ہوتا ہے۔ خواہ یہ حقیقت کسی مصور کا فن پارہ ہو۔ یا کسی مصنف کا ادب پارہ۔ تم نے نہیں دیکھا، انسان کے خوابوں نے قوموں کی بدبختی و بدشکلی کی کیسی صورت گری کی؟ یہ دنیا کی عظیم تہذیبیں۔ سائنس کی ہوشربا ایجادیں۔ قوموں کی ناقابلِ فراموش کلاسیکی موسیقیاں۔ اور یہ مذاہبِ عالم۔ یہ ساری ٹھوس حقیقتیں کبھی انسان کا خواب تھیں محض خواب! مگر خواب کو منزل سمجھنا غلطی ہے۔ خواب تو ایک سفر ہے جس کی منزل حقیقت ہے۔ اس لئے انسان ہمیشہ نہ خواب دیکھ سکتا ہے نہ صرف حقیقت میں زندہ رہ کر خوش رہ سکتا ہے۔ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔

ارے تم نے دیکھا؟ مرے باتیں کرتے کرتے یہ چاند کس قدر زرد پڑتا جاتا ہے! جیسے کوئی مدقوق ہو۔ اس کی وجہ کیا ہے؟
اور وہ درخت پر بیٹھی ہوئی ننھی ابابیل! اسے کیا ہوا؟ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ہے۔ کیوں؟ مجھے تو یہ سب کچھ اتنا فضول معلوم ہوتا ہے، جتنا کسی انسان کا غم زندگی کی وجہ سے خودکشی کر لینا!

اس وقت میں یہ چند سطور اس لئے نہیں لکھ رہی کہ عہد رفتہ میں کبھی تم کو مجھ سے شدید محبت تھی یا مجھے تم سے عشق تھا۔ یوں کبھی نہیں ہوا۔ اگر یوں ہوتا۔ تو شاید مری زبان اس وقت گنگ ہوتی اور مرا قلم تمہارے کردار کی صحیح تصویر کشی نہ کر سکتا۔ صحیح تو شاید اب بھی نہ کر سکے۔ کیونکہ یہ تو تصویر کا محض ایک رخ ہے۔ جانے اور کتنے مختلف رخ ہوں گے جن سے میں ناآشنا ہوں۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ تم اور میں محض ایسی ہی شناسا تھیں جیسے عام آدمی ہوتے ہیں۔ نہ مرے دل میں تمہارے لئے شدید محبت تھی نہ تم مجھ سے بے حد نفرت کرتی تھیں۔ لیکن ہم دونوں کچھ دیر کے لئے ایک ہی جادۂ حیات کے راہ رو ضرور رہے ہیں۔ پھر ہمارے رستے بالکل مختلف سمتوں کو جا نکلے۔ مختلف سمت!

وہ دور دیکھو کتنی دور ایک سمت پر رستہ نظر آ رہا ہے۔ یہ رستہ ہی ہے یا کوئی سراب یقینی طور پر کیا کہا جا سکتا ہے؟ کیونکہ اگر میں کسی بات کو یقینی طور پر کہہ سکتی ہوں تو صرف اتنا کہ یہ راہیں پیچیدہ ہوتے ہوتے بڑی دور جا کر مسافر کے لئے گمراہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے انسان کو قدم پھونک پھونک کر رکھنا اور محتاط رہنا چاہیئے۔ راہوں کی اس پیچیدگی کے علاوہ کوئی بات اس وقت مجھے یقینی نہیں معلوم ہوتی۔ شاید تم کو مری طبیعت متشکی معلوم ہو۔ کیونکہ مجھے کسی بات پر یقین نہیں۔ خیر مجھے تمہارے اعتراض کی بھی کوئی پروا نہیں۔ کیونکہ اعتراض کرنے والا دوسرے کی جس بات پر معترض ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ اس کا اپنا لاینحل مسئلہ ہوتا ہے۔ اور وہ اصل میں درپردہ اپنے آپ پر معترض ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے تمہارے اعتراض کی کوئی پروا نہیں۔ تم نے کبھی کتابیں پڑھی ہوں گی تو کسی کتاب میں ضرور پڑھا ہوگا کہ ہمارے سقراط نے ایک دفعہ ایک معترض کو کیا نصیحت کی تھی۔ اس بوڑھے مفکر نے کہا تھا:

"تم معقول آدمی بنو۔ یہ خیال نہ کرو کہ فلسفی برے ہیں یا بھلے۔ تم صرف ان کے فلسفے پر غور کرو اور اس کو پرکھنے کی کوشش کرو۔ اگر فلسفہ ویسا نکلے جیسا مرا ایمان ہے کہ نکلے گا تو اس کی تقلید کرو اور اس کے پیرو ہو جاؤ۔"

یہی میں تم سے کہہ رہی ہوں کہ مری عصبیت پر نہ جاؤ۔ مرے بیان کی صداقت کو پرکھو۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ میں تمہیں کسی بات پر مجبور کر رہی ہوں۔ نہیں اس لئے نہیں کہ میں تھک گئی ہوں یا شام ڈھل چکی ہے، یا میں مغموم ہوں، بلکہ اس لئے کہ ہر آدمی میں ایک جذباتی بے بصری ہوتی ہے۔ وہ وہی چیز دیکھ سکتا ہے جو وہ چاہتا ہے کہ دیکھے۔

★

لیکن یاد کرو وہ شام ناہید! ایک دن تم اور میں کلب کے ایک میلے میں چلی گئی تھیں۔ بھلا یاد ہے تمہیں عہد ماضی کی وہ بہت دور کی ایک شام؟ ۔ جہاں جا کر رستے اور پگڈنڈیاں وقت کے دھندلکوں میں غائب ہو جاتی ہیں؟

شام کا آفتاب دم توڑ چکا تھا۔ اور ساری فضا میں ایک افسردگی سی بدغم تھی۔ ہائے کیا شام تھی وہ بھی! ہاں میں بھول گئی اس شام افسردگی کے ساتھ فضا میں ایک شعریت سی رچی ہوئی تھی جس سے تم ہمیشہ ناآشنا رہیں۔ اس لئے نہیں کہ تم ایک نارمل ذہنیت کی عورت تھیں۔ بلکہ اس لئے کہ بدقسمتی سے تمہیں شعر و موسیقی۔ فن و ادب ہسٹیریا کی اولاد معلوم ہوتے تھے۔ مجھے تم جیسی شدید نارمل ذہنیت کی عورت تو ہمیشہ توحش رہا۔ تم لوگوں میں نازک احساسات کا جو فقدان ہوتا ہے وہ مرے لئے وبال جان بنا رہتا ہے تمہیں یاد ہوگا۔ انہیں ایام میں تمہارا رجحان طبع دیکھتے ہوئے میں نے ایک دفعہ بڑی ہمدردی و خلوص سے تمہاری خدمت میں اپنی یہ رائے پیش کی تھی کہ تمہیں سیاسیات کے میدان میں اچھل کود اختیار کرنی چاہیئے۔ جہاں اگرچہ فانی زندگی کے چند دن ہنگاموں اور شور و شر میں گزر جاتے ہیں مگر جونہی آنکھ بند ہوتی ہے تم لوگوں کی ہستی کا سراغ تک نہیں لگنے پاتا کہ دھواں بن کر کہاں اڑ گئی اور تم کون تھے۔ اس پر تم برامان گئی تھیں۔ مگر اس کا کیا علاج

ناہید کہ تم جیسے سطحی ہنگامہ پسند لوگ پلیٹ فارموں پر بآواز بلند چیخنے چلانے اور شب و روز کی ضیافتوں اور محفلوں میں تھوڑی دیر بے سرے راگ گانے کے سوا زندگی کے کسی اور سنجیدہ اور فنکارانہ شعبے میں داخل ہونے کے ناقابل ہوتے ہیں۔ بھلا تم لوگوں کو کیا علم کہ گلیلیو نے زمین کی گردش کی حیرت انگیز دریافت سے پہلے کتنی راتیں اور کتنے دن محض سوچ بچار اور تجسس میں بسر کئے ہوں گے؟ فرائڈ، ڈارون، سفاکلیز، دوستوفسکی، مائکل انجیلو، کیا یہ سب کے سب جینئس نہیں تھے؟ کیا یہ سب اعصابی تھے؟ محض اس لئے کہ وہ ہماری طرح شامیں کلبوں اور تفریح گاہوں میں اور دن محفل آرائیوں میں بسر کرتے تھے؟ اگر دنیا کی بدقسمتی سے کہیں ان مشاہیر عالم نے شامیں تاش کھیلنے یا رقص کرتے گذار دی ہوتیں تو آج دنیا عظیم دریافتوں، عظیم مصوری کے فن پاروں اور عظیم ادب کے شاہکاروں سے محروم نہ رہ جاتی؟ پھر اس بچاری دنیا کے پلے کیا پڑتا؟ چند احمق! جو دن رات بیٹھے لطیفہ گوئی، تاش بازی اور چیخنے چلانے میں مصروف ہوتے! بتاؤ تم نے کبھی کسی کالی رات میں دریچے سے باہر جھانک کر یہ بھی سوچا ہے کہ اگر کسی رات، رات کی تاریکی ان ننھے ننھے تاروں کو کھا جائے اور یہ بے نور ہو جائیں تو کیا ہو؟ بھلا ان خرافات پر تم نے کبھی کاہیکو سوچ کر اپنا وقت ضائع کیا ہوگا ناہید؟ ہائے احساس کی شدت واقعی آدمی کو مار ڈالتی ہے!

مگر تم کو اصرار تھا کہ میں تمہیں ایک فنکار یا ایک مفکر سمجھوں۔ یہ کیسے ممکن تھا ناہید! تم کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ "آخری دعوت" کا کھینچنے والا مصور کون ہے؟ ایڈیپس کے مصنف کا کیا نام ہے؟ "خود آگاہی" کی تلقین پہلے پہل یونان کے کس احمق نے دنیا کو کی تھی؟ پھر بھلا میں تم کو اہل علم کی بلند صف میں کیسے لیجا کر بٹھا دیتی؟ جو کچھ تم ہو اُسے قبول کیوں نہیں کرتیں؟ جو تم نہیں ہو تم وہ کیوں بننا چاہتی ہو۔ کان کھول کر سنو۔ تم سوائے ایک خوش باش تیتری کے جو جگمگاتی محفلوں میں اڑتی پھرتی ہے، اور کچھ نہیں ہو۔ اپنے آپ کو قبول کرنا سیکھو جیسی بھی تم ہو۔

ہاں تو میں ایک خاص شام کا ذکر کر رہی تھی۔ تو اس شام صحن گلستان میں دل آرام کے پھول قہقہے لگا رہے تھے اور میں زرد لیموں کی ٹہنی کے نیچے بیٹھی دیوان غالب پڑھ رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی ایک بلی کو ٹھنڈی کوکو پلا رہی تھی۔ مجھے اس قسم کے مشاغل اتنے پسند ہیں ناہید! کیونکہ میں اسی میں اپنی خیریت دیکھتی ہوں۔ دیوان غالب پڑھنا، بلیوں کو ٹھنڈی کوکو پلانا، نیلے آسمانوں اور نارنجی رنگ کے آفتاب کی پرستش کرنا اور کہانیاں لکھنا، زندگی کی سچی کہانیاں اور اپنی کہانیوں کے ذریعہ پھر سے حقیقت کی ٹھوس دنیا میں واپس آ کر تم سب دوستوں سے ملنا جلنا بجائے اس کے اگر میں تم نارمل ذہنیت کے لوگوں کی طرح اپنے دوستوں اور رشتہ داروں سے براہ راست چلا چلا کر لڑنے جھگڑنے لگوں تو مجھے کیا مل جائے گا؟ انسان کے طریق فکر و طریق عمل مختلف ہوتے ہیں ناہید! مرکز ایک ہوتا ہے، راہیں جدا ہوتی ہیں۔ کوئی اپنے رفیقوں سے توتو میں میں اور ہاتا پائی کر کے اپنی توانائی کو بحال رکھتا ہے۔ کوئی اپنے خیالستان میں بیٹھ کر کہانیاں لکھ لکھ کر اس ضرورت کو پوری کر لیتا ہے۔

تو مجھے یاد ہے اس شام میں کسی نامعلوم وجہ سے غمگین سی ہو رہی تھی اور سوکھی گھاس میں ایک جھینگر بڑے دردناک پیرائے میں ماتم کناں تھا۔ ایسے ماحول میں دفعتاً تم ایک بھڑکیلا سرخ لباس پہنے آموجود ہوئی تھیں۔ تمہارے ہاتھ میں ایک دف تھا اور تم ایک عامیانہ عشقیہ مصرع اس پر بجا بجا کر رات کی محفل کے لئے مشق کر رہی تھیں۔

تمہارا نزول مجھے بے وقت کا راگ معلوم ہوا۔ اور میں نے ذرا بیزاری کے لہجے میں بغیر سر اٹھائے تم سے پوچھا تھا "کیا بات ہے؟"

تم ولولے میں تھیں۔ "چلو چلو۔ رات کے میلے میں چلیں۔ یہ چھوٹا سا مصنوعی خنجر دیکھتی ہو؟ رات کو میں اس سے نواب ہارون کو قتل کر دوں گی۔ وہ ڈاکو بن رہے ہیں۔ چلو روحی چلو۔ تم آسکر وائلڈ کی سلومی بنو"۔

میں نے ہنس کر کہا "جو کچھ میں ہوں۔ وہی نہ رہوں؟"

"ارے بند بھی کرو اپنے فلسفے کو۔ آج کی بہترین ہنگامے کی رات ہوگی میں چاہتی ہوں روحی۔ شہر کی تمام بیگمات پر میں سبقت لیجاؤں اور کل کے اخبار میں میرا نام —— ارے اٹھو بھی میلے کا وقت ہو گیا"

میں نے ذرا چڑچڑے لہجے میں کہا "اونہہ۔ ایسی مدہوش شام کلب کے میلے میں! تمہارا مذاق تیسرے درجے کا ہے" یہ کہہ کر میں نے نشان کے لئے دیوان غالب کے ورق پر گھاس کی ایک پتی رکھ دی تھی۔ اور دستی سے بلی کا منہ پونچھا تھا۔

تم مڑ گئیں۔ ایک قہر آلود نگاہ مجھ پر ڈالی پھر غصے سے بے قابو ہو کر تیزی سے باغ کے دروازے تک پہنچیں۔ مڑ کر مجھ پر حقارت کی ایک دوسری بھرپور نظر ڈالی اور بڑے دھڑتے سے یوں باہر نکل گئیں۔ جیسے مری زندگی ہی سے باہر نکل گئی ہو۔

تمہارے جانے کے بعد باغ کے درختوں نے مری ہنسی کی آواز سنی۔ لیکن خود میں نے نہیں سنی۔ میں بیٹھی بلی کو دوبارہ ٹھنڈی کوکو پلا رہی تھی۔ گر اندرونی اضطرار نے مجھے بیٹھنے نہ دیا اٹھ گئی۔ تیز قدمی سے باغ کی شکستہ دیوار تک پہنچی۔ وہاں سے جھانک کر تمہیں جاتا ہوا دیکھنے لگی۔

تم غصے میں گاڑی میں بیٹھ چکی تھیں۔ تمہارا دامن جلدی میں گاڑی کے دروازے میں پھنس گیا تھا۔ جھنجلاہٹ میں تم نے زور سے کھینچا تو وہ پھٹ گیا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ اپنی یہ ہنسی اس دفعہ میں نے بھی سنی۔

پھر میں نے بڑی بیدلی سے چلا کر تم سے پوچھا تھا: "کہاں جا رہی ہو؟ میں آؤں؟ چلیں میلے میں؟" : "نہیں نہیں۔ تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ تم دیوان غالب پڑھو اور بلی کو کوکو پلاؤ"۔ تمہاری غصیلی آواز گرمیوں کی سہ پہر میں پائین باغ میں یوں گونجی جیسے ہوا کا جھکڑ چل رہا ہو —— لیکن میں لمحہ بھر میں تمہارے پہلو میں تھی۔ اب تم غصہ تھوک کر انسان بن چکی تھیں۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں سر جوڑ کر یوں آہستہ آہستہ باتیں کر رہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

غرض ہمارا بچپن یوں گذر گیا —— تمہارا میلے ٹھیلوں میں۔ مرا دیوان غالب پڑھنے اور بلیوں کو کوکو پلانے میں —— ! اور شامیں ڈھلتی رہیں۔ اور انسان کا غم تازہ ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ ہر چیز بدلتی گئی۔ نہ صرف مری کائنات کی۔ بلکہ تمہاری دنیا کی بھی۔ یہ اور بات ہے کہ میں اس تغیر پر متاثر اور بے چین سی رہی۔ مگر تم اور تمہارے فرشتے بھی اس تغیر سے بے تعلق و بے خبر رہے —— اسلئے کہ تم میلوں میں لگی رہیں۔ نارمل ذہنیت کی تھیں نا! اور میں دیوان غالب اور بلیوں میں گرفتار رہی —— میں اعصابی جو ہوئی! لیکن اگر میں وہ نہ ہوتی۔ جو میں ہوں۔ تو آج یہ کہانی بھی نہ لکھی جاتی۔ اور تم کبھی آئینے میں اپنا عکس نہ دیکھ پاتیں!

اور پھر اس رات جب ہم میلے کے ہنگاموں سے بڑی رات گئے واپس آئیں تو باغ میں چاند تاڑ کے ایک درخت کے پیچھے آسمان کے ایک کونے پر اتنی دور پھسل گیا تھا کہ اسے دیکھ کر میں ڈر گئی کہ کہیں وہ ہماری دنیا میں نہ اتر آئے! اس دنیا میں پہلے ہی شور و شر کیا کم ہے!

اور رات کے سناٹے میں درختوں کی پراسرار ٹہنیوں پر ایک موسیقی رقصاں تھی۔ تم ڈر گئی تھیں۔ کہ رات کی ویرانی میں بوڑھے درختوں پر جن بیٹھے عشقیہ دھنیں نہ الاپ رہے ہوں۔ جن جو ہماری آنکھوں کو نظر نہیں آتے۔ مگر پرانی داستانوں میں عورتوں پر عاشق ہوتے تھے......

تو ایک ایسے ہی جن کو میں نے آہستہ آہستہ تمہاری دنیا میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ یا یوں کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ تم کو میں نے اس کی زندگی پر مسلط ہوتے دیکھا؟

مسلط کا لفظ یاد رکھنا نہید!

اور اس پر برا نہ مان جانا۔ میں آخر ایک افسانہ نویس عورت ہوں جس کا کام ہی زندگی کی سچی کہانیاں لکھنا ہے۔ خواہ اس کی سزا میں دنیا ہمیں سولی پر چڑھا دے۔ یا فرط عقیدت سے اپنے سینے سے چمٹا لے۔

اچھا جب بات آپڑی ہے تو میں کہہ دوں۔ اتفاق کی بات کہ وہ جن دراصل نیلم کا ایک حسین خواب تھا۔ ہاں نیلم! جس کی آنکھوں میں چھپی گھٹی حسرت یوں جھانکا کرتی تھی جیسے ساون کے مہینے میں آسمان کے کناروں سے اودی گھٹا۔ گھٹا جھوم کر اٹھتی اور برستی ہے نا؟ بس یہی حال نیلم کی حسرتوں کا تھا۔ جھومتی ہوئی اٹھتی تھیں۔ اور آنکھوں کے ذریعہ برس جاتی تھیں۔ مگر ہائے اب جانے دو۔ شام ڈھلی جا رہی ہے۔ اور احساس غم مارے ڈالتا ہے! کاش ایسے میں کوئل گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ اٹھتی۔ اور مرا یہ اضمحلال ولولے میں منتقل ہو جاتا اور میں پھر سے تم کو سنانے لگتی کہ عہد ماضی میں کیا ہوا تھا...

تو ہوا یہ تھا کہ اس دن فیروزے آسمانوں پر سیندوری رنگ کا آفتاب جگمگاتا رہا۔ اور مہندی کے درختوں پر کاسنی پروں والی مینائیں مسلسل گاتی رہیں۔ بید مجنوں کے درخت فوارے کے پاس دم بخود کھڑے رہے۔ ہارسنگھار کی خمیدہ شاخ پر بلبل کا ایک نوخیز جوڑا بیٹھا تمام دن ایک
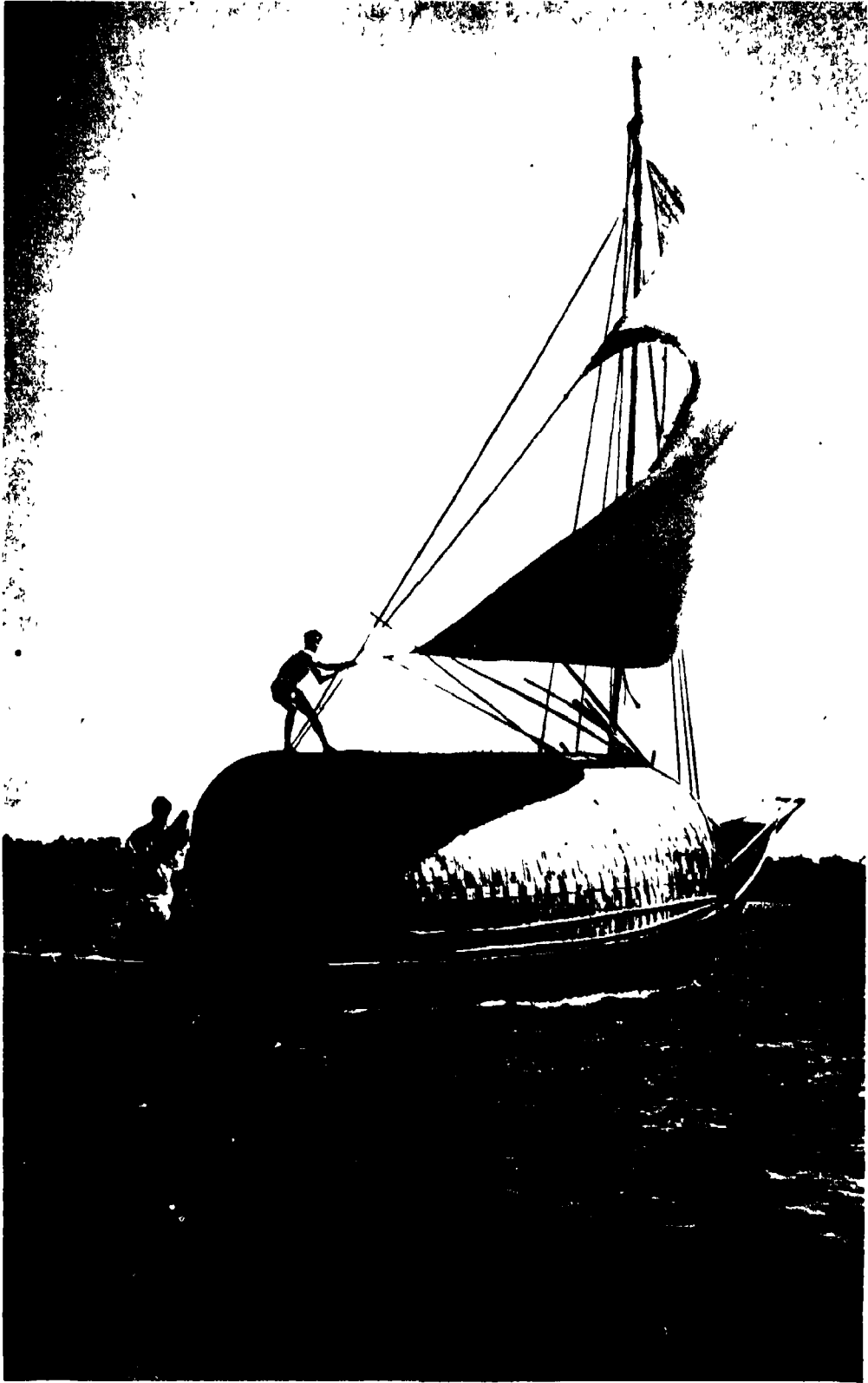
ناؤ : مشرق پاکستان

۱ : روضہ حضرت شمس تبریز رح (ملتان)
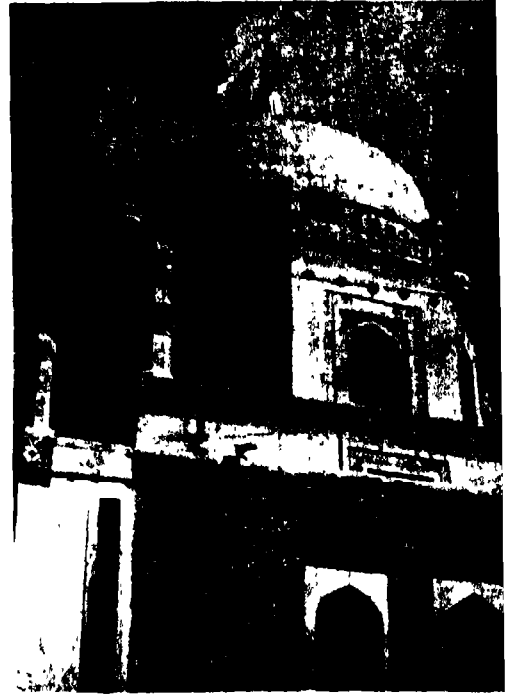
۲ : اونٹ کی کھال سے بنے والی نقش گری (بہاولپور)

۳ : ملتان کے نقش ٹائلوں کا نمونہ

۴ : آبپاشی کے کام میں جھالر اور اونٹ کا حصہ

دوسرے سے اظہارِ عشق کرتا رہا اور میں ساری دوپہر ایک پرانے پیڑ کے نیچے سنگ مرمر کی چبوتری پر نیم دراز کہانیاں لکھتی اور کہانیوں کے خاکے سوچتی رہی۔

درخت سے خزاں رسیدہ پتوں کو گرنے سے کون روک سکتا ہے ناہید؟ مرے اطراف خزاں کی ماری پتیاں مسلسل شور پیدا کر رہی تھیں کہ میں چونک پڑی، پھر بول اٹھی: "ارے اس تیزی سے کہاں اڑی جا رہی ہو جیسے بہار کی تیتری؟"

نیلم کے لمبے لمبے بال ہوا میں بادلوں کی طرح لہرا رہے تھے۔ سانولی صورت پر نکھار سا برسنے لگا تھا۔ اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ کا ہلکا سا ارتعاش تھا کہنے لگی: "زندگی میں سنہرے موقعے کم آتے ہیں نا روحی؟"

"جب آتے ہیں تو خبر تک نہیں ہوتی کہ یہی سنہری موقع تھا" میں نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔ پھر اس کے سراپا کو دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں سرگوشی کی تھی: "گلاب کی طرح کھِل جا رہی ہو۔ بتاؤ کوئی سنہری موقع ہاتھ آگیا؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف بنفشے کے پھول جیسے کھلے ہوئے گہرے نیلے آسمانوں کو دیکھ کر مسکرانے لگی اور بولی: "کوئی بادل نہیں کسی قسم کا کوئی خوفناک سایہ نہیں۔ آج تو روشنی ہی روشنی ہے"۔

میں اٹھ بیٹھی۔ دلچسپی سے پوچھنے لگی: "تمہیں سائے نہیں پسند نیلم؟"

وہ گھبرا کر بولی: "نہیں روحی نہیں۔ بلکہ آج ان کا نام تک نہ لو۔ کم از کم روشن شاموں میں سیاہ سایوں کو یاد نہ دلاؤ" پھر وہ ہنس پڑی تھی۔ وہ صاف دل لڑکی تھی۔ اس لئے ہنس سکی تھی۔ میں ہمیشہ نیلم کے کردار میں اس کی ہنسی کی پاکیزگی کو محسوس کرتی رہی۔ اس کے اندر بغض یا بغاوت نہ تھی، محبت کے لئے استقبال تھا۔ اور زندگی کے لئے خوشامدید! اسے زندگی میں جو بھی اور جتنا بھی میسر آجاتا تھا وہ اس پر دلیرانہ طور پہ قانع ہو جاتی تھی۔ وہ ہر چیز کو جلدی بھول جاتی تھی۔ اس لئے کبھی کبھی خوش بھی ہوتی تھی۔

اور جبھی تو اس نے پرانے یونانیوں کی طرح کہا تھا: "کم از کم روشن شاموں میں سیاہ سایوں کو یاد نہ کرو"!

مگر مجھے روشنی اور سایوں کا ایک عظیم طوفان اپنے دائیں بائیں گھومتا نظر آرہا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مری الم پسندی مجھے جانے کیا کیا کچھ دکھاتی رہتی ہے۔ میں نے دبی زبان سے اسی وقت کہا تھا: "میں چیزوں کو اپنے نظریئے سے دیکھتی ہوں نیلم۔ اچھا! تم نے بتایا نہیں — جا کہاں رہی تھیں اتنی تیزی سے؟"

اس نے اس وقت تو مجھے کوئی جواب نہ دیا تھا، مگر آج۔ آج اتنے سالوں بعد میں سوچتی ہوں تو معلوم ہوتا ہے وہ اس تیزی سے زندگی کے طوفانوں سے لڑنے جا رہی تھی۔ ہائے بہادر لڑکی!

اب جانے بھی دو۔ شام ڈھل رہی ہے۔ اور دل مغموم ہے۔ گڑے مردے اکھیڑنے سے فائدہ بھی کیا!

سچ پوچھو تو مجھے نیلم میں اس کا سانولا رنگ پیارا لگتا تھا۔ اگرچہ کہ نیلم خود اپنی رنگت سے ہمیشہ مغموم رہی۔ یہ حسن اسے اپنی ماں کی طرف سے ورثہ میں ملا تھا۔ نیلم کی ماں۔ جو تمہاری سوتیلی ماں کہلاتی تھیں، بچپن میں مجھے ہمیشہ بے حد پسند رہیں۔ اس بات کا مجھے کبھی یقین نہ آیا کہ وہ حبشی النسل تھیں۔ ہر چند کہ نیلم کے بال بے حد گھونگر یالے تھے مگر اس کے چہرے میں وہ بے پناہ جاذبیت اور اس کی آواز میں وہ ہوشربا موسیقیت تھی کہ آدمی مسحور سا ہو جاتا تھا۔ جبھی تو نیلم تمہیں اتنی بری لگتی تھی۔

جب تم دونوں بہنیں اکٹھی ہوتی تھیں تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تم سرخ گلاب کا ایک دہکتا ہوا پھول ہو۔ اور نیلم؟ وہ چنبیلی کی ایک زرد کلی جسے بادِ سموم نے جھک کر ہلکے سے چوم لیا ہو۔ کلی اور پھول میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ دونوں کی دلآویزی مسلّم۔ مگر ان کی نکہتیں الگ الگ ہوتی ہیں اور ان کا حسن جدا جدا۔ مگر ہائے وہ کلی! جو کھل کر پھول نہ بن سکی!

اور ماضی کی اس دوپہر کو میں اب تک نہیں بھولی ہوں ناہید۔ فیروزے آسمانوں پر سیندوری رنگ کا آفتاب جگمگا رہا تھا۔ مہندی کے درختوں پہ کاسنی پروں والی مینائیں مسلسل گائے جا رہی تھیں۔ بید مجنوں کے درخت فوارے کے پاس دم بخود کھڑے تھے۔ اور دلِ رسنگھار کی

خمیدہ شاخ پر بلبل کا ایک نوخیز جوڑا بیٹھا تمام دن ایک دوسرے سے اظہارِ عشق کرتا رہا۔ اور ایسے میں۔ بے اختیار ہو کر میں نے نیلم سے پوچھا تھا: "ارے اس تیزی سے کہاں اڑی جا رہی ہو جیسے بہار کی تیتری؟"

مجھے اب خیال آ رہا ہے میں نے اسے بہار کی تیتری کیوں کہا تھا۔ خزاں کا پتا کیوں نہ کہا تھا۔ وہ بھی تو تیزی سے اڑتا پھرتا ہے ہواؤں میں۔

وہ ۔۔ دیکھو دیکھو۔ شام کس تیزی سے ڈھلی جا رہی ہے۔ یہ انسان کے غم کو کیا ہو گیا؟

لیکن اگر تم آئینے میں ماضی کا عکس دیکھنا پسند کرو تو مرے ہاتھوں میں اتنی طاقت ہے کہ تمہارے مقابل آئینہ تھامے رکھوں۔ خواہ شام ڈھل جائے اور غمِ زندگی چلا اٹھے۔

تو پھر آؤ۔ یاد کرو اس رات کو جس رات ہم میلے سے واپس آئی تھیں۔ یاد ہے تم کو؟ تم اندھیرے باغ میں چاند کو دیکھ کر کس قدر خوف زدہ ہو گئی تھیں؛ تمہارے منہ سے نکلا تھا: "ارے روحی۔ ذرا دیکھو تو چاند کو! کوئی عادی مجرم معلوم ہو رہا ہے۔ زرد۔ اور مکار سا!"

شاید جرم تمہارے اپنے اندر تھا۔ لیکن جب ہم فوارے کے پاس افلاطون کے بت کے قریب سے گذر کر بارہ دری کے زینے پر پہونچی تو چمن کی خواب گاہ میں روشنی ہو رہی تھی۔ یاد ہو گا۔ دو مہینوں سے عرفی موتیا کی خوشبوؤں کے لئے اوپر سے نیچے کی خوابگاہ میں اتر آئے تھے تاکہ تمام رات ان کا کمرہ مہکا رہے۔ ان کی اس عظیم ضرورت کو ہم سب نے مان لیا تھا۔

خیر، ہم دونوں اس وقت خوف زدہ اور حیران ہو گئی تھیں۔ اتنی رات گئے ان کے کمرے میں روشنی! اور پھر بالوں کی آواز؟ تم نے حواس باختہ ہو کر کہا تھا "مجھے تو کوئی حادثہ معلوم ہوتا ہے روحی۔"

"ایسے موقع پر کسی حادثے کا نہ ہونا بھی ایک حادثہ ہوتا ہے" میں نے جواب دیا تھا۔

تم کو مرے جملے کی پیچیدگی پر غصہ آ گیا تھا۔ ابرو سکیڑ کر بولی تھیں: "کیا بک رہی ہو۔ مرے تو ہوش اڑ گئے ہیں۔ وہ دیکھو کمرے کے اندر۔۔"

اس نے باغ میں کھڑے ہو کر دریچے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو کمرے میں عرفی بستر پر پڑے ہوئے نظر آئے۔ ہم نے زینے پر قدم رکھا ہی تھا کہ ہمارے چچا آواز سن کر باہر نکل آئے اور اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "ستم ہو گیا ستم! کون کھڑا ہے اندھیرے میں؟ ارے روحی اور ناہید۔ معلوم بھی ہے تمہیں؛ عرفی بیہوش ہو گئے تھے۔ مگر ستم ہے۔ کہ اب بہتر ہوتے جاتے ہیں۔"

تمہارے چچا کو ہر چیز خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ لمبی ہو یا چوڑی۔ اچھی ہو یا بری۔ ستم معلوم ہوتی تھی۔ مثلاً تمہیں یاد ہو گا ایک دفعہ انہوں نے تمہاری سالگرہ کے موقع پر کہا تھا "ستم ہو گیا۔ آج تم اٹھارہ سال کی ہو گئیں!" اور ہم ان کے فقرے کی بے ربطی پر ہنس پڑی تھیں۔ لیکن عرفی کا بے ہوش ہونا واقعی ستم تھا۔ اسلئے تم نے پوچھا تھا "انہیں کیا ہو گیا تھا چچا جان؟"

"لو لگ گئی تھی، مگر ستم ہے کہ عین موقع پر ڈاکٹر آ گیا تھا۔"

جب ہم عرفی کی خوابگاہ میں داخل ہوئیں تو کمرہ موتیا کے پھولوں کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور بیہوش آدمی کے ہوش لوٹ کر آ چکے تھے۔

"نجانے آدمی بے ہوش کیوں ہوتا ہے؟ شاید ہوش سے فرار کی یہ بہترین راہ ہے" میں نے اپنے آپ سے سوال و جواب کیا تھا۔

ہم نے مریض پر سے نظریں اٹھائیں اور ادھر ادھر دیکھا۔ دریچے میں دوا کی شیشی اور نیلم تھے۔ دونوں ساکت! مرے لئے کسی بات کا اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔ اور اندازے پھر اندازے ہوتے ہیں۔ لیکن تم نے جھٹ نیلم سے سوال کیا تھا "تم تھیں سارے وقت یہاں؟"

اور چاند تھا۔ اور موتیا کی رومان انگیز نکہتیں تھیں۔ اور کمرے کی نیم تاریکی! واقعی دنیا میں کتنی ساری چیزیں حسین ہیں! صرف ونیس کا بت ہی نہیں۔

اور دوسری صبح نیلم کے لئے ایسی درخشاں اور اتنی تاباں تھی کہ زندگی میں ایسی صبحیں کم ہی آتی ہوں گی۔

خیال کرو۔ دنیا کتنی بوڑھی ہے! اور اسی لئے تو نیلم نے بنفشے کے پھول جیسے کھلے ہوئے گہرے نیلے آسمانوں کو دیکھ کر کہا تھا: "کوئی بادل نہیں۔ کسی قسم کا کوئی خوفناک سایہ نہیں۔ آج روشنی ہی روشنی ہے۔"

اور پھر وہ زندگی کے طوفانوں سے لڑنے چلی گئی تھی۔ وہ بہادر لڑکی!

مرے ندیم! محبت کے گلستانوں میں بہار تازہ نے خیمے سجا دیئے کہ نہیں؟

لیکن! تمہارے لئے راتیں اور بھی سیاہ ہو گئیں۔ تاریکی کا ایک خوفناک طوفان تمہارے گرد منڈلانے لگا۔ یہاں تک کہ تم اس میں غرق ہو گئیں۔ بجز ظلمات کی ان خوفناک موجوں میں سے صرف تمہاری آتشیں چیخوں کی بھیانک آواز گالیوں کے لہجے میں مجھے سنائی دیتی رہی۔ لیکن تمہاری چیخوں میں درد نہیں تھا۔ وہ غم نہیں تھا ناہید۔ جو خون دل کی آخری بوند سے پیدا ہوتا ہے اور جو انسان کی زندگی کی معراج کہلاتا ہے تمہاری چیخوں میں نفرت اور غصے کی خوفناک گونج تھی، انتقام تھا۔ اور تخریبی جنون تھا۔ ناہید! کیا تم جانتی ہو کہ تخریبی جنون اور تعمیری غم میں کتنا فرق ہوتا ہے؟ میں نے تم سے اس موقع پر یہ سوال کیا تھا۔ مگر مرا یہ سوال آج بھی تشنۂ جواب ہے۔ مجھ میں یہ نقص ہے۔ میں اپنے دوستوں سے سوال کرتی ہوں۔ لوگوں میں یہ وصف ہے وہ جواب دینے سے کترا جاتے ہیں لیکن آدمی کو اپنی توہین دوسرے کی بیہودگی فوراً نظر آجاتی ہے۔ اور پھر یہ ڈھلتی ہوئی شامیں۔ اور یہ غم حیات ایک موہوم سی چیز معلوم ہونے لگتی ہے۔

یاد کرو ناہید۔ اگر حافظہ تمہارا ساتھ دے اور اگر ان یادوں کو تم دردناک نہ سمجھو، تو ایک دفعہ تھوڑی دیر کے لئے یاد کرو۔ وہ ایک گرم اور بے حد دلربا گہرے قرمزی رنگ کی ایشیائی صبح تھی۔ اس دن کا سنی آسمانوں پر گلابی رنگ کا آفتاب یاقوت کی طرح دمک رہا تھا۔ اور زندگی، کم از کم مجھے ایک دلکش شعر معلوم ہوتی تھی۔ نیلم کسی پرانی عشقیہ غزل کا ایک ہی مصرع بار بار گائے جا رہی تھی۔ یوں کھوئی کھوئی گنگنا رہی تھی۔

تمہارے ہاتھ میں ہار سنگھار کی ایک پتلی سی چھڑی تھی جسے تم نے شاخ گل کے دھوکے میں توڑ لیا تھا اور کبھی کبھی بے خیالی میں اسے خوفناک طریق پر گھمانے سے بھی باز نہ رہ سکتی تھیں۔ انسان کی کئی زبانیں ہوتی ہیں۔ ہاں تو اس صبح دیوانی کوئل اس زور سے کوک رہی تھی کہ مجھے اندیشہ ہو رہا تھا کہ آج اس کا کلیجہ شق ہو جائے گا۔

اتفاق کی بات کہ اس صبح میں اپنی زندگی سے تھوڑی دیر کے لئے مطمئن تھی، اسلئے چپ تھی۔ ہر چیز اپنی جگہ پر قائم تھی۔ یہاں تک کہ چشمے کا پانی بھی — اور کتب خانہ کے فوارے کے پاس کھڑا ہوا افلاطون کا بت بھی! مگر جانے کیوں، عرفی ایک نامعلوم سے اضطراب کا شکار معلوم ہوتا تھا۔ یہ نامعلوم چیزیں بڑی پریشان کن معلوم ہوتی ہیں، پریشان کن اور خطرناک!

ہم چاروں فوارے کے پاس بید مجنوں کے تلے کوئلوں کی کوک سنتے ہوئے چاء پی رہے تھے۔ "کتنی شکر؟" اچانک تم نے عرفی سے با آواز بلند پوچھا تھا۔ تمہارے لہجے میں وہ خود اعتمادی اور تکبر تھا کہ جیسے اگر عرفی نے اس کا فوراً موزوں سا جواب نہ دیا تو یہ کائنات درہم برہم ہو جائے گی۔ اور اگر نہ ہوئی تو تم خود اپنی کرسی سے اٹھ کر اسے تہہ و بالا کر دو گی۔

مگر! عرفی نے کیا کہا تھا؟ بے پروائی سے کہنے لگا: "ایک چمچہ بھی نہیں۔ جب سے لُو لگی ہے۔ مٹھاس سے طبیعت گھبرا گئی۔" یہہ کہکر اسنے اپنا نیم وا سگریٹ کیس بھی بند کر لیا تھا۔

واقعی بات پریشانی کی تھی! مگر خرابی صرف سگریٹ کیس کے بند کرنے ہی سے پیدا نہیں ہوئی۔ ادھر میں نے دل میں سوچا کیا شہد کی مکھی کو بھی مٹھاس کبھی کاٹ سکتی ہے؟ کوئی بات مری سمجھ میں نہ آئی تو میں نے اس کو ادھورا ہی چھوڑ دیا اور دل لگا کر کوئل کی کوک سننے لگی۔ خیال تو کرو۔ اس کائنات میں کوئلیں نہ ہوتیں تو ہم زندگی کا سارا غم پس پشت ڈال کر کس کی کوک سنتے رہتے؟ تم کو پھیکی چاء کا تصور بے حد خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ تم چاہتی تھیں گرم گرم چاء کی پیالی کا دہکتا ہوا انگارہ اٹھا کر فضا میں پھینک دو اور اس کائنات کو آگ لگ جائے۔ مگر تم مجبور تھیں، یوں نہ کر سکیں۔ صرف اتنا کہا: "پھر تو تم خود ہی چاء بنالو۔ یہہ لو" اور تم نے بڑے زور سے بھری ہوئی پیالی عرفی کی طرف بڑھا دی تھی۔ عرفی کے ہاتھ پر دو ایک گرم قطرے آخر پڑ ہی گئے۔ اسنے کہا تھا: "ہائیں ہائیں پیالی چھلک گئی!"

نیلم نے مستعدی سے کہا "تو لاؤ میں بھر دوں اسے" اور وہ چاء انڈیلنے لگی۔ پھر غزل کا نامکمل مصرع گنگناتے ہوئے عرفی کو دیکھ کر پوچھنے لگی "کتنے چمچے مٹھاس کے عرفی؟"

"جتنی چاہو ڈال دو" نجانے عرفی نے کیوں کہدیا۔

"پھر بھی؟" نیلم مسکرا رہی تھی۔ شاید غزل کے نامکمل مصرع پر!
"ویسے پیتا تو چار ہوں۔ لیکن تم پانچ ڈال دو نیلم" اور اس نے سگریٹ کیس یونہی کھول دیا۔ "تمہارے لئے کسی آدمی کا اتنی زیادہ مٹھاس کھانا ناقابلِ برداشت تھا اور ناقابلِ معافی بھی! بھلا خیال تو کرو۔ اس دنیا میں اتنی زیادہ مٹھاس کہاں سے آ گئی!" تم اس وقت ایک آتشیں بگولے کی طرح اٹھی تھیں۔ اور جانے کن پہنائیوں میں گم ہو گئی تھیں۔ پہنائیاں! انسان کے اس اتھاہ تاریکی کے ذخار سمندر کو کون عبور کر سکتا ہے نا ہمید؟ اور بیچارہ عرفی تو ایک معمولی نوجوان تھا! ایسا ہی معمولی جیسے شمع کے گرد گھومنے والا ایک عام پروانہ جو صرف پروانہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ تم کہو گی کہ ایک پروانے کا پروانہ ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔

اس گہرے قرمزی رنگ کی صبح کے بعد پھر میں نے تم کو اس وقت دیکھا جب چاند رخسارِ کائنات کا ایک ڈھلکا ہوا آنسو بن کر نیچے کو اتر آیا تھا۔ تم جلد جلد بارہ دری کی شہ نشین سے گذر کر اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھیں جب میں نے تم کو روک کر پوچھا تھا "تمہیں چاندنی راتیں اور اس کی خنکی پسند ہے نا ہمید؟"

اس پر تم نے ابرو سکیڑ کر تلخ سا جواب دیا تھا "نہیں۔ مجھے جھلسانے والا سورج اور اس کی تمازت مرغوب ہے۔"

اس زمانے میں مجھے ان گرمیوں اور سردیوں کی کیا پہچان تھی بھلا!

اس کے بعد میں نے اکثر تمہاری مٹھیاں بھنچی ہوئی دیکھیں! اور یوں صبح نو رخصت ہونے لگی۔

اور پھر کیا ہوا تھا؟ یاد تو کرنے دو۔ ہاں پھر تم نے زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے۔ اپنے حسن، اپنی رعنائی۔ اور اپنے افسوں سے کائنات کو تہہ و بالا کرنے کی کوشش میں لگ گئیں۔ محض اس لئے کہ آسمان کے جس درخشاں ستارے کو تم نوچ لانا چاہتی تھیں وہ تمہاری گرفت میں آ جائے۔ مجھے اس بات کا اعتراف ہے تم نے بڑی محنت کی، بڑی ریاضت کی۔ تمہارے پاس عزم تھا۔ ضد تھی۔ اور حسن تھا۔ نہیں تھیں تو صرف دو ضروری چیزیں۔ درد محبت۔ اور غمِ زندگی! وقت گذرتا گیا۔ ظالم وقت گذرتا چلا گیا۔ مگر چنگاری شعلہ نہ بن سکی۔ شعلے پھر بھی بے ضرر ہیں۔ نظر تو آتے ہیں۔ ان کا تدارک تو ہو سکتا ہے۔ مگر دبی ہوئی چنگاریاں؟ وہ انسان کے دودِ آہ کی طرح خطرناک ہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی کے مزار پر شمع جلتی رہی۔ اور مجھے خیال آنے لگا کہ ڈھلتی شاموں میں صبحِ نو کا اب کیا ذکر!

لیکن ان تمام واقعات سے بہت پہلے عرفی کی بیہوشی نے اس کے ہوش کے چور دروازے کھول دئے تھے۔ وہ چھپا ہوا چور جو نجانے کب اور کس طرح بند دروازوں میں داخل ہو گیا تھا، باہر نکل آیا۔ تم نے کبھی تہہ خانوں کی سیر کی ہے؟ نہیں۔

"دراصل میں تمہیں لوٹنا چاہتا ہوں۔ تمہیں" اس چور نے کہا تھا۔

اس زمانے میں مجھے کسی نے سرگوشی میں بتایا تھا کہ لوٹے جانے میں بھی ایک دلربائی ہوتی ہے۔ تم تو اس سے واقف ہو ہی نہیں سکتیں۔ کیونکہ تمہارے نازک ہاتھ ہمیشہ لینے کے لئے بڑھتے رہے۔ دینے کے لئے نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے دن جب تم بحرِ ظلمات میں غوطہ زن تھیں تو آسمان بنفشے کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا اور کوئی بادل نہ تھا۔ کوئی خوفناک سایہ نہ تھا۔ اور زندگی کے سنہرے موقع باغِ حیات میں یوں کھلے ہوئے تھے جیسے تالاب میں موسمِ بہار کے کنول۔ یہی مجھے نیلم نے بتایا تھا جو غزل کے ادھورے مصرعے کا کرب اس کے ادھورے پن سے مطمئن تھی۔ کیونکہ اس کے باطن کے ادھورے پن کی تکمیل بڑی سرعت سے ہو رہی تھی! مگر عرفی لاعلم تھا۔ تمام باتوں سے لاعلم۔ وہ یونانیوں کے بت جیسے خط و خال والا حسین مرد عرفی۔ وہ اتنا ہی احمق تھا جتنا مراسیاتی بلا عنبر! آج مرا یہ چہیتا بلا عنبر گلاب کے پودوں میں بیٹھا اسقدر حسین اور دلفریب معلوم ہو رہا تھا اور اسکی فیروزے رنگ کی آنکھوں میں اس بلا کا جنون اور اظہاریت تھی کہ میں نے سمجھا مائکل انجیلو نے بھی کبھی ایسی دلربا تصویر نہیں کھینچی ہو گی!

مگر خیر۔ گلاب کے پودوں اور آنکھوں کی اظہاریت کی بات بالکل اور ہے۔ اس کمرے میں یہاں شام ڈھلی جاتی ہے اور میں مغموم ہو گئی ہوں۔ بند ہی نہ کر دوں یہ داستانِ پارینہ؟

ہائے نجانے آج کوئل کو کیا ہو گیا تھا۔ تمام شام گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختی رہی۔ حالانکہ میں سخت متوحش تھی اور اپنے افسانے کی ایک سطر نہ لکھ سکی تھی۔ اور نجانے خزاں کے ان بادلوں کو بھی کیا ہو گیا تھا۔ تمام شام آسمان کے کناروں پر غول بیابانی کی طرح رقصاں رہے۔ حالانکہ میں سخت مغموم تھی اور اپنی

نظم کا ایک شعر نہ سوچ سکی تھی۔ غرض تمام شام میں سہمی سہمی رہی کیونکہ موسم بدل رہا تھا اور تم جانتی ہو میں موسموں کی کیسی دیوانی ہوں! آخر باغ کے اس حصے میں چلی گئی جہاں رستے ختم ہوتے تھے اور عشق پیچاں کی بیلوں نے ایک خزاں رسیدہ پیڑ کو جکڑ رکھا تھا۔ یہ بیلیں بھی کیسی عجیب ہوتی ہیں۔ دیکھنے میں نازک عمل میں زنجیر کی طرح مضبوط!

"ارے نیلم تم ہو۔ بہار کی تیتری کی طرح پھولوں میں چھپی ہوئی!؟" میں نے متحیر ہو کر نیلم کو دیکھا جو سبز گھاس پر نیم دراز ہو کر عمر خیام کی رباعیات پڑھ رہی تھی۔ میں نے دوبارہ اس سے پوچھا "وہ تم ہی تھیں جو ابھی ابھی باغ کے زینے پر ایک عشقیہ مصرع گنگناتی ہوئی اتر رہی تھیں؟"

"ہاں وہ میں ہی تھی!" اس نے دھیمے سے کہا اور اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ دمکنے لگی پھر سرگوشی کی سی آواز میں کہنے لگی روحی میں سوچتی ہوں کیا بہار کی پری کے بازو ان شاعروں کے خیال سے ٹکرا گئے ہیں؟ نہیں تو یہ اتنے حسین خیال کیوں کر واقع ہوتے ہیں؟

"ساقی غم فردائے حریفاں چہ خوری — پیش آر پیالۂ کہ شب مے گزرد"

میں ذرا حیران ہوئی، پھر میں نے نظر اٹھا کر غور سے نیلم کو دیکھا۔ اور پھر مجھے موجودہ فضا کے متعلق قیاس آرائیوں میں زیادہ دقت پیش نہیں آئی۔

اب سنو۔ تمہارے چچا کو بڑا چاؤ تھا۔ بڑا ارمان کہ تمہاری زندگی میں ایک نظم پیدا ہو جائے۔ تمہیں یاد ہوگا ان کا تکیہ کلام عجیب و غریب تھا۔ نجانے انہیں عہد طفولیت میں کونسا ذہنی دھچکا لگا تھا اور نجانے انہیں یہ طرز گفتگو کس نے سکھا دیا تھا کہ ہر فقرے کی ابتدا یا انتہا میں "ستم ہو گیا ستم" لگا دینے کے شدت سے عادی تھے۔ وہ کچھ تو سوچتے کہ اس قسم کے بوجھل الفاظ ہلکے پھلکے فقروں کے ساتھ زیب نہیں دیتے۔ مگر انہیں پرواکس کی تھی؟

ایک دن میں اپنی تلمیوں اور دیوان غالب سے فراغت پا کر موتیا کے پھولوں سے مہکتے ہوئے پائیں باغ میں دھوپ گھڑی کے پاس کھڑی کان لگا کر بلبل کی نغمہ سرائی سن رہی تھی کہ کتب خانہ کا دروازہ کھلا اور خلاف توقع تمہارے چچا دبے پاؤں پائیں باغ میں اتر آئے اور مجھے دیکھ کر فرمایا: "روحی ستم ہو گیا، مرے پیٹ میں درد ہے"۔

ہاتھ سے بلبل کو تھوڑی دیر چپ رہنے کا اشارہ کر کے میں بڑے دنوں بعد زور سے ہنس پڑی اور جھک کر ایک زرد گلاب کی کلی ٹہنی سے نوچ کر ان کے کوٹ کے کاج میں لگاتے لگاتے بولی: "واقعی ستم ہو گیا۔ چورن کھایئے"

چورن! مجھے خیال آیا کہیں دردِ زندگی چورن کھانے سے بھی رفع ہو سکتا ہے! تمہارے چچا بے حد سنجیدگی سے کہنے لگے: "وہ کھا چکا ہوں۔ پر ستم ہے ستم۔ مجھے خیال آتا ہے روحی، اگر درد بڑھ گیا اور مجھے کچھ ہو گیا تو یہ ساری سوچی ہوئی باتیں یونہی ادھوری رہ جائینگی"

ادھوری باتیں۔ یہ سنکر میں سوچنے لگی انسان کے معیار کے مطابق کبھی کوئی چیز پایہ تکمیل کو بھی پہونچی ہے؟ اور انسان کی آرزوؤں کی انتہا اور تمناؤں کی تھاہ کہاں ہے؟ زندگی کا ادھورا پن بدقسمتی سہی مگر اس کا احساس اس سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ زندگی ادھوری ہے۔ زندگی کھوکھلی ہے۔ اسی بے بنیاد یقین پر پہونچکر ہی تو کئی قنوطیوں نے خودکشی کر لی۔ یہ لوگ احمق نہ تھے۔ صرف قنوطی تھے۔ سوچتے زیادہ تھے اور سمجھتے کم۔ اور احمق نہ سوچتا ہے نہ سمجھتا ہے۔ ذہین آدمی کی سوچ تو ہائے اسے مار ڈالتی ہے!

کچھ دیر بعد میں نے کہا تھا: "آپ کے پیٹ کا درد تو بے ضرر چیز ہے۔ مگر زندگی کے ادھورے پن کا احساس مالیخولیا کی علامت ہے"۔

اس پر وہ بولے: "میں علامتوں کا قائل نہیں۔ میں بنیادی چیزوں پر نظر رکھتا ہوں، اور ستم ہو گیا، اس پر سوچتا بھی ہوں"

اور واقعی اس دن ستم ہو گیا جس دن تمہارے چچا کی تجویز پر ہم سب صنوبر کے جنگلوں میں سیر کے لئے گئے تھے۔ اس دن دل آرام کے پھول صحن گلستاں میں قہقہے لگا رہے تھے اور گہرے گلابی رنگ کی دھوپ فضا کو جگمگا رہی تھی۔ فیروزے پروں والی بلبلیں صنوبر کے درختوں پر زور زور سے نغمہ زن تھیں۔ غرض کائنات شاعر کا ایک حسین خواب معلوم ہوتی تھی۔ وقت کی نزاکت کو محسوس کر کے نجانے کہاں سے نکال کر تم نے ایک ایسا چست اور سنہرا لباس زیب تن کیا تھا جو ایسے مصوروں کے مذاق کے عین مطابق تھا جنہیں جسم انسانی کی خط کشی کا شوق ہوتا ہے۔ تمہاری براق سی سفید گردن میں سراندیپ کے بڑے بڑے سفید موتی دمک رہے تھے اور تمہارے مختصر سے تراشیدہ بالوں میں موتیا کی سفید شرمگیں کلیاں مہک رہی تھیں۔ اس صبح تم مجھے کلیوپیٹرا معلوم ہو رہی تھیں۔ تم جانتی ہو مجھے کلیوپیٹرا کا کردار کبھی پسند نہیں رہا۔ مجھے اس قسم کی

"ساقیت" سے بھرپور حسین عورتوں سے ہمیشہ وحشت سی رہی جو اپنے دامن میں افعی کو پنہاں رکھتی ہیں اور بوقت ضرورت ڈستی اور ڈسواتی ہیں۔

نیلم نے بادلوں کے رنگ کی پوشاک پہن رکھی تھی۔ جب وہ چلتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے پہاڑوں کی کہر میں کوئی روح متحرک ہے۔ اس کی پوشاک ڈھیلی ڈھالی تھی۔ اس کو چست لباس پہن کر اس میں افعی کو پوشیدہ رکھنے کا سلیقہ نہ تھا۔ اس کے طویل دامن جب اس کے لمبے لمبے بالوں کے ساتھ صحرائی ہواؤں میں لہراتے تھے تو یوں معلوم ہونے لگتا تھا جیسے کہساروں پر لکہ ہائے ابر رقصاں ہوں۔ عرفی تم دونوں کے درمیان یوں چلے جا رہے تھے جیسے دو بے چین اور زنبیلی موجوں کے درمیان ایک لکڑی کی کشتی! تم نے کبھی کشتی کو ڈوبتے ابھرتے دیکھا ہے؟

جنگل میں پہونچکر جب سب ایک جگہ بیٹھ گئے تو تمہارے چچا نے یکلخت بوکھلا کر کہا "ستم ہو گیا رحمی۔ ناشتہ دان گھر ہی پر رہ گیا"

"جی نہیں۔ یہ یہاں موجود ہے" میں نے تشفی کر دی۔

"لیکن کیلے ساتھ نہیں آئے ستم ہے ستم!"

"وہ بھی موجود ہیں" میں نے اطمینان دلایا۔

غرض ہر چیز موجود تھی، لیکن ناہید، تم کو معلوم ہے کہ کیا چیز موجود نہ تھی؟ خیر چھوڑو جو چیزیں موجود نہ تھیں ان کا کیا ذکر۔ لیکن کیلوں اور ناشتہ دالوں کے علاوہ جو چیزیں وہاں موجود تھیں۔ ان کا تمہیں علم ہے؟ تمہارے اندر، مرے اپنے اندر، ہم سب کے چور دروازوں میں کون کون سے چور موجود تھے؟ ایک ناشتہ دان ہی نہیں۔

اور اسی ناشتہ دان ہی کا تو وہ قصہ ہوا تھا۔ جو بعد میں زندگی کا المیہ بن گیا۔ کیا زندگی میں ناشتہ دانوں کی کوئی اہمیت ہوسکتی ہے؟ اس سے پہلے مجھے بھی اس کا علم نہ تھا۔ مگر انسان کی آتش حسن تھوڑی دیر کے لئے ٹھنڈے ناشتہ دانوں کو بھی گرم کر دیتی ہے۔ جب سیندوری رنگ کا آفتاب جنگل نے آبشار کے عین اوپر پہونچ گیا تو تمہارے چچا کے حسب الحکم ہم سب پانی کے چھینٹوں کے قریب ایک مرطوب جگہ کھانے کے لئے بیٹھ گئے۔ ہائے کیسی حسین دوپہر تھی! ہوا صندلیں کی قیں قیں، اور ہد ہد کی کھٹا کھٹ نے سارے جنگل کو سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ہواؤں میں سونف کے گچھوں کی ٹھنڈی خوشبوئیں آوارہ تھیں۔ اتنے میں کوئل نے زور زور سے کوکنا شروع کر دیا۔ اس موقع پر عرفی نے نجانے کیوں خلاف عادت ایک فقرہ ایسا کہا تھا جسے سنکر ہم سبھی متوجہ ہو گئے تھے۔ کہنے لگا: "دیوانی چڑیا۔ نجانے کیا بک رہی ہے! اپنی داستان محبت کس کو سنا رہی ہے؟ کوئی سن بھی رہا ہے؟"

"داستان محبت سنانے کے لئے تو نہیں ہوتی عرفی۔ دیوانے کہیں کے! اپنے لئے ہوتی ہے۔ ہر آدمی، ہر ذی روح اپنی کہے جاتا ہے۔ دوسرے کی سنتا ہی کب ہے؟" نیلم اپنے کہر جیسے ملکوتی لباس میں مسکرانے لگی۔ عرفی نے اپنی عنابی رنگ کی ٹکٹائی جس پر نقرئی چمکیلی پتیاں بنی ہوئی تھیں، ڈھیلی کر دی۔ اور حافظ کا ایک عشقیہ شعر بڑے آرام سے گانے لگا۔ اس کی آواز میں ایک ولولہ تھا۔ اور تھوڑا سا سوز بھی۔ کچھ دیر بعد تمہارے چچا ایک کیلا لیکر ہم سے کچھ دور چشمے کی خنکیوں میں جا بیٹھے کیونکہ اس زمانے میں انہیں سوائے پکے کیلے کے ہر قسم کی غذا کی ممانعت تھی۔

ان کے جانے کے بعد ہم چاروں رہ گئے تھے۔ ہمارے ساتھ ہمارے خیالات تھے اور ہمارے سروں پر جھکی ہوئی ایک بے ترتیب سی لمبی ٹہنی پر ایک پرندہ آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ میں نے سر اوپر کو اٹھایا اور اسے دیکھا۔ یہ کس چیز سے آنکھیں بند کر رہا تھا؟ سخت فراری تھا۔ ارے کوئی زندگی کے تماشے سے یوں آنکھیں بند کرتا ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

یاد رکھنا! میں نے تماشہ کہا ہے۔ اور تماشے میں سنجیدگی کہاں ہوتی ہے؟ اور زندگی کی پیشگاہ پر آئے دن تماشے ہی ہوتے رہتے ہیں ناہید۔ آؤ آج میں تمہیں کئی سال کا پرانا تماشہ پھر سے دکھاؤں جسے مری تصوری آنکھ اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر پہلے نیند سے دیکھتی رہتی ہے۔ اس تماشے کا پہلا منظر کچھ اس طرح شروع ہوتا تھا کہ عرفی نے ہاتھ بڑھا کر ناشتہ دان اپنی طرف کھینچا تھا اور اسے کھولنے لگا تھا۔ کیونکہ وہ حافظ کی عشقیہ غزل کا مصرع گاتا گا کر اب تھک گیا تھا اور بھوکا تھا۔ وہ مرد تھا۔ اس کی جذباتیت پر بھوک بڑی آسانی سے غالب آسکتی تھی۔ ناشتہ دان کے ایک خانے میں قیمے کے سموسے رکھے تھے۔ اس کو گرم رکھنے کے لئے اس کے نیچے کے خانے میں دہکتے ہوئے انگارے رکھے تھے۔ دوسرے خانے میں نجانے کیا چیز تھی۔

اس کے نیچے اسے سرد رکھنے کے لئے برف کی چلکتیاں رکھی ہوئی تھیں۔ اپنے چست اور سفید لباس میں تم اس وقت ہوشربا نظر آرہی تھیں۔ چنانچہ عرفی نے بلا سوچے سمجھے بے اختیار ہو کر اچانک کہا تھا "کھانے کے بعد مرے ساتھ صنوبروں کی چھاؤں میں سیر کو چلو گی؟"

تم فرطِ انبساط سے گلاب کی طرح کھل گئیں۔ مگر تم مجھے بتاؤ۔ ہر چمکنے والی چیز سونا ہوتی ہے؟ اسی وقت میں انجام کو دیکھ رہی تھی۔ تم کہتی ہو۔ میں قنوطی ہوں۔ میں کہتی ہوں مری قنوطیت میں حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے۔ میں محض قنوطی نہیں ہوں۔

ارسطو کا بچپن دواؤں کی تیز مہک کے ماحول میں گذرا۔ اس کا باپ شاہی حکیم تھا۔ لیکن مرے باپ کے پاس کوئی ایسا مطلب نہ تھا جہاں ادراک کے ہاون دستے میں قنوطیت کی معجون کوٹی جاتی۔ اور پھر بھی اگر میں قنوطی ہوں تو یہ بچپن کے جذباتی ماحول کا نتوہ نہیں بلکہ بلوغِ ذہنیت کی سوچ بچار کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے مجھے موردِ الزام نہ بناؤ۔ اور سمجھو کہ مرے جنون میں بھی ایک مقصد ہوتا ہے۔

عرفی کے سوال کے جواب میں ایک بلبل نے بڑے زور کا قہقہہ لگایا تھا۔ کیونکہ بلبل کا صرف دل ہوتا ہے، دماغ نہیں۔ اور تمہارا چہرہ دمک اٹھا تھا۔ نجانے اس وقت تمہارے چاپکس جھیل کے پرسکون کنارے پر بیٹھے اپنا کیلا ختم کر رہے تھے۔ اس وقت میں نے سوچنے سمجھنے کا منطقی پرزہ اپنے دماغ سے نکال دیا تھا۔ اس لئے آرام سے خالی بیٹھی تھی۔ مجھے صرف چھن سے یکلخت شیشہ ٹوٹنے کی آواز نے چونکا دیا تھا۔ پھر میں نے نیلم کو خشمگیں نظروں سے دیکھ کر کہا تھا "تمہاری عادتیں بگڑتی جاتی ہیں، یہ گلاسوں کے چکنا چور کرنے کا کیا شوق ہے تمہیں؟ ارے ہوا کیا ہے، کیا ہتھیلی میں شیشہ چبھ گیا؟"

وہ اپنی ہتھیلی پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جھکی ہوئی اسے بغور دیکھ رہی تھی۔ "تھوڑا سا خون اور نکال دو نیلم" تم نے مسکرا کر نیلم کو علاج بتایا تھا۔ نیلم دم بخود تھی۔ اور تہنی پر پرندہ آنکھیں بند کئے سرنگوں بیٹھا تھا!

مرد طبعاً چٹورا ہوتا ہے۔ زندگی کے خطرناک سے خطرناک موڑ پر وہ دسترخوان کھول کر بڑی بے تکلفی سے بیٹھ سکتا ہے۔ جبکہ عورت کی بھوک بند ہو جاتی ہے۔ عرفی اس وقت کھانے میں مصروف تھا۔ نیلم مجرموں کی طرح سر جھکائے اپنی لہولہان ہتھیلی کو دیکھ رہی تھی۔

تم اپنے چست لباس میں ایک ادا کے ساتھ مسکرا رہی تھیں۔

اور میں محض سوچ رہی تھی۔ اپنی کہانی کا خاکہ۔

لو تماشے کا پہلا منظر تم نے دیکھ لیا۔ اب اسی تماشے کا دوسرا منظر بھی ہمت کر کے دیکھ لو۔

ہم سب اسی انداز سے بیٹھے تھے۔ ہر چیز وہی تھی۔ یہاں تک کے جذبات اور خیالات بھی وہی تھے۔ اس لئے تم نے عرفی سے سموسوں کا گرم خانہ برتن رعنائی سے مانگا تھا۔ اور پھر تم سفید چست لباس میں دعوت نظارہ بھی دے رہی تھیں۔

مگر چشمِ باطن کو کون بند کر سکتا ہے ناہید؟ اب ذرا سنبھل کر بیٹھو۔ تم نے مانگا تھا۔ اور لینے کی خواہش مند تھیں۔ اس لئے عرفی نے تمہارے لہجے کی رعنائی کو مدنظر رکھتے ہوئے دلربا انداز میں برتن اٹھا کر تمہیں دیدیا تھا۔ اور ساتھ ہی نیلم کی ہتھیلی پر نظر جماتے ہوئے بولا: نیلم۔ زخم لئے کب تک بیٹھی رہو گی۔ تم بھی تو کچھ لو نا" اور یہ کہتے ہوئے دوسرا برتن نیلم کو دیدیا۔

مگر غلطی سے برتن بدل گئے تھے۔ محض غلطی سے! برف تمہارے حصے میں آئی تھی۔ اور دہکتے ہوئے گرم انگارے نیلم کو دیدے گئے تھے۔ ایک میں آتش خوش رنگ چمک رہی تھی۔ دوسرے میں سرد برف رکھی ہوئی تھی۔

ہر چند تمہارا لباس چست اور دیدہ زیب تھا! ادھر نیلم کی ہتھیلی سے اب خون نکلنا بند ہو گیا تھا! میں تغیرات پر دم بخود تھی اور کہانی کا خاکہ سوچ رہی تھی۔

یہی زندگی ہے ناہید۔ یہاں ہر چیز بدل جاتی ہے اور اس تیزی سے بدلتی ہے کہ ہمیں خبر تک نہیں ہونے پاتی۔ البتہ احساس ہمیں مطلع کر دیتا ہے کہ کائنات تہہ و بالا ہو گئی۔ یا شامیں ڈھلنے لگیں، یا غم حیات چیخ اٹھا۔ بھلا بتاؤ جہاں اتنی چیزیں دنیا میں جاگ رہی ہوں وہاں پرندکی طرح آنکھیں بند کر کے سو جانے کا کیا فائدہ؟ چشم بینا کو وا رکھنا چاہیے۔ خواہ سمندروں میں تلاطم آئیں۔ خواہ جنگل تباہ ہو جائیں۔

ان سب واقعات کے تھوڑی ہی دیر بعد وہ کئی ایک پگڈنڈی پر تمہارے چچا نمودار ہوئے شاید ان کا کیلا بھی اختتام کو پہونچ چکا تھا۔ ہر چیز ختم ہو جاتی ہے جیسے شامیں ڈھلتی ہیں۔ تمہارے چچا جیسے گئے تھے۔ ویسے ہی واپس آ گئے تھے یعنی جذباتی اعتبار سے۔ لہذا انہوں نے باآواز بلند بغیر کسی تامل کے عادتاً فرمایا "ستم ہو گیا۔ مرا کیلا ختم ہو گیا۔" لیکن انہوں نے بہت جلد دیکھ لیا کہ یہاں آدمی کا آدا ہی بگڑ چکا ہے۔ اس زمانے میں تم مجھ پر اکثر آوازہ کسا کرتی تھیں "روحی تم بڑی خیال پرست ہو۔ ہر وقت اندازے لگاتی رہتی ہو۔ قیاسات پر کوئی جیتا ہے روحی؟"

لیکن ناہید، ہم برسات کی جھومتی گھٹاؤں کو دیکھ کر اس کے برسنے سے پہلے ہی کیسے پیشین گوئی کر دیتے ہیں کہ یہ بڑے زور سے برسے گی کچھ تو عقل کے ناخن لو۔ تماشے کے اس دوسرے منظر نے ہم سب کو سنجیدہ کر دیا تھا۔ یاد ہے؟

تمہارے چچا نے سمجھا تھا کہ کیلے کی طرح ہر چیز آرام سے تکمیل کو پہونچ جاتی ہے! شاید تم اور عرفی بھی اسی دھوکے میں رہے۔ تم سب احمق تھے۔ تم لوگوں نے سفید چست لباس کو دیکھا۔ ناشتہ دان کے اس ٹھنڈے پیالے کو نظر انداز کر دیا جو گرم کے دھوکے میں محض غلطی سے تمہارے ہاتھ میں تھما دیا گیا تھا۔ زندگی میں کئی ایسے موقع آئے ہیں ناہید۔ جب تم نے صاف آنکھیں موند لیں۔ اسی لئے تو مجھے اس پرندے پر اتنا غصہ آیا تھا جو ہمارے سر پہ جھکی ہوئی ٹہنی پہ آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ آنکھیں بند کرنے پر مجھے اعتراض نہیں لیکن آنکھیں بند کر کے کچھ دیکھا بھی تو کرو۔ میں نابینا کو کبھی اندھا نہیں کہتی۔ اندھے اور ہوتے ہیں۔

کوئی تمہارے چچا کو سمجھائے۔ کیلا چھیل کر کھانا بے شک آسان ہے۔ مگر زندگی کو تکمیل کے مراحل تک پہونچانا جوئے شیر لانا ہے۔ مگر وہ اس تکمیل سے کبھی فارغ ہونے کی یوں جلدی جلدی تیاریاں کرنے لگے جیسے کیلے چھیل: جا رہے ہوں اور شامیں ڈھل رہی ہوں!

پھر وہ دوپہر آگئی جب رس بھریاں توڑی گئی تھیں!!

یاد ہے؟ دن کچھ زیادہ ہی اضطرار میں گذرنے شروع ہو گئے تھے۔

میں دن دن بھر دریچے میں بیٹھی سمندر کے تلاطم کو دیکھتی رہتی تھی۔ اور مرا خیال ہے کہ اب چست لباس میں تمہارا دم بھی گھٹنے ہی لگا تھا۔ اس زمانے میں میں نیلم کے لمبے بالوں میں اکثر ایک گلاب کی کلی سنوری ہوئی دیکھا کرتی تھی۔ مری تمام بلیاں مالیخولیا میں مبتلا معلوم ہوتی تھیں اور مرے چہیتے طوطے جعفر کا نروس بریک ڈاؤن سا ہو گیا تھا۔ یا یہ سب مرے قیاسات تھے؟ اس دن دوپہر کے کھانے کے بعد ہم چچا کے حسب الحکم باغ میں شہتوت اور رس بھریاں توڑنے اتر گئے تھے تاکہ وہ مصنوعی حرارت سے پکائی جاسکیں۔

ہائے عہد ماضی کی وہ گہرے گلابی رنگ کی ایشیائی دوپہر! بانس کے سربلند درختوں پہ سرخ پروں والی اور گہری نیلی آنکھوں والی مینائیں بیٹھی ایک دوسرے کو اپنی داستان عشق سنائے جا رہی تھیں۔ حنا کے میانہ قد درختوں پر ابابیلیں بیٹھی سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ سبز آسمانوں پہ نارنجی رنگ کا آفتاب دمک رہا تھا۔ باغ کی کاسنی رنگ کی لمبی لمبی گھاس میں زرد ٹڈیاں اچھل کود رہی تھیں۔ ہواؤں میں ارغنوں کا سا سریلا شور تھا۔ اور دوپہر اپنے پورے حسن کے ساتھ شباب پر تھی۔ مگر ہم چاروں گونگوں کی طرح بے زبانی کے ساتھ رس بھریاں توڑ رہے تھے۔ ہم رس بھریاں توڑنے میں مصروف تھے کہ عرفی کی قمیص کی آستین جھاڑی کے کانٹوں میں الجھ کر پھٹ گئی۔ اس پر اس نے اچانک کہا " مرا ارادہ شادی کرنے کا ہو رہا ہے روحی۔"

"عجیب بات ہے۔ آخر کیوں عرفی؟" میں نے ایک رس بھری منہ میں ڈالتے ہوئے حیران ہو کر پوچھا تھا۔ پھر مجھے دو ٹوکریوں کے نیچے گر پڑنے کی آواز آئی تھی اور رس بھریاں زمین پر بکھر گئی تھیں۔ "دیکھتی ہو مری پھٹی ہوئی آستین؟" عرفی نے بسورتے ہوئے مرے سوال کا جواب دیا تھا۔

"احمق کہیں کے! اتنی سی بات پر شادی! پھر تو تمہیں ماں کی ضرورت ہے۔ خود بیٹھ کر سیو" میں نے اسے نصیحت کی تھی۔

"بیوی ماں نہیں ہوتی روحی؟" وہ سوالیہ انداز میں مری طرف دیکھنے لگا۔

میں بولی "ہاں ہوتی ہے۔ بیوی کی مصیبت یہ ہے کہ اسے ماں اور بیوی دونوں کے کردار ادا کرنے پڑتے ہیں۔ اور ماں کی آسانی یہ ہے کہ وہ صرف ماں بنی رہتی ہے۔"

"ماں بھی ماں کب بنی رہتی ہے؟" کسی نے ہلکے سے سرگوشی کی تھی پھر جملہ ختم کیا تھا۔ "ساری خرابی یہیں سے تو پیدا ہوتی ہے۔" میں نے سر اٹھا کر

کہنے والے کو ادھر اُدھر ڈھونڈا۔ مگر مجھے تو کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ یہ کون تھا؟

اس وقت تم اور نیلم گہری گلابی دھوپ میں بڑی سرعت سے رس بھریاں توڑ رہی تھیں۔ بڑی سرعت سے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے تم دونوں کو سوائے رس بھریاں توڑنے کے اس دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں! پھر میں نے ایک پکی ہوئی رس بھری اپنے منہ میں ڈالتے ہوئے کن انکھیوں سے عرفی کو دیکھ کر پوچھا تھا "آخر کس سے شادی کر رہے ہو عرفی تم؟"

عرفی ہنس پڑا "ایک بڑی چست اور حسین لڑکی سے"۔ عین اس وقت درخت سے ایک زرد و خشک پتا نیلم کے سر پر آ پڑا۔ اور وہ اس بوجھ تلے یوں دب گئی جیسے کسی عظیم الشان عمارت کے ملبے کے نیچے کچل گئی ہو۔

"وہ جانبر بھی ہو سکے گی؟؟؟" ہم تینوں کے ضمیر نے سرگوشی میں ہم سے سوال کیا تھا۔

یاد ہے تمہیں زندگی کا وہ اتفاقی حادثہ! اور پھر بھی تم حادثوں کو اتفاقی کہتی ہو!

اور دوسرے دن میں صبح سے ایک دریچے میں بیٹھی انسان کے غم حیات پر غور کر رہی تھی اور تم بے موقع کھلکھلا کر ہنس رہی تھیں! انہیں دنوں میں ایک دفعہ تم نے مجھ سے سوال کیا تھا "جب بہاریں گذر جاتی ہیں تو کیا ہوتا ہے روحی؟" میں نے حقارت سے جواب دیا تھا "اتنا بھی نہیں جانتیں؟ خزاں آجاتی ہے"۔

تم نے فوراً مجھے ٹوک دیا تھا "نہیں، میں تو پھر دوسری بہاروں کا انتظار شروع کر دیتی ہوں"۔

"خوب! مگر جب دوسری بہار بھی گذر جاتی ہے تو۔؟"

"تو۔ تو پھر تیسری کا انتظار کرتی ہوں" اور میں تمہاری ذہنیت کی غیر معمولی صحت مندی پر عش عش کرا ٹھنے کے باوجود انگشت بدنداں رہ گئی تھی۔ میں مانتی ہوں یہ مری عصبیت ہے۔

پھٹے دامنوں کو رفو کرنا اگر تم بچپن میں سیکھتیں تو آج تم اپنی جادۂ حیات کی کسی اور ہی شاہ راہ پر کھڑی ہوتیں! تم مجھے بتاؤ نا مہدیہ آدمی عمر کی ناہموار وادیوں میں گمراہ کیوں ہو جاتا ہے؟ کیا اس لئے نہیں کہ وہ خود شناس نہیں ہوتا؟ جو آدمی اپنے آپ کو بھولا ہوا ہو وہ رستوں کو کیسے یاد رکھ سکتا ہے؟ بہت پرانی بات ہے۔ آج ساڑھے تین ہزار سال کا طویل زمانہ گذر گیا، یونان کے بازاروں میں ایک مجنوں شکل کے آدمی نے انسان کو مخاطب ہو کر کہا تھا کہ "اے انسان! صراط مستقیم کو چھوڑ کر بھول بھلیوں کی طرف کہاں چلا؟ اپنے آپ کو پہچان!" مگر اس شخص نے ہمیں خود آگاہی کے گر نہیں بتائے تھے۔ صرف نصیحت کی تھی۔ لیکن آج، اس کے ہزاروں سال بعد انسانیت کے ایک محسنِ اعظم نے خود آگاہی کی تکنیک ہمیں سمجھائی اور ہمیں اپنے لاشعور کی کالی گھاٹیوں میں شمع ہدایت کو لیکر اترنے کا رستہ بتایا۔ اب بھی ہم اپنی محبت اور اپنی نفرت کو صراط مستقیم پر نہ ڈال سکیں اور اس پر قابو نہ پاسکیں اور شاموں کو خاموشی سے یونہی ڈھلتا دیکھتے رہیں تو ایک دن یہہ شام انسانیت پر ایسے ڈھلے گی کہ پھر کبھی اس پر سورج نہ نکلے گا!

ارے یوں ناک نہ سکوڑو۔ مجھے صرف اتنا بتا دو۔ تم نے کبھی انسان کے غم کو بھی اپنایا ہے؟ اگر اپنایا ہوتا تو پھر ڈھلتی شاموں کے حسن کو بھی محسوس کرتیں اور تمہارے پہلو میں ایک ایسا دلِ دردمند ہوتا جو زمانۂ سلف میں نبیوں کے سینوں میں دھڑکا کرتا تھا۔ ایسا دردمند دل اسی کو عطا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے جو خود شناس ہوتا ہے! لیکن تم!!

یہہ اسی زمانے ہی کی تو بات ہے کہ ایک صبح سورج کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور نیلم پیانو کے آگے بت بنی بیٹھی تھی۔ تم جانتی ہو کہ نیلم کو موسیقی سے کس درجہ عشق تھا لیکن اب کئی دنوں سے نہ اس کے ہونٹ مرتعش تھے نہ اس کی انگلیاں متحرک تھیں! تم نے کبھی خاموش طوفانوں کو دیکھا ہے؟ طوفان ــ اور خاموش! دو متضاد چیزیں ہیں مگر ان دنوں نیلم کو دیکھ کر ان گونگی آندھیوں کا خیال آجاتا تھا جنہیں ہم دور کے ساحلوں پر دیکھتے ہیں لیکن اپنے درمیان محسوس نہیں کرتے۔ اسکی یہہ حالت دیکھ کر میں نے اس سے ایک دن فیض کی ایک غزل گانے کی فرمائش کر ہی دی ؎

بجھے گی کیونکر بساط یاراں کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں   سجے گی کیسے شب نگاراں کہ دل سر شام بجھ گئے ہیں

مگر نیلم نے اُن ڈھلتی شاموں میں اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے، اور بہری بن گئی۔ اس نے مری فرمائش سنی یا نہیں سنی۔ اس کا مجھے علم نہیں —
لیکن وہ بڑی تیزی سے موسیقی کے کمرے سے نکل گئی تھی اور باغ کی طرف بھاگ گئی تھی جہاں شام ڈھل رہی تھی اور دل مری شام بجھ گئے تھے۔ اس کے جانے کے بعد میں ایک دریچے میں جاکر کھڑی ہوئی۔ اور وہاں سے زندگی کو جھانک کر دیکھنے لگی لیکن دبیز پردوں کو کون ہٹا سکتا ہے؟ جو چیز تم کو نظر آتی ہے ضروری تو نہیں کہ مجھے بھی نظر آجائے! میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ نیلم نے تو صرف اپنے کان بند کئے تھے۔

اور وہ شام بھی ڈھلنے لگی۔ اور ڈھلتے ڈھلتے ایک خوفناک رات میں تبدیل ہوگئی! اس رات چاند کا رنگ سرخ تھا۔ ہاں گہرا سرخ۔ تم نے بھی دیکھا ہوگا! اور سیب کے درختوں پر خوابیدہ چڑیاں نیند میں کراہ رہی تھیں۔ ساری فضا پر ایک خوفناک سا سایہ متحرک معلوم ہوتا تھا۔ اسی رات غذائی زہر کا وہ افسوسناک حادثہ وقوع پذیر ہوا جس پر اتنا ہنگامہ ہوا تھا! تمہیں یاد ہے وہ رات نا ہید؟ اگست کی گرم رات تھی، تاڑ کے فلک بوس درخت کے اوپر چاند آگ کی طرح دہک رہا تھا۔ ارے یہ تو انسان کا لہو ہے، مری زبان سے نکلا تھا پھر میں سہم گئی تھی اور اپنے آپ سے کہنے لگی: انسان کا لہو اتنا بلند اور کہاں ہوتا ہے کہ آسمانوں کی رفعت پر جا پہونچے! انسان اور اس کا لہو۔ نہ بڑی ناچیز اور ارزاں چیز ہے۔

چونکہ وہ اگست کی ایک بے حد گرم رات تھی، اس لئے چچا کے حسب خواہش ہم نے کھانا صحنِ گلستاں میں افلاطون کے بت کے پاس فوارے کی مرطوب فضا میں کھایا تھا۔ شمشاد کی روش پر چینی قندیلیں آویزاں تھیں اور تم دیر تک وہاں بیٹھی اس شب بڑے اطمینان سے بربط بجاتی رہی تھیں! تمہارے قدموں میں عشقیہ موسیقی کی ایک کتاب پڑی ہوئی تھی اور تمہارے سر پر سرخ چاند دمک رہا تھا! لیکن اس شب نیلم پرانی تاریخوں کا ایک باسی چاند معلوم ہو رہی تھی۔ تم دونوں بہنوں میں یہی تو فرق تھا۔ تمہارے چہرے پر اگر صبح نو کی درخشانی تھی تو نیلم کی آنکھوں میں ڈھلتی ہوئی شاموں کا حسن تھا۔

ہاں تو میں تمہیں اس خوفناک رات کی روداد سنا رہی تھی جس رات چاند لہو کے ایک سرخ تازہ قطرے کی طرح آسمان پر دہک رہا تھا۔ تمہاری فرمائش پر باورچی نے دہی میں مچھلی پکاکر زعفران میں دم کی تھی۔ یہ تمہاری دل پسند غذا تھی۔ سب ہی کو خوش ذائقہ معلوم ہوئی۔ اگر مچھلی زہریلی ہوتی تو تم، عرفی، تیں اور چچا کیسے محفوظ رہ سکتے تھے؟ لیکن نیلم نے اسے غم حیات کے تلخ گھونٹوں کی طرح نگلا۔ اور اس کی آنکھیں پتھرا گئیں! دراصل وہ زندگی سے آنکھیں پھیرنا چاہتی تھی۔ مچھلی نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا!

وہ موسیقی کی دیوانی لڑکی نیلم۔ اس کی عادات میں مالیخولیا کا رنگ صاف جھلکتا ہوا نظر آنے لگا تھا۔ وہ گھنٹوں اپنے باجے پر سر جھکائے بیٹھی رہتی تھی۔ اس کے ہونٹ سل گئے تھے اور اس کی آنکھیں زیادہ کھل گئی تھیں۔ اگر وہ اپنے غم حیات کو موسیقی کے ابلنے والے چشمے میں ڈبو دیتی یا ساری کائنات کا درد بلبل کی نے میں سننے کی کوشش کرتی تو میں تم سے شرطیہ کہتی ہوں وہ اپنی زندگی سے کبھی یوں بیزار نہ ہوتی! مگر اس نے غم حیات کو زہر کا گھونٹ سمجھ لیا۔ یہ خالص مالیخولیا کی علامت تھی۔

جس رات کا میں ذکر کر رہی ہوں اس شب چاند کا رنگ انسانی خون کی طرح سُرخ تھا!

دوسری صبح کائنات میں یوں خاموشی سے اتری جیسے صدیوں سے اترتی آئی ہے! لیکن نیلم کی خواب گاہ کی چوکھٹ پر بلی کی لاش پائی گئی تو زمین و آسمان تہ و بالا ہوگئے۔ سامنے طشتری میں دودھ کے چند قطرے تھے۔ نیلم کی کشتی حیات طوفانی موجوں پر ابھر آئی لیکن بلی غرق ہوگئی۔ مرے لئے بلی کی موت ناقابل برداشت تھی کیونکہ تم جانتی ہو اس کائنات کی حسین ترین چیزوں میں سے ایک بلی بھی ہے!

اس حادثہ کے بعد سب کی زبانیں گنگ تھیں اور آنکھیں وا۔ اور تمہارے چچا اب ہر فقرے کے بعد ایک کی بجائے تین تین دفعہ "ستم ہوگیا ستم" کی رٹ لگائے جا رہے تھے۔

یہ تیسرے دن کا واقعہ ہے کہ صبح کا چہرہ سخت مغموم تھا۔ مرے دار المطالعہ کی ہر چیز پراگندہ ہو رہی تھی۔ میز پر کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ گلدانوں میں مسکرانے والے پھولوں کا دم واپسیں تھا۔ خزاں کی ماری پتیاں قالین پر اڑتی پھرتی تھیں اور صبح کا چہرہ سخت مغموم تھا۔

میں تین دفعہ اپنا نامکمل افسانہ مکمل کرنے کے لئے میز پر جا بیٹھی مگر کمرے اور موسم کی پراگندگی کو دیکھ کر مجھے اپنی اندرونی پراگندگی کا احساس شدت سے ہونے لگا اور میں کہانی کی ایک سطر نہ لکھ سکی۔ اس وقت مجھے کوئل کا خیال آیا جو ڈراؤنے موسم میں بھی اطمینان سے بیٹھی کوکو

۱۰ نو، کراچی، نومبر ۱۹۵۸ء

کرتی رہی۔ اور میں خارجی چیزوں میں اپنا داخلی عکس دیکھ کر لرزتی رہی۔ لیکن اس میں مرا قصور نہیں تھا۔ میں اس دنیا میں اس نابینا کی مثال ہوں جس کا سہارا اس کی لاٹھی ہوتی ہے، وہ اسے جدھر لیجائے اسی کو وہ اپنی صراطِ مستقیم سمجھتا ہے۔ کوئل کی بات بالکل جدا ہے۔ اسے لاشعور کا عذاب نہیں بخشا گیا۔ اسلئے اس کا سہارا نابینا کی لاٹھی نہیں بلکہ وہ آپ اپنا سہارا ہوتی ہے، پھر تم مرا اور کوئل کا مقابلہ کیوں کرتی ہو؟

اس بھیانک رات کے بعد جب رات آسمانوں پر سرخ چاند دہکا تھا کائنات ہی تہہ و بالا ہوگئی تھی۔ اب نسترن کے تمام پھول مرجھا چکے تھے۔ بلبل کا نغمہ بھی مرچکا تھا۔ کوئل کی کوک بھی دفن ہوگئی تھی اور ہر طرف موت کا سناٹا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کائنات کی ساری موسیقی فنا ہوگئی ہے۔ صرف انسان اور اس کی گناہ گار آہیں زندہ ہیں، لیکن! میں تو گناہ ثواب کی قائل ہی نہیں۔ گناہ کا لفظ میں نے محض تمہاری خاطر لکھ دیا۔ میں محض پھولوں کے کھلنے کی قائل ہوں اور پھر ان کے مرجھا جانے کی! خیال تو کرو اگر اس دنیا میں پھول نہ ہوتے!۔

نیلم نے بڑی عقلمندی کا ثبوت دیا تھا۔ بلّی تو مرگئی تھی مگر اس نے اب موسیقی کو اپنی راہ نجات بنا لیا تھا۔ اور اس کے حصول کے لئے اب وہ ہم سب سے دور شاید افق کے اس پار جا رہی تھی جہاں موسیقی کے چشمے ابلتے تھے۔ اور اپنی بجائے بلّی کو موت کی بھیانک گھاٹیوں میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ تم سب نیلم کو وداع کرنے کے لئے نیچے کی منزل میں چلے گئے تھے۔ اوپر صرف میں عرشۂ چمن پر بیٹھی نیچے پھولوں کو مرجھاتا دیکھتی رہی اور سر دھنتی رہی۔ ہائے آج اتنے سالوں بعد یہ ساری باتیں مجھے کیوں یاد آرہی ہیں؟ مجھے یاد ہے تم باغ کی راہ سے یوں اچانک مرے سامنے آگئی تھیں جیسے موسمِ گرما کی کوئی شوخ تیتری اڑتی ہوئی اندر آجاتی ہے۔

مجھے دیکھ کر کہنے لگیں "یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو رودی! ہم سب نیچے کے کمرے میں ہیں، تم بھی وہیں چلو"۔

میں نے بغیر نظر اٹھائے ذرا تلخی سے جواب دیا تھا "تو ایک مرے نہ ہونے سے کمرہ خالی تو نہیں رہ جائے گا"۔ تم تاڑ گئی تھیں، بولیں: "جلی ہوئی معلوم ہوتی ہو۔ نیچے جاکر نیلم کو خدا حافظ تو کہو۔ کم از کم دعائیں ہی دیدو"۔

"کیا مری دعائیں اسے محفوظ رکھیں گی ناہید؟"

تم لمحہ بھر کے لئے چپ ہوگئی تھیں۔ پھر احساسِ جرم تم میں عود کر آیا حالانکہ تم مجرم نہیں تھیں کہنے لگیں "نیلم اپنی خوشی سے جا رہی ہے"۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ تمہاری خوشی سے جا رہی ہے"۔

"لیکن تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟"

"میں؟ میں نیچے جھانک کر پائیں باغ کے پھولوں کو مرجھاتا ہوا دیکھ رہی ہوں"۔

"تم بڑی جذباتی ہو" تم نے طنز سے کہا تھا۔

"بہت" میں نے اقرار کر لیا تھا۔ پھر کچھ سوچ کر تم خشک لہجے میں بولیں "تم پھولوں کے مرجھانے کو اتنی اہمیت دیتی ہو رودی؟" میں نے تم پر ایک بھرپور نظر ڈالی تھی "جب میں زندگی کو پھول سمجھنے لگتی ہوں ناہید"۔

پھر تم خاموشی سے نیچے چلی گئی تھیں۔ تمہارے قدموں کی آواز ہلکی ہوتے ہوتے سکوتِ مطلق میں غائب ہوگئی تھی، یہاں تک کہ ہر طرف سناٹا چھا گیا تھا۔ اور پھر اس سناٹے میں یکلخت باجے سے بجنے لگے۔ شہنائیاں اور پونگیاں بجنے لگیں۔ لوگوں کے گانے کی زور زور سے آوازیں آنے لگیں۔ میں گھبرا سی گئی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ نیلم تھی۔ اور یہ نیلم کی موسیقی تھی جو ملک کے مختلف اور مشہور شہروں میں سنی جا رہی تھی۔ نیلم نے اپنے مالیخولیا کو بلّی کے سپرد کر دیا تھا اور موت کی وادیوں میں بھیج دیا تھا۔ اور خود فن کے عظیم الشان سمندر میں ایک بہادر غواص کی طرح غوطہ زن تھی۔ آدمی اپنی راہ نجات دو چیزوں میں تلاش کرتا ہے۔ بیماری میں یا فن میں!

تمہارے سادہ خط کے جواب میں اتنا کچھ لکھنے کے بعد اب میں سوچتی ہوں کہ آخر ان ڈھلتی شاموں میں کل کی ان نوخیز صبحوں کا کیا ذکر و شبِ گذشتہ کا ایک خوابِ پریشاں معلوم ہوتی ہیں! لیکن آؤ اس خوابِ پریشاں کی اب تعبیر دیکھیں۔

شادی کے بعد تم اور عرفی "ماہِ عسل" منانے کے لئے کوہِ الماس چلے گئے۔ اس سفر کی ابتدا میں تمہاری شیفتگی اور وارفتگی کو دیکھ کر سب کا یہ ایمان تھا کہ یہ صبحیں اور یہ شامیں خواہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو جائیں۔ تمہاری محبت کا آفتاب ہمیشہ نصف النہار ہی پر رہے گا۔ مگر دو ہفتوں کے

بعد کوہ الماس سے واپسی پر ٹرین کا وہ دہشت انگیز حادثہ پیش آیا! سینکڑوں مسافروں کی طرح عرفی بھی عمر بھر کے لئے معذور ہو گیا، گویا زندگی کے اس سفر میں محبت کی گاڑی کے دو پہیے آنِ واحد میں ٹوٹ کر ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے!

مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ اس خوفناک حادثے کے بعد پورے تین مہینے تم نے غالب کی طرح انتظار کھینچا۔ حیاتِ انسانی میں تین مہینے بہت بڑی مدت ہوتی ہے نا! پھر صبحِ نو رخصت ہونے لگی اور شام ڈھلنے لگی۔ تمہاری نظر میں زندگی کی قدریں اب بالکل بدل چکی تھیں۔ تم جذباتی تو کبھی تھیں ہی نہیں کہ چیزوں کے بدلنے پر ماتم کرتیں۔ رخسارِ حسن پر معذوری کے ناسور کو دیکھ کر تمہاری محبت سہم گئی تھی۔ تم نارمل ذہنیت کی عورت تھیں نا۔ اس لئے تمہارا مطمحِ حیات حصولِ مسرت تھا، غم انگیزی اور المیت میں مزہ لینے کی خو بیمار ذہنیت کے اعصابی کی ہوتی ہے، اس لئے تم نے جادۂ حیات پر چلتے چلتے یکلخت درمیان ہی سے اپنا رخ بدل دیا۔ اور اپنے ناکارہ ساتھی کا ساتھ چھوڑ کر دوسری راہ پر نکل کھڑی ہوئیں۔

مگر یہ دُنیا کیسی عجیب ہے! اس نے تمہاری اتنی بڑی بہادری کی تعریف نہ کی۔ تمہاری نارمل ذہنیت کو لوگوں نے تمہارے اچھرپن سے موسوم کیا۔ اُدھر وہ بھٹکا ہوا مسافر عرفی بسترِ پر پڑا شب و روزِ زندگی کے آخری موڑ کو یوں تکتا رہا جیسے وہاں سے اسے کوئی مشعلِ راہ دکھائی دیتے جائے گی۔ مگر مشعلِ راہ اسے کون دکھاتا! احمق کہیں کا۔ تم دوسری پگڈنڈی پر نکل گئی تھیں اور اتنی دور نکل گئی تھیں کہ اگر عمرِ رفتہ تمہیں آواز بھی دیتی یا تم خود گردن موڑ کر اس پرانی راہ کو دیکھنا بھی چاہتیں۔ تو اب تمہیں وہ نظر نہ آتی! بڑی تیز رفتار تھیں تم!

ناہید! نجانے کیوں۔ آج اتنے سالوں بعد مراجی چاہتا ہے، یا یوں کہو مری جنوں پسندی چاہتی ہے کہ تم سے کچھ باتیں کروں۔ اور پھر تم کو ایک بہت پرانی کہانی سناؤں۔ بہت پرانی جو شاید تم نے کبھی سننے کی تکلیف ہی نہیں اٹھائی۔ یہ آج کی نہیں بلکہ آج سے چودہ سال پرانی بہاروں کی کہانی ہے۔ میں اور نیلم اپنی پرانی محلسرا کے عرشۂ چمن پر بیٹھی اپنی گڑیوں کی چوٹیاں گوندھ رہی تھیں میں گڑیا کی دائیں آنکھ میں کاجل لگا رہی تھی کہ نیلم نے ایک دلدوز چیخ ماری جیسے سنکر میں دہشت سے پیلی پڑ گئی تھی اور کہا تھا "لعنت ہو تم پر! کیوں چیخی تھیں؟"

نیلم کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تھے، بولی: "دیکھو وہ دیکھو۔ خدا کے لئے اسے بچا دو دی۔" وہ صحنِ گلستان کی طرف فضا میں اشارے کرنے اور رونے لگی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو وہاں خزاں کی دو زرد پتیاں ہوا میں معلق نظر آئیں۔ "سوکھے پتے؟" میں نے اکتا کر کہا۔

"ارے نہیں۔ تین تتلیاں۔ ایک نازک سی زرد رنگ کی تتلی آگے آگے ناچتی ہوئی جا رہی ہے اور اس کے تعاقب میں یہ دو زرد تتلے بھاگے جا رہے ہیں۔ وہ آپس میں لڑ پڑیں گے اور ایک کا خون ہو جائے گا۔"

یہ سنکر میں باغ کی سیڑھی پر جا بیٹھی اور ان کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی "تم دخل در معقولات نہ کرو۔ تینوں کو اپنے حال پر چھوڑ دو۔"

نیلم غمگین ہو کر بولی: "مگر ہائے۔ تم نے شاید دیکھا نہیں ان تتلوں میں سے ایک کا بازو غائب ہے"

"اور دوسرا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہ صحیح سلامت ہے۔ وہ دیکھو۔ معذور تتلا پیچھے رہ گیا۔ وہ دیکھو صحیح سالم تتلے کے ساتھ اس پھول پر جا بیٹھی، اب وہ دونوں غائب ہو گئے۔ اور یہ رہ گیا۔"

"یہ بالکل قدرتی بات ہے نیلم" میں نے کہا

"لیکن روحی۔ اگر وہ تتلی میں ہوتی تو رحم کھا کر اس معذور تتلے کے ساتھ اڑتی پھرتی۔"

"مگر لوگ تم کو بے وقوف کہتے۔"

وہ بہاریں گذر گئیں۔ اور نجانے ان تینوں تتلیوں کا کیا حشر ہوا۔ پھر برسات آگئی۔ نیلی نیلی گھٹائیں شرابیوں کی طرح جھوم جھوم کر اٹھنے لگیں۔ سمندر کے سینے پر بیتاب موجیں لوٹنے لگیں۔ اب ہم گڑیوں کی بجائے تاش کے پتوں سے دل بہلانے لگی تھیں۔ برسات کی جنوں انگیز گیلی رات تھی۔ صبح سے شاعر کے سلسلۂ خیال کی طرح مینہ مسلسل برستا رہا تھا۔ لیکن اس وقت بارش کچھ دیر کے لئے رک گئی تھی اور ہواؤں میں گیلی مٹی کا عطر ملا ہوا تھا۔ میں اور نیلم تیسری منزل کے ایک نارنجی رنگ کے کمرے میں بیٹھی تاش کھیل رہی تھیں۔ یکلخت نیلم نے ایک دلدوز

چیخ ماری جیسے سکر میں دہشت سے پیلی پڑ گئی: "لعنت ہو تم پر۔ کیوں چیخی تھیں؟" میں نے غصہ سے پوچھا۔

وہ دریچے سے باہر باغ کے اندھیرے کی طرف انگلی سے اشارہ کرنے لگی۔ دریچے کی راہ سے برساتی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سامنے رکھی ہوئی موم کی شمع بجھتے بجھتے رہ گئی۔ اس کے ساتھ ہی زمین پر رینگنے والے دو پروانے دریچے کی راہ اندر داخل ہوئے اور شمع کے گرد نثار ہونے لگے۔ اس کلاسیکی منظر کو دیکھ کر میں نے کہا: "تاش پھینک دو۔ آؤ اسی کو دیکھیں۔ اسی منظر کی نقاشی سے شاعر کا دیوان بھرا پڑا ہے"

نیلم نے غور سے دیکھ کر کہا "مگر ہائے روحی۔ ایک پروانے کا پر پہلے ہی سے جلا ہوا ہے"۔ "اور دوسرا؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"دیکھ لو۔ وہ ہٹا کٹا ہے"۔

ابھی اس کا جملہ ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ دریچے سے برساتی ہوا کا ایک اور تیز جھونکا اندر آیا اور چراغ کی لو اوپر کو اٹھ گئی۔ اور دیکھتے دیکھتے اتنی اونچی اٹھی کہ پروانے کو جا لگی۔ چشم زدن میں وہ جل کر راکھ ہو گیا۔ اور دوسرا شکستہ پر پروانہ بیٹھے کا بیٹھا ہی رہ گیا۔ میں نے نیلم کو پلٹ کر دیکھا اور بولی "دیکھا صحیح سالم پروانے کو شمع نے اپنی آغوشِ شوق میں لیکر آتشِ محبت میں خاکستر کر دیا"۔

وہ گھبرا کر بولی "اور دوسرے معذور کو ناقابلِ قبول سمجھا؟"

"یونہی ہوتا آیا ہے نیلم"۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"لیکن روحی۔ اگر میں شمع ہوتی تو اس شکستہ پر کو قبول کرتی"۔

"مگر دنیا تمہیں دیوانہ کہتی نیلم"

وہ برساتیں بھی گذر گئیں، پھر خزاں آ گئی۔ گلستانوں کے سارے موسم مرجھا گئے۔ ساری کائنات پر زردی چھا گئی۔ یہاں تک کہ شام کو کالے آسمانوں پر ابھر آنے والا چاند بھی یرقان کا مریض معلوم ہونے لگا۔

اب ہم نے تاش کھیلنا چھوڑ دیا تھا۔ اب رات رات بھر شاعروں کا دیوان ہاتھ میں لیکر غزلیں گنگناتے میں زندگی کٹنے لگی۔ میں ایک شوخ غزل گانے میں مشغول تھی کہ نیلم کی ایک دلدوز چیخ نے مجھے پھر بیدار کر دیا۔ جب ماضی کی طرح آج بھی خفا ہو کر میں نے کہا تھا "لعنت ہو تم پر کیوں چیخی تھیں؟"

وہ سنبھل گئی۔ پھر ہنسنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی: "میں یونہی اپنی دیوانگی میں چیخی تھی، روحی"

"ہائے۔ کیا تم ماضی کی ان دو تتلیوں اور دو پروانوں کو یاد کر رہی تھیں؟"

"ہاں، دونوں تندرست ذہنیت کے تھے روحی۔ تم نے سچ کہا تھا"۔ اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک آہ بھری اور بولی "میں نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا مگر نیلم! مجھے خود وہ شکستہ پر پروانہ اور بازو ٹوٹا ہوا تتلا پیارا لگتا تھا۔ میں خیال پرست عورت ہوں۔ تم جو کہتی ہو وہ کرتی نہیں۔ اور جو میں کہتی ہوں۔ میں بھی نہیں کرتی!

اس کے بعد ہم دونوں برسات کی اس اداس گھنگھور بارات میں دریچے میں جا کھڑی ہوئیں۔ ہمارے سامنے انتہاء تاریکی کا ایک سیلاب زمین سے لیکر آسمان تک موجیں مار رہا تھا۔ مجھے یاد ہے میں نے بے چین اور متاثر ہو کر کہا تھا: "نیلم! تم مجھے ایک شمع تو لا دو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اس تاریکی کے سیلاب کے پیچھے کیا ہے؟"

"وہاں کیا رکھا ہوگا روحی؟" نیلم نے نڈھال لہجے میں مرثیہ کے طرز پر کہا تھا۔ اور دونوں ہاتھ آنکھوں پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

آج ان باتوں کو چودہ سال گزر چکے ہیں ناہید! اور مجھے یوں تو معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال گزر چکے ہیں۔ بیشمار شامیں ڈھلتی رہی ہیں۔ اور انہیں ڈھلتی شاموں میں ایک شام۔ جادۂ حیات پر چلتے چلتے نیلم نے زندگی کے آخری موڑ پر مڑتے ہوئے اتفاق سے پیچھے پلٹ کر مجھے دیکھا اور ایک سوال کیا: "یہ کس کا شعر ہے روحی؟..."

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب　　　چھین لے مجھ سے حافظہ میرا"

اور اتفاق دیکھو کہ میں اس لمحہ شاعر کا نام بھول گئی تھی۔ اس زندگی میں اتنی باتیں یاد رکھنی پڑتی ہیں کہ ایک بھی یاد نہیں رہنے پاتی! میں نے برسوں بعد نیلم کو دیکھا تھا۔ اس لئے غور سے دیکھا۔ لاعلاج مرض نے زندگی کا خون نچوڑ لیا تھا اور وہ ایک ایسی افسردہ شام معلوم ہوتی تھی جو کسی دم ڈھل جائے گی۔

میں بہت تھک گئی ہوں، تم اس تیز رفتاری سے نہ چلو نا ہید۔ ابھی تو میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر اس معذور شخص کے پاس لیجانا چاہتی ہوں جو زندگی کے نکڑ پر اس کوڑھی کی طرح بیٹھا ہے جسے سوسائٹی قبول نہیں کرتی۔ اس کے ہاتھ میں کشکول ہے اور وہ راہ چلتوں سے محبت کی بھیک مانگ رہا ہے۔ تم اس تیز رفتاری سے کہاں بھاگ رہی ہو زندگی کے میلوں میں؟

اور آج اتنے عرصے بعد تمہارا سادہ خط اور دو باسی پنکھڑیاں مجھے ملیں تو مری ذہنی کیفیت اس دیوانے کی سی ہو گئی جو ابھی ابھی پاگل خانے سے شفا پا کر نکلا ہو اور اپنی دیوانگی سے قبل کے ماضی کو سوچ رہا ہو! آج مجھے ماضی کا غم اور حال کی خوشی، دونوں ایک معلوم ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ دونوں فانی ہیں، دونوں گذر جانے والی کیفیات ہیں۔ میں کسی چیز کو تھامنے کی کوشش کرتی رہ جاتی ہوں اور وہ مرے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ دفتر، رفیق، محبتیں، نفرتیں۔ کوئی چیز بھی ہاتھ نہیں آتی! سوچتی ہوں۔ آج اتنے سالوں بعد ان تمام باتوں کو تمہارے آگے دہرانے سے کیا حاصل تمہارا غمِ حیات یا دردِ محبت سے کیا واسطہ اور کیا تعلق! تم ایک نارمل ہستی ہو۔ تمہاری متوازن ذہنیت نے تم کو کبھی طوفانوں سے آشنا ہی نہیں کیا۔ تمہیں اس سے کیا غرض کہ کوئی غمِ حیات کو بہلانے کے لئے موسیقی سے ہمکنار ہو کر زندگی کے سینے پر سر رکھ کر بیہوش ہو گیا ہے۔ یا کسی معذور سوالی کے شکستہ ہاتھوں سے کشکولِ محبت گر پڑا ہے اور دنیا کے قدموں میں چکنا چور ہو گیا ہے! آج تم نجانے زندگی کی کس بلندی پر کھڑی بیمار ذہنیت کی پستی پر کھلکھلا رہی ہو گی۔

لیکن مرا کام زندگی کے قہقہوں اور آنسوؤں کو سننا اور دیکھنا ہے، غمِ حیات کو محسوس کرنا اور شاموں کو ڈھلتے ہوئے دیکھنا اور کہانیاں لکھنا ہے جبھی تو میں نے اس خط کی ابتدا میں کہا تھا کہ شاید ایک ہزار سال گذر جائیں، جب بھی شامیں یونہی ڈھلتی رہیں گی اور انسان کا غم یونہی تازہ رہے گا۔ چنانچہ اب شام ڈھل چکی ہے! ۔

"ماہِ نو"

جِلد نمبر کی تبدیلی

رسالہ "ماہِ نو" اپریل ۱۹۴۸ء میں جاری ہوا تھا اور دس سال تک اس کی سالانہ جلدوں کا شمار ہر سال اپریل سے شروع ہو کر آئندہ سال مارچ تک کیا جاتا تھا۔

جو حضرات سن وار مجلدات رکھنے کے شائق ہیں وہ جلدوں کے اس طرح شمار کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ اسلئے فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس سال دسمبر میں "ماہِ نو" کی گیارہویں جلد کا شمارہ نو اشاعتوں پر ختم کر دیا جائے اور بارہویں جلد کی پہلی اشاعت جنوری ۱۹۵۹ء کو سمجھا جائے اور آئندہ کلینڈری سال کے مطابق جلدوں کا شمار جاری رہے۔ قارئین جلد نمبر کی اس تبدیلی کو نوٹ فرمالیں۔

نوٹ: جلد نمبر کی اس تبدیلی سے سالانہ خریداران کی مدتِ خریداری وغیرہ کسی چیز پر اثر نہیں پڑے گا ــــــ

(ادارہ)

فروزاں لمحہ

ابن الحسن

ایک یہ حسن ترا
—— اتنا پاکیزہ، سُبک، نرم، گریزاں، رخشاں
ایک میری نگہ شوق مرے خواب کی پرکارفسوں کاری ہے
اور بھی جس سے ہے یہ حسن دلآویز ترا
کچھ ہے موسم کا اثر
—— چاندنی، پھول، ہوا نرم خرام
جھیل کا صاف رو پہلا پانی
ہلکے ہلکورے، رقص، فضا گیت بھری
کیسی مدہوشی ہے سرشاری ہے!

★

جذبِ باہم سے فروزاں لمحہ
—— روزِ اول ہی سے یہ وقت کی تقدیر میں تھا
خوابِ امید تھا کل، آج کشادِ امید
کل یہ پھر ہوگا کہاں؟
ایک لمحے کا توقف ہے یہاں

★

ایک لمحہ ہی سہی
—— دیکھ پیپل پہ ستارے روشن
پتّے پتّے پہ چمکتی ہوئی مہتاب کرن
تو مرے پاس تری آنکھ کے دیپک روشن
تیری سانسوں تری زلفوں ترے عارض کی مہک
لذتِ وصل، امنگوں کا یہ پرکیف بہاؤ
ڈگمگاتی ہوئی احساس کی ناؤ
—— جانے کس سمت بہی جاتی ہے!

★

سمت کیا؟ سمت کہاں ہے کوئی؟
دل یہ کہتا ہے کہ۔ ہاں!
لمحہ سچّا ہی سہی۔
اور اس لمحے کو سرشار کریں
جذبِ باہم سے شرر کار کریں
یہ جو سنگین حدیں ذات کی ہیں پار کریں
تاکہ یہ لمحہ مدام

★

کسی گوہر کی طرح
اخترِ شام کے شفاف اشارے کی طرح
نیلگوں سائے میں ایام کے رخشندہ رہے!

غزل

تابش دہلوی

اک کشاکش بھی ہے رنجِ نامرادی کے سوا
ہائے کیا کہیے دلِ مایوس کس مشکل میں ہے

یہ سکونِ دل بھی ٹھہرا حاصلِ صد اضطراب
اب یہ عالم ہے کہ گویا بحرِ بھی ساحل میں ہے

نامرادی کے لئے کیا کیا تمنائیں نہ کیں
بیدلی کی آرزو گویا مذاقِ دل میں ہے

مرحلے ہیں رہروِ راہِ طلب کے ساتھ ساتھ
راہبر ہے جس میں، رہزن بھی اسی منزل میں ہے

لطف لیتا ہے شکستہ خاطروں سے اک جہاں
اب دلوں کا ٹوٹ جانا، رونقِ محفل میں ہے

بحر میں ہو بھی چکا کب کا سفینہ تہ نشیں
اور دادِ بیکسی اب تک لبِ ساحل میں ہے

روز ہوتا ہے یہاں تابش غروب اک آفتاب
ایک داغِ آرزو پھر بھی ہمارے دل میں ہے

شبد انجراتی

نگاہِ شوق کے وہ نا تمام اندازے
دل و نظر کو بھگتنے پڑے ہیں خمیازے

کچھ اس ادا سے سرِ انجمن اٹھی وہ نظر
بکھر بکھر سے گئے زندگی کے شیرازے

کہاں کہاں نہ بھٹکتی رہی نگاہِ خلوص
کہاں کہاں نہ ہوئے دل کو دل کے اندازے

اٹھے گا کب کوئی منصور بطنِ گیتی سے
بہت کسے ہیں جنوں پر خرد نے آوازے

ہمیں ہیں محرمِ اسرارِ میکدہ ساقی
ہمیں پہ بند ہیں تیرے کرم کے دروازے

مرے جنوں کو نئے حوصلے مبارک ہوں
بدل گئے ترے نقد و نظر کے اندازے

* * *

یادِ رفتگاں:

صدّیق مرحوم

رشید احمد صدیقی

صدیق احمد صدیقی ۔ خوش ذوق، بذلہ سنج، شگفتہ مزاج ــــ وطن ہو یا بیرونِ وطن، ہر کہیں ادبی و مجلسی زندگی کی رُوحِ رواں۔ آج ہم میں نہیں! یہی رونقِ محفل بننے کی صلاحیتیں تھیں اور اُردو زبان و ادب کی خدمت کا شوق جو انھیں بی بی سی لندن میں لے گیا ــــ اُردو نشریات کے نگراں کی حیثیت سے ــــ اور وہیں عین جوانی میں ان کی وفات واقع ہوئی ــــ مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور!

"ماہِ نو" ان کے اعزّہ و احباب کے ساتھ ان کی سوگوار یاد میں شریک ہے کہ "وہ بیچارا ہم سے بھی تھا آشنا"۔ وہ ہمارے معاونین میں تھے اور ان کے مضامین اکثر ان صفحات کی زینت بنتے رہے ہیں۔ ذیل کی چند سطور ان کے ایک استاد اور اُردو کے مشہور مزاح نگار پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ایک حالیہ خط سے لی گئی ہیں جو انہوں نے اس سانحہ کے فوراً ہی بعد لکھا تھا۔ (ادارہ)

صدیق احمد صدیقی کا لندن میں دفعتاً انتقال ہوگیا۔ جہاں وہ بیوی بچوں کے ساتھ عزت عافیت اور فراغت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ انہیں کے ساتھ نہیں، اپنے کتنے ایسے دوستوں کے ساتھ جو اُن کے گھر میں، ان کے آس پاس اور ان سے دور اور بہت دور رہتے بستے تھے! ایسی وابستگی ان کو دوستوں سے اور دوستوں کو اُن سے تھی!

ابتدائی تعلیم ندوہ میں ہوئی۔ اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے انٹرنس کرنے کے بعد مسلم یونیورسٹی آگئے۔ ۱۹۳۸ء میں اُردو میں آنرز اور ۱۹۴۰ء میں ایم۔اے فرسٹ ڈویژن میں کیا۔ اس درمیان میں مکتبہ جامعہ دہلی سے بھی منسلک رہے۔ ۳۷-۱۹۳۶ء میں مسلم یونیورسٹی یونین کے سکرٹری منتخب ہوئے۔ وائس پریسیڈنٹ (اب پریسیڈنٹ) بھی ہوجاتے۔ اگر سیاسی فضا یکسر منقلب نہ ہوجاتی۔ انجمن اردوئے معلّے کے بھی سکرٹری رہے۔ بحیثیت طالب علم مارسن کورٹ آفتاب ہوسٹل اور ممتاز ہاؤس میں قیام رہا۔ کچھ دنوں ظفر عمر مرحوم کے ساتھ "علی گڑھ گزٹ" میں بھی اڈیٹری کی خدمات انجام دیں اور ٹیوشن بھی کرتے رہے غالباً ۱۹۴۱ء میں ڈیلی کالج اندور میں اُردو کے لیکچرار ہوگئے۔ ملک کے تقسیم ہونے تک وہیں رہے۔ پھر پاکستان چلے گئے۔ وہاں کے مختلف نشیب و فراز (فراز کم نشیب زیادہ) سے گزرتے ہوئے بالآخر بی بی سی لندن کے پاکستان سکشن میں ۱۹۴۹ء میں ملازم ہوگئے اور وہیں سفر آخرت پیش آگیا!

لندن میں وہ پاکستان و ہندوستان بالخصوص علی گڑھ والوں کا ماویٰ و ملجا تھے۔ کیا تعجب اوروں کے بھی رہے ہوں۔ ان میں سے کوئی بھی لندن سے گزرے صدیق احمد صدیقی کی محبت و مدارات سے خوش وقت ہونے کے لئے ان کے ہاں ضرور پہنچتا۔ ایسے لوگ بھی پہنچ جاتے جو مالی یا کسی اور دشواری میں مبتلا ہونے صدیقی وہ سب کرتے جو کر سکتے تھے۔ خاص کر طالب علموں کے لئے، اُن کا دل اور اُن کے گھر کا دروازہ اُن کے ہر دوست کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا۔ جیسے لندن کا وہ مشہور ہسپتال جس کے بارے میں مشہور ہے کہ اس کا صدر دروازہ افتتاح کے دن کھلا تو آج کئی سو سال سے بند نہیں ہوا!

علی گڑھ والوں میں سے کوئی لندن سے آتا تو قبل اس کے کہ میں پوچھتا کہ صدّیقی سے ملاقات ہوئی یا نہیں وہ خود اُن کی محبت و مدارات کا ذکر کرنے لگتا، جیسے اس ذکر کرنے میں دیر لگادی تو وہ کسی فروگذاشت کا مرتکب ہوجائے گا۔ صدّیقی کی وفات کا صدمہ ان کے علی گڑھ کے دوستوں پر کیسا ہوا، اس کا اندازہ وہ نہیں کرسکتا جس نے اُن کے ساتھ نہ علی گڑھ کا زمانہ گذارا ہو نہ لندن کا! اُردو کے اچھے مقرر تھے، بولنے کا انداز مولانا آزاد سبحانی کا تھا۔ بعد کے نہیں بالکل ابتدا کے آزاد سبحانی کا۔ کبھی مزے یا جوش میں آکر بات کرنے لگتے تو معلوم ہوتا جیسے تقریر کرنے لگے ہوں!

ماہِ نو، کراچی۔ نومبر ۱۹۵۸ء

علی گڑھ میں طلبا کی شخصیت کا نشوونما کلاس روم میں نہیں بورڈنگ ہاؤس میں ہوتا ہے۔ کلاس کے ساتھی ایک دوسرے سے اتنے آشنا نہیں ہوتے جتنے بورڈنگ ہاؤس کے ساتھی۔ اسی سبب سے بورڈر کا درجہ ڈے اسکالر سے ممتاز سمجھا گیا۔ اچھے ڈویژن میں پاس ہونے اور پوزیشن لانے کی بھی علی گڑھ میں بڑی منزلت رہی ہے اور بڑے بڑے "گرینڈی" یا "شورہ پشت" ان کا احترام کرتے تھے۔ اول الذکر دونوں کی کمان اترتے بارہا علی گڑھ میں دیکھی لیکن اچھے اسکالر اور اچھے کھلاڑی کا درجہ ہمیشہ چڑھا کا توں اونچا رہتا تا وقتیکہ انہوں نے اپنے آپ کو لیڈری کے چکر میں نہ ڈال دیا۔

صدیقی شروع سے آخر تک لیڈر رہے۔ پڑھنے لکھنے میں بھی ممتاز تھے طباع اور ذہین ہونے کے علاوہ دنیا اسکے باوجود مخلص اور شریف النفس تھے۔ ساتھیوں کی طرح طرح سے حمایت اور دلداری کرتے تھے، ضرورت دیکھتے تو کبھی کبھی ان کو اپنی اہمیت کا بھی احساس دلا دیتے تھے! تمام یونیورسٹی میں "چچا صدیق" کہلاتے تھے۔ مذاق سے نہیں پیار اور اخلاص سے۔ ان کے ساتھی کہتے تھے کہ صدیقی ساتھ نہ ہوتے تو نہ بزم میں مزا آتا نہ رزم میں۔ لیڈر ہونے کے سبب سے اختلافِ تمیز ان سے چوکتے ضرور رہتے لیکن ان کا خیال بھی بہت کرتے تھے۔ اس لئے کہ جانتے تھے کہ یہ ان کی لیڈری تھی۔ وہ کسی کی چاکری میں لیڈری پر فائز نہیں ہوئے تھے اس لئے ہمیشہ قابلِ اعتبار رہے۔ یہی سبب ہے کہ لیڈر رہنے کے باوجود وہ علی گڑھ کی بدنامی کا باعث کبھی نہیں ہوئے۔

اپنے استادوں کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہ بات ان میں خاندانی تربیت اور روایات سے آئی تھی۔ پرانے مسلمان گھرانوں میں اب بھی بڑوں کا احترام اور چھوٹوں کی دلداری شرافت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ مجھ سے بہت مانوس تھے اور کچھ "سجدۂ مرشد" قسم کے آداب ملحوظ رکھتے تھے جس سے میں بہت گھبراتا ہوں۔ یہ اس لئے کہ خود میری نظر میں کوئی کتنا ہی محترم اور محبوب کیوں نہ ہو۔ میں اس طرح کے آداب برتنے پر اپنے آپ کو کبھی نہیں آمادہ کر سکتا تا وقتیکہ میرا مقصد اس کا مذاق اڑانا یا تضحیک نہ ہو!

چنانچہ ایک دفعہ مجھے کہنا پڑا، صدیق صاحب میں جون پور کا رہنے والا ضرور ہوں لیکن وہاں کے "ملا ٹولے" سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ ماشاء اللہ آپ بھی کچھ ایسے غیر ضروری طور پر خوش عقیدہ مسلمان نہیں معلوم ہوتے۔ پھر آپ کے میرے تعلقات ایسے ناسزا کیوں ہوں! مسکرائے، یہ حربہ وہ بڑی کثرت اور اتنے ہی کاری طور پر استعمال کیا کرتے تھے، کہنے لگے بات "ملا ٹولے" اور خوش عقیدگی کی ہو یا نہ ہو "نفس" اور "نجابت" کی ضرور ہے۔ کیا کروں اب نہ ایسے لوگ ملتے ہیں نہ ایسی جگہ جہاں شرفا کے آداب ملحوظ رکھنے کی آرزو پوری کر سکوں۔ ایک اپنی یہ یونیورسٹی اور اساتذہ رہ گئے ہیں وہاں آپ یہ فرماتے ہیں! میں نے کہا آپ کی آرزو بڑی مستحسن ہے لیکن کسی بات کو مستحسن یا غیر مستحسن قرار دینے میں آپ کو جو برمحل فارمولا بنا لینے کی مشق ہے اس سے ڈرتا ہوں اور آپ کو بھی ڈرانا چاہتا ہوں۔ اپنی یونیورسٹی میں بھی آدمی کا انتخاب کرنے میں احتیاط برت لیا کیجئے تو کیا ہرج!

جیسا کہ کہہ آیا ہوں صدیقی بڑے ذہین نوجوان تھے۔ ان کو اپنی بات منوا لینے کا ڈھب آتا تھا۔ صورت حال کیسی ہی نازک یا پیچیدہ کیوں نہ ہو وہ اس پر قابو پا لیتے تھے۔ اس میں ان کے خلوص اور خدمت کرنے کے جذبے کے علاوہ ان کی طبع سلیم اور فہم رسا کو بھی بڑا دخل تھا۔ ایسے مواقع پر بھی رجوع ہوتے تو بیڑا اٹھا لیتے جن لوگوں اور جب یہاں پر اردو لٹریچر کا جن لوگوں مجرم یا آرٹسٹ سے سابقہ ہوتا ہے ان کو قابو میں لانا اور رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ صدیقی اپنے طرح طرح کے جمانوں سے نباہ بھی خوب کرتے اور نپٹتے بھی خوب تھے۔ جیسے وہ اسی طرح کے کام کے لئے خلق ہوئے ہوں۔

صدیق احمد صدیقی کے کسی طرح ابھی مرنے کے دن نہ تھے اپنی کتنی ہی فطری اور اکتسابی اچھی صلاحیتوں سے وہ دوسروں کو بہت دنوں تک فائدے پہنچا سکتے تھے اور خود بھی زندگی کی نعمتوں سے بہرہ مند ہو سکتے تھے جس کے وہ یقیناً مستحق تھے۔

خدا جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین۔

★

(ایک شہری کا دوسرے شہری کے نام خط)

خدا کرے ڈاکیہ میرا یہ خط آپ کو پہنچا دے اور سچ پوچھو تو ہمارے یہاں ڈاک والوں کے حسن انتظام سے برسوں کا بھٹکا ہوا خط بھی آخرکار منزل مقصود تک پہنچ ہی جاتا ہے - پھر یہ کیوں نہ پہونچے گا؟ مگر یہ تو میں ایسے ہی کہہ رہا ہوں - خط تو محض بہانہ ہے - اصل مطلب تو یہ ہے کہ کسی طرح جی ہلکا ہو - دل کی بات زبان تک آئے اور دوسروں تک پہنچے - وہی جس کو دل ہی دل میں ،،اونچا اونچا سوچنا،، کہتے ہیں - تاکہ خود بھی ڈھب کی باتیں سوچی جائیں اور دوسروں کو بھی سمجھائی جائیں - کس ڈھب سے کوئی سمجھے بس مدعا یہی ہے -

ہماری ساری زندگی اندھیروں اجالوں ہی میں تو گذرتی ہے - رات ہو یا دن ہماری سرگرمیاں جاری ہی رہتی ہیں - اچھی بری سب ہی - مگر بھئی! ہمارا دامن تو پاکستان جیسے پاک دیس سے وابستہ ہے لہذا ہماری سرگرمیاں تو ہر صورت میں اچھی ہی ہونی چاہئیں اور ہمیں اپنے اور اپنے بھائی بندوں کے طور طریق کو کڑی نظر سے دیکھنا چاہئے - بڑی برائیاں تو خیر بڑی ہی ہیں مثلاً چور بازاری، ناجائز درآمد برآمد، رشوت ستانی، غنڈہ گردی وغیرہ - یہ ہر قوم کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں اور نہایت خطرناک - ان کو روکنا ہمارا فرض ہے - مگر چھوٹی برائیاں بھی کچھ کم نقصان دہ ثابت نہیں ہوتیں - یہ چپکے ہی چپکے سوسائٹی کو گھن لگا دیتی ہیں - اور یہ کچھ ایسی ڈھکی چھپی بھی نہیں ہوتیں - ہم اٹھتے بیٹھتے، جاگتے سوتے - ہر کہیں ان کو دیکھتے ہی رہتے ہیں - لیکن ان سے بچنے یا ان کو دور کرنے کے لئے ذرا بھی ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے - بلکہ الٹا ان کو خوشحال سمجھتے ہیں - اور ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ان کے مرتکب ہوتے ہیں - دیکھئے اس وقت روز روشن ہے - ہر طرف اجالا ہی اجالا - ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے کا نقشہ دیکھئے - یہ ہے آرائش کا کمرہ - سامنے ڈریسنگ ٹیبل ہے - اس قدر خوبصورت! شفاف آئینہ جھم جھم کرتا ہوا - ہر قسم کا بناؤ سنگھار کا سامان نفاست سے چنا ہوا - اور نئی نویلی دلہن زور شور سے محو آرائش - کیوں نہ ہو - بننے سنورنے کے یہی تو دن ہیں - غازہ، سرخی، پاؤڈر، تیل، پالش، لیونڈر، کیا نہیں - یہ سب حسن کو چار چاند لگا دیتے ہیں - مگر یہ چیزیں حسن کی شان کو لاکھ دوبالا کریں، اسے چمکائیں، جلا دیں یہ بذات خود تو حسن نہیں ہیں - ایک شاعر نے بڑی پتے کی

بات کہی ہے ، خواہ الفاظ کتنے ہی بھاری بھرکم سہی :

پوچھ مت رسوائی انداز استغنائے حسن
دست مرہون حنا ، رخسار رہن غازہ تھا

ہاں فرق اتنی کی بات تو یہی ہے کہ رخسار بالکل ہی رہن غازہ یعنی سراپا غازہ بن کر رہ جائیں - پہلی چیز تو حسن کی اپنی پروقارگی ہے - جو صحت و تندرستی ہی سے پیدا ہو سکتی ہے - یہ کیا کہ انسان ہر وقت بناؤ سنگھار ہی میں کھویا رہے اور اپنی جان کو روگ لگا بیٹھے - جھوٹ موٹ نہیں سچ مچ کا روگ کیونکہ ہر وقت لیپنے پوتنے کا خبط واقعی انسان کو دق لگا دیتا ہے - غور کیجئے - دلہن بیگم کا دن بھر اور کوئی کام ہی نہیں - سرخی اور پاؤڈر تھوپ تھوپ کر کیا حال کرلیا ہے - ایسے تو آئے دن نئے سامان کی ضرورت ہوگی اور نئے نئے خرچ اٹھیں گے - جو چیز کھانے پینے اور صحت بنانے پر صرف ہونی چاہئے وہ صحت بگاڑنے پر صرف ہوگی مگر یہ ٹیپ ٹاپ صرف ان کے رخ زیبا اور سنگھار میز ہی تک ہے - گرد و پیش ایک عجیب بے پروائی اور وحشت کا عالم ہے - جیسے گھر نہیں ڈر ہے - بالکل جیسے ''مبتلا'' کے گھر ''ہریالی'' کے آنے سے پہلے - میلے کپڑوں کے انبار مسہریوں پر ، میزوں پر ، فرش پر ، کونوں میں ، کھڑکیوں میں ، دروازوں کی چولوں میں - غرض کہاں کہاں بکھرے ہوئے نہیں - اور کیا فرش ، کیا در و دیوار پر گرد کی نہیں کی تہیں جم رہی ہیں - یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے - اور ذرا اس حجلۂ عروسی سے باہر نکل جائیے تو طرفہ تر عالم ہے - صحن میں ٹوکروں کوڑا کرکٹ جیسے ہر طرف لمبے بلماں لوٹ رہی ہوں - باورچی خانہ سے لے کر گھر کے ایک ایک کونے تک مکھیوں کی بے پناہ بھرمار اور بھنبھناہٹ - یہ سب کیوں ؟

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز!

صرف اس لئے کہ دلہن بیگم کو گھر کی دیکھ بھال سے کوئی سروکار نہیں - اور ایک دلہن بیگم تو کیا کتنی ہی گھر گھرستنوں کو گھر کے سنوارنے بہارنے اور صحیح معنوں میں جنت بنانے سے کوئی سروکار نہیں - یہ کوئی معمولی بات نہیں - غور سے دیکھا جائے تو یہ سارا معاملہ امور خانہ داری میں سلیقہ کا ہے - یعنی گھر بنانے اور گھر بگاڑنے کا - اکثر گھرانوں کی زندگی اس لئے ناگفتہ بہہ نظر آتی ہے کہ ان کی عورتیں گھر سنبھالنے کا فن نہیں جانتیں - انھیں نہ دور کی سوچ ہے نہ قریب کی - خرچ حد سے بڑھ رہا ہے تو بڑھے - چیزیں ٹوٹتی پھوٹتی یا ضائع جاتی ہیں تو ان کی بلا سے - دن رات نئی سے نئی پکچر دیکھنے کی دھن سوار ہے - نئے نئے کپڑے، نئے نئے گہنے پاتے اور سیریں ، تفریحیں - شوہر خستہ حال اور بچے ان سے بھی زیادہ برے حالوں - اب آپ ہی کہئے بات بنے تو کیسے ؟ مطلب یہ ہے کہ ہمیں جزرسی ، کفایت شعاری اور اعتدال پسندی کو اپنا شعار بنانا چاہئے - صرف ضرورت کی جگہ پر

خرچ کیا جائے تو نہ قرض ادھار تک نوبت پہنچتی ہے نہ ہاتھ تنگ ہونے سے خواہ مخواہ پریشانی اور گھبراہٹ ہوتی ہے - یہ تو ایسی باتیں ہیں جنھیں سب گھر گرہستنوں کو پلے باندھ لینا چاہئے - یہ ان ہی پر دھیان نہ کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ اکثر گھریلو زندگیاں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں -

آئیے اب ذرا گھر سے باہر چل کر دیکھیں - یہاں بھی دن دھاڑے کیا کچھ نہیں ہوتا - یہ رہے ایک پرچون فروش - اہا ! کس صفائی سے ڈنڈی ماری کہ پلڑا وہ گیا - اور پلک جھپکنے میں سیر کا سوا سیر بن گیا ! یہ بددیانتی نہیں تو اور کیا ہے ؟

لیجئے اور دیکھئیے - یہ رہا گھی - کیا یہ واقعی گھی ہے ؟ کیا آپ اسکو پہچان سکتے ہیں ؟ معاذاللہ ! اس قدر ملاوٹ کہ صرف ملاوٹ ہی رہ جائے - اصل جنس بالکل برائے نام - اور اس کا نتیجہ کچھ نہ پوچھئیے ، کھانسی ، زکام ، نزلہ ، تپ محرقہ ، دق ، خدا جانے کیا کیا کچھ - سوچنے کی بات ہے کہ جب کھانے پینے کی ایسی بنیادی چیزیں ہی ٹھیک نہیں تو صحت کیا ہوگی ؟ ساری قوم کی صحت کا ستیہ ناس اور لطف یہ ہے کہ چھوٹے بڑے سب ہی اس چکی میں دلے جاتے ہیں - اور صرف گھی ہی کیا ، کونسی چیز ہے جس میں کھوٹ نہیں ، ملاوٹ نہیں ؟ منٹو مرحوم نے وہ قصہ ٹھیک ہی گھڑا تھا - گھڑا کیا آنکھوں دیکھی بات ہی کہی تھی کہ ایک صاحب سنکھیا خریدنے گئے اور پھانک بھی لیا مگر اثر ندارد ! اس میں بھی کھوٹ ! ! اب کس کس چیز کا ذکر کیا جائے - ہمیں نجی ، کاروباری ، قومی زندگی میں دیانتداری کو شمع راہ بنانا چاہئے - بالخصوص جب ہم اسلام کے پیرو ہیں - وہ اسلام جو دیانتداری اور راستبازی کو تمام دینوں سے زیادہ اہمیت دیتا ہے -

یہ بھی آنکھوں دیکھی بات ہے نہ یار لوگ کس کس طرح اپنے گرد و پیش کو خوشگوار
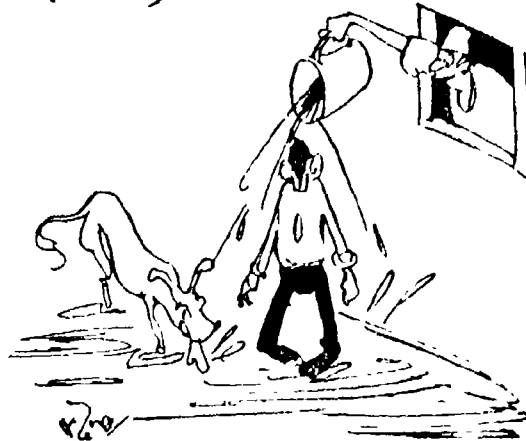
بناتے ہیں - یہ سب دھرتی اللہ میاں کی دھرتی ٹھہری - اس لئے ہم اسکو جیسے بھی جی چاہے کام میں لائیں - یہ ہمارا پیدائشی حق ہے - لہذا ہم جی بھر کر اپنے ماحول کو خوشگوار بناتے ہیں - محلے محلے ایک ہی عالم ، ایک ہی نقشہ - ماشاءاللہ یہ مٹھائی کی دکان اور ہوٹل خوب چل رہے ہیں - شکر ہے اپنے دیس میں لوگ آسودہ و خوش حال تو ہیں - مگر دیکھئے اس خوش حالی کا زور کہاں نکلتا ہے - ہوٹل کی ساری جھوٹن اور غلیظ پانی چوبچوں یا بدرووں میں ڈال دئے جانے کی بجائے کس بے تکلفی سے گھروں کے سامنے میدان میں پھینک دیا جاتا ہے - تاکہ وہاں آوارہ کتے اور سر پر منڈلاتے ہوئے سینکڑوں کوے اور چیلیں جشن منائیں - آتے جاتے راہوں کو ذوق نظر کا سامان بھی ملے - کتنی کئی دن کا گلا سڑا پانی میدان ہی کی نذر ہو جاتا ہے - اسلئے کہ یہ خالی کیوں رہے ؟ بنجر کیوں رہے ؟ سیراب کیوں نہ ہو جائے ؟ یہ اسکو بھرنے اور سیراب کرنے کا بہت ہی عمدہ طریقہ ہے ! گھروں کا کوڑا کرکٹ بھی ان کی چاردیواری میں کیوں رہے ؟ کھلے میدان کی زینت کیوں نہ ہو ؟ چنانچہ جا بجا گھورے کے انبار کے انبار جنب نظارہ ہیں - گھروں میں

ہماری ڈاک

مکرمی

جنابِ ڈاکٹر محمد صادق صاحب نے ستمبر کے "ماہ نو" میں "لاہور کرانیکل" کے بارے میں یہ سطور لکھی ہیں :۔

"اس کی نسبت کرنیل گولڈنگ نے اپنی تصنیف "اولڈ لاہور" (پرانا لاہور) میں صفحہ ۵۱ پر وضاحت سے درج کیا ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کی تاریخ مقرر نہیں کر سکتا۔ لیکن سرکاری ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ اخبار اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی کے اواخر میں نکل رہا تھا۔"

اس سلسلے میں گذارش ہے کہ گولڈنگ کی کتاب قابلِ اعتماد نہیں کیونکہ وہ خود لکھتا ہے کہ میں نے محض یادداشت کی بناء پر یہ کتاب لکھی۔ لاہور کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے سید محمد لطیف کی کتاب "ہسٹری آف لاہور" زیادہ موزوں ہوگی جو ۱۸۹۲ء میں چھپی۔ رہی یہ بات کہ لاہور کرانیکل "اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی کے اواخر" میں نکل رہا تھا۔ اس زمانے میں تو کلکتہ سے بھی کوئی اخبار نہیں نکلتا تھا۔ برِعظیم کا پہلا اخبار "بنگال گزٹ" ۱۷۸۰ء میں کلکتہ سے بھی جاری ہوا۔ "لاہور کرانیکل" الحاقِ پنجاب کے دو چار ماہ بعد ۱۸۴۹ء کے وسط میں جاری ہوا اور اس کے بانی سید محمد لطیف مصنف "ہسٹری آف لاہور" کے والد منشی محمد عظیم تھے۔ لاہور کرانیکل کے ۱۸۴۹ء میں اجراء کے ثبوت میں دو سندیں پیش کرتا ہوں:

۱۔ "انہوں (منشی محمد عظیم) نے دہلی میں کمپنی قائم کی۔ چھاپے خانے کا سامان خریدا اور ۱۸۴۹ء میں ایک بڑے عملے کے رکنِ اعلیٰ کی حیثیت سے لاہور آئے اور یہاں سے انگریزی زبان کا پہلا اخبار "لاہور کرانیکل" کے نام سے جاری کیا۔" (ہسٹری آف لاہور" صفحہ ۲۴۲)

۲۔ "یہ انگریزی اخبار "لاہور کرانیکل" پنجاب کے مورخ، سید محمد لطیف کے والد، منشی محمد عظیم نے ۱۸۴۹ء میں جاری کیا۔"

"سول اینڈ ملٹری گزٹ" مورخہ ۲ مارچ ۱۸۷۷ء: اداریہ۔

امید ہے ان حوالوں سے صورتِ حال بخوبی واضح ہو جائے گی۔

(عبدالسلام خورشید)

مکرمی

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ہم آپ کے رسالہ "ماہ نو" کے سالانہ قاری ہیں۔ مجھے ایک مضمون بعنوان "دوسرے جہانوں کا سفر" از علی ناصر زیدی (مطبوعہ اگست ۱۹۵۸ء) میں ایک غلطی دیکھ کر افسوس ہوا۔ اسکی چھٹی سطر میں بیان کیا گیا ہے کہ امریکہ نے روس سے کہیں پہلے مصنوعی سیارچہ چھوڑا۔ یہ صریحاً بالکل غلط ہے کیونکہ روس نے سب سے پہلے ایسا سیارچہ چھوڑا تھا۔ ازراہ کرم بواپسی ڈاک جواب دیں۔ میں آپ کے رسالہ کا بے حد مداح ہوں۔ میرا نام آفتاب ہے اور میری عمر ۱۲ سال کی ہے۔

آپ کا تابعدار

آفتاب گل۔ معرفت

میجر نذیر محمد۔ مزنگ روڈ۔ لاہور

*

مکرمی۔

گرامی نامہ مورخہ ۲۱ اگست موصول ہوا، شکریہ۔ کس طرح معذرت کروں کہ میرے مضمون میں سہواً ایک جملہ ایسا چھپ گیا جو حقیقت کے برعکس ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچھلے سال اکتوبر میں سب سے پہلے روس نے ایک مصنوعی سیارچہ فضا میں چھوڑا، دوسرا بھی روس کا تھا۔ پھر امریکہ نے یہ کامیابی حاصل کی لہذا یہ جملہ یوں ہونا چاہیئے تھا: "پہلے روس اور پھر امریکہ نے یکے بعد دیگرے کئی مصنوعی سیارے فضا میں چھوڑے۔" اگر واقعی میرے مسودے میں یوں ہے جیسے ماہ نو میں چھپا تو معذرت خواہ ہوں (مسودہ میں یونہی تحریر ہے: مدیر) سوائے سہو کے اور کیا کہوں۔

(علی ناصر زیدی)

ر۔غ

نقد و نظر

انتخاب کلام سکندر علی وجد

ناشر: انجمن ترقی اردو۔ ہند، علی گڈھ۔
صفحات ۴۶، قیمت ۱۲

یہ اردو شاعروں کے انتخابی سلسلہ (پہلا سیٹ) کی ایک کڑی ہے جس کا بیڑہ انجمن ترقی اردو ہند نے اٹھایا ہے۔ اس سلسلہ کا مدعا یہ ہے کہ وہ قارئین جو کسی مجبوری کی وجہ سے سارے کلام کا مطالعہ نہیں کر سکتے، شاعر کے رنگ سے متعارف ہو جائیں اور انہیں اس کے تفصیلی مطالعہ کی خواہش پیدا ہو۔ رنگ سے متعارف ہونے کی ضرورت جبھی پیش آتی ہے کہ اس میں کوئی تخصیص ہو۔ اگر رنگ و بے رنگ میں امتیاز نہ رہے تو سرگرمئ شوق وہیں ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے یہاں نظم گوئی کی ایک کیفیت کی کیسی ایسی ہے جو محض نظم برائے نظم کی مصداق اور بکٹے سیدھے، سپاٹ، یکساں پیرایوں میں طول طویل، بیانیہ تشریحی خطبات پر مشتمل ہے۔ ایسی نظم گوئی جو ایسے ہی جامد اور میکانکی تصور سے جنم لیتی ہے، ہماری شاعری کے ترقی پذیر ہونے میں ایک مستقل رکاوٹ بن گئی ہے۔ کیونکہ جب تک ہم سکہ بند تصور اور قدیم الوضع پیرایوں سے سبکدوش نہ ہوں، شعر و فن کا بلند تصور پیدا ہونا محال ہے۔ چونکہ ابھی تک اسی وضع کی اکثریت ہی کا غلبہ ہے۔ اس لئے شعر و ادب ہو یا نقد و نظر ہم ایک منجدھار میں پھنسے ہوئے ہیں۔ صرف پیش نظر مجموعہ ہی پر موقوف نہیں، جس کی پہلی نظم اور آخری نظم پہلی غزل اور آخری غزل میں کوئی فرق نہیں، اکثر مجموعوں کا یہی عالم ہے۔ اور شاعر کا مکمل تعارف ایک ہی نظم یا غزل سے ہو جاتا ہے۔ زیر نظر مجموعہ انتخاب ہی سہی، مگر اس میں کونسا پارہ حقیقی معنوں میں انتخاب ہے؟

عکسِ خیال

از: ارشد صدیقی ساگری
بہ اہتمام: حلقۂ دانشوران بھوپال۔
ریونیو سکرٹریٹ، بھوپال۔
صفحات ۴۸، قیمت دو روپے

ایک زبان کے سحر کو دوسری زبان میں منتقل کرنا دقت سے خالی نہیں۔ کیونکہ یہ سحر مفرد نہیں مرکب ہے۔ اس میں ذوق، فکر و احساس، تخیل، بیان، زبان، معانی بین السطور، محاکات، تلازمات وغیرہ کتنی ہی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ اور ہم ان کو بجنسہ اپنی زبان کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتے۔ اس میں شکست و ریخت، کمی بیشی، تغیر و تبدل، رنگ آفرینی سب کچھ لازم ہے۔ اور اس کے معنی ہیں از سر نو تخلیق۔ اگر ترجمہ میں ویسی ہی تخلیقی شان نہ پیدا ہو جو اصل میں ہے، تو اس کا سحر کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ایسی کامیاب عکاسی کے لئے ترجمہ کا اعلیٰ تصور پیدا کرنا ضروری ہے۔ زیر نظر مجموعہ میں مترجم کی سعی و کاوش کے باوجود ترجمہ کا سحر کارگر ثابت نہیں ہوا۔

"کشتِ خون"۔ "خشتِ خون"

از امانی بنگلوری
ناشر: انجمن ترقی اردو، میسور۔ بنگلور۔
صفحات (ہر دو) ۲۹۶، قیمت ۵ روپے

حکیم امانی صاحب اردو کے سچے فدائی ہیں۔ انہیں اردو سے عشق ہے۔ بابائے اردو کے یہ الفاظ ان کے اردو سے والہانہ عشق پر روشنی ڈالتے ہیں کہ وہ قیام پاکستان سے پہلے بھی اردو کے سپاہی تھے اور اب بھی میسور میں مجاہدانہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کے یہ دونوں مجموعے ان کی اردو پرستی کا بیّن ثبوت ہیں۔ امید ہے وہ اردو کے لئے اپنی خدمات کا سلسلہ اسی ذوق و شوق سے جاری رکھیں گے۔

جوئبار

مرتبہ: بیگم ہما اخلاق حسین
ناشر: فیروز سنز لاہور، پشاور، کراچی
ضخامت: ۵۱۲ صفحات۔ مجلد خوبصورت، رنگین گردپوش سے آراستہ۔ قیمت آٹھ روپے فی جلد

اردو کے قدیم، متوسط اور جدید شعرا کے چیدہ، نفیس اور مؤثر کلام کے جستہ جستہ پارے یعنی متفرق غزلیات و اشعار اور مخصوص آہنگ شعری کے نمائندہ نمونے اس مجموعہ میں جمع کئے گئے ہیں۔ اس کے مطالعہ سے ہر شاعر کے مخصوص رنگ سخن اور اس کی زندگی کے حالات و حقائق کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ یہ ہماری زبان کے شعری جواہر پاروں کا ایک بہت اچھا دستاویزی خزینہ ہے جسے باذوق حضرات اکثر اپنے لئے قابل مطالعہ پائیں گے اور اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔

انتخاب کے معاملہ میں بیگم ہما اخلاق حسین صاحبہ کا رچا ہوا ذوقِ ادب اور کلام کے نمونوں کے جمع کرنے میں ان کی کاوش و تفحص ایک قابل داد کارنامہ ہے۔

وادیٔ مہران میں: ایک جفاکش کسان

لکھنے والے:

* یوسف ظفر
* جمیل نقوی
* ناصر کاظمی
* زہرہ نگاہ وغیرہم
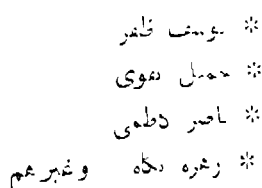
ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی
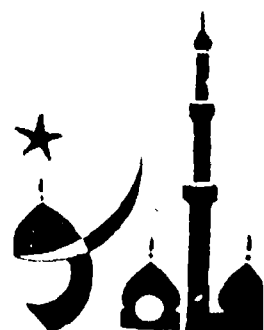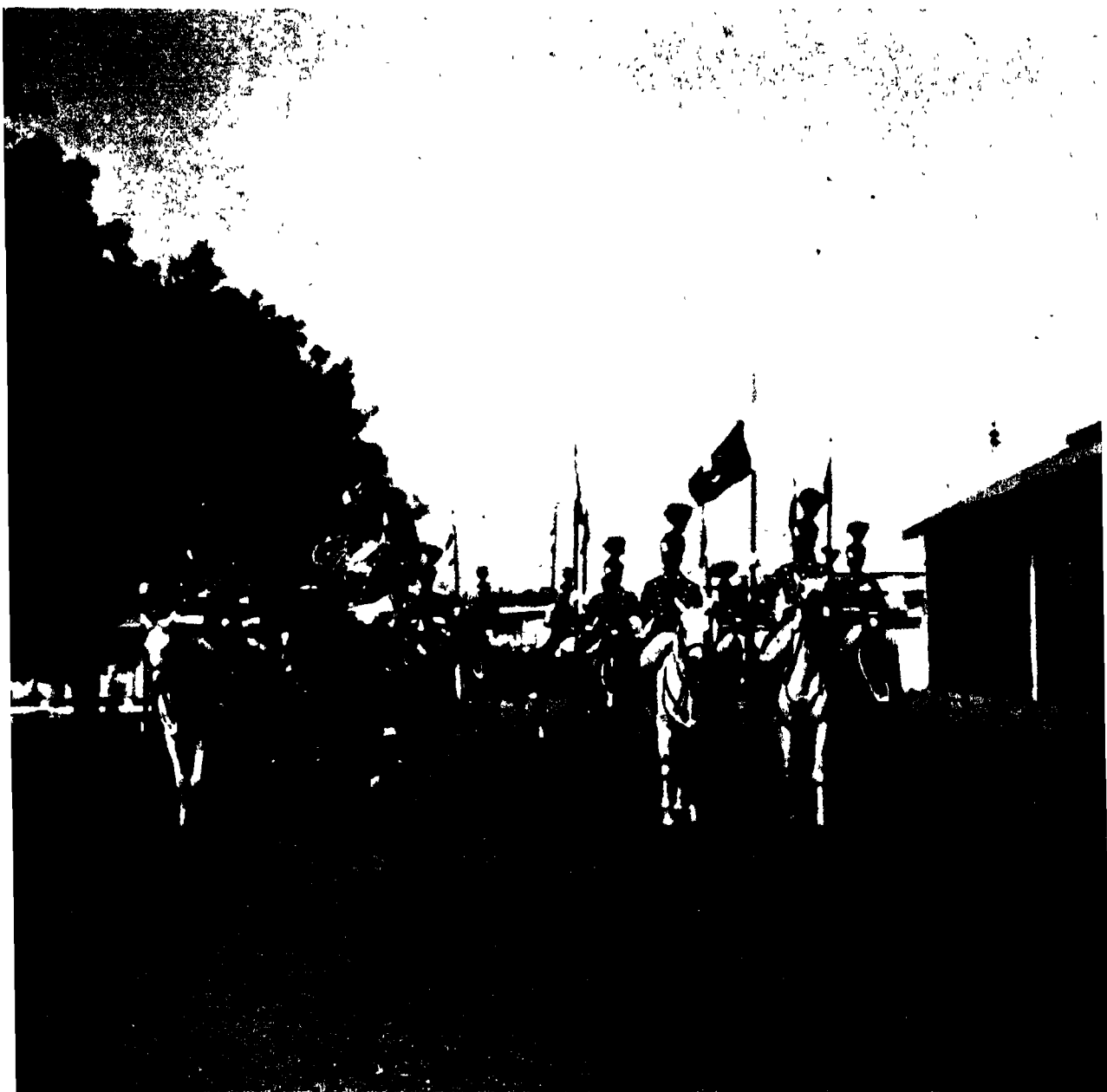
ڈاکٹر محمد باقر　　ممتاز حسین　　سراج الدین ظفر

فضل احمد کریم فضلی　　ابو سعید قریشی　　انور ممتاز　　دسمبر ۱۹۵۸ء

ضمیر اظہر　　فضل حق قریشی　　ماہر القادری　　۸/

ماہ نو

جلد ۱۱

شمارہ ۹

دسمبر

۱۹۵۸ء

مدیر
رفیق خاور

نائب مدیر
ظفر قریشی

سالانہ چندہ: ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی: آٹھ آنے

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

اپس کی باتیں

اُس والہانہ محبت کی بنا پر جو ہمارے دل میں قائدِ اعظمؒ کے لئے ہے ہم ہر اُس تقریب کا انتہائی ذوق و شوق سے خیر مقدم کرتے رہے ہیں جو اُن کی ذاتِ گرامی سے متعلق ہو اور آج پھر اسی روز افزوں عقیدت و احترام کی بنا پر ان کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ ایک عظیم رہنما کی حیثیت سے نہیں بلکہ بابائے ملت کی حیثیت سے جس کو وطنِ عزیز کے دونوں حصوں، مشرقی و مغربی پاکستان، سے یکساں محبت تھی۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کی ذات ہی پاکستان سے عبارت ہو، جو اس کا خالق، اس کا دل و دماغ اور روحِ رواں ہو، اس کی زندگی کا ہر پہلو ہمارے لئے دلچسپی کا باعث ہے۔ اسی میں اُن کا دورۂ مشرقی پاکستان بھی شامل ہے جو درحقیقت اُن کی فطری محبت ہی کا نتیجہ تھا۔ اس بنا پر ہم اس شمارہ میں اس کی چشم دید کیفیت پیش کر رہے ہیں۔ ایک ایسے ناظر کی نگاہ سے جو اس سفرِ شوق میں قائدِ اعظم کے ہمراہ تھا۔

ہمیں مسرت ہے کہ ہم اب کی بابائے ملت کا ذکرِ خیر ایسے حالات میں کر رہے ہیں جو قائدِ اعظمؒ کے ساتھ خاص مناسبت رکھتے ہیں کیونکہ جس پُر خلوص جد و جہد سے انہوں نے ہماری حیاتِ ملیہ میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کیا تھا اور ہمیں بیگانوں کے پنجۂ استبداد سے نجات دلائی تھی اسی طرح عساکرِ پاکستان نے قوم کا صالح ترین عنصر اور دل و ضمیر بن کر ہمیں اپنوں کے ہاتھ سے نجات دلائی جو اپنے طرزِ عمل میں بیگانوں سے کم نہ تھے! اور اس طرح ایک اور خوشگوار انقلاب رونما ہوا جس کو ہماری دوسری اور حقیقی آزادی قرار دینا بیجا نہ ہوگا۔ اس شمارہ کا ایک نقش "افق سے آفتاب ابھرا" اس دورِ خوشگوار کی چند در چند جھلکیاں اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔

☆

اک داغِ تازہ اور بہ داغِ کہن کے ساتھ! --- ابھی ہم اپنے نامور صحافی، ادیب اور شاعر ظفر الملت مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے سانحۂ ارتحال کو بمشکل برداشت کر پائے تھے کہ ان کے فرزندِ ارجمند مولانا اختر علی خاں بھی ہمیں داغِ مفارقت دے گئے! جس سے ظفر الملت کی وفات کی یاد تازہ ہوگئی اور نہ صرف اردو جرائد کے سرخیل "زمیندار" کو، جس کی ان دونوں نے خونِ جگر سے آبیاری کی تھی، غمِ تازہ سے دوچار ہونا پڑا بلکہ دنیائے صحافت بھی ایک صدمۂ جانکاہ سے دوچار ہوئی۔ قوم اس دوگونہ محرومی پہ سوگوار ہے کیونکہ شمعِ صحافت کے ایسے پروانوں کا بدل میسر آنا بہت مشکل ہے۔

☆

اقوامِ متحدہ نے نوعِ انسان کی فلاح و بہبود اور امنِ عالم کی بحالی کے سلسلے میں جو جد و جہد کی ہے اس کی اہمیت محتاجِ بیان نہیں۔ اس کی سب سے بڑی خوبی اس کی پُر خلوص نوعیت اور نامساعد حالات کے باوجود مسلسل سعی و کوشش ہے جو اقوامِ عالم کی زندگی میں کافی خوشگوار نتائج پیدا کر چکی ہے۔ حقوقِ انسانی کا تحفظ وہ مہتم بالشان اصول ہے جس پر اس بین الاقوامی ادارۂ فلاح و بہبود کی بنیاد استوار ہے اور جس کا عالمی منشور ان گوناگوں آزادیوں کا ضامن ہے جو نوعِ انسان کا پیدائشی حق ہیں۔ چنانچہ امسال حقوقِ انسانی کے عالمی منشور کی جو سالگرہ منائی جا رہی ہے، اس کے سلسلے میں ایک مضمون، اور تصاویر، اس شمارہ میں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ہمارے دل میں اس منشورِ آزادی کی یاد تازہ رہے۔

☆

قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے یہاں مصوری کو جو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا ہے اس کا ثبوت اُن متعدد نمائشوں سے ملتا ہے جو وقتاً فوقتاً پاکستان اور بیرونِ پاکستان منعقد ہوتی رہی ہیں۔ حال ہی میں پاکستان کے پانچ مصوروں کی تصاویر کی جو نمائش لندن میں منعقد ہوئی ہے وہ مصوروں کے ذوق و شوق اور اس فن کی غیر معمولی ترقی کا قابلِ قدر مظاہرہ ہے۔ اس سلسلے میں آرٹ کونسل آف پاکستان اور دیگر فنی اداروں کی پر خلوص سرگرمیوں سے اور بھی توقع نتائج کی امید ہے۔

سرورق: صدرِ پاکستان کا باڈی گارڈ

حُدی خواں

(بیادِ قائدِ اعظمؒ)

محمد علی تنویر

آزادیٔ نفس کا حدی خواں بشر تھا تو
ہو برق در کنار وہ آتش جگر تھا تو
صدہا ہزار شعلوں کا حامل شرر تھا تو
ظلماتِ بیکراں میں پیامِ سحر تھا تو
بہرِ نجاتِ قوم کلیمِ دگر تھا تو

★

پنہاں تری نگاہ میں بیداریوں کے راز
خورشید وار شرق سے تا غرب ترکتاز
پیغامِ رستخیز ترا دستِ کارساز
اوجِ فلک پہ شانِ تجمل سے سرفراز
سوزِ درونِ قلب ترا ایک جہاں گداز

★

تھا مادرِ وطن کا تو فرزندِ ارجمند
ڈالی تھی جس نے بڑھ کے ستاروں پہ بھی کمند
فکرِ بلند و عزمِ بلند و دلِ بلند
جولاں عناں گسیختہ افکار کے کمند
شانِ جہاد کیوں نہ ہو تیری جہاں پسند

★

صبحِ حیاتِ تازہ کی تابندگی تھا تو
آئینہ دارِ شوکت و شانِ خودی تھا تو
یکتائے دہر پیکرِ آزادگی تھا تو
اک دل کے ساتھ حاملِ صد زندگی تھا تو
دورِ جمود میں ہمہ تن آگہی تھا تو

★

تاریخِ روزگار میں حاصل جسے دوام
اور آب و تاب جس کی ہے بالائے صبح و شام

★

ماہ نو، کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۸ء

بیاد قائد اعظمؒ

ایک یادگار سفر

عبد الحق شہباز

مغربی پاکستان ہو یا مشرقی پاکستان، قائد اعظم کو دونوں سے یکساں محبت تھی، کیونکہ ان کے ساتھ ان کا رشتہ بابائے ملت کا رشتہ تھا۔ اگرچہ وفاقی پایۂ تخت میں مستقل قیام کے باعث مغربی پاکستان کو ان کے فیض محبت سے مستفیض ہونے کا زیادہ موقع حاصل ہوا، پھر بھی مشرقی پاکستان ان کے دل کی گہرائیوں میں اسی طرح جاگزیں تھا اور ان کی محبت سے برابر بہرہ یاب رہا۔ یہی والہانہ محبت تھی جو انہیں گورنر جنرل کی حیثیت سے نہیں، بابائے ملت کی حیثیت سے دورۂ مشرقی پاکستان پر لے گئی۔ یہ دورہ محض ایک تاریخی دورہ نہ تھا بلکہ اس محبت کی یادگار تھا جو بابائے ملت کو فرزندان قوم سے تھی اور ان کا استقبال بھی مشرقی پاکستان میں بابائے قوم کی حیثیت ہی سے کیا گیا۔

جن لوگوں نے بچشم خود اس سفر شوق کا مشاہدہ کیا ہے، وہ اس کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ راقم ان خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنھیں یہ موقع نصیب ہوا۔ اس دورہ کے حالات درحقیقت ملت کا سرمایۂ عزیز ہیں اور اُس تک پوری وضاحت سے پہنچ جانے چاہئیں۔ بالخصوص اس لئے کہ یہ حیات قائد کا ایک نہایت اہم جزو ہیں۔

حصول آزادی کے بعد بابائے ملت قائد اعظم محمد علی جناح نے مارچ ۱۹۴۸ء میں گورنر جنرل کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کا پہلی مرتبہ دورہ کیا۔ وہاں کے عوام نے پاکستان کے بانی کا جس گرمجوشی سے استقبال کیا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ آج گیارہ سال گزر جانے کے باوجود عوام یہ محسوس کر رہے ہیں کہ وہ قائد کے اس دورے کی یاد کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔

مارچ ۱۹۴۸ء کے اوائل میں جب قائد اعظم کے دورۂ مشرقی پاکستان کی خبر شائع ہوئی تو صوبے میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ہر ضلع کے عوام و حکام بابائے ملت کے استقبال میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کے لئے تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔ صوبے کے صدر مقام "ڈھاکہ" کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ ہر موڑ پہ آرائشی دروازے اور محرابیں بنائی گئیں جو اسلامی ثقافت کی عکاسی کرتی تھیں۔ چاٹگام کی آرائش خاص مقامی ثقافت کی آئینہ دار تھی۔

چندہ روز کی مسلسل تیاریوں کے بعد قوم اپنے عظیم رہنما کے شایان شان استقبال کے لئے ہر طرح سے تیار تھی۔ ۱۹ مارچ قائد کے ڈھاکہ پہنچنے کا دن تھا اور گھنٹوں پہلے یہاں کے شہری اور دیہاتی جوق در جوق ہوائی اڈے کی طرف چل پڑے۔ ہزاروں لوگ اپنے نجات دہندہ کی صرف ایک جھلک دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ شہر سے ہوائی اڈے تک سڑک کے دو رویہ پاکستان کی بری فوج کے نوجوان "تنظیم" کے مطمع نظر کو عملی جامہ پہنانے کھڑے تھے۔ ان کے چہروں سے شگفتگی اور بشاشت ٹپک رہی تھی جو اُن کے عزم اور ذمہ داریوں کی مظہر تھی۔

صوبے کے وزیر اعلیٰ، ان کے ساتھی وزراء، اسمبلی کے اسپیکر اور ارکان، سرکاری افسر اور ممتاز شہری قائد کی آمد سے سوا گھنٹہ پیشتر ہوائی اڈے پر پہنچ چکے تھے۔ ڈھاکہ کی سہ پہر کسی قدر گرم تھی، اس کے باوجود عوام دھوپ میں ہوائی اڈے کے گرداگرد ہزاروں کی تعداد میں کھڑے تھے۔ کراچی سے جہاز کی آمد میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ تمام وزراء اور سرکاری حکام گورنر کی معیت میں ہوائی اڈے کے اندر داخل ہونا چاہتے تھے کہ مغرب سے گھٹا اٹھی، آناً فاناً بادل چھا گئے اور بارش ہونے لگی۔ گویا قدرت بھی قائد اعظم کے استقبال میں عوام کی شریک تھی۔ بادلوں کی گرج کے ساتھ بارش تیز ہو گئی لیکن عوام نے اپنی جگہیں چھوڑنے کی بجائے "پاکستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے لگانے شروع کر دئے۔ چند ہی لوگ ایسے تھے جنھوں نے بارش سے بچنے کی خاطر سائے کی تلاش میں اپنی جگہیں چھوڑیں لیکن پھر انہیں وہاں جگہ نہ مل سکی۔

بارش تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ موسم خوشگوار ہو گیا تھا، بادلوں پر قوس قزح عجیب سماں پیش کر رہی تھی جیسے آسمان بھی قائد کے استقبال میں

بانیٔ پاکستان

پیچھے نہ رہنا چاہتا۔ عین اس وقت جبکہ قوس قزح اپنے پورے جوبن پر تھی۔ فضا میں ایک ہوائی جہاز نمودار ہوا۔ اسی کے ساتھ ہی "قائد اعظم زندہ باد" اور "پاکستان زندہ باد" کے فلک شگاف نعرے سنائی دینے لگے۔

بانئ ملت، بانئ پاکستان کا "ڈکوٹا" ہوائی اڈے پر اتر چکا تھا، اور آپ اپنی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح کی معیت میں جہاز سے اتر رہے تھے۔ گورنر اور وزیر اعلیٰ نے بڑھ کر آپ کا پر تپاک خیر مقدم کیا۔ فضا ابھی تک "پاکستان زندہ باد" اور "قائد اعظم زندہ باد" کے فلک بوس نعروں سے گونج رہی تھی۔ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی پہلی آمد متعدد سرکاری تقریبات کا پیش خیمہ تھی۔ آپ جونہی خاکی وردیوں میں ملبوس بری فوج کے ایک دستے اور سبز رنگ کی وردیوں میں ملبوس خواتین نیشنل گارڈز کے معائنے کے لئے آگے بڑھے۔ عوام نے پورے جوش اور ولولے سے تالیاں بجا کر ان کا استقبال کیا۔ فوجی دستے نے پاکستان کے اس مرد مجاہد کو سلامی دی۔ سلامی کے بعد آپ ایک کھلی کار میں بیٹھ کر شہر کی طرف روانہ ہوئے جہاں سڑکوں پر دو رویہ ہزاروں اشخاص آپ کی راہ میں آنکھیں بچھائے کھڑے تھے، اور ہزاروں اشخاص ایسے تھے جو آپ کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے چھ میل کا فاصلہ طے کر کے تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر پہنچے تھے۔

جونہی شام ڈھلی لوگ اپنے دلوں میں اس "عظیم دن" کی یاد لئے جس کی خاطر انہوں نے گذشتہ پندرہ روز تیاریوں پر صرف کئے تھے۔ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوئے۔

اگلے روز قائد اعظم، محترمہ فاطمہ جناح، صوبائی گورنر اور دیگر حکام کے ہمراہ پاکستانی دستوں کے معائنے کے لئے کرمیتولا کے ہوائی اڈے پر گئے۔ پاکستانی فوج کے افسروں اور جوانوں نے، جو پاکستان کی سرحدوں کے محافظ ہیں، مملکت کے سب سے بڑے سربراہ کو سلامی پیش کی۔ قائد اعظم نے ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> "بنگال کی عسکری سپرٹ اور ماضی میں مسلمانوں کا کردار تاریخی طور پر مسلم ہے۔ اب آزاد پاکستان میں جو دنیا کا ایک عظیم ملک بننے والا ہے۔ آپ ایک آزاد اور خود مختار حکومت کے ماتحت ہیں۔ اب آپ کو اپنی خاطر دنیا پر اپنی عسکری اسپرٹ واضح کر دینے کا ہر موقع میسر ہے۔"

اپنے انتہائی مصروف پروگرام کے باوجود قائد اعظم اقلیتوں کے نمائندوں سے بھی ملے۔ پس ماندہ اقوام کے نمائندوں کی معروضات کو پوری ہمدردی سے سنا اور ان کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت کی پوری توجہ کا یقین دلایا۔ آپ نے کہا: "میں نے ہمیشہ آپ کی وکالت کی ہے اور کرتا رہوں گا۔"

صوبائی مجلس قانون ساز کے ہندو ارکان سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے اس امر پر زور دیا کہ ہندوؤں کو حکومت کے ساتھ دوسرے محب وطن پاکستانیوں کی طرح تعاون کرنا چاہیئے۔

۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کا دن عوام الناس کا دن تھا۔ ڈھاکہ کا بڑا میدان "رمنا" انسانوں کا ایک عظیم سمندر نظر آ رہا تھا۔ بے شمار لوگ دور دراز مقامات سے چلچلاتی دھوپ میں اپنے رہنما کی تقریر سننے کے لئے آئے تھے اور گھنٹوں سے منتظر بیٹھے تھے۔ آخر وہ لمحہ بھی آن پہنچا جب قوم کا رہنما قوم کے درمیان تھا۔ شہر کی استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین نے قائد اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح کا استقبال کیا۔ اور فضا نعرہ ہائے تحسین سے گونج اٹھی۔ مائکروفون کے قریب کھڑے ہو کر جب قائد نے اپنے عوام کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھا تو فضا "قائد اعظم زندہ باد" کے نعروں سے ایک بار پھر گونج اٹھی۔ آپ نے قوم کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے ان مشکلات اور ان مسائل کا تذکرہ کیا جن پر گزشتہ سات ماہ میں حکومت نے قابو پالیا تھا۔ آپ نے کہا:-

> "متحد رہیئے۔ ناموزوں حالات اور مشکلات کا مقابلہ کیجئے اور اپنے عوام کی بھلائی کے لئے ایثار سے کام لیجئے۔ قوم یا ملک کی بھلائی کے لئے انفرادی یا اجتماعی کوشش محنت یا ایثار سے پہلو تہی نہ کیجئے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر گامزن ہو کر آپ پاکستان کو پانچواں بڑا ملک بنا سکتے ہیں نہ صرف آبادی کے لحاظ سے، جیسا کہ یہ ہے، بلکہ طاقت کے لحاظ سے بھی تاکہ دنیا کی دوسری اقوام ہمارا احترام کریں۔"

ماضی و مستقبل کی قابل فخر "ڈھاکہ یونیورسٹی" نے اپنا سالانہ جلسہ تقسیم اسناد بھی قائد کی آمد پر منعقد کیا۔ قائد اعظم طلبہ سے خطاب کرنے کے لئے یونیورسٹی گئے، جہاں چانسلر اور وائس چانسلر کے علاوہ ہزاروں طلبہ نے بھی آپ کا خیر مقدم کیا۔ طلبہ سے مخاطب ہو کر بابائے قوم نے کہا:-

> "آپ میں سے اکثر اپنی تعلیمی زندگی ختم کر کے کارزار حیات میں داخل ہوں گے۔ مگر اپنے پیشروؤں کے برعکس،

خوش قسمتی سے آپ یونیورسٹی سے نکل کر ایک آزاد و خود مختار ملک میں اپنی زندگی کا آغاز کریں گے جو کہ آپ کا اپنا ملک ہے۔ پاکستان کے قیام پر جو انقلابی تبدیلی ہوئی ہے۔ اس کی پیچیدگیوں کو مکمل طور پر سمجھنا آپ اور آپ کے دوسرے ساتھیوں کے لئے اشد ضروری ہے۔ ہم طوقِ غلامی کو توڑ کر اب آزاد ہو چکے ہیں۔ یہ ہمارا اپنا ملک ہے۔ حکومت ہمارے عوام کی حکومت ہے، جو عوام کے سامنے جوابدہ ہے اور مملکت کی بھلائی کے لئے کام کر رہی ہے۔ تاہم آزادی کا مطلب بے لگامی نہیں ہے۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں کہ اب آپ جو چاہیں کریں یعنی مملکت اور دوسرے لوگوں کے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے وہی کریں جو آپ چاہتے ہیں۔ آپ اور ملک دونوں پر ایک عظیم ذمہ داری ان پڑی ہے۔ اب پہلے سے کہیں زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم ایک متحد اور منظم قوم کی طرح کام کریں۔ اب ہمیں ٹھوس تعمیری جذبے سے کام کرنا ہے نہ کہ اس زمانے کے جارحانہ جذبے سے جب کہ ہم حصولِ آزادی کے لیے لڑ رہے تھے۔ "تعمیری جذبہ" پیدا کرنا، حصولِ آزادی کی جدوجہد کے جارحانہ جذبے سے کہیں کٹھن مشکل کام ہوتا ہے جیل جانا یا آزادی کے لئے لڑنا حکومت چلانے کے لئے مقابلے میں بہت آسان ہے۔

اگر آپ متحد رہے تو زندہ رہ سکیں گے اور بکھر گئے تو زندہ رہنا مشکل ہے"۔

مستقبل کی عظیم بندرگاہ چٹاگانگ بھی کراچی کے مہمانوں کی آمد کی منتظر تھی۔ پہاڑیوں، دریاؤں اور سمندر کی اس حسین سرزمین کو آرائش کی ضرورت نہیں تھی لیکن چٹاگانگ کے باشندے اپنی سرزمین کے حسن میں اضافہ کا عزم کئے ہوئے مہمانوں کے استقبال کے لئے بالکل تیار تھے۔

چمکتے ہوئے سورج کی روشنی میں ہوائی جہاز ڈھاکہ سے چٹاگانگ پہنچا۔ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کے سربراہ اور صوبے کے وزیر اعلیٰ پہلے سے وہاں موجود تھے تاکہ پاکستان کے مشرقی دروازے پر بانیٔ ملت کا استقبال کر سکیں۔

چٹاگانگ کی بحری اہمیت اور پاکستان کے بحری مرکز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پاکستانی بحریہ کے افسروں اور نوجوانوں نے جو بے داغ سفید وردیوں میں ملبوس تھے، قائد اعظم کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔ ہوائی اڈے پر جب قائد اعظم غیر رسمی طور پر لوگوں سے ملے تو چٹاگانگ کے بحری سیاح قریب سے آپ کو دیکھنے کے لئے آپ کے گرد جمع ہو گئے۔۔ "لیکن قوم کو منظم ہونا چاہیئے" ۔۔۔ قائد کا چہرہ اس اپیل کے ساتھ تمتما اٹھا اور قوم پر فوراً ہی اس کا اثر ہوا۔

قائد اعظم مشرقی پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ کے معائنہ کے لئے بھی گئے جہاں سے کافی مقدار میں پٹ سن کی براہ راست برآمد ہوتی تھی۔ بندرگاہ نے اپنی خنک ہوا اور مختلف قوموں کے رنگین جھنڈوں کے ساتھ آپ اور آپ کی بہن کو خوش آمدید کہا۔ قائد اعظم نے "جولڈیا" نامی جہاز میں بیٹھ کر بندرگاہ بھی دیکھی۔ جب جہاز کرنافلی کے قریب پہنچا تو بندرگاہ کو ترقی دینے سے متعلق نقشہ جات اور خاکے گورنر جنرل کے سامنے پیش کئے گئے، اور تمام نقاط کی تفصیل بتائی گئی۔ یہی وہ سفر تھا جسے چٹاگانگ کبھی نہیں بھول سکے گا کیونکہ ماضی کی غفلت کوشیوں اور مستقبل کی اہمیت سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ اسی جہاز پر چٹاگانگ کی نئی زندگی کے آغاز کا فیصلہ کیا گیا جس کا مستقبل تابناک ہے۔

"اب یہ چٹاگانگ کے باشندوں کا کام ہے کہ وہ اپنا کام خود ہی سنبھالیں اور بندرگاہ کو وہ عروج دیں جس کی یہ مستحق ہے"۔

یہ تھا وہ پیغام جو عوام تک پہنچانے کے قائد اعظم نے محترمہ فاطمہ جناح کی معیت میں جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ قائد اعظم نے اپنے استقبال کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"جب آپ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان میں سماجی انصاف اور اسلامی سوشلزم مستحکم بنیادوں پر رائج ہونا چاہیئے جو اخوت و مساوات کو تقویت دے تو آپ نہ صرف میرے بلکہ لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ہماری ترقی کے یہ مقاصد پاکستان میں نزاعی یا اختلافی نہیں کیونکہ ہم نے پاکستان کا مطالبہ کیا، اس کے لئے جدوجہد کی اور بالآخر ہم نے اسے حاصل کر لیا۔ اب ہم اپنی روایات کے مطابق اپنے امور کا فیصلہ کرنے میں روحانی اور جسمانی طور پر آزاد ہیں"۔

۲۹ مارچ قائد اعظم کے اس یادگار دورے کا آخری دن تھا جس نے مشرقی پاکستان میں ترقی کیلئے ایک نئی قومی امنگ پیدا کر کے صوبے کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا تھا۔ بے شمار لوگ بانیٔ ملت کو الوداع کہنے کے لئے ہوائی اڈے پر اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ اپنے عوام سے رخصت ہونے کے بعد قائد اعظم الوداعی سلام لینے کے لئے ڈائس پر تشریف لائے۔ روانگی کے وقت ان کے چہرے پر وہی مسکراہٹ رقصاں تھی جو مصائب و مشکلات میں بھی ان کے چہرے پر عیاں رہتی تھی۔

جب ڈکوٹا نے پرواز کی تو ہزاروں نظروں نے عقیدت مندی کے ساتھ جہاز کا تعاقب کیا۔ تو کھڑکی سے اپنا سفید رومال باہر نکالے مشرقی پاکستان کو الوداع کہہ رہے تھے

طوفانِ نیل!

صہبا اختر

وہ رات ہم جسے عفریت زاد کہتے تھے
وہ ایک تیشۂ فرہاد سے تمام ہوئی
جو رات خاصۂ خاصانِ شب کا حصّہ تھی
سحر ہوئی تو ستارہ گرِ عوام ہوئی

★

وہ رات ہم جسے اک دیو باد کہتے تھے
مرے چمن کے لئے پھر صبا خرام ہوئی
وہ رات ہم جسے ظلمت نژاد کہتے تھے
وہ طبلِ صبح کے بجتے ہی شعلہ فام ہوئی

★

ہر اک مکان کے ظلمت نصیب آنگن میں
اُفق میں کھوئی ہوئی روشنی اُتر آئی
کئی بجھے ہوئے ماتھوں سے چاندنی پھوٹی
دلوں میں ڈوبی ہوئی کہکشاں اُبھر آئی

★

کشیدہ ماہ، خُمِ نیلتاب سے برسی
کشیدہ ماہ، جو ہر تیرگی مٹا آئی
شفق عذار سحر روشنی کے پھول لئے
مرے وطن کے در و بام جگمگا آئی

★

وہ سانپ، بچھو، سنپولے وہ اژدرانِ سیاہ
جو میرے ملک کی شہرگ کا خون پیتے تھے
وہ کنکھجورے، کہ پیوست تھے رگ و پے میں
وہ بھیڑیئے جو لہو چاٹ چاٹ جیتے تھے

★

وہ سنگ رنگ مگرمچھ جو تیز موجوں میں
شکار کرتے رہتے تھے ہر ایک بے بس کو
ہزار پائے، جو تہہ جران کے سمندر میں
جکڑ کے بیٹھ گئے تھے ہماری نس نس کو

★

سمندروں کے وہ ڈاکو، زمیں کے کالے چور
کہیں اماں نہ تھی جن سے وطن پرستوں کو
جو ہڈیوں کو چبا جائیں گوشت کھا جائیں
ہم آدمی بھی سمجھتے تھے اُن درندوں کو!

★

ہر ایک کھیت کا چاندی سا روپ جھلسا کر
ہر اک شگوفے ہر اک روشنی کا خون پیا
مری زمین کہ سونا اُگلنے والی تھی!
مری زمین کو ان ڈاکوؤں نے لوٹ لیا

★

خدا کا شکر، وطن دشمنوں کو موت آئی
خدا کا شکر کہ ظلمت نژاد غرق ہوئے
خدا کا شکر کہ طوفانِ نیل آ پہنچا
خدا کا شکر کہ "فرعون زاد" غرق ہوئے

"اُفق سے آفتاب اُبھرا"

مارشل لاء کے تحت نئی حکومت کو قائم ہوئے ڈیڑھ مہینہ سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے اگرچہ یہ مدت فی نفسہ بہت قلیل ہے خصوصاً حکومتوں کی مضبوطی و استحکام کے سلسلہ میں، کیونکہ ان کی بقا تمام تر امتدادِ وقت ہی کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ اس مختصر عرصہ ہی میں نئی حکومت نے جو استقامت، اعتماد اور ہردلعزیزی پیدا کرلی ہے، وہ بجائے خود اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کی آئینہ دار ہے۔ اس کے ساتھ اگر اس ترقی کی رفتار کو پیش نظر رکھا جائے جو اس قدر تھوڑے عرصہ میں بروئے کار آئی ہے، اُن زبردست اقدامات کو ملحوظ رکھا جائے جو زندگی کے ہر شعبے میں کئے گئے ہیں، اور ان کے دُور رس نتائج پر نظر ڈالی جائے، تو اس کی توانائی اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ انقلاب عوامی خواہشات کے مطابق ہے، اس کی فی الحقیقت ضرورت تھی کیونکہ یہ تمام قوم کے حقیقی تقاضوں کا نتیجہ ہے، اور عوام جس سے بجا طور پر اپنی تمناؤں اور ضرورتوں کے پورا ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔ اس کی بنیادیں اُن ہی مقاصد پر اُستوار ہیں جن کے لئے برصغیر پاک و ہند کے تمام مسلمانوں نے حصولِ پاکستان کی جد و جہد میں متفقہ طور پر حصہ لیا تھا، اور وہ یقین رکھتے تھے کہ اس نصب العین کو عملی طور پر حاصل کر لینے کے بعد وہ آزادی کے فیوض و برکات سے مستفیض ہو سکیں گے۔ قیامِ پاکستان اس خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کا بہترین ذریعہ تھا۔ اور حق یہ ہے کہ ابتدا میں عنانِ قیادت جن بے لوث رہنماؤں کے ہاتھوں میں تھی، انہوں نے حتی الامکان جمہور کی آرزوؤں اور مطالبوں کو پورا کرنے کی سر توڑ کوشش کی، اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ یہ قائدِ اعظم محمد علی جناح اور شہیدِ ملت لیاقت علی خاں ہی کی پُرخلوص کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پاکستان کی بنیادیں استوار ہوئیں، قوم اتحاد و یگانگت کی بنا پر آسودگی و خوش حالی کی دولت سے مالا مال ہوئی اور نہ صرف اندرونِ ملک ترقی کا دور دورہ ہوا بلکہ بیرونی ممالک میں بھی ہماری نوزائیدہ مملکت کی ساکھ قائم ہو گئی۔ لیکن شومیٔ قسمت سے یہ صورتِ حال ان پُرخلوص قائدین کے حینِ حیات ہی تک قائم رہ سکی، اور اس کے بعد تخریبی عناصر کا ہیجان۔ یکے بعد دیگرے گوناگوں راہزن، رہنماؤں کا روپ دھار دھار کر سامنے آئے اور آئے دن وزارتی بحرانوں کا دور دورہ ہوا جس کا نتیجہ ہمہ گیر بدنظمی و انتشار کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ تخریبی عناصر کے روز افزوں غلبہ نے نہ صرف نظم و نسق پر تباہ کن اثر ڈالا بلکہ معاشرہ میں چند در چند خرابیاں پیدا کیں۔ ان حالات میں ایک ایسے انقلاب کی ضرورت تھی جو جمہور کو اُن کا حق دلائے، جو قوم میں زندگی کی نئی رُوح پھونک دے، اس کی خواہشات و ضروریات کو پورا کرے، اس کے مسائل کو حل کرے، اس کو آسودگی اور خوشحالی سے روشناس کرائے، بدنظمی و انتشار کو دور کرے، سیاسی، معاشری اور انتظامی خرابیوں کا قلع قمع کرے اور زندگی کے ہر شعبہ کی تطہیر کے بعد اس میں نیا خون دوڑا کر از سرِ نو ترقی اور جد و جہد کرنے کی صلاحیت عطا کرے، اور ان سب کے ثمرۂ شیریں کے طور پر قومی فکر و ثقافت کے مایۂ ناز عناصر بھی برگ و بار پیدا کریں۔

ہماری خوش قسمتی سے قوم میں ایک پُرخلوص اور بے لوث عنصر ایسا تھا جو "برسلطنتِ جم زن" کی دشوار مگر اہم خدمت انجام دے سکتا تھا۔ چنانچہ عساکرِ پاکستان نے جو قوم کا صالح ترین عنصر اور ضمیر بیدار تھا، مارشل لاء کے ناظمِ اعلیٰ اور موجودہ صدر جنرل محمد ایوب خاں کے زیرِ قیادت عین وقت پر یہ کردار ادا کیا اور اس طرح تاریخِ ملت میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ایک ایسا دور جس نے آزادی کا احیائے ثانیہ کر کے قوم میں پھر ایک نیا ولولہ، نئی حرکت، نئی تاب و تواں پیدا کر دی ہے، اور اس کے ساتھ ہی ساتھ نئی امید بھی۔ لہٰذا جمہور اس نئے اقدام کو اپنا ہی اقدام سمجھتے ہیں، اس انقلاب کو اپنا ہی انقلاب تصوّر کرتے ہیں، اصلاح و تجدید کے سلسلہ میں قائدین کی ہر تدبیر کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ اور ابتدائی دورِ مختصر کے بعد پہلی بار حکومت کو صحیح معنوں میں اپنی ہی حکومت سمجھتے ہیں۔ اسے اپنے رہنماؤں پر پورا اعتماد ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اب حکومت حقیقی معنوں میں جمہوری ہے۔ کیونکہ اس کا واحد مقصود عوام ہی کی فلاح و بہبود ہے۔ اور اس سلسلہ میں اصطلاحات کا امتیاز قطعاً بے معنی ہے۔

اس سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ ہمارا موجودہ انقلاب نہایت پُرسکون ہے اور حقیقی معنوں میں آیۂ رحمت۔ یہ ایک ایسا انقلاب ہے جو بغیر کسی خون خرابے کے رونما ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس کا مقصد نیک تھا، اس لئے کہ اس کا منشا اصلاح و تجدید اور عوام کی فلاح و بہبود کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اس لئے کہ عوام اپنے سابقہ حکمراں طبقہ سے بیزار اور یومِ نجات کے منتظر تھے۔ اور سب سے بڑھ کر اس لئے کہ قوم کا کوئی سنجیدہ عنصر اس کے خلاف نہ تھا۔ اور نہ ہے۔ یہ ایک ایسا انقلاب ہے جس میں ردعمل کا کوئی شائبہ نہیں جیسا کہ سطحی اور ہنگامی قسم کے انقلابات میں بالعموم ہوا کرتا ہے۔ داعیانِ انقلاب نے شروع ہی میں اعلان کر دیا تھا کہ مارشل لا کا نفاذ تمام تر عارضی ہے اور بہت جلد شہری نظم و نسق کو بحال کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اب اس حکمت عملی پر عملدرآمد بھی شروع ہو گیا ہے۔ یہ خلوصِ نیت کی بین علامت ہے۔ اس سے حکومت کے مقاصد مکمل طور پر واضح ہو جاتے ہیں۔ شکوک و شبہات دور ہو جاتے ہیں اور اس اعتماد کو تقویت پہنچتی ہے جو ہمارے دلوں میں اس کے متعلق جاگزیں ہے۔ جنرل محمد ایوب خاں نے بار بار بالتصریح اعلان کیا ہے، عوام کو یقین دلایا ہے کہ ان کا مقصد ایک خوشگوار فضا پیدا کرنا اور معاشرہ کو بے راہ روی سے نجات دلا کر صحیح اقدار کو فروغ دینا ہے۔ موجودہ حکومت کا مقصد عوام کی خیرخواہی اور ہمدردی ہے، وہ تخریب و سیاست کے ایک خونیں باب کا آغاز نہیں کرنا چاہتی۔ اسی لئے کسی کو بھی بے جا طور پر تعزیر و عقوبت کا تختۂ مشق نہیں بنایا گیا۔ مدعا نظم و نسق کی بحالی تھا اور معاشرہ کی کایا پلٹ۔ اس کے لائحہ عمل سے صریحاً روشن خیالی اور بہبودیٔ عوام کی خواہش جھلکتی ہے۔

اس موقع پر انقلاب کی بدولت جو حیرت انگیز تبدیلیاں صادر ہوئی ہیں ان کا ذکر تحصیل حاصل ہے کیونکہ ہم ان سے پہلے ہی واقف ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ حکومت نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ، وسیع، گوناگوں، دوررس اور ہمہ گیر تغیرات کا ایک ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ اور جو کچھ گذشتہ سات آٹھ سال میں انجام نہیں دیا جا سکا، وہ بہت تیزی سے انجام پا رہا ہے۔ ناجائز درآمد و برآمد، نفع اندوزی، چور بازاری، اقربا پروری، بددیانتی، اور دیگر مکروہ اور سنگین مفاسد کے خلاف جو برق رفتار اقدام کیا گیا ہے اور جس طرح گرانی کے مسئلہ کو حل کیا گیا ہے: وہ خوش تدبیری اور مستعدی کی ایک بے نظیر مثال ہے۔ اسی طرح انتظامی اور دفتری نظم و نسق میں حسنِ کارکردگی کا ارفع و اعلیٰ معیار بھی مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ بیش بہا زرِ قوم اور ناجائز درآمد شدہ مال وغیرہ کی بازیابی سے ملک کی اقتصادی حالت میں جو بہتری پیدا ہوئی ہے، خصوصاً زرِ مبادلہ میں جو گراں قدر اضافہ ہوا ہے، نیز اناج کی ناجائز برآمد کی روک تھام سے ملک کی غذائی حالت پر جو دوررس اثرات مرتب ہوئے ہیں، انہوں نے ہماری ساکھ تمام ملکوں میں بڑھا دی ہے۔ ان تمام تدابیر سے قومی وقار میں اندرون و بیرون ملک جو فرق رونما ہوا ہے وہ ان تمام امور پر مستزاد ہے۔ اور بلاشبہ معرکہ آرا حیثیت رکھتا ہے۔

اس سلسلہ میں زرعی اصلاحات کے لئے کمیشن کا تقرر جو عنقریب اپنی سفارشات پیش کرنے والا ہے اور تعلیمی امور پر توجہ دو ایسے نہایت اہم اقدامات ہیں۔ ایک قوم کی خوشحالی کا موثر ترین ذریعہ اور دوسرا اس کی ذہنی و ثقافتی نشوونما کا کفیل۔ اور یہ دونوں باہمدگر مربوط ہیں۔ ان تدابیر سے قوم کی فکری، تہذیبی اور تمدنی زندگی سے کیا نتائج مرتب ہوں گے وہ اربابِ نظر کے لئے خاص دلچسپی کا باعث ہیں۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جب ملک میں بے اطمینانی، بدنظمی، انتشار، بدحالی اور پریشانی کا دور دورہ ہو، جب انفرادی و اجتماعی آزادی، سرگرمیٔ عمل اور غور و فکر کی راہیں مسدود ہوں، قوتِ لایموت کے لئے دیانتدارانہ سعی و کوشش خاطر خواہ نتائج نہ پیدا کرے، تعلیم و تربیت کے لئے ذرائع و مواقع میسر نہ ہوں تو علم و ادب اور تہذیب و تمدن کے پروان چڑھنے کے لئے فضا چنداں سازگار نہیں رہتی۔ خوش گوار فضا کے ساتھ نئے نئے تصورات جنم لیتے ہیں، ذہنی پرواز کی فضائیں کشادہ ہوتی ہیں، فکر و نظر کے نئے نئے طلسمی دریچے وا ہوتے ہیں، حدیثِ شوق و جنوں نئے سرے سے تازہ ہوتی ہے، افق افق پر ایک نئی روشنی کھلتی ہوئی نظر آتی ہے، قدم قدم پر نئے نئے کوندے لپکنے لگتے ہیں اور دل و نگاہ سرشاریٔ کیف کے عالم میں نئے نئے بلند سے بلند تر مقامات تک رسا ہوتے ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس قدر غیر محسوس طور پر، اس قدر بے ساختگی سے ہوتا ہے کہ دیکھتے ہی دیکھتے پس و پیش ایک جہانِ دیگر دکھائی دیتا ہے۔ ایک عرصہ سے ہمارے

بعض ادبی حلقوں کو جمود کی شکایت رہی ہے۔ یہ شکایت صحیح ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ مشکل ہے۔ کیونکہ بسا اوقات نئے رجحانات آہستہ آہستہ پیدا ہوتے اور چپکے ہی چپکے نشو ونما پاتے رہتے ہیں۔ زندگی اور ادب و ثقافت کے دھارے کبھی چھوٹے چھوٹے زیر دھاروں کی صورت بھی اختیار کر لیتے ہیں اور رفتہ رفتہ باہم مل جل کر ایک دریائے بے کراں بن جاتے ہیں۔ شاید یہی کیفیت پچھلے سات آٹھ سال بھی رہی ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ؎

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

ہمارے لئے بھرپور آزادی کی سحراب آن کر طلوع ہوئی ہے۔ اس لئے قدرتی طور پہ ہمارے قوائے فکر کو بھی نشو ونما کا حقیقی موقع اب ہی ملنا چاہئے۔ نیا دور ہمارے لئے سیر حاصل علمی و ادبی اور فکری و ثقافتی جولانیوں کا پیغام بھی لے کر آیا ہے۔ قبل ازیں ایک مدت مناسب حالات و ذرائع اور ساز و سامان کے فقدان کی وجہ سے صحافت بھی کافی اضمحلال کا شکار رہی ہے۔ اور ادیب و فن کار بے دلی و بے سرو سامانی میں مبتلا ہو کر تخلیقی حیثیت سے کچھ زیادہ سرگرم نہیں رہے۔ لیکن اب جب کہ دشواریوں نہیں بلکہ آسانیوں، پریشانی نہیں بلکہ آسودگی کے دور کا آغاز ہو چکا ہے، ارباب فن میں از سر نو جوش تخلیق پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ لہٰذا ہمیں ادب و فن کے میدان میں بھی نئی نئی سرگرمیوں کی امید ہے۔ جب ہم موجودہ انقلاب سے پیدا شدہ صورت حالات پر غور کرتے ہیں تو ہمیں تا حد نظر روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ صدر پاکستان نے علوم و معارف کی وقیع خدمات انجام دینے والوں کی رفاہ و بہبود کے لئے جو خاص فنڈ کھولا ہے، وہ اس کی خوش آئند علامت ہے اور ادب و فن کی خدمت کے لئے بہت عمدہ اور پر زور ترغیب۔ جیسا کہ اعلان کیا گیا ہے۔ یہ فنڈ ان قدر دانی کے مستحق لوگوں کیلئے کھولا گیا ہے جنہوں نے پرورش لوح و قلم کے سلسلے میں بیش بہا خدمات انجام دی ہوں۔ لیکن ناسازئ حالات یا کسی اور بنا پر حصول معاش سے معذور رہوں۔ بلاشبہ صدر پاکستان کے الفاظ میں "معاشرہ ان تخلیقی فن کاروں اور ارباب قلم کا ممنون ہوتا ہے جو اپنی کوشش علوم و فنون کی خدمت کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اگر جسمانی معذوری یا کوئی اور وجہ ان کی تخلیقی سرگرمیوں میں سد راہ ہو تو ہم ان کی پوری پوری مدد کریں۔"

کیا ان شواہد کے بعد اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ اب پاکستان کا مستقبل غیر معمولی طور پر تابناک ہے ؟

"ہمارے بعض ایسے مسائل ہیں جن کو فوری طور پر حل کرنا ہے اور بعض ایسے ہیں جو طویل المیعاد نوعیت کے ہیں۔ ہم ان کو حل کرنے اور خرابیوں کو دور کرنے کی حتی الوسع کوشش کریں گے لیکن اس کام میں مجھے آپ کے دلی تعاون اور ضبط و تحمل کی ضرورت ہوگی۔ میں آپ سے یہ بھی کہوں گا کہ محنت سے کام کریں اور اپنی پوری کوشش صرف کریں۔ یہ وہ دور ہے جب ہماری مملکت کو تعمیر کرنے کی ضرورت ہے اور یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب ہمارے عوام اپنی پوری توجہ اور کوشش سے کام لیں"۔

(جنرل محمد ایوب خاں : قوم سے خطاب : ۸-اکتوبر ۱۹۵۸ء)

اسٹائل

ممتاز حسین

خواہ آپ اسٹائل کا ترجمہ اپنی زبان میں اسلوب سے کیجئے یا طرز سے یا کسی اور لفظ سے لیکن بعض موقعوں پر جو بات کہ اسٹائل کے کہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ اسلوب یا طرز کے کہنے سے نہیں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً جب ٹینس کا ایک کھلاڑی کوئی خوبصورت ہاتھ دکھاتا ہے تو اس وقت تحسین و آفریں یا داد دہی کے موقع پر اسٹائل ہی کا لفظ زیب دیتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ فرنگیوں کا کھیل ہے اور اس کی اداؤں کی داد دہی کے لئے انہیں کی زبان کے الفاظ موزوں ترین ہوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ وہاں اسٹائل کا مفہوم اچھے اسٹائل یا حسنِ ادا سے ہے نہ کہ یہ مفہوم ہے کہ اچھا ہو یا برا' اسٹائل ہر اک کا ہوتا ہے۔ تو عرض یہ ہے کہ انگریزی زبان میں اسٹائل کا یہ محل استعمال کچھ بلا وجہ نہیں ہے' اسٹائل کا ایک معیار ہوتا ہے۔ اس کا تعلق حسنِ ادا سے ہے نہ کہ ادائے محض سے یا انفرادیت محض سے۔ مجھے امید ہے کہ آپ میری بات سمجھ گئے ہوں گے۔ میں اسے تسلیم نہیں کرتا کہ ہر شخص کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے خواہ وہ اناڑی ہی کیوں نہ ہو جس کے خرام قلم میں کوئی حسن نہ ہو، جس کے صریرِ خامہ میں نوائے سروش نہ ہو' اس کا اسٹائل کیا؟ اسٹائل انفرادیت کا مترادف نہیں ہے ہر چند کہ اس میں انفرادیت موجود ہوتی ہے۔ اسٹائل کا ایک معیار ہوتا ہے جو کہ مذاقِ سخن کی تبدیلی کے ساتھ بدلتا بھی رہتا ہے۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ہم ایک مخصوص عہد کے ایک مخصوص طرزِ نگارش کو بھی اسٹائل کہتے ہیں۔ مثلاً کلاسیکل اسٹائل یا موڈرن اسٹائل۔ یہی نہیں بلکہ ایک ہی دور کی مختلف طرزِ نگارش کو بھی کیا بہ اعتبارِ موضوع اور کیا بہ اعتبارِ ٹکنیک' اسٹائل کہتے ہیں مثلاً تاثر نگاری کا اسٹائل، مجرد پرستی کا اسٹائل بیانیہ اسٹائل، رزمیہ اسٹائل وغیرہ۔ اور لطف یہ ہے کہ ایک ہی شخص بہ اعتبارِ موضوع اپنے اسٹائل کو بدلتا بھی رہتا ہے۔ وہ بہ یک وقت مختلف قسم کی اسٹائلوں پر قادر ہو سکتا ہے لیکن اس کے باوجود فارسی کا جو یہ شعر ہے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوشں
من اندازِ قدت را می شناسم

اس کا اطلاق اس کی ہر قسم کی تحریروں پر کیا جا سکتا ہے یعنی ہر چند کہ وہ اپنے کو اپنی مختلف اسٹائلوں میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے' وہ چھپ نہیں پاتا ہے۔ اسکے یہ معنی ہونے کہ اسٹائل، کا صرف ایک فنی معیار ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کا ایک رشتہ مصنف کی شخصیت سے بھی ہوتا ہے۔

اسٹائل کے سلسلے میں یہ دونوں باتیں کتنی متضاد ہیں۔ اگر ایک طرف یہ کہنا صحیح ہے کہ ادیب کا کام اپنی شخصیت کے اظہار کرنے کا نہیں ہے بلکہ اپنے خیالات اور جذبات کو مناسب ترین اور موزوں ترین الفاظ کے ذریعے ادا کرنے کا ہے تو دوسری طرف یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ وہ نہ صرف اپنی شخصیت کے رشتے سے آزاد نہیں ہو پاتا ہے بلکہ اس کی نگارش میں جان اس کی شخصیت ہی کے رشتے سے پیدا ہوتی ہے۔ صحیح لکھنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ جو چیز کہ لکھی گئی ہے وہ موثر' دلنشیں اور جاذب بھی ہے، اور اگر اسے بھی تسلیم کر لیا جائے کہ اثر آفرینی اور دلنشینی کی بھی ٹکنیک ہوتی ہے' تو پھر ایک شئے الفاظ کی شعلہ فشانی، سرخی اور گرمی بھی ہوتی ہے، وہ کیفیت الفاظ میں شخصیت ہی کے اکتساب نور سے پیدا ہوتی ہے۔

اول الذکر صورت میں ادیب کی شخصیت غیر اہم اور اس کی فنکارانہ کوشش ہی اہم ہے لیکن آخر الذکر صورت میں اس کی شخصیت ہی اہم ترین قرار دی جا سکتی ہے' اب سوال یہ ہے کہ ہم ان دونوں متضاد چیزوں کو کیونکر ایک دوسرے سے ہم آہنگ کریں؛ وجود جملہ اشیاء بہ ضد است۔ ہمیں اس کے تضاد سے گھبرانا نہیں چاہیئے، دیکھنا یہ ہے کہ آرٹ یا شعر و ادب کیونکر وجود میں آتا ہے، یہ پیدا ہی ہوتا ہے اس نفسیاتی کشمکش سے جو کہ فنکار میں اس کے ماحول کے تضاد سے پیدا ہوتی ہے، فن کار کے پاس پکے پکائے ہوئے خیالات اور بنے بنائے ہوئے جذباتی سانچے موجود نہیں ہوتے ہیں کہ اس کے سامنے مسئلہ صرف اُنکے اظہار کا ہو۔ فن اس کی شخصیت کے اظہار کا اتنا ہی اہم ایک مظہر ہے جتنا کہ اس مظہر کو مناسب اور موزوں ترین الفاظ کے جامہ پہنانے کا ایک اہم کارنامہ۔ ایسی صورت میں اصل مسئلہ شخصیت کو فن سے خارج کرنے کا نہیں' جیسا کہ ایلیٹ کا خیال ہے، بلکہ شخصیت کو فن کے تابع کرنے کا ہے۔ ہاں ایسا ضرور ہے کہ

ایسی صورت میں اس کی شخصیت اتنی اہم نہیں رہ جاتی ہے جتنا کہ اس کا فن لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا بھی درست نہ ہوگا کہ اس کی شخصیت غیر اہم ہو جاتی ہے، نہ صرف اس رعایت سے کہ فن کی نمود خونِ جگر سے ہوتی ہے بلکہ اس لئے بھی کہ فن تو صرف اس کی ایک شعوری کوشش کا نتیجہ ہے، جسے وہ اوپر سے عاید کرتا ہے۔ ورنہ اصل میں تو اس کی شخصیت ہی بولتی ہے ؎

کیا تھا شعر کو پردۂ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

اس رشتے کو اُبھارنا اس لئے ضروری تھا کہ اسلوب میں جو انفرادیت پیدا ہوتی ہے وہ شخصیت ہی سے اثر پذیر ہوتی ہے ورنہ فن تو قوانینِ حسن کے تابع ہے، جس کا ایک خارجی معیار رہتا ہے اور اسے کوئی بھی شخص حاصل کر سکتا ہے اور اُس صورت میں ایک فنکار کے اسلوب کو دوسرے فنکار کے اسلوب سے پہچاننا مشکل ہو جائے گا۔ اور یہ کہنا غلط ہے کہ ایک ہی شے کے بیان کرنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، اور اگر ہو بھی تو اسلوب اس سے نہیں پیدا ہوتا ہے کہ ان مختلف طریقوں میں سے کسی نے کوئی ایک طریقہ اختیار کر لیا ہے۔ یہ کسی منشی کے لئے صحیح ہو تو ہو فنکار کے حق میں صحیح نہیں ہے، اور چونکہ ہم اسٹائل کی بات محرّروں اور منشیوں کے رابطے سے نہیں کر رہے ہیں بلکہ فنکار، شاعر اور ادیب کے رابطے سے اس لئے مجھے امید ہے کہ آپ بھی انہیں اس موقع پر نظر انداز کریں گے۔ یہ بات اور بھی زیادہ یوں صاف ہو سکتی ہے کہ ہم کسی شاعر یا ادیب کے اسٹائل کو اس کے خیالات اور جذبات کی قسموں سے نہیں بلکہ اس کے طریقِ فکر اور اس کی آواز یا لب و لہجہ سے پہچانتے ہیں، اسلوب کی انفرادیت خیال یا جذبات کی انفرادیت سے نہیں بلکہ طریقِ فکر اور آواز کی انفرادیت سے پہچانی جاتی ہے، ایک انسان دوسرے انسان سے اپنی شکل و صورت وغیرہ کے امتیازات کے علاوہ اپنے ایگو کی تفریق سے بھی پہچانا جاتا ہے جو اس کے طریقِ فکر اور افتادِ طبیعت کو متعین کرتی ہے۔ اسلوب میں انفرادیت اسی ایگو کے طریقِ فکر، جذباتی افتاد اور ذوقِ احساس کی انفرادیت سے پیدا ہوتی ہے۔ ایک لفظ میں اسی کو شاعر کی آواز کہتے ہیں جو کہ اس آواز سے مختلف ہوتی ہے جس سے کہ آپ اپنے کسی دوست کو پہچانتے ہیں ؎

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

ہم اس پر بحث آگے کریں گے کہ میر کی وہ آواز کیا ہے۔ فی الحال تو اسی کو ذہن نشین کرانا ہے کہ اسلوب اس سے پیدا نہیں ہوتا ہے کہ ایک ہی بات کے کہنے کے مختلف طریقے ہوتے ہیں، شاعر یا ادیب ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر لیتا ہے، یا یہ کہ کسی کی تقلید میں اسلوب پیدا ہو سکتا ہے، اسلوب طریقِ فکر کی انفرادیت سے پیدا ہوتا ہے، اور وہی انفرادیت اسے انداز بیان کو بھی منفرد کر دیتی ہے۔ غالب کا جو انداز بیاں اور ہے تو اس کا بھی مطلب وہی ہے کہ ان کا طریقِ فکر ہی منفرد تھا۔ ان کے منفرد ایگو کا ایک مخصوص اسلوب فکر تھا جو کہ غالب کی نشاندہی کرتا ہے۔ یوں تو ہر آدمی سوچتا ہے لیکن مفکر ہر ایک نہیں ہوا کرتا ہے، اسلوب مفکر کا ہوا کرتا ہے نہ کہ ہر آدمی کا یا کہ ہر منشی کا۔

استاد ذوق استاد شاہ بھی تھے اور ہر فن میں طاق بھی تھے، لیکن وہ اپنا کوئی اسلوب پیدا نہ کر سکے، معلوم نہیں آپ میرے اس خیال سے کہاں تک متفق ہوں گے لیکن مجھے تو یہ کہنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہر کس و ناکس کا اسلوب نہیں ہوا کرتا ہے تو پھر مجھے تو کچھ شعراء کو چھانٹنا ہی پڑیگا۔ لیکن اس چھانٹی کا اصول بھی مقرر کرنا ہوگا۔ شروع میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس راہ میں صرف استادی کام نہیں آتی ہے، اس کے لئے ایک شخصیت اور پھر اس کا ایک مخصوص اسلوب فکر درکار ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ استاد ذوق کے پاس کوئی شخصیت نہ تھی تو شاید آپ اور بھی زیادہ خفا ہو جائیں گے۔ اس لئے فی الحال یہی کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ وہ سوچتے تو تھے لیکن سوچنے کا کوئی مخصوص اسلوب نہیں رکھتے تھے۔ جیسے ہمارے مدرسین سوچتے تو ہیں لیکن وہ سوچنے کا کوئی اسلوب نہیں رکھتے ہیں۔ نوٹس بنا کر سوچنے اور سوچنے کی صلاحیت کو فروغ دینے میں بڑا فرق ہے۔ تاوقتیکہ فکر کا مادہ بالطبع شاعر میں نہ ہو، وہ کوئی اسلوب فکر پیدا نہیں کر پاتا ہے۔ استاد ذوق کے یہاں سب کچھ اسی شے کی کمی سی محسوس ہوتی ہے۔ اور کیا عجب جو اس کا احساس انہیں بھی رہا ہو۔ آزاد مرحوم سے معذرت کے ساتھ ؎

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

رہ گئی شخصیت کی بات تو اس کے بارے میں یہ عرض ہے کہ میں اسے بھی اسٹائل کی طرح ایک مثبت شے تصور کرتا ہوں یا تو آدمی کے پاس شخصیت ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی ہے۔ شخصیت کے مدارج ہو سکتے ہیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ اس شے کے نہ ہوتے ہوئے بھی کسی شخص میں شخصیت پائی جائے جس سے کہ ہم شخصیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ شخصیت کی وہ بنیادی شے کیا ہے جس کے پائے جانے میں شخصیت کا اطلاق کیا جاتا ہے اور جس کے نہ پائے جانے میں شخصیت کا اطلاق نہیں کیا جاتا ہے لیکن قبل اس کے کہ میں اسے زیر بحث لاؤں، اسے ذہن نشین کر لیجئے کہ شخصیت انفرادیت کے مترادف نہیں ہے، بالکل اسی طرح جس طرح کہ اسلوب انفرادیت کے مترادف نہیں ہے۔

علم النفس کے مطابق شخصیت منظم ہوتی ہے ایگو یا خودی کے گرد، اور ایگو کی تعریف خودنگری اور خودگری ہی نہیں ہے بلکہ اپنی محافظت بھی ہے، کسی بھی انسان میں کیریکٹر ایگو کی اسی مدافعت سے پیدا ہوتا ہے، کیریکٹر شخصیت کی ضد نہیں ہے جیسا کہ ہربرٹ ریڈ ہمیں بتانا چاہیں گے بلکہ شخصیت کا جزو اعظم یا اس کا سنگ بنیاد ہے، کیریکٹر کے بغیر کوئی شخصیت نہیں ہوا کرتی ہے، اور کیریکٹر کے یہ معنی نہیں ہے کہ وہ اٹل اور ہٹ ہو۔ اس میں کوئی لچک اور کوئی بہاؤ نہ ہو، وہ ہر طرف جھکتا ہے اور اپنے ماحول سے مطابقت پیدا کرتا ہے، لیکن وہ اپنے مرکز ثقل سے ہٹتا نہیں ہے۔ اس میں ایک پینیدی ہوتی ہے جو کہ شخصیت میں وزن پیدا کرتی ہے، اور اس کی ترقی میں وقار پیدا کرتی ہے اور شخصیت کا یہ معیار نہ صرف عام انسانوں کے بارے میں صحیح ہے بلکہ فن کار، ادیب اور شعراء کے بارے میں تو خاص طور سے صحیح ہے، کیونکہ اگر فن اس کے ایگو کے کشمکش کا نتیجہ ہے جو کہ وہ اپنے ماحول کے بالمقابل محسوس کرتا ہے تو پھر اس کی کشمکش کا وزن تو اسی وقت محسوس کیا جا سکتا ہے جبکہ وہ اس کشمکش میں کسی جگہ پر کھڑا ہو۔ ادب کسی حقیقت مطلق یا کسی ازلی صداقت کی دریافت نہیں ہے۔ کہ اس میں دریافت کرنے والے کی شخصیت بے معنی ہو جائے اور ہم یہ کہہ سکیں کہ ہمیں دریافت سے دلچسپی ہے نہ کہ دریافت کرنے والے کی شخصیت سے، یہ تو صرف اس دکھ درد کی کہانی ہے جو کہ شاعر یا ادیب اپنے ماحول کے تصادم میں محسوس کرتا ہے، اور اسے قبول کرنے یا نہ کرنے یا تبدیل کرنے کا رویہ اختیار کرتا ہے، اس ادب کی زندگی تمام تر فنکار کی داخلیت میں ہے اور اس کا حسن اسے خارجی نقطۂ نظر سے بیان کرنے میں ہے۔ اور وہ اپنے اس طریق کار سے جس عالمگیر صداقت یا (RELATIVE CONSTANT) اضافی دائمیت تک پہونچتا ہے اس میں اس کا نفس ایک حصہ لینے والے، جانب دار فاعل کی حیثیت سے کام کرتا ہے کسی بھی فنکار کے فن کو سمجھنے کے لئے اس کی شخصیت کا مطالعہ اسی لئے اہم ہوتا ہے کہ وہ اس کے مصدر شخصیت سے صادر ہوتا ہے لیکن اگر شخصیت میں کوئی مرکز ثقل نہ ہو تو پھر اسے ہم کیونکر جانچ سکتے ہیں، جذبات کی گہرائی ہو یا شخصیت کی پہنائی، ان دونوں ہی کو ہم اس وقت جانچ سکتے ہیں جب کہ ہمیں اس کے کسی مستقر کا علم ہو۔ ان حالات میں یہ کہنا صحیح ہے کہ شخصیت اسی کے پاس ہوتی ہے جس کے پاس کیریکٹر یا نشست مدافعت ہو۔ صرف اسی حالت میں اس کے تجربات ایک انفرادیت اختیار کرتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کیریکٹر نہیں بلکہ چال چلن (CONDUCT) اچھا یا بُرا ہوا کرتا ہے، کہ کیریکٹر یا تو ہوتا ہے یا پھر نہیں ہوا کرتا ہے، اور یہاں ہم شاعر یا ادیب کے کیریکٹر سے بحث کر رہے ہیں نہ کہ اس کے چال چلن سے، اب ایک جزوی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کیریکٹر شخصیت کے مترادف ہے؟ نہیں۔ کیریکٹر تو صرف اس کی شخصیت کا سنگ بنیاد یا مرکز ثقل ہوتا ہے جس کے گرد اس کی شخصیت نمو کرتی ہے بشرطیکہ اسے اپنی شخصیت کے فروغ دینے کا موقع ملے، ہاں شخصیت کو آپ منفرد انسانیت (INDIVIDUALIZED HUMANITY) کا نام دے سکتے ہیں، یعنی اس میں احترام نفس کے ساتھ احترام انسانیت بھی ہوتی ہے، اور یہ ایک ایسی شے ہے جس کا معیار تکمیل شخصیت کے مادی اور روحانی وسائل کے مطابق ہر زمانے میں بدلتا رہے گا، انسان کی شخصیت کے ارتقا کی کوئی حد اور منزل نہیں ہے۔ اب ہم اس جگہ پر پہنچے ہیں جہاں شخصیت کی خودی (EGOISTIC CHARACTER) ہی اہم نہیں ہے بلکہ اس کی غیر خودی (ALTRUISTIC CHARACTER) یا انسانیت بھی اہم ہے۔ یہاں ہم پھر ایک نئے تضاد سے دوچار ہوتے ہیں کیونکہ خودی غیر خودی سے بغیر کسی تصادم کشمکش اور تضاد کے ہم آہنگ نہیں ہوتی ہے۔ لیکن جس طرح کہ ایک بڑا فن کار اپنے اظہار شخصیت، اور فن کے مطالبات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی خودی اور غیر خودی کے درمیان بھی ایک ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور جو شخص کہ توازن پیدا نہیں کر پاتا ہے اس کی شخصیت پارہ پارہ اور منتشر ہو کر رہ جاتی ہے، شعراء اور فنکار کی فہرست ہر زمانے میں بڑی طویل ہوا کرتی ہے لیکن ان میں سے شاعر اور فنکار یہی بقول غالب دو ڈھائی ہی نکلا کرتے ہیں، غالب تو شیفتہ کو بھی بہ حیثیت شاعر قبول کرنے میں تامل کرتے تھے، کیونکہ کبھی کبھی ان کی بھی ٹھیک نکل جایا کرتی، تو عرض یہ ہے کہ یہ لفظ ٹھیک بڑا مناسب لفظ ہے، اس میں شخصیت کی ٹھیک اور فن کی ٹھیک دونوں ہی کا اشارہ ہے۔ کلام چلتا صرف اسی وقت نہیں ہوتا ہے جب کہ بندش میں چستی اور الفاظ میں نشست نہ ہو بلکہ اس وقت بھی ہوتا ہے جبکہ شخصیت میں گٹھاؤ اور ٹھیک نہیں ہوتی ہے، آرٹ میں مسئلہ صرف کہنے یا صرف ابلاغ کا نہیں ہے۔

بلکہ جذباتی قوت کے ساتھ کہنے کا ہے۔ اس کی تحریر میں کبھی بھی اسٹائل نہیں ہوتا ہے جس میں جذباتی قوت نہ ہو' اس سے یہ نہ سمجھئے گا کہ خطابت سے لازمی طور سے اسٹائل پیدا ہوتا ہے۔ خطابت تو جذباتی قوت کا ایک برا بدل ہے۔ یہ شے اپنی شخصیت کے مستعار جاموں (MANNERISM) کو اتارنے اور اپنی آواز کو پانے سے پیدا ہوتی ہے، واعظ کے لہجے سے گزر کر آدمی کے لہجے میں بات کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی اصل شخصیت وہیں اجاگر ہوتی ہے جبکہ وہ آدمی کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ میر تقی میر کی آواز کو پہچاننا اسی لئے مشکل ہو گیا ہے کہ انہوں نے جوجگی کا سوانگ بھرا۔ وہ ان کی اصل شخصیت پر کچھ اس طرح مستولی ہو گیا کہ بالعموم ان کی اسی آواز کو لوگ میر تقی کی آواز سمجھنے لگے ؎

فقیرانہ آئے صدا کر چلے　　　　میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

یہ صحیح ہے کہ بے نیازی اور استغنا ان کی شخصیت کا ایک اہم جزو ہے لیکن ان کی دردمند آواز کی صرف یہی ایک لے نہیں ہے۔ ایک لے وہ بھی ہے جس کا تعلق ان کے اپنے احترام نفس سے ہے ؎

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں　　　　کھنچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

تاوقتیکہ ان کی شخصیت کی اس پیچیدگی کو ہم سامنے نہ رکھیں جو ان کے احترام نفس اور احترام آدمیت کے درمیان ایک توازن کا رشتہ قائم کرتی ہے ہم ان کی آواز کو پہچاننے میں غلطی بھی کر سکتے ہیں۔ مجنوں گورکھپوری بڑے میر پرست ہیں لیکن ایک بار ان سے بھی غلطی ہو ہی گئی ؎

شکستہ رنج نصیبوں سے ہی ملائے میر　　　　مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اس شعر کو انہوں نے میر تقی میر سے منسوب کر دیا۔ اور یہ بھول گئے کہ یہ لہجہ تو لکھنؤ اسکول کی شاعری کی مخصوص نسائیت کا حامل ہے۔ میر ستم دیدہ کے لہجے میں ایسی کوئی بھی نسائیت نہیں ہے۔ وہ اظہار شکست کرتے بھی ہیں تو ان کے لہجے میں ایک مردانگی ہوتی ہے ؎

بارے کل بھڑ گئے اس ظالم خونخوار سے ہم　　　　منصفی کیجے تو کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا

"کچھ کم نہ جگر ہم نے کیا": یہ ہے میر کا لہجہ نہ کہ "مقابلہ تو نہ دلِ ناتواں نے خوب کیا"۔ میر زخمی ہوتے ہیں' قتل ہوتے ہیں' لڑتے بھڑتے ہیں اور بے حمیت ہو کر بھر جاتے ہیں ؎

آج پھر مقابلے حمیت میر داں　　　　کل لڑائی سی لڑائی ہو چکی

لیکن نہ تو وہ اپنی آن بان میں فرق آنے دیتے ہیں اور نہ ان کے لہجے میں نسائیت پیدا ہو پاتی ہے۔ دردمندی کی آواز اور نسائیت کے لہجے میں بڑا فرق ہے ؎

سخن کی نہ تکلیف ہم سے کرو　　　　لہو ٹپکے ہے اب شکایت کے بعد

اصل شخصیت میر کی یہ ہے جو کہ کبھی کبھی اس قدر بلند بانگ بھی ہو جاتی ہے ؎

میں کون ہوں اے ہمنفساں سوختہ جاں ہوں

اک آگ مرے دل میں ہے جو(؟) شعلہ فشاں ہوں

یہ جو ایک مثال میں نے اسلوب کی شناخت سے متعلق دی ہے اور اس کی انفرادیت کو شخصیت کے آئینے میں دکھلایا ہے تو وہ کچھ بے وجہ نہیں ہے۔ اسلوب کو افکار اور جذبات کی نوعیت سے نہیں بلکہ شخصیت کے رشتے سے پہچانا جاتا ہے' اسلوب اس نقش کا نام ہے جو کہ شخصیت تحریر میں چھوڑتی ہے، یہ اس کے منفرد انداز فکر، اس کی منفرد افتاد طبع اور اپنے سلیقے سے زندگی کے برتنے سے پیدا ہوتی ہے اور اپنے اس نقش کو انسان اس وقت مرتسم کرتا ہے جبکہ وہ انداز بیان کے تمام مستعار اسلوبوں سے درگزرتا ہے۔ بہترین اسٹائل اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ وہ اپنی اسٹائل سے بے خبر اور اپنی شخصیت سے باخبر ہوتا ہے۔ لیکن اسٹائل جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا' تمامتر شخصیت ہی کی شے نہیں ہے' اس کا کچھ تعلق ابلاغ کے فن سے بھی ہے جس کا ایک معیار ہوتا ہے' جو کہ زمانے کے مذاق کے ساتھ بدلتا بھی

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

ہمارے خیال میں یہ مصرع یوں ہے: 'اک آگ مرے دل میں ہے جو شعلہ فشاں ہوں'۔ لیکن مضمون نگار کو اصرار ہے کہ 'جو' کی بجائے 'جوں' لکھا جائے۔ اس لئے ہم نے اسے بجنسہٖ رہنے دیا ہے (مدیر)

بیادِ رفتگاں:

اشک رامپوری

فضل احمد کریم فضلی

کئی سال کی بات ہے میں اس زمانے میں ڈھاکے میں تھا۔ کسی کام سے کراچی آیا ہوا تھا۔ مولانا ماہر القادری سے ملاقات ہوئی۔ انہیں جہاں اللہ نے اور بہت سی خوبیاں عطا فرمائی ہیں وہاں ایک یہ بھی ہے کہ انہیں دوسروں کے اچھے اچھے شعر بہت یاد رہتے ہیں اور وہ احباب کو بڑے شوق سے سنایا کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے ایک شعر سنایا ؎

میں نے چکھی تھی کہ ساقی نے کہا جوڑ کے ہاتھ
آپ للہ چلے جائیے میخانے سے

میں شعر سن کے اچھل پڑا۔ بڑی دیر تک اس کی گوناگوں لطافتوں سے ہم لطف اندوز ہوتے رہے۔ میں نے پوچھا شعر کس کا ہے۔ کہنے لگے ایک صاحب ہیں اشک رامپوری۔ اس سے پہلے میں نے اشک صاحب کا نام نہ سنا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ جو شخص ایسا اچھا شعر کہہ سکتا ہے وہ گوشۂ گمنامی میں کیسے پڑا ہوا ہے۔ حالات دریافت کئے معلوم ہوا کسی زمانے میں رند لاابالی تھے، اب فقیر گوشہ گیر ہیں اور راولپنڈی کی کسی خانقاہ میں رہتے ہیں۔ ان کے یہ مختصر حالات سن کے ان سے ملنے کا اشتیاق زیادہ ہوا۔ لیکن کہاں ڈھاکہ کہاں راولپنڈی۔ دل میں شوق ملاقات لئے ہوئے ڈھاکے واپس گیا۔

قدرت کا کرنا کچھ ایسا کہ چند روز کے بعد میرا تقرر راولپنڈی کا ہو گیا۔ وہاں پہنچا اشک صاحب کے متعلق دریافت کیا۔ معلوم ہوا کوئی مقام ہے گولڑہ۔ وہاں کا راستہ ایسا اللہ کا سنوارا ہے کہ وہاں پہنچنا بھی ایک طرح کا جہاد کرنا ہے۔ الغرض ملاقات تو نہ ہو سکی البتہ غائبانہ تعارف کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کچھ مشترک احباب بھی مل گئے۔ ان کے ذریعہ سے سلام و پیام آتے جاتے رہے۔ ایک دن ایک دوست کے یہاں دیکھا کہ ایک صاحب جو وضع قطع سے ملا بھی نہیں بلکہ ملیٹے معلوم ہوتے ہیں، بیٹھے ہوئے ہیں۔ کندھے پر بڑا چارخانے والا رومال پڑا ہوا ہے، ڈاڑھی ایک مشت جائز حد سے بھی آگے قدم بڑھائے ہوئے ہے۔ ہونٹ باچھوں تک پان سے رنگین ہیں۔ بلکہ ریش مبارک کا بھی معتدبہ حصہ پان خوردہ ہے۔ معلوم ہوا حضرت اشک یہی ہیں۔ جی تو میرا بے اختیار چاہا کہ لپٹ جاؤں لیکن ان کی وضع قطع سے جھجکا۔ وہ بھانپ گئے اور انہوں نے خود بڑھ کے میرا شوق پورا کیا۔ اس وقت سے جو میری نیازمندی کا سلسلہ شروع ہوا وہ بحمد اللہ بڑھتا ہی گیا۔ اور وہ اکثر مجھے شرف میزبانی عطا فرماتے رہے۔

ان لوگوں کی زبانی جو انکی پہلی زندگی دیکھ چکے تھے، معلوم ہوا کہ حضرت اشک کسی زمانے میں مسٹر واجد علی خاں عرف اچھن صاحب کہلاتے تھے۔ بڑے بانکے چھبیلے تھے۔ بڑی آن بان تھی، بڑے ٹھاٹ باٹ، بڑے کر و فر۔ ٹاپ ہیٹ اور فراک کوٹ وغیرہ میں ملبوس ایک دو سال نہیں بلکہ چودہ برس انگلستان اور جرمنی میں گذار چکے تھے۔ اپنے عہد کے نوجوانوں میں ان سے زیادہ خوش پوش، خوش باش شاید ہی کوئی رہا ہو۔ قیمتی سے قیمتی لباس اور قیمتی سے قیمتی چیزیں ان کے استعمال میں رہتیں۔ جدید ترین فیشن کا وہ معیار تھے اور انہیں دیکھ دیکھ کے لوگ فیشن اختیار کرتے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم والئی رامپور کی اولاد میں سے تھے۔

اشک صاحب کا ظرف ملاحظہ ہو کہ اگرچہ وہ مجھ سے بہت قریب آ گئے تھے لیکن کبھی انہوں نے بے خیالی میں بھی ایک حرف ایسا اپنی زبان سے نہ نکالا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ امیرانہ زندگی بھی گذار چکے ہیں۔ اگر کوئی ذکر بھی کرتا تو ہنس کے ٹال جاتے اور کوئی دوسرا ذکر شروع کر دیتے۔ ایک دفعہ ان کے اصرار پر گولڑے جانا ہوا۔ حضرت اشک کی جائے سکونت دیکھی ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی۔ سامان صرف ایک پلنگ، ایک پرانی دری اور ایک مٹی کا گھڑا، اور وہاں ایک کھونٹی بھی جس پر ان کے معدودے چند کپڑے ٹنگے تھے۔ تھوڑی دیر میں خانقاہ کے لنگر خانے سے

کھانا آگیا۔ کھانا کیا تھا خمیری روٹی اور سالن جیسا لنگر خانوں سے ملتا ہے۔ وہیں دری پر بیٹھ کے ہم لوگوں نے کھایا۔ اشک صاحب اس طرح خوش خوش کھا رہے تھے جیسے رامپور کے رئیسانہ دسترخوان پر بیٹھے الوان نعمت کھا رہے ہیں۔ زندگی کی مشکلات کو اس خوشی سے چھپانا کہ دیکھنے والے کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ وہ مشکلات سے دوچار بھی ہیں۔ اشک صاحب کا بڑا کمال تھا۔

باوجودیکہ ان کی ظاہری زندگی میں اتنا عظیم انقلاب آگیا تھا۔ لیکن دل سے وہ اب تک ویسے ہی رندلاابالی تھے جیسے کہ پہلے تھے۔ دل کی شگفتگی چہرے سے بھی ٹپکی پڑتی تھی۔ اور باتوں سے بھی۔ زندگی کی خشکی اور یبوست ان کے پاس پھٹکی تک نہ تھی۔ ہر وقت خوش نظر آتے تھے۔ جن دنوں جگر صاحب تشریف فرما ہوتے اور رمی کا دنگل لگتا تو اس میں بھی اشک صاحب برابر کے شریک ہوتے اور گھنٹوں زور آزمائی کیا قسمت آزمائی کیا کرتے۔ کبھی بیگم صاحب کو نمائش کا شوق چراتا تو اس میں بھی وہ بند نہ تھے۔ ساتھ ساتھ شغل ذکر اور چلہ کشی بھی جاری رہتی۔ چالیس چالیس دن کے چلّے تو معلوم نہیں کتنے کھینچ چکے تھے۔

کچھ عرصہ ہوا خبر ملی تھی کہ چودہ مہینے کا چلّہ کر بیٹھے ہیں۔ کیا حوصلہ تھا! اللہ اکبر!

وہ مشاعروں میں بہت کم شریک ہوتے۔ تحت اللفظ پڑھتے۔ سخندانوں کی محفل ہو تو پھر وہی وہ نظر آتے۔ کچھ عرصہ ہوا میرے اصرار پر کراچی تشریف لائے۔ یہاں کے چند مشاعروں میں شریک ہوئے تو اس طرح کہ سب پر چھا گئے۔ سامعین نے بہ اصرار کئی کئی غزلیں سنیں اور پھر بھی سیر نہ ہوئے۔ غالباً ان سے بڑا اس وقت کوئی اور فن شعر میں دستگاہ رکھنے والا نہ تھا۔ اپنا کلام کبھی محفوظ نہ رکھتے۔ میرے بار بار کہنے سے وہ کلام جمع کرنے پر راضی ہوئے اور اپنی کچھ غزلیں اپنے شاگردوں کو لکھانی شروع کیں۔ جب کراچی تشریف لائے تو اپنے ساتھ پچاس ساٹھ غزلوں کا تحفہ بھی لائے۔ اور میرے حوالے کر گئے۔ فرماتے تھے کہ اور غزلیں ان کے شاگردوں کے پاس راولپنڈی میں ہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ سب کلام یکجا ہو جائے۔ اور اس کی معقول اشاعت کا انتظام کیا جائے۔

ابھی ڈیڑھ مہینے ہوئے ان کا ایک خط ملا جس میں یہ خبر وحشت اثر لکھی تھی کہ ڈاکٹروں نے ان کے پھیپھڑوں میں کینسر تشخیص کیا ہے۔ اور اپریشن کرنے والے ہیں۔ میں نے لکھا کہ خدا کرے تشخیص غلط ہو۔ انہوں نے پھر اطلاع دی کہ ڈاکٹروں کو اپنی تشخیص پر اعتماد ہے۔ اور اپریشن عنقریب ہونے والا ہے۔ ایک دوست نے اطلاع دی کہ اپریشن ملتوی کر دیا۔ کیونکہ اشک صاحب ابھی کمزور ہیں انہیں قوت کی دوا دی جا رہی ہے۔ یکایک گذشتہ جمعہ کی صبح کو ان کے انتقال پرملال کی خبر آئی۔ ان کے ایک عزیز شاگرد کے خط سے یہ تفصیل معلوم ہوئی کہ گذشتہ جمعرات کو ان کا اپریشن ہوا۔ بارہ بجے دن سے ساڑھے تین بجے شام تک اپریشن ہوتا رہا۔ ڈاکٹروں نے لکھا کہ اپریشن کامیاب ہوا۔ آٹھ بجے ہوش آجائے گا۔ لیکن پانچ بجے شام کو ان کے دل کا دھڑکنا بند ہو گیا۔ اس طرح نہ صرف ایک بڑا شاعر اٹھ گیا۔ بلکہ ایک بڑا انسان بھی۔ چند شعر ملاحظہ ہوں۔

چاک داماں اور چاک گریباں کا مضمون کس قدر پامال ہے لیکن دیکھئے اشک صاحب نے اسے کتنا نیا بنا دیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اب وحشت میں
ہائے دامن نہ ہوا ہائے گریباں نہ ہوا

محاورے کے برمحل استعمال سے شعر میں بڑا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ اشک صاحب کے کلام میں یہ لطف بہت ہے لیکن جیسا مندرجہ ذیل شعر میں محاورے کا انہوں نے بھرپور استعمال کیا ہے ویسا بہت کم میری نظر سے گذرا ہے ؎

خامیٔ وحشت نہ کر زنداں میں اتنا شرمسار
سر نہیں اٹھتا مرا دیوار و در کے سامنے

چند اور شعر ہیں ؎

ان کا دورِ جوانی ان کی وہ کافر نگاہ
جس طرف آنکھ اٹھ گئی ہے کہہ گئی جام آگیا

ماہِ نو، کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۵ء

دردِ ازل ملا بھی تو کیسا ہم کو نذرانہ
اک زندگی جو باعثِ شرمندگی رہی
جس سے نباہ کر کے چلے ہم تہِ زمیں
اس زندگی کا یہ حال کہ منہ دیکھتی رہی
اک وہ کہ خود بلائے گئے بزمِ ناز میں
اک ہم کہ اپنے آپ کو سمجھا کے رہ گئے

اپنے آپ کو سمجھا کے رہ گئے کی کیا داد دی جا سکتی ہے۔ اس ایک ٹکڑے میں ایک جہانِ معنی سمٹ آیا ہے۔
ایک داغ کے رنگ کا بھی شعر ملاحظہ ہو۔ یہ رنگ بھی اشک صاحب کے کلام میں جا بجا پایا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

للہ یہ تو آپ کسی دن بتائیے
کے دورِ وعدۂ فردا کے رہ گئے

اب ان کی ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

اک دن وہ مل گئے تھے سرِ رہ گزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں
اندازِ اعترافِ محبت تو دیکھیے
میری نظر کہیں ہے تو ان کی نظر کہیں
ان ہمدموں کی کارگزاری نہ پوچھیے
دل سے بنا بنا کے ادھر کی ادھر کہیں
اے رازداں یہ سب ترے کہنے کی بات ہے
رکھتے ہیں ورنہ کان بھی دیوار و در کہیں

یہاں "سب ترے کہنے کی بات ہے" نے کیا مزہ دیا ہے اور کیا معنی پیدا کر دیے ہیں۔ مقطع ہے ؎

اس نکتہ چیں کو حال سنانے چلے تو اشک
اپنی زباں جواب نہ دے وقت پر کہیں

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان، کراچی)

سرحد کا پہلا اردو شاعر

(معز اللہ خان افغان)

خیال بخاری

اردو زبان کہاں اور کیسے پیدا ہوئی، یہ ایک متنازعہ فیہہ مسئلہ ہے جس کے حل کرنے کے لئے ابھی بہت تحقیق اور تدقیق کرنی پڑے گی۔ پہلے تو دکن، دلی، لکھنؤ اور اودھ کو اس کی جائے پیدائش اور گہوارہ ہونے کا دعویٰ تھا۔ بعد میں پنجاب بھی اس دعوے میں شامل ہوگیا۔ مگر برصغیر ہند و پاکستان کے شمال مغربی گوشے میں ایک علاقہ اور بھی ہے۔ جو اس بات کا دعویدار ہے۔ کہ اردو زبان نے اسی کے میدانوں میں جنم لیا، اسی کے آغوش میں پرورش پائی۔ اور جب یہ زبان کچھ چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی۔ تو وہ برصغیر کے حصوں تک پہنچ گئی۔ بلکہ اس علاقہ کے رہنے والوں نے ہی اپنی تلواروں کی جھنکار اور علم و فضل کے بیش قیمت خزانوں کے ساتھ اسے وہاں تک پہنچا دیا۔ اور پھر وہاں کے شاہنشاہوں، تاجداروں، نوابوں اور امیروں کی سرپرستی میں اپنی بھرپور جوانی کو پہنچی۔

اٹک کے اس طرف رہنے والوں کے متعلق اہل ہند (غیر تقسیم شدہ) کا یہی خیال رہا ہے کہ وہاں افغان یا پختون بستے ہیں۔ جو پختو یا پشتو زبان بولتے ہیں۔ اور دوسری زبانوں میں زیادہ سے زیادہ فارسی بول لیتے ہوں گے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ "اباسین" کے اس طرف رہنے والے زمانۂ قدیم سے ایک اور زبان بھی بولتے آتے ہیں۔ جو زمانۂ قدیم کے رواج کے مطابق اس دریا کے نام پر "ہندکو" کہلاتی ہے۔ ہند دراصل سند یا سندھو دریا ہی کا نام ہے۔ (ہند میں سنسکرت کا (س)، (ہ) سے بدل جاتا ہے) کہا جاتا ہے کہ اسی "ہندکو" نے اردو کو جنم دیا۔ اس نظریہ کی تائید یا مخالفت میں جو بھی کہا جائے، تاہم وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سرحد (سابقہ) نے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے وہ دکن، دلی یا لکھنؤ سے کچھ کم نہیں۔

اب تک یہاں کے شعراء میں قاسم علی افریدی اور حیدر پشاوری وغیرہ کو اردو کے قدیم ترین شعراء خیال کیا جاتا تھا۔ ان میں قاسم علی خاں نسلاً افریدی تھا۔ مگر اس کے آبا و اجداد اپنے وطن (اخور ضلع کوہاٹ) کو خیرباد کہکر یوپی چلے گئے تھے۔ اور وہاں لکھنؤ کے قریب "کوہاڑ" نامی ایک قصبہ میں مستقل طور پر بود و باش اختیار کرلی تھی۔ قاسم علی خاں وہیں پیدا ہوئے اور تقریباً ساری عمر وہیں گذار دی۔ قاسم علی کا زمانۂ حیات ۱۷۶۳ء سے ۱۸۳۲ء تک بتایا جاتا ہے۔ چونکہ وہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں یوپی کے مختلف شہروں میں رہے۔ اس لئے انہوں نے اپنے کلیات کو (جو پختو، فارسی اور اردو زبانوں میں ہے) فرخ آباد میں ۱۲۰۷ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا، جیسا کہ ان کے کلیات کے قلمی نسخہ پر لکھی ہوئی تاریخ سے ظاہر ہے۔ (یہ نسخہ اسلامیہ کالج پشاور کی لائبریری کی ملکیت ہے۔ اور پشتو اکیڈمی اسے شائع کرنے کے انتظامات کر رہی ہے)

حیدر پشاوری کے کلام کے دستیاب شدہ اوراق سے پتہ چلا ہے کہ ان اوراق (جو غالباً اسی دیوان کا ایک حصہ ہیں) کی تاریخ تحریر محرم ۱۲۱۶ھ ہے[1]۔ ظاہر ہے کہ قاسم علی کی زبان یوپی میں خوب منجھ گئی اور حیدر پشاور کے رہنے والے تھے۔ پشاور میں "ہندکو" کی ایک ترقی یافتہ شکل مروج ہے۔ جو اردو کے بہت قریب ہے۔ اسی لئے ان دونوں قدیم شعراء کی زبان بہت صاف، شستہ اور منجھی ہوئی ہے۔ اور الفاظ و محاورات کے لحاظ سے ولی دکنی سے بہت بعد کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ مگر آج ہم سرحد کے جس اردو شاعر کا تعارف کرا رہے ہیں وہ نہ صرف صحیح معنوں میں ولی کا ہمعصر تھا۔ بلکہ اس کی زبان بھی خالص اسی وقت کی زبان معلوم ہوتی ہے۔

یہ گمنام مگر قادرالکلام اور بلند پایہ شاعر معز اللہ خاں مہمند ہے۔ جو پشاور سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں "گڑھی محسن خاں" کا رہنے والا تھا۔ اس کے آبا و اجداد مشہور مہمند قبیلہ کے ملک یا سردار تھے۔ مغل شاہنشاہوں کی طرف سے ان کو اس قبیلہ کے تمام علاقہ کی نوابی عطا کی گئی تھی۔

---

[1] ادبیات سرحد۔

اس عہدہ کو "اربابی" اور عہدہ دار کو بجائے نواب کے "ارباب" کہتے تھے۔

معز اللہ خان کی پیدائش کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں ہو سکی۔ مگر اس کی ایک پشتو غزل سے، جو اس نے اپنے ایک معاصر شاعر عبدالقادر خان خٹک کی ایک فخریہ غزل کے جواب میں لکھی ہے، یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ اس کی پیدائش ۱۰۸۵ھ کے لگ بھگ ہے۔

معز اللہ خان کا دیوان اس کی وفات سے تقریباً سوا دو سو سال کی گمنامی کے بعد پشتو اکیڈیمی نے پیدا کیا ہے۔ یہ نسخہ شاعر کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اور اس پر لکھی ہوئی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اسے ۱۱۵۹ھ میں مکمل کیا۔ یہ دیوان تین زبانوں یعنی پشتو، فارسی اور اردو میں ہے۔ عام دستور کے مطابق وہ اپنا نام یعنی "معز اللہ" ہی لکھتا ہے۔ مگر اردو اور فارسی میں "افغان" تخلص کیا ہے۔ اگرچہ پشتو اکیڈیمی کی طرف سے چھپے ہوئے نسخہ کے مطابق یہ دیوان صرف ۷۶ صفحات پر مشتمل ہے، مگر غالب کے دیوان کی طرح یہ مختصر سا دیوان بھی کافی قدر و قیمت رکھتا ہے۔ پشتو میں وہ صف اول کا شاعر تو ہے ہی۔ مگر فارسی اور اردو میں بھی اس کا کلام بہت بلند ہے۔ یہاں اس پر پوری طرح تبصرہ نہیں کیا جا سکتا مگر اس کے فارسی کلام کے معیار کی طرف اشارۃً یہ ذکر کر دینا نامناسب نہ ہوگا۔ کہ پچھلے دنوں لاہور میں منعقدہ بین الاقوامی اسلامی مجلس مباحثہ میں حصہ لینے والے ایرانی وفد کے اراکین جب پشتو اکیڈیمی تشریف لائے تو یہاں معز اللہ خان افغان کا کلام دیکھ کر آقائے علامہ فیروز نفر اور ڈاکٹر معین صاحبان نے، جو موجودہ ایران کے سب سے بڑے علما اور ارباب کمال میں شمار ہوتے ہیں، بے ساختہ فرمایا کہ یہ تو حافظ اور صائب کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ اور حیرت کا اظہار کیا کہ ایک غیر اہلِ زبان نے اتنا بلند پایہ کلام چھوڑا ہے۔ اور ادبی دنیا ابھی اس سے بے خبر ہے۔

افغان کا اردو کلام، جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، بہت ہی کم ہے یعنی یہ صرف چند غزلوں اور ایک مخمس پر مشتمل ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت سی اردو کتابوں کا بھی مصنف تھا۔ اس لئے ممکن ہے دستیاب شدہ دیوان کے علاوہ اس کا اور بھی کوئی مجموعہ ہو۔ مگر اس وقت یقین کے ساتھ اس بارہ میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس کی اور کوئی تصنیف و تالیف ابھی تک ہاتھ نہیں آئی۔

اس دیوان کی غزلوں کو افغان کے اردو کلام کا نمونہ سمجھ لیں، تو اس سے اس کے کلام پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

سرحد کے دوسرے قدیم اردو شعراء کے کلام میں وہ الفاظ جن کو اب متروک کہا جاتا ہے، بالکل ناپید ہیں۔ صرف افغان ایسا شاعر ہے جس کے کلام میں وہ تمام الفاظ بکثرت موجود ہیں۔ جو ولی دکنی کے زمانہ کے شعراء کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً :۔

سیں (سے)، یا دستیں (یا دسے)، موں (میں)، کون (کو) کسی کون (کسی کو)، ہووے (ہو) لیویں (لیں) اور انکھیاں وغیرہ۔

بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو اردو زبان میں تو نہیں، مگر ہندی کبتوں وغیرہ میں اب تک مروج ہیں۔ جیسے :۔

برہوں۔ برہہ۔ لالن۔ ساجن۔ کمھ۔ پیتم۔ پیا وغیرہ۔

ان کے علاوہ بعض الفاظ ایسے بھی ہیں۔ جو لغت کی عام کتابوں میں بھی نہیں۔ اور آج کل ان کا استعمال بالکل نہیں ہوتا اور اس وقت کے عام دیوانوں میں مشکل سے ہی ملتے ہیں۔ جیسے :

پنیہ :۔ چادر یا پگڑی سے اپنے منہ سر کو اس طرح لپیٹ لینا کہ سارا چہرہ وغیرہ چھپ جائے۔ صرف دیکھنے کے لئے آنکھوں کے سامنے تھوڑی جگہ چھوڑ دی جائے۔ پشتو میں اسے "پوزنی" یا "ترپوزنک" کہتے ہیں۔ بالعموم ڈاکو، چور یا قاتل ایسا کیا کرتے ہیں، تاکہ پہچانے نہ جا سکیں۔

مِی : مچھلی، ماہی

چونکہ یہ نسخہ معز اللہ خان کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس لئے اس کے رسم الخط کے متعلق بھی دو ایک باتیں قابل ذکر ہیں۔ اس نے ٹ کی بجائے ت لکھی ہے اور ڈ، ڑ کو پشتو کے رسم الخط کے مطابق د، ر لکھا ہے۔ ڈ اور ڑ کے متعلق تو یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ سرحدی شاعر ہونے کی وجہ سے اس نے ان حروف کو پشتو کے رسم خط کے مطابق لکھ دیا ہے، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ (ٹ) کو پشتو کے رسم خط کے مطابق ټ کیوں نہیں لکھا ؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ٹ ڈ ڑ کی موجودہ یا چار نقطوں والی شکلیں یعنی ٽ ڐ اور ڙ یا تو سرے سے اس وقت ایجاد ہی نہیں کی گئی تھیں۔ یا ان کا رواج دستور عام نہ تھا۔

ایک خصوصیت اور بھی قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ بعض الفاظ کے آخر میں ایک فالتو ہ لگا دی گئی ہے۔ جیسے:

ابہ (اب)، ایکہ (ایک)، تبہ (تب)، آپہ (آپ) اور تکہ (تک)۔

ہمارے پاس اردو کے قدیم رسم الخط کا کوئی نمونہ موجود نہیں جس سے یہ معلوم کیا جا سکے کہ یہ فالتو ہ اس وقت کے مروجہ خط میں موجود تھی۔ یا یہ صرف افغان کے رسم الخط کی خصوصیت ہے۔

ایک خالص پختون یعنی وہ جس کی مادری زبان پختو یا پشتو ہو، چاہے کتنا ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہو۔ اور اردو کے ساتھ اس کا تعلق کتنا ہی گہرا اور زیادہ کیوں نہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہیں کبھی نہ کبھی بے جان اسماء کی تذکیر و تانیث میں ضرور ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ یہ افغانوں کی خصوصیت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو (اور ہندی) کے بہت سے بے جان اسماء کی تذکیر و تانیث پشتو کے بالکل برعکس ہے۔ افغان نے بھی دو ایک جگہ یہی ٹھوکر کھائی ہے۔

افغان کی زندگی کے عام حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کا پشتو و فارسی کا دیوان اس امر کی بین دلیل ہے کہ اس نے اپنے وقت کے مروجہ علوم جیسے تفسیر، حدیث، فقہ، علم بیان اور معانی وغیرہ میں کافی دسترس حاصل کی تھی۔ اور باوجودیکہ وہ ایک خوشحال اور جنگجو خاندان کا فرد تھا، پھر بھی وہ صوفیانہ طبیعت رکھتا تھا اور زہد و تقویٰ کا بہت پابند تھا۔ اس کا بیٹا اور پوتا بھی بڑے عالم گزرے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ شیخ احمد سرہندی کا بہت عقیدت مند تھا، اس لئے اکثر سرہند شریف جایا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں ولی اورنگ آبادی کے ایک دورہ کی طرف اشارہ کر دینا شاید نامناسب نہ ہوگا۔

جناب رام بابو سکسینہ نے اپنی کتاب "اے ہسٹری آف اردو لٹریچر" کے صفحہ ۴۲ پر ولی کے حالات میں لکھا ہے۔ کہ اس نے شہنشاہ عالمگیر کے عہد میں (۱۷۰۰ء) دلی کا ایک سفر کیا۔ جہاں اس کو شاہ سعد اللہ گلشن نے۔ جو مشہور صوفی اور فارسی گو شاعر تھے، فارسی شاعری کی طرز پر ریختہ کا ایک دیوان لکھنے کی رائے دی۔ ولی اس سفر سے واپس آ کر احمد آباد گیا جہاں وہ ایک عرصہ سید ابوالمعالی کے پاس رہا۔ جب سید صاحب نے دہلی اور سرہند کے بزرگوں اور مزارات کی زیارت کا ارادہ کیا تو ولی بھی ۱۷۲۲ء میں اس کے ہمراہ آیا۔ یہ شہنشاہ اورنگ شاہ کے عہد سلطنت کا تیسرا سال تھا۔ ایکے وہ اپنا دیوان بھی اپنے ساتھ لایا تھا جس کی وجہ سے وہ یکدم آسمان شہرت پر چمک اٹھا.... بہت ممکن ہے کہ ولی جب سید صاحب کے ساتھ سرہند آیا ہو۔ اور یہاں اس کی ملاقات معز اللہ خان سے ہوئی ہو۔ کیونکہ غزل (یا ریختہ) کا رواج دہلی میں ولی کے اس دورہ کے بعد شروع ہوا اور بقول سکسینہ، وہ شعراء جو اب تک فارسی میں شعر کہا کرتے تھے، اردو کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور انہوں نے اس کے بعد اردو میں دیوان مرتب کرنے شروع کئے۔ معز اللہ خان کا نام بھی تو انہی فارسی گو شعراء میں آتا ہے۔

آخر میں اردو کے نام کے متعلق ایک عجیب بات آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں جیسا کہ اس تاریخ ادب میں مذکور ہے "ہندوستانی" کا لفظ اردو زبان کے نام کے طور پر سب سے پہلے ڈاکٹر گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ء (۱۲۰۲ھ) میں استعمال کیا ہے۔ مگر افغان نے اپنے کلام میں اس کو "اردو" کی بجائے "ہندوستانی" لکھا ہے۔ گویا اس نے ڈاکٹر گلکرسٹ سے بھی پچاس ساٹھ سال پہلے یہ نام اردو کو دیا۔

جہاں تک شاعر کے کلام کا تعلق ہے عام قاعدہ کے مطابق اس پر تبصرہ کرنے اور چیدہ چیدہ اشعار پیش کرنے کی بجائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی چند غزلیں قارئین کے مطالعہ کے لئے پیش کر دی جائیں۔ یہ غزلیں معز اللہ خان کے اس دیوان سے لی گئی ہیں۔ جو پشتو اکیڈمی نے حال ہی میں طبع کرایا ہے۔

جس نے جو دیکھا روئے تو دیوانہ ہو رہا

آئینہ خانہ تجھ سوں پریخانہ ہو رہا

کیوں سے تیرے ادے بال اپنی جان میں بھی

شمشاد مادہ زلف تراش نہ ہو رہا

تیری کٹاری پریم کی دل موں مرے لگی

جتا لہو ہوں دل مرا میخانہ ہو رہا

نرگس تری دو نین سوں بیمار پڑ رہا
سرو از خیالِ قدِ تو مستانہ ہو رہا
پوشیدہ دل مرے موں جو تھا راز عاشقی
انغاں تمام خلق موں افسانہ ہو رہا

★

میں روتا روتا بہوت جو ہوں دو نوں نینوں موں ناسور ہوا
یہی رونا تیری یاد ستیں تب جلتا ہوں دستنور رہوا
اب کیا بکاروں رو رو کر مکھ لال لہو سوں دھو دھو کر
کیا راز چھپاؤں برہوں کا جوں عالم موں مشہور ہوا
مجھے لالن جو دیدار دیا منے تن من صدقہ وار کیا
حیبہ اپنا ہم نے جار لیا جب گھونگھٹ مکھ سوں دور ہوا
منے آپ سوں لاج بڑا را ہے مرے من سوں صبر سدھارا ہے
مرا گھر تجھ بن اندھارا ہے تری یاد ستیں پُرنور رہا
نہیں چین مجھے بن تیرے سوں یہ امید نہ کرنا میرے سوں
ترا مکھ زلفوں کے اندھیرے سوں مجھ ظاہر شعلۂ طور ہوا
جب دل مو محبت جاگا ہے ترے غم سوں تن مرا تا گا ہے
جوں اجل مرے سوں بھاگا ہے اب جینا مجکوں ضرور رہا
ٹک انغاں مجکوں قرار نہیں جوں ساجن مجسوں یار نہیں
وہ بتا تاکب دیدار نہیں بہوت اپنے پر مغرور رہوا

★

مجکوں نہ زاہد سیں صلح نہ برہمن سیں عناد
میں غلامِ آدس کا ہوں جس کا پاک ہووے اعتقاد
جس کے دیوان میں دو مصرع بھواں کے فرد تھے
اب تو چار ابرو میں پایا ہے رباعی کا سواد
خاک پڑتی مراد پہ ہے سرکشوں کے غیب سیں
گر یقیں کس کوں نہیں تو دیکھ بیوے گرد باد
دیکھ کر تجھ حسن کوں قاضی بھی مفتی دیوے دل
عاشقی کی شرع میں کیا پیش جاوے اجتہاد
فاختہ کے بر میں دیکھو شالِ طوسی کی قبا
سرو قدّوں کے جلالیوں کی ہے دولت خانہ زاد
انکھیاں کے دیکھتے انغاں بیچارہ دل گیا
عشق کی نگری میں چھوٹے چور جا پکڑے ہیں ساد

★

نکل پیارے گھراتے سوں جو بن تجھ سوں خرابی ہے
بتا مکھ آپنا نکوں جو نجکوں اضطرابی ہے
اگر مرنے کا کس کوں شوق ہے آ کر ملے اس سوں
جو وہ نازک بدن پھر آج مخمور و شرابی ہے
در و دیوار سوں عاشق مبادا کیا دستنا ہے
نشانی قتل کی ساجن تیرا چہرہ گلابی ہے
ترے رخسار زلفوں کے خموں موں زیب کرتے ہیں
عجب سنبل کی شاخوں موں یہ ہر گل آفتابی ہے
کہی دانا محبت کے سنے بات آہستہ انغاں کوں
جو دیوان حسن کے مور [illegible] ذ ہے

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

افسانہ:

انورؔ ممتاز

وہ سنسنی خیز خبر، جو چھ ماہ ہوئے، اخباروں میں شائع ہوئی تھی اور جس میں بیان کیا گیا تھا کہ ایک نیا شادی شدہ جوڑا اپنی نئی کار میں کلفٹن کے ساحل پر پہلی تفریح گاہ سے دُور، غروبِ آفتاب کا لطف اٹھا رہا تھا، کہ اچانک خانقاہ کی جانب سے ایک جیپ آئی اور اُس میں بیٹھے ہوئے تین مسلح بدمعاشوں نے اُس معصوم نوجوان جوڑے پر ریوالور سے پانچ فائر کئے۔ عورت تو وہیں ہلاک ہوگئی۔ اس کا شوہر بُری طرح زخمی ہوا۔ بدمعاش زیورات اور نقدی لے کر جیپ میں فرار ہوگئے۔ یہ دل ہلا دینے والی سنسنی خیز خبر غلط ہے۔ وہ عورت جو بدمعاشوں کے ریوالور سے وہیں ہلاک ہوگئی تھی، شادی شدہ نہیں تھی اور وہ شخص جو ریوالور کے فائروں سے بُری طرح زخمی ہوگیا تھا، میں تھا۔

میں آج ہی ہسپتال سے باہر آیا ہوں، اور اس وقت اصغری بیگم کی قبر پر کھڑا ہوں، او میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور میرے دل میں غم کا طوفان بپا ہے۔

دراصل اس خبر کا سنسنی خیز حصہ درست ہے لیکن اس کا دل ہلا دینے والا حصہ کسی کو معلوم نہیں۔ صرف مجھے معلوم ہے، اور آج صبح جب میں ہسپتال سے باہر آرہا تھا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں موت کے منہ سے نکل کر دنیا کو زندگی کا کوئی پوشیدہ راز بتلانے جارہا ہوں اور اب اصغری بیگم کی قبر پر کھڑے ہوکر میں محسوس کر رہا ہوں جیسے قدرت نے مجھے اس حادثے کے پیچھے چھپی ہوئی دل ہلا دینے والی کہانی سنانے کے لئے ہی زندہ رکھا ہے۔

اُس دن میں بہت خوش تھا پہلی ریس کو چھوڑ کر باقی سب ریسوں میں میرے گھوڑے جیت گئے تھے۔ پہلی ریس میں مجھے کوئی ایک ہزار روپے کا نقصان ہوا تھا لیکن باقی جیتی ہوئی ریسوں میں تین فلوک تھے اور چار فیورٹ۔ اس طرح میں سیزن کا نقصان پورا کر کے اب کوئی اٹھائیس ہزار روپے اَپ تھا۔

چھٹی ریس میں جب سبز پری اول آئی تو ریس کورس پر سناٹا چھا گیا۔ سبز پری پر لگانے والے میرے علاوہ صرف تین اور تھے جن کو میں نے ٹپ دیئے تھے سبز پری عجیب وغریب گھوڑی ثابت ہوئی اور بہت زرخیز فلوک۔ اُس نے پانچ روپے کے ٹکٹ پر پانچ سو چوالیس روپے ادا کئے۔ جب اختتام سے ایک فرلانگ پہلے سبز پری نے دوسرے گھوڑوں کو کاٹنا شروع کیا ہے تو ریس کورس میں صرف چار آوازیں چیخ رہی تھیں: سبز پری۔ سبز پری۔ سبز پری۔ سبز پری۔ جب سبز پری ایک پوری لنگتھ سے ریس جیت گئی تو میری دُوربین دھڑپ سے میرے سینے پر آگری، اور میں اپنی فائل اور اپنی تھرموس بوتل بنچ پر چھوڑ کر بے تحاشا ریلنگ کے بائیں کنارے کی طرف بھاگا، اور جب بورڈ پر جیتنے والے گھوڑوں کے نمبروں کے اُوپر سبز پری کا نمبر نمودار ہوا، اور جب سبز پری اپنے سبزی مائل سیاہ سینے کو تانتے ہوئے ریلنگ کے پاس سے گذری تو میں پاگلوں کی طرح چلّا اٹھا: سبز پری زندہ باد! سبز پری زندہ باد!!

اور جب میں واپس اپنی سیٹ پر آیا تو میں نے دیکھا کہ میری تھرموس بوتل کے پاس سبز پری بیٹھی ہے۔ اُس کا سنگِ مرمر کا بنا ہوا چہرہ نائلون کی ساڑی کے کناروں کے درمیان سرچ لائٹ کی طرح دمک رہا تھا۔ اور اُس میں ایک اور غیر معمولی بات تھی، کوئی ایسی غیر معمولی بات جو مجھے نہایت غیر مہذب انداز میں اُس کو دیکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ وہ غیر معمولی بات کیا تھی، وہ غیر معمولی بات کیا تھی!!

لیکن میں تو اُس لمحے میں دنیا کا مشغول ترین اور امیر ترین انسان تھا۔ میرے پاس عورتوں کی دلکشیوں پر ضائع کرنے کے لئے وقت کہاں تھا۔ میں نے اپنی تھرموس بوتل اور فائل اُٹھائی اور کیش کاؤنٹر کی طرف چل پڑا۔

لیکن طاؤس کے تاروں میں ایک نہایت حسین نغمہ جھنجھنا اٹھا:

"معاف کیجئے! زحمت ہوگی سا‌ٔن دو ٹکٹوں پر میرا کیش لے آیئے۔"

اُف ترنّم! اُف موسیقی! اور اُس کو ایک دفعہ پھر دیکھنے کا موقعہ! میں ایک لمحے کے لئے اُس کی اس غیر معمولی پنہاں جاذبیت میں گم ہوگیا اور پھر جیسے نیند

سے بیدار ہوکر بولا:

"کونسا گھوڑا؟"

"نمبر ۵"

"سبز پری!"

"سبز پری"

"اوہ——کس نے بتایا آپ کو؟"

"پھر بتاؤں گی۔ کیش لے آئیے۔ تھرمس اور فائل یہیں رکھ دیجئے۔ میں ان کی حفاظت کرسکتی ہوں۔"

"اور آپ کے——"

"میرے شوہر؟ وہ دفتر میں ہوں گے۔ مجھے ٹیلیفون کیا تھا کہ سیدھی ریس کورس پہنچ جاؤں۔ ابھی تک نہیں آئے۔ شاید کوئی ضروری کام آپڑا ہوگا۔"

"لیکن آج تو اتوار ہے۔"

"جی نہیں، آپ بھولتے ہیں آج سیٹر ڈے ہے، اور سیزن کا آخری دن۔ کل اتوار سے رمضان شروع ہورہا ہے اور رمضان کے احترام میں ریس کورس بند کیا جارہا ہے۔"

"ارے ہاں، میں بھول رہا تھا۔ آپ نے اس یاد سے میری خوشی میں اضافہ کردیا ہے۔ میں سارے سیزن میں بری طرح ہارتا رہا ہوں۔ آج میں نے اپنا سارا خسارہ پورا کرلیا ہے اور کافی آپ چلا گیا ہوں۔ آج سیزن بند ہوجائے گا اور مجھے اگلے اتوار ہارنے کے لئے یہاں نہیں آنا پڑے گا۔"

وہ ہنس پڑی اور فضا میں موتی بکھر گئے۔

میں نے تھرموس بوتل اور فائل وہیں رکھ دیئے اور کیش لینے کے لئے چلا گیا۔

کاؤنٹر پر جاکر میں نے اس خاتون کے ایک ہزار اٹھاسی روپے لئے اور ان کو اپنی پینٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اور جب میں اپنا کیش گن رہا تھا تو ایک حقیقت بجلی کی طرح میرے ذہن پر کوندی، اور وہ غیر معمولی جاذبیت جو میں اس خاتون میں محسوس کر رہا تھا لیکن سمجھ نہیں سکا تھا اچانک میرے سامنے آگئی، اور وہ غیر معمولی جاذبیت ایسی معمولی بات ثابت ہوئی کہ میں بے حد مایوس ہوا۔ وہ غیر معمولی جاذبیت اس خاتون کے ہونٹوں کی لپ سٹک تھی۔

لپ سٹک سے مجھے بڑی نفرت ہے۔ لپ سٹک کے ساتھ موڈرن عورت بڑی خونخوار نظر آتی ہے۔ موڈرن عورت کے ہونٹوں پر لپ سٹک کی بڑے اہتمام سے بنی ہوئی لکیریں دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ مردوں کا خون بڑے آرٹسٹک طریقے سے چوستی ہے۔ بدصورت عورت بغیر کسی لپ سٹک کے بڑی خوبصورت معلوم ہوتی ہے مجھے سانولی عورت کے اودے اودے ہونٹ، سفید عورت کے گلابی گلابی ہونٹ اور زرد عورت کے سفید سفید ہونٹ بڑے اچھے لگتے ہیں۔ وہ آپ کو فریب میں مبتلا نہیں کرتے۔ وہ سچ بولتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں: دیکھو، ہم بدصورت ہیں۔ ہم پر اپنا وقت ضائع مت کرو۔ جاؤ اپنے اپنے گھروں کو۔ اور دوسری طرف کسی اینیمیا کی ماری ہوئی عورت کے لپ سٹک سے لپے ہوئے، جھوٹے، دغاباز اور مکار ہونٹ کہتے ہیں: ہمیں دیکھو! ہم کتنے حسین ہیں! کتنے صحت مند! کتنے تندرست! ہماری طرف دیکھو! ہمارے پاس آؤ! آؤ!! آؤ!!!

پھر اس خاتون کے لپ سٹک میں چھپے ہوئے ہونٹوں میں مجھے غیر معمولی جاذبیت کیوں نظر آتی ہے۔ یہ کیا الجھن ہے! یہ کیا راز ہے!

جب میں گیلری میں واپس آیا، تو وہ خاتون میری ریسوں کی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی اور اس کے پاس چائے کی ٹرے پڑی تھی۔ میں نے اس کو ایک ہزار اٹھاسی روپے کے نوٹ دیتے ہوئے کہا: "چائے کی ٹرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے شوہر آگئے ہیں۔" اُس نے تھینک یو کہہ کر نوٹ لئے، گنے اور اپنے پرس میں رکھتے ہوئے جواب دیا: "جی نہیں۔ میرے شوہر نہیں آئے لیکن چائے کا ٹائم آگیا ہے۔"

میں نے مشورہ دیا: "بہتر ہوتا اگر چائے کے لئے ان کا انتظار کیا جاتا۔"

وہ مسکرا کر بولی: "گھبرائیے نہیں۔ آپ کو میرے ساتھ چائے پیتے دیکھ کر وہ کچھ نہیں کہیں گے۔ میرے شوہر بڑے ایڈوانسڈ ہیں۔ آپ سے مل کر بہت خوش

ہوں گے خصوصاً جب اُنہیں معلوم ہوگا کہ سبز پری کا ٹپ مجھے آپ سے ملا تھا۔"

"مجھ سے؟"

"جی ہاں۔ اگر آج میرے شوہر یہاں ہوتے تو سبز پری ان کو بھی مالا مال کر دیتی۔ میرے شوہر ریس کے بہت رسیا ہیں۔ وہ ایک اعلیٰ افسر ہیں اور اپنی تمام تنخواہ ریسوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ اگر اس ملک میں رشوت کی رسم نہ ہوتی تو ان کی فیملی بھوکی مرجاتی۔ اُن کو ریس سے منع کرنا ایسا ہی ہے جیسا کسی پیاسے کو پانی پینے سے منع کرنا۔ اُن کی پہلی بیوی بڑی بیوقوف تھی۔ اُن کو ریس کورس سے باز رکھنے کے سلسلے میں اُن سے ہمیشہ فساد رکھتی تھی۔ آخر وہ طلاق دینے پر مجبور ہوگئے۔ اب وہ اپنے چھ بچوں کے ساتھ در در کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے۔ میں ان کو ریس کورس سے منع نہیں کرتی۔ ہر ریس میں اُن کے ساتھ آتی ہوں تاکہ اگر میں اُن کو ریس سے باز نہیں رکھ سکتی تو کم از کم ریس میں زیادہ روپیہ لگانے سے منع کروں۔ آج وہ نہیں آئے اور میں کاؤنٹر کے پاس سے گذر رہی تھی۔ آپ کو سبز پری پر پانچ سو روپے لگاتے دیکھا۔ جی چاہا کہ آپ کو اتنا روپیہ لگانے سے منع کروں لیکن معلوم نہیں مجھے کیا ہوا۔ آپ کو منع کرنے کی بجائے میں نے بھی سبز پری پر دس روپے لگا دیئے ــــ کتنے چھپے جیتی؟"

میں نے جلدی سے کہا "معاف کیجئے، میں چائے نہیں پیتا۔ کافی پیتا ہوں۔ میری تھرموس میں بہت کافی ہے۔"

وہ بھی جلدی سے بولی: "معاف کیجئے، میں کافی نہیں پیتی۔ چائے پیتی ہوں۔ اس لئے آپ چائے پئیں گے اور میں کافی۔"

★

ساتویں ریس کے گھوڑے پیڈک میں آگئے تھے۔ خاتون میری دُوربین لیکر گھومتے ہوئے گھوڑوں کو دیکھنے لگی اور دیکھتے دیکھتے بولی "اس ریس کیلئے آپکو کونسا گھوڑا پسند ہے؟"

میں نے کہا: "آج رات کو میں نے خواب میں ایک ایسا گھوڑا دیکھا ہے جس کی دُم کٹی ہوئی تھی۔ ذرا غور سے دیکھئے ان گھوڑوں میں کوئی ایسا گھوڑا تو نہیں جس کی دُم کٹی ہوئی ہو۔"

وہ دوربین سے سب گھوڑوں کو دیکھنے کے بعد بولی: "جی نہیں۔ کوئی نہیں۔"

میں نے مشورہ دیا: "اچھا کتاب سے سب گھوڑوں کے نام پڑھئے۔"

وہ پڑھنے لگی: "مائی ڈارلنگ۔ سپوٹنک۔ گولڈ ڈسٹ۔ لنڈی کوتل۔"

میں نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "ٹھہریئے، لنڈی کوتل جیتے گا۔ لنڈی کا اشارہ کٹی ہوئی دم کی طرف ہے اور کوتل گھوڑے کو بولتے ہیں۔"

چنانچہ لنڈی کوتل جیتا لیکن اس ریس میں میں زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ کیونکہ اُس خاتون نے مجھے زیادہ روپے لگانے سے منع کر دیا تھا۔

★

شام ہوگئی۔ ریسنگ سیزن ختم ہوگیا۔ خاتون کا خاوند نہ آیا۔ میں نے کہا: "اگر کہیں تو میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ آؤں۔ میرے پاس کار ہے۔"

وہ بولی: "نوازش ہوگی۔ میں نے آپ کو آج بہت زحمت دی۔"

"جی، بالکل نہیں۔ آیئے۔"

میں نے اُس کے لئے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا لیکن وہ بولی: "اگر آپ کار خود ڈرائیو کر رہے ہیں تو میں آپ کے پاس آگے بیٹھوں گی۔ تاکہ آپ کو اپنے بنگلے کا راستہ بتانے میں آسانی ہو۔"

"جی بہتر۔ کدھر چلیئے گا؟"

"کلفٹن۔ وہ جو کلفٹن بینڈ سٹینڈ کے پاس نئے بنگلے بنے ہیں۔ اُن میں ایک۔"

کار چل پڑی۔ باتھ آئیلینڈ کے پاس جا کر اُس نے خاموشی کا طلسم توڑا: "وہ سامنے نیلا بنگلہ۔ بینڈ سٹینڈ کی طرف سے چوتھا۔"

تھوڑی دُور جا کر وہ پھر بولی: "آپ اتنا تیز کیوں جا رہے ہیں؟ کیا آپ کو بہت جلدی ہے؟"

میں نے کہا: "جی نہیں۔ میرا خیال ہے آپ کا انتظار ہو رہا ہوگا۔"

"اس بنگلے کے ماحول میں کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ برج شروع ہوگئی ہوگی۔ کوئی نئی پارٹنر آگئی ہوگی، شراب کی بوتلیں کھل گئی ہوں گی۔ میرے بنگلے کا ماحول کوئی زیادہ اطمینان بخش نہیں ہے۔"

"کہیں تو کار آہستہ کر دوں؟"

"جی نہیں۔ آپ کی وائف انتظار کر رہی ہونگی۔"

"جی نہیں۔ میں نے ابھی شادی نہیں کی۔ میرا انتظار کرنے والا کوئی نہیں۔"

"تو پھر میں آپ کو تھوڑی سی اور زحمت دوں گی۔ مجھے کلفٹن کے ساحل پر چھوڑ آیئے۔ میں اس وقت سیر کرنے کی عادی ہوں۔"

"لیکن کیا اس وقت کلفٹن کے ساحل پر ایک لیڈی کا اکیلے سیر کرنا محفوظ ہوگا؟"

"بالکل محفوظ۔ میں پچھلے دو سال سے اس وقت وہاں روزانہ پیدل سیر کرنے جاتی ہوں اور آج اگر آپ کو میرا نکر کھائے جا رہا ہو تو آپ میرے ساتھ ٹھہر سکتے ہیں۔"

میں لاجواب ہوگیا۔

★

ہم نیلے بنگلے کے پاس سے گذر گئے۔ کلفٹن کا ساحل آگیا۔ اُس کی خواہش پر میں کار کو ہجوم سے پرے غیر آباد ساحل پر لے گیا۔ ہم کار سے نیچے اترے۔ سمندر کی لہریں فضا میں موسیقی بکھیر رہی تھیں۔ دھیمی دھیمی مرطوب ہوا چل رہی تھی۔ شام کے سائے لمبے ہو رہے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔

یکایک لپ سٹک کی غیر معمولی جاذبیت کا راز کھل گیا۔ وہ لپ سٹک کی سرخی کہاں تھی۔ وہ تو مصوّر کے موقلم کا اعجاز تھا۔ وہ تو سنگِ مرمر کے چہرے کا ایک مرکزی مقام تھا۔ وہ تو آرٹ کی تکمیل کی طرف ایک اہم قدم تھا۔ اس نے مجھے چونکا دیا: "آپ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہیں؟"

"اوہ — معاف کیجئے!"

"میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں آپ سے ایک بہت اہم بات کرنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ کو میرا چہرہ دیکھنے سے فرصت ہوگئی ہو۔ تو عرض کروں۔"

"فرمایئے، میں شرمندہ ہوں۔"

"میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر آپ کے سامنے کسی بلڈنگ میں آگ لگی ہو اور دھوئیں اور شعلوں میں الجھی ہوئی انسانی آوازیں پکار رہی ہوں: مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!! تو آپ کیا کریں گے؟" اُس کے الفاظ نے میرے ذہن کے پردوں پر میری زندگی کا ایک نہایت مکروہ واقعہ اجاگر کر دیا۔ میری زندگی کا یہ مکروہ واقعہ مجھے جب کبھی یاد آتا ہے۔ میری نظریں ندامت سے جھک جاتی ہیں۔ میری نظریں خاتون کے حسین چہرے سے جھک کر اُس کے پاؤں کے پاس آگئیں اور میں بت کی طرح سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔

وہ پھر بولی: "میں پوچھ رہی ہوں کہ اگر سیڑھیوں پر کسی کا پاؤں پھسل جائے اور وہ سمندر میں گر جائے اور اپنی جان بچانے کے لئے چیخنے لگے: مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!! تو آپ کیا کریں گے؟"

میں اسی طرح خاموش، اس کے پاؤں کے پاس اپنی نظریں گاڑے کھڑا رہا۔

اب وہ جھنجھلا کر بولی: "مجھے آپ کی خاموشی نے حیران کر دیا ہے۔ کیا آپ ایسے سادہ سوال کا جواب بھی نہیں دے سکتے؟ کیا آپ دُور کھڑے ہو کر کسی کو چلتے ہوئے اور ڈوبتے ہوئے دیکھتے رہیں گے؟ کیا آپ کے دل میں اس کو بچانے کی تمنا پیدا نہ ہوگی؟"

میرے ذہن سے صدمے کا اثر زائل ہو رہا تھا اور اب میں اس کی باتوں کا جواب دینے کے قابل ہوگیا تھا۔ میں نے کہا "ہوگی۔"

"پھر آپ بولتے کیوں نہیں؟ آپ کی زبان بند کیوں ہوگئی ہے؟"

"محترم خاتون! میں ایک بزدل انسان ہوں۔ میرا قد چھ فٹ لمبا ہے۔ میرا سینہ ۳۶ انچ چوڑا ہے۔ میرے بازو لوہے کی طرح سخت ہیں۔ میں تندرست و توانا ہوں لیکن بزدل ہوں، اور جب مجھے یہ یاد آتا ہے تو میں پتھر کے بت کی طرح ساکت ہو جاتا ہوں۔ میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلتا۔ میری زبان بند ہو جاتی ہے۔"

"میں نے تو آپ کو بزدل نہیں کہا۔"

"تھوڑی دیر ہوئی آپ نے دو ایسے دردناک منظر پیش کئے تھے جن میں سے مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!! کی آوازیں آ رہی ہیں۔ یہ الفاظ میرے دماغ پر بھاری بھاری پتھروں

کی طرح گرے۔ ان الفاظ نے مجھے میری زندگی کے ایسے شرمناک واقعہ کی یاد دلائی جس میں میں پہلی دفعہ اس حقیقت سے دوچار ہوا کہ میں بزدل ہوں۔ میں چھ فٹ لمبا ہوں۔ ۳۶ انچ چوڑا سینہ رکھتا ہوں۔ لوہے جیسے بازوؤں کا مالک ہوں اور بزدل ہوں اور جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے تو ایک اور حقیقت سامنے آتی ہے کہ ایک بزدل انسان اگر کسی جلتے ہوئے اور ڈوبتے ہوئے انسان کو بچانا بھی چاہے تو نہیں بچا سکتا۔"

"کیا میں وہ واقعہ سن سکتی ہوں؟"

"اتوار کا دن تھا۔ ریسنگ سیزن زوروں پر تھا۔ میرا دوست اور میں تباہ کن بیٹنگ موڈ میں تھے۔ وہ جیت رہا تھا، میں ہار رہا تھا۔ وہ ہار رہا تھا، میں جیت رہا تھا۔ آج جیسا دن نہیں تھا لیکن اچھا دن تھا۔ اور شام کو جب ہم پیلیس چائے پینے گئے۔ ہماری جیبیں کافی بھاری تھیں۔ چائے پینے کے بعد میرے دوست نے اپنی بیوی کے لئے چند قیمتی زیورات خریدے اور ہم کار میں بیٹھ کر ڈرگ روڈ سٹیشن کی طرف چل دیئے۔ میرا دوست ڈرگ روڈ ریلوے سٹیشن کے نزدیک ایک بنگلے میں رہتا تھا، اور اس دن اس کی بیوی نے مجھے ڈنر کے لئے بلایا تھا۔ میرا دوست جب بھی ریس کورس میں آتا تھا مجھے اس کو چھوڑنے کے لئے ڈرگ روڈ جانا پڑتا تھا۔ وہ ان دنوں کار چلانا سیکھ رہا تھا۔ اور کراچی سے واپس جاتے وقت میری کار وہی چلاتا تھا۔ اس لئے وہ ان سڑکوں سے بچتا تھا جہاں ٹریفک زیادہ ہو اور ہم ریس ختم ہونے کے بعد ڈرگ روڈ سٹیشن کو واپس جانے کے لئے ہمیشہ اس اکیلی اور سنسان سڑک کو استعمال کرتے تھے۔ جو للیا سیمنٹ فیکٹری کے سامنے سے ہو کر آرڈیننس ڈپو کے پاس سے گزرتی ہوئی ڈرگ روڈ سٹیشن پر جا پہنچتی تھی ـــ رات سخت کالی تھی، اندھیرا بہت ڈراؤنا تھا، ہیڈ لائٹوں کی روشنی کار کے گزرنے کے لئے اتھاہ اندھیرے کے سینے میں دھندلا سفید سوراخ بناتی جا رہی تھی۔ یکایک سڑک کے دائیں کنارے سے ایک عورت ہیڈ لائٹوں کی روشنی میں آ گئی، بال بکھرے ہوئے، کپڑے پھٹے ہوئے۔ اس نے اپنے دونوں بازو ہوا میں بلند کئے اور چلانے لگی: مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!!! میں لے لیا اور نکال لیا۔ میرے دوست نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ میں چلایا: "عزیز! کار کو سٹوپ کرو، بریک لگاؤ، روکو!" عزیز نے میری طرف دیکھے بغیر کہا:- "DON'T BE SILLY" اور کار کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ عورت کی دردناک پکار سنائی دے رہی تھی، مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ! مجھے بچاؤ!!! ـــ میں نے کہا: "عزیز! روکو کار کو۔ وہ سڑک کے درمیان ہے۔ کچلی جائیگی۔" عزیز نے کہا: "بیوقوف! ہم سخت خطرے میں ہیں" ـــ وہ بے بس ہو کر سڑک کے دائیں کنارے کی طرف ہو گئی۔ کار اسکے پاس سے گزر گئی۔ میں عزیز کو بے تحاشا گالیاں دینے لگا۔ اس نے کہا: "ابے گدھے کے بینگ! تو نے کبھی اخباروں میں جرائم کا کالم پڑھا ہے؟ اگر ہم یہاں ٹھہر جاتے تو ہماری ہڈیوں اور بوٹیوں سے چیلوں اور کوؤں کی ڈنر پارٹی ہوتی، اس عورت کے ساتھ ایک پورا گینگ تھا" ـــ ڈرگ روڈ سٹیشن آ گیا۔ میں نے زبردستی کار رکوائی اور عزیز سے کہا: "بچو! تو اب یہاں اپنے گھر تک پیدل مارچ کر۔ ڈنر میں شامل نہ ہو سکنے پر بھابی سے معذرت۔ میں اس عورت کی مدد کے لئے جا رہا ہوں۔" اور میں طوفانی رفتار سے واپس چل پڑا۔ اس مقام پر پہنچ کر میں کار سے اترا، اور سڑک کے نزدیک ایک پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اپنی ریوالور کو ہوا میں ہلاتے ہوئے میں زور زور سے چلانے لگا: "کون مجھے مدد کے لئے پکار رہا تھا، کون تھا جس نے مجھے مدد کے لئے پکارا تھا؟" میری آواز ارد گرد کی پہاڑیوں میں گونجی اور گم ہو گئی ـــ میں ایک دوسری پہاڑی پر چڑھ گیا اور پھر چیخنے لگا: "محترمہ! میں آپ کی مدد کے لئے آ گیا ہوں۔ محترمہ! آپ کہاں ہیں؟" ـــ کوئی جواب نہیں۔ میں ایک اور پہاڑی پر چڑھ کر چلانے لگا: "بہن آؤ! مجھے بتاؤ تمہیں کیا تکلیف تھی؟ بہن! مجھے بتاؤ تمہیں کس نے تکلیف پہنچائی تھی؟" ـــ وہی خاموشی، وہی سناٹا، وہی اندھیرا۔ میں مایوس ہو کر اپنی کار کی طرف چل پڑا، اور کار کے دروازے پر کھڑے ہو کر رقت آمیز لہجے میں بولنے لگا: "بہن مجھے معاف کر دو۔ میں ایک بزدل انسان ہوں، میری آنکھوں کے سامنے تمہاری حرمت لٹ گئی اور میں تمہاری کوئی مدد نہ کر سکا۔" میں چپ ہو گیا اور خاموشی تکلیف دہ ہو گئی۔

وہ دیر تک میرے چہرے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر بولی: "آپ بزدل نہیں ہیں، جذباتی ہیں اور جذبات میں بہہ کر حالات کی نزاکت کو محسوس نہیں کرتے۔ میں آپ کے دوست کی عقلمندی کی داد دیتی ہوں۔ اگر وہ آپ کے کہنے پر اس خطرناک علاقے میں کار روک دیتے تو ممکن ہے آپ دونوں کی لاشوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ان سنسان پہاڑیوں میں بکھیر دیا جاتا۔ اس واقعہ سے آپ کے دوست کی معاملہ فہمی کا ثبوت ملتا ہے۔ اس سے آپ کی بزدلی ثابت نہیں ہوئی۔ اس واقعہ نے تو یہ ثابت کیا ہے کہ اگر کوئی بے بس عورت آگ میں جل رہی ہو یا پانی میں ڈوب رہی ہو تو آپ اپنی جان خطرے میں ڈال کر بھی اس کی مدد کو پہنچیں گے۔"

"ہو سکتا ہے کہ میں کسی آگ میں جلتی ہوئی یا پانی میں ڈوبتی ہوئی مظلوم عورت کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرے میں ڈال دوں لیکن مجھے افسوس ہے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔"

اس کا سانس رک گیا اور وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی: "میں نے آپ سے کونسی مدد مانگی ہے؟"

"محترمہ! ادھر ادھر کی فضول باتیں کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ آپ اپنے شوہر کو پسند نہیں کرتیں۔ آپ کی اور آپ کے شوہر کی عمروں میں فرق ہے۔ آپ چاہتی ہیں کہ میں آپکو

آپ کے شوہر کے پنجے سے چھڑا لوں۔ معاف کیجئے، میں شادی شدہ عورتوں اور ان کے شوہروں کے درمیان آنا پسند نہیں کرتا؟

اس کے جواب نے مجھے حیرت زدہ کر دیا: "کون شادی شدہ عورت؟ کس کا شوہر؟"

اس ظاہر و باہر سوال کا جواب کیا تھا؟ میں نے کہا: "آپ اور آپ کا شوہر!"

میرا کوئی شوہر نہیں، میری ابھی شادی نہیں ہوئی، میں کنواری ہوں"

یکایک ڈرامے کا سین بدل گیا۔ ایک نیا کردار میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور میری دلچسپی کا پیمانہ کناروں تک اچھل پڑا! میں دیر تک چپ چاپ مبہوت اس کی طرف دیکھتا رہا اور پھر حیرت سے بوجھل الفاظ میں بولا۔ "خاتون، آپ کون ہیں؟"

"میرا نام اصغری بیگم ہے۔ میں ایسے ماحول میں پیدا ہوئی تھی جہاں شادیوں کے سوال پیدا نہیں ہوتے، اور جہاں ہر ہر لمحے شادیاں ہوتی ہیں۔ میری ماں کی چھ لڑکیاں تھیں جن میں سے پانچ کو اس نے پانچ پانچ سو روپے میں خریدا تھا۔ میں چھٹی تھی اور صرف میں اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوئی تھی۔ میرے باپ بننے کے دعویداروں میں بڑی بڑی خونریز لڑائیاں ہوئیں۔ سب سے پہلے ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد گوہر خاں کو میرا باپ تسلیم کیا گیا۔ گوہر خاں نے بڑا اقتدار حاصل کیا۔ اور اپنے مکے اور مونچھوں کے زور پر سارے بازار کا چودھری مقرر ہوا۔ ایک دن اس نے میری ماں کو بری طرح مارا اور میری ماں نے دوسرے دن موقعہ پاکر اس کو یار اکھلا دیا جب یارا اس کے گھٹنوں میں اتر گیا تو فوراً امان اللہ نے میرا باپ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ گوہر خاں کی پارٹی نے بری طرح شکست کھائی اور امان اللہ کو میرا باپ تسلیم کر لیا گیا۔ دراصل میرا باپ ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ میری ماں اپنے وقت کی بہت بڑی ناچنے اور گانے والی تھی اور جب اس نے فلموں میں ناچنا اور گانا شروع کر دیا تھا، تو اس کی آمدنی کسی وزیر باتدبیر کے برابر ہو گئی تھی اور ہمارے ان وزیر نے میری ماں کو اپنے سوشل فنکشنوں میں مدعو کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے امان اللہ کے اقتدار سے بہت جلد لوگ جلنے لگ گئے اور اس کے خلاف سازشیں ہونی شروع ہو گئیں۔ آخر ایک سازش میں اس کے بھتیجے حامد حسین نے امان اللہ کو چاقو سے ہلاک کر دیا، اور میرا باپ بن بیٹھا۔ میرے نئے باپ نے میری تعلیم، میرے ناچ اور میرے گانے کی طرف خاص توجہ دینی شروع کی۔ میرا نیا باپ مجھے اپنی سوسائٹی کے اعلےٰ طبقے کے لئے اور فلم کے لئے تیار کر رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ وہ دنیا میں اسی طرح نام پیدا کرے جس طرح بعض ایکٹرسوں کے "باپوں" نے پیدا کیا ہے۔ میرا تیسرا باپ بڑا طاقتور ثابت ہوا۔ اس نے اپنے تمام دشمنوں کو اپنے راستے سے ہٹا دیا سوائے ایک دشمن کے ...."

میں اصغری بیگم کے گفتگو کے انداز سے اس قدر متاثر ہوا کہ میرے لئے ایک خاموش تماشائی کا پارٹ ادا کرنا مشکل ہو گیا۔ اس لئے میں اصغری بیگم کی بات کاٹ کر بولا: "وہ دشمن کون تھا؟"

اس نے بڑے ڈرامائی انداز میں جواب دیا: "میں"

"آپ؟"

"میں نے اس ماحول کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس دن میری سولھویں سالگرہ تھی۔ بڑی پر تکلف چائے تھی۔ میرا ناچ تھا۔ شہر کے تمام اعلیٰ طبقے کے دولتمند تاجر مہمان تھے۔ تقریب کے اختتام پر مجھے دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا اور میری پہلی رات کے کرانے کا نیلام شروع ہوا۔ میں دروازے کے پاس کھڑی سب کچھ سن رہی تھی: پانچ سو۔ چھ سو۔ آٹھ سو۔ ایک ہزار۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں باہر نکلی، اور سب سے مخاطب ہو کر بولی: "معزز مہمانوں کو معلوم ہونا چاہئیے کہ میں عصمت فروش لڑکی نہیں ہوں۔ میں ایک پڑھی لکھی پاکیزہ خیالات کی لڑکی ہوں۔" میرے باپ کا آہنی پنجہ میرے بازو پر پڑا، مجھے گھسیٹ کر سب سے اندر کے کمرے میں لے جایا گیا۔ باپ کا ہنٹر کھونٹی سے اترا۔ اور مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک بے بس بے دست و پا، بدنصیب لڑکی ہوں۔ جب میں روتے روتے تھک گئی تو میں نے اپنے سر پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ وہ ایک ہزار روپیہ ادا کرنے والا تاجر تھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں امید کی پہلی کرن نظر آئی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا کہ وہ مجھے ایک ہفتہ کے اندر اندر اس ماحول سے لے جائے گا اور مجھ سے شادی کر لے گا۔"

"پسند تھا وہ آپ کو؟"

"اگلے دو تین دن میں مجھے اس کے بارے میں جو معلومات فراہم ہوئیں، وہ بڑی تشویشناک تھیں۔ وہ بلیک مارکٹ کا بادشاہ اور سمگلروں کا شہنشاہ تھا۔ اس نے ایک ممتاز سیاسی جماعت کو ایک لاکھ روپے چندہ دیا تھا اور اس کے ٹکٹ پر دس روپے فی ووٹ کے حساب سے قیمت ادا کر کے اسمبلی کا ممبر منتخب ہو گیا تھا۔ اس نے ایک ایکٹر

ہونو، کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۸ء

وہ اَن پڑھ تھا۔ اس لئے علم کی روشنی
زمین میں صرف اپنے خرچ پر مسجد بنوائی تھی اور اُس کے چاروں طرف دکانیں بنا کر ان کو دس دس ہزار روپے پگڑی لیکر کرائے پر دیا تھا۔
پھیلانے کے لئے اس نے ایک خیراتی اسکول، اور ایک یتیم خانہ کھولا ہوا تھا جس پر وہ تمام روپیہ لگا دیتا تھا جو خواہ مخواہ حکومت کو انکم ٹیکس کی شکل میں دینا پڑتا۔ اُس کی صرف
ایک بیوی تھی اور اتنی دولت ہوتے ہوئے صرف ایک بیوی پر اکتفا کر لینا بڑی نامعقول حرکت تھی۔ یہ باتیں بہت تشویشناک تھیں، لیکن میری تشویش بے معنی تھی، میرے
سامنے پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا سوال نہیں تھا۔ مجھے تو ایک تنکے کا سہارا چاہیئے تھا۔ اس کا پیغام آیا کہ وہ دوسرے دن بارہ بجے مجھے لینے آئے گا!"

"پھر وہ آیا؟"

"دو مہینے دن بارہ بجے معلوم ہوا کہ وہ ایک ٹ دلے کا چیف منسٹر ہو گیا ہے!"

"اور اب وہ کہاں ہے؟"

"جیل میں"

وہ ہنس پڑی۔ میں بھی ہنس پڑا۔

پھر وہ بولی: "جب میری ماں کو اور میرے باپ کو میری سکیم کا پتہ چلا تو ان کی گرفت مجھ پر زیادہ مضبوط ہو گئی لیکن کچھ عرصے کے بعد امید کی دوسری کرن نظر
آئی، میری ماں کا انتقال ہو گیا۔ میں خوش ہوئی کہ میری ماں راستے سے ہٹ گئی ہے اور اب مجھے اپنا راستہ ڈھونڈنے میں آسانی ہو گی لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ میرے
باپ نے میری ماں کے فرائض انجام دینے شروع کر دیئے اور مجھے تالے میں بند رکھا جانے لگا۔ کچھ مدت کے بعد اُمید کی تیسری کرن نظر آئی۔ حکومت نے عصمت فروشی کو ممنوع
قرار دے دیا لیکن اس کا بھی کوئی زیادہ فائدہ نہ ہوا۔ اس نے میرے باپ کو اور مجھے دوسرے مکروہ جرائم کی طرف دھکیل دیا۔ آج امید کی چوتھی کرن نظر آئی ہے، کیا
آپ میری مدد کریں گے؟"

میں سوچ میں پڑ گیا۔

"آپ سوچتے ہوں گے میں بہت گندے ماحول میں پلی ہوں۔ بہت گندے ماحول میں رہتی ہوں۔ اس لئے آپ کے قابل نہیں ہوں۔ جی ہاں، میں آپ کے قابل
نہیں ہوں، جائیے۔ آرام کیجئے۔"

میں تھوڑی دیر چپ کھڑا رہا۔ پھر بولا: "اصغری بیگم، آپ کا سوال بہت سنجیدہ ہے۔ اس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جا سکتا۔"

"آپ بزدل ہیں۔ آپ کا چھ فٹ لمبا قد۔ آپ کا چھتیس انچ چوڑا سینہ، آپ کے طاقتور بازو، سب بے کار ہیں۔ آپ کسی مظلوم عورت کی جان بچا سکتے ہیں لیکن
اس کی زندگی نہیں بچا سکتے۔ کسی مظلوم عورت کو بچانا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس کی زندگی کو بچانا بڑی جوانمردی ہے، اور آپ وہ ہیں جن کی زندگی میں ایک ایسا شرمناک
واقعہ پیش آ چکا ہے جس کی یاد آپ کی گردن جھکا دیتی ہے۔ میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں کہ اگر آپ کی زندگی میں وہ شرمناک واقعہ پیش نہ آیا ہوتا اور آپ اس مصیبت زدہ
عورت کو جس نے ڈالمیا سیمنٹ فیکٹری سے آگے، اُس کالی ڈراؤنی رات کو، اس سنسان سڑک پر آپ کو مدد کے لئے پکارا تھا بچانے کے لئے ٹھہر جاتے۔ تو آپ اس کی
مدد نہ کر سکتے، کیونکہ وہ عورت آپ کو اپنی حرمت اور جان بچانے کے لئے نہیں پکار رہی تھی۔ اپنی زندگی بچانے کے لئے پکار رہی تھی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے؟"

"میں اس عورت کو جانتی ہوں۔"

"اصغری بیگم، وہ عورت کہاں ہے؟ میں اُس سے معافی مانگنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ مجھے اس سے ملا سکتی ہیں؟"

"ہاں"

"کون ہے وہ؟"

"میں!"

"اصغری بیگم!"

"میں پچھلے چھ ماہ سے آپ کا تعاقب کر رہی ہوں۔ میں کراچی کے سب سے بڑے جرائم پیشہ گینگ کی ایجنٹ ہوں۔ ان چھ مہینوں میں کئی دفعہ آپ کی زندگی

پیروں کے نیچے آئی لیکن میں زندگی سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے ہر دفعہ آپ کو چھوڑ دیا۔ صرف دو منحوس موقعوں پر گینگ کی پستولوں کی نالیوں کے سامنے مجھے آپ کو موت کے نزدیک لانا پڑا۔ لیکن دونوں دفعہ میرے ذہن میں ایک سکیم تھی۔ اُس سنسان سڑک پر میں نے بکھرے بالوں اور پھٹے کپڑوں والی مصیبت زدہ عورت کا پارٹ ادا کیا کہ شاید آپ کو مجھ پر رحم آجائے اور گینگ کے آنے سے پہلے آپ مجھے کار میں بٹھا کر اس ماحول سے دُور کہیں لے جائیں، اور آج میں اپنے بہترین لباس میں اور اپنی بہترین رعنائیوں میں آپ کے سامنے آئی ہوں کہ شاید آپ کو مجھ پر پیار آجائے اور آپ مجھے اس ذلت کے غار سے نکال لیں۔ آپ کا کام آسان تھا: آپ کو صرف ایک زندگی بچانی تھی۔ میرا کام مشکل تھا مجھے دو زندگیاں بچانی تھیں"۔

"اصغری بیگم، یہ آپ نے کیا غضب کیا۔ آپ نے مجھ جیسے ذلیل انسان کی زندگی کو اپنے پیروں کے نیچے کیوں نہ روند ڈالا؟"

اصغری بیگم نے میری طرف بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر نظریں جھکا کر بولی: "چھ ماہ کا عرصہ بڑا قیامت ہوتا ہے، اور قیامت کے دن، جب کوئی کسی کا نہیں ہوتا پھر بھی کوئی کسی کا ہو جاتا ہے۔ میرے گینگ کو کچھ معلوم نہ تھا۔ میرا گینگ سمجھتا تھا کہ میں پچھلے چھ ماہ سے آپ کو اس کے جنگل میں پھنسانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرے گینگ کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں پچھلے چھ ماہ سے آپ کو بچانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ آج آپ کی اور میری آخری ملاقات ہے۔ اس کے بعد میں آپ کا تعاقب نہ کروں گی۔ اس کے بعد میں گینگ کے لئے کام کرنے سے انکار کر دوں گی، اور گینگ میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا، ظاہر ہے پستول کی گولی! میری موت! خدا حافظ! جائیے، آپ فوراً یہاں سے چلے جائیے۔ آپ سخت خطرے میں ہیں۔ گینگ صرف سورج کے غروب ہونے کا انتظار کر رہا ہے"۔

اور جیپ خانقاہ کے پاس نمودار ہو گئی۔ وہ چلائی: "وہ آگئے۔ جاؤ! خدا کے لئے جلدی جاؤ!"

میں نے کار کا دروازہ کھولا۔ اور اصغری بیگم سے کہا: "گھبراؤ مت! کار میں بیٹھو! وہ ہمیں نہیں پکڑ سکیں گے"۔

وہ گھبرائی ہوئی بولی: "نہیں! نہیں!! اب میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی۔ میرے جانے کا وقت نکل گیا ہے، اب وہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں جانے دیں گے"۔

میں نے اپنے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "اور اب دنیا کی کوئی طاقت مجھے اصغری سے جدا نہیں کر سکتی" میں نے اصغری بیگم کو بازو سے پکڑ کر کار میں بٹھا لیا اور کار سٹارٹ کر دی۔

ڈز! ڈز! ڈز! ڈز!— کار کے پہیے ریت میں دھنس گئے۔ اصغری بیگم سخت گھبراہٹ میں بولی: "انہوں نے کار کو پنکچر کر دیا ہے!"

میں نے اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا: "گھبراؤ نہیں، میرے پاس ریوالور ہے"

جیپ میری کار سے کچھ فاصلے پر ٹھہر گئی۔ اصغری بیگم دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ میں ریوالور لیکر دوسرے دروازے سے باہر نکلا۔ اصغری بیگم رونے، گڑگڑانے اور چلانے لگی:

"ابا! ابا!! ان کو چھوڑ دو۔ ان کی جان بخش دو۔ یہ میرے دوست ہیں۔ مجھے ان سے محبت ہے!"

ڈز! ڈز! ڈز! ڈز!— اصغری بیگم ریت میں اور خون میں ڈھیر ہو گئی۔ میں اس کو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھا۔

ڈز! ڈز! ڈز!— پھر مجھے معلوم نہیں کیا ہوا +

★

"اسٹائل" —————— بقیہ صفحہ (۱۸)

رہتا ہے قطع نظر اس بات کے کہ وہ بہ اعتبار موضوع یا تکنیک کس قدر متنوع ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے (یہاں میں شخصیت کی انفرادیت کو سامنے نہیں رکھتا ہوں) اسٹائل کو بہ حیثیت مجموعی پانچ بڑے خانوں میں تقسیم بھی کیا جا سکتا ہے۔

ایک اسلوب زیر لب گنگنانے، خود اپنی ذات سے ہمکلام ہونے یا اپنے ہی خواب میں در آنے کا ہوتا ہے۔ دوسرا خواب سے بیدار ہو کر دوسروں کو ہو نکانے اور جگانے کا۔ تیسرا کاروباری جسے ان دنوں صحافتی کہتے ہیں۔ چوتھا خالصتاً فکری اور پانچواں طنز و مزاح کا کہ بڑا شریر ہوتا ہے۔ اب اس کے بعد میرا یہ کہنا اپنی بات کو دہرانا ہوگا کہ نہ صرف یہی صحیح ہے کہ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ بلکہ یہ بھی صحیح ہے کہ جس طرح نَے کی آواز میں نے نواز کا سوز دروں ہوتا ہے نہ کہ کارنامۂ نَے۔ اسی طرح شعر و ادب کی جلوہ ریزی میں فنکار کا سوز دروں یا اس کی شخصیت ہی بالآخر اہم ہوتی ہے نہ کہ اس کی زباندانی ؎

بقدر حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم۔

اور اسلوب اس کی اسی شخصیت کی انفرادیت ہی سے متعین ہوتا ہے لیکن نکھار اس اسلوب میں فن پر کمال حاصل کرنے ہی سے پیدا ہوتا ہے +

ماہِ نو، کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۸ء

افسانہ:

زہرخند

ابوسعید قریشی

کلفٹن کے مرکزی ویپر لیمپ یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے اجالے کو دور کرنے کے لئے کسی نے اندھیرے کے دیئے جلا دئے ہوں، باغ کے تختے، زمین پر ہوتے ہوئے بھی معلق ہونے کا احساس اور کراچی کا ہجوم! سایوں کے اس انبوہ میں میری نظر یا ایک ایسے چہرے پر پڑیں جسے میں نے کہیں دیکھا تھا۔ مجھے ستی یاد آگئی اور اس کے قہقہے میرے کانوں میں گونج اٹھے۔

اس کا نام ثمینہ تھا لیکن ہم لڑکیاں اسے ستی کہا کرتیں۔ اس کے پاؤں چلتے وقت زمین کو تھوڑی چھوتے تھے۔ بجلیاں بھری ہوں جیسے، ہوا میں ناچا ہی۔ اس کا وجود ہوسٹل کی بند فضا میں آزاد چڑیوں کی ہوا کا جھونکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ کسی گیت کا ٹکڑا ہوتا۔ اور جیسے بھونرا کبھی باغ کے ایک کنج میں ہوتا ہے کبھی دوسرے میں، ستی کی گنگناہٹ کبھی ڈارمیٹری میں سنائی دیتی، کبھی کسی سینئر کے کیوبیکل میں اور کبھی کومن روم میں۔ وہ کہا کرتی چلیو اس مل بیٹھنے کو غنیمت جانو۔ ناؤ کے مسافر، تربخن کی مٹیاریں اور ہوسٹل کی سہیلیاں کب کب اکٹھی ہوتی ہیں۔ اور ہماری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ نکلتے۔ مگر اس کے حسین مسکراتے چہرے کو دیکھ کر ہمیں اپنے دکھ درد سب بھول جاتے۔ اس کی جگنوؤں سی آنکھیں بجھے دلوں کے دیئے جلاتی تھی وہ کہا کرتی، میری باتیں کہیں لکھ رکھو۔ یہ تمہیں فلسفے کی کتابوں میں نہیں ملیں گی۔ افلاطون اگر آج زندہ ہوتا تو سقراط کے بجائے میری شاگردی کرتا۔ ایک دن آئے گا کہ تمہیں میرے اقوالِ دانش یاد آئیں گے۔ تو سنو۔۔۔۔۔

بوڑھی شکی مزاج وارڈن نے بارے میں اس نے ایک روز کہا تھا کہ اگر تم میں سے کسی کو ایسی ساس مل گئی تو کیا کرو گی؟ یہ تو تمہارے پارٹ کی ریہرسل ہے۔ آئندہ زندگی کے لئے ریاضت ہے!۔ لیج ہم کہتیں۔ زہر نہ دے ڈالیں گی ہم ایسی ساس کو۔ اس کا جواب ہمیں یہ ملا تھا کہ زہر اتنا آسان نہیں ہوتا، کھاتا نہ کھلایا ہوتا تو موٹروں کے بجائے لوگ زہر کے پرمٹ لیتے۔ اور ہاں بوڑھی وارڈن جوان سوتیلی ماں سے تو بُری نہیں۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ چھٹیوں میں جب میں گھر جاتی ہوں تو مجھے تمہارے خط بھی سنسر ہو کر ملتے ہیں۔ اور ہم چیخ اٹھی تھیں۔ ہائے اللہ! اس روز ہمیں اپنی بوڑھی وارڈن مس برق، جس کو ہم مِس کیکٹس کہا کرتی تھیں، فرشتہ بن کر دکھائی دی تھی۔ اور ہمارے دل ستی کے لئے ہمدردی کے جذبات سے معمور ہو گئے تھے لیکن اس نے ہمارے جذبات کو تمسخر آمیز قہقہوں میں اڑا دیا تھا۔ اور ہم ایسی خفیف ہوئی تھیں کہ بس۔

ستی کو مصوری کا بے پناہ شوق تھا۔ کارٹون بنانے کا تو اسے کچھ ایسا ڈھنگ آتا تھا کہ بس۔ بڑی بڑی نک چڑھی صاحبزادیاں کوٹلے کے اس ٹکڑے سے کانپا کرتی تھیں جس سے وہ بیگمات کی چڑیلیں بنا کر رکھ دیتی تھی۔ لیکن قدرتی مناظر اور سٹل لائف سے اس کو خاص لگاؤ تھا۔ وہ کہا کرتی کہ مجھے ان کا تعاون کا جذبہ بہت پسند ہے۔ یہ احتجاج کے لفظ سے ناآشنا ہیں۔ کاسنی پھول کو لال رنگ کر دو تو بھی وہ اعتراض نہیں کرے گا۔ یعنی اسے دوسرے کی رائے کا احترام کرنا آتا ہے اور اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ کہو کیا فلسفہ ہے؟ تم لوگ تو بے کار برٹرینڈ رسل اور جانے کس کس کے پیچھے بھاگتی ہو۔

"اس طرح ہنسی ہنسی میں وہ جانے کیا کچھ کہہ ڈالتی اور ہمارا دل بہلاتی رہتی لیکن ہم اس سے جلد محروم ہو گئیں۔ ایک مرتبہ جب وہ چھٹیوں میں گھر گئی تو کالج کھلنے کے قریب اس کا خط آیا کہ میری والدہ زیادہ تعلیم کی قائل نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ زیادہ لکھ پڑھ کے لڑکیاں آوارہ ہو جاتی ہیں۔ ابا سے کہہ رہی تھیں کہ اس چڑیل کو بڈھا کانے لگاؤ۔ الف اے تو پاس کر لیا۔ یا نوکری کراؤ گے اور خاندان کی ناک کاٹو گے۔ اچھا اب خدا حافظ۔ مس کیکٹس سے میرا سلام کہنا۔ خدا کرے کہ وہ سسرال میں میرا انتظار نہ کر رہی ہو۔ اچھا رخصت۔ دیکھیں اب ناؤ کے مسافر پھر کب اکٹھے ہوتے ہیں۔

اس روز کلفٹن کے باغ میں یہ باتیں مجھے پھر یاد آگئیں۔ لیکن کیا یہ ستی ہی ہے؟ میں سوچ میں پڑ گئی۔ وہ تو اڑھائی گز کے دوپٹے کا بوجھ بھی برداشت

نہیں کرسکتی تھی۔ بس ایک چیز ی ہوتی تھی گلے میں اور یہ برقع پوش۔ ٹھیک کہ اس نے نقاب الٹ رکھا تھا لیکن تھی اور برقع! چاہے پیرس کی ایجاد کیوں نہ ہو یہ بات میرے ماننے ہی میں نہیں آسکتی تھی اور قریب تھا کہ میں پاس سے نکل جاتی لیکن شاید وہ میرے دل کا حال جان چکی تھی۔

"ہاں ہاں میں تمہی ہی ہوں بھئی۔ کیوں؟" — "اللہ! اس کیوں" میں جو اس کے ہنسنے سے ادا کیا تھا جانے کیا بات تھی کہ میرے جی میں آئی تمہی سے لپٹ کر خوب زور زور سے روؤں۔ مگر اس نے میرے ہاتھ تھام لئے۔ "ادھر آجاؤ۔ اس کنج میں، اگر ہم یہیں رونے لگیں تو وضع داری کے خلاف ہوگا۔ نہیں سمجھیں؟ ارے تم میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ یہ برقع! ارے بھئی ساڑھی، غرارے اور شلوار قمیص کی طرح یہ بھی لباس ہے۔ ٹھہرو۔ میں تمہیں ایک بات بتاتی ہوں۔ لیکن پہلے یہ کہو کہ شادی ہوگئی تمہاری؟"

"نا" میں نے کہا۔ "امی کہہ رہی تھیں ایسی کونسی جلدی ہے۔ جہاں بی اے کیا ہے وہاں ایم۔ اے بھی کرلو۔ ہم تو یہی جہیز تیار کر رہے ہیں تمہارے لئے ورنہ بابا ہم نہیں مانتے۔ اگر لڑکیاں بھی ایم۔ اے کرنے بیٹھ گئیں تو مرد بیچارے کیا کریں گے۔"

"نہیں تو آنربری ڈگریاں بھی مل جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسی۔ اور میرے کانوں میں ایک بار پھر وہی آواز گونج اٹھی جو روٹھی ہوئی روحوں کو منایا کرتی تھی۔

"مگر بات کہاں سے کہاں پہونچ گئی۔" وہ بولی۔ "میں تمہیں ایک راز بتانے والی تھی۔ گرہ سے باندھ لو، چٹیا میں گوندھ لو یا تعویذ بنا کے گلے میں ڈال لو۔ سنو: انسانی جسم۔ اور خاص طور پر یہ عورت کا چہرہ بڑی گھناؤنی اور خوفناک چیز ہے۔ اس لئے اس کو ہمیشہ چھپائے رکھو۔ جس طرح آدمی ناسوروں پہ پٹی باندھ لیتا ہے، اسی طرح اس کو غلافوں اور نقابوں میں ملفوف رکھو۔ تم کو بھی میں یہی مشورہ دوں گی کہ برقع پہنو۔ قوم کی نجات برقعے اور محض برقعے میں ہے۔ سب ناسوروں کو چھپا دو اور سمجھو کہ وہ نہیں ہیں۔ اور ہاں۔" اس کا لہجہ انتہائی رازدارانہ ہوگیا۔ "اور ہاں، حسن کو کیا سمجھیں۔ حسن کو خدا کا عذاب سمجھو۔ اور ان بدبخت شاعروں، مصوروں، سنگتراشوں اور افسانہ نگاروں کی ایک نہ سنو، ایک نہ مانو۔ دیوانے! اپنی موت آپ مرجائیں گے۔ کہو کیسی تقریر تھی؟ آخاخاخا۔" اور پھر وہ یکایک خاموش ہوگئی۔ "خیر ہٹاؤ۔ تم اپنی کہو نجو۔ کیا حال ہے تمہارا؟ جی چاہتا ہے تم سے خوب زور سے گلے ملوں اور اونچی اونچی آواز میں چیخیں ماروں۔ اتنی خوش ہوں میں، اتنی خوش ہوں میں مگر تماشہ بن جائے گا۔ اور یہ تو پہلے ہی تماشائیوں کا شہر ہے۔ اچھا یہ تو بتاؤ فریدہ اور ریحانہ اور نکہت کہاں ہیں۔ میکے میں یا سسرال گئیں؟" اور تبھی میں نے سنا۔ "کہ مس کیکٹس، اللہ معاف کیجیو، مس برج مرے ہوئے آدمی کے نام رکھنا گناہ ہوتا ہے بھئی۔ ہاں تو مس برج چل بسیں بے چاری۔ چلو کوئی بات نہیں۔ اگر اُس دنیا میں بھی کوئی ہوسٹل ہے تو اس کو ضرور جگہ مل جائے۔ تجربہ کار آدمی ہے بے چاری اور یہ ایکسٹنشنز کا زمانہ ہے۔ خدا غریب کے گناہ معاف کرے۔ اور ہماری بھی عاقبت سنوارے۔ خیر، اب یہ بتاؤ کہ تم کب آئیں اور کیسے آئیں زندوں کے اس قبرستان میں؟"

"میری خالہ یہیں ہیں نا آجکل۔ یونیورسٹی بند تھی۔ میں نے کہا چلو کراچی ہی کی سیر کرلو، ٹھہرنے کی جگہ تو ہے ہی۔"

"اری اس کی یہاں کوئی کمی نہیں۔ وہ کیا کہا تھا مرزا غالب نے ـ ...... یہ وہ کافر دل ہے۔ تو بس۔ مگر تم نے ابھی ابھی وہ کیا نام لیا تھا بھلا سا۔ یونیورسٹی نا! وہ کیا ہوتی ہے بہن۔ دیکھو بھئی تم ہمارے ساتھ انگریزی مت بولو۔ ہمارا تمدن غرق ہوجائے گا۔ ثقافت فالودہ ہوجائے گی، میرا مطلب ہے کثافت آلودہ ہوجائے گی۔ ارے! ایک تو یہ "ق" مجھ سے کبھی ادا نہیں ہوتا۔ ہمیشہ گھپلا کر جاتی ہوں۔ ہمارے یہاں ایک بڑی بی آیا کرتی تھیں۔ حیران کو حریان اور بالکل کو کابل کہتی تھیں بے چاری۔ میں نے اس کی نقل اتاری تھی۔ اور میں جو الفاظ کو یوں گڑبڑ کر جاتی ہوں تو یہ اسی کی سزا ہے شاید۔ وہ کس کا قول ہے ـ بڑا بول بولو نہ ہرگز کبھی۔ شیخ سعدی تو نہیں؟ مگر وہ تو فارسی گو تھے۔ دماغ کیا خراب ہوگیا ہے۔ اب فارسی بھی نہیں پہچانی جاتی۔ یہ سب تمہاری نگوڑ ماری اردو کی مہربانی ہے۔ اب عربی داں ایسی غلطی نہیں کرسکتا۔ اس کا عین غین ہمیشہ صاف ہوتا ہے۔ ہمارے محلے کے ملّاجی اردو کو بھی، عربی، ہی کہتے ہیں جناب۔ کیا سمجھیں۔ یہ چیز کتنی کیسی ہے، اس کا مجھے علم نہیں۔ شاید مصادر کا مسالہ لگتا ہے۔ ہاں! ابھی یہ تو بتا نا کہ 'مسا' س سے ہے، ص سے یا ث سے۔ اور وہ دوچشمی ہے یا کانی، یا وہ حلوے والی۔ ارے توبہ اب ہمارے جیوں کی حالت یہ ہوگئی۔ اور یہ سب عربی سے لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ جبھی تو وہ کہتے ہیں کہ عربی بولو، عربی لکھو اور عربی کھاؤ۔ تم بھی عربی کا ایم۔ اے کررہی ہو نا!

نہیں۔ AESTHETICS میں نے کہا

اچھا۔ ANAESTHETICS یعنی بے ہوش کرنے والی ادویہ کی ماہر بن رہی ہو تم۔ ڈاکٹری، ڈاکٹری۔ اور پھر وہ ہنسنے لگی۔ وہی اگلے وقت کی کھنک تھی جیسے پائل بول رہی ہو۔ مگر وہ یکایک خاموش ہو گئی۔ اور اس کی نظریں سامنے جھاڑیوں پہ گڑ گئیں۔ لو بھی بڑی بی بھی آ گئیں۔ اس عمر میں بھی وہ نظر پائی ہے کہ سوئی میں دھاگہ ڈلوا لو چاندنی رات میں مجھے تو لاکھوں کے ہجوم میں بھی ڈھونڈ نکالتی ہے۔ یاد دلانے آئی ہے مجھے گھر چھوڑ کے ڈرائیور کو انہیں جہانگیر پارک سے لانا ہے۔ مجلس ثقافتِ شرقیہ کا خاص اجلاس ہے نا آج۔ حقوقِ نسواں پہ مذاکرہ ہے کوئی۔ جانے کیا ہوتا ہے۔ ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں۔ یہ کہتے ہیں کہ بڑا بڑا وفد آیا ہوا ہے بمعہ تو مصر شریف سے۔ بغداد، المقدس اور عربیہ سے۔ مگر میں پھر باتیں کرنے بیٹھ گئی۔ کار لیٹ نہ ہو جائے کہیں۔ اور میں نے آج تک انہیں شکایت کا موقع نہیں دیا۔ رخصتی کے وقت والد صاحب نے کہا تھا کہ اب تو اس گھر کی ہو گئی۔ ایسے میں آدمی مالک کو ناراض نہیں کر سکتا۔ اچھا ابھی اب چلتی ہوں۔ کل تم سے پھر ملاقات ہو گی، جی بھر کے۔ تین بجے چلی آنا۔ چائے وہیں پینا۔ خوب گپ رہے گی۔ ابھی تو مجھے تمہاری کہانی سنی ہے۔ آج تو میں ہی بکواس کرتی رہی۔ تمہیں دیکھ کے اگلی عادت پھر زندہ ہو گئی۔ رسی کا بل! میری خوشدامن بھی مجھ سے یہی کہا کرتی ہیں کہ بہو تیری زبان تو سروتے کی طرح چلے ہے۔ بوڑھی ہو گئیں بے چاری۔ جان ان کی پاندان میں بند ہے۔ کہانیوں کے جن کی طرح۔ کھانا چاہے ملے نہ ملے پان ضرور ملنا چاہیئے۔ ہاتھوں پہ بس مہندی لگی معلوم ہوتی ہے۔ ارے توبہ پھر وہی داستانِ امیر حمزہ شروع کر دی میں نے۔ اب بڑی بی کو کیسے بتاؤں کہ نجو میری کون ہے۔ یہ میری سہیلی ہیں بڑی بی۔ کل ہمارے یہاں آ رہی ہیں۔

مجھے اپنے گھر کا پتہ دے کر وہ چلی گئی۔ اور میں سوچتی رہ گئی کہ سمی کو ملنے سے مجھے خوشی ہوئی تھی یا رنج ہوا تھا۔ ٹھیک ہے وہ ہمیشہ کچھ اسی انداز سے باتیں کیا کرتی تھی اور یہ کہنا مشکل ہو جاتا تھا کہ وہ کونسی بات سنجیدگی سے کر رہی ہے اور کونسی محض دل لگی سے لیکن اب کے اس کے لہجے میں کچھ اور بھی تھا۔ جیسے ستار کی ایک طرب غلط آواز دے رہی ہے۔ لیکن یہ خود میرے کانوں کا بھی قصور ہو سکتا تھا۔ اس سے ملے آخر دو سال گذر چکے تھے۔ مگر۔ مگر اس کا چہرہ! ایسے ہی چند غیر ملکی عورتیں میرے سامنے سے گذریں۔ ان کے چہروں پر بھی وہی نیلاہٹ اور مردنی تھی، مرکری ویپر لائیٹ کا شعبدہ لیکن برقع! میں نے سنا تھا کہ انہیں دنوں کچھ دیوانے بے نقاب پھرنے والی خواتین کی چٹیاں کاٹنے کے لئے اپنی آستینوں میں قینچیاں چھپائے پھر رہے تھے۔ چنانچہ بعض آزاد خیال خواتین بھی مستورات بن گئی تھیں اور برقع دوزی کا کاروبار چمک اٹھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود بھی بے شمار خواتین کھلے چہرے پھرتی تھیں۔ تو! اور میں یہی سوچتی گھر پہونچ گئی۔ رات کھانے پہ خالہ خود بلانے آئیں تو مجھے خیال آیا کہ میں نے ابھی کھانا بھی نہیں کھایا۔ لیکن بھوک نہیں تھی۔ جی چاہتا تھا کہ رات جلد ختم ہو اور جلد سمی سے ملوں اور پوچھوں کہ آخر تم کہنا کیا چاہتی ہو؟ رات کٹی تو دن ڈھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ ایک ایک گھنٹہ سال سال بھر کا ہوا جا رہا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے گھڑی نے اڑھائی بجائے۔ میں نے ٹیکسی منگوائی اور سمی کا پتہ دیا۔

ٹیکسی جمشید روڈ کے ایک عظیم الشان بنگلے کے سامنے آ کے رکی، جسے دیکھ کر ایک بار تو میں گھبرا گئی۔ اور سوچنے لگی کہ یہ مکان سمی کا نہیں ہو سکتا۔ مکان کے باہر الحاج مرزا عبدالحسن چاندی والے کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ اور لوہے کے جالی دار دروازے پر دارالبرکات کے حروف چمک رہے تھے۔ میں اسی شش و پنج میں تھی کہ اتروں یا لوٹ جاؤں کہ اسنے میں وہی رات والی بڑھیا دروازے کی جانب آتی دکھائی دی اور میری ڈھارس بندھی کہ پتہ ٹھیک ہی تھا۔

چلی آؤ نا بیٹی۔ بڑھیا نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ بہو بیگم تو صبح سے تمہارا انتظار دیکھ رہی ہیں۔

یہ کہتے وقت بڑی بی مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں سے میں گھبرا گئی کہ کہیں کپڑوں میں شکن تو نہیں پڑے تھے، لیکن میری توجہ بٹ گئی۔ فوارہ، پھول اور سبزہ زار۔ کراچی میں یہ چیزیں! جہاں ترتیب پہ چڑھانے کو پھول نہیں ملتے وہاں کارنیشن اور ٹیولپ۔

برآمدے کا فرش سنگِ مرمر کا تھا اور چھت پہ۔ لیکن بڑی بی نے دروازہ کھولا۔ غلام گردش میں سبز قالین فرش بہار کی طرح چمک رہا تھا۔ اور فضا ایرکنڈیشننگ کا پتہ دے رہی تھی۔

ایک اور دروازہ کھلا جس کے آگے ایک بھاری پردہ تھا۔ اور پردے کے پیچھے سمی کھڑی مسکرا رہی تھی۔

میرا گرو ادھر ہے بھئی۔ اس نے مجھے بازوؤں سے پکڑ کے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ گھڑیوں کو آج جانے کیا ہو گیا تھا۔ وقت

تھم گیا ہو جیسے۔ اب رک جائے تو احسان بھی مانوں۔ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ گئی۔ یہ کراچی کی آب و ہوا بھی ایک مصیبت ہے۔ یہاں تو گلا ہی بیٹھا رہتا ہے۔

ہنستی کیوں ہو سمی۔ میں نے کہا۔ کیا میں تمہیں نہیں جانتی؟

یا میں تمہیں نہیں جانتی!

مجھے معلوم نہیں تھا کہ خود میرا گلا بھی رندھ گیا ہے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے ہیں۔ ہم دونوں کھلکھلا کے ہنس پڑیں۔

کچھ عجیب میلوڈرامہ ہے۔ سمی نے کہا۔ لیکن مسسٹر وزڈم کہا کرتی تھیں کہ میلوڈرامہ ادب عالیہ میں شمار نہیں ہوتا۔ خدا معلوم کیوں؟ دراصل یہ نقاد بڑے فراڈ ہوتے ہیں۔ رعب ڈالنے کے لئے ایسے ہی انٹ شٹ اصول بنا لیتے ہیں۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ سہیلیاں، ناؤ کے مسافر کہیں اتفاق سے قفلِ ابجد کے حروف کی طرح مل جائیں تو کیا انہیں رونے کا بھی حق نہیں؟ یہ کہہ کر وہ پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ آخر جب ہمارے دل کی بھڑاس نکل گئی تو اس نے ایک تپائی میرے سامنے کھینچتے ہوئے کہا:

لو سیب کھاؤ۔ سنا ہے رقیق القلب، توبہ ہے ان قافوں سے، میرا مطلب ہے سیب ہم جیسے کمزور دل والوں کے لئے بہت مفید ہوتا ہے۔ کیا کہتے ہیں ایسی چیز کو؟ ہاں۔ مفرح! حکیم پتہ نہیں کیا نوس کہ فوس نے ہاں ہاں جعلینوس، میرا مطلب ہے جالینوس نے اسے حتمی علاج بتایا ہے۔

میں ہنس پڑی مجھے پھر وہی سمی یاد آگئی جو سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو بھی ہنسی میں اڑا دیا کرتی تھی۔ نقلیں اتارنے کا تو اسے خاص ملکہ تھا۔

ارے تم میری عربی سے مرعوب نہیں ہوئیں؟ شین قاف اور عین غین کی مشق کرتے کرتے میرا گلا پھر آیا اور تم ہنس رہی ہو۔ خیر ہٹاؤ۔ فی الحال سیب کھاؤ۔ چھلکے سمیت کہ چھیل دوں؟ ویسے حیاتین، جنہیں تم لوگ وٹامن کہتی ہو، چھلکے ہی میں ہوتے ہیں۔ سوچ کیا رہی ہو؟

یہ رنگ، یہ خوشبو، میں نے کہا۔ پھولوں کی طرح سیب تو دراصل دیکھنے کی چیز ہے۔ مگر اس نے میری بات کاٹ دی۔

لیکن تم نے یہ نہیں سوچا کہ سیب ہو یا پھول زیادہ عرصہ شاخ بھی اسے اپنے ساتھ نہیں رکھتی۔ مگر میں پھر جانے کیا فلسفہ بکنے لگی ہوں۔ دراصل تمہیں ملنے کی خوشی سے میرا دماغ چل گیا ہے۔ چلو میں تمہیں اپنا مکان دکھاؤں۔ اہلِ ذوق کی زیارت گاہ ہے یہ بنگلہ۔

بے شک۔ میں نے کہا۔ اتنا سنگِ مرمر تو میں نے مغلوں کے محلوں ــــ

یا مقبروں ہی میں دیکھا ہوگا۔ سمی نے میری بات کاٹی۔ اور قہقہہ لگایا۔ ایک تو میری قہقہہ بازی نہیں جاتی کمبخت۔ یاد ہے نادرہ ہماری کیمسٹری ٹیچر کیا کہا کرتی تھیں مجھے: "YOU ARE A FLASK OF LAUGHING GAS, SAMINA." ناک میں دم تھا بے چاری کا۔ شکر کرتی ہوگی کہ بلا ٹلی ــ لڑکیوں کو لوگ پیار سے بھی بلا ہی کہتے ہیں نجمہ، ماں باپ بھی، تم نے کبھی سوچا: کیوں؟

کمرا تنے اس کی خوابگاہ آگئی۔ اور یہ میرا پلنگ ہے بھئی۔ اس کے ساحل کا مجھے کبھی پتہ نہیں چلا۔ آڑے ترچھے کسی طرح لیٹ جاؤ۔ چاروں طرف پلنگ ہی پلنگ ہوتا ہے۔ جب میں اس پہ لیٹتی ہوں تو سمت کا احساس نہیں رہتا۔ کہا تا سمت کی حس سُن ہو جاتی ہے۔ چھت پہ بڑی سی کمپس لگوانے کی سوچ رہی ہوں..

ــــ اور یہ ادھر بچوں کا ہوسٹل سمجھ لو۔ ایک فقط مس برج نہیں ہے۔ سمی نے کہا۔ اس وقت چائے پی رہے ہوں گے۔

اس نے دروازے پہ آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے آواز آئی: تشریف لے آیئے۔ ہم نے دروازہ کھولا تو السلام علیکم کے کورس نے ہمیں سر پہ اٹھا لیا۔ بیٹھ جاؤ بھئی۔ سمی نے کہا۔ اور ہاں وعلیکم السلام۔ جیتے رہو۔ یہ میری سہیلی ہیں۔ میں نے کہا تم سے بھی ملتی جائیں۔ آپ ایم۔ اے کر رہی ہیں۔ ہر چند کہ لڑکیوں کو اتنی تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن کسی کو جتنا پڑھنا ہو اس کے لئے تو استاد کی ضرورت ہوتی ہی ہے نا۔ اور کالج میں استاد کی اپنی تعلیم کم از کم ایم۔ اے تک ہونی چاہیے۔ اگر تم میں سے کسی کو کبھی جمالیات کے مضمون سے دلچسپی ہوئی تو شاید تمہیں میری انہی سہیلی سے پڑھنا ہوگا۔ ان کا نام یاد رکھنا۔ نجمہ۔ میں انہیں بے تکلفی سے نجو کہا کرتی ہوں۔ ہاں تو آدمی جس طرح نیم حکیم سے ڈرتا ہے اسی طرح اس کو نیم استاد سے بھی خوف کھانا چاہیے۔ کیوں ہے نا بشریٰ۔

جی امی جان۔ بشریٰ نے کہا۔ وہ کوئی سولہ سترہ برس کی لڑکی تھی لیکن قد سمی سے نکلتا ہوا۔ بدن قدرے بھاری اور چہرے پہ تمسخر، خوف اور ادب کے ملے جلے جذبات۔ میری بوکھلاہٹ جو سمی کی مبہم باتوں سے پہلے ہی بڑھتی چلی آ رہی تھی، اب بالکل ہی پہیلی بن گئی۔ میں نے سمی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس کے نازک ہونٹ تھرتھرا رہے تھے جیسے تذبذب میں ہیں کہ ہنسیں یا روئیں۔

۱۵ لو کراچی، دسمبر ۱۹۵۸ء

سلمیٰ بڑی نیک لڑکی ہے ماشاءاللہ۔ سمی نے کہا۔ اب کے میٹرک میں فرسٹ ڈویژن حاصل کیا ہے۔ عربی میں اول آئی ہے۔ مجھے اس سے صرف ایک شکایت ہے۔ میں چاہتی تھی کہ یہ سب بچے مجھے آپا باجی کہیں۔ لیکن ان کے ابا مصر ہیں کہ امی، میرا مطلب ہے امی ہی کہا جائے۔ اور یہ کبریٰ، طاہرہ، صغریٰ اور طوبیٰ ہیں۔ بڑی ارجمند، ایسی سلیقہ شعار، باتمیز، مہذب کہ ان کی موجودگی کا گھر میں پتہ ہی نہیں چلتا۔ اب میں ٹھہری ہوسٹل کے شور کی عادی ایسے میں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے کبھی کبھی کہ ماشاءاللہ بھرا گھر ہو اور اتنی چپ چاپ۔ مگر بیٹھ جاؤ نا بھئی۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے تمہاری۔ اور یہاں سبب ہے خانساماں نے؟ چائے کے ساتھ پھل ان کا معمول ہے نجو۔ ان کے ابا تو چائے پسند ہی نہیں کرتے۔ بس رواج ہے اس لئے بنتی ہے۔ اور اس گھر میں اس رواج کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری مجھ پہ ہے۔ اچھا ممی خدا حافظ!

اس خدا حافظ کی بازگشت نے نہیں کمرے سے باہر دھکیل دیا۔ سمی نے کہا: دیکھا۔ یہ ہے تربیت۔

سمی کے کمرے میں جانے سے بار بڑی ممی آ ہوس کی ٹرالی پہ جاری کے برتن اندھیری رات میں جگنوؤں کی طرح جگمگا رہے تھے کیا کھاؤ گی؟ سمی نے میز کی طرف اشارہ کیا جہاں کوئی بیس قسم کی مٹھائیاں پڑی تھیں۔

صرف چائے۔ میں نے کہا۔

وجہ، باعث، سبب، جواز؟ سمی نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

تمہاری باتوں سے بھوک مٹ گئی۔

پھر تو میں واقعی بڑی قیمتی جنس ہوں۔ نانی اماں کی طرح مجھے صندوقچی میں بند رکھنا چاہیئے۔ شکر! جاہل لوگ چینی کہتے ہیں۔ کتنے چمچے؟ میں کہنا چاہتی تھی چاہے کتنی الٹ دو۔ کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن پردے کی سلاخ پر پیتل کے چھلے جھنجھنائے۔ اور ایک بزرگ صورت سامنے نظر آئی۔ چھوٹی موہری کا پاجامہ، پاؤں میں مخملی جوتی۔ اوپر سفید ریشمی اچکن جس کے ساتوں بٹن گلے تک بند۔ اور سر پہ دوپلی ٹوپی۔ بدن دوہرا۔ اچکن کے نیچے توند کا ابھار۔ چہرے پر بھرپور داڑھی، یہیں ریشمی ہوئیں۔

اوہ! معاف کیجیئے گا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ پردہ ہے۔ اور وہ الٹے پاؤں لوٹ گئے۔ لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کوئی دروازے میں اس جگہ پہ کھڑا ہمیں گھور رہا ہے۔ اتنے باہر سے آواز آئی اللہ جانے یہ بڑی بی کہاں مر گئی ہے۔ کسی نے بتایا تک نہیں کہ مہمان آئے ہوئے ہیں بیگم صاحب کے!! اور پھر ایک بڑی سی لاحول کا ریڈ ورمیں گونجی۔

خسر ہیں تمہارے؟ میں نے سمی سے پوچھا۔ جواب ملا۔ نوج! بڑی آئیں صورت شناس۔ میرے۔ میرے میاں ہیں کمبخت۔ شوہر میرے۔ سفید بالوں سے دھوکا ہوا تمہیں پگلی! بال تو آدمی کے سائے میں بھی سفید ہو جاتے ہیں۔ دھوپ کی ہی شرط نہیں۔ یہ دیکھ لو!۔ اور سمی نے اپنا جوڑا کھول کے ہتھیلی پہ پھیلا دیا۔ لو؟ آیا خیال شریف میں۔ چہرہ شناسی اور عمر کا اندازہ لگانا کالج کی لڑکیوں کا کھیل نہیں جناب!۔ مگر پردوں کے چھلے پھر چھنکے۔ اور بڑی بی نمودار ہوئیں۔

میاں کہتے ہیں کہ مہمان سے معافی مانگیئے گا میری طرف سے۔ میں غلطی میں چلا آیا۔ اور پوچھتے ہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔

نہیں بڑی بی۔ کچھ نہیں چاہیئے۔ شکریہ! بڑی بی چلی گئی تو سمی مجھ سے مخاطب ہوئی، دیکھا!

ہاں دیکھا! میں نے کہا۔

حسد نہ کرنے لگنا خدا کے لئے۔ ایسا برخوردار شوہر کسی نصیبوں والی کو ملتا ہے۔ اور اس نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور میرے بدن سے گویا جان ہی نکل گئی۔ اتنا دھیان رکھتے ہیں میرا کہ بس۔ ذرا گرمی پڑی اور کولر لگوا دیئے۔ نوکروں کو حکم ہے کہ دلہن بیگم کو ذرا تکلیف نہ ہو۔ اور تو نے خسر بنا دیا۔ واہ! میں کہنا چاہتی تھی کہ بنو نہیں اب۔ مگر اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ جب وہ بول رہی ہو تو پہلے بھی کسی کو باری نہیں ملا کرتی تھی۔ اور اب تو۔

میرا زیور نہیں دیکھا تو نے۔ ایک تو ہی ہے جس نے مجھ سے یہ فرمائش نہیں کی۔ زانہ۔ خیر یہ دیکھ۔ وہ ایک پوشیدہ طاقچے سے زیور کا صندوقچہ نکال لائی۔ عام استعمال کی چیزیں رکھی ہیں یہاں۔ باقی بینک میں ہیں کہ کون حفاظت کرتا پھرے۔ میرا تو خیر جی ہی نہیں چاہتا کچھ پہننے کو۔ کون وزن اٹھائے پھرے۔

مگران کی خاطر۔ یہ موتیوں کی مالا نہیں دیکھی تم نے۔ وہ حج کرنے گئے تھے تو لوٹتے وقت عدن سے لائے تھے۔ میرے بیاہ سے پہلے کی بات ہے یہ — اس نے ہار میرے گلے سے لگا دیا۔ اور کتنا پیارا لگتا ہے تمہیں۔ یہ تمہارا ہوا نجو۔ جب شادی ہوگی تمہاری —

شادی! میں نے کہا۔

کیوں۔ سوچ میں پڑ گئی۔ کہیں مس برچ کا اثر تو نہیں ہو گیا؟

شادی کا اگر یہی مآل ہے تو؟ — میں نے کہا۔ اور پھر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں پھوٹ پڑی۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے کہیں۔ رحم آتا ہے واقعی کہ تمہارا یہی انجام ہونا تھا۔

رحم، ہمدردی! وہ بھڑک اٹھی۔ یہ کیا بک رہی ہو۔ میں کوئی کوڑھی ہوں، اپاہج ہوں، بیمار ہوں، مفلوج ہوں کہ رحم اور ہمدردی کی طالب ہونے لگی۔ ان الفاظ سے مجھے نفرت ہے نفرت! اور پھر جیسے اپنی آواز کی بلندی سے گھبرا گئی اور چپ ہو گئی۔ پردے کے پیچھے اس وقت پھر جھنجھنائے اور بڑی بی نمودار ہوئی۔

آپ نے مجھے آواز دی تھی بیگم صاحب؟

ہاں بڑی بی۔ سمی نے ذرا سے توقف کے بعد کہا۔ سمی کیا کہنا تھا مجھے۔ توبہ ہے! ہاں چائے کچھ ٹھنڈی ہو گئی ہماری باتوں میں۔ میں نے کہا بڑی بی کو زحمت دوں۔ اچھا اور کہو، نجو،

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں۔ معاً مجھے اس کی مصوری یاد آگئی۔ میں نے پوچھا صورت گری کا کیا حال ہے؟

صورت گری۔ صورت گری کہا نا تم نے؟ جیسے کسی نے جگا دیا ہو۔ ہوں تصویریں۔ ایسے ہی لڑکپن کا خبط تھا وہ۔ اور اس کے ہونٹوں پہ ایک راضی برضا سی مسکراہٹ نظر آئی۔ صورت گری نجو؟ — سچ تو یہ ہے کہ اب دل کا زور نہیں رہا!

مجھے دفعتاً محسوس ہوا کہ سمی کے کانوں میں ہیروں کی بجلیاں یکایک بجھ گئی ہیں اور چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہے۔ مگر عین اس وقت کلاک کی کوئل پانچ بار کوکی۔

ارے؟ سمی نے کہا۔ پانچ بج گئے۔ اور تم ابھی آکر بیٹھی بھی نہیں۔ کالج میں ریس ہوئی ہو جیسے اور پتہ بھی نہ چلے۔ آج کے ٹائم ٹیبل میں ریس کے بعد بچوں کو دودھ پلانے کا پیریڈ ہے۔ یہ لو آپا بھی آگئی۔ منّوں کو آج یہیں لے آؤ آیا۔ شاباش! ان کی خالہ بھی دیکھ لیں گی۔ بڑی پکی دوستی ہے کبھی ہم میں ہوسٹل میں ہم اکٹھی رہا کرتی تھیں۔

ہاں! میں بھی کہوں۔ آج بیگم صاحب بڑی خوش خوش نظر آرہی ہیں۔ ضرور کوئی سہیلی ہوں گی پرانی۔ اچھی سہیلیاں سکھیاں مشکل سے ہی ملتی ہیں بہو رانی۔

بس اتم خود سیانی ہو۔ اب ذرا منّوں کو لے آؤ جلدی سے۔

اب کے پردہ جھنجھنایا تو بچہ گاڑی نظر آئی۔ گاڑی میں دو ننھے منے کلوٹے سے پڑے تھے۔

یہ میاں جناب ہمارے صاحبزادے۔ ہمارے یہاں تمام غیر فطری رسموں سے نفرت ہے۔ نا بچہ یہ برخوردار محض ماں کا دودھ اور دلیاؤں کا عرق پیتے ہیں۔ مگر اس کا بھی وقت مقرر ہے — تمہیں ان میں کوئی خاص بات نظر آئی نجو؟

میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ اس درجہ مشابہت! صرف کپڑوں کا فرق تھا۔ سمی بھانپ گئی۔ تمہارا اندیانہ درست ہے، اس نے کہا۔ لوگ ایک کو ترستے ہوئے بوڑھے ہو جاتے ہیں اور یہاں اللہ نے —

مگر ان کی پرورش؟ اور تم کہتی ہو کہ ڈبے کا دودھ بھی منع ہے۔

ہاں۔ یہ لو ہے! سمی نے کہا۔ مگر سوچتی ہوں کہ اگر دو کے بجائے رباعی ہو جاتی تو میں کیا کرتی۔ کیا کر سکتی تھی میں! یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ یہ صاحب چند گھنٹے پہلے تشریف لائے تھے۔ انہیں زیادہ بھوک لگی ہوگی۔

اس وقت سمی کے چہرے پر مجھے پھر وہی روشنی نظر آئی جو میں نے گذشتہ شام اس عورت کے چہرے پہ پھیلی ہوئی تھی۔ جسے میں نے کہیں دیکھا تھا۔

محمد عمر میمن

چاچا فضلو نے چونک کر چور نظروں سے اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ گلی کے سرے پر کوئی گوالا اپنی دھن میں کچھ گنگناتا اپنی گائیں بھینسوں کو ہانکتا جا رہا تھا۔ اور گلی کے داہنے سرے پر بڑے سے پیپل کے درخت کے نیچے گاؤں کے مکھیا اللہ دیا کی چوپال تھی جہاں ہر وقت لوگوں کا جمگھٹا رہتا۔ اس وقت بھی حقے کا دور چل رہا تھا۔ اور گاؤں کے چند نکھٹو قسم کے بے پروا کسان چوپال میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ بابا فضلو کو یہاں سے گزرتے ہوئے سخت کوفت ہوتی تھی مگر زمیندار کے مال گوداموں تک بس یہی تو ایک پُرپیچ، نیم روشن گلیوں سے ہوتا ہوا راستہ جاتا تھا۔ مصیبت ساری یہ تھی کہ ہر روز صبح کام پر جاتے ہوئے بابا فضلو کو یہ چوپال میں بیٹھے ہوئے ناکارہ لوگ بلا کر چند ایک منٹ تک عجیب لایعنی سی باتیں کر کے اس کا وقت ضائع کر دیتے تھے۔

وہ حسبِ سابق بالکل انجان بنا سر جھکائے چلا جا رہا تھا کہ اللہ دیا کی نظر اس پر پڑ ہی گئی۔

"ارے چاچا پھجلو جرا ادھر کو تو آؤ۔ کہاں سبیرے سبیرے جات ہو؟" اور وہ پیچ و تاب کھاتا چوپال میں پہنچا۔

"کیا ہے بھائی اللہ دیئے؟" اس نے کھڑے کھڑے پوچھا۔ "ہونا کیا تھا بادشاہو۔ جرا ایک آدھ چلم کا دم ہی لگالو۔ سبیرے جاوت ہو!" رحمو نائی نے اللہ دیئے کی بجائے جواب دیا اور بابا فضلو نے جلدی جلدی دو چار دم لگائے اور کھانستا ہوا تیزی سے چل دیا۔

"پھجلو تو پاگل ہوئے گیل ہے، روز سبیرے ہی سبیرے کام پر جات ہے، بھلا اس سے کا پھائدا ہوت ہے۔ دوسرے لوگن تو اسیر دیر سے کام پر آت ہیں!" کرم دین بولا اور چوپال میں بیٹھے ہوئے سبھی لوگ ہنسنے لگے۔

چچا فضلو کی عمر ایسی کوئی زیادہ بھی نہ تھی۔ یہی کوئی چالیس سال کی رہی ہو گی لیکن ذمہ داری کے احساس نے اسے قبل از وقت ہی بوڑھا کر دیا تھا۔ بیوی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ بیٹی کوئی اس سے ایک دو سال چھوٹی ہوگی مگر جسم ابھی تک گُتھا ہوا تھا۔ اور وہ کیا کچھ نہیں چاہتی تھی۔ خود تو کچھ نہ کہتی مگر اس کی ایک ایک حرکت سے اس کی بات جھلک جھلک پڑتی۔ مگر فضلو، اسے نہ تو اپنی بیوی سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ اپنی جوان لڑکی کی فکر!

★

خریف کی فصل پک کر تیار کھڑی تھی۔ چند ایک کھیت تو کٹ بھی چکے تھے اور برابر والے گاؤں میں بڑے زور شور سے میلہ لگا تھا۔ غریبوں کی زندگی میں خوشی اور مسرت کے بس یہی تو چند ایک موقع ہوتے ہیں جب وہ گھڑی دو گھڑی ہنس بول لیتے ہیں۔ شادیوں میں یا کبھی تین چار سال میں لگنے والے ان میلوں میں۔ گاؤں کا زمیندار بے رحم نہیں تھا، اسے اپنے گاؤں کے ان غریب دہقانوں کی زندگی کا پورا پورا علم تھا۔ اس لئے اس نے اپنے تمام ملازمین کو تین روز کی چھٹی دے دی۔ جا کر میلہ ہی دیکھ آئیں۔

دہقانوں کے گروہ کے گروہ حسبِ توفیق اچھے کپڑے پہنے، خوشیاں مناتے، اچھلتے کودتے گاتے ہوئے میلہ دیکھنے جا رہے تھے۔ اور اب گنتی کے چند آدمی ہی گاؤں میں باقی رہ گئے تھے۔ وہ بڑے بوڑھے اور چلنے پھرنے سے معذور تھے یا پھر چند ایک ایسے جنہیں جینے کے لئے میلہ دیکھنے سے ضروری کچھ اور کام بھی تھے۔ لیکن فضلو بابا کو تو کوئی کام نہیں تھا اور نہ کوئی ذمہ داری، پھر بھی وہ میلہ دیکھنے نہیں گیا۔ وہ زمیندار کی کل پیداوار، خام مال، بھوسہ، بورے اور دیگر سامان کے ذخیروں کا ذمہ دار رکھوالا تھا۔ وہ روزانہ کھیتوں پر جاتا اور ملازمین کی چوکیداری بھی کرتا، انہیں مناسب ہدایات دیتا۔ تنخواہ بھی اتنی زیادہ نہ تھی لیکن زمیندار سے اس نے کبھی اس کو بڑھانے کا مطالبہ نہ کیا۔ جب اخراجات بڑھ گئے تو اس نے دن کے ساتھ رات گئے تک کام کرنا شروع کر دیا۔ عجیب کم گو قسم کا بابا فضلو بڑی مستعدی سے اپنا کام کرتا۔ اور مستعدی سے کام کرنا تو گویا اب اس کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ ذمہ داری کے احساس نے اس کی ذاتی زندگی اور خانگی زندگی کے تمام احساسات کو برف کی طرح منجمد اور سرد کر دیا تھا۔ خوشی کسے کہتے ہیں یا غم کیا ہے؟ کبھی اس کے مشغول اور منہمک دماغ نے یہ سوچنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی، اور ایک دفعہ جب اس کے کسی قریبی

اجمل کی مصوری (۲)

سنگھار

''دروازہ در !''

اجمل کی مصوری

جاوی رقص

ہگوٹ لو : سہی ترکمان

رشتہ دار کا ننھا سا لڑکا بیل گاڑی سے بری طرح کچل کر مر گیا تو وہ اپنی بیوی کے پیہم اصرار کے بعد چند لمحات کیلئے وہاں گیا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ آخر کیا کرے۔ اور جب کچھ نہ بن پڑا تو اپنی صدیوں پرانی پگڑی کے پلو کو درست کرتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ چلتے چلتے اس کے کانوں میں وہاں گئے ہوئے لوگوں کے جملے پڑے: "اُف کس قدر بھیانک موت ہے!" کوئی کہہ رہا تھا۔ "ہائے رے ننھی سی جان! جب اس کے نازک بدن پر بیل گاڑی کے من من بھر وزنی پہیئے گزرے ہوں گے تو...... ہائے ہائے — آہ!" کہنے والا جیسے اس تکلیف کو اپنے اُوپر محسوس کر رہا تھا۔ لیکن بابا فضلو اب ان جملوں کی محدود سرحد کو تیزی سے پار کر کے کرم دین کے کھیت کی منڈیر پر نکل آیا تھا اور اب تو اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس تخلیق کا واحد مفہوم اپنے کام کو مستعدی اور ذمہ داری سے بحسن و خوبی انجام دینے ہی میں مضمر ہے۔

اس کے کمربند سے ہمیشہ چابیوں کا ایک بڑا اسرار گچھا لٹکا رہتا جس میں ہر قسم اور ہر سائز کی لاتعداد چابیاں ہوتیں اور وہ ان میں سے ہر ایک چابی سے انفرادی طور پر اس قدر واقف اور مانوس ہو گیا تھا کہ بغیر دیکھے ہی ضرورت کے وقت مطلوبہ چابی اپنی انگلیوں سے نکال لیتا۔ اس کے ہاتھ ہر ہر کنجی کے نقوش کو باوجود کھردرے اور سخت ہونے کے بخوبی محسوس کر لیتے۔ وہ ان چابیوں کے گچھے کو اس قدر احتیاط سے لیکر چلتا کہ کہیں وہ ٹکرا نہ جائیں۔ اور اگر کبھی ٹکرا ہی جاتیں تو ان کی کھنکھناہٹ کی آواز سن کر اسے محسوس ہوتا جیسے چابیاں آپس میں نہیں ٹکرائیں، اس کے دل سے ٹکرا گئی ہیں اور کسی سے بھی باتیں کرتے وقت وہ ان چابیوں کو ضرور گردش دیتا جاتا۔ گویا وہ چابیاں بھی اس کی بات چیت میں برابر کی شریک ہیں۔ جن کو حرکت میں لائے بغیر وہ ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا۔

وہ اپنا کام بڑی سنجیدگی، خوش اسلوبی اور مستعدی سے کرتا۔ کوئی بھی چیز اس کی نگاہوں سے نہیں بچ سکتی تھی۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا کہ کسی سے باتیں کرتے کرتے یا چلتے چلتے سرِ راہ یکلخت، بالکل غیر ارادی اور لاشعوری طور پر جھک جاتا اور زمین پر سے کوئی ٹوٹا پھوٹا، لوگوں کی عدم توجہی کا شکار لوہے کا کوئی ٹکڑا یا ایسی ہی بے کار چیز بڑے فخر سے اٹھاتے ہوئے بڑبڑاتا: "اوہ: لوگ کسی چیز کی پرواہ ہی نہیں کرتے۔" اور پھر گرد جھاڑتے ہوئے بالکل غیر ارادی طور پر اس کی چابیاں حرکت میں آجاتیں۔ اور وہ اپنی بات مکمل کئے بغیر اسے گودام میں رکھنے کے لئے بڑھ جاتا۔ اس کے اس قسم کے افعال میں اس کے ارادے اور شعور کو قطعاً کوئی دخل نہ ہوتا۔ بس بالکل مشینی سا انداز ہو چلا تھا اس کا۔ اور زمیندار بیچارا مال گودام میں ٹوٹے پھوٹے لوہے کے ان ٹکڑوں اور گھسی پٹی چیزوں کو دیکھ کر خاصا جھنجھلا جاتا۔ لیکن وہ جانتا تھا یہ سب چچا فضلو کی عادت بن چکی ہے اور جب تک چچا فضلو رہے گا تو اس کے گوداموں میں گندم، مکی اور اوزاروں کے ساتھ یہ تمام چیزیں بھی رہیں گی۔ یا پھر چچا فضلو ہی نہ رہے اور یہ زمیندار کو منظور نہ تھا۔

★

تعطیل کی پہلی صبح ہی کو زمیندار کی ملاقات، بالکل اتفاقیہ سرِ راہ چچا فضلو سے ہو گئی۔

"ارے تم یہاں کیا کر رہے ہو چچا فضلو؟" اس نے پوچھا۔ "تو کیا تم واقعی میلہ دیکھنے نہیں جاؤ گے؟ مگر کیوں؟"

"میری بیوی چاہتی ہے کہ میں اسے میلہ دکھانے لے جاؤں:" فضلو نے جواب دیا۔ "لیکن میں اس قسم کی تفریحوں کے لئے خاصا مشغول انسان ہوں۔ کمبخت ہر وقت یہی چاہتی ہے کہ اسے تفریح کراؤں۔ جیسے میرے ذمہ کوئی کام ہی نہیں۔"

"چلو جاؤ۔ میلہ دیکھنے۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ تمہارے ذمہ کوئی اہم کام بھی تو نہیں۔" زمیندار ہنستے ہوئے بولا۔ "تمہیں بھی دوسروں کی طرح آرام اور تفریح کی ضرورت ہے چچا۔ جاؤ بیچاری کو میلہ ہی دکھا لاؤ!"

"یہ بھی خوب ہے میرے ذمہ کوئی کام نہیں۔ میں اپنے ذمہ بہت کام رکھتا ہوں، مثلاً یہی کہ گودام کی دیکھ بھال کروں اگر بالفرض کوئی چیز گم ہو گئی، خواہ وہ معمولی سی رسی کا ٹکڑا ہی کیوں نہ ہو، تو میں تو اس کا ذمہ دار گردانا جاؤں گا!" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا۔

★

اگلی صبح جب زمیندار میلہ دیکھنے گیا تو اس نے لوہار خانے کے باہر چاچا فضلو کو آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے دیکھا۔

"تو گویا تم آگئے ہو چاچا!" زمیندار نے ہنستے ہوئے دریافت کیا۔ "لیکن چاچا تمہاری بیوی کہاں ہے؟"

"میں یہاں تفریح کرنے نہیں آیا ہوں!" چچا فضلو نے عجیب ناگواری سے کہا اور پھر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگا: "میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں کہ اسے میلہ دکھانے لے جاؤں۔ اور یہ کدال اور درانتیاں جو آپ دیکھ ہی رہے ہیں انہیں تیز کروانے لایا ہوں تاکہ ضرورت کے وقت ہمارے

آدمی فالتو نہ بیٹھیں بلکہ فوراً فصل کی کٹائی کے لئے تیار ہو جائیں۔ اس کے علاوہ میں بیل گاڑیوں کے لئے موٹے اور مضبوط رسّی بھی دیکھنے آیا ہوں۔ یہیں کہیں میلے میں میری لڑکی بھی ہوگی۔" فضلو نے یونہی بے مقصد ادھر اُدھر دیکھا اور پھر کہنے لگا۔" وہ یہاں اپنی خالہ کے پاس رہنے آئی ہے تاکہ میلہ آسانی سے دیکھ سکے۔ اس کا منگیتر بھی اسکے ساتھ ہے۔ وہ اس کی خالہ کا لڑکا ہی ہے۔ دونوں یہیں کہیں گھوم رہے ہوں گے۔" محض ضمنی طور پر فضلو نے اپنی لڑکی کا ذکر کر دیا تھا۔ بعد میں اسے محسوس ہوا بھلا زمیندار کو اس قصے سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ اس لئے وہ پھر کہنے لگا۔" کل ہی ہمارے گاؤں سے ایک شخص کسی ضروری کام سے شہر جا رہا ہے۔ کیوں نہ ہم اس کے سپرد چند گندم کی گاٹھیاں کر دیں؟ وہ بیچ آئے گا۔ کام بھی جلدی ہو جائے گا اور سنبھالنے کی بھی دقت نہ ہوگی۔ بس آپ اس سے کہدیں۔"

"مگر چاچا وہ شہر نہیں جا رہا ہے۔ وہ قصبہ جا رہا ہے جہاں سے شہر کوئی پانچ چھ میل دور ہے۔ ہمیں اتنی جلدی بھی نہیں۔ اس بیچارے کو چھٹیاں تو آرام سے گذار لے دو۔" زمیندار مسکراتے ہوئے بولا۔

لیکن جس قدر جلد ہم گندم شہر بھیجدیں۔ اسی قدر بہتر ہوگا۔ منڈی میں سب سے پہلے مال پہنچے گا تو دام بھی مناسب مل جائیں گے۔ ورنہ بعد میں دام بھی کم ملیں گے۔" چچا فضلو ایک مشتاق تاجر کی طرح بڑے اضطرار سے بولا اور پھر سڑک کی دوسری جانب کھڑے ہوئے آدمی کے پاس زمیندار کو کھینچ لے گیا جو کل شہر سے نزدیک کسی قصبے میں جانے والا تھا۔

★

ابھی صبح صادق کے آثار نمودار ہونے میں بھی کافی دیر تھی۔ چاروں اور گھمبیر اندھیاروں کی عکمرانی تھی مگر فضلو بستر چھوڑ کر اٹھ بیٹھا۔ ابھی سردیاں باقی تھیں اور اس صبح تو کچھ غیر معمولی سردی پڑ رہی تھی۔ فضلو کو پوری رات نیند بھی نہیں آئی تھی وہ بڑا بے چین تھا کہ کب صبح ہو اور کب وہ جا کر گودام سے گندم تول کر اس آدمی کے حوالے کرے جو قصبہ جا رہا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گودام پہنچا لیکن جب دروازہ کھولنے کے لئے چابی تلاش کی تو وہ غائب تھی۔ وہ مارے جھنجھلاہٹ کے جواس باختہ ہو گیا۔ کئی بار اس نے بغور کھیسے کا جائزہ لیا — لیکن بے سود۔

تب تقریباً وہ بھاگتا ہوا گودام سے گھر آیا۔ زور سے دھکا مار کر کواڑ کھولا اور کانپتی انگلیوں سے لالٹین کی بتی سلگائی۔ اس کی بیوی ہنوز محوِ خواب تھی لیکن اس نے عجیب وحشیانہ انداز میں جھنجھوڑ کر اسے بیدار کر دیا اور پھر اس کے اور اپنے بستر کی چادر، گدوں اور تکیوں کو اٹھا اٹھا کر پھینکنا شروع کیا۔ لیکن چابی پھر بھی نہ ملی، چچا فضلو کی حالت بالکل اس بھیڑیئے سے مشابہ تھی جس کا شکار ادھر اُدھر کہیں جھاڑیوں میں جا چھپا ہو اور وہ دیوانہ وار بھوکا پیاسا عجیب جنونی انداز میں ان جھاڑیوں کو روند رہا ہو۔

"آخر بات کیا ہے؟" اس کی بیوی بیحد ناگواری سے بولی۔" کیا تم مجھے آرام سے سونے بھی نہ دو گے؟" وہ اس سے ابھی تک ناخوش تھی۔ کل کے ناخوشگوار حادثے کا اثر ابھی تک اس کے ذہن پر نقش تھا۔ جب چچا فضلو نے عجیب بیدردی سے اس کی میلہ دیکھنے والی آرزو کو کچل ڈالا تھا۔ اس کے علاوہ رات ہی کو دونوں میں سخت جھگڑا ہوا تھا۔ چچا فضلو مصر تھا کہ زمانہ خراب ہے اور اس نے بغیر اس کی اجازت کے لڑکی کو کیوں اس کی خالہ کے یہاں جانے دیا جبکہ اس کا منگیتر بھی وہیں موجود ہے۔ جوان لڑکیوں کو یوں شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دینے کا وہ ہرگز روادار نہ تھا۔ اسے زمانے کی اونچ نیچ کا پورا پورا احساس تھا لیکن وہ بھی بضد تھی۔

"آخر میں نے کونسا ایسا جرم کیا ہے۔ جب ان دونوں کا آپس میں رشتہ طے پا ہی چکا ہے تو پھر ان دونوں کا ملنا جلنا کوئی اعتراض کی بات نہیں۔"

اس پر چچا فضلو نے اسے بری طرح ڈانٹا اور پھر دونوں میں دیر تک تو تو میں میں ہوتی رہی۔ لیکن ان تمام تلخ تجربات کے بعد جب سکون سے اس نے نگاہ چچا فضلو کے چہرے پر ڈالی تو اسے محسوس ہوا درحقیقت وہ کسی چیز کے لئے بیحد پریشان ہے۔" کیا کچھ کھو گیا ہے؟" اس نے نہایت حلیمی سے پوچھا اور پھر وہ بھی ڈھونڈنے لگی لیکن بذاتِ خود اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کیا ڈھونڈ رہی ہے۔ چچا فضلو نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کی پیشانی خاصی شکن آلود ہو گئی اور چند لمحات میں اچھا بھلا سلیقے سے جا سجایا کمرہ اتھل پتھل کر کے رکھدیا۔

"جانے اسے کس چیز کی تلاش ہے؟ اس سے قبل اس نے مجھے اپنے ہر دکھ درد میں برابر کا شریک کیا ہے لیکن آج اس کا انداز اس قدر اجنبی کیوں ہے؟ جب سے وہ گوداموں کا ذمہ دار چوکیدار بنا ہے۔ بیچارے کی یہی گت بن گئی ہے۔ تن من کا کچھ ہوش ہی نہیں۔ اور اب ہی پر کیا منحصر ہے پہلے ہی کب اسے گھر کی پروا تھی۔ بیٹے ہیں تو خیر وہ بہرے چوکیدار بھی تو ہیں۔ وہ تو یوں اپنے کو ہلکان نہیں کر لیتے۔ ہائے! اُف!! آہ!!!" وہ جیسے اپنی بدقسمتی پر ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے خود سے بولی۔

"اوہ ۔ یہاں بھی نہیں !" فضلو شدید نااُمیدی سے بولا۔ اور قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی سنتی ۔ وہ دیوانہ وار پاؤں پٹختا جا چکا تھا۔ تب اس بیچاری نے کپڑے بدلے اور زمیندار کے گھر کا راستہ ناپا۔ شاید وہیں کچھ معلوم ہو سکے ۔

★

چچا فضلو پر عجیب اضطراری کیفیت طاری تھی ۔ ابھی خاصا اندھیرا تھا اور وہ دیوانہ وار ہاتھوں میں لالٹین لئے گھر سے مال گودام تک زمین کا ایک ایک چپّہ بغور تلاش کرتا جا رہا تھا ۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر تھا کہ لالٹین کی مدھم روشنی کا کمزور سا ہالہ اس گھناؤنے اندھیارے میں کہاں تک اس کا ساتھ دے سکے گا کہاں تک اس کی رہنمائی کر سکے گا۔ کم از کم اسے صبح تک تو انتظار ہی کرنا چاہیئے ۔لیکن اس وقت تو اس کا ذہن بالکل ماؤف ہو چکا تھا اور حواس معطّل ۔ وہ اپنی دُھن میں نہایت ہی متفکر چلا جا رہا تھا ۔ یہاں تک کہ یوں جھک کر چلتے ہوتے اس کی کمر درد سے چیخ اٹھی ۔ وہ دم لینے کو زمین پر لالٹین رکھ کر ذرا سا سیدھا ہوا اور پھر وہی......! اسی تلاش میں وہ مال گودام تک پہنچ گیا لیکن کہیں بھی اسے چابی کا ہلکا سا مبہم سا نشان بھی نہ مل سکا جس کا ردِ عمل کچھ یوں رونما ہوا کہ اس کے چہرے پر دبیز اداسیاں چھا گئیں ۔ وہ ٹوٹے دل کے ساتھ گودام کی دیوار سے پیٹھ ٹیک کر بیٹھ گیا ۔ اس کڑاکے کی سردی میں اس کی پیشانی پر پسینہ کی بوندیں اُبھر آئیں لیکن وہ ان تمام خارجی کیفیتوں سے بے خبر اپنے دل میں ہر لحظہ تیز سے تیز تر ہونے والے اندرونی ہیجان کی پیچیدہ گتھیاں سلجھانے میں ہمہ تن مشغول تھا ۔ اس کی مصروفیت کے عالم کا اندازہ کچھ اس طور پر صحیح لگایا جا سکتا ہے کہ اس تاریکی میں جب چاروں طرف ایک ہو کا عالم طاری تھا تو اس کی یوں بے وقت آمد سے گاؤں کے کتّوں کا ایک غول کا غول بیدار ہو کر اس کے پیچھے پیچھے اپنی پوری طاقت سے بھونکتا آ رہا تھا لیکن وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوا ۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہ دیکھا ۔ اس نے اپنی ہتھیلی پر اپنا سر رکھ لیا اور پھر اسی سوچ میں گم ہو گیا ۔ وہ شدت سے سوچ رہا تھا ۔ اس نے چابی بھلا کہاں کھوئی ہوگی !

"جب میں نے آج سے پانچ روز پہلے کھیتی باڑی کے اوزار گودام میں رکھے تھے تب ۔ اور چار روز قبل گندم کو دھوپ کھلانے کے لئے باہر نکالا تھا تب بھی شاید میں نے کنجی استعمال کی تھی ۔ اور تیسرے روز جب میں نے دوسرا سامان گودام میں رکھا تھا تب بھی وہ غالباً تھی اور جب کل میلے گیا تھا تو مجھے معلوم ہے وہ اپنی جگہ پر تھی ۔ میری انگلیوں نے اسے محسوس کیا تھا ۔ تب پھر۔ پھر...... !" وہ تقریباً گھنٹہ بھر تک یہی سوچتا رہا یہاں تک کہ صبح کی سپیدی فضا پر چھا گئی ۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا ہاتھ زور سے اپنی ران پر مارا ۔" مل گیا پتہ !" وہ خوشی سے آپ ہی بڑبڑایا ۔

اسے یاد آ گیا تھا کہ کل جب میلہ میں وہ مضبوط رسّی کی تلاش میں سرگرداں تھا تب اسے اپنی لڑکی اور ہونے والا داماد نظر آیا تھا ۔ وہ ان دونوں کے ساتھ چند ہی قدم چلا تھا کہ ایک تالے والا نظر پڑا اور اس کے ساتھ ہی بالکل اتفاقیہ طور پر اسے خیال آیا تھا کہ اسے گودام کی ایک زائد چابی بھی بنوانی ہے ۔ جب اس نے چابی کو گچھے سے علیحدہ کیا تھا ، اور کسی ضروری کام سے اپنے داماد اور لڑکی کو وہاں تالے والے کے پاس اپنا انتظار کرنے کے لیے چھوڑ کر وہ آگے بڑھ گیا تھا ۔ اور وہاں سے وہ سیدھا لوہار کی بھٹّی پر پہنچا تھا ۔ جہاں اس کی زمیندار سے ملاقات ہوئی تھی ۔ اور وہ اس وقت تک چابی اور اپنی منتظر لڑکی کے بارے میں بالکل بھول چکا تھا ۔

تب اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنی لڑکی کو دل ہی دل میں اپنی کمزوری پر سخت سُست کہا : اگر میں بھول گیا تھا تو کم از کم وہی بروقت پہنچا دیتی لیکن ان لوگوں کو بس اپنے آرام کا خیال ہے ۔ بوڑھے باپ کی پروا نہیں !

لیکن اب وہ کیا کرے گا ؟ بس یہی ایک خیال رہ رہ کر شدت سے اس کے ذہن میں گونج رہا تھا یہاں تک کہ بالکل غیر ارادی طور پر اس نے نظریں اٹھا کر دُور خلاؤں میں گھورا جہاں کہر کی دبیز چادر کو پھاڑتا ہوا ایک مبہم مبہم سا سایہ لرزاں لرزاں آگے بڑھ رہا تھا ۔ اور قریب آنے پر یہی سایہ اس کی بیوی کی شکل میں ڈھل گیا ۔

"اوہ دیکھو ۔ کیا تمہیں اسی کی تلاش ہے ؟" ہانپتے ہوئے اس کی بیوی نے مال گودام کی دو چابیاں اس کی طرف بڑھا دیں ۔ چچا چچا فضلو نے عجب انداز کی طرح دونوں چابیوں کو گھورا اور پھر اپنی بیوی کو ـــــ اور پھر بلا تامل بغیر کچھ بولے پیٹھ موڑ کر گودام کھولنے لگ گیا ۔ تب اس کی بیوی نے کل ماجرا کہہ سنایا ۔ بات دراصل یہ تھی کہ اس کی لڑکی اور ہونے والا داماد دیر تک تالے والے کے پاس اس کا انتظار کرتے رہے اور جب دیر تک وہ لوٹ کر نہ آیا تو انھوں نے گاؤں جانے والے اپنے ایک پڑوسی کو کنجیاں دیتے ہوئے سمجھا دیا کہ وہ جا کر انہیں ان کے گھر دیدیں ۔ جب رات گئے چچا فضلو گھر لوٹا تو اس وقت تک اس کی بیوی سو چکی تھی ، اور صبح بھی چچا فضلو نے اسے اپنی تلاش کے بارے میں کچھ نہ بتایا ورنہ اتنی آفت ہی کیوں آتی ۔

(باقی صفحہ ۵۲ پر)

غزل

سراج الدین ظفرؔ

رندی کو میگسار رہِ گیر کر گئے
عالم کو رقصِ جام سے تعبیر کر گئے

منزل سے آگہی کی جو گذرے قدح پرست
پرزے نقابِ چہرۂ تقدیر کر گئے

بنیادِ زہد، اٹھا کے خداوندگانِ خیر
اک قصر تھا کہ ریت پہ تعمیر کر گئے

خلوت میں اس ہنر سے کھلے حلقہ ہائے زلف
وحشت کو بے سلاسل و زنجیر کر گئے

سرزد جو عرشیوں سے ہوا کاتبانِ راز
اس کو بھی میری فردِ میں تحریر کر گئے

شیخِ حرم کہاں ہے کہ اس شہر کے غزال
کفرِ نگاہ سے مری تکفیر کر گئے

کل شب قبائے زہرہ جمالاں کے قوس و خط
ابھرے کچھ اس طرح انہیں تصویر کر گئے

آئینہ دارِ صدق تھے یارانِ انجمن
ساغر سے ردِ حیلۂ تزویر کر گئے

جائیں کدھر کو رند کہ اوہام خیر و شر
ذہنوں کو بھی حوالۂ زنجیر کر گئے

اسمائے دلبراں ترے حسنِ مقال کو
مانندِ نطقِ طوطیٔ تصویر کر گئے

جرأت نہ اہلِ زہد کو جس چیز کی ہوئی
آخر میں اس کو لائقِ تعزیر کر گئے

گفتار رہروشاں تھی کہ جیسے دمِ سحر
جھونکے نسیم کے کوئی تقریر کر گئے

پیرانِ میکدہ کی کرامت میں شک نہیں
میرے لئے شراب کو اکسیر کر گئے

معنی کا اک لغت تھے دمِ رقص ان کے ہاتھ
ہر زاویے کو حاملِ تقریر کر گئے

میرے وقار میں ہیں خلوت مرے ہنر
کچھ اور بھی اضافۂ توقیر کر گئے

دنیا عذابِ سخت تھی لیکن اٹھا کے جام
یارانِ شب نجات کی تدبیر کر گئے

حیرت کے سلسلے سرِ آئینۂ جمال
مجھکو سپردِ عالمِ تصویر کر گئے

منظور تھا جو وقت کی رو میں مرا ثبات
اسرار مجھکو مرکزِ تغییر کر گئے

زنجیر ارتقا میں مرے ولولے ظفرؔ
مجھکو بھی ایک حلقۂ زنجیر کر گئے

غزل

ماہر القادری

فضا نشاط کی پھر دل کو راس آئی ہے
سکوں نے لُوٹ لیا، درد کی دُہائی ہے

یہ تیوروں پہ جو وارفتگی سی چھائی ہے
تری نظر بھی کہیں چوٹ کھا کے آئی ہے

جبین و رُخ کو ذرا دیکھنا توجہ سے
مری نگاہ بھی کچھ نقش چھوڑ آئی ہے

نہ التفات جسے کہہ سکیں، نہ بیزاری
اس اہتمام سے اُس نے نظر چُرائی ہے

یہ خارزارِ محبت، یہ سنگلاخ زمیں
اِسی سفر میں تو لطفِ برہنہ پائی ہے

یہ کون جانب عرشِ بریں ہے گرمِ خرام
فلک نے زیرِ قدم کہکشاں بچھائی ہے

میں اُن کی بزم میں شایانِ یک نظر بھی نہیں
اسی کا نام مقدّر کی نارسائی ہے

جنابِ شیخ کی توبہ کو کیا کہوں ماؔہر
میں جانتا ہوں بڑھاپے کی پارسائی ہے

* * *

ضمیر اظہر

یارب وہ درد دے کہ تمنا کہیں جسے
تکمیلِ زندگی کا تقاضا کہیں جسے

پھینکا ہے لا کے وحشتِ خانہ خراب نے
اک عالمِ سراب میں صحرا کہیں جسے

ہمت کہاں کہ تیری تمنا کو چھوڑ دیں
ہر دردِ زندگی کا مداوا کہیں جسے

محوِ خرام رہتا ہے صحرائے قلب میں
تیرا خیال، آہوئے رعنا کہیں جسے

اب تک ہے یاد کیف کسی چشمِ ناز کا
تخئیلِ رند و حسرتِ صہبا کہیں جسے

پھر ضَوفگن ہے دل پہ محبت کا ماہتاب
آئینۂ بہارِ تمنا کہیں جسے

اظؔہر ہجومِ یاس میں آواز دیں کسے
ایسا بھی کوئی ہے کہ ہم اپنا کہیں جسے

انسانی حقوق اور اقوامِ متحدہ

فضل حق قریشی

معاشرتی ترقیوں کا اندازہ لگانے کے لئے بہت سے معیار ہیں۔ مثلاً ایک معیار یہ ہے کہ قومیں، حکومتیں اور افراد کس حد تک انسانی حقوق کا احترام کرتے ہیں۔ ثقافتی ترقی کا معیار تہذیب نہیں کہا جاسکتا تاوقتیکہ یہ ترقی بنی نوعِ انسان میں معاشرتی احساس کی نشو و نما اور فروغ کا باعث نہ بن سکے۔ اسی اصول کے پیشِ نظر اِس سال بھی دنیا بھر کے ملکوں خصوصاً اقوامِ متحدہ کی ۸۱ حکومتوں نے تہیہ کیا ہے کہ ۱۰ دسمبر کو اُس عالمی منشور کی دسویں سالگرہ بہت تزک و احتشام کے ساتھ منائی جائے جو انسانی حقوق کو تسلیم کرنے اور ان کا احترام کرنے کے لئے ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء سے نافذ ہے۔ انسانی حقوق کا یہ عالمی منشور اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے منظور کیا اور تمام قوموں سے کہا تھا کہ اس کی روشنی میں قومی آئین و ضوابط مرتب کئے جائیں۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس تاریخ سے قبل انسانی حقوق کو تسلیم نہیں کیا جاتا تھا۔ تاریخِ عالم پر نظر ڈالی جائے تو فوراً ماننا پڑے گا کہ انسانی حقوق کے تحفظ کی جدوجہد اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ خود انسانیت کی تاریخ۔ حمورابی، فرمانروائے بابل کے عہد سے آج تک دنیا کے بڑے بڑے قانون ساز کوشاں رہے ہیں کہ جائز طریقوں سے کمزور ہستی کو ظلم و استبداد کے پنجے سے بچایا جائے۔ مذہبی راہنماؤں سے لیکر اربابِ سیاست تک ہر مفکر و مدبر نے اپنے زمانے کے غلط نظام پر اعتراض کیا جب بھی اس میں کوئی نقص نظر آیا اور انسانی وقار کو تسلیم کرانے کے لئے زور دیا جب بھی انہیں موقع ملا۔ ان حقوق کو منوانے کے لئے بہت سے انسانوں نے اپنی جانیں تک دی ہیں، قربانیاں پیش کی ہیں، سختیاں اور مصیبتیں جھیلی ہیں اور ان میں سے بہت سے انسان اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ ہم تاریخ میں بار بار پڑھتے ہیں کہ جابر حکمرانوں اور بادشاہوں نے جب بھی اپنی رعایا کے حقوق غصب کئے، چند نڈر اور بہادر انسانوں نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔

قدیم چین کے ایک مذہبی پیشوا نے سب سے پہلے اعلان کیا کہ سلطنت کے استحکام میں عوام کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہود و نصاریٰ کے تاریخی قصوں میں بھی ایسے ہی خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ یونان کے عہدِ عتیق میں ہر خاص و عام کو مساوی حقوق دینے کے علاوہ اظہارِ خیال کی آزادی کا حق بھی دیا جاتا تھا۔ روما کے فلسفی کہتے تھے کہ انسان فطرتاً آزاد ہے اور اسے آزاد رہنا چاہیئے۔ لیکن یہ مفکر اور فلسفی ہمیشہ حکومتوں کی طرف سے معتوب رہے کیونکہ وہ غلاموں اور کنیزوں کی فروخت کے انسانیت سوز رواج کو ترک کرانا یا غلاموں اور کنیزوں کو عام انسانوں یا کم سے کم دوسرے ملازموں کے برابر کوئی درجہ دینا نہیں چاہتے تھے۔ کچھ بعد کے زمانے میں اسلام نے حریت و آزادی، اخوت و مساوات، عدل و انصاف اور وقارِ انسانی کا بہترین سبق دیا ہے۔ اس نے بردہ فروشی کو قطعاً ناجائز قرار دیا اور صرف لڑائی میں حاصل کئے ہوئے غلاموں اور کنیزوں کو چند شرطوں کے ساتھ رکھنے کی اجازت دی جن میں وقارِ انسانیت کا خاص خیال رکھا گیا۔

انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا موجودہ تصور جمہوری نظام کی ترقی کے ساتھ ساتھ ذہن نشین ہوا ہے اور آج سے پچاس سال پہلے تو اس دائرے کو اتنا وسیع کر دیا گیا کہ سیاسی آزادی کے دوش بدوش اقتصادی اور سماجی حقوق بھی انسان کو تفویض کر دیئے گئے۔ بیروزگاروں کے لئے ذریعۂ معاش اور بوڑھوں یا بیماروں کے مفاد کا لحاظ بھی رکھا جانے لگا لیکن فاشی اور نازی نظام نے بساطِ سیاست پر قدم رکھ کر صحیح جمہوریت کے تار و پود کو درہم برہم کر دیا۔ انسانی حقوق کے جملہ تصورات طاقِ نسیاں کی زینت بن گئے۔ بعض اور ملکوں میں نسل و مذہب اور زبان و رنگ کے امتیازات نے اپنا رنگ جمانا شروع کر دیا اور اس طرح انسانیت مغلوب و مفلوج ہو کر رہ گئی۔ مثال کے طور پر جنوبی افریقہ میں پاکستانی اور ہندوستانی باشندوں پر وہاں کی حکومت نے ایسی پابندیاں لگا رکھی ہیں کہ ان کے ذکر سے بھی تکلیف ہوتی ہے۔ مختصراً یہ کہ وہاں کے قانون کے مطابق پاکستانی اور ہندوستانی باشندے اس ملک میں گوری نسل کے باشندوں کے ساتھ مل جل کر معاشرتی زندگی کے کسی شعبے میں حصہ نہیں لے سکتے۔

حسنِ اتفاق سے دوسری جنگِ عظیم میں اتحادیوں کی فتح کے آثار رونما ہونے لگے۔ چنانچہ لڑائی کا میدان جیتنے کے ساتھ ساتھ کوشش کی جانے لگی کہ غلط رفتار

مہروں کا رخ پھیر کر بساطِ انسانیت کی سطح کو بلند کر دیا جائے کیونکہ صلح جُو اور عافیت پسند ہستیاں اچھی طرح جانتی تھیں کہ اس کے بغیر دنیا بھر میں صحیح امن و عافیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ۱۹۴۱ء کا معاہدۂ اوقیانوس اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ پھر ۱۹۴۲ء میں واشنگٹن کانفرنس، ۱۹۴۳ء میں ماسکو کانفرنس اور ۱۹۴۴ء میں ڈمبارٹن اوکس کے مذاکرات انہی تصورات کو ترقی و توسیع دیتے رہے۔ حتیٰ کہ جب سان فرانسسکو کانفرنس منعقد ہوئی تو اس میں دنیا کے بہت سے غیر سرکاری اداروں کے نمائندوں نے بھی شرکت کی اور انہوں نے اپنی حکومتوں کے ایما پر یا ذاتی رائے کے مطابق ان تجاویز پر مہر توثیق ثبت کر دی جو ڈمبارٹن اوکس میں زیرِ غور تھیں۔ خصوصاً اس تجویز کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا جس میں کہا گیا تھا کہ بین الاقوامی اعتبار سے اقتصادی، معاشرتی اور انسان دوستی کے جملہ مسائل کو حل کرنے اور انسانی حقوق کا احترام کرنے کے لئے متحدہ کوششیں ہونی چاہئیں۔ چنانچہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں جو انہی دنوں وجود میں آیا، اس پہلو پر سب سے زیادہ زور دیا گیا۔ اس کی تمہید میں لکھا ہے :۔

"ہم اقوام متحدہ کے باشندوں نے مصمم ارادہ کیا ہے، انسان کے بنیادی حقوق پر دوبارہ ایمان
لانے کا اور انسانی افراد کی عزت اور قدر و قیمت کو پلٹنے کا۔ یہ ہمارا ایمان ہوگا کہ عورت اور مرد کے
حقوق برابر ہیں اور چھوٹی بڑی قومیں ایک جیسے حقوق کی مالک ہیں۔"

اس قرارداد کے بموجب مسودۂ منشور تیار کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا جس نے مسز فرینکلن روزویلٹ کی قیادت میں ۲۷ جنوری ۱۹۴۷ء سے کام شروع کر دیا۔ کمیشن کے کل اٹھارہ اراکین تھے جو مختلف ملکوں سے منتخب ہوئے تھے۔ ابتدا میں اس کمیشن کو تمام ملکوں اور علاقوں سے معلومات اور اعداد و شمار جمع کرنے میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن آخر کار ۴۰۰ صفحات کی ایک دستاویز تیار ہو گئی۔ اس کی بنیاد پر منشور کا ابتدائی مسودہ مرتب کیا گیا جو بڑی بحث و تمحیص کے بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ء کو انقطاعی طور پر منظور کر لیا گیا اور تمام حکومتوں نے اسی روز اس پر مہر توثیق کر دی۔ چنانچہ اسی تقریب کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہر سال دسمبر کی ۱۰ تاریخ کو ساری دنیا میں "یوم حقوقِ انسانی" منایا جاتا ہے۔

سب سے پہلے اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر ٹورے بودیٹ کے دل میں خیال آیا کہ دنیا بھر میں "یوم حقوق انسانی" کی سالگرہ منائی جایا کرے۔ انہوں نے ۱۹۴۹ء کے شروع میں یونیسکو کی تمام ممبر حکومتوں کو مراسلے لکھے کہ سرکاری اور غیر سرکاری مدرسوں میں ایک خاص پروگرام کے ماتحت ۱۰ دسمبر کو اُصولِ آزادی اور وقارِ انسانی کے سلسلے میں کامیاب جدوجہد ہوئی ہے اس سے خراج تحسین ادا کیا جائے۔ اس تجویز کو بہت پسند کیا گیا۔ پھر اپریل ۱۹۴۹ء میں چند بین الاقوامی غیر سرکاری اداروں کی کانفرنس لیک سکسیس میں منعقد ہوئی اور فیصلہ کیا گیا کہ اقوام متحدہ کے زیر ایوان یہ سالگرہ منائی جایا کرے۔ لہٰذا اسی سال اس قرارداد پر عمل ہوا اور ہر سال عمل ہوتا ہے۔

انسانی حقوق کے عالمی منشور میں شہری، سیاسی اور مذہبی آزادیوں کے تصورات کو جمع کر دیا گیا ہے جن کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انسان اب تک جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں نئے اقتصادی اور معاشرتی حقوق بھی شامل ہیں جن کا اس زمانے میں بتدریج احساس ہو رہا ہے۔ ان پر سرسری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

تمہید میں انسانی شخصیت کے وقار و احترام پر زور دیا گیا ہے۔ پہلی دو دفعات میں صاف طور پر کہا گیا ہے کہ یہ حقوق اور آزادیاں ہر شخص کو ہر جگہ ملنی چاہئیں۔ دفعات ۳ تا ۱۵ میں پرانے مسلمہ حقوق کا اعادہ کیا گیا ہے یعنی یہ کہ ہر شخص کو اپنی جان، آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق ہے، قانون اس کی شخصیت کو تسلیم کرے اور منصفانہ طریقے پر اس کے مقدمے کی سماعت ہو۔ ان دفعات میں غلامی، جسمانی اذیت، انسانیت سوز بُرے سلوک، ظالمانہ سزا، بے قاعدہ گرفتاری، نجی اور خانگی زندگی اور ذاتی خط و کتابت میں مداخلت کو معیوب کہا گیا ہے۔ قومیت کے حق کو تسلیم کیا ہے اور یہ بھی مانا ہے کہ اسے ہر ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور سکونت اختیار کرنے کی آزادی ہو۔

دفعہ ۱۶ میں مردوں اور عورتوں کے اس حق کی حمایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق شادی کا فیصلہ کریں۔ دفعہ ۱۷ میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو جائداد رکھنے کا حق ہے اور اسے زبردستی اس سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اس کے بعد آزادیٔ مذہب، آزادیٔ ضمیر اور آزادیٔ اظہار رائے کا ذکر ہے۔ دفعات ۲۰ اور ۲۱ میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو پر امن طریقے پر میل جول رکھنے اور انجمنیں قائم کرنے کا حق ہے اور وہ اپنے ملک کی سرکاری ملازمت میں بھی حصہ لے سکتا ہے۔

دفعات ۲۲ تا ۲۶ میں اقتصادی اور معاشرتی حقوق کا اعلان کیا گیا ہے۔ ان میں کام کرنے، مقررہ وقفوں کے بعد تنخواہ سمیت چھٹیاں لینے، بے روزگاری

سے بچنے، اپنے لئے روزگار پسند کرنے، تجارتی انجمنوں میں شریک ہونے اور مساوی کام کے عوض مساوی معاوضہ لینے کا حق شامل ہے۔ منشور میں ہر شخص کے لئے معقول معیارِ زندگی کے حق کو بھی تسلیم کیا گیا ہے جس میں رہائش، طبی دیکھ بھال، بیماری، بیوگی اور بڑھاپے کی صورت میں تحفظ شامل ہے۔ تعلیم پانے، اپنے فرقے کی ثقافتی زندگی میں شریک ہونے اور سائنسی تحصیلات سے استفادہ کرنے کے حقوق بھی شامل ہیں۔

دفعہ ۲۹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں اقوامِ متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جاسکتیں اور آخر میں اعلان کیا ہے کہ اس منشور کی کسی دفعہ سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جاسکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی تخریب ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

۱۹۵۴ء میں اس موضوع سے متعلق اقوامِ متحدہ کے دو مسودے نافذ ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک خواتین کے سیاسی حقوق سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا مہاجرین کے مرتبے اور حیثیت سے متعلق ہے۔ اول الذکر میں لکھا ہے کہ عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔ وہ ان تمام اداروں کے لئے انتخابات کے لئے حصہ لے سکیں گی جنھیں قانون کے مطابق عام انتخابات سے قائم کیا گیا ہو۔ انہیں عہدہ سنبھالنے اور تمام سرکاری فرائض ادا کرنے کا حق حاصل ہوگا اور یہ حق کسی فرق و امتیاز کے بغیر مردوں کے حق کے برابر ہوگا۔ یہ پہلا عالمگیر مسودۂ قانون ہے جو سیاسی حقوق کے ضمن میں بلحاظِ جنس ہر فرق و امتیاز کی تنسیخ کرتا ہے۔

مہاجرین کے مرتبے اور حیثیت سے متعلق ضابطے میں ایسے بین الاقوامی قاعدے درج ہیں جن پر عمل کرنے سے ان بدنصیب لوگوں کے مصائب و آلام میں کمی ہوسکتی ہے جو سیاسی واقعات کی بنا پر اپنا وطنِ مالوف چھوڑنے اور ایک غیر ملک میں نہایت مصیبت و پریشانی کے عالم میں آباد ہونے کے لئے مجبور ہوگئے ہیں۔

شادی شدہ عورتوں کی قومیت سے متعلق بھی ایک قانون نافذ کیا گیا ہے جس کا منشا یہ ہے کہ شادی، طلاق، یا شادی کے دوران میں خاوند کی قومیت بدل جانے سے بیوی کی قومیت پر خود بخود کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ اس کی رُو سے یہ اجازت دی گئی ہے کہ کوئی غیر ملکی بیوی اگر چاہے تو درخواست دینے پر اپنے خاوند کی قومیت حاصل کرسکتی ہے لیکن اس مقصد کے لئے اسے متعلقہ ملک میں آبادکاری کے طریقۂ کار کا پابند ہونا پڑے گا۔

* * *

جنگ سے نڈھال انسانیت اقوامِ متحدہ کی طرف امید و بیم کے جذبات کے ساتھ دیکھ رہی ہے، کیونکہ بنی نوعِ انسان کی نجات اور تہذیبِ حاضرہ کا مستقبل اس بات پر موقوف ہے کہ یہ ادارہ جنگ کے اسباب اور امنِ عالم کو لاحق ہونے والے خطروں کو دور کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوتا ہے۔ پاکستان، جسے حال ہی میں "اقوامِ متحدہ" کا رکن بنایا گیا ہے، اس ادارہ کی تقویت کے لئے حتی المقدور کوشش کرے گا؛ اور جو نصب العین اس ادارہ نے اپنے سامنے رکھے ہیں ان کو حاصل کرنے میں مدد دے گا۔

.... ہم اقوامِ متحدہ کے منشور (چارٹر) کی پوری تائید کرتے ہیں.....

(قائدِ اعظمؒ)

•

(اقتباس از خطاب بہ بحریۂ پاکستان : ۲۳ جنوری ۱۹۴۸ء)

* * *

انسانی حقوق کا عالمی منشور

-۱

-۲

-۳

-۴

-۵

-۶
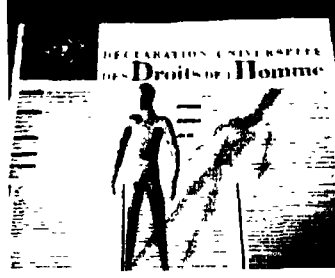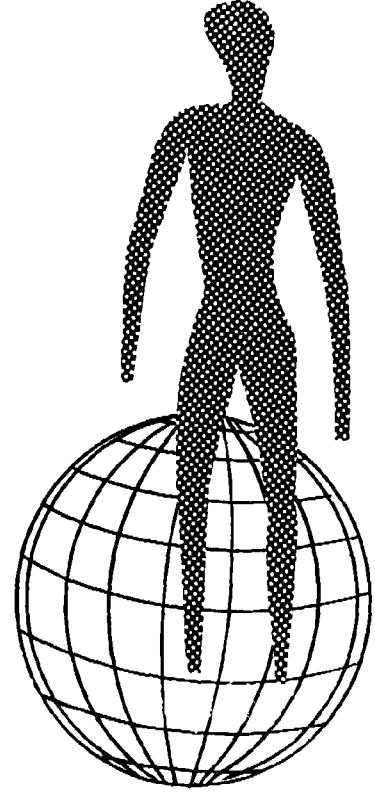
۱ :- آیئے ہم فرض کریں کہ ایک انسانی پیکر
اس اعلان سے نمودار ہوا اور جیتا جاگتا
انسان بن گیا۔

۲ :- یہ انسان مرد ہو۔۔

۳ :- یا عورت ۔۔۔۔

۴ :- اس انسان کا رنگ گندمی ہو یا کالا
سفید ہو یا پیلا۔۔۔

۵ :- بہرحال یہ انسان ہر جگہ رہتا ہے۔ اسکا
ملک چھوٹا ہو یا بڑا، آزاد ہو یا آزادی کا
خواہشمند۔۔۔۔

۶ :- حقیقتاً یہی انسان ہم کرۂ ارض کے رہنے
والوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ چاہے ہم کوئی بھی
ہوں اور کہیں بھی رہتے ہوں۔

ہیر کا مقبرہ

(جھنگ)

(۱)

[illegible]

(۲)

۱ - مقبرہ کی عمارت

۲ - مقبرہ کا اندرونی منظر

ثقافت:
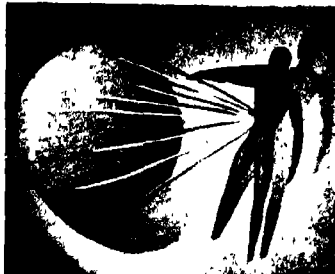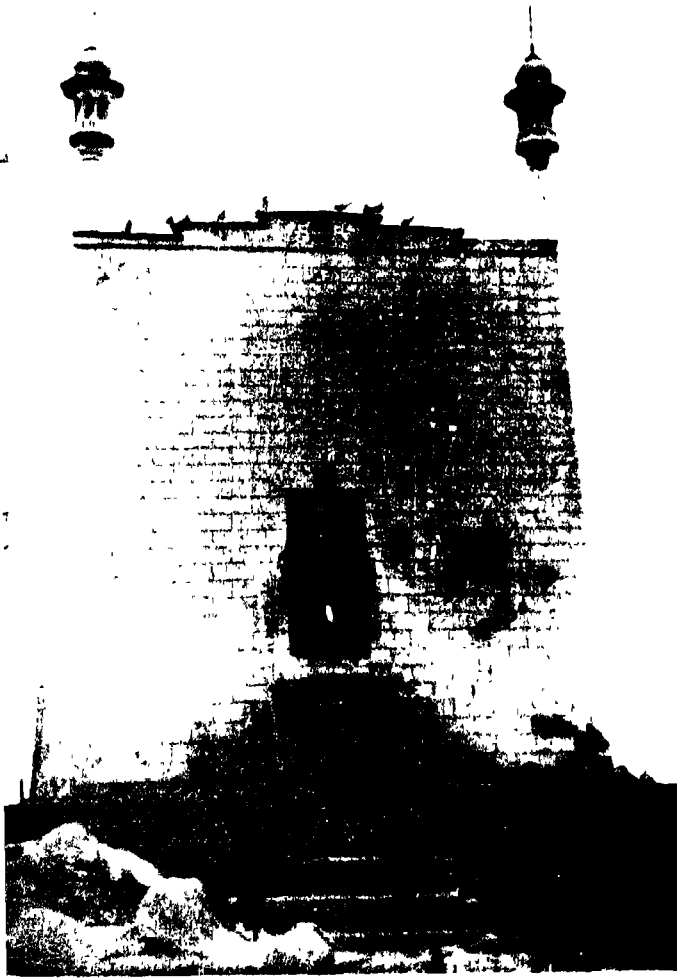
ہیر کا مقبرہ اور ہیر رانجھا کا عہد

ڈاکٹر محمد باقر

افسانوی روایات کے کرداروں کے زمانے کو معین کرنا نہ صرف مشکل ہے بلکہ بسا اوقات ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ پنجاب کے مشہور رومانی افسانے "ہیر رانجھا" کے عہد کو معین کرنے کی چند مساعی کی گئی ہیں اور عام طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس افسانے کے کردار "ہیر" اور "رانجھا" اکبر کے عہد (۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ء) میں زندہ تھے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ پنجابی میں سب سے پہلے ہیر رانجھا کے قصے کو جھنگ کے ایک اروڑہ، دمودر نے نظم کیا تھا۔ وہ اس قصے کو جلال الدین اکبر کے زمانے کا واقعہ لکھتا ہے۔ اور تفصیلات کو اس طرح بیان کرتا ہے گویا وہ خود انہیں دیکھ رہا ہے۔ دمودر نے یہ بھی کہا ہے کہ چوچک خاں سیال یعنی ہیر کا والد اکبر کے زمانے میں ہو گزرا ہے لیکن بعض حضرات کا خیال ہے کہ دمودر کا یہ بیان صحیح نہیں اور اس نے یہ قصہ شاہجہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کے زمانوں میں نظم کیا۔

دمودر کا بیان صحیح ہو یا نہ ہو لیکن اب ہم فارسی ادب کی مدد سے ہیر اور رانجھا کی روایت کو اکبر کے عہد تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ افغانستان کی سرحد شمال میں جہاں بخارا سے ملتی ہے وہاں بخارا کے جنوب میں ایک قصبہ ابھی تک آباد ہے جسے کولاب کہتے ہیں۔ یہ مقامی صوبہ ختلان کا دارالخلافہ ہے۔ تقریباً چار سو سال پہلے اسی قصبہ کا رہنے والا شاعر باقی کولابی بخارا سے ہند میں وارد ہوتا ہے اور اکبر کے عہد میں اپنی زندگی بسر کرتا ہوا ۱۵۷۹ میلادی جونپور میں معصوم خاں کابلی کی بغاوت کے زمانے میں مارا جاتا ہے۔ بدایونی نے اپنی معروف تالیف منتخب التواریخ میں باقی کا ذکر کیا ہے (جلد سوم، ص ۱۹۴)۔

اس سے زیادہ تفاصیل باقی کے متعلق اور کسی تذکرے سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ آج سے ۳۳ سال پیشتر باقی کی لکھی ہوئی ایک مثنوی "ہیر و رانجھا" خان بہادر ڈاکٹر مولوی محمد شفیع صاحب نے مرحوم سر شہاب الدین کے کتابخانہ میں دیکھی تھی۔ چونکہ انہیں اس وقت اس مثنوی کا زیادہ غور سے مطالعہ کرنے کی فرصت نہ ملی، اس لئے وہ صرف یہ اطلاع دے کر خاموش ہو گئے کہ "یہ نسخہ ناقص الاول ہے۔ پہلا عنوان ہے: در صفت بادشاہ عالم پناہ اکبر شاہ گوید"۔ سندھی ادبی بورڈ نے اس سال (۱۹۵۸ء) میں جب "مثنویات ہیر و رانجھا" شائع کیں تو مقدمہ میں یہ بیان کیا کہ اس مثنوی کا ایک نسخہ نیشنل میوزیم کراچی میں موجود ہے۔ راقم نے اس خطی نسخہ کو کراچی سے منگوا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ وہ نسخہ ہے جو کسی وقت سر شہاب الدین کے کتابخانے میں موجود تھا اور جسے ڈاکٹر شفیع صاحب نے ملاحظہ فرمایا تھا۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ یہ نسخہ چند سال پیشتر میرے پاس بھی فروخت ہونے کے لئے آیا تھا کیونکہ میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے چند اشارے اس پر موجود ہیں۔ نہ جانے اس وقت کس وجہ سے خریدا نہ جا سکا۔

بہر صورت کہنا یہ مقصود ہے کہ ہیر رانجھا کے فارسی معروف قصوں میں اب تک یہ سب سے قدیم منظوم قصہ ہے۔ کیونکہ یہ ۱۵۵۶ء اور باقی کی وفات یعنی ۱۵۷۹ء کے درمیان لکھا گیا ہے۔ باقی نے اس مثنوی کے آغاز میں اکبر کا ایک قصیدہ لکھا ہے اور اس قصیدہ کے بعد ایک ساقی نامہ نظم کیا ہے جس میں اکبر کو "شاہ عادل" کے نام سے یاد کیا ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ پنجابی کے معروف قصوں میں یہی تعریف "عدلی راجہ" کا لقب اختیار کر گئی ہے۔ اس بیان سے اس حقیقت کی طرف واضح طور پر راہنمائی ہوتی ہے کہ ہیر رانجھا کا قصہ اکبر یا اکبر سے پہلے معروف ہو چکا تھا۔ اور اگر ان دو کرداروں کی کوئی حقیقت تھی تو یہ اکبر کے عہد میں یا اس سے پہلے زندہ تھے۔

از روئے کرم بکن تو یاری — ساقی بدہ آں مے کہ داری
گر نیک بود خیالِ باقی — لطفی بنما بحالِ باقی
بکشا در گنج معنوی را — بنما رہ ملک مثنوی را
گفتم من ناتوانِ بیدل — ایں نامہ بنام "شاہِ عادل"
چوں ملک شدہ ز عدلش آباد — عالم ہمہ در نگینِ او باد

آگے چل کر قصے کے دوران میں جب رانجھا اور ہیر کے خاوند کی نزاع عدالت تک پہنچتی ہے تو اس وقت مولانا باقی نے پھر "بادشاہِ عادل" کا ذکر کیا ہے جس سے اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ یہ واقعہ غالباً عہدِ اکبر سے متعلق ہے:

رفتہ برِ "بادشاہِ عادل" — فریاد و فغاں کشیدہ از دل

کردہ دہ ہزار داد فریاد — کای بادشہِ جہاں بدہ داد

یہ تو مولانا باقی کے بیانات ہیں جن سے اس امر کی تصدیق ہو رہی ہے کہ ہیر اور رانجھا اکبر کے عہد کے قریب قریب روایتی طور پر زندہ تھے۔ اب ہیر کے معروف مقبرہ کی طرف آیئے جو آج کل کے جھنگ سے تقریباً نصف میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے متعلق مقامی روایت یہ مشہور ہے کہ یہ مقبرہ پہلے یہاں نہیں تھا اور اس جگہ سے ہٹ کر دریائے چناب کے کنارے پر واقع تھا۔ اتفاق سے دریائے چناب میں ایک بادشاہ یا تاجر کشتی میں سفر کر رہا تھا، اور اس کی کشتی ایک دفعہ اس کنارے پر لگی جہاں ہیر کا مزار تھا۔ رات اُس نے اسی مزار پر بسر کی اور ہیر نے خواب میں آکر اُسے کہا: میرا مزار یہاں سے ہٹا کر فلاں جگہ پر بنا دو لیکن اس طرح کہ اس کی چھت کھلی رہے تاکہ بارش الزارالہٰی اُس پر ہوتی رہے۔ بادشاہ یا تاجر نے صبح اُٹھ کر ہیر کی اس خواہش کی تکمیل کی اور جھنگ کے قریب موجودہ جگہ پر ہیر کا تابوت منتقل کر کے اس پر مقبرہ بنا دیا۔

عالمگیر کے عہد میں ایک شاعر میتا چنابی گذرا ہے۔ اس نے ۱۱۱۰ھ قمری میں ہیر رانجھا کا قصہ فارسی میں نظم کیا ہے۔ اس نے بیان کیا ہے کہ پہلے ہیر کو چوچک کے گاؤں "چوچکانہ" میں دفن کیا گیا تھا۔ کیونکہ اس وقت اس سے بہتر اور کوئی جگہ نہ تھی لیکن کچھ مدت گذرنے کے بعد ایک حاکم کو خواب میں ہیر دکھائی دی اور اس کے کہنے کے مطابق ہیر کا مقبرہ نواحِ جھنگ میں تعمیر کیا گیا۔ چنابی اپنی مثنوی میں رانجھا کے لئے "ماہی" کا لفظ استعمال کرتا ہے اور واقعہ یوں بیان کرتا ہے:

ماہی چوں برفت زیں جہاں ہیر — در رفتنِ خود چہ کرد تاخیر

مدفونش بہ چوچکانہ کردند — در خاک دو نعشش سپردند

جای موزوں درآں زمانہ — بودی نہ ورای چوچکانہ

یکچند بریں سخن چو بگذشت — ہم جھنگ بحسن سمر گشت (کذا)

ہیرش بشبی بخواب فرمود — گفتا بہ برم ازیں زمیں زود

دفنم کن در نواحِ جھنگ — در طرفِ جنوب او دو فرسنگ

حاکم چو شنید زاں پری کیش — ایں امرِ سعادتِ خویش

تابوت از آں زمیں ربودہ — زیرش بصواب فرق سودہ

مدفونش در آں زمیں کرد — تعمیر سزای آفریں کرد

خوش ساختہ روضہ سرافراز — لیکن سرِ او بسانِ در باز

آں روضہ نشانِ عشقبازیست — مظہرِ پی شانِ عشقبازیست

من ہم کردہ ام زیارتِ او — دیدم روِیش عمارتِ او

چنابی کے آخری شعر سے اس امر کی شہادت بھی ملتی ہے کہ اُس کی مثنوی کی تکمیل یعنی ۱۱۱۰ھ قمری (۱۶۹۸ء) سے پہلے ہیر کا مقبرہ یہاں موجود تھا اور چنابی نے اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اب عمارت کے فنِ تعمیر پر نقص کی ایک نظر ڈالیں تو اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ سولھویں صدی عیسوی کی عمارت ہے۔ اس کی اینٹیں وہی ہیں جو اکبری عہد میں استعمال ہو رہی تھیں، اور مقبرہ کی اٹھان بھی سولھویں صدی کے مزارات کی طرح ہے۔ مقبرہ کی چاروں دیواروں میں ایسے طاقچے اور کھڑکیاں بنی ہوئی ہیں جو اپنی قدامت کی خود شہادت دے رہی ہیں۔ یہ مقبرہ بھی اس امر کی گواہی دیتا ہے کہ اس کا مدفون سولھویں صدی عیسوی یا اس سے پہلے زندہ تھا۔ لہٰذا اگر ہیر اور رانجھا کا کوئی وجود تھا اور اُن میں سے اگر ایک فرد بھی اس مقبرہ میں دفن ہے تو اُن کے زمانے کی قدامت کم ازکم اکبر کے عہد تک حتمی طور پر ثابت کی جا سکتی ہے۔

* * *

اب قیمتیں گر رہی ہیں
لہٰذا اور زیادہ بچت کیجئے
ہماری نئی حکومت کی کوششوں سے
چیزوں کے دام رفتہ رفتہ کم
ہو رہے ہیں۔ اس خوشگوار تبدیلی
سے روپے کی قوتِ خرید بڑھتی جارہی
ہے لہٰذا اب بچت کی ضرورت اور بڑھ
گئی ہے۔ آپ بھی زیادہ
بچت کیجئے۔

"احساس" :— بقیہ صفحہ ۴۳

چچا فضلو اپنا کام ختم کرکے ناشتہ کرنے گھر لوٹا۔ جہاں چوکھٹ ہی پر اسے اپنی بیوی نظر آئی جو نہایت ہمدردانہ انداز میں لبوں پر تبسم بکھیرے اپنی نشیلی آنکھوں میں اس کے لئے سارے زمانہ کا پیار سمیٹے اس کی منتظر تھی۔ چچا فضلو نے آج عجیب بیباک نظروں سے اس کے گدرائے ہوئے جسم کو گھورا۔ وہ شرما گئی۔

فضلو نے چپ چاپ ناشتہ کیا۔ لیکن اس کا ذہن ہزارہا خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا:

"یہ میری غلطی ہے۔ مجھے اپنے کو اتنا ہلکان نہیں کرنا چاہیئے۔ میں بھی تو انسان ہوں۔ مجھے بھی سیر و تفریح کی اتنی ہی ضرورت ہو سکتی ہے جتنی کہ دوسروں کو۔ آخر اتنی ذمہ داری سے کیا حاصل؟ بھلا یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ دوسرے تو چھٹی کے دنوں میں آرام کریں اور میں ناحق اپنے کو کام میں پھنسائے رکھوں۔ آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یقیناً کوئی ضرورت نہیں۔ اتنا اچھا موسم اور کام بھی نہیں۔ کم از کم مجھے ایسے میں ایک اچھی سی دعوت کرکے اپنے ہونے والے داماد کو تو بلانا چاہیئے۔ جانے کیا سوچتا ہوگا وہ بھی!" چچا فضلو آج زندگی میں پہلی بار اس طرح سوچ رہا تھا۔ آج اسے موسم کی دلفریبی کا احساس ہوا تھا — اور شاید اپنی طویل راتوں کی بے ہنگم تنہائیوں کا بھی احساس! اس کی بیوی کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔

آخری لقمہ چباتے ہوئے اس کی آنکھیں کسی اندرونی مسرت اور شادمانی سے چمکنے لگیں۔ اس نے ادھ چبا نوالہ جلدی سے نگلا اور بجلی کی تیزی سے کھڑے ہوتے ہوئے انتہائی رومانی انداز میں اپنی گم صُم بیوی کو دیکھا۔ پھر اس کے ہونٹوں کو گھورا، جیسے زندگانی کا تمام تر احساس مال گوداموں کی ذمہ داری سے چوکیداری کرنے سے ہٹ کر اب ان ہونٹوں میں آگیا تھا۔ اس نے ان ہونٹوں کو مَس کیا —— دھیرے سے ہولے سے۔ پھر وہ پیار سے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"چل اُٹھ جلدی سے تیار ہو جا۔ ہم بھی میلہ دیکھنے جائیں گے ہاں! تو اتنے تیار ہو میں باہر خچر پر زین کستا ہوں"

اس کی بیوی عجیب بے یقینی سے اسے گھورنے لگی یہاں تک کہ چچا فضلو نے اپنی شادی کا زری دار جوڑا نکالا جو جانے کتنے ہی سالوں سے لکڑی کے بکس کی زینت بنا ہوا تھا۔ پھر مل مل کر نہایا اور صاف ستھرا ململ کا کرتہ پہنا۔ شادی کا ریشمیں پگڑ نکالا، سرسوں کا تیل لگا کر بال کاڑھے اور پھر شان سے رنگین پگڑ سر پر رکھ کر اس کا پلو شانے پر درست کرنے لگا۔ پھر طلّے کے کام کی ہوئی شادی کی صدری پہنی اور بچھوار کا خاص جہلم کا جوتا پہن کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور پھر بولا۔

"اری تو اب تک تیار نہیں ہوئی!"

اور اس کی بیوی سوچ رہی تھی برسوں سے اس گاؤں کی حدود میں کوئی انقلاب نہیں آیا تھا، آج کیسے آگیا؟ —— "ابھی ہوتی ہوں" وہ دھیرے سے گنگنائی!! (خیال ماخوذ)

★

"ماہِ نو" میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط:—

(۱) ماہِ نو میں شائع شدہ مضامین کا معاوضہ پیش کیا جائے گا۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان "ماہِ نو" کے معیار کا خیال رکھیں، اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

صحت مند جلد کی قدرتی
خوبصورتی کے لئے
اصل خوبصورتی کا انحصار صحت مند جلد پر ہے
رکسونا صابن آپ کی جلد میں جذب ہو کر نہ صرف اسے صاف
کرتا ہے بلکہ یہ صحت بخش بھی ہے۔ نیز رکسونا میں
کیڈل بھی ہوتا ہے جو ان قدرتی تیلوں کا ایک خاص مرکب
ہے جن سے آپ کی جلد لطافت و جاذبیت حاصل کرتی ہے
اپنی جلد کی حفاظت
رکسونا
صابن سے کیجئے
Rexona
BLENDED WITH CADYL
رکسونا

RP. 15—183 UD

اوفو، کراچی۔ دسمبر ۱۹۵۸ء

افق تا افق:

ہماری موسیقی

(ایک مغربی نقاد کی نظر میں)

"کیا آپ کو ہماری موسیقی پسند ہے؟ کیا آپ واقعی ہماری موسیقی کو پسند کرتے ہیں؟" برصغیر پاک و ہند میں کئی لوگ مغربی ناقدان فن سے یہ سوال پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ دراصل وہ پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ آپ لوگ ہماری موسیقی کو سمجھتے بھی ہیں یا نہیں جس کا ظاہر ہے کوئی قطعی جواب نہیں دیا جا سکتا۔ بات یہ ہے کہ ہماری روایات ان باتوں میں بہت حصہ لیتی ہیں۔ کیونکہ زندگی ہو یا تاریخ اپنے آپ کو ایک مخصوص رویہ یا ردعمل کے سانچے میں ڈھال لیتی ہے۔ لہٰذا جب ہم گانا سنتے ہیں تو خیال کرتے ہیں کہ ہم اس کو سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ ہم اس پر ذرا بھی سوچ بچار نہیں کر رہے ہوتے۔ اہل یورپ مغربی موسیقی کی کسی نادر تخلیق کو ایسے ہی سن لیتے ہیں جیسے وہ کوئی ادق چیز ہونے کے باوجود مانوس ہی ہو۔ اس کی وضع ہماری توقعات کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن جب ہم کسی نئے فن کار سے دوچار ہوتے ہیں اور وہ رواجی یا روایتی طور طریق سے انحراف کر کے ساز میں کوئی نئی دھن یا گر برتتا ہے، آواز میں کوئی اور تیور، غیر مانوس تالیف یا تان پلٹے سے کام لیتا ہے تو ہم سوچے بغیر نہیں رہ سکتے اور ہماری سوجھ بوجھ کھو سی جاتی ہے۔ ہم موسیقی کے اس نمونے کو اس لئے پسند نہیں کرتے کہ ہم اس کو سمجھ نہیں پاتے۔ بعض اوقات یہ خیال کیا جاتا ہے کہ موسیقی پسند کی جاتی ہے، سمجھی نہیں جاتی۔ یہ صحیح نہیں ہم اس میں کوئی بات ڈھونڈتے ہیں اور اس کو پا کر اس کا پورا پورا احساس بھی کرتے ہیں۔ سارا عمل ایک کیفیت ہوتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں کہ اس کا تجزیہ نہ کیا جا سکے۔ خواہ ہم شعوری طور پر ایسا نہ کر رہے ہوں۔

ایک اور بڑی دقت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سوال نئے پرانے کا نہیں بلکہ اوپری قسم کی موسیقی کا ہو جس کی وضع اور تلازم اثرات ہمارے لئے بالکل اجنبی ہوں۔ اگرچہ ہماری اپنی موسیقی یکساں قسم کی ہے پھر بھی اس میں تو مینوں کا فرق موجود ہے۔ ایک ملک کے لوگ کسی دوسرے یورپی ملک کی موسیقی کو سن کر خیال کرتے ہیں کہ اس کے بعض حصے موسیقی کی فطری کیفیت کی عکاسی نہیں کرتے، پھر بھی مغربی موسیقی کی یکرنگی برقرار رہتی ہے۔ لیکن جونہی ہم مغربی ممالک کے تہذیبی رچاؤ، مقابلہ و کشمکش، سائنسی طور و طریق اور چست و چاق رہنے کے تقاضوں سے گذر کر مشرق کے امن و سکون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جہاں انسان کی زندگی اس کے اپنے ہی لئے ہوتی ہے یا بڑی حد تک اس کے اہل و عیال کے لئے نہ کہ ملک و قوم کے لئے، جہاں انسان واقعی زندگی بسر کر سکتا ہے، جہاں حقیقت کا سراغ نہ تحلیل و تجزیہ سے ملتا ہے نہ باہمی مفاہمت میں۔ اور روحانی غذا گولیوں میں لپٹی لپٹائی نہیں ملتی تو ہماری سوجھ بوجھ کچھ کام نہیں کر سکتی کہ ہم ایسی موسیقی کی طرف کیا رویہ اختیار کریں جو کافی پھیلی ہوئی ہونے کے باوجود ہیجانی ہوتی ہے۔

ایسا ہی ایک اجنبی سا انداز ہمیں اپنے ہی قرون وسطیٰ کے گوناگوں، کثیرالاصوات آہنگ میں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں سوال مقام کا نہیں بلکہ وقت کا ہے۔ کیونکہ ہمیں اپنی تہذیب و تمدن کے پورے چار سو سال پھلانگ کر ایک اور ہی وضع کو اپنانا پڑتا ہے۔ ہم اسالیب کی بحث و تکرار کو فراموش کر کے حسن کے ایسے مظاہر سے روشناس ہوتے ہیں جو مدتیں گذریں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے۔ ہم حیران ہوتے ہیں کہ آج وہ کاریگر کہاں ہیں جنہوں نے نغمہ و آہنگ کے ایسے شاندار محل تعمیر کئے تھے۔ ان کی کامیابی کا راز کیا تھا۔ اور وہ زندگی کیا تھی جس کی انہوں نے اپنے فن میں عکاسی کی تھی۔ وہ ہمیں بھولی بسری امیدوں اور کھوئی ہوئی خوشیوں کی یاد دلاتے ہیں۔ اس موسیقی سے ایک مذہبی انسان یکلخت اس حقیقت کو بھانپ لیتا ہے۔ جو حد و تعین سے ماوراء ہے۔ یہی عجیب شناسائی ہے جس کا احساس ہمیں برصغیر پاک و ہند کی موسیقی سے ہوتا ہے۔

لیکن ان ابتدائی قسم کے عوامی گیتوں کی روح اور وضع اور اسلوب کو سمجھنے کے لئے تو اور بھی زیادہ پرواز تخیل کی ضرورت ہے۔

میرا مطلب ہے تالیفی موسیقی (HARMONY) کے برعکس مفرد قسم کی موسیقی (MELODY) جس کا سمجھنا ان لوگوں کے لئے تو اور بھی دشوار ہے جو اس سادہ موسیقی کا تصور تالیفی موسیقی ہی کی بنیاد پر کرنے کے عادی ہیں۔ وہ اس کو تالیفی موسیقی کے بغیر قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ یہ مسئلہ واقعی بہت ٹیڑھا ہے۔ کیونکہ تالیفی موسیقی کی بنا پر مرتب کیا ہوا عوامی گیت تو تالیفی بنیاد کے بغیر یورپی سامعین کو یوں لگتا ہے جیسے وہ پارہ پارہ ہوتا جارہا ہو۔ اُس تصویر کی طرح جس میں تناظر کا فقدان ہو۔

تالیفی و مفرد موسیقی میں ایک اور زیادہ گہرا رشتہ بھی ہے جس میں تالیف و ترتیب محض ظاہری آرائش ہی نہیں ہوتی جس کو ہم جب چاہیں اس پر چسپاں کر دیں بلکہ اس پر اثر انداز ہونے والا ایک نہایت جاندار عنصر ہے۔ دُھن کیا ہے؟ ایک موسیقانہ جملہ، ایک پیرا، ایک باب۔ ظاہر ہے کہ جملے میں اہم الفاظ بھی ہوتے ہیں اور غیر اہم بھی۔ یہ محض لغت کے الفاظ کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ اسی طرح دھن میں بھی اہم اور غیر اہم سُر ہوتے ہیں۔ اور ان کی موزونیت یا معقولیت کا دارو مدار تمام تر ان کے نظم و ترتیب پر ہوتا ہے۔ لیکن وہ اصول جن پر دُھنوں کی اہمیت مبنی ہوتی ہے، وہ مفرد اور تالیفی موسیقی میں بالکل مختلف ہوتے ہیں۔

تالیفی موسیقی میں سب سے واضح بات یہ ہے کہ نظم و ترتیب کی بعض صورتیں دوسری صورتوں سے زیادہ خوش آہنگ ہوتی ہیں۔ جو صورتیں زیادہ خوش آیند ہوں مغنی ان پر زیادہ زور دیتے ہیں اور دوسرے مجموعوں سے یونہی سرسری طور پر گذر جاتے ہیں۔ تالیفی موسیقی کی روح رواں یہی اہم اور سرسری سُر ہیں۔ اور اس میں سامعہ کی تربیت کچھ اس طرح کی جاتی ہے کہ زیادہ سے زیادہ سرسری سُر اہم سروں کی جگہ لینے جائیں۔ اس طرح جو لو تلموں مجموعے یا تانیں پیدا ہوتی ہیں وہ اس سرگوز یادہ وضاحت یعنی اہمیت عطا کرتے ہیں جس پر وہ مرکوز ہوں۔

مفرد موسیقی کا مابہ الامتیاز اکہرے سروں کا سلسلہ ہے جس میں دُھن کا آہنگ محض اونچا نیچا ہوتا رہتا ہے یعنی اس میں زیادہ اتار ہوتا ہے یا چڑھاؤ۔ اس کے معنی ہیں ایک خاص ہموار سطح کا تعین جس پر دُھن مجموعی طور پر قائم رہتی ہے۔ اور جس کے مقابلے میں زیادہ نمایاں حصے۔ اونچے ہوتے ہیں یا نیچے۔ لہٰذا مفرد موسیقی کے قواعد ان اونچی نیچی سطحوں کے مابین فاصلے سے متعین ہوتے ہیں اور ایک سطح سے دوسری سطح تک گریز کی جاتی ہے۔ بعد میں یہ روش مستحکم ہو کر روایت کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ درمیانی سُر یا وہ سُر جو ان دونوں نمایاں مقامات سے دور ہوں، کم یا زیادہ اہمیت اختیار کرتے جاتے ہیں جو یا سارا تالیفی گیت ان ہی اہمیتوں کے تنوع پر مبنی ہوتا ہے۔

چونکہ تالیفی موسیقی جہاں جی چاہے دھن کے کسی بھی سُر پر زور دیتی ہے، اس لئے تالیفی دُھن کا رجحان یہ ہوگا کہ وہ آہنگ کے بہت ہی زوردار مقامات کی نہج پر چلے اور ان کی بحرانی کیفیتوں کو ابھارے۔ ایسی موسیقی کی اہمیت اس تصادم کا نتیجہ ہوگی جو مفرد موسیقی کے لاآبالیانہ پن اور تالیفی ربط و ضبط سے پیدا ہو۔ ان دو رجحانات کی باہمی مفاہمت ہئیت میں چستی اور وحدت پیدا کرے گی کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کو مطلق العنان ہو کر اپنی اپنی راہ اختیار کرنے سے باز رکھیں گے۔

اس کے برعکس مفرد موسیقی کا قانون خود اس کی ذات میں مضمر ہے۔ اور اسے صرف اپنے اصول کو واضح کرنے ہی کی ضرورت ہے اور بس۔ نہ کہ یہ اس کا کسی اور سے تصادم ظاہر کرے۔ اگر آہنگ کے اصولوں سے تجاوز نہ کیا جائے تو کسی ایک طرح کو دوسرے پر ترجیح دینا کچھ ایسا قابل لحاظ نہیں۔ اس طرح ہم بہ آسانی تنوع اور جزئیات کی تفصیل کی طرف رجوع کرسکتے ہیں جس سے دھن بجائے خود نمایاں نہیں رہتی اور سارا زور کیفیت پر جا پڑتا ہے۔ تالیفی موسیقی کا وصف امتیازی ہے رچاؤ، تربیت۔ اور مفرد موسیقی کا جوہر خالص لوچ اور ہلکی پھلکی نفاست۔

ہمارے لئے یورپ کی قدیم موسیقی کو سمجھنا دشوار نہیں لیکن برصغیر پاک و ہند میں صدہا سال کی جمع شدہ، بے شمار روایات ہمارے اور وہاں کی دھنوں کی ادائیگی اور تحسین کے مابین سدراہ ہیں۔ ہم اس موسیقی کو سمجھنے سے قاصر ہیں جس میں ہم خود حصہ نہ لیں۔ لیکن حق یہ ہے کہ کوئی مغنی بھی اس موسیقی کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اگر اسے یقین ہو کہ یہ روایات فی نفسہٖ دلچسپ ہیں اور ان کی تہہ میں حقیقتہً فن بھی کار فرما ہے۔ یہاں کی اعلیٰ ترین موسیقی کو سمجھنے میں سب سے بڑی مشکل اس کا مذہبی عنصر ہے۔ موسیقی کی کوئی عام فہم زبان نہیں اور اس زبان کا ادراک اور بھی مشکل ہو جاتا ہے جب کہ اس کا موضوع وہ ہو جو ہر سمجھدار شخص اپنی ہی ذات تک محدود رکھتا ہے۔ مذہبی احساس کی وسعت اور

گہرائی ہر ملک میں مختلف ہوتی ہے۔ یورپ اور برصغیر کے مذاہب کی روحانیت سے تعرض کئے بغیر ہم ایک کو عملی اور دوسرے کو فکری قرار دے سکتے ہیں۔ یورپ، خصوصاً انگلستان میں ایسے مذہب کو کچھ ایسا وقیع خیال نہیں کیا جاتا جو اچھی زندگی بسر کرنے میں مدد نہ دے۔ برصغیر میں تمام تر مذہب کی نوعیت پر زور دیا جاتا ہے یعنی یہ کہ اس میں عرفان اور پرواز تخیل کا کتنا عنصر ہے جس سے اعلیٰ زندگی قدرتی طور پر صادر ہوتی ہے۔ لہٰذا یورپ میں جو موسیقی زیر بحث موسیقی سے قریب ترین معلوم ہوتی ہے وہ موسیقی ہے جو سنکے سنٹسٹس (CINQUECENTISTS) موسیقاروں کے یہاں پایۂ تکمیل کو پہنچی تھی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایک خاص زاویۂ نگاہ مثلاً مذہبی تصور ایک خاص قسم کی موسیقی کو جنم دیتا ہے۔

برصغیر نے جتنی مفرد موسیقی کو رواج دے کر بھلا دیا ہے، اتنی یورپ نے سیکھی بھی نہیں! برصغیر میں لے اور تال کا ایک بار نہیں کئی کئی بار گوناگوں شکلوں میں سنجوگ ہوتا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس موسیقی کا نظری حصہ بھولے بسرے نظاموں کا ایک جمگھٹا بن کر رہ گیا ہے۔ وراثت سن کے باعث اس کا احترام زمان و مکان کے حجابات سے عین ذات پر اپنا زور توجہ، وہ ایقان جو دور حاضر کو ازلی دور خیر سے وابستہ کرتا اور بہترین روحانی بلندیوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ ان سب عناصر نے مل کر برصغیر کی موسیقی کو ایک منفرد تشخص عطا کر دیا ہے۔ اور ایسے ناموں اور صفات کی یاد محفوظ کر رکھی ہے جو ایک مدت سے بیگانۂ معنی ہو چکے ہیں۔ لہٰذا ان کے اکثر نظریوں کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اساطیری حصہ کو سمجھ کر سکیں۔ اسی طرح عملی پہلو کو لیا جائے تو فی البدیہہ نغمہ سرائی ایک ہی دن یا ایک ہی فرد کی حین حیات میں تیار نہیں ہوئی بلکہ بول چال کی طرح یہ ساری قوم کے جبلی موروثی احساس کا نتیجہ ہے۔

اس ہی کا تعلق ایک اور خصوصیت سے بھی ہے۔ یہ کہ اس موسیقی میں بولوں یا سروں کو لکھ کر یادداشت کو گھٹانے کا جتن نہیں کیا جاتا۔ درحقیقت یہ صدہا سال کا ریاض ہی ہے نہ کہ یادداشت جس نے برصغیر کے موسیقاروں کو ان متنوع طریقوں کا ایک بے پایاں خزانہ عطا کر دیا ہے۔ اور وہ اس سے جھٹ اپنی ہی کوئی دھن وضع کر لیتے ہیں۔ یہ بدیہہ آفرینی وہ کرشمہ ہے جو ایک رجزیہ صورت اختیار کر لیتا ہے۔ جیسا کہ وہ تمام فنون جو پشت در پشت منتقل ہوتے چلے آرہے ہوں۔ کہتے ہیں کہ اگر ہم "اولڈ ٹرنک روڈ" پر سفر کریں تو ہم براہ راست انجیل کے "باب پیدائش" میں پہنچ جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم ان صدہا سال قدیم ترانوں میں ہومر کے رجزیہ نغمہ سراؤں کا والہانہ آہنگ پاتے ہیں۔ یہ موسیقی قدیم ہے۔ لیکن لعینہٖ یونان کے انمٹ ریحان شباب کی طرح دور کہ ٹروبا ڈور نواسنجوں کی سکہ بند موسیقی کی طرح جو قواعد و ضوابط کے شکنجے میں اس طرح جکڑی ہوئی تھی کہ اس دور کو، موسیقی کا دوسرا عہد طفولیت قرار دینا بے جا نہ ہوگا۔

موسیقی اور بول چال جغرافی حیثیت سے ایک ہی نہج اختیار کرتے ہیں۔ یہ دونوں الگ تھلگ معاشروں میں گمبھیرتا پیدا کر کے بالآخر آپس میں گھل مل جاتے ہیں اور ایک مجموعی، ہمہ گیر بہاؤ پیدا کرتے ہیں۔ چنانچہ راگوں کے سینکڑوں نام اس حقیقت کو نمود دیتے ہیں کہ دھنیں ہر اعتبار سے بولیوں ہی کی طرز و روش اختیار کرتی ہیں۔ الگ الگ درباروں نے بھی موسیقی میں ایسی ہی گمبھیر اور بھرپور کیفیت پیدا کی ہے۔ اب جبکہ خلوت، جس پر فکری موسیقی پروان چڑھتی رہی ہے، کی بجائے جلوت کا بازار گرم ہے اور قصباتی یا درباری فضا ناپید یا نسبتہً کم ہو گئی ہے، کوئی مغنی اپنے فن پر چنداں فخر محسوس نہیں کر سکتا۔ پھر بھی یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ موسیقی ہر بوالہوس کی حسن پرستی سے بیزار ہو کر دنیا سے مفقود ہو جائے گی۔ بالخصوص ایک ایسی قوم سے جو شعر و نغمہ کی روح سے بدرجۂ اتم سرشار ہے۔

چونکہ زیر بحث موسیقی کی زبان میں مقدار (QUANTITY) کا عمل دخل ہے نہ کہ تاکید (ACCENT) کا، اس لئے اس کی تالیں آہنگ کی بجائے وزن پر مبنی ہیں۔ کھلی آوازوں کی کثرت اور وزن کے امتزاج سے موسیقی بڑی حد تک آواز سنگیت رہی ہے نہ کہ ساز سنگیت، اور چونکہ آواز مدھر لہجے کی یکسانیت پر زور دیتی ہے نہ کہ تند و تیز ہیجانی جذبات پر، اس لئے اس کمی کو طبلے کے بولوں سے پورا کر دیا گیا ہے۔

موسیقی کے اعلیٰ مظاہرے تو کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں، لیکن جب بھی انسان ان سے دوچار ہو اُن کے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ بے ساختگی، اور صدیوں قدیم دنیا یا جہانِ دیگر کی یاد آوری ہمیں حسن و کیف کے اس احساس سے سرشار کر دیتی ہے۔

جو کم درجہ فن میں بھی مفقود نہیں ہوتی۔ ان فن پاروں کا موضوع وہی انسان کی فطری خواہشات ہیں اور وہی بیم و امید کے سیدھے سادے احساسات۔ وہی ذکر الٰہی کی لامتناہی تکرار اور انسانی محبت کی داستان جس سے طبیعت کبھی سیر نہیں ہو سکتی۔

موسیقی کی نشو و نما کا سلسلہ کبھی رک نہیں سکتا۔ اس فن کے رسیا پرانی راہوں میں نئی پگڈنڈیاں پیدا کرتے ہی رہتے ہیں۔ اس دوران میں بہت کچھ بھول بھی جاتا ہے، ناپسندیدہ عنصر چھوٹ جاتے ہیں لیکن فن کا دریائے رواں برابر جاری رہتا ہے۔ برصغیر کی موسیقی کو جو ذرائع اظہار میسر ہیں ان میں نئے حالات کے گوناگوں تقاضوں کے باعث کچھ نہ کچھ کمی بیشی اور کاٹ چھانٹ ضرور ہوگی، اس کے ترچھے ٹیڑھے کونے ہموار ہو جائیں گے اور جن امور کی دائمی ضرورت ہے، وہ زیادہ سادگی، صفائی اور خوش اسلوبی سے ادا کئے جائیں گے۔ اس سلسلہ میں فرسودہ پابندیاں اور قواعد و ضوابط کبھی سد راہ نہیں ہو سکتے۔ زندگی کی طرح فن بھی اپنی آزادی کی راہیں تلاش کر ہی لیتا ہے۔

سنوارنے نکھارنے کا یہ عمل شروع ہو چکا ہے اور کئی ایک باتیں چھٹ بھی چکی ہیں۔ یہ ہے تو افسوسناک لیکن اصلاح کا ایک صورت صرف ایک ہے: اول نئے حالات کو قبول کر لیا جائے۔ پھر ان سے بے نیاز ہو کر موسیقی کو تخلیق کیا جائے۔ اور بعد میں نئے حالات ہی سے ان میں زندگی کی روح پھونکی جائے۔ وہ موسیقی جو انسانوں کے حقیقی احساسات اور تقاضوں پر مبنی نہ ہو وہ کوئی موسیقی نہیں۔ یہ کہنا کہ راگ راگنیاں اور تالیں بالکل اسی قدیم حالت میں رہیں جس میں یہ پہلے تھیں، اسی قدر راہ راست سے دور ہے۔ جتنا یہ کہنا کہ بیسویں صدی کی شاعری چاسر کی زبان یا بنگلا میں محبت کا گیت صد ہا سال پرانی زبان میں لکھا جائے ؂ (لے۔ ایچ۔ ایف۔ سٹرینگ ویز)

"سرحد کا پہلا اردو شاعر" ــــــ بقیہ صفحہ: (۲۵)

مخمس کے چند بند

(اس مخمس میں شاعر نے اپنی ہی ایک غزل تضمین کی ہے۔)

آج باندھا سر اپن پر چیرہ لالی الحفیظ
مست آیا از شراب پر تگالی الحفیظ
مال دانائی ہمو نے آ کو ڈالی الحفیظ
اب جو یہ تلوار زلفوں کی نکالی الحفیظ
"مت کوئی آکہ ملو سے پائمالی الحفیظ"

جب منے جام محبت اس پیاری کا پیا   پیارے
رد رنا دل سوں ہو نے غم کوں دل اپنا دیا
کچھ نہیں واقف مرے احوال سوں میرا پیا
کل مجھے بیمار اپنے نین کا فرسوں کیا
"آج مجھکوں پوچھتا ساجن خیالی الحفیظ"

چھوڑ دیا عشق موں ہم نے جہاں کا کام کاج
سخت ہوتا ہے مجھے اب کیا کرونگا کس سوں لاج
جاں بلب پہنچا ہے مجکوں کچھ نہیں میرا علاج
کل پوچھا مجکوں، نہیں واقف مرے سوں یار آج
"خوب یاری ہم ستیں ساجن نے پالی الحفیظ"

نوشہرہ میں کاغذ سازی اور ہارڈ بورڈ کا کارخانہ

۱ :

۲ :

۳ :

۴ :

۱— کارخانہ کا بیرونی منظر
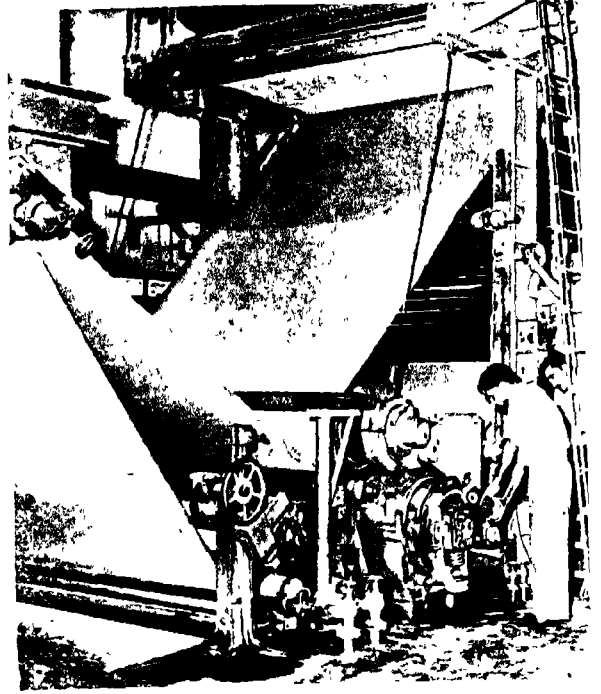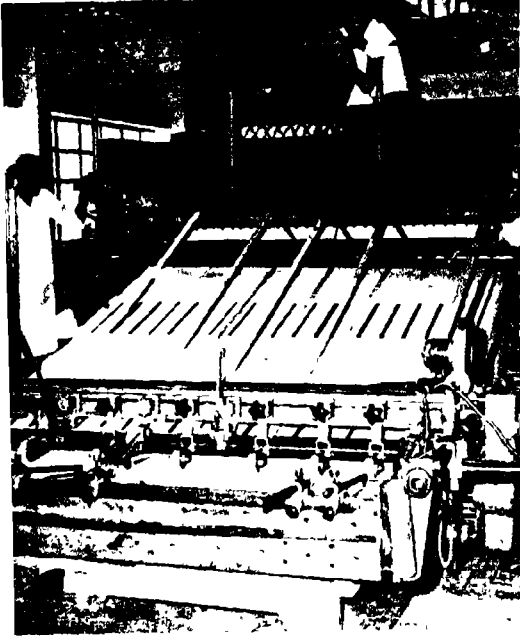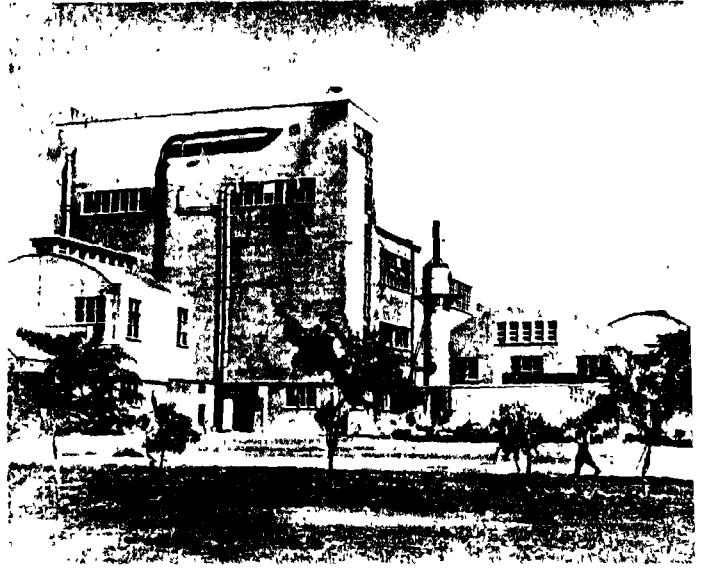
۲— ہارڈ بورڈ کی تیاری

۳— مناسب سائزوں میں کٹائی

۴— تیار مال کی پیکنگ

ادارۂ مطبوعات پاکستان ۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ ۔ کراچی

جوش ملیح آبادی روش صدیقی ممتاز حسن
آغا محمد اشرف قیوم نظر آغا عبدالحمید
ابن انشا تابش دہلوی یونس احمر

جنوری ۱۹۵۹ء
۸/

ماہِ نو

جلد ۱۲ شمارہ ۱

جنوری ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور
نائب مدیر: ظفر قریشی

سالانہ چندہ:۔ ساڑھے پانچ روپے
فی کاپی:۔ آٹھ آنے

ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان
پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

اپس کی باتیں

نیا سال اپنے ساتھ نئی نئی امیدوں کی روشنی لئے ہوئے طلوع ہو رہا ہے۔ صرف دو ماہ کے قلیل عرصہ ہی میں ہمہ گیر، تیز رفتار قومی و ملکی ترقی کی آب و تاب اس قدر خیرہ کن ہے کہ قبل ازیں شاید اس کا خفیف ہی سا عکس دکھائی دے سکتا تھا۔ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس روز افزوں اُجالے میں تاریکی کا شائبہ تک نہیں۔ اس لئے کہ موجودہ انقلاب نے فی الحقیقت ہماری زندگی کی ہر اعتبار سے کایا پلٹ کر کے رکھ دی ہے۔ اور پچھلے اور موجودہ دور میں نمایاں فرق دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے ہاں تطہیر کا عمل جس غیر معمولی تیزی اور کامیابی سے ہوا ہے وہ ایک ناقابلِ یقین معجزہ ہے، اور پھر اس کے بعد سیاسی، انتظامی، اقتصادی، کاروباری، زراعتی، معاشرتی، اخلاقی، ثقافتی، غرضیکہ ہماری حیاتِ ملّیہ کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں حرکت و توانائی کی ایک برقی رَو نہ دوڑ گئی ہو۔ اس طرح ہم نے سالہا سال کا فاصلہ دنوں میں طے کر لیا ہے جو مہتم بالشان ہی نہیں بلکہ خوش آئند اور محیّر العقول بھی ہے۔ اور اس نے ہمارا عالمی وقار بدرجہا بلند کر دیا ہے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے ہی امید ظاہر کی تھی، اس انقلاب سے ہماری خوابیدہ حسیات، ہماری وہبی صلاحیتیں، جو ناسازگار حالات کی وجہ سے ماؤف، متاثر، یا سرد ہو چلی تھیں، پھر سے جاگ اٹھیں اور یہ زندگی کے لطیف ترین جوہر — ثقافت، کو حیاتِ تازہ کی نوید ہو گئی۔ چنانچہ دنیائے ادب و فن میں ایک نئی حرکت نظر آنے لگی ہے۔ پچھلے دنوں صرف وفاقی پایۂ تخت میں کراچی پریس کلب کا قیام، قومی تھیٹر کو مضبوط بنیادوں پر قائم کرنے کی بڑھتی ہوئی جد و جہد، پاکستان آرٹ کونسل کی بیش از بیش سرگرمیاں، جامعات کراچی و پنجاب اور اردو ترقیاتی بورڈ کے مفید اقدامات ایک نئی زندگی کی خبر دیتے ہیں۔ اسی طرح مغربی پاکستان میں دائرۃ المعارف کی ترتیب اور ادبی کنونشن کا اہتمام، ایک ثقافتی وفد کا پاکستان بھر میں دورہ کرنے کا ارادہ، اس ہماہمی کے آئینہ دار ہیں۔ ابھی نئی زندگی کی یہ دھڑکنیں اتنی تیز، اتنی بلند آوار نہ سہی لیکن آگے چل کر یہی ایک طوفانی آہنگ پیدا کریں گی۔

✻

افسوس ہے کہ سالِ کہن رخصت ہوتے ہوئے کچھ پرچھائیاں بھی چھوڑ گیا۔ پہلے مغربی پاکستان کے ایک نامور دانشور، ماہرِ تعلیم و علم الالسنہ، اور متبحر عالم و محقق شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتا جو جلیل القدر سلسلۂ "شمس العلماء" کی آخری کڑی تھے، ہم سے رخصت ہو گئے۔ قدرت نے وادیٔ مہران کے اس چشم و چراغ کو غیر معمولی صلاحیتیں، ذاتی وجاہت اور اخلاقی فضیلتیں عطا کی تھیں جو اُن کی گوناگوں علمی و ادبی، قومی و ملکی خدماتِ جلیلہ کی شکل میں بروئے کار آئیں۔ پاکستان کا افقِ ادب و ثقافت اُن کی تجلیاتِ علم و ادب سے ہمیشہ تابناک رہے گا۔

تھوڑے ہی عرصہ بعد علم و ادب کی ایک اور شمع بھی افسردہ ہو گئی جس نے اپنی روشنی سے مشرق و مغرب دونوں اُفقوں کو جگمگا رکھا تھا اور بین الاقوامی آب و تاب پیدا کی تھی۔ پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) شہرۂ آفاق ادیب، فصیح و بلیغ مقرر، زندہ دل مزاح نگار، بلند نظر مدبّر، عمیق النظر نقاد اور وسیع المشرب مردِ آفاقی جو جامع شرق و غرب ہونے کی حیثیت سے مجمع البحرین تھے۔ ایک تابناک ستارہ جو اپنے پیچھے ذاتی علم و فضل کی ایک بڑی لمبی لکیر چھوڑ گیا ہے۔

ایک غیر فانی ادیب و مزاح نگار اور محسن قوم و ملک کی حیثیت سے "ماہ نو" ان کے لئے سوگوار ہے۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ان کی حیثیت ایک پُرخلوص سفیر قوم و وطن کی تھی اور اسی کے شایانِ شان اعزاز کے ساتھ ان کی تدفین بھی ہوئی۔ دعا ہے کہ پاکستان کے اس فرزندِ جلیل کی لحد پر آسمان ابرِ شبنم افشانی کرے اور اپنے محبوب وطن سے ہزاروں میل دور پُرسکون ابدی نیند سو جائے۔

ان ستاروں کا نظروں سے روپوش ہو جانا ایک نقیب نظر ہے۔ وہ اب بھی ویسے ہی وجہِ فروغِ انجمن ہیں جیسے کہ پہلے تھیں۔ ان کا نور ایک عظیم تر نور کا جزو بن چکا ہے۔ پاکستان کی عظمت پائندہ اور یہی رنج و غم کے ان موقعوں پر ہمارے لئے سامانِ شکیبائی ہے۔

سرورق : جہاز سازی کی گودی (کراچی)

بیادِ رفتگاں:

آغا محمد اشرف
ممتاز حسن
آغا عبدالحمید
ابن انشا
فرید احمد

آغا محمد اشرف

نیویارک کی ٹیلی فون ڈائریکٹری میں ہر اس شخص کا نام ملے گا کہ جس کے ہاں فون لگا ہوا ہے۔ لیکن اس ضخیم کتاب میں پروفیسر احمد بخاری کا نام نہیں ملتا۔ حالانکہ یہ ۸ سال سے زیادہ عرصہ تک نیویارک میں رہے۔ اور رہے بھی ایک معمولی اور غیر معروف انسان کی طرح سے نہیں۔ بلکہ چار سال تک اقوامِ متحدہ میں پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے اور تقریباً اتنا ہی عرصے اقوام متحدہ میں انڈر سکریٹری کے طور پر۔

پروفیسر بخاری کے اپنے عملے کو حکم تھا کہ میرا نجی فون نمبر نہ تو کتاب میں چھپے، نہ اسے کسی کو بتایا جائے۔ غالباً یہ بھی بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ نیویارک کے کس کوچہ میں پروفیسر بخاری رہتے ہیں۔ ان کے صرف خاص خاص دوستوں اور عقیدت مندوں کو ان کے فلیٹ پر جانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ پروفیسر بخاری نے تمام دنیا سے قطع تعلق کر کے گوشۂ عزلت میں زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی۔ یہ صرف ان کی زندگی کا ایک پُراسرار رُخ تھا۔ جسے یہ نہایت کوشش سے پُراسرار ہی رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی زندگی کا مجلسی رخ وہ تھا کہ جس کی جھلک اقوام متحدہ کے کھانے کے کمرہ میں یا احباب کی بے تکلف صحبتوں میں نظر آتی تھی۔ پروفیسر بخاری بغیر مجلس اور احباب کے ایک دن زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ ہر روز لنچ کے وقت یہ چند پاکستانی احباب کو مستقل طور سے فون پر پیغام بھیجکر کھانے کے کمرے میں بلواتے تھے۔ اگر ان میں سے کسی کو آنے میں دیر ہو جاتی تو اس کے کمرے کے باہر دالان میں کھڑے ہو کر انتظار کرتے۔ اور جس روز اتفاق سے کوئی بھی نہ ملتا تو یہ کھانے کی ٹرے لے کر اس تلاش میں رہتے کہ کوئی شناسا مل جائے۔

دوپہر کے کھانے کا وقت عموماً ایک گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اس ۶۰ منٹ میں ان کے لطیفے، بذلہ سنجیاں اور پرلطف باتیں جس نے ایک مرتبہ سنی ہیں وہ بخاری صاحب کو عمر بھر نہیں بھول سکتا۔ لیکن جونہی یہ محفل برخاست ہوتی، ان کے چہرے پر اداسی کے آثار نظر آنے لگتے۔ ڈاکٹر نے کئی سال سے انہیں کھانے کے بعد کچھ دیر تک آرام کی تاکید کر رکھی تھی۔ یہ خود بھی جانتے تھے کہ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن وہ شخص کہ جس کی تمام زندگی ایک مسلسل مسکراہٹ ہو وہ کسی تاریک کمرہ کے خاموش گوشہ میں کیسے آرام کر سکتا تھا۔

یہی حال غالباً ان کا دفتر کے بعد ہوتا تھا۔ انہیں کسی ہمدم اور ہمساز کی تلاش رہتی تھی کہ چند منٹ اس سے بیٹھ کر جی بہلا سکیں۔ یہ پروفیسر بخاری کے آخری چند سال کا افسوسناک پہلو تھا۔

پاکستان نے بین الاقوامی سیاست کی بساط پر اب تک صرف دو فرزند اتارے ہیں ایک ظفراللہ خاں دوسرے احمد بخاری۔ اور ان دونوں پر دنیا کا ہر ایک ملک فخر کر سکتا ہے۔ حسن اتفاق سے ظفراللہ خاں اور بخاری دونوں کئی سال تک بیک وقت پاکستان کی اقوام متحدہ میں نمائندگی کرتے رہے۔ دونوں کے میدان ایک تھے۔ دونوں کا طریقۂ کار ایک تھا لیکن دونوں ملکر ایک ایسا نقشہ پیش کرتے تھے کہ حریف تڑپ تڑپ کر بلبلا بلبلا کر رہ جاتے تھے۔

قائد ملت لیاقت علی خاں نے پروفیسر بخاری کو سنہ ۱۹۵۰ء میں پاکستان کا مستقل نمائندہ بنا کر اقوام متحدہ بھیجا۔ اس سے پہلے یہ پاکستان بنتے ہی

ایک دوستانہ مشن کے ساتھ افغانستان جا چکے تھے۔ کئی مہینے تک ایک بین الاقوامی کانفرنس میں، جو ریڈیو کے متعلق فیصلے کر رہی تھی، پاکستان کی نمایندگی میکسکو میں کر چکے تھے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی اور اکنامک اور سوشل کانفرنس میں شریک ہو چکے تھے۔ لیاقت علی خاں کے ساتھ امریکہ کا دورہ کر چکے تھے۔ اس دورہ میں وزیر اعظم کی تمام تر تقریریں انہوں نے ہی تیار کی تھیں جو اب کتاب کی صورت میں بھی چھپ چکی ہیں۔ لیکن اصلی معنوں میں بین الاقوامی افق پر بخاری صاحب کو ۱۹۵۰ء ہی میں کام کرنے کا موقع ملا۔

لیک سکس میں ان کی پہلی کانفرنس ہمیشہ یاد گار رہے گی۔ میرا خیال ہے کہ اس روز ان کے چہرہ سے پریشانی کی ہلکی سی جھلک ظاہر ہوتی تھی۔ اور اس پر کچھ تعجب بھی نہیں۔ کیونکہ اقوام متحدہ بین الاقوامی سیاست کا دنیا میں سب سے بڑا اکھاڑہ ہے۔ یہاں بڑے بڑے سیاست دانوں کی شہرت ایک آن میں بنتے بگڑتے دیکھی گئی ہے۔ یہاں اخبار نویس اصلی معنوں میں آزاد اور بے باک ہوتے ہیں۔ ان پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا۔ بخاری صاحب جانتے تھے کہ آج میری شہرت کا امتحان اور میری سیاست دانی کی آزمائش ہے۔ پریس کانفرنس شروع ہوئی اخبار نویس اس تاک میں تھے کہ اس نئے سوار کو گرا دیں۔ بخاری صاحب اپنے موقع کی تلاش میں تھے۔ ایک ایسا بھرپور وار کریں جو سب سے ان کا لوہا منوا لے۔

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات پر سوالات کی بارش ہونے لگی۔ ہندوستان کے اخبار نویس بڑھ بڑھ کر سوال کر رہے تھے۔ (اس وقت کوئی پاکستانی اخبار نویس نہیں تھا) پاکستان پر الزامات لگائے جا رہے تھے۔ پروفیسر بخاری نے باتوں باتوں میں کہا پاکستان تو ہندوستان سے تعاون کرنے کو تیار ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج ہے کہ دوسرے کوئی ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ تقسیم کے وقت فیصلہ ہوا کہ پاکستانی فوجوں کو کئی ہزار جوتے مشترکہ ذخیروں میں سے دیئے جائیں گے۔ جوتے پہنچے ضرور۔ لیکن جب صندوق کھولے گئے تو ہزاروں جوتے صرف بائیں پاؤں کے تھے۔ دایاں پاؤں ایک نہیں تھا!

کانفرنس میں قہقہہ لگا۔ اور اس کے بعد سوالوں کا رخ بدل گیا۔ اقوام متحدہ میں سیاست کی گتھیاں ابھی سنجیدگی سے سلجھائی جاتی تھیں۔ غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ سیاست جیسے ثقیل مبحث میں طنز، بذلہ سنجی اور مزاح کی چاشنی بھی کسی نے شامل کی تھی۔ اس کے بعد تو پروفیسر بخاری کی دھاک بیٹھ گئی۔ اخبار نویس خواہ مغرب کے ہوں یا مشرق کے ہوں سب ان کا کلمہ پڑھنے لگے۔ اب تک سیاسی تقریروں میں کسی نے شیکسپیئر کا حوالہ بہت کم دیا ہوگا۔ ایک مرتبہ غالباً تیونس کی آزادی معرض بحث تھی سلامتی کونسل میں دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں۔ پاکستان ان دنوں سلامتی کونسل کا ممبر تھا۔ پروفیسر بخاری کی تقریر اخبار نویس دم بخود کاغذ کے پرزوں پر لکھتے جاتے تھے۔ ایکا ایکی انہوں نے ایک دوسرے کو ٹہنیاں مارنی شروع کیں۔ آج یہ کیا ہو رہا ہے۔ پروفیسر بخاری غلط انگریزی کیوں بول رہے ہیں۔ ان کا انگریزی زبان پر عبور تمام دنیا میں مشہور تھا لیکن آج ان کی انگریزی کو کیا ہو گیا تھا۔ ایکا ایکی ان پر یہ راز کھلا کہ تیونس کے مبحث پر بولتے بولتے پروفیسر بخاری شیکسپیئر کے صفحے کے صفحے نقل کرتے چلے جا رہے تھے۔ اور یہ اس طرح چسپاں ہو رہے تھے کہ بحث میں حوالہ، حوالہ نہیں معلوم ہوتا تھا بلکہ تقریر کا جزو بن گیا تھا۔ یہ پروفیسر بخاری کی طاقت لسانی کا ایک ہلکا سا معجزہ تھا۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۲ء تک انہوں نے سلامتی کونسل میں پاکستان کی نمایندگی کی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مشہور برطانوی سیاست داں سر گلیڈون جب اس کے ممبر تھے۔ روس کی طرف سے جیکب ملک اور کبھی کبھی موسیو وشنسکی شریک ہوتے تھے کوریا کے مسئلہ پر دن رات بحثیں ہوتی تھیں۔ مراکش اور تیونس کی آزادی پر ایشیا اور عرب جان کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔ ان تمام بحثوں میں پروفیسر بخاری جب کبھی بولے، ہزاروں سننے والوں نے یہی کہا کہ ان کی تقریر حاصل مشاعرہ تھی۔ اب جلسہ ختم ہو گیا کوئی اور کیا بولیگا۔ بنڈونگ کانفرنس میں یہ شریک نہیں ہوئے لیکن یہ بات سب جانتے ہیں کہ اس کی بنیاد انہوں نے ہی رکھی تھی۔

امریکہ بھر میں انہیں یونیورسٹیاں اور کالج دعوتیں دیتے تھے۔ اور یہ انہیں قبول کرتے تھے۔ لوگ ان کی تقریریں بار بار سننے کے لئے آتے تھے۔ اور ہر مرتبہ پھر سننے کی خواہش کرتے تھے۔ یہ سعادت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی۔

اکتوبر ۱۹۵۴ء میں بخاری صاحب کی عمر ۵۵ سال کی ہوگئی اور انہیں حکومت پاکستان کی ملازمت سے پنشن مل گئی۔ اقوام متحدہ کے سکرٹری جنرل مسٹر ہیمرشیلڈ کی مردم شناس نظروں نے انہیں اول دن سے تاک رکھا تھا۔ فوراً محکمۂ اطلاعات کا انڈر سکرٹری بنا لیا۔ اس کے ساتھ یہ سکرٹری جنرل کے سیاسی مشیر بھی تھے۔ دسمبر ۱۹۵۴ء میں انہوں نے اپنے نئے عہدہ کا چارج لیا۔ جنوری ۱۹۵۵ء میں سکرٹری جنرل کو جنرل اسمبلی نے اشتراکی چین سے مصالحت کی گفت وشنید کے لئے چن کنگ بھیجا۔ اس موقع پر سکرٹری جنرل نے صرف پروفیسر بخاری کو اپنے ساتھ لیا۔ اور چو۔ این۔ لائی اور دوسرے چینی رہنماؤں سے گفتگو میں یہ شریک رہے۔

لیکن ان کی صحت روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے انہیں قلب کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اس کے علاوہ ذیابیطس کی بھی شکایت تھی۔ ان کا وزن بہت کم ہوگیا تھا۔ چہرہ پر وہ پہلے جیسی رونق بھی نہیں رہی تھی۔ سکرٹری جنرل کے سیاسی مشیر کی حیثیت سے ۲۴ گھنٹے انہیں تیار رہنا پڑتا تھا۔ مسٹر ہیمرشیلڈ غضب کے مستعد انسان ہیں۔ اور کام کرنے کا تو انہیں ہوکا ہے۔ ۱۷۔۱۸ گھنٹے روزانہ کام کرنا ان کا معمول ہے۔ سوئز کا قضیہ شروع ہوا تو یہ صرف ۳۔۴ گھنٹے سوتے تھے۔ روزانہ ۲۰۔۲۰ گھنٹے دفتر میں کام کرتے تھے۔ پروفیسر بخاری کو ڈاکٹر کا یہ حکم تھا کہ لنچ کے بعد آرام کرو۔ تیسرے پہر چار بجے کے بعد دفتر چھوڑ دو۔ رات کو دس بجے سے پہلے بستر پر لیٹ جاؤ۔ ایسے حالات میں یہ سکرٹری جنرل کے ساتھ دوڑ نہیں سکتے تھے۔ نومبر ۱۹۵۶ء میں ان کی صحت جواب دے رہی تھی۔ اور سکرٹری جنرل کا یہ عالم تھا کہ دن بھر سلامتی کونسل اور جنرل اسمبلی کے اجلاس میں بیٹھتے تھے۔ شام کو مختلف نمائندوں سے تبادلۂ خیالات کرتے تھے۔ اور پھر رات کے دس بجے سے جنرل اسمبلی کا جو اجلاس شروع ہوتا تھا تو صبح کے تین بج جاتے تھے۔ اس وقت یہ اٹھ کر نیویارک کے بازاروں میں کسی نیم خوابیدہ کافی فروش کی دوکان پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ میں نے اس زمانے میں جو کیفیت پروفیسر بخاری پر طاری دیکھی اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ اس دوڑ میں جی چھوڑ چکے ہیں۔ سیاسی مشیر اگر ہمرکاب نہ رہے تو جرنیل دوسرے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ سکرٹری جنرل نے نئے مشیر مقرر کرلئے۔ اور بخاری صاحب پچھلی صف میں بیٹھنے لگے۔

اقوام متحدہ کے حلقوں میں اور اس کے باہر یہ تقریریں اب بھی کرتے تھے اور سننے والوں کا اشتیاق اسی طرح قائم تھا۔ ان کی آخری معرکہ آرا تقریر نومبر ۱۹۵۷ء میں سان فرانسسکو میں ہوئی۔ امریکی حکومت نے دنیا بھر کے مشہور ریاست دانوں کو مشورے کے لئے جمع کیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ مشرق اور مغرب کے ثقافتی تعلقات کو بہتر کیسے بنایا جائے۔ یورپ، ایشیا اور امریکہ کے بڑے بڑے فلسفی اور پروفیسر سب اس جلسے میں جمع تھے۔ سنا ہے کہ پروفیسر بخاری کی تقریر جب ختم ہوئی تو ہزاروں کا مجمع بیک وقت کھڑا ہوگیا۔ اور بہت دیر تک تالیاں بجا کر ان کی سحر بیانی کا اعتراف کرتا رہا۔

یہ ان کی آخری تقریر سمجھنی چاہئے اس کے بعد انہوں نے منصبی فرائض کی ادائیگی میں تقریریں ضرور کیں لیکن جیسا کہ دستور ہے، ان کے نائبین لکھ دیتے تھے اور یہ جا کر پڑھ آتے تھے۔ فروری ۱۹۵۸ء میں میں نے اقوام متحدہ کے ایک جلسہ میں ان سے تقریر کی فرمائش کی۔ انہوں نے تقریر کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ لیکن کہا تم لوگ سمجھتے ہو میں ایک مشین ہوں کہ جب چاہا، اس سے تقریر کروا لی۔ میں تقریر پر محنت کرتا ہوں، اور اس کے لئے وقت کی ضرورت ہے۔

جن لوگوں نے پروفیسر بخاری کو بولتے سنا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ ان کی تقریروں کے مزاحیہ ٹکڑے اگرچہ آمد معلوم ہوتے تھے لیکن ان کی چولیں بٹھانے پر خونِ دل صرف کرنا پڑتا تھا۔

پروفیسر بخاری کو لباس پہننے کا بہت اچھا سلیقہ تھا۔ اور پھر یہ جامہ زیب بھی تھے۔ اگر اپنے کسی دوست کو اچھا سوٹ پہنے دیکھ لیتے تو اس کی تعریف کرتے۔ ۱۹۵۷ء میں ایک کانفرنس کے سلسلے میں میں ان کے ساتھ جنیوا گیا۔ وہاں ایک درزی کی دکان پر انہیں سفید ڈنر جیکٹ پسند آگئی۔ پہلے تو اس کی وہیں کھڑے ہو کر تعریف کی۔ اور پھر ایک نہیں بلکہ دو کا آرڈر دیا۔ انہیں خود نیویارک کی واپسی کی جلدی تھی۔ مجھ سے کہا کہ یہ اپنے ساتھ لے کر آنا اور اس کے ساتھ یہ بھی اصرار تھا کہ علیحدہ بکس میں بندھوانا۔ کہیں استری نہ ٹوٹ جائے۔

(سناری)

جوتا خریدنے اور جوتا پہننے کا انہیں بہت شوق تھا۔ سب سے پہلے ان کی نظر دوسرے کے جوتے پر پڑتی تھی۔ جوتے بنانے کے تمام مرحلوں سے یہ بخوبی واقف تھے۔ اور جوتہ سازی پر اس طرح گفتگو کرتے تھے جیسے اس فن کو انہوں نے خود حاصل کیا تھا۔ اٹلی کے بنے ہوئے جوتے اٹلی جاکر خریدتے تھے اور نہایت خوش سلیقگی سے انہیں استعمال کرتے تھے۔

دراصل آرٹ ان کی زندگی کا جزو بن گیا تھا۔ ان کا اردو اور انگریزی کا خط اسقدر پاکیزہ تھا کہ نظروں میں کھب جاتا تھا۔ ہر خوبصورت چیز کو دیکھ کر ان کی طبیعت خوش ہوتی تھی۔ اور اپنے چاروں طرف حسین و جمیل چیزیں دیکھنی پسند کرتے تھے۔ مرنے سے چند ہفتے پہلے میں نے اقوام متحدہ کے ایک پروگرام کے سلسلے میں چند لوگوں کو دنیا کے مختلف ممالک سے منتخب کرکے بلایا۔ ان میں سے ایک کے متعلق مجھے بلا کر آہستہ سے کہا، "اس کی آنکھ میں موہنی ہے"۔

انگریزوں کو برتنا یہ خوب جانتے تھے۔ انگریز اپنی سلطنت کے خواب ہزار بھلانے کی کوشش کرے لیکن جب اس کا مقابلہ ایشیاء افریقہ اور عرب ممالک کے باشندے سے ہوتا ہے تو ایکا ایکی اسے اپنا تابناک ماضی یاد آ جاتا ہے۔ پروفیسر بخاری انگریز کی اس دکھتی رگ سے خوب واقف تھے۔ اس سے یہ اونچے ہوکر ملتے تھے اور برابری کے دعوے سے نہیں، بلکہ ذہنی بلندی کے زاویے سے اس پر ثابت کر دیتے تھے کہ ایشیائی ملک اب آزاد ہیں اور بین الاقوامی مجلسوں میں برابر کا درجہ رکھتے ہیں۔

اقوام متحدہ کی ملازمت کے سلسلے میں انہوں نے ہمیشہ ایشیائی اور مشرقی برتری کا اعتراف کروایا۔ جب یہ نئے نئے آئے تو ان کے نائب یہی سمجھے بیٹھے تھے کہ دفتری دردسری سے انہیں کیا واسطہ۔ جو ہم کہیں گے اس پر یہ آنکھیں بند کرکے دستخط کر دیں گے۔ لیکن بہت جلد انہیں پتہ چل گیا کہ یہ خیالِ خام تھا۔ پروفیسر بخاری دفتر شاہی کے پرانے اور آزمودہ کار شاطر تھے۔ دفتری مسلوں پر یہ صرف خانہ پری نہیں کرتے تھے۔ بلکہ ایسے دو ٹوک فیصلے لکھتے تھے کہ ان کے ماتحت اپنی کرسیوں پر کسمسا کر رہ جاتے تھے۔ وہ اہل کار کہ جنہیں اپنی کارکردگی پر بہت غرور تھا ان کے کمرہ میں جانے سے پہلے کوٹ کے بٹن لگا لیتے تھے اور کندھوں کو ہموار کر کے اندر داخل ہوتے تھے۔

بڑھ بڑھ کر بولنے والوں کو خاموش کرنے میں پروفیسر بخاری کو خاص طور سے لطف آتا تھا۔ گذشتہ سال ایک انگریز افسر جو تمام عمر حکومت ہند میں اعلیٰ عہدوں پر کام کر چکا تھا تمام دنیا کا سفر کرتا ہوا نیویارک پہنچا۔ یہ اور اس کی بیوی دونوں خدا جانے کیوں پروفیسر بخاری سے ملنا چاہتے تھے۔ چونکہ تمام عمر ہندوستان میں رہتے رہتے ان کی عادتیں بگڑی ہوئی تھیں، پروفیسر بخاری سے بھی انہوں نے کچھ اسی اونچے انداز میں گفتگو شروع کی۔ چین کا ذکر آ گیا۔ دونوں میاں بیوی یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ چین کے اسکولوں میں ہماری بہت آؤ بھگت ہوئی۔ اس بیان کو انہوں نے ایسا طول دیا کہ طبیعت عاجز ہوگئی۔ پروفیسر بخاری ہوں ہوں کرتے جاتے تھے۔ دوران گفتگو میں اس انگریز کی بیوی نے کہا شاید آپ کو نیا چین دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ پروفیسر بخاری نے نہایت بے پروائی سے کہا "۱۹۵۵ء میں جب میں چو۔ این لائی کا مہمان تھا۔۔۔۔"۔ دونوں میاں بیوی نے فوراً گفتگو کا رخ بدل دیا۔

اقوام متحدہ میں آخری معرکہ انہوں نے مرنے سے ٹھیک پندرہ دن پہلے سر کیا تھا۔ اول دن سے ہندوستان کو پروفیسر بخاری کے تقرر پر اعتراض تھا۔ جنرل اسمبلی کی کمیٹیوں اور عام اجلاس میں یہ نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ ۱۹۵۷ء کی جنرل اسمبلی نے محکمۂ اطلاعات کے کام پر نظرثانی کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کر دی۔ اس کمیٹی کے چھ ممبروں میں روس، برطانیہ، امریکہ، مصر اور ہندوستان کے نمائندے بھی شامل تھے۔ کمیٹی کی رپورٹ محکمے کے خلاف تھی اور کچھ حلقوں میں اسے پروفیسر بخاری کی شکست کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ جب کمیٹی کی رپورٹ پر جنرل اسمبلی میں بحث ہوئی تو اخباروں نے رپورٹ کی مخالفت کی سیکرٹری جنرل نے بھی اس کی مخالفت میں دو مرتبہ کراری تقریر کی۔ آخر ایک امریکی اور برطانوی تجویز منظور ہوئی اور سیکرٹری جنرل کو پورا اختیار دیا گیا کہ جیسا ان کا جی چاہے اس محکمے کو چلائیں۔ گویا رپورٹ کو اسمبلی نے حرف غلط کی طرح پس پشت ڈال دیا۔

یہ پروفیسر بخاری کی بہت بڑی فتح سمجھی گئی۔

پروفیسر بخاری نے مرنے سے نو روز پہلے مجھے لکھا تھا:

[illegible] House
East 65th Street
York
August 11, 1953

مشفقی۔ سلام مسنون۔

"ڈان" میں آپ کا مضمون پڑھا۔ مسٹر [illegible] سے میری پہلی ملاقات یوں ہوئی تھی کہ مرکزی حکومت نے ریڈیو کے لئے ایک سیلکشن بورڈ مرتب کیا۔ گرد و نواح کے صوبوں سے اس کے لئے آدمی آگئے۔ یو۔پی کی حکومت نے رشید احمد صدیقی کا نام اور پنجاب کی حکومت نے میرا نام پیش کیا۔ یہ معاملہ ایسا تو نہیں کہ اس سے تاریخ عالم میں کچھ فرق پڑے۔ از حد غیر اہم بات ہے۔ تاہم اس بہانے سے آپ کو ایک محققانہ قسم کا خط لکھنے کی صورت نکل آئی۔ ورنہ [illegible] کہ فرصت شاید مجھے نہ ہوتی۔

دراصل دل چاہتا تھا آپ کا شکریہ ادا کروں۔ آپ نے جو کلمات خیر میرے حق میں کہے ہیں۔ وہ میرے استحقاق سے فزوں ہیں۔ اور آپ کی کرم فرمائی پر دلالت کرتے ہیں۔

بندۂ خاکسار

بخاری

پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس مرحوم

(۱۸۹۸ء — ۱۹۵۸ء)

عکس تحریر پطرس:

ماہ نو، کراچی، جنوری ۱۹۵۹ء

" میں دسمبر یا جنوری کے آخر تک یو۔ این سے قطع تعلق کر لوں گا اور کولمبیا یونیورسٹی میں پروفیسر ہو جاؤں گا۔ آگے جو خدا کو منظور ہو"
لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بیسویں صدی میں ہمارے ملک نے گنتی کے ایسے لوگ پیدا کئے ہیں کہ جن کا نام مدتوں یاد رہے گا۔ ان چند لوگوں میں پروفیسر بخاری کا نام ہمیشہ بہت اونچا لکھا جائے گا۔ یہ اپنے دم سے ایک انجمن تھے۔ ان کی ذات میں مشرق اور مغرب کی بہترین خوبیاں جمع تھیں۔ یہ ایک اچھے دوست تھے، عمدہ استاد تھے اور ایک بہت اچھے انسان تھے۔ ایسے انسان قدرت بار بار پیدا نہیں کرتی۔

یہ رہتے نیویارک میں ضرور تھے۔ لیکن ذہنی طور پر ان کی زندگی اپنے وطن میں گذرتی تھی، دن میں کتنی مرتبہ یہ اپنے لاہور کے زمانۂ طالب علمی کا ذکر کرتے تھے۔ دلی کی صحبتوں کا ذکر کس طرح مزے لے لے کر کرتے۔ اقبال، گرامی، سالک، آصف علی، ان احباب کے ذکر سے ان کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ میرے سامنے دو مرتبہ یہ نیویارک سے کراچی آئے۔ کراچی کی گلیوں اور بازاروں میں یہ اس شوق سے دوستوں کے ساتھ پھرتے تھے جیسے ان کوچوں میں یہ کوئی کھوئی ہوئی شے تلاش کر رہے تھے۔ مجید لاہوری مرحوم کے ساتھ ہم سب ایک روز ساؤتھ نیپئر روڈ پر کھڑے تھے۔ ایک قلندر نے آکر خاص انداز میں سلام کیا۔ پروفیسر بخاری نے اس سے زیادہ خلوص سے سلام کا جواب دیا پھر قلندر کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

یہ تصنع نہیں تھا جس طرح ایک متکبر اور مغرور انگریز افسر کو یہ خاموش کر سکتے تھے، اسی طرح ایک مرد قلندر سے یہ اسی کی سطح پر کھڑے ہو کر باتیں بھی کر سکتے تھے۔ (عمان۔ اردن ۔ ۷ دسمبر ۱۹۵۸ء)

ممتاز حسن

احمد شاہ بخاری کی بے وقت موت نے ہم سے ایک باکمال انسان، ایک لائق منتظم اور ایک بے مثال ادیب چھین لیا ہے۔ اقوام متحدہ کا ایک اعلیٰ کارکن ہونے کی حیثیت سے اس کا دائرہ عمل وسیع تھا۔ اور اس کی لیاقت کی وجہ سے اس کی شہرت عالمگیر تھی۔ آج ساری دنیا نے اس کا ماتم کیا ہے۔ کیونکہ اس کی موت ساری دنیا کا نقصان ہے۔ مگر مجھ سے پوچھئے تو باقی دنیا کا نقصان اتنا نہیں ہے جتنا پاکستان کا۔ ہمارے ہاں پہلے ہی قحط الرجال ہے۔ اور احمد شاہ بخاری جیسے آدمی تو اچھے سے اچھے ملک کو بھی برسوں نصیب نہیں ہوتے۔

احمد شاہ بخاری نے اپنی زندگی میں جس کام میں ہاتھ ڈالا اسے کمال تک پہنچایا۔

اردو ادب میں پطرس کے مضامین کا مجموعہ طنز و مزاح کا ایک شاہکار ہے۔ پطرس کی لکھی ہوئی ہر چیز معیاری ہے۔ اردو میں اس درجہ کا مزاح نگار جس کے ادبی کارنامے کی سطح ہمیشہ اونچی رہی ہو آج تک پیدا نہیں ہوا۔

انگریزی زبان سے لگاؤ ہوا تو اس میں یہ کمال پیدا کیا کہ آج پاکستان میں تو یقیناً کوئی شخص ایسا موجود نہیں ہے جو انگریزی کو اس درجہ تک سمجھ، بول اور لکھ سکتا ہو جو احمد شاہ بخاری کو میسر تھا۔ اہل زبان کو چھوڑ کر دنیا میں بہت کم آدمی ایسے نکلیں گے جو اس میدان میں احمد شاہ بخاری کی برابری کا دعویٰ کر سکیں۔ انتظامی امور کی طرف توجہ کی تو اس میدان میں بھی ہر ایک نے اس کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ ڈائرکٹر جنرل آل انڈیا ریڈیو کی حیثیت سے بخاری کا نام حکومت ہند کے انتظامی حلقوں میں بہت اونچا تھا۔ اقوام متحدہ میں پاکستان کے سفیر کی حیثیت سے اس نے پاکستان کی نمائندگی انتہائی قابلیت سے کی۔ اس نے جو تقریر کی، ساری دنیا نے گوش بر آواز ہو کر سنی۔ پھر جب اس کی خدمات خود اقوام متحدہ نے حاصل کر لیں تو ساری دنیا نے اس کی قابلیت کا لوہا مانا۔ اور اس لائق پاکستانی کی لیاقت نے پاکستان کی عزت میں اضافہ کیا۔

آج جب احمد شاہ بخاری ہم میں نہیں ہے، ہم سب مغموم ہیں۔ مگر ہم سے زیادہ غم اردو ادب کو اور پاکستان کے علمی اور ثقافتی اداروں کو ہے کاش اسے کچھ اور مہلت ملتی تو وہ کچھ اور مضامین لکھ لیتا۔ میری آرزو تھی کہ اسے پاکستان میں کسی یونیورسٹی میں دیکھوں۔ وہ کسی یونیورسٹی کا وائس چانسلر بن جاتا۔ تو اسے ترقی کی معراج پر لے جاتا۔ مگر ایسا ممکن نہ ہوا۔ ساٹھ سال کی عمر بھی آخر کوئی عمر ہے۔ ہم لوگ یہی کہہ سکتے ہیں کہ خدا کو یہی منظور تھا۔ احمد شاہ بخاری ایک فانی انسان تھا، دوسرے فانی انسانوں کی طرح موت نے اسے ہم سے جدا کر دیا۔ مگر پطرس اور پطرس کے مضامین پر موت کا کچھ اختیار نہیں ہے وہ زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ (بہ شکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

آغا عبدالحمید

پروفیسر احمد شاہ بخاری مرحوم میرے استاد بھی تھے اور دوست بھی۔ مجھے ان دونوں باتوں پر فخر حاصل ہے۔ جن لوگوں کو میری طرح سے ان کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ صحیح معنوں میں ان سے بہتر استاد ملنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ ہمارے ہاں ایسے استاد تو بہت ہیں جو محنت سے کام لیتے ہیں، اور طالبعلموں سے سچی ہمدردی بھی رکھتے ہیں لیکن ایسے بہت کم ہیں جو قوتِ فکر کو ابھار سکیں اور خود اعتمادی پیدا کر سکیں۔ پروفیسر بخاری میں سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ وہ ہر ایک کو سوچنے پر آمادہ بلکہ ایک حد تک مجبور کرتے تھے۔ اور ذہن کو فروعات سے ایسا صاف کرتے تھے کہ عمر بھر کے لئے سیدھا سوچنے کی عادت ہو جاتی تھی۔

بحیثیت دوست کے وہ جس شفقت سے پیش آتے تھے وہ کبھی فراموش نہیں ہو سکتی۔ ان کی صحبت میں اداس ہونا یا تھکنا ناممکن تھا طبیعت میں شگفتگی حد درجے کی تھی۔ ہر وقت انہیں کوئی نہ کوئی نئی بات سوجھتی رہتی تھی۔ وہ شعر جو کئی سو دفعہ سن چکے ہوتے تھے جب وہ پڑھتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پہلی دفعہ سن رہے ہیں۔ اور گویا اب تک انہیں صحیح طور پر سمجھا ہی نہیں۔

غیر زبانیں سیکھنے اور انہیں صحیح تلفظ سے بولنے کا انہیں نہ صرف بہت شوق تھا بلکہ ایک خداداد قابلیت بھی تھی۔ وہ پشتو، پنجابی، اردو، انگریزی، فارسی اور ہسپانوی زبانوں پر پوری قدرت رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ کسی قدر فرانسیسی اور عربی بھی جانتے تھے۔ مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ مجھے زندگی بھر ایسا کسی شخص سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا جو مشرقی اور مغربی کلاسیکی ادب سے ایک ہی وقت میں اتنا زیادہ واقف ہو۔

اردو اور انگریزی دونوں میں ایک خاص طرزِ تحریر کے مالک تھے۔ ان کی گفتگو میں وہی اختصار اور وہی توازن تھا جو ان کی تحریر میں نظر آتا ہے۔ اپنے خاص دوستوں میں بیٹھنے اور بات چیت کرنے کے گرویدہ تھے۔ جب کبھی ان سے ملاقات کا موقع ملتا تھا وقت کے گذرنے کا کبھی احساس نہیں ہوتا تھا، اور اکثر رات کو بہت دیر تک صحبت رہتی تھی۔ خط اتنے دلچسپ لکھتے تھے کہ بار بار پڑھنے سے جی نہیں بھرتا تھا۔

اتنی خوبیوں کے مالک کا یکایک ہم سے جدا ہو جانا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ بار بار خیال آتا ہے کہ شاید خبر غلط ہو۔ بخاری صاحب کی وفات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کا ایک کونہ اندھیرا ہو گیا ہے اور ہر شے کا رنگ کچھ پھیکا ہو گیا ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے وہ ان کا نام ہمیشہ زندہ رکھے گی اور "مضامین پطرس" اس وقت تک پڑھے جائیں گے، جب تک اردو زبان زندہ رہے گی۔

(بہ شکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

ابن انشا

مجھے قاعدے سے بخاری[1] مرحوم پر کچھ لکھنے کا حق نہیں پہنچتا کیونکہ میں ان کا ہم عصر رہا نہ ہم جلیس، شاگرد نہ رفیق۔ آل انڈیا ریڈیو اور ریڈیو پاکستان میں نوکری کی لیکن بڑے بخاری تو بڑے بخاری، چھوٹے بخاری صاحب تک کے نیاز حاصل نہ ہوئے۔ لیکن مجھے قائل کرنے والے ایک دوست نے یاد دلایا کہ تم نے تو لاہور میں ایک عمر گزارنے کے باوجود شالامار باغ بھی نہیں دیکھا۔ نور جہاں کے مقبرے کی سیر بھی نہیں کی اور دلی میں رہتے ہوئے قطب صاحب کی لاٹ تک نہ جا سکے لہٰذا یہ مزاجی بدتوفیقی معقول عذر نہیں۔ اس برہانِ قاطع کے ساتھ مجھے کچھ اور جواز یاد آ گئے۔ میں نے بخاری مرحوم کو ایک بار دو سو گز کے فاصلے سے دیکھا ہے جب وہ چند سال قبل کراچی میں مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے اور جان گنتھر جیسے شہرۂ آفاق مصنف اپنی مبسوط اور عالمانہ کتابوں کے لئے منظرے خوش گزرے سے زیادہ کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ زمانہ جدید کے ایک مصنف جارج مائکس نے اپنی کتاب "شکسپیئر اینڈ مائی سلف" میں شیکسپیئر کو ——— 'My late lamented colleague.' کے لقب سے یاد کیا ہے، اس لحاظ سے بخاری صاحب سے ہم قلمی کا رشتہ بھی ہوا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ چند برس قبل ان پر ایک مضمون بھی تو لکھ چکا ہوں جسے پڑھ کر بخاری مرحوم کو نیویارک سے میرے نام ایک خط[2] لکھنا پڑا جو میں چاہوں تو مجھے پنساری بنانے

---

[1] مضمون نگار نے اپنے اس انشائیہ کو "بڑے بخاری" کا عنوان دیا ہے۔ اہل قارئین بھی اس کو یہی سمجھیں (مدیر)

[2] یہ خط اسی شمارہ کے ایک تصویری صفحہ کی زینت ہے۔ (مدیر)

کے لئے ہلدی کی گرہ کا کام دے سکتا ہے۔

۱۹۵۳ء میں کراچی کے ایک انگریزی روزنامے نے مجھ سے فرمائش کی کہ اردو کے زندہ مصنّفین پر مضامین کا ایک سلسلہ لکھوں چنانچہ میں نے لکھا۔ جن زندہ مصنّفین کو میں نے لیا ان میں سے آدھے اب زندہ نہیں رہے لیکن اسے محض اتفاق سمجھنا چاہئے۔ منجملہ بخاری صاحب بھی تھے۔ اردو پڑھنے والوں کو تو اپنے محبوب مصنّفین کا حال احوال کچا چٹھا عموماً معلوم رہتا ہے لیکن انگریزی قارئین کے لئے 'سوانح عمری' دینی ضروری تھی اور مخدومی مولانا عبدالمجید سالک نے جو ان دنوں کراچی میں مقیم تھے میری رہنمائی کی۔ وہ بتانے والے میں لکھنے والا۔ نتیجۃً مضمون میں بعض ایسی باتیں آگئیں جو جزوی، ذاتی اور بے حد معمولی تھیں لیکن دلچسپی کا پہلو لئے تھیں۔ نیچے ان کی زندگی کا خاکہ دیتے ہوئے میں پطرس مرحوم ہی کے انداز میں معذرت کروں گا کہ یہ آپ کے لئے نہیں ہے۔ آپ سے بھلا کونسی بات چھپی ہے۔ لیکن کئی پڑھنے والے ایسے ہیں جنہوں نے اس سے پہلے کچھ نہیں پڑھا۔ میرا وہ مضمون تک نہیں پڑھا جس کا میں نے حوالہ دیا ہے۔

احمد شاہ بخاری رہنے والے پشاور کے تھے۔ ثانوی تعلیم وہیں ہوئی۔ کالج کی تعلیم کے لئے لاہور آئے اور وہاں گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ اپنے زمانے کے نامی طالب علموں میں سے تھے اور انگریزی میں ان کی لیاقت کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی "سول اینڈ ملٹری گزٹ" ہرچند کہ رڈیارڈ کپلنگ کے دورِ تبختر سے گزر چکا تھا تاہم ابھی اس کی ناک خاصی اونچی تھی اور ایک طالب علم کے مضامین کا اس میں اکثر چھپنا معقول وجہ مباہات تھی۔ انہی مضامین کے لئے پہلے پہل بخاری مرحوم نے پطرس کا قلمی نام اختیار کیا۔ کیوں کیا؛ یہ بات کم لوگ جانتے ہیں۔ گورنمنٹ کالج میں مرحوم کے ایک پروفیسر تھے پیٹر واٹکنس جو تلفظ میں سند تھے اور بخاری صاحب کو اس باب میں درجہ استناد انہی کی بدولت حاصل ہوا۔ استاد اور شاگرد دونوں ایک دوسرے کو بہت عزیز رکھتے تھے اور بخاری نے خراج عقیدت یوں ادا کیا کہ استاد کے نام کے جزو اوّل پیٹر کی مشرقی صورت پطرس کو اپنا لیا۔ ان کے زمانۂ طالب علمی کی دوسری فتوحات کا حال تو ان کے ہم سبقوں اور ہم عصروں کو بہتر معلوم ہوگا لیکن ایک سانحے کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ پطرس مرحوم کو اہلیت اور لیاقت کے میدان میں کبھی ناکامی نہیں ہوئی۔ اِلّا ایک بار، بی، اے پاس کرنے کے بعد خدا جانے کس نے ان کے کان میں کیا پھونکا، انہوں نے ایم۔ ایس۔ سی میں داخلہ لے لیا۔ بھلا کہاں ادبِ انگریزی کے کتابی اور کہاں امتحانی نلیاں۔ فیل ہوئے اور بری طرح فیل ہوئے۔ خیر صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آیا اور بخاری صاحب نے انگریزی ادب میں شان سے ایم اے پاس کیا اور اپنے ہی کالج میں لکچرر ہوگئے۔ گورنمنٹ کالج میں انگریزی پڑھانے کے ساتھ ساتھ سنٹرل ٹریننگ کالج میں علم تلفظ کے استاد بھی مقرر ہوئے۔

یہ سب کچھ تھا لیکن علم کی پیاس دامنگیر تھی۔ دو ایک سال بعد بخاری صاحب نے مطالعے کی رخصت لی اور راہی کیمبرج ہوئے۔ وہاں مشہور زمانہ عمانوئیل کالج میں داخلہ لیا اور بی اے پاس کیا۔ واپسی پر پھر وہی کالج اور وہی شغل تدریس۔ یہی دن تھے جب انہوں نے وہ مشہور طربیہ اور مزاحیہ مضامین لکھے جو "پطرس کے مضامین" نامی مجموعے میں شریک ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ شائع ہوا۔ موجودہ ایڈیشنوں میں جو آخری مضمون "لاہور کا جغرافیہ" ہے یہ بعد کا اضافہ ہے اور ۱۹۴۰ء کے قریب مرحوم مولانا چراغ حسن حسرت کے پرچے "شیرازہ" میں چھپا تھا۔ خیر ہم داستان کے جس حصّے تک پہنچے تھے وہ تیسری دہائی کے اواخر سے تعلق رکھتا ہے۔ ان دنوں مزاحی مضامین کی طرف لوگوں کی رغبت کچھ زیادہ ہی تھی اور مغربی ادب پاروں کے چربوں کا چلن عام تھا لیکن پطرس کا نکھرا ہوا مزاح جس میں شعوری ٹھٹول کا شائبہ تک نہ تھا ایک نئی ہی چیز تھی اور اب تک ہے۔

۳۶-۱۹۳۷ء تک بخاری صاحب بڑے خلوص سے انگریزی پڑھاتے رہے ہاں "نیاز مندانِ لاہور" نے دھوم مچانی شروع کی تو یہ بھی ساتھ رہے۔ اور غالباً دوسروں سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ کیسی اچھی محفلیں تھیں۔ ایک سے ایک نکلتا ہوا۔ بخاری۔ تاثیر۔ سالک۔ حفیظ۔ مجید ملک۔ تبسم۔ امتیاز علی تاج، عبدالرحمن چغتائی۔ ایک کارواں تھا جس کے سارباں اور حدی خواں تاثیر مرحوم اور مجید ملک تھے۔

۱۹۳۶ء میں اس برّعظیم میں براڈکاسٹنگ کا آغاز ہوا۔ مسٹر لائنل فیلڈن جو چند برس قبل تک لندن آبزرور کے ایڈیٹر تھے (اور شاید اب بھی ہوں) نشریات کا نظام قائم کرنے کے لئے بلائے گئے۔ ذوالفقار علی بخاری یعنی چھوٹے بخاری ان دنوں شملے میں تھے اور شوقیہ ڈرامے کھیلا کرتے تھے۔ فیلڈن کو ان میں جوہر نظر آیا اور ان کو ساتھ لے لیا۔ انہی نے فیلڈن سے اپنے نامور بھائی کی تعریف کی اور تعارف کرایا۔ فیلڈن کو بڑے بخاری صاحب نے ایک ہی ملاقات میں اس قدر متاثر کیا کہ یہ ڈپٹی کنٹرولر کے طور پر ریڈیو میں بلائے گئے ——— میں نے اپنے مضمون میں یہ بات یونہی لکھی تھی، سالک صاحب سے یونہی معلوم ہوئی اور اپنے طور پر بھی میں نے یونہی سنی تھی لیکن بخاری صاحب نے مضمون پڑھ کر مجھے لکھا کہ یہاں تم سے لغزش ہوئی۔ ریڈیو میں آنے کا اصل قصہ یہ ہے کہ نشریات

کے لئے ایک آدمی چاہیئے تھا۔ مرکزی حکومت نے مختلف صوبوں سے نام مانگے۔ صوبجات متحدہ سے ایک نامور اور مسلّمہ قابلیت کے ادیب کا نام بھیجا گیا۔ پنجاب نے مجھے نامزد کیا اور آخر میں قرعۂ فال میرے نام پڑا۔

آل انڈیا ریڈیو کو آل انڈیا ریڈیو بنانے والے بخاری ہی تھے۔ اس کے تار و پود پر بخاری مرحوم کی شخصیت کی چھاپ ہے۔ وہی عظمت، وہی شوکت، وہی شان دلآرائی — AIR کا موزوں و بلیغ طغرہ بھی پطرس ہی کی قوتِ ایجاد کا ایک مظہر ہے اور دلّی کی پارلیمنٹ اسٹریٹ پر آل انڈیا ریڈیو کی بلند و بالا خوبصورت عمارت بھی ان کے ذوقِ نفیس کا شاہکار ہے۔ آل انڈیا ریڈیو، سارے مشرق میں اگر سربرآوردہ حیثیت رکھتا تھا تو بخاری کی محنت اور دلسوزی کی بدولت۔ فیلڈن دو ہی سال میں ان کے سپرد سب کام کر کے چلے گئے۔

پاکستان بننے کے بعد بخاری گورنمنٹ کالج کی پرنسپلی پر واپس چلے گئے اور ملک کی ثقافتی نشاۃ ثانیہ کی طرف بطورِ خاص متوجہ رہے۔ پھر اقوام متحدہ میں جانا اور اپنی غیر معمولی ذہانت اور سیاسی فہم و بصیرت پر بین الاقوامی حلقوں سے خراج تحسین وصول کرنا کل کی بات ہے اور سب کو معلوم ہے۔ افسوس کہ وہاں بھی ان کو پریشانیاں لاحق رہیں۔ سنہ ۱۹۵۳ء کے قریب کیفیت یہ تھی کہ پرنسپلی پر واپس نہیں آ سکتے تھے کیونکہ سبکدوش ہو کر گئے تھے اور اقوام متحدہ میں تقرر کی میعاد ختم ہو گئی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کریں۔ انہی دنوں انہوں نے اپنے دوستوں کو مدد کے لئے پے بہ پے خطوط لکھے۔ بارے اقوام متحدہ کے سکرٹریٹ میں تقرر ہوا اور جمعیت خاطر بسر ہوئی جو بعد ازاں معلوم ہوا کہ جمعیت خاطر نہ تھی۔ بشر فانی ہو جانے کے بعد اگر مگر کی بحث فضول ہوتی ہے لیکن خیال تو آتا ہے کہ اگر بخاری کو اپنے ہاں کسی یونیورسٹی میں وائس چانسلر کی کرسی مل جاتی یا وطن عزیز تعلیمات کا کوئی اور منصب ان کے سپرد کر دیتا تو اقوام متحدہ کے دفتری کام کے فشار سے وہ مامون رہتے اور کیا عجب ..... لیکن اب تو

ہر اک مقام سے آگے گزر گیا مہ نو!

شاعری تو خیر شاعری ہے۔ ایک شعر بلکہ ایک مصرع بھی دریائے معانی ہوتا ہے لہٰذا غالب کا دیوانچہ ان کی شہرت عام اور بقائے دوام کا باعث بنا تو چنداں تعجب کی بات نہیں لیکن پطرس کے علاوہ کوئی نثر نگار اردو کا (انگریزی کا بھی) مجھے نظر نہیں آتا جس کے تھوڑا لکھے کو بہت سمجھا گیا ہو۔ متداول ایڈیشن کو دیکھئے تو "پطرس کے مضامین" مع دیباچہ و انتساب کل ۱۵۵ صفحے کا شیرازہ ہے جس میں کل گیارہ مضمون ہیں۔ ان میں سے بھی "انجام بخیر" اور "میبل اور میں" کو نکال دیجئے جو پطرس کے رتبۂ حقیقی سے فروتر ہیں تو نو رہ جاتے ہیں جن میں زبان کی کاریگری ہے نہ تراکیب و تلازمات کے طوطا مینا۔

کیا جانیں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

انصاف سے دیکھا جائے تو اردو نثر کی عمر ہی کیا ہے۔ جمعہ جمعہ ڈیڑھ سو برس۔ اس میں سے بھی پچاس برس گھٹنیوں چلنے میں صرف ہو گئے اور بڑے ہو کے بعد ذمہ داریوں کا بوجھ کاندھوں پر نہ آ پڑتا تو جانے یہ بچہ کب بالغ ہوتا۔ نثر کے اس سرمایے میں ہمیں لطافت اور بذلہ سنجی کی چنگاریاں پہلے پہل غالب کے خطوط اور سید احمد خاں کے مضامین میں نظر آتی ہیں۔ اودھ پنچ کا دور آنے تک لوگ براہ راست انگریزی سے شناسا ہو چلے تھے۔

یوں تو لندن کے "پنچ" سے لطف اندوز ہونے کے لئے بھی طبیعت کو خاصا ریاض کر کے ڈھرے پر لانا پڑتا ہے لیکن "اودھ پنچ" کے بعض مضمون نگار تو بس گھسے پٹے سخن تکیوں کو بذلہ سنجی کی کلید سمجھ بیٹھے تھے اور اکثر کے ہاں کاوش اور بناوٹ، جو مزاح کی ضد ہے، صاف جھلکتی ہے۔ خیر یہ دور بھی آیا اور گزر گیا۔ شروع میں یہی ہوتا ہے لیکن انگریزی کا علم عام ہو جانے کے بعد بھی ہمارے ہاں صحیح قسم کے مزاح کا نشان کم ہی ملتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد ایک زمانہ ضرور آیا جب لوگوں نے اس فن سے غیر معمولی شگفتگی کا اظہار کیا۔ اس زمانے میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، امتیاز علی تاج، میر ولی اللہ مانپوری۔ سب نے شستہ مزاحی تخلیقات سے اردو کو سرخرو کیا لیکن اس وقت بھی بیشتر بزرگ ایسے تھے جو بیوی سے پٹنے کو خندہ آفرینی کا مجرب نسخہ سمجھتے تھے، لطیفوں کی مالا پروتے تھے یا پیوندی اردو کا خوانچہ لگاتے تھے۔ یہ نہ ہوتے تو اچھے برے ادب میں فرق کیسے نمایاں ہوتا۔ شعر اور افسانے میں تو اوّل دوم ڈیوڑھا تیسرا سبھی درجے ہو سکتے ہیں لیکن مزاح کے ساتھ یہ قباحت ہے کہ وہ اوّل درجے ہی کا ہو سکتا ہے۔ ذرہ بھر مبتذل ہوا اور مزاح کی تعریف سے خارج۔

شاہ چارلس دوم سے یہ قول یادگار ہے: "GOOD JEST OUGHT TO BITE LIKE LAMBS NOT DOGS. THEY SHOULD CUT, NOT WOUND." پطرس پر اس تعریف کا جامہ چست بیٹھتا ہے۔ ان کا مزاح، طنز کی تلخی، کبیدگی اور ترشی سے یکسر پاک ہے۔ سٹیفن لیکاک

کے الفاظ میں وہ زندگی کی بوالعجبیوں کا مشفقانہ مطالعہ ہے: 'THE KINDLY CONTEMPLATION OF INCONGRUITIES OF LIFE.' ذرا آنکھ بند کیجئے اور ذہن کو فلم کا پردہ بنا لیجئے۔ دیکھئے 'ہاسٹل میں پڑھنا' کا واحد متکلم والدین کو قائل کرنے کے لئے جو اس کے ہوسٹل میں داخل ہونے کے مخالف ہیں، کیا کیا دلیلیں لاتا ہے:

"ہاسٹل میں ایک علمی فضا ہوتی ہے۔ جن کو ادب انگریزی کا شوق ہے وہ دن رات آپس میں شیکسپیئر کی طرح گفتگو کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ ریاضی کے طلبہ اپنے ہر خیال کو الجبرے میں ادا کرنے کی عادت ڈال لیتے ہیں۔ فارسی کے طلبہ رباعیوں میں تبادلہ خیالات کرتے ہیں۔ تاریخ کے دلدادہ . . . . ."

اور "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" میں ——

"حضرت عیسیٰ بھی تو بس واجبی طور پر ہلکی سی آواز میں "قُم" کہہ دیا کرتے ہوں گے۔ زندہ ہو گیا تو ہو گیا نہیں تو چھوڑ دیا۔ کوئی مردے کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ جایا کرتے تھے یا توپیں تھوڑی داغا کرتے تھے۔"

"اُردو کی آخری کتاب" میں دیکھئے:—

"ایک طرف نیچے اوپر مٹی کے برتن دھرے ہیں۔ کسی میں دال ہے کسی میں آٹا، کسی میں چوہے —— میاں جب آتا ہے کھانا لا کر سامنے رکھتی ہے، پیچھے کبھی نہیں رکھتی۔ کھا چکتا ہے تو کھانا اٹھا لیتی ہے۔ ہر روز یوں نہ کرے تو میاں کے سامنے ہزاروں رکابیوں کا ڈھیر لگ جائے۔"

"مرید پور کے پیر" کی تقریر کسے یاد نہ ہوگی جو گھر سے نوٹ لیکر اشعار رٹ کر مثالیں سوچ کر چلتا ہے اور وہاں بوکھلاہٹ میں سب کا ملغوبہ بنا دیتا ہے۔

اور "مرحوم کی یاد" تو انکا شاہکار ہے۔ کس طرح مرزا صاحب سے ہزاروں ارمانوں کے ساتھ بائیسکل کا سودا ہوتا ہے اور جب وہ آتی ہے:—

"برآمدے کے ساتھ ہی ایک عجیب و غریب مشین نظر پڑی۔ ٹھیک طرح پہچان نہ سکا کہ کیا چیز ہے۔ نوکر سے دریافت کیا:

"کیوں بے یہ کیا چیز ہے؟"

نوکر بولا: "حضور یہ بائیسکل ہے۔"

میں نے کہا: "بائیسکل؟ کس کی بائیسکل؟"

کہنے لگا: "مرزا صاحب نے بھجوائی ہے آپ کے لئے۔"

میں نے کہا: "اور جو بائیسکل رات کو انھوں نے بھیجی تھی وہ کہاں گئی؟"

کہنے لگا: "یہی تو ہے"

"اس کو صاف کیوں نہیں کیا؟"

"حضور دو تین دفعہ صاف کیا ہے۔"

"تو یہ میلی کیوں ہے؟"

نوکر نے اس کا جواب دینا شاید مناسب نہ سمجھا۔

"تیل دیا؟"

"حضور وہ تیل دینے کے چھید نہیں ملتے، میل اور زنگ میں دب دبا گئے ہیں۔"

میں نے کہا —— "اچھا اوپر ہی اوپر ڈال دو —— یہ بھی مفید ہوتا ہے۔"

اور جب سوار ہو کر چلے تو ——

"بائیسکل اس رفتار سے چلنے لگی جیسے تارکول زمین پر بہتا ہے —— میرا سر پیچھے کو یوں جھٹکے کھا رہا تھا جیسے کوئی متواتر ٹھوڑی کے نیچے مکّے مارے جا رہا ہو —— سائیکل ذرا تیز ہوئی تو ادھر ادھر کے لوگ چونکے —— ماؤں نے اپنے بچوں کو سینے سے لگا لیا۔"

ایک مستری کے پاس لے گئے۔ "لوہے کی سلاخ اس کے ہاتھ میں تھی جس سے اس نے مختلف حصوں کو بڑی بیدردی کے ساتھ ٹھوک بجا کر دیکھا۔
..... میں نے کہا: "صرف ہینڈل اور گدی کو اونچا کر کے کسوانا ہے۔ بتاؤ کتنے پیسے ہونگے؟"
مستری کہنے لگا: "مڈگارڈ بھی ٹھیک نہ کر دوں۔"
میں نے کہا: "ہاں وہ بھی ٹھیک کر دو۔"
کہنے لگا: "آپ باقی چیزیں بھی ٹھیک کرالیں تو اچھا ہو۔"
میں نے کہا: "اچھا کر دو ——"
بولا: "دس پندرہ دن کا کام ہے۔ اسے ہمارے پاس چھوڑ جائیے۔"
"اور پیسے کتنے لوگے؟"
کہنے لگا: "بس تیس چالیس روپے لگیں گے۔"
میں نے کہا: "بس جی جو کام تم سے کہا ہے کر دو اور باقی ہمارے معاملات میں دخل مت دو۔"
تنگ آکر اسے بیچنے نکلے۔" بلا سے دس پندرہ روپے کا خسارہ سہی۔ چالیس کے چالیس روپے تو ضائع نہ ہوں گے۔ عمر بھر کسی چیز کے بیچنے کی نوبت نہ آئی تھی ——
بڑے سوچ بچار کے بعد منہ سے صرف اتنا نکلا کہ: "یہ بائیسکل ہے۔"
دکاندار کہنے لگا: "پھر؟"
میں نے کہا: "لوگے؟"
کہنے لگا: "کیا مطلب؟"
میں نے کہا: "بیچتے ہیں ہم"
دکاندار نے مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو۔ پھر مجھے دیکھا۔ پھر بائیسکل کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فیصلہ نہیں کر سکتا، آدمی کونسا ہے اور بائیسکل کونسی ہے؟
آخر کار بولا: "کیا کریں گے آپ اس کو بیچ کر۔"
میں نے کہا: "کیا تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ جو روپے مجھے وصول ہوں گے، اُن کا مصرف کیا ہوگا؟"
کہنے لگا: "وہ تو ٹھیک ہے مگر کوئی اس کو لیکر کریگا کیا؟"
میں نے کہا: "اس پر چڑھے گا اور کیا کرے گا۔"
کہنے لگا: "اچھا چڑھ گیا۔ پھر؟"
میں نے کہا: "پھر کیا؟ پھر چلائے اور کیا؟"
دکاندار بولا: "اچھا۔ ہوں۔ خدا بخش ذرا یہاں آنا، یہ بائیسکل بکنے آئی ہے۔"

بخاری صاحب سے گالزوردی کے 'ایپل ٹری' (سیب کا درخت) کا ترجمہ بھی یادگار ہے جو مجید ملک کے کارواں میں چھپا تھا اور اناطول فرانس کی "تائیس" کو بھی انہوں نے "مصری رقاصہ" کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔ اور بھی ترجمے ہوں گے مگر ان کے اشعار بھی بلیغ اور برجستہ ہوتے تھے لیکن ان کا جائزہ میں نہیں لوں گا۔ البتہ دو شعر مجھے ان کے یاد آتے ہیں جو انہوں نے (بروایت) شملے سے (حکومتِ ہند کے دیگر دفاتر کے واپسی کوچ کے ساتھ) رخصت ہوتے ہوئے کہے تھے ؎

اٹھ گیا لپنے یہاں سے ٹیلی فون
اب کہیں جا کر ملے گا اگلی جُون
اس کے ہونے سے رہا کرتی تھی وخ
یہ چمن یونہی رہے گا اور —— الخ

جون کے ہردو معنی کی رعایت بھی خوب ہے لیکن آخر کا تا فیہ یوں اور کون لاسکتا تھا —— باتیں اس کی یاد رہیں پھر باتیں نہ ایسی سنئیے گا۔

فرید احمد

ہم نے پروفیسر بخاری کو سب سے پہلے پطرس کے روپ میں دیکھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں اور میرے چند ہم مذاق ساتھی آٹھویں نویں جماعت میں پڑھا کرتے تھے۔ ہم میں سے ہر ایک نے "مضامین پطرس" کا اتنی بار مطالعہ کیا، یا یوں کہئے خود اس کتاب کی لازوال دلچسپی اور لطافت نے ہمیں اسقدر مسحور کر دیا کہ ہم کو ساری کتاب قریب قریب حفظ ہو گئی۔

علمی ذوق رکھنے والوں میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو پطرس کی مزاحیہ تحریر سے لطف اندوز نہ ہوا ہو۔ ان کے مزاح، ان کے انداز بیان سے محض ہمارے لب ہی نہیں، ذہن بھی مسکرا اٹھتا ہے۔ اور یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہم نے اپنی زندگی کا پہلا متفقہ فیصلہ کیا اور وہ یہ کہ پطرس ہم سب کے ہیرو ہیں۔

اس وقت سے ہمارے دلوں میں یہ تمنا پیدا ہو گئی کہ اپنے ہیرو سے کس طرح شرفِ ملاقات حاصل کیا جائے۔ ہماری یہ تمنا مدت تک پوری نہ ہو سکی۔ نومبر ۱۹۵۱ء میں یو۔ این کی جنرل اسمبلی کا چھٹا سالانہ اجلاس پیرس میں منعقد ہو رہا تھا۔ اتفاق سے میں بھی موجود تھا۔ جوئندہ یابندہ۔ بالآخر ۹ نومبر کی سہ پہر کو پیرس کے ایک خوبصورت ہوٹل میں جہاں پاکستانی وفد مقیم تھا، ان سے ملاقات ہو ہی گئی۔ وہ چودھری ظفر اللہ خاں اور دوسرے پاکستانی مندوبین سے مصروف گفتگو تھے۔ موقع ملتے ہی آداب بجالایا اور اپنا مدعا ظاہر کیا۔ یہ ملاقات کچھ کاروباری قسم کی تھی جس کا نتیجہ میرا یو۔ این میں رپورٹر براڈ کاسٹر کی حیثیت سے تقرر تھا۔ اس طرح مجھے تقریباً چار ماہ پروفیسر بخاری کو پطرس کے علاوہ اور حیثیتوں سے بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی شخصیت متعدد، غیر معمولی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ یو۔ این میں ہر شخص، بلالحاظ قوم و ملت، ان کا گرویدہ اور مداح ہے، مختلف مسائل پر ان سے مشورہ طلب کرتا ہے، ان کی خوش گفتاری اور اخلاق کا دلدادہ ہے، ان کی علمی قابلیت، حکیمانہ نظر، سیاسی تدبر اور وسیع المشربی کا قائل ہے۔

پروفیسر بخاری یو۔ این کی متعدد کمیٹیوں کے ممبر تھے۔ ان میں سے کسی کمیٹی کا ممبر ہونا اس بات کی ضمانت تھی کہ جو وہ چاہیں یا کہیں، وہی ہو گا۔ یہاں یہ واضح کر دینا غیر ضروری نہ ہو گا کہ عالمی کانفرنسوں میں جو کچھ کیا جاتا ہے وہ تو محض ظاہری ٹیپ ٹاپ ہوتی ہے۔ اصل سرگرمیاں، غور و خوض، بات چیت، جوڑ توڑ تو کانفرنسوں کی لابیوں میں طے پاتے ہیں۔ ان لابیوں میں بخاری کی ساکھ بہت بلند تھی۔ ان کی مقبولیت اور ہمہ گیر اثر کا اندازہ اس بات سے بھی ہوا کہ لاطینی امریکہ کی دو ریاستیں، ڈومنیکن ریپبلک اور کولمبیا میں کچھ پرانے سرحدی جھگڑے چلے آ رہے تھے۔ جن کے تصفیے کے لئے دونوں ریاستوں کے نمائندے کسی اور نہیں بلکہ صرف پروفیسر بخاری کے حسن توسل کے جویا تھے۔

عرب مہاجرین کا مسئلہ یو۔ این کی خاص سیاسی کمیٹی میں زیر بحث تھا۔ عرب اور دوسرے بڑے ممالک کے نمائندے اپنی اپنی تقریریں ختم کر چکے تھے۔ ان لاکھوں برباد و بے خانماں مہاجرین کی وقتی ضرورت اور آبادی کے لئے جو رقم یو۔ این کی طرف سے مقرر ہوا کرتی تھی، اس میں ایک تجویز کے تحت بھاری تخفیف ہونے والی تھی۔ کیونکہ امریکہ و برطانیہ نے اپنے چندے میں تخفیف کا اعلان کر دیا تھا۔ اس بات سے عرب ممالک کے نمائندے بے حد ناراض اور برافروختہ تھے۔ اس مسئلہ پر آخری روز پروفیسر بخاری کی تقریر تھی۔ یہ ایک ایسی معرکہ آرا تقریر تھی۔ جس نے سامعین کو رلا دیا۔ اور مخالفین بے حد شرمندہ ہوئے۔ اس نے سامعین کی خفتہ انسانیت کو ابھارا۔ اور جب کمیٹی کا اجلاس ختم ہوا تو میں نے دیکھا لوگ بخاری کا اس طرح استقبال کر رہے تھے جیسے اپنے ہاں کے کسی بہت بڑے پیر و مرشد کا۔ عرب مندوبین ان سے بے اختیار بغلگیر ہو رہے تھے، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دے رہے تھے۔ کوئی ان کی خطابت اور جادو بیانی کے قصیدے گا رہا تھا، کوئی ان کے استدلال اور تقریر کی ادبی شان کی تعریف کر رہا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ بخاری کی تقریر نے ایسا جادو کا اثر کیا کہ مہاجرین کے لئے اصلی رقم بحال رکھی گئی۔

پروفیسر بخاری یو۔ این سیکرٹریٹ کے اسٹاف میں بے حد مقبول تھے۔ ہر شخص ان کی مدد چاہتا اور وہ اس کی مشکلات کو آسان

کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ صحافی حلقوں میں بھی بے حد مقبول تھے۔ اکثر صحافی ملاقات کے اس لئے مشتاق رہتے کہ وہ نہ صرف پاکستانی وفد کے لیڈر بلکہ ایک اچھے با مذاق انسان تھے، ادیب تھے، بلند پایہ مدبر تھے۔ اور مشرق و مغرب کے معاملات و مسائل کے متعلق صحیح، غیر جانبدارانہ رویہ رکھتے تھے۔

میں نے پروفیسر بخاری کو اعلیٰ صحبتوں اور بے تکلفی کے عالم میں بھی دیکھا ہے۔ جب وہ اپنے مخصوص دلفریب مزاحیہ انداز میں طرح طرح کے قصے کہانیاں اور لطیفے سناتے تھے۔ وہ مختلف ممالک کے ادبیات اور نئے نئے ادیبوں کو روشناس کراتے کراتے باتوں ہی باتوں میں نئے نئے نکات سمجھا جاتے۔ ان کی محفل سے اٹھ کر ہمیشہ ایسا محسوس ہوا ہے کہ ہم نے اس تھوڑے سے عرصے میں بہت کچھ سیکھ لیا، نئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ اور ہم آپ ہی آپ کچھ سے کچھ بن گئے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص ایسی نعمت بخش سکتا ہے اس کی محبت، اس کی ہم نشینی پر کون جان نہیں دے گا۔

پیرس میں یو۔ این کا اجلاس ختم ہو گیا تو پروفیسر بخاری نیویارک واپس چلے گئے۔ جہاں وہ پاکستانی وفد کی صدارت سے سبکدوش ہو کر یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو یو۔ این کے شعبۂ اطلاعات کے افسر اعلیٰ اور انچارج کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس نئے عہدے پر فائز ہو کر آپ نے مشرق و مغرب کو ایک دوسرے سے قریب تر کرنے اور ان کے ملاپ سے ایک نئی دنیا تعمیر کرنے کے سلسلہ میں لوگوں کے دل و دماغ کو مسحور کرنے اور عملی دعوت دینے میں منہمک ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو نہ صرف پاکستان بلکہ تمام دنیا کا شہری قرار دیا گیا۔ وہ قدیم و جدید تہذیب و تمدن کا ایسا زندہ مرکز تھے جس کی دنیا کو بڑی ضرورت ہے۔

مجھے نیویارک میں رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اور میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ پروفیسر بخاری کو وہاں کے ادبی، سیاسی اور ثقافتی حلقوں میں بڑی شہرت اور وقار حاصل تھا۔ ان کی غیر جانبداری، ان کے صلاح مشورے، ان کے خیالات و آراء سے جس حد تک لوگ متاثر ہوئے اس کا اندازہ ناممکن ہے۔ اگرچہ وہ اپنے وطن سے دور رہے لیکن ان کا دل ہمیشہ وطن ہی میں رہا۔ بلکہ ان کا "دل" تو یہ چاہتا تھا کہ ان کی عمر کا بقیہ حصہ بھی پاکستان کی خدمت ہی میں گذرتا لیکن ہمارے سابقہ ارباب حل و عقد کو یہ منظور نہ ہوا!

پروفیسر بخاری نے ہر اعتبار سے اپنے وطن اور اہلِ وطن سے جتنا پایا اس سے کہیں زیادہ ان کو دیا، اور اس دین کی ہم جتنی بھی قدر کریں کم ہے۔

میری پروفیسر بخاری سے ملاقات نیویارک ایرپورٹ پر ہوئی۔ جب وہ یو۔ این کے کام سے یورپ سے جا رہے تھے۔ میں ایک عقیدت مند کی حیثیت سے مشرقی تہذیب کے انداز میں ان کے سامان کو اپنے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ میں نے عرض کیا قبلہ! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ یہ بیگ بھی مجھے دے دیجئے۔ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنا دوسرا ہاتھ ان کے بیگ کی طرف بڑھایا۔ انہوں نے بیگ اپنی طرف کھینچ لیا اور بولے "عورت اپنے میک اپ کا بیگ اور ڈپلومیٹ اپنا پورٹ فولیو اپنے سوا کبھی کسی دوسرے کو نہیں دیتے۔"

افسوس! آج ہمارا ہیرو، ہمارا لیڈر، ہمارا پروفیسر بخاری جس نے ہمیں کیا کچھ نہیں دیا، ہم میں نہیں رہا۔ لیکن ہمیں عارفِ شیراز کا یہ ارشاد تسلی دیتا ہے کہ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

★

ڈاکٹر داؤد پوتا مرحوم

عبد الواحد سندھی

جہاں برصغیر پاک و ہند میں غلبۂ فرنگ کے دور کے کتنے ہی تلخ پہلو ہیں، وہاں ایک خوشگوار پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اس میں علوم و معارف اور ان کے علمبرداروں کی کما حقہٗ قدر و منزلت کی گئی اور جس شخص نے زبان و ادب یا علم و حکمت کے باب میں کوئی بھی نمایاں خدمت انجام دی، اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا گیا۔ حصولِ علم کے راستے میں دشواریاں ضرور تھیں، اور وہ کس زمانہ میں نہیں ہوتیں، پھر بھی تشنگانِ شوق پر کوئی پابندی نہ تھی اور ہر شخص کو یہ موقع حاصل تھا کہ وہ ذاتی جد و جہد سے اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے۔ چنانچہ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس دور میں جن لوگوں نے نام پیدا کیا اور شہرت کے آسمان پر آفتاب بن کر چمکے، وہ اکثر و بیشتر غریب گھرانوں ہی کے چشم و چراغ تھے۔ انہوں نے اپنی دشواریوں کو ترقّی کا زینہ بنایا اور کشمکشِ حیات میں جن تاریکیوں نے ان کو گھیر رکھا تھا، ان کے باوجود ان کے طبعی جوہر چمکے۔ انہوں نے اپنی روشنیٔ طبع سے نہ صرف اپنے ملک کے بام و در کو جگمگایا بلکہ تمام دنیا کے افقِ علم و ادب کو منوّر کیا۔ ان ہی میں سے ایک شمس العلماء ڈاکٹر داؤد پوتا مرحوم تھے۔ وہ غریبی کے آغوش میں پرورش پانے کے باوجود ذاتی قابلیت، اخلاقی وجاہت اور دل و دماغ کے گوناگوں اوصاف کی بدولت علم و فضل اور شہرت و قابلیت کی معراج تک پہنچے اور "شمس العلماء" کے خطاب سے مشرف ہوئے جو کسی سیاسی و ملکی مصلحت نہیں بلکہ خالص علمی خدمت کا نتیجہ تھا۔ ان کا شمار ان معدودے چند خوش نصیب انسانوں میں ہے جنہوں نے دورِ غلامی ہی میں گراں بہا خدمات انجام نہیں دیں اور اربابِ علم و فضل کو اپنے علمی فیضان سے بہرہ ور نہیں کیا بلکہ دورِ آزادی میں بھی مختلف حیثیات سے زندگی کے مختلف میدانوں میں قوم و ملک کو تعلیم و تدریس، علوم و معارف اور تحقیق و تشریح کے گوناگوں فیوض و برکات سے مالا مال کیا۔ اور ایک مستقل، غیر فانی فیضان کا سرمایہ باقی چھوڑ گئے جس پر ہر پاکستانی کو خواہ وہ کسی حصّۂ ملک سے تعلق رکھتا ہو بجا طور پر ناز ہے۔ وہ ایک ایسی مشعلِ علم و حکمت تھے جس کی روشنی سے پاکستان کا گوشہ گوشہ منور ہے، اور جو ہماری آنے والی نسلوں کے لئے دلیل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی نے درست کہا ہے کہ: زندہ دارد مرد را آثار مرد۔ ہمارے محترم عالم و محقق مرحوم ڈاکٹر داؤد پوتا آج ہم میں جسمانی حیثیت سے موجود نہیں اور ہم اس پر سراپا افسوس ہیں، ہمارا ہر فرد اس سانحۂ الیم پر پیکرِ ماتم ہے، لیکن ان کا علمی و فکری فیضان آج بھی ہم میں موجود ہے ان کے محبوب رودِ جاری مہران کی طرح۔ ہمارے دل و دماغ کی رگ رگ اس جوئے حیات آفریں کی لہروں سے سیراب ہے۔ اور یہی حزن و غم کے اس روح فرسا طوفان میں جو سلسلۂ جلیل "شمس العلماء" کی آخری شاندار کڑی کے محو ہو جانے سے برپا ہوا، ہمارے لئے سامانِ تشفی ہے۔ جن لوگوں کو پاکستان کے اس فرزندِ یگانہ سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، جو اس کے شخصی اوصاف اور اخلاق حسنہ کو جانتے، اور مرتبۂ علمی کو پہچانتے ہیں، وہ اسے کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

اے صدر نشینِ محفلِ ما　　　　رفتید ولے نہ از دلِ ما

پاکستان کا یہ مایۂ ناز عالم و محقق، سابق صوبۂ سندھ کے ضلع دادو کے ایک قدیم تاریخی قصبہ ٹلٹی میں ایک کسان خاندان میں پیدا ہوا جو داؤد پوتا کہلاتا ہے۔ اور اس صوبہ کی تاریخ میں خاصی شہرت رکھتا ہے۔ اگرچہ داؤد پوتا کی ولادت جون ۱۸۹۶ء میں ایک غریب گھرانے ہی میں ہوئی۔ ان کا اصلی نام عمر اور باپ کا نام محمد تھا۔ وہ بچپن ہی سے ذہین و طبّاع تھے اور ایک قیافہ شناس کہہ سکتا تھا کہ ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

ابتدا میں وہ کھیتی باڑی اور دوسرے معمولی کاموں میں اپنے غریب باپ کی مدد کرتے رہے۔ گو دیہات یا گھر کا ماحول ایسا نہ تھا کہ وہ حصولِ علم کی طرف مائل ہوتے لیکن۔ چوں عشق حرم باشد سہل است بیاباں ہا۔ ان کے ذوق و شوق نے تمام مشکلیں آسان کر دیں۔ انہیں شروع ہی سے تعلیم کے معاملہ میں خاصی کامیابی ہوئی۔

۱۹۱۷ء میں میٹرک کے امتحان میں صوبہ بھر میں اوّل آئے۔ ایک غریب لڑکے کی مالی استطاعت معلوم لیکن وہ خالی اوقات میں ادنیٰ سے ادنیٰ قسم کی محنت مزدوری کر کے اپنے تعلیمی مصارف پورے کرتے رہے جو حوصلہ و ہمت کی ایک قابل قدر مثال ہے۔ ۱۹۲۱ء میں بی۔اے کا امتحان پاس کیا اور صوبہ بھر میں بی۔اے میں اوّل آکر وظیفہ حاصل کیا۔ ۱۹۲۳ء میں ایم۔اے (عربی) میں اوّل رہے اور "چانسلر میڈل" حاصل کیا جسے اس وقت تک کسی سندھی طالبعلم نے حاصل نہیں کیا تھا۔ اسی غیر معمولی لیاقت کا نتیجہ تھا کہ سابق مرکزی حکومت ہند نے انھیں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے اسٹیٹ اسکالرشپ عطا کیا۔ چنانچہ اس فاضل بے بدل نے کیمبرج یونیورسٹی میں تین سال رہ کر اپنا معرکہ آرا تحقیقی مقالہ "فارسی شاعری پر عربی شاعری کا اثر" پیش کیا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ یہ وہ زبردست مقالہ ہے جس نے ان کے تبحر علمی کی دھاک تمام مستشرقین پر بٹھا دی۔ چنانچہ جب وہ ۱۹۲۷ء میں اپنے وطن مالوف واپس آئے تو ان کے سابقہ گہوارۂ علم "سندھ مدرستہ الاسلام" کے بورڈ نے انہیں متفقہ طور پر اس تعلیمی ادارہ کے پرنسپل کے عہدہ کے لئے منتخب کیا۔ اس وقت اس ادارہ کی حالت مالی تعلیمی اور تربیتی ہر اعتبار سے بہت ہی پست تھی۔ یہ وادی مہران کے اس چشم و چراغ کی عدیم النظیر قابلیت اور جدوجہد ہی کا نتیجہ تھا کہ یہ ہر لحاظ سے ایک معیاری ادارہ بن گیا۔

۱۹۳۰ء میں مرحوم "اسماعیل یوسف کالج" بمبئی میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اپنے دوران ملازمت میں اپنے وطن کی مستند قدیم تاریخی کتابیں "چچ نامہ" اور "تاریخ معصومی" کو از سر نو بہ بدید انداز میں مرتب کیا۔ علمائے تاریخ ان دونوں کتابوں کو نہایت معرکہ آرا علمی کارنامے تسلیم کرتے ہیں۔ قیام بمبئی ہی کے زمانہ میں مرحوم کو عربی، فارسی اور سندھی زبانوں کے "بورڈ آف اسٹڈیز" کا رکن چنا گیا۔ اور اس حیثیت سے بڑے عمدہ منصوبے پیش کئے جو ان زبانوں کی ترویج و ترقی کے لئے نہایت کارآمد ثابت ہوئے۔

ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے بھی تدریس و تعلیم کے اس شیدائی کی خدمات تاریخی اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۳۹ء سے لیکر جب وہ سابق صوبۂ سندھ کے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے، آخری وقت تک انہوں نے تعلیم کی توسیع و ترقی کے سلسلہ میں نہایت گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اصلاحِ نصاب، تربیتِ اساتذہ اور ابتدائی و ثانوی تعلیم کی اصلاح و تجدید ان کی فتوحات خصوصی میں شامل ہیں۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں کی انتہائی مخالفت کے باوجود "سندھ یونیورسٹی" کا چارٹر منظور کروایا۔ پنجاب اور ڈھاکہ یونیورسٹی کے بعد سندھ یونیورسٹی نے قیام پاکستان کے بعد مہاجر طلبہ کی کراچی میں پانچ سال جو تعلیمی خدمت کی اس کا سہرا داؤد پوتا ہی کے سر ہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہندوؤں کے چلے جانے اور مہاجرین کی آمد سے سندھ میں تعلیمی ابتری پھیل جانے کا اندیشہ تھا لیکن ہم مرحوم کے بے حد ممنون ہیں کہ انہوں نے اپنی انتظامی قابلیت سے، چند دنوں میں پورے صوبے کا نظام درست کر دیا اور یونیورسٹی کو قائم کر کے پاکستان کی تعلیمی ترقی کے لئے راستہ ہموار کیا۔ ایسی ہی وسیع خدمات انہوں نے "سندھ پبلک سروس کمیشن" کے رکن کی حیثیت سے بھی انجام دیں۔

مگر سچ پوچھئے تو مرحوم کی طبعی صلاحیتوں کی حقیقی جولاں گاہ علم و ادب ہی کی خدمت تھی۔ چنانچہ ۱۹۵۶ء میں ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ پھر علمی و ادبی تحقیقات کے زیادہ خوشگوار اور گراں قدر کام میں منہمک ہو گئے۔ "سندھی ادبی بورڈ" نے جو سندھی زبان اور علم و ادب کے فروغ اور توسیع و ترقی کا سب سے بڑا ادارہ ہے، ان الفوران کی خدمات حاصل کیں۔ چنانچہ اس ادارہ کی مدیر تصنیفات و تالیفات اور مشہور رسالہ "مہران" کے مدیر مسئول کی حیثیت سے ایسی خدمات انجام دیں جو ہمیشہ یادگار رہیں گی۔

عمومی شغف علم و ادب کے علاوہ مرحوم کو جو نسبت خاص سندھی زبان، ادب، تاریخ، تعلیم اور رفاہ عامہ سے تھی اس کا قدرتی تقاضا تھا کہ وہ سابق صوبۂ سندھ کی روح رواں اور محبوب و مقبول شاعر و عارف شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے ملہمانہ کلام کی ترتیب و تدوین اور تشریح و توضیح میں خاص دلچسپی سے کام لیں۔ چنانچہ وہ آخری وقت تک اس کام کے لئے وقف رہے جو انہیں جان و دل سے عزیز تھا۔ برسوں پہلے داؤد پوتا مرحوم اور ان کے نامور استاد ڈاکٹر گربخشانی کی مشترکہ محنت سے جو "شاہ جو رسالو" تین مبسوط جلدوں میں متن، شرح اور حل لغات کے ساتھ شائع ہوا تھا، وہ سندھی ادب کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

تحقیق کے میدان میں سب سے بلند درجہ ڈاکٹر داؤد پوتا کو حاصل ہے۔ اس سے ماہرین تاریخ کی رائے میں علمائے سلف کی یاد تازہ ہوتی ہے جن کا تبحر علمی ہر اعتبار سے مسلم تھا۔ مرحوم کو عربی، فارسی، اور سندھی پر جو عبور تھا وہ محتاج بیان نہیں لیکن اس کے ساتھ انگریزی زبان پر ان کی غیر معمولی قدرت ان کا امتیاز خاص تھی۔ ماہر علم و ادب کے علاوہ ماہر لسانیات کے اعتبار سے بھی ان کی حیثیت مستند ہے۔ ان کا ایک اور طرۂ امتیاز جو بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے، یہ ہے کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے نثر نگار تھے، اور اس لحاظ سے منفرد حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی وفات نے ہمارے علمی و ادبی حلقوں میں ایک ایسا خلا پیدا کر دیا ہے جس کا پُر ہونا دشوار ہے۔ افسوس ہے کہ صیاد اجل کی بے مہری سے ؎

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا!
ایک روشن چراغ تھا نہ رہا!

غزل!

جوش ملیح آبادی

جب گجر کی صدا جگاتی تھی ہائے کچھ اور نیند آتی تھی
سینہ یوں آرزو سے روشن تھا شبِ تاریک جگمگاتی تھی
دم آرائش ایک جانِ حیا میں جو آتا تو بیٹھ جاتی تھی
ہات نکھڑے کو ڈھانک لیتے تھے اوڑھنی سر پہ جھلجھلاتی تھی
دیکھتا تھا بغور جب اس کو کوئی شے دل میں گنگناتی تھی
سانس لیتی تھی وہ ڈلائی میں کُنج میں یا نسیم آتی تھی
جب اُسے دادِ نغمہ دیتا تھا لے کے انگڑائی ٹوٹ جاتی تھی
شبِ فرقت میں زمزموں کی صدا سانس کو ہچکیاں بناتی تھی
زندگی ولولوں کی گرمی سے برف باری میں لہلہاتی تھی
کم سِنوں کے بدن کی خوشبو سے آنچ سی تن میں سنسناتی تھی
جب چٹختی تھی پور پور اُن کی دیر تک کائنات گاتی تھی
ہائے راتوں کی وہ مُلاقاتیں شمع بجھ کر دیئے جلاتی تھی
ہائے وہ زندگی نہیں ملتی جب ہمیں روز موت آتی تھی
کوچہ گردئ دآستاں جوئی دُھوپ کو چاندنی بناتی تھی
شہرِ خوباں کی ہائے دل داری جو گلی تھی، بچھی سی جاتی تھی
تھے کچھ ایسے بھی نقش پا جن سے خاک سی چیز مسکراتی تھی
یاد سا ہے کہ اس خرابے میں کبھی برکھا کی رُت بھی آتی تھی

جوش اب وہ قدم ہیں خاک آلود
جن پر اکثر وہ سر جھکاتی تھی

مذاکرہ:

پہنائے غزل

اثر جلیلی

تابش دہلوی

اثر جلیلی:

میں اس کے اسباب و علل بتانے سے تو قاصر ہوں مگر اظہارِ تاسف سے محروم نہیں رہ سکتا کہ وہ سخت کافر تھا جس نے سب سے پہلے یہ نکتہ دریافت کیا کہ "مقدمۂ شعر و شاعری" میں حالی نے سب سے پہلے غزل کے خلاف آواز اٹھائی۔ "مقدمہ" نہ کل نایاب تھا نہ آج کمیاب ہے مگر اس کے باوجود ہر شخص غزل کی مخالفت یا موافقت کے سلسلے میں اپنی گفتگو کا آغاز اسی مفروضے سے کرتا ہے چنانچہ فراق گورکھپوری کو بھی "مقدمہ" میں غزل کے خلاف اعلانِ جہاد نظر آتا ہے اور آل احمد سرور بھی اسی کو غزل پر اعتراضات کا نقطۂ آغاز قرار دیتے ہیں۔ اس حقیقتِ کبریٰ سے تو انکار محال ہے کہ حالی یقیناً پہلا شخص ہے جس نے غزل کے سلسلے میں چند تجویزیں اور ترمیمیں پیش کرنے کی ہمت کی لیکن جیسا کہ سیاق و سباق سے واضح ہوتا ہے اس کی تہہ میں غزل دشمنی کا جذبہ کارفرما نہیں تھا بلکہ یہ غزل کی بقا کے لئے ایک مستحسن اور مخلصانہ اقدام تھا۔ اسی طرح جب غالب کو پہلی اور شاید آخری مرتبہ یہ احساس ہوا کہ "بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل"[1] تو یقیناً اس کے ذہن میں بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ تجمل حسین خاں کی مدح سرائی کے لئے قصیدہ کا وسیع میدان چاہیے لیکن نہ جانے کس نحس ساعت میں اس نے یہ "تنگنائے غزل" کی ترکیب وضع کی تھی کہ آج وہ بھی غزل کی فردِ جرم میں شامل ہو گئی۔

ہر مشورہ واضح ہوتا ہے لیکن اس کے اثرات و نتائج بہت ہی غیر محسوس ہوتے ہیں چنانچہ اردو غزل کی تاریخ میں سعد اللہ خاں گلشن کا ولی کو یہ مشورہ کہ "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند ایں ہارا بکار ببر، از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت" بہت واضح ہے لیکن جن اثرات نے "اک بات لچرسی بزبانِ دکنی" کو اردوئے معلیٰ بنا دیا وہ ہر چند اسی مشورے کے آوردہ اور نہ ائیدہ تھے لیکن ان کے غیر محسوس عمل پر ہم خطِ فاصل نہیں کھینچ سکتے۔ یہ بھی اسی مشورے کا نتیجہ ہے کہ ہماری غزل ایران کی غزل کا چربہ معلوم ہوتی ہے ورنہ ممکن تھا کہ اس میں گل و بلبل کی جگہ تمام ترآم اور کوئل کا ذکر ہوتا۔ حالی کے مشورے نے بھی ہماری غزل میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں، یہ اور بات ہے کہ ہم بآسانی "اشارت ہاو کسندہ" کے مرحلے سے نہیں گزر سکتے۔ حالی کا مقدمہ اردو غزل کی طویل شاہراہ میں ایک موڑ ہے جس سے بے خبری اور اس کے نتائج سے لاعلمی گمراہی کا سبب بن سکتی ہے اور بنی ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر مقدمے نے جن کو گمراہ کیا ہے ان میں چند نام بالخصوص قابل ذکر ہیں مثلاً: حمید الدین سلیم، عظمت اللہ خاں، کلیم الدین احمد اور جوش ملیح آبادی۔ ان حضرات کے نزدیک اردو غزل ہمہ نقص ہے۔

ان لوگوں کو غزل سے جو شکایات ہیں اگر ان کا جائزہ بامعانِ نظر لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مطلوبہ نتائج اخذ کرنے کے لئے چند مقدمات یا غیر سنجیدہ مفروضات پر انہوں نے اپنے مباحث کی بنیاد رکھی ہے اور اس بحث میں یہ حضرات دلائل و براہین سے کم اور زبان آوری سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ وحید الدین سلیم کے نزدیک غزل محض قافیہ پیمائی ہے اور اس میں حقیقی جذبات نہیں پائے جاتے جس طرح چند وجوہ کی بنا پر افلاطون کی ریاست میں شاعروں کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی، عظمت اللہ خاں کے ذہن میں غزل کے لئے کوئی گوشہ نہیں ہے۔ کلیم الدین احمد کی ساری صلاحیتیں اس محور کے گرد گھومتی ہیں کہ غزل ایک نیم وحشی صنفِ سخن ہے چونکہ اس کے اشعار میں تسلسل نہیں پایا جاتا اور یکجہتی کا فقدان تہذیب و تمدن کے منافی ہے بلکہ عہدِ ماقبلِ تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ جوش ملیح آبادی کی رائے میں غزل غیر فطری شاعری کا نمونہ ہے

---

[1] یہ خیال جس کو قبل ازیں کئی لوگوں نے محسوس کیا ہے اور اس کا اظہار بھی کیا ہے، یقیناً صحیح ہے۔ آثر لکھنوی صاحب نے اپنی کتاب "مطالعۂ غالب" میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جس سلسلہ میں غالب نے اس ترکیب کو برتا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ غزل کے مخصوص میدان سے مدح کے "بحرِ بے کراں" کی طرف گریز چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے ممدوح کی جی کھول کر تعریف کر سکے۔ غزل کے فی نفسہٖ تنگنائے ہونے کا تصور بعد میں پیدا ہوا جب کہ یہ صنف مغربی شاعری کے مقابلے میں محدود محسوس کی جانے لگی۔ تاہم یہ سوال اپنی جگہ پر قابلِ بحث ہے کہ غزل واقعی "تنگنائے" ہے یا نہیں؟ (مدیر)

چونکہ انسان پر وقتِ واحد میں واحد جذبہ ہی طاری ہوسکتا ہے اور غزل جو وقتِ واحد کی تخلیق ہوتی ہے مختلف جذبات کی عکاسی کرتی ہے لہٰذا مصنوعی ہے۔

یہ اعتراض آج سے تقریباً ربع صدی پہلے کی یادگار ہے۔ جب جوش صاحب دلی سے ماہنامہ "کلیم" نکالتے تھے۔ بجز اس کے کہ "نوعِ انسانی" کی جگہ "نفسِ انسانی" نے لے لی ہے اور "نارمل حالات" کی شرط کا اضافہ ہوگیا ہے جہاں تک بنیادی خیال کا تعلق ہے وہ آج بھی "بشرطِ استواری اصلِ ایماں" کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اعتراض کی سطحیت تو پہلی ہی نظر میں واضح ہوجاتی ہے لیکن اس کے باوجود میں آئندہ سطور میں اس کا جائزہ لینے کی کوشش کروں گا تاکہ کم ازکم ان حضرات پر بھی اس کی حقیقت واضح ہوجائے جو اعتراض کی تصدیق معترض کی شخصیت کے پیشِ نظر کرتے ہیں۔

جوش نے ہر چند نفسیات کی "سادہ اور عام فہم" بات کہی ہے لیکن میں ایک خاص بات عرض کرنے کی جسارت کروں گا جس وقت ہم پر کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے۔ کیا ہم اپنی توجہ شاعرانہ اندازِ بیان کی جانب منعطف کردیتے ہیں اور اس کے اظہار کے لئے شعر گوئی پر آمادہ ہوجاتے ہیں؟ اس سوال کی نوعیت الزامی نہیں بلکہ واقعی سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ جب شاعر کے ذہن پر کوئی جذبہ طاری ہوگا۔ اس مغلوبیت اور تاثر پذیری کے عالم میں کیونکر ممکن ہے کہ وہ اس جذبے یا تاثر کے اظہار کے لئے شاعرانہ تراکیب، بحور و قوافی اور فنکارانہ صناعی کی جانب متوجہ ہوجائے مثلاً ڈارون نے اپنی کتاب "EXPRESSION OF EMOTION IN MAN & ANIMAL" میں خوف کی حالت میں انسان کی تصویر کشی یوں کی ہے کہ "نبض کی رفتار سست، تنفس مشکل اور جسم کمزور ہوجاتا ہے، دورانِ خون قریب قریب بند ہوجاتا ہے، جسم کی حرارت کم ہوجاتی ہے، جلد ٹھنڈی پڑجاتی ہے جسم کے غدود اپنا پانی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس لئے ٹھنڈا پسینہ جاری ہوجاتا ہے، رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، اعضا تھر تھر کانپنے لگتے ہیں، منہ خشک ہوجاتا ہے، لبوں پر پپڑی جم جاتی ہے، حلق سوکھ جاتا ہے، انتڑیاں لچک جاتی ہیں اور منہ سے یا تو آواز بالکل نہیں نکلتی یا پھر بے اختیار چیخ نکل جاتی ہیں"۔ ظاہر ہے کہ جب کسی شخص کی یہ حالت ہوگی تو وہ کسی قسم کے بیان پر کیونکر قادر ہوسکتا ہے چہ جائیکہ شعر کہنے لگے۔ شاید وہ نفسیات کے اس مسئلہ سے واقف نہیں کہ جذبے سے اثر پذیری یا مغلوبیت کے عالم میں بجز اضطراری اور جبلی افعال کے کوئی فعل صادر نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک نظم میں غزل گویوں کو ہدفِ ملامت بنانے کا تعلق ہے۔ مجھے ذاتی طور پر جوش سے کوئی اختلاف نہیں۔ اس لئے کہ وہ اس سلسلے میں بڑے فراخ حوصلہ ہیں چنانچہ اس اعتراف کے باوجود کہ "میرے باپ بھی شاعر تھے دادا بھی اور پردادا بھی" وہ بیباکانہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ؎

یہ فقط رسمی مقلد وامق و فرہاد کے — مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے
ان کی سیرت ہے انوکھی ان کی غیرت ہے عجیب — گڑ نہیں جاتے حیا سے یہ اب وجد کے رقیب
آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیب روسیاہ — کرچکا ہے زندگی جو میرؔ و مومنؔ کی تباہ
پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے ہر لے، ہر صدا — ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولیؔ کے لب پہ تھا

یا ؎

سلسلہ ان کے سخن کا دور تک ہوتا نہیں — کون ہے ان میں جو بالآخر کرنک ہوتا نہیں
سر سے پا تک بے سرے ہیں سربسر نقال ہیں — یہ حقیقی شاعروں کے اصل میں نقال ہیں
قلب ان کا قطرۂ شبنم تو ہے چھالا نہیں — کوئی ان میں زندگی کا دیکھنے والا نہیں

چونکہ جوش طنز کو بہت اچھے ہیں اس لئے اسی قسم کی پھبتیاں ان کی نظموں میں تو گوارا ہوجاتی ہیں لیکن اس قسم کا لہجہ اور اس قسم کے دلائل علمی مباحث میں بیکار ہیں۔ چونکہ شعری منطق اس منطق سے مختلف ہوتی ہے جس کی ضرورت ہمیں مسائل کے افہام و تفہیم میں پیش آتی ہے۔ اس لئے اگر اس مقصد کی ترویج و اشاعت نظموں تک ہی محدود رہے تو اچھا ہے۔

بشریت کی یہ ازلی کمزوری ہے کہ وہ اپنی ادعائیت کو جا و بیجا صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے لیکن صرف شخصیت کے بل بوتے پر اس قسم کے غیر عقلی دعوے سندِ قبول نہیں پاسکتے۔ چونکہ میرا مقصد یہ نہیں کہ غزل کی مقبولیت کے لئے اقوال و اسناد کا انبار لگا دوں بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ جس نظریہ پر جوش نے اپنے اعتراض کی بنیاد رکھی اس کی حیثیت کیا ہے یعنی کیا شعر اس معنی میں جذبے کی تخلیق کہا جاسکتا ہے کہ کوئی جذبہ طاری ہوتے ہی شعر میں ڈھل جائے۔

یہ واقعہ ہے کہ ہم روزانہ کی گفتگو میں معہودِ ذہنی سے بڑا کام لیتے ہیں یا پھر کلیات پر بحث کرتے وقت ضمنی مباحث اور صغریٰ و کبریٰ کو منطقی ترتیب سے بیان نہیں

کرتے لیکن جب کوئی شخص اس قسم کی گفتگو میں عام طور پر استعمال ہونے والے الفاظ کی نزاکت کو قائم نہیں رکھتا بلکہ مجازی معنی سے لغوی معنی اور لغوی معنی سے مجازی معنی کے حدود و امتیازات کو نظر انداز کر کے حسبِ دلخواہ نتائج کا استخراج کرنے کی کوشش کرتا ہے تو پھر ایسے ہی مفروضے تراشتا ہے جیسے جوشؔ نے تراشے ہیں کہ ادھر جذبہ وارد ہوا اُدھر بنا بنایا شعر یا گھڑی گھڑائی نظم معرضِ وجود میں آگئی۔ یہ واضح ہے کہ جوشؔ تخلیقِ شعر کے سلسلے میں ذہنی اعمال سے ناواقف ہیں ورنہ ایسی بے سروپا بات ہرگز نہ کہتے۔ حالیؔ کا یہ دعویٰ کہ ؎

خشک سیروں تنِ شاعر میں لہو ہوتا ہے　　　تب نظر آتی ہے اک مصرعِ تر کی صورت

یا صائبؔ کی یہ تنبیہ کہ ؎

دامنِ فکرِ بلند آساں نمی آید بدست
سرو می پیچد بخود تا مصرعۂ موزوں کند

یا غالبؔ کی "جوہرِ اندیشہ کی گرمی" اور "آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے" قسم کی باتیں بظاہر محض شاعرانہ تصورات نظر آتے ہیں لیکن کوئی جذبہ یا خیال ذہن میں وارد ہونے کے نقطۂ آغاز سے شعری جامے کے درجۂ کمال تک پہنچنے کے لئے جن مراحل سے گزرتا ہے۔ وہ ممکن ہے ہر شخص کے علم میں نہ ہوں لیکن یہ لاعلمی ان فطری اور جبلی وظائف میں کوئی تغیر پیدا نہیں کرتی جو ایسی صورت میں حواسِ انسانی ادا کرتے ہیں اور ان سے آگاہی اس ناقابلِ تردید علمی حقیقت کو اقبالؔ کے الفاظ میں یوں منکشف کر دیتی ہے کہ "مصرعِ من قطرۂ خونِ من است"۔ کیتھرائن پیٹرک کا دعویٰ ہے کہ ہر تخلیقی فکر میں تدوین (PREPARATION)، ترتیب (INCUBATION)، اشراق (ILLUMINATION) اور تصدیق (VERIFICATION) کے چاروں مدارج لازم ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ اس فکر کا تعلق علم و حکمت سے ہو یا شعر و ادب سے۔ چنانچہ براہِ راست شاعری کے متعلق اس کی رائے ہے کہ:-

"جو شاعر شعر کہنا چاہتا ہے وہ مواد تلاش کرتا ہے جو موضوع بن سکے۔ چنانچہ اس سلسلے میں وہ دوسروں کے اشعار کا مطالعہ کرتا ہے، اپنے ماحول کا جائزہ لیتا ہے، اپنی خیال آرائی کو کام میں لاتا ہے اور اس کے بعد کوئی خیال مختلف اوقات اور مختلف صورتوں میں پرورش پاتا رہتا ہے جس کے بعد وہ خیال مجوزہ حل کی صورت میں موضوعِ شعر کی حیثیت سے فکر کے تیسرے درجے یعنی اشراق میں داخل ہوتا ہے۔ پھر شاعر اپنے مسودے میں حذف و اضافہ کے بعد اپنی تخلیق کا دوسری معیاری شاعرانہ تخلیقات سے موازنہ کرتا ہے جو ممکن ہے اسے مزید حک و اضافہ پر مجبور کرے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی تخلیق کو مکمل کر لے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ڈیوئی (DEWEY) کا طریقِ کار صرف سائنسی مسائل پر ہی نہیں بلکہ شاعری، ادب، فن، موسیقی اور ڈرامے وغیرہ پر بھی منطبق ہوتا ہے۔"

فیبل مین (HEBLIMAN) کی رائے بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ:-

"فن کارانہ اظہار کی نفسیات میں منطقی ہیئت کی ساخت بنیادی درجہ رکھتی ہے۔ فنی تخلیق کے لئے مقدمات (PREMISES)، اسلوب (METHOD)، انطباق (APPLICATION) اور اختتام (CONCLUSION) بہت ضروری ہیں۔ فن کے لئے مقدمہ وہ جذبات، خیالات یا دونوں ہیں جنھیں فن کار ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ ایک مرتبہ جب مقدمات کا انتخاب کر لیا گیا تو پھر فن کار کو اس کے حدود سے تجاوز کرنے کا حق نہیں۔ اب وہ خود مختار آ وہ سب کچھ نہیں کر سکتا جو چاہتا ہے بلکہ اس کا دائرہ عمل مقدمات کے امکانات کی اجازت تک محدود ہے کیونکہ انہیں انتخاب کر کے اس نے اپنے اوپر بھی چند پابندیاں عائد کر لی ہیں۔ فنکارانہ اظہار کے لئے اسلوب کا اختیار کرنا مقدمات کو اختیار کرنے کا جزو ہے بلکہ اہم جزو کیونکہ بغیر اسلوب کے فن کا عمل ناممکن ہے۔ دراصل اسلوب کی حیثیت ثانوی مقدمے کی سی ہے کیونکہ "کیا کرنا ہے" پر "کس طرح کرنا ہے" کو منطقی اور زمانی اعتبار سے فوقیت حاصل ہے اور مقدمات کے انتخاب پر اس اصول کی نگہداشت لازم ہے۔ انطباقِ مقدمات ان اقدامات سے عبارت ہے جو اسلوب کی متابعت میں فن کو پیش کرنے کے لئے کئے جاتے ہیں۔ یہ اقدامات عرضِ فن کی خواہش کے لئے کسی معینہ اصول کے ماتحت جسمانی حرکات سے عبارت ہوتے ہیں جو طریقِ کار کا اہم اور بدیہی حصہ ہیں۔ ایک فن کار دورانِ عمل کے اس مرحلے میں واقعی ایک فن کار ہے جو اپنے منصوبے میں مشغول ہے۔ فنی طریقِ کار کا اختتام فنی تخلیق اور اس کے مقصد و معنی کی آراستگی سے عبارت ہے۔ اس آخری عمل کے بعد فنی تخلیق مکمل ہوتی ہے۔"

اسی خیال کو اقبال نے اپنے شاعرانہ انداز میں یوں کہا ہے کہ ؎

از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست
پیشِ محفل جز بم و زیر و مقام و راہ نیست

جب یہ متعین ہوگیا کہ شعر کہنا اس قدر آسان نہیں جتنا کہ جوش نے سمجھا تھا اور کسی خیال یا جذبے کا اظہار اس کے وارد ہوتے ہی نہیں ہوجاتا بلکہ اس سلسلے میں کچھ "سخت مقامات" بھی آتے ہیں تو اعتراض کی سطحیت پر تعجب ہوتا ہے جو "ایک بڑے شاعر" سے منسوب ہے۔ ایک مغربی نقاد ہنری ٹمروڈ (HENRY TIMROD) نے کسی ایسے ہی معترض کے جواب میں اچھی بات کہی تھی کہ :۔

"اس لمحے میں جب فوری انکشاف حسن یا احساس عظمت سے متعلق کوئی عظیم خیال پہلی مرتبہ دماغ میں پیدا ہوکر چہرے کو تمتما دے، اور عمل اور محنت طلب تکمیل کی ساعت میں ضرور کوئی حدِ فاصل ہونی چاہئے"

ہم جس اصول کے پیرو ہیں اس کے پیش نظر شعر کا بالقصد ہونا بھی ضروری ہے اور چونکہ غزل بھی اس تعریف میں آتی ہے، لہٰذا یہاں بھی ہم اسے اضطراری فعل نہیں کہہ سکتے۔ یہ سچ ہے کہ بعض اوقات کوئی خیال بھی ہمیں مجبور کر دیتا ہے کہ اسے موزوں کیا جائے لیکن اس کے باوجود قصد و ارادہ کی شرط اپنی جگہ ہے بعض حضرات اس کی مختلف تاویلیں صرف اس لئے کرتے ہیں کہ بعض اعتبارات سے یہ قصد والی شرط مغربی آرا سے متصادم نظر آتی ہے لیکن در اصل ایسا نہیں ہے۔ کینتھ ابن بیرک کا مشورہ ہے کہ :۔

"آپ کو قصداً کوشش کرنا چاہئے کہ وہ کیفیت (MOOD) یا جذباتی لہجہ پیدا کریں جو آپ کی تخلیقی فکر میں ممد و معاون ہوسکے"

مجھے یہ کہتے ہوئے بھی باک نہیں کہ اس سلسلے میں، بقول جمیل الدین عالی جوش نے جو "نو نکات" دریافت کئے ہیں وہ بھی نہایت سطحی اور بے بنیاد ہیں۔ یہ وہ خصائص ہیں جو انہیں ولی سے لیکر آج تک کے ہر شاعر میں مشترک نظر آتے ہیں اور اس وجہ سے وہ بلا تکلف انہیں "کاربن پیپر کی اتاری ہوئی نقلیں" کہدیتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی توجہ پروفیسر اختر انصاری کے اس بیان کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ :۔

"آپ دنیا کے کسی ادب کو اٹھا کر دیکھ لیجئے ایک خاص مقام اور ایک خاص زمانے کی زندگی آپ کو اس میں جھلکتی نظر آئے گی۔ مثال کے طور پر اردو غزل ہی کو لیجئے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ عشقیہ شاعری اپنے عہد کی سیاسی اقتصادی اور معاشری زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی اور یہی اس کے حامیوں کا دعویٰ بھی ہے لیکن در اصل ایسا نہیں ہے۔ اگر ذرا غور سے کام لیا جائے اور غزل کی معنوی ہیئت کا تجزیہ کیا جائے تو بہت آسانی سے یہ معلوم ہوجائے گا کہ یہ داخلی اور "خالص جمالیاتی" شاعری خارجی حالات کے اثر سے اپنے آپ کو بچانے میں کبھی کامیاب نہ ہوسکی۔ کیا میر کے تغزل میں اٹھارویں صدی کے سیاسی مزاج اور جماعتی انتشار کا عکس نہیں پایا جاتا؟ میر درد کے متصوفانہ کلام میں جو فرار پسند ذہنیت کارفرما نظر آتی ہے کیا وہ اس دور کی سماجی اور اقتصادی بدحالی کا نتیجہ نہیں تھی؟ کیا غالب کا حزن اسلامی تمدن و سیاست کی مکمل شکست کا پرتو نہ تھا؟ کیا انشا اور اسکے لکھنوی معاصرین کی شاعری پر اودھ کی حکومت کا اثر نہیں پڑا۔ .... آخر میں اس سوال پر غور کیجئے کہ کیا موجودہ دور کے غزل نگار شعراء معانی و مطالب کے لحاظ سے میر و درد یا انشاء و جرأت کے انداز کی غزلیں لکھ سکتے ہیں یا انیسویں صدی کے سخن سنج یگانہ اور فانی کے رنگ میں شعر کہہ سکتے تھے اگر نہیں تو بتائیے کہ یہ فرق سیاسی اور سماجی ماحول کا فرق نہیں تو کیا ہے؟"

اس سلسلے میں بیجا نہ ہوگا اگر "عشق کی لاکھوں داستانیں در اصل کاربن پیپر کی اتاری ہوئی نقلیں ہیں" کا جواب بھی اختر انصاری ہی کے الفاظ میں پیش کر دوں کہ :۔

"جذبۂ عشق کی ترجمانی تیر بھی کرتا ہے اور ہندی کی شاعرہ میرا بھی، سعدی و حافظ بھی اور ایران جدید کا شاعر بہار بھی، شاعر اطالوی ڈانٹے بھی اور قدیم یونان کی شاعرہ سیفو بھی لیکن ان میں سے ہر ایک کی شاعری دوسروں کی شاعری سے بنیادی طور پر مختلف ہے، اس لئے کہ ہر ایک کا جذبۂ عشق ایک مخصوص جداگانہ سیاسی و معاشی ماحول میں رنگا ہوا ہے"

جیسا کہ سطور بالا سے واضح ہوچکا ہے، چونکہ ان کا بنیادی اعتراض ہی غلط ہے۔ اس لئے اس سے اخذ کردہ نتائج کی صحت بھی معرضِ خطر میں ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ جذبہ وارد ہوتے ہی شعر میں ڈھل جاتا ہے ناقابل یقین ہے اور اس معنی میں شعر کی بنیاد جذبے پر رکھنا غلط ہے۔ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ شعر کی یہ تعریف کوئی نئی

دریافت نہیں مثلاً شبلی نے شعر العجم میں دعویٰ کیا تھا کہ :-

"حیوانات پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو مختلف قسم کی آوازوں یا حرکتوں کے ذریعے سے ظاہر ہوتا ہے مثلاً شیر گونجتا ہے، مور (؟) چنگھاڑتے ہیں، کوئل کوکتی ہے، طاؤس ناچتا ہے، سانپ لہراتے ہیں۔ انسان کے جذبات بھی حرکات کے ذریعے سے ادا ہوتے ہیں لیکن اس کو جانوروں سے بڑھ کر ایک اور قوت دی گئی ہے یعنی نطق اور گویائی، اس لئے جب اس پر کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے موزوں الفاظ نکلتے ہیں۔ اسی کا نام شعر ہے۔"

لیکن وہ اس تعریف پر تفصیل سے گفتگو نہیں کر سکے بلکہ اس سلسلے میں "علمی بحث" کے لئے انہیں دوسری تعریف اختیار کرنا پڑی کہ "شاعری دراصل دو چیزوں کا نام ہے محاکات اور تخییل"۔ یہی نظریہ نہ صرف مقبول ہے بلکہ سائنٹفک اور علمی ہے۔ بقول میتھیو آرنلڈ "شاعری تخییل و آرٹ کا مجموعہ ہے"۔ اور صاحب دبیر عجم کی رائے میں "شعر قولیست متخیل کہ در نفس انسانی بداں انبساطے یا انقباضے حادث گردد"۔ آزاد کی رائے ہے کہ "شعر خیالی باتیں ہیں، جو خیال شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے" اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے الفاظ میں "شعر اس فکر سے عبارت ہے جس پر جذبات نے اپنا رنگ چڑھا دیا ہو" یا "شاعر کے تجربے میں جذبہ اپنے آپ کو تخییل کے رنگ میں رنگ لیتا ہے"۔ بصیر احمد ناصر کے الفاظ میں بقول کروچے :

"فن کی اصل تصورات کو تشکیل کرنے کی قوت میں مضمر ہے۔ تخییل بے مثل طریقے سے فن پر حکومت کرتا ہے۔ فن کا کل سرمایہ تخیلات ہیں۔ انسان جوں ہی تخیل آفرینی کرنے لگتا ہے فن کار ہو جاتا ہے۔"

مندرجۂ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ شاعری جذبات سے نہیں بلکہ تخیل سے ہوتی ہے تو پھر قدرتاً یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ تخیل کیا ہے اور اسے شعر کی اساس کیوں بنایا گیا ہے؟ اسے بڑی فراخ حوصلگی سے انسانی علم کی کوتاہی کہا جا سکتا ہے کہ آج اس مادی ترقی کے باوجود ہمارے دماغ کی یہ قوت اس کی دسترس سے باہر ہے اور نفسیات کی تمام موشگافیوں کے باوصف تخیل اس علم اور اس کے ماہروں کے لئے

کس ندانست کہ منزلگہ مقصود کجاست
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ نقادانِ فن اور مبصرینِ شعر و ادب نے اس سلسلے میں بڑے تفحص سے کام لیا ہے۔ چنانچہ حالی کا دعویٰ ہے کہ :

"وہ (تخییل) ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا ذخیرہ جو تجربے اور مشاہدے کے ذریعے سے ذہن میں پہلے سے موجود ہوتا ہے یہ اس کو مکرر ترتیب دے کر ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ کے ایک ایسے دلکش پیرائے میں جلوہ گر کرتی ہے جو معمولی پیرایوں سے بالکل یا کسی قدر مختلف ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر یوسف حسین خاں "روحِ اقبال" اور "اردو غزل" میں علی الترتیب اس کے مدعی ہیں کہ :

"تخیل کی قوت کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ عقل سے زیادہ قدیم اور قوی ہے۔ وہ اشیا کی تعریف و تحدید نہیں کرتا بلکہ انہیں محسوس کرتا ہے اور یہی احساس اس کے معانی و تصورات کا جوہر ہے۔ یہی احساس جب خواہش بن جاتا ہے تو اس میں ایسی دلکشی آجاتی ہے کہ شاعر اس کی خارجی صورت دیکھنے کے لئے خود بیتاب ہو جاتا ہے۔ ...... سوائے تخیل کے جذبات کی دنیا کا کوئی محرمِ راز نہیں ہو سکتا۔ اس کی بصیرت کے آگے فکر ششدر و حیران رہ جاتی ہے جسے عقل ادھورا دیکھتی ہے اسے تخیل مکمل دیکھ لیتا ہے۔"

"تخیل میں یہ قوت ہے کہ وہ طلسمی یا غیر مرئی حقائق کو یا یوں کہئے کہ ان حقائق کو جو حواس کی کوتاہی اور نارسائی کی وجہ سے پوری طرح محسوس نہیں ہوتے جیتی جاگتی شکل میں ہماری نظر کے سامنے لے آئے۔ تخیل ایک نہایت ہی لطیف، نازک اور پیچیدہ حقیقت ہے اور وہ ایسے اسباب پر منحصر ہوتا ہے جن پر عقل کو قابو نہیں، اس کی تخلیقی اور اختراعی قوت معمولی اور ظاہری واقعات میں ایسے ایسے نکتے اور باریکیاں تلاش کر لیتی ہے کہ عقل ششدر و حیران رہ جاتی ہے۔"

مشہور مغربی نقاد لانجائنس نے اس طرح وضاحت کی ہے کہ :

"عموماً خیال یا تخیل کے نام سے وہ چاہے جس لباس میں ہو دماغ کے ہر اس خیال کو موسوم کیا جاتا ہے جو نطق کی تحریک کا سبب ہوتا ہے لیکن فی زمانہ یہ لفظ قصداً ان مواقع پر استعمال کیا جاتا ہے جب جذبے کی شدت اور ہیجان کا ابلاغ مقصود ہو۔"

تخیل کی مندرجہ بالا تعریفیں تو صرف ان حضرات کی کاوش کا ماحصل ہیں جو شاعر یا ادیب ہیں لیکن اس سلسلے میں ایک مشہور ماہر نفسیات آئی۔ ایم۔ ایل ہنٹر نے اپنی کتاب "حافظہ ــــ صداقتیں اور مغالطے" (MEMORY ——— FACTS and FALLACIES) میں بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ:

" دماغ کی آنکھ ایک محاورہ ہے جس کے معنی سوائے اور زیادہ اندھے کے ہر شخص اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں فوراً سمجھ سکتا ہے۔ یہ دماغ کی آنکھ ہی کا کرشمہ ہے کہ ہم اپنے غائب دوست کا چہرہ یا بقول ورڈز ورتھ 'آبی نرگسوں کے انبوہ کا ایک رقص' دیکھ سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ ہم ایک دوست یا بہت سے پھولوں کا خیال کر رہے ہیں۔ ہر چند تخیل بظاہر بصارت کی دنیا کی چیز ہے لیکن یہ نہ صرف باصرہ کے متعلقات کے لئے بلکہ سامعہ، ذائقہ، شامہ، لامسہ، تجربات حرارت، جسمانی حالات، عضوی حرکات، کشمکش وغیرہ کے لئے بھی مستعمل ہے۔ مختصراً اس کا استعمال ان تمام مثالوں کے لئے ہوتا ہے جن میں ہم نوعیت سے قطع نظر کسی سابقہ تجربہ کا اعادہ کرتے ہیں یا ہم اپنے گھر کے گزشتہ عافیت میں کسی سابقہ مرکب تجربے کی تجدید کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ ہم دوبارہ شاداب اور سربلند پہاڑ، نیلگوں آسمان، ساحل پر آکر ختم ہو جانے والی چھوٹی چھوٹی موجیں دیکھ سکتے ہیں بلکہ ہم دوبارہ دریائی پرندوں کی چہچہاہٹ اور جہاز کی سیٹی کی آواز سن سکتے ہیں۔ ہم دوبارہ ساحل پر اگی ہوئی گھاس کی بو اور اپنے کوٹ میں لگے ہوئے گلاب کی پھول کی خوشبو سونگھ سکتے ہیں' ہم اُس روز کی کھائی ہوئی چاکلیٹ کو چکھ سکتے ہیں اور دوبارہ اپنے چہرے پر آفتاب کی تمازت کو محسوس کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ جہاز کے بلند عرشے پر اپنی چہل قدمی اور بحری علالت میں اپنی ناتوانی کا تجربہ کرتے ہیں اور ان تمام صورتوں میں ہم تصورات اور خیالات کی شکل میں اپنے گزرے ہوئے تجربات کو دہراتے ہیں۔ ہم اپنے ذاتی تجربات کی وساطت سے جانتے ہیں کہ ایسے تخیلات ہماری اپنی یادداشت کے صریحی اعمال ہیں اور ہم میں سے اکثر اس سلسلے میں ورڈز ورتھ سے متفق ہوں گے کہ ہماری باطنی آنکھ ــــ اور کان ناک وغیرہ ــــ 'عزلت کی انتہائی مسرت ہے'؛ ہم میں سے بیشتر کبھی کے ان تجربات کے تصورات سے بے اندازہ مسرت حاصل کرتے ہیں اور اپنے ذہن میں انہیں تخیلہ سے آمیز کر کے نئے اور ہیج تجربات پیش کرتے ہیں جن کا ماضی یا حال کے محسوسات سے کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔"

ہر چند نفسیاتیین کا یہ مطالعہ ابھی "گل تواں گفت ولے چیدن نیست" کی منزل سے آگے نہیں بڑھا ہے لیکن اس حقیقت کا معترف یہ علم بھی ہے کہ کوئی مخفی قوت ہے ضرور جس کا نام تخیل رکھ دیا ہے اور اس قوت یا جوہر کے اعمال و وظائف سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ شعر و ادب نیز فنون لطیفہ میں یہی قوت' جسے تخیل کہتے ہیں' کار آمد ثابت ہوتی ہے اور جذبات و احساسات کی حیثیت "مشاہدۂ حق کی گفتگو" میں "شیشہ و ساغر" کے ذکر سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہی غالب کے یہاں "ہوسِ غزل سرائی' تپشِ فسانہ خوانی ہے" یوسف حسین خاں کے یہاں غزل کی دروں بینی اور فراق کے الفاظ میں تخلیقی جدت (CREATIVE ORIGINALITY) ہے اور یہی تنگنائے غزل کا وہ جہان ہے جو بے حدود ہے اور جس کا افق بے ثغور ہے۔

تالبشنے دھلوی:

غزل کے بارہ میں تنقید اور طنز کے دوگونہ عناصر کو آمیز کرتے ہوئے جناب جوش ملیح آبادی نے پھر سے وہی خاردار مسئلے چھیڑ دیئے ہیں جن کے متعلق قبل ازیں بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن اب کی صاحب موصوف اور ان کے ہمنواؤں نے جس زور شور سے اس بحث کا اہتمام کیا ہے اس کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تفصیلاً گفتگو کی جائے۔ اپنے استدلال میں نفسیات کا سہارا لیتے ہوئے جوش صاحب نے کہا ہے کہ "یہ بات مسلّم ہے کہ نفسِ انسانی پر وقتِ واحد میں جذبۂ واحد ہی طاری ہو سکتا ہے" بے شک۔ لیکن پوری غزل کو جذبۂ واحد کیوں سمجھا جائے اور ایک ہی غزل کے ہر شعر کو جذبۂ واحد کیوں نہ سمجھا جائے؟ اور پھر وقتِ واحد کو دس بیس گھنٹوں سے کیوں تعبیر کیا جائے؟ ایک پل کے ہزارویں حصہ کو بھی وقتِ واحد کیوں نہ سمجھا جائے؟ قوائے ذہنی و باطنی ایک پل کے ہزارویں حصہ میں لاکھوں میل کا فاصلہ اور ہزاروں کیفیات کو طے کر لیتے ہیں، اسلئے کیا یہ ممکن نہیں کہ ایک ہی غزل میں مختلف جذبات و خیالات کی گرفت بیک وقت کی جا سکے اور اس طرح بعض مشہور "غزل باف" میر، مومن، غالب اور فانی کے نام سے ہمیشہ اردو ادب میں زندہ رہیں؟

یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ غزل ایک غلط اور غیر فطری صنف ہے۔ غیر فطری اسلئے نہیں ہے کہ یہ صنف انسانی جذبات سے جس قدر قریب ہے کوئی اور صنف

نہیں، اور غلط اسلئے نہیں کہ غزل کے شعر کے دو مصرعوں میں جو منطقی استدلال ہوتا ہے وہ بسا اوقات پوری پوری نظموں میں مفقود نظر آتا ہے۔ فاضل نقاد نے اس دعویٰ کی کوئی دلیل پیش نہیں کی۔ اصل میں یہ دعویٰ ہی غلط ہے۔ تمام انسانی اعمال و افعال منطقی لحاظ سے غیر فطری ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم بعض چیزوں کو غیر فطری کہہ کر اپنے معاشرہ کے مطابق ان کو "خوب" سے تمیز کرنے کے لئے "زشت" قرار دیتے ہیں اور غیر فطری ٹھیراتے ہیں۔

شاعر کی شخصیت عام آدمی کی شخصیت سے بہت الگ ہوتی ہے۔ اس میں بجائے خود محشرِ خیال ہونے کی صلاحیت بدرجۂ اولیٰ ہوتی ہے۔ وہ خارجیت کو داخلیت میں اس طرح سمو لیتا ہے کہ داخلیت سے خارجیت کو الگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی داستان میں حدیثِ دیگراں بیان کرتا ہے۔ اسی لئے شاعر کی آپ بیتی، جگ بیتی اور تمام جگ بیتی اس کی آپ بیتی ہوتی ہے، بلکہ یہ فرق کبھی مشکل ہو جاتا ہے کہ آپ بیتی کہاں ختم ہوئی اور جگ بیتی کہاں شروع ہوئی۔ وہ جگ بیتی کو آپ بیتی بنا کر بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ فلاں شاعر میں یہ بات موجود نہیں یا اس کی سیرت کا یہ خاصہ نہیں تو پھر اُس نے یہ بات کیونکر بیان کر دی، کہاں تک درست ہے؟ ریاض کی خمریات کے متعلق بھی یہی دلیل کافی ہے۔ انہوں نے خمریات کے متعلق جو کچھ بیان کیا وہ بالکل اُن کا اپنا جذبہ ہے خواہ انہوں نے ایک بوند بھی نہ چکھی ہو۔ ایک غیر شرابی عمدہ شاعر شراب کے متعلق یقیناً لافانی شعر کہہ سکتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک شرابی شاعر شراب کے متعلق ساری عمر ایک بھی اچھا شعر نہ کہہ سکے۔ یہ بات تمام بڑے شاعروں پر منطبق ہوتی ہے۔ خود جوشؔ صاحب کی سینکڑوں نظمیں ایسے عنوانات اور موضوعات کے متعلق ہیں جن کا بظاہر ان کی زندگی سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ امیرؔ مینائی کے متعلق بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے۔ عشق اور اتقا میں کوئی بیر تو نہیں، اور یہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ امیرؔ مینائی آدمی کم اور متقی زیادہ تھے۔ میری ناچیز رائے میں وہ آدمی پہلے تھے اور متقی بعد کو۔

جوشؔ صاحب کا مزید ارشاد ہے کہ "غزلوں کے اسّی فیصدی اشعار عاشقانہ ہیں"۔ یہ درست ہے بلکہ میں کہوں گا سو فیصدی۔ اور یہ بھی درست ہے کہ تمام غزل گو عشق پیشہ تھے (بلکہ ہیں) صاحب، عشق ہی وہ جذبہ ہے جس سے اس کائنات کی نمود ہے، عشق یا خواہش ہی وہ "جذبۂ اوّل" ہے جو انسان کے تمام افکار و اعمال میں جاری و ساری ہے۔ پھر اگر اس عشق یا خواہش کے اظہار کے بیان میں لوگوں نے عمریں گذار دیں تو کیا قصور کیا؟ آپ کو اعتراض ہے کہ تمام عاشقوں کی داستانِ عشق ایک جیسی ہے، وہ ایک ہی دور کے لوگ معلوم ہوتے ہیں، ان کا ایک ہی خاندان سے تعلق ہے، وغیرہ وغیرہ میں آپ سے سوال کروں گا کہ بھوک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا ازل سے لے کر آج تک انسان کو ایک ہی طریقے سے بھوک نہیں لگی اور کیا انسان نے صرف خوراک ہی کے ذریعہ اس کو دور نہیں کیا؟ بھوک کے سلسلے میں کیا تمام دنیا کے انسان ازل سے لے کر آج تک ایک ہی دور اور ایک ہی خاندان کے لوگ نہیں معلوم ہوتے؟ اصل میں عشق کوئی فیشن نہیں جو روز بدل دیا جائے۔ ہجر و وصال تمام عشاق کا یکساں ہے، صرف کیفیات کے رد و قبول میں فرق ہے اور کیفیات کے اس رد و قبول کا فرق غزل کے مختلف شعراء کے یہاں مختلف ہے جو ہر دور کی غزل میں بدرجۂ اولیٰ ملتا ہے۔ عشق بھوک کی طرح ایک بنیادی جذبہ ہے جس میں ازل سے آج تک کوئی فرق نہیں ہوا۔ اسی لئے آدمؑ و حوّا کا فراق، لیلیٰ مجنوں کے فراق سے مختلف نہیں۔

اب رہا یہ خیال کہ "عشق کی تمام داستانیں کاربن کی اُتاری ہوئی نقلیں ہیں"۔ ایک عمدہ فقرہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ یہی بات نظم گو حضرات کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ کوئی نظم ایسی بتا دیجئے جس کے موضوعات پر کسی مغربی یا مشرقی شاعر نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ موجودہ خیال تو یہ ہے کہ دنیا میں کوئی خیال نیا نہیں۔ آپ نے جو اعتراض غزل پر کیا ہے اس استدلال کی روشنی میں وہی اعتراض نظم پر نہیں کیا جا سکتا؟ قنوطیت سے مُراد ہے ہر چیز کا تاریک یا غمناک پہلو دیکھنا۔ زندگی دونوں رخ پیش کرتی ہے؟ آپ کے سامنے اس کا مسرت ناک پہلو ہو سکتا ہے۔ اور کسی اور کے سامنے اس کا غمناک پہلو لیکن آپ اُسے بالکل اُسی طرح مطعون نہیں کر سکتے جس طرح وہ آپ کو نہیں کر سکتا! یہ بحث الگ ہے کہ زندگی قنوط کا نام ہے یا رجا کا، یہاں صرف زندگی اور اس کی کیفیات کی قبولیت سے بحث ہے، اور ان کیفیات کے اظہار کے لئے جو ذریعہ اختیار کیا جاتا ہے وہ کس حد تک موثر ہے، اس کی افادیت سے یہاں بحث نہیں کیونکہ ادب کی افادیت ایک اور بحث کا دروازہ کھولتی ہے۔

نظم کے مقابلہ میں ادبی اور قومی اعتبار سے غزل ہر لحاظ سے قابلِ ترجیح ہے، اس کے لئے یہ دلیل کافی ہے کہ نظم کا وہ دور جو ۱۹۳۶ء سے شروع ہوا اور جس نے بعض اچھے جدید نظم گو شعرا پیدا کئے، اب تقریباً ختم ہو گیا ہے، اور اب جو لوگ نظم کہہ رہے ہیں ان کے لئے بھی نئے موضوعات بالکل نہیں مگر غزل غالبؔ اور فانیؔ کو پیدا کرنے کے بعد پھر متحرک ہے اور اب بھی اس کی توانائی نے اُسے باوجود مخالفتوں کے زندہ رکھ چھوڑا ہے۔ اسکی

بڑی وجہ یہی ہے کہ غزل دلی معاملات سے تعلق رکھتی ہے، آدمی کتنا ہی "مصنوعی" ہو جائے دلی معاملات جاری رہیں گے اور غزل بھی زندہ رہے گی غزل میں جذبہ کی شدت، اثر و تحصر کو زیادہ تیز کر دیتی ہے اور اس کا ایک شعر دل پر جو نقش چھوڑتا ہے وہ نظم کے ہزار شعروں سے بھی نہیں پیدا ہوتا، خود آپ بھی بات بات پر کسی غزل ہی کا شعر پڑھتے ہیں، نظم کا نہیں۔

اب رہا "بازاری عورتوں اور بد اطوار لڑکوں کا عشق" تو یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کھل کر گفتگو کرنے کے لئے بہت سے اخلاقی آداب کو بالائے طاق رکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور یہی بہتر ہے کہ اس کو بالائے طاق ہی رہنے دیا جائے۔

رودکی سے آج تک غزل کی (فارسی اور اردو دونوں کی) تقریباً ایک ہزار سالہ تاریخ میں عظیم شعرا کی تعداد "غزل بافوں" کی زیادہ ہے نظم گو خال خال نظر آتے ہیں، اور ان غزل گو حضرات نے جو سرمایہ چھوڑا ہے وہ یقیناً دنیا کی کسی بھی زبان کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس غزل گوئی کے دور نے جو شعرا پیدا کئے ان کے ادب کے مقابلہ میں دوسری زبانوں کا ادب پاسنگ بھی نہیں ہے، کیا بلحاظ مقدار اور کیا بہ اعتبار اوصاف۔

تعجب ہے کہ جوش صاحب شاعر کے ذہنی عوامل اور اس کی ذہنی نفسیات سے منکر ہیں۔ اسے تجاہل عارفانہ بھی نہیں کہا جا سکتا کیونکہ "تجاہل عارفانہ" میں صرف تجاہل نہیں بلکہ عرفان کا پہلو بھی ہوتا ہے مگر معترض کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی منکر ہے یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ اس انکار سے ان کی مراد اصل میں پوری ادبی تاریخ سے روگردانی ہے اور اُن تہذیبی ورثوں سے انحراف ہے جو شعر، خاصکر غزل کے شعری سرمایہ کی شکل میں ہمیں ملے ہیں۔

غزل گو شعرا کو اوباش کہہ دینے سے نظم گو شعرا کی عظمت قائم نہیں ہوتی بلکہ اس طرح ان کی عظمت میں جو پہلے ہی خال خال ہیں اور کمی واقع ہوتی ہے۔ فارسی ادبیات کی تاریخ میں فردوسی، نظامی، سعدی (حالانکہ سعدی غزل میں زیادہ عظیم ہیں) اور اسی طرح ایک آدھ نام اور لیا جا سکتا ہے جن کو صحیح معنی میں نظم گو شعراء قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب اردو کی طرف آئیے۔ اس میں نظیر اکبرآبادی، علامہ اقبالؒ اور خود جوش صاحب کی ذات شمار کی جا سکتی ہے۔ اس قلیل تعداد کے مقابلہ میں غزل گو حضرات صرف فارسی ہی میں کم و بیش دو ہزار گذرے ہیں۔ اور یہی تعداد شاید اردو میں بھی ہو، کیا ان فارسی غزل گو شعراء میں کم از کم پچاس عظیم غزل گو نہیں ہیں، جو دنیا کی کسی دوسری زبان کے عظیم شعراء کے مقابلہ میں کھڑے کئے جا سکتے ہیں؛ اس مقابلہ کے بعد معلوم ہوگا کہ ان عظیم فارسی غزل گو شعراء کی تعداد اور اُن کا شعری سرمایہ اُن سے زیادہ ہے۔

★

غزل

عابدہ نکہت

بہار آ کے چمن میں ٹھہر نہ جائے کہیں
مرے خیال کی جنت سنور نہ جائے کہیں

عجیب فکر تھی گھل گھل کے مٹ گئی شبنم
گہر سے گلشنِ اغیار بھر نہ جائے کہیں

صبا سے جشنِ بہاراں منانے والوں نے
کہا ہے جانِ چمن، یہ خبر نہ جائے کہیں

اسیرِ حسن کر نہ ہو سکے تو لمحوں کو
وہ بزم ہے جو نظر میں بکھر نہ جائے کہیں

بجا کہ راس ہے تبدیلئ بہار و خزاں
نظر اجالے اندھیرے سے ڈر نہ جائے کہیں

وہ برق ہے کہ تڑپتی ہے خود نمائی کو
نظر، نظر ہی نہیں جو ٹھہر نہ جائے کہیں

اس اعتقادِ مشیت کو کیا کہے کوئی
نظر سے اپنی یہ دنیا اتر نہ جائے کہیں

ٹھہر کہ وقت کی رفتار تیز ہے نکہت
فریب دے کے زمانہ گذر نہ جائے کہیں

ماہِ نو، کراچی، جنوری ۱۹۵۹ء

افسانہ:

آندھیاں

یونس احمر

میرا مضطرب دل بوڑھی گنگا کی پُرسکون لہروں کے ساتھ ساتھ نہ جانے کہاں بہا جا رہا ہے۔ آج کی سرمئی شام بھی کتنی اُداس ہے ـــــ بالکل اُس شام کی طرح جب آج سے دو سال پہلے ذکیہ باجی نے زہر کھا کر اپنی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھا دیا تھا۔ یہ سوال بڑا ٹیڑھا ہے کہ اس المیہ کا ذمہ دار کون ہے ـــــ نامراد زندگی یا ذکیہ باجی۔ یہ گتھی بھی شاید ہی سلجھ پائے کہ زندگی ذکیہ باجی کے ہاتھوں فریب کھا گئی یا ذکیہ باجی کا زندگی سے نباہ نہ ہو سکا۔ اس وقت میرے کمرے میں کوئی نہیں ہے، میں بالکل اکیلی خیالات کی آندھیوں کے ساتھ اِدھر اُدھر بھٹک رہی ہوں۔ آندھیاں میری زندگی میں برابر آتی رہی ہیں مگر یہ آندھیاں میرے جذبات کی شمعیں بجھا نہ سکیں ــــ ان کی لَویں بھڑکتی رہیں۔ البتہ ذکیہ باجی شکست کھا گئیں اور اُن کے چمن کے شگفتہ پھول عین بھری بہار میں منتشر ہو گئے۔

میرے کانوں کے پردے اسٹیمر کی سیٹی سے پھٹ جائیں گے۔ ان سیٹیوں کو سن کر مجھے موت کی آہٹوں کا گمان ہوتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری چیخ نکل جائے گی اور میرا سرمایۂ حیات بھی لُٹ جائے گا۔ میرا سرمایۂ حیات ہے ہی کیا ـــ یہی چند دبی گھٹی آرزوئیں اور کچلی روندی تمنائیں جن کو میں اپنے چھلنی سینے سے لگا کر رکھتی ہوں۔ اسٹیمر کی سیٹیاں سن کر ذکیہ باجی برابر چونک پڑتی تھیں اور ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں ـــــ اور آہستہ آہستہ مجھ سے کہتی تھیں: "سلمیٰ ہمیں اس مکان سے کہیں اور شفٹ کر جانا چاہیئے۔ یہ سیٹیاں ایک نہ ایک دن میری جان لیکر رہیں گی۔"

میں ان کی کمزوری کا مذاق اڑاتے ہوئے جواب دیتی: "باجی ایسی بھی بزدلی کیا۔ بھائی جان سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ اور پھر یہ مکان کتنے شوق سے انہوں نے کرایہ پر لیا ہے۔ دکھن رُخ، ہوا دار اور سب سے بڑی بات یہ کہ بوڑھی گنگا کا کنارا! کتنی خاموشی اور سناٹا ہے یہاں۔" باجی میری ان باتوں کو سن کر خاموش ہو جاتیں۔

شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ آج بیساکھی آندھی نہیں آئی۔ آسمان پر کالے کالے بادل بھی نہیں چھائے ہیں لیکن ہوا بند ہے۔ اس کمرے میں میرا اکیلا پن مجھے بھوت بن کر ڈرا رہا ہے۔ یہ میرا اکیلا پن ہے یا ذکیہ باجی کی خوبصورت حسین تصویر جو سنہری فریم میں دیوار پر آویزاں ہے۔ میں جب بھی اکیلی ہوتی ہوں۔ ذکیہ باجی کی تصویر مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ میرا دل بار بار ملامت کرتا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی ہے اور جیسے اسٹیمر کی سیٹیاں مجھ سے کہتی ہیں، "سلمیٰ تو ہی ذکیہ کی قاتل ہے، تو نے ہی اس کی زندگی کا چراغ ہمیشہ کے لئے گل کر دیا۔ تو قاتل ہے، قاتل ہے، قاتل......"

یہ مکان دو منزلہ ہے۔ اُوپر صرف ایک بڑا سا کمرہ ہے اور نیچے دو کمرے ہیں۔ اوپر والے کمرے میں صرف میں رہتی ہوں۔ البتہ رات کو رحیمن بوا میرے پاس آ جاتی ہے۔ نیچے امی، ابا اور دو بھائی رہتے ہیں۔ ابا کا خیال ہے کہ میں پاگل ہو چکی ہوں کیونکہ میں کسی سے بات چیت نہیں کرتی، کسی کی باتوں کا جواب بھی نہیں دیتی۔ امی میری اس کیفیت کو دیکھ دیکھ کر روتی رہتی ہیں۔ کیا میں سچ مچ پاگل ہوں، کیا واقعی میرا ذہنی توازن بگڑ چکا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ابا اور دوسرے لوگ مجھے پاگل کیوں سمجھتے ہیں۔ دراصل اپنی زندگی کا محاسبہ کرتے کرتے میری ایسی کیفیت ہو گئی ہے۔

اب چاروں طرف اندھیرا چھا گیا ہے۔ بوڑھی گنگا تاریکیوں کی چادر میں لپٹی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ صرف کشتیوں کے اندر جو ٹمٹماتی ہوئی لالٹینیں جل رہی ہیں وہی بوڑھی گنگا کو تھوڑی بہت روشنی دے جاتی ہیں۔ اس بوڑھی گنگا کی سپاٹ زندگی بھی میری ہی طرح بے کیف اور حزن و یاس سے بھرپور ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس کا بڑھاپا اس پر بوجھ بن چکا ہے اور میری جوانی مجھ پر بار بنی ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود اس کے بڑھاپے میں کبھی کبھی ترنگیں جاگ اٹھتی ہیں اور میری جوانی میں تو جیسے کبھی بہار کے پھول مسکرائے ہی نہیں۔

رحیمن بوا چپکے چپکے آ کر میرے کمرے کی روشنی جلا گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو ذکیہ باجی کی تصویر سے میری نگاہیں ٹکرا گئیں۔ ہونٹوں پر وہی سرخی،

آنکھوں میں کاجل کی وہی ہلکی سی لکیریں، چہرے پر وہی سنجیدگی اور وقار، وہی سب کچھ میرے قدم آپ ہی آپ اٹھنے لگے اور میں ان کے بالکل قریب آگئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے ذکیہ باجی میرے سامنے کھڑی ہیں اور کہہ رہی ہیں: "سلمٰی تمہارے بھائی جان اب تک نہیں آئے"۔

میں نے جواب دیا: "نہیں باجی، وہ تو تمہاری جدائی میں ایسے پاگل ہوئے کہ شکل تک نہیں دکھائی اب تک"۔ یہ سن کر ان کے سرخ ہونٹوں پر گلاب جیسی مسکراہٹ ناچنے لگی اور بولیں: "میری جدائی میں پاگل ہوئے ——— یا" وہ یہاں تک کہہ پائی تھیں کہ اسٹیمر کی سیٹی سنائی دی اور میں نے پلٹ کر دیکھا — بوڑھی گنگا پر اسٹیمر چلی جارہی ہے اور اس کی روشنیاں پرسکون موجوں کو نکھار رہی ہیں۔

شاید رحیمن بوا مجھے آواز دے رہی ہے۔ ہاں ہاں وہی تو ہے۔ میں نے پوچھا: "کیا بات ہے بوا؟"

"بیٹی تم اُدھر کیا دیکھ رہی ہو ——— بہت دیر سے"۔

"کچھ بھی تو نہیں۔ اسٹیمر کی سیٹی کی آواز سن کر میں ادھر آگئی تھی"۔

"ایک بات پوچھوں، تم ———"

"نہیں رحیمن بوا۔ مجھ سے کچھ نہ پوچھو۔ کچھ نہیں۔ میں جانتی ہوں تم کیا پوچھوگی۔ وہی جو اس سے پہلے نہ جانے کتنے لوگ پوچھ چکے ہیں۔ میرے کان پک گئے ہیں ان باتوں کو سن سن کر"۔ رحیمن بوا چپ چاپ کھڑی رہی اور پھر چلی گئی۔ مجھے اب اپنے اوپر جھنجھلاہٹ ہورہی ہے کہ میں نے رحیمن بوا کا دل کیوں توڑا۔ نہ جانے وہ کیا پوچھنا چاہتی تھی، نہ معلوم وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔

میں اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ بہت دیر کے بعد ہوا کی ٹھنڈی ٹھنڈی لہر آنے لگی ہے۔ بوڑھی گنگا کی یہ ہوا کتنی فرحت بخش اور کیف پرور ہے۔ یہی نشہ آور ہوا سہج سہج ماضی کی ان یادوں کو تازہ کرجاتی ہے جو دل میں دفن ہیں۔ یادیں ہی تو واماندہ زندگی کو نمو بخشتی ہیں ——— خواہ وہ یادیں کتنی تلخ ہی کیوں نہ ہوں۔ میرے دل میں بھی یادوں کی قبریں بنی ہوئی ہیں۔ ان گنت، بے شمار۔ ان قبروں پر اداس اور جاں گسل لمحوں میں، میں آنسوؤں کی گل کاری کرتی ہوں اور تھوڑی دیر کیلئے مسمار اور برباد قبریں تازہ ہوجاتی ہیں ——— اور ایک ایک کرکے ان قبروں سے مختلف قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بھیانک اور ڈراؤنی۔ اور پھر میرے سامنے عجیب عجیب شکلیں ابھر آتی ہیں۔ میں کانپ اٹھتی ہوں، میری چیخ نکل جاتی ہے۔ اس چیخ کو سن کر سب کے سب نیچے سے اوپر آجاتے ہیں اور اس طرح ان کا یہ واہمہ حقیقت میں بدل جاتا ہے کہ میں پاگل ہوگئی ہوں۔ ان یادوں میں ایک یاد میرے دل پر پہاڑ کی چٹانوں جیسی بھاری ہے۔ اس کا بوجھ برابر میری روح کو جیسے کچل جاتا ہے۔

آج سے دو سال پہلے کی بات ہے۔ بیساکھی کی آندھیاں شروع ہوچکی تھیں۔ نرائن گنج سے شفٹ کرکے ہم ڈھاکہ آگئے تھے اور نیاز بھائی نے اپنی پسند سے یہ مکان کرایہ پر لیا تھا۔ ذکیہ باجی نے اسی کمرے کو پسند کیا تھا۔ ان کی شادی کو ایک ہی سال گذرا ہوگا۔ نیاز بھائی کو آرٹ سے بڑا گہرا لگاؤ تھا اور میں ان دنوں آرٹ اسکول میں تعلیم حاصل کررہی تھی۔ وہ میرے آرٹ کے بڑے قدرداں تھے اور خوب ہمت افزائی کرتے تھے۔ باجی ہمیشہ سائنس کی اسٹوڈنٹ رہیں۔ اسلئے انھیں آرٹ سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ نیاز بھائی پہروں میری بنائی ہوئی تصویریں دیکھتے اور میری تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملادیتے۔ ان کے تعریفی الفاظ سے میں بہت خوش ہوتی یہاں تک کہ میں ان کے بہت قریب آگئی ——— اتنی قریب کہ ایک دن باجی نے صاف صاف مجھ سے کہہ دیا۔

"سلمٰی تم اپنا زیادہ وقت بیکار باتوں میں گذار دیتی ہو۔ اور یہ زیادہ نہ آیا کرو۔ تمہاری پڑھائی میں حرج ہوگا"۔ میں ان کا مطلب سمجھ نہ پائی چنانچہ میں نے بڑے بھولے پن سے جواب دیا: "باجی میں تو نیاز بھائی کے بلانے پر آتی ہوں"۔ اور انہوں نے ہونٹوں پر زبردستی ہنسی لاتے ہوئے کہا تھا: "میں یہاں آنے سے منع نہیں کرتی پگلی۔ البتہ مجھے افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ ان دنوں تم اپنا بہت سا وقت ہنسی مذاق میں گنوا رہی ہو"۔

ان کا اصل مدعا تو میری سمجھ میں نہ آیا، پر دل نے ان کی باتوں کا اچھا اثر نہیں لیا۔ میں سوچتی ——— آخر ذکیہ باجی کو ہو کیا گیا ہے۔ نیاز بھائی کے پاس میرا بیٹھنا انہیں اچھا کیوں نہیں لگتا۔ میں نے اوپر جانا بند تو نہیں کم کردیا۔ نیاز بھائی نے کئی بار اس یکایک تبدیلی کی وجہ دریافت بھی کی تو میں نے امتحان کا بہانہ بناکر ٹال دیا۔

اس واقعہ کے تین چار دن کے بعد کا ذکر ہے۔ گھر کے سارے لوگ چچا جان کی عیادت کے لئے عظیم پورہ گئے تھے۔ گھر پر میں تھی اور میرا چھوٹا بھائی شکیل۔ اُس روز پانچ ہی بجے زور کی آندھی آئی۔ ہوا کی سائیں سائیں سے میرا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ میں باجی کے کمرے کی کھڑکیاں بند کرنے اوپر گئی۔ بوڑھی گنگا

کے اُوپر کالے کالے بادلوں کا قافلہ بڑا پیارا معلوم ہو رہا تھا۔ میں بھی ان بادلوں کے ساتھ نہ جانے کہاں پرواز کرنے لگی۔ مجھے ذرا بھی ہوش نہ تھا۔ آندھیوں کا زور کم ضرور ہوا تھا مگر طوفانی ہوا ابھی چل رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی اور دنیا میں آگئی ہوں۔ یکایک کسی نے میری آنکھوں کو زور سے بند کر دیا۔ میں چکرا گئی اور اس سے پہلے کہ میری چیخ نکل پڑتی، میں نے اپنے سامنے نیاز بھائی کو کھڑا ہوا پایا۔ ان کے سر کے بال الجھے ہوئے تھے اور ہونٹوں پر مسکراہٹیں کھیل رہی تھیں اور غصّے کے مارے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ انہوں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ "تو واقعی تم ڈر گئی تھیں؟"

میں جواب دینے کی بجائے کمرہ سے نکلنا ہی چاہتی تھی کہ انہوں نے میرا بازو پکڑ لیا ——— "آج کل تم مجھ سے خفا نظر آتی ہو۔ میرے پاس آنا بھی چھوڑ دیا ہے بات کیا ہے آخر؟" میرا سارا جسم لرز اٹھا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو ان کی گرفت سے آزاد کر سکی۔ ایک سیڑھی طے کر پائی تھی کہ سامنے ذکیہ باجی پر نظر پڑ گئی۔ انہوں نے گھبراتے ہوئے پوچھا: "تمہارے نیاز بھائی آگئے؟" میرا جواب سنے بغیر وہ طوفان کی طرح اُوپر چلی گئیں۔

اور اس بیساکھی طوفان کے بعد ہی میری زندگی بھی ہولناک طوفان سے دوچار ہوگئی اور ایک نامعلوم کرب اور ایک انجانی کسک سے دل ہر وقت تڑپنے لگا۔ اس رات مجھے بہت دیر تک نیند نہ آسکی۔ مختلف قسم کے خیالات میرے ذہن و فکر کو کریدتے رہے۔ اور دوسرے دن ذکیہ باجی مجھ پر برس پڑیں: "کل شام کو تم اکیلے میرے کمرے میں کیوں گئی تھیں؟"

میں نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: "کھڑکیاں بند کرنے گئی تھی۔ کتنے زور کی آندھی آئی تھی باجی۔"

"اور پھر اس کے بعد ———" ان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"اس کے بعد، میں نے آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"تم اپنے نیاز بھائی کے ساتھ کیا کر رہی تھیں؟"

مجھ پر جیسے بجلی گر پڑی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے گال پر زور سے طمانچہ رسید کر دیا ہو۔ میں نے ایسے عالم میں بھی بڑی سنجیدگی سے جواب دیا "کچھ بھی تو نہیں۔ میں آپ کا مطلب اب بھی نہیں سمجھی۔"

انہوں نے جاتے جاتے اتنا کہا: "آئندہ سے تم میرے کمرے میں ہرگز نہ آؤ۔"

ذکیہ باجی فطرتاً بیحد جذباتی واقع ہوئی تھیں۔ انہوں نے نہ جانے کیسے یہ فرض کر لیا کہ نیاز بھائی میری ذات سے بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ میرے آرٹ کے شیدائی بلکہ دیوانے تھے اور یہی وجہ تھی کہ میں گھنٹوں ان کے ساتھ بیٹھ کر آرٹ کے موضوع پر گفتگو کرتی اور انہیں اپنی تصویریں دکھاتی رہتی اور میری کمزوری صرف اتنی تھی کہ جب نیاز بھائی میری تعریف کرتے تو میں بہت خوش ہوتی تھی۔

اس واقعہ کے بعد میں نے ذکیہ باجی کے کمرے میں جانا بند کر دیا۔ اب تصویریں بناتی اور ان تصویروں کو دیکھ کر خود ہی اپنے دل کو تسکین دے لیتی۔ میری تعریف کرنے والا کوئی نہ تھا۔ نیاز بھائی اور ذکیہ باجی کے تعلقات کشیدہ ہوتے گئے۔ اس کی اطلاع مجھے ملتی رہی۔ ابا اور اماں نے بھی مجھ پر کڑی نگرانی شروع کر دی جیسے میں نے کوئی بہت بڑا جرم کیا ہو۔ ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ حالات قابو سے باہر ہوگئے۔

شام ہو چلی تھی اور بیساکھی ہوائیں آندھی بن کر چل رہی تھیں۔ یکایک ذکیہ باجی کے کمرے میں ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ابا اور اماں اُوپر جا چکے تھے۔ میں بھی ڈرتے ڈرتے گئی۔ باجی چیخ چیخ کر کہہ رہی تھیں: "میں زہر کھا لوں گی۔ کیا فائدہ اس طرح جینے کا۔ آپ کو سلمیٰ سے محبت ہے تو شادی کر لیجئے اس کے ساتھ۔ میں آپ کے رستے سے ہٹ جاتی ہوں۔" یہ زہر آلود الفاظ میرے دل و دماغ پر بجلی بن کر گرے۔ میں بھاگ گئی وہاں سے۔ میں نے جو کچھ سنا اُس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا ——— اور بار بار میں نے آپ سے پوچھ بیٹھتی تھی ——— "نیاز بھائی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے تو کبھی اپنی اس کیفیت کا اظہار نہیں کیا۔ ذکیہ باجی کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" ——— وہ شام میرے لئے بہت بھاری ثابت ہوئی۔ اسٹیمر کی سیٹیاں میری دھڑکنوں میں اضافہ کرتی رہیں۔ ذکیہ باجی نے سچ مچ زہر کھا لیا۔ وہ نیاز بھائی کے رستے سے ہٹ گئیں۔

اس واقعہ کو دو سال بیت گئے، پورے دو سال۔ لیکن میری زندگی میں کوئی گل اپنے سجانے کو نہیں آیا۔ نیاز بھائی ذکیہ باجی کی موت کے دو تین مہینے کے

(باقی صفحہ ۵۵ پر)

غنائی افسانہ:

نغمۂ کہسار

کرم حیدری

طشتِ مغرب میں سمٹنے لگا سورج کا لہو
چشمِ مشرق میں ابھرنے لگی کاجل کی لکیر
دُور برفانی ہمالہ کی خُنک گودی میں
مُسکراتا ہوا بیدار ہوا ماہِ مُنیر

★

آنکھ کھولی ہے ستاروں نے سرِ بامِ فلک
قافلے جاگے ہیں شب خیز حسیناؤں کے
غرفۂ نور میں لی زہرہ نے یوں انگڑائی
دل دھڑکنے لگے آوارہ تمناؤں کے
بزمِ مریخ میں ناہید کے نغمے گونجے
حوصلے بڑھنے لگے انجمن آراؤں کے
رقص فرما ہے اُفق تا بہ اُفق تابانی
جھلے افلاک پہ روشن ہوئے سلماؤں کے
اس طرح بکھرے ہیں ہر سمت ستاروں کے چراغ
پاسباں جیسے ہوں صحراؤں میں لیلاؤں کے

★

اس چمن زار کی آغوش میں حیران و خموش
ایک سنّاٹے کے عالم میں کہستانی فضا
راستے دیدۂ طفلاں کی طرح نیند میں گم
دُور تک ہے کوئی جگنو نہ شرارا نہ دیا
سرو و شمشاد و صنوبر کے گھنے سایوں میں
تھک کے سمٹی ہوئی چپ چاپ سی بیٹھی ہے ہوا
اور اُس چشمے پہ وہ ایک کہن سال بلوط
جانے کس سوچ میں کھویا ہوا تنہا تنہا!

★

آئی ہے کس طرف سے یہ قدموں کی نرم چاپ
یہ پائلوں کا ہلکا چھنا کا ہُوا کہاں؟
پیدا ہوا فضا میں یہ کیا ارتعاش سا
یہ ہولے ہولے بجنے لگیں کیسی چوڑیاں!
یہ کون جا رہا ہے درختوں کی اوٹ میں
جیسے رواں ہو چاند گھٹاؤں کے درمیاں!
یہ سُرخ جوڑا اور یہ حنا بستہ ہاتھ پاؤں
کانوں میں اُجلی اُجلی سی چاندی کی بالیاں
یہ رات، یہ سکوت، یہ ویرانہ، یہ فضا
ایسے میں اک حسینۂ تنہا یہاں کہاں؟
دیکھ ایک بار اس کو ذرا چشمِ غور سے
سب اس کا حال اسکے سراپا سے ہے عیاں:

زلفیں بکھری ہوئیں اوراقِ محبت کی طرح
چہرہ اک نقش ہے دُھندلائی ہوئی راہوں کا
سُرخ مہندی ہے کہ پھوٹے ہیں لہو کے سوتے
گہرا دُھندلا سا ہے افسردہ دُھواں آہوں کا
دل کی دھڑکن ہے کہ جاتے ہوئے قدموں کی چاپ
غم کو لپٹائے ہوئے حلقہ تہی باہوں کا
اپنے بچھڑے ہوئے شوہر کے تصور کے طفیل
ذہن اک جال ہے نادیدہ گزرگاہوں کا
دل میں ہلچل ہوئی پلکوں پہ ستارے ٹوٹے
لبِ افسردہ سے نغمے کے شرارے پھوٹے،

دُور پردیس گیا چاند مرا ہو گیا مجھ سے جُدا چاند مرا

۱؎ کوہستانی گیت "چن" کا آزاد ترجمہ

میری دنیا تو ہے تاریک بہت — ہے کہاں جلوہ نما چاند مرا
تارِ خاموش ہیں میرے دل کے — ہے کہاں نغمہ سرا چاند مرا
میں نے اک خواب بھیانک دیکھا — جاگ اٹھی تو نہ تھا چاند مرا
ہائے افلاس کی ظلمت جس نے — مجھ سے یوں چھین لیا چاند مرا
میں تو فاقوں میں بسر کر لیتی — کس مصیبت میں پڑا چاند مرا
مجھ کو تھی خواہشِ ملبوس کہاں — میرا ملبوس تو تھا چاند مرا
چاند ابھرا تو مرا دل رویا — کیا کروں ڈوب گیا چاند مرا
اے مری روح کے تنہا پنچھی تو ہی — اڑ کے جا ڈھونڈ کے لا چاند مرا

☆

آہ یہ نالۂ دلسوز کہ جس کو سن کر
پیڑ کے سینے میں بھی دوڑ گئے غم کے شرار
ٹلکچے پتوں پہ جمنے لگیں نم نم بوندیں
کھردری چھال سے اٹھنے لگا تاریک غبار
ٹہنیاں ڈوب گئیں غم کی گھنی چھاؤں میں
کونپلیں آہوں کے جھونکوں سے ہوئیں تیرہ و تار
ہڈیاں پیڑ کی چیخیں تو یہ محسوس ہوا
جیسے شق ہو گئے اربابِ محبت کے مزار
درد ھر پتے سے بن بن کے فغاں اٹھنے لگا
پیڑ کے نوحے سے ہر سمت دھواں اٹھنے لگا:

ہدفِ سنگِ حوادث ہے یہ کہسار ابتک
زندگی اس میں ہے اک وادیٔ پرخار ابتک
انقلابات نے الٹے ہیں زمانے کے ورق
ہے یہاں وقت کی لیکن وہی رفتار ابتک
حسن برستا ہے نئے دور کے انساں پہ مگر
اس خرابے پہ ہے افلاس کی یلغار ابتک
آدمی دانۂ گندم کے لئے سرگرداں
پیٹ ہی اسکی تگ و دو کا ہے معیار ابتک
وہی تاریک گھروندے وہی محبوس فضا
ذہن ہیں پنجۂ ظلمت میں گرفتار ابتک
آج بھی عشق یہاں طوق و سلاسل کا اسیر
حسن ہے حسرتیٔ لذتِ گفتار ابتک
آج بھی رات کے دولہا ہیں سحر کے راہی
دلہنیں گریہ کناں ہیں پسِ دیوار ابتک
چاند چھپتے ہیں تو برسوں نظر آتے ہی نہیں
دل ہیں ماتم کدۂ خواہشِ دیدار ابتک
دمبدم ہوتا ہے نو خیز تمناؤں کا خوں
سانس ہے سینوں میں چلتی ہوئی تلوار ابتک
جانے کب تک یہ طلسمِ شبِ غم ٹوٹے گا !
سینۂ سنگ سے کب کوئی شرر پھوٹے گا !!

★

فرازِ کوہ پہ اک شہرِ رنگ رنگ آباد
جہاں فضاؤں میں ہر سو ہیں بجلیاں آزاد
چمن چمن میں تبسم فروز لالہ و گل
روش روش پہ خراماں صنوبر و شمشاد
دریچے، غرفے، در و بام، کوچہ و برزن
تماشا گاہ پری چہرگانِ خاک نژاد
سخن سخن میں ادائیں، ادا ادا میں سخن
نظر نظر میں شبستانِ بابل و بغداد
بغیر افسر و اورنگ ہر کوئی پرویز
بغیر تیشہ و اندیشہ ہر کوئی فرہاد
یہ شہرِ حسن و دل آویزی و "بیا و ببیں"
یہ شہرِ عشق و جوانی و "ہر چہ بادا باد"
شراب و نغمہ و محبوب و رقص و مستی و شوق
عجیب شان سے عشرتکدے ہوئے آباد
مغنیہ کہیں پُرسوز لے میں گاتی ہوئی!
دلوں میں راگ سے اک آگ سی لگاتی ہوئی!

★

کس کو معلوم کہ انجامِ جہاں کیا ہوگا
دو گھڑی عیش سے گزرے تو زیاں کیا ہوگا
ہے رواں جن کی رگ و پے میں بہاروں کا سرور
ایسے رندوں کو بھلا خوفِ خزاں کیا ہوگا
ناصحا! دل نہ جلا اپنا کہ میخانے میں
کس کو غم ہے کہ پسِ عمرِ رواں کیا ہوگا

آج کی رات غنیمت ہے گنواؤ نہ اسے
کوئی کیا جانے کل اے تیرہ شباں کیا ہوگا
خطِ پیمانہ پہ تحریر ہیں اسرارِ حیات
بادہ نوشوں سے کوئی رازِ نہاں کیا ہوگا

★

اُدھر نشیب میں کچھ بستیوں کے ویرانے
بنا لئے ہیں جہاں حسرتوں نے کاشانے
کہیں شعاعِ تمنا نہ آرزو کی کرن
قدم قدم پہ نمودار ہیں سیہ خانے
بہارِ عیش سے محروم گلشنِ احساس
مسرتوں سے ہیں خالی دلوں کے پیمانے
مگر یہ شمع کی مانند جلنے والے لوگ
خلوصِ شوق سے ہیں زندگی کے پروانے
جمی ہے محفلِ یاراں کسی گھروندے میں
وفا کے گیت جہاں گا رہے ہیں مستانے
دھواں بکھیرتی مشعل کی زرد کرنوں میں
چھلک رہے ہیں مئے معرفت کے پیمانے:

عشق[1] سمائے جس کے دل میں وہ نہیں پھرنے والا
لاکھ حسین ملیں پر وہ ہے ایک کا ہی متوالا
غزنی کے سلطان کے ہمدم کتنے غلام تھے پیارے
لیکن ایک ایاز کے آگے ہیچ ہوئے وہ سارے
سورج چمکے لاکھ یہ چکوا چاند کا ہے دیوانہ
شعلوں سے منہ پھیر دئے پر مرتا ہے پروانہ
ایک سے بڑھ کر ایک حسینہ سامنے قیس کے آئی
اس نے لیلا لیلا کرتے اپنی جان گنوائی
مقناطیس کو دیکھ کے لوہا گلے ملے اُٹھ اُٹھ کر
ہیرے موتی اس کے آگے جیسے موتی کنکر
کاہ رُبا آئے تو اُڑ کر پہنچیں تنکے سارے
لعلوں سے ملتے نہیں جا کر دل کے رنگ نیارے
ادنےٰ یار بسے جس دل میں اعلےٰ یار نہ بھائے
جس کا یار ہو سب سے اعلےٰ وہ کیوں ٹھوکریں کھائے

★

نہری جھیل میں جادو سا ہے اب چاند کنول
اور بھی پھیل گیا رات کا گہرا کاجل
سو گئے نغمۂ طرب خیز شبستانوں میں
نیند منڈلانے لگی جاگتے ایوانوں میں
کہیں لہراتے ہوئے ناگ حریری آنچل
کہیں تاریک گھروندوں میں بنے خواب محل
کوئی کمخواب میں لپٹائے ہوئے سوزِ دروں
کوئی ہے خاک کے بستر پہ ہم آغوشِ سکوں
بیکراں ولولے آخر کو سمٹ کر سوئے
غم کے مارے ہوئے غم ہی سے لپٹ کر سوئے
ہو گئے نیند میں گم وادی و کہسار تمام
ایک شاعر ہے کہ حاصل نہیں جس کو آرام
ایک گوشے میں ہے بیٹھا ہوا تنہائی میں
ذہن آوارہ ہے تخئیل کی پہنائی میں
وہ ہے فطرت کی پُراسرار زباں سے مانوس
وقت کی دھڑکنیں کر لیتا ہے پہلے محسوس
آج لاوے کی خنک سبزے سے آتی ہے اُسے
فصلِ گل خونِ وفا یاد دلاتی ہے اُسے
فرشِ سبزہ پہ لئے بیٹھا ہے مینائے غزل
آج ہر چند بہت تلخ ہے صہبائے غزل:

وہ ہم سے ہنس کے گھڑی دو گھڑی تو بول گئے
نجانے کتنے دریچے سخن کے کھول گئے
اُمڈ کے آئے تھے جو میکدے گھٹاؤں کے
ہمارے ہونٹوں سے کرتے ہوئے ٹھٹھول گئے
صبا کے جھونکے ترے گیسوؤں سے کیا اُلجھے
چمن چمن مرے رازِ جنوں کو کھول گئے
وفا کے شہر میں وہ جوہری بنے اپنے
کہ جن کے دم سے گہر کوڑیوں کے مول گئے

[1] سیف الملوک کے اشعار کا منظوم ترجمہ

پلٹ کے روتی رہیں جن سے رات بھر کلیاں
سحر ہوئی تو وہ پنچھی پَر اپنے تول گئے
بپا ہوا ہے کچھ ایسا تلاطمِ حالات
کہ ساتھ ساتھ سفینوں کے دل بھی ڈول گئے
نہ پوچھ ہم سے عنایاتِ ساقیانِ حرم
شرابِ سادہ کے شیشوں میں زہر گھول گئے
وہی ہے ہم پہ ابھی التفاتِ چارہ گراں
کبھی جو آئے تو زخموں کو پھر ٹٹول گئے
نوا ہماری کرم کارگر ہوئی نہ ہوئی
ہم اہلِ دہر کے کانوں میں رس تو گھول گئے

★

رات رخصت ہوئی بھیگی ہوئی پلکیں لے کر
صبح کے ہونٹوں پہ اُبھری ہے تبسم کی لکیر
دامنِ کوہ سے آئی کہیں کوئل کی صدا
صحنِ مسجد سے کہیں اٹھی اذانِ تکبیر
ہوگئیں بند سلگتی ہوئی پلکیں آخر
کر لیا نیند نے شاعر کے تخیل کو اسیر!

★

یہ اونچے دلکش کہسار
ان کی اودی اودی رنگت
جیسے نیلم کی دیوار!

★

یہ کہسار نہیں ایواں ہیں
شاہنشاہوں کے ذی شان
حیرت خیز بلند مکاں ہیں
وادیاں ہیں جن کے دالان
حدِ نظر تک لامتناہی
قدرتی پُر شوکت تالار
سج دھج کر دن رات کھڑے ہیں
جن میں درباری دیودار
یہ اونچے دلکش کہسار!

نیا دور

قیوم نظر

گئے وہ دن کہ پریشاں تھے خستہ حال تھے ہم
مثالِ سبزۂ بیگانہ پائمال تھے ہم
حقیقتوں کے جہاں میں فقط خیال تھے ہم

خزاں کا دور گیا، حُسنِ انتظام آیا
فنا کا خوف مٹا، مژدۂ دوام آیا
سکوں جو روٹھ گیا تھا، پئے سلام آیا

نشانِ فتح و ظفر ہے، نئے نظام کی بات
دلیلِ ہوش و خرد ہے، اب انصرام کی بات
ہر ایک بات ہماری ہے آج کام کی بات

ہمارے عزم سے زندہ ہے این و آں کا جہاں
زمیں کے قدموں پہ آیا ہے آسماں کا جہاں
دمک اُٹھا ہے وطن کے نئے جہاں کا جہاں

وطن سے عشق ہماری نگہ سے پیدا ہے
نفس نفس سے ہمارا جنوں ہویدا ہے
ہماری زندگی حسنِ عمل کی شیدا ہے

گئے وہ دن کہ پریشاں تھے خستہ حال تھے ہم
مثالِ سبزۂ بیگانہ پائمال تھے ہم
حقیقتوں کے جہاں میں فقط خیال تھے ہم

بنگلا افسانہ:

لال جُوتو

علاء الدین الآزاد

مترجمہ: احمد سعدی

"ارے آپ اور یہاں؟" حیرت میں ڈوبی ہوئی ایک آواز سنائی دی۔ ایک طرف ایک رکشا کھڑا ہوا تھا، اس میں سے ایک خاتون اتری اور سامنے آکر بولی "کیا بات ہے؟"

اس اچانک ملاقات سے چند لمحوں کے لئے محبوب گھبرا سا گیا، اس نے رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا "یہی سوال میں بھی تو کر سکتا ہوں"

"اس کا جواب بالکل سیدھا سا ہے، یعنی یہی ہمارا گھر ہے" دونوں گیٹ کے سامنے کھڑے تھے، اندر ایک جدید طرز کے بنے ہوئے دو منزلہ مکان کی طرف سلینہ خانم نے اشارہ کیا، اس کے بعد تھوڑی دیر ٹھہر کر اپنی گردن کو ہلکا سا خم دے کر اس نے محبوب کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ ابھر آئی، اس نے کہا "اف کتنی تیز دھوپ ہے، چلئے تھوڑی دیر بیٹھئے گا"

اسے کچھ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ خاتون آگے بڑھ گئی اور محبوب کسی ان دیکھی کشش کے زیر اثر یوں چلنے لگا، جیسے اس کی دعوت پر عذر یا بہانہ کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

تین طرف دیوار وں سے گھرے ہوئے برآمدہ کے نیچے صحن کا منظر بڑا ہی دل فریب تھا۔ درمیان میں سان پتھر اور سرکی سے ایک گول سا دائرہ بنا ہوا تھا، جس میں سورج مکھی کے پودے لگے ہوئے تھے اور ان پودوں میں چھوٹے بڑے پھول دوپہر کی اس تیز دھوپ میں بھی اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے اور ان پودوں میں چھوٹے بڑے پھول دوپہر کی اس تیز دھوپ میں بھی اپنا چہرہ آسمان کی طرف اٹھائے ہوئے تھے، اس کے علاوہ دیوار کے کنارے بھی مختلف اقسام کی بیلیں اور پھولوں کے پودے لگے ہوئے تھے۔ ویسے ہی مکان کافی خوبصورت تھا، پھر بھی اگر زمین کے اندر سے نمایاں ہونے والی اتنی ساری رنگینیوں اور خوبصورتیوں کو یہ صحن اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے نہ ہوتا تو صحن کا یہ حصہ بالکل سونا سونا نظر آتا۔

دونوں طرف کیاری بنائے ہوئے سرخ بجری کے راستے پر چلتے ہوئے وہ دونوں برآمدہ تک جا کر رک گئے۔

"آپ ذرا ٹھہریئے، میں ابھی آئی" برآمدے میں داخل ہو کر سلینہ نے اپنا چہرہ گھما کر کہا، اس کے ہونٹوں پر اب بھی وہی پراسرار مسکراہٹ تھی۔

اس مسکراہٹ کا کیا مطلب ہے؟ گذشتہ ڈیڑھ سال کے عرصے میں اس کے ساتھ جتنی بار بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی، اسے یاد تھا کہ اس خاتون نے ہمیشہ اس مسکراہٹ ہی سے اس کا استقبال کیا تھا اور بہت سوچنے کے بعد بھی محبوب اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا، یہ ایک چھپا ہوا مذاق ہے، ایک ایسی میٹھی چھری ہے جو سیدھے احساسات میں اتر جاتی ہے، لیکن اپنے اس خیال پر وہ زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکتا، بلکہ اسی معمولی التفات کا سہارا لے کر زندگی کے آداس لمحوں میں ہزاروں دل فریب آرزوؤں کے چراغ اس کے دل میں جھلملانے لگتے۔

سیشن شروع ہونے کے بعد یونیورسٹی کلاس میں جب وہ پہلی بار اس مسکراہٹ سے متعارف ہوا تھا، تو محبوب کے دل میں بے پناہ مسرتیں انگڑائیاں لینے لگی تھیں، اس کی بائیس سالہ زندگی میں یہ پہلا تجربہ تھا۔ اس کا میس شہر کے آخری سرے پر واقع تھا۔ بہت دور پیدل چل کر آنے کی وجہ سے اس دن اسے دس منٹ دیر ہو گئی تھی، اس وقت پہلا لکچر ہو رہا تھا، اس نے اجازت لینے کا انتظار نہیں کیا، آہستہ سے کمرے میں داخل ہو کر سب سے پیچھے بچھی ہوئی بنچ پر ایک کنارے بیٹھ گیا، اس کے سامنے لڑکیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ اس کے کمرہ میں داخل ہوتے ہی خاتون نے دائیں طرف مڑ کر اسے دیکھا، اور چند لمحوں تک ٹکٹکی لگائے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد ایک پراسرار دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ دوسرے طالب علموں یا پروفیسر کسی کو بھی اس کا علم نہ ہو سکا۔ لیکن اس کا دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا تھا کہ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے

دل کی دھڑکن سبھوں کو سنائی دے رہی ہو۔

کلاس ختم ہونے کے بعد وہ باہر راستے پر نکل آیا تھا، ہسپتال کے موڑ پر آ کر شمال کی سمت جانے والے راستے پر چلتے ہوئے وہ کب رمنا میدان پہنچ گیا، اسے معلوم بھی نہ ہو سکا۔ اس نے نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو اسے ہر چیز خوبصورت نظر آئی۔

شام کے بعد میس میں جا کر اس نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا "پہلی بنچ پر دائیں طرف وہی خاتون بیٹھی ہوئی تھی، رنگ گورا، سانپ کی طرح بڑے اہتمام سے گوندھی ہوئی چوٹی کولھے کو چھوتی ہوئی، کان کے آویزے بہت خوبصورت ہلکے نیلے رنگ کا بلاؤز، ہونٹ اور آنکھیں حیرت انگیز طور پر خوبصورت تھیں، شکل ان تمام چیزوں کے ساتھ اس قدر مماثل، اس کے حسن کا تمام نکھار اس کے چہرہ پر سمٹا ہوا، اس کا پرسکون حسن مردوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز نہیں کرتا، ان کی رگوں میں بہتے ہوئے خون میں ابال پیدا نہیں کرتا، بلکہ ایک دھیمی دھیمی محبت کی خوشبو سے دل و دماغ کو بھر دیتا ہے۔ کبھی کبھی جب وہ چنچل ہو جاتی ہے تو اس کی دونوں آنکھوں میں فہم و فراست کے چراغ جگمگاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، اس کی ہر چیز میں جیسے ایک فطری کشش ہے لیکن اس کی مسکراہٹ کا میرے خیال میں کوئی جواب نہیں ہے۔ آج ایسی مسکراہٹ نے میرے دل میں ایک زبردست تہلکہ مچا دیا ہے، میں کیا کروں؟"

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس خاتون میں اس نے اپنی آرزوؤں کا عکس تلاش کر لیا تھا اور حسن و جمال کی افسانوی شہزادی کی طرح اس کے تصور پر ہر وقت نشیلے سپنے چھائے رہنے لگے تھے۔

دھوپ میں سر اٹھائے ہوئے سورج مکھی کے پھولوں کو دیکھنے میں محبوب محو تھا کہ یکایک جوتے کی کھٹ کھٹ کی آواز سن کر وہ چونک اٹھا، اس نے مڑ کر دیکھا۔ سلیمہ ہنستی ہوئی چلی آ رہی تھی، اس کے خوبصورت سفید دانت موتی کی طرح چمک رہے تھے اور اس کے گلابی عارض پر دو ہلکے ہلکے گڑھے نمودار ہو گئے تھے۔ محبوب نے سنا، وہ کہہ رہی تھی "آیئے، آپ کو بہت دیر انتظار کرنا پڑا اس کا کچھ خیال نہ کیجئے گا۔"

بالائی منزل پر جاتے ہوئے سیڑھیوں پر چڑھتے وقت محبوب نے دیکھا، اس کے پاؤں میں اس وقت بھی گھسے ہوئے ہیل کا لال جوتا تھا اور سامنے کے فیتے کی گرہ میں اس کی نرم و نازک انگلیوں کو جیسے بڑے پیار سے جکڑے ہوئے تھیں، ساڑی کے پاڑھ کے نیچے اس کی چال کے ساتھ اس کے خوبصورت پاؤں یوں جھلک رہے تھے، جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں۔

یہ لال جوتا جیسے اس کے پاؤں کے ساتھ چمٹ کر رہ گیا تھا، ڈیڑھ سال کے عرصے میں اس نے جتنی بار بھی اُسے دیکھا تھا، ہر مرتبہ اس کا جسم ایک نئی سج دھج کے ساتھ مختلف لباسوں میں ملبوس نظر آیا تھا، خاص طور پر ایک ساڑی میں اس نے اُسے دو تین دن سے زیادہ کبھی نہیں دیکھا تھا، لیکن پاؤں کی طرف اسے کبھی کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی تھی۔

آج بھی اس نے دیکھا، بہت دنوں تک استعمال کرتے رہنے کی وجہ سے جوتے کی جوڑی خستہ اور بے رنگ ہو گئی تھی، دونوں ایڑیاں گھس گئی تھیں، اور شاید اسی عیب کو چھپانے کے لئے اس نے ساڑی کو نیچے کی طرف جھلا کر پہن رکھا تھا، نیا جوتا خریدنے کی استطاعت نہیں تھی، اس کے متعلق یہ رائے بھی قائم نہیں کی جا سکتی تھی، پھر بھی وہ ابتک اسی پرانے جوتے کو کیوں استعمال کر رہی تھی، یہ حیرت کی بات ضرور تھی۔

سیڑھیاں جہاں پر ختم ہوتی تھیں، اس کے قریب ہی دروازہ تھا۔ دھاری دار براؤن رنگ کے پردے کو سرکا کر دونوں کمرے میں داخل ہوئے۔

گدے دار صوفے کی طرف اشارہ کر کے سلیمہ نے کہا "بوشون، بیٹھئے۔"

اسے بہر حال بیٹھنا ہی تھا، لیکن نہ جانے کیوں محبوب احساس کمتری محسوس کر رہا تھا، صوفہ اتنا قیمتی ہے، وہ اس پر کیسے بیٹھے گا؟ اس کے لباس کے ساتھ کسی چیز کا بھی تو میل نہیں تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں، بیٹھئے!"

"ہاں، وہ تو ٹھیک ہے!" اس کے ہونٹوں پر ایک بجھی ہوئی مسکراہٹ پھیل گئی، نرم صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھنے کے بعد اس نے

محسوس کیا جیسے ایک عجیب قسم کی پژمردگی اس کے وجود سے چمٹ گئی ہو، خاتون بڑی سادگی، خلوص اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر رہی تھی، اس لئے اسے کسی قسم کی جھجک محسوس نہیں کرنی چاہیئے تھی، پھر بھی نہ جانے کیوں وہ دیر تک اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے سے ہچکچا رہا تھا۔ کاش اس کمرے میں وہ اکیلا ہوتا!

اپنی پیشانی پر جھولتے ہوئے بالوں کو دائیں ہات سے ٹھیک کرتے ہوئے محبوب نے کہا: "ایک گلاس پانی پلا سکتی ہیں؟"

"ہمارے ہاں پانی اتنا کمیاب تو نہیں ہے!" خاتون نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "ذرا سی دیر ٹھہریئے!"

اس کے چلے جانے کے بعد محبوب نے بڑے غور سے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا، ایک طرف ایک چھوٹی سی چوکی تھی جس پر بھاری جھالر دار ایک سفید چادر بچھی ہوئی تھی سرہانے میں دو تکئے قرینے سے سجا رکھے تھے، کتابیں رکھنے کا ریوالونگ شلف اتنی دور رکھا ہوا تھا کہ سوتے سوتے ہاتھ بڑھا کر آسانی سے کتاب اٹھائی جا سکے۔ محبوب کو یہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ گو اس کمرہ کو ڈرائنگ روم بنا لیا گیا تھا۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی اس کمرے میں ضرور سوتا تھا، آہستہ آہستہ اس کی نظریں اوپر کی طرف اٹھتی گئیں۔ تین طرف کی دیواروں کو دیکھ کر وہ چونک پڑا، ہر طرف تصویریں ہی تصویریں نظر آ رہی تھیں، مصوروں کی بنائی ہوئی مختلف تصویریں یوں آویزاں تھیں، جیسے کسی چھوٹی موٹی نمائش کے لئے کمرے کو سجایا گیا ہو۔

یکے بعد دیگرے تصویروں کو دیکھنے کے بعد اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ان میں سے زیادہ تر تصویریں اس کی پہلے سے دیکھی ہوئی ہیں، گذشتہ تین سال کے عرصے میں ڈھاکہ میں جتنی مصوری کی نمائشیں ہوئی تھیں، وہ دیکھ چکا تھا اور یہ تصویریں ان ہی نمائشوں سے خریدی ہوئی تھیں۔ اس میں کسی شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

گذشتہ دسمبر کی نمائش اسے یاد آئی، یہ نمائش میوزیم کے برآمدہ میں ہوئی تھی۔

مغرب میں ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی درختوں سے چھن چھن کر برآمدے کی سیڑھیوں پر پڑ رہی تھیں اور ہلکی ہلکی ٹھنڈک محسوس ہو رہی تھی، پرانے کھمبے سے ٹیک لگائے ہوئے محبوب سگریٹ کے کش لگا رہا تھا، اس کے بعد بات میں تہہ کئے ہوئے خاکستری رنگ کا کوٹ پہن کر وہ نمائش دیکھنے کے لئے اندر داخل ہوا تھا۔ شروع ہی سے وہ تصویروں کا شیدائی تھا، سچ بات تو یہ تھی کہ وہ ہمیشہ سے ایک چھوٹا موٹا نقاد تھا اس سے قبل جو نمائش ہوئی تھی اس سے متعلق اخبار میں اس کا ایک تبصرہ بھی شائع ہوا تھا۔ جو بہت عمدہ تصور کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے مضمون میں لیونارڈو ڈاونچی سے لے کر پکاسو تک کے آرٹ کا حوالہ دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی کلاسیت سے لے کر سرریلزم تک آرٹ کی مختلف تحریکات پر بحث کی تھی، اس لئے مضمون کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

اس کے بعد بہت سے لوگ اس کی عزت کرنے لگے تھے، خاص طور پر مصور اسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ ایک شخص کو اس نے یہ بھی کہتے ہوئے سنا تھا "لڑکا بہت ذہین ہے، بہت ذہین ہے، بہت اچھی معلومات ہیں اس کی"

وہ صرف نقاد فن ہی نہیں تھا، تصویریں دیکھنے کا شوقین ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ شاعر تھا۔ چونکہ عمر بھی اکیس سال تھی اس لئے خیالات بھی جوان تھے۔ وہ شاعری کرتا تھا، اس کی نظمیں کبھی کبھی ماہانہ رسائل میں شائع بھی ہوتی تھیں، اس لئے اگر وہ مشہور نہیں تھا تو متعارف ضرور تھا۔ جدید شاعری سے متعلق اس کا الگ نظریہ تھا، جسے وہ اپنے ذہن کی اپج کہا کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہم عصر آرٹ، موسیقی، ڈرامہ اور شاعری، یا دوسرے معنی میں فنون لطیفہ کا ہر اصول، ہر ضابطہ ایک دوسرے سے مربوط و متعلق ہے، اس لئے شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر تہذیبی و ثقافتی ضابطے اور اصول سے پوری پوری واقفیت رکھتا ہو، ورنہ اس کی تخلیقات خاکستری ریگ زار کی ناہموار فضا میں دم توڑ دیں گی۔

اس دن تصویریں دیکھتے دیکھتے جب وہ روغنی نقاشی سے سجائے ہوئے چھوٹے سے کمرے میں داخل ہوا تو اور دائیں طرف نظر گھما ڈالی تو یہی خاتون دیوار پر ٹنگی ہوئی ایک اسٹل لائف کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"ارے آپ!" اسے دیکھ کر سلیمہ جیسے خوشی سے کھل اٹھی تھی۔ "جانے دیجئے، اچھا ہی ہوا، اس کا سر پیر کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے، مجھے ذرا سمجھا تو دیجئے، آپ تو بڑے اچھے نقاد ہیں۔"

محبوب نے ہنستے ہوئے کہا "واقعی۔"

"نہیں تو اور کیا؟ گزشتہ دنوں آپ نے جو مضمون لکھا تھا، وہ کیا میں نے نہیں پڑھا ہے؟"

"وہ کچھ بھی نہیں ہے، خود دیکھ کر جو کچھ سمجھا جائے، وہی چیز حقیقتاً سمجھ میں آتی ہے۔"

"لیکن میں تو کچھ بھی سمجھ نہیں رہی ہوں۔" خاتون کی باتوں میں ایسی معصومیت جھلک رہی تھی کہ محبوب اس میں دلچسپی لئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے ہونٹوں کے کنارے پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے کہا "نہیں سمجھ رہی ہیں؟ تب تو بڑی مشکل ہے؟"

"بے شک یہ تصویر مجھے بری نہیں لگ رہی۔" وہ کہنے لگی۔ "مصور نے جس طرح رنگوں کا استعمال کیا ہے، اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اُسے موقلم پر پوری پوری قدرت حاصل ہے، لیکن جو سوال میں کرنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ اس تصویر کے ذریعہ مصور کہنا کیا چاہتا ہے؟ اس میں ایک آدمی ہے جس کے کندھوں پر رستہ ہے اور وہ بانس کے دستے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے آگے کی طرف جھکا ہوا ہے، اس سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟ یہی کہ اس پر ناقابلِ برداشت، تھکا دینے والا بوجھ لدا ہوا ہے، لیکن اس تصویر کا نام ہے: "شوپنو، خواب"۔ انسان کے نزدیک خواب کا دوسرا نام اُمید ہے۔ جو کچھ ہمیں نہیں ملا ہم اس کے لئے خیالوں کے جال بنتے ہیں۔ حقیقی زندگی کے خلا میں ہم سپنوں کے قوس قزح سے رنگ بھرتے ہیں اور اس طرح زندہ رہتے ہیں، لیکن اس تصویر میں وہ احساسات کہاں ہیں؟"

خاتون کی بات سن کر محبوب تھوڑی دیر کے لئے مبہوت رہ گیا۔ وہ اس طرح کی باتیں بھی کر سکتی ہے، اس کی ظاہری شکل و صورت سے اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔

محبوب نے کہا "آپ تو کہہ رہی تھیں کہ تصویر آپ کی سمجھ میں نہیں آئی۔"

"ہاں، یہ تو صحیح ہے۔"

"لیکن اتنی دیر آپ نے جو خیال ظاہر کیا ہے، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے جس نظر سے تصویر کو دیکھا ہے، وہی درست ہے۔ آرٹ کو زندگی سے قریب سمجھ کر ہی اس پر تبصرہ کیا جا سکتا ہے اور آپ نے وہی کیا ہے۔"

"نہیں، میں نے سوچ کر یہ سب کچھ نہیں کہا۔ تصویر دیکھ کر جو خیال میرے ذہن میں پیدا ہوا، میں نے اسی کا اظہار کیا ہے۔" کمرے کے ایک کونے میں جا کر سلیمہ نے پوچھا "آپ کو کون سی تصویر سب سے اچھی معلوم ہوئی؟"

"اس کا جواب دینا مشکل ہے۔" محبوب نے اس کے سوال کو ٹال جانا چاہا۔ اس نے کہا "ہر تصویر کسی نہ کسی اعتبار سے اچھی ہی ہے۔"

سلیمہ نے سر ہلا کر کہا "پھر بھی سنوں تو سہی۔"

محبوب نے جن تین تصویروں کو پسند کیا تھا، آج صوفے پر بیٹھے بیٹھے وہ حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ ان میں سے دو تصویریں دیوار پر ٹنگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک آب رنگی اور دوسری اسٹل لائف تھی۔ ایک میں حدِ نظر تک زرد اور سبز رنگ کی لہریں لیتی ہوئی فصلیں لہلہا رہی تھیں، درمیان میں مانگ کی طرح پتلے مٹی کے کچے راستے پر ایک بیل گاڑی چلی جا رہی تھی چاروں طرف بڑی حسین رنگ آمیزی نظر آ رہی تھی اور ان رنگوں کے امتزاج سے زندگی کی ناقابلِ تردید عظمت و اہمیت نمایاں تھی۔ دوسری تصویر میں ایک میز پر چینی کی رکابی میں خربوزے کی قاشیں رکھی ہوئی تھیں، ایک طرف شراب کی بوتل، سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس کی ڈبیہ رکھی تھی۔ رکابی کے قریب ایک انسانی کھوپڑی اور ہڈی رکھی ہوئی تھی۔ اس تصویر سے تقدیر سے متعلق انسان کے لاعلم ہونے کا اعتراف جھلکتا تھا، لیکن زندگی کا بھڑکتا ہوا شعلہ پھر بھی ماند نہیں تھا۔ اس دن کی باتیں اس سے زیادہ اسے کچھ یاد نہیں تھیں، لیکن وہ یہ ضرور سمجھ رہا تھا کہ ان دونوں تصویروں کے خریدنے میں اس کی ذاتی پسند کو ضرور دخل ہے۔

محبوب دل ہی دل میں خوش ہوا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ وہ اتنا زیادہ غیر اہم نہیں ہے۔ شکل، بات چیت، طرز عمل یا کسی اور طریقے سے دوسروں کو گرویدہ بنالینے ہی کو شخصیت کی خوبی کہتے ہیں اور آج اچانک اسے محسوس ہوا جیسے اس کی بھی کوئی شخصیت ہے۔ اپنے اندر چھپے ہوئے اس انمول خزانے کی دریافت سے اس کا احساس کمتری دور ہونے لگا۔ وہ سنبھل کر صوفے پر بیٹھ گیا اور اس کے پسینے سے بھیگے ہوئے چہرے پر خود اعتمادی جھلکنے لگی۔

"دیر ہوگئی، کچھ خیال نہ کیجیئے گا! نوکر نوکرانی کھانا پکانے میں مشغول ہیں، کیا کروں" شیشے کے ایک منقش ٹرے میں ایک گلاس "اورنج اسکوئش" اور ایک گلاس پانی لئے ہوئے سلیمہ نے دوسرے کمرے سے آتے ہوئے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر اب بھی مسکراہٹ ناچ رہی تھی۔

"اس کی کیا ضرورت تھی، صرف پانی ہی کافی تھا"

"صرف پانی بھی کہیں دیا جاتا ہے؟"

"کیوں نہیں دیا جاتا؟"

"آپ مہمان جو ہیں!" سلیمہ نے جواب دیا۔ "اور وہ بھی نئے"

"یہ بات ہے! لیکن دیکھیئے گا کہیں مہمان نوازی کرتے ہوئے مجھے سچ مچ مہمان نہ بنا دیجیے گا"

"نہیں، اس کا خطرہ نہیں ہے" تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد چہرہ اوپر اٹھا کر سلیمہ نے کہا۔ "اگر ایسا ہوتا تو آپ کو بڑا تکلف نظر آتا"

محبوب نے محسوس کیا جیسے اتنی دیر کے بعد اس کے اندر کا سویا ہوا مرد انگڑائی لے کر جاگ اٹھا ہو۔ گلاس کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اس نے کہا "لیکن آپ یہ کیوں بھول رہی ہیں کہ کسی خاتون کا اتنا کہہ دینا ہی بہت بڑا تکلف ہے، اس کے علاوہ جو کچھ اور ہو وہ لطف بالائے لطف ہے"

"اچھا یہ بات ہے؟" سلیمہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوگئی۔

"آپ ہنس رہی ہیں"

"نہیں، ویسے ہی" اس نے جواب دیا "آپ سچ مچ شاعروں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ خیر جانے دیجیے، میرا مہمان کہنا آپ کو پسند آیا، اس کا شکریہ!"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں، مجھے جو کچھ پانا تھا وہ میں پا چکا ہوں"

"مگر وہ کیسے؟"

"تمام باتیں کیا بتانے کی ہوتی ہیں؟"

"کہنے میں حرج بھی کیا ہے؟"

"حرج تو کچھ بھی نہیں" محبوب نے کہا "اچھا ہمارے دلوں میں ہر لمحہ جو احساسات جنم لیتے رہتے ہیں، انہیں کیا ہم ہر جگہ دہرا سکتے ہیں؟ میں کہونگا، نہیں ہر آدمی کے دل کی گہرائی میں ایک گوشہ ایسا رہتا ہے، جہاں وہ اکیلا رہتا ہے۔ اس جگہ وہ تنہا ہنستا ہے، روتا ہے اور سپنوں کے جال بنتا ہے۔ اس کی گہرائی میں جو چیز بہت ہی قیمتی ہوتی ہے اس کا اظہار کیا جائے تو اچھا خاصا مذاق معلوم ہوگا۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ اس لذت سے اکیلے ہی لطف لیا جائے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"آپ کا خیال برا نہیں" سلیمہ نے گردن جھکا کر رک رک کر جواب دیا۔ "لیکن میں کہتی ہوں کیا اسی طرح ناپ تول کر چلتے ہوئے زندگی ختم کر دوں؟ جو چیز اچھی لگتی ہے اسے قریب لا کر الٹ پلٹ کر کے دیکھ بھی نہیں سکتی؟ کسی کو اپنے قریب پا کر میرا دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ کیا یہ بات نہیں کہہ سکتی؟ ہر وقت خود کو ڈھک کر اور چھپا کر ہی رہنا ہوگا؟"

لڑکی کی آواز میں جوش اور شدت دیکھ کر محبوب کو قدرے حیرت ہوئی اور وہ اس کی باتوں کا کوئی تسلی بخش جواب فوراً نہ دے سکا۔

سامنے کے دروازے سے، راستے کے اس پار ناریل کے درخت کے پتے ہلتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ایک کوا اڑتے ہوئے آکر اس پر بیٹھ گیا دوپہر کی دھوپ میں آسمان کی نیلاہٹ جیسے ٹپکتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ بہت دور فضا کی لامحدود وسعتوں میں اڑتی ہوئی چیل کالے کالے بھونرے

کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ محبوب اس طرف دیکھتا رہا اور تھوڑی دیر کے لئے وہ اپنے وجود سے بھی غافل ہوگیا۔

اس دن تصویریں دیکھتے دیکھتے تقریباً شام ہوچلی تھی۔ بہت سے لوگ آجا رہے تھے وہ دونوں انوکھے طرز کے لباس میں ملبوس تھے اور ان کے چہرے سے ان کی دلی کیفیات عیاں تھیں، لیکن اس طرف دیکھنے کی کسی کو بھی فرصت نہیں تھی جس لڑکی کے ساتھ اس کی ہر روز ملاقات ہوتی تھی، اس دن اسی لڑکی کے ساتھ وہ اجنبیت اور خاموش رومانی کیفیت محسوس کر رہا تھا اور بات بات پر اس کے دل کے کنول کھل رہے تھے۔

وہ دونوں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کھڑے ایک آب رنگی تصویر پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک لڑکا بڑی عجلت سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی عمر بھی پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ خوش شکل سفید پتلون اور سفید قمیص پہنے ہوئے۔ گلے میں قیمتی ٹائی جھول رہی تھی اور آنکھوں پر چشمہ لگائے ہوئے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے کہا "ارے تم یہاں ہو اور میں تمہیں تلاش کرتے کرتے پریشان ہوگیا۔"

سلینہ نے مڑکر دیکھا، اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر ہونے لگی۔ اس نے کہا "کیوں، تم کب آئے؟"

"دس منٹ سے کیا کم ہوا ہوگا" رسٹ واچ پر نظر ڈالتے ہوئے لڑکے نے جواب دیا "تم سے تو بڑا مدہ میں رہنے کو کہا تھا۔"

"خیال نہیں رہا۔ ان سے ملاقات ہوگئی؛ اس لئے تصویروں پر تبادلۂ خیالات کر رہی تھی۔ آپ محبوب صاحب ہیں، میرے کلاس فرینڈ" اور نووارد نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا "یہ میرے رشتہ دار ہیں، کبیر۔"

"آپ سے ملکر بہت خوشی ہوئی۔" مصافحہ کرنے کے بعد اس نے خاتون سے کہا "ساڑھے پانچ بج رہے ہیں، جلدی چلو۔"

"ہاں، چلو" سلینہ نے محبوب سے مخاطب ہوکر کہا۔ "اچھا، اب اجازت دیجئے، پھر کسی دن باتیں ہونگی، کیوں؟ کل کلاس میں جائیں گے تو؟"

"ہاں، جاؤں گا۔" محبوب نے رک رک کر جواب دیا اور پھر اس نے دیکھا، لال جوتے سے ڈھکے ہوئے دو سفید پاؤں کھٹ کھٹ کرتے ہوئے بھاگے جا رہے تھے۔

کون آیا اور کون گیا اسے اس بارے میں سر کھپانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس جگہ وہ بن بلائے ہوئے مہمان کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے کسی طرح بھی اسے اپنا کوئی حق جتلانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، پھر بھی وہ اپنے دل میں ایک خوفناک طوفان اٹھتا ہوا محسوس کر رہا تھا اور اس کے اندر کا نا سمجھ مرد کسی طرح بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ اس لڑکی کی زندگی کے ڈرامہ میں اس کا کوئی کردار نہیں تھا۔

لیکن اس کا یہ تاثر زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ اس کے بعد اس چشمہ والے لڑکے کے ساتھ اس نے کتنی ہی بار اس لڑکی کو کبھی رکشا میں بیٹھے ہوئے کبھی رمنا میدان میں، کبھی جھیل کے کنارے اور کبھی سینما میں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ اس لڑکی کا کیا رشتہ ہے، یہ اسے معلوم نہ ہوسکا اور شاید یہ معلوم کرنے کی اسے ضرورت بھی نہیں تھی۔

اس دن ٹہلتے ہوئے محبوب صدر گھاٹ کی طرف نکل گیا تھا۔ اسے آدمیوں کا اژدہام بہت برا لگ رہا تھا۔ وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا بالکل تنہا! اس لئے وہ ایک بجرے کی چھت پر چڑھ کر اندھیرے میں دریا کی لہروں کو دیکھنے لگا۔ اس نے سن رکھا تھا کہ دریا کی لہروں پر جب تیز ہوائیں چلتی ہیں تو اس سے ایک خاص قسم کی موسیقی پیدا ہوتی ہے۔

جب وہ میس میں واپس پہنچا تھا تو بہت رات ہوچکی تھی۔ سونے سے پہلے اس نے تکیہ کے نیچے سے ڈائری نکال کر اس میں لکھا تھا، تسفید کاغذ پر اس وقت میں سیاہی سے لکیریں بنا رہا ہوں۔ ممکن ہے اس کی رنگت آگ جیسی ہو یا کسی ماہر مغنی کا گایا ہوا دیپک راگ ہو لیکن آج شام کے وقت ساڑھے پانچ بجے اگر وہ واقعہ رونما نہ ہوتا تو میری اس سیاہی سے کھینچی ہوئی لکیروں سے شاید کوئی دوسرا گیت جنم لیتا۔ ایک معمولی سا واقعہ ہے، ایک آدمی آیا اور چلا گیا، بس اسی معمولی سے واقعہ نے کاغذ کے ورق کو بدل دیا ہے، اب اس کاغذ کی مثال ایک ریگستان جیسی ہے جہاں صرف سراب نظر آتے ہیں۔

"پرانا زمانہ ہی اچھا تھا، پہلے انتخاب کیا اس کے بعد فتح کرکے حاصل کرلیا، اس میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس میں ڈرنے کی کون سی بات ہے؟ وہ جنگجوؤں کی قوت اور تلوار کی آزمائش ہوتی ہے۔ جو زندہ بچ گیا، اس کی محبت بھی دن کے اجالے میں چمکتی ہوئی تلوار کی طرح ہوگی

اور جو مر گیا اس کے لئے بھی خجل ہونے کی ایسی کوئی بات نہیں۔ اس کی تو صرف شکست ہوگی اور بس!"

"لیکن تہذیبی دور کی یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے کہ کسی کو انتخاب بھی کیا تو وہ اس وسیع پیمانہ پر مقابلہ کے لائق ہونے کے باوجود سونے کی ہرنی ہوتی ہے، جسے کسی طرح بھی حاصل نہیں کیا جاسکتا"

محبوب کو خود بھی اس کا احساس تھا کہ ان چند بے معنی الفاظ کی ترتیب ممکن ہے اپنے اندر کچھ معنی رکھتی ہو، لیکن اس میں دل کی سرخی شامل نہیں تھی۔ زیادہ دن نہیں، ایک سال بعد ہی جب وہ اسے کھول کر پڑھے گا تو اسے خود خیال ہوگا کہ یہ سب جوانی کا جوش تھا، اس میں حقیقت کی کوئی جھلک نہیں۔ صرف اپنے خیالات کو رنگینی اور موثر بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس وقت اپنی اسی تحریر کو پڑھ کر اس کا بچپنہ کا دل ہنسنے لگا وہ خود اسے پھاڑ کر پھینک دے گا، لیکن کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی کوئی قیمت نہیں ہے؟ یہ کہنے کو وہ تیار نہیں تھا، کیونکہ جس وقت اس نے یہ سب کچھ لکھا تھا، اس وقت یہ ایک کھلی حقیقت تھی۔

وہ پانچ منٹ تک گم سم بیٹھا رہا، لیکن اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا لڑکی اس کے چہرہ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی، اسے اس کا بھی کوئی علم نہیں تھا یکایک اس کے کانوں سے ایک آواز ٹکرائی "آپ بالکل خاموش بیٹھے ہیں؟"

محبوب چونک اٹھا، اس نے کہا "نہیں، یونہی، آپ نے جو سوال اٹھایا ہے اس کے متعلق سوچ رہا تھا"

"پہلے گلاس تو خالی کر لیجئے"

"شکریہ" محبوب نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "آپ نے جو کچھ کہا ہے، وہ بہت اہم ہے"

آنچل کو انگلی سے مروڑتے ہوئے نہ جانے سلیمہ نے کیا سوچا۔ اس کے بعد اس نے سر اٹھا کر کہا "وہ میں نہیں جانتی، پھر بھی میرے دل میں خیال آتا ہے کہ اس کے بغیر آدمی کیسے زندہ رہ سکتا ہے۔ دل کا درد چھپا کر کوئی زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتا، حالانکہ اس حقیقت کو ہمارا سماج کسی قیمت پر بھی ماننے کو تیار نہ ہوگا۔ ذرا سی بھی خلاف ورزی ہو تو طعن و تشنیع سنتے سنتے کان پک جائیں گے اور وہی دن میں جینا دوبھر ہو جائے گا۔ لیکن میں اسے کیوں مانوں گی؟" ایک تیز ہوا کے جھونکے سے اس کی ساڑی کا آنچل پھڑپھڑانے لگا اور اس کے دل کی تابش اس کے چہرے پر سرخی بن کر جھلکنے لگی۔

سلیمہ صوفے پر سے اٹھ کر بے چینی کے ساتھ کمرے میں چکر کاٹنے لگی۔ جس جگہ وہ دونوں بیٹھے ہوئے تھے اس سے تھوڑی ہی دور، دیوار سے لگی ہوئی ایک چھوٹی سی الماری تھی۔ اس کے کونے پر کہنی کے بل کھڑے ہو کر سلیمہ نے کہا "آپ کا کیا خیال ہے کسی آدمی کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا کیا اتنا ہی آسان ہے؟ میرا خیال ہے، نہیں۔ ہر آدمی کی شخصیت کے کئی پہلو ہوتے ہیں، اس لئے اس کے متعلق فیصلہ کرنے سے پہلے اس کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھنا ہوگا۔ لیکن ہم لوگ کس طرح فیصلہ کرتے ہیں؟ ہم لوگ کسی خاص وقت کی ملاقات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر دیتے ہیں لیکن کیا یہ صحیح ہے؟ ٹھیک ہے؟"

محبوب اس کی باتوں کا کیا جواب دیتا۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکا اس لئے خاموش بیٹھا رہا۔ آج دوپہر، خلاف توقع اسے ان حالات سے دوچار ہونا پڑیگا، اس کا اسے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اس مکان کے سامنے کے راستے سے وہ اپنے ایک دوست سے ملاقات کرنے جا رہا تھا کہ یکایک اس لڑکی کے ساتھ اس کی ملاقات ہوگئی تھی۔ اور اس کے بعد اس ملاقات اور بات چیت کا سلسلہ ابتک ختم نہ ہو سکا تھا۔ یہ سب کچھ کسی ڈرامہ سے کیا کم تھا

"آپ چونکہ شاعر ہیں، ذی فہم ہیں، اس لئے کہہ رہی ہوں، کچھ خیال نہ کیجئے گا" رک رک کر بولنے کے بعد وہ چند لمحوں تک سر جھکائے کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی عود کر آئی تھی اور اس کے تر و تازہ سرخ ہونٹوں پر ہلکی سی سیاہی جم گئی تھی۔ جونہی سر اٹھا کر اس نے دیکھا، اس کی دونوں آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اپنے سینے میں ابھرتے ہوئے درد کو اس نے بڑی مشکل سے دبا رکھا ہو۔ ساکت نظروں سے دیکھتے ہوئے سلیمہ نے کہا "اچھا، آپ ہی بتایئے، مجھے چھوڑ کر ان کا یہاں سے چلے جانا کیا مناسب ہے؟"

"کون؟ آپ کس کی باتیں کر رہی ہیں؟"

ماہ نو، کراچی جنوری ۱۹۵۹ء

سلیمہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے چھلک پڑے، الماری کے اوپر ٹہرے سے فریم میں لگی ہوئی ایک تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا "میں ان کی بات کر رہی ہوں، یہ میرے شوہر ہیں۔"

"اوہ" محبوب کے منہ سے عجیب سی آواز نکلی۔

اتنی دیر میں اس تصویر پر دو ایک بار اس کی نظر ضرور پڑی تھی، لیکن ہر مرتبہ اُسے یہی خیال ہوا کہ وہ شاید کسی لیڈر کی تصویر ہے، اس لئے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اب اس نے غور سے اس تصویر کو دیکھا۔ یہ قیمتی سوٹ میں ملبوس درمیانی عمر کے ایک آدمی کی تصویر تھی، عمر کچھ زیا ہوگی، پھر بھی چہرے سے یہ عمر ہونے کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ نصف سر گنجا، چہرے پر قلبی سکون اور مسرت واطمینان کی جھلک بڑے اہتمام کے ساتھ ہوا، ہونٹوں پر پُر مسرت مسکراہٹ پھیلی ہوئی۔ تصویر کے فریم کے گرد ایک گل پھول کا ہار جس کے پھول مرجھا کر سیاہ ہو گئے تھے۔

نصف گلاس میں پانی رہ گیا تھا، ہاتھ بڑھا کر محبوب نے گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ پھر اس نے پوچھا "وہ کہاں گئے ہیں؟"

"کوراچی" بھیگی پلکیں اوپر اٹھا کر سلیمہ نے جواب دیا۔ "وہاں انہوں نے نوکری کر لی ہے۔"

"کتنے دن ہوئے؟"

"تقریباً آٹھ ماہ۔ اس عرصہ میں انہوں نے صرف دو خط لکھے ہیں، وہ بھی پوسٹ کارڈ پر چند سطریں۔ آپ ہی کہئے اس پر غصہ نہیں آئے" آنچل کے کونے سے اپنی آنکھیں پونچھنے کے بعد سلیمہ کہنے لگی "کس طرح رہتے ہیں، کچھ بھی نہیں لکھتے۔ صرف اتنا ہی لکھتے ہیں کہ خیریت سے ہوں۔ اتنا لکھ دیا اور کیا! میں جیسے کچھ سمجھتی ہی نہیں۔"

محبوب کو ایسا محسوس ہوا جیسے چمکتے ہوئے سر والی تصویر میں جان پڑ گئی ہو اور وہ شخص مسکراتے ہوئے اس خاتون کی باتیں سن ر کوئی کچھ بھی کہے۔ وہ میرے بارے میں کوئی غلط رائے کیوں قائم کریں گے؟" سلیمہ پھر کہنے لگی۔ "کبیر رشتے میں میرا ماموں زاد بھائی بچپن سے ہم دونوں ایک ساتھ کھیلے ہیں، ایک ساتھ رہے ہیں، ایک ساتھ پھول چنے ہیں، اس کے ساتھ چلنا پھرنا کیا بُرا ہے؟ لیکن وہ مجھے چھو چلے گئے، انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اتنے بڑے مکان میں، میں اکیلی کیسے رہوں گی۔ ایک نوکر اور نوکرانی ضرور رہے، مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟"

محبوب چپ چاپ بیٹھا ہوا اس کی باتیں یوں سن رہا تھا، جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ اُسے کسی چیز کا ہوش نہیں تھا۔ اس کا دل پتھر کی طرح منجمد ہو گیا تھا۔

"قسمت سے کبیر آگیا ہے، ورنہ اس مکان میں خوف سے میرا دم نکل جاتا۔ اس کے ساتھ بھی ہزار بکھیڑے ہیں، میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہمیشہ ہسپتال میں ڈیوٹی دینی پڑتی ہے، دن کو آٹھ بجے سے کلاس شروع ہوتی ہے اس وقت سے زیادہ تر باہر ہی رہنا پڑتا ہے، لیکن رات کو رہتا ہے۔ اس سے تھوڑی سی دلجمعی ہو جاتی ہے۔ چاروں طرف جس طرح چوری ڈکیتی ہو رہی ہے ——" تھوک نگلتے ہوئے سلیمہ کہنے لگی "اتنا بڑ ہے۔ اس کی ہر چیز ان کے ہاتھ کی سجائی ہوئی ہے، ہر چیز ان کی اپنی پسند کی ہوئی ہے۔ فرض کیجئے، اگر ایک تصویر ہی چوری ہو جائے تو کیا ہوگا اس کا انہیں کوئی خیال ہی نہیں۔"

محبوب خاموش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ کوئی بات بولنے کی بھی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا "وہ کہتے تھے، ہمیشہ خوش رہا کرو، زندگی دو دن کی تو نہیں ہے، لیکن اس طرح کا سلوک کرنے سے کوئی کس طرح مسکرا سکتا ہے میں مسکراتی ہوں، بغیر مسکرائے میں رہ بھی نہیں سکتی۔ ان کی باتیں سن سن کر مسکرانے کی عادت سی ہو گئی ہے؟"

وہ چمکتے ہوئے سر والی تصویر کو اب بھی اسی طرح دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہنستے ہوئے چہرے پر شکایت کی کوئی پرچھائیں نہیں تھ بارش کے بعد سورج نکلتے ہی آسمان کا رنگ نکھر آتا ہے، اسی طرح سلیمہ کے دل پر چھائے ہوئے غم کے بادل بھی چھٹ گئے تھے اور اس کا نکھر آیا تھا۔ اس نے ایک بار تصویر کی طرف دیکھا، اس کے بعد الماری کے پاس سے سرک آئی، ذرا سا جھک کر دونوں ہاتھوں میں اٹھاتے ہوئے کہا "بہت ساری باتیں بک گئی ہوں، کچھ خیال نہ کیجئے گا" اور اس کے ہونٹوں پر پہلے دن کی طرح پھر مسکراہٹ ابھر آ

محبوب نے زور سے ہنستے ہوئے کہا "نہیں، نہیں، خیال کرنے کی کیا بات ہے۔ اتنی دیر تک آپ کے ساتھ بات چیت کر کے بڑی مسرت ہوئی"۔ "اب تو آپ نے مکان دیکھ ہی لیا ہے، لگا ہے گا ہے آتے رہئے گا۔ کلاس کے علاوہ تقریباً ہر وقت اکیلا ہی رہنا پڑتا ہے۔ آپ آئیں گے تو ادھر اُدھر کی باتوں میں آسانی سے وقت کٹ جائے گا"۔ دوسرے کمرے میں جاتے ہوئے اس نے کہا "تھوڑی دیر بیٹھئے، میں آ رہی ہوں"۔

گیٹ کے پاس سے کوئی آدمی بڑی دیر سے آوازیں دے رہا تھا لیکن محبوب کچھ ایسا کھویا ہوا تھا کہ وہ اس کی آواز نہ سن سکا۔ اتنے میں ایک رکشا آ کر رکا، ٹن ٹن کی آواز سنائی دی، پھر دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی چاپ اُبھری، کوئی بڑی تیزی سے بالائی منزل کی سیڑھیاں پھلانگ رہا تھا، چاپ قریب آ گئی، ہوا سے پردے میں ہلکی سی جنبش ہوئی اور پردہ ذرا سا سرک گیا۔ "یہ کون آیا؟" محبوب نے دروازہ کی طرف متوجہ ہو کر سوچا "کون آیا؟" سلینہ نے بھی دوسرے کمرے سے واپس آ کر ناآشنائی نظروں سے دروازہ کی طرف دیکھا۔

"کون؟" ایک نے دوسرے کی آنکھوں سے جھانکتے ہوئے خاموش سوال کو الفاظ کا جامہ پہنایا۔

دونوں کا خیال صحیح تھا۔ دائیں ہاتھ سے پردہ سرکا کر کبیر کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بائیں بازو کے نیچے بغل میں کچھ دبائے ہوئے تھا۔

"یہ لو، میوزک سینٹر میں اچانک مل گیا!" سلینہ کے ہاتھوں میں گیتوں کے کئی ریکارڈ دے کر وہ محبوب سے مخاطب ہوا: "آپ کب آئے؟ خیریت سے تو ہیں؟"

"ہاں" محبوب اٹھ کر کھڑا ہو گیا "آپ کیسے ہیں؟"

"اچھا ہی ہوں" دونوں ہونٹ سکوڑ کر کبیر نے بڑے بے ڈھنگے پن سے مسکرانے کی کوشش کی۔

"ریکارڈ تو بہت اچھے ہیں۔ یہ تو بہت اچھے گانے تمہیں مل گئے؟" اپنی بات ختم کر کے اس نے کبیر کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پیکٹ دیکھ کر اس نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

"خود ہی دیکھ لو۔ تمہارے ہی نام آیا ہے" ہاتھ بڑھا کر پیکٹ دیتے ہوئے کبیر نے کہا "گیٹ کے قریب پوسٹ مین مل گیا تھا، وہی دے گیا ہے"۔

"اچھا؟" سلینہ یکایک خوشی سے کھل اٹھی۔ اس نے ریکارڈوں کو میز پر رکھ دیا اور بولی "دیکھوں، دیکھوں"۔

رجسٹرڈ پارسل بڑی عمدگی سے پیک کیا ہوا تھا۔ وہ جلدی جلدی پیکٹ کھولنے لگی۔ باریک دھاگے اور کاغذ کو علیحدہ کرنے کے بعد باریک کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز پیکٹ سے برآمد ہوئی، سلینہ نے جلدی سے اس باریک کاغذ کو بھی پھاڑ کر پھینک دیا اور وہ خوشی سے چیخ اٹھی ـــ جوتا، کوراچیر جوتا! جوتا ہے، کراچی کا جوتا!" ان دونوں نے بھی دیکھا، ایک جوڑا لال جوتا تھا جس کے سرخ بدن سے سوندھی سوندھی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ سلینہ خوشی سے بے قابو ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے رقص کر رہے تھے اور چہرہ تمتما اٹھا تھا۔ ابھی اس نے ہاتھوں سے جوتے کو الگ کیا اس کے اندر سے ایک چھوٹا سا کاغذ کا پرزہ نکلا۔ خوشی کے مارے وہ بھول گئی کہ وہ جگہ خط پڑھنے کی نہیں تھی۔ وہ ان دونوں کے سامنے ہی پرزہ کھول کر پڑھنے لگی:

"پیاری سلینہ! یہ لو تمہاری پسند کی چیز۔ امید ہے تم اس کو پسند کرو گی۔ تمہارا اپنا ......"

وہ خوشی سے تالیاں پیٹنے لگی۔ پھر کبیر سے مخاطب ہو کر بولی "میں نے تم سے کہا تھا نا، جوتا خریدنے کی مجھے ضرورت نہیں، انہوں نے کب خرید کر دیا تھا، انہیں ضرور یاد ہو گا۔ ایک نہ ایک دن ضرور بھیج دیں گے، کیوں میری بات صحیح ہوئی نا؟"

اور وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے!

اجازت لے کر آنے سے پہلے محبوب نے دیکھا، کبیر کا چہرہ سخت اور سیاہ ہو گیا تھا اور چشمہ کے اندر ڈھکی ہوئی اس کی دونوں آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔

★

قطعات

اختر انصاری

سرشتِ شاعر

جہاں میں کب کوئی مجھ سا خراب آیا تھا
کسی نے کب مِرا درد و گداز پایا تھا
مجھے یقین ہے معبود! تو نے روزِ ازل
جگر کے خون سے میرا خمیر اٹھایا تھا

دام و درہم

اُدھر دماغ ہیں ساکت، دلوں کو سکتہ ہے
اِدھر سکوت بھی فریاد سے چھلکتا ہے
وہاں تو حلق میں پھنستا نہیں نوالہ بھی
یہاں یہ حال کہ سینے میں سانس اٹکتا ہے

کمند

یہ سچ ہے اے فلک کور چشم و تیرہ ضمیر
کہ تیرے وار سے کوئی نہ زینہار بچا!
مگر — وہ کنگرۂ بامِ انجمیں پہ ترے
زمیں والوں نے ڈالی کمند، وار بچا!

ٹیڑھی چال

خرد کے مصلحت افروز سائے میں نہ پلے
صلاحِ کار کے سانچے میں جیتے جی نہ ڈھلے
نثار اس تری ٹیڑھی زمین کے یارب!
تمام عمر یونہی ہم بھی ٹیڑھی چال چلے

جنّت الفردوس

اسی نے مسخ کیا آدمی کی فطرت کو
اسی نے روگ لگایا خلوصِ نیت کو
جہاں سے نیکیٔ بے لوث اٹھ گئی یارب
اٹھا کے پھینک دے دوزخ میں اپنی جنت کو

اپنے سخن سے

مِرے سخن نہ غمیں ہو، وہ وقت آئے گا
زمانہ تیری شعاعوں سے جگمگائے گا
بہ فیضِ آئنۂ زیست محوِ تزئیں رہ
رہا میں خود، تو یہ پردہ تو اٹھ ہی جائے گا

کھجور

شیر افضل جعفری

ستی ریگ زار ہوتی ہے — یہ پھلوں کی نگار ہوتی ہے
اسکے کانوں میں سینکڑوں بُندے — یہ تو کھجی کی نار ہوتی ہے
اسکی انگڑائیوں پہ ساون میں — سروکی جاں نثار ہوتی ہے
قد و گیسو کو دیکھکر اس کے — ہیر بھی شرمسار ہوتی ہے
اس طرح جھومتی ہے شرماکر — جیسے بادہ گُسار ہوتی ہے
چُور ہے یوں غرور میں جیسے — ملکۂ شاخسار ہوتی ہے
جب یہ لیتی ہے بُور گوشوں پر — رو کشِ نوبہار ہوتی ہے
میٹھے میٹھے پھلوں کی دولت سے — حاتمِ روزگار ہوتی ہے
فاتحِ سندھ کی جوانی کی — اک حسیں یادگار ہوتی ہے
سرزمینِ عرب ہے اس کا وطن — یہ غریب الدّیار ہوتی ہے
ذکر قرآن میں بھی ہے اس کا — نوریوں میں شمار ہوتی ہے

کرتی ہے آسمان سے باتیں
شانِ پروردگار ہوتی ہے

★

ھ دریا کا بغلی علاقہ۔

رچنا[1]

سیّد مظفر علی مظفر

یہ رچنا کی رومان رومان وادی
یہ وادی کے منظر شرابی شرابی
یہ پُروا کے سرمست سرمست جھونکے
تخیل کی لہریں چنابی چنابی
درختوں کی شاخیں نشیمن نشیمن
ببولوں کے سائے سحابی سحابی
یہ رانجھوں کے مسکن نشیلے نشیلے
یہ بیردں کے تبندے عنابی عنابی
ہرن مست آنکھوں میں کاجل کے ڈورے
جنوں خیز عالم شبابی شبابی
لب لالہ گوں زنگترے کی یہ قاشیں
رسیلی رسیلی، گلابی گلابی
اداؤں کے خنجر نکیلے نکیلے
نگاہوں کے نشتر شہابی شہابی
یہ بے تابیٔ دل سمندر سمندر
یہ رومان دل کے حبابی حبابی

[1] راوی چناب کی وادی۔

غزل

تابش صدّیقی

حیراں ازل سے ہوں کہ وہی خود نگر ملے
آئینہ بن گیا ہوں کہ آئینہ گر ملے

غم ہے عطائے دوست، بہ صد شکر کر قبول
جس سے ملے، جہاں سے ملے جس قدر ملے

اے حیرتِ خیال یہ عالم ہے دیدنی
ہم جب اٹھائیں آنکھ اُنہیں سے نظر ملے

نقشِ بر آب، رنگِ نشاطِ مئے حیات
جب تک نہ اس شراب میں خونِ جگر ملے

اشکوں میں یوں تباہ نہ کر دل کی آگ کو
کیوں خاک میں امانتِ برق و شرر ملے

منزل تو خود ہے سنگِ گراں راہِ عشق میں
رہزن کو ڈھونڈتا ہوں اگر راہبر ملے

اے دوستو! حرم نہ سہی بت کدہ سہی
شاید یہیں کہیں روشِ خوش نظر ملے

عبد اللہ خاور

مری نظر سے الجھ کر شرارِ رنگ و نمو
بکھر گئیں ہیں تری خود نمائیاں ہر سو

کسی نظر میں نہیں التفات کا پہلو
نہ چھیڑ چشمِ سخن گو، فسانۂ لبِ جُو

ازل نوا ہے دلِ زار، داستانِ فراق
عدم کی شام سے ظلمت ہے تا حدِ گیسو!

خلوصِ عشق کی موجِ بلند اٹھی ہے
جگا گئی ہیں تری بے نیازیاں جادو

تری روش سے جوابِ وفا تو کیا ملتا
مگر ہمیں نے نکالے خلوص کے پہلو!

شکستِ خاطرِ یاراں، گذر گئی شبِ غم
سپید ہونے لگا ہے رگِ سحر کا لہو

بدل رہا تھا مزاجِ بہار، کیا بدلا
بکھر گیا لبِ گلبرگ پر شرارِ نمو!

کسی فسانے کی کونپل ابھر رہی ہوگی
برس رہا ہے مسلسل صداقتوں کا لہو!

افق تھا ذہن کا جنگاہ بدلے خاور
یہی خرابہ ہے اک بیکنار عالم ہُوا

★

اُفق تا اُفق:

اسلامی تاریخ کا مطالعہ

ڈاکٹر عترت حسین زبیری

انقلاب کے فوراً ہی بعد ڈاکٹر عترت حسین زبیری صاحب، مشیر تعلیمات پاکستان نے جامعہ کراچی کے زیر اہتمام ادارہ مطالعۂ تاریخ و تمدن اسلامی
کے جلسہ افتتاحیہ میں اسلامی تاریخ کے مطالعہ اور جدید انقلاب کے تحت نظام تعلیم کی نہج پر ایک خطبہ پیش کیا تھا۔ ذیل میں اس خطبہ کا متن پیش کیا جاتا ہے۔ (مدیر)

پاکستان کا تصور ہی اسلامی تاریخ سے وابستہ اور اسی کی روشنی میں قابل فہم ہے۔ ہم اپنے ماضی کو اسی صورت میں ملاحظہ سمجھ سکتے اور اپنے مستقبل کی
منصوبہ بندی کر سکتے ہیں جب کہ ہم تمام دنیائے اسلام کی تاریخ کو پیش نظر رکھیں۔
تاریخ پر یا تو انسان ایک ماہر فن کی حیثیت سے نظر ڈال سکتا ہے یا ایک عام شخص کی حیثیت سے جو اس کے گوناگوں پہلوؤں کا امعان نظر سے مسلسل جائزہ لیتا
رہا ہو۔ یہی خصوصی مطالعہ اسلامی تاریخ کے سلسلہ میں بھی لازمی ہے۔ چنانچہ مجھے اس بارہ میں جو کچھ کہنا ہے وہ ایک عالم یا محقق کے رسمی پیرایہ میں نہیں بلکہ ایسے
شخص کی حیثیت سے ہوگا جس نے حالات روزگار کا غور وخوض سے مشاہدہ کیا ہے اور اپنی ہی فہم وفراست کی روشنی میں ان پر سوچ بچار بھی کی ہے۔
یہ تو ظاہر ہے کہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ تمام دنیا کی تاریخ کے پس منظر ہی میں کرنا چاہیئے نہ کہ اس سے الگ کیونکہ تاریخ عالم میں اسلام نے جو حصہ لیا ہے اس کا
صحیح اندازہ ان عوامل کو سامنے رکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے جن سے ایشیا اور یورپ دونوں میں تہذیب و تمدن کی نشو ونما بروئے کار آئی ہے۔ اس وقت مسلمان
مؤرخین کے سامنے سب سے بڑا کام یہی ہے کہ وہ تاریخ اسلام اور اس کے مطالعہ کو مستشرقین کے ہاتھوں سے نجات دلائیں۔
جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے دیار مغرب میں اسلامیات کا آغاز اور نشو ونما یورپ کی استعماری توسیع و ترقی ہی کے ساتھ ساتھ ہوئی۔ یہ حقیقت ہمارے
برصغیر کے سلسلہ میں بھی اسی قدر صحیح ہے جتنی کہ ولندیزی جزائر شرق الہند یا کسی اور ملک کے بارہ میں۔
یورپی مؤرخین اسلام شروع ہی سے دو بڑی کمزوریوں کا شکار رہے ہیں۔ اول ان کے سیاسی و عملی مقاصد جو شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کی تحقیقات
کی تہہ میں کارفرما تھے اور دوسرے اسلامی دینیات اور قرآن و سنت کے متعلق معلومات کا فقدان۔ کیونکہ ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر جانتے ہیں کہ کوئی شخص کسی بڑے مذہب
کی تاریخ کا اس وقت تک ٹھیک ٹھیک مطالعہ نہیں کر سکتا جب تک وہ اس کے دینیات اور الٰہیات سے بوجہ احسن آشنا نہ ہو۔ اسلئے کہ یہ تمام امور باہدگر
مربوط ہیں اور نہایت وسیع معنوں میں تاریخی واقعات کی نہج و روش کی تشکیل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔
مذاہب عالم میں اسلام واحد مذہب ہے جو تاریخ کی بھرپور روشنی میں جلوہ گر ہوا۔ پیغمبر اسلامؐ، حضرت عیسیٰؑ، موسیٰؑ اور تاریخ کے دور تر دھندلکوں میں
نمودار ہونے والے دیگر انبیاء کرام کے مقابلہ میں زیادہ قریبی عہد تاریخ میں مبعوث ہونے کے باعث ایسی شخصیت ہیں جن پر تاریخ کی بھرپور روشنی پڑ رہی ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ اسلام نے بار بار تاریخ کی اہمیت پر اس لئے زور دیا ہے کہ یہ مشیت الٰہی کی آئینہ دار ہے۔ اس لئے مسلمان ابتدا ہی سے فکری و ذہنی تحریکات
کے سلسلہ میں تاریخی اصولوں پر بے حد زور دیتے رہے ہیں۔
میرا یہ پختہ عقیدہ ہے کہ ممالک اسلامیہ کی موجودہ تمدنی تحریکات کو تاریخی مطالعہ کی مضبوط بنیادوں پر مبنی ہونا چاہیئے۔ ہمیں مغربی منہاج کا گہرا مطالعہ
کر کے اس پر پورا پورا عبور پیدا کرنا چاہیئے۔ اور پھر اس کا اطلاق مذہب اسلام پر بحیثیت تاریخ عالم کی ایک زبردست و مہتم بالشان تحریک اور تہذیبی قوت کے
کرنا چاہیئے۔ ہمیں اس امر کو بھی ایک بنیادی حقیقت کے طور پر قبول کر لینا چاہیئے کہ اسلام کے بعض اساسی عناصر مثلاً قرآن، شریعت اور اسلامی اداروں نے تاریخ
اسلامی کو اپنی ہی ایک پُر معنی وحدت عطا کر دی ہے اور اس طرح تمام مسلم اقوام و ملل کی تاریخ میں بنیادی محرکات کے طور پر حصہ لیا ہے۔
میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ کسی اسلامی ملک کی تاریخ کو بھی اس وقت تک سمجھنا ممکن نہیں جب تک اس کا مطالعہ تاریخ اسلام کے جامع سانچے

کے ضمن میں نہ کیا جائے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہمارے اِن اسلامی تاریخ کا مطالعہ مجرد طور پر نہ کیا جائے، اور ہمیں یہ جاننے کی پوری پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ دیگر اسلامی ممالک میں بھی اسلامی تاریخ و تمدن کی تحقیق کے سلسلہ میں کیا کام کیا جا رہا ہے۔

بنابریں میں نے ہمیشہ شدت سے محسوس کیا ہے کہ ہمارے ہاں اسلامی تاریخ سے متعلق ایک خاص دبستان قائم ہونا چاہیئے جو وضع و اسلوب میں لندن یونیورسٹی کے اسلامی و افریقیائی مدارس مطالعہ کے مماثل ہو۔ میں یہ رائے صرف ضمنی طور پر دے رہا ہوں کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے زمانہ میں اسلامی تاریخ کا مطالعہ اس قدر پیچیدہ ہوگیا ہے کہ اس کو بعض عتیق و جدید زبانوں کے حلقہ سے قطعی طور پر وابستہ کرنا لازمی ہے۔

میرے خیال میں آج کل اسلامی تاریخ کے بارہ میں تحقیق و تدقیق کے لئے عربی، ترکی، فارسی، اور ہسپانی السنہ کا جاننا ضروری ہے۔ جہاں تک عتیق زبانوں کا تعلق ہے میری رائے میں لاطینی، عبرانی اور سریانی کا جاننا ضروری ہے۔

اس سلسلہ میں یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ جب میں نے سترھویں صدی کے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا تو اس کے لئے مجھے رومن کیتھولک چرچ کا خصوصی مطالعہ کرنا پڑا تھا۔ اور اس فرقہ کی تاریخ کے مطالعہ میں بار بار اسلامی تاریخ کے حوالوں سے دوچار ہونا پڑا۔ میری دانست میں نصرانی مآخذ، خصوصاً ابتدائی پیشواؤں کے مواعظ اور قرونِ وسطیٰ کے عیسائی مؤرخین و علما، جنہوں نے ظہورِ اسلام سے پہلے اور اس کے بعد کے زمانوں میں کتب تاریخ ترتیب دیں، کی تصانیف کا مطالعہ اسلامی تاریخ کے کلیسائی یورپ سے روابط کو سمجھنے کے لئے لازمی ہے۔ ان کتابوں میں یہ بات عام طور پر مشاہدہ میں آتی ہے کہ ان سے کچھ ایسا مواد ہاتھ آجاتا ہے جن کا مسلمان مؤرخوں نے کوئی ذکر نہیں کیا کیونکہ ان میں سے بعض مؤرخین کی زاد بوم دنیائے اسلام ہی کے حدود میں تھی۔ مثلاً خطبات یوحنا دمشقی جو کہ مصنف جس نے اموی دور میں خلفائے بنو امیہ کے قرب و جوار میں زندگی بسر کی اور تھیوڈور ابو قرہ، جن کی تصانیف بہت ہی اہم طبعزاد مآخذ ہیں۔

اب وقت آچکا ہے کہ ان مآخذ کو تاریخ اسلام کے صحیح مطالعہ کے لئے کام میں لایا جائے۔ کیونکہ ان میں نہ صرف اسلام بلکہ نصرانیوں کے اسلامی تاریخ کے بارہ میں تصور کے متعلق کافی مواد ہے۔ ان سے نصاریٰ کے عادات نیز ان حالتوں پر روشنی پڑتی ہے جو مسلمانوں اور عیسائیوں میں رونما ہوئے تھے۔ اب ان مآخذ کی اہمیت کو محسوس کرنا لازم ہے۔ کیونکہ ہمیں عربی مآخذ سے ان کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اور مجھے امید ہے کہ ہماری جامعات کے تحقیقی ادارے ان ذرائع کے باقاعدہ مطالعہ پر توجہ مبذول کریں گے۔

ساتھ ہی میں اس بات پر بھی زور دوں گا کہ اسلامی آثار قدیمہ کی تحقیق و تدقیق کا سلسلہ بھی آگے بڑھایا جائے۔ کیونکہ یہ اسلامی تاریخ کے مطالعہ کے لئے بڑی اہم مدد بہم پہنچائے گا۔ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ فسطاط (مصر) اور سامرہ (عراق) میں حفریاتی تحقیق و تفتیش کے نئے نئے افق طلوع ہوئے ہیں۔ لہٰذا اب یہ بات ایک مسلّمہ حقیقت قرار پا چکی ہے کہ آثار قدیمہ کی مدد کے بغیر اقوام کی تمدنی تاریخ بھی شافی طور پر مرتب نہیں ہو سکتی۔ اکثر اسلامی ممالک میں اسلامی حفریات کا باب بدستور ایک سربمہر مکتوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلئے میں اس امر پر زور دوں گا کہ ہمیں اسلامی آثار قدیمہ کی دریافت و تحقیق پر بھی توجہ دینی چاہیئے۔

آپ اتفاق کریں گے کہ اسلامی تاریخ کا مطالعہ بطور ایک عالمی تحریک کے کرنا چاہیئے جس سے انسانی معاشرہ میں ایک نئے تصور کا آغاز ہوا۔ اور اس حیثیت سے اسلامی تاریخ کا مطالعہ ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں غیر معمولی فیضان کا باعث ہو سکتا ہے۔

اسلام کے حدود عالمگیر ہیں اور اس کی اپنی ہی ایک بین الاقوامی ہیئت ہے۔ لہٰذا اس کے صحیح و باقاعدہ مطالعہ سے مسلم اور دیگر اقوام عالم میں بہتر مفاہمت پیدا ہو سکتی ہے۔ ایشیا کے کسی اور مذہب، مثلاً ہندو مت، کنفیوشزم یا شنتو مت کا مطالعہ بھی بین الاقوامی میدان میں ایسے عمدہ نتائج کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

میرے خیال میں پاکستانی جامعات کو دورِ حاضر میں ایک نہایت تاریخی کردار ادا کرنا ہے۔ انہیں پاکستان کی ذہنی و فکری قیادت کی عنان اپنے ہاتھ میں لے لینی چاہیئے۔ تاریخ نے ہم لوگوں کو جو اہم کام تفویض کیا ہے وہ ہماری قوم کو وحدت و یکجہتی کے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ ہم اس درد و کرب کے عالم سے گذر رہے ہیں جو ایک نئے روحانی انقلاب، ایک نئی پیدائش کے لئے ضروری ہے۔ اور میری رائے میں ہماری جامعات کو نئی نسل کے ذہن میں اس نئے انقلاب کی روح اور موقف کو رچانے کے لئے قیادت کا فرض ادا کرنا ہے۔ کیونکہ انقلابات محض تصوریت سے رونما نہیں ہوتے بلکہ نئے

بحری جنگی مشقیں

ایک خداساز اتفاق ہے کہ ہمارے موجودہ قومی انقلاب کے رونما ہوتے ہی بحریۂ پاکستان کی بعض دیگر دوست ممالک کے بحریوں کے تعاون سے وہ مہتم بالشان بحری مشقیں ہوئیں جو اس کی تاریخ میں منفرد حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ بیک وقت ہمارے روز افزوں وقار کی خوش آیند علامت بھی ہیں اور روشن تر مستقبل کی بشارت بھی۔ ذیل میں ان تجرباتی مشقوں پر ایک تحریر پیش کی جاتی ہے۔ (مدیر)

★

"بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی"۔ علامہ اقبالؒ کے یہ الفاظ ہم میں سے کس کو رہ رہ کر یاد نہیں آتے، یہ الفاظ جو انھوں نے ہمارے اولوالعزم اسلاف کے بارہ میں کہے ہیں۔ اور ہم پاکستانی جوان مہتم بالشان بحر پیماؤں کے جانشین ہیں، ان کو بھی اپنی بحر پیمائی پر کچھ کم ناز نہیں۔ ان کے پر شکوہ سفینوں "دلاور"، "ہمالیہ"، "کارساز"، "بہادر" وغیرہ کے لئے بھی تو بحرِ بے کراں ایک وسیع و عریض بازی گاہ ہے، لفظاً و معنیً۔ کیونکہ یہ ان کی مسلسل مشقوں اور جولانیوں کا میدان رہا ہے۔ تنہا ہی نہیں بلکہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر یہ دوستانہ طور پر واقعی سمندر کی نیلگوں پہنائیوں پر بہ صد شوق کھیلتے رہے ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل دلچسپی سے خالی نہیں۔ پاکستان اور اسکے اولوالعزم جہاز رانوں ـــ کیونکہ مشرقی پاکستان ہو یا مغربی پاکستان، دونوں کے فرزند پیدائشی جہاز راں ہیں ـــ کے روابط دوسرے ممالک سے استوار ہیں۔ اور پھر میزبانی کی خوش آیند روایات بھی ہمیں اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملی ہیں۔ چنانچہ پچھلے دو سال بحریۂ پاکستان نے بارہا دیگر ممالک کے بحریوں کی میزبانی کا حق ادا کیا ہے۔ اور بہت وسیع پیمانہ پر بین الاقوامی بحری مشقوں میں جی کھول کر حصہ لیا ہے۔ ابھی پچھلے ہی سال کی بات ہے کہ ہمارے بحریہ نے "مشقِ ہلالی" کا اہتمام و انصرام کیا تھا جس میں ایران، ترکیہ، برطانیہ اور امریکہ جیسے سربرآوردہ ممالک شریک ہوئے تھے۔ اب کے بحریۂ پاکستان نے پھر "معاہدۂ بغداد" کے بحری مشقوں سے متعلق ایک منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کا بیڑا اٹھایا جس کا نام (EXERCISE MIDLINK) ہے۔ یعنی رابطۂ مشرق وسطیٰ سے متعلق بحری مشق ـــ اور اس کو بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام دیا۔ یہ مظاہرہ اپنے حسنِ اہتمام کے اعتبار سے حقیقتاً ایک یادگار مظاہرہ تھا۔ جس میں پاکستان، ترکیہ، برطانیہ اور امریکہ سب کے جنگی جہاز شریک ہوئے۔

یہ مظاہرہ اِن ممالک کی ہم آہنگی اور تعاون باہمی کی ایک شاندار مثال ہے۔ کیونکہ پورے تین ہفتے ہمارے معزز و محترم مہمانوں کے جہاز اور بیڑے آتے رہے اور بحریۂ پاکستان کے ساتھ مل کر برابر مشقیں کرتے رہے۔ اس طرح انہیں بڑی یکجہتی و یکدلی کے ساتھ کام کرنے اور ایک مشترکہ دفاعی تکنیک پیدا کرنے کا موقع ملا۔ کچھ عرصہ یہ بیڑے اور جہاز کراچی کی بندرگاہ میں مشقیں اور صلاح مشورہ کے لئے کانفرنسیں کرتے رہے۔ جب یہ مرحلہ ختم ہو چکا تو وہ کھلے سمندر میں آگئے اور دس دن تک مل جل کر سرگرم کار رہے اور پھر آپس میں زور شور سے "گتھ" گئے۔ یہ مڈبھیڑ ایک زبردست ہوائی و بحری معرکۂ حرب و ضرب پر منتج ہوئی۔ اس تمام معرکہ کا اہتمام کچھ اس طرح کیا گیا کہ اس سے سمندری لڑائی کے تمام عوامل ـــ جن میں آبدوز، ہوامار جہاز اور بری فوجیں بھی شامل تھیں ـــ شریک کارزار ہوئے۔

چونکہ ان عظیم الشان بحری مشقوں کا منصوبہ اُن قوموں کا مشترکہ منصوبہ تھا جو معاہدۂ بغداد کی حلیف یا حامی ہیں۔ اس لئے اس کا خاکہ ابتداءً دفاتر معاہدۂ بغداد کے عملۂ منصوبہ بندی نے تیار کیا تھا۔ اس کے بعد بحریۂ پاکستان کی باری آئی جس کے ارباب حل و عقد نے اس کو ہر اعتبار سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ اس وسیع اہتمام کا مدعا یہ تھا کہ اگر اس علاقہ میں جہاں یہ مشقیں ہوئیں، شریک ممالک کو فی الحقیقت اپنے مشترکہ دفاع کے سلسلے میں کسی افتاد کا سامنا کرنا پڑے تو ان کو اس کا پہلے ہی عملی طور پر پورا پورا تجربہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ محاربہ میں شریک ہونے والی تمام طاقتوں کے لئے یہ مشقیں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان کی ترکیب یہ ٹھہرائی گئی کہ عدن سے لیکر کراچی تک خلیج فارس سے ہوتی ہوئی جو عظیم بحری شاہراہ ہے، ہماری توجہ اس پر ہی مرکوز کی جائے کیونکہ یہی وہ سمندری علاقہ ہے جہاں

دن رات ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر تجارتی آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اور جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے اس کی حیثیت شہ رگ کی ہے۔ کیونکہ اس شاہراہ پر جو تجارت عالمگیر پیمانہ پر ہوتی ہے، اس ہی پر ہماری خوشحالی اور اقتصادی قوت و استحکام کا دار و مدار ہے اور صرف مغربی پاکستان ہی کیا، مشرقی پاکستان کا بھی یہی حال ہے۔ جس کی خوشحالی و بہبودی بھی اُس تجارت ہی پر موقوف ہے جو سمندری جہازوں کی لگاتار آمد و رفت سے ہوتی ہے۔ اس طرح اس تمام سمندری علاقے کی اہمیت بخوبی نمایاں ہو جاتی ہے جس پر ایسا مہتم بالشان مظاہرہ خاص معنی رکھتا ہے۔

اس غیر معمولی مظاہرہ سے ہماری توجہ قدرتی طور پر پاکستانی بحریہ کی طرف منعطف ہوتی ہے۔ اس قدر وسیع پیمانہ پر مشقوں سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ہمارا بحریہ ترقی کے کس درجہ تک پہنچ چکا ہے اور اس کی ہیئت ترکیبی، اس کا ساز و سامان، اس کی طاقت، اس کا نظم و ضبط اور سب سے بڑھ کر اس کے بیدار مغز عمال، اس کا مستعد عملہ کس قدر اعلیٰ مقام پر پہنچ چکے ہیں۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ بحریہ کے پانچ ہزار سے زیادہ افسر اور کارکن ان مشقوں میں شریک تھے۔ اور یہ سارا جم غفیر اس طرح یکجان اور یکدل ہو کر مصروف کار تھا کہ انسان انگشت بدنداں رہ جائے۔ گویا ایک عظیم الشان زندہ و متحرک مشین کے کل پرزے آپس میں مل جل کر انتہائی چابکدستی سے کام کر رہے تھے۔ اتنی بڑی مشقوں کی جس طرح چھوٹے سے چھوٹے جزئیات طے کئے گئے تھے، ان کو ایک ایک کر کے ہوبہو مجوزہ صورت میں پیروی کی گئی۔ اس خوش اسلوبی کے ساتھ نقشہ وسیع پیمانے پر انسانوں کی یہ ہم آہنگی اور مختلف عوامل میں بے تکلف تعاون اور اشتراک عمل کو منصوبہ بندی اور حسن انتظام کی انتہا تصور کرنا چاہیئے ویسے دیکھنے میں تو بحری بیڑے کے یہ متحرک عوامل ہی سرگرم کار تھے لیکن ان کے پس پردہ بحریہ کے دوسرے عناصر بھی اپنا فرض بڑی تندہی سے انجام دے رہے تھے جس سے عملی کارروائیوں کا خاطر خواہ وقوع پذیر ہونا ممکن ہو سکا۔ ہمارا مطلب یہ ہے کہ ویسٹ وہارف میں سمندری گودی" دلاور" اور "کارساز" جیسے ساحل پر واقع امدادی شعبے اور صدر دفتر کا عملہ وغیرہ یہ سب شروع سے آخر تک برابر بحریہ کے سرگرم عمل کی انتہائی تندہی سے معاونت کرتے رہے۔ تب کہیں یہ مشقیں مکمل طور پر کامیاب ثابت ہوئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن مشقوں کا ہم ذکر کر رہے ہیں، بحریۂ پاکستان کی مختصر تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وقت کا تصور کیجئے جب کہ بحریۂ پاکستان تو کیا خود پاکستان کا بھی زمانۂ آغاز تھا۔ اور قدرتی طور پر بحریہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ اور یوں بھی اجڑے لٹے پریشاں ہی کا مجموعہ تھا اور بس۔ اس کے پاس نہ ساز تھا نہ سامان لیکن آج ہم اس پر جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ ہر طرح کے جدید ترین سامان سے پوری طرح لیس اور ہر طرح کافی و شافی، ساخت میں بے حد لچکدار اور بنیاد میں کشادہ، ملک کے ذرائع و وسائل کے پوری طرح شایان شان۔

یہ ترقی بحریہ کے بالذات کی کیفیت۔ وہ بحریہ جو ہمہ وقت سینۂ بحر پر جولاں اور متحرک ہے۔ دوسری طرف ساحلی سررشتۂ اہتمام بھی کچھ کم وقیع نہیں۔ گودی بھی کافی اچھی اور مرمت کی سہولتیں بھی موجود۔ ساتھ ہی ساتھ تربیتی ادارہ کا اعلیٰ درجہ پر بندوبست، اور ادارے بھی کیسے جن میں ہر قسم کی پیشہ ورانہ ٹریننگ دی جا سکتی ہے۔

آیئے ہم ایک نظر اپنے بیڑے پر ڈالیں۔ یہ ایک ایسا بیڑہ ہے جس پر ہم بلاشبہ فخر کر سکتے ہیں۔ گشتی جہاز بابر، ڈولڈ کا تباہ کن جہاز خیبر و بدر، سی آر کلاس کے دو تباہ کن جہاز ــــ جہانگیر اور عالمگیر، تین او کلاس تباہ کن جہاز ــــ ٹیپو سلطان، طارق اور طغرل، سی ایچ کلاس کا تباہ کن جہاز ــــ تیمور، چار عام جنگی جہاز ــــ جہلم، سندھ، شمشیر اور ذوالفقار، چار سرنگیں ہٹانے والے ساحلی جہاز ــــ محافظ، مجاہد، مبارک اور محمود اور انکے علاوہ بیشمار ذیلی قسم کے جہاز۔

بیڑے کے مقابلے میں ساحل پر واقع انتظامی سررشتے ہیں۔ انہوں نے بھی بیڑے کے ساتھ ہی ساتھ خوب ترقی کی ہے اور اس کی جسامت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے اور رفتہ رفتہ چند ہی سال کے عرصہ میں اس کی انتظامی کوششوں کا ایک جال سا بچھ گیا ہے۔ یہ سررشتہ متحرک بحریہ کی ہر قسم کی ضروریات کا کفیل ہے۔

ساحل پر جو توسیعی کارروائیاں عمل میں آئی ہیں ان میں سے ایک ویسٹ وہارف کراچی میں پی۔ این کی پرشکوہ گودی کی تکمیل ہے۔ وہ مقام جو اس سے پہلے بالکل بنجر تھا آج ایک نہایت اعلیٰ بارونق بحری اڈے کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جہاں زندگی ہی زندگی نظر آتی ہے۔ یہاں جہاز کے تلوں کو زنگ وغیرہ سے صاف کرنے اور ان پر تارکول پھیرنے کی گودی، مرمت و انصرام کے شعبے اور ساز و سامان سے لیس کرنے کے ٹھکانے ہیں۔ مرمت و انصرام کے ورکشاپ متعدد جدید قسم کے نہایت ہی صحت سے کام کرنے والے آلات سے آراستہ ہیں۔ جو جدید جنگی جہازوں کے پیچیدہ مشینی پرزوں کی بڑی نازک قسم کی مرمت بھی کر سکتے ہیں۔

پاکستانی جہازوں کو وقتاً فوقتاً گودی میں قیام اور مرمت کی سہولتیں بہم پہنچانے کے علاوہ ویسٹ وہارف کراچی میں واقع گودی اُن تمام تجارتی جہازوں کو جن کی پاکستانی سمندر میں آمد و رفت جاری رہتی ہے اور حلیف ممالک کے بحریوں کے جنگی جہازوں کو لنگر اندازی کی سہولت بہم پہنچاتی ہے۔
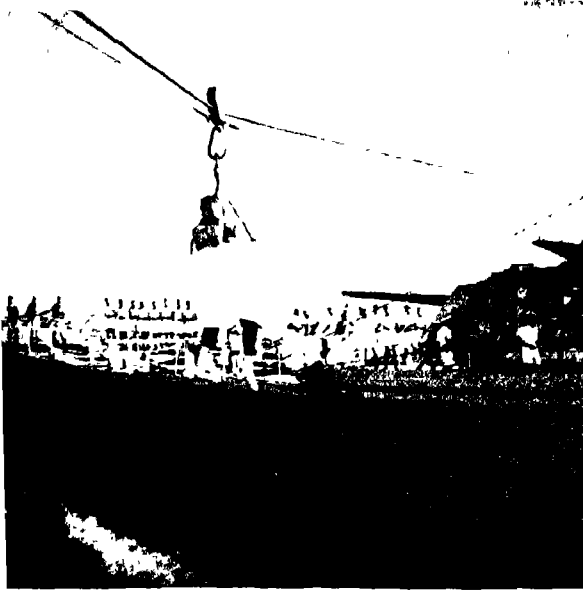
پاکستان کا ایک تباہ کن جہاز

عساکر پاکستان کے کمانڈر۔ دائیں سے بائیں:
پاکستان، جنرل محمد ایوب خان۔ میجر جنرل ملک شیر بہادر
اور ایئر کموڈور مقبول رب

"مڈلنک" کی بحری جنگی مشقیں

امیرالبحر، بحریہ پاکستان
جناب ایچ۔ ایم صدیق چودھری

بحری جنگی مشقوں میں شرکت
کرنے والے ممالک
(پرچموں کی ترتیب دائیں سے بائیں:
امریکہ، برطانیہ، ترکیہ،
پاکستان، ایران)

نیا دور

(شہری اصلاح)

صاف ستھری سڑک

دیواروں کی صفائی

قطار بندی کی عادت

’’ بجوے استعمال کیجئے ‘‘
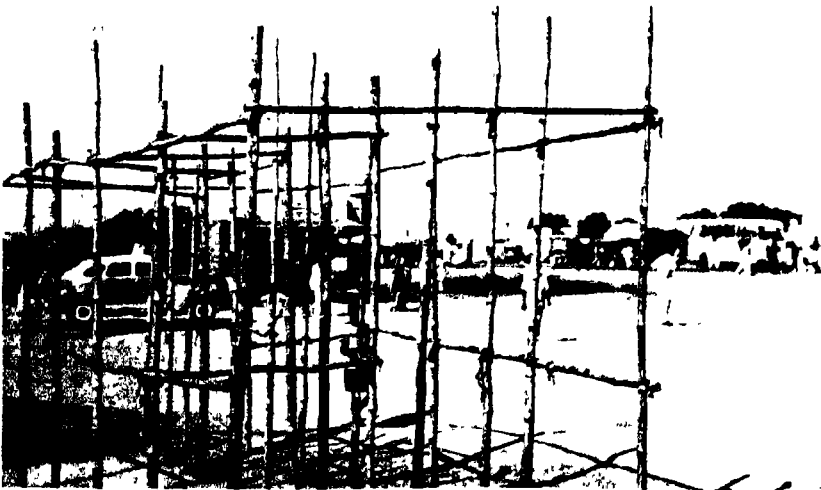
پیشاب خانوں کی تعمیر

قبل ازیں پاکستانی بحریہ کو وقتاً فوقتاً درستی وغیرہ کے لئے دوسرے ملکوں کی گودیوں میں بھیجنے سے جو غیر معمولی اخراجات برداشت کرنے پڑتے تھے۔ ان کا سلسلہ بند ہوگیا ہے اور اس طرح پاکستان کے زرمبادلہ میں خاصی بچت واقع ہوئی ہے۔

حال ہی میں بحریۂ پاکستان نے بے اندازہ ناجائز درآمد شدہ سونے کی بازیابی کا جو کارنامہ سرانجام دیا ہے، وہ حقیقتاً ہماری قوم کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھنے کے قابل ہے اور بحریہ کے روشن پہلوؤں میں ایک اور اضافہ ـــ اور ابھی یہ پہلو اور بھی روشن اور بھی تابناک ہوں گے۔ کیونکہ وطنِ عزیز کے تحفظ و استحکام کے لئے پاکستانی بحریہ اپنی توسیع و ترقی اور عظیم تر خدمات سرانجام دینے کے لئے رات دن کوشاں ہے۔

★

"آندھیاں": ـــــــــ بقیہ صفحہ: (۳۴)

بعد ہی چاٹگام چلے گئے اور اب تک واپس نہیں لوٹے۔ ان کا کوئی خط بھی نہیں آیا۔ میرے آرٹ کی دنیا اب ویران پڑی ہے۔ لیکن یہ کیسی خلش ہے جو اکثر مجھے اُن تنہائیوں میں واپس لے جاتی ہے جب میں نیاز بھائی کو اپنی تصویریں دکھاتی تھی اور وہ مختلف زاویوں سے دیکھتے اور زیرِ لب مسکرا کر تعریفیں کرتے تھے۔ کیا واقعی میں بھی نیاز بھائی کو چاہنے لگی تھی؟ یہ سوال نہ جانے کتنی بار میرے دل میں جاگا اور ہر بار میں خلا میں گھورتی رہ گئی۔ کوئی جواب نہ ملا مجھے اس سوال کا۔ اب نہ میں میں اسکول جاتی ہوں اور نہ تصویریں بنانے میں کوئی مزا آتا ہے۔ اب تو بوڑھی گنگا کی پُرسکون لہریں ہیں جن کے ساتھ میں نہ جانے کہاں کہاں بھاگتی پھرتی ہوں یا پھر ذکیہ باجی کی یہ تصویر جو مجھے بیتی باتیں یاد دلا کر اذیت پہنچاتی رہتی ہے۔

اسٹیمر کی سیٹی پھر سنائی دے رہی ہے اور میری بے قراریاں بڑھتی جارہی ہیں۔ کیا یہ بے قراریاں کبھی ختم بھی ہوں گی؟ شاید کبھی نہیں، کبھی نہیں!

★ ★ ★

"اسلامی تاریخ کا مطالعہ": ـــــــــ بقیہ صفحہ: (۵۲)

روحانی عوامل سے بھی جنم لیتے ہیں۔ اور ہماری جامعات کو گوشۂ خلوت سے نکل کر ایک نئے فلسفۂ تعلیم کی تشکیل کرنی چاہیے جو ہمارے انقلاب کے بنیادی تصور سے ہم آہنگ ہو۔

کوئی انقلاب تبھی معرضِ اظہار میں آسکتا ہے جب کہ یہ ایک نئے نظامِ تعلیم پر مبنی ہو۔ میں کسی ایسے انقلاب کا تصور نہیں کرسکتا جس کے بعد نظامِ تعلیم میں تغیرات رونما نہ ہوئے ہوں۔ مثال کے طور پر انقلاب فرانس یا انقلاب روس، یا پھر ہٹلر ہی کے رجعتی نازی نظام ہی کو لیجئے۔ جو کچھ ترکیۂ جدید میں ہوا وہ بھی درحقیقت ایک انقلاب ہی تھا۔ اسلئے نتیجتہً ایک نئے فلسفۂ تعلیم کی تشکیل ہوئی جس کو اتاترک نے فوراً عملی جامہ پہنادیا۔

لہٰذا میں یہ گذارش کروں گا کہ پاکستانی جامعات کو اب ایک نیا فلسفۂ تعلیم پیدا کرنا چاہئے جو انقلاب کے بنیادی تصورات اور نصب العینؐ سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ وہی جن کی توضیح و تشریح صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خاں نے فرمائی ہے۔ ایک انقلابی حکومت نئی نسل کے نصب العین کے حصول کے لئے نئے نئے مواقع بہم پہنچاتی ہے۔ اسلئے اب یہ ہماری جامعات ہی کا کام ہے کہ وہ نئی پود کا ان امیدوں، تمناؤں، مقاصد اور نصب العین کے حصول کے لئے نیا موقع بہم پہنچائے جو گذشتہ دس سال میں نامساعد حالات کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہوگئے تھے۔

★

آیئے بہتر زندگی اختیار کریں

"کچھ راہِ خدا دے جا...."

پیٹ کی خاطر مرے جاتے ہیں گاگا کر فقیر — کسی مردخدا نے ان الفاظ میں فقیروں کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے - بے شک فقیر لوگ گاگا کر مرے جاتے ہیں - انہیں دن بھر اور کام ہی کیا ہے؟ علی الصباح کہ مردم بہ کاروبار روند، ہمارے گودڑی پوش اللہ کا نام لیکر اٹھتے ہیں اور گلی گلی کوچے کوچے گاگا کر مرے جانے کا ڈرامائی پارٹ ادا کرتے ہیں اور خلق خدا کو خواب غفلت سے جگانے کا نیک کام انجام دیتے ہیں - آپ ہی کہیئے اس سے بہتر کام اور کیا ہوگا - جو آپ کو ثواب دارین کی نعمت سے سرفراز کرے اور سیدھا جنت کو پہنچا دے - اور پھر گانے جیسی انمول چیز جس کو دنیا غذائے روحانی کہتی ہے بالکل مفت، اس قدر فراواں، اس قدر گوناگوں - نہ ریڈیو کی ضرورت نہ قوالی کا بندوبست، نہ جلسوں کی جھنجھٹ نہ مشاعروں کا گورکھ دھندا - اور پھر نہ گھنڈی گھمانے کی زحمت نہ گراموفون کے توے بدلنے کی حاجت - اللہ میاں کے جیتے جاگتے ریڈیو گرام خود بخود توے پر توا بدلتے جاتے ہیں، چلتی پھرتی ٹلیں، بقول شخصے آپ ہی آپ کوک کوک اٹھتی ہیں - چلئے سرود خانہ ہمسایہ سے بھی بے نیازی اور شادی بیاہ کے موقعوں پر نصب شدہ لاؤڈ اسپیکروں سے بھی چھٹی - کیونکہ گدائی موسیقاروں کے غول کے غول سر بازار لہک لہک کر بہ آواز بلند گاتے، ان گنت نغمے بکھیرتے اور موسیقی کی نعمت کو عام کرتے پھرتے ہیں - اللہ کرے زور دہن اور زیادہ! اور یہ لحن داؤدی - دربدر کوچہ بکوچہ شوق غزل سرا - سبحان اللہ! یہ تو اللہ میاں کی خاص دین ہے - جس کو وہ یہ نیاز دے - یہی تو ان درویشوں، ان فقیروں کی سب سے بڑی دولت ہے - اس لئے اس پر نعرض کیوں خصومت کیوں؟ اب جب آواز کا کام ہی یہ ہے کہ وہ گونجے اور زور شور سے گونجے - تو پھر آپ ہی کہیئے فقیر لوگ گاگا کر مرے نہ جائیں تو اور کیا کریں -

اس میں شک نہیں کہ آزادئی جمہور کے زمانہ میں جب ہر شخص کو آزادئی عمل کا حق ہے، فقیروں کو بھی حق ہے، کہ وہ آزادی سے کام لیں اور شہروں کے شور وغل میں خاطرخواہ اضافہ کریں، ان کی چہل پہل کو چار چاند بلکہ ہزار چاند لگائیں - آخر ان کو فن برائے فن اور

غل برائے غل کے حق سے کیوں روکا جائے - مگر اس میں کچھ شک ہے کہ انکا فن واقعی برائے فن ہے یا افادی نظریہ کی وکالت کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ یہ کلاکار واقعی پیٹ کی خاطر گا گا کر مرے جاتے ہیں - شاید ایک حد تک یہ خالص مقصدی پیچ بھی آن پڑتا ہو کیونکہ پیٹ کی علت کس کو نہیں لگی - بیچارے فقیر تو کیا بڑے بڑے بادشاہ بھی اس کمبخت پیٹ کے ہاتھوں لاچار ہیں - لیکن شک ہی نہیں یقین ہے، علم النفس، عین النفس، حق النفس، سب کچھ ان بھکاریوں کے سب جتن پیٹ ہی کے لئے ہوتے ہیں - البتہ گا گا کر مرے جانے کی بات جچتی نہیں - یہ خدا کے بندے — نہیں نہیں پیٹ کے بندے، تو گا گا کر جئیے جاتے ہیں - مر جاتے تو بات ہی کیا ہوتی - وہ تو گا گا کر کھاتے پیتے، ہنستے کھیلتے، ناچتے کودتے، اللہ ہو، اللہ ہو، کے نعرے مارتے، بھنگ چرس چانڈو کے دم لگاتے، چنیا بیگم سے لو لگاتے اور داؤ لگ جائے تو ادھے، سندھی یا تاڑی کے جام پر جام لنڈھاتے ہیں - اور اس طرح مرنے کی بجائے اور بھی دھڑلے سے جئے جاتے ہیں -

فقیروں کے روحانی کمالات تو آج کل کم ہی دیکھنے میں آتے ہیں - بات یہ ہے کہ درویشوں کی قدر و منزلت اور آؤ بھگت کا زمانہ ہی لد گیا - وہ دن گئے جب خلیل خاں زور شور سے فاختائیں اڑایا کرتے تھے - لیکن مادی کمالات کی تو آج بھی بڑی دھوم دھام ہے - ذخیرہ اندوزی کے ماہر عام پبلک میں تو کم ہونگے، البتہ فقیروں میں ان کا ایک سے بڑھ کر ایک مکھیا موجود ہے - سچ پوچھئے تو ہر گودڑی پوش کئی کئی سیٹھوں پر بھاری ہوتا ہے - مال مفت دل بے رحم - دن بھر ٹکے سیدھے کرنے کے علاوہ ان کا کام ہی کیا ہے - اور کن کن ڈھنگوں سے کہ عقل دنگ رہ جائے - اگر کسی فقیر کی جھولی کو جھاڑا جائے تو کچھ عجب نہیں اس سے چھن چھن سکوں پر سکے برسنے لگ جائیں - فقیری کی آڑ لیکر اور نواب کے بھوکے، سادہ لوح انسانوں کی حماقت سے فائدہ اٹھا کر وہ کیا کچھ پاکھنڈ نہیں کرتے - وہ تو یوں سمجھئے پیدائشی بہروپئے ہیں - گداگری کا آرٹ ان کی گھٹی ہی میں پڑا ہے - حق یہ ہے کہ کوئی ماہر اداکار اپنا پارٹ ادا کرنے میں چوک کر بیٹھے تو کر بیٹھے لیکن یہ قدرتی اداکار کبھی نہیں چوک سکتے - ان کا ہر وار سر بہدف ہوتا ہے اور عین نشانے پر جا کر لگتا ہے - جیسے انہوں نے دنیا بھر کا علم النفس گھول کر پی رکھا ہو - وہ خوب جانتے ہیں کہ کونسے

شاہ دولہ کے ”چوہے“

بول، کونسے ہتھکنڈے، کونسی چال ان کےشکار پر عین تیر کی طرح جا کر بیٹھے گی - اور وہ ان کو دیکھتے ہی اپنی انٹی ڈھیلی کر دے گا - اللہ تو خیر سب کا سہارا ہے اور فقیروں کا سب سے بڑا سہارا اور ان داتا ہے - انکے نام پر اپیل بھی بےکار نہیں جاتی کیوں کہ شومئی قسمت سے نام اللہ اپنے سیدھے سادے بندوں کی سب سے بڑی کمزوری بھی ہے اور وہ اس نام پر فوراً پسیج جاتے ہیں - نفسیات کا سب سے بڑا گر تو یہ ہے کہ:

اے دیکھنے والو مجھے ہنس ہنس کے نہ دیکھو
تقدیر کہیں تم کو بھی مجھ سا نہ بنا دے

فلسفہ - بڑے بڑے جگادری، ماہرین نفس تو ان فقیروں کی مردم‌شناسی یعنی نفس‌شناسی کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے - اور وہ دعائیں - خدا کی پناہ! مرد ہیں تو، گھر والی کی خیر، گھر کی خیر، نوکری سلامت - کنواروں کے لئے - سونے کے سہرے - اور خبر نہیں اور کیا کیا کچھ - اور عورتیں ہوں تو گھروالا سلامت - سرتاج سلامت - سہاگ قائم - جوڑی سلامت - دودھوں نہائے پوتوں پھلے - گلے میں بچوں کا ہار - اور پھر دامن پکڑ پکڑ کر، راستہ روک روک کر واسطے، منتیں، التجائیں، بماضے کہ کوئی بہت ہی ہٹ دھرم یا ڈھیٹ ہی ہو تو کچھ دے کر پیچھا نہ چھڑائے ورنہ اکثر تو ایک دو واروں یا پینتروں ہی میں چاروں شانے چت نظر آتے ہیں - اور لطف یہ ہے کہ ان کی دعاؤں سے نہ تو اجڑنے والے سہاگ سلامت رہتے ہیں نہ بچھڑنے والی جوڑیاں قائم رہتی ہیں - نہ مال بڑھتا ہے نہ مرتبہ - نہ عمر لمبی ہوتی ہے نہ بال بچوں میں بڑھوتی - بلکہ شاید الٹا ہی اثر ہو - ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہونا ہے -

اس لئے جتنے بھی غلیظ، پھٹے پرانے کپڑے پہنے جائیں، بلکہ سرے سے پہنے ہی نہ جائیں، جتنا بھی برا حلیہ بنایا جائے، اتنا ہی اچھا ہے - ایک آنکھ ندارد - دو ندارد - ہاتھ غائب، بازو غائب، اور میرے خدا! — ناک غائب! ایک ٹانگ لنگ، دونوں لنگ - رینٹھ بہتی، سر مونچھ داڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے، الجھے ہوئے، گرد میں اٹے ہوئے - بدن برسوں غسل سے محروم میلا چیکٹ، کیچڑ سے لت پت - دق، فالج، کوڑھ کے مارے، غرض کیا کہا جائے اور کیا نہ کہا جائے - جب یہ ساری بھیانک چیزیں موجود ہوں تو کوئی رد بلا کے طور پر ہی سہی، کیوں نہ تھوڑی سی بھیک دے کر اپنی خیر منائے - تو یہ ہے گداگری کی کامیابی کا راز، اس کا

ہم اکثر بری بری جنسوں کی بہتات کا رونا تو روتے ہی ہیں - مثلاً چیونٹیاں، ٹڈیاں، مکڑیاں، تل چٹے وغیرہ وغیرہ - سنتے ہیں بنی اسرائیل پر سات سات بڑی بڑی بلائیں نازل ہوئی تھیں - مگر سچ پوچھئیے تو فقیر ان سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں - چھوٹے فقیر، بڑے فقیر، جوان فقیر، بڈھے فقیر، دبلے پتلے گال دھنسے، لحیم شحیم، کلوں پر کلے چڑھے فقیر، ہٹے کٹے ہیکڑ، ڈھیٹ، دبنگ فقیر، چور، جیب تراش فقیر، مجرم فقیر، یتیموں، بیماروں، کوڑھیوں کے بل بوتے پر جینے والے فقیر اور بڑے بڑے دھنی فقیر - چپ چاپ فقیر، بلند بانگ فقیر، منہ پھٹ فقیر، اکیلا مانگنے والا فقیر، سنگت میں مانگنے والے فقیر - آپ کو یقین آئے نہ آئے لیکن یہ

"کس چیز کی کمی ہے خواجہ تری گلی میں"

حقیقت ہے کہ فقیروں کی بڑی بڑی منظم انجمنیں بھی ہیں۔ صدر بھی ہیں اور سیکرٹری بھی، عہدیدار بھی ہیں اور سالار بھی۔ عالیشان دفتر بھی ہیں اور دفتروں کا ساز و سامان بھی۔ ان کی مجلس شوریٰ بھی ہوتی ہے اور قواعد و ضوابط بھی ہیں۔ لائحہ عمل بھی مرتب ہوتا ہے کہ "شئے للہ" اور "حاضر سائیں" کا سلسلہ کیسے بڑھایا جائے۔ اور قانون کے ماہرین بھی مقرر ہوتے ہیں تا کہ پبلک کی جیبیں خالی کرانے کا منظم بندوبست اور پورا پورا اہتمام کیا جائے۔ صدر، سکرٹری اور دوسرے عہدیدار بڑی بڑی تنخواہیں پاتے اور گلچھرے اڑاتے ہیں۔ اور مسکینوں کے نام پر روپیہ کمانے، انہیں قربانی کا بکرا بنانے اور قربانی کی کھالیں اڑا اڑا کر چوریاں کرنے والے منظم ادارے بھی کچھ کم نہیں۔

سچ پوچھئے تو یہ لوگ سوسائٹی کے جسم پر پھوڑے ناسور ہیں۔ یہ وہ جونکیں ہیں جو چمٹی ہی ہوئی ہیں ہمارا خون چوستی رہتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ بعض سیاسی قسم کے فقیر بھی ہیں جن کی سرپرستی اور خوشنودی کے لئے باقاعدہ کمیشن ملتے ہیں۔ مگر اس سے بڑھ کر ستم ظریفی کیا ہوگی کہ ہم آگے بڑھ بڑھ کر ان کی دستگیری، ان کی پرورش کرتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں کہ یہ ہمارے لئے ثواب ہے۔ حالانکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ جو لوگ واقعی مستحق ہیں۔ ان کی مدد میں تو کوئی برائی نہیں۔ مگر یہ کون جانے کہ مستحق کون ہے۔ گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پیسا جانئے۔ اور پھر مستحق لوگوں کی مدد کے لئے مناسب ادارے بھی تو ہیں۔ فقیروں کو خواہ مخواہ دھیلا دینے کی بجائے ہم ان کی صحیح طریقے سے مدد کیوں نہ کریں۔ ان کو حتی الوسع قوم کا ایک مفید عنصر بنا کر ان سے کام کیوں نہ لیں۔ ان کو مفت کھانے پینے کی بجائے کسب حلال کا خوگر کیوں نہ بنائیں جس کی دین بھی ہدایت کرتا ہے اور دنیا بھی۔

ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ ہماری نئی حکومت نے گداگری کو ایک لعنت تصور کرتے ہوئے اس کی روک تھام شروع کردی ہے اور اب ہمارے کوچہ و بازار دوسرے کوڑے کرکٹ کی طرح اس ناگوار عنصر سے بھی پاک ہوتے جا رہے ہیں۔ اور وہ دن دور نہیں جب حضرت فقیر کا تصور محض ذہن ہی میں کیا جا سکے گا۔ اور وہ بھانت بھانت کی بھیانک آوازیں، طرح طرح کی مکروہ شکلیں جو دن رات ہمارے لئے بلائے جان بنی رہتی ہیں۔ اب خواب و خیال میں بھی دکھائی نہیں دیں گی۔ یہ مارشل لا کی بہت بڑی برکت ہے۔ اور پھر ملک کی عام خوشحالی بھی تو بڑی تیزی سے حالات پیدا کر رہی ہے جن میں گداگری کا امکان ہی محال ہے۔ جب رفتہ رفتہ لوگ محنت و مشقت کے عادی ہو جائینگے تو ان کے دل سے گداگری کا خیال خود بخود دور ہو جائے گا۔ اور معاشرہ میں شدید احساس پیدا ہو جائیگا کہ گداگری کو کسی طرح برداشت نہ کیا جائے۔ پھر نہ قانون امداد گداگری کی ضرورت رہے گی نہ حکومت کی طرف سے کسی اور سخت گیر اقدام کی *

فروری ۱۹۵۹ء
۸ /

ماہِ نو

جلد ۱۲ شمارہ ۲

فروری ۱۹۵۹ء

مدیر رفیق خاور

نائب مدیر ظفر قریشی

سالانہ چندہ :۔ ساڑھے پانچ روپے

فی کاپی :۔ آٹھ آنے ۸/

ادارۂ مطبوعات پاکستان

پوسٹ بکس ۱۰۳ کراچی

اپس کی باتیں

وہ تابانیاں جن کے ساتھ نیا دور طلوع ہوا تھا، بدستور جلوہ گر ہیں۔ بلکہ ان کا فروغ روزافزوں ہے۔ ابھی دورِ انقلاب کا آغاز ہوئے پورے چار مہینے بھی نہیں گزرے، پھر بھی اس قلیل مدت میں قومی زندگی کے ہر شعبے میں جو غیر معمولی اقدامات ہوئے ہیں، ان سے تاریخ کا ایک نیا باب مرتب ہو رہا ہے۔ اور ان کے نتائج جتنے دوررس ہیں اتنے ہی مہتم بالشان بھی ہیں۔ تاہم یہ اپنی قسم کی واحد مثال نہیں ہے۔ برصغیر کے اسلامی دور میں بارہا ایسے فوجی مجاہد پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے انتہائی تنزل و انحطاط کے زمانے میں قوم کو تباہی و بربادی سے نجات دلائی اور اس کے پیکرِ بےجان میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس شمارہ میں ہم اس تاریخی حقیقت کو ایک افسانوی دستاویز کی شکل میں پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ یہ خصوصی پیشکش قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگی۔

★

پاکستان جیسی آزاد اسلامی مملکت میں تعلیم کی نوعیت کیا ہونی چاہئے، یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس پر تمام دیگر امور کے ہماری نوزائیدہ مملکت کے استوار، ترقی پذیر اور جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کا دار و مدار ہے۔ اب جبکہ ہمارا قومی شعور بیدار ہو چکا ہے اور ہمارے ارباب حل و عقد کو جدید مسائل کی اہمیت کا احساس ہے، تعلیم کی نوعیت اور اس کے متعلقات پر بھی توجہ لازم ہے۔ اس سلسلہ میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے کراچی اور ڈھاکہ کے تعلیمی اجتماعات میں جن بصیرت افروز خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اجتہاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور امید ہے کہ بہت جلد اصلاح و تجدید پر مبنی حکمتِ عملی کی شکل میں نتیجہ خیز بھی ثابت ہوں گے۔ لہٰذا اس شمارہ میں ہم صدر پاکستان کی مذکورہ بالا دونوں تقریروں کا ملخص "افق تا افق" کے عنوان کے تحت پیش کر رہے ہیں۔

★

عجیب اتفاق، بلکہ حسنِ اتفاق ہے کہ مرزا غالب کے ایک فارسی قصیدہ "شمار یافت روزگار یافت" کی تشبیب میں جن غیر معمولی واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، وہ ہمارے "نئے دور" کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتے ہیں۔ اور مزید اتفاق یہ ہے کہ فروری کا مہینہ "غالب نامِ آورم" ہی کی یادآوری کے لئے مخصوص ہے۔ بنا بریں جہاں ہم اس یگانہ روزگار شاعر کے بارہ میں چند خصوصی نگارشیں پیش کر رہے ہیں، خاص طور پر اس کی طویل ترین و اہم ترین مثنوی "ابرِ گہربار" کے ایک حصہ "بیانِ معراج" کا منظوم ترجمہ؛ وہاں مذکورہ قصیدہ کی تشبیب کے چند منتخب اشعار بھی نقل کر رہے ہیں۔ "بیانِ معراج" کے سلسلہ میں یہ امر بھی خصوصیت سے قابل لحاظ ہے کہ معراج شریف کا واقعہ بھی اسی مہینہ میں شرف صدور پا چکا تھا۔

★

جیسا کہ ہم پچھلے شمارہ میں اعلان کر چکے ہیں، "ماہ نو" کا مارچ کا شمارہ خاص نمبر ہوگا۔ ادارہ کی انتہائی کوشش ہوگی کہ اس کو ہر اعتبار سے ہماری قومی زندگی کا آئینہ دار بنایا جائے۔ اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارے قلمی معاونین، ارباب فن اور دیگر زمرہ فرماؤں سے بھی ہے کہ وہ اس کو ایک قومی فرض اور خدمت سمجھتے ہوئے اس میں انتہائی ذوق و شوق سے شریک ہوں گے۔ سوال محض "نئے دور" کے اہم پہلوؤں کو ہی اجاگر کرنا نہیں، گرچہ موجودہ اجتہادات اس کا ایک وقیع حصہ ہوں گے، بلکہ یہ بھی ہے کہ اس "ہنگامِ بادآورد" کو حیلہ کار بناتے ہوئے زندگی کے تمام شعبوں میں وہ روح دوڑائی جائے اور اصلاح و تجدید کے ایسے موثر و متحرک عوامل کی نشان دہی کی جائے جو موجودہ نشاۃ الثانیہ کو وسیع ترین معنوں میں نشاۃ الثانیہ اور قومی عروج و ترقی کے دیرینہ خوابوں کی بہترین تعبیر بنا دیں۔ بالفاظ دیگر یہ ہماری ملت کے تمام عناصر کو دعوت ہے کہ وہ اپنی بہترین فکری و عملی صلاحیتوں اور ادبی و فنی جوہروں کو اذن نمود دیں۔ اور ان بلندیوں کو چھو لیں جو ہماری دنیوی و دینی، مادی و روحانی زندگی کی معراج ہیں۔

سرورق: شاہی مسجد لاہور کی دیواروں پر رنگین نقاشی

غالب کے خطوط کی تاریخیں اور ترتیب

سید قدرت نقوی

مرزا غالب کے خطوط ان کی زندگی ہی میں وقعت کی نظر سے دیکھے جانے لگے تھے چنانچہ سب سے پہلے منشی شیو نرائن نے غالب کو خطوط کی اشاعت کے متعلق لکھا جس کے جواب میں مرزا صاحب نے ۱۸ نومبر ۱۸۵۸ء کے مکتوب میں اشاعت کی مخالفت کی اور اس کو "زائد بات" کہہ کر ٹال دیا منشی ہرگوپال تفتہ نے بھی انہی ایام میں اشاعتِ خطوط کے متعلق لکھا اور کافی زور دیا۔ تفتہ کو بھی مرزا صاحب نے ۲ نومبر ۱۸۵۸ء کے خط میں صاف جواب دے دیا اور لکھ دیا: "رقعات کے چھاپے جانے میں ہماری خوشی نہیں ہے، لڑکوں کی سی ضد نہ کرو۔"

دو سال بعد منشی عبدالغفور سرور مارہروی اور منشی ممتاز علی خاں میرٹھی نے غالب کو بغیر خبر کئے خطوط کی اشاعت کا ارادہ کر لیا، سرور نے اس کا نام "مہرِ غالب" رکھا اور دیباچہ بھی لکھ کر خاں صاحب کو دیدیا۔ ابھی طباعت کا کام شروع نہ ہوا تھا کہ ممتاز علی خاں کو پتہ چل گیا کہ منشی غلام غوث بیخبر بھی ایک مجموعۂ مکاتیب مرتب کر رہے ہیں۔ یہ کام غالب کی اجازت اور امداد سے ہو رہا تھا، ان سے رابطہ قائم کر کے ممتاز علی خاں نے ان کے جمع کردہ خطوط بھی منگا لئے اور "عودِ ہندی" کے نام سے شائع کرنے کی کوشش کی جانے لگی لیکن طباعت میں تاخیر ہوئی۔ احباب کا تقاضہ ہوا تو غالب نے خود اشاعتِ خطوط میں "اکمل المطابع" دہلی کے کارپردازان کا ہاتھ بٹایا اور خطوط کی نقول فراہم کیں۔ اس مجموعہ کا نام "اردوئے معلیٰ" قرار پایا۔

ان حضرات کے پیشِ نظر خطوطِ غالب کے وہ اہم پہلو نہیں تھے جو آج ہیں۔ اسی بنا پر "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں ترتیب کا کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ "اردوئے معلیٰ" میں صرف ایک نظریہ کارفرما تھا کہ سہل خطوط ابتدا اور مشکل خطوط آخر میں ہوں۔ چنانچہ یہی ترتیب ایک مدت تک قائم رہی مجیدی پریس کانپور میں جب "اردوئے معلیٰ" ۱۹۲۲ء میں طبع ہوئی تو مولوی محمد منیر صاحب نے حصہ اول و دوم کو یکجا کر کے ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے یکجا جمع کر دیئے، لیکن "اردوئے معلیٰ" مطبوعہ لاہور میں وہی قدیم ترتیب قائم رہی البتہ ضمیمہ میں کچھ خطوط کا اضافہ ہو گیا جو قدر بلگرامی اور لطیف احمد بلگرامی کے نام ہیں۔ یہ خطوط مولانا حسرت موہانی کے رسالہ "اردوئے معلیٰ" سے نقل کئے گئے ہیں لیکن مرتب شیر محمد سرخوش صاحب نے کوئی حوالہ درج نہیں کیا۔

منشی مہیش پرشاد اور ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے کچھ خطوط تاریخی اعتبار سے ترتیب دیکر "خطوطِ غالب" کے نام سے طبع کرا لئے۔ مولانا غلام رسول صاحب مہر نے "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" کی ترتیب بدل کر ہر مکتوب الیہ کے نام کے جملہ خطوط بلحاظ تاریخ مرتب کر کے "خطوطِ غالب" کے ہی نام سے دو جلدوں میں طبع کرائے۔ جن میں چند خطوط ایسے بھی ہیں جو "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں نہیں تھے، بلکہ مختلف رسائل میں شائع ہوئے تھے۔

مندرجہ بالا کوششوں کے باوجود اب تک خطوطِ غالب میں ترتیب کی غلطیاں پائی جاتی ہیں متن میں لفظی اور تاریخی غلطیاں کافی تعداد میں موجود ہیں۔ تاریخی ترتیب اور صحت کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے۔ اگر مکمل صحت کے ساتھ تاریخی ترتیب قائم ہو جائے تو ہمیں بعض تاریخی واقعات کا صحیح طور سے اندازہ ہو سکتا ہے مثلاً جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد دہلی اور اہلِ دہلی پر جو ظلم و ستم کئے گئے، ان پر کما حقہ روشنی پڑ سکتی ہے۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے "غالب کا روزنامچہ" خطوطِ غالب سے مرتب کیا تھا لیکن خطوط کی تاریخی ترتیب درست نہ تھی۔ اسی وجہ سے واقعاتی تسلسل اس میں برقرار نہ رہ سکا۔

غالب کے جملہ خطوط پر اگر نظر ڈالی جائے تو بلحاظ تاریخ حسب ذیل نوعیت رکھتے ہیں:

(۱) وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت ہے۔

ا۔ صحت تاریخ کا قرینہ موجود ہے۔

ب۔ صحتِ تاریخ کا کوئی قرینہ موجود نہیں۔

(۲) وہ خطوط جن پر تاریخ ثبت نہیں ہے۔

ا۔ تعینِ تاریخ کا قرینہ موجود ہے۔

ب۔ تعینِ تاریخ کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے۔

خطوط کی مندرجہ بالا نوعیتوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے چند خطوط پر بطورِ مثال روشنی ڈالی جاتی ہے۔

"اردوئے معلیٰ" میں سیف الحق منشی میاں داد خاں سیاح دوسرے مکتوب الیہ ہیں۔ ان کے نام کل ۳۵ خط ہیں۔ صرف ایک خط کے علاوہ تمام خطوط پر تاریخ درج ہے۔ یہ ۱۱ جون ۱۸۶۰ء سے ۱۵ اگست ۱۸۶۶ء تک لکھے گئے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے جب ان خطوط کو مرتب کیا گیا ہے تو دن کے خط الگ کر کے ترتیب قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن دشواری یہ پیش آتی ہے کہ دن اور تاریخ بعض خطوط پر درج نہیں [illegible] ۳۳ [illegible] معلیٰ کانپور ۲۸ اسی قسم کا خط ہے۔ اس کی تاریخ غالب نے اس طرح تحریر کی ہے: "سہ شنبہ ۱۱ محرم ۳۱ جولائی سال حال" سنین ہجری و عیسوی تقویم یا دیگر خطوط کی مدد سے متعین کئے جا سکتے ہیں کہ ۱۸۶۰ء اور ۱۲۷۷ھ ہیں۔ اسی نوعیت کا ایک اور خط ۷ "اردوئے معلیٰ کانپور" ہے جس کی تاریخ "صبح سہ شنبہ ۲۰ ذی قعدہ ۲۰ مئی" مطبوعہ ہے لیکن "اردوئے معلیٰ لاہور" اور "خطوطِ غالب لاہور" میں "شنبہ ۲۰ ذی قعدہ ۲۰ مئی" طبع ہوا ہے جس میں صفر اور سہ شنبہ کا لفظ "سہ" مندرج نہیں جو ابتداءً کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے بعد کو کسی نے غور نہ کیا اور یہ غلطی آج تک برقرار رہی۔ اگر تقویم کی مدد لی جائے تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ ۱۸۶۲ء اور ۱۲۷۸ھ میں مئی و ذی قعدہ کی تاریخیں یکساں تھیں اور ۲ مئی کو ۱۸۶۲ء میں جمعہ واقع ہوتا ہے، شنبہ نہیں اور ۲۰ مئی کو سہ شنبہ واقع ہوتا ہے۔ اس لئے "اردوئے معلیٰ کانپور" میں تاریخ صحیح ہے۔

خط ۱۹ "اردوئے معلیٰ کانپور" ایسا خط ہے جس پر کوئی تاریخ طبع نہیں ہوئی ہے۔ "خطوطِ غالب لاہور" میں اس کا نمبر ۵ ہے اور اس کو خط ۵ مورخہ ۱۲ فروری ۱۸۶۱ء اور خط ۶، ۲۷ فروری کے درمیان قرار دیا ہے۔ اس خط میں یہ ایک فقرہ تعینِ تاریخ میں مدد دیتا ہے:

"تذکیر و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سے مشورہ کر لیا کرو اور دیتے ہوئے حروف بھی ان سے پوچھ لیا کرو۔"

فاضل مرتبِ خطوطِ غالب نے اسی فقرہ کو اساس قرار دے کر ۱۲ فروری کے خط کو مقدم اور اس کو موخر قرار دیا لیکن یہ خط ۱۲ فروری سے پہلے کا ہے کیونکہ: (۱) غالب نے ۱۲ فروری اور ۲۷ فروری کے خطوط میں رجب علی بیگ سرور کا ذکر کیا ہے۔ اول الذکر میں بھی مشورہ کے متعلق لکھا ہے اور موخر الذکر میں سیاح کی غلط فہمی دور کی ہے۔ ان تینوں خطوط کے فقرے علی الترتیب درج ذیل ہیں:

۱۔ "تذکیر و تانیث کے باب میں مرزا رجب علی بیگ سے مشورہ کر لیا کرو اور دیتے ہوئے حروف بھی ان سے پوچھ لیا کرو۔" (خط بغیر تاریخ)

۲۔ "مادہ تاریخ آ سکتا ہے لیکن الف دینا پڑتا ہے۔ خدا کے واسطے اس کی تدبیر رجب علی بیگ صاحب سے بھی سرور پوچھنا۔" (۱۲ فروری ۱۸۶۱ء)

۳۔ "بھائی میرے تم کو یہ نہیں کہا کہ تم مرزا رجب علی بیگ کے شاگرد ہو جاؤ اور اپنا کلام ان کو دکھاؤ۔ میں نے یہ کہا ہے کہ تذکیر و تانیث کو ان سے پوچھ لیا کرو۔" (۲۷ فروری)

خط ۱۹ کی مدد سے خط ۲۳ کا سن بآسانی متعین ہو سکتا ہے اور اگر فقرات پر گہری نظر ڈالی جائے تو خط ۱۹ کو خط ۲۳ سے مقدم تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ پہلے فقرہ میں صرف تاکید ہے اور دوسرے میں تاکید پر زور دیا ہے۔ اسی تاکیدِ مزید کو سیاح اشارہ شاگردی پر محمول کر بیٹھے اور غالب سے معلوم کیا کہ کیا کلام بھی "ان کو دکھایا کروں" جس کا جواب غالب نے خط ۲۳ میں دیا۔ بادی النظر میں خط ۱۹ خط ۲۳ ہی سے مقدم معلوم دیتا ہے کیونکہ دونوں میں "تذکیر و تانیث" کا ذکر ہے اور اسی سے یہ سہو واقع ہوا لیکن تاکید در تاکید مزید پر غور کیا جائے تو ترتیب بالا ہی درست ہے۔ (۲) اس خط کو اول قرار دینے کے لئے ایک خارجی پہلو یہ ہے کہ غالب کے زمانہ میں ڈاک کا انتظام اتنا عمدہ نہ تھا جتنا آج کل ہے۔ اس زمانہ میں دہلی سے سورت تک سفر تین چار شبانہ روز میں طے ہوتا تھا (خط ۲۶ بنام غلام بابا) ڈاک کا ہفتہ بھر میں پہنچنا یقینی امر ہے۔ غالب نے خود سیاح کو ایک خط کے ملنے کی اطلاع اس طرح دی ہے: "تمہارا خط مرقومہ ۳۰ اگست پرسوں بروز جمعہ ۸ ستمبر ۱۸۶۵ء کو پہنچا۔" گویا یہ خط سورت سے دہلی دس دن میں آیا۔ اگر ہم ایک ہفتہ اوسط مقرر کریں تو ۱۲ فروری کا تحریر کردہ خط ۱۹ یا ۲۰ فروری تک

سیاح کے پاس پہنچا۔ اگر سیاح نے فوراً جواب لکھ دیا ہو تو غالب کے پاس ۲۶ یا ۲۷ فروری تک پہنچا ہوگا چنانچہ اسی تخمینہ کے مطابق ۱۲ فروری کے بعد ۲۷ فروری کا خط موجود ہے۔ درمیان میں خط کا بھیجنا قرینِ قیاس نہیں۔ سیاح اس زمانہ میں بنارس میں تھے، وہاں سے بھی ڈاک ایک ہفتہ سے پہلے نہیں آسکتی۔ نیز ۳۱ دسمبر ۱۸۶۰ء کے خط کے بعد یہ خط ہے جو غالباً ۲ جنوری کو لکھا گیا ہوگا، لہٰذا یہ خط جنوری ۱۸۶۱ء کے عشرۂ ثانی کا قرار پاتا ہے اور ترتیب میں اس کا پانچواں نمبر ہے۔

خط ۲۵ "خطوط غالب" جلد دوم ص۶۷ کی تاریخ ۱۷ جون ۱۸۶۶ء طبع ہے۔ "اُردوئے معلیٰ" کانپور اور لاہور میں تاریخ کے ساتھ دن سہ شنبہ بھی چھپا ہے "خطوط غالب" میں نہ معلوم کس بنا پر دن کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ سنہ تینوں کتابوں میں غلط چھپا ہے۔ اس خط کی صحیح تاریخ، سہ شنبہ ۱۷ جون ۱۸۶۲ء ہے۔ دو اور چھ کے ہندسے میں غلطی کا قوی امکان ہے۔ ناقل یا کاتب نے دو کو چھ سے بدل دیا اور یہ غلطی برقرار رہی۔ اس خط کی تاریخ متعین کرنے کے سلسلہ میں امورِ ذیل پر نظر رکھی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ خط ۱۸۶۲ء ہی کا ہے :۔

(۱) سہ شنبہ ۱۷ جون کو ۱۸۶۲ء میں واقع ہوتا ہے۔ غالب کی حیات میں اور کسی سنہ میں واقع نہیں ہوا جب سے کہ سیاح سے تعلقات قائم ہوئے البتہ ۷ جون سمجھ لیا جائے تو ۱۸۶۴ء اور ۲۷ جون خیال کر لیں تو ۱۸۶۵ء مطابقت کی جا سکتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ دوئی قرینہ موجود نہیں، تاریخ اور دن کے ہر امکانی اختلاف کو سامنے رکھ کر اگر کوشش کریں تو ۱۸۶۶ء سے کسی طرح بھی مطابقت نہیں ہوتی۔

(۲) خط زیر بحث میں بریلی سے آموں کا آنا بیان کیا گیا ہے۔ جنوں بریلوی کے نام کے خطوط میں ۱۸۶۲ء میں ۲۸ جون کو اکیس بیس آموں کا پہنچنا بیان کیا گیا ہے (خط ۲۲ بنام جنوں)، اور سیاح کے خط میں دو سو آم غالب نے وصول پائے جس میں کل تراسی آم اچھے اور ایک سو سترہ خراب نکلے۔ ۸ جون ۱۸۶۶ء کو (خط ۲۸ بنام جنوں بریلوی) آم ملنے کی اطلاع پھر جنوں کو دی گئی ہے: "جمعہ کے دن ۸ جون کو دوپہر کے وقت کہار پہنچا"۔ ۸ جون جمعہ کے دن ۱۸۶۶ء میں واقع ہوتی ہے لیکن غالب سیاح کو لکھتے ہیں: "لے لو آج بریلی سے ایک بہنگی ایک دوست کی بھیجی ہوئی آئی" گویا ۱۷ جون کو آم ملے، لہٰذا یہ خط ۱۸۶۶ء کا نہیں، کیونکہ جنوں کو ۸ جون کو خط لکھا گیا آم ۸ کو وصول ہوئے ۱۷ جون کو نہیں۔

(۳) خط زیر بحث میں غالب نے سیاح کو میر غلام بابا کے متعلق لکھا ہے: "میر غلام بابا خانصاحب واقعی ایسے ہی ہیں جیسا تم لکھتے ہو، سیاحت میں دس ہزار آدمی تمہاری نظر سے گزرا ہوگا۔ اس گروہ کثیر میں جو تم ایک شخص کے مداح ہو تو وہ شخص ہزاروں میں ایک ہے لاریب فیہ"۔ میر غلام بابا سے ۱۸۶۳ء میں غالب کی خط و کتابت شروع ہو گئی تھی۔ (خط ۱ بنام غلام بابا) اور ۱۸۶۶ء تک میر صاحب غالب کی امداد بھی کر چکے تھے۔ (خط ۱۱ بنام غلام بابا) ان حالات کی روشنی میں یہ عبارت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ غالب خود مداح تھے اور سیاح کا تین چار سال بعد مداح ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ سیاح سورت میں میر غلام بابا کے پاس مئی ۱۸۶۲ء میں پہنچے (خط ۱۱ بنام سیاح) جون کے اوائل میں سیاح نے خط لکھا جس میں غلام بابا کی تعریف لکھی۔ غالب نے اس کے جواب میں یہ خط لکھا۔ بنا بریں یہ خط سہ شنبہ ۱۷ جون ۱۸۶۲ء کا ہے ۱۸۶۶ء کا نہیں اور ترتیب میں اس کا نمبر ۱۲ ہونا چاہیئے۔

اسی طرح خط ۲۷ "خطوط غالب" جلد دوم کی تاریخ سہ شنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۶۶ء درج ہے۔ اس خط کا سنہ بھی غلط چھپا ہے ۱۸۶۲ء ہونا چاہیئے۔ وجوہ درج ذیل ہیں :۔

۱۔ سہ شنبہ ۱۸ نومبر ۱۸۶۲ء کے مطابق ہے، ۱۸ نومبر ۱۸۶۶ء کو دن یکشنبہ واقع ہوتا ہے۔

۲۔ خط ۲۸ بنام سیاح محررہ ۳ جنوری ۱۸۶۲ء میں تحریر ہے: "ربیع الاول میں تمہارا خط آیا۔ ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الثانی، رجب، آج شعبان کی ۲۶ ہے۔ صبح کے وقت یہ خط لکھ رہا ہوں، ۸ بج گئے ہیں۔ اس وقت تک نہ کوئی تمہارا خط آیا، نہ کوئی نواب صاحب کا عنایت نامہ۔ واسطے خدا کے میرے اس خط کا جواب جلد لکھو"۔ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط کو آئے ہوئے تقریباً پانچ ماہ گزر چکے ہیں، خط ۲۶، ۵ ستمبر ۱۸۶۱ء کا تحریر کردہ ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے سیاح کے خط کا جواب دیر سے دیا ہے، فوراً نہیں۔ نیز سیاح کا خط ربیع الاول کے آخر میں آیا ہوگا۔ بہرحال ان خط کے حساب سے یہ عرصہ تقریباً درست ہے نومبر کے خطِ زیر بحث کی موجودگی میں غالب کا یہ کہنا بے معنی ہو جاتا ہے کہ تمہارا اور نواب صاحب کا کوئی خط آج بھی نہیں آیا۔ حالانکہ خطِ زیر بحث میں غالب نے خود لکھا ہے: "پہلا خط تمہارا مع قصیدہ پہنچا"۔ یعنی اس خط سے پہلے بھی ایک خط مع قصیدہ آچکا تھا۔ لہٰذا یہ خط ۱۸۶۱ء کا نہیں ہے۔

۳۔ خط ۲۶ بنام سیاح میں تصویر کا ذکر ہے اور جشن میں شرکت سے معذوری کا اظہار ہے۔ اس خط ۲۷ مورخہ ۱۸ نومبر میں، ان میں سے کسی ایک کا بھی

ذکر نہیں حالانکہ ۱۴ نومبر ۱۸۶۶ء کو میر غلام بابا کے خط ۳۲ میں شرکتِ جشن سے معذوری کا بیان بصراحت موجود ہے۔ نیز خط کے آخر میں سیاح کو مخاطب کرکے تصویر کے متعلق لکھا ہے: "ایک میرے دوست معصوم علی [illegible] کرا کے بھیج دیئے ہیں۔ وہ آجائیں تو تمہاری تصویر تمام ہوکر آپ کے پاس بھیج جائے"

وجوہ مندرجہ بالا کی بنا پر یہ خط سہ شنبہ ۱۰ نومبر ۱۸۶۲ء کا ہے ۱۸۶۶ء کا نہیں اور اس کا نمبر ۳ ہے ۲۵ نہیں۔

خط ۲۲ خطوطِ غالب جلد دوم کی تاریخ یکم مارچ ۱۸۶۶ء درج ہے لیکن اردوئے معلی کانپور اور لاہور میں تاریخ کے ساتھ دن سہ شنبہ طبع ہوا ہے۔ یہ خط بھی ۱۸۶۶ء کا نہیں ہے بلکہ ۱۸۶۴ء کا ہے۔ سن کی تبدیلی سہو کاتب کے سبب واقع ہوئی جس کی طرف بعد کو کسی نے غور نہیں کیا اور یہ برقرار رہی۔

اس سلسلہ میں وجوہ ذیل ملاحظہ فرمائیے:

۱۔ "اردوئے معلیٰ" کانپور اور لاہور میں بھی دن سہ شنبہ طبع ہوا ہے۔ دن کی جب تاریخ سے مطابقت کی جاتی ہے تو ۱۸۶۴ء برآمد ہوتا ہے۔

۲۔ اسی خط میں غالب نے سیاح کو لکھا ہے: "بہت دن سے مجھ کو خیال تھا کہ مولانا سیاح نے مجھ کو دھیان [illegible] کیا کل ناگاہ تمہارا خط پہنچا۔" حالانکہ ۱۸۶۶ء میں [illegible] کی بلیات کے سلسلہ میں غالب اور سیاح کی خط و کتابت جلد جلد ہو رہی تھی۔ ۲۰ فروری ۱۸۶۶ء کو سیاح کا خط ملا اور ۲۱ فروری ۱۸۶۶ء کو غالب نے جواب دیا (خط ۲۳) اور لکھا: "[illegible] آپ کا عنایت نامہ [illegible]" لیکن زیر بحث خط میں غالب کہتے ہیں "تمہارا کوئی خط [illegible] پہنچا" ۲۲ فروری کو غالب نے وہ لکھا [illegible] ان کو لکھ کر جواب مانگا تھا [illegible] ۱۲ فروری کو [illegible] خط نہیں آیا۔ [illegible] ۱۸۶۶ء نہیں ہے بلکہ ۱۸۶۴ء ہے کیونکہ [illegible] ۱۸۶۳ء خط ۲۱ کے بعد یکم مارچ ۱۸۶۴ء تک ایک طویل عرصہ ہے جس میں خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہے۔

۳۔ اگر [illegible] خط کے زمانہ کو پیش نظر رکھا جائے تو [illegible] واضح ہے کہ [illegible] کے بعد [illegible] بغیر کسی خاص وجہ کے نہیں لکھا جاسکتا کیونکہ ۲۱ فروری کا لکھا ہوا خط یکم مارچ تک تو شاید سیاح کو بھی نہ ملا ہو [illegible] جواب لکھتے۔ پھر ۲۲ مارچ کا خط موجود ہے جو اس ثبوت ہے کہ یکم مارچ کا خط اس زمانہ سے متعلق نہیں ہے بلکہ کسی دوسرے سال سے تعلق رکھتا ہے۔ [illegible] تلاش کیا جائے تو ۱۸۶۴ء برآمد ہوتا ہے۔

۴۔ اگر خطوط ماقبل و مابعد پر گہری نظر ڈالی جائے تو ۲۳ جنوری، ۲۱ فروری، ۲۲ مارچ کے خطوط کی عبارت میں ربط و تسلسل معنوی موجود ہے۔ ۲۲ مارچ ہی کو ایک خط غلام بابا کو لکھا ہے۔ اس کے اور سیاح کے خط کے مضمون میں یک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے لیکن یکم مارچ کے خط کی عبارت خود بتا رہی ہے کہ میرا مقام یہ نہیں ہے۔

مندرجہ بالا شواہد کی بنا پر یہ خط یکم مارچ ۱۸۶۴ء کا ہے سہ شنبہ کی اسی سنہ میں مطابقت ہوتی ہے۔ ترتیب میں اس کا نمبر ۱۵ ہونا چاہیئے۔

خط ۳۵ خطوطِ غالب جلد دوم ص ۵۰ کی تاریخ ۲۵ جنوری ۱۸۶۸ء طبع ہوئی ہے۔ "احوالِ غالب" ص ۲۲۹ پر مختار الدین آرزو نے بھی ۱۸۶۸ء لکھا ہے۔ اردوئے معلیٰ مطبعہ لاہور میں بھی ۱۸۶۸ء درج ہے۔ اس خط کی تاریخ کے سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اردوئے معلیٰ کے پہلے نسخہ مطبوعہ اکمل المطابع دہلی ۱۲۸۵ھ (۱۸۶۹ء) میں اس کا سنہ ۱۸۶۷ء طبع ہوا (بشکریہ مولانا عرشی) اور اردوئے معلیٰ کانپور میں بھی ۱۸۶۷ء چھپا ہے لیکن ۱۹۲۰ء میں جب شیخ مبارک علی نے "اردوئے معلیٰ" طبع کرائی تو ۱۸۶۷ء ۱۸۶۸ء سے بدل گیا۔ خطوطِ غالب اور احوالِ غالب میں اسی نسخہ سے تاریخ نقل ہوئی۔ "اردوئے معلیٰ" دہلی اور کانپور سے قطع نظر کرتے ہوئے خط کی عبارت پر غور کیا جائے تو بوجوہ ذیل ۱۸۶۷ء ہی کے نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

۱۔ خط مذکورہ میں سب سے پہلا فقرہ "صاحب تمہارے خط کے پہنچنے سے کمال خوشی ہوئی" خط ماسبق یعنی خط ۲۸، ۳ جنوری ۱۸۶۷ء کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں غالب نے لکھا تھا "ربیع الاول میں تمہارا خط آیا تھا۔ . . . . . اس وقت تک نہ کوئی تمہارا خط آیا، نہ کوئی نواب صاحب کا عنایت نامہ۔"

۲۔ خط ۲۸، ۳ جنوری میں ٹوپیوں کی ترسیل مذکور ہے۔ زیر بحث خط میں انہی ٹوپیوں کے متعلق غالب نے لکھا: "ٹوپیاں اگرچہ تمہارے سر پر ٹھیک نہ آئیں لیکن ضائع نہ گئیں، میرے شفیق اور تمہارے مربی کے صرف میں آئیں۔" آخر میں پھر ٹوپیوں کے متعلق لکھتے ہیں "نواب صاحب کو میرا سلام کہنا اور میری زبانی کہنا کہ ٹوپیوں کو میرا ارمغان سمجھنا، سیف الحق کی نذر تصور نہ کرنا۔" اس کے بعد خط ۲۹، ۱۲ فروری ۱۸۶۷ء میں جبکہ سیاح کو یہ امر ناگوار گزرا ہوگا

کہ ٹوپیاں میں نے نذر کیں اور وہ "ارمغانِ غالب" بن گئیں تو ٹوپیوں کی حقیقت معلوم کی۔ غالب نے لکھا: "صاحب ٹوپیوں کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے "لطائفِ غیبی" کی پندرہ جلدیں سات روپے آٹھ آنے دام بھیجکر منگوائیں، پھر دو روپے کے ٹکٹ بھیجکر ٹوپیاں منگوائیں۔ میں نے تمہارے بھیجے ہوئے روپیوں کی لطائف خرید کر تم کو بھیجدیں۔ چاہو تم پہنو، چاہو چھوٹے صاحب کی نذر کرو۔" ٹوپیوں سے متعلق تینوں خطوط کے فقرات میں ربط و تسلسل ہے۔ بالخصوص ۲۵ جنوری اور ۱۲ر فروری کے خط سے ارمغان و نذر کا تعلق بدرجۂ اتم ظاہر ہے۔ غالب شاید اس خط کا جواب زیادہ سختی سے دیتے لیکن "چاہو تم پہنو چاہو چھوٹے صاحب کی نذر کرو" لکھ کر معاملہ ختم کردیا، کیونکہ اسی زمانہ میں سیاح کے نام سے ایک اعتراض قتیل پر شائع کرایا تھا۔ اس وجہ سے یہ معاملہ ختم کرنا پڑا کہ سیاح ناراض نہ ہوجائیں۔

۳۔ خط مذکورہ میں تعین سنہ کے لئے ایک اور قرینہ بھی پایا جاتا ہے جس نے غالباً مؤلف "احوالِ غالب" کو مغالطہ میں ڈالا یعنی تصویر کا ذکر "مصور سے سخت عاجز ہوں، وعدہ ہی وعدہ ہے وفا کا نام نہیں"۔ سیاح نے تصویر کی فرمائش ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء سے قبل کی تھی جس کا جواب غالب نے خط نمبر ۲۶ مورخہ ۵ ستمبر ۱۸۶۶ء میں دیا، بعد ازاں ۱۴ر نومبر ۱۸۶۶ء کو میر غلام بابا کے خط نمبر ۷ میں سیاح کو سلام لکھنے کے بعد لکھا: "ایک میرے دوست مصور، خاکسار کا خاکہ اتار کر دربار کا نقشہ اتارنے کو اکبرآباد گئے ہیں، وہ آجائیں تو شغل تصویر تمام ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے۔" جنوری میں پھر تقاضہ ہوا تو غالب نے مذکورہ بالا خط ۲۵ جنوری میں اس کا جواب دیا۔

اس کے بعد خط نمبر ۳۳ مورخہ ۱۱ر جون ۱۸۶۷ء میں تصویر کے متعلق تحریر فرمایا: "تصویر کا حال یہ ہے کہ ایک مصور صاحب میرے دوست میرے چہرے کی تصویر اتار کر لے گئے۔ اس کو تین مہینے ہوئے آج تک بدن کا نقشہ کھینچنے کو نہیں آئے۔ میں نے گوارا کیا آئینہ پر نقشہ اتروانا بھی۔ ایک دوست اس کام کو کرتے ہیں، عید کے دن وہ آئے تھے، میں نے ان سے کہا کہ بھائی میری شبیہ کھینچ دو، وعدہ کیا تھا کہ کل نہیں تو پرسوں اسباب کھینچنے کا لیکر آؤں گا۔ شوال، ذی قعدہ، ذی الحجہ، محرم، یہ پانچواں مہینہ ہے آج تک نہیں آئے۔" اس تحریر سے ظاہر ہے کہ مصور تین مہینے سے اور فوٹوگرافر پانچ مہینے سے نہیں آیا۔ حالانکہ ایک مصور نومبر ۱۸۶۶ء میں خاکہ اتار چکا تھا جو یقیناً دوسرا تھا۔ کیونکہ اگر پہلے مصور کا ذکر ہوتا تو عرصہ آٹھ ماہ کا ہوتا ہے، تین ماہ کا نہیں۔ پہلے مصور نے وعدہ پورا نہ کیا جس کا ذکر ۲۵ جنوری کے خط میں ہے تو پہلے فوٹو بنوانے کی کوشش کی، اس کے بعد کسی دوسرے مصور سے تصویر بنوانا چاہی۔ اس نے بھی یہ کام ادھورا چھوڑا۔ اگر یہ خط ۱۸۶۸ء کا ہوتا تو اس میں بھی مصور کے ساتھ ساتھ فوٹوگرافر کا ذکر ہوتا جبکہ غالب کی آخری تصویر فوٹوگراف ہی ہے جو سیاح کو غالباً اگست ۱۸۶۸ء میں بھیجی گئی تھی۔

۴۔ غالب نے فروری ۱۸۶۷ء میں ایک اعتذار "اکمل الاخبار" میں شائع کرایا تھا جس کے متعلق سیاح سے ۲۹ر اپریل ۱۸۶۷ء خط نمبر ۳۲ میں استفسار کیا ہے۔ اس کے بعد غالب کے اکثر و بیشتر خطوط میں ذکرِ پیری و ضعف بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ خط نمبر ۳۴ مورخہ ۲۵ر اگست ۱۸۶۷ء کا خط پڑھا جائے، اس کے بعد اس خط کو پڑھا جائے تو دونوں کے طرز تحریر میں زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ پہلے میں حزن و یاس کا عالم ہے اور دوسرے میں غالب کی طبعی شوخی موجود ہے۔ عبارت بھی شگفتہ ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ غالب کی صحت نے جواب دیدیا تھا، وہ خود خط تک نہیں لکھ سکتے تھے، شوخیٔ طبع بالکل مفقود تھی جس کا اندازہ ۲۵ر اگست کے خط سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے لیکن اس ۲۵ جنوری کے خط میں شوخی نمایاں ہے۔ بنا بریں یہ خط ۱۸۶۷ء کا ہے ۱۸۶۸ء کا نہیں، اور ترتیب میں اس کا نمبر ۲۹ ہونا چاہیئے۔

اس مضمون میں چند خطوط کی صحیح تاریخ متعین کرکے ارباب علم و دانش کے سامنے پیش کئے جارہے ہیں۔ غالب کے تمام خطوط اسی طرح مرتب کئے جاسکتے ہیں۔ راقم الحروف اب تک مطبوعہ خطوط کی جو ترتیب کرسکا ہے اسکی کیفیت حسب ذیل ہے :۔

۱۔ "عودِ ہندی" اور "اردوئے معلیٰ" میں ترتیب کا کوئی خاص خیال نہیں تھا۔

۲۔ "اردوئے معلیٰ" کانپور میں ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے یکجا کردیئے گئے، اختلاف تاریخ برقرار رہا۔

۳۔ "خطوطِ غالب" از مہیش پرشاد اور "خطوط غالب" از مولانا مہر میں ہر مکتوب الیہ کے نام جتنے خطوط تھے۔ وہ تاریخی ترتیب سے جمع کئے گئے ہیں۔ "مکاتیب غالب" از مولانا عرشی اور "نادراتِ غالب" از آفاق دہلوی کی ترتیب بھی اسی نوعیت کی ہے۔

اب تک خطوط غالب کی ترتیب کے یہ تین پہلو ظاہر ہو چکے ہیں لیکن ان کو ایک اور نوعیت سے بھی ترتیب دیا جاسکتا ہے یعنی مکتوب الیہم کو پیش نظر رکھ کر نہیں بلکہ دن، تاریخ اور سن کے اعتبار سے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ غالب کی زندگی کے متعلق واقعاتی تسلسل قائم ہوجائے گا، اور خطوط کے مطالعہ سے کتنے ہی اہم پہلو اجاگر ہوجائیں گے جو اس جداگانہ اور مختلف ترتیب میں نظروں سے اوجھل رہے ہیں :

نسخہ فرہنگی کے ورق کی سوختی تحریر کا

دیوان غالب اردو کا ایک نادر مخطوطہ

غالب کے خوشنویس
فارسی کلام کا
ایک صفحہ
(از کتبخانہ
نواب سائل دہلوی)
مرحوم

کیونکہ اس کا سن طباعت ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۷ء) تھا جیسا کہ اس نے خود اسی مضمون میں عرشی کے حوالے سے لکھا ہے۔ دراصل اس کی یہ عبارت ہی محل نظر ہے کہ:

"دیوانِ اردو طبع اوّل کی تقریظ میں تعداد اشعار ۱۰۷۲ اور طبع ثانی میں ۱۷۹۳ ہے"

کیونکہ طبعِ اوّل کی تقریظ میں اشعار ۱۰۹۰ سے کچھ زیادہ درج ہیں اور طبعِ ثانی کی تقریظ میں ۱۱۰۰ بیان کئے گئے ہیں اور خود دیوان میں ۱۱۱۱ ہیں۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنے مضمون "غالب کے اردو کلام کی اشاعت" (مطبوعہ "ماہ نو" فروری ۵۴ء) میں طبع ثانی کی تعداد اشعار ۱۱۵۹ بیان کی ہے۔ اور امتیاز علی عرشی نے ۱۱۰۰ ("ماہ نو" جولائی ۵۴ء)۔ مسٹر مالک رام نے "ذکرِ غالب" کی تیسری اشاعت (مطبوعہ دہلی ۱۹۵۵ء) میں غالب سے متعلق تمام تحقیقات کو سمو دیا ہے۔ بعد کو انھوں نے ۱۹۵۷ء میں غالب کا اردو دیوان نہایت اہتمام کے ساتھ "آزاد کتاب گھر دہلی" سے شائع کیا اور اس کے مقدمہ میں دیوانِ غالب کی مختلف اشاعتوں کے متعلق تفصیلات بہم پہنچائیں۔ ان سے بھی بعض امور میں سہو ہوا ہے۔ چنانچہ پہلی کتاب میں وہ اشاعتِ اوّل کو "۱۵ سطری مسطرہ" اور دوسری میں "۱۳ سطری مسطرہ" لکھی ہوئی بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک میں تعداد اشعار ۱۰۷۰ بیان کی گئی ہے تو دوسری میں تقریظ میں ۱۰۹۸ اور دیوان میں ۱۰۹۵۔ دوسرے ایڈیشن کی تعداد اشعار "ذکرِ غالب" میں ۱۱۵۹ ہے تو مقدمہ میں ۱۱۱۱ یعنی طبع اوّل سے ۱۶ زیادہ۔

دیوان کی اوّلین دو اشاعتوں کی اہم تفصیلات یہ ہیں:۔

(۱) اشاعتِ اوّل:۔ اکتوبر ۱۸۴۱ء، مطبع سید الاخبار دہلی۔ تقریظ کا سن ۱۲۵۲ھ، تعداد اشعار "ہزار و نود و اند" یعنی ۱۰۹۰ سے اوپر۔ گو ... نے "اند" کے ہوتے ہوئے بھی "ہشت" بڑھا دیا ہے یعنی ۱۰۹۸۔ لیکن صحیح تعداد ۱۰۹۵ ہے کیونکہ کلکتہ والے قطعے کے آخری تین شعر غزلیات میں بالتکرار درج ہیں۔ اس دیوان میں دو قصیدے، ۳ قطعات اور دس رباعیاں ہیں۔

(۲) اشاعتِ ثانی:۔ مئی ۱۸۴۷ء۔ مطبع دار السلام۔ دہلی۔ تقریظ کا سن ۱۲۵۴ھ۔ تعداد اشعار ۱۱۰۰۔ اگرچہ دیوان میں اشعار کی صحیح تعداد ۱۱۱۱ ہے یعنی طبع اول سے ۱۶ زیادہ۔ ایک تو وہی "بسنی روٹی" والا قطعہ جس کے ۲ شعر ہیں۔ دوسری "جاں کے لئے" والی غزل جس کے ۱۴ شعر ہیں۔

اب اس تیسرے نسخے کی طرف آئیے جس کا ہم نے شروع ہی میں ذکر کیا ہے۔ اس کے اہم خصائص حسب ذیل ہیں:۔

صفحات: ۱۲۸؛ تقطیع: ۷½ × ۵؛ سطور: ۱۱؛ نستعلیق؛ خوشخط؛ سن کتابت: ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء)؛ تعداد اشعار: ۱۱۰۷؛ تقریظ میں ۱۱۰۰ سے کچھ اوپر؛ غزلیات ۱۰۰۷؛ قصائد ۲ (۱۶۱ اشعار)، قطعات ۳ (۱۹ اشعار)، رباعیات ۱۰ (۲۰ اشعار)؛ صفحۂ اول یعنی سرورق پر مولوی کریم الدین پانی پتی کی دستخطی تحریر ہے: "مالک ایں کریم الدین سررشتہ دار محکمہ ڈائرکٹری پنجاب"۔ صفحہ ۲ سے غالب کا دیباچہ ہے یعنی "مشام شمیم آشنایاں راصلا..." آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر درخشاں کی تقریظ ہے جس کا سن ۱۲۵۴ھ ہے، اور تعداد اشعار "یکہزار و یکصد و اند"۔ تقریظ کے خاتمہ پر کاتب کا ترقیمہ (ملاحظہ ہو متعلقہ تصویری صفحہ)۔ اشاعتِ اوّل کے برعکس مخطوطے میں قطعۂ کلکتہ والے تین اشعار مکرر درج نہیں۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ یہ نسخہ اشاعتِ اوّل ۱۸۴۱ء کے مطابق نہیں بلکہ اس کے بعد مرتب ہوا۔ دوسرے اشاعتِ اوّل کی تقریظ میں تعداد اشعار "یکہزار نود و اند" یعنی ۱۰۹۰ سے اوپر درج ہے لیکن اس مخطوطے کی تقریظ میں تعداد اشعار "یکہزار و یکصد و اند" ہے۔

یہ مخطوطہ اشاعتِ ثانی سے بھی مختلف ہے کیونکہ اس میں ۱۱۰۷ اشعار ہیں اور اشاعتِ ثانی میں ۱۱۱۱۔ اشاعتِ ثانی کے مذکورہ بالا ۱۶ زائد اشعار مخطوطے میں موجود نہیں۔ اس لئے یہ اشاعتِ ثانی سے بھی مختلف ہے۔ مخطوطے کی تقریظ میں تعداد اشعار ۱۱۰۰ سے اوپر تحریر ہے اور اشاعتِ اوّل کی تقریظ میں ۱۰۹۰۔ اس لئے مخطوطے کی تقریظ ۱۸۴۱ء کے بعد مرتب ہوئی ہوگی۔ اشاعتِ ثانی کی تقریظ میں تعداد اشعار مخطوطے کے مطابق ہے لیکن صحیح تعداد میں اختلاف ہے۔

ان امور سے ظاہر ہے کہ مخطوطہ پہلے ایڈیشن کے بعد تیار کیا گیا اور بالتخصیص تیار کیا گیا کیونکہ اس کی تقریظ بھی بدلی گئی۔ اب تک تو ہمیں یہ معلوم تھا کہ ۱۸۴۱ء کے بعد ۱۸۴۷ء ہی میں تقریظ کی تعداد اشعار بدلی گئی تھی لیکن اس مخطوطے سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۷ء سے پیشتر ۱۸۴۵ء میں بھی تعداد اشعار ۱۰۱۰ سے اوپر کی بجائے ۱۱۰۰ سے اوپر لکھدی گئی تھی۔ دونوں اشاعتوں کے درمیان ۱۸۴۵ء میں تقریظ کی تبدیلی صاحبِ دیوان کے ایماء پر ہی ہوئی ہوگی، ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ دہلی میں دیوان غالب کا ایک اور نسخہ ۱۸۴۵ء میں مرتب ہو رہا ہو اور غالب کو اس کا علم تک نہ ہو جب کہ تقریظ بھی بدلی جا رہی ہو۔ دوسرے، اس مخطوطے کی کتابت مولوی کریم الدین پانی پتی کے لئے ہوئی جن کے پاس ۱۸۴۱ء کا مطبوعہ نسخہ ہونا یقینی ہے۔ پھر مطبوعہ نسخے کی موجودگی میں ایک اور نسخہ مرتب کرانا قابل غور ہے۔ جہاں تک

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

کہ اک برق ہے جس میں رم ہی نہیں
کوئی کوندنا د مبدم ہی نہیں
کہیں کیا تھی کس درجہ عالم فروز
تجلّی سے وہ شب تھی مانند روز
گر اُس دن سے تشبیہہ روئے حسیں
ہُوا کرتی شب سے تو حیرت نہیں
تھے آئینہ در پیش، روشن سرشت
عیاں تھا سبھوں پر خطِ سرنوشت
زمانے میں آنکھوں پہ بے سعی و رنج
عیاں دل کے راز اور گیتی کے گنج
یہ تھی ریزشِ نور بالائے نور
کہ تھا شش جہت ایک دریائے نور

جبریل امیں کی روانگی

چلی جو ہوا بالِ جبریل سے
تو موج گراں اٹھی اس نیل سے
صدائے ہمایون شہپر نہ پوچھ
ہمہ چشم تھے گوش کیونکر نہ پوچھ
کہ تھی روشنی خود پیامِ نگاہ
مئے جلوہ پروازِ جامِ نگاہ
نگہبانِ خاصِ در کبریا
حریمِ تجلّی کا پردہ کشا
مبارک ہمائے سراپا پیام
پیام آوری سے ہی عالی مقام
نمو پرورِ عقل و روحِ رواں
نبی کے لئے محرمِ جاوداں
وہ روحِ امیں حاجبِ بابِ حق
کہ ہے جرعہ نوشِ مئے نابِ حق
سر دشتِ ازل، قاصدِ اوّلیں
کہیں عقلِ اوّل جسے راز بیں
فروزاں بہ فرِ فروغِ یقیں
محمدؐ کا دل اور اس کی جبیں

پیامِ الٰہی

کہا یہ سرایندۂ راز نے
سماوات کے نغمہ پرواز نے
ہُوں یوں عرض پرداز بعد از درود
لبوں پر ہے رازِ نہاں کا سرود
کہ اے چشمِ ہستی ترے رخ پہ باز
ہے سرمایۂ ناز جس کا نیاز
خدا آپ تیرا خریدار ہے
کہ شب بھی تری روز آثار ہے
گراں پھر ترا لنگرِ ناز کیوں؟
نہیں طور تو پھر یہ انداز کیوں؟
دکھایا تھا سینا نے اوروں کو نور
کیا ہے تری رہ سے یہ سنگ دور
نہیں رہ میں کوئی جگہ سنگلاخ
گراں تا گراں ایک راہِ فراخ
اگر ہو گدا کوئی دیدار خواہ
میسر ہو جز راہ کب دید شاہ؟
وہ جس کو ہو فرمانِ شاہی نصیب
ہے دربار میں سب سے شہ کے قریب
ترے دور میں لن ترانی کہن
کہاں انتہائے سخن پر سخن
خدا نے تجھے خود بلایا ہے آ[1]
تجھے لن ترانی کا اندیشہ کیا؟
جو کچھ بھی تھا موسیٰؑ نے حق سے کہا
وہی تجھ سے ربِ عُلا نے کہا
تو وہ ہے کہ جب سے بلایا تجھے
کیا دور ہر گرد کو راہ سے
ہے آئین کا کیا ذکر، ایمن ہے راہ
سوارِ فرس ہو کہ روشن ہے راہ

یہ تنویرِ رُخ، اس سے تو اک دیا
ذرا طاقِ ابرو کے آگے جلا
میں کہتا نہیں حق ہے عاشق ترا
مگر جذبہ صادق ہے بے انتہا
خدا کو خور و خواب مشکل ہوا
تُو سوتا ہے کیا چین سے اُٹھ ذرا
سنوار اپنے شمشادِ بے سایہ کو
مسخّر کر اور نگِ نُہ پایہ کو

توصیف براق

ہوئے گوش آگاہ گفتار سے
تو رخشِ ہُما سایہ بخشا اُسے
فرشتوں کے ہاتھوں کا پالا ہُوا
تجلائے حق کا اُجالا ہُوا
وہ خلدِ بریں کے حسیں سبزہ زار
اُنہیں پر پلا پیکرِ برق وار
وہ توسن کہ گر آئے مستی پہ وہ
ہو یکدم بلندی سے پستی پہ وہ
جو اخروٹ گنبد سے لڑھکے کہیں
یقیناً وہ آئے گا سوئے زمیں
تھی رفتار از بسکہ برق آفریں
بھڑک کر ہوا آگ دامانِ زیں
براق اس قدر برق رفتار تھا
کہ زیرِ قدم راکھ ہر خار تھا
ادھر سے پیمبر کا اعجاز تھا
کہ دم سے دیا ما سوا اللہ جلا
جو مرکب کو اسوار ایسا ملا
دمِ تازہ نس نس میں پیدا ہُوا
روانی میں آئی عناں ناگہاں
زمیں اس کا میداں کراں تا کراں
عیاں ٹاپ سے گنجِ قاروں ہوا
اُدھر دُم سے پردیں کو برہم کیا

---

[1] ارنی

ہے روشن مثال ان کے آہنگ کی
وہ ساقی کہ ہو مستِ نغمہ وری
وہ موجِ نفس، وہ دمِ جاں فزا
ہوئی جس سے ناہید نغمہ سرا
سنا زہرہ کا نغمہ دلستاں
ہوئے شاہ جب اور بالا رواں
تو اک چادرِ نور بخشی اُسے
تجلّائے صد طور بخشی اُسے
ردائے فروزاں کہ وقتِ سحر
دمِ جلوہ پہنے وہ بالائے سر

فلکِ چہارم

جو طے ہو گیا تیسرا مرحلہ
تو آیا نظر اک نیا محلکہ
سنہرا سنہرا محل شاندار
تجلی فشاں بقعۂ تابدار
کئی تاجدار اور کئی بادشاہ
کئی جم حشم اور کئی کجکلاہ
وہ دانا کہ شرمائیں ہوشنگ کو
دکھائیں اگر ہوش و فرہنگ کو
سلاطین ذی شان والا مقام
تھے اس قصرِ عالی کے ادنیٰ غلام
شتاباں کئی راہرو شش جہات
نگاہیں بندھیں حلقۂ در کے ساتھ
اسی در پہ پھیلائے دستِ سوال
اور اس قلزمِ بے کراں سے نہال
تھا اس قصرِ عالی میں اک نامور
شہنشاہ تو کیا شہنشاہ گر
اسی سے جہانگیر ہر شہریار
اسی سے گل افشاں ہر اک نوبہار
اگر روشنی کی ہے اس سے نمود
تو سائے کا بھی ہے اسی سے وجود

نظر صاف اور پاک جاں اس قدر
کرے سنگ اور خاک کو لعل و زر
نہ اس میں ہوس کا کوئی شائبہ
نہ کوئی کرشمہ طلسمات کا
شریعت کی تائید سے گرم کار
قیامت کا ہنگامۂ گیر و دار
ہوا اس قدر مستِ ذوقِ لقا
خوشی میں نہ تھا ہوش سر پاؤں کا
اٹھا پیشوائی کو دیوانہ وار
بڑھا سوئے مہماں پروانہ وار
اسے پار اُس حد سے پہنچا دیا
جہاں اس کا کاشانۂ نور تھا
ادھر آگئے آگے مسیحا رواں
سلاطین ادھر پیچھے پیچھے رواں
دل و جاں پیمبر کا سودا لئے
قدمبوسیوں کی تمنا لئے
پس و پیش بوسے دئے اسقدر
ہوئی تنگ راہِ سفر پاؤں پر
محبت کے مارے ہوئے ہونٹ وا
ہر اک بوسہ سے اک ستارہ اُگا
جو بکھرے ہیں تارے یہ آکاش پر
فضائے فلک ہے گہر بر گہر
تو پھلجھڑیاں ہیں یہ اسی رات کی
وہ نبیوں کے دولھا کی بارات کی
وہ شاہانِ عالم کا دارالاماں
جو پہنچے مقرر گھڑی پر وہاں
اُدھر مہرِ تاباں سے پہنچا نیاز
ادھر شاہوں کے سجدہ ہائے دراز
سلامِ مسیحا علیہ السلام
درودِ فراوانِ ربّ الانام
وہ کبکِ خراماں بلندی گرا
گیا اس نے ان سب پہ ظلِ ہما

سمندِ توانا و گردوں خرام
ہوا اور بھی کچھ پرے تیز گام

فلکِ پنجم

وہ راکب، وہ مرکب کہ شانِ خدا
پڑا پانچویں چرخ میں غلغلہ
وہ بہرام سالارِ چرخِ بریں
پروں سے کلہ پر کئے زیب و زیں
سرِ رہ گہر پارے چننے لگا
مگر یہ عمل کچھ نہ کام آسکا
کہ حد اس کے دامن کی تھی تا کمر
کہاں اس میں وہ چن کے رکھتا گہر
اگر صرف اپنی کلہ بھر سکا
نہ پھر بھی وہ موتی تھے کیا بے بہا
کہو کیسے با افسرِ گوہریں
ہو خورشید تاباں کا وہ ہم نشیں
اگر اس سے ہوتا تونگر تو کیا
کہاں اک سپہبد کہاں بادشا
وہ دم جس سے رگ رگ ہوا خون گرم
تھا بہرام کا دل مروّت سے نرم
زبس اس کی فطرت میں اخلاص تھا
سراسر کرم میں سراپا وفا
رگِ گردن اس کی بہ آں خود سری
ثمر لائی تسلیم و افتادگی
گروہِ صف آرائے بہرامیاں
حرم کے قریں جیسے احرامیاں
اب وجد مرے تا جہاں بال پشنگ
کھڑے تھے قدم بر قدم تنگ تنگ
جو بازو کی قوت دکھاتے تو کیا
ہر اک ٹیک کر گھٹنے آگے بڑھا
رواں ہائے مژگانِ خنجر گزار
پرافشاں تھے ہر سمت پروانہ وار

فلکِ ششم

شمارِ سپہ سے فراغت ہوئی
تو شہ نے چھٹے چرخ کی راہ لی
نظر آیا اک معبدِ دلکشا
کہ جیسے کوئی گنبدِ خوشنما
مہ وشانِ فرخندہ امشاسپند
کھڑے اس کے در وا بصد دست بند
در و بامِ کاشانہ خورشید زا
وہاں معتکف ایک مردِ خدا
کہ سب خوبیاں ہیں اسی کی طفیل
نکوکاریاں ہیں اسی کی طفیل
جو دم دے کے تن کو توانا کرے
تو من کو خرد سے مجلّیٰ کرے
ہے تلخی بھی اس کی یونہی نوشِ جاں
کہ قہرِ طبیباں برِ اہلِ جہاں
ہیں نرمی بھری اس کی یوں سختیاں
کہ جس طرح استاد کی جھڑکیاں
جواں بخت بوڑھا ہمایوں صفات
دلِ زندہ سے رازدارِ حیات
نبی نے اسے بہرِ قلبِ صفا
محبت میں سینے سے لپٹا لیا
خداوند در بار و بر جیسے سیل
ادھر سے کشش تھی ادھر سے بھی میل
اٹھا نور اس جذب او میل سے
بہم شیر و شکر ہوں جیسے ملے
جو پیتے ہیں پانی بوقتِ سفر
تو شہ نے کیا نوشِ شیر و شکر
امڈ آیا تن من سے اک سیلِ نور
خوشا راہرو، چشمِ ما سے دور
پیا گھونٹ جو چشمۂ نوش سے
تو لہرا اٹھی اس ذوقِ سرجوش سے
اب اس لہر کی دلبری کیا کہیں
اور اس کیف کی سرخوشی کیا کہیں

فلکِ ہفتم

نگاہِ جہاں بیں میں اس چرخ کی
در آیا چراغ اک بصد روشنی
اسی معبد آثار کاشانہ میں
کہ گر سامنے اس کی لو کو رکھیں
ہمیں گوہرِ جاں بھی آئے نظر
پہ دھندلاہٹوں کا تھا اس پر اثر
کہ جذب از بسکہ سینے میں دود
ہوا شعلہ کا روئے روشن کبود
وہ کھلایا منصب، وہ دھندلی گپھا
وہاں ایک ہندو کا بسرام تھا
وہ ہندو کہ سوجھ اس کی ٹیڑھی تمام
جنیو پہنے ہی میں مگن صبح و شام
کلائی وہ چکر میں آئی ہوئی
اسی کام سے پیچ کھائی ہوئی
جو دیکھا سراسیمہ ہو کر اٹھا
ادب سے سواگت کی خاطر بڑھا
جنیو چھوٹ کر گر پڑا فرش پر
ہوا وہ کھڑا ہاتھوں کو جوڑ کر
گیا اس پہ افسوس کرتے ہوئے
پہ خفت کے مارے ٹھٹکتے ہوئے
زبس ہر قدم پر ادب نے کہا
اسے "دور باش" اور کرم نے "بیا"
جو دیکھا نگاہوں نے یہ ماجرا
تو وہ اس پہ حیران سا رہ گیا
کچھ اس طرح سے ہول طاری ہوئے
قدم اس کے چلنے میں بھاری ہوئے
پیمبر کہ تھے جادہ پیمائے حق
نظر بے قرارِ تماشائے حق
بصد شوق پوئندۂ راہ تھے
خدا ہی کے جوئندۂ راہ تھے
جو یوں سات قلعوں کو سر کر چکے
نئے معجزاتِ ظفر کر چکے

سپہرِ ثوابت

سپہرِ ثوابت ہوا آشکار
گہر ہی گہر بے حد و بے شمار
گہر پیکروں نے چپ و راست سے
ہزاروں ہی موتی نچھاور کئے
نہیں شک دلِ چرخ کلفت زدہ
فراقِ نبی سے تھا پُر آبلہ
کہ افلاک کے قلعۂ تار میں
نگہ نے کئے رخنے دیوار میں
زبس جذبۂ شوق و ذوقِ ظہور
بنا پردۂ چرخ غربالِ نور
نہ ہے شوقِ گستاخ، دیدار خواہ
نہ ہے حسن مستور، عاشق نگاہ
نہ ہے شوقِ بے حد کہ بے اختیار
بڑھے حسن اس کی طرف بے قرار
ملائک بھی شاید بڑی دیر سے
نبی کے لئے چشم براہ تھے
کیا رحمتِ حق کے سیلاب نے
بصد لطف چھڑکاؤ انوار سے
خراماں رہا یونہی با برگ و ساز
پئے شوق تھا اور گزرگاہِ ناز
ادھر ساتھ یارانِ ہمدم رواں
عقب میں پرے بر نظارہ کناں
ادھر قدسیاں خیل در خیل آئیں
اور اس کے پسینے پہ جانیں لٹائیں
امڈ آئیں کیا صورتیں رنگ رنگ
دل و جاں میں ان کے ہزاروں ترنگ

وہ ان کا عروج از جنوب و شمال
کئے باز بندِ نقابِ خیال
حمل عجز سے سر جھکائے ہوئے
اور اس پر تعلّی میں آئے ہوئے
کہ کیسا ہی حیوان بیگانہ ہو
پہ جس سے حصولِ آب اور دانہ ہو
وہ پاتا ہے اس سے جو خوراک بھی
تو از راہِ نرمی و افتادگی
زبس ان سبھوں کا وہ رکھوالا ہے
جو حیوان ہے اس کا متوالا ہے
اسی کی طرف دوڑ کر جائیں وہ
سرِ شوق بڑھ بڑھ کے سہلائیں وہ
بڑھے تا کہ اس کی طرف بے درنگ
یہ مشتاق تھی چرخ کی گاؤ شنگ
کہ خود سینگ پہلو میں تھی مارتی
ٹھوکوں سے کہتی کہ تیز اور بھی
نہ ہوتا اگر شیرِ نر سدِّ راہ
تو چرتی بہ تعجیل در خوشہ گاہ
یہ منظر براہِ خداوندِ دَور
یہ چرخِ بریں با ثریا و ثور
یہ لگتا تھا ہندی گدا ہے کوئی
ہے خر مہروں سے جبکی گائے سجی
ذرا دیکھو اس کی گدائی کی شان
کہ چلنے میں بھی ہے عجب آن بان
وہ خیرات کے مانگنے کی ادا
نہاں جس میں گستاخی کی انتہا
کہاں راہبوں سے بھلا وان ہے
یہ تو اک زبردستی تاوان ہے
وہ علوی سرو شانِ فرخ لقا
وہ کاشانے ان دونوں کے دلکشا
انہوں نے کہا اک نئی لو لگائیں
نبی کے لئے حرز بازو بنائیں

بھلا اس سے بہتر ہے کیا حرز شاہ
کہ پیوند خوشحالی مہر و ماہ
کہ جب لوٹ کر آئیں وہ خاک کو
تو اندیشۂ چشم بد ہیں نہ ہو
وہ تو ام کہ مستِ مئے شوق تھے
معاً خیر مقدم کو آگے بڑھے
پئے نذر ہمساں بدست نیاز
وہ لے آئے اک تحفۂ دلنواز
وہ تحفہ جو تھا سالہا سال میں
بنایا کسی نادرہ کار نے
تھے از بسکہ دونوں براہِ نبی
کمر بستۂ خدمتِ خسروی
شرف میں بڑھے اک سے تا دوسرا
ہوا ایکدم ایک سے اک جُدا
کہیں سے پڑوسی نے دُرہائے نور
تو سرطاں ہوا غرقِ دریائے نور
پہ کھل سم سم اس طرح دروازہ کی
جلوخانۂ مہ کی قسمت کھلی
درخشاں لآلی کی وہ آب و تاب
بنی زینتِ خانۂ ماہتاب
وہ نظارۂ خوشنما ہر طرف
بنا بہرِ برجیس بیت الشرف
اسد نام اک قصرِ شاہانہ تھا
نہ پوچھو کہ کیا اس کا دروازہ تھا
یہ دو شوکتوں کی حدِ تام تھا
کہ یہ نقطۂ اوجِ بہرام تھا
نگہبانوں نے کھولا دروازے کو
کہ اعدا کا جس سے جگر چاک ہو
وہ گائے کی مانند قرباں ہوا
پہ وہ شیرِ نر گربہ خواں ہوا
مگر وہ کہاں خوئے محنت کہاں
وہ گائے کی صورت مشقت کہاں

نہ پنجے میں زور اور نہ سینے میں دم
یونہی رہ گیا بن کے شیرِ علم
اٹھے سرکشی دانوں کے خوشے میں
کہ اٹھ اٹھ کے حضرت کو سجدہ کریں
اگر چرخ کے پاس کچھ توشہ تھا
تو اپنے ہی خرمن کا یہ خوشہ تھا
یہ تھا تیر کو فخر اس راہ پر
شرف گھر میں ہی بیٹھے آیا نظر
خزانوں کے در جب سے ہیں وا ہوئے
ہیں تلتے جواہر تو میزان سے
جہاں پر کہ طومار ہو گنج کا
ترازو کا ہے کام ہی تولنا
فلک نے زراہِ شرف اک خیال
کیا پرورش دل میں حیرت مثال
کہ تولے زحل کو بڑے دھیان سے
بخاکِ رہِ خواجہ میزان کرے
جو پلّہ زحل کا فلک کو چھوا
تو وہ دوسرا تا زمیں جھک گیا
جو عقرب میں پہنچے رسول امیں
تو اس جلوہ گہ کا فدائے گزیں
ہرا دل سے خواہاں کہ وہ دوڑ کر
بڑھے سوئے سردارِ والا گہر
مگر بسکہ وہ تھا نگہبانِ راہ
اسے تو یہی تھا تردد کہ شاہ
پلٹ کر کب آئیں گے اس پاس سے
تجلائے کامل کے دیدار سے
ذرا ہٹ کے جاتا کہیں وہ محال
نفر کو کہاں سرکشی کی مجال
خوشا قوس میں پھر ورودِ سعید
وہ برجیس کو شبہ لگن کی نوید
اسی پر تھی اوروں میں وہ پیش پیش
زہے طالعِ غالب عجز کیش

ورق در ورق نکتۂ دلپذیر
مگر سب اسیرِ خیالِ دبیر
نہ کہنے کو سننے سے دوری کوئی
نہ مشہود و شاہد میں بیگانگی
جو ہر نقشِ اظہار کو پایا
تو وحدت سے کثرت پہ مائل ہوا
بڑھا دل میں شوقِ نمو اس قدر
تنزل کا غلبہ ہوا فکر پر
احد کو ملی کسوتِ احمدی
میسّر دمِ دولت سرمدی
زبس تھا وفا کا طبیعت میں جوش
اسی میم احمد سے حلقہ بگوش
ہر اک طرح کی نعمتیں بخششیں
سرافرازیوں کی حسیں جنبشیں
میسّر ہوئیں پھر انہیں بازگشت
پہ حق پر ہوئی منتہی بازگشت

٭

وہ آیا زمیں کی طرف بے درنگ
پلٹ آئے جس طرح چہرے پہ رنگ
ندی سے نکل کر گیا آپ دُور
پھر آیا پلٹ کر بہ اندازِ نور
نشانِ قدم سے نہ نکلا تھا پاؤں
برابر قدم اور قدموں کی چھاؤں
پڑے تھے جہاں نعلِ برقِ جہاں
اٹھیں سنگِ در سے تھی چنگاریاں
ابھی اڑ کے اوپر کو جانے کو تھیں
کہ وہ آ گئے پھر بہ سوئے زمیں
یونہی ہلتی کنڈی بھی دروازے کی
سرہانے میں، بستر میں گرمی رہی
وہ سر جس پہ رحمت کا سایہ ہوا
پلٹ آئے لے کر حبیبِ خدا
یہ وہ خواب تھا جس میں بختِ رسا
کہ سو آنکھ سے بڑھ کے بیدار تھا

٭

سُنے جا رہا تھا بہ تارِ نگاہ
وہ رختِ فروزاں کہ تھا زیبِ شاہ
سحر گہ بہ ہنگامِ نذرِ سجود
وہ ہم نامِ یزداں، وہ اس کا ورود
مبارک سلامت کا وہ غلغلہ
وصالِ علیؓ اور شادی فزا
مئے قدس کے رات ساغر پیئے
صبوحی ملی کس کے دیدار سے
جمالِ علی چشمۂ نوش تھا
صبوحی کا دورِ مئے دوش تھا
دو ہمراز باہمدگر راز گو
نشاں ہائے بینش بہم بازگو
دو آنکھیں ہیں اور دونوں میں روشنی
یہ جو دیکھتی ہیں وہ ہے ایک ہی
کہاں ہو دوئی درنبی و امام
علیہ الصّلوٰۃ وعلیہ السّلام

٭

در روزگار ہا نتواند شمار یافت — خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت
پرکارِ تیز گردِ فلک درمیاں ببیں — حق دا، داد حق کہ بمرکز قرار یافت
درہائے آسماں بزمیں باز کردہ اند — ہر کس ہر آنچہ جست بہر رہگزار یافت
آمد اگر بفرض ز بالا بلا فرود — بر روئے خاک پیچ و خمِ زلف یار یافت
چوں حسن ماہ یکشبہ بینی بداں کہ ماہ — پاداشِ جانگدازیِ شبہائی تار یافت
چوں رنگِ روئے گل نگری شاد شو کہ گل — اجرِ جگر خراشیِ پیکانِ خار یافت
ہر کس بقدرِ فطرتِ خویش ارجمند گشت — ہر شے بہ حسنِ جوہرِ خویش اعتبار یافت
مہ روشنی و مہر فروزش ز مہر گرفت — لیل و نہار صورتِ لیل و نہار یافت
نظارہ فتنہ ہائے عیاں از نظر سترد — اندیشہ گنج ہائے نہاں آشکار یافت
جام از شراب روشنیِ آفتاب داد — بزم از نشاط تازگیِ نو بہار یافت
روئے سخن صفائے بناگوشِ گل گزید — بانگِ قلم نشاطِ نوائے ہزار یافت
برہم زدند قاعدہ ہائے کہن بدہر — ہر کس نشاطِ تازہ ز ہر گونہ کار یافت

از انتظامِ شاہی و آئینِ خسروی
سور و سرور و دانش و داد انتشار یافت

طلوع

(عید میلاد النبی کے موقع پر)

اخلاق اختر حمیدی

کرنیں ہیں کہ ہیروں میں پروئی ہوئی لڑیاں
خورشید نے دیکھا ہے نئی شان سے دنیا
مشاطۂ فطرت نے بکھیرے ہیں نئے رنگ
پھر سینۂ لالہ میں دہکنے لگے شعلے

چاندی کی قبا اوڑھ کے آئی ہے سحر بھی
گلپاش نظر آتی ہے ہر راہگذر بھی
ہیں نور میں نہلائے ہوئے کوہ و کمر بھی
پھر پاک ہوا نرگسِ شہلا کا جگر بھی

اے ماہ وشو بادہ کشو آنکھ تو کھولو
پھر شورشِ مے نوشیِ رنداں [illegible] ہے
ہر موج میں اک کیفیتِ نشہ [illegible] ہے
مطرب کی ہر اک [illegible]

میخانۂ مشرق میں اُچھلنے لگے شیشے
پھر تندیِ صہبا سے پگھلنے لگے شیشے
ہر شاخِ گل و لالہ پہ ڈھلنے لگے شیشے
ساقی کے اشارے پہ مچلنے لگے شیشے

پھر سینۂ یزداں سے اٹھی موجِ طرب خیز
ہر شاخِ چمن منتظرِ لالہ تھی کب سے
مے نوشو اٹھو ساغر و پیمانہ سنبھالو
پھر آئی ہے شہنازِ سمن بر کی سواری

پھر وادیِ صحرا سے ہوئے جلوے ہم آغوش
برسوں سے بہت پیاسے تھے رندانِ بلانوش
آئے ہیں سفیرانِ سحر میکدہ بر دوش
گل ریز و گہر خیز و گہر بیز و گہر پوش

صحرائے عرب مطلعِ انوارِ سحر ہے
خورشید، تری گود سے ٹوٹا ہوا تارا
ہم اہلِ زمیں محوِ رخِ لالہ نشاں ہیں
یہ شمع تو پھونکوں سے بجھی ہے نہ بجھے گی

ظلمت سے کہو محفلِ گیتی سے نکل جائے
کہتا ہے کہ شاید مری تقدیر بدل جائے
گو تیرِ حسد زہرۂ افلاک پہ چل جائے
اے پھونکنے والے ترا دامن ہی نہ جل جائے

---

* ہماری دنیا جو سورج سے ٹوٹ کر گری ہے

اساسِ کائنات

سیماب اکبر آبادی (مرحوم)

بیخودی میں کل کسی آزاد نے کہہ دی یہ بات — ہے محبّت ہی سے پردہ داریٔ رازِ حیات

ہیں یہ دونوں آب و رنگِ مہر سے سینچی ہوئی — سبزہ زاروں کی سحر ہو یا سمن زاروں کی رات

ہے محبّت برہمیٔ دہر کو روکے ہوئے — ورنہ تھا اس کا اُلٹنا از قبیلِ ممکنات

ہیں اسی سے بزمِ کیف و وجد کی سرمستیاں — اور ہے قیدِ الم میں ہر نفس اس کا نجات

عشق کی گرمی اسی سے اخذ کرتی ہے سکوں — حسن کی نظروں کو یہ دیتی ہے رنگِ التفات

ہو کوئی گمنام، یا مزدور، یا صحرا نشیں — مرحمت کرتی ہے سب کی زندگی کو اک ثبات

ہے اسی سے روح پرور نغمۂ نَے کی صدا — انجمن میں ہے یہ مضرابِ ربابِ حسّیات

مُو قلم میں کار فرما ہے مصوّر کے یہی — ذہنِ شاعر میں اسی سے ہے نزولِ واردات

عالمِ ہستی کی یہ مضبوط اک بنیاد ہے — یعنی قایم ہے محبّت پر اساسِ کائنات

مرحبا بر جانِ او، صد سجدہ ہا بر نامِ او

او خدائے ماست و ما بندۂ بے دامِ او

اختر شیرانی

(ایک [illegible])

منظر ایوبی

[illegible] کسی زمانے میں ظہور پذیر ہوتا ہے جب تہذیب، زبان اور اظہار میں پختگی آ چکی ہو۔ اس کے برعکس رومانی ادب [illegible] زمانے میں [illegible] وجود میں آتا ہے جب [illegible] اور خود زندگی [illegible] انقلاب سے دوچار ہوتا ہے اور ان میں کوئی ثبات نہیں پایا جاتا۔ [illegible] اردو ادب پر بھی صادق آتا ہے۔ حالی [illegible] زمانے [illegible] پرانی شاعری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ایک نئی اصلاحی تحریک کا آغاز کیا۔ اس [illegible] ایک طرف اردو شاعری میں عقلی، سماجی، اخلاقی اور تبلیغی عناصر کی افراط ہوئی اور پہلی مرتبہ باقاعدہ [illegible] اس کی جگہ خشکی، بے لطفی اور سپاٹ پن نے لے لی۔ شاید اسی لئے [illegible] ادب اور [illegible] جدید کے [illegible] حاصل ہوا۔ مگر یہ سلسلہ زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا۔ آخر اس کے خلاف بھی آواز بلند ہوئی۔ ہمارے ادیب [illegible] انگریزی ادب کی رومانوی تحریک سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اقبال کی روایت شکنی اور انفرادیت کے [illegible] رجحان نے رومانی رجحانات کو ترقی دی۔ انہوں نے [illegible] کلاسیکی [illegible] قدروں، رسم پرستی، عقلیت اور میانہ روی کے خلاف بغاوت کی۔ [illegible] اقبال کی شاعری میں رومانیت کی صرف ابتدائی کرنیں ہی ملتی ہیں۔ اگرچہ یہ خاصی تیز اور شوخ ہیں۔ شاعری [illegible] رومانیت کی حسین [illegible] ہے۔

روایت [illegible] اختر شیرانی کے یہاں نظر آتے ہیں جس کو اردو کی رومانی شاعری کا پیغمبر کہا جا سکتا ہے۔ رومانیت اس کے یہاں [illegible] ہے۔ [illegible] بلکہ انسانی زندگی سے عبارت ہے۔ اس نے رومانیت کے اصولوں پر اپنی زندگی کا [illegible] کیا ہے۔ [illegible] کی روح [illegible] لئے ہوئے ہے۔ اس نے اردو شاعری کے فرسودہ اور پامال مضامین کو اپنے کلام کا موضوع نہیں بنایا [illegible] زندگی کو [illegible] ملتا ہے [illegible] جا کر اسے یہ مرتبہ حاصل ہوا ہے۔ وہ اردو کا پہلا شاعر ہے جس کے یہاں عشق [illegible]۔ مومن کی طرح اختر کا محبوب بھی پہلی مرتبہ مکمل عورت کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن اختر خوش قسمت ہے کہ اس کا محبوب مومن کی طرح ہرجائی نہیں۔ مومن کا عشق [illegible] سے وابستہ رہا مگر اختر کی محبت ایک کھلی فضا میں پروان چڑھتی ہے۔ اس نے عشق کیا اور مکمل کر کیا [illegible] عشق ہی اس کی زندگی ہے۔

بعض نقاد اختر کو اردو کا کیٹس بھی کہتے ہیں کیونکہ کیٹس اور اختر میں بڑی مماثلت ہے۔ دونوں کے یہاں حیات کا تصور اور عشق کا انجام ایک ہے۔ دونوں حسن کے متلاشی ہیں۔ دونوں کے یہاں محبوب [illegible] کا تصور انتہائی بلندی پر نظر آتا ہے۔ اس اشتراک کے باوجود اختر اور کیٹس میں فرق بھی پایا جاتا ہے۔ اختر کے یہاں جذباتیت زیادہ ہے۔ اسی لئے اس میں وہ گہرائی اور گیرائی نہیں جو کیٹس کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ اختر جذباتی ضرور تھا لیکن اس کا فنی شعور نہایت پختہ ہے۔ اسے خلاؤں اور [illegible] موہوم بستیوں کی تلاش ضرور رہی مگر وہ زندگی کے حقائق اور اس کی تلخیوں سے کبھی بیگانہ نہیں رہا۔ اس کی شاعری اس کے دلی جذبات اور کوائف کی صحیح آئینہ دار ہے۔ اس نے اپنی داخلی دنیا میں رہ کر وہ گل کھلائے ہیں کہ اس کا کلام فن کی انتہائی بلندیوں پہ نظر آتا ہے۔ اس کے یہاں کیٹس کی سی گہرائی و گیرائی تلاش کرنا بیکار ہے۔ اس لئے کہ وہ واردات قلبی اور کیفیات داخلی کی ترجمانی کرنے کے لئے حکیمانہ اور فلسفیانہ انداز بیان کا پابند نہیں ہے۔ وہ کائنات کو مفکر اور فلسفی کی نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ ایک شاعر کی آنکھ سے مشاہدہ کرتا ہے اور کائنات کے ہر ذرہ کو حسن کا دیوتا سمجھتا ہے۔ وہ بائرن کے اس قول کا

پابند نظر آتا ہے کہ "زندگی کا مقصد مسرت نہیں بلکہ مسرت کی تلاش ہے۔" سلمٰی اس کے لئے مسرت کا دائمی سرچشمہ نہیں ہے بلکہ ایک ذریعہ ہے جس سے اختر مسرت کی تلاش کرتا ہے۔ اس تلاش میں اگر اس کے یہاں جذبات کی شدت اور انفرادیت پرستی ملتی ہے تو اس سے اس کی رومانی شاعری کی قدر و منزلت کم نہیں ہوتی بلکہ بڑھ جاتی ہے۔ رومانی شاعری کے لئے ہم آہنگی، توازن اور قطعیت ضروری نہیں بلکہ جذبات اور احساسات میں جسقدر شدت، تیزی، اور لامحدودیت ہوتی ہے اسی قدر شخصیت کی نشو و نما آزادانہ طور پر ہوتی ہے۔ اختر نے بھی اپنی شاعری کی بنیاد جذبہ، احساس اور وجدان پر رکھی ہے۔ اور اس طرح اس نے رومانیت کے بنیادی اصولوں پر اپنی شاعری کی عمارت تعمیر کی ہے۔ اس میں کتنا حسن ہے۔ کتنا جادو ہے۔ کتنی رنگینی ہے۔ کتنی بہار، کتنی ابدیت ہے، کتنی آفاقیت ہے، اس کا اندازہ اس کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالنے سے لگایا جاسکتا ہے۔ اس کی شاعری کا موضوع "سلمٰی" ہے۔ اس کی اپنی زندگی ـــ سنہری خوابوں کی حسین تعبیر ـــ ایک بیکراں آرزو۔ ایک حسین خلش۔

سلمٰی سے اختر کی محبت کا آغاز کسی ناساز حادثے یا اچانک ملاقات سے نہیں ہوتا بلکہ خط و کتابت کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ کسی بے فکر اور الھڑ نوجوان کی طرح محبت کو زندگی کا کھلونا نہیں سمجھتا بلکہ اس کا عشق مستحکم ہے۔ یہ اس کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ یہ رسمی نہیں، حقیقی ہے۔ اس میں اس کی زندگی اور ذاتی تجربوں کا نچوڑ ہے۔ وہ کھلم کھلا محبت کرتا ہے اور سلمٰی کے گیت گاتا ہے۔ اردو کے دوسرے شاعروں کی طرح اس کے یہاں بھی معاملہ بندی ملتی ہے مگر چھچھورا پن نہیں ملتا۔ وہ محبوبہ سے خط و کتابت کے لئے "ننھا قاصد" کا انتخاب کرتا ہے۔ لیکن اسے یہ خدشہ ضرور رہتا ہے کہ اس کا "ننھا قاصد" کم سن ہے، وہ دل میں ضرور سوچتا ہوگا کہ باجی خط میں کیا لکھتی ہیں اور لکھ کر اسے کیوں بھیجتی ہیں۔ اور یہ بھی سوچتا ہوگا کہ ؎

پھر ایسے اجنبی پر اس کی باجی مہرباں کیوں ہیں	اگر میں بھی تو گھر والوں سے یہ باتیں نہاں کیوں ہیں
یہ نوخیز اجنبی جانے کہاں سے اکثر آتا ہے	جب آتا ہے تو باجی کی طرح خط لکھ کے لاتا ہے
عزیزوں کی طرح یہ کیوں مکاں میں آ نہیں سکتا	جب اس سے پوچھتا ہے وہ اسے سمجھا نہیں سکتا

اور جب وہی "ننھا قاصد" جوان ہو کر اختر سے ملتا ہے تو اختر زمانے کے تغیر سے پریشان ہو جاتا ہے اور چیخ اٹھتا ہے ؎

ترے قاصد سے ملتے وقت مجھ کو شرم آتی تھی
مگر اس کی نگاہوں میں شرارت مسکراتی تھی

"ننھے قاصد" سے ملتے وقت تو اختر کو زمانے کے تغیر کی پریشانی تھی مگر نظم "آج کی رات" میں، اختر کی پریشانی کا سبب وہ تمام کیفیات اور جذبات ہیں جو کسی عاشق کے دل میں اس وقت موجزن ہوتے ہیں جب وہ پہلی مرتبہ اپنی محبوبہ کے سامنے آتا ہے۔ اختر کی یہ نظم اس کے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ پہلے اختر کے ذہن میں سلمٰی کے غائبانہ خط لکھنے اور اشعار کی داد دینے کے تصورات ابھرتے ہیں پھر اسے شرم، حیا، تذبذب اور کشمکش کے واہمے گھیر لیتے ہیں۔ کہتا ہے ؎

اے دل ایسا ہو کہ کچھ بات بنائے نہ بنے	حالِ دل جو بھی سنانا ہے سنائے نہ بنے
پاس آئیں تو مگر پاس بٹھائے نہ بنے	شرم کے مارے انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہ تصور سے بھی آتی ہے حیا آج کی رات

مگر اختر ان مراحل سے بڑی بے باکی سے گذر جاتا ہے۔ اس کی محبت پروان چڑھنے لگتی ہے۔ اب وہ سلمٰی کا پہروں منتظر رہتا ہے۔ اس کے انتظار کی کیفیت یہ ہے ؎

بہار رنگ کیف کی بدلی اتر آئے گی وادی میں
سرور و نور کا کوثر چھڑک جائے گی وادی میں
نسیم بادیہ منظر کو مہکائے گی وادی میں
شباب و حسن کی بجلی سی لہرائے گی وادی میں
سنا ہے میری سلمٰی رات کو آئے گی وادی میں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اختر میں دنیا کے ناخوشگوار حالات اور واقعات سے نبرد آزما ہونے کی جرأت نہیں ہے۔ وہ دنیا کے تمام ہنگاموں اور شورشوں سے دور تخیل کی ایک ایسی حسین دنیا میں آباد ہونا چاہتا ہے جو حسین ہو، خوبصورت ہو اور زندگی کے تمام سامان سے آراستہ ہو۔ یہ صحیح نہیں۔ ایک دنیا سے اس کا فرار اور دوسری دنیا میں پناہ لینے کی آرزو مصنوعی نہیں بلکہ فطری ہے۔ کیونکہ دنیا والے محبت میں تڑپتے ہوئے دو دلوں کا ملاپ نہیں دیکھ سکتے۔ اختر نے سماج کے مضبوط بندھن، ظلم اور مربوط رشتے جنہوں نے ارضِ مشرق کے انسانوں کو صدیوں سے جکڑا ہوا ہے۔ توڑنا آسان نہیں پایا۔ وہ ظلموں، جفاؤں، آہوں، کراہوں اور گناہوں کی درد بھری دنیا اور سفاک نگاہوں سے دور، وہ کسی سلمیٰ کے پیار کا طالب ہے۔ جہاں اس کی محبت برسات کی متوالی مشکبو گھٹاؤں میں پروان چڑھ سکے۔ پیار کے دامن کی مستانہ ہواؤں میں اس کے رِستے ہوئے زخموں کو سکون مل سکے، چاندنی راتوں کی شفاف فضاؤں میں سلمیٰ کا مرمریں پیکر تاج محل کا روپ دھار سکے۔ اسی لئے وہ کہتا ہے ؎

اک ایسی جنت آباد وادی میں پہنچ جائیں
جس میں کبھی دنیا کے غم دل کو نہ تڑپائیں
اور جس کی بہاروں میں بچھڑے ہوئے آئیں

لے چل وہیں تب لے چل
اے عشق کہیں لے چل

جس شخص کے سینے میں محبت ہزاروں ہو، جس کی چشم حقیقت نگر ہو گیا وہ اختر کی اس شکایت، یاس اور واقعیت نگاری سے انکار کر سکتا ہے جس کا عکس اس کی اس مذکورہ نظم میں ہے!

یہ تو تھا اختر کی محبت کا آغاز، ہجر و وصال کے واقعات، اور درد و کرب اور یاس و ناامیدی کی دنیا سے دور کسی حسین جگمگاتی ہوئی بستی کی تلاش کا ذکر۔ شاعر پر ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں ملتا۔ اسے سلمیٰ پر پیار کی بجائے غصہ آتا ہے۔ سلمیٰ ایک کمزور مشرقی لڑکی کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے۔ زمانے کے ہاتھوں وہ بھی دنیا کے رسمی بندھنوں میں جکڑ دی جاتی ہے۔ اب اس کا دل اختر کے لئے صرف تڑپ سکتا ہے، وجہ سکون نہیں بن سکتا۔ وہ محبت کے بے کراں آنسوؤں سے اپنی پیاس کو بجھا سکتی ہے، آب دیدہ نہیں ہو سکتی۔ اس کی رعنائیاں اور بہاریں اب اختر کے دل کو باغ و بہار نہیں کر سکتیں بلکہ ان کھنڈروں کا نقش اب اس کا اپنا جیون ساتھی ہے۔ وہ اختر کی دنیا سے بہت دور جا چکی ہے۔ وہ اسی آنسوؤں، کراہوں اور درد بھری دنیا میں آگئی ہے جس سے اختر نے فرار چاہا تھا۔ اس عہد میں اختر کا لب و لہجہ اور تیور شکوہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اب وہ سلمیٰ کو پھولوں کی طرح مہکتے ہوئے خطوں، اس کی نوازشوں، مسرتوں اور رعنائیوں کی یاد دلاتا ہے ؎

تم جواب اور مدارات ہے بیگانوں کی
کون سنتا ہے خبر عشق کے دیوانوں کی

کہیں اس کی شکایت زیادہ تلخ اور تیز ہو جاتی ہے ؎

بادۂ عشق میں ایسی ہی اگر تلخی تھی — پہلے اس جام کو ہونٹوں سے لگایا کیوں تھا
گر نظر آئی تھی دشوار وفا کی منزل — پھر قدم راہِ محبت میں اٹھایا کیوں تھا

یہاں تک کہ وہ ایک جگہ صاف صاف کہہ اٹھتا ہے ؎

تمہارا جسم جھوٹا ہو چکا افکار بھی جھوٹے
تمہارے ہونٹ جھوٹے ہو چکے اور پیار بھی جھوٹے
تم اپنے ہاتھوں اپنی عصمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں

یہ تھے اختر کی رومانی شاعری کے رجائی اور قنوطی انداز جن کا آغاز و اختتام سلمیٰ پر ہوتا ہے۔ ایک محور جس کے اردگرد اختر کی

(باقی صفحہ پر)

قومی تنزّل اور فوجی تدبّر

ہماری تاریخ میں

سیّد امجد علی

سات اکتوبر کا انقلاب غور کیا جائے تو ایک عظیم انقلاب تھا لیکن یہ ہماری تاریخ کا تنہا واقعہ نہیں۔ ہند و پاکستان کے مسلمان عروج و زوال کی بہت سی منازل سے گذرے ہیں، اور بارہا ایسے سخت مقام آئے ہیں۔ جب قوم کا شیرازہ منتشر ہوتا معلوم ہوتا تھا اور امید کی تمام راہیں مسدود نظر آتی تھیں لیکن ایسے نازک موقع پر ہر دفعہ مردے از غیب بروں آید و کارے کرد۔ ان محسنانِ قوم کے نام تاریخ کے صفحات پر روشن ہیں۔ اور ہماری نظروں میں خاص وقعت اور اہمیت رکھتے ہیں۔ کچھ ماضی کے دھندلکے نے ان کے نقوش کو ایک خاص عظمت اور صولت بخش دی ہے لیکن ظلم ہوگا اگر قوم اس زمانے کے محسنوں کو محض اس وجہ سے لائقِ اعتنا نہ سمجھے کہ وہ ہمارے ہمعصر ہیں

تو اے کہ محوِ سخن گسترانِ پیشینی
مباش منکرِ غالب کہ در زمانۂ تست

ہمارے پہلے وزیرِ اعظم، لیاقت علی خاں کی شہادت کو سات سال گزر چکے تھے، اور (فرعون کے خواب کی طرح بُرا شگون لئے ہوئے) سات وزیرِ اعظم یکےبعد دیگرے، ہماری سیاست کے اسٹیج پر گزر چکے تھے، کہ یہ امیدوں کی دنیا ویران ہوتی نظر آتی تھی۔ اور ہماری قوم کا کاروان دشتِ ظلمت میں ٹھوکریں کھا رہا تھا اس افراتفری کی حالت میں، خصوصاً جمہوریت دم توڑتی نظر آتی تھی۔ سات اکتوبر کی معرکہ آرارات سے پہلے دو ہفتوں میں، نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ مشرقی پاکستان کی مجلسِ قانون ساز میں دنگا فساد کے باعث اسپیکر کی ہلاکت واقع ہوئی۔ ادھر مرکز میں پارلیمانی حکومت نے یہ مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی تھی کہ ارا کینِ کابینہ کی تعداد چھبیس ۲۶ تک پہنچ گئی تھی، اور اگر ان آٹھ وزیروں کو بھی شامل کر لیا جائے جو صوبجات میں تھے۔ تو مرکزی اسمبلی کے اسّی ممبروں میں سے چونتیس منصب سنبھالے ہوئے تھے۔ گویا جمہوریت ایک مذاق بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن عین وقت پر غیب سے مدد آئی : ع

جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا

جیسا کہ اس سے پہلے بھی بارہا ہوا تھا، اسی طرح قومی بحران کے اس خطرناک زمانے میں تاریخ میں بھی ایک بڑا انسان منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا اور اس نے آن کی آن میں ملک کی کایا پلٹ دی۔ اس عظیم انسان نے ملک کو ان سیاسی مردار خواروں اور ان بھیڑیوں کے ہاتھ سے نجات دلائی جنہوں نے بھیڑوں کا روپ دھار رکھا تھا۔ ایک تربیت یافتہ اور اطاعت شعار فوج کی مدد سے جو قبل ازیں طوفانوں اور قحط کے سلسلے میں شاندار خدمات انجام دے کر خیر خواہیٔ ملت کا ثبوت دے چکی تھی۔ جنرل محمد ایوب خاں نے ایک خاموش انقلاب پیدا کیا اور اس طرح کہنہ و فرسودہ نظام کو مٹا کر نئی نئی امیدوں کی جوت جگائی اور از سرِ نو قومی جد و جہد اور نشو و ارتقا کا در باز کر دیا۔
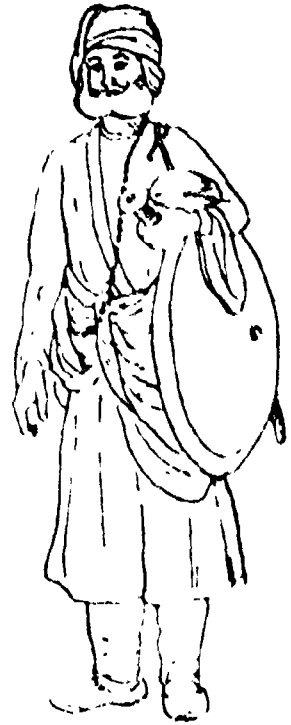
اس بروقت اور برحق انقلاب کا جس دلی اطمینان اور جوش و خروش کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا، وہ ملت کی بے مثل و فش تعریف اور پُرخلوص تائید کا بیّن ثبوت ہے۔ اس کے برعکس نئی حکومت نے جو بردباری، ضبط و تحمل اور نرمی و شفقت ظاہر کی ہے وہ اس کے اعلیٰ مقاصد اور بہی خواہیٔ ملت کی بہترین ضامن ہے کیونکہ اس کا واحد مقصد ایک اور صرف ایک ہے، یعنی "وانشاۃ الثانیہ، نہ کہ بربریت و تشدد۔"

ایک حد تک ہم اس دفعہ کو مغربی طرز کی جمہوریت کی ناکامی بھی قرار دے سکتے ہیں۔ کیونکہ دونوں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں عوام اپنے صحیح نمائندے انتخاب کرنے میں ناکام رہے تھے۔ صرف یہی نہیں بعد انتخابات کے بعد جو لوگ پہلے دوسرے پر ہوا کرتے تھے، وہ بھی برطرف کئے جا چکے تھے۔ اور ان کا کام خاص مقرر کئے ہوئے فرائض چلا رہے تھے اس لئے ان اداروں کی بھاری اکثریت کبھی اپنے معاملات کو سر انجام دینے میں ناکام رہی تھی۔

یہ سب کس کا قصور تھا؛ تمام تر ان قائدین کا جو بقول شخصے "اپنے آقاؤں کی درست طور پر تربیت" نہیں کر سکے تھے اور آئے دن پارٹیاں بدلنے اور اُدھر سے اِدھر ہو کر جنبہ داری برتنے اور دوسری گھٹیا حرکات سے کام لینے کے باعث کسی اعلیٰ جذبے سے سرشار ہو کر کوئی بلند پایہ قومی تحریک کی اُمنگ نہ پیدا کر سکے۔

ان وجوہ کی بنا پر کسی قسم کی نمائندہ حکومت کے جو تقاضات اور رائے عامہ کے جائزہ کے لئے نصب ہی کبھی موجود ہیں آنے کے لئے ہمیں فی الحال انتظار ہی کرنا پڑے گا تاآنکہ کوئی مرد کار ملک میں پوری طرح بحالی نظم و ضبط نہ کر دے اور عوام کو وہ من و سلویٰ دریا یک معقول حد تک خوشحالی و بہبودی میسر نہ ہو جائے جو ان کا حق دراصل مقصود ہے۔

جمہور ملک میں حالیہ انقلاب سے جو ولولہ و خروش پیدا ہوا ہے اس سے دوبارہ اُفق خیال میں امید سے جگمگا اٹھا ہے کہ پاکستان اب بھی اپنے روشن مستقبل کو حاصل کر کے نقطۂ عروج پر پہنچ سکتا ہے۔ اور یہ منزل کچھ ایسی بعید بھی نہیں۔ چنانچہ چند ہی ماہ کی فرصت قلیل میں تمام ملک ایک عظیم الشان تغیر سے روشناس ہو گیا ہے۔ ناجائز درآمد و برآمد اور بد دیانتی کا قلع قمع کیا جا رہا ہے، مہاجرین کی بحالی و آبادکاری بڑی تیزی سے جاری ہے، ارضی و اراضیاتی اصلاحات کی داغ بیل ڈالی جا رہی ہے، عوام میں تعلیم کو فروغ دیا جا رہا ہے وہ دفتری نظم و نسق کو مستعدی و کارگزاری کے اعلیٰ ترین پیمانوں پر پہنچانے کی انتہائی جد و جہد کی جا رہی ہے۔ لہٰذا ہمیں خداوند کریم کے فضل و کرم سے اپنے محبوب وطن پاکستان کے لئے ایک نہایت مہتم بالشان اور تابناک دور کی توقع کرنا چاہیئے ؎
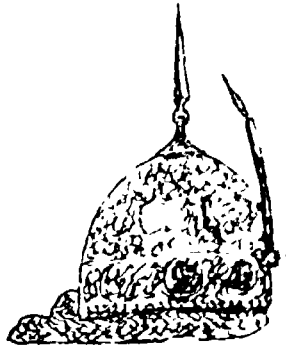
ہوائے دورِ خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

لیکن اس دورِ خزاں کو جھیل لینا بھی آسان نہ تھا ؎

نہ ہر درخت تحمل کند جفائے خزاں
غلامِ ہمت مردم کہ ایں قدم دارد

اب ذرا قوم کے ماضی کی طرف نظر ڈالیئے کہ پہلے کیسے نازک وقت اس پر آئے، اور کیسے کیسے اس کا تدارک کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ حالات کی نوعیت ہمیشہ جداگانہ ہوتی ہے۔ اور ایسے ہی اس کا علاج بھی۔ لیکن یہ خیال بھی ایک حد تک صحیح ہے کہ افراد کی طرح اقوام کا مزاج بھی اسی ردِ عمل سے عیاں ہوتا ہے۔ جو وہ کسی نازک موقع پر ظاہر کریں۔

اس نقطۂ نظر سے مسلمانانِ برِ صغیر کی تاریخ کا امعانِ نظر سے جائزہ دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ خصوصاً بحران کی ان خاص مثالوں کا جب سیاسی انحطاط یا اخلاقی تنزل نے اس کو تباہی و بربادی کے کنارے لا کھڑا کیا۔ قوم اس قعرِ ذلّت سے کس طرح بار بار اُبھری، وہ برگزیدہ عناصر کونسے تھے جو اس کی احیاءِ ثانیہ کا باعث ہوئے اس کا جاننا یقیناً دلچسپ بھی ہے اور اہم بھی ؎

بہ وصلش تا رسم صد بار بر خاک افگند شوقم
کہ نو پروازم و شاخِ بلندے آشیاں دارم

چنانچہ غور و مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ء اور ۱۷۵۰ء کے درمیان مسلمانوں پر سات بار ایسی افتادیں پڑیں، جب قوم کے افراد میں سے ایک اُن کی رستگاری کا باعث بنا۔ معاصرین کی زبانی ان خاص واقعات کا حال سننے کے لائق ہے، کیونکہ انہیں صرف گذارشِ احوالِ واقعی سے غرض ہے۔ نہ کہ کوئی نظریہ مرتب کرنے سے۔

بایں ہمہ، اس مطالعہ سے یہ تعجب خیز نتیجہ نکلتا ہے کہ ہر قومی بحران کے بعد جو نجات دہندہ پیدا ہوا، وہ افواج ہی کی صفوں میں سے اُبھرا۔ اور اس خطہ سے، جو اب پاکستان ہے۔ چنانچہ غیاث الدین تغلق، بہلول لودھی اور منعم خاں، خانِ خاناں تو انقلاب کے وقت لاہور کے حاکم تھے۔ جلال الدین خلجی کا تعلق سمانہ یعنی لاہور کے اطراف میں ایک مقام سے تھا۔ فیروز تغلق ٹھٹھہ کے پاس خود موجود تھا، اور غیاث الدین تغلق اور جلال الدین خلجی کی طرح بلبن کی خاص آماجگاہ بھی پاکستان کا مغربی علاقہ رہا۔ جہاں منگولوں کے حملوں کو روکنا اور ہماری مغربی سرحدوں کو سنبھالنا اس کا خاص کارنامہ تھا۔ البتہ نجف خاں ایران سے نو وارد تھا۔ ان سب نے بزم سے پہلے رزم میں اپنے جوہر دکھلائے۔ لیکن اپنی لیاقت اور تدبر کا ایسا ثبوت دیا کہ اکثر کو لوگوں نے خوشامد کر کے عنانِ حکومت کے سنبھالنے پر راضی کیا۔ جیسے غیاث الدین تغلق، فیروز تغلق، بہلول لودھی۔

واقعات میں پوری پوری مطابقت کی تلاش بے کار ہے۔ لیکن اگر ہم سابقہ حالات کا بغور مطالعہ کریں اور پھر ہم ان کا موازنہ موجودہ صورت حال سے کریں تو ان میں کتنی ہی باتیں مشترک نظر آئیں گی۔ آیئے ہم ان انقلابات پر یکے بعد دیگرے نظر ڈالیں۔

اس سلسلہ کی سب سے پہلی کڑی ہے: سلطان غیاث الدین بلبن۔ ایک معاصر مورخ منہاج السراج صاحب "طبقاتِ ناصری" اس کے متعلق لکھتا ہے:-

"یہ بات محسوس کی گئی کہ الغ بڑا ہونہار نوجوان ہے۔ اس لئے سلطان (شمس الدین التمش) نے اسے اپنا ذاتی مصاحب بنا لیا۔ گویا اس کے ہاتھ پر اقبال کا باز بٹھا دیا تاکہ بعد کو اس بادشاہ کی اولاد کے زمانہ میں یہ نوجوان اس کی سلطنت کو دشمنوں کی چیرہ دستی اور ریشہ دوانیوں سے بچائے اور جاہ و جلال کو درجۂ کمال تک پہنچائے۔"

سنہ ۶۴۱ھ (۱۲۴۳ء) میں الغ خاں حاجب درگاہ کے عہدہ پر فائز ہوا۔ جب لشکرِ شاہی پایۂ تخت سے رواں ہوا تو اس نے باغیوں کو شکستِ فاش دے کر ان کی خوب سرکوبی کی۔ اس نے کفار کے خلاف خوب لشکر کشی کی اور شاہراہوں اور گرد و پیش کے علاقوں کو باغیوں سے پاک کر دیا۔

الغ خاں نے اپنے استقلال اور پامردی سے ۱۲۴۵ء کے دوران میں ترکستان کی افواج اور منگولوں کو شجاعت اور اعلیٰ سپہ سالاری کے

ایسے جوہر دکھائے کہ انہوں نے پھر کبھی بالائی علاقوں سے سندھ کا رخ نہ کیا . . . . . .

"اس سال (۱۲۴۹ء) اعلیحضرت ناصر الدین نے اس سپہ سالار کی زبردست قابلیت اور خدمات جلیلہ کا اعتراف کیا، اس لئے اس کا مرتبہ ملک اور حاجب سے کہیں بڑھا کر اس کو خان کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔

اور رجب ۶۴۸ھ (۱۲۵۰ء) کو اسے الغ کے خطاب سے ملقب کرکے سپہ سالار کے عہدے پر متعین کیا۔"

ضیاء الدین برنی تاریخ فیروز شاہی (مؤلفہ ۱۳۵۷ء) میں لکھتا ہے:

"غیاث الدین بلبن ۶۶۲ھ (۶۶۴ھ مطابق ۶-۱۲۶۵ء) ہونا چاہئے) میں تخت نشین ہوا۔ وہ شمسی غلاموں میں سے تھا۔ اس کے برسر اقتدار ہونے سے پہلے سلطنت کا جاہ و جلال کے اس درجہ سے بہت ہی گر چکی تھی جہاں تک وہ سلطان شمس الدین کے عہد میں رسا ہوئی تھی۔ وہ سلطان جو کہ سلاطین مصر کا ہمسر اور شاہان عراق و خراسان اور خوارزم کا مد مقابل تھا۔ اس کے بعد دس سال تک اس کے بیٹوں کے زمانے میں ملکی معاملات اس کے ابتدائی جانشینوں کی سرگرمی شباب و عیش پرستی اور سلطان ناصر الدین کی نرمی و عاجزی کے سبب بالکل ابتر ہو چکے تھے۔ خزانہ خالی تھا اور شاہی دربار کے پاس نہ دولت تھی نہ مرکب، شمسی غلام خان بن چکے تھے اور تمام دولت و طاقت انہی میں منقسم ہو چکی تھی جس کے باعث ملک پر اختیار انہی کے ہاتھ میں تھا۔ ثروت و حشم اور جاہ و جلال میں وہ ایک دوسرے کے حریف تھے اور خود مباہات کے نشہ میں ایک دوسرے سے یہ آواز بلند کہتے تھے:
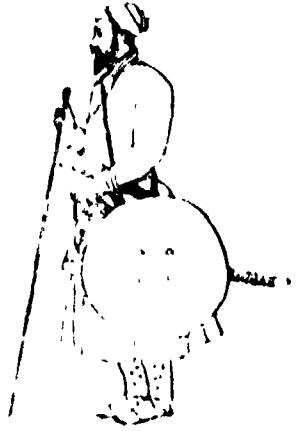
"تم کیا ہو جو میں نہیں ہوں اور تم کیا بن سکتے ہو جو میں نہیں بن سکتا۔" اس طرح شمس الدین کے بیٹوں کی نااہلی اور شمسی غلاموں کی رعونت نے اس حکومت کو بالکل حقارت آمیز بنا دیا تھا جو دنیا میں اس قدر ممتاز و برگزیدہ تھی۔

سلطان غیاث الدین معاملات ملکی میں بہت ماہر و تجربہ کار تھا۔ اس نے نظم و نسق کو بحال کیا اور اس سررشتہ کو خوب استوار و کارگذار بنایا جو خلل پذیر اور تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ اس نے حکومت کے عز و وقار کو بحال کیا۔ اور اس کے نہایت کڑے قواعد اور عزم بالجزم نے ملک کے تمام لوگوں، ادنیٰ و اعلیٰ کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیا۔ تمام لوگوں کے دل پر خوف و رعب طاری ہو گیا لیکن اس کے انصاف اور رعایا پروری نے سب کے دل کو موہ لیا۔ . . . .

اپنی حکومت کے پہلے ہی سال میں بلبن نے اپنے عمل مزید اور تجربہ سے سب سے پہلے فوج کی تنظیم پر ہی مرکوز کیا کیونکہ فوج ہی نظم حکومت کا ذریعہ و وسیلہ ہے . . . .

اپنی ۲۲ سالہ حکومت کے دوران بلبن نے سلطنت کا عز و وقار اس کا دبدبہ و صولت اس طرح برقرار رکھا کہ اس سے زیادہ تصور کرنا محال ہے . . . . . .

عدل و انصاف میں وہ انتہائی سخت گیر تھا یہاں تک کہ اپنے خویش و اقارب، مصاحبوں، حاشیہ نشینوں اور اولاد کی بھی رعایت نہیں کرتا تھا۔ اور اگر ان میں سے کوئی کسی غیر منصفانہ فعل کا مرتکب ہوتا تو وہ مظلومین کی حق رسی اور تلافی نقصان سے کبھی دریغ نہ کرتا۔"

کچھ وقفہ جس میں بلبن کے دو پوتے تخت نشین ہوئے

"جو تھوڑا بہت نظم حکومت قائم ہوا تھا وہ بھی برباد ہو گیا۔ لوگ بے روزگار تھے اور محل کے اردگرد بے انتہا انبوہ جمع ہو گئے۔ نظم و ضبط کی کوئی تدبیر نہیں کی گئی تھی۔ سلطنت میں کہیں بھی امن چین نہ تھا اور دربار کے معاملات درہم برہم ہو گئے۔ کسی کام میں بھی کوئی قاعدہ دستور نہ رہا۔
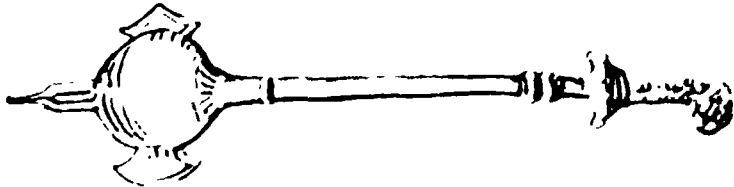
اس وقت جلال الدین، عریض ممالک کے عہدہ پر فائز تھا۔ اس نے فوج کی چہرہ نویسی کی اور معائنہ کیا۔ جلال الدین کے بیٹے، جو نہایت دلیر تھے، پانچ سو نفری لے کر علانیہ شاہی محل کو گئے اور خورد سال سلطان کو اپنے باپ کے پاس اٹھا لائے۔

اب یارانِ اغیار سب نے جلال الدین کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس کو سواروں کے ایک بڑے دستہ کی ہمراہی میں بہارپور سے لے جا کر تخت نشیں کیا۔ اس نے فوراً اپنی حیثیت مستحکم کرلی اور اس کی حکومت مضبوط سے مضبوط تر ہوگئی۔ اس کے اعلیٰ کردار، انصاف پسندی، شفقت و کرم اور خلوص نے عوام کی بدگمانی دور کردی ....

جلال الدین ہمیشہ اپنے امراء و عمائدینِ سلطنت اور رعایا کے ساتھ بڑی نرمی اور لطف و کرم سے پیش آتا تھا۔ .... وہ اربابِ کمال کا بڑا قدردان اور مربّی تھا۔ .....

•

علاء الدین کی جابرانہ مگر مضبوط حکومت، اور پھر قطب الدین اور خسرو کا دورِ آشوب

قطب الدین کی غفلت و فضول خرچی اور سابقہ نظم و ضبط کے معطل ہوجانے کی وجہ سے مسلمانوں میں بے اعتدالی پیدا ہوگئی اور ہندوؤں میں بددلی اور بغاوت کے بیج پھوٹ نکلے۔ جبر و تشدّد کے شعلے آسمان تک پہنچنے لگے۔ آخر جو امراء و رؤسا جمع تھے انہوں نے بیک آواز کہا کہ غاصبین نے شاہی خاندان کی کوئی نشانی بھی باقی نہیں چھوڑی اور عرض کیا کہ،

"اے غازی ملک! تمہارا ہم پر حق ہے۔ کیونکہ تم برسوں منگولوں کے خلاف ہماری سپر رہے ہو اور ان کی آمد کو روکتے رہے ہو۔ تم نے ایک ایسا کارنامہ انجام دیا جو تاریخ کے صفحات پر درج رہے گا۔ تم نے مسلمانوں کو ہندوؤں اور پیروالیوں کے جوئے سے نجات دلائی ہے۔ تم نے ہمارے محسنوں کا بدلہ لیا ہے اور امیر و غریب سب پر احسان کیا ہے۔ .... جتنے لوگ بھی یہاں جمع ہیں تمہارے بجز اور کسی کو بادشاہی اور حکومت کے لائق نہیں سمجھتے۔ چنانچہ تمام حاضرین نے اس کو متفقہ طور پر بادشاہ قرار دیا۔ اور وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے لقب سے تخت نشیں ہوا (۱۳۲۰ء)

سلطان ایک ہی ہفتہ میں معاملاتِ حکومت کو صحیح نہج پر لے آیا۔ اور خسرو اور اس کے نابکار پیروؤں نے جو بدنظمی پیدا کی تھی۔ اس کو دور کر دیا۔ .... تمام اہالیانِ ملک اس کی تخت نشینی پر بے حد خوش ہوئے، بغاوت و سرکشی ختم ہوگئی اور ہر طرف امن و اطاعت کا دور دورہ ہوا۔

اپنے جبلّی جود و کرم کے باعث اس نے حکم دیا کہ تمام ملک میں لگان منصفانہ طور پر، پیداوار کے مطابق لگایا جائے .... ساتھ ہی یہ بھی احتیاط برتی جائے کہ کاشتکاری ہر سال ترقی پذیر ہو۔ .... سلطان کا دبدبہ جلال تمام خراسان و ہندوستان پر چھا گیا اور ہند و سندھ کے تمام ممالک اور عمائد و سپہ سالارانِ شرق وغرب مدتوں اس سے خائف و لرزہ براندام رہے۔

سلطان کی وفات ۱۳۲۵ء میں ہوئی۔
اس کے بعد محمد تغلق نے حکومت کی۔
۱۳۵۰ء میں اسکو پیکِ اجل نے آن لیا۔
وہ ٹھٹھہ کی تسخیر کے لئے آگے بڑھ رہا تھا کہ
واپسی پر باغیانِ ٹھٹھہ اور منگولوں نے فوج پر حملے کئے۔

یہ آڑا وقت تھا جب اس سلسلہ کی چوتھی کڑی سامنے آئی: فیروز تغلق۔ فوج دریائے سندھ کے کنارے کرب و اضطراب کے عالم میں کھڑی تھی اور اس کو جان و مال کا شدید ترین خطرہ درپیش تھا.... عورتیں اور بچے موت کے گھاٹ اتر چکے تھے ... چنانچہ سارے سردار جمع ہوئے اور فیروز شاہ کے پاس جا کر بیک آواز کہا: "تم سلطان مرحوم کے ولیعہد اور وارث ہو۔ اس کا کوئی بیٹا نہ تھا۔ اور تم اس کے بھتیجے ہو۔ شہر یا لشکر میں کوئی ایسا شخص نہیں جس پر لوگوں کو اعتماد ہو یا وہ حکومت کا اہل ہو۔ خدا کے لئے ان بدنصیب لوگوں کو بچائیے اور تخت نشیں ہو کر ہمیں اور ہزارہا دوسرے برگشتہ قسمت انسانوں کو مصیبت سے نجات دلوائیے ..... چنانچہ فیروز شاہ ۷۵۲ھ (۱۳۵۱ء) میں تخت نشیں ہوا۔ اور ہند و سندھ کے تمام اربابِ ہوش نے دیکھ لیا کہ اس کے عہدِ مبارک میں کس طرح چنگیز خانی منگولوں کے حملے رک گئے۔"

شمس عفیف اپنی تصنیف "تاریخ فیروز شاہی" (مرتبہ عبدالکبیر) میں لکھتا ہے کہ:

"سابقہ سلاطین کے عہد میں غیر دانشمندانہ قوانین مرتب کئے گئے تھے جن کی وجہ سے رعیت و رعایا کو بھاری لگان ادا کرنے پڑتے تھے۔ سلطان فیروز نے احکام شریعت کو شمع راہ بنایا، ان پر پابندی سے عمل کیا اور ان کے منافی تمام امور کی ممانعت کر دی۔ مقررہ سرکاری لگان سے زیادہ کچھ بھی وصول نہیں کیا جاتا تھا، اور جو افسر زیادہ وصول کرتا اس کو اس کی تلافی کرنی پڑتی۔ شاہی محل کے لئے قماش ریشم یا دیگر اشیاء بازار کے نرخ پر خریدی جاتیں اور ان کی قیمت بھی ادا کر دی جاتی۔ سلطان نے ایسے قوانین نافذ کئے کہ رعایا غریب سب نہایت پوری طرح مطمئن تھے۔ لوگوں کے گھر اناج، مال، گھوڑوں اور دوسرے سامان سے پُر تھے۔ سب کے پاس سونا چاندی کثرت سے تھے۔ کوئی عورت ایسی نہ تھی جس کے پاس زیورات نہ ہوں۔ اور کسی گھر میں پلنگوں کی کمی نہ تھی۔۔۔۔۔ سلطان فیروز نے توفیق الٰہی کے بموجب تمام محاصل ملک کو عوام میں تقسیم کر دیا۔۔ چونکہ سلطان اس قدر مہربان تھا اسلئے سب لوگ اپنی دلی خوشی سے اسکے مطیع تھے۔"

اور اس روشنی کے بعد پھر تاریکی! پانچ نااہل بادشاہوں کے مختصر دورِ حکومت اور پھر تیمور کا ہولناک قتل عام!! اس وقت حاکم ملتان و لاہور نے تاج شاہی سر پر رکھ کر خاندان سادات کی بنیاد ڈالی جس کے چار سلاطین (۱۴۰۵ء) اپنی حکومت پایۂ تخت سے باہر قائم نہ کر سکے اور دہلی لوگوں کی مناقشات و تنازعات کی آماجگاہ بن گئی۔ اس طوائف الملوکی میں نظم و ضبط پیدا کرنے کے لئے ایک بار پھر لاہور ہی کا حاکم لوگوں کی بہتری کیلئے سامنے آیا۔ یہ تھا بہلول لودھی جس نے لودھی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ اس اولوالعزم شخصیت کا ایک نامور مورخ نے ان الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

"آخر سرکردہ امرا نے تہیہ کیا کہ وہ تخت کو خیرباد کہہ کر ایسے آدمی کو دعوتِ حکومت دیں جو ملک میں نظم و نسق قائم کر سکے۔۔۔۔۔ بہلول ایک سپاہی تھا اور اس نے ارادہ کر لیا کہ ملک اپنی کھوئی ہوئی سطوت کو دوبارہ حاصل کرے۔۔۔۔ اس کے بعد امن و سکون کے جو چار سال آئے ان میں بہلول نے سرکش سرداروں اور چھوٹے چھوٹے راجوں کو مسخر کر کے دہلی کی سابقہ طاقت کو کافی حد تک بحال کیا۔ اس کا کردار بے داغ تھا۔ وہ نمود و نمائش سے متنفر تھا۔ وہ بے حد فیاض تھا۔ غرض وہ اپنے زمانہ کے جابر بادشاہوں میں مستثنیٰ حیثیت رکھتا ہے۔"

مغلوں کے حملے سے پہلے ملک کی جو افسوسناک حالت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن ہم بابر کو ملکی نجات دہندوں میں شمار نہیں کر سکتے۔ مغلیہ دور اورنگ زیب عالمگیر کی وفات تک کامیابی و فتوحات کا ایک طویل و شاندار دور تھا۔ اگرچہ اس میں بھی کئی حادثے آئے اور گذر گئے۔

مرحوم شہنشاہ نے ایک جاں نثار شخص منعم خاں کو کابل کا انصرام سپرد کیا تھا۔ اس نے اورنگ زیب کے سب سے بڑے زندہ بیٹے، شاہ عالم، کی بڑی جانفشانی اور اطاعت شعاری سے خدمت کی تھی جس کے نتیجہ میں شہزادے نے صوبہ لاہور کا انصرام اس کے سپرد کر دیا تھا اور اس کے لئے شہنشاہ سے صوبہ کی دیوانی کی سفارش بھی کی تھی جو شہنشاہ نے اس کو ارزانی فرمائی تھی۔ آخر کار جب منعم خاں ہی کی تدابیر سے فوج اور روپیہ کی امداد سے شہزادہ تخت نشین ہوا تو اس نے اس کو وزارت اعلیٰ کے عہدہ پر فائز کر کے اس کو خان خاناں کے خطاب سے سرفراز کیا۔ خان خاناں نے وزیر کی حیثیت سے اپنی خدمات انتہائی خلوص، امتیاز اور دیانت داری سے سرانجام دیں۔ اس نے ہر شہر میں اپنے نام پر ایک سرائے، ایک مسجد اور ایک مدرسہ تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ یہ تجویز پوری طرح عمل میں آئی۔

۱۷۱۲ء میں بہادر شاہ کی وفات سقوطِ عظیم کا پیش خیمہ تھی۔ اس کے بعد پیہم و مسلسل خانہ جنگی اور مناقشات کا آغاز ہوا جس کا نتیجہ نادر شاہ کا حملہ تھا۔ شامت اعمال ما صورت نادر گرفت! پھر مرہٹوں نے اپنی بے پناہ چیرہ دستیوں سے ملک میں کہرام مچا دیا۔ ہر طرف ایک قیامت صغریٰ برپا تھی جس نے ایک اور بیرونی حملہ آور — احمد شاہ درانی کو دعوت یلغار دی۔ چنانچہ اس نے ۱۷۶۱ء میں وارد ہو کر مرہٹوں کا کچومر نکال دیا، لیکن اس نے ملک کو بھی اینٹ سے اینٹ

بجادی۔ اور وہ کمزوری و ابتری کا صید زبوں بن گیا تھا۔ شاہ عالم برائے نام تاجدار تھا۔ اُسنے الٰہ آباد میں پناہ لے لی تھی۔ گو وہ بعد میں دوبارہ اپنی کھوئی ہوئی طاقت حاصل کرکے ۱۷۷۲ء میں پھر دہلی وارد ہوا تھا۔ اور اس سے ڈرامے

کے ایک نئے سین کے لئے بساط بچھ گئی تھی۔

جادوناتھ سرکار اپنی تصنیف "FALL OF THE MUGHAL EMPIRE" میں لکھتا ہے:-

"جب شاہ عالم کے بحیثیت شہنشاہ، ورودِ دہلی (۱۷۷۲ء) سے پھر پہلی بار آفتاب امید طلوع ہوا تو ہر طرف خوشی و خرمی کا منظر دکھائی دیا... انحطاط، بے آبادی، غریبی اور سرنگونی کے وہ بارہ سال جو پایۂ تخت نے اپنے والی کی عدم موجودگی میں بسر کئے تھے، ختم ہو گئے۔ اور اُمید بندھی کہ شاید دہلی اب پھر اپنا سر افتخار بلند کرے... لیکن شہنشاہ میں یہ تاب کہاں تھی کہ وہ ان توقعات کو پورا کرے؟ اس کے لئے تو خود بھی گزر اوقات مشکل تھی۔ خزانہ خالی، جاگیر خالصہ قبضہ سے باہر، محلات ساز و سامان سے معرا۔.... شاہ عالم ثانی کے سامنے جنوری ۱۷۷۲ء میں جو کام تھا وہ یہ تھا کہ وہ اپنی پارہ پارہ سلطنت کو کس طرح دوبارہ مسخر کرے جبکہ اس کا خزانہ خالی تھا اور صوبجات میں بڑے بڑے طاقتور غاصب اپنے پاؤں مضبوطی سے گاڑے ہوئے تھے.....

اس مہتم بالشان کام کے لئے نوجوان شہنشاہ کے پاس مردانِ کار کیسے تھے؟..... اس کے اردگرد جو درباری جمع تھے وہ محض سیاسی بساط کے شاطر تھے اور بس۔ ان میں سے کوئی بھی لشکری یا منتظم نہ تھا۔

شاہ عالم کی مراجعتِ دہلی کے بعد صرف ایک فرد آہستہ آہستہ مگر نہایت واضح طور پر، محض خداداد قابلیت کی بنا پر، حکومت کا مشیر اعلیٰ اور بساطِ سیاست کی واحد محیط کُل شخصیت بنا۔ یہ وہ آخری ممتاز مدبر و فوجی مجاہد تھا جس نے حکومت دہلی کے معاملات کی باگ ڈور سنبھالی، قبل اس کے کہ شہنشاہ دہلی محض ایک پرچھائیں، ایک کٹھ پتلی بن جائے، اور سلطنت محض ایک نام!..... جب ہم نجف خاں کے کارنامۂ حیات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ اس کی کس بات کی سب سے زیادہ تعریف کریں ـــ اس کی فوجی صلاحیت، سیاسی بصیرت یا انسانیت۔ ان تمام امور میں دہلی کے تمام معاصر اعیانِ سلطنت یا ماتحت امراء میں اس کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔..... اپنے ملک کے سیدھے سادے کسانوں، تاجروں اور مفتوحہ شہروں کے غیر مہار زباشندوں کے ساتھ اس کا سلوک بے حد مشفقانہ تھا اور وہ اس فراخدلی کے ساتھ ان کی جان و مال اور عزت و ناموس کی حفاظت کرتا تھا جس کی اس زمانہ کے جنگ و جدل میں کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

مرزا نجف خاں ذوالفقار الدولہ، مورخین دہلی کے ذہن میں غیر معمولی جگہ رکھتا ہے، اس لئے کہ وہ مغلیہ سلطنت کا آخری جلیل القدر مسلمان وزیر اعظم تھا۔ اور اسکے بعد عنان کار دو سال تک نااہل وزرا کے ہاتھوں میں رہنے کے بعد پھر عرصۂ دراز کے لئے غیر ملکی حاکموں کے قبضہ میں آگئی۔ اس کے آخری ایام نے اس کے گرد یادوں کا ایک بہت ہی محبت آمیز ہالہ بنا دیا ہے، کیونکہ اس نے مغلیہ پایۂ تخت کو امن و خوشحالی کے چند لمحات عطا کئے۔ اسی لئے ۱۷۸۲ء میں اس کی وفات پر تمام ملک میں صف ماتم بچھ گئی، اور دہلی کی دنیا پر حزن و یاس کے گھٹا ٹوپ بادل چھا گئے!

ڈاکٹر پرسیوال سپیئر اس کے متعلق ("TWILIGHT OF THE MUGHALS") میں لکھتے ہیں:" تمام اہل الرائے متفق ہیں کہ اگر حالات زیادہ سازگار ہوتے تو وہ مغلیہ حکومت کے لئے سامان نجات ثابت ہوتا۔"

یہ تھیں اس سلسلۂ عظیم کی سات جلیل القدر کڑیاں۔ اور آٹھویں؟ ـــ سلسلۂ مشاہیر میں اوّل بھی وہی آخر بھی وہی۔ صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خان جن کے متعلق غالب کے الفاظ میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ع

از بازپسیں کارگزاران پیشم

★

اسلامی فنون کے علائم
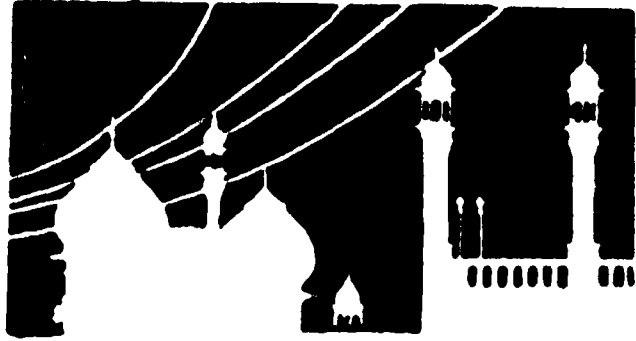
اگر اسلامی فنون کا بحیثیت مجموعی دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ ہم ان کی زیادہ نمایاں خصوصیات کو ٹھیک طرح متعین کر کے یہ معلوم کریں کہ انھوں نے وہ مخصوص وضع کیوں اختیار کی۔ اس طرح ہم اسلامی فنون کے ان اوصاف کو واضح کر سکیں گے جو انہیں دیگر اقوام عالم کے فنون سے ممیز کرتے ہیں اور ساتھ ہی اس امر پر بھی روشنی ڈال سکیں گے کہ اسلامی فنون کے مختلف مظاہر کس اعتبار سے مسلمانوں کی مادی ضروریات اور کس طرح ان کے روحانی، مذہبی اور جمالیاتی تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ علاوہ بریں کونسے سیاسی و اقتصادی عوامل ہیں جنہوں نے ان کی تشکیل اور نشوونما پر اثر ڈالا ہے۔

چونکہ اسلامی فنون کا سلسلہ پیغمبر اسلام کے زمانہ سے لے کر عہد حاضر تک جاری رہا ہے اور اتنے وسیع و عریض علاقے میں جو ہسپانیہ و مراقش سے لے کر فلپائن تک پھیلا ہوا ہے، یہ بات ظاہر ہے کہ ہم ابھی ان سوالات کا کوئی تسلی بخش جواب دینے سے بہت دور ہیں یہاں تک کہ بعض ابتدائی سوالات کا جواب بھی ممکن نہیں کیونکہ ارباب نظر نے ان میں کوئی گزشتہ پچاس سال ہی سے تو دلچسپی لینا شروع کی ہے۔ ایک اور بڑی دشواری یہ ہے کہ اسلامی فنون کو سمجھنے کے لئے اسلامی مذاہب، تاریخ، الٰہیات اور اقتصادی اساس اور نشوونما کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مطالعہ اور تحقیق کے لئے کس قدر وسیع معلومات لازم ہیں۔ لہٰذا علمائے تحقیق کا رجحان یہ رہا ہے کہ یا تو وہ روایتی قسم کے مستشرق ہوں یا اسلامی تعمیرات و نوادر سے گہری دلچسپی رکھتے ہوں۔ اس قسم کے دوگونہ تبحر علمی کا اجتماع شاذونادر ہی ممکن ہوا ہے۔ اس لئے کسی معاملہ کے حقیقی وجوہ کو تلاش کرنے کی کم ہی کوششیں عمل میں آئی ہیں۔

یہ حقیقت کہ اسلامی فنون ایک مخصوص نوعیت کے حامل ہیں، اسلامی و دیگر تہذیبوں کے مظاہر فن میں بدیہی فرق ہے۔ اس کا احساس آج ہی نہیں بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر ایک رباعی میں جو عمر خیام سے منسوب کی جاتی ہے' دود' کو جو زرتشتی عبادت کا ایک مخصوص جزو ہے' چراغ کے ساتھ ملا دیا گیا ہے اور یہ دونوں مسجد کے بدیہی لوازمات ہیں۔ اس قسم کے اجتماع سے صاف ظاہر ہے کہ اسلامی فن کاروں کو مختلف قوموں کے ثقافتی مظاہر کے فرق باہمی کا کس قدر احساس تھا۔ اس کے علاوہ ہم اسلامی تہذیب کی مخصوص نوعیت خصوصاً اس کے مذہبی پہلو کو ایک علامت میں منعکس پاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم زندگی کے بعض عوامل کو اسلام میں کارفرما پاتے ہیں۔ کیونکہ چراغ کی یہ غیر معمولی اور اہم حیثیت ہمیشہ ہی موجود نہیں رہی اور بعض خاص معاملات ہی سے بروئے کار آئی۔ بالعموم چراغ کا صرف ایک ہی مصرف رہا ہے اور وہ لوگوں کے ذہن میں اسی طرح جاگزیں بھی رہا ہے کہ وہ محض روشنی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ جس کو بڑی ہی کاریگری سے بنائے ہوئے خوش وضع، آراستہ و پیراستہ اور بعض اوقات قیمتی مسالہ سے بنے ہوئے دیوٹ یا لگن میں نصب کر دیا جاتا ہے۔

لیکن جب الغزالی نے قرآن کی ایک نہایت نکتہ آمیز آیت کی بہت ہی بلیغ و خیال افروز تفسیر کی تو اس کی حیثیت محض روشنی دینے والی آرائشی چیز سے کہیں بلند ہو گئی۔ اس عظیم مفکر نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک رسالہ موسوم بہ "مشکوٰۃ الانوار" تحریر کیا جس میں سورۂ نور کی ان مشہور آیات کی تفسیر کی گئی تھی کہ " اللّٰهُ نُورُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ مَثَلُ نُورِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ، اَلْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ "

اس کے بعد چار سو سال سے زیادہ عرصہ تک یہ دستور رہا کہ محراب کی آرائش بالعموم اس طرح کی جاتی کہ اس کے کسی گوشے میں چراغ کا نقش مرتسم کر دیا جاتا اور اسی طرح دوسرے گوشوں کو بھی آراستہ کیا جاتا۔ جیسا کہ خیام کی مذکورہ بالا رباعی سے ظاہر ہے کہ دنیائے اسلام میں چراغ ایک علامت کی حیثیت

اختیار کر چکا تھا یعنی ایک ہستیٔ غیب کی محسوس و مرئی علامت۔ لیکن آہستہ آہستہ اس علامت کی مقبولیت میں کمی کے باعث اس کی قوت بھی ماند پڑ گئی۔ کچھ اس وجہ سے اور کچھ تزئین و آرائش کے بے پناہ شوق کے باعث یہ بلیغ علامت آہستہ آہستہ محض آرائشی چیز بن کر رہ گئی جس میں چراغ بلوریں' جو نورِ حق کی علامت تھا، گلدانوں میں مبدل ہو گیا۔ اور جوں جوں ہم عہد بہ عہد آرائشوں پر نظر ڈالیں، اس تغیر کا یکے بعد دیگرے مختلف حالتوں میں سراغ لگا سکتے ہیں۔ یوں تو اکثر تہذیبوں میں خالی سطح کو نقش و نگار سے آراستہ کرنے کی شدید تمنا پائی جاتی ہے لیکن دنیائے اسلام میں یہ شوق خاص طور پر نمایاں ہے۔ گو یہ رجحان بعض نہایت عمدہ و نفیس فنی تخلیقات میں جلوہ گر ہوا ہے، پھر بھی اس کی طبعی رغبت نے ایک روحانی چیز کو محض مادی و خارجی حسن کا مظہر بنا دیا، جیسا کہ خود چراغ کے سلسلہ میں ہوا تھا۔

غرض جہاں تک چراغ کا تعلق ہے یہ تو صرف کچھ عرصہ ہی کے لئے علامت کے طور پر مستعمل رہا۔ اس کے علاوہ دیگر علامات کیا تھیں؟ ایک طرح مسجد کو بھی اسلامی تہذیب کی علامت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اسلام میں مسجد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ یہ خانۂ خدا ہے اور بلاشبہ اسلامی فن کے خارجی مظہر کی حیثیت سے بھی اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اس کے مختلف نمونے اس قدر ہم وضع اور مخصوص نوعیت کے حامل نہیں ہیں کہ ایک عمومی' عالمگیر دلالت پیدا کر سکیں۔ مثال کے طور پر مساجد کی ساخت عموماً یہ ہوتی ہے: ایک احاطہ، اس کے گرد چار دیواری تعمیری حصہ اور اس کے سامنے صحن میں حوض یا فوارہ۔ یہی کیفیت مشرقِ اقصیٰ اور بحیرۂ قلزم کے گرد و پیش کے اسلامی علاقوں کے نجی مکانات میں بھی نظر آتی ہے۔ جن میں صرف جسامت ہی کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے' باقی رہے اونچے اونچے گنبد' تو کیا وہ مسجد' مدرسہ یا کم از کم کسی بزرگ کے روضہ کے آئینہ دار نہیں ہو سکتے؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔ کیونکہ فردوسی کے "شاہنامہ" میں بھی جہاں جہاں طلوعِ سحر کا نقشہ کھینچا گیا ہے، وہاں گنبدوں کے پیچھے سے سورج کے نمودار ہونے اور ان کو سنہری بنا دینے کا ذکر ہے۔ جس کا اطلاق ظاہر ہے ایران قدیم ہی کی عمارات ہی پر ہو سکتا تھا۔ اسی طرح "مینار" بھی اپنی مخصوص نوعیت کے ساتھ دیگر اغراض و مقاصد کے لئے پہلے ہی موجود تھا۔ اور اذان کے لئے یہ متعدد صورتوں میں سے کوئی صورت بھی اختیار کر سکتا تھا جن میں سے بعض کو برجوں کے ساتھ کوئی مناسبت نہ تھی، لہٰذا مسجد جیسی بنیادی چیزوں میں بھی جن میں دنیاوی چیزوں کی بہ نسبت مذہبی اصولوں پر زیادہ شدت سے عملدرآمد ہوتا ہے۔ ایک طرف تاریخی نشو و نما کے قدرتی رجحانات اور دوسری طرف مقامی اثرات کے باعث ـــــ کیونکہ اسلامی فنِ تعمیر بالعموم سابقہ اسالیب ہی پر مبنی ہوتا تھا ـــــ کافی فرق پایا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسجدوں میں نہ صرف جا بجا عربی وضع کی مساجد دکھائی دیتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ساتھ ایران، ترکی، ہندوستان اور چین میں بھی مقامی وضع کی مساجد نظر آتی ہیں۔ ان انواع و اقسام کی مساجد کو دیکھتے ہوئے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ عبادت خانے صرف مذہب اور عبادت ہی کی مستقل اہمیت پر دلالت کرتے ہیں' یا زیادہ وسیع نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس غیر معمولی کثرت کے آئینہ دار ہیں جو اسلامی تہذیب کی مجموعی وحدت کے پردہ میں پائی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ عالمِ اسلام میں کوئی ایسے مظاہر بروئے کار نہیں آئے جو عمومی اور اسلامی دلالت کے حامل ہوں اور اس کی حقیقی علامت قرار دیئے جا سکیں۔ اگر کوئی ایسے مظاہر تھے تو وہ یا تو ذوالفقار کی طرح بالکل محدود نوعیت کے تھے یا نجم و ہلال کی طرح نسبتاً بہت ہی قریبی زمانہ میں نمودار ہوئے ہیں۔ ان کی حیثیت دنیاوی ہے۔ اس لئے یہ چیزیں ساری اسلامی تہذیب کے لئے مجموعی طور پر ایک معنی خیز، نمائندہ حیثیت اختیار نہیں کر سکتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے جدید زمانہ کے سکہ جات، پرچموں یا ڈاک کے ٹکٹوں میں بھی کوئی ایسا علاماتی مظہر بروئے کار نہیں آیا جس کو اسلامی معاشرت کی ایک مسلمہ و عالمگیر علامت تسلیم کیا گیا ہو۔ سوال اٹھتا ہے کیا کبھی ایسی کوئی علامت نمودار بھی ہوگی یا نہیں؟ یہ تمام تر اس امر پر موقوف ہے کہ دو متضاد رجحانات میں سے کونسا رجحان غالب رہتا ہے؛ اسلام کی عالمگیری کا مشترک احساس یا مختلف قومیتوں کا ظہور۔

بایں ہمہ ایک چیز شروع سے آخر تک اسلامی فنون کی حقیقی علامت ضرور رہی ہے: عربی رسم الخط۔ اس کے ساتھ دلی لگاؤ' اور اس کا یادگاروں، عمارتوں، اشیاء اور سکہ جات پر بکثرت و مسلسل استعمال نہ صرف اسلامی اتحاد کا ایک نہایت مضبوط رشتہ رہا ہے بلکہ اسلامی فن کے ایک نہایت اہم، بلیغ اور مختص مظہر کا باعث بھی ہوا ہے۔ ہمارا اشارہ فنِ خطاطی کی طرف ہے۔ اس کی نشو و نما اور تہذیب و آرائش میں تمام اقوامِ مسلم نے حتی الامکان ہر دور اور ہر عہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا' دینی امور کے لئے بھی اور دنیاوی امور کے لئے بھی۔ چونکہ اس کی بنیاد قرآن کی زبان پر ہے اور یہ دنیائے اسلام کی عالمگیر زبان ہے پہلے یہ اپنے حلقہ میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو مذہبی ارتسامات یا مناظر نصاریٰ یا بودھیوں کے مذہبی موضوعات کے سلسلہ میں رکھتے ہیں۔ تاہم جہاں یہ علامت

مسلمانوں کے نزدیک بے انتہا اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں بہت بڑی کمی یہ ہے کہ یہ دارالسلام سے باہر کہیں نہیں سمجھی جاتی۔

رسالے کے محدود میدان میں تمام اسلامیہ کے صرف ایک ہی مخصوص لوازمہ کا ذکر کر سکا۔ اس قسم کے دیگر لوازمات یہ ہیں:-

(۱) مدرسہ: تعمیری روشکل جو مساجد کے بعد ظہور میں آئی لیکن اس کی وضع و ہیئت بحیثیت ایک درس گاہ کے پوری دنیائے اسلام میں یکساں رہی ہے۔ بمقابلہ یورپ کے جہاں درس گاہوں کی عمارات میں اس لحاظ سے کوئی تخصیص نظر نہیں آتی۔

(۲) باغات: عربی تحریر کے علاوہ گل بوٹے بنانے اور اقلیدسی اشکال کا ذوق و شوق جس میں شبیہی نقاشی میں کم اور سنگ تراشی میں اور بھی کم حصہ لیتی ہیں۔

(۳) ہر سطح اور شکل کو ان نقوش سے مزین کرنے کا شوق جس میں بالاکثر اشکال کی نوعیت کا بھی خیال نہیں رکھا جاتا۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ پیچیدہ ڈیزائنوں اور بے اندازہ طرحوں کی طرف شدید میلان۔

(۴) نسبتاً بالکل سادہ اور معمولی سامان کا کثیر استعمال، بالخصوص وہ خام ساز و سامان جس کو صناعوں اور کاریگروں نے اول اول برتنا شروع کیا تھا۔ اور اس وجہ سے بالعموم اسراف و نمود و دولت سے احتراز دکھائی دیتا ہے گو یہ رجحان کوئی عالمگیر حیثیت اختیار نہ کر سکا۔

مغربی محققین میں پروفیسر میتی نان پہلے شخص تھے جنہوں نے مذکورہ بالا خصائص کو مسلمانوں کے مذہبی میلانات سے منسوب کیا اور دیگر فضلائے مغرب نے اس سلسلہ میں ان کی پیروی کی ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، بعض ایسے مظاہر جن کو بالتخصیص اسلامی قرار دیا جاتا ہے، اسلام سے پہلے بھی موجود تھے یا بازنطین اور چین کے معاصر فنی حلقوں میں پائے جاتے تھے۔ دراصل یہ اسی قسم کا استدلال ہے جو اسلام کے دیگر منابع سے ماخوذ ہونے کی بنا پر کیا جاتا ہے یعنی یہ کہ اسلام کے فلاں فلاں خصائص یہودی، عیسائی، زرتشتی یا ہندو ماخذوں سے مستعار ہیں۔ یہ کہ اس کے بعض فقہی تصورات پر رومن قانون یا دیگر سرچشموں کا پرتو ہے ممکن ہے یہ باتیں صحیح ہوں، لیکن سچ پوچھئے تو ہر تہذیب کا بہت کم حصہ اپنا ہوتا ہے۔ پھر بھی سابقہ یا معاصر تہذیبوں سے بعض چیزوں کو اپنا کر انہیں نئی نئی شکلوں میں ترتیب دیا جا سکتا ہے اور اس طرح ترتیب و تشکیل کی جو نئی نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں یا ان میں نئی معنویت پیدا کی جاتی ہے، وہ تخلیقات میں اپچ پیدا کر سکتی ہے اور یقیناً ایسی تخلیقات کا باعث ہوتی ہے جن کو طبع زاد قرار دیا جا سکے۔ یہ بات اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے جب کہ ہم کسی سابقہ دور سے بعض خصائص منتخب کرتے وقت اس کے اہم ترین یا عمومی عناصر کو نظر انداز کر دیں۔ گرچہ مستعار عناصر قبل ازیں بھی موجود تھے، پھر بھی وہ بعد میں بالکل نئے انداز میں دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ان کا جو مصرف پیدا کیا گیا ہے۔ وہ بالکل مختلف ہے۔

ایک اور سوال جو اس سلسلہ میں اٹھایا جاتا ہے یہ ہے کہ قدیم ماخذ اس جدید معنویت کی تردید کرتے ہیں جو تخمینی فن پاروں میں داخل کی گئی ہو، چونکہ یہ انکشافات مستند دستاویزی ثبوت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے ان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس بارہ میں قدیم ماخذ کی تردیدی شہادت فیصلہ کن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض امور میں نئے مفہوم و معانی کا ادخال صحیح نہیں، اور اس کی تعمیم لازم ہے لیکن اس کے برعکس یہ بھی تو ممکن ہے کہ مذکورہ ماخذ بعض حالات کی نشاندہی کرتے ہوں جن پر عمومیت کا اطلاق بجا نہیں۔ مثال کے طور پر بعض مقامات مقدسہ کعبہ، روضۂ نبویؐ یا قبۃ الصخریٰ میں بعض قیمتی نوادر کا پایا جانا ان مقامات کی تقدس و تبریک کا باعث ہے۔ لیکن اس سے ان تبرکات کی تحریمی حیثیت پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ اس طرح خانۂ کعبہ میں جو ہدیے رکھے ہوئے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ نومسلم فرماں رواؤں نے اپنے اظہار اطاعت کے لئے انہیں وہاں پیش کیا ہے یا کسی غیر مسلم وسیلہ سے حاصل شدہ مال غنیمت کو یہاں لاکر [illegible] رکھا گیا ہے۔ ان معین شواہد کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی نشاندہی صرف اس لئے کی گئی ہے کہ وہ خلاف معمول مثالیں ہیں۔

ان تمام توجیہات بلکہ تحقیق کے سلسلہ میں مسلمان محققین سے بے حد مدد حاصل ہو سکتی ہے جو نہایت کارآمد بھی ثابت ہوگی۔ کیونکہ یہ لوگ ان یادگاروں کے وارث ہیں جو ہم مغربیوں کے مطالعہ کا موضوع ہیں اور وہ قدیم سرمایۂ ادب جس سے ان معاملات پر روشنی پڑتی ہے، براہ راست ان کی دسترس میں ہیں۔ وہ ان شاندار عمارات اور نوادر کو درست طور پر اپنوں کے سامنے بھی پیش کر سکتے ہیں اور دوسروں کے سامنے بھی۔ خدا کرے اسلامی فنون کا یہ ورثہ مشرق و مغرب دونوں کے لئے ایک نیا سرچشمۂ فیضان ثابت ہو۔ (ڈاکٹر رچرڈ ایٹنگھاوسن)

★
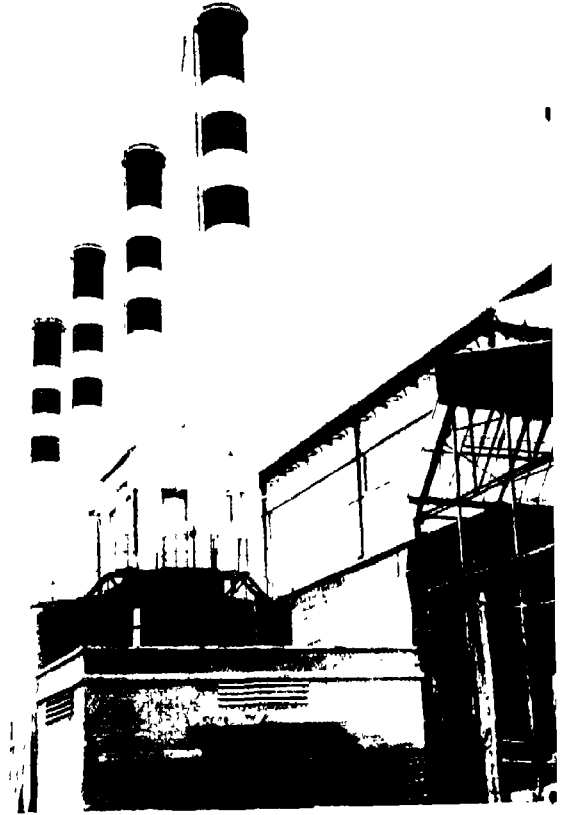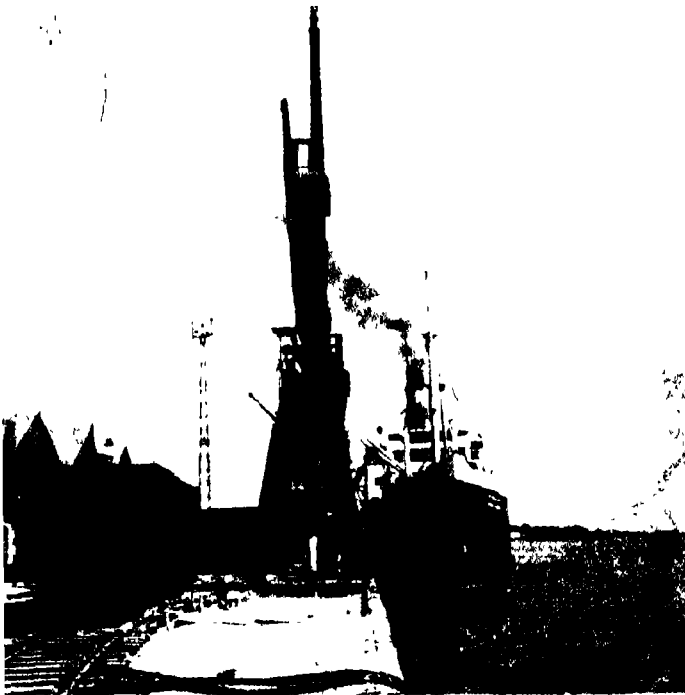
خطّاطی

ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

فنونِ لطیفہ میں جو جمالیاتی شان و شوکت اور دلکشی مسلمانوں کی خطاطی کو حاصل ہے، وہ دنیا کے کسی فنِ خطاطی کو آج تک حاصل نہیں ہوئی۔ اس کا مشاہدہ کرنے والا خواہ اس کی حقیقت سے واقف ہو یا نہ ہو، مگر اس کی موزونیت و لطافت اس پر ایک کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔ مسلمانوں نے اس کے مختلف انواع اور اسالیب وضع کر کے اس فن کو ہر پہلو سے ایک اعلیٰ فن بنا دیا ہے۔ مسلمان قرآن مجید کی کتابت اسی جذبہ سے کرتے تھے گویا یہ بھی عبادت ہے۔ اور بادشاہ سے لے کر معمولی انسان تک اس میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔

اسلام میں فنِ خطاطی کا ارتقاء نزولِ قرآن کریم کے بعد شروع ہوا۔ آنحضرت صلعم پر جب کوئی آیت نازل ہوتی تو صحابہ اس کو زبانی یاد کر لیا کرتے تھے لیکن حضور قرآن مجید کو لکھ لینے کی بھی تلقین فرماتے تھے۔ نزولِ قرآن کریم کے وقت عرب میں جو لوگ حلقۂ اسلام میں آئے ان میں سے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد صرف سترہ تھی ان میں سے بعض ایسے تھے جو صرف پڑھ سکتے تھے، لکھ نہیں سکتے تھے۔ سب سے پہلا کاتب قرآن ہونے کا شرف حضرتِ زیدؓ بن ثابت کو حاصل ہے۔ آپ نے قرآن شریف کو کھال کے ٹکڑوں اور درختوں کے پتوں پر لکھا۔ اسی طرح بعض صحابۂ کرام بھی قرآنِ کریم کی آیات کو لکھ لیا کرتے تھے کیونکہ کاغذ اس وقت تک عرب میں میسر نہیں تھا۔

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو عربی خط کی ابتداء مقام حیرہ سے ہوئی جو کوفہ سے بالکل ملا ہوا تھا۔ کوفہ کو مسلمانوں نے شروع ہی میں فتح کر لیا تھا۔ یہ مقام اسلام سے پہلے ایک حد تک متمدن تھا۔ یہاں عربی طرزِ تحریر نے کسی قدر ایک صورت بھی اختیار کر لی تھی۔ اس وجہ سے ابتداء میں طرزِ کوفی زیادہ مشہور بھی ہوا تھا۔

آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جب حضرت ابو بکر صدّیقؓ خلیفہ ہوئے تو آپ کو حضرت عُمرؓ نے قرآن شریف کو ایک جا اکٹھا کرنے اور اسے تحریر کروانے کا مشورہ دیا۔ اور حضرت ابو بکرؓ نے یہ کام حضرت زید بن ثابتؓ کے سپرد کیا۔ انہوں نے نہایت احتیاط کے ساتھ مختلف چیزوں پر سے قرآن کریم کی لکھی ہوئی آیات بصورتِ قرطاس مدون کیں۔ حضرت عثمانؓ نے قرآنِ کریم کی تلاوت میں اختلافِ قرأت کی بناء پر اس کو خالصتاً عربی لہجہ میں لکھے جانے کے لئے لوگوں کو مقرر کیا۔ اس طرح جو قرآن آپ نے لکھوا کر مکمل کروایا اُسے "مصحفِ عثمان" کہا جانے لگا۔ مصحفِ عثمان کی بہت سی نقلیں کی گئیں اور ان کو مختلف ممالک میں مروّج کرنے کا حکم دیا گیا۔ چنانچہ عراق، شام، مصر وغیرہ میں اسی کے نسخے ارسال کئے گئے۔ یہ تھی اسلامی خط کی ابتدائی جمالیاتی کیفیت جس کے لئے اتنے مراحل قرآنِ کریم کو بصورتِ کتاب لانے کے لئے طے کئے گئے۔

جب حضرت علیؓ کا دور آیا تو مقام خلافت کوفہ تھا۔ اس کی وجہ سے کوفہ کو مزید اہمیت حاصل ہوئی اور یہاں عربی رسم الخط کو بہت ترقی ہوئی۔ جب خلفاء راشدہ کے بعد بنو امیہ کا زمانہ آیا تو اسلام کا دارالخلافہ دمشق تھا اور حضرت معاویہ پہلے خلیفہ تھے۔ جو حضور صلعم کے کاتبانِ وحی میں شمار ہوتے تھے۔ یہاں کے مشہور لکھنے والوں میں ایک قطبیہ تھا جس نے چار طرح سے عربی رسم الخط کو رواج دیا۔ اس کے بعد ضحاک بن عجلان مشہور ہوا جس کا زمانہ بنو عباس کا ابتدائی دور تھا۔ اس نے قطبیہ کے طرزِ خط کے حسن و جمال میں خاصہ اضافہ کیا، اسحاق بن حمّاد کاتب خلیفہ منصور اور مہدی کے دورِ خلافت میں گزرا ہے۔ جو ضحاک پر بھی فوقیت رکھتا تھا۔ اس کے بے شمار تلامذہ نے عربی خط کو بہت فروغ دیا۔ ان میں سے یوسف الکاتب بہت مشہور ہے۔ جو "لِقوۃ الشاعر" کے لقب سے شہرت رکھتا ہے۔ ابراہیم المحسن نے یوسف کے خط کے حسن و جمال میں مزید اضافے کئے۔ اس کے تلامذہ میں سے عبدالجبار اَدسی شعرانی، اَبرش اور سلیم الکاتب بہت مشہور ہیں۔ عمرو بن مسعدہ اور احمد الکلبی، مامون کے کاتب تھے جو عباسیوں کے دورِ اول میں اصلی عربی خط کو نہایت موزونیت سے لکھتے تھے، اور یہی زمانہ تھا جبکہ عربی رسم الخط نے ایک خاص جمالیاتی

پہچان نہ سکا۔ بلکہ خود ابن بواب بھی بعد میں اپنے لکھے ہوئے جزکی نشان دہی نہ کر سکا ۔ مذکورہ کتب خانہ کا یہ نسخہ ہمیشہ ابن مقلہ ہی کا لکھا ہوا شمار ہوتا رہا محققین کے نزدیک ابن بواب کے خط کو کسی خاص طرزِ خط کا نام نہیں دیا گیا۔ یاقوت نے اس خطاط کو "صاحب الخط الملیح والاذہاب الفائق" لکھا ہے۔

ابن بواب کے بعد خطِ نسخ کو کافی فروغ ہوا اور خطِ کوفی میں ایک خاص طرح کی زیبائش پیدا ہو گئی۔ بنابریں وہ بالاکثر عنوان لکھنے کے لئے استعمال ہونا شروع ہوا اور اس کی طرف مزید رجحان پیدا ہوا چنانچہ ابن بواب کے بعد جس نے خط منسوب یعنی خط جاریہ عمدگی سے لکھا، وہ ابوطالب المبارک تھا جس کا انتقال ۵۸۸ھ میں ہوا۔

ساتویں صدی ہجری تک فن خطاطی کے سلسلہ میں مرکزی حیثیت بغداد ہی کو حاصل رہی۔ اس صدی میں ایک اور شخص جمال الدین ابوالدر یاقوت گذرا ہے جو دراصل خلیفہ معتصم باللہ کا آزاد شدہ غلام تھا اور اس نے اس کو خطاطی کی تعلیم دلائی۔ اسی لئے وہ یاقوت معتصمی کے نام سے مشہور رہے اس نے نسخ، ثلث، توقیع، محقق، ریحان اور رقاع میں کمال پیدا کیا اور اپنی کتابت کو خوب مزین کرنے کا بھی سلیقہ پیدا کیا۔ ان اقسام خط کو ایک دوسرے سے الگ الگ تمیز کرنا آسان نہیں۔ اس لئے خط نسخ ایک عام اصطلاح ہو گئی جو بالعموم عربی رسم الخط پر منطبق کی جاتی ہے۔ یاقوت کے تلامذہ میں سے چھ نے بہت نام پیدا کیا۔ ان کو استادانِ ستہ کہتے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں شیخ زادہ، ارغون کامل، نصر اللہ طبیب، مبارک شاہ، زرین قلم، میر یحیٰی صوفی اور یوسف مشہدی۔ بعض نے ان کے ساتھ عبداللہ صیرفی، میر حیدر اور مبارک صوفی کو بھی شامل کیا ہے۔

یاقوت کے خط نے آٹھویں صدی ہجری میں بہت فروغ پایا۔ خاص کر ایران میں اس خط نے ایک خاص صورت اختیار کی جسے عام طور پر تعلیق کہتے ہیں۔ یہ بہت بڑی تبدیلی تھی۔ اسے بعض نے خطِ ترسیل کے نام سے بھی تعبیر کیا ہے جس میں رسائل و اخبارات لکھے جاتے ہیں۔ عثمانیوں اور مصریوں نے اسے خط دیوانی کا نام دیا گیا۔ بعض کا بیان ہے کہ حسین علی فارسی نے تعلیق، کو خط نسخ، رقاع اور ثلث سے استنباط کر کے ایجاد کیا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ خواجہ تاج الدین سلمانی نے جو ہر شش خط میں مہارت تامہ رکھتا تھا، اس خط کو استخراج کیا ہے۔ بہرحال یہ مسلمہ امر ہے کہ خطِ تعلیق اور نسخ کے امتزاج سے طرزِ نستعلیق کا استخراج کیا گیا۔ جس کا موجد عام طور پر خواجہ میر علی تبریزی کو قرار دیا جاتا ہے۔

خطِ نستعلیق کی نشوونما اور فروغ میں شہزادہ بایسنغر بن شاہ رخ مرزا کا بڑا حصہ ہے۔ مولانا سلطان علی مشہدی نے اس خطِ نستعلیق کو مولانا اظہر سے حاصل کیا اور اس میں ایک خاص معیار پیدا کر کے اس کو چار چاند لگائے۔ اسی وجہ سے آج اسے "قبلۃ الکتاب" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے تلامذہ میں سے مولانا میر علی ہروی سلطان محمد خنداں، سلطان محمد نور وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بے شمار لکھنے والے پیدا ہوئے۔ میر علی ہروی نے اس فن میں اسقدر ترقی کی کہ اس سلسلہ میں اس کا نام ضرب المثل ہے۔

ظہیر الدین بابر بادشاہ نے ۹۳۲ھ میں فتح ہند کے بعد یہاں مغل سلطنت کی بنیاد قائم کی اور نستعلیق طرز کے ماہرین کو ہمراہ لایا اس سے قبل یہاں محض خطِ نسخ کے طرز میں ہی لکھا جاتا تھا۔ مگر اس زمانے سے نستعلیق کا رواج شروع ہوا۔ اگرچہ مؤرخین نے بابر کے خط کو بھی "طرزِ خط بابری" سے یاد کیا ہے۔ جس میں بابر نے ایک قرآنِ کریم بھی لکھا۔ اور اس کو مکہ معظمہ بھجوایا تھا۔ اس وقت اس خط کے ماہر میر عبدالحئی منشی اور اس کا بھائی میر عبداللہ قانونی تھے۔ بابر کے دربار میں ملا علی الکاتب نے نستعلیق طرز میں "تزکِ بابری" کے نسخہ کو ۹۳۷ھ میں شہزادہ ہمایوں کیلئے مکمل کیا مگر ہمایوں کو چند سال حکومت کرنے کے بعد ۹۴۷ھ میں ایران جانا پڑا۔ واپسی پر وہ اپنے ہمراہ ملا خواجہ عبدالصمد شیریں قلم اور سلطان بایزید بن نظام الدین جیسے ماہران کتابت لایا۔ اکبر کے دربار میں خطِ نستعلیق نے وہ ترقی کی کہ ایران کی ترقی بھی ماند پڑ گئی۔

(تلخیص: بہ شکریہ ریڈیو پاکستان، لاہور)

★

میں نے فرط محبت سے اس گھناؤنے بچے کو گود میں اٹھا کر اپنا سوٹ خراب کرتے ہوئے کہا: "نہیں صاحب ہم دیں گے اپنے بیٹے کو چونّی اور یہ ضرور خریدے گا ڈور پتنگ۔"

اس نابکار نے بھی میری گردن میں باہیں ڈال کر میری ٹائی کو ڈگام کی طرح کھینچ کر کہا: "اوہو ہو ہو۔ تم بڑے اچھے ہو۔"

ٹھیکہ دار صاحب رسماً کہتے بھی رہے کہ آپ نے خواہ مخواہ اپنے کپڑے خراب کر لیے اس کو گود میں اٹھا کر۔ مگر میں نہایت منافقت سے یہی کہتا رہا کہ "کپڑے میلے ہو گئے تو کیا ہوا بچے کا دل تو میلا نہیں ہوا۔ لو میاں یہ چونّی اور لے آؤ ڈور پتنگ۔"

صاحبزادے تو چونّی لیکر اچھلتے کودتے دفعان ہو گئے مگر اب ٹھیکہ دار صاحب کے تیور ہی بدل چکے تھے بڑی یگانگت سے میری طرف دیکھ رہے تھے بلکہ مجھ کو ان کی نگاہوں میں کچھ کچھ مروت بھی نظر آ رہی تھی لہذا میں نے موقع غنیمت جان کر عرض کیا:

"تو جناب والا جہاں تک مکان کا تعلق ہے مجھے گویا نا امید ہو جانا چاہیئے۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے ایک دم سے چونک کر کہا: "نا امید؟ کیوں آخر نا امیدی کی کیا بات ہے۔ میں نے آپ سے کچھ زیادہ تو کرایہ نہیں مانگا۔ ابھی جس کرایہ دار نے مکان خالی کیا ہے آپ کے سر کی قسم وہ پونے دو سو روپیئے دے رہا تھا۔ اب میں نے اس میں دو پنکھے لگوا کر صرف پچیس ہی روپیئے تو بڑھائے ہیں۔"

میں نے عرض کیا: "سب سے بڑا مرحلہ تو میرے لئے یہ ہے کہ پانچ سال کا پیشگی کرایہ ادا کروں آپ خود ہی غور فرمایئے کہ بارہ ہزار روپیہ یکمشت میں کہاں سے لاؤں۔"

ٹھیکہ دار صاحب نے ہنس کر کہا "بس اتنی سی بات۔ میاں یہ تمہارا گھر ہے بس رہنا شروع کر دو اور پانچ سال کا پیشگی نہ سہی بس ایک سال کا دیدو۔ بس اب تو خوش ہو۔"

میں واقعی خوش تھا اور اتنی رقم آسانی سے ادا کر کے دو سال تک اس گھر میں اطمینان سے رہ سکتا تھا اس لئے اب سو روپیہ مہینہ ماہ بماہ مجھے ادا کرنا تھے۔ اور باقی سو اس پیشگی میں سے دو سال تک منہا ہو سکتے تھے لہذا میں نے اسی وقت دو ہزار چار سو کا چک لکھ کر ان کے حوالے کر دیا اور دوسرے ہی دن اپنا سامان لا کر اس گھر میں رہنا شروع کر دیا جو دراصل مجھ کو اپنے عزیز از جان بھتیجے کے طفیل میں ملا تھا جو اب مجھ کو باقاعدہ چچا کہنے لگا تھا۔

غضب ہی ہو جاتا اگر میں اس وقت اس الگھوری بھتیجے کو پیار سے گود میں نہ اٹھا لیتا اور اپنا سوٹ غارت نہ کر سکنے کے علاوہ پتنگ لانے کیلئے وہ چونّی نہ دیدیتا۔ اگر میرے لئے غیب سے یہ سامان نہ ہو جاتا تو یہ مکان مجھے قیامت تک نہ مل سکتا اس لئے کہ اس گھر میں آ جانے کے بعد اور ٹھیکہ دار صاحب سے تفصیلی ملاقاتوں کے بعد معلوم یہ ہوا کہ ٹھیکہ دار صاحب ذاتی طور پر نہایت خبیث واقع ہوئے ہیں۔ انسانیت اور مروت کا ان کے آس پاس گذر بھی نہیں ہے۔ پیسہ پر اُن کی جان جاتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے کنجوس بھی ہیں لے دے کر ان کی تیلا دی شخصیت میں اگر کہیں چمک پیدا ہوتی ہے تو عزیزم گھسیٹے سلمہ کے معاملہ میں یعنی میرے اسی راحت جان بھتیجے کے سلسلہ میں جو عمر بھر میں ان کی واحد اولاد ہے۔ اولاد کے شوق میں وہ دو بیویوں کو مار چکے ہیں ایک کو چھوڑ چکے ہیں اور اس حساب سے محترمہ والدہ گھسیٹے گویا ان کی چوتھی بیوی ہیں۔ ان زوجہ پر داں نے ٹھیکہ دار صاحب سے گنڈے تعویذ کرائے۔ درگاہوں پر حاضریاں دلوائیں، چلّے کھنچوائے اور آخر کار حضرت بدھی شاہ کے ایک گنڈے سے جب اولاد کی امید پیدا ہوئی تو حضرت شاہ صاحب نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ بچہ جیسے ہی پیدا ہو اس کو گیہوں پھٹکنے والے سوپ میں ڈالکر گھسیٹتے ہوئے باہر میرے پاس لانا اور لڑکا ہو تو نام گھسیٹے رکھنا، لڑکی ہو تو گھسیٹی چنانچہ جب یہ صاحبزادے پیدا ہوئے تو ان کے ساتھ یہی سلوک کیا گیا اور شاہ صاحب قبلہ نے ان کو گھسیٹے کہکر ان کے کان میں اذان دی اور کچھ پڑھ کر ان پر دم کیا۔ اب یہ لڑکا ٹھیکہ دار صاحب کا دیوتا ہے۔ جو اسے خوش کر دے ٹھیکہ دار صاحب اس کے غلام ہیں باقی سب خود ٹھیکہ دار صاحب کے غلام چنانچہ میری قسمت کا ستارہ تو نہ جانے کس عروج پر تھا کہ میں نے اس کو گود میں بھی اٹھا لیا اور اس کو چمکار کر ایک چونّی بھی دیدی اللہ جانے کس حلال کی کمائی کی تھی وہ چونّی جس نے یہ برکتیں دکھائیں۔

اب مصیبت میرے لئے یہ ہے کہ گھر کی بیٹھنے والی عورتیں تو یہ باتیں جانتی نہیں کہ آجکل اس شہر کراچی میں مکان کس طرح ملتا ہے اور جن کو

ماہِ نو، کراچی۔ فروری ۱۹۵۹ء

بنگلا کہانی،

اشرف صدیقی

مترجمہ: یونس احمر

مسلم ہال میں دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا کہ ایک مختصر سا خط ملا۔ رابعہ آپا نے رنگپور سے بھیجا تھا۔ تین چار سطروں کا خط:

"امید ہے تم اچھے ہوگے۔ بہت دنوں سے ہم نے ایک دوسرے کی کھوج خبر نہیں لی۔ شاید اس طویل خاموشی سے تم نے اندازہ لگایا ہوگا کہ جیسے میں اس دنیا میں اب موجود نہیں۔ سچ مچ میں مر گئی ہوں۔ لیکن جسمانی موت نہیں ہو جاتی۔ تمہاری کہانیاں برابر پڑھتی ہوں اور جی نہال ہو جاتا ہے۔ اس بار چھٹیوں میں رنگپور ضرور آنا۔ تمہاری آپا کا حکم ہے۔"

رابعہ آپا! کیا وہی رابعہ آپا ہیں۔ تقریباً چھ سال کی طویل خاموشی کے بعد یہ خط! تو آپا زندہ ہیں۔ اور یہ ہے ان کا حکم۔ زندگی میں نہ جانے کتنی بار ان کے احکام کی تعمیل کی ہے اور ان کی وجہ سے نہ جانے کتنی بار مصائب سے دوچار ہوا ہوں۔ ایک بار پھر ان کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔

یادوں کے دبیز پردوں پر کتنی بھولی بسری باتیں تازہ ہو رہی ہیں۔ مومن شاہی شہر، برہم پتر کا کچھار، مہہ گینی روڈ، آنند موہن کالج، شاہجہاں ولا، ابر آلود دن، چاندنی راتیں اور وہ سن ۱۹۴۳ء آج سے کتنے سال پہلے کی بات۔ کتنی بار برساتیں، گرمیاں، سردیاں اور بہاریں آئیں اور گذر گئیں۔ ایک زمانہ بیت گیا۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود میں رابعہ آپا کو بھلا نہ سکا، بھلا بھی نہیں سکتا!

آنند موہن کالج میں پڑھتا ہوں اور شاہجہاں ولا میں رہتا ہوں۔ یکایک ایک دن متصل کے مکان میں ایک نیا کرایہ دار آیا۔ سادُتھ علاقے کا نیا ایس۔ ڈی۔ او۔ تین لڑکیاں، چار لڑکے، خود اور بیوی۔ بڑی لڑکی میرے ہی کالج میں آرٹس کلاس میں داخل ہوئی۔ عمر میں مجھ سے کچھ بڑی ہی تھی۔

اس کے بعد اس مکان میں ایک نئی کہانی نے جنم لیا!

صبح سویرے دریا، دوپہر کو گیتوں کی دنیا، شام کو ہارمونیم، کچھ اندھیرا ہوا تو لڑکیاں چھت پہ تارے گننے یا برہم پتر کی چنچل لہروں سے جی بہلانے آجاتیں۔ ہنسی کا فوارہ چھوٹتا، گیتوں کے انبار بلند ہوتے!

ایک دن کالج جاتے وقت مکان کے پچھواڑے میں بڑی لڑکی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔

چہرے پر معصومیت اور گمبھیرتا کا عکس تھا۔ میں نے اس سے کچھ کہتے ہوئے کمزوری سی محسوس کی۔ اگر تھپڑ مار دے تو۔ کیا ضرورت ہے بات کرنے کی! دور ہی سے سلام کر لوں۔

اسی عرصہ میں کالج کا سالانہ انتخاب شروع ہو گیا۔ میں کالج میگزین کا سکریٹری منتخب ہوا۔ حسب دستور سبھوں کے نام مضامین لکھنے کی درخواست بھیجدی۔ جلد ہی مجھے ایک مضمون ملا۔ ایک مسلمان لڑکی کا تحریر کیا ہوا تھا۔ نام تھا۔ رابعہ بیگم۔ مضمون پڑھ کر حیرت میں ڈوب گیا۔ میگزین کمیٹی حتیٰ کہ گولڈ میڈلسٹ پروفیسر کو بھی تعجب ہوا۔

دوسرے دن ایک خط بھیجا جس میں میں نے صرف اتنا دریافت کیا تھا۔ "یہ مضمون کیا آپ ہی نے لکھا ہے؟"

کاش مجھے پہلے معلوم ہوتا کہ ایسا خط بھیج کر میں نے کتنی حماقت اور جہالت کا ثبوت دیا ہے۔ رابعہ بیگم خط پڑھ کر آپے سے باہر ہو گئیں۔ میگزین کمیٹی کے نام ان کا خط آیا۔ گالیوں سے بھرپور۔ ہم یہ خط پڑھ کر اپنا گریبان نوچنے لگے۔

اس کے مکان میں میلاد کی محفل سجی۔ گھر بھر کو دعوت دی گئی تھی۔ رابعہ بیگم کے چھوٹے بھائی کے ساتھ تعارف ہو چکا تھا۔ اس نے رابعہ سے بھی میرے بارے میں کہا۔ میلاد ختم ہونے کے بعد چوروں کی طرح بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے چھت کے اوپر عجیب تماشا دیکھا۔ رابعہ بیگم اور انکی

اس کے بعد دو دو دن پر خط آنے لگے۔ کتنی خوش ہوتی تھیں وہ خط پا کر۔ بھوک پیاس کو بھلا کر خط پڑھتیں اور نہال ہو جاتیں اور دن بھر خوشی سے ان کا چہرہ شگفتہ پھول کی طرح کھلا رہتا۔ ایک دن خط آیا تو میرا جی پڑھنے کو چاہا۔ میں نے بڑی ہوشیاری سے کھولا۔ تحریر بڑی خوبصورت تھی۔ "پیاری، بہت جلد میں قید سے رہا ہو رہا ہوں۔ اب تو اسی امید میں دن گذر رہے ہیں کہ وہ دن کب آئے گا جب ہم آپس میں ملیں گے......"

خط پڑھ کر اسے بند کیا اور پھر آپا کو دے آیا۔

آپا کے ابا اور اماں مجھے اپنے بچے کی طرح پیار کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کہیں آنے جانے میں پابندی نہ تھی۔

ایک دن سویرے سویرے آپا مجھے سیر کرانے لے گئیں۔

رکشا اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی اور میں آپا کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ ہم پہونچے ہی تھے کہ گاڑی آ گئی تیسرے درجے سے ایک دبلا پتلا شخص تلخ ہنسی ہنستا ہوا باہر آیا۔ آپا نے ان کے گلے میں پھولوں کا ہار پہنا دیا۔ کیا ہی جیل میں تھے؟ کیا یہی ہیں مسٹر اے دین؟ ویٹنگ روم میں بہت دیر تک دونوں باتیں کرتے رہے اور اسٹیشن میں چکر کاٹتے کاٹتے میرا دم نکل گیا۔ آپا باہر آتے ہی بولیں "بہت دیر تک میں نے تمہیں انتظار کرایا۔"

آپا نے اس شخص کے بارے میں مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے بھی پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ ایک دن دوپہر کا وقت تھا۔ لیٹے لیٹے ایک کہانی پڑھ رہا تھا۔ آپا دبے پاؤں میرے کمرے میں آئیں اور بولیں۔ "جانتے ہو آج میں نے تمہارے لئے خدا سے بہت دیر تک دعائیں مانگی ہیں۔"

"کیسی دعائیں؟"

"یعنی تمہیں چاند سی بہو ملے۔"

"نہیں آپا نہیں۔"

"سونے کا بھاؤ کیا ہے جانتے ہو؟"

"کیوں؟ میری دلہن کو دیں گی کیا؟"

"مگر تم نے تو ابھی کہا کہ شادی نہیں کرو گے۔"

"جب شادی نہیں کرو گے تو میرا ایک کام کر دو۔ یہ انگشتری لو اور اسے بیچ کر جتنے روپے ملیں اس پتے پر دے آؤ۔ کچھ خیال نہ کرنا۔"

انگشتری بیچ کر میں روپے دے آیا۔ وہ شخص میس میں رہتا تھا۔ اس وقت وہ بخار میں تپ رہا تھا۔ اس کے کمرے کو دیکھ کر مجھے گھن آنے لگی ایسی جگہ کوئی انسان رہ سکتا ہے۔ آتے روپے دیئے اور اس نے بیہوشی کے عالم میں مجھے دعائیں دیں اور بولا: "انسانیت بڑی چیز ہے بھائی۔ ملک کے کام آؤ۔ ملک کی خدمت کرو۔"

اس وقت پاکستان کی تحریک بڑے زوروں پر تھی۔ میں نے مسٹر اے۔ دین (علاء الدین) کو ان ہی دنوں اسکولوں، کالجوں، چائے کے اسٹالوں، بستیوں، مزدوروں کے کارخانوں، کھیتوں اور کوچوانوں میں کام کرتے دیکھا تھا۔

سرکٹ ہاؤس گراؤنڈ میں عظیم الشان جلسہ تھا۔ بڑے لاٹ صاحب آئے تھے۔ انگریزوں پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ جرمنی نے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔ انہیں روپوں کی ضرورت تھی۔ بڑے بڑے ہوائی جہاز تیار کرنے کے لئے جنگ پر فتح پانے کے لئے۔

علاء الدین صاحب کو طیش آ گیا تھا۔ مائک کے قریب آ کر انہوں نے باغیانہ تقریر کر ڈالی۔ انہیں بخشا نہیں گیا۔ قید ہو گئی۔

رابعہ آپا کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں لیکن راستے سے نہیں ہٹیں۔ وہ خواتین کے اندر آزادی کی روح پھونکتی رہیں۔ ان کے دل کو اطمینان نصیب نہ تھا۔ علاء الدین صاحب کا خط میرے پتے پر آتا۔ ایک دن خط آیا۔ پڑھ کر بولیں: "تمہیں آج ہی میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ لیکن ذرا ہوشیاری سے۔ کسی کو معلوم نہ ہو۔"

سومن شاہی جیل کا دروازہ تھا۔

علاء الدین صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ان کا جسم لہولہان تھا۔ آپا پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ جیل کا دروازہ بند ہو گیا۔ ہم واپس آ گئے۔۔ سی۔ آئی۔ ڈی نے ہمارا پیچھا کیا۔

وہ رو پڑیں۔ ساون کی برکھا کی طرح ان کے آنسو گرنے لگے۔ اور چاند کی شفاف روشنی میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے سفید پتھر سے جھرنا پھوٹ رہا ہو۔

ٹرین روانہ ہوگئی۔ ڈبے چھوٹے سے چھوٹے ہوتے گئے۔ کتنی عجیب ہے یہ دنیا اور یہ انسان!

میں گھر واپس آگیا۔ آپا کے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ آپا صرف ایک خط چھوڑ گئی تھیں جس میں تحریر تھا۔

"آسمان پر اڑنے والے پنچھی کو پنجرے میں بند نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے وطن کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ ڈھاکہ کی ایک غلیظ بستی میں آج میری شادی ہوئی، علاء الدین کے ساتھ۔ مجھے افسوس ہے کہ تم لوگوں کی دعوت نہ کر سکی۔ مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ۔ رابعہ"

اس کے بعد آپا کے گھر میں کسی دن بھی ان کا ذکر نہ آیا۔ اور اگر کبھی ذکر آتا تو ان کے ابا اماں کہتے "رابعہ نامی کسی لڑکی نے میرے گھر میں جنم نہیں لیا"

میرا امتحان ختم ہوگیا۔ مومن شاہی سے اپنے وطن آگیا۔ رابعہ آپا نے کبھی خط نہیں لکھا۔ کبھی کبھی ان کی باتیں یاد آتیں تو سوچتا۔ نہ جانے وہ زندہ ہیں یا مر گئیں!

نہیں، نہیں، رابعہ آپا زندہ ہیں — رنگپور بلا رہا ہے انہوں نے۔ اسٹیشن سے بہت دور گلی میں بڑی تلاش کے بعد ان کا گھر ملا۔ انہوں نے مجھے دیکھا۔ میں نے ان کو دیکھا۔ مگر یہ کیا؟ یہ تو صرف ان کی چھایا ہے! ان کا حسین چہرہ سیاہ ہوگیا تھا۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ ایک بچہ مٹی میں کھیل رہا تھا۔ بہت دیر تک وہ مجھے دیکھتی رہیں پھر بولیں۔ "میں تو پہچان نہ سکی۔ کتنے بڑے اور کیسے خوبصورت ہوگئے ہو تم۔ میں جانتی تھی آؤ گے۔ ایک دن مسلم ہال کی ادبی انجمن کے میگزین میں تمہارا نام دیکھا۔ اور اسی پتہ پر تمہیں خط بھیج دیا۔"

انہوں نے اپنے ہاتھوں سے مجھے کھلایا پلایا۔ میں نے پوچھا: "گھر پر اور کوئی نہیں؟" کہنے لگیں: "رات کو ایک بڈھا یہاں آکر رہتا ہے۔ اسکول کا دربان ہے وہ۔ اس سے سو داسلف منگا لیتی ہوں۔"

شام کو انہوں نے اپنی کہانی بیان کی، اپنی شادی کی۔ پھر علاء الدین صاحب کے بارے میں انہوں نے کہا کہ کس طرح ان کی صحت بگڑ گئی، ایک آنکھ جاتی رہی ایک ہاتھ مفلوج ہوگیا۔ آپا پرائیوٹ اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ چالیس روپے تنخواہ۔ بڑی تنگ دستی سے دن گذر رہے ہیں۔ اور پھر ایک دن زندگی کا سرمایہ لٹ گیا۔ تنہا رہ گئیں۔ ساتھی نے ساتھ چھوڑ دیا۔

رابعہ آپا کی کہانی سن کر میرا دل تڑپ کر رہ گیا۔ میں نے اپنے جی میں کہا۔ "آپا تم اپنی زندگی کو موم بتی کی طرح پگھلاتی رہیں۔ اپنے لئے نہیں، ملک اور قوم کی آزادی کے لئے۔ آج میں ساری باتیں لکھوں گا رابعہ آپا کی بھولی بسری باتیں۔"

غزل

سراج الدین ظفر

اُٹھ کہ مانندِ شلنگِ آہو
زندگی رقص ہے از ہُو تا ہُو

سحر و شام گذرتے ہیں مرے
یا بہ گُل پیرہناں یا ہاہُو

رات بھر یارِ پری چہرہ و جام
صبح کو نالۂ یاہُو یاہُو

میری رندی کے لئے کافی ہے
یک قدح بادہ و یک صحرا ہُو

کون آغوشِ محبت سے اٹھا
عالمِ شوق ہے سرتاپا ہُو

میرے ہاتھوں سے تری زلفِ دراز
کبھی کھل جائے تو یا ہُو یاہُو

عالمِ ہُو کو جو پہنچے سے خوار
کوئی بے ہُو تھا نہ کوئی باہُو

رات دیکھا جو بروئے تحقیق
جام میں کچھ بھی نہ تھا الّا ہُو

بیخودیٔ عشق کی نائی ہے کہاں
ہر قدم دامِ فنا ہر جا ہُو

امتیاز ان میں کہاں تک یارو
خیر و شر دونوں ہیں سرتاپا ہُو

جام و تسبیح و رباب و زنّار
ہمہ اسباب و ہمہ اشیا ہُو

لبِّ و نجمہ و شیخ و واعظ
ہمہ القاب و ہمہ اسما ہُو

کہیں زمزم ہے کہیں جامِ شراب
کہیں قطرہ ہے کہیں دریا ہُو

کہیں اسرار کے سوسو پردے
کہیں بازار میں ہے رُسوا ہُو

زندگی کی کوئی تعریف نہیں
بس کہ ناپید سے ہے پیدا ہُو

رات کو لوحِ ذہانت پہ مری
چھوڑ جاتا ہے نقوشِ پا ہُو

یہی اشعار میں ڈھل جاتے ہیں
صبح کے وقت ز راسم یاہُو

ہر غزل ہے مری برجستہ ظفرؔ
کیا قیامت ہے نویں میں راہُو[1]

---

[1] میکہ کا راہو میرے زائچے کے خانۂ نہم میں ہے اور خانۂ نہم ادب سے متعلق ہے۔

غزلیں

(برنگِ میر) — صہبا اختر

○

تم نے کہا تھا چپ رہنا سو چپ نے بھی کیا کام کیا
چپ رہنے کی عادت نے کچھ اور ہمیں بدنام کیا
کنجِ چمن میں آس لگائے چپ بیٹھے ہیں جس دن سے
ہم نے صبا کے ہاتھ روانہ ان کو اک پیغام کیا
فرزانوں کی تنگ دلی فرزانوں تک محدود رہی!
دیوانوں نے فرزانوں تک رسمِ جنوں کو عام کیا
ہم نے بتاؤ کس تپتے سورج کی دھوپ سے مانی ہار
ہم نے کس دیوارِ چمن کے سائے میں آرام کیا
صہبا کون شکاری تھے تم وحشت کیش غزالوں کے
متوالی آنکھوں کو تم نے آخر کیسے رام کیا

○

صحرا صحرا[1] گلشن گلشن گیت ہمارے سنئے گا
یاد بہت جب آئیں گے ہم چپ بیٹھے سر دھنئے گا"
آج ہمارے اشکوں سے دامن کو بچا لیں آپ مگر
یہ وہ موتی ہیں کل جنکو شبنم شبنم چنئے گا!
ہم سے سادہ دل لوگوں پر ذوقِ اسیری ختم ہوا
ہم نہ رہے تو کس کی خاطر جال سنہرے بنئے گا!
دل کی باتیں طولانی ہیں اور یہ راتیں فانی ہیں!
میں بھی کب تک بول سکونگا آپ بھی کب تک سنئے گا
جس صہبا کے دل دینے کے قصے سے ناراض ہیں آپ
اس نے آخر جان بھی دے دی یہ بھی اک دن سنئے گا

○

رات کی ظلمت کیا سمجھے کب صبح کا تارا جانے ہے
جو بھی دل پر گذرے ہے وہ دل ہی ہمارا جانے ہے
شبنم کے یہ جھلمل قطرے کس کی آنکھ کے آنسو ہیں
کوئی انہیں موتی سمجھے ہے کوئی ستارا جانے ہے
ثبت ہیں غنچے کے ہونٹوں پہ محبت کی مہریں
اس گلشن کا ذرّہ ذرّہ عشق ہمارا جانے ہے!
اندھی دنیا کی آنکھیں گو دیکھ نہیں سکتیں لیکن
ہم نے کتنے دیپ جلائے یہ اندھیارا جانے ہے
عمرِ رواں کی بیتابی کو کیا سمجھیں گے سست قدم
تیز ندی کے موڑوں کو بہتا ہوا دھارا جانے ہے
کس نے تمہیں صہبا کے سوا چاہا ہے پرستش کی حد تک
مانے نہ مانے آنکھ نہ مانے دل تو تمہارا جانے ہے

---

[1] اس لئے کہ یہ مطلع میر کے مطلع سے بہت قریب ہے ۔ ص ۔ ا

غزل

جمیل نقوی

حسن ہے عشق کا اعجاز، کوئی کیا جانے
یہ بھی اک راز ہے، اک راز، کوئی کیا جانے

فطرتِ شعلۂ آواز کوئی کیا جانے
نغمگی سوز ہے یا ساز، کوئی کیا جانے

کلفتِ دردِ اسیری بھی بری شے ہے مگر
لذتِ حسرتِ پرواز، کوئی کیا جانے

اس نے دیکھا تھا تجاہل سے مرے دل کی طرف
تھا وہ انجام کہ آغاز، کوئی کیا جانے

یک بہ یک شعلہ سا لپکا تھا مرے پہلو میں
کہہ گیا کیا دلِ غماز، کوئی کیا جانے

مجھے اس شوخ نے کل رات بھری محفل میں
کیوں کیا تھا نظر انداز، کوئی کیا جانے

عشق کس درجہ صفا فطرت و سادہ ہے جمیل
عقل ہے کتنی دراز انداز، کوئی کیا جانے

نظر حیدرآبادی

اے ہمنشیں نہ پوچھ کہ کن خلوتوں میں ہوں
فرصت کہاں کہ وقت کو آواز دے سکوں

اس کشمکش نے زیست کو آسان کر دیا
وہ صاحبِ جمال ہیں میں صاحبِ جنوں!

مدماتی آنکھ، بوٹا سا قد، ڈولتی سی چال
آواز کی کھنک میں ہے آہنگِ ارغنوں

چہرہ لطافتِ گلِ تازہ لئے ہوئے
لہجے کی نرم آنچ سے دمکا ہوا فسوں!

کس سادگی سے میری طرف دیکھتے ہیں آپ
اس طرفہ التفات کو کہئے کہ کیا کہوں

اُٹھئے کہ پائے ناز پہ سجدے کروں نثار
مدت سے آپ رہتے ہیں محزون و سرنگوں

نازک ہے پھول اور حوادث کے ہوں شکار
شاخوں کے سر سے اور گذر جائے موجِ خوں

جانِ نظر سکوں ہے محبت کی چھاؤں میں
دُنیائے دوں کی دھوپ کہاں اور کہاں سکوں

بے خانماں لوگوں کی آبادکاری

بے خانماں لوگوں کی آبادکاری حکومت پاکستان کا ایک مقدس فرض ہے کیونکہ یہ عوام ہی ہیں جن کی سرفروشانہ جدوجہد سے پاکستان وجود میں آیا۔ اور یہی فدائیانِ ملت ہیں جو برِصغیر کے دُور دراز گوشوں سے اپنے آبائی وطن اور گھر بار کو تج کر ہزارہا مصائب جھیلنے اور جان و مال کی بے اندازہ قربانیاں دینے کے بعد اپنے نئے وطن میں پہنچے اور اس کے شہریوں کی حیثیت سے ان کی آسودگی و خوشحالی کا اہتمام لازم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب پاکستان قائم ہوا تو قائدِ اعظمؒ نے مہاجرین کی بحالی و آبادکاری کو حکومت کی اوّلین توجہ کا مستحق گردانا اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش عمل میں لائی۔ ان کے بعد قائدِ ملت کے زمانہ میں بھی ان کوششوں کا سلسلہ جاری رہا، اور اگر سرگرمیٔ عمل و خلوصِ کار کی یہی کیفیت رہتی تو یقین ہے کہ مہاجرین کی بحالی و آبادکاری کا مسئلہ کبھی کا حل ہو چکا ہوتا۔ مگر افسوس! تعمیر و ترقی کے اس روشن دور کے بعد ایک طویل دورِ تاریک کا آغاز ہوا جس سے قومی مفاد خود غرض عناصر کی سیاسی چالبازیوں اور ذاتی و جماعتی منافشات و تنازعات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اور دیگر اہم مسائل کی طرح یہ مسئلہ بھی مدتوں بے توجہی کا شکار رہا۔ چنانچہ پاکستان کے یہ بدنصیب شہری اپنے وطن میں بھی غریب الدیار ہی رہے اور شہر شہر قریہ قریہ گھاس پھونس کی جھونپڑیوں اور فٹ پاتھوں پر رُلتے رہے۔ توقع تو یہ تھی کہ ان کے نئے وطن کی آزاد فضائیں ان کے لئے مسلسل آسودگی و خوشحالی کا پیغام لائیں گی، لیکن اس کے برعکس وہ برابر گرمی سردی اور آندھی برسات کے صدمے سہتے رہے۔ ہر طرف گھٹا گھٹا غلیظ ماحول اور اس کا لازمی شاخسانہ گوناگوں بیماریاں اور وبائیں یہ صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات تھے، جن سے وہ عرصۂ دراز تک دوچار رہے۔

شاید وہ بدستور ایک غیر معین مدت تک ان ہی مصائب میں مبتلا رہتے اور کوئی بھی ان کا پرسانِ حال نہ ہوتا لیکن دفعتہً ایک کرشمۂ غیب سے ان کی قسمت جاگ اٹھی۔ قدرت نے ان کو یکایک ایک ہمدرد اور خیر خواہ حکومت عطا کر دی جس کا مقصد افرادِ ملت کی رفاہ و بہبود کے سوا کچھ نہ تھا چنانچہ اس نے عنانِ کار ہاتھ میں لیتے ہی اس اہم مسئلہ کی طرف توجہ مبذول کی اور بے خانماں لوگوں کی مکمل آبادکاری کو اپنا مقصدِ اوّلیں قرار دیا۔ ابھی نیا انقلاب پوری طرح بروئے کار نہیں آیا تھا کہ مارشل لاء کے ابتدائی زمانہ ہی میں حکومت نے اعلان کر دیا کہ وہ ان مفلوک الحال انسانوں کو تسلی بخش طور پر آباد کرکے ہی دم لیگی۔ یہ پاکستانی شہریوں کو ان کے واجبی حقوق دلانے اور ان کو آسودہ و خوشحال بنانے کے ہمہ گیر نصب العین کا جزو لاینفک تھا۔ کیونکہ آبادی کے اتنے کثیر حصّہ کو یوں بے اطمینانی کی حالت میں چھوڑ دینے سے زندگی کا نظام درہم برہم رہتا ہے اور کسی معاملہ پر بھی یکسوئی و دلجمعی سے توجہ نہیں دی جاسکتی۔ چہ جائیکہ قومی عزائم و مقاصد کا مکمل طور پر اہتمام کیا جاسکے۔

یہ احساس نئے قائدین کے دل میں کس قدر شدت سے جاگزیں تھا، اس کا اندازہ اس اعلان سے لگایا جاسکتا ہے جو موجودہ صدر پاکستان نے انقلاب کے چار ہی دن بعد ناظمِ اعلیٰ مارشل لاء کی حیثیت سے ایک پریس کانفرنس منعقدہ ۱۱ اکتوبر میں کیا تھا یعنی نئی حکومت کے نزدیک جو مسائل سرِ فہرست ہیں، ان میں سے ایک بے خانماں لوگوں کی آبادکاری کا مسئلہ بھی ہے۔ چنانچہ دس دن کے اندر ہی اندر ایک کمیٹی قائم کر دی گئی تاکہ مہاجرین کے مسئلہ پر غور و خوض کیا جائے اس سے متعلق منصوبوں کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔ ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو ان کے عملی صورت اختیار کرنے میں سدِّ راہ ہیں۔ اور اس کام کی تکمیل کے لئے آخری وقت کا تعین کر دیا جائے۔ اس سے نہ صرف اس خدمت سے عہدہ برآ ہونے کی شدید تمنا ظاہر ہوتی ہے بلکہ وہ احساس بھی نمایاں ہوتا ہے جو نئے اربابِ اختیار قوم کے اس مصیبت زدہ طبقہ کے لئے اپنے دل میں لئے ہوئے ہیں۔

انہوں نے بار بار کہا ہے کہ یہ لوگ ہمیں نہایت عزیز ہیں۔ ہماری نظروں میں ان کی بے حد قدر ہے کیونکہ انہوں نے جو بھی مصیبتیں سہیں پاکستان ہی کی خاطر سہیں۔ ہم ان کے ساتھ انصاف اور فیاضی کا سلوک روا رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ہماری ہمدردی شفقت اور محبت کے مستحق ہیں۔ وہ ہماری قوم کا نہایت اہم سرمایہ ہیں۔ ہم انہیں مطمئن اور خوش و خرم دیکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا انہیں بددل یا مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ احساسِ مسرت سے

سرشار ہونا چاہیئے کہ ان پر ایک مہربان حکومت کا سایہ ہے جو ان کے لئے آسودگی و خوشحالی کا سامان مہیا کر رہی ہے اور ان کے باشرف زندگی بسر کرنے کے لئے سازگار فضا پیدا کرنے میں کوشاں ہے۔

قبل ازیں ارباب نظم و نسق کے سامنے کوئی معین لائحۂ عمل نہ تھا۔ اب صورت حال بدل چکی ہے اور حکومت نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ وہ قوم کے لئے صحیح معنوں میں ابرِ رحمت ثابت ہو۔ اور اس کی واحد صورت یہ ہے کہ تمام ممکنہ وسائل اور متعلقہ مرکزی و صوبائی منصوبوں کو یکجا اور باہمدگر مربوط کر کے اس مسئلہ پر پوری شدت سے مرکوز کر دیا جائے۔ چنانچہ ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء سے لے کر اب تک انتظامی کارروائیوں کا ایک وسیع سلسلہ نظر آتا ہے۔ کارپردازوں اور ان کے کام کی کڑی سے کڑی نگرانی کی جا رہی ہے، وقتاً فوقتاً طے شدہ مراحل کا جائزہ لیا جاتا ہے، کارکردگی کے لئے بہتر سے بہتر قواعد و ضوابط مرتب کئے جا رہے ہیں۔ نئے وسائل کی تلاش اور استعمال برابر جاری ہے۔ منصوبوں کی ہر وقت شدید غور و پرداخت ہوتی ہے اور ان کو مناسب توسیع و ترقی سے موثر ترین بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ غرضیکہ یہ سارا سلسلہ ایک متحرک تجرباتی و ترقیاتی سلسلہ ہے۔ جس کا مقصد ایک ہنگامی صورت حالات سے نبرد آزما ہونا ہے۔ کیونکہ جب تک یہ بنیادی رکاوٹ ہمارے راستے سے دور نہیں ہو گی ہم کبھی قومی تعمیر و ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے کہ اس کام کے لئے جو طریقے اور تدبیریں اختیار کی جائیں گی وہ ایک مربوط و منظم منصوبے پر مبنی ہوں گی۔ جو گزشتہ چار مہینوں میں کافی واضح شکل اختیار کر چکا ہے۔

مہاجرین کے سلسلہ میں دو اہم سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ایک ان کی تسلی بخش آبادکاری اور دوسرا متروکہ جائدادوں سے متعلق دعاوی کا فیصلہ۔ لہٰذا ساری توجہ انہی دو مسئلوں پر مرکوز کی جا رہی ہے۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو اعلیٰ سطح پر جو کانفرنس منعقد ہوئی اس میں فیصلہ کیا گیا کہ بحالیات کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق دریائے حب کے پاس مضافاتی علاقہ میں فی الفور ۵۰ ہزار بے خانماں خاندانوں کو دو سال کے اندر اندر بسانے کا اہتمام کیا جائے جو دیہاتی علاقہ میں بڑی مصیبت کے دن کاٹ رہے ہیں۔ اس مقصد کے لئے پچاس ہزار کوارٹر بنائے جائیں گے جن کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ آغاز سے ۶ ماہ یا حکومت کی منظوری سے ۸ ماہ بعد۔ دس ہزار کوارٹر

۲۔ ۱۲ ماہ بعد۔ بارہ ہزار کوارٹر

۳۔ ۱۸ ماہ بعد۔ چودہ ہزار کوارٹر

۴۔ ۲۴ ماہ بعد۔ چودہ ہزار کوارٹر

جہاں تک دیہاتی علاقہ کا تعلق ہے آبادکاری کی ساری مہم کراچی ترقیاتی ادارہ کے سپرد کر دی گئی ہے جس نے ۳ نومبر کو کراچی کی ۵ مہاجر آبادیوں، لالوکھیت، ڈرگ روڈ ولیج، مالیر، لانڈھی اور مالیر ایکسٹینشن کا کام سنبھال لیا۔ اور ایک اعلیٰ طاقت کی کمیٹی موسوم بہ کوآرڈینیٹنگ کمیٹی اس غرض سے قائم کی گئی کہ وہ یہاں کے بے خانماں لوگوں کو جلد از جلد تسلی بخش طور پر بسا دے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ تاریخ اعلان ۹ نومبر سے ۶ ماہ کے اندر اندر ۱۲ ہزار کوارٹر تعمیر کئے جائیں۔ نصب العین یہ ہے کہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ بے خانماں لوگوں کو آباد کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ اس کام کے لئے تقریباً ۲ کروڑ روپے کا سرمایہ فوری طور پر موجود تھا اور اسے کے لئے وقف کر دیا گیا۔ مزید دس کروڑ روپے دیگر ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

کمیٹی کے اہم فیصلہ جات یہ تھے:

۱۔ بے خانماں لوگوں کو خاص خاص علاقوں میں ۱۲۰ مربع گز کے پلاٹ دیئے جائیں گے۔ جن پر انہیں حقوق مالکانہ ہوں گے۔
۲۔ تعمیر کا کام معین منصوبوں کے مطابق ہو گا جس میں بعد کو توسیع بھی ہو سکے گی اگر الاٹی ذاتی خرچ کرنے پر آمادہ ہو۔
۳۔ تمام نو آبادیوں کو پانی، بجلی، دواخانوں، سڑکوں، بدروؤں، مدرسوں اور مارکیٹوں وغیرہ کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی۔
۴۔ صفائی اور رفاہ و بہبود کے لئے عملہ مہیا کیا جائے گا۔
۵۔ کمیٹی تعمیر کے کام کی برابر نگرانی کرے گی۔
۶۔ سٹیرنگ کمیٹی تعاون کار سے رکاوٹوں کو دور کرے گی۔
۷۔ تمام معاملات جلد از جلد انجام پذیر ہوں گے۔

سب سے بڑھ کر سارا کام ایک جامع منصوبے کے تحت ہوگا جس کے مطابق یہ نو آبادیاں مضافاتی شہروں کا حصہ بن جائیں گی۔ اور پھر کام انتہائی تیزی و مستعدی سے حسب نشان دہی، عین مقررہ اوقات پر انجام پائے گا۔ یہ تمام فیصلے آخری و قطعی ہیں اور ان پر پوری طرح عملدرآمد ہوگا۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ مختلف علاقوں کے بے خانماں لوگوں کو مرکزی فیصلوں کے مطابق ایک ایک کرکے بسایا جائے۔ ایک اور اسکیم کے مطابق جدا جدا منصوبوں کے تحت خاص خاص علاقوں میں نو آبادیاں قائم کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے جن میں بنیادی ضرورتیں مہیا کی جائیں گی۔ ان علاقوں میں نجی طور پر تعمیر مکانات کی بھی گنجائش چھوڑی گئی ہے۔ جن لوگوں کے کوئی دعاوی نہیں ہیں ان کو غلام محمد بیراج میں بسانے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ ان تمام نئی آبادیوں میں گھریلو دستکاریوں کو منظم طریقے سے جاری کرنے اور لوگوں کو روزی کمانے اور خود کفیل بننے کا اہتمام بھی ہے۔

متوسط طبقے کے مہاجرین کے لئے کورنگی میں ایک نو آبادی تعمیر کی جا رہی ہے۔ اس میں ۵۰ ہزار مکانات ہوں گے۔ اور ان کی لاگت چھوٹی چھوٹی آسان قسطوں میں وصول کی جائے گی یا یہ مکانات تقریباً مفت بھی مہیا کئے جائیں گے۔

حکومت مغربی پاکستان نے ایک مہتم بالشان منصوبہ بنایا ہے جس کے مطابق صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو رہائش مہیا کی جائے گی۔ سارے صوبے میں چھوٹے چھوٹے مکانوں کے لئے ۸۰ ہزار پلاٹ بنائے جائیں گے جو مزدوروں کو بڑی آسان شرائط پر مہیا کئے جائیں گے۔ بڑے بڑے صنعت کاروں کو بھی ترغیب دلائی گئی ہے کہ وہ مزدوروں کو بسانے میں حصہ لیں۔ حکومت نے ان کے لئے ۱۰ ہزار کوارٹر بنانے کا اقرار کیا ہے۔ اس مقصد کے لئے ۵۰ مختلف مقامات منتخب کئے جا چکے ہیں جن کو مضافاتی شہروں کے طور پر آباد کیا جائے گا۔ اس منصوبہ کا کام تیزی سے جاری ہے۔

وزیر بحالیات، جنرل محمد اعظم خاں نے مشرقی پاکستان کا دورہ کرکے ایسے ہی اہم اقدامات کئے ہیں۔ انہوں نے محمد پور کے مضافاتی شہر کا سنگِ بنیاد رکھا اور مہاجرین کو مشورہ دیا کہ یاس و ناامیدی کو خیرباد کہہ کر خوشی و خرمی کا احساس پیدا کریں اور نئے جوش و خروش کے ساتھ زندگی کا آغاز کریں۔

بحالیاتی مہم کی دوسری شق دعاوی کا جلد از جلد فیصلہ ہے۔ یہ بھی ۱۰-۱۱ سال سے معرض التوا میں پڑی ہوئی تھی اور اس کے جلدی انجام پانے کی امید روز بروز موہوم سے موہوم تر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اور پھر دعویداروں کے بے بطور، مبالغہ آمیز اور جھوٹے مطالبوں نے معاملہ کو شدید تر اور پیچیدہ تر بنا دیا تھا۔ لہٰذا ان دعاوی کا فیصلہ سخت گیر اقدام کے بغیر ناممکن تھا۔ نئے اعیان حکومت نے شروع ہی میں مطالبوں کو درست اور غلط دعووں کو واپس لینے کی ہدایت کر دی تھی۔ مارشل لا کے ساتھ ان اقدامات نے سخت تر ہو کر تنبیہہ کی صورت اختیار کر لی، اور ۳۱ دسمبر ۵۸ء تک مہلت دی گئی کہ غلط دعوے واپس لے لئے جائیں، مبالغہ آمیز دعووں کی تصحیح کر دی جائے اور جو متروکہ جائداد ناجائز قبضہ میں ہو اس کا اعلان کر دیا جائے۔ اس کا خاطر خواہ نتیجہ ہوا اور جوں جوں وقت گزرتا گیا واپس اور تصحیح شدہ دعووں کی تعداد بڑھتی گئی یہاں تک کہ آخرکار واپس شدہ دعووں کی تعداد ۳۶۱۹ اور تصحیح شدہ دعووں کی تعداد ۴۲۲۱ تک پہنچ گئی۔ اس طرح ایک ارب سے زائد مالیت کے دعوے واپس لے لئے گئے۔ مخفی دولت۔ جائداد جو واپس کر دی گئی یا جس کا اعلان کیا گیا یا ناجائز قبضہ میں ہے، اس بازیافتہ رقم میں شامل نہیں۔ غرض یہ تمام تدبیریں نیر بہدف ثابت ہوئیں۔ اس مقصد کے لئے ۲۸ نومبر ۵۸ء کو ایک مارشل لا ریگولیشن (نمبر ۴۹) جاری کیا گیا۔ انہی ایام میں جو اعلیٰ سطح کی کانفرنس منعقد ہوئی اس میں طے پایا کہ دیہاتی علاقوں میں متروکہ زرعی اراضی کی تقسیم کے بارہ میں جو فیصلہ کیا گیا ہے اس کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔ صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خاں نے سال نو کے تحفہ کے طور پر ۴ جنوری ۵۹ء کو بے خانماں لوگوں کی بحالی و ادائگی مطالبات سے متعلق ترمیم شدہ آرڈی ننس جاری کیا جس کے مطابق آبادکاری کا کام تین مرحلوں میں طے ہو جائے گا۔ متروکہ جائدادوں کا انتقال مارچ کے اخیر سے شروع ہوگا۔ اور بیشتر کام سال کے آخر تک ختم ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی رشوت ستانی کا وہ سلسلہ بھی جس کا تمام سابقہ سیاسی حکومتوں میں بازار گرم رہا۔ جہاں تک جموں اور کشمیر کے مہاجرین کا تعلق ہے انہیں جو مکانات یا دکانیں الاٹ کی گئی ہیں وہ بدستور بحال رہیں گی۔

مہاجرین کو منظم طریقے سے صحیح مقامات پر بسانے کے لئے حال ہی میں مرکزی دفتر اعداد و شمار، ادارۂ ترقی اقتصادیات اور کراچی یونیورسٹی کے باہمی تعاون سے کم از کم وقت میں ۱۴ ہزار مہاجرین سے اہم کوائف بہم پہنچائے گئے۔

بحالیاتی پالیسی میں ان امور پر ترتیب وار توجہ دی جائے گی: تعمیرات، تعلیم اور رہائش۔ دیگر اقدامات میں ایک معلوماتی ادارہ اور منصوبوں کی نگرانی کے لئے مرکزی وزارتِ بحالیات میں ایک نئے شعبہ موسوم بہ شعبۂ مکانات و ترقیات کا قیام خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ ان تمام اقدامات کی اہمیت اظہر من الشمس ہے جنہوں نے پاکستان کو حقیقی معنوں میں جنتِ ارضی بنا دیا ہے۔

افق بہ افق :

ہمارا تعلیمی نصب العین

جنرل محمد ایوب خاں

"ہمارا تعلیمی نصب العین کیا ہونا چاہیئے؟" یہ سوال ہماری قومی نشوونما اور عروج و ترقی کے سلسلہ میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور نئی حکومت کی خصوصی توجہ کا باعث۔ لہٰذا کراچی یونیورسٹی کے حالیہ جلسۂ تقسیم اسناد اور طلباء ڈھاکہ کے ایک اجتماع میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں کے ارشادات ہمارے تعلیمی نصب العین کی نشاندہی کے سلسلہ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں اور ہم ان کو ذیل میں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ (مدیر)

مجھے یقین ہے کہ آپ کو اپنے زمانۂ طالبعلمی کے دوران کتنے ہی لوگوں نے ہزار مشورے دیئے ہوں گے۔ کبھی آپ کے والدین نے، کبھی اساتذہ نے، اور کبھی انہوں نے جن کا کام ہی محض مشورے دینا ہے۔ آج جب آپ اپنی مادرِ علمی کی آغوش سے باہر نکل رہے ہیں، میرا یہ ارادہ نہیں ہے کہ آپ کو اور بھی وعظ و نصیحت اور مشوروں سے گراں بار کروں لیکن چند ایک باتیں ایسی ہیں جو میرے دل و دماغ میں بھی اسی طرح موجود ہیں جیسی کہ وہ یقیناً آپ کے ذہن میں بھی ہوں گی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع پر ان اُمور کے بارے میں آپ سے گفتگو کروں۔

میرے عزیز لڑکو اور لڑکیو! جب آپ یونیورسٹی کی مقدس حدود سے باہر نکلیں گے تو سب سے پہلے جس حقیقت کا آپ پر انکشاف ہوگا وہ یہ ہے کہ زندگی پھولوں کی سیج نہیں اور نہ یہ کسی طرح ایک وسیع و عریض خارزار ہی ہے۔ پاکستان کے موجودہ حالات درحقیقت ایک زبردست چیلنج ہیں۔ ہم اس وقت جس الجھن سے دوچار ہیں وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو بے اندازہ مواقع موجود ہیں اور دوسری طرف ان سے بے انتہا غفلت برتی جا رہی ہے یا ان کا غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہمارا وطن پاکستان ایک زندہ و توانا متحرک قوم کے جذبۂ بے اختیار اور سیاسی و روحانی ولولہ کی پیداوار ہے۔ اور جب اس کا قیام عمل میں آیا تو زندگی کے تمام شعبوں نظم و نسق، کاروبار، صنعت و حرفت وغیرہ میں بے پایاں امکانات کے دروازے کھل گئے۔

اسلام کی تاریخ میں کبھی ایسا وقت نہیں آیا جب کہ مسلمانوں کو نظریاتی، علاقائی یا مادی حیثیت سے ایسا سروسامان اور مواقع دستیاب ہوئے ہوں جیسے کہ قیامِ پاکستان کے بعد میسر آئے۔ اگر کسی چیز کی ضرورت تھی تو صرف اعلیٰ مقصد اور پُرخلوص قیادت کی جو ہمارے ہر اس نصب العین کو عملی شکل عطا کر دے، جس کی بنا پر پاکستان قائم ہوا تھا۔ اور مملکت کے بے پایاں وسائل کو قوم کی خدمت کے لئے وقف کر دے۔ شومئی قسمت سے ایسا نہ ہو سکا۔ اور میں آپ جیسے نونہالانِ قوم کے دل و دماغ کو اس ناکامی کی ناگوار تفصیلات سے پریشان نہیں کرنا چاہتا۔

ابھی تک ہیں کہ ہم سب غلطیاں کرتے ہیں۔ آپ کے بعض بزرگوں سے جو آخر انسان ہی تھے، کچھ فروگذاشتیں ہوئیں لیکن اب یہ باب ختم ہو چکا ہے۔ آپ اسے ہمیشہ کے لئے بھول جائیے۔ ماضی کی یاد میں نہ کھوئے رہیے بلکہ حال پر توجہ دیجئے اور بہتر مستقبل کے لئے سرگرمِ عمل ہوں لیکن اس بات کا کہہ دینا آسان ہے، اس کو کر دکھانا مشکل ہے۔ جب آپ زندگی کے میدان میں عملی طور پر قدم رکھیں گے تو ممکن ہے آپ کشمکشِ حیات کو بے حد کٹھن، صبر آزما اور حد درجہ نامساعد پائیں۔ مایوسیوں اور دلخراش تصورات کے یادر ہوا ہے، احساس آپ کے دل و دماغ کو گھیرے رکھے گا۔ لیکن بعینہٖ ایسے حالات ہی ہیں جن میں تعلیم انسان کے طرزِ عمل میں فرق پیدا کرتی ہے۔ ایک غیر تعلیم یافتہ شخص ذاتی دشواریوں اور آزمائشوں سے گھبرا کر بہ آسانی اپنے ملک و وطن کی طرف سے بددل اور بدگمان ہو جاتا ہے لیکن چونکہ آپ تعلیم یافتہ ہیں اسلئے آپ کو ایسی لغزشوں سے دامن بچانا چاہیئے اور اپنی ذاتی مایوسیوں کو کبھی یہ اجازت

نہیں دینی چاہیئے کہ وہ آپ کے جذبۂ حب الوطنی پر غالب آئیں۔ ہم اور آپ تو آتی جاتی پرچھائیں ہیں۔ جو چیز ہمیشہ قائم رہے گی وہ ہمارا وطن پاکستان ہے۔ اسلئے ہمارا فرض ہے کہ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ پاکستان پورے عزّ و وقار اور افتخار کے ساتھ قائم رہے۔

حصولِ آزادی سے پہلے جب میرے دَور کے لوگ یونیورسٹیوں سے تعلیم پاکر فارغ التحصیل ہوئے تو ان کا راستہ بہت صاف اور آسان تھا۔ اس وقت تعلیم کا واحد مقصد یہ تھا کہ ایک غیر ملکی مشین کے لئے کل پُرزے پیدا کئے جائیں۔ اب یہ مقصد ختم ہوچکا ہے۔ اب ہمیں سامراجی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے کارگذار بابو اور عمّال پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب ہمیں ایسے جوان مردوں اور عورتوں کی ضرورت ہے جو ایک نااہل قیادت کے خلا کو پُر کرسکیں۔ وہ قوم کی صحیح معنوں میں خدمت بجالائیں نہ کہ اس پر حکومت کریں۔ وہ ہماری شاندار مسلح افواج کو اور بھی چار چاند لگائیں۔ کاروبار اور صنعت و حرفت میں دیانت داری، انصاف اور رکھ رکھاؤ کی نئی روایات قائم کریں، موجودہ ایٹمی سائنس کے دور میں فنیاتی ترقی کا مہتم بالشان کام انجام دیں اور اس طرح بالعموم ملک کی سماجی، پیشہ ورانہ، ثقافتی اور ذہنی زندگی میں زیادہ وسعت اور تنوع پیدا کریں۔

میں خوب جانتا ہوں کہ یہ معجزہ راتوں رات رونما نہیں ہوسکتا۔ آپ بدستور ایک ایسے طریقۂ تعلیم کی خرابیوں کا شکار ہیں جو فرسودہ ہوچکا ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ اس نظام کو قومی ضروریات کی روشنی میں اچھی طرح پرکھا جائے اور اس کو ترمیم یا اصلاح سے ہمارے جدید حالات اور تقاضوں کے مطابق بنایا جائے۔ جیساکہ آپ جانتے ہیں ہمارے نظامِ تعلیم کی جانچ پڑتال کے لئے ایک اعلیٰ اختیارات کا کمیشن مقرر کیا جاچکا ہے اور اس کو یہ ہدایت کردی گئی ہے کہ وہ آئندہ مئی کے وسط تک اپنی رپورٹ پیش کردے۔ اس کمیشن کی سفارشات کے نتیجہ میں جو تبدیلیاں یا ترقیاں کی جائیں گی، ان کا اثر صرف اگلی نسل کے طلبہ ہی پر ہوگا۔

میرے عزیز نوجوان گریجوئیٹو! جہاں تک آپ کا تعلق ہے مجھے یہی کہنا پڑے گا کہ آپ کو موجودہ صورتِ حال کو، جو کچھ ایسی اچھی نہیں، زیادہ سے زیادہ کارآمد بنانے کی کوشش کرنا پڑے گی مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ قائدِ اعظمؒ کے اصولوں ـــ یقین، اتحاد اور تنظیم کے ساتھ اپنی نئی عملی زندگی میں داخل ہوں گے تو آپ ہم میں سے اکثر کی بہ نسبت زیادہ کامیاب ثابت ہوں گے۔

اس نئے سلسلۂ حالات میں آپ کو اپنا کردار ادا کرنے میں مدد دینے کے لئے ہم نے اپنی جگہ مصمم ارادہ کرلیا ہے کہ آپ کو معاشرتی انصاف اور منصفانہ سلوک کا ایسا پاک و صاف ماحول مہیا کیا جائے جس میں ذاتی قابلیت کی بنیاد پر سب کو مساوی مواقع حاصل ہوں گے اور ذات، عقیدہ، معاشرتی حیثیت اور دباؤ یا اثر کے دیگر عناصر کی کوئی پروا نہیں کی جائے گی۔

آپ میں سے ان لوگوں کو جو ابھی اپنے تعلیمی دَور سے گذر رہے ہیں مجھے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ اپنے دورانِ طالبعلمی سے بہترین فائدہ اٹھائیے۔ یہ ایک بڑا ہی عزیز زمانہ ہے اور زندگی میں ایک ہی بار آتا ہے۔ خود کو ان اثرات کا شکار نہ ہونے دیجئے جو آپ کو سیاسی اقتدار کی کشمکش کا آلۂ کار بنادینا چاہتے ہیں۔ اپنی تمام تر توجہ تعلیمی مشاغل ہی پر مبذول فرمائیے اور یونیورسٹی میں دورانِ مطالعہ آپ کو جو سہولتیں اور رعایات حاصل ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو لائق اور شائستہ بنانے کی کوشش کریں۔ وکیل، ڈاکٹر یا صنعت کار ہونے سے پہلے انسان، انسان ہی ہوتا ہے۔ آپ لائق اور سمجھدار آدمی بن جائیں تو آپ خود بخود لائق اور سمجھدار وکیل اور ڈاکٹر بن جائیں گے۔ یاد رکھیے، آپ کے والدین جو اس سنگین دور میں کثیر اخراجات برداشت کرکے آپ کو تعلیم دلاتے ہیں اور آپ کی قوم جو آپ کو اس مقصد کے لئے وسائل فراہم کرتی ہے، اُن کا آپ کے مستقبل پر یکساں حق ہے، ان کو ناامید نہ کیجئے۔ اپنے والدین کے لئے قوت کا ذریعہ اور اپنی قوم کے لئے قیمتی اثاثہ بننے کی کوشش کیجئے، یہ نہ ہو تو تعلیم بالکل بے معنی ہے۔

اب میں اساتذۂ کرام کی طرف روئے سخن کرتے ہوئے اُن کی خدمت میں بھی کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ قوم کے معمارِ حقیقی معنوں میں اہلِ علم حضرات ہی ہیں۔ ہمارے ملک میں ان کو بھی بُری روایات ہی ہاتھ آئی ہیں لیکن انہوں نے بڑی حد تک اس کٹھن کام کی صعوبتوں کو بڑی کامیابی سے برداشت کیا ہے۔ یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ ایسے ذمہ دار پیشہ کے لوگ دوسروں کے مقابلے میں بہت کم اُجرت پاتے ہیں۔ یہ بات دنیا کے کتنے ہی ملکوں پر صادق آتی ہے جن میں ہمارا اپنا ملک بھی شامل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بہترین لیاقت و صلاحیت رکھنے والے لوگ اس پیشہ کی طرف راغب نہیں ہوتے۔ ہمارے وسائل محدود ہیں اور ہمیں یہ بھی سیکھنا ہے کہ ہم اپنے وسائل کے اندر رہ کر ہی گزارہ کریں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اساتذہ کی حیثیت اور ان کی تنخواہوں کو معقول بنانے

کی کوئی کوشش نہ کی جائے۔

مجھے یقین ہے کہ ہماری حکومت اس مسئلہ پر پوری پوری توجہ دے گی۔ بے شک اساتذہ کے معاملہ میں ہم اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کریں گے لیکن ہمیں اساتذہ سے بھی یہ توقع ہے کہ وہ قوم کے سلسلہ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کریں گے۔ اساتذہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ انہیں انسانوں پر اثر پذیری کے بہترین زمانہ میں اثر ڈالنے کا موقع ملتا ہے تعلیم کے سلسلہ میں ان کی جدوجہد ایسے اذہان پر صرف ہوتی ہے جو نشوونما کے مرحلہ سے گذر رہے ہوتے ہیں۔ اور ان میں ذوق وشوق، تفریح اور تجسس کی صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اگر اساتذہ اپنے فرضِ منصبی کو خوش اسلوبی سے ادا کریں تو ان کا کام نونہالانِ ملت کو ٹھیک سانچوں میں ڈھالنے کا خالص تخلیقی کام ہے۔

یہ ہمارے اساتذۂ کرام ہی کا کام ہے کہ وہ ہماری آئندہ نسلوں کو علاقائی اور فرقہ وارانہ تعصبات کے زہر سے پاک کریں اور ان کو ایک متحد، ترقی کوش اور باوقار قوم کے سانچے میں ڈھالیں۔ اساتذہ یہ کام تبھی بوجہ احسن ادا کر سکتے ہیں کہ خود ان کا دل ودماغ تندرست وسنجیدہ ہو۔ بعض اوقات یونیورسٹی کے عہدہ داروں اور کالجوں کے اساتذہ میں ذاتی یا کسی فرقے سے متعلق رقابتوں کو ہوا دینے والی پارٹیاں قائم کرنے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بات اُن کے شایانِ شان نہیں۔

آپ قوم کے نونہالوں کا ٹھیک طرح دھیان رکھیئے۔ اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قوم بھی آپ کا اسی طرح لحاظ رکھے گی۔ میں اپنی قوم کے لیئے فارغ التحصیل طلبا اور طالبات دونوں کے لیئے ایک نہایت شاندار اور خوش وخرم زندگی کے لیئے دست بدعا ہوں۔ خدا آپ کو اپنے اعتقادات میں استقامت عطا کرے اور آپ کو یہ موقع دے کہ آپ اپنے ملک کی نہایت دیانتداری کے ساتھ پر خلوص خدمات انجام دیں۔ (تقریر کراچی یونیورسٹی)

•

اہلِ پاکستان کو جو مختلف نسلوں پر مشتمل ہونے کے باوجود ایک ہی نقطۂ نظر اور نصب العین رکھتے ہیں، ایک طاقتور اور مضبوط اور مستحکم قوم بنانے کے لئے دو چیزیں لازمی ہیں: وسعتِ نظر اور فراخ دلی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں کتنی ہی زبانیں، کتنی ہی نسلیں پائی جاتی ہیں، علاقائی وفاداریوں کو ایک بلند تر وفاداری کے ماتحت رکھنا ضروری ہے۔ سارے ملک کی وفاداری بیشک ایک خاص حصۂ ملک میں آباد ہونے کی بنا پر آپ کو اس کے ساتھ ایک نسبت خاص ہے لیکن اسکے ساتھ ہی اور اس سے بڑھ کر آپ کو وسیع تر حیثیت — پاکستان سے شدید تر وابستگی لازمی ہے تاکہ جس مقامی حصہ میں آپ بود وباش رکھتے ہیں اس کی کما حقہٗ حفاظت کی جا سکے جب تک ایسا نہیں ہوگا آپ کی حیثیت بڑی مخدوش رہے گی۔ مثال کے طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو دیکھئے، جس کے باشندے یورپ کی مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس براعظم میں تو یہ مدتوں ایک دوسرے سے محوِ پیکار رہے اور ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارتے رہے لیکن جب وہ اپنے نئے ملک میں آباد ہو گئے تو وہ ہمیشہ کے لئے اتحاد ویکانگت کے رشتہ میں منسلک ہو گئے۔

ہمارے طلباء کو زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرنا ہے کیونکہ ہمارے ملک کو جرأت مند اور بلند کردار لوگوں کی شدید ضرورت ہے۔ ایسے لوگ جنھوں نے دورانِ تعلیم میں وسیع وبسیط مطالعہ کر کے قومی زندگی کے لئے خوب تیاری کی ہو تاکہ وہ قوم کو بلند سے بلند تر مقاماتِ ترقی کی طرف لے جا سکیں۔ آپ کے ملک کی آنکھیں آپ ہی کی طرف لگی ہیں تاکہ آپ قوم کو صحیح قسم کے رہنما مہیا کریں۔ ہمارا زمانہ نعرہ بازی اور جلوسوں کا زمانہ نہیں۔ یہ زمانہ تو ہمیشہ کے لئے لد چکا ہے اب تو ہمارے ملک کو از سرِ نو بنانے اور سنوارنے کی ضرورت ہے۔ تعمیرِ نو کی ضرورت ہے۔ فی الحال آپ کا کام یہی ہے کہ آپ اپنا وقت مفید کاموں میں صرف کریں اور زیادہ سے زیادہ تبحرِ علمی بہم پہنچائیں تاکہ آپ کی قوم آپ پر ناز کرے۔

طلباء معاشرے کا ایک ایسا عنصر ہیں جس پر خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ وہ قوم کے مستقبل کے معمار ہیں، لہٰذا انہیں پہلے ہی سے اس اہم کام کی تیاری شروع کر دینی چاہیئے۔ انہیں کسی فوری فائدے کی توقع کے بغیر کام کرنا پڑے گا اور ساتھ ہی بڑی بڑی قربانیوں کے لئے بھی تیار ہونا پڑے گا۔

زندگی اور اپنے وطن پاکستان کے بارے میں طلباء کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیئے؟ اس سلسلہ میں آپ کو حصولِ پاکستان کے لئے جدوجہد اور ملک کے دونوں حصوں کی آبادی کی ہیئتِ ترکیبی کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ چونکہ پاکستان کے باشندے ایک ہی نسل پر مشتمل نہیں بلکہ مختلف نسلوں کا مجموعہ ہیں، پھر بھی ان کا نقطۂ نظر ایک ہی ہے اور ان کے مقاصد اور نصب العین بھی مشترک ہیں ایسے معاشرے میں کچھ کسر یں بھی ہوتی ہیں اور کچھ توتیں بھی، لہٰذا آپ کو ایسا رویہ

اختیار کرنا چاہیئے جو کسروں کو دبا دے اور قوتوں کو ابھار دے۔ یہ بات قوم کو ایسی قوت عطا کردے گی کہ وہ ترقی کے میدان میں آگے بڑھ سکے گی۔

مختلف نسلوں کی طرح پاکستان میں مختلف زبانیں بھی ہیں۔ ایسے ہی جگہ جگہ علاقائی وفاداریاں بھی ہیں لیکن ان مقامی وفاداریوں کی حفاظت کے لئے لازم ہے کہ ہم اعلیٰ قسم کی وفاداری یعنی پاکستان اور اس کی ملت سے پاسِ وفا کو زیادہ ملحوظ رکھیں۔ بالفاظ دیگر ہمیں بہترین قسم کے پاکستانی بننا چاہیئے۔ اگر ہمارے طلباء پاکستان کے بارے میں صحیح قسم کا میلان پیدا نہیں کریں گے تو وہ شکاریوں کی اصطلاح میں وہی بات کریں گے جس کو "نشانہ کی بطخ" بنکر بیٹھ جانا کہتے ہیں۔ انھیں اپنے آپ کو دشمنانِ ملک کا تختۂ مشق نہیں بننے دینا چاہیئے۔ انھیں پاکستان کے سلسلہ میں اعلیٰ قسم کی وفاداری پیدا کرنے کی جدوجہد کرنی چاہیئے۔ ورنہ ان کے لئے اور ان کی آنے والی نسلوں کے لئے کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ اگر اتفاق سے کوئی بات ٹھیک نظر نہ آئے تو ہمیں اس کی غلط تشریح نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ بہت بلند نظری اور وسیع المشربی سے کام لینا چاہیئے۔ (تلخیص) (تقریر: اجتماع طلبہ ڈھاکہ)

★

پاکستان شاہراہِ ترقی پر

ہمارے نئے باتصویر کتابچوں کا سلسلہ

ملک کی اہم صنعتوں پر ادارۂ مطبوعات پاکستان نے مصور کتابچوں کا سلسلہ حال ہی میں شروع کیا ہے۔ جو ملک میں اپنی افادیت اور نفیس آرائش و طباعت کی خوبیوں کے باعث بہت مقبول ہوا ہے۔ یہ کتابیں ہر موضوع سے دلچسپی رکھنے والے ماہروں سے مرتب کرائی گئی ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ملک کی ان اہم صنعتوں پر مختصر مگر مکمل معلومات، اعداد و شمار اور اہم حقائق، عام پڑھنے والوں کی دلچسپی اور استفادہ کے لئے پیش کئے گئے ہیں۔

ہر کتابچہ آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی بارہ صفحے کی نفیس تصاویر سے مزین ہے۔ ان تصویروں کو دیکھنے سے ہر صنعت کے مختلف مراحل تیاری وغیرہ کی کیفیت پوری طرح ذہن نشین ہو جاتی ہے۔

ہر کتاب میں جدید ترین معلومات اور اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں۔ جن سے ملکی صنعت کی رفتار ترقی کا پورا جائزہ ہر شخص کی نظر کے سامنے آجاتا ہے۔

استفادۂ عام کے پیش نظر ہر کتابچہ کی قیمت صرف چار آنے رکھی گئی ہے۔ یہ کتابچے اب تک شائع ہو چکے ہیں:-

پٹ سن کی صنعت	سیمنٹ کی صنعت
چائے کی کاشت اور صنعت	کپڑے کی صنعت
پن بجلی کی صنعت	ماہی گیری
اشیائے صرف	ذرائع آبپاشی کی صنعت
کاغذ کی صنعت	غذائی مصنوعات

ملنے کا پتہ:

ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳، کراچی

"دیوانِ غالب اُردو" :——— بقیہ صفحہ: (۱۳)

مجھے معلوم ہے آج دیوانِ غالب اُردو کا کوئی ایسا مجموعہ یا قلمی نسخہ موجود نہیں جو ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان مرتب ہوا ہو اور ان دونوں اشاعتوں سے مختلف ہو۔ موجودہ مخطوطے کی موجودگی سے یہ ثابت ہے کہ دیوان غالب ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان بھی ایک بار مرتب ہوا جس کی تقریظ بھی بدلی گئی اور اس مخطوطے کے علاوہ اس کی کوئی اور نقل بھی کہیں محفوظ نہیں، اور نہ محققینِ کلام غالب کو اس کا علم ہے کہ ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۷ء کے درمیان بھی کوئی نسخہ مرتب ہوا تھا۔ ممکن ہے ۱۸۴۵ء میں یہ نسخہ مرتب ہوا ہو اور ہمارا موجودہ مخطوطہ ہی وہ اصل نسخہ ہو۔

مولوی کریم الدین پانی پتی نے ۱۸۴۵ء کے قریب ہی اُردو شعرا کے تذکرے مرتب کئے تھے۔ پہلا "گلدستۂ نازنیناں" (اختتام تالیف دسمبر ۱۸۴۴ء۔ اختتام طباعت جولائی ۱۸۴۵ء) اور دوسرا گارسن دتاسی سے ماخوذ "طبقات الشعرائے ہند" (تالیف ۱۸۴۷ء۔ طباعت ۱۸۴۸ء)۔ ان دونوں تذکروں میں مولوی کریم الدین نے غالب کے اُردو دیوان کا ذکر کیا ہے جس کی نشان دہی سب سے پہلے شیخ محمد اکرام صاحب مؤلف "غالب نامہ" نے کی تھی۔ اور مولوی کریم الدین کی شہادت کو دیوانِ غالب کی تاریخی ترتیب کے سلسلہ میں بطور اساس استعمال کیا تھا۔ موجودہ نسخہ خود مولوی کریم الدین نے تیار کرایا تھا جس سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔

"اختر شیرانی" :——— بقیہ صفحہ (۲۶)

شاعری گھومتی ہے جو اس کی اپنی زندگی کا آئینہ ہے مگر عجیب بات ہے کہ بعض لوگ ابھی تک سلمیٰ کو محض ایک علامت سمجھتے ہیں۔ ن۔م۔ راشد کے خیال میں سلمیٰ ایک نصب العین تھی جس تک اختر پہنچنا چاہتے تھے۔ منٹو کا کہنا ہے کہ سلمیٰ اگر خیالی پیکر نہ ہوتی تو اختر اس سے اس قدر والہانہ محبت نہ کرتا۔ ڈاکٹر مرحسن لکھتے ہیں کہ وہ (اختر) کسی خاص محبوبہ کے غمزوں کا شکار نہیں بلکہ خود اپنی سرمستی پر عاشق ہے۔ اسے مست رہنے کے لئے جذبۂ رومان کی ضرورت ہے۔ اور ریحانہ، سلمیٰ اور شیریں محض اس جذبہ کے خوبصورت بہانے ہیں۔ اسے ان کی ضرورت نہیں۔

سلمیٰ کے متعلق یہ نظریے کہاں تک صحیح ہیں یا ان میں کتنی صداقت ہے، وہی حضرات جان سکتے ہیں جنہیں اختر کے کلام سے دلچسپی ہے اور جنہوں نے اس کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ ہمارے خیال میں سلمیٰ نہ صرف ایک علامت ہے، اور نہ محض نصب العین۔ بلکہ وہ ایک زندہ جاوید حقیقت ہے۔ اختر کی زندگی میں ضرور کوئی نہ کوئی ایسی لڑکی داخل ہوئی ہے جس کی پرورش مشرق کے خالص اصولوں کے تحت ہوئی اور جس نے پنجاب کی محبت خیز زمیں اختر سے والہانہ عشق کیا۔ اس کا اصلی نام کچھ بھی ہو مگر اختر اسے سلمیٰ، ریحانہ، بیلی وغیرہ کے ناموں سے پکارتا ہے۔

اختر کے کلام کا کچھ حصہ حب الوطنی اور قوم پرستی کے جذبہ سے بھی معمور ہے۔ مگر یہ بے جان ہے۔ کیونکہ اس میں اختر کی شخصیت کھل کر سامنے نہیں آتی۔ اس کا مزاج حسن و عشق اور رومان ہی کے ساتھ طبعی مناسبت رکھتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جمال پرستی اور عشق و محبت کی گرمجوشیوں اور خشک سیاسیات کا آپس میں کس حد تک میل ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اختر کی شاعری میں کہیں کہیں ابتذال اور سوقیانہ پن بھی ملتا ہے۔ مگر یہ نقص صرف اختر کے کلام ہی کو موردِ الزام نہیں ٹھہراتا بلکہ مبتذل اور رکیک مضامین سے کلاسیکی ادب ہو یا جدید دور کا سرمایہ شعر و ادب کسی کا دامن بھی پاک نہیں ہے۔ اختر کے یہاں اس قسم کی لغزشوں کا سبب جذبات کی شدت، اور احساسات کی تیزی ہے۔ وہ جذبات کی رو میں اس حد تک بہہ جاتا ہے کہ اسے زبان و بیان پر قابو نہیں رہتا اور عرب کے آزاد منش اور بے باک صحرائی شاعروں کی طرح وہ ایسے معاملات کی عکاسی بھی کر جاتا ہے جن کی نفاست پسند طبع مہذب متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہ شاعر کی خامی ہے یا بیماری، اس کا فیصلہ خلاقیات کی بجائے جنسیات ہی کر سکتے ہیں۔

اختر کی شاعری اب ذاتی سے زیادہ تاریخی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اور ہم شاعر کے مزاج اور پارہ ہائے فن کا اس حیثیت سے ہی جائزہ لے سکتے ہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ شاعرِ رومان اختر نے اردو شاعری کو بہت کچھ دیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی دین صنف نازک ہے جو پہلی دفعہ اپنے حسن و جمال، قدرتی رنگ روپ اور دلی کیفیات کے ساتھ ہمارے سامنے آتی ہے۔

یوم پیدائش قائد اعظم رح
(کراچی)

ماہ نو
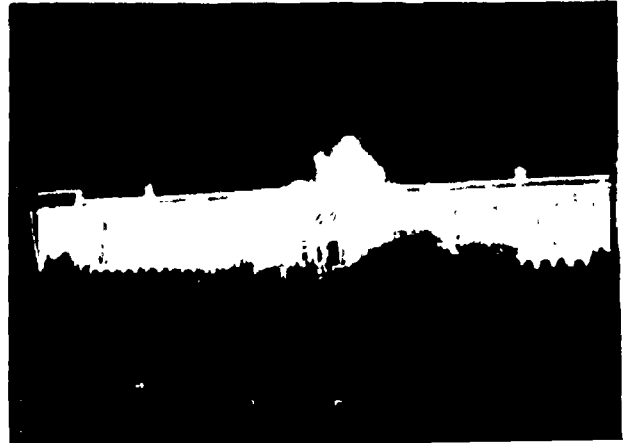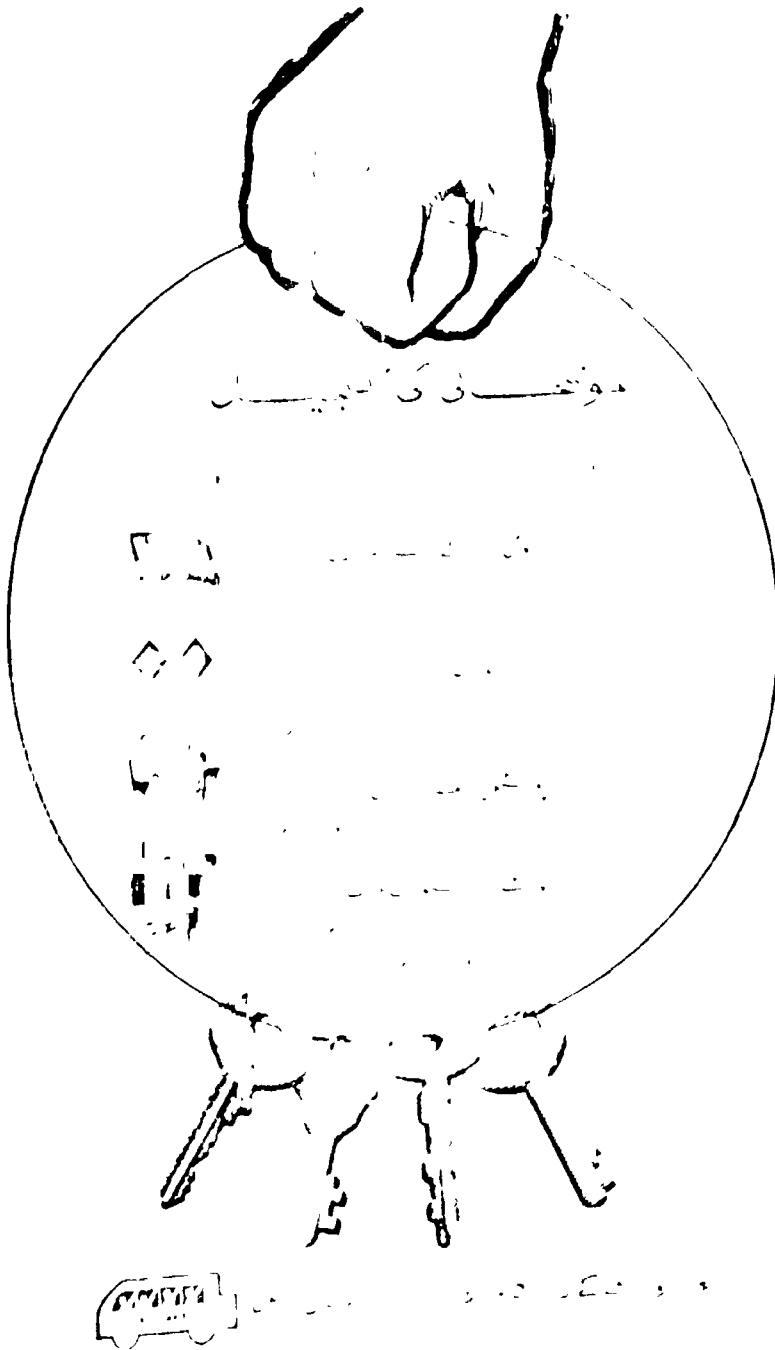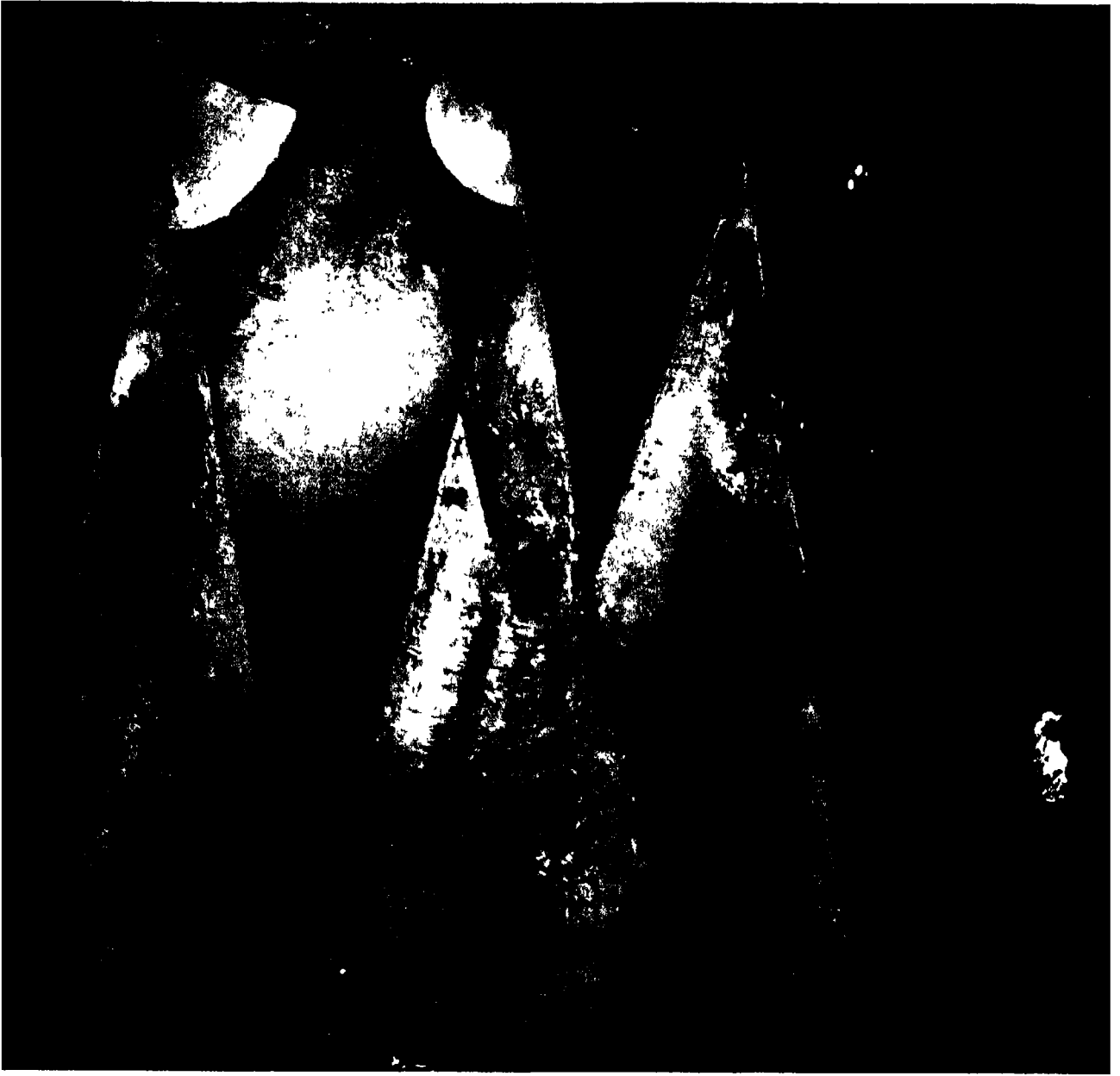
ڈاکٹر مولوی عبدالحق | جسیم الدین | جوش ملیح آبادی
قدرت اللہ شہاب | انتظار حسین | فضل احمد کریم فضلی
شاہد احمد دہلوی | انور ممتاز | جمیل الدین عالی
ممتاز حسین | صادق حسین | شوکت تھانوی

خاص نمبر
یوم پاکستان
مارچ ۱۹۵۹

ماہِ نو

جلد ۱۲ — شمارہ ۳
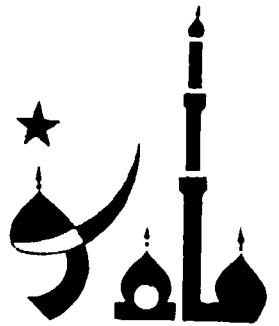
خاص نمبر: یومِ پاکستان

مارچ ۱۹۵۹ء

مدیر: رفیق خاور — نائب مدیر: ظفر قریشی

ادار یہ:

بہ تقریب یوم پاکستان:

نیا دور:

نظمیں:

شائع کردہ: ادارۂ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

سالانہ چندہ: ساڑھے پانچ روپے

خاص نمبر - فی کاپی: ایک روپیہ چار آنے

سرورق: تین روحیں: محمد کبریا

(پاکستانی نقاشی کی دوسری قومی نمائش، کراچی، ۱۹۵۹ء میں اس تصویر کو اول انعام ملا)

آپس کی باتیں

"ماہ نو" کا یہ شمارۂ خاص اُن خوشگوار حالات کا عکس ہے جو نسبتاً حال میں بروئے کار آئے ہیں اور ہماری قومی تاریخ میں ایک نئی منزل کی خبر دیتے ہیں۔ اور یہی اس کا مابہ امتیاز ہے۔ سچ پوچھئے تو یہ حالات بجائے خود ایک تقریب ہیں۔ جس میں جشنِ استقلال اور جشنِ حصولِ پاکستان دونوں مدغم ہیں اور قومی زندگی سے متعلق تمام کثرتیں ایک ہی سانچے میں ڈھل کر وحدت بن گئی ہیں۔ وحدتِ پاکستان ع

منتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

بلاشبہ یہ وہ تقریب ہے جس میں ہمارا قومی نصب العین — حقیقی آزادی — اور اپنے وطن کو زندہ تر، پائندہ تر اور تابندہ تر دیکھنے کی تمنا پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یہ ہماری تاریخ کے انتہائی نقطۂ عروج کی آئینہ دار ہے اور اُس دَور کی نقیب جس میں کتابِ ملت کی ازسرِنو شیرازہ بندی ہوئی ہے، اور حکیم ملت ہی کے الفاظ میں صبا نے پھر لوٹے گل یعنی اپنے نئے پُرخلوص، صاحبِ نظر اور دُور اندیش قائدین سے ہم سفر پیدا کیا ہے جو قوم کو منزلِ مقصود تک پہنچانے کا مصمم ارادہ کر چکے ہیں اور اس کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا یہ تقریب بحقیقی معنوں میں "یوم پاکستان" کی تقریب ہے اور "ماہ نو" کا یہ شمارۂ خاص اسی سے مناسبت رکھتا ہے۔

پانچ مہینے کا عرصہ جس میں نئے قائدین کو قومی معاملات کی باگ ڈور سنبھالنے کا موقع ملا ہے، بظاہر بہت ہی مختصر ہے، خصوصاً گیارہ سال کے اُس طویل عرصے کو دیکھتے ہوئے جبکہ وزارتوں پر وزارتیں آتی رہیں، جاتی رہیں لیکن زندگی کے کسی شعبے میں بھی نمایاں پیشقدمی نہ ہو سکی۔ اس کے برعکس ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پانچ مہینے کی انتہائی قلیل مدت میں جو برق رفتار رہبرجہتی اقدامات ہوئے، وہ حقیقتاً حیرت انگیز ہیں، اور اس قدر فراواں کہ اُن کا شمار آسانی سے ممکن نہیں۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے!

تاہم اس شمارہ کے مختلف مضامین میں محال کو ممکن بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں وہ دن خصوصیت سے یاد رہیں گے جب سالِ نو کے آغاز سے تھوڑا عرصہ بعد وفاقی پایۂ تخت گوناگوں ہنگاموں کی آماجگاہ بن گیا اور اس کے در و دیوار "نواسنجانِ گلشن" یعنی ادبائے پاکستان کے غلغلے سے گونج اٹھے۔ یہ پہلا موقع تھا جبکہ اس شہر میں، جو اپنے کاروباری شور و غل کے لئے ممتاز ہے، علم و ادب کی غیر کاروباری ہماہمی اور ہنگامہ پیدا ہوا جیسے کسی محفلِ موسیقی میں کسی مافوق الفطرت طلسمی اثر کے ماتحت سارے ساز ایک دم بج اٹھیں۔ چنانچہ جب شہر کے ایک حصے میں مشرقی و مغربی پاکستان کے گوشہ گوشہ سے بے شمار ادبی مندوبین ایک معرکہ آرا کنونشن میں شریک تھے تو دوسرے حصے میں اتنے ہی زور شور سے ایک اور عالمگیر اسلامی مذاکرہ کی کارروائی جاری تھی۔ ان کے علاوہ اسی زمانے میں "پاکستان آرٹس کونسل" کے زیرِ اہتمام پاکستانی نقاشی کی دوسری نمائش بھی منعقد ہوئی اور اراضی سے متعلق انقلاب آفریں اصلاحات کا اعلان بھی ہوا۔ علیٰ ہٰذا دوسرے اداروں میں بھی مختصر پیمانے پر یہی علمی، ادبی اور فنی کارروائیاں ظہور میں آئیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب کراچی مکمل طور پر بلدۂ علم و فن بن جائے گا — اور ظاہر ہے کہ حکومت کی ادب اور اہلِ ادب کے بارے میں خیر اندیشانہ پالیسی سے جو پہلے ہی کنونیشن کی شکل میں نہایت دقیع نتائج پیدا کر چکی ہے، یہ مرحلہ زود تر طے ہو جائے گا — تو اس کا عالم کیا ہوگا۔ نئے دور کی بھرپور عکاسی کا حق جب ہی ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہم ان تمام سرگرمیوں پر نظر ڈالیں۔ اس سلسلے میں ادبی کنونیشن جو پاکستان ہی نہیں، تمام برِصغیر میں اپنی قسم کا پہلا، مہتم بالشان اجتماع ہے اور حکومت کی ادب نواز، معارف پرور پالیسی سے قطع نظر، اہلِ ادب کے لئے دوررس نتائج کی حامل ہے، خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اس لئے اس شمارہ کا کافی حصہ اسی کے لئے وقف ہے۔ ارادہ تھا کہ اس پیشکش کو زیادہ سے زیادہ سیر حاصل بنایا جائے لیکن مدیر کی مسلسل ناسازئ طبع سدِراہ ہوئی۔ لہٰذا یہ خوانِ نعمت جیسا بھی ہے، حاضرِ خدمت ہے۔

جب پاکستان کی علمی و ادبی شمعوں سے فضا یوں نور علیٰ نور تھی تو ناگہاں ایک ناساز اتفاق نے ہمیں ایک ایسی شمع سے محروم کر دیا جس سے ہماری ادبی محفلوں میں غیر معمولی فروغ تھا، خلیفہ عبدالحکیم جنہوں نے ادب اور فکر دونوں کو جلا دینے میں نمایاں حصہ لیا، صرف ذاتی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی، جس کی خدمات محتاجِ بیان نہیں۔ مرحوم کی کوششیں آخری وقت تک علوم و معارف کی خدمت کے لئے وقف رہیں۔ وہ اسلامک سیمینار میں شرکت کے لئے کراچی تشریف لائے تھے اور عین اس وقت جبکہ اس یادگار اجتماع کی سرگرمیاں جاری تھیں، باتیں کرتے کرتے ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گئے ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

یومِ پاکستان

اسد ملتانی

مزدکی ہو کہ فرنگی، ہوسِ خام میں ہے
امنِ عالم تو فقط دامنِ اسلام میں ہے

صورتِ خیر و سلامت ہے تو اسلام میں ہے
حسن کا جو بھی تصور ہو اسی نام میں ہے

وہ کہاں یورپ و امریکہ میں، جو حسن و جمال
ترکی و مصر و عراق و عرب و شام میں ہے

حسنِ باطن کا تو امکاں ہی نہیں اور کہیں
حسنِ ظاہر بھی فقط عالمِ اسلام میں ہے

کسی منزل ہی کی جانب تو رواں ہے دنیا
کوئی مقصد تو نہاں گردشِ ایام میں ہے

کون اقطارِ سماوات سے باہر نکلا
اُڑ کے پہنچا جو کہیں بھی تو اسی دام میں ہے

عقل کو اور کہیں سے بھی نہیں مل سکتی
وہ ہدایت جو خود اللہ کے پیغام میں ہے

یوم ہر سال مناتے ہیں جو پاکستاں کا
خاص اک یوم یہ اسلام کے ایام میں ہے

ہو گئی دین کی بنیاد پہ ملت قائم
اک نیا تجربہ اس دور کی اقوام میں ہے

ذمہ داری بھی اسی کی ہے زیادہ سب سے
ملک جو سب سے بڑا عالمِ اسلام میں ہے

رازِ عظمت ہے مقاصد کی بلندی میں اسد
ہم یہ سمجھے کہ بلندی در و بام میں ہے

دورِ نو

نظر حیدر آبادی

بنامِ روحِ آزادی وہ ساماں ہم نے دیکھا ہے
قفس اندر قفس حسنِ گلستاں ہم نے دیکھا ہے
نظر کو، روح کو، دل کو ہراساں ہم نے دیکھا ہے
کہ احساسات کو بھی پابجولاں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

خضر کی شکل میں رہزن امامانِ سیاست تھے
سیہ باطن اجالے رونقِ صبحِ سعادت تھے
ہمایوں بخت مجرم تخت آرائے حکومت تھے
لٹیروں کو بھی ملّت کا نگہباں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

جہاں وحشت کے جھونکوں سے لرزتی تھی فضائے دل
جہاں سینے کے داغوں سے تجلّی بار تھی محفل
جہاں بلبل کو اذنِ نغمہ پیرائی نہ تھا حاصل
وہاں زاغوں کو سرمست و غزلخواں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

نہ پوچھو کیسے غم، کیا دکھ تھے، کیسی جگ ہنسائی تھی
نہ پوچھو کس نے اور کیسی قیامت ہم پہ ڈھائی تھی
ہمارے ناخدا نے کچھ ہوا ایسی چلائی تھی
بھنور میں امن اور ساحل پہ طوفاں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

تلاطم تھا امانت دارِ لطف و راحتِ ساحل
چمکتی برق تھی اب تک نگہدارِ غمِ حاصل
تڑپتی تیغ تھی ماتم گسارِ لاشۂ بسمل
جہنم کو ندیمِ شبنمستاں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

وہ عہدِ بے یقینی اس قدر مسموم و ابتر تھا
گلوں کے لب پہ کانٹے اور ہر کانٹا گلِ تر تھا
کمال آشفتہ حال و بیقرار و زار و بے زر تھا
مگر بے کمالی کو زر افشاں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

سدا فن کار پر تھا بند دروازہ حکومت کا
مقدر ہو گیا تھا ان کا حصہ دُور کا جلوا
کہاں وہ بابِ عالی اور کہاں ہم سے وفا پیشہ
دعاؤں کو بھی ہوتے "نذرِ درباں" ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

خدا کا شکر اب وہ رسمِ اندازِ کہن بدلی
نئے ساقی نے بُنیادِ بساطِ انجمن بدلی
کچھ اس انداز سے تقدیرِ اہلِ علم و فن بدلی
کہ اخترِ ہر سخنور کا فروزاں ہم نے دیکھا ہے
وہ دورِ انقلابِ چرخِ گرداں ہم نے دیکھا ہے

★

"وہ چمک اٹھا افق"

اگر اُن حالات پر نظر ڈالی جائے جو گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد رونما ہوئے ہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، وہ ایک نہایت نازک اور پُر آشوب دور ہے اور اس کے ساتھ بے انتہا ہنگامہ خیز بھی۔ اس میں تمام اقوامِ عالم معرضِ امتحان میں ہیں، اور ایک مسلسل روح فرسا آزمائش کے مرحلے سے گزر رہی ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آگے چل کر ان کا انجام کیا ہو، اور اگر وہ خوش قسمتی سے اس پُر آشوب دور کے اُس پار امن و سلامتی کے کنارے پر پہنچ بھی جائیں تو ان کی حیثیت کیا ہوگی۔ اُن قوموں کے لئے جو صفحۂ ہستی پر اُبھری ہی ہیں اور اُنہیں آزاد قوموں کے زمرے میں شامل ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری، یہ مرحلہ اور بھی صبر آزما، اور بھی جانگداز ہے۔ وہ دوہری آزمائش سے دوچار ہیں۔ آزادی تو صرف اتنا ہی کرتی ہے کہ اُنہیں وجود میں لا کر ایک کھلے میدان میں چھوڑ دے کہ وہ جئیں یا مریں۔ اور ان تمام ناتوانیوں، خطروں اور دشواریوں کے ساتھ جو کسی چیز کے جنم لینے کے بعد لازمی ہیں۔ یہ نازک مرحلہ کچھ اور بھی کٹھن ہوتا ہے کیونکہ اس میں ساری کشمکش اپنے ہی ساتھ ہوتی ہے ؎

ہمہ از دستِ غیر می نالند　　　سعدی از دستِ خویشتن فریاد

اور پھر وہ قوموں اور ملکوں کی مسلسل باہمی کشمکش ہے جو سب کے لئے یکساں ہے اور جس سے کوئی بھی آزاد نہیں رہ سکتا۔ پاکستان شروع ہی سے ان دونوں قسم کی کشمکشوں سے دوچار رہا ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے لئے نجی قسم کی کشمکش اور بھی بلائے جاں ثابت ہوئی اور کچھ عجب نہیں کہ جان لیوا بھی ثابت ہوئی۔ گویا ہمیں دوہری نہیں تہری کشمکش سے دوچار ہونا پڑا۔ کچھ غیروں کے ہاتھ سے اور کچھ اپنے ہاتھ سے، ... اور یہ کیفیت ہوئی کہ ؎

کاروبارِ موج با بحر ست خودداری مجو　　　در شکستِ خویشتن بے اختیار افتادہ ام

اس طرح دس گیارہ ابتدائی نازک سال سسکتے، رینگتے، کلبلاتے، ایڑیاں رگڑتے گذر گئے۔ نہ کوئی مسئلہ حل ہوا، نہ کوئی چارۂ دردِ نہاں ہوا۔ حالات روز بروز بدتر ہوتے گئے اور یہ امید کہ کسی دن ایک دورِ خوشگوار بھی آئے گا موہوم رہوتی گئی ؎

مرداں روزِ بہی می طلبند از ایام　　　مشکل اینست کہ ہر روز بتر می بینم

یہاں ان افسوسناک حالات کو دوہرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم ان سب سے بخوبی واقف ہیں اور سچ پوچھئے تو بار بار ان کا اعادہ ایک خفقانی ذہنیت کی نشانی ہے جو تندرست اور سنجیدہ ذہنیت کے منافی ہے۔ بہت اچھا ہے کہ ہم ایک بر وقت انقلاب کی بدولت اس رنج و کرب اور سنگین آزمائش کے بھیانک دور سے باہر نکل آئے ہیں۔ اور ایک بار پھر ویسی ہی روشن اور تابناک فضا میں داخل ہو رہے ہیں جو ہمارے لئے بے انتہا صحت مند اور حوصلہ افزا ہے۔ بلکہ یہ فضا اس لحاظ سے اور بھی خوشگوار ہے کہ اس میں وہ اندیشے، وہ رکاوٹیں نہیں جو ایک سنگین دیوار بن کر ہمارے راستے میں کھڑی ہو جائیں اور ہمیں آگے بڑھنے سے روکیں۔ ہمارے لئے انقلاب آیا اور اس انداز سے آیا کہ سارا بت خانے کا بت خانہ زیر و زبر ہو گیا ع

آں سیل سبکسیرم ہر بند گسستم من

اور آج اس طوفانی، برق رفتار، عہد آفریں انقلاب کی بدولت ہمارے سامنے ایک کھلا میدان ہے جس میں ہم پوری آزادی سے گرمِ جولاں ہوں اور اُن مقامات کو طے کرنے کی کوشش کریں جن کے لئے ہم نے ایک آزاد وطن کو حاصل کرنے کی جد و جہد کی تھی۔ یہی وہ مرکزی بات ہے جو موجودہ انقلاب کو خاص اہمیت عطا کرتی ہے۔ اور باقی سب کچھ اسی نقطۂ روشن کی تفسیر ہے اور بس۔ کوئی بھی تحریک یا واقعہ ہو، اس کی روحِ رواں وہ جذبہ، شعور یا تصور ہی ہوا کرتا ہے جو اس کی تہہ میں کارفرما ہو اور جس سے باقی سب مظاہر بروئے کار آئیں۔ چنانچہ حالیہ انقلاب بھی اسی لئے اہم ہے کہ یہ صحیح معنوں میں انقلاب ہے۔ ما یغیر بقوم حتی یغیر ما بانفسہم کا مصداق۔ کیونکہ اس کی بنیاد دلی خلوص پہ ہے۔ یہ محض ایک حکومت کے بدلے دوسری حکومت نہیں اور نہ اس کی بنیاد ہم جوئی یا نشۂ اقتدار پہ ہے بلکہ

یہ ملک و قوم کی حقیقی بہبود اور عوام کے مفادات کو بہترین طور پر روبہ عمل لانے کی پرخلوص کوشش ہے۔ اور یہی درحقیقت عوام کی حکومت برائے عوام ہے، جو ریاست کے اعلیٰ ترین تصور سے پوری پوری مناسبت رکھتی ہے۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمیں ایسی اعلیٰ حکومت کسی ناگوار حادثے یا کسی شور و شر، کسی کشت و خون، حصول اقتدار کے لئے کسی رسّہ کشی اور انتخابات بازی کی شکل میں نہایت گراں قیمت ادا کئے بغیر ہاتھ آئی ہے۔ گویا ہمارے قدم ستاروں کی آخری منزل تک بغیر زحمت رفتار پہنچ گئے ہیں اور بہترین امکانات و توقعات کے ساتھ

مولانا شبلی مرحوم نے ٹھیک کہا ہے:

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو	دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں	کر دیا ذرّۂ افسردہ کو ہمرنگِ شرار
یا کوئی حادثہ ملک و وطن تھا جس نے	کر دیا دم میں قوائے عملی کو بیدار

اور ہمارے انقلاب میں یہ دونوں محرکات پوری شدت سے کارفرما ہیں۔ اور یہ فوجی مدبروں اور مجاہدوں کی شکل میں جذبۂ دینی ہی ہے جس نے حقیقتاً قوم کے پیکر افسردہ میں ایک نئی روح پھونک دی ہے۔ اور شروع سے ایک اب تک جتنے بھی اقدامات ہوئے ہیں، وہ اسی آتش نہاں کے شعلے ہیں۔

سب سے پہلے جس چیز کی ضرورت تھی وہ معاشرہ کی ہر اعتبار سے تطہیر تھی۔ اس کے ضمیر خفتہ کو بیدار کرنا تھا، اسے برائیوں کے چکر سے نجات دلانی تھی تاکہ وہ تندرست اور چست و چاق ہو کر تعمیر و ترقی کی راہ پر پوری مستعدی اور برق رفتاری کے ساتھ گامزن ہو۔ بالفاظ دیگر ساری قوم کے جسم اور دل و دماغ کو زہر سے پاک کر کے ہشاش بشاش بنانا تھا تاکہ میدانِ حیات میں اس کی صلاحیتیں پوری پوری توانائی اور اثر آفرینی کا ثبوت دے سکیں۔ چنانچہ ابتدا میں ایسی تدابیر اختیار کی گئیں جو اس جسمانی و دماغی قصب ماہیت کا باعث ہوں۔

اس سلسلہ میں ایک اہم اقدام اُن خرابیوں کا سدباب تھا جو سابقہ حکومتوں، مدبروں، سیاست دانوں، ملکی جماعتوں اور قوم دشمن عناصر کی سرگرمیوں کا نتیجہ تھیں۔ چنانچہ ان پر حملے نرکانہ ہوئے اور پے در پے ہوئے۔ اور اس طرح اصلاح مفاسد کی کوئی صورت ناآزمودہ نہ رہی۔ خود غرض اور مفاد پرست وزارتوں اور سیاست دانوں کا قلع قمع ہوا اور نت نیا آشوب پیدا کرنے والی جماعتیں بھی مکمل طور پر ساقط ہو گئیں۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی جو لازماً نئی حکومت کی استواری کا باعث ہوئی۔ ہمارے ایک جواں سال وزیر نے کار کے الفاظ میں یہ سکہ آئوب کا سکہ مرزا اور سکہ آئوب ورسس بیڈران ڈیڈز کا سوال تھا۔ اور حق یہ ہے کہ ان ناموں اور اصطلاحوں سے متعلقہ عناصر کی نمائندگی کا حق پورا پورا ادا ہو جاتا ہے۔

ان بنیادی اقدامات کے بعد جو کچھ ہوا وہ ایک ہی معاملہ کی مختلف شقوں اور ایک ہی درخت کے شاخ و برگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک بہت بڑا سوال مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ تھا، وہ مسئلہ جو دس گیارہ سال سے مسلسل معرضِ التوا میں تھا اور بظاہر تعطل کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ کچھ عجب نہیں کہ اگر تھوڑا عرصہ اور گزرتا تو قطعی طور پر داخل دفتر ہو جاتا۔ اور اس کے ساتھ سینکڑوں بے بس اور مصیبت زدہ پاکستانی عوام کی قسمت کا فیصلہ بھی ہو جاتا اور وہ حتمی طور پر زندہ درگور ہو جاتے۔ لیکن نیا دور عوام کا دور تھا اور نئی حکومت عوام ہی کی حکومت تھی۔ اس کا مطمح نظر عوام ہی کی خیر خواہی تھی اور اس کے ارباب اختیار کے ذہن میں انہی کا خیال مقدم تھا۔ اور دل و دماغ میں اُن ہی کا سودا سمایا ہوا تھا۔ کیونکہ اگر پاکستان کے عوام آسودہ و خوش حال نہیں تو حکومتوں کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے۔ بنیادی چیز بالآخر عوام ہی ہیں اور ان کی بہبودی اگر عوام ہی نہیں ہوں گے تو ظاہر ہے حکومت کس پر کی جائے گی اور کب تک کی جائے گی۔ لہٰذا سب سے پہلے اسی مسئلہ سے مکمل طور پر نمٹنے کی کوشش کی گئی۔ اور حکومت کا شروع ہی سے مطمح نظر یہ قرار پایا کہ اس مسئلہ کو جیسے بھی ہو اس طرح حل کیا جائے کہ اس میں کوئی کسر باقی نہ رہے۔ اور قوم ہمہ وجوہ مطمئن و فارغ البال ہو کر جادۂ ترقی پر گامزن ہو۔ چنانچہ اس بارہ میں بار بار ایسے قطعی اعلانات کئے گئے ہیں اور ان پر واقعتہً اس طرح عملدرآمد ہو رہا ہے کہ ان ارادوں کی تکمیل کے متعلق شک و شبہ کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ حال ہی میں اعلان ہوا ہے کہ یہ مسئلہ سالِ رواں کے گزرنے سے پہلے ہی مکمل طور پر انجام پذیر ہو جائے گا۔

اس کے ساتھ عادی کا دیرینہ مسئلہ بھی شامل ہے۔ جس کو اس سے پہلے نہ تو دست گرہ کشا نے حل کرنے کا پورا ارادہ کیا اور نہ کوئی اقدامات ہی کئے۔ اگر توجہ دی بھی گئی تو بہت سرسری طور پر۔ نئی حکومت نے آتے ہی اس معاملہ کو اس طرح ہاتھ میں لیا گویا وہ اس کو طے کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اور اس طرح جیسے کسی معاملہ کو عملی طور پر

نبٹایا جاتا ہے۔ چنانچہ سب سے پہلی کوشش یہ ہوئی کہ دعاوی کو مناسب حدود میں لایا جائے۔ اور اس میں مارشل لاء کے کڑے ضبط و نظم سے پورا پورا کام لیا گیا۔ جیسا کہ لازم تھا یہ حکمتِ عملی مکمل طور پر کامیاب ثابت ہوئی، اور بے شمار لوگوں نے یا تو اپنے دعاوی واپس لے لئے یا مبالغہ آمیز دعاوی کی تصحیح کر دی۔ یہ مسئلہ سلجھانے کے لئے بھی مفید ہے۔ اور حکومت کا بار ہلکا کرنے کے لحاظ سے بھی کارآمد۔ اور اب اس ابتدائی کارروائی کے بعد یہ بھی اعلان کر دیا گیا ہے کہ حتی الوسع مارچ تک یہ معاملہ طے کر دیا جائے گا۔

ملکی اقتصاد کے لئے ایک نہایت سنگین اور تباہ کن مسئلہ ناجائز درآمد برآمد، منافع خوری، ذخیرہ اندوزی اور اس قسم کی دیگر تخریبی کارروائیاں تھیں۔ جن کا سلسلہ علی الاعلان جاری تھا اور ستم ظریفی یہ کہ خود حکومت کے عمال و اہلکاران کے تعاون کے ساتھ۔ جس سے ملکی معیشت کو بُری طرح گھن لگتا جا رہا تھا اس کی بنیادیں روز بروز کھوکھلی ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ اناج جو قوم کے لئے سرمایۂ حیات ہے بے تحاشا باہر بھیجا جا رہا تھا تاکہ اس پہ ملک و قوم کے بیرونی دشمنوں کے مہلک جراثیم پرورش پا پا کر توانا اور دلیر ہوں۔ اس طرح وہی خطہ جو قوموں کا کھلیان کہلاتا تھا قحط کی حد تک پہنچ چکا تھا۔ صریحاً اگر ملک کو اس عظیم خطرے سے بچانا تھا تو اس کے لئے نہایت ہی شدید اقدام کی ضرورت تھی۔ چنانچہ آج اس حکمتِ عملی کا منطقی نتیجہ ہمارے سامنے ہے کہ حکومت کو اس محاذ پر، جو بیک وقت اندرونی بھی ہے اور بیرونی بھی، قابلِ رشک کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اور اس کو اپنے ہی نہیں بیگانے بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کو کسی چیز نے بروقت بچا لیا ہے تو وہ یہی سخت گیر اقدام ہے۔ اس نے ہماری ساکھ بھی محفوظ کر دی ہے اور دھاک بھی۔ اور آج یہ کیفیت ہے کہ ایک ذرہ کی بھی ناجائز درآمد برآمد ممکن نہیں۔ وہ تمام رخنے جن کی راہ سے ہماری قومی طاقت بہی جا رہی تھی بند ہو گئے ہیں۔ اور اناج جیسی قیمتی چیز جس پہ ہماری زندگی کا دارومدار ہے اور جس کی اسی ناجائز برآمد کے باعث ملک میں بحرانی حالت پیدا ہو چکی تھی، اندرونِ ملک ہی محفوظ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہم غذائی حیثیت سے پوری طرح مطمئن ہیں اور کسی خاص دوستانہ ہاتھ کے حاجتمند نہیں رہے۔ اس سلسلے میں جعلی راشن کارڈوں کی مہم نے بھی بہت بڑا کام کیا۔ جس سے ہماری غذائی حالت دہری مضبوط اور اطمینان بخش ہو گئی ہے۔

اسی محاذ کا ایک اہم پہلو دفتری نظم و نسق اور کارکردگی کو صحیح نہج پہ لانا تھا یعنی دفتری نظم و ضبط کو صحیح معنوں میں موثر بنانا تھا۔ کیونکہ اسی میں رخنے ہونے کی وجہ سے قوم دشمن عناصر کو من مانی کرنے کا موقع ملتا تھا۔ بنا بریں پہلے یہ لازم تھا کہ انتظام کی کل سیدھی کی جائے۔ رشوت ستانی، بددیانتی اور نااہلی کا سدباب لوازمات سے تھا۔ یہ بات نئے دور کے لئے خصوصیت سے باعثِ افتخار ہے کہ اس نے نظم و نسق کے کل پرزے پوری طرح کس دئے ہیں اور ان میں سستی یا خرابی کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔

چونکہ نئی حکومت کا مدعا خود زندگی کی بنیادی اصلاح تھی اور زندگی یک جہت نہیں صد جہت ہے، اس لئے حکومت کی تدابیر اور اقدامات بھی صد جہت ہیں۔ بڑی بات یہ ہے کہ سب جہتیں ایک ہی مرکز پر بیک وقت مجتمع ہو گئی ہیں۔ جیسے وہ خود بخود ایک مرکزی اور بنیادی احساس اور تقاضے کے ماتحت ابھر رہی ہوں۔ ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی اور نئے رنگ کے عناصر کی موجودگی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ذرائع تعلیم ناکافی ہو جائیں اور نظام تعلیم بھی موجودہ ضروریات کے لئے ناکارہ ثابت ہو، کیا بلحاظ کمیت اور کیا بلحاظ کیفیت۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ تعلیم کے بغیر ذہنی بیداری کہاں تک ممکن ہے۔ پھر غلامی سے آزادی میں داخل ہونے کے بعد تعلیم کی صحیح نہج اور نوعیت کا سوال پیدا ہونا بھی ناگزیر تھا۔ یہ حالات ہیں جنہوں نے تعلیم کے مسئلہ کو غیر معمولی اہمیت عطا کر دی۔ اسی بناء پر حکومت نے پہلی بار منظم طور پر اس کو حل کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لئے ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا ہے۔ اور جیسا کہ لازم ہے اب اس مسئلہ کا سلجھنا تھوڑے ہی دن کی بات ہے۔ بعض قابلِ لحاظ اقدامات پہلے ہی ہو چکے ہیں اور تعلیم کو بہتر اور ارزاں بنانے میں کافی اثر دکھا رہے ہیں۔

کچھ ایسی ہی اہمیت پولیس کو بھی حاصل ہے اور موجودہ زمانہ میں اس اہم شعبہ کا جو تعلق زندگی سے ہے، اس کی بناء پر یہ اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ چنانچہ پولیس کمیشن کے تقرر نے اس کے ہر ہر پہلو اور ہر مسئلہ کی چھان بین اور مناسب سفارشات کے لئے میدان صاف کر دیا ہے۔

عام، جلد، ارزاں اور حقیقی انصاف اور مستعد، کارگذار عدالتیں۔ یہ ہیں ایک اچھے معاشرہ کا ایک اور بنیادی لوازمہ۔ کوئی

معاشرہ درست طور پر نشوونما نہیں کر سکتا جس کی بنیاد عدم مساوات پر ہو۔ ایک طرف بڑے بڑے زمیندار اور جاگیردار اور دوسری طرف مفلوک الحال مزارعین۔ ایسے ہوتے ہوئے دولت کی صحیح تقسیم کیسے ممکن ہے! ہمارے زمانہ میں جب تمام دنیا اس قدر وسیع انقلابات سے دوچار ہو چکی ہے، اس قسم کے غیر متوازن نظام کو برقرار رکھنا، معاشرہ کو تعطل پذیر ہونے اور اس میں افراتفری پیدا ہونے کی کھلی دعوت ہے۔ چنانچہ اس کے نتائج ہمارے سامنے ظاہر ہو رہے تھے۔ موجودہ حکومت کی بالغ نظری کا بڑا ثبوت ہے کہ یہ صورت خرابی کی، یہ بنیادی شر اس کی نگاہوں سے پنہاں نہ رہ سکا اور اس نے عنان کار سنبھالتے ہی اس پر توجہ دی اور آج روز روشن کی طرح ہمارے سامنے عیاں ہے کہ پاکستان جس میں ایسے دور رس نتائج رکھنے والی زرعی اصلاحات کا وہم و گمان بھی نہ تھا، نہایت بنیادی قسم کی اصلاحات پر فخر کناں ہے۔ کہنے کو یہ تنہا صرف ایک اقدام ہے لیکن اس کے سامنے اور اس کی تہہ میں اور کیا کچھ نہیں۔ لہٰذا یہ جائزہ خود ایک بسیط مطالعہ کا مستحق ہے تاکہ اس کے مضمرات اور متعلقات کا بخوبی حق ادا کیا جائے۔

جب اس قدر وسیع اور تمام معاشرہ پر حاوی اقدامات پیش نظر ہوں تو ان کو لازماً ایک بہتر نظام ہی کی طرف پیشقدمی تصور کرنا چاہیے۔ اور یہ امر وجہ مسرت ہے کہ نئے دل اور دماغ شروع ہی سے اس منزل کی طرف قدم بڑھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چنانچہ بارہا اعلان کیا گیا ہے کہ یہ بہی خواہان ملک، بہترین اور نہایت درست تصورات سے معمور، قوم کے لئے ایک ایسا نظام حکومت تیار کرنے کی تدبیر کر رہے ہیں جو اس کے لئے پوری طرح موزوں ہو۔ وہ خود صرف عارضی طور پر اس کے مدارالمہام ہیں اور جونہی وہ اس منزل پر بخیر و خوبی پہنچ جائیں گے، عوام کی اپنی ہی پسند اور آراء کی ضرورت و پاس کے لئے موزوں و مناسب حکومت خود بخود معرض اظہار میں آ جائے گی۔

ان انقلابات نے خوشگوار فضا پیدا کر دی ہے اس سے زندگی کے سینے میں ایک بار پھر جوش و خروش اور ولولہ و اہتزاز پیدا ہونا لازم ہے۔ یہ وہ فضا ہے جس سے ایک نئی روح خود بخود ابھر آتی ہے، حوصلے پھر بلند اور جد و جہد پھر تازہ ہوتی ہے۔ ایسی فضا ادب و فن کی جولانیوں کے لئے خاص طور پر موزوں ہوتی ہے۔ خوش بختی ہمارے ہاں یہ نوازش [illegible] اور بہار کی طرح خود صدر پاکستان کے دل میں بھی ادب و فن کی پرورش اور حوصلہ افزائی کا ولولہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکی۔ چنانچہ ایک بات جو نئے دور کو ممیز کرتی ہے وہ ایک سپاہی کے دل میں یہ لگن ہے کہ ادب کی اہمیت کو، جو زندگی کا جزو لازمی ہے اور ایک خاص قدر و قیمت رکھتا ہے، تسلیم کیا جائے۔ ساتھ ہی ادیبوں کی اہمیت بھی تسلیم کی جائے جو حیات کو متاثر اور راہنمائی کرنے میں دسترس رکھتے ہیں۔

چنانچہ کچھ عرصہ پہلے صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خان نے ادیبوں کے لئے ایک خاص فنڈ کا اعلان کیا۔ اس سے فضا یکدم چمک اٹھی اور اہل ادب کو سرگرمیوں کے لئے ایک نئی روشنی نظر آئی۔ ان کا تخیل تیکھا ہوا اور وہ اپنے لئے نئے دور رس امکانات کا تصور کرنے لگے۔ اس پختہ ویژن اور پرواز تخیل کا نتیجہ پاکستانی ادیبوں کی پہلی عظیم الشان کنونشن کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جس میں پہلی دفعہ ادب کا ایک خاص منصب تسلیم کیا گیا۔ اور ایک گلڈ کا قیام عمل میں آیا جس سے ان کی حیثیت مستحکم ہو جاتی ہے، وہ تخلیقی کاموں کے لئے زیادہ سازگار [illegible] ہو جاتی ہے، وہ استحصال کے مضرات، ناساز حالات اور اقتصادی پریشانیوں سے آزاد ہو کر سرگرم کار ہو سکتے ہیں، اور اپنی کاوشوں سے [illegible] متمتع ہونے کی توقع کر سکتے ہیں جو ان کے نتائج کی تکمیل ہو سکے۔ صدر پاکستان نے کنونشن کے آخری اجلاس میں شریک ہو کر پھر ادیبوں کے ترقی کوش عزائم اور رجحانات سے موافقت ظاہر کی اور اپنی گراں قدر اعانت سے ادب اور ادیبوں میں دلچسپی کا عملی ثبوت دیا۔

لہٰذا نئے دور کی فضا اہل ادب اور اہل فکر ہی کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لئے خواہ وہ زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھتے ہوں، یکساں ولولہ انگیز ہے۔ اب ہم ایک ایسے دور میں داخل ہو چکے ہیں جو فی نفسہ متحرک ہے، اسلئے اس سے ہر فرد کے دل میں جنبش و حرکت پیدا ہونا لازم ہے۔

یہ فروغ صبحگاہی اہل پاکستان کو پوری طرح ہنگامہ آرا ہونے کی دعوت ہے اور ہم اس نئی سحر کے ساتھ پھر نئے ذوق و شوق سے صبا رفتار ہوتے ہیں۔
خدا کرے ہمارا یہ سفر زیادہ سے زیادہ کامیاب ہو۔ ع تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

★

اعجازِ سفر

محشر بدایونی

اِک قافلۂ صد شعلہ بسر — سورج کی طرح ہے گرمِ سفر
ہر موڑ نئی وسعت کا یقیں — ہر گام نئی منزل کی خبر
جس راہگذر کی سمت بڑھے — ضو دینے لگے وہ راہگذر
بس ایک ہی رُخ ہے اس کی جہت — بس ایک ہی ٹیک ہے اس کی ڈگر
آفاق میں چاہے کچھ بھی ہو — اس کو یونہی چلنا آٹھ پہر
آگاہ یہ خوب اس راز سے ہے — منزل ہے فقط چلنے کا ثمر
کھل جاتا ہے جب پائے جنوں — بن جاتی ہے دیوار ہی در
تہ تک کی خبر لے لیتا ہے — کشتی کا دباؤ دریا پر
شاموں میں اگر ہے رنگ اتنا — صبحوں میں ہے اتنا حسن اگر
یہ ایسے نزہت بخش چمن — یہ اتنے سایہ دار شجر
کیا یوں ہی میسّر آئے ہیں — یہ لالہ و گل یہ لعل و گہر
روشن بھی ہوا ہے نقش کوئی — بے جذبِ نگہ، بے فیضِ اثر
اک تیز چمک تھی ذرّوں کی — جو بڑھ کے بنی عالم کی سحر
رہرو کسی حد پر بند نہیں — ہر راہ کے بعد اک راہِ دگر
ہاں شل ہو نہ یہ رفتارِ طلب — ہاں کم ہو نہ یہ پیکارِ سفر
اے دل یہ نشاں ہے منزل کا — منزل سے اسے تعبیر نہ کر

جلوے پئے دیدار اور بھی ہیں
عالم پئے اظہار اور بھی ہیں

قاری کو اپنی طرف متوجہ کرے اور اس طرح متوجہ کرے کہ قاری اس توجہ کو اپنے وقت کا بہترین مصرف سمجھ کر کم از کم تھوڑی دیر کے لئے کسی اور چیز کی طرف متوجہ ہونے کی طرف مائل نہ ہو۔ قاری کو اپنی کہانی کی طرف متوجہ کر لینے کے بعد افسانہ گو (اس میں ناول نگار، افسانہ نگار اور داستان سرا سب شامل ہیں) کی دوسری کوشش یہ ہوتی ہے کہ قاری کی توجہ کو قائم رکھے اور اس کوشش میں کامیابی کے لئے وہ کہانی میں کوئی ایسی صورت پیدا کرتا ہے کہ جس سے قاری کا جذبۂ تحیر ابھرتا ہے۔ اس جذبۂ تحیر کو ابھار کر اسے قائم رکھنا اور اسے شوق و اشتیاق کی صورت دینا افسانہ نگار کے کام کا تیسرا مرحلہ اور اس کے آدابِ فن کا تیسرا جزو ہے۔ قاری کا یہی احساسِ تحیر جو شوق، انتظار، بے یقینی، تذبذب اور امید و بیم کی ملی جلی کیفیتوں کی صورت اختیار کرتا رہتا ہے، اس کی مسرت کی بنیاد اور مدار ہے۔ گویا مجموعی حیثیت سے افسانہ گو کا مقصود سامع یا قاری کے لئے لطف و مسرت کا ایک ایسا سامان مہیا و فراہم کرنا ہے جو اسے تھوڑی دیر کے لئے اپنے گرد و پیش کی ہر چیز سے بے تعلق کر کے صرف کہانی کی فضا میں گم کر دے۔ قاری کی یہی گم گشتگی افسانہ گو کی سب سے بڑی کامیابی اور اس کے آدابِ فن کی پیروی و پابندی کا انعام ہے۔

کہانی کہنے اور کہانی سننے کے اس دوگونہ اور دو رخے عمل میں ظاہر ہے کہ مصنف کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ قاری پر ایک خاص طرح کا ردِ عمل پیدا کرے لیکن اس ردِ عمل کی نوعیت ہمیشہ ایک سی نہیں ہوتی اور اس میں شبہ نہیں کہ ردِ عمل کی نوعیت کا یہ فرق مصنف کے تخلیقی عمل کی نوعیت میں بھی فرق پیدا کرتا ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قاری کے ردِ عمل میں مجموعی حیثیت سے قاری کے ارادے کو دخل نہیں ہوتا۔ اس خاموش ردِ عمل میں اس کی حیثیت وہ فعالی حیثیت نہیں ہوتی جو افسانہ گو یا افسانہ نگار کی ہے۔ وہ متوجہ ہوتا ہے، اس میں تحیر، استعجاب، اشتیاق، تذبذب، امید، بیم اور ان سب کے مجموعی اثر سے بہجت و مسرت کی جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں اُن کے لئے اسے کوئی ارادی کوشش نہیں کرنی پڑتی اور اس طرح یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنف اور قاری کے بدیہی، لابدی اور ناگزیر رشتے میں اُس کے وجود کی حیثیت اہم ہونے کے باوجود بظاہر ثانوی اور فروعی ہے۔ اصل حیثیت مصنف کی ہے جو ولکی کولنز (NILKIE COLLINS) کے الفاظ میں "انھیں ہنساتا، انھیں رُلاتا اور اُنھیں انتظار اور تذبذب میں رکھتا ہے۔"*

افسانہ گوئی اور داستان سرائی کی ہزاروں برس کی تاریخ شاہد ہے کہ کہانی کہنے والوں نے ہمیشہ قاری کی اس ثانوی اور غیر فعالی حیثیت کو غلط معنی پہنا کر اپنے وجود اور شخصیت کو اس کے وجود اور شخصیت پر غالب کرنے اور حاوی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اپنے آپ کو ایک بلند تر سطح پر متمکن کر کے قاری پر فراست جنبیت، بے نیازانہ اور تحقیر کی نظر ڈالی ہے۔ اپنے آپ کو فہم و ذکا اور ذہانت اور فطانت کا امین اور سرمایہ دار جان کر اسے کم فہمی بلکہ نافہمی کا مظاہرہ عطا کیا ہے۔ اس سے دوستانہ اور منصفانہ مراسم قائم کرنے کے بجائے اُس کے معاملات میں واعظ و ناصح بلکہ محتسب بننے کو اپنا منصب خاص سمجھا ہے اور بعض اوقات اپنے فن کو وہ آداب برتتے ہوئے بھی جن میں قاری کی فطرت کے بعض تقاضوں کا پیش نظر رکھنا لازمی ہے، توازن و اعتدال کی حدود باقی نہیں رکھے ہیں اور قاری کے دل میں پیدا ہونے والے تذبذب اور شوق سے اتنا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے کہ مصنف کا عمل قاری کے لئے مسرت کے بجائے اذیت اور فرحت و شگفتگی کے بجائے تکدر و انقباض کا سبب بن گیا ہے۔ کبھی کبھی قاری کے ان معصوم اور فطری میلانات سے مصنف اس حد تک ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کی فریب کاری آشکار ہو جاتی ہے اور قاری اس مسرت و لطف سے یکسر محروم رہ جاتا ہے جس کی آرزو اور جس کے حصول کا یقین اسے کہانی کی طرف لاتا ہے۔

ہزاروں سال کی قصہ گوئی اور داستان سرائی میں مصنف کے رویے کے ایک خاص پہلو کی یہ تصویر نہ دلکش ہے نہ خوش آیند لیکن حقیقت یہ ہے کہ کہانی کہنے والوں نے کہانی کہتے وقت اپنے اور قاری کے رشتے کو صرف اسی ایک انداز سے نہیں دیکھا۔ ان کا ایک عام انداز یہ بھی رہا ہے کہ انہوں نے قاری کے مزاج کی بعض خصوصیتوں کو پیش نظر رکھ کر محض ان کی خوشنودی کو اپنا مقصودِ آخر سمجھنے کی غلطی کی ہے اور اس طرح فن کی بارگاہ میں ایک ناقابلِ معافی مجرم ٹھہرے ہیں۔ ایک نقاد کا قول ہے کہ محض کسی روایت کی تقلید اور پیروی اور کسی خاص حلقے کے قاری کی خوشنودی کا خیال فن کا آخری مطمح نظر نہیں۔ جن مصنفوں نے بدنامی یا ناپسندیدگی کے خوف یا زیادہ سے زیادہ لوگوں کی داد و تحسین حاصل کرنے کے لئے اپنے فن کو ان کی پسند اور مرضی کے سانچوں میں ڈھالا ہے، وہ اپنے فن کے دشمن ہیں۔ انھوں نے اس کے ساتھ بے وفائی برتی اور غداری کی ہے۔ اور اس طرح کی بے وفائی اور غداری قصہ گوئی کی صنف کی تاریخ میں کسی اور صنف کی تاریخ کے مقابلے میں یقیناً زیادہ واضح اور زیادہ عام ہے۔

---

* "MAKE THEM LAUGH; MAKE THEM CRY; MAKE THEM WAIT."

مبلغ اور مصلح کی طرح ہمارے سامنے آتا ہے تو مبلغوں اور مصلحوں سے زیادہ فلسفیوں کی سی باتیں کرتا ہے اور جب اُسے خود بخود شبہ ہونے لگتا ہے کہ اس کی باتیں توجہ سے نہیں سنی جا رہی ہیں اور ان کا صحیح مطلب نہیں سمجھا جا رہا ہے تو اسے غصہ آجاتا ہے اور اپنی بات چیخ چیخ کر اور گلا پھاڑ کر کہنا شروع کرتا ہے اور اس کے باوجود اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کی بات تاثیر سے خالی رہی تو وہ قاری کو دھکے دے کر اپنی آنکھوں کے سامنے سے دور ہٹا دیتا ہے۔ اس طرح اپنے آپے سے باہر ہو جانے والے لارنس نے کبھی کبھی اپنے قاری کے دل میں یہ یقین پیدا کیا ہے کہ دیدہ و دانستہ اُس کی اہانت کی جا رہی ہے اور اس یقین کے بعد کہی ہوئی بات یا کہانی کا جو حشر ہوتا ہے، ظاہر ہے۔ ایسی تخلیق کا انجام سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ بے بسی اور بے کسی اُسے ابدی نیند سُلا دے۔

اس طرح کی ایک اور نمایاں مثال ایچ۔ جی۔ ویلز کی ہے، جہاں ناول نگار نے اُس تحکم اور خودسری کا مظاہرہ تو نہیں کیا جو کپلنگ اور لارنس کی تخلیقات میں ظاہر ہوتی ہے، لیکن قاری کی ایک فطری کمزوری سے یقیناً ضرورت سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اُس کی عظیم کہانیوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے زندگی کے بے شمار محالات و ناممکنات کو ممکن کی سطح پر لا کر پڑھنے والوں کے لئے قابلِ یقین اور قابلِ قبول بنایا ہے۔ اس کی ناول نگاری اور افسانہ نگاری کے فن کا انحصار قاری کی تحیر پسند اور حیرت پرست فطرت پر ہے۔ اس نے تخیل کی بے پایاں قوت سے قاری کی اس فطرت کے ساتھ ہر طرح کے کھیل کھیلے ہیں۔ اسے ابھارا ہے، اسے دبایا ہے، اسے مہمیز دی ہے، اسے حسبِ دلخواہ جس مرحلے پر چاہا ہے آگے بڑھنے سے روکا ہے، اسے گدگدایا ہے، اس کے چٹکیاں لی ہیں، اسے ہنسا ہنسا کر رُلایا اور رُلا رُلا کر ہنسایا ہے، اس پر کاری ضربیں لگائی ہیں، اس پر خنک مرہم رکھے ہیں، اور جب چاہا ہے اس سے ناممکن کو ممکن بنا دینے کی خدمت لی ہے ـــــ یہ سب کچھ اس کی عظمت کی نشانیاں ہیں لیکن جذبۂ تحیر کو اس عظیم فن کار نے کبھی کبھی اتنا عاجز اور پست کیا ہے کہ اُس کی فن کارانہ بازی گری کے سامنے اس کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہی، وہ ایک بے جان کٹھ پتلی ہے کہ اسے سب دلخواہ تخیل کے تاروں پر ادھر سے اُدھر نچایا جا رہا ہے۔ یہ صورتِ حال بھی کسی نہ کسی انداز میں اپنی قوتوں کے مقابلے میں قاری کی صلاحیتوں کو بے حقیقت اور حقیر سمجھنے سے پیدا ہوتی ہے۔

اب دو مثالیں اور ـــــ چیخوف اور موپساں جس طرح اب سے ستر اسّی برس پہلے کہانی کے شیدائیوں کے محبوب تھے، اسی طرح اب بھی ہیں اور اُن کی یہ محبوبی مستقبل میں بھی یقینی ہے اس لئے کہ ان دونوں نے اپنی افسانہ گوئی کی بنیاد مصنف اور قاری کے اُس رشتے پر رکھی ہے جس میں دونوں ایک دوسرے کو محبوب بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے نزدیک معزز و محترم بھی۔ چیخوف اور موپساں دونوں نے قاری کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کرتے ہوئے اُس کے ساتھ کسی طرح کی شعبدہ گری اور طلسم کاری سے کام نہیں لیا۔ ان کی کہانیوں کا موضوع زندگی اور اس کے حقائق ہیں۔ وہ حقیقت کو جس رنگ اور روپ میں دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں اسی رنگ روپ میں اس پر کسی طرح کا پردہ ڈالے بغیر یا اسے کسی سانچے میں ڈھالے بغیر فن کار کی طرح قاری کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ چیخوف اور موپساں ایک ایسی حقیقت اور صداقت کے مصور اور مفسر ہیں جو کبھی فرسودہ نہیں ہوتی، امتدادِ زمانہ سے اس میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا۔ چیخوف اور موپساں دونوں اس صداقت کی مصوری کو اپنا مطمحِ نظر اسی لئے بناتے ہیں کہ اُن میں سے کوئی اپنے قاری کو تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ بعض دوسرے لکھنے والوں کی طرح وہ قاری کو احمق سمجھ کر اس کی آنکھوں پر پردے نہیں ڈالنا چاہتے۔ دونوں کی نظر میں ان کے قاری میں اتنی ذہانت، ذکاوت اور تصور آفرینی ہے کہ ان کی کہی ہوئی ادھوری بات کو پورا کر کے اس سے وہی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں جو افسانہ نگاروں کا مقصود ہیں۔ گو اس معاملے میں موپساں اور چیخوف میں مدارج کا فرق ہے۔

اپنے معاشرے کے افراد کے متعلق موپساں کی رائے مجموعی حیثیت سے کچھ بلند نہیں اس لئے وہ اپنے افسانے کے قاری کو بھی ذہانت کا بلند مقام نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی کہانیوں میں بات بلا واسطے وسیلے کے زیادہ سیدھے سادے انداز میں کہی جاتی ہے اس کی منطق زیادہ واضح اور مربوط ہوتی ہے، اس کی بتائی ہوئی تصویروں میں رنگوں کی جگہ خالی نہیں چھوڑی جاتی اور عموماً سبب اور نتیجے کا تعلق پیچ دار نہیں ہوتا۔ چیخوف کے دل میں اپنے قاری کی طرف سے اس طرح کی کسی بدگمانی کی گنجائش نہیں۔ اسے یقین ہے کہ وہ اس کے بنائے ہوئے خاکوں میں خالی جگہوں کو پُر کرنے اور اس کی بنائی ہوئی ادھوری تصویروں میں رنگ بھر لینے کے اہل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی بیانیہ مصوری کی بنیاد عموماً رمز اور تصور آفرینی پر رکھی جاتی ہے۔

بعض اوقات چیخوف کے افسانوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ "ان میں کچھ واقع نہیں ہوتا" ـــــ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے نازک افسانوں میں جو کچھ واقع ہوتا ہے یا جو کچھ پیش آتا ہے، وہ صفحۂ قرطاس کی قیدوں یا ایک محدود منظر کی پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے۔ واقعات پیش آتے ہوتے نظر نہیں آتے لیکن ایک واضح اشارہ ان کے وجود کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کہانی ختم ہو جاتی ہے اور واقعہ برابر جاری رہتا ہے۔ کسی قاری کو اگر یہ واقعہ ہوتا ہوا نظر نہ آئے

زر حقیقت میں یہ اس کی نظر اس کے تصور اور اس کی بصیرت کی کوتاہی ہے جس ذہانت اور تصور آفرینی کی توقع چیخوف اپنے قاری سے رکھتا ہے وہ اگر اس میں موجود ہو تو اس کی آنکھیں ایک ایسا منظر دیکھ سکتی ہیں جس میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی، رنگینی بھی ہے اور تاثیر بھی۔ چیخوف اپنی بنائی ہوئی تصویروں میں خطوط اور رنگوں کے جو خالی مقامات چھوڑ دیتا ہے ان میں ہر طرح کے قاری کے لئے یہ آزادی ہے کہ وہ اپنے تصور، تخیل اور ذہانت کے مطابق اس کی تکمیل کرے۔ گویا چیخوف کی نظر انسانی ذہن و ذکاوت کی بےپایاں صلاحیتوں پر ہے اور انھیں صلاحیتوں کے احترام اور تقدس نے اسے رمز و کنایہ اور تصور و احساس کا فن سکھایا ہے۔ چیخوف کی کہانی پڑھ کر ہمارے سامنے کردار کا جو نقش ابھرتا ہے وہ کسی ایک خاص معاشرے کے فرد کا نہیں بلکہ عالمگیر انسانی برادری کی سیرت اور شخصیت کا نقش ہوتا ہے۔ کہانی میں کرداروں کے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے ہمارے دلوں میں صرف اسی کا درد نہیں ہوتا بلکہ اس سے بھی ہمارے دل اس تصور سے پگھلتے ہیں جو کہانی ختم ہونے کے بعد کرداروں پر پڑتا نظر آتا ہے۔ اس طرح چیخوف کے دل میں انسان کی ذہنی صلاحیتوں کا جو احترام ہے اس نے کہانی کے ایک ایسے فن کی تخلیق کی ہے جس میں قاری کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ غیر ذہین اور سطحی قاری اس فن پر نہیں ریجھ سکتا، لیکن ذہین قاری چیخوف کے جذباتی گداز اور روحانی عظمت کا ساتھ دینے یا اس سے انحراف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ اسے انسانیت کے مستقبل کا امین سمجھیں گے۔

دنیا کے ادب میں ہمیشہ سے رہنے والے قصہ گویوں کی مثالیں اس حقیقت کی طرف بھی واضح اشارہ کر رہی ہیں کہ کہانی کے مصنف اور قاری کے درمیان ایک اٹوٹ رشتہ ہوتا ہے۔ کبھی اسے ایک جانب سے کھینچا جا سکتا ہے اور کبھی اس کی طاقت بے فقدان ہو جاتی ہے اور یہ بدلتی رہتی ہے۔ اس رشتے کی نوعیت گو ہمیشہ ایک سی نہیں رہی لیکن اس کا وجود کہانی کے وجود کا ایک ضروری عنصر ہے اور یہ اگر ہر دور میں اپنی نوعیت کے اعتبار سے کہانی کے فن کی نوعیت میں تبدیلیاں کرتا رہا ہے اور کرتا رہتا ہے۔ اور ہر زمانے میں کامیاب افسانہ نگار وہی ہوا ہے جس کو ادب میں عزت اور قبول عام کا سوال در پیش آیا ہے جو دوام کا شرف انھیں کے حصے میں آیا ہے جنھوں نے اپنے قاری کو محبوب اور محترم جانا ہے اور اسے تحقیر کی نظر سے دیکھ کر اس کے جذبات کے ساتھ بےدردی سے کام نہیں لیا ہے، قاری کو فریب میں مبتلا رکھنے والے قصہ گو اسے الجھن اور پیچیدگی میں پھنسانے والے داستان سرا اس کے جذبہ تجسس اور ذوق و شوق کو اپنا کھلونا بنانے والے ادیب نہ تو اپنے فن کے صحیح مظہر ہیں اور نہ اس کی روایات کے حقیقی پاسبان۔ ان کی راہ خدمتِ فن کی راہ نہیں۔ اس لئے ان کی نظر اس کہانی کہنے اور کہانی سننے والے کے اس رشتے کی طرف سے آنکھیں بند کئے ہوئے ہے جو فطرت کے قوانین کا پیدا کیا ہوا ہے۔

کہانی کے مصنف اور اس کے قاری کے رشتے کی اہمیت کی بنیاد چونکہ کہنے اور سننے والے کے فطری تقاضوں اور ان تقاضوں کے اشتراک پر ہے اس لئے اس کی اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے لیکن زندگی کے موجودہ دور میں کہ انسانی فطرت اور اس کی نفسیاتی نزاکتوں کا علم بہت عام ہو گیا ہے اس کی اہمیت اور اس اہمیت کے احساس میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔

s. o'faolain نے افسانہ نگاری کے جدید رجحانات کا تجزیہ کرتے ہوئے مصنف اور قاری کے رشتے کے سلسلے میں بعض نکتے کی باتیں کہی ہیں۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے:
"اب سے ایک صدی پہلے تک قاری و کتاب کو متاثر کرنے کی تکمیل لکھا جا سکتا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا (خصوصیت سے مختصر افسانے میں)۔ عام قاری کی سطح اب خاصی بلند ہو گئی ہے تعلیم، سفر، وسیع تر معاشرتی روابط، لباس، رہن سہن اور مذاق میں حد درجے کی یکسانی نے ان بےشمار چیزوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لا کر رکھ دیا ہے جو ایک صدی پہلے ہم سے بہت دور تھیں اور جن کے لئے ان کا صحیح تصور کرنے کے لئے ہم تفصیلی بیانات کے محتاج تھے۔ مصنف اور قاری دونوں تفصیلات کی روح فرسا محتاجی سے آزاد ہو گئے ہیں۔ اب صرف اشارے کنائے کافی ہیں۔"

کہانی کے مصنف اور قاری کے رشتے کا یہ حقیقت پسندانہ تصور ان افسانوں اور ناولوں کے مطالعے کا پیدا کیا ہوا ہے جس میں مصنف عہدِ حاضر کے علمی، استدلالی، تجزیاتی اور نفسیاتی رجحانات سے متاثر نظر آتا ہے۔ جدید سائنٹفک نظریات اور جمہوری ماحول نے ایک طرف تو قاری کے تجربات میں وسعت پیدا کی ہے اور دوسری طرف اسے اپنے گرد و پیش کی زندگی پر غور و فکر اور تجزیے اور تنقید کی نظر ڈالنے کا عادی بنایا اور ان پر اظہارِ خیال کی آزادی دی ہے۔ یہی ذہنی کیفیت مصنف کی بھی ہے اس لئے ہمارے ناولوں اور افسانوں میں مشاہدے اور غور و فکر کی روح، تفصیلات اور جزئیات کی تلاش کا جذبہ، خارجی مشاہدات اور داخلی کیفیات کی موشگافی اور تجزیے کا رجحان اور بےباکانہ تنقیدی جسارت کا میلان چھایا ہوا نظر آتا ہے اور افسانوی ادب میں مصنف اور قاری دونوں پوری طرح ہم آہنگ ہو کر زندگی کی تفسیر اور تنقید کا حق ادا کر رہے ہیں لیکن مصنف اور قاری کے تجربات کی یکسانی، ہم آہنگی اور اشتراک نے ہمیشہ طوالت کے بجائے اختصار اور تفصیل و تشریح کے بجائے اشارے کنائے اور تصور آفرینی کی ضرورت اختیار کی ہے۔ موجودہ عہد کے ایک اور معروف ناول نگار

ہمنگوے نے ناول نگار اور قاری کے مشترک تجربات، احساسات اور افکار و تخیلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ناول نگار اپنے گوناگوں تجربات کے اندوختہ سرمایے سے، اپنے علم سے، اپنے تصور اور تخئیل سے اور اپنے احساس سے اور ان سب کے اجتماع اور امتزاج سے واقعات اور کردار تخلیق اور تعمیر کرتا ہے اور ان میں ایک فنکارانہ ترتیب پیدا کرتا ہے، اور قاری کا مشترکہ تجربہ، تخئیل، احساس اور فکر ناول نگار کی تخلیق کی ہوئی زندگی کو اس تخلیق اور تعمیر کو قاری کی زندگی بنا دیتا ہے ـــــ ہمنگوے نے مصنف اور قاری کے تجربے کے اس مشترک سرمائے کی بنیاد پر اپنی ناول نگاری کے لئے جو فن وضع کیا ہے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اس فن کے اشاروں اور علامتوں کے ذریعہ بعض باتیں لکھے بغیر بھی قاری کے ذہن اور قلب میں جاگزیں کر دیتا ہے۔ اس کا لکھا ہوا ایک جملہ بیک وقت کئی باتیں کہتا اور بتاتا ہے، اور تفصیلات کے پیچیدہ اور طویل عمل میں اُلجھے بغیر وہ پڑھنے والے کے سامنے ایک ایسی فضا قائم کر دیتا ہے، جس میں آنکھوں کو ایک منظر کی واضح تصویر بھی نظر آتی ہے اور دل کو ایک شدید احساس اور جذبے کی گونج بھی سنائی دیتی ہے۔ ہمنگوے نے اپنے معتدل اور منضبط فن کے ذریعے ناول نگار کو فنی نظم و ضبط کی جو تعلیم دی ہے وہ موجودہ عہد میں مصنف اور قاری کے تجربات کے ناگزیر اشتراک کا نتیجہ ہے۔ اپنے مشاہدات میں سے غیر ضروری تفصیلات کو خارج کرنا، جذبات کو ابھارنے کے لئے مبالغہ آرائی سے کام نہ لیا، اور محض حسنِ ذوق اور حسنِ نظر کی تسکین کے لئے ادبی اور شاعرانہ بیانات، فنی شعبدہ بازیوں اور سحر طرازیوں کے استعمال سے اجتناب اور احتراز کرنا اُس کے فنی ضبطِ نفس کے لوازم ہیں۔ اپنے فن کے متعلق اُس کے مندرجہ ذیل الفاظ کو افسانوی فن کی موجودہ روش کی روح کہا جاسکتا ہے :۔

"افسانہ نگار جس چیز کے متعلق لکھ رہا ہے اگر اسے اس کا صحیح علم اور واقفیت ہے تو وہ آسانی سے ایسی چیزوں کو ترک کر سکتا ہے جو اس کے اور قاری کے تجربات میں مشترک ہیں۔ اگر افسانہ نگار نے لکھتے وقت صداقت اور خلوص سے کام لیا ہے تو یقین ہے کہ قاری بھی انہیں اسی شدت سے محسوس کرے گا جس شدت سے مصنف محسوس کرتا ہے، خواہ مصنف انہیں بیان کرے یا نہ کرے۔"

ہمنگوے نے اپنے نظریات اور ان نظریات پر عمل کر کے جو پُر حیات اور مؤثر ناول لکھے، وہ لکھنے والوں کی نئی نسل کا صحیفہ فنی بن گئے، اس لئے کہ انھوں نے ان اصول کی پیروی میں موجودہ عہد کے قاری کے دل کی دھڑکن بھی سنائی دی اور اس کے فکر و تخئیل کا وہ عکس بھی نظر آیا جس نے مصنف اور قاری کو ایک ہی ذہن پر لاکر کھڑا کیا اور ایک مشترک فنی تجربے اور عمل کے دو ایسے عناصر بنائے ہیں جو ایک دوسرے کے پابند بھی ہیں اور ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور باہمی اثر پذیری اور اثر اندازی نے افسانے اور ناول کے فن کو ایک نیا مفہوم دیا ہے، ایک نئے معنی سے آشنا کیا ہے۔

کہانی کے اس نئے فن میں مصنف کا کام یہ ہے کہ وہ ماحول اور انسان کے خارجی اور داخلی پہلوؤں کا دقت نظر سے مشاہدہ اور مطالعہ کرے، اپنے مواد پر پوری غور و فکر صرف کرے، غور و فکر میں تخئیل کی رنگ آمیزی سے مشاہدے، مطالعے اور فکر کی پیدا کی ہوئی حقیقت سے ایک نئی حقیقت کی تخلیق کرے اور نفسیاتی تجزیے اور فنی حسنِ انتخاب کی منزلوں سے گزر کر قاری کے سامنے زندگی کی ایک ایسی تصویر پیش کرے جس کے خطوط مبہم اور غیر واضح اور جس کے رنگ ہلکے اور غیر مرئی ہونے کے باوجود اتنے واضح اور شوخ ہوتے ہیں کہ قاری ان کی مدد سے ایک مکمل تصویر بنا لیتا ہے جس کا ہر نقش اُبھرا ہوا ہوتا ہے اور ہر رنگ اپنے اپنے محل کے اعتبار سے موزوں، متناسب اور متوازن۔ موجودہ دور کی کہانی کا فن صرف مصنف کی ذات پر ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اُس سے بھی بہت آگے قاری کی ذات پر جاکر اُس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس فن میں مصنف کی ذات یا اس کی ادبی اور شاعرانہ موشگافی قاری کی نظر اور اُس کے موضوع کے درمیان حائل نہیں ہوتی۔ مصنف کہانی میں زندگی کی تفصیلات بیان کرنے کے بجائے اُس کی تصویر کشی اور تفسیر کرتا ہے اور اس مصوری اور تفسیر میں اشاروں کنایوں سے رموز و علامات سے، بالواسطہ بیان اور عمل سے کام لیتا ہے۔ اس کے واقعات کہانی کی بندشوں میں ختم ہو کر نہیں رہ جاتے بلکہ اس کے ختم ہونے کے بعد بھی جاری رہتے ہیں؛ اُس کے کردار کہانی میں جو کچھ کرتے دکھائے گئے ہیں، اس سے بھی زیادہ وہ کہانی کی چہار دیواری سے باہر نکل کر کرتے نظر آتے ہیں، اور کہانی کی حد بندی کو توڑ کر واقعات اور کرداروں کا یوں ایک وسیع تر ماحول کی تخلیق کرنا صرف اس لئے ممکن ہے کہ قاری کی ذہانت، اس کے وسیع تر تجربات، اس کی فکری اور تخئیلی صلاحیتوں، اس کی نظر کی پردہ دری اور دروں بینی نے قاری کو محض قاری نہیں رکھا۔ وہ ایک وسیع تر مفہوم میں خود کہانی کا خالق ہے اور کہانی کے فنی تخلیقی عمل میں مصنف کے ساتھ اس درجہ وابستہ ہے اور اس کے فن پر اس حیرت انگیز حد تک اثر انداز ہے کہ قاری کی حیثیت سے بڑھ کر اس نے خالق کی حیثیت اختیار کر لی ہے اور تخلیق میں مصنف اور قاری کے اس مکمل اشتراک نے افسانے کے فن کو اس مقام تک پہنچایا ہے جہاں وہ اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔

(باقی صفحہ ۹۲ پر)

چند اگلی صحبتیں

جوش ملیح آبادی

لکھنؤ کی اگلی صحبتوں کی یادیں جو میرے ذہن میں ابھرتی ہیں ان میں کئی جھلکیاں دوسروں کو دکھانے کے لائق ہیں ان چند سے میں آپ کا بھی غائبانہ تعارف کراتا ہوں :-

مثلاً ایک شاعر تھے منشی واحد علی صاحب ابر تخلص والی جو نواب صاحب رامپور کے یہاں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے۔ بہت وجیہہ اور رئیسانہ مزاج کے بزرگ اور میرے والد کے احباب میں سے تھے۔ ابر صاحب کے بھائی منشی احمد علی صاحب شوق انھیں کے پاس رہا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک بار رام پور میں جبکہ میں وہاں گیا ہوا تھا۔ ابر صاحب نے مجھے رات کے کھانے پر بڑی بزرگانہ شفقت کے ساتھ مدعو کیا۔ میرے ہمراہ میرے ایک پھوپھی زاد بھائی بھی تھے۔ جنھیں ہم سب "چھوٹے دادا" کہا کرتے تھے۔ چھوٹے دادا ایک خاص مزاج اور ایک خاص لہجے کے مالک تھے۔ ان کا زیادہ وقت قہقہے مارنے میں صرف ہوا کرتا تھا۔ اور وہ اس کے قائل نہیں تھے کہ تکلفات کی بنا پر زندگی میں ایک لمحے کی بھی تکلیف اٹھائی جائے۔ ابر صاحب کی دعوت میں رام پور کے دیگر حضرات کے ساتھ ساتھ چھوٹے دادا بھی شریک تھے۔ کھانا جب رات کے آٹھ بجے ختم ہو گیا۔ تو ہم سب لوگوں کے واسطے آرام کرسیاں رکھ دی گئیں۔ ہر آرام کرسی کے پاس ایک ایک اسٹول اور ہر اسٹول پر سوڈے کی ایک ایک بوتل ایک ایک گلاس اور چورن کا ایک ڈبہ رکھ دیا گیا۔

میں حیران ہو گیا کہ ہر اسٹول پر یہ سوڈا، یہ گلاس اور یہ چورن کیا معنی رکھتا ہے۔ مگر تہذیباً کچھ نہیں کہا۔ اور رات گئے پتہ چلا کہ ان چیزوں کا مقصد کیا تھا۔ بہرحال جب ہم لوگ کرسیوں پر ایک ایک سوڈے، ایک ایک گلاس اور ایک ایک چورن کے ڈبے کے مالک بنکر بیٹھ گئے۔ تو ابر صاحب سامنے کے تخت پر جا کر مختلف صندوقچوں سے پرچے نکال نکال کر ایک دوسرے پر چننے لگے اور ان کے بھائی نے ایک بڑا سا رجسٹر کھول کر اپنا کلام سنانا شروع کر دیا۔ انھوں نے بیس پچیس یا شاید اس سے بھی زیادہ غزلیں ایک سانس میں سنا ڈالیں۔ اتنے میں گھڑی نے گیارہ بجا ڈالے اور شوق صاحب نے اپنے بھائی ابر صاحب کو جب کن انکھیوں سے دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ وہ اپنے تمام کارتوس لگا چکے ہیں، انھوں نے بڑی آواز کے ساتھ اپنا رجسٹر بند کر کے ابر صاحب کی جانب اس طرح اشارہ کیا گویا وہ بڑی ہی شفقت کے ساتھ یہ اشارہ فرما رہے ہوں کہ میاں اب یہ مٹھائی کھاؤ۔ میں نے شوق صاحب کے اشارہ پر مڑ کر جب ابر صاحب کی طرف دیکھا تو نظر آیا کہ ان کے داہنے ہاتھ پر غزلوں کے تلے اوپر رکھے ہوئے پرچے سات آٹھ مناروں کی صورت اختیار کئے ہوئے ہمارے کانوں میں اترنے کے واسطے مٹھی میں گھور رہے ہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ چھوٹے دادا ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو تکلف میں آ کر ایک لمحے کی بھی تکلیف گوارہ فرمائیں۔ جیسے ہی انھوں نے غزلوں کے ان مناروں کو دیکھا۔ اپنی داہنی مونچھ ملنے لگے۔ ایک منٹ کے اندر دروازہ تک پہونچ کر انھوں نے کمرے کی چوکھٹ اٹھائی۔ باہر قدم رکھ کر اور میری طرف منہ کر کے کہنے لگے۔ بھائی شبیر حسین خاں جوش السلام علیکم۔ ہم سے یہ بارِ گراں نہیں اٹھ سکتا۔ آہا آہا یہ کہا اور قہقہے مارتے ہوئے غائب ہو گئے۔ چھوٹے دادا کے اس طرح چلے جانے سے محفل پر سناٹا چھا گیا۔ میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔ اور ابر صاحب اپنی دو انگلیوں سے داڑھی میں کنگھی کرنے لگے کہ شوق صاحب نے بڑی دانائی کے ساتھ رنگ محفل بدل دیا۔ انھوں نے فوراً قہقہہ مارا اور کہنے لگے واہ رے پٹھان کس کی جان تھی کہ چوکھٹ اٹھا کر یوں شان سے نکل جاتا۔ واللہ مزا آ گیا مزا۔ میاں جوش تم برا نہ ماننا تم ان پٹھانوں میں دل ہو دلی۔ یہ تمہارے ہیں کون؟۔ میں نے یہ نہیں بتایا کہ وہ میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں۔ کہہ دیا کہ وہ ملیح آباد کے افاغنہ میں سے ہیں۔ ابر صاحب نے کہا تو ٹھیک ہے۔ سپاہی رزم کا آدمی ہوتا ہے بزم سے اسے کیا کام۔ اور پھر ابر صاحب سے کہا۔ ارے صاحب کلام سنائیے۔ یہ سب مشتاق ہیں۔ ہمہ تن گوش بیٹھے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ابر صاحب نے

کلام سنانا شروع کردیا۔ ایک بجا، دو بجے اور جب تین بجنے والے تھے۔ ابر صاحب نے ہم سے کہا کہ ذرا چورن کھا کر سوڈا تو پی لیجئے۔ اب ہم سمجھے کر سوڈا اور چورن کیا معنی رکھتا تھا۔ ہم نے کانپتے ہاتھوں سے چورن زہر مار کیا۔ اور سوڈا پیا اور پھر غزلیں سننے لگے۔

دیکھئے یہ غزل میر کے رنگ میں ہے۔ یہ سودا کے رنگ میں ہے۔ یہ مومن کے رنگ میں ہے۔ یہ مصحفی کے رنگ میں ہے اور یہ آتش کے رنگ میں ہے۔

ہم سب کا ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ مگر ابر صاحب تھے کہ برسے ہی چلے جاتے تھے۔ اب ہم سب کو انگڑائیاں آرہی تھیں۔ ہم جمائیاں لے رہے تھے۔ ہماری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ لیکن ابر صاحب کو کوئی پروا نہیں تھی۔ گویا کہہ رہے تھے کہ اب برس کر کبھی نہیں برسوں گا۔ گھڑی نے تین بجائے چار بجے پانچ بجے۔ ہمارے حواس بجا نہیں تھے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ شاعر اپنا کلام سنا رہا ہے یا اونٹ بلبلا رہا ہے۔ غرض جب ساڑھے پانچ بج گئے مرغ بولنے لگے۔ اذانیں ہونے لگیں تو ابر صاحب نے عینک اتار کر مجھ سے کہا اچھا میاں جاؤ۔ بڑی سمع خراشی کی میں نے کل رات کو پھر آنا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نواب صاحب رامپور سے بڑی منت و سماجت کے ساتھ رخصت طلب کر کے میں لکھنؤ بھاگ گیا۔ اور وہاں کے شعراء کو اپنی یہ بپتا سنائی۔ تو سب کا رنگ زرد ہو کر رہ گیا۔ اس واقعے کے کوئی ہفتے یا عشرے کے بعد مولانا صفی کی محفل میں دیگر اساتذۂ لکھنؤ کے ساتھ میں بھی حاضر تھا۔ یکایک ایک گاڑی رکی اور دیکھا کہ ابر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

ابر صاحب کو دیکھتے ہی سب کے منہ اتر گئے۔ دلوں پر وحشت کی گھٹا چھا گئی۔ لیکن جب وہ کمرہ میں داخل ہوئے تو تمام شعراء سروقد ہو کر ان سے ملے اور بڑے احترام کے ساتھ مولانا صفی نے انھیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ یہ ماہ صیام کا زمانہ تھا۔ صفی صاحب نے ابر صاحب سے کہا روزہ نہ ہو تو پان حاضر کروں۔ ابر صاحب نے کہا۔ مولانا پان وان تو ہوتا رہے گا میں تو کلام کا مشتاق ہوں کچھ ارشاد فرمائیے۔ مولانا صفی سمجھ گئے کہ یہ اپنا کلام سنانے کی تمہید ہے۔ دست بستہ فرمانے لگے۔ ابر صاحب آپ کرم فرمائیں اور میں کلام پیش نہ کروں یہ بھی کوئی بات ہے۔ لیکن کیا کروں ماہ صیام کا احترام مانع ہے۔ ابر صاحب کے چہرہ پر شدید مایوسی دوڑ گئی وہ سوچ میں پڑ گئے اور پھر کہنے لگے تو پھر آپ تمام حضرات آج غریب خانہ پر افطار فرمائیں گے۔ مولانا صفی نے کہا ابر صاحب اس کی کیا ضرورت ہے۔ ابر صاحب نے کہا مولانا میرا لکھنؤ کا آنا ہی بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اگر آپ اور یہ تمام حضرات تشریف نہیں لائیں گے۔ چار و ناچار صفی صاحب اور ان کے ساتھ ساتھ ہم سب نے ابر صاحب سے وعدہ کر لیا اور جب شام کے وقت ابر صاحب کی خوراک بننے کیلئے صفی صاحب کے حسب ارشاد ہم سب ان کے مکان پہونچے تو انھوں نے اپنے زنانے مکان کی ڈیوڑھی میں منہ ڈال کر کہا! بیگم ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔ مولانا صفی کی بیگم نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا ہے ہے کیا ہوا، صفی صاحب نے کہا بس ہمارا کہا سنا معاف کرنا اتنی ہی درخواست ہے۔

ان کی بیگم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا خدا کے لئے جلدی بتائیے، نہیں تو میں سر پیٹ کر باہر نکل پڑوں گی۔ یا علی مدد۔ یا علی مدد۔

صفی صاحب نے کہا ہم ابر صاحب کا کلام سننے جا رہے ہیں بیگم ہمارا کہا سنا معاف کرنا۔

"ایسے نہ جاہیے۔ حضرت عباس کی قسم نہ جائیے کسی کی دردناک آواز مکان سے آئی اور ہم سب ہنسی کے مارے پیٹ پکڑ کر گلی میں بیٹھ گئے اس کے بعد کیا ہوا۔ ابر صاحب نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا۔ اور وہ پہاڑ سی رات، وہ شب شہادت ہم سب پر کیا، کر گذری یہ کچھ نہ پوچھئے۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیئے

لگے ہاتھوں ایک قصہ اور سن لیجئے حضرت آغا شاعر۔ خدا بخشے۔ بڑی خوبیوں کے آدمی اور بڑی خصوصیات کے بزرگ تھے۔ ایسے بھولے بھالے معصوم لوگ اب کاہے کو پیدا ہوں گے۔ داغ کے شاگردوں میں ان کا جواب نہیں تھا۔ اور تحت اللفظ اس طرح پڑھتے تھے کہ مشاعروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔

آغا صاحب کی شخصیت بڑی ہی شاندار تھی انھیں اس قدر مردانہ حسن حاصل تھا کہ مہینوں میں ایک ہنگامہ سا بپا رہتا تھا اور ان کے اندر کا یہ عالم تھا کہ

رات پیتے ہی گزر جاتی تھی میخانوں میں — اٹھ کے منہ دیکھتا ہوں صبح کو پیمانوں میں

میں جب آغا صاحب سے ملا اس وقت ان کی عمر ساٹھ بلکہ پینسٹھ سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اندر کا بازار سرد ہو چکا تھا مالی مشکلات کا آئے دن سامنا رہتا تھا۔ اور وہ اسی قدر افسردہ ہو کر رہ گئے تھے کہ اٹھتے بیٹھتے آہ آہ آہ کیا کرتے تھے۔

فانی بدایونی اور آغا صاحب۔ دونوں اس قدر غم پرست ہو کر رہ گئے تھے کہ میں کہا کرتا تھا کہ اس دنیا کے عزا خانے میں فانی اور آغا شاعر ایسے دو مستقل تعزیے ہیں جو کبھی ٹھنڈے نہیں کئے جاتے۔ ان دونوں کو میرے سوا پورے ہندوستان میں کوئی اپنا نہیں سکتا تھا۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ میں آغا صاحب کے وہاں دوپہر کے بعد پہنچا۔ ان کے بیٹے آفتاب سلمہ نے کہا آپ ٹھہریں ابا ابھی دو منٹ میں آتے ہیں۔ پنچ کی مسجد میں نماز پڑھنے گئے ہیں۔ مجھے شرارت سوجھی تو ان کا لحاف سر سے پاؤں تک اوڑھ کر لیٹ گیا۔ اتنے میں وہ کمرے میں آئے۔ آہ آہ کرتے ہوئے اور یہ دیکھ کر کہ شاید ان کا کوئی بیٹا ان کی چارپائی پر سو گیا ہے وہ تخت پر بیٹھ گئے۔ آہ آہ کرتے رہے میں نے بھی لحاف سے آہ آہ کی آواز بلند کی۔

آغا صاحب بھوتوں کے قائل تھے۔ خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ارے یہ کیا اور پھر شاید یہ سمجھ کر کہ کہیں کان نہ بجے ہوں۔ وہ اپنے جوتے کی ڈوری کھولنے لگے۔ آہ آہ آہ کرتے میں نے بھی اسی طرح لحاف کے اندر سے آواز نکالی۔ آہ آہ آہ۔

یہ سنتے ہی آغا صاحب ارے ارے کر کے کھڑے ہو گئے ایک جوتا پاؤں میں تھا۔ ایک اتار چکے تھے۔ میں نے پھر آواز بلند کی۔ "آہ آہ آہ — آہ"

آغا صاحب یہ سنتے ہی کمرے سے بھاگے ارے دوڑو ارے دوڑو کمرے میں بھوت بول رہا ہے۔ بھوت۔

یہ سنتے ہی میں نے بڑی زور کا قہقہہ مارا۔ اور میری آواز پہچان کر آغا صاحب بڑے مردانہ تیوروں سے کمرے میں داخل ہوئے اور میرا لحاف الٹ کر کہنے لگے۔ کیوں جی اگر ڈر کے مارے ہم مر جاتے تو۔ . . .

ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"

اسی طرح ایک روز میں آغا صاحب کے وہاں سرِ شام پہنچا۔ وہ بالا خانے پر رہتے تھے کوئی لڑکا آیا۔ اس سے میں نے کہا آغا صاحب سے کہہ دو۔ پردہ کرا کے مجھے بلا لیں۔ میں ایک شاعر ہوں۔ جو ان سے غزل لکھوانے آیا ہوں۔

لڑکے نے اوپر سے آکر جواب دیا۔ آغا صاحب کہتے ہیں میری طبیعت خراب ہے میں چل نہیں سکتا۔ لڑکے سے میں نے کہا۔ اچھا ذرا کاغذ پنسل تو لا دو۔ اور جب لڑکا لے آیا تو میں نے لکھا آغا صاحب۔ آج ہی رات کو ایک مشاعرہ ہے۔ میں آپ سے طرح پر غزل لکھوانے آیا ہوں مجھے فوراً اوپر بلا لیجئے۔ میرا نام عبدالصمد خاں ہے میں بڑا بگڑے دل آدمی ہوں۔ آپ نے اگر مجھے فوراً نہیں بلایا تو میں موقع کی تاک میں رہوں گا۔ اور اندھیرے اجالے جب بھی آپ ملیں گے آپ کو گولی مار دوں گا۔ جیسے ہی یہ پرچہ اوپر گیا اور آغا صاحب نے پڑھا چیخ کر کہنے لگے۔ "ارے بیگم فوراً دروازہ بند کرا لو۔ کوئی عبدالصمد پٹھان کھڑا ہوا ہے جو مجھے گولی مار دینے والا ہے۔" دروازہ فوراً بند ہو گیا۔ آغا صاحب چھجے پر آئے۔ اور اس زاویہ سے جھانک کر کہ اگر میں گولی ماروں تو ان کے نہ لگ سکے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ کیوں عبدالصمد صاحب آپ مجھے مار ڈالیں گے۔

جی ہاں مار ڈالوں گا۔ میں نے بڑی کڑی آواز سے کہا۔ آغا صاحب نے یہ سنتے ہی ایک چیخ ماری اور کہا سنتی ہو بیگم۔ یہ مجھے مار ڈالنے کو کہہ رہے ہیں۔" یہ سنکر میرا قہقہہ نکل گیا۔ اور میری آواز پہچان کر آغا صاحب وہیں چارپائی پر گر پڑے۔" ارے مار ڈالا۔ اس کم بخت جوش نے۔ بیگم دروازہ کھلوا دو یہ جوش کی شرارت تھی۔ جوش سے ہماری جان خطرے میں نہیں ہے!"

"دروازہ کھلوا دو"

ہائے ہائے۔ . . . مار ڈالا ظالم نے:

★

(بشکریہ ریڈیو پاکستان۔ کراچی)

ریختہ کی کہانی علائی کی زبانی

سید یوسف بخاری

ریختہ کی یہ کہانی حضرت مرزا نواب علاء الدین احمد خاں نبیرہ و علائی، فرزند نواب مرزا امین الدین احمد خاں اوّل مرحوم مغفور والیٔ ریاست لوہارو نے خود اپنی زبانی دلّی سوسائٹی کے اس جلسہ میں سنائی تھی جو ۵ مئی سنہ ۱۸۶۶ء کو دلی میں ہوا تھا۔ اس سوسائٹی کے صدر اس وقت کے ڈپٹی کمشنر دلّی تھے مانھیں ہی کی فرمائش اور اصرار پر علائی نے یہ مقالہ وہاں پڑھا تھا۔

حضرت علائی ۲۵ر اپریل سنہ ۱۸۳۲ء کو دلّی میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ آزادی تک دلّی میں رہے۔ اس کے بعد لوہارو چلے گئے۔ اس منتقلی کے بعد غالباً یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ علائی اس مقالہ کی خاطر دلی آئے۔ پھر کبھی ان کو اپنی زندگی میں دلّی کی بہار یا بربادی دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔ ہاں ۳۱ر اکتوبر سنہ ۱۸۸۴ء میں ان کا جسدِ خاکی، پھر ولی دلّی کی اس خاکِ پاک پر آیا اور اسی مٹی میں مل گیا جس کا وہ خمیر تھا۔ اسی طرح مرزا غالب جیسا علائی کا عاشقِ زار جس کو "دم واپسیں بر سرِ راہ" کی نوبت تک علائی کی دھن لگی ہوئی تھی اپنے سفرِ آخرت تک لوہارو نہ جا سکا ؛

یہ نادر مقالہ جو پون صدی گذر جانے کے بعد آج بھی تاریخی معلومات کے لحاظ سے ادب کا ایک بے مثل شاہکار ہے اپنی خواندگی کے بعد دلّی سوسائٹی کے رسالہ میں سنہ ۱۸۶۶ء میں تمام و کمال شائع ہوا تھا۔ لیکن اس وقت اس کا کوئی نسخہ کسی کے پاس موجود نہیں۔ اس اعتبار سے راقم الحروف خوش قسمت ہے اور اس کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس کے ہاتھوں پہلی بار یہ شاہکار "ماہِ نو" کے صفحات کی زینت بن رہا ہے ؛

یہ گمشدہ گنجِ گراں مایہ، یوسفِ گم گشتہ ونفر و مایہ تک کیونکر پہونچا۔ یہ کہانی بھی پون صدی پرانی ہے۔ جب یوسف کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں بھی نہ آیا تھا اس کے دادا حضرت سید محمد مرحوم مغفور، شاہی امام جامع مسجد دہلی اور حضرت علائی کے درمیان رشتۂ دوستی اور محبت تھا۔ یہی ملاقات کے علاوہ آپس میں نامہ و پیام بھی ہوا کرتے تھے، دونوں کو ایک دوسرے کی دید و شنید ہی عزیز نہ تھی، تحریر و تقریر بھی پیاری تھی۔ دونوں کے نوشتے ایک دوسرے کے پاس محفوظ رہتے تھے، ان ہی میں یہ دُرِّ شاہوار بھی شامل تھا۔ دادا کے بعد یہ سرمایہ راقم الحروف کے والد ماجد سید حامد بخاری مرحوم مغفور امام وخطاط کو ورثہ میں ملا۔ باپ کی زندگی میں کہ ہمیں اس وقت کوئی علمی شعور حاصل نہ تھا۔ ہم نے ادب کے ان انمول موتیوں کی اپنی بے بصر آنکھوں سے زیارت کی، بعد ازاں کچھ لکھ پڑھ کر جب تھوڑا بہت شعور حاصل ہوا تو اب ہم نے اس کو ایک نگاہِ غور سے دیکھا۔ دیکھ تو لیا مگر آنکھیں ادب کی اس روشنی سے خیرہ اور حیرت زدہ ہو گئیں۔ افسوس! وہ مطبوعہ مقالہ ۱۹۴۷ء کے خونچکاں انقلاب میں ہمارے پاس سے جاتا رہا۔ صرف وہ خطوط باقی رہ گئے جو غالب کے اندازِ نگارش کا صحیح معنوں میں ایک عکسِ لطیف اور منہ بولتی تصاویر ہیں۔ ادب کے یہ تیر و نشتر کھانے میں کچھ ایسی لذت آئی اور طبیعت نے زیست کا کچھ ایسا مزا پایا کہ تیر کھانے کی ہوس اور بڑھ گئی۔ اس لئے اور بھی کہ ہم نے یہ دیکھا اور واقعی یہ محسوس کیا کہ علائی جو غالب کا "نیرِ اصغر، دل نشیں، آنکھوں کا تارا پیارا اور دلارا تھا جو غالب کا خلیفۂ اوّل و آخر اور جانشینِ مسندِ ادب تھا جو غالب کے کلام نظم و نثر فارسی و اردو کا امین اور علمبردار تھا جس نے ادبی دنیا کو غالب کے کلام کی دولت بخشی اور خود جیتے جی، داد کی تمنا، صلہ کی خواہش اور شہرت کی آرزو سے بے نیاز رہا۔ اس کا کلامِ نظم و نثر فارسی و اردو بھی اس کے عظیم الشان کتب خانۂ لوہارو میں سامانِ پریشاں کی طرح آوارہ و منتشر ہی رہا۔ نہ ان کے بعد ہی کسی کو اتنی توفیق ہوئی کہ علائی کے ادبی کارناموں سے ادبی دنیا کو روشناس کراتا اور اس طرح علائی کی ادبی و تاریخی شخصیت

تذکروں اور تواریخ میں اردو ادب کے نئے گوشے اور نئے ابواب ابھرتے۔ نہ محققین اور نقادانِ ادب نے اس طرف کوئی معقول توجہ کی۔

تاہم ہمیں ہم کو علائی کے اس مقالہ اور اس کے ساتھ ان کے کلام کی تلاش اور جستجو لاحق ہوئی۔ اس کی خاطر جب ہم دلی میں تھے تو بارہا حضرت سائل دہلوی سے ملے۔ اسی خاندان کے ایک اور امیر نواب منظور یار جنگ بہادر سے حیدرآباد دکن میں ملاقات کی۔ پاکستان میں آئے تو ان کے رشتہ داروں کو خطوط لکھے۔ کراچی میں جناب کرم حسین ہاشمی فریدآبادی اور جناب جمیل الدین خاں عالی سے ملاقات کی۔ انتہا تو یہ ہے کہ ۱۹۵۴ء میں دلی جاکر اُن کی خاک پاک کو بوسہ دیا اور دعا مانگی۔ اس خاک سے جو ذرّے ملے ڈھونڈکر لے آیا۔ بہرحال ہوا یہ کہ علائی کے پوتے نواب مرزا صمصام الدین احمد خاں فیروز جنگ سے نیاز حاصل کیا۔ بالآخر جو مانند بابرہ ان سے ان کی خاندانی اور قلمی بیاض حاصل کی جس میں ہمارا یہ مقالہ درج تھا۔ اس کے علاوہ حکام وقت کے نام خطوط، بیان نامے اور سب سے بڑھ کر علائی کے کلام نظم و نثر فارسی و اردو کا گنج پوشیدہ مخفی تھا۔ یہ اصل بیاض نہ تھی اس کی دوسری نقل تھی، اصل نقل جس کو کہ کلک و قلم نصیب ہے، نہ خط در قم اپنی دسترس میں۔ بہرحال یہ مالک کے خاندہ دہائی، چنانچہ یہ بیاض مطالعہ میں رہی۔ بڑی محنت و کاوش کے بعد بہت سے در آبدار انتخاب میں آئے جس کی اساس پر علائی کے ذاتی و خاندانی سوانحِ حیات، کلام نظم و نثر فارسی و اردو کو ترتیب دیا۔ اس کا نام بھی "یادگارِ غالب" کے وزن پر "یادگارِ علائی" رکھا۔ یہ مقالہ اسی تعمیری یادگار کا ایک حصہ ایک گوشہ اور ایک ٹکڑا ہے۔ "یادگارِ علائی" زیرِ طبع ہے۔ اسے شائع ہونے پر دیکھئے گا۔ بقول حضرت اکبر الٰہ آبادی ؎

انھی کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات ان کی	انھی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات ان کی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے انھی کا مطلب نکل رہا ہے	انھی کا مضمون انھی کا کاغذ قلم انھی کا دوات ان کی

میرا تو اس میں کچھ بھی نہیں ہے، تمام تر حضرت علائی ہی کا صدقۂ جاریہ ہے۔

ہمیں اس بات کا افسوس ہے کہ علائی کی نظم کے مقابلہ میں نثر کے جو نمونے ہم تک پہونچ سکے ہیں وہ صرف چند خطوط، تین بیان نامے اور ایک مقالہ پر مشتمل ہیں۔ ان میں سے خطوط "یادگارِ علائی" میں شائع ہوں گے، ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں نہ تو ہم صحیح معنوں میں ان کی نثر پر تنقید کرسکتے ہیں۔ حقیقت میں ان کی نثر کی علمی و ادبی خوبیوں کا اظہار ہوسکتا ہے۔ جب تک کسی ادیب یا مصنف کے رشحاتِ قلم اپنی گوناگوں رنگینیوں کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے نہ آئیں اور اس کی تحریروں کے مختلف پہلو پیشِ نظر نہ ہوں اس کے طرزِ نگارش اور علمی و ادبی خصائص پر بحث خارج از بحث ہے۔ علائی کی نثر پر تنقید کرتے ہوئے اسی کمی کی بنا پر ہم کافی تشنگی محسوس کرتے ہیں۔ بہرحال زمانے کے ہاتھوں علائی کے موتی قلم سے نکلے ہوئے جو نقوش ہم تک پہونچ سکے ہیں وہ بھی غنیمت ہیں۔ آئندہ چند سطور میں ہم اس مقالے کے چند اُن حقائق کا ذکر کریں گے جن کی روشنی میں زبانِ اردو کی تاریخ کے بعض نئے گوشے ابھر آئے ہیں، مطالعہ کے وقت ہمیں ذیل کی چند باتوں کو ضرور اپنے پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

اوّل یہ کہ یہ مقالہ زبانِ اردو کی تاریخ پر انیسویں صدی کا اولین مقالہ نہ سہی تاہم ابتدائی اور بنیادی مقالات میں سے ضرور ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ تاریخ تحریر درخواندگی ہی تک کی ہے جس میں تاریخ قلم بند ہوئی ہے۔

دوم یہ کہ علائی نے یہ مقالہ از خود نہیں لکھا فرمائش پر رقم کیا تھا اور ایسے حالات میں رقم کیا تھا جب وہ ہنگامہ آزادی کے مصائب جھیل کر ریاستی نظم و نسق میں منہمک اور اعداء کی ستم کوشیوں کے مقابلہ میں نبرد آزما و سخت پریشان اور بدحواس تھے۔ ثبوت فراہم کرنے کے لئے اس وقت ان کے پاس ضروری کتب تواریخ بھی نہ تھیں اس لئے کہ دہلی میں ان کا عظیم الشان کتب خانہ تلف ہو چکا تھا۔ صرف اپنی قوتِ منطق اور حافظے سے کام لے کر یہ مقالہ ترتیب دیا تھا۔

سوم یہ کہ اربابِ انجمن کے اشارے کے مطابق ان کے دہن و گفتار پر قفل لگا دیا گیا تھا۔ یہ ہدایت کر دی گئی تھی کہ وہ صرف زبانِ اردو کے ذکرِ پیدائش، ارتقاء اور تدریجی منازل اور جدید شعرا کے حالات ہی تک محدود رہیں ایسی صورت میں علائی کی علمی قابلیت اور حافظہ کی داد نہ دینا سراسر ظلم کے مترادف ہوگا۔ علائی صرف حضرت خسرو [illegible] اور کلامِ غالب ہی کے حافظ نہ تھے نہ معلوم انھیں

اور کس کس کے دیوان ازبر تھے لیکن انھوں نے بخوفِ طوالت مقالہ میں خسرو رح کے اشعار پیش نہیں کئے۔ یوں بھی اس وقت خسرو رح کا کلام لوگوں کے وردِ زبان تھا۔ غالباً اس پابندی کے پس منظر میں انیسویں صدی کا وہ اردو تنازعہ اور سر سید اعظم کی وہ مذہبی و تعلیمی تحریکات اصلاح و ترقی بھی کارفرما ہوں گی جن کے نتیجہ میں اس وقت دنیائے ادب و صحافت ایک نئے انقلاب سے آشنا ہو رہی تھی اور علائی سرکارِ برطانیہ کی ایک محکوم ریاست کے والی ہونے کی وجہ سے اس چپقلش سے دور رہنے کے لئے مجبور تھے۔ یہ کشمکش برابر جاری رہی یہاں تک کہ یہ موضوعِ بحث مقامی حیثیت سے تجاوز کر کے صوبجاتی اور بین الملکی حدود میں داخل ہوگیا اور ایک مستقل سیاسی تنازعہ بن گیا۔ آج بھی برصغیر ہند و پاکستان میں زبان اور رسم الخط کا بھی اہم مسئلہ در پیش ہے۔

الغرض اس بحث و تحیص نے اتنا طول پکڑا کہ آخر کار سنہ ۱۹۱۱ء میں ملک کے تمام سر برآوردہ اہلِ قلم ہندو اور مسلمان اس مباحثہ اور مناظرہ کے میدان میں کود پڑے اور منشی سید احمد دہلوی، مصنف فرہنگ آصفیہ کو بھی اپنا مشہور و معروف مقالہ "محاکمہ اردو" باقاعدہ ایک رسالہ میں پیش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ بمقابلہ علائی یہ محاکمہ اپنی جگہ کافی معلومات اور اردو کے حق میں مضبوط اور ٹھوس دلائل کا ناشر اور معلن ہے لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ منشی سید احمد کے دلائل میں بیشتر حصہ علائی کی تحقیقات کا شامل ہے۔

چہارم یہ کہ اسی ضمن میں چونکہ علائی ریاست لوہارو کے ایک محکوم حاکم تھے اس لئے حسبِ دستورِ وقت ان کے مقالہ کا آغاز و انجام خدا کی حمد و ثنا کے بعد سرکار برطانیہ اور مقامی حکومت کی تعریف اور دعا پر مشتمل ہے ورنہ فطرتاً ان کی طبیعت کا یہ تقاضا ہرگز نہ تھا۔

پنجم یہ کہ اس دور کے مروجہ دستور کے مطابق مقالہ علائی کی عبارت مقفّیٰ اور مسجّع ہونے کے ساتھ ساتھ عربی و فارسی کی تراکیب اور مغلق الفاظ پر مشتمل ہے لیکن ان کے خطوط میں یہ رنگ نہیں پایا جاتا۔ وہاں وہ اپنی سلاست اور روانی سادگی اور شوخی، طنز اور مزاح میں غالب کے کافی ہم رنگ اور ہم طرح نظر آتے ہیں۔

ششم یہ کہ علائی کے مقالہ میں ان کی تصنیف کردہ ایک نظم اردو بھی شامل ہے اور یہ اردو ادب کے لئے ایک بیش قیمت تحفہ ہے۔ علائی نے حسبِ دستورِ قدیم تبرکاً اس نظم کے مطلع کا ½ مصرعہ اپنے استاد مرزا غالب کی مشہور نظم "صفتِ انبہ" سے مستعار لیا ہے۔

آخری بات یہ ہے، جس کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں کہ جس بیاض سے یہ مقالہ نقل کیا گیا ہے وہ ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ اصل بیاض کی دوسری ناقص اور نامکمل نقل ہے، ہم نے اس کی نقل کرنے اور یہاں دوہرانے میں اپنی محدود قابلیت کے مطابق جہاں تک ممکن تھا مقالہ کی نوک پلک درست کر کے پیش کیا ہے پھر بھی ہمیں اس کا اعتراف ہے کہ نقل مطابق اصل نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں تک عبارت اور الفاظ کی املا کا تعلق ہے اس باب میں نہ تو ہم کو علائی پر نکتہ چینی کا حق حاصل ہے اور نہ آپ کو مجھے کوسنے کا کوئی مجاز ہے۔

آئیے اب ہم علائی کے مقالہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ انھوں نے کیا فرمایا ہے:

ان کے مقالہ کا نقطۂ آغاز جسے وہ مصلحتاً اور حسبِ ضرورت کہانی کے درمیان میں لاتے ہیں لفظ "اردو" کی نئی اور اچھوتی تحقیق ہے۔ علائی فرماتے ہیں کہ لفظ "اردو" جس کے معنی "لشکر" کے ہیں فی الاصل لفظ فارسی ہے ترکی نہیں۔ اسی طرح ان کی تحقیق کے مطابق سرزمینِ ہند میں زبان اردو کی تخم ریزی امیر خسرو علیہ الرحمتہ کے ہاتھوں ہوئی۔ بعد ازاں اس باغ کی آبیاری اور چمن بندی میں دوسرے متقدمین اور متاخرین کا حصہ ہے اور بالآخر حضرت شاہجہاں نے اس کو "اردوئے معلیٰ" کا نام اور لقب عطا کیا۔

علائی کے بقول ہم خود دیکھتے ہیں کہ جلال الدین اکبر کے دور میں اس تازہ نہال میں شاخیں اور کونپلیں پھوٹنی شروع ہوئیں۔ درحقیقت فارسی اور ہندی بھاشا یا بھاکا کا صحیح میل اور اختلاط اسی دور میں ہوا اور یہیں سے ایک نئی زبان کا ہیولیٰ وجود میں آنا شروع ہوا، جس نے بعد میں اردو زبان کی صورت اختیار کر لی۔

غالب کی طرح علائی بھی ابوالفضل کی فضیلت سے ضرورت سے زائد متاثر نہ تھے، انھوں نے بھی اپنے مقالہ میں کھل کر ابوالفضل

کی مدح سرائی نہیں کی صرف، اچھا ماہر زبان ہندی تھا، کہہ کر خاموش ہو گئے۔ اسی طرح ولی اور جعفر کا بھی ذکر ضمنی طور پر کیا ہے منشی سید احمد دہلوی نے بھی ولی گجراتی کو خسرو کے بعد اردو کا مخترع ہونا تسلیم کیا ہے۔ مگر اس دعوے کے ساتھ کہ وہ بھی دلی ہی کا تربیت اور فیض یافتہ تھا ؛

علائی نے شعراء کے جو ادوار قائم کئے ہیں وہ بھی قریب قریب جدید تحقیقات اور موجودہ معلومات کے مطابق ہیں۔ بعض مشہور شعراء دہلی و لکھنؤ کا نام انھوں نے دیدہ دانستہ یا سہواً نہیں لیا۔ ہو سکتا ہے کہ جن شعراء سے علائی متاثر تھے۔ انہی کو انھوں نے قابل ذکر سمجھا ہو۔ ہر نوع علائی نے نہایت ہی اختصار سے ہر دور کے مشہور و معروف شعراء کا ذکر کرتے ہوئے ان کی خصوصیات کلام کو بیان کیا ہے لیکن اس باب میں ان کا نظریہ اپنے استاد مرزا غالب کے برعکس ہے کسی نے مرزا غالب سے حضرت ناسخ کے بارے میں دریافت کیا تو مرزا نے طنزاً یہ جواب دیا ـ

زبان ہر اور مرزا الہام ہے
مگر یاں بزرگوں میں خوش بیاں ہے

علائی شعرا لکھنؤ کے بارے میں فرماتے ہیں،

حق یوں ہے کہ تمام بلاد ہندوستان سے ان کی زبان پاکیزہ تر اور ان کو اوروں پر رجحان اور تفوق حاصل ہے۔

دراصل علائی کی شادی نواب جلال الدین حیدر نواب ضابطہ خاں روہیلہ کی دختر نواب شمس النساء بیگم سے ۱۸۵۵ء میں بمقام نجیب آباد ہوئی تھی اس لحاظ سے ان کی آمد و رفت اور میل و ملاپ کا سلسلہ اہل لکھنؤ سے آخر وقت تک قائم رہا اور چونکہ گیسوئے اردو کو سنوارنے اور تابدار بنانے میں دلی کے بعد اہل لکھنؤ نے بھی مشاطگی کی تھی اس لئے علائی بھی زلفوں کے اس پیچ و خم میں گم ہو گئے۔ یہ شیدگی انہیں ایسی بھائی کہ بعض اوقات وہ تذکیر و تانیث اور واحد و جمع میں لکھنؤ کے مقلد ہو گئے۔ دلی والے مشعریں، برسیں، چیتیں، سانسیں نثریں وغیرہ صیغہ جمع میں نہیں بولتے لیکن علائی نے اپنے مقالہ میں ایک جگہ ــــــ "اردو کی نثریں اس وقت بھی اچھی نہ تھیں" ... نثر کی جمع نثریں لکھی ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ "لینا یا حاصل کرنا" کے معنی میں انھوں نے لکھنؤ کی زبان میں صرف "پا" لکھنے پر اکتفا کی ہے۔

"ما کہ مفہوم و مراد و مطالب مکتوب علیہ و سامع اس سے پا جاتا ہے"

مذکیر و تانیث اور واحد جمع کی بحث میں منشی سید احمد دہلوی کی طرح اردو کی تعریف فرماتے ہیں کہ اہل زبان وہ لوگ ہیں جن کا وطن وہی سرزمین ہو جہاں وہ زبان پیدا ہوئی اور اردو زبان والے وہ لوگ نہیں جنھوں نے اہل زبان سے ان کی زبان سن کر یا پڑھ کر اس کو سیکھا ہو، مقلد زبان کو لازم ہے کہ وہ اہل زبان کے محاورے اور روزمرہ کی تلاش و جستجو سے غافل نہ رہے اس کا عامل بنے تاکہ اس کا سخن مستند اور قابل اعتبار ہو۔ خود علائی اپنے مقالہ میں دلی کو اردو کا مصدر اور مرکز تسلیم کرتے ہیں اور زبان اردو سے مراد خاص زبان شاہجہاں آباد قرار دیتے ہیں۔

علائی نے آخر میں اردو نثر سے بحث کرتے ہوئے یہ بات کہی ہے کہ لوگوں نے اردو نثر کی طرف توجہ دینے میں اس لئے "تاخیر سے کام لیا کہ ابتدا میں اکثر اہل علم حضرات نے اس نئی زبان کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی بلکہ اسے محض ایک لشکری اور بازاری زبان سمجھا اور اپنے معیار کے مطابق نہ جانا یہی وجہ تھی کہ اردو نثر نظم کے کافی مدت بعد وجود میں آئی۔ علائی نے خاص اپنے دور کے اردو ادب کا جائزہ لیتے ہوئے بڑے مخلصانہ انداز میں اردو نثر کی کم مائیگی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ وہ ان لوگوں پر ان کی غلط روی کی مثال دے کر معترض ہوئے ہیں کہ فارسی داں نہ ہوتے ہوئے بھی وہ فارسی میں نامہ نگاری کرتے تھے اور اس کا اردو ترجمہ بھی غلط کرتے تھے۔ پھر لطف یہ کہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہونے کی بجائے اپنے آپ کو اہل زبان سمجھتے تھے۔

ان کا یہ خیال اور تمنا بالکل بجا تھی کہ اردو نثر پر جو فارسی انشاء کا غیر ضروری اور غیر فطری اثر ہے اسے حتی الامکان کم کرنے کی کوشش

کی جائے تاکہ اردو میں زیادہ سے زیادہ مقامی رنگ نمایاں ہو سکے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اس تاریخی حقیقت کا بھی اظہار کیا ہے کہ مرزا غالب نے اردو نثر نویسی کا جو ڈھنگ نکالا ہے وہ واقعی انہی کا حصہ ہے اور اولیت کا سہرا بھی انہی کے سر ہے۔

علائی کی نقادانہ نظر نے نئے حالات اور بدلتی ہوئی اقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ پیشین گوئی بھی کی تھی کہ جدید انگریزی تہذیب اور انگریزی زبان کے اختلاط سے مستقبل قریب میں نئے نئے الفاظ اور نئی نئی تراکیب کا اضافہ ہوگا اور اس طرح موجودہ کمزوریاں اور خرابیاں دور ہونے کے بعد بہت جلد ایک نئی اور ترقی یافتہ زبان جنم لے گی۔

علائی نے اپنے مقالہ میں مسئلہ رسم الخط کو بالکل نہیں لائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت رسم الخط ناگری اور رومن وغیرہ کی اگر کوئی تحریک تھی بھی تو شاید وہ اتنی قوی اور زور دار نہ تھی گو مستقبل میں یہ بڑی شدت کے ساتھ سامنے آئی اور ہنوز یہ مسئلہ برصغیر ہند و پاکستان میں اپنی اپنی جگہ ایک متنازعہ فیہ اور حل طلب مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس قدر تمہید کے بعد علائی کا وہ مقالہ قارئین کی نذر ہے میرا کام تو صرف اسے آپ تک پہونچانا تھا اور علائی کی یاد کو تازہ کرنا تھا جسے ہم ایک مدت سے فراموش کئے بیٹھے ہیں۔

مقالہ علائی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ نستعینہ علیٰ ما یکون ونحمد علیٰ ما کان الحمد للہ فاطر الارض والسماوات مفضل الانسان علیٰ سائر الخلق ثم افضل العلم والحیات ذی القدرۃ والعظمۃ والکمال والکبر یا قاضی الحشر مقدر القضا فسبحان یا من ثنا دون الحصر والاحصا فھو سبحانہ وراء الوراء ثم وراء الوراء والصلوٰۃ والسلام علیٰ جمیع المرسلین والانبیا۔

رسم ہے کہ حمد و ثنائے باری کے بعد نامہ نگار اپنے عنوان صحائف کو مستجل بمدحت حاکم عہد کرتے ہیں، پس لازم ہوا کہ گزارش مدعا سے قبل اور حمد و نعت کے بعد اپنے بادشاہِ وقت کی ستائش و ثنا کروں۔ مانا کہ نقشِ مطلوب دل پذیر ہے مگر یہ تنگیٔ میدانِ گفتار ادب ناطقہ کا عنان گیر ہے؎

دل زکجا و ہوا پر و بال از کجا
من کہ و تعظیم جلال از کجا

ہاں تبرکاً صرف ادائے رسم التعظیم نام مبارک اپنے شہنشاہ خورشید کلاہ مہر چہر مریم جناب بلقیس نقاب عیسیٰ دم کلیم کلام کا لیتا ہوں۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک و گلاب
ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبیست

ملکہ معظمہ آسمان اورنگ آیت رحمت کبریا کوئن وکٹوریہ؎

سرور شاہاں ہتو انا تری
ناموبر دہر بدانا تری

خلد اللہ ظلالہا علیٰ مفارق الانام الیٰ یوم القیام کہ جس کا دامن عاطفت آج چتر سایۂ بان ساکنانِ ہندوستان ہے، مجھ کو اور تمام اہل ہند کو اپنا وجود اس عہد میں موجب شرف و افتخار اور مستوجب شکر ایزد منان ہے۔ بدیں اعتبار کہ یہ دولت جاوید طراز دُرۃ التاج اعصار و دھور ہے اور انوار راحت کا اس میں وفور ہے اگرچہ ہم نے اپنے زمانہ کو ماحیٔ آثار اسلاف و باعث نازش اخلاف کہیں تو بجا ہے۔ یہ کون کہتا ہے کہ ملک ہندوستان کبھی نہ تھا لیکن باعتبار آبادی و آراستگی و امن و کثرت تجارت کے جو آج اس تعلیم کو رونق حاصل ہے فی الاصل نام اس کا ہندوستان جنت نشان نہ تھا۔ جب سے اس ملک کی وسعت و فسحت اعتبار میں ہے۔ اختلاف السنہ و مذاہب و لغات شمار میں ہے۔ مگر زبانہ باقی ہیں اس اقلیم کے

کامل حکومت راجہ ہائے ہند میں چار پانچ برس کے درمیان ہوگیا کہ اکثر رسوم والسنہ اہل ہند میں فتور عظیم آگیا۔ قوت و استیلائے اہل اسلام سے ملکِ ہند مرجع انام بنا بلکہ مسلمانوں کا امید گاہ و موطن و مقام بنا۔ مگر خاص ارتباط مزید بہدگر سے جیسا تغیر رسوم و قیود اسلامیان ہند میں آیا ویسا ہی خاص اہل ہند کے اوضاع والسنہ میں بھی اختلاف واقع ہوا۔ ادھر فاتحان اسلامی باہمہ بیگانگی آشنا ہو کر ہندی جنم اور ہندی گو بنے اور ادھر اہل ہند کو ضرورتِ سپاہ و سپاہدار کی زبان سمجھنی اور بولنی پڑی۔ معہٰذا دفتر نے بھی ترکی و فارسی میں انضباط و انتظام پایا اور معاملات و مکتوبات نے بادشاہ وقت کی زبان میں انصرام پایا۔ پس رایانِ ہند کی جہانداری کا کامل زوال ہوا۔ اور راجاؤں کے راج نے اختتام و انجام پایا۔ تیرھویں و چودھویں صدی عیسوی کے درمیان جس کو ہندوستان میں عہد دولت خاندان سلطان غیاث الدین تغلق جاننا چاہیے۔ میرے نزدیک اسلامی لوگوں میں سے حضرت خسرو رح جل عظمتہٗ نے زبانِ ہندی میں مہارتِ کامل حاصل کی۔ اصل اس شاعر بے مثال کی ہزارہ لاچین سے ہے۔ یہ عزیز قوم کا مغل اور خود ہندوستان زادہ تھا یہی وجہ زبان فارسی و عربی و ترکی و ہندی میں اس والا دستگاہ کو مہارتِ کامل تھی، قطع نظر کمالاتِ شاعری کے جو زبان فارسی میں اس شخص نے بہم پہونچائی اور اس کا بیان میرے بیان سے وراء ہے، زبان ہندی میں وہ کمال اس عزیز نے پیدا کیا کہ شاید خاص صاحبِ زبانِ ہند اس سے محروم ہوں، اقسام نظم و نثر ہندی از قسم مکرنی و پہیلی و مثال و فقرات ذو معنین ایہامی وغیرہ ایسے لطیف اور مذاق انگیز اس کے ہیں کہ سخن شناسان جوہر پسند اس کی داد دیتے ہیں اور فنِ موسیقی میں قول و گیت اور چھند اور بعض راگنی و مقامات اس عزیز کے مخترعات ایسے ہیں۔ کہ ماہرانِ فنِ موسیقی اس سے مزے لیتے ہیں۔ کثرتِ شہرت سے میں اس شخص کا حال لکھنا ضرورت نہیں دیکھتا ورنہ اس قسم کا کلام اس کامل کا مسوّدِ اوراق کے ضبط حافظہ ہے۔

بعد اس شخص کے تا عہدِ جلال الدین اکبر انار اللہ برہانہٗ (۱۶۰۰ء) میں کوئی ایسا نامور شاعر ماہر ہندی زبان اسلامی گروہ سے نظر نہیں آتا جس کا نام یہاں لوں۔ البتہ شیخ ابوالفضل فیضی فیاضی، شیخ مبارک ناگوری کا بیٹا اچھا ماہر زبانِ ہندی تھا کہ بحکم اپنے بادشاہ جوہر دوست، اکبر، اغنی کی اکثر کتب معتبرہ مشہورہ سنسکرت و بھاکا زبانِ فارسی میں ترجمہ کی ہیں مگر اقسام نظم سے کلام اس کا ہندی میں نامہ نگار کے کان تک نہیں پہونچا۔ ہاں زمانِ اکبر، ماضی سے تمام معاملات و رسوم رعیت و لشکر کے مخلط ہوئے کہ زبانِ ہندی نے نئی شکل بوجہ کثرت ربط کے حاصل کی اور رفتہ رفتہ دونوں ہندی زبان میں قطعاً متروک ہوگئیں۔ جیسے شہر کے لوگ فارسی و ترکی سے بیگانہ تھے۔ اسی طرح لشکر کے لوگ ہندی سے کم آگاہ۔ نظر برآں اکابر والا دستگاہ نے متفق الرائے ہو کر ہندی اور فارسی کو ایک لطیف ترکیب دی۔ اور اس ترکیب سے ایک زبان جدید پیدا کی۔

واضح ہو کہ "لشکر کو فارسی میں "اردو" بھی کہتے ہیں جس کا ترجمہ عربی میں جیش اور انگریزی میں کیمپ و آرمی (CAMP AND ARMY) ہے۔ ہرچند کہ بعض لوگ اردو کو بمعنی لشکر لفظ ترکی بتاتے ہیں۔ مگر یہ لفظ فارسی کا ہے۔ بایں حال جب اس زبان نے ترکیب پائی اور لشکر کے بازارگاہ میں جہاں اطراف و اکناف عالم کے تجار آتے جاتے تھے صرف محاورات و مکالمت ہوئے تو یوماً بعد یوم اس کی ترقی ہوگئی اور نام اس کا زبانِ اردو ہوا۔ از آنجا کہ بعد عہد اکبر زمانہ شاہجہاں سے یہ شہر شاہجہاں آباد و معسکر قرار پایا اور خود اپنی ذات سے بادشاہ بھی اسی جا متمکن بر دوام رہا تو نام اس لشکر کا تعظیماً "اردوئے معلّیٰ" رکھا جس کا ترجمہ انگریزی میں رائل کیمپ (ROYAL CAMP) ہوسکتا ہے۔ بدیں نظر زبان اردو سے مراد، خاص زبان شاہجہاں آباد ہوئی۔ نامہ نگار نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا مگر سے اکابر سے سنا ہے کہ موسوی خان معز فطرت نے بھی زبانِ اردو میں اشعار کہے ہیں۔ یہ شخص صدور و امنائے عالمگیری سے تھا چنانچہ ایک مطلع غزل اس کا جو میرے حافظہ میں ضبط ہے لکھتا ہوں تا شائقین احوال اردو پر زبان کی کیفیت جو آج سے دو سو برس پہلے تھی منکشف ہو جائے۔ شعر:

در خانۂ آئینہ گھٹا جھوم پڑی ہے

از زلفِ سیاہ تو بدل دھوم پڑی ہے

زمانہ عالمگیر سے یہ زبان اردو ترقی پذیر ہو کر قریات و بلاد ہند میں شائع ہوئی ادھر عقلائے ماہرین نے تراکیب میں تصرفاتِ شائستہ

کئے کہ فصاحت و بلاغت زبان اردو خواص کی زبانوں پر بڑھتی گئی۔ لوگوں نے تتبع شعراء ایران پر وزن بحر و تقطیع کے لحاظ سے اردو میں اشعار لکھے چنانچہ ولی و جعفر و صادق زمانہ عالمگیر اور بعد عالمگیر مشہور شعر اگزرے ہیں اور یہ صاحب دیوان لوگ ہیں، ان کے دیوان بہ تلاش ہاتھ آ سکتے ہیں۔ جعفر زٹلی مشہور ہے اور اس کا کلام اکثر بے ربط ہو ہا نے رکیک و مزاح پر مشتمل ہے اور اس قسم کے کلام کو "زٹل" کہتے ہیں۔ تا زمانہ شاہ عالم از عہد عالمگیر اول کہ لا اقل مدت ایک صدی کی سمجھنی چاہیئے زبان اردو کے اشعار میں اکثر اسقام تھے کہ وہ شاہ عالم کے عہد کے بعد شعراء اردو گو نے نکال دیئے اور بعض الفاظ ہندی کو غیر فصیح جان کر از بسکہ تصرف فی الترکیب معیوب اور متروک رکھا۔ چنانچہ ولی و جعفر وغیرہم کے کلام میں سجن و سو ہا ناد ہنپٹ ڈھنگ ڈھنک و تلک اکثر باندھا جاتا تھا کہ بعض اس میں سے یک قلم نکال دیئے گئے۔ اس عہد یعنی ۱۰۰۰ء و ۱۰۸۰ء کے درمیان شعرائے نامور، قائم و سودا و میر و مصحفی، سوز و فدوی وغیرہم معتبر ہیں اور ان کا کلام اکثر مرتب و موجود ہے، ہر وقت بہ تلاش مل سکتا ہے۔ علی الخصوص میر تقی میر کہ از فصحائے نامور اور دیوان موجود و مکمل، زبان اردو معتبر ہے۔ باایں ہمہ زبان اردو کو جو شستگی و رنگینی چاہیئے میرے نزدیک اس وقت میں بھی حاصل نہ تھی۔

۱۰۸۰ء کے بعد سے آوازۂ جہانداری برٹش گورنمنٹ اطراف ہند پہ پہونچا اور اقتدار روز افزوں دولت و سلطنت انگریزی ہندوستان میں انتظام کامل ہوا۔ وہ خطرات و آفات و شدائد و مصائب جو لوم نہ ہونے خداوند صاحب داد گر کے اہل ہند پر ہر روز حادث تھے، دفعتاً رفع ہوئے، ملک رونق و عمارت اور خلق کو بھی دجمعیت نصیب ہوئی۔ فارغ البال لوگوں نے اپنی اصلاح احوال کی، بعد اصلاح، گفتار و مقال میں صرف ہمت کیا، زبان اردو کی ترتیب میں سعی اور فصاحت و بلاغت میں جہد جب مبذول ہوا تو یہ زبان ایک فصیح و لطیف و شیریں زبان بن گئی اور ۱۸۱۳ء گورنری مارکوئس آف ہیسٹنگز ششم گورنر جنرل ہندستان سے کہ آج تک یہ زبان ایسی مانجھی گئی کہ ہم پایہ زبان فارسی ہوئی۔ شہر ہائے شہر شاہجہاں آباد ایسے طبع آزمایان خوش فکر اور ایسے سخنوران کامل گزرے ہیں کہ ان کا کلام پاکیزہ موجود و مرتب اور ہم پلہ اساتذۂ ایران معتبر ہے۔ اکثر ان حضرات میں سے رہگرائے عالم بقا ہوئے اور بعض اس وقت بھی موجود ہیں، ادام اللہ زمان کی لم ہیں، یہاں ان کے اسماء درج صحیفہ کرتا ہوں۔

جرأت و انشا و رنگین و نصیر و معروف و ناجی و شہید و منور و احسان یہ لوگ کچھ پہلے شمار کئے گئے ہیں۔ افضل المتاخرین اکمل المتقدمین استادی مخدومی مرزا اسد اللہ غالب اور حضرت مخدومی و مطاعی نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر نیر و رخشاں اور عزیزی آغا ثاقب سمندر و سالک و رضوان سلمہ اللہ صہبائی و آزردہ و مومن و شیفتہ و سوز و عارف و ذوق و اشکی و حسرت و محو و حیا و کوکب وغیرہم بڑے نامی سخن سنجان زبان اردو اور شیریں کلامان ریختہ ہیں۔ سودا و راقم نے ان حضرات کے کلام بھی دیکھے اور خود شریک صحبت مشاعرہ رہا ہے۔ بعض ان میں وہ لوگ ہیں کہ ان کا کلام متین سند اور ان کی فصاحت و بلاغت معتمد ہے، انہیں حضرات نے مکروہ ہندی و اسقام زبان اردو دور کئے اور اس زبان کو زبان ریختہ بھی کہا۔ اس شہر میں بعض مستورات زن بھی شاعرہ گذری ہیں کہ تذکرہ گلشن بے خار و بہارستان ناز میں مشروحاً ان احوال و اشعار مذکور ہیں۔

نظم علائی

ہاں دل نغمہ سنج زمزمہ ساز	کیوں نہ کھولے در خزینۂ راز
بارے اردو کا کچھ بیاں ہو جائے	خامہ طوطیٔ خوش زباں ہو جائے
ہے در ورطۂ بیان اردو	زیور شاہد زبان اردو
ہے زبان ایک اور چار مزے	اس کی ہر بات میں ہزار مزے
یوں تو ہر قوم کی زبان ہے خوب	اس کا اس رنگ میں بیان ہے خوب
پر یہ ترکیب دل پسند کہاں	لفظ و معنیٰ ارجمند کہاں
دلربا اس کے بندلہ ہائے عجیب	جاں فزا اس کے نکتہ ہائے غریب

معنی و لفظ اس کے جاں پرور ‏ ‏ ‏ ‏ حسنِ ترکیب خود جہاں پرور
میں کہوں کیا کہ یہ زباں کیا ہے ‏ ‏ ‏ ‏ لطف کیا وسعتِ بیاں کیا ہے
آسمانی زباں سے ملتی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ دلّی میں آسماں سے ملتی ہے
لیک مانے نہ دیدہ ور اس کو ‏ ‏ ‏ ‏ آسمانی کہوں اگر اس کو
خاص یہ اردوئے جہاں آباد ‏ ‏ ‏ ‏ منبع کی ہو جس سے جاں آباد
آسماں پر اگر فرشتہ جائے ‏ ‏ ‏ ‏ یہ زباں کے سنے کہاں سے لائے
لاکھ عالی ہو ہم سے شانِ ملک ‏ ‏ ‏ ‏ ایسی ستھری کہاں زبانِ ملک
ہم نے خاص اس زباں کے لئے ‏ ‏ ‏ ‏ نہ بنی یہ زبان جہاں کے لئے
یا خدا تا رہے زمین و زماں ‏ ‏ ‏ ‏ تا رہے ہند کا زمیں پہ نشاں
اہلِ دلّی کی یہ زبان رہے ‏ ‏ ‏ ‏ حسنِ تقریر اور بیان رہے
لطفِ حکامِ عہد سے یہ زباں ‏ ‏ ‏ ‏ رونقِ تازہ پائے اے منّاں

میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ صرف اسی شہر میں چرچا شعر و سخن کا ہوا بلکہ اطرافِ ہند میں بھی زبانِ اردو نے رواج پایا۔ اسی ۱۸۰۰ء کے درمیان عرصہ ۶۰ برس میں شعر گوئی کے فن نے ترقی پکڑی مگر انصاف یوں ہے کہ اور سب میں لکھنؤ نے بیشتر فصاحت و شستگی و سلاستِ زبانی و حسنِ ترکیب کو ملحوظ رکھا۔ اور اس دیار میں قدما میں ناسخ و آتش و آباد و خلیق اور متاخرینِ حال میں انیس و دبیر و عشق و مونس و انس و امیر اچھے شاعر ہیں، ہر چند کہ والا نظرانِ نکتہ سنج باعتبار فصاحت و بلاغت پورب کے شعرا کو سخنورانِ شاہجہان آباد پر فضل و برتری نہیں دیتے اِلّا حق یوں ہے کہ اور تمام بلادِ ہند سے ان کی زبان پاکیزہ تر اور ان کو اوروں پر رجحان اور تفوق حاصل ہے و ہو ہذا الہو والحق اقول یہاں سے لازم ہے کہ مسودۂ اوراق نثرِ اردو کے رواج کی حقیقت جس سے اصل رواجِ اردو مراد ہے لکھے۔

مخفی نہ رہے کہ شرفائے شاہجہان آباد کو باہمہ آرائشِ زبان و تصرفِ ترکیب و باہمہ نظرِ بیان و استحسانِ فنِ شاعری بزبانِ ریختہ و باہمہ اعتبارِ شعر گوئی و قافیہ سنجی و باہمہ اعزاز و تکریم شعرائے ریختہ کو اردو نثر لکھنے سے اجتناب رہا بلکہ بعض پابندانِ قیود جو خوش وضعانِ اہلِ ہند، اعتبار کئے جاتے ہیں یہاں تک اس سے نفرت رہی کہ انشا، کتابت و ارقامِ صحائف و مطالب کو اپنا ننگ و عار جانتے تھے۔ شاید وجہ یہ کہ یہ زبانِ مادری ان کی بے مشقت تعلیم حاصل شدہ مرکب از زبانِ دیسی بھاکا و الفاظ لشکری بازاری تھے کہ وہ لوگ اس سے محترز ہوئے۔ ایسی پابندی بعض امور میں اہلِ ہند کو اکثر ہوتی ہے اور مجھ کو اس کی تشریح اطناب محل ہے۔ نامہ نگار نے دو چار برس پہلے دیکھا ہے کہ باہمہ کمی سرمایہ و نقصانِ علمی گذارش مطالب پر فارسی میں قادر نہوں مگر جب لکھیں تو فارسی ہی لکھیں اور اپنی زبانِ اردو میں بھی وقتِ انشا و املا میں کتنی ہی اغلاط واقع ہوں تو اس سے شرم نہ کریں بلکہ کچھ اعتذار بیہودہ فرما کر اپنا حسنِ وضع اس کو جانیں۔

نظر بریں رسوم و عادات آج سے تیس برس پہلے رسم اردو نثر کی نہ تھی، لامحالہ سرکار را بد مدار کو بھی ہندوستان میں دفاتر کا انضباط فارسی مرعی رہا۔ بپایانِ کار اس سے مشکلات عدیدہ پیش آئیں۔ اوّل تو یہ کہ حکام از ولایت تازہ رسیدہ کو اس قدر جلد حاصل کرنا زبان کا کہ لِما علیہ مقدمہ پر آگہی تمام پائیں دشوار رہا۔ دوسرے یہ کہ عوامِ ہند کو افہام و تفہیم معاملات فارسی میں جو ان کی نہ زبان تھی نہ انھوں نے حاصل کی تھی سخت محال۔ سوائے اس کہ حاکمِ عہد نے بہ اندیشۂ صواب گرائی داد خواہ کا داد کو پہونچنا اور اپنا انصاف بواجب مراد کو نہ پہونچنا تصور فرما کر دفتر بدل و باقی الواقع رائے سنجیدہ اور اندیشہ معدلت رائے اندریں معاملہ حکامِ عہد نے فرمایا۔ مجھ کو امید ہے کہ یہ معاملہ زمانۂ گورنری جناب لارڈ ولیم بینٹنک صاحب بہادر ہشتم گورنر جنرل ہند سے ۱۸۲۷ء میں بروئے کار آیا لیکن اردو کی نثریں اس وقت بھی اچھی نہ تھیں۔ کیوں کہ دل اور زبانِ خلق پر ایسے محاورات فارسی چڑھے ہوئے تھے کہ گذارش مطلب اسی رنگ و محاورات میں اردو زبان میں کرتے اور وہ ایسا بے مزا و بے لطف ہوتا

کہ طبع مذاق انگیز کو اس سے نفور ہو۔ چنانچہ اب بھی بعض حضرات بے توجہ دنا شائق جو منصد یانِ ہندی تعلیم و تربیت پا چکے ہیں پہلے فارسی ایسی لکھتے تھے جس کے ایک خط کی عبارت میں لکھتا ہوں وہ ہو بہو اسی رنگ کی ہیں۔

"برخوردارِ من! از ایں روز یکہ آں برخوردار رہگراے آں صوب شدہ اند بترقیم احوال خود نہ پرداختند، دل و خاطر از آنجا کہ متعلق است، لازم کہ زود خیر و عافیت خود بنویسند۔"

اور اس کا ترجمہ بعینہ حرف بحرف یوں فرماتے ہیں اور وقت ضرورت یوں اردو میں اس کے مطلب کو لاتے ہیں۔

"برخوردار میرے اس دن سے کہ وہ برخوردار رہگراہ اس طرف کے ہوئے ہیں ساتھ لکھنے احوال اپنے کے نہ مشغول ہوئے ہیں، دل و خاطر کہ اس جگہ سے کہ متعلق ہے لازم کہ جلد خیر و عافیت اپنی لکھتے رہیں۔"

ما فی الضمیر و مراد و مطلب مکتوب الیہ و سامع اس سے پا جاتا ہے مگر لطفِ محاورات اور زبان کا مزا کب ایسی تحریر میں آسکتا ہے۔ اصل پوچھئے تو گذارش مدعا اس رنگ پر بامزا و با محاورہ یہ ہے۔

"کہ میاں جس روز سے گئے ہو اپنی خیر و عافیت نہیں لکھی لازم کہ جلد اپنا احوال لکھو۔"

مگر میں امید کرتا ہوں کہ جو اسقام بدایت حال میں تھے وہ اب بہت دور ہو گئے ہیں اسی طرح جو اب ہیں۔ وہ کچھ عرصہ قلیل میں کلام سے اور ان کے محاورات کلام سے نکل جائیں گے کہ حکام ہنر دوست ہنر نواز کو تربیت و تعلیم و ہدایت واماندگانِ جاہل کی جانب اور احداثِ مدارس و ترقی تعلیم زبان اردو و ازدیادِ تالیفات حاوی مطالبِ مشکلہ مختلفہ کی طرف، توجہ و التفات کثیر ہے، یقین ہے کہ سعی موفور حکامِ عہد مشکور ہو اور باقی ماندہ عیوب اس زبان سے دور۔

اگرچہ اہل لکھنؤ نے اس زبان کی آراستگی کی کوشش اچھی کی اور بہت پاکیزہ شیوہ و رنگ پر نثرہائے اردو سلیف لکھے ہیں مگر اس شہر میں اب بھی اچھے لوگ باقی اور ان کی عبارت اردو پاکیزہ و دلچسپ ہے۔ باایں ہمہ یہ ایک شیوہ خاص مذاق انگیز جو حضرت استادی و مخدومی مولانا غالب نے نکالا ہے یہ کسی کو نصیب نہیں۔ حق یوں ہے کہ طرح بنائے ریختہ حضرت ہی نے ڈالی اور خود ہی موجد اور خود ہی مکمل اس کے ہیں۔

بالجملہ جیسے یہ اردو پہلے چار لغات یعنی عربی و فارسی و ترکی و ہندی سے مرکب تھی اب پانچ زبان پر مشتمل ہوئی یعنی زبانِ انگریزی بھی اکثر اس میں داخل ہوئی اور ہوتی جاتی ہے۔ مثلاً عدالت گاہوں میں الفاظ سررشتہ مثل اپیل و ڈگری و اپیلانٹ و ریسپانڈنٹ و وارنٹ و سمن وغیرہ اور روزمرہ بیع و شراء کے معاملات میں مثل ٹین و بوگی و بوتل و گلاس و کوچ و لیمپ و چرٹ و لالٹین اور اسمائے غریبہ ولایت جو یہاں پیدا نہیں مل گئے ہیں اور مستعمل ہو کر اردو کا ایک جز دیکھے جاتے ہیں۔ بدیں قدر اس زبان کی ترقی یوماً فیوماً متصور ہے۔ واللہ واعلم بحقیقۃ الحال۔

اب میں اس مختصر نامہ کو دعائے عافیتِ حاضرین دہلی سوسائٹی اور دعائے ازدیادِ عمر و حشمت صاحب کمشنر بہادر دہلی پر ختم کرتا ہوں اور ناظرین حق گزین سے اپنی سہو و خطا پر عفو اور کرم کا امیدوار اور مبدأ فیاض سے ترقی فیض دہلی سوسائٹی کا طلب گار ہوں۔

الٰہی مملکتِ ہند کو زیر لوائے جہاں کشائے حضرت ملکہ معظمہ انگلستان رونق و آبادی تازہ حاصل اور رعایا کو توفیق شکر نعمت و فرماں بری بادشاہ عہد بدل اور حکام عادل کا دل جانب عوام و خواص بہ ہر د لطف مائل رہے۔

نظم

برتست پاس خاطر بیچارگاں و شکر — ابرار برخدائے جہاں آفریں جزا
یارب ز بادِ فتنہ نگہدار خاک ہند — چندانکہ خاک را بود و باد را بقا

والسلام دعوٰی آخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ۔

اب آپ ہی انصاف سے کہئے اور گوش ہوش سے سنئے کیا حضرت علائی کی روح غالب کی زبان میں ہم سے یہ فریاد نہیں کر رہی ہے کہ

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

★

پاکستانی ادیبوں کا
کنونشن

کراچی : ۲۹، ۳۰ - ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء

•

* منشور
* سفارشات اور تجاویز

•

- شاہد احمد دہلوی — جسیم الدین
- ڈاکٹر مولوی عبدالحق — ممتاز حسین
- قدرت اللہ شہاب — جمیل الدین عالی

پاکستانی ادیبوں کا
منشور

- ہم پاکستانی ادیب اپنے وطن کی ترقی اور عظمت، امن عالم اور بنی نوع انسان کے ارتقا کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے کا عہد کرتے ہیں۔
- ہم اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق انسانی حقوق میں اپنے ایقان کا اعادہ کرتے ہیں بحیثیت ادیب ہمارا بنیادی حق آزادیٔ اظہار و تبلیغ نظریات ہے جس کے بغیر ادبی تخلیق بے معنی ہے۔
- ہمیں اپنی عظیم تمدنی روایات پر فخر ہے اور ہم ان کی حفاظت اور ترقی کے لئے ہر ممکن کوشش کریں گے۔
- ہمیں اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہے۔ ہم سچائی کا اظہار کرنے والے جذبۂ وطن پرستی کو ابھارنے والے، عالمی یکجہتی اور تعاون کے لئے راہ ہموار کرنے والے اور انسانی رشتہ کو استوار کرنے والے ہیں۔ ہم ایسے حالات کے خالق ہیں جن میں بنی نوع انسان آسائش اور عزت سے زندہ رہ سکے۔
- بحیثیت ادیب انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم نے اپنے ذمہ ایک خوش آیند اور صحتمند معاشرہ پیدا کرنے کا کام لیا ہے۔ ایسا معاشرہ جس میں ہر فرد کے لئے آگے بڑھنے کی راہیں کھلی ہوں جہاں دولت اور طاقت انسانی اقدار اور روحانی آدرشوں کی پابند ہو، اسی لئے ہم سائنس کی ترقی پر ایمان رکھتے ہیں بشرطیکہ وہ دنیاوی امن اور خوشحالی کی ضامن ہو۔

—•—

سفارشات اور تجاویز

سماجی اور اقتصادی مسائل

(۱) ادیبوں کو اظہار اور تبلیغِ خیالات کی مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔

(۲) کسی ادبی، فنی یا ثقافتی انجمن پر کوئی قید نہیں ہونی چاہیئے۔ سوائے اس کے کہ کسی عدالتی فیصلہ کے مطابق پابندی لگائی جائے۔

(۳) — رائٹرس گلڈ نے اراکین کو سفر کی سہولتیں اور رعایتیں مہیا کی جائیں تاکہ وہ پاکستان کے ہر حصہ میں جاکر سماجی تحریکوں میں معاون ہوں یا ان کی ابتدا کریں۔

(۴) — ایک ایسا انتظام مرتب کیا جائے جس کے تحت مردہ یا اپاہج ادیبوں کے خاندان اور بچوں کی سماجی اور اقتصادی بہتری یقینی ہو۔

(۵) اگر کسی ادیب کے خلاف فحش نگاری کا الزام لگایا جائے تو چارہ جوئی سے پہلے رائٹرس گلڈ کی رائے لی جائے۔

(۶) ریڈیو اور حکومت کے اشاعتی ادارے انتخاب کرتے وقت سوائے ادبی اقدار کے کسی اور تمیز کو بروئے کار نہ لائیں۔

(۷) — ادیبوں اور کتابوں کے دوسرے ملکوں سے تبادلے زیادہ اور جلد ہوں۔

(۸) — حکومت سماجی اور اقتصادی منصوبے بناتے وقت اس بات کا خیال رکھے کہ ایسے حالات پیدا ہوں جن میں تحریر ذریعۂ معاش اور باعزت پیشہ بن سکے۔

(۹) سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار ادیبوں کو فوراً رہا کر دیا جائے یا ان پر عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔

(۱۰) حکومت جب ادیبوں کو دوسرے ملکوں کی دعوتوں پر بھیجے تو اسے چاہیئے کہ وہ رائٹرس گلڈ سے ناموں کے بارے میں مشورہ لے۔

(۱۱) — کتابوں کی درآمد برآمد پر سے مروجہ پابندیاں اٹھالی جائیں۔

(۱۲) — سرکاری ملازم ادیبوں پر سے مندرجہ ذیل پابندیاں اٹھالی جائیں:

(الف) ریڈیو اور حکومت کے اشاعتی اداروں سے انہیں کسی تخلیق کے پچیس روپے سے زیادہ نہیں ملتے۔ یہ تفریق ختم ہونی چاہیئے۔

(ب) مروجہ قوانینِ ملازمت کے تحت انہیں اپنی کتابوں کی آمدنی کا ایک تہائی حکومت کے خزانہ میں داخل کرنا پڑتا ہے۔ یہ پابندی دور ہونی چاہیئے۔

حقوقِ مصنفین

مروجہ کاپی رائٹ ایکٹ میں چند تبدیلیوں اور اضافوں کی ضرورت ہے۔ یہ مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) — حقِ طباعت بحقِ مصنف محفوظ ہونا چاہیئے۔ فروختگی حقوق کی صورت میں ناشر زیادہ سے زیادہ پندرہ سال تک حقدار رہ سکتا ہے۔

(۲) — مروجہ ایکٹ میں تعینِ مدت کی شق میں تبدیلی کرکے ورثا کو پچاس کی بجائے سو سال تک حقوقِ طباعت دیئے جائیں۔

(۳) — موسیقار کی مرتب کردہ دھنوں کو بغیر اجازت استعمال کرنے پر پابندی لگائی جائے۔

(۴) — مروجہ ایکٹ میں مناسب دفعہ کا اضافہ کیا جائے جس کی رو سے نصابی کتب کے جملہ حقوق بحقِ مصنف یا ورثا محفوظ ہونے چاہئیں اور اس کا معاوضہ بصورت رائلٹی ادا کیا جائے بجز اسکے کہ مصنف کو یہ بات منظور نہ ہو۔

(۵) — حکومت سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اس تجویز پر غور کرے کہ مصنف اپنی کتاب کی طباعت کا معاوضہ دوسرے ملکوں سے بھی وصول کر سکے۔ خصوصاً ہندوستان اور پاکستان کے درمیان اس نوعیت کا معاہدہ۔

(۶) — مصنفوں کی کتابوں کی آمدنی پر انکم ٹیکس وصول نہ کیا جائے۔

(۷) — ایک ایسا قومی کتب خانہ قائم کیا جائے جس میں ہر مصنف کی ہر کتاب کی دو جلدیں کتاب کا ناشر لازمی داخل کرے۔

★ رائٹرس گلڈ ایک دارالاشاعت قائم کرے جسکے مقاصد مندرجہ ذیل ہوں:-

(۱) — دارالاشاعت ادیبوں کے فائدے کے لئے ہو۔

(۲) — اراکین انجمن اور اساتذۂ قدیم کی تخلیقات کی اشاعت۔ اسکے علاوہ انجمن کا کوئی اور مجوزہ کام۔

(۳) — پاکستان کی قومی زبانوں اور علاقائی بولیوں کے ادب کی ترویج اور فروغ۔

(۴) — مشرقی اور مغربی پاکستان میں ثقافتی ہم آہنگی کیلئے کتابوں کا تبادلہ اور ترجمے۔

(۵) — بیرونی ممالک میں پاکستانی ادب کی نمائندگی۔

(۶) — دوسری زبانوں کی کلاسیکی اور شہرۂ آفاق تخلیقات کے ترجمے۔

خطبۂ استقبالیہ :

شاہد احمد دہلوی :

جنابِ صدر، معزز خواتین و حضرات!

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

میں اس کنونیشن کی مجلسِ عمل کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں مندوبین کا شکریہ ادا کرنا واجب نہیں سمجھتا کیونکہ جس کام کے لئے وہ زحمت فرما کر یہاں جمع ہوئے ہیں وہ ان کا اپنا کام ہے البتہ میں اس امر پر اظہارِ مسرت کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان سب نے مجلسِ عمل کی آواز پر لبیک کہا اور مکمل تعاون کا ثبوت دیا۔
پاکستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ قومی پیمانہ پر ادیبوں کا اتنا بڑا اجتماع ہوا ہو آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اس اجتماع میں ہر مکتبِ خیال اور ہر پیشہ کے ادیب موجود ہیں۔ یہ واقعی ایک تاریخی اور عظیم اجتماع ہے۔

اس وقت میرا مقصد کوئی ادبی قسم کا خطبہ پیش کرنا نہیں ہے ادبی موضوعات پر مقالے ہماری آخری نشست میں پڑھے جائیں گے جو صاحبان مقالات کے ذاتی خیالات ہوں گے۔ میری حیثیت میزبان اور میرے موجودہ فرائض کی ذمہ داریاں اس کی متقاضی بھی نہیں تھیں۔ کنونیشن کے انتظام میں جو دشواریاں تھیں، میں ان کی تفصیل بتا کر بھی آپ کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ ہاں اتنا عرض کر دوں کہ نو آدمیوں کی ایک مختصر سی تنظیم سے جس کے پاس نہ دفتر ہو نہ ملازمین نہ روپیہ ہو اور نہ فرصت اور جس کے سب رکن دن بھر فکرِ معاش میں مبتلا رہتے ہوں اتنے بڑے کام کی تکمیل کی امید نہیں کی جا سکتی تھی مگر جب نیت ثابت ہوتی ہے تو منزل آسان ہو جاتی ہے اس شہر سے چند مخلص ادیب اٹھے اور انہوں نے سر جوڑ کر پاکستانی ادب اور ادیبوں کی بہتری کے لئے ایک تجویز سوچی ان کی ہمت اور اللہ کی مدد سے وہ تجویز اس بڑے اجتماع میں تبدیل ہو گئی۔

خواتین و حضرات!

۴ر دسمبر ۱۹۵۸ء کو کراچی کے آٹھ ادیبوں نے ایک اعلان نامہ جاری کیا جس میں اس کنونیشن کی تجویز پیش کی، یہ ادیب کسی ایک مجلس کے رکن نہیں تھے بلکہ کسی ایک شہر کے رہنے والے بھی نہیں تھے اس اعلان نامے کے بعد انہوں نے اپنے حلقۂ عمل کو وسیع کیا اور مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی میری دلی آرزو بھی یہی تھی اس لئے باوجود خرابیٔ صحت کے میں ان کے ساتھ ہو گیا اس کے بعد انہوں نے ہر مکتبِ فکر کے کارکن ملائے اور یہ سب اُن کی اَن تھک کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم سب ایک جگہ جمع ہیں۔

کنونیشن کے بارے میں جو پہلا اعلان ہوا تھا اسے ملک بھر میں انفرادی اور جماعتی طور پر پسند کیا گیا، پریس نے بھی اس تجویز کا خیر مقدم کیا اور بہت سے اخباروں نے تفصیلی اور تعمیری اداریئے بھی لکھے لیکن اس اعلان سے چند در چند غلط فہمیاں بھی پھیلیں۔ کوئی نئی بات نہیں تھی خلوص کو اکثر شبہ کی نظر سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ کام حکومت کے اشارے پر کیا جا رہا ہے یہ گمان انہیں یوں ہوا کہ اس اعلان پر جن ادیبوں کے دستخط تھے ان میں سرکاری ملازم بھی شامل تھے یہ بھی سمجھا گیا کہ اس کام کے لئے حکومت نے خفیہ طور پر روپیہ دیا ہے ورنہ پاکستان کے ادیبوں میں یہ بات کہاں کہ اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھائیں یہ بھی کہا گیا کہ لوگ ذاتی مفاد اور ادبی مقاصد حاصل کرنے کے لئے یہ کنونشن کر رہے ہیں۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں، ظاہر ہے کہ ایسے شبہات فوری اور اضطراری کیفیت کا نتیجہ تھے لیکن ان سے مجھے اور میرے رفقائے کار کو بے حد اذیت ہوتی رہی کیونکہ پچھلے ۳۵۔۴۰ سال سے ادب کی بُری بھلی خدمت کر رہا ہوں اور مجلسِ عمل کے اراکین بھی اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ ادبی حیثیت اور ذاتی کردار رکھتے ہیں ان میں جو سرکاری ملازم ہیں اس بات پر کڑھتے تھے کہ آخر ان کا سرکاری ملازم ہونا کون سا جرم ہے آخر وہ پہلے بھی تو سرکاری ملازم تھے اس لئے جب ہم ان ہی سے برابر اس قسم کی باتیں سنتے رہے تو ہماری بہت دل شکنی ہوتی رہی اور ہم سوچنے لگے تھے کہ شاید ہم نے یہ ساری بات ہی غلط شروع کی ہے ہم میں آپس میں بھی اکثر اختلافات پیدا ہو جاتے تھے اور اندیشہ ہونے لگا تھا کہ ہماری تجویز دم توڑ دے گی مگر نیت کی صداقت اور کام کی لگن نے اس نوبت کو نہیں آنے دیا۔

قیامِ پاکستان کو ساڑھے گیارہ سال ہوئے قومی زندگی کے ہر شعبہ کی طرح ادب اور ادیبوں میں بھی افراتفری کا دور رہا۔ سیاست دانوں اور اہلِ اقتدار نے اول تو ہماری

گذارشات کی طرف کبھی توجہ نہیں کی۔ اور اگر کبھی توجہ کی تو یہ کی کہ کچھ ادیبوں پر کوئی نہ کوئی الزام لگا کر انہیں قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کر دیا جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ادب کو فیشن کے طور پر اختیار کرنے والے چند افسروں کے ہاتھ میں پورے ملک کی ادبی تحریکوں اور تہذیبی اور ثقافتی اداروں کی اجارہ داری آگئی سرپرستی کی تو یہ کہ چند شعرا اور ادبا کو ذاتی وظیفوں سے نواز دیا ہمیں ان وظائف اور افسروں کی ان بالادستیوں پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ پچھلی حکومتوں نے اتنا بھی کیا تو بہت کیا۔ مگر ہم اپنی شکایت میں حق بجانب ہیں کہ انہوں نے اتنے بڑے ملک کے اس سرمایہ کو جسے ادب کہتے ہیں اور ترقی دینے کی مطلق کوشش نہیں کی شاید وہ ادیبوں کو بدقماش، بےکار اور تماش بینوں کی ایک تفریحی جماعت اور کبھی کبھار ریڈیو پر مشاعرہ اور ایک آدھ تقریر کرا دینا یا ایک آدھ سرکاری رسالے کے اجرا کو پورے ملک کی تہذیبی اور ثقافتی مطالبات کا جواز سمجھتے رہے انہوں نے مصوری، رقص اور موسیقی پر تو کبھی کبھار توجہ دی بھی کیونکہ ایسی نمائشوں اور محفلوں میں انہیں کچھ مزا بھی آجاتا تھا اور ان کی ذہنی پس ماندگی کا پول بھی نہیں کھل پاتا تھا مگر ادب اور ادیب کی بنیادی حیثیت سے وہ کبھی آگاہ نہ ہو سکے۔ اس غلط اندیشی کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو تازگی، جوش اور عمل ہمارے ادیبوں میں ۱۹۴۷ء میں تھا وہ ۱۹۵۸ء تک یکسر معدوم ہو گیا۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ حکومتیں اچھا ادب پیدا کر سکتی ہیں۔ جی نہیں ہرگز نہیں، ادب تو اچھے ادیب ہی پیدا کرتے ہیں اور اپنی مرضی سے پیدا کرتے ہیں ان پر پابندی لگائی جائے یا ہدایات کا پابند کیا جائے تو وہ لکھنا بند کر دیتے ہیں لیکن حکومتیں ملک میں اچھے اور برے ادیب پیدا کرنے کے حالات ضرور پیدا کر سکتی ہیں اس سے کسی کو انکار نہیں کہ کوئی حکومت ہمارے سئے نئی امیدیں لے کر آتی ہے۔ اب وہ کہاں تک اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہوتی ہے۔ اس کا جواب وقت دے گا یہ ضرور ہے کہ اس حکومت کے تعمیری پروگرام کو دیکھتے ہوئے ہمیں بھی اس کوشش کا خیال پیدا ہوا اور ہمیں یقین ہے کہ یہ حکومت ادب اور ادیبوں کے معاملے میں ہمدردی اور روشن خیالی کا ثبوت دے گی لیکن اس کے علاوہ حکومت سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا ہے اور سرکاری ملازم کارکنوں نے جو بھی کام کیا ہے وہ اپنی ذاتی حیثیت میں کیا ہے ویسے ہم حکومت کا احترام ضرور کرتے ہیں۔ حکومت ہمارے ہی مصالح کی ضامن ہے اور ہمارے اپنے ملک کی ہے، دنیا جانتی ہے لیکن ہم نے اس اجتماع کے لئے ہر قسم کے معاملات میں آزاد اور خود کفیل رہنے کی کوشش کی چاہے وہ مادی کوئی مقصود رہے یا عقت ہمیں نہیں تھے۔ بیرونی دروازے کھلے ہوئے تھے، ہم نے ریلوے کے محکمے سے مندوبین کے لئے اس رعایت کی درخواست کی جو وہ صحافیوں اور طالب علموں کو دیتا ہے مگر پہلی بار ہماری درخواست رد کر دی گئی اور جب ہم نے مالی مجبوریوں سے متاثر ہو کر وہاں کے اعلیٰ افسروں کو کنونشن کی اہمیت جتائی تو انہوں نے اتنی رعایت منظور فرمائی کہ نچلے درجے کے ٹکٹ پر اس سے اونچے درجہ میں سفر کیا جا سکتا ہے یہ حکم بھی اتنی دیر سے جاری ہوا کہ ہم اب تک اپنے کئی مندوبین کے بارے میں پریشان ہیں کہ انہیں اس رعایت کا فائدہ حاصل ہو سکا یا نہیں۔

ہم نے پی۔ آئی۔ اے سے بھی درخواست کی تھی اور ان کے پاس اپنے نمائندے بھی یہ عرض کرنے بھیجے کہ وہ مشرقی پاکستان کے مندوبین کے لئے کرایہ میں کمی کر دیں مگر وہاں سے صاف انکار ہو گیا حالانکہ یہ ادارہ بڑے افسروں اور امرا کو لندن کی سیر بارہا کرا چکا ہے۔ ع

ساقی یہ تری کم نگہی یاد رہے گی

مرکزی حکومتی اداروں سے ان دو درخواستوں کے علاوہ ہم نے کوئی اور درخواست کی اور نہ ادھر سے کوئی پیشکش قبول ہوئی، ہاں ابھی ۲۳ جنوری کو جب ہمارے مشرقی پاکستان کے مندوبین کی تعداد بڑھ گئی اور ان کے مالی مسائل جواب دے گئے تو آئیت، ویسٹ پاکستان یونٹی فنڈ سے کچھ روپیہ صرف مشرقی پاکستان کے مندوبین کے لئے لیا گیا وہاں کے مندوبین کے کرایہ کا انتظام ان ہی کی کوشش اور ان ہی کے روپیہ سے ہوا ہے۔

لاہور کے مندوبین کا کرایہ وہیں کے ایک مخیر علم دوست نے دیا ہے مگر ان کے قیام کا انتظام چند دیگر مقامات سے آنے والے مندوبین کے کرایہ اور ان کے قیام کا انتظام اور کراچی کے اخراجات کراچی کے چند دیگر علم دوست حضرات نے کیا ہے، وہ سب عطیات جو اس سلسلہ میں وصول ہوئے ان کی فہرست اسی خطبے کے آخر میں دے دی گئی ہے ہم نے کوئی مہم چندے کی نہیں چلائی بلکہ رضاکارانہ امداد دی گئی۔ کیا جن علم دوستوں نے ہمارے مقاصد کو دیکھتے ہوئے خود پیش کی یہ سب اپنے ناموں کا اعلان نہیں چاہتے مگر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کے نام پردۂ خفا میں نہ رکھے جائیں۔

اچھا اب خواہ گراں ہو تھوڑا سا گلہ بھی سن لیجئے ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ کنونشن پاکستانی ادیبوں کا ایک نمائندہ اجتماع ہو، اس لئے دعوت نامے جاری کرنے میں اس بات کا بہت خیال رکھا گیا ہے کہ کسی آبگینہ کو ٹھیس نہ لگنے پائے مگر عددی حساب سے پاکستانی ادیبوں کی تعداد ہزاروں بلکہ لاکھوں تک ہے ظاہر ہے کہ ہم سب کو نہیں بلا سکتے تھے لہٰذا ایک خاصی تعداد کو شکوہ ہے کہ ہم نے انہیں نظر انداز کر دیا ہم انہیں یقین دلاتے ہیں کہ اگرچہ وہ یہاں نہیں ہیں لیکن وہ ہمارے
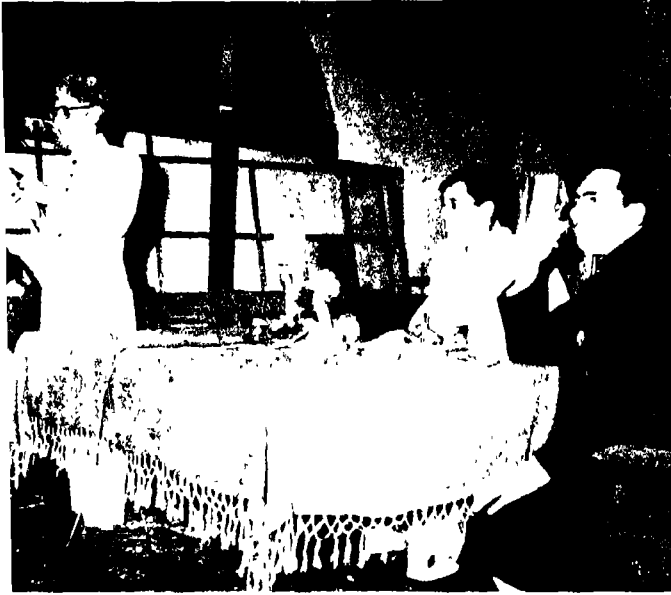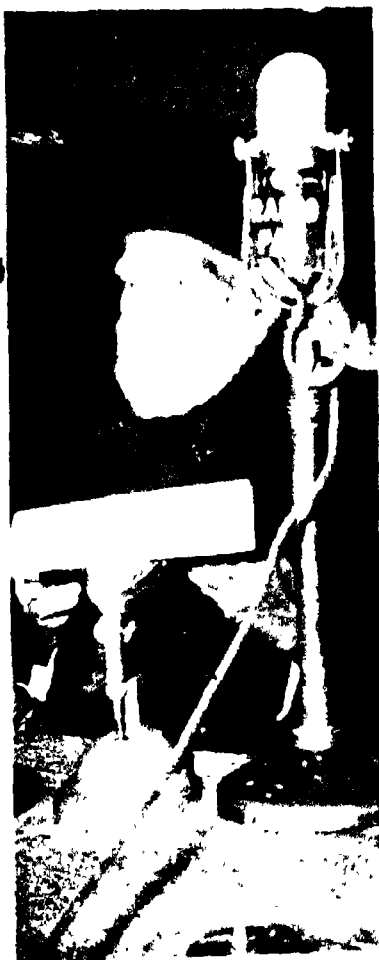
دل سے بہت قریب ہیں اور اگر مالی وسائل اجازت دیتے تو یہ اجتماع شاید دگنا ہوتا۔ ہمیں یقین کرنا چاہئے کہ کنونشن میں جو قراردادیں منظور ہوں گی وہ تمام ادیبوں کی ترجمانی کریں گی اور اس کنونشن سے فائدہ پہنچے گا تو سبھی کو پہنچے گا یہ بات ہمارے جتانے کی نہیں بلکہ خود ادیبوں کے سمجھنے کی تھی یہاں تو کوشش ہوئی کہ اجتماعی طور پر سوچ بچار کیا جائے مگر ایسے بھی لوگ تھے جنہوں نے معاملات کو ذاتی سطح پر دیکھنے کی کوشش کی۔ اسی شہر کراچی میں چند اہلِ قلم نے ہمارے دعوت ناموں اور تحریری یاددہانیوں کو شاید اس لئے قابلِ جواب بھی نہیں سمجھا کہ سرکاری یا سماجی طور پر ان کی حیثیت عام مندوبین سے بہتر ہے۔ افسوس کہ ہماری برادری کے بعض غلط اندیش افراد نے ہم پر بہتان باندھے اور بعض نے دھمکیاں تک دے ڈالیں۔ ایک اچھے خاصے ادیب نے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا کہ معمولی ادیبوں کو کنونشن میں کیوں بلوایا گیا ہے۔ [illegible] فرماتے ہیں کہ بھیڑوں میں اونٹ کیوں بلائے جاتے ہیں۔ ع

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

چند حضرات کو یہ خطرہ پیدا ہوا کہ ادب کی باگ ڈور نوجوانوں کے ہاتھ میں دی جا رہی ہے کچھ لوگوں نے بڑے بڑے کرائے اور اخراجات مانگے کچھ نے اس کنونشن کو مشاعرہ سمجھ کر ہوں تول شروع کر دیا کچھ کو یہ اعتراض رہا کہ یہ کام نو آدمیوں نے کیوں شروع کیا اور گھر گھر پھر کر ہر شہر میں دستخطوں کی مہم کیوں نہیں چلائی۔

یہ چند مثالیں اس لئے پیش کی گئیں کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ہماری برادری میں اس ذہنیت کے لوگ بھی موجود ہیں۔ اس ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے باہمی اختلافات کو مٹانے کی ضرورت ہے، ادب ایثار چاہتا ہے ادب رواداری چاہتا ہے نخوت و منافقت کا شکار سب کچھ ہو سکتا ہے ادیب نہیں ہو سکتا۔"

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی سے معاف

آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

اگر اس اندھیرے میں کچھ درخشاں کرنیں نہ ہوتیں تو شاید یہ اجتماع ہی نہ ہونے پاتا۔ شکر ہے کہ دور دراز سے آنے والے اپنے انتظامات سے بھی آئے ہیں کچھ بزرگوں نے ہمیں حوصلہ افزا خطوط لکھے ہمیں مکمل تعاون کا یقین دلایا اور جہاں تک ہو سکا ہمارے لئے بڑے فخر کی بات ہے ان رضا کاروں کی بدولت ہمیں اپنے بجٹ میں دفتر کے لئے کوئی تنخواہ دار کارکن نہیں رکھنا پڑا۔

خواتین و حضرات!

ہمارا کام آپ سب کو ایک جگہ جمع کرنا تھا بحمد اللہ آپ سب یکجا ہو گئے آپ کے سامنے مجوزہ طریقہ کار ہے اور پروگرام کی تفصیل وضاحت بھی موجود ہے۔ آپ چاہیں تو پروگرام کو قبول کر لیں آپ چاہیں تو اس میں مناسب ترمیم کر لیں یا اسے بالکل ہی ساقط کر دیں اور نیا پروگرام بنا لیں آپ چاہیں تو اس اجتماع ہی کو ختم کر دیں ہمارا پہلا اور آخری مقصد تو یہ تھا کہ آپ سب ایک بار جمع ہو جائیں تاکہ ہم ادب کے لئے اپنے لئے اور اپنے ملک کے لئے مضبوط اور ٹھوس تجاویز پر عمل کریں اور ہماری درخواست ہے کہ اس اجتماع میں نزاعی ادبی مسائل زیرِ بحث نہ لائے جائیں یہ اجتماع عددی حساب سے اتنا بڑا ہے کہ انفرادی قراردادیں پیش کرنے یا ان پر انفرادی تقریروں اور مباحثوں کی گنجائش نہیں اس لئے ہم نے موصول شدہ قراردادیں موضوعات پر تقسیم کر دیں جو آپ کے منتخب کردہ نمائندہ سنبھالیں گے قراردادیں پیش کرنے والے مختلف کمیٹیوں سے اپنے طور پر رجوع کر سکتے ہیں کیونکہ اگلے اجلاس میں سکریٹری صاحب خود اعلان کر دیں گے کہ کن صاحب کی قرارداد کس کمیٹی کے پاس گئی ہے کمیٹیوں کی سفارشات آپ کے سامنے اجلاس میں پیش ہوں گی۔

ہمارے پاس صرف تین دن ہیں اور کام بہت ہے آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ یہاں کتنے "نظم و ضبط" اور کتنی محنت کی ضرورت ہے یہ بات میرے کہنے کی نہیں ہے مگر یاد رکھئے کہ یہ ہماری تاریخ میں پہلا اور قیمتی موقع ہے اس میں بہت روپیہ خرچ ہوا ہے اور بہت سے کارکنوں نے بڑی قربانیاں کی ہیں یہ بھی نہ بھولئے کہ اس وقت نہ جانے کس کس کی آنکھیں ہماری طرف لگی ہوئی ہیں اور وقت ہم سے کیا تقاضہ کر رہا ہے اگر ہم ادبی مباحثوں میں الجھ گئے یا ذاتی بنیادوں پر سوچنے لگے تو وقت بڑے افادی نتائج کے بغیر گزر جائے گا اور ہمیں امید نہیں کہ کوئی ادارہ یا فرد اس کنونشن کے ناکام ہو جانے کے بعد مستقبل قریب میں اتنے بڑے کام کو دوبارہ شروع کرنے کی ذمہ داری لے ہمیں یقین ہے کہ اگر ہمارا یہ اجتماع ایک منظم مجلس کی شکل میں بدل جائے تو حکومت مدد کرے یا نہ کرے، ہم اسے ایک خود کفیل ادارہ بنا سکتے ہیں۔

خواتین و حضرات!

مجلسِ عمل کے اراکین نے طے کر لیا ہے کہ اس خطبے کے بعد ہم اپنی جماعتی حیثیت کو ختم کر دیں گے اور عام مندوبین کی حیثیت اختیار کر لیں گے اور ان کے جماعتی

فرائض صرف اس کنونشن کے انتظامات تک محدود رہیں گے۔ مثلاً مہمانوں کے انتظامات اور اجتماع کی کارروائی۔ اب اس پورے اجتماع کو جاری رکھنے کی ذمہ داری آپ کی ہے اور آپ سب اپنے قانونی اور ادبی فرائض سے واقف ہیں ہم نے داعی بن کر جو زحمت اٹھائی ہے وہ اب ختم ہو جانی چاہیئے۔
چنانچہ اب ۴ دسمبر کے اعلان پر دستخط کرنے والے آٹھ افراد میں اپنی جماعتی حیثیت ختم کرنے کا اعلان کرتے ہیں اب یہ پورا اجتماع اس امت مرحومہ کا جانشین ہے۔ اس لمحے کے بعد آپ کیا کرتے ہیں اور تاریخ آپ کو کس طرح یاد کرتی ہے یہ سب آپ کی ذمہ داری ہے

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حساب کم و بیش را

خطبۂ صدارت :

جسیم الدین :

معزز خواتین و حضرات

ادیبوں کے اس جلسے کی صدارت کی عزت بخشے جانے پر میں اپنے کو بڑی الجھنوں میں مبتلا پاتا ہوں۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں مجھ سے کہیں زیادہ دیرینہ سال قابل اور ممتاز شخصیتیں موجود ہیں ایسی شخصیتیں جنہوں نے زندگی بھر ادب کی خدمت انجام دی ہے اور اپنے ہم وطنوں کے لئے جنت سے آب حیات مہیا کیا ہے۔ اگر ان ہی میں سے کسی صاحب نے مسند صدارت کو رونق بخشی ہوتی تو یہ فرض بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ انجام پاتا۔ ان کی خدمات کی قدر دانی بھی ہو جاتی اور آپ حضرات بھی ایک خاص قسم کی خوشی اور فخر محسوس کرتے۔ مجھے اب اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا شدید احساس ہو رہا ہے اور یہ احساس مجھے نڈھال کئے دیتا ہے۔ مجھے اپنے چاروں طرف ادب کے پھولوں کا جو چمن دکھائی دے رہا ہے اس کے رنگ و بو سے ساری فضا مہکتی اور دمکتی دکھائی دے رہی ہے۔
اس وقت مجھے مشرقی پاکستان کے دریائے پدما، جمنا، میگھنا، دھلیشوری، مدھومتی، کمار، سیتالکھا کے خوشگوار ترین سے تخلیق شدہ بھٹیالی گیتوں کے ساتھ ساتھ جہلم، بیاس اور سندھ کے کنارے بسنے والے کاشتکاروں کی جھونپڑیوں سے اٹھتے ہوئے گیتوں کی گنگناہٹوں کا ایک حسین امتزاج نظر آرہا ہے۔
ان دیہی دوشیزاؤں کے نرم و نازک گلے سے حکی پیستے وقت جو میٹھے نغموں کا آبشار پھوٹ بہتا ہے وہ دور دراز مشرقی پاکستان کی اہلیوں کے ترنم کے ساتھ ہم آغوش ہو کر جامدانی آنچلوں کا روپ دھار رہا ہے اور آج اس جگہ کیسے کیسے چابک دست باغبانوں کا اجتماع ہے۔ ایرانی بلبل ہزار داستاں کے نغموں کے مترنم اور گلاب کے خونِ جگر کے رنگ سے کتنی حسین و جمیل تصویریں بنتے رہتے ہیں کشمیری شالوں کے رنگ برنگ شامیانوں کے سائے میں تربوز کی قاشوں کے رنگ میں جو غزلیں ڈھلتی ہیں ان کی شیریں لہریں دور مشرقی پاکستان سے جا جا کر ٹکرا رہی ہیں۔ ہم مشرقی پاکستان کے گل بوٹوں سے مزین سوزن کاری کے شاہکاروں پر دور دور تک پھیلے ہوئے دھان کے کھیتوں کی ہریالی کا تحفہ لے کر آئے ہیں۔ آم اور کٹہل کے گھنیرے سایوں میں کسانوں کی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں پروان چڑھنے والی سادہ داستانیں محبت اور سرسوں کے کھیتوں میں ارغوانی مٹر کے پھولوں سے سجی ہوئی رنگین کہانیوں کا روپ دھار لائے ہیں۔ سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد کے خرمہ، اخروٹ، بادام، کھجور، انار کے درختوں کے سایہ میں آپ حضرات جو خواب دیکھتے رہتے ہیں۔ وہ ہماری کہانیوں کے ساتھ مل کر ایک ایسی دوستی کا رشتہ استوار کر رہے ہیں۔ اگر میں اس دوستی کے سنگم کا باعث ہو سکا تو یہ بات میرے لئے بڑے فخر کی ہوگی۔ آج پاکستان کو وجود میں آئے بارہ سال ہو چکے ہیں۔ وطن کے سیاسی اور اقتصادی بہت سے مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا رہا ہے۔ وطن کے دونوں بازوؤں سے سیاسی اور صحافتی اور تعلیمی جماعتوں نے مختلف ممالک کے سفر اختیار کئے۔ مگر بدنصیب ادیبوں کی خاطر کسی کو بھی سوچنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ ملک کے لکھنے والوں کے متحدہ اجتماع کے متعلق کسی نے بھی نہ سوچا۔ آپ میں سے جن حضرات نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اس اجتماع کی کوشش فرمائی ہے۔ ان کی خدمت میں میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ اس عظیم اجتماع میں ادیبوں کے مسائل سمجھنے کا جو موقع آپ نے فراہم کیا ہے اس سلسلے میں آپ کی کوششوں کو سراہے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔

قیام پاکستان کے بعد ملک کا صرف ایک طبقہ ہی بلندیوں پر گامزن ہونے لگا۔ ملازمت کا میدان ہو، صنعتی اداره ہوں یا تجارت سب ہی پر اسی ایک طبقہ

کے لوگوں نے قبضہ جما لیا مگر ایک اور طبقہ تھا جو کہ رفتہ رفتہ تحت الثریٰ میں دھنستا چلا گیا اور یہ طبقہ دیس کے عوام پر مشتمل تھا اور ہم لکھنے والے اسی طبقہ سے متعلق ہیں اور ہم ہی یہ داستان بیان کریں گے کہ ہم کس طرح نیچے گرتے چلے گئے۔ آئیے آج آپ مشرقی پاکستان کے المناک حادثہ کی بابت سنئے۔

صورت خواہ کچھ مختلف ہی کیوں نہ ہو، مجھے یقین ہے کہ مغربی پاکستان کے ادیبوں کی بھی ان ہی جیسی درگت ہوئی ہوگی۔ آزادی سے قبل کے زمانے میں ہم کو اپنی تخلیقات کی طباعت و اشاعت کے لئے جدید ترین مواقع میسر تھے۔ لیکن آزادی کے بعد مشرقی پاکستان کی راجدھانی ڈھاکہ میں آنے کے بعد ان تمام ذریعوں سے ہم محروم ہو گئے۔ آزادی سے قبل مشرقی پاکستان میں گنتی کے چند ہی اسلامی کتابوں کے ادارے موجود تھے اور انہوں نے سرمایہ دار ناشروں کے ساتھ مقابلہ کر کے کسی نہ کسی طرح اپنی ہستیاں برقرار رکھی تھیں۔ اس زمانے میں ہندوؤں کے اثر سے متاثر تعلیمی اداروں میں ان کی شائع کی ہوئی کتابیں شاذ ہی پڑھائی جاتیں لیکن آزادی کے فوراً بعد ہندو ہمارے تعلیمی اداروں کو خیرباد کہہ کر سرحد پار چلے گئے، جب کتابوں کی تجارت کی اجارہ داری مسلمان ناشروں کے ہاتھ میں آئی تو وہ راتوں رات بڑے آدمی بن جانے کے خواب دیکھنے لگے اور حکومت سے کتابوں کی اشاعت کے نام پر کاغذ کے پرمٹ حاصل کر کے چور بازار میں فروخت کرنے لگے۔ نظموں، ڈراموں، ناول، وغیرہ جیسی غیر درسی کتابیں جو اسکول میں نہیں پڑھائی جاتیں، چھاپنی بند کر دیں، اور جو غریب مصنف پانی کے مول اپنی کتابوں کے حق طباعت دینے پر آمادہ ہو جاتے صرف ان ہی کی دو چار کتابوں کو نہایت بھدے انداز میں چھاپ کر ناشر حضرات گویا ان پر احسان فرماتے۔ کتابوں کی طباعت، اشاعت، کتابت، جلد، گرد پوش غرض ہر چیز نہایت گھٹیا ہوتی اس لئے لازمی طور پر خریدار کے لئے ان میں کوئی کشش اور دلچسپی نہیں ہوتی غرض ہم ناشروں کے ہاتھوں کا کھلونا بنے رہے اور اب تک بنے ہوئے ہیں۔

ڈھاکہ پہنچ کر میں نے ناشروں سے اپنی کتاب نقشی کانتھا راٹ (FIELD OF THE EMBROIDERED QUILT) کی بابت بات چیت شروع کی۔ ایک ناشر صاحب نے مستقل ۶ مہینے تک مجھے دوڑایا۔ آخر ایک دن انہوں نے فرمایا:

"اگر آپ اپنی کتاب کا حق فروخت کر دیں تو میں اسے شائع کر سکتا ہوں"۔ میں انہیں تسلیم کر کے چلا آیا اور اس لئے چلا آیا کہ میرے والد صاحب نے مجھے ایم۔ اے پڑھانے میں خاصہ روپیہ صرف کیا تھا اور میں گورنمنٹ میں ملازم تھا۔ اگر میری گزر اوقات صرف کتاب پر منحصر ہوتی تو مجھے ناشر صاحب کی خدمت میں پانی کے مول اپنی کتاب فروخت کرنی پڑتی اور اس طرح مستقبل میں میری اولاد اس کتاب کی آمدنی سے محروم ہو جاتی۔ مظہر الحق مشرقی پاکستان کے ایک ادیب ہیں جنہوں نے تقریباً ایک سو کتابیں لکھی ہیں ان کی بعض بعض کتابوں کے تیس تیس ایڈیشن شائع ہوئے ہیں لیکن وہ ایک بھکاری کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتابوں کا حق بہت ہی سستے داموں میں فروخت کر دیا ہے۔ اس قسم کی مثالیں مشرقی پاکستان میں اور بھی ملیں گی ناشروں کی جبرہ دستیوں کا اب سدباب ہونا چاہئے وہ ادیب جو غربت اور افلاس سے تنگ آ کر اپنی کتابوں کے حقوق کوڑیوں کے مول بیچ دیتے ہیں وہ ان کو واپس ملنا چاہئے۔ اب ہمیں ایک ایسے قانون کی ضرورت ہے جس کی رو سے کوئی بھی ناشر کسی ادیب کی کتاب کا حق خریدنے سے قاصر ہو۔ مجھے امید ہے کہ حکومت اس سلسلے میں جلد از جلد مناسب قدم اٹھائے گی۔ برصغیر ہند و پاکستان کا مشہور افسانہ نگار فضل الحق آزادی کے بعد امیدوں اور تمناؤں سے لبریز دل لے کر ڈھاکہ آیا۔ نوکری اور روزگار کی تلاش میں۔ لیڈروں اور وزیروں کے دروازوں کی خاک چھانتا رہا مگر پیہم فاقہ کشی نے اسے ایک دن ریل گاڑی کے پہیوں کے نیچے خودکشی کرنے پر مجبور کیا۔ ایک گرانقدر زندگی جو ابھی پوری طرح نکھرنے بھی نہ پائی تھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت کی تاریکی میں کھو گئی۔ اگر وہ زندہ رہتا تو آج اس کی لکھی ہوئی کہانیوں سے ہمارا وطن اور ہمارا سماج یقیناً فیضیاب ہوتا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ایک ادیب کو غربت سے دوچار ہونا ہی چاہئے غریبی میں جذبات کی تربیت ہوتی ہے لیکن زمانہ حال میں یہ مقولہ نہیں چل سکتا۔ غیر ممالک کے ادیبوں کے متعلق مجھے جہاں تک معلوم ہے ان کی آمدنی اچھی خاصی ہے غربت اگر اچھی تخلیق کے لئے ضروری ہوتی تو پھر ہمارے یہاں برنارڈ شا، ابسن اور ہارڈی جیسے ادیب کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ اس کے برعکس افلاس اور غربت کی وجہ سے ہمارے بہت سے ہونہار ادیب لکھنے ہی سے باز آ جاتے ہیں۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ ناشر صاحب میری کتاب چھاپنے پر رضامند نہیں تھے اور چھپوانے میں بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا ضروری تھا۔ عام طور پر پڑھنے والوں کے لئے کتاب کو جاذبِ نظر بنانے میں عمدہ کاغذ نفیس چھپائی اچھے بلاک میکر اور ایک اچھے آرٹسٹ کی ضرورت پڑتی ہے۔

کرنافلی مل کی وجہ سے کافی کاغذ تو مل جاتا ہے۔ مگر جس کاغذ سے جاذبِ نظر کتاب تیار ہو سکتی ہے وہ کاغذ نہیں ملتا۔ مزید برآں کرنافلی کاغذ کے دام بھی زیادہ ہو گئے ہیں۔ آزادی کے بعد مطبع کے مالکوں نے چھپائی کی اجرت بھی بڑھا دی ہے۔ چھاپہ خانوں کی تعداد محدود ہے۔ مگر چھپائی کا کام زیادہ ہے لہٰذا اجرت کے لئے مقابلہ نہیں ہے۔ ڈھاکہ میں بلاک کے کارخانے من مانے دام وصولتے ہیں۔ اس پر بھی اچھے بلاک تیار نہیں ہو پاتے۔ میرے دوست زین العابدین کے زیرِ ہدایت

مخصوص کر دی تھی۔ اس ملک کی میں نے سیر کی ہے اور یہ دیکھا ہے کہ رسالوں کی دوکان کے سامنے خریدنے والوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ فرانسیسیوں نے جو دنیا کے ادب و فن میں اتنا بیش بہا اضافہ کیا ہے اس میں حکومت کا بڑا ہاتھ ہے۔

حصولِ پاکستان کے بعد بہت سی حکومتیں آئیں اور ختم ہوگئیں ان کے بہت سے بیانات اخباروں میں شائع ہوئے مگر ان میں کہیں بھی ادیبوں کا ذکر نہیں ملتا۔ ہماری موجودہ حکومت نے مختلف وقتوں میں جو بیانات دئے ہیں ان سے ہماری امید بندھتی ہے لیکن جب تک عوام ہمارے متعلق سوچنا شروع نہ کر دیں گے اس وقت تک حکومت کی مدد بھی محض بیکار ثابت ہوگی۔ ہمارے ملک کو ادیبوں سے غفلت اور حقارت نہ کرنا چاہئے ہم ہی ملک کی چلتی پھرتی یونیورسٹیاں ہیں، ہمارا کام وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں پر تعلیمی اداروں کا کام ختم ہو جاتا ہے ہم لوگوں کو ڈراموں، ناولوں نظموں اور اپنے دیگر فن پاروں کے تاج محلوں سے مسحور کرتے ہیں اگر ہم نہ ہوں تو پڑھے لکھے لوگ جاہل ہی رہ جائیں ہم صرف نعمت کے وقت ہی سرور و نشاط مہیا نہیں کرتے ہم سکون بخشتے ہیں۔

تصفیہ ستائے ہیں گھروں میں آشتی فراہم کرتے ہیں ہم فراق زدوں کے لئے خیالوں کا فردوس بہم پہنچاتے ہیں اور دو رافتادوں کے زخم دل پر الفاظ کا مرہم رکھتے ہیں۔ ہم سے غفلت نہ برتنا چاہئے ہم چھوٹے ہوں یا بڑے لیکن ہماری بھی ضرورت ہے۔ ہماری ہی تحریروں کے ذریعے سے بڑے بڑے ادیب پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر بہاری لال اور مائکل مدھوسدن نہ ہوتے تو رابندر ناتھ ٹیگور بھی وجود میں نہ آتے ہم ادیب مختلف زبانوں اور مختلف ممالک میں اپنی تخلیقات سے آپ کے لئے سرور و نشاط فراہم کرتے رہتے ہیں۔ اپنے قلم کی طاقت سے مختلف زمانوں میں ہم نے کتنی ہی حکومتیں بنائی ہیں کتنی حکومتیں بگاڑی ہیں کتنے آدرش پھیلائے ہیں کتنے آدرشوں کے ساتھ ٹکرائے ہیں اور اس طرح انسان کے لئے ایک رستہ تیار کیا ہے جس وقت آپ خواب میں مدہوش ہوتے ہیں اس وقت ہم مٹی کے دئے جلا کر آپ کی خاطر کہانیاں لکھتے ہیں راتیں جاگ کر بتا دیتے ہیں اور وہ کہانیاں آپ کے سکھ دکھ میں رفاقت کرتی ہیں۔ آپ ہم سے غفلت نہ برتیں ہم کو اعزاز بخشنا وطن کو اعزاز بخشنے کے مرادف ہے بڑی بڑی ریاستیں تباہ ہو جاتی ہیں سیاسی لیڈر تاریخ کے اوراق میں محبوس ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم ادیب ہر دور میں زندہ رہتے ہیں، اگر کالی داس اس کی حمایت نہ کرتا تو آج راجہ وکرمادتیا زندہ نہ رہتا کیونکہ آج کالی داس ہی کے کارناموں میں راجہ وکرمادتیا اور اس کے حکومت کا ذکر ملتا ہے۔

بادشاہوں، نوابوں کا زمانہ ختم ہوگیا۔ وطن کے عوام ہی کو اب ہماری سرپرستی کرنی ہوگی ماضی میں جو دو ایک رہنما ادب کے لئے کچھ کرنا چاہتے تھے ان سے عالم و فاضل حضرات فن کاروں کے نمائندے بن کر تمام تر فیض حاصل کر لیا کرتے تھے۔ اب وہ دور آگیا ہے کہ علماء و فضلاء کو یونیورسٹیوں میں تحقیقات کے کام میں مصروف رہنے دیا جائے تاکہ ادیبوں کے اجتماع میں صرف "اہلِ ذوق" اور "اہلِ احساس" کی آوازیں سنی جا سکیں۔ کنول کے حسین جھیل میں بگلے اور بطخ کا کام تو صرف گھونگے اور سیپیاں ہی تلاش کرنا ہے۔

مشرقی پاکستان کے ادب کا مقابلہ اکثر ہندوستانی ادب اور خاص طور پر مغربی بنگال کے ادب سے کیا جاتا ہے۔ ان کی حسین اور دیدہ زیب کتابیں دیکھ کر ہمارے پڑھنے والوں کی آنکھوں میں چکا چوند مچ جاتی ہے۔ اگر وہاں کی حال کی شائع شدہ کتابوں کے ساتھ مشرقی پاکستان کی کتابوں سے صحیح مقابلہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ نہیں کہ ہم نے کچھ نہیں کیا صرف ٹیگور کو مستثنیٰ کر کے مغربی بنگال یا ہندوستان میں کوئی ایسا نہیں جس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہو۔ ترجمہ میں نظم سے زیادہ ناول کی اصلیت برقرار رہتی ہے ہندوستان کے بہت سے ناولوں کو مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا ہے مگر ان میں سے ایک نے بھی تو تھامس ہارڈی یا مان کے ناولوں کی طرح بین الاقوامی شہرت نہیں حاصل کی۔ ٹیگور کے ناول ملک کی سرحدوں کے پار نہیں پہنچ سکے۔ ٹیگور کے نوبل پرائز حاصل کرنے کے یہ معنی نہیں کہ ہم ایک پیر صاحب کے خاندان کی طرح وہاں کے تمام ادیبوں کی شان میں خراج عقیدت پیش کرتے رہیں۔ وہ اور ہم بین الاقوامی ادب میں ایک مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود کیا بات ہے کہ بھارت کے ادیبوں کی کتابیں ہمیں زیادہ پسند ہوتی ہیں۔ وطن کے لوگ ہماری کتابیں کیوں نہیں پڑھتے۔ اس "کیوں" کا جواب دینے کے لئے ہمیں ماضی کی سمت دیکھنا ہوگا۔

انیسویں صدی میں مغربی ثقافت بنگالہ میں داخل ہوئی۔ حکومت اور دولت کھوئے ہوئے مسلمانوں کو اس ثقافت سے علیحدہ رکھنے کے لئے طرح طرح کے جال بچھا دئے گئے تاکہ وہ اس سے فیض نہ حاصل کر سکیں۔ زندگی کی مختلف راہوں میں کامیابی حاصل کر کے ہندو معاشرہ اپنی ذات سے مرکوز ہوگیا۔ ہندوستانی ثقافت، اقتصادیات میں ترقی کرتے کرتے بہت ہی بلند مقام پر پہنچ گئے اور ہم مسلمان ان کی زندگیوں کو پریوں کی کہانی کی طرح سمجھنے لگے اور جوں جوں ہم ان کی عزت کرتے گئے وہ اور بھی اونچے ہوتے چلے گئے اور ان کی نگاہوں سے ہماری ثقافت اور ہمارا ادب گرتا گیا خود ہمارے ادیب ان کی نقالی کرنے لگے اور بعض اپنی تخلیقوں میں

ہندو کردار پیش کرنے لگے غرض اس طرح ہمارے اندر ایک احساس کمتری سرایت کر گیا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے بھولے بھالے کسانوں کے دل میں ساہوکار اور بنیا کچھ کی کہانیاں ایک سنسنی سی پیدا کر دیتی ہیں۔

مغربی ثقافت کو اپنا کر ہندو لوگ آگے بڑھ گئے، تمام ہندوستان میں یہ جملہ تسلیم کیا جانے لگا کہ بنگال جو آج سوچتا ہے ہندوستان اس پر کل غور کرتا ہے، لیکن نقل کی چمک زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہتی آج زندگی کی جدوجہد میں بنگالی پیچھے رہ گئے ہیں اس کا سبب شاید یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تہذیب و تمدن کو نظر انداز کر کے غیر ملکی تصورات کی مدد سے اپنے کو بڑھانے کی کوشش کی تھی۔ اپنے ادب کی روایتوں کو چھوڑ کر جو غیر ملکی اثرات انہوں نے لئے تھے اور اس کی وجہ سے جو ادب وجود میں آیا اُسے باہر والوں نے بین الاقوامی مرتبہ نہیں دیا اور اپنے دیس کے لوگوں نے بھی اسے اپنا نہ سمجھا۔ پریس کی سہولتوں کے باوجود جدید لکھنے والوں میں کتنے ایسے ہیں جو چنڈی داس، ودیا پتی، گوبند داس اور کتنے رام کی طرح مقبول ہو سکے ہیں۔

ادب کے میدان میں ہمارا ادب اطمینان بخش نہیں پھر بھی پاکستان کی ادبی حیثیت ایک دم معمولی اور ادنیٰ بھی نہیں ہے مشرقی پاکستان کے کاشتکاروں کے لوک گیت انگریزی، فرانسیسی اور چیک زبانوں میں ترجمہ کئے گئے ہیں اور ان کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اگر ہم سندھ، پنجاب اور سرحد کے لوک گیت اکٹھا کریں اور ترجمہ کریں تو ہماری ادبی عزت بڑھے گی۔ ہمارے لوک گیت کا فن دنیا میں حیرت پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم انہیں جمع کر کے دنیا کو نہ دکھائیں تو ہم آنے والی نسلوں کی نظروں میں غدار وطن ٹھہریں گے تعلیمی و اقتصادی معیار جس طرح بدل رہے ہیں ان سے لوک گیت کے نشان تک غائب ہو جائیں گے۔ آج چین اور جاپان بھی اپنی قدیم ثقافت کو دنیا کے سامنے پیش کر کے تخلیقی فنکاروں اور ادیبوں کو اپنے معیار بلند کرنے میں مدد دے رہے ہیں مشہور مغربی ادیبوں اور فنکاروں نے ان دونوں ممالک کے سامنے اپنے استفادہ کا اقرار کیا ہے۔

مشرقی پاکستان کا "پوتھی ادب" دنیا کے عجائبات میں سے ہے الف لیلیٰ، قصص الانبیاء جیسی بڑی کتابوں کو نظم میں ترجمہ کیا گیا ہے، اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں یہ پوتھی ادب رفتہ رفتہ مرتا جا رہا ہے اس لئے کہ جس منحوس ٹائپ اور کاغذ میں وہ چھاپا جاتا تھا وہ اب تیار نہیں ہوتا۔ اس پوتھی ادب کو اگر نہ بچایا گیا تو وہ لوگ جو اس سے سرور حاصل کرتے ہیں وہ ہم کو بددعا دیں گے۔

میرے چاروں طرف ممتاز حضرات تشریف فرما ہیں۔ آپ کے درمیان مجھے بہت سے ممکنات کے خواب دکھائی دے رہے ہیں۔ آپ میں سے کوئی کسی سے نہ بڑا ہے نہ چھوٹا۔ ملک کو پروان چڑھانے اور ترقی کی منزلوں کی طرف لیجانا ہم سب کا فرض ہے۔ ہمارے قلموں ہی کے ذریعے سے تاریخ بنانے والے بڑے بڑے ادیب و شاعر ابھریں گے۔ خدا ہم سب کو کامیاب کرے۔

کنونشن سے خطاب:

ڈاکٹر مولوی عبدالحق:

محترم صدر پاکستان و معزز حاضرین!

میں آپ صاحبوں کو، سارے ملک کے اہل قلم کو ایک مرکز پر جمع دیکھ کر جو مسرت محسوس کرتا ہوں اسے الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں ان باہمت دوستوں کو مبارکباد دیتا ہوں جن کی کوششوں سے یہ مبارک موقع آیا۔ اس نادر اجتماع پر نظر ڈالتا ہوں تو اس میں ایسے ایسے فاضل ادیب دیکھتا ہوں جو جدید عہد کے تقاضوں، ادبی نکات و رموز اور ادیبوں کے حقوق و فرائض پر زیادہ بصیرت، گہرائی اور قوتِ نقد سے بحث کر سکتے ہیں۔ یہ نوجوان ادیب زیادہ مستعد اور باخبر ہیں۔ میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں یہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔ بنظر انصاف دیکھا جائے تو ان کے ہوتے ہوئے میں اس منصب کا مستحق نہیں جو آپ نے مجھے عطا فرمایا ہے۔ غور کرتا ہوں تو اس کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ بڑھوں کا ادب ہماری قدیم تہذیب میں داخل ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے زمرے میں کچھ دقیانوسی خیالات کے حضرات شریک ہیں جو اپنی آبائی سنت پر قائم ہیں انہوں نے اہلیت سے زیادہ سفید بالوں کا لحاظ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ بُری سے بُری چیز میں بھی خوبی کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل آتا ہے۔ طوالت عمر جسے میں اس زمانہ میں ایک عذاب سمجھتا ہوں اور جس سے میں سخت بیزار ہوں آج آخر وہی عیب میرے حق میں ہنر ثابت ہوا، اور مجھے

اس کی بدولت اپنے اہلِ قلم دوستوں سے ملنے، باتیں کرنے اور ان سے بہت کچھ جاننے اور سیکھنے کا موقع ملا، اس کے لئے مجھ پر آپ کا شکر واجب ہے یہ شکر رسمی نہیں صدق دل سے ہے۔

جب ہم حسن اتفاق سے ایک جا جمع ہیں تو کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اپنے ادب کا سرسری جائزہ لیں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنے ادب شعر و سخن، غزل سرائی، فسانہ گوئی، مشاعرہ بازی، معمولی کتابوں کی تالیف و ترجمہ تک محدود کر رکھا ہے۔ ہم نے قیام پاکستان کے بعد سے کسی ایسی تالیف یا تصنیف کا اضافہ نہیں کیا جسے دنیا کے سامنے نہ سہی پاکستان ہی کے اہلِ فکر کے سامنے یہ کہہ کر پیش کر سکیں کہ یہ ہمارے ادب کی قابلِ قدر تخلیق ہے جب تک ہم علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کر کے اعلیٰ پایہ کی کتابیں تالیف و تصنیف نہیں کریں گے، ہمارے ادب کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوں گی اور نہ وہ کسی مہذب اور ترقی یافتہ ملک میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ہمیں بہت سے کھانچے بھرنے ہوں گے، بہت سی خامیاں رفع کرنی ہوں گی اور بہت سی کمیوں کو پورا کرنا ہوگا۔ ہمیں مستند جامع لُغات اور اِن سائیکلو پیڈیا ئیں لکھنی ہوں گی۔ استناد کی کتابیں تالیف کرنی ہوں گی، فلسفہ، سائنس، تاریخ و معاشیات وغیرہ کی تالیفات کے انبار لگانے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہمیں دنیا کی اُمہاتِ کتب کے ترجمے کرنے ہوں گے۔ یہ انقلابی اور عہد آفریں کتابیں ہمارے خیالات میں روشنی پیدا کریں گی اور رہنمائی کا کام دیں گی، انجمن ترقی اردو نے یہ کام شروع کیا تھا اور بہت کچھ کیا بھی لیکن پاکستان میں آکر یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ میں بڑی خوشی سے اس امر کا اظہار کرتا ہوں کہ حال میں سید محمد تقی صاحب نے بعض ایسی اُمہاتِ کتب کا ترجمہ شروع کیا ہے جو نہایت مشکل اور دقیق علمی مسائل پر مبنی ہیں یہ کام آسان نہیں۔ اس کے لئے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے اور اگر ہمیں اپنے ادب کی ترقی مدنظر ہے تو یہ چنے چبانے ہی پڑیں گے۔ یہ کام ہماری یونیورسٹیوں اور کالجوں کے پروفیسروں کا تھا جو ان مضامین میں اعلیٰ ڈگریاں رکھتے ہیں مگر وہ اس سے قاصر رہے اس میں ان کا اتنا قصور نہیں جتنا ہمارے نظامِ تعلیم کا ہے، پروفیسر صاحب نے جو کچھ پڑھا تھا انگریزی زبان کے ذریعہ سے پڑھا تھا۔ اب جو انہیں پڑھانے کا منصب ملا تو اپنے شاگردوں کو بھی انگریزی کے ذریعہ پڑھایا۔ معلم اور متعلم دونوں اس علم کو جو انہوں نے حاصل کیا ہے اپنے اہلِ وطن تک پہنچانے سے قاصر ہیں۔ ان کا علم گونگے کا گُڑ ہے۔ اگر یہ نظامِ تعلیم نہ بدلا تو صدیوں تک ہم انگریزی کے محتاج رہیں گے۔ اور علم کی اشاعت ملک میں عام نہ ہونے پائے گی۔ آج کل صدیوں کی منزلیں برسوں بلکہ مہینوں میں طے ہونے لگی ہیں جو نظامِ حکومت تین مہینے میں انقلابی قسم کی زرعی اصلاحات نافذ کر سکتا ہے وہ ایک مہینے میں اپنی زبانوں کو ان کا چھنا ہوا مقام بھی واپس دلا سکتا ہے۔ انگریزی زبان ایک عمدہ زبان کے طور پر باقی رہنی چاہیئے اور رہے گی۔ لیکن ہماری درسگاہوں میں ذریعۂ تعلیم کی حیثیت سے فوراً ختم ہونی چاہیئے۔ اور آج ہی ابھی غروبِ آفتاب سے قبل ختم ہونی چاہیئے۔ اگر یہ مشکل ہے تو زرعی اصلاحات بھی مشکل تھیں اور آج سے چند روز قبل کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ ایسی انقلاب انگیز اصلاحیں جن کا نام سنتے ہی ہمارے مصلحین اور سیاست داں کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے اس طرح آناً فاناً عمل میں آجائیں گی۔ مشکل اسی وقت تک مشکل ہے جب تک ہم اسے مشکل سمجھتے ہیں انسان دل پر رکھ لے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

ہمارے ادب میں جو جمود پایا جاتا ہے وہ بہت غور طلب ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ اس موضوع اور اس کے ا[illegible]باب پر ہمارے ادیبوں نے بہت کچھ بحث کی ہے لیکن اصل سبب کی تلاش کے لئے ہمیں کسی قدر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ تاریخ عالم شاہد ہے کہ جب کسی ملک یا قوم میں سیاست کاری مسلط ہو جاتی ہے اور اس کا تسلط جس قدر قوت کے ساتھ ہوتا ہے اسی قدر اس ملک کی ثقافتی زندگی مفلوج ہو جاتی ہے اس کی ذہنی، روحانی اور اخلاقی قوتیں زوال پذیر ہونے لگتی ہیں، اقتدار کی ہوس اس قدر غالب ہو جاتی ہے کہ توجہ مفاد عامہ سے ہٹ کر اپنی ذات اپنے عزیز و اقارب اور اپنی پارٹی کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ سیاست میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ زندہ بنیادی اصولوں کی جگہ مردہ وقتی ضابطے کارفرما ہو جاتے ہیں سیاست کار حکومت کی مشین کو اپنی ہوس کے لئے استعمال کرتے ہیں، اور اس ہوس کے زیر سایہ سازشیں اور تخریبی کارروائیاں پھلنے پھولنے لگتی ہیں، خیانت، بددیانتی، جعلسازی، رشوت، مکر و فریب، غارت گری اور ہر قسم کی بداخلاقیاں عام ہو جاتی ہیں۔ ہماری حکومت کے پچھلے چند سال اسی لعنت میں مبتلا تھے اگر کچھ دن اور یہی حال رہتا تو حکومت کی کل پاش پاش ہو جاتی، ایسی حالت میں انقلاب کا آنا لازم تھا انقلاب آیا بر وقت آیا۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ اس طرح آیا کہ کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔

اب سیاست کاری کی لعنت اٹھ گئی ہے اور وہ ماحول جس نے زندگی کے تمام شعبوں میں جمود پیدا کر دیا تھا۔ باقی نہیں رہا آپ نے صحیح وقت پر اپنی انجمن قائم کی ہے کیونکہ انفرادی کوششیں زیادہ کارگر نہیں ہو سکتیں، اجتماعی قوت بہت بڑی قوت ہے اسی کے بل پر آپ اپنے مقاصد پورا کر سکتے ہیں۔

اس وقت جو فضا ملک میں پیدا ہو گئی ہے اسے غنیمت سمجھنا چاہئے اور اب ہمیں ذہنی اور ادبی جمود کو توڑنے کے لئے وہی کرنا ہوگا جو اٹھارویں صدی میں فرانس میں ان انسائیکلو پیڈسٹ (ENCYCLOPAEDIST) نے کیا تھا۔ اس عالی ہمت جرأت مند مفکروں کی مختصر جماعت نے علم و حکمت کی شمع روشن کی اور اوہام باطلہ اور خیالات فاسدہ کا قلع قمع کرنا شروع کیا۔ سائنس اور فلسفہ کے مسائل اور موضوعات کو نئے پیرائے اور عام فہم زبان میں پیش کیا۔ کائنات اور انسان، ریاست (سٹیٹ) اور معاشرہ، مذہب اور اخلاق کے قدیم نظریات اور روایات کو بڑی جرأت اور آزادی سے عقل و حکمت کی کسوٹی پر کسا اور تمام علوم انسانی کو از سر نو نئی بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس انسائیکلو پیڈیا نے خیالات میں تغیر عظیم پیدا کر دیا اور ملک میں بیداری کی نئی لہر دوڑا دی۔ مگر حکومت اور کلیسا دونوں بڑی قوتیں درپئے آزار ہوگئیں، طرح طرح کی سختیاں کی گئیں، تکلیفیں پہنچائی گئیں۔ حکومت کی طرف سے کتاب کے چھپنے کی ممانعت کر دی گئی۔ مطبع میں چھپتے وقت مضامین میں تحریف کر کے کتاب مسخ کر دی گئی لیکن باوجود ان تمام موانعات اور مصائب کے ان علم و ادب کے شیدائیوں نے کام جاری رکھا۔ آخر پولیس کی مسلسل ایذا رسانی سے آبرو نی اور تعزیر سے تنگ آکر بعض رفیق رفاقت ترک کر کے الگ ہو گئے مگر ان کے بہادر سرخیل اور رہنما دیدرو باوجود ان صعوبتوں کے اپنے عزم پر قائم رہا اور شب و روز جن کی طرح کام کرتا رہا۔ راتوں کو پروف پڑھتے پڑھتے اور مضامین نگاروں کے مسودوں کی اصلاح کرتے کرتے اس کی بصارت میں فرق آگیا۔ مگر اس نے اپنا کام پورا کر کے چھوڑا۔

اس انسائیکلو پیڈیا کی مجلدات اب آپ کو اپنے کسی کتب خانے میں نظر نہ آئیں گی اور شاید ہی اب کسی نے اس کی کوئی کتاب یا اس کے مضامین پڑھے ہوں لیکن ان ہی معتوب اور ستم رسیدہ ادیبوں کے افکار و خیالات نے اس عظیم انقلاب کی راہ ہموار کی جو انقلاب فرانس کے نام سے مشہور ہے، جس نے سارے یورپ کو ہلا دیا تھا اور جس کا اثر دور دور تک پہنچا۔ اس پر سینکڑوں کتابیں لکھی گئیں اور اب بھی ہر زبان میں اس کی داستان دہرائی جاتی ہے۔

ہماری قوم میں بھی ہماری ہی زندگی میں ایک ایسا ذہنی انقلاب واقع ہو چکا ہے۔ یہ انقلاب سر سید احمد خان کی پر خلوص سرفروشانہ مساعی سے عمل میں آیا۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے قوم کے اس مصلح اعظم کو قریب سے دیکھنے اور کام کرنے کی سعادت حاصل رہی ہے۔ سر سید علیہ الرحمۃ نے ایک شکستہ دل افسردہ اور مایوس قوم میں ایک نئی روح پھونک دی۔ جمود توڑا، جدید مغربی تعلیم کا ڈول ڈالا، توہمات، تعصبات، اوہام باطلہ کی بیخ کنی کی اور عقلیت کی طرف مائل کیا۔ اپنی تحریروں اور مقالوں سے اردو ادب کا درجہ بلند کر دیا اور سنجیدہ اور حکیمانہ مضامین لکھنے کا ڈھنگ ڈالا۔ یہ کام کچھ آسان نہ تھا۔ ہم اس وقت ان مشکلات کا اندازہ نہیں کر سکتے جو سر سید کو پیش آئیں۔ سر سید نے جس وقت اس منزل میں قدم رکھا تو مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا، طعن و تشنیع سب و شتم کی بوچھار ہونے لگی، کفر کے فتوے صادر ہوئے اور ملحد، دجال، کرسٹان کے خطاب عطا ہوئے۔ اس نے سب کچھ سہا اور اپنے عزم پر قائم رہا اور آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوا اور قوم کو غفلت و محرومی سے نکال کر ساحل مراد پر پہنچا دیا۔

میں نے ذہنی جمود توڑنے کی دو مثالیں پیش کی ہیں، ایک فرانس کے انسائیکلو پیڈسٹوں کی، دوسری سر سید احمد خاں کی۔ آپ نے دیکھا ان عالی ہمت مجاہدوں نے کیسی کیسی سخت مصیبتیں اور صعوبتیں، رسوائیاں اور ایذائیں برداشت کیں مگر اپنے مقصد سے منہ نہ موڑا۔ یہ بنی نوع انسان کے محسن ہیں اور زندۂ جاوید ہیں۔ ہمیں ان سے سبق حاصل کرنا چاہئے۔ صرف انجمن بنا دینا، قرارداد میں منظور کر دینا یا حکومت سے امداد حاصل کر لینا کافی نہ ہوگا۔ ہمیں کام کرنا ہوگا۔ کام سے مراد یہ نہیں جو سرکاری دفتروں میں ہوتا ہے کہ دس بجے آئے اور چار بجے چلتے بنے۔ یہ کام جو ہمیں کرنا ہے پوری قوت اور استقلال سے کرنا ہوگا۔ دن رات، گرمی سردی، بارش سے بے نیاز ہو کر کام سے عشق ہونا چاہئے۔ عشق نہیں تو وہ کام نہیں بیگار ہے۔

جو لوگ کسی بڑے مقصد کے لئے پر خلوص اور صداقت سے والہانہ کام کرتے ہیں اور اپنی جان تک کھپا دینے کی پروا نہیں کرتے وہ کبھی نہیں مرتے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور جو اپنی جان عزیز رکھ کر محنت سے جی چراتے ہیں وہ مردہ ہیں۔

سلطنتوں کے تخت الٹ جاتے ہیں، قومیں فنا ہو جاتی ہیں، تہذیبیں مٹ جاتی ہیں لیکن ان کے ادیبوں اور مفکروں کے کارنامے زندہ رہتے ہیں۔ قدیم یونان کو ایران کی جرار فوجوں نے صفحۂ ہستی سے مٹا دیا مگر ان کے حکماء، ادبا اور مفکرین زندہ ہیں، ان کا کلام بڑے احترام سے پڑھا جاتا ہے اور اس کا ذہنی اور روحانی فیض بدستور قائم ہے۔ اب بھی جب کبھی سائنس یا فلسفہ میں کوئی نیا نظریہ یا ایجاد ہوتی ہے تو اس کا سراغ کسی نہ کسی صورت سے قدیم یونان میں ملتا ہے۔ اس کے فلسفیوں، صناعوں اور ادیبوں کے نام ہر ملک اور ہر زبان میں زبان زد خاص و عام ہیں حتیٰ کہ ہمارے گھروں میں ہماری عورتیں

بچے، افلاطون، ارسطو، سقراط و بقراط کا نام اس طرح لیتے ہیں گویا وہ ہم ہی میں سے تھے۔

ادیب قوموں کی اصل پونجی ہیں اس پونجی کی حفاظت اور نگہداشت قوم کا مقدس فرض ہے۔ ہمارے ادیبوں کا طبقہ کس مپرسی کی حالت میں ہے ان کی محنت رائیگاں جاتی ہے اس کی جیسی چاہیئے قدر نہیں ہوتی۔ بہت سے ایسے نوخیز ادیب ہیں کہ ان کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملتا بعض ایسی تصانیف گمنامی کی نذر ہو جاتی ہیں جو قابلِ قدر ہوتی ہیں ایک ادیب شب و روز کی محنت اور دماغ سوزی سے اور بعض اوقات فاقے کر کے اپنی بساط کے مطابق کوئی چیز تخلیق کرتا ہے اور بہزار دقت اس کی اشاعت کی سبیل نکالتا ہے یہ دیکھ کر اسے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرا شخص یا ناشر بغیر اجازت اسے چھاپ کر فائدہ اٹھا رہا ہے غریب ادیب کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ عدالت سے رجوع کرے۔ لیکن انصاف اتنا مہنگا ہے کہ اس کے مصارف اس کی استطاعت سے باہر ہیں پھر عدالت کا چکر بے ڈھب ہوتا ہے۔ کئی کئی مہینے بعض اوقات کئی کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس معاملہ میں بھارت اور پاکستان کے تعلقات بھی بہت تکلیف دہ ہیں بھارت والے پاکستانیوں کی اور پاکستانیوں کی کتابیں بھارتی بلا تکلف شائع کرتے ہیں۔ یہاں قانونی چارہ جوئی بھی نہیں ہو سکتی۔ غرض ادیبوں کا حال بے ادبوں کی نذر ہو جاتا ہے اور اس قسم کی بہت سی خرابیاں اور بدعنوانیاں ہیں جن کی اصلاح صرف آپ ہی کی انجمن کر سکتی ہے۔

اب آپ نے جب انجمن بنائی ہے تو اس کے ذریعہ ادب کی ترقی کے مختلف منصوبے عمل میں لا سکتے ہیں ادب اور ادیبوں کے حقوق، ادیبوں اور ناشروں کے تعلقات سے متعلق تجویزوں پر غور کر کے ضروری اور مناسب انتظام کر سکتے ہیں غرض ادب اور ادیبوں سے متعلق اس قسم کے تمام معاملات اسی انجمن کے ذریعہ طے ہو سکتے ہیں۔

ادب ایک شریف پیشہ ہے اس کی شرافت پر آنچ نہ آنے دیجیئے۔ راستی اور خلوص آپ کا شعار ہونا چاہیئے۔ آپ ادب کے ذریعہ قوم کے اخلاق اور کردار بنانے، روشن خیالی پھیلانے اور باطل خیالات اور اوہام کی تاریکی مٹانے میں بہت بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں اپنے پیچھے ایسی یادگار چھوڑ جایئے کہ آئندہ نسلیں اس سے فیض حاصل کرتی رہیں۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو!

مل کر کام کرنے میں بڑی برکت ہوتی ہے خدا کرے آپ کی یہ انجمن ادیبوں کے لئے بابرکت اور قوم کے حق میں مفید ثابت ہو:

★

تعمیرِ وطن کے باب میں ادباء کو ایک نہایت اہم خدمت انجام دینا ہے۔ انہیں روحِ اسلام
کی روشنی میں لوگوں کی رہنمائی کرنا ہے تاکہ وہ اپنی منزلِ مقصود کو جلد از جلد پا سکیں:

جنرل محمد ایوب خاں

(پاکستانی ادیبوں کا کنونشن کراچی
۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء)

★

کہ اب انسان اپنے فولادی پیکر دست و بازو، اور قوتِ برق کے باعث انسانی محنت کے اُس استحصال کی ضرورت سے درگذر ا ہے جس نے سرمایہ دارانہ نظام میں اپنے منتہا کو پہنچ کر، چند نفس پرست اور مشکوک انسانوں کی خاطر، ابنِ آدم سے اس کی قبائے انسانیت چھین لی، اسے تکمیلِ شخصیت سے محروم کر رکھا، کہ آج اب وہ اپنی ذات سے مقصد نہیں، بلکہ کسی اور کے حصولِ مقصد کا ذریعہ ہے، اور اسے اپنی ذات سے اس حد تک بیگانہ کر دیا کہ اس کا وقت اور کام اپنا وقت اور کام نہیں بلکہ غیر کا وقت اور کام بن گیا ہے۔ اس نظام میں عدمِ انسانیت کے ساتھ ساتھ، میکانکیت اور تخلیقی جوہر کا فقدان بھی اسی باعث پیدا ہوا ہے۔

لیکن یہاں اس کے اظہار سے یہ مقصود نہیں کہ میں اس کے دمِ نزع، اس کو سنگسار کر رہا ہوں۔ یہاں تو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کلچر صرف اخلاقیات کا نام نہیں اور نہ یہ صرف چند مجموعہ ہائے کلام، چند عمارات قدیم، چند تصویر بتاں اور کچھ پردہ ہائے ساز اور رنگہائے نغمہ ہی ہے کہ یہ کہنے کو ہو کہ ہم مر نے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا۔ کلچر انسان کی اس مجموعی طاقت کا نام ہے جس سے وہ وسعت اور گہرائی دونوں اختیار کرتا ہے، کلچر سائنس کو جمالِ انسانیت کے تابع کرنے اور آرٹس کو سائنس کی قوت دینے میں ہے کہ انسان اپنی انسانیت کو خارجی اور داخلی دونوں پہلوؤں سے پا تا ہے۔ اس کی آزادی اور اس کی خود مختاری اس کی انسانیت کے ساتھ متحد ہے، اور اس اتحاد میں نفاق سائنس سے نہیں بلکہ استحصال سے پڑا ہے۔ اس لئے ہمیں سرمایہ داری کو رد کرتے وقت، سائنس کو نہیں، اس کی برکات کو نہیں، اس کی عقل اور دماغ کو نہیں بلکہ اس کے استحصال کو ختم کرنا ہے جو کہ بیگانہ دل و جذبہ انسانیت رہا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارا اپنا کلچر کیا ہے؟

بس اس کی طرف فوراً آرہا ہوں، لیکن اس سے پہلے اس کے ایک بین الاقوامی رشتے کو واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آج رسل و رسائل کی سہولتوں اور ایک عالمی بازار کے ثقافتی لین دین کے باعث ایک عالمی کلچر بھی پیدا ہو گیا ہے۔ آج نہ صرف سائنس، ٹکنالوجی اور مشینیں پیداوار ہر ملک میں یکساں ہے بلکہ اخلاقیات کے بنیادی اصول اور آزادیوں کا منشور بھی یکساں ہے۔ انسان کی یہ مرکزیت جو روز بروز زبردستی جا رہی ہے لابدی ہے کہ انسان اپنی ٹولیوں اور ٹولیوں میں بٹنے سے پہلے اور بعد میں بھی ایک دل اور دماغ رہا ہے۔ ع بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔

کرۂ ارض کے سمٹنے اور بنی آدم کی مرکزیت کے اس دائرے کے بڑھنے سے ہمارے قدیم کلچر کی بہت سی نعمتوں پر پابندیاں بھی عائد ہو گئی ہیں، ہم غلاموں اور کنیزوں کے خریدنے سے محروم ہو گئے ہیں اور کیا عجب جو چند سالوں کے بعد کسی عالمی منشورِ آزادی پر دستخط کرنے کے باعث تعدادِ ازدواج کے عیش سے بھی محروم ہو جائیں۔

ان حالات میں نہ تو ہم اپنے قومی کلچر کو عالمی کلچر اور بین الاقوامی قیود کے رشتوں سے جدا کر کے پیش کر سکتے ہیں اور نہ اپنے کلچر کی کسی ایسی تاویل پر ایمان لا سکتے ہیں جو دورِ حاضر کی آگہی، امن پسندی اور آزادیوں سے بہرہ رکھتی ہو۔

ع ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است۔ یہ ایک قانونِ فطرت ہے۔ اسی طرح اس چمن عالم میں ہماری اپنی قومی شخصیت کی بھی ایک مخصوص نفسیات ہے جو پاکستان کے بننے ہی عدم سے وجود میں نہیں آئی بلکہ اپنی ایک لمبی تاریخ رکھتی ہے۔ اس نفسیات نے برِ عظیم ہند و پاک کی سرزمین پر گذشتہ چھ سات سو سالوں میں نشو و نما پائی ہے اور وہ ہیں کے مخصوص تاریخی حالات اور قوتوں سے وہ متعین ہوئی ہے۔ یہی تو ہمارا کلچر اور ہماری زبانیں، عرب، ایران اور ترکستان کے کلچر اور زبانوں سے مختلف ہیں ہر چند کہ ہمارے ان کے درمیان اسلام کا رشتہ قدرِ مشترک رکھتا ہے۔ کتنے مسلمان کن کن زمانوں میں کن ملکوں سے ہندوستان میں آئے اور کیا کیا چیزیں اپنے ساتھ لائے یہ سب جاننا بہت ضروری اور اہم ہے کیونکہ وہ چیزیں اب ہمارے کلچر کا جزو ہیں۔ لیکن یہ جاننا اس سے کم اہم اور مفید نہیں ہے کہ کیا پاکستان اور کیا ہندوستان ان دونوں ملکوں میں مسلمانوں کی اکثریت ان مقامی لوگوں کی آبادی پر مشتمل ہے جنہوں نے تصوف کی اس عظیم تحریک کے زیرِ اثر اسلام قبول کیا جس نے ہندوستان کی کایا پلٹ دی۔ اس تحریک نے نہ صرف دیر و حرم کے پردے اٹھائے بلکہ غلامی، ذات پات اور وراثتی پیشہ کے بندھنوں کو توڑ کر، انسان اور خدا کے درمیان عشق و محبت اور وحدت الوجود اور انسان اور انسان کے درمیان مہر و وفا، احترامِ نفس، احترامِ آدمیت، اخوت و مساوات، صلح و آشتی، ورزش و اخلاق کے رشتوں کی بنیاد ڈالی ہے۔

نیازارم زخود ہرگز دلے را   کہ می ترسم در آں جائے تو باشد

یہ تھا اس کا احترامِ آدمیت ع کہ اصلِ تہذیب احترامِ آدمی است۔

ادیب اور آزادیٔ تحریر

قدرت اللہ شہاب

اس سے پہلے کہ ادیب اور اس کے حقوق پر گفتگو کی جائے یہ بہتر ہے کہ ہم اس کی ذمہ داریوں کی وضاحت کر دیں وہ یہ ہیں:
پہلی یہ کہ ادیب کسی حیثیت سے بھی قانون سے بالا نہیں۔ دوسری یہ کہ وہ ایک ملک میں رہتے ہوئے کسی دوسرے ملک کا وفادار نہیں ہو سکتا، تیسری یہ کہ وہ ایک نظریہ کی تبلیغ کرتے ہوئے شاعری کی آڑ لیکر کسی دوسرے نظریہ پر عمل پیرا نہیں ہو سکتا۔

یہ حدود تمام اچھے شہریوں پر عائد ہوتی ہیں لیکن ادیب پر یہ زیادہ واضح اور شدت سے عائد ہوتی ہیں کیونکہ وہ ہر وقت عوام کی نظروں میں رہتا ہے۔ جو کچھ وہ لکھتا ہے ضروری نہیں کہ یاد کے خزانے میں گم ہو جائے بلکہ اس کے برعکس اس کے الفاظ پھیلتے اور چکر لگاتے رہتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آتی صدیوں تک اس کی آواز گونجتی رہے۔ جتنا مقبول اور جتنا جاندار ادیب ہوگا اتنا ہی اس پر ذمہ داریوں کا بوجھ بھاری ہوگا۔ وہ اتنی آسانی سے ہر بات نہیں کہہ سکے گا جتنی آسانی سے دوسرے کہہ سکتے ہیں اور کہتے ہیں۔ کیونکہ اتفاق سے اس کے سننے والے ہیں۔ اسے بڑے اطمینان سے غلط سمجھا جا سکتا ہے اور اس کے متعلق غلط رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ اثر انداز ہونے کی اہلیت ان کے لئے نعمت بھی ہے اور مصیبت بھی۔ مصیبت یہ ہے کہ ادیب جیسا غیر معمولی ذہن بھی عام ترازو میں تولا جاتا ہے۔ اگر آپ کو اس میں کوئی نقص نظر آئے تو ہو سکتا ہے کہ یہ نہ ادیب کا قصور ہو نہ آپ کی ترازو کا بلکہ یہ آپ کی اپنی نظر کی محدودیت اور اندازہ کا قصور ہو۔ ادیب آپ سے برداشت کا نہیں فہم کا طلبگار رہے۔ مجسٹریٹ یا پولیس انسپکٹر کا فہم نہیں بلکہ ایک اچھے اور برے ادب میں تمیز کرنے والے کا فہم، ایک اعلیٰ اقدار کو نظر میں رکھنے والے کا فہم۔ ایک صداقت کے پجاری کا فہم۔ آپ چور کو پکڑنے کے لئے چور کی خدمت حاصل کر سکتے ہیں لیکن لکھنے والے کے لئے آپ کو پڑھنے والے کی تلاش کرنی پڑے گی۔ نوکر شاہی جو ادیب کے حقوق پر فیصلے کرتی ہے اگر اس کا مطالعہ صرف دفتری مسلوں اور یادداشتوں تک محدود ہے اور کتابوں کی قسمت کا اس کی زندگی میں کوئی لمحہ نہیں تو یہ ہمیشہ ادیب کو غلط سمجھے گی اور اس کا مذاق اڑائے گی ایسی نوکر شاہی کی سمجھ میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی کہ جسم کی صعوبتیں ضروری نہیں کہ روح کے لئے بھی عذاب ہوں۔ اور یہ کہ خیالات کی موت واقع نہیں ہوتی اور یہ کہ دنیا کے تمام قانون اور سائنس کی تمام ترقی وہ زنجیر دریافت کرنے سے معذور رہیں جو علم اور سچائی کو گرفتار کر سکے۔ پاکستان میں بالخصوص دفتر میں لوگ من حیث الجماعت کائناتِ ذہن سے زیادہ مادی دنیا میں زندہ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں میں یہ اسلئے کہہ سکتا ہوں کہ بدقسمتی سے میں یہ جانتا ہوں۔ پاکستان میں افسروں کی تنخواہوں کا کچھ حصہ انہیں کتابوں کی صورت میں دیا جائے۔

ادیب کے لئے دوسرا بڑا خطرہ اس حقیقت سے پیدا ہوتا ہے کہ وہ وقت اور فاصلے کے تعینات سے آزاد ہو کر زندہ رہ سکتا ہے۔ وہ اَن دیکھی اور انجانی حقیقتوں کو چھوتا ہے اور اس کے مستقبل کے خواب ہو سکتا ہے کہ آج کے تقاضوں کے بالکل برعکس ہوں۔ وہ نہ پاگل ہے نہ غدار ہاں یہ ہے کہ اس کی نگاہ آپکی نگاہ سے زیادہ گہری ہے اور اس کے جذبات آپ کے جذبات سے زیادہ شدید ہیں۔ جب تک آپ اپنے ذہن کو اس بلندی تک لیجانے میں کامیاب نہیں ہوتے آپ ادیب کو ہمیشہ غلط سمجھیں گے۔

ادیب کے لئے تیسرا خطرہ اس کی اقتصادی پسپائی ہے۔ ہمارے ہاں کتابیں اسلئے نہیں بکتیں کہ وہ سستی نہیں ہیں جو خرید سکتے ہیں وہ پڑھتے نہیں۔ جو پڑھنا چاہتے ہیں خرید نہیں سکتے، اس تمام تضاد میں جو شخص فائدہ اٹھاتا ہے وہ ناشر ہے۔ وہ ادیب کے خون کا آخری قطرہ تک چوس لیتا ہے اور پھر بھی

اسے کھلا رہتا ہے کہ خون میں مناسب گرمی نہیں تھی وہ ادیب کو اپنی تجارت کے فروغ کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اسی لئے اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایک ان پڑھ عربی ناشر پر ہمارے ادب کا انحصار ہے وہ جو چاہتا ہے ادیب لکھتا ہے اور عوام پڑھتے ہیں۔ اگر ادیب اپنی کاوشوں کے سہارے اقتصادی طور پر آزاد نہ ہوئے تو ناشر ان کے ذہنوں کی چور بازاری کرتا رہے گا اور ہمارے ادب کا معیار گرتا جائیگا۔

یہ چند خطرات ہیں جن سے ہمارے ادیب دوچار ہیں لیکن یہ تمام خطرات اندرونی ہیں ان سے بڑا بھی ایک خطرہ ہے جو اس کے ذہن کو پروان نہیں چڑھنے دیتا ہے۔ یہ خطرہ بیرونی ہے۔

ہمارا چھوٹا سا ملک ہے۔ ہم غریب ہیں ہم نے اپنے معاملات میں خود الجھنیں ڈال دی ہیں۔ ان الجھنوں کی وجہ سے دنیا میں ہمارے کئی ہمدرد پیدا ہو گئے ہیں امداد دینے والے، مذاق اڑانے والے اور ہمدردی کے پردے میں دشمنی کرنے والے۔ چلئے یہ بھی ٹھیک ہے لیکن جو سب سے زیادہ خطرہ کی بات ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اقتصادی اور سیاسی ابتری نے ہمارے آدرش دھندلا دئے ہیں۔ ہم کچھ امیدیں اور تمنائیں لے کر چلے تھے۔ پاکستان کسی منفی نعرہ کی پیداوار نہیں یہ ایک مثبت نظریہ کا نتیجہ ہے۔ مگر جب خود ہم نے اپنے نظریات کو پس پشت ڈال دیا تو ایک خلا پیدا ہو گیا۔ ہر قسم کے لوگ دنیا کے ہر حصہ کے بسنے والے طرح طرح سے اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ ہم مختلف اور متضاد نظریات کی آماجگاہ بن گئے ہیں ہمارے ذہنی مکتب بنانے کی فکر ہو رہی ہے کوئی اسے ماسکو میں تعمیر کرنا چاہتا ہے کوئی واشنگٹن میں اور کوئی کلکتہ میں۔ ارادے ہر ایک کے مختلف ہیں۔ ماسکو اور کلکتہ والے بیخ کنی کے قائل ہیں۔ واشنگٹن والے خیال کو دوسری راہ پر لگانا چاہتے ہیں لیکن یاد رکھئے ہمارا ذہنی کعبہ کہیں نہیں صرف پاکستان میں ہے۔ پاکستان کے ادیب عالمی سیاست کی بساط کا مہرے نہیں بننا چاہتے۔ ہم غریب ہیں، ہم جد و جہد کر رہے ہیں لیکن ہمارا اپنا ذہنی اور ثقافتی افق ہے۔ ہمیں کچھ دیر اپنے چمن کی بھی سیر کرنے دیجئے۔

اس بین الاقوامی سیاسی بازیگری کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہماری تخلیقی قوتوں اور صلاحیتوں پر پچھلے چند سالوں میں بہت زنگ لگ چکا ہے۔ غیر زبانوں کی متون معمولی کتابیں ہمارے ادیبوں پر ترجمے کے لئے ڈال دی ہیں اور ہمارے ادیبوں نے یہ سودا خوشی سے منظور کر لیا ہے۔ ہمارا اگر کوئی بہترین ادیب اپنی کاوش اور محنت سے کوئی تخلیق پیش کرتا ہے تو بازار میں اس کے مشکل سے دس آنے ملتے ہیں لیکن اگر وہ کسی دوسرے درجہ کے مصنف کی کسی گھٹیا کتاب کا ایک صفحہ ترجمہ کر لے تو اسے دس روپے مل جاتے ہیں۔ آخر ہمارے ادیب بھی زندہ رہنا چاہتے ہیں اسلئے ان میں سے اکثر سائبیریا کے جنگلوں اور کیلی فورنیا کے باغوں کی خوشہ چینی میں مشغول ہیں۔ دو تعلقات دہقان کے کھیت اور ناہور کی عظمتوں کے کوئی گیت نہیں گاتا۔ اس "قومی لام گریزی" سے ہمارے تخلیقی سوتے سوکھتے جا رہے ہیں اور ہمارے اظہار اور خیال کی راہیں مسدود ہوتی جا رہی ہیں

آخر میں میں حکومت اور ادب کی آزادی کے تعلق پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ تین مہینے پہلے تک سیاستدانوں نے ہر قسم کی آزادی کو ترقی دی تھی۔ خصوصاً گھونٹنے کی آزادی ایک فن کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ غیر محدود آزادی کے زمانہ میں مجھ میں یہ کچھ کہنے کی جرأت نہیں تھی مگر آج جب کہ مارشل لاء کی بہتر دفعات میرا احاطہ کئے ہوئے ہیں اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر میرے سامنے بیٹھے ہیں، میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آزادی سے وہ ساری باتیں کہہ سکتا ہوں جو میں نے کہی ہیں۔ میرے خیال میں آپ کا اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہئے۔

★

سرپورتاژ :

ادیبوں کا کنونشن

جمیل الدین عالی

"ہم پاکستانی ادیب اپنے آپ کو اپنے ملک کی عظمت، عالمی امن اور انسانی ارتقا کے لئے وقف کرتے ہیں۔"

یہ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کی سہ پہر تھی۔ ڈھلتی ہوئی دھوپ جس میں ابھی تمازت باقی تھی۔ کراچی کے (کے جی اے) ہال میں ملٹے ہاتھ کے سیدھے دروازے سے گذرتی ہوئی صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ انھیں ۱۰۲ درجے بخار تھا اور ہم منتظمین نے ان کے لئے نشست مخصوص کرتے وقت یہ بات سوچی ہی نہیں تھی۔ کہ اس طرف دھوپ پڑے گی جس سے بچنے کے لئے کوئی انتظام نہیں ہے۔

میں اسٹیج سکریٹری تھا۔ وہ پہلی صف میں بالکل میرے سامنے بیٹھے تھے۔ اور میں انھیں بائیں ہاتھ سے دھوپ کی تمازت کا مقابلہ کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ میں ان کی نشست تبدیل نہیں کر سکتا تھا۔ میں ان سے معذرت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بیمار اور بے چین تھے۔ مگر ہمہ اشتیاق ہمہ گوش اور ہمہ توجہ بنے بیٹھے تھے۔

ابن الحسن پاکستانی ادیبوں کا منشور پڑھ رہا تھا۔

"ہم ان انسانی حقوق میں اپنے ایقان کا اعادہ کرتے ہیں۔ جو اقوام متحدہ کے منشور میں بیان کئے گئے ہیں۔ ادیبوں کی حیثیت سے ہم اپنے حق آزادی کے اظہار پر فخر کرتے ہیں کیونکہ آزادیٔ اظہار کے بغیر تخلیقی ادب بے معنی ہے۔"

ابن الحسن ایک دبلا پتلا بتیس سال کا نوجوان ہے۔ وہ کنونشن کے آٹھ کارکنوں میں سے ایک تھا۔ نہ کوئی اتنا بڑا ادیب بھی نہیں تھا جسے منشور پڑھنے کا اعزاز بطور استحقاق دیا جاتا۔ وہ اتنا با اثر افسر بھی نہیں ہے۔ بلکہ فوج میں ایک معمولی میجر ہے اس نے سولہ سترہ افسانے لکھے ہوں گے اور اسے بہت سے لوگ نیا ادیب کہتے ہیں۔ مگر یہ منشور اس کا حق تھا۔ اس نے اس منشور پر اپنی راتیں صرف کی تھیں۔ اس پر مشرقی پاکستانیوں اور مغربی پاکستانیوں سے گھنٹوں بحثیں کی تھیں۔ اس نے منشور کو اپنی زندگی بنا لیا تھا۔ وہ اسے ایک نوزائدہ اور ناتواں بچے کی طرح۔ محفوظ رکھے پھرتا تھا۔ اور جب اس کے مسودے کو منشور کمیٹی نے منظور کیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اور اب یہ منشور پڑھ رہا تھا۔ پاکستانی ادیبوں کا پہلا منشور۔ جب اسٹیج پر مولوی عبدالحق کے برابر بیٹھا تھا۔ مولوی صاحب اس اجلاس کے صدر تھے ان کی بوڑھی آنکھوں نے بڑے بڑے معرکے دیکھے ہیں۔ وہ سرسید کے ہم عصر ہیں۔ اور صرف بڑے ادیب ہی نہیں بلکہ بڑے کارکن بھی ہیں۔ مولوی صاحب اس منشور کو ایک بے نیاز صدر کی سی بے پروائی کے ساتھ نہیں سن رہے تھے۔ جس کا کام صرف صدارت کرنا ہوتا ہے۔ وہ ابن الحسن کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک نقطہ کو غور سے سن رہے تھے۔ منشور انگریزی میں پڑھا جا رہا تھا۔ اور یہ بات مولوی صاحب کو ضرور ناپسند ہوگی۔ مگر منشور تین بجے منظور ہوا تھا۔ اور قومی زبانوں میں ترجموں کا وقت نہیں تھا۔ اس لئے بمجبوری اور غیر ملکی مہمانوں اور پریس کا لحاظ رکھتے ہوئے اسے انگریزی ہی میں پڑھا جا رہا تھا۔ اور مولوی عبدالحق۔ بابائے اردو اسے بڑے غور سے سن رہے تھے اور میں اسے رشک سے دیکھ رہا تھا خواہ وہ کوئی بڑا کام کرے یا نہ کرے وہ امر ہو گیا ہے۔

میں نے ابن الحسن کا چہرہ صرف ایک بار دیکھا جب اس نے ایک لمحہ کے لئے صحافیوں کی طرف رخ کیا اس کا چہرہ عام طور پر کسی کو متاثر نہیں کرتا۔ بالکل معمولی سا چہرہ ہے۔ مگر اس وقت اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔ اس کی آواز میں ان ڈھائی سو ادیبوں کے دل و دماغ شامل تھے۔ جو سامنے بیٹھے تھے۔

پاکستان کے ڈھائی سو ادیب بڑے اور چھوٹے ادیب۔ افسانہ نگار، شاعر، ناول نویس، نقاد اور محققین وہ سب لوگ جو اس سہ پہر سے پہلے اپنی اپنی عظمتوں کے بوجھ اٹھائے الگ الگ ادھر سے ادھر گھومتے تھے اس وقت چپ چاپ مطمئن اور کچھ مغرور سے معلوم ہوتے تھے جیسے انھوں نے اپنی منزل کا تعین کر لیا ہو۔ اور اب کوچ کے لئے تیار ہوں۔ اس تیاری میں ایک عزم، ایک وقار اور ملائمت کا احساس ہوتا تھا۔ یہ منشور ایک سپر تھی جو انہیں انتشار، پراگندگی، انفعالیت اور لامقصدیت کے حملوں سے بچنے کے لئے مل رہی تھی۔ ایک مضبوط سپر جس پر شاید بڑے سے بڑے حملے بھی کارگر نہ ہو سکیں۔

مندوبین کے دوسری طرف مہمان بیٹھے تھے سفراء اور عمائد۔ سفراء ہو گئے اور متوجہ تھے۔ عمائد بیزار اور کبیدہ معلوم ہوتے تھے۔ اس ملک میں ایک نئی جماعت پیدا ہو رہی تھی۔ ادیبوں کی جماعت۔ ان لوگوں کی جماعت جنکا سماج میں بحیثیت جماعت کوئی مقام نہیں تھا۔ جو دعوتوں کے بعد خشک میووں کا کام دیتے تھے! اور جو افسروں، تاجروں اور مالداروں سے سرپرستی کی بھیک مانگنے پر مجبور تھے۔ یہ لوگ جو آوارہ، بدقماش اور بے مقصد لوگ کہلاتے تھے اب ایک جگہ جمع ہو گئے تھے اور انھوں نے ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کی سہ پہر سے پہلے پہلے ایک انجمن بنا لی تھی۔ ان کے سینوں پر قلم کے نیج آویزاں تھے۔ ان کی نشستیں الگ تھیں۔ سفراء اور عمائد سے الگ اور وہ اس پر مطمئن اور خوش بیٹھے تھے۔

یہ پاکستان رائٹرز کنونشن کا آخری اجلاس تھا۔ یہ کنونشن تین دن رہا۔ اس میں ڈھائی سو مندوب شریک ہوئے۔ ساٹھ مشرقی پاکستان کے مندوب تھے سوا سو مغربی پاکستان سے آئے تھے۔ اور باقی کراچی کے مندوب تھے۔ ان میں جہاندیدہ ادیب تھے، سنجیدہ ادیب تھے، شعلہ مزاج آتش بیان لکھنے والے تھے، نرم رو، سبک خرام سنبھلے ہوئے مصنفین تھے۔ یہ ترقی پسند زیادہ تر منفرد اور عامل بے پسند۔ ہر طرح کے لوگ تھے ان میں کوئی کسی کو اپنا سردار نہیں مانتا تھا۔ ان میں نئی نسل کے لڑکے تھے۔ جو پرانی نسل والوں کی موت کے سبب تلاش کرتے رہتے ہیں۔ بڈھے لکھنے والے تھے جو نوجوانوں کی تحریر و تقریر میں زبان کی غلطیاں نکال کر اداس ہو جاتے ہیں وہ لوگ تھے جو جنس پر افسانے لکھتے ہیں۔ وہ لوگ تھے جو اسلامی تاریخی ناول اور نظمیں لکھتے ہیں۔ وہ لوگ تھے جو اپنی تحریر کے علاوہ سب کچھ ناپسند کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی تھے جو اپنی تحریر کو بھی ناپسند کرتے ہیں۔ ان میں خواتین بھی تھیں عمر رسیدہ خواتین اور نو عمر خواتین۔ چلبلی اور بے باک لڑکیاں۔ پرانی سنجیدہ خاموش کام کرنے والی عورتیں۔

اب یہ سب لوگ ایک مرکز پر جمع ہو گئے تھے۔ انھوں نے تین دن تک سخت کام کیا تھا۔ سینکڑوں قراردادوں کی چھان بین کی تھی۔ اور بڑی محنت اور بحث کے بعد کچھ فیصلے کر سکے تھے۔ ان تین دنوں میں بڑے بڑے تماشے بھی ہوئے۔ مخصوص اجلاسوں میں طرح طرح کی باتیں بنائی گئیں۔ دبی اور کھلی زبان سے پرانے سوالات بھی اٹھائے گئے اور آپس میں چھوٹی موٹی سازشیں بھی کی گئیں۔ ان ادیبوں نے کئی بار باقاعدہ اور بے قاعدہ مجلسیں بنائیں۔ اور انفرادی طور پر چپکے چپکے گفتگوئیں بھی کیں۔ یہ بھی ہوا کہ کسی نے کسی کو ذلت بھی دی اور پھر خود دھچکا کھا گیا۔ ایک دو بار لوگوں نے سخت کلامی بھی کی چپکے چپکے پارٹیاں بنائیں اور توڑ دیں!

یہ سب ہوا۔ انسانی کمزوریاں ایک ایک کر کے ظاہر ہوئیں۔ بڑے سے بڑے آدمی نے چھوٹی سی چھوٹی بات کی اور سننے والوں کو حیرت و افسوس میں مبتلا رکھا۔

مگر ——— پھر سب ٹھیک ہو گیا۔ دلوں کی نرمیاں مزاجوں کی گرمیوں پر حاوی ہو گئیں۔ ساڑھے گیارہ برس کا بوجھ تین دن میں اتارنا تھا جس کے لئے یہ سب عمل اور ردِ عمل ضروری تھا۔ ان جلسوں میں بہت کچھ ہوا۔ مگر یہ نہیں ہوا کہ کوئی دوستی ٹوٹ گئی ہو یا کوئی عداوت بن گئی ہو۔ یہ مفلوک الحال پس ماندہ مختلف مصائب کے شکار لوگ خواہ بڑے شاعر، بہت بڑے افسانہ نگار، بہت بڑے نقاد اور سب سے بہت بہتر ثابت ہوئے اور ۳۱ جنوری کو تین بجے تک انھوں نے اپنے لئے ایک جماعتی دستور اور ایک منشور بنا لیا۔ اور جب یہ سب ہو گیا تو سب نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا جیسے یہ سب اس آدمی کی تلاش کر رہے ہوں جو ان کو روشنی کی ایک کرن دے کر خود تاریکی میں غائب ہو گیا ہو۔

اس کنونشن کا پورا حال تو کوئی اور لکھے گا خاص طور پر وہ کارکن یا مندوب جو اس کے آغاز میں شریک نہ ہو۔ میں اس کے بنیادی کارکنوں میں سے ایک تھا۔ اس میں میری کئی راتیں صرف ہوئی تھیں۔ اس کنونشن میں میری روح تھی، میری زندگی تھی۔ اس میں میرے اچھے اچھے دوست چھوٹ گئے۔ اور نئے نئے دوست پیدا ہوئے۔ میں بہت سے ملے جلے جذبات کا شکار ہوں۔ میں اس کے بارے میں صحیح طرح نہیں لکھ سکتا۔ مجھے اس کنونشن سے متعلق ہر چیز اور ہر فرد سے جذباتی وابستگی ہو گئی ہے۔

مجھے مولوی عبدالحق، پروفیسر سعید، جسیم الدین اور وہ طالب علم کارکن جن کے نام بھی مجھے یاد نہیں سب ایک نئی طاقت کے مظاہر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کاغذ جو ہزاروں کی تعداد میں استعمال ہوئے۔ وہ سستے بدنما فائل جو ادھر ادھر دوڑتے پھرے۔ موٹروں کے کمرے۔ کنونشن کا دفتر جہاں ہم سرد راتوں میں ٹھٹھرتے ہوئے آتے تھے

یہ سب میرے جذبات کی تہوں میں جم گئے ہیں۔ یوں تو یہ ایک ہنگامہ سا ہوا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ ایک بڑی تحریک کی ابتدا ہے۔ جو آہستہ آہستہ اس ملک میں اور نہ جانے کہاں کہاں پھیل جائے گی۔

ہم لوگ بغیر نظم و ضبط کے کام کرتے تھے۔ پہلے ہم آٹھ آدمی تھے جنہوں نے ۴ دسمبر ۱۹۵۸ء کو ایک اعلان نامہ جاری کیا تھا۔ پھر ہمارے صدر شاہد احمد دہلوی ہوگئے یہ نویں آدمی تھے۔ اور گو ہمارے افسر تھے۔ مگر ہمیں میں سے ایک ہو کر رہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے بہت مختلف لوگ تھے اور ہم نے عجیب عجیب کام اپنے اپنے ذمہ لے لئے تھے۔ اور ہر کام پر آپس میں پیچیدگیاں پیدا کرتے تھے۔

ابن الحسن مجھ سے ہر وقت اصولوں اور وقت کی پابندی پر لڑتا تھا۔ وہ ہر کام کی یادداشت رکھتا تھا۔ اور ہم سب کو بھی گھڑی کی طرح چلنے پر مجبور کیا کرتا تھا۔ ابن سعید ہر تحریر کو ٹائپ شدہ دیکھنا چاہتا تھا؛ وہ میری بدخطی کو انتہائی نفرت سے دیکھتا تھا۔ اور زچ آکر گھنٹوں خود ٹائپ کیا کرتا۔ قرۃ العین حیدر دسمبر کے اعلان کے بعد ۲۹ جنوری تک صرف دو بار نظر آئیں۔ اور ۲۸ جنوری کی شام "کام کرنے بھی آئیں"۔ مگر اتنے دنوں ان کے عدم تعاون کے قصے پورے شہر میں وہ دوست مشہور کرتے رہے۔ جو کنونشن کے انعقاد سے ڈرتے تھے۔ ان قصوں سے ہمارے کام میں بڑی مدد ملی۔ ضمیر الدین احمد دو ماہ میں صرف تین دن پائپ پیتے ہوئے نظر آتے اور کام کا "معائنہ" کر کے چلے گئے۔ مگر وہ ہر روز پچاس بار ٹیلیفون کرتے تھے اور ہر کام خود کرنا چاہتے تھے۔ غلام عباس کے تمام گھر والے ان دنوں بیمار رہے۔ اور وہ بے حد پریشان تھے۔ مگر انھوں نے اپنی پوری شخصیت ہمارے حوالے کر دی تھی۔ اور ہم ان کا نام لے لے کر معترضین کو ٹھنڈا کیا کرتے تھے۔ عباس احمد عباسی جو فی گھنٹہ ایک لفظ بولنا بھی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ گھنٹوں چھاپے خانوں اور کارکنوں میں دماغ کھپاتے تھے۔ اور مترجمین کو سینت سینت کر رکھتے تھے کہ شاید اب کوئی خطبہ کوئی تقریر ڈھاکے یا لاہور سے آجائے۔ قدرت اللہ شہاب ہر آدمی کی ہر بات مان جاتے تھے اور ہمارے لئے نئی نئی مصیبتیں کھڑی ہو جاتی تھیں۔ مگر انھوں نے اپنی "اتنی خوفناک" سروس کو جس کے اراکین بڑے سے بڑے ادیب کو اپنے کالر کی سختی پر قربان کر دیں، ہمارے سپرد کر دیا تھا۔ کہ ہم جب چاہیں جس طرح چاہیں اس کا استعمال کریں۔ اور میں تھا جو ہر کام کرتا تھا۔ اور کچھ نہ کر پاتا تھا۔ اور چیخ چیخ کر باتیں کرتا تھا۔ اور شاہد احمد دہلوی جن کی متانت ہمارے ہر شور و غوغا، جلد بازی، معاملہ (نا فہمی) کو برداشت کرتے کرتے تھک جاتی تھی۔ مگر جو ہر وقت کمر کسے حاضر تھے۔

ہمارے پاس کوئی ملازم نہیں تھا۔ کلرک نہیں تھے۔ باقاعدہ مترجمین نہیں تھے۔ ۱۵ جنوری تک روپیہ بھی نہیں تھا۔ ہم نے اعلان نامہ جاری کرنے میں خاصی جلد بازی دکھائی۔ ہم آٹھ دستخط کرنے والوں کی بجائے اٹھارہ یا آٹھ سو بھی ہو سکتے تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہم نے اس پر سوچا بھی نہیں کہ ہم لوگ آٹھ ہی کیوں رہ جائیں بس ہم نے ایک اعلان نامہ تیار کیا اور پریس میں دے دیا۔ اس پر کچھ لوگ ہم سے چڑے، اور کچھ سے ہم چڑے۔ مگر کام شروع ہو گیا۔ اسی طرح ہم نے دعوت نامے بھیجنے میں عجلت برتی۔ ہم نے ایک نشست میں ایک فہرست بنائی اور پھر اسے بھول گئے۔ اس طرح ہم کچھ ادیبوں کو چھوڑ گئے اور کچھ کو بھول گئے۔ چنانچہ وہ فہرست منتشر یادوں میں بٹ گئی۔ اور پھر جو جس کو یاد آیا اسے دعوت دی جانے لگی۔ ہاں ہم نے کوئی بڑا نام نہیں چھوڑا۔ چند بڑے نام والے علالت، مجبوری یا کسی اور سبب سے نہ آئے ہوں تو وہ انکی اپنی ذمہ داری ہے ہمارا قصور نہیں۔ غرض یہ کہ ہم سے بہت سی غلطیاں ہوئیں ہم تجربہ کار منتظمین نہیں تھے نہ ہم جلسے باز لوگ تھے۔ ہاں سب میں میں ہنگامہ پرور آدمی ہوں۔ مگر میرا تجربہ سرکاری ملازموں کی جماعتوں کے الکشن تک محدود ہے۔ ادبی ہنگاموں کے معاملے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میرے لئے میزبانی کا یہ پہلا موقع تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں اپنی چھوٹی موٹی ادبی حیثیت کو بالکل بھول کر ہر چھوٹے بڑے کو تعاون پر آمادہ کروں اور لڑکوں بالوں تک کے نخرے اٹھاؤں۔ اور باقی لوگ تو بالکل ہی الگ تھلگ رہنے والے انفرادیت پسند قسم کے لوگ تھے۔ انھوں نے تو کسی مشاعرے میں تقدیم و تاخیر یا پارٹی بازیوں کے جھگڑے تک نہیں دیکھے تھے۔ چنانچہ ایک اتنے بڑے کام کے سر پر آ جانے سے ایک بدحواسی پیدا ہو گئی تھی۔ ہم آپس میں خوب لڑتے تھے اور معاملہ ادیبوں سے ادب پر آ جاتا تھا اچھا ادب، برا ادب عالمی ادب، عظیم ادب اور ظاہر ہے کہ ان موضوعات پر سبھی اپنی اپنی رائے رکھتے ہیں۔

مگر شاید یہ سب ضروری تھا۔ بے تنظیم کے ادارے شاید ایسے ہی قائم ہوتے ہیں اور جب مختلف الوضع لوگ ایک دوسرے کے قریب آجائیں تب کہیں انہیں اپنے مقصد کی ہم آہنگی کا پتہ چلتا ہے جس سے طریقہ کار میں استواری پیدا ہوتی ہے۔ اس ہم آہنگی کے وجود میں آنے تک ہمیں بھی انہی مرحلوں سے گذرنا پڑا۔ ابن سعید اور ابن الحسن کی بول چال قرۃ العین حیدر سے دنوں بند رہی گو یہ سب ایک دوسرے کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ غلام عباس نے اپنے ذمہ صرف ایک کام لیا تھا اور وہ ہماری خفگی کے باوجود وہی کام ۲۹ جنوری تک کرتے رہے۔ وہ کام یہ تھا کہ وہ ایک صاحب کو

مندوب کی حیثیت سے لانا چاہتے تھے اور وہ صاحب اس پر تیار نہ ہوتے تھے۔

افسوس کہ غلام عباس ناکام رہے۔!

قدرت اللہ شہاب خاص طور پر اس چکر میں تھے کہ مشرقی پاکستان کے مندوبین کو ۲۱۲ مفت لے آئے۔ اور دوسرے کرایوں کی شرحیں کچھ اس قدر گھٹ جائیں کہ ہزاروں مندوبین جمع ہو جائیں۔ اور وہ ادب اور ادیبوں کے لئے لاکھوں روپے جمع کرلیں۔

افسوس کہ وہ بھی پورے طور پر کامیاب نہ ہو سکے۔

جمیل جالبی آخر میں کارکن ہو گئے تھے۔ ۲۹ کی صبح وہ ایک بڑے شاعر کو ان کی رضامندی حاصل کرلینے کے بعد کنونیشن میں لانے گئے۔ اور اکیلے واپس آئے۔

سجاد رضوی بھی ایک بڑے ادیب کے لئے گئے اور اکیلے واپس آئے۔ ہمیں اب تک معلوم نہیں کہ کون کیوں نہیں آیا۔ ایسی اور دوسری ایسی ہی باتوں کی جتنی ذمہ داری ہماری ہے اس سے ہمیں انکار نہیں۔ اغلب ہے کہ ہم سے ابتدا ہی میں ایسی غلطیاں ہوئی ہوں جن کا ہم کو احساس تک نہیں ہوا مگر جو واقعی غلطیاں ہوں مگر دوسری طرف ہم نے یہ بھی دیکھا کہ لگن والے لوگ از خود بھی چلے آئے کچھ نے ہمیں اپنے نام یاد دلائے۔ کچھ نے اپنے خطوں کے باوجود کام کے لئے اپنی خدمات پیش کیں اور کام بھی کیا، اور کچھ آخر دن تک ہمیں حقارت کی نظر سے دیکھا۔

مولوی عبدالحق کا واقعہ یہ ہے۔

ابن انشا، میں اور ابن الحسن، مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولوی صاحب دھوپ کھا رہے تھے۔ ہم نے مختصراً کیفیت عرض کی۔

"اچھا" مولوی صاحب بولے۔ شاید انہیں یقین نہیں آیا۔

"اچھا تو تعلیمی کانفرنس سے تاریخیں تو نہیں ملتیں نہیں ملتیں نا"۔ انہوں نے کسی سے استفسار کیا۔

"ہاں بھی تو میں آجاؤں گا"۔ یہ ان کا تیسرا اور آخری فقرہ تھا۔

ہم مولوی صاحب کے پاس دوبارہ نہیں گئے۔ حالانکہ مولوی صاحب ہمارے آخری اور خاص اجلاس کے نامزد صدر تھے۔ وہ چاہتے تو ہم کو کنوئیں جھکوا دیتے اور طرح طرح کی شرطیں سامنے رکھ دیتے جو ہمیں ماننی پڑتیں۔ مگر انھوں نے اپنا خطبہ صدارت میں بھیج دیا اور خود تشریف لے آئے۔ وہ پہلے اجلاس میں بھی مندوب ہو کر آئے اور مندوبین کے رجسٹر پر دستخط کئے۔

اور مولوی عبدالحق نے ہمارا قلم والا بیج بھی لگایا یہ وہ مولوی عبدالحق ہیں جو سرسید کے ساتھ کام کر چکے ہیں اور جن کی عمر ۹۲ سال ہے۔

ہمارے کارکنوں کا سرگروہ انور سدید رضوی تھا۔ یہ طالب علم ہے۔ اس نے کوئی سو کارکن طالب علموں کو ENDURANCE TEST کرایا اور ان میں سے بیس انتخاب کرائے۔ یہ کارکن طالب علم لوہے کے بنے ہوئے تھے۔ ان میں لڑکیاں بھی تھیں۔ انھوں نے آخری پانچ دنوں میں بیس بیس گھنٹے کام کیا اور بہتوں نے شاید ایک وقت کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ ان میں سے چند ہدایات کو دیر میں سمجھتے تھے، کچھ غلط سمجھتے تھے کچھ ایک دوسرے کی "اہم ذمہ داریوں" پر رشک بھی کرتے تھے مگر کام سب کرتے تھے۔

آج میں سوچتا ہوں کہ یہ سب اتنا کام کیوں کرتے تھے۔ وہ نرم و نازک شرمیلی لڑکیاں جو برقعے پہن کر آتی تھیں۔ وہ دو دو سو کرسیاں ترتیب سے کیوں لگاتی تھیں۔ وہ آسودہ حال لڑکے جن کے سوٹوں پر سلوٹ نظر نہیں آتی تھی ہوائی اڈے اور اسٹیشن پر ٹھنڈی صبحیں اور راتیں کیوں گذار رہے تھے۔ انہیں بعض ادیبوں نے ستایا بھی۔ یہ ادیب کچھ اس چکر میں تھے کہ کنونیشن میں لڈو بٹیں گے اور وظیفے مقرر ہوں گے۔ ان ادیبوں نے کارکنوں کو خوب دوڑایا بھگایا۔ کپڑے دھلوانے بھیجے۔ سواریاں منگوائیں، اور وقت بے وقت چائے، پان، کافی کی فرمائش کی۔ یہاں تک کہ کنونیشن کا رنگ دیکھ کر ادیب خدمت لینی بھول گئے مگر کارکن مستعد رہے۔

یہ کارکن جن کے نام محفوظ نہیں ہیں ہمارے محسن ہیں ہم سب ان کے ممنون رہیں گے۔

یہ کنونیشن تین دن رہا۔ اس میں پاکستان کے ہر گوشے سے مندوبین آئے۔ اچھے خوش اخلاق، اور بدمزاج، چڑچڑے مندوبین۔ کچھ

مزاجاً، کچھ اخلاقاً خوش طبع تھے۔ کچھ مشتبہ اور کچھ خالی خالی۔ جیسے بس یونہی چلے آئے ہوں۔ ان میں امیر، غریب، افسر، مدیران، ناشرین سبھی طرح کے لوگ تھے مگر جب یہ مل کر بیٹھے تو ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ رہے۔ پشاور کے مندوبین، سلہٹ والوں سے جس طرح ملے شاید وہ ہم جماعت جوائنٹ سکریٹری بھی کبھی نہ مل سکیں ان مندوبین میں ایک برادری کا احساس پیدا ہو رہا تھا اور سب اس احساس کی اجنبیت کے باوجود خوش نظر آ رہے تھے۔ ان میں بعض لوگ ایک دوسرے کی زبان بھی نہیں سمجھتے تھے بعض انگریزی بھی نہیں جانتے تھے مگر ان سب نے آپس میں باتیں کیں ان کی زبان میں خلوص تھا۔ سچائی تھی محبت تھی۔ لکھنے والے سبھی محبت کرتے ہیں۔

پہلا اجلاس ۲۹ کی صبح منعقد ہوا۔ پروفیسر مرزا سعید اسٹیج پر آئے، پنجاب سے آنے والے مندوبین زیادہ تر نوجوان تھے۔ وہ انھیں اتنا ہی جانتے تھے کہ یہ پطرس مرحوم کے وہ استاد ہیں جن کے نام مرحوم نے اپنی کتاب معنون کی تھی۔ مشرقی پاکستان والے شاید اتنا بھی نہیں جانتے تھے اور کراچی کے مندوبین صرف ان کے نام سے واقف تھے۔

مگر ــــ پانچ منٹ میں سب جان گئے کہ پروفیسر سعید کون ہیں۔ پروفیسر سعید بیمار تھے۔ وہ بدقت تمام آئے تھے۔ وہ خلوت نشیں ہیں اور جلسوں سے بالکل دور رہتے ہیں۔ ان کا کوئی ادبی حال یا مستقبل بھی نہیں ہے جو وہ اس کے چکر میں آ گئے ہوں۔ ان سے کھڑا نہیں ہوا جاتا تھا اور بولنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی۔ مگر وہ بے حد خوش تھے۔ وہ کھڑے رہے اور بولتے رہے۔

"یہ اس ملک کی تاریخ میں ایک بڑی بات ہو رہی ہے" انھوں نے کہا۔ "خوشی اس امر کی ہے کہ آپ میں مختلف الخیال ادیب ایک ہی مسئلہ پر گفتگو کرنے جمع ہوئے ہیں اور مجھے آپ کے آجانے سے ہی امید ہے کہ آپ لوگ اپنے مسائل کے حل ضرور تلاش کریں گے۔"

پروفیسر سعید نے بہت کچھ پڑھا ہے اور بہت کچھ پڑھایا ہے۔ ان کے شاگردوں کے شاگرد پورے پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ایک سبق انھوں نے ادیبوں کو بھی دیا:

"امید ہے کہ آپ حضرات اپنے معاملات پر گفتگو کرتے وقت ادب کے نزاعی معاملات زیر بحث نہیں لائیں گے۔ اس سے کام میں ہرج ہو سکتا ہے مگر ادبی مسائل طے نہیں ہو سکتے۔"

مندوبین یہ سبق نہیں بھولے اور انھوں نے کام پورا کر لیا۔ پروفیسر سعید کو ایک نئی تحریک کا افتتاح کرتے وقت جو مسرت ہو رہی تھی وہ ان کے بیمار مگر روشن چہرے سے پڑھی جا سکتی تھی۔

شاہد احمد دہلوی نے خطبہ استقبالیہ پڑھا۔ چند فقروں میں انھوں نے رسمی باتیں کہیں پھر وہ صاف گوئی بلکہ سخت گوئی پر اتر آئے۔

"کہا گیا کہ ہمیں حکومت نے اس کام کے لئے خفیہ روپیہ دیا ہے"۔ وہ گرجے "ہمارے دوستوں نے طرح طرح کی باتیں بنائیں"۔ دوست لوگ شرما شرما کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کچھ مسکرائے اور کچھ نے صحافیوں کی طرف دیکھا جو آپس میں باتیں کرتے کرتے متوجہ ہو گئے تھے۔

"سیاستدانوں کی نااہلی نے ادب اور ثقافت کو چند افسروں کی اجارہ داری میں دے دیا تھا" شاہد احمد بولتے رہے۔ یہ خطبہ خاصا طویل تھا۔ اس میں گیارہ برس کے دکھ کی داستان تھی۔ آزاد تخلیقی کام کرنے والوں پر جو مصائب گزرے ان کی بپتا تھی۔ حکومت نے جس کج فہمی اور کج خلقی کے مظاہرے بار بار کئے ہیں۔ اس کی تشریح تھی۔ ناچ رنگ مصوری کی سرپرستی کرنے والوں کے متعلق انھوں نے کہا کہ ان لوگوں نے ان فنون لطیفہ سے جو تھوڑی بہت دلچسپی دکھائی تو اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ایک تو ان جلسوں میں کچھ تفریح بھی ہو جاتی ہے۔ دوسرے ان "سرپرستوں" کی ذہنی پسماندگی کا پول بھی کھلنے نہیں پاتا۔

کچھ افسروں پر اوس سی پڑ گئی تھی۔ چند افسر جو مندوب تھے اور مہمانوں میں بیٹھ گئے تھے۔ وہ گھبرا کر مندوبین کی صفوں میں آ بیٹھے۔ مندوبین ہر ہر فقرے پر تالیاں بجاتے تھے۔ ان کے برسوں کے پھوڑے پھوٹ رہے تھے ادب اور ثقافت نے اپنا مطالبہ قوم اور حکومت کے سامنے پیش کر دیا تھا۔

شاہد احمد دہلوی کا خطبہ ایک جہاد کا اعلان تھا۔ ایک رزمیہ تھا۔ ایک پیشین گوئی تھی۔ یہ سیدھا سادا سا خطبہ جس میں کارکنوں کی مشکلات اور لوگوں کے شبہات کا ذکر تھا۔ اپنے اندر ایک آگ لئے ہوئے تھا۔ جو اس ملک کے بے چین ماضی نے ہر اہل قلم کے دل میں بھڑکا رکھی ہے اس خطبہ میں کوئی ادبی مسئلہ نہیں چھیڑا

گیا تھا۔ مگر اپنے طور پر یہ خطبہ خود ایک ادبی مسئلہ کا حل تھا۔ وہ مسئلہ جسے ادیبوں کی زندگی کہتے ہیں۔

جسیم الدین نے بنگالی زبان میں صدارتی خطبہ پڑھا۔ اس کا ترجمہ بے حد دلکش تھا اور اردو داں افسوس کرتے تھے کہ کاش اسے اصلی زبان میں پڑھ کر لطف اٹھاتے۔ جسیم الدین بقول کسے بادلے کوی ہیں۔ مگر بکار ادب ... بے شمار نکلے۔ انھوں نے ایک ایک کرکے ادیبوں کے مسائل گنائے اور ٹھوس تجویزیں پیش کیں۔ ان کا خطبہ ادب کی زبان میں تھا۔ اور تمام تر کاروباری معاملات پر حاوی تھا۔ ان کے خطبے سے بعد میں کئی سب کمیٹیوں نے استفادہ کیا۔ اور اس کی کئی تجاویز کو اپنی قراردادوں میں شامل کیا۔

پہلے اجلاس کی صدارت کا اعزاز جو مغربی پاکستان والوں نے ایک مشرقی پاکستانی مندوب کو دیا تھا کوئی جھوٹی یا سیاسی رواداری کی بنا پر نہیں تھا۔ اس میں محبت تھی تعاون تھا۔ پیار تھا۔ وہ پیار جس کا تحفہ جسیم الدین بقولِ خود پدما اور میگھنا کی شاداب وادیوں میں تقسیم کرنے لے گئے ہیں۔

دوپہر کو کاروباری اجلاس شروع ہوا۔ اس اجلاس سے لے ۳۱ کی دوپہر تک تمام اجلاس صرف مندوبین کے لئے تھے۔ پہلے جلسے میں حامد علی خاں اور دوسرے جلسوں میں بیگم پروفیسر جمال محمد حسین نے صدارت کی۔ حامد علی خاں کی صدارت میں ایک عظیم الشان معرکہ ہوا جس میں کمیٹیوں کی نشستوں کے معاملے میں ہمو ابیت کا زہر پھوٹ بہا۔ گیارہ برس سے یہ زہر ہمارے رگ و ریشہ میں پرورش پاتا رہا ہے۔ مندوبین جوش و خروش میں اسمبلیوں کی کارروائیوں کے طور پر بات تو شروع کر گئے مگر پھر خود ہی شرما گئے۔ آخر سب جانتے تھے کہ بات یوں نہیں بنتی۔ چنانچہ چند ہی منٹ میں سیاست کے زہر کو افہام و تفہیم کے ابرِ دھارے نے راکھ کرکے بہا دیا۔ کمیٹیاں بن گئیں مضامین تقسیم ہو گئے اور فوراً کام شروع ہو گیا۔

۴۵ آدمیوں کی سٹیرنگ کمیٹی اور نو نو اراکین پر مشتمل سات سب کمیٹیوں نے ڈھائی دن شب و روز جس طرح کام کیا اس کا مزا وہ لے سکتے ہیں جنھوں نے یہ وقت کنونشن ہال میں گزارا ہو۔

غزل گو شعرا، افسانہ نگار، ڈرامہ نویس، ناول نویس اور نقاد لوگ اپنی اپنی انا بھول کر جماعتی کام میں لگے ہوئے تھے۔ ہر کمیٹی کے لئے ایک کنوینر خاتون مقرر تھیں۔ کبھی کبھار دو جنسیں طاقت آزمائی کی کوشش کرتے تو خاتون کنوینر کی موجودگی سے شرما کر پھر کام کرنے لگتے تھے۔

یہ خواتین بہت کارآمد ثابت ہوئیں۔ یہ خواتین کوئی اَن پڑھ لڑکیاں نہیں تھیں بلکہ کئی کالجوں کے ادبی شعبوں سے متعلق تھیں۔ اور برسوں کی پڑھانے والیاں تھیں۔ طالب علم ان میں صرف ایک تھیں۔ یہ ایک فرانسیسی خاتون ہیں جو کراچی یونیورسٹی میں اردو پر کام کر رہی ہیں۔ ان خواتین نے بے باک، لاپروا ادیبوں کے بکھرے بکھرے ارشادات کو بڑے سلیقے سے منضبط کیا ہے۔ ادیب لوگ سیکڑوں قرار دادیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتے تھے اور جب بھی ادھر ادھر کی باتیں کرنی چاہتے تھے یہ خواتین انھیں ان کے فرائض یاد دلاتی تھیں بعد میں کھلے اجلاسوں میں انھی خواتین نے اپنی کمیٹی کی منظور شدہ قرار دادیں پیش کیں۔

تین اجلاس بیگم محمد حسین کی صدارت میں ہوئے۔ یہ ایک مشرقی پاکستانی ادیبہ ہیں جو کراچی میں انگریزی ادب پڑھاتی ہیں۔ کنونشن کی کامیابی کا سہرا تو نہ جانے کس کس کے سر بندھے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک اتنے بڑے اجتماع کو جس میں اتنے اچھے اور بڑے ادیب جمع تھے۔ کامیابی سے جاری رکھنے کا کام بیگم حسین نے پورا کیا۔ ان اجلاسوں کی پیچیدگیاں۔ نت نئے اختلافی مسائل۔ بحثیں، جھگڑے۔ ان سب کے دل میں مندوبین کے خلوص نیت کے ساتھ ساتھ بڑا حصہ بیگم حسین کا رہا۔ انھوں نے فضا میں ایک نہایت سلیقہ مندی کا احساس پیدا کر دیا تھا۔ وہ بنگلہ، اردو، انگریزی روان بولتی تھیں اور ہر زبان کے مقرر یا معترض سے اسی زبان میں نبٹ لیتی تھیں۔ وہ بیرسٹر اعجاز بٹالوی، شاعر جسیم الدین، پروفیسر ابواللیث صدیقی اور مجھ حقیر اسسٹنٹ سکریٹری سے تنہا چومکھی لڑتی تھیں۔ ڈھائی سو ادیبوں کی ذہانت اور مت کو مسلسل منضبط رکھنے میں بیگم محمد حسین کی کوششیں بھلائی نہیں جائیں گی۔ ان کی شدت تنظیم کے باوجود ان کی مقبولیت

کا یہ عالم تھا کہ مندوبین نے تین اجلاسوں میں متواتر انہیں کو صدر منتخب کیا۔ میں اسٹیج سکریٹری جو پہلے دن کی افراتفری میں اسٹیج کنٹرولر بن بیٹھا تھا، ان کی صدارت میں چپ چاپ اپنے حقیر عہدے پر واپس آگیا۔ وہ واقعی صدر ثابت ہوئیں۔

ویسے مجھے اس بات کا دلی افسوس ہے کہ یہاں بھی ہم سب نے اپنے پرانے رقیب، یعنی طبقۂ نسواں، سے مات کھائی ہے!

تین دن میں مندوبین نے سینکڑوں قرار دادیں اور تجویزیں کھنگال کر آٹھ تجاویز منظور کیں۔ قرار دادیں بے شمار آئی تھیں۔ شعرا نے بیشتر تجاویز ذاتی خطوط کی شکل میں بھیجی تھیں۔ نثر نگاروں نے ذرا سلیقے سے کام لیا تھا اور ایک ایک کاغذ پر دس دس تجویزیں روانہ فرمائی تھیں جب کہ منتظمین کی پیہم درخواستوں میں الگ الگ تین تین نقلیں مانگی جاتی تھیں۔ کارکنوں نے ان تجاویز کی نقلیں عنوانات کے تحت کردی تھیں اور ہر سب کمیٹی کے لئے الگ فائل کھول دیئے گئے تھے۔ اپنی دھن میں مست رہنے والے شعرا اور نقرے باز نثر نگاروں کو یہ سب کچھ پڑھنا پڑھا اور ہر منظور شدہ قرار داد کو سننا بھی پڑا۔ ان سب پر طویل بحثیں ہوئی۔ ترمیمات پیش ہوئیں اور ترمیمات پر ترمیمات پیش ہوئیں اور پھر آٹھ قرار دادیں ایک دستور اور ایک منشور تیار ہوا۔ یہ سب کام ان لوگوں نے کیا جو اس ملک کا ناکارہ طبقہ کہلاتے تھے!۔ یہ کام اپنے خیالوں کی دنیا میں مگن رہنے والے ادیبوں نے کیا جن پر جوتے اور پتنگ بنانے والوں کو ترجیح دی جاتی تھی اور جن کے بارے میں مجھ سے کراچی کے چند بڑے اہل قلم نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ بھائی یہ سب لڑیں گے۔ کام دام بالکل نہیں کریں گے تم یونہی روپیہ ضائع کراؤ گے۔

معلوم نہیں اس انجمن مصنفین کا انجام کیا ہو۔ اس کے پہلے سکریٹری جنرل قدرت اللہ شہاب مقرر ہوئے ہیں اور پچیس ادیبوں پر مشتمل ایک مجلس انتظامیہ بنی ہے جو ہر زبان کے ادیبوں کی نمائندگی کرے گی۔ اس انجمن کا مستقبل خدا کے بعد ان حضرات کے ہاتھ میں ہے اب تاریخ کے سامنے وہ جواب دہ ہوں گے مگر میں تو اتنا جانتا ہوں کہ ایک بار تو ایسا ہوا کہ پورے پاکستان کے ادیبوں کی آوازیں ایک آواز میں بدل گئیں اور ہزار ہا نرم و گرم لہجے ایک لہجے میں سمٹ آئے۔

——— اور یہ اس ملک میں پہلی بار ہوا ہے!۔

یہ بھی اس ملک میں پہلی بار ہوا ہے کہ ادیبوں میں انتظامی امور کے لئے عہدیدار مقرر ہوئے ہیں۔ جن ادیبوں نے یہ انتخابات کئے ان میں کوئی کسی سے کچھ کم ہو تو ہو بالکل ہی گیا گذرا کوئی نہیں تھا مگر انھوں نے انتخاب کرتے وقت ادبی عظمتوں کا چکر نہیں چلایا بلکہ انتظامی اہلیت اور ذاتی حالات سامنے رکھے۔ اس مجلس میں میں شامل نہیں ہوں مگر ہم سب شامل ہیں وہ سب جن کو اپنے لئے کام کرنے کی لگن ہے اور جن کا اس بات پر یقین ہے کہ زندگی میں کچھ نہیں تو ایک لمحہ ایسا بھی ہوتا ہے۔ جب انسان اپنی ذات سے ہٹ کر کسی بلند مقصد کے لئے سوچ سکتا ہے۔

یکم دسمبر ۱۹۵۸ء کو جنرل محمد ایوب خاں نے ایک اعلان کیا تھا جس میں انھوں نے مستحق ادیبوں کو امداد دینے کے لئے ایک رقم مقرر کی تھی۔ یہ اعلان اس صدرِ حکومت نے کیا تھا جس کے ہاتھ میں مارشل لا کی شمشیر ہے جو اپیل اور عدالتی کارروائی سے بہت بے نیاز ہے جس نے پارلیمنٹ جیسے ادارے کو معطل کر کے رکھ دیا ہے اور جس کے پاس لاکھوں مضبوط جوانوں کی مسلح فوج ہے۔ وہ صدر ادیبوں اور کھلاڑیوں میں مقبولیت کا محتاج نہیں تھا۔ اس کے احکام کسی فرد یا جماعت کی منظوری کا انتظار نہیں کرتے۔ یہ اعلان سچائی کا اعلان تھا۔ ہمدردی کا اعلان تھا۔ اس نے ادب اور ادیب کی حیثیت مان لی تھی۔

یوں اس زمانے سے پہلے بھی صدر گذرے ہیں۔ خوش باش، خوش اوقات صدر۔ مجلس پسند صدر۔ پبلسٹی کے شائق صدر اور ایسے ہی وزراء اور وزرائے عظام بھی گذرے ہیں مگر ان میں سے کسی کو کسی بیمار شاعر، کسی مفلوک الحال افسانہ نگار، کسی بے کس نقاد کا خیال نہیں آیا تھا۔ بس اِکّا دُکّا وزارت کبھی کبھار صوبائی حکومتوں کے اصرار پر کچھ کر دیا کرتی تھی اور پاکستانی ادب اور ثقافت کی لاش پر آدھے پونے کفن ڈھانپ دیتی تھی۔

اور اب ایک صدر نے، جو ہم ادیبوں کی رائے کا محتاج نہیں ہے، جن کو وہ فائدہ پہنچانا چاہتا ہے، یہ اعلان کیا تو مجھے بھی جھرجھری سی آئی۔ میں گیارہ برس سے اس ملک میں بے مقصد گھومتا رہا ہوں اور طرح طرح کی پیچیدگیوں، پریشانیوں اور لغویتوں میں خود بھی مبتلا

رہا ہوں اور کن کن اعلیٰ دماغوں کو مبتلا دیکھا ہے۔ میں اک میں نے کن کن لوگوں کو گروہ بندیوں کا شکار دیکھا ہے، جاگ گیا۔

اس شام نو بجے میں نے ابن الحسن سے کہا۔

"ابن۔ یار۔ یہ اعلان تو بہت زبردست چیز ہے"

ابن الحسن راولپنڈی جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

"ہاں ہے تو"۔ اس نے ٹالا۔ "بھئی تو پھر تم کون۔ وہ خود ہی کچھ کریں گے۔ آخر اتنی بڑی حکومت چل رہی ہے"

"تو پھر ہم خود بھی تو کچھ نہ کچھ کریں۔ اب بات آگے چلنی چاہیئے نا"۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ میں ابن الحسن سے پوری بات الیکدم نہیں کرتا۔

"مثلاً" وہ چیخا۔ پھر وہ اچھلنے لگا۔ "مشاعرہ" اب وہ مزے لینے لگا۔

"ہاں بھئی مشاعرہ کرو اور اس رقم سے۔ سب شاعر بانٹ لو۔ واہ کیا بات نکالی ہے بیٹھے بیٹھے"۔ وہ ہماری رہتا مگر میں برا مان گیا۔

"ابے بیوقوف نثر نویس"۔ میں نے دھاڑ ماری۔ "میں یہ کہتا ہوں کہ ہم میں سے جو محتاج ہو وہ اور جو نہ ہو وہ۔ سب مل کر بیٹھیں اور امداد باہمی پر بھی غور کریں"

"مطلب"۔ وہ چپ سا ہو گیا۔

"مطلب یہ کہ ادیبوں کا کنونیشن بلایا جائے۔ آخر یہ آپس میں چپکے چپکے قرضے لیں اور دیں تو کب تک۔ اور حکومت کچھ کرے تو کس حد تک اور کس کس کے لئے کرے گی۔ کنونیشن بلاؤ کنونیشن،۔ اب میری ہی بات مجھ پر بھی واضح ہو گئی تھی۔

وہ پہلے تو چونکا پھر آرام سے بیٹھ کر سوچنے لگا۔

دوسرے دن ہم ابن سعید کے پاس گئے اور خوب لڑ جھگڑ کر ایک اعلان نامہ لکھوایا۔ یہ ابن سعید نے لکھا اور خود ہی ٹائپ کر کے دیا۔

تین دسمبر کو باقی پانچ نے دستخط کر دیئے۔ ان میں سب سے کم وقت قدرت اللہ شہاب اور ضمیر الدین احمد نے لیا۔

چار دسمبر کو یہ اعلان نامہ چھپ گیا۔

۸۔ دسمبر کو ہم نے ۱۸۰۰ روپے کا باہمی چندہ کیا۔ ۱۵۔ جنوری کو ہم نے کراچی میں سولہ ہزار روپے جمع کر لئے۔ روپیہ تین آدمیوں نے دیا۔ ان کے نام شائع ہو گئے ہیں اسی طرح لاہور اور ڈھاکے انتظامات کی تفصیل شائع کر دی گئی ہے۔

یہ سب کچھ آپ ہی آپ ہوتا رہا۔

۲۹، ۳۰، ۳۱ جنوری کو کنونیشن منعقد ہوا۔ ۳۱ کو اس میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں شریک ہوئے۔ ان سے شرکت کی درخواست دسمبر کے اواخر میں کی گئی تھی۔ اس وقت کسی کو پتہ نہیں تھا کہ کنونیشن میں کیا کیا قرار دادیں آئیں گی اور کیا کیا فیصلے ہوں گے بلکہ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ کون کون آسکے گا۔ چنانچہ ہم نے آخری اجلاس کے پانچ مقالے مقرر کئے تھے اور ان سے صرف سننے کی درخواست کی تھی ہم آٹھ آدمی نہ تو ادبی سوادیبوں کے بارے میں کوئی پیشین گوئی کر سکتے تھے نہ سب کی طرف سے کوئی خطبہ وغیرہ پیش کر سکتے تھے یہ معاملہ شہریوں کے جیسے جیسا نہیں تھا جس میں پہلے سے سوچی سمجھی باتیں کی جاتی ہیں۔

مگر ــ اس شام تک پورے ملک کے بہترین اور مختلف الخیال ادیب اپنے لئے کچھ اہم فیصلے کر چکے تھے اور اب 'اچھے بچوں' کی طرح مطمئن بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنے بارے میں پیدا ہونے والے ہزارہا شبہات کا ازالہ کر دیا تھا۔ وہ متحد ہو گئے تھے۔

اور اب وہ چاہتے تھے کہ صدر پاکستان تقریر کریں۔ زرعی اصلاحات کا اعلان تازہ تازہ تھا۔ اسی زمانے میں پاکستانی دانشور پہلی بار جمع ہوئے تھے وہ صدر پاکستان سے ادب اور ادیبوں کے بارے میں سننا چاہتے تھے۔

اس وقت تک ممتاز حسین۔ قدرت اللہ شہاب اور جاوید اقبال اپنے اپنے خطبے پڑھ چکے تھے جو ۳۱ جنوری کے بعد سے محفوظ ہو گئے ہیں مشرقی

پاکستان کے دو مندوبین مقامی حالات پر بصیرت افروز مقالے پڑھ گئے تھے۔ مولوی عبدالحق صدر تھے۔ پانچ سو مندوبین اور مہمان سامنے بیٹھے تھے اور چاہتے تھے کہ صدر پاکستان اس اجتماع میں تقریریں کریں۔ منتظمین خجل تھے کہ ان سے کس طرح کہیں۔

مگر یہ کنونیشن تھا ہی نئی تاریخ بنانے کے لئے۔ اسی کنونیشن میں یہ تاریخ بھی بنی کہ صدر مملکت بغیر کسی تیاری کے تقریر کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کی فی البدیہہ تقریر سے ظاہر ہو گیا کہ انھیں اپنی ذات پر مکمل اعتماد ہے۔

جنرل محمد ایوب خاں کی تقریر تاریخ کے حافظے پر ہمیشہ موجود رہے گی۔ اس کا ماحصل وہ ضمانت ہے جو انھوں نے ادیب کو آزادیٔ اظہار کے لئے دی ہے اور جس کے ساتھ واحد شرط حبُّ الوطنی ہے۔

"انجمن مصنفین" کو دو گھنٹے کی عمر میں پہلا عطیہ صدر مملکت نے دیا اور انھوں نے اس سلسلے میں کوئی شرط نہیں لگائی۔ یہ پہلا عطیہ انجمن مصنفین کے لئے مالی امداد ہی نہیں ہے بلکہ اس میں ملک بھر کے ادیبوں کے لئے ایک خوشخبری بھی پنہاں ہے۔ خوش خبری اس امر کی کہ اب کام کرنے کا موقع بھی ہے اور آزادی بھی۔ ادیب تاریخ کے آگے جوابدہی کے لئے تیار رہیں!

کام پر ہی مولوی عبدالحق صاحب نے زور دیا۔ اُن کے نہایت آسان اور وقیع خطبے میں کام اور صرف کام کا ذکر تھا۔ یہ خطبہ اپنی الگ شان رکھتا تھا۔ مولوی صاحب نے نقاہت کے باوجود اسے اپنی مضبوط آواز میں پڑھا اور سننے والوں نے شاید پہلی بار اتنے خلوص سے کوئی صدارتی خطبہ سُنا۔

کنونیشن ختم ہو گیا۔ تین دن کا اجلاس ختم ہو گیا مگر اب ادیبوں کی ایک مجلس کا آغاز ہو گیا ہے جسے اب شاید وہ خود بھی چاہیں تو ختم نہ کر سکیں گے اس مجلس میں مندوبین کے علاوہ اور اہل قلم بھی شامل ہوتے رہیں گے۔

یہ انجمن یوں تو ایک کاروباری سا ادارہ معلوم ہوتی ہے مگر اس کے ذریعے بہت سے لوگ ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں۔ موسمی سوٹ اور متناسب ٹائیاں پہن کر ادب پیدا کرنے والے افسر، مفلوک الحال ادیب، مغرور نقاد، اسلامی ادب والے، جنسی ادب والے، تحلیلِ نفسی کے مشاق، مادّی جدلیت کے پرستار، اب شاید یہ ایک دوسرے کو پہلے سے بہتر طور پر سمجھنے لگیں گے اور پھر پاکستان میں ایک نئی ان کہی تحریر کا آغاز ہو گا ——!

یہ ان لکھی تحریر صرف ادب کی زبان میں نہیں ہوگی بلکہ ایک تحریک کی شکل میں ابھرے گی، امداد باہمی کی تحریک، نفرتوں، عداوتوں کو کچلنے کی تحریک، رواداری کی تحریک، لکھنے کی تحریک۔

اس تحریک سے بڑے لکھنے والے چھوٹے نہیں ہو جائیں گے، چھوٹے لکھنے والے ایکدم بڑے ادیب نہیں بن جائیں گے۔ ادب کا کام اپنا اپنا ہے اپنی اپنی تخلیقی قوتیں خدا کی دین، علم، مشاہدہ، تجربات اور حالات یہ سب الگ معاملات ہیں اس کنونیشن میں کوئی غیر ادیب شریک بھی ہو گیا ہو تو وہ ادیب نہیں بن جائے گا نہ وہ جو یہاں نہیں آسکے ادیب رہنے یا کہلانے کی عزت سے محروم ہو جائیں گے مگر یہ ضرور ہو گا کہ اگر اس نوزائیدہ انجمن مصنفین کے امین یعنی اراکین انتظامیہ نے اپنے ایمان کو بالکل ہی ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اپنی اہلیت و استعداد کو بقدر پانچ فیصدی کام پر لگا یا تو اس پس ماندہ مگر بے حد زرخیز ملک میں بڑے ادب پیدا ہونے کے حالات پیدا ہو جائیں گے وہ بڑا ادب جس کے مرثیہ خواں سوائے خود ملامتی کے اور کچھ نہیں کر سکے ہیں، وہ بڑا ادب کوئی عنقا چیز نہیں ہے بلکہ بہت سے چھوٹے چھوٹے ادیبوں کی مسلسل کاوشوں کے بعد آپ ہی آپ کسی ایک یا چند اہلِ قلم کی بدولت ظہور میں آنے لگتا ہے اور یہ کنونیشن جس نے انجمن مصنفین پاکستان کو جنم دیا ہے اور جو بہت سی تعریفوں اور ملامتوں کے ساتھ ختم ہوئی ہے اس بڑے ادب کی تاریخ میں سنگِ بنیاد کی حیثیت سے یاد کی جائے گی۔

لیکن —— میری خوش فہمیوں کی حیثیت ہی کیا ہے۔ آیئے ہم سب اس فیصلے کا انتظار کریں جو تاریخ سنائے گی۔

پھر آئی بہارِ تازہ

عاصمہ حسین

اک صبح نئی چمکی ہے مشرق کے کہستانوں میں
اک سیلِ تجلی اُمڈا تاریک شبستانوں میں
پھر آئی بہارِ تازہ جھلسے ہوئے ویرانوں میں
گلبانگِ عنادل گونجا سنسان خیابانوں میں
ہنگامۂ نو برپا ہے پھیلے ہوئے میدانوں میں
ہنگامے ہی ہنگامے ہیں جو ہر کے کاشانوں میں
شان اور ہرے کھیتوں کی بات اور کھلیانوں میں
رہ رہ کر بجلیاں دوڑیں ٹھٹھری ہوئی شریانوں میں
کیا یہ کسی دورِ نو کا اعجازِ مسیحائی ہے؟

★

اٹھو کہ نئی لو آئی — اٹھو کہ نیا دور آیا
اٹھو کہ نئی بو آئی — اٹھو کہ نیا طور آیا
اٹھو کہ نئی ضو آئی — اٹھو کہ سمے اور آیا
خورشیدِ سحر کی تابش پیغام نیا لائی ہے

قصرِ دل و جاں میں پیدا اک اور ہی طوفاں کردے
تاب و تبِ بے پایاں سے ہر سمت چراغاں کردے
پیدا[؎] دلِ وارفتہ میں اک اور ہی ارماں کردے
یا ہر طلبِ ناقص کا شیرازہ پریشاں کردے
ہے عینِ فنا بے کاری، خوں زخم سے جولاں کردے
گر ہم نہیں تیرے شایاں، اوروں کو نمایاں کردے
وہ شانِ براہیمی ہو، آتش کو گلستاں کردے
رنگین چمن شعلوں سے آراستہ یزداں کردے
مغرب میں تجلی کی لَو سے اک طور فروزاں کردے
مشرق میں نئے عنواں سے خورشید کو تاباں کردے
جو پائے تنِ آسانی کو ہنگامۂ دوراں کردے
طوبیٰ سے چھڑا کر دامن، کوثر پہ خراماں کردے
قطرے کی حقیقت کیا ہے گوہر شرر افشاں کردے
جوہر کی تہ میں پنہاں سرمایۂ یکتائی ہے

؎ یا بہ آرزو [illegible] — [illegible]
بکاری [illegible] — [illegible] اندر آور
رنگیں چمنے ز شعلہ آرائے — [illegible] آور
[illegible] از زمین [illegible] — خورشید [illegible] آور
جاں [illegible] راحت [illegible] — [illegible] کوثر آور
[illegible] از [illegible]
یا قطرہ [illegible] گوہر آور

فریبِ خیال

طاہرہ کاظمی

اجنبی دیس سے آئے ہوئے ساتھی تم بھی
کہیں تخئیل کی اک اجنبی پرواز نہ ہو!

دُور، افق پار، تخیّل کے سمن زاروں میں
دیوتا بستے ہیں، انسان کہاں ملتے ہیں
دیوتا جن کی نگاہوں میں ہے تقدیسِ دوام
چاندنی رات میں موتی کی طرح روشن ہیں
مرمریں، سرد، حسیں، خواب نما تاج محل
دیوتا، جن کی پرستش سے تو انکار نہیں
ان کے پیکر میں مرے دوست! نہیں کیفِ حیات

خواب کے دیس میں شہزادے بہت رہتے ہیں
جو کبھی رات کو محلوں سے اُتر آتے ہیں
اپنے دامن میں بہاروں کے نئے رنگ لئے
اپنی پوشاک میں سیماب کا نیرنگ لئے
جگمگاتے ہوئے وہ نیلم و لعل و یاقوت
جھلملاتی ہوئی وہ کرنیں طلائی، سیمیں
کہکشاں، قوسِ قزح، راہگذاریں اُنکی
حکمراں ہیں وہ تخیّل کی حسیں وادی پر
رنگ بھی اُنکے، چمک اُنکی، بہاریں اُنکی
لیکن اے دوست! وہ نزدیک تو آتے ہی نہیں

زندگی کا کوئی نغمہ تو سناتے ہی نہیں
یہ تو بس خواب کے شہزادے ہیں، اور کچھ بھی نہیں!

کتنا مانوس ہے یہ قرب کا پہلا احساس
اب تو آنکھوں میں نہاں کوئی تلاطم بھی نہیں
کون ہو، نام ہے کیا، تجھ سے یہ رشتہ کیا ہے؟
کیا تمہیں بھی ہے اندھیروں میں محبّت کی تلاش؟
کسی سائے کی، کسی سانس کی قربت کی تلاش؟

تم ابھی دیکھ رہے تھے مجھے بے خود، مبہوت
اس خموشی میں نہاں کوئی تکلّم بھی نہ تھا
ثبت پیشانئ سادہ پہ تھی اک مہرِ سکوت
اور ان ہونٹوں پہ ہلکا سا تبسّم بھی نہ تھا

تم کہاں ہو مرے ہمراز! نگہ اٹھتے ہی
کھو گئے تم بھی اندھیروں میں اُجالوں کی طرح
تم بہاروں کی طرح نغمہ فشاں آئے تھے
چھُپ گئے ذہن میں خاموش خیالوں کی طرح

گر کبھی عرصۂ پُرخار میں چلتے چلتے
ہو گئی تم سے ملاقات سرِ راہگذار
تم ٹھٹک جاؤ گے، رک جاؤ گے، سوچو گے ضرور:

اس گزرتے ہوئے سائے کو قریں دیکھا تھا
یہ حقیقت تو نہیں، خواب کہیں دیکھا تھا

تیرگی سے روشنی تک

صہبا اختر

مرے دیس کی وادیاں کتنی سرسبز و شاداب تھیں
رشکِ خورشید تھیں جانِ مہتاب تھیں
خلدِ افسانہ تھیں جنتِ خواب تھیں
ریشم و اطلس و پرنیاں دیبا و کمخواب تھیں

وہ کپاس ایسی چاندی کے پربت کھڑے کر دیئے کہاں
ڈھونڈتا ہے جنہیں وادیوں کا دھواں
سبزہ و گل کی ویرانیاں نوحہ خواں
ہائے وہ کھیپ سونے کی اشرفیوں کا قلزم بیکراں

یہ فضا ہے جہاں کل حنا رنگ پھولوں کے انبار تھے
دور تک خواب آسا فسوں زار تھے
پر کسان اس فضا میں بھی بیدار تھے
خونِ دل میں ڈبوئی ہوئی انگلیوں سے چمن کار تھے!

مسکرا، مسکرا، خوبصورت زمیں مسکرانے لگی
پنگھٹوں کی فضا جھلملانے لگی!
ساحرہ، ساحرہ رسمسانے لگی
ہر شگوفے کی محبوس آواز پھر گنگنانے لگی

دھان کی لہلہاتی چادریں فن کی عظمت کا اظہار تھیں
وادیاں ان کے رنگوں سے گلنار تھیں
نیلگوں ندیوں پر شفق بار تھیں
گیہوں کی سیمگوں بالیاں ان کی محنت کا شہکار تھیں

آج جاگیرداروں کے چنگل سے آزاد ہے ہر زمیں
پھر اگائیگی صد لعل و گوہر زمیں
کھیت سے کھیت تک مشک و عنبر زمیں
کس مسیحا نفس کے نفس سے ہوئی پھر معطر زمیں!

گیت

تبسم نظر

دل کیوں چھوٹا ہو

دل میں سما جاتا ہے سب کچھ اس کی تھاہ نہیں ہے
اس میں سونے چاندی کے سکوں کی راہ نہیں ہے
تو خوش ہو ہر حال میں جس سے ایسا سودا ہو
دل کیوں چھوٹا ہو

تو خوش ہے تو دنیا خوش ہے جگ کی ریت یہی ہے
تیری خوشیاں دنیا بانٹے، تیری جیت یہی ہے
خوش ہو جب تیرا ہمسایہ، تو بھی ہنستا ہو
دل کیوں چھوٹا ہو

رہتا ہے جس رنگ میں کوئی رہنے دے اچھا ہے
اپنے آپ میں گر وہ خوش ہے، تیرا کیا لگتا ہے
تیرا اپنا کام بہت ہے اس کا چرچا ہو
دل کیوں چھوٹا ہو

بیلے کی حور

شیر افضل جعفری

تو کلی کی چھلتی شرمیلی مستور
عصمت کی خوشبو سے عمر تری مخمور
تیرا پاک تبسم تاروں میں مشہور
کانوں کی بچھیوں بُندوں کے انگور
تھرئیں تیری گائیں طوطے، مور، تلور
چڑیاں تیری سکھیاں تو کھیتوں کی حور
حسن لچکتی ٹہنی تو ٹہنی کا بُور
سرسوں تجھ پر وارے کُندن کُندن نُور
بھونروں کو ترسائے تیرا پھول غرور
تیری خیر منائیں تنگر، برج، کلور

میں دلگیر فرشتہ
تو اک نور سرور

---

[1] لوک گیت۔
[2] ادھر کے تین گاؤں۔

افسانہ:

حصار

انتظار حسین

"تمہیں اپنے والد یاد ہیں؟ انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا۔" ہاں اسے اپنے والد یاد ہیں، پھر؟ اس قصے میں اپنے والد کا حوالہ اسے پسند نہیں آیا تھا مگر میر صاحب کا تو طریقہ ہی یہ ہے کہ اپنی بات سچ ثابت کرنے کی خاطر خود عینی شاہد بن جاتے ہیں یا کسی دوسرے کو بنا لیتے ہیں۔ وہ آخری دن تھا۔ حصار نہیں کھینچا تھا۔ آخری تسبیح پڑھتے شک ہوا کہ پیچھے کوئی کھڑا ہے۔ بس اسی میں دھیان بٹ گیا اور دانہ بھول گئے کہ کونسا ہے ...... یہ کیا بات ہوئی۔ اسے اس داستان پہ بالکل اعتبار نہیں آ رہا تھا۔ سوچا کہ آج تو یہی باتیں ہوتی رہیں گی۔ یہاں سے اٹھ چلو۔

"میر صاحب، جلالی وظیفہ کسی کا پورا بھی ہوا ہے؟" نعیم نے سوال کیا۔

وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

"سینکڑوں میں کوئی ایک نکل جاتا ہے۔" میر صاحب رکے، پھر بولے "بھائی جلالی وظیفہ تو جوا ہے۔ بس اندھا داؤں سمجھو۔ آدمی یا پیر کامل یا پاگل۔ بندے علی تو ابھی تک جیتے تھے۔ سب نے انہیں دیکھا ہے۔ بیچارے اسی میں پاگل ہوئے۔ انتالیس دن خیریت سے گذار دئے۔ چالیسواں دن بھی خیریت سے گذر چلا تھا۔ آخری تسبیح کے دو دانے باقی تھے ...... لو صاحب ننانویں دانے پہ بکھر گئے۔ بس یوں لگا کہ انگلیوں میں کنکھجورا ہے۔ تھرترا کے انگلیوں کو جھٹکا۔ تسبیح جانماز سے پرے جا گری ...... بس اسی میں دماغ چل بچل ہو گیا۔ ہر وقت انگلیوں کو جھٹکتے تھے۔" میر صاحب چپ ہوئے، پھر ٹھنڈا سانس بھر کے بولے "بھائی یہ تو اندھا داؤں ہے۔ جو نکل گیا وہ پیر کامل۔ جو رہ گیا وہ پاگل۔"

اس نے پھر اٹھنے کی ٹھہی باندھی۔ یہاں تو یہی باتیں ہوتی رہیں گی۔

"میر صاحب بعض عامل ہوتے ہیں کہ جس چیز کو کہو فوراً حاضر کر دیتے ہیں۔" نعیم نے ایک اور سوال کر ڈالا۔

"سفلی عمل۔" میر صاحب بولے۔

"اچھا؟"

"ہاں آں۔ تھے ایک ایسے عامل۔ کتے کی قبر کے پاس والی املی کے نیچے پڑے رہتے تھے۔ ہم اس زمانے میں بچے تھے۔ ہم کئی لڑکے ان کے پاس پہنچ گئے کہ شاہ جی گلگلے کھائیں گے۔ شاہ جی نے انگلی اٹھائی۔ لو صاحب گرم گرم گلگلوں سے بھری ٹوکری سامنے آ گئی۔ سب نے جی بھر کے کھائے۔ جب واپس ہونے لگے تو محلہ میں کیا بھنگن چلاتی پھر رہی تھی کہ میں نے بچوں کے لئے گلگلے پکائے تھے۔ ایک ننگ دھڑنگ لنگوٹ بند مردوا چوکے سے گلگلوں کی ٹوکری اٹھا کے لے گیا۔ بس کیا پوچھتے ہو بہت طبیعت خراب ہوئی۔"

"حد ہو گئی۔" نعیم بولا۔

وہ انگڑائی لیکر اٹھ کھڑا ہوا۔

نعیم نے اس کی طرف دیکھا "ابھی سے؟"

"نیند آ رہی ہے۔" اس نے ہلکی سی جماہی لی۔

"یار آج میری طرف نہ سو جاؤ۔"

"کیوں؟"

"آج میں اکیلا ہوں۔ گھر سے سب لوگ گئے ہوئے ہیں۔ اوپر سے میر صاحب نے یہ باتیں سنا دیں۔ اب رات بھر نیند نہیں آئے گی۔ ویسے تمہارے گھر بھی کون بیٹھا ہے جو تمہارا انتظار کرے گا۔ میری طرف چلے چلو۔"

"نہیں بھئی۔" اس نے مختصر سا جواب دیا اور چل پڑا۔

"مغل محل میں پاک نجس کی تمیز نہیں ہوتی۔ اور بھائی اب تو مغل محل ہی رہ گیا ہے۔ ....." میر صاحب کی آواز رفتہ رفتہ پیچھے رہ گئی۔ وہ میر صاحب کی دکان سے چل کر نظامی کی دکان پر رکا۔ سگریٹ خریدے۔ سگریٹ کی ڈبیا کھولتے ہوئے اچٹتی سی نظر سڑک پر ڈالی۔ بازار ابھی چل رہا تھا۔ گاڑی شاید آگئی تھی کہ سواریوں سے بھرے کئی تانگے آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ بازار کی بھیڑ کے باعث رفتار ان کی ذرا سست ہو گئی تھی۔ بھیڑ دکانوں پہ تو ایسی نہیں تھی مگر چلتے پھرتے لوگ بہت خاصے دکھائی دے رہے تھے۔ دکانوں کے تختوں اور تپائیوں پہ جم کر بیٹھنے والوں کی گرم گفتگو اس پہ مستزاد تھی۔ اس سب کی وجہ سے بازار میں ہلکی ہلکی گرمی اور روشنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ سگریٹ کی ڈبیا کھول کر اس نے سگریٹ نکالا، منہ میں لگاتے ہوئے اسے لٹکی ہوئی سلگتی رسی سے سلگایا۔

موڑ مڑ کر وہ پرانی سڑک پر ہو لیا۔ جگمگاتی دکانیں پیچھے رہ گئی تھیں اور شور بازار کا دوسری دنیا سے آتا معلوم ہوتا تھا۔ دور دور کھڑے بجلی کے کھمبے خاموش سڑک پر اجالا ضائع کر رہے تھے۔ اس نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور اس ٹھنڈی رات کی نم فضا میں دھواں بکھیرتے ہوئے ایک اطمینان کا سانس لیا۔ وہ میر صاحب کی دکان کی فضا سے باہر نکل آیا تھا۔ یوں اسے میر صاحب کا فقرہ نادانستہ پھر یاد آگیا تھا۔ مگر اب اس کے ساتھ ناخوشگواری کا احساس شامل نہیں تھا۔ "تمہیں اپنے والد یاد ہیں؟ انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا۔" بھلا یاد کیوں نہ ہوتے اور سفید داڑھی والا جلا بجھا سا چہرہ اس کی نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ گذرے دن اب خواب سے لگتے تھے۔ عجب مفلسی کے دن تھے۔ کبھی قرض ادھار سے کبھی گھر کی چیزیں گروی رکھ کے گھر کا خرچ چلایا جاتا اور کسی طور پر پورا نہ ہوتا۔ بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو انہوں نے جلالی وظیفہ پڑھنا شروع کر دیا۔ اوپر والے کمرے میں دن دن بھر جانماز پہ بیٹھے رہنا، نہ ہنسنا نہ بولنا، خیالوں میں گم کھڑاؤں پہنے گھڑی دو گھڑی کے لئے باہر آنا اور ابلی دال اور روٹی کھا کر ترک حیوانات کے باعث گوشت گھی دودھ سے پرہیز تھا پھر اندر جا کر دروازہ بند کر لینا۔ چالیسویں دن جب تیسرا پہر جا رہا تھا اور دھوپ کم کم سب سے اوپر والی منڈیر پہ باقی تھی، سر برہنہ دونوں ہاتھوں میں کھلا قرآن لئے بغل میں عصا پیروں میں کھڑاؤں کمرے سے نکلے "یہاں سے نکل چلو"۔ گھر بھر کی پریشان نظریں دہشت زدہ چہرے پہ ان کے جم گئیں، مگر کسی کو کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ جیسے بیٹھے تھے ویسے کھڑے ہوئے اور گھبراتے گھبراتے ہوئے مگر چپ چپ نقی حسین کے گھر چلے گئے۔ نقی حسین کے گھر رات گئے تک کوئی نہیں سویا۔ جب اونچی آوازیں باتوں کا تار ٹوٹا، اور ایک ایک کر کے گھر والے سوتے گئے تو پھر نقی حسین کی بیوی اور اس کی والدہ دبی دبی آواز میں باتیں کرنے لگیں "میں تو جانوں انہوں نے حصار نہیں کھینچا تھا" نقی حسین کی بیوی کہہ رہی تھیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ اسے بھی نیند آگئی۔ رات گئے آنکھ اس کی پھر کھل گئی تھی۔ سب سو رہے تھے۔ بس والد اس کے جانماز پہ بیٹھے سامنے قرآن کھولے اونچی آواز سے تلاوت کر رہے تھے۔ وہ ڈرا ڈرا اٹھا۔ نالی پہ جا کر پیشاب کیا، اور چپکے سے کچھ ڈرتے ہوئے باہر جھانک کر دیکھا۔ گلی خالی، گھر میں چھت پہ صحن میں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا، دروازہ بند، باہر سے تالا پڑا سا پڑا ہوا۔ دل اس کا دھڑ دھڑ کرنے لگا ...... وہ چونک پڑا اور جلدی جلدی چل کر پرانی سڑک سے کھڑکی والی گلی میں مڑ لیا۔

کھڑکی والی گلی میں مڑتے ہوئے قدم اس کے زیادہ تیزی سے اٹھنے لگے تھے۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ گھروں کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ ماسٹر امتیاز علی کا دروازہ ضرور چوپٹ کھلا تھا، مگر اندر باہر اندھیرا ہی اندھیرا۔ کیا گھر میں اس وقت کوئی نہیں ہے؟ مگر پھر اسے مقفل ہونا چاہیئے تھا۔ نظر اس کی وہاں سے اٹھ کر قدیر کے بالائی کمرے پر گئی جس کے شیشوں سے روشنی چھن کر سامنے والی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ قدیر امتحان کی خاطر یوں راتوں کو نہ جاگتا تو اس گلی میں تو بالکل ہی اندھیرا رہا کرتا۔ اندھیرا اور خاموشی۔ صرف اس کے قدموں کی چاپ گونج رہی تھی۔ اور اس نے اپنی چاپ سے جھجک کر چال سست کر دی۔

کھڑکی والی گلی سے وہ اس اگلی اپنی گلی میں داخل ہوا جس کے بیچوں بیچ ایک نالی چلی گئی تھی اور پرلے نکڑ پہ ایک دھندلے قمقمے والا کھمبا کھڑا تھا جس کی روشنی میں اسے ایک شخص کمبل اوڑھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ جب وہ شخص اس کے قریب پہنچا تو یہاں وہ اجالا نہیں تھا، پھر یوں بھی اس نے کمبل منہ تک لپیٹ رکھا تھا، وہ شخص سائے کی مثال پاس سے گذر گیا۔ اس کے گذر جانے پر اسے کرید ہوئی کہ آخر یہ کون شخص تھا۔ مڑ کر دیکھا تو گلی خالی پڑی تھی۔ اتنی جلدی وہ گلی سے گذر گیا! اسے کچھ تعجب ہوا سوچا کہ کیوں نہ پلٹ کر گلی کے کنارے پہ پہنچ کر اسے دیکھ لیا جائے۔ مگر پھر فوراً ہی اسے خیال آگیا کہ یہ تو بڑی بے تکی

بات ہے اور اس نے اپنی چال تیز کر دی۔

اس تپلی اندھی اپسی گلی سے گذر کر جب اس نے قاضیوں والی گلی میں قدم رکھا تو تھوڑی ڈھارس ہوئی۔ اس نسبتاً چوڑی گلی میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے دور تک کھمبے کھڑے تھے جن کی روشنی سے ساری گلی منور تھی۔ تھوڑی دور چلا ہوگا کہ پیچھے قدموں کی چاپ اور قدموں کی چاپ کے ساتھ دو آدمیوں کی باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ جی میں آئی کہ پیچھے مڑ کر دیکھو تو سہی کہ کون لوگ ہیں۔ مگر فوراً کے فوراً ارادہ ترک کر دیا۔ ہوگا کوئی، اپنی بلا سے۔ ہاں پیچھے کان لگا کر یہ ضرور اس نے سننے کی کوشش کی کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ مگر جیسے وہ کوٹ یا کمبل کے اندر منہ دیکر باتیں کر رہے ہوں ایک لفظ بھی تو اس کے پلے نہیں پڑا۔ پھر وہ قدم کسی درمیان میں کٹنے والی گلی میں مڑ گئے کہ ساتھ اس کے قدموں کی چاپ بھی کم ہوگئی۔ پھر دور بہت پیچھے کسی دروازے پہ دستک ہوئی کہ وہ فوراً کھلا اور کھل کر زور سے بند ہوگیا۔ تب اچانک اسے احساس ہوا کہ سب گھروں کے دروازے بند ہوچکے ہیں اور وہ باہر گلی میں اکیلا چل رہا ہے۔ اس نے لمبے لمبے ڈگ بھرنے شروع کر دیئے۔ رات بہت ہوگئی ہے، جلدی گھر پہنچنا چاہیئے۔ لمبے ڈگوں کے ساتھ ہمراہ چلتی پرچھائیں بھی تیزی سے حرکت کرنے لگی۔ جلدی جلدی لمبی ہوتی چلی جاتی، پھر چھوٹی ہونے لگتی، چھوٹی ہوتے ہوتے اس کے قدموں سے لپٹتی اور پھر پیچھے پھیلتی چلی جاتی لمبی ہوتی جاتی۔ یہ اتنی بڑی پرچھائیں میری ہے؟ ایک اڑتا سا خیال پرچھائیں کی شال ذہن میں آیا اور گذر گیا۔ آپ ہی آپ وہ آہستہ چلنے لگا۔ اسے تھوڑی تھوڑی سردی لگنے لگی تھی اور انگلیاں تو بالکل ٹھنڈی ہوگئی تھیں۔ سردی ناخنوں اور پوروں سے چڑھتی ہے، آدمی کے پاس دستانے ضرور ہونے چاہئیں۔ جاڑے کی راتوں میں سکڑتے ہوئے بندے علی اسے الل ٹپ یاد آگئے کہ کسی بھی گلی کے نکڑ پر کسی سڑک کے موڑ پر اچانک نظر آجاتے۔ کبھی کوئی پھٹا ٹوٹا کمبل لپیٹے کبھی کمبل غائب، خالی کرتا پائجامہ سر پہ میلی سی ٹوپی، مگر سیدھے ہاتھ کی انگلیاں ہر صورت جھٹکتے جھاڑتے ہوئے، کبھی منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے کبھی گم سم اپنے آپ میں کھوئے ہوئے جیسے باقی دنیا سے کوئی رشتہ نہیں۔ یہ رشتوں کا جہان بھی کیا تنگ ہے کہ قدم ذرا غلط پڑا اور آدمی اس سے باہر۔ پہلے وہ خود ایک جہان ہوتا ہے، بکھرے رشتوں کا خود مختار جہاں، جہاں تسبیح کھنکھجورا اور کھنکھجورا تسبیح ہوتی ہے....

"تو شہزادے کے سر میں ہر وقت درد رہوے۔ حکیموں طبیبوں ویدوں نے سب علاج کر دیکھے پر کوئی علاج نہ لگے۔ تب شاہی حکیم نے کہ سب حکیموں کا استاد تھا یہ کہا کہ میں شہزادے کی کھوپڑی کھول کے دیکھوں گا۔ تو اس نے کیا کیا کہ شہزادے کو بیہوشی کی دوائی پلائی اور تیز تلوار سے اس کی کھوپڑی ٹوپی کی طرح اتار لی.........."

"کھوپڑی؟"

"ہاں بیٹا حکیم نے شہزادے کی کھوپڑی جو اتاری تو کیا دیکھے ہے کہ مغز میں کھنکھجورا پنجے گاڑے بیٹھا ہے........"

"کھنکھجورا!"

"ہاں بیٹا کھنکھجورا۔ اب حکیم شش و پنج میں کہ نکالوں کیسے۔ اور دیر کرے تو شہزادے کی جان کا خطرہ۔ تو اس کے شاگرد نے کہا کہ یا استاد گستاخی معاف، آگ منگاؤ، آگ کے ساتھ چمٹی منگاؤ، چمٹی سے ایک دہکتا انگارہ پکڑو، انگارہ پکڑ کے کھنکھجورے کی پشت پر رکھ دو۔ تو بھیا حکیم نے یہی کیا۔ بس کھنکھجورے نے تڑپ کے پنجے چھوڑ دیئے......." ایک لمبی جھرجھری کے ساتھ وہ چونک پڑا۔ قدم اس کے تیز تیز اٹھنے لگے۔

وہ اپنے آپ سے خفا خفا چل رہا تھا۔ آخر یہ بھولے بسرے قصے جن کا کوئی سر پیر نہیں کیوں یاد آرہے ہیں۔ کھنکھجورا کہیں دماغ کے اندر ہو سکتا ہے! آخر کیسے اور کیوں؟ اندر تو وہ پیدا ہو نہیں سکتا، باہر ہی سے جائے گا۔ مگر کس راستے سے؟ کان کے راستے سے؟ جیسے اس لڑکی کے دماغ میں جس کا سر ہر وقت دکھا کرتا تھا ایک ننھی کنسلائی کان کے رستے داخل ہوگئی تھی، اور پھر کنسلائی سے کنسلائی اور کنسلائی سے کنسلائی پیدا ہوئی کہ دماغ میں کنسلائیاں ہی کنسلائیاں رینگنے لگیں۔ اس نے گھگھیاہٹ کے احساس کے ساتھ سر کو ذرا جھٹکا۔ لاحول ولاقوۃ، یہ کیا کم مضحکہ خیز کہانی ہے۔ اس کا بس چلتا تو اس وقت اپنے دماغ میں کنجی لگا دیتا۔ مگر دماغ میں کنجی نہیں لگائی جا سکتی اور خیال کے ہزار پیر ہوتے ہیں کہ بے آہٹ رینگتا رینگتا کبھی کان کے راستے کبھی آنکھ کے سہارے دماغ کے اندر داخل ہوتا ہے اور اندھیرے میں چھپ بیٹھتا ہے۔ اسے اپنے آپ پہ غصہ آنے لگا کہ وہ کیوں پیر صاحب کی دکان پہ بیٹھ کر عقل سے خارج باتیں اور فرضی قصے سنتا ہے۔ آخر یوں وقت ضائع کرنے سے فائدہ؟ ــــ اندھیرے میں ایک ساتھ سیاہی کا ایک تودا اٹھ کھڑا ہوا کہ وہ ٹھٹھک گیا اور چیخ بس منہ سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔

اسے رمضانی پہ غصہ آنے لگا کہ کمبخت بیچ گلی میں بھینس کو باندھ دیتا ہے۔ شاید یہ غصے ہی کا اثر ہو کہ بدن اس کا کچھ کانپنے لگا تھا۔ یا شاید سردی کا اثر ہو؟ ویسے تھوڑا تھوڑا پسینہ بھی آگیا تھا اور دل بلا وجہ دھڑکنے لگا تھا۔ سردی تو اسے اب مطلق نہیں لگ رہی تھی، بلکہ اس کا تو یہ دل چاہ رہا تھا کہ گرم کوٹ ہی کے نہیں قمیص کے بٹن بھی کم از کم اوپر والا بٹن ضرور کھول دے تاکہ تنگ کالر جو اس گھڑی زیادہ تنگ لگ رہا تھا ڈھیلا ہو اور گلے اور گردن کو کچھ سکون ملے۔

قاضیوں والی گلی سے تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گویا چل نہیں بھاگ رہا ہے وہ پتھر والے کنوئیں پہ، پتھر والے کنوئیں کے پاس سے گذر کر شیخ جی کی ٹال کے سامنے سے نکلتا ہوا وہ تیزی سے اپنی گلی میں مڑ گیا۔ مگر وہ اتنا تیز کیوں چل رہا ہے؟ اس نے اپنی چال سست کر دی۔ یوں بھی اسے کچھ اطمینان سا ہو گیا تھا جیسے گرجتے بادلوں اور گھرتی گھٹا والے آسمان سے بچ کر وہ چھت کے سائے میں آگیا ہو۔ گلی خالی اور خاموش تھی، ساتھ میں پرسکون بھی۔ روشنی جو قاضیوں والی گلی کے آدھے رستے پہ پہنچ کر ساتھ چھوڑ گئی تھی پھر واپس آگئی تھی اور اس کے مکان کے بالکل برابر بجلی کے کھمبے کے نیچے اجالے کا ایک تھالا چھلک رہا تھا۔ قدموں کے ساتھ دل کی چال کے ساتھ سانس کی رفتار بھی معتدل پہ آچلی تھی۔ اطمینان سے چلتا ہوا وہ اپنے دروازے پہ پہنچا۔ تالا کھولا، بجلی جلائی اور کمرے میں جو بیٹھک بھی تھا اور خوابگاہ بھی قدم رکھا۔

کپڑے اتارتے اتارتے عقب میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے مڑ کر بستر پہ نظر کی۔ بستر خالی تھا۔ ہاں بستر کے پائنتی دیوار کے سوراخ میں دہی ہو رہا جو اس کمرے میں کبھی آزادانہ کبھی چوری چھپے گھومتا نظر آتا تھا داخل ہو رہا تھا کہ دم اس کے سوراخ میں گم ہو جانے کے بعد بھی لہراتی رہی اور جسم میں اس کے اک ہلکی جھرجھری پیدا کر کے آہستہ سے اوجھل ہو گئی۔ کپڑے اتارنا بھول کر وہ بستر صاف کرنے لگا۔ زور زور سے چادر جھاڑی، جھاڑ کر بچھائی، لحاف کو جھاڑا، تہہ کر کے رکھا، تکئے کا غلاف اتارا، اتار کر جھڑکا یا اور قرینے سے سرہانے جمایا۔

نیند آنکھوں سے رخصت ہو چکی تھی۔ جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکالتے ہوئے اڑتی سی نظر پلنگ کی پائنتی سے ادھر کے سوراخ پہ ڈالی اور کرسی پہ بیٹھ گیا۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے میر صاحب کی بات پھر یاد آگئی "تمہیں اپنے والد یاد ہیں؟ انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا"۔ اور قرآن شریف پہ جھکا ہوا وہ سفید ڈاڑھی والا پریشان چہرہ تصور میں پھر ابھرنے لگا۔ اور وہ گھر بھی جس میں کئی دن تک تالا اور اندھیرا پڑا رہا تھا۔ پھر جب واپس ہوئے تو ڈرے ڈرے سے۔ ویسے بالائی کمرے میں اس کے بعد بھی تالا پڑا رہا تھا۔ باہر تالا اور اندر اندھیرا پڑا رہتا اور صحن میں کھلنے والی کھڑکی جو وظیفے کے ختم کے دن کھل رہ گئی تھی کھلی پڑی رہتی۔ اور کسی کسی جمعرات کو شام پڑے لگتا کہ اندر کوئی چل رہا ہے اور سب کے سب سہم جاتے۔ وہ گھر جس کی چھتیں اور زینے اور کمرے کل تک مانوس تھے اب کتنا ڈراؤنا لگتا تھا۔ اور سگریٹ سلگا کر اس نے اک ذرا عجلت سے میز پہ پڑی ہوئی وہ کتاب اٹھائی جو کل پڑھتے پڑھتے درمیان سے چھوڑ دی تھی۔ اکھڑی اکھڑی طبیعت جمی نہیں۔ تیسرے صفحے پہ بالکل اکھڑ گیا اور کتاب بند کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اٹھتے ہوئے نظر نادانستہ پھر پلنگ کی پائنتی سے ادھر کے خالی سوراخ پہ جا پڑی۔ اتارا ہوا کوٹ کھونٹی سے اتار جھٹ پٹ پہنا، قریب ٹنگا ہوا مفلر کھینچ گلے میں ڈال، بجلی بجھا، کمرہ بند کر باہر نکل آیا۔ بجلی گلی کی گل ہو چکی تھی۔ وہ حیران ہوا کہ ابھی تو وہ بجلی جلتی چھوڑ کر گیا تھا اور ابھی نکلا ہے تو بجلی ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ پھر خیال آیا کہ اچھا آج چاندنی رات ہے۔

مفلر سر سے لپیٹتا لپیٹتا وہ گلی سے باہر چلا۔ روشنی دور تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہاں جا بجا چاندنی اتری ہوئی تھی جس کے عکس سے کچھ اندھیرے میں بھی اجالا جھلکنے لگا تھا۔ ساتھ میں کہرے نے مل کر فضا کو دودھیا دودھیا کر دیا تھا۔ سردی اب زیادہ ہو گئی تھی۔ ٹھنڈی ہوتی انگلیاں اس نے مٹھی کی صورت میں بھینچیں۔ سردی ناخنوں اور پوروں کی راہ بدن میں چڑھتی ہے آدمی کے پاس دستانے ضرور رہنے چاہئیں، اس نے ہاتھوں کو کوٹ کی جیبوں میں ٹھونس لیا۔

قاضیوں کی گلی میں مڑتے ہوئے سامنے رمضانی کے دروازے پہ نظر ڈالی جہاں بھینس حسب توقع موجود تھی، مگر تھی بیٹھی ہوئی۔ برابر سے گذرنے پہ بھی نہ چونک کر کھڑی ہوئی نہ گردن کو جنبش دی! بس جگالی کرنے والا جبڑا جیسے سِلا ہوا، آنکھیں بند، دم ساکت۔ بس کالونس کا ایک ڈھیر سا رکھا تھا۔ بجلی کے سب کھمبے ٹھنڈے ہو چکے تھے اور گلی خالی اور خاموش تھی۔ بس چاندنی کے عکس سے دمکتا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایک سفید بلی ایک بند دروازے کے برابر دہیروں پہ بیٹھی اسے دور سے گھور رہی تھی! نیلے کنچا سی پتلیاں ٹکٹکی باندھے اسے گھورتی رہیں یہاں تک کہ وہ اس کے برابر آگیا اور برابر سے گذر کر آگے نکل گیا۔ مگر جب تیلی اگلی ایسی گلی میں مڑ رہا تھا تو اس نے سامنے دیوار پہ جہاں چاندنی اتر چلی تھی بلی کی چلتی پرچھائیں دیکھی جو تھوڑی

میں مکھائی دی پھر اوجھل ہوگئی۔ اس گلی میں چلتے ہوئے اس شخص کا خیال اسے پھر آگیا جو پاس سے سائے کی صورت گذر گیا تھا۔ آخر کون شخص تھا وہ؟ اتنی دیر کی بات بھی ابھی کی لگنے لگی۔ وہ ذرا تیز تیز چلنے لگا اور مڑنے میں خاص طور پر عجلت برتی۔ عجلت سے مڑ کر دور تک نظر ڈالی۔ گلی یہاں بھی خالی پڑی تھی۔ ہاں آخری نکڑ پر کھلی ہوئی چاندنی میں سے ایک کھڑی دم اور اٹھے ہوئے منھ کے ساتھ سنتری کی صورت کھڑا تھا۔ کتنے رات میں آدمی کو بہت خراب کرتے ہیں، گھر سے چھڑی لیکر نکلنا چاہیئے۔ اس کی رفتار پھر آہستہ ہوگئی۔ گلی خاموش تھی۔ ماسٹر امتیاز علی کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ قدیہ کے بالائی کمرے کی روشنی گل تھی۔ آج شاید وہ سویرے سو گیا تھا۔

گلی کے نکڑ پہ پہنچتے پہنچتے وہ اندھیرے سے اچانک چاندنی میں آگیا۔ مگر وہ کتا کہاں گیا! اس نے ادھر ادھر بہت نظر دوڑائی، کتا کہیں دکھائی نہیں دیا۔ اسے تعجب، تعجب کے ساتھ اطمینان ہوا کیونکہ وہ گھر سے چھڑی لیکر نہیں چلا تھا اور کتے رات کو ہر شریف آدمی پہ جا و بیجا بھونکتے ہیں۔ سائے کی طرح برابر سے گذر جانے والے نامعلوم شخص کا خیال پرچھائیں کی مانند اس کے ذہن میں آیا اور گذر گیا۔ اور چپکے سے ایک سوال اس کے اندر پیدا ہوا۔ کیا بندے علی رات کو بالکل نہیں سوتے تھے؟ لگتا تو ایسا ہی تھا...... اور سیٹی کی آواز پہ اس نے چپل اتار ہاتھ میں لئے اور دوڑنا شروع کر دیا۔ سیٹی کی آواز اب کے کہیں قریب سے آئی تھی اور وہ دوڑتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب کے بھی اگر سالے ہاتھ سے نکل گئے تو بیٹا ساری رات چھ رہنے رہو گے اور گھر میں پٹائی ہوگی سو الگ۔ خیر دروازہ تو اب بھی بند ہو ہی چکا ہوگا اس نے ایک ایک ہاتھ میں تھامے ہوئے ایک ایک چپل کو اور مضبوطی سے جکڑا اور زیادہ تیزی سے دوڑنا شروع کر دیا۔ مگر گلی میں مڑتے ہی وہ ٹھٹھک گیا۔ پاؤں سو سو من کے ہو گئے کہ بھاگا جائے نہ ٹھہرا جائے۔ بندے علی ماسٹر صاحب کے دروازے کی طرف منھ کئے چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے اور دروازہ بند گلی خالی تھی۔ آہٹ پہ انہوں نے مڑ کے بڑی بڑی گھبرائی آنکھوں سے اسے گھورا۔ پھر انگلیوں کو زور سے جھٹکا اور جلدی جلدی چل کر دوسری گلی میں مڑ گئے۔ اور وہ پلٹ سکتا تھا نہ بڑھ سکتا تھا۔ اونچی دیواروں والی اس گلی کی دونوں طرفیں اسے بند لگ رہی تھیں جیسے وہ کسی گہری کھائی میں گر پڑا ہو۔ اس نے رفیا اور منے اور دینا کو زور سے آواز دینی چاہی مگر آواز گلے میں پھنس گئی اور سینے پہ بوجھ سا رکھا ہوا...... خیال کا سلسلہ بس آپ ہی آپ ٹوٹ گیا۔ سڑک اسی طرح خاموش تھی اور کھری ملی چاندنی پوری سڑک پہ پھیلی ہوئی تھی۔ قدم اس کے تیزی سے اٹھ رہے تھے اور دل کچھ کچھ دھڑکتا ہوا۔ جاڑا اسے اس وقت بالکل نہیں لگ رہا تھا، بلکہ گرم کپڑے بدن پہ بوجھ بن گئے تھے۔ سر اور کانوں پہ لپٹا ہوا مفلر اس نے ڈھیلا کیا اور کوٹ کے دونوں بٹن کھول دیئے۔ اس کے تیز تیز اٹھے ہوئے قدموں کی چاپ اتنی اونچی تھی کہ وہ خود ہی اس سے ڈر گیا۔ وہ آہستہ چلنے لگا ہم رکاب پرچھائیں بھی آہستہ چلنے لگی۔ اس نے اپنی چاپ اور پرچھائیں سے قطع نظر کر کے سڑک کے نزدیک و دور کا جائزہ لیا۔ سڑک خالی تھی بس کنارے کنارے دودھیا کھمبے چاندنی میں نہائے ہوئے بینائی سے محروم ایک دوسرے سے بے تعلق کھڑے تھے۔ ایک دوسرے سے بے تعلق نابینا کھمبوں کو دیکھ کر اسے اچنبھا ہونے لگا کہ جب روشن تھے تو سڑک کے اس کنارے سے اس کنارے تک ایک رشتے میں کیسے پیوست نظر آتے تھے۔ تو روشنی رشتہ ہے؟ یا رشتہ سے روشنی پیدا ہوتی ہے؟ یعنی جسم اور پرچھائیں کا رشتہ روشنی نے پیدا کیا ہے یا روشنی کو جسم اور پرچھائیں کے رشتہ نے پیدا کیا ہے؟ اور قدموں اور چاپ کا رشتہ؟ چاپ کے قدموں کی پرچھائیں ہے یا قدم؟ — وہ گڑبڑا گیا جس خیال کا سر پیر نہیں ہوتا اس کے کتنے پیر ہوتے ہیں — بسر پیر کے خیال سے بچنے کے لئے آدمی کو واقعی اپنے گرد حصار کھینچنا چاہیئے ورنہ ہزار بسر پیروں والے وسوسے اور واہمے اس کے گرد حصار کھینچ لیں گے۔ وہ جلدی سے مڑ کر بازار والی سڑک پہ ہولیا۔

بازار جسے وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے جاگتا چھوڑ گیا تھا اب سویا ہوا تھا۔ اسے یوں لگا کہ ایک جگ کے بعد وہ اس بازار میں پلٹا ہے۔ بجلیاں ٹھنڈی تھیں اور خالی سڑک نصف نصف چاندنی اور سائے میں تقسیم تھی کہ ایک طرف کی بند دکانیں اجالے میں اور دوسری طرف کی بند دکانیں اندھیرے میں تھیں۔ اس نے چاندنی چھوڑ کر سائے میں چلنا شروع کر دیا گویا کسی سے چھپ کر چلنا چاہتا ہے۔ مگر چند قدم چلا تھا کہ ایک تھڑے کے نیچے سے تیزی کے ساتھ ایک سیاہ سی شے نکلی۔ وہ گھگھیا کے پیچھے ہٹا۔ پھر فوراً ہی سنبھل گیا۔ وہ تو کتا تھا جو اسے دیکھ کر سڑک پہ آ کھڑا ہوا تھا اور بھونکنے لگا تھا۔ وہ بیسے سنبھل جانے کے باوجود دل اس کا زور زور سے دھڑک رہا تھا اور ٹانگیں کچھ کچھ کانپنے لگی تھیں اور کتا تھا کہ بھونکے جا رہا تھا۔ لحاف میں لپٹی ہوئی ایک آواز نے اسے دھتکارا اور وہ بھونکنا بند کر کے آہستہ آہستہ غرغر کرنے لگا اور اسے اس وقت تک غور سے دیکھتا رہا جب تک وہ دکان کے سامنے سے گذر نہیں گیا۔ اور وہ گذرا بھی اس چال سے جیسے کتے پہ ثابت کر رہا ہو کہ وہ اس سے بالکل نہیں ڈرا ہے۔ ہاں دکان کے سامنے سے گذرتے ہوئے اس نے ایک

اچٹتی سی نظر دوکان کی طرف ضرور ڈال۔ وہاں دوکان کے مقفل دروازے سے متصل سائبان کے نیچے ایک چارپائی بچھی تھی جس پہ میلے لحاف میں لپٹا ہوا کوئی پڑا تھا۔ یہ کون شخص ہے جو اس جاڑے میں باہر سوتا ہے؟ دکان والا ہوگا۔ اس نے سوچا۔ مگر دکان والا ہے تو اندر بھی سو سکتا تھا۔ کوئی شخص ہو سکتا ہے! مارو گولی، ہوگا کوئی۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں قیاس کے اس سلسلہ کو رد کر دیا۔ اسی فیصلہ کن انداز میں اس کے قدم بھی اٹھنے لگے۔ کہ چلتے چلتے اسے شک گذرا کہ کوئی پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ اور اس شک کے ساتھ دل کی حرکت رکنے لگی۔ مگر پھر اس نے سوچا کہ وہی کتا ہوگا۔ کبھی کبھی کتا بھی تو اس احتیاط سے چلتا ہے کہ اس کی آہٹ آدمی کے قدموں کی آہٹ بن جاتی ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنا چاہا مگر پھر رک گیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا اپنے خوف کا اعلان کرنا ہے۔ پھر وہ بہت تنگ کرے گا۔ اور اسے یکایک گمان ہوا کہ کیا خبر یہ وہی شخص ہو جو لحاف میں منہ دیئے پڑا تھا۔ ارے نہیں۔ اسے باؤلے کتے نے کاٹا ہے کہ وہ اس جاڑے میں بستر سے اٹھ کر کسی کا پیچھا کرے گا۔ آخر کیوں؟ اور وہ اندھیرے کی سمت سے ہٹ کر چاندنی والی سمت میں آ گیا۔ چلتے چلتے ایک مرتبہ کنکھیوں سے اس نے اس لحاف والی چارپائی کو دیکھنے کی بھی کوشش کی۔ مگر وہ اب اتنا آگے نکل آیا تھا کہ اسے وہ چارپائی نظر نہ آ سکی۔

میر صاحب کی مقفل دوکان کے سامنے سے نکلتے ہوئے اسے پھر اپنے والد یاد آ گئے۔ قرآن شریف پہ جھکا ہوا وہ پریشان چہرہ اور وہ تلاوت کرتی ہوئی اکیلی آواز کہ رات کی خاموشی میں سارے گھر میں گونجتی رہتی۔ وہ آواز آوازوں کے جہان سے اب کتنی دور ہو گئی تھی اور وہ اپنا گھر باوجود بولنے چالنے کے کتنا خاموش ہو گیا تھا...... اس نے میر صاحب کی مقفل دوکان سے نظر ہٹا کر سامنے سڑک کو دیکھا۔ دور سڑک کے نکڑ پہ مدھم مدھم روشنی نظر آئی۔ تو مولوی ٹنٹے کی دوکان اب تک کھلی ہے! اور اس مشاہدے کے ساتھ اسے اس بازار کے پچھلے دن یاد آ گئے جب رات گئے تک دوکانیں کھلی رہتی تھیں اور میر صاحب کی دوکان پہ چوکڑی جمی رہتی تھی۔ اور اب نہ دیکھے نعیم اور خود وہ ان کے سامعین میں ہیں۔ اس خیال سے اس کی طبیعت اداس اداس ہو گئی۔ رہ رہ کر اسے خیال آ رہا تھا کہ اس بازار کو کیا ہو گیا۔ وہ رنگیلے کیا ہوئے؟ وہ شب بیدار دوکاندار دوکانیں بڑھا کر کس کھوہ میں چلے گئے؟ اب صرف مولوی ٹنٹا..... مگر مولوی ٹنٹا تو........ اسے وہ داستان یاد آ رہی کہ مولوی ٹنٹا کی دوکان صبح تک کھلی رہتی ہے کیونکہ آدھی رات کے بعد جن اس کی دوکان سے پان اور عطر اور اگربتیاں خریدنے آتے ہیں۔ اسے یہ داستان اس وقت بے سروپا نظر آ رہی تھی۔ ایک بھلے مانس کو خواہ مخواہ باؤلا بنانا۔ اس داستان کو رد کرتے ہوئے اس نے تیزی سے قدم اٹھائے اور جلدی جلدی چل کر مولوی ٹنٹا کی دوکان پر جا کر دم لیا۔ خمیدہ کمر، کالی رنگت، گال پچکے ہوئے، بڑا سا دہانہ، سامنے کے دو دانت ٹوٹے ہوئے، کلے میں تمباکو والا پان رکھا ہوا جس کے باعث اکثر وہ انگلیوں کے اشاروں اور آنکھوں کی نقل و حرکت کے ذریعہ سوال و جواب کرتا۔ اس کی بڑی بڑی گھورتی آنکھوں سے وہ ڈر سا گیا اور بجلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں دوڑا، کہیں مولوی ٹنٹا خود ہی تو....... ارے نہیں، کیا فضول بات ہے۔ یوں اپنا ذہنی اطمینان کر لینے کے بعد بھی وہ اس کی سوالیہ نظروں سے سٹپٹایا ہوا رہا۔ سگریٹ تو ابھی ہے، اس نے جیب ٹٹولتے ہوئے سوچا۔ پان، ہاں پان کھا لینا چاہیئے۔ "پان" اس نے کہا۔ مولوی ٹنٹا کی نظریں اس کے چہرے سے ہٹ کر اپنے کام پر مرکوز ہو گئیں۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالی۔ سلگتی رسی سے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی نظر مولوی ٹنٹا کے جلدی جلدی حرکت کرتے ہوئے سیدھے ہاتھ پہ جا پڑی جس کی تین انگلیاں گم تھیں، انگشتِ شہادت تین چوتھائی، بس انگوٹھا سالم تھا۔ اسے یاد آیا کہ مولوی ٹنٹا جوانی میں شب برات پر پٹاخے بنایا کرتا تھا۔ گولا کٹتے کٹتے کنکر نے موسل سے رگڑ کھائی اور گولا اس طرح پھٹا کہ سوا تین انگلیاں اس کی اپنے ساتھ لے گیا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے سلگتی رسی انگلیوں سے چھوڑ دی جو تھوڑی دیر جلتی رہی۔ پھر ساکت ہو گئی۔ اس نے ایک لمبا کش لیا اور دھواں اڑاتے ہوئے پان کے لئے مولوی ٹنٹا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پان منہ میں رکھنے کے بعد اسے اپنی انگلیاں گیلی گیلی لگیں۔ اس نے روشنی کے قریب لا کر اپنی انگلیوں پر نظر کی۔ شاید کتھا بہت پتلا تھا کہ انگلیاں اس کی سب کی گیلی ہو گئی تھیں۔ کتھئی دھبوں والی پونچھن سے اس نے انگلیاں صاف کیں، پھر سگریٹ کو انگلیوں میں داب کر ایک لمبا کش لیا اور نعیم والی گلی میں اتر گیا۔

اگر انگلیاں اڑ جانے کی وجہ سے اپنا مولوی مولوی ٹنٹا ہو گیا تو جس شہزادے نے رات کے پھندے میں آنے والی پھول شہزادی کو پکڑنے کی غرض سے اپنی انگلی تراش لی تھی اسے شہزادہ ٹنٹا کیوں نہ کہا جائے؟ اور یہ پرانے زمانے کے شہزادے بھی عجیب تھے، شب بیداری کا ایک ہی طریقہ جانتے تھے کہ انگلی قلم کی اور زخم پر پسی ہوئی مرچیں چھڑک لیں۔ کیا انگلی میں زخم پیدا کئے بغیر شب بیداری ممکن نہیں؟ اور کیا پریاں اور جن شب بیدار

ہی کو نظر آتے ہیں؟ اور کیا مولوی ٹنٹا کی دوکان پر سچ مچ جن عطار اور پان اور اگر بتیاں لینے آتے ہیں؟ اور کیا بندے علی کی انگلیوں میں جو واقعی...... اور سوئی ایسے پیروں والے رینگتے ہوئے سوال ایک بے سر پیر کی ابھرتی ہوئی تصویر میں تحلیل ہو گئے۔ چندی حلوائی ایک سرخ منہ والے زرد رنگ سانپ کو دم سے پکڑے دوکان سے باہر نکلا۔ دھڑ کے ساتھ زاویۂ قائمہ بناتے ہوئے اس لمبے ہاتھ کی انگلیوں نے دم کو جکڑ رکھا تھا اور رسی کی مثال لمبے سانپ کے سرخ منہ سے سوئی زبان چنگاری کی طرح بار بار نکلتی تھی۔ چندی حلوائی اس شان سے پرانے مندر تک گیا اور وہاں اندھے کنوئیں کی من پہ کھڑے ہو کر اس نے اپنا تانا ہوا ہاتھ کنوئیں کے بیچوں بیچ ٹھہرایا اور انگلیاں ڈھیلی کر دیں۔ وہ زرد دم انگلیوں سے پھسل کر کنوئیں کے اندھیرے میں اوجھل ہو گئی...... اس اوجھل ہوتی تصویر کے ساتھ اسے ایک پھریری آئی اور ساتھ ہی وہ منظر یاد آ گیا جب اس نے نتے کی دیکھا دیکھی چوہے دان میں مقید چوہے کی تاروں سے باہر نکلی لمبی دم پکڑ لی تھی مگر فوراً گھگھیا کر چھوڑ دی اور پھر صابون سے خوب مل مل کے ہاتھ دھوئے مگر کئی دن تک اس کی انگلیاں اس گلگلے سے احساس سے اس کی طبیعت میں بدمزگی پیدا کرتی رہیں۔ اور اس یاد کے ساتھ گجگجاہٹ کی ایک کیفیت پوروں سے شروع ہوئی اور پورے بدن میں دوڑتی چلی گئی۔ اس نے سر کو آہستہ سے جھٹکا۔ وہ ان رینگتی یادوں اور سرسراتے وسوسوں کے جال سے نکل کر اطمینان سے چلنا چاہتا تھا۔ گردن پہ پڑا ہوا مفلر اس نے سر اور کانوں پر اچھی طرح لپیٹا۔ اسے اب سردی لگ رہی تھی۔ اس نے اپنی ٹھنڈی ہوتی انگلیوں کی مٹھیاں باندھیں اور جیبوں میں ٹھونس لیں۔ پھر سوچنے لگا کہ مفلر تو موجود ہے ہی۔ کانوں کو ہوا نہ لگے تو آدمی سردی کی سو بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے۔ بس دستانے اور خرید لینے چاہئیں کہ سردی ناخنوں اور پوروں کی راہ بھی چڑھتی ہے۔

نعیم کا گھر اب قریب تھا اور جاڑوں کے لئے جو چیزیں اسے مطلوب تھیں اس کے منصوبوں نے اس کی توجہ کو بہت حد تک جذب کر لیا تھا مگر کوئی گمنام ہزار پا خیال شاید ابھی تک اس کے ذہن کے کسی عقبی گوشے میں چپکے چپکے رینگ رہا تھا کہ طبیعت اس کی پوری طرح بحال نہیں ہوئی تھی۔ اصل میں اوٹ پٹانگ خیالوں اور یادوں نے اسے بہت بے مزہ کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ جس خیال کا سر پیر نہیں ہوتا اس کے ہزار پیر ہوتے ہیں جو کبھی کانوں کی راہ اور کبھی آنکھوں کی پتلیوں کے ذریعہ کبھی انگلیوں کی پوروں کے اندھے راستے رینگتا رینگتا دماغ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس نے طے کیا کہ حواس لعنت ہیں، وہ کون حکیم تھا جس نے اہلِ نظر کو کچھوے کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کی تھی؟ کچھوا جس کی پشت حصار ہے کہ اس کی بدولت وہ درد و الم سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی پشت حصار ہے کہ حصار کا بار اس کی پشت پر ہے؟ اور اہلِ نظر کچھوے ٹھہرے یا کچھوا اہلِ نظر ہے؟ اور آدمی؟ آدمی تو ظالم و جاہل ہوا کہ بے منتِ حصار جینا چاہتا ہے؟ — سوئی ایسے پیروں والے سوال اس کے ذہن میں پھر رینگنے لگے تھے۔ اس نے جلدی سے قدم تیز کئے اور نعیم کے بند دروازے پر رکتے ہوئے زور سے دستک دی۔

نعیم نے دروازہ کھولا اور آنکھیں ملتا ہوا باہر نکل آیا "کون؟ ارے تم!"

"ہاں یار نیند نہیں آ رہی تھی۔ بیٹھے بیٹھے خفقان ہونے لگا۔ میں نے کہا کہ چلو نعیم ہی کی طرف چلے چلو۔"

"یار تمہارے دماغ میں بھی کیڑا ہے۔"

"کیا؟" وہ چونک پڑا۔

"ہاں اور نہیں تو کیا۔" نعیم کہنے لگا "جب میں نے کہا تھا تو نہیں مانے۔ اور اب جب میں سو گیا ہوں تو آ کر آدھی رات کو دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ آؤ، اندر چلو۔"

نعیم کے پیچھے پیچھے وہ اندر گیا۔

"کپڑے بدلو، اور بس سو جاؤ۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اس نے کوٹ کے بٹن کھولے، مفلر اتار کر الگ رکھا، پھر کوٹ اتارتے اتارتے رکا، عین بجلی کے نیچے جا کر کھوئی کھوئی نظروں سے وہ اپنی انگلیاں دیکھنے لگا۔

"کیا ہوا؟" نعیم نے حیران ہو کر سوال کیا۔

"کچھ نہیں۔" وہ انگلیوں کو غور سے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا "مولوی ٹنٹے نے آج کچھ اتنا چپلا کر رکھا تھا کہ میرا سارا ہاتھ کتے سے خراب ہو گیا۔" ایک گجگجاہٹ کے ساتھ جیسے انگلیاں اس کی سچ مچ کتے میں سن گئی ہوں اس نے انگلیاں مٹھی کی صورت میں سمیٹیں اور جیب میں ہاتھ ٹھونس لئے۔ اسے وہ فقرہ اڑتا اڑتا سا پھر یاد آ چلا تھا: "تمہیں اپنے والد یاد ہیں۔ انہوں نے بھی حصار نہیں کھینچا تھا۔"

اور سورج نکل آیا

صادق حسین

دفعتاً اکبر کا مضبوط ہاتھ ہوا میں بلند ہوا اور پھر دوسرے لمحہ جیسے ایک بھاری سل پارو کے سانولے منہ پر دھائیں دھائیں برس پڑی ہو۔ پارو کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ سر چکرا گیا۔ نرم و نازک رخسار پہ پانچ انگلیوں کے نشان تیزی سے ابھرنے لگے۔ اچانک اور غیر متوقع چوٹ کھا کر پارو کو درد کا احساس کم ہوا مگر حیرت زیادہ معلوم ہوئی۔ ضرب چہرہ پر لگی تھی مگر لہو کی دھاریں دل سے پھوٹ نکلیں۔ وہ پتھر کا مجسمہ بنی چوکی پر بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ لمحہ بہ لمحہ اسے محسوس ہونے لگا جیسے اس کی سرخ ساڑھی میں آگ لگ گئی ہو۔ چوڑے سنہرے حاشیہ والی شوخ سرخ رنگ کی ساڑھی جو اکبر چھنگا ؤں سے خرید کر لایا تھا۔ وہی ساڑھی جو پارو نے چار ماہ پہلے شبِ عروسی پر پہنی تھی اور اکبر نے اس کا گھونگھٹ اٹھا کر محبت بھری آواز میں کہا تھا "سبحان اللہ آج میرے گھر میں چاند نکل آیا ہے" وہ بات، وہ فقرہ، وہ جیتی جاگتی بھرپور زندگی کی پکار سن کر پارو کو ایک عجیب و غریب احساس ہوا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔ اس کی پلکیں خود بخود جھک گئی تھیں۔ اس رات اکبر نے من موہ لینے والی باتیں کی تھیں۔ اور ان باتوں میں کھو کر پارو اپنا گاؤں، اپنا میکا، وہاں کے کھیت پگڈنڈیاں، تالاب اور وہاں کی نہ بھولنے والی ان گنت یادوں کو یکسر بھول سی گئی تھی۔

اس رات کے چراغوں سے چاروں طرف اجالا ہی اجالا ہو گیا تھا پھر اکبر نے پہلی تین بیویوں کے عیوب، خامیاں اور کرتوت انگلیوں پہ گن گن کر شدید نفرت کا اظہار کیا تھا۔ وہ تمام قصے سن کر پارو کو تسلی ہو گئی تھی کہ جو اڑتی اڑتی افواہیں اس نے سن رکھی تھیں وہ سب کی سب بے بنیاد ہیں۔ اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ گاؤں کے لوگ اس کے شوہر سے خواہ مخواہ جلتے ہیں۔ شاید اس لئے کہ اکبر دو سو ایکڑ زرخیز زمین اور پانچ سو ناریل اور سپاری کے پیڑوں کا مالک تھا۔ اس کے پاس عمدہ بیلوں کی دس جوڑیاں تھیں اور اس کے پانچ تالابوں میں "روئی" مچھلی کی افراط تھی۔

وہ رات پلک جھپکتے بیت گئی تھی۔ پھر آفتاب طلوع ہوا تھا جس کی کرنوں میں ایک نئی زندگی کا پیغام تھا۔ ایسی زندگی جس کے وہ اکثر خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ خواب جن میں ساون کے گیت تھے اور بکل کے پھولوں کی بھینی بھینی مہک۔ لیکن دوسرے ہی دن خوابوں کی اس دنیا کو ایک خوفناک دھچکا سا لگا جب اس کی ایک سوکن نے نہایت رازدارانہ لہجہ میں اس سے کہا تھا "سبحان اللہ! آج میرے گھر میں چاند نکل آیا ہے" یہ سن کر پارو اپنے بالوں میں کنگھی کرتے کرتے رک گئی تھی۔ اس کے کانوں کی لویں گرم انگارے بن گئی تھیں۔ خون کھول اٹھا تھا۔ اس نے سوچا تھا "بدتمیز کہیں کی۔ رات کو کن سوئیاں لیتی رہی ہے" اور پھر اس کا جی چاہا تھا کہ وہ اپنی سوکن کے منہ پر طمانچہ مار دے لیکن جب باقی دو سوکنوں سے بات چیت ہوئی تو اسے پتہ چلا کہ یہ فقرہ تو اکبر کی پہلی تینوں بیویوں نے بھی شبِ عروسی پر سنا تھا۔ جذبات کی اسی شدت کے ساتھ، عہد و پیماں کی اسی گمبھیرتا کے بیچ۔

آج شادی کے چار ماہ بعد پارو طمانچہ کھا کر چوکی پر چپ چاپ بیٹھی تھی۔ اکبر پلنگ پر نیم دراز ہو کر سگرٹ کے کش لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تاڑی کی سرخی جھلک رہی تھی۔ وہ چارخانہ دار لنگی اور سفید بنیان پہنے ہوئے تھا۔ اس کی دونالی بندوق دیوار کے ساتھ کھڑی تھی۔ لالٹین کی روشنی میں اکبر کے بھاری بھرکم جثے کا سایہ دیوار پر یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا۔

"کھٹ! کھٹ!!" کسی نے صدر دروازے پر دستک دی۔

اکبر نے اٹھ کر کھڑاویں پہنیں۔ دروازہ کھولا۔ اور پھر ڈیوڑھی سے گذر کر صدر دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

"کون ہے؟" اکبر نے پوچھا۔

"غنی" جواب ملا

اکبر نے دروازہ کھولا۔ باہر گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گھر کا راستہ سنسان پڑا تھا۔ غنی اور کبیر ہاتھ میں قلم لئے سامنے کھڑے تھے۔ غنی نے اکبر کے کان میں کچھ کہا اور پھر غنی اور کبیر دونوں آناً فاناً اندھیرے میں گم ہو گئے۔ اکبر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے میں پہنچا۔ کھلے آنگن میں لوکل، ناریل اور سپاری کے پیڑ خاموش کھڑے تھے۔ اس کی تیسری بیوی کے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ وہاں سے دو بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اندھیرے میں جھانک رہی تھیں۔ اس کی دوسری بیوی اپنے کمرے میں مصلّے پر بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھی۔ اس کی پہلی بیوی کے کمرے میں تاریکی تھی اور وہاں سے خراٹوں کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

اکبر نے جھٹ پٹ جوتا پہنا، کمر میں بھورے چمڑے کی چوڑی پیٹی باندھی۔ پیٹی کا دایاں بٹوا کھول کر سو سو کے نوٹوں کا جائزہ لیا۔ بائیں بٹوے میں کارتوس ٹھونس لئے اور پھر تارچ پیٹی میں اڑس، دونالی بندوق ہاتھ میں لے، گھر سے باہر نکلا۔ اور چند لمحوں میں پیڑوں کے جھنڈ تلے جا پہنچا جہاں غنی اور کبیر قلم ہاتھ میں لئے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی نے بات نہ کی۔ مشینی طور پر اکبر آگے آگے چل پڑا۔ غنی اور کبیر اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ عام راہوں اور پگڈنڈیوں سے ہٹ کر اکبر لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دریا کے کنارے جا پہنچا اور چپ چاپ ایک "شمپان" (کشتی) میں بیٹھ گیا۔ غنی اور کبیر نے شمپان کو گہرے پانی کی طرف دھکیلا اور پھر وہ دونوں نہایت پھرتی سے اچک کر شمپان کے دونوں سروں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ شمپان پانی کے بہاؤ کے ساتھ تیزی سے بہنے لگا۔ چپوؤں کی شپ شپ رات کے سناٹے میں ہلچل مچانے لگی۔ اکبر نے اپنا دایاں ہاتھ پانی میں ڈبو کر ایک گہرا سانس لیا اور پھر بھیگی ہوئی ہتھیلی پھیلا کر اپنے بائیں شانے پر آہستہ آہستہ پھیری۔ سخت اور کھردری انگلیاں زخم کے اس ترچھے نشان کو سہلانے لگیں جو اس کے مضبوط شانے کو عبور کر کے گردن کی طرف نکل گیا تھا۔ یوں تو اکبر کے بدن پر زخموں کے نشان ایک درجن کے لگ بھگ تھے مگر یہ زخم سب سے بڑا تھا جو اس نے زندگی کی جدوجہد کے ابتدائی دنوں میں کھایا تھا۔ اس وقت وہ صرف وار کرنا جانتا تھا وار سہنے اور روکنے کا ریاض نہ تھا۔ وہ اپنے دھندے کو زندگی کی جدوجہد کا نام دے کر اپنے آدمیوں کو آگے بڑھنے پر اکسایا کرتا تھا۔ اسے یاد تھا جب وہ پہلے پہل دھان کی بوریاں شمپان میں لاد کر راتوں رات ایک تحصیل سے دوسری تحصیل میں لے گیا تھا تو مارے خوف کے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ خوف کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو گیا۔ شروع شروع میں اس کے دل میں ایک چبھن سی ہوا کرتی تھی مگر جوں جوں وقت گذرتا گیا دل میں کھٹکنے والا کانٹا خود بخود نکل گیا۔ اور اب اسے اچھی طرح معلوم ہو چکا تھا کہ دولت کی گرمی زندگی کو کتنی توانائی بخش سکتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر اب وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے اپنے گاؤں میں لوگ فاقوں سے مر رہے ہیں۔ جوان ہڈیوں کے ڈھانچے بن گئے ہیں ننھی ننھی جانیں بلک بلک کر ہمیشہ کے لئے چپ ہو رہی ہیں۔ خوبصورت چہروں پر موت کی زردی چھائی ہوئی ہے۔ کہیں سے بانسری کی مدھر تانیں سنائی نہیں دیتیں۔ دریا کی لہریں بھٹیالی گیتوں کی تانوں کو ترس گئی ہیں بھوک کی آگ نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ یہ سب کچھ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ہنستا۔ اور پھر اسے اپنی ماں یاد آ جاتی۔ وہ ماں جو جوانی میں بیوہ ہو گئی تھی۔ جس نے بڑے دکھ اٹھا کر اسے پالا تھا اور جب وہ سیانا ہوا تھا تو اس نے اپنی آنکھوں سے اپنی ماں کو قحط کی بھٹی میں جلتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ منظر اس کی آنکھوں میں اکثر پھر جاتا تھا۔ جب تھوڑا سا باسی بھات اس کی ماں کے کانپتے ہوئے ہاتھوں نے اسے دیا تھا، اور وہ ایک بھوکے کتے کی طرح دانہ دانہ کھا کر ادھ موا ہو کر زمین پر گر پڑا تھا اور اس کی ماں نے "بھات! بھات!!" پکار پکار کر جان دے دی تھی وہ پکار اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہی پکار جس کو گاؤں کے ہر شخص نے سننے سے انکار کر دیا تھا۔ اسے اپنی ماں کی ایک ایک بات یاد تھی۔ وہ کہا کرتی تھی کہ اس نے زندگی میں بہت دکھ پائے تھے۔ اسے اپنی ازدواجی زندگی میں سکھ کی گھڑی میسر نہ آئی تھی۔ وہ کہا کرتی تھی "تیرا باپ ایک جلاد تھا۔ وہ مجھے بہت پیٹا کرتا تھا۔ میں اس کی چوتھی بیوی تھی۔ باقی تینوں کا تو مجھ سے بھی برا حال تھا۔"

"مالک!" غنی نے خاموشی کو توڑا۔

چپو فوراً رک گئے۔ کہیں دور سے انجن چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

"ادھر سے چلو" اکبر نے سامنے دریا کے کنارے کی طرف اشارہ کیا جہاں خمیدہ درختوں نے پانی کے کچھ حصہ کو چھپا رکھا تھا۔ چپو تیزی سے چلنے لگے۔ چند لمحوں میں شمپان ٹہنیوں اور پتوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ اور انجن کی آواز قریب سے آنے لگی۔

اکبر نے بندوق چھتیائی۔

"مالک!" منشی آہستہ سے بولا "معلوم ہوتا ہے آج کسی نے مخبری کی ہے۔ دھان پکڑا گیا ہوگا۔"

"ہمارا دھان کوئی نہیں پکڑ سکتا" اکبر نے دونالی بندوق اور شہبے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

موٹر لانچ شور مچاتی ہوئی آگے نکل گئی۔ پانی کی لہریں دوڑتی ہوئی دونوں کناروں سے ٹکرائیں۔ شمپان نے دو ایک ہچکولے کھائے۔ اکبر نے لبلبی سے ہاتھ ہٹا لیے۔ موٹر لانچ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تو شمپان درختوں کی اوٹ سے نکل کر پھر لہروں کے ساتھ بہنے لگا۔ یکایک سمتِ مخالف سے کسی نے ٹارچ جلائی۔ چپو پھر تھم گئے۔ عین منجدھار میں شمپان رک گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک شمپان کچھ فاصلہ پر نظر آیا۔ وہاں سے کسی نے تین مرتبہ ٹارچ روشن کی۔ اکبر نے جواباً اوپر تلے دو مرتبہ ٹارچ جلائی۔ دوسرا شمپان قریب آگیا۔

"سب ٹھیک ہے مالک" دوسرے شمپان سے ایک شخص بولا۔ اور پھر دونوں شمپان گھوم کر بہاؤ کے خلاف چلنے لگے۔ شپ۔ شپ۔ شپ! شپ!! ۔ چپو تھامے ہوئے ہاتھوں کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ بازوؤں کی مچھلیاں ابھر آئیں۔ گردنوں کی رگیں تن گئیں۔ ہر جھٹکے کے ساتھ ہچکولا اور ہر ہچکولے کے ساتھ شمپان کی مخصوص آواز تاریک رات میں پراسرار معلوم ہونے لگی۔ اکبر نے پانی میں ہاتھ ڈبو کر ایک گہرا سانس لیا اور اس دفعہ ایسا کرتے ہوئے اس کے دل میں تین خیال آئے۔ پہلا خیال اس بھکاری سے وابستہ تھا جس نے کل اس کے دروازے پر صدا دی تھی۔ ہاتھ پھیلا کر چاول کی بھیک مانگی تھی اور اکبر نے بھیک دینے کے بجائے بھکاری کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ بھکاری نے ایک آہ بھری تھی اور پھر سر جھکا کر، چپ سادھے، کچے راستہ پر آنسو بہاتا کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ اور شام کو اکبر نے اس بھکاری کی لاش ایک درخت کے نیچے پڑی ہوئی دیکھی تھی۔ دوسرا خیال اس کی چوتھی بیوی پارو سے متعلق تھا۔ اس نے پارو کو نہایت معمولی سی بات پر چند گھنٹے پہلے چانٹے مارے تھے۔ اس نے بھی ایک گہرا سانس لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو امڈ آئے تھے۔ اکبر کے دل میں ایک نامعلوم سا درد ہونے لگا۔ عین اسی لمحہ اکبر کی ماں کا شکن آلود چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ اس نے بھی ایک لمبی آہ کھینچی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے تھے۔ اس خیال کے آتے ہی اکبر کے دل میں ایک جوالا پھوٹ پڑی۔ اس کا بدن جلنے لگا۔ اس نے پانی میں سے ہاتھ نکال کر اپنے چہرے پر پھیرا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے تراوٹ پہنچانے لگے۔

★

گھر پہنچ کر اکبر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر کسی نے پہلے لالٹین روشن کی، اور پھر قدموں کی آہٹ آہستہ آہستہ دروازے کے قریب آنے لگی۔

"کون۔؟" کسی عورت کی آواز تھی۔

"دروازہ کھولو"

کسی نے دروازہ کھول دیا۔

اکبر نے اندر داخل ہو کر چٹخنی چڑھا دی۔ اس کی تیسری بیوی لالٹین ہاتھ میں لئے دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ چھریرا بدن، چہرے پر اداس اداس زردی، سر کے چمکیلے اور سیاہ بالوں کا بھاری جوڑا، آنکھوں میں ساون کی بدلی، وہ یوں نظر آ رہی تھی جیسے کوئی تصویر لالٹین ہاتھ میں تھامے دیوار کے چوکھٹے میں کھڑی ہو۔ یکایک کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ اکبر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پارو چوکی پر سو رہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ اب بھی اس کے بائیں رخسار پر ٹکا ہوا تھا۔ اس کی چمپا کی کلیوں جیسی انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ اس کے سر کے لانبے بال چوکی سے نیچے لٹک کر فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ اکبر نے پہلے جوتا اتارا، پھر پیٹی کھول کر تکئے کے نیچے رکھی، بندوق پلنگ کی پٹی کے متوازی توشک کے نیچے جما دی اور پھر لالٹین بجھا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا بدن تکان سے چور چور ہو رہا تھا۔ اس نے دو ایک بار سر کو جھٹکا کر، انگلیاں چٹخائیں اور پھر جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر ہر خیال کو دماغ سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ آنگن سے رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی۔ ٹھنڈی اور معطر ہوا کے جھونکے تھکے ہوئے اعضاء کو فرحت پہنچانے لگے۔ آہستہ آہستہ اکبر کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو کر آپس میں مل گئیں۔

★

"چور! — چور!!"

"کون ۔!" اکبر نے لپک کر لالٹین روشن کی ۔ پارو چوکی پر ایک کونے میں سمٹی بیٹھی تھی ۔
"چور ہے چور!!" آنگن سے پھر آوازیں آئیں ۔
اکبر نے بندوق اور ٹارچ سنبھال کر دروازہ کھولا ۔ اور پھر کود کر آنگن میں چلا گیا۔
اس کی پہلی بیوی بند کمرے سے شور مچا رہی تھی ۔ دوسری اور تیسری بیوی کے کمروں میں روشنی تھی ۔
"کہاں ہے چور ۔ ؟" اکبر گرج کر بولا ۔
"میں نے دروازے کی جھری میں سے کسی کو باورچی خانے میں جاتے ہوئے دیکھا ہے ۔" اکبر کی پہلی بیوی اندر سے بولی
"برتن گرنے کی آواز آئی تھی" اس کی دوسری بیوی اپنے کمرے سے گھبرائی ہوئی آواز میں بولی ۔
"کوئی دروازہ توڑ رہا تھا" اس کی تیسری بیوی نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا۔
باورچی خانہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اکبر نے ٹارچ کی روشنی باورچی خانہ کے اندر پھینکی ۔ ایک شخص کونے میں جھکا ہوا بیٹھا نظر آیا ۔ اکبر نے بندوق سیدھی کرلی ۔ مگر دوسرے لمحہ کچھ سوچ کر رک گیا ۔ اس نے پھر ایک بار ٹارچ کی روشنی میں مجرم کو دیکھا ۔ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ باورچی خانہ کے ایک کونے میں دیگچی پر جھکا ہوا لپ لپ بھات کھا رہا تھا ۔
"ذلیل کتے" اکبر نے للکار کر کہا۔
چور کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی ۔ وہ بے تحاشہ کھائے جا رہا تھا ۔ اکبر کو حیرت ہونے لگی کہ وہ نحیف و نزار شخص دیوار پھاند کر کیسے اندر آیا ۔ اس نے باورچی خانہ کا دروازہ کیسے توڑا ۔ ان ہڈیوں میں اتنی ہمت ، اتنی دلیری، اتنی جرأت کہاں سے آئی ۔ اکبر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پارو لالٹین ہاتھ میں لئے آپہنچی اور اس کی دیکھا دیکھی اس کی تینوں سوکنیں بھی باہر نکل آئیں ۔ اکبر بائیں ہاتھ میں روشن ٹارچ اور دائیں ہاتھ میں بندوق تھامے آہستہ آہستہ آگے بڑھا ۔ چور نے کوئی حرکت نہ کی ۔ اکبر باورچی خانے کی دہلیز پر پہنچ کر رک گیا ۔ چور نے بھات کھاتے کھاتے ایک مرتبہ اکبر کی طرف اس طرح دیکھا جس طرح ہرن زخمی ہو کر آخری بار شکاری کی طرف دیکھتا ہے ۔ چور کی آنکھیں دو گڑھوں کے اندر سے صرف ایک لمحہ کے لئے اکبر کی طرف دیکھ کر پھر بھات پر جم گئیں ۔ وہ مٹھیاں بھر بھر کر بھات منہ میں ڈالے جا رہا تھا ۔ اس کا چہرہ پسینہ میں شرابور تھا ۔ سانس پھول رہا تھا ۔ بڑھی ہوئی داڑھی ، الجھے ہوئے سر کے بال جسم پر صرف ایک پھٹی پرانی لنگی ، پسلیوں کی ایک ایک ہڈی نمایاں ، چور مجسم بھوک بن کر بے خوف و خطر اکبر کے باسی بھات کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا ۔
"بندوق سیدھی کیوں نہیں کرتے" اکبر کی دوسری بیوی بولی ۔
"بھات! بھات!!" ماضی کے تاریک غار سے ایک خوفناک آواز آئی ۔ ایک بھوکی بیوہ کی آواز ۔ وہ بیوہ جس نے تھوڑا سا باسی بھات کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنے بچے کو کھلا کر اپنی جان دیدی تھی ۔ اس آواز کو گاؤں کے ہر شخص نے سننے سے انکار کر دیا تھا ۔
"ذلیل کتے" اکبر گرج کر بولا ۔ اور پھر بندوق کا سرا چور کے سینے کے قریب چلا گیا ۔
چور نے بھات کھاتے کھاتے ہاتھ روک لیا ۔ اس نے دیوار کے ساتھ پیٹھ لگا کر ٹانگیں پسار لیں ۔ اس کی مرجھائی ہوئی آنکھوں نے اکبر کی طرف دیکھ کر ایک سوالیہ نشان کی صورت اختیار کرلی ۔ اور سوالیہ نشان تمام گاؤں پر پھیلتا ہوا ایک تحصیل سے دوسری تحصیل اور دوسری تحصیل سے دیس کے گوشہ گوشہ تک پھیل گیا ۔
"گولی کیوں نہیں چلاتے ۔ صرف عورتوں پر ہاتھ اٹھانا جانتے ہو" اکبر کی پہلی بیوی تنک کر بولی ۔
یکایک اکبر کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے ، کھنچی ہوئی رگیں اپنی اصلی حالت پر آگئیں ۔ جھنجھلاہٹ رفع ہوگئی ۔ اور پھر انجانے جذبات کا ایک ہجوم اس کی آنکھوں میں ڈبڈبانے لگا ۔ چاروں بیویاں اکبر کی پلکوں پر پہلی مرتبہ تھرتھراتی ہوئی شبنم دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں ۔

★

ڈوب ڈوب کے اُبھری ناؤ

انور ممتاز

اس کہانی کو کتاب مچھلی شہری نے اپنے ماہنامے میں چھاپنے کے لئے انتخاب کیا تھا۔ کتاب مچھلی شہری کا ماہنامہ "گھاس بندر" جو انہوں نے "مست قلندر" کے مقابلے میں اُس کی کامیابی سے کباب ہو کر نکالا تھا، اور جس کی تصدیق شدہ اشاعت ملک کے تمام ماہناموں کی مجموعی اشاعت سے زیادہ تھی، اس ملک کا سب سے بڑا رسالہ تھا۔ اس لئے جب "گھاس بندر" کے ایڈیٹر نے میری کہانی کو اشاعت کے قابل قرار دے دیا تو مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

اُس دن میں "گھاس بندر" کے دفتر میں ایک ٹوٹی ہوئی بینت والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اور میرے سامنے ایک پچکے ہوئے گدے والے صوفے پر کتاب مچھلی شہری تشریف فرما تھے۔ ریڈیو پر خبریں نشر ہو رہی تھیں اور وہ مجھ سے باتیں کر رہے تھے۔

"آپ کا افسانہ مجھے بہت پسند ہے۔ آپ نے ہماری سوسائٹی کی خرابیاں بڑی چابکدستی سے اُجاگر کی ہیں۔ میرے رسالے نے ہمیشہ مظلوموں کا ساتھ دیا ہے۔ میں آپ کے افسانے کو رسالے میں بڑی امتیازی جگہ دوں گا۔"

میں خوش ہو کر بولا: "مجھے آپ کے رسالے سے ہمیشہ عقیدت رہی ہے۔ خصوصاً مجھے اس کا نام بہت پسند ہے۔"

ریڈیو خبریں نشر کر رہا تھا۔

کتاب مچھلی شہری نے ریڈیو کی آواز سے زیادہ بلند آواز میں میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا: "مجھے آپ سے اتفاق نہیں ہے۔ مجھے اپنے رسالے کی ہر بات پسند ہے۔ لیکن اس کا نام پسند نہیں۔ کسی بلند پایہ علمی اور ادبی رسالے کا نام "گھاس بندر" بڑا غیر موزوں نام ہے۔ اس نام کو سُن کر گھوڑوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور انسان کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں لیکن میں اپنے رسالے کو یہ نام دینے پر مجبور تھا۔ پچھلے دنوں میں نے بڑے بڑے فلاوری ناموں والے اتنے علمی اور ادبی رسالوں کو موت کے گھاٹ اترتے اور "مست قلندر" کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقیوں کے اتنے مراحل پھلانگتے ہوئے دیکھا تھا کہ آخر مجھے "مست قلندر" کے ایڈیٹر کے پاس اس کی کامیابی کا راز معلوم کرنے کے لئے جانا پڑا۔ اس نے مجھے بتایا: وہ ایک دن بے کاری اور بھوک سے تنگ آ کر خودکشی کے ارادے سے راوی کے پُل پر بیٹھا اونگھ رہا تھا کہ کسی نے اس کے کیسوں کو زور زور سے پکڑ کے ہلایا۔ دیکھا کہ ایک مست قلندر، لمبی لمبی جٹوں والا، میلے کچیلے جسم والا، ننگ دھڑنگ اُس کے پاس کھڑا ہے۔ اس نے اُسے سلگتی ہوئی ڈراؤنی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا: او اُلٹے بالوں والے!..... رسالہ نکال اور مالا مال ہو جا۔ چنانچہ اس نے رسالہ نکالا۔ رسالے کا نام "مست قلندر" رکھا اور مالا مال ہو گیا۔

مجھے بھی کچھ ایسے ہی واقعات پیش آئے ہیں۔ میں گھاس بندر کے سامنے "گھاس بندر ریسٹورنٹ" کی سستی چائے جو کبھی کبھی مری ہوئی مکھی کی وجہ سے مفت بھی مل جاتی تھی، پینے اور گھاس بندر کا نظارہ کرنے کے لئے اکثر وہاں جاتا تھا۔ گھاس بندر کے بالکل نزدیک نیٹی جیٹی ہے۔ جہاں خودکشی کرنے والوں کا مندر ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نیٹی جیٹی، گھاس بندر کے اس قدر نزدیک ہے۔ میں انسانوں سے تنگ آ چکا تھا۔ میرا خیال تھا گھاس بندر پر ہری ہری گھاس ہوگی، گدھے ہوں گے، گھوڑے ہوں گے، گائیں ہوں گی۔ دل بہلے گا لیکن گھاس بندر پر گھاس کی ایک پتی بھی نہ تھی! اس کی بجائے وہاں مچھیروں کے جالوں میں سمندر سے نکلی ہوئی مچھلیاں تڑپتی دیکھیں۔ تڑپتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھ کر مچھلی شہر یاد آ گیا۔ اس کے بعد جب اپنے وطن کی یاد ستاتی، میں گھاس بندر کے سامنے گھاس بندر ریسٹورنٹ میں آ بیٹھتا۔ پانی کے بغیر تڑپتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھتا۔ میں بھی تو ماہیٔ بے آب تھا، میں بھی تو ایک مُردہ مچھلی تھا، بلکہ میں تو مچھلی کا کباب تھا، بے روزگار تھا، بھوکا تھا، اور سامنے نیٹی جیٹی تھی اور چائے میں مری ہوئی مکھی پڑی تھی۔ میں اٹھ کر نیٹی جیٹی کی طرف بھاگا اور کنارے پر پہنچ کر سمندر میں کودنے کے لئے جھکا۔ یکایک مجھے گھاس بندر نے آواز دی: او کم ہمت، بزدل انسان! واپس آ، واپس آ۔ ادب کی خدمت کر۔

رسالہ نکال۔ چنانچہ "گھاس بندر" وجود میں آیا۔ کباب مچھلی شہری پیدا ہوا اور "گھاس بندر" رسالے کا نام نہیں ہے۔ زندگی کا سمبل ہے۔"

میں نے کباب مچھلی شہری کی فصاحت و بلاغت کی بیحد تعریف کی اور آخر میں کہا: "میں اب اجازت چاہتا ہوں۔ جانے سے پہلے صرف اتنا کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مالی لحاظ سے میں بھی آجکل گھاس بندر اور نیٹی جیٹی کے درمیان گھاس بندر ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوں۔ مجھے امید ہے مجھے میرے افسانے کا معقول معاوضہ ــــــــ"

کباب مچھلی شہری نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا: "آپ کا افسانہ نہایت عمدہ ہے۔ آپ نے ہمارے ملک کی شرمناک برائیوں کو خوب بے نقاب کیا ہے۔ میں اس کو اپنے رسالے میں بڑی امتیازی جگہ ــــــــ"

اس کے الفاظ اس کے منہ میں رہ گئے۔ میں دروازے کے پاس کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

ریڈیو نے اعلان کیا: "چودھری عبدالغنی بھٹن وزیر تجارت و صنعت کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ چودھری صاحب ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے، انہوں نے اپنی دماغی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک معمولی حیثیت سے ترقی کر کے ملک کے وزیر کی پوزیشن حاصل کی ہے۔ ان کی زندگی کامیاب انفرادی جدوجہد کی بڑی قابلِ تقلید مثال ہے۔"

کباب مچھلی شہری نے تلملا کر ریڈیو بند کر دیا۔ وہ اپنے پچکے ہوئے صوفے سے اٹھے۔ دفتر کی میز سے میرا افسانہ اٹھایا اور میرے پاس آ کر مجھ سے پوچھا:

"کیا یہ عبدالغنی بھٹن وہی ہے جس کا اس افسانے میں ذکر ہے؟"

میں نے کہا: "جی ہاں!؟"

اُس نے افسانہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: "معاف کیجئے، یہ افسانہ نہیں چھپ سکے گا۔"

میں نے مایوسی اور طنز سے ملے جلے جذبات کے ساتھ کہا: "لیکن حضرت! آپ کا پرچہ تو ظلم کے خلاف ہمیشہ صدائے احتجاج بلند کرتا ہے۔ آپ تو اصول کے لئے لڑتے لڑتے مرنا بھی گوارا کر لیتے ہیں۔ اور اب ــــــــ"

کباب مچھلی شہری نے میری بات کاٹ کر کہا: "آپ نے ٹھیک فرمایا۔ میں اپنے اُصول کے لئے ایک دفعہ مرتے مرتے بچ گیا۔ میں نے اپنے پرچے میں اُس پچاس لاکھ کے امپورٹ لائسنس کی طرف سرسری اشارہ کیا تھا۔ اسی رات کو چودھری عبدالغنی بھٹن کے آدمیوں نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ میں تین ماہ تک ہسپتال میں رہا۔ پھر جب چودھری عبدالغنی نے پاپولر موٹرز لمیٹڈ کو خرید لیا اور ملازمت سے الگ ہو گیا تو میں نے اُس کی طرف سے کم خطرہ محسوس کیا اور آپ کی ذمہ داری پر آپ کی کہانی چھاپنے کے لئے رضامند ہو گیا، لیکن اب چودھری عبدالغنی بھٹن پھر طاقت میں آ گیا ہے۔ وہ اب موجودہ حکومت کا منسٹر ہے وہ اب میرے اشتہار بند کر دے گا، میرے پرچے کو ختم کر دے گا اور آپ جانتے ہیں ایک ادیب کو اپنی تخلیق اپنی جان سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ اپنی کہانی واپس لے لیجئے، میں مجبور ہوں۔"

میں نے اپنی کہانی کا مسودہ لیکر جیب میں ڈال لیا اور "گھاس بندر" کے دفتر سے باہر آ گیا۔

اور اُس وقت سے اب تک میں اس کہانی کو لیکر ہر اخبار اور ہر رسالے کے دفتر میں گیا ہوں، لیکن کوئی اس کو چھاپنے پر رضامند نہیں ہوا۔

* * *

پھر یکایک یہ لمبی، ڈراؤنی، تاریک رات ختم ہو گئی، سورج نکلا، صبح ہوئی اور روشنی دور دور تک پھیل گئی۔

* * *

آج یہ کہانی تاریکی سے دن کی روشنی میں آتی ہے۔

آج چودھری عبدالغنی بھٹن جیل میں ہے اور اُس کی جائداد گورنمنٹ کا ۲۵ لاکھ روپیہ جرمانہ پورا کرنے کے لئے ضبط کر لی گئی ہے۔

آج کباب مچھلی شہری بلیک میلنگ کے جرم میں جیل میں چلا گیا ہے۔ اور اُس کی زندگی کا سمبل "گھاس بندر" رشوت لیکر چودھری عبدالغنی بھٹن کا غلط پراپیگنڈہ کرنے کے الزام میں بند ہو چکا ہے۔

عبدالغنی بھٹی میرا ہیڈ کلرک تھا۔

میں نے عبدالغنی بھٹی کی رشوت خوری، اقربا نوازی اور احباب پروری کی بے شمار رپورٹیں افسرانِ بالا تک پہنچائیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے سروس سے ڈسگریس کر کے انتہائی ڈسمس کر دیا گیا یعنی مجھے بے عزتی کے ساتھ ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔

میں پاکستانی سی۔ ایس۔ پی ہوں۔ ملک کے بہت سے اہم عہدوں پر ڈپٹی کمشنر اور کمشنر کے فرائض انجام دے چکا ہوں۔ کئی شہروں میں سکولوں، ہسپتالوں اور سڑکوں پر میرا نام کندہ ہوا ہے۔ کامران ہائی سکول، کامران ہوسٹل، کامران روڈ۔

یہ ملک کے اس حال کی بات ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ دو افسر اپنی ایمانداری اور پرہیزگاری کے باعث بہت بدنام تھے۔ ہمارے ملک کا پرائم منسٹر اور میں۔ اس وقت ہمارے پرائم منسٹر کا عہدہ ایک ایسے مومن مرد کے ہاتھوں میں تھا جو مرغی کھانے کو رشوت کھانے سے بہتر سمجھتا تھا اور جو نماز پڑھنے کو پکنک کرنے پر ترجیح دیتا تھا جس کا چہرہ خواجہ خضر کی طرح نورانی اور طبیعت بچے کی طرح معصوم تھا۔

ایک دن ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے رسیور اٹھایا۔ پرائم منسٹر تھے۔ انہوں نے مجھے اس شام کو چائے پر مدعو کیا اور کہا کہ وہ مجھ سے چند بہت اہم باتیں ڈسکس کرنا چاہتے ہیں۔

میں وزیر اعظم اور اپنی ملاقات کے حالات خالص افسانوی انداز میں حقیقت سے ذرا ہٹ کر بیان کرنا چاہتا ہوں کیونکہ سرکاری پروٹوکول کا وہ طریقہ جو اس ملاقات کے دوران میں استعمال کیا گیا بہت غیر دلچسپ ہے اور بے حد بور کرنے والا۔

میں شام کو پرائم منسٹر ہاؤس گیا۔ وزیر اعظم گھاس پر مخمل کا مصلیٰ بچھائے نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز ختم کرنے کے بعد انہوں نے میری طرف دیکھا۔ میری طرف دیکھ کر وہ پہلے زار و قطار روئے اور پھر کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پوچھا: "یا حضرت! آپ مجھے دیکھ کر پہلے روئے اور پھر ہنسے یہ کیا راز ہے؟" انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کے لئے کہا اور مجھے ایک اور گھاس کے قطعے میں لے آئے جہاں چائے کی تپائیاں لگی ہوئی تھیں۔ تپائیوں پر مرغی کے تکوں کی پلیٹیں، کیک پیسٹری کی اور پھلوں کی پلیٹیں اور چائے کے سیٹ لگے ہوئے تھے۔ ہم چائے پر بیٹھ گئے۔

وزیر اعظم نے کہا

"تمہیں دیکھ کر پہلے میں رویا اور پھر ہنسا۔ تم اس کا سبب جاننا چاہتے ہو۔ میں اپنے ملک کی حالت پر دن رات روتا ہوں۔ میرے ملک میں رشوت ستانی، بے ایمانی، دغابازی، بلیک مارکیٹنگ، سمگلنگ اور دنیا بھر کے عیب پھیلے ہوئے ہیں۔ میں روتا ہوں کہ میں اس ملک کا وزیر اعظم ہوں اور کچھ نہیں کر سکتا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے رونا آیا کہ میں تمہارے سامنے اپنی بے چارگی کا اظہار کرنے والا ہوں۔ اور پھر ساتھ ہی مجھے ہنسی بھی آئی کہ میرے ملک میں کم از کم ایک آدمی تو ایسا ہے جس کو میں ایماندار کہہ سکتا ہوں اور جس سے میں اپنے ملک کے عیوب دور کرنے کے لئے مدد کا خواہاں ہو سکتا ہوں۔"

میں نے عرض کیا۔ "حضور! میں دل و جان سے خدمت کے لئے حاضر ہوں۔"

انہوں نے فرمایا: "میں تم کو امپورٹ کمشنر مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ امپورٹ آفس رشوت خوری میں بے حد بدنام ہو گیا ہے۔ میں نے سنا ہے وہاں کوئی ہیڈ کلرک عبدالغنی بھٹی ہے جس کا بینک بیلنس دو لاکھ روپے ہے اور سب کے پاس ہر سال نئے ماڈل کی کار ہوتی ہے۔ تمہارے پاس کار ہے؟"

میں نے سادگی سے جواب دیا: "جی نہیں۔ مجھ میں اس تنخواہ کے اندر کار رکھنے کی استطاعت کہاں ہو سکتی ہے؟"

وزیر اعظم نے اپنی بات جاری رکھی: "اور میں نے سنا ہے کہ امپورٹ آفس کے چپڑاسی نے ایک ہزار گز کے پلاٹ میں ایک عالیشان کوٹھی بنائی ہے اور امریکہ کے سفارت خانے کو ایک ہزار روپے ماہوار کرائے پر دی ہوئی ہے؟"

میں نے کہا: "حضور! اکثر افواہیں بے بنیاد ہوتی ہیں۔ میں وہاں جا کر حالات کا مطالعہ کروں گا۔"

وزیر اعظم نے یکایک موضوع کو بدلتے ہوئے کہا: "اور یہ تم نے کیا غضب کیا۔ مرغی کے تکوں کو کیوں ہاتھ نہیں لگایا۔ پیسٹری کے پیچھے کیوں پڑے ہوئے ہو؟" مرغی کے تکوں کی پلیٹیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ پھلوں کی پلیٹوں میں چند فروٹ باقی تھے۔ پیسٹری کی پلیٹوں میں تھوڑی سی پیسٹریاں پڑی ہوئی تھیں اور میں نے پیسٹری کے دو ٹکڑے کھائے تھے۔

میں نے امپورٹ آفس کا چارج لے لیا۔

شام کو عبدالغنی پھمّن اور دوسرے عملے نے میٹروپول میں مجھے شاندار ڈنر دیا۔ ڈنر کے آخر میں میں نے عبدالغنی پھمّن اور دوسرے عملے کو رشوت خوری کے خلاف ایک لمبی چوڑی تقریر سے بے حد مایوس کیا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ امپورٹ آفس اپنی رشوت ستانی کے باعث ہر جگہ بدنام ہے۔ سنا جاتا ہے کہ امپورٹ آفس کے چپڑاسیوں کے پاس بڑی بڑی شاندار کوٹھیاں ہیں جو انھوں نے ہزار ہزار روپے کرائے پر دی ہوئی ہیں۔ یہ بھی سنا ہے کہ اس آفس کے معمولی کلرکوں کے پاس لاکھوں روپے بینک بیلنس میں ہیں اور کاریں ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ افواہیں غلط ہیں۔ اور اگر یہ درست ہوئیں اور میرے آفس میں رشوت ستانی ختم نہ ہوئی تو میں آپ سب کو تنبیہہ کرتا ہوں کہ جس کو میں نے رشوت لیتے ہوئے پکڑ لیا اُس کو ڈسگریس کے ساتھ ڈسمس کرا دوں گا۔

جب ڈنر ختم ہوا تو سب کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔

عبدالغنی پھمّن مجھے اپنی کار میں گھر تک چھوڑنے گیا۔

دوسرے دن صبح کو عبدالغنی پھمّن مجھے دفتر لے جانے کے لئے کار لیکر میرے گھر پر آگیا۔

میں نے کہا: "مسٹر پھمّن، آپ تکلیف نہ کریں۔ میں ٹیکسی پر آجاؤں گا۔"

اس نے میرے لئے دروازہ کھولتے ہوئے کہا: "جی نہیں مجھے زیادہ دیر تکلیف نہیں کرنی پڑے گی۔ میں بہت جلد آپ کے لئے کار مہیّا کر دوں گا۔"

میں چپ ہو گیا۔

دفتر پہنچ کر عبدالغنی پھمّن نے بڑے ادب سے میرے لئے دفتر کا دروازہ کھولا اور اپنے دفتر میں جانے کی بجائے میرے ساتھ ہی میرے دفتر میں آگیا۔ چپڑاسی کار میں سے میرا بیگ دفتر میں لے آیا اور پھر باہر چلا گیا۔

عبدالغنی پھمّن بڑے محتاط اور مہذب لہجے میں بولا: "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔ اجازت ہو تو جرأت کروں۔"

میں نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا: "فرمائیے۔ تشریف رکھئے۔"

وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آپ کی رات کی تقریر نے اس دفتر کے عملے میں بڑی تشویش پیدا کر دی ہے۔"

"کیوں؟"

"میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں اور اس دفتر کا سب عملہ رشوت کو ایک نہایت مکروہ چیز سمجھتے ہیں۔ اور اس دفتر میں رشوت اس مفہوم میں ہرگز موجود نہیں ہے جس میں آپ نے اپنی گذشتہ شب کی تقریر میں یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ ہاں ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جب کسی تاجر کو امپورٹ لائسنس مل جاتا ہے تو وہ خوش ہو کر اس دفتر کے ہر فرد کو، امپورٹ کمشنر سے چپڑاسی تک کو، کچھ نہ کچھ نذرانے کے طور پر ضرور دیتا ہے۔ میری یہ کار بھی مجھے تحفے کے طور پر ملی ہے اور آپ کو بھی بہت جلد ایک کار تحفے میں ملنے والی ہے۔"

میں جھنجھلا اٹھا اور بولا: "مسٹر پھمّن، رشوت بھیس بدل کر بھی میرے دفتر میں داخل نہ ہو سکے گی۔ تحفہ، نذرانہ، بخشش، انعام، رشوت ہر شکل میں ممنوع ہے۔"

عبدالغنی پھمّن نے نہایت لجاجت سے کہا: "میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں۔ کلرکوں کی تنخواہیں دیکھئے، اور بازار میں گرانی دیکھئے۔ اگر ان کو تنخواہوں کے علاوہ تھوڑی بہت آمدنی نہ ہوگی تو وہ سسک سسک کر مر جائیں گے۔ کلرکوں کو چھوڑیئے، اپنے آپ کو دیکھئے۔ آپ اپنی دو ہزار روپے کی تنخواہ میں کار بھی نہیں خرید سکتے اور منسٹر اپنی پانچ ہزار روپے کی تنخواہوں میں اپنے بچوں کو انگلستان یا امریکہ تعلیم کے لئے نہیں بھیج سکتے۔ تو پھر کیوں نہ بڑے بڑے تاجروں سے جو سمگلنگ اور بلیک مارکیٹنگ سے ہزاروں روپے روزانہ کماتے ہیں، آپ اور ہم اپنی اہم ضروریات کے لئے کچھ قبول کر لیں۔ آخر ہم اپنی ضروریات کس طرح پوری کریں گے؟"

مجھے غصہ آگیا۔ میں نے کہا: "مسٹر پھمّن، آپ کے خیالات بے حد نامعقول ہیں۔ آپ اس دفتر کے ہیڈ کلرک ہیں اور آپ کا فرض ہے کہ آپ اس کو میری ہدایات کے مطابق چلائیں۔ میں آپ کو وارننگ دیتا ہوں کہ اگر اس دفتر کی برائیاں میری مرضی کے مطابق رفع نہ ہوئیں، تو میں آپ کو اس کا ذمہ دار ٹھہراؤں گا۔"

اور دفتر کی برائیاں رفع نہ ہوئیں۔ دفتر سے رشوت ختم نہ ہوئی۔

آخر میں تنگ آ کر وزیر تجارت و صنعت کو عبدالغنی بھٹی کے خلاف ایک اسپیشل رپورٹ بھیجی اور اس میں اُس کے خلاف انکوائری کرنے کی سفارش کی۔
وزیر تجارت و صنعت نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا اور ہمارے درمیان یہ گفتگو ہوئی: "عبدالغنی بھٹی کے خلاف یہ اسپیشل رپورٹ آپ نے بھیجی ہے؟"
"جی ہاں"
"آپ کو معلوم ہے عبدالغنی بھٹی کون ہے؟"
"جی نہیں"
"وہ گورنر جنرل کی آیا کا بیٹا ہے"
"جناب گورنر جنرل کی آیا کا یہ بیٹا پرلے درجے کا رشوت خور ہے اور میرے سارے عملے کو رشوت خوری کی ترغیب دیتا ہے۔ میں اُس کے خلاف انکوائری کی سفارش کرتا ہوں"
"اگر وہ آپ کی سفارش پر ڈسمس ہو گیا، تو گورنر جنرل آپ کو برباد کر دے گا"
"اگر اپنے فرائض کی انجام دہی میں مجھے کوئی نقصان پہنچتا ہے، تو مجھے اس کی پروا نہیں کرنی چاہیئے"
"بہرکیف میں اپنے پاؤں پر کلہاڑی نہیں مار سکتا۔ میں اس رپورٹ پر کوئی ایکشن نہیں لوں گا"
میں وزیر تجارت و صنعت کے دفتر سے باہر آ گیا۔

* * *

ایک سال ہو گیا۔ میں عبدالغنی بھٹی کے خلاف رپورٹیں کرتا رہا۔ عبدالغنی بھٹی میری آنکھوں کے سامنے رشوت کھاتا رہا۔ میرے دفتر کا سارا عملہ پہلے سے بھی زیادہ جرائم پیشہ ہو گیا۔ میری پرہیزگاری ان کو ناجائز آمدنی سے باز رکھنے کی بجائے اُن کو مالی فائدہ پہنچانے لگی۔ وہ میری رشوت کا حصّہ بھی آپس میں بانٹنے لگے میں رپورٹوں پر رپورٹیں کرتا رہا اور بے بسی سے اُن کو رشوت میں ہاتھ رنگتے دیکھتا رہا۔

* * *

پھر یکایک حالات نازک ہو گئے۔
اور پاپولر موٹرز لمیٹڈ کے پچاس لاکھ کے امپورٹ لائسنس کا واقعہ پیش آیا۔
پاپولر موٹرز لمیٹڈ نے پچاس لاکھ روپے کے امپورٹ لائسنس کی درخواست کی۔
اُس دن لائسنس جاری کرنے کی آخری تاریخ تھی اور سب ضروری لائسنس جاری ہو چکے تھے۔
شام کے پانچ بجے تھے۔ دفتر کے سب کلرک چلے گئے تھے۔ عبدالغنی بھٹی خلافِ معمول اور میں حسبِ معمول ابھی دفتر میں موجود تھے۔
دروازہ کھلا عبدالغنی بھٹی میرے دفتر میں داخل ہوا اور فائل میرے سامنے رکھ کر بولا: "پاپولر موٹرز لمیٹڈ کے امپورٹ لائسنس پر آپ کے دستخط ہونگے"
میں نے فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا: "پاپولر موٹرز لمیٹڈ ایک غیر ملکی فرم ہے۔ میں اس کو پچاس لاکھ کا امپورٹ لائسنس جاری کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو اس کا ہمارے ملک کے سٹرلنگ بیلنس پر بہت بُرا اثر پڑے گا"
عبدالغنی بھٹی نے جچے تلے الفاظ میں کہا: "پاپولر موٹرز لمیٹڈ ایک غیر ملکی فرم ہے۔ اگر اُس کو پچاس لاکھ روپے کا امپورٹ لائسنس جاری نہ کیا گیا، تو اس سے بین الاقوامی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے"
میں نے کہا: "تاہم میں اتنا بڑا قدم وزیر تجارت و صنعت کے مشورے کے بغیر نہیں اٹھاؤں گا"
"وزیر تجارت و صنعت پیرس میں فلموں کے بین الاقوامی مقابلے میں اپنی فلم انڈسٹری کی نمائندگی کرنے گئے ہیں"
"ان کی غیر حاضری میں میں وزیر اعظم سے مشورہ کر سکتا ہوں"
"وزیر اعظم بغداد میں روضوں کی زیارت کے لئے گئے ہوئے ہیں"

"تو کوئی بات نہیں۔ گورنر جنرل سے مشورہ کیا جا سکتا ہے۔"
"گورنر جنرل ہوکس بے میں ہیں۔ جاپانی لڑکیوں کا وہ وفد جو دنیا کا دورہ کر رہا ہے۔ آج گورنر جنرل کے ساتھ ہوکس بے میں پکنک منا رہا ہے۔"
میں نے غصّے کو دباتے ہوئے کہا: "مسٹر بھٹّی! کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے یہ سب کچھ معلوم نہیں؟ میں جانتا ہوں وہ تینوں دارالخلافے میں موجود نہیں ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں اس کیس کو اُن کے آنے تک ملتوی رکھنا چاہتا ہوں۔"
"آپ اس کیس کو ملتوی نہیں رکھ سکتے۔"
"کیوں؟"
"آج لائسنس جاری کرنے کا آخری دن ہے۔"
میں نے فائل اُس کی طرف سرکاتے ہوئے کہا: "تو پھر اس کیس کو LATE TOO کے ریمارک کے ساتھ واپس کر دیجئے۔ پاؤلر موٹرز لیمیٹڈ نے اتنا بڑا اہم معاملہ وقت پر پیش کیوں نہیں کیا؟"
"پاولر موٹرز لیمیٹڈ نے یہ معاملہ بالکل وقت پر پیش کیا ہے۔ اُن کو اتنا وقت اس لائسنس کی غیر سرکاری طور پر منظوری لینے میں لگا۔ گورنر جنرل اور تجارت اور صنعت کے منسٹر نے اس کو غیر سرکاری طور پر منظور کر لیا ہے۔"
میں نے حیران ہو کر پوچھا: "گورنر جنرل نے منظور کر لیا ہے، کیوں؟"
"گورنر جنرل کو منظور کرنا پڑا۔ گورنر جنرل کا لڑکا پاولر موٹرز لیمیٹڈ کے غیر ملکی جنرل منیجر کی لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ اگر گورنر جنرل اس لائسنس کو منظور نہیں کرے گا تو اس کے لڑکے کی شادی پاولر موٹرز لیمیٹڈ کے جنرل منیجر کی لڑکی سے نہ ہو سکے گی۔"
"اور وزیر تجارت و صنعت کا کیا انٹرسٹ ہے؟"
"چار لاکھ روپے۔"
میں حیران ہو گیا: "چار لاکھ روپے؟"
وہ رازدارانہ لہجے میں بولا: "اب پردہ کیا ہے۔ اس ڈیل میں وزیر تجارت وصنعت کو چار لاکھ روپے، آپ کو دو لاکھ روپے، مجھے ایک لاکھ اور ہمارے عملے کو پچاس ہزار روپے ملیں گے۔"
میں غصّے سے کانپنے لگا۔ میں نے فائل کو اٹھا کے دیوار کے ساتھ دے مارا اور چلّایا: "شٹ اَپ، یُو...."
میں دفتر سے باہر آنے کے لئے اٹھا۔ عبدالغنی بھٹّی نے بکھری ہوئی فائل کو اٹھاتے ہوئے کہا: "آپ اس لائسنس پر دستخط کئے بغیر باہر نہیں جا سکتے۔ شاید آپ نے یہ نہیں سوچا کہ میں نے اس لائسنس پر دستخط کرانے کے لئے وہ وقت چنا ہے۔ جب تمام کلرک جا چکے ہیں، دفتر سنسان پڑا ہے اور کوئی آپ کی مدد کو نہیں آسکتا....!"
میں نے دیکھا عبدالغنی بھٹّی پستول لئے ہوئے میری طرف آ رہا ہے۔ میں کرسی پر گر گیا اور اُس دن مجھے معلوم ہوا کہ میں بزدل ہوں، ذلیل ہوں، بے غیرت ہوں، کمینہ ہوں۔
عبدالغنی بھٹّی نے میرے سامنے فائل رکھ دی اور میں نے دستخط کر دیئے۔
عبدالغنی نے فائل کو سنبھالتے ہوئے کہا: "پولیس کو بلانے کی غلطی نہ کیجئے۔ اس لائسنس میں پولیس کا بھی حصّہ ہے۔"
عبدالغنی بھٹّی میرے دفتر سے نکل کر اپنے دفتر میں چلا گیا۔ میں پاگلوں کی طرح ٹیلیفون کے ڈائل کو گھمانے لگا۔ پولیس کو چیخ چیخ کر رپورٹ کی اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک میں اس عالم میں بیٹھا رہا۔ آخر جب میں نے سر اٹھایا تو میرے دفتر میں پولیس کھڑی تھی۔
"ہم آپ کے دفتر کی تلاشی لینے آئے ہیں۔"
میں ان کو چلّا چلّا کر یہ واقعہ بتاتا رہا، لیکن انہوں نے میری کوئی بات نہ سنی۔ چپ چاپ میری درازوں کی تلاشی لیتے رہے۔

اور میرے ایک دراز سے سو سو روپے کے پچاس نوٹ برآمد ہوئے جن پر پولیس کے دستخط تھے!

پھر پولیس مجھے میرے بنگلے پہ لے آئی اور میرے بنگلے کی تلاشی لینے لگی۔ میرے بنگلے سے سمگل کیا ہوا سونا برآمد ہوا۔ اور یہ سب کچھ کیسے ہوا، مجھے ابھی تک معلوم نہیں۔ اتنا ظاہر تھا کہ اس کے پیچھے عبدالغنی بھٹن کی دماغی صلاحیتیں کام کر رہی ہیں۔

مجھے گرفتار کر لیا گیا، مجھ پر مقدمہ چلایا گیا، دو سال قید بامشقت کی سزا ہوئی اور ملازمت سے ڈسگریس کے ساتھ ڈسمس کر دیا گیا۔

لیکن میری زندگی کی اس ٹریجڈی سے بھی بڑی ایک اور ٹریجڈی ہوئی۔

جس دن مجھے قید کی سزا ملی، اسی دن ہمارے نمازی، پرہیزگار اور معصوم وزیر اعظم کو اُن کے عہدے سے علیحدہ کر دیا گیا۔

میں اپنے یہ دو غم لیکر دو سال تک جیل کی کوٹھڑی میں سڑتا رہا!

جب میں رہا ہو تو جیل سے باہر آ کر مجھے معلوم ہوا کہ عبدالغنی بھٹن نے پچاس لاکھ کا لائسنس جاری ہونے کے تھوڑے عرصے بعد ملازمت چھوڑ دی، اور پاپولر موٹرز لمیٹڈ کو خرید لیا۔ چار مہینے بعد ہماڑ تکا ماڑ کا کے جنگلات میں ایک ایم۔ ایل۔ اے کی لاش ملی۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد عبدالغنی بھٹن بائی الیکشن میں بہت بڑی اکثریت کے ساتھ کامیاب ہوا۔ اور پھر جب میں گھاس منڈی کے ایڈیٹ کباب گلی شہری کے دفتر میں بیٹھا تھا تو ریڈیو نے اعلان کیا:

"چودھری عبدالغنی بھٹن وزیر تجارت و صنعت کی حیثیت سے کابینہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ چودھری صاحب ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی دماغی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک معمولی حیثیت سے ترقی کر کے ملک کے وزیر کی پوزیشن حاصل کی ہے۔ ان کی زندگی کامیاب انفرادی جد و جہد کی بڑی قابلِ تقلید مثال ہے"

* * *

میں جیل سے نکل کر پوچھتا پوچھتا سیدھا وہاں گیا جہاں ہمارے معزول شدہ وزیر اعظم تنہائی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ان کی کوٹھی میں داخل ہو کر جب میں مرغیوں کے جالی دار ڈربوں کے پاس سے گزر رہا تھا تو مجھے خیال آیا کہ جس شخص کے سامنے ہر قوم اور ہر ملک کے سفیر جھک کر سلام کرتے تھے، اس کے ارد گرد اب ہر ملک اور ہر نسل کی مرغیاں کڑکڑاتی پھرتی ہیں۔ اُف انقلاباتِ زمانہ!

جب میں اندر ساتوں نے دیکھا کہ ہمارے ملک کے سابقہ وزیر اعظم ایک خشک گھاس کے قطعے میں چٹاگانگ کی چٹائی پہ بیٹھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ جب وہ نماز ختم کر چکے تو ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر پہلے تو دونوں خوب روئے۔ پھر دیر تک کھلکھلا کر ہنستے رہے۔

★

ماہِ نو — میں اشاعتِ مضامین سے متعلق شرائط

(۱) "ماہِ نو" میں شائع شدہ مضامین کا مناسب معاوضہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۲) مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار صاحبان یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔

(۳) ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر ضروری حوالہ جات دینا ضروری ہے۔

(۴) ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔

(۵) مضمون کے ناقابلِ اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا

(۶) ایڈیٹر مسودات میں ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

فکاہیہ:

تشخیصِ مرض

شوکت تھانوی

دو تین ڈاکٹروں کو دکھایا۔ ایک حکیم صاحب سے بھی مشورہ لیا مگر کسی کی سمجھ میں وہ مرض نہ آسکا جس میں بیگم صاحبہ مبتلا ہیں اور یہ ماننے کو میں تیار نہ تھا کہ وہ اچھی خاصی ہیں اور محض اخلاقاً پژمردہ سی ہو رہی ہیں یا تفریحاً گھل رہی ہیں۔ نہ ان میں وہ اگلی سی شگفتگی باقی تھی نہ وہ خندہ پیشانی کچھ عجیب آدم بیزار سی چڑچڑی ہو کر رہ گئی تھیں کہ کچھ نہیں ہے تو بچوں ہی کو ڈانٹ رہی ہیں کہیں سیر سپاٹے کو چلنے کے لئے کہا جائے تو لڑنا شروع کر دیں حد یہ ہے کہ اپنی بعض عزیز از جان سہیلیوں تک سے ملنا جلنا چھوڑ رکھا تھا جن سے وہ اس حد تک ملا کرتی تھیں کہ ان کے لئے بد دعا کرنے کے لئے میں نے نماز تک شروع کر دی تھی کہ الہٰ العالمین یا تو اب مجھکو اٹھا لے یا ان کی ان سہیلیوں کا ناس ہو جن کی وجہ سے میری اچھی خاصی بیوی میرے لئے عنقا بن کر رہ گئی ہے۔ مگر آجکل میں ان ہی سہیلیوں کے لئے درازیٔ عمر کے علاوہ یہ دعا بھی کرنے لگا ہوں کہ اے مقلب القلوب تو میری بیوی کا دل ان کی سہیلیوں ہی کی طرف پھیر دے تاکہ ان کی طبیعت کچھ تو بہلے۔ مجھے یقین ہے کہ میری ہی دعائیں قبول ہو گئیں اور آج ان میں سے دو تین سہیلیاں ان سے ملنے آگئیں۔ میں برابر کے کمرے میں کتابوں کی الماری کھول کر اپنی سہیلیوں سے دل بہلانے لگا اور اُس کمرے میں جہاں کچھ دن سے زندگی کے تمام آثار مفقود تھے ایک عجیب گہما گہمی سی پیدا ہو گئی۔ شکوے شکایتوں کے دفتر کھلے۔ بے مروتی اور طوطا چشمی کے طعنے ایک نے دوسرے کو دئے کسی نے اپنے پڑوسی کے لڑکے کی شادی کا قصہ شروع کر دیا تو کسی نے اپنی پڑوسن کے طلاق کی پوری تفصیل سنا کر رکھدی۔ اللہ جانے یہ کس کا ذکر تھا کہ اس نے اپنی لڑکی کو بٹھا رکھا ہے اور سسرال بھیجنے کے بجائے داماد کو لکھ دیا ہے کہ فارغ خطی لکھ دو اور نہ جانے اس شادی اور طلاق کے ذکر پر ایک عجیب و غریب نام کے اسنو کی بات کہاں سے چھڑ گئی ہیں تو اس وقت چونکا ہوں جب بیگم صاحبہ کی بھولی بسری کھنکتی ہوئی آواز میرے کان میں آئی کہ:-

"اے ہے۔ وہ کہاں مل رہی ہے۔ میں نے تو سارے شہر کے سارے بازار چھان مارے۔ کہیں اس نگوڑ ماری اسنو کا پتہ نہ چلا"

مسز جمیل کی آواز میں نے پہچان لی وہ بڑی مستعدی سے بولیں "لو اور سنو بازار میں کہاں دھری ہے ایک بیچارے دکاندار نے خدا اس کا بھلا کرے اس مارشل لا کی وجہ سے کچھ چیزیں چھپا کر رکھ لی تھیں، ان ہی میں یہ اسنو بھی مجھکو مل گئی۔ مگر بہن مہنگی بہت کر دی ہے"

بیگم صاحبہ نے کہا "بلا سے مہنگی کر دی ہے مگر ہے تو سہی۔ تو اب یہ تمہارے ذمہ ہے کہ دو شیشیاں مجھے منگا کر بھیجدو گی۔ اللہ جانتا ہے ترس کر رہ گئی میں تو ان چیزوں کو۔ یہ دیکھو لوڈبہ رکھا ہوا ہے پاؤڈر کا۔ سارا شہر چھان مارا کہیں نہیں ملتا"

ایک اور بیگم صاحبہ بولیں "تو یہ آخر کہاں سے ملا؟"

بیگم صاحبہ نے تقریباً آدھ بھرتے ہوئے کہا "ملا کہاں سے خالی ڈبہ پڑا ہوا ہے۔ میں تو اس کے لئے بھی تیار ہوں کہ بلا سے کوئی دوگنے تگنے دام لے لے مگر دے تو دے یہ پاؤڈر"

مسز جمیل کی آواز کھنکی "ایسی آگ لگی ہے ان تمام ولایتی چیزوں کو کہ میں کیا کہوں۔ اے دیکھو یہ لپ اسٹک میں ہمیشہ استعمال کرتی ہوں مگر ایکی جو ختم ہو گئی تو دکان دکان جھانکتی پھری کہیں نہ ملی آخر ایک دکاندار نے تگنے دام لے کر اللہ جانے کہاں سے نکال دی۔ میں نے تو بہن اسی وقت اُن ہی داموں میں چھ خرید لیں کہ اللہ جانے پھر ملیں کہ نہ ملیں"

بیگم صاحبہ نے بڑی مرجھائی ہوئی آواز میں کہا "اب میں تم سے کیا بتاؤں کہ ایک ایک چیز کے لئے کتنا کتنا پریشان ہونا پڑتا ہے، نیل پالش ہے تو وہ غائب روج ہے تو اس کا پتہ نہیں۔ کریم اور اسنو تو ایسی غائب ہوئی ہیں کہ دل بیٹھ کر رہ گیا ہے۔ اب یہ تو بہن ہم سے ہو نہیں سکتا کہ زندگی بھر جن چیزوں کے عادی رہے ہیں ان کو چھوڑ کر یہ دیسی قلعی شروع کر دیں"

مسز جمیل نے قہقہہ لگایا، "قطعی تم نے بالکل ٹھیک کہا اللہ قسم۔ وہ ہیں نا نجمہ اے وہی ڈاکٹر کریم کی بیوی۔ اللہ بچائے اس سے بھی نہ جانے کونسا چونا منہ پر تھوپ کر دروازوں کا روغن ہونٹوں پر لگا لیتی ہے"

بیگم صاحبہ نے کہا: "ہاں بہن ہم سے تو یہ ہو نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ کہ نہ کہیں آنے کے رہے ہیں نہ جانے کے بھلا بتاؤ کون اس طرح منہ جھاڑ سر پہاڑ کہیں چلا جائے بلکہ میں نے تو تمہارے بھائی صاحب سے کہہ دیا ہے کہ ایک تو مجھ سے اب کہیں جانے کو نہ کہا کریں دوسرے اب میں شروع کرتی ہوں برقعہ۔"

مسز جمیل ہنس پڑیں: "برقعہ؟ - سچ مچ برقعہ ہی اوڑھنا ہوئے گا اب ان چیزوں کا قحط۔ سچ مچ زندگی سے بیزار کر کے رکھ دیا ہے ان چیزوں کی نایابی نے۔"

بیگم صاحبہ بولیں: "مجھ سے زیادہ تو شاید ہی کوئی بیزار ہوا ہو قسم لے لو مجھ سے جو مہینوں سے کبھی نکلی ہوں۔ کہیں جانے کو جی ہی نہیں چاہتا اور تو اور وہ موا ونڈر واٹر تک نہیں ملتا۔"

مسز جمیل نے کہا: "نہیں یہ نجمہ تو کہیں سے لائی تھیں۔"

نجمہ نے کہا: "وہی تین تو تھیں جو خریدی تھیں وہی چل رہی ہیں کہو تو تمہارے لئے بھی ڈھونڈ دوں۔"

بیگم نے کہا: "اے بہن خدا کے لئے ڈھونڈ دو اور یہ پاؤڈر تو جتنے کا بھی ملے میں دس پانچ ڈبے لے کر رکھ لوں گی۔ کہو تو تمہارے بھائی صاحب سے کہوں موٹر نکالیں۔"

اور پھر خود ہی بلند آواز سے مجھ کو پکارا: "اے میں نے کہا سن رہے ہیں آپ۔"

میں تو ظاہر ہے کہ سن ہی رہا تھا لہٰذا جواباً عرض کیا: "اس سے قبل کہ میں کچھ سنوں مسز جمیل اور نجمہ بہن کو میرا سلام کہہ دیجئے۔"

مسز جمیل نے اسی کمرے سے کہا: "تو کیا آپ پردہ میں بیٹھ گئے ہیں بھائی صاحب؟"

میں نے اٹھتے ہوئے کہا: "جی نہیں میں سلام کے لئے حاضر ہوتا ہوں۔ میں نے مخل ہونا مناسب سمجھا تھا خیال تھا کہ چائے کی میز پر تو سلام عرض کرنے کا موقع مل ہی جائے گا۔"

اور یہ کہتا ہوا میں بیگم صاحبہ کے کمرے میں جو آیا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب انگیز خوشی ہوئی کہ بیگم صاحبہ کے چہرے پر بحالی صحت کے پورے آثار موجود تھے یعنی آنکھوں میں بھی چمک تھی اور لبوں پر وہ موجِ تبسم بھی بس کو میں ان کے لبوں کی ساخت میں شامل سمجھا کرتا تھا مسز جمیل اور نجمہ تو سنبھل کر بیٹھ ہی چکی تھیں مگر بیگم صاحبہ کی حالت بھی مجھ کو سنبھلی ہوئی نظر آئی وہ بڑی شگفتگی سے بولیں: "آپ ذرا موٹر نکال کر ہم لوگوں کو بازار نہیں لے چلتے۔"

میں نے کہا: "میرے تو پروگرام ہی میں شامل تھا آپ کو ڈاکٹر صاحب کے پاس لیجانا مگر اب اس کی ضرورت نہیں رہی اسلئے کہ مرض کی تشخیص ہو چکی ہے۔"

مسز جمیل نے گھبرا کر پوچھا: "مرض کی تشخیص؟ مرض کیسا؟"

عرض کیا: "دونوں امراض کی تشخیص ہو گئی۔ ان کا مرض بھی اور بازار کا مرض بھی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان دونوں امراض میں باہمی تعلق کیا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ آپ بازار کی مریض ہیں اور بازار آپ کا۔ رہ گیا میں تو جواب نہیں ہے میری حماقت کا کہ اتنے دن سے خواہ مخواہ ڈاکٹروں اور حکیموں کی نازبرداریاں کرتا پھر رہا ہوں۔"

بیگم صاحبہ نے بڑے غمزے سے کہا: "اچھا خیر ہو گا کبھی۔ چلئے نا ذرا بازار۔"

عرض کیا: "ویسے تو میں خادم ہوں مگر ایک بات سن لیجئے مجھ سے کہ اگر آپ سب کا یہی عالم ہے تو وہ تمام اصلاحی تدابیر قطعاً بیکار ہیں جو اس شدومد سے جاری ہیں۔ آپ ہی کی قسم کے لوگ ان دکانداروں کو چور بازاری اور منافع خوری سکھاتے ہیں اور آپ ہی کی قسم کے گاہکوں کی بدولت یہ لعنتیں دب دب کر ابھرتی ہیں لیکن میں آپ کو بتلائے دیتا ہوں کہ اگر اس ملک کو باقی رکھنا ہے تو یہ تمام چونچلے آپ کو ختم کرنا پڑیں گے اور جب تک آپ یہ حرکتیں نہ چھوڑیں یہ دکاندار ان لعنتوں سے تائب نہیں ہو سکتے۔"

شروع شروع میں تو اس بے محل لکچر اس سے ان خواتین نے بیزاری ظاہر کی مگر جب میں نے ان ہی چھوٹی چھوٹی باتوں کے عظیم نتائج ان کے سامنے پیش کئے اور جب یہ نقشہ ان کے سامنے لایا کہ اس طرح وہ اپنا کتنا زرمبادلہ اپنے ملک کے باہر بھیج کر اپنے میک اپ کی بدولت اپنے وطن کے لئے بدصورتی خرید رہی ہیں تو میں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھیں کھل رہی ہیں نتیجہ یہ کہ سب سے پہلے مسز جمیل ہی بولیں: "پھٹکار ایسے بناؤ سنگھار پر کہ ہم ملک ہی کو نیلام پر چڑھا دیں۔"

بیگم نے بھی ہاں میں ہاں ملائی: "بہن یہ تو سچ ہے کہ اگر ہم ہی نہ بگڑے ہوں یہ آخر نہ بگڑیں تو یہ موئے چور بازاری آخر کس سے کریں گے۔"

میں نے خوش ہو کر کہا: "تو پھر نکالوں موٹر۔"

بیگم نے کہا: "اب کیا کریں گے بازار جا کر۔"

میں نے کہا: "میں تو جاؤں گا مٹھائی لینے میری بیوی کا غسلِ صحت ہے آج۔" اور میں سب کو واقعی پکڑ کر بازار لے گیا۔

غنچے چٹکے آدھی رات

محمد عمر میمن

اس کے چہرے سے گہرے فکر کے جذبات ہویدا تھے۔ سامنے تپائی پر اخبار پڑا تھا۔ اس نے ہر لمحہ اپنے امڈتے ہوئے جذبات کی طغیانی سے نجات نہ پاکر پھر ایک اخبار اٹھا کر یونہی خالی خالی نظروں سے دیکھنا شروع کیا۔ وہ پڑھ کیا رہا تھا۔ یہ تو خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔ بس اس کے ذہن میں تو دو گھنٹہ قبل پڑھی ہوئی۔ اخبار کے پہلے صفحے پر جلی حروف میں درج خبر بری طرح چکر لگا رہی تھی۔

حکومت نے تمام ناجائز املاک کا حساب مانگ لیا تھا اور ڈکلریشن فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ میں اب صرف دو دن باقی رہ گئے تھے۔ ان گذشتہ نو سال میں "بلیک" کے کام اور دیگر ناجائز طریقوں سے حاصل شدہ دولت کا حساب اس قدر آسانی سے نہ ہو سکتا تھا۔ مستقل ڈیڑھ ماہ سے وہ برابر کوشش کر رہا تھا کہ اخباروں یا ریڈیو سے وہ توجہ ہٹا لے اور اعلان نہ پڑھے نہ سنے۔ مگر کبھی ایسا نہ ہو سکا۔

"اف میں کس قدر مصیبت میں پڑ گیا ہوں، اف میرے خدا۔ . . . . اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی سے پیدا شدہ لکیریں اور بھی گہری ہو گئیں۔ تب اچانک اسے یہ محسوس ہوا" وہ اس جال میں جو خود اس نے دوسروں کو پھانسنے کیلئے ان گزشتہ نو سال میں بنایا تھا بری طرح خود ہی پھنس گیا ہے۔ لیکن یہ تو سب میری مرضی کے مین منافی ہوتا رہا ہے۔ میں نے اس ناجائز دولت کے حصول کے لیے جو کچھ ذرائع استعمال کئے ان میں کب میرے ارادے کو دخل تھا . . . . ؟ ذہن کے کسی گوشے سے آواز آئی اور ضمیر تڑپ اٹھا۔

سیٹھ محمود علی! اب اتنے بھولے بھی نہ بنو یہ تمام املاک یہ لاکھوں کا نفیس بنگلہ یہ کاریں، عیش و طرب کے سامان، چمکیلا فرنیچر ان سب کے حصول کے لئے جب تم ناجائز طریقوں کو اپنانے کے لئے بڑھے تھے۔ تو کیا اس موقع پر میں نے تمہاری راہ نہ روکی تھی۔ کیا تمہیں اس وقت میں نے تمہارے اس مکروہ اقدام سے باز رکھنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اور صرف ایک دفعہ ہی کیا۔ ان طویل نو سال میں جب بھی تم نے دولت کے حصول کے لئے کوئی بھی ناجائز ذریعہ استعمال کیا میں نے ہر بار تمہیں اپنے ارادے سے باز رکھنے کی تنبیہہ کی۔ لیکن سیٹھ! دولت کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ کھنکھناتے روپیلے سکوں کی جھنکار انسان کی عقل پر دبیز پردہ ڈال دیتی ہے اور تم نے بھی ہر بار ان کھنکھناتے سکوں کی جھنکار کے آگے میری سرزنش کو پس پشت ڈال دیا۔ اور اب تم کتنے بھولے بن رہے ہو۔ تمہارے فعل میں تمہارے ارادے کو دخل نہ تھا تو سیٹھ محمود علی یہ بنگلہ کیسے بن گیا۔ اور چمکتی ہوئی ہزاروں کی یہ "پیکارڈ" تم کہاں سے لے آئے۔؟"

"لیکن . . . . لیکن ——— یہ سب میں نے اپنے لئے تو حاصل نہ کیا تھا ——— اور جب یہ سب میرے لئے نہیں تو میں ہی کیوں اس کا تن تنہا خمیازہ بھگت رہا ہوں؟

اس سے بحث نہیں یہ تم نے اپنے لئے حاصل کیا یا طویل طنزیہ جملوں کی ہر لمحہ بڑھتی ہوئی یورش سے اپنے کو محفوظ رکھنے کے لئے یا اپنی بیوی اور دیگر رشتہ داروں کے بیہم اصرار کے بعد ——— حاصل تو کیا! تو اب پھر ان طویل پچھتاووں سے کیا حاصل! تم اپنا ضمیر تو پہلے ہی بیچ چکے ہو سیٹھ"

تب اچانک ضمیر کی اس کشمکش سے ہٹ کر اس کی آنکھیں اخبار پر پھیلی ہوئی ایک دوسری سرخی پر پھسل گئیں . . .

ایک خوفناک اسمگلر اپنی لانچوں سمیت بحری فوج کے ہاتھوں پکڑا گیا تھا . . . . . اچانک اسے کچھ شک سا گزرا روزانہ وہ اخبار میں اسمگلروں کی گرفتاریوں کی خبریں پڑھتا آیا تھا۔ لیکن کریلا والا ابھی تک آزاد تھا اور وہ کریلا والا کی پھرتی اور چالاکی کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا اس انقلابی دور میں جب کہ فوج نے ایک ایک اسمگلر کو پکڑ لیا تھا۔ کریلا والا اسی آزادی سے سپاہیوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتا پھر رہا تھا اور یہ ناممکن ہے کہ بلیک لسٹ پر کریلا والا جیسے کالے مجرم کا نام نہ ہو۔ لیکن نہ جانے کیوں آج اس کا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ باوجود بڑی کوشش کے وہ خبر کی مکمل روداد پڑھنے سے اپنے آپ کو باز نہ رکھ سکا ——— اس کا خدشہ صحیح تھا۔ کریلا والا اپنے کیفر کردار کو پہنچ چکا تھا۔ یکایک ایک ہلکی سی کراہ اس کے لبوں سے نکلی اور اسے شدت سے محسوس ہوا، اس کا دایاں بازو ٹوٹ چکا ہے وہ تقریباً یتیم ہو گیا ہے۔

"اوہ ـــــ ہائے" وہ کسی اندرونی ہیجان سے کراہ اٹھا اور اس کی آہ لبوں سے نکل کر کمرے کی فضا میں پھیل گئی۔ اس نے ختم ہوتے ہوئے سگار کے دو تین لمبے لمبے کش جلد جلد لے ڈالے اور اسے ایش ٹرے میں رکھتے ہوئے بکس سے دوسرا سگار نکال لیا۔ لائٹر کے مدھم سے کانپتے ہوئے ننھے شعلے میں اسے اپنا مستقبل نظر آنے لگا۔ اس نے عجیب ہذیانی انداز میں جلدی سے پھونک مار کر شعلے کو گل کر دیا۔ جیسے وہ اپنا مستقبل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ جیسے اسے علم تھا کہ اس کا مستقبل کا روپ کہیں زیادہ گھناؤنا اور تاریک ہوگا۔ ایک بھرپور کش لیتے ہوئے اس نے سارا دھواں کمرے میں بکھیر دیا۔ دھوئیں کے پر پیچ بادل کمرے میں بے ترتیبی سے پھیل گئے اور ان دھندلے بادلوں کے بیچ میں اسے اپنا مستقبل نظر آنے لگا جسے وہ اپنی مرضی کے خلاف بے بس و مجبور سا دیکھ رہا تھا۔

وہ آہنی سلاخوں کے پیچھے بڑے بڑے چوکور خانوں والا لباس پہنے کھڑا ہے اس کے ہاتھوں میں آہنی چوڑیاں ہیں اور پیروں میں وزنی بیڑیاں جنہوں نے اسے اس درجہ بے بس کر دیا ہے کہ وہ ایک ہلکی سی آزاد جنبش سے بھی معذور ہے۔

"اف! کیا اس تمام دولت کے عوض اس کی قسمت میں یہ سلاسل ہی آئی ہیں۔ تب پھر یہ سب کس کے لئے تھا۔ اب سے نو سال پہلے کی زندگی کیا اتنی گھٹی گھٹی سی تھی کہ وہ اس آزاد معصوم اور پاکیزہ زندگی کو خیرباد کہہ کر ایک نئے باب میں داخل ہوا تھا وہ باب ـــــ زندگی کا وہ حصہ جو نو سال تک اس کی قسمت میں اپنے نئے انوکھے رنگ بھر کر اب اس مکروہ اور انتہائی گھناؤنے ایک اور رنگ کا اضافہ کر رہا تھا۔ اسے یہ رنگ نہیں چاہئے۔ اس نے اس رنگ کی تمنا ہی کب کی تھی۔ اسے تو نو سال قبل کی وہ معصوم پاکیزہ اور آزاد زندگی ہی پسند تھی۔ لیکن اب تو اس کی یہ سوچ بھی کتنی بعد از وقت ہے۔ وقت اس کی راہوں میں انگور کی نرم نرم خوشنما بیلوں کو پھلانگتے پھلانگتے اتنی دور پہنچ گیا ہے کہ اگر وہ باقی ساری زندگی بھی اپنی پوری قوت سے دوڑے تب بھی وہ اس کو نہیں پا سکتا اور انگور کی ان مخملیں بیلوں پر طویل نو سال تک چلتے چلتے اب جبکہ اپنی راہوں میں خار دار جھاڑیاں آ گئی ہیں تو وہ چاہتا ہے کہ واپس اس راہ پر لوٹ کر اپنی وہی پرانی روش اختیار کر لے جہاں نہ پھول ہیں نہ کانٹے ـــــ اطمینان تو ہے لیکن اب تو وہ اتنی دور نکل آیا ہے کہ واپس لوٹ جانا بھی اس کے بس کی بات نہیں۔ قسمت کی کبھی ان خار دار گزرگاہوں پر اب اسے طوعاً و کرہاً اپنا سفر جاری ہی رکھنا ہے۔

دھوئیں کے بادل فضا میں تحلیل ہو گئے کمرے میں نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور مینٹل پیس پر خوشنما گھڑی کے نزدیک پڑا ہوا بدھ کا لکڑی کا مجسمہ اسی روایتی انداز میں سر جھکائے کسی گہری فکر میں ڈوبا ہوا تھا ـــ یکایک اسے محسوس ہوا ـــــ بدھ بھی اپنی سوچ اور استغراق کے عالم سے جب چونکے گا۔ تو اسے اپنی اس طویل خاموشی اور سکوت کا بدلا مل جائے گا وہ بھی راہ نجات پائے گا۔ لیکن میں . . . اس نے پھر ایک گہرا کش لے کر فضا کو دھوئیں سے بوجھل کر دیا ـــــ اس کے چہرے پر بے چینی اور اضطراب اور بھی بڑھ گیا۔

رات کی سنسان خاموشی میں کسی کمرے میں لگے ہوئے بڑے سے کلاک نے گزرتے ہوئے وقت کی لاش پر اپنی بھرپور قوت سے ضربیں لگانی شروع کیں۔ وہ چونک گیا صوفے پر ہلکے نیلے سلیپنگ سوٹ میں ملبوس اپنے جسم کو ایک ہلکی سی جنبش دی اور کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی پر ایک سرسری سی نظر ڈالی ـــــ "اف! ـــــ دو بج گئے اور جانے کتنے بجتے جائیں گے۔

سامنے سبز مخملیں کمبلوں میں لپٹی ہوئی اس کی محو خواب بیوی نے کسمسا کر پہلو بدلا اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

"ارے! آپ ابھی تک نہیں سوئے ـــــ" پھر اس نے مینٹل پیس پر رکھی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھ کر حیرت سے کہا "ارے دو بج گئے" کسی نے بڑی سبک خرامی سے آکر دھیمے سے اس کی سوچ کے ساکت سمندر کی خاموش سطح پر جیسے ایک چھوٹا سا کنکر دے مارا۔ وہ چونک پڑا۔

"کیا کہا روبی ـــ سوئے کیوں نہیں!" اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ رینگ گئی اور وہ اپنے احساس میں نیم کی نبولی جیسی کڑواہٹ اور تلخی لیتے ہوئے بولا "تم سو جاؤ روبی ـــــ یہ شب بیداری تمہاری ہی تو دی ہوئی ہے . . . . . سو جاؤ . . . . . . میں نے جانے کتنی ہی ایسی طویل راتیں جاگ کر کاٹ دی ہیں۔

"یہ پچھلے چند دنوں سے آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ آپ کی بہکی بہکی باتیں یہ اضطراب در یہ کھویا کھویا پن آخر کس چیز کا ردعمل ہے؟ ـــــ"

"ایک حسرتناک مستقبل کا پیش خیمہ کہو روبی" وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے عجیب مضطرب انداز میں بولا۔

"کیوں ـــــ؟ کیسا مستقبل؟ کیسی حسرت؟ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے آخر؟"

"کچھ بھی تو نہیں ہوا مجھے روبی . . . تم سو جاؤ۔ تم پریشان نہ ہو" وہ بڑے مدھم لہجہ میں بولا اور روبی دوسری طرف کروٹ بدل کر سو گئی۔ اس کے جی میں آیا کہہ دے "روبی تم بہت بھولی ہو اب سے صرف نو سال پہلے تم نہ کہا کرتی تھیں۔ آخر ہمارے رشتہ دار سرحد پار کر کے ایسے رئیس تھے۔ لیکن اب . . . . . یہاں آتے ہی

ان کی قسمت جاگ اٹھی۔گویا کوڑی کے دن پھر گئے اور اب تو زندگی خود ان پر رشک کرتی ہے۔ آخر ہم میں کیا برائی ہے؟ ہم کیوں ایسے نہ بنیں ...... ! اور تب پھر ردبی "محمود جنرل اسٹورز کی فٹ پاتھ سے ملی ہوئی دوکان شہر کی سب سے عظیم شاہراہ پر "محمود اینڈ سنز ایکسپورٹرس اینڈ امپورٹرس" کے لمبے چوڑے آفس میں تبدیل ہوگئی۔ لیکن ردبی اس چھوٹی سی دوکان کی سوڈیڑھ سو روپے کی ماہانہ آمدنی ہم اور ہمارے بچوں کو ایک سکون تو دے سکتی تھی۔ موٹا جھوٹا پہننے کو اور سیدھا سادا کھانے کو لیکن .... تمہیں اس زندگی سے اور اس کے اطمینان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بہانے تمہارے، اور تمہارے رشتہ داروں کے طویل طنزیہ جملوں سے بچنے کے لئے ہر مخدوش ذریعہ کو حصول دولت کیلئے اپنا کر تمہارے زرد لٹکتے ہوئے رخساروں کو کھنکھناتے سکوں کی سرخی پر اگر بخشدی۔ لیکن اپنا سکون اور وہ مطمئن نیند میں اس پہلے ہی دن کھو آیا تھا جب پہلی بار ۳۵ ہزار کا درآمدی لائسنس ۴۵ ہزار میں بیچ کر دس ہزار کے نوٹوں سے میں نے جیبیں بھاری کرلی تھیں اور جب زندگی میں سب سے پہلی بار میرے انگ انگ میں مسرت کی لہر دوڑی تھی۔ کھوکھلی مسرت! تب اس شب دیر تک مجھے نیند نہ آسکی تھی۔ اور میں یہ سمجھا تھا آج کی حاصل کردہ خوشی مجھے سونے نہ دے گی۔ .... تب میں زندگی میں پہلی بار اپنے دوستوں سمیت بار میں پہنچا تھا ــــــ اس دن کے بعد سے آج کی رات تک میں بہت ہی کم سو پایا ہوں۔"

اس نے چاہا وہ سب کچھ اپنی بیوی سے کہدے۔ جو مستقل اس کے ذہن میں رہ رہ کر ہجوم کر رہا تھا۔ لیکن وہ صرف سوچ کر رہ گیا۔ کہہ کچھ بھی نہ سکا۔

اس نے نیا سگار اٹھا کر سلگایا اور فضا میں دھواں بکھیر دیا۔ نیلگوں پینٹ سے رنگی ہوئی بیڈ روم کی دیواروں کو اپنے پس منظر میں لئے ہوئے دھواں ایک عجیب رنگ کو جنم دے رہا تھا۔ تب وہ اٹھا اور اپنے صدیوں سے دکھے ہوئے بدن کو اکڑا کر ایک بھرپور انگڑائی لی اور پھر دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ دروازے میں آراستہ ریشمیں نیلگوں حریری پردے اس کے پیچھے ہوا کے مدھر دوش پر دھیمے دھیمے لہرانے لگے۔

ہلکی ہلکی خنکی فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے کی گرم فضا سے نکل کر اب اس ہلکی ہلکی خنکی نے اس کے جسم میں ایک جھر جھری سی پھیلا دی۔ چاندنی کی دودھیا نرم نرم روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ اوپری منزل کے سامنے خوشنما باغ کی سیمیں روشوں سے ذرا ہٹ کر ہری ہری کیاریوں میں سرخ سرخ گلابوں کی ادھ کھلی کلیوں پر چاندنی اپنی کرنوں کا حسین سا رقص پیش کر رہی تھی۔ ہر چیز میں حسن تھا اور بلا کا ــــــ لیکن وہ فطرت کی ان تمام رنگینیوں سے بے خبر اپنے گنجان خیالات کے لامتناہی سلسلہ میں گم تھا ...... یہاں تک کہ جب اس خنکی سے سردی کی ایک دھیمی سی لہر اس کی رگ رگ میں سرایت کر گئی۔ تو جانے وہ کس خیال سے پلٹ کر کمرے میں پہنچا۔

"کہیں جاگ نہ جائے!" اس نے دھیمے سے سرگوشی کی۔ ان طویل نو سالوں کی اس عیش و طرب کی زندگی نے اس کے دماغ میں بلا کی نازکی پھیلا دی ہے اس کی جلد بہت نرم اور حساس ہوگئی ہے۔ کہیں اس خنکی کا اثر نہ قبول کرلے۔" تب کمرے میں پہنچکر اس نے اپنا گاؤن اپنے شانوں پر پھیلا دیا اور بیڈ روم کے کھلے دروازے کو بند کرتا ہوا۔ بالکونی میں نکل آیا۔ کٹہرے کے سہارے کھڑے ہو کر اس نے اپنے جسم کا سارا بوجھ ٹکی ہوئی اپنی کہنیوں پر منتقل کر دیا۔

رات کی رانی کی خوشبو میں بسا ہوا ایک معطر سا جھونکا اس کے نتھنوں سے آٹکرایا۔ اس نے ایک بھرپور سانس لیکر ساری خوشبو اپنے میں جذب کرلی۔ دور تک باغ کی روشوں پر چاندنی اپنے کو بچھا در کئے دے رہی تھی اور باغ کے بیچوں بیچ سنگ مرمر سے تراشیدہ کیوپڈ کے نازک سے مجسمے سے ٹکے ہوئے فوارے کے نیچے سلور گرے کلر کے موزیک چپس (CHIPS) چاندنی میں اپنی پوری تابانی سے جگمگا رہے تھے فوارے کے گھیرے میں پڑا ہوا پانی خاموش اور ساکت تھا۔ اچانک پانی کی پرسکون سطح پر اچھل سی ہوئی اور سوئی ہوئی خاموشی تھی منی ہزار ہا شوخ رنگوں والی مچھلیاں اپنی سیمیں دموں کو ہلاتی ہوئی تیرنے لگیں۔ باغ کے داہنے کونے میں مہندی کی باڑھ سے ملا ہوا بچوں کا جھولا بھی خاموش تھا۔ کائنات سو رہی تھی۔ لیکن وہ تنہا فطرت کی رنگینیوں کے مابین اپنے دل کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو لئے بالکونی میں کٹہرے سے ٹکا کھڑا تھا۔ اس نے سگار کا ایک اور طویل کش لیا اور چاہا سینے سے نکلتے ہوئے دھوئیں کے ساتھ ہی اس کا سارا بوجھ اور خلش نکل جائے۔ جو ان نو سالوں سے مسلسل اس کے دل کو بھینچتی رہی ہے۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔

دھوئیں کا بادل اس کے خیالوں کو بڑے ہی پرفن انداز میں بالکل غیر محسوس طریقے پر ماضی کی ان گم گشتہ راہوں پر لے گیا۔ جو اب بالکل اجڑی پڑی تھیں۔

"ہائے! وہ زندگی کیا بری تھی۔ ہم اپنے پرانے دیس میں کونسی ایسی جاگیر چھوڑ کر آئے تھے۔ جو یہاں آکر ہم نے دولتمند بننے کے خواب دیکھے۔ وہ زندگی جیسی کچھ بھی تھی۔ پرسکون اطمینان بخش تو تھی۔ جب سارا دن اپنی چھوٹی سی دوکان میں گاہکوں کو راضی کرتے کرتے تھک کر جب رات گئے میں گھر لوٹتا تھا۔ تو مجھے کتنی مسرت ہوتی تھی۔ نہ مستقبل کا کوئی غم نہ کوئی فکر ــــــ کاش میں ان ترغیبوں میں نہ آتا ــــــ"

یکایک یوکلپٹس کی کسی شاخ سے کوئی چمگادڑ اس کے خیالات کے پرسکون سمندر اور فضا کی ہم آہنگی میں اپنے پیچھے ایک بے ہنگم سی پھڑپھڑاہٹ کے شور کو جنم دیتی ہوئی، سڑک کی دوسری جانب بجلی کے کھمبے کے کسی تار پر جا لٹکی ——

اس کے خیالات بہک گئے اور اب تو وہ بڑے واضح انداز میں ان تمام ترغیبات کو سن رہا تھا جو وقتاً فوقتاً کبھی اپنی بیوی اور کبھی اپنے دیگر رشتہ داروں سے اس مکروہ زندگی میں داخل ہونے کے لئے اسے ملی تھیں۔

"آپ اپنی اس معمولی زندگی سے مطمئن ہیں۔ کیا آپ کو اچھا کھانے اچھا پہننے کی تمنا نہیں؟ آپ ذرا ہاتھ پاؤں تو ماریئے۔ اب بھلا چچا اسلم کا لڑکا ایسا وہاں کون ہزار دو ہزار کما رہا تھا۔ لیکن سب آپ کی طرح ہاتھ پہ ہاتھ دھرے ٹھوڑی بیٹھے رہتے ہیں، یہاں آتے ہی اس نے اپنی قسمت چمکا لی۔ ٹھاٹ سے رہتا ہے۔ لاکھوں کا بنگلا ہے ہزاروں کی کار ہے، ایک اسی پر کیا موقوف۔ رفیعہ خالہ کے داماد ہی کو لیجئے، شہر کی سب سے بڑی شاہراہ پر سب سے جگمگاتی ہوئی دوکان اسی کی ہے ریحانہ کے شوہر ہی کو لیجئے۔ ملک کا ایک متمول ترین تاجر ہے۔ جب کہ وہاں اس کے گھر کی حالت آپ سے کچھ چھپی نہیں تھی۔ پھر آخر ہم سب یہ کیوں حاصل نہیں کر سکتے۔"

اور وہ اکثر اپنی بیوی کی ان ترغیبات پر جھنجھلا اٹھتا —— "آخر یہ عورت چاہتی کیا ہے، کیا میں دوکان پر سارا دن بیکار بیٹھا رہتا ہوں۔ کیا میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا سارا دن تو محنت کرتا ہوں۔ تب پھر ہاتھ پاؤں ہلانے کے کیا معنی ہوتے ہیں" اور پھر بڑی بیزاری سے پوچھتا "کیا تمہارے خیال میں میں ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا! تو پھر! تمہاری منشا کیا ہے؟ میں نہیں سمجھ سکتا!"

اور روبی اپنے خاوند کی اس سادہ لوحی پر کڑھ کر سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی بڑے مبہم انداز میں ہمیشہ جملہ اس طرح ختم کر دیتی:

"ہاتھ پاؤں تو آپ بھی ہلاتے ہیں۔ لیکن ذرا —— اب میں خود کیا کہوں آپ خالہ رفیعہ کے داماد سے ملئے تو سہی وہ خود آپ کو اس کا مطلب بتا دیں گے"

اور وہ جھنجھلا کر کہتا: "کیا ذرا —— ؟"

عرصہ تک اپنی سادہ لوحی کے سبب وہ سمجھ ہی نہ سکا کہ اس ہاتھ پاؤں ہلانے کا دوسرا مطلب کیا ہو سکتا ہے۔

"میاں محمود! تم بیکار اپنی زندگی ضائع کر رہے ہو۔ کچھ کما لو اولاد کی بھلائی کے ہی کام آئے گا۔ انسان کو اپنی موجودہ زندگی سے کبھی مطمئن نہ ہونا چاہئے۔ ہر لحظہ خوب سے خوب تر کی تلاش جاری رکھنی چاہئے۔ بھئی ہماری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ جانے کیسے انسان ہو تم بھی! ہاں کچھ ہاتھ پیر بھی تو ہلاؤ —— میں تمہاری مدد کو تیار ہوں خالہ رفیعہ کا داماد ایک روز بولا تھا۔ اور پھر وہی ہاتھ پاؤں ہلاؤ —— وہ جھنجھلا گیا —— اسے ایک ضد سی ہو گئی ..... وہ خاموش ہی رہا۔

اور جب ایک روز اپنی بیوی کی تنبیہہ اور رشتہ داروں کے طنزیہ فقروں سے تنگ آ کر اس نے گھنٹوں سر جوڑ کر غور کیا تو اس ہاتھ پاؤں ہلانے کا مطلب وہ اچھی طرح سمجھ گیا۔ لیکن اچانک اسے محسوس ہوا۔ لعنت ہو۔ ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ دولت پر، لعنت ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہوئی ...... لیکن وہ اپنے خیالات میں ثابت قدم نہ رہ سکا —— اور پھر ایک روز وہ رفیعہ خالہ کے داماد منور علی کے پاس پہنچا۔

"منور بھائی! بھئی میں تو اپنی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں، آپ صحیح کہتے تھے۔ لیکن اب آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ آپ کے سوا کون ہے۔ آپ مجھے بتائیں کونسا دھندہ سود مند ثابت ہوگا۔

اور منور علی مسکراتے ہوئے بولا تھا۔

"ایکسپورٹر امپورٹر بن جاؤ —— ایک ہی لائسنس میں قسمت بدل جائے گی"

"وہ کیسے منور بھائی؟ یہ ایکسپورٹر اور امپورٹر کیا ہوتا ہے؟"

اور تب منور علی نے اسے ان تمام باتوں سے باخبر کر دیا اس کی امید بندھائی۔ تمام تجارتی ہتھکنڈے اور گر ازبر کرا دیئے۔ مزید کہا:

یار محمود شروع شروع میں ذرا دقت کا سامنا ہوگا۔ لیکن۔ گھبرانا نہیں، ذرا ثابت قدمی دکھاؤ —— ایک دفعہ قسمت جاگی سو جاگی!

"اچھا ——" وہ بڑی حیرت سے بولا۔ اور چند ہی دنوں میں نٹ ہاتھ سے ملی ہوئی دکان، "محمود جنرل اسٹور" کا بورڈ شہر کی سب سے عظیم شاہراہ پر منور علی کی دکان کے برابر ہی ایک بڑے سے آفس میں تبدیل ہو گیا "محمود اینڈ سنز ایکسپورٹرس اینڈ امپورٹرس" یہ سب منور علی کے اثر و رسوخ سے ہوا تھا۔ اپنے ہی اثر سے اس نے شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل میں محمود کی طرف سے ایک پارٹی دے ڈالی جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے بین الاقوامی تجارت کا "بڑا صاحب" مدعو تھا اس

پارٹی میں شہر کے سب ہی بڑے بڑے تاجر موجود تھے۔ منور علی نے ان تمام مشہور تجار سے محمود کا تعارف کرایا پھر بڑا صاحب منور علی اور محمود تینوں ایک خالی میز پر آبیٹھے جہاں باتوں باتوں میں منور علی نے بڑے صاحب سے محمود کے لئے کسی لائسنس کی منظوری کا اظہار کر دیا۔ بڑے صاحب اپنے لبوں پر ایک چمکیلی مسکراہٹ لئے ہوئے بولے:

بھئی محمود صاحب! کسی روز دفتر تشریف لائیے، بھلا ہمارے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی تکلیف پہنچے، یہ ناممکن ہے۔ بھئی دوستوں ہی کے کام نہ آسکے تو بیکار ہے۔

تو اس رات منور علی دیر تک اسے اپنی سوچی سمجھی اسکیم کی بابت بتاتا رہا۔

"بھئی محمود! میں نے ایک پارٹی بھی ڈھونڈلی ہے جو لائسنس دس ہزار کی رقم زیادہ دے کر خرید لے گی۔ اور اس دس ہزار میں سے دو ہزار تم بہتر سمجھ سکتے ہو بڑے صاحب کے ہوں گے اور دو ہزار میرے اور باقی کے تنہا مالک تم ہوگے۔"

تب اچانک شدت سے اسے محسوس ہوا۔ "تو گویا ہاتھ پاؤں ہلانے کا مقصد یہ تھا" خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ پڑی۔ مہینوں کی عرق ریزی اور گاہکوں کی جھک جھک سے تو نجات ملی اور اگلے روز ہی وہ جانے کتنے ہی مستقبل کے خوش آیند سپنوں کا رنگ لے کے بڑے صاحب کے دفتر پہنچا ——— اور پھر مستقل معقول کی تگ و دو کے بعد اس کے ہاتھ میں منظور شدہ ۲۵ ہزار کا درآمدی لائسنس تھا جسے اس نے منور علی کے ایما پر شیخ ایاز کے ہاتھوں حاصل ہونے کے چند ہی لمحوں بعد ۳۵ ہزار میں بیچ دیا اور یوں اس کالے دھندے سے سب کا حساب بیباق کرنے کے بعد اس کی جیبیں چھ ہزار کے نوٹوں سے بوجھل ہوگئیں۔

خوشی سے بے قابو ہو کر جب وہ گھر پہنچا تو رات گئے تک اسے نیند نہ آسکی۔ ذرا سی محنت سے جب چھ ہزار مل گئے تھے۔ تب کاروبار بڑھنے پر تو وارے نیارے ہی ہو جائیں گے۔ اور شاید یہی خوشی اس کے اور اس کی نیند کے درمیان آہنی دیوار بن کر حائل ہوگئی تھی۔ لیکن خوشی کا غلبہ اسقدر شدید تھا کہ وہ بالکل غیر محسوس طریقے پر نیند اور وہ بھی گزشتہ پرسکون نیند کی اہمیت ہی کو بھلا بیٹھا۔

اچانک پام کے ننھے منے پودوں پر پھدکتی ہوئی ابابیل پھڑ پھڑا کر اڑ گئی اور فضا میں ایک وسیع بیضوی دائرے کی شکل میں بڑی تیزی سے چکر لگانے لگی اس پھڑ پھڑاہٹ سے اس کے خیالات کا سلسلہ بکھر گیا۔ لیکن چند لمحات بعد فضا میں پھر پہلے جیسی ہم آہنگی اور یکسانیت گھل گئی اور پھر وہ تھا ——— اور ماضی ....

تب چاندنی میں وہاں بالکونی کے کٹہرے سے ٹیک لگا کر کھڑے کھڑے اسے خیال آیا۔ اور اس شب جب رات اچھی طرح بھیگ چکی تھی۔ وہ زندگی میں سب سے پہلی بار اپنے دوستوں کی معیت میں بار پہنچا تھا تو آتشیں سیّال کے چند پیگ حلق میں انڈیلنے کے باوجود بھی اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ اس کے دوست اس کے چاروں طرف دائرے کی صورت میں پھیلے ہوئے ہنس رہے تھے۔ اپنے ہر ہر فعل سے اپنی اندرونی مسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن وہ ان سب سے بہت دور ——— مستقل یہی سوچے جا رہا تھا۔ کیا یہ سب درست ہے؟ اندر ہی اندر اسے محسوس ہوا ایک بے۔ مرسی خلش اس کا دل اپنی پوری شدت سے مسوس رہی ہے۔ تب وہ بے دلی سے اٹھ کر وہاں سے گھر چلا آیا۔ ساری خوشی یکلخت ختم ہوگئی ——— اور وہ سمجھ نہ سکا آج اتنی رات گزر جانے پر اسے نیند کیوں نہیں آرہی ہے ایک بے نام سا خوف دھیمے دھیمے اس کے سینہ میں سر ابھارنے لگا۔ لیکن اس نے اپنے بڑھتے ہوئے اضطراب اور خوف کو یہ کہہ کر تسکین دے لی۔ آج زندگی ایک نئے دور میں داخل ہوئی ہے شاید پرانی زندگی پر اس نئی زندگی کے غلبے کی شدت اور ہزارہا خوشیاں اسے نہیں سونے دے رہی ہیں ——— لیکن یہ اندر ہی اندر کوئی اس کا دل بھینچ رہا ہے پچھلی راتوں سے یہ رات کتنی مختلف ہے! یہ کیسا احساس ہے جو اس کی روح کے گرد تیزی سے چھاتا جا رہا ہے ؟

اور جب وہ اپنے مضمحل وجود کو لیکر رات کے تین بجے اپنے بستر پر دراز ہوا۔ تو اسے محسوس ہوا! وہ بہت تھک چکا ہے۔ بہت بوجھل ہو گیا ہے۔ چھ ہزار کے ان نوٹوں نے اپنی پوری قوت سے اسے اپنے نیچے بھینچ لیا ہے اور پھر وہ حقیقت جس کو وہ ہر لحہ چھپانے کی کوشش کرتا آیا تھا۔ بڑے واضح انداز میں اس کے سامنے منہ پھیلائے اکڑی ہوئی۔

"محمود ——— یہ دھندہ چھوڑ دو!" اس نے اس نشتر چبھونے والے احساس سے فرار پانے کو کسمسا کر کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن ضمیر کی آواز صدائے بازگشت بنکر اس کے ذہن پر ہتھوڑے برساتی رہی "محمود! یہ تم سب کیا کر رہے ہو؟ یہ زندگی ملمع ہے، دولت کے اس انبار تلے تمہاری حقیقی خوشیاں مدفون ہیں، صرف آج ہی کی رات نہیں۔ تم آنے والی کئی صدیوں تک سکون سے نہ سو سکو گے! بہتر ہے اس ملمع کو اتار دو۔"

لیکن نہ جانے کیسے وہ ضمیر کی آواز کو خوش آئند مستقبل کے ہزاروں دلفریب پرشکوہ محلات کے عقب میں تھپک تھپک کر سلانے میں کامیاب ہو گیا۔

اور نئی زندگی کی دوسری صبح جو طلوع ہوئی تو اس میں اس کے لئے غم کے دبیز دھندلکے تیر رہے تھے۔ اور ہر آنے والی کل کے ساتھ اس کی سابق پرسکون زندگی

بڑھتی ہوئی دولت کی پریشانی اور فکر میں ڈھلتی گئی ——— راتوں کو اب برائے نام نیند آتی تھی۔ . . . . . اور بڑھتے ہوئے دنوں کے ساتھ کاروبار بھی اپنے شباب کی انتہائی منزلوں کو چھونے لگا ——— جانے کتنے لاکھوں کے بین الاقوامی تجارت کے لائسنس ان بڑے صاحب کے دفتر سے نکل کر اس کی گود میں سکوں کی بارش کرتے ہوئے نئی منزلوں کی طرف بڑھنے لگے۔

اس نے دھیمے سے ایک آہ بھری ——— گزری ہوئی کل کے کھلے ہوئے سرخ سرخ گلاب چاندنی میں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ اور سنگِ مرمر کے دیوتا کے بوجھ اٹھائے ہوئے۔ محبت اور حسن کے دیوتا کیوپڈ کے لب پر اس کے محبت کے تیر کی انی چاند کی دودھیا روشنی میں چمک رہی تھی اس نے ہر لمحہ ذہن میں ہجوم کرتے ہوئے ان خیالات کی رو سے بغاوت کرنا چاہی۔ وہ کامیاب بھی ہو گیا۔ لیکن یہ کامیابی وقتی تھی۔

"سیٹھ ریاض کی بیوی کسی دن شام کو یہاں آئی تھیں۔ انھیں ہمارے گھر کا معمولی فرنیچر پسند نہیں آیا اور واقعی ہمارا فرنیچر ہے بھی کتنا معمولی۔ سیٹھ ریاض کا فرنیچر تو آپ نے دیکھا ہے نا!" ایک روز روبی اٹکتے ہوئے بولی تھی۔ لیکن اس کے ایک ایک لفظ سے اس کی آرزو کا اظہار واضح ہو رہا تھا۔ اور ان الفاظ کے پیچھے لپٹا ہوا روبی کا اشتیاق اور آرزو اس سے مضمر و مستور نہ رہ سکی۔ وہ بڑی محبت سے بولا۔

"کل ہی چلنا! جس قسم کا فرنیچر چاہو آرڈر دے لینا ———"

اور آنے والے ایک ہی ہفتہ میں اس کا بنگلہ چمکتے ہوئے ستر ہزار کے فرنیچر سے بھر گیا۔

کھیت کرتی ہوئی چاندنی کے درمیان پام اور یوکلپٹس کے پودوں کے سایہ میں اس نے اپنے ماضی کی ایک اور بھیانک شکل دیکھی ——— ایک منظر!

اب سے بہت پہلے ——— جب ایک روز وہ اپنی کمپنی کے دفتر میں بیٹھا ہوا نہ جانے کس سوچ میں غرق تھا کہ خالہ رفیعہ کا داماد منور علی جو کپڑے کا بہت بڑا بیوپاری ہونے کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا اپنے ساتھ ایک پستہ قد سیاہ فام اجنبی کو لئے اس کے آراستہ کیبن میں داخل ہوا۔

"اوہ منور بھائی ——— آیئے ———" وہ بڑے تپاک سے بولا لیکن اس کی نظریں برابر پستہ قد اجنبی کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کیوں اسے اس صورت سے بڑی دہشت محسوس ہوئی ——— وہ اس اجنبی کے بارے میں قیاس ہی کر رہا تھا کہ منور علی بولا۔

"بھئی محمود ان سے ملو ——— یہ ہیں مسٹر کریلا والا ——— میں نے ان کا ذکر تم سے اس دن کیا تھا نا؟"

اور اس کا دل اس کے پہلو میں بڑی شدت سے دھڑکا ——— "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مسٹر کریلا والا" وہ بڑے تپاک سے بولا لیکن اس تپاک کے پیچھے اس کے تصنع اور اضطراب کو کریلا والا بھی محسوس کئے بنا نہ رہ سکا۔ چنانچہ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور سفاک چہرے پر بلا کی مسرت پیدا کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں سیٹھ صاحب! کیا بات؟ آر یو ناٹ فیلنگ ویل ———"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں مسٹر کریلا والا ———" اسے اپنی بے وقت کی اس کمزوری پر شدید غصہ آیا . . . . . . لیکن اگلے ہی لمحہ اس کا دل شدت سے دھڑکنے لگا اب سے چند روز پہلے جب منور علی نے کریلا والا کا تعارف غائبانہ طور پر اس سے کرایا تھا اس وقت بھی اس کا دل شدت سے دھڑکا تھا۔

"بھئی محمود! یہ کریلا والا بڑا پھرتیلا شخص ہے۔ بلا کا ذہین اور مکار! اسمگلروں کا شہنشاہ کہلاتا ہے۔ اس قدر چالاک اور اثر و رسوخ کا آدمی ہے کہ پولیس کو بھی شاید ناک چنے چبوا دیئے ہیں اور معلوم ہوتا ہے جیسے تھک ہار کر پولیس نے اس کی جستجو ہی چھوڑ دی ہے کویت، عدن، گوادر سے لیکر بمبئی کولمبو اور چاٹگام تک اس کا جال بچھا ہوا ہے اس سے معاملہ پکا ہو جائے تو بس وارے نیارے ہو جائیں گے۔"

اور وہ اپنے امنڈتے ہوئے جذبات اور ہر لمحہ سرزنش کرتے ہوئے ضمیر کی آواز کو پس پشت ڈالتے ہوئے بولا تھا۔

"ٹھیک ہے منور بھائی، آپ لے آیئے میں تیار ہوں" اور میری تیاری کا کیا سوال آپ نے ہی میری راہ نمائی کی ہے۔ آپ جو ٹھیک سمجھیں وہی کیجئے" اسے اپنی کمزوری کا علم تھا چنانچہ وہ مزید بولا تھا۔ "آپ پہلے ہی سے سودے کی بات پکی کر کے آیئے گا۔ میرے سامنے نہ کیجئے گا۔"

تب اس رات بھی اس کا ضمیر تڑپا تھا لیکن اب اس نے اس کمبخت ضمیر کو سلانے کا ایک اور کارگر سہارا تلاش کر لیا تھا۔ جب بھی اس کے ضمیر نے سرزنش کی اس نے یہ کہتے ہوئے "جب ساری دنیا ہی چار سو بیس کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ تو ہمیں سچائی اور صداقت کی زندگی بسر کرنے سے کیا حاصل" دو چار پیگ تلخ شراب کے پی کر اسے سلا ڈالا۔

اور اب کریلا والا اس کے سامنے تھا، چوڑی چوڑی موچھوں والا کریلا والا، جس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بلا کی عیاری اور ذہانت ٹپکتی تھی۔ . . . اور وہ اپنے اندرونی ہیجان پر خارجی پھیکی سی مسکراہٹ پھیلاتے ہوئے صرف کریلا والا سے صرف اسی قدر کہہ سکا۔

"کوئی گڑبڑ تو ـــــ نہ ہوگی؟"

"آپ کیسی باتیں کرتے ہیں سیٹھ!" کریلا والا بڑی مکاری سے بولا۔

"تو گویا معاملہ پکا ہوگیا"

"بالکل ـــــ!" تب اس نے منور علی سے رقم کے بارے میں پوچھا اور دراز کھول کر سوسو کے نوٹوں کی کتنی ہی گڈیاں نکال کر کریلا والا کے آگے پھیلا دیں جنہیں اسنے بڑی ہوشیاری سے سمیٹ کر بیگ میں بھر لیا اور بڑی عجلت سے لٹھتے ہوئے بولا "سیٹھ مال دو روز میں پہنچ جائے گا"

اور اس روز کے بعد سے سالوں تک سوسو کے نوٹوں کی کتنی ہی گڈیاں اس کی دراز سے نکل کر کریلا والا کے بیگ میں منتقل ہوتی رہیں۔ اور ان کے عوض اسمگلنگ کا مال اس کے توسط سے مارکیٹ میں پھیلتا رہا۔

ماضی کے اس بھیانک روپ کو دیکھ کر اسے ایک جھرجھری آگئی ـــــ "اب تو کریلا والا بھی اپنی تمام مجرمانہ ذہانت کے باوجود اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ چکا ہے": وہ بڑبڑایا۔

اب تو اسے جینے کا ڈھنگ آگیا تھا۔ لیکن ہائے یہ کیسی بے نام سی خلش تھی۔ جو اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، خوابوں میں، ہر وقت اس کے دل میں کچوکے لگاتی رہتی جوں جوں اس کا بینک بیلینس بڑھتا گیا ایک بوجھ سا اس کے دل پر چڑھتا گیا۔ اور آج اسے پوری شدت سے محسوس ہوا۔ تو سال پہلے کی وہ زندگی کتنی مطمئن تھی جب نہ کوئی فکر تھی نہ کوئی بوجھ ـــــ نہ کوئی خلش ـــ!

"کیا آج کی رات بھی نیند نہ آئے گی!" جیسے وہ اپنے آپ سے بولا،

"سیٹھ محمود! تم نے جس روز سیٹھ کا یہ دم چھلا اپنے نام کے ساتھ لگایا تھا، اس روز سے آج کی رات تک تم کب سکون سے سو سکے ہو!" اسے محسوس ہوا اسکا ضمیر بڑے طنزیہ انداز میں اسکی ہنسی اڑا رہا ہے . . . . . وہ تلملا اٹھا۔

رات کی تاریکی دھیمے دھیمے چند ساعتوں بعد طلوع ہونے والے دن کی مدھم لیکن بتدریج بڑھتی ہوئی روشنی کے آگے سرنگوں ہو رہی تھی۔ ایک ایک کر کے ستاروں کی سیمیں قندیلیں بجھ رہی تھیں۔ اور چاندنی دودھیا روشنی دن کے اجالے کی ہلکی ہلکی سپیدی میں گھل مل گئی تھی۔ وہ بہت بوجھل تھا۔ مضمحل سا وہ دھیمے دھیمے چلتا ہوا کمرے میں آیا۔ اس کی بیوی بڑے اطمینان سے سو رہی تھی یکایک بیوی کے اس اطمینان سے اسے اپنے اندر حسد کا جذبہ زور پکڑتا ہوا محسوس ہوا۔

یہ اطمینان مجھے کیوں میسر نہیں! ہائے! آہ!! مقدر کی تو ریت نرالی ہے جسنے مجھے گناہ کی زندگی کی طرف بڑھنے کی ترغیب دی۔ وہ خود میری نیند پر آکر کتنے اطمینان سے سو رہی ہے" اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اور گاؤن اتار کر اپنے تھکے ہوئے نڈھال مضمحل دکھے ہوئے وجود کو۔ بستر پر گرا دیا۔ پھر دھیمے سے بستر سے لگی الماری سے وسکی نکالی۔ دو تین پیگ پئے اور آنکھیں بند کرلیں۔

اگلی صبح جو طلوع ہوئی تو وہ دیر تک سوتا رہا دس بجے کے قریب جب مشرقی کھڑکیوں کے سرکے ہوئے ریشمیں پردوں کے پیچھے شیشوں سے چھن چھن کر سورج کی کرنیں اس کے چہرے پر ناچنے لگیں تو ان کی ہلکی ہلکی حدت سے اس کی آنکھ کھل گئی ـــــ اس نے اٹھ کر گھنٹی بجائی۔ دس منٹ کے اندر ہی اندر ملازم ناشتہ کی گاڑی ڈھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گول تکیئے سے اپنی پشت ٹیک کر لیٹے ہی لیٹے بیڈ ٹی پی اور تھوڑی دیر تک خمار آلود نظروں سے ادھر ادھر بالکل خالی الذہن دیکھتے رہنے کے بعد سامنے کھڑے ہوئے نوکر سے انتہائی مختصر سی بات کی؛

"اخبار ـــ"

اور جب اس نے اخبار کا پہلا ہی صفحہ دیکھا تو اس کی نظروں کے سامنے دبیز دھندلکے پھیل گئے۔ اور بوجھ کی ایک وزنی چادر اس کے سر پر جیسے دھم سے آن پڑی۔ ناجائز املاک کا ڈکلریشن فارم داخل کرنے کی آخری تاریخ میں ایک دن اور چند ساعتیں ہی رہ گئی تھیں۔

بجلی کی سی تیزی سے وہ اٹھا اور فون کے پاس پہنچ کر اس نے اپنی کمپنی کے منیجر کو گزشتہ ریکارڈ اور معتبر اسٹاف لیکر جلد سے جلد بنگلے پر پہنچنے کی تاکید کی پھر اٹھ کر پرائیویٹ روم میں گیا۔ دروازہ بند کر کے اپنی سیف کا خفیہ خانہ کھولا اور اسمگلنگ اور دیگر ناجائز ذرائع سے حاصل شدہ تمام دولت کے ریکارڈ نکالے اور ڈرائنگ روم میں آکر انھیں تپائی پر پھیلا دیا۔

باتھ روم میں جا کر اس نے اپنے مضمحل اور رجلے ہوئے جسم کو شاور کی ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار کے نیچے کر دیا۔ ٹھنڈے پانی کے پڑتے ہی اس کے جسم میں پے در پے کئی جھرجھریاں اٹھیں اور اسے محسوس ہوا۔ اس جسم کی گرمی کے لئے تو برف کی ٹھنڈک بھی ناکافی ہے . . . . اب سے نو سال پہلے تو اتنے دن چڑھے تک تو وہ اپنی کان میں ہوا کرتا تھا۔ کیا زندگی ہے یہ بھی! ـــــ کتنی بے قاعدہ کتنی بے ربط۔ نہ کوئی خوشی نہ کوئی مسرت رہ رہ کر ایک پھانس سی دل میں کھٹکنے لگی ہے . . . . . ! وہ بڑبڑانے لگا

*

"منیجر!" وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے زور سے بولا اور منیجر عجیب اضطراری انداز میں یکلخت اٹینشن ہو گیا۔

"یس سر!"

"کپڑے کی چوربازاری سے حاصل کردہ رقم کا پورا پورا اندراج ڈکلریشن فارم میں ضروری ہے" وہ ڈکلریشن فارم منیجر کی جانب اچھالتے ہوئے بولا۔ اور منیجر اس کی اس حرکت پر حیرت زدہ رہ گیا۔ کپڑے کی چوربازاری اسقدر منظم اور خفیہ طریقے پر ہوئی تھی کہ قیامت تک حکومت کو اس کی خبر نہ ہو سکتی تھی، لیکن . . . .

"لیکن سیٹھ صاحب . . . . . وہ . . . . . وہ تو . . . . . اس کا سر چکرایا وہ کچھ بھی تو نہ بول سکا۔

"منیجر! ـــــ ناجائز ذریعوں سے حاصل کی ہوئی ہر رقم کا پورا پورا اندراج ضروری ہے، میں تمہارا مطلب سمجھ گیا، لیکن یہ میرا حکم ہے! ناجائز و ناجائز ذریعے سے حاصل کی ہوئی ایک پائی بھی حساب سے نہ بچنے پائے . . . . . " وہ سانس لینے کو رکا . .

"منیجر! ایسی دولت لے کر میں کیا کروں گا . . . ! مجھے سکون چاہئے۔ مجھے نیند اور اطمینان چاہتے" وہ تقریباً چیخا ـــــ

"لو ـــــ یہ لو ـــــ! یہ وہ باقی حسابات اور لین دین کے کاغذات ہیں جن کی ہوا تم لوگوں کو بھی نہ لگی ہو گی"

اس کا پورا دفتری عملہ سے یوں گھور رہا تھا۔ جیسے اسے اس کے دماغی توازن کے بارے میں شک ہو لیکن اس کی آواز گونجی۔

"منیجر! جب میں یہاں آیا تھا ـــــ لکھو! تو تین کپڑے سے تھا، یہ سب کچھ جو تم سب دیکھ رہے ہو چور بازاری اور کالے دھندے کا دیا ہوا۔ لکھو کہ اب میری بیوی کے پاس ساڑھے سات سو تولے سونے کا زیور ہے، پچھتر ہزار کا فرنیچر اور ہزاروں کی کار ہے۔ ڈھائی لاکھ کا یہ بنگلہ۔ اور یہ بھی درج کرنا نہ بھولنا کہ میرا بینک بیلنس ستر لاکھ سے کم نہیں ـــــ جس پر مختلف طریقوں سے انکم ٹیکس کی ایک پائی بھی نہیں دی گئی ہے۔"

اور اس کا منیجر اسے یوں گھور رہا تھا جیسے کوئی ننھا سا بچہ کسی بڑے آدمی کو بڑی مدلل گفتگو کرتے دیکھ کر کچھ بھی نہ سمجھ سکے۔ اور وہ خود یوں محسوس کر رہا تھا۔ اپنی ناجائز آمدنی کا ذکر جوں جوں وہ کرتا جا رہا تھا۔ ایک بوجھ کی ناقابل برداشت دبیز چادر دھیمے دھیمے اس کے سر سے اترتی جا رہی ہے جسے وہ ان طویل نو سالوں میں ضمیر کی کشمکش سے پیچھا چھڑا کر بالکل غیر محسوس طریقے پر اپنے اوپر رکھے ہوئے تھا۔

*

سال کی آخری رات تھی ـــــ!

اور جب اب سے چند ساعتوں بعد زمین کے بے نم کناروں کو چومتی ہوئی افق کے قرمزی دریچوں سے جھانکتی ہوئی جو نئے سال کی پہلی سحر طلوع ہو گی تو اس کے جلو میں ـــــ اس نے سوچا ـــــ زندگی کے کتنے ہی نئے دل آویز رنگ ہوں گے!

شب کے ساڑھے گیارہ بجے تھے اور آنے والے آدھے گھنٹے بعد ڈکلریشن فارم بھرنے کی معینہ مدت ختم ہو جائے گی، پورا شہر سکوت اور خاموشی کے اتھاہ ساگر میں ڈوبا ہوا تھا، فضا میں ہلکی ہلکی خنکی پھیلی ہوئی تھی۔ اور روشنیوں کے اس شہر کی تمام روشنیاں جھلملا کر ایک ایک کر کے خاموش ہو گئی تھیں۔ یہاں تک کہ انکم ٹیکس آفس کے چوراہے پر کھڑا ہوا آٹومیٹک ٹریفک کنٹرولر بھی سر جھکائے کسی سوچ میں غرق کھڑا تھا اس کے منہ سے نکلنے والی رنگ برنگی روشنیاں بھی بہت پہلے ہی سو گئی تھیں۔

ہر شے سو رہی تھی ——— زندگی کے آثار مفقود تھے ——— لے دے کر زندگی کی جو کچھ بھی حرارت، چہل اور ہما ہمی تھی، سب کی سب کھنچ کر آج سال کی آخری رات، انکم ٹیکس کے آفس چلی آئی تھی ——— دور تک گہرے سناٹے اور چاند کی مدھم دودھیا روشنی میں سڑک کے کنارے دور ——— بہت دور ——— کاروں کی ایک لمبی قطار کھڑی تھی۔

جانے سال کے ساتھ ہی لوگ اپنی گزشتہ زندگی کی تمام آلودگیوں کو اتار پھینکنا چاہتے تھے۔

"کیو" میں کھڑے اس پر نیند کا ایک شدید غلبہ آیا، اور اس کی آنکھیں، نیند سے بوجھل آنکھیں، دھیمے دھیمے بند ہونے لگیں، اسے حیرت ہوئی، اتنی شدت سے نیند کی خواہش، اس نے آج سے پہلے کبھی اور کیوں نہیں محسوس کی، اس کا دل اسے بہت ہلکا محسوس ہوا۔ وہ بڑی بے صبری سے اپنے نمبر کا منتظر تھا ——— اور جب اس کا نمبر آیا تو وہ ——— عجیب اضطراری انداز میں بجلی کی سرعت سے آگے بڑھا، اپنی تمام جائز اور ناجائز املاک کا جملہ حساب ڈکلریشن فارم کی صورت میں، کاؤنٹر پر پھینکتا ہوا، تیزی سے کاروں کی اس لمبی قطار کی طرف بھاگا، جلدی سے گاڑی نکالی اور تیزی سے گھر کی جانب ڈرائیو کرنے لگا۔۔۔

"آج کی رات میں سکون اور اطمنان کی نیند تو سو سکوں گا" رات کی سنسان تاریکی میں دھیمی سی مسرت سے اس کے لب ہلے۔ اور اسے محسوس ہوا ——— شدت سے محسوس ہوا، بوجھ کی وہ ناقابل برداشت چادر اچانک اس کے ذہن اور قلب سے اتر چکی ہے۔۔۔۔۔۔ وہ اپنے کو بہت ہلکا محسوس کرنے لگا ——— بہت ہلکا ——— روئی کے نرم نرم گالوں کی طرح ——— یا فلک بوس پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھیمے دھیمے گرتے ہوئے برف کے بے وزن گالوں کی طرح ——— بہت ہلکا ——— اتنا کہ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اسے اڑا لے جا سکتا ہے۔

"آج کی رات دوسری راتوں سے کتنی مختلف ہوگی ـ"

سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے برقی کھمبوں کی روشنی کے سائے تلے وہ کار ڈرائیو کرتا رہا ——— اور اسے شدت سے محسوس ہوا ——— نو سال تک گناہ کی زندگی کے تھپیڑے سہتے سہتے ——— اسے جیسے ایک بار پھر، گھناؤنی تاریکی میں بھٹکتے بھٹکتے ——— اچانک منزل کے نشان نظر آنے لگے ہیں ——— ! چمکیلے، صاف اور واضح ——— منزل کے نشان ——— !!!

فن:

پاکستانی مصوّروں کی نئی تخلیقات

جلال الدین احمد

مصوری کی دوسری قومی نمائش، جو پچھلے دنوں کراچی کے فن دوست حلقوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہے، کئی اعتبار سے اہم اور دلچسپ تھی۔ یہ جنوری کے آخری ہفتے میں شروع ہوئی اور پندرہ دن کے عرصے میں کم و بیش بائیس ہزار آدمیوں نے اسے دیکھا۔ اس میں مردوں اور عورتوں کے علاوہ بچوں کی معتد بہ تعداد بھی شامل تھی، خاص طور سے اسکول اور کالج جانے والے لڑکے اور لڑکیاں جو اپنی کلاسوں سے فارغ ہوتے ہی نمائش میں موجود مصوروں پر سوالات کی بوچھار کیا کرتے: آپ خود کس طرح پینٹ کرتے ہیں، آپ کے فلاں معاصر کے موضوعات اتنے مبہم کیوں ہوتے ہیں، یورپ کے فلاں مصور کی کیا خصوصیت ہے، آپ بجائے اس طرز کے کسی اور تکنیک میں طبع آزمائی کیوں نہیں کرتے — اور سب سے دلچسپ بلکہ نازک مرحلہ وہ ہوتا جب کسی تصویر پر آپس میں تبادلہ خیال کرتے ہوئے اور اس پر جارحانہ تنقید کرتے ہوئے وہ پیچھے مڑکر دیکھتے اور اس تصویر کے ذہنی خالق کو بہ نفس نفیس اپنے قریب کھڑے اس تنقید سے لطف اندوز ہوتا دیکھکر گھبرا جاتے۔ اور پھر مصور کے اصرار پر اپنی بحث جاری رکھتے، اور مصور خود بھی اس میں سرگرمی کے ساتھ شریک ہو جاتا۔

یہ مصوری کی دوسری قومی نمائش تھی۔ سالانہ نمائشوں کا یہ سلسلہ پاکستان آرٹس کونسل، کراچی نے شروع کیا ہے، اور اس سلسلے کی پہلی نمائش اگست ۱۹۵۷ء میں کراچی کے فریئر ہال میں منعقد ہوئی تھی۔ اس نمائش میں بھی پاکستان کے تمام فنکاروں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی اور پورے ملک سے تقریباً سب مصوروں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ لیکن چونکہ وہ پہلا موقع تھا جب کہ کراچی میں ہمعصر پاکستانی مصوروں کے شاہکار یکجا کئے گئے تھے، اس لئے نمائش کے کارکنوں اور عام دیکھنے والوں، دونوں کا رویہ ناقدانہ کم، اور توصیفی و مربیانہ زیادہ تھا۔ یہی بہت تھا کہ سارے ملک کے مصوروں کی تخلیقات جمع کر دی گئی تھیں اور اس سے زیادہ توقعات وابستہ کرنے کی نہ ضرورت تھی، نہ اس کا موقع تھا۔

البتہ اس سال دوسری نمائش کی بات ذرا مختلف تھی، اس دفعہ منتظمین بھی خود احتسابی پر آمادہ تھے اور طے یہ کیا گیا کہ مصوروں کا نیا کام نمائش کے لئے منتخب کیا جائے۔ پچھلی نمائش کے موقع پر تو فن کاروں کو دعوت دی گئی تھی کہ گذشتہ کئی سالوں میں انہوں نے جو کچھ تخلیق کیا ہے اس میں اپنی پسند کے مطابق جو تصاویر چاہیں انتخاب کرکے پیش کریں۔ اس سال کمیٹی نے نمائش میں حصہ لینے والے مصوروں کو اشارتاً یہ واضح کر دیا تھا کہ صرف تازہ تخلیقات ہی نمائش میں شریک کی جائیں گی۔ اور اس طرح وہ تمام شاہکار جو گذشتہ نمائشوں میں پیش کئے جا چکے تھے اس دفعہ شامل نہ ہو سکتے تھے۔ اس پابندی کے باوجود بھی نوے فن کاروں نے چار سو سے زیادہ تصویریں نمائش کے لئے بھیجیں۔ یہ امر بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ آرٹ کی تحریک ملک میں روز افزوں ترقی کر رہی ہے۔

ان تصاویر میں سے بیشتر نئی تھیں خصوصاً مشرقی پاکستان سے جتنی تصاویر بھی نمائش میں شامل ہوئیں ان میں سے ہر ایک کے لئے بلاتخصیص یہ بات کہی جا سکتی ہے۔ بلکہ زین العابدین کی بعض آبی تصاویر کا تو رنگ بھی پوری طرح خشک نہ ہوا تھا۔ یہ تصاویر انہوں نے نمائش کے افتتاح کی تقریب میں شرکت کے لئے ڈھاکہ سے کراچی کے ہوائی سفر پر روانہ ہونے سے چند گھنٹے پیشتر مکمل کی تھیں، اس طرح یہ نمائش جدید ترین رجحانات کی نمائندہ تھی۔ علاوہ ازیں اس کے مطالعے سے بہت سے مصوروں کے اسٹائل، تکنیک اور موضوع میں جو نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں ان کا اندازہ بھی آسانی سے لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر زبیدہ آغا کی نئی تصاویر کے رنگوں میں ایک خوش گوار تازگی ہے جو ان کی جدید تخلیقات کی "آرائشی" خصوصیت سے

پوری پوری مناسبت رکھتی ہے۔ گل بوٹوں کا سا ماحول اور خالص رنگوں کا استعمال مجموعی تاثر کی بنا پر انہیں یورپی مصور ماتیس MATISSE کے بہت قریب لے آتا ہے۔ اسی طرح ایک اور تجریدی مصور شاکر علی کی تخلیق "سوسن کی کلیاں" اور "پر سکون زندگی" بھی کچھ کم دلچسپ نہیں۔ اس تصویر میں سوسن کی کلیاں تجریدی پیشکش کے باوجود اپنے فطری خد و خال کے ساتھ نظر آتی ہیں اور ان میں اتنے پر اثر انداز میں رنگ آمیزی کی گئی ہے کہ ان خوبصورت پھولوں کو توڑنے کے لئے آپ کا بے اختیار دل چاہنے لگے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک مشہور کہانی میں ایک بلبل نے گلاب کے پھول کی ایک تصویر کو اصل سمجھ کر اس پر اپنی چونچ مار دی تھی۔

نمائش دیکھ کر ایک خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض اساتذہ فن نے اس نمائش کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی۔ مثلاً چغتائی، فیضی رحمین اور عسکری سرے سے اس میں شریک ہی نہیں ہوئے۔ اللہ بخش البتہ مستثنیات میں سے ہیں انہوں نے نہ صرف یہ کہ تصویریں نمائش کے لئے پیش کیں بلکہ انہوں نے نوجوان مصوروں کی ہمت افزائی بھی کی اور تین انعامات میں سے ایک انعام کھلے مقابلہ میں بھی حاصل کیا۔ وہ بنفس نفیس کراچی تشریف لائے اور نمائش میں ان کی موجودگی نوجوان فن کاروں کی توجہ کا مرکز بنی رہی۔

نوجوان مصوروں نے قدرتی طور پر بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا اور ان میں سے بعض کی نئی تصاویر حقیقتاً ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ چند نئے نام بھی ہیں جو پہلی دفعہ قومی نمائش میں شریک کئے گئے ہیں۔ مثلاً کراچی کے ایک سولہ سالہ فنکار عشرت علی خاں اور ڈھاکہ کے ننہا گوپال کُندو۔ جو کافی تندہی سے کام کر رہے ہیں اور ان سے بڑی امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ دوسری طرف چند خاص مقبول مصوروں مثلاً اے، ایس، ناگی۔ اے۔ بی۔ نذیر اور بیلی شاہزادہ نے نمائش کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی تخلیقات کا بڑی جلدی میں انتخاب کیا ہے۔ خصوصاً ناگی نے اپنی ایک نسبتاً مقبول لیکن فنی اعتبار سے کافی کمزور تصویر "کپاس چننے والیاں" نمائش میں شامل کر کے اپنے ساتھ بڑی ناانصافی کی ہے۔ ناگی میں اس سے کہیں زیادہ نفیس کام کرنے کی صلاحیت ہے۔ اگر وہ اپنے انتخاب میں قدرے احتیاط سے کام لیتے تو وہ ناظرین پر اس سے کہیں زیادہ خوشگوار تاثر پیدا کر سکتے تھے۔

لاہور کی مصورات میں عباسی اختر، مریم شاہ (حال مریم حبیب) اور ذکیہ ملک کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ رضیہ فیروز کے اسٹائل اور پیرایۂ عمل میں ایک دلکش تبدیلی کا احساس ہوتا ہے اور ان کی حالیہ تصاویر تمام تر انگلستان کے مناظر پر مشتمل ہیں، جہاں حال ہی میں انہوں نے کچھ وقت گذارا ہے۔ لیکن ان کنوسوں کو دیکھ کر ان کی آئندہ تخلیقات کے بارے میں خوش آیند توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ کراچی کی ایک ہونہار خاتون طلعت قیوم نے بھی شبیہ نگاری میں ذہانت اور صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔

دو نوجوان مصوروں یعنی محمد کبریا اور اجمل حسین کی تخلیقات دوسروں سے بالکل الگ نظر آتی ہیں۔ حالانکہ دونوں کا تعلق مشرقی پاکستان سے ہے لیکن ایک ڈھاکہ میں کام کرتا ہے اور دوسرا کراچی میں۔ کبریا نے گذشتہ قومی نمائش کی طرح اس سال بھی پہلا انعام حاصل کیا ہے لیکن فنی اعتبار سے ان کا کام اس حد تک مختلف ہے کہ پہلی دفعہ دیکھنے والے کے لئے اس بات کا یقین کرنا مشکل ہے کہ تصویر "تین روحیں" کا خالق خالص مہندسی نقاش۔ وہی آرٹسٹ ہے جس نے گذشتہ نمائش میں ایک "مالن" کا لطیف جذباتی مطالعہ پیش کیا تھا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سال اس کی پیشکش کسی حد تک ماخوذ ہے اور اس کی بناوٹ میں جہاں تہاں یورپین تصاویر کا عکس جھلکتا ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے یہاں اظہار کے بنیادی خلوص کا فقدان ہے۔ اس کے برخلاف یہ خصوصیت اس کی ان تصاویر میں بدرجہ اتم موجود ہے —— "مالن" کے زمانہ کی سادگی و معصومیت اس کے تازہ شاہکاروں یعنی "شفق" اور "چھتیں" میں بڑی حد تک صوفیانہ انداز میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ تمام خطرات جو صوفیانہ طرزِ اظہار کے غلو میں مضمر ہیں کبریا کی بعض تخلیقات میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر اس کی تصاویر "دریا کا گیت" اور "ہریادل میں مچھلیاں" کو ہی لے لیجئے جو بالکل رمزی ہو کر رہ گئی ہیں۔

اجمل حسین کے جو فن پارے نمائش میں پیش کئے گئے ہیں وہ یقینی طور پر اس دور یا مخصوص زمانہ سے تعلق رکھتے ہیں جس پر اجمل حسین کے دورۂ جاپان کے اثرات کی گہری چھاپ ہے۔ نمائش میں بہت کم ایسی روغنی تصاویر ہیں جو اس قدر معتدل، منظم اور دلنشیں خصوصیات کی حامل ہوں جیسی کہ اجمل حسین کے سادہ مگر بھرپور مطالعوں "خزاں کے رنگ" اور "ایک شبیہ" میں پائی جاتی ہیں۔ "ترتیب اور بانس" اور

"بیٹھی ہوئی خاتون" خطوط اور رنگوں کی ترتیب کے دو جاندار تجربے ہیں۔

اور بہت سے شاہکاروں کے ساتھ ساتھ ہم امین الاسلام کی تصاویر "عورت اور کبوتر" اور "ساکن کشتیاں" اور قاضی عبدالباسط کے خوشگوار مطالعہ "ماں اور بچہ" سے دوچار ہوتے ہیں جسے ایک خاص انعام دیا گیا ہے۔ کبریا کی طرح یہ دونوں نوجوان مصور بھی ڈھاکہ آرٹ انسٹی ٹیوٹ میں معلم کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے بڑی حد تک متاثر ہیں۔ قمرالحسن اور عبدالرزاق بھی اسی انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ ہیں۔ اول الذکر کو ان کی آبی رنگوں سے بنی ہوئی تصویر "گھر کے راستے میں" اور ثانی الذکر کو ایک ایچنگ "ایستادہ مجسمہ" کے لیے دو خاص انعامات دیئے گئے۔ جواں سال ہونے کے باوجود ان کے کام میں ایک طرح کی پختگی موجود ہے، خاص طور پر کندہ کاری میں عبدالرزاق کی مہارت قابل رشک ہے۔

نمائش دیکھنے والوں کے ایک گروہ میں سردار محمد کی روغنی تصویر "تعزیہ" اور صادقین کی "خودشبیہ" کے متعلق بڑی دلچسپ بحث تھی۔ صادقین کی مذکورہ تصویر بھی روغنی ہے لیکن اس نے بلیڈ سے کھرچ کر اپنی تصویر کی بناوٹ میں ایک دلچسپ خصوصیت پیدا کر دی ہے۔ مگر سردار کی تصویر میں رنگوں سے پیوندکاری کا طریقہ بھی دلچسپ ہے۔ صادقین نے اپنی تصویر "آئندہ نسلیں" میں پٹ سن پر روغنی رنگ استعمال کئے ہیں اور اپنی ایک دوسری یک رنگی تشریحی ڈرائنگ "سیپیا" میں قلم اور روشنائی سے مدد لی ہے۔

نمائش کی سب سے زیادہ جاذب توجہ تصویر (اس میں ذاتی پسند کو زیادہ دخل ہے) زین العابدین کی روشنائی سے بنائی ہوئی ایک کمپوزیشن تصویر ہے جسے انہوں نے "ترتیب" (کمپوزیشن) کا نام دیا ہے۔ زمانہ حال کی مصوری کے ایک بالغ نظر مبصر جنہوں نے ملک کے بہت سے ابھرتے ہوئے نوجوان فن کاروں کی معاونت اور ہمت افزائی کی ہے اس نمائش میں موجود تھے۔ اور اس تصویر کے متعلق انہوں نے گہرے ذاتی تاثر کا اظہار کیا اور اس بات کا اقرار کیا کہ "ملاحوں" کا یہ جاندار مطالعہ دیکھ کر وہ مبہوت ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور ان کی اس رائے سے شاید ہی کوئی اختلاف کر سکے۔ زین العابدین اپنے ہمراہ پانچ تصاویر یادگار کے لائے تھے جو انہوں نے نمائش کے لیے پیش کئے۔ ان میں سے چار آبی رنگ کے اسکیچ ہیں جو انہوں نے اپنے جانے پہچانے انداز میں تخلیق کئے ہیں لیکن یہ رنگوں اور موقلم کی مدد سے تخلیق کئے ہوئے مطالعے اس تمام سلیقے اور قوتِ حیات کے حامل ہیں جو عابدین کی ۴۴-۱۹۴۳ء کے قحط والی تصاویر کی جان ہیں۔ عابدین کے بہت سے مداحوں کا یہ خیال ہے کہ آرٹ انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل کی حیثیت سے انتظامی ذمہ داریوں نے عابدین کی تخلیقی صلاحیتوں پر گہرا اثر ڈالا ہے لیکن اگر وہ ان کی تازہ تخلیقات کو دیکھیں تو انہیں عابدین کے فن میں ایک نئے باب کا آغاز نظر آئے گا۔

یہاں تک تو ہم نے فنکاروں اور ان کی تخلیقات کا فرداً فرداً ذکر کیا ہے۔ جہاں تک نمائش اور تصاویر کی ترتیب کا تعلق ہے ایک خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر کچھ زیادہ وقت صرف کیا جاتا اور تصویروں کی ترتیب میں زیادہ توجہ سے کام لیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ مثال کے طور پر جس ہال میں نمائش منعقد ہوئی وہ آرٹ کی نمائشوں کے لئے کوئی موزوں جگہ نہیں ہے۔ یہ اصل میں ایک لیکچر ہال ہے جس کا فرش سلامی دار (ڈھلوان) اور نشستیں نیچی ہیں۔ اور اس میں ایک پلیٹ فارم بھی ہے جو دراصل اسٹیج کے کام آتا ہے۔ باہمہ نمائش کے منتظمین لائق ستائش ہیں۔ انہوں نے سلیقہ مندی سے روشنیاں آویزاں کر کے اور بڑے انوکھے انداز میں جگہ جگہ تصاویر کے لیے بورڈ رکھ کر اس ہال کو اپنے مقصد کے مطابق بنا لیا تھا۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ کراچی میں اتنی بڑی نمائشیں ترتیب دینے کے لئے کوئی اور مناسب جگہ موجود نہیں ہے۔

علاوہ ازیں تصویروں کو اسلوب یا موضوع کے لحاظ سے ترتیب دینے کی کوئی بھی کوشش نہیں کی گئی۔ منظرکشی کے نمونے اور آبی رنگ کی تصاویر کے دوش بدوش روغنی اور رنگین پنسلوں سے بنی ہوئی تصاویر نظر آتی ہیں۔ مجرد اور غیر معروضی تصاویر کے بالمقابل دیوار پر قدیم انداز اور تقریباً فوٹوگرافک طرز کی تصاویر حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتی ہیں۔ شاید اس اجتماع ضدین سے بھی اتفاقیہ طور پر تقابلی مطالعہ کا موقع فراہم ہو گیا تھا۔ لیکن نمائش دیکھنے والوں میں سے اکثر یہ چاہتے ہیں کہ وہ ایک نہج کی تصویریں یکجا دیکھ سکیں۔

یہ بات بہرحال عام طور پر تسلیم کی گئی کہ یہ نمائش ملک میں موجودہ آرٹ کے نمائندہ نمونوں کی ایک کثیر تعداد کو ایک ہی نظر میں دیکھنے کا نادر موقع فراہم کرتی ہے۔ اگر ہمارے یہاں کے بہتر نمونوں کو مغربی ممالک کی اس قسم کی نمائشوں میں پیش ہونے والی تصاویر کے ہم پلہ تسلیم نہ بھی کیا جائے تو بھی حالیہ نمائش میں پیش ہونے والی تصاویر کا اوسط معیار دنیا کے کسی حصہ میں بنی ہوئی تصاویر سے کسی طرح کم تر نہیں ہے۔

صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خان اور جناب نیاز محمد خان، صدر پاکستان آرٹس کونسل،
نمائش کے افتتاح کے بعد

قومی مصوری کی نمائش
کراچی

افتتاحی تقریب کے موقع
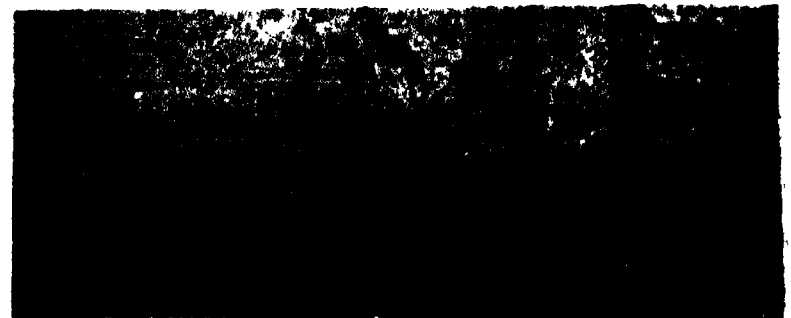
"کہانی میں مصنف اور قاری کا رشتہ" ـــــــ بقیہ صفحہ: (۱۹)

افسانہ نویسی کے ہر دور میں مصنف اور قاری کے اس رشتے کی اہمیت مسلّم رہی ہے اور اثر اندازی اور اثر پذیری کا مشترک عمل مصنف اور قاری کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں ممد و معاون رہا ہے۔ اس لئے ادیب یا کہانی کہنے اور لکھنے والا یہ سوچتا ہے کہ قاری کو کیا چیز خوش کرتی ہے تو اپنی تخلیق سے پہلے وہ قاری کے تعاون کا طالب ہوتا ہے۔ قاری کا یہ تعاون کبھی مصنف کے لئے ایک ہمدردانہ نظر کی صورت اختیار کرتا ہے اور کبھی قاری کو اپنے اوپر وہی ذہنی اور جذباتی کیفیت طاری کرنی پڑتی ہے جس میں ڈوب کر مصنف نے اپنی تخلیق کی ہے ـــ کبھی وہ اسی مشترک جذبے کے تحت رومانیت کا پرستار بنتا ہے اور کبھی مثالیت کا دلدادہ اور کبھی اس حقیقت کا جویا جو اسے زندگی میں نہیں، صرف کہانی میں ملتی ہے۔ لیکن مصنف اور قاری کے اس مشترک عمل، مشترک جذبے اور مشترک احساس کو ہم آہنگ ہونے کا ایسا موقع شاید کبھی نہیں ملا، جتنا موجودہ زمانے کے مشترک خارجی اور داخلی تجربات کے اشتراک اور ہم آہنگی کی بدولت ملا ہے۔

٭

"ہماری تہذیبی جدوجہد" ـــــــ بقیہ صفحہ: (۴۸)

کہ اس کے بغیر زندگی ایک بلا ہے خوبصورت ہو کہ بدصورت، اسی طرح ادب کی بنیادی قدر تخلیقِ انسانیت ہے کہ جمالِ آدم اسی سے اکتسابِ نور کرتا ہے اسی کو خیر و حسن کا اتحاد بھی کہتے ہیں: ؎

خدا ساز تھا آذر بت تراش
ہم اپنے تئیں آدمی تو بنائیں

ہمارا اپنا یہی نقطۂ نظر، اپنے کو آدمی بنانے کا کہ ادب ایک آئینۂ شخصیت بھی ہے، اور جمالِ انسانیت کے نکھارنے کا کہ آذر کی نسبت سے اس شعر میں وہ رشتہ بھی موجود ہے، ہماری اس صحتِ فکر کا ضامن رہا ہے کہ ہم نے ادب کو ادب کے لئے نہیں بلکہ انسان کے لئے تخلیق کیا، اور اسے وہ ادب سکھلایا، جو تہذیب و شائستگی، احترامِ آدمیت، آزادیٔ فکر، تکمیلِ شخصیت اور آزادیٔ انسان کے اقدار کا حامل رہا ہے، لیکن چونکہ انسانیت حیوانیت کے تصادم میں اور تہذیب بربریت کے تخالف میں بڑھ رہی ہے اس لئے اس تصادم و تخالف میں جب کبھی جہاں کہیں بھی انسانیت اور تہذیب کی قوتوں نے، حیوانیت اور بربریت پر فتح پائی ہے تو ہم نے اس فتح کے گیت گائے ہیں۔ مشرق و مغرب کو اپنے سلام بھیجے ہیں، اور الجزائر کی قومی آزادی کی جدوجہد کا دن منایا ہے۔ یہی ہمارے جنوں کی وہ حکایتِ خونچکاں ہے جسے ہم اپنے خونِ جگر سے رقم کرتے رہے ہیں:

ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے!

★

سِندنام کی بستیاں

(مصر، عرب، ہند اور چین میں)

ابوالجلال ندوی

ہمارے اس برصغیر کو جسے اب بھارت اور پاکستان کہا جاتا ہے تقسیم سے پہلے تک ہند، ہندوستان اور انڈیا کہا جاتا تھا۔ مدت ہوئی پنڈت لیکھ رام کا ایک مضمون یا اس کا اقتباس پڑھ چکا ہوں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم کو ہند، ہندی، ہندو اور ہندوستان کے نام سے گھن محسوس کرنی چاہیئے۔ فارسی لغت نویسوں کے حوالے سے لفظ ہندو کے نہایت بُرے بُرے معانی گنا کر انھوں نے بتایا تھا کہ یہ نام مسلمانوں نے ہم کو توہین کے طور پر عطا کیا ہے۔ ویدوں سے لے کر ستیارتھ پرکاش تک اسلامی دور سے پیشتر کا سارا ہندوستانی لٹریچر ہند، ہندی، ہندو اور ہندوستان سے خالی ہے۔ تقسیم ملک کے بعد بھارت کے ہندو نیتاؤں نے اپنے حصہ کو بھارت یعنی انڈیا کا نام دیا اور ہند اور ہندوستان کے لفظ کو کتابِ آئین سے خارج کر کے پنڈت لیکھ رام کی آتما کو ایک حد تک سنتوش (تسکین) دے دیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندو اور ہندی کو زبانوں اور خیالات سے کب کنارے کیا جائے گا۔

ہندوستان اسلام سے پیشتر تاریخ کے معلوم عہد میں کبھی بھی ایک واحد ملک نہیں رہا ہے۔ قرآن پاک میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے گاؤ پرست بنو اسرائیل سے تو یہ کہا کہ توبہ کرو اور اپنے آپ کو سزائے ارتداد کے لئے خوشی خوشی تیار کر لو، لیکن بہکانے والے سامری کو فرمایا کہ تیرے لئے یہ ہے کہ لوگوں سے کہا کرے گا کہ لا مساس یعنی مجھے چھونا نہیں۔ معلوم نہیں یہ موسوی سراپ برہمنوں پر کیسے آ چکی، برہمن اور پریا میں اتنی ہم جنسی بھی نہیں جتنی دیسی ٹٹو اور تازی گھوڑے میں خیال کی جاتی ہے۔ ہندوستانی آریوں کا تقدس اتنا نازک ہے کہ کسی پریا کا سایہ پڑا اور ساری پوترتا نشٹ ہو گئی۔ جغرافی، لسانی اور نسلی حیثیت سے ہندوستان ہمیشہ مختلف راشٹروں (قوموں) میں بٹا رہا۔ برہمنوں کے لامساسی مذہب نے کسی ایک بستی کے باشندوں کو بھی گھل مل کر ایک ہونے کی اجازت نہ دی، قبائل کو باہم مدغم ہونے سے روکا اور اس دیس کو کبھی ایک متحد قوم کا دیس ہونے نہیں دیا۔ مسلمانوں کا ایک مذہبی فریضہ یہی تھا کہ بنی آدم کو پھر سے اُمتِ واحدہ بنانے کی کوشش کریں۔ اسلام نیک و بد، مومن و کافر، متقی و گناہ گار کے افتراق کو تو تسلیم کرتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ تفرقہ ہمیشہ برقرار رہے بلکہ اصل مقصود ان تفرقوں کو مٹانا ہے۔ نیک و بد کے علاوہ کسی طبقہ وار تقسیم کو اسلام تسلیم نہیں کرتا۔ جغرافی، نسلی، لسانی، معاشرتی کسی قسم کے تفرقہ کا اسلام روادار نہیں ہے۔ مسلمانوں نے کوشش کی کہ تا امکان ہمالیہ سے راس کماری تک سمندر اور سمندر کے درمیان کو ایک دیس اور یہاں کے دیسیوں کو ایک متحد سماج بنا دیں۔ اس جد و جہد کے سلسلہ میں ادبی و لسانی فریضہ انجام دیتے ہوئے سارے ملک کو ایک نام ہند عطا کیا۔ اس لئے نہیں کہ عربی تصور میں یہ نام کوئی بُرا مفہوم رکھتا تھا بلکہ اس لئے کہ ان کی زبان میں اس دیس کا یہی نام تھا۔

ایسا ہمیشہ ہوا ہے کہ ایک ملک والے اپنے دیس کو کسی نام سے یاد کرتے تھے اور دوسرے دیس والے اُسے کسی اور نام سے یاد کرتے تھے۔ فارموسا کا ذکر انگریزی اور امریکی خبروں میں اسی نام سے آتا ہے۔ چینی خبروں میں تیوان کے نام سے اس کا ذکر آتا ہے۔ مصر کو وہاں کے باشندے مصر کہتے ہیں۔ یورپ میں اس ملک کا نام ایجپٹ ہے۔ کیانیوں کے دور میں ایران کا نام ایریانہ تھا، مگر اسی دور کے میڈی کتبے میں اس دیس کا ذکر پارسی کے نام سے ملا ہے۔ عرب کو یورپ والے اب تو عرب کہتے ہیں۔ پہلے تو وہ سارا سین کہتے تھے۔ ایرانی لوگ عربوں کو تازی کہتے تھے۔ جناب کے۔ اے نیل کنٹھ شاستری نے اپنی کتاب FOREIGN NOTES ON SOUTH INDIA میں چینی مصنف CHAU JU KUA کا قول نقل کیا ہے کہ اس دیس میں جب تاشی

ے۔ بددعا   لے۔ سند

(عرب) لوگ آتے تھے تو لوگ ان کو گھروں سے باہر بٹھاتے تھے۔ اور جداگانہ مکانوں میں ٹھہراتے تھے۔" جس قوم کو ایران والے تازی کہتے تھے چینی نام، اس کا تاشی TA SHI تھا۔ اسی مصنف چاؤ جو کوا کا یہ بیان بھی ہے کہ "TIENTCHU کا ملک TATSIN (عرب) کے ماتحت ہے۔ اس کے تمام حکام کو TATSIN (طاسین) مقرر کرتے ہیں"۔ اس سے معلوم ہوا کہ چین والے ملکِ عرب کو طاسین اور یہاں کے باشندوں کو تاشی کہتے تھے۔ عرب والوں کو اپنے ان بدیسی ناموں مور، تازی، تاشی اور طاسین کی خبر تھی یا نہیں۔ اس کا ہم کو ابھی تک کوئی علم نہیں ہے۔ عدم علم کو علم عدم باور کرنے کی یورپی ریت کو ہم اپنائیں تو دلیری سے کہہ سکتے ہیں کہ عرب اپنے ان ناموں سے قطعاً واقف نہیں تھے۔ ہندوستان کے قدما اپنے عربی اور ایرانی نام ہندو اور ہند سے اگر ناواقف تھے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ نام اس دیس کو بغرض توہین دیا گیا تھا۔ فارسی لغت نویسوں کا حوالہ بے جا ہے۔ ہندوستان میں کرستان کا لفظ ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں پر جس مطلب کا حامل ہو گیا ہے یا ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں اور یوروشینوں نے "نیٹو" کو جس بُرے مطلب میں استعمال کیا ہے۔ اس کی دلیل سے کوئی بھی لفظ "نیٹو" اور کرستان کو اصلاً بُرا لفظ نہیں قرار دے سکتا۔ "صلوات" جیسے مقدس لفظ کو صلواتیں سنانے والوں نے جو بُرا مطلب دے دیا ہے اس کی دلیل سے اگر کوئی یہ کہے کہ ہم کو لفظ صلواۃ سے گھن کرنی چاہیئے تو اُسے ہم پنڈت لیکھرام شرما کا ہم دماغ تو مانیں گے۔ مگر اس لفظ کو ہرگز ناپسند نہ کریں گے۔

جس دیس کو عربوں اور ایرانیوں نے ہند یا ہندوستان کا نام دیا اس کا چینی نام TIEN TCHAU تین چاؤ اور CHENTOU چن تاؤ تھا۔ کے۔ اے نیل کنٹھا شاستری نے ایک چینی مؤلف PON YONG پون یونگ (۱۲۵ء) کا ایک بیان نقل کیا ہے جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

"تین چاؤ کے ملک کو چن تاؤ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ملک HIONG NOU ہیانگ ناؤ کے جنوب مشرق میں کئی ہزار "لی" کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس کی رسمیں ہیانگ ناؤ کی رسموں جیسی ہیں۔ لیکن یہ دیس پست، مرطوب اور گرم ہے۔ یہ ریاست ایک بڑے دریا کے کنارے واقع ہے۔ یہ لوگ لڑائی کو نکلتے ہیں تو ہاتھیوں پر سوار ہو کر نکلتے ہیں۔ یہ لوگ یوچے YUE TCHE کی بہ نسبت کمزور ہیں۔ مہاتما بُدھ کے دھرم کو مانتے ہیں۔ کسی جان کو نہ مارنا اور کسی سے جنگ نہ کرنا ان کا جزو ایمان ہے۔

KAO FOU کو فو (کابل) سے جو کہ YUE TCHE کا دیس ہے۔ ایک شخص جنوب مشرق کو روانہ ہوگا تو مغربی سمندر کے ساحل پر پہونچ جائے گا اور مشرق کو پان کی PAN-KI کے ملک میں پہونچے گا۔ یہ ساری سرزمین CHEN TOU کے ملک میں داخل ہے۔ چن تاؤ میں (پایۂ تخت کے علاوہ) اور کئی ہزار شہر ہیں۔ ہر شہر میں انھوں نے ایک گورنر مقرر کر رکھا ہے۔ (مخصوص علاقہ کے علاوہ) یہاں اور بھی کئی ریاستیں تھیں۔ ہر ریاست میں ایک بادشاہ ہے۔ اگرچہ ان ریاستوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے فرق پائے جاتے ہیں مگر ان سب کو CHEN TOU کہا جاتا ہے۔ آج کل (بظاہر ۱۲۵ء) یہ ریاستیں YUE TCHE کے ماتحت ہیں YUE TCHE نے یہاں کے راجا کو قتل کر کے ایک سردار کو ان لوگوں کا گورنر مقرر کر رکھا ہے۔

اس ملک میں ہاتھی، گینڈا، کچھوا، گھونگھا، سونا، چاندی، تانبا، لوہا، سیسہ، اور ٹین پیدا ہوتا ہے۔ مغربی ساحل سے یہ لوگ TA-TSIN (رومی صوبہ سیریا کا) کے ساتھ تجارتی رابطہ رکھتے ہیں اور یہاں TA-TSIN کی اشیاء ملتی ہیں۔ یہاں عمدہ قسم کے بانتے اچھی قسم کے اونی قالین۔ ہر طرح کی خوشبوئیں، شکر، کھانڈ، مرچ، ادرک اور کالا نمک پایا جاتا ہے۔

شہنشاہ HO کے زمانے (۸۹ء تا ۱۰۵ء) میں ان لوگوں نے باج اور ہدیوں کے ساتھ کئی مواقع پر سفارتیں بھیجیں۔ بعد میں مغربی ممالک نے چونکہ بغاوت کر دی تھی اس لئے یہ روابط منقطع ہو گئے۔ پھر شہنشاہ HOUAN کی حکومت کے دوسرے (۱۵۹ء) اور چوتھے (۱۶۱ء) سال وہ دوبارہ دو مواقع پر JE-NAN کے پاس آئے۔"

(FOREIGN NOTES ON SOUTH INDIA PP. 10-11)

شاستری جی نے قوسین میں TA-TSIN کو رومی صوبہ شام قرار دیا ہے۔ لیکن غور سے اس بیان کو پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ اس سے مراد عربستان ہے۔ شام ہی مراد ہو تب بھی ہندوستان کے مغربی ساحل سے شام تک کوئی جہاز عدن، مندب اور بحر احمر کے دیگر بندروں سے گزرے بغیر نہیں جا سکتا تھا۔

TIEN TCHOU اور CHEN TOU بول کر اہلِ چین پورے ہند کو مراد لیتے تھے۔ لیکن غور سے پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ CHEN TOA

نام تھا۔ اس دیس کا جو کابل سے ملا ہوا تھا۔ کابل سے مغربی سمت کو جانے والا سند کے علاقہ سے گذرتا تھا۔ چن تاؤ کو ہم سن تا، کا لفظ دے کر خیال کریں تو بے جا نہ ہوگا +

ہند کی بابت عام خیال ہے کہ اصلی صورت اس کی سندھو تھی۔ ویدک آریوں کے وطن کا ویدک نام سپت سندھو تھا، جس کا ترجمہ ہفت آب کیا جا سکتا ہے۔ اس ہفت آب کے پانچ دریا اس دیس میں ہیں جو تقسیم سے پہلے ہند کہلاتا تھا۔ ایک دریا کبھہ یا چینیوں کا کاؤفاؤ اور ہمارا کابل بدیسی ہوگیا، ایک دریا سرستی ہے آب ہو کر معدوم ہوگیا۔ اس لئے ہفت آب گھٹ کر پنجاب ہوگیا۔ تقسیم ملک کے بعد دو دریا بھارت کو ملے اور تین دریا پاکستان کو ملے۔ اس لئے اب پنجاب کا نام ہی نام رہ گیا۔ سندھو کا مفہوم سنسکرت کے مطابق دریا یا پانی ہے مگر سنسکرت کے علاوہ کسی دوسری آریائی زبان میں ایسا کوئی لفظ اس معنی میں نہیں ہے مسلمانوں کے ابتدائی زمانے میں اس دریا کو جسے اب انڈس یا دریائے سندھ کہا جاتا ہے۔ مہران رود کہا جاتا تھا۔ ایک دوسرے دریا کو ملتان کے قریب پانچوں دریاؤں کے مشترک سنگم سے ہم آغوش ہوتا ہے۔ سند رود کہا جاتا تھا۔ اس نام کا عربی ترجمہ وادی سند (سند کو سیراب کرنے والا) مختصر ہو کر وادی بنا۔ سندھو بمعنے دریا اسی سند رود جیسے کسی قدیم لفظ کا مختصر ہے۔ چن تاؤ کی طرح سند ایک ملک یا ایک قوم کا نام تھا۔ ویدک آریا جب ایران اور افغانستان سے ہوتے ہوئے دور دراز ممالک سے یہاں وارد ہند ہوئے تو انھوں نے کسی دریا کا نام سند رود جیسا سنا اور اس دریا کو پھر ہر دریا کو سندھو کہنے لگے +

سنسکرت کا س جس طرح فارسی ماہ میں ہ بن گئی۔ سی طرح ایرانی لب و لہجہ میں سندھو کا نام متغیر ہو کر ہندو بن گیا۔ جسے عرب ہند کہتے تھے۔ عبرانی کتاب سفر آستر میں یہی نام ھدو بن کر آیا ہے۔ THE ARYAN RULE IN INDIA کے مؤلف E. B. HAVELL نے بیان کیا ہے کہ ویدک آریا پنجاب میں بستے تھے۔ عہد ابطال میں ان لوگوں نے جمنا اور گنگا کو اپنایا اور اس دیس کو آریہ ورت اور اندو کا نام دیا۔ میرے نزدیک سندھو ہندو اور اندو ایک ہی نام کے مختلف العصر اور مختلف الامکنہ تلفظ ہیں۔ ہاول نے بتایا ہے کہ اندو کے معنی چاند کے ہیں۔ چونکہ یہ جدید آریہ ورت شیو جی کی دھنش (کمان) اور ہلال جیسا تھا۔ اس لئے اسے یہ نام دیا گیا۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس دیس کا یہ نام اس لئے پڑا ہو کہ یہاں کے قدما خود کو چندر بنسی (خاندان قمر سے) سمجھتے تھے۔ یا یہ چاند کے پجاریوں کا دیس تھا۔ اندو کا اصلی مطلب چاند ہے۔ تو سندھو کا بھی قدیم مطلب تقریباً یہی ہونا چاہیئے +

اندو نام کی سرزمین تو سرت اس دیس میں پائی گئی۔ جو اب بھارت ہے۔ لیکن سند اور ہندو کے نام وادی مہران اور گنگ و جمن کی سرزمین کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھی مل سکتے ہیں بشرطیکہ ہم پاستان بیں نگاہوں سے کام لینا برا نہ سمجھیں۔ ہند نام کے علاقوں سے ہم اس وقت بحث نہیں ہے۔ ذیل میں ہم قاموس اور یاقوت کی معجم البلدان سے چند اسمائے اماکن نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ سند نام کے لوگ کہاں کہاں بستے تھے:۔

۱۔ سند — اندلس کے اعمال طلیطلہ میں ایک ناحیہ (یاقوت)

۲۔ سند — اندلس کے اقلیم قریش کا ایک شہر (یاقوت)

۳۔ سند — مغرب کی ایک وادی (قاموس)

۴۔ سند — خراساں کے شہر نسا کے نواح میں ابیورد کے قریب ایک بستی (یاقوت)

۵۔ سندبلس — مصر میں ایک جگہ (یاقوت)

۶۔ سندفا — مصر میں ایک شہر (یاقوت)

۷۔ سندیون — مصر میں ایک شہر (قاموس)

۸۔ سندیہ — عراق میں بغداد و انبار کے درمیان ایک بستی (یاقوت)

۹۔ سندیہ — بیابان عرب میں المغیثہ کے پاس ایک پانی (یاقوت)

۱۰۔ سندان — ابو دواد الایادی کے شعر میں ایک وادی (یاقوت)

۱۱۔ سنداد — حیرہ اور الابلہ کے درمیان ایک نہر (یاقوت)

۱۲۔ سندبایا — آذربیجان میں ایک جگہ (یاقوت)

۱۴۔ سندابل   چین کا ایک شہر (یاقوت)

کتابوں کو اگر کھنگالا جائے تو شائد اس فہرست میں اور بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ سندھ کو عربوں کے فتح کرنے کی وجہ ایک سندھی قوم زُرکت نے پیدا کی۔ ایلیٹ نے "تاریخ ہند بقلم مؤرخین ہند" کے ایک ضمیمہ میں کئی کتابوں کے حوالے سے ایسے قبائل اور اماکن کے نام گنائے ہیں جن کی آبادیاں EUXINE کے سواحل پر تھیں اور ان ناموں میں لازمی طور پر کرکت یا سند کا نام شریک ہے۔ پھر لکھا ہے کہ ایک قدیم مصنف HESYCHIUS نے جو عربوں کے سندھ پر حملہ (۷۱۲ء) سے دو سو برس پہلے (چھٹی صدی کے اوائل میں) گذرا صراحت کے ساتھ ان سندھیوں کو ہندوستانی لوگ، بتایا ہے +

سندیوں | اندلس، مغرب اور خراساں کے سندیوں کی قدامت کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ لیکن بہرحال ایک زمانے میں سند کہلانے والوں کے چند قبائل ان بستیوں میں بستے تھے۔ اسی طرح سندبس، سندفا اور سندیوں کے ناموں کی قدامت پر بھی کو کوئی روشنی نہیں ڈال سکتے۔ لیکن ایک دلچسپ بات قابل ذکر ہے قیصر کے دوسرے خانوادے کے چھٹے بادشاہ " Sesostris " کے نام کو سندی با سنتی پڑھا گیا ہے۔ اس بادشاہ کا ہمارے سندھ سے کیا رابطہ ہو سکتا ہے؟ اس رابطہ پر ہم بعد میں غور کریں گے۔ سند اور سندی میں لغوی رابطہ تو ہے خواہ وہ ہی رابطہ ہو اس موقع پر اتنا کہنا کافی ہے کہ ہیروڈوٹس کا قول ہے۔ زمانہ کی طوالت کے دوران میں کوئی بات بھی ممکن ہو سکتی ہے۔ مصر کے سندیوں کا مصر کے سندی سے تو ضرور کوئی رشتہ ہوگا۔ مگر ہمارے سند کا مصر سے کیا رشتہ! یہی تو ہم کو اور آپ کو سوچنا ہے +

سنداد وسنداں | سندیہ نام کی دو جگہیں جو عربی بولنے والے علاقے میں تھیں ان کی بابت ہم نہیں جانتے کہ وہ کب آباد ہوئیں۔ لیکن سنداں کا ذکر چونکہ ابو دواد الایادی کے شعر میں آیا ہے جو حضرت رسولِ خدا کے زمانے سے پہلے گذرا اس لئے سنداں کا زمانہ ایام جاہلیت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ یاقوت نے کئی جگہوں پر لکھا ہے کہ عراقی عرب شخصی اسما کے آخر میں آن بڑھا کر ان کو مقامات کا نام بنا لیتے تھے۔ سنداں کا مطلب اس قاعدے کے مطابق سندیوں کی بستی ہے۔ سنداں میں جو کہ عراق سے ملے ہوئے عربی بیابان میں واقع تھا، اس جگہ کے بیاباں ہونے سے پہلے سند کہلانے والی ایک قوم کی بستی تھی، سند نام کی کوئی قوم ابو دواد الایادی کے زمانے میں نہ تھی۔ سنداد ایک نہر کا نام تھا، جو کہ حیرہ اور الآبلہ کے درمیان بہتی تھی، اس نہر کے سواحل پر بنو ایاد آباد تھے، خسرو پرویز کے زمانے میں جب بادشاہ حیرہ نعمان ابن منذر ابن مصور کو دھوکہ سے گرفتار کر کے قتل کر دیا اور حیرہ کی حکومت پر ایرانیوں نے براہ راست قبضہ کر لیا تو بنو لخم اور بنو ایاد کے غیرت مندوں نے اس علاقے سے ہجرت کر دی اور انقرہ میں جا بسے ایک شاعر الاسود ابن یعفر نے اس پر ایک نظم کہی جس کے چند اشعار پڑھئے:-

ومن الحوادث لا ابالک انني	تیرا باپ مرے، ایک آفت یہ ہے کہ ساری زمین
ضربت على الارض بالاسداد	اپنے باندھوں سمیت مجھ پر دے ماری گئی۔
لا اهتدي فيها لموضع تلعة	اس کے اندر عراق اور مراد کی سرزمین میں
بين العراق وبين ارض مراد	مجھے پانی کا ایک چشمہ نہیں دکھائی دیتا
ماذا اؤمل بعد آل محرق	شاہانِ حیرہ اور بنو ایاد نے اپنی بستیاں،
تركوا منازلهم وبعد اياد	چھوڑ دیں اب میں آرزو کروں تو کاہے کی
جرت الرياح على محل ديارهم	ان کی بستیوں میں اب دھول اڑتی ہے
فكانما كانوا على ميعاد	معلوم ہوتا ہے کہ ان کو پہلے سے خبر تھی۔
ولقد غنوا فيها بانعم عيشة	یہاں وہ بہترین راحت کے ساتھ مدتوں تک ایک
في ظل ملك ثابت الاوتاد	مستحکم حکومت کے سایہ تلے بسر کرتے رہے
فاذا النعيم وكل ما يلهى به	پھر کیا ہو؟ ہر نعمت اور دلچسپی کی ہر چیز
يوما يصير الى بلى ونفاد	کو ایک نہ ایک دن بوسیدہ ہونا اور چک جانا ہے

اهل الخورنق والسدیر وبارق	خورنق، سدیر، بارق اور سنداد
والقصر ذی الشرفات من سنداد	کے قصر ذوالشرفات کے باشندے
حلوا بانقرة یسیل علیهم	انقرہ میں جا بسے ان کے پاس ٹیکریوں
ماء الفرات یجیء من اطواد	سے بہ کر شیریں دریا کا پانی آتا ہے۔
ارض تخیرها لطیب عیشها	یہ ہے وہ زمین جس کی آرام دہ زندگی کی بنا
کعب بن مامة وابن ام دواد	پر اُسے کعب بن مامہ اور ابو دواد الایادی
	نے پسند کیا ہے۔

سنداد تھا تو ان دنوں ایک نہر کا نام جس کے ساحل پر ایک قصر ذوالشرفات (اونچی منڈیروں والا) کھڑا تھا۔ معلوم نہیں وہ بالکل نابود ہوگیا یا ابھی تک اس کے آثار باقی ہیں لیکن حقیقت میں وہ اس قصر کے بانی اور اس نہر کے پہلے مالک یا کھدوانے والے کا نام تھا۔ چنانچہ یاقوت نے "معجم البلدان" میں لکھا ہے کہ:-

قال حمزة فی تاریخه وکان	حمزہ نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے کہ پرانے
قد تملک فی العدة من الفرس	زمانے میں فارس کے بارہ مرزبانوں نے
علی مواضع متفرقة من ارض	ارض عرب کے متفرق مواضع میں
العرب ستة عشر مرزبانا منهم[1]	حکومت قائم کرلی تھی۔ ان میں سے
سخت ملک هذا ارض کندة	ایک سخت تھا اس نے ارض کندہ
وحضرموت وما قاربها دهرا	اور حضرموت اور اس کے آس پاس پر
لا ادری فی ای زمان واخر	حکومت جمائی تھی مگر مجھے نہیں معلوم کہ
ذلک کان ثم ملک بعده سنداد	یہ کب کا اور کس بادشاہ کے زمانے کا
هذا عمل سخت وطال ملکه	واقعہ ہے۔ پھر سخت کی عملداری کا
فی الریف حتی بنی فیه الابنیة	مالک سنداد ہوا جس نے ریف میں
وهو صاحب القصر ذو الشرفات	مدتوں قیام کیا اور عمارتیں تعمیر کیں۔
الذی یقول فیه الاسود بن	اور وہی اس قصر ذوالشرفات والا ہے،
یعفر والقصر ذی الشرفات من سنداد	جس کا ذکر الاسود بن یعفر نے کیا ہے۔

حمزہ اصفہانی کو سخت اور سنداد کا زمانہ نہیں معلوم لیکن یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ان دونوں کا زمانہ اس علاقہ پر بنو لخم کی حکومت قائم ہونے اور اس میں بنو ایاد کے آبسنے سے مدتوں قبل گذرا۔ بنو ایاد کے یہاں آبسے اور بنو لخم کی حکومت کے آغاز ۲۵۰ء سے بہت پہلے سنداد گذرا ہوگا۔ ٹھیک زمانہ دونوں کا کندہ، حضرموت اور حیرہ تا ایلہ کے آثار قدیمہ کے اکتشاف کے بعد ہی متعین کیا جا سکتا ہے۔ سخت و سنداد کو حمزہ نے فارس کے "مرزبان" خیال کیا ہے اسلام سے پیشتر کا ملک فارس بہت وسیع تھا۔ اس میں افغانستان و بلوچستان کے علاوہ کچھ حصہ پنجاب اور سندھ کا بھی شامل تھا۔ سنداد کا نام دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ ایک تو سند ہے دوسرے لفظ کا مطلب سمجھیے:-

آدَ الشیءُ (ض) ییدا وآدا ایدَ اور آدَ، صدر، کے معنی ہیں

---

[1] اصل میں وھم چھپا ہے۔

المشتد وصلب وتقوی.... الآم	کڑا ہونا۔ سخت ہونا۔ قوی ہونا۔
والاسید الفتح (اقرب الموارد)	قوت آور قوی ہوا غالب ہوا۔

سند آد کے معنی ہیں سندھ کو غلبہ اور تسلط حاصل ہوا۔ سنداد ایک سندھی نژاد عرب کا نام تھا۔ سنداد اگرچہ سندھی تھا۔ مگر غالباً اس کی زبان وہ تھی جسے عراقی عرب بولتے تھے +

سندابل | سنہ ۲۶۱ھ سے ۲۷۹ھ (۸۷۴ء سے ۸۹۲ء) تک عباسیوں کی طرف سے خراسان میں نصر بن احمد سامانی حکومت کرتا تھا۔ اس زمانے میں چین میں ایک بادشاہ تھا جس کے پایہ تخت کا نام سندابل بتایا گیا ہے۔ بادشاہ کے نام کا چینی تلفظ معلوم نہیں عربی نام اس کا قالین ابن الشخیر تھا۔ اس نے نصر بن احمد کے پاس ایک پیغام بھیجا کہ ایک چینی شہزادی کا نکاح ایک خراسانی شہزادے سے اور ایک خراسانی شہزادی کا نکاح ایک چینی شہزادے سے کر دیا جائے۔ اس پیغام کا جواب لے کر خراسان سے ایک وفد سندابل کو گیا۔ اس وفد میں ابو دلف مسعر بن مہلہل بھی تھے۔ ان کے پورے سفرنامے کو ایک قدیم مخطوطہ سے اختصار کے ساتھ الصین کے ذکر میں یاقوت نے نقل کیا ہے۔ اس نام کے پہلے جزو سندا کا چینی تلفظ غالباً CHEN TOU ہوگا۔ دوسرے لفظ بل کو سمجھنا چاہیئے۔

مسعر بن مہلہل تبت ہوتے ہوئے سندابل پہونچا تھا۔ سندابل پہونچنے سے چند یوم پیشتر ایک مقام قلیب سے گزرا تھا۔ اس جگہ اسے ایک بت پرست قوم ملی "جو پرانی عربی بولتی تھی، کوئی اور زبان نہیں جانتی تھی۔ حمیری رسم خط میں لکھتی تھی۔ ہمارے رسم خط سے ناواقف تھی، اس قوم نے اپنی ایک ریاست بھی قائم کر رکھی تھی۔ ان کا فرمانروا انھیں کے ایک مخصوص بلند خاندان میں سے ہوتا تھا کسی دوسرے خاندان میں ان کی حکومت منتقل نہیں ہوتی تھی۔ ان کا فرماں روا چین کے فرمانروا سے تحفوں اور ہدیوں کا تبادلہ کرتا تھا۔ مسعر بن مہلہل کا خیال ہے کہ یہ لوگ اس تبع کی فوج کی یادگار ہیں جس نے ایک زمانے میں چین کو فتح کیا تھا ایک شاعر قس ابن ساعدہ الایادی مشہور عیسائی واعظ (جو حضرت رسول خدا صلعم کی ابتدائے جوانی تک زندہ تھا) کی طرف ایک نظم منسوب ہے۔ مجھے اس نظم کی بابت شبہ ہے کہ کسی اور نے اُسے اس کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ بہر خیر اس نے یا اس کی زبان سے کسی اور شاعر نے ہم کو نصیحت کی ہے، وہ ذرا پڑھیئے:-

لاتامنن مکر الزمان فانہ	زمانہ کی دغا سے ہوشیار رہا کرو۔
اذری الزمان بشمر الصباح،	زمانے نے شمر صباح تک کو ہلاک کر دیا۔
من بعد ملک السین امیح مالکا	حکومت چین حاصل کرنے کے بعد،
اکرم بہ من مالک محتاج	وہ مر گیا، یہ مرنے والا کتنا شریف تھا،

ایسے اشعار کی بدولت عرب میں مشہور تھا کہ ایک تبع نے چین تک کو فتح کیا تھا۔ ابن خلدون کو اس پر اعتراض ہے۔ وہ یہ کہ ایران سے گذرے بغیر چین تک کسی فوج کی رسائی ممکن نہیں، ایران میں مستحکم حکومتیں تھیں جن کو پامال کرنا تبابعہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ۵۱۲ق۔م سے ۳۲۵ ق۔م تک۔ پھر ۲۱۲ء سے ۶۳۶ء تک کی مدت کے علاوہ ایران کی باقی تاریخ افسانہ ہی ہے۔ پھر یہ ضروری نہیں کہ یہ قوم فاتحانہ ہی چین میں گئی ہو۔ جنوبی عرب کے باشندے معین، سبا، حضر موت، قتبان وغیرہ نامعلوم زمانے سے تجارت پیشہ تھے اور دور دراز ممالک میں ان کے قافلے جاتے رہتے تھے۔ سبا کے پرزے پرزے اڑ گئے۔ عربی کہانیاں جن کو تفسیر کا درجہ دے دیا گیا ہے۔ ناقابل تعجب صورت حال بتاتی ہیں۔ لیکن قرآن پاک میں سیل عرم کے ذکر کے بعد خدا نے فرمایا:-

"اور ہم نے ان کے درمیان اور ان بستیوں کے درمیان جن میں ہم نے برکتیں رکھی تھیں چند نمایاں بستیاں حائل کر دی تھیں۔ اور انھیں (بستیوں) میں سیر مقدر فرما دی تھی۔ کہ ان میں چند راتیں اور چند دن امن کے ساتھ سیر کر لیا کرو۔ مگر انھوں نے کہا کہ اے ہمارے رب! ہمارے سفروں کو دراز تر فرما دے (اور یہ کہہ کر) انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ اس لئے ہم نے ان کو باتیں ہی باتیں بنا دیا، اور ان کے پرزے پرزے بکھیر دئے۔ بے شک اس قصہ میں ہر صبار لینے والے شکر گزار کے لئے عبرت کی نشانیاں ہیں + (ع ۲۔ سورہ سبا)

تباہی آیا کا ٹھیک اور آخری سبب یہ تھا کہ وہ اپنے ملک کی معاشی خرابی کو سہہ کر اپنے ہی دیس میں جدوجہد کرنے پر دور دراز ممالک میں جا بسنا چاہا تھا ممکن ہے قلیب میں پرانی عربی بولنے والی، حمیری رسم خط لکھنے والی جس قوم سے ابو دلف مسعر بن مہلہل نے ملاقات کی تھی وہ انھیں لوگوں کی نسل سے ہوں جن کا ذکر سورۂ سبا میں آیا ہے یا اس سے بھی پہلے کے ہوں۔ سندبل کو یہ نام ممکن ہے انھیں اہل قلیب نے دیا ہو۔ یمنی ناموں میں سے ایک شرحبیل ہے۔ یہ اس نام کا حجازی تلفظ ہے، قدیم یمنی لفظ شرحبل ہوگا۔ بل کے معنی بابلی زبان میں آقا کے ہیں۔ سندبل کے معنی ہیں: سندھی آقا۔ یہ شہر غالباً کسی سندھی آقا نے آباد کیا ہوگا۔ بہت ممکن ہے کہ یہ سندھی آقا ہی وہ شخص ہو جسے عربی کہانی شمر صباح کا نام دیتی ہے۔

پچھلی سطروں میں آپ نے دیکھا سند ایک ایسی قوم کا نام تھا جو اندلس، مغرب، عرب، ایران، ہند اور چین میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس قوم کو اس نام کی حقیقت پر غور کرنے سے پہلے ایک بار پھر میرے مضمون (مطبوعہ ماہ نو استقلال نمبر ۱۹۵۶ء صہ ۲۷ پر) پروفیسر تجاٹ کی ایک عبارت کا ترجمہ دیکھ لیجئے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ:-

(۱) مصر قبل فراعنہ کے مدفنوں میں
(۲) فلسطین کی وادیٔ نطوف میں
(۳) عراق کے تل العبید،
(۴) سندھ کے موہن جو ڈرو میں،

ایک ہم جنس قوم کی کھوپڑیاں ملی ہیں اور اس جنس کے خالص ترین نمونے عرب کے جزیرہ نما میں پائے جاتے ہیں۔

سند اسی ہم جنس گروہ کا نام تھا۔ ہند اور سند یعنی اس نام کے دیسوں میں بسنے والے قدیم تر لوگوں کی بابت عربوں کا جو تصور تھا، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بھی ایک نظر ڈالی جائے۔

(۱) (طبری باسنادہ عن ابن اسحاق)
منکم کوش بن حام بن نوح قرنبیل
ابنۃ تاویل بن ترس بن یافث،
بن نوح فولدت الحبشۃ والسند والهند
فیما یزعمون۔ ونکح قوط بن
حام بن نوح بنت تاویل بن ترس
بن یافث ولدت له القبط قبط مصر
(ج ۱ صلا) ویقال ان مصرایم ولد
القبط والبربر وان قوطا
سار الی ارض السند والهند
وان اهلها من ولده (ج ۱ صلا)

ابن اسحاق (المتوفی سنہ ۱۵۰ھ) نے
کہا کہ حام بن نوح کے فرزند کوش نے
ترس بن یافث کی پوتی قرنبیل
بنت تاویل سے نکاح کیا جس کی اولاد میں
حبشہ، سند اور ہند ہیں۔ اور قوط بن
حام نے تاویل کی دوسری بیٹی بخت
سے نکاح کیا۔ جس سے مصر کے قبطی
پیدا ہوئے۔ نیز کہا جاتا ہے کہ
قبط و بربر مصر کی اولاد ہیں، اور
قوط نے ہند و سند کو جاکر آباد کیا
وہاں والے اسی کی نسل سے ہیں۔

(۲) (باسنادہ عن ابن عباس) قال
العرب والفرس والنبط والهند،
والسند والسند من ولد سام بن
نوح (ج ۱ - صلا)

حضرت ابن عباس (المتوفی سنہ ۶۸ھ)
نے کہا عرب اور فارس (کے قدما)
اور نبط اور ہند اور سند سب کے
سب سام بن نوح کی نسل سے ہیں۔

(۳) (باسنادہ عن محمد بن السائب)
قال الهند والسند بنو توقیر[1]

روایت ابن عباس کے یہ راوی محمد بن السائب
نے کہا کہ ہند اور سند بیٹے ہیں۔

[1] یہی چھاپا ہے توقیر ہے۔

بن یقطن بن عابر بن شالح بن ارفخشد بن سام بن نوح ۔ ج ۱ صفحہ ۱۰۵) | یوفیر (اوفیر) بن یقطن بن عابر بن شالح بن ارفخشد بن سام بن نوح کے ۔

عربوں کے دو خیال تھے، ایک گروہ ہند و سند کو بنو حام یعنی اہل مصر اور ان کے ہم نسلوں کے ہم رشتہ خیال کرتا تھا۔ دوسرا گروہ ان کو عربوں خصوصاً جنوبی عرب کے باشندوں سبا بن یقطن کا ہم نسل قرار دیتا تھا۔ چونکہ دوسرے قول کی سند حضرت ابن عباس تک منتہی ہوتی ہے۔ اس لئے خالص عرب خیال اسی کو قرار دیا جا سکتا ہے ۔

بنو حام یعنی مصر و شام کے قدما اور بنو سام یعنی عربوں اور عبرانیوں کے اسلاف دونوں بحر شامی گروہ کی شاخیں ہیں جو یقیناً ایک زمانہ میں نسل واحد ۔۔۔ ہوں گے۔ بعد میں زمانے کے نامعلوم ادوار میں یہ دونوں دو ہوئے۔ مگر عموماً باہم مدغم بھی ہوتے رہے۔ قدمائے سندھ کا بھی بڑا گروہ اسی بحر شامی نسل کا تھا۔ اب جبکہ ہم کو سند کہلانے والے مصر اور عرب میں بھی مل چکے ہیں تو ہمارے لئے جائز ہو گیا کہ سنسکرت لغت کی بجائے مصر و عرب میں لفظ سند کی حقیقت تلاش کریں ۔

تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کیجئے کہ ملک سند کا قدیم تر نام اس کے چینی نام CHEN TOU سے ملتا جلتا تھا TOU کو مصری لفظ TA اور TAVI سے مناسبت ہے۔ TA کے معنی ہیں "زمین"۔ مصر کا ایک قدیم نام TAMERU (ارض سیلاب) تھا۔ بحر احمر کے افریقی یا عربی ساحل کو مصر والے PUNT "پونت" اور TA NETER (ارض معبود) کہتے تھے۔ مصر کا ایک نام TAVI تھا۔ جس کا ترجمہ "دو زمینیں" کیا گیا ہے۔ یہی لفظ طویٰ بن کر اس سرزمین کے نام کی حیثیت سے قرآن میں آیا ہے۔ جس میں حضرت موسیٰ پر پہلی وحی نازل ہوئی خدا نے فرمایا "اپنی جوتیاں اتار دو، تم مقدس وادی طویٰ میں ہو"۔ جس پہاڑ پر یہ وحی نازل ہوئی۔ اس کا ایک قرآنی نام طور سینین (سین کہلانے والوں کا پہاڑ) ہے۔ توراۃ میں ہے کہ بنو اسرائیل "مصر سے خارج ہو کر دوسرے مہینے کے پندرہویں دن سین کے بیابان میں جو ایلیم اور سینا درمیان ہے"۔ پہونچے (خروج ۱:۱۲) سین کا اصلی مفہوم چاند ہے۔ عراق میں کئی سامی النسل بادشاہ گزرے جن کے ناموں میں سن یا سین کا لفظ ملتا ہے۔ مثلاً نارام سن، ابی سن، وارد سن، سن موبلت وغیرہ ۔

ایسے ہی ناموں والی قوم کی بدولت جو طور کے پاس وادی طویٰ میں بستی تھی، طور کو طور سینین کہا گیا۔ سرزمین طویٰ کے عبرانی نام مدبر سین کا ترجمہ فرعونی عہد کی مصری میں کیجئے۔ تاسین بن جاتا ہے۔ اور یہ نام ملک عرب کے چینی نام TA TSIN سے ملتا جلتا ہے۔ اس تاسین کا عکس، سین تا چینی زبان میں چن تاو بن کر سند کا نام بن گیا۔ تاسین اور سین تا دونوں کا مطلب ہے "سن" (چاند) کہلانے والوں کا دیس یا چاند کا ملک سین تا تغیر لہجہ کے بعد سنت، سند، ہنت، ہند، ہندو اور اندو (چاند) بنا۔ سند پہلے ملک، کا نام تھا۔ پھر قوم کا نام بنا۔ ویدک آریوں نے سندھو کو سند رود، پھر ہر رود کا نام بنا دیا ۔

اس طویل تحریر کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ وادیٔ سندھ کے قدمائین کی یادگاریں مکتوب مہروں کی شکل میں ہم کو موہن جو ڈرو اور ہڑپا وغیرہ مقامات میں ملی ہیں۔ ان کو پڑھنے کے لئے ایک راہ کھولی جائے۔ سندھی مہریں اس لئے معمہ بنی ہوئی ہیں کہ ہم نے آج تک اس بات کا خیال نہیں کیا کہ قدمائے سندھ کیا تھے، یورپی شاہد و بابیرہ پر ایشیائی روایات کو ختم نہیں کرنا چاہیئے۔ سند ایک ایسی قوم کا نام تھا۔ جو کہ ایرانی کے ایران ہونے اور ہندوستان کے آریہ ورت ہونے سے پہلے مصر ، شام، عرب، ایران و سند میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی ایک شاخ چین تک میں جا گھسی تھی اور سند ابل کو اس نے آباد کیا تھا۔ یہ لوگ عربوں کے خیال کے مطابق جنوبی عرب میں بسنے والے حضر موت و سبا اور معین اور قتبان کے ہم نسل تھے۔ قدمائے سندھ کے تعلقات عراق عرب کے ساتھ ثابت ہو چکے ہیں۔ اس لئے بیجا نہ ہوگا اگر ہم وادیٔ سندھ کی مہروں کو اس زبان میں پڑھنے کی کوشش کریں۔ جسے عرب کا سند باد بولتا تھا ۔

سند کی طرح ہند نام کی بستیاں بھی راوی و مہران اور گنگا جمنا کے دیس سے باہر حبش میں عرب میں اور ایران میں دکھا سکتے ہیں۔ اور کبھی موقع ملا تو دکھائینگے تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ وادیٔ سندھ کے نوشتوں کو مسند کی مدد سے سند اد کی زبان میں حل کرنے کی کوشش ناکام نہیں ہو سکتی۔ بشرطیکہ اہل علم نے شاید و باید اور غالباً و اغلباً کے زور سے مفروضات کی جو عظیم الشان عمارتیں کھڑی کر دی ہیں ہم انھیں کو گھورتے نہ رہیں ۔

رپورتاژ

قلعۂ ملتان کی ایک شام

عارف حجازی

نگار خانہ[1] میں خوب چہل پہل تھی۔ اسکول اور کالج کے لڑکے لڑکیوں کے علاوہ اور بہت سے لوگ بھی آئے ہوئے تھے۔ لیکن ان تمام لوگوں میں جیسے میں ہی ایک اجنبی تھا جس پر اکثر لوگوں کی نگاہیں گھورنے لگتیں اور میں انجان بنا ملتانی مصنوعات اور دلکش تصویری شاہکاروں کی طرف متوجہ ہو جاتا کبھی کبھار کسی کی شریر نگاہیں مجھے بے چین کر دیتیں اور اس وقت ایسا معلوم ہوتا جیسے دل کی سونی نگری میں ساون کی ہوا اور فریب گھٹائیں اُمنڈ آئی ہیں۔

بڑی دیر تک نگار خانہ میں گھومتے گھامتے جب باہر نکلا تو اس وقت میری حالت اس تماشائی کی مانند تھی جس نے اپنا سب کچھ کسی کے نذر کر دیا ہو۔ ماحول کی چہل پہل نے پچھلی بہت سی بھولی بسری باتیں یاد دلا دی تھیں۔ جوانی کی مسکراتی ہوئی صبحیں اور گلابی شامیں، بہت سارے جانے پہچانے لوگ، گاؤں کی معطر فضائیں، کھیت کھلیان، سینکڑوں حسین مناظر، پُر فضا مقامات، ویرانے، وادیاں، غرضیکہ ایسی نہ جانے کتنی بے شمار یادیں تھیں۔ درد بھرے اور شیریں گیت تھے، لوگ تھے اور سحر انگیز صبح اور شامیں تھیں جن کی تفصیل اور بیان کے لیے صبر اور استقلال کی ضرورت ہے۔ اس وقت قلعۂ ملتان کے اُجڑے ہوئے ماحول میں ان تمام بیتی ہوئی باتوں کو یاد کر کے دل میں ایک ہوک سی مچ گئی تھی اور ذہن میں قلعۂ ملتان کی دو ہزار سالہ قدیم تاریخ کے رومانی واقعات کا دفتر کھلا ہوا تھا۔

قلعہ کے اس مقام کا تصور کر کے جہاں آج سے تقریباً ایک صدی قبل سورج دیوتا کے مندر کے علاوہ بہت سی خوب صورت عمارتیں اور عہدِ قدیم کی یادگاریں تھیں، مجھے ذرا تعجب ہوا اور ارد گرد کا ماحول کچھ عجیب پُر ہول سا معلوم ہونے لگا۔ پھر چلتے چلتے مجھے یونانی تاریخ داں "ایرین" (ARIAN) کے روزنامچے کی چند سطریں یاد آ گئیں۔ ۳۲۶ ق۔م میں جب اسکندر نے حملہ کیا تھا تو اس زمانہ میں سورج دیوتا کے مندر کا پجاری قبیلۂ ملوئی[2] یہاں حکمران تھا۔ اسکندر کو اس معرکہ میں بڑی مزاحمت کرنی پڑی تھی۔ اور بُری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ لیکن قسمت کی یاوری نے یہاں بھی اس کا ساتھ دیا۔

یونانیوں کے حملے کے ایک عرصہ کے بعد کے حالات کے بارے میں کہیں کوئی پتہ نہیں چلتا۔ آگے چل کر تاریخ کے کچھ حوالے ملتے ہیں تو وہ "چچ نامہ" کا معتبر تذکرہ ہے۔ لیکن قلعہ کے اصل بانی کا آج تک تاریخ میں کہیں سراغ نہ مل سکا۔ وادیٔ سندھ میں جب موہنجوداڑو اور ہڑپا کی تہذیب و تمدن پھل پھول رہا تھا، عالی شان عمارتیں اور انسانی آسائش کی تمام سہولتیں مہیا تھیں، اگر اس دور کے آثار اور طرزِ تعمیر سے قلعہ ملتان کا مقابلہ کیا جائے تو پھر بھی اس بات کی تصدیق نہیں ہوتی کہ یہ قلعہ بھی اس دور کی یادگار ہوگا۔ چچ نامہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب محمد بن قاسم نے وادیٔ سندھ پر حملہ کیا تو اس وقت سورج دیوتا کے مندر اور قلعۂ ملتان میں خوب چہل پہل تھی۔ جب عربوں نے قلعہ کا محاصرہ کیا تو یہاں کے راجہ نے بھی دفاعی مقابلہ کے لئے قلعہ کی بڑی مضبوط مورچہ بندی کر رکھی تھی۔ پھر اگلے روز سورج چڑھتے ہی زور شور سے جنگ چھڑ گئی۔ اسی دوران میں ایک شخص نے جان بچا کر قلعہ سے بھاگ نکلنا چاہا تھا کہ عربوں نے اُسے گرفتار کر لیا۔ پھر اسی شخص نے دریا کی جانب قلعہ کی شمالی فصیل کی اس جگہ کا پتہ بتایا جہاں سرنگ بآسانی سے کھودی جا سکتی تھی۔ چنانچہ عربوں نے یہاں ایک بہت بڑی سرنگ کھود دی اور دو تین دن میں شہر پناہ کی دیوار گر پڑی اور قلعہ پر عربوں کا قبضہ ہو گیا۔

محمد بن قاسم کے حملے کے بعد یہ قلعہ جیسے ہمیشہ کے لئے خونریز جنگوں کا اکھاڑا بن گیا تھا۔ [illegible] میں ابوالفتح داؤد اور لاہور کے راجہ انند پال متحد ہو کر سلطان محمود غزنوی کے خلاف بغاوت کرتے ہی قلعہ ملتان کی تاریخ کا پھر ایک نیا دردناک دور شروع ہو گیا تھا۔ ابوالفتح کے اتحادی دوست انند پال کو پشاور کے مقام پر غزنوی فوجوں نے شکست دی تو ابوالفتح نے قلعۂ ملتان کو ہی دفاعی مورچہ بنایا۔ لیکن سات دن کے محاصرہ کے بعد غزنوی فوجیں قلعہ پر قابض ہو گئیں۔

۱۔ ایک جدید طرز کی "آرٹ گیلری" (ملتانی مصنوعات۔ مصوری شاہکاروں کی نمائش گاہ)
۲۔ آریہ نسل کا ایک قبیلہ۔

اور پھر تقریباً پونے دو سو سال کے بعد ۱۱۷۵ء میں سلطان معز الدین محمد بن سام (شہاب الدین غوری) نے اس قلعہ پر اپنا پرچم لہرایا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد تاتاریوں نے قتل و غارتگری کا بازار گرم کر دیا۔ انھیں جنگوں میں بلبن کا بیٹا محمد شہید ہوا اور اس کے پیر و مرشد حضرت امیر خسرو دہلویؒ کو تاتاریوں نے گرفتار کر کے قید کر دیا۔ اپنی اسیری اور قید و بند کی صعوبتوں کے خلاف احتجاج کرنے کی بجائے حضرت خسروؒ نے اپنے جذبات کا کتنے لطیف انداز میں اظہار کیا ہے۔

من کہ برسر نمی نہادم گل
بار بر سر نہاد و گفتا بل

دوپہر کے گہرے سناٹے میں ہر شئے دنیا کی بے ثباتی کا جیسے ماتم کر رہی تھی۔ اور میرے قدم تنہائی کے احساس سے اور تیزی سے اٹھ رہے تھے قلعہ کے سب سے زیادہ پُر فضا، اونچے، سرسبز، قلعہ بند، ٹیلے کی جنوبی فصیل کے ساتھ ساتھ دو بالاخانے بنے ہوئے نظر آئے جنھیں قریب سے دیکھ کر قدیم طرزِ تعمیر کی خوبصورتیاں پھر اُجاگر ہو گئیں۔ میں نے پہلے پشتے کے ۱۵ فٹ چوڑے بالاخانے پر چڑھ کر اپنی دوربین سے چاروں طرف دیکھا تو دور دور کے مضافات اور شہر کے خوب صورت منظر کی تصویر نگاہوں کے سامنے کھنچ گئی۔ شہر سے کوئی چار میل پر دریائے چناب ایک لمبے سفید فیتے کی مانند سبزہ زاروں کے درمیان بل کھاتا ہوا دور بہت دور جیسے نیلگوں خلاؤں میں گھل مل گیا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اس قلعہ کو یوں تو بڑے بڑے فاتحین نے پامال کیا لیکن آج سے تقریباً ساڑھے پانچ سو برس پہلے تیموری لشکر کے حملہ نے جیسے اس کی شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا تھا جسے بعد میں مغلوں کے ساڑھے تین سو سالہ دورِ حکومت نے دوبارہ زندہ کر دیا تھا۔ اور ساتھ ہی اسلامی معاشرت، تمدن نے اس گوشہ میں اتنا عروج پایا کہ جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ جہاں زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی ہوئی وہاں، بزرگانِ دین نے بھی اپنی برکتوں کے خزانے کھول دئیے تھے۔ آج بھی ان کے مزاروں کو دیکھ کر ان کے جاہ و جلال کا تصور تعظیم و ادب پر مجبور کر دیتا ہے۔ میں نے دور سے حضرت پیر بہاء الحق اور شاہ رکنِ عالمؒ کے مزاروں کے گنبدوں کو دیکھ کر دل میں کہا۔ مگر مغل حکومت کے زوال کے بعد ہی جیسے ملتان پر بھی زوال کے بادل چھا گئے تھے۔ جنوری ۱۸۱۸ء میں سکھوں کے اٹھارہ ہزار ٹڈی دل لشکر کا خیال آتے ہی میری نگاہوں کے سامنے اس سب سے بڑی آخری خونریز جنگ کا نقشہ کھنچ گیا جسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی +

میں نے بالاخانے پر بیٹھے بیٹھے ایک طائرانہ نظر ڈالی تو یوں معلوم ہوا جیسے نواب خاں مظفر خاں شہید کے دو ہزار جانباز قلعہ کی فصیلوں پر دشمن پر جوابی حملہ کرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔ شہر پناہ کی فصیل پر اسلامی پرچم لہرا رہا ہے۔ ضعیف العمر نواب زرہ بکتر پہنے گھوڑے پر سوار اپنے بہادر سپہ سالاروں کے ہمراہ خود مورچہ مورچہ کا معائنہ کرتا پھر رہا ہے۔ کہ اتنے میں دشمن کے توپ خانے نے گولہ باری شروع کر دی۔ اور ادھر قلعہ کے مورچہ بند جانبازوں نے جوابی حملے شروع کر دیئے۔ گھمسان کا رن پڑ رہا تھا۔ "زمزمہ" توپ کی دل ہلا دینے والی گونج گرج اور دھماکوں سے قلعہ کی دیواریں لرز رہی تھیں، گر رہی تھیں اور نواب کے وفادار بہادر سپاہی ہتھیار پھینکنے کی بجائے جام شہادت پی رہے تھے۔ اور نعرۂ تکبیر سے آسمان کا گنبد گونج رہا تھا کہ آناً فاناً دشمن قلعہ میں داخل ہو گیا۔ مگر نواب اور اس کے مٹھی بھر سپاہی ملبے اور دیوار کے کھنڈر کے پیچھے کھڑے ہوئے آخری دم تک لڑتے رہے۔ ان کی زبان پر خدا کا نام تھا اور چہروں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ابھی دشمن بُری طرح گولہ باری کر رہا تھا۔ آخر بڑی دیر تک خونریز جنگ ہونے کے بعد قلعۂ ملتان کا ٹیپو، نواب مظفر خاں اپنے پانچ بیٹوں اور ایک بہادر بیٹی کے ساتھ لڑتا ہوا شہید ہو گیا۔ "تاریخ عالم میں اپنی بہادری، حب الوطنی اور قومی و ملی آن بان کی ایک ایسی مثال چھوڑ گیا جسے زمانہ ہمیشہ یاد کر کے خراجِ عقیدت کے پھول چڑھاتا رہے گا۔" میں نے دل میں کہا اور بالاخانہ سے اتر آیا +

سہ پہر ڈھل چکی تھی۔ خزاں رسیدہ ماحول میں جیسے بہار کے آثار نمایاں ہو گئے تھے۔ صدیوں کے حادثات اور واقعات کی المناک پرچھائیاں کہیں ویرانوں میں کھو گئی تھیں۔ بڑی دیر تک بیسویں صدی کے قلعۂ ملتان میں گھومتے پھرتے وہاں کے چند جدید مقامات۔ کتب خانہ۔ جدید طرز کا کھیلوں کا میدان (اسٹیڈیم) جس میں پچاس ہزار آدمی بیک وقت سما سکتے ہیں) تیراکی کا تالاب اور پرانے آثاروں میں قلعہ کا بہت بڑا عالی شان دروازہ دیکھنے کے بعد اس طرف نکل آیا جہاں برطانوی شہنشاہیت کی یادگار "چوکونا مینار" کھڑا تھا۔ (جہاں برطانوی سامراج کے دو شاطر ولیم اینڈرسن اور پیٹرک الگزنڈر وانز اگنیو دفن ہیں) ۱۸۴۸ء میں ولیم اینڈرسن اور اگنیو کو سکھوں نے سازش کر کے قتل کروا دیا تھا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد سکھوں اور انگریزوں میں جنگ ہوئی اور ۱۸۴۹ء میں

ؔ (بھنگیوں کی توپ جو احمد شاہ ابدالی کی یادگار ہے اور آجکل لاہور کی مال روڈ پر نصب ہے)

قلعہ ملتان پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔ جان ڈنلپ نے قلعہ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ حقیقت اُجاگر ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:—

"شہرپناہ کی فصیلوں اور شہر کے شمال کی جانب نگاہ اٹھاتے ہی قلعہ کے اندر حصار بند نہایت بلند گڑھی (چھوٹا قلعہ) ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جنوری کو جب انگریز فوجیں قلعہ میں داخل ہوئیں تو دیوان مولراج یہیں پناہ گزیں تھا۔ یہ گڑھی بہت اونچے ٹیلے پر ہے۔ جس کے چاروں طرف چالیس اور ستر فٹ اونچی اور ہشت پہلو دیواریں حلقہ کیے ہیں۔ شمال مغربی دیوار کوئی دو سو گز لمبی ہے جہاں سے شہر کٹ گیا ہے قلعہ کی بیرونی پناہ فصیل سے ملی ہوئی ایک بیس فٹ گہری اور چالیس فٹ چوڑی کھائی بنی ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ فصیل کے چاروں طرف کوئی تیس برج نما مینار، بالا خانے، حویلیاں، مسجدیں اور ہندوؤں کا قدیم زمانے کا مندر اور نواب کا محل ہے۔ ان عمارتوں کی خوبصورتی اور طرزِ تعمیر کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے لیکن ۱۸۱۸ء میں رنجیت سنگھ کی گولہ باری سے یہ عمارتیں برباد ہو چکی ہیں۔ قلعہ بندی کے اعتبار سے ہندوستان میں اس قلعہ کا جواب نہیں ملتا جس کا اعتراف ولیم اینڈرسن نے لاہور ریذیڈنٹ کے نام ایک خط میں کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ایسا قلعہ ہندوستان بھر میں کہیں نہیں دیکھا جو اتنا محفوظ، مستحکم ہو اور جس کی فصیلوں پر دفاعی مورچہ بندی کیلئے آٹھ توپخانے بنے ہوئے ہوں۔ اور جہاں زندگی کی تمام ضروریات کا بکثرت ساز و سامان موجود ہو۔"

"یہ کوئی ایک صدی قبل کی کہانی ہے۔ یا محض ڈنلپ کی تحریر" میں نے جو کونے مینار پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر کہا۔ اور پھر مینار سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گیا پھر مجھے "ٹائمز" کے نامہ نگار اور مشہور تاریخ داں کی وہ تاریخی دستاویز بھی یاد آ گئی جس نے قلعہ کی تعریف، دولت اور خوبصورتی کے بارے میں لکھتے ہوئے ڈنلپ کو بھی مات کر دیا ہے۔ تاریخ آنکھوں دیکھا ماحول پیش کرتے ہوئے "ٹائمز" کا نامہ نگار لکھتا ہے:

"یہ قلعہ کیا ہے دولت اور اشیائے خورد و نوش و آسائش کی منڈی ہے جس کے بڑے بڑے گودام اور مال خانے چھتوں تک بھرے پڑے ہیں۔ افیون، نمک، گندھک اور معمولی سی معمولی چیز اسے لیکر چاول، گھی، گندم، چمڑے کے تھیلے، ہر اقسام کے برتن، عمدہ ریشمی کپڑے، شال، قالین، اسلحہ سے بھرے ہوئے تہ خانے اور نہ جانے کتنی چیزیں ہیں جن کا شمار کرنے کے لئے بہت وقت چاہئیں۔ ان استعمال کی اشیا کے علاوہ مجھے سب سے زیادہ اس دولت نے محوِ حیرت کر دیا ہے جس کی تصویر میرا قلم بھی نہیں کھینچ سکتا۔ اور میں حیران و ششدر کھڑا ہوا سونے، چاندی، ہیرے، جواہرات سے بھری ہوئی سربمہر ان گنت دیگوں کو دیکھ رہا ہوں۔ اس کثیر دولت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ یہ دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور میرے حواس میرے قابو میں نہ رہے۔"

جان ڈنلپ اور "ٹائمز" کے نامہ نگار کے آنکھوں دیکھے تاریخی تذکروں کو سوچ کر مجھے بیٹھے بیٹھے ایک ایک جھرجھری سی آئی۔ اور میں متعجب لگا ہوں سے اس کے ماحول کو دیکھ کر خود حیران و ششدر تھا کہ وہ قلعہ ملتان جس کے بارے میں ان مشہور تاریخ دانوں نے اپنے جذبات کو تاریخ میں سمویا ہے کیا یہ حقیقت تھی یا محض کوئی قدرتی جادوگری کا تماشہ تھا جسے دیکھ کر تاریخ داں بہک گئے تھے۔ مجھے جیسے ان پر یقین ہی نہیں آیا کیونکہ نہ وہاں قلعہ کی ان عالی شان بلند یوں کے نقوش اُجاگر تھے۔ نہ وہ دولت کی فراوانی تھی اور نہ چہل پہل کیونکہ جب ۱۹۲۷ء میں انگریز سامراج اور حکومت کا خاتمہ ہو گیا تو ۴۸ ایکڑ رقبہ میں ویرانی اور کھنڈروں، ٹیلوں کے کچھ یہاں کچھ نہ تھا۔ قلعہ کے بچے کچے کھنڈر سنسان پڑے تھے۔ جہاں شب کو گیدڑوں اور بھیڑیوں کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔

ان تمام پر غور و فکر اور سوچ بچار کرتے کے بعد جب میں کمر سیدھی کرتے ہوئے اٹھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے زمانہ کے حادثات نے مجھے بھی قلعہ کی طرح کھوکھلا کر دیا ہو۔ میں نے چوکونا مینار پر ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور پھر تھکے ماندے مسافر کی طرح چل پڑا۔ قاسم باغ[1] کے معطر ماحول میں قدم رکھتے ہی جیسے میرے ذہن کا بوجھ ہلکا ہو رہا تھا۔ چاروں طرف لوگوں سے خوب چہل پہل اور گہما گہمی تھی۔ اور جیسے جیسے شام کی گلابی فضائیں باغ کے ہرے بھرے ماحول پر چھا رہی تھیں مستقبل کے زندہ و درخشاں لمحات کا سماں میرے سامنے کھنچ گیا تھا۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں ماضی کے کھنڈروں سے نکل کر کسی جنت میں آ گیا ہوں جہاں طائرانِ خوش الحان کی نغمہ سرائی سے پتہ پتہ سرشار ہے اور ذرہ ذرہ زندگی کی گوناں گوں خوشیوں سے مہک رہا ہے اور سارا ماحول دیس کی خوشحالی، ترقی اور سلامتی کی دعائیں مانگ رہا ہے جن کی مترنم آوازوں میں میرے دل کی دھڑکنیں بھی شامل تھیں۔

---

[1] سنہ ۱۹۲۲ء میں قلعہ کے ویران ٹیلوں اور گڑھوں کو ہموار کر کے اس باغ کی بنیاد رکھی گئی۔

ملتان
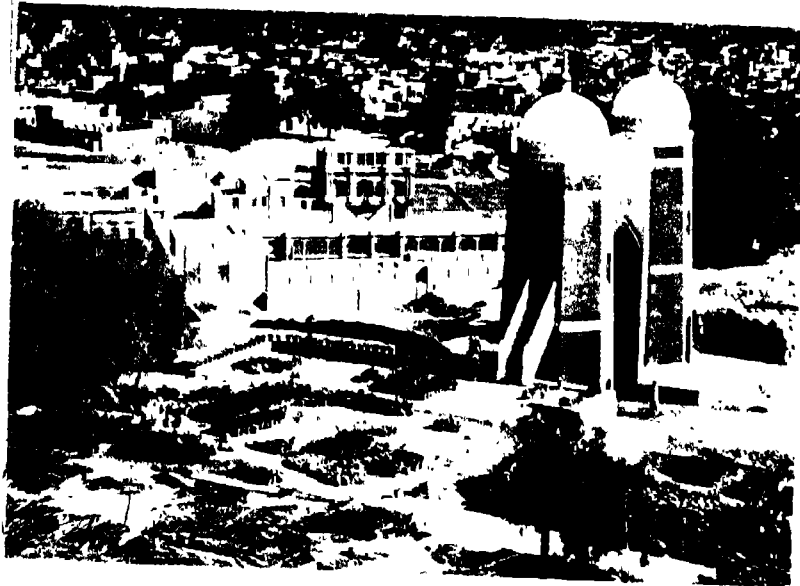
پاکستان شاہراہ ترقی پر
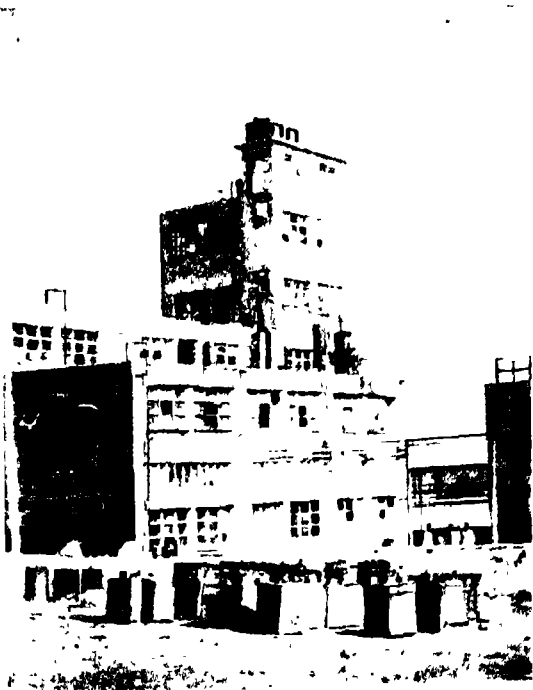
زندگی کی چند جھلکیاں

(ملی انقلاب کے بعد)

سیّد ضمیر جعفری

زندہ باد اے سات اکتوبر کے ملی انقلاب ۔۔۔ نام ہے تیرا شباب اور کام ہے تیرا شتاب
کھول کر بیٹھے ہیں "اوراقِ طلائی" کی کتاب ۔۔۔ "تاجرانِ بے حساب و حاجیانِ بے ثواب"

ایک کے جو چار لیتا تھا وہ اب لاچار ہے!

بھاؤ طے کرنے میں وہ لڑنے کی تیاری گئی ۔۔۔ بحث گوبھی کی تھی، مولی کھینچ کر ماری گئی
وہ خریداری کہ "مشقِ جوت پیزاری" گئی ۔۔۔ قیمتوں کی سطحِ ناہموار ۔ "ہموار" ی گئی

تول پورا، بول سچا، نرخ برخوردار ہے!

گھی میں گھبراہٹ نہیں ہے، دودھ میں پانی نہیں ۔۔۔ تان کی اب شکل مردانی ہے نسوانی نہیں
ہم نے یہ مانا کہ انڈوں کی فراوانی نہیں۔ ۔۔۔ لوگ دیوانے سہی، مرغی تو دیوانی نہیں

ملّتِ بیضا کو انڈا ہی نقطۂ پرکار ہے!

تنگ گلیاں کھل گئیں، کوڑے کا بیڑا ہو گیا ۔۔۔ نقش جو دھندلا تھا رگڑا کھا کے اُجلا ہو گیا
شہر کا نقشہ ابھی کیا تھا، ابھی کیا ہو گیا ۔۔۔ ایک ہی کروٹ میں سارا اونٹ سیدھا ہو گیا

ہر دکاں شفاف، ہر کوڑا تھوڑا ہموار ہے!

فلم کے دل پھینک موسیقار غائب ہو گئے ۔۔۔ وہ لچر اشعار، اونچے پیار غائب ہو گئے
ہیرا پھیری کے وہ رشتہ دار غائب ہو گئے ۔۔۔ اس طرح کہ تین میں سے چار غائب ہو گئے

اب "مہرِ تسلیم" کے اوپر مزاجِ یار ہے!

پیالیوں میں، تھالیوں میں، جالیوں میں بند ہیں ۔۔۔ یعنی سب چیزیں اب ان "گھر والیوں" میں بند ہیں
بد زبانوں کی زبانیں گالیوں میں بند ہیں ۔۔۔ لڑنے والے اپنی اپنی پالیوں میں بند ہیں

سنتری ہشیار ہے، فوجی جواں تیار ہے!

اپنی اپنی راہ سے آگاہ پیدل اور سوار　　خر میں خرمستی نہ شیورلٹ میں نخوت کا خمار
ضبط کے پیکر ہیں "قلم و چلم" کے امیدوار　　کتنی سیدھی تیر ہے وہ ڈالڈا گھی کی قطار
ایک ہی صف میں کلاہ و جبہ و دستار ہے!

وہ کمیٹی گھر کے "خلوت خانے" والی گاڑیاں　　گھر کا ملبہ شہر میں پھیلانے والی گاڑیاں
خود مہکتی، راہ کو "مہکانے" والی گاڑیاں　　آدھ موئے بیلوں کے پیچھے گھلنے والی گاڑیاں
یہ تماشہ اب سر بازار کچھ دشوار ہے!

مغربی چھم چھم ہے کم کم نازنینوں کے لئے　　عاشقوں نے بھی تخالف مارکینوں کے لئے
"جو بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کے لئے"　　گھر میں بیٹھے ہیں نہ جانے کے مہینوں کے لئے
پینٹ پائیدار ہے، نازک مزاجِ یار ہے!

وہ جہازی اشتہاروں میں بنام انقلاب　　مولوی گلشیر سے مسجد کے چندے کا حساب
جوگیوں، سنیاسیوں کے نسخہائے لاجواب　　چار آنے میں بڑھاپے سے قیامت تک شباب
اب مگر دیوار کا مقصد فقط دیوار ہے!

زرپناہوں کے جو خفیہ درہم و دینار تھے　　کچھ سمندر بیچ تھے تو کچھ سمندر پار تھے
چور بازاری میں سونے کے محل تیار تھے　　جھوٹ کی گردن میں سچے موتیوں کے ہار تھے
اب یہ سب دولت متاعِ ملتِ بیدار ہے!

کوئی بندی اب کسی آقا کی آسندی نہیں　　کاشتکاروں کی شکر خندی، شکر قندی نہیں
اب زمینداری بس انسانوں کی "وٹ بندی"[1] نہیں　　آبرومندی تو ہے لیکن خداوندی نہیں
جتنا "چورس" آدمی ہے اتنی "مورس" کار ہے!

گندم و ربند، حجروں سے عیاں ہو جائے گا　　بحر کی ہر لہر پر سونا رواں ہو جائے گا
"کیا خبر تھی انقلاب آسماں ہو جائے گا"　　یعنی "ان اور دھن" نصیبِ دوستاں ہو جائے گا
کھیت کیا، عزم جو اس سے ریت بھی گلزار ہے!

[1] زراعت کی ایک پنجابی اصطلاح۔

★

غزل

فضل احمد کریم فضلی

کج ادا ہے کہ نہیں، برق تپاں ہے کہ نہیں — باوجود اس کے بھی ظالم مری جاں ہے کہ نہیں

دل سے خود پوچھ کہ تو جنسِ گراں ہے کہ نہیں — فکر کیا، کوئی خریدار یہاں ہے کہ نہیں

کیا قیامت ہے کہ ذرّے کا بھی دل ٹوٹ گیا — سوچتا یہ ہوں کہیں جائے اماں ہے کہ نہیں

دل کے اندر ہی سہی منزلِ سلمائے یقیں — بیچ میں مرحلۂ وہم و گماں ہے کہ نہیں

شرم اپنی سرِ مقتل بھی مجھے رکھنی ہے — ذرہ ذرہ مری جانب نگراں ہے کہ نہیں

لو مبارک ہو، گری برق، نشیمن اُجڑا — پھر گلستاں میں وہی امن واماں ہے کہ نہیں

تو نے سب کچھ تو بنایا ہے خدایا لیکن — تیری دنیا میں سکونِ دل وجاں ہے کہ نہیں

پاؤں میں کیوں نہ بھلا رقصِ سلاسل ہوتا — ہاتھ میں سلسلۂ زلفِ بُتاں ہے کہ نہیں

ہم نے مانا کہ محبّت ہے مصیبت لیکن — دیکھنا یہ ہے، طبیعت پہ گراں ہے کہ نہیں

میں کچھ اس طرح تری بزم میں چُپ بیٹھا ہوں — کوئی دیکھے تو کہے، منہ میں زباں ہے کہ نہیں

بے وفا ہی سہی لیکن یہ بتاؤ تو سہی — وہ حسیں ہو کہ نہیں، جانِ جہاں ہے کہ نہیں

کتنے ارماں ہیں کہ پامال ہوئے جاتے ہیں — کچھ خبر بھی تجھے اے عُمرِ رواں ہے کہ نہیں

یہ سنا ہے کہ غمِ مرگ نہیں جنّت میں — کون جانے کہ غمِ زیست وہاں ہے کہ نہیں

تم نے دو بار کہا ہے جو "نہیں" ہنس ہنس کر — تمہیں انصاف سے کہہ دو کہ یہ ہاں ہے کہ نہیں

ہر سخن فہم کے دل کو یہی تڑپاتا ہے
یہ جو فضلی ترا اندازِ بیاں ہے کہ نہیں

غزل

شان الحق حقی

انداز ہیں موسم میں مرے رنگ غزل کے
آتی ہے تری یاد بڑے بھیس بدل کے

ہاں دورِ زمانہ کوئی پیمانہ بدل کے
ابتک مرے پہلو میں وہی درد ہیں کل کے

خائف نہ ہوں اربابِ خرد اہلِ جنوں سے
وحشت میں بھی پڑتے ہیں بہت پاؤں سنبھل کے

پاتے نہیں اب ساز وہ نغمے جو دمِ رقص
گونجے تھے فضا میں ترے قدموں سے نکل کے

اب اور کوئی ذکرِ دل افزا و دل افروز
بیٹھے ہیں زمانے پہ بہت زہر اگل کے

کچھ اب بھی غنیمت ہیں خیالوں کے اُجالے
بڑھتے چلے جاتے ہیں نگاہوں کے دھندلکے

یاد آنے لگا پھر وہ سکوں تیری گلی کا
پھر دل کا تقاضا ہے کہ بیٹھیں کہیں چل کے

آتے ہیں جہاں سے گل و نسرین کے سندیسے
ہم ڈھونڈنے والے ہیں اسی رنگ محل کے

کچھ آب و ہوا ہی پہ نہیں دل کا گزارہ
نغمے چلے آتے ہیں پہاڑوں سے پگھل کے

مت پوچھ کہ ہستی کے وہ برباد سے لمحے
کیا چیز بنے ہیں مری تخئیل میں ڈھل کے

وہ دل کہ رہا تھا تری قربت میں بھی بے چین
رہ جاتا ہے بارے تری یادوں سے بہل کے

اے دل یہ بنا دہر کے آلام دو روزہ
ہوتے ہیں کہاں گم تری آغوش میں پل کے

ویسے تو وفا سے نہیں دل اب بھی گریزاں
پڑتے ہیں مگر آپ ہی کچھ پاؤں سنبھل کے

کھینچے ہیں قلم سے دلِ پرخوں کے مرقعے
رکھ دے کوئی ان کاغذی پھولوں کو مسل کے

غزل

تابش دہلوی

مری فغاں نے کیا آشنا جہاں سے مجھے
زیاں ہے سوزِ الم کا مگر فغاں سے مجھے

کیا ہے اہلِ جنونِ طلب نے پس ماندہ
دکھائی کچھ نہ دیا گردِ کارواں سے مجھے

سمجھ رہا ہوں میں بیکاریٔ جنوں کو فریب
بہار کا بھی کچھ اندازہ ہے خزاں سے مجھے

بہت عزیز ہے خطروں کی زندگی صیاد
ہزار برق کی نسبت ہے آشیاں سے مجھے

بوقتِ جلوہ گریٔ بزمِ نازمیں تو نے
حجاب کہہ کے اٹھایا ہے درمیاں سے مجھے

فنائے عشق پہ جیتا ہوں، کوئی خضر نہیں
کہ زندگی نہ ملے عمرِ جاوداں سے مجھے

رہِ طلب سے کچھ اس طرح لُٹ کے آیا ہوں
کہ لوگ جان گئے اہلِ کارواں سے مجھے

یہاں نگاہِ تماشا، وہاں تجلّیٔ حسن
بہت حجاب اٹھانے ہیں درمیاں سے مجھے

دل و جگر نہ ہوئے چاک آج بھی تابش
نجات، دیکھئے کب ہو غمِ نہاں سے مجھے

★

عبد اللہ خاور

وقت افسانہ ہے، اندازِ بیاں ہیں لمحے
تم ہو عنوان، تغزل کی زباں ہیں لمحے

وقت کے ساز کو پہنائیٔ شب میں توڑوں
تم نہیں ہو، تو اندھیروں کا جہاں ہیں لمحے

وقت رفتار بدلتا ہے مری فکر کے ساتھ
ذہن پر گاہ سبک، گاہ گراں ہیں لمحے

ایک لمحے میں کئی دور سما جاتے ہیں!
یوں تو اک چشمکِ برقِ گذراں ہیں لمحے

شوخیٔ رم کی حسیں یاد میں ڈھل جاتے ہیں
شوخ رفتاریٔ جادو نظراں ہیں لمحے

لمسِ گلبرگ کبھی، سنگِ گراں بار کبھی
صلۂ حوصلۂ سود و زیاں ہیں لمحے

یوں چمکتے ہیں مرے ذہن کے ویرانوں میں
جیسے ماضی میں ابھی شعلہ بجاں ہیں لمحے

ناپتے جاتے ہیں صحرائے ابد کو پیہم
کسی دیوانے کے قدموں کے نشاں ہیں لمحے

زمزمے سازِ رگِ جاں پہ مچلنے دو یونہی
ہم کو معلوم ہے شمشیر و سناں ہیں لمحے

غم کی صدیوں کو کیا غرقِ صبوحی، خاور
جاتے جاتے مری جانب نگراں ہیں لمحے

★

غزل

سراج الدین ظفر

دمِ شوق ضبطِ ہوس کس طرح — کریں سنبل و گل سے بس کس طرح
تعاقب نہ ہو جو رہیں اے بہار — بچے گی تو اب کے برس کس طرح
کوئی قافلہ آرزو کا نہ ہو — نفس میں یہ شورِ جرس کس طرح
تری زُلف کو چھو کے بیراں نہیں — یہاں تک ہوئی دسترس کس طرح
سمائے ہیں دل میں ہزار ختن — کریں ایک آہو پہ بس کس طرح
کھلی جا رہی ہے مری روح میں — کسی کی شمیمِ نفس کس طرح
دکھا مجھ کو اے مصرِ جامِ شراب — کہ ہے دن را تیبس کس طرح
بتا اے مری روحِ آوارہ خو — تجھے راس آیا قفس کس طرح
سبو کف میں ہے داد کو کشتگاں میں — درِ شہرِ یار و عسس کس طرح
ازل میں تو تھا صفر کا اک عدد — ہوا صفر سے پھر یہ دس کس طرح
کہاں میں کہاں شمعِ رو بانِ شب — ثمر سے رہ و رسمِ خس کس طرح
کہاں شیخِ شہر اور کہاں سِرِّ حق — سرِ عرش پہنچے مگس کس طرح
نہ ہوں زیرِ تحقیق جبتک غزال — نظر ہو کوئی دور رس کس طرح
گل و مُل نہ ہوتے جو موضوعِ شب — تو باتوں میں آتا یہ رس کس طرح
رہے بزمِ بادہ میں ہم مستعد — کہ نیکی میں ہو پیش و پس کس طرح
ظفر بھی سلامت نہیں عشق سے — یہ اژدر گیا اس کو ڈس کس طرح

ضمیر اظہر

وجد میں رقص کناں، شاد و غزل خواں دیکھا
ہم نے تاروں پہ عجب سحرِ بہاراں دیکھا
چشمِ مشتاق کو سہلاتے ہوئے سبزے میں
رنگِ شادابی و نزہت کو نمایاں دیکھا
کثرتِ لالہ و گل، سرو و سمن کے باعث
جوئے تخئیل میں اک شہرِ نگاراں دیکھا
شاخ در شاخ شگوفوں کے نگینے چمکے
خواب در خواب ستاروں کا چراغاں دیکھا
گم شدہ یاد نے پھر کروٹیں بدلیں دل میں
جھولتے لمحوں میں عکسِ رُخِ جاناں دیکھا
حجلۂ ذہن میں خوشبوئے وفا لہرائی
جنسِ اُلفت کو برنگِ گلِ خنداں دیکھا
گیت ہی گیت تمنا کے جزیروں سے اٹھے
کیف ہی کیف فضاؤں میں پرافشاں دیکھا
وسعتِ دید بھی کیا طرفہ عطا ہے اظہر
ہم نے ہر رنگ میں سو رنگ کا طوفاں دیکھا

مشرقی پاکستان کے لوک گیت

سیّد امجد علی

مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان بھی بیشتر دیہات ہی کی دنیا ہے۔ یہاں کے شہروں تک میں ایک دیہاتی رنگ ہے قطع نظر ان نئی نویلی بستیوں کے جو جدید ترقیات کی مظہر ہیں لیکن ایک ماحول یہ طرح بسی نہیں۔ دیہات کے ذکر سے مقصد اس ذہنی سکون اور فطرت کے قرب کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اس زندگی کی خصوصیت ہے۔ مشرقی پاکستان کے بسنے والے فطرت سے بہت قریب زندگی بسر کرتے ہیں۔ گرد و پیش کی فطرت بھی اور قلب و روح کی فطرت بھی۔ باوجود سطحی اور جزوی ہنگامہ آرائی کے کاروانِ حیات یہاں اپنے ازلی وقار سے خراماں خراماں گامزن ہے۔ داخلی کیفیات اسی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ خواہ وہ کنبہ کے افراد کا باہمی لگاؤ ہو یا جوانوں کا والہانہ عشق، یا مذہبی جذب و کیف ہو یا رنگین رسوم کی ساحری، خواہ شاعری کا جادو ہو یا نغمہ کا سرور۔ ان داخلی کیفیات میں مشرقی پاکستانی ڈوبا ہوا ہے، ان مواقع کو سینے سے لگائے ہوئے ہے۔ یکسوئی اور انہماک کے ساتھ دولت یا منصب کے حصول کی کوشش کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ عام شہریوں کی سی ہوس اور خود غرضی اس میں نہیں ہے جس کے بغیر مادی ترقی ذرا مشکل سے ہوتی ہے۔ وہ تو بس وقتی پریشانی کا قائل ہے اور پھر آرام سے محنت کا پھل کھانے کا۔

فطرت کے مزاجی جلووں سے تو وہ ہر جگہ دوچار ہے۔ مثلاً رہ بے پناہ بارش جو سال میں آٹھ مہینے موسلادھار برستی ہے، وہ ذخار دریا گنگا میگھنا اور برہم پترا جن پر آج تک انسان پل نہ باندھ سکا اور جن کے معاون ایک روپہلی جال کی طرح ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ انسان حیوان اور نباتات کے قدیم کا سلسلہ پیدائش، افزائش اور موت، جو چشم بصیرت کے لئے ہر شے فطرت کے اسرار و رموز اجاگر کرتا ہے۔ یہ ہیں مشرقی پاکستان کی زندگی کے اہم حقائق جو جزئیات پر حاوی ہیں، اور یہاں کے باشندوں کے دلوں پر گہرے نقوش چھوڑے ہوئے ہیں۔ باشندے بھی ایسے جو قدرتاً ذکی اور حساس ہوں۔ پھر جب یہ خیال کیا جائے کہ ان میں اکثر کا کام ہی زمین کی کاشت ہے یعنی قوائے فطرت کو قابو میں لانا یا ان سے تعاون کرنا، تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ مشرقی پاکستان والے واقعی قدرت سے بہت قریب ہیں۔

یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیئے کہ ان کی تمام زندگی بس جذب و کیف کی ترنگ میں گزرتی ہے۔ حقیقت تو اس کے برعکس ہے۔ ٹھوس حقیقتوں سے ان کے خواب کی دنیا جا بجا الجھ کر پارہ پارہ ہے۔ لیکن پھر بھی یہ صحیح ہے کہ ان کا دل کیفیات سے لبریز ہے، خواہ وہ خوشی کی ہوں یا غم کی، سرشاری ہو یا سرگرانی، ان کے دل کی دنیا جذبات اور شدید احساسات سے رچی ہوئی ہوتی ہے۔ لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ گیت کی شکل میں اظہار کا راستہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اہلِ عمل جب واقعاتِ زندگی سے متاثر ہوتے ہیں تو کسی اور ہی ڈھب سے اس کا جواب دیتے ہیں لیکن اہلِ دل کا انداز یہی ہے اور دیکھا جائے تو شدید جذبات کا پورا پورا اظہار عمل میں اتنا نہیں ہوسکتا جتنا فنی تخلیق میں، یعنی اس کے گیت۔ شاید مشرقی پاکستان میں اس مخصوص ردعمل کی ایک وجہ یہاں کے باشندوں کی غیر معمولی قوتِ اظہار بھی ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، واقعہ یہ ہے کہ یہاں والے جس بات سے بھی متاثر ہوتے ہیں اس کو گیت کی شکل دیدیتے ہیں۔ چنانچہ ان کے ہاں گیتوں کا ایک ایسا خزانہ ہے جو شاید ہی کسی اور زبان میں ہو۔

ہر موقع کا ایک گیت ہے، ہر موسم کا، بلکہ ہر موڑ کا۔ ادبی حلقوں تک جو گیت پہنچتے ہیں وہ تو ایک عشرِ عشیر ہیں ان لاتعداد زمزموں کا جو وہاں کے وادی و کہسار میں گونجتے ہیں، جو وہاں کے کھیتوں اور جنگلوں میں مرتعش ہیں، جو وہاں کے گھروں، بستیوں اور کشتیوں میں جادو جگاتے ہیں۔ ایک آدھی صدی سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ ڈاکٹر دنیش چندر راسین نے اس گنج بادآورد کو سمیٹنا شروع کیا اور ان اوراق پریشاں کی تدوین اور تالیف کا بیڑا اٹھایا۔ پھر ان کے شاگردِ ارجمند جناب جسیم الدین نے یہ کام جاری رکھا اور یہ خود آگے چل کر ہمارے نامور عوامی شاعر بنے۔ ان کے بعد کئی اور فاضل ادیبوں اور عالموں نے اس نیک کام میں ہاتھ بٹایا۔ منجملہ اوروں کے مولوی عبدالکریم، ڈاکٹر محمد شہید اللہ، ڈاکٹر انعام الحق وغیرہ۔ کل کی بات ہے کہ پہلی دفعہ ٹیگور نے شہر والوں کی توجہ ان نغمہ نیا نہ گیتوں کی طرف دلائی جو "باول" یا "بول" کہلاتے ہیں اور جن کے گانے والے بھی اسی نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان انمول جواہر پاروں سے لوگ کم واقف تھے۔ جب ٹیگور

(۵)

چپّو کو اٹھا رکھ دے
او رے مانجھی رے بھائی
بے سود تھی ہر کوشش
آخر کو قضا آئی !

یا پھر اس تفکرانہ رنگ کی بجائے سیدھی سادی محبت کی باتیں ہوتی ہیں مثلاً :-

اے ملکوتی بشر، اے آسمانوں کی پری
روشنی ہے جس کے دم سے زندگانی میں مری

تیری خاطر ہو گیا ہوں میں سراپا انتظار
اور ترا گھر ہے اس دریائے بے پایاں کے پار

بے بسی میں تیرے گھر کو یوں کھڑا ہوں تک رہا
دفعتاً آنکھوں سے میری ایک گرم آنسو بہا

مل گیا دریا کی موجوں میں یہ آنکھوں سے چھلک
کاش پہنچے موجِ دریا اس کو لیکے تم تلک

چٹکا :

جس طرح بھٹیالی میں مانجھی کی محبت کا اظہار اپنی محبوبہ سے ہوتا ہے، اس طرح "چٹکا" ایک گانا ہے جس میں عورت اپنے دور گئے ہوئے مانجھی کی یاد میں نغمہ سرا ہوتی ہے۔ یہ گیت مرد بھی گاتے ہیں لیکن اصل میں یہ عورت کی طرف سے ایک، دلسوز خطاب ہوتا ہے۔ یوں تصور کیجئے کہ مشرقی پاکستان کے شمالی علاقوں کی سرسبز پہاڑیوں میں ایک ٹیلے پر چند دیہاتی عورتیں بیٹھی ہیں۔ ان کے سامنے، عملاں کے آگے ایک وسیع منظر پھیلا ہوا ہے جس میں ایک پُر شور دریا دُور تک بہا چلا جا رہا ہے۔ اِدھر ٹھنڈی ہوا میں ان کے آنچل اڑ رہے ہیں، ادھر ہوا کشتی کے رنگین بادبانوں کو دھکیلتی ہوئی سطحِ آب پر لئے جا رہی ہے۔ ان کشتیوں کے چلانے والے جیسا کوئی مانجھی ان کے دلوں کے قریب لیکن نظروں سے دور ہے جس کی یاد میں یہ نغمہ سرا ہیں۔

جیسا طریقہ ہو کئی شیریں آوازیں مل کر تیز تیز اس گانے کو گاتی ہیں۔ آس پاس کی پہاڑیوں اور وادیوں میں ان کے سُر گونجتے ہیں اور اسی اعتبار سے اس گانے کو "چٹکا" یا "صدائے بازگشت" کہتے ہیں۔

گیت کا مضمون مانجھی سے التجا ہوتی ہے کہ اپنے لامتناہی سفر کو مختصر کرے۔ طرح طرح پیار سے اپنی خدمت کا یقین دلایا جاتا ہے۔ گھریلو آرام و آسائش کی دلآویز تصویر کھینچی جاتی ہے۔ پھر اپنی تنہائی اور حسرت کا المناک نقشہ کھینچا جاتا ہے ـــــ اور یہ سب اظہار ایسے دلنشیں انداز میں ہوتا ہے کہ سخت سے سخت دل بھی پانی ہو جائے :

او مانجھی او خوبصورت کشتی والے
بس موڑ لے کشتی کو، اس گھاٹ لگا لے

یوں ندی کو بہتے رہنا ہے کب تک
اس کشتی کو آخر کھینا ہے کب تک

کس دھن میں چلا جاتا ہے شام سویرے
دل میں کیا راز چھپا ہے مانجھی تیرے

دریا یہ ختم بھی ہوگا، او رے ماجھی
کیا اسکا سرا نہیں ہے، کیوں رے ماجھی

گھڑیا میں جب میں پانی بھرنے آئی
رنگیں کشتی نے تیری یاد دلائی

اک لہر نے گھڑیا چھین لی یوں اکدم سے
دل چھین لیا تھا جیسے تم نے ہم سے

ساری گان اور گم بھیرا:

بھٹیالی اور "چٹکا" دونوں سوز و گداز کے گیت ہیں۔ ان کے مدھم اور نرم، کومل سروں میں دلدوز جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن اور گیت بھی ہیں، جو انکے برعکس ولولہ انگیز اور ہنگامہ خیز دھوم دھام سے گائے جاتے ہیں۔ یہ سرخوشی و انبساط کے نغمے ہیں، جوش و خروش کے گیت۔ ان میں سے ایک ساری گان ہے۔ اگر بھٹیالی بہاؤ کے ساتھ کشتی چھوڑ کر گایا جاتا ہے تو ساری گان کی لچکدار اور تیز تانیں جب اٹھائی جاتی ہے جب کشتی بمشکل بہاؤ کے اوپر جارہی ہو، یا پھر جب برسات میں دریا پانی سے بھر جاتے ہیں اور بہاؤ تیز ہوتا ہے تو جوان اپنے جوش میں ان پرخروش دریاؤں میں کشتیاں دوڑاتے ہیں اور خوب خوب مقابلے ہوتے ہیں۔ جابجا ملک بھر میں کشتی بانی کے میلے منعقد ہوتے ہیں کیونکہ یہ تو یہاں کے لوگوں کا قدرتی مشغلہ ٹھہرا۔ ان مقابلوں میں جب دو فریق ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لئے پرواز و رلکار رہے ہوتے ہیں تو مل کر "ساری گان" گاتے ہیں جس کے لفظی معنی ہی ہیں "ساروں کا گانا" یعنی گیت سُر ملا کر گایا ہوا۔ چنانچہ چپوؤں کی یکساں حرکت کے ساتھ گانے کے بول بھی ملا جلا کر گائے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ زور سے آواز کو اٹھاتے ہیں پھر آہستہ سے نیچے لے آتے ہیں۔ اس طرح جوں جوں دوڑ اختتام کو پہنچتی ہے، گانے میں بھی جوش و خروش بڑھتا جاتا ہے۔

لوک سنگیت کے ماہر عباس الدین نے اس گانے کو یوں خوبصورتی سے بیان کیا ہے:۔

"ابر چھا رہا ہے، ہوا تیز چل رہی ہے اور دریا میں موجیں اٹھ رہی ہیں۔ ملاح خطرہ محسوس کرتا ہے اور خدا سے مدد چاہتا ہے اور گاتا ہے "کدھر جاؤں کہ، کنارے کو چھوڑوں، کس کنارے کو پکڑوں" بادل اس کے سامنے صف در صف پھیل رہے ہیں۔ بجلی کوند رہی ہے اور ہیبتناک تاریک منظر کو سنہری لکیروں سے اجاگر کر رہی ہے۔ طوفانی ہوا کے اثر سے دریا میں قیامت برپا ہے۔ موجیں غصے سے بل کھا رہی ہیں اور ان کے منہ سے گویا جھاگ نکل رہے ہیں۔ ملاح اپنے ساتھیوں سمیت ان کوہ پیکر موجوں سے لڑنے کے لئے کمر باندھتا ہے۔ چپوؤں پر جھوم جھوم کر زور لگاتا ہے اور ساری کے بلند آہنگ نغمے گاتا جاتا ہے۔

"او ماجھی آج ہے جھار، طوفانے چلاؤ ساری"

طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اس کا دل جوش سے بھر جاتا ہے۔ بڑی بڑی مچھلیاں اور مگرمچھ اسے گھیرے ہوئے ہیں۔ سیاہ لہریں اس کی طرف بڑھتی ہیں لیکن اسکے

چتونوں کا ڈنک کھا کر وہ اپنے پھن نیچے کر لیتی ہیں۔ جو پدما دریا کے سینے پر زندگی گزارتا ہو، وہ طوفانوں سے کب ڈرنے والا ہے۔ بجلی اور کڑک تو اس کے رات دن کے ساتھی ہیں؛

گمبھیر:

یہ بھی "ساری" کی طرح مل جل کر گایا جاتا ہے بلکہ یہ کچھ کچھ قوالی کی طرح ہے۔ ایک آدمی ایک بول گاتا ہے، پھر دوسرے مل جاتے ہیں اور ساتھ گانے لگتے ہیں۔ یہ خوشی اور سرشاری کا گانا ہے اور اس میں قوالی کی طرح خوب دھما چوکڑی ہوتی ہے اور غم دور کرنے کا اچھا طریقہ ہے۔ ضلع رنگ پور اور مالدہ سے یہ گانا مخصوص ہے اور ڈھول اور ڈھاک سے اس کی سنگت ہوتی ہے۔

"بھوتیا":

پانی کے گیتوں کا بہت ذکر ہو چکا۔ اب ذرا ان گیتوں کو لیجئے جو کھیت اور کھلیان، وادی اور جنگلوں میں مترنم ہیں۔ شمال کے ایک وسیع میدانی علاقے کا تصور کیجئے۔ جہاں، دور دور تک دھان کے کھیت پھیلے ہوئے ہیں اور بیچ میں ایک کچی سی سڑک بل کھاتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔ اس کے کنارے کہیں ناریل اور چھالیہ کے حسین درختوں کی قطاریں ہیں، کہیں کہیں آم اور کیلے کے جھنڈ۔ سڑک سے ہٹ کر ادھر ادھر اکا دکا گاؤں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سڑک پر ایک لمبا قافلہ بھیلوں کا، ہچکولے کھاتا چلا جا رہا ہے۔ اس پر دیہات کی پیداوار کی مختلف چیزیں لدی ہوئی ہیں۔ جیسے پھل، ترکاریاں، اناج، گڑ وغیرہ۔ یہ قافلہ کسی منڈی کی طرف رواں ہے، جہاں سامان فروخت کر کے غریب کسان اپنے گزارے کا انتظام کرتے ہیں۔

جیسے جیسے سفر کی تھکن بڑھتی جاتی ہے اور گھر کی یاد ستاتی ہے، گاڑی بانوں کی طبیعت انہیں گانے پر اکساتی ہے اور ایسے وقت میں وہ "بھوتیا" کی تان اٹھاتے ہیں۔ پہلی گاڑی والا ایک مصرع گاتا ہے، دوسرا اسے دہراتا ہے اور پھر تیسرا، چوتھا۔ اس طرح آن کی آن میں ساری وادی سینکڑوں آوازوں کے گانے سے گونج اٹھتی ہے۔ اس کا مضمون محبت کے سیدھے سادے اظہار پر مبنی ہے، جو کسان کی طرف سے اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کے حضور میں ہوتا ہے:

ڈھونڈتا پھرتا ہوں ہر جا تجھ کو میں
اے مرے محبوب، میرے جان و دل
جس کی خاطر منزلیں چھانا کئے
اپنی کٹیا سے گیا آخر کو مل

اس گانے میں بڑا سوز و گداز ہوتا ہے اور اس کے گانے کے انداز میں ہی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ چنانچہ گاتے گاتے یک بیک آواز سُر سے بھٹک سی جاتی ہے، جیسے ساز کا تار ٹوٹ گیا ہو۔ انجان سننے والا یہ سمجھتا ہے کہ گانے والا بہک گیا لیکن درحقیقت یہ دانستہ یا قدرتاً ہوتا ہے اور اس سے وہی یاس انگیز کیفیت کا اظہار مقصود ہے جو نفس مضمون میں بھی پایا جاتا ہے۔ پھر دفعتاً، گویا اسے کچھ امید کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اکھڑے اکھڑے بول پھر صحیح سرگم میں آ جاتے ہیں۔ یہ تھا بھوتیا جو مشرقی پاکستان کے شمال مشرقی علاقوں کا خاص گانا ہے اور تاثیر میں یکتا ہے۔

رکھالی:

جس طرح گاڑی بان سفر کی تھکن اور کوفت دور کرنے کے لئے بھوتیا گاتے ہیں، اسی طرح اکثر دوسرے پیشہ ور بھی اپنے اپنے کام کے ساتھ گانے کا مشغلہ جاری رکھتے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے، نوجوان کسان اکثر وہ خوبصورت گیت گاتے ہیں، جو "رکھالی" کہلاتے ہیں۔ ان میں کرشن اور گوپیوں کی داستانیں ہوتی ہیں۔ ہرے بھرے کھیتوں میں جب جا بجا لوگ جھکے ہوئے کام میں مشغول ہوتے ہیں تو

ان میں سے ایک رکھوالی کی تان اٹھاتا ہے اور دوسرے اس کے بعد دہراتے ہیں حتیٰ کہ کھیت نغموں سے معمور ہو جاتے ہیں۔

اسی طرح کمہار بھی برتن بناتے ہوئے گاتے ہیں اور جولاہے کپڑا بنتے ہوئے۔ لوہار لوہا کوٹتے ہوئے اور ہر ایک اپنے اپنے کام پر، خواہ کچھ ہی ہو۔

کیرتن :

چنانچہ ان کا مقبول گانا کیرتن ہے اور بڑھے بھی اسے بہت شوق سے گاتے ہیں اور رات رات بھر کیرتن کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں۔ یہ ایک طرح کے مذہبی گیت ہوتے ہیں جن میں وشنوی عقیدے کے لوگ بڑے جوش اور عقیدت سے حصہ لیتے ہیں۔ سنگت کے لئے "کھول" ہوتا ہے جو ایک طرح کا لمبا سا ڈھول ہے جو بیچ میں سے چوڑا اور دونوں سروں پر سے پتلا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ پیتل کی تھالیاں یعنی "کرتال" اور لکڑی کے دو ٹکڑے جن پر گھنگرو بندھے ہوتے ہیں اور جو ایک ہی ہاتھ سے آپس میں بجائے جاتے ہیں۔ انہیں "کاٹ کرتال" کہتے ہیں۔ ان گانوں میں حال اور سرشاری کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان محفلوں کا حاصل سمجھی جاتی ہے اور جن میں دنیاوی تفکرات سے بالاتر ہو کر حصہ لینے والے ایک روحانی سرور حاصل کرتے ہیں۔

جاگ گان :

رات کے گانوں کا جب ذکر آیا ہے تو اس ایک مستقل رسم کا ذکر لازم ہوگیا۔ یہ رسم "جاگ گان" کہلاتی ہے یعنی رات کو جاگنے (رتجگے) کا گانا۔ سردی میں پوس کے مہینے میں جب خریف کی فصلیں کاٹی جا رہی ہوتی ہیں، دل خوشی سے معمور ہوتے ہیں اور کھلیان اناج سے، کھانے پینے کی فراوانی ہوتی ہے اور گھر والیاں طرح طرح کے لذیذ کھانے تیار کرتی ہیں ۔۔ خاص کر "پیٹھے" یعنی چاول اور آٹے کی لذیذ میٹھی ٹکیاں۔ ایک دوسرے کی دعوتیں ہوتی ہیں، حصے بھیجے جاتے ہیں اور ہر طرف مسرت کے شادیانے بج رہے ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کٹائی کے کام میں ایک گھرانہ دوسرے کی مدد لیتا ہے۔ رات کو کٹی ہوئی فصل کی رکھوالی بھی کرنی پڑتی ہے۔ سب لوگ کسی بڑے پیپل یا برگد کے نیچے بیٹھ کے آگ جلا لیتے ہیں اور یوں رات گزارتے ہیں۔ ایسے میں قدرتاً گانے کا سلسلہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ "جاگ گان" کا مضمون عام طور سے اولیاء کی زندگی کے حالات ہوتے ہیں اور ان کے معجزات اور کمالات کا بیان۔ جاگ گان خاص طور پر راج شاہی اور پبنہ اور دوسرے ضلعوں میں رائج ہیں۔

کبھی کبھی ان رتجگوں میں کہانیاں بیان کی جاتی ہے اور یہ "پالاگان" کہلاتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور منظوم کہانیاں یہ ہیں: "میووا"، "مالوا" "کاجل ریکھا"، "دیوان بھینہ" اور "دیوان مدینہ"[1] آخرالذکر کا لکھنے والا دو صدی پہلے کا ایک دیہاتی شاعر بنام منصور بیاتی تھا۔ یہ داستان اس قدر تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے کہ مشہور فرانسیسی ادیب رومان رولاں نے بھی اس کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ یہ داستانیں عام انسانوں سے متعلق ہوتی ہے اور روزمرہ زندگی کی آئینہ۔ دوسرے ملکوں کے لوک گیتوں کی طرح ان میں بھی مافوق الفطرت واقعات ہوتے ہیں لیکن کم۔ کہانی کا ہیرو بادشاہ ہو یا کوئی بڑا سوداگر، اس کی زندگی کے معمولات وہی ہوتے ہیں جو ایک عام انسان کے۔ اس کی بھی وہی مشکلات اور پریشانیاں ہوتی ہیں جو عام آدمیوں کی۔ مثلاً کہانی میں ملکہ کو بھی دوسری عورتوں کی طرح گھاٹ پر جا کر نہانا ہوتا ہے۔ اس کو بھی صحن میں بیٹھ کر مچھلی کاٹنی پڑتی ہے وغیرہ۔ چنانچہ ان کہانیوں کا رنگ عوامی ہے اور عوامی زندگی کی عکاس ہیں۔

ان کی ایک اور خصوصیت حزن و ملال ہے۔ یہ کہانیاں اکثر بیشتر یاس انگیز ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں مقبول گیت حزنیہ ہی ہوتے ہیں۔ یا پھر اس یاس و حسرت میں بھی یہاں کی اصل زندگی کا عکس ہے۔ یہ تو صحیح نہیں کہ یہاں کے دیہات کی زندگی سراپا الم ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ باوجود زندگی کی مشکلات کے یہ لوگ خاصے مست اور مگن رہتے ہیں۔ البتہ ہر بلائے آسمانی اور جفائے انسانی کے وہ اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ کہانی گھڑتے وقت بھی واقعات کی کڑیاں قدرتاً وہ اس طرح جوڑتے ہیں کہ ٹریجڈی پر منتج ہوں۔ دراصل ایسی کہانیاں بنانے والے اور گانے والے گویا اس طرح اپنا دل ہلکا کر لیتے ہیں اور یونان میں ٹریجڈی کا مقصد یہی سمجھا جاتا تھا یعنی "کیتھارسس"۔

یہاں کے گانوں میں آہ و زاری ایک مستقل صنف کی شکل میں بھی موجود ہے جسے "زاری گان"[2] یعنی حزنیہ گانے کہتے ہیں۔ اکثر تو ان گانوں کا موضوع واقعات کربلا ہی ہوتے ہیں اور اس طرح ان کو مرثیوں کے مترادف سمجھنا چاہیئے لیکن اس کے علاوہ اور بھی طرح طرح کے غم روزگار جو ہیں ان کا دکھڑا "زاری" یا

---

[1] دیوان = دیوانہ، دیوانی : مدینہ = ایک عورت کا نام تھا

[2] "جاری" یا "زاری" = رونا : گان = گانا۔

"جاری" کی شکل میں رویا جاتا ہے۔طغیانی سے تباہی آگئی یا وبا پھیل گئی۔ بارش نہیں ہوئی یا قحط پڑ گیا، ہر غم کا اظہار "جاری" میں کیا جاتا ہے، مثلاً :

" دوپہر کی دھوپ میں ریت دور دور تک پھیلا ہوا ہے
دھوپ کی تپش سے بلا کی پیاس لگ رہی ہے
خدایا ابر بھیج، بارش بھیج
زمین سوکھ گئی ہے، آسمان تپ گیا ہے
بادلوں کا بادشاہ شاید سو رہا ہے
اے خدا ابر بھیج، بارش بھیج "

یا یہ لیجئے :

" دریائے سرما میں طغیانی آگئی ہے
ہفتے سے پانی چڑھنا شروع ہوا
اور اتوار تک ہر چیز تہ آب ہوگئی
جس کے پاس بڑی بڑی کشتیاں ہیں
وہ تو دوسرے گاؤں میں چلے گئے
لیکن غریب کیا کریں
ان کے لئے تو طغیانی موت کا پیغام ہے "

بارہ ماشی[1]

زندگی کی عکاسی کی یہی خصوصیت ان گاؤں میں بھی نمایاں ہے جو "بارہ ماشی" کہلاتے ہیں۔ لفظ کا مطلب ہے "سال کے بارہ مہینے" اور اس میں بارہ مہینے کی گھریلو زندگی کا حال بیان کیا جاتا ہے۔ یہ بیان ایک بیوی کی زبانی ہوتا ہے جو اپنے شوہر کے فراق میں زندگی کے وہ لطف بیان کرتی ہے جو اس کے ہوتے ہوئے میسر آتے ہیں۔ بڑی حسرت سے وہ زندگی کی ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بیان کرتی ہے جو ایک غریب لیکن بابرکت گھر میں نصیب ہوتی ہیں۔ اس بیان سے گویا بچھڑے ہوئے شوہر کو اپنے پیار اور محبت کا یقین دلانا مقصود ہوتا ہے تاکہ وہ اس دوری کو روا نہ رکھے اور پھر واپس آجائے ۔

" سکھی اگھن کا مہینہ شروع ہوگیا، کھیت میں دھان پک گئے ہیں
دل کا راجہ تو بدیس میں ہے، مجھے کیا سکھ ملے گا
سکھی لو پوس بھی آگیا، یہ جوانی بوجھ بن گئی ہے مجھ پہ
کب تک برہ کی آگ میں جلتی رہوں گی
ماگھ آگیا، بن میں شیر چنگھاڑتے ہیں
وہ مجھ جیسی کامنی نار سے دور کیوں ہے ؟
پھاگن شروع ہوگیا، پھاگ کھیلنے کے دن !
میں کس کے ساتھ کھیلوں ؟
سکھی چیت کا مہینہ کیسے گزاروں

---

[1] بارہ ماشی = "بارہ ماش" : ماش = ماہ؛ مثل "بارہ ماسے"۔ یوپی کے دیہاتی گیت

سارا جسم سیاہ ہوتا جا رہا ہے
بیساکھ آیا اور آندھیاں آنے لگیں
میرے دل میں بھی طوفان مچلنے لگے
سکھی لو درختوں میں آم پکنے لگے
جیٹھ کا مہینہ شروع ہو گیا
کھانے میں مزہ کہاں، وہ جو مجھ سے بہت دور ہے
اساڑھ آیا اور بادل گرجنے لگے
کیا من کا میت بھیگتے بھیگتے آئے گا؟"

ایک اور خصوصیت بنگال کے لوک گیتوں کی ان کا ناصحانہ رنگ ہے۔ ہر کہانی اور ہر گانے کے آخر میں پند و نصائح کا کوئی نہ کوئی پہلو نکلتا ہے۔ مثلاً کسی دلیر کسان کی شیر سے لڑائی کا ذکر ہوتا ہے۔ داستان گو تصور کی شدت اور بیان کی قوت سے ایک سماں باندھ دیتا ہے لیکن کہانی ختم ہوتے ہی وہ رُخ بدلتا ہے اور اس میں نصیحت کا پہلو نکالتا ہے اور تنبیہہ کرتا ہے کہ اس طرح جان جوکھوں میں ڈالنا اچھی بات نہیں، کیونکہ جان خدا کی دی ہوئی نعمت ہے اور تھوڑی سی شہرت اور نفع کی خاطر اس کو ضائع کرنا گناہ ہے۔

یہ قرونِ وسطیٰ کا ناصحانہ رنگ اکثر بنگالی لوک گیتوں میں ملیگا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ نمایاں ان گانوں کا مذہبی رنگ ہے۔ بیشتر گانے تو ہیں ہی اِن موضوعات پر مشتمل اور دوسرے میں کوئی نہ کوئی پہلو خدا رسول کے ذکر کا نکال ہی لیا جاتا ہے۔ مذہبی گانوں میں ہندوؤں کے کیرتن کا ذکر تو آ ہی چکا۔ اسکے علاوہ مسلمانوں کے "معرفتی"۔ "مرشدی"۔ "بول" اور "دیہو تتو" ہیں۔

لیکن اس مذہبیت کی چند خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔ اول تو اس میں روکھا پن اور یبوست نہیں، بلکہ مذہبی جذبے کا اظہار ان گیتوں میں بڑے جوش اور وارفتگی کے ساتھ ہوتا ہے، جیسے قوالی میں، بلکہ کھیل تماشے، دھوم دھڑکے کے قصوں کہانیوں کے ساتھ بھی یہ مذہبیت نبھ جاتی ہے۔

دوسرے اس مذہبیت میں اسلام برائے نام ہی ہے۔ بہت سے خیالات جو ان میں ظاہر کئے جاتے ہیں وہ قطعی غیر اسلامی ہوتے ہیں لیکن خدا رسول کا نام بیچ میں لاکر انہیں جاہل عوام کی نظر میں قابلِ قبول بنا دیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ پورا سلسلہ گیتوں کا جو مرشدی کہلاتا ہے، مرشد کی تعریف میں اس قدر غلو کا شکار ہے کہ ایک سمجھدار مسلمان ان کو سن کر حیران و ششدر رہ جائے گا بلکہ کانوں کو ہاتھ لگائے گا۔

لیکن ایک پہلو اس مذہبیت کا وہ عام خدا ترسی اور انسان دوستی ہے جس کی دوسرے مذاہب نے بھی تلقین کی ہے مگر اسلام نے خاص طور پر شرفِ آدم کو بلند کرنے اور اخوتِ بشر کو پھیلانے پر زور دیا، خصوصاً صوفیا کے مسلک نے اس کو بہت فروغ دیا۔ بہرکیف حقیقت یہ ہے کہ ان گیتوں میں ان خیالات و جذبات کا محرک تنہا اسلام کو نہیں قرار دیا جا سکتا۔ دراصل ان کا ماخذ بھگتی مذہب خدا پرستی یا صوفیت کے وہ گیت اور گانے ہیں جن کی مثالی شکل چودھویں صدی

کے مشہور شاعر چنڈی داس کے کلام میں ملتی ہے (اور بھگتی مذہب جیسا کہ ہم جانتے ہیں، اسلام کے زیر اثر نمودار ہوا) مثلاً چنڈی داس کا یہ قول لیجئے :-

"سن رے مانس بھائی
سب سے اوپر انسان کی بھلائی
اس سے اُوپر کچھ ناہی"

اور اسلام میں بھی یہ خیال ہمیشہ سامنے رہا ہے۔ مثلاً سعدیؒ کا شعر ہے ؎

"دل بدست آور کہ حج اکبر است
از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است"

اور خود ہمارے شاعر اعظم علامہ اقبال کا قول ہے ؎

آدمیت احترام آدمی
باخبر شو از مقام آدمی

بہرحال انسان دوستی کے یہ خیالات کچھ ہندوؤں کے فرقہ دشنو کے شعراء کے ذریعے اور بھی پھیلے اور اس سلسلہ میں بہت سے مسلمان شاعر بھی منسلک ہیں مثلاً سید مرتضیٰ، مرزا کنگلی، فیض اللہ، ناصر محمود، علی رضا وغیرہ۔ ان کے کلام میں انسان کی طرف سے خالق، اللہ کی جستجو کو عشق مجازی کے پیرائے میں پیش کیا جاتا ہے۔ انسانوں کی پیار محبت کی باتوں کے ذریعے خالق و مخلوق کے تعلق کو بڑے موثر اور محسوس طریقے پر پیش کیا جاتا ہے۔ بے تکلفی اور لگاؤ کی باتوں میں خدا کی دوری ختم ہو جاتی ہے اور انسان کی کم مائگی کا احساس بھی بھلا دیا جاتا ہے۔ پھر اس وارفتہ محبت میں مادی نعمتوں کی خواہش بھی ختم ہو جاتی ہے اور صرف لطف و عنایت پر نظر رہتی ہے۔ ان میں سے بہت سے شاعر گھر بار چھوڑ کر تلاش حق میں حیران و سرگرداں پھرتے رہے اور اس عشق الٰہی کو بڑے لطیف و دلنشیں پیرائے میں بیان کرتے رہے۔ مثلاً ایک پرانے شاعر کے شعر ہیں :

کچھ پیار کی باتیں کر، لے دوست کہ میرا دل	اکتا گیا دنیا سے۔ خوں ہو گیا الفت سے
بس عشق الٰہی کی اب پیاس کچھ ہی ہے	دل ڈھونڈتا ہے مرہم، اللہ کی محبت سے
اس شاہد رعنا کا، دیدار جہاں بھی ہو	ہم جائیں گے سر کے بل، محنت سے مشقت سے
کس ہیئت پہ رکھی ہو سکھیو نزادھرکا ہے	دل اسکو دو جو بخشے، کچھ عشق کی دولت سے
جو فیض کا منبع ہے، جو چین کا داتا ہے	رکھو دل کے دوارے میں کام اسکی عبادت سے
چھوڑ اور صنم سارے، کر بند نظر اپنی	بس اس کے قدم پر رکھ، سر اپنا عقیدت سے
پھر سکھ کا زمانہ ہے، پھر شانت سے جیون ہے	غیبت کا نہ غم ہوگا، آزار نہ فرقت سے

ان صوفیانہ گیتوں کی مختلف شکلوں میں تھوڑا تھوڑا ہی فرق ہے۔ "باؤل" کہتے ہیں کہ "اولیاء" کا بگڑا ہوا تلفظ ہے[1] اس کے گانے والے قلندر قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کے امام شیخ مدن باؤل تھے جو عہد مغلیہ کے ایک شاعر تھے۔ تفصیل نامعلوم ہے۔ ان کے صوفیانہ خیالات کا اندازہ بخوبی اس گیت سے لگایا جا سکتا ہے :

کھل رہا ہے کتنی صدیوں سے مرے دل کا کنول
میں ہی کیا، تو بھی مقید ہے، نہیں رستہ، سنبھل

حیف دونوں کس قدر مجبور ہیں

---

[1] باؤل = "آول" = اولیاء۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ "باؤلے" یا مجذوب فقراء کے گیت ہیں۔ بعض اسے "بول" سے مشتق بتاتے ہیں۔

اس کا چہرہ ہے سَت گفتہ اور اَن مٹ اس کا نور
شہد کا اس میں خزانہ ، اس سے ہو دل کا سرور
کس قدر پر کیف ، کیسا بے مثال
لالچی بھونرے اسے تو چھوڑ سکتا ہی نہیں
میں ہی دیوانہ نہیں ، تو بھی تو ہے اس کے قریں
اس جہاں میں دل کو آزادی کہاں (مترجمہ۔ یونس احمر)

معرفتی گیت بھی کسی حد تک "باؤل" کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کا موضوع بھی خودی کی پہچان ہے۔ "من عرف نفسہ فقد عرف ربہ"۔ اس ضمن میں بہت سے نادر صوفیانہ مضمون ان گیتوں میں ملتے ہیں۔ مثلاً لالن شاہ کا یہ نادر گیت ملاحظہ ہو :- (مترجمہ: یونس احمر و ش جعفی)

اور کسی نے داب رکھی ہے میرے گھر کی کنجی
پل پل لٹے کیسے دیکھوں اپنے گھر کی پونجی
اپنے گھر میں رکھ کر میں دھن دولت مال خزانہ
لین دین پرایوں سے کرنے کو ہوا روانہ
دام گرہ میں اور کے اور سودا کسی کے ساتھ
دھن والا تھا جنم کا اندھا ، دھویا دھن سے ہاتھ
دریا دریا کنکر رولے ، من موتی کے اندر
لالن اپنا آپ نہ جانا من سی چیز کو پاکر

اس کے علاوہ مرشدی گیت ہوتے ہیں۔ جن میں اولیاء اللہ کی کرامات بیان کی جاتی ہیں اور عجیب وغریب معجزات اور کمالات کے بیان کے علاوہ، نہایت مبالغہ آمیز عقیدت کا اظہار کیا جاتا ہے جو سادہ لوح دیہاتیوں کی نظر میں اسلامی خیالات کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ان کے لکھنے والے بھی بیشتر جاہل فقیر ہوتے ہیں۔ جن میں درگائی فقیر سب سے زیادہ مشہور ہے۔
"دیہوتتو" بھی اسی ذیل کا ایک مذہبی گیت ہے جس میں دل کو یا روح کو ایک پرندہ سمجھا جاتا ہے اور بدن کو ایک پنجرہ جس میں وہ مقید ہے۔ اس طویل استعارہ میں جلد دیوار تصور کی جاتی ہے اور ہڈیاں ستون ، آنکھیں کھڑکیاں ، منہ دروازہ اور روح بے پردہ کی کہانی بیان کی جاتی ہے آیا وہ اڑ کر خدا کی طرف جائے گا یا شیطان کی طرف !

مختصر یہ کہ ہمارے بنگال کے سیدھے سادے باشندوں کے گیت اپنی سادگی ، صفائے احساس اور خوبیٔ اظہار میں یکتا ہیں۔ ان کو یقیناً عوامی شاعری کے بہت خاص ثمر نے سمجھنا چاہیئے۔ نغموں کا یہ بہتا ہوا دھارا صدیوں سے بہتا چلا آرہا ہے اور آج بھی پہلے کی طرح دلوں کو شاداب کر رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان گیتوں میں ملک کی تصویر دکھائی دیتی ہے اور قوم کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں۔

★

زرعی اصلاحات

اقبال نے کہا تھا کہ جس خوشۂ گندم سے دہقاں کو روزی نہ ملتی ہو، اس خوشۂ گندم کو جلا دینا ہی بہتر ہے۔ مراد یہ تھی کہ دہقان کی پسماندگی اور زبوں حالی کے اسباب کو جب تک آہنی پنجہ سے صاف نہیں کر دیا جائے گا، کوئی اصلاحِ احوال ممکن نہیں ہو سکتی اور خواجہ و مزدور کا فرق کبھی نہ مٹ سکے گا۔ جس آہنی پنجہ کا انتظار تھا وہ ہمارے عوام کی گلو خلاصی اور صدیوں کی پس ماندگی سے انہیں باہر نکالنے کے لئے بروقت آپہنچا۔

ملک کا نظامِ آراضی اور مسائلِ زراعت صدیوں سے ایک پرانی ڈگر پر چلے آرہے ہیں۔ بہت سے غور طلب مسائل پر سرسری توجہ اور اصلاحِ احوال کی نیم دلانہ کوششیں پہلے بھی ہوتی رہی ہیں لیکن ملک کا نظامِ اراضی، خصوصاً مغربی پاکستان میں مسئلہ زمین، حل طلب ہی رہا کیونکہ سیاسی بازیگری اور مفاد پرستوں کے مصالح انہیں کوئی عملی جامہ پہنا ہی نہ سکے۔ وجوہ ہر ایک کے علم میں ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس مسئلہ کی ہر جانچ اور سابق کی تمام کوششیں بااثر و قوی عناصر کی ریشہ دوانیوں اور سیاسی و سماجی دباؤ کے نیچے دب کر محض "تجویزیں" اور "سفارشیں" بنکر رہ جاتی تھیں اور کوئی بھی سود مند عملی نتیجہ برآمد نہ ہوتا تھا۔ مغربی پاکستان میں زرعی اصلاحات کا مسئلہ سب سے پہلے جس ہماہمی اور جوش و خلوص نیت سے اس نئے دور میں مکرر، بہتر اور قوی تر مساعی کے ساتھ حل کیا گیا ہے اس کی مثال ہمیں اور کہیں نظر نہیں آتی۔ صرف تین ماہ کی قلیل مدت میں "اصلاحات اراضی، مغربی پاکستان" کے کمیشن نے اپنا کام ختم کر دیا اور ایسے نتائج و سفارشات بروئے کار آئی ہیں کہ ان کا دور رس اثر ملک کے نظامِ معیشت و زراعت کو ہی نہیں بلکہ ہماری سیاست، ہمارے معاشرہ اور آئندہ نسلوں کے معیارِ حیات کو بھی نئے سانچوں میں ڈھال دے گا، ان اصلاحات کے نفاذ کے بعد جو دور رس نتائج برآمد ہوں گے ان کا ایک بڑا پہلو یہ ہے کہ درمیانی طبقۂ معاشرت اب ہمارے دیہی علاقوں میں بھی پیدا ہو سکے گا۔ جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کا دور ختم ہوا۔ اب ہاریوں، کسانوں، مزارعوں کا زمانہ آگیا ہے جو اپنی کوششوں سے اور حکومت کی لائی ہوئی برکتوں سے فیضیاب ہو کر بڑے قلیل عرصے میں اپنی، اور اپنے ساتھ ملک کی کایا پلٹ سکیں گے۔ اب ان مساعی کی بدولت وہ زمین کی قوتِ پیداوار میں اضافہ کر سکیں گے اور اس تیقن کے ساتھ کہ جو کچھ بھی وہ کریں گے وہ انہیں کے کام آئے گی اور صرف بڑے زمیندار، ان کے گاڑھے پسینہ کی کمائی سے فائدہ نہ اٹھا سکیں گے۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ پاکستان میں مارشل لا کے نفاذ پر جب ناظمِ اعلیٰ مارشل لا کا عہدہ جنرل محمد ایوب خاں نے سنبھالا تو اپنی پہلی ہی کانفرنس میں انہوں نے اپنے اس آہنی عزم کا اعلان کر دیا تھا کہ وہ جناب اختر حسین، گورنر مغربی پاکستان کی زیر صدارت ایک زرعی اصلاحات کا کمیشن مقرر کریں گے تاکہ نظامِ اراضی کے مسئلے کی پوری جانچ کی جا سکے۔ اور وہ ایسی سفارشات کر سکے جن پر عملدرآمد سے پیداوار میں اضافہ ہو اور دیہی علاقوں کے ان ۹۰ فیصد باشندوں کا معیارِ زندگی بلند ہو سکے۔ چنانچہ اس کمیشن کا تقرر فوراً عمل میں آیا اور جنوری کے اواخر میں اس کی سفارشات اور خلاصۂ نتائجِ تحقیق شائع کر دیئے گئے ہیں۔ اس کمیشن کے سلسلے میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں نے حالیہ نشری تقریر میں بالکل بجا فرمایا ہے کہ "ہم اس ملک میں ایک ایسا معاشرہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جس کا چلانا اقتصادی طور پر ممکن ہو اور جو معاشی طور پر آزاد ہو، مستحکم ہو اور سماجی انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں"۔ انہوں نے اس بات کو تسلیم کیا کہ عملاً سماجی انصاف کے تقاضے اور اقتصادی ترقی کے مفاد کے جذبے ہمیشہ ہم آہنگ نہیں ہو سکتے، لیکن درمیانی راستہ یا احوال سے مفاہمت پیدا کر کے اس خلیج کو بہت کم کر دینا اور معاشری ناانصافیوں کو دور کر دینا تو قطعی ممکن ہے۔ اس لئے بے بسی کے عالم میں رہنا ایک زندہ و فعال معاشرہ کے شایانِ شان نہیں۔ بہرکیف، کمیشن کے سامنے جو کام تھا وہ اپنی جگہ بڑا پیچیدہ اور مشکل تھا۔ وقت کی کمی کے باوجود اس نے اور متعلق عملوں نے جس تندہی، کاوش، فرض شناسی سے کام کیا وہ ان کے جذبۂ حب الوطنی کا

ثبوت ہے اور آئندہ نسلیں ہمیشہ جذبۂ احسان و تشکر کے ساتھ یاد کریں گی۔ کمیشن نے سب سے پہلے اس بات کا جائزہ لیا کہ مغربی پاکستان میں دیہی آبادی کس قدر ہے۔ ۱۹۵۱ء کی مردم شماری کو سامنے رکھ کر کام شروع کیا گیا۔ پھر موجودہ زمین کا حساب لگایا گیا۔ کمیشن نے دیکھا کہ ہماری زمین اقتصادی طور پر کافی مواقع بہم نہیں پہنچاتی، نیز ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ زمین کی تقسیم اکثر علاقوں میں غیر منصفانہ یا غیر مساوی یا غیر اقتصادی ہے۔ ہمارے دیہی عوام کا بڑا پیشہ صرف زراعت ہے اور جو یہ نہیں کر سکتے وہ زمین کے لئے بوجھ ہیں اور وہ معاشرہ میں ایک مفید عنصر نہیں ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ زمین پر آبادی کا دباؤ بڑھتا جا رہا ہے۔ زمین کی ملکیت تقسیم در تقسیم ہو کر بہت سی پریشانیاں اور اقتصادی مسائل پیدا کرتی رہتی ہے۔ لیکن کمیشن کو یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ہمارے دیہی عوام میں ولولہ اور جوش پھر بھی موجود ہے بشرطیکہ انہیں اپنے زرعی مستقبل کا پکا یقین ہو۔ بہت سی زمینیں قابل کاشت ہیں مگر انہیں بویا جوتا نہیں جاتا مگر یہ بیکار زمینیں ہمیں بہت کچھ دے سکتی ہیں۔

کمیشن نے دیکھا کہ مزارع کو مزارع رہنے کا یقین نہیں ہوتا اس لئے وہ تندہی و عرق ریزی سے کام نہیں لیتا کیونکہ اسے اپنی محنت کا پورا پھل ملنے کی امید نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ محنت اور سرمایہ زمین پر لگانے سے ہچکچاتا ہے اور زمین کی پیداوار بڑھنے نہیں پاتی۔ سیاسی و سماجی دائرے میں کیفیت یہ ہوتی ہے کہ ساری طاقت کھنچ کر چند علاقوں کے بڑے بڑے چیدہ زمینداروں اور جاگیرداروں کے ہاتھ میں آ جاتی ہے۔ نتیجۃً ملک میں سیاسی ابتری اور معاشی ناہمواری پیدا کرنے میں اس چیز نے بڑا حصہ لیا.... جس کے مضر اسباب کو یک قلم ختم کر دینا ازبس ضروری تھا اور خدا کا شکر ہے کہ اب یہ ناسور ہمارے جسم سیاست و معاشرہ سے بالکل دور کر دیا گیا ہے۔

کمیشن کی بعض اہم سفارشات یہ ہیں:

۱۔ کوئی شخص بحیثیت مالک یا بحیثیت قابض پانچ سو ایکڑ نہری یا ایک ہزار ایکڑ بارانی زمین سے زیادہ نہ رکھ سکے گا۔ موجودہ مالکوں کو البتہ اس امر کی اجازت ہوگی کہ اس مقررہ حد سے زیادہ ایسا رقبۂ زمین بھی اپنے پاس رکھ سکیں گے جس کا حق ان کو اس وقت پہنچتا ہو، جبکہ ملکیت کی زیادہ سے زیادہ حد، بے خانماں افراد کی زمین کی طرح، ایسی ہو جس کی پیداوار ۳۶ ہزار پیداواری اکائیوں کے برابر ہو۔ ان کو اس بات کی بھی اجازت ہوگی کہ (۱۵۰) ایکڑ باغاتی رقبہ بھی اپنے پاس رکھ سکیں گے اور اپنے وارثوں کے نام ایک مقررہ حد میں ہبہ بھی کر سکیں گے۔

۲۔ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس آخری حد بندی کے بعد جو زمین باقی رہ جائے گی، وہ زمین حکومت اپنے قبضے میں لے لیگی اور مزارعین یا دیگر مستحقوں میں تقسیم کر دے گی۔ مزارعین کو جگہ سے بے جگہ ہونے کی پریشانی سے بچانے اور اس خیال سے کہ پیداوار میں کمی نہ واقع ہو حکومت یہ بھی کرے گی کہ پہلا حق ان مزارعین کا سمجھے گی جو اس وقت کاشت کر رہے ہوں گے تاکہ وہ یہ زمینیں خود خرید لیں اور پچیس سال میں قسطوں کے ذریعہ اس کی قیمت ادا کرتے رہیں۔

۳۔ زمین کے موجودہ مالکوں کو ان کی زمینوں کا مناسب معاوضہ ادا کیا جائے گا۔ یہ نقد قیمت کی صورت میں ادا نہیں کیا جائے گا بلکہ تمسکات یعنی بانڈ دیئے جائیں گے جو ۲۵ سال میں قابل ادائیگی ہوں گے اور ان پر ہر سال منافع بھی ملتا رہے گا۔

۴۔ موروثی کاشتکاروں کو تمام مغربی پاکستان میں زمینوں کا پکا مالک قرار دے دیا جائے گا۔

۵۔ جن علاقوں میں آبادی کا دباؤ زمین کے رقبہ کے تناسب سے زیادہ ہے، وہاں کے مزارعین کو، حتی الوسع، ایسے نئے علاقوں میں بسایا جائے گا جہاں کی زمین سرکاری ملکیت میں ہیں۔

۶۔ مزارعین کو ان کی میعادِ کاشتکاری تک زمینوں سے بیدخل نہیں کیا جائے گا اور اگر ایسی نوبت آ ہی گئی تو قانون کے مطابق مزارعین کو زمین بسانے اور جگہ سے بے جگہ ہونے کا مناسب معاوضہ دیا جائے گا۔ لگان بڑھانے پر بھی پابندی لگا دی جائے گی کسی قسم کا نذرانہ، بیگار اور کسی طرح کی مفت خدمت لینے کی ممانعت کر دی جائے گی۔

۷۔ تمام جاگیریں بغیر کسی معاوضے کے سرکاری قبضہ میں لے لی جائیں گی اور وہ تمام مفادات و منافع جو ان جاگیروں سے جاگیرداروں کو حاصل ہوتے تھے کالعدم قرار دیئے جائیں گے۔

۸۔ اس خیال سے کہ ملکیت زمین کے ٹکڑے ٹکڑے نہ ہوتے رہیں اور تقسیم در تقسیم کی خرابیاں دور کی جاسکیں، ایک خاص اقتصادی حد مقرر کردی گئی ہے جس سے کم رقبۂ زمین تقسیم نہ کیا جائے گا اور قانونی طور پر چھوٹے رقبوں کو ایک مشترکہ بندوبست کے تحت مجتمع کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

۹۔ فوری انتظام کیا جائے گا کہ تمام مغربی پاکستان میں ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ملکیتِ اراضی کو لازمی طور پر یکجا کردیا جائے۔

ان اور دیگر سفارشات کو فوری عملی جامہ پہنانے کے لئے مارشل لا کا ضابطہ جاری کردیا گیا ہے تاکہ کمیشن کے کاموں کو فوراً بروئے کار لایا جاسکے۔ اس ضابطہ کے تحت مغربی پاکستان میں "صوبائی زرعی کمیشن" کا تقرر بھی عمل میں آگیا ہے جو ان سفارشات کو ضابطۂ مارشل لا کے تحت عملی جامہ پہنائے گا۔

سفارشات کی اہمیت پر صدر پاکستان، جنرل محمد ایوب خاں نے اور حالیہ زرعی پریس کانفرنس میں حکومت کے وزراء نے ان امور پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ مثلاً یہ کہ سب سے بڑی اصلاح جو روبہ عمل آئی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کی حدِ ملکیت معین کردی گئی ہے اور جو بھی زمین زاید ہوگی اسے مناسب قسطوں پر ان مزارعین میں تقسیم کردیا جائے گا جن کی اپنی زمین نہ ہو یا جن کی اپنی زمین اقتصادی طور پر ناکافی ہو۔ مغربی پاکستان میں کوئی چھ ہزار زمیندار ہیں۔ یہ زمین اب ان زمینداروں اور دیگر مستحقین میں انصاف و مساوات کے اصول پر تقسیم کردی جائیں گی۔ اس طرح مزارعین اور ان زمینداروں، سب کو ہی اپنی زندگی سنوارنے کا بہتر اور منصفانہ موقع مل سکے گا اور سب طبقات نے جذبۂ حب الوطنی کے تحت، اور قواعد کی روح کے مطابق، اپنا اپنا فرض ادا کیا تو ملک کی کایا پلٹ ہوجائے گی۔ خود حکومت کی پوری مشینری کامل خلوص و تندہی کے ساتھ ان احکام پر عمل کرانے کے لئے حرکت میں آچکی ہے۔

اس سلسلے میں صدر پاکستان جنرل محمد ایوب خاں نے وضاحت فرماتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ ان اصلاحات کے لئے انہوں نے جو اعلان کیا تھا وہ محض جذباتی نہ تھا بلکہ ایک حقیقت پسندانہ تصورِ ذہنی تھا تاکہ ایسا حل نکالا جاسکے جس کو "دل کے علاوہ عقل بھی تسلیم کرے"۔ ظاہر ہے کہ اس سے بہتر اور کوئی زاویۂ فکر نہ ہوسکتا تھا۔ ان کے دوررس نتائج میں سماجی اور اقتصادی ناانصافی کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہوجائے گا اور زرعی اقتصادی زندگی بہتر ہوتی چلی جائے گی۔ مزید برآں جنرل محمد ایوب خاں نے یہ بھی کہدیا ہے کہ "میری حکومت کے یہ فیصلے ہماری زرعی اقتصادی زندگی کو بہتر بنانے کے ضامن ہوں گے"۔ پریس کانفرنس میں بھی یہ بات واضح کردی گئی ہے کہ مارشل لا کا حالیہ ضابطہ ان سفارشات اور فیصلوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے موجود ہے اس لئے کسی سمت میں شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہنی چاہیئے۔

ان سفارشات اور حکومت کے فیصلوں کا اعلان کرتے ہوئے جنرل محمد ایوب خاں نے فرمایا کہ بہت ممکن ہے کہ بعض فیصلے زمینداروں کو سخت دکھائی دیں۔ لیکن انہوں نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ اب زمانے بدل چکے ہیں اور یہ امید ظاہر کی ہے کہ "یہ وقت کے تقاضوں سے بے خبر نہیں ہوں گے۔ دوسرے ملکوں کی تاریخ ہمارے سامنے ہے اور ہم کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ علاوہ اس بات کے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے سماجی انصاف کو پیش نظر رکھنا ہمارا فرض ہے مجھے یقین ہے کہ ان اصلاحات کا نفاذ اس نظام کے لئے اور ان اقدار کے لئے بھی ضروری ہے جو ہمیں اسقدر عزیز ہیں اور جن کی خاطر پاکستان کا آزاد ملک وجود میں آیا ہے"۔

ان اصلاحات کے نفاذ کا مقصد کسی سے سیاسی یا اور کسی طرح کا انتقام لینا مقصود نہیں ہے، ورنہ حکومت اس سے زیادہ سخت جامد قوانین بھی جاری کرسکتی تھی، مگر ظاہر ہے کہ حقیقت پسندانہ اور عملی نقطۂ نظر کو سامنے رکھ کر انتہائی ملائم قانون بنائے گئے ہیں اور کسی بھی طبقہ کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دی گئی ہے۔ اب یہ زمینداروں کا کام ہے کہ وہ اپنی زندگیاں، دوسروں کی محنت پر عیش کرنے کے بجائے خود ہاتھ پیر ہلا کر بسر کریں گے اور خود محنت و جانفشانی کرکے زمینوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائیں گے اور جو اپنی زندگی کے ڈھب کو نہ بدلیں گے زمانہ کی رفتار ان کا انتظار نہ کرے گی۔

اس مسئلہ کا ایک فریق اگر زمیندار ہیں تو دوسرا فریق مزارعین بھی ہیں۔ انہیں بھی اپنے فرائض سمجھنے چاہئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمارے

نظام زراعت کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی مثال ہیں۔ اور اس سے پہلے کبھی یہ تسلیم نہ کیا گیا تھا کہ مغربی پاکستان کی پیداوار بڑھانے میں مزارعین کی فی الحقیقت کیا قدر و قیمت ہے اور ان کی کس قدر اہمیت ہے۔ اسی وجہ سے انہیں اب بیدخلی کے خطرے سے نجات دلادی گئی ہے۔ تاکہ وہ خوب محنت اور شوق سے زمینوں کو جوت بو سکیں۔ یہ بیشک صحیح ہے کہ ہر ہر شخص کو فائدہ پہنچانا ناممکن بات ہے کیونکہ زمینیں کم ہیں، اس لئے جو لوگ مالک زمین نہ بن سکیں انہیں بددل نہ ہونا چاہیئے۔ ترقی و بہتری کے مواقع محنت کش کے لئے بہت ہیں اس لئے ان سے بجا طور پر یہ امید ہے کہ وہ زمین کے مالک کے ساتھ مل جل کر کام کریں گے اور اس کے کام کو اپنا کام سمجھ کر کریں گے تاکہ زمینوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ نیز مزارع کی حیثیت سے ان پر جو عوائد و فرائض آتے ہیں ان کو وہ بدستور ادا کرتے رہیں گے اور کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں گے۔

امید ہے زرعی اصلاحات کے نفاذ کے بعد مغربی پاکستان کے مزارعین کے حقوق کی کماحقہٗ حفاظت ہو جائے گی اور معاشرہ کے وہ افراد جو اب تک روایتی عیش و نعم کی زندگیاں بسر کر رہے تھے اب ملک کے زیادہ بہتر شہری بن جائیں گے اور اپنے دست و بازو کی قوت سے ملک کی خوشحالی و بہتری کے لئے کوشاں ہوں گے اور ہم ان سب کی مساعی سے بہرہ مند ہو سکیں گے۔ اور پاکستان حقیقی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے گا۔ ع

کہ خشت و سنگ سے ہوتے ہیں یوں جہاں پیدا

★

پاکستان کی صنعتی ترقی

ایم۔ ایم۔ اکرم

۱۹۴۷ء میں دنیا کے نقشے پر ایک نیا ملک ابھرا جو زرعی معیشت کا ملک تھا صنعتی ترقی اور صنعتوں کا روشناس کرانا اور زرعی اقتصادیات کو صنعتی اقتصادیات کی منزلوں پر پہنچانا نہایت ضروری تھا۔ کیونکہ سو فیصدی زرعی ملک اپنی اور دوسری تمام ضروریات کی تکمیل کے لئے دوسرے ملکوں کے دست نگر ہوتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت ہم مجبور تھے۔ کہ اپنی روزمرہ ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے دوسرے ملکوں کے دست نگر تھے۔ یہی نہیں بلکہ ضروری اشیاء جیسے کپڑا جوتے۔ شکر کیمیاوی دواؤں وغیرہ کے لئے ہمیں دوسرے ملکوں کی طرف دستِ سوال دراز کرنا پڑتا تھا۔ اور ملک کی اقتصادی زندگی میں اتنا سکت نہ تھا۔ کہ دوسرے ملکوں سے اپنی روزمرہ ضرورت کی اشیاء درآمد کر سکیں۔ زرعی اقتصادیات پر پاکستان کا دارومدار تھا اور پھر ملک میں صنعتوں کے قیام کے لئے نہ فنی ماہرین تھے، اور نہ صنعتی ترقی کے لئے ہم کوئی طریق کار جانتے ہی تھے یعنی صنعتی میدان میں تجربہ سے بھی خالی تھے۔ ہم اس زرعی اقتصادیات کے ملک کو نیم صنعتی اقتصادیات کا ملک بنانا چاہتے تھے۔ یعنی ہمیں زراعت کے ساتھ ساتھ صنعتی ترقی بھی کرنی تھی۔ تاکہ دوسروں کی محتاجی ختم ہو۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں کراچی میں اس مقصد کے حصول کے لئے پاکستان کی پہلی صنعتی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اور ۱۹۴۸ء میں حکومت نے اپنی صنعتی پالیسی کا اعلان کیا۔ ۱۹۴۸ء کا یہ اعلان گویا پاکستان کی صنعتی ترقی کی خشتِ اول یا سنگِ بنیاد تھا۔ اس صنعتی پالیسی میں چند ایک صنعتوں کے علاوہ جیسے۔ اسلحہ۔ بجلی پیدا کرنے کی صنعت اور ایسی صنعتیں جو سلسلۂ مواصلات سے متعلق تھیں جیسے ٹیلیفون اور تار کے آلات ریل کے ڈبے بنانا اور نشریاتی آلات و اوزار وغیرہ بعض قومی مصلحتوں کی بنا پر انہیں حکومت کے زیر کنٹرول رکھا گیا۔ مگر ان کے علاوہ دیگر ضروری اشیاء اور مصنوعات کی تیاری کے لئے نجی سرمایہ کاروں اور اداروں کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ اور اس پالیسی میں یہ گنجائش بھی رکھی گئی تھی۔ کہ ملک میں صنعتوں کے قیام کے لئے اگر نجی سرمایہ مناسب طور پر نہیں لگایا جا رہا ہے تو پھر حکومت اس خلا کو پُر کرے تاکہ پاکستان کی اقتصادی زندگی میں اور پاکستان کی معاشی ترقی میں کوئی رکاوٹ بھی پیدا نہ ہونے پائے۔ حکومت کی یہ صنعتی پالیسی بلاشبہ دوراندیشی پر مبنی تھی۔ صنعتی ترقی کے لئے حکومت نے ٹیکسوں میں مراعات بھی کیں تاکہ غیر ملکی سرمایہ پاکستان میں زیادہ سے زیادہ لگایا جا سکے۔ لیکن نجی اور غیر ملکی سرمائے کا جہاں تک تعلق ہے سرمایہ خاطر خواہ طور پر صنعتوں میں نہیں لگایا گیا ـــــ حکومت کا یہ یقین کہ پاکستانی نجی سرمایہ صنعتوں میں خاطر خواہ لگایا جائے گا پورا نہ ہوا مگر آہستہ آہستہ صحیح ثابت ہوتا رہا۔ چنانچہ متعدد صنعتوں میں قابل لحاظ ترقی نمایاں ہونے لگی جیسے سوتی کپڑے کی صنعت، چمڑے کی صنعت، دیاسلائی، سگرٹ اور اسی طرح کی متعدد صنعتیں ملک میں قائم ہو گئیں۔ ملک میں صنعتوں کا قیام ہو رہا تھا اور حکومت صنعتوں کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی لیکن یہ محسوس کیا گیا کہ نجی سرمایہ بڑی اور اہم تر صنعتوں میں خاطر خواہ نہیں لگایا جا رہا ہے جیسے پٹ سن کی مصنوعات، کاغذ سازی، جہاز سازی، بھاری مشینوں کی صنعت کیمیاوی کھاد وغیرہ۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ان صنعتوں کے لئے کثیر سرمایہ کی ضرورت تھی یا یہ کہ ان کا طریقہ کار فنی طور پر زیادہ پیچیدہ بھی تھا۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ سرمایہ لگانے کے بعد فوری طور پر سرمائے کی واپسی یا منافع کی توقع سرمایہ کاروں کو نہ تھی۔ اُدھر سرمایہ داروں نے یہ سوچنا بھی شروع کر دیا کہ درآمد برآمد میں رقم لگائی جائے تو اس میں زیادہ سے زیادہ تھوڑے ہی عرصے میں حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اور پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے راہیں ہموار کرنے اور ملک میں متوازن طور پر صنعتوں کو بڑھانے اور صنعتی اقتصادیات کا رجحان پیدا کرنے کے لئے پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن یعنی پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کا قیام عمل میں آیا۔

اپنے قیام کے سات برسوں میں پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے یہ کارخانے جاری کئے، پٹ سن ۱۲۔ کاغذ سازی اور گتہ بنانے کے ۳۔ اون ۳،۔ سیمنٹ ۲۔ جہاز سازی و مرمت جہاز ۳۔ کیمیاوی اشیاء، ۵۔ شکر ۵۔ کیمیاوی کھاد ۲۔ سوتی پارچہ ۱، اور سوئی سے کراچی و ملتان تک پانچسو پینسٹھ میل لمبی پائپ لائن بچھائی ہے۔ گیس تقسیم کرنے والی دو کمپنیاں بھی قائم کی ہیں۔ کارپوریشن کا قیام ۲ جنوری ۱۹۵۲ء کو ہوا تھا۔ جب سے اب تک اس ادارے نے ۴۹ منصوبے مکمل کئے ہیں۔ اور مزید ۱۷ منصوبوں پر کام ہو رہا ہے تکمیل شدہ منصوبوں پر [illegible] کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے

اور جو منصوبے زیرِ تکمیل ہیں۔ ان پر مزید نو سے کروڑ کی لاگت آئے گی۔ جو منصوبے مکمل ہیں۔ ان پر ۲۳ کروڑ روپیہ نجی سرمایہ سے لگایا گیا ہے۔

پچھلے سات برس میں پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے قایم کردہ کارخانوں نے ایک ارب پچاس کروڑ روپیہ کا مال تیار کیا جس میں سے چالیس کروڑ زرِ مبادلہ کا مال برآمد کیا گیا۔ اس وقت پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے جو منصوبے زیرِ تکمیل ہیں، ان میں اخباری کاغذ کا ایک کارخانہ۔ شکر کا ایک کارخانہ اور قدرتی گیس کے ذریعہ چلنے والے کیمیاوی کھاد کے دو بڑے کارخانے۔ دو کیمیاوی پلانٹ دو سیمنٹ کے کارخانوں کی توسیع ایک برقابی طاقت کا اسٹیشن ہیں۔ ملتان اور وال پار کو سلسلہ کی لائن کے ذریعہ ملایا جا رہا ہے اور اس کے علاوہ دیگر چھوٹی چھوٹی اسکیمیں زیرِ تکمیل ہیں۔ یہاں ایک بات یہ بھی واضح کر دینا بہتر ہوگا کہ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کا ادارہ ملک میں صنعتوں کی اجارہ داری حاصل کرنا نہیں چاہتا بلکہ اس کا اولین مقصد یہ ہے کہ ملک میں صنعتوں کی ترقی ہو۔ اسی لئے پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے منصوبوں میں نجی سرمایہ طلب کیا جاتا ہے اور پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے مکمل کردہ چھ کارخانے کلی طور پر نجی اداروں کو منتقل کئے جا چکے ہیں۔ نو کارخانے ایسے ہیں۔ جن میں پی، آئی، ڈی، سی نے اپنی شرکت باقی رکھی ہے۔ لیکن ان کا انتظام شریک صنعت کاروں کے ہاتھ میں ہے۔

بلاشبہ پی، آئی، ڈی، سی نے اہم صنعتوں کی ذمہ داری سنبھالی ہے جنہیں نجی صنعت کار تنہا سنبھال نہ سکتے تھے۔ اس طرح پی، آئی، ڈی، سی کا ادارہ اگرچہ اپنی قسم کا واحد ادارہ نہیں ہے لیکن اس کی اہمیت نہایت مسلم ہے کیونکہ اس ادارے نے نجی صنعت کاروں کے سرمائے اور حکومت کی نگرانی اور اس کے منصوبوں کو یکجا کر دیا ہے اس ادارے کے قیام کے بعد سے جو صنعتیں ملک میں پروان چڑھی ہیں ان کی بنا پر ہم اپنی بہت سی ضروریات میں خود کفیل ہو گئے ہیں یعنی غیر ملکوں کا دستِ نگر رہنے کی حالت ختم ہو چکی ہے۔

یہی نہیں بلکہ ہم نے اپنا زرِ مبادلہ بچایا ہے۔ اس عظیم منصوبے کی تکمیل کے بعد اس کی کارکردگی نے ہمیں جو کامیابیاں عطا کی ہیں۔ ان کی فہرست طویل ہے۔

۱۹۵۸ء میں پی، آئی، ڈی، سی کے کارخانوں نے ایک لاکھ اسّی ہزار ٹن پٹ سن کا سامان تیار کیا چار لاکھ ٹن سیمنٹ بنائی چھبیس ہزار ٹن کاغذ دس ہزار ٹن اعلیٰ اور معمولی قسم کا گتہ اڑتیس ہزار ٹن شکر بیس ہزار ٹن کیمیاوی کھاد دو لاکھ ٹن معدنی کوئلہ ایک کروڑ ۲۰ لاکھ مکعب فٹ قدرتی گیس ستر لاکھ پونڈ سوت سات لاکھ گز اونی کپڑا ایک لاکھ اونی کمبل اس کے علاوہ کیمیاوی اشیاء جیسے سنٹونین، "ڈی۔ ڈی۔ ٹی"۔ اور بیروزہ اور تارپین کثیر مقدار میں تیار کی گئیں۔ پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے کارخانہ جہاز سازی میں ملکی اور غیر ملکی جہازوں کی مرمت کی گئی اور چھوٹے جہاز تیار کئے گئے۔ اصل میں پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی کے کارناموں کی تفصیل یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ یہ ادارہ ملک کی پیداوار میں اور ملک کی پیداواری صلاحیت میں زیادہ سے زیادہ وسعت اور ترقی پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ قائدِ اعظمؒ کے ارشاد کے مطابق ملک کے لامحدود وسائل سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر ایک طاقتور توانا اور خوشحال پاکستان فروغ پائے۔

پی۔ آئی۔ ڈی۔ سی نے ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء کے چھوٹی مدت کے منصوبے میں پانچ نئے منصوبے شامل کرنے کی حکومت سے سفارش کی ہے ان میں تین منصوبے مشرقی پاکستان کے لئے ہیں اور دو مغربی پاکستان کے لئے چٹاگانگ کے قریب ایک سیمنٹ فیکٹری کے قیام کا منصوبہ بھی ہے جس پر تقریباً تین کروڑ کی لاگت آئے گی فرید پور کے قریب دوا سازی اور دوسری اعلیٰ قسم کی کیمیائی اشیاء کا ایک کارخانہ قائم کرنے کی تجویز بھی ہے۔ زیل پاک سیمنٹ فیکٹری کی توسیع کی سالانہ پیداوار تقریباً ۵ لاکھ ٹن ہو جائے گی۔

بلوچستان میں کوئلے کی کانیں کھودنے کا کام اور فرید پور میں PEET کے کھودنے کا کام بھی ہے اُدھر مغربی پاکستان میں ایک سیمنٹ فیکٹری کی توسیع جس سے سالانہ پیداوار تقریباً ۵ لاکھ ٹن ہو جائے گی۔

اس طرح پاکستان صنعتی ترقیات کارپوریشن کا یہ معروف اور مستعد ادارہ پاکستان کی صنعتی ترقی میں پوری تندہی سے مصروف ہے۔ آج جو منصوبہ کاغذ پر تیار ہوتا ہے۔ وہ کل ایک کارخانے اور ایک پروجیکٹ کی شکل میں اس سرزمین پر مجسم ہو جاتا ہے۔ کارخانوں کے کل پرزے مسلسل اور لگاتار حرکت کرتے ہیں۔ اور ملک کے لامحدود وسائل ملک کی معدنیات اور ملک کی نباتات سے ملک کی ضروریات کی مصنوعات شب و روز تیار ہوتی ہیں اور ایک ترقی پذیر صحت مند پاکستان کی تعمیر کی بنیاد بن جاتی ہیں ملک کی ترقی میں ہمیشہ صنعتوں کا بڑا دخل ہوتا ہے اور صنعتیں تجارت اور اقتصادیات کی اقتصادی زندگی میں استحکام ہوتا ہے وہ ملک پروان چڑھتا ہے اس طرح پی، آئی، ڈی، سی ایک عظیم منصوبہ ہے جو عظیم تر پاکستان کی تعمیر میں اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان کراچی)

... میکلوڈ روڈ ۔ کراچی
مدیر: رفیق خاور